درِ دل

نبیلہ عزیز

نبیلہ عزیز

دردِ دل

اس کے قدم شکستہ تھے! کہتے ہیں کہ انسان کی اندرونی کیفیات صرف چہرے سے ہی نہیں اس کے قدموں سے بھی عیاں ہوتی ہیں۔ جیسے انسان کے چہرے کے تاثرات، آنکھیں اور زبان بولتی ہے۔ بالکل اسی طرح انسان کے قدم بھی بولتے ہیں۔ اپنے جذبات اپنی کیفیات ظاہر کرتے ہیں جیسے کہ انسان خوش ہو تو سرشار قدم، غم زدہ ہو تو بوجھل، بیمار ہو تو نڈھال قدم، عجلت میں ہو تو تیز قدم، نشے میں ہو تو بہکے قدم، ناکام ہو تو مایوس قدم، بچہ ہو تو لڑکھڑاتے قدم، جوان ہو تو مضبوط قدم، بوڑھا ہو تو کمزور قدم، پرعزم ہو تو ثابت قدم اور زندگی کے کسی اہم مقام پہ آکر ہارا ہو تو "شکستہ قدم"! اور آج وہ بھی ایک ہارا ہوا انسان تھا۔ آج اس کے قدم بھی شکستہ تھے۔

آج سے پہلے زندگی میں اس کے قدموں نے بھی ہزاروں ذائقے چکھے تھے۔ کئی بار سرشار ہوئے تھے تو کئی بار بوجھل کئی بار نڈھال ہوئے تھے اور کئی بار بہکے بھی تھے۔ لیکن شکستہ پہلی بار ہوئے تھے۔ کیونکہ وہ ہارا پہلی بار تھا۔ وہ اس وقت پوری طرح سے ہارا ہوا ایک شکست خوردہ انسان لگ رہا تھا اور اس وقت وہ کچھ کہنے اور کچھ کرنے کی پوزیشن میں ہرگز نہیں تھا اس وقت وہ صرف سوچ سکتا تھا کیونکہ اس وقت سوچنے کے علاوہ اس میں اور کوئی ہمت نہیں تھی اس کی ہمت و حوصلہ ڈوب چکا تھا شکست کی کسی اتھاہ گہرائی میں۔

وہ اپنے بے دم شکستہ قدموں پہ اپنی غم زدہ بوجھل ذات کا بوجھ بمشکل اٹھا کر ہسپتال کے پرائیویٹ روم کی چوکھٹ میں آکھڑا ہوا اور دور تک پہنچی کشادہ راہداری میں دیکھنے کی کوشش کی تھی اور اس کوشش کے بعد وہ

مضبوط انسان دھواں دھواں ہو کے رہ گیا تھا اور اس دھوئیں کی تاریکی اسے سرتاپا اپنے حصار میں گھیرنے لگی تھی وہ اس چوکھٹ میں یوں کھڑا تھا جیسے اس کی دنیا یہیں پہ ختم ہو گئی ہو اور اس چوکھٹ سے باہر اس کے لیے کچھ بھی نہیں بچا ہو۔ حالانکہ اب سے تھوڑی دیر پہلے تک وہ کافی حد تک مطمئن تھا۔ شاید اس لیے کہ اس کے دل میں کہیں نہ کہیں ایک چھوٹی سی ایک مدھم سی "امید" سانسیں لے رہی تھی۔ اسے جانے والے پہ بہت زیادہ نہ سہی تھوڑا بہت "مان" ضرور تھا لیکن اسے تھوڑی دیر پہلے تک یہ خیال چھو کے بھی نہیں گزرا تھا کہ مان "اکثر" ٹوٹ جایا کرتے ہیں اور امیدیں ہمیشہ دم توڑنے کے لیے ہی ہوتی ہیں۔

اگر اس چیز کا خیال اسے ذرا سا پہلے ہو جاتا تو وہ یقیناً "کبھی بھی اس پہ مان نہ کرتا۔ مگر اب۔ اب کیا ہو سکتا تھا؟ اب تو وہ بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ بہت تنہا ہو گیا تھا۔ آج اس کی امید نے ہی دم نہیں توڑا تھا بلکہ اس کا مان بھی ختم ہو گیا تھا اس کی موہوم سی خوشی بھی بجھ کر راکھ ہو گئی تھی۔ وہ اس پرائیویٹ روم کی چوکھٹ میں کھڑا ابھی تک کشادہ راہداری کو دیکھ رہا تھا جو تھوڑی دیر پہلے اتنے زیادہ لوگوں کی بدولت تنگ پڑ رہی تھی اور اب بالکل خالی اور ویران نظر آ رہی تھی۔ بالکل اس کی ذات کی طرح!

☼ ☼ ☼

"سر کیا میں یہ روم صاف کر سکتی ہوں؟" ہسپتال کی ملازمہ مریض کے ڈسچارج ہوتے ہی روم کی صفائی ستھرائی کے لیے فوراً" حاضر ہو گئی تھی شاید اب اس روم میں کسی نئے مریض کو شفٹ کرنے کی تیاری ہو رہی تھی اس لیے ان کو یہ روم از سر نو صاف کرنے کی جلدی تھی۔ وہ جواباً" کچھ بھی کہے بغیر چوکھٹ پہ رکھا اپنا ہاتھ ہٹا کر خود بھی وہاں سے ہٹ گیا تھا۔ لیکن اس کے قدم اس کا ساتھ نہیں دے پا رہے تھے وہ اپنے شکست خوردہ قدموں سے چل کے بمشکل ہاسپٹل سے باہر پارکنگ تک آیا تھا۔

پارکنگ میں تھوڑی دیر پہلے اس کی گاڑی کے علاوہ اور بھی چند گاڑیاں کھڑی تھیں مگر اس وقت صرف اس کی پراڈو موجود تھی۔ اپنی گاڑی کا لاک کھولتے ہوئے اسے اپنے ہاتھوں میں ہلکی سی لرزش محسوس ہوئی تھی شاید تنہا واپسی کے احساس نے اس کی "تھکن" اس کی "تنہائی" اس کی شکستگی میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔ تھکے تھکے انداز سے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس کی نظر پچھلی سیٹ کی سمت اٹھی تھی جس پہ سرخ خون کے دھبے اب سیاہی مائل ہونے لگے تھے لیکن اس کے ذہن میں وہ منظر، وہ لمحہ، وہ وقت آج بھی پہلے دن کی طرح تازہ تھا اس کی سماعتوں میں اس کی دردناک چیخ آج بھی محفوظ تھی اور وہ اس کی تکلیف سوچ کر آج بھی تڑپ اٹھتا تھا آج بھی اس کا دل کسی انہونی شے کے خیال سے جیسے مٹھی میں آ جاتا تھا وہ نجانے اور کتنی دیر یونہی گردن موڑے پچھلی سیٹ کو دیکھتا رہتا کہ اچانک اس کے سیل فون پہ ہونے والی وائبریشن نے اسے چونکا دیا تھا مگر چونکنے کے بعد بھی اس نے سیل فون نکال کر دیکھنے یا کال ریسیو کرنے کی زحمت نہیں کی تھی بلکہ لب بھینچ کر سر جھٹکتے ہوئے اسٹیئرنگ تھام لیا تھا اور اگلے ہی لمحے گاڑی آگے بڑھا لی تھی۔

ہسپتال سے گھر کے گیٹ تک آ کر بھی اس کی کیفیت میں رتی برابر فرق نہیں آیا تھا وہ اک ٹرانس کی سی کیفیت میں گھر تک پہنچا تھا اور ایسی حالت میں کسی اور چیز کی طرف دھیان دینا ہرگز ممکن نہیں تھا۔

"سلام صاحب۔" چوکیدار نے اس کی گاڑی دیکھ کر فوراً" ہی گیٹ کھول دیا تھا جبکہ وہ اس کے سلام کا جواب تک نہ دے سکا تھا اور خاموشی سے گاڑی اندر بڑھا لے گیا تھا حالانکہ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا کہ وہ اپنے کسی ملازم کے سلام کا جواب نہ دیتا وہ اگر کبھی غصے یا پھر غم کی حالت میں بھی ہوتا تو ہاتھ کے اشارے سے یا پھر سر کے اشارے سے ہی سہی مگر جواب ضرور دیتا تھا۔ لیکن نظرانداز نہیں کرتا تھا۔ شاید اسی لیے آج اس کے چوکیدار کو

اس کی گہری چپ اور کسی سنگین مسئلے کا احساس پہلے سامنے میں ہی ہو گیا تھا۔ جب تک چوکیدار نے گیٹ بند کیا تب تک وہ گاڑی سے اتر کر اندر چلا گیا تھا اور آگے پیچھے کچھ بھی دیکھے بنا ڈرائنگ روم کے صوفے پہ آ کر ڈھے گیا تھا۔

"سلام صاحب جی۔!" اس کی ملازمہ ڈرائنگ روم کے صوفوں پہ رکھے کشن ترتیب سے رکھ رہی تھی اچانک اسے آتے دیکھ کر الرٹ ہو گئی تھی مگر وہ بہت نڈھال نظر آ رہا تھا ملازمہ اسے اس طرح شکستہ حال میں دیکھ کر ٹھٹک گئی تھی چوکیدار کی طرح اسے بھی اپنے مالک کی کیفیت کا فوراً" اندازہ ہو گیا تھا۔ کیونکہ اس پہ چھائی مایوسی اور تھکن اس کے انگ انگ سے جھلک رہی تھی وہ آج حقیقتاً" دیکھنے والوں کو بھی "تنہا" لگ رہا تھا۔ اپنی کنپٹیوں کو مسلتے ہوئے اس نے ملازمہ کو بیڈ روم سے سگریٹ کا پیکٹ لائٹر لانے کا کہا تھا اور پھر چند سیکنڈز میں ہی اس نے سگریٹ کو اپنے تیکھے کٹاؤ دار عنابی ہونٹوں میں دبا کر لائٹر سے شعلہ دکھا دیا تھا اور اس سے ایک گہرا کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑ دیا تھا اور پھر رفتہ رفتہ سگریٹ کا دھواں ڈرائنگ روم میں ہی نہیں اس کی ذات میں بھی بھرنے لگا تھا۔ ہر سو دھوئیں کے مرغولے پھیلتے جا رہے تھے اور ہر سو اس کی تنہائی رقص کرنے لگی تھی ایک کے بعد ایک سگریٹ سلگتا رہا اور دھواں بڑھتا رہا۔

گزشتہ چند دنوں سے وہ اسموکنگ سے کافی حد تک گریز کر رہا تھا وہ اپنی عادت اپنی طلب پہ کنٹرول کرنا سیکھ رہا تھا مگر آج اچانک۔ سب کچھ پہلے جیسا ہو گیا تھا۔ اس کی سوچیں اور وہی عادتیں عود کے سامنے آنے کو بے تاب ہو گئی تھیں آج پھر سگریٹ اس کی شکستہ ذات کو اپنے دھوئیں کی چادر میں لپیٹ رہے تھے اور وہ پور پور دھوئیں میں ڈوب رہا تھا ڈرائنگ روم کا فریش ماحول دیکھتے ہی دیکھتے حبس زدہ ہو گیا اور اس کے ملازم اسے اس حال میں دیکھ کر بہت پریشان ہو رہے تھے کیونکہ وہ اپنے مالک سے بہت بچے تھے اس کا اچھا برا انہیں بھی متفکر کر دیتا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ نہ تو آگے بڑھ کے اسے روک سکتے تھے اور نہ ہی وجہ پوچھ سکتے تھے کیونکہ وہ اس وقت اپنی ہی ذات کے نہاں خانوں میں اترا ہوا تھا اور فی الحال اسے ڈسٹرب کرنا ہرگز مناسب نہیں تھا البتہ اس کے حال پہ وہ اندر ہی اندر جلتے کڑھتے رہے تھے۔

وہ شام سے ڈرائنگ روم کے صوفے پہ ایک ہی پوزیشن میں بیٹھا ہوا تھا اور مسلسل سگریٹ پھونکتے ہوئے اذیت ناکی کا یہ کھیل بھی جاری تھا اور شام سے مسلسل اس کے قریب پڑی کرسٹل ٹیبل پہ رکھا موبائل لگاتار ہونے والی وائبریشن سے تھرک رہا تھا یوں جیسے کال کرنے والا اس کے لیے تڑپ رہا ہو اور وہ موبائل اسکرین دیکھے بنا بھی جانتا تھا کہ یہ "تڑپ" یہ کال کس کی ہے؟ لیکن اس وقت وہ اپنے لیے تڑپنے والے سے بھی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس وقت وہ صرف اپنے آپ کے ساتھ رہنا چاہتا تھا وہ اپنی تنہائی اپنی شکستگی کی حد دیکھنا چاہتا تھا اپنے آپ کو آزمانا چاہتا تھا اور اسی لیے اس نے متواتر بجنے والی کال ریسیو نہیں کی تھی اور ایک بار پھر سر جھٹک کر سگریٹ ایش ٹرے میں مسل کر دوبارہ نیا سگریٹ سلگا لیا تھا آج نہ تو اس کے ذہن پہ سوار بوجھ کم ہو رہا تھا اور نہ ہی رات آگے سرک رہی تھی ہر چیز پہ اک جمود سا طاری تھا سب کچھ جیسے ٹھہر گیا تھا۔ لمحات ساکت ہوتے لگ رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

بڑی حویلی کے انتہائی بلند اور مضبوط در و دیوار پہ سورج کی نوخیز سنہری کرنیں اپنے وجود میں کئی رنگ سمیٹ کر نئے دن نئی صبح کی سریلی سی دستک دے رہی تھیں اور اس دستک کی کھنک پورے لان میں محسوس کی جا رہی تھی حویلی کا وسیع و عریض لش گرین لان دھوپ کے چمکیلے رنگوں سے بے حد نکھرا ہوا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی خوبصورتی اور تازگی ابھر کر سامنے آ رہی ہو انتہائی نفاست اور اک ترتیب سے سجے گملوں میں پودے طرح طرح کے پھولوں سے لدے ہوئے تھے اور بے حد محنت اور خوبصورتی سے سجائی گئی کیاریاں بھی اپنی گود میں نوخیز صبح کی

نشانیاں لیے ہوئے تھیں ہر طرف تازہ پھولوں کی مہک اس طرح پھیلی تھی کہ تمام آنے جانے والوں کو بھی اپنے حصار میں لے رہی تھی ایک پل کے لیے گزرنے والوں کی سانسیں مسحور ہو کے رہ جاتی تھیں اس خوشبو اس مہک نے پورے لان کا احاطہ کر رکھا تھا مگر اس وقت کسی کے پاس اتنی فرصت نہیں تھی کہ وہ چند لمحے ٹھہر کر اس خوشبو کی دلفریب سرگوشیاں ہی سن لیتا۔

صرف ایک بوڑھا مالی بابا ہی جو صبح سے شام تک ان خوشبوؤں اور ان پھولوں سے باتیں کرتا تھا پورے لان میں چکراتا رہتا تھا اس کے پاس اور کوئی کام ہی نہیں تھا سوائے ان پودوں کی دیکھ بھال کے۔ اور وہ پورا دن ان کی دیکھ بھال میں ہی گزار دیتا تھا۔ بلکہ دن تو کیا؟ اس نے تو پوری زندگی ہی گزار دی تھی بس ایک اسی لان کو سجاتے سجاتے عمر بیت گئی تھی۔

وہ بچپن سے مالی بابا کو حویلی کا یہ لان ہی سجاتے سنوارتے دیکھتی آ رہی تھی اس کے علاوہ کبھی کوئی اور کام کرتے نہیں دیکھا تھا۔

"علیزے۔!" وہ بڑی محویت سے مالی بابا کے کام کا جائزہ لے رہی تھی جب اچانک اسے عقب سے پکارا گیا تھا وہ فوراً پیچھے پلٹی تھی۔

"جی بابا؟" وقار آفندی اسے پکارنے کے بعد قدم بڑھاتے ہوئے اس کے قریب آ گئے تھے۔

"میں کب سے دیکھ رہا ہوں کہ تم کتنی دیر سے یہاں کھڑی مالی بابا کو دیکھے جا رہی ہو کیا بات ہے؟ کیا دیکھ رہی تھیں؟" وقار آفندی نے بہت محبت اور فکرمندی سے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"بابا! میں صرف یہ دیکھ رہی ہوں کہ ہم لوگ ہمیشہ یہی سمجھتے ہیں کہ ہمارا لان بس ایسے ہی ہمیشہ ہر وقت سجا سجایا رہتا ہے ہمیں کبھی یہ خیال بھی نہیں آیا کہ اس لان کو سجانے سنوارنے میں مالی بابا کی محنت اور لگن کا کتنا بڑا ہاتھ ہے؟ اس لان کو سنوارنے میں ان کا خون پسینہ ایک ہو جاتا ہے۔" علیزے نے وقار آفندی کو دیکھتے ہوئے اپنی سوچ بیان کی تھی اور وقار آفندی بیٹی کی اتنی گہری بات پہ ہلکے سے مسکرائے تھے۔

"دیکھو بیٹا ہمیشہ چیز کو سجانے کے پیچھے بھی کسی کا ہاتھ ہوتا ہے اور چیز کو بگاڑنے کے پیچھے بھی کسی کا ہاتھ ہوتا ہے بس فرق اتنا ہے کہ اس دنیا میں کچھ ہاتھ سنوارنے کے لیے بنائے گئے ہیں اور کچھ ہاتھ بگاڑنے کے لیے۔ اور یہ مالی بابا کی خوش قسمتی ہے کہ اللہ نے ان کے ہاتھوں کو کچھ سنوارنے کا ہنر بخشا ہے۔" علیزے آفندی کا سوال اچھا تھا تو وقار آفندی کا جواب بھی کمال تھا۔

"آپ کا اپنے ہاتھوں کے بارے میں کیا خیال ہے بابا؟" اس کا سوال دلچسپ اور گہرا تھا مگر وقار آفندی خود بھلا اپنے ہاتھوں کے بارے میں کیا کہہ سکتے تھے؟ بس اس سوال پہ مسکرا کے رہ گئے تھے نظر اپنے ہاتھوں پہ تھی۔

"بتائیے نا بابا۔" اس نے ضد کی تھی اور ضد اس کی فطرت بن چکی تھی۔

"میری جان میں خود اپنے ہاتھوں کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں بھلا؟ البتہ تم جو چاہے کہہ سکتی ہو میرے ہاتھوں کے بارے میں۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے مجرموں کی طرح اپنے ہاتھ بیٹی کے سامنے پھیلا دیے تھے اور علیزے نے چند سیکنڈ ان کے ہاتھ دیکھنے کے بعد بے ساختہ ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے تھے۔

"میرے بابا کے ہاتھ بہت اچھے بہت پیارے ہیں یہ ہاتھ بھی اللہ نے کچھ سنوارنے کے لیے بنائے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ان ہاتھوں نے ہمیشہ سنوارا ہی ہے بگاڑا کچھ بھی نہیں۔ رئیلی بابا آپ بہت اچھے ہیں آپ میرے آئیڈیل ہیں آئی ایم ریئلی پراؤڈ آف یو۔" وہ ان کے ہاتھوں کو محبت اور عقیدت سے بوسہ دیتی ہوئی ان کے سینے سے لگ گئی تھی اور اپنی اولاد کی اتنی والہانہ محبت دیکھ کر وقار آفندی کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں کتنی ہی دیر وہ کچھ کہہ نہ سکے تھے۔

ان کے دو بیٹے تھے لیکن جتنی محبت ان کی بیٹی ان سے کرتی تھی اتنا کوئی بھی نہ کرتا تھا۔ وقار آفندی کی زندگی بھی اپنی بیٹی سے شروع ہو کر بیٹی پہ ہی ختم ہوتی تھی دونوں باپ بیٹی کی محبت ایک مثالی محبت تھی۔

"السلام علیکم ڈیڈ۔" آذر آفندی بلیک پینٹ اور وائٹ شرٹ میں ملبوس اپنی ڈیشنگ سی شخصیت کو مزید اجاگر کرتے ہوئے ان کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا وقار آفندی کو بھتیجے کی سوبر پرسنالٹی بہت پرکشش لگتی تھی اس وقت بھی ان کی نظروں میں آذر کے لیے ستائش تھی۔

"والسلام اتنی جلدی کہاں جا رہے ہو؟" انہوں نے اپنی مضبوط کلائی موڑتے ہوئے ٹائم دیکھتے ہوئے پوچھا تھا اس وقت صبح کے سات بج رہے تھے ___ اور وہ لوگ آفس کے لیے آٹھ نو بجے گھر سے نکلتے تھے۔

"مجھے بہت افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ ڈیڈ آپ بوڑھے ہو گئے ہیں۔" آذر کی بات پہ وقار آفندی کے ساتھ ساتھ علیزے نے بھی حیرت سے اسے دیکھا تھا انداز دونوں کا استفہامیہ تھا۔

"ابھی رات کو ہی ڈیڈ کو بتانے ان کے کمرے میں بھی گیا تھا کہ میں صبح فیکٹری کی مشینری کا کچھ سامان لینے کراچی جا رہا ہوں اور اس کام میں تین چار دن لگ جائیں گے لیکن ڈیڈ اتنے بوڑھے ہو چکے ہیں کہ انہیں اس وقت کچھ بھی یاد نہیں۔" آذر کے جواب پہ وقار آفندی بے ساختہ مسکرائے تھے۔

"ہاں اولاد جوان ہو جائے تو ماں باپ بوڑھے ہی ہو جاتے ہیں۔" انہوں نے آذر کا کندھا تھپکا تھا۔

"لیکن ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمیشہ جوان ہی رہیں۔" آذر کی بات پہ علیزے ہنسی تھی۔

"ارے نہیں بیٹا جوانی بہت بری شے ہے۔ بہت سی برائیوں کی جڑ ہے یہ جوانی۔ اگر انسان پہ یہ جوانی ہمیشہ رہتی تو دنیا میں پتا نہیں کیا کیا فساد ہوتے اور کیا کیا قیامتیں آتیں۔ شکر ہے کہ یہ خطرناک شے اللہ نے گزر جانے کے لیے بنائی ہے یہ گزر جاتی ہے تو انسان سکون صبر اور برداشت کے لبادے میں آ جاتا ہے جیسے کسی طوفان کسی آندھی کے بعد سکون اور سناٹا چھا جاتا ہے کچھ ایسا ہی حال جوانی کے بعد بھی ہو جاتا ہے۔ جوانی جوبن پہ ہو تو دوسروں کو ڈراتی ہے دھمکاتی ہے رلاتی ہے اور جو جوانی ڈھل جاتی ہے تب دوسروں سے ڈرتی ہے خوف زدہ ہوتی ہے اور روتی ہے۔ اور رونے کا مطلب ہے عاجزی ___ اور عاجزی اللہ کو بہت پسند ہے میرے بچے۔" وقار آفندی بہت گہرائی سے بولے تھے اور ان دونوں نے بھی انہیں بہت گہرائی سے سنا تھا۔

"صبح صبح اتنی اچھی بات بتانے کے لیے تھینکس مجھے اجازت دیجیے میں اب چلتا ہوں۔" آذر ہاتھ ملا کر جانے کے لیے پلٹا۔

"علیزے۔!"

"جی بھائی؟"

"کچھ منگوانا ہے کراچی سے؟" وہ جہاں بھی جاتا تھا علیزے سے ضرور پوچھتا تھا۔

"جی منگوانا ہے۔" وہ آہستگی سے بولی تھی۔

"کیا؟" آذر کو خوشی ہوئی تھی کہ وہ کچھ منگوا رہی ہے۔

"سمندر۔" وہ مسکرا کر شرارت سے بولی تھی۔

"یعنی تم لاہور کو ڈبونا چاہتی ہو؟"

"نہیں میں خود ڈوبنا چاہتی ہوں۔"

"تمہارے لیے تو ایک گلاس پانی بھی کافی ہے ڈوبنے کے لیے۔" آذر نے چھیڑا تھا۔

"نہیں میں ایسی جگہ ڈوبنا چاہتی ہوں جہاں سے میرا کوئی اتا پتا بھی نہ ملے۔"

"تو پھر سمندر کو لاہور لے کر آنے کی کیا ضرورت ہے تم میرے ساتھ کراچی چلو۔" آذر اس کی باتوں کا جواب

دلچسپی سے دے رہا تھا۔

"مگر میں چاہتی ہوں کوئی خود مجھے ڈوبنے کے لیے آئے۔" علیزے کا لہجہ عجیب سا ہوا تھا۔

"یہ تم سمندر کی بات کر رہی ہو یا کسی انسان کی؟" آذر ٹھٹکا تھا۔

"بات تو ایک ہی ہے آذر بھائی ڈوبنے والا بھی ظالم ہوتا ہے اور ڈبونے والا بھی ظالم۔ یعنی سمندر بھی ظالم اور انسان بھی۔!" علیزے کا لہجہ ہنوز تھا۔

"لگتا ہے پاگل ہو گئی ہو۔" وہ ہلکے سے مسکراتے ہوئے اس کے سر پہ چپت لگا کر آگے بڑھ گیا تھا اور علیزے مالی بابا کے پاس جا کر باتیں کرتے وقار آفندی کے پاس آگئی تھی۔

"چلیں پاپا ناشتا کرتے ہیں مجھے بھوک لگ رہی ہے۔" وہ ان کا بازو پکڑتے ہوئے بولی تھی اور وہ اپنی بات ختم کر کے ہی بیٹی کے ساتھ قدم بڑھاتے اندر ڈائننگ روم میں آگئے جہاں باقی فوج بھی جمع ہو چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

آج موسم بے حد سرد تھا پچھلے کئی دنوں سے انگلینڈ کے تمام شہروں میں لگاتار ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی اور یہ بارش تمام شہریوں کے لیے ایک معمول بن گئی تھی جیسے یہ بھی ان کی روٹین کا حصہ ہو اور اس بارش کے باوجود وہ اپنے روزمرہ کے کام بہت ہی اچھے طریقے سے نبٹا لیتے تھے ایسی بارشیں ان کی صحت اور کام پہ ذرا اثر نہیں ڈالتی تھیں۔ لیکن آج رات ہونے والی اندھا دھند برف باری نے تمام نظام درہم برہم کر کے رکھ دیا تھا روزمرہ کی روٹین ڈسٹرب ہو کے رہ گئی تھی تمام سڑکیں، تمام راستے بند ہو چکے تھے۔

آج اندرون اور بیرون ملک جانے والی تمام فلائٹس بھی کینسل ہو چکی تھیں بہت سے شہری اپنے گھروں سے نکلنے سے بھی قاصر تھے کیونکہ ان کے کھڑکیوں دروازوں کے آگے بھی برف کے پہاڑ سے کھڑے تھے آج برف چھ سے سات فٹ تک پڑی تھی اور گورنمنٹ کے ملازمین صبح سے سڑکوں اور گھروں کے سامنے سے برف ہٹانے میں جتے ہوئے تھے اور یہ ان کی پھرتی اور بہادری تھی کہ دوپہر ایک بجے تک وہ گھروں کے سامنے سے برف ہٹانے میں کافی حد تک کامیاب ہو گئے تھے بہت سے لوگ برف کے ہٹتے ہی قیدیوں کی طرح گھروں سے باہر نکلے تھے اور ان قیدیوں میں ایک وہ بھی تھی جو گھر سے نکلنے کے لیے بے تاب ہو رہی تھی۔ اس نے گرم مفلر سر اور کانوں پہ لپیٹتے ہوئے چونک کر دروازے کی سمت دیکھا جہاں فائزہ بیگم کھڑی اسے دیکھ رہی تھیں۔

"کہاں جا رہی ہو؟" مفلر لپیٹ کر وہ اپنے ہاتھوں پہ بلیک کلر کے گرم گلوز چڑھانے لگی تھی۔

"میں کیا کہہ رہی ہوں مدحیہ؟" فائزہ بیگم نے سختی سے کہا۔

"اپنے فرینڈز کے ساتھ جا رہی ہوں مام۔ کسی کے ساتھ بھاگ نہیں رہی آپ فکر نہ کریں۔" مدحیہ دروازے کی سمت بڑھتے ہوئے خفگی اور ناگواری سے بولی تھی۔

"نبیل تمہارا پاسپورٹ مانگ رہا تھا فرائیڈے کو ہم لوگ پاکستان جا رہے ہیں اس نے ٹکٹ کنفرم کروانے ہیں۔" فائزہ بیگم کی آواز پہ اس کے قدم ٹھٹک گئے تھے۔

"میں نے آپ کو کل ہی بتا دیا تھا کہ میں پاکستان نہیں جاؤں گی آپ نے میرا جواب نبیل بھائی کو بتایا نہیں؟" وہ بیرونی دروازے کے ہینڈل پہ ہاتھ رکھے اپنے ازلی سرکش لہجے میں بات کر رہی تھی۔

"بتایا تھا مگر وہ کہتا ہے تم ایک بار پھر سوچ لو' تم کہاں رہنا پسند کرو گی؟ پاکستان میں یا پھر انگلینڈ میں اگر پاکستان میں رہو گی تو سب اپنوں کے درمیان رہو گی اور اگر انگلینڈ میں رہو گی تو اکیلی رہ جاؤ گی کیونکہ انگلینڈ رہ جانے کی صورت میں تمہیں ہم سے ہمیشہ کے لیے تعلق ختم کرنا ہو گا۔" فائزہ بیگم نرم مزاج خاتون تھیں مگر جب ان کا

مزاج سخت ہوتا تھا تو پھر نرمی کا شائبہ تک نہیں ملتا تھا اور ایسا ہی مزاج ان کے بیٹے نبیل حیات کا بھی تھا نبیل بہت نرم خو اور تحمل پسند آدمی تھا جبکہ مدیحہ اپنے باپ کی کاپی تھی خود سر ضدی اور ہٹ دھرم۔ اتنی تیکھی بات کرتی کہ سننے والے کو آگ چھو جاتی تھی یہاں تک کہ وہ باپ کا بھی کوئی لحاظ نہیں کرتی تھی البتہ نبیل غصے میں ہوتا تو اس سے دب جاتی تھی اور ایسا بھی کبھار ہی ہوتا تھا۔

"آپ لوگ مجھے دھمکی دے رہے ہیں؟"

"نہیں ہم حقیقت بتا رہے ہیں۔"

"تو پھر آپ لوگ میری حقیقت کیوں نہیں سمجھتے؟ میں پاکستان نہیں جا سکتی میں وہاں کبھی بھی ایڈجسٹ نہیں کر سکتی پاکستان از ناٹ مائی کنٹری۔!" مدیحہ پاؤں پٹخ کر چیخی تھی۔

"یہ بات تم نبیل کو بتانا۔ شاید وہ تمہاری حقیقت سمجھ جائے۔" فائزہ بیگم سپاٹ سے انداز میں کہہ کر اپنے بیڈ روم میں چلی گئی تھیں اور مدیحہ غصے سے بیرونی دروازہ دھڑام سے بند کر کے گھر سے باہر نکل آئی تھی۔ برف سے اٹے روڈ ابھی بالکل صاف نہیں ہوئے تھے اس لیے وہ اپنی گاڑی لیے بغیر پیدل ہی چل پڑی تھی۔

"ہائے میڈی۔" کرسٹینا اسے دیکھتے ہی قریب آ گئی۔

"ہائے۔" مدیحہ نے آہستگی سے جواب دیا تھا۔

"کہاں جا رہی ہو؟"

"آج شیلے اور برائن کا برتھ ڈے ہے اس لیے مارکیٹ سے گفٹ لینے جا رہی ہوں۔" وہ دونوں روڈ پہ ایک ساتھ پیدل چل رہی تھیں اور دونوں نے ہی اپنے ہاتھ لانگ کوٹ کی جیبوں میں پھنسا رکھے تھے۔

"میں نے تو ان کو رات کو ہی وش کر دیا تھا۔" کرسٹینا فخریہ بولی۔

"کل میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے رات کو جلدی سو گئی تھی اور ویسے بھی پارٹی تو آج ہی ہے نا؟" مدیحہ بہت ہی نارمل سے لہجے میں بات کر رہی تھی اور ایسا تب ہی ہوتا تھا جب وہ کہیں الجھی ہوئی ہوتی تھی۔

"طبیعت تو تمہاری اب بھی خراب لگ رہی ہے۔" کرسٹینا نے اسے غور سے دیکھا۔

"میں بہت ڈسٹرب ہوں کرسٹی۔" بالآخر اس نے کہہ ہی دیا تھا اور پھر شام کو شیلے اور برائن کی برتھ ڈے پارٹی میں بھی مدیحہ کی ڈسٹربنس کی ہی باتیں ہو رہی تھیں۔

"یہ لو ساری ڈسٹربنس کا حل۔" جبزی نے وائن کا گلاس اس کے سامنے رکھ دیا تھا جبزی اس کا بسٹ کلوز فرینڈ تھا وہ مدیحہ کی پرابلم جانتا تھا۔

"نہیں یار موڈ نہیں ہے۔" اس نے گلاس پیچھے ہٹا دیا تھا۔

"ایک بار ہونٹوں سے تو لگاؤ موڈ خود بہ خود بن جائے گا۔" جبزی نے اسے چھیڑا تھا۔

"جبزی پلیز میرے مسئلے کا حل نشے میں نہیں ہے بلکہ کچھ سوچنے میں ہے' مجھے سوچنے دو۔" مدیحہ چڑچڑی ہو رہی تھی۔

"یار وہ دیکھو وہ لوگ بھی کچھ دیر پہلے بہت پریشان تھے اب کیسے بے فکر ہو کر زندگی کے مزے لوٹ رہے ہیں۔" جبزی نے ایک لڑکی اور لڑکے کی سمت اشارہ کیا جو اس ہال کے ایک کونے میں کھڑے نشے میں بے سدھ تمام حدود کو کراس کر چکے تھے اور یہی حال موجود تمام ینگ لڑکے لڑکیوں کا بھی تھا۔

"تم جانتے ہو جبزی مجھے ایسا کچھ بھی پسند نہیں ہے۔"

"ایک بار یہ چکھ لو پھر سب کچھ پسند آ جائے گا۔" وہ اسے شراب پینے پہ اکسا رہا تھا۔

"ایم سوری۔" اس نے پھر انکار کر دیا اور پھر جبزی لاپروائی سے کندھے اچکا کر وہاں سے ہٹ گیا تھا اور

تھوڑی دیر بعد مدیحہ کو جبزی کرسٹینا کے ساتھ مصروف نظر آیا تھا وہ بھی جسمانی طلب میں غرق تھے مدیحہ اکیلی بیٹھی تھی اور پھر نہ جانے کیوں اور کب مدیحہ نے وائن بھرا گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا تھا وہ بیٹھے بیٹھے چند اور پیگ بھی چڑھا گئی تھی اور جب فل ہو گئی تو اٹھ کر باہر نکل آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

تیری اس ادا سے بھی ہوں آشنا' تجھے اتنا جس پہ غرور ہے
میں جیوں گا تیرے بغیر بھی' مجھے زندگی کا شعور ہے
جو سمجھ لیا تجھے بے وفا تو پھر اس میں تیری بھی کیا خطا؟
خلل ہے میرے دماغ کا' یہ میری نظر کا قصور ہے
کوئی بات دل میں وہ ٹھان کے' نہ الجھ پڑے تیرے شان سے
وہ نیاز مند جو کہ سر یہ خم کئی دن سے تیرے حضور ہے
میں نکل کے بھی تیرے دام سے' نہ کروں گا اپنے مقام سے
میں قتیل جور و ستم سہی' مجھے تم سے عشق ضرور ہے!
مجھے تم سے عشق ضرور ہے
مجھے تم سے عشق ضرور ہے

ڈائری کے خوبصورت صفحات پہ وہ اپنے پسندیدہ اشعار لکھتے لکھتے آخری جملے پہ ٹھہری گئی تھی اور اس کا پین اسی ایک جملے کو بار بار تحریر کرتا جا رہا تھا "مجھے تم سے عشق ضرور ہے" یہ جملہ اس کا پین ہی نہیں اس کی دھڑکنیں بھی دل کے کاغذ پہ بار بار لکھتی جا رہی تھیں اس کا دل اس جملے پہ ہمک رہا تھا اور وہ اس جملے کو بار بار لکھنے سے باز نہیں آ رہی تھی۔

"محترمہ اب بس کرو کتنا لکھو گی اس جملے کو؟" نگارش نجانے کب چپکے سے کمرے میں داخل ہوئی اور دبے قدموں سے چلتی اس کے پیچھے آ کھڑی ہوئی تھی اور وہ اپنی ڈائری میں شاعری لکھنے میں ایسی محو تھی کہ اس کی آمد کا ذرا احساس نہیں ہوا تھا اور نگارش کی اچانک ابھرنے والی آواز پہ بری طرح گڑبڑا گئی تھی اور اس گڑبڑاہٹ نے کام خراب کر دیا تھا اس کا ہاتھ ٹھٹکنے سے پورا صفحہ داغ دار ہو گیا تھا اتنی خوبصورتی اور نفاست سے لکھے اشعار بدنما سے نظر آنے لگے تھے جس پہ نگارش کو تو بے حد افسوس اور ندامت بھی ہوئی تھی مگر وہ چپ چاپ عجیب سی نظروں سے دیکھتی رہ گئی اس کی آنکھوں میں ہلکے سے دکھ کا عکس تھا۔

"زری ایم سوری یار' ایم ریئلی ویری سوری۔ مجھے ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنی محویت سے لکھ رہی ہو۔" نگارش کو گہری شرمندگی نے گھیر لیا تھا۔

"اٹس اوکے بھابھی چند لفظ ہی تھے نا جو مٹ گئے کون سا قسمت کا لکھا مٹا ہے جس پہ افسوس کیا جائے؟" زری چند لمحے بعد بغور لفظوں کی بگڑی حالت دیکھتی رہی پھر سر جھٹک کر نگارش کی سمت متوجہ ہوئی تھی۔

"آپ میرے بیڈ روم میں بدروحوں کی طرح کیوں چکرا رہی ہیں؟ عبداللہ بھائی کہاں ہیں؟" اس نے سوال کرتے ہوئے ٹیبل پہ بکھری شاعری کی کتابیں سمیٹنا شروع کر دیں۔

"وہ نیچے نبیل بھائی کے پاس بیٹھے ہیں۔" نگارش چلتی ہوئی زری کی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آ رکی تھی جہاں بہت ہی دلفریب پرفیومز کا کلیکشن سجا تھا وہ یونہی پرفیومز اٹھا اٹھا کر چیک کرنے لگی تھی۔

"یار یہ 'ٹائیٹ فرینڈ' کی خوشبو تو مدہوش کر کے رکھ دیتی ہے۔" نگارش پرفیوم اپنی آستین پہ اسپرے کرتے

ہوئے مسحور سے لہجے میں بولی تھی۔

"لیکن جس نے یہ خوشبو دی ہے وہ کبھی بھی مدہوش نہیں ہونے دیتا نہ اپنی قربت میں نہ اپنی محبت میں اور نہ اپنی فرقت میں۔" زری نگارش کے ہاتھ میں موجود پرفیوم کی خوبصورت سی شیشی دیکھ کر بس سوچ کے رہ گئی تھی۔

"زری یہ پرفیوم برتھ ڈے پہ تمہیں کس نے گفٹ کیا تھا؟" نگارش نے بے ساختہ پوچھ لیا تھا۔

"پتا نہیں اتنے زیادہ گفٹس تھے اب تو ٹھیک سے یاد بھی نہیں ہے۔" حالانکہ اس کے دل پہ لکھا تھا کہ یہ پرفیوم کس نے دیا ہے؟۔

"ہوں ویسے ہے بہت قیمتی اور بہت کمال کی خوشبو ہے۔" نگارش نے دوبارہ تعریف کی لیکن زری اسے اتنا بھی نہیں کہہ سکتی تھی کہ تمہیں پسند ہے تو تم رکھ لو۔

"نبیل کے ساتھ مدیحہ نہیں آئی؟" زری بات ٹالنے کو بولی تھی۔

"مدیحہ آتی تو اس وقت تمہارے سامنے ہوتی۔"

"یعنی نیچے دونوں مرد حضرات اکیلے ہیں؟"

"جی جناب اکیلے ہیں اور میں ان دونوں میں مس فٹ تھی اس لیے تمہارے پاس آ گئی۔" نگارش ڈریسنگ ٹیبل سے ہٹ کر بیڈ پہ آ بیٹھی تھی۔

"مدیحہ بہت دنوں سے ہمارے گھر نہیں آئی کیا مسئلہ ہے؟" زری کو تشویش ہوئی تھی کیونکہ بہت دنوں سے نبیل ہی دو تین بار آیا تھا مدیحہ نے تو شکل بھی نہیں دکھائی تھی۔

"مسئلہ گمبھیر ہے یار۔" نگارش سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی تھی جبکہ زری ٹھٹک سی گئی۔

"کیا مطلب؟"

"نبیل بھائی اور فائزہ آنٹی پاکستان شفٹ ہو رہے ہیں نبیل بھائی نے اپنا سارا بزنس وائنڈ اپ کر لیا ہے اور فرائیڈے کے لیے ٹکٹ بھی کنفرم کروا رہے ہیں مگر مدیحہ اپنا پاسپورٹ نہیں دے رہی وہ پاکستان نہیں جانا چاہتی، اس نے صاف انکار کر دیا ہے ان کے گھر میں کافی مسئلہ چل رہا ہے آج کل۔" نگارش کے ساری بات بتانے پر زری خاصی پریشان ہو گئی تھی۔

"وہ پاکستان کیوں نہیں جانا چاہتی؟"

"یار یہ تو وہ بتا سکتی ہے کہ وہ کیوں نہیں جانا چاہتی؟" نگارش نے کندھے اچکائے تھے۔

"کہیں کوئی اور مسئلہ تو نہیں ہے؟" زری نے پر سوچ انداز میں کہا۔

"سوچا تو میں نے بھی یہی ہے۔" نگارش نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"لیکن بھابھی اگر وہ کسی کو پسند کرتی تو مجھے ضرور بتاتی۔ وہ اپنی باتیں چھپاتی نہیں ہے۔!" زری ڈانوا ڈول تھی۔

"پھر پتا نہیں کیا چکر ہے اس نے فائزہ آنٹی کو صاف انکار کر دیا ہے کہ وہ پاکستان نہیں جائے گی۔"

"ہوں۔! میں بات کروں گی اس سے، اگر وہ نہ آئی تو میں صبح خود جاؤں گی اس سے ملنے۔" زری چھوٹا سا کشن گود میں لے کر نیچے فلور کشن پہ بیٹھ گئی تھی۔

"تم بھی تو پاکستان جانا چاہتی ہو تم کب جاؤ گی؟" نگارش نے اس پہ نظریں جماتے ہوئے ذو معنی لہجے میں پوچھا تھا اور زری کی نظریں بے ساختہ اس جملے پہ جھک گئی تھیں۔

"کیا مجھ سے تنگ آ گئی ہیں؟" وہ سنبھلتے ہوئے بولی۔

"ارے میری جان دل والوں سے کون تنگ آ سکتا ہے؟" نگارش نے بیڈ پہ بیٹھے بیٹھے ذرا سا جھک کر زری کا

گال کھینچا تھا۔

"کیا مطلب دل والوں سے؟" وہ انجان بنتے ہوئے بولی تھی۔

"مطلب یہ کہ تم دل والی ہو، لیکن افسوس یار" وہ دل والا نہیں دماغ والا ہے وہ دماغ سے سوچتا اور دماغ سے ہی کرتا ہے اور تم دل سے سوچتی ہو اور دل سے کرتی ہو۔ بے شک وہ سراپا دل ہے مگر پھر بھی اس پہ دماغ حاوی رہتا ہے، وہ سوچ کار بندہ ہے اور تم محبت کی چڑیا ہو' بہت دلچسپ جوڑی ہے۔" نگارش نے وہ سب کہہ ڈالا جو زری دل میں لیے پھرتی تھی زری کو حال دل عیاں ہو جانے پہ بڑی حیرت ہوئی تھی۔

"بھابھی آپ کو کیسے؟" اس سے کچھ بولا ہی نہیں گیا تھا۔

"سویٹ ہارٹ تم بھول رہی ہو کہ میں بھی "ایک دل والی" ہی ہوں میری تمہارے بھائی سے لو میرج ہوئی ہے، میں نے بھی محبت کی ہے، میں بھی محبت کے استاد کی شاگرد رہ چکی ہوں بس فرق اتنا ہے کہ ہمیں ڈگری مل گئی ہے اور تم ابھی زیر تعلیم ہو۔ تمہارا امتحان ابھی باقی ہے۔!" نگارش کی شاعرانہ سی باتوں پہ زری کو خوشگوار حیرت اور خوشی ہوئی گویا اسے کوئی رازداں کوئی غمگسار مل گیا تھا! اب وہ بھی سب کی طرح اپنے دل کی باتیں کہہ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر سکتی تھی، اب وہ بھی گھٹ گھٹ کے جینے کی بجائے کھل کے سانس لے سکتی تھی،

"بھابھی آئی لو یو سو مچ یار آئی لو یو سو مچ۔" زری بے ساختہ اٹھ کر نگارش سے لپٹ گئی تھی۔

"پاگل لڑکی تم خود ہی اس بات کو چھپاتی تھیں اس لیے کبھی میں نے بھی ذکر نہیں کیا۔" نگارش نے اس کے گال پہ پیار کیا تھا۔

"میں۔ میں ڈرتی ہوں بھابھی مجھے تشہیر ہونا اچھا نہیں لگتا اور پھر عبداللہ بھائی کا خیال دامن پکڑ لیتا ہے۔ وہ کیا سوچیں گے میں ان کے دوست سے۔" زری کہتے کہتے لب بھینچ گئی تھی۔

"زری تمہیں پتا ہے نا جس دوست کی تم بات کرتی ہو وہ نبیل اور عبداللہ کی جان ہے وہ تینوں دوست اک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں ایسے میں اگر وہ تمہیں پسند کرتا ہے یا تم سے شادی کرتا ہے تو مجھے پتا ہے عبداللہ بہت خوش ہوں گے اس سے بڑھ کر اور خوشی بھلا کیا ہوگی کہ ان کی بہن دلہن بن کے ان کے دوست کے گھر جائے۔" نگارش نے بات کرتے ہوئے زری کی آنکھوں میں دیکھا اس کی آنکھوں میں بہت سی چاہت کے دیے روشن تھے۔

"مگر بھابھی وہ بہت ہی پتھر انسان ہے اس نے کبھی مجھے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا کبھی میرے لیے اپنے ہونٹوں سے اک حرف تک ادا نہیں کیا۔" اسے شکایت ہوئی دل کے وہم وسوسے دل سے نکل کر چہرے پہ پھیل گئے تھے۔

"وہ تمہاری عزت کرتا ہے اس لیے ایسا کرتا ہے۔" نگارش نے سچ کہا تھا لیکن زری کو اس سچ سے کوفت اور بے زاری ہوئی تھی۔

"اتنی عزت؟ صرف میری ہی کیوں؟ مدیحہ کی کیوں نہیں کرتا؟ مدیحہ بھی تو نبیل کی بہن ہے۔ اسے دیکھتا بھی ہے اس سے باتیں بھی کرتا ہے اس کے ساتھ ہنستا بھی ہے اور اس پہ غصہ بھی کرتا ہے۔" زری کی شکایتوں کا منہ کھلا تو یکدم بپھری گئی جس پہ نگارش بے ساختہ قہقہہ لگا کے ہنسی تھی۔

"سچ کہتے ہیں محبت میں تو ہواؤں سے بھی رقابت ہو جاتی ہے یہ تو پھر مدیحہ ہے اس کی منہ بولی بہن۔" نگارش ابھی بھی ہنس رہی تھی۔

"پگلی اگر تم غور کرو تو مدیحہ رشتے میں تمہاری نند ہوگی کیونکہ وہ مدیحہ کو بہن سمجھتا ہے اور یہ مدیحہ جو آج کل فائزہ آنٹی اور نبیل کے بھائی کے قابو میں نہیں آ رہی مجھے پورا یقین ہے کہ اگر وہ یہاں ہوتا تو مدیحہ کب کی پاکستان

جانے کے لیے مان چکی ہوتی۔" زری نگارش کی بات پہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئی تھی کیونکہ وہ سچ ہی تو کہہ رہی تھی اس کی اپنی کوئی بہن نہیں تھی وہ شروع سے مدیحہ کو ہی بہن سمجھتا آرہا تھا اور مدیحہ بھی اس سے خاصی فرینک اور کلوز تھی لیکن زری شکایت کرتے ہوئے یہ بھول گئی کہ وہ کس رشتے پہ شکوہ کر رہی ہے؟

"کیا ہوا چپ کیوں ہو گئی ہو؟" نگارش نے اسے چھیڑا۔

"بس ایسے ہی۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"یہ 'نائٹ فرینڈ' کس نے گفٹ کیا ہے نا؟" اس کے انداز میں شرارت تھی اور زری نے مسکراتے ہوئے سر ہلا دیا تھا۔ جس پہ نگارش ایک بار پھر کھلکھلا کر ہنسی تھی اور زری نے خفت سے چہرہ جھکا لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ رات کو سونے سے پہلے صبح چھ بجے کا الارم سیٹ کر کے سویا تھا اسے پتا تھا کہ وہ بے حد تھکا ہوا ہے اس لیے ہو سکتا تھا کہ صبح آنکھ دیر سے کھلتی۔ جس کے ڈر سے اس نے پہلے سے ہی انتظام کر لیا تھا لیکن ہوا وہ ہی تھا جس کا اسے ڈر تھا وہ اتنی گہری نیند سویا تھا کہ اس کی آنکھ الارم کی تیز آواز پہ بھی نہیں کھلی تھی یہاں تک کہ سورج کی تیز نوکیلی کرنیں برآمدے میں اس کے بستر تک بھی آگئی تھیں مگر وہ دنیا جہان سے بے خبر لمبی تان کے گہری نیند سو رہا تھا حالانکہ گھر میں موجود اس کی امی اور بہنیں ناشتا کرنے کے بعد گھر کے چھوٹے موٹے کام بھی نبٹا چکی تھیں لیکن پھر بھی ان لوگوں نے اسے جگانے کی کوشش نہیں کی تھی وہ بھی جانتی تھیں کہ وہ اتنے دنوں سے تھکا ہوا ہے۔ صبح گھر سے نکلتا ہے اور شام کو مایوس تھکا ہارا واپس آتا ہے لیکن نوکری کی نوید کہیں سے نہیں ملتی۔ کچن میں برتن دھو کر ترتیب سے رکھتے ہوئے اچانک اسٹیل کا ڈونگا مریم کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جا گرا تھا اور اک دھڑام کی آواز پہ وہ یکدم ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا تھا اس نے غائب دماغی سے سارے ماحول کو سمجھنے کی کوشش کی تھی کیونکہ اس کے خیال میں اس وقت صبح چھ بجے کے مطابق ہلکا ہلکا اندھیرا ہونا چاہیے تھا جبکہ یہاں تو ہر طرف سورج صاحب کا راج نظر آرہا تھا۔

"کیا ٹائم ہوا ہے امی؟" اس نے آگے پیچھے چھوٹا سا الارم کلاک دیکھتے ہوئے پوچھا تھا جو وہ قریب ہی چھوٹی سی تپائی پہ رکھ کے سویا تھا۔ مگر اس وقت کلاک بھی غائب تھا اور تپائی بھی۔

"نو بج رہے ہیں بیٹا تم تھکے ہوئے تھے اس لیے تمہیں نہیں جگایا تم اٹھ کر منہ ہاتھ دھو لو مریم تمہارا ناشتا بنا دیتی ہے۔" عابدہ خاتون نے نرمی سے کہا تھا۔

"اوہ میرے خدایا۔۔۔ آپ نے یہ کیا کیا امی؟ مجھے ایک جگہ انٹرویو کے لیے جانا تھا اتنے دنوں سے میں آج کے دن کا انتظار کر رہا تھا۔" اسے افسوس نے شکنجے میں لے لیا تھا وہ بالوں میں انگلیاں پھنسائے اپنے بستر پہ ہی بیٹھا رہ گیا آف وائٹ دھاگے کا بنا کھیس ابھی بھی آدھا اس کی ٹانگوں پہ پھیلا ہوا تھا۔

"دیکھو بیٹا ہوتا وہی ہے جو قسمت میں ہوتا ہے تم لاکھ اس دن کا انتظار کرتے لیکن اس دن بھی وہی ہونا ہے جو اللہ نے شروع سے ازل سے لکھ دیا ہے۔ آج تمہاری قسمت میں انٹرویو دینا نہیں لکھا تھا اسی لیے تم گہری اور بے فکر نیند سوئے رہے ورنہ روزانہ تم ہی تو صبح صبح اٹھ کر کام کی تلاش میں چلے جاتے ہو۔ آج تھکن زیادہ تو نہیں تھی؟ بس یہ سمجھو کہ آج قسمت نہیں تھی۔" عابدہ خاتون نے بہت پیار اور تحمل سے بیٹے کو سمجھایا تھا جو نیند سے اٹھتے ہی افسوس کی حالت میں بیٹھا تھا۔ ماں کی بات پہ چپ کا چپ رہ گیا تھا۔

"بھائی آپ کے لیے ناشتا بناؤں؟" مریم کچن سے نکلتے ہوئی بولی وہ ابھی ابھی کچن کے کام نبٹا کر فارغ ہوئی تھی

اس سے چھوٹی چاروں بہنیں اسکول اور کالج کے لیے نکل چکی تھیں جبکہ وہ آج کل انگیزامز سے فارغ ہو کر گھر داری میں مصروف تھی اور ماں کے ساتھ مل کر اپنی غربت اور مفلسی پہ صبح و شام جلتی کڑھتی رہتی تھی۔

"نہیں رہنے دو۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے اچانک کھیس ہٹا کر بستر سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور اپنی چپل پہن کر تیزی سے غسل خانے میں چلا گیا۔ ٹھنڈے پانی کے دو تین چھپاکے مارنے کے بعد گیلا ہاتھ بالوں میں پھیرتے ہوئے غسل خانے سے نکل کر کمرے میں آگیا تھا۔ جلدی جلدی کپڑے بدلے گھڑی باندھی اور فائل اٹھا کر بغل میں دبا کر اپنی آستین کے بٹن بند کرتا باہر نکل آیا تھا۔

"بیٹا ناشتا تو۔۔۔"

"نہیں امی بھوک نہیں ہے۔" وہ ان سے دعا لینے کے لیے ان کے سامنے جھکا اور پھر اتنی ہی تیزی سے ساتھ والے کمرے میں چلا آیا۔

"السلام علیکم ابا! کام کے لیے جا رہا ہوں دعا کیجیے گا۔" وہ بیمار باپ کے قریب جھکا اور ان کا ہاتھ چوم کر ان کی کمزور سی مسکراہٹ سمیٹ کر گھر سے نکل گیا تھا۔ اور مریم اپنے بھائی کے بغیر ناشتے چلے جانے کا بوجھ دل پہ لیے تھکے تھکے قدموں سے چلتی اندر آکر اکیلی گم سم سی بیٹھ گئی تھی ایسا ہی کچھ بوجھ عابدہ خاتون کے دل پہ بھی تھا مگر وہ ایک باہمت خاتون تھیں وہ ایک دکھ دل میں چھپا کر دوسرے دکھ کو بہلانے آگئی تھیں ان کا شوہر دروازے کی سمت ہی دیکھ رہا تھا کہ شاید کوئی اندر آئے اور ان کی تنہائی کٹے۔

"وہ آج پھر کام ڈھونڈنے چلا گیا ہے حالانکہ میں نے اسے منع بھی کیا ہے کہ آج گھر پہ رہو اور تھوڑا آرام کرلو۔" وہ شوہر کی آنکھوں کے سوال اسی طرح پڑھ لیتی تھیں جیسے کاغذ پہ لکھی تحریر۔

"نہیں اس نے ناشتا نہیں کیا ایسے ہی اٹھ کر چلا گیا ہے۔" وہ ان کے اک اک خاموش سوال کا جواب دے رہی تھیں۔

"ہاں آپ بھی دعا کرو اللہ اسے مایوس نہ کرے۔" عابدہ خاتون آہستہ آہستہ شوہر کے پاؤں اور ٹانگیں دبانے لگی تھیں۔

"جی مریم دوسرے کمرے میں ہے وہ بھی اپنے بھائی کے بارے میں سوچ رہی ہوگی دن رات اکیلی بیٹھی اپنا خون جلاتی رہتی ہے۔" وہ سارے جواب خود ہی دیتی جا رہی تھیں اور ان کے شوہر نے آہستگی سے تھکے تھکے انداز میں آنکھیں موند لی تھیں۔ اس گھر میں موجود تینوں نفوس ایک ہی فرد کے متعلق سوچ رہے تھے اور اس ایک کے متعلق سوچتے سوچتے جب دوسرے کا خیال آتا تھا تو دل دکھ سے بھر جاتا تھا۔

☼ ☼ ☼

آج اسے تین چار دن ہو گئے تھے نوکری کے لیے بڑی حویلی کے چکر لگاتے ہوئے لیکن اس کی بدقسمتی کہ اسے حویلی پہ کوئی بھی نہیں ملتا تھا سوائے "مبارک خان" کے۔ مبارک خان' وقار آفندی کا خاص ملازم تھا حویلی کے تمام اہم کام مبارک خان کے ذمے تھے۔ تمام ملازموں کی نگرانی کرنا بھی اسی کی ذمہ داری تھی۔ اس کی سب پہ کڑی نظر ہوتی تھی۔ گھر کی عورتوں کو کہیں آنا جانا ہوتا' کوئی شاپنگ وغیرہ کرنی ہوتی' کوئی بیمار ہوتا تو ان سب کو اپنی ذمہ داری پہ اپنے ساتھ لے کر جانا بھی مبارک خان کے کاموں میں شمار ہوتا تھا اور اکثر وہ گھر کے علاوہ وقار آفندی کے آفس کے کام بھی نبٹا لیتا تھا اور ضرورت کے وقت وہ وقار آفندی کے ڈرائیور کے فرائض بھی سر انجام دے لیتا تھا وقار آفندی بزنس کے سلسلے میں شہر سے کہیں باہر جاتے تو بھی مبارک خان کو ساتھ لے کر جانا نہیں بھولتے تھے مبارک خان ان کا رائٹ ہینڈ تھا بہت سے کام مبارک خان کے ذمے لگا کر وہ خود اکثر لاپروا ہو جاتے تھے کیونکہ

انہیں پتا ہوتا تھا کہ جو کام انہوں نے کہہ دیا ہے وہ اسے کر کے ہی دم لے گا اور دوبارہ کہنے کی ضرورت بھی پیش نہیں آئے گی اور ہوتا بھی ایسا ہی تھا وہ اپنا کام بہت محنت اور ایمانداری سے کرتا تھا۔

حویلی کے تمام ملازموں کے ساتھ وہ بہت سخت اور روکھا پھیکا تھا' اپنے مالکان کے سامنے وہ بہت مودب اور مہذب ہوتا تھا اور عام لوگوں کے لیے بے حد نرم اور رحم دل سا تھا وہ کسی کو دکھ اور پریشانی میں نہیں دیکھ سکتا تھا یہی وجہ تھی کہ اس نے آج تک وقار آفندی سے کہہ کر بہت سے لوگوں کے مسائل حل کروائے تھے' بہت سے غریبوں کی مدد کروائی تھی اور کئی لوگوں کو نوکریاں بھی دلوائی تھیں اور جس جس کو نوکری دلوائی تھی وقار آفندی کے آگے بھی تعریف کرتے تھے کہ وہ لوگ اچھا کام کر رہے ہیں اور مبارک خان' وقار آفندی کی طرف سے ملنے والی تعریف پہ خوش ہو جاتا تھا اس کی بڑی بڑی مونچھیں خوشی اور فخر سے اور بھی پھول جاتی تھیں وہ دونوں طرف سے شاباش کما رہا تھا اور اسی شاباش اور لوگوں کی بھلائی کے چکر میں آئے روز وہ لوگوں سے ہزاروں وعدے کر لیتا تھا اور ایسا ہی ایک وعدہ اس نے اس کے ساتھ بھی کیا ہوا تھا کہ وہ وقار آفندی سے اسے نوکری ضرور دلائے گا لیکن آج تین چار دن ہو گئے تھے اسے حویلی کے گیٹ پہ آتے ہوئے مگر وقار آفندی ملتے ہی نہیں تھے۔

دو روز سے وہ شہر سے باہر تھے اور دو روز سے وہ کسی میٹنگ یا پریس کانفرنس کے لیے نکل جاتے تھے لیکن آج وہ بھی ارادہ کر کے آیا تھا کہ ان سے ملے بغیر ہرگز نہیں جائے گا چاہے پورا دن باہر گیٹ پہ انتظار ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔

ابھی بھی اسے آئے ہوئے آدھا گھنٹہ ہو گیا تھا اور چوکیدار کے ہاتھ مبارک خان کو پیغام بھجوائے بھی آدھا گھنٹہ گزر چکا تھا مگر اس وقت نہ تو مبارک خان کے کچھ آثار نظر آ رہے تھے اور نہ ہی حویلی کے مکینوں کی آمد کا دور دور تک کوئی امکان لگتا تھا وہ باہر چوکیدار کے قریب رکھی کرسی پہ بیٹھا انتظار کی سولی پہ لٹکا ہوا تھا چوکیدار بار بار اس سنجیدہ سے لیے دیے انداز والے خوبرو نوجوان کو سرتاپا غور سے دیکھ رہا تھا لیکن اس نے ایک بار بھی چوکیدار کی سمت توجہ کی نظر سے نہیں دیکھا تھا بس اپنے مخصوص انداز میں سر جھکائے شرافت سے بیٹھا رہا۔ کافی دیر گزر جانے کے بعد اس نے ایک بار پھر گھڑی پہ نظر دوڑائی تھی اب آدھے گھنٹے سے بڑھ کے پچاس منٹ ہو چکے تھے اسے یہاں بیٹھے ہوئے اور مبارک خان ابھی تک حویلی سے برآمد نہیں ہوا تھا۔

"ارے میاں میری مانو تو آج چلے جاؤ۔ آج مہینے کا آخری دن ہے آج سارے راشن پانی اور نوکروں کا حساب کتاب چکانا ہے ——— مبارک خان مہینے بھر کا حساب دینے میں مصروف ہے۔" چوکیدار نے اسے بیٹھے بیٹھے مفید مشورہ دیا تھا۔

"مہینے بھر کا حساب دینے میں مصروف ہے؟ کون سا موت کے بعد زندگی بھر کا حساب دے رہا ہے؟" وہ اپنے مخصوص تیکھے کاٹ دار لہجے میں بولنے سے باز نہیں آیا تھا حالانکہ اس کی کوشش یہی تھی کہ وہ اپنے لب و لہجے اور اپنے انداز پہ کنٹرول رکھے کیونکہ لوگ اس جیسے مزاج کے آدمی کو بطور ملازم ہرگز پسند نہیں کرتے تھے لوگ ملازم ایسا چاہتے تھے جو دب کے رہے نہ کہ دبا کے رکھے! اور وہ بھی یہی سوچتا تھا کہ اگر اسے کام مل جائے تو وہ ہمیشہ دب کے رہے گا کیونکہ اسے کام کی "ضرورت" تھی اور ضرورت کے لیے تو انسان "کچھ" بھی کر لیتا ہے یہ تو پھر محض اس کی عادت تھی۔

"اوئے کدھر گیا وہ آدمی؟" مبارک خان اچانک گیٹ سے نمودار ہوا اور چوکیدار سے استفسار کیا تھا۔

"وہ بیٹھا ہے۔" چوکیدار نے سائیڈ پہ رکھی کرسی کی سمت اشارہ کیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ مبارک خان اس کے قریب آتا وہ اس کی آواز سن کر خود ہی اٹھ کر قریب آ گیا تھا۔

"السلام علیکم۔" اس نے مبارک خان سے ہاتھ ملایا تھا۔

"ہاں ہاں وعلیکم السلام چلو اندر چلو میں نے صاحب سے بات کی ہے تمہاری نوکری کے لیے لیکن وہ کہتے ہیں کہ پہلے اس آدمی سے مل لیں اسے دیکھ پرکھ لیں پھر کام پہ رکھیں گے۔" مبارک خان اسے بتاتے ہوئے ساتھ لے کر اندر داخل ہوا تھا اور بڑی حویلی کے گیٹ سے اندر قدم رکھتے ہوئے ایک بار اس کے قدم اپنی جگہ پہ جم سے گئے تھے اور دوسرے ہی پل وہ بمشکل اپنے قدموں سے جیسے بھاری پتھر باندھ کر چلتا آگے بڑھ آیا تھا عالیشان حویلی کی آن بان اس کے درودیوار سے جھلک رہی تھی اس نے اس حویلی کو ہزاروں بار دیکھا تھا مگر باہر سے اور دور دور سے۔

آج پہلی بار اس جنت نما حویلی کو دیکھنے کا موقع نصیب ہوا تھا حویلی جتنی باہر سے خوبصورت نظر آتی تھی اس سے سوگنا زیادہ اندر سے خوبصورت تھی کئی کنال پہ تو اس کا لان پھیلا ہوا تھا اور لان کا سبزہ نظروں کو نرم نرم سا سکون بخش رہا تھا ایک سائیڈ پہ مچھلی نما فوارہ بہہ رہا تھا اور فوارے سے نکلنے والا پانی لان کے درمیان سے چھوٹی سی ندی کی طرح چکر کھا کر حویلی کے سائیڈ والے لان کی طرف جا رہا تھا البتہ لان کی دونوں سمت آنے جانے کے لیے ایک خوبصورت چھوٹا سا گولائی کی شکل میں پل بنایا گیا تھا اور اس پل سے گزر کر ہی لان کی اس سائیڈ پہ جایا جا سکتا تھا۔

وقار آفندی اس وقت لان چیئرز پہ لان کی وسط میں بیٹھے کسی سے باتیں کر رہے تھے جب ان کی نظر مبارک خان اور اس کے ساتھ آتے آدمی پہ پڑی تھی اور ان کے پہنچنے تک وقار آفندی کی مقابل چیئر پہ بیٹھی علیزے چیئر دھکیل کر کھڑی ہو گئی تھی اس کی آنے والوں کی سمت پشت تھی۔

"اوکے پاپا میں ویٹ کرتی ہوں آپ فارغ ہو کر جلدی آجائیں۔" وہ جھک کر ٹیبل پہ رکھی اپنی بکس اور میگزین اٹھا کر اندر کی سمت بڑھ گئی تھی اس کی متوازن چال اور قدموں کی تمکنت وہ دور تک دیکھتا رہ گیا تھا البتہ اس حسینہ کی شکل دیکھنے سے محروم رہ گیا تھا مگر اتنا اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ وہ وقار آفندی کی بیٹی ہے کیونکہ اس کے اندازے کا سبب اس کا لفظ "پاپا" تھا۔

"سلام صاحب۔" اس نے قریب آ کر سلام کیا تھا جبکہ وقار آفندی سوالیہ نظروں سے مبارک خان کو دیکھ رہے تھے۔

"صاحب یہ ہی ہے جس کے لیے آپ کو کام کا کہا تھا بہت ہی مجبور ہے بے چارہ۔" مبارک خان نے وضاحت دی حالانکہ اس آدمی کے سامنے لفظ بے چارہ خود "بے چارہ" لگ رہا تھا اس کی ہائیٹ اور ہیلتھ اکثر لوگوں کو ٹھٹکا دیتی تھی کوئی اس کی مجبوریوں کا یقین ہی نہیں کرتا تھا۔

"اوہ ہاں۔ تو تم اس کے لیے کام کا کہہ رہے تھے؟"

"جی صاحب۔" مبارک خان تیزی سے بولا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"جی منصور حسین۔" وہ مختصر بولا تھا۔

"ہاں تو منصور حسین کیا تعلیم ہے تمہاری؟"

"میٹرک تک پڑھا ہے صاحب جی لیکن میٹرک پاس نہیں کر سکا جن دنوں امتحان تھے ہمارے گھر میں بڑی مصیبت آ گئی تھی میں اتنے دن اسکول ہی نہیں جا سکا تھا۔" اپنی طرف سے اس نے سچ بتانا ضروری سمجھا تھا۔

"کیا میٹرک بھی پاس نہیں کیا؟" وقار آفندی کو حیرت ہوئی تھی اتنا خوبرو نوجوان تھا مگر تعلیم ندارد۔ البتہ حال حلیے سے وہ واقعی ـ غریب لگ رہا تھا یہ بات اور تھی کہ شکل و صورت نوابوں کی طرح تھی۔ بے شک اس کے چہرے پہ مسکینی چھائی ہوئی تھی تفکر کے سائے تھے' کئی دنوں کی بڑھی ہوئی شیو تھی لیکن پھر بھی گدڑی میں

"لعل" کی طرح پہچانا جا رہا تھا۔

"سر میٹرک پاس ہوتا تو یقیناً" آج کسی افسر کے دفتر میں پرچیاں بنا رہا ہوتا یا پھر کسی ڈاک خانے میں ڈاکیا ہی لگ چکا ہوتا۔ مگر افسوس کہ میٹرک پاس نہیں ہوں اسی لیے جگہ جگہ دھکے کھا رہا ہوں بڑے بڑے دفتر والے تو مجھے پوچھتے بھی نہیں ہیں اس لیے سوچا ہے کہ کسی گھر میں نوکری ڈھونڈوں چاہے کوئی چوکیدار، مالی یا پھر ڈرائیور ہی رکھ لے لیکن میری مشکل حل کردے۔" اس نے وضاحت پیش کی تھی لیکن وقار آفندی شش و پنج کا شکار نظر آ رہے تھے۔

"صاحب کوئی مسئلہ ہے کیا؟" مبارک خان نے وقار آفندی کو کشمکش سے نکالنے کی کوشش کی تھی۔

"دیکھو منصور حسین دراصل ہمیں فی الحال گھر کے لیے کسی کام کرنے والے کی ضرورت نہیں ہے چوکیدار، مالی اور ڈرائیور پہلے سے موجود ہیں اور کافی اچھا کام کر رہے ہیں لہٰذا انہیں بلاوجہ کام سے نکالا بھی نہیں جاسکتا اس طرح تو ان کے بیوی بچوں کی روزی روٹی پہ بھی لات مارنے والی بات ہوگی اس لیے ہم سوچ رہے ہیں کہ تمہیں اپنے آفس یا پھر فیکٹری میں کسی کام پہ رکھ لیتے ہیں بس تم تھوڑے دن انتظار کرلو ان شاءاللہ کام تمہیں ضرور مل جائے گا۔" وقار آفندی نے اسے تسلی دی تھی لیکن وہ چند دن کا سن کر مایوس ہوگیا تھا۔

"صاحب تھوڑے دنوں میں تو بہت کچھ ہو جاتا ہے میرے گھر کے حالات بہت خراب ہیں آپ پلیز اور دیر نہ کریں۔" منصور حسین نے التجا کی تھی حالانکہ وہ التجا کرتے ہوئے عجیب لگ رہا تھا۔

"دیکھو برخوردار کچھ سوچ سمجھ کر کوئی جگہ خالی دیکھ کر ہی تمہیں رکھنا ہے نا، بنا ضرورت کے تو نہیں رکھ سکتے؟ تم مبارک خان کو اپنا گھر کا پتا دے جاؤ جب کام نکل آیا تو وہ تمہیں بلا لے گا۔" وقار آفندی بات ختم کرکے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"صاحب آپ جیسا چاہیں گے میں ویسا کام کروں گا اللہ کے لیے مجھے کام پہ رکھ لیں۔" وہ پھر بولنے سے باز نہیں آیا تھا۔

"منصور حسین چپ رہو اگر صاحب نے کہہ دیا ہے تو وہ تمہیں ضرور کام دیں گے۔" مبارک خان نے اسے مزید گلے پڑنے سے روک دیا تھا اور وہ وقار آفندی کو اندر جاتے دیکھ کر مایوس ہوگیا تھا انداز میں تھکن اتر آئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"کیا کرسکتے ہو؟ کیسا کام ڈھونڈ رہے ہو آخر؟" اس آدمی نے اس کے تھکے تھکے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے کافی بے تکلفی سے پوچھا تھا۔

"میں کسی سونہو کا کام کرنے کو بھی تیار ہوں مجھے لوگوں کے واش روم دھونا پڑیں — تو وہ بھی کرلوں گا۔" اس کا لہجہ بے حد تلخ اور کچھ بھیگا ہوا تھا لہجے کی نمی اپنی مجبوری پہ تھی اور لہجے کی تلخی اپنی بے بسی پہ تھی۔ کیا وہ اتنا ہی قسمت کا مارا تھا کہ کوئی بھی اسے کام پہ نہیں رکھ رہا تھا حالانکہ ہر بندے کے سامنے التجا کرتا پھر رہا تھا۔ اس کو اتنے دن ہوگئے تھے وہ لوگوں سے "کام" بھیک کی طرح مانگتا پھر رہا تھا مگر اسے یہ بھیک کسی ایک در سے بھی نصیب نہیں ہوئی تھی ہر ایک نے "سوری" کا سگنل دے کر اسے دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا اور وہ پورا دن اپنے قدموں سے ناپ کے شام ڈھلے سڑک کے کنارے بنے اسے ڈھابے کی ایک بینچ پہ آبیٹھا تھا جہاں اس وقت چند اور لوگ بھی چائے اور سگریٹ سے شغل فرمانے میں مصروف تھے لیکن خود اس کی جیب میں دس روپے بھی نہیں تھے کہ وہ دن بھر کا بھوکا پیاسا خالی پیٹ کو چائے کے ڈیزل سے تکور دینے کے لیے ایک کپ چائے کا ہی پی لیتا۔

"اوئے باؤجی کیا لے کر آؤں آپ کے لیے؟" ڈھابے کا ملازم صفائی ستھرائی والا میلا کچیلا کپڑا میز پہ پھیرنے کے بعد اپنے کندھے پہ ڈالتے ہوئے بڑے اسٹائل سے بولا تھا۔ لیکن وہ اپنی جیبوں کے خالی پن سے واقف تھا

جبھی خاموش رہا تھا۔

"باؤجی میں آپ سے بات کر رہا ہوں کیا لینا ہے؟" اس ڈھابے کے ویٹر نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا تھا۔

"کچھ نہیں لینا۔" اس نے فوراً" نفی میں گردن ہلائی تھی اور اس کے جواب پہ جہاں ویٹر کو حیرت ہوئی تھی وہیں قریب بیٹھے ایک دو دکاندار بے ساختہ ہنس پڑے تھے وہ لوگ روزانہ شام پانچ بجے کی چائے اپنی دکانیں بند کرکے اسی ڈھابے سے آکر پیتے تھے کیونکہ اس ڈھابے کی چائے بہت خالص اور مزے دار ہوتی تھی وہ کڑک سی چائے پی کر دن بھر کی تھکن بھول جاتے تھے۔

"باؤ لینا کچھ نہیں ہے تو یہاں کیا کر رہا ہے؟" ویٹر بدلحاظی سے گویا ہوا تھا۔

"اوئے کم بخت تیری زبان کو آرام نہیں ہے تجھے کتنی بار کہا ہے کوئی نیا گاہک آجائے تو تو اپنی زبان بند رکھا کر۔ گاہک ایسے ہی نہیں بن جاتے گاہک بنانے کے لیے بڑے پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں۔"

"ہاں باؤجی آپ نے کچھ نہیں بھی لینا پھر بھی آرام سے بیٹھو آرام کرو اسے اپنا ہی ہوٹل سمجھو۔" ہوٹل کا مالک اپنے ڈھابے سے نکل کر صحن میں آگیا تھا جہاں وہ لوگ — کرسیاں اور ٹوٹی پھوٹی سی چارپائیاں ڈالے بیٹھے تھے۔

"شکریہ ایک گلاس پانی مل سکتا ہے؟" اس نے ہوٹل کے مالک کی نرمی محسوس کرکے پانی مانگ لیا تھا۔

"اوئے کیوں نہیں باؤجی۔ ابھی پانی پیو، چل شیدے جا کر صاف ستھرے گلاس میں تازہ پانی لے کر آ۔" اس نے اپنے ملازم کو حکم جاری کیا تھا۔

"جی استاد ابھی لے کر آیا۔" شیدا اب جی، جی کر رہا تھا آخر اپنے مالک کا رعب اور دبدبہ تھا اس پہ۔

"کیوں باؤجی کیا پریشانی ہے؟ بڑا تھکا ہوا پریشان نظر آرہا ہے؟" اس آدمی نے بڑی اپنائیت سے پوچھا تھا جیسے برسوں کی جان پہچان ہو ان دونوں کی۔

"چاچا میری پریشانی بھی وہی ہے جو آج کل کے ہر نوجوان کی ہے، بے روزگاری نے جینا مشکل کر رکھا ہے جی چاہتا ہے کسی کنویں میں چھلانگ لگا کر خودکشی کرلوں۔" اس کا لہجہ زہرخند ہو رہا تھا۔

"اللہ معافی دے پتر ——— ایسا ہرگز مت کرنا اللہ بہتر کرے گا۔ تو یہ بتا تو کام کیا کرسکتا ہے؟" ان لوگوں کے قریب بیٹھا ایک اور نرم دل سا آدمی اچانک بول پڑا تھا۔

"فی الحال میرے کام سے میرے گھر والوں کو دو وقت کی روٹی بھی مل جائے تو میرے لیے یہ ہی اللہ کا بڑا کرم ہوگا۔"

"تو پھر میرے ساتھ کام کر۔" وہ آدمی دوسری چارپائی سے اٹھ کر اس کے برابر آبیٹھا تھا وہاں موجود باقی دکاندار بھی انہی کو دیکھ رہے تھے آخر ان لوگوں میں فاصلہ ہی کتنا تھا کہ وہ ان کی گفتگو نہ سن سکتے۔

"آپ کے ساتھ کام؟" اس نے بے یقینی سے سر اٹھایا تھا۔

"ہاں میرے ساتھ، مجھے بھی بہت عرصے سے کسی ایسے آدمی کی تلاش تھی جو محنتی اور قابل بھروسہ بھی ہو اور مجھے لگتا ہے تم میرے معیار پہ پورے اترو گے۔" وہ آدمی اس سے زیادہ خوش ہوا تھا اور اس وقت ان دونوں کی خوشی دیدنی تھی جس کو دیکھ کر ہوٹل کا مالک بھی خوش ہوگیا تھا۔

"لو باؤجی پانی پیو اللہ نے بیٹھے بیٹھے مسئلہ حل کردیا ہے باؤ امتیاز بہت چنگا (اچھا) بندہ ہے خوب گزرے گی تم دونوں کی۔" ان کی بات پہ وہ بھی سچ مچ خوش ہوا تھا باؤ امتیاز سے خوشی خوشی ان کا ایڈریس لے کر کل صبح کام پہ آنے کا وعدہ کرکے وہاں سے رخصت ہوگیا تھا اسے اس وقت گھر جانے کی جلدی تھی اور اس جلدی اور اس خوشی

میں وہ ”کام“ پوچھنا بھی بھول گیا تھا یہ بات اسے گھر میں داخل ہوتے ہوئے یاد آئی تھی کہ آخر اسے کام ملا کیا ہے؟ اور اس کشمکش میں اس کی خوشی آدھی رہ گئی تھی۔

”السلام علیکم۔“ اس نے آہستگی سے سلام کیا تھا۔

”والسلام بیٹا بیٹھو میں پانی منگواتی ہوں۔“ عابدہ خاتون نے صحن میں بچھی چارپائی کی سمت اشارہ کیا تھا وہ چارپائی پہ بیٹھنے کی بجائے اندر ابا جی کے کمرے میں چلا آیا تھا۔

”السلام علیکم ابا۔“ وہ اپنی گھسی پرانی شرٹ کے بٹن کھولتے ہوئے وہیں ان کے قریب کرسی پہ بیٹھ گیا تھا اور انہوں نے اپنی آنکھوں کی جنبش سے اس کے سلام کا جواب دیا تھا اک خاموش سا ”وعلیکم السلام۔“ اس تک پہنچ گیا تھا۔

”آپ کی طبیعت ٹھیک ہے نا؟“ وہ اب آستین کے بٹن کھول کر شرٹ اتارنے لگا تھا شرٹ کے نیچے اس نے وائیٹ بنیان پہنی ہوئی تھی جو فی الحال وہی کافی تھی۔

”مجھے کام مل گیا ہے آج۔“ اس نے ذرا ٹھہر کر انہیں خوش خبری سنائی تھی اور اس خوش خبری پہ ان کے چہرے پہ اک خفیف سی مسکراہٹ دوڑ گئی تھی اک ایسی مسکراہٹ جو ان کے لبوں پہ نہیں پھیل سکتی تھی مگر ان کی آنکھوں اور چہرے کے تاثر میں اپنا عکس دکھا گئی تھی وہ زندگی کی ایسی تلخ اور اذیت ناک اسٹیج پہ تھے کہ وہ رو تو سکتے تھے مگر کسی خوشی پہ ہنس نہیں سکتے تھے ان کے لب مسکرا نہیں سکتے تھے ان کی مسکراہٹ ان کی آنکھوں سے ظاہر ہوتی تھی اور ایسا ہی اک دکھ آنکھیں بھی جھیل رہی تھیں کیونکہ اگر وہ روتے بھی تھے تو اپنے آنسو خود نہیں پونچھ سکتے تھے اور اس سے بہتر تھا کہ ان کے آنسو کسی اور کو پونچھنا پڑتے وہ رونے سے احتراز برتتے تھے وہ اپنے آنسو پی جاتے تھے۔

”مجھے ابھی یہ تو نہیں پتا کہ کام کیسا ہے؟ مجھے کیا کرنا ہے؟ بس یہی کافی ہے کہ مجھے کہیں کام تو مل گیا ہے نا؟“ اس نے لاپروائی سے بتایا تھا۔

”پھر تو بہت بہت مبارک ہو آپ کو۔“ مریم اس کے لیے چائے کا کپ لے کر اندر چلی آئی وہ بھی یہ خوش خبری سن چکی تھی۔

”خیر مبارک بس تم دعا کیا کرو۔“ وہ چائے کا کپ تھامتے ہوئے کافی ہلکے پھلکے لہجے میں بولا تھا۔

پچھلے پانچ منٹ سے ڈور بیل متواتر بج رہی تھی لیکن گھر میں موجود دونوں افراد میں سے ایک بھی اٹھ کر دروازہ کھولنے کا نام نہیں لے رہا تھا حالانکہ رات دو بجے بھی وہ اسی طرح جاگ رہے تھے جیسے دن کے دو بجے کا وقت ہو۔ نبیل حیات چاہ رہا تھا کہ فائزہ بیگم اٹھ کر دروازہ کھولیں تاکہ وہ اس کا سامنا نہ کرے جبکہ دوسری طرف فائزہ بیگم چاہ رہی تھیں کہ نبیل اٹھ کر دروازہ کھولے تاکہ انہیں اس کے ساتھ چخ چخ نہ کرنی پڑے۔ اور اسی کشمکش میں وہ اپنی اپنی جگہ پہ اٹھنے اور نہ اٹھنے کا فیصلہ ہی نہیں کر پا رہے تھے بالآخر وہ ڈور بیل پہ ہاتھ رکھ کے ہٹانا بھول گئی تھی اور آخر کار نبیل حیات کو راکنگ چیئر سے اٹھنا ہی پڑا تھا۔

مضبوط قدموں سے چلتے ہوئے بیڈ روم کا دروازہ کھول کر وہ نیچے اتر آیا تھا۔ اس کے قدم جتنے مضبوط اتنے ہی بھاری بھی محسوس ہو رہے تھے اس نے لب بھینچتے ہوئے آگے بڑھ کے ڈور کھول دیا۔ سامنے ہی وہ نشے کی حالت میں کھڑی اپنا توازن برقرار نہ رکھتے ہوئے تقریباً ڈول رہی تھی۔ نبیل کو اپنے سامنے دیکھ کر ذرا ٹھٹکی۔

”ہائے۔“ اس نے وہیں کھڑے کھڑے ہاتھ ہلا کر اس کی سمت ہلکی سی مسکراہٹ اچھالی تھی۔

”مدحیہ۔“ نبیل یکدم غصے سے دھاڑا تھا اس کی آنکھیں غصے سے سرخ پڑ گئی تھیں وہ کافی سخت تیوروں سے اس کی سمت بڑھا تھا۔

”نبیل رکو۔“ فائزہ بیگم یکدم دہل گئی تھیں تھوڑی دیر پہلے وہ بھی اٹھنے سے گریز کر رہی تھیں مگر جب نبیل کے سیڑھیاں اترنے کی آواز آئی تو نہ چاہتے ہوئے وہ بھی اٹھ آئی تھیں کہ کہیں دونوں بہن بھائی میں زیادہ بدمزگی نہ ہو جائے۔

”مما آپ پلیز اس معاملے سے دور رہیں اب میں خود نبٹا لوں گا‘ آخر یہ کیا چاہتی ہے؟ یہ ایسا کیوں کر رہی ہے؟ کیا پلان ہے اس کا؟“ اس کا بازو اپنے جارحانہ شکنجے میں دبوچتے ہوئے اسے کھینچتا ہوا اندر لے آیا تھا اور لا کر ڈرائنگ روم کے صوفے پہ دھکیل دیا تھا وہ لڑکھڑا کے منہ کے بل صوفے پہ گری تھی اور کتنے ہی لمحے سنبھل نہیں پائی تھی۔

”نبیل کیا کر رہے ہو؟ جاؤ اپنے کمرے میں‘ میں اسے دیکھتی ہوں۔“ فائزہ بیگم لپک کر پھر اس کے پیچھے ڈرائنگ روم میں آئی تھیں۔

”نہیں میں آج اس سے فائنلی بات کر کے جاؤں گا اسے ایک آخری فیصلہ کرنا ہی ہوگا۔“ نبیل صوفے پہ جھکی ہوئی مدحیہ کی طرف دوبارہ بڑھنے لگا کہ اچانک تیزی سے فائزہ بیگم نے اسے بازو سے پکڑ کر روک لیا۔

”کیا بات کرو گے اس سے؟ وہ تو ہوش میں ہی نہیں ہے۔“ انہوں نے تلخی سے اس کے بے حس و حرکت وجود کی سمت اشارہ کیا تھا کیونکہ اگر وہ ہوش میں ہوتی تو یقیناً اب تک سنبھل کر سیدھی ہو چکی ہوتی مگر وہ ابھی بھی اوندھے منہ گری ہوئی تھی۔ اور نبیل حیات غصے اور بے بسی سے درمیانی میز کو پاؤں کی ایک زوردار ٹھوکر مارتا ہوا واپس پلٹ گیا تھا۔

”ابھی تو یہ ہوش میں نہیں ہے لیکن صبح اس کے سارے ہوش و حواس ٹھکانے آ چکے ہوں گے آپ بس اسے اتنا بتا دیجیے گا کہ کل میرے اٹھنے سے پہلے وہ کہیں مت جائے اسے جو بھی فیصلہ کرنا ہے وہ کل صبح ہو جانا چاہیے میں اب اور زیادہ برداشت نہیں کروں گا بس۔“ وہ جاتے جاتے سیڑھیوں سے پلٹ کر ماں کو اپنا فیصلہ سنا آیا تھا لیکن پھر بھی اس کے اندر کا غصہ اور بے بسی کم نہیں ہو پا رہی تھی وہ اضطراری انداز میں اپنے کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہلنے لگا تھا سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس لڑکی کے ساتھ کیا کرے؟ وہ اتنے دنوں سے کسی لائن پہ نہیں آ رہی تھی اور فائزہ بیگم اس کے ساتھ بحث و تکرار کر کے تھک گئی تھیں۔ البتہ وہ خود بھی ایک بار بھی اس کے روبرو نہیں ہوا تھا وہ چاہتا تھا کہ یہ معاملہ اک دوسرے کے سامنے آئے بغیر ہی نبٹ جائے لیکن اس لڑکی نے اس کی برداشت کا پیمانہ لبریز کر دیا تھا وہ ان لوگوں کی ناک میں دم کر چکی تھی اور وہ مارے عزت و غیرت کے کسی کے سامنے کھل کے اپنا مسئلہ بھی نہیں رکھ سکتے تھے۔

نبیل اس کے ذکر سے بچنے کے لیے حتی الامکان کوششیں کرتا رہتا تھا مگر پھر بھی کہیں نہ کہیں سے اس کا ذکر نکل ہی آتا تھا اور وہ اب اس کے چال چلن سے اپنی تحمل مزاجی کا دامن چھوڑنے لگا تھا وہ غصہ بہت کم کرتا تھا مگر آج کل غصہ اس پہ حاوی رہنے لگا تھا صرف اسی کی وجہ سے حالانکہ وہ کافی کول سا بندہ تھا۔ کمرے میں ٹہلتے ہوئے بلکہ چکراتے ہوئے اسے ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی کہ اس کے سیل فون پہ رنگ ٹیون بجنے لگی اس نے چونک کر سیل فون اٹھایا۔

پاکستان سے اس کے دوست کی کال تھی۔

اس نے گھڑی پہ ٹائم دیکھا دو بج رہے تھے تو اس کا مطلب تھا کہ پاکستان میں اس وقت صبح سات بجے کا وقت تھا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

نبیلہ عزیز

دردِ دل

حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت متاثر ہے۔

فائزہ بیگم کا اصرار ہے کہ مدیحہ نبیل کے ساتھ پاکستان شفٹ ہو جائے مگر اس پر وہ قطعی راضی نہیں اور اس انکار کی وجہ سے فائزہ بیگم جہاں حیران ہیں وہیں نبیل کا غصہ بھی عروج پر ہے۔

زارا کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست آذر سے محبت ہے۔ مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل چار سال سے نوکری کی تلاش میں ہے مگر اسے کامیابی کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ اور مایوسی کے اندھیرے ہر طرف سے گھیر لیتے ہیں۔ خودکشی کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔ ایسے میں اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باؤ امتیاز مل جاتا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے۔ جس پر منصور کافی خوش ہوتا ہے اور اسی خوشی میں کام کے بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

فائزہ بیگم کو مدیحہ کی طرف سے جو خدشہ تھا جس کے پیش نظر وہ پاکستان شفٹ ہونا چاہتی تھیں وہ درست ثابت ہو گیا۔ مدیحہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پر [illegible] کے [illegible] قدم [illegible] سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

۲
دوسری قسط

"السلام علیکم۔" اس نے ذرا ٹھہر کر اپنے اعصاب کو کنٹرول کرتے ہوئے تقریباً" پانچ سیکنڈ کے لیے کچھ سوچا اور پھر کال ریسیو کرلی تھی۔ لیکن اپنے اعصاب کنٹرول کرنے کے باوجود وہ اپنے لہجے کا بھاری بوجھل پن کنٹرول نہیں کرسکا تھا' جبکہ ریسیور کے دوسری طرف موجود شخص بھی حد سے زیادہ کائیاں تھا' وہ انسانوں کو صرف چہروں سے ہی نہیں بلکہ لہجوں سے بھی پہچاننے اور پرکھنے کا فن جانتا تھا' اس کی چھٹی حس بہت تیز تھی اور نبیل اس کی اس خاصیت سے بخوبی واقف تھا۔

"نبیل کیا بات ہے؟ اس وقت کیوں جاگ رہے ہو؟" اس کا پہلا تشویش بھرا سوال اٹھا تھا اور نبیل اس فکرمند سے انداز پہ ذرا دیر کے لیے چپ سا ہوگیا تھا۔ اب وہ اسے کیا بتاتا کہ آج کل گھر میں اس کی بہن نے کیا تماشا بنا رکھا ہے؟ اور وہ حد سے زیادہ باغی ہوچکی ہے؟

"کیا سوچ رہے ہو نبیل؟" ریسیور کے ایئرپیس سے دوبارہ اس کی گمبھیر آواز ابھری تھی اور اس آواز میں حد درجہ پریشانی کا رس گھل رہا تھا۔ نبیل سر جھٹک کر اس کی آواز کی سمت متوجہ ہوا تھا۔

"کچھ نہیں سوچ رہا یار' تم سناؤ آج صبح صبح مجھے کیسے یاد کرلیا؟" نبیل کا ارادہ اس کی بات گول کرنے کا تھا۔

"نبیل مجھے ٹالو مت' صاف صاف بتاؤ کیا مسئلہ ہے۔" وہ نبیل کی بات جھٹک کر دوبارہ پوچھ رہا تھا اور نبیل جانتا بھی تھا کہ وہ اپنے اس دوست سے کبھی نہیں چھپ سکتا' پھر بھی چھپنے کی کوشش کررہا تھا اور یہ کوشش سراسر بے سود کوشش تھی۔

"ارے یار کوئی مسئلہ نہیں ہے' تمہیں کوئی وہم ہورہا ہے شاید۔" نبیل نے اسے ٹالنے کی ایک اور کوشش کر دیکھی تھی کہ شاید وہ ٹل ہی جائے' مگر وہ ایسا انسان تھا کہ کوئی اس کے سامنے اپنی کھال بھی اتار کے رکھ دیتا تو وہ مطمئن نہیں ہوتا تھا۔

"نبیل تم شاید بھول رہے ہو کہ [illegible] "یقین" [illegible] والا [illegible] شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ تم اس وقت پریشان ہو' مگر چھپا رہے ہو۔ ہاں اگر تم بتانا نہیں چاہتے یا پھر کوئی پرسنل میٹر ہے تو اٹس اوکے' میں اصرار نہیں کرتا۔" اس نے دوٹوک کہتے ہوئے اپنی طرف سے بات ختم کرکے نبیل کو شش وپنج سے نکالنے کی کوشش کی تھی' لیکن نبیل اس شش وپنج سے نکلنے کی بجائے مزید الجھن کا شکار ہوگیا تھا' اسے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اسے کیا بتائے؟ اور کیا چھپائے؟ اور بہت سوچنے کے بعد اس نے کہہ ہی دیا تھا۔

"مدحیہ پاکستان نہیں جانا چاہتی' اس نے انکار کردیا ہے۔" مدحیہ کے معاملے میں نبیل سے ایک جملہ بولنا بھی مشکل ترین ہوجاتا تھا' کل اتنی دیر عبداللہ کے پاس بیٹھا رہا تھا۔ مگر پھر بھی کچھ نہیں کہہ سکا تھا' البتہ اس کا ذہن بٹانے کی خاطر عبداللہ کافی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں سناتا رہا' لیکن پھر بھی اس کے ذہن پہ رکھا بوجھ کم نہیں ہوا تھا۔ اور اب اسے رات کے اس پہر نشے کی حالت میں دیکھ کر تو اس کے اعصاب کی طنابیں مزید کھنچ گئی تھیں' یعنی جس خدشے کے تحت فائزہ بیگم نے اسے پاکستان شفٹ ہونے کا کہا تھا وہ خدشہ اب سچ ثابت ہونے لگا تھا؟ اس کے آثار اب آئے روز نظر آنے لگے تھے۔

"میں نے تم سے کیا کہا تھا نبیل؟" دوسری طرف اس کی آواز گمبھیر ہی نہیں اب کچھ پرسوچ ہوچکی تھی' لہجہ ٹھہرا ہوا تھا۔

"بس میں اس وقت اس چیز کو سمجھ نہیں سکا تھا' میں یہ ہی سوچتا تھا کہ اور بھی تو ہزاروں لڑکیاں ایسی ہیں جو پاکستان سے آکر یہاں رہ رہی ہیں' وہ یہاں رہ کر بھی اپنی مشرقیت کو نہیں بھولتیں' اب تم نگارش بھابھی اور زری کو ہی دیکھ لو۔" نبیل اپنی غلطی پہ پچھتا رہا تھا۔

"مدحیہ اور ان لوگوں میں بہت فرق ہے' نگارش ایک مذہبی گھرانے کی لڑکی ہے' بے شک وہ یورپ میں پلی

بڑھی ہے' مگر اس کی تعلیم وتربیت پہ کڑی نگاہ رکھی گئی ہے' تم نے دیکھا تو ہوگا ہی کہ جیسے ہی اس کا رجحان عبداللہ کی سمت ہوا تھا اس کے گھر والوں نے چپ چاپ شرافت سے اسے عبداللہ کے ساتھ رخصت کردیا۔ تاکہ وہ کسی غلط سمت پہ نہ چل نکلے' اور رہی زری کی بات تو یہ بھی سن لو کہ اس کی لگام بھی بہت سخت ہاتھوں میں ہے' بے شک عبداللہ براڈ مائنڈڈ ہے' لیکن زری کے معاملے میں اس کی نسلی جاگیردارانہ حس جاگ اٹھتی ہے' زری انگلینڈ جاکر بھی بالکل ایسے ہی رہتی ہے جیسے وہ اپنی حویلی میں رہتی تھی اور اس چیز میں سب سے بڑا ہاتھ عبداللہ کا ہے' وہ صرف اس کی تعلیم کے معاملے میں آزاد خیال ہے اور کسی چیز میں نہیں' جبکہ تم نے اور ممتاز انکل نے آج تک اپنے بزنس سے ہٹ کے کچھ سوچا ہی نہیں' ممتاز انکل نے اپنی بیوی' اپنی بیٹی کے لیے کچھ نہیں سوچا اور تم نے اپنی ماں اور اپنی بہن کے لیے کچھ نہیں سوچا۔ تم لوگوں نے ان کو اتنا ٹائم ہی نہیں دیا کہ وہ تمہاری عزت اور غیرت کو کچھ سمجھ سکیں۔

اب اگر وہ اپنی من مانی کرتی ہے تو تمہیں اتنی تکلیف کیوں ہوتی ہے؟ حالانکہ میں نے تمہیں بتادیا تھا کہ جیسی تم دونوں باپ' بیٹے کی روٹین ہے' تم لوگ پچھتاؤ گے۔ تمہاری ماں اور بہن کو صرف تمہارے پیسے کی ضرورت نہیں ہے انہیں تمہاری بھی ضرورت ہے' لیکن تم کبھی میری بات نہیں سمجھ سکے' اب بھگتو' اب جو وہ کہتی ہے وہ کرو' اب وہ بااختیار ہے اور تم بے بس۔"

اس کی ایک ایک بات حرف باحرف سچ تھی' اس نے نبیل کو حقیقت کا آئینہ دکھایا تو وہ مزید چپ اور سپاٹ ہوکے رہ گیا تھا اور اس کی یہ چپ دوسری طرف بھی محسوس کی جارہی تھی' لیکن وہ اس وقت نبیل کے حق میں ہرگز نہیں تھا' اس کی نظر میں مدحیہ اپنی جگہ پہ درست تھی۔ جس لڑکی کو کبھی باپ اور بھائی کے ہوتے ہوئے بھی ان کے ہونے کا مان نہ ملا ہو اس کا ایسا ری ایکشن تو ہوتا ہی تھا' وہ اگر کسی غلط روش پہ چل رہی تھی تو اس کے [illegible] نبیل اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔

"تم جانتے ہو نبیل؟ مدحیہ جب میرے ساتھ ہوتی ہے تو وہ کیوں خوش ہوتی ہے؟" اس نے ذرا طنزیہ کہا تھا' لیکن نبیل کچھ نہ بول سکا تھا۔

وہ صرف اس لیے خوش ہوتی ہے کہ میں جب اس کے ساتھ ہوتا ہوں تو "صرف اس کا" بھائی ہوتا ہوں' اس وقت میرے لیے میری بہن اہم ہوتی ہے' مدحیہ اہم ہوتی ہے' میں اپنے ضروری کام بھی کچھ دیر کے لیے ترک کردیتا ہوں' صرف اس لیے کہ وہ مجھے بھائی کہتی ہے اور میں اسے ایک بھائی ہونے کا بھرپور احساس دلاسکوں' اور میں جب اسے بھائی ہونے کا احساس دلاتا ہوں تو وہ بھی مجھ سے پیچھے نہیں رہتی' وہ بھی مجھے بہنوں سا ایک مان دیتی ہے' خوشی دیتی ہے' کیا کبھی تم نے اس کے ساتھ ایسا کیا ہے؟ کبھی اسے ٹائم دیا ہے؟ کبھی اس کی خوشی محسوس کی ہے؟"

وہ جو کچھ بھی کہہ رہا تھا سو فیصد سچ تھا' نبیل اپنے مقام پہ غلط تھا اس لیے چپ چاپ سب سن رہا تھا' وہ اس کی کوئی بھی بات جھٹلا نہیں سکتا تھا' اور نہ ہی گیا وقت ہاتھ آسکتا تھا کہ وہ سب کچھ پیچھے لے جاکر اسے اپنی پسند کے مطابق ڈھال سکتا۔ جو ہونا تھا وہ ہوچکا۔ اب اختیار کی حد ختم ہوچکی تھی۔

"نبیل بیٹیوں کے کردار بنانے اور بگاڑنے میں باپ اور بھائی کا بھی بہت بڑا عمل دخل ہوتا ہے' ذرا سی بھی نظر چوک جائے' پورا دامن داغ دار ہوجاتا ہے' اور تمہاری خوش قسمتی ہے کہ وہ آخری حد تک جاکر بھی اپنی حد میں ہے' اس نے تمہاری عزت پہ کوئی داغ نہیں لگایا' اگر عزت کا بھلا چاہتے ہو تو اسے سچ مچ پاکستان لے آؤ' ورنہ پانی تمہارے سر سے گزر جائے گا۔"

"مگر کیسے لے آؤں؟ میں ایسا کیا کہوں کہ وہ جانے کے لیے تیار ہوجائے؟" نبیل اچانک اس کی بات کاٹ کے

بولا تھا اور وہ دوسری طرف خاموش ہو گیا تھا' وہ نبیل کی ذہنی ٹینشن باخوبی سمجھتا تھا اس لیے اسے مزید ٹارچر کرنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے نارمل انداز میں لوٹ آیا۔

"ٹھیک ہے تم رہنے دو میں خود مدیحہ سے بات کروں گا۔" اس نے نبیل کو تسلی دی تھی۔

"میں صبح ٹکٹس کنفرم کروانے کا سوچ رہا ہوں اور مدیحہ کا پاسپورٹ مدیحہ کے پاس ہی ہے۔"

"اٹس اوکے' وہ بھی دے دے گی تم اب آرام کرو ڈونٹ وری' مان جائے گی وہ۔" اس نے کال بند کرنے سے پہلے نبیل کو یقین دلایا تھا اور نبیل اس کی باتوں کو سوچتا بیڈ پہ بیٹھ گیا۔

☼ ☼ ☼

"دل آور شاہ سے ملاقات ہو سکتی ہے؟" وہ لڑکی ان کے گھر کے گیٹ کے سامنے کھڑی چوکیدار سے پوچھ رہی تھی۔

"بی بی تم ہو کون؟ اور کیوں ملنا چاہتی ہو دل آور شاہ سے؟" چوکیدار نے تیکھے اور کڑے انداز میں اس لڑکی کو سرتاپا دیکھا تھا۔ میلے سے کپڑوں میں ملبوس وہ لڑکی اپنے حال حلیے سے ہی کافی غریب اور مجبور لگ رہی تھی لیکن وہ اس کی غریبی اور مجبوری دیکھ کر اسے اندر تو نہیں بھیج سکتا تھا نا؟۔

جبکہ وہ لڑکی ہاتھ جوڑ کے کھڑی ہو گئی تھی۔

"اللہ کے لیے مجھے ایک بار دل آور شاہ سے ملنے دو میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں' تمہارے پاؤں پکڑتی ہوں۔ میں ــــ میں تمہارا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی مجھے صرف ایک بار ــــ صرف ایک بار ان سے ملنے دو ــــ میں در در انصاف کے لیے بھٹک رہی ہوں مجھے ایک بار دل آور شاہ کے سامنے اپنا حال سنانے دو خدا کے لیے میرے ہاتھوں کو دیکھو مجھ پہ ترس کھاؤ۔" وہ لڑکی کہتے کہتے آبدیدہ ہو گئی تھی اس کی آواز بھیگ گئی تھی اور حلق میں آنسوؤں کا گولا اٹک گیا تھا چوکیدار بے چارہ تو بڑا پھنسا تھا اگر اس لڑکی سے کہتا کہ صاحب گھر پہ نہیں ہیں تو بھی وہ بہانہ ہی سمجھتی اور اگر اسے بغیر کسی پوچھ کے انتظار کرنے کے لیے بٹھا لیتا تو بھی اسے صاحب کی ڈانٹ کا خدشہ تھا اور غصہ الگ سہنا پڑتا۔! وہ ابھی اس لڑکی سے کچھ کہنے کے لیے کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ دور سے اسے دل آور شاہ کی گاڑی آتی دکھائی دی تھی اور اس کی گاڑی کو دیکھ کر چوکیدار دل ہی دل میں بے پناہ خوش ہوا کہ چلو اچھا ہے اس لڑکی کی ملاقات کسی بھی اجازت کے بغیر ہی ہو جائے گی اور وہ بھی بہانہ کرنے سے بچ جائے گا۔

"دیکھو میں اور کچھ نہیں کہوں گی میں بس اپنا مسئلہ بتانے آئی ہوں۔ وہ اگر میری عزت کو ــــ"

"مجھے کچھ نہ کہو وہ صاحب کی گاڑی آ رہی ہے ان سے کہو۔" چوکیدار نے آہستگی سے کہتے ہوئے آنکھوں سے اسے گاڑی کی سمت اشارہ کیا تھا۔ وہ لڑکی بے تابی سے پیچھے پلٹی تھی اتنے میں دل آور شاہ کی چمچماتی ہوئی ڈارک گرے کلر کی گاڑی سیدھی گیٹ کے سامنے روش پہ آ رکی تھی چوکیدار نے فوراً اسے سلام کیا تھا اور وہ اس کے سلام کا جواب دے کر اس لڑکی کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

"کون ہے یہ لڑکی؟" دل آور شاہ نے اس لڑکی کو دیکھتے ہوئے چوکیدار سے استفسار کیا تھا۔

"پتا نہیں صاحب کون ہے؟ لیکن بہت دیر سے آپ سے ملنے کے لیے اصرار کر رہی ہے۔ اللہ کے واسطے دے رہی ہے۔" چوکیدار نے ایک بار پھر پلٹ کر اس لڑکی کو دیکھا تھا اور پھر اپنی گاڑی دوبارہ اسٹارٹ کرتے ہوئے اس نے چوکیدار کو اشارہ کیا تھا۔

"اسے اندر بھیج دو۔" وہ اپنی گاڑی اندر بڑھا لے گیا اور چوکیدار نے اس لڑکی کو اجازت کا پروانہ تھما دیا تھا جو ابھی تک دل آور شاہ کی پرسنالٹی سے مرعوب کھڑی تھی اس شخص کے سامنے بولنے کی ہمت ابھی اس میں نہیں

ہو رہی تھی تو بعد میں بھلا کیا ہو سکتی تھی؟ وہ بمشکل اپنے آپ کو سنبھالتی اندر پہنچی تھی۔ وہ پہلے سے ڈرائنگ روم میں کھڑا اس لڑکی کے آنے کا انتظار کر رہا تھا جو آہستہ آہستہ ڈرے سہمے قدم اٹھاتی وہاں تک پہنچی تھی۔

"بیٹھیے۔" وہ کافی سنجیدگی سے کھڑا صوفے کی سمت اشارہ کر رہا تھا۔ لیکن اس لڑکی کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ وہاں بیٹھ جائے۔ ایک تو اس کی شخصیت اور دوسرا اس کا ناپا تلا سا انداز۔ کہیں بھی کوئی لچک نظر نہیں آ رہی تھی۔

"دیکھیے بی بی آپ ڈریے مت بیٹھ جائیے۔ بیٹھ کے بات کریں کیا کہنا ہے آپ کو؟ کیا مسئلہ ہے آپ کے ساتھ؟" وہ معمول سے ہٹ کے کافی نرمی سے گویا ہوا تھا مگر اس کی وہ ٹوک نرمی میں بھی نرمی نہیں لگتی تھی۔

"شاہ! کون ہے بیٹا؟ کس سے باتیں کر رہے ہو؟" بتول شاہ اس کی آواز سے اندازہ لگا چکی تھیں کہ ڈرائنگ روم میں اس کے علاوہ بھی کوئی ہے اسی لیے وہ ملازمہ کو کچن میں بھیج کر خود ڈرائنگ روم میں آ گئی تھیں لیکن وہاں ایک ڈری سہمی لڑکی کو دیکھ کر یکدم ٹھٹک گئی تھیں جبکہ ڈرائنگ روم میں کسی خاتون کے وجود کو داخل ہوتے دیکھ کر اس لڑکی کو بہت ڈھارس ملی تھی اس کی تھمی تھمی سی سانسیں فوراً ہموار ہو گئی تھیں۔ اسے بتول شاہ کا وجود اس وقت بہت بڑی ڈھال محسوس ہوا تھا اب وہ دل آور شاہ کے سامنے کھل کے اپنا دکھ' اپنا نقصان' اپنی اذیت و بے بسی بیان کر سکتی تھی۔ وہ دل آور شاہ کو اپنی سمت متوجہ دیکھ کر ذرا سا گھبرا گئی تھی اور فوراً صوفے پہ ٹک گئی تھی۔

"اماں جان آپ بھی بیٹھیے کھڑی کیوں ہیں؟" اس نے بتول شاہ کو بھی بیٹھنے کا کہا تھا جو اسے ابھی تک سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھیں مگر وہ خود اس لڑکی کو نہیں جانتا تھا اس لیے ان کے کسی بھی سوال کا جواب فی الحال نہیں دے سکتا تھا اسی لیے ان کے سوال سے نظر ہٹا کر اس کی سمت متوجہ ہوا تھا۔

"جی فرمائیے؟ کس لیے مجھ سے ملنا چاہ رہی تھیں آپ؟" بتول شاہ کے برابر والے صوفے پہ براجمان ہوتے ہوئے اس نے کالی گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے سوالات کا آغاز کیا تھا۔

"[illegible] مجھے ــــ [illegible] تھانوں اور کچہریوں کے چکر لگا رہی ہوں مجھے کہیں سے کوئی انصاف نہیں مل رہا' میں غریب ہوں' مجبور اور بے بس ہوں' میرے ہاتھ میں پیسوں کی گڈیاں نہیں ہیں اس لیے کسی کو احساس ہی نہیں ہو رہا کہ مجھ پہ ظلم ہوا ہے ــــ آج اگر میں کسی امیر باپ کی بیٹی ہوتی تو کب کا انصاف مل چکا ہوتا بلکہ میرا مجرم اپنے انجام کو پہنچ چکا ہوتا مگر اور بہت سی بدنصیبیوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی بدنصیبی ہے کہ میں ایک غریب باپ کی بیٹی ہوں اور میری عزت اتارنے والا ابھی تک بڑی شان سے جی رہا ہے۔" وہ لڑکی کہتے ہوئے تڑپ تڑپ کے رو دی تھی اور بتول شاہ کے ذہن کو ایک گہرا شدید دھچکا لگا تھا انہیں اس لڑکی پہ ہونے والا ظلم سن کے جیسے کرنٹ چھو گیا تھا انہوں نے بے ساختہ اس لڑکی سے نظریں ہٹا کر دل آور شاہ کو دیکھا جو بھینچ کر ان سے نظر چرا گیا تھا اس کے چہرے کے تاثرات سرد پڑ گئے تھے جبکہ وہ لڑکی مزید بولے جا رہی تھی۔

"میں انصاف کے لیے جہاں بھی گئی ہوں الٹا مجھے ہی لوگوں نے غلیظ اور گندی نظروں سے دیکھا ہے کسی نے بھی میرے حال کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی کسی نے مجھے انصاف دلانے کا نہیں سوچا' یا تو بھی بھاری فیس مانگتے ہیں یا پھر اس بدمعاش کا نام سن کر ہاتھ کھینچ لیتے ہیں میں شاید تھک ہار کے اپنا معاملہ رب پہ چھوڑ دیتی لیکن مجھے تھانے سے نکلتے ہوئے انسپکٹر شہباز نے مشورہ دیا تھا کہ میں ایک بار آپ سے ضرور ملوں [illegible] اپنا معاملہ رب پہ چھوڑنے کے ساتھ ساتھ رب کے بندے کے سامنے بھی دامن پھیلانا چاہتی ہوں' خدا کے لیے مجھے انصاف دلا دیں۔ مجھے برباد کرنے والا سکھ کی نیند سوتا ہے یہی سوچ کر میری رات کانٹوں پہ بسر ہوتی ہے' میں آگ پہ سوتی ہوں اور میرا دماغ دار وجود راکھ کا ڈھیر بن جاتا ہے۔ خدا کے لیے مجھ پہ رحم کرو ــــ"

وہ لڑکی اچانک اپنا دوپٹہ پھیلا کر اس کے قدموں میں گرنے کے سے انداز میں آ بیٹھی تھی اور زلزلے کی زد پہ

رکھا دل آور شاہ کا دماغ یکدم جھنجھنا اٹھا تھا اس نے فوراً اپنے پاؤں پیچھے کھینچ لیے تھے وہ لڑکی ہنوز دوپٹہ پھیلائے بیٹھی رو رہی تھی اور وہ مٹھیاں اور لب بھینچے نجانے کون سے طوفان کے ابال کو ضبط کرنے کی کوشش میں تھا جب یہ طوفان اختیار سے باہر ہوا تو وہ یکدم اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا لیکن وہاں سے جانے سے پہلے وہ اس لڑکی کا دوپٹہ اٹھا کر اس کے سر پہ ڈال گیا تھا گویا اسے امید اور تسلی دے گیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ ہے۔

دوسری طرف بتول شاہ ساکت و صامت سی سپاٹ چہرہ لیے بیٹھی تھیں ان کے دماغ میں اس لڑکی کی آواز گونج رہی تھی اور سماعتوں میں سائیں سائیں ہو رہی تھی وہ لڑکی ابھی بھی دوزانو قالین پہ بیٹھی آنسو بہا رہی تھی اور اس لڑکی کے آنسو بتول شاہ کو اپنے دل پہ گرتے محسوس ہو رہے تھے وہ عورت تھیں، عورت کا دکھ جانتی تھیں انہوں نے بہت ہی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا تھا اور پھر اعصاب یکجا کرتے ہوئے اٹھ کر اس لڑکی کی سمت آئی تھیں۔ "اٹھو بیٹا اوپر صوفے پہ بیٹھو۔" اسے کندھوں سے تھام کر کہا تھا۔

"چپ ہو جاؤ۔ میرا دل آور شاہ تمہارا کیس ضرور لڑے گا، چاہے کچھ بھی ہو جائے۔" ان کے لہجے میں تسلی، دلاسا، مان، بھروسہ، یقین سب کچھ تھا کیونکہ وہ دل آور شاہ کی "ماں" تھیں اور ایک ماں ہونے کے ناتے وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ ان کا "بیٹا" کیا کچھ کر سکتا ہے۔؟

☼ ☼ ☼

آسمان کا شفاف نیلا رنگ رفتہ رفتہ اس قدر گہرا ہو گیا تھا کہ اب تاحد نظر پھیلا آسمان سرمئی رنگ میں ڈھل چکا تھا اور اسی سرمئی رنگ پہ زرد رنگ کا اداس چاند چھوٹی چھوٹی بے ضرور بدلیوں سے الجھتا، اپنا دامن چھڑاتا آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر بڑے بڑے بادلوں کی سنگت سے بچھڑی یہ بدلیاں بار بار چاند کے راستے میں حائل ہو کر اسے چھیڑ کر، اس کی اداسی میں خلل ڈال رہی تھیں جس پہ چاند کی اداسی اور بے زاری میں قطرہ قطرہ اضافہ ہو رہا تھا وہ ان بدلیوں کو جھٹک جھٹک پیچھے ہٹا رہا تھا بار بار جھڑک رہا تھا مگر وہ اتنی شریر تھیں کہ اس کا راستہ چھوڑنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں بلکہ ان کی شرارتوں اور اٹھکیلیوں میں اور بھی کئی آوارہ بدلیاں شامل ہو چکی تھیں اور چاند کے گرد گھیرا تنگ کر چکی تھیں اس کا جی چاہا وہ فوراً جائے اور اداس سے بے زار چاند کو ان ننھے باز آوارہ بدلیوں کے گھیرے سے نکال کے اپنے پاس لے آئے اور پھر آرام سے سہولت سے اطمینان سے بیٹھ کر اس چاند سے اس کی اداسی کا سبب پوچھے۔

تم اور کسی کو نہ سہی صرف مجھے اپنا سمجھ کے، اپنا راز داں، اپنا غم گسار سمجھ کہ یہ بتاؤ کہ تم اتنے اداس کیوں ہو؟ کس بے مہر نے تمہیں دکھ پہنچایا ہے؟ کس نے تمہیں اداسی کا رنگ بخشا ہے؟ کون ہے وہ؟ کہاں ہے وہ؟ میں اس سے پوچھتی ہوں، میں اس سے لڑتی ہوں۔ آخر کیوں کیا اس نے ایسا؟ حالانکہ تم تو اتنے اچھے ہو کہ جن کو بھی تنہا دیکھتے ہوئے اس کے ہی ہو جاتے ہو۔ جبکہ یہ بے مہر، بے مروت لوگ تمہاری اس ادا کو اس وفا کو بھی "ہرجائی" کا نام دیتے ہیں حالانکہ لوگ خود ہرجائی ہیں۔

وہ چپ کی زباں میں چاند سے باتیں کرتی نہ جانے کیا کیا کہہ رہی تھی اور کیا کیا سوچ رہی تھی کہ اچانک اس کے رخسار پہ بارش کی پہلی بوند نے بوسہ دیا تھا۔ اس نے بری طرح چونک کر اپنے گال پہ ہاتھ رکھ کے اس بوند کو چھو کر محسوس کیا تھا اور ایک بوند کو محسوس کرتے کرتے اور بوندیں بھی اس کو چھیڑتی ہوئی گزر گئی تھیں۔۔۔ تو کیا چاند چھپ گیا؟ تھک گیا ان بدلیوں سے لڑتے لڑتے؟ اس نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا جس پہ چاند کا نام و نشان تک نہیں تھا البتہ بدلیاں قہقہے لگاتی پھر رہی تھیں اب آسمان کے فراخ سینے پہ ان کا راج تھا وہ ہواؤں کے سنگ اڑتی پھر رہی تھیں جیسے چاند کو وہاں سے بھگا کر جشن منا رہی ہوں۔ اور اب چاند کی اداسی اس پہ اتر آئی تھی اب چاند

کے لیے وہ اداس ہو رہی تھی!

"میں جانتی ہوں تم کس کے لیے اتنی اداس ہو رہی ہو۔" کومل اپنے دھیان، اپنی اداسی میں ایسی محو کھڑی تھی کہ اس کی آواز پہ گڑبڑا کے رہ گئی تھی۔

"حرمت تم؟" کومل نے اپنے دل پہ ہاتھ رکھتے ہوئے گھور کے کہا تھا۔ "ہاں میں۔۔۔ کیا تم کوئی اور سمجھی تھیں؟" حرمت کا انداز ذو معنی تھا جس پہ کومل کو مزید خفگی ہوئی تھی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" اس کے ماتھے پہ سلوٹیں پڑ چکی تھیں۔

"میرا مطلب ہے کہ رات کے وقت بارش میں بھیگنا ٹھیک نہیں ہے۔ بیمار پڑ جاؤ گی۔" حرمت نے بے دھیانی میں بارش میں بھیگتی کومل کو بارش کی سمت متوجہ کیا تھا اور اپنی بات گول کر دی تھی۔

"اتنی نازک نہیں ہوں کہ بارش کی بوندوں سے بیمار پڑ جاؤں۔" وہ اپنے بال پیچھے ہٹاتے ہوئے سر جھٹک کر بولی تھی۔

"تم جتنی نازک ہو میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ خیر چھوڑو اس بات کو، چلو نیچے چلتے ہیں سبھی ڈرائنگ روم میں ٹی وی دیکھتے ہوئے اتنا انجوائے کر رہے ہیں اور تم یہاں بور ہو رہی ہو۔" حرمت نے کومل کا بازو پکڑ کر اسے ٹیرس سے کھینچ کر کمرے میں دھکیلا تھا اسے پتا تھا کہ وہ اتنی جلدی وہاں سے نہیں ہٹے گی۔

"تم سے کس نے کہا کہ میں بور ہو رہی تھی؟" کومل اس وقت اس کے ساتھ نیچے نہیں جانا چاہتی تھی اسی لیے جرح کر رہی تھی۔

"اوکے بابا مان لیا کہ تم بور نہیں ہو رہی۔۔۔ بلکہ انجوائے کر رہی تھیں۔ لیکن میری جان ہم چاہتے ہیں کہ تم اکیلی انجوائے نہ کرو بلکہ ہمارے ساتھ مل کے انجوائے کرو۔ نیچے چلو ہم سب نے آئس کریم منگوائی ہے زین آئس کریم لے کر آ چکا ہو گا۔" حرمت کے بار بار اصرار کرنے پر کومل کو اٹھنا ہی پڑا تھا۔ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی کومل کی سب سے پہلی نظر علیزے پہ پڑی تھی جو شاید دانیال یا پھر احمد کی کسی بات پہ ہنس رہی تھی اور یہ بات اس حویلی کی تاریخ کی اہم ترین بات تھی کہ علیزے آفندی سب کے ساتھ اتنی بے تکلفی سے بیٹھی ان کی باتوں پہ ہنس رہی تھی اور یہ بات وہاں موجود لوگوں کے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں تھی کہ علیزے ان کے ساتھ ان کے درمیان بیٹھی باتیں کرتی ہنس رہی ہے۔ مسکرا رہی ہے۔ اس کی مسکراہٹ دیکھ دیکھ کر ان لوگوں کا خون بڑھ رہا تھا۔

"ہونہہ؟" کومل کو دیکھ کر کوفت ہوئی تھی نہ جانے کیا بات تھی کہ علیزے باقی سب کو جتنی عزیز تھی کومل کو اتنی ہی خار کی طرح چبھتی تھی۔

"کومل کھڑی کیوں ہو بیٹھو نا۔" دانیال نے ایک نظر حرمت کو دیکھ کر کومل کو بیٹھنے کا کہا۔

"کیا ہو رہا ہے؟" کومل نے اپنے چہرے کے تاثرات کنٹرول کرتے ہوئے نارمل سے لاپروا لہجے میں پوچھا تھا۔

"مت پوچھو کہ کیا ہو رہا ہے؟" دانیال نے مسکراتے ہوئے جس انداز میں نفی میں گردن ہلائی تھی اس پہ زبردست سا قہقہہ پڑا تھا اور اس قہقہے میں جویریہ، مدحت، انوشہ اور احمد بھی شامل تھے جبکہ عون اور عدید تو ہنس ہنس کے دوہرے ہو رہے تھے۔

"عون اور عدید اپنی علیزے آپی کو طرح طرح کی پہیلیاں بوجھوا رہے ہیں اور وہ نہ جانے کیسے کیسے جواب ڈھونڈ کے لا رہی ہے کہ ہم بھی ایسی معلومات سے بے خبر ہیں۔ اب تم یہی سوال دیکھ لو کہ ایک مشہور شخصیت کا نام لے کر پوچھ رہے ہیں۔ ان کی قبر میں کون دفن ہے؟" دانیال نے دل کھول کے ہنستے ہوئے ان لوگوں کا سوال بتایا تھا اور کومل اس سوال پہ چونک گئی تھی۔

"اب تم بتاؤ کومل۔" دانیال نے شرارت سے کہا تھا۔
"ظاہر ہے بھئی جس کی قبر ہے وہی دفن ہوں گے اور کون ہو سکتا ہے بھلا؟" کومل نے حیرانی سے دیکھتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"کریکٹ ـــ دیکھا محترمہ علیزے ایسے ہوتے ہیں ذہین بچے فوراً" جواب حاضر ـــ" دانیال نے کومل کو داد دیتے ہوئے علیزے کو شرم دلائی جو عون اور عدید کے اس سوال پہ بے ساختہ پوچھ بیٹھی تھی کہ "کون دفن ہے؟"

"یہ چیٹنگ ہے دانیال بھائی پہلے آپ نے عون اور عدید کے ساتھ مل کر مشورہ کیا اور پھر مجھے بے وقوف بنایا اور ان کے سوال پہ ایسے حیرانی ظاہر کی کہ مجھے بھی ان کا سوال سن کے حیرانی ہونے لگی اسی لیے میں اس سوال کو سیریس لینے لگی۔ کیونکہ یہ پاکستان ہے' یہاں صرف بم دھماکے اور خود کش حملے ہی نہیں ہوتے یہاں دھوکے اور فراڈ بھی ہوتے ہیں' جن سے آج کل قبرستان بھی محفوظ نہیں ہیں۔ یہاں تو پتا نہیں کس کس کی قبر میں کون کون دفن ہے؟" بچوں کی مذاق میں کہی بات اتنی سنجیدگی کا روپ لے گئی تھی کہ وہاں موجود سبھی لوگ چپ کے چپ رہ گئے تھے۔ وہ سچ ہی تو کہہ رہی تھی' بلکہ وہ بیٹھے بیٹھے ان کو اپنے ملکی حالات کا آئینہ دکھا گئی تھی اس کی بات پہ کسی کو بھی اعتراض یا اختلاف نہیں ہوا تھا۔

"ہائیں اتنی خاموشی کیوں ہے جی؟" زین نے ڈرتے ڈرتے ڈرائنگ روم میں قدم رکھا تھا اور ان سب کو خاموش دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ حالانکہ وہ آئس کریم لے کر اچھلتا کودتا' ڈانس کرتا' یہاں تک آیا تھا کیونکہ تھوڑی دیر پہلے وہ ماحول بے حد خوش گوار چھوڑ کے گیا تھا۔

"لاؤ میں آئس کریم نکالتی ہوں۔" حرمت نے اٹھ کر اس کے ہاتھ سے شاپر تھام لیے تھے اور جب وہ باؤلز میں آئس کریم سجائے واپس ڈرائنگ روم میں آئی تو وہاں سب موجود تھے' لیکن علیزے جا چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

آج وہ صبح ہی صبح سب سے پہلے اٹھ کر بیٹھ گیا تھا کیونکہ اسے پتا تھا کہ اگر آج وہ خرگوش کی طرح نیند کے مزے لیتا رہ گیا تو بہت پیچھے رہ جائے گا۔ بلکہ پچھتاتا رہ جائے گا۔ آج اس کو نوکری کی خوشی اور ولولے نے ٹھیک سے سونے ہی نہیں دیا تھا۔ آج رات کے بارہ بجے ہی اس کا دل چاہ رہا تھا کہ صبح کے سات بج جائیں' تاکہ اسے مزید سات گھنٹوں کے انتظار کی کوفت نہ اٹھانا پڑے۔ لیکن وقت ایسا اٹل تھا کہ وہ چاہے ایڑیاں بھی رگڑ لیتا اپنے اصول' اپنے مقام' اپنے اوقات سے آگے یا پیچھے نہیں سرک سکتا تھا' وقت ایک ایسا گھوڑا تھا جس کی لگام خود اللہ کے ہاتھ میں تھی اور وہ اللہ ـــ کی حکم عدولی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اللہ کی رضا کے مطابق بڑی سبک رفتاری سے چل رہا تھا۔ بارہ گھنٹوں میں رات کا سفر طے کرتا تھا اور بارہ گھنٹوں میں دن کی مسافت ختم کرتا تھا۔ کبھی ایک منٹ یا ایک سیکنڈ بھی ادھر سے ادھر نہیں ہونے پایا تھا۔ وجہ کیا تھی؟ "خدا کے ہاتھ میں لگام" اور بس۔

"ناشتا نہیں کرو گے؟" وہ نہ جانے کس دھیان میں گم تھا کہ عابدہ خاتون کی آواز بھی نہ سن سکا تھا۔

"میں تم سے پوچھ رہی ہوں بیٹا' ناشتا کرو گے نا؟" انہوں نے قریب آکر اسے متوجہ کیا تھا' وہ چونک کر سیدھا ہوا تھا۔

"جی امی ناشتا کر کے ہی جاؤں گا' آج پہلا دن ہے وہاں پتا نہیں کیا ملتا ہے اور کیا نہیں؟" عدیل نے سمجھ داری سے کام لیا تھا کیونکہ پہلے وہ صرف نوکری تلاش کرنے جاتا تھا' کبھی ناشتا کر لیتا تھا' کبھی چھوڑ دیتا تھا۔ مگر آج وہ کام پہ جا رہا تھا' دن بھر کام میں مصروف رہنے کے ساتھ ساتھ اگر بھوکا بھی رہتا تو یقیناً" کل دوبارہ کام پہ جانے کے لیے ذرا بھی سکت نہ رہتی۔

"ٹھیک ہے تم باہر آ کے بیٹھو' مریم ناشتا لگا دیتی ہے تمہارا۔" وہ اس کا کندھا تھپک کے باہر نکل گئی تھیں اور وہ بھی ان کے پیچھے پیچھے برآمدے میں چلا آیا تھا' مریم چھوٹی سی ٹیبل پہ ناشتا لگانے لگی ـــ اور تھوڑی دیر بعد وہ ناشتا کر کے عابدہ خاتون اور مریم سے دعا لے کر باپ کے پاس آیا تھا' ان کی خاموش دعا دامن میں سمیٹ کر فوراً" گھر سے نکل گیا۔ اب اسے مطلوبہ ایڈریس پہ پہنچنے کی جلدی تھی' بس اسٹاپ پہ آ کر پانچ منٹ بس کا انتظار کیا تھا اور شکر تھا کہ چھٹے منٹ میں بس کی ٹوٹی پھوٹی سی شکل نظر آ ہی گئی تھی۔

لیکن لوگ اس ٹوٹی پھوٹی بس کو بھی بخشنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ وہ بس کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اتنے بڑے شہر میں صرف ایک ہی بس رہ گئی تھی۔ جیسے ہی بس قریب آ کر رکی' پورے بس اسٹاپ پہ اک شور' اک کھلبلی سی مچ گئی تھی۔ کچھ سواریاں بس سے اترنے کے لیے بے چین تھیں اور کچھ اس بس میں سوار ہونے کے لیے بے تاب ہو رہی تھیں اور ان بے تاب لوگوں میں وہ بھی سرفہرست تھا۔

وہ بھی اس بس میں سوار ہونے کے لیے راستہ تلاش رہا تھا۔ مگر لوگوں کا ہجوم اتنا زیادہ تھا کہ اسے لگ رہا تھا وہ آج بس کی وجہ سے اپنی اتنی مشکلوں سے ملنے والی نوکری سے محروم ہو کے رہ جائے گا۔ جبکہ نوکری سے محرومی کا خیال ہی اتنا سوہان روح تھا۔ وہ بھی اپنا مہذب پن اور تمیز بالائے طاق رکھتے ہوئے اس ہجوم اور دھکم پیل میں شامل ہو گیا تھا اور تقریباً" سات' آٹھ منٹ کی مسلسل تگ و دو کے بعد وہ بس میں سوار ہونے اور ایک عدد سیٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا تھا۔ اس نے ایک بے چین سی نظر اپنی مضبوط کلائی پہ بندھی گھڑی پہ ڈالی تھی اور راستے سے توقف میں اسے گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی تھی اور اس نے یک دم جیسے شکر کا سانس لیا تھا۔ اور یونہی وقفے وقفے سے گھڑی دیکھتے ہوئے اس کا باقی کا سفر کٹا' اور ٹھیک آدھے گھنٹے بعد وہ اپنے مطلوبہ ایڈریس پہ پہنچ چکا تھا۔ لیکن اس ایڈریس پہ پہنچ کر اس کے قدم اپنی جگہ پہ جمے رہ گئے تھے۔ اس کی نظریں سڑک کنارے لمبا سا بورڈ تھیں جس کے نیچے امتیاز کاشمیری کا نام درج تھا ـــ اس وقت اس بورڈ پہ درج چاچا امتیاز کے نام نے نہیں بلکہ کسی اور چیز نے منجمد کر دیا تھا اور وہ ابھی تک اسے ہی بار بار پڑھے جا رہا تھا۔ "چانٹا ورکشاپ"

تو گویا اسے ورکشاپ میں کام کرنا تھا؟ اس کے ذہن میں تمسخرانہ سا سوال ابھرا تھا۔ جیسے وہ خود ہی اپنے آپ کا مذاق اڑا رہا ہو۔ اگر یہی کرنا تھا تو وہ اتنے دنوں سے اپنی ڈگری فائل میں سجائے کیوں گھوم رہا تھا؟ کیا حاصل تھا اس کا جس کو حاصل کرنے کے لیے اس نے اتنے سال دن رات پڑھائی کی تھی' موٹی موٹی کتابوں سے مغز ماری کی تھی' اتنے امتحان پاس کیے تھے اور اپنی کامیابی کے لیے اتنی دعائیں مانگی تھیں۔ لیکن آج سب کچھ دھرا کا دھرا رہ گیا تھا' بلکہ "چانٹا ورکشاپ" کا بورڈ بڑے تمسخرانہ انداز میں اس کے ہاتھ میں پکڑی فائل کا منہ چڑا رہا تھا' جسے وہ گھر سے نکلتے ہوئے بڑی احتیاط اور بڑی خوشی کے ساتھ اپنے ساتھ لے آیا تھا' تاکہ ضرورت پڑنے پہ وہ اس کی کوالیفکیشن بھی دیکھ لیں۔ مگر ضرورت بھلا کیا پڑ سکتی تھی؟ ضرورت سے پہلے ہی اس کی ڈگری منہ چھپانے پہ مجبور ہو گئی تھی۔ وہ سڑک کنارے کھڑا اپنی فائل کو بے بسی سے تھامے زخمی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"اوئے باؤ عدیل تم آ گئے؟" چاچا امتیاز اچانک ورکشاپ کے احاطے سے باہر نکلے تو پہلی نظر اسی پہ پڑی تھی جو اپنی جگہ پہ جامد کھڑا ورکشاپ کے اندر جانے کی ہمت مجتمع کر رہا تھا اور چاچا امتیاز کی آواز پہ یک دم چونک کر اپنے حواسوں میں واپس آیا تھا اور گہری سانس کھینچی تھی۔

☼ ☼ ☼

رات کے تین بجے کا وقت تھا جب اچانک ان کی آنکھ کھلی تھی اور وہ بے ساختہ ہی کسی احساس کے تحت اٹھ

کر کمرے سے باہر نکل آئی تھیں' ان کا رخ کچن کی طرف تھا' کیونکہ کچن کی جلتی ہوئی لائٹ کے ساتھ ساتھ برتنوں کی کھڑبڑکی آوازیں بھی آرہی تھیں اور کچن کے دروازے میں پہنچ کرانہیں وہی نظر آیا تھا جس کی وہ توقع کررہی تھیں۔

"جودت۔" ان کی آواز میں سختی کا عنصر نمایاں تھا اور وہ جو اپنے دھیان میں مگن بڑی احتیاط کے ساتھ اپنے لیے کھانا نکال کر گرم کررہا تھا ان کی آواز پہ ذرا سا چونک کر سیدھا ہوا تھا۔

"جی مام؟" اس نے اپنے تاثرات کنٹرول کرنے میں سیکنڈ کا وقت لیا تھا۔

"یہ کون سا وقت ہے گھر آنے کا؟" ان کے لہجے کی سختی مزید گہری ہوئی تھی' کیونکہ اگر وہ اس طرح سختی سے پیش نہ آتیں تو کل کو باقی گھر والوں کے ساتھ ساتھ ان کے بڑے بیٹے اور شوہر کا زیادہ الزام ان ہی پہ آتا کہ انہوں نے ہی اسے بگاڑا ہے کیونکہ وہ اس کی ماں تھیں اور اکثر اولاد کے بگڑنے کا سبب لوگ ماں کو ہی گردانتے ہیں' چاہے اس میں ماں کا رتی برابر بھی قصور نہ ہو۔

"جودت میں کیا پوچھ رہی ہوں تم سے؟" اب کی بار ان کی آواز دبی ہوئی' مگر لہجہ کافی تیز تھا۔

"مام گھر آنے کا بھی کوئی وقت ہوتا ہے؟ گھر تو گھر ہے' جب چاہے آؤ' جب چاہے جاؤ' تو ٹینشن؟" وہ انتہائی لاپروائی سے کہتا فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل اور رائتے کا باؤل نکال کر ٹیبل کی سمت آگیا اور دائیں پاؤں کی مدد سے کرسی گھسیٹ کر کھانا کھانے کے لیے بیٹھ گیا تھا۔

"یہ روٹین گھر کی نہیں ہوٹلز کی ہوتی ہے' جب چاہے آؤ اور جب چاہے جاؤ' جہاں کسی کو کوئی پروا نہیں ہوتی کہ کون آرہا ہے؟ اور کون جارہا ہے؟ وہاں تمہارا یہ "نو ٹینشن" بھی سوٹ کرجاتا ہے اور تم شاید بھول رہے ہو کہ یہ گھر ہے' یہ بڑی حویلی ہے' یہاں آج تک ایسی آوارہ گردی کسی نے بھی نہیں کی جیسی تم کررہے ہو' اگر تمہاری ان حرکتوں کا بھائی صاحب (وقار آفندی) کو پتا چل گیا تو وہ ایک لمحے کی بھی تاخیر کیے بنا تمہیں گھر سے نکال دیں گے' پھر کرتے رہنا جی بھر کے آوارہ گردی۔"

ثروت بیگم کا انداز بے حد تیز اور سخت تھا' وہ جودت کو ہر ممکن طریقے سے ان حرکتوں سے باز رکھنا چاہتی تھیں' جبھی ان کا لیکچر رات کے تین بجے بھی جاری تھا' جس کا بہرحال جودت آفندی پہ ذرا بھی اثر نہیں تھا' وہ بے نیازی سے کھانا کھانے میں مصروف تھا' اس نے سلاد کی پلیٹ سے کھیرے کا ٹکڑا اٹھا کر منہ میں رکھتے ہوئے ثروت بیگم کی خاموشی نوٹ کی تھی اور فوراً" ہی استفہامیہ نظروں سے ان کی سمت دیکھا تھا' وہ لب بھینچے سخت کڑی نظروں سے اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔

"آپ خاموش کیوں ہو گئیں مام؟ کچھ اور بھی کہیے نا' میں سب سن رہا ہوں ڈونٹ وری۔" اس نے اپنی ماں کو پھر سے بولنے پہ اکسایا تھا۔

"یعنی تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ آپ بھونکتی رہیے مجھ پہ کوئی اثر نہیں ہوگا؟" ثروت بیگم نے غصے اور ملامت کی حد کرڈالی تھی۔

"اف خدایا۔ اللہ معافی دے' آپ کیوں رات کے اس پہر مجھے گناہ گار کرنے پہ تلی ہوئی ہیں؟ آپ میری ماں ہیں' آپ کا اک اک لفظ میرے لیے قابل احترام ہے' میں بھلا کیوں ایسا کہنے لگا؟" اس نے توبہ توبہ کرتے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگائے تھے۔

"اس وقت تم کون سا کوئی نیک کام کرکے آرہے ہو جو تمہیں گناہ گار ہونے سے ڈر لگ رہا ہے؟" وہ حقیقتاً" غصے کی بہت تیز تھیں اور زندگی میں انہیں سب سے زیادہ غصہ جودت نے ہی دلایا تھا۔ حالانکہ ان کے باقی تینوں بچے بھی تھے۔ تذر' حرمت اور مدحت! انہوں نے کبھی بھی ماں کو اس طرح تنگ نہیں کیا تھا جیسے جودت کرتا تھا'

جودت ہر وہ کام کرکے رہتا تھا جس سے اسے منع کیا جاتا تھا' وہ ذہین بھی تھا لائق بھی تھا' مگر اچھا بچہ نہیں تھا۔ اس نے آج تک کوئی بھی اچھے بچوں والا کام نہیں کیا تھا' سوائے تعلیمی ریکارڈ کے۔ اچھی پوزیشن لینا اس کا ریکارڈ تھا اور وہ بھی صرف اس لیے تھا کہ ہر بار ایگزامز کے دنوں میں اس کا اپنے کزنز دانیال' زین' احمد اور حماد وغیرہ سے کمپیٹیشن ہوجاتا تھا' جس کے لیے وہ دن رات محنت کرتے ہوئے فرسٹ پوزیشن کو اپنا ٹارگٹ بنالیتا تھا اور ہر بار یہ ٹارگٹ جیت کر وہ اپنے ماں' باپ اور تایا جان (وقار آفندی جن کو وہ سب "ڈیڈ" کہتے تھے) کو لاشعوری طور پہ بے پناہ خوش کردیتا تھا۔ اگر کبھی اسے یہ احساس ہوجاتا کہ گھر والے اس کی اس کامیابی پہ کس قدر خوش ہوتے ہیں تو یقیناً" وہ اگلے ہی سال ان کی یہ خوشی ملیامیٹ کرکے رکھ دیتا۔

"آپ کیسے کہہ سکتی ہیں کہ میں اس وقت کوئی برا کام ہی کرکے آرہا ہوں؟" وہ اتنے مضبوط لہجے میں بولا کہ ثروت بیگم ٹھٹک گئیں۔ لیکن اگلے ہی لمحے اس کی بات کو مذاق سمجھ کر سر جھٹک دیا تھا۔

"تو تم کون سا اس وقت تہجد پڑھ کے آرہے ہو؟ تمہارا تو بس ایک ہی کام ہے' دو چار آوارہ دوست' شراب' کلب اور دو ٹکے کی تھرڈ کلاس الٹرا ماڈرن لڑکیاں۔ اور بس' اس سے آگے کا تم سوچ ہی نہیں سکتے۔" ان کا لہجہ انتہائی تمسخرانہ ہوگیا تھا' جس پہ جودت نے کھانا ختم کرکے اٹھتے ہوئے بڑے غور سے اپنی ماں کے تیور دیکھے تھے۔

"مام صرف تہجد پڑھنا ہی نیک کام نہیں ہے' نیک کاموں کی فہرست بہت طویل ہے' اگر اس وقت آپ کو گنوانے کھڑا ہوگیا تو مجھے یقین ہے کہ صبح کا سورج طلوع ہو کر کل شام تک غروب بھی ہوجائے گا۔ لیکن وہ فہرست ختم نہیں ہوگی۔ لہٰذا آپ کے لیے مختصر بتا دیتا ہوں کہ مجھے راستے میں ایک بوڑھی عورت مل گئی تھی' بہت مجبور اور بے بس تھی' اس کے بیٹے کا کہیں ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا۔ مگر اس کے پاس اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ وہ اپنے بیٹے کے پاس جاسکتی' جس کے لیے وہ جگہ جگہ بھیک مانگتی پھر رہی تھی' مجھ سے بھی اس نے بھیک مانگی اور اپنی بپتا سنائی' مجھ سے وہ نہیں دیکھا گیا اور اس کی مدد کرنے چلا گیا اور اس وقت میں اس عورت کو اس کے بیٹے کے پاس اسلام آباد چھوڑ کے آیا ہوں' اس کا بیٹا شدید زخمی تھا اور اسپتال میں تھا۔ اس لیے وہاں سے واپسی میں اتنی دیر ہوگئی اور آپ جانتی ہوں گی کہ لاہور سے اسلام آباد کا سفر کتنا طویل اور کتنے گھنٹے کا ہے؟ اور اگر پھر بھی آپ کا کوئی شک باقی رہ جائے تو صبح فون کرکے اس بوڑھی عورت سے میری اس داستان کی تصدیق بھی کرلیجیے گا اور اس کے بیٹے کی عیادت بھی۔"

وہ ساری بات نپے تلے لفظوں میں بیان کرکے اپنا موبائل فون یہ کہہ کر ان کے ہاتھ پہ رکھ کے چلا گیا کہ سب سے پہلا نمبر اس اسپتال کا ہے' آپ وہاں سے پتا کرلیجیے گا۔ اور ثروت بیگم حیرت اور بے یقینی سے گنگ کھڑی رہ گئی تھیں۔ وہ کبھی اپنے ہاتھ پہ رکھے جودت کے موبائل کو دیکھ رہی تھیں اور کبھی کچن سے باہر جہاں جودت غائب ہوگیا تھا۔ اور اب غصے سے نکلتے ہی انہیں وہی روایتی ماؤں سا پچھتاوا ہوا تھا کہ انہوں نے غصے میں اپنے بیٹے کو ٹھیک طرح سے کھانا بھی نہیں کھانے دیا تھا۔ حالانکہ وہ اتنا لمبا سفر طے کرکے تھکا ہوا گھر آیا تھا۔ ان کی ان ہی سوچوں میں فجر کی اذان بھی ہونے لگی تھی اور حویلی کے بیشتر لوگ نماز کے لیے اٹھنے لگے تھے اور سب سے پہلے اٹھنے والی آسیہ آفندی تھیں۔

"ثروت تم یہاں کیوں کھڑی ہو؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" وہ بھی کچن کی لائٹ جلتی دیکھ کر ادھر ہی آگئی تھیں' لیکن ثروت بیگم کو کچن کے بیچوں بیچ کسی اسٹیچو کی طرح کھڑے دیکھ کر ٹھٹک گئیں۔

"ہوں ٹھیک ہوں' بس وہ نماز پڑھنے جارہی تھی۔" ثروت بیگم نے گہری سانس لیتے ہوئے جودت کا موبائل مٹھی میں دبا کر ہاتھ نیچے کرلیا تھا۔

"ٹھیک ہے تو پھر وضو کرو' میں بھی وضو کرنے ہی جارہی ہوں۔" آسیہ آفندی ان کا کندھا تھپک کر چلی گئیں اور

ثروت بیگم جودت کا موبائل رکھنے کے لیے اس کے بیڈ روم میں آگئیں جہاں وہ تھکن کے باعث اتنی سی دیر میں ہی بے سدھ سو رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ چائے کا بڑا سا مگ ہاتھ میں لیے چائے پینے کے ساتھ ساتھ نیوز پیپر کی ہیڈ لائنز پہ بھی نظر دوڑا رہا تھا جب اچانک ڈور بیل کی آواز نے ذرا سا چونکا دیا تھا۔

"اس وقت کون ہو سکتا ہے؟" اس نے خود سے سوال کرتے ہوئے بے ساختہ وال کلاک کی سمت دیکھا تھا جہاں اس وقت صبح کے آٹھ بج رہے تھے اور یہاں لندن میں صبح آٹھ بجے کا وقت بھی رات کے چار بجے کا وقت سمجھا جاتا تھا' اس لیے اس وقت کسی کی آمد پہ حیران ہونا ایک لازمی امر تھا' کیونکہ یہ وقت یہاں کے باسیوں کے سونے کا وقت ہوتا تھا۔ یہاں لوگ عموماً" دن کے گیارہ' بارہ بجے بے دار ہونا شروع ہوتے تھے اور بے داری کا یہ سلسلہ دن کے تین' چار بجے تک جاری رہتا تھا' یعنی ان لوگوں کی صبح دن کے تین یا چار بجے ہوتی تھی۔ خصوصاً" عورتوں کی صبح' کیونکہ بچوں اور مردوں کو جلدی اٹھنا ہوتا تھا۔ بچے اسکول جانے کے لیے جلدی اٹھنے پہ مجبور ہوتے تھے اور مرد اپنے کام پر جانے کے لیے' البتہ جو مرد حضرات لیٹ کام پر جاتے تھے وہ بیویوں کے ہمراہ لیٹ ہی بے دار ہوتے تھے اور جو جلدی اٹھنے پہ مجبور تھے وہ اپنا ناشتا بھی خود ہی بنانے پہ مجبور ہوتے تھے' کیونکہ رات کے ڈھائی' تین بجے سونے والی ماؤں اور بیویوں کے پاس اتنا لاڈ پیار ہرگز نہیں ہوتا تھا کہ وہ صبح صبح اٹھ کر اپنے بچوں اور شوہروں کے نخرے اٹھاتیں اور انہیں ناشتا بنا کر کھلاتیں' لہٰذا اپنی مدد آپ کے تحت وہ لوگ خود ہی روکھا پھیکا ناشتا کر کے گھروں سے نکل کھڑے ہوتے تھے اور یہ بات یقینی تھی کہ ان لوگوں نے آج تک صبح صبح کسی عورت کے ہاتھ سے بنے پراٹھے اور چائے کا ذائقہ بھی نہیں چکھا تھا' وہ چاہتوں سے بھرے ذائقوں سے محروم زندگی جی رہے تھے۔ ان کے یہاں کھانے پینے میں بھی ناز نخرہ نہیں چلتا تھا۔

وہ نیوز پیپر سائیڈ میں رکھ کر دروازہ کھولنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا' البتہ ذہن میں ابھرتی حیرانی اور ہاتھ میں پکڑا چائے کا مگ ساتھ ساتھ تھے۔ جب تک وہ دروازے تک پہنچا' ڈور بیل تیسری بار بج چکی تھی۔ چند سیکنڈز کے توقف سے اس نے دروازہ کھول دیا تھا۔ لیکن حیرانی ختم ہونے کی بجائے مزید بڑھ گئی تھی' جس کی وجہ سامنے کھڑی ہستی تھی۔

"آپ؟" بے ساختہ منہ سے نکلا تھا۔

"السلام علیکم!" وہ بھی اسے سامنے دیکھ کر تھوڑا جھجکی تھی۔

"وعلیکم السلام' آپ اس وقت یہاں؟" نبیل حیات سے اپنی حیرانی چھپائے نہیں چھپی تھی۔

"جی وہ میں مدحیہ سے ملنے آئی تھی۔" اس نے آہستگی سے اپنے ٹھہرے ہوئے مخصوص دھیمے پن سے جواب دیا تھا۔

"اوہ! اندر آیئے۔" نبیل حیات فوراً" سامنے سے ہٹ گیا تھا اور وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اس کے پیچھے ہی اندر آگئی تھی۔ ڈرائنگ روم میں بغیر والیوم کے ٹی وی چل رہا تھا۔ ناشتے کی پلیٹ درمیانی ٹیبل پہ رکھی تھی' چائے کا مگ اس کے ہاتھ میں تھا۔ گویا اس وقت وہ اکیلا بیٹھا ناشتا کر رہا تھا اور باقی؟

"مدحیہ اور آنٹی وغیرہ کہاں ہیں؟" اس نے ڈرائنگ روم کا جائزہ لینے کے بعد استفسار کیا تھا' جبکہ نبیل حیات کی نظریں اس کے احترام میں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ اس کی سمت دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔ ہمیشہ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ اس کی نظر نہ بھٹکے۔

"مام ذرا لیٹ اٹھتی ہیں اور مدحیہ کے اٹھنے کا کوئی ٹائم مقرر نہیں۔ لیکن پھر بھی اس وقت دونوں سو رہی ہیں۔ آپ پلیز بیٹھیے میں آپ کے لیے چائے لے کر آتا ہوں۔" وہ کہتے ہوئے کچن کی سمت پلٹا۔

"نن۔۔۔ نہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے' میں ابھی گھر سے ناشتا کر کے ہی نکلی ہوں۔ وہ ان فیکٹ عبداللہ بھائی نے کسی کام سے آج برمنگھم جانا تھا۔ اس لیے میں نے کہا کہ جانے سے پہلے مجھے ڈراپ کر جائیں بعد میں کوئی ڈراپ کرنے والا نہیں ہوگا۔ اس لیے کافی صبح صبح ہی آگئی ہوں اور آپ کو بھی ڈسٹرب کر دیا ہے۔" اس نے اپنی آمد کی وضاحت بیان کی' اور نبیل حیات کی نظر اڑتے اڑتے بھی اس کے چہرے کو چھو آئی تھی۔ حالانکہ ایسا اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا نظر کی یہ حرکت بے اختیاری تھی سو فیصد۔

"ڈسٹرب؟" وہ زیر لب بڑبڑایا۔

"کیا میں مدحیہ کے بیڈ روم میں جا سکتی ہوں؟" وہ نبیل حیات کی خاموشی سے اکتا کر بولی تھی' کیونکہ وہ چپ چپ لگ رہا تھا اور بہتر تھا کہ وہ وہاں سے جلدی ہی ہٹ جائے۔

"ہاں کیوں نہیں۔" وہ اب کی بار بھی آہستگی سے بولا تھا۔ اس کی اجازت پا کر زری فوراً" ہی سیڑھیاں عبور کر گئی تھی' جبکہ وہ وہیں کا وہیں کھڑا تھا' چپ سوچ میں گم اور کسی غیر مرئی نقطے کو گھورتا ہوا۔ یقیناً" وہ زری کے متعلق ہی سوچ رہا تھا۔ وہ عبداللہ کی بہن تھی پڑھی لکھی' خوب صورت' مشرقیت سے مالا مال' ہر لحاظ سے پرفیکٹ۔ اور ایک اس کی بہن تھی پڑھی لکھی' خوب صورت' مغربی رنگ ڈھنگ میں پور پور ڈوبی' ہر لحاظ سے ان کمپلیٹ' جتنی زری سلجھی ہوئی تھی۔ اتنی ہی مدحیہ بگڑی ہوئی تھی' اور اس میں قصور کس کا تھا؟ اس سوال کا جواب وہ اپنے آپ کو نہ دے سکا۔ کیونکہ جواب دینے کے لیے اسے پچھلے کھاتے کھول کے دیکھنا پڑتے جو فی الحال وہ نہیں کر سکتا تھا۔

☆ ☆ ☆

"مبارک خان! مبارک خان۔" وہ حویلی کی پچھلی سائیڈ میں بنی انیکسی سے نکل کر حویلی کی بائیں سائیڈ عبور کرتی ہوئی مرکزی حصے کی طرف آتے ہی پکاری تھی' اس کی آواز خاصی بلند تھی اور قدم عجلت بھرے لگ رہے تھے وہ لان کی نرم گھاس اپنے سینڈلز کی ہیل سے کچلتے ہوئے بڑی تیزی سے دائیں سائیڈ میں بنے سرونٹ کوارٹرز کی سمت بڑھ رہی تھی۔

"مبارک خان۔" اس نے ایک بار پھر آواز دی' مگر مبارک خان موجود ہوتا تو جواب دیتا' جب وہ موجود ہی نہیں تھا تو جواب کیسے آسکتا تھا؟

"مبارک خان!" اس نے سرونٹ کوارٹرز کے کونے میں کھڑے ہو کر ایک بار پھر چیخ کر پکارا تھا' اس کا جی چاہ رہا تھا کہ مبارک خان سامنے ہو تو اس کا گلا گھونٹ دے "آخر وہ کہاں غائب ہو گیا تھا۔

"علیزے کیا بات ہے؟ مبارک خان کو کیوں بلا رہی ہو؟" آذر آفندی کی آواز پہ علیزے تیزی سے پیچھے مڑی تھی۔

"آذر بھائی آپ کب آئے؟" علیزے کے چہرے سے پریشانی کا عکس صاف دکھائی دے رہا تھا۔ آذر مزید پریشان ہوا تھا' وہ ابھی ابھی حویلی واپس آیا تھا۔ گاڑی سیاہ پتھروں سے بنی روش پہ گولائی کی شکل میں گھومتی ہوئی پورٹیکو کی سمت آئی تو آذر کی پہلی نظر علیزے پہ ہی پڑی تھی' جو کافی عجلت بھرے انداز میں سرونٹ کوارٹرز کی سمت بڑھ رہی تھی اور مبارک خان کو آوازیں دے رہی تھی' جس پہ فوراً" ہی آذر کو کسی پریشانی' کسی گڑبڑ کا احساس ہو گیا تھا۔

"میں بس ابھی آیا ہوں' تم بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟ کیوں آواز دے رہی ہو مبارک خان کو؟" آذر نے ذرا سختی سے دہرا کے پوچھا تھا۔

"وہ۔ وہ عائشہ پھوپھو کی طبیعت خراب ہے' انہیں ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا ہے۔" علیزے آذر کے تیور دیکھ کر ٹھٹک گئی تھی' وہ لڑکیوں کے معاملے میں بہت سخت تھا۔ لیکن اس نے یہ سختی اور خفگی کبھی علیزے پہ ظاہر نہیں کی تھی' کیونکہ وہ ان کی سب سے چھوٹی اور لاڈلی کزن تھی۔ باقی سب کی طرح وہ بھی اسے بہت پیار کرتا تھا اور علیزے آذر سے کافی کلوز بھی تھی۔

"باقی سب کہاں ہیں؟" اس کے لہجے کی سختی ہنوز تھی۔

"کوئی بھی گھر پہ نہیں ہے۔" علیزے آہستگی سے بولی۔

"کیوں دانیال' زین اور جودت وغیرہ کہاں گئے؟" آذر کا انداز تفتیشی تھا' حالانکہ آذر کافی بردبار قسم کا آدمی تھا۔ وہ اپنے تمام کزنز میں سے سب سے بڑا تھا۔ اس کے اپنے ماں' باپ ہی نہیں اس کے چچا اور تایا بھی اس پہ ہی انحصار کرتے تھے' بلکہ وہ اس کی عزت اور قدر کرتے تھے۔ کیونکہ وہ ان کا بہت سمجھ دار' لائق' فائق اور ہونہار سپوت تھا۔ تحمل اور سمجھ داری اس کی شخصیت کے دو اہم رکن تھے' وہ اپنے سے چھوٹے کزنز پہ بلاوجہ اپنا بڑاپن اور رعب جمانے کی کوشش کرتا تھا' نہ ہی اس نے کبھی دوسرے کزنز یا پھر اپنے بہن' بھائیوں کی پرائیویسی یا معاملات میں انٹرفیئر کیا تھا۔ بس جو جیسا ہے' ٹھیک ہے' کہہ کر اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ وہ عزت کرنا بھی جانتا تھا اور کروانا بھی! البتہ لڑکیوں کے معاملے میں تھوڑا روڈ تھا' لیکن اس کے باوجود اس نے لڑکیوں پہ کبھی بھی زیادہ یا بے وجہ روک ٹوک ہرگز نہیں کی تھی' یہ ہی وجہ تھی کہ اس کے تمام کزن حقیقتاً اس کی بہت عزت اور احترام کرتے تھے' کوئی بھی بات کہہ دیتا وہ فوراً حکم بجا لاتے تھے۔ شاید وہ اس کی خاموشی' اس کی چپ سے خائف رہتے تھے کہ وہ کہیں پھٹ نہ پڑے۔ حالانکہ ایسا ہرگز نہیں تھا' وہ ایک نارمل اور ڈیسنٹ پرسن تھا۔

"مجھے کیا پتا کہ کہاں گئے؟" علیزے نے [illegible]

"تم چلو میں آرہا ہوں میں پھوپھو کو اسپتال لے جاتا ہوں۔" آذر علیزے کا چپ ہونا بھانپ گیا تھا۔

"پھوپھو کی طبیعت زیادہ خراب ہے' وہ اکیلی آپ کے ساتھ نہیں جاسکتیں' میں مما کو بھیجتی ہوں؟" وہ کہتے ہوئے حویلی کے اندرونی مرکزی دروازے کی طرف بڑھ گئی تھی' اور آذر صرف دیکھ کر رہ گیا تھا۔ وہ جان چکا تھا کہ علیزے نے اس کے سخت لہجے کو کافی فیل کیا ہے۔

وہ سر جھٹک کر اس مسئلے کو پھر کبھی پہ ٹال کے انیکسی کی سمت بڑھ آیا تھا' جہاں پہنچ کر اسے علیزے کی پریشانی کا بخوبی اندازہ ہو گیا تھا۔ کیونکہ عائشہ پھوپھو کی کافی سیریس کنڈیشن تھی اور ان کے پاس سوائے انوشہ (عائشہ پھوپھو کی بیٹی) کے اور کوئی بھی نہیں تھا اور انوشہ ان کے سرہانے بیٹھی مسلسل روتے ہوئے اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ کر سہلا رہی تھی۔ عائشہ پھوپھو اس وقت نیم بے ہوشی کی حالت میں تھیں' آذر نے انوشہ کو تسلی دیتے ہوئے عائشہ پھوپھو کو اپنے بازو کے سہارے اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ وہ شوگر اور بلڈ پریشر کی مریضہ تھیں اور کبھی کبھی ان دونوں مرض میں سے کوئی ایک بھی ان پہ حاوی ہو جاتا تو ان کی حالت اسی طرح غیر ہو جاتی تھی' اس وقت بھی نہ جانے ان کا بی پی لو ہو گیا تھا یا پھر شوگر ہائی ہو چکا تھا۔ جس کی وجہ سے ان کے ہاتھ پیر بے دم ہو رہے تھے' وہ اپنے قدموں پہ کھڑی ہونے اور چلنے کے قابل بھی نہیں تھیں' ان کی سکت ختم ہو چکی تھی۔ وہ انہیں لے کر اپنی گاڑی تک پہنچا تو آسیہ آفندی کو پہلے سے منتظر پایا تھا۔

"آذر! عائشہ کی طبیعت تو پہلے سے بھی زیادہ خراب لگ رہی ہے۔" آسیہ آفندی نے گاڑی میں بیٹھ کر عائشہ آفندی کا سر گود میں رکھتے ہوئے تشویش کا اظہار کیا تھا۔

"جی مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے۔" وہ گاڑی نکالتے ہوئے فکر مندی سے بولا تھا اور پھر جیسے ہی گاڑی روڈ پہ ڈالی اس نے فوراً" ڈیش بورڈ سے اپنا موبائل اٹھا کر دانیال کا نمبر ڈائل کیا تھا۔ اس نے دوسری ہی رنگ پہ کال ریسیو کرلی تھی۔

"عائشہ پھوپھو کی طبیعت خراب ہے' تم ابھی اسپتال پہنچو' میں انہیں لے کر اسپتال ہی آرہا ہوں۔" آذر نے ایک ہی سانس میں بات ختم کرکے اس کا جواب سنے بغیر کال بند کرڈالی تھی اور ساتھ ہی گاڑی کی اسپیڈ بڑھادی تھی' اسے پتا تھا کہ دانیال ماں کی طبیعت کا سن کر ان سے بھی پہلے اسپتال پہنچ چکا ہوگا۔ کیونکہ ان تینوں بھائی بہن دانیال' زین اور انوشہ کے لیے ان کی ماں ہی سب کچھ تھی۔

☼ ☼ ☼
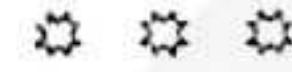
"بی بی آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں۔" لہجہ بے لچک سا تھا۔

"جی مومنہ!" وہ آہستہ سے بولی تھی۔

"ہاں تو مومنہ بی بی' میں نے فیصلہ کیا ہے میں آپ کا کیس لڑنے کے لیے تیار ہوں۔" وہ مضبوط اور پر عزم لہجے میں بولا تھا اور اس لڑکی کے چہرے پہ زندگی چمک اٹھی تھی۔

"لیکن ایک شرط پہ!" اس کی اگلی بات نے اس لڑکی کے چہرے کی چمک' بلکہ زندگی نوچ لی تھی۔ اس نے وہم و وسوسوں میں گھر کر دل آور شاہ کے سرد وسپاٹ پتھریلے تاثرات والے چہرے کی سمت دیکھا تھا۔

"کیا اس کی شرط بھی باقی وکیلوں جیسی تھی؟"

"کہ آپ کسی بھی موڑ پر جاکر قدم پیچھے نہیں ہٹائیں گی' چاہے آپ پر کتنی ہی مشکل اور مصیبت کیوں نہ آجائے' آپ نے پھر بھی ہمیشہ ثابت قدم رہنا ہے' کسی بھی چیز سے گھبرانا نہیں ہے اور اگر ایسا کرنا ہے تو ایم سوری میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکتا' آپ اپنا کیس کسی اور کے ہاتھوں میں سونپ سکتی ہیں اور آپ یہاں سے جا سکتی ہیں۔" اس نے دوٹوک کہتے ہوئے اپنی سوچ کا اظہار کیا تھا اور اس مومنہ نامی لڑکی کا رکا ہوا سانس بحال ہوا تھا' اس کے چہرے کی چمک اور زندگی واپس اپنے مقام پہ آگئی تھیں۔

"وکیل صاحب ایک شریف اور عزت دار لڑکی کے لیے اس کی عزت ہی سب کچھ ہوتی ہے اور جب وہ عزت بھی نہیں رہتی تو کچھ بھی نہیں رہتا' پھر کسی مشکل' مصیبت اور آفت سے ڈر بھی نہیں لگتا۔ میں بھی ہر ڈر سے عاری ہوں اور کبھی بھی قدم پیچھے نہیں ہٹاؤں گی۔ کیونکہ ثابت قدم رہنے کے لیے اور انصاف پانے کے لیے میں نے بھی بہت سے لوگوں کے قدم پکڑے ہیں۔ بہت سے لوگوں کے پاؤں پڑی ہوں۔ بہت دھکے کھانے کے بعد آپ کے سامنے بیٹھی ہوں اس وقت۔" اس لڑکی کا لہجہ اور انداز بہت مضبوط تھے اور دل آور شاہ کی تسلی ہوگئی تھی' وہ یک دم صوفے سے کھڑا ہوگیا تھا۔

"ٹھیک ہے' پھر آپ کل ہی میرے آفس آکر اپنا کیس ریکارڈ کروادیں' باقی کا کام میں دیکھ لوں گا۔" وہ کہتے ہوئے جانے کے لیے ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے کی سمت بڑھا تھا' لیکن اچانک کچھ یاد آنے پہ ٹھہر گیا تھا اور دوبارہ واپس پلٹ آیا۔

"ایم سوری مجھے یہ بتانے کا تو خیال ہی نہیں آیا کہ میرا آفس لاہور میں ہے' آپ اسلام آباد سے لاہور کیسے جائیں گی؟" اس کا انداز متفکر تھا۔

"جی میں بھی لاہور کی رہنے والی ہوں' لاہور کے ساتھ ہی میرا گاؤں ہے' میں یہاں اسلام آباد صرف آپ کے لیے آئی ہوں' مجھے کسی نے بتایا تھا کہ آپ آج کل اپنے اسلام آباد والے گھر پہ ہی ملیں گے' کیونکہ آپ اپنی اماں

جان سے ملنے کے لیے گئے ہوئے ہیں۔" اس نے وضاحت دی تھی۔

"ہوں! پھر ٹھیک ہے آپ لاہور پہنچ کر میرے منشی سے رابطہ کرلیجیے گا۔" وہ جیب سے کارڈ نکال کر اسے تھما گیا تھا اور اندر داخل ہوتی بتول شاہ کچھ ریلیکس ہوگئی تھیں کہ انہیں اب یقین ہوگیا تھا کہ اس لڑکی کو انصاف ضرور ملے گا۔ اول تو دل آور شاہ کوئی بھی ایسا ویسا کیس ہاتھ میں نہیں لیتا تھا اور اگر لیتا تھا تو پھر کبھی ہارنے کا سوچا بھی نہیں تھا۔ لاہور ہائی کورٹ میں اس کی اپنی ایک ساکھ تھی' لوگ جس کیس پہ دل آور شاہ کا نام دیکھ لیتے تھے اس کیس کے مدعی یا مجرم کو بنا کیس لڑے ہی جیتا ہوا تصور کرتے تھے' جیسے اس وقت بتول شاہ کررہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

اس نے اپنے بھاری اور بوجھل سر کو بمشکل حرکت دیتے ہوئے گردن سیدھی کی اور آنکھیں کھول کر بیڈ کے قریب کھڑی زری کو دیکھنے کی ناکام کوشش کی۔ اس کا سر اور دماغ ہی بھاری نہیں ہورہے تھے' بلکہ آنکھوں کے پپوٹے بھی بھاری اور بوجھل محسوس ہورہے تھے' جس کی وجہ سے آنکھیں کھل ہی نہیں رہی تھیں اور اس کی یہ مشکوک سی بہکی بہکی حالت زری نے بھی محسوس کی تھی۔ مگر اپنے شک کو جھٹک دیا تھا۔

"مدحیہ کیا بات ہے؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" زری نے جھک کر اس کی پیشانی پہ ہاتھ رکھا تھا اور زری کے ٹھنڈے ہاتھ کا لمس یک دم اس کے جسم میں کپکپی دوڑا گیا تھا۔ اس نے فوراً" آنکھیں کھول دیں۔ لیکن پھر بھی بوجھل ذہن کو ٹھکانے پہ لانے کے لیے اسے چند منٹ لگے تھے۔

"آر یو آل رائٹ مدحیہ۔" اس نے دہرا کے پوچھا' ساتھ ہی کھوجتی ہوئی گہری نظر اس پہ مرکوز کردی تھی۔

"یس آئی ایم فائن؟" مدحیہ نے اپنا توازن برقرار رکھنے کی کوشش کی اور کمبل ہٹا کر پاؤں بستر سے نیچے اتار لیے تھے اور [illegible] ہوش و حواس [illegible] ہوگئی [illegible] سرد و گرم سے بے نیاز ہو کر' لیکن اس کے قریب کھڑی فائزہ بیگم اس کی ماں تھیں۔ انہوں نے تو ماں اسے سرد و گرم سے بچایا تھا۔ محفوظ رکھا تھا۔ پھر اب اسے کیسے اس کے حال پہ چھوڑ کے پیچھے ہٹ جاتیں' وہ رہ نہ سکیں اور جیسے تیسے بمشکل اسے سہارا دے کر بیڈ روم میں چھوڑ گئی تھیں۔ یہاں تک کہ اس کی جیکٹ اور جاگرز بھی انہوں نے ہی اتار کر رکھے تھے اور کمبل بھی وہی اوڑھا کر گئی تھیں۔

"تم سناؤ تم کیسی ہو؟" مدحیہ نے شدید قسم کی انگڑائی روکتے ہوئے اپنے گھنگھریالے بالوں کو دونوں ہاتھوں سے

سمیٹ کر پیچھے کیا تھا۔ اب وہ زری کے سامنے کھڑے ہونے کا سوچ رہی تھی کہ کیسے اپنا توازن قائم رکھے 'کیونکہ اس کو اپنے لڑکھڑانے کا اندیشہ پہلے سے ہی تھا۔

"میں ٹھیک ہوں' لیکن تم ٹھیک نہیں لگ رہیں؟" زری کا لہجہ شکی تھا۔

"او یار فکر نہ کرو میں ٹھیک ہوں 'بس آج ذرا لیٹ سوئی تھی' شاید دو' تین گھنٹے ہوئے ہیں مجھے سوئے ہوئے' اس لیے اچانک نیند ٹوٹنے پہ ذہن ٹھکانے پہ نہیں آرہا' تم بیٹھو میں آتی ہوں۔" مدحیہ ننگے پیر ہی اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور لڑکھڑانے کے ڈر سے تیز تیز قدم اٹھاتی واش روم میں بند ہوئی تھی۔ وہ جلد از جلد چہرے پہ پانی کے چھینٹے مار کر دانت برش کرنا چاہتی تھی' تاکہ اس کے منہ سے شراب کی بو نہ آئے جو یقیناً" زری کو ناگوار گزرتی۔ اس نے دو سے تین بار برش کیا اور پھر ماؤتھ واش سے پورا منہ حلق تک واش کر ڈالا تھا۔ جب منہ سے خوشبودار سانس خارج ہوئی تب اسے اطمینان ہوا تھا اور وہ چہرہ دھو کر واش روم سے باہر نکل آئی' جہاں اپنے ذہن 'اپنی سوچ سے الجھتی زری اس کی منتظر بیٹھی تھی۔

زری جس چیز کے متعلق سوچ رہی تھی اس چیز کے متعلق کچھ بھی کہنا نہیں چاہتی تھی اور کہنے نہ کہنے کی کشمکش ہی اسے الجھا رہی تھی۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" مدحیہ تولیے سے چہرہ پونچھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی اور آئینے میں نظر آتے زری کے عکس کو دیکھتے ہوئے ہیر برش اٹھا کر بال سلجھانے لگی' جو اتنے گھنے اور گھنگھریالے تھے کہ بمشکل ہی سلجھتے تھے۔

"سوچ رہی ہوں کہ آج کل تم کہاں بزی ہوتی ہو؟" زری نے اچانک کہہ دیا تھا مدحیہ کے ہاتھ لمحہ بھر کو رکے تھے اور پھر سے رواں ہو گئے۔

"جہاں پہلے ہوتی تھی۔" جواب کورا تھا۔

"پہلے تو تم مجھ سے بھی کانٹیکٹ رکھتی تھیں 'گھر بھی آنا جانا تھا' اب تو تم نے اتنے دنوں سے سب کچھ ہی چھوڑ دیا ہے نہ اپنی خیر خبر نہ ہماری۔" انداز کھوجتا ہوا' لیکن لہجہ شکوے سے پُر تھا۔

"بس میرے فرینڈز برائن اور شینے کا کل رات برتھ ڈے تھا' بہت دنوں سے اس برتھ ڈے پارٹی کی ارینج منٹ میں لگے ہوئے تھے۔ اس لیے فرصت نہیں ملی۔" وہ اپنے بالوں کو سختی سے بینڈ میں جکڑتے ہوئے بیڈ کے سامنے رکھے صوفے پہ دھنس کر بیٹھ گئی تھی۔ انداز بے حد لاپروا تھا جو زری کو ہرگز اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

"پاکستان کب جا رہے ہیں آپ لوگ؟" اب کی بار اس نے سیدھا سیدھا سوال کیا تھا اور اس کے سوال پہ مدحیہ کے بوجھل تاثرات یک دم سرد و سپاٹ ہو کر سختی میں ڈھل گئے تھے۔ وہ زری سے جس بات کی توقع کر رہی تھی اس نے وہی کی تھی۔ اس کی سوچ سچ ثابت ہوئی تھی۔

"میں پاکستان نہیں جا رہی۔" جواب دو ٹوک تھا۔

"کیوں؟" سوال بھی مختصر آیا۔

"جس نے تمہیں پاکستان جانے کا بتایا ہے اس نے میرے نہ جانے کا بھی بتایا ہو گا اس لیے یہ "کیوں" اور "کیا" کے سوال کرنا بے کار ہے۔" مدحیہ بہت بے لچک لگ رہی تھی۔

"لیکن مدحیہ اس طرح بات کو ٹال کر تم اس بات کو دبا نہیں سکتیں۔ تمہیں کچھ تو بتانا ہی ہو گا؟" زری کافی سیریس ہو چکی تھی۔

"کیا بتانا ہو گا؟" اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا' اس کی نظریں سوالیہ تاثر کے علاوہ ہر تاثر' ہر اثر سے عاری

تھیں۔

"پاکستان نہ جانے کی وجہ۔۔۔ آخر کیا وجہ ہے کہ تم پاکستان نہیں جانا چاہتیں؟" ایک کے بعد ایک سوال تھا۔

"کوئی وجہ نہیں ہے۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ ہر چیز کے پیچھے کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے اور میں تم سے وہ وجہ جاننا چاہتی ہوں؟" زری نے اپنی فرینڈشپ کے بل بوتے پہ زور دیا تھا۔

"ہر چیز کے پیچھے آپ لوگوں کا وہم بھی تو ہو سکتا ہے؟" مدحیہ کا انداز ابھی بھی عجیب سا نان سیریس تھا۔

"ایک بندے کو وہم ہو سکتا ہے' لیکن سب کو تو نہیں۔" زری اپنی بات پہ قائم تھی۔

"طرز فکر ایک ہی ہو تو سب کو وہم بھی ایک ہی ہو گا۔" مدحیہ کا جواب بھی درست تھا۔ لیکن اس کی بات کو ماننے والے بہت کم تھے۔ اکثر بھی اس کی بات سے اختلاف ہی کرتے نظر آتے تھے۔ سو زری کو ابھی بھی اس کی بات سے اختلاف ہی ہوا تھا۔

"سب کا طرز فکر ایک نہیں ہے' بلکہ تمہاری سوچ سب کے لیے ایک سی ہو گئی ہے' تم سب کو ایک ہی نظر سے دیکھنے لگی ہو۔ تمہاری نظر میں شینے اور زرین ملک میں کوئی فرق نہیں ہے۔ تم دونوں کو ایک ہی ترازو میں تولتی ہو۔" زری نے اپنے مخصوص دھیمے پن سے ہٹ کے بہت تیزی سے جواب دیا تھا۔ جس پہ مدحیہ لمحہ بھر کے لیے خاموش سی ہوئی تھی۔

"زری میں تمہاری عزت کرتی ہوں۔" اس کا لہجہ مضبوط تھا اور دو ٹوک بھی۔

"صرف عزت؟" زری بھی برجستہ بولی تھی۔

"اور کیا چاہتی ہو؟ عزت سے بڑھ کے بھی کچھ ہے؟" مدحیہ سنجیدگی پہ آگئی۔

"اس سے محبت [illegible] چاہیے مدحیہ تاکہ تم میرے سامنے اپنا آپ چھپاؤ مت بلکہ عیاں کر دو۔ میں تمہارے اور اپنے درمیان ایسے رشتے کا مان چاہتی ہوں کہ تم مجھے اپنی بہن سمجھ کے سب کچھ کہہ دو۔" مدحیہ چپ چاپ گہری نظروں سے زری کی اپنائیت دیکھ رہی تھی' اس کا خلوص جانچ رہی تھی کہ اچانک سائیڈ ٹیبل پہ رکھا اس کا موبائل گنگنا اٹھا تھا۔ زری نے چونک کر مدحیہ کے موبائل کی سمت دیکھا تھا۔ جو اس کے قریب ہی رکھا ہوا تھا اور جس کی اسکرین پہ جگمگاتی تصویر نے اک پل میں اس کی پوری ہستی بدل ڈالی تھی' اس کی دھڑکنیں بھاگم بھاگ چل نکلی تھیں' اسے بھول گیا کہ اس کے سامنے کون بیٹھا ہے؟ وہ کیا بات کر رہی تھی؟ اور۔۔۔ اور وہ کہاں موجود تھی۔

"کس کا فون ہے؟" مدحیہ نے زری سے استفسار کیا تھا۔ لیکن زری کا دھیان کہیں اور تھا' وہ جواب نہ دے سکی۔ لہٰذا مدحیہ نے اٹھ کر خود ہی کال اٹینڈ کر لی تھی۔

"ہیلو بھائی؟" اس کے انداز میں محبت' اپنائیت اور احترام تھا' قدر تھی۔ زری اسے دیکھتی رہ گئی' مدحیہ فون پہ بات کرتے ہوئے یکسر مختلف مدحیہ لگ رہی تھی' جس کے لفظ لفظ سے پیار کا رس چھلک رہا تھا' وہ کسی بات پہ انکاری تھی' جبکہ دوسری طرف سے یقیناً" ۔۔۔ اصرار کیا جا رہا تھا' جس پہ وہ اگلے چند لمحوں کے لیے چپ سی ہو گئی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں)

☼ ☼

نبیلہ عزیز

دردِ دل

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نبیل حیات دونوں بہن بھائی ہیں، مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے، وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پہ رنگ چکی ہے، جس کے پیشِ نظر فائزہ بیگم، نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں، لیکن مدحیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے، جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے، مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے، مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، بے بسی اور مجبوری سے تنگ آ کر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے، لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باؤ امتیاز مل جاتا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے، جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے، اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے، وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے، وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے، وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے، اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا، اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔

۳

تیسری قسط

اس کی اتنی طویل اور گہری چپ اس کے اقرار کا اعلان کرنے لگی تھی۔ جتنی اس کی چپ گہری تھی اتنی ہی اس کی سوچ اور سوچ کی یہ گہرائی اسے بہت ہی نازک مقام تک لے گئی تھی' جہاں سے اس کے انکار کی ذرا سی بھی گنجائش نہیں نکلتی تھی اور اب یہ بات طے تھی کہ وہ انکار نہیں کر سکتی تھی' کیونکہ مقابل اس کا بھائی تھا۔

بے شک لوگوں کی نظر میں اس کا اور دل آور شاہ کا رشتہ منہ بولے بہن' بھائی کا تھا' لیکن اس رشتے کی قدر وہ سگے رشتوں سے بھی زیادہ کرتے تھے۔ انہوں نے ہمیشہ ہر مقام پہ اس رشتے کے حوالے سے اک دوسرے کا مان بڑھایا تھا اور کبھی بھی اس رشتے کی اہمیت کو کم نہیں ہونے دیا تھا' ان دونوں کو اپنائیت اور چاہ دیکھ کر کبھی یہ محسوس ہی نہیں ہوا تھا کہ ان کا رشتہ خون کا رشتہ نہیں بلکہ منہ بولا رشتہ ہے اور اس کی بڑی وجہ یہ ہی تھی کہ وہ دونوں سگے بہن' بھائیوں سے بڑھ کے اک دوسرے کو چاہتے اور عزت و احترام کرتے تھے۔ مدحیہ کو بہن بنانے کے بعد دل آور شاہ اپنی زندگی میں بہن جیسی کمی کو ہمیشہ کے لیے بھول گیا تھا اور دوسری طرف مدحیہ بھی اس رشتے کے بعد اپنے آپ کو دو بھائیوں کی بہن سمجھنے لگی تھی۔ وہ زندگی میں نبیل حیات کی بات تو ٹال سکتی تھی' لیکن دل آور شاہ کی نہیں' کیونکہ مدحیہ کے معاملے میں وہ خود بھی ایسا ہی کرتا تھا' وہ بھی ہمیشہ مدحیہ کی بات کو ہی فوقیت دیتا تھا' اس کے مقابل چاہے کوئی بھی ہوتا وہ صرف اور صرف مدحیہ کی بات کو ہی اہم جانتا تھا' تو پھر اب' اب یہ کیسے ممکن تھا کہ مدحیہ اسے انکار کر کے فون بند کر دیتی؟

موبائل فون کی دوسری طرف وہ بالکل خاموشی سے اس کے انکار اور اقرار کا منتظر تھا' جبکہ مدحیہ اپنے ضدی اور ہٹ دھرم خیالات کو آمادہ کرنے میں لگی ہوئی تھی' وہ اپنے ذہن میں پلنے والی ضد کو کچلنے کی کوشش کر رہی تھی جو کچھ اس نے سوچ رکھا تھا وہ سب مٹی کا ڈھیر ہوتا نظر آ رہا تھا' اس کے سرکش عزائم ادھورے رہ گئے تھے' صرف اور صرف دل آور شاہ کا مان رکھنے کی خاطر۔

اور اس لمحے اسے محسوس ہوا تھا کہ کسی رشتے کا مان رکھنا کتنا مشکل ہوتا ہے' یہاں تک کہ انسان کو زہر کا گھونٹ بھی پینا پڑ جاتا ہے اور آج اس نے بھی یہ ذائقہ چکھ لیا تھا' اپنے اندر کی ضد اور جنون کو اپنے بھائی کی محبت کا لبادہ اوڑھاتے ہوئے فیصلے کا اختیار دل آور شاہ کو سونپ دیا تھا اور ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے فون بند کر کے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور قریب بیٹھی زری دیکھتی رہ گئی تھی' اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ مدحیہ دل آور شاہ کی کتنی عزت کرتی ہے۔

☆ ☆ ☆

دانیال حسب توقع ان لوگوں کے پہنچنے سے پہلے ہی بڑی حویلی کے مخصوص فیملی ہاسپٹل میں موجود تھا' جہاں سے وہ اپنے مخصوص ڈاکٹرز سے اکثر علاج معالجہ کرواتے تھے اور وہی ڈاکٹرز ان کے بطور فیملی ڈاکٹر بھی کام کرتے تھے اور ان ہی میں سے ایک ڈاکٹر ظفر بھی تھے جو عائشہ آفندی کے معالج تھے اور کافی عرصہ سے وہی ان کا علاج کر رہے تھے اور اس وقت وہ انہیں ڈاکٹر ظفر کے پاس ہی لے کر آئے تھے۔

آذر کی گاڑی دیکھتے ہی دانیال لپک کے قریب آیا تھا۔

"کیا ہوا ہے امی کو؟ اتنی اچانک طبیعت کیسے خراب ہو گئی؟" اس کے چہرے پہ پریشانی سے ہوائیاں اڑ رہی تھیں' آذر کے گاڑی سے اترنے سے پہلے ہی وہ پچھلی سائیڈ کا دروازہ کھول چکا تھا۔

"یہ تو ہمیں بھی نہیں پتا کہ اتنی جلدی طبیعت کیسے خراب ہو گئی؟ وہ تو علیزے انیکسی کی طرف گئی تو پتا چلا کہ عائشہ کی طبیعت خراب ہے اور گھر پہ کوئی بھی نہیں ہے' اس لیے آذر اسے لے کر اسپتال آ رہا ہے۔" آسیہ آفندی' دانیال کو بتاتے ہوئے گاڑی سے اتر آئی تھیں' جبکہ عائشہ آفندی کو آذر اور دانیال نے مل کر سہارا دیا تھا اور پارکنگ سے اندر اسپتال تک لے کر آئے تھے۔ ڈاکٹر ظفر اس وقت آن ڈیوٹی تھے۔ انہوں نے عائشہ آفندی کی حالت کے پیش نظر فوری ٹریٹ منٹ شروع کر دی اور ساتھ ساتھ انہوں نے یہ بھی انکشاف کر دیا تھا کہ اگر تھوڑی دیر اور وہ لوگ ان کو لے کر نہ آتے تو یقیناً" عائشہ آفندی کی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے" کیونکہ ان کا بی پی خطرناک حد تک لو ہو گیا تھا' جس کی وجہ سے ان کے جسم سے جیسے جان ختم ہو چکی تھی' ان کے ہاتھ پاؤں بے جان ہوتے لگ رہے تھے اور ان کی ایسی سنگین حالت کے بارے میں جان کر وہ تینوں خاموش ہو کے رہ گئے تھے۔

"تم کہاں تھے اس وقت؟" آذر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں دانیال سے استفسار کیا تھا۔

"ماموں کے ساتھ آفس میں تھا۔" دانیال متفکر سا سر جھکائے بیٹھا دل ہی دل میں ماں کے لیے دعا گو تھا۔

"اور باقی سب؟" آذر کو نہ چاہتے ہوئے بھی تمام لڑکوں کی غیر موجودگی پہ غصہ آ رہا تھا۔ مگر اس وقت وہ غصہ ضبط کرنے پہ مجبور تھا۔

"باقی سب مجھے بتا کر تو نہیں جاتے؟" دانیال خفگی سے بولا۔

"لیکن زین تو تمہیں بتا کر جا سکتا ہے نا؟ وہ تو تم سے چھوٹا ہے' خبر رکھا کرو۔" آذر نے اسے تنبیہہ کی۔

"کیا جودت اپنی خبر رکھنے دیتا ہے؟ یا پھر جہاں جاتا ہے بتا کر جاتا ہے آپ کو؟ چھوٹا تو وہ بھی ہے؟"

دانیال کے طنزیہ جواب آذر کو سلگا کر رکھ گئے تھے۔

"تم میری بات کا الٹا مطلب کیوں لے رہے ہو۔"

"کیونکہ آپ الٹی بات کر رہے ہیں' جو لوگ آپ کے سمجھانے سے باز نہیں آتے وہ میرے سمجھانے سے کیسے باز آ جائیں گے؟ ان کے نزدیک جو ویلیو آپ کی ہے وہ میری نہیں ہے' پھر بھی وہ بات نہیں مانتے' اس میں کس کا قصور ہے؟ میرا یا آپ کا؟" دانیال سو فیصد درست کہہ رہا تھا' جس کا اندازہ آذر کو بھی ہو گیا تھا' آج کی نسل بھلا کس کے قابو میں تھی؟ یہاں ماں' باپ کی بات سنی ان سنی کر دی جاتی تھی' وہ تو پھر بھائی کے عہدے پہ تھے اور بھائی ہونے کے ناتے وہ لوگ ان کی عزت کر لیتے تھے تو یہ بھی ان کا احسان تھا' آذر چپ ہو چکا تھا۔ دانیال اٹھ کر آئی سی یو کی سمت آ گیا' جہاں عائشہ آفندی کا ٹریٹ منٹ جاری تھا۔

"بھائی امی کو کیا ہوا ہے؟" دانیال کے عقب سے زین کی ہانپتی ہوئی آواز ابھری تھی' وہ شاید بہت عجلت میں یہاں تک آیا تھا' اس کے چہرے پہ بھی وہی پریشانی رقصاں تھی جو دانیال کے چہرے کو گھیرے ہوئی تھی۔ وہ زین کے چہرے کو دیکھ کر رہ گیا تھا اور اگلے ایک گھنٹے میں ڈاکٹرز نے ان کی حالت خطرے سے باہر بتائی تھی۔ لیکن اس کے باوجود ان کو چوبیس گھنٹے کے لیے ایڈمٹ کر لیا گیا تھا۔ اور ان کی طبیعت کی خرابی کا سنتے ہی ان کے تینوں بھائی وقار آفندی' اسرار آفندی اور اظہار آفندی فوراً" ہی اسپتال پہنچ چکے تھے۔

وقار آفندی نے عائشہ کی طبیعت معلوم کرنے کے بعد دانیال اور زین کو بطور خاص قریب بلا کر تسلی' دلاسا دیا تھا اور انہیں حوصلہ مضبوط رکھنے کا کہا تھا اور وقار آفندی کے یہ تسلیاں' دلاسے اور پیار محبت تو وہ بچپن سے لیتے آ رہے تھے' جب بھی کوئی ایسی ویسی بات ہوتی تو وہ اپنی بھانجی اور بھانجوں کو اسی طرح پاس بلا کر' بٹھا کر پیار' اور تسلی سے سمجھاتے تھے اور ان کی اتنی محبت اور توجہ یہ وہ لوگ سچ مچ سمجھ بھی جاتے تھے' اس وقت بھی ان دونوں

بچیوں کو ان کی موجودگی سے بہت ڈھارس ملی تھی' حالانکہ یہاں دونوں ماموں بھی بے حد اچھے تھے' لیکن بڑے ماموں کی تو بات ہی اور تھی جن کو وہ بھی باقی سب کی طرح ڈیڈ ہی کہتے تھے۔

☼ ☼ ☼

ورکشاپ کے اندر قدم رکھتے ہی اس نے سارے میں اک طائرانہ سی نگاہ دوڑائی تھی۔ سارا ماحول اور سب کچھ وہی تھا جو کسی بھی ورکشاپ کا ہونا چاہیے تھا' وہی پیٹرول اور ڈیزل کی ناگوار بدبو' وہی ٹوٹی پھوٹی سی مرمت کے انتظار میں کھڑی گاڑیاں' وہی ٹائر' ٹیوب اور پنکچر لگانے کا سامان اور وہی گاڑیوں کی سروس کے لیے ایک کونے میں مخصوص جگہ! وہاں سب کچھ فٹ اور پرفیکٹ تھا۔ سوائے عدیل نیازی کے' جو ابھی بھی ایک نظر ورکشاپ کو ایک اور نظر اپنی فائل کو دیکھ رہا تھا اور ایک نظر دیکھنے میں ہی اس کا خون جل کر راکھ ہونے لگا تھا' تبھی اس نے باؤ امتیاز کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے اپنی فائل لوہے کے کیل پرزوں سے اٹی شیلف پہ ڈال دی تھی اور اس برآمدے نما کھلے سے کمرے میں بیٹھ گیا جہاں باؤ امتیاز کے چھوٹے (ملازم) نے کرسی ڈال کر دی تھی۔

"یہ چھوٹا ہے' اس ورکشاپ کا سب سے اہم اور کار آمد پرزہ۔" باؤ امتیاز نے چھوٹے کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے مسکرا کر اس کا تعارف کروایا تھا۔

"...کے... یہ ورکشاپ بے رنگ ہے'...ل... اگر رونق ہے تو اسی...ت۔" عدیل نے ان کے لفظ "بے رنگ" اور "رونق" پہ حیرت سے ایک بار پھر ورکشاپ کے احاطے میں نظر دوڑائی کہ باؤ امتیاز نے کس چیز کو رنگ اور رونق کا نام دیا ہے؟ وہاں ایسی کون سی چیز تھی جس پہ اس وقت رنگ تھا اور وہ چھوٹے کے بغیر بے رنگ ہو جاتی تھی' اسے تو چاروں اطراف ٹوٹی پھوٹی گاڑیوں اور پرانے ٹائروں کے علاوہ کچھ بھی نظر نہیں آیا تھا۔

"باؤ عدیل کسی کے دم سے جو رونق اور رنگ ہوتے ہیں نا وہ انسان کے دل میں ہوتے ہیں' ماحول میں نہیں' تمہارے دل میں رونق ہوئی تو تمہیں یہ کاٹھ کباڑ سے اٹا ورکشاپ بھی جنت سے کم نہیں لگے گا۔" عدیل کے ذہن میں اٹھتی تمسخرانہ سی حیرت باؤ امتیاز نے اک پل میں نوٹ کی اور اس کا جواب بھی دے مارا تھا' جس پہ عدیل مزید حیرت سے دوچار ہوا تھا اور شرمندہ بھی۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں' میں تو یہ دیکھ رہا تھا کہ آپ نے چھوٹے کا تعارف کروایا بھی تو کیسا؟ آپ اسے ایک اہم اور کار آمد پرزے سے تشبیہ دے رہے ہیں۔" عدیل کو اپنی بے ربط اور کھوئی کھوئی سی کیفیت سے نکل کر اپنے اعصاب ٹھکانے پہ لانے پڑے تھے' جب یہاں آ ہی گیا تھا تو یہاں کے ماحول کو قریب سے جاننا اور سمجھنا بھی ضروری تھا۔ جبھی اپنے انداز و اطوار کو سنبھالا دیا تھا۔

"پرزہ اس لیے کہا ہے کہ آج کل ہم ایک مشینی زندگی جی رہے ہیں' ہمارا انسانوں کے بغیر تو گزارا ہو جاتا ہے' لیکن مشینوں اور ان کے پرزوں کے بغیر نہیں ہوتا اور یہ چھوٹا تو ماشاء اللہ ایک ایسا پرزہ ہے' جو کسی بھی وقت کہیں بھی فٹ ہو جاتا ہے' تم اگر گاڑی کے نیچے لیٹ کر اسے ٹھیک نہیں کر سکتے تو یہ ہی پرزہ ہے' جو گاڑی کے نیچے گھس کر تمہاری مشکل حل کر دے گا' بغیر گاڑی کو جیک لگائے بھی یہ گاڑی کے نیچے جا سکتا ہے۔" انہوں نے فخریہ انداز میں چھوٹے کی خوبیاں بیان کی تھیں اور عدیل بے ساختہ اس سے متاثر ہونے والے انداز میں مسکرایا تھا۔

"کیا اس کے علاوہ کوئی اور پرزے بھی ہیں یا نہیں؟" اس نے جان بوجھ کر پرزے پہ زور دیا تھا اور باؤ امتیاز اس کی شرارت پہ مسکرا دیے تھے۔

"ارے کیوں نہیں ہیں' پرزے ہوں گے تو ورکشاپ چلے گا نا؟ اوئے جیدی' سلو ادھر آؤ اپنے انچارج سے ملو' کل ہی دریافت ہوا ہے۔" انہوں نے ایک بلند اور تیز آواز سے کچھ دور گاڑی ٹھیک کرتے دو لڑکوں کو قریب بلایا تھا۔

"جی استاد ابھی آئے۔" وہ فوراً" ہاتھوں میں پکڑے اوزار ایک طرف ڈالتے ہوئے ان کا حکم بجا لائے تھے اور ہاتھوں اور کپڑوں کو جھاڑتے ہوئے قریب آ گئے۔

"السلام علیکم۔" انہوں نے نئے چہرے کو کافی احترام سے سلام کیا تھا۔

"وعلیکم السلام۔" عدیل نے اٹھ کر دونوں سے ہاتھ ملایا۔

"یہ جیدی ہے اور یہ سلو ہے' سلو کو تم اگر پورے نام سے پکارنا چاہو تو سلمان خان بھی کہہ سکتے ہو' کیونکہ سلو کی دادی کو بہت شوق ہے کہ لوگ اسے سلمان خان کہہ کے پکاریں' دراصل اس کی دادی اپنی جوانی سے ہی سلمان خان کی بہت بڑی فین ہیں' یوں سمجھ لو دونوں "ہانی" (ہم عمر) ہی ہوں گے' یہ تو اس کی دادی نے شادی کر لی اور بوڑھی نظر آنے لگی' ورنہ وہ بھی سلمان خان کی طرح بڑھاپے میں بھی جوان رہتیں' آخر بیچلر لائف بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔" باؤ امتیاز کی دلچسپ وضاحت اور سلو کے تعارف پہ باقی سب کی طرح وہ بھی ہنس دیا تھا۔ وہاں موجود جیدی' سلو اور چھوٹا بے تحاشا ہنس رہے تھے اور عدیل سب کے بے فکرے چہرے دیکھ کر رہ گیا تھا۔ بے شک وہ سب بھی کسی نہ کسی مجبوری اور ضرورت کے تحت ہی یہاں کام کر رہے تھے' لیکن پھر بھی چہروں سے آزاد اور بے فکر لگ رہے تھے' شاید اس لیے کہ ان کے کندھوں پہ ویسے بوجھ نہیں تھے' جیسے عدیل نیازی کے کندھوں پہ تھے' جن کی وجہ سے اس کے کندھے ہی نہیں بلکہ سر بھی ہمہ وقت جھکا رہتا تھا' وہ کھل کے ہنس نہیں سکتا تھا' وہ کھل کے بول نہیں سکتا تھا' کیونکہ اس کے احساسات آزاد نہیں تھے' وہ سوچ کی مضبوط مٹھی میں جکڑے تھے' اس کے اعصاب پہ اس کے حالات کا پہرہ تھا' جن سے ہٹ کے وہ کچھ کر ہی نہیں سکتا تھا' اپنی کیفیت کا اظہار بھی نہیں۔

☼ ☼ ☼
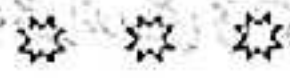
"جودت!" وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا پرفیوم اسپرے کر رہا تھا' جب کومل دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی' جودت اس کی آواز پہ فوراً" اس کی سمت پلٹا۔

"جی آپا ___؟"

"کیا فری ہو اس وقت؟" کومل نے اس کی تیاری دیکھتے ہوئے فوراً" ہی بھانپ لیا کہ وہ کہیں جانے کے چکر میں ہے۔

"آپ کے لیے فراغت نکالتے کون سا دیر لگتی ہے' بس حکم کرو آپ۔" وہ پرفیوم کی شیشی پہ کیپ چڑھا کر واپس ڈریسنگ ٹیبل پہ رکھتے ہوئے انتہائی سعادت مندی سے بولا۔ "وہ انوشہ کو اسپتال چھوڑنا تھا۔"

"ہیں؟ یہ انوشہ نے اسپتال کب سے جوائن کر لیا؟" وہ کافی غیر سنجیدہ لگ رہا تھا۔

"جودت!" کومل نے سرزنش کرنے والے انداز سے کہا۔

"جی جان جودت؟" وہ اک ادا سے بولا اور کومل خفگی سے گھورنے لگی۔

"حالانکہ میں جانتا ہوں آپ میری نہیں کسی اور کی جان بننا چاہتی ہیں۔ اینی وے' ہماری جان کوئی اور بن جائے گی۔" وہ ذو معنی لہجے میں کہتا عین کومل کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا اور اس کی بات پہ کومل کی نظر جھک گئی' مبادا کچھ عیاں نہ ہو جائے۔

"فکر نہ کریں میں آپ کے راز افشا نہیں کروں گا' ویسے جہاں آپ نے ہاتھ مارا ہے نا وہاں آپ کو کچھ بھی نہیں ملنے والا' جہاں لوگوں کے دل دھک دھک کرتے ہیں وہاں ان کا دل کام' کام اور صرف کام ہی کرتا رہتا ہے۔" جودت نے کومل کو چھیڑتے ہوئے آنکھوں ہی آنکھوں میں کئی اشارے کر ڈالے تھے' وہ بڑے دنوں بعد نظر آئی تھی' اسی لیے اس کو زچ کرنے پہ تلا ہوا تھا' بلکہ وہ ایسا اکثر ہی کرتا تھا' اس کا مذاق اڑاتا تھا۔

"فضول مت بولا کرو، چلو نیچے انوشہ انتظار کر رہی ہے۔" کومل اس کی باتوں کو نظر انداز کر گئی۔

"آپ کی محبت کا ذکر اگر فضول ہے تو ٹھیک ہے، نہیں کرتے۔" وہ الٹی سیدھی ہانکتا کومل کے پیچھے ہی بیڈ روم سے نکل آیا تھا۔

"کہاں جا رہے ہو۔" سیڑھیاں اترتے ہوئے احمد نے پوچھا۔

"کومل آپا جہاں لے جائیں۔" وہ کندھے اچکا کر شرارت سے بولا اور کومل نے آگے چلتے ہوئے یک دم پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے اسے گھورا اور راستے میں وہ بری طرح کسی سے ٹکرا گئی تھی۔ آذر اچانک ہی ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے سے باہر آیا تھا اور اندر داخل ہوتی کومل کو نہ دیکھ سکا۔ ٹکراؤ خاصا شدید تھا۔ جودت اپنی بوکھلاہٹ اور ہنسی چھپانے کے لیے رخ موڑ گیا تھا، جبکہ چکراتے دماغ کو سنبھالتی کومل آذر کو دیکھ کر مزید چکرا گئی تھی۔ احمد کے سامنے ایسا تصادم گھبراہٹ اور خفت کا باعث تھا اور خفت تو اسے آذر اور جودت سے بھی ہو رہی تھی۔

"آر یو آل رائٹ؟" آذر نے ذرا ٹھہر کر اس سے تصدیق چاہی، کیونکہ کومل اپنی پیشانی سہلا رہی تھی اور دوسرا ہاتھ اپنی ناک پہ رکھا ہوا تھا، پیشانی سے بھی زیادہ چوٹ اس کی ناک پہ لگی تھی۔

"جج... جی میں ٹھیک ہوں۔" اس نے فوراً" سنبھلتے ہوئے کہا اور اتنی سخت چوٹ پہ آنکھوں میں آجانے والے پانی کو جلدی سے ہاتھ کی پشت سے رگڑ کر پونچھ دیا تھا۔

"ایم سوری، میں دیکھ نہیں پایا۔" آذر نے معذرت کی، حالانکہ غلطی کومل کی تھی جو آگے بڑھتے ہوئے پیچھے کی طرف جودت کو دیکھ رہی تھی۔

"اٹس اوکے۔" کومل بمشکل کہہ پائی، اسے اس وقت تین لوگوں کی نظروں کا مرکز بنتے ہوئے کوفت اور بے زاری ہونے لگی تھی۔ اسی لیے وہ مزید وہاں رکے بغیر اندر چلی گئی تھی اور آذر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا تھا، لیکن کچھ خیال آجانے پہ اگلے ہی پل ٹھہر بھی گیا تھا۔

"کیا پوچھ سکتا ہوں آپ جناب کہاں جا رہے ہیں؟" اس نے احمد اور جودت کو بیک وقت مخاطب کیا۔

"میں تو اس وقت جم جا رہا ہوں، البتہ جودت کا کیا ارادہ ہے؟ کچھ کہہ نہیں سکتا۔" احمد نے کندھے اچکائے۔

"جی آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ کہاں جا رہے ہیں؟" آذر کا لہجہ طنزیہ ہو چکا تھا۔

"وہ... میں انوشہ کو اسپتال ڈراپ کرنے جا رہا ہوں، وہ پھپھو سے ملنا چاہتی ہے۔" جودت نے شرافت سے جواب دیا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے جانے کی، پھپھو گھر آچکی ہیں۔" آذر کہہ کر سیڑھیاں چڑھ گیا اور احمد کوریڈور کی سمت مڑ گیا، جبکہ جودت وہیں سیڑھیوں کے پاس کھڑا رہ گیا تھا، لیکن پھر کچھ یاد آنے پہ قدم ڈرائنگ روم کی سمت بڑھا دیے۔ لیکن جو کچھ وہ دل میں ٹھان کے اندر داخل ہوا تھا وہ سب اسے فوری ہی ملتوی کرنا پڑ گیا تھا، کیونکہ وہاں ایک آدھ نہیں پورا ٹولا موجود تھا، حرمت، مدحت، کومل، جویریہ اور انوشہ! انوشہ کو دیکھ کر اسے آذر کی بات یاد آگئی۔

"پھپھو گھر آچکی ہیں شاید، دانیال انہیں سیدھا انیکسی میں ہی لے گیا ہے۔" جودت کی اطلاع پہ وہاں یک دم ہلچل مچ گئی تھی اور سب سے پہلے صوفے سے چھلانگ لگا کر اٹھنے والی انوشہ تھی۔ جلدی اور عجلت میں وہ اپنی چپل کی بجائے جویریہ کی چپل پاؤں میں پھنساتی وہاں سے بھاگ نکلی تھی۔ اپنی ماں کی آمد کی خبر سنتے ہی وہ سب کچھ بھول بھال گئی تھی اور جودت وہیں کھڑا دیکھتا رہ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ پچھلے پانچ دن سے مسلسل تھکن اور رت جگے کا شکار تھا، اس کے ذہن پہ کوئی ٹینشن سوار تھی اور وہ اس ٹینشن کا اب کوئی حتمی حل نکالنا چاہتا تھا اور اس کے لیے جو فیصلے اور جو عزم وہ کر چکا تھا ان پہ ایک بار پھر غور کر رہا تھا اور اسی غور و فکر نے اس کی آنکھوں سے نیند کا تعلق ختم کر رکھا تھا۔ اسے پتا تھا کہ اسے پرسکون نیند اسی وقت آئے گی جب وہ کوئی حتمی فیصلہ کر لے گا اور آج کی رات فیصلے کی رات تھی اور اس نے اپنے اٹل عمر کے ارادوں پہ آخری فیصلے کی مہر لگا دی تھی۔

جس کے بعد وہ حقیقتاً" تھوڑی دیر کے لیے ریلیکس ہو گیا تھا، کیونکہ فیصلہ ہو چکا تھا، ایک مضبوط فیصلہ۔ وہ گہری سانس خارج کرتے ہوئے راکنگ چیئر سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور کھڑکی کی طرف بڑھتے ہوئے تمام پردے ہٹا دیے تھے، صبح کا سورج نمودار ہونے کے لیے انگڑائیاں لے رہا تھا اور تمام پرندے اک نئی صبح، اک نئے تحفے پہ اللہ کی حمد و ثنا کرتے اس کی ذات کا شکر ادا کر رہے تھے، زندگی چند گھنٹوں کے وقفے کے بعد پھر سے جاگ اٹھی تھی، نئی امیدیں، نئے عزم و تمنائیں لے کر صبح کی زمانتیں ہر چہرے سے عیاں تھیں، اس کی نظر کوارٹرز کی سمت اٹھی۔

گل اپنے کوارٹر سے نکلتے ہوئے اپنا دوپٹہ درست کرتی گھر کی اندرونی سمت میں آرہی تھی، جہاں سے اس کے دن بھر کے کاموں کا آغاز ہوتا تھا اور اس آغاز کے لیے وہ پہلا قدم کچن میں رکھتی تھی، کیونکہ وہ صبح صبح جاگنگ وغیرہ کا عادی تھا۔ اس لیے جاگنگ اور ایکسرسائز کے بعد اسے جوس کی فوری اور شدید طلب ہوتی تھی۔ لہٰذا گل پہلا کام جوس بنانے کا ہی کرتی تھی، لیکن پچھلے چار، پانچ روز سے نہ تو وہ جاگنگ پہ گیا تھا اور نہ ہی ایکسرسائز کی تھی، اسی لیے گل کو اس سے یہ پوچھنا پڑتا تھا۔

"صاحب آپ کے لیے چائے بناؤں یا جوس؟" دروازے پہ دستک دے کر گل آج بھی یہ ہی سوال لے کر آئی تھی۔

"چائے۔" وہ آہستگی سے کہتا کھڑکی سے ہٹ گیا تھا۔

"سنو، گلاب خان کہاں ہے؟" اس نے باہر نکلتی گل سے پوچھا۔

"صاحب وہ اپنی ڈیوٹی پہ ہے۔" گلاب خان چوکیداری پہ مامور تھا۔

"ہوں، ٹھیک ہے، اسے کہو اخبار دے جائے۔"

"جی ٹھیک ہے، کہہ دیتی ہوں۔" وہ سعادت مندی سے سر ہلا کر دروازہ بند کرنے لگی۔

"ٹھہرو۔"

"جی صاحب؟"

"باقی کام تم بعد میں کرنا، پہلے گلاب خان سے کہو بل ڈوگ کو اس کی خوراک دے، میرا خیال ہے اس نے ابھی اسے دودھ نہیں پلایا؟" اس نے پلٹ کر کھڑکی سے نیچے جھانکا اور اک نظر بل ڈوگ کو دیکھا، جس کی بے چینی بھوک کا اعلان کر رہی تھی۔

"جی ٹھیک ہے۔" گل کہہ کر چلی گئی اور وہ پلٹ کر واش روم میں آگیا۔

آج کورٹ میں اس کے ایک کیس کی آخری سماعت تھی، کیس اہم تھا، اس لیے جانا ضروری تھا۔ شاور لے کر وہ کافی حد تک فریش ہو چکا تھا۔ وہ تیار ہو رہا تھا جب اس کا سیل بجا۔

"السلام علیکم۔" کال ریسیو کرتے ہی اس نے کہا۔ دوسری طرف لاء چیمبر سے اس کے منشی قادر کا فون تھا۔ وہ اس کے آنے نہ آنے کے متعلق پوچھ رہا تھا۔

"آرہا ہوں میں، تم کیس کی فائلز تیار رکھو۔" اس نے مختصر کہتے ہوئے فون بند کر دیا تھا۔

"صاحب چائے اور اخبار۔" گل نظر جھکائے ہوئے اندر داخل ہوئی، یہ ... کی شرم و حیا کا سب سے بڑا ثبوت

تھا' وہ تھی ہی ایسی نیک اور شریف' ایک ملازمہ ہونے کے باوجود ولی آور شاہ اس کی بہت عزت کرتا تھا اور اس چیز پہ گلاب خان کو بھی اعتبار تھا' جبھی تو اپنی جوان جہان' خوب صورت بیوی کو گھر کے اندر کام کرنے کی اجازت دے رکھی تھی' کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کا مالک سخت' تیکھا اور غصیلا تو ہے' مگر نظر باز نہیں۔

"رکھ جاؤ' اور آج ناشتا مت بنانا' مجھے ذرا جلدی نکلنا ہے۔" وہ چائے کی ٹرے میز پہ رکھنے کا اشارہ کر کے خود اپنے شوز نکال کر پہننے لگا۔

"جیسے آپ کی مرضی۔" وہ آہستگی سے کہہ کر چلی گئی اور وہ شوز پہننے کے بعد چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے اخبار بھی سامنے پھیلا چکا تھا۔ وہی روزمرہ کی سیاست' کرائم اور شوبز کی سنسنی خیز خبریں تھیں جو ہر روز تھوڑی بہت تبدیلی کے بعد اخبار کی زینت بنادی جاتی تھیں اور اخبار پڑھنے کے شوقین لفظوں اور جملوں کے اس ہیر پھیر سے ہی خوش ہو کر چٹخارے لیتے رہتے تھے اور اگلے روز وہی اخبار ردی میں جا کر سموسے' پکوڑے' برگر اور نان وغیرہ لپیٹنے کے کام آجاتا تھا' گویا اخبار کا اتنا ہی کام تھا' مزا بھی لے لیا اور کام بھی چلا لیا۔

وہ گھر سے نکل رہا تھا' جب بتول شاہ کا فون آگیا' جن دنوں وہ لاہور میں ہوتا تھا وہ روزانہ صبح کے وقت اسے کال کرتی تھیں' ولی آور شاہ کے لیے ان کی کال بھی روٹین کا حصہ تھی' جو کبھی مس نہیں ہوتی تھی۔

"جی میں کورٹ کے لیے نکل رہا ہوں' دعا کیجیے گا۔"

"ان شاء اللہ فتح یاؤ گے' اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔" انہوں نے دل سے دعا دی۔ وہ ان کا فون سنتے ہوئے گاڑی کا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال چکا تھا اور گلاب خان نے گاڑی اسٹارٹ ہوتے دیکھ کر گیٹ کھول دیا۔

"آپ گھر پہ ہیں یا کالج میں؟" اس نے بتول شاہ سے استفسار کیا تھا۔

"نہیں ابھی تو ناشتا کرنے لگی ہوں اور تمہیں پتا ہے کہ میں کالج تھوڑا لیٹ جاتی ہوں۔" بتول شاہ نے اسے یاد دلایا۔

"مگر جب میں اسلام آباد میں ہوتا ہوں تب تو آپ کافی جلدی چلی جاتی ہیں؟" اس کی حیرت اور اعتراض پہ بتول شاہ بے ساختہ مسکرائیں۔

"پاگل میں جلدی نہیں جاتی' بلکہ تم لیٹ اٹھتے ہو اور جب تم اٹھتے ہو اس وقت میرے جانے کا ٹائم ہو چکا ہوتا ہے' اس لیے تمہیں لگتا ہے کہ میں جلدی جا رہی ہوں۔" ان کے جواب پہ وہ ٹھٹک سا گیا تھا اور ان کی وضاحت سمجھ میں آتے ہی مسکرا دیا' وہ غلطی پہ تھا۔

"سوری۔"

"سوری کس لیے؟ آئندہ میں اس چیز کا خیال رکھوں گی' جب تم یہاں ہو گے تو اور زیادہ لیٹ جایا کروں گی' تاکہ میرے بیٹے کو شکوہ نہ ہو۔" وہ ان کی اتنی چاہ' اتنی ممتا پہ یک دم چپ ہو گیا تھا۔

رشتوں کے نام پہ ان کے پاس اور تھا ہی کون' سوائے ولی آور شاہ کے؟ اور اس بھری دنیا میں ولی آور شاہ کا بھی اور کوئی اپنا نہیں تھا سوائے ان کے۔ ان دونوں کے اپنے اور سگے رشتے بس اک دوسرے پہ ہی ختم ہوتے تھے' کوئی اپنا' کوئی تیسرا نہیں تھا' بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ تیسرا تھا تو سہی' مگر کوئی اسے نگل گیا تھا۔ وہ کوئی "کون" تھا؟ یہ سوچ کر ہی اس کے ذہن و دل جلتے تندور میں جا گرے تھے' اس کے ہاتھوں کی گرفت اسٹیرنگ پہ سخت ہو گئی تھی' یہاں تک کہ اس کے ہاتھوں کی رگیں ابھر آئی تھیں۔ لب بھینچ کر اس طرح دانت پہ دانت جما لیے تھے کہ جبڑا ٹوٹ جانے کا خدشہ ہو چکا تھا' غصے کے باعث آنکھوں میں سرخ ڈورے تیرنے لگے تھے' یوں جیسے خون آنکھوں میں جم گیا ہو۔ بات کرتے کرتے اچانک اس کی خاموشی اور خاموشی کے بعد اس کی موجودہ کیفیت بتول شاہ نے آنکھوں سے اوجھل رہ کر بھی جان لی تھی۔

وہ کسی اہم کیس کے لیے جا رہا تھا' اس لیے وہ اسے ہوا دے کر مزید شعلہ نہیں بنانا چاہتی تھیں' جبھی زبان پہ آیا ذکر بھی واپس پلٹ دیا تھا اور ساتھ ہی اسے ریلیکس کرنے کے لیے کسی اور کا ذکر چھیڑ دیا۔ جس کا ذکر ماں کے بعد آتا تھا' یعنی ماں اور پھر بہن! پہلے بتول شاہ' پھر مدحیہ حیات۔

"مدحیہ سے بات ہوئی تمہاری؟ کیسی ہے وہ؟" اس ٹھنڈے میٹھے رشتے کے ذکر سے بہلانے اور دھیان بٹانے کی کوشش کی گئی تھی۔ لیکن چوٹ گہری اور درد شدید ہو تو بہلنا آسان نہیں ہوتا۔ دل آور شاہ کا زخم تازہ نہیں تھا۔ مگر جب جب کھرنڈ اترتا تھا باسی زخم' تازہ زخم کو بھی مات دے جاتا تھا۔ ٹیسیں ناقابل برداشت ہو جاتی تھیں اور ایسے عالم میں وہ اکثر پاگل ہو جاتا تھا اور اپنے اس پاگل پن کے ہاتھوں شاید وہ دوسروں کو بھی پاگل کر ڈالتا' اپنے جنون کی بھینٹ چڑھا دیتا' اگر اسے سنبھالنے والی بتول شاہ نہ ہوتیں وہ اس کی سب حالتوں اور سب کیفیتوں سے واقف تھیں' اسی لیے چاہے مشکل سے ہی سہی مگر اسے ہینڈل فوراً کر لیتی تھیں۔

"میں تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں شاہ؟" موڈ لاڈ پیار کا ہوتا تو وہ اسے شاہ پکارتی تھیں۔

"ہوں؟ کیا کہا آپ نے؟" وہ اپنے جنون کو ٹھہراتے ہوئے بولا۔

"مدحیہ کا پوچھ رہی ہوں۔" انہوں نے اپنی بات پہ زور دیا۔

"اوہ... ہاں پاکستان آ رہے ہیں وہ لوگ۔" دھیان کی طنابیں ان کی بات کی طرف موڑتے ہوئے دقت ہو رہی تھی اسے۔

"ہیں؟ کب؟ تم نے پہلے تو نہیں بتایا۔" بتول شاہ کو سن کر خوشی ہوئی تھی' کیونکہ ایک نبیل کی ہی تو فیملی تھی جن کے ساتھ وہ خوش ہوتا تھا اور جن کے ذکر پہ اس کے چہرے پہ حقیقی خوشی دیکھنے کو ملتی تھی۔

"ان کا پروگرام کبھی بن رہا تھا' کبھی کینسل ہو رہا تھا' اس لیے نہیں بتایا۔ کب آ رہے ہیں؟ کنفرم تو نہیں ہے' لیکن نبیل کی کوشش ہے کہ اس منتھ کے لاسٹ فرائیڈے تک آ جائے۔"

"ہوں... کون کون آ رہا ہے؟" بتول شاہ اپنے سوالات کا سلسلہ بڑھا رہی تھیں۔

"نبیل' مدحیہ اور فائزہ آنٹی۔"

"اور بھائی صاحب؟" ان کا سوال دل آور کو بھی خاموش کرا گیا۔ اور اس کی خاموشی سے وہ ممکنہ جواب اخذ کر چکی تھیں۔

"کہاں ہوتے ہیں آج کل؟" ان ہی کے متعلق دوسرا سوال۔

"کینیڈا۔" اس کا لہجہ سرد تھا۔

"کیا انہیں پتا ہے کہ نبیل لوگ پاکستان شفٹ کر رہے ہیں؟"

"آئی ڈونٹ نو' میں نے پوچھا ہی نہیں۔" اس نے سر جھٹکا۔

"چلو اللہ انہیں خیریت سے لے کر آئے۔" وہ صدق دل سے بولیں۔

"آمین۔" وہ جواباً" آہستگی سے بولا۔

"ٹھیک ہے اماں' میں فون بند کرتا ہوں' میں اس وقت چیمبر پہنچ چکا ہوں۔" اس نے گاڑی پارک کرتے ہوئے بتول شاہ سے الوداعیہ کلمات کہے اور فون بند کر کے ہینڈ فری ڈیش بورڈ پہ ڈال دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

فائزہ بیگم دروازے پہ دستک دے کر اندر چلی آئی تھیں' ان کی نظروں کا مرکز زری تھی۔

"زری بھی آئی ہے؟" انداز میں شوق اور پیار تھا اور لہجے میں بلا کی نرمی تھی' وہی نرمی جس سے مدحیہ کو چڑ اور

کوفت ہوتی تھی' بلکہ اب تو غصہ بھی آ جاتا تھا۔

"السلام علیکم آنٹی' آپ اٹھ گئیں؟ میں نے آپ کا پتا کیا تھا' آپ سو رہی تھیں۔" مقابل ہستی کے انداز و اطوار کی نرمیاں بھی کچھ کم نہیں تھیں' وہ بھی آخر زرین ملک تھی' جس کو اس کے گھر والے "معصوم کی گڑیا" اور "مٹی کا مادھو" بھی کہتے تھے۔ ہر ایک کے لیے اچھی' ہر ایک کے لیے پیاری' سب کے لیے اپنے دل میں نرمی اور چاہ کا جذبہ رکھتی تھی' کوئی کچھ بھی کہہ دیتا' برا نہیں مناتی تھی اور اگر مناتی تھی تو ظاہر نہیں کرتی تھی' ہمہ وقت سکون اور ٹھہراؤ کا لبادہ اوڑھے نہ جانے کیسے جی لیتی تھی؟ مدحیہ سوچتی تو وحشت سے بدک جاتی تھی کہ سب کچھ دل میں رکھ کے نہیں جیا جا سکتا۔ اور یہ کام مشکل ہی نہیں ناممکن بھی تھا۔

کسی اور کے لیے نہیں صرف مدحیہ حیات کے لیے' جو اپنی باتیں' اپنے فیصلے' اپنے ارادے بانگ دہل کہہ دیتی تھی' جس نے چپ رہ کے اور بات دل میں رکھ کے جینا نہیں سیکھا تھا' جو ہر بات ڈنکے کی چوٹ پہ کہہ دیتی تھی' بات منہ پہ کہہ دینا اس کی عادت تھی اور ایسا کرتے ہوئے وہ سامنے والے کا نہ کوئی ڈر رکھتی تھی' نہ لحاظ دوسرے لفظوں میں اس چیز کو بے مروتی بھی کہا جا سکتا تھا اور اس بات کا تو وہ خود بھی اعتراف کرتی تھی کہ۔

"سوری میں مروت نہیں نبھا سکتی۔" اور یہ اعتراف کرتے ہوئے وہ خاصی لاپروا اور بے نیاز ہوتی تھی' لیکن اس کے برعکس زرین ملک ایسا کبھی نہیں کر سکتی تھی' وہ شفاف' خاموش اور سبک ندی کی مانند لڑکی مدحیہ جیسی ضدی' ہٹ دھرم اور جنگجو لڑکی کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔

دونوں تصویر کے دو رخ تھے اور دونوں کو اپنے علاوہ دوسرا رخ پسند نہیں تھا' لیکن اس کے باوجود دونوں اک دوسرے سے بے حد قریب تھیں' مزاج کے تضادات کے باوجود دونوں کی فرینڈشپ قائم و دائم تھی' لیکن ایک بات بڑی عجیب تھی' دونوں ہی اک دوسرے کے دل کے حال سے انجان اور ناواقف تھیں۔ البتہ یہ بات اور تھی کہ مدحیہ کے تو دل کا کوئی "حال" سرے سے تھا ہی نہیں' وہ دل اور دل کے حال سے فی الحال دور تھی۔ اور جو حال زری کے دل کا تھا وہ اس نے مدحیہ سے دانستہ چھپا رکھا تھا۔ صرف اس ڈر سے کہ اپنی عادت اور فطرت سے مجبور مدحیہ کبھی بھی اس کا راز' راز نہیں رکھ سکے گی' بلکہ کسی نیوز کی طرح خبر نشر کرتی پھرے گی اور زری فی الحال اپنے آپ کو نشر کروانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھی' جبھی مدحیہ کی نگاہ سے بچ کے رہتی تھی' اسے محسوس نہیں ہونے دیتی کہ میرے دل کی دھڑکنیں صرف دھڑکنیں نہیں رہیں' بلکہ کسی کے نام کا راگ بھی الاپنے لگی ہیں' جہاں اس کے نام کی ڈور چھوٹتی ہے' وہیں پہ ایک دھڑکن بھی چھوٹ جاتی ہے۔

"مجھے نبیل نے بتایا ہے کہ زری آئی ہے' خود تو کہیں باہر چلا گیا ہے' میں نے سوچا ناشتا بعد میں بناتی ہوں پہلے تم سے مل آؤں' تم بتاؤ کہاں تھیں اتنے دنوں سے؟ میں انتظار ہی کرتی رہی کہ تم آؤ گی' عبداللہ کے ساتھ' لیکن وہ کئی بار آیا' کئی بار گیا' مگر اکیلا۔" انہوں نے افسوس اور محبت سے شکوہ کیا۔

"بس میرے فائنل ایگزامز ہو رہے تھے اس لیے بزی تھی۔" زری ان کے محبت بھرے شکوے پہ مسکرائی' اور مسکرائی تو مدحیہ بھی تھی' مگر تمسخرانہ' جیسے کہہ رہی ہو۔

"واہ ری مروت۔" کسی کی یاد چاہے نہ آئے' چاہے نہ آئے' لیکن جب وہ ملے تو مروتاً" کہہ دو "جناب میں آپ کو ہی یاد کر رہا تھا' بڑی لمبی عمر ہے آپ کی۔" سامنے والا بے ساختہ خوش ہو جائے گا۔ یعنی مروت نبھ گئی' ٹھیک ٹھاک طریقے سے' یہی حال اس وقت بھی تھا زری اور فائزہ بیگم کے بیچ۔ مدحیہ مسکراتی نہ تو اور کیا کرتی؟

"نگارش کہاں ہے؟ تم اسے بھی ساتھ لے آتیں؟"

"بھابھی کی طبیعت تھوڑی خراب تھی' وہ ریسٹ کرنا چاہتی تھیں' اس لیے نہیں آئیں۔"

"کیوں خیریت کیا ہوا اسے؟" وہ متفکر ہوئیں۔

"ہاں وہ سردی کی وجہ سے ان کی کمر میں درد ہو جاتا ہے' پہلے بھی کئی بار ہو چکا ہے' لیکن وہ کوڈا مول لے کر کچھ دیر لیٹ جائیں تو ٹھیک بھی جلدی ہو جاتی ہیں۔" زری نے وضاحت دی۔

"لیکن بیٹا تمہیں میرا کہنا تو برا لگے گا' مگر میں پھر بھی کہہ رہی ہوں کہ تمہیں اس کے پاس رہنا چاہیے تھا۔"

ان کی دلی دلی سی سرزنش پہ زری مسکرا کر سر اثبات میں ہلانے لگی۔

"بے شک آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں' لیکن آنٹی مجھے یہاں بھابھی نے خود بھیجا ہے' حالانکہ میں نے آنے سے انکار بھی کیا تھا' لیکن وہ کہہ رہی تھیں کہ میں اتنے دنوں سے مدحیہ سے اور آپ سے نہیں ملی' اس لیے میرا جانا ضروری ہے' کیونکہ چند ہی دنوں میں آپ یہ ملک چھوڑ کے پاکستان جا رہی ہیں' بعد میں پتا نہیں کب ملاقات ہو' اس لیے آج کے دن سے فائدہ اٹھا لیا جائے۔" اس نے کہتے ہوئے گردن ترچھی کر کے مدحیہ کو دیکھا جو پاکستان کے ذکر پہ پہلو بدل کر رہ گئی تھی اور اس کی اس حرکت پہ فائزہ بیگم نے بھی اک نظر اسے دیکھا تھا' پھر اس کا انکار اور رات والی حرکت یاد آ گئی تھی اور پھر ان سے مزید اس کے بیڈ روم میں ٹھہرنا مشکل ہو گیا تھا' وہ نہ جانے زری سے کیا کہہ کر فوراً" ہی واپس آ گئی تھیں۔

"اب کیا سوچ رہی ہو؟" مدحیہ کو لب بھینچے خاموش بیٹھے دیکھ کر زری قریب آ گئی' جبکہ مدحیہ اک جھٹکے سے اٹھی اور اپنی وارڈروب تک چلی گئی۔ وارڈروب کا چوتھے نمبر والا پٹ کھول کے بلیک لیدر کا بیوٹی بکس نکال کر تین ہندسوں کا پاس ورڈ ڈائل کیا اور کلک کے ساتھ بیوٹی بکس کا لاک اوپن ہو گیا۔ اس نے اپنے کالج' یونیورسٹی کے ڈاکومنٹس' بینک کے کاغذات اور کریڈٹ کارڈز کے ساتھ ساتھ اپنا پاسپورٹ بھی اسی میں سنبھال رکھا تھا' کوئی بھی ایمرجنسی پڑنے کی صورت میں وہ اپنا یہ بیوٹی بکس اٹھا کر کبھی بھی کہیں بھی جا سکتی تھی' باقی لوگوں کی طرح اپنے ضروری کاغذات اور اشیاء ڈھونڈنے کی کوفت نہیں اٹھانا پڑتی تھی۔ اس نے بیوٹی بکس کی اندرونی پاکٹ کی زپ کھول کر اپنا پاسپورٹ نکالا اور خود پہ بڑا ضبط کرتی ہوئی پلٹ کر زری تک آئی تھی۔

"یہ لو نبیل بھائی کو دے دینا۔" اس نے جیسے اپنے برکاٹ کے زری کے ہاتھوں میں تھما دیے تھے' زری اس کا پاسپورٹ دیکھ کر اندر سے خوش ہوئی کہ چلو ان لوگوں کا تو مسئلہ حل ہوا نا۔ لیکن مدحیہ کا انداز اور اس کے تاثرات دیکھ کر اسے برا بھی لگا تھا۔

"تم تو ایسے دے رہی ہو جیسے احسان عظیم کر رہی ہو؟"

"ہاں احسان عظیم ہی ہے' اگر یہ لوگ مجبور نہ کرتے تو میں یہ احسان بھی کبھی نہ کرتی۔" وہ تلخی اور سختی کا رنگ لیے ہوئے تھی۔

"ان لوگوں نے تمہیں کب مجبور کیا؟ تم تو۔۔۔۔" زری کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"ہاں میں ول آور بھائی کے کہنے پہ مجبور ہوئی ہوں' لیکن تم یہ بتاؤ ان کو یہ بات کہنے کے لیے کس نے کہا؟ کس نے مجبور کیا؟ صرف اور صرف میرے گھر والوں نے! ان کو کوئی الہام تو نہیں ہوا تھا نا؟ بس خوش قسمتی ہے ان کی کہ بیچ میں ول آور بھائی آ گئے۔ لیکن۔۔۔ لیکن زری یہ مجھے کبھی سدھار نہیں سکتے۔ میں پاکستان تو چلی جاؤں گی' لیکن یہ لوگ پچھتائیں گے' مجھے وہاں لے جا کر بھی پچھتائیں گے۔ مدحیہ' مدحیہ ہی رہے گی' چاہے پاکستان میں رہے' چاہے انگلستان میں۔" وہ اپنے غصے اور نفرت کا اظہار کرتے ہوئے پھنکاری تھی اور زری حقیقتاً" اس کے ارادوں سے خائف ہو گئی تھی۔

"مدحیہ پلیز یہ کیا پاگل پن ہے؟ کیوں بے وقوف بن رہی ہو؟" زری نے اسے باز رکھنا چاہا۔

"یہ تو وقت آنے پہ پتا چلے گا کہ کون پاگل ہے؟ میں یا پھر یہ لوگ۔" اس کے عزائم نیک نہیں تھے۔ زری چپ

ہو کے رہ گئی' اسے بھلا کتنا سمجھاتی؟ اور اگر سمجھاتی بھی تو وہ کون سا سمجھنے والی تھی؟ تھوڑی دیر اور اس کے پاس بیٹھنے کے بعد زری جانے کے لیے کھڑی ہو گئی۔

"کس کے ساتھ جاؤ گی؟" مدحیہ کو پتا تھا کہ عبداللہ شہر میں نہیں ہے' اس لیے اسے پک کرنے نہیں آئے گا۔

"تمہارے ساتھ۔" زری' نبیل کے ساتھ جانے کا سوچ کر جھجک گئی تھی' اسی لیے فوراً" اپنی ذمہ داری مدحیہ پہ ڈال دی۔

"یعنی میرا ہی سر اور میرے ہی جوتے' مجھ سے ملنے آئی ہو اور اب میں ہی چھوڑ کر آؤں؟" مدحیہ مصنوعی خفگی سے کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور زری مسکراتے ہوئے اس کے بیڈ روم سے باہر آ گئی۔ دونوں آگے پیچھے سیڑھیاں اترتی نیچے آئیں' سامنے ہی نبیل اور فائزہ بیگم دونوں مل کر کوئی چیز خاکی رنگ کے کارٹن میں بند کر کے اوپر سے پیکنگ ٹیپ لگا کر اسے مزید مضبوط پیکنگ کی شکل دے رہے تھے' پچھلے دو روز سے وہ اپنی ضروری چیزیں اور سامان سمیٹنے میں لگے ہوئے تھے۔

"ارے تم جا بھی رہی ہو؟ اتنی جلدی' بیٹھو تو سہی۔" فائزہ بیگم سب چھوڑ چھاڑ کے قریب آ گئیں۔

"آنٹی تین' چار گھنٹے تو گزار لیے' اب اور کتنا بیٹھوں گی؟"

"لیکن بیٹا۔" وہ اسے زیادہ اصرار اور مجبور کرنے سے رک گئیں' ان کی نظر زری کے ہاتھوں میں پکڑے پاسپورٹ پہ ٹھہر گئی تھی اور ان کی آنکھوں میں بے یقینی پھیل گئی' یہ پاسپورٹ یقیناً" مدحیہ کا تھا۔ براؤن رنگ کا پاسپورٹ برٹش ہونے کا ثبوت تھا اور اس ثبوت کو وہ پچھلے کئی دنوں سے التجاؤں سے مانگ رہے تھے۔ لیکن اس نے نہیں دیا تھا اور آج؟ حیرت کا مقام تھا۔ وہ مان گئی تھی؟

"یہ مدحیہ کا پاسپورٹ ہے' آپ اس کی ٹکٹ کنفرم کروا سکتے ہیں۔" مدحیہ کے کہنے پہ زری نے پاسپورٹ نبیل کی سمت ہی بڑھایا تھا اور نبیل نے اس کے ہاتھ سے پاسپورٹ لیتے ہوئے بے ساختہ مدحیہ کی طرف دیکھا' وہ نظر پھیر گئی تھی۔ اسے یہ احساس ہی نہیں تھا کہ زری کے ہاتھ سے اس کا پاسپورٹ لیتے ہوئے نبیل کو کتنی سبکی اور ہتک کا احساس ہوا تھا۔

گویا اسے اپنی بہن پہ ہی اختیار نہیں تھا' وہ دوسروں سے سفارشیں کرواتا پھر رہا تھا اور وہ سب کی بات ماننے کو تیار تھی سوائے ان کی۔ فائزہ بیگم اور نبیل چپ کے چپ رہ گئے' نبیل کو پتا تھا کہ اس نے کس کے کہنے پہ پاسپورٹ دیا ہے؟

"چلو زری مجھے دیر ہو رہی ہے' میں نے اپنے فرینڈز سے بھی ملنے جانا ہے۔" مدحیہ اسے متوجہ کرتی خود بیرونی دروازے کی سمت بڑھ گئی' مجبوراً" زری کو ان دونوں ماں' بیٹا سے نظر چرا کر اجازت لینا پڑی اور اس کے پیچھے باہر نکل آئی تھی' مدحیہ اپنی جینز سے گاڑی کی چابی نکال کر لاک کھول رہی تھی' زری خاموشی سے آ کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔

☼ ☼ ☼

وہ کالج سے واپسی پہ سب سے پہلے شاور لیتی تھی اور پھر لنچ کرتی تھی۔ جتنی دیر میں وہ شاور لیتی' اتنی دیر میں اس کی خاص ملازمہ رجو اس کا کھانا نکال کر گرم کرتی اور تازہ روٹی پکا کر دیتی تھی' البتہ یہ اور بات تھی کہ روٹی وہ بہت کم کھاتی تھی' اس کی زیادہ دلچسپی چائنیز اور رائس وغیرہ میں ہوتی تھی' ویجی نبیل بھی شوق سے کھاتی تھی اور اس کی پسند کے کھانے پکانے کے لیے اس کی ملازمہ رجو مخصوص تھی' صبح سے لے کر شام تک علیزے کا کوئی بھی کام ہوتا وہ رجو نے ہی نبٹانا ہوتا تھا' صبح سویرے فریش جوس سے لے کر رات سونے سے پہلے دودھ کا گلاس دینے کی

ذمہ داری بھی رجو کی ہی تھی۔ علیزے اپنی ملازمہ کو بھی بنا سنوار کے رکھتی تھی اس کے کپڑے جوتے اور دیگر اشیاء اسے خود منگوا کر دیتی تھی وہ اپنی ملازمہ کو گندے مندے حلیے میں برداشت نہیں کر سکتی تھی لہٰذا باقی تمام ملازمین میں سب سے زیادہ فریش اور تازہ دم رہنے والی ملازمہ صرف رجو ہی تھی۔

بڑی حویلی میں مبارک خان کے بعد قابل ذکر اور اہم مقام رجو کا ہی تھا شاید اس لیے کہ مبارک خان وقار آفندی کا خاص ملازم تھا اور رجو علیزے آفندی کی خاص ملازمہ کہلاتی تھی۔ دونوں باپ بیٹی کے ٹھاٹھ ہی نرالے تھے کافی شاہانہ طرز زندگی تھا باقی سب سے ہٹ کے۔ وہ شاور لے کر آئی تو لنچ تیار تھا پانچ دس منٹ میں ہی وہ لنچ سے فارغ ہو کر اپنے بیڈ روم میں سونے کے لیے آ گئی۔ اسے سوئے ہوئے نہ جانے کتنی دیر گزری تھی کہ اچانک کسی نے زوردار دستک دے ڈالی وہ ہڑبڑا کے اٹھی اور ننگے پاؤں لپک کر دروازے تک آئی اور دروازہ کھول دیا۔

"عون؟" اس نے اپنے اعصاب کنٹرول کرتے ہوئے آنکھیں پوری طرح سے کھول کر حیرت سے عون کو دیکھا دماغ کے ساتھ ساتھ نیند کی وجہ سے آنکھیں بھی بوجھل ہو رہی تھیں۔ اسے اس وقت عون کی موجودگی کی توقع ہرگز نہیں تھی۔

"علیزے آپی وہ ڈیڈ آپ کو بلا رہے ہیں باہر لان میں بیٹھے ہیں۔" عون نے پیغام دیا۔

"مجھے بلا رہے ہیں؟ اس وقت؟ خیریت؟" علیزے نے "اس وقت" پہ ایسے زور دیا جیسے اس وقت آدھی رات کا وقت ہو۔

"کیوں اس وقت نہیں بلا سکتے؟" عون کو حیرت ہوئی اور اس کی حیرت پہ علیزے تھوڑا سا ٹھٹک گئی اس نے گردن موڑ کر اپنے بیڈ کی سامنے والی دیوار کے ساتھ نصب وال کلاک کو دیکھا جہاں اس وقت شام کے چھ بج رہے تھے۔ علیزے اپنا سر تھام کے رہ گئی۔ یعنی وہ اتنی گہری نیند سوئی تھی کہ اسے دن رات یا پھر صبح شام کا فرق بھول گیا تھا اور دوسرا یہ کہ اس کے بیڈ روم کی دیواریں بھی ساؤنڈ پروف تھیں باہر یا اندر کیا ہو رہا ہے کچھ پتا نہیں چلتا تھا پردے برابر ہوتے تو دن میں بھی رات امڈ آتی تھی۔

"علیزے آپی ہوش میں تو ہیں آپ؟" عون نے اس کا بازو پکڑ کر ہلایا۔

"ہاں ٹھیک ہوں تم چلو میں آتی ہوں۔" وہ اپنے ہاتھوں سے بال پیچھے ہٹاتی پلٹ کر واپس آ گئی عون کندھے اچکا کر چلا گیا تھا۔ وہ واش روم سے تولیے سے چہرہ پونچھتی ہوئی باہر نکلی۔

"ہاؤ۔" یک دم اس کے عقب سے ہاؤ کی آواز ابھری علیزے ڈر کے یک دم پیچھے ہٹی۔

"اف۔"

"ہاہاہا! آپ ڈر گئیں؟" وہ ہنس رہا تھا بے تحاشا اور علیزے تلملا کے رہ گئی۔

"عدید یہ کیا بدتمیزی ہے؟ واٹ نان سینس۔" وہ اپنا غصہ کنٹرول نہیں کر پا رہی تھی حالانکہ وہ بلاوجہ غصہ کرنے والی اور چیخنے چلانے والی لڑکی نہیں تھی لیکن اس وقت اسے حقیقتاً غصہ آیا ہوا تھا۔ پہلے عون کے دروازہ دھڑدھڑانے کی حرکت اور اب یہ عدید۔۔۔ وہ ایک ہی وقت میں دوبار دہل چکی تھی۔

"یہ بدتمیزی نہیں ہے یہ تو کسی کو ڈرانے کا ایک انداز ہے علیز آپی۔" اس نے جیسے اپنی "علیز آپی" کی کم عقلی پہ افسوس کیا۔

"شٹ اپ۔۔۔ جسٹ شٹ اپ ایک تو بدتمیزی اور بے ہودگی کرتے ہو اور پھر مسخرے بنتے ہو؟" علیزے نے عدید کو اچھا خاصا جھڑک دیا تھا۔

"علیزے یہ کون سا طریقہ ہے بات کرنے کا؟" آسیہ آفندی بیٹی کے تیور دیکھ کر حیران ہوئیں۔

"مما آپ نہیں جانتیں یہ دونوں حد سے زیادہ بدتمیز ہو چکے ہیں آس پاس کچھ بھی نہیں دیکھتے اور مذاق کرنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔" علیزے سچ مچ تپ گئی تھی۔

"عدید کیا کیا ہے تم نے؟" آسیہ آفندی عدید کی سمت پلٹیں علیزے کو اپنے دونوں بھائی بہت عزیز تھے دونوں جڑواں تھے دونوں کی عمر چودہ سال تھی کافی ذہین اور لائق تھے لیکن دونوں ہی حد درجہ شرارتی تھے اپنی شرارتوں سے وہ ہمہ وقت کسی نہ کسی کو ستائے رکھتے تھے بڑی حویلی میں بہت سالوں بعد ان کے دم سے رونق جاگی تھی سبھی ان کی شرارتوں اور چھیڑ خانی کو انجوائے کرتے تھے لیکن اگر کبھی وہ اوور ہو جاتے تو ہلکی پھلکی ڈانٹ بھی کھا لیتے تھے اور اکثر اوقات یہ ڈانٹ انہیں علیزے سے ہی کھانے کو ملتی تھی کیونکہ سب سے زیادہ تنگ وہ اسی کو کرتے تھے وہ درگزر بھی کرتی تھی مگر کبھی کبھی تو پھر یہ بھی ضروری ہو جاتا تھا۔

"سوری بولو آپی کو۔" آسیہ آفندی نے خفگی سے کہا عدید کا چہرہ اترا ہوا تھا۔

"سوری!" وہ کہہ کے فوراً کمرے سے باہر نکل گیا اور علیزے اس کی سوری پہ چونک کر سیدھی ہوئی تب تک وہ جا چکا تھا۔

"مما۔" وہ خفگی سے تولیہ پٹخ کر جھنجلائی۔

"اٹس اوکے ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ کہتے ہوئے واپس چلی گئیں علیزے بال سنوار کر برے برے منہ بناتی آف موڈ کے ساتھ نیچے آ گئی۔ اس کا رخ لان کی طرف تھا۔

"کہاں کے ارادے ہیں؟" گزرتے گزرتے حرمت نے پوچھ لیا۔

"باہر لان میں۔"

"کوئی خاص وجہ؟"

"پاپا نے بلایا ہے۔" وہ وضاحت دے کر آگے بڑھ آئی۔

ہمیشہ کی طرح وقار آفندی لان کی وسط میں چیئرز ڈالے آذر اور اسرار آفندی کے ساتھ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

"السلام علیکم۔" اس نے قریب آ کر آہستگی سے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام" "آؤ بیٹھو بیٹا کیسی ہو؟" وقار آفندی سے بھی زیادہ محبت اور گرمجوشی اسرار آفندی کے لہجے میں سمائی ہوئی تھی۔ علیزے مسکرانے کی محض کوشش کرتے ہوئے وقار آفندی کے بائیں طرف رکھی چوتھی کرسی پہ بیٹھ گئی۔

"عون نے ڈسٹرب تو نہیں کیا تمہیں بلا کر؟" وقار آفندی اک نظر میں اس کے چہرے کے تاثرات نوٹ کر چکے تھے اس کا موڈ آف لگ رہا تھا۔

"نہیں۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" وقار آفندی کا رواں رواں متفکر ہوا تھا۔

"جی ٹھیک ہوں۔" اس کے نپے تلے مختصر سے جوابات پہ آذر نے بھی ٹھٹک کر اس کی سمت دیکھا بظاہر تو وہ بالکل ٹھیک تھی لیکن پھر بھی کچھ گڑبڑ ضرور تھی موڈ خراب لگتا تھا۔

اس سے پہلے کہ وقار آفندی مزید تشویش کا اظہار کرتے اچانک مبارک خان وہیں چلا آیا۔

"سلام صاب! وہ مردان خانے میں آپ سے کوئی ملنے آیا ہے۔"

"کون ملنے آیا ہے؟" آذر نے سوال کیا۔

"ایس ڈی کمپنی کے مینیجر اور ایم ڈی صاحب ہیں آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔" مبارک خان نے وقار آفندی کی سمت اشارہ کیا۔

"صدیقی صاحب ہم سے ملنا چاہتے ہیں؟ خیریت؟" وقار آفندی نے کہتے ہوئے آذر اور اسرار آفندی کو دیکھا

وہ دونوں باپ بیٹا بھلا کیا کہہ سکتے تھے؟

"آئیے دیکھتے ہیں، کس سلسلے میں ملنا چاہ رہے ہیں۔" اسرار آفندی کھڑے ہوگئے، جبکہ وقار آفندی، علیزے کو دیکھ رہے تھے، جس کو بلا کر اب وہ خود اٹھ کر نہیں جانا چاہ رہے تھے۔

"آپ جائیے بابا، میں بالکل ٹھیک ہوں، اور ہوسکتا ہے ان لوگوں کو آپ سے زیادہ ضروری کام ہو؟" علیزے ان کی پریشانی بھانپ گئی تھی۔

"آر یو شیور؟"

"یس پاپا۔"

"ٹھیک ہے ہم چلتے ہیں، بیٹھو تم لوگ۔" وہ اٹھتے ہوئے علیزے کا گال پیار سے تھپک گئے تھے، جبکہ اسرار آفندی نے اس کا سر تھپکا تھا۔ ان کے جانے کے بعد لان میں وہ دونوں رہ گئے تھے، آذر کافی دلچسپ نظروں سے علیزے کو دیکھ رہا تھا، لیکن علیزے۔ اس کی بجائے گردن ترچھی کر کے گیٹ کی طرف دیکھنے میں مصروف تھی، جہاں سے ابھی ابھی زین اپنی بائیک لے کر اندر داخل ہوا تھا اور اپنی دھن میں کی چین اچھالتا اندرونی مین ڈور کی سمت بڑھ گیا تھا۔

"ناراض ہو؟" آذر کے سوال میں بھی دلچسپی تھی۔

"کیوں؟" علیزے نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تم جانتی ہو۔"

"کیا؟"

"یہ ہی کہ تم کیوں ناراض ہو۔"

"آپ کو لگتا ہے کہ میں ناراض ہوں؟"

"ہاں۔"

"جب آپ کو یہ پتا ہے کہ میں ناراض ہوں تو پھر آپ کو یہ بھی پتا ہوگا کہ آپ کی بات اور آپ کا رویہ غلط تھا اس روز؟" علیزے کو وہ بات پھر سے یاد آئی تو خفگی نے گھیر لیا تھا۔

"ہاں تھوڑا بہت۔" وہ اعتراف کر رہا تھا۔

"تھوڑا بہت نہیں، بہت زیادہ کہیں۔ اس وقت عائشہ پھپھو کی جو حالت تھی اس کو دیکھتے ہوئے جو میں کر رہی تھی وہی صحیح تھا۔ عائشہ پھپھو کو اسی حال میں چھوڑ کر میں ایک بار حویلی کے اندر آئی، باری باری سبھی کے بیڈ رومز چیک کیے، مگر کوئی بھی نہیں تھا، دوبارہ پھر واپس گئی، انوشہ کو ان کے پاس بٹھایا اور ایک بار پھر ادھر آگئی۔ اپنے ڈرائیور کا پتا کیا، لیکن وہ گاڑی کی سروس کروانے گیا ہوا تھا، اس لیے پھر سوچا کہ مبارک خان کا پتا کرتی ہوں، مگر وہ سن ہی نہیں رہا تھا۔ اور آپ تھے کہ..." علیزے کہتے کہتے ٹھہر گئی۔

"میں اور کچھ نہیں کہہ رہا تھا، میرا صرف یہ مطلب تھا کہ اگر مبارک خان کو بلانا ہی ہے تو تم کسی اور کو بھی کہہ سکتی تھیں، کسی بڑی بزرگ کو یا پھر کسی ملازمہ کو۔" وہ صفائی دے رہا تھا، علیزے کی ناراضی وہ افورڈ نہیں کر سکتا تھا، اسی لیے منانے کے جتن کیے جا رہے تھے۔

"آذر بھائی جب اچانک اتنی ایمرجنسی پڑ جائے تو انسان کچھ بھی نہیں سوچتا، بس جو ذہن میں آتا ہے وہ کرتا جاتا ہے اور ہاں ایک بات اور... جب آپ لوگوں نے ملازموں پہ اعتبار کرتے ہوئے ان کو حویلی میں رکھ ہی لیا ہے تو پھر ان پہ پورا پورا اعتماد کریں، ہمارے تمام ملازم بہت اچھے ہیں، آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے، عزت کرتے ہیں۔ بس

اور بیٹیوں کی طرح۔" علیزے واقعی اپنے گھر کے تمام ملازمین سے مطمئن تھی، آذر اس کی بات پہ خاموشی سے سر ہلا کر رہ گیا تھا۔

"او کے ایم سوری۔" وہ آہستگی سے بولا۔

"ارے آذر بھائی... یہ... یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ مجھے شرمندہ کرنے کا ارادہ ہے؟" علیزے کو بے ساختہ خفگی اور ندامت کا احساس ہوا تھا، آذر اس کے لیے بڑے بھائیوں کی جگہ تھا، قابل قدر اور قابل احترام، وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آذر اس سے سوری کرے۔

"یار شرمندہ تو میں ہوں، خواہ مخواہ اتنا روڈ ہو گیا، اینی وے آئندہ احتیاط کروں گا، لیکن تم یہ بتاؤ تمہارا اس وقت موڈ کیوں آف تھا؟" آذر کی بات پہ وہ مسکرائی اور عون اور عدید کی حرکت بتانے لگی، جسے سن کر آذر قہقہہ لگا کے ہنسا تھا اور اپنے اتنے جاندار قہقہے کی بدولت وہ کسی کی نظروں کی زد میں آگیا تھا اور عجیب سی بات تھی کہ آذر نے بھی بے ساختہ ہی ٹیرس کی سمت دیکھا تھا، لیکن اب وہاں کوئی بھی نہیں تھا، وہ سر جھٹک کر پھر سے علیزے کی سمت متوجہ ہو چکا تھا۔

✲ ✲ ✲
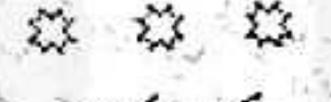
مبارک خان فارغ تھا، اسی لیے اپنی فراغت دور کرنے کی غرض سے چوکیدار کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔

"زہے نصیب جی آج تو مبارک خان خود ہمارے پاس آیا ہے، کیا بانٹوں مٹھائی یا لڈو؟" چوکیدار نے مبارک خان کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بولا، مبارک خان زیادہ تر وقار آفندی کے کاموں میں مصروف رہتا تھا، اسی لیے باقی ملازموں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا کم ہی تھا۔ جس کو باقی ملازم مغروری کا نام دیتے تھے۔ مبارک خان، عارف کی بات پہ ہنس دیا۔

"یار ایسا تو آج تک تیری بھر جائی نے نہیں کہا جیسا تو کہہ رہا ہے، مٹھائیاں بانٹ رہا ہے۔"

"یار بھرجائی تو تب کہے گی جب تو اس کے پاس جائے گا؟ جب جاتا ہی نہیں تو پھر کہنا کیا خاک ہے؟" عارف جل کے بولا، کیونکہ مبارک خان اتنے دن اپنے گاؤں نہیں جاتا تھا، اسے دو، دو، تین، تین مہینے گزر جاتے تھے اپنے گھر والوں کی شکل دیکھے ہوئے۔

"یار تجھے کیا پتا کہ اچھا نوکر بننے کے لیے بھی بڑے بڑے پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں، اپنا سب کچھ پیچھے چھوڑتا ہوں تو تب بڑے صاحب آگے جگہ دیتے ہیں۔ ورنہ باقی سب کی طرح میں بھی کہیں پیچھے پڑا ہوتا۔ آگے آنے کے لیے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے یار۔"

"ہاں یار یہ تو ٹھیک کہا تم نے، نوکری ملنا اور پھر نوکری کرنا دونوں ہی مشکل کام ہیں، اپنے مالکوں کو خوش کرنا آسان نہیں ہوتا۔" عارف سنجیدہ اور افسردہ سا ہو گیا تھا۔

"ارے نوکری سے یاد آیا وہ آدمی دوبارہ نہیں آیا کیا؟" مبارک خان نے تیزی سے پوچھا۔

"کون آدمی؟" عارف بھول چکا تھا۔

"ارے وہی منصور حسین۔" مبارک خان کے یاد دلانے پہ عارف کو اس کی شکل و صورت کے ساتھ ساتھ نام بھی یاد آگیا۔

"نہیں یار دوبارہ کبھی اسے دیکھا ہی نہیں، ہوسکتا ہے اسے کہیں کام مل گیا ہو؟ اتنے دن ہوگئے ہیں اسے آئے ہوئے۔" عارف نے کندھے اچکانے کے ساتھ ساتھ قیاس آرائی بھی کی۔

"ہاں یہ بھی ہوسکتا ہے، لیکن یار آج کل کام ملنا اتنا بھی آسان نہیں ہے، پڑھے لکھے ہاتھوں میں ڈگریاں لے کر دھکے کھاتے پھر رہے ہیں، وہ تو پھر صرف چار جماعتیں پاس ہے۔ سمجھو ہمارے جیسا ہی ان پڑھ ہے۔" مبارک

خان افسوس سے کہہ رہا تھا۔

"تمہارے پاس اس کا فون نمبر تو ہوگا نا؟ تم فون کرکے پتا ہی کرلیتے کہ کیا بنا اس کا؟" عارف نے مبارک خان کو مشورہ دیا۔

"فون کیسے کرلیتا؟ صاحب نے اس کے لیے کوئی کام بتایا ہی نہیں' خوامخواہ فون کروں گا تو اس بے چارے کی آس بھی ٹوٹ جائے گی۔" اس کے انداز میں بے چارگی تھی۔

"بس یار بڑے لوگوں کے بھی نخرے ہی ہوتے ہیں' مرضی ہو تو جس کو دل چاہے پکڑ کر کام پہ رکھ لیں اور مرضی نہ ہو تو اپنے اتنے پرانے اور وفادار ملازم کو بھی اٹھا کر باہر پھینک دیں۔"

"بس اللہ نے ان کو دے جو رکھا ہے' وہ بے چارا اتنے دن آتا رہا' منتیں کرتا رہا' مگر صاحب نے۔۔۔" عارف کو بھی افسوس نے ہی گھیر رکھا تھا' لیکن اس سے پہلے کہ مبارک خان کچھ کہتا اس کی جیب میں رکھا موبائل بجا' اس نے نمبر دیکھا' کوئی انجان نمبر ہی تھا۔ اس نے کال ریسیو کرلی۔

"ہیلو السلام علیکم۔" پہلے ہیلو' پھر السلام علیکم عارف' مبارک خان کی کم عقلی پہ ہنسا۔

"وعلیکم السلام۔"

"مبارک خان' منصور حسین بات کررہا ہوں۔" دوسری طرف سے مرجھائی ہوئی تھکی تھکی آواز سنائی دی۔

"اوئے منصور حسین اللہ بھلا کرے بڑی لمبی عمر ہے تمہاری' ابھی تجھے ہی یاد کررہے تھے۔" مبارک خان کو بڑی خوشی ہوئی تھی یہ ہی حال عارف کا تھا۔

"کاش لمبی کی بجائے مختصر ہوتی' نجات تو ملتی۔" منصور حسین کا لہجہ تلخ تھا اور جن حالات سے وہ گزر رہا تھا ان کے بعد ایسی تلخی حیرانی کی بات تو نہیں تھی' یہ تو فطری عمل تھا۔ مبارک خان کے دل کو کچھ ہوا' بنیادی طور پہ وہ خاصا نرم دل انسان تھا' کسی کو مشکل اور پریشانی میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"ایسا نہ کہہ منصور حسین' اللہ رحم کرے گا' صبر سے کام لو۔"

"ہونہہ! صبر سے کام؟ پیٹ خالی ہو تو صبر سے کام لینا بھی بڑا مشکل ہوتا ہے مبارک خان...... صبر کرنے کے لیے پیٹ کا بھرا ہونا ضروری ہوتا ہے' صبر کرنے کے لیے انسان کو برداشت' ہمت اور سکت کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ چیزیں انسان کے معدے میں کچھ ہو تو تبھی آسکتی ہیں' تم میرے گھر آؤ اور میرے گھر کے حالات دیکھو' تب تمہیں میری بے صبری کا احساس ہوگا۔ تم نے تو بس وعدہ کرلیا اور بھول گئے' لیکن میں کیا کروں جو اتنے دنوں سے آس لگائے بیٹھا ہوں؟ اگر تم کچھ نہیں کرسکتے تو مجھے انکار کردو' تاکہ میں کہیں اور جوتیاں گھسالوں؟" منصور حسین اس سے آخری فیصلہ سننا چاہ رہا تھا۔ جبکہ مبارک خان سوچ میں پڑ گیا تھا۔

"مبارک خان جو بھی جواب دینا ہے جلدی دو' میں کسی کے فون سے فون کررہا ہوں۔" وہ کچھ یاد آنے پہ بولا۔

"تو تمہارا اپنا فون کہاں ہے؟" مبارک خان کو پتا تھا کہ منصور حسین کے پاس ایک موبائل ہے' بے شک وہ کافی سستا سا ہی تھا۔

"دو روز پہلے گھر میں کچھ بھی نہیں تھا' سبھی کے پیٹ خالی تھے۔ صبر سے کام لینا ناممکن ہوچکا تھا' صرف ایک موبائل تھا' بیچ دیا' تیرہ سو روپے میں۔" مبارک خان کے سوال پہ اس نے طنزیہ قہقہہ لگاتے ہوئے بتایا' لفظوں میں بڑی چبھن اور کاٹ تھی۔ جواباً وہ کچھ نہ کہہ سکا' بلکہ مزید شرمندگی ہوئی تھی' جیسے اس کے گھر کے حالات کا ذمہ دار وہی تھا۔

"ٹھیک ہے منصور حسین تم پرسوں' نہیں پرسوں نہیں بلکہ کل ہی صاحب کے آفس آجاؤ' میں بھی وہاں ہی ہوں گا۔ پھر صاحب سے بات کریں گے کہ وہ تمہیں کام پہ رکھنا چاہتے بھی ہیں کہ نہیں؟" مبارک خان نے اسے

تسلی دی اور منصور حسین کو پھر سے آس بندھ گئی تھی' اس نے فون بند کردیا۔

☼ ☼ ☼

"مما! عون اور عدید کہاں ہیں؟" وہ کافی عجلت میں تیار ہو کر نیچے آئی اور چھوٹتے ہی ان کے بارے میں استفسار کیا تھا۔

"وہ تو اسکول چلے گئے۔"

"کب؟ ابھی تو ان کی آواز ڈائننگ روم سے آرہی تھی؟"

"ہاں ابھی ابھی نکلے ہیں۔"

"اوکے میں بھی چلتی ہوں' بائے۔" وہ تیزی سے آگے بڑھ کے مما کو پیار کرتی کوریڈور کی سمت لپکی تھی' شیشے کی طرح چکنے پتھر کے فرش پہ چلتے ہوئے وہ بمشکل اپنے آپ کو گرنے سے بچاتے ہوئے تیز تیز چلتی کوریڈور کے داخلی دروازے سے باہر نکل آئی تھی۔

"عون' عدید رکو' پلیز جسٹ ون منٹ۔" وہ اونچی آواز سے پکاری تھی اور مبارک خان کی گاڑی کی سمت بڑھتے وہ دونوں یک دم ٹھہر گئے تھے۔ مبارک خان ان کے اسکول بیگ اپنی گاڑی میں رکھ رہا تھا' روزانہ صبح وہی ان کو اسکول ڈراپ کرتا تھا اور پھر وقار آفندی کو آفس چھوڑنے جاتا تھا۔

"جی؟" وہ عجلت میں پھولی ہوئی سانسوں کو ہموار کرتی ان تک پہنچی تھی اور اس کے قریب آنے پہ انہوں نے بڑا مختصر سا "جی" کہا تھا' جس سے ان کی ناراضی اور لاتعلقی صاف ظاہر ہورہی تھی' علیزے ان کو یونیفارم پہنے تک سک سے تیار خفا خفا سے انداز میں دیکھ کر بے ساختہ مسکرائی اور دونوں کے باری باری گال چوم لیے تھے' ان کی خفگی کی پروا کیے بغیر۔

"سوری میری جان' میں کل غصے میں کچھ زیادہ کہہ گئی۔ ان فیکٹ اچانک نیند سے اٹھنے کی وجہ سے کچھ پتا نہیں چلا کہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔ اتنی زیادہ ڈانٹ کے لیے اگین سوری۔" اس نے دونوں کے گال چھو کر کہا اور وہ دونوں اک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے' آنکھوں آنکھوں میں کچھ کہا' پھر علیزے کو دیکھا۔

"ٹھیک ہے ہم آپ کی کل والی ڈانٹ بھول سکتے ہیں' مگر ایک شرط پہ۔" کافی شاہانہ انداز تھا ان کا۔

"کیسی شرط؟"

"آپ آج واپسی پہ ہمیں آئس کریم بھی کھلائیں گی اور شاپنگ بھی کروائیں گی' اپنی گاڑی میں اپنے ڈرائیور کے ساتھ۔ مطلب کہ سب کچھ آپ کا ہی ہوگا؟" دونوں کی شرط پہ وہ ایک بار پھر مسکرائی۔

"اوکے منظور ہے۔"

"ٹھیک ہے' پھر ہم بھی راضی ہیں۔" انہوں نے علیزے کو گڈ بائے کہا اور فلائنگ کس کرتے وہاں سے چلے گئے۔

"کیا ہو رہا ہے؟ کالج نہیں جانا؟" آذر اور دانیال آفس جانے کے لیے نکل رہے تھے' علیزے کو گاڑیوں کے قریب روش پہ کھڑے دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔

"جانا ہے۔"

"تو پھر یہاں کیوں کھڑی ہو؟" ان کی حیرانی بجا تھی۔

"بس وہ عون اور عدید کے لیے کھڑی تھی۔" اس کے کہنے پہ آذر معاملہ سمجھ کے مسکرا دیا تھا۔

"اوکے چلتی ہوں' گڈ بائے۔" وہ اپنی گاڑی کی سمت بڑھ گئی' اس کا ڈرائیور گاڑی لیے تیار کھڑا تھا۔ آذر اور

دانیال اپنی گاڑی کی طرف آ گئے۔ ان لوگوں کی گاڑیاں اک دوسرے کے آگے پیچھے حویلی کے گیٹ سے باہر نکلی تھیں۔

☆ ☆ ☆
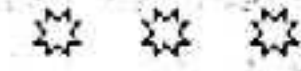
وقار آفندی اخبار پڑھتے ہوئے مبارک خان کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ عون اور عدید کو ڈراپ کر کے ابھی نہیں آیا تھا' اپنے مقررہ ٹائم سے دس منٹ لیٹ ہو چکا تھا اور اس کے لیٹ ہونے کا مطلب تھا کہ وہ یقیناً "ٹریفک جام میں پھنس گیا تھا' صبح صبح لاہور کی سڑکوں پہ ٹریفک کا رش بھی بے انتہا ہوتا تھا' اسکول' کالج' یونیورسٹیز اور آفسز کے لیے نکلنے والوں کا اژدھام ہوتا تھا' اپنے وقت پہ مطلوبہ جگہ پہنچ جانا ناممکن ہو جاتا تھا' خود وقار آفندی بھی آفس جاتے ہوئے کئی بار اس اژدھام میں پھنس چکے تھے' جس کے باعث وہ کئی بار آفس سے لیٹ ہو جاتے تھے' آج بھی انہیں ایسا ہی کچھ لگ رہا تھا' لیکن ابھی وہ گھڑی دیکھ ہی رہے تھے کہ مبارک خان بھی آ گیا' ملازمہ ان کا بریف کیس گاڑی تک چھوڑ آئی تھی۔

"سلام صاحب۔" مبارک خان نے ان کو دیکھتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔

"واسلام' لیٹ کیوں ہو گئے تھے؟"

"ٹریفک جام تھا صاحب۔" ان کی حسب توقع جواب آیا تھا۔ اگلے چالیس منٹ میں وہ آفس پہنچے تھے' حالانکہ تیس منٹ کا راستہ تھا' شکر تھا کہ دس منٹ لیٹ ہوئے تھے۔ وہ کافی فریش موڈ کے ساتھ آفس میں داخل ہوئے تھے۔ لیکن انہیں پتا نہیں تھا کہ ان کا یہ فریش موڈ محض کچھ دیر کے لیے ہے۔ آذر اور دانیال آج فیکٹری کے راؤنڈ پہ نکلنے والے تھے' اسی لیے آفس کا کام ذرا جلدی نبٹانے کی کوشش میں تھے۔

"اوکے ڈیڈ' ہم چلتے ہیں۔" آذر اجازت طلب لہجے میں بولا۔

"ٹھیک ہے' جاؤ تم لوگ اور اظہار سے کہو صدیقی صاحب کا کام ضرور کروا دے وہ کافی ..." ان کا موبائل بجنے لگا تو بات ادھوری رہ گئی' کسی لینڈ لائن نمبر سے کال تھی۔

"ایک منٹ۔" انہوں نے آذر وغیرہ کو رکنے کا اشارہ کر کے کال ریسیو کرلی' وہ دونوں ٹھہر گئے۔

"وقار آفندی۔ سنا ہے تمہاری ایک ہی بیٹی ہے؟" دوسری طرف کا لہجہ کافی پراسرار اور روڈ قسم کا تھا۔

"کون ہو تم؟"

"تمہاری بیٹی کا عاشق ہرگز نہیں ہوں۔" لفظوں میں حقارت تھی۔

"میں پوچھ رہا ہوں کون ہو تم؟" وہ بری طرح پریشان ہو اٹھے تھے اور ان کی پریشانی آذر اور دانیال کو بھی چونکا گئی تھی۔

"میری فکر چھوڑو' اپنی بیٹی کی فکر کرو' سنا ہے ابھی ابھی اس کے کالج روڈ پہ اس پہ فائرنگ ہوئی ہے' پتا نہیں بے چاری کس حال میں ہو گی؟ ایک ہی بیٹی ہے تمہاری۔ وہ بھی نہ رہی تو؟" کافی طنز اور سفاکی سے کہنے کے بعد فون بند کر دیا گیا تھا' وقار آفندی پتھرا گئے تھے' زبان لڑکھڑا گئی۔

"علیزے پہ فائرنگ؟؟"

☆ ☆

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

نبیلہ عزیز

دردِ دل

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدیحہ اور نبیل حیات دو ہی بہن بھائی ہیں، مدیحہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے، وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پہ رنگ چکی ہے، جس کے پیش نظر فائزہ بیگم، نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں، لیکن مدیحہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے، جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے، مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے، مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، بے بسی اور مجبوری سے تنگ آ کر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے، لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے بابا امتیاز مل جاتا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے، جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے، اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے، وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے، وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے، وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے، اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا، اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔

چوتھی قسط

"واٹ؟ علیزے پہ فائرنگ؟" آزر اور دانیال کے لیے یہ خبر کسی دھماکے سے کم نہیں تھی وہ تڑپ کر ان کی ٹیبل کے قریب آئے تھے۔ وقار آفندی کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا وہ خالی الذہنی سے ان دونوں کے چہرے دیکھ رہے تھے' ان کی حالت پتھرائی ہوئی لگ رہی تھی۔

"ڈیڈ بتائیے نا؟ کیا ہوا ہے؟ کس کا فون تھا؟" آزر اپنی پریشانی کنٹرول کرتے ہوئے ذرا تحمل سے پوچھ رہا تھا لیکن اس کے باوجود اس کی پریشانی اس کے چہرے سے ہویدا تھی۔

"وہ...... وہ کالج کے روڈ پہ۔" انہوں نے بتانے کی کوشش کی مگر بات مکمل کرنے کا حوصلہ نہیں ہوا تھا۔

"کیا ہوا ہے کالج کے روڈ پر؟ پلیز ڈیڈ جلدی بتائیے ورنہ...... ورنہ کچھ ہو نہ جائے؟" دانیال نے آگے بڑھ کے ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھا تھا اور بات مکمل کرنے کے لیے ان کا حوصلہ بڑھایا تھا۔

"علیزے پہ فائرنگ ہوئی ہے' پتا نہیں وہ کس حال میں ہے؟" وقار آفندی کہتے کے ساتھ ہی ڈھے گئے تھے ان کی حالت بھی ان دونوں کے لیے پریشانی کا باعث بن گئی تھی اس عجیب سی صورت حال کو ہینڈل کرنا مشکل ہو گیا تھا۔

"دانیال! یہ لو چابی' تم گاڑی نکالو' میں ڈیڈ کے پاس مبارک خان کو چھوڑ کے ابھی آتا ہوں۔" آزر نے پینٹ کی جیب سے چابی نکال کر دانیال کی سمت اچھالی۔

"اوکے' جلدی آؤ۔" دانیال چابی لے کر تیزی سے دروازہ عبور کر گیا آزر نے پلٹ کر ڈیڈ کو دوبارہ دیکھا۔

"ڈیڈ پلیز حوصلہ رکھیں اور اللہ سے دعا کریں ان شاء اللہ علیزے کو کچھ نہیں ہوگا۔" آزر نے ان کے ساتھ ساتھ جیسے اپنے آپ کو بھی تسلی دی تھی۔

"میں ابھی جا کر مبارک خان کو بھیجتا ہوں اور پلیز ڈیڈ اس چیز کا آفس میں کسی کو بھی پتا نہیں چلنا چاہیے' لوگ ہزاروں باتیں بنا لیتے ہیں۔" آزر نے ایسی پریشانی اور عجلت کے عالم میں بھی اس نازک پہلو پہ غور کر لیا تھا۔

"آزر میں بھی چلتا......"

"نہیں ڈیڈ آپ کہیں نہیں جائیں گے' میں اور دانیال جو جا رہے ہیں' وہاں جا کر آپ کو سب کچھ بتا دیں گے' ہو سکتا ہے یہ بات جھوٹ ہو' کسی نے ہمیں ستانے کے لیے ایسا کیا ہو۔؟" آزر کی بات صحیح تھی لیکن اس وقت ایسے ایسے وہم اور ہول اٹھ رہے تھے کہ کچھ بھی ماننا مشکل ہو رہا تھا مگر پھر بھی انہیں آزر کی بات کو اہمیت تو دینی ہی تھی اسی لیے جوں کے توں بیٹھے رہے۔

آزر وہاں سے سیدھا اسٹاف روم میں گیا مبارک خان توقع کے مطابق وہیں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا اسے وقار آفندی کے روم میں بھیج کر وہ تیز تیز قدم اٹھاتا آفس بلڈنگ سے باہر نکل آیا تھا۔ اس کے بیٹھتے ہی دانیال نے گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔

"اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو علیزے کے ڈرائیور نے فون کر کے ہمیں اطلاع تو ضرور دینی تھی؟" آزر پرسوچ انداز سے بولا' نظریں سامنے ونڈ اسکرین پہ تھیں۔

"تو دیر کس بات کی ہے؟ اس نے فون نہیں کیا تو ہم خود کر لیتے ہیں' تم ٹرائی کرو اس کا نمبر۔" دانیال نے صاف روڈ پہ آتے ہی اسپیڈ بڑھا دی تھی آزر کو اس کی بات خاصی معقول لگی تھی اس نے فوراً موبائل نکال کر علیزے کے ڈرائیور کا نمبر ڈائل کیا تھا۔ دوسری طرف رنگ جا رہی تھی لیکن کوئی ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ اس نے دو تین بار لگاتار ٹرائی کیا مگر اسے کوئی رسپانس نہیں ملا تھا۔

"علیزے کے نمبر پہ چیک کرو۔" دانیال نے ایک اور مشورہ دیا لیکن آزر کی دونوں طرف کوشش کے جواب میں "نو آنسرنگ" کی مشینی آواز موصول ہوئی تھی اور ایسی سچویشن میں آزر کی پیشانی پہ سچ مچ پسینہ پھوٹ پڑا تھا' اس کے وہم و وسوسے یقین کی شکل اختیار کر گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

"دیکھو' بیٹا تم پریشان مت ہو' اب یہاں کوئی بھی نہیں ہے' تم میرے ساتھ چلو' یہ ساتھ ہی تو کالج ہے' میں ابھی فون کر کے تمہارے پیرنٹس کو بلا لیتی ہوں۔" اس حادثے کے بعد اتفاقاً گزرتے گزرتے علیزے کی ٹیچر اسے دیکھ کر اپنی گاڑی سی اتر آئی تھیں اور ہراساں سے انداز میں گاڑی سے باہر نکل کر ادھر ادھر دیکھتی علیزے کو انہوں نے ہی سنبھالا تھا رفتہ رفتہ اور لوگ بھی جمع ہو گئے تھے اور لوگوں نے ہی مل جل کر علیزے کے ڈرائیور کو گاڑی سے نکالا تھا جو ایک گولی کی زد میں آتے ہوئے زخمی ہو گئے تھے ان کا خون پانی کی طرح بہہ رہا تھا اور علیزے کی ان پہ نظر پڑتے ہی چیخیں ابل پڑی تھیں۔

"خیرو بابا؟" وہ ان کی حالت دیکھ کر خوف زدہ ہو گئی تھی اور میڈم عالیہ سے اس کو سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔

"ریلیکس۔ ریلیکس بیٹا انہیں کچھ نہیں ہوگا' وہ صرف زخمی ہوئے ہیں۔ پریشانی والی بات نہیں ہے۔" انہوں نے بڑی مشکل سے اسے قابو کیا تھا کسی آدمی نے ایمبولینس کو کال کر دی۔ انجان لوگ علیزے کو بھی دیکھ رہے تھے اور خیرو بابا کی حالت کو بھی...... ہر زبان پہ طرح طرح کی باتیں مچل رہی تھیں۔ اور علیزے اتنے زیادہ لوگوں کی نظروں سے اور باتوں سے وحشت زدہ ہوئی جا رہی تھی اس کے خوف و ہراس میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

"علیزے......؟" دانیال اور آزر بڑی سرعت سے لوگوں کو پیچھے ہٹاتے ہوئے سامنے آئے تھے جہاں میڈم عالیہ' علیزے کو وہاں سے چلنے کے لیے بہلا پھسلا رہی تھیں۔

"علیزے......" اب کی بار آزر نے قریب آ کر اسے پکارا اور اس کا بازو پکڑ کر اسے سامنے کیا تھا وہ میڈم عالیہ کے عقب میں کھڑی تھی جیسے چھپنے کی کوشش کر رہی ہو۔

"آزر بھائی۔" علیزے اسے دیکھ کر چیخ اٹھی تھی اور تڑپ کر اس کے کندھے سے لگ گئی تھی۔

"علیزے پلیز۔ پلیز سنبھالو اپنے آپ کو ہم آ گئے ہیں نا۔ کچھ نہیں ہوگا پلیز ریلیکس۔" آزر نے اتنے لوگوں پہ طائرانہ سی نگاہ ڈالتے ہوئے بہت دھیمی آواز میں اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"بھائی وہ...... وہ خیرو بابا۔" وہ تڑپ تڑپ کر روئی' آزر بری طرح چونک گیا تھا۔ علیزے کو سامنے دیکھ کر وہ خیرو بابا کو تو بھول ہی گیا تھا۔

"کہاں ہیں خیرو بابا؟" اس نے فوراً استفسار کیا۔

"وہ... ان کو گولی۔" علیزے سے آگے کچھ بولا ہی نہ گیا تھا۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو؟ کہاں ہیں وہ؟" آزر کی پریشانی دیدنی تھی۔

"دیکھو بیٹا وہ کافی زیادہ زخمی ہو گئے تھے ان کا خون بھی کافی بہہ رہا تھا اس لیے ان کی حالت دیکھتے ہوئے دو لڑکے ایمبولینس میں ان کو ہسپتال لے گئے ہیں اور اتنی زیادہ فائرنگ اور اپنے ڈرائیور کی تشویشناک حالت دیکھ کر یہ بہت خوف زدہ ہو گئی ہے آپ اسے فوراً گھر لے جائیں۔" میڈم عالیہ نے آزر کو بتاتے ہوئے مشورہ دیا تھا آزر ان کو پہچانتا تھا وہ ایک دو بار علیزے کو ڈراپ کرتے کالج آیا تو گیٹ پہ میڈم عالیہ سے بھی ٹکراؤ ہوتا رہتا تھا۔ وہ سر اثبات میں ہلا کر دانیال کی سمت پلٹا۔

"دانیال تم علیزے کو لے کر گاڑی میں بیٹھو' میں ابھی آتا ہوں۔" آزر علیزے کو دانیال کے حوالے کرتے ہوئے علیزے کی گاڑی کی سمت بڑھا تھا جس پہ گولیوں کے نشان دور سے ہی نظر آ رہے تھے اور رائٹ سائیڈ کی دونوں کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ چکے تھے کانچ سڑک پہ بکھرا ہوا تھا اور خون کی دھاریں بھی زمین پر وافر مقدار میں نظر

آ رہی تھیں' آذر ایسے وحشیانہ اور خطرناک حملے پہ اندر ہی اندر متفکر ہوتا گاڑی کے اندر گھس گیا اس نے علیزے کا موبائل اس کا بیگ اور فائل وغیرہ نکال لی تھیں پھر ڈیش بورڈ سے خیرو بابا کا موبائل بھی اٹھا لیا تھا جو ان لوگوں نے علیزے سے کانٹیکٹ میں رہنے کے لیے دے رکھا تھا اس نے بڑی سوچ بچار کے بعد تمام ضروری اشیاء گاڑی سے نکال لی تھیں تاکہ کسی بھی قسم کی انویسٹی گیشن کے دوران وہ چیزیں انوالو نہ ہوں وہ چند ہی منٹوں میں کچھ فاصلے پہ کھڑی اپنی گاڑی کے قریب آیا تھا۔

"یہ لو' یہ علیزے کا سامان ہے احتیاط سے لے جاؤ' اور اسے چپ کرواؤ۔" اس نے کھڑکی سے جھکتے ہوئے بیگ دانیال کے حوالے کیا اور علیزے کو دیکھا جو ابھی تک رو رہی تھی۔

"لیکن آذر تم اکیلے یہاں؟" دانیال کو فکر نے آن گھیرا۔

"ڈونٹ وری میں یہاں سب کچھ سنبھال لوں گا خیرو بابا کے پاس ہاسپٹل بھی جانا ہے ابھی۔" آذر نے اسے تسلی دی۔

"لیکن تمہارے پاس تو گاڑی بھی نہیں ہے۔"

"دانیال پلیز تم میری فکر نہ کرو' تم علیزے کو یہاں سے لے کر نکلنے کی کوشش کرو یہ سراسر پولیس کیس ہے' ہو سکتا ہے ابھی نہیں تو تھوڑی دیر تک پولیس بھی آ جائے' میں ابھی آس پاس دیکھنے والے لوگوں سے کچھ پوچھ گچھ کرتا ہوں آخر کون لوگ تھے جنہوں نے فائرنگ کی؟ کسی نے تو دیکھا ہی ہو گا؟" آذر کی بات سمجھ کر دانیال بھی چپ ہو گیا تھا۔

"ٹھیک ہے میں علیزے کو حویلی ڈراپ کر کے دوبارہ آتا ہوں۔" دانیال نے گاڑی آگے بڑھا دی اور آذر پلٹ کر دوبارہ جائے وقوعہ پہ آ گیا تھا ابھی وہ ایک دو آدمی سے بات کرنے کا ارادہ باندھ ہی رہا تھا کہ پولیس کی گاڑی آتی دکھائی دی اور لوگ پولیس کو دیکھ کر شہد کی مکھیوں کی طرح اڑتے چلے گئے تھے جیسے کسی نے ان کے چھتے پہ پتھر مار کر ان کو اڑا دیا ہو۔

اور وہاں میڈم عالیہ اور دو تین ادھیڑ عمر مرد ہی کھڑے رہ گئے تھے یا پھر ذرا فاصلے پہ آذر اکیلا کھڑا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کبھی بھی وقت پہ نہ پہنچنے والی پولیس اب کیا کارکردگی دکھاتی ہے؟ پولیس کی گاڑی قریب پہنچنے تک آذر' وقار آفندی کا نمبر ڈائل کر چکا تھا دوسری طرف کال ریسیو کرنے والا مبارک خان تھا آذر کے کہنے پہ اس نے موبائل وقار آفندی کی سمت بڑھا دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

علیزے پہ قاتلانہ حملے کی خبر بڑی حویلی کے درو دیوار ہلا کر رکھ گئی تھی' چھوٹے بڑے سبھی چکرا کے رہ گئے تھے علیزے دانیال کے ساتھ گھر پہنچی تو اس کی گھٹی گھٹی چیخوں کو کھل کر باہر آنے کا رستہ مل گیا تھا وہ بلند آواز سے رو رہی تھی اور اس کی حالت ایسی تھی کہ آسیہ آفندی نے دیور اور دیورانی کے مشورے پہ اسے کچھ دیر کے لیے ٹرینکولائزر دے کر سلا دیا تھا وہ ایسی پوزیشن میں ہرگز نہیں تھی کہ سب کے تشویش بھرے سوالات کے جواب دے سکتی لہٰذا اسرار آفندی نے اسے کچھ دیر سکون دینے اور اس حادثے کو اس کے دماغ سے ذرا دیر کے لیے محو کرنے کے لیے یہی آئیڈیا سوچا تھا اور قریب متفکر سی کھڑی ثروت بیگم نے بھی شوہر کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔

علیزے کو اپنے کمرے میں سلا کر جیسے ہی آسیہ آفندی کمرے سے باہر آئیں انہیں راہداری سے وقار آفندی آتے دکھائی دیے ساتھ احتیاطاً" ان کے سہارے کے لیے مبارک خان بھی تھا جو ان کا بازو تھامے ہوئے تھا۔

"علیزے کہاں ہے؟" انہوں نے آسیہ آفندی کو دیکھ کر چھوٹتے ہی استفسار کیا تھا۔

"اللہ کا شکر ہے وہ ٹھیک ہے' میں نے اسے تھوڑی دیر کے لیے سلا دیا ہے وہ کافی اپ سیٹ ہو چکی تھی۔" انہوں نے شوہر کو تسلی دی۔

"آسیہ! تم ٹھیک کہہ رہی ہو نا؟" وہ بے یقین لگ رہے تھے۔ حالانکہ آذر فون پہ ان کو اچھی خاصی تسلی دے چکا تھا اور ساری صورت حال بھی بتا چکا تھا۔

"آپ خود دیکھ لیں۔" آسیہ آفندی نے مڑ کر دروازے کا ہینڈل گھما کر دروازہ کھول دیا تھا۔ اور وہ اتنے غیر مطمئن تھے کہ انکار نہیں کر سکے اور کمرے میں آ گئے مبارک خان باہر ہی کھڑا رہ گیا۔

"علیزے میری جان۔" وہ بے ساختہ بیڈ پہ لیٹی علیزے کے قریب آئے اور جھک کر اس کی پیشانی چوم لی تھی بے شک علیزے نیند آور گولیوں کے زیر اثر سو گئی تھی لیکن اس کا ذہنی انتشار اس کے سوئے ہوئے چہرے سے بھی عیاں ہو رہا تھا بے تحاشا رونے کی وجہ سے اس کی پلکیں جڑی ہوئی تھیں اور پپوٹے سرخ اور سوجن زدہ ہو رہے تھے وقار آفندی کا سر مٹھی میں آ گیا تھا انہوں نے بچپن میں بھی علیزے کو کبھی رونے نہیں دیا تھا وہ ذرا سا "اف" بھی کرتی تو ہزاروں لوگ الرٹ ہو جاتے تھے اور آج وہ اکیلی اتنا سنگین منظر' اتنا ہولناک واقعہ خود پہ سہہ آئی تھی!

"میری جان' میری علیزے۔" وہ اس کے قریب بیٹھے اس کے بال سہلا رہے تھے اور ان کا وہاں سے اٹھنے کا کوئی ارادہ بھی نہیں تھا۔

"وقار!" آسیہ آفندی نے آگے بڑھ کے ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھ دیا۔

"انہیں باہر چلیں' باہر سب پریشان ہو رہے ہیں اور ہم یہاں کمرے میں آ کر بیٹھ گئے ہیں' پلیز سنبھالیے اپنے آپ کو' علیزے اگر آپ کو اس طرح کمزور دیکھے گی تو اور زیادہ ٹینس ہو جائے گی۔ پلیز حوصلے اور ہمت سے کام لیں۔" آسیہ آفندی نے ان کے کندھے پہ دباؤ ڈالتے ہوئے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔ جواباً" انہوں نے کچھ بھی نہ کہا اور علیزے کا گال تھپک کر ان کے ساتھ باہر نکل آئے تھے۔

"رجو کہاں ہے؟" انہوں نے علیزے کی ملازمہ کا پوچھا۔

"علیزے کا بیڈ روم صاف کر رہی ہے شاید۔" انہوں نے ٹائم کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا تھا۔

"اسے کہو وہ علیزے کے پاس آ کر بیٹھے۔" انہوں نے رک کر آرڈر دیا تھا۔

"لیکن علیزے تو سو رہی ہے۔" آسیہ آفندی نے حیرانی سے کہا۔

"اسی لیے تو کہا ہے' وہ جب اٹھے گی تو خود کو کمرے میں اکیلے دیکھ کر کہیں خوف و ہراس میں نہ آ جائے' رجو اس کے سامنے ہو گی تو اس کی تسلی ہو جائے گی۔" وقار آفندی نے وضاحت دی لیکن آسیہ پھر بھی تذبذب کا شکار تھیں۔

"جاؤ اسے کہو سارے کام چھوڑ کر وہ علیزے کے پاس آ کے بیٹھے اور اس کا خیال رکھے۔" اب کی بار وہ انکار نہ کر سکیں اور پلٹ کر رجو کو بلانے آ گئیں۔ اور وہ خود ڈرائنگ روم میں چلے آئے جہاں باقی سب بھی موجود تھے۔

☼ ☼ ☼

"میڈی پاکستان جا رہی ہے۔" کرسٹینا نے آتے ہی اپنے گروپ میں شوشا چھوڑا تھا اور اس گروپ میں سب سے زیادہ چونکنے والا جیزی ہی تھا۔

"کب؟ تمہیں کس نے بتایا؟" اس کے سوال میں بے چینی سی تھی۔

"بتایا تو اس نے خود ہی ہے' البتہ کب جا رہی ہے؟ اس کا نہیں بتایا۔" اس نے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔

"وہ تمہیں خود ملی ہے یا فون پہ بتایا ہے؟" جبزی کے سوال بے ساختہ تھے وہ خود کو روک نہیں پایا تھا۔

"ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی فون پہ بتایا ہے' ہوسکتا ہے وہ ادھر کیفے کی طرف بھی آئے۔" جبزی جتنا کانشس ہو رہا تھا کرسٹینا اتنی ہی لاپرواہ دکھائی دے رہی تھی اسے مدحیہ کے آنے اور جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

"لیکن وہ تو کہہ رہی تھی کہ وہ کبھی پاکستان نہیں جائے گی؟" یونیورسٹی کے لان میں گھاس پہ بیٹھی شیٹے نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

"ہونہہ! یہ ان پاکستانیوں کی صرف باتیں ہی ہیں' جو کہتے ہیں وہ کرتے نہیں اور جو کرتے ہیں وہ کہتے نہیں۔ ان کے لیے بڑی بڑی باتیں کرلینا تو آسان ہے لیکن بڑی بڑی باتوں پہ عمل کرنا بہت مشکل۔" کرسٹینا اور اس کی فیملی پاکستانیوں سے متنفر تھی یہ تو اس کی مجبوری تھی کہ مدحیہ ان کے گروپ کا حصہ تھی اس لیے برداشت کرنا پڑتا تھا اور ویسے بھی وہ پاکستانی مردوں سے متنفر تھی عورتوں کے لیے ابھی کوئی رائے قائم نہیں کی تھی اس لیے جیسی تیسی ہی سہی مدحیہ سے فرینڈشپ چل ہی رہی تھی۔

"ہیلو ایوری باڈی؟ کیا ہو رہا ہے؟" تھوڑی ہی دیر میں کرسٹینا کے عقب سے مدحیہ کا چہرہ نمودار ہوا تھا۔

"ہائے!" سبھی نے اسے وش کیا تھا لیکن جبزی تو یہ بھی نہیں کرسکا تھا۔

"لگتا ہے کوئی سیریس ٹاپک چل رہا ہے؟" شیٹے کے برابر گھاس پہ بیٹھتی مدحیہ نے سبھی کے چہرے اک نظر میں بھانپ لیے تھے۔

"اس وقت تو تم ہی ٹاپک ہو۔" کرسٹینا نے عجیب سے انداز میں مسکرا کر کہا۔

"کیوں؟ کوئی ریزن؟" مدحیہ نے تیکھی نظروں سے کرسٹینا کی مسکراہٹ کا جائزہ لیا۔

"نہیں کوئی خاص وجہ نہیں' بس وہ جبزی تمہیں مس کر رہا تھا' تمہارے پاکستان جانے کا سن کر پریشان ہوگیا ہے۔" کرسٹینا کا انداز ہنوز لاپروائی لیے ہوئے تھا جبکہ اس کی بات پہ جہاں مدحیہ چونکی وہیں جبزی گڑبڑا کے رہ گیا تھا وہ کرسٹینا کے ایسے حملے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا۔

"کیوں؟ میرے جانے سے جبزی کو کیا پرابلم ہے؟" مدحیہ نے براہ راست جبزی کی طرف رخ موڑا وہ اپنے تاثرات کنٹرول کرنے میں لگا ہوا تھا۔

"جبزی کو تمہارے جانے سے یہ پرابلم ہے کہ ہمارے گروپ کی ایک بہت اچھی فرینڈ ہم سے دور ہوجائے گی اور اس کی کمی ہمیں ہمیشہ فیل ہوگی۔" شیٹے نے درمیان میں بولتے ہوئے بات سنبھالی تھی اور جبزی نے شیٹے کو ممنون نظروں سے دیکھا تھا۔ مگر کرسٹینا کو دیکھ کر دل چاہ رہا تھا اس کا گلا دبا دے۔۔۔!

"یہ تو ٹھیک کہہ رہے ہو تم لوگ' کمی تو مجھے بھی بہت محسوس ہوگی آپ لوگوں کی۔۔۔ لیکن اتنا پریشان ہونے والی بات بھی نہیں ہے' ہم لوگ فون پہ اور نیٹ پہ ہمیشہ کانٹیکٹ میں رہیں گے بلکہ تم لوگ اگر کبھی چھٹیوں میں چاہو تو مجھ سے ملنے پاکستان بھی آسکتے ہو' اینڈ آئی ہوپ کہ تم سب انجوائے بھی کرو گے۔" مدحیہ نے بے ساختہ ہی ان لوگوں کو مہمان نواز میزبان کی طرح دعوت دی تھی اور اس دعوت پہ سبھی نے مسکرا کر سر ہلایا تھا سوائے کرسٹینا کے۔۔۔!

"میڈی میرا وعدہ ہے کہ کوئی اور آئے نہ آئے' میں ضرور آؤں گا۔" برائن نے کتاب سے سر اٹھا کر پہلی بار لب کشائی کی تھی۔

"میں ویٹ کروں گی۔" مدحیہ کے چہرے پہ ہلکی سی مسکراہٹ در آئی تھی۔

"تم جا کب رہی ہو؟" شیٹے نے سوال کیا۔

"نیکسٹ ویک۔"

"ٹکٹ کنفرم ہوگیا تمہارا؟"

"ہاں! آج ہی ہوا ہے۔" مدحیہ نے کہہ کر سر جھکا لیا تھا۔

"کیا پاکستان جا کر شادی کرنے کا ارادہ ہے؟" برائن کے سوال میں سنجیدگی تھی۔

"نہیں' شادی کی پلاننگ تو دور دور تک بھی نہیں ہے۔" وہ نفی میں گردن ہلا رہی تھی۔

"ارے ابھی نہیں ہے نا؟ پاکستان جا کر ضرور ہوجائے گی۔ تمہیں پہلی نظر میں ہی کسی اکڑے ہوئے سینے اور پھولے ہوئے بازوؤں والے ہیرو سے محبت ہوجائے گی' جو بات بھی کرے گا چھت پھاڑ کے۔" کرسٹینا نے تمسخر سے کہتے ہوئے پاکستانی فلموں کے ہیرو کا نقشہ کھینچا تھا۔

"اب میرا ٹیسٹ اتنا برا بھی نہیں ہے کیوں جبزی؟" مدحیہ نے چپ بیٹھے جبزی کو بھی گفتگو میں گھسیٹا۔

"ہاں یار میڈی ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے' اس کا ٹیسٹ تو اتنا اعلا ہے کہ یہاں لندن جیسے شہر میں رہتے ہوئے بھی ابھی تک اسے کوئی پسند نہیں آیا' کوئی اپنے معیار کا ہی نہیں لگا' نہ کوئی مسلم' نہ کوئی کرسچن۔" جبزی ڈائریکٹ مدحیہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا مدحیہ کی نیت صاف تھی اس لیے وہ نظر چرانے کی بجائے مسکرا دی۔

"یہ تو تم ہنڈرڈ پرسینٹ درست کہہ رہے ہو اور یہی بات کبھی کبھی میں خود بھی سوچتی ہوں کہ مجھے یہاں رہتے ہوئے اتنی زیادہ آزادی بھی تھی کوئی مسئلہ' کوئی روک رکاوٹ بھی نہیں تھی مگر پھر بھی مجھے کوئی اچھا نہیں لگا؟ کسی نے بھی اس دل کو ٹچ نہیں کیا۔" وہ اپنے دل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عجیب سے انداز میں بولی تھی۔

"لیکن یہ تو ہوسکتا ہے ناکہ تم کسی کے دل کو ٹچ کر گئی ہو؟" جبزی نے ذو معنی بات کہی۔

"تو پھر یہ کسی کے دل کا مسئلہ ہے' میرا نہیں۔" وہ بے نیاز تھی۔

"کوئی تمہیں چاہتا ہے' کیا تمہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا؟" جبزی اسے کھوج رہا تھا۔

"نہیں مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا' کیونکہ مجھے کوئی بھی چاہ سکتا ہے اور میں ہر ایک کے لیے فکر اور تجسس نہیں پال سکتی۔" اس کے انداز میں لاپروائی ہنوز تھی اس نے جبزی کی بات کا نوٹس ہی نہیں لیا تھا۔

"تو پھر تم کس کے لیے فکر اور تجسس پال سکتی ہو؟ کون ہوگا وہ خوش نصیب؟" جبزی نے ہمت نہ ہاری اور کھوج کا سلسلہ جاری رکھا۔

"وہ خوش نصیب وہ ہوگا جو "صرف" مجھے چاہے گا' جس کی زندگی میں پہلے اور بعد میں' میرے سوا کوئی نہیں ہوگا' جو ادھر ادھر منہ ماری نہیں کرے گا۔" مدحیہ کی بات پہ جبزی پل بھر کے لیے چپ سا ہوگیا تھا کیونکہ مدحیہ کے سامنے ہی وہ ایسے منہ ماری کرنے کے ہزاروں کارنامے سرانجام دے چکا تھا۔

"آج کل ایسا خوش نصیب ملنا بہت مشکل ہے میڈی' بالکل فنو آدمی تمہیں کہیں بھی نہیں ملے گا۔" جبزی نے مدحیہ کو اس کی شرائط سے باز رکھنا چاہا۔

"ہونہہ! مشکل ہوسکتا ہے ناممکن نہیں' اللہ کی دنیا بہت وسیع ہے اور اس وسیع دنیا میں ہر قسم کے انسان آباد ہیں۔" اس نے یقین سے کہا تھا۔ اور وہ مزید کچھ نہ کہہ سکا۔ لیکن بہت پہلے زری کے منہ سے سنا ہوا شعر بے ساختہ ہی مدحیہ کے لبوں پہ مچل گیا تھا۔

ہم تو محبت میں بھی توحید کے قائل ہیں — فراز
ایک ہی شخص کو محبوب بنائے رکھنا!

انہوں نے مدحیہ کے اس شعر پہ ناسمجھی سے اسے دیکھا تھا اور مسکراتے ہوئے اس نے شعر کو انگلش میں ٹرانسلیٹ کردیا تھا۔

"ہوں! انٹرسٹنگ" برائن نے ایک بار پھر کتاب سے نظریں ہٹا کر مدحیہ کی حوصلہ افزائی کی اور اسے داد دی

تھی۔

"تمہیں کیسا لگا؟" وہ جیزی سے مخاطب تھی۔

"اچھا لگا۔" وہ آہستگی سے کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا تھا اور باقی سبھی اسے دور جاتا ہوا دیکھنے لگے۔۔۔۔

☼ ☼ ☼
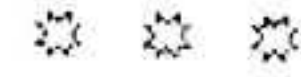
وہ تقریباً" دو بجے کورٹ سے فارغ ہوا تھا اور کورٹ سے فارغ ہونے کے بعد اس کا ارادہ گھر جانے کا تھا لیکن جب اس کے لیڈر نے بتایا کہ آفس میں کافی زیادہ کام ہے تو پھر اس نے کچھ دیر کے لیے آفس کا چکر لگا لینا بھی مناسب سمجھا تھا۔ ابھی وہ پارکنگ کی سمت جا ہی رہا تھا کہ انسپکٹر شہناز سے ٹکراؤ ہو گیا' وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی اسے دیکھ کر مسکرائی تھی اور اس کی مسکراہٹ بھی ہمیشہ والی شوخی و شرارت لیے ہوئے تھی۔

"سلام شاہ جی۔" اس نے اپنی خوشی کے اظہار کے طور پہ دل آور شاہ کو سلوٹ کیا تھا۔

"وسلام' کیسی ہیں آپ؟" وہ چاہتے ہوئے بھی بے مروتی نہ دکھا سکا کیونکہ اسے پتا تھا وہ کبھی پیچھا نہیں چھوڑے گی۔

"ایک دم فٹ ہوں شاہ جی' لیکن آپ آج کل کچھ الجھے بکھرے دکھائی دے رہے ہیں؟" وہ قریب آ کھڑی ہوئی۔

"یہ بھی لوگوں کی نظر کا دھوکا ہے۔" دل آور شاہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا' یوں جیسے وہ انسپکٹر شہناز کے سوال سے محظوظ ہوا ہو۔

"اوہ! تو آپ یہ مان رہے ہیں کہ آپ دھوکا بھی دیتے ہیں۔؟" انسپکٹر شہناز کا انداز معنی خیز تھا۔

"صرف دھوکا ہی نہیں' دغا بھی دیتا ہوں۔" وہ جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر سگریٹ ہونٹوں میں دباتے ہوئے بولا اور ساتھ ہی لائیٹر سے سگریٹ کو شعلہ دکھا دیا۔

"کام تو دونوں ہی خطرناک ہیں۔" وہ ہونٹ سکیڑ کر بولی۔

"اسی لیے تو کہتا ہوں بچ کے رہا کریں۔" دل آور شاہ نے اسے ڈرایا اور وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بے ساختہ کھلکھلا کر ہنسی تھی۔

"شاہ جی یہ بھی خوب کہی آپ نے۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔

"ظاہر ہے میرا فرض بنتا ہے کہ میں آپ کو باز رکھوں' آگ سے کھیلنا خطرناک ہی تو ہے۔" وہ سگریٹ کا کش لے کر دھواں فضا میں اڑائے جا رہا تھا انداز دونوں کا غیر سنجیدہ تھا۔

"آپ بھول رہے ہیں شاہ جی' آگ جہاں بھی ہو پتنگا ضرور آتا ہے۔"

"ہاں جانتا ہوں وہ پتنگا جل کے مر بھی جاتا ہے۔"

"لیکن شاہ جی مرنے سے پہلے آگ کو چھو تو لیتا ہے نا۔ چھونے کی حسرت دل میں لے کر نہیں مرتا' چاہے کچھ بھی ہو جائے اپنی حسرت تمام کر لیتا ہے۔" انسپکٹر شہناز کو اس کی باتوں سے اختلاف تھا۔

"اوہ یعنی آپ بھی حسرت تمام کرنا چاہتی ہیں؟" دل آور نے اسے جان بوجھ کر چھیڑا۔

"میں حسرت تمام نہیں کرنا چاہتی بلکہ تمام حسرتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

"ماشاءاللہ کیا خیالات ہیں میڈم کے۔" اس نے سراہا۔

"میڈم بلاوا آ چکا ہے۔" اچانک ایک لیڈی کانسٹیبل تیزی سے قریب آئی اور اپنی میڈم کو اطلاع دی۔

"چلیں شاہ جی آج کے لیے بخشا آپ کو' پھر ملاقات ہوگی۔" اس نے جیسے عنایت کی تھی۔

"بڑی مہربانی ہے میڈم' بخشنے کا شکریہ الگ سے۔" دل آور نے عاجزی سے کہا اور وہ مسکراتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ وہ گہری سانس کھینچتا سگریٹ زمین پہ پھینک کر پاؤں سے مسلتا ہوا اپنی گاڑی کی طرف آ گیا تھا۔

جیسے ہی وہ آفس پہنچا اس کا لیڈر الرٹ کھڑا تھا اس نے رفتہ رفتہ تمام کیسز کی تفصیلات نکال کر سامنے رکھنا شروع کر دیں۔

"اب سے تمام کیسز کی ڈیٹس نومبر کے بعد کی ہونی چاہئیں میں دو تین کیسز کے سلسلے میں کراچی جا رہا ہوں جن کو نبٹاتے ہوئے چند دن تو لگ ہی جائیں گے بلکہ ہو سکتا ہے' زیادہ عرصہ لگ جائے۔" اس نے لیڈر کو سب کچھ سمجھاتے ہوئے اطلاع دی۔

"لیکن سر دو تین کیسز کی تو نومبر سے پہلے۔۔۔۔"

"ہوں! جانتا ہوں تم بس تمام کیسز کی تاریخیں لیتے جانا' کوئی فرق نہیں پڑے گا' باقی جو ہو گا بعد میں دیکھا جائے گا۔" وہ چند کاغذوں پہ سائن کرنے کے بعد اپنے لیڈر قادر کو بتاتا جا رہا تھا۔

"آپ جا کب رہے ہیں؟" قادر تھوڑا پریشان ہو چکا تھا۔

"ابھی کچھ فائنل نہیں ہے آج ڈسکشن ہو گی پھر ہی کچھ پتا چلے گا۔"

"سر کل ایک لڑکی آئی تھی آفس میں۔"

"پھر؟"

"اپنا کیس ریکارڈ کروا کے گئی ہے۔"

"کیا نام تھا؟" اس نے مصروف سے انداز میں پوچھا۔

"مومنہ بی بی۔"

"اوہاں! مومنہ بی بی' پھر تم نے کیس ریکارڈ کیا؟"

"جی کر لیا تھا۔" قادر مودب سے لہجے میں بولا۔

"اس کے کیس کی ایک کاپی مجھے دے دو۔"

وہ فائلز بند کرتے ہوئے بولا اور پین پہ کیپ چڑھا کر ٹیبل پہ ڈال دیا۔

"جی سر ابھی تیار کروا لیتا ہوں۔" قادر اٹھ کر ریک کی سمت بڑھ گیا۔ "بس پانچ منٹ میں مکمل کرو سب کچھ۔ اور ہاں وہ لڑکی اپنا کوئی کانٹیکٹ نمبر وغیرہ دے کر گئی ہے یا نہیں؟" اس نے کچھ یاد آنے پہ پوچھا۔

"نہیں سر! نمبر وغیرہ تو کوئی نہیں دیا۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"اوکے! اب اگر وہ دوبارہ آئے یا پھر کوئی رابطہ کرے تو اس سے نمبر ضرور لے لینا اور میرے نمبر پہ فارورڈ کر دینا' میں اس سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"جی سر' کر دوں گا۔" قادر دوبارہ سر ہلاتے ہوئے پلٹ گیا تھا۔

اور وہ خود گھڑی دیکھتے ہوئے ایک اور کیس کی فائل نکال کر چیک کرنے لگا اسے ابھی کیس چیک کرتے ہوئے دس منٹ ہی گزرے تھے کہ اس کا سیل فون بجنے لگا۔

"السلام علیکم۔" کال ریسیو کرتے ہی سلام کرنا اس کی عادت تھی۔

"وعلیکم السلام' کیسے ہو؟" نبیل کی آواز آج کچھ نارمل اور ریلیکس لگ رہی تھی۔

"کیسا ہو سکتا ہوں؟" وہ کرسی کی بیک سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔

"ہٹا کٹا۔" نبیل قہقہہ لگاتے ہوئے ہنسا تھا اور اس کے انداز پہ خود دل آور کے چہرے پہ بھی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

"یہ بات تم میری اماں کے سامنے کہو تو وہ تمہیں اس بات کا مزا چکھائیں۔" دل آور نے جیسے اسے دھمکی دی تھی۔

"ارے یار ماؤں کا کیا ہے۔؟ اچھے خاصے رسلر بیٹے کو دیکھ کر بھی کہہ دیں گی۔ بے چارا کمزور ہو گیا ہے 'اتنا سا منہ نکل آیا ہے' نہ جانے کس کی نظر لگ گئی ہے؟" نبیل نے جس لہجے میں کہا دل آور اپنا قہقہہ نہ روک سکا۔

"ارے یہ عبداللہ کے انداز و اطوار تم نے کہاں سے سیکھ لیے؟" اس نے ہنستے ہوئے پوچھا تھا۔

"عبداللہ کے ساتھ رہوں گا تو اسی کے انداز سیکھوں گا نا؟" نبیل بھی ہنس رہا تھا۔

"یعنی میرے ساتھ رہو گے تو میرے سیکھو گے۔" دل آور نے معنی نکالے۔

"اف! توبہ کرو یار اس دنیا میں ایک ہی دل آور شاہ کافی ہے 'کہاں میں بے ضرر سا! مسکین سا آدمی' اور کہاں تم جیسا ہٹلر۔۔۔"

نبیل نے توبہ توبہ کرتے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"کیا اتنا برا ہوں یار؟" دل آور کا لہجہ ایسا تھا کہ نبیل فوراً" سنبھل گیا۔

"ارے نہیں یار' تم تو اپنی جان ہو' یہ سب تو ایک مذاق ہے۔"

"دیکھا اس طرح سیدھی لائن پہ لاتے ہیں؟" اب کی بار دل آور کا لہجہ غیر سنجیدگی میں بدل چکا تھا اور نبیل اس کی شرارت سمجھ کر اسے برے برے القاب سے نوازنے لگا۔

"اوکے۔۔۔ اوکے یہ سب بعد میں بھی ہوتا رہے گا تم یہ بتاؤ ٹکٹ کون سی ڈیٹ کے کنفرم ہوئے ہیں؟" دل آور نے بات سمیٹتے ہوئے پوچھا۔

"اس ماہ کی انتہا میں کے۔"

"ہاں انتہا میں فرائیڈے ہی ہو گا۔" اس نے بھی اندازہ لگایا۔

"تم نے گھر میں سب کچھ چیک کر لیا؟" نبیل اپنے گھر کے متعلق پوچھ رہا تھا۔

"ہاں میں کل گیا تھا' پورے گھر کی صفائی نئے سرے سے کروائی ہے 'کچن کا سامان بھی میں نے گلاب خان کے ہاتھوں بھجوا کر سارا کچن سیٹ کروایا ہے' آپ لوگوں کے بیڈ رومز میں نے خود چیک کیے ہیں سب کچھ پرفیکٹ ہے 'لیکن پھر بھی کوئی کمی رہ جائے تو میری طرف سے معذرت۔۔۔" دل آور کا لہجہ ابھی سے معذرت خواہانہ تھا۔

"میں تمہاری ایسی بکواس پہ کان دھرنے والا نہیں ہوں۔" نبیل نے لاپروائی سے کہہ کر اللہ حافظ بولا اور فون بند کر دیا اور وہ اپنے بند موبائل کو دیکھ کر مسکرا دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"استاد! باؤ عدیل اس کام کے قابل تو نہیں تھا جس کام میں تم نے ڈال دیا ہے۔" چھوٹے کے پیٹ میں کوئی بات اور دماغ میں کوئی خیال کبھی ٹکتا نہیں تھا فوراً" زبان پہ آجاتا تھا۔ چاہے اچھا ہو چاہے برا۔۔۔ ابھی بھی وہ اپنے استاد کو ہی افسوس بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"نالائق! میں نے اسے اس کام میں نہیں ڈالا وہ خود اس کام میں پڑا ہے۔ مجھے ایک سمجھ دار اور ایماندار آدمی چاہیے تھا اور اسے گھر والوں کے لیے دو وقت کی روٹی' مجھے میری مرضی کا آدمی مل گیا اور اسے دو وقت کی روٹی۔ اور ویسے بھی وہ تو اتنا مجبور تھا کہ سڑکوں پہ جھاڑو لگانے اور باتھ روم صاف کرنے کے لیے بھی تیار تھا تو کیا یہ کام برا ہے ان کاموں سے؟" باؤ امتیاز بھی بے چارا سچ کہہ رہا تھا لیکن پھر بھی سب کو عدیل کی قسمت پہ افسوس تھا اتنا پڑھنے لکھنے کے بعد بھی اس کی قسمت میں پیٹرول اور ڈیزل کی کالک ہی لکھی تھی تو بہتر تھا کہ وہ ان پڑھ ہی رہتا' دل

میں کچھ بننے کا خواب تو نہ پیدا ہوتا.....!

"لگتا ہے اس ورکشاپ میں آپ دونوں کے راز و نیاز کچھ زیادہ ہی ہوتے ہیں؟" عدیل ان دونوں کے قریب چلا آیا تھا۔

"ذمہ داریاں بھی تو ہم دونوں پہ زیادہ ہیں۔" چھوٹے نے گردن اکڑا کے کہا۔

"اوئے کم بخت گردن ڈھیلی رکھا کر ٹوٹ جائے گی' سوکھے سڑے تیلے کی طرح تو ہے۔" باؤ امتیاز نے اس کے کندھے پہ ہاتھ مار کر کہا اور عدیل بمشکل اپنی مسکراہٹ روکنے میں کامیاب ہوا تھا' تبھی چھوٹے کا منہ بن گیا۔

"دیکھ استاد کام وام اپنی جگہ اور عزت بے عزتی اپنی جگہ' میں اپنی انسلٹ برداشت نہیں کر سکتا بتا رہا ہوں تجھے۔" چھوٹے نے اپنے استاد کو دھمکی دی۔

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے' جا ڈھابے سے چائے لے کر آ۔" باؤ امتیاز لاپروائی سے بولا۔

"جاتا ہوں' جاتا ہوں' پہلے ڈھابے والے کا پہلا کھاتہ تو صاف کرو' دو سو دس روپیہ دینا ہے اس کا' روز جاتا ہوں تو وہ پیسوں کا پوچھنے لگتا ہے' کل بھی پوچھ رہا تھا۔" چھوٹا اپنی جگہ سے کھڑا ہو چکا تھا لیکن جانے سے پہلے باؤ امتیاز کے ساتھ کم مکا کرنا چاہتا تھا۔

"اوئے منحوس! کل تو میں خود گیا تھا.....؟"

باؤ امتیاز نے اسے کوسا اور چھوٹا پہلے چونکا پھر کھسیا گیا' واقعی غلطی ہو چکی تھی۔

"نہیں نہیں استاد میں شام کی نہیں دن کی بات کر رہا ہوں۔" اس نے بات سنبھالی۔

"اچھا تو تو پھر اکیلا چائے پینے گیا ہو گا؟" باؤ امتیاز نے تیور بدلے تو چھوٹے کو لائن پہ آنا پڑا۔

"ارے استاد کل نہیں پرسوں دن کی بات۔"

"جاتا ہے یا ماروں کچھ؟" باؤ امتیاز نے گھورتے ہوئے جھک کر قریب پڑی لوہے کی ہتھوڑی اٹھائی اور چھوٹا ورکشاپ سے گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو گیا اب کی بار عدیل ہنسی نہیں روک پایا تھا۔

"آپ نے سچ ہی کہا تھا کمال کا پرزہ ہے یہ بھی....." عدیل اس کی باتوں اور حرکتوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

"اسی لیے تو کہا تھا کہ اسی کے دم سے رونق ہے۔" باؤ امتیاز مسکرا دیئے۔

"واقعی اس میں کوئی شک نہیں۔" عدیل کو ان سے اتفاق تھا۔

"چلو اللہ خیر رکھے تم بھی رفتہ رفتہ سب سے واقف ہو جاؤ گے' آج کا دن بھی آخر ختم ہو ہی گیا' یہ لو تمہاری پہلی دہاڑی۔" باؤ امتیاز نے جیب سے کچھ روپے نکال کر اس کی سمت بڑھائے' پہلی کمائی کی صورت میں۔

"دہاڑی؟ لیکن میں نے تو آج کا پورا دن کوئی کام ہی نہیں کیا؟" عدیل نے تعجب بھری نظروں سے دیکھا۔

"بے شک نہیں کیا' لیکن آج کے دن سے تم اب اس ورکشاپ میں شامل ہو چکے ہو' تمہارا حصہ بھی سب کے ساتھ ہی ہو گا۔" انہوں نے انصاف سے کام لیا۔

"لیکن چاچا۔" عدیل متذبذب تھا۔

"ارے چھوڑ یار' آج پہلا دن ہے' خالی ہاتھ گھر جائے گا تو گھر والے کیا سوچیں گے؟ تو ایسا کر آج ان پیسوں سے گھر والوں کے لیے کچھ کھانے پینے کی چیزیں لے جا۔" باؤ امتیاز نے زبردستی وہ پیسے اس کی جیب میں ڈال دیے۔

"اور ہاں آئندہ کام کرے گا تو دہاڑی ملے گی ورنہ ایسی عیاشی روز روز نہیں ہو گی۔" انہوں نے اسے ساتھ ساتھ آگاہ کرنا بھی ضروری سمجھا تھا جس پہ عدیل ممنونیت سے مسکرا دیا تھا اتنے میں سلو اور جیدی بھی پاس آ گئے اور چھوٹا بھی چائے لے کر حاضر ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"بھائی.....!"

"ہوں؟"

"آپ نے جھوٹ کیوں بولا؟"

"کون سا جھوٹ؟" وہ انجان بنا۔

"جاب والا۔" مریم اس کے کپڑے نکالتے ہوئے آہستگی سے پوچھ رہی تھی۔

"جاب والا؟ کیا مطلب؟" عدیل نظریں چرائے ہوئے بات کر رہا تھا۔

"ارے یار جاب ملی ہے تو سب کچھ لے کر آیا ہوں نا۔؟"

"میں مانتی ہوں آپ کو جاب ملی ہے لیکن وہ نہیں ملی جو آپ نے ابا جی اور امی کو بتائی ہے۔" عدیل کھانے پینے کی چیزیں اور کچھ گھر کی ضرورت کی اشیاء لے کر گھر میں داخل ہوا تو سبھی بہت خوش ہوئے تھے انہوں نے فوراً اس کے کام کی نوعیت پوچھی تھی اور وہ اپنی نوکری کی بابت بتاتے ہوئے کترا گیا تھا اس لیے جھوٹ بول دیا کہ ایک کمپنی میں ملازمت ملی ہے لیکن محدود مدت کے لیے اور اس وقت اس کے گھر والوں کے لیے محدود مدت بھی کسی نعمت سے کم نہیں تھی۔ چار دن تو اچھے گزر ہی جاتے۔ لیکن مریم اس کے جھوٹ سے مطمئن نہیں ہوئی تھی۔

"تو پھر کون سی ملی ہے؟" عدیل اس کے ہاتھ سے کپڑے لیتے ہوئے گھور کے بولا۔

"یہ تو آپ ہی بتا سکتے ہیں' مجھے الہام تو نہیں ہو گا نا؟"

"جب اتنا بڑا شک ظاہر کر رہی ہو یہ بھی تو کسی الہام کی بنا پر ہی کر رہی ہو نا؟"

"نہیں بھائی یہ شک نہیں یہ میرا یقین ہے۔" مریم الماری بند کر کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"کیا کرو گی شک اور یقین کو الگ کر کے؟"

"دھوکے کی خوشی سے بچ جاؤں گی' جو آپ نے امی' ابا کو دی ہے' محض ایک جھوٹی خوشی....." مریم تلخی سے بولی۔

"لیکن یار مجھے کام تو مل ہی گیا ہے نا؟ اب اتنا پریشان ہونے والی کیا بات ہے؟" عدیل نے اسے بہلانا چاہا۔

"لیکن کام کا پتا تو چلے؟"

"مریم!" عدیل نے خفگی سے کہا۔

"آپ مجھے بتا دیں میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔" وہ بہلنے والی نہیں تھی۔

"کل صبح جانے سے پہلے بتا دوں گا۔"

"نہیں ابھی بتائیں۔" مریم کے انداز میں بچوں کی سی ضد تھی۔

"کیا اپنے تک رکھو گی؟"

"ہاں۔" اس نے سر ہلایا۔

"وہ دراصل مجھے ورکشاپ میں کام ملا ہے۔" عدیل رخ موڑتے ہوئے بولا وہ اپنے چہرے کے تاثرات نہیں دکھانا چاہتا تھا۔

"ورکشاپ؟" مریم کی نظروں میں پورا کمرا چکرا کے رہ گیا تھا اس کا اتنا لائق فائق بھائی کسی اچھی سیٹ پہ کام کرنے کی بجائے ورکشاپ میں کام کرے گا؟

"آہستہ بولو' امی نے سن لیا تو پریشان ہو جائیں گی۔"

"لیکن بھائی....." مریم نے کچھ کہنا چاہا۔

"نہیں مریم ناشکری مت کرنا ہمارے لیے یہ بھی بہت بڑی نعمت ہے' اللہ کا احسان ہے ہم پہ۔" عدیل نے اسے کچھ کہنے سے روک دیا تھا اور خود نہانے کے لیے غسل خانے میں چلا گیا مگر مریم ابھی تک بے حس و حرکت کھڑی تھی اس کی نظروں میں عام ورکشاپوں کے مناظر گھوم گئے جہاں کوئی بھی کام کرنے والا اپنی اصلی حالت میں نہیں ملتا تھا جہاں ہر وقت ٹھوکا ٹھاکی کی آوازیں اور ڈیزل کی بدبو سہنا پڑتی تھی

☼ ☼ ☼

تمہیں دل لگی بھول جانی پڑے گی
محبت کی راہوں میں آکر تو دیکھو
تڑپنے پہ میرے نہ پھر تم ہنسو گے
کبھی دل کسی سے لگا کر تو دیکھو
وفاؤں کی ہم سے توقع نہیں ہے
مگر ایک بار آزما کر تو دیکھو

کمرے میں گونجتی نصرت فتح علی خان کی آواز' کمرے کے ماحول کو خاصا سوز بخش رہی تھی اور اس سوز کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کرتی زری اپنی سوچوں اور اپنے خوابوں کے ہمراہ کہیں سے کہیں پہنچی ہوئی تھی اس کی روح پہ کسی کی یاد کی مہک طاری تھی اور وہ اس مہک سے مسحور ہوتی موجودہ ماحول سے دور ہوتی چلی گئی تھی وہ جب بھی فرصت سے اسے دل کے تخت پہ بٹھا کر خود اس کے سامنے اس کے قدموں میں بیٹھتی تو اسے دیکھتے دیکھتے دو عالم بھول جاتی تھی اور اس وقت بھی اس کا یہی حال تھا وہ راکنگ چیئر پہ بیٹھی آنکھیں بند کیے تصور کا جہان آباد کیے ہوئے تھی جہاں وہ اکیلی نہیں تھی' جہاں اس سے محبتیں وصول کرنے والا اس کی خواہشوں کی نگری میں اس کے قدم سے قدم ملا کر چل رہا تھا' جہاں وہ اسے محبت پاش نظروں سے دیکھ رہا تھا اور وہ شرم و حیا سے مغلوب اس سے تھوڑا ہٹ کے چل رہی تھی اور لبوں پہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

الٹی چال چلتے ہیں یہ دیوانگان عشق
آنکھوں کو بند کرتے ہیں دیدار کے لیے!

اس کی بند آنکھوں اور مسکراتے لبوں نے نگارش کو شعر کہنے پہ مجبور کر دیا تھا زری چونک کر سیدھی ہوئی تھی اور سامنے نگارش کو دیکھ کر وہ جھنجلا سی گئی۔

"بھابھی۔" اس کا لفظ بھی جھنجلایا ہوا تھا۔

"جی میری جان؟" نگارش نے اس کی کیفیت سے حظ اٹھایا۔

"اف! کیا آپ کو ابھی آنا تھا؟" اس نے منہ بنا کر کہا۔

"کیوں؟ کیا تم رومینس میں مصروف تھیں؟" نگارش کی بات پہ اس کا چہرا سرخ پڑ گیا۔

"پلیز! بھابھی کچھ تو خیال کریں۔" وہ بلش ہوئی لگ رہی تھی۔

"کیسا خیال؟"

"میرے رومینس کا۔" وہ بھی شرارت سے بولی تو نگارش کھلکھلا کے ہنس پڑی تھی۔

"ویسے یہ تو بتاؤ رومینس تم کر رہی تھیں؟ یا وہ کر رہا تھا؟" نگارش نے اسے مزید چھیڑا۔

"بھابھی۔" زری نے اسے کشن دے مارا تھا اور نگارش ہنستے ہنستے بیڈ کی پائنتی کی طرف بیٹھ گئی۔

"ویسے یار میں تمہیں ایک بات بتانے آئی تھی۔" نگارش نے تجسس پھیلایا۔

"کیا؟" زری کے انداز میں فطری بے ساختگی تھی۔

"عبداللہ اس سے نیٹ پہ بات کر رہے ہیں۔ اپنے بیڈ روم میں بیٹھا ہے بہت چارمنگ لگ رہا ہے' چلو تمہیں بھی دکھاؤں۔" نگارش نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اٹھنے کا کہا۔

"کون چارمنگ لگ رہا ہے؟" زری نے ناسمجھی سے پوچھا۔

"محترمہ آپ کے دل آور شاہ صاحب اور کون بھلا؟" نگارش نے گھورا زری اس کے اس طرح نام لینے پہ گھبرا گئی تھی۔

"پلیز آہستہ تو بولیے۔"

"اچھا چلو تمہیں دکھاتی ہوں۔" نگارش نے پھر اس کا ہاتھ کھینچا۔

"نہیں نہیں میں نہیں جا سکتی۔"

"کیوں؟ تم کیوں نہیں جا سکتیں۔؟"

"بس اچھا نہیں لگتا اس طرح۔"

"لیکن یار تم میرے ساتھ چل رہی ہو نا۔ اس میں بھلا کیا برائی ہے۔؟"

"برائی کچھ نہیں ہے لیکن میرے جانے سے وہ بڑی جلدی کیمرہ آف کر دے گا۔"

"تو کر دے' کم از کم تم دیکھ تو لو گی؟"

"دیکھنے کو چھوڑیں آپ ہی بتا دیں کہ کیسا لگ رہا ہے؟" زری دلچسپی سے بولی۔

"جیسا ہمیشہ لگتا ہے۔"

"کیا کر رہا ہے؟"

"چائے پی رہا ہے۔" نگارش خفگی سے بول رہی تھی۔

"چائے کے بعد یقیناً سگریٹ پیے گا۔" زری کو اس کی عادت کا پتا تھا وہ اس کی اک اک حرکت بڑے غور سے نوٹ کرتی تھی۔

"ظاہر ہے' یہ تینوں دوست سگریٹ بہت پیتے ہیں' کئی بار عبداللہ سے کہہ چکی ہوں پلیز اسموکنگ ختم کر دیں لیکن مانتے ہی نہیں ہیں کہتے ہیں جس روز باقی دونوں نے بھی ختم کر دی اس دن میں بھی کر دوں گا۔" زری والی خفگی کا رخ عبداللہ کی اسموکنگ کی طرح مڑ چکا تھا۔

"تو آپ باقی دونوں سے کہہ دیں کہ وہ اسموکنگ ختم کر دیں۔" زری نے اسے چھیڑتے ہوئے آئیڈیا دیا۔

"ہاں' ہاں' اڑا لو مذاق جب تمہاری شادی ہو گی تو پھر پوچھوں گی تم سے کہ شوہر کی اسموکنگ کرنے کی عادت سے کتنی چڑ ہوتی ہے۔" نگارش نے گھورتے ہوئے کہا تھا۔

"مجھے اپنے شوہر کی کسی بھی عادت سے چڑ نہیں ہو گی کیونکہ اس کی تمام عادتیں مجھے پسند ہیں' میرے دل پہ لکھی ہوئی ہیں۔"

زری نے مسرور سے انداز میں جواب دیا۔

"ماشاء اللہ' شادی سے پہلے میں بھی یہی کہتی تھی۔" اب مذاق اڑانے کی باری نگارش کی تھی۔

"آپ' آپ ہیں اور میں' میں ہوں۔" زری کو اپنی محبت پہ یقین تھا۔ لیکن نگارش پھر بھی متفق ہونے والی نہیں تھی کیونکہ اسے پتا تھا کہ شادی کے بعد میاں بیوی ایک دوسرے کے لیے کتنے ضدی اور ڈھیٹ ہو جاتے ہیں۔ اک دوسرے کی بات ماننا گناہ سمجھتے ہیں۔

"چلو وقت آنے پہ دیکھیں گے۔" نگارش نے چیلنج کیا تھا۔

"ان شاءاللہ۔" زری نے مسکرا کر کہا۔

"نگارش؟" اچانک عبداللہ عجلت میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تھا۔

"جی؟" وہ دونوں متوجہ ہوئیں۔

"دل آور تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔" عبداللہ کے کہنے پہ نگارش نے زری کو دیکھا وہ فوراً" نظر جھکا گئی۔

"جی آرہی ہوں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اور ہاں زری تم میرے لیے ایک کپ چائے لے آؤ۔" عبداللہ نے جاتے جاتے کام بھی کہہ دیا اور زری بری طرح ٹھٹک گئی تھی وہ جس کام سے کترا رہی تھی وہی کام سامنے آگیا تھا مجبوراً" اٹھنے کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آیا تھا لیکن اس نے اٹھنے کے ساتھ ساتھ حل بھی سوچ لیا تھا۔ سو بڑے سکون اور اطمینان سے چائے بنانے آئی تھی۔ اس نے تین کپ چائے بنائی۔ نگارش اور عبداللہ کے لیے دو کپ ٹرے میں رکھ کر ان کے کمرے تک آئی اور دروازے پہ دستک دی۔

"آجاؤ زری۔" عبداللہ کی آواز میں لاپرواہی تھی لیکن زری کو اپنی بے اختیاری پہ کوئی اختیار نہیں تھا اس لیے وہ اندر نہیں جانا چاہتی تھی اسے پتا تھا کہ وہ اسے دیکھتے ہوئے باقی سب کچھ فراموش کر بیٹھے گی اور اس کی نظروں کی محویت یقیناً" گڑبڑ کر سکتی تھی۔ لہٰذا احتیاط ہی بہتر تھی۔

"بھائی چائے لے لیں، میں نیچے چولہا کھلا چھوڑ آئی ہوں میں نے نیچے جانا ہے۔" اس نے سوچا ہوا بہانا گھڑا۔

"چولہا کیوں کھلا چھوڑ دیا۔" عبداللہ دروازہ کھول کے باہر نکلا۔

"بھوک لگ رہی تھی کباب تلنے لگی ہوں۔" اس نے ٹرے عبداللہ کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے واپس بھاگنے کی سوچی۔

"تو پھر مجھے بھی دے جانا۔" عبداللہ نے پیچھے سے آواز دی اور زری ٹھٹک گئی۔

"ہیں اب کباب تلنے پڑیں گے؟" زری کا جھوٹ اس کے اپنے ہی گلے پڑ گیا تھا وہ منہ بناتی فریج سے کباب نکال کر چولہا جلانے لگی۔ رات کے بارہ بجے وہ اپنے جھوٹ کے ہاتھوں مجبور کچن میں کھڑی کباب تل رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

پورے فلیٹ میں اتنی خاموشی اور اتنا سناٹا تھا کہ اس کی سانسوں کا ارتعاش بھی شور نما لگ رہا تھا۔ وہ تکیے پہ سر رکھے اوندھے منہ لیٹا دنیا و جہاں سے بے خبر گہری نیند کی آغوش میں بے سدھ پڑا تھا' پورے کمرے میں پھیلاوا ایسا تھا کہ یوں لگ رہا تھا مہینہ بھر روزانہ صفائی ستھرائی ہوگی تو یہ پھیلاوا سمٹے گا۔ سگریٹ کے ٹکڑے' شراب کی خالی بوتلیں' جوس اور کولڈ ڈرنک کے خالی کین' استعمال شدہ ٹشو' قالین پہ بکھری ہوئی سی ڈیز' کشنز اور تکیے' اور ایسی ہی اور بھی بے شمار اشیاء تھیں جن کو دیکھ کر دماغ گھوم کے رہ جاتا لیکن وہ اس سب کے باوجود اتنے پھیلاوے میں بھی سکون کی نیند سو رہا تھا اور اس کی اس نیند اور سکون میں خلل اس کی مام نے ڈالا تھا۔

تکیے کے نیچے رکھے موبائل کی وائبریشن اتنی تیز تھی کہ نیند کے باوجود وہ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا تھا۔ اور پھر اس سارے ماحول کو سمجھنے کی کوشش کی۔ چند سیکنڈ غور کرنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ وہ اپنے دوست صائم کے فلیٹ پہ ہے اور رات سے یہیں پہ ہے آج تو وہ رات کو بھی حویلی نہیں گیا تھا اور حویلی کا خیال آتے ہی وہ تھوڑا محتاط ہو گیا تھا اس نے لپک کے تکیے کے نیچے سے اپنا موبائل نکال لیا۔

"ہیلو۔" اس نے کال اٹینڈ کرلی۔

"جودت؟" ان کے لہجے کا غصہ اور کاٹ وہ باآسانی محسوس کر رہا تھا۔

"یس مام؟" وہ آہستگی سے بولا۔ اور دوسری طرف ثروت بیگم اس کی نیند سے بوجھل آواز کو فوراً" بھانپ گئیں وہ ابھی سو کر اٹھا ہے۔

"رات سے کہاں ہو؟ گھر کیوں نہیں آئے؟" ان کا نرمی سے عاری لہجہ جودت کو بہت جلد نیند کے شکنجے سے نکال کر اس کے ازلی ہٹ دھرم اور لاپروا انداز میں لے گیا تھا۔

"آپ اتنی فکر مند کیوں ہو رہی ہیں؟ جہاں بھی ہوں زندہ ہوں۔" وہ بالوں میں ہاتھ پھیرتا دوبارہ بیڈ پہ لیٹ گیا تھا۔

"مجھے بھی پتا ہے زندہ ہو' اسی لیے تو کال سن رہے ہو' مگر میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ تم رات گھر کیوں نہیں آئے؟" ثروت بیگم کو احساس تھا کہ وہ دن بہ دن اور زیادہ بگڑتا جا رہا تھا اس کی سرکشی بڑھتی جا رہی تھی اور وجہ یہ تھی کہ حویلی کے مرد حضرات اس کی ایسی لوفرانہ حرکات سے بے خبر تھے ابھی تک انہوں نے اس کے آنے جانے کا اور یار دوستوں کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا تھا اسی لیے وہ تھوڑا آزاد اور بے فکر ہو کر یہ سب کچھ کرتا پھر رہا تھا۔

"وجہ بتانا میں ضروری نہیں سمجھتا۔" اس کی آنکھوں میں رات کے مناظر گھوم گئے۔

"وجہ میں جانتی ہوں۔" وہ چبا کے بولیں۔

"پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہیں؟" وہ ماں کی ذہانت پہ چونکا مگر پھر سنبھل گیا تھا۔

"تمہارے منہ سے سننا چاہتی ہوں۔" انہوں نے زور دے کر کہا۔

"دیکھو جودت' شرافت سے گھر آجاؤ' آذر بھی آنے والا ہے وہ پہلے ہی پریشان ہے صبح سے دھکے کھاتا پھر رہا ہے۔ اگر اسے تمہاری رات بھر کی غیر موجودگی کا پتا چلا تو بہت برا ہوگا۔" ثروت بیگم زیادہ دیر اپنی پریشانی چھپا نہیں سکی تھیں۔

"آذر بھائی پریشان کیوں ہیں؟ اور صبح سے دھکے کس لیے کھا رہے ہیں؟" اس کے لہجے کی لاپروائی ہنوز تھی البتہ اندر سے وہ بھی ٹھٹک سا گیا تھا۔

"کیا تمہیں ابھی تک نہیں پتا چلا؟" ثروت بیگم کو حیرانی ہوئی حالانکہ جانتی بھی تھیں کہ وہ ابھی سو کر اٹھا ہے۔

"کیا مطلب؟ مام آپ بتائیں نا کیا ہوا ہے؟" وہ الجھن آمیز انداز سے بولا۔

"آج صبح علیزے کالج جا رہی تھی جب اچانک راستے میں دو موٹر سائیکل سوار آئے اور گاڑی پہ فائرنگ کر کے بھاگ گئے۔"

"ہیں؟ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟" جودت یکدم اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

"ٹھیک کہہ رہی ہوں خیرو بابا ہسپتال میں ہیں ان کو گولی لگی ہے' زندگی اور موت سے لڑ رہے ہیں' علیزے ابھی تک دہشت اور خوف کے مارے روئے اور چلائے جا رہی ہے وہ بھی کافی بے حال ہو چکی ہے' آذر پولیس اور پریس والوں کی طرف بھاگ دوڑ کر رہا ہے احمد اور دانیال وغیرہ بھی ہسپتال میں ہیں خیرو بابا کے پاس' عون' عدید اور زین وغیرہ تو ہیں ہی چھوٹے وہ بھلا کیا کر سکتے ہیں؟ اور ایک تم ہو جس کو کچھ خبر ہی نہیں ہے' جس کی لاپروائیاں خود ایک مصیبت بن چکی ہیں۔" ثروت بیگم کی بات پہ جودت کو اندر ہی اندر ان لوگوں کی پریشانی اور اپنی کوتاہی کا احساس ہوا تھا وہ حقیقتاً" گھر اور گھر والوں سے بے خبر اور لاتعلق رہنے لگا تھا۔

"خیرو بابا کس ہسپتال میں ہیں؟" جودت نے تیزی سے اٹھتے ہوئے پوچھا اس کا رخ باتھ روم کی طرف تھا وہ شاور لینا چاہتا تھا۔

"تم ہسپتال جانے کی بجائے گھر آؤ۔"

"کیوں؟" اس نے اچنبھے سے دیکھا۔
"کیونکہ گھر پہ کوئی نہیں ہے صرف تمہارے ڈیڈ اور ڈیڈی وغیرہ ہیں' ہوسکتا ہے کوئی کام ہی پڑ جائے؟ کسی لڑکے کا حویلی میں ہونا ضروری ہے۔" ثروت بیگم نے اسے سمجھایا اور کچھ دیر کے لیے تو وہ واقعی سمجھ بھی گیا تھا۔
"ٹھیک ہے میں گھر ہی آرہا ہوں۔" اس نے اثبات میں جواب دیا تو انہوں نے فون بند کردیا تھا۔
لیکن ان کی کال بند ہوجانے کے بعد بھی اس کا ذہن ان کی باتوں کے گرد ہی چکرا تا رہا تھا وہ بڑے الجھن بھرے انداز میں علیزے پہ ہونے والی فائرنگ کے متعلق سوچتا' شاور لے کر تیار ہوا اور فلیٹ سے باہر نکل آیا تھا۔
"ارے کہاں جارہے ہو؟" سامنے سے آتے سائم نے حیرت سے استفسار کیا تھا۔
"حویلی۔"
"لیکن کیوں؟ تم تو کہہ رہے تھے آج بھی یہیں رکو گے؟" سائم نے آج رات کے لیے بھی کافی بندوبست کررکھے تھے اسی لیے متفکر ہورہا تھا۔
"نہیں یار ایک پرابلم ہوگیا ہے گھر جانا ضروری ہے۔" جودت کو اس وقت کسی چیز سے بھی دلچسپی نہیں تھی۔
"کیا مطلب؟ کیسی پرابلم؟" سائم ٹھٹکا۔
"ابھی تو مجھے خود بھی ٹھیک سے نہیں پتا بس مام کی کال آئی تھی۔" جودت نے چابی نکال کر سائم کے حوالے کی۔
"تو وہ تمہارا رات والا پروگرام؟"
"یار کینسل کردو۔" جودت جھنجلا کر بولا اور پھر سائم کو ایک طرف ہٹا کر خود سیڑھیاں اتر گیا تھا وہ کسی چیز کا نوٹس نہ لیتا تو کبھی نہ لیتا لیکن اگر لے لیتا تھا تو پھر پوری طرح سے انوالو ہوکر نوٹس لیتا تھا عام طور پہ وہ بھی حویلی والوں کی کوئی فکر اور قدر نہیں کرتا تھا لیکن کچھ رشتے ایسے تھے کہ جن سے وہ حقیقتاً" انسیت رکھتا تھا اور ان کی عزت اور قدر کرتا تھا اس کی کزنز کومل اور علیزے بھی انہی رشتوں میں شمار ہوتی تھیں لہٰذا علیزے کی پریشانی پہ پریشان ہونا اس کے دل کی بے اختیاری حرکت تھی۔
وہ گھر پہنچا تو سب سے پہلے علیزے سے ملنے ہی گیا تھا مگر وہ سو رہی تھی سو مجبوراً" نیچے ڈرائنگ روم میں چلا آیا جہاں باقی سب بھی بیٹھے ہوئے تھے اپنی الجھن اور پریشانی میں کسی نے بھی اس کی آمد پہ دھیان نہیں دیا لیکن اسرار آفندی کے برابر بیٹھی ثروت بیگم کی ملامتی نظریں اسی پہ تھیں وہ کھسیا کر ان سے نظریں چراتا کومل سے ساری تفصیل پوچھنے لگا جس پہ اسرار آفندی نے ان سب کو ڈرائنگ روم سے باہر بھیج دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

آذر کی سرتوڑ کوشش تھی کہ اس معاملے کو اخبارات اور نیوز چینلز سے دور رکھا جائے' تاکہ لوگوں کو کریدنے اور انگلی اٹھانے کا موقع نہ ملے اور کہیں بھی ملک کے مشہور و معروف بزنس مین وقار آفندی کی بیٹی علیزے آفندی کا نام غلط انداز سے نہ لیا جائے۔ اور اسی لیے وہ صبح سے ہزاروں جگہوں پہ ادھر سے ادھر بھاگ دوڑ کرتا پھر رہا تھا کبھی خیرو بابا کے پاس ہاسپٹل جاتا' کبھی پولیس اسٹیشن' کبھی پریس والوں کے دفتر اور کبھی کہیں۔۔۔ اسی چکر میں صبح سے شام' اور شام سے رات ہوگئی تھی اس نے اس ایک دن میں لاکھوں روپے بھی خرچ کردیے تھے صرف اس لیے کہ یہ معاملہ دبا رہے اور کسی کے علم میں نہ آئے۔
ایسے معاملوں میں لوگوں کے منہ صرف پیسے دے کر ہی بند کیے جاتے تھے سو اس نے یہ منہ پوری تسلی سے بند کیے تھے ہاسپٹل سے لے کر پولیس اسٹیشن اور پریس والوں تک اس نے پیسے کے لڈو بانٹ دیے تھے اور پیسے کے

لڈو کھانے کے بعد کوئی بھی بولنے کے قابل نہیں تھا اور وہ خود مطمئن ہوکر گھر جانے کے لیے ہسپتال سے نکلا تھا۔ خیرو بابا کے پاس دانیال اور احمد کو چھوڑ دیا تھا تاکہ خیرو بابا کو ۔۔۔ کسی چیز کی ضرورت پڑے تو وہ لوگ بروقت پہنچادیں۔ آذر کا دھیان ڈرائیونگ کے دوران بھی اسی مسئلے کی طرف تھا اس کے ذہن میں صبح سے کئی سوال مچل رہے تھا اور ان سوالوں کے جواب صرف ڈیڈ اور علیزے کے پاس تھے اسی لیے وہ یہ سوال ذرا فرصت سے کرنا چاہتا تھا تاکہ تسلی بخش جواب لے سکتا کیونکہ ان سوالوں کے جواب وہ فون پہ نہیں لینا چاہتا تھا بلکہ روبرو پوچھنا چاہتا تھا۔
رات کے بارہ بجے کا ٹائم تھا جب اس کی گاڑی حویلی میں داخل ہوئی تھی' اس وقت بھی تقریباً" سب ہی افراد جاگ رہے تھے' سب ہی کو آذر کا ہی انتظار تھا خصوصاً" وقار آفندی کو۔
"السلام علیکم۔" اس نے ڈرائنگ روم میں قدم رکھتے ہوئے موجود افراد پہ طائرانہ سی نگاہ دوڑائی۔
"وعلیکم السلام۔" وقار آفندی اسے دیکھ کر کھڑے ہوگئے اور اس کے قریب چلے آئے تھے۔
"آؤ بیٹھو' تم ٹھیک تو ہو؟" وہ اس کے چہرے کی تھکن بھانپتے ہوئے بولے۔
"اٹس او کے ڈیڈ' میں ٹھیک ہوں۔" وہ ان کے ساتھ آگے بڑھ کے صوفے پہ بیٹھ گیا۔
"بھوک لگی ہے تو کھانا لگواؤں؟" ثروت بیگم بیٹے کے لیے فکرمند ہورہی تھیں۔
"نہیں ابھی نہیں۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔
"چائے لوگے؟"
"نہیں کھانے کے بعد لے لوں گا' ابھی کچھ نہیں چاہیے۔" اس نے دوبارہ انکار کردیا۔
"خیرو بابا! کیسے ہیں؟ کچھ ہوش آیا؟" آسیہ آفندی بھی خاصی پریشان تھیں۔
"ہاں پہلے سے ٹھیک ہیں وہ' لیکن دوائیوں کی وجہ سے غنودگی چھائی ہوئی ہے' ان شاء اللہ صبح تک مکمل ہوش میں آجائیں گے۔" اس نے ان کو تسلی دی۔ وہ ویسے بھی ملازموں کی بہت کیئر کرتی تھیں۔
"شکر ہے اللہ کے فضل پڑھتوں گی جب وہ ٹھیک ہوجائیں گے۔" آسیہ آفندی نے اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے کہا۔
وہ صبح سے خیرو بابا کے لیے متفکر تھیں اور دانیال وغیرہ سے کئی بار ان کی خیریت پوچھ چکی تھیں۔
"ہوں اچھی بات ہے۔" اس نے سر ہلایا۔
"آسیہ! تم علیزے کے پاس جاؤ اسے کچھ کھانا وغیرہ دو۔" وقار آفندی نے ان دونوں خواتین کو وہاں سے جانے کا ہلکا سا اشارہ دیا تھا وہ خاموشی سے اٹھ کر باہر چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد وہ آذر کی طرف متوجہ ہوئے۔
"کچھ سراغ ملا؟" ان کا انداز متجسس تھا۔
"ڈیڈ سرا ہو تو سراغ ملتا ہے اور یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔" آذر تلخی سے بولا۔
"کیا مطلب؟"
"مطلب یہ کہ بس دو لوگ موٹر سائیکل پہ آئے اور علیزے کی گاڑی پہ اندھادھند فائرنگ کرکے بھاگ گئے' ان دونوں کو کسی نے نہیں دیکھا کیونکہ دونوں کے چہروں پہ رومال بندھے ہوئے تھے' وہ کس طرف سے آئے اور کس طرف چلے گئے؟ کچھ پتا نہیں۔ ان کی موٹر سائیکل کا نمبر وغیرہ کیا تھا؟ کچھ پتا نہیں۔ وہ خود ہمارے دشمن تھے یا محض کرائے کے غنڈے تھے؟ یہ بھی پتا نہیں۔۔۔ اور جب ہمیں کچھ بھی پتا نہیں تو سراغ کیسے ملے گا؟" آذر بے بسی سے لفظ چبا کر بات کررہا تھا۔۔۔ لیکن کچھ یاد آنے پر ٹھٹک گیا۔
"ڈیڈ آپ کا سیل کہاں ہے؟"
"کیوں؟" وقار آفندی چونکے۔

"بس کچھ یاد آگیا ہے۔" آذر کے انداز میں بے چینی در آئی۔

"یہ لو۔" انہوں نے صوفے کی سائیڈ پہ رکھی چھوٹی کرسٹل ٹیبل سے سیل اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا۔ آذر نے تیزی سے ریسیوڈ کالز کا ریکارڈ چیک کیا۔

"صبح جس نمبر سے آپ کو کال آئی تھی کیا وہ لینڈ لائن نمبر تھا؟" آذر ایک نمبر پہ ٹھہرتے ہوئے بولا وہ کنفرم کرنا چاہ رہا تھا۔

"ہاں! لینڈ لائن نمبر تھا۔" انہوں نے یاد کرتے ہوئے سر ہلایا۔

"اس آدمی نے آپ سے کیا کہا؟" آذر کے سوال پہ وہ چونک گئے اس سوال کا جواب ذرا مشکل تھا ان کے چہرے کی رنگت سرخ پڑ گئی۔

"ڈیڈ پلیز کھل کے بتائیے کچھ بھی چھپانے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے ان کی ہمت بندھائی اور مجبوراً وقار آفندی کو بتانا پڑا نظریں جھکی ہوئی تھیں وہ آدمی ان کی بیٹی کے لیے اتنی ہتک اور حقارت سے بات کر رہا تھا کہ اس کو دوبارہ سوچتے ہوئے وقار آفندی کے سینے میں آگ لگ گئی تھی۔ اور اس کو سن کر آذر کا چہرہ بھی لال ہو گیا تھا۔

"آپ کے خیال میں یہ آدمی کون ہو سکتا ہے؟"

کیا آج کل بزنس میں ہماری کسی سے ان بن چل رہی ہے؟" اس نے وقار آفندی، اسرار آفندی اور اظہار آفندی کو ایک ساتھ سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"نہیں ایسا تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" اسرار آفندی نے نفی میں گردن ہلائی۔

"آپ لوگ ایک بار پھر سارے معاملات کو غور اور دھیان سے سوچ لیں، کبھی کسی سے کوئی جھڑپ کوئی جھگڑا، کوئی تو تو میں میں یا پھر کوئی ناانصافی ہوئی ہو؟" آذر نے ان کو اپنا اپنا حافظہ کھنگالنے کا مشورہ دیا تھا اور وہ لوگ آذر کی بات پہ چونک گئے تھے۔

"ہاں میں ٹھیک کہہ رہا ہوں، ہو سکتا ہے کہ کسی پرانی رنجش کی بنا پر ایسا ہوا ہو؟" آذر ہر پہلو پہ سوچ رہا تھا۔

"لیکن بیٹا تم جانتے تو ہو کہ ہماری تو کسی سے کوئی دشمنی ہے کوئی مخالفت بھی نہیں ہے، سب کچھ تمہارے سامنے ہی تو ہے؟" وقار آفندی الجھ گئے تھے۔

"لیکن ڈیڈ بغیر وجہ کے کوئی ایسا کیوں کرے گا؟" آذر کے سوال بھی الجھے ہوئے تھے۔

"بیٹا صبح سے ہم لوگ بھی تو "وجہ" ہی سوچ رہے ہیں نا؟ آخر کسی نے ایسا کیوں کیا؟ اس کے پیچھے کوئی مقصد ہے تو اپنا مقصد بتائے۔" اسرار آفندی بھی پر سوچ اور متفکر سے انداز میں بولے تھے۔

"تم اس نمبر کا پتا کرواؤ یہ نمبر کس کا ہے؟" اظہار آفندی نے سیل کی طرف اشارہ کیا۔

"وہ تو میں صبح ہوتے ہی کرواؤں گا لیکن مجھے یقین ہے یہ نمبر کسی کا ذاتی نمبر نہیں ہے کوئی اپنے گھر کے نمبر سے ایسی حرکت کبھی نہیں کر سکتا یقیناً "یہ نمبر کسی پی سی او یا پھر کسی پبلک پلیس کا ہوگا۔" وہ بہت زیادہ سوچ بچار سے کام لے رہا تھا وہ لوگ بھی اس کی بات سے متفق تھے۔

"تو پھر کیا کیا جائے؟"

"سوچتے ہیں کچھ کہ کیا کرنا ہے؟" آذر نے سر ہلایا اور پھر وقار آفندی کی طرف متوجہ ہوا۔

"علیزے کہاں ہے؟"

"اپنے بیڈ روم میں، کیوں؟"

"میں نے اس سے کچھ پوچھنا ہے۔"

"لیکن وہ تمہارے سوالوں کے جواب نہیں دے پائے گی۔ وہ بہت اپ سیٹ ہے۔" وقار آفندی نے فکرمندی سے کہا وہ علیزے کے معاملے میں ماؤں سے زیادہ حساس ہو جاتے تھے ہر لمحہ اس کی فکر میں مبتلا رہتے تھے۔

"میں اسے اپ سیٹ نہیں ہونے دوں گا۔" آذر کو پتا تھا کہ وہ علیزے کو ہینڈل کر لیتا ہے، اور وہ اس سے ساری بات باآسانی پوچھ لے گا۔

"اوکے جیسا تم مناسب سمجھو۔" انہوں نے اجازت دے دی۔

"آپ زیادہ ٹینشن نہ لیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔" آذر نے انہیں تسلی دی۔

"ان شاء اللہ۔" انہوں نے دل سے کہا۔ لیکن اس سے پہلے کہ آذر وہاں سے اٹھ کر علیزے کے بیڈ روم میں جاتا وقار آفندی کے سیل پہ میسج ٹون بجی آذر صوفے سے اٹھتے اٹھتے دوبارہ بیٹھ گیا تھا اور وقار آفندی کی بجائے سیل بھی اسی نے اٹھایا تھا اور پھر میسج اوپن کیا۔

"وقار آفندی میری ایک جھلک تم آج صبح دیکھ چکے ہو، اور دوسری جھلک تم کل صبح دیکھو گے، انتظار میں رہنا۔" میسج پڑھتے ہی آذر کے چہرے پہ تناؤ آگیا تھا اس کے لب بھنچ گئے تھے اس نے فوری اسی نمبر پہ کال ملائی لیکن دوسری طرف وہ نمبر آف جا رہا تھا۔

"آذر کیا بات ہے؟ کس کا میسج ہے؟" اسرار آفندی بیٹے کے چہرے پہ پریشانی کے سائے دیکھ چکے تھے۔

"کچھ نہیں، آپ لوگ آرام کریں۔" وہ میسج ڈیلیٹ کر کے وہاں سے نکل گیا اور پیچھے وہ تینوں بھائی دیکھتے رہ گئے تھے انہیں اندازہ ہو چکا تھا کہ کوئی پریشانی والی بات ہے۔ لیکن کیا...؟

☼ ☼ ☼
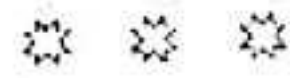
منصور حسین ہر بات سے بے نیاز اور بے خبر صبح ہی صبح حویلی کے گیٹ پہ پہنچ گیا تھا حویلی کا چوکیدار عارف اسے دیکھ کر خوش بھی ہوا اور پریشان بھی۔

"کیسے ہو منصور حسین؟" اس نے مصافحہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"جیسا نظر آرہا ہوں۔"

"ماشاء اللہ نظر تو ٹھیک آرہے ہو، صحت بھی اچھی خاصی ہے۔" عارف نے اسے سر تا پا جانچا۔

"پیدائشی صحت مند ہوں، ادھر ادھر سے کھا کر صحت مند نہیں ہوا۔" اس نے خفگی سے کہا۔

"ہاں یہ تو لگ رہا ہے، ورنہ اتنی غربت میں ایسی صحت کہاں رہتی ہے؟" عارف نے اس کی بات سے اتفاق کیا۔

"تم یہ بتاؤ مبارک خان کہاں ہے؟" وہ اپنے مطلب کی بات پہ آگیا۔

"مبارک خان تو حویلی میں ہی ہے لیکن تمہیں آج نہ تو مبارک خان ملے گا اور نہ ہی کوئی کام وام۔" عارف مایوسی سے بولا۔

"کیوں حویلی کے اندر کوئی آفت آگئی ہے کیا؟" منصور حسین جل کے بولا تھا۔

"ارے یار آفت ہی سمجھو۔" عارف افسوس کا اظہار کر رہا تھا اور منصور حسین چونک گیا۔

"کیوں؟ کیا ہوا ہے؟" اس کا سوال بے ساختہ تھا۔

"وہ کل علیزے بی بی۔" عارف کچھ کہتے کہتے اچانک رک گیا اسے بے دھیانی میں خیال آیا کہ وہ حویلی کا پرسنل معاملہ کسی اجنبی کے گوش گزار کرنے لگا ہے اور یہ خیال آتے ہی اس نے اپنی زبان روک لی تھی۔

"بتاؤ نا کیا ہوا؟ اور علیزے بی بی کون ہے؟" منصور حسین ایک فطری تجسس کے ہاتھوں پوچھ رہا تھا لیکن

عارف یہ غلطی نہیں کر سکتا تھا۔

"کوئی نہیں تم کوئی اور بات کرو۔" عارف کے بات بدلنے پہ منصور حسین کو غصہ آیا مگر اس سے زبردستی تو نہیں پوچھ سکتا تھا؟ سو اسے بھی بات بدلنی ہی پڑی تھی۔

"مبارک خان کو بلاؤ۔" وہ کافی تلخی سے بولا تھا مبارک خان سے اس کی اچھی خاصی گپ شپ تھی جبکہ عارف کو اس کے انداز پہ حیرانی ہوئی تھی۔

"وہ ابھی اپنے کام پہ تمہیں آیا ہوگا' اپنے کوارٹر میں ہوگا۔"

"تو تم کوارٹر سے بلا لاؤ۔"

"نہیں نہیں میں گیٹ خالی چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔"

"تمہیں میرے اندر آجانے کا ڈر ہے تو ایسا کرو گیٹ اندر سے بند کر کے چلے جاؤ۔" اس نے ذہانت کا ثبوت دیا۔

"میں نہیں جانے والا تم چلے جاؤ بعد میں آجانا۔" عارف بے زاری سے بولا۔

"ہونہہ! جانے والا تو میں بھی نہیں ہوں' جاؤں گا تو مبارک خان سے بات کر کے جاؤں گا' آخر وہ مجھے کس کھاتے میں اتنے لارے لگا کے خوار کر رہا ہے؟" منصور حسین بھی شاید اپنے نام کا ایک ہی تھا اس روز کی طرح آج بھی عارف کی کرسی گھسیٹ کر خود ہی بیٹھ گیا۔

"ارے تو تو بڑا ڈھیٹ آدمی ہے۔" عارف حیرت سے بولا۔

"اب چپ کر کے بیٹھ جاؤ' ورنہ اپنا ڈھیٹ پن تمہیں دکھا بھی دوں گا۔" منصور حسین مزاج کے لحاظ سے غصے کا تیز لگتا تھا اور ایسے لوگ کچھ بھی کر سکتے ہیں یہی سوچ کر عارف دوسری کرسی لے کر خود بیٹھ گیا۔

"عارف! آذر صاحب کہاں گئے ہیں؟" مبارک خان کسی کام سے آیا تو سامنے منصور حسین کو بیٹھا دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

"منصور حسین؟" وہ قریب چلا آیا۔

"ہاں منصور حسین ہی ہوں' غور سے دیکھ اور پہچان لو' تمہارے انتظار میں لیلیٰ یا مجنوں تو نہیں بن گیا؟" منصور حسین کا لہجہ طنزیہ تھا۔

"دیکھو منصور حسین میں تمہیں ساری بات بتاتا ہوں تم بس۔۔۔"

"تم مجھے ساری بات نہ بتاؤ صرف اتنا بتا دو کہ مجھے کام مل رہا ہے یا نہیں؟" منصور حسین دوٹوک لہجے میں بولا۔

"ابھی کیسے بتا دوں؟ کل میں صاحب کے آفس میں بیٹھا تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا کہ اچانک ایک مصیبت بن گئی۔ صاحب اسی وقت گھر آگئے اور میں تمہارا فون بھی نہ سن سکا۔" مبارک خان نے صفائی پیش کی۔

"تم فون نہیں سن سکے؟ کل میں پورا ایک گھنٹہ آفس کے باہر انتظار کرتا رہا' پھر تمہارے نمبر پہ کال کر کے تھک گیا مگر تم نے بات ہی نہیں کی' مبارک خان اگر تم نے بھی مجھے اسی طرح ذلیل و خوار کرنا تھا تو پھر بہتر تھا کہ میں کہیں اور جا کر ذلالت اٹھا لیتا۔" منصور حسین بے بسی سے بولا' عارف اور مبارک خان لمحہ بھر کے لیے چپ سے ہو گئے تھے۔

"دیکھو یار ایک مسئلہ ہو گیا ہے وہ ٹھنڈا ہو جائے تو ان شاء اللہ تمہیں نوکری ضرور دلاؤں گا۔" مبارک خان نے وعدہ کیا۔

"یہاں کیا ہو رہا ہے؟" آذر کی آواز ان لوگوں کے عقب سے ابھری تھی انہوں نے چونک کر دیکھا وہ جاگنگ پہ گیا ہوا تھا اور ابھی جاگنگ سے ہی واپس آرہا تھا اس وقت وہ جاگر زپنے ٹریک سوٹ میں ملبوس رات کے مقابلے

میں تھوڑا فریش لگ رہا تھا شاید ذہن سے کچھ دیر کے لیے بوجھ اور پریشانی ہٹی ہوئی تھی۔

"صاحب یہ۔ یہ منصور حسین ہے' بڑے صاحب سے ملنا چاہتا ہے' پہلے بھی ایک بار مل چکا ہے۔" عارف تیزی سے بولا تھا لیکن آذر کے ماتھے پہ بل پڑ گئے تھے۔

"یہ کون سا وقت ہے ملنے کا؟"

"صاحب یہ روز آتا ہے لیکن صاحب سے ملاقات نہیں ہو پاتی اس لیے آج صبح صبح آگیا ہے۔" مبارک خان نے بھی وضاحت دی۔

"اوکے۔ اوکے ہو جائے گی ملاقات' لیکن آج نہیں کچھ دن صبر کرو۔" آذر منصور حسین سے مخاطب ہوا تھا۔ مبارک خان نظر چرا گیا اسے منصور حسین کی مایوس نظروں سے شرمندگی ہو رہی تھی۔ وہ ایک بار پھر واپس جانے کے لیے پلٹ گیا تھا۔

"سنو۔" آذر نے آواز دی۔

"جی؟" وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"تم کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہو؟" آذر نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھا۔

"صاحب اپنے لیے کام ڈھونڈ رہا ہوں' ان سے کام مانگنے آیا تھا۔"

"او اچھا' اچھا میں سمجھا۔۔۔" آذر اس کے جواب سے تھوڑا ریلیکس ہو گیا ورنہ وہ کل والے معاملے کے لیے خاصا مشکوک ہو رہا تھا۔ منصور حسین کے جانے کے بعد وہ لوگ اندر آگئے۔ لیکن اندر آذر کے لیے ایک اور دھماکا منتظر تھا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

☆ ☆

نبیلہ عزیز

دردِ دل

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور عدیل تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدیحہ اور نبیل حیات دوی بہن بھائی ہیں۔ مدیحہ انتہائی مغرور اور خود سر لڑکی ہے۔ وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پر رنگ چکی ہے۔ جس کے پیش نظر فائزہ بیگم، نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں۔ لیکن مدیحہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے۔ جس پر نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے۔ مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے۔ مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ بے بسی اور مجبوری سے تنگ آ کر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے۔ لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے بابا امتیاز مل جاتا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے۔ جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے۔ اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے۔ وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے۔ وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دلاور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے۔ وہ اپنے قول و فعل کا سچا اور پکا آدمی ہے۔ اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا۔ اس کی ماں عقیل شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔

۵

پانچویں قسط

بڑے سے ڈائننگ ہال میں سولہ کرسیوں کی طویل ڈائننگ ٹیبل کی بالکل سامنے والی کرسی وقار آفندی کے لیے مخصوص تھی اور روزانہ صبح کے وقت وہ اسی کرسی پہ بیٹھے نیوز پیپر پڑھتے یا پھر ناشتا کرنے میں مصروف نظر آتے تھے۔ آج ان کے سامنے ناشتا بھی رکھا ہوا تھا اور نیوز پیپر بھی لیکن وہ خود سر تھامے بیٹھے پریشان حال نظر آ رہے تھے۔ دائیں طرف کی کرسیوں پہ اسرار آفندی اور اظہار آفندی براجمان تھے جبکہ ان کے بالکل مقابل والی کرسیوں پہ ثروت بیگم اور شمو بیگم بیٹھی ہوئی تھیں البتہ تائی (آسیہ آفندی) اس وقت کہیں نظر نہیں آ رہی تھیں۔

آذر اندر قدم رکھتے ہی ماحول کی سنگینی بھانپ گیا تھا کسی انہونی کا احساس اسے ان سب کے چہروں سے ہی ہو چکا تھا وہ لب بھینچے وقار آفندی کے قریب آ کھڑا ہوا تھا۔

"آذر! تم نے نیوز پیپر پڑھا؟" دانیال پریشانی کے عالم میں نیوز پیپر ہاتھ میں پکڑے خاصے تیز قدموں سے ڈائننگ ہال میں داخل ہوا تھا اور آذر کا انداز الجھا ہوا تھا۔

"یہ دیکھو۔" اس نے نیوز پیپر کا ہیڈ لائن والا پیج آذر کے سامنے کر دیا اور جیسے ہی آذر کی نظر ہیڈ لائن پہ گئی اس کی کنپٹی کی رگیں ابھر آئی تھیں اور دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھنچ گئی تھیں اس کا خون کھول اٹھا تھا وہ نہیں جانتا تھا کہ اخبار والے اس کے ساتھ اس طرح دھوکا کریں گے کل اس نے پورا دن اسی بھاگ دوڑ کی نذر کر دیا تھا لیکن حاصل کیا ہوا؟ وہی بدنامی اور رسوائی؟ وہی وقار آفندی کی بیٹی کے نام کا چرچا...؟ وہی لوگوں کی کریدتی ہوئی سوالیہ نظریں اور چٹخارے؟

"میں ان لوگوں کو نہیں چھوڑوں گا۔ میں نے ذلیلوں کو لاکھوں روپے صرف ایک دن میں کھلایا ہے میں ان پہ کیس کروں گا۔ آخر انہوں نے ایسا کیوں کیا؟" آذر دوبارہ نیوز پڑھتے ہوئے بھڑک اٹھا اور پھر نیوز پیپر وہیں ہاتھ میں دبوچے وہ ڈائننگ ہال سے لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا تھا۔

"آذر! کول پلیز بات سنو۔" دانیال اس کے پیچھے لپکا۔

"آذر واپس آؤ۔" اسرار آفندی بھی بیٹے کے پیچھے باہر آئے تھے لیکن وہ ان سے کافی فاصلے پہ تھا۔

"دانیال! روکو اسے۔" انہوں نے دانیال کو اشارہ کیا اب کی بار دانیال بھاگنے کے سے انداز میں اس کے پیچھے گیا تھا۔ آذر اپنی گاڑی کا دروازہ کھول ہی رہا تھا کہ دانیال نے اسے جیکٹ سے پکڑ کر روک لیا۔

"پلیز دانیال چھوڑو مجھے مجھے پتا کرنے دو کہ ان پریس والوں نے یہ بے غیرتی کیوں کی ہے؟ ایک حملہ کل ان لوگوں نے کیا تھا اور ایک حملہ آج ان لوگوں نے کیا ہے انہوں نے ہماری عزت اچھالی ہے ہمیں بدنام کر کے رکھ دیا ہے انہوں نے غداری کی ہے میرے ساتھ۔" آذر بری طرح بھڑک رہا تھا یہ خبر اس کے لیے کسی تازیانے سے کم نہیں تھی۔

وہ رات کو مطمئن ہو کر گھر لوٹا تھا کہ ایسی کوئی بھی حرکت نہیں کی جائے گی لیکن پریس والوں نے تو اس کا سارا اطمینان غارت کر کے رکھ دیا تھا۔

"یہ غداری کروائی گئی ہے میری جان۔" اسرار آفندی کی آواز پہ وہ ان کی طرف پلٹا ان کی بات ہی ایسی تھی۔

"کیا کہا آپ نے؟" وہ ان کو استعجابیہ انداز سے دیکھ رہا تھا۔

"یہ غداری کروائی گئی ہے جس طرح تم نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے اس خبر کو روکا اسی طرح اس خبر کو پھیلانے والے نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے اس خبر کو پھیلایا ہے۔ تم نے اگر لاکھوں روپے ایک

دن میں کھلایا ہے تو اس نے لاکھوں روپے ایک گھنٹے میں کھلایا ہو گا۔ تو پھر اس چیز سے اندازہ لگا لو کہ مخالف پارٹی کمزور یا پھر حیثیت میں ہم سے کم نہیں ہے۔ جہاں ہماری پہنچ ہے وہاں پہنچنا اس کے لیے مشکل نہیں ہے اور ایسے حالات میں غصے اور جذباتی انداز سے کام لینے کی بجائے عقل اور تحمل سے کام لینا پڑے گا' سوچو' سمجھو' غور و فکر کرو' تب کوئی قدم اٹھاؤ۔" انہوں نے بیٹے کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے تھپکا وہ ان کی بات تقریباً سمجھ چکا تھا۔

"تم اگر اس طرح مشتعل ہو کر اخبار والوں سے الجھو گے تو سمجھو اپنے آپ کو اور بھی رسوا کرو گے' میڈیا والوں سے دشمنی مول لینا حکومت کے بس کی بات نہیں ہم تو پھر ایک عام سے شہری ہیں۔ تم اس معاملے کو سمجھو لیکن ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ۔ ہمیں پتا ہے کہ یہ معاملہ ہماری عزت اور غیرت کا ہے لیکن عزت اور غیرت کے معاملے میں ہمیشہ قدم پھونک پھونک کے اٹھانا پڑتے ہیں۔ ہمیں تم پہ پورا بھروسہ ہے تم سب حل کر لو گے بس صبر سے چلو' سکون سے رہو۔" انہوں نے اسے ہر اونچ نیچ سے آگاہ کیا تھا آذر چپ ہو گیا۔

اس کے ذہن میں رات وقار آفندی کے سیل پہ آنے والا میسج پھر سے تازہ ہو گیا تھا۔

"ہونہہ! تو گویا اس نے اپنی دوسری جھلک دکھا ہی دی۔" وہ اخبار دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا دانیال اور اسرار آفندی اسے تھوڑا قائل کرتے ہوئے اندر لے آئے تھے لیکن اس کا ذہن ہنوز الجھا ہوا تھا۔

وہ برٹش لائبریری سے باہر نکلی تو یکدم ٹھٹک گئی' اچھا خاصا دن' رات میں ڈھل چکا تھا۔ صرف ایک گھنٹے میں موسم ایسی کروٹ لے لے گا اسے ہرگز امید نہیں تھی ہلکی ہلکی بارش کے ساتھ برف بھی گر رہی تھی روش پہ دور تک برف کی تہہ جم چکی تھی سبزہ درختوں اور گھاس پہ سفید برف کا غبار اترا ہوا لگ رہا تھا اور درختوں کے پتے برف کے بوجھ سے جھکے جا رہے تھے بارش اور برف باری میں وقتاً "فوقتاً" ہوا کا زور بھی شامل ہو جاتا تھا اور پہلے ہی برف کا بوجھ کندھوں پہ اٹھائے زمین کی طرف جھکنے والے درخت ہوا کے زور سے لہرا کے رہ جاتے تھے اور ان کا یوں رک رک کر ٹھہر ٹھہر کر لہرانا ان کی تھکن کا پتا دے رہا تھا اور ان درختوں جیسا حال اس کا اپنا بھی تھا۔

وہ لانگ "گرم" اونی ٹوپا پہنے ہوئے تھی لیکن جیکٹ گاڑی میں ہی رکھی ہوئی تھی' ہاتھوں پہ گلوز بھی نہیں چڑھائے تھے اور لائبریری کے احاطے سے نکل کر اپنی گاڑی تک جانا اتنی ٹھنڈ میں آسان بھی نہیں تھا لیکن اسے یہ مشکل کام کرنا ہی تھا آخر وہ کتنی دیر یہاں کھڑی ٹھہر سکتی تھی؟ اس نے اپنے پینٹ کی پچھلی پاکٹ میں اڈریس سلپ نکال کر اپنے پرس سے سلور کلر کے بیگ میں رکھا اور زپ بند کرنے کے بعد اطمینان سے میدان میں اتر گئی وہ روش پہ تیز قدموں سے چلتی ہوئی تقریباً "بھاگ رہی تھی اور اس کے جوگرز کے نیچے برف کی تہہ چرمرا رہی تھی وہ بھاگتے بھاگتے بھی اچھی خاصی بھیگ گئی تھی تیز ہوا کے تھپیڑوں اور برف کی بوچھاڑ نے کسی آسیب کی طرح اسے اپنے شکنجے میں لے کر اس پہ کپکپی اور لرزا طاری کر دیا تھا گاڑی کے پاس پہنچ کر اس نے بمشکل سرد ہاتھوں سے گاڑی کی چابی نکالی اور لاک کھول کر اندر بیٹھ گئی اس نے بیگ کندھے سے اتار کر فرنٹ سیٹ پہ پھینکا اور گاڑی کے کیبنٹ سے تولیہ نکال کر اپنا چہرہ اور ہاتھ پونچھے پھر ساتھ ہی ہیٹر بھی آن کر دیا۔

گاڑی میں ہیٹنگ ہوئی تو اس کے سردی سے تنے ہوئے اعصاب نارمل ہوئے تب جا کر اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور گھر کا رخ کیا تھا۔ آج شام آٹھ بجے ان کی "لندن گیٹ وک" سے پاکستان روانگی تھی اس نے تمام ضروری کام نمٹا لیے تھے بس یہ لائبریری کا تھوڑا کام رہتا تھا سو آج وہ نمٹانے آ گئی تھی یہ اب اسے کچھ نہیں کرنا تھا اس لیے اطمینان سے گھر کی طرف گامزن تھی۔ تقریباً "آدھے گھنٹے میں وہ گھر پہنچ گئی تھی۔ ڈور بیل پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے پلٹ کر سارے ایریا پہ نظر دوڑائی اور پھر طائرانہ نظری پرواز کرتے ہوئے مطینا کے کاٹیج پہ آ کر رک گئی۔ وہ چند سیکنڈ یوں ہی دیکھتی رہی اور ایک لمحے کو سوچا کیا وہ واقعی سب کچھ چھوڑ کے جا رہی ہے؟ کیا وہ پاکستان جانے کے لیے مان

گئی ہے؟ کیا وہ واقعی مشرقی لڑکیوں کی طرح ہتھیار ڈال چکی ہے؟"
"مدحیہ! کیا دیکھ رہی ہو؟" فائزہ بیگم کی آواز نے اسے چونکا دیا تھا وہ آج اپنی آواز اپنے لہجے سے ہی بہت ریلیکس اور پرسکون محسوس ہو رہی تھیں۔
"کچھ نہیں۔" وہ کہہ کر اندر آ گئی۔
"عبداللہ آیا ہوا ہے اپنی فیملی کے ساتھ۔" انہوں نے پیچھے سے اسے اطلاع دی، مدحیہ کے قدم ٹھٹک گئے۔
"زری بھی؟"
"ہاں! زری بھی آئی ہے۔" انہوں نے اثبات میں جواب دیا۔
"ہوں!" وہ مختصر ہوں میں جواب دے کر اوپر آ گئی۔
وہ لوگ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے ہوئے تھے اس لیے مدحیہ کو نہ دیکھ سکے۔
"کون تھا؟" نبیل نے عبداللہ سے بات کرتے کرتے فائزہ بیگم سے استفسار کیا تھا۔
"مدحیہ۔"
"اچھا آ گئی؟ کہاں ہے اب؟" زری نے فوراً اپنے انداز سے اس کے انتظار کا اظہار کیا تھا۔
"اوپر کپڑے چینج کرنے گئی ہے، بارش میں بھیگے ہوئے تھے۔" انہوں نے اندازہ لگاتے ہوئے کہا اور دوبارہ آ کر نگارش کے پاس بیٹھ گئیں۔ سلسلہ کلام جہاں سے منقطع ہوا تھا وہیں سے پھر شروع ہو گیا۔ وہ نگارش کو کسی ڈاکٹر پاس جانے کا مشورہ دے رہی تھیں اور نگارش ان کے مشورے پہ اچھی خاصی متفق تھی وہ بھی آج کل اپنی شادی شدہ لائف کے اسی پہلو پہ سوچ رہی تھی۔
"ہیلو ایوری باڈی! ہاؤ آر یو؟" اس نے خاصی اونچی آواز سے سب کو متوجہ کیا تھا۔
"ہیلو! تم کیسی ہو؟" نگارش نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا اور مدحیہ کے گلے مل کر باقاعدہ اس کے رخسار پہ پیار کیا تھا۔
"فرسٹ کلاس، آپ سنائیں، آج آپ کو فرصت کیسے مل گئی؟" حیرت کی بات تھی آج مدحیہ کسی سے شکوہ کر رہی تھی۔
"ہمیں تو فرصت مل گئی لیکن تمہیں تو وہ بھی نہیں ملی۔"
"ارے نہیں اب ایسی بھی بات نہیں ہے میرا پکا ارادہ تھا کہ جانے سے پہلے آپ سے مل کر جاؤں گی، آپ نہ بھی آتیں تو میں خود آ جاتی۔"
"ماشاءاللہ ہم سے زیادہ تو نگارش ہے جن کا مدحیہ کو احساس یا قدر تو ہے۔" عبداللہ نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔
"بھابھی کی قدر ہے تو بھائی کی کیوں نہیں ہو گی؟" مدحیہ ان کی چوٹ پہ مسکرائی۔
"سنا ہے اصل سے سود پیارا ہوتا ہے؟" عبداللہ نے توجیہ پیش کی۔
"لیکن پھر بھی دیکھا جائے تو اصل، اصل ہی ہوتا ہے انسان دونوں چیزوں سے ہاتھ کھینچ سکتا ہے اصل سے اور نہ ہی اصل کے ساتھ ملنے والے سود سے۔" مدحیہ کا کہا بھی سو فیصد درست تھا عبداللہ کو ماننا ہی پڑی۔
"پاکستان جانا کیسا لگ رہا ہے؟" عبداللہ کے سوالوں کا رخ مدحیہ کی طرف تھا اور وہاں موجود باقی افراد بھی اسی کی طرف متوجہ تھے۔
"میرے جواب نہ دینے کو گستاخی میں شمار تو نہیں کیا جائے گا؟" اس کی اوروں کے ساتھ ایسی تیز ایسی شائستگی نبیل کو حیرانی اور رشک میں ڈال جاتی تھی۔

"جواب نہ دینے کی وجہ؟" عبداللہ نے بھنویں اچکائیں۔
"میں اس طرح سب کے درمیان اپنی فیلنگز کا اظہار کروں گی تو میرے گھر والوں کو گراں گزرے گا۔" وہ بات واضح نہ کر کے بھی کر گئی تھی۔
"اوکے ڈیئر ہم سوال بدل دیتے ہیں، تم یہ بتاؤ کہ تمہیں اپنے بھائی ول آور کے پاس جانا کیسا لگ رہا ہے؟" عبداللہ کے دام سے بچنا اتنا آسان نہیں ہوتا تھا۔
"اچھا لگ رہا ہے بہت اچھا۔" وہ محبت سے مسکرائی۔
"ہوں! یہ کی ہے نا کام کی بات۔" عبداللہ خود بھی مسکرایا تھا بلکہ باقی سب کے چہروں پہ بھی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔
"اس سے بات ہوئی؟"
"جی آج صبح ہی ان کی کال آئی تھی۔"
"وہاں جا کر سب سے پہلا کام کیا کرو گی؟"
"شادی۔۔۔" وہ بے ساختہ بولی۔
"کیا؟" وہ سب ہی چونکے۔
"اپنی نہیں ول آور بھائی کی۔" اس نے تصحیح کی۔
"اوہ اچھا! ویسے ول آور صاحب کے ساتھ ساتھ اگر اپنے نبیل سائیں پہ بھی نظر ڈال لو تو کیا ہی کہنے ہیں؟"
عبداللہ خود شادی کر چکا تھا اس لیے اسے باقی دونوں کی آزادی اور بیچلر لائف ہضم نہیں ہوتی تھی وہ وقتاً فوقتاً جمال شاہ اور فائزہ بیگم کو مشورے دیتا رہتا تھا کہ وہ اپنے اپنے بیٹوں کے لیے لڑکی ڈھونڈنے کی مہم شروع کریں لیکن وہ دونوں مائیں اس معاملے میں بالکل ہی ٹھنڈی تھیں جبکہ اس کی اپنی ماں جو اس کی شادی کے لیے اکثر بے چین رہتی تھیں اس نے شادی کر کے ان کو خود ہی ٹھنڈا کر دیا تھا۔ وہ دونوں دوست شادی کے معاملے میں ایسی عجلت پہ اکثر اس کا مذاق اڑاتے تھے۔
"جس روز ہماری شادیاں ہوں گی اس روز تم اپنے بچوں کے پیمپر بدل رہے ہو گے، تمہیں شادیاں اٹینڈ کرنے کی بھی فرصت نہیں ملے گی۔" ول آور کی کہی ہوئی بات اس کے ذہن میں جاگی تو بے اختیار ہنس دیا۔
"کیا یاد کر کے ہنس رہا ہے؟" نبیل متجسس ہوا۔
"ول آور کی بات کو۔" عبداللہ کا لہجہ محبت پاش تھا۔
"وہی پیمپر والی؟" نبیل ہنسا۔
"ہاں۔۔۔" عبداللہ نے اعتراف کیا، وہ اب اپنی باتوں میں لگ چکے تھے، زری اور نگارش کی گفتگو مدحیہ کے ساتھ شروع ہو چکی تھی ساتھ ساتھ فائزہ بیگم بھی شامل ہو جاتی تھیں اتنے میں لینڈ لائن فون کی بیل بجی، ستارہ بیگم اٹھنے لگیں لیکن مدحیہ خود کھڑی ہو گئی۔
"میں دیکھتی ہوں۔" وہ کہہ کر لاؤنج سے نکل گئی اور ڈرائنگ روم میں فون اسٹینڈ کے پاس آ گئی رنگ متواتر بج رہی تھی۔
"ہیلو۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر فوراً فون اٹھا لیا کہ کہیں کال بند نہ ہو جائے۔
"کون مدحیہ؟" دوسری طرف کا بھاری بارعب لہجہ اور آواز مدحیہ کو خاموش کرنے کے لیے کافی تھے۔
"ہیلو۔" وہ خفگی سے ہیلو کہتے ہوئے اس کی موجودگی کا یقین چاہ رہے تھے۔
"سن رہی ہوں۔" مدحیہ کا لہجہ سرد تھا۔

"ماں کہاں ہے تمہاری؟" ان کا لہجہ بھی کچھ کم نہیں تھا اکھڑا اور خشک۔
"یہ پوچھیں کہ آپ کی بیوی کہاں ہے۔"
"ہاں ہاں جو بھی ہے بتاؤ اس کو۔" وہ بے زاری سے بولے۔
"بلاتی ہوں آپ کی رعنا کو۔" وہ کہہ کر ریسیور ایک سائیڈ میں ڈال کر واپس لاؤنج میں آ گئی۔
"آپ کے مالک کا فون ہے۔" وہ ماں کے قریب آ کر کچھ اس طرح بولی کہ صرف فائزہ بیگم ہی سن اور سمجھ سکی تھیں۔
"حیات کا فون ہے؟" وہ فوراً کھڑی ہو گئیں۔ مدیحہ نے جواب دینے کی بجائے لاتعلقی سے رخ پھیر لیا تھا وہ وہاں سے چلی گئیں۔
"کھڑی کیوں ہو بیٹھو نا؟" زری نے مدیحہ کو ہاتھ سے پکڑ کے متوجہ کیا۔
"ہوں! تم سناؤ تم پاکستان کب آؤ گی؟" مدیحہ زری کے پاس صوفے پہ ٹک گئی۔
"ظاہر ہے اسٹڈی کمپلیٹ ہو گی تو میں بھی پاکستان آ جاؤں گی۔ بہت رو لیا یہاں بھی۔" زری نے ہلکے سے مسکرا کر کہا نگارش نے دو معنی نظروں سے زری کو دیکھا تھا وہ ان کی نظروں سے انجان بن گئی اتنے میں نبیل پہلو بدل کر بیٹھا تو نظر سامنے بیٹھی زری کی طرف اٹھ گئی وہ شاید مدیحہ یا نگارش کی بات پہ کچھ کترا رہی تھی پنک سوٹ کے ساتھ پنک بڑا سا دوپٹہ پہنے اور کندھوں پہ پھیلائے سر پہ بلیک اسکارف لپیٹے وہ بہت ہی مہذب اور پردے میں لگ رہی تھی اس کا خوب صورت گول چہرا بلیک اسکارف کے ہالے میں دمک رہا تھا کسی بھی قسم کے میک اپ سے عاری چہرا گلابیاں بکھیر رہا تھا چند از جلد اس کی فریش جس کا منہ بولتا ثبوت تھی کوئی اسے دیکھ کر پہلی نظر میں ہی فدا ہو سکتا تھا۔
"تم بیٹھو میں فون سن کے آتا ہوں۔" عبداللہ اپنے سیل پہ آنے والی کال اٹینڈ کرتا وہاں سے اٹھ گیا اور نبیل اپنی نظروں کی محویت پر آج پھر گڑبڑا گیا تھا۔
"اگر عبداللہ دیکھ لیتا تو۔۔۔؟" اور اس "تو" کے آگے اسے شرمندگی ہی شرمندگی نظر آئی تھی وہ سر جھٹک کر کھڑا ہو گیا۔
"اب آپ کہاں جا رہے ہیں نبیل بھائی؟" نگارش نے رفتہ رفتہ سب کو اٹھتے دیکھ کر پوچھا۔
"آپ لوگ آرام سے بیٹھ کر باتیں کریں ہم کمرے میں چلے جاتے ہیں۔" نبیل نے نرمی سے جواب دیا اور وہاں سے چلا گیا۔
اب وہ لڑکیاں ہی رہ گئی تھیں سو کھل کر بات چیت کر سکتی تھیں۔ ان کی آج شام آٹھ بجے کی فلائٹ تھی اس لیے وہ لوگ ان سے ملنے اور ان کے ساتھ گزارنے کی غرض سے صبح ہی آ گئے تھے۔ تانیہ بیگم فون سن کر کچھی کچھی سی کچن میں آ گئیں اور عبداللہ وغیرہ کے لیے کھانے پینے کی چیزوں کا انتظام کرنے لگیں پر اور باقی فاسٹ فوڈز کے لیے نبیل نے ہوم ڈیلیوری کا آرڈر کر دیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد نگارش بھی آ کر ان کی ہیلپ کروانے لگی حالانکہ انہوں نے منع بھی کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ کچن سمیٹ کر گھر کے باقی کاموں کی طرف آئی تو سارے کام نمٹاتے نمٹاتے دن کے بارہ بج گئے اور اسے ابا کے لیے یخنی بنانے کا خیال آیا تو سر پیٹ لیا۔
"اف! میں اتنی لاپروا ہو گئی تھی؟ ناشتہ کا پتا ہی نہیں چلا انہوں نے صبح بھی کچھ نہیں کھایا؟" وہ دل ہی دل میں

اپنے کاموں کو کوستی ہوئی ابا کے کمرے میں چلی آئی۔
"ابا۔۔۔ ابا۔" اس نے ذرا ٹھہر کر انہیں دوبارہ پکارا تھا۔ وہ اس کے پکارنے پر متوجہ نہ ہوئے تو وہ ان کے قریب آ گئی۔ ان کی آنکھیں بند تھیں۔ اس کا دل بری طرح دھڑکا۔
"ابا!" اس نے کان لگا کے سنا اور تسلی ہوئی۔ ان کی سانسوں کا ارتعاش اس کے لیے ڈھارس بن گیا تھا وہ سو رہے تھے۔ پہلے اس کے دل میں خیال آیا کہ ان کو جگا دے پھر سوچا پہلے کھانے کے لیے کچھ بنا لوں پھر انہیں جگاتی ہوں۔ اور اپنے دوسرے خیال پہ عمل کرتی وہ باہر نکل آئی۔ گوشت پہلے سے صاف کر کے رکھا ہوا تھا اسے ایک بار پھر تسلی سے اچھی طرح دھویا اور یخنی کے لیے چڑھا دیا ساتھ ساتھ ان کے لیے تازہ سلاد روٹیاں اور ان کا رات کا بچا ہوا ہیرزی سالن گرم کر کے رکھ لیا تھا کہ پتا نہیں ان کا کیا کھانے کو دل چاہ رہا ہو۔
یخنی تو آج ان کے لیے اضافی خوراک بلکہ اضافی نعمت بھی حالانکہ ڈاکٹرز نے یہ نعمت اس کے لیے ڈیلی چارٹ میں سب سے پہلے تجویز کی تھی۔ مگر۔۔۔! وہ یخنی وغیرہ تیار کر کے دوبارہ کمرے میں پہنچی تو تب تک وہ واقعی بیدار ہو چکے تھے فاروق نیازی کی آنکھوں میں بیٹی کے لیے محبت چمکی "وہ جیتی رہو" اس وقت بھوک ہی محسوس کر رہے تھے۔
"السلام علیکم! آپ اٹھ گئے؟ میں تھوڑی دیر پہلے آئی تھی لیکن آپ سو رہے تھے۔" اس نے بشاشت کا اظہار کرتے ہوئے ٹرے ٹیبل پہ رکھی اور پھر ان کو انتہائی مضبوطی سے تھام کر ذرا سا اٹھایا اور سنگل بیڈ کے بیڈ کراؤن کے ساتھ تکیوں کے سہارے نیم دراز سا بٹھا دیا پھر پانی لے کر ان کو کلی کروائی اور کھانا کھلانے کے لیے بیٹھ گئی۔
یخنی کا پیالہ دیکھ کر ان کی آنکھوں میں استفسار جاگا۔ گویا وہ پوچھنا چاہ رہے تھے کہ گوشت کہاں سے آیا؟
"وہ کل عدیل بھائی لے کر آئے تھے۔ امی نے کہا گوشت کا سالن بنا دوں بھائی کے لیے مگر بھائی نے منع کر دیا وہ کہنے لگے کہ یہ گوشت ابا جی کے لیے یخنی بنانے کے لیے لایا ہوں اسے رکھ دو اور گوشت لایا تو پھر بنا لیں گے آئمن اور ایمان وغیرہ کو بہت پسند ہے۔" مریم کافی کم گو لڑکی تھی لیکن جب بھی فاروق نیازی کے پاس بیٹھتی وہ خوب خود بولنا شروع ہو جاتی تھی شاید وہ انہیں ان کی خاموشی ان کی کمی کا احساس نہیں ہونے دینا چاہتی تھی تاکہ وہ اسے سنتے ہوئے اپنی محرومی اپنی بے بسی کو بھول جائیں۔
اب بھی وہ عدیل کی بات سن کر خوش ہوئے تھے اور ساتھ ساتھ مریم کے ہاتھ سے نوالے کھانے لگے۔ چند نوالے لینے کے بعد ان کا جی اچاٹ ہو گیا تو مریم نے ان کی بے زاری محسوس کرتے ہوئے یخنی پلانا شروع کر دی۔
"مزے دار ہے نا؟" اس نے ان کے چہرے کے تاثرات نوٹ کیے وہ اس کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے لیکن صرف آنکھوں کی جنبش سے۔
"کل بھی بنا کروں گی تھوڑا گوشت بچا کے رکھ دیا ہے۔" اس نے اپنے سگھڑاپے اور کفایت شعاری کا ثبوت پیش کیا فاروق نیازی ان دیکھی مسکراہٹ سے مسکرا دیے تھے وہ واقعی ان کے لیے ہر وقت فکر مند رہتی تھی اور سب سے زیادہ خیال بھی وہی رکھتی تھی۔ ان کا دل مریم کے لیے دعاؤں سے بھرا ہوا تھا۔
"کیا سوچ رہے ہیں؟" مریم نے اندازہ لگایا تھا لیکن وہ مزید کوئی استفسار نہ کر سکی باہر دروازے پہ دستک ہونے لگی۔
"ابا آپ ایک منٹ انتظار کریں میں ابھی آئی۔" وہ پیالہ رکھ کے چھوٹے تولیے سے ان کا منہ پونچھ کر باہر نکلی۔
"ارے کون ہے؟ صبر کرو۔" وہ تیز تیز قدموں سے دروازے تک پہنچی۔
"فاطمہ؟" مریم اپنی دوست کو دیکھ کر کھل اٹھی۔

"اندر تو آؤ نا یار۔" مریم نے پیچھے ہٹتے ہوئے اسے راستہ دیا اور پھر اس سے ہاتھ ملایا۔

"کیسی ہو؟" فاطمہ نے مریم کے سراپے پر تنقیدی نگاہ ڈالی۔

"اللہ کا شکر ہے تم اندر آجاؤ میں ابا کو چائے پلا رہی تھی۔" مریم اسے اشارہ کرتی خود بھی فاروق نیازی کے پاس آگئی۔

"السلام علیکم۔" اس نے احتراماً ذرا سا سر جھکا کر کہا۔

"وعلیکم السلام بیٹھ جاؤ۔" جواب مریم نے دیا تھا۔

"انکل کی طبیعت اب کیسی ہے؟" فاطمہ ان کی طبیعت کو بخوبی جانتی تھی پھر بھی فارملٹی نبھا رہی تھی محض چند دن ہی تو ہوئے تھے اسے یہاں آئے ہوئے اور چند دنوں میں بھلا کیا فرق آسکتا تھا؟

"ان شاء اللہ، اللہ بہتر کرنے والا ہے۔" مریم شکر گزاری سے کام لے رہی تھی۔

"باقی سب کہاں ہیں؟ آنٹی نظر نہیں آرہیں؟" اس نے بات بدلتے ہوئے کہا۔

"ہمارے محلے کی ایک جاننے والی بیمار ہیں امی ان کی عیادت کے لیے ہسپتال گئی ہوئی ہیں اور باقی سب اپنے اپنے اسکول کالج۔" مریم ساتھ ساتھ جواب بھی دیتی جا رہی تھی۔

"تمہارا کالج کب ختم ہو رہا ہے؟ ایگزام ہو گئے کیا؟" فاطمہ جان بوجھ کر ادھر ادھر کے سوال کر رہی تھی۔

"نہیں آج شاید ان کی ڈیٹ شیٹ آئے گی تب ہی کچھ پتا چلے گا۔" وہ برتن سمیٹ کر سیدھی ہوئی تو نظر فاروق نیازی کی نظروں سے ٹکرائی وہ انہیں ساتھ والے کمرے میں جانے کا کہہ رہے تھے شاید۔

"جی ابا! چلی جاتی ہوں آپ آرام کریں میں کچھ دیر بعد پھر آجاؤں گی۔" وہ نرمی سے کہہ کر برتن اٹھاتے ہوئے فاطمہ کے ساتھ باہر چلی گئی برتن کچن میں رکھے اور دوسرے کمرے میں اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

"جناب عدیل محمد صاحب کیا کر رہے ہیں آج کل؟" فاطمہ نے کمرے کا بغور جائزہ لیا یہ کمرہ عدیل کا تھا اور باقی دونوں کمروں کے مقابلے میں کچھ بہتر اور قابل حالت میں تھا اس لیے جب بھی کوئی مہمان آتا اسے اسی کمرے میں بٹھایا جاتا تھا۔

"عدیل بھائی؟" مریم ذرا سا رکی۔

"جی ہاں! آپ کے عدیل بھائی۔" فاطمہ طنزیہ بولی۔

"انہوں نے بھلا کیا کرنا ہے؟" مریم بات گول کر گئی۔

"وہ کچھ کر بھی نہیں سکتا میں تو صرف جاب کا پوچھ رہی ہوں۔"

"اوہ جاب! ہاں جاب تو وہ کر رہے ہیں۔" مریم بتاتے ہوئے کترا رہی تھی۔

"واقعی؟" فاطمہ کو حیرانی ہوئی۔

"ہاں چند دن ہوئے ہیں۔"

"اچھا! تو کہاں جاب لگی ہے؟"

"یار کمپنی کا نام بتا رہے تھے وہ مگر اب نام میرے ذہن میں نہیں رہا۔"

"سیلری کتنی ہے؟"

"یہ تو میں نے پوچھا ہی نہیں۔"

"ہونہہ! کچن سے فرصت ملے گی تو کچھ پوچھو گی نا؟" فاطمہ خفگی سے گویا ہوئی۔

"پلیز فاطمہ! اتنی خفا تو مت ہو۔"

"خفا؟ تمہارے بھائی نے اتنی اچھی جاب ٹھکرا دی آخر کیوں؟ صرف اس لیے نا کہ وہ جاب مجھ سے ملی تھی

تھی؟" فاطمہ مزید خفا ہوئی۔
"ارے نہیں یار! ایسی بات نہیں ہے وہ دراصل خود کچھ کرنا چاہتے تھے' وہ رشوت اور سفارش کے بغیر چلنا چاہتے تھے۔" مریم نے خود سے بات بنائی کیونکہ عدیل نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا بلکہ وہ صرف یہ کہتا تھا کہ کسی اپنے یا دوست کا تو ور کسی جاننے والے کا احسان کبھی مت لو' وہ احسان ہمیشہ کے لیے ہمارے گلے پڑ جاتا ہے اور ہمیں نظر جھکانے پر مجبور کرتا ہے بلکہ اس کے مقابلے میں کسی انجان اور اجنبی شخص کا احسان لے لو تو وہ کم از کم بار بار احسان جتانے کے لیے آپ کے گھر تو نہیں آئے گا نا!
"نہیں ایک تو یہ مڈل کلاس لوگوں کی نام نہاد خودداری نہیں جاتی گردن کٹ رہی ہوگی پھر بھی کہیں گے' سر تو نہیں جھکا نا؟" فاطمہ آج شاید اپنی بھڑاس نکالنے ہی آئی تھی۔
"فاطمہ یار! پلیز میں اس وقت تم سے کوئی بھی بحث نہیں کرنا چاہتی' اتنے دنوں بعد آئی ہو' آرام سے بیٹھو کوئی بات کرو' بلکہ ایسا کرو تم یہ کتاب دیکھو میں تمہارے لیے چائے لے کر آتی ہوں۔" مریم اٹھنے لگی۔
"نہیں چائے رہنے دو' میں زیادہ دیر نہیں بیٹھوں گی۔" اس نے ہاتھ اٹھا کے روک دیا۔
"کیوں آج میرے ہاتھ کی چائے بھی کڑوی ہو گئی؟" مریم نے فاطمہ کو ناراضی سے دیکھا۔
"نہیں ایسی بات نہیں ہے۔"
"تو پھر کیسی بات ہے؟"
"اوکے یار جاؤ لے آؤ چائے۔" فاطمہ نے ہار مانی۔
"ٹھیک ہے' تم بس پانچ منٹ ویٹ کرو۔" مریم مسکراتی ہوئی کچن میں چلی گئی اور اس کے لیے چائے بنانے لگی۔
جب فاطمہ آئی تو مریم گھر کا دروازہ بند کرنا بھول گئی تھی اسی لیے دروازے کی کنڈی کھلی ہوئی تھی عدیل نے دستک دینا چاہی مگر دروازہ کھلتا چلا گیا تھا جس پر وہ حیران ہوتا اندر آ گیا۔
"مریم!" اس نے صحن اور برآمدہ خالی دیکھ کر پکارا۔
"جی بھائی؟" وہ فوراً کچن سے نمودار ہوئی تھی۔
"کیا ہو رہا ہے؟ دروازہ کیوں کھلا چھوڑ رکھا ہے؟" اس نے ہاتھ میں پکڑے شاپر اسے تھمائے۔
"پتا نہیں شاید یاد نہیں رہا۔" وہ شاپروں میں جھانکنے لگی کہ شاید کوئی ایسی چیز مل جائے جو وہ چائے کے ساتھ فاطمہ کو پیش کر سکے۔
"تمہارے لیے برگر اور باقی سب کے لیے سموسے لایا ہوں اور رات کی ہنڈیا کا سامان بھی ہے۔"
"برگر؟" مریم کو خوشی ہوئی کہ چلو فاطمہ کے لیے تو کچھ مل ہی گیا۔
"ہاں تمہیں برگر پسند ہے نا؟"
"جی! جی ہاں۔"
"امی کہاں ہیں؟" عدیل اپنے کمرے کی سمت بڑھتے ہوئے بولا۔
"امی خالہ تمیز کا پتا کرنے گئی ہیں' ابا اپنے کمرے میں ہیں اور میں فاطمہ کے لیے چائے بنا رہی ہوں۔" اس نے ساری تفصیل بتائی۔
"فاطمہ؟" عدیل کے کمرے کی طرف اٹھتے قدم تھم گئے۔
"جی! وہ اندر کمرے میں ہے۔" اس نے اشارہ کیا۔
"ٹھیک ہے تم چائے بناؤ' میں ابا کے پاس بیٹھتا ہوں۔" وہ وہیں سے پلٹ گیا۔

"السلام علیکم۔" فاطمہ اس کی آواز سن کر کمرے سے باہر نکل آئی تھی عدیل کے قدم رک گئے۔
"وعلیکم السلام! کیسی ہیں آپ؟" اس نے فاطمہ کو سرسری نظروں سے دیکھا۔
"خیریت سے ہوں' آپ اپنی سنائیں کیسی گزر رہی ہے؟" فاطمہ نے اسے سر تا پا دیکھا' کافی تھکا تھکا لگ رہا تھا۔
"جو گزر رہی ہے وہ اچھی ہی گزر رہی ہے۔"
"ارے اچھی! مجھے تو کہیں بھی نظر نہیں آ رہی؟" فاطمہ نے طنز کیا۔
"وہ اتنی اچھی بھی نہیں ہے کہ آپ جیسے صاحب حیثیت لوگوں کو نظر آ سکے' بس اتنی اچھی ہے کہ ہم لوگ رات کو پیٹ بھر کے سوتے ہیں اور صبح سکون سے اٹھتے ہیں' بھوک کی بے چینی سے وقت سے پہلے ہی بیدار نہیں ہونا پڑتا اور ہمارے لیے آج کل پوری نیند اور بھوک کے مطابق کھانا ملنا ہی اللہ کی ان نعمتوں میں سے ہے جن کو ہم جھٹلا نہیں سکتے۔" عدیل نے مطمئن سے انداز میں جواب دیا تھا۔
"لیکن یہ اچھی بہت اچھی بھی ہو سکتی تھی اگر آپ جناب میری بات مان لیتے تو۔" فاطمہ کا دبا دبا غصہ طنز و تمسخر میں ڈھل چکا تھا۔
"مگر آپ کی بات مان لیتا تو اس وقت سر اٹھا کر اپنے حالات کا تذکرہ نہ کر رہا ہوتا بلکہ آپ کی عنایتوں سے سر جھکا کر مشکور و ممنون ہو رہا ہوتا۔" عدیل کی بات بھی جھٹلانے والی نہیں تھی لیکن وہ مزید کچھ کہہ نہ سکی کیونکہ ابھی کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ مریم ٹرے اٹھائے چلی آئی۔
"ارے! تم ابھی تک یہیں کھڑی ہو؟ چلو اندر چائے پیو۔" فاطمہ کا دل چاہا انکار کر کے چلی جائے لیکن پھر مریم کے خیال سے باز آ گئی تھی عدیل پلٹ کر ابا جی کے پاس چلا گیا تھا مریم اسے بھی چائے کا کپ دے گئی تھی!

☆ ☆ ☆

"سنو۔"
"جی صاحب؟" وہ سیڑھیاں اترتے ہوئے ٹھہر گئی اور فوراً پلٹ کر آواز کو دیکھا۔
"علیزے کہاں ہے؟" اس نے اپنی آستین کا بٹن بند کرتے ہوئے پوچھا وہ ابھی ابھی اپنے کمرے سے تیار ہو کر نکلا تھا۔
"جی اپنے کمرے میں ہیں۔"
"جاگ رہی ہے؟"
"جی صاحب کافی دیر سے۔"
"ہوں! جاؤ تم۔" وہ سر ہلا کر کچھ سوچتا ہوا اوپر آ گیا دائیں طرف آخری والا بیڈ روم علیزے کا تھا اس نے دروازے پہ ٹھہرتے ہوئے ہلکی سی دستک دی۔
"یس کم ان۔" اس کی مدھم سی آواز سنائی دی کیونکہ دروازہ ذرا سا کھلا ہوا تھا تو وہ دروازہ دھکیل کر اندر آ گیا۔
"گڈ مارننگ۔" نور نے اپنی آواز اور لہجے کو قدرے فریش رکھا تھا۔
"نور بھائی؟" علیزے اپنے بیڈ پہ کمبل میں کافی کسلمندی سے دبکی ہوئی تھی اسے دیکھ کر فوراً اٹھ بیٹھی۔
"کیسی طبیعت ہے تمہاری؟" وہ کافی نرمی اور رسان سے پوچھ رہا تھا۔
"کافی بہتر ہوں۔" علیزے آہستگی سے بولی۔
"ناشتا نہیں کیا ابھی؟"
"نہیں۔"

"تو پھر اٹھو ایک ساتھ کرتے ہیں۔"
"نہیں ابھی دل نہیں چاہ رہا۔"
"مگر میرا دل تو چاہ رہا ہے نا؟"
"تو آپ کریں ناشتا۔" علیزے نے مسکرا کر کہا۔
"صرف ناشتا کرنے کو نہیں چاہ رہا تمہارے ساتھ ناشتا کرنے کو چاہ رہا ہے۔" آذر نے اپنی بات پر زور دیا۔
"پلیز آذر بھائی موڈ نہیں ہے میں نے رجو کو بھی انکار کر دیا ہے۔"
"یعنی تمہاری نظر میں میری حیثیت رجو جتنی ہے؟ تم نے اس کو انکار کر دیا تو مجھے بھی انکار کر دیا؟" آذر نے اسے اموشنلی بلیک میل کیا۔
"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" علیزے ٹھٹک گئی۔
"ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہوں' تمہاری بات کا یہی تو مطلب ہے۔" آذر ناراضی سے کہتا صوفے پہ بیٹھ گیا اور علیزے پریشان ہو گئی۔
"میں نے ایسا کب کہا؟"
"تو تم نے ناشتا کرنے کا بھی تو نہیں کہا؟"
"اف! آپ تو مائنڈ کر گئے؟" وہ سر جھٹک کے بولی۔
"تم نے بات ہی ایسی کی ہے۔"
"ایم سوری! آپ کو برا لگا۔"
"سوری نہیں چلے گا۔"
"تو پھر؟" وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔
"ناشتا۔۔۔" آذر نے پھر وہی بات کی۔
"اوکے! چلتی ہوں۔" وہ بے ساختہ ہنستی ہوئی کمبل ہٹا کر اٹھ گئی پنک کلر کے بیک لیس سلیپر پہنے اور گرم مفلر لپیٹتی اس کے ساتھ بیڈ روم سے باہر نکل آئی۔
دونوں ایک ساتھ سیڑھیاں اترتے نیچے ڈائننگ ہال میں پہنچے تو وہاں باقی سب بھی موجود تھے تقریباً سبھی نے انہیں بیک وقت دیکھا تھا۔
"السلام علیکم۔" اس نے آہستگی سے سلام کیا۔
"تم اٹھ گئیں؟" آسیہ آفندی اسے دیکھ کر فوراً قریب آئیں۔
"اٹھی نہیں ہوں اٹھایا گیا ہے۔" اس نے آذر کو شکایتی نظروں سے دیکھا وہ مسکرا دیا۔
"اگر میں تمہیں اٹھا کر ساتھ نہ لاتا تو اس وقت آپ خوش کیسے ہوتیں؟" وہ آسیہ آفندی کے چہرے کو دیکھ رہا تھا جو علیزے کو نارمل کیفیت میں دیکھ کر واقعی خوش ہو رہی تھیں کیونکہ کل صبح سے علیزے کی حالت بہت خراب تھی وحشت اور خوف کے مارے نہ کچھ کھا رہی تھی اور نہ ہی کوئی بات کر رہی تھی جبکہ آذر نے کل والی بات کا کوئی بھی ذکر کیے بغیر اس سے اتنی نارمل بات چیت کی کہ وہ خود بھی اس بات کے حصار سے نکل آئی تھی۔
"گڈ مارننگ میم۔" وہ کرسی کھینچ کے بیٹھ رہی تھی جب اچانک جورت بھی ڈائننگ ہال میں داخل ہوا۔
"گڈ مارننگ۔" وہ جورت کو دیکھ کر مسکرائی۔
"آج تو لگتا ہے ڈائننگ روم میں تمام بہاریں ایک ساتھ آ گئی ہیں۔" جورت نے آذر' علیزے' کومل' حرمت اور جویریہ کی سمت دیکھتے ہوئے خوش گوارت کا اظہار کیا۔

"ہاں آج تم جو نظر آ رہے ہو۔" حرمت نے گھور کے کہا۔
"ہیں! اپنی تو بات ہی کچھ اور ہے جہاں بھی گئے داستان چھوڑ آئے۔" انہوں نے فخریہ کالر کھڑے کیے۔
"کیسی داستان؟ کچھ ہمیں بھی تو پتا چلے؟" حرمت نے شرارت سے کہا اور جورت سٹپٹا گیا اس نے گھور کے حرمت کی سمت دیکھا۔
"آرام سے ناشتا کرو' آذر بھائی ڈسٹرب ہو رہے ہوں گے۔" اس نے جان بوجھ کے آذر کا حوالہ دیا اور پھر نظر کومل پہ جا ٹھہری وہ خاموشی سے سر جھکائے ناشتا کر رہی تھی۔
"آج کومل آپا بڑی چپ چپ ہیں؟" لہجہ اور انداز معنی خیز تھے۔ کومل چونک کر سیدھی ہوئی۔
"میں یونیورسٹی سے لیٹ ہو رہی ہوں اس لیے جلدی ناشتا کر رہی ہوں۔"
"اتنی جلدی کی کیا ضرورت ہے۔ آپ اطمینان سے ناشتا کریں' آذر بھائی ڈراپ کر دیں گے آپ کو۔" جورت نے لاپروائی سے کہا کومل اور حرمت دونوں ٹھٹک گئیں آذر کافی سنجیدگی اور مگن سے انداز میں ناشتا کر رہا تھا۔
"بھائی آپ کومل آپا کو ڈراپ کر دیں گے نا؟ وہ لیٹ ہو رہی ہیں۔" کومل کے انکار سے پہلے ہی جورت نے آذر سے بھی پوچھ لیا سوچ تک کر متوجہ ہوا پہلے جورت کو اور پھر اک نظر کومل کو دیکھا وہ پریشان سی دیکھ رہی تھی۔
"ہوں! کر دوں گا۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا اور چائے کا کپ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔
"دیکھا؟ ہو گیا نا مسئلہ حل؟ آپ خوا مخواہ پریشان ہو رہی تھیں۔" جورت نے آنکھ دبائی۔ تھوڑی دیر بعد آذر کھڑا ہو گیا۔
"چلیں۔" اس نے کومل سے کہا اور پلٹ کر علیزے کو دیکھا۔
"اوکے ڈیئر تم آپی کے ساتھ باتیں کرو' ہم لوگ لنچ پہ دوبارہ ملیں گے۔" آذر نے اسے چھکے چھکے انداز سے کہا اور ڈائننگ ہال سے نکل گیا کومل ہونق بنی جورت اور آذر کی پشت کی سمت دیکھ رہی تھی۔
"چلیں۔ محترمہ مسٹر آذر آفندی گاڑی اسٹارٹ کر چکے ہوں گے۔" جورت نے ہاتھ لہرا کر کومل کو پھر متوجہ کیا۔
"جورت چپ! جاؤ گے مجھ سے۔" کومل اپنا بیگ اور کتابیں اٹھاتی جورت کو گھورتی ہوئی وہاں سے چلی گئی اور اس کے جانے کے بعد جورت کی توپوں کا رخ علیزے کی سمت ہو گیا آسیہ آفندی مسکرا رہی تھیں!
وہ گاڑی اسٹارٹ کرکے ہارن دینے ہی والا تھا کہ حویلی کے مرکزی دروازے سے کومل باہر نکلتی دکھائی دی وہ دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ پہ جمائے اس کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگا کیونکہ حویلی کے مین ڈور اور ڈرائیو وے کے درمیان اچھا خاصا فاصلہ تھا دائیں طرف کا پورا لان گھوم کے آنا پڑتا تھا اور ڈرائیو وے تک آتے آتے بھی چند منٹ لگ ہی جاتے تھے اس نے ذرا سا جھک کر دوسری سائیڈ کا دروازہ کھول دیا کومل آ کر کھلے دروازے سے اندر بیٹھ گئی چوکیدار نے بڑا سا گیٹ وا کر دیا تھا وہ گاڑی بیک کرتے ہوئے گیٹ سے نکلا اور پھر گاڑی روڈ پہ ڈال دی۔
جیسے ہی گاڑی روڈ پہ آئی اس کی اسپیڈ میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ چند سیکنڈ گزرے تو آذر کو گاڑی کے اندر کی خاموشی عجیب سی لگنے لگی اور اس خاموشی کا احساس ہوتے ہی اس نے بات شروع کی۔
"کون سے ایئر میں ہو؟"
"فائنل ایئر میں۔" کومل نے بمشکل تمام جواب دینے کی ہمت مجتمع کی تھی۔
"فائنل ایئر؟ لیکن تمہیں یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیے تو تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہے؟"
"تین سال کا عرصہ تھوڑا عرصہ نہیں ہوتا۔" کومل نے زور دے کر کہا۔
"تین سال؟ واقعی وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا؟ مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میں چند روز پہلے ہی تمہارا

ایڈمیشن کروا کے آیا ہوں۔" کومل کا ایڈمیشن آذر نے ہی کروایا تھا اسی لیے وہ وقت یاد کر کے وقت کے جلدی گزر جانے پہ حیران ہو رہی تھی۔

"ہم نے تین سال پڑھتے ہوئے اور ایگزام دیتے ہوئے گزارے ہیں اس لیے ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ وقت کیسے گزرا۔" کومل نے کھڑکی سے باہر دیکھ کر کہا اندر دیکھنے کی ہمت نہیں تھی اس کی۔

"کون سا سمسٹر چل رہا ہے؟"

"ساتواں یعنی فائنل ایئر کا فرسٹ سمسٹر۔"

"ہوں! تو گویا ابھی ایک سال کا وقت ہے اسٹڈی سے فارغ ہونے میں؟"

"ہاں! تقریباً۔" کومل نے سر ہلایا۔

"اس کے بعد کیا ارادہ ہے؟"

"ابھی سوچا نہیں، امی سے ڈسکس کروں گی۔"

"وہ کون سا انکار کریں گی؟" آذر ثمو بیگم کو سوچتے ہوئے بے ساختہ مسکرا دیا تھا وہ رشتے میں تو ان سب کی چچی تھیں لیکن انہوں نے کبھی بھی چچی ہونے کا احساس نہیں دلایا تھا ہمیشہ فریش اور فرینڈلی موڈ میں نظر آتی تھیں کافی ہنس مکھ اور سافٹ نیچر کی تھیں اور دوسری بات یہ کہ وہ آذر کی چچی ہی نہیں خالہ بھی تھیں ثروت بیگم اور ثمو بیگم بہنیں تھیں اس لیے آذر اور حورت وغیرہ کا کومل سے "مسیر" کا رشتہ بھی بنتا تھا۔

"آپ علوزے کے لیے بہت پریشان ہیں نا؟"

"ظاہر ہے یہ معاملہ ہی پریشانی والا ہے۔"

"کچھ مسئلہ حل ہوا؟" کومل نے اتنے عرصے میں پہلی بار سر اٹھا کر ڈرائیو کرتے آذر کو دیکھا۔

"ایک دن میں کیا مسئلہ حل ہو سکتا ہے؟" کومل سمجھ دار تھی گھر میں لڑکیوں سے سب سے بڑی تھی اسی لیے اس کے استفسار پہ آذر کو جواب نہ دینا غیر مناسب لگ رہا تھا۔

"علوزے نے کچھ بتایا نہیں؟"

"نہیں میں نے پوچھا ہی نہیں، ابھی وہ تھوڑی سنبھل جائے پھر بات کروں گا، صبح ہی صبح یہ بات چھیڑ دیتا تو وہ مزید ڈسٹرب ہو جاتی۔" آذر کو اس کے آرام اور سکون کا بھی کتنا خیال تھا؟ کومل نے رشک سے دیکھا۔

"آپ ڈسٹرب نہیں ہیں کیا؟"

"میری ڈسٹربنس کچھ اور نوعیت کی ہے اور علوزے کی کچھ اور۔"

"لیکن ڈسٹربنس تو ہے نا؟"

"ہوں! کہہ سکتی ہوں۔" آذر بہت نارمل بات کر رہا تھا کومل کی گھبراہٹ کم ہو چکی تھی اور اسی لیے تو وہ بات بھی کر رہی تھی اور ابھی وہ کچھ اور کہنے کا ارادہ بھی رکھتی تھی کہ آذر کا سیل بجا۔ اسرار آفندی کی کال تھی۔

"جی ڈیڈی؟"

"تم ہسپتال پہنچو۔" وہ مختصراً بولے ان کے پیچھے شور سا تھا۔

"کیوں خیریت؟" اس کا ماتھا ٹھنکا۔

"میں خیرو بابا کی خیریت معلوم کرنے اسپتال آیا تھا اور میرے پیچھے میڈیا والے بھی پہنچ گئے۔" وہ کچھ پریشان لگ رہے تھے۔

"اُف! آپ کو کس نے کہا تھا کہ ہسپتال جائیں؟ میں نے رات کو کہا بھی تھا کہ آپ لوگوں کو ہسپتال وغیرہ کے چکر لگانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے ہم لڑکے ہی کافی ہیں اس کام کے لیے، ایک خیرو بابا ہی ہیں نا؟ ہم سنبھال لیں

گے ان کو۔"

"ارے یار بھائی صاحب نے آنے کو کہا تھا۔" اسرار آفندی جھنجلا گئے۔

"ڈیڈ بھی میرا خیال ہے کہ کچھ کرنے سے پہلے سوچتے نہیں ہیں؟" آذر خفا ہو رہا تھا۔

"وہ خیرو بابا کے لیے پریشان تھے۔"

"پریشان تو ہم سب ہیں تو اس کا کیا مطلب ہے کہ اسپتال میں ڈیرہ ڈال کے بیٹھ جائیں؟ صرف ایک ملازم زخمی ہوا ہے پورا گھر زخمی نہیں ہوا جس پہ آپ لوگ اتنے بدحواس ہو رہے ہیں، اٹس او کے میں آ رہا ہوں آپ ویٹ کریں۔" اس نے کہہ کر فون بند کر دیا اور گاڑی کی اسپیڈ مزید بڑھا دی اس نے لب سختی سے بھینچ رکھے تھے کومل اسے دیکھتے ہوئے اس وقت چونکی جب اس نے یونیورسٹی کے سامنے بریک لگائے تھے۔

"تھینک یو۔" وہ گاڑی سے اترنے کے بعد تھینک یو کہہ رہی تھی کہ آذر گاڑی جھٹکے سے آگے بڑھا لے گیا تھا اس کے پاس ٹائم کم تھا ورنہ وہ ایسی بداخلاقی کبھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ انتہائی رش ڈرائیونگ کر رہا تھا حالانکہ صبح کے وقت ایسی ڈرائیونگ خطرے سے خالی نہیں تھی لیکن اس کا ہسپتال پہنچنا ضروری تھا اسے جلدی پہنچنا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ آج بہت عرصے بعد دن کے وقت سویا تھا، رات کو نیند ہی پوری نہیں ہوتی تھی اور دن میں کام پیچھا نہیں چھوڑتے تھے نیند! ایک بھرپور نیند اور فریش موڈ خواب و خیال ہو کے رہ گئے تھے۔

آج اس نے کورٹ نہیں جانا تھا اس لیے تقریباً فارغ ہی تھا۔ صبح اٹھا ایک دو ضروری کام نمٹایا اور گھر آ گیا اپنے کمرے میں فارغ ٹہلتے ہوئے بوریت ہونے لگی تو نیند کو ترجیح دی اور پھر ویسا ہی تھا کہ نیند اس پہ مہربان ہو گئی۔ وہ دن کے بارہ بجے سویا تھا اور شام کے پانچ بجے آنکھ کھلی کر پانچ گھنٹے کی نیند بھی کچھ کم نہیں تھی موڈ خود بخود فریش اور دماغ ہلکا پھلکا ہو چکا تھا۔ شاور لے کر نیچے آیا تو دن کے سائے ڈھل چکے تھے مغرب کی طرف ڈوبتے سورج کی بے دم سی شعاعیں مشرق کو الوداع کہہ رہی تھیں اسے لان میں دیکھ کر اس کا بل ڈوگ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور بے چینی سے دائیں بائیں ٹہلتا اپنی تھوڑی دیر کی رہائی کی فریاد کرنے لگا۔ دل تور نے آگے بڑھ کے اسے تھپکا بل ڈوگ لوہے کے موٹے سے کھونٹے سے بندھا ہوا تھا اور جس کھونٹے سے بندھا ہوا تھا وہ کھونٹا گھر کی دیوار میں نصب تھا جسے سیمنٹ اور بجری سے مضبوط کیا گیا تھا تاکہ بل ڈوگ چاہے جتنی بھی زور آزمائی کر لیتا اس کھونٹے کو نہ

اکھاڑ سکتا۔

اس کی بے چینی محسوس کرکے دل آویز نے اسے کھول ہی دیا تھا اور بل ڈوگ خوشی کا اظہار کرتا اپنے صحت مند جسم سمیت اشتیاقی طویل جست لگا تا لان کے ایک حصے سے دوسرے حصے میں پہنچ گیا تھا۔ دل آویز لان کی ایک سائیڈ میں لگے واش بیسن پہ گیا اچھی طرح ہاتھ وغیرہ دھونے کے بعد آکر کرسی پہ بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد گل آگئی۔

"صاحب جی کیسے ہیں آپ؟ دن میں بھی کھانا نہیں کھایا؟"

"چائے لے آؤ۔" وہ بل ڈوگ کی طرف متوجہ تھا۔

"گل۔" اس نے آواز دی۔

"جی صاحب؟"

"گلاب خان کو اندر بلاؤ، میں نے تم لوگوں سے بات کرنی ہے۔" اس نے بل ڈوگ سے دھیان ہٹا کر گل سے کہا۔

"جی ابھی بلاتی ہوں۔" وہ سعادت مندی سے کچن گیٹ کی طرف چلی گئی اور پانچ منٹ بعد وہ دونوں اکٹھے اس کے سامنے آکھڑے ہوئے۔

"جی صاحب آپ نے بلایا؟" گلاب خان مودب کھڑا تھا۔

"گل نبیل کی فیملی پاکستان پہنچ رہی ہے ان کی ملازمہ اور ملازم سب نئے ہیں اور میں کچھ خاص مطمئن نہیں ہوں۔ اتنے عرصے بعد وہ لوگ پاکستان آئیں اور انہیں ٹھیک سے کھانا بھی نہ ملے یہ بات میرے لیے شرمندگی کا باعث ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ صرف دو دن کے لیے گل کو ان کی طرف بھیج دیتا ہوں اگر تمہیں برا نہ لگے تو؟" دل آویز اپنے ملازم سے بھی اس طرح بات کرتا تھا کہ اس کی عزت نفس پہ ٹھیس نہیں پہنچتی تھی بلکہ ملازم کا وقار بڑھا دیتا تھا وہ چاہتا تو ایک مالک ہونے کے ناتے اپنے ملازموں کو نبیل کے گھر جانے کا حکم بھی دے سکتا تھا مگر اس نے حکم کی بجائے ان کی رضامندی کو ترجیح دی۔

"صاحب! یہ کیسی بات کر رہے ہیں آپ؟ مجھے برا کیوں لگے گا؟" گلاب خان کا اپنے صاحب پہ مان بڑھ گیا تھا۔

"برا لگ بھی سکتا ہے، گل تمہاری بیوی تمہاری عزت ہے اور اپنی عزت کے بارے میں تم سے بہتر فیصلہ کون کر سکتا ہے بھلا؟"

"نہیں نہیں صاحب ہماری عزت کے بارے میں آپ سے بہتر فیصلہ کوئی نہیں کر سکتا گل دو دن نہیں چار دن بھی جا کر رہ سکتی ہے آپ جب چاہیں چھوڑ آئیں۔" گلاب خان نے بے اختیار سوچا۔

"نہیں بس دو دن ہی کافی ہیں پھر وہ اپنی ملازمہ کو ٹرینڈ کر لیں گے۔"

"لیکن صاحب آپ کیا کریں گے؟ کھانا وغیرہ کون بنائے گا؟" گلاب خان کو اس کی فکر ہوئی۔

"تم ہو نا۔" دل آویز نے گلاب خان کو مسکرا کر دیکھا۔

"میں؟" اسے تعجب ہوا تھا۔

"ہاں! تم کھانا تو بنا ہی لیتے ہو نا؟"

"لیکن صاحب جب سے یہ شہر آئی ہے تب سے اپنے ہاتھ کا ذائقہ اچھا نہیں رہا۔" گلاب خان گل کو محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا تو گل شرم سے چہرا جھکا گئی اور دل آویز ان دونوں کی حرکت پہ یکدم قہقہہ لگا کے ہنسا تھا جبکہ وہ دونوں خجل ہو کر رہ گئے تھے۔

"تمہارے ہاتھ کا ذائقہ اب بھی وہی ہے بس یہ کہو کہ تمہیں بیوی کے ہاتھ سے کھانے کی عادت پڑ گئی ہے۔ لیکن مجبوری ہے یار دو دن تمہیں میرے ساتھ ہوٹل کا کھانا ہی کھانا پڑے گا۔" دل آویز نے مذاق کرتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں صاحب کھالیں گے۔" گلاب خان سر خم کرتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہے کل صبح جب میں کہوں۔۔۔ تم جا کر گل کو چھوڑ آنا۔"

"جی صاحب جیسے آپ کی مرضی۔"

"او کے جاؤ تم اور گل تم چائے لے آؤ۔" اس نے اشارہ کیا وہ دونوں ہی چلے گئے۔ چائے پینے کے بعد سگریٹ سلگا لیا۔

"چائے کے فوراً بعد سگریٹ؟ ایک ساتھ دو نشے کیسے افورڈ کر لیتے ہیں؟" اس نے سگریٹ کا کش لیا ہی تھا کہ وہ پوچھ بیٹھی۔

"چائے طلب ہے اور سگریٹ عادت۔۔۔ ان دونوں چیزوں میں سے کوئی ایک بھی نشہ نہیں کہلا سکتی نشہ اس چیز کا ہوتا ہے جو ہر چیز سے بے گانہ کر دے اور یہ دونوں تو اتنے بے ضرر ہیں کہ ہر دوسرا بندہ ان سے لطف اندوز ہو رہا ہوتا ہے۔" دل آویز نے اپنی رائے دی۔

"لیکن میری نظر میں تو یہ نشے کا درجہ ہی رکھتی ہیں۔" وہ ضد سے کر بولی۔

"تو پھر ایک نشہ تو آپ بھی کرتی ہیں۔" وہ جتنے سکون سے بولا تھا وہ یکدم سٹپٹا گئی تھی۔

"کیا مطلب؟"

"چائے تو آپ بھی پیتی ہیں۔" وہ رسان سے بولا اور اس کی رکی ہوئی سانس بحال ہوئی تھی۔

"میں تو ایک اور نشہ بھی کرتی ہوں۔" آپ کی بار وہ رسان سے بولی تھی۔

"کون سا؟" سوال بے ساختہ سا تھا۔

"محبت کا۔" اس کے جواب پہ وہ جیسے مبہوت ہو گیا تھا جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ اس کی بے نیازی اور لاتعلقی پہ اس کا چہرہ بجھ کے رہ گیا اور وہ زری کے چہرے کی بجھی روشنیوں سے نظر چرا تا وہاں سے اٹھ گیا تھا اور چونکا تو اس وقت جب بل ڈوگ نے دیوار پہ بیٹھے کبوتر کو دیکھ کر غرانا شروع کیا وہ کبوتر کو نگلنا چاہتا تھا دل آویز جھٹک کر ماضی سے حال میں پہنچا۔

"تو کیا میں زری کو یاد کر رہا تھا؟" وہ حیرت سے سوچتا سگریٹ مسل کر بل ڈوگ کے قریب گیا اور دیوار کے قریب لا کے دوبارہ کھونٹے سے باندھ دیا اسے لان میں بیٹھے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی اس لیے اندر آگیا سامنے ہی ٹیبل پہ موسٹ ارجنٹ کی کیس فائل پڑی تھی وہ فائل اٹھا کر اپنے اسٹڈی روم میں آبیٹھا اور اطمینان سے کیس اسٹڈی کرنے لگا اب اسے دیر تک مصروفیت کا موقع مل گیا تھا۔

گل رات کو کھانے کا پوچھنے آئی تو بھی اس نے انکار کر دیا جب وہ بزی ہوتا تھا تو کھانے پینے پہ بھی دھیان نہیں دیتا تھا اور کیس اسٹڈی کرتے ہوئے تو سوائے سگریٹ اور چائے کے کسی اور چیز کی طلب نہیں ہوتی تھی اس کا ایش ٹرے سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھر جاتا تھا اور ہر پندرہ بیس منٹ بعد چائے بھی ختم ہوتی رہتی تھی۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

✡ ✡

نبیلہ عزیز

دردِ دل

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور عنیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدیحہ اور نبیل حیات دونوں بہن بھائی ہیں' مدیحہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے' وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پہ رنگ چکی ہے' جس کے پیش نظر فائزہ بیگم' نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں' لیکن مدیحہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے' جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے' مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے' مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا' بے بسی اور مجبوری سے تنگ آ کر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے' لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باؤ اتیاز مل جاتا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے' جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے' اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے' وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے' وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

ولی آور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے' وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے' اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا' اس کی ماں حور شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔

پورا دن اکٹھے گزارا تو ٹائم گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا' مدحیہ اس وقت ٹھٹک کے رہ گئی جب نگارش نے اسے تیار ہونے کا کہا۔

"تمہارے بھائی صاحب کہہ رہے ہیں کہ ٹائم کم رہ گیا ہے' ایئرپورٹ بھی پہنچنا ہے پھر سامان وغیرہ کی چیکنگ میں بھی ٹائم لگے گا' اٹھو جلدی سے چینج کرکے آؤ اور ایک بار پھر اپنی تمام چیزیں یاد کرلو کہ تم نے بیگ میں رکھ لی ہیں نا؟" نگارش سمجھ دار بہنوں جیسا برتاؤ کررہی تھی زری مسکرائی۔

"چلو جاؤ اب۔" زری نے مدحیہ کو اٹھایا اور وہ خاموشی سے چپ چاپ اوپر آگئی کپڑے چینج کیے' اپنا بیڈروم دیکھا' بیڈروم کی سیٹنگ دیکھی اور سر جھکا کر اپنا بیگ اٹھالیا۔ باقی کا سامان وہ لوگ پہلے ہی گاڑی میں رکھوا چکے تھے۔

"کوئی گفٹ نہیں بھیجا تم نے؟" گھر سے نکلتے ہوئے نگارش نے زری سے سرگوشی کی۔

"کیا بھیجتی؟" زری بھی آہستگی سے بولی۔

"اپنا دل۔"

"ہونہہ! دل کو دل بھیجتی؟"

"ہاں! تاکہ دل کو دل سے راہ ہوجاتی۔"

"میرا دل نرم ہے اور وہ دل سخت۔" زری اس کا تصور کرتے ہوئے بولی۔

"سخت کو نرم ہونے میں بھی دیر نہیں لگتی' بس اثر ہونا چاہیے۔" نگارش نے گہرائی سے کہا۔

"اثر ہونے کے لیے وقت چاہیے' جو فی الحال نہیں ہے۔" زری جواب دیتی باہر نکل آئی لیکن باہر کا موسم ہنوز خراب تھا باہر روڈ کی اسٹریٹ لائٹس بھی اس برفانی موسم کی وجہ سے دھندلی سی لگ رہی تھیں اور اس دھند کی وجہ سے تمام لائٹس کی روشنی سرخ نظر آرہی تھی۔

"مدحیہ کہاں ہے؟" زری نے گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے پوچھا۔

"وہ ہم سب سے پہلے جاکر بیٹھ گئی ہے' تم بھی بیٹھ جاؤ' قلفی بن جاؤگی۔" نگارش نے خفگی سے کہا تھا اور یوں وہ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے ایئرپورٹ کے لیے روانہ ہوئی تھیں انہیں ایئرپورٹ پہنچتے ہوئے ایک گھنٹہ لگ گیا تھا اور فلائٹ کا ٹائم بھی کم رہ گیا تھا۔

"میڈی۔" مدحیہ سر جھکائے چپ چپ سی بیٹھی تھی جب ایک شناسا سی آواز پہ چونک کر سر اٹھایا۔

"جیزی؟" اس نے حیرت سے جیزی کو دیکھا۔

"تم واقعی جارہی ہو؟" وہ بے یقینی سے پوچھ رہا تھا لہجے کی افسردگی نمایاں تھی۔

"آف کورس۔"

"واپس نہیں آؤگی؟" سوال میں آس تھی۔

"شاید۔" وہ کوئی بھی جواب ٹھیک سے نہ دے پائی۔

"تم ہم سے ملے بغیر جارہی ہو؟ ہمیں بتایا بھی نہیں؟ آج بھی اگر کرسٹینا نہ بتاتی تو ہمیں پتا ہی نہ چلتا۔؟" وہ شکوہ کررہا تھا۔

"جب چھوڑ کر جانا ہی ہے تو پھر اتنے اہتمام سے چھوڑ کر جانے کا کیا فائدہ؟ دو گھڑی کا یہ ملنا بھی کس کام کا؟" مدحیہ کے لہجے میں تلخی در آئی پانچ قدم کے فاصلے پہ نگارش' زری اور فائزہ بیگم کھڑی تھیں البتہ نبیل اور عبداللہ سامان وغیرہ کلیئر کروا رہے تھے۔

"تم ہمیں مس نہیں کروگی؟"

"شاید۔" وہ عجیب سی بے حسی کا مظاہرہ کررہی تھی۔

"باقی سب سے نہیں ملوگی؟" جیزی افسردہ لگ رہا تھا فائزہ بیگم نے بلیک لانگ کوٹ پہنے اور لانگ شوز چڑھائے جیزی کو ناگواری سے دیکھا تھا۔

"باقی سب؟" وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"میڈی؟" اچانک نہ جانے کہاں سے برائن' شیٹے' کرسٹینا اور جیسمین نمودار ہوئے تھے اور مدحیہ کو دیکھ کر چلا اٹھے تھے مدحیہ ان لوگوں کو اچانک دیکھ کر خوش بھی ہوئی اور اداس بھی۔

"موڈ کیوں آف ہے؟" شیٹے اس کی بیسٹ فرینڈ تھی اس لیے اس کی اداسی اور افسردگی بھی شیٹے نے ہی محسوس کی تھی۔

"تو کیا اس وقت اس جگہ پہ کھڑے ہوکر میرا موڈ آن ہونا چاہیے؟" مدحیہ نے شیٹے کو خفگی سے دیکھا۔

"ڈونٹ وری یار ہم لوگ ضرور ملیں گے۔" برائن نے انہیں تسلی دی وہ شیٹے کا بھائی تھا اسی وجہ سے مدحیہ کی اس کے ساتھ بھی کافی اچھی فرینڈشپ تھی دونوں بہن بھائی بے حد سوفٹ نیچر کے تھے۔

"ان شاء اللہ۔" مدحیہ بے ساختہ بولی۔

"یہ کیا کہا؟" برائن نے الجھ کر پوچھا۔

"میں نے کہا ہے کہ اللہ نے چاہا تو ہم ضرور ملیں گے۔" مدحیہ نے انگلش میں بتایا تو وہ سر ہلا کر رہ گئے۔

"ہوں! ان شاء اللہ۔" برائن نے دہرا کے کہا اور مدحیہ مسکرادی۔

"مدحیہ چلو۔" فائزہ بیگم نے قریب آکر سختی سے کہا۔

"جسٹ ون منٹ مام پلیز۔" اس نے انہیں روکا اور کرسٹینا کو دیکھا۔

"کرسٹی! تم کچھ نہیں کہوگی؟" مدحیہ نے خاموش کھڑی کرسٹینا کے قریب آکر نرمی سے پوچھا۔

"سب کچھ نہ کچھ کہہ ہی رہے ہیں' میرا کہنا ضروری تو نہیں ہے؟" وہ لاپروائی سے بولی۔

"اگر ضروری نہیں ہے تو اتنی دور سے' اتنی ٹھنڈ میں یہاں کیوں آئی ہو؟" مدحیہ کے استفسار پہ کرسٹینا لاجواب ہوگئی۔ اور نظر چرالی تھی۔

"میں جانتی ہوں کرسٹینا تمہاری فیملی کسی پاکستانی کی دی ہوئی چوٹ سے بلبلائی ہوئی ہے اور یہی چوٹ تم لوگوں کو باقی پاکستانیوں کی طرف بڑھنے نہیں دیتی لیکن ایک بات سوچو' جس طرح تمام یورپین ایک جیسے نہیں ہیں اسی طرح تمام پاکستانی بھی ایک جیسے نہیں ہیں' اچھے برے لوگ ہر جگہ' ہر ملک میں پائے جاتے ہیں ایک کی سزا دوسرے کو دینا کہیں سے بھی انصاف نہیں کہلاتا۔ اور تمہیں آج چپ نہیں بلکہ خوش ہونا چاہیے کہ تمہارے گروپ کی وہ لڑکی جارہی ہے جو تمہیں ہمیشہ ناگوار گزرتی تھی۔؟" مدحیہ اس کے روبرو کھڑی کہہ رہی تھی اور کرسٹینا کا چہرا فق ہوگیا تھا۔ تو کیا مدحیہ اس کی ناگواری اور فیملی کی تلخی کے متعلق بھی جانتی تھی؟ حالانکہ اس نے کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ کرسٹینا کے اندر کا حال جانتی ہے۔

"میڈی تم۔۔۔۔ تم۔" کرسٹینا بول ہی نہ پائی۔

"مدحیہ چلو بھی۔" اب کی بار زیادہ سختی سے پکارا گیا تھا۔

"آئی مس یو میڈی۔۔۔" کرسٹینا نم آنکھوں سے اس کے گلے لگ گئی اور مدحیہ کا گال چوم لیا شیٹے اور جیزی مسکرادیے۔

"اینڈ ایم سوری فار مائی بی ہیویئر۔" کرسٹینا نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

"ہنس لو کے یار! مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ تم مجھ سے ملنے کے لیے آئی ہو بلکہ ان سب کو لے کر آئی ہو۔ تھینک یو سو مچ......" اس نے خوشی کا اظہار کیا تھا پھر باقی سب سے مل کر ہاتھ ہلاتی وہ زری اور نگارش کے پاس آرکی۔

"پتا نہیں ان سب سے دوبارہ ملنا ہو گا بھی یا نہیں اس لیے جلدی جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ تم سے تو ملاقات ہو ہی جائے گی اس لیے امید ہے کہ تم نے مائنڈ نہیں کیا ہو گا۔" اس نے زری کے گلے ملتے ہوئے کہا۔

"اور بھابھی آپ بھی جلدی پاکستان آنے کی کوشش کیجیے گا۔" وہ نگارش سے ملی تو ساتھ تاکید بھی کر ڈالی۔

"پہلے تم تو جاؤ......"

"اتنی جلدی ہے آپ کو؟"

"ہاں! جلدی تو ہو گی ایک گھنٹے سے اتنی سردی میں کھڑے کھڑے ہڈیوں کا گودا بھی جیسے جم گیا ہے۔" نگارش مصنوعی خفگی سے بولی۔

"فکر نہ کریں میں عبداللہ بھائی سے کہتی ہوں گھر جاتے ہی آپ کی ہڈیاں اوون میں رکھ دیں۔" مدیحہ شرارت سے بولی اس کا موڈ پہلے سے قدرے خوشگوار ہو چکا تھا۔

"اوون میں رکھنے کی کیا ضرورت ہے وہ خود کسی اوون سے کم ہیں کیا؟" نگارش کا ذو معنی لہجہ مدیحہ اور زری کو ہنسنے پہ مجبور کر گیا تھا۔

"یہ تو اور بھی اچھی بات ہے جناب۔" مدیحہ نے سراہا۔

"مدیحہ۔" نبیل نے قریب آ کر کہا اور پھر نگارش اور زری کو دیکھا بس اک طائرانہ سی نظر کا موقع تھا اور اک نظر میں اس کے چہرے کا ایک آخری لمس تھا وہ لمس سمیٹ کر مدیحہ کے ساتھ اللہ حافظ کہتا آگے بڑھ گیا سب سے آخر میں عبداللہ سے ملاقات ہوئی تھی دونوں دیر تک بغل گیر ہوئے تھے پھر سب چلے گئے۔ جہوزی بھی وہیں کھڑا تھا اور زری وغیرہ بھی۔ شاید جہاز پرواز کر چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

ہسپتال میں میڈیا والے مکھیوں کی طرح بھنبھنا رہے تھے اور اسرار آفندی ان کے گھیرے میں تنگ آئے ہوئے تھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ انہیں کی تاک میں بیٹھے ہوئے ہیں جیسے ہی وہ خیرو بابا کی خیریت معلوم کرنے کے لیے ہسپتال پہنچے وہ سب بھی سمندری ریلے کی طرح امڈ آئے انہوں نے لاکھ کوشش کی وہاں سے نکلنے کی مگر اتنے ہجوم میں راستہ ملنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔

"کل آپ کی بھتیجی پہ فائرنگ ہوئی' آپ لوگوں کا ڈرائیور زخمی ہو گیا' کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ کام کس کا ہو سکتا ہے؟ آپ کو کسی پہ شک ہے؟" ایک صحافی نے مائیک سامنے کرتے ہوئے سوال کیا تھا۔

"آفندی صاحب سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ آپ کی بھتیجی کیوں زخمی نہیں ہوئی؟" دوسرے صحافی نے اپنی سوچ کا اظہار کیا تھا۔

"کل سے وقار آفندی صاحب کہیں بھی نظر نہیں آئے کیا وہ خوف کی وجہ سے ملک چھوڑ گئے ہیں؟ یا پھر اپنے کمرے میں بند ہو چکے ہیں؟"

"شٹ اپ! یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے آپ لوگوں نے؟" آزر جیسے ہی سب کو ہٹاتا ہوا سامنے آیا اس کے کانوں میں اس صحافی کا تمسخرانہ سا سوال گونجا تھا۔

"بند کرو یہ کیمرے۔" اس نے غصے سے خونخوار آنکھوں سے دیکھا۔

"سر کیمرے بند کر دینے سے آپ پورے شہر کی آنکھیں تو بند نہیں کر سکتے نا؟" صحافی کچھ زیادہ ہی تیز تھے۔

"سر ہم نے تو سنا ہے کہ آپ نے یہ معاملہ دبانے کی پوری پوری کوشش کی ہے؟" آزر کا جی چاہا ایک زوردار مکا ان کے منہ پہ دے مارے لیکن اسرار آفندی نے اس کا بازو پکڑ کر اس کو ایسی کسی بھی حرکت سے باز رکھا تھا وہ خون کا گھونٹ پی کر رہ گیا تھا۔

"چلیں ڈیڈی۔" وہ اسرار آفندی کو ساتھ لے کر اس ہجوم کو چیرتا ہوا وہاں سے نکل گیا تھا اسرار آفندی کا ڈرائیور تیار کھڑا تھا ان کے آتے ہی گاڑی اسٹارٹ کر دی اور خود آزر بھی اپنی گاڑی نکال لے گیا تھا کیوں کہ اگر یہاں ٹھہرتا تو بھی یہی کچھ ہوتا تھا' بہتر تھا کہ کچھ پر نظروں سے اوجھل رہتے۔

اس نے اپنا سیل نکالتے ہوئے وقار آفندی کا نمبر ڈائل کیا تھا۔

"السلام علیکم۔" وہ کال ریسیو کرتے ہوئے بولے۔

"وعلیکم السلام۔" وہ غصہ ضبط کرتے ہوئے آہستگی سے بولا۔

"خیریت؟"

"خیریت آپ کو ڈیڈی بتا دیں گے' آپ ایسا کریں کہ مبارک خان کو خیرو بابا کے پاس بھیج دیں وہ ان کی دیکھ بھال کر لے گا۔" اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا تھا۔

"مبارک خان کو؟ مگر حویلی میں بھی تو کوئی کام......"

"ڈیڈ حویلی کے کام ہم سنبھال لیں گے آپ اسے ہسپتال بھیج دیں' دانیال تو صبح ہی ہسپتال سے گھر چلا گیا تھا اب ان کے پاس احمد اور زین بیٹھے ہوئے ہیں' احمد بھی رات سے تھک چکا ہو گا اسے گھر بھیج دیتا ہوں تاکہ وہ ریسٹ کر لے۔" آزر کا دھیان ہر طرف رہتا تھا اسی لیے احمد کے آرام کا خیال کرتے ہوئے مبارک خان کو طلب کیا تھا۔

"ٹھیک ہے میں اسے بھیجتا ہوں۔ لیکن تم کہاں ہو؟"

"میں اظہار انکل کے پاس آفس جا رہا ہوں' واپسی پہ خیرو بابا سے مل کر آؤں گا' لنچ گھر پہ ہی کروں گا۔"

"او کے اللہ حافظ۔" انہوں نے فون رکھ دیا تھا اور فون بند ہونے کے بعد آزر کی سوچ کا در کھل گیا تھا اس کا دھیان اس نمبر کی طرف چلا گیا جس نمبر سے کل وقار آفندی کو کال آئی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے آفس جانے کا ارادہ بدلا اور گاڑی ٹیلی فون ایکسچینج کی طرف موڑ دی وہ اس نمبر کی پوری انکوائری کروانا چاہتا تھا اس کے لیے اس نے ایک دو جگہ سفارش بھی کروائی تھی کیونکہ کسی کے نمبر کی معلومات حاصل کرنا اتنا آسان بھی نہیں تھا۔

ٹیلی فون ایکسچینج پہنچ کر اس نے سپروائزر سے ملنے کا کہا اور تھوڑی دیر بعد ہی وہ ان کے سامنے بیٹھا تھا۔

"پچھلے دس منٹ سے میں آپ کا ہی انتظار کر رہا تھا۔" سپروائزر خوشدلی سے بولا۔

"تھینک یو سر۔ دراصل کل ہمیں ایک نمبر سے کال موصول ہوئی تھی۔ میں اس نمبر کی ڈیٹیل اور لوکیشن وغیرہ جاننا چاہتا ہوں' ہمارا مقصد کسی کو نقصان پہنچانا نہیں ہے' بس ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ہمارا دشمن کون ہے؟ جس سے ہم خود بھی بے خبر ہیں' لیکن وہ ہم پہ وار کیے جا رہا ہے۔" آزر نے تمہید باندھی۔

"جی۔ جی میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں آپ وہ نمبر دے دیں ہمیں تھوڑی دیر تک آپ کو اس نمبر کی تمام ڈیٹیلز فراہم کر دوں گا۔" سپروائزر بھی اس کی پرابلم سمجھ چکا تھا آزر چاہتا تو یہ کام پولیس کے ذریعے بھی کروا سکتا تھا لیکن اگر یہ بات بھی سامنے آ جاتی کہ علیزے آفندی پہ فائرنگ کرنے والے نے وقار آفندی کو فون کال کر کے خود

فائرنگ کی اطلاع دی تھی تو نہ جانے اور کتنے افسانے بنائے جاتے؟ اس لیے آذر نے یہ نمبر پولیس کو انکوائری کے لیے دینے کی بجائے خود اس کی پوچھ گچھ کرنا ہی مناسب سمجھا تھا تبھی وہ اس کام کے لیے خود آیا تھا کسی اور کو نہیں بھیجا تھا۔

"سر رات کو ایک موبائل نمبر سے کچھ میسجز بھی تھے اس نمبر کا کچھ پتا چل سکتا ہے؟" آذر نے "ایک" میسج کہنے کی بجائے "کچھ" "میسجز" کا اضافہ کیا تھا۔

"سوری آذر صاحب آپ کو اس نمبر کا وہیں سے پتا چل سکتا ہے۔ جس موبائل کمپنی کا وہ نمبر ہے آپ اس کمپنی کے سروس سینٹر کال کریں یا پھر اس کے کسی قریبی فرنچائز میں جا کر ساری صورت حال سے آگاہ کریں۔ وہ آپ کو اس کا حل بتا دیں گے" سپروائزر نے آذر کو مشورہ دیا اور پھر لینڈ لائن کا نمبر لے کر اپنے کسی ملازم کو دیا "اس نمبر کا ریکارڈ نکلواؤ۔" انہوں نے ملازم کو کام سونپا وہ کاغذ پہ لکھا ہوا نمبر لے کر چلا گیا تھا تھوڑی دیر بعد واپس آیا تو آذر سمیت وہ بھی اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

"سر! اختر صاحب کہہ رہے ہیں اس نمبر کا ریکارڈ کچھ دیر بعد ملے گا۔" اس نے آ کر پیغام دیا۔

"کتنی دیر بعد؟" آذر نے گھڑی دیکھی۔

"گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تو لگ ہی جائے گا۔"

"وہ پھر تو کافی لیٹ ہو جائے گا؟" آذر کو پریشانی ہوئی۔

"ڈونٹ وری آذر صاحب میں یہ ریکارڈ آپ کے گھر یا آپ کے آفس بھجوا دوں گا یا پھر آپ اپنا آئی ڈی دے جائیں آپ کو میل کر دوں گا۔" سپروائزر کافی اچھے مزاج کا تھا آذر مل کر خوش ہوا تھا اور پھر اپنا کارڈ نکال کر تھما گیا تاکہ وہ اسے میل کر سکے۔

☼ ☼ ☼

"اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟" وہ آفس کا ایک چکر لگا کر واپسی پہ ہسپتال آیا تھا۔

"اللہ کا بڑا کرم ہے صاحب۔"

خیرو بابا نے نقاہت سے کہتے ہوئے اللہ کا شکر ادا کیا تھا۔

"کیسا محسوس کر رہے ہیں؟ کہیں درد وغیرہ تو نہیں ہے؟" آذر نے ان کے بازو پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کافی اپنائیت اور ہمدردی سے پوچھا تھا۔

"صاحب چوٹ لگی ہے تو درد تو ہو گا نا؟"

"اگر زیادہ درد ہے تو میں ڈاکٹرز سے بات کرتا ہوں وہ کور کریں۔"

"نہیں صاحب جب تک زخم نہیں بھرے گا درد ٹھیک نہ ہو گا" آپ فکر نہ کرو آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گا۔" خیرو بابا کافی باہمت اور بہادر تھے اتنی تکلیف سہہ کر بھی ان کے ماتھے پہ شکن تک نہیں تھی۔

"ان شاء اللہ آپ جلدی ٹھیک ہو جائیں گے۔" وہ انہیں تسلی دے رہا تھا۔

"علیزے بی بی کیسی ہیں؟ وہ ٹھیک ہیں نا؟" انہیں اب بھی علیزے کی فکر تھی۔

"اللہ کا شکر ہے کہ وہ ٹھیک ہے" اس کو بچاتے بچاتے آپ خود زخمی ہو گئے" آپ کو اپنے لیے بھی احتیاط کرنی چاہیے تھی۔"

"نہ صاحب! یہ تو میرا فرض بنتا تھا" بی بی کی حفاظت میرے ذمے ہی تو تھی" ساری زندگی بڑے صاحب کا نمک کھایا ہے" ان کی بیٹی کو کچھ ہو جاتا تو میں ان کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا" اور میری زندگی کا کیا ہے؟ آج ہے" کل نہیں ہو گی۔ علیزے بی بی تو ابھی بچی ہے اس نے ابھی دیکھا ہی کیا ہے؟ میں تو اپنی پوری زندگی برت چکا ہوں۔"

انہوں نے آذر کے ہاتھ پہ اپنا کمزور سا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں خیرو بابا" اپنی اپنی جگہ ہر ایک کی زندگی ضروری اور اہم ہے" آپ ہمارے لیے قابل احترام ہیں" علیزے کی جان بچا کر آپ نے ہم سب کو اپنا احسان مند کر لیا ہے" ہم لوگ آپ کا یہ احسان کبھی نہیں اتار سکتے۔"

"یہ احسان نہیں ہے صاحب یہ تو میرا فرض اور محبت ہے" آپ سب کو تو میں نے اپنے ہاتھوں سے پالا پوسا ہے" کھلایا" سکھایا ہے" اپنے بچوں کی طرح پیار کیا ہے" اور کون ایسا انسان ہے۔ جو اپنے بچے کو چوٹ لگتے خاموشی سے دیکھ سکتا ہے؟ انسان چاہتا ہے اس کے بچے کو لگنے والی چوٹ بھی اسے لگ جائے۔" خیرو بابا کی بات پہ آذر کو اطمینان کے ساتھ ساتھ خوشی ہوئی تھی۔

"واقعی آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں یہ آپ کی محبت اور خلوص ہے کہ آپ اس طرح سمجھتے ہیں ورنہ آج کل اتنی محبت اور خلوص ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل سکتے۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"بڑے صاحب نے کچھ کہا تو نہیں؟"

"نہیں وہ بھلا کیا کہیں گے؟ آپ کی خیریت پوچھ رہے تھے کافی پریشان بھی تھے آپ کے لیے" آپ کی دیکھ بھال کے لیے مبارک خان کو بھیجا ہے انہوں نے۔" اس نے خیرو بابا کو اطمینان دلایا۔

"یہی تو ان کی اچھائی ہے" وہ ہر ایک کا خیال رکھتے ہیں اپنے ملازموں کو بھی نہیں بھولتے۔" انہوں نے وقار آفندی کی تعریف کی آذر مسکرا دیا۔

"اگر آپ کچھ بہتر محسوس کر رہے ہیں تو آپ سے کچھ سوال پوچھ سکتا ہے؟" اس نے تھوڑا جھجک کے کہا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں صاحب" آپ پوچھو کیا پوچھنا ہے؟" خیرو بابا نے بشاشت ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کو کیا لگتا ہے وہ موٹر سائیکل سوار آپ کے پیچھے گاڑی کو فالو کرتے ہوئے آئے تھے یا پھر سامنے سے آ کر حملہ کیا تھا؟"

"صاحب وہ ہمارا پیچھا کرتے ہوئے نہیں آئے تھے اور نہ ہی سامنے سے آ کر حملہ کیا تھا" آپ کو پتا ہو گا کہ علیزے بی بی کے کالج روڈ پہ جائیں تو ایک روڈ مغرب کی طرف سے بھی نکلتا ہے" وہ لوگ اسی روڈ سے اچانک نکلے اور گاڑی پہ فائرنگ کر دی لیکن میں نے گاڑی پھر بھی نہیں روکی اور علیزے بی بی کو کہا کہ وہ سیٹ پہ لیٹ جائیں وہ یکدم چیخنے چلانے لگی تھیں میری بات پہ دھیان نہیں دیا اور اسی طرح سیٹ پہ بیٹھی رہیں۔ میں نے پھر مڑ کر انہیں کہا کہ سیٹ پہ لیٹ جائیں ان کو گولی لگ جائے گی اور علیزے بی بی یکدم سیٹ پہ گر گئیں لیکن میں سیدھا ہو کر بیٹھا تو سامنے ایک گولی میرے آ لگی اور گاڑی میرے قابو سے باہر ہو گئی میں نے فوراً" بریک لگا دیئے تھے اور میں بریک نہ بھی لگاتا تو گاڑی رک جاتی کیوں کہ انہوں نے آخر میں ٹائروں پہ بھی فائر کر دیئے تھے اور وہاں سے بھاگنے سے پہلے انہوں نے ایک بار رک کر علیزے بی بی کو دیکھا تھا وہ رو رہی تھیں وہ ان کو دیکھ کر چلے گئے تھے وہ چاہتے تو علیزے بی بی کو مار سکتے تھے" ان کے ہاتھ میں اسلحہ بھی تھا لیکن انہوں نے کچھ نہیں کہا اور چلے گئے" پھر مجھے ہوش نہیں رہا کہ بعد میں کیا ہوا؟" خیرو بابا نے تفصیل سے بتایا تھا۔

"کیا آپ ان کو پہچان سکتے ہیں؟"

"نہیں صاحب ان کے چہرے پہ رومال بندھے ہوئے تھے۔" خیرو بابا نے نفی میں سر ہلایا۔

"آپ کی نظر ان کی موٹر سائیکل یا نمبر پلیٹ پہ گئی ہو؟" وہ ہر طرح سے تصدیق اور تسلی چاہتا تھا۔

"صاحب! جب موت سر پہ کھڑی ہو تو ان چیزوں کا ہوش کسے رہتا ہے؟" وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہے تھے آذر چند ثانیے کے لیے خاموش ہو کے رہ گیا تھا اس کے ذہن میں یہ چبھ کے رہ گئی تھی کہ ان لوگوں نے کچھ دیر رک کر"

گاڑی میں جھانک کر علیزے کو دیکھا اور کچھ بھی کہے بغیر چلے گئے؟ اگر وہ چاہتے تو علیزے کو مار سکتے تھے' زخمی یا نقصان پہنچا سکتے تھے۔ اس کی جان لے سکتے تھے' مگر۔۔۔؟ اور اس مگر نے آذر کی الجھنوں میں اضافہ کر دیا۔ مگر انہوں نے کچھ نہیں کیا اور علیزے کی زندگی بخش کر چلے گئے؟ آخر کیوں؟ کیا وجہ تھی؟ کیا مقصد تھا ان کا؟

وہ جتنا ہی سوچتا اتنا ہی الجھتا' کوئی سرا ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔

"ایک سوال اور۔۔۔"

"کیا پہلے کبھی علیزے کو پک اینڈ ڈراپ کرتے ہوئے ڈرائیونگ کے دوران یا کالج کے آس پاس کوئی مشکوک آدمی نظر آیا؟ جس کو آپ نے دو تین بار لگاتار دیکھا ہو؟"

"صاحب انہی لوگوں کو دیکھتا تھا جو اپنی بچیوں کو چھوڑنے آتے تھے کسی کے ساتھ بھائی ہوتا تھا کسی کے ساتھ باپ' کوئی گاڑی پہ آتے تھے کوئی موٹر سائیکل پہ۔۔۔ میں بھلا کس کس کو یاد رکھ سکتا ہوں؟" آذر کو آخری سوال کا جواب بھی مل گیا مگر وہ بھی باقیوں جیسا۔

"ہوں! کوئی بات نہیں آخر پتا چل ہی جائے گا۔" آذر کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"آپ آرام کریں' میں مبارک خان کو اندر بھیجتا ہوں۔" وہ ان کا ہاتھ تھپک کر باہر نکل آیا۔ باہر کشادہ راہداری میں رکھے بینچ پہ بیٹھا مبارک خان اخبار پڑھ رہا تھا آذر ست قدموں سے مبارک خان کے پاس آ کھڑا ہوا مبارک خان اسے دیکھ کر فوراً" کھڑا ہو گیا تھا۔

"جی صاحب! حکم؟" وہ سر جھکا کے مودب کھڑا تھا۔

"اندر جاؤ خیرو بابا کے پاس۔" آذر نے آہستگی سے کہا پیشانی پہ شکنیں تھیں مبارک خان اسے دیکھ کر متفکر ہوا تھا۔

"خیریت تو ہے نا صاحب؟ آپ بہت پریشان لگ رہے ہیں؟"

"ہوں! نن نہیں کوئی پریشانی نہیں تم خیرو بابا کا خیال رکھو اور کسی بھی چیز کی ضرورت پڑے مجھے فون پہ بتا دینا' شام کو دانیال اور جودت چکر لگائیں گے' تم آج رات یہیں رکو گے۔" اس نے اپنے خیالات اپنی سوچوں کے دائرے سے نکلتے ہوئے اسے ہدایات دیں۔

"ٹھیک ہے صاحب جیسے آپ کا حکم۔" وہ فوراً" حکم بجا لایا۔ اور آذر ہسپتال کے احاطے سے نکل آیا تھا اس کا رخ بڑی حویلی کی طرف تھا لیکن سوچوں کے رخ نجانے کہاں سے کہاں جا رہے تھے' کوئی کہیں تو کوئی کہیں پہنچا ہوا تھا۔ ریشم کی تھی جو سلجھ ہی نہ رہی تھی الٹا دماغ شل ہو کے رہ گیا تھا۔

یہ تو اس کی ہمت تھی کہ کل سے لگاتار الجھ بھی رہا تھا اور بھاگ دوڑ بھی کر رہا تھا یہاں تک کہ سب کا خیال بھی رکھ رہا تھا ہر اونچ نیچ پہ نظر تھی' ہر اچھے برے کا احساس تھا کیا ظاہر کرنا تھا اور کیا چھپا کے رکھنا تھا اس پہ بھی اس کا دھیان تھا اور یہ سب اس کی خوبیوں اور بلند حوصلے کی نشانی تھی وہ گھر پہنچا تو وہ لوگ لنچ پہ اس کا ویٹ کرتے نظر آئے تھے لیکن جتنا فریش وہ صبح نظر آ رہا تھا اس وقت اتنا ہی ست اور الجھا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

"آذر بھائی اتنا لیٹ کر دیا آپ نے؟ مجھے کب سے بھوک لگ رہی تھی۔" علیزے اسے دیکھتے ہی بے چارگی سے بولی۔

"تو تم کھا لیتیں نا؟" آذر سوچوں کا بوجھ تھوڑی دیر کے لیے جھٹکتے ہوئے نرمی سے بولا۔

"آپ نے صبح میرے بغیر ناشتا نہیں کیا تو میں لنچ کیسے کر لیتی؟" علیزے کا جواب بھی کھرا تھا آذر اتنی ٹینشن کے باوجود مسکرا دیا۔

قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

"تھینک یو سویٹی' تم نے مجھے یاد رکھا' میرا انتظار کیا' بھوک برداشت کی' تھینک یو سو مچ۔" وہ آہستگی سے اس کا گال چھوتے ہوئے کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا تھا وقار آفندی' اسرار آفندی اور ان کی بیگمات بھی وہیں موجود تھیں۔ حرمت' مدحت' جویریہ' انیسہ اور احمد بھی وہیں بیٹھے ہوئے تھے' آذر نے کلاک کی سمت دیکھا تین بج رہے تھے گویا وہ بھی اپنے وقت پہ کالج اور یونیورسٹی سے آئے تھے بس وہ لیٹ پہنچا تھا۔

"دانیال کہاں ہے؟" اس نے کھانا شروع کرنے سے پہلے پوچھا۔

"ٹیکسی میں۔" جواب احمد نے دیا تھا۔

"کیوں کیا کر رہا ہے؟" آذر نے اپنے سامنے نیپکن پھیلاتے ہوئے کہا۔

"آرام۔" اس نے آرام پہ زور دیا۔

"ابھی تک تھکن نہیں اتری؟"

"رات کی تھکن رات ہی اتار سکتی ہے' دن میں چاہے جتنا بھی آرام کر و وہ کمی پوری نہیں ہوتی۔" احمد نے جواز پیش کیا۔

"اگر آج کی رات دوبارہ جانا پڑ گیا تو؟" آذر نے احمد کو بوکھلا کے رکھ دیا تھا۔

"نن۔ نہیں آذر بھائی ایک رات میں ہی کمر تختہ بن گئی ہے اگر آج کی رات بھی لگ گئی تو سمجھیں ہم آپ کو "تخت" پہ نظر آئیں گے' سیدھے' اکڑے ہوئے' اور ٹھنڈے۔" احمد نے ہولناک سا نقشہ کھینچا تھا۔

"نہ۔ کچھ تو سوچ سمجھ کر بولا کرو۔" ثمرہ بیگم نے بیٹے کو سرزش کی۔

"ممی آپ بھی تو دیکھیں' ہم پہ کون سا ظلم ہو رہا ہے۔" احمد نے منمنا کے کہا۔

"یہ ظلم ہے؟" وہ گھورنے لگیں۔

"تو اور کیا ہے؟" وہ روہانسا ہونے لگا۔

"یہ کسی بیمار کی عیادت اور خدمت کا موقع ہے' فائدہ اٹھاؤ اور ثواب حاصل کرو۔"

"یہ فائدہ اور ثواب پوری حویلی میں کوئی اور کیوں نہیں حاصل کر رہا؟" اس کا انداز ایسا تھا کہ آذر ہنسی چھپانے کے لیے پانی کا گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگانے پہ مجبور ہو گیا تھا جبکہ حرمت وغیرہ ہنسی نہیں روک سکی تھیں وقار آفندی بھی مسکرا رہے تھے کیونکہ ان کی علیزے جو ہنس رہی تھی اس کی ہنسی ان کی رگوں میں زندگی دوڑا دیتی تھی۔

وہ لوگ ہنسی مذاق میں لنچ کر رہے تھے اتنی ٹینشن اور پریشانیوں کے باوجود تھوڑی دیر کے لیے خوشگوار ماحول کافی اچھا لگ رہا تھا جب اچانک آذر کے سیل پہ میسج ٹیون بجی۔ اس نے فوراً" سیل نکال کر دیکھا۔

"آذر آفندی کیا خیرو بابا نے یہ نہیں بتایا کہ جن لڑکوں نے فائرنگ کی تھی وہی ان کو ہسپتال میں لے کر گئے تھے؟" وہ میسج پڑھ کر دنگ رہ گیا تھا۔

اس کا دماغ چکرا گیا تھا اور کانوں میں سے جیسے دھواں نکلتا ہوا محسوس ہوا تھا وہ ششدر سا بیٹھا موبائل اسکرین پہ نظر آتے الفاظ کو دیکھ رہا تھا' اس کے ایک ہاتھ میں کھانے کا چمچہ تھا اور ایک ہاتھ میں موبائل فون۔ لیکن دونوں چیزوں کو تھامنے کے باوجود اس کے دونوں ہاتھ اپنی اپنی جگہ پہ ساکت ہوئے لگ رہے تھے اور یہی حال اس کی نظروں کا بھی تھا جو موبائل اسکرین پہ جمی ہوئی تھیں۔

"آذر! کیا بات ہے؟ کیا ہوا ہے؟" اس کی یہ منجمد سی کیفیت سب سے پہلے وقار آفندی نے ہی نوٹ کی تھی جس پہ باقی سب بھی آذر کی سمت متوجہ ہوئے تھے اور آذر یکدم چونک گیا تھا۔

"خیریت تو ہے نا؟" آذر کے چہرے پہ پریشانی اور الجھن کے سائے صاف نظر آرہے تھے۔

"جی سب خیریت ہے ڈونٹ وری۔" اس نے بمشکل اپنے آپ کو کمپوز کیا تھا۔

"میسیج کس کا تھا؟"

"میرے ایک دوست کا تھا۔" اس نے بہانا بنا دیا۔

"تو پھر اتنے پریشان کیوں لگ رہے ہو؟" وقار آفندی اسے کرید رہے تھے۔

"اس کی طبیعت ٹھیک نہیں' اس لیے پریشانی ہو رہی ہے۔" آذر کو اپنا جھوٹ نبھانے کے لیے مزید جھوٹ بولنا پڑا۔

"اوہ! تو اس سے مل آؤ جاکر۔"

"ابھی میں تھکا ہوا ہوں' آرام کروں گا۔" آذر لاپروائی سے کہتا چمچہ رکھ کر پانی پیتے ہوئے فوراً" ہی کھڑا ہو گیا تھا ان کی حیران سی نظریں آذر پہ ہی تھیں' لیکن ان میں سے صرف علیزے کی نظریں ایسی تھیں' جن میں حیرانی نہیں بلکہ خوف اور دہشت کی لہر سی تیر رہی تھی۔ آذر اس کی نظروں سے تھوڑی دیر کے لیے نظریں چراتا وہاں سے چلا آیا تھا اس کا رخ اپنے بیڈ روم کی طرف تھا وہ بڑی تیزی سے سیڑھیاں طے کرتا اپنے بیڈ روم میں آیا تھا اور سب سے پہلے موبائل نکال کر دانیال کا نمبر ڈائل کیا تھا۔

"ہیلو۔۔۔" دانیال کی نیند سے بوجھل آواز سنائی دی۔

"دانیال! میں آذر بات کر رہا ہوں۔"

"ہاں میں نمبر دیکھ چکا ہوں' کہاں ہو تم؟"

"میں حویلی میں ہی ہوں' تم ابھی بیڈ روم میں آؤ' میں نے تم سے بات کرنی ہے۔" آذر کا لہجہ عجلت بھرا تھا۔

"کیا؟ تم حویلی میں ہو؟" اب کی بار دانیال کو اچنبھا ہوا تھا کہ وہ حویلی میں موجود ہو کر بھی فون پہ رابطہ کر رہا ہے آخر کیا وجہ ہے؟

"ہاں حویلی میں ہوں' تم جلدی آؤ' اور ہاں کسی کو بتانا مت کہ میں نے تمہیں بلایا ہے۔" آذر نے فون بند کرنے سے پہلے تاکید کی تھی۔

"اوکے۔" دانیال نے فون بند کر دیا اور آذر اپنے بیڈ روم میں بے چینی سے ٹہلتے ہوئے اس کا انتظار کرنے لگا تھا اور اگلے دس منٹ میں دانیال اس کے بیڈ روم میں اس کے سامنے تھا۔

"سب خیریت تو ہے نا؟" دانیال نے چھوٹتے ہی سوال کیا۔

"خیریت ہوتی تو تمہیں نیند سے نہ جگاتا۔" آذر کے انداز و اطوار سے اضطراب جھلک رہا تھا۔

"کیوں؟ کیا ہوا ہے؟" دانیال بھی متفکر سا ہو چکا تھا۔

"میں آج خیرو بابا سے ملنے ہسپتال گیا تھا۔" اس نے جیسے اپنے اضطراب کو بیان کرنے کے لیے تمہید باندھی۔

"پھر؟"

"پھر میں نے ان سے حال چال پوچھنے کے بعد ان سے چند سوال پوچھے اور انہوں نے وہی جواب دیے جو وہ جانتے تھے۔"

"کیسے سوال پوچھے تھے؟"

"یہی کہ جن دو لڑکوں نے فائرنگ کی وہ ان کو پہچان سکتے ہیں یا نہیں؟"

"پھر کیا کہا انہوں نے؟"

"وہی جو ہم پہلے ہی جانتے ہیں کہ ان کے چہروں پہ رومال بندھے ہوئے تھے اس لیے پہچاننا بہت مشکل کام ہے۔ بلکہ وہ تو یہ بھی نہیں جانتے کہ ان کو ہسپتال کون لے کر گیا تھا؟"

"تو اب تمہیں کیا بات پریشان کر رہی ہے؟" دانیال آذر کے پریشان چہرے کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"یہ دیکھو۔" اس نے موبائل دانیال کے سامنے کر دیا۔

"آذر آفندی کیا خیرو بابا نے یہ نہیں بتایا کہ جن لڑکوں نے فائرنگ کی تھی وہی ان کو ہسپتال بھی لے کر گئے تھے؟" دانیال بھی میسج پڑھ کر شاید شاکڈ رہ گیا تھا یہ میسج اب سے بیس منٹ پہلے کا تھا یعنی تازہ ترین.....! اس کے کانوں سے بھی دھواں اسی طرح نکلا تھا جیسے آذر کے کانوں سے نکلا تھا۔

"اس نمبر پہ ٹرائی کیا تم نے؟" دانیال نے اسکرین پہ نظر آتے نمبر کو دیکھا۔

"یقیناً" آف ہو گا۔" آذر کو یقین تھا۔

"ٹرائی تو کرو۔"

"تم خود کر کے دیکھ لو۔" اس نے موبائل دانیال کو پکڑا دیا۔ اور پھر سچ مچ وہ نمبر پاور آف ملا تھا۔

"اب کیا سوچ رہے ہو تم؟" دانیال اس کا پر سوچ انداز بھانپ چکا تھا۔

"میں سوچ رہا ہوں کہ صرف فائرنگ ہی مسئلہ نہیں ہے بلکہ اور مسئلے بھی سامنے آ رہے ہیں ایک ہی مسئلے کی کئی شاخیں نکل رہی ہیں۔" آذر کا انداز ہنوز پر سوچ سا تھا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" دانیال الجھا۔

"یار مطلب کو نہ دیکھو" تم غور کرو" علیزے پہ فائرنگ ہوئی لیکن علیزے کو نقصان نہیں پہنچا" فائرنگ کے فوراً" بعد ڈیڈ کو ان کے پرسنل نمبر پہ اطلاع دی گئی۔ حالانکہ ڈیڈ کا نمبر حادثے کے وقت نہ علیزے نے کسی کو دیا تھا نہ خیرو بابا نے یعنی نمبر پہلے سے موجود تھا؟ پھر میڈیا والوں کو خرید لیا گیا' یعنی جتنا پیسہ میں نے دیا تھا اس سے زیادہ پیسہ اس آدمی نے دیا ہو گا؟ ڈیڈ صبح خیرو بابا کی عیادت کے لیے ہسپتال گئے تو میڈیا والے بھی ان کے پیچھے پہنچ گئے' یعنی انہیں خبر کی گئی تھی؟ پھر میں ہسپتال گیا تو بھی خبر ہو گئی کہ میں خیرو بابا سے ملنے گیا ہوں یہاں تک کہ میرے پرسنل نمبر پہ میسج بھی بھیج دیا ہے۔ اور اس ساری صورت حال سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ آدمی کس حد تک باخبر ہے اور کسی حد تک ہم پہ نظر رکھے ہوئے ہے؟" آذر نے اپنی سوچ کا اظہار کافی تفصیل سے کیا تھا۔

"یہ تو تم واقعی ٹھیک کہہ رہے ہو" لیکن کیا کیا جا سکتا ہے اب؟" دانیال بھی اس کی سوچ پہ متفق تھا۔

"یہی کہ ہم حد سے زیادہ محتاط ہو جائیں" کوئی بات کسی سے ڈسکس نہ کریں' ہر بات اپنے تک محدود رکھیں' اور جو بھی قدم اٹھائیں اس کا کسی کو بھی علم نہ ہو۔ یہاں تک کہ ہمارے بڑوں کو بھی نہیں" کیونکہ ہمارے بڑے کسی بات کو نہیں چھپا سکتے اور آج کے بعد ہر بات میرے اور تمہارے درمیان رہے گی" کوئی تیسرا کچھ بھی نہ سنے۔" آذر نے اسے اچھی طرح سمجھایا۔

"او کے ایز یو وش۔" دانیال نے سر جھکا دیا۔

"اور اب میرا خیال ہے کہ جو بھی پوچھ گچھ کرنی ہے وہ تم کرو گے" تم ہسپتال جاؤ اور پتا کرنے کی کوشش کرو کہ

جن لڑکوں نے خیرو بابا کو ایڈمٹ کروایا تھا انہوں نے اپنا نام و پتا درج کروایا تھا؟" آذر نے اسے کام سونپا۔

"او کے میں پتا کرتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے پھر مجھے بتا دینا۔" آذر نے تاکید کی۔

"اس نمبر کا کیا بنا جس سے کل ڈیڈ کے نمبر پہ کال آئی تھی؟" دانیال جاتے جاتے پھر واپس پلٹا۔

"میں ٹیلی فون ایکسچینج گیا تھا۔ سپروائزر سے ملاقات ہوئی تھی وہ کہتے ہیں کچھ دیر تک ساری انفارمیشن میل کر دیں گے۔" آذر نے تسلی دی اور دانیال باہر نکل گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کومل.....!" وہ سیڑھیاں چڑھ رہی تھی جب پیچھے سے حرمت کی آواز سنائی دی۔

"ہوں؟" اس نے پلٹ کر دھیمے سے کہا۔

"لنچ نہیں کرو گی۔"

"نہیں بھوک نہیں ہے۔"

"کیوں آج بھوک کہاں اڑ گئی؟" حرمت کا لہجہ معنی خیز تھا۔

"کیوں؟ میری بھوک کیوں اڑے گی؟" کومل نے اسے گھورتے ہوئے دیکھا۔

"بس ویسے ہی....." اس نے کندھے اچکائے

"تم ملازمہ سے کہو کھانا لگائے میں چینج کر کے آ رہی ہوں۔" کومل کہہ کر اوپر بیڈ روم چلی گئی تھی اور حرمت حسب توقع ملنے والے جواب پہ مسکراتی ہوئی کچن میں آ گئی۔ کچھ ہی دیر کومل بھی وہیں چلی آئی۔

"کھانے میں کیا بنا ہے آج؟" وہ کرسی گھسیٹتے ہوئے بولی۔

"مٹن رائس اور مٹن کڑاہی اور ساتھ میں باقی لوازمات۔"

"اف یار آج پھر مٹن؟" کومل کو کھانے میں چکن پسند تھا۔

"آذر بھائی اور ڈیڈ نے گھر پہ ہی لنچ کرنا تھا اس لیے ان کی پسند کو مد نظر رکھا گیا تھا۔" حرمت نے آگاہ کیا۔

"اور علیزے نے؟" کومل کو آذر اور ڈیڈ کے بعد علیزے کا خیال آیا۔

"اس کا کھانا تو پہلے ہی رجو نے تیار کرنا ہوتا ہے یقیناً" کوئی ویجی ٹیبل ہی بنائی ہو گی' یہ مٹن اور چکن تو اسے پسند ہی نہیں ہیں۔" حرمت سلاد کی پلیٹ میں سے مولی کی قاش اٹھاتے ہوئے بولی۔

"ہاں! یہ تو میں بھول ہی گئی۔" کومل تمسخرانہ سا بولی اور کھانا نکالنے لگی۔

"تم بتاؤ سفر کیسا رہا؟" حرمت بالآخر اپنے مطلب کی بات پہ آ ہی گئی تھی۔

"کون سا سفر؟" وہ انجان بنی۔

"جس پہ تمہیں بھیجا تھا۔"

"آخری سفر؟" کومل بے ساختہ بولی۔

"بکو مت' صاف صاف بتاؤ' سفر کیسا رہا اور کیا کیا باتیں ہوئیں؟" حرمت کو بے چینی ہو رہی تھی۔

"یار کیسا سفر اور کیسی باتیں چھوڑو کوئی اور بات کرو۔" کومل کھانا کھانے میں مصروف تھی۔

"کیوں کوئی اور بات کروں تم کچھ تو بتاؤ نا۔" وہ اصرار کر رہی تھی۔

"تمہیں مایوسی ہو گی۔" کومل کا انداز لاپروا سا تھا اور بات بھی خاصے نارمل سے انداز میں کر رہی تھی۔

"وہ کیوں؟ آخر تمہیں کس لیے بھیجا تھا؟" حرمت کو تاؤ آ گیا تھا۔

"کس لیے بھیجا تھا؟" کومل نے پانی گلاس میں انڈیلتے ہوئے پوچھا۔
"باتیں کرنے کے لیے۔" وہ زور دے کر بولی۔
"کیسی باتیں؟" پھر وہی انجان پن۔
"کومل پلیز۔" حرمت جھنجلا گئی۔
"یار پوچھ رہی ہوں ناکہ کیسی باتیں؟" کومل نے پھر سوال دہرایا۔
"تمہاری باتیں اور ان کی باتیں۔" اب کی بار حرمت چبا کر بولی تھی۔
"ہوں! یعنی ہماری باتیں؟ دیکھو حرمت میری باتیں یہ تھیں کہ میری اسٹڈی کیسی جا رہی ہے اور میں کون سے ائیر میں ہوں؟ اور ان کی باتیں یہ تھیں کہ وہ علیزے کے لیے بہت پریشان ہیں اور علیزے آج کل ڈسٹرب ہے۔ بس اس کے بعد فون کال آگئی اور باتیں ختم۔" کومل نے کافی استہزائیہ سے لہجے میں بتایا تھا۔
"بس یہ باتیں؟" حرمت کو افسوس ہوا۔
"بس یہ سفر۔" کومل نے ساتھ لقمہ دیا۔
"لیکن کومل۔"
"پلیز حرمت اب کوئی صفائی مت دینا' میں سب جانتی ہوں۔" وہ کرسی دھکیل کر کھڑی ہو گئی۔
"کومل یار سنو تو۔" حرمت نے پکارا۔ مگر وہ وہاں رکے بغیر چلی گئی تھی اس کا موڈ آف ہو چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

"استاد میں بڑے دنوں سے ایک بات سوچ رہا ہوں لیکن مجھے سمجھ نہیں آرہی۔" چھوٹا پرانے کپڑے سے اپنے تیل سے اٹے ہاتھ پونچھتا ہوا عدیل کے پاس آبیٹھا۔ عدیل ورکشاپ کے لیے نئے پرزے منگوانے کے لیے لسٹ بنا رہا تھا لیکن چھوٹے کی بات پہ ٹھہر گیا۔
"کیا بات سوچ رہے ہو۔" عدیل نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
"پہلے وعدہ کرو کہ جواب ضرور دو گے۔" چھوٹے نے پہلے وعدہ لیا' عدیل کو حیرت ہو رہی تھی۔
"اوکے ضرور دوں گا۔"
"تو پھر یہ بتاؤ کہ "منی کیوں بدنام ہوئی؟" چھوٹا سنجیدہ سا منہ بنا کے بولا تھا۔
"ہیں؟" عدیل کو مزید حیرت نے آگھیرا اور دور کھڑے سلو اور جیدی کو دیکھ کر وہ چھوٹے کی شرارت سمجھ گیا تھا وہ دونوں ہنس رہے تھے۔
"بتاؤ نا استاد منی کیوں بدنام ہوئی۔" چھوٹے نے اصرار کیا۔
"ڈارلنگ تیرے لیے۔" اس نے بے ساختہ کہا تھا اور چھوٹا خوشی اور فتح کے احساس سے قہقہے لگاتا اٹھ کر سلو کے پاس جا کھڑا ہوا تھا۔
"دیکھا استاد کو بھی پتا ہے "منی میرے لیے بدنام ہوئی ہے" تم تو صرف نام کے سلمان خان ہو۔" اس نے سلو کو چڑایا تھا۔
"تیرے لیے بدنام ہونے سے بہتر تھا کہ منی مر ہی جاتی۔" سلو چھوٹے کو پرے دھکیلتا ہوا گاڑی کے انجن پہ جھک گیا تھا۔
"یار تو شیلا کی جوانی گانا شروع کر دے۔" جیدی نے سلو کو تھپکی دی۔
"اور یہ پھر کہے گا کہ شیلا تو اس کی منگیتر رہی ہے۔" سلو نے چھوٹے کو گھور کے دیکھا تھا اور عدیل ان کی

شرارتوں اور چھیڑ چھاڑ پہ مسکراتا ہوا دوبارہ لسٹ کی طرف متوجہ ہوا تھا ان لوگوں کی پورا دن کسی نہ کسی گانے یا فلم پہ بحث اور نوک جھوک ہوتی ہی رہتی تھی اور کچھ نہ بس چلتا تو ایکٹرس اور ایکٹرز کو گفتگو میں گھسیٹ لاتے تھے اور جو جس کا دیوانہ ہوتا تھا اس کے بارے میں معلومات کا خزانہ بھی رکھتا تھا۔ اور ایسے چکروں میں اگر ورکشاپ کا کوئی کام ادھورا رہ جاتا تو باؤ امتیاز کے ہاتھوں ان کی شامت آجاتی تھی اس وقت بھی کچھ ایسا ہی حال نظر آرہا تھا۔
"یار باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ کام بھی کر لیا کرو یہ گاڑی آج ہی ٹھیک کر کے شیخ صاحب کے گھر پہنچانی ہے استاد تاکید کر کے گئے ہیں۔" عدیل نے بالآخر ان کو ٹوک ہی دیا تھا۔
"اور استاد نے یہ بھی تاکید کی ہے کہ شیخ صاحب پیسے نہ دیں تو گاڑی اسی طرح واپس ورکشاپ ہی لے آنا۔" چھوٹے نے ہنستے ہوئے کہا۔
"پھر شیخ صاحب خود گاڑی کی طرح بھاگتے ہوئے پیچھے آئیں گے۔" سلو نے بھی حصہ لیا اور عدیل چاہتے ہوئے بھی اپنی مسکراہٹ نہیں روک سکا تھا۔
"چلو اب باتیں بعد میں کرنا پہلے کام ختم کرو۔" اس نے سنجیدگی طاری کرتے ہوئے کہا۔
"استاد سارا دن کام ہی تو کرتے رہتے ہیں۔" جیدی نے بے زاری سے کہا۔
"اوئے کم بخت سارا دن کام کرتے ہو تو کیا کام کے پیسے نہیں لیتے؟" باؤ امتیاز نے اندر آتے ہوئے اس کی بات سن لی تھی اور جیدی یکدم اچھل پڑا تھا۔
"نہیں استاد میں تو ویسے ہی کہہ رہا تھا۔" اس نے فوراً صفائی پیش کی۔
"میں اچھی طرح جانتا ہوں تو کتنا ہڈ حرام ہے کام چور ہے تو۔" باؤ امتیاز کو موقع مل گیا اسے کھری کھری سنانے کا' جیدی سر جھکائے سنتا رہا اور باقی دونوں بڑی شرافت اور محنت کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود بہ خود اپنے اپنے کام میں لگ گئے تھے ان کو باتیں سنا کر باؤ امتیاز عدیل کے قریب آرکے۔
"بن گئی لسٹ؟"
"جی بن گئی ہے۔" عدیل اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا۔
"کتنا خرچہ آئے گا؟" وہ ٹوٹل حساب پوچھ رہے تھے۔
"تقریباً بیس سے پچیس ہزار کا سامان ہو گا یہ سارا۔" عدیل نے اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔
"ہوں! تو پھر ایسا کرو کہ یہ سامان کل گوجرانوالہ جا کر لے آؤ' باؤ حمید کی مارکیٹ میں جانا اور میرا نام لینا' وہ سارا سامان سستے ریٹ میں دیں گے۔" انہوں نے اسے سمجھایا۔
"ٹھیک ہے میں جا کر لے آؤں گا' آپ سب کچھ سمجھا دیجیے گا۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ہوں! شام تک سب سمجھا دوں گا اور سامان کے لیے رقم بھی دے دوں گا۔" باؤ امتیاز کو اس پر بھروسہ تھا اسی لیے اب ہر چھوٹے موٹے کام کی ذمہ داری اسے ہی سونپتے تھے۔
"جیسے آپ کی مرضی۔" وہ سعادت مندی سے بولا۔
"اور ہاں ایک بات بتاؤ' تمہارے ابا جی کیسے ہیں؟" باؤ امتیاز کچھ یاد آنے پہ واپس مڑتے ہوئے ٹھہر گئے تھے۔
"اب ابا جی کی طبیعت کے لیے میں کیا کہوں؟" عدیل نے بے بسی سے مسکراتے ہوئے کہا۔
"کیوں؟"
"کیونکہ ان کی طبیعت ویسی ہی ہے جیسی پچھلے دو سالوں سے چلی آرہی ہے اب کون سا علاج کروا رہے ہیں جو اتنی جلدی فرق آجائے گا؟" عدیل جیسے اپنے آپ پہ طنز کر رہا تھا حالانکہ وہ بڑا صابر و شاکر سا بندہ تھا۔
"تو علاج کیوں نہیں کروا رہے؟" باؤ امتیاز کا سوال بہت بے ساختہ سا تھا۔ عدیل باؤ امتیاز کو دیکھتا رہ گیا۔ "جیب

کیوں ہو گئے ہو؟"

"استاد آپ صرف اتنا جانتے ہیں کہ میرے ابا جی بیمار ہیں' نہ چل پھر سکتے ہیں' نہ خود کچھ کھا پی سکتے ہیں لیکن آپ یہ نہیں جانتے کہ میری پانچ بہنیں بھی ہیں جن کی ذمہ داری بھی ظاہر ہے کہ میری ہی ذمہ داری ہے ایسے میں گھر کا انتظام چلے یا پھر کسی بیماری کا علاج؟" عدیل نے ان کو سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تھا باؤ امتیاز چپ کے چپ رہ گئے تھے اور انہیں یہ بھی احساس ہو گیا تھا کہ عدیل اتنا خاموش خاموش اور سنجیدہ سنجیدہ سا کیوں رہتا ہے؟

"دیکھیے استاد میں ورکشاپ میں کام کر رہا ہوں' جہاز کا انجینئر نہیں ہوں کہ ایک دم سے میرے گھر کے سارے مسئلے حل ہو جائیں' پورا مہینہ گاڑیوں کی مرمت ہو گی تب جا کر تنخواہ ملے گی' اینی وے آپ پریشان نہ ہوں' اللہ بہتر کرے گا بس اللہ سے بہتری کی دعا کرنی چاہیے۔" اس نے باؤ امتیاز کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے الٹا انہیں تسلی دی تھی۔

"باؤ عدیل! تو تو واقعی بڑے حوصلے اور بڑے صبر والا ہے؟" باؤ امتیاز آہستہ سے سراہنے والے لہجے میں بولا تھا۔

"استاد مشکلیں اور مصیبتیں خود ہی انسان کو صبر اور حوصلہ سکھا دیتی ہیں اس میں کسی کی تسلی اور ہدایت کی ضرورت بھی نہیں پڑتی' سب کچھ خود بہ خود آ جاتا ہے۔" عدیل کا انداز ٹھہرا ہوا تھا۔

"اللہ تمہیں اس صبر کا اجر دے گا۔" انہوں نے اس کا کندھا تھپکا۔

"آمین۔" وہ آہستہ سے کہہ کر کام کی طرف متوجہ ہو گیا لیکن باؤ امتیاز کا دھیان کافی دیر اسی کی طرف لگا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ آج صبح کافی جلدی اٹھ گیا تھا اور جاگنگ پہ جانے کی بجائے شاور لینے باتھ روم میں چلا گیا۔ دس منٹ بعد شاور لے کر باہر نکلا تو دروازے پہ دستک ہوئی تھی۔

"ہوں! آ جاؤ۔" اسے پتا تھا باہر کون ہو گا؟

"جی صاحب کس وقت نکلنا ہے؟" گلاب خان حکم کی تعمیل کے لیے تیار کھڑا تھا۔

"سات بجے ایئر پورٹ پہنچنا ہے' آٹھ بجے کی فلائٹ ہے اور صبح صبح اتنا رش ہوتا ہے کہ راستے میں لیٹ ہونے کی بجائے بہتر ہے کہ ہم ذرا پہلے پہنچ جائیں۔" وہ اپنے بالوں میں تولیہ رگڑتے ہوئے بولا۔

"جی صاحب یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" گلاب خان نے اتفاق کیا۔

"او کے تم گل سے کہو کہ وہ جلدی سے ناشتا بنا کر تیار ہو جائے' ہم راستے میں اسے نبیل کے گھر ڈراپ کر جائیں گے۔" اس نے وارڈ روب کھول کر اپنے کپڑے نکالے۔

"جی صاحب کہہ دیتا ہوں۔" گلاب خان سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"اور زلفی سے کہو اب تمہاری صرف نائٹ ڈیوٹی نہیں بلکہ فل ٹائم جاب ہو گی۔" اس نے ایک اور حکم دیا۔

"فل ٹائم؟" گلاب خان کو حیرت ہوئی۔

"ہاں یار! تمہیں ہزاروں کاموں کے لیے ادھر سے ادھر بھاگنا پڑتا ہے اور آج کل کے حالات ایسے ہیں کہ ذرا دیر کے لیے بھی گیٹ کو خالی نہیں چھوڑا جا سکتا' اس لیے بہتر ہے کہ زلفی کو پکا پکا واچ مین رکھ لیا جائے' تمہاری پرابلم اور بھاگ دوڑ کم ہو جائے گی اور وہ بھی ایک جگہ ٹک جائے گا۔ کیا خیال ہے تمہارا؟" اس نے آخر میں گلاب خان سے استفسار کیا۔

"صاحب میرا خیال آپ کے خیال سے اچھا نہیں ہو سکتا' آپ نے جو بھی سوچا ہے' بہتر سوچا ہے۔" اسے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا؟

"ٹھیک ہے جاؤ تم گاڑی تیار کرو' میں آ رہا ہوں بس۔" اس نے گلاب خان کو اجازت دی اور خود تیار ہونے لگا دس منٹ میں وہ تیار ہوا اور ناشتا کیا تھا۔ جب تک وہ گاڑی میں بیٹھا گل بھی چادر لے کر آ گئی تھی۔ گلاب خان اس کے لیے بیک ڈور کھول رہا تھا وہ پیچھے بیٹھ گئی اور خود آ کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ آج گیٹ پہ گلاب خان کی بجائے زلفی تھا جیسے ہی گاڑی اسٹارٹ ہوئی اس نے گیٹ کھول دیا تھا۔ اور ساتھ ہی ہاتھ کے اشارے سے دل آور شاہ کو سلام کیا جواباً" وہ بھی اشارے سے والسلام کہنا نہیں بھولا تھا۔

"اسپیڈ بڑھاؤ یار۔" اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

"صاحب ہم سات بجے ان شاء اللہ ایئر پورٹ پہ ہوں گے۔" گلاب خان کو اپنی ڈرائیونگ پہ یقین تھا۔ دل آور اپنا موبائل نکال کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔

"السلام علیکم سر۔" دوسری طرف اس کا منشی قادر تھا۔

"میں آج کورٹ نہیں آ رہا' تم آفس کا چکر لگا لینا۔"

"سر آج تو بہت اہم کیس ہے....."

"قادر! میں جانتا ہوں یہ کیس کتنا اہم ہے؟ لیکن میرے دوست نبیل سے زیادہ اہم نہیں ہے میں اگلی تاریخ پہ سب ہینڈل کر لوں گا۔ تم بس تاریخ لے لو۔" اس نے منشی کو سمجھایا۔

دل آور شاہ نے کبھی بھی اپنے کسی کام میں کوتاہی نہیں کی تھی اور نہ ہی اپنے کلائنٹس کو خوار کرتا تھا بس آج کل اس کی مصروفیت ہی ایسی بڑھ گئی تھی کہ اسے یہ سب کرنا پڑ رہا تھا۔

"آپ کل تو کورٹ آئیں گے نا؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتا' کل کا کام تمہیں کل ہی بتاؤں گا۔"

"سر! وہ مومنہ بی بی.....!"

"پلیز قادر میں اس وقت کسی بھی مومنہ بی بی کو ڈسکس نہیں کر سکتا' یہ کام پھر کبھی پہ اٹھا رکھو۔" اس نے قادر کو روک دیا۔

"سوری سر!"

"او کے رات کو مجھے فون کر کے ساری تفصیل بتا دینا۔"

"ٹھیک ہے سر اللہ حافظ۔" اس نے فون بند کر دیا تھا۔

اور اگلے پانچ منٹ میں گل کو نبیل کے گھر ڈراپ کرنے کے بعد وہ لوگ ایئر پورٹ کی سمت روانہ ہو چکے تھے اور گلاب خان کے قول کے مطابق ٹھیک سات بجے وہ لوگ ایئر پورٹ پہ موجود تھے۔ گلاب خان گاڑی میں ہی بیٹھا رہا جبکہ وہ اندر چلا گیا فلائٹ کی ٹائمنگ کا ایک بار پھر پتا کرنا تھا۔

☼ ☼ ☼

آذر نے صبح اٹھتے ہی سب سے پہلے اپنا لیپ ٹاپ آن کرتے ہوئے اپنی میلز چیک کی تھیں اور ایک میل پہ اس کی نظریں جم گئی تھیں وہ بری طرح چونکا تھا۔ یہ میل ٹیلی فون ایکس چینج کے سپروائزر فیضان حامد نے کی تھی جس میں انہوں نے آذر کے مطلوبہ نمبر کا ڈیٹا بتایا تھا' وہ نمبر اس ہسپتال کا نمبر تھا جہاں اس وقت خیرو بابا ایڈمٹ تھے۔

آذر اس نئے انکشاف پہ ایک بار پھر ساکت سا بیٹھا رہ گیا تھا یہ ساری گتھی اس قدر الجھی ہوئی تھی کہ سلجھنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی کوئی سرا ہاتھ ہی نہیں آ رہا تھا۔

"اُف! اب کس کس چیز کا پتا کیا جائے؟" وہ لیپ ٹاپ اسی طرح چھوڑ کر بیڈ سے کھڑا ہو گیا تھا اور کمرے میں کافی اضطراری انداز میں ٹہلنے لگا تھا پھر نجانے کیا سوچ کر بیڈ روم سے باہر نکل آیا۔ اس وقت صبح کے چھ بجے کا وقت تھا اور حویلی میں چہل پہل کی خاصی کمی تھی آسیہ آفندی ڈرائنگ روم میں قرآن پاک پڑھ رہی تھیں۔

"السلام علیکم۔" اس نے آہستگی اور احترام سے سلام کیا۔ جواباً انہوں نے اک نظر اسے دیکھ کر سر ہلایا تھا۔ آزر کا ارادہ انیکسی میں جا کر دانیال کو جگانے کا تھا لیکن پھر اس کے آرام کا خیال کر کے رک گیا اور اپنا ذہن کچھ ریلیکس کرنے کے لیے چائے پینے کا سوچا۔

وہ وسیع و عریض کچن کے دروازے سے اندر داخل ہوا ہی تھا کہ قدم وہیں ٹھٹک گئے۔ کومل چولہے پہ چائے کے لیے پانی رکھ رہی تھی۔

"کیا ایک کپ چائے کا مجھے بھی مل سکتا ہے؟" آزر کی آواز پہ کومل یکدم اس کی سمت پلٹی تھی آزر دروازے کے بیچوں بیچ کھڑا تھا ڈھیلے ڈھالے ٹراؤزر شرٹ میں ملبوس سادہ سلیپر پہنے بے ترتیب سے ہیئر اسٹائل کے ساتھ وہ اس کے دل کو اور بھی دھڑکا گیا تھا۔

"یہ کیا پاگل پن ہے؟" آزر نے آگے بڑھ کے جھٹکے سے کومل کو اپنی سمت کھینچ لیا تھا کومل چکرا گئی تھی وہ اس حملے کے لیے تیار نہیں تھی۔ آزر نے اس کا دوپٹہ کھینچ کر پرے پھینک دیا تھا۔

"کھڑے کھڑے کہاں گم ہو جاتی ہو؟" آزر سختی سے اسے جھڑک رہا تھا اور کومل پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی آزر کو اور کبھی فرش پہ جلتے اپنے دوپٹے کو دیکھ رہی تھی جب آزر کی سمت پلٹی تو دوپٹے کا پلو چولہے سے جا ٹکرایا تھا۔

"دوپٹے کی بجائے کپڑوں کو آگ لگ جاتی تو؟ کچن میں آتی ہو تو احتیاط کیا کرو۔" اس نے ہاتھ بڑھا کے چولہا بھی بند کر دیا تھا۔

"یہ کیا ہوا ہے؟" ثمو بیگم کچن میں داخل ہوئیں لیکن وہاں کی صورت حال دیکھ کر تڑپ گئیں۔

"دوپٹے کو پیچھے سے آگ لگ گئی تھی۔ وہ تو شکر ہے کہ میں نے دیکھ لیا۔" آزر نے ان کو بتایا۔

"اف خدایا۔ کوئی نقصان تو نہیں ہوا؟" انہوں نے آگے بڑھ کے کومل کو تھام لیا۔

"اسے پانی پلائیں اس کے حواس ٹھکانے پہ نہیں ہیں۔" اس نے خود ہی گلاس میں پانی انڈیل کر ثمو بیگم کی سمت بڑھایا۔

"یہ بدبو کیسی ہے؟ کیا جل رہا ہے؟" ثروت بیگم بھی اندر آ گئیں۔

"ڈونٹ وری کچھ نہیں ہوا۔" آزر ان کو تسلی دیتا ہوا باہر نکل گیا اور کومل اسے پیچھے تک دیکھتی رہ گئی۔

اپنے لیے اس کو اس قدر فکرمند ہوتا دیکھ کر جیسے دل کو ایک قرار سا آ گیا تھا اپنی ذات کے لیے اس کی پریشانی کومل کو روح تک سرشار کر گئی تھی ایک لمحے میں ہی وہ کتنا کانشس ہو گیا تھا؟ ثمو بیگم ثروت بیگم اور باقی سب اس کے لیے متفکر ہو رہی تھیں لیکن وہ اندر ہی اندر خوشی سے رقص کر رہی تھی۔ اور وہ جو کسی ارادے سے اپنے بیڈ روم سے نکلا تھا جوں کا توں واپس لوٹ آیا تھا۔ اب اسے آٹھ نو بجے تک دانیال کے اٹھنے کا انتظار کرنا تھا لیکن اس انتظار کے دوران اس کے دماغ میں طرح طرح کی سوچیں ناچتی رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"امی۔ ! مریم کہاں ہے؟"

"کچن میں۔۔۔"

"فارغ ہے؟"

"وہ بھلا کب فارغ ہوتی ہے؟" عابدہ خاتون مسکرائیں۔

"یمن وغیرہ کہاں ہیں؟"

"کالج کے لیے نکل گئی ہیں۔ کیوں کیا کام ہے؟" انہوں نے عدیل کو تذبذب کا شکار دیکھا تو پوچھ لیا۔

"یہ کپڑے استری کروانے تھے۔" وہ شرمندگی سے بولا۔

"کون سے کپڑے؟" مریم فوراً کچن سے نمودار ہوئی۔

"یہ گرے۔" اس نے کپڑے برآمدے میں نکال کر رکھے ہوئے تھے۔

"یہ کیا کرنے ہیں؟ وائٹ پہن جائیں۔"

"نہیں وائٹ خراب ہو جائیں گے۔"

"خراب؟"

"ہاں سفر کے دوران گاڑیوں میں ہزاروں داغ لگ جاتے ہیں ایک ہی نیا سوٹ ہے وہ بھی خراب ہو جائے گا۔" عدیل نے مریم کو آنکھوں ہی آنکھوں میں چپ رہنے کا اشارہ کیا وہ سمجھ گئی تھی۔

"جانا کہاں ہے؟" عابدہ خاتون نے بے ساختہ پوچھ لیا۔

"وہ امی دراصل آفس کے کسی کام سے گوجرانوالہ جانا ہے شام تک واپس آجاؤں گا۔" اس نے فوراً ماں کو تسلی دی۔

"آپ سچ مچ گوجرانوالہ جا رہے ہیں؟" مریم اس کے کپڑے اٹھا کر اندر آئی تو مشکوک سے لہجے میں پوچھا تھا۔

"سچ مچ سے کیا مطلب ہے تمہارا کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں؟" عدیل نے اسے خفگی سے دیکھا۔

"آپ سچ بھی تو نہیں بول رہے نا؟"

"مریم میں واقعی گوجرانوالہ جا رہا ہوں۔"

"میں کیسے مان لوں؟" وہ بے یقین ہو رہی تھی۔

"یہ دیکھو پیسے یہ استاد نے دیے ہیں ورکشاپ کے لیے کچھ ضروری سامان لانا ہے وہاں سے۔" اس نے اپنے تکیے کے نیچے رکھا پیسوں کا لفافہ نکال کر سامنے کیا۔

"اوکے اوکے مجھے یقین آگیا ہے۔" مریم پیسے دیکھ کر فوراً مان گئی تھی۔ اور استری کا پلگ لگا کر کپڑے استری کرنے بیٹھ گئی۔

"کچھ منگوانا ہے گوجرانوالہ سے؟" عدیل نہا کر آیا تو وہ کپڑے استری کر چکی تھی اور فرش سے استری اور کھیس اٹھاتے ہوئے وہ یکدم ہنس پڑی تھی۔

"آپ تو اس طرح پوچھ رہے ہیں جیسے انگلینڈ یا امریکہ جا رہے ہوں؟"

"یار ہم غریبوں کے لیے یہی انگلینڈ اور امریکہ ہے۔"

"ہاں یہ غریبوں کا انگلینڈ یا امریکہ ہے نا اسی لیے یہاں نہ بجلی مل رہی ہے نہ پانی نہ آٹا نہ چینی یہاں موت بھی ملتی ہے تو بم دھماکے کی صورت میں۔" مریم دیکھتے ہی دیکھتے تلخ ہو گئی تھی عدیل جواباً کچھ نہ کہہ سکا وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی۔

"ناشتا بنا چکی ہو؟"

"جی آپ جلدی سے آجائیے۔" وہ سر جھٹکتی ہوئی باہر نکل گئی عدیل کو پتا تھا مریم حد سے زیادہ حساس ہے اس لیے وہ اس کا خیال سب سے زیادہ رکھتا تھا البتہ وہ خود بھی کافی کیئرنگ تھی ہر ایک کا خیال رکھتی تھی ہر ایک کے لیے ہلکان ہوتی رہتی تھی۔

"اچھا امی میں چلتا ہوں۔" عدیل ماں سے مل کر اباجی کے پاس گیا پھر مریم کو اللہ حافظ کہتے ہوئے گھر سے نکل گیا تھا۔

"فی امان اللہ۔" مریم دھیمے سے کہتی ہوئی دروازے بند کرکے برآمدے میں آگئی۔

"مریم۔" ساتھ والے گھر سے کوثر کی آواز سنائی دی۔

"جی باجی؟" مریم نے فوراً پوچھا۔

"تمہاری سہیلی کا فون ہے جلدی آؤ ہولڈ پہ رکھا ہے۔" کوثر بلند آواز سے پیغام دے رہی تھی۔

"امی وہ فاطمہ کا فون ہے؟" مریم نے ماں کو دیکھا۔

"جاؤ سن آؤ جاکر۔" عابدہ خاتون نے اجازت دی اور مریم دوپٹہ پھیلا کر اوڑھتی ہوئی دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ وہ گلی میں بہت کم نکلتی تھی' اس کا کسی کے گھر بھی آنا جانا نہیں تھا کبھی کبھار ضرورت کے وقت ہی کوثر باجی کے گھر آتی تھی۔

"السلام علیکم۔" اس نے گھر میں داخل ہوتے ہی سامنے صحن میں کھڑی کوثر باجی کو سلام کیا تھا۔

"وعلیکم السلام' جلدی جاؤ۔" انہوں نے کمرے کی طرف اشارہ کیا جہاں ان کا فون سیٹ رکھا تھا۔

"ہیلو......"

"کہاں مرگئی تھیں؟ دوبارہ دنیا میں آتے آتے دیر ہوگئی کیا؟" فاطمہ اس کی آواز سنتے ہی چڑ گئی تھی۔

"یار آج تک دوبارہ دنیا میں کون آیا ہے جو میں آؤں گی؟" مریم ہنسی تھی اسے پتا تھا کہ فاطمہ غصے میں ہے۔

"مجھے تو یہی لگ رہا تھا کہ تم دنیا سے رخصت ہوگئی ہو؟"

"چلو یار یہی سمجھ لو کہ میں دنیا سے رخصت ہوگئی ہوں اب بولو تمہیں میری یاد کیسے آگئی؟" مریم نے مطلب کی بات پوچھی۔

"مریم کیا واقعی تم میری دوست ہو؟" فاطمہ نے ذرا افسوس سے پوچھا۔

"تمہیں کوئی شک ہے؟" مریم سنجیدہ ہو چکی تھی۔

"ہاں۔" فاطمہ نے اثبات میں جواب دیا۔

"صرف اس لیے کہ پرسوں تمہارا برتھ ڈے ہے اور میں بھولی ہوئی ہوں؟" مریم نے سوال کیا اور فاطمہ حیرت سے گنگ رہ گئی' مریم کو اس کا برتھ ڈے یاد تھا۔

"تمہیں یاد تھا؟" وہ آہستگی سے بولی۔

"یاد تو مجھے پچھلے سال بھی تھا بس کسی مجبوری کی وجہ سے بھولنا پڑا۔" مریم کا لہجہ استہزائیہ تھا۔

"لیکن اس بار میں کوئی مجبوری نہیں دیکھوں گی میں نے تمہیں انوائٹ کرنے کے لیے فون کیا ہے' تم نے پرسوں شام کو میرے گھر آنا ہے۔" فاطمہ نے حکم دیا۔

"لیکن فاطمہ......"

"لیکن ویکن کچھ نہیں میں گاڑی بھجوادوں گی۔"

"مگر یار!" مریم نے بولنا چاہا۔

"میں نے کہا نا یار میں کوئی بہانا نہیں سنوں گی۔" فاطمہ اپنی مرضی چلا رہی تھی۔

"لیکن فاطمہ مجھے امی اور بھائی سے تو پوچھ لینے دو۔"

"ان سے بھی میں ہی پوچھ لیتی ہوں۔"

"نن...... نہیں امی تو اباجی کے پاس بیٹھی ہوئی ہیں اور بھائی گھر میں نہیں ہیں۔" مریم نے اطلاع دی۔

"بھائی صاحب کہاں ہیں تمہارے؟" فاطمہ کو ذرا ٹھہر کر اس کا خیال آیا تھا۔

"وہ کسی کام سے گوجرانوالہ گئے ہیں۔"

"گوجرانوالہ میں کون سا کام نکل آیا؟" فاطمہ کو حیرت ہوئی۔

"آفس کا کوئی کام تھا شاید۔" مریم کو بہانا بنانا پڑا۔

"آفس کا کام گوجرانوالہ میں؟ یقیناً کوئی لوہا وغیرہ خریدنا ہوگا؟ لوہا وہاں سے سستا مل جاتا ہے نا اس لیے۔" فاطمہ نے مذاق اڑایا۔

"پتا نہیں یار۔" مریم کو کوفت ہونے لگی۔

"اچھی وے' تم باقی باتوں کو چھوڑو اور میرے گھر آنے کی تیاری کرو' اور ہاں کسی گفٹ وغیرہ کے چکر میں مت پڑنا ورنہ جوں کا توں تمہارے ساتھ واپس بھیج دوں گی' بس میرے لیے تمہارا میری پارٹی میں چلے آنا ہی سب سے بڑا تحفہ ہوگا۔" فاطمہ بہت اپنائیت سے بولی تھی اور مریم اس کی بات پہ مسکرادی۔

"تھینک یو۔"

"او کے اللہ حافظ' میں ویٹ کروں گی تمہارا اور گاڑی بھی بھجوادوں گی۔" فاطمہ نے تاکید کرتے ہوئے فون بند کردیا تھا اور مریم ریسیور ہاتھ میں لیے چپ چاپ سی بیٹھی رہ گئی تھی۔

وہ تو کوئی انکار' کوئی بہانا بھی سننے کو تیار نہیں تھی اور گھر کے حالات اقرار بھی نہیں کرنے دے رہے تھے وہ خاموشی سے اٹھ کر گھر آگئی۔

"خیریت ہے نا؟ فاطمہ نے فون کیوں کیا؟" عابدہ خاتون مریم کو چپ چپ سا دیکھ کر پریشان ہوگئی تھیں۔

"جی خیریت ہے۔"

"پھر تم کیوں پریشان ہو؟"

"پرسوں فاطمہ کی سالگرہ ہے اس نے آنے کی دعوت دی ہے' پچھلی بار بھی میں نہیں گئی تھی اور نہ اسے وش کیا تھا۔" مریم اندر ہی اندر متفکر سی تھی۔

"کوئی بات نہیں بیٹا چلی جانا۔"

"چلی جاؤں؟ مگر کیسے؟" مریم خفگی سے بولی۔

"کیسے جانا چاہتی ہو؟"

"خالی ہاتھ نہیں جانا چاہتی۔" وہ تلخی سے کہتی چارپائی پہ بیٹھ گئی۔

"تو میں کب کہہ رہی ہوں کہ خالی ہاتھ جاؤ' اللہ بہتر سبب نکالے گا' میں عدیل سے بات کروں گی۔"

"نہیں امی بھائی سے کچھ مت کہیے گا۔" اس نے منع کردیا۔

"کیوں؟"

"خوامخواہ ان کو پریشان کریں گی۔"

"چلو اللہ بہتر کرے گا ابھی کل کا دن تو ہے نا۔" وہ مریم کا سر تھپکتے ہوئے بولیں اور اٹھ کر اندر چلی گئیں' لیکن مریم وہیں بیٹھی سوچوں میں گم ہوگئی تھی اسے فکر نے گھیر رکھا تھا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

☼ ☼

سالگرہ نمبر

دردِ دل

نبیلہ عزیز

۷

ساتویں قسط

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نبیل حیات دونوں بہن بھائی ہیں' مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے' وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پہ رنگ چکی ہے' جس کے پیش نظر فائزہ بیگم' نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں' لیکن مدحیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے' جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے' مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے' مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا' بے بسی اور مجبوری سے تنگ آ کر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے' لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے بابا امتیاز مل جاتا ہے' وہ اسے کام کی آفر کرتا ہے' جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے' اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے' وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے' وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

ولی آویز شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے' وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے' اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا' اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ سوداں کو بھی دوتی ہیں۔

"دل آور شاہ آپ ہی ہیں نا؟" کسی نے اس کے عقب سے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا تھا اور وہ اس جانی پہچانی سی آواز پہ ایک جھٹکے سے پلٹا تھا۔

"نبیل؟" اس کی آواز اور لہجے سے خوشی کا رس ٹپک رہا تھا۔

"دل آور!" وہ دونوں یکدم ایک دوسرے سے بغل گیر ہوئے تھے۔

"کیسا ہے شہزادے؟" دل آور اس کو بھینچتے ہوئے بولا تھا۔

"دیکھ لو کیسا ہوں؟" نبیل نے ہنس کر جواب دیا۔ ان دونوں کی اس قدر محبت بھری اور جذباتی ملاقات پہ کئی لوگوں نے باقاعدہ ٹھہر کر ان کی اس ملاقات کا سین دیکھا تھا۔

"ماشاءاللہ پہلے سے جوان ہو گیا ہے۔" دل آور کا جملہ نبیل کو قہقہہ لگانے پہ مجبور کر گیا تھا۔

"تیری یہی باتیں تو تجھے یاد رکھنے پہ مجبور کرتی ہیں۔" نبیل شرارت سے بولا۔

"اس بات کا بھی حساب لوں گا تم سے۔ تم یہ بتاؤ مدحیہ اور آنٹی کہاں ہیں؟" دل آور اس کے عقب میں دیکھتے ہوئے بولا۔

"وہ ابھی اندر ہیں' سامان کی چیکنگ ہوئی ہے ابھی۔" نبیل نے اشارہ کیا۔

"یار چیکنگ میں تو تم لوگوں کا سارا سامان خراب ہو جائے گا' میں کچھ کرتا ہوں۔" اس نے کچھ سوچتے ہوئے اپنا سیل نکالا اور کسی کا نمبر ڈائل کیا تھا اور واقعی اس کی سفارش کام آئی تھی ان کا سامان چیکنگ کے عذاب سے بچ گیا تھا اور وہ لوگ جلدی باہر آ گئے تھے۔

"بھائی۔۔!" مدحیہ بڑے والہانہ انداز میں اس کی طرف بڑھی تھی۔

"میری گڑیا۔" وہ سینے سے لگی مدحیہ کا سر تھپکتے ہوئے نرمی سے مسکرایا تھا اس وقت اگر اس کے کولیگز اسے دیکھ لیتے تو حیران رہ جاتے۔ اسے دیکھ کر کہیں سے بھی نہیں لگ رہا تھا کہ یہ وہ دل آور شاہ ہے جو کورٹ میں کھڑا ہوتا تھا تو لفظوں کی جگہ آگ اگلتا تھا اور سننے والے دم سادھ جاتے تھے۔

"کیسی ہو؟" وہ اس کے دونوں کندھوں پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

"میں ٹھیک ہوں' آپ سنائیں کیسے ہیں؟ اور آنٹی کہاں ہیں؟" مدحیہ نے بتول شاہ کا پوچھا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں میری جان' اماں اسلام آباد میں ہیں' ان کے کالج میں آج کل ایگزام ہو رہے ہیں اس لیے مصروفیت کی وجہ سے نہیں آسکیں۔" دل آور نے اس کو جواب دیا اور آگے بڑھ کے فائزہ بیگم سے ملا۔

"السلام علیکم آنٹی۔" اس نے ان کے سامنے سر خم کیا تھا اور انہوں نے دل آور کی پیشانی چوم لی تھی۔

"جیتے رہو' خوش رہو' اللہ عمر دراز کرے۔" انہوں نے اس کے کندھے پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے دعائیں دیں۔

"آمین۔" نبیل نے شرارت سے آمین کہا۔

"بچو! تم سے تو میں بعد میں بات کروں گا' ابھی گھر چلو' بڑی ہوا لگی ہے۔" "نہیں۔" دل آور مدحیہ کے ہاتھ سے سامان سے لدی ٹرالی دھکیلتا ہوا آگے بڑھا دوسری ٹرالی نبیل دھکیل رہا تھا وہ لوگ وہاں سے اپنے گھر کی ضرورت کے لیے کافی سامان لے کر آئے تھے۔

"آئیے صاحب۔" گلاب خان لپک کے قریب آیا۔

"نبیل صاحب کی ہیلپ کرو۔" اس نے اشارہ کیا۔

"سلام صاحب۔" گلاب خان نے نبیل کو سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔" نبیل سمجھ گیا کہ یہ دل آور کا ملازم ہے۔

"لائیے صاحب میں رکھتا ہوں گاڑی میں۔" گلاب خان نے ٹرالی کے ہینڈل اس کے ہاتھ سے تھام لیے تھے۔

"گلاب خان میں نے وین ہائر کی ہے تم اس وین میں سارا سامان لے کر نبیل صاحب کے گھر پہنچو' گاڑی میں خود ڈرائیو کر لوں گا۔" دل آور نے سامان زیادہ دیکھ کر گاڑی بک کروائی تھی۔

"جی صاحب جیسے آپ کا حکم۔" گلاب خان سعادت مندی سے بولا۔

"چلو رکھواؤ سامان گاڑی میں۔" دل آور نے اپنی نگرانی میں سارا سامان احتیاط کے ساتھ گاڑی میں رکھوایا تھا۔

"یار ہر چیز کے معاملے میں بہت کنسیرنگ ہو تم۔" نبیل کہے بغیر نہ رہ سکا۔

"ہاہاہا۔۔۔ میں دوست تو دوست دشمن کی بھی بڑی کیئر کرتا ہوں۔" وہ قہقہہ لگاتا ہوا اپنی گاڑی کی سمت بڑھا اور نبیل اس کی گاڑی کے قریب آکر ٹھہر گیا تھا۔

"تو جناب نے آج کل 'مسرف' رکھی ہوئی ہے۔" نبیل سلور کلر کی چمچماتی ہوئی گاڑی کو ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"بس جو غریبوں کو پسند آ جائے۔" وہ عاجزی سے کہتا ہوا ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھ گیا دوسری سائیڈ سے دروازہ کھول کر نبیل بھی فرنٹ سیٹ پہ بیٹھ گیا تھا۔

"ویسے یار یہ پراڈو' لینڈ کروزر' پجارو اور مسرف میں کوئی خاص فرق تو نہیں ہے؟" نبیل واقعی ٹھیک کہہ رہا تھا اس گاڑی کی شیپ بھی پراڈو اور لینڈ کروزر جیسی ہی تھی۔

"بے شک فرق نہ ہو لیکن یار پیسے کا اور نام کا فرق تو ہے نا؟" دل آور نے مسکرا کر فرق سے آگاہ کیا۔

"ہاں یہ تو ٹھیک کہا تم نے' پاکستان میں چیزوں کا دکھاوا زیادہ ہی ہوتا ہے چاہے وہ موبائل فون ہو' چاہے گاڑی' چاہے لڑکیوں کے ہینڈ بیگ۔ بس سب کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ اس کی چیز باقیوں سے منفرد نظر آئے۔" نبیل نے اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔

"ایک بات کہوں نبیل؟" دل آور نے گاڑی روڈ پہ ڈالتے ہوئے کہا۔

"کہو۔۔۔"

"لاہور پاکستان کا دل ہے اور دل میں آکر ایسی باتیں مت کرو کہ دل کو ناگوار گزرے' اس لیے بہتر ہے کہ کوئی اور بات چھیڑو۔" اس نے بڑی نرمی اور بڑے طریقے سے نبیل کو سمجھایا تھا۔

"اوہ۔۔۔ اچھے بچے اور پکے پاکستانی ہو؟" نبیل معنی خیزی سے بولا۔

"یہی سمجھ لو اور اس میں کوئی شک بھی نہیں ہے۔" اس نے کندھے اچکائے۔

وہ دونوں اتنے عرصے بعد ملے تھے اس لیے ان کی باتوں کو پر لگنے کا موقع مل گیا تھا۔ جبکہ پچھلی سیٹ پہ فائزہ بیگم کے ساتھ بیٹھی مدحیہ چپ چاپ لاہور کے مناظر دیکھ رہی تھی سڑکوں پہ خاصی چہل پہل اور گہما گہمی تھی سب کچھ ویسا ہی نظر آ رہا تھا جو وہ لوگ فلموں اور ڈراموں میں دیکھتے تھے وہی سڑکیں' وہ راستے' وہی لوگ' وہی بازار۔

"اف! اب یہاں ان لوگوں کے ساتھ رہنا پڑے گا؟ جن کو کسی بھی چیز کی تمیز نہیں ہے؟" اسے سوچ کر ہی کوفت اور بے زاری ہونے لگی تھی وہ گاڑی میں بیٹھے بیٹھے پہلو بدل کر رہ گئی۔ دل آور اس کی بے زاری صورت بیک ویو مرر سے ہی دیکھ چکا تھا اور کچھ بھی کہنے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے نبیل کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"سعید اللہ کیسا تھا؟"

"فٹ فاٹ ہے یار۔"

"اور نگارش بھابھی؟"

"وہ بھی ٹھیک ہیں۔ ساری فیملی ہمیں ایئرپورٹ سی آف کرنے آئی تھی۔" نبیل نارمل سے انداز میں بولا اس

نے یہ بھی نوٹ نہ کیا کہ ولی آور نے عبداللہ اور نگارش بھابھی کا حال احوال پوچھ لیا ہے' لیکن زری کا کیوں نہیں پوچھا وہ بھی تو عبداللہ کی فیملی کا حصہ تھی؟

"اس کا کوئی ارادہ نہیں ہے پاکستان چکر لگانے کا؟" ولی آور گاڑی کا موڑ کاٹتے ہوئے بولا۔

"زری کی اسٹڈی کمپلیٹ ہو گئی تو پھر ہی کوئی پروگرام بنے گا اس کا' زری اور نگارش بھابھی کو اکیلے چھوڑ کر تو نہیں آسکتا وہ۔" نبیل نے اندازاً" جواب دیا تھا۔

"ہوں یعنی ابھی کچھ عرصہ لگے گا؟"

"ہاں یقیناً" ۔" نبیل نے اس کی بات کی تائید کی۔

"خیر تم آگئے ہو تو وہ بھی آجائے گا' یار زندہ صحبت باقی۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ویسے یار ایک چیز کا بہت افسوس ہو رہا ہے۔" وہ افسوس بھرے لہجے میں بولا۔

"کس چیز کا؟"

"تیرے پہلو میں کوئی گوری میم نہیں ہے اس لیے۔" اس نے افسردگی اور مایوسی کا اظہار کیا۔

"جب تو لندن سے آیا تھا تو کیا تمہارے پہلو میں گوری میم تھی؟" نبیل نے گھور کے پوچھا۔

"یار یہاں کیا لڑکیاں مر گئی تھیں جو میں گوری میم کو لے کر آتا؟" ولی آور چڑانے والے انداز سے بولا۔

"یعنی تمہارے لیے یہاں لڑکیاں زندہ ہیں اور میرے لیے مر گئی ہیں؟" نبیل نے اس کی بات کا مطلب اخذ کیا۔ جواباً" وہ ایک بار پھر فلک شگاف قہقہہ لگا کر ہنسا تھا آج اس کی دلی خوشی کا اظہار اس کے قہقہوں سے ہو رہا تھا۔

"ولی آور باز آجا۔" نبیل نے گھور کے کہا یہ ان کا آپس میں بات کرنے کا ایک مخصوص اسٹائل تھا۔ ولی آور نے رہائشی ایریا میں پہنچتے ہوئے ان کے گیٹ کے سامنے ہارن دیا تھا۔ چوکیدار نے فوراً" سلام کرتے ہوئے گیٹ کھول دیا۔ وہ گاڑی اندر لے آیا۔

سب ملازم ولی آور کی ہدایت پہ ان کے انتظار میں ڈرائیو وے پر ہی کھڑے تھے ان کے گاڑی سے اترتے ہی انہوں نے سلام کرنا شروع کر دیا۔

"شکر ہے تیری ذات کا جس نے اتنے سالوں بعد ہمیں اپنے گھر کی چار دیواری دیکھنی نصیب کی ہے۔" فائزہ بیگم نے اوپر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے اللہ کا شکر ادا کیا تھا۔ ان کی آنکھوں میں اس وقت تشکر کے آنسو تھے۔ لیکن ان سے چند قدم دور کھڑی مدیحہ اس گھر کے ملازموں کو اور اس گھر کے در و دیوار کو اجنبی نظروں سے دیکھ رہی تھی اس کا چہرہ بالکل سرد و سپاٹ ہو رہا تھا کیونکہ وہ گھر تھا جو اس کے باپ ممتاز حیات نے اپنی کمائی سے بنایا تھا اور یہی وہ گھر تھا جہاں اس کی ماں فائزہ حیات دلہن بن کے آئی تھیں اور اس گھر سے بھر والے نے بہت ارمان وابستہ کیے تھے اور بہت سے خواب سجائے تھے' لیکن اتنے ڈھیر سارے خوابوں میں سے صرف دو خواب زندہ رہ پائے تھے۔

ایک نبیل حیات اور ایک مدیحہ حیات اور ان دونوں کے سوا باقی سارے خواب مر گئے تھے بکھر گئے تھے کرچی کرچی ہو گئے تھے۔ کیونکہ ان کے خوابوں کے باغ کو سینچنے والا خود باغی ہو گیا تھا اور اب یہی دھڑکا انہیں بیٹی کی طرف سے بھی لگا رہتا تھا۔

"مام اندر چلیں پلیز۔" نبیل نے ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے انہیں سوچوں کے گرداب سے نکالا۔

"ہاں چلو۔" وہ آنکھوں کی نمی پونچھتی ہوئی اس کے ساتھ اندر آگئیں ولی آور مدیحہ کے ساتھ بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ بیڈ پہ نیم دراز سے لیٹے تھے جب دروازے پہ ہلکی سی دستک ہوئی۔

"کم ان۔" ان کی اجازت پہ علیزے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تھی۔

"علیزے۔" وہ فوراً" اٹھ کر بیٹھ گئے۔

"السلام علیکم پاپا۔"

"وعلیکم السلام ادھر بیٹھو یہاں۔" انہوں نے بیڈ پہ اپنے قریب بیٹھنے کا کہا۔

"آپ کی طبیعت ٹھیک ہے نا۔"

"ہاں ٹھیک ہوں دو دن آفس نہیں گیا اس لیے آج آفس میں فارغ رہ کر بھی تھکن ہو گئی ہے۔"

"تو آپ کوئی ٹیبلٹ لے لیتے؟"

"نہیں بیٹا ٹیبلٹ کی ضرورت نہیں ہے چائے سے ہی تھکن دور ہو جائے گی۔"

"آپ آرام کریں میں چلی جاتی ہوں۔" وہ اٹھنے لگی۔

"بیٹھو میری جان' بیٹھو اور یہ بتاؤ کہ کس کام سے آئی ہو؟" انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا دیا تھا۔

"آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے پھر بات کر لوں گی۔" اس نے انکار کر دیا۔

"بیٹی میری طبیعت کو کچھ نہیں ہوا بس ذرا سی تھکن ہے وہ بھی اتر جائے گی تم بتاؤ کیا کہنے آئی ہو؟" انہوں نے اس کا ہاتھ تھپکا۔ علیزے ... ان کے چہرے کو دیکھنے لگی وہ اسی کی طرف متوجہ تھے۔

"پاپا وہ میں نے آپ کو بتانا تھا کہ ..."

"ہاں بولو بیٹا؟"

"وہ پیپرز اسٹارٹ ہونے والے ہیں میری ایک کلاس فیلو نے بتایا ہے کہ پیپرز کی ڈیٹ شیٹ آگئی ہے شاید نیکسٹ ویک پہلا پیپر ہو گا؟" علیزے نے اپنی پریشانی کی وجہ بیان کی۔

"پھر ...؟" وقار آفندی کو بھی سن کر کافی پریشانی ہوئی تھی۔

"پاپا کیا میں اب کالج نہیں جا سکتی؟" علیزے نے کافی سہمے ہوئے انداز میں پوچھا تھا۔

"ارے نہیں بیٹا کیوں نہیں جا سکتی؟ ان شاء اللہ تم کالج ضرور جاؤ گی۔" وقار آفندی نے اسے تسلی تو دے دی لیکن اندر سے خود بھی فکر اور پریشانی میں گھر گئے تھے۔

"تم پیپرز کے روز کالج جاؤ گی یا پہلے بھی؟"

"پاپا پیپرز سے پہلے ہونے والے لیکچرز تو زیادہ اہم ہوتے ہیں۔ لیکچرز تو اٹینڈ کرنا ہی ہوں گے؟" علیزے خود بھی پریشان اور تذبذب کا شکار تھی کہ آج کل کے مسئلے کے بعد اسے جانا چاہیے یا نہیں۔

"سب سے پہلے تو تمہاری گاڑی کا مسئلہ ہے آذر فارغ نہیں تھا ورنہ وہی شوروم چلا جاتا' خیر اس کام کے لیے تو تھوڑا ٹائم نکال ہی لے گا' لیکن اس کے بعد سب سے بڑا مسئلہ ہے تمہارے لیے ڈرائیور رکھنے کا۔ خیرو بابا کافی بوڑھے ہو چکے ہیں اور اب اس حادثے کے بعد تو اور بھی کمزور ہو گئے ہیں' ان کی عمر اب گھر بیٹھنے کی ہے ڈرائیونگ کرنے کی نہیں۔"

"لیکن پاپا کسی نئے ڈرائیور کے ساتھ کیسے سب کچھ مینیج ہو گا؟"

"یہی تو میں سوچ رہا ہوں کہ نیا ڈرائیور رکھنا' پھر اس پہ اعتماد کرنا آسان بھی نہیں ہے۔"

"پھر کیا ہو گا؟" علیزے فکر مند تھی۔

"کچھ ہو ہی جائے گا' تم جاؤ آرام کرو اور جاتے جاتے آذر کو میرے بیڈ روم میں بھیج دو۔" انہوں نے علیزے کو وہاں سے بھیج دیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد آذر ان کے سامنے تھا۔

"بیٹھو۔" وہ دائیں دیوار والے صوفے پہ بیٹھ گیا۔
"فارغ تھے تم؟"
"جی فارغ ہی تھا۔"
"نیند تو نہیں آرہی؟"
"نہیں۔"
"دانیال کہاں ہے؟"
"عائشہ پھپھو کو چیک اپ کے لیے ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا ہے۔"
"آج کل بڑی انڈر اسٹینڈنگ ہے تم دونوں میں؟" وہ چھیڑنے والے انداز سے بولے۔
"کیا نہیں ہونی چاہیے؟" وہ بھی مسکرایا۔
"ارے کیوں نہیں بیٹا ہونی چاہیے اور ضرور ہونی چاہیے' تم دونوں بھائی ہو' کزن ہو اور یہ رشتہ بہت ہی خوب صورت رشتہ ہے' جواد تم سے چھوٹا ہے اور زین دانیال سے چھوٹا ہے اس لیے تم دونوں کی انڈر اسٹینڈنگ ان کے ساتھ تو ہو نہیں سکتی تھی' اس لیے بہتر ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کو سمجھو' ویسے بھی دانیال بہت سمجھ دار اور سعادت مند لڑکا ہے ہر اونچ نیچ سمجھتا ہے۔" وقار آفندی اس کی تعریف کر رہے تھے۔
"ڈیڈ آپ کی بات درمیان میں ٹوکنے کے لیے سوری' لیکن پلیز آپ وہ بات کریں جس کے لیے مجھے یہاں بلایا ہے۔" آذر شائستگی سے بولا۔
"بور ہو گئے ہو؟"
"نہیں بور نہیں ہوا' بس لیٹ ہو گیا ہوں۔" آذر نے رسان سے کہا۔
"لیٹ کس لیے؟"
"آفس کا کچھ ضروری کام نبٹانا تھا۔"
"بیٹا آفس کے کام کے علاوہ بھی اور بہت سے ضروری کام نبٹانے والے پڑے ہیں۔"
"کون سے کام؟" آذر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔
"علیزے کے لیے نئی گاڑی نکلوائی ہے' اس کے لیے کسی ڈرائیور یا کسی گارڈ کا بندوبست بھی کرنا ہے' اس کے ایگزامز سر پہ آگئے ہیں۔" وقار آفندی نے اپنی پریشانی بیان کی۔
"کیا مطلب؟ کب ایگزامز ہیں؟" آذر چونک گیا۔
"نیکسٹ ویک۔"
"اوہ! یہ تو واقعی پرابلم ہو گئی ہے۔"
"اسی لیے تمہیں بلایا ہے کہ اس پرابلم کا کوئی حل نکالو۔"
"کیا اس حادثے کے بعد علیزے ذہنی طور پہ کالج جانے کے لیے تیار ہے؟" آذر کو پتا تھا کہ وہ اندر سے کتنی ڈری سہمی ہوگی۔
"یقیناً تیار ہی ہوگی' وہ خود میرے پاس آئی تھی کہ اس کے ایگزامز کی ڈیٹ شیٹ آگئی ہے۔"
"گاڑی کا مسئلہ تو کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے جب تک شوروم سے گاڑی نکلے گی تب تک گھر سے کوئی اور گاڑی بھی استعمال میں لائی جاسکتی ہے' اصل مسئلہ تو ڈرائیور کا ہے۔"
"لیکن ڈیڈ یہ کام تو مبارک خان بھی کر سکتا ہے؟" آذر بات کرتے کرتے ان سے سوال کر بیٹھا۔
"مبارک خان یہ کام کر تو سکتا ہے' لیکن اگر اسے علیزے کی گاڑی ڈرائیو کرنے پہ مامور کر دیا تو حویلی کے اور

آفس کے بہت سے کام رک جائیں گے' اس نے بہت ذمہ داریاں اٹھا رکھی ہیں۔" وقار آفندی بھی اپنی جگہ ٹھیک ہی سوچ رہے تھے جو کام مبارک خان انجام دیتا تھا وہ کوئی اور ملازم نہیں کر سکتا تھا۔
"تو پھر اتنی جلدی کوئی نیا ملازم ملنا بھی تو بہت مشکل کام ہے' وہ بھی کوئی قابل اعتماد بندہ؟" آذر اور وقار آفندی کی پریشانی ایک ہی تھی۔
"بس بندہ اعتماد کا ہو۔"
"یہ کام بھی مبارک خان کر سکتا ہے۔" وقار آفندی کا دھیان اس آدمی کی طرف چلا گیا جسے کافی روز پہلے مبارک خان کوئی کام دلانے کی غرض سے اپنے ساتھ لے کر حویلی آیا تھا۔
"مبارک خان؟ وہ کیسے؟"
"اس کے پاس کوئی آدمی ہے اسے کام کی ضرورت ہے' ایک بار مجھ سے مل بھی چکا ہے' نام بھی بتایا تھا اس نے لیکن میرے ذہن سے محو ہو چکا ہے' میرے خیال میں وہی بندہ ٹھیک رہے گا؟" وقار آفندی فیصلہ کر چکے تھے۔
"کون آدمی ہے؟ کچھ اتا پتا؟"
"وہ بھی پتا چل جائے گا' میں مبارک خان سے کہتا ہوں وہ صبح ہی اسے بلالے گا۔"
"ٹھیک ہے آپ بلا لیجیے گا' لیکن پہلے ساری تسلی کر لیجیے گا۔" آذر صوفے سے کھڑا ہو گیا۔
"اور گاڑی؟"
"گاڑی کا کام آپ پرسوں پہ رہنے دیں' ہو سکتا ہے کہ مجھے کل کام کے سلسلے میں کراچی جانا پڑے۔ البتہ میں کل گاڑی کی بکنگ کروا دوں گا۔" آذر نے انہیں تسلی دی۔
"آذر بات سنو۔"
"جی ڈیڈ۔"
"ادھر آؤ۔"
"جی کہیے؟"
"اتنے دن ہو گئے' تم نے کوئی بات نہیں بتائی؟ کیا بنا اس معاملے کا؟" وقار آفندی فائرنگ والے معاملے کا پوچھ رہے تھے۔
"ڈیڈ! مجھے کوئی بات پتا چلتی تو میں بتاتا نا؟ فی الحال تو کوئی سرا ہاتھ نہیں آرہا۔" اس نے کندھے اچکائے۔
"وہ دو لڑکے جو خرم بابا کو ہسپتال لے کر گئے تھے ان کا کچھ پتا چلا؟" وقار آفندی نے پوچھ ہی لیا تھا۔
"آپ کو کس نے بتایا؟" آذر ٹھٹک گیا تھا' یہ بات تو اس نے چھپائی تھی ان سے۔
"کیا تم نہیں بتاؤ گے تو ہمارا دشمن بھی نہیں بتائے گا؟" انہوں نے اپنے موبائل کی طرف اشارہ کیا' یعنی وہی میسج ان کے نمبر پہ بھی آیا تھا۔
"اوہ۔" اس نے گہری سانس خارج کی تھی۔
"نہ ان لڑکوں کا پتا چلا ہے اور نہ ہی ہسپتال کے ریسپشن سے کال کرنے والے آدمی کا....." ان لڑکوں نے اپنا نام و پتا غلط لکھوایا تھا۔ آذر اور دانیال اندر ہی اندر کافی بھاگ دوڑ کر چکے تھے لیکن ابھی تک کچھ بھی حاصل نہیں ہوا تھا اور اب گزشتہ دو دن سے ہر طرف سکون ہی سکون نظر آرہا تھا دو دن سے کوئی میسج اور فون کال موصول نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی کوئی اور ایکشن سامنے آیا تھا۔
"ٹھیک ہے بیٹا تم زیادہ ٹینشن نہ لو اور آرام کرو۔"
"اوکے گڈ نائٹ....." آذر ان کو گڈ نائٹ کہتا کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"لگتا ہے زیرو میٹر ہے۔؟" سائم نے پاس سے گزرتی لڑکی کو دیکھ کر خباثت سے کمنٹ پاس کیا تھا۔
"کیوں تو انجینئر ہے کیا؟" کامی نے آنکھ دبا کر کہا تھا۔
"یار اتنا تجربہ تو ہو ہی گیا ہے کہ گاڑی کو دیکھ کر ہی اس کی خوبی اور خامی کا پتا چل جاتا ہے۔" سائم نے فخریہ بولا۔
"پھر تو تمہیں انجینئرنگ کی ڈگری ملنی چاہیے؟" جوودت اور کامی ہاتھ پہ ہاتھ مار کے ہنسے تھے۔
"میں بھی تو یہی کہتا ہوں۔" سائم نے تائید کی تھی۔
"چل کامی یار اسے جوتوں کا ہار پہنا۔" جوودت نے شان بے نیازی سے کہا۔
"تیری تو۔" سائم جوودت کو مارنے کے لیے لپکا۔
"اوئے سائم رک، ایک اور آئی ہے۔" کامی نے دور سے آتی لڑکی کو دیکھ کر اشارہ کیا۔
"اوئے لوفر تجھے شرم نہیں آتی لڑکیوں کو تاڑتے ہوئے؟ گھر میں ماں بہنیں نہیں ہیں کیا؟" وہ لڑکی قریب آچکی تھی اس لیے کامی کی آواز سن چکی تھی جوودت اور سائم یکدم اس کی اچانک درگت پہ منہ چھپاتے ہوئے اپنی ہنسی روکنے لگے۔
"میں نے تمہیں کب تاڑا ہے؟" کامی نے حیرانی سے اور معصومیت سے پوچھا۔
"تو کیا اپنی اماں کو تاڑ رہے تھے؟" وہ لڑکی خاصی مردمار قسم کی لڑکی تھی وہ ان لڑکوں کو دیکھ کر ڈرنے سہمنے والی نہیں تھی۔
"جوودت، سائم۔؟" اس نے ان دونوں کو پکارا۔
"ہونہہ! لفنگے کہیں کے سڑک چھاپ۔" وہ ان تینوں پہ خونخوار سی نظر ڈالتی آگے بڑھ گئی تھی۔
"ہاہاہا۔" وہ دونوں قہقہے لگاتے ہوئے اس کے دائیں بائیں آکھڑے ہوئے تھے۔
"سائم یہ زیرو میٹر تھی یا سیکنڈ ہینڈ؟" جوودت نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔
"یہ تو چلتا پھرتا راکٹ تھی یار۔" سائم نے شرارت سے کامی کو دیکھا وہ اپنا سر کھجا رہا تھا۔
"اسی لیے تو کہتا ہوں کہ ہر کام میں اپنا ایک اسٹینڈرڈ رکھنا چاہیے۔ جب ہمیں ہماری کلاس کی لڑکیاں پلیٹ میں سجی سجائی مل جاتی ہیں تو ہمیں ادھر ادھر منہ مارنے کی کیا ضرورت ہے بھلا؟" جوودت نے اس کو سمجھایا۔
"یار میں نے اسے کب چھیڑا تھا؟ میں نے بس سائم کو دعوت دی تھی۔"
"چل یار تم نے نہیں چھیڑا لیکن وہ تو تمہیں چھیڑ گئی ہے۔ نا؟" جوودت نے مذاق اڑایا۔
اتنے میں اس کا سیل بجنے لگا۔ پینٹ کی پچھلی پاکٹ سے سیل نکال کر دیکھا تو اس کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔
"کس کا فون ہے؟" سائم اور کامی نے بیک وقت پوچھا۔ جوودت نے سیل ان کے سامنے کر دیا۔
"اوہو بیٹھے بیٹھے قسمت جاگ اٹھی ہے۔؟"
"ہیلو؟" وہ کال اٹینڈ کرتے ہوئے بولا۔
"کہاں ہو؟"
"جہاں بھی ہوں تمہارے انتظار میں ہوں؟" وہ لہجے کو گمبھیر بناتے ہوئے بولا۔
"انتظار ختم سمجھو۔" وہ ہنسی تھی۔
"سچی؟" جوودت چہکا۔
"ہاں مجھے پک کرنے آجاؤ۔" وہ تیار بیٹھی تھی۔

"اور پک کرنے کے بعد؟" اس نے استفسار کیا۔
"جہاں تم لے جاؤ۔"
"جیتی رہو خوش رہو میں آرہا ہوں۔" اس نے فون بند کر دیا۔
سائم چابی کہاں ہے؟" جوودت بائیک پہ سوار ہوتے ہوئے بولا۔
"تمہاری پاکٹ میں۔"
"ارے نہیں یار میں فلیٹ کی چابی کا پوچھ رہا ہوں۔" اس نے جھنجلا کر کہا۔
"تم اسے لے کر فلیٹ پہ جاؤ گے؟"
"نہیں میں اسے لے کر حویلی جاؤں گا۔"
"کبھی کسی لڑکی کو لے ہی جاؤ تو اچھا ہے۔" سائم نے گھورتے ہوئے چابی اس کے حوالے کی تھی۔
"تھینک یو۔" اس نے کہتے ہوئے بائیک اسٹارٹ کی۔
"یار ہمیں اکیلے چھوڑ کے جا رہے ہو؟ ہمارا ٹائم کیسے گزرے گا؟ ہمیں بھی ساتھ لے جاتے؟" کامی نے فریاد کی جوودت ہنسا تھا۔
"ایک دو اور زیرو میٹر دیکھ لو۔" اس نے چوٹ کی اور بائیک اڑا لے گیا تھا۔ لیکن کامی کی آہیں اتنی پراثر تھیں کہ وہ اس کی حسرتیں دل میں ہی لے کر رہ گیا تھا اسے آذر کی کال آگئی تھی۔
"کہاں ہو؟" آذر کا لہجہ سنجیدہ اور دوٹوک تھا۔
"ڈیفنس۔" جوودت نے بمشکل جواب دیا۔
"ڈیفنس کیوں؟"
"وہ اپنے ایک دوست سے ملنے جا رہا تھا۔" اس نے بات بنائی۔
"دوست سے تم بعد میں مل لینا پہلے خیرو بابا کے پاس ہسپتال پہنچو۔"
"کیوں خیریت؟" جوودت ٹھٹکا۔
"ہاں خیریت ہی ہے دراصل میں کام کے سلسلے میں کراچی جا رہا ہوں اور مبارک خان کو ڈیڈ نے گھر بلوا لیا ہے اس لیے خیرو بابا کے پاس اور کوئی بھی نہیں ہے۔"
"اور دانیال بھائی؟" جوودت نے کسی امید کے تحت استفسار کیا۔
"کیا تمہیں پہلے ساری ڈیٹیلز ریکارڈ کرواؤں پھر تم آؤ گے؟" آذر کو غصہ آگیا تھا۔
"نن۔ نہیں آپ ٹینشن نہ لیں میں آرہا ہوں۔" جوودت کو مانتے ہی بنی۔
"میں ہسپتال میں تمہارا ویٹ کر رہا ہوں۔" آذر نے کہہ کر کال بند کر دی اور جوودت آہ بھر کے رہ گیا۔
"یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا۔" وہ با آواز بلند کہتا اپنی بائیک اسٹارٹ کرتے ہوئے ہسپتال کے لیے واپس مڑ گیا تھا اور اگلے چند منٹوں میں وہ ہسپتال میں آذر کے سامنے کھڑا تھا۔
"تم نے شام تک ہسپتال میں خیرو بابا کے پاس رہنا ہے۔"
"اور شام کے بعد؟" جوودت اپنی عادت کے مطابق بے ساختہ پوچھ بیٹھا۔
"شٹ اپ۔ میں تم سے کوئی ہنسی مذاق نہیں کر رہا کہ تمہیں اس وقت بھی شرارت سوجھ رہی ہے؟ خیرو بابا کی حفاظت اور تیمارداری ہمارا فرض بنتا ہے ان کی یہ حالت ہماری وجہ سے ہوئی ہے ان کی ذاتی کوئی دشمنی نہیں تھی کسی سے۔ ایک دن کی ذمہ داری نہیں نبھا سکتے تم؟ شرم آنی چاہیے تمہیں۔" آذر کا غصہ عروج پہ آیا تھا۔ جوودت کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔

"آئم سوری بھائی۔"

"ہونہہ! سوری۔"

"بس یونہی منہ سے نکل گیا' آئم ریئلی سوری۔"

"اپنا منہ بند رکھا کرو۔" آذر بے وجہ اور بات بے بات غصہ نہیں کرتا تھا لیکن جب کرتا تھا تو۔

"تم شام تک نہیں بلکہ کل میرے آنے تک یہیں رہو گے اور خیرو بابا کا ہر طرح سے خیال رکھو گے' کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔" آذر نے اسے سزا کے ساتھ ساتھ وارننگ بھی دے دی تھی۔

"آپ جب تک کہیں گے میں یہیں رہوں گا۔" وہ مودب سے انداز میں بولا تھا۔

"ٹھیک ہے' یہ رکھ لو کوئی بھی ضرورت پڑ سکتی ہے۔" آذر نے اپنے والٹ سے ہزار ہزار کے نوٹ نکال کر اسے تھما دیے اور وہاں سے چلا گیا تھا۔ جورت پیسوں کو دیکھتا رہ گیا اس کا اپنا والٹ پیسوں سے بھرا ہوا تھا۔ اسے بھلا ان پیسوں کی کیا ضرورت تھی؟ لیکن آذر اس سے بڑا تھا اس کا فرض تھا کہ وہ ہر چیز کا دھیان رکھتا' سو اس نے یہی کیا تھا۔ جورت سر جھٹک کر اندر خیرو بابا کے پاس آ گیا وہ دوائیوں کے زیر اثر سو رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

آج کا دن منصور حسین کے لیے بہت ہی مبارک دن تھا شاید؟ وہ پی سی او سے مبارک خان کو فون کرنے آیا تھا اور جیسے ہی مبارک خان نے اس کی آواز سنی فوراً "خوشی کا اظہار کیا تھا۔

"اوئے منصور حسین تو جلدی حویلی پہنچ' میں تجھے کب سے فون کر رہا ہوں مگر تیرا نمبر ہی بند تھا۔" مبارک خان کے ذہن سے یہ نکل گیا تھا کہ منصور حسین نے اپنا موبائل بیچ دیا ہے۔

"کیا میرے لیے کام مل گیا؟" منصور حسین کے لہجے میں بھی خوشی در آئی تھی۔

"سمجھو مل گیا ہے' بس ایک بار صاحب سے ملنا ضروری ہے۔"

"ارے میں مل تو چکا ہوں تیرے صاحب سے؟"

"منصور حسین وہ ملنا اور تھا' یہ ملنا اور ہے۔"

"کیوں کیا اب میری ان سے رشتہ داری ہونے والی ہے؟"

"اف یار منصور حسین ایک تو تیری زبان بھی تلوار ہے تلوار' بس کاٹ دینے کو تیار۔" مبارک خان سر پیٹ کے بولا تھا۔

"تو کام کا بندہ ہے' تجھے نہیں کاٹے گی۔" منصور حسین نے اسے تسلی دی۔

"اچھا چھوڑ اس بات کو' تو یہ بتا حویلی کب پہنچ رہا ہے؟" مبارک خان سارا کام جلدی جلدی نمٹا لینا چاہتا تھا اس کی یہی کوشش تھی کہ منصور حسین کو جیسا بھی سہی بس کام مل جائے۔

"تو فون رکھ' میں ابھی پہنچا۔" اس نے فون بند کر دیا اور پھر بڑی حویلی کی طرف چل پڑا تھا ایک اسٹاپ تک اسے رکشا کا سہارا لینا پڑا باقی رستہ اس نے پیدل طے کیا تھا اور جب وہ بڑی حویلی کے سامنے پہنچا اس کی پیشانی سے پسینے کے قطرے گر رہے تھے۔

"اوئے خانماں خراب تو پھر آ گیا ہے؟" عارف اسے دیکھ کر ٹھٹک گیا تھا۔

"آیا نہیں ہوں' بلایا گیا ہوں۔" اس نے چبا کر جواب دیا تھا۔

"کیا مطلب ہے؟"

"مطلب اپنے صاحب سے پوچھو۔"

"ہیں؟ صاحب نے بلایا ہے؟" عارف کو حیرت ہوئی۔

"پہلے ایک گلاس پانی پلاؤ' پھر بتاتا ہوں۔" وہ آج پھر عارف کی کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا تھا۔

"دیکھ منصور حسین تیری وجہ سے ہمیں بھی ڈانٹ پڑتی ہے اس روز تو صاحب بھی خفا ہو رہے تھے تو بس نکل یہاں سے۔" عارف نے بے مروتی دکھائی۔

"آج تو یہاں سے نکلنے سے پہلے یا تو مر کے جاؤں گا یا مار کے۔" منصور حسین آج مرنے مارنے پہ تل گیا تھا۔

"یار بڑا ظالم انسان ہے تو۔" عارف نے اسے گھورا۔

"ظالموں کے ساتھ ظالم ہونا ہی پڑتا ہے۔" اس نے عارف کو خونخوار نظروں سے دیکھا۔

"اوئے یار یہ لو پانی پیو اور جان چھوڑو۔" عارف نے اسے پانی کا گلاس تھمایا۔

"شکریہ۔" اس نے گلاس فوراً "خالی کر دیا تھا۔

"اب اندر اطلاع کرو کہ منصور حسین آ گیا ہے۔" اس نے نیا حکم جاری کیا۔

"لیکن......؟"

"جو کام کہا ہے وہ کرو۔" اس نے عارف کو ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"کرتا ہوں۔" اس نے انٹرکام پہ اطلاع کر دی تھی۔

"اسے اندر بھیج دو۔" مبارک خان کی طرف سے اجازت ملی۔

"تم اندر جا سکتے ہو۔" عارف نے اشارہ کیا۔

"بہت شکریہ۔" منصور حسین مسکرا کر کہتا ہوا اندر داخل ہوا تھا اور اس جنت نما حویلی میں قدم رکھتے ہی اس کی بولتی بند اور ہوش گم تھی وہ اتنی بڑی حویلی کو جیسے ٹکر ٹکر دیکھ رہا تھا۔

"ادھر آ جاؤ' صاحب مردان خانے میں ہیں۔" مبارک خان سامنے ہی کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا وہ اسے اپنے ساتھ لے کر مردان خانے میں داخل ہوا تھا۔

"السلام علیکم صاحب۔" منصور حسین نے آہستگی سے سلام کیا تھا۔

"وعلیکم السلام" آؤ بیٹھو یہاں۔" وقار آفندی اس کی آواز پہ چونکے تھے اور اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے اخبار رول کرکے سائیڈ پہ رکھ دیا تھا۔

"جی ابھی یہیں ٹھیک ہوں۔" اس نے بیٹھنے کی بجائے کھڑے رہنے کو ترجیح دی تھی۔

"اتنی دیر کہاں کھڑے رہو گے؟ بیٹھ جاؤ۔" انہوں نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

"جی شکریہ۔" منصور حسین کو بیٹھنا ہی پڑا تھا۔

"کیا نام بتایا تھا تم نے؟"

"منصور حسین۔"

"تعلیم کتنی ہے؟"

"میٹرک فیل۔" اس نے کھرا جواب دیا۔

"کرتے کیا ہو؟"

"نوکری تلاش۔"

"اس کے علاوہ کیا کرتے ہو؟"

"اس کے علاوہ فرصت ہی نہیں ملتی۔"

"کتنے عرصے سے بے روزگار ہو؟" وقار آفندی ایک ایک بات پوچھ رہے تھے۔

"جتنے عرصے سے آپ کی حویلی کے چکر کاٹ رہا ہوں۔" اس کے بے تکے سے جوابات پہ وقار آفندی نے مبارک خان کی طرف دیکھا تھا جواباً مبارک خان نے انہیں تسلی رکھنے کا اشارہ دیا تھا۔

"رہتے کہاں ہو؟"

"میں لاہور میں رہتا ہوں۔" اس نے بتایا۔

"کیا کام کر سکتے ہو؟ اگر تمہیں کوئی بڑی ذمہ داری سونپی جائے تو؟"

"ذمہ داری نبھا کر دکھادوں گا صاحب' شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔" اس نے سینے پہ ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔

"ڈرائیونگ کرلیتے ہو؟"

"جی صاحب آنکھیں بند کرکے ڈرائیونگ کرنے کا کہیں گے تو وہ بھی کرلوں گا' بڑا عرصہ ایک ڈرائیور کے ساتھ واسطہ رہا ہے۔" اس نے ان کی تسلی کرائی۔

"ڈرائیونگ لائسنس ہے تمہارے پاس؟"

"صاحب ہر چیز کا لائسنس ہے آپ مانگیں تو سہی۔" اس نے بے فکری سے کہا۔

"ہوں یہ تو اچھی بات ہے لیکن ہم چاہتے ہیں کہ تم ڈرائیونگ کے ساتھ ساتھ ایک گارڈ کے فرائض بھی سر انجام دو۔ تمہیں ہمہ وقت ہماری بیٹی کے ساتھ رہنا ہوگا اس کی حفاظت کرنی ہوگی اور اس کے لیے تمہیں اپنے ساتھ ریوالور بھی رکھنا پڑے گا۔" وقار آفندی نے اپنی گود میں رکھا ریوالور اٹھا کر سامنے ٹیبل پہ رکھ دیا تھا۔ منصور حسین نے چونک کر وقار آفندی اور پھر مبارک خان کو دیکھا تھا۔

"یہ کیسی نوکری مل رہی تھی اسے؟" اس کی نظر ریوالور پہ آکر ٹھہر گئی تھی!!!

وہ کافی گہری نیند سو رہی تھی جب بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ رکھے موبائل پہ رنگ ہونے لگی تھی اور اس کی گہری نیند کا تسلسل ٹوٹ گیا تھا۔ اس نے موبائل اٹھا کر نمبر دیکھا اور پھر یکدم چونک کر اٹھ بیٹھی تھی' پاکستان سے بی بی جان کی کال تھی۔

"السلام علیکم۔" کال ریسیو کرتے ہی سلام کرنے کی عادت بھی اس نے کسی خاص مدرسے سے سیکھی تھی۔

"وعلیکم السلام بیٹا کیسی ہو؟" بی بی جان نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"میں ٹھیک ہوں بی بی جان آپ کیسی ہیں؟ اور بابا کیسے ہیں؟" وہ نیند سے اٹھتے ہی اپنی ماں کی آواز سن کر خوش ہوگئی تھی۔

"میرے بیٹے کو بڑی جلدی خیال آگیا ہے اپنی ماں اور اپنے بابا کا حال پوچھنے کا؟" ان کی محبت شکوہ کر بیٹھی۔

"آئم سوری بی بی جان دراصل آج کل اپنا ہوم ورک بہت زیادہ مصروفیت ہے' لیکن آج سنڈے تھا میں رات کو ارادہ کرکے سوئی تھی کہ صبح اٹھ کر آپ کو کال ضرور کروں گی' آئی ایم سوری بی بی جان میں آج آپ کو کال کرنے والی تھی۔" اس نے انہیں یقین دلانے کی کوشش کی۔

"ہاں بیٹا اب ماں باپ کی اہمیت رہ گئی ہے کہ بچے انہیں اتوار کے اتوار یاد کرتے ہیں' آگے پیچھے کے دنوں میں تو انہیں ٹائم ہی نہیں ملتا۔" ان کا یہ شکوہ بجا تھا جس پہ زری شرمندہ تھی اسی لیے کچھ کہہ نہ سکی اور چپ ہوگئی۔

"بچے چھوڑو بیٹا تمہیں بتاؤ عبداللہ کیسا ہے؟" وہ اس کی شرمندگی بھانپتے ہوئے بات ہی بدل گئی تھیں۔

"اللہ کا شکر ہے وہ بھی ٹھیک ہیں' آپ کی بات کرواؤں ان سے؟" زری نے آہستگی سے پوچھا۔

"نہیں۔"

"کیوں بی بی جان؟"

"کیونکہ میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی اس کے نمبر پہ فون کیا تھا وہ ابھی سو رہا ہے' اس کی بیوی نے فون اٹھایا تھا۔"

"اس کی بیوی آپ کی بہو ہوتی ہے بی بی جان۔" زری نے باور کروایا تھا۔

"کیسی بہو؟" انہوں نے تعجب سے کہا۔

"دیکھی نہ سنی نہ ہی کوئی بات کی' ہمارا تو اس سے دور دور تک بھی کوئی واسطہ نہیں۔" بی بی جان کے لہجے سے ان کی خفگی اور ناراضی نمایاں تھی اور زری جانتی تھی کہ یہ سب کیوں ہے؟ اور کب تک ہے؟

"بی بی جان کسی سے کوئی واسطہ بنانا ہو تو بنتا ہے یوں کسی سے ملے بغیر غلط اندازے لگانے سے تو نہیں بنتا نا؟" زری نے ان کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"ہاں جب سے تجھے انگلینڈ کی ہوا لگی ہے' تجھے اپنی ماں کے اندازے بھی غلط لگنے لگے ہیں۔" ان کے انداز کی خفگی ہنوز تھی اور زری ان کی معصوم سی بات پہ مسکرا دی تھی۔

"انگلینڈ میں بندے کو ہوا نہیں لگتی ـــ یا تو برف لگتی ہے یا بارش۔" اس نے بی بی جان کو چھیڑا تھا۔

"بس بس مجھے بہلانے پھسلانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" وہ اپنے لہجے میں سختی لاتے ہوئے بولیں۔

"ارے بی بی جان میں کیوں آپ کو بہلانے لگی؟ آپ یہ بتائیں کہ باقی سب کیسے ہیں؟ کوئی گاؤں کی نئی تازی؟" زری مسکراتے ہوئے پوچھ رہی تھی اسے پتا تھا کہ ابھی وہ بہل بھی جائیں گی۔

"باقی سب بھی ٹھیک ہیں اور گاؤں میں تو آئے روز نئی تازی ہوتی ہی رہتی ہے کسی کے گھر خوشی اور کسی کے گھر غمی۔" وہ بات کرتے کرتے ادھر کے ہولی تھیں۔

"کیوں بی بی جان خیریت تو ہے نا؟" زری کو ان کے لہجے میں افسردگی کی جھلک نظر آئی تھی۔

"بس بیٹا زمانہ ہی ایسا آگیا ہے' اب تو اپنی ہی بیٹیوں سے خوف آنے لگا ہے۔" وہ واقعی اندر سے ڈری ہوئی لگ رہی تھیں۔

"ہوا کیا ہے؟" زری کو بے چینی ہوئی۔

"ہونا کیا ہے بیٹا' دینو موچی کی بیٹی نے زہریلی گولیاں کھا کر خودکشی کرلی ہے' چار بھائیوں کی ایک ہی بہن تھی اب چاروں بھائی بھی بیٹھے رو رہے ہیں اور ماں باپ بھی۔" دینو موچی کی بیٹی؟ کیا نام تھا اس کا' ہاں یاد آیا' زلیخا نام تھا۔ زری نے ذہن پہ زور ڈالا اور سب یاد آگیا تھا۔

"لیکن بی بی جان زلیخا تو بہت اچھی لڑکی تھی بہت سلجھی ہوئی اور عقل مند تھی۔" زری کے دماغ کی اسکرین پہ زلیخا کا خاکہ نمودار ہوچکا تھا وہ زری کی ہم عمر تھی اور کئی بار زری سے ملنے حویلی بھی آئی تھی۔

"بیٹا یہ جو محبت نام کی بیماری ہے نا؟ سب سے پہلے بندے کی عقل ہی تو مارتی ہے اور رفتہ رفتہ بندہ خود بھی مر جاتا ہے' کبھی زہریلی گولیاں کھا کر' کبھی نہر میں کود کر' اور کبھی گھر والوں کی خاطر کسی ان چاہے کی ڈولی میں بیٹھ کر' بس فرق اتنا ہے کہ زلیخا نے کسی کی ڈولی میں بیٹھنے والی خودکشی نہیں کی بلکہ گولیاں کھا کر خودکشی کرلی ہے۔" بی بی جان کی بات زری کے دل میں ترازو ہوگئی تھی۔

"لیکن بی بی جان زلیخا کی منگنی تو اس کے چچا کے بیٹے کے ساتھ ہوچکی تھی نا۔" زری کو اک اک بات یاد آرہی تھی۔

"بیٹا جس کے ساتھ منگنی ہوئی تھی اس کے ساتھ محبت نہیں ہوئی اور جس کے ساتھ محبت ہوئی تھی اس کے ساتھ منگنی نہیں ہوئی تھی اس لیے وہ نہ منگنی کی ڈولی میں بیٹھی اور نہ محبت کی ڈولی میں۔" بی بی جان بتاتے ہوئے افسردہ ہورہی تھیں۔

"اس کے گھر والوں کو اس کی محبت کا پتا تھا؟"

"سب پتا تھا ماں باپ کو بھی اور بھائیوں کو بھی' لیکن سب کی ایک ہی ضد تھی کہ اسے بیاہ کر ہی دم لیں گے' مگر وہ بھی انہی کی اولاد تھی اس کی بھی ایک ہی ضد تھی یا ڈولی یا جنازہ۔ آج اس کا جنازہ نہ اٹھتا تو ڈولی اٹھنی تھی۔ آخر کسی ایک کی ضد تو پوری ہونی ہی تھی' اپنی بات کے پکے بھی تھے' اور آج بھی پکے رہے ہیں' پتا نہیں اترا رہے ہیں یا رو رہے ہیں کہ اس کی جیت پہ؟ کیا ہوتا اگر مان جاتے؟ گونج کی طرح کڑوی بھری تھی ان کے سامنے' مگر کوئی بھی تو نہیں مانتا تھا۔ اب نہ ماننے کا ماتم کر بھی رہے ہیں تو اپنی تنڈی کے کس کام کا؟" بی بی جان جلے دل کے پھپھولے پھوڑ رہی تھیں اور زری چپ سادھے سب سن رہی تھی۔

"بس بیٹا اپنی بیٹیوں سے ڈر لگتا ہے اور اللہ سے دعا کرتی ہوں جیسے پہلے ایک بیٹی کے فرض سے فارغ کیا ہے اب دوسری بیٹی کے فرض سے بھی فارغ کردینا' زمانہ بڑا ظالم ہے' کب کیا ہوجائے کچھ پتا نہیں چلتا۔" وہ زری کے لیے دعا کررہی تھیں۔ زری کچھ بھی نہ کہہ سکی تھی۔

"زری..." انہوں نے اس کی چپ محسوس کرتے ہوئے پکارا۔

"جی بی بی جان؟"

"چپ کیوں ہوگئی ہو؟"

"زلیخا کو سوچ رہی تھی۔"

"چھوڑو بیٹا! ایسی باتوں کو دل پہ نہیں لیتے۔" انہوں نے آہستگی سے کہا۔

"دل کی باتوں کو دل پہ نہ لیں تو اور کیا کریں؟ آج محبت کے قبیلے کا ایک فرد مر گیا تو کیا اس کا افسوس بھی نہ

کریں؟" زری کے لہجے میں اداسی رچی تھی بی بی جان کو خود زلیخا کی موت پہ بے حد دکھ اور افسوس تھا اس لیے مزید کچھ نہ کہا۔

"بی بی جان کیا محبت اتنی ہی نامراد ہوتی ہے؟" اس نے عجیب سے انداز میں پوچھا۔

"نامراد ہوتی ہے' کبھی تو بندے کو قبر میں لے جاتی ہے' چاہے سوہنی ہو' چاہے ماہیوال' یہ کسی کو بھی نہیں دیکھتی' نہ چڑھتی جوانی' نہ کالے بال' نہ گوری رنگت' نہ سرخ ہونٹ' بس سارا کچھ مٹی میں لے جاتی ہے اور پیچھے غم اور ماتم چھوڑ جاتی ہے یا پھر اپنا نام۔" بی بی جان تو آج نہ جانے محبت کے کون سے بخیے ادھیڑنے پہ تلی ہوئی تھیں۔ اور زری کا تو خود محبت کے قبیلے سے تعلق تھا' بھلا کیا کہہ سکتی تھی محبت کے خلاف تو بالکل بھی نہیں۔

بی بی جان نے تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد فون بند کردیا تھا لیکن زری کا دھیان پھر بھی نہیں ہٹا' وہ مسلسل زلیخا کے متعلق اور بی بی جان کی باتوں کے متعلق ہی سوچ رہی تھی۔

"بی بی جان آپ کی بیٹی بھی محبت کی بیماری دل سے لگا بیٹھی ہے' اب دیکھنا یہ ہے کہ میں نے کون سی خودکشی کرنی ہے؟" وہ خود کلامی کے سے انداز میں بولی تھی۔ اور اٹھ کر باہر نکل آئی۔ کچن سے برتنوں کی کھڑ پٹر کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ نگارش اٹھ چکی تھی شاید!

"گڈ مارننگ بھابھی۔" زری نے کچن میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"گڈ مارننگ سویٹ ہارٹ۔" نگارش نے خوش دلی سے مسکراتے ہوئے زری کا گال چھوا تھا۔

"اف بھابھی۔" زری کسمسائی۔

"کیوں؟"

"اتنے ٹھنڈے ہاتھ ہیں آپ کے۔" اس نے اپنے گال کو سہلایا۔

"اب میں گرم ہاتھ کہاں سے لاؤں؟" نگارش کے انداز میں شرارت تھی۔ لیکن زری نے ان کی شرارت پہ کوئی رسپانس نہیں دیا تھا۔

"کیا بات ہے زری؟" نگارش نے آنچ دھیمی کرتے ہوئے پوچھا وہ آملیٹ بنا رہی تھی۔

"کچھ نہیں بھابھی۔" زری آگے بڑھ کے اپنے لیے چائے بنانے لگی۔

"زری۔" نگارش نے اس کے ہاتھ سے ٹی بیگز کا پیکٹ تھام لیا تھا وہ سیپرٹ چائے بنا رہی تھی۔

"جی بھابھی؟"

"بات کیا ہے؟"

"بی بی جان کا فون آیا تھا۔"

"پھر؟"

"گاؤں کے دینو موچی کی بیٹی زلیخا نے آج خودکشی کرلی ہے۔" وہ آہستگی سے بولی آواز جیسے لرز رہی تھی۔

"کیوں؟ اس نے خودکشی کیوں کی ہے؟" نگارش کو پریشانی ہوئی تھی۔

"جوان لڑکی خودکشی کیوں کرتی ہے؟" الٹا زری نے نگارش سے سوال کیا تھا۔

"یعنی محبت کی وجہ سے؟" نگارش سمجھ گئی تھی۔

"ہاں ایک اور قتل محبت کے سر۔" زری تلخی سے بولی۔

"یہ غلط ہے زری ایسا نہیں کرنا چاہیے ان لڑکے اور لڑکیوں کو اپنی زندگی کے متعلق سوچنا چاہیے' یہ حرام موت ہے کیا حاصل ہوتا ہے ایسا کرکے؟" نگارش نے مخالفت کی تھی۔

"بی بی جان بتا رہی تھیں کہ یہ جو محبت نام کی بیماری ہے نا سب سے پہلے بندے کی عقل ہی کو مارتی ہے اور رفتہ

رفتہ بندہ خود بھی مر جاتا ہے۔" آپ خود سوچیے جس بندے کی عقل ہی مر جاتی ہے وہ اپنی زندگی کے متعلق کیسے سوچ سکتا ہے؟ اسے کیسے احساس ہو سکتا ہے کہ یہ حرام موت ہے؟ وہ تو حاصل اور لاحاصل کی فکر سے بھی بے نیاز ہو چکا ہوتا ہے؟" زری نے بھی دل کے پھپھولے پھوڑے تھے۔

"تم پھر بھی یہی کہوں گی کہ یہ سب غلط ہے غلط کیا ہے اس لڑکی نے۔" نگارش نے سر جھٹکا۔

"دعا کیجیے بھابھی یہ غلط کام آپ کی زری کو نہ کرنا پڑے۔" زری ان کے ہاتھ سے پیکٹ لے کر دوبارہ چائے کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

"پاگل ہو گئی ہو تم؟" نگارش کو شاک لگا تھا۔

"عقل مر جائے تو بندہ پاگل ہی ہو جاتا ہے۔ بتایا ہے نا؟"

"اسٹاپ اٹ آئندہ ایسی بات کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔"

نگارش نے اسے جھڑکا۔

"ڈونٹ وری بھابھی ابھی اس محبت کے در سے اتنی مایوس نہیں ہوں میں، ابھی امید باقی ہے آس باقی ہے۔ دعا کیجیے محبت میں میرا مقدر بھی آپ جیسا ہی ہو، جو چاہا وہ پالیا۔" اس نے نگارش کے ہاتھ تھام کے کہا تھا اور نگارش اپنی گہری نظروں سے زری کے چہرے کو کھوجنے لگی تھی۔

"بات کروں تمہارے بھائی سے؟"

"کیسی بات؟"

"تمہارے رشتے کی، تمہاری شادی کی۔"

"مگر اس میں بھائی بھلا کیا کر سکتے ہیں؟ اور جو کر سکتا ہے وہ تو اتنی دور بیٹھا ہے کہ تعلق اور واسطہ، کبھی بھولے سے بھی خیال نہیں آیا اسے۔" زری کے لبوں پہ شکوہ مچل گیا تھا۔

"ان شاءاللہ اسے ہی خیال آئے گا بس ہمارے پاکستان جانے کی دیر ہے، سارے خیال وہی کرے گا۔" نگارش نے اسے تسلی دے کر بہلایا۔

"اللہ آپ کی زبان مبارک کرے۔" وہ گہری سانس کھینچ کے بولی تھی۔

"آمین، مدیحہ کی کوئی کال وغیرہ آئی ۔۔۔؟ فرائیڈے کو وہ لوگ گئے تھے اتنے دن ہو رہے ہیں؟"

"نہیں مدیحہ کی تو نہیں نبیل اور فائزہ آنٹی کی کال آئی تھی عبداللہ بھائی بتا رہے تھے۔"

"مدیحہ نے کیوں نہیں کی؟"

"اس کے پاس اپنا ذاتی نمبر نہیں ہے اس لیے۔"

"او اچھا۔" نگارش اپنے کام کی طرف متوجہ ہو چکی تھی۔ اور زری بھی ان کے قریب بیٹھی چائے کا کپ تھامے باتوں میں مشغول ہو گئی تھی۔

"تو ایٹ تھی چلو گی۔؟" نگارش نے پوچھا۔

"کیوں؟"

"بھئی شاپنگ کرنے، آج تم فارغ ہو نا؟"

"نہیں بھابھی آج موڈ نہیں ہے۔" اس نے انکار کر دیا۔

"موڈ کہاں ہے؟"

"اپنے گاؤں کے وڈے مولوی کے گھر میں۔" اس کے جواب پہ نگارش چونکی اور پھر چپ ہو گئی تھی اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ زری کا پورا دن اب اسی بات کے زیر اثر اداس اور افسردہ گزرے گا وہ چاہے کچھ بھی کرے۔

☆ ☆ ☆

وہ نماز پڑھ کے چپ چاپ چھت پہ آگئی تھی اور اکیلی ہی چھت پہ ٹہلنے لگی۔ ذہن الجھا ہوا تھا اسی لیے تنہائی کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی آدھا گھنٹہ ٹہلنے کے بعد جب تھک گئی تو چھت پہ رکھی چارپائی پہ لیٹ گئی اور نظر آسمان کے نظاروں سے جا لگی تھی۔ آسمان کا کشادہ سینہ روشن ستاروں سے بھرا ہوا تھا لیکن اس سینے سے چاند کی صورت غائب تھی۔

"اللہ تعالیٰ نے انسان کے علاوہ باقی ہر چیز کو بے فکر کیوں بنایا ہے؟" وہ ستاروں کی ٹمٹماتی روشنی دیکھ کر سوچنے پہ مجبور ہوئی تھی۔

"چاند رات کو بے فکری سے نکلتا اور دن چڑھنے سے پہلے غائب ہو جاتا ہے۔ سورج دن کو بے فکری سے طلوع ہوتا اور شام کو ڈوب جاتا ہے نہ کوئی جھگڑا نہ کوئی جھنجھٹ بس ایک سی لگی بندھی روٹین۔ لیکن انسان کا ہر دن پہلے دن سے مختلف ہوتا ہے اور ہر رات نئی رات ہوتی ہے نئی فکریں اور نئی سوچیں لے کر۔ انسان ہر روز پریشان ہوتا رہتا تھا اور باقی ساری کائنات بے فکر رہتی ہے۔" وہ ستاروں کو دیکھتے ہوئے نجانے کیا کیا سوچے جا رہی تھی کہ نیچے ان کے دروازے پہ دستک ہوئی۔

"کون ہے؟" یہ آواز ایمن کی تھی۔

"دروازہ کھولو۔" باہر سے عدیل کی آواز سنائی دی۔

"بھائی آ گئے بھائی آ گئے۔" سونیا اور عدینہ اندر سے بھاگتی ہوئی نکلی تھیں ایمن نے دروازہ کھول دیا تھا اور جیسے ہی عدیل اندر داخل ہوا وہ دونوں اس سے لپٹ گئیں وہ دونوں چھوٹی جو تھیں۔

"کیسی ہو میری جان۔" عدیل ان کے بال سہلاتے ہوئے بولا۔ ایمن اس کے ہاتھ سے شاپر وغیرہ تھام چکی تھی۔

"آپ کیا لے کر آئے ہیں بھائی؟" ان دونوں نے اشتیاق سے پوچھا اور عدیل ان کی معصومیت پہ مسکرا دیا۔

"تم لوگوں کے لیے کھانے کی چیزیں لے کر آیا ہوں میری جان، مریم سے کہو وہ تمہیں پلیٹوں میں نکال دے۔" اس نے سونیا کا سر تھپکا۔

"میں نکال لاتی ہوں۔" ایمن نے کچن ۔۔۔ کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟ مریم کہاں ہے؟" عدیل چونکا، اب وہ بھی مریم کی غیر موجودگی نوٹس کر چکا تھا۔

"وہ تو شاید اوپر چھت پہ ہیں۔"

"کیوں؟"

"بس ایسے ہی نماز پڑھی تو اوپر چلی گئی۔"

مریم نے قریب آتے ہوئے جواب دیا وہ نیچے اتر آئی تھی۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

عدیل کو اپنی چہیتی بہن کی طرف سے فکر ہوئی تھی۔

"جی بالکل ٹھیک ہوں دن میں شاید کپڑے دھوتی رہی ہوں اس لیے تھکن ہو گئی ہے۔"

"اچھا! کیا تمہیں بھی تھکن ہوتی ہے؟" عدیل نے خفگی سے کہا تھا وہ جانتا تھا کہ مریم دن بھر کاموں میں مصروف رہ کر اپنی فراغت کم کرنے کی کوشش میں لگی رہتی ہے۔

"بدقسمتی سے انسان ہی ہوں، تھکن ہو بھی سکتی ہے۔" وہ منہ بنا کر کہتی ایمن سے شاپر وغیرہ تھام کے کچن کی

طرف بڑھی۔
"آج اتنی قوطیت کس لیے؟ خیر تو ہے؟" عدیل کہے بغیر نہ رہ سکا۔
"خیریت ہے' آپ پریشان نہ ہوں۔" اس نے سر جھٹک کر کہا۔
"یہ وائیٹ والا شاپر تم رکھ لو تمہارے لیے ہے۔" اس نے مریم کو اشارہ کیا وہ ہاتھ میں پکڑے شاپرز میں سے وائیٹ شاپر دیکھنے لگی۔
"ابھی رہنے دو بعد میں دیکھ لینا۔" عدیل کا اشارہ وہ سمجھ گئی تھی لیکن اندر سے حیران بھی ہوئی تھی کہ ایسا بھی کیا ہے کہ وہ سب کے سامنے دیکھنے سے منع کر رہا ہے؟ پھر عدیل امی ابو کی طرف آ گیا اور مریم ان سب کو فروٹ چاٹ وغیرہ پلیٹوں میں نکال کر دینے لگی۔ اور کافی دیر بعد کمرے میں آئی تو عدیل بھی آ گیا۔
"یہ کیا ہے بھائی؟" بالآخر اس نے پوچھ ہی لیا تھا۔
"تمہارے لیے سوٹ ہے۔ گوجرانوالہ میں کپڑوں کی بہت اچھی ورائٹی تھی اور کافی سستے بھی تھے یہ سوٹ یونہی تمہارے لیے پسند کر لیا' سوچا اگر دوبارہ آنا ہوا تو امی اور عدینہ وغیرہ کے لیے لے کر آؤں گا۔" عدیل اپنی کہہ رہا تھا اور مریم اپنی سوچ رہی تھی اس کے سامنے انتہائی نفیس سا شیفون کا سوٹ تھا اور دھیان فاطمہ کی برتھ ڈے کی طرف تھا دماغ جوڑ توڑ کرنے میں لگا ہوا تھا۔
"کیا بات ہے پسند نہیں آیا؟" عدیل نے اسے چپ دیکھ کر پوچھا۔
"نن... نہیں بھائی' ایسی تو کوئی بات نہیں ہے بہت خوبصورت سوٹ ہے تھینک یو سو مچ۔" مریم کے دماغ پہ رکھی سوچوں کا بوجھ قدرے کم ہو گیا تھا اور عدیل بھی اس کے چہرے پہ مسکراہٹ دیکھ کر خوش ہو گیا تھا پھر اس کا سر تھپکتے ہوئے منہ ہاتھ دھونے چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

"ریوالور؟"
"ہاں یہ ریوالور تم رکھو گے۔" وقار آفندی نے منصور حسین کی طرف اشارہ کیا تھا۔
"لیکن صاحب اس کو رکھنے کی کیا ضرورت ہے؟" منصور حسین نا سمجھی سے پوچھ رہا تھا۔
"اس کو رکھنے کی ہی تو ضرورت ہے' اور اگر ڈیوٹی کے وقت تمہیں علیزے کی گاڑی کے آس پاس کوئی بھی مشکوک آدمی نظر آئے تو اسے گولی مار دینا۔" انہوں نے اسے اجازت دی تھی۔
"واقعی گولی مار دوں؟" وہ حیرت سے دوہرا کر بولا تھا۔
"ہاں واقعی گولی مار دینا۔" وہ بھی زور دے کر بولے تھے۔
"اگر کوئی مر گیا تو...؟"
"تو مر جائے' دشمن کے ساتھ رعایت کرنا خود اپنے ساتھ دشمنی کرنے کے برابر ہوتا ہے۔"
"یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں' میں بھی اسی بات کا قائل ہوں' کوئی رعایت نہیں' کوئی گنجائش نہیں۔" منصور حسین نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔
"مجھے اپنی بیٹی کی زندگی سے زیادہ کوئی زندگی عزیز نہیں۔" وقار آفندی کے چہرے پر سختی اتر آئی تھی۔ منصور حسین اور مبارک خان ان کی طرف دیکھتے رہ گئے۔
"ریوالور چلا سکتے ہو؟"
"چلا کر دکھاؤں؟" اس نے ہاتھ بڑھا کر ٹیبل پہ رکھا ریوالور اٹھا لیا تھا اور پھر ریوالور کی نال میں ہلکی سی پھونک

مارنی تھی۔
"نہیں یہاں نہیں' حویلی میں فائر کی آواز سے سب پریشان ہو جائیں گے۔" انہوں نے منع کر دیا۔
"نشانہ کیسا ہے؟"
"جب ریوالور چلاؤں گا نہیں تو میرے نشانے کا پتا کیسے چلے گا؟" منصور حسین نے بے دلی سے کہا تھا۔
"اسلحے کا لائسنس ہے؟" انہوں نے کچھ یاد آنے پہ پوچھا۔
"جی صاحب ہے تو سہی پر رینیو کروانے والا ہے۔"
"تو کروا لو' ابھی چند دنوں میں تو ضرورت ہے۔"
"کروا لوں گا سر' لیکن پاس لائسنس کی فیس بھرنے کے لیے پیسے نہیں ہیں ابھی۔" اس نے اصل مسئلہ بیان کیا تھا۔
"ڈونٹ وری' مبارک خان تمہارے ساتھ جائے گا اور سارا کام کروا دے گا۔ مبارک خان نے اپنا لائسنس بھی رینیو کروانا ہے شاید؟" وقار آفندی نے مبارک خان کی سمت دیکھا۔
"جی صاحب میں نے بھی آج اور کل میں ہی کروانا ہے۔" مبارک خان نے فوراً" تائید کی تھی۔
"تو ٹھیک ہے پھر منصور حسین کو بھی ساتھ لے جانا۔"
"جی لے جاؤں گا۔"
"تمہارا آئی ڈی کارڈ کہاں ہے؟"
"حاضر ہے صاحب۔" منصور حسین نے جیب سے شناختی کارڈ نکال کر ان کے سامنے رکھ دیا تھا وہ اس کا شناختی کارڈ دیکھ کر مطمئن ہو گئے تھے۔
"صاحب اس کے پاس موبائل بھی نہیں ہے ہم اس سے رابطہ کیسے کریں گے؟" مبارک خان نے لگے ہاتھوں ایک اور کمی بیان کی تھی۔
"وہ بریف کیس اٹھا کر ادھر رکھو۔" وقار آفندی نے کاؤچ پہ رکھے بریف کیس کی سمت اشارہ کیا تھا مبارک خان نے بریف کیس اٹھا کر ان کے سامنے ٹیبل پہ رکھ دیا تھا انہوں نے بریف کیس کا پاس ورڈ پریس کیا اور لاک اوپن کر لیا تھا پھر ایک موبائل سیٹ بمعہ چارجر کے نکال کر منصور حسین کے سامنے رکھا۔
"یہ موبائل تمہارے لیے ہے' اسے تم رکھو گے' سم کارڈ ہم خود ایشو کروا کے دیں گے۔ اور یہاں موبائل چوبیس گھنٹے آن رہنا چاہیے' فل چارجر' فل سگنل' فل کریڈٹ' کسی چیز میں بھی کمی نہیں ہونی چاہیے۔" انہوں نے دو ٹوک سمجھایا تھا۔
"ان شاء اللہ صاحب کوئی کمی نہیں آئے گی' موبائل ہی نہیں میں خود بھی چوبیس گھنٹے آن رہوں گا۔" اس نے وقار آفندی کو تسلی دی تھی۔
"مبارک خان سرونٹ کوارٹر صاف کروا دے گا تم وہاں شفٹ ہو جانا' اپنا کوئی سامان لانا چاہتے ہو تو وہ بھی لے آنا۔" وقار آفندی فیصلہ کن انداز میں کہتے ہوئے بریف کیس بند کر کے کھڑے ہو گئے تھے۔
"نوکری پکی ہے نا صاحب؟" منصور حسین نے ایک بار پھر تصدیق چاہی تھی۔
"ان شاء اللہ۔" انہوں نے بھی اسے تسلی دی تھی اور وہاں سے چلے گئے تھے۔ منصور حسین اور مبارک خان پیچھے اکیلے رہ گئے۔
"شکریہ مبارک خان۔" منصور حسین اس کا مشکور ہوا۔
"کس بات کا؟"

"نوکری دلانے کا۔"

"نہیں منصور حسین نوکری تم نے خود اپنے بل بوتے پہ لی ہے' ورنہ صاحب کہاں اتنا دھیان رکھنے والے تھے' تم نے ہمت نہیں ہاری' بار بار دروازے پہ آتے رہے۔" آج مبارک خان بھی بڑا خوش ہو رہا تھا چلو ایک غریب کا تو بھلا ہوا تھا۔

"ضرورت مجھے تھی میں نے بار بار آنا تو تھا ہی؟" منصور حسین نے خوشی اور افسردگی کے ملے جلے تاثرات کا اظہار کیا تھا۔

"چلو تمہیں چھوڑ آؤں۔" مبارک خان نے اشارہ کیا۔

"کہاں؟"

"تمہارے گھر۔"

"آج یہ عنایت کیوں؟"

"آج تم حویلی کے ملازموں کی لسٹ میں شامل ہو چکے ہو اس لیے۔" مبارک خان نے مسکرا کے کہا تھا۔

"بڑے خود غرض ہو؟" منصور حسین نے گھور کے کہا۔

"کام میں خود غرض ہونا ہی پڑتا ہے۔"

"چلو یہ تو وقت وقت کی بات ہے بچے۔" منصور حسین اس کے ساتھ باہر نکل آیا تھا اور ہر بار کی طرح اس بار بھی وہ بڑی حویلی کی پر غرور' بلند و بالا اور مضبوط عمارت کو دیکھ کے رہ گیا تھا بڑی حویلی کے احاطے میں نظر دوڑاتے ہوئے اس کی نظروں میں عجیب سی حسرت ہوتی تھی عجیب سے خواب ہوتے تھے۔

"مبارک خان۔" اس نے کسی خاتون کی آواز پہ چونک کر دیکھا تھا حویلی کے مرکزی دروازے کے سامنے بنی سیڑھیوں پہ آسیہ آفندی کھڑی تھیں۔

"جی بیگم صاحب؟" وہ مودب سا ان کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

"فارغ ہو؟" انہوں نے اک نظر منصور حسین کو دیکھ کر مبارک خان سے پوچھا۔

"آپ حکم کریں بیگم صاحب۔"

"فریزر میں آئس کریم نہیں ہے' علیزے کے لیے آئس کریم لے آنا۔"

"جی لے آؤں گا' صاحب نے کہہ دیا تھا مجھے۔" وقار آفندی کو آسیہ آفندی سے بھی زیادہ فکر تھی وہ دن میں ایک بار آئس کریم ضرور کھاتی تھی اس لیے فریزر میں ہر وقت آئس کریم موجود رہتی تھی۔

"یہ کون ہے؟" انہوں نے کچھ دور کھڑے منصور حسین کے متعلق پوچھا۔

"علیزے بی بی کا نیا ڈرائیور ہے اور گارڈ بھی۔" مبارک خان نے تعارف کروایا تھا۔

"السلام علیکم۔" منصور حسین نے آگے بڑھ کے سلام کیا وہ ان کی نرم و نفیس سی پروقار شخصیت سے حقیقتاً متاثر ہوا تھا۔

"وعلیکم السلام کیا نام ہے تمہارا؟"

"جی منصور حسین۔" اس نے احتراماً جواب دیا تھا۔

"صاحب سے ملاقات ہوئی؟"

"جی صاحب سے مل کر ہی آ رہے ہیں۔"

"اچھی بات ہے۔" وہ سر ہلا کر رہ گئیں لیکن یہ سوچنے پہ مجبور ہو گئی تھیں کہ وقار آفندی نے اتنے جوان جہان آدمی کو کام پہ کیسے رکھ لیا ہے؟ وہ تو اتنے ینگ ملازموں کے حق میں ہی نہیں تھے۔

"ہمیں اجازت ہے؟" مبارک خان نے اجازت چاہی۔

"ہوں' جاؤ تم لوگ۔" انہوں نے اجازت دی اور پلٹ کر اندر چلی گئیں۔

"یہ کون ہیں؟" منصور حسین نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ بڑی بیگم صاحبہ ہیں' علیزے بی بی کی امی ہیں۔"

"تمہاری علیزے بی بی کیا چیز ہیں آخر؟" اس نے مبارک خان کو دیکھا۔

"علیزے بی بی وہ چیز ہیں جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔" مبارک خان مسکرا کے بولا۔

"یعنی دیدار لازم ہو گیا ہے؟" جواباً وہ بھی ہنسا تھا۔

"بچ کے منصور حسین' وہ وقار آفندی کی بیٹی ہیں۔"

"صرف دیکھنے کی ہی تو بات کی ہے۔" منصور حسین نے ذو معنی کہا۔

"دیکھنا بھی سوچ سمجھ کے۔"

"او یار تم سنبھال کے رکھو اپنی علیزے بی بی کو' ہمارے دیکھنے کے لیے اور بہت ہیں۔" منصور حسین نے شاہانہ انداز میں کہا تھا۔

"ہاں بس یہی ٹھیک ہے۔" مبارک خان نے ہاں میں ہاں ملائی اور گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی۔

اس کی گاڑی فراٹے بھرتی گیٹ سے اندر روش پہ آ رکی تھی۔ وہ ڈور کھول کے نیچے اترا آیا تھا لیکن ابھی ڈرائنگ روم میں پہنچا ہی تھا کہ موبائل بجنے لگا۔ نمبر دیکھا تو نبیل کا نمبر نظر آیا تھا۔

"السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام" مجھے میرے گھر میں چھوڑ کر کہاں غائب ہو گئے ہو؟ پلٹ کر کوئی خبر ہی نہیں لی؟" نبیل نے ناراضی کا اظہار کیا تھا۔

"یعنی تمہیں تمہارے گھر میں چھوڑ کر خود بھی تمہارے ساتھ تمہارے گھر میں رہتا؟"

"تو اس میں کیا قباحت تھی؟"

"اپنا گھر ملازموں کے حوالے کر دیتا؟" ول آور نے استہزائیہ پوچھا۔

"کر دیتے۔"

"کر دیتا' ضرور کر دیتا' لیکن اگر کبھی تم میرے لیے اپنا بزنس اپنے کام چھوڑ کر مجھ سے ملنے پاکستان آئے ہوتے۔ یاد کرو' کبھی میرے لیے پاکستان آنے کا سوچا؟" ول آور نے ایک ہی جملے میں اگلے پچھلے حساب بے باق کر دیئے تھے نبیل ٹھٹک کے رہ گیا تھا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟ اب تم میرے ساتھ میرے والا برتاؤ کرو گے؟"

"نہیں تمہارے ساتھ تم سے بھی برا برتاؤ کروں گا۔" اس نے دھمکی دی۔

"اتنی بڑی سزا؟"

"میں نے سزائیں دینا اور سزائیں دلانا ہی تو سیکھا ہے۔" ول آور کا لہجہ عجیب سا ہو گیا تھا۔

"بس بس مجھے ڈراؤ مت اور میرے گھر پہنچو۔" نبیل نے سر جھٹک کر کہا تھا اسے پتا تھا کہ جب ول آور کا لہجہ عجیب ہوتا ہے تو پھر وہ خود بھی سیریس ہو جاتا ہے۔

"کیوں؟"

"یار اتنے سارے کام ہیں۔"

"میں نہیں آ سکتا۔"

"چل یار؟"
"میں اسلام آباد کے لیے نکل رہا ہوں۔"
"خیریت؟"
"ہوں! اماں سے ملنے جا رہا ہے۔"
"یار ان سے تو میں نے بھی ملنا تھا؟"
"ابھی تم اپنا گھر سیٹ کرو پھر ان سے بھی مل لینا۔" دل آور نے مشورہ دیا۔
"گھر سیٹ کرنے کے لیے ہی تو تمہیں بلایا ہے۔" نبیل خفگی سے بولا۔
"کیوں کیا مسئلہ ہے؟"
"کوئی ایک مسئلہ ہو تو بتاؤں نا؟ اتنے سارے مسئلے بکھرے پڑے ہیں۔"
"مثلاً؟"
"مثلاً" یہ کہ اپنے لیے گاڑی نکلوانی ہے' مدحینہ کے لیے گاڑی نکلوانی ہے' اپنے لیے' امام کے لیے اور مدحیہ کے لیے موبائل فون کے سم کارڈز لینے ہیں' اپنا بینک اکاؤنٹ اوپن کروانا ہے' کرنسی چینج کروانی ہے بلکہ اور بھی ہزاروں کام ایسے پڑے ہیں جن کے بغیر ہم بے کار بیٹھے ہیں۔" نبیل نے کاموں کی لسٹ گنوائی۔
"ایک دن صبر کر لو کل تمہارے سارے کام ہو جائیں گے میں کل واپس آ جاؤں گا۔" دل آور نے اسے تسلی دی۔
"یار اس میں صبر کی بات کہاں سے آگئی یہ سب ضرورت کی چیزیں ہیں اور ہم ہاتھ پہ ہاتھ رکھے بیٹھے ہیں' صرف لینڈ لائن نمبر کا سہارا ہے۔" نبیل نے جھنجلا کر جواب دیا تھا۔
"اچھا میں ایک کام کرتا ہوں گلاب خان کو تمہاری طرف بھیج دیتا ہوں تم اس کے ساتھ کسی بھی موبائل کمپنی کی فرنچائز میں جاؤ اور اپنی مرضی کے نمبر ایشو کروالو' اگر کیش کی ضرورت ہے تو وہ بھی بھیج دیتا ہوں اور کچھ دن کے لیے میری دوسری گاڑی بھی تم اپنے پاس رکھ لو۔" اس نے نبیل کے مسائل کا مختصر اور فوری حل سوچا تھا۔
"لیکن یار۔" نبیل نے کچھ کہنا چاہا۔
"لیکن ویکن کس لیے؟ میں بھیجتا ہوں گلاب خان کو' چھوٹے موٹے کام نبٹا لو' باقی میں آ جاؤں تو پھر کر لوں گا۔" دل آور نے اسے ہدایت دی۔
"کل آ جاؤ گے؟"
"ہوں!"
"او کے بھیج دو گلاب خان کو۔"
"وہ تو میں بھیج دیتا ہوں لیکن دھیان رکھنا اس کی گل تمہارے گھر میں ہے' تھوڑی دیر کی تنہائی کی ضرورت ہو گی انہیں۔" دل آور کا لہجہ شرارتی تھا اور نبیل بدک گیا تھا۔
"کیا کہا؟"
"میں نے کہا ہے کہ دو دل کل سے بچھڑے ہوئے ہیں' انہیں ملنے کا موقع دے دینا۔" وہ اپنی شرارت سے باز نہیں آیا تھا۔
"بڑا ایکسپیرئنس ہے دو دلوں کے ملنے اور بچھڑنے کا؟" نبیل نے ذو معنی انداز سے پوچھا۔
"یہ بحث پھر کبھی سہی۔" دل آور نے ٹال دیا۔
"دل آور!"
"جی میری جان؟"

"نکل رہے ہو؟"
"نہیں یار بس بحث لمبی ہو گئی تو میں لیٹ ہو جاؤں گا اس لیے پھر کبھی۔" دل آور سنجیدہ ہو گیا تھا اور نبیل کو چپ ہونا پڑا۔
"خیر کب تک راز کو راز رکھے گا' کبھی تو سامنے آئے گا نا؟" نبیل نے دھمکی دی۔
"جب آئے گا تب دیکھا جائے گا۔"
"او کے اللہ حافظ۔" نبیل نے کہہ کے فون رکھ دیا تھا اور دل آور موبائل کو دیکھتا نبیل کی بات سوچتا رہ گیا تھا۔
"یار اس ماہ کا ڈائجسٹ کس کے پاس ہے؟" حرمت اندر داخل ہوتے ہی کافی عجلت بھرے انداز میں استفسار کر رہی تھی۔
"انوشہ کے پاس۔" جویریہ نے لاپروائی سے کہتے ہوئے ڈائجسٹ کو نامحسوس طریقے سے کشن کے نیچے چھپا دیا تھا۔
"لیکن انوشہ تو کہہ رہی تھی کہ وہ کومل کے کمرے میں ہی چھوڑ آئی تھی۔" حرمت نے ادھر ادھر متلاشی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"ایسی کیا خاص بات ہے اس ماہ کے ڈائجسٹ میں؟" جویریہ آنکھیں مٹکا کے بولی تھی کومل' مدحت اور اینہ اپنی مسکراہٹ بمشکل ہی روک پائی تھیں۔
"وہ سلسلے وار ناول کی لاسٹ قسط آئی تھی۔"
"وہ تو پڑھ لی ہے۔" جویریہ نے بے ساختہ کہا تھا۔
"ہیں؟ تمہیں کیسے پتا؟ تم نے پڑھ لیا ہے؟" حرمت ٹھٹک گئی۔
"میں ابھی پڑھنے والی تھی کہ تم آ ٹپکیں۔" کومل نے آہستگی سے لقمہ دیا تھا۔
"کیا کہا؟" حرمت چیخ اٹھی اور جویریہ فوراً کشن کے نیچے سے ڈائجسٹ جھپٹ کر بھاگ کھڑی ہوئی تھی۔
"دیکھو حرمت میں قسط پڑھنا شروع کر چکی ہوں' پہلے مجھے پڑھ لینے دو پھر تم پڑھ لینا۔" جویریہ' حرمت اور انوشہ تینوں ہی ڈائجسٹوں کی دیوانی تھیں ہر مہینے تینوں نے باری باری ڈائجسٹ منگوانا ہوتے تھے اور جس مہینے جو ڈائجسٹ منگواتی تھی اس مہینے اسی کی اجارہ داری ہوتی تھی۔ اس بار حرمت کی باری تھی سارے ڈائجسٹ اسی نے منگوائے تھے اسی لیے اسی کی اجارہ داری تھی۔
"میں نے اپنے سارے پیسے صرف اس ایک قسط کے لیے ہی تو خرچ کیے ہیں اور تم کہہ رہی ہو کہ ابھی نہ پڑھوں؟" حرمت نے تلملا کے کہا تھا۔
"یار تھوڑی دیر بعد پڑھ لو گی تو بھی تمہارے پیسے پورے ہو جائیں گے۔" جویریہ نے اسے تسلی رکھنے کا کہا۔
"تو پھر وعدہ کرو جب تک میں قسط نہ پڑھ لوں تم کوئی بھی بات ڈسکس نہیں کرو گی' اس طرح سارا چارم ختم ہو جاتا ہے۔" نجانے کیوں اور کیسے حرمت مان گئی تھی ورنہ وہ ناولز کے معاملے میں بے حد کریزی تھی۔
"او کے وعدہ۔" جویریہ نے خوشی خوشی وعدہ کیا تھا۔
"چلو تم بیٹھو میں تب تک پڑھ لوں۔" جویریہ خاصی خوش ہوئی تھی اور حرمت اپنی بے چینی پہ کنٹرول کرتے ہوئے کومل کے قریب فلور کشن پہ ٹک گئی تھی۔
"کیا ملتا ہے ان ناولز اور ڈائجسٹوں سے؟" کومل نے تعجب سے پوچھا۔
"جو آج کل کے معاشرے سے نہیں ملتا۔" حرمت نے دو ٹوک کہا۔
"کیا مطلب؟"

"مطلب ان ناولوں اور ڈائجسٹوں سے ہمیں نصیحت ملتی ہے' زندگی جینے کا تھوڑا بہت ڈھنگ ملتا ہے' سبق ملتا ہے اور سب سے بڑی بات کہ چند لمحوں کی خوشی اور راحت ملتی ہے۔ جو آج کل حقیقت کی دنیا میں بالکل بھی نہیں ہے۔" حرمت کے جواب پہ کومل واقعی چپ ہوگئی تھی۔

"یہ سب افسانوی باتیں ہیں یار۔" مدحت نے سر جھٹک کر تمسخرانہ کہا تھا۔

"تمہارے سمجھنے اور میرے سمجھنے میں بہت فرق ہے یار' تم ہر چیز کو تھیوری لیتی ہو اور میں ڈیپ لی۔" حرمت نے اپنی بہن کو حقیقت سے آگاہ کیا تھا۔ مدحت بڑے سکون سے بیٹھی اپنے ہاتھوں کے ناخنوں کی تراش خراش میں لگی ہوئی تھی۔

"حرمت۔" باہر سے ثروت بیگم کی آواز سنائی دی تھی۔

"جی ماما؟"

"وہ نیچے دانیال آیا ہے اسے کھانا نکال دو۔" انہوں نے کومل کے بیڈ روم کا دروازہ کھولتے ہوئے اسے کام سونپا۔

"دانیال کو کھانا؟"

"ہاں وہ عائشہ باجی اور انوشہ مارکیٹ تک گئی ہیں انیکسی میں کوئی نہیں تھا اس لیے میں نے اسے کہا کہ کھانا کھا کر ہی جائے۔ جاؤ وہ انتظار کر رہا ہوگا۔" انہوں نے اشارہ کیا۔

"اس بات کو بھی ڈیپ لی لیجیے گا۔" مدحت نے پیچھے سے آواز دی تھی اور حرمت اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے باہر نکل گئی تھی۔ وہ کچن میں آئی تو دانیال واقعی انتظار کر رہا تھا لیکن شکر تھا کہ وہ اکیلا نہیں تھا اس کے ساتھ احمد بھی بیٹھا ہوا تھا احمد شاید ابھی ابھی آیا تھا' پانی کی بوتل سے پانی انڈیل کر پی رہا تھا اور دانیال اس کے ساتھ محو گفتگو تھا حرمت نظروں کے حصار سے بچ گئی تھی ورنہ وہ دانیال کی چپ اور بولتی آنکھوں سے خائف ہو جاتی تھی۔

☆ ☆ ☆

"بیگم صاحبہ آج کھانے میں کیا بنانا ہے؟" ملازمہ ان کے پیچھے ڈرائنگ روم میں ہی چلی آئی تھی۔

"قیمہ کریلے۔" بتول شاہ کے لہجے میں تحکم تھا۔

"آج اتنے دنوں بعد میرا بیٹا گھر آرہا ہے تو کھانا بھی اسی کی پسند کا ہوگا۔"

"لیکن بیگم صاحبہ وہ قیمہ کریلے؟"

"تم جا کر مسالا تیار کرو قیمہ اور کریلے ابھی آجائیں گے منگوا لیے گا' آتا ہی ہوگا۔" بتول شاہ نے حکم جاری کیا تھا آج وہ اس کی آمد کا سن کر بہت خوش ہوئی تھیں اور کالج بھی نہیں گئی تھیں اس بار وہ کافی دنوں بعد آرہا تھا۔ اور وہ کافی دنوں سے اس کے لیے اداس بھی ہو رہی تھیں لیکن وہ اپنے کاموں میں بزی تھا اسی لیے اسے آنے کا نہیں کہا تھا لیکن آج جب اسے فرصت ملی تو اس نے سب سے پہلے اماں سے ملنے کا ہی سوچا تھا اور فون کر کے انہیں اطلاع بھی دے دی تھی انہوں نے اس کا بیڈ روم از سر نو صاف کروایا اور ملازمہ کو اس کی فیورٹ ڈشز بنانے کا آرڈر بھی دے دیا تھا پورا دن بیٹے کی آمد کی تیاریوں میں ہی گزر گیا تھا شام کے سائے ڈھل رہے تھے جب گیٹ پہ اس کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا وہ تیز قدموں سے راہداری عبور کرتی ہوئی باہر نکل آئی تھیں اتنے میں وہ بھی گاڑی سے اتر آیا تھا۔

"السلام علیکم اماں۔" وہ ان کے سامنے جھک گیا اور بتول شاہ نے اس کی پیشانی پہ بوسہ دیتے ہوئے اسے سینے سے لگا لیا۔

"میری جان' جیتے رہو' خوش رہو۔" وہ اس کے کندھوں اور بالوں پہ ہاتھ پھیر رہی تھیں اور دوبارہ پھر اس کے ماتھے پہ بوسہ دیا تھا۔

"کیسی ہیں آپ؟" وہ ان کے دونوں ہاتھ چوم کر آنکھوں سے لگاتے ہوئے بولا۔

"تمہیں دیکھتی ہوں تو جوان ہو جاتی ہوں' سارے غم بھول جاتی ہوں۔" ان کی آواز ہی نہیں آنکھیں بھی چھلک گئی تھیں اور دل آویز شاہ ان کو اپنے بازو کے گھیرے میں لے کر اندر لے آیا تھا۔

"یہ دن آپ کے اداس ہونے کے دن نہیں ہیں' یہ تو آپ کی خوشی کے دن ہیں' خوش رہا کریں اور اللہ کے رنگ دیکھتی جائیں۔" اس نے ان کو صوفے پہ بٹھاتے ہوئے کہا اور ان کے ہاتھوں کو دباتے ہوئے تسلی دی تھی۔

"میری خوشیوں کے دن تو اسی روز ختم ہوگئے تھے جس روز بابر شاہ کی موت ہوئی تھی۔" بتول شاہ کے لہجے میں دکھ کی ہوک اٹھ رہی تھی دل آویز نے لب بھینچ لیے اور سر جھٹک گیا اس کے جھکے ہوئے سر کو دیکھ کر بتول شاہ کو اپنے آپ کو کنٹرول کرنا پڑا کتنی غلطی کر رہی تھیں وہ' وہ اتنا طویل سفر طے کر کے آیا تھا اور آتے ہی انہوں نے اس کی تھکن میں اضافہ کر دیا تھا' وہ اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

"کہاں جا رہی ہیں؟"

"تمہارے لیے جوس لے آؤں۔"

"ارے نہیں اماں آپ بیٹھیں میں لے لوں گا یا پھر ملازمہ کو آواز دے دیجیے۔" اس نے ان کا ہاتھ پکڑ کر روکنا چاہا۔

"ملازمہ کو کیوں؟ میں خود لے کر آتی ہوں۔" وہ نرمی سے کہہ کر کچن میں چلی گئی تھیں اور چند منٹ کے توقف کے بعد اس کے لیے انار کا جوس لے آئی تھیں۔

"آپ میرے پاس بیٹھیں۔ اور یہ بتائیں کہ آپ اتنی کمزور کیوں لگ رہی ہیں؟"

"میں کمزور لگ رہی ہوں؟" وہ حیرت سے بولیں۔

"لیکن میں تو اپنے آپ کو بالکل فٹ محسوس کر رہی ہوں۔" وہ مسکرانے لگیں۔

"لگتا ہے آپ کالج کو زیادہ ٹائم دے رہی ہیں؟"

"ارے چھوڑو ٹائم کو' تم یہ بتاؤ نبیل اور مدیحہ کیسے ہیں؟" بتول شاہ نے سر جھٹک کر استفسار کیا تھا۔

"وہ بھی فٹ فاٹ ہیں' نبیل آپ کو یاد کر رہا تھا آپ سے ملنا چاہتا تھا۔" اس نے مسکرا کر جواب دیا تھا۔

"ہاں میری بات ہوئی تھی فائزہ بھابھی سے وہ پاکستان آکر بہت خوش ہیں' اللہ کے بڑے شکرانے ادا کر رہی تھیں۔" بتول شاہ نے کل فائزہ بیگم کو باقاعدہ خود فون کیا تھا اور اتنے سالوں بعد وطن واپس آنے پہ مبارک باد دی تھی۔

"ہاں نبیل بھی بہت خوش ہے۔" دل آویز نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اور مدیحہ؟"

"مدیحہ بھی ٹھیک ہے بس پہلی بار پاکستان آئی ہے اس لیے اسے ایڈجسٹ ہوتے ہوئے کچھ عرصہ لگے گا۔" اس نے مدیحہ کی ناخوشی کا جواز دیا۔

"معید اللہ اور اس کی فیملی کیسی ہے؟" وہ دل آویز کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔

"وہ بھی ٹھیک ٹھاک ہیں' معید اللہ سے بھی بات ہوتی رہتی ہے۔" اس نے نارمل سے انداز میں کہتے ہوئے کندھے اچکائے اور جوس کا گلاس منہ سے لگا لیا تھا۔

"زری سے بھی بات ہوتی ہے؟" ان کے اس اچانک اور گہرے سوال پہ دل آویز نے بے ساختہ چونک کر دیکھا تھا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

☆ ☆

نبیلہ عزیز

دردِ دل

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نبیل حیات دونوں بہن بھائی ہیں، مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے، وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پہ رنگ چکی ہے، جس کے پیش نظر فائزہ بیگم، نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں، لیکن مدحیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے، جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے، مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے، مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، بے بسی اور مجبوری سے تنگ آ کر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے، لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے بابا امتیاز مل جاتا ہے، جو اسے کام کی آفر کرتا ہے، جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے، اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے، وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے، وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے، وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے، اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا، اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔

۸

آٹھویں قسط

بتول شاہ اس کی سمت بڑی گہری نظر سے دیکھ رہی تھیں' دل آور نے چند سیکنڈز میں ہی اپنے چہرے کے تاثرات کنٹرول کر لیے تھے۔ تاکہ وہ کوئی بھی نتیجہ اخذ نہ کریں۔

"اتنا مشکل سوال تو نہیں کیا میں نے؟" انہوں نے دل آور کے چہرے پہ فوکس کر رکھا تھا۔ لیکن وہ بھی اس کام میں ماہر تھا' چہرے کے تاثرات چھپانا اور کسی کو نظر کا دھوکا دینا اس کے لیے مشکل تو نہیں تھا۔

"میں نے کب کہا کہ سوال مشکل ہے' میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ آپ کو اچانک زری کا خیال کیسے آیا؟" اس نے بڑی مہارت سے بات کا رخ بدل دیا۔

"اس میں سوچنے کی کیا بات ہے؟ مدحیہ کا خیال آسکتا ہے' نبیل کا آسکتا ہے' عبداللہ کا آسکتا ہے تو پھر زری کا کیوں نہیں آسکتا؟ وہ بھی تو عبداللہ کی فیملی کا حصہ ہے' بہن ہے اس کی؟" وہ بھی اسی کی اماں تھیں چھوٹی موٹی بات سے بہلنے والی نہیں تھیں' دل آور کو مزید سنبھلنا پڑا۔

"دراصل آپ کی زری کے ساتھ زیادہ بات چیت نہیں ہے اس لیے کہہ رہا ہوں۔"

"تمہیں کس نے کہا کہ میری زری کے ساتھ زیادہ بات چیت نہیں ہے؟" وہ دلچسپی سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟ یعنی آپ کی اس سے بات ہوئی ہے؟" دل آور کو واقعی اس کا اندازہ نہیں تھا۔ جب ہی تو حیرانی ہو رہی تھی۔

"ابھی تمہارے آنے سے پہلے ہی ہوئی ہے۔" انہوں نے کندھے اچکا کر بے نیازی سے کہا' دل آور کو یقین نہیں آیا تھا کہ ان کا آپس میں کانٹیکٹ ہے۔

"اچھا! کب سے چل رہا ہے یہ سلسلہ؟"

"کیوں تمہیں برا لگا؟"

"مجھے کیوں برا لگے گا؟" اس نے سر جھٹک کر کہا۔

"تمہارے چہرے سے تو یہی لگ رہا ہے؟"

"میرے چہرے پہ نہ جایا کریں' سراسر دھوکہ دیتا ہے۔"

"میں تمہاری ماں ہوں' تمہارے دھوکے بھی سمجھتی ہوں۔" انہوں نے یقین سے کہا۔

"تو پھر یہ بھی سمجھ لیں کہ مجھے آپ کا اور زری کا کانٹیکٹ کس لحاظ سے برا بلکہ عجیب لگ رہا ہے۔" اس نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے جوس کا گلاس خالی کیا اور ذرا آگے جھکتے ہوئے ٹیبل پہ رکھ دیا تھا۔

"کیا تمہیں زری پسند نہیں ہے؟" ان کا یہ سوال واقعی مشکل تھا۔ لیکن جواب تو دینا ہی تھا' چپ رہتا تو وہ اقرار سمجھتیں۔

"پسند' ناپسند کا قصہ ابھی رہنے دیں۔"

"کیوں رہنے دوں؟"

"بس ابھی دل سے اس کی پسند اور ناپسند پوچھی ہی نہیں۔" اس کا انداز ہنوز سنجیدہ ہی تھا۔

"تو پوچھو نا۔"

"نہیں اماں! ابھی پوچھنے کا وقت نہیں ہے۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"کب آئے گا وقت؟"

"جب میں آپ کی نظروں میں سرخرو ہو جاؤں گا۔" اس نے برملا کہا تھا اور بتول شاہ اسے دیکھتی رہ گئیں' اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ لیکن آنکھوں میں قیامت ہلکورے لے رہی تھی' ان کا کلیجہ دہل گیا۔ وہ اس قیامت کو

روکنا بھی چاہتیں تو نہیں روک سکتی تھیں' اب سب کچھ اختیار سے باہر تھا۔

"آپ بیٹھیں' میں ذرا فریش ہو کر آتا ہوں۔" وہ ان کی چپ سے دامن بچا کر کھڑا ہو گیا اور بتول شاہ اسے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دیکھتی رہیں۔

"کھانا لگا دوں بیگم صاحبہ؟" ملازمہ کی آواز پہ وہ چونک کر متوجہ ہوئیں اور اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"بھائی۔"

"ہوں۔؟"

"آپ سے اجازت لینا تھی۔" اس نے دھیمے سے کہا' عدیل چونک گیا' وہ نہا کر اپنے کام پہ جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا' جب مریم اس کے پیچھے کمرے میں چلی آئی۔

"کیسی اجازت؟"

"وہ کل فاطمہ کی برتھ ڈے ہے' اس نے فون کر کے انوائیٹ کیا تھا' میں نے جانے کے لیے ہامی تو نہیں بھری' لیکن وہ بہت اصرار کر رہی تھی۔" مریم نے آہستگی سے بتایا۔

"تو اس میں اتنا ڈرنے والی کیا بات ہے؟" عدیل کو حیرانی ہوئی۔

"آپ سے اجازت لینا تھی کہ کیا میں کل اس کے گھر جا سکتی ہوں؟"

"ہوں! لیکن ان کا فنکشن تو رات میں ہو گا؟" عدیل نے کچھ خیال آنے پہ پوچھا۔

"جی۔!" مریم نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تو پھر کیسے جاؤ گی تم؟ آنے جانے میں مسئلہ ہو گا؟"

"وہ گاڑی بھیج دے گی۔"

"وہ گاڑی بھیج تو دے گی' لیکن تم رات کے وقت ڈرائیور کے ساتھ اکیلی تو نہیں آجا سکتیں؟" عدیل کو اس کے جانے کی نہیں بلکہ پک اینڈ ڈراپ کی فکر ہو رہی تھی۔

"تو پھر کس کو ساتھ لے کر جاؤں؟" مریم کو پریشانی ہو رہی تھی۔

"میں تمہیں چھوڑ آؤں گا۔" اس نے مریم کو تسلی دی۔

"آپ؟ لیکن آپ کیسے چھوڑ کے آسکتے ہیں؟ آپ تو شام کو تھکے ہارے آتے ہیں' مجھے چھوڑنے کیسے جائیں گے؟ آپ کے ساتھ تو خود ٹرانسپورٹ کا مسئلہ ہے۔"

"تم میرے مسئلے کو چھوڑو' اپنی فکر کرو' تم نے کل فاطمہ کے گھر جانا ہے تو بس فکر چھوڑ دو۔" وہ مریم کو ڈراپ کرنے کے لیے طریقہ سوچ رہا تھا اور اس کی سوچ کی سوئی سلو کی موٹر سائیکل پہ جا کر ٹھہر گئی تھی۔ وہ اگر تھوڑی دیر کے لیے سلو سے موٹر سائیکل مانگ لیتا تو یقیناً وہ انکار نہ کرتا اور اس طرح مریم آسانی سے جا بھی سکتی تھی اور آ بھی سکتی تھی۔

"لیکن بھائی۔" اس نے کچھ کہنا چاہا۔

"لیکن ویکن چھوڑو اور کل جانے کی تیاری کر لو۔" اس نے بالوں میں کنگھا پھیرتے ہوئے کہا اور مریم سر ہلا کر پلٹ گئی۔

"سنو۔" اس نے آواز دی۔

"جی؟" وہ ٹھہر گئی۔

"مگر اس کی برتھ ڈے پہ جانا ہے تو کچھ لے کر بھی تو جانا ہے؟" جو پریشانی مریم کو جانے کا سن کر ہوئی تھی وہ ہی پریشانی عدیل کو بھی ہوئی تھی۔

"جی یہ تو ہے۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تو کیا لے کر جاؤ گی؟" اس کے سوال پہ مریم نے چہرہ جھکا لیا تھا۔

"کیا بات ہے؟ چپ کیوں ہو گئیں؟" عدیل اب پوری طرح سے اس کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔

"وہ دراصل اور کوئی گفٹ نہیں تھا دینے کے لیے' اتنے دنوں سے امی کا سلائی کا کام بھی ڈاؤن جا رہا ہے' اس لیے میں نے سوچا کہ آپ کل جو سوٹ لائے تھے وہ میں فاطمہ کو گفٹ کروں گی' اتنا پیارا سوٹ ہے' اسے پسند آئے گا۔" مریم نے ڈرتے ڈرتے کہا تھا اور عدیل چپ ہو گیا۔

"کیا بات ہے آپ کو برا لگا؟" مریم پریشانی سے پوچھ رہی تھی' آخر وہ اتنی محبت اور اتنے شوق سے لے کر آیا تھا۔

"ظاہر ہے برا تو لگے گا۔"

"لیکن بھائی وقت بھی تو گزارنا ہے' گھر کے حالات ایسے نہیں ہیں کہ ہم اپنے فرینڈز کے لیے کوئی اچھا گفٹ خرید سکیں' یہ تو آپ اتفاقاً" میرے لیے سوٹ لے آئے ہیں اور میں نے گفٹ دینے کا سوچ لیا' ورنہ یہ بھی نہ ہوتا تو میں کبھی جانے کا سوچتی بھی نہیں۔" اس نے عدیل کو وجہ بتائی۔

"آپ کو یاد ہو گا کہ پچھلی بار بھی میں نے اسے وش نہیں کیا تھا اور وہ ہمارے گھر آ کر کتنا خفا ہوئی تھی' اس بار بھی میں نے گفٹ نہ ہونے کی وجہ سے اسے وش نہیں کیا تھا۔ اور بہانا کر دیا کہ مجھے یاد نہیں رہا تھا۔" مریم اسے ساری صورت حال سے آگاہ کر رہی تھی۔

"لیکن پھر بھی اگر آپ کو برا لگ رہا ہے تو میں اسے منع کر دیتی ہوں کہ میں نہیں آ سکتی' کیونکہ گفٹ کے بغیر خالی ہاتھ جانا بھی تو مناسب نہیں ہے۔" مریم نے سعادت مندی سے کہا کہ اگر اسے پسند ہے تو ٹھیک' اگر نہیں تو وہ اپنا جانا کینسل کر دے گی۔ عدیل نے نظر اٹھا کے اس کے چہرے کی سمت دیکھا اور پھر آگے بڑھ کے اس کے سر پہ ہاتھ رکھ دیا تھا۔

"میں تمہارا بھائی ابھی زندہ ہوں نا؟ ایک تو کیا دس' دس سوٹ لا کر دوں گا' تم اگر اپنی دوست کو گفٹ دے کر خوش ہو تو میں تمہاری خوشی میں خوش ہوں۔ یہ سوٹ میں نے تمہاری خوشی کے لیے لیا ہے' لیکن اگر تمہاری خوشی کسی اور طرح سے حاصل ہوتی ہے تو یوں ہی سہی۔" اس نے مریم کا سر تھپکتے ہوئے کہا تھا اور مریم کے چہرے پہ مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

"تھینک یو بھائی' تھینک یو سو مچ۔" اس کے سر سے بوجھ ہٹ گیا تھا۔

"مینشن ناٹ ڈیئر۔" جواباً" وہ بھی مسکرا دیا تھا۔

"تو پھر میں کل کے لیے تیاری کر لوں؟"

"بالکل کر لو' لیکن اتنا بتا دو کہ آج ناشتا ملے گا یا نہیں؟" عدیل نے دلچسپی سے کہا۔

"اوہ سوری بھائی' میں بس پانچ منٹ میں آپ کا ناشتا لگا رہی ہوں' آپ فوراً" آ جائیے۔" وہ کہہ کے جلدی سے باہر نکل گئی اور عدیل بھی مسکراتا ہوا باہر آ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ بے زاری سے بیٹھا میگزین الٹ پلٹ کر رہا تھا' جب اچانک ڈاکٹرز خیرو بابا کے چیک اپ کے لیے اندر آ گئے

اور آذر کی ہدایت کے مطابق وہ فوراً" الرٹ ہو گیا تھا۔

"السلام علیکم۔" اس نے سلام کیا تھا۔ ڈاکٹرز اس کے سلام کا جواب دے کر خیرو بابا کے چیک اپ میں مصروف ہو گئے تھے۔ ان کے زخم کا تفصیلی معائنہ کرنے کے بعد انہوں نے چند دوائیاں تجویز کیں اور انہیں ڈسچارج کرنے کا کہہ دیا۔

"اب کیسی طبیعت ہے ان کی؟" جودت ڈاکٹرز کو آپس میں باتیں کرتے دیکھ کر قریب آ گیا تھا۔

"آج ان کو ڈسچارج کر دیا گیا ہے' آپ انہیں گھر لے جا سکتے ہیں۔" ڈاکٹر نے اسے خوشی کی خبر سنائی تھی۔

"رئیلی ڈاکٹر؟"

"آف کورس۔" ڈاکٹر نے کندھے اچکائے۔

"تھینک یو ڈاکٹر۔" جودت نے بڑی گرمجوشی سے ڈاکٹر سے ہاتھ ملایا تھا۔

"مسٹر آذر آفندی کہاں ہیں؟" ڈاکٹر کی آذر کے ساتھ واقفیت تھی' اس لیے اسی کا پوچھا تھا۔

"جی وہ کسی کام کے سلسلے میں کراچی گئے ہیں' کل تک آ جائیں گے۔" جودت کا دل اندر ہی اندر قلابازیاں کھا رہا تھا کہ وہ اس اسپتال کی قید سے آزاد ہو گیا تھا۔ صبح سے بیٹھے بیٹھے کمر اکڑ گئی تھی اور بوریت الگ سے۔

"ٹھیک ہے' آپ انہیں بتا دیجیے گا۔" ڈاکٹرز کہہ کر اپنے راؤنڈ پہ چلے گئے اور جودت خیرو بابا کو گھر لے جانے کا سوچنے لگا' لیکن وہ اکیلا انہیں لے کر نہیں جا سکتا تھا۔ لہٰذا کسی دوسرے کی مدد ضروری تھی اور آذر کے بعد پہلا خیال دانیال کے سوا اور بھلا کس کا آ سکتا تھا؟ اس نے اپنا سیل نکالا اور دانیال کا نمبر ڈائل کر لیا۔

"السلام علیکم۔" دانیال کی آواز خاصی مصروف تھی۔

"وعلیکم السلام' دانیال بھائی میں جودت بات کر رہا ہوں۔"

"جودت؟"

"جی اسپتال سے بات کر رہا ہوں۔" اس کی اطلاع پہ دانیال چونک گیا تھا۔

"ہاں' کہو؟"

"وہ خیرو بابا کو ڈاکٹرز نے ڈسچارج کر دیا ہے' ان کو حویلی لے کر جانا ہے' لیکن میں یہاں اکیلا ہوں۔" اس نے مسئلہ بیان کیا۔

"ڈونٹ وری یار' تم ویٹ کرو' میں آ رہا ہوں۔" دانیال نے عجلت میں کہتے ہوئے فون بند کر دیا تھا اور اگلے پندرہ منٹ میں وہ اس کے پاس اسپتال میں موجود تھا۔ اس نے آ کر تمام بلز کلیئر کیے۔ پھر دونوں مل کر انہیں سہارا دے کر گاڑی تک لائے' وہ کافی بہتر ہو چکے تھے۔ آہستہ قدموں سے چل پھر سکتے تھے' اسی لیے کوئی وہیل چیئر یا پھر اسٹریچر استعمال نہیں کیا تھا۔ دانیال کی گاڑی ڈرائیور واپس لے گیا تھا۔ اس لیے جودت کی گاڑی میں ہی خیرو بابا کو لے کر وہ گھر پہنچے تھے اور گھر میں خیرو بابا کی واپسی کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلی تھی' جتنی خوشی وقار آفندی اور آسیہ آفندی کو ہوئی تھی' اتنی شاید خود خیرو بابا کو بھی نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے گھر کے فرد کی طرح ان کی آؤ بھگت کی تھی' یہ احساس ہی نہیں ہو رہا تھا کہ وہ ان کے ملازم اور معمولی سے ڈرائیور ہیں۔

☆ ☆ ☆

وہ یونیورسٹی کے لان میں بیٹھی اپنے اگلے پیپر کی تیاری کر رہی تھی' جب اسے اپنی کتاب پہ کسی کا سایہ ہلتا ہوا محسوس ہوا اس نے چونک کر دیکھا سامنے وہ ہی سنہری بالوں اور سنہری آنکھوں والا لڑکا کھڑا تھا جو اس روز سب فرینڈز کے ساتھ مدیحہ کو ایئرپورٹ سی آف کرنے آیا تھا۔ زری کو اس کے نام کا پتا تھا' لیکن فی الحال یاد نہیں آ رہا

تھا کہ اس کا نام کیا ہے؟ اور شاید وہ بھی زری کی الجھن بھانپ گیا تھا۔

"میں جبزی ہوں' میڈی کا دوست۔" اس نے مدحیہ کے حوالے سے ہی اپنا تعارف کروایا تھا۔

"جی کہیے؟"

"میڈی پاکستان میں ٹھیک تو ہے نا؟"

"کیا مطلب ہے آپ کا؟"

"مطلب یہ کہ ہم سب فرینڈز کو میڈی کے حوالے سے بہت پریشانی ہو رہی ہے' وہ ہم سے کانٹیکٹ کرنے کا وعدہ کر کے گئی تھی' لیکن اس نے ابھی تک کوئی کانٹیکٹ نہیں کیا؟" جبزی' مدحیہ کے لیے حد سے زیادہ متفکر ہو رہا تھا۔

"تو اس میں اتنی پریشانی والی کیا بات ہے؟ کانٹیکٹ تو اس نے مجھ سے بھی نہیں کیا۔" زری نے بھنویں اچکائیں۔

"پریشانی والی بات کیوں نہیں ہے؟ پاکستانی لوگ اکثر لڑکیوں کو پاکستان لے کر جاتے ہیں تو ان پہ بہت زیادہ تشدد کرتے ہیں' انہیں پاکستان میں رہنے پہ مجبور کرتے ہیں' ہو سکتا ہے کہ میڈی کے ساتھ ابھی ایسا ہی ہو؟" جبزی نے اپنی سوچ کا برملا اظہار کیا تھا' جس پہ زری کے ماتھے پہ بل پڑ گئے تھے اور وہ کتابیں سمیٹ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

"جسٹ فار یور کائنڈ انفارمیشن مسٹر جبزی' مدحیہ اپنی مرضی سے پاکستان گئی ہے' اگر اسے زبردستی پاکستان لے کر جانا ہوتا تو آج سے دو سال پہلے لے جاتے' اس کی مرضی کا انتظار نہ کرتے' وہ پاکستان میں بالکل ٹھیک ٹھاک اور خوش باش ہے' آپ کو اس کے لیے فکر پالنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور آپ کے دماغ میں پاکستان کے خلاف جو زہر بھرا ہے' پلیز وہ دور کر لیجیے' پاکستان ایسا بھی برا نہیں جیسا آپ نے بنا لیا ہے' اگر پاکستان میں بیٹیوں پہ ایسا ہی تشدد ہو رہا ہوتا تو میں اس وقت آپ کے سامنے نہ ہوتی جو پاکستان کے ایک گاؤں سے یہاں پڑھنے کے لیے آئی ہوں۔" اس نے جبزی کی اچھی خاصی کلاس لے ڈالی تھی۔

"ایم سوری' میرا مقصد آپ کو اموشنل کرنا نہیں تھا۔" جبزی نے سر جھکاتے ہوئے معذرت کی۔

"لیکن میرا مقصد آپ کو سمجھانا تھا' یقیناً" آپ سمجھ گئے ہوں گے۔" ہمیشہ کول کول رہنے والی زری اس وقت کافی تپی ہوئی لگ رہی تھی اور جبزی خاصا محتاط ہو گیا تھا۔

"او کے آئی انڈر اسٹینڈ۔" اس نے سر ہلایا۔

"انی وے میں مدحیہ کو آپ کا میسیج دوں گی۔ ابھی اس کے پاس اپنا سیل نمبر نہیں ہے' جب ہو گا تو آپ سے کانٹیکٹ کر لے گی۔" زری نے اپنا غصہ کنٹرول کرتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

"کیا اس — کا لینڈ لائن نمبر مل سکتا ہے؟" جبزی کو کچھ زیادہ ہی بے چینی ہو رہی تھی۔

"مل سکتا ہے' ضرور مل سکتا ہے' لیکن اگر مدحیہ اجازت دے تو۔" زری نے سر ہلایا۔

"اجازت؟" اسے سمجھ نہ آیا۔

"جی مدحیہ سے پوچھے بغیر میں اس کا نمبر آپ کو نہیں دے سکتی۔" اس نے کندھے اچکائے۔

"او کے تو آپ اس سے پوچھ لیجیے۔"

"میں آپ کو کل بتادوں گی' یا پھر مدحیہ آپ سے کانٹیکٹ کر لے گی۔"

"تھینک یو میم۔" جبزی خوش ہو گیا تھا اور زری سر ہلا کر لائبریری کی سمت بڑھ گئی۔ وہ کتابیں ایشو کروا کے وہ واپسی کے لیے یونیورسٹی کے احاطے سے باہر نکل آئی تھی۔ عبداللہ اسے پک کرنے کے لیے پہنچ چکا تھا۔

"السلام علیکم بھائی۔" وہ ڈور کھول کر فرنٹ سیٹ پہ بیٹھ گئی تھی۔

"وعلیکم السلام! پیپر کیسا رہا؟" وہ گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"ظاہر ہے' مجھ سے پوچھیں گے تو میں اچھا ہی کہوں گی۔" وہ ذرا سا مسکرا کے بولی۔

"اور ظاہر ہے کہ پیپر تمہارا ہے تو تم ہی سے پوچھیں گے نا؟" عبداللہ بھی مسکرا کے بولا۔

"ہاں یہ بات بھی سوچنے کی ہے۔" زری ہنس پڑی۔

"نگارش بھابھی چلی گئیں؟"

"ہاں ابھی تھوڑی دیر پہلے اسے ہی ڈراپ کر کے آیا ہوں' میرا پورا دن تو تم لوگوں کی ڈرائیوری میں گزر جاتا ہے' کام میں نے کیا خاک کرنا ہے؟" عبداللہ مصنوعی خفگی سے جھنجلا کر بولا تھا۔ زری اپنی مسکراہٹ دبا گئی۔

"آپ ہماری اتنی کیئر کرتے ہیں' اللہ آپ کو ڈھیر ساری خوشیاں اور کامیابی عطا کرے گا۔ ان شاء اللہ اوپر والا آپ کو اجر دے گا' میرا کیریئر بنانے میں آپ کا بہت بڑا ہاتھ ہے' ورنہ میں بھی آج باقی لڑکیوں کی طرح میٹرک پاس کر کے گاؤں کی حویلی کے ایک کونے میں پڑی ہوتی' آپ کا احسان تو میری پوری زندگی پہ محیط ہے۔" زری کہتے کہتے سنجیدہ ہو گئی تھی۔

"ارے پاگل اس میں احسان کہاں سے آگیا؟" عبداللہ نے اسے منع کرتے ہوئے سر جھٹکا۔

"احسان ہی تو ہے آپ نے میری خاطر سب سے ناراضی مول لے لی' بھلا کون راضی تھا میرے یہاں آنے پر؟ بابا جان تو تعلیم کے خلاف تھے کجا کہ ہائر اسٹڈی کے لیے کسی دوسرے ملک جانا؟ تصور ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن آپ نے اس ناممکن کو ممکن بنا دیا' آج گاؤں کی لڑکیوں کے لیے اور حویلی کی لڑکیوں کے لیے میں ایک مثال ہوں کہ کوئی آگے بھی بڑھ سکتا ہے' بس ہمت کرنے کی دیر ہے۔" زری سنجیدگی سے بول رہی تھی۔

"ہاں یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو' تعلیم ایک زیور ہے اور اس زیور کے لیے سب کو لڑنا چاہیے' اس زیور کا حصول سب کے لیے ضروری ہے' چاہے وہ گاؤں کی لڑکی ہو یا شہری۔" عبداللہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"لیکن بھائی اس زیور کے حصول کے لیے آپ جیسے بھائیوں کی بھی اشد ضرورت ہے ہمارے معاشرے کو' جو اپنی بہنوں کی تعلیم کے رستے میں رکاوٹ نہ بنیں' بلکہ ان کے لیے ڈھال ثابت ہوں' کاش مشرقی مردوں کی سوچ آپ جیسی ہو جائے۔" زری نے حسرت سے کہا تھا اور عبداللہ مسکرا دیا۔ وہ دونوں گھر پہنچ چکے تھے' نگارش آج اپنے میکے گئی ہوئی تھی۔

✡ ✡ ✡

دل آور شاہ واپس لاہور جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا' جب بتول شاہ اس کے بیڈ روم کا دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوئیں۔

"جا رہے ہو؟" ان کے لہجے میں کیا کچھ تھا' دل آور بخوبی سمجھتا تھا۔

"نہ جاؤں؟" اس نے پلٹ کر ان کو بغور دیکھا' لیکن ان کے چہرے کے تاثرات یک دم بدل گئے تھے۔ وہ اور سے اور ہو گئی تھیں' ان کے چہرے پہ سرد برف کے سوا اب کچھ بھی نہیں تھا۔

"میں نے کب کہا کہ تم نہ جاؤ؟" اب کی بار لہجہ بھی کچھ اور تھا۔

"تو پھر میری کامیابی کی دعا کے ہمراہ مجھے رخصت کیجیے۔"

"خیر سے جاؤ اور خیر سے آؤ' تمہاری کامیابی کے انتظار میں ہی تو اپنی آنکھیں پتھر کر لی ہیں' اب پتا نہیں یہ آنکھیں پتھر سے دوبارہ آنکھیں کب بنیں گی؟" ان کا لب و لہجہ عجیب سا ہو رہا تھا' ان کے اندر کا درد ان کی آواز میں گھل رہا تھا اور اذیت کی لہر دل آور شاہ کی رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی۔

"آپ کی آنکھوں کو آنکھیں بنانے کے لیے میں پوری دنیا کو پتھر کردوں گا' یہ میرا وعدہ ہے آپ سے۔" اس نے بتول شاہ کو کندھوں سے تھام کے اپنی گرفت کی مضبوطی کا احساس دلایا تھا۔

"تمہارے وعدوں پہ نہیں' تمہاری آس پہ جی رہی ہوں میری جان' اللہ تمہیں لمبی زندگی عطا کرے۔" انہوں نے دل آور کی پیشانی چوم لی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ناشتے سے فارغ ہو کر وہ جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

"اب میں اسلام آباد نہیں آؤں گا' بلکہ اب آپ لاہور آئیں گی' اپنی تیاری رکھیے گا۔"

"ان شاء اللہ ضرور آؤں گی۔"

"او کے اللہ حافظ۔" وہ ان سے مل کر گاڑی میں آبیٹھا اور پھر ان کو ہاتھ ہلا کر گاڑی نکال لے گیا۔ اس نے نبیل کے ساتھ وعدہ کر رکھا تھا کہ وہ کل واپس آکر اس کے مسائل حل کردے گا' اس لیے وہ آج اسلام آباد سے جلدی نکل آیا تھا۔ لیکن ابھی اسلام آباد کی حدود سے نکل ہی رہا تھا کہ کسی نے ہاتھ کے اشارے سے سامنے آتے ہوئے گاڑی روک دی' اسے بریک لگانے پڑے۔

"انسپکٹر شہناز آپ؟" وہ حیرانی سے کہتا ہوا گاڑی کا دروازہ کھول کے نیچے اتر آیا۔ انسپکٹر شہناز سڑک کے کنارے کھڑی ہیلپ مانگ رہی تھی۔

"دراصل میری گاڑی خراب ہو گئی ہے' میں لاہور جا رہی تھی' آدھا گھنٹہ ہو گیا ہے ڈرائیور کو مکینک کے پاس بھیجے' لیکن ابھی تک نہیں آیا۔" وہ چہرے سے پریشان لگ رہی تھی۔

"کیا خرابی ہو گئی ہے گاڑی میں؟"

"پتا نہیں' انجن بند ہو گیا ہے۔"

"چیک کیا ہے؟"

"ہاں ڈرائیور سارا انجن چیک کر کے گیا ہے' مکینک کے بغیر ٹھیک ہونے والی نہیں ہے اور میں پریشان ہو رہی ہوں' مجھے ذرا جلدی لاہور پہنچنا تھا۔" انسپکٹر شہناز نے ہاتھ میں پکڑے موبائل سے ٹائم دیکھ کر کہا۔

"چلیے پھر آپ کی پریشانی حل کیے دیتے ہیں' آیئے میرے ساتھ چلیے۔" دل آور نے اسے آفر کی۔

"لیکن شاہ جی۔" انسپکٹر شہناز کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"کیوں کوئی ڈر ہے؟" دل آور نے معنی خیزی سے کہا۔

"ڈر ہونا بھی چاہیے' مرد کا کیا بھروسہ؟" وہ بھی جواباً" مسکراتے ہوئے معنی خیزی سے بولی۔

"خیر بھروسے کی تو آپ بات نہ ہی کریں تو بہتر ہے' بھروسہ تو عورت کا بھی نہیں ہے۔" اس نے سر جھٹکا۔

"کیوں شاہ جی کون کم بخت دھوکہ کر گئی آپ کے ساتھ؟"

"دل آور شاہ کو دھوکہ دینے والی ابھی کوئی پیدا ہی نہیں ہوئی۔" دل آور شاہ نے ہنس کر کہا تھا۔

"اور جو پیدا ہوئی ہیں' انہیں آپ نے نظر عنایت ہی نہیں بخشی۔"

"کوئی سراپا التجا بھی تو نہیں ہوا ابھی تک؟" وہ بے نیازی سے کہہ رہا تھا۔

"کبھی کبھی مجھے لگتا ہے شاہ جی آپ بہت بے رحم ہیں۔" انسپکٹر شہناز کا لہجہ عجیب سا ہو گیا تھا اور دل آور شاہ یکدم فلک شگاف قہقہہ لگا کے ہنسا تھا۔

"کبھی کبھی کیوں لگتا ہے؟ یہ تو اکثر لگنا چاہیے۔" وہ اس کی بات سے محظوظ ہو رہا تھا۔

"اکثر تو آپ اچھے ہی لگتے ہیں' بس کبھی کبھی اچھی رائے بدل جاتی ہے اور لگتا ہے کہ آپ۔۔"

"آپ بہت برے ہیں۔" دل آور نے انسپکٹر شہناز کا ادھورا جملہ مکمل کیا تھا۔

”اب میں آپ کو برا بھی تو نہیں کہہ سکتی شاہ جی۔“ انسپکٹر شہناز کا انداز خاصا دوستانہ سا تھا۔

”واہ کیا پالیسی ہے؟ بے رحم کہہ لیا‘ لیکن برا نہیں کہہ سکتیں‘ آپ پولیس والوں سے بھی اللہ ہی پناہ دے آپ کے بھی اپنے ہی قانون ہوتے ہیں۔“ وہ ابھی تک اس کی بات انجوائے کر رہا تھا۔

”اصل قانون دان تو آپ ہیں شاہ جی ہماری غلطیوں کو بھی میگنٹ کی طرح پکڑ لیتے ہیں۔“ انسپکٹر شہناز ہنسی تھی۔

”سلام میڈم! مکینک کو لے آیا ہوں۔“ اس کے عقب سے ڈرائیور کی آواز سنائی دی۔ جب تک مکینک نے اس کی گاڑی چیک نہ کی ڈرائیور کے ساتھ دل آور بھی وہیں کھڑا رہا۔

”میڈم ایک گھنٹہ لگ جائے گا گاڑی ٹھیک ہونے میں۔“ مکینک نے اسے اطلاع دی۔

”اوہ نو۔“ انسپکٹر شہناز نے سر جھٹکا۔

”آپ کا آج کا سفر میرے ساتھ لکھا ہے میڈم۔“ دل آور نے اپنی گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

”دیکھ لیجیے گا شاہ جی میں آج پولیس والی نہیں ہوں۔“ انسپکٹر شہناز نے اس کی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا‘ وہ اپنی گاڑی ڈرائیور کے حوالے کر آئی تھی۔

”رعب تو اب بھی ہے نا۔“ وہ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔

”اب کیا پتا کہ آپ کا رعب مجھ پہ ہے یا میرا رعب آپ پہ۔“ وہ ہنسی۔

”نہیں میڈم آپ کا ہی رعب ہے اور آج تو کچھ زیادہ ہی اچھی لگ رہی ہیں۔“ اس نے انسپکٹر شہناز کو سراپا دیکھتے ہوئے تعریف کی تھی‘ وہ خوب صورت تو تھی ہی‘ لیکن آج رائل بلیو کلر کی بارڈر والی ساڑھی اور شولڈر کٹ بالوں کے ساتھ کچھ زیادہ ہی گڈ لکنگ لگ رہی تھی۔ ورنہ اکثر وہ یونیفارم میں ہی نظر آتی تھی۔

”تھینک یو۔“ وہ مسکرا رہی تھی۔

”ویسے آپ آج اسلام آباد میں کیا کر رہی تھیں؟“

”میری کزن کی شادی تھی‘ میں دو روز سے اسلام آباد آئی ہوئی تھی‘ آج واپس جا رہی ہوں۔“

”تو ہمیں ہی شادی میں انوائیٹ کر لیتیں۔“ اس نے افسوس سے کہا۔

”مجھے کیا پتا تھا کہ آپ بھی اسلام آباد کو رونق بخشے ہوئے ہیں؟“

”خیر آئندہ کسی کزن کی شادی ہو تو یاد رکھیے گا۔“ دل آور خاصا موڈ میں تھا۔ انسپکٹر شہناز کو حیرانی ہو رہی تھی۔

”یہ آپ ہی ہیں نا شاہ جی؟“ اس نے اپنی حیرانی کا اظہار بھی کر دیا تھا۔

”کیوں میڈم آپ کو کوئی ڈاؤٹ ہے؟“ دل آور نے دلچسپی سے انسپکٹر شہناز کا چہرہ دیکھا۔

”ڈاؤٹ تو نہیں‘ لیکن آپ کو کبھی اتنے خوش گوار موڈ میں دیکھا بھی تو نہیں ہے۔“

”آج کل میرا بہت قریبی دوست پاکستان آیا ہوا ہے‘ شاید اسی کی ملاقات کا جشن منا رہا ہوں۔“

”او... یعنی آپ ”جشن بہاراں“ منا رہے ہیں؟“

”جشن بہاراں نہیں ”جشن یاراں“ منا رہا ہوں میڈم۔“ اس نے خوش گواریت سے جواب دیا۔

”کیا میں آپ کے اس دوست سے مل سکتی ہوں؟“ انسپکٹر شہناز نے کافی ایکسائٹمنٹ کا اظہار کیا تھا۔

”کیوں؟“

”اس خوش نصیب کی خوش نصیبی پہ رشک کرنا چاہتی ہوں۔“

”وہ آپ جیسی چیزوں سے دور بھاگتا ہے‘ پرہیز کرتا ہے‘ بہت سادہ دل انسان ہے۔“ دل آور نے نبیل کی تعریف میں کہا۔

”آپ کا دوست سادہ دل؟“ اس نے اچنبھے سے کہا۔

”آپ نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے میڈم؟“ دل آور کے سوال پہ انسپکٹر شہناز قہقہہ لگا کے ہنسی تھیں اور جواباً اس نے بھی مسکراتے ہوئے اسپیڈ بڑھا دی تھی۔

☆ ☆ ☆

”علیزے...!“

”جی پاپا؟“ وہ سیڑھیاں اتر رہی تھی‘ جب وقار آفندی کی آواز پہ قدم تھم گئے تھے۔

”کہاں جا رہی تھیں؟“

”بس ایسے ہی عائشہ پھوپھو کی طرف۔“ اس نے کندھے اچکائے۔ وقار آفندی سیڑھیاں اترتے ہوئے اس کے برابر آ گئے اور اس کے کندھے کے گرد بازو پھیلاتے ہوئے اسے اپنے ساتھ ڈرائنگ روم میں لے آئے۔

”بیٹھو۔“ خود بیٹھے تو اسے بھی ساتھ بٹھا لیا تھا۔

”خیریت پاپا؟“

”ہاں بیٹا جانی سب خیریت ہے‘ وہ دراصل ہم نے تمہیں اطلاع دینی تھی کہ ہم نے تمہارے لیے ڈرائیور رکھ لیا ہے اور ان شاء اللہ آج آذر واپس آ گیا تو تمہاری گاڑی کا انتظام بھی ہو جائے گا‘ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ انہوں نے علیزے کو پاس بٹھا کر اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا تھا‘ علیزے کی جان میں ان کی جان تھی‘ اس کی پریشانی ان کا خون خشک کر دیتی تھی۔ ان کے دو بیٹے ان کے لیے اتنی اہمیت نہیں رکھتے تھے‘ جتنی علیزے اہمیت رکھتی تھی انہوں نے اپنی پوری عمر کی محبت صرف علیزے پہ لٹائی تھی‘ کبھی کبھی تو آسیہ آفندی ان کی اس قدر محبت پہ حیران پریشان رہ جاتی تھیں اور ان کی حیرانی اور پریشانی کی وجہ علیزے کی آئندہ کی زندگی کا خیال ہوتا تھا‘ انہیں پتا تھا کہ باپ اتنی محبت دے گا تو وہ شوہر میں بھی اتنی ہی محبت تلاش کرے گی اور اگر ذرا سی بھی کمی بیشی ہوئی تو زندگی بھر کے لیے مسئلہ بن جائے گا اور اس چیز کا اظہار انہوں نے ایک بار وقار آفندی سے بھی کیا تھا جس پہ جواباً وہ مسکرا دیے تھے۔

”ہم اس کی شادی ہی اس سے کریں گے جو ہم سے بھی زیادہ محبت دے گا اسے۔“ ان کا لہجہ بھی مسکرا رہا تھا۔

”آپ جیسی محبت کون کر سکتا ہے اس سے؟“ آسیہ آفندی کو یقین نہیں تھا۔

”وقت آنے پہ پتا چلے گا تمہیں۔“ انہوں نے بیوی کو تسلی دی۔

”آپ کی محبت کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا وقار‘ کبھی کبھی مجھے احساس ہوتا ہے میں علیزے کی ماں ہوں‘ لیکن مجھ سے بھی زیادہ آپ اس سے محبت کرتے ہیں میری محبت بھی آپ کی محبت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔“ آسیہ آفندی سنجیدگی سے کہہ رہی تھیں اور اس وقت بھی وہ ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے میں کھڑی باپ اور بیٹی کا محبت بھرا انداز دیکھ رہی تھیں یوں ہی باپ سے باتیں کرتے کرتے علیزے کی نظریں ان کی طرف اٹھی۔

”ارے مام آپ وہاں کیوں کھڑی ہیں؟“ اس کی آواز پہ وقار آفندی نے بھی آسیہ آفندی کو دیکھا تھا۔

”آپ دونوں کو دیکھ رہی تھی۔“ وہ اندر آ گئیں۔

”اس طرح چھپ چھپ کے تو آپ نے جوانی میں بھی نہیں دیکھا ہمیں۔“ وقار آفندی مسکرائے علیزے بھی ہنس پڑی تھی۔

”آپ نے جوانی میں کبھی دیکھنے کا موقع ہی نہیں دیا‘ ہمیشہ کاروبار کی فکروں میں ہی رہتے تھے‘ یہ تو اللہ تعالیٰ کا شکر ہے‘ جس نے مجھے مصروفیت کے لیے تین عدد بچے دے دیے‘ ورنہ میں تو اب بھی بیٹھی آپ کا آفس سے

واپسی کا انتظار ہی کرتی رہتی۔" آسیہ آفندی نے مصنوعی خفگی کا اظہار کیا تھا۔

"تو گویا آپ کی بات کا یہ مطلب ہوا کہ اب آپ کو ہماری آفس سے واپسی کا کوئی انتظار نہیں ہوتا؟" وقار آفندی کافی اہم نقطہ اٹھا کے لائے تھے۔ آسیہ آفندی جز بز سی ہو گئیں۔ علیزے اپنے پیرنٹس کی ایسی دلچسپ بحث و تکرار سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

"بتایئے نا بیگم صاحبہ اب ہماری کوئی قدر نہیں ہے آپ کی نظر میں؟" انہوں نے آسیہ فندی کو بولنے پہ اکسایا تھا اور وہ بے ساختہ مسکراتے ہوئے وقار آفندی کے پہلو میں بیٹھ گئیں۔

"آپ کی قدر یا تو آسیہ کا دل جانتا ہے یا آسیہ کا خدا۔" انہوں نے کتنی نرمی سے کتنی گہری بات کہی تھی۔ وقار آفندی کا دل شانت ہو گیا تھا۔

"تھینک یو آسیہ۔" انہوں نے آسیہ آفندی کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا اور علیزے مسکراتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"کہاں جا رہی ہو بیٹا؟"

"آپ لوگ باتیں کریں میں انیکسی کی طرف جا رہی ہوں۔" وہ کہہ کے باہر نکل آئی تھی اس کا رخ انیکسی کی طرف ہی تھا اور جیسے ہی وہ انیکسی میں پہنچی اسے خوش گوار حیرت کا سامنا کرنا پڑا تھا باقی لڑکیاں بھی اتفاقاً" وہیں تھیں۔

"السلام علیکم۔" اس نے اونچی آواز میں سلام کیا۔

"علیزے۔" انوشہ لپک کے پاس آئی تھی' علیزے کبھی کبھار ہی تو اس طرف آتی تھی اور وہ بھی انوشہ کی وجہ سے۔

"کیسی ہو؟"

"جی ٹھیک ہوں۔"

"آؤ نا' علیزے اندر آؤ۔" انوشہ نے اسے اندر آنے کا کہا' وہ اندر آ گئی۔

"ہیلو! کیا ہو رہا ہے؟" اس نے سب پہ نظر دوڑائی۔

"دیکھ لیجیے کیا ہو رہا ہے۔" کومل کی آواز پہ علیزے نے چونک کر کومل کی سمت دیکھا۔

"کومل آپی کیسی ہیں آپ؟" علیزے کا لہجہ اور انداز نارمل' بلکہ اپنائیت لیے ہوئے تھا۔

"جیسی تم ہو' ویسی میں ہوں۔" کومل نے سر جھٹک کے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب کہ جیسے تم ٹھیک ہو' ویسے میں بھی ٹھیک ہی ہوں۔" کومل کی وضاحت پہ باقی سب ہنس پڑی تھیں۔

"او اچھا۔" علیزے نے سر ہلایا۔

"بڑی جلدی سمجھ آ گیا ہے؟"

"آپ کے سمجھانے کا طریقہ اچھا ہے۔" علیزے معصومیت سے کہہ رہی تھی۔

"تو پھر ساری باتیں کیوں نہیں سمجھ لیتیں تم؟" کومل کے لہجے میں ہلکے طنز کا عنصر نمایاں تھا۔

"میں کبھی نہیں کومل آپی؟" علیزے نے الجھن آمیز نظروں سے دیکھا تھا۔

"کچھ باتیں سمجھ لیتی ہو اور کچھ نہیں سمجھتیں' عجیب بات ہے؟" کومل کا لہجہ ابھی بھی طنز لیے ہوئے تھا۔

"کومل۔" حرمت اس کے قریب ہی بیٹھی ہوئی تھی' اس نے کومل کو سرزنش کرنے والے انداز میں ٹوکا تھا۔

"ارے تو میں کیا کہہ رہی ہوں؟ اپنی سویٹ سی کزن سے باتیں ہی تو کر رہی ہوں؟" کومل نے تعجب سے دیکھا۔

"تو باتیں کرو نا' طنز تو نہیں۔" حرمت نے دبے الفاظ میں خفگی سے کہا جسے صرف کومل ہی سن سکی تھی۔

"آؤ علیزے' بیٹھو یہاں۔" کومل نے اپنے قریب صوفے پہ اشارہ کیا تھا' علیزے اس کے انداز کو بالکل بھی نہیں سمجھ پائی تھی اور خاموشی سے آ کر اس کے برابر بیٹھ گئی۔

"آج کل تم گھر پہ نظر آ رہی ہو' کالج چھوڑ دیا ہے کیا؟"

"نہیں کالج کیوں چھوڑوں گی بھلا؟"

"تم مسلسل اتنے روز سے گھر پہ ہو اس لیے میں نے سوچا کہ شاید۔"

"وہ دراصل مجھے پک اینڈ ڈراپ کرنے کا مسئلہ تھا۔ کوئی ڈرائیور تھا اور نہ ہی میری گاڑی تھی' لیکن پاپا نے کہا ہے کہ کل تک سارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔" اس کا بتانے کا انداز اب بھی معصوم سا تھا۔

"یعنی کل تک نیا ڈرائیور اور نئی گاڑی ارینج ہو جائیں گے؟"

"جی! ان فیکٹ یہ مسئلہ آج بھی حل ہو سکتا تھا' لیکن آذر بھائی گھر پہ نہیں تھے' شوروم سے گاڑی انہوں نے ہی نکلوانی تھی' آج وہ آ جائیں گے تو ان شاء اللہ کوئی مسئلہ نہیں ہو گا۔" وہ بے فکری سے کہہ رہی تھی اور کومل کا خون جل گیا تھا۔ وہ آذر کا اس طرح ذکر کرتی تھی جیسے وہ ہی اس سے زیادہ قریب تھی' حالانکہ اگر کومل دل سے سوچتی تو علیزے ہی آذر سے زیادہ قریب تھی' وہ خود بھی تو اسی پہ زیادہ توجہ دیتا تھا اور علیزے اس کی لاڈلی اور چہیتی کزن تھی۔

"بائی دا وے وہ گئے کہاں ہیں؟"

"کراچی۔"

"کیوں؟"

"کام سے۔"

"آئیں گے کب؟"

"آج۔"

"او اچھا۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر چپ ہو گئی تھی' حرمت نے علیزے کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"نبیل۔ نبیل!" وہ اندر داخل ہوتے ہی نبیل کو آواز دینے لگا۔

"سلام صاحب۔" گل کچن سے نکل کر اس کے سامنے آ گئی۔

"والسلام! گل کیسی ہو تم؟" ول آور کا انداز خوش گوار ہے لیے ہوئے تھا' وہ انسپکٹر شہناز کو ڈراپ کر کے سیدھا یہیں آیا تھا۔

"اللہ کا کرم ہے صاحب۔"

"گلاب خان کہاں ہے؟ کل آیا تھا نا؟"

"جی! صاحب آیا تھا۔"

"ملاقات ہوئی اس سے؟" اس کے سوال پہ گل کا چہرہ شرم سے جھک گیا تھا۔

"گل بی بی میں نے صرف ملاقات کا پوچھا ہے۔" وہ اپنی بات پہ زور دے کر پوچھ رہا تھا۔

"یار کیوں اسے کٹہرے میں کھڑا کر رکھا ہے؟ کسی کو تو بخش دیا کرو۔" نبیل سیڑھیاں اترتے ہوئے قریب آ گیا

تھا۔
"کوئی خود ہی کٹہرے میں کھڑا ہونے والی باتیں کرے تو میں کیا کروں؟" وہ نبیل سے مصافحہ کرتے ہوئے شرارت سے مسکرا کے بولا۔
"جاؤ گل! اپنے صاحب کے لیے کچھ کھانے کے لیے لے کر آؤ۔" نبیل نے گل کو اشارہ کیا۔
"فی الحال کچھ نہیں چاہیے' میں نے لنچ کافی لیٹ کیا تھا۔" دل آور نے منع کردیا۔
"تو پھر کچھ پینے کے لیے لے آؤ۔" نبیل نے دوبارہ گل کو مخاطب کیا تھا۔
"پینے کے لیے کیا؟" گل نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
"چائے لے آؤ۔" دل آور نے خود ہی کہہ دیا اور دونوں ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔
"اسلام آباد کا چکر کیسا رہا؟"
"بس یار! اماں سے ملنا تھا مل کر آگیا۔" اس نے نارمل سے انداز میں کہا۔
"اماں کیسی ہیں؟"
"ٹھیک ہیں وہ تمہارا اور مدحیہ کا پوچھ رہی تھیں۔"
"ہوں! میں فون کروں گا انہیں' ویسے یار تم نے کتنی بڑی غلطی کی ہے تم انہیں اپنے ساتھ لاہور ہی لے آتے' ہم سب کی ملاقات ہو جاتی؟" نبیل نے افسوس کا اظہار کیا تھا۔
"وہ مصروف ہیں آج کل۔" دل آور نے سنجیدگی سے جواب دیا۔
"مصروف تو تم بھی ہو؟"
"ہاں یار! کام ہی کچھ ایسا ہے۔"
"کام ایسا نہیں ہے' تم خود ہی کچھ ایسے ہو' تمہیں کس نے کہا تھا کہ وکالت کی طرف جاؤ؟"
"یہ میرے بابا کا خواب تھا یار' انہیں شوق تھا کہ میں وکیل بنوں' وہ میرے نام کے ساتھ ایڈووکیٹ اور بیرسٹر کا لفظ دیکھنا چاہتے تھے۔"
"ماشاء اللہ اور تم نے ان کا خواب پورا کردیا۔" نبیل نے مسکرا کے ستائشی لہجے میں کہا۔
"خواب تو پورا کردیا' لیکن وہ خواب کو تعبیر ہوتے نہ دیکھ سکے' کاش کہ وہ دیکھ سکتے کہ میں نے ان کے خواب کو شرمندہ تعبیر کردیا ہے۔" دل آور کے لہجے میں دکھ بول رہا تھا اور نبیل کو اس کے دکھ کا احساس ہو گیا تھا' لیکن اب بات کا رخ بدلنا بھی مشکل تھا۔
"بھائی۔" اچانک مدحیہ کی آواز سنائی دی' دل آور نے چونک کر سیڑھیوں کی سمت دیکھا اور نبیل نے شکر ادا کیا کہ چلو اس کا دھیان تو ہٹ گیا نا۔
"بھائی کی جان کیسی ہو؟" دل آور سر جھٹکتے ہوئے جی جان سے متوجہ ہوا تھا۔
"بالکل بور۔" اس نے بے زاری کا بھرپور اظہار کیا تھا۔
"کیوں بھئی؟"
"دو دن سے پاکستان آکر اپنے بیڈ روم میں بند ہوں باہر نکلو تب بھی بوریت دور کرنے کے لیے کچھ سامان نہیں ہے' نہ موبائل' نہ گاڑی' نہ فرینڈز اور نہ ہی آپ... بوریت نہ ہو تو اور کیا ہو؟" اس نے ایک ایک چیز گنوا ڈالی۔
"او کے بابا او کے' اب میں آگیا ہوں تو سب آجائے گا' موبائل بھی' گاڑی بھی' اور تمہاری بوریت کے لیے کمپنی بھی۔" اس نے مدحیہ کو تسلی دی۔
"آپ کہاں تھے' میں نے آپ کے نمبر پہ فون بھی کیا تھا۔"

"سوری یار! میں اسلام آباد گیا ہوا تھا۔"
"ہوں! سنا ہے اسلام آباد بہت خوب صورت شہر ہے؟" مدحیہ آج ذرا اپنے خول سے نکل کر بات چیت کر رہی تھی۔
"خوب صورت تو نہیں ہے' بس جب میں جاتا ہوں تو تب ہو جاتا ہے۔" اس کی بات پہ نبیل یک دم قہقہہ لگا کے ہنسا تھا اور مدحیہ بھی اپنی مسکراہٹ نہ روک سکی۔
"یار تم تو جہاں بھی جاتے ہو چار چاند لگا دیتے ہو۔" نبیل ہنس رہا تھا۔
"کوئی شک ہے تمہیں؟" اس نے بھنویں اچکا کے نبیل کو دیکھا۔
"کوئی شک نہیں ہے یار' کوئی شک نہیں ہے۔" اس نے ہنستے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔
"چلو پھر آج تم لوگوں کو لاہور دکھاؤں۔" اس نے نبیل اور مدحیہ کو آفر کی۔
"اس وقت؟" نبیل نے ٹائم دیکھا۔
"یار شام اور رات ہی تو لاہور کی رونقیں دیکھنے والی ہوتی ہیں' آج ہی تو تم لاہور کے نظارے دیکھو گے۔" اس نے مسکرا کے کہا۔
"میرا کوئی موڈ نہیں ہے' تم مدحیہ کو لے جاؤ' اس نے پاکستان نہیں دیکھا اسے دیکھنے کی ضرورت ہے۔" نبیل نے انکار کردیا۔
"کیوں تمہارا موڈ کیوں نہیں ہے؟"
"بس ایسے ہی۔"
"یہ جو "بس ایسے ہی" ہوتا ہے نا؟ یہ ہی بہت "خاص" ہوتا ہے۔" دل آور نے معنی خیزی سے کہا۔
"سوری یار مجھے خیال نہیں رہا کہ میں ایک وکیل کے سامنے بات کر رہا ہوں۔" نبیل نے ہتھیار ڈال دیے' کیونکہ اسے پتا تھا کہ وہ باتوں باتوں سے اپنے مطلب کی بات نکال لے گا اس کے سامنے انکار بھی فضول تھا۔

"چلو اٹھو پھر۔" دل تو رکھنا ہو گیا۔
"لیکن وہ جائے۔" نبیل نے کپ کی طرف اشارہ کیا۔
"جائے پھر سہی۔" اس نے ٹال دیا اور تھوڑی دیر بعد وہ ان دونوں کو ساتھ لیے گاڑی نکال لے گیا تھا شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا اور روشنیاں جاگ اٹھی تھیں پورے لاہور کی رونقیں عروج پر تھیں مدیحہ دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کیا بات ہے استاد! کچھ پریشان نظر آتے ہو؟" چھوٹا گاڑی کا پنکچر لگاتے ہوئے بار بار عدیل کو دیکھ رہا تھا اور جب پنکچر لگا کر فارغ ہو گیا تو سیدھا عدیل کے پاس آگیا۔
"ہاں یار! پریشان تو میں ہوں لیکن سمجھ نہیں آرہا کہ یہ پریشانی حل کیسے ہو گی؟"
"کیا مطلب ہے استاد؟ کھل کے بول۔" چھوٹے نے بڑا پن دکھایا۔
"یار وہ دراصل مجھے کل کچھ دیر کے لیے۔۔۔" عدیل کہتے کہتے رک گیا۔
"کل کچھ دیر کے لیے؟" وہ زیر لب دہرا کے بولا۔
"کیا چھٹی چاہیے؟" اس نے اندازاً پوچھا۔
"نہیں یار چھٹی نہیں چاہیے بلکہ۔۔۔" وہ پھر رک گیا۔
"ارے استاد بتاؤ بھی تم تو ایسے شرما رہے ہو جیسے لڑکی چاہیے؟" چھوٹے نے خفگی سے کہا تھا اور عدیل کو بتانا ہی پڑا۔
"یار مجھے نہ تو چھٹی چاہیے اور نہ ہی کوئی لڑکی چاہیے بلکہ مجھے بائیک چاہیے وہ بھی کل شام تھوڑی دیر کے لیے۔"
"بائیک؟" چھوٹے کو کافی حیرانی ہوئی تھی۔
"ہاں یار! بس کل شام کسی کام سے جانا ہے پک اینڈ ڈراپ کا مسئلہ تھا میں نے سوچا سلو سے کہوں گا اس کی بائیک ہے لیکن یار اب اسے کہتے ہوئے مجھے عجیب لگ رہا ہے دل نہیں مان رہا۔"
"استاد تیرا دل مانے یا نہ مانے لیکن میرا تو مانے گا نا؟"
"کیا مطلب؟"
"مطلب کہ میں اس سے کہتا ہوں تم بے شک نہ کہو۔" چھوٹے نے اس کی مشکل حل کرتے ہوئے اسے ٹینشن فری کر دیا تھا۔
"واقعی؟"
"اوئے آف کورس استاد۔" چھوٹے نے آف کورس کو بھی زبان سے خاصا رگڑ کے ادا کیا تھا۔
"تھینک یو یار تھینک یو سو مچ۔" عدیل کا چہرہ کھل اٹھا تھا اور پھر واقعی دوسرے روز چھٹی سے پہلے چھوٹے نے سلو کی بائیک کی چابی لا کر عدیل کو تھما دی تھی اور عدیل اس کا بار بار شکریہ ادا کرتا ہوا بائیک لے کر گھر آگیا تھا وہ نہا دھو کر فریش ہوا تو مریم بھی جانے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔
"چلیں بھائی۔" وہ چادر اوڑھ کر باہر نکل آئی ہاتھ میں فاطمہ کے گفٹ کا شاپر تھا اس نے اس سوٹ کو کافی خوب صورت پیکنگ کی شکل دے لی تھی۔

"چلو۔" عدیل امی ابو کو اللہ حافظ کہتا باہر آگیا اور دونوں بہن بھائی فاطمہ کے گھر کے جانے کے لیے روانہ ہو گئے اور ٹھیک پندرہ منٹ بعد وہ فاطمہ کے گھر کے سامنے پہنچ چکے تھے۔ عدیل نے بائیک باہر ہی روک دی حالانکہ گیٹ کھلا ہوا تھا۔ مریم بائیک سے اتر گئی۔
"پک کرنے کے لیے کب آؤں؟" اس نے مریم سے پوچھا۔
"ابھی تو آئی ہوں مجھے کیا پتا کہ ان کی پارٹی کا کیا ٹائم فکس ہے؟" مریم نے رسانیت سے کہا۔
"ٹھیک ہے میں آنے سے پہلے فون کر کے پتا کر لوں گا۔" اس نے سر ہلا دیا اور مریم پلٹ کر اندر آگئی۔
"السلام علیکم۔" فاطمہ اسے گیٹ پر ہی مل گئی تھی۔
"وعلیکم السلام کیسی ہو؟" فاطمہ مریم سے گلے ملی تھی آج وہ باقاعدہ پارلر سے تیار ہو کر آئی تھی اس کی خوب صورتی لشکارے مار رہی تھی مریم کو وہ نظر لگ جانے کی حد تک خوب صورت اور پیاری لگی تھی۔
"میں ٹھیک ہوں تم سناؤ؟"
"میں کیا سناؤں؟ تم سناؤ کہ تم اکیلی آئی ہو؟" فاطمہ نے اسے اکیلے دیکھ کر ذرا مایوسی سے کہا تھا۔
"نہیں وہ عدیل بھائی ڈراپ کر کے گئے ہیں۔"
"وہ گیٹ تک آکر چلا گیا؟ اندر بھی نہیں آیا؟" فاطمہ کو اور زیادہ ملال ہوا۔
"وہ کام سے تھکے ہوئے آئے تھے بس مجھے چھوڑنے کے لیے آگئے ابھی واپس جا کر انہوں نے کھانا بھی کھانا تھا۔"
"تو کیا یہاں اسے کھانا نہیں مل سکتا تھا؟" فاطمہ بحث کرنے کھڑی ہو گئی تھی اسے عدیل پہ رہ رہ کر غصہ آرہا تھا۔
"فاطمہ پلیز یار چھوڑو بھی کوئی اور بات کرو۔" مریم نے بات کو ٹالنے کی کوشش کی۔
"کیا یہ چھوڑنے کی بات ہے؟ اسے اتنی توفیق بھی نہ ہوئی کہ مجھے اپنی زبان سے وش ہی کر دے؟" فاطمہ کے دل میں افسوس اور صدمہ ہلکورے لے رہا تھا۔
"وہ جلدی میں تھے یار۔"
"ہونہہ! اس کی جلدی میں بخوبی سمجھتی ہوں اسے صرف بھاگنے کی جلدی تھی خیر تمہیں پک کرنے بھی تو آئے گا دیکھ لوں گی تمہیں کیسے لے کر جاتا ہے۔" فاطمہ کے عزائم پہ مریم بے ساختہ مسکرا اٹھی تھی اور اتنے میں وہاں کھڑے کھڑے ہی اوپن ایئر جیپ اندر آرکی جس کی ہیڈلائٹس کی روشنی میں فاطمہ اور مریم نہا گئی تھیں اور ان دونوں نے ہی چونک کر دیکھا تھا جیپ سے تین چار لڑکے ایک ساتھ اترے اور ان کی طرف دیکھتے ہوئے ان کی طرف ہی بڑھ آئے تھے مریم نامحسوس انداز میں اپنی چادر درست کرتے ہوئے سمٹ گئی جبکہ فاطمہ مسکرا کر دیکھ رہی تھی۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

☼ ☼

نبیلہ عزیز

دردِ دل

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدیحہ اور نبیل حیات دو ہی بہن بھائی ہیں مدیحہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پہ رنگ چکی ہے جس کے پیش نظر فائزہ بیگم نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں لیکن مدیحہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا بے بسی اور مجبوری سے تنگ آ کر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باؤ امتیاز مل جاتا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

[illegible] شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے اس نے [illegible] ہارنا نہیں سیکھا اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو [illegible] ہیں۔

۹
نویں قسط

جودت کی نظریں مسکرا کر دیکھنے والی فاطمہ پہ نہیں بلکہ چادر درست کرتے ہوئے سمٹنے والی مریم پہ تھیں' وہ سائم اور کامی وغیرہ کے ساتھ چلتا ہوا قریب آگیا تھا۔

"ہیلو ڈیئر! ہیپی برتھ ڈے اینڈ منی منی ہیپی ریٹرن آف دی ڈے۔" سائم دو دن بعد گھر آیا تھا' اس لیے اسے بہن کو وش کرنے کا موقع ابھی مل رہا تھا۔

"میری طرف سے بھی ہیپی برتھ ڈے۔" کامی نے شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بس؟" فاطمہ نے آنکھیں پھیلائیں۔

"کیوں؟ کچھ اور بھی کہنا چاہیے؟" کامی نے معصومیت سے پوچھا۔ سائم مسکراہٹ دبا گیا۔

"کہنا نہیں چاہیے بلکہ دینا چاہیے۔"

"کیا دینا چاہیے؟" کامی انجان بن رہا تھا۔

"گفٹ' میرا برتھ ڈے کا گفٹ۔" وہ زور دے کر بولی۔

"اچھا! برتھ ڈے پہ گفٹ بھی دیتے ہیں؟" وہ حیرانی سے کہہ رہا تھا۔

"ہاں! اس نے کبھی کسی کو دیا ہو تب نا؟" سائم نے چوٹ کی۔

"بس بس زیادہ طنز مت کر' دے دوں گا' تمہارے سارے گفٹس لوٹا دوں گا۔"

"کب؟" سائم تیزی سے بولا۔

"جب میں اپنے پیروں پہ کھڑا ہو گیا۔" اس نے سکون سے جواب دیا۔

"تو کیا اب تو ہاتھی کے پیروں پہ کھڑا ہے؟" سائم کاٹ کھانے کو دوڑا تھا۔

"تو مجھے چھوڑ اس کی بات کر' جو ہر وقت دل کے پیروں پہ کھڑا رہتا ہے۔ جس طرف دل چاہتا ہے اسی طرف چل پڑتا ہے۔" کامی نے معنی خیزی سے آنکھ دباتے ہوئے سائم کے کان میں سرگوشی کی' تب سائم نے چونک کر دیکھا اور اسے جودت کی چپ اور محویت کا احساس ہوا تھا۔ سائم کو دیکھنے پہ فاطمہ بھی متوجہ ہوئی۔

"جودت!" سائم نے اسے کہنی مارتے ہوئے متوجہ کیا۔

"ہوں؟"

"فاطمہ کو وش نہیں کرو گے؟" سائم چبا کے کہہ رہا تھا۔

"ہوں۔۔۔ ہاں ہیپی برتھ ڈے۔" اس نے چونکتے ہوئے ان کو دیکھا اور پھر فاطمہ کو وش کرنے کی فارمیلٹی نبھائی۔

"تھینک یو۔" فاطمہ کا تھینکس خفگی لیے ہوئے تھا۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"ہوں! ابھی تک تو ٹھیک ہی تھی' لیکن اب۔۔۔" وہ بات ادھوری چھوڑتے ہوئے سر جھٹکنے لگا۔

"آیئے تو پھر اندر چلتے ہیں۔" فاطمہ نے اندر کی طرف اشارہ کیا اور مریم کو ساتھ لے کر اندر آگئی' اس نے ان لوگوں کا مریم کے ساتھ تعارف بھی نہیں کروایا تھا اور مریم جو وہاں کھڑے کھڑے اس لڑکے کی بے باک نظروں سے بچنے کی ناکام کوششیں کر رہی تھی وہاں سے ہٹتے ہی اس نے شکر ادا کیا تھا۔ ان کے پیچھے سائم اور کامی بھی اندر کی طرف بڑھ رہے تھے کہ جودت نے سائم کو شرٹ سے پکڑ کر پیچھے کھینچ لیا۔

"بات سنو۔" جودت سنجیدگی سے بول رہا تھا۔

"سناؤ۔"

"یہ لڑکی کون ہے؟"

"فاطمہ کی فرینڈ ہے۔"

"پہلے تو کبھی نہیں دیکھا؟"

"پہلے وہ کبھی آئی بھی تو نہیں ' اگر آتی بھی ہے تو سالوں بعد۔" سائم نے کندھے اچکائے۔

"مڈل کلاس سے لگتی ہے۔" جودت نے اندازہ لگایا۔

"تمہیں کوئی پرابلم ہے؟"

"پرابلم تو ہے نا' مڈل کلاس کی لڑکیاں مشکل میں ڈال دیتی ہیں۔" جودت نے بال کھجاتے ہوئے کہا۔

"جودت اپنی سوچ کو لگام دو۔" سائم نے اسے سرزنش کرتے ہوئے باز رکھنا چاہا۔ جبکہ جودت ڈھٹائی سے مسکرا دیا تھا۔

"میری سوچ کو بے لگام کرنے والے بھی تو تم ہی ہو؟" جودت اسے کچھ جتا رہا تھا۔

"خیر چھوڑو اس بات کو' چلو اندر چلتے ہیں۔" سائم بات کو ٹال رہا تھا۔

"چلتے ہیں' پہلے نام بتاؤ۔" جودت ہنوز اپنی جگہ پہ کھڑا تھا۔

"نام۔۔۔"

"ہوں! اس لڑکی کا۔" جودت نے اندر کی طرف اشارہ کیا۔

"جودت یہ کیا بے ہودگی ہے؟"

"نام پوچھنا بے ہودگی ہے۔ حیرت ہے؟" جودت حیرانی سے کہہ رہا تھا۔

"ارے چلو یار کس تکرار میں الجھ گئے ہو؟" کامی پلٹ کر ان دونوں کے پاس آگیا۔

"اس سے نام پوچھ رہا ہوں لیکن یہ بتا ہی نہیں رہا۔" جودت اپنی بات پہ ڈٹا ہوا تھا۔

"تمہیں نام سے کیا مطلب؟" سائم گھور رہا تھا۔

"تم نام بتاؤ' مطلب میں بتا دوں گا۔" وہ انتہائی سکون سے کہہ رہا تھا سائم کو غصہ تو آیا لیکن پھر دبا گیا تھا۔

"اگر نہ بتاؤں تو؟"

"تو میرا اندر جانے کا کوئی فائدہ نہیں میں یہیں سے واپس چلا جاتا ہوں۔" وہ بھی اپنی ضد کا پکا تھا سائم جھنجلا گیا۔

"او کم آن یار' ذرا سی بات کو خواہ مخواہ ایشو بنا رہے ہو تم۔"

"ایشو میں نہیں تم بنا رہے ہو' اس لڑکی کا نام ہی تو پوچھا ہے' دام تو نہیں پوچھا۔" جودت بھی جھنجلا کے بولا تھا۔

"جودت۔" سائم نے پھر غصے سے دیکھا۔

"نام بتا دو' فائدے میں رہو گے۔" جودت مسکرا رہا تھا۔

"یار وہ بہن کی دوست ہے' کچھ شرم کرو۔"

"اوکے میں شرم کر لیتا ہوں' چلا جاتا ہوں یہاں سے۔" اس نے لاپروائی سے کہا۔ اور قدم واپس موڑ لیے تھے۔

"مریم نام ہے اس کا۔" سائم نے بالآخر ہتھیار ڈال دیئے تھے وہ جودت کی ناراضی مول نہیں لے سکتا تھا دونوں کی بچپن کی دوستی تھی ایک دوسرے کا اچھا برا بھی برداشت کرنا پڑ ہی جاتا تھا جیسے اس وقت جودت کی ضد کے آگے ہار ماننا پڑی تھی اور نہ چاہتے ہوئے بھی اسے نام بتانا پڑا تھا۔

"تھینک یو یار! تم واقعی ایک اچھے دوست ہو۔" جودت اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے مسکرایا۔

"لیکن تم ذرا بھی اچھے دوست نہیں ہو' بات بات پہ تڑی دکھاتے ہو۔" سائم دانت پیس کے بولا تھا۔ جواباً جودت قہقہہ لگاتے ہوئے اس کے ساتھ اندر آگیا تھا اور مہمانوں کی آمد بھی شروع ہو چکی تھی۔

✡ ✡ ✡

وہ انہیں سیدھا فوڈ اسٹریٹ لے کر آیا تھا اور لاہور کے فوڈ اسٹریٹ تو ماشاء اللہ حیران کن حد تک بارونق اور گہما گہمی سے مالا مال تھے جگمگاتی روشنیاں طرح طرح کے لوگ اور طرح طرح کے کھانے مدحیہ واقعی حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ جبکہ کھانوں کی مہک نے سوئی ہوئی بھوک کو جگا دیا تھا۔

"بیٹھو یہاں۔" دل آور نے ایک کرسی کھینچ کر مدحیہ کو بیٹھنے کا کہا۔

"تھینک یو۔" وہ حیران سی کہتی ہوئی کرسی پہ بیٹھ گئی۔ پھر وہ دونوں بھی بیٹھ گئے تھے۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟" دل آور نے پوچھا چہرے پہ مسکراہٹ تھی۔

"یہ سارا ماحول اور یہاں کی ارینج منٹ وغیرہ دیکھ رہی ہوں۔" اس نے اپنی حیرانی کا اظہار کیا۔

اس کی حیرانی کی وجہ یہاں کی عورتیں اور لڑکیاں تھیں' فیشن ایبل اور ماڈرن' بغیر کسی دوپٹے کے اور بغیر کسی حجاب کے کسی نے ہاف سلیوز پہن رکھی تھی اور کئی سلیولیس تھیں۔ ان کی شرٹس کے گلے بیک اور فرنٹ سے ایک جیسے ڈیپ تھے' ٹراؤزر کے پائنچے ٹخنوں سے کئی انچ اوپر تھے اتنے کہ گوری پنڈلیاں کئی منچلوں کے دل بہلا رہی تھیں' کھلے بال اور میک اپ سے سجے چہرے' مدحیہ کو ہلکا سا شاک لگا تھا کہ یہ پاکستان ہے؟

"اگر پاکستان کا یہ حال ہے تو پھر یورپ کو کیوں بدنام کر رکھا ہے کہ وہاں بے حیائی ہو رہی ہے؟ کیا یہ ہیں وہ مشرقی عورتیں جن کی مغرب میں دھوم مچی ہوتی ہے؟ مشرقی عورت' مشرقی عورت اور مشرقی عورت۔؟ کمال ہے ایسی مبالغہ آرائی؟" مدحیہ مسلسل سوچ میں گم تھی۔

"مدحیہ کیا سوچ رہی ہو؟" دل آور نے ٹیبل بجا کر اسے متوجہ کیا تھا۔

"صرف سوچ ہی نہیں رہی' دیکھ بھی رہی ہوں۔" وہ استہزائیہ بولی۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟"

"آپ کی فیورٹ عورتیں' یعنی مشرقی عورتیں۔" اس نے تمسخرانہ لہجے میں کہہ کر اشارہ کیا دل آور نے چونک کر اس کی نظر کے تعاقب میں دیکھا تھا ایک لڑکی اور ایک لڑکا ایک ہی پلیٹ میں کھانا کھاتے ہوئے ہنس رہے تھے اور ان کی آپس میں چھیڑ چھاڑ بھی جاری تھی دل آور کے چہرے کی رنگت سرخ پڑ گئی تھی۔

"تم ادھر میری جگہ پہ آجاؤ۔" وہ اپنی کرسی سے کھڑا ہو گیا یہ بات نبیل کہتا تو شاید وہ ضد پہ اڑ جاتی لیکن کہنے والا دل آور شاہ تھا۔

"کیا جگہ چینج کرنے سے ماحول بھی چینج ہو جائے گا؟" وہ طنز کرنے سے باز نہ آئی۔

"دیکھو مدحیہ پورا پاکستان ایک جیسا تو نہیں ہے نا؟ یہ امیر گھروں کی بگڑی ہوئی لڑکیاں ہیں۔"

"تو آپ مجھے کسی ایسی جگہ لے جاتے جہاں غریب گھروں کی سلجھی ہوئی لڑکیاں ہوتیں؟" مدحیہ اپنی طرف سے طنز کر رہی تھی کہ سب ایسی ہی ہیں۔

"مجھے تو لگ رہا ہے پاکستان نے فیشن کے سوا اور کسی کام میں ترقی نہیں کی؟" وہ دل کھول کے بھڑاس نکال رہی تھی۔

"یہ بحث کا وقت نہیں ہے میری جان کھانا کھاؤ۔" دل آور بحث کو ٹال گیا تھا ورنہ وہ تو ماہر تھا اس کام میں' اسے تو بس موقع چاہیے تھا۔

"اپنا موبائل دیں گے مجھے؟" وہ کھانا کھا کر فارغ ہوئے تو مدحیہ نے اس کا موبائل مانگا تھا۔

✡ ✡ ✡

تمہیں غیروں سے کب فرصت ہم اپنے غم سے کب خالی
چلو بس ہو چکا ملنا' نہ تم خالی' نہ ہم خالی

اپنی ڈائری سے شعر پڑھتے ہوئے اس کے دل سے عجب ہوک نکلی تھی اور وہ ڈائری بند کر کے رائٹنگ ٹیبل کے سامنے سے اٹھ گئی اس کا رخ ونڈو کی طرف تھا۔ اس نے آگے بڑھتے ہوئے دونوں پٹ کھول دیئے باہر دن میں رات چھائی ہوئی لگ رہی تھی گہرے سرمئی بادلوں نے پورے ماحول کو سرمئی بنا دیا تھا۔ زری اس سرمئی ماحول کو دیکھتی ہوئی بے وجہ ہی اداس ہونے لگی تھی شاید اسے اس سرمئی رنگ سے کسی کے سرمئی رنگ کے لباس کا خیال آگیا تھا اور لباس کے ساتھ اور بہت کچھ بھی' جن کو سوچتے ہوئے اس نے کھڑکی کے کھلے پٹ سے سر ٹکاتے ہوئے آنکھیں موند لی تھیں۔

"اتنی ٹھنڈ میں کیوں کھڑی ہیں؟ کیا بیمار ہونے کا ارادہ ہے؟" وہ جاتے جاتے دو پل کے لیے ٹھہرا تھا اس کے پاس اور زری کو لگا اس کے پاس پوری کائنات ٹھہر گئی ہو اور اس نے پلکیں اٹھا کر اس کو دھڑکتی نظروں سے دیکھا تھا۔

"بیمار ہو بھی جاؤں تو کون سا میری عیادت کو کوئی آجائے گا۔" بس زری کا اتنا سا کہنا تھا کہ اس نے نظریں چرا لی تھیں۔

"کسی کی عیادت کے لالچ میں خود کو بیمار کرنا سراسر بے وقوفی ہے کیونکہ اس طرح بیماری طویل بھی ہو سکتی ہے' میرا مطلب ہے کہ عیادت کرنے والا نہیں بھی آسکتا۔" وہ اپنی بات پہ زور دے کر بولا۔

"آجائے گا تو کیا بگڑے گا اس کا' بلکہ کسی کی طبیعت ہی سنبھل جائے گی؟" زری اپنی بات پہ زور دے رہی تھی۔

"طبیعت سنبھل جائے گی لیکن حالات بگڑ جائیں گے۔"

"حالات؟" وہ ناسمجھی سے پوچھ رہی تھی۔

"خیر چھوڑیں آپ نہیں سمجھیں گی' اندر چلی جائیں ٹھنڈ بہت ہے۔" وہ واپس جا رہا تھا زری اس کے ہاتھ میں گاڑی کی چابی دیکھ چکی تھی۔

"ٹھنڈ تو واقعی بہت ہے آپ بھی تو باہر جا رہے ہیں؟" زری نے فوراً کہا لیکن وہ خاموش ہی رہا۔

آج وہ سرمئی رنگ کے شلوار قمیص میں ملبوس اپنی تمام مردانہ وجاہتوں سمیت عبداللہ اور نبیل کے ساتھ بیٹھے ہوئے بھی نمایاں لگ رہا تھا زری کا دل کئی بار دھڑکنے پہ مجبور ہوا تھا۔ اور اس وقت بھی وہ اسے ہی سوچنے پہ مجبور تھی دل کسی اور طرف راغب ہی نہیں ہوتا تھا۔ اور ابھی نجانے وہ اور کتنا سوچتی کہ اس کے موبائل پہ بیل ہونے لگی پہلے وہ اگنور کرتی رہی لیکن جب مسلسل رنگ ہوئی تو اسے کھڑکی سے ہٹ کے بیڈ کے قریب آنا ہی پڑا لیکن جیسے ہی اس نے موبائل اسکرین پہ نمبر دیکھا اس کی آنکھیں بے یقینی سے پھیل گئی تھیں اسے یقین نہیں آرہا تھا۔ "دل آور شاہ کالنگ" وہ موبائل اسکرین کو ہی دیکھے جا رہی تھی دل کی دھڑکنیں معمول پہ آتیں تو وہ کال سننے کا سوچتی اور بالآخر کال خود ہی بند ہو گئی۔

"ہیں؟ یہ کیا ہوا ہے۔" اس کا دل دھک سے رہ گیا وہ پاس آ کے چلا گیا زری کے روئیں روئیں میں بے چینی کا

ابال اٹھا تھا۔ لیکن شکر تھا کہ کال دوبارہ آگئی اس نے ایک ہاتھ سینے پہ رکھا اور سنبھل کے بیڈ پہ بیٹھ گئی کیونکہ ٹانگوں میں خوشی کے مارے سکت نہیں رہی تھی۔ اور یونہی دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے یس کا بٹن پریس کیا تھا۔

"السلام علیکم۔" اس کا سلام بھی لرز رہا تھا۔

"وعلیکم السلام یہ مدحیہ آپ کو کال کررہی تھی۔ اس سے بات کرلیں۔" وہی دل پہ دھمک چھوڑتی ہوئی بھاری گمبھیر آواز ذرا کی ذرا سماعتوں میں اتری اور گم ہوگئی۔

"ہیلو۔" اب مدحیہ کی آواز سنائی دی تھی۔

"السلام علیکم۔" زری نے مشکل خود کو کمپوز کیا تھا ورنہ دل و دماغ تو منتشر ہی تھے۔ وہ اس کے دل و دماغ کو ستا کے رکھ گیا تھا۔

"وعلیکم السلام! کیسی ہو؟"

"اداس۔"

"کیوں؟ اداس کیوں؟"

"بس اکیلے دل نہیں لگ رہا۔"

"پاکستان آجاؤ۔"

"کوشش تو یہی ہے بس ایگزامز کا انتظار ہے۔" زری اداسی سے بولی۔

"خیر تم سناؤ اتنے دنوں بعد آج کانٹیکٹ کررہی ہو؟ کیا وجہ تھی؟" زری نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔

"میرے پاس ابھی میرا اپنا سیل نمبر نہیں ہے ہوسکتا ہے آج ہی لے لوں، آج ہم دل آور بھائی کے ساتھ لاہور گھومنے کے لیے نکلے ہوئے ہیں ابھی ابھی فوڈ اسٹریٹ سے کھانا کھایا ہے اور لاہور کے دلچسپ نظارے دیکھے ہیں۔" مدحیہ کہتے کہتے استہزائیہ انداز پہ اتر آئی تھی۔

"دلچسپ نظارے کیا مطلب؟"

"ارے وہی جن کو آپ لوگ مشرقی نظارے کہتے ہیں۔" مدحیہ ایک ہی بات پہ اڑی ہوئی تھی۔

"مدحیہ تم بھول رہی ہو کہ ہر ملک میں رہنے والے لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے 'اچھے برے انسان تو ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔" زری نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"مجھے مت سمجھاؤ زری' میں سمجھنے والی نہیں ہوں' میں نے تو تمہیں اس لیے کال کی ہے تاکہ تمہیں تمہارے پاکستان کا حال لائیو سناؤں۔" مدحیہ کا انداز طنز لیے ہوئے تھا۔

"چار سالوں میں میری یادداشت اتنی کمزور نہیں ہوئی کہ میں اپنے وطن کا حال بھول جاؤں۔ بے شک میں یہاں رہ رہی ہوں لیکن میری جڑیں تو پاکستان میں ہی ہیں نا؟ میں نے لوٹ کر تو وہیں آنا ہے نا؟ اب اپنی فیملی کو ہی دیکھ لو' کتنے سال یہاں گزارے لیکن اپنے اصل کی طرف لوٹ گئے' پاکستان ہمارا اصل ہے اور اصل چاہے اچھا ہو چاہے برا' آخر قبول کرنا ہی پڑتا ہے۔" محبت کی باتیں کرنے والی زری ملک کی باتیں کررہی تھی مدحیہ کو سن کر تعجب ہوا تھا۔

"ماشاء اللہ کافی اچھا بول لیتی ہو۔"

"تھینک یو۔" زری نے اس کے طنز کا جواب خفگی سے دیا تھا۔

"باقی سب کیسے ہیں؟" مدحیہ کو سب کا پوچھنے کا خیال آہی گیا تھا۔

"سب ٹھیک ہیں عبداللہ بھائی آفس گئے ہیں بھابھی اپنے پیرنٹس سے ملنے اور میں گھر پہ۔"

"[illegible] تم اداسی بور ہو رہی ہوگی؟ شاید اداسی بھی اسی لیے ہے؟"

"ہونہہ! اداسی کسی کے لیے ہے' کسی کو پتا ہی نہیں۔" وہ دھیمے سے بولی۔

"کیا مطلب؟" مدحیہ چونک گئی۔

"مطلب کسی کے سمجھانے سے سمجھ نہیں آتا مدحیہ جانی۔" زری ہلکے سے ہنسی۔

"تم چھپا رہی ہو زری؟"

"چھپے ہوئے کو چھپانا کیسا؟"

"لیکن زری تم نے جو بات کہی ہے وہ۔"

"ارے مدحیہ یاد آیا کہ مجھے یونیورسٹی میں وہ جیزی ملا تھا۔" زری بات ٹال دینا چاہتی تھی۔

"جیزی کو گولی مارو' اپنی بات کہو۔"

"میری کوئی بات ہوگی تو تمہیں ہی بتاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے زری تم مجھے ٹال رہی ہو اور میں ٹل جاتی ہوں' لیکن اتنا یاد رکھنا کہ اگر تمہیں کچھ کہنا ہو تو مدحیہ حاضر ہے۔" مدحیہ نے بڑے سوبر سے لب و لہجہ اور انداز میں کہا تھا زری کو اس کے انداز پہ بے ساختہ پیار آگیا تھا۔

"تھینک یو سو مچ ڈیر اینڈ آئی مس یو ویری مچ۔" زری نے کھل کے اظہار کیا تھا۔

"سیم ہیر۔" وہ بھی جواباً آہستگی سے بولی۔

"تمہارے فرینڈز بھی تمہیں بہت مس کررہے ہیں جیزی تمہارا پوچھنے آیا تھا میں نے اسے کہا کہ مدحیہ تم لوگوں سے خود کانٹیکٹ کرلے گی وہ تمہارے گھر کا لینڈ لائن نمبر مانگ رہا تھا لیکن تمہاری اجازت کے بغیر میں نے اسے نمبر نہیں دیا۔" زری اسے تفصیل سے بتارہی تھی۔

"او کے اچھا کیا ہے۔"

"او کے۔" زری دھیمے سے بولی۔

"اچھا زری ہم ذرا مارکیٹ کی طرف نکل رہے ہیں تم سے بعد میں بات کروں گی دل آور بھائی میری باتوں کے ختم ہونے کا انتظار کررہے ہیں۔" مدحیہ الوداعی کلمات ادا کرتے ہوئے بولی۔

"او کے ایز یو وش' سب کو میرا سلام کہنا۔"

"ٹھیک ہے کہہ دوں گی لیکن یار جاتے جاتے ایک شعر تو سنا دو۔ بہت دنوں سے میں تمہارے اشعار کو مس کررہی ہوں۔" مدحیہ تیزی سے بولی زری کا دل مدھم تال پہ دھڑکا!

تم سے کیا کہیں جاناں اس قدر جھمیلے میں
ہو سکے تو سن جاؤ ایک دن اکیلے میں

دھیمی بوجھل آواز میں کہہ کر اس نے فون بند کردیا لیکن اسے یہ نہیں پتا تھا کہ مدحیہ کے پاس کھڑے دل آور نے بھی اس کا یہ شعر با آسانی سنا ہے کیونکہ فون کا والیوم بلند تھا اتنے شور ہنگامے میں مدھم والیوم سے بات بھی تو نہیں سنی جاسکتی تھی۔؟ لیکن جو کچھ بھی تھا آج وہ اس کی آواز کے ذرا سے امرت سے ہی جی اٹھی تھی۔

☼ ☼ ☼

"فاطمہ میری بات سنو۔" مریم نے پاس سے گزرتی فاطمہ کا ہاتھ پکڑ کر روک دیا تھا وہ اپنے مہمان اٹینڈ کرتی پھر رہی تھی اور مریم کونے والی کرسی پہ بیٹھی اس لڑکے کی نظروں سے بچنے کی کوششیں کررہی تھی جو مسلسل اسے ہی

دیکھے جا رہا تھا۔

"کیا بات ہے؟" فاطمہ ذرا ٹھہر کر متوجہ ہوئی۔

"میں نے عدیل بھائی کو فون کرنا تھا وہ مجھے پک کرنے آجاتے۔"

"اس کے پاس موبائل ہے؟"

"نہیں! کوثر باجی کے گھر فون کر کے پیغام دینا تھا۔"

"ان کو زحمت دینے کی کیا ضرورت ہے، تھوڑی دیر بعد مہمان کھانا کھالیں تو میں خود تمہیں ڈراپ کر آؤں گی۔"

"نہیں عدیل بھائی نے کہا تھا کہ وہ مجھے لینے کے لیے آجائیں گے۔"

"تو ٹھیک ہے پھر انتظار کرو، ان کے آنے کا۔"

"لیکن فاطمہ میں اکیلی بیٹھی کیا کروں گی؟ تم کیک کاٹ چکی ہو اس لیے مجھے اب گھر جانا چاہیے۔" مریم اسے کیا بتاتی کہ اس جودت نام کے لڑکے نے اسے دیکھ دیکھ کر اپنی نظروں سے ہی زچ کر دیا ہے۔

"کھانا کھالیا تم نے؟"

"نہیں میں کھانا کھا کر آئی تھی۔"

"کیوں؟ میرے گھر کے کھانے میں زہر ملا ہوا تھا کہ تمہارا بھائی بھی بھاگ گیا اور تم بھی کھانا کھائے بغیر جا رہی ہو۔" فاطمہ جب غصے میں ہوتی تو اسی طرح جو منہ میں آتا کہہ جاتی تھی۔

"پلیز فاطمہ! کیوں ذرا ذرا سی بات پہ اتنی بدگمان ہو جاتی ہو؟" مریم خفگی سے بولی۔

"تم جب غیرت برتتی ہو تبھی مجھے بدگمانی ہوتی ہے۔" فاطمہ کا غصہ عروج پہ تھا۔

"دیکھو فاطمہ میں اگر غیریت برتتی تو تمہارے بلانے پہ اس وقت تمہارے گھر نہ آتی حالانکہ تم جانتی ہو کہ میں کہیں بھی آتی جاتی نہیں ہوں خصوصاً" رات کے وقت تو تصور بھی نہیں کیا جاسکتا لیکن پھر بھی تمہاری خاطر آگئی، اور تم ہو کہ ابھی بھی بدگمان ہو رہی ہو؟" مریم نے افسوس سے کہا تھا فاطمہ کچھ دیر کے لیے چپ ہو گئی تھی۔ مریم اگر اس کے لیے اس وقت یہاں تک آگئی تھی تو بڑی بات تھی۔

"ہیلو ڈیئر! کیا ہو رہا ہے؟" فاطمہ کی ایک اور فرینڈ پاس آگئی تھی۔

"نتھنگ اسپیشل، تم سناؤ کھانا کھالیا؟"

"آف کورس کھانا کھا کر ہی تمہارے پاس آئی ہوں۔" اور ذرا فاصلے پہ کھڑا جودت اپنے دھیان میں آگے بڑھا تھا کہ ویٹر سے ٹکرا گیا اور کولڈ ڈرنک کے گلاسوں سے سجی ٹرے، جودت پہ ہی الٹ گئی تھی اس کی شرٹ رنگ برنگے مشروب الٹنے سے رنگین ہو گئی تھی۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟ تم دیکھ کر نہیں چل سکتے؟" جودت نے اپنی غلطی ویٹر کے سر ڈال دی۔

"جودت کول ڈاؤن یار، سارے مہمان دیکھ رہے ہیں۔" سائم لپک کے پاس آیا تھا اور اسے مزید غصہ نکالنے سے روکا۔

"میری ساری شرٹ خراب ہو گئی ہے اور تم۔۔۔"

"یار پلیز! کیوں تماشا بنا رہے ہو؟ تم میرے بیڈ روم میں جا کر میری شرٹ پہن لو، آؤ میرے ساتھ۔" سائم نے بمشکل اسے ٹھنڈا رکھنے کی کوشش کی۔

"غلطی تمہاری تھی، تمہاری نظریں کہیں اور لگی ہوئی ہیں، اس کا بھلا کیا قصور ہے؟" سائم نے جودت کو مزید کچھ کہنے سے پہلے ہی روک دیا تھا۔ اور پھر اپنے ساتھ بیڈ روم میں لے گیا۔

"بی بی جی! باہر کوئی عدیل صاحب آئے ہیں۔" ملازمہ نے اندر آکر فاطمہ کو اطلاع دی۔
"ان سے کہو اندر آجائیں۔"
"کہا تھا بی بی جی، لیکن وہ کہتے ہیں کہ وہ جلدی میں ہیں۔ مریم بی بی کو باہر بھیجو۔" ملازمہ نے عدیل کا جواب ایڈوانس میں ہی پوچھ لیا تھا۔
"میں چلتی ہوں فاطمہ۔" مریم نے جانے کے لیے پر تولے۔
"چلو۔" فاطمہ اسے اشارہ کرتی اس کے ساتھ باہر نکل آئی تھی۔
"السلام علیکم۔" مریم کے ساتھ فاطمہ کو آتے دیکھ کر عدیل سیدھا کھڑا ہوگیا۔
"وعلیکم السلام مجھے دراصل آپ کا شکریہ ادا کرنا تھا اس لیے یہاں تک آئی ہوں۔" فاطمہ کا انداز طنزیہ تھا۔
"شکریہ کس بات کا؟"
"مریم کو لے کر آنے کا۔"
"اس میں شکریے کی کیا بات ہے؟ آپ دونوں فرینڈز ہیں ایک دوسرے سے ملنے کا حق بنتا ہے۔" عدیل نے نارمل سے لہجے میں کہا۔
"کیا انسانوں کے حقوق بھی جانتے ہیں آپ؟"
"فاطمہ کافی ٹائم ہو چکا ہے ہمیں اب چلنا چاہیے۔"
مریم نے بیچ بچاؤ کرانے کی کوشش کی۔
"واقعی چلنا چاہیے 'اوکے گڈبائے۔" فاطمہ پلٹ گئی۔
"سنیے۔" عدیل نے پکارا۔
"وش یو ہیپی برتھ ڈے۔" جاتے جاتے وہ اس کا شکوہ دور کر گیا تھا فاطمہ پیچھے دیکھتی رہ گئی وہ بائیک کو کک لگاتے ہوئے چند سیکنڈز بعد نظروں سے اوجھل ہوگیا وہ ابھی وہیں کھڑی تھی کہ اتنے میں جودت عجلت میں تقریباً بھاگتا ہوا باہر آیا تھا لیکن باہر فاطمہ اکیلی کھڑی تھی۔۔۔ گویا وہ جا چکی تھی جودت اپنی گاڑی کے بونٹ پہ مکا رسید کر کے رہ گیا اور دوسری ٹھوکر ٹائر کو دے ماری تھی اس کا چانس مس ہوگیا تھا۔

☼ ☼ ☼

سبز گھاس پہ شبنم کے قطرے رات بھر رونے کی نشانی تھی اور وہ رات کے آنسوؤں میں پاؤں بھگوتی پورے لان کی گھاس کو اپنے سفید کبوتر سے پاؤں کا نرم لمس بخشتے ہوئے مسلسل چہل قدمی میں مصروف تھی۔ سبز گھاس کا قالین اس کے پیروں تلے دب رہا تھا اور پھولوں کی دلفریب خوشبو اس کے پیروں کی پازیب بنی جا رہی تھی جس طرف قدم اٹھ رہے تھے اسی طرف مہک کے جھونکے چل رہے تھے۔
"کوئی کانٹا لگ جائے گا علیزے۔" آذر اسے منع کیے بغیر نہ رہ سکا۔
"یہاں کوئی کانٹا نہیں ہے آذر بھائی۔" علیزے اس کی آواز پہ مسکرا کر پلٹی تھی۔
"تمہیں کیسے پتا کہ یہاں کوئی کانٹا نہیں ہے؟"
"میں کافی دیر سے یہیں ٹہل رہی ہوں۔"
"لیکن ننگے پیر ٹہلنے کی کیا ضرورت ہے؟"
"آپ بھی ایک بار جوتے اتار کے دیکھیں پھر آپ کو پتا چلے گا کہ ننگے پیر ٹہلنے کی کیا ضرورت ہے۔؟" علیزے نے مسکراتے ہوئے اسے مشورہ دیا۔

"میں جوتے اتار کے دیکھوں؟" آذر دلچسپی سے ہنسا۔
"آف کورس آپ سے ہی کہہ رہی ہوں۔" علیزے نے اصرار کیا تھا اور آذر نے بھی دلچسپی سے مسکراتے ہوئے اپنے جاگرز اتارے اور اس کے ساتھ گھاس پہ ننگے پیر ٹہلنے لگا۔
ٹھنڈی شبنم کے قطرے پیروں میں گدگدی کرنے لگے دھیمی مسکراہٹ آپ ہی آپ لبوں کا احاطہ کرنے لگی تھی اور اسے دیکھ کر علیزے ہنس پڑی۔
"کیسا لگ رہا ہے؟"
"بہت اچھا۔"
"کبھی کبھی میرا موڈ اچھا ہو تو میں یونہی ننگے پیر چہل قدمی کرتے ہوئے بہت انجوائے کرتی ہوں۔"
"اوہ تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ آج تمہارا موڈ اچھا ہے؟"
"ہوں۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔
"وجہ؟"
"نہیں ایسے ہی۔"
"حیرت ہے بغیر وجہ کے موڈ فریش ہے۔؟"
"بس کبھی کبھی انسان کی کیفیت ایسی ہو ہی جاتی ہے۔ نہ اپنی اداسی کا سبب پتا چلتا ہے اور نہ ہی خوشی کا۔" اس نے کندھے اچکائے۔
"لگتا ہے تم کالج جانے کے لیے خوش ہو؟" آذر نے اس کے دلکش چہرے کو اک نظر دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"لیکن ابھی تو میرے کالج جانے کا کوئی انتظام ہی نہیں ہوا۔ نہ گاڑی نہ ڈرائیور اور دو روز سے آپ بھی گھر پہ نہیں تھے۔"
"آج گاڑی کا انتظام بھی ہو جائے گا' ڈرائیور کے لیے تو ڈیڈ نے کسی کو کہہ دیا ہے' ہو سکتا ہے کہ آج ڈرائیور بھی آجائے' اس نے شام کو آنے کا کہا ہے۔" آذر نے اسے تسلی دی۔
علیزے چلتے چلتے ٹھہر گئی تھی اور آذر اسے دیکھ کر ٹھہر گیا تھا۔
"کیا ہوا؟" آذر اس کے چہرے پہ پریشانی کی پرچھائی دیکھ چکا تھا۔
"ایک بات پوچھوں آذر بھائی؟" اس کا لہجہ سنجیدہ تھا۔
"ہاں ہاں ضرور پوچھو۔" آذر ہمہ تن گوش ہوا۔
"آپ کو ابھی تک اس آدمی کا پتا نہیں چلا نا' جس نے فائرنگ کروائی تھی؟" علیزے بغور آذر کے چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی آذر ایک پل کے لیے تذبذب کا شکار ہو گیا تھا لیکن اس وقت اگر وہ علیزے کے سامنے اپنی ناکامی اور مایوسی ظاہر کرتا تو یقیناً وہ اندر سے پریشان اور ہراساں ہو جاتی اور آذر اسے ہراساں نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ کمزور دل کی لڑکی تھی' دوسرے لفظوں میں ڈرپوک اور بزدل بھی کہا جا سکتا تھا۔
"آذر بھائی۔؟" اس کی آواز آذر کو ہوش کی دنیا میں لے آئی۔
"ہوں؟"
"میں نے جو پوچھا ہے اس کا جواب دیں۔"
"دیکھو علیزے ایسی باتیں سب کے سامنے شو کرنے والی نہیں ہوتیں' ایسے معاملوں میں بہت احتیاط برتنی پڑتی ہے۔ عورتوں کو بات بتانے سے بات پھیل جاتی ہے اسی لیے میں نے کسی کو کچھ نہیں بتایا۔" آذر کا انداز تسلی دینے والا تھا۔

"مطلب کہ آپ کو دشمن کا پتا چل چکا ہے؟"
"بالکل۔" آذر کو علیزے کی خاطر جھوٹ بولنا پڑا تھا۔
"کون ہے وہ؟"
"ایم سوری میری جان یہ نہیں بتا سکتا۔"
"آپ یہ کیوں نہیں کہتے کہ آپ کو خود بھی پتا نہیں ہے؟" علیزے بلا جھجک کہہ گئی آذر چونک گیا تھا۔
"یعنی تمہارے خیال میں، میں جھوٹ بول رہا ہوں؟" وہ الٹا اس پہ خفا ہونے لگا تھا۔
"نن نہیں میں یہ تو نہیں کہہ رہی۔" علیزے کو اپنی بے ساختگی اور بے یقینی پہ ندامت ہوئی تھی۔
"بہر حال تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ بہت جلد وہ آدمی سامنے آجائے گا۔ بس کوشش یہی ہے کہ سارے ثبوت ہاتھ آجائیں۔" وہ بار بار علیزے کو تسلی دیتے ہوئے سمجھا رہا تھا۔
"او کے دیکھتے ہیں کہ کیا ہوتا ہے؟" اس نے کندھے اچکا دیے۔
"ہوں! چلو اندر چلتے ہیں، کافی ٹائم ہو رہا ہے میں نے ابھی آفس کے لیے تیار بھی ہونا ہے۔" آذر اسے کہتے ہوئے واپسی کے لیے پلٹا لیکن سامنے کومل کو دیکھ کر ٹھٹک گیا تھا۔
"کومل۔"
"جی وہ میں آپ کو بلانے آئی تھی، آنی بلا رہی ہیں ناشتا تیار ہے۔" کومل نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا اس کی نظریں جھکیں تو ان دونوں کے پیروں پہ جا کر ٹھہر گئیں وہ دونوں گھاس پہ ننگے پیر کھڑے تھے علیزے کو تو نہیں البتہ آذر کو کومل کی نظریں بہت محسوس ہوئی تھیں۔ وہ آذر کے جواب سے پہلے ہی پلٹ کر اندر چلی گئی تھی جبکہ علیزے اس کے ساتھ ہی اندر آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

نبیل ابھی ناشتا کر کے فارغ ہوا ہی تھا کہ گیٹ پہ دل آور کی گاڑی کا ہارن سنائی دینے لگا وہ جلدی جلدی چائے کا کپ خالی کر کے کھڑا ہو گیا۔
"آپ کو اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے ابھی بتا دیجیے۔ آتے ہوئے لے آؤں گا۔" نبیل جاتے جاتے ٹھہر گیا۔
"نہیں بیٹا مجھے بھلا کس چیز کی ضرورت ہوگی؟ بس اپنے گھر کی ضرورت تھی اور گھر مل گیا۔" فائزہ بیگم گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولیں۔
"پلیز ماما اداس نہ ہوا کریں۔" نبیل ان کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔
"جس ماں کا تم جیسا سمجھ دار محبت کرنے والا اور لائق فائق بیٹا ہو اسے بھلا اداس ہونے کی کیا ضرورت ہے؟" وہ اس کا ہاتھ تھپکتے ہوئے بولیں۔
"مجھے پتا ہے آپ کس لیے اداس ہوتی ہیں، لیکن ماما آپ کو کتنی بار کہہ چکا ہوں کہ اس اداسی اور اس انتظار کا کوئی فائدہ نہیں ہے، کچھ حاصل نہیں ہوتا ایسے انتظار اور اداسی سے۔" وہ ماں کی کیفیت کو کافی گہرائی سے سمجھتا تھا وہ جانتا تھا کہ وہ ممتاز حیات کی بے گانگی کا غم دل میں دھڑکن کی طرح لیے پھرتی ہیں جب جب دل دھڑکتا ہے تب تب غم بڑھتا ہے۔
"ایسی کوئی بات نہیں ہے بیٹا، جاؤ تم، دل آور تمہارا انتظار کر رہا ہوگا۔" انہوں نے نبیل کو یاد دلایا۔
"اوہ ہاں! اب تو وہ مجھے گالیاں بھی دے رہا ہوگا۔" نبیل سر پہ ہاتھ مارتے ہوئے پلٹا اور کرسی پہ رکھا اپنا نیوی بلیو

کلر کا بریف کیس اٹھا کر باہر کی سمت لپکا تھا لیکن سامنے سے اس کا چوکیدار کوریڈور عبور کرتے ہوئے اندر آرہا تھا۔
"صاحب وہ دل آور صاحب کہہ رہے ہیں کہ کیا آپ زندہ ہیں؟" چوکیدار نے ذرا جھجکتے ہوئے کہا تھا جس پہ نبیل بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنسا تھا اور چوکیدار کے ساتھ ہی باہر نکل آیا تھا گیٹ کے سامنے ہی وہ اپنی طرف لیے کھڑا تھا چہرے پہ غصہ تھا۔
"دل آور صاحب سے کہو نبیل صاحب زندہ ہیں اور آ گئے ہیں۔" نبیل نے چوکیدار کو اشارہ کیا اور ذرا اونچی آواز سے کہا تھا تاکہ گاڑی میں بیٹھا دل آور بھی سن لے۔
"اب اور کتنا لیٹ کرو گے؟" وہ بالآخر رہ نہ سکا اور غصے سے بول پڑا۔
"یار تم تو ہر وقت جلدی میں ہی رہتے ہو، میں سوچتا ہوں اپنی بیوی کے ساتھ نجانے کیا کرو گے؟ نہ پیار کرو گے نہ اظہار کرو گے، نہ ہی اس کا انتظار کرو گے، بے چاری روئے گی اپنے نصیب پہ۔" نبیل فرنٹ سیٹ پہ بیٹھا دل آور کی ہونے والی بیوی پہ افسوس کر رہا تھا۔
"اور بڑی خوش نصیب ہوگی تمہاری بیوی، ہر وقت اس کے گھٹنے سے لگ کے بیٹھے رہو گے، کبھی گھر سے ہی نہیں نکلو گے۔"
"اللہ معاف کرے یار، اب ڈھکے چھپے لفظوں میں مجھے زن مرید تو نہ کہو، اللہ ایسی نوبت نہ لائے۔" نبیل نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا اب ہنسنے کی باری دل آور کی تھی اور یونہی باتوں باتوں میں وہ کرنسی چینج کروانے کرنسی ایکس چینج پہنچ گئے، وہاں سے بینک کا رخ کیا اپنا اکاؤنٹ اوپن کروایا اور اے ٹی ایم کارڈ اپلائی کروا دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بینک سے بھی فارغ ہو گئے تھے پھر ایک موبائل کمپنی کی فرنچائز گئے اور مدیحہ اور فائزہ بیگم کے اپنی پسند کے نمبر ایشو کروائے تھے۔
دو روز پہلے نبیل گلاب خان کے ساتھ آ کر اپنے لیے نمبر لے چکا تھا۔ لیکن مدیحہ وغیرہ کے ابھی باقی تھے سارے

کام کرنے کے بعد ان کا رخ شوروم کی طرف تھا جہاں سے نبیل نے بیک وقت تین گاڑیاں نکلوانی تھیں دل آور اسے اس شوروم میں لے کر آیا جہاں اس کی پرانی جان پہچان تھی شوروم کے مالک اکرام مجید کچھ عرصہ پہلے کسی الزام کی زد میں آگئے تھے اور ساتھ ہی انہیں گاڑیوں کے جعلی لین دین کے کیس میں ملوث کردیا گیا تھا تب اکرام مجید ہر طرف سے ناکام اور مایوس ہو کر دل آور شاہ کے پاس پہنچے تھے اور اس نے محض تین ماہ میں انہیں اس کیس سے باعزت بری کروا دیا تھا جس کی خوشی میں انہوں نے دل آور کو ایک گاڑی تحفے میں بھجوائی تھی لیکن اس نے یہ تحفہ لینے سے انکار کردیا تھا وہ اپنے کلائنٹس سے صرف اپنی فیس لیتا تھا "چائے پانی" کے نام پہ اضافی پیسے لینا حرام سمجھتا تھا یہ اور بات تھی کہ کوئی عام شہری اس کی فیس افورڈ نہیں کرسکتا تھا اسے بس بڑی بڑی آسامیاں ہی ہائر کرسکتی تھیں جیسے اکرام مجید!

"واؤ کیسا شاندار شوروم ہے۔" نبیل شوروم کے احاطے میں داخل ہوتے ہی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکا تھا کیونکہ شوروم کی سجاوٹ پارکنگ تک نظر آرہی تھی۔

"اندر چلو' اندر سے اور بھی شاندار لگے گا۔" دل آور گاڑی لاک کرکے اس کے ساتھ اندر آگیا تھا۔ لیکن اندر داخل ہوتے ہی اس کی نظر دوسرے گلاس ڈور سے باہر نکلتے آدمی پہ ٹھہر گئی۔ دل آور اس آدمی کو دیکھ بھی چکا تھا اور پہچان بھی چکا تھا لیکن وہ آدمی اتنی عجلت میں تھا کہ دل آور شاہ کو نہ دیکھ سکا البتہ اکرم مجید گلاس وال سے دل آور شاہ کو دیکھ کر خود ہی گلاس ڈور کے پاس آگئے۔

"السلام علیکم شاہ جی' باہر کیوں رک گئے؟ اندر آیئے۔ نا؟" اکرم مجید بچھے جارہے تھے۔ لیکن دل آور اس آدمی کو دیکھے جارہا تھا اس کی نظروں نے پارکنگ تک اس آدمی کا پیچھا کیا تھا۔

"کس کو دیکھ رہے ہو؟" نبیل نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا لیکن اسے کچھ نظر نہیں آیا تھا۔ "کسی کو نہیں۔" اس نے نفی میں سرہلایا اور پھر اکرم مجید سے ہاتھ ملا کر اندر آگیا۔

"کیا لیں گے شاہ جی ٹھنڈا یا گرم؟" وہ انہیں اپنے آفس روم میں لے آئے۔

"ٹھنڈا۔" وہ مختصر بولا۔

"اتنا ٹھنڈا کہ سینے کو کچھ دیر کے لیے ٹھنڈا کردے۔"

"جیسے آپ کی مرضی شاہ جی' آج ہمارے غریب خانے کو رونق کیسے بخشی؟"

"بس میرے دوست کا کچھ خریدنے کا موڈ تھا سوچا آپ کی دکان ہی اچھی رہے گی۔" اس نے وسیع وعریض کشادہ اور جگمگاتے شوروم کو بیٹھے بیٹھے دکان کا نام دے دیا تھا یہی تو اس کا شاہانہ پن تھا۔

"اچھا تو یہ آپ کے دوست ہیں؟ کیسے ہیں سر؟" اکرام مجید نے نبیل حیات سے دوبارہ ہاتھ ملایا۔ اور چند اور باتیں کرنے کے بعد وہ لوگ اٹھ کر گاڑیاں پسند کرنے لگے ایک ساتھ تین گاڑیاں' اکرام مجید سن کر ہی مرعوب ہوگئے تھے۔ نبیل اپنے لیے گاڑی پسند کررہا تھا لیکن دل آور کی نظریں بلیک چمچماتی مرسڈیز پہ تھیں۔

"یہ گاڑی سیل ہوچکی ہے۔" مینجر نے آگے بڑھ کے اطلاع دی۔

"اندازہ ہے مجھے۔" دل آور نے سر جھٹکتے ہوئے کہا اور پلٹ کر نبیل کے برابر آکھڑا ہوا جس کی نظر انتخاب براڈو پہ ٹھہری ہوئی تھی۔

"یہ کیسی رہے گی؟"

"ہوں اچھی ہے۔" اس نے اثبات میں سرہلا کر رائے دی اور نبیل نے نو ہی اوکے کردی۔ مدیحہ کے لیے سلور کرولا پسند کی تھی اس نے دل آور کو تاکید کی ہوئی تھی کہ اس کی گاڑی سلور کلر میں ہی ہونی چاہیے۔ سو اس کی گاڑی دل آور نے ہی پسند کی تھی اور پھر نبیل کے تمام کام نبٹانے کے بعد وہ اپنے کام نبٹانے کے لیے چل دیا تھا وہ جس کیس پہ کام کررہا تھا وہ بہت اہم تھا۔

✡ ✡ ✡

"اندر چلا جاؤں چوکیدار صاحب؟" منصور حسین کی آواز عقب سے ابھری تو چوکیدار بدک کے پیچھے پلٹا تھا وہ کندھے پہ بیگ ڈالے بڑے دل جلانے والے انداز میں پوچھ رہا تھا۔

"تم آبھی گئے منصور حسین؟" عارف اس کا بیگ دیکھ کر بولا۔

"آگیا ہوں جناب۔۔۔ آگیا ہوں دروازے کھول دو گھر کے بھی' دل کے بھی۔" منصور حسین کو جب سے نوکری ملی تھی خوش باش نظر آنے لگا تھا۔ "مجھے تو لگتا ہے بڑے صاحب نے ڈرائیور نہیں رکھا بلکہ عذاب رکھا ہے۔" عارف نے اپنا ماتھا پیٹتے ہوئے کہا۔

"کیوں دل جلاتے ہو بادشاہو صحت پہ اثر پڑتا ہے۔" منصور حسین نے عارف کے کندھے پہ ہاتھ رکھ دیا تھا۔

"تم اندر ہی چلے جاؤ تو اچھا ہے۔" عارف نے جھنجلا کر چھوٹا گیٹ کھول دیا تھا اور منصور حسین مسکراتے ہوئے اندر آگیا تھا۔

مغرب کا وقت تھا شام کا اندھیرا گہرا ہوچکا تھا۔ حویلی کے لیمپ پوسٹ روشن ہوچکے تھے گیٹ' ڈرائیو وے اور کوریڈور تک روشنیاں ہی روشنیاں تھیں رات میں دن کا سماں تھا۔ منصور حسین ہمیشہ کی طرح ایک ہی جگہ کھڑا حویلی کی خوب صورتی دیکھ رہا تھا۔

"منصور حسین۔" مبارک خان اسے دور سے ہی دیکھ چکا تھا اسی لیے آواز دی تھی۔

"یار کھڑے کھڑے کیا دیکھنے لگتے ہو؟"

"اللہ کے رنگ۔" وہ آہستگی سے بولا۔

"اللہ کے رنگ؟"

"ہاں یار' دیکھتا ہوں کہ اللہ نے اگر کسی کو نوازا ہے تو بے بہا نوازا ہے اور جس کو نہیں نوازا اسے حسرت سے نواز دیا ہے تاکہ وہ دوسروں کو حسرت سے دیکھتا رہے۔" منصور حسین آہ بھر کے بولا اس کا موڈ اداس ہوچکا تھا۔

"اللہ نوازے گا یار سب کو نوازے گا دل چھوٹا نہیں کرتے۔ تم آؤ میرے ساتھ میں تمہیں تمہارا کوارٹر دکھا دوں۔" مبارک خان اسے تسلی دیتے ہوئے اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ مبارک خان کے ساتھ والا کوارٹر منصور حسین کے لیے صاف کروایا گیا تھا۔ مبارک خان نے آگے بڑھ کے کوارٹر کی کنڈی کھول دی۔

منصور حسین اندر آگیا اس کمرے میں ایک چارپائی' دو کرسیاں' ایک ٹیبل' اور ایک الماری تھی پنکھے اور بجلی کا انتظام بھی اچھا تھا کمرے کا فرش اور دیواریں صاف ستھری اور جگمگا رہی تھیں گویا ملازموں کا بھی کافی خیال رکھا گیا تھا منصور حسین کو یہ بات بڑی پسند آئی تھی۔ وہ ٹیبل پہ بیگ رکھ کر چارپائی پہ بیٹھ گیا چارپائی کڑکڑا کے رہ گئی۔

"یار یہ تو ابھی سے احتجاج کرنے لگی ہے۔ میرا وزن سہہ بھی پائے گی یا نہیں؟" منصور حسین پیچھے کی طرف چارپائی پہ ہاتھ جماتے ہوئے اس پہ دباؤ ڈال کر چارپائی کی مضبوطی چیک کررہا تھا کہ کہیں وہ ٹوٹ ہی نہ جائے۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

✡ ✡

نبیلہ عزیز

دردِ ساحل

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدیحہ اور نبیل حیات دونوں بہن بھائی ہیں، مدیحہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے، وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پہ رنگ چکی ہے، جس کے پیش نظر فائزہ بیگم، نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں، لیکن مدیحہ پاکستان جانے سے انکار کردیتی ہے، جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے، مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصے سے نوکری کی تلاش میں ہے، مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، بے بسی اور مجبوری سے تنگ آ کر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے، لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باؤ امتیاز مل جاتا ہے، جو اسے کام کی آفر کرتا ہے، جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے، اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے، وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے، وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے، وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے، اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا، اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دلاتی ہیں۔

۱۰

دسویں قسط

"حد سے زیادہ وزن ڈالو گے تو کیسے سہہ پائے گی۔۔۔؟ بے چاری ٹوٹ ہی جائے گی نا۔۔۔؟" مبارک خان اس کے انداز پہ ہنس کر بولا تھا۔

"تو پھر ایسا کرو اس کی جگہ کوئی مضبوط سی چارپائی لا کر رکھو' ورنہ یہ سچ مچ ٹوٹ ہی جائے گی۔ میں بڑی "اتھری" نیند سوتا ہوں۔" منصور حسین نے مبارک خان کو پہلے سے اطلاع دی تھی۔

"رنگلے پایوں والا بڑا پلنگ منگوالوں تمہارے لیے؟" مبارک خان کا لہجہ استہزائیہ تھا۔

"ارے یار! اس سے بڑی نیکی اور کیا ہوگی؟ نواڑی پلنگ پہ سونے کا بھی اپنا ہی مزا ہے' ہر کروٹ پہ ڈھیلا پڑتا ہے۔" منصور حسین مزا لیتے ہوئے بولا۔

"ویسے یار آپس کی بات ہے اگر تم بڑے صاحب کے سامنے رنگلے پایوں والے نواڑی پلنگ کی فرمائش کرو گے تو وہ یہ فرمائش بھی پوری کردیں گے۔" مبارک خان نے آہستہ آواز میں کہا۔

"وجہ۔۔۔؟" منصور حسین نے حیرت سے پوچھا۔

"آخر تم علیزے بی بی کے ڈرائیور ہو' ان کے ملازم ہو' کیا یہ وجہ کم ہے؟" مبارک خان اس گھر کا خاص ملازم تھا وہ علیزے اور اس کے ملازموں کی اہمیت خوب جانتا تھا اس کے ملازموں کی بھی گھر میں بڑی قدر اور اہمیت جانی جاتی تھی۔

"اوہ! اچھا' اچھا۔" منصور حسین نے سمجھتے ہوئے سرہلایا تھا۔ لیکن اتنے میں ان دونوں کو کسی کے کراہنے کی آواز سنائی دی وہ دونوں ہی چونک گئے مگر مبارک خان فوراً" ہی ریلیکس ہو گیا۔ اسے آواز کی سمجھ آگئی تھی۔

"یہ کس کی آواز ہے۔؟" منصور حسین انجان تھا اسی لیے پوچھ رہا تھا۔

"خیرو بابا کی۔"

"کون خیرو بابا؟"

"علیزے بی بی کے ڈرائیور۔۔۔"

"ڈرائیور۔۔۔؟" منصور حسین کو اچنبھا ہوا۔

"چند روز پہلے تک وہی علیزے بی بی کے ڈرائیور تھے۔"

"یار! صاف صاف بات کرو۔ "تھے" سے کیا مطلب ہے تمہارا۔۔۔؟"

"مطلب کہ اب تم ہو' وہ نہیں ہیں۔"

"لیکن کیوں۔۔۔؟"

"کیونکہ چند روز پہلے۔۔۔" مبارک خان بات بتاتے بتاتے رک گیا تھا۔

"چند روز پہلے کیا ہوا۔۔۔؟"

وہ پوچھ رہا تھا اور مبارک خان تذبذب کا شکار تھا کہ اسے بتائے یا نہ بتائے۔

"کیا کوئی راز کی بات ہے؟ منصور حسین نے اس کے چہرے پہ کھوجا۔

"خیر جو بھی بات ہے تمہیں بتانی تو پڑے گی' آخر تمہیں اسی لیے تو اس نوکری پہ رکھا گیا ہے۔" مبارک خان ایک کرسی گھسیٹ کر اس کے قریب ہی بیٹھ گیا تھا۔

"اچھا۔ بتاؤ پھر۔"

"بتاتا ہوں یار۔" مبارک خان نے خود کو سب بتانے کے لیے تیار کیا تھا۔

"بچپن سے علیزے بی بی نے جب اسکول میں ایڈمیشن لیا تھا خیرو بابا تب سے ان کے ڈرائیور ہیں ان کو پک اینڈ ڈراپ کرنا ان کی ذمہ داری تھی' علیزے بی بی نے کہیں اور بھی آنا جانا ہوتا تھا تو وہی لے کر جاتے تھے لیکن

چند روز پہلے وہ علیزے بی بی کو کالج ڈراپ کرنے گئے تو راستے میں گاڑی پہ فائرنگ شروع ہو گئی' خیرو بابا بہت وفادار ملازم ہیں خود زخمی ہو گئے لیکن علیزے بی بی پہ ذرا سی بھی آنچ نہیں آنے دی' پچھلے کئی دنوں سے ہسپتال میں داخل تھے کل ہی واپس آئے ہیں' ابھی کمزور ہیں' اٹھتے بیٹھتے ہوئے تکلیف ہوتی ہے اسی لیے درد سے کراہ اٹھتے ہیں۔" مبارک خان نے اسے تفصیل سے بتایا۔

"اوہ! یہ تو واقعی پریشانی کی خبر سنائی ہے تم نے' لیکن یار سوچنے کی بات ہے' فائرنگ کروائی کس نے تھی۔۔۔؟ کیا تمہارے بڑے صاحب کی کسی سے کوئی دشمنی وغیرہ چل رہی ہے؟" منصور حسین پرسوچ انداز میں پوچھ رہا تھا۔

"ارے نہیں یار! اس حویلی کے سبھی افراد بہت نیک' شریف اور سلجھے ہوئے لوگ ہیں' نمازی اور پرہیز گار ہیں' کسی سے کوئی دشمنی نہیں ہے' اگر دشمنی ہوتی تو فوراً" پتا چل جاتا کہ فائرنگ کروانے والا کون تھا۔۔۔؟ یہ تو پتا نہیں اچانک کون دشمن اٹھ کھڑا ہوا ہے' جس کا کوئی اتا پتا ہی نہیں ہے۔" مبارک خان اس بات سے خود بہت پریشان ہو رہا تھا۔

"ہوں! یہ تو اور بھی پریشانی کی بات ہے یار' پھر کیا سوچا ہے تمہارے صاحب نے۔؟"

"ارے سوچنا کیا ہے بس چھان بین میں لگے ہوئے ہیں ابھی' اب دیکھو کہ کب مسئلہ حل ہوتا ہے؟" مبارک خان پریشانی سے سرہلا کر بولا۔

"اتنا بڑا واقعہ ہونے کے بعد تمہارے صاحب پھر اپنی بیٹی کو باہر بھیجنے کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔ انہیں ڈر نہیں لگتا؟" منصور حسین تعجب سے پوچھ رہا تھا۔

"ڈر کس کو نہیں لگتا؟ ماں باپ ہیں آخر' علیزے بی بی بڑی منتوں مرادوں کے بعد ملنے والی اولاد ہیں ان کی' وہ تو اس دنیا کی ہوا بھی نہ لگنے دیں' پر مجبوری ہے' پڑھنے کے لیے تو بھیجنا ہی ہے۔ ان کے امتحان سر پہ پہنچ چکے ہیں' کالج نہیں جائیں گی تو پورے سال کی محنت کا نقصان ہوگا' اسی لیے تو ایمرجنسی میں انہوں نے تمہیں ڈرائیور رکھ لیا ہے' ورنہ کوئی اور حالات ہوتے تو سو سو طرح کی چھان بین کرتے اور پھر بھی مطمئن نہ ہوتے۔" مبارک خان صاف صاف بات کر رہا تھا۔

"اور کیسی چھان بین کرنا تھی انہوں نے؟ شناختی کارڈ' لائسنس' نام و پتا' گھر بار سب پوچھا ہے انہوں نے؟" منصور حسین کو حیرت ہوئی تھی۔

"یار بے شک پوچھا ہے انہوں نے لیکن پھر بھی وہ مطمئن ہونے والے نہیں' خیر شاید اللہ نے تمہاری دعا سن لی تھی اسی لیے تمہارے لیے نوکری کا سبب بنا دیا۔"

"ہاں یار! میرے لیے تو سبب بن گیا لیکن خیرو بابا کا کیا ہوگا؟ وہ بے چارے تو بے روزگار ہو گئے نا؟" اسے افسوس ہو رہا تھا۔

"خیرو بابا کی فکر نہ کرو صاحب نے ان کے لیے بڑا اچھا انتظام کر دیا ہے۔"

"انتظام۔۔۔ کیسا انتظام؟" منصور حسین کو سمجھ نہ آیا۔

"بڑے صاحب خیرو بابا کو ان کے گوٹھ بھجوا رہے ہیں۔ جہاں ان کے بیٹے بیٹیاں اور پوتے پوتیاں رہتے ہیں وہ بھی اب انہی کے پاس رہیں گے اور ان کو بغیر کوئی کام کیے' گھر بیٹھے ہر مہینے تنخواہ ملتی رہے گی۔ اس طرح ان کا بڑھاپا بھی سکون میں گزرے گا اور ماہانہ خرچ بھی ملتا رہے گا۔" مبارک خان نے مزید اطلاع دی تھی اور منصور حسین سچ مچ مرعوب ہوا تھا۔

"پھر تو تمہارے بڑے صاحب واقعی نیک آدمی ہیں۔ اپنے ملازموں کے لیے بھی اتنا اچھا سوچتے ہیں' نرم دل رکھتے ہیں سینے میں۔" منصور حسین توصیفی لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"ان کے اچھا سوچنے کے لیے' ہمارا اچھا بننا ضروری ہے منصور حسین' ورنہ لوگ برے کے ساتھ برا ہی پیش آتے ہیں۔ اور مجھے امید ہے کہ تم اچھے بن کے ہی رہو گے۔" مبارک خان نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے اسے تھپکی دی اور منصور حسین اس کی بات پہ دلچسپی سے مسکرا دیا تھا۔

"میں ہوں ہی اچھا' مجھے بننے کی کیا ضرورت ہے؟" اس کے دلچسپ انداز پہ مبارک خان بھی مسکرا دیا تھا اور اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

"کہاں جا رہے ہو؟"

"خیرو بابا کی طبیعت پوچھنے' لگتا ہے وہ اکیلے ہیں اس وقت؟" مبارک خان نے اندازہ لگایا۔

"تو مجھے بھی ساتھ لے چلو' میں بھی ان کی عیادت کر لوں گا۔" منصور حسین کھڑا ہو گیا تھا اور پھر مبارک خان کے ساتھ اپنے کوارٹر سے نکل کر خیرو بابا کے کوارٹر میں آ گیا۔

"السلام علیکم۔" اس کی بھاری دبنگ سی اجنبی آواز پہ خیرو بابا نے چونک کر آنکھیں کھولی تھیں اور مبارک خان کے ساتھ کسی اور کو دیکھ کر انہیں حیرانی ہوئی تھی۔

"السلام علیکم خیرو بابا۔" مبارک خان قریب آ کے بولا۔

"وعلیکم السلام۔" انہوں نے نقاہت زدہ آواز میں سلام کا جواب دیا۔

"اب کیسی طبیعت ہے؟" منصور حسین نے پوچھنے میں پہل کی تھی جبکہ وہ اجنبی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"یہ منصور حسین ہے خیرو بابا' علیزے بی بی کا نیا ڈرائیور۔" مبارک خان نے ان کی مشکل آسان کی۔

"اچھا' اچھا یہ ہے نیا ڈرائیور؟ ماشاء اللہ بڑا گھبرو جوان ہے۔" انہوں نے بڑی محبت سے اسے دیکھا اور سراہا تھا۔

"شکریہ۔" منصور حسین نے ان کی ستائش بھری نظروں پہ سر جھکا لیا تھا۔

"اللہ تجھے زندگی دے پتر' چہرے سے ہی بہادر لگتے ہو' آئندہ بھی بہادر بن کے ہی رہنا۔" انہوں نے منصور حسین کو نصیحت کی وہ ان کے قریب ہی کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا تھا۔

"میں بہت شرمندہ ہوں آپ سے۔" اس نے خیرو بابا کے ہاتھ تھام لیے لہجہ واقعی شرمندگی لیے ہوئے تھا۔

"کیوں پتر؟ میرا اور تیرا تو ایسا کوئی واسطہ ہی نہیں کہ تجھے شرمندہ ہونا پڑے۔" خیرو بابا کو حیرت ہوئی۔

"بس اوپر والا کسی نہ کسی سے کوئی نہ کوئی واسطہ بنا ہی دیتا ہے' میں بہت دنوں سے نوکری کے لیے دھکے کھاتا پھر رہا تھا لیکن کہیں کوئی خالی جگہ ہی نہیں مل رہی تھی' صاحب نے بھی انکار کر کے مجھے واپس بھیج دیا' لیکن اب جب آپ زخمی ہوئے ہیں تو صاحب کو آپ کے بڑھاپے کا خیال آ گیا ہے اسی لیے انہوں نے آپ کے بڑھاپے کی جگہ میری جوانی کو نوکری پہ رکھ لیا ہے۔ میری جوانی اور طاقت سے آپ کا بڑھاپا مات کھا گیا ہے' آپ کو ہٹا دیا گیا ہے اور مجھے رکھ لیا گیا ہے' خیر دین کی جگہ منصور حسین کو اوکے کر دیا گیا ہے۔ اسی لیے منصور حسین کو شرمندگی ہو رہی ہے کہ اس نے آپ کی جگہ لے لی ہے۔" منصور حسین نے ان کے ہاتھ تھامے اپنی شرمندگی کا جواز پیش کیا تو خیرو بابا اور مبارک خان حیرت سے اسے دیکھنے لگے وہ کتنا حساس ہو رہا تھا ورنہ اسے تو اس نوکری پہ خوش ہونا چاہیے تھا مگر خیرو بابا کا سن کر اس کی خوشی ماند پڑ گئی تھی۔

"یہ کیسی بات کر رہے ہو پتر؟ سب کے اپنے اپنے نصیب ہوتے ہیں' میں نے اپنے نصیب کا کما لیا ہے' اب تجھے تیرے نصیب کا ملے گا' اور ویسے بھی اللہ کسی کا حق نہیں چھوڑتا' صاحب نے مجھے نوکری سے الگ کیا ہے' مجھے میرے نصیب سے تو الگ نہیں کیا' اللہ نے ان کے دل میں رحم ڈال دیا ہے میرے لیے' میرے حصے کا رزق مجھے ملتا رہے گا۔" خیرو بابا بھی بہت صابر و شاکر تھے انہوں نے منصور حسین کی شرمندگی کو کم کر دیا تھا۔

"یہ تو انہوں نے واقعی بہت اچھا کام کیا ہے' مجھے سن کر بڑی خوشی ہوئی ہے۔" منصور حسین نے ان کے جذبے کو سراہا تھا۔

"خوشی تو مجھے بھی بہت ہوئی ہے' اچھا ہے اپنے بچوں کے پاس اپنے گوٹھ میں رہوں گا' ساری عمر شہر میں کام کرتے ہی گزار دی۔" خیرو بابا نے گہری سانس کھینچی اور اپنا گزرا وقت یاد کرنے لگے منصور حسین کو ان کے پاس بیٹھنا اور باتیں سننا بہت اچھا لگا تھا وہ کافی دیر تک اپنی جوانی کے قصے سناتے رہے اور وہ دونوں سنتے رہے۔

☼ ☼ ☼

"جودت.....!" وہ گاڑی سے اتر کر ڈھیلے ڈھالے قدموں سے چلتے ہوئے روش سے لان کی سیڑھیوں کی سمت بڑھ رہا تھا جب لان کے بائیں حصے سے ابھرنے والی کومل کی آواز پہ ٹھٹک کر رک گیا تھا۔

"کومل آپا؟"

وہ اسے غور سے دیکھتے ہوئے سیڑھیوں سے اتر کر چھوٹی سی ندی کے پل سے گزر کر لان میں آ گیا تھا۔

"جی ہاں! کومل آپا۔" اس نے سر اثبات میں ہلا کر اعتراف کیا کہ میں ہی ہوں۔

"رات کے اس پہر یہاں کیوں.....؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"یہی سوال اگر میں تم سے کروں تو؟" کومل نے جودت کو سر تا پا گھورتے ہوئے پوچھا تھا۔

"میں تو لوفر' آوارہ ہوں یقیناً' اس وقت آوارہ گردی ہی کر کے آیا ہوں گا۔" اس نے کندھے اچکائے۔

"لگ تو نہیں رہا کہ تم اس وقت آوارہ گردی کر کے آئے ہو.....؟"

"تو پھر کیا لگ رہا ہے آپ کو کہ کیا کر کے آیا ہوں۔" وہ استہزائیہ ہنسا۔

"تھکے تھکے لگ رہے ہو' کیا بات ہے"

"آپ بتائیں آپ کیا کھوجنا چاہتی ہیں۔؟"

"یہی کہ آج تمہاری چال کیوں بدلی ہوئی ہے.؟"

"آپ کے خیال میں میری چال کیوں بدلی ہوئی ہے؟" وہ الٹا اسی سے پوچھے جا رہا تھا۔

"کوئی لڑکی چھوڑ کر چلی گئی ہے تمہیں۔" کومل نے برملا کہہ دیا' وہ بہت بری طرح چونک گیا تھا اس کا اندازہ کافی حد تک درست ہی تو تھا۔

"آپ کو کیسے پتا؟"

"تمہاری چال بتا رہی ہے۔"

"کافی تیز نظر ہے آپ کی۔" وہ مسکرایا۔ "اسی بات کا تو رونا ہے۔" کومل نے سر جھٹک کر آہستگی سے کہا۔

"خیر یہ بتاؤ' کون چھوڑ کر گئی ہے' اور کیوں گئی ہے؟" اس نے بات ٹال دی۔

"چھوڑ کر گئی بھی ہے اور نہیں بھی۔"

"کیا مطلب۔؟"

"مطلب کہ ابھی اسے صرف دیکھا ہے' ہیلو ہائے نہیں ہوئی' اگر ہیلو ہائے ہو جاتی تو اس طرح چھوڑ کر نہ جاتی۔" وہ بات کرتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔

"کون ہے وہ؟"

"یہی تو پتا کرنا ہے ابھی' اور اسی سوچ نے تو چال کا رنگ بدل دیا ہے۔"

"اوہ! تو معاملہ ابھی صرف نظروں تک ہے؟"

"نظروں تک نہیں، نظر تک ہے، صرف میری نظر تک، اک نظر کا معاملہ دوسری نظر تک پہنچے تو تبھی نظروں کا معاملہ کہلاتا ہے اور فی الحال اس کی نظر میری نظر کے ساتھ شامل نہیں ہے، لیکن ان شاء اللہ بہت جلد شامل ہو ہی جائے گی۔" جودت شرارت سے کہہ کر ہنسا تھا۔

"بڑا یقین ہے؟"

"ہاں! کیوں نہیں، جسے خود پہ یقین نہ ہو وہ بھی کوئی آدمی ہے بھلا۔؟"

"اور تمہاری بات سن کے مجھے بھی ایک بات پہ یقین ہو گیا ہے۔" کومل نے گہری سانس کھینچتے ہوئے کہا۔

"کیسا یقین۔؟"

"یہی کہ جس نے تم سے آج نظر نہیں ملائی وہ تم سے کل بھی نظر نہیں ملائے گی۔" کومل کے انداز میں یقین تھا جودت سن کر بے ساختہ ہنس دیا۔

"میں پرانے دور کی لڑکی کی بات نہیں کر رہا، آج کے دور کی لڑکی کی بات کر رہا ہوں۔"

"میں بھی آج کے دور کی لڑکی کی بات کر رہی ہوں، اگر وہ واقعی۔ نظر نہ ملانے والی شریف گھرانے کی لڑکی ہے تو۔" کومل نے اپنی بات پہ زور دے کر کہا۔

"غلط فہمی ہے آپ کی کومل آپا۔"

"تم خود ہی تو کہتے ہو کہ میری نظر بھی تیز ہے اور اندازہ بھی درست ہے؟" کومل نے اسے جتایا تھا۔

"ضروری نہیں کہ ہر بار درست ہی ہو؟" جودت ماننے کو تیار نہیں تھا۔

"او کے تو پھر ایسا کرنا جب وہ لڑکی تم سے نظر ملائے تم مجھے آکر ضرور بتانا۔" کومل نے اسے ہلکا پھلکا چیلنج دیا۔

"او کے منظور ہے۔"

"اگر نہ ملائے تب بے شک نہ بتانا۔" اس نے اپنی طرف سے جودت کے سامنے راستہ رکھا۔

"ہوں۔۔۔!" وہ صرف ہوں کر کے رہ گیا تھا۔

"اندر چلو گے؟" کومل نے اندر جانے کے لیے پر تولے۔

"ہوں! چلیں۔" وہ اس کے ساتھ ہی چل پڑا تھا۔

"تھوڑی دیر پہلے ثروت آنٹی تمہارا ہی پوچھ رہی تھیں۔"

"آپ نے کیا کہا؟"

"یہی کہ تم ابھی تک نہیں آئے۔" اس نے کندھے اچکائے۔

"پھر انہوں نے کیا کہا؟"

"تمہارے خیال میں کیا کہا ہو گا انہوں نے۔۔؟"

"برا بھلا۔"

"ہاہاہاہا۔" کومل اس کے جواب پہ یکدم کھلکھلا کے ہنسی تھی اور حویلی کی پر سکون، خاموش دیواریں اس کی ہنسی کی جگمگاہٹ سے چمک اٹھی تھیں سناٹے میں آواز کا شگاف پڑتا چلا گیا تھا۔

"تمہارا بھی اندازہ درست ہے۔" اس کی بات پہ جودت بھی ہنس پڑا تھا۔

"او کے گڈ نائٹ۔" سیڑھیوں کے قریب جا کر وہ رک گیا تھا کومل نے پلٹ کر اسے دیکھا ایک ہاتھ سیڑھیوں کے لکڑی سے بنے موٹے سے ستون پہ تھا اور ایک قدم پہلی سیڑھی پہ!

"کہاں جا رہے ہو اب؟"

"کچن میں۔"

"کیوں؟"

"بھئی! کھانا کھانے اور کیوں؟"

"جہاں سے آ رہے ہو، وہاں سے کھانا نہیں ملا؟" کومل نے خفگی سے کہا۔

"ملا تھا، لیکن میں نظر سے نظر ملانے کے چکر میں کھانا کھانا بھول گیا تھا۔ جب ہوش آیا، تب سارے مہمان کھانا کھا چکے تھے۔" جودت نے وجہ بتائی اور کومل خفگی سے گھورتی ہوئی اس کے پیچھے کچن میں ہی آ گئی۔

"بیٹھو! میں کھانا نکال دیتی ہوں۔" اس نے کرسی کی سمت اشارہ کیا اور خود فریج کی طرف بڑھ گئی۔

"آج کل کیا مصروفیات ہیں موصوف کی۔؟" جودت نے ریموٹ اٹھا کر کارنر میں رکھا ٹی وی آن کر لیا۔

"موصوف؟ کس کی بات کر رہے ہو؟" وہ فریج سے سالن کا ڈونگا نکال کے پلٹی تو جودت سے پوچھا تھا۔

"اس گھر میں صرف ایک ہی "موصوف" ہیں، باقی سب تو لڑکے لڑکیاں ہیں پیاری آپا۔" وہ چینل سرچ کرتے ہوئے لاپروائی سے کہہ رہا تھا۔

"مجھے ان کی مصروفیات کی کیا خبر۔۔۔؟ خبر تو تمہیں ہونی چاہیے، تم ان کے بھائی ہو۔" وہ اوون آن کرتے ہوئے بولی۔

"اب مجھ پہ اتنا برا وقت بھی نہیں آیا کہ میں اپنی گرل فرینڈز کو چھوڑ کر آپ کے موصوف کی خبر رکھنے لگوں، یہ کام آپ پہ ہی جچتا ہے۔"

"مجھ پہ کیوں جچتا ہے؟ میرا کیا تعلق ان سے؟" اس نے بے گانگی اور لاپروائی ظاہر کی۔

"اوے تعلق کیوں نہیں ہے؟ آخر کزن ہیں آپ کے۔"

"وہ صرف میرے ہی کزن نہیں ہیں، اور بھی بہت سے کزنز ہیں ان کے۔" وہ سالن گرم کر کے قریب آ گئی۔

"اوہ اچھا! تو آپ ان کو "صرف اپنا" دیکھنا چاہتی ہیں؟" جودت نے مطلب نکالا۔

"لیکن افسوس ایسا نہیں ہو سکتا، البتہ ایک حل ہے ان کو صرف اپنا دیکھنے کے لیے۔" وہ پلیٹ میں سالن نکالتے ہوئے مزے سے بولا، کومل اسے مسلسل گھور رہی تھی۔

"ان کے ساتھ رشتہ بدل لیں، کوئی نیا رشتہ استوار کریں پھر وہ صرف ایک کے۔"

"جودت! آرام ۔ اور خاموشی سے کھانا کھاؤ، رات کے اس پہر بھی تمہاری زبان ایسے چل رہی ہے جیسے دن ابھی شروع ہوا ہو۔" کومل نے اس کی بات درمیان میں ہی کاٹ دی۔

"کیوں کچھ غلط کہہ دیا میں نے؟" وہ معصومیت سے بولا۔

"کھانا کھا کر ٹی وی اور کچن بند کر دینا ورنہ صبح ڈانٹ پڑے گی، میں اب سونے کے لیے جا رہی ہوں۔" وہ کہہ کے باہر کی سمت چل دی۔

"یہ کہیے کہ میں اب جاگنے کے لیے جا رہی ہوں۔" اس نے پیچھے سے آواز دی۔

"اب ایسی بھی نوبت نہیں آئی کہ میں کسی کے لیے اپنی نیندیں قربان کرتی پھروں۔" کومل نے پلٹ کر اسے جواب دیا تھا۔

"آ جائے گی نوبت، فکر نہ کیجیے۔" وہ بلند آواز سے بولا اور کومل مسکرا کر سر جھٹکتی ہوئی باہر نکل گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"واؤ! بیوٹی فل۔" وہ روش پہ سلور کلر کی جگمگاتی کرولا دیکھ کر بے ساختہ خوش ہوئی تھی اور نبیل حیات اس کی خوشی دیکھ کر خوش ہو گیا تھا۔

"تھینکس گاڈ! تمہیں پسند تو آئی۔" اس نے سکون کا سانس لیا تھا۔
"میں اسے ڈرائیو کر سکتی ہوں۔" وہ گاڑی کے قریب آکر پوچھ رہی تھی۔
"وائے ناٹ۔" نبیل حیات نے ہاتھ میں پکڑی چابیوں میں سے ایک چابی نکال کر اس کی طرف بڑھادی۔
"واؤ! تھینک یو۔" وہ خوشی سے بہت نارمل ری ایکٹ کر رہی تھی۔
"یو ویلکم۔" نبیل بے ساختہ مسکرایا اور مدحیہ گاڑی کا ڈور کھول کر اندر بیٹھ گئی تھی۔
"کہاں جا رہی ہوں مدحیہ۔" فائزہ بیگم اچانک باہر آئی تھیں اور صبح صبح مدحیہ کو گاڑی اسٹارٹ کرتے دیکھ کر ٹھٹک گئیں۔
"لاہور کی سڑکوں پہ گاڑی اڑانے۔" اس نے شیشہ فولڈ کرتے ہوئے ماں کو جواب دیا۔
"لیکن اس وقت اس حلیے میں؟" انہوں نے تعجب سے پوچھا مدحیہ ابھی ابھی سو کر اٹھی تھی اس نے ابھی تک اپنا وائیٹ ڈھیلا ڈھالا ٹراؤزر اور بے بی پنک ہاف سلیو ٹاپ پہنا ہوا تھا۔ پیروں میں پنک کلر کی نرم سی قینچی چپل تھی اور سیاہ گھنے گھنگھریالے بال چہرے کا احاطہ کیے شانوں پہ بکھرے ہوئے تھے وہ اس کا حلیہ دیکھ کر جز بز ہو رہی تھیں۔
"کیوں اس حلیے کو کیا ہوا ہے؟" اس نے لاپروائی سے پوچھا۔
"لیکن مدحیہ! نائیٹ ڈریس نائیٹ ڈریس ہی ہوتا ہے۔ چینج کر لو پھر چلی جانا۔" فائزہ بیگم نے اسے ٹوکا تھا۔
"مام پلیز! میرے فریش موڈ کو خراب مت کریں، جینز اور ٹاپ کی بجائے ٹراؤزر اور ٹاپ پہننے میں کیا حرج ہے؟"
"مگر مدحیہ۔"
"پلیز مام۔" اس نے ماں کو روک دیا کہ وہ مزید اعتراض نہ کریں۔
"لیکن جا کہاں رہی ہو؟"
"دل آور بھائی کے گھر۔" اس نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔
"لیکن وہ تو گھر پہ نہیں ہے۔" اب کی بار نبیل نے جواب دیا تھا۔
"کیا مطلب؟ کہاں ہیں وہ۔؟" وہ ٹھٹکی۔
"وہ کراچی گیا ہے کسی کیس کے سلسلے میں، چند دن میں آجائے گا۔"
"مجھے تو نہیں بتایا انہوں نے۔؟"
"فون کیا تھا اس نے لیکن تمہارا نمبر بزی تھا اور اس کی فلائیٹ کا ٹائم بھی ہو چکا تھا۔"
"گئے کب ہیں؟"
"کل شام کو، آج شاید اس کے کیس کی پہلی پیشی ہے۔"
"ہوں! اوکے میں ان سے فون پہ بات کر لوں گی۔" وہ کہہ کے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے گاڑی نکال لے گئی تھی۔ اور جاتے جاتے ان دونوں کو ہاتھ بھی ہلایا تھا۔
لندن کی سڑکوں پہ تو اس نے بارہا ڈرائیونگ کی تھی لیکن آج اسے لاہور کی سڑکوں پہ ڈرائیونگ کرنے کا شوق ہو رہا تھا وہ بھی شاید اس لیے کہ نبیل، عبداللہ اور دل آور اسے کئی بار یہ بات بتا چکے تھے کہ پاکستان کی سڑکوں پہ ڈرائیونگ کرنا جان جوکھم میں ڈالنے والی بات ہوتی ہے کیونکہ یہاں ٹریفک کا کوئی نظام نہیں ہے، کوئی قانون نہیں ہے، اسی لیے تو پاکستان میں ایکسیڈنٹ زیادہ ہوتے ہیں۔ اسے راستوں کا صحیح پتا نہیں تھا اسی لیے تو گاڑی بے سمت دوڑا رہی تھی لیکن یونہی بے ارادہ ہی ایک بڑی سی سوئیٹس شاپ دیکھ کر اسے بھوک کا احساس ہوا اور ناشتے

کا خیال آیا تھا اور اسی خیال کے تحت اس نے گاڑی کو یکدم بریک لگائے تھے اس کی گاڑی کے ٹائر چرچرا کے رہ گئے۔ لیکن ساتھ ہی یکدم ایک "ٹھا" کی آواز کے ساتھ مدحیہ کی گاڑی ہل کے رہ گئی تھی خود مدحیہ ڈیش بورڈ سے ٹکراتے ٹکراتے بچی تھی۔ اس نے پیچھے گردن موڑ کر دیکھا کسی لڑکے نے اس کی گاڑی کو اپنی بائیک دے ماری تھی۔ وہ دیکھ کر غضب ناک ہوتی ہوئی خونخوار تیور لیے اپنی گاڑی سے نکل آئی اور گاڑی کے سامنے سے گھوم کر دندناتی ہوئی پیچھے کی طرف آئی تھی۔

"ایڈیٹ! اندھے ہوگئے ہو؟ تمہیں اتنی بڑی گاڑی دکھائی نہیں دی؟" سلو کی بائیک کو سنبھالتے عدیل نے اس تیز آواز پہ چونک کر اسے دیکھا۔ نظریں ٹھٹک گئی تھیں۔ اس کے سامنے غضب کا حسن تھا یا غضب کی جوانی تھی وہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا۔

"کیا اب تمہیں سنائی بھی نہیں دے رہا؟" وہ تلملا کر بولی تھی۔

"غلطی آپ کی ہے میم، میرا تو کوئی قصور نہیں ہے۔؟" عدیل نے معصومیت سے کہتے ہوئے کندھے اچکائے۔

"میری غلطی۔۔؟ تم ہوش میں تو ہو؟ میں نے کہا تھا کہ میری گاڑی کو بائیک دے مارو؟"

"میم! آپ نے یہ بات کہی نہیں ہے لیکن اس پہ عمل ضرور کیا ہے، بیچ سڑک میں اچانک بریک لگا دینا اپنے ایکسیڈنٹ کے ساتھ ساتھ کئی اور ایکسیڈنٹ کروانے کے مترادف ہے، ابھی تو شکر ہے کہ میرے پیچھے اور کوئی گاڑی نہیں آرہی تھی۔ ورنہ مجھے کچلتے ہوئے آپ کو بھی اڑا کے لے جاتی۔" عدیل نے اسے اچانک بریک لگانے کا نقصان بتایا۔

"مجھے ٹالو مت، تم نے میری گاڑی کا نقصان کیا ہے۔ نقصان پورا کرو۔" اس نے چٹکی بجا کے اسے اشارہ کیا تھا۔

"اور جو میرا نقصان ہوا ہے وہ کون پورا کرے گا۔؟" عدیل بائیک کو دیکھ کر بولا۔

"آئی ڈونٹ نو، لیکن میں تمہیں ایسے نہیں جانے دوں گی، میری نئی نکور، زیرو میٹر گاڑی برباد کر ڈالی ہے تم نے۔"

"آپ کو کس نے کہا تھا کہ زیرو میٹر گاری لے کر کے صبح صبح روڈ پہ آجائیں۔؟" عدیل آج خلاف مزاج بول رہا تھا۔

"مجھے زیرو میٹر گاڑی لے کر روڈ پہ آنے کے لیے کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ سمجھے تم؟" اس نے انگلی اٹھا کر غصے سے کہا تھا۔

"جی سمجھ گیا، آپ دیکھنے میں ہی خدائی فوجدار لگ رہی ہیں، آپ کو بھلا کس کی اجازت کی ضرورت ہے۔؟"

"اوہ یو شٹ اپ۔" وہ عدیل کے استہزائیہ انداز پہ سلگ اٹھی تھی۔

"کچھ اور نہیں کر سکتے تو بکواس بھی نہ کرو، میں تو تمہاری شکل دیکھ کر ہی پہچان گئی تھی کہ تم کتنے پانی میں ہو؟ بس بائیک پہ سوار خالی جیبیں لے کر ہیرو بنے پھر رہے ہو، میرا نقصان بھلا کہاں سے پورا کرو گے؟" مدحیہ نے اس کو شرمندہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

"آپ کی غلط فہمی ہے میم! میں بائیک پہ سوار ہیرو بننے کی ہرگز کوشش نہیں کر رہا تھا۔ بس یہ بائیک کسی سے ایک دن کے لیے ادھار مانگی تھی، وہی دینے جا رہا تھا کہ آپ بیچ میں آگئیں، ویسے جو کچھ آپ کہہ رہی ہیں اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں ہے، وہ کیا کہتے ہیں کہ خدا جب حسن دیتا ہے تو نزاکت آہی جاتی ہے۔ امیر لوگ غریبوں پہ غصہ بھی نہ کریں تو اور کیا کریں؟ پھر انہیں امیر کون کہے گا بھلا۔۔۔۔؟ اور انسان کے غصے کا کیا ہے، کہتے ہیں کہ انسان

کی تیوری کے تین بل تو نیند میں بھی نہیں جاتے، ہوش تو پھر ہوش ہے گویا انسان نیند میں ہو تب بھی غصے میں ہی رہتا ہے۔" عدیل نے اسے جواب دیا تو وہ دنگ رہ گئی تھی وہ بائیک اٹھا کر سیدھی کرنے لگا اور پھر اسے اسٹارٹ کرتے ہوئے سوار ہو گیا تھا۔

"ایم سوری میم میری جیبیں اس وقت واقعی خالی ہیں۔ اگر بھری ہوتیں تو آپ کا نقصان کھڑے کھڑے ہی پورا کر دیتا۔ خیر پھر کبھی ٹکرائیے گا تب آپ کا سارا نقصان پورا کر دوں گا اور آئندہ کوشش کروں گا کہ میری جیبیں بھری رہیں ورنہ کل کو آپ جیسی کوئی اور حسینہ غریبی کا طعنہ دے کر دھتکار دے گی۔" وہ بائیک لے کر اس کے پاس سے گزر کر آگے بڑھ گیا تھا مدحیہ ہکا بکا کھڑی تھی ابھی اس نے اپنے قدم واپس موڑے ہی تھے کہ وہی بائیک اس کے قریب دوبارہ آرکی تھی۔

"ایک بات کہنا تو بھول ہی گیا کہ آپ بے شک لندن پلٹ ہیں لیکن اپنے لندن پلٹ ہونے کا یوں پرچار تو مت کیجیے۔" اس نے مدحیہ کے ٹاپ کی طرف اشارہ کیا اس کا ٹاپ بے حد ٹائٹ تھا اور اس کے فرنٹ پہ بڑے بڑے حروف میں یو کے لکھا ہوا تھا جو دیکھنے والے کو پہلی نظر میں ہی اپنی طرف متوجہ کر لیتا تھا جیسے عدیل کو کر گیا تھا لیکن وہ نظر چرا گیا تھا مگر یہ ضروری تو نہیں تھا کہ ہر دیکھنے والا نظر چرا لیتا؟

"در اصل یو کے تو پاکستانی بڑی مشکل سے دیکھ پاتے ہیں، لیکن اس یو کے کو ہر کوئی دیکھے گا، کسی کی نظر کو ویزے کی ضرورت نہیں پڑے گی، اس لیے احتیاط کیجیے۔ اللہ حافظ۔" وہ کہہ کے بائیک کو کک لگاتا ہوا ہو گیا اور مدحیہ غصے سے لال پڑ گئی تھی اس نے بل کھا کے اپنی ہی گاڑی کو ٹھوکر دے ماری تھی۔

"باسٹرڈ! سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو۔؟ ایڈیٹ۔" مارے غصے کے جو اس کے منہ میں آیا کہتی گئی۔

☆ ☆ ☆

کسی نئی جگہ پہ سونے کی وجہ سے رات بھر نیند کا تسلسل نہیں بن سکا تھا وقفے وقفے سے نیند ٹوٹتی رہی اسی لیے وہ فجر کے وقت ہی اٹھ گیا تھا ڈھیلے ڈھالے قدموں سے کوارٹر کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا تھا اس کا ارادہ بلڈنگ کے گیٹ تک جانے کا تھا اسی لیے دائیں سائیڈ میں بنے کوارٹرز اور وسیع لان عبور کر کے روش پہ آیا تو قدم تھم گئے تھے گاڑیوں کی لمبی قطار لگی ہوئی تھی اور اس قطار میں بلیک مرسیڈیز یوں جگمگا رہی تھی جیسے ابھی شو روم سے لا کر کھڑی کی ہو۔ اس کی چمک دمک ہی نرالی تھی۔

"یہ علیزے بی بی کی نئی گاڑی ہے، رات ہی شو روم سے آئی ہے، تم ہی نے یہ گاڑی ڈرائیو کرنی ہے۔" مبارک خان اس کے عقب سے نکل کر سامنے آیا تو اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تھا اور اسی لیے اس گاڑی کا تعارف کروا دیا تھا۔

"یعنی زیرو میٹر ڈرائیو کروں گا؟" منصور حسین مسکرا کر بولا۔

"بالکل جی عیش ہیں تمہارے۔" مبارک خان نے کندھے اچکائے۔

"پرائی چیز پہ عیش کیسے یار۔؟" اس نے گاڑی کی ونڈ اسکرین پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"بے شک پرائی ہے۔ لیکن اختیار تو تمہارا ہی چلے گا نا؟ تمہارے پاس رہے گی تو تمہاری ہی نظر آئے گی۔"

"چل یار دل کو بہلانے کے لیے خیال اچھا ہے۔" منصور حسین سر جھٹک کر ہنسا اور مبارک خان کے ساتھ گیٹ سے نکل آیا تھا۔

"السلام علیکم۔" چوکیدار عارف نے ان دونوں کو دیکھ کر سلام کیا تھا۔

"وعلیکم السلام! کیسے ہو؟" منصور حسین بڑی تمیز سے پوچھ رہا تھا۔

"ٹھیک ہوں۔" اس نے مختصر سا کہا۔

"لگتا ہے ناراض ہو مجھ سے۔؟" اس کی بات پہ مبارک خان مسکراہٹ دبا گیا تھا۔

"میں نے کیوں ناراض ہونا ہے بھلا؟" عارف نے کندھے اچکائے۔

"چلو جو بھی ہے ایسا کرو کہ پچھلی خفگی والی باتوں کو بھول کر آج سے دوستی کر لیتے ہیں' اب تو ہم لوگ نے ساتھ ہی رہنا ہے۔" منصور حسین نے عارف کے کندھے پہ ہاتھ رکھ دیا۔

"ہوں! یہ بھی اچھی بات ہے' عارف کر لو دوستی' منصور حسین دل کا برا نہیں ہے' بس غصے کا اور زبان کا تیز ہے۔" مبارک خان نے ہاں میں ہاں ملائی اور عارف نے جز بز ہوتے ہوئے' منصور حسین سے ہاتھ ملا لیا تھا۔

"شاباشا۔" مبارک خان نے اسے تھپکی دی۔

"مبارک خان.....!" آذر جاگنگ کے لیے نکلا تو گیٹ پہ آج پھر ان لوگوں کو کھڑے دیکھ کر ٹھٹک گیا تھا۔

"جی صاحب؟"

"یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے۔"

"کچھ نہیں صاحب' ابھی ابھی سو کر اٹھے ہیں تو باہر ذرا تازہ ہوا کھانے کے لیے آ گئے۔"

"تازہ ہوا کھانے کے لیے تم لوگوں کو گیٹ کے سوا کوئی اور جگہ نہیں ملی؟" اسے ان سب کا گیٹ پہ کھڑے ہونا اچھا نہیں لگا تھا۔

"صاحب ہم پارک تک جانے والے تھے کہ عارف کو دیکھ کر اس کے پاس رک گئے۔" مبارک خان صفائی پیش کر رہا تھا۔

"ٹھیک ہے جہاں جانا ہے جاؤ' لیکن یہاں لوفروں کی طرح کھڑے ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے' آس پاس کے لوگ دیکھیں گے تو کیا سوچیں گے۔؟" آذر نے اسے جھڑک دیا تھا۔

"جی صاحب ابھی چلے جاتے ہیں۔" مبارک خان نے سر جھکا کر کہا۔

"ہوں! جاؤ۔" اس نے سر ہلایا اور پھر ذرا ٹھہر کر انہیں دیکھا۔

"رکو! ادھر آؤ۔" اس نے ان دونوں کو ہاتھ کے اشارے سے قریب بلایا تھا۔

"تم کون ہو۔؟" آذر نے چند روز پہلے بھی اسے گیٹ پہ دیکھا تھا لیکن نام بھول گیا تھا۔

"جی! میں منصور حسین ہوں۔"

"کون منصور حسین؟"

"علیزے بی بی کا نیا ڈرائیور ہے یہ' منصور حسین۔" مبارک خان ہر بار اس کی مشکل آسان کر دیتا تھا۔

"علیزے کا ڈرائیور؟" آذر کو حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔

"لیکن علیزے کا ڈرائیور....." آذر کچھ کہتے کہتے رک گیا تھا۔

"بڑے صاحب نے اسے کام پہ رکھا ہے' علیزے بی بی کی حفاظت کے لیے پستول بھی دیا ہے۔"

"ہیں.....؟ یہ سب کیا چکر ہے؟" آذر سوچ میں پڑ گیا تھا۔

"ہم جائیں صاحب؟"

"ہوں۔" وہ محض سر ہلا کے رہ گیا تھا۔ منصور حسین اور مبارک خان چلے گئے جبکہ آذر جاگنگ پہ جانے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے اندر آ گیا تھا اس کا رخ آنی اور ڈیڈ کے کمرے کی طرف تھا۔ وہ دستک دے کر اجازت ملنے کا انتظار کرنے لگا۔

"یس کم ان۔" وقار آفندی کی آواز سنائی دی تھی آذر دروازہ دھکیل کر اندر آ گیا تھا۔

"السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام! خیریت تم اس وقت یہاں؟" انہیں صبح صبح آذر کو اپنے بیڈ روم میں دیکھ کر حیرانی ہوئی تھی۔

"جی خیریت ہی ہے' آپ آرام سے تیاری کر لیں' میں انتظار کر لیتا ہوں۔" وہ صوفے کی طرف بڑھ گیا۔

"میری تیاری ہوتی رہے گی۔ تم بتاؤ کیا مسئلہ ہے۔؟" وہ اپنا کوٹ اور ٹائی بیڈ پہ ڈال کے اس کے سامنے آ بیٹھے۔

"آپ نے علیزے کے لیے ڈرائیور رکھ لیا ہے؟"

"ہوں! رکھ لیا ہے۔"

"مطمئن ہیں آپ؟"

"آف کورس بیٹا' مطمئن ہوں تبھی تو رکھا ہے۔"

"لیکن ڈیڈ ایم سوری' میں مطمئن نہیں ہوں۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

"غیر مطمئن ہونے کی وجہ؟"

"بہت سی وجوہات ہو سکتی ہیں' آپ بس اسے فارغ کریں' ہم کوئی اور ڈرائیور رکھیں گے۔" آذر کے لہجے میں خفگی اور ناگواری تھی۔

"تو وہ وجوہات بیان کرو نا بیٹا' بغیر کسی ٹھوس وجہ کے میں اسے نہیں نکال سکتا' کام پہ رکھا ہے اسے' زبان دی ہے' کل سے آیا ہوا ہے' حویلی میں رات گزار چکا ہے' اب صبح اٹھ کر بغیر کسی وجہ کے میں اسے کہہ دوں کہ ہم تمہیں کام پہ نہیں رکھ سکتے' تم اپنا بوریا بستر سمیٹو اور چلتے پھرتے نظر آؤ' کیا یہ سب اچھا لگے گا۔؟" انہوں نے آذر کو سمجھانے کی کوشش کی اور آذر انہیں سمجھانے کی کوششوں میں تھا۔

"دیکھیے ڈیڈ! میں اتنے جوان جہان مرد کو کام پہ رکھنے کے حق میں نہیں ہوں گھر میں جوان بیٹیاں ہیں' اور علیزے..... کیا وہ اکیلی اس کے ساتھ آیا جایا کرے گی؟" اس کی ایک وجہ سن کر وقار آفندی بے ساختہ مسکرا دیئے تھے۔ انہیں اس کی بات سمجھ آ گئی تھی کہ اصل مسئلہ منصور حسین کی جوانی ہے.....!

"دیکھو بیٹا میں نے اسے اسی لیے کام پہ رکھا ہے کہ وہ "جوان جہان مرد" ہے' اگر خدانخواستہ پھر علیزے پہ کوئی حملہ ہو جاتا ہے تو وہ ڈٹ کر دشمن کا مقابلہ تو کر سکتا ہے نا؟ خیرو بابا بوڑھے اور کمزور تھے انہیں تو یہ بھی پتا نہیں چلا کہ حملہ آور ہی انہیں اٹھا کر ہسپتال لے جا رہا ہے' منصور حسین جوان اور بہادر مرد ہے' میں نے اس کی چند باتوں سے اسے جج کیا ہے وہ بے خوف اور نڈر ہے' مشکل وقت پڑ گیا تو جھکے گا نہیں' ڈٹ جائے گا' تم بے فکر رہو' رہی بات اس کے جوان ہونے کی تو ایک بات یاد رکھو' شریف اور ایماندار آدمی کا جوانی کبھی کچھ نہیں بگاڑ سکتی' اور وہ مجھے ایماندار لگا ہے۔" وقار آفندی نے آذر کو تفصیل سے سمجھاتے ہوئے تسلی دی تھی۔

"ڈیڈ! کسی کے ماتھے پہ نہیں لکھا ہوتا کہ وہ ایماندار ہے۔"

"لیکن بیٹا! ایماندار کی آنکھوں میں ضرور لکھا ہوتا ہے کہ وہ ایماندار ہے' ایماندار کی آنکھ کبھی نہیں جھکتی' میں نے منصور حسین کی نظر جھکتے ہوئے نہیں دیکھی۔"

"آپ اس کے اتنے حامی کیوں ہو رہے ہیں؟"

"بیٹا! اس کے خلاف ہونے کی وجہ بھی تو نہیں ہے؟"

"گویا آپ اسے کام سے نہیں نکالیں گے؟"

"یقیناً۔" ان کے جواب پہ آذر لب بھینچتے ہوئے کھڑا ہو گیا تھا۔

"مبارک خان کو کام پہ رکھتے ہوئے بھی تمہیں ایسے ہی وہم اور اعتراض ہوئے تھے اور آج وہی مبارک خان

ہے جس پہ ہمیں تمام ملازموں سے زیادہ اعتماد ہے اور اس کے بغیر ہمارے سارے کام ادھورے ہیں۔" وقار آفندی نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اس کا کندھا تھپکا تھا۔

"لیکن ڈیڈ۔"

"پلیز مائی سن! چند روز اس کا کام دیکھو، اس پہ چیک رکھو، پھر کچھ برا لگے تو بے شک کام سے نکال دینا، بس چند دن میری زبان کا پاس رہنے دو۔" انہوں نے کچھ اس انداز سے کہا کہ آذر مزید کچھ نہ کہہ سکا۔

"وقار! اتنا لیٹ کیوں ہو گئے ہیں آپ؟ ناشتا لگ چکا ہے، علیزے اور...." آسیہ آفندی اپنے دھیان میں بولتی ہوئی اندر آئی تھیں لیکن ان کے ساتھ آذر کو دیکھ کر رک گئی تھیں۔

"گڈ مارننگ۔" آذر نے آہستگی سے انہیں وش کیا۔

"ٹو یو مائی سن، کیا بات ہے تم اس وقت یہاں....؟" وہ صبح صبح اسے اپنے کمرے میں دیکھ کر پریشان ہوئی تھیں۔

"ڈونٹ وری! کسی کام سے آیا تھا، اوکے ڈیڈ چلتا ہوں اب۔" آذر نے آسیہ آفندی سے کہہ کر وقار آفندی سے کہا تھا۔

"اور ناشتا....؟" آسیہ آفندی نے پیچھے سے آواز دی۔

"جی میں آرہا ہوں بس شاور لے کر تیار ہو جاؤں۔" اس نے پلٹ کر جواب دیا اور باہر نکل گیا تھا۔

"وقار کیا بات ہے؟ کوئی پریشانی، کوئی مسئلہ ہے کیا؟" آسیہ آفندی کو بھی اب ہر وقت کھٹکا ہی لگا رہتا تھا۔

"ارے! اس نے تمہیں بتایا تو ہے کہ کوئی بات نہیں ہے، بس کسی کام سے آیا تھا۔" وہ اپنی ٹائی اٹھا کر آئینے کے سامنے آکھڑے ہوئے تھے، آج ان کی میٹنگ تھی اسی لیے کافی اہتمام سے تیار ہو رہے تھے۔

"آپ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں۔"

"اگر تم ایسا سمجھ رہی ہو تو ایسا ہی سہی۔" وہ ذرا متبسم سے انداز میں بولے تھے۔

"وقار! میں واقعی پریشان ہو رہی ہوں۔" انہوں نے خفگی سے کہا تھا۔

"مجھے حیرت ہو رہی ہے یہ دیکھ کر کہ وقار آفندی کی بیوی اتنی بے وقوف اور کم عقل بھی ہو سکتی ہے۔؟" وہ ٹائی کی ناٹ درست کرتے ہوئے آسیہ آفندی کی طرف پلٹے۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" وہ نا سمجھی سے دیکھ رہی تھیں۔

"کم عقل خاتون! اگر علیزے کے حوالے سے کوئی پریشانی والی بات ہوتی تو کیا میں تمہیں اس طرح بے فکر اور ریلیکس نظر آتا۔" انہوں نے آسیہ آفندی کے کندھوں پہ ہاتھ رکھ کر جس قدر پر سکون انداز میں کہا وہ واقعی مطمئن ہو گئی تھیں۔

"شکر ہے اللہ کا، ورنہ میں تو ڈر ہی گئی تھی۔"

"کم عقل جو ہو۔" وہ مسکرا کر بولے۔

"محبت کم عقل بنا دیتی ہے۔" آسیہ آفندی کہہ کر پیچھے پیٹ گئیں اور وہ مسکراتے ہوئے باہر نکل آئے تھے وہ پیچھے ان کا کوٹ اور بریف کیس بھی اٹھا کے نیچے لے آئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

وہ ویکیوم سے قالین اور کارپٹ صاف کر کے فارغ ہوئی ہی تھی کہ باہر ڈور بیل بجنے لگی، کچن میں جانے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے وہ مختصر سا کوریڈور عبور کر کے بیرونی مین ڈور کے پاس آگئی اور ہول سے دیکھتے ہوئے باہر جھانکا تھا۔ سامنے نگارش کا چہرا نظر آیا تھا زری کھل اٹھی تھی اس نے جھٹ سے دروازہ کھول دیا تھا۔

"بھابھی۔" اس نے نگارش کو اندر بھی نہ آنے دیا اور وہیں اس سے لپٹ گئی تھی۔

"اللہ خیر کرے کیا ہو گیا ہے؟ اتنی بے قرار کیوں؟" نگارش نے حیرانی سے اسے تھپکتے ہوئے پوچھا۔

"آئی ریئلی مس یو۔" زری نے بچوں کی طرح بڑی معصومیت سے اظہار کیا تھا۔

"ریئلی....؟" نگارش نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھا۔

"آف کورس۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"یقین تو نہیں آرہا۔" نگارش بے یقینی سے کہتی ہوئی اندر آگئی عبداللہ اسے گھر ڈراپ کر کے کام پہ چلا گیا تھا۔

"بے یقینی کی وجہ جان سکتی ہوں....؟"

"جو بندہ ہر وقت، ہر لمحہ، ہر آن کسی ایک کی یاد میں قید رہتا ہو، اس سے یہ توقع کیسے کی جا سکتی ہے کہ وہ کسی دوسرے کے لیے اس یاد کے حصار سے باہر آیا ہو گا؟ اسے ایک یاد سے فرصت ملے گی تو وہ دوسرے کو ٹائم دے گا نا؟" نگارش سچ ہی تو کہہ رہی تھی، لیکن جھوٹی تو زری بھی نہیں تھی۔ اس نے حقیقتاً اسے بہت مس کیا تھا۔

"یعنی میں آپ سے جھوٹ بول رہی ہوں....؟" زری کا انداز خفگی لیے ہوئے تھا۔

"خیر جھوٹ تو تم نہیں بول رہی، لیکن سچ ماننے پہ یہ دل آمادہ بھی نہیں ہے۔" نگارش نے کندھے اچکائے۔

"جائیے میں آپ سے نہیں بولتی۔" وہ ناراضی سے پلٹ کر کچن میں چلی گئی۔

"ارے میری جان! اس میں ناراضی والی کیا بات ہے؟ جو سچ ہے وہی تو کہا ہے، تم اسے یاد کرتی ہو تو اپنا آپ بھول جاتی ہو، پھر کیسے ممکن ہے کہ تمہاری یادوں کی راہ گزر سے ہم غریبوں کا بھی گزر ہو سکے....؟" نگارش نے آکر اس کے رخسار کو چھو کر اسے چھیڑا تھا۔

"ایسی بات نہیں ہے بھابھی، جو مقام آپ کا ہے، وہ صرف آپ کا ہے، محبت اپنی جگہ اور رشتے اپنی جگہ۔ اور ضروری نہیں کہ جس راہ گزر سے ایک گزرے اس سے دوسرا نہ گزرے، آخر راہ گزر کا نام کیا ہے؟ راہ گزر۔ یعنی اس سے کوئی بھی گزر سکتا ہے، سب کے لیے یکساں ہوتی ہے، آپ گزرو، وہ گزرے، کوئی اور گزرے، بس فرق اتنا ہے کہ کبھی کبھی کوئی گزرنے والا اپنے قدموں کی دھمک چھوڑ جاتا ہے وہ بھی ایسا ہی گزرنے والا ہے۔ جو اپنے قدموں کی دھمک چھوڑ گیا ہے۔" زری دھیمے سے بولی رہی تھی اور نگارش اس کی بات کی گہرائی میں کھو سی گئی تھی۔

"کتنا خوش قسمت ہے دل آور شاہ۔" نگارش کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔

"بھابھی....؟" زری یوں بہانگ دہل اس کا نام سن کر لرز گئی تھی۔

"کب تک چھپاؤ گی؟"

"جب تک وہ چھپے گا۔"

"وہ ساری عمر چھپے گا؟"

"تو میں ساری عمر چھپاؤں گی۔"

"زری کبھی گہرائی میں جا کر سوچا ہے تم نے کہ اگر کبھی خلاف آرزو کچھ ہو گیا تو؟" نگارش نے ڈرتے ہوئے سوال کیا تھا۔

"تو دینو موچی کی زلیخا ہی یاد ہے مجھے۔"

"پاگل ہو گئی ہو کیا؟"

"سیانے جب کسی سیانا سمجھنا چھوڑ دیتے ہیں تو وہ پاگل ہی ہو جاتا ہے۔" زری نے سر جھٹکا، نگارش اس کی بات پہ اسے دیکھتی رہ گئی۔

”تم ہوش میں تو ہو......؟“

”آپ جانتی بھی ہیں کہ جب وہ میرے حواسوں پہ طاری ہوتا ہے تو میرے ہوش میرے ساتھ نہیں رہتے۔“ وہ پلکیں سمیٹتے ہوئے ہلکے سے مسکرائی۔

”کسی سے اندھا دھند محبت کرتے ہوئے یہ بات بھی نظر میں رکھنی چاہیے کہ جس سے تم محبت کرتے ہو‘ وہ کس سے محبت کرتا ہے‘ آپ سے؟ یا آپ کے کسی رقیب سے؟“ نگارش نے سمجھانے کے لیے دلیل دی۔

”وہ میرے سوا کسی اور سے محبت نہیں کر سکتا۔“

”اتنا یقین کس بات پہ ہے؟“

”میں نے اس کی کاٹ دار آنکھوں کو کئی بار اپنے لیے جھکتے ہوئے دیکھا ہے۔“

”ہو سکتا ہے تمہارے احترام میں جھک جاتی ہوں۔؟“

”ہرگز نہیں! وہ میری محبت کے بوجھ سے جھک جاتی ہیں۔“

”تو پھر ابھی تک اس نے کوئی پیش رفت کیوں نہیں کی۔؟“ نگارش وہموں میں پڑی ہوئی تھی۔

”شاید اس لیے کہ اسے پتا ہے کہ زری صرف اسی کی ہے‘ جب بھی ہاتھ بڑھائے گا کھنچی چلی آئے گی۔“ آج زری کی سرشاری اس کے انگ انگ سے بول رہی تھی۔

”کیا بات ہے؟ میرے پیچھے کوئی خاص بات ہوئی ہے کیا؟“ نگارش اسے بغور دیکھتی ہوئی پاس چلی آئی تھی۔ زری نے بے ساختہ پلکیں جھکا لی تھیں۔

”آپ بیٹھیں میں آپ کے لیے چائے بناتی ہوں۔“ زری نے الیکٹرک کیٹل آن کرتے ہوئے کہا۔

”اوہ! یعنی واقعی کوئی بات ہوئی ہے؟“ نگارش کو سگنل مل گیا تھا۔

”کوئی بات نہیں ہوئی بھابھی جی۔“

”کوئی تو بات ہوئی ہے نند جی‘ سرخ ہونٹوں پہ گلابی تبسم محبوب کی کسی ادا کی نشانی معلوم ہوتا ہے‘ خاموش ہونٹوں پہ مسکراہٹ بے معنی نہیں ہوتی۔“ نگارش نے ٹھوڑی سے پکڑ کر اس کا چہرا سامنے کیا تھا۔ زری نہ پلکیں اٹھا سکی اور نہ ہی اپنی مسکراہٹ روک سکی تھی۔

”بتاؤ بھی۔“ اس نے اصرار کیا۔

”اس کا فون آیا تھا۔“

”ہیں۔؟“ نگارش اچھل پڑی تھی۔

”کب؟“

”دو دن پہلے۔“

”فون کس لیے آیا تھا؟ کیا کہا اس نے؟“

”کہا تو کچھ نہیں سوائے اس کے کہ مدحیہ مجھ سے بات کرنا چاہتی ہے۔“ وہ دھیمے سے بولی۔

”مدحیہ بات کرنا چاہتی ہے‘ کیا مطلب ہے اس کا؟“

”مدحیہ اور نبیل اس کے ساتھ ہی تھے‘ مدحیہ مجھ سے بات کرنا چاہتی تھی لیکن اس کے پاس اپنا سیل نہیں تھا اس لیے مدحیہ نے اس کے نمبر سے مجھے کال کی‘ اتنی دیر میرا سیل بجتا رہا اور اسکرین پہ اس کا نام جگمگاتا رہا‘ میں دیکھتی ہی رہی اور کال بند ہو گئی‘ پھر اس نے دوبارہ کال کی‘ میں نے ڈرتے ڈرتے ریسیو کی تو دوسری طرف وہی بھاری گمبھیر آواز تھی جو دل کے نہاں خانوں میں ہر لمحہ گونجتی رہتی ہے۔“ زری اس کا ذکر نہیں کرتی تھی ورد کرتی تھی ایک دن میں لاکھوں بار......!

”بس اتنی سی بات تھی......؟“ نگارش مایوس ہو گئی۔

”یہ اتنی سی بات ہے؟“

”تو اور کیا ہے؟“ نگارش گھور کے بولی۔

”بہت کچھ ہے میرے لیے‘ میں نے اس کی اور اس نے میری آواز تو سنی ہے نا؟“

”صرف آواز سنی ہے‘ بات تو نہیں کی نا؟“

”بات کا کیا ہے وہ تو ہم دن میں ہزاروں بار کرتے ہیں۔“ وہ آہستگی سے مسکرائی۔

”اف! ایک تو تم اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی پاگل کر دو گی۔“ نگارش نے اپنا ماتھا پیٹ لیا تھا۔

”بھابھی! محبت تو آپ نے بھی کی ہے‘ ایسا پاگل پن آپ پہ کیوں سوار نہیں ہوا۔“؟ وہ معصومیت سے سادگی سے پوچھ رہی تھی۔

”کیونکہ میں تمہاری جیسی بے وقوف نہیں تھی۔“

”میں بے وقوف ہوں؟“ زری آنکھیں پھیلا کر بولی۔

”تو سیانی کہاں سے ہو؟“

”یہاں سے۔“ اس نے اپنے دل پہ ہاتھ رکھ دیا۔

”اوکے اوکے تم جیتیں‘ میں ہاری‘ جلدی سے چائے لے آؤ‘ میرا سر درد کرنے لگا ہے۔“ نگارش اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہتی ہوئی باہر نکل گئی تھی اور زری اس کے انداز پہ یکدم کھلکھلا کر ہنسی تھی اور دو کپوں میں چائے انڈیل کر باہر اس کے پیچھے ہی چلی آئی تھی۔

”میری محبت کی تذکرے پہ ہی آپ کا سر درد کرنے لگا ہے؟“ وہ اسے کپ تھماتی ہوئی بولی۔

”تمہاری محبت آگے نہیں بڑھ رہی‘ بس یہی سوچ سوچ کر سر درد کرنے لگا ہے‘ کوئی نشوونما نہیں ہو رہی اس کی۔“ نگارش کی بات پہ زری کی ہنسی چھوٹ گئی تھی۔

”یہ کس چیز سے تشبیہ دے دی میری محبت کو۔“ اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

”بچے سے۔“ اس کا جواب مختصر تھا۔

”بچے سے؟“ زری کو اچنبھا ہوا۔

”بچہ پیدا ہوتا ہے‘ محبت بھی پیدا ہوتی ہے‘ بچہ آنکھیں کھولتا ہے تو دنیا کو دیکھتا ہے‘ محبت آنکھیں کھولتی ہے تو محبوب کو دیکھتی ہے‘ بچہ دنیا کو دیکھ کر روتا ہے‘ واویلا کرتا ہے‘ محبت محبوب کو دیکھ کر مسکراتی ہے‘ لجاتی ہے‘ پھر بچہ بڑا ہونے لگتا ہے‘ پھر محبت بھی بڑھنے لگتی ہے‘ بچہ سالوں میں بڑا ہوتا ہے‘ محبت دنوں میں بڑھتی ہے‘ دونوں کے قد نکلنے لگتے ہیں‘ پاؤں پاؤں چلنے لگتے ہیں‘ بچے کی ضدیں بڑھتی ہیں اور محبت کی خواہش بڑھتی ہیں دونوں کو دیکھو تو ایک جیسے ہی دکھائی دیتے ہیں‘ ضدی بھی اور معصوم بھی۔ بچوں کی نشوونما رک جائے تو ماؤں کو فکر ہو جاتی ہے‘ ڈاکٹرز کو دکھاتی ہیں‘ ان کی خوراک بڑھاتی ہیں۔ اسی لیے تم سے کہہ رہی ہوں تمہاری محبت کی نشوونما رکی ہوئی ہے‘ اس کو ڈاکٹر کو دکھاؤ اور خوراک بڑھاؤ۔“ نگارش نے اسے طویل مثال دی اور ساتھ میں مشورہ مفت......!

”کون ڈاکٹر۔؟“ زری نے ناسمجھی سے پوچھا۔

”ڈاکٹر دل آور شاہ۔“

”واٹ؟ ڈاکٹر دل آور شاہ؟“

”آف کورس یار‘ بے شک وہ وکیل ہے لیکن تمہارے مرض کا وہی ڈاکٹر ہے‘ اسے اپنی محبت کا مرض دکھاؤ‘ تکالیف بیان کرو‘ وہ خوراک بڑھا دے گا‘ باہمی مشورے سے بڑا فائدہ ہو گا تمہیں دیکھ لینا۔“

"بھابھی کیا کہنا چاہتی ہیں آپ؟"

"میں چاہتی ہوں کہ تمہارا علاج شروع کیا جائے۔"

"علاج۔۔۔؟"

"مطلب شادی۔" نگارش نے علاج کے لفظ کا مفہوم بتایا۔

"مگر بھابھی۔"

"بس کوئی اگر مگر نہیں' میں آج عبداللہ سے ضرور بات کروں گی۔"

"لیکن ابھی یہ سب مناسب نہیں ہے بھابھی۔" زری پریشان ہو اٹھی۔

"غیر مناسب بھی نہیں ہے' محبت کے کسی بھی معاملے میں دیر نہیں کرنی چاہیے' تمہیں کیا پتا۔ محبوب کتنے جلد باز ہوتے ہیں۔؟"

نگارش نے اسے سمجھایا تھا۔

"مگر وہ بی جان اور بابا جان۔؟" زری متفکر تھی۔

"ان کو عبداللہ ہینڈل کرلیں گے' ڈونٹ وری' ٹرائی تو کرنے دو' عبداللہ بھلا اس معاملے میں کیا کہتے ہیں؟"

نگارش کی بات پہ وہ جز بز ہوتی' چپ ہو گئی تھی وہ مطمئن نہیں تھی جبکہ نگارش نے ارادہ باندھ لیا تھا۔

"بتول آنٹی سے بھی بات کروں گی۔"

"آپ ہوش میں تو ہیں؟ ان سے کیا بات کرنی ہے؟" وہ بدک گئی۔

"یہی کہ وہ بیٹے کی شادی کے معاملے میں ہاتھ پہ ہاتھ رکھے کیوں بیٹھی ہیں؟"

"بھابھی! ان کا بیٹا ہے' وہ بہتر جانتی ہوں گی کہ کب کیا کرنا ہے؟"

"ان کا بیٹا ہماری بیٹی کے دل کا چور ہے' ہمارا ہونے والا داماد ہے' ہم کیوں نہ بات کریں اس کے بارے میں؟"

تھوڑی دیر پہلے نگارش اسے سمجھا رہی تھی اور اب خود اس کے ساتھ مل کر سہانے خواب سجانے میں مدد کر رہی تھی۔ داماد کے لفظ پہ زری لال ہو گئی تھی۔

"اگر میں اپنے مشن میں کامیاب ہو گئی تو کیا انعام دو گی؟" نگارش شرارت اور معنی خیزی سے پوچھ رہی تھی۔

"اپنے دس تولے کے کنگن آپ کی کلائیوں میں سجا دوں گی۔" زری نے سرشاری سے کہا۔

"واؤ! پھر تو بیٹھے بیٹھے امیر ہو جاؤں گی۔" وہ شرارت سے ہنسی۔

"ویسے یار آپس کی بات ہے آج کل دس تولے کے کنگن کتنی مالیت کے ہوں گے۔" نگارش نے رازدارانہ انداز میں پوچھا اور زری اس کے انداز پہ ہنس پڑی تھی' نگارش اب پتا نہیں کیا کیا منصوبے بنا رہی تھی۔

آج صبح اس کی آنکھ ذرا دیر سے کھلی تھی اسی لیے نماز کا وقت لیٹ ہو گیا تھا لیکن پھر بھی وہ عجلت میں اٹھی اور سیدھی واش روم میں چلی گئی۔ جلدی جلدی وضو کیا اور قضا نماز ادا کرنے کھڑی ہو گئی تھی لیکن گہری نیند سے اچانک ہڑبڑا کر اٹھنے اور فوری طور پر وضو کرنے سے اس کی طبیعت پہ برا اثر پڑا تھا چند منٹوں میں ہی اسے چھینکیں شروع ہو گئی تھیں اور چھینکوں کے ساتھ زکام کے اثرات بھی اجاگر ہونے لگے تھے۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ یقیناً" تھوڑی دیر اور بستر میں لیٹ کر آرام کر لیتی' لیکن وہ پہلے ہی لیٹ اٹھی تھی اسے آج کالج بھی جانا تھا اس لیے مزید لیٹ ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا وہ جیسے تیسے ہی سہی کالج کے لیے تیار ہونے لگی تھی۔ یونیفارم پہنا' سینڈل پہنے' اسکارف لپیٹا' اپنا سارا بیگ چیک کیا اور پھر مطمئن ہو کر نیچے آگئی' لیکن چھینکوں نے ابھی بھی اس کا برا حال کر رکھا تھا کچھ ہی دیر میں آنکھیں اور ناک سرخ ہو گئی تھیں اور اس کی یہی حالت دیکھ کر ڈائننگ روم میں موجود تقریباً" سبھی افراد پریشان ہو گئے تھے۔

"کیا بات ہے بیٹا تم ٹھیک تو ہو؟" وقار آفندی اپنی کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"ڈونٹ وری پاپا! میں بالکل ٹھیک ہوں' بس وہ شاید ٹھنڈے پانی سے وضو کرنے کی وجہ سے فلو ہو گیا ہے۔" وہ ٹشو سے اپنی آنکھیں اور ناک پونچھتی ہوئی انہیں تسلی دے رہی تھی۔

"ٹھنڈے پانی سے کیوں؟ رجو نے گیزر آن نہیں کیا تھا؟ رجو! ادھر آؤ۔" وہ پریشانی سے غصے میں آگئے تھے۔

اٹس او کے پاپا' تھوڑی دیر میں ٹھیک ہو جاؤں گی' رجو کو گیزر آن کرنے سے میں نے ہی منع کیا تھا۔ موسم چینج ہو چکا ہے' اب گرم پانی اچھا نہیں لگتا۔" علیزے نے رجو کی بچت کرادی ورنہ واقعی اس کی شامت آجاتی' موسم چاہے جیسا بھی ہوتا علیزے کو زیادہ ٹھنڈا پانی سوٹ نہیں کرتا تھا اور رجو آج گیزر آن کرنا بھول گئی تھی۔

"ڈاکٹر کو بلالوں؟ میڈیسن سے جلدی ٹھیک ہو جاؤ گی؟" پریشانی ان کے چہرے سے ہویدا تھی۔

"پاپا! ایم فائن' پلیز کول ڈاؤن۔" اس نے ان کا بازو تھام لیا تھا۔

"بیٹھیے اور ناشتا کیجیے۔" اس نے انہیں کرسی پہ بٹھا دیا اور خود بھی کرسی کھینچ کے بیٹھ گئی تھی۔

"آج ناشتے میں جوس مت لو' ہاف بوائل انڈے کے ساتھ ڈرائی کیک یا شہد لے لو۔" وقار آفندی اپنا ناشتا بھول کر اس کے ناشتے کی فکر میں تھے۔

"نہیں! ملک شیک ہی ٹھیک ہے۔ آچھ" کہتے کہتے اسے چھینک بھی آگئی۔

"لیکن بیٹا۔۔۔؟"

"نو پاپا! پلیز موڈ نہیں ہے۔" اس نے لجاجت سے کہا اور پھر رجو کو ملک شیک لانے کا آرڈر دیا تھا۔

"جی ابھی لے کر آئی۔" رجو پلٹ گئی تھی۔

"اگر طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو کالج مت جاؤ' کل چلی جانا۔" آذر نے بھی لب کشائی کی تھی' کومل نے بے ساختہ پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا تھا وہ اسے دیکھ رہا تھا اس کا من جل اٹھا' روئیں روئیں میں کانٹے سے چبھنے لگے تھے۔

"نہیں! آج بہت اہم کلاسز ہیں' میں اپنی فرینڈ کو بتا چکی ہوں کہ آج میں کالج آرہی ہوں۔" اس نے انکار کر دیا۔

"تو پھر اپنا بہت سا خیال رکھنا بیٹا' چھوٹی سی تو ہو' ہمیں تو ڈر ہی لگا رہتا ہے۔" اسرار آفندی تاکید کرتے ہوئے مسکرا کر بولے تھے اور کومل وہاں سے جلتی بھنتی ہوئی سب سے پہلے اٹھ گئی تھی۔ اس کے بعد اسرار آفندی اور احمد بھی چلے گئے علیزے بھی جوس ختم کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"میں ڈراپ کر دیتا ہوں تمہیں۔" آذر نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"میں تھوڑی دیر کے لیے پک اینڈ ڈراپ لے کر اپنی عادت نہیں بگاڑ سکتی' میری گاڑی اور میرا ڈرائیور تیار ہیں میں چلی جاؤں گی' آپ فکر نہ کریں گڈ بائے۔" وہ آہستگی سے مسکرا کر کہتی ان سب کو ہاتھ ہلا کر باہر نکل آئی۔

"میرا بیگ۔۔۔؟" اس نے پلٹ کر رجو کو دیکھا۔

"جی! میں گاڑی میں رکھ آئی ہوں۔" اس کا بیگ گاڑی تک پہنچانے کی ذمہ داری بھی رجو کی تھی۔ علیزے سر ہلا کر کوریڈور کی سمت بڑھ گئی۔ طویل و عریض کوریڈور عبور کر کے باہر نکلی تو اپنی گاڑی کی تلاش میں نظر دوڑائی تھی اور بہت سی گاڑیوں میں بلیک مرسیڈیز اسے دور سے ہی نظر آگئی تھی وہ روش کا اتنا لمبا راؤنڈ لے کر گاڑی تک پہنچی اور گاڑی کا ڈور کھولنے کے لیے ڈرائیور کو متوجہ کیا تھا جو گاڑی کی چھت پہ بازو ٹکائے اس کی سمت پشت کیے جانے کس سوچ میں غرق تھا کہ آواز ہی نہ سن سکا۔ اور وہ دوبارہ پکارنے پہ مجبور ہوئی تھی۔

ڈرائیور۔۔!!

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ کریں)

نبیلہ عزیز

دردِ دل

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور عنیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدیحہ اور نبیل حیات دو ہی بہن بھائی ہیں، مدیحہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پر رنگ چکی ہے جس کے پیش نظر فائزہ بیگم نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں لیکن مدیحہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

ندی کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصے سے نوکری کی تلاش میں ہے مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا ہے، ہی اور مجبوری سے تنگ آ کر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باؤ امتیاز مل جاتا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے، اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے، وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ حویلی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے، وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے جس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا، اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔

11

گیارہویں قسط

علیزے کی آواز دوبارہ پکارنے کی وجہ سے ذرا تلخی لیے ہوئے تھی' جبکہ اپنی سوچ' اپنے دھیان میں گم منصور حسین نسوانی آواز پہ یکدم چونک کر پلٹا تھا اور گاڑی کی چھت کے اوپر سے ہی گاڑی کی دوسری سائیڈ میں کھڑی اس "پھولن دیوی" کو دیکھا جس کا ذکر وہ پچھلے کئی دنوں سے مبارک خان' وقار آفندی' آذر' آسیہ آفندی' چوکیدار اور خیرو بابا کے منہ سے سنتا آ رہا تھا اور اس ذکر میں اتنی شدت' اتنی محبت' اتنی عزت ہوتی تھی کہ کئی بار بلاوجہ ہی منصور حسین کا اسے دیکھنے کو دل چاہا تھا کہ آخر وہ چیز کیا ہے۔۔۔؟

اور آج۔۔۔ اس لمحے اسے یہ اعتراف کرنا پڑا تھا کہ وہ واقعی اس چیز کا حق رکھتی تھی کہ بڑی حویلی کا ہر فرد ہی اس کا ذکر کرتا اور اسے ہی چاہتا اور وقار آفندی اسے چھپا چھپا کے اور سینت سینت کے رکھتے اور ہر وقت انہیں اسی کی طرف سے دھڑکا لگا رہتا۔۔۔ یوں لگتا تھا جیسے اللہ نے اسے بڑی فرصت اور بڑے اہتمام سے بنایا تھا اور اسے بنانے کے بعد خوب صورتی کے تمام در بند کر دیے ہوں گے۔ دیکھ کر پہلی نظر میں ہی یہ احساس ہوتا تھا کہ جیسے اللہ نے دلکشی کا سارا خزانہ اسی پہ لٹا دیا ہو اور اس خزانے کی چمک دمک ہر دیکھنے والی آنکھ کو خیرہ کر ڈالتی تھی۔۔۔ اسے ٹھہر کر دیکھنے والے منصور حسین کا کوئی قصور نہیں تھا' بلکہ اسے جو بھی دیکھتا تھا اسی طرح زنجیر ہو جاتا تھا۔

"دروازہ کھولو۔" علیزے کے لہجے سے ناگواری جھلک رہی تھی اسے لوگوں کا اپنی طرف دیکھنا اور یوں ٹھہر کر دیکھنا سخت ناگوار گزرتا تھا۔

"ڈرائیور! میں نے کہا دروازہ کھولو۔" علیزے نے اسے متوجہ نہ ہوتے دیکھ کر خفگی سے جھنجلا کر کہا تھا۔

"کون سا دروازہ؟" منصور حسین کے منہ سے بے ساختہ پھسلا۔

"گاڑی کا دروازہ" وہ زچ ہوتے ہوئے بولی۔

"اوہ اچھا! گاڑی کا۔" منصور حسین اچھی اور خوب صورت چیز دیکھ کر خوش بھی ہوتا تھا اور سراہتا بھی تھا لیکن مرعوب اور فریفتہ نہیں ہوتا تھا چاہے وہ چیز کتنی ہی خاص کیوں نہ ہوتی؟ یہی وجہ تھی کہ وہ علیزے کو دیکھ کر خوش بھی ہوا تھا اور سراہا بھی تھا لیکن مرعوب اور فریفتہ نہیں ہوا تھا جبھی سر جھٹک کر سیدھا ہوا اور گھوم کر اس کی سائیڈ پہ آیا اور گاڑی کا بیک ڈور کھول دیا تھا۔

"پلیز!" اس نے مودب سے انداز میں علیزے کو بیٹھنے کا اشارہ کیا' علیزے اس کی سمت دیکھے بنا گاڑی میں بیٹھ گئی اور منصور حسین اس کی سائیڈ کا ڈور بند کر کے اپنی سائیڈ میں آیا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور جیسے ہی گاڑی اسٹارٹ کی تھی حویلی کا بڑا سا گیٹ فوراً ہی کھل گیا تھا گاڑی پانی میں تیرتی مچھلی کی طرح پھسلتی ہوئی گیٹ عبور کر گئی تھی۔۔۔ مرسیڈیز ڈرائیو کرتے ہوئے منصور حسین اپنے آپ کو کچھ سمجھ رہا تھا اور اسی سبب بہت مسرور بھی ہو رہا تھا ڈرائیونگ میں تو اسے ویسے ہی بہت مہارت تھی اسی لیے اسے کوئی پرابلم نہیں ہوئی تھی اتنی ٹریفک کے باوجود وہ گاڑی نکال لے گیا تھا وہ بہت سرشار اور خوش تھا ہوا لڑکی کے کالج کے گیٹ تک پہنچا تھا لیکن جیسے ہی اس نے بریک لگائے وہ یکدم ٹھٹک گیا تھا اس کے ساتھ ہی آذر آفندی کی گاڑی نے بھی بریک لگائے تھے۔

"صاحب! آپ یہاں؟" وہ گاڑی پارک کر کے نیچے اتر آیا تھا۔

اتنے میں آذر بھی اپنی گاڑی سے نیچے آ گیا۔

"کیوں میرے آنے پہ پابندی ہے؟" آذر نے اسے کچھ ناشناسا سی نظروں سے دیکھ کر پوچھا۔

"ارے نہیں صاحب پابندی کیوں ہے بھلا؟ ماشاء اللہ کر کے آؤ میں تو اس لیے کہہ رہا تھا کہ کوئی کام تھا تو مجھے ہی کہہ دیتے؟" منصور حسین نے کہا۔

"وہ کام تمہیں کہنے والا نہیں تھا' مجھے علیزے کے ٹیچرز سے ملنا ہے' اس لیے آنا پڑا۔"

"ہوں! یہ واقعی آپ والا کام ہے' پڑھے لکھے لوگوں والا' یہ میرے والا نہیں ہے۔" منصور حسین نے سر ہلاتے ہوئے کہا اور پھر علیزے کی سائیڈ کا دروازہ کھول دیا تھا وہ بھی نیچے اتر آئی تھی۔

"اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟" آذر نے چھوٹتے ہی علیزے سے اس کی طبیعت پوچھی تھی اور اس کے پوچھنے پہ بے ساختہ ہی منصور حسین کی نظر بھی علیزے کے چہرے پہ اٹھی تھی کہ آخر اس کی طبیعت کو کیا ہوا ہے؟ اس کی پلکیں جھکی ہوئی تھیں جس کی وجہ سے وہ اس کی آنکھوں کی سرخی اور نمی نہیں دیکھ سکا تھا جو زکام اور چھینکوں کی مرہون منت تھی البتہ چھوٹی سی ستواں ناک ہونٹ چہرے میں سرخ نظر آ رہی تھی۔

"کچھ بہتر ہوں اب۔۔۔" وہ آہستگی اور نرمی سے بولی تھی۔

"چلو اندر چلیں۔" آذر نے کالج کے گیٹ کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"آپ میرے ساتھ چلیں گے۔" وہ ٹھٹک گئی۔

"ہاں! ایسا ہی کام تھا۔"

"کس سے کام ہے آپ کو؟" وہ الجھن آمیز نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"تمہارے ٹیچرز سے۔"

"میرے ٹیچرز سے کیوں؟"

"علیزے! کیوں اتنے سوال کر رہی ہو؟"

"آپ مجھے صاف بتاتے کیوں نہیں۔" وہ پل میں پریشان نظر آنے لگی تھی۔

"کوئی خاص بات نہیں ہے میری جان' پلیز تم پریشان مت ہو' میں تو بس ایسے ہی چلا آیا ہوں۔" آذر نے علیزے کا ہاتھ تھامتے ہوئے نرمی سے اس کا رخسار تھپکا تھا اور چار قدم کے فاصلے پہ گاڑی سے اپنی پشت لگائے کھڑا منصور حسین حیرانی اور تعجب سے ان کی اتنی اپنائیت دیکھ رہا تھا۔

"آذر بھائی! مجھے پتا ہے آپ بلاوجہ نہیں آ سکتے ضرور کوئی بات ہے۔" علیزے چڑیا کا سا دل رکھتی تھی جو پل میں سہم بھی جاتا تھا اور خوف زدہ بھی ہو جاتا تھا وہ پریشانی سہہ نہیں پاتی تھی۔

"میری جان' میری جان! میں پہلے بھی تو تمہارے ٹیچرز سے کئی بار ملنے آیا ہوں؟ آج کوئی پہلی بار تو نہیں آیا؟"

"نہیں! آپ ہمیشہ اسی وقت ٹیچرز سے ملنے کے لیے آتے ہیں جب کوئی بات ہوتی ہے۔" وہ ماننے کو تیار نہیں تھی۔

"اف میری جان! کیوں اتنی پریشان ہو رہی ہو؟" آذر نے اسے ریلیکس کرنے کی کوشش کی۔

"کیونکہ آپ مجھ سے باتیں چھپاتے ہیں تاکہ میں پریشان نہ ہو جاؤں۔" آذر اس کی معصومیت پہ مسکرا دیا تھا آف وائیٹ اسکارف کے ہالے میں لپٹا اس کا چہرا ابھی بہت معصوم لگ رہا تھا آذر کو بے ساختہ اس پہ پیار آیا تھا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے' تم آؤ میرے ساتھ۔" وہ اسے کندھے سے تھام کے آگے بڑھا لیکن علیزے کی نظر بے ساختہ ہی روڈ کی اس سمت اٹھی تھی جس طرف اس کی گاڑی پہ فائرنگ ہوئی تھی اور ایک دم سے اس کی نظروں میں وہ منظر تازہ ہو گیا تھا اس نے بے اختیار آذر کا بازو دبوچ لیا تھا۔

"علیزے! کیا دیکھ رہی ہو؟" وہ اس کی زرد پڑتی رنگت بھانپ چکا تھا۔

"کک۔۔۔ کچھ نہیں۔۔۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی تھی۔

"اس طرف کیا ہے؟" آذر نے الجھ کر پوچھا۔

"وہ۔۔۔ وہ اس روز۔۔۔ فائرنگ۔۔۔ وہ خیرو بابا۔۔۔" اس کے الفاظ بے ربط ہو رہے تھے اور آذر اس کے خوف زدہ لہجے پہ گہری سانس کھینچ کے رہ گیا تھا اس نے اپنے قدم روک لیے تھے۔

"اس سے بہتر ہے کہ تم کالج کی بجائے گھر چلو، جب طبیعت اچھی طرح ٹھیک ہو گئی تب آجانا۔" اس نے علیزے کی حالت کے پیش نظر حل ڈھونڈا۔

"گھر...؟"

"ہاں، واپس گھر۔"

"نن... نہیں! واپس گھر نہیں، مجھے کلاسز اٹینڈ کرنی ہیں۔" اسے ایکدم سے اپنی کلاسز کا بھی خیال آگیا تھا۔

"کیا تم نے اس حالت میں کلاسز اٹینڈ کرنی ہیں؟" آذر نے اشارہ کیا۔ اس کی پیشانی پہ باریک سے ننھے موتیوں کی طرح پسینے کے قطرے چمک رہے تھے... علیزے نے بے ساختہ اپنی پیشانی کو چھو کر دیکھا تو انگلیوں کی پوریں نم ہو گئی تھیں، تب اس نے تیزی سے اپنے بیگ سے ٹشو نکالا اور اپنی پیشانی کے ساتھ ساتھ پورا چہرا ٹشو سے تھپتھپا ڈالا تھا اور ساتھ ہی اپنے اعصاب ڈھیلے چھوڑنے کی کوشش کی تھی۔

"ایم فائن۔" اس نے بڑی ہمت کر کے خود کو ریلیکس ظاہر کیا تھا۔

"او کے! تو پھر جاؤ۔"

"کیا مطلب؟ آپ نہیں آئیں گے؟"

"نہیں۔"

"کیوں...؟"

"تمہارے ٹیچرز سے پھر کبھی مل لوں گا، ابھی آفس سے لیٹ ہو رہا ہوں۔" اس نے اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن آذر بھائی..."

"ڈونٹ وری یار... تم جاؤ، میں تب تک یہیں کھڑا ہوں۔" آذر نے اسے بچوں کی طرح بہلا کر تسلی دی، اسے پتا تھا کہ علیزے پورا دن یہی سوچ سوچ کر پریشان ہوتی رہے گی کہ وہ اس کے ٹیچرز سے کیوں ملنے کے لیے آیا ہے... اس لیے یہی بہتر تھا کہ وہ آج ٹیچرز سے ملنے کا ارادہ ملتوی کر دیتا سو اس نے کر دیا تھا۔ وہ چند سیکنڈز کھڑی اسے دیکھتی رہی پھر سر جھکا کر دل کڑا کر کے تیز تیز قدم اٹھاتی گیٹ کے اندر غائب ہو گئی تھی اور آذر بھی چند سیکنڈز وہیں کھڑا رہا پھر پلٹ کر اپنی گاڑی کی سمت آگیا، لیکن گاڑی کا لاک کھولتے ہوئے منصور حسین پہ نظر پڑی تو وہ پلٹ کر اس کے قریب آگیا تھا۔

"سنو! منصور حسین..."

"جی صاحب جی حکم..." وہ فوراً گاڑی سے پشت ہٹا کر سیدھا ہوا تھا۔

"علیزے کا خیال رکھنا، اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" اس نے منصور حسین کو باقاعدہ قریب آکر تاکید کی تھی۔

"میں خیال کیسے رکھ سکتا ہوں صاحب... وہ کالج کے اندر ہیں اور میرا یہ خیال رکھنے کی ذمہ داری گیٹ کے باہر سے شروع ہوتی ہے۔" منصور حسین اپنی عادت سے مجبور تھا اس لیے کھرا کھرا جواب دیا تھا۔

"ہوں! یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو، لیکن میرے کہنے کا مطلب تھا کہ اگر اس کی طبیعت زیادہ خراب ہو، وہ تمہیں کال وغیرہ کرے تو تم اسے فوراً حویلی لے جانا، یا پھر میرے نمبر پہ اطلاع کر دینا۔" آذر نے تحمل سے اسے سمجھایا۔

"جی! بہتر ہے صاحب جیسے آپ کا حکم۔" اس نے مؤدب سے انداز میں سر خم کیا تھا۔

"اور ہاں... واپسی پہ تم اسے اوپر والے روڈ سے لے کر جانا، وہ اس راستے سے تھوڑی خوف زدہ ہو سکتی ہے کہ مزید پریشان ہو جائے، اس لیے بہتر ہے کہ چند روز اس راستے سے آنا جانا چھوڑ دیں۔" آذر دائیں

طرف کے روڈ کی سمت اشارہ کر رہا تھا۔

"ٹھیک ہے صاحب! لیکن صاحب ہم ابھی ابھی تو اسی روڈ سے گزر کے آئے ہیں؟" وہ حیرانی سے پوچھ رہا تھا۔

"وہ شاید بے دھیانی میں تھی اسی لیے اس نے نوٹس نہیں لیا، لیکن اب اس کا دھیان ہو چکا ہے وہ یونہی پریشان ہوتی رہے گی اس لیے بہتر ہے کہ ہم ہی کوئی احتیاط کر لیں۔" آذر سمجھداری سے کام لے رہا تھا۔ منصور حسین نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔

"ٹھیک ہے صاحب جی! آپ کا حکم، ہم آئندہ اوپر والے راستے سے ہی آیا جایا کروں گا۔" اس کے لب و لہجے میں سعادت مندی ڈھل چکی تھی۔

"ہوں! شاباش... یہ رکھ لو، پانی وغیرہ پی لینا۔" آذر نے جیب سے والٹ نکال کر دیکھا اور چند سرخ نوٹ احتیاط سے نکال کر منصور حسین کے ہاتھ پہ رکھ دیے، منصور حسین کی مضبوط چوڑی ہتھیلی پہ وہ نوٹ بہت چھوٹے لگ رہے تھے۔

"یہ کیا ہے صاحب...؟" وہ ان سرخ نوٹوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"آج کام پہ تمہارا پہلا دن ہے، یقیناً تمہارے پاس جیب خرچ بالکل بھی نہیں ہو گا، تنخواہ تو مہینے بعد ملے گی، پورا مہینہ کیسے گزرے گا؟" آذر نے پورے مہینے کا سوچ ڈالا تھا منصور حسین کو بڑی حیرت ہوئی تھی۔

"کیا اس سے پورا مہینہ گزر جائے گا؟" وہ اپنی ہتھیلی پہ رکھے نوٹ دیکھ کر بولا۔

"پورا مہینہ تو نہیں البتہ پورا دن ضرور گزر سکتا ہے، تم آج کا دن گزارو، کل کا دن کل دیکھا جائے گا۔" آذر اتنی نرمی بھی برت سکتا تھا یقین نہیں آرہا تھا۔

"لیکن صاحب یہ تو تنخواہ کے اوپر کے پیسے ہوئے نا؟ میں یہ نہیں لے سکتا، بڑے صاحب کو پتا چلے گا تو کیا سوچیں گے...؟ میں ایمانداری اور رزق حلال کی کمائی کمانا چاہتا ہوں۔" اس نے انکار کر دیا۔

"ارے یار! اس میں بے ایمانی کہاں سے آگئی؟ یہ میں اپنی خوشی سے دے رہا ہوں، جب تمہیں تنخواہ ملے گی تب نہیں دوں گا۔" آذر نے کندھے اچکاتے ہوئے اتنا اصرار کر رہا تھا مجبوراً منصور حسین کو وہ پیسے رکھنے پڑے تھے، آذر اللہ حافظ کہہ کر وہاں سے چلا گیا تھا اور وہ نوٹ دیکھتا رہ گیا۔

اسے واقعی بڑی حیرانی ہو رہی تھی کہ حویلی کے تمام فرد حقیقتاً اتنے اچھے ہیں؟ وقار آفندی سے لے کر آذر آفندی تک۔

* * *

سلو، جیدی اور چھوٹا ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی ورکشاپ میں آئے تھے اور آتے ہی ورکشاپ کی صفائی ستھرائی میں لگ گئے، کاٹھ کباڑ سے اٹا ورکشاپ صاف تو نہیں ہو سکتا تھا البتہ وہ ان حصوں کی جھاڑ پونچھ ضرور کر لیتے تھے جہاں انہوں نے دن بھر اٹھنا بیٹھنا ہوتا تھا، پلاسٹک کی کرسیاں پرانے کپڑے سے پونچھ کر رکھیں، جھاڑو دیا، کولر میں تازہ پانی بھر کے برف ڈالی اور کولر کو دوبارہ اس کے پرانے سے اسٹینڈ پہ رکھ دیا، اب اس کولر سے انہوں نے دن بھر پانی پی پی کر اپنی پیاس بجھانی تھی... وہ ابھی اپنے انہی چھوٹے موٹے کاموں میں مصروف تھے جب سلو کی بائیک سوار بدر علی ورکشاپ میں داخل ہوا تھا اور ورکشاپ کی بائیں دیوار کے ساتھ ہی بائیک کھڑی کر کے نیچے اتر آیا لیکن بائیک لاک کرنے کے بعد وہ ان کی طرف نہیں آیا تھا بلکہ وہیں کھڑا بائیک کو غور سے جانچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا اور وہ تینوں اس کی ایسی حرکت پہ اسے دیکھنے لگے... اگلے پانچ منٹ میں وہ ان کے پاس نہیں آیا تو وہ خود اس کے پاس چلے آئے تھے اور بڑی حیران نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

السلام علیکم استاد۔۔۔" ان تینوں نے کورس میں سلام کیا۔
"وعلیکم السلام" عدیل چونک اٹھا۔
"کیا بائیک کی داڑھی مونچھیں نکل آئی ہیں یا بائیک کو پر لگ گئے ہیں جو اتنے غور و فکر سے دیکھ رہے ہو۔" چھوٹے نے بائیک کو دیکھتے ہوئے حیرانی ظاہر کی۔
"بائیک کی داڑھی مونچھ نہیں نکلی بلکہ ٹوٹ گئی ہے۔" اس نے آہستگی سے جواب دیا۔
"کیا مطلب؟ کیا ٹوٹ گئی ہے؟" چھوٹا ناسمجھی سے بولا۔
"داڑھی مونچھ۔" عدیل نے بائیک کے سامنے والے حصے کی سمت اشارہ کیا، بائیک کی سامنے والی لائیٹ ٹوٹی ہوئی تھی۔ سلو کے ساتھ ساتھ چھوٹا بھی بدک گیا تھا آخر سلو سے بائیک چھوٹے نے ہی تو مانگی تھی وہ بھی اپنی گارنٹی پہ۔
"یہ کیا ہوا ہے۔۔۔؟" چھوٹا صدمے سے پوچھ رہا تھا۔
"ٹکر ہو گئی تھی۔"
"کس سے ٹکر ہو گئی تھی؟"
"ایک لڑکی سے"
"کیا؟ لڑکی سے؟" وہ تینوں کے تینوں اچھل پڑے تھے۔
"ہاں یار! لڑکی سے ہوئی ہے۔" عدیل بے دلی سے بولا۔
"کب؟ کیسے ہوئی؟" وہ بائیک کے نقصان کا صدمہ بھول کر اب اس لڑکی کے بارے میں بڑے اشتیاق سے پوچھ رہے تھے۔
"یار زیرو میٹر گاڑی تھی اس کے پاس، بڑی اسپیڈ سے جا رہی تھی، اچانک نجانے اسے کیا ہوا کہ اس نے بنا سوچے سمجھے ہی گاڑی کو بریک لگا دیے، میں اس کے پیچھے ہی جا رہا تھا مجھے پتا ہی نہ چلا کہ اس نے بریک لگا دیا ہے، میں نے بائیک کو بڑی مشکل سے کنٹرول کیا تھا لیکن پیچھے پیچھے بھی ٹکر ہو گئی۔" عدیل پریشانی سے بتا رہا تھا۔
"پھر کیا ہوا؟" سلو نے زبان کو کھولا۔
"پھر کیا ہونا تھا؟ الٹا وہ مجھ پہ گرم ہونے لگی کہ میں نے ٹکر ماری ہے، اپنی تو غلطی ہی نہیں مان رہی تھی۔" عدیل کو سوچ کر ایک بار پھر غصہ آ گیا۔
"وہ سچی تھی اور سچ گرم ہوتا ہی ہے، ٹکر تو تم نے ہی ماری تھی ناں استاد۔" چھوٹے نے مسکراتے ہوئے شرارت سے اسے آنکھ ماری۔
"مجھے کیا ضرورت تھی ٹکر مارنے کی؟ بریک تو اس نے لگائے تھے نا۔۔۔" عدیل نے صفائی دی۔
"وہ تھی کیسی۔۔۔؟" سلو نے پھر لب کشائی کی۔۔۔ عدیل نے چونک کر اس کی سمت دیکھا وہ بڑے کھوئے کھوئے سے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔
"وہ جنگلی بلا جیسی تھی۔" اس نے جل کر جواب دیا۔
"نہیں واقعی۔۔۔؟"
"دوبارہ ملی تو دکھاؤں گا تمہیں۔"
"استاد! یہ کیوں نہیں کہتے کہ دوبارہ دیکھی تو ملواؤں گا تمہیں؟" سلو نے خفگی سے کہا اور عدیل اس کے انداز پہ بے ساختہ مسکرا اٹھا تھا۔
"بہت ذلیل لوگ ہو تم، چلو کام کرو۔۔۔"

"کام کیسے کروں؟ مجھے تو اپنی اس منحوس بائیک پہ غصہ آ رہا ہے۔" سلو نے اپنی بائیک کو خونخوار نظروں سے دیکھا جیسے وہ کوئی جاندار چیز ہو۔
"کیوں؟ غصہ کیوں آ رہا ہے؟" عدیل نے ناسمجھی سے دیکھا۔
"پانچ سال ہو گئے ہیں مجھے اس منحوس کو چلاتے ہوئے مجال ہے جو کسی حسینہ کی گاڑی سے ٹکرائی ہو یا کوئی حسینہ اس سے ٹکرائی ہو۔۔۔ آج ایک دن کے لیے کسی کو دی تو جھٹ سے ٹکرا گئی، دل چاہ رہا ہے لوہے کا ڈنڈا اٹھاؤں اور سالی کو توڑ کے رکھ دوں۔" سلو نے غصے سے کہتے ہوئے بائیک کو پاؤں سے ٹھوکر ماری تھی اور وہ سبھی یکدم قہقہہ لگا کر ہنس پڑے تھے۔
"تو فکر نہ کر تجھے ڈنڈا میں لا کر دیتا ہوں۔" جیدی نے سلو کا کندھا تھپکا۔
"کیوں تجھے بڑی جلدی ہے؟" سلو گھور کے بولا۔
"تو اور کیا۔۔۔؟ میں نے سوچا شاید غصے میں تم کوئی اچھا کام ہی کر دو۔" جیدی نے کندھے اچکائے۔
"اس چیز کو توڑ پھوڑ دینا اچھا کام ہے کیا۔۔۔؟" سلو ہنوز اسے گھور رہا تھا۔
"بالکل اچھا کام ہے، اب دیکھو نا ہم لوگ روز سائیکل پہ آتے ہیں اور استاد خیر سے بسوں کے دھکے کھاتا ہوا آتا ہے جبکہ تو بڑے ٹھاٹھ سے بائیک پہ آتا ہے، کم بخت بائیک چلاتا بھی اتنی احتیاط سے ہے جیسے بائیک درود کر رہی ہو؟ کسی حسینہ سے ٹکرائے گی کیا خاک؟" جیدی نے کھڑے کھڑے سلو کے لتے لے ڈالے تھے۔
"تو کیا تیرا خیال ہے کہ کسی حسینہ سے ٹکرانے کے چکر میں خود ہسپتال پہنچ جاؤں۔" سلو نے برجستہ پوچھا۔
"تو یہ کہو ناں کہ بائیک چلاتے ہوئے ڈرتے ہو، بلکہ ڈر ڈر کے چلاتے ہو۔" جیدی نے اس کا مذاق اڑایا سلو لاجواب ہو گیا تھا۔
"دیکھ استاد! یہ جان بوجھ کر مجھ سے پنگا لے رہا ہے۔" سلو نے دھمکی آمیز لہجے میں کہتے ہوئے عدیل کو بھی درمیان میں گھسیٹا تھا۔
"بس بس یہ معاملہ یہیں ختم کرو اور چلو کام شروع کرو۔" عدیل نے بیچ بچاؤ کروانا چاہا۔
"آج کے لیے تو چھوڑ رہا ہوں لیکن آئندہ شکل بگاڑ دوں گا اگر کچھ کہا تو۔" سلو اپنی طرف سے تڑی دکھا رہا تھا وہ تینوں مسکراہٹ دبا گئے۔
"شکریہ جناب شکریہ! جان بخشی کے لیے شکریہ۔" جیدی نے ہنستے ہوئے آداب پیش کیا تھا۔
"جیدی! اینج جا تھے۔۔۔"
"بچ گیا ہوں جناب، تم بس یہ فکر کرو کہ تمہاری بائیک جس حسینہ سے ٹکرائی ہے وہ بھلا کیسی ہو گی؟ آخر زیرو میٹر ڈرائیو کر رہی تھی وہ۔۔۔؟ کسی امیر کبیر گھرانے کی ہو گی۔۔۔؟" جیدی نے سلو کی سوئی پھر دوسری سمت میں پھیر دی۔
"ارے ہاں استاد! بتاؤ نا کیسی تھی وہ حسینہ۔" وہ عدیل کی طرف متوجہ ہوا اور عدیل کی نظروں میں تھوڑی دیر پہلے ٹکرانے والی حسینہ (مدیحہ) کا سراپا گھوم گیا تھا اور اس کے سراپے کے ساتھ ساتھ اس کا حلیہ کچھ ایسا تھا کہ عدیل ان سب کے سامنے نقشہ نہیں کھینچ سکتا تھا۔
"کہاں استاد! سوچ میں پڑ گئے ہو۔" چھوٹے نے ٹہوکا دیا۔
"نہیں یار! کچھ نہیں، کام کرو اپنا۔۔۔"
"ہم نے تم سے کچھ پوچھا ہے استاد! کیسی تھی وہ حسینہ۔۔۔؟" وہ اصرار کرنے لگے۔
"ارے اچھا کیا پتا یار کیسی تھی وہ؟ اس نے مجھے کھری کھری سنائیں، میں نے اسے کھری کھری سنا دیں بس

بات ختم ہوا اپنے رستے اور میں اپنے رستے۔" اس نے نارمل سے انداز میں کہتے ہوئے کندھے اچکا دیے تھے۔

"وہ اس طرح بات ختم کیسے ہوتی ہے استاد.... اس طرح تو بات شروع ہوتی ہے۔ تم اس کی کھری کھری باتوں کو یاد کرو گے اور وہ تمہاری کھری کھری باتوں کو سوچ کر چڑتی رہے گی' پھر تم اس کے رستے اور وہ تمہارے رستے۔ منزل دونوں کی ایک ہی ہو گی۔"

چھوٹے نے ان کی ملاقات بلکہ ٹکراؤ کا سارا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا تھا۔

"بڑے خوش فہم ہو تم لوگ....؟" عدیل نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہتے ہوئے سر جھٹکا۔

"غریبوں کے پاس خوش فہمی کے علاوہ اور کچھ ہوتا بھی تو نہیں۔"

"لیکن یار! اتنی خوش فہمی بھی تو ٹھیک نہیں ہے ناکہ غریب کسی شہزادی کو اٹھا کر اپنی جھونپڑی میں سجانے کے خواب دیکھنے لگے۔" عدیل نے اعتراض کیا۔

"خدا اگر کسی غریب کی لڑکی کو اٹھا کر محل میں سجا سکتا ہے تو کسی شہزادی کو اٹھا کر جھونپڑی میں بھی بٹھا سکتا ہے۔"

چھوٹے کی بات پہ عدیل ٹھٹک کے رہ گیا تھا۔

"وہ وقت اور ہوتے تھے جب ایسے معجزے رونما ہوتے تھے' یہ وقت' یہ زمانہ اور ہے اب ایسا کچھ نہیں ہوتا۔" عدیل نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

"وہ وقت اور اس لیے ہوتے تھے کہ اس وقت لوگوں کا ایمان مضبوط ہوتا تھا' ایمان کو مضبوط رکھ کے اللہ سے کچھ مانگتے تھے تو اللہ کو مجبوراً کرنا ہی پڑتا تھا کیونکہ اس کے بندوں کا اس پہ ایمان مضبوط ہوتا تھا' یقین ہوتا تھا اللہ کی ذات پہ.... لیکن اب اس زمانے میں ایسا کچھ اس لیے نہیں ہوتا کہ اب لوگوں کے ایمان کمزور پڑ گئے ہیں' اللہ کی ذات پہ یقین اور بھروسہ نہیں رہا' اللہ سے کچھ مانگتے بھی ہیں تو بے یقین ہو کے.... تو پھر ایسے میں اللہ معجزے کرے بھی تو کس کے لیے....؟ کمزور ایمان والوں کے لیے....؟ بے یقین لوگوں کے لیے....؟ ان کے لیے جنہیں اس پہ بھروسہ ہی نہیں ہے؟"

چھوٹے نے بولنا کیا شروع کیا ان سب کی حیرت سے آنکھیں کھل گئی تھیں کہ اتنی بڑی بڑی اور گہری باتیں کرنے والا چھوٹا ہی ہے۔

"استاد! اس وقت کوئی غریب کسی شہزادی کو چاہتا تھا تو اپنی چاہت کی "حد" کر دیتا تھا یہاں تک کہ وہ شہزادی اپنا تخت و تاج چھوڑ کے اس کی جھونپڑی میں آنے پہ مجبور ہو جاتی تھی اور اسی طرح اگر کسی شہزادے کو محبت ہو جاتی تھی تو وہ اپنی محبت اپنے عشق میں مزدور بن جاتا تھا صرف ایک لڑکی کی خاطر.... غریب جھونپڑی والی لڑکی کی خاطر....." اس نے اک اک بات یوں بیان کی جیسے اس پہ سب بیت چکا ہو۔

"اوئے چھوٹے یہ عشق و محبت کی پٹی کہاں بیٹھ کے پڑھتا رہا ہے تو....؟" چیدے نے حیرانی سے پوچھا۔

"عشق و محبت کی پٹی اللہ سب کو ماں کے پیٹ سے ہی پڑھا کے بھیجتا ہے' بس اتنا ہے کہ کسی کو یہ پٹی زبانی یاد ہو جاتی ہے اور کوئی بھول جاتا ہے' مجھے یاد رہ گئی' اور تم بھول گئے....." چھوٹے نے لاپروائی سے کندھے اچکائے اور آگے بڑھنے لگا لیکن عدیل پہ نظر پڑی تو رک گیا تھا۔

"دیکھو استاد! شہزادی کو چاہو یا شہزادے کو لیکن اتنا چاہو کہ وہ اپنے مقام سے ہٹنے پہ مجبور ہو جائیں' خود چل کے تمہارے پاس آ جائیں....." چھوٹے نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"جب مجھے کسی کی چاہت ہوئی نا تو ضرور تم سے مشورہ کروں گا۔" عدیل نے بات کا رخ بدلنا چاہا۔

"مجھ سے مشورہ بے شک نہ کرنا لیکن ایک بار فرصت سے بیٹھ کر اپنے دل سے مشورہ ضرور کر لینا' دل نہ مانے تو دماغ سے رجوع کرنا.... اپنے دل و دماغ سے ایک میٹنگ ضرور رکھنا' اکثر چاہت اور محبت کے معاملے میں یہ

دونوں اک دوسرے کے خلاف ہو جاتے ہیں دونوں جنگ اختیار کر لیتے ہیں' اس لیے بہتر ہے کہ دونوں کو پہلے سے کنوینس کر لیا جائے۔" چھوٹا روانی سے بول رہا تھا عدیل نے چونک کر دیکھا۔

"تمہاری ایجوکیشن کیا ہے....؟" عدیل کو اس کی باتوں سے کچھ شک ہوا تھا۔

"یہ کیا ہوتا ہے؟" چھوٹا انجان بنتے ہوئے بولا۔

"تم جانتے ہو' یہ کیا ہوتا ہے؟" عدیل نے زور دے کر کہا۔

"جانتا ہوتا تو یہاں ہوتا....؟" اس نے ورکشاپ کی چار دیواری کی سمت اشارہ کر کے کہا۔

"میں بھی تو یہاں ہی ہوں....." عدیل نے اپنی مثال دی۔

آئے ہیں کتنے سکندر تم سے پہلے بھی یہاں
کہا گئی اپنی کفن کیسے کیسے آسماں

چھوٹا ہنستے ہوئے بلند آواز میں گنگناتا ہوا اس سے تھوڑا دور ہٹ گیا تھا۔ "یار چھپا کیوں رہے ہو؟ بتاؤ نا کیا ایجوکیشن ہے تمہاری....؟" عدیل کو تجسس ہو رہا تھا۔

"کیا فائدہ اس ایجوکیشن نامی چیز کا....؟ بس اس پاکستان میں یہ بھی کافی ہے کہ ایک ورکشاپ میں دن بھر کام کرو گاڑیوں کے پیچھے ٹھوکریں کھاؤ' ٹھوکریں مار مار کے مرمت کرو اور شام کو چار پیسے مل جائیں تو شرافت سے چپ کر کے بغیر گھر لے جاؤ اور گھر کو ان سے گھروالے پورا دن ان چار پیسوں کا بے صبری سے انتظار کرتے ہیں' نوبت کا روز فاقہ بھی تو کرنا ہوتا ہے پیٹ....؟" چھوٹا لاپروائی سے کہہ رہا تھا۔

"پھر بھی....."

"چھوڑ استاد! اس اگر مگر کو' تو میری ڈگری نہ پوچھ میں تیری ڈگری نہیں پوچھتا' بس چپ چاپ چل....." اس نے دونوں ہاتھ اٹھانے کے ساتھ ساتھ سر جھکا دیا تھا اور بالآخر عدیل کو بھی اس اصرار کا دامن چھوڑنا پڑا تھا البتہ اسے افسوس ضرور ہوا تھا۔ وہ تو سمجھتا تھا کہ اس کے ساتھ اچھا نہیں ہوا لیکن یہاں تو سب کے سب ہی قسمت کے مارے بے چارے رو رہے تھے' جس کو بھی ٹٹولا جاتا اسے ہی پر درد ہوتا تھا۔

❋ ❋ ❋

اس کی گاڑی دیکھ کر چوکیدار نے فوراً ہی گیٹ کھول دیا تھا گاڑی فراٹے بھرتی اندر آ رکی تھی.... اس نے بریک یوں لگائے کہ ٹائر پورے زور سے چرچرا کے رہ گئے تھے.... اور ٹائروں کی یہ چرچراہٹ اندر ڈائننگ روم تک پہنچ گئی تھی وہ گاڑی کا دروازہ دھڑام سے بند کرتی ہوئی اندر کی طرف بڑھی تھی وہ ابھی تک اندر ہی اندر کھول رہی تھی اور ابھی تک اس آدمی کو گالیوں سے نواز رہی تھی جس نے اس کی گاڑی سے بائیک کی ٹکر ماری تھی۔

"مدیحہ! کیا بات ہے؟ کیا ہوا ہے....؟" نبیل اپنا ناشتا ادھورا چھوڑ کے ڈائننگ روم سے نکل آیا تھا وہ کوریڈور کراس کر کے اوپر اپنے بیڈ روم میں جا رہی تھی۔

"کچھ نہیں ہوا۔" اس نے سر جھٹکا۔

"کچھ تو ہوا ہے....؟" نبیل اس کے چہرے کی سرخ رنگت سے ہی اس کے غصے کو بھانپ چکا تھا۔

"میں اپنے بیڈ روم میں جا رہی ہوں۔" وہ خفگی سے کہہ کر سیڑھیوں کی سمت بڑھی۔

"مدیحہ۔" نبیل نے دوبارہ اسے پیچھے سے آواز دی لیکن وہ رکی نہیں تھی سیدھی اوپر چلی گئی.... نبیل کا دل چاہا وہ اس کے پیچھے اوپر جائے لیکن اسے پتا تھا فی الحال وہ غصے میں ہے کوئی بات ہوئی بھی تو نہیں بتائے گی۔

"کیا بات ہے؟ اتنے پریشان کیوں ہو رہے ہو....؟ مدیحہ کہاں ہے؟" فائزہ بیگم بھی اس کے پیچھے آ کھڑی

ہو گئیں۔

"پتا نہیں کیا ہوا ہے؟ گھر سے تو ٹھیک ٹھاک گئی تھی واپسی پہ غصے میں لگ رہی ہے؟" نبیل نے اپنی پریشانی ظاہر کی۔

"تم نے پوچھا نہیں اس سے؟ کسی سے لڑ جھگڑ تو نہیں آئی....؟" قائرہ بیگم کو کسی اور خدشے نے ستایا تھا۔

"پوچھا تو ہے لیکن اس نے بتایا نہیں کہ کیا ہوا ہے؟" وہ متفکر ہو رہا تھا۔

"خیر جو بھی ہے پتا چل ہی جائے گا تم اپنا ناشتا کرو۔" انہوں نے اسے ڈائننگ روم میں چلنے کا اشارہ کیا تھا۔

"بس اب بھوک نہیں ہے' صرف جوس کا گلاس دے دیں۔" اس نے کھڑے کھڑے ان سے جوس مانگا تھا۔

"ہونہہ! اس لڑکی نے تو ہماری بھوک پیاس اڑا کے رکھ دی ہے' نہ وہاں چین لینے دیا' نہ یہاں چین لینے دے گی۔" انہوں نے جھنجلا کر کہتے ہوئے گلاس میں جوس انڈیلا اور نبیل کی سمت بڑھایا۔

"مام پلیز! اس کے سامنے ایسی باتیں نہ کیا کریں وہ اور بھی ضدی اور چڑچڑی ہو جاتی ہے۔"

"کیوں نہ کہوں؟ تم ہر وقت اسی کے لیے ہلکان اور پریشان ہوتے رہتے ہو اور وہ ہے کہ اسے پروا ہی نہیں ہوتی۔"

"کوئی بات نہیں مام' اس کا حق بنتا ہے کہ وہ اپنی ضدیں منوائے' مجھ سے چھوٹی ہے وہ۔" نبیل نے نرمی سے کہا۔

"اور ویسے بھی اگر میں اس پہ غصہ کروں گا تو تکلیف آپ کو ہی ہو گی' یاد ہے نا اس دن آپ ہی بیچ بچاؤ کرانے آ گئی تھیں۔" نبیل نے مسکراتے ہوئے انہیں وہ رات یاد دلائی جب وہ مدیحہ پہ غصہ ہو رہا تھا اس روز وہ نشے کی حالت میں گھر آئی تھی۔

"میں یہ تو نہیں کہتی کہ تم اس پہ ہاتھ اٹھاؤ' میں بس یہ چاہتی ہوں کہ تم اس پر اپنی گرفت مضبوط رکھو' اتنا مضبوط کہ وہ بغیر اجازت کے ایک قدم بھی نہ اٹھائے۔"

"ہاہاہا..... آپ ماں ہیں نا' اس لیے غصے میں بھی نرمی کا پہلو رکھنا چاہتی ہیں' اچھی ہے میری کوشش یہی ہے کہ میری گرفت اس پہ مضبوط رہے' لیکن اس مضبوط گرفت کے لیے غصہ کرنا ضروری نہیں ہے' اس کے لیے تو پیار بھی کافی ہو گا' آپ سے میں نے یہی تو سیکھا ہے' وہ گرفت رکھتا ہے لیکن پیار سے۔" نبیل نے مسکرا کے کہا۔

"ہوں! اچھی بات ہے۔" انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"او کے میں چلتا ہوں' تھوڑی دیر تک واپس آ جاؤں گا۔" وہ وال کلاک دیکھتے ہوئے بولا۔

"کہاں جا رہے ہو؟"

"بس اپنے کاروبار کے سلسلے میں کچھ معلومات اکٹھی کرنا چاہتا ہوں۔"

"اللہ تمہیں کامیاب کرے۔" انہوں نے بیٹے کو دعا دی اور وہ اللہ حافظ کہہ کر باہر نکل آیا تھا لیکن اپنی گاڑی نکالتے ہوئے اس کے ہاتھ ٹھٹک گئے تھے اس نے فوراً اپنی گاڑی کا شیشہ فولڈ کر کے مدیحہ کی گاڑی دیکھی تھی۔ اس کی گاڑی کی بیک سائیڈ پہ ڈینٹ پڑا ہوا تھا جسے دیکھ کر نبیل کی پیشانی پہ بل پڑ گئے تھے۔

"مدیحہ کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔" وہ پریشانی سے بڑبڑاتا ہوا اپنی گاڑی سے نکل آیا تھا اور اس کی گاڑی کو گھوم پھر کر آگے پیچھے سے دیکھا تھا اس کا پچھلا حصہ متاثر ہوا تھا نبیل بے ساختہ واپس گھر کے اندر چلا آیا تھا۔

"کیا ہوا بیٹا؟ واپس کیوں آ گئے؟" قائرہ بیگم اپنے بیڈ روم کی سمت جاتے ہوئے ٹھٹک کے رک گئیں۔

"مدیحہ سے کچھ کام ہے۔" اس نے سرسری سے انداز میں کہہ کر اپنی پریشانی ان سے چھپانی چاہی۔

"کیسا کام؟ خیریت تو ہے....؟" وہ پھر بھی اس کی پریشانی بھانپ گئی تھیں۔

"میں مدیحہ سے مل لوں' پھر بتاتا ہوں آپ کو۔" وہاں سے کہہ کر وہ اوپر آ گیا تھا مدیحہ کے بیڈ روم کے دروازے پہ دستک دی اور اجازت کا انتظار کرنے لگا' لیکن مدیحہ جس موڈ میں اپنے بیڈ روم میں آئی تھی اس میں اجازت ملنا دشوار تھا لہٰذا وہ ایک بار مزید دستک دینے کے بعد اندر چلا آیا تھا۔

"مدیحہ" اس نے نرمی سے اسے پکارا وہ صوفے پہ بیٹھی اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھامے لب بھینچ کر اپنا غصہ ضبط کرنے کی کوشش میں لگ رہی تھی..... نبیل خود ہی آگے بڑھ کے اس کے برابر ہی صوفے پہ بیٹھ گیا تھا۔

"اتنا غصہ کیوں آ رہا ہے تمہیں.....؟" وہ نرمی سے اس کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

"اتنا غصہ اس لیے آ رہا ہے کہ میرا آج ہی ایک خبیث کے ساتھ ایکسیڈنٹ....." مدیحہ کچھ کہتے کہتے یکدم رک گئی تھی اس نے دوبارہ لب بھینچ لیے تھے۔

"میں جانتا ہوں مدیحہ تمہارا ایکسیڈنٹ ہوا ہے' لیکن یہ تو بتاؤ ہوا کیسے ہے؟ تم خود تو خیریت سے ہو نا۔" نبیل اس کا سر تھپکتے ہوئے بولا' مدیحہ نے نبیل کے لہجے میں محبت اور اپنائیت بھرے انداز پہ ذرا کی ذرا چونک کر دیکھا تھا۔ نبیل کے چہرے پہ اس کو بے پناہ شفقت نظر آئی تھی وہ بھی چند لمحوں کے لیے خود بخود نرم پڑ گئی تھی۔

"ہوں! میں ٹھیک ہوں لیکن گاڑی کو نقصان ہوا ہے' ڈینٹ پڑ گیا ہے۔" اس نے متفکر سے انداز میں بتایا۔

"دیٹس او کے' اب ٹھیک ہو جائے گا' شکر ہے کہ تمہاری بچت ہو گئی۔" نبیل واقعی شکر ادا کر رہا تھا۔

"شکر ہے کہ میرے ہاتھوں اس ذلیل کی بچت ہو گئی' دو منٹ اور ٹھہرتا تو حلیہ بگاڑ کے رکھ دیتی' آئینہ اپنی شکل اور شناخت بھی بھول جاتا....." وہ تلملا کے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"ریلیکس' ریلیکس' کول ڈاؤن میری جان' یہ پاکستان ہے انگلینڈ نہیں کہ تم لوگ کسی کی غلطی پہ سب فرینڈز کے ساتھ مل کر کسی کی دھلائی کر دو' یہاں چھوٹی چھوٹی باتوں کا بھی بڑا دھیان رکھنا پڑتا ہے' ذرا سی بات ایشو بن جاتی ہے خصوصاً لڑکیوں کے معاملے تو کچھ زیادہ ہی اچھالے جاتے ہیں۔" نبیل نے اسے سمجھانا چاہا۔

"لیکن بھائی اس نے غلطی کی پھر بھی وہ اپنی غلطی ماننے کو تیار نہیں تھا' بلکہ اس نے تو مجھ سے سوری تک نہیں کیا۔" مدیحہ کو عدیل کی باتیں رہ رہ کر سلگا رہی تھیں بس اس کا جی چاہ رہا تھا وہ ایک بار پھر اس کے سامنے آ جاتا تو وہ اسے واقعی نوچ کھسوٹ ڈالتی' وہ اس وقت بھوکی شیرنی کی طرح چکرا رہی تھی۔

"غلطی کس کی تھی؟"

"اسی کی غلطی تھی بھائی۔"

"وہ کیسے.....؟"

"میں نے ایک سویٹس شاپ دیکھ کر بریک لگائے تھے اور اس نے پیچھے سے ٹکر دے ماری۔" اس نے غصے سے بتایا۔

"تم نے راستے میں بریک لگائے ہوں گے' اس لیے اس نے ٹکر دے ماری' تمہاری گاڑی کے پیچھے وہ بھی فل اسپیڈ سے آ رہا ہو گا..... جیسے ہی تمہاری گاڑی رکی وہ گاڑی سے ٹکرا گیا۔" نبیل نے نتیجہ اخذ کیا تھا' اس کا اندازہ درست تھا لیکن مدیحہ ماننے کو تیار نہیں تھی یا اس کے غصے کی اصل وجہ عدیل کی طنزیہ اور استہزائیہ باتیں تھیں۔

"اس طرح اس کی کوئی غلطی نہیں ہے' تمہیں بریک لگاتے ہوئے خود سوچنا چاہیے تھا اور دیکھنا چاہیے تھا کہ تم کہاں بریک لگا رہی ہو۔"

"مگر بھائی۔" وہ تلملا کے پلٹی۔

"چھوڑو میری جان' کسی زیادہ نقصان سے بچ گئے ہیں یہی بہت ہے' اللہ کا شکر ادا کرو۔" نبیل اپنی جگہ سے کھڑا

ہو گیا تھا۔

"تم تھوڑی دیر کے لیے فریش ہو کر نیچے چلی جاؤ ماما پریشان ہو رہی ہوں گی۔" وہ اسے سمجھا رہا تھا اور مدیحہ محض سر ہلا کے رہ گئی تھی۔ جیل اس کا سر تھپک کے باہر نکل گیا تھا وہ اپنے بیڈ روم کے بیچوں بیچ کھڑی رہی پھر بے ساختہ قدم اٹھاتی ہوئی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی اور آئینے میں نظر آتے اپنے سراپے کو دیکھا تھا اس کے سینے پہ بڑے بڑے حروف میں U.K لکھا تھا جو ٹاپ تنگ ہونے کی وجہ سے بے حد نمایاں ہو رہا تھا بلکہ اس کا تو پورا فگر ہی نمایاں ہو رہا تھا۔ مدیحہ کو بے ساختہ اس ٹاپ سے چڑ ہوئی تھی اور فوراً ڈریسنگ روم میں جا کر وہ ٹاپ چینج کیا اور پھر کچن میں جا کر اسے آگ لگا دی تھی۔ بے چارا U.K ٹکڑے ٹکڑے شعلوں کی نذر ہو گیا تھا وہ پاؤں پٹختی ہوئی وہاں سے نکل آئی تھی۔

غصہ ابھی بھی ہنوز تھا.....!

❋ ❋ ❋

اس نے گھر سے نکلتے ہی موبائل سے سائم کا نمبر ڈائل کیا تھا۔

"ہیلو۔" سائم کی جاگی سوئی سی آواز سنائی دی تھی۔

"ہائے..... "جوہت کی آواز سنجیدہ تھی۔

"تم.....؟" سائم اس کی آواز پہ ٹھٹکا۔

"ہاں میں..... "وہ دو ٹوک بول رہا تھا۔

"خیریت؟ اس وقت کیوں کال کی..... آج تو تمہارا یونیورسٹی سے آف ہے شاید.....؟" سائم کے لہجے میں حیرانی تھی۔

"میں تم سے ملنے تمہارے گھر آرہا ہوں۔"

"میرے گھر؟ اس وقت؟ مگر کیوں۔" سائم کو یقیناً اچنبھا ہوا تھا۔

"یہ سب آکر بتاؤں گا۔" اس نے مختصراً کہا۔

"لیکن جوہت اس وقت ممی ڈیڈی سب گھر پہ ہوتے ہیں تم....." سائم نے اسے روکنا چاہا تھا۔

"کچھ نہیں کہیں گے..... میں کوئی بہانا کر دوں گا....." جوہت نے اسے تسلی دی۔

سائم نے کچھ بھی سنے بغیر فون بند کر دیا اور اپنی ہیوی بائیک کی اسپیڈ بڑھا دی۔ اس کا رخ سائم کے گھر کی طرف تھا۔ آج یونیورسٹی سے آف تھا اس لیے وہ بھی اپنے اپنے گھروں میں ابھی تک آرام فرما رہے تھے لیکن جوہت کو ایسی بے چینی لاحق تھی کہ وہ رات بھر سو نہیں پایا تھا اور اگر تھوڑی دیر کے لیے آنکھ لگی بھی تھی تو وہ لڑکی اس کے خواب میں بھی چلی آئی تھی اور وہ بے چینی سے دوبارہ اٹھ بیٹھا تھا۔ اس کا موڈ آف ہو چکا تھا تو وہ دوسروں کا کیوں نہ کرتا.....؟ اگلے دس پندرہ منٹ میں وہ سائم کے گھر میں موجود تھا۔

"جوہت تم یہاں.....؟" فاطمہ یونیورسٹی کے لیے نکل رہی تھی جوہت کو یہاں دیکھ کر اپنی گاڑی کا ڈور کھولتے کھولتے رک گئی۔

"سائم سے ملنے آیا ہوں، میرے کچھ نوٹس رہ گئے تھے اس کے پاس آج یونیورسٹی سے آف ہے اس لیے سوچا کہ کچھ تیاری کر لوں۔"

"ماشاءاللہ بڑے لائق ہو گئے ہو۔" فاطمہ نے اسے سراہا تھا۔

"بس کچھ دیر کے لیے....." جوہت نے لقمہ دیا اور وہ یکدم کھلکھلا کے ہنسی تھی۔

"واقعی درست کہا۔"

"اپنی خوبیوں اور خامیوں سے اچھی طرح واقف ہوں اسی لیے۔"

"ہوں! انٹرسٹنگ۔" فاطمہ نے اسے سراہتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

"ایک بات کہوں آپ سے.....؟" جوہت رہ نہ سکا اور بے ساختہ کہہ گیا۔

"ہوں! کہو کیا کہنا ہے؟" فاطمہ نے اجازت دی لیکن جوہت سوچ میں پڑ گیا کہ اس سے مریم کے بارے میں کیا پوچھے..... اور کیسے پوچھے.....؟

"چپ کیوں ہو گئے؟ کہو نا کیا کہنا ہے.....؟" اس کی خاموشی دیکھ کر فاطمہ نے اسے پھر متوجہ کیا تھا۔

"کچھ نہیں کہنا آپ جائیں پھر کبھی سہی....." اس نے سر جھٹکا۔

"کیا کوئی خاص بات ہے؟" وہ اسے بغور دیکھنے لگی۔

جوہت نظریں پھیر کر ادھر ادھر دیکھنے لگا تھا۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے بس ابھی شاید مناسب وقت نہیں ہے جب ہو گا تب ضرور کہوں گا۔"

"اوکے ڈیئر! جیسے تمہاری مرضی تم سائم سے ملو اور میں یونیورسٹی کے لیے نکلتی ہوں کافی لیٹ ہو چکی ہوں تمہاری باتوں میں۔" فاطمہ موبائل پہ ٹائم دیکھتی ہوئی بولی اور جوہت فوراً سائیڈ پہ ہو گیا تھا۔

"اوکے بائے۔" وہ کہہ کے آگے بڑھ آیا، فاطمہ اپنی گاڑی اسٹارٹ کرنے لگی..... جوہت کا رخ سائم کے بیڈ روم کی طرف تھا وہ دعا کر رہا تھا کہ سائم کے ممی ڈیڈی سے ٹکراؤ نہ ہو ورنہ کچھ دیر ان کے پاس بھی رکنا پڑ جاتا لیکن دعا ابھی لبوں میں ہی تھی کہ سائم کی ممی نے پکار لیا۔

"جوہت بیٹا! خیریت صبح صبح کیسے آنا ہوا.....؟" ممی کو جوہت کے اتنی صبح آنے پہ حیرت اور تجسس ہو رہا تھا۔

"السلام علیکم۔" مجبوراً اس نے پلٹ کر سلام کیا تھا۔

"وعلیکم السلام! آؤ ناشتا کرو۔"

"نو تھینکس آنٹی، میں ذرا جلدی میں ہوں سائم سے اپنے نوٹس لینے آیا ہوں مجھے ضرورت تھی۔" اس نے اپنا بہانا دہرایا۔

"اوکے! سائم اپنے بیڈ روم میں ہو گا، لے لو جا کر، لیکن سنو تمہاری آنٹی کہاں ہوتی ہیں آج کل؟ بہت دنوں سے انہیں کہیں بھی نہیں دیکھا.....؟" انہوں نے آسیہ آفندی کے بارے میں پوچھا تھا۔

"آنٹی گھر پہ ہی ہوتی ہیں اگر کوئی خاص فنکشن یا پارٹی ہو تو ڈیڈ کے ساتھ چلی جاتی ہیں ورنہ ان کا زیادہ تر وقت گھر پہ ہی گزرتا ہے پورا دن کچن کا کام بھی وہ اپنی نگرانی میں کرواتی ہیں۔" جوہت کو ان کے سامنے اپنی آنٹی کی تعریف کرنے کا موقع مل گیا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ مسز بدر (سائم کی ممی) کافی سوشل ہیں ان کا زیادہ وقت گھر سے باہر اور پارٹیز میں گزرتا ہے جبکہ اپر کلاس کی تمام بیگمات سے ہٹ کے آسیہ آفندی ایسی نہیں تھیں ان میں اپر کلاس والی کوئی بات ہی نظر نہیں آتی تھی حالانکہ وہ شہر کے مشہور بزنس ٹائیکون وقار آفندی کی بیوی ہونے کا اعزاز رکھتی تھیں..... پھر بھی بہت سادہ اور حلیم طبع تھیں۔

"ہوں! اچھی بات ہے، ان سے کہنا مسز بدر آپ کو یاد کر رہی تھیں، کبھی ٹائم نکال کے ملیں ہم سے بھی۔" انہوں نے پیغام دیا۔

"جی کہہ دوں گا۔" جوہت اور ہونے لگا تھا۔

"اوکے جاؤ تم....."

"تھینک یو آنٹی۔" وہ اجازت ملتے ہی رفو چکر ہو گیا تھا اور اک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر سیڑھیاں پھلانگ گیا تھا۔

کہ مبادا کوئی اور نہ مل جائے۔

وہ کوئی بھی دستک دیے بغیر بے دھڑک اندر چلا آیا تھا۔ ساحم اپنے بیڈروم میں اے سی کی کولنگ میں مزے سے سو رہا تھا۔ جودت نے اس کے بیڈروم کا دروازہ اتنے زور سے بند کیا کہ ساحم کی ساتوں نسلیں جاگ گئی تھیں۔ وہ یکدم ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا تھا۔

"کیا ہوا...؟ کیا گر گیا ہے؟" ساحم کو بوکھلاہٹ اور نیند ٹوٹنے کی وجہ سے یہ بھی پتا نہ چلا کہ دروازہ بند ہوا ہے کچھ گرا نہیں ہے۔ ساحم نے آنکھیں پٹپٹا کے دیکھا پہلے دروازے کو پھر جودت کو اور رفتہ رفتہ ساری پچویشن سمجھ آگئی تھی۔

"او تو یہ تم نے دروازہ بند کیا ہے...؟"

"آف کورس میں آیا ہوں تو میں نے ہی بند کیا ہے۔" اس نے کندھے اچکائے اور فلور کشن کھینچ کے بیٹھ گیا تھا۔

"بہت ایڈیٹ ہو تم۔" ساحم غصے سے کہہ کر دوبارہ بیڈ پہ گر گیا تھا۔

"جانتا ہوں میں۔" اس نے اعتراف کیا۔

"اور کیا جانتے ہو؟" ساحم نے استہزائیہ پوچھا۔

"یہ کہ تم مجھ سے بھی زیادہ ایڈیٹ ہو۔" اس نے حساب برابر کیا۔

"تم بہت خبیث ہو۔" ساحم نے دوبارہ کہا۔

"نکو اب؟ صبح صبح کیوں نازل ہو گئے ہو... ایسی کیا آفت آگئی تھی۔" اس نے چڑ کر پوچھا تھا۔

"میرا تو دل چاہ رہا تھا کہ میں رات کو ہی نازل ہو جاتا۔"

"وہ کیوں...؟" وہ تیکھے انداز میں بولا۔

"کیوں کا جواب تم جانتے ہو۔" اس نے سکون سے جواب دیا۔

"یار میں کچھ بھی نہیں جانتا' نیند کی وجہ سے میرے اپنے حواس ٹھکانے پہ نہیں ہیں۔" ساحم جھنجلا رہا تھا۔

"اٹھ کر شاور لو' جب تمہارے حواس ٹھکانے پہ آجائیں پھر بات کریں گے۔" جودت نے باتھ روم کی طرف اشارہ کیا۔

"ایسی کیا خاص بات ہے۔" اب کی بار ساحم نے اسے بغور دیکھا تھا اور چند سیکنڈ مسلسل دیکھنے کے بعد یکدم اٹھ کے بیٹھ گیا تھا۔

"کسی لڑکی کا معاملہ ہے۔" وہ اس کے چہرے سے ہی معاملہ پہچان گیا تھا۔

"ہوں۔" اس نے بے حد آہستگی سے سر ہلایا۔

"کیا معاملہ ہے؟ کون ہے وہ لڑکی...؟" جودت فلور کشن پہ بیٹھا ہوا تھا اور ساحم بیڈ پہ' لیکن دونوں آمنے سامنے ہی بیٹھے ہوئے تھے۔

"تم جانتے ہو میں نہیں جانتا۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا... جودت تم کچھ..." ساحم کہتے کہتے ایک دم رک گیا تھا۔ اس کے ذہن میں اچانک جھماکا ہوا تھا اور رات والا سارا معاملہ ذہن کی اسکرین پہ روشن ہو گیا تھا۔

"تم... تم مریم کی بات کر رہے ہو۔" ساحم بے یقینی سے پوچھ رہا تھا۔

"ہوں' اکافی ذہین ہو۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"دیکھو جودت پلیز اس کا خیال دل سے نکال دو' وہ تمہارے ٹائپ کی لڑکی نہیں ہے۔ تم خوامخواہ اتنی جگہ پہ ٹانگ

اڑا رہے ہو' بڑی خواری ملے گی تمہیں۔" ساحم کی نیند ہوا ہو چکی تھی' وہ جودت کا مدعا سمجھ کر اسے سمجھانے بیٹھ گیا تھا۔

"وہ بہت خوب صورت ہے یار۔" جودت کا لہجہ بدل گیا تھا اس کی آواز میں ہلکے خمار کی جھلک تھی۔

"تمہارے لیے خوب صورت لڑکیوں کی کمی نہیں ہے' ایک سے بڑھ کر ایک مل سکتی ہے۔" ساحم نے باز رکھنا چاہا۔

"اس کی سیاہ آنکھوں میں دل رہ گیا میرا' وہی ڈھونڈ لانا ہے اب۔" جودت اس کے سنے بغیر بول رہا تھا۔

"تمہارا دل تو کئی آنکھوں میں رہتا ہے' کبھی کسی کی نیلی آنکھوں میں' کبھی کسی کی سبز آنکھوں میں' کبھی بھوری آنکھوں میں اور کبھی پو جھل آنکھوں میں' کہاں کہاں سے ڈھونڈو گے؟" ساحم زچ ہو رہا تھا۔

"پلیز یار ایسی مستیاں چھوڑ دو' تمہارا اور اس کا اسٹیٹس کہیں سے بھی میچ نہیں کرتا۔"

"تو میں کون سا اس سے شادی کر رہا ہوں جو اسٹیٹس کا فرق درمیان میں آئے گا۔" اس نے شانے اچکائے۔

"یعنی تم..." ساحم آگے کچھ نہ کہہ سکا اس کی آنکھیں تحیر سے پھیل گئی تھیں۔

"میں اسے صرف حاصل کرنا چاہتا ہوں' کل سے میری نیندیں اڑا کے رکھ دی ہیں اس نے۔" جودت نے کھل کے اظہار کیا تھا۔ ساحم بیڈ سے کھڑا ہو گیا تھا۔

"تم ہوش میں نہیں ہو' جاؤ مجھ سے بعد میں بات کرنا۔" ساحم سلیپر پہن کر باتھ روم کی سمت بڑھ گیا' انداز اکتایا ہوا تھا۔

"ساحم تمہیں پتا ہے کہ میں تمہیں بتائے بغیر بھی سب کچھ کر سکتا ہوں' لیکن پھر بھی میں چاہتا ہوں کہ تم میرا ساتھ دو' وہ لڑکی ایسی بھی کوئی افلاطون کی اولاد نہیں ہے کہ کسی لڑکے سے فرینڈشپ ہی نہ کرسکے' بس تم میری اس سے فرینڈشپ کروا دو' باقی اسے لائن پہ لانا میرا کام ہے۔" جودت اسے ایک غلط کام پہ اکسا رہا تھا لیکن ساحم اس کے لیے سب کچھ کر سکتا تھا مگر فاطمہ کی کسی دوست کے ساتھ دھوکا نہیں کر سکتا تھا۔ ساحم کے لیے مریم بھی فاطمہ جیسی ہی تھی' وہ کافی سالوں سے مریم کو جانتا تھا اور اس نے جب بھی مریم کو دیکھا عزت اور شرافت کے لبادے میں ہی دیکھا تھا اور اب وہ اس کے لبادے کو داغ دار نہیں کرسکتا تھا جبکہ جودت اسی کام پہ تلا ہوا تھا۔ ساحم اس کا ساتھ دینے سے انکاری تھا جبکہ جودت اپنی بات پہ بضد تھا۔

"آئیم سوری' میں اس معاملے میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا۔" اس نے صاف انکار کر دیا۔

"اوکے' ساتھ نہ دو لیکن اس کے گھر کا ایڈریس دے دو۔" جودت نے ایک اور سوال سامنے رکھا۔

"ہرگز نہیں! ایسا سوچنا بھی مت۔" ساحم کوئی بھی بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔

"ٹھیک ہے' صرف اتنا بتا دو کہ وہ کس ایریا میں رہتی ہے...؟" جودت بس اسے ڈھونڈنے کے لیے صرف ایک نشان چاہتا تھا۔

"میں تمہیں ایک لفظ تک نہیں بتا سکتا۔" وہ اپنی بات پہ قائم تھا۔

"اوکے' اوکے' کچھ مت بتاؤ' میں سب پتا کر لوں گا' لیکن اتنا یاد رکھنا کہ میں اگر کچھ کر گزرا تو تم مجھے روک نہیں پاؤ گے اور نہ ہی کوئی دوش دو گے۔" جودت انگلی اٹھا کے اسے وارننگ دے رہا تھا۔

"جودت تم غلط..."

"بس تم میرے دوست ہو یہی کافی ہے' مجھے سمجھانے کا یا پھر کوئی حق جتانے کا اختیار تم کھو چکے ہو۔" جودت اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا۔

"جودت میں نے کبھی پہلے تمہیں کسی کام سے روکا ہے؟ میں تو صرف اتنا کہہ رہا ہوں کہ وہ لڑکی ایسی نہیں ہے

تم کسی اور کے بارے میں سوچ لو میں ہر طرح سے تمہارا ساتھ دوں گا۔" صائم جھنجھلا کے اس کے سامنے آگیا تھا۔

"میں صرف مریم فاروق نیازی کے بارے میں سوچ رہا ہوں اور جب تک وہ مل نہیں جاتی اسی کے بارے میں سوچتا رہوں گا۔" جودت نے لفظ لفظ پہ زور دیا تھا صائم نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر وہ بات ختم کر گیا تھا۔
"گڈ نائٹ! اب میں تم سے اسی روز ملوں گا جب اس کے بارے میں مکمل انفارمیشن لے لوں۔" وہ کہہ کے باہر نکل گیا تھا۔

صائم اپنے کمرے کے وسط میں کھڑا پریشان سا چپ رہ گیا' اسے پتا تھا کہ جودت کتنا ضدی اور ہٹ دھرم ہے اپنی ضد میں آ کر وہ کبھی بھی کچھ بھی کر گزرتا تھا' اس نے آج تک جو کہا تھا وہ پورا کیا تھا۔ وہ بے حد نڈر اور بے خوف لڑکا تھا بس آغا اور وقار آفندی کے سامنے ان کی عزت اور احترام کے مارے اکثر چپ ہی رہتا تھا ورنہ اس نے آسانی سے کوئی بات مان لینا ہرگز نہیں سیکھا تھا۔۔۔ وہ خاصا منہ پھٹ اور بے باک بھی تھا دل کی بات دل میں ذرا کم ہی رکھتا تھا۔ جیسے اس وقت نہیں رکھ سکا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ کافی دیر تک بیٹھا اپنا ایک کیس اسٹڈی کرتا رہا اور جب نیند سر پہ سوار ہوئی تو بے ساختہ گھڑی دیکھی تھی۔۔۔ رات کے ڈیڑھ بجے کا ٹائم ہو رہا تھا اور صبح جلدی اٹھنے کے خیال سے اس کے دماغ پہ مزید تھکن سوار ہو گئی تھی اسی لیے سب کچھ سمیٹ کر احتیاط سے سائیڈ میں رکھا اور تکیہ درست کر کے سونے کی تیاری کرنے لگا۔۔۔ لیکن ابھی اسے سوئے ہوئے دس منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ اس کے سیل پہ وائبریشن ہونے لگی وہ اکثر سیل کو وائبریشن پہ ہی رکھتا تھا۔۔۔ اس نے جاگے سوئے سے انداز میں سیل اٹھا کر کان سے لگا لیا تھا۔
"یس ولی آور شاہ اسپیکنگ۔۔۔؟" بوجھل آواز میں بھی حد درجہ رعب تھا' تمکنت تھی' دبدبہ تھا۔
"جناب! نبیل حیات بات کر رہا ہوں۔" نبیل کی آواز پہ وہ چونک گیا تھا۔
"تم اس وقت کال کر رہے ہو؟" ولی آور کو اچنبھا ہوا تھا نیند سے اس کی آنکھیں سرخ ڈوروں سے بھری ہوئی تھیں۔
"فارغ ہی اس وقت ہوا ہوں اور ویسے بھی میں نے سوچا کہ کراچی میں لوگ اتنی جلدی نہیں سوتے اس لیے یقیناً تم بھی جاگ رہے ہو گے؟"
"جاگ رہا تھا دس پندرہ منٹ پہلے میں بھی جاگ رہا تھا' لیکن کیس اسٹڈی کرتے کرتے نیند آگئی۔" ولی آور ایک ہاتھ سے موبائل کان سے لگائے دوسرے ہاتھ سے آنکھوں کو مسلتے ہوئے تکیے کے بل اٹھ بیٹھا تھا۔
"اچھا تو پھر سو جاؤ۔" نبیل کو جیسے اس کی تھکن پہ رحم آگیا تھا۔
"ارے نہیں یار! تم بولو میں سن رہا ہوں۔" اس نے نبیل کو کال بند کرنے سے روکا۔
"میں نے صرف بولنے کے لیے فون نہیں کیا' باتیں کرنے کے لیے فون کیا ہے۔" نبیل نے زور دے کر کہا۔
"اوکے! باتیں ہی کروں گا' تم بولو تو سہی' باتوں کے لیے تمہید کیا باندھ رہے ہو۔" ولی آور نے ایک ہاتھ سے جگ سے گلاس میں پانی انڈیلا اور گلاس اٹھا کر منہ سے لگا لیا تھا' گلاس پانی پینے کے بعد اس نے سگریٹ کا پیکٹ اور ایش ٹرے اٹھا لیا تھا' ایک ہاتھ سے سگریٹ اٹھا کر ہونٹوں میں دبایا اور ایک ہاتھ سے ہی سگریٹ کو لائٹر سے شعلہ دکھا دیا تھا۔
"اسموکنگ کر رہے ہو۔" نبیل فوراً ہی پہچان گیا تھا۔

"ہوں! نیند کو بھگانے کا آسان طریقہ ہے' تم سے بات بھی تو کرنی ہے؟" وہ نبیل سے بات کرتے ہوئے نیم دراز سا بیٹھ گیا تھا۔
"اس چیز سے صرف نیند ہی نہیں بھاگتی لڑکیاں بھی بھاگتی ہیں۔" نبیل شرارت سے بولا ولی آور کے ہونٹوں کو بھی مسکراہٹ چھو گئی تھی۔
"یعنی سگریٹ لڑکیوں کے لیے 'سوتن' کا کام کرتی ہے۔" ولی آور انگلیوں میں دبے سگریٹ کو دیکھ کر مسکرایا اور نبیل بے ساختہ قہقہہ لگا کے ہنسا تھا۔
"سگریٹ سوتن اور شراب سوتیلی ثابت ہوتی ہے۔"
"اف یار بس کرو میرے پیٹ میں درد ہونے لگا ہے۔" نبیل نے ہنستے ہوئے اسے روکا۔
"بات تو تم نے ہی چھیڑی تھی نا۔" ولی آور ابھی بھی شرارت بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔
"اور تم نے حد کر دی۔"
"حد نہیں کی' 'حد' کا اندازہ لگایا ہے' ویسے یار آپس کی بات ہے لڑکیاں سگریٹ سے بھاگتی کیوں ہیں۔۔۔ اسموکنگ ہم کرتے ہیں بے زاری اور اکتاہٹ انہیں ہوتی ہے' وجہ۔۔۔؟" ولی آور کے بھرپور معنی خیز سوال کو سمجھتے ہوئے یکلخت ہی پھر نبیل کا قہقہہ بلند ہوا تھا وہ دونوں ہی اس بات سے بے حد محظوظ ہو رہے تھے۔
"جب شادی ہو گی تو بیوی سے پہلا سوال یہی پوچھوں گا۔" نبیل جی بھر کے انجوائے کر رہا تھا۔
"سگریٹ سلگا کے پوچھو گے یا بجھا کے۔۔۔؟" ولی آور نے لقمہ دیا۔
"بجھا کے پوچھوں گا' سلگا کے پوچھا تو وہ قریب نہیں آئے گی۔" نبیل نے خدشہ بیان کیا۔
"ٹھیک ہے تم بجھا کے پوچھنا' میں سلگا کے پوچھوں گا۔" ولی آور کی بات پہ ایک اور قہقہہ پڑا تھا۔
"تم واقعی سلگا کے پوچھنے والے آدمی ہو۔" نبیل کو ماننا پڑا۔
"گویا تم اعتراف کر رہے ہو کہ تم بجھا کے پوچھنے والے آدمی ہو۔" ولی آور نے چھیڑا تھا اسے۔
"میں نبیل حیات ہوں میری جان' ولی آور شاہ نہیں۔" نبیل نے اسے جتایا۔
"تم ولی آور شاہ ہو بھی نہیں سکتے میری جان' ولی آور شاہ بننے کے لیے بہت بڑا 'جگرا' چاہیے۔" ولی آور کے لہجے میں زمانے بھر کی تمکنت اتر آئی تھی۔
"واقعی ولی آور شاہ صرف ایک ہی ہے' کبھی کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔" نبیل نے کھلے دل سے اعتراف کیا تھا۔
"اچھا وے! تم یہ بتاؤ رات کے اس پہر کال کیوں کی ہے؟" ولی آور سر جھٹک کر سگریٹ کا کش لیتے ہوئے بولا گفتگو کا رخ یک خود بخود بدل دیا تھا۔
"تم سے کچھ ڈسکس کرنے کے لیے۔"
"کیا ڈسکس کرنا ہے؟" وہ سگریٹ پہ سگریٹ پھونک رہا تھا۔
"بزنس کے سلسلے میں کچھ ڈسکس کرنا ہے یار۔۔۔"
"ہوں! بولو میں سن رہا ہوں۔"
"یار جب سے میں تمہارے ساتھ شوروم گیا ہوں میری سوئی شوروم پہ ہی اٹکی ہوئی ہے۔"
"کیا مطلب؟ تم شوروم بنانا چاہتے ہو۔" ولی آور اس کی بات کا مفہوم سمجھ گیا تھا۔
"ہاں۔۔۔"
"پاگل ہو گئے ہو۔۔۔ تم اتنے اچھے بزنس مین ہو' اتنا وسیع کاروبار ہینڈل کرتے رہے ہو اور اب تم ایک شوروم پہ اکتفا کر کے بیٹھ جاؤ گے؟ گاڑیوں کی خرید و فروخت میں لگے رہو گے؟" ولی آور کو اس کا آئیڈیا کچھ خاص پسند

نہیں آیا تھا۔

"لیکن یار مجھے بہت شوق ہو رہا ہے شوروم بنانے کا۔" نبیل واقعی آج کل اسی شوق کا شکار تھا۔

"شوروم بنانا بہت آسان کام ہے یار' لیکن شوروم کی ساکھ بنانا بہت مشکل ہے جتنا عرصہ تمہیں اس کی ساکھ بنانے میں لگے گا اتنے عرصے میں تمہارا دیوالیہ ہو جائے گا۔

کام ایسا شروع کرو جو تمہیں شروعات میں ہی پرافٹ دینا شروع کر دے' تاکہ پاکستان میں تمہارے قدم جم جائیں اور جب تم جان لو گے کہ تمہارے قدم جم چکے ہیں تو پھر بے شک ایک چھوڑ کے دس شوروم بناتے رہنا۔" دل آور نے اسے اچھے طریقے سے سمجھایا' نبیل تذبذب کا شکار ہو گیا۔

"اگر ہمیں شوروم بنانے کی بجائے بنا بنایا مل جائے تو؟"

"پہیلی مت بجھاؤ' صاف بات کہو۔" دل آور بے حد سنجیدہ ہو رہا تھا۔

"صاف بات یہی ہے کہ دو تین دن پہلے میری ملاقات اکرام مجید سے ہوئی تھی۔" نبیل نے کہنا شروع کیا۔

"پھر....؟"

"پھر اس نے مجھے پہچان لیا تھا' تمہاری وجہ سے کافی پروٹوکول دے رہا تھا' چائے بھی پلائی' اس نے اور کچھ دیر بیٹھ کر باتیں بھی کرتا رہا۔"

"کیسی باتیں....؟"

"یہی شوروم کے سلسلے میں...."

"اچھا پھر....؟"

"پھر کیا یار؟ مجھے اس کی باتوں سے یہی لگا ہے کہ وہ شوروم چھوڑنا چاہتا ہے' اس لیے میں نے سوچا کہ اگر وہی شوروم میں خرید لوں تو....؟" نبیل نے اصل بات بتائی' دل آور لمحہ بھر کے لیے چپ ہوا' پھر بولنا شروع کیا۔

"دیکھو نبیل! تم جو بھی کام کرو اپنی مرضی سے کرو' میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالنا چاہتا' لیکن یہ بات میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ تمہارے ساتھ کوئی فراڈ ہو' تم پاکستان میں ابھی نئے نئے آئے ہو' تم یہاں کے کھاگ شکاریوں کو نہیں سمجھ سکتے' یہاں جو بھی مال دار اور معصوم آسامی نظر آئی ہے' لوگ اسے گھیرنے کے لیے بڑے بڑے جال پھینکتے ہیں' اکرام مجید تم سے مل چکا ہے اور وہ یہ بھی جان چکا ہے کہ تم کتنی بڑی آسامی ہو' اور دوسرے یہ کہ یہاں بالکل نئے اور انجان ہو' لیکن اکرام مجید ابھی یہ نہیں جانتا کہ وہ دل آور شاہ کے دوست کو گھیرنے کی کوشش کر رہا ہے' تمہارے ساتھ کوئی فراڈ کرے اس کی ایسی کی تیسی کر دوں گا.... تم اسے یہ نہ کہو کہ میں نے شوروم خریدنا ہے بلکہ تم اسے یہ کہو کہ دل آور شاہ نے یہ شوروم خریدنا ہے.... پھر دیکھنا کیا تاثرات ہوں گے اس کے۔" دل آور نے کہتے ہوئے سگریٹ مسل دیا تھا اور نبیل اس کی بات پہ مسکرا اٹھا۔

"یار یہ تو مجھے بھی پتا ہے کہ تمہارے ہوتے ہوئے میرے ساتھ کوئی بھی فراڈ نہیں کر سکتا۔" نبیل کے لہجے میں تفاخر اور یقین تھا۔

"دل آور...." نبیل نے اچانک پکارا۔

"ہوں....؟"

"میرے ذہن میں ایک آئیڈیا آیا ہے۔"

"ہوں! کہو۔"

"مجھے شوروم بنانے کا شوق ہو رہا ہے اور تمہیں بزنس کرنے کا.... کیوں نا ہم دونوں کام مل کر شروع کریں' پارٹنرشپ کے اصولوں پہ....؟"

"مطلب....؟"

"مطلب کہ تم اپنے شیئرز میرے ساتھ شوروم میں انویسٹ کرو اور میں تمہارے ساتھ بزنس میں انویسٹ کرتا ہوں۔" نبیل بہت پرجوش ہو رہا تھا۔

"وہ سب تو ٹھیک ہے یار لیکن تم جانتے ہو کہ میرا پروفیشن مجھے بزنس کو ٹائم دینے کی اجازت نہیں دیتا۔ بڑا مشکل ہو جاتا ہے زیادہ ٹائم نکالنا۔"

"ارے یار! تم کیوں پریشان ہوتے ہو؟ میں ہوں ناں سب سنبھالنے کے لیے میں بزنس کو ٹائم دوں گا اور تم شو روم کو۔" نبیل سارے پلان خود ہی بنائے جا رہا تھا اور بالآخر اس نے ولی آور کو قائل کر ہی لیا تھا۔

"اوکے یار! جیسے تمہاری مرضی، جو دل چاہتا ہے کرو لیکن کسی سے دھوکہ مت کھانا۔" وہ اسے سمجھا رہا تھا۔

"نہیں کھاؤں گا یار۔" نبیل مسکرایا۔

"خیر یہ بتاؤ مدیحہ اور آنٹی کیسی ہیں۔"

"ٹھیک ہیں یار، دو تین روز پہلے مدیحہ کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔"

"واٹ؟ ایکسیڈنٹ؟" ولی آور یکدم اٹھ بیٹھا۔

"ڈونٹ وری یار! زیادہ نقصان نہیں ہوا تھا شکر ہے کہ مدیحہ خود بچ گئی بس گاڑی پہ کچھ خراشیں آئی ہیں۔" نبیل نے اسے تسلی دی۔

"تو اسے ابھی اتنی جلدی ڈرائیو کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟" وہ خفگی سے کہہ رہا تھا۔

"نئی گاڑی دیکھ کر سب کو ڈرائیو کرنے کا شوق ہو ہی جاتا ہے۔" جواباً نبیل نے وجہ بتائی۔

"یار! انسان ہوش سے کام لیتا ہے جوش سے نہیں، سمجھانا اسے۔" ولی آور نے تاکید کی۔

"کچھ عرصہ اور گزار لو خود بخود سمجھ جائے گی۔"

"خیال رکھا کرو اس کا۔" ولی آور کے کہنے پہ نبیل مسکرا دیا۔

"مسکرا کیوں رہے ہو؟" وہ جان چکا تھا کہ نبیل مسکرا رہا ہے۔ ان لوگوں کے ایک دوسرے کے بارے میں اندازے اتنے درست ہوتے تھے کہ کوئی دیکھ لیتا تو حیران رہ جاتا۔ وہ تینوں دوست آپس میں ایک دوسرے کی حرکتیں آنکھیں بند کر کے بھی جان لیتے تھے۔

"تمہاری بات پہ مسکرایا ہوں۔"

"کس بات پہ؟" ولی آور نا سمجھی سے بولا۔

"خیال رکھنے والی بات پہ، یار! بھی کبھی بڑی حیرت ہوتی ہے کہ میں سب کا خیال رکھتا ہوں لیکن میرا خیال کوئی بھی نہیں رکھتا، تم بھی نہیں رکھتے۔" نبیل نے شکوہ کیا اور ولی آور چند ثانیے خاموش رہا پھر گہری سانس کھینچتے ہوئے بولا۔

"تمہیں کیا پتا۔ میں ہی تو تمہارا خیال رکھتا ہوں۔" ولی آور کا لہجہ عجیب سا ہو رہا تھا اس نے ایک نیا سگریٹ سلگا کر گہرا کش لیا اور دھواں فضا میں چھوڑ دیا، دھوئیں کے مرغولے اوپر اٹھتے چلے گئے تھے۔

"کیسے؟"

"یہ صرف اللہ جانتا ہے۔"

"ایسا کیا ہے جو میں نہیں جانتا۔" نبیل کو تجسس ہوا۔

"ایسا بہت کچھ ہے جو تم نہیں جانتے اور کبھی نہ جانو تو ہی بہتر ہوتا ہے۔" ولی آور نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔ "ولی آور سے اور سمندر سے بھی زیادہ گہرا ہے، کبھی کبھی دل چاہتا ہے تمہاری گہرائی کی کھوج لگاؤں لیکن ڈر لگتا ہے کہ ڈوب جاؤں گا۔" نبیل سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

تم ڈوبنے کے خیال سے ہی ڈر جاتے ہو اور ہم ڈوبنے کے خیال سے ہی ڈوب جاتے ہیں، بس تم ساحل پہ کھڑے تماشا دیکھتے رہو کہ اندر کیا ہو رہا ہے؟ سمندر پہ کیا گزر رہی ہے؟ کشتی پہ کیا گزرے گی؟ کشتی اور سمندر بھنور سے کیسے بچیں گے؟ بس دیکھتے جاؤ اس سمندر میں محبت والے بھی ڈوب جاؤ گے.....؟"

ولی آور کا لہجہ بھی عجیب تھا اور باتیں بھی عجیب تھیں۔ اس کا دھیان شاید اس "کشتی" کی سمت تھا جو بے دھیانی میں اس نے تھاشیں مارتے گہرے سمندر میں اتار دی تھی اور کنارے لگنے کا کوئی راستہ نہیں مل رہا تھا سمندر چاہتا تو پل میں اسے اپنی منہ زور لہروں کے بل بوتے پہ بہا لے جاتا لیکن نجانے کیا بات تھی کہ یہ سمندر بھی اس کشتی کی ہمت دیکھ رہا تھا جو بغیر کسی سہارے اور آس امید کے چل رہی تھی اور سمندر کبھی اس کشتی کو دیکھتا تھا کبھی ساحل پہ کھڑے تماشا دیکھنے والے اس لڑکی کو جو ڈوبنے کے خیال سے ہی ڈر جاتا تھا!

"کہاں کھو گئے ہو.....؟" نبیل کی آواز نے اسے گہری سوچ سے متوجہ کیا تھا۔

"جہاں تم کھونا چاہتے ہو۔" اس کی بات مبہم تھی۔

"میں کہاں کھونا چاہتا ہوں.....؟" نبیل کو حیرانی ہوئی۔

"یہ تو تمہیں پتا ہو گا کہ تم کہاں کھونا چاہتے ہو۔" ولی آور نے لاپروائی ظاہر کی۔

"بتاؤں تمہیں کہ میں کہاں کھونا چاہتا ہوں؟" نبیل بتانے پہ آمادہ ہوا۔

"نہیں ابھی اس سمت چھوڑو، نیند اور تھکن سے خاص پتا نہیں چلے گا مجھے، کبھی فرصت سے بتانا۔" ولی آور نے اسے روک دیا۔

"کبھی بھی نہ بتاؤں؟"

"کیا مطلب؟"

"مطلب کہ کبھی فرصت تو نہیں ملے گی۔"

"ارے ڈونٹ وری یار! مجھے واپس آنے دو پھر فرصت ہی فرصت ملے گی۔" ولی آور نے تسلی دی۔

"اوکے، انتظار کرتا ہوں۔"

"ضرور۔"

"ٹھیک ہے پھر تم آرام کرو میں فون بند کرتا ہوں، دوبارہ بات ہو گی۔" نبیل کو ٹائم کا احساس ہوا۔

"اب نیند کہاں.....؟"

"کیوں.....؟"

"نیند کا وقت گزر گیا یار....."

"پھر بھی کوشش تو کرو، صبح چھ، سات بجے تک تو آرام کر ہی لو گے۔" نبیل مشورہ دیا۔

"اوکے، کوشش کر کے دیکھ لیتے ہیں۔"

"اوکے تو پھر گڈ نائٹ۔" نبیل نرمی سے بولا۔

"مدیحہ کو میری طرف سے پیار دینا، جلدی فارغ ہو گیا تو اسے کال کروں گا۔"

"ٹھیک ہے جناب، آپ کا پیغام دے دوں گا۔"

"تھینک یو، اینڈ گڈ نائٹ۔" ولی آور نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا اور پھر اپنے دھیان میں سگریٹ پھونکتے ہوئے سوچوں کا رخ بدل گیا تھا۔ معاملہ سنگین تھا تو سوچیں بھی گہری تھیں۔

ہجر میں خون رلاتے ہو، کہاں ہوتے ہو؟
لوٹ کر کیوں نہیں آتے ہو، کہاں ہوتے ہو؟

جب بھی ملتا ہے کوئی شخص بہاروں جیسا؟
مجھ کو تم کیسے بھلاتے ہو' کہاں ہوتے ہو؟
سرد راتوں میں تمہیں کیسے بھلا سکتا ہوں؟
آگ سی دل میں لگاتے ہو' کہاں ہوتے ہو؟
مجھ سے بچھڑے ہو تو محبوب نظر ہو کس کے؟
آج کل کس کو ستاتے ہو' کہاں ہوتے ہو؟

"میں بتاؤں کہاں ہوتا ہے؟" نگارش بھابھی صوفے کے پیچھے کھڑی زری کے عقب سے اس کی گود میں رکھی شاعری پڑھ رہی تھی اور زری کو خبر ہی نہیں تھی جیسے ہی وہ بولی زری یکدم چونک گئی تھی۔
"بھابھی آپ۔۔۔؟" اس نے فوراً گردن موڑ کر اسے دیکھا۔
"کیوں میرے ہونے پہ کوئی اعتراض ہے؟" نگارش صوفے کی سائیڈ سے نکل کر سامنے آگئی تھی۔
"آپ ہمیشہ دبے پاؤں آتی ہیں؟ یا مجھے ہی خبر نہیں ہوتی۔۔۔" وہ تعجب سے پوچھ رہی تھی۔ نگارش اطمینان سے اس کے مقابل والے صوفے پہ بیٹھ گئی تھی۔
"تمہیں ہی خبر نہیں ہوتی۔۔۔ اور محبت کرنے والوں کی سب سے بڑی خوبی یہی ہوتی ہے کہ وہ ہر بات سے' ہر چیز سے بے خبر ہوتے ہیں تمہاری طرح۔" وہ سکون سے کہہ رہی تھی۔
"میں بے خبر ہوں۔"
"بالکل۔۔۔"
"وہ کیسے۔۔۔؟"
"وہ ایسے کہ تمہیں تو یہ سب ہی پتا نہیں ہوتا کہ دل میں آگ سی لگانے والا آج کل کہاں ہوتا ہے؟"
"کیا مطلب؟ کہاں ہوتا ہے؟" زری ہی جان سے چونک کر متوجہ ہوئی۔
"اپنے اس سوال سے ہی سمجھ جاؤ کہ تم بے خبر ہو۔" نگارش مسکرائی۔
"بتائیے نا بھابھی؟ کہاں ہے وہ۔" زری کے انگ انگ سے بے چینی پھوٹ پڑی تھی۔
"آج کل جناب کراچی میں ہوتے ہیں' کسی کیس کے سلسلے میں۔"
"آپ کو کس نے بتایا ہے؟"
"عبداللہ نے۔۔۔"
"کب۔۔۔؟" "ابھی تھوڑی دیر پہلے۔" "ان کی بات ہوئی ہے اس سے؟"
"ہاں! اس نے خود فون کیا تھا۔"
"اور کیا کہتا ہے۔۔۔؟"
"کہتا ہے میری طرف سے زری کو ایک ڈھیر سارا پیار دینا اور میں تمہیں وہی پیار دینے آئی ہوں۔" نگارش کے انداز میں شرارت تھی زری خفگی سے اسے گھورنے لگی۔
"یار! گھور کیوں رہی ہو؟ پیار دینے ہی تو آئی ہوں۔"
"تو تھینکس! مجھے ایسے پیار کی ضرورت نہیں ہے' اگر پیار دینا ہی ہے تو وہ خود آکر دے۔" کہتے ہوئے اس کا چہرہ گلابی پڑ گیا تھا۔
"ماشاءاللہ' ماشاءاللہ' ذرا چہرہ تو دیکھو اپنا۔" نگارش معنی خیز انداز سے دیکھ رہی تھی۔

"بھابھی پلیز! مجھے کنفیوژ تو مت کیا کریں۔"
"تو پھر کیا کروں۔"
"میری شادی کروا دیں۔" زری بھی شرارت سے بولی۔
"ہیں۔۔۔؟ سچی۔۔۔؟" نگارش اچھل پڑی۔
"تو کیا میں مذاق کر رہی ہوں۔" زری بھی اسی کے انداز میں بولی۔
"تو پھر میں بات کروں عبداللہ سے۔۔۔"
"اف! آپ کریں گی؟" وہ مصنوعی خفگی کا اظہار کر رہی تھی۔
"آج کروں گی' ابھی کروں گی' دیکھنا آپ۔" نگارش نے کمر کس لی تھی۔
"نگارش۔۔۔" عبداللہ نے ریلنگ کے قریب آتے ہوئے پکارا تھا۔
"جی۔۔۔ تمہیں چائے بنوانے کے لیے بھیجا تھا۔"
"سوری! میں زری کے پاس رک گئی' ابھی آ رہی ہوں۔" نگارش فوراً کھڑی ہو گئی تھی عبداللہ وہاں سے ہٹ کر بیڈ روم میں چلا گیا تھا۔
"آج مجھے تمہارے بھائی کے ارادے ٹھیک نہیں لگتے' شام سے ہی نگارش نگارش پکار رہے ہیں۔" نگارش نے شرارت سے کہا' زری کے چہرے پہ مسکراہٹ بکھر گئی۔
"اچھا ہے' آپ کی بولتی انہی کے پاس جا کے بند ہوگی۔"
"آج میری بولتی بند ہونے والی نہیں ہے۔"
"کیوں۔۔۔؟"
"آج تمہارے بھائی کا ارادہ کچھ اور ہے اور میرا ارادہ کچھ اور۔۔۔"
"آپ کا ارادہ کیا ہے؟"
"تمہارے حق میں بولنے کا۔"
"واٹ؟ یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟"
"ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں یار' یہ بڑا اچھا موقع ہوتا ہے بیویوں کے لیے کوئی بات کرنے کا' ہنڈرڈ پرسینٹ چانس ہوتے ہیں بات ماننے کے۔" نگارش ذومعنی بول رہی تھی لیکن زری ۔۔۔۔۔۔ نگارش کو باز رکھنا چاہتی تھی۔
"مگر بھابھی۔۔۔"
"چھوڑو یار! تم بھی نا بس' کچھ کرنے دو گی نہ ہی خود کچھ کرو گی؟" نگارش خفگی سے کہہ کر کچن میں گئی اور چائے بنانے لگی۔
چند منٹوں میں وہ چائے بنا کر واپس بھی آگئی۔
"او کے گڈ نائیٹ۔"
"بھابھی سنیے تو۔۔۔" زری نے روکا۔
"ابھی وقت نہیں ہے' تمہارے بھائی صاحب بہت بے چین ہو رہے ہوں گے' تمہاری بات بعد میں سنوں گی اپنے بیڈ روم میں جاؤ تو تمام لائٹس آف کر دو' شاباش' تم آرام سے بیٹھ کر شاعری پڑھتی رہو' باقی میں سنبھال لوں گی۔" نگارش جاتے جاتے اسے بچوں کی طرح پچکار گئی تھی اور زری پریشان سی دیکھتی رہ گئی۔۔۔
(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

☆ ☆

نبیلہ عزیز

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نبیل حیات دو ہی بہن بھائی ہیں، مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے، وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پہ رنگ چکی ہے، جس کے پیش نظر فائزہ بیگم، نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں، لیکن مدحیہ پاکستان جانے سے انکار کردیتی ہے، جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے، مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے، مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، بے بسی اور مجبوری سے تنگ آ کر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے، لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باؤ امتیاز مل جاتا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے، جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے، اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے، وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے، وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے، وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے، اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا، اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔

۱۲
بارہویں قسط

نگارش بیڈ روم کا دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوئی تو عبداللہ سامنے ہی بیڈ پہ بیٹھا اسی کا انتظار کرتا دکھائی دیا تھا۔ نگارش کے لبوں پہ دھیمی سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ وہ دروازہ بند کر کے بیڈ کے قریب آئی اور چائے کا کپ عبداللہ کی سمت بڑھا دیا تھا۔ لیکن عبداللہ نے کپ تھاما مگر اس کی کلائی سمیت۔

"آرام سے عبداللہ! چائے گر جائے گی۔" نگارش نے اسے روکا' لیکن وہ اسے گھور کے دیکھ رہا تھا۔

"میں ہمیشہ ہر معاملے میں آرام سے ہی پیش آتا ہوں' لیکن تم میرے اس آرام اور تحمل کا ناجائز فائدہ اٹھاتی ہو۔" وہ نگارش کے ہاتھ سے کپ لے کر بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ رکھ چکا تھا۔

"میں ناجائز فائدہ اٹھاتی ہوں؟ کیا مطلب ہے آپ کا؟" نگارش اپنی مسکراہٹ دبا کے بولی تھی۔

"جب بھی کسی کام سے جاتی ہو' واپس آنے کا نام نہیں لیتیں' اور اگر آتی بھی ہو تو دیر لگا کے۔" عبداللہ نے اسے آہستگی سے کھینچ کے بیڈ پہ بٹھا لیا تھا۔

"اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں ہے' بیڈ روم کے اندر آپ ہوتے ہیں اور بیڈ روم کے باہر آپ کی بہن ہوتی ہے اور ظاہر ہے میں نے تو دونوں کو ٹائم دینا ہے۔" اس نے لاپروائی سے کہتے ہوئے کندھے اچکائے۔

"ارے! اس میں اس کا کیا قصور ہے؟ وہ تو چار دن کی مہمان ہے' چند دنوں تک چلی جائے گی' تم اپنی بات کرو' تم کیا کرو گی پھر؟"

"پھر میں وہ ہی کروں گی جو آپ کہیں گے۔" وہ ہلکے سے مسکرائی۔

"عبداللہ! مجھے کچھ کہنا تھا آپ سے۔" اس نے بمشکل اپنے ہوش و حواس قابو میں رکھتے ہوئے کہا تھا' ورنہ عبداللہ اپنے جذبات سمیت اس پہ حاوی ہو رہا تھا۔

"ابھی نہیں' پھر کبھی۔" وہ گمبھیر لہجے میں بولا۔

"لیکن عبداللہ۔"

"نگارش پلیز یار! اس وقت تمہارے سوا کوئی بات اچھی نہیں لگ رہی' ایسے میں اگر کچھ کہہ دو گی تو سر کے اوپر سے گزر جائے گا' اس لیے اپنی بات کل کے لیے اٹھا رکھو۔" عبداللہ کے کہنے پر نگارش کے پاس کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہیں رہی تھی' اس نے مجبوراً ہتھیار ڈال دیے تھے۔

صبح سنڈے تھا' اس لیے جلدی اٹھنے کی فکر نہیں تھی' وہ دونوں خوب گہری نیند سوئے اور ابھی نہ جانے کتنی دیر تک سوتے کہ اچانک بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ رکھا عبداللہ کا موبائل بجنے لگا' رنگ ٹیون کا میوزک بجتے ہی اس کی نیند ٹوٹ گئی تھی' اس نے موبائل اٹھا کر نمبر دیکھا تو اسکرین پہ بابا جان کا نمبر جلتا بجھتا دکھائی دیا' جسے دیکھ کر عبداللہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا تھا' وہ یک دم اٹھ بیٹھا تھا۔

"السلام علیکم بابا جان۔" اس نے محبت اور اشتیاق سے لبریز لہجے میں کہا تھا۔

"وعلیکم السلام۔" وہاں سے نپا تلا سا جواب آیا تھا۔

"بابا جان کیسے ہیں آپ؟ آج... آج میں اتنا خوش قسمت کیسے ہو گیا؟" اس کی خوشی اس کی آواز اور لہجے سے جھلک رہی تھی۔

"ہم نے تمہیں تمہارے لیے فون نہیں کیا' ہم نے تمہیں زری کے لیے فون کیا ہے۔" انہوں نے اس کی خوشی پل میں ختم کر ڈالی تھی۔ وہ چپ کا چپ رہ گیا تھا اور چند ثانیے تو کچھ کہہ ہی نہیں سکا تھا' لیکن وہ ان کے سامنے جذباتی ہو کر کمزور نہیں پڑنا چاہتا تھا' اسی لیے اپنے آپ کو کنٹرول کرتے ہوئے آپے میں ہی رہنا پڑا۔

"زری کے لیے فون کیا ہے؟ خیریت۔" اس کے لب و لہجے میں بھی سنجیدگی اتر آئی تھی۔

"اسے پاکستان کب بھیج رہے ہو؟"

"پاکستان... کیا مطلب ہے آپ کا؟ میں سمجھا نہیں؟" وہ واقعی نہیں سمجھا تھا۔

"کیا ساری زندگی اسے کنواری بٹھانا چاہتے ہو؟" انہوں نے طنزیہ کہا۔

"دیکھیے بابا جان! آپ جو کہنا چاہتے ہیں صاف صاف کہیں' مجھے پہیلیاں سمجھ نہیں آتیں۔" اس نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔

"برخوردار! بات ویسے ہی صاف صاف ہے' اس کی شادی نہیں کرنی کیا؟ اس کے لیے رشتہ آیا ہے' اسے پاکستان بھیجو' رشتہ طے کرنا ہے اس کا' شادی کرنی ہے اس کی۔" وہ کافی سخت اور دبنگ انداز میں بول رہے تھے۔

عبداللہ ان کی بات پر ٹھٹک گیا تھا۔

"زری کے لیے رشتہ آیا ہے؟" وہ جیسے دہرا کے بولا تھا اور اس کے قریب ہی بیڈ پہ جاگی سوئی سی نگارش بھی اس بات پہ یک دم اٹھ بیٹھی تھی۔

"ہاں' اس کے لیے رشتہ آیا ہے' پہلے بھی دو' تین اچھے رشتے آئے تھے' لیکن اس کی پڑھائی کے شوق اور تمہاری ضد کی وجہ سے ان رشتوں کو انکار کر دیا تھا' لیکن اب یہ رشتہ ایسا ہے کہ اس سے انکار نہیں ہو سکتا' اس لیے اسے ایک مہینے کے اندر اندر واپس پاکستان بھیجو' بہت ہو گئی پڑھائی' پانچ سال ہونے والے ہیں آخر۔" وہ زری کی واپسی کا حکم جاری کر رہے تھے۔

"ایم سوری بابا جان! وہ اپنی پانچ سال کی محنت اور شوق ادھورا اور آخری اسٹیج پہ چھوڑ کے نہیں آسکتی' اس کا لاسٹ سمسٹر چل رہا ہے اور ایگزیمز بھی بس چند روز میں اسٹارٹ ہونے والے ہیں' ایک مہینے سے زیادہ ٹائم لگ جائے گا' آپ انتظار کر سکتے ہیں تو ٹھیک ہے' ورنہ اس رشتے سے بھی انکار کر دیں۔" عبداللہ' زری کے معاملے میں کوئی کمپرومائز نہیں کرتا تھا' زری اسے بہت عزیز تھی' کیونکہ وہ تھی ہی ایسی نرم اور ٹھنڈی میٹھی' شہد آگیں لہجے والی' صابر اور شاکر' وہ اس کے ساتھ کوئی زبردستی یا ناانصافی نہیں ہونے دے سکتا تھا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟ عورت ذات ہے وہ' اس کے لیے شادی ضروری ہے یا پڑھائی۔" وہ غصے سے بولے تھے۔

"دونوں چیزیں ضروری ہیں' پہلے پڑھائی' پھر شادی۔" عبداللہ نے اطمینان سے جواب دیا تھا۔

"دماغ چل گیا ہے تمہارا' ولایت کے آزاد ماحول میں رہ رہ کر عزت اور غیرت کے نام کو بھی بھول گئے ہو' بہن کو اپنے نقش قدم پر چلانا چاہتے ہو۔" وہ فون میں ہی دھاڑنے لگے تھے۔ ان کی آواز ائیرپیس سے باہر تک سنائی دینے لگی تھی۔

"تو کیا آپ کے نقش قدم پہ چلنے دوں؟ عزت' غیرت اور جاگیر کے نام پہ دلوں کو اجاڑ دوں؟ نام نہاد عزت' نام نہاد غیرت اور نام نہاد جاگیر کی خاطر اپنے سگے اور قابل احترام رشتوں کو خوف زدہ کر دوں؟ بری نظر رکھوں؟ یا پھر... یا پھر شہرین کی طرح اسے بھی کسی چوہدری کی چوہدراہٹ میں دے دوں؟ تاکہ وہ اس چوہدری کی پہلی بیویوں اور ان

کے بچوں کو پالتی رہے؟ ہونہہ! یہ خوش فہمی ہے آپ کی' آپ زری پہ کوئی زور زبردستی نہیں کر سکتے' میں اسے ساری زندگی کنواری بٹھا کر اس کی ذمہ داری اٹھا سکتا ہوں' لیکن اسے کسی چوہدری کے پاؤں کی جوتی نہیں بنا سکتا۔" وہ دبے لہجے میں چبا کر بولا تھا۔

"تو تم اپنے باپ سے متھا لگاؤ گے۔" وہ غرا کے بولے تھے۔

"میری اتنی مجال کہاں بابا جان؟ میں بھلا کون ہوتا ہوں آپ سے متھا لگانے والا؟ آپ والد محترم ہیں ہمارے' آپ کا ہر حکم سر آنکھوں پہ' لیکن میں معذرت چاہتا ہوں آپ سے' زری کے معاملے میں' میں آپ کا کوئی حکم نہیں مان سکتا' وہ پاکستان آئے گی تو اپنی اسٹڈی کمپلیٹ کر کے اور دوسری بات کہ شادی اس کی پسند اور مرضی کے بغیر نہیں ہوگی' شہرین والا معاملہ زری کے ساتھ نہیں ہوگا۔" اس نے بابا جان کو واضح الفاظ میں بتا دینا اور سمجھا دینا ضروری سمجھا تھا۔

"تم جانتے ہو تم کیا کہہ رہے ہو؟" وہ سخت انداز میں بولے۔

"جی! کافی اچھی طرح جانتا ہوں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔"

"تم بھول رہے ہو کہ میں تمہارا باپ ہوں' اگر ضد پہ آگیا تو ولایت مجھ سے دور نہیں ہے' میں وہاں بھی آسکتا ہوں۔" انہوں نے گویا دھمکی دی۔

"شوق سے آئیے' لیکن یہ بھی یاد رکھیے کہ ہوگا وہی جو زری چاہے گی' یہ ملکہ الزبتھ کی ریاست ہے' آپ کی جاگیر نہیں ہے' یہاں عورت کی ویلیو ہے' مرد کو تو کوئی جانتا بھی نہیں' یہاں صرف عورت ایک فون کال کرتی ہے اور مرد جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہوتا ہے' آپ سوچ لیجیے کہ آپ نے کیا کرنا ہے؟ اگر آپ زری کے لیے آنا چاہتے ہیں تو کبھی آنے کا سوچیے گا بھی مت' اور اگر آپ ہم سے ملنے کے لیے آنا چاہتے ہیں تو آپ کا ریٹرن ٹکٹ میری طرف سے۔" عبداللہ بھی ان ہی کا بیٹا تھا' اس نے باتوں باتوں میں انہیں بہت کچھ جتا دیا تھا' جسے سن کر انہوں نے یک دم غصے سے فون پٹخ دیا تھا اور عبداللہ موبائل کو دیکھتا رہ گیا تھا۔ پھر گہری سانس کھینچتے ہوئے موبائل سائیڈ ٹیبل پہ ڈال دیا تھا۔

"کیا بات ہے عبداللہ؟ بابا جان کیا کہہ رہے تھے؟" نگارش نے پریشانی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی اور سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر اٹھا کر سگریٹ سلگا لیا تھا۔

"آپ زری کے بارے میں بات کر رہے تھے' آپ زری کو پاکستان بھیج دیں گے؟" نگارش عبداللہ سے بھی زیادہ متفکر ہو رہی تھی۔

"ارے یار نہیں بھیج رہا۔" عبداللہ سر جھٹکتے ہوئے جھنجلا کر بولا تھا اور نگارش اس کا موڈ دیکھ کر چپ ہو گئی تھی' وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے سگریٹ پھونک رہا تھا' وہ اسے اس کے حال پہ چھوڑ کے اٹھ کر واش روم میں چلی گئی' کافی دیر بعد شاور لے کر باہر نکلی تو عبداللہ کھڑکی میں کھڑا نظر آیا تھا' وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آکھڑی ہوئی اور اپنے بال سنوارنے لگی' عبداللہ ہنوز گہری سوچ میں گم تھا۔

"آپ شاور لے لیں' میں ناشتا بناتی ہوں۔" وہ دوپٹہ اٹھا کر پھیلاتے ہوئے عبداللہ سے مخاطب ہوئی تھی۔

"ٹھہرو۔" عبداللہ کی آواز پہ اس کے قدم ٹھہر گئے تھے۔

"جی؟"

"ادھر آؤ۔" اس نے اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ وہ خاموشی سے قریب آگئی۔

"رات کو تم کچھ کہنا چاہتی تھیں؟"

"جی! مگر ابھی مناسب نہیں۔"

"پھر کیا بات ہے؟"

"وہی بات ہے جیسی آپ چھپا رہے ہیں۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"کچھ نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"نگارش....." عبداللہ نے خفگی سے اسے دیکھا۔

"تو پھر آپ بتائیں نا کیا مسئلہ ہے؟ بابا جان کیا کہہ رہے تھے؟ زری کے رشتے کی بات کر رہے تھے آپ لوگ؟" نگارش بھی جواباً خفگی سے بولی تھی اور عبداللہ چند ثانیے کے لیے خاموش سا ہو گیا' پھر اسے ساری بات نگارش کو بتانا پڑی تھی' جسے سن کر نگارش بدک گئی تھی۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟ وہ یہاں سے پڑھ لکھ کر جائے اور وہاں کسی پینڈو' جاہل اور اجڈ کی خدمت گزاری کرے' وہ ان چیزوں کو سہنے والی نہیں ہے' آپ نے بابا جان کو بتایا کیوں نہیں کہ زرین' شہرین نہیں ہے' وہ شہرین تھی جو سب کچھ سہہ گئی' یہ تو ایک دن میں مر جائے گی' ہاں اسے مارنا چاہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہے' پھر جیسا چاہیں کر سکتے ہیں۔" نگارش زری کے لیے تڑپ اٹھی تھی اور عبداللہ بے ساختہ نگارش کو دیکھے گیا تھا' وہ اس کے دیکھنے پہ ٹھٹک گئی تھی۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟"

"دیکھ رہا ہوں کہ اتنی محبت ہے زری سے؟" عبداللہ کی بات پہ اس کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے تھے اور چہرہ جھکا لیا تھا۔

"سچ ہے عبداللہ' میں زری کو آپ کی بہن نہیں' اپنی بہن سمجھتی ہوں اور اپنے بہن' بھائیوں کے لیے کوئی بھی یہ نہیں سوچ سکتا..... بلکہ میں تو شروع سے ہی زری کے لیے کچھ اور سوچتی ہوں۔" نگارش نے بالآخر کہہ ہی دیا تھا' عبداللہ نے چونک کر اس کے چہرے کی سمت دیکھا۔

"کچھ اور؟ کیا مطلب؟" "مطلب کہ اس کی شادی کے حوالے سے۔" وہ آہستگی سے بولی۔ "کیا سوچتی ہو اس کی شادی کے حوالے سے" وہ سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا اور نگارش بھی اس کے برابر کھڑکی سے لگ کے کھڑی ہو گئی' باہر کا موسم آج پھر ابر آلود ہو رہا تھا۔

"نبیل بھائی اور دل آور بھائی کسی بھی لڑکی کے لیے آئیڈیل شوہر ثابت ہو سکتے ہیں' میں جب بھی ان دونوں کو دیکھتی ہوں تو مجھے زری کا خیال آتا ہے اور مجھے لگتا ہے زری کی جوڑی دل آور بھائی کے ساتھ ہی سج سکتی ہے کسی اور کے ساتھ نہیں۔" نگارش نے بات کرتے ہوئے نبیل کا ذکر بھی شامل کر لیا تھا' تاکہ عبداللہ کو شک نہ گزرے اور دوسری طرف عبداللہ' نگارش کی بات سن کر ششدر سا کھڑا تھا۔ نگارش کتنی بڑی بات کہہ گئی تھی۔

"عبداللہ! کیا زری کی شادی دل آور بھائی سے نہیں ہو سکتی۔ وہ تو جس کا بھی نصیب بنیں گے خوش قسمت کہلائے گی وہ۔" نگارش اس سے پوچھ رہی تھی اور عبداللہ کچھ کہنے کی بجائے گم سم سا اسے دیکھ رہا تھا۔

"عبداللہ! آپ چپ کیوں ہو گئے؟ کیا میں نے کچھ غلط کہہ دیا ہے؟" نگارش نے اس کا بازو ہلایا تھا۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے نگارش؟ اک ناممکن سی بات کہہ رہی ہو تم۔"

"اس جہان میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے عبداللہ' بس کرنے کی نیت ہونی چاہیے۔" وہ اسے اکسا رہی تھی کچھ کہنے پہ اور کچھ کرنے پہ۔

"نگارش! دل آور میرا دوست ہے' ہم اک دوسرے کے سامنے سر اٹھا کر رہتے ہیں اور آنکھ سے آنکھ ملا کر بات کرتے ہیں' نہ تو وہ میری بہن کے بارے میں اس حوالے سے سوچ سکتا ہے اور نہ ہی میں اسے کچھ کہہ سکتا

ہوں۔" وہ حیرانی اور بے یقینی سے کہہ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے آپ کچھ نہیں کرسکتے' لیکن اگر وہ کچھ کہے تو پھر آپ کی کیا رائے ہوگی۔۔۔؟" وہ اس کا عندیہ جاننا چاہتی تھی۔

"میں فی الحال اس ٹاپک پہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میرے لیے جتنی زری اہم ہے اتنا ہی دل آور بھی اہم ہے۔ لیکن ان دونوں کے بارے میں کبھی سوچا نہیں ہے اس لیے رائے دینا مشکل کام ہے' پلیز میں پہلے ہی ٹینشن ہوں مجھے مزید نہ الجھاؤ۔"

"ٹھیک ہے میں آپ کو ڈسٹرب نہیں کرتی لیکن جب آپ زری کی شادی کا سوچیں تو دل آور بھائی کا بھی سوچیے گا۔" نگارش نے زور دے کر کہا اور وہاں سے ہٹ گئی تھی لیکن عبداللہ پہ نئی سوچ کے در وا کرگئی تھی وہ نہ چاہتے ہوئے بھی سوچنے پہ مجبور ہوگیا تھا اور دوسری طرف ذہن میں بابا جان کی باتیں گردش کررہی تھیں۔۔۔

☼ ☼ ☼

"منصور حسین۔۔۔! تجھے دیکھ کر میں اک بات سوچ رہا تھا۔" عارف نے بڑی دلچسپی سے کہا تھا۔ منصور حسین ابھی ابھی نہا کر آیا تھا پرانی سی جینز پہ بدرنگ سی بنیان پہنی ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود اس کی دمکتی رنگت اور کسرتی جسم کے مضبوط مسلز بے حد نمایاں ہو رہے تھے جن کو دیکھ کر عارف کی نظروں میں ستائش اتر آئی تھی۔ اور وہ کہے بغیر رہ نہیں سکا تھا۔

"کیا سوچ رہے تھے مجھے دیکھ کر۔۔۔؟" منصور حسین نے دلچسپی سے پوچھا اور تولیے سے بال رگڑتا ہوا کمرے میں لٹکے چھوٹے سے شیشے کے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔

"تمہارے چہرے کی داڑھی صاف کروا کے' تمہارے بالوں کی کٹنگ کروا کے' تمہیں نئے اور امیروں والے کپڑے پہنا کر سامنے لایا جائے تو قسم سے مجھے پورا یقین ہے تمہارے جیسا جوان پورے شہر میں نہیں ہوگا۔" عارف نے بڑے شوق اور بڑے جوش سے کہا تھا جس پہ منصور حسین یکدم فلک شگاف قہقہہ لگا کے ہنسا تھا اور اس کے قہقہے کی گونج کافی دور تک گئی تھی۔

"اچھا! تو تم مجھے تصور کی آنکھ سے امیروں والے حلیے میں دیکھتے ہو۔۔۔؟" منصور حسین کو عارف کی بات بات دلچسپ لگی تھی۔

"ہاں یار! تمہاری چال ڈھال ہی ایسی ہے' لیکن تمہیں دیکھ کر افسوس ہوتا ہے' تمہیں کسی امیر گھرانے میں پیدا ہونا چاہیے تھا' بس غلطی سے غریب گھرانے کے فرزند بن گئے ہو۔" عارف افسوس سے کہہ رہا تھا لیکن منصور حسین کو کوئی افسوس نہیں تھا وہ جس گھرانے میں پیدا ہوا تھا وہ اسی پہ خوش تھا۔

"یار! امیری اور غریبی پہ اتنا افسوس یا خوشی نہیں ہونی چاہیے' یہ سدا رہنے والی چیزیں نہیں ہیں' نہ کوئی ہمیشہ امیر رہتا ہے اور نہ کوئی ہمیشہ غریب رہتا ہے' وقت اور حالات بدلتے رہتے ہیں' اللہ میرا ساتھ دے تو میں اپنے زور بازو پہ اپنے حالات بدل سکتا ہوں اور جو چیز بدل سکتی ہے اس پہ افسوس کیسا۔۔۔؟" منصور حسین کی بات ہی ایسی تھی کہ عارف کو متاثر ہونا پڑا تھا اور اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"ہاں یار! یہ بھی تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو' لیکن یار میں چوکیدار ہوں اور تم ڈرائیور' اب تم یہ بتاؤ کہ چوکیداری کرکے یا ڈرائیوری کرکے حالات کہاں تک بدلے جاسکتے ہیں۔۔۔؟" عارف کے لب و لہجے میں مایوسی کا رنگ تھا۔

"تو کس نے کہا ہے کہ ساری زندگی چوکیداری کرتے ہی گزار دو' اس سے اچھا اور بہتر کام ملے تو وہ کرلو' میں بھی دیکھتا ہوں کہ اس ڈرائیوری میں میرے گھر کے حالات کہاں تک بدلتے ہیں؟ اگر نہ ہوا تو کہیں اور ہاتھ پاؤں مار

لوں گا۔" اس نے لاپروائی سے کہتے ہوئے سر جھٹکا۔

"یار! تم جانتے تو ہو کہیں اور ہاتھ پاؤں مارنا آسان نہیں ہے۔ آج کل کام کہاں ملتا ہے اور اگر ملتا ہے تو حالات بدلنے والا نہیں ملتا۔" عارف نے گہری سانس کھینچی تھی۔

"عارف صاحب! تم اللہ کے بندے ہو' اور اللہ کے بندے اللہ سے مایوس نہیں ہوتے' اور وہ کیا کہتے ہیں کہ کوشش کرنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے تم کام کی بات کرتے ہو۔۔۔؟ کوشش کرو میری جان تمہیں سب کچھ ملے گا' خدا بھی اور خدا کی خدائی بھی۔" منصور حسین نے پلٹ کر عارف کے کندھے پہ تھپکی دی تھی اتنے میں مبارک خان اس کے کوارٹر میں داخل ہوا تھا جسے دیکھ کر منصور حسین مسکرا دیا تھا۔

"دیکھو مبارک خان بھی تو ہے نا' جو کبھی مایوس نہیں ہوا۔" اس نے مثال دی عارف بھی سر ہلا کر مسکرایا تھا۔

"کیا ہوا ہے اسے۔۔۔؟" اس نے عارف کا پوچھا۔

"چند منٹوں کے لیے حالت افسوس میں گیا ہے بس' پریشانی والی کوئی بات نہیں ہے ابھی اس حالت سے نکل آئے گا۔" منصور حسین نے مبارک خان کو تسلی دی۔

"حالت افسوس میں گیا کیوں تھا۔۔۔؟" مبارک خان نے وجہ پوچھی۔

"غریب بندہ ہے' کسی بھی وقت حالت افسوس میں جاسکتا ہے اس پہ پابندی تو نہیں ہے نا۔" منصور حسین عارف کی طرفداری کررہا تھا۔

"چلو پھر غریب بندے کی دلجوئی بعد میں کرلینا پہلے اپنے کام پہ جاؤ۔" اس نے منصور حسین کو اشارہ کیا تھا۔

"کام۔۔۔؟"

"ہاں' وہ علیزے بی بی نے کہیں جانا ہے شاید۔" مبارک خان اسے بلانے آیا تھا۔

"جانا کہاں ہے۔۔۔؟"

"شاپنگ پہ جانا ہے شاید ساتھ میں عون اور عدید صاحب بھی ہیں۔" مبارک خان نے اطلاع دی۔

"ٹھیک ہے پھر تم جاؤ میں آرہا ہوں۔" منصور حسین الرٹ ہوگیا تھا فوراً شرٹ پہن کر اپنے جوتے پہننے کے لیے بیٹھ گیا۔

"جلدی آؤ' وہ ڈرائنگ روم میں تیار بیٹھی ہیں۔" مبارک خان کہہ کر پلٹ گیا تھا اور عارف کے ساتھ وہ بھی کوارٹر سے نکل آیا تھا وہ سیدھا گاڑی تک پہنچا تھا۔

اتنے میں مبارک خان کی اطلاع پہ علیزے بھی دونوں بھائیوں کے ساتھ حویلی کے مرکزی مین ڈور سے باہر آگئی تھی منصور حسین نے انہیں دیکھتے ہی گاڑی کے ڈور کھول دیئے تھے۔ علیزے اور عدید بیک سیٹ پہ بیٹھے تھے جبکہ عون خود ہی ڈور کھول کر فرنٹ سیٹ پہ بیٹھ گیا تھا منصور حسین گاڑی کے تمام ڈور بند کرکے دوسری طرف سے گھوم کے آیا اور ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھ گیا تھا اس نے گاڑی اسٹارٹ کی ہی تھی کہ مین گیٹ بھی وا ہوگیا گاڑی فراٹے بھرتی روڈ پہ آگئی تھی۔

"علیزے آپی! پہلے کہاں جانا ہے؟ آئس کریم پارلر یا شاپنگ سینٹر۔۔۔؟" عون نے گردن موڑ کر پیچھے بیٹھی علیزے کو دیکھا تھا۔

"یہ تو تم دونوں کی پسند پہ ڈپینڈ کرتا ہے کیونکہ میں تم دونوں کے کہنے پہ ہی تو آئی ہوں۔" علیزے نے لاپروائی ظاہر کی۔

"اوہ! یعنی ہم جو چاہیں کرسکتے ہیں؟ ہمیں کھلی چھوٹ ہے۔۔۔؟" عون نے چہکتے ہوئے علیزے کو چھیڑا تھا۔

"زیادہ بھی کھلی چھوٹ نہیں ہے' بس آئس کریم یا پھر شاپنگ' اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں' میں نے انہی

دونوں چیزوں کا وعدہ کیا تھا۔" علیزے نے ان کو ہری جھنڈی دکھائی تھی۔

"آپی صاحبہ! آپ نے اپنا وعدہ ایفا کرنے میں اتنے دن لگا دیے ہیں اب تو قرض کے ساتھ سود بھی کافی بن چکا ہے' شاپنگ اور آئس کریم کے ساتھ ساتھ گھومنے پھرنے کا بھی حق بنتا ہے ہمارا اور آپ ہمیں ہمارے حق سے محروم نہیں کر سکتیں۔" عدید نے بھی گفتگو میں حصہ لیا تھا۔

"تم دونوں چیٹنگ کر رہے ہو' تم لوگوں نے کہا تھا کہ صرف آئس کریم کھانی ہے یا پھر شاپنگ کرنی ہے' اب یہ تیسرا حق کہاں سے نکل آیا۔؟" علیزے نے ان دونوں کی بے ایمانی پہ احتجاج کیا تھا۔

"ٹھیک ہے ہم کچھ بھی نہیں کرتے' ہم واپس چلتے ہیں' ڈرائیور! گاڑی واپس لو۔" پیچھے سے عدید نے شور مچا دیا تھا اور منصور حسین ان کے شور پہ گاڑی روکنے پہ مجبور ہو گیا تھا اور بے ساختہ بیک ویو مرر سے علیزے کو دیکھا اس کی دلفریب سی صورت پہ پریشانی کے سائے پھیل رہے تھے وہ ہکا بکا سی ان دونوں کی چالاکی دیکھ رہی تھی۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم لوگ۔۔۔؟"

"ظاہر ہے خالی خالی شاپنگ کرنے کا بھلا کیا فائدہ؟ وہ تو ہم کسی کے ساتھ بھی جا کر کر سکتے ہیں' آپ ہمارے ساتھ نہیں جانا چاہتیں تو بہتر ہے واپس حویلی چلے جاتے ہیں۔" عون نے کندھے اچکائے اور علیزے ان دونوں کی چالاکی اور ہوشیاری دیکھ کر بے بس ہو گئی تھی۔ گھر سے اتنی دور آ کر وہ واپس بھی جاتے تو اچھا نہ لگتا اور اگر واپس چلے بھی جاتے تو علیزے کو معلوم تھا کہ وہ دونوں ساری زندگی وعدہ نہ نبھانے پہ طعنے دے دے کر مار دیتے۔ اس لیے بہتر تھا کہ ان کی بات مان لیتی جو مشکل تو تھی لیکن ناممکن نہیں تھی۔

"چلو ڈرائیور۔" علیزے نے اشارہ کیا۔

"کہاں؟" وہ ابھی بھی بیک ویو مرر سے دیکھ رہا تھا علیزے کی نگاہ اٹھی تو اسے اپنی سمت دیکھتے پا کر چہرے پہ ناگواری بکھر گئی تھی۔

"مارکیٹ۔" وہ ناگوار لہجے میں ہی بولی تھی۔

"صرف مارکیٹ۔۔۔؟" عون نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں! جہاں تم لوگ کہو گے وہاں بھی۔" وہ چڑ کے بولی۔

"ہائیو۔" انہوں نے یکدم نعرہ لگایا تھا اور منصور حسین نے گاڑی آگے بڑھا دی علیزے نے دو تین بار پھر وقفے وقفے سے مرر کی سمت دیکھا تھا لیکن اسے دوبارہ منصور حسین کی نظریں جھکی ہی نظر آئی تھیں بیک ویو مرر اس کی آنکھوں ـــــ سے خالی تھا اور وہ اپنے آپ کو اطمینان دلاتی دوبارہ سے عون اور عدید کے ساتھ باتوں میں لگ گئی تھی "پیس" کے سامنے گاڑی پارک کی تو وہ تینوں بہن بھائی گاڑی سے اتر گئے تھے اور منصور حسین نے وہیں ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھے بیٹھے جیب سے سگریٹ کی ڈبیا اور ماچس نکال کر سگریٹ سلگا لیا اور تیلی کو پھونک مار کے بجھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا تھا لیکن آگے بڑھتے ہوئے بلا ارادہ ہی عون کی نظر منصور حسین پہ پڑی تو اس کے قدم تھم گئے وہ آگے بڑھنے کی بجائے واپس منصور حسین کی سائیڈ پہ آ رکا تھا۔

"ایکسکیوز می۔" اس نے اسے متوجہ کیا منصور حسین نے چونک کر دیکھا تھا۔

"جی! کہیے؟" وہ الرٹ ہو گیا۔

"آپ اس گاڑی میں سگریٹ نہیں پی سکتے۔" عون جیسے حکم صادر کر رہا تھا۔

"کیوں؟ کیا یہ گاڑی موم کی بنی ہے یا پھر اس میں بم فٹ ہے۔۔۔؟" منصور حسین بھی عادت سے مجبور تھا کہے بغیر نہ رہ سکا' یہ دیکھے اور سوچے بغیر کہ جس سے وہ بات کر رہا ہے وہ اس کے مالک کا بیٹا ہے' کچھ بھی کہہ سکتا ہے اور کچھ بھی کر سکتا ہے۔

"نہ موم کی بنی ہے' نہ بم فٹ ہے' یہ گاڑی علیزے آپی کی ہے اور انہیں سگریٹ کی بو سے سخت الرجی ہے' ان کی وجہ سے آج تک حویلی میں کسی مرد نے اسموکنگ نہیں کی' اس لیے پلیز آپ بھی احتیاط کیجیے' ورنہ یہ اسموکنگ آپ کو جاب سے نکلوا بھی سکتی ہے۔" عون اتنا بڑا نہیں تھا لیکن اس لمحے علیزے کو خود سے کئی سال بڑا اور ذہین محسوس ہوا تھا۔

"اور ہاں! میری بات کو مائنڈ مت کیجیے گا' مجبوری ہے' آپ کو اگر اسموکنگ کی زیادہ ضرورت محسوس ہو رہی ہے تو گاڑی سے باہر آ جائیے۔" اس نے منصور حسین کو سگریٹ پینے کا حل بتایا تھا اور پلٹ کر علیزے اور عدید کے پاس آ گیا جو چند قدم کے فاصلے پہ کھڑے اس کی بات سن رہے تھے منصور حسن چند لمحے یونہی بیٹھا رہا' پھر گہری سانس کھینچ کر گاڑی سے نکل آیا تھا۔ لیکن اس نے انگلیوں میں دبے سگریٹ کو بجھانے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ دور جاتے عون کو پیچھے تک دیکھتا تھا جس کی چال ڈھال اور بات کرنے کے انداز میں ہی امیری کا زعم تھا اور منصور حسین اس بچے سے کئی سال بڑا ہونے کے باوجود بھی اس کے سامنے بے بس تھا کیونکہ غربت اس کی مجبوری تھی ایسی مجبوری جس پہ کچھ دیر پہلے عارف افسوس کر رہا تھا اس کے افسوس کی وجہ منصور حسین کو محسوس ہو ہی گئی تھی کہ کبھی کبھی بندے کا جہاں بولنے کو دل چاہے وہ مجبوری کے مارے بول بھی نہیں سکتا!

☼ ☼ ☼

آنے سے اس کے آئے بہار جانے سے اس کے جائے بہار
بڑی مستانی ہے میری محبوبہ' میری زندگانی ہے میری محبوبہ

عدیل کے ساتھ فٹ پاتھ پہ چلتے ہوئے چھوٹا بڑی ترنگ میں گانا گنگنا رہا تھا اور چھیڑتی ہوئی معنی خیز سی نظریں عدیل پہ ہی مرکوز کر رکھی تھیں۔ عدیل جانتا تھا کہ وہ جان بوجھ کر اسے چھیڑنے کے لیے گنگنا رہا ہے۔ اسی لیے وہ سنی ان سنی کرتا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا سڑکوں پہ تو جیسے گاڑیوں کا سیلاب امڈ آیا تھا اور اس سیلاب میں سے گزرنا اور اپنے لیے راستہ بنانا بے حد دشوار ہو رہا تھا تبھی وہ دونوں موقعے کی تلاش میں تھے کہ کب وقفہ پڑے اور وہ دونوں سڑک کراس کر کے دوسری فٹ پاتھ پہ جائیں جہاں سے دوسرا بس اسٹاپ قریب تھا کیونکہ ان کے روٹ کی بس دوسرے بس اسٹاپ سے با آسانی مل جاتی تھی۔

"استاد! اتنے دن ہو گئے آپ کا اس حسینہ سے دوبارہ کوئی ٹکراؤ نہیں ہوا۔" چھوٹے نے اسے چھیڑ ہی دیا عدیل نے گردن موڑ کر اسے دیکھا لیکن گھورتی ہوئی نظروں سے۔

"اس قیامت خیز ماحول میں تمہیں وہ حسینہ یاد آ رہی ہے۔؟" عدیل کی بات پہ چھوٹا بے ساختہ ہنس دیا تھا۔

"تمہیں کیا پتا استاد قیامت خیز ماحول میں اگر کوئی حسینہ یاد آ جائے تو وہ بھی جنت خیز ہو جاتا ہے' یہ بدنما آوازوں والی گاڑیاں بھی خوش نما تتلیاں لگنے لگتی ہیں۔" چھوٹا سرور لیتے ہوئے بولا تھا اور عدیل اس کے انداز پہ بے ساختہ امڈنے والی مسکراہٹ نہیں روک سکا تھا جس کو دیکھ کر چھوٹا خود بھی ہنس پڑا۔

"پاگل ہو تم لوگ بھی۔" عدیل نے کہتے ہوئے سر جھٹکا اور مسکرا دیا۔

"پاگل نہیں' ہم لوگ درویش ہیں درویش جو بات کہہ دیں وہی ہوتی ہے اور میں نے تو پہلے روز سے ہی کہہ دیا ہے کہ وہ لندن پٹ حسینہ ہمارے استاد کی ہے' اور دیکھ لینا استاد ایسا ہی ہوگا اور جس دن ایسا ہوا میں داتا دربار جا کر حاضری دوں گا اور زردے کی میٹھی دیگ چڑھاؤں گا وہ بھی اپنی محنت مزدوری کی کمائی سے۔" چھوٹا بڑے جوش و خروش سے اور پر عزم لہجے میں کہہ رہا تھا اور عدیل اس کی خوش فہمیوں پہ مسکراتا ہوا چھوٹے کا ہاتھ پکڑ کے سڑک کراس کرنے کے لیے تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا تھا لیکن انتہائی تیز رفتار گاڑی کے ٹائر بڑے زور سے

اک عجیب سا لودیتا ہوا احساس تھا جو عدیل کے سینے کو چھو گیا تھا بس لوگوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی بیٹھنے کے لیے سیٹ نہیں تھی کھڑے ہو کے سفر طے کرنا تھا اور بھی کئی لوگ کھڑے تھے اور ان میں وہ بھی شامل تھا مگر اک دلکش سا احساس لیے، عجیب سے مہکتے ہوئے جذبات کے ساتھ۔ اپنے جذبات کو لیے وہ گھر آیا تھا اور جیب سے وہ دلکش سا احساس نکال کر احتیاط سے اور آہستگی سے اپنے بستر کے سرہانے رکھ دیا تھا اور خود کپڑے اٹھا کر نہانے کے لیے باتھ روم میں چلا گیا تھا لیکن جذبات اب بھی اس کے ساتھ ساتھ تھے۔

☼ ☼ ☼
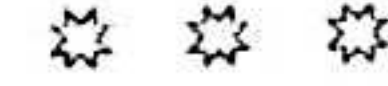
شاپنگ کرنے اور کئی جگہوں پہ گھومنے پھرنے کے بعد وہ فارغ ہو چکے تو آئس کریم کے لیے شور مچا دیا تھا لیکن علیزے کی ٹانگیں جواب دے چکی تھیں۔

"پلیز عون! اب گھر چلتے ہیں۔" واٹر پارک سے نکلتے ہوئے علیزے نے تھکے تھکے سے انداز میں کہا تھا۔

"بس اب صرف آئس کریم ہی تو رہ گئی ہے۔" وہ لاپروائی سے بولے۔

"دیکھو پلیز! میں بہت تھک گئی ہوں۔" وہ نڈھال سے انداز میں کہتی قریب آئی تو منصور حسین نے گاڑی کا دروازہ کھول دیا گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس نے منصور حسن کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا اسے منصور حسین کی کاٹ دار اور بے باک آنکھیں ناگوار گزرتی تھیں۔

"لیکن ہم تو ابھی بھی نہیں تھکے۔" عدید نے کندھے اچکائے۔

"میں تم دونوں کی شکایت کروں گی پاپا سے۔" اس نے دھمکی دی۔

"کوئی بات نہیں بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔" وہ دونوں ہنس رہے تھے اور وہ انہیں گھور کے رہ گئی۔ جیسے ہی منصور حسین نے گاڑی اسٹارٹ کی علیزے کا دھیان اسموکنگ کی طرف چلا گیا اسے گاڑی میں سگریٹ کی بدبو محسوس ہوئی تھی اور اس کی پیشانی پہ سلوٹیں پڑ گئی تھیں۔

"پلیز ڈرائیور! ایئر فریشنر آن کرو گاڑی میں سگریٹ کی اسمیل ابھی بھی ہے، میرا دماغ بھاری ہو رہا ہے۔" اس نے اپنی کنپٹیوں کو سہلاتے ہوئے کہا تھا عون اور عدید نے چونک کر علیزے کی سمت دیکھا وہ دونوں پریشان ہو گئے تھے جبکہ منصور حسین حیران پریشان رہ گیا تھا گاڑی میں ذرا سی بھی اسمیل نہیں تھی جو تھی وہ کب کی ختم ہو چکی تھی لیکن اس کی حس — ایسی تیز تھی کہ وہ ذرا سی اسمیل بھی برداشت نہیں کر پا رہی تھی اور یہ حیرت، تعجب اور بے یقینی کا ہی تو مقام تھا اتنی نازکی بھی تو نہ کبھی دیکھی تھی نہ کبھی سنی تھی اسے تو روز حیرت کے جھٹکے لگتے تھے۔

"ڈرائیور! آپ ایئر فریشنر آن کر کے گاڑی کے تمام شیشے فولڈ کر دیں۔" عون نے تیزی سے کہا تھا اور حیران پریشان منصور حسین نے تیزی سے ایئر فریشنر کا بٹن پش کیا اور تمام کھڑکیوں کے شیشے فولڈ کر دیئے تھے باہر کی تازہ ہوا اندر آنے لگی تھی تب جا کے اس کا دماغ کچھ ٹھکانے پہ آیا تھا۔

"کسی کولڈ کارنر پہ گاڑی روکو۔" علیزے نے حکم جاری کیا تھا منصور حسین نے دائیں بائیں دیکھا قریب ترین کوئی بھی کولڈ کارنر نہیں تھا۔ تھوڑا آگے جا کر اسے آئس کریم پارلر دکھائی دیا تھا اور وہ گاڑی کی اسپیڈ بڑھا کر وہاں تک فوراً" پہنچا تھا۔

"آپ آئس کریم لیں گی یا کولڈ ڈرنک...؟" منصور حسین خود ہی گاڑی سے اتر گیا تھا۔

"ملک شیک بنوا کے لے آؤ علیزے آپی کولڈ ڈرنک نہیں لیتیں۔" عدید نے جواب دیا تھا۔

"اور آپ کے لیے؟" اس نے عون اور عدید دونوں کو دیکھا۔

"نہیں! ہمیں کچھ نہیں چاہیے۔" وہ بے چارے دونوں ہی سہم چکے تھے منصور حسین بھی کافی پریشان ہوا تھا

وہ تیزی سے اندر گیا اور اس کے لیے ملک شیک بنوانے کے ساتھ ساتھ عون اور عدید کے لیے مینگو فلیور آئس کریم بھی لے آیا تھا۔ ان تینوں بہن بھائیوں کو چھوٹی سی ٹرے گاڑی کے اندر ہی مہیا کی تھی اس نے۔

"آپ نے کچھ نہیں لیا...؟" عون اور عدید وغیرہ کو شروع سے خیرو بابا اور مبارک خان کے ساتھ بے تکلفی کی عادت تھی اسی لیے منصور حسین کے ساتھ بھی وہ اسی طرح سے پیش آ رہے تھے۔

"ضرورت نہیں ہے۔" اس نے انکار کر دیا تھا۔

"آئس کریم ضرورت کے لیے نہیں کھائی جاتی بلکہ شوق سے کھائی جاتی ہے۔"

"مجھے شوق بھی نہیں ہے۔"

"تو کیا آپ کو صرف اسموکنگ کا شوق ہے...؟"

"ہاں! شوق تو ہے لیکن لگتا ہے کہ چھوڑنا پڑے گا۔" منصور حسین نے کہتے ہوئے اک نظر علیزے کی سمت دیکھا جس کے حواس ٹھکانے پہ آئے تو چہرے سے ہی فریش لگنے لگی تھی۔

"چھوڑ دیں تو اچھی بات ہے۔"

"اچھی بات تو ہے لیکن آسان بات نہیں ہے نا۔"

"کوشش کرنے سے سب کچھ ہو جاتا ہے۔" عون نے بڑے بزرگوں کی طرح دلیل دی۔

"ہوں! کروں گا کوشش...." اس نے کہتے ہوئے سر ہلایا تھا اور اتنے میں علیزے نے ملک شیک کا گلاس خالی کر کے ٹرے منصور حسین کی طرف بڑھا دیا تھا وہ احتیاط سے ٹرے اور بل لے کر واپس چلا گیا تھا واپس گاڑی میں آیا تو وہ تینوں بہن بھائی واپسی کے لیے تیار بیٹھے تھے منصور حسین نے گاڑی اسٹارٹ کر کے روڈ پہ ڈالی ہی تھی کہ علیزے کا موبائل بجنے لگا۔

"ہیلو آذر بھائی۔"

"السلام علیکم! علیزے — کہاں ہو تم؟" آذر نے پریشانی سے پوچھا وہ اک پل بھی ادھر ادھر ہو جاتی وہ سب کے سب متفکر ہو جاتے تھے۔

"جی وہ میں عون اور عدید کے ساتھ آئی تھی انہوں نے مجھ سے شاپنگ کا وعدہ لیا تھا اس لیے پورا کرنا پڑا۔"

"علیزے! پاگل ہو گئی ہو تم؟ جانتی بھی ہو کہ حالات کیسے ہیں۔ پھر بھی تم ان بچوں کے ساتھ چلی گئیں...؟" آذر کو ہلکا سا غصہ آیا تھا۔ اور اس کے ذرا سے غصے پہ ہی علیزے کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔

"آذر بھائی! میں ان کے ساتھ اکیلی تو نہیں ہوں ڈرائیور بھی ساتھ ہے، آپ اور پاپا خود ہی تو کہتے ہیں کہ جب ڈرائیور ساتھ ہو تو تمہیں ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" وہ روہانسے — لہجے میں بولی تھی اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس سے بہت بڑی غلطی ہو گئی ہو اور آذر بھائی اس کی غلطی پہ اس سے خفا ہو گئے ہوں۔

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن تمہیں ٹائم کا اندازہ ہے کوئی...؟ شام ڈھل چکی ہے اور اندھیرا ابھی بس گہرا ہونے والا ہے؟" آذر اس کے لیے اتنا فکر مند ہو رہا تھا کہ بے دھیانی میں یہ بھی خیال نہ رہا کہ وہ الٹا علیزے کو پریشان کر چکا ہے اس کے آنسو بہہ نکلے تھے وہ خود کو رونے سے روک نہیں پائی تھی۔

"علیزے....." آذر نے چونک کر بے تابی سے پکارا تھا وہ اس کی سسکی سن چکا تھا۔

"بھائی! میری کوئی غلطی نہیں ہے، بس وہ ضد کر رہے تھے ہم۔ میں انہیں۔ منع نہیں کر سکتی تھی۔ انہوں نے ہی اتنا ٹائم لگا دیا ہے۔" وہ دبے دبے سے انداز میں روتے ہوئے بے ربط سا بول رہی تھی اور آذر کی تو جان پہ بن آئی تھی وہ خوامخواہ اسے رلا بیٹھا تھا۔

"علیزے پلیز یار! رووَمت' میں تمہیں ڈانٹ نہیں رہا تمہیں صرف واپسی کا احساس دلا رہا ہوں۔ ڈیڈ بھی تمہارا پوچھ رہے تھے انہوں نے ہی مجھے فون کرنے کو کہا ہے۔"

"لیکن بھائی! ہم تو واپس ہی آ رہے ہیں۔۔۔۔"

"او کے! پھر فون بند کرو' میں انتظار کر رہا ہوں۔" آذر نے بات سمیٹتے ہوئے کہا اور فون بند کر دیا تھا اور علیزے نے بھی فون بند کر دیا مگر اس کے آنسو بند نہیں ہوئے تھے اس کا ذرا سا تو دل تھا اونچی آواز کی دھمک بھی نہیں سہہ پاتا تھا۔ منصور حسین' عون اور عدید تینوں خاموش بیٹھے تھے وہ اس کانچ کی گڑیا کو کب تک بہلاتے۔۔۔؟ اور دس منٹ بعد خدا خدا کر کے وہ لوگ واپس بڑی حویلی پہنچے تو شکر کا سانس لیا تھا۔ گاڑی گول روش پہ گھوم کر گیراج کی طرف آئی تو آذر بھی قریب آ گیا تھا۔ منصور حسین نے فوراً" اتر کر گاڑی کا دروازہ کھولا تھا نڈھال سی علیزے تھکے تھکے قدموں سے باہر نکل آئی تھی۔

"علیزے! آر یو آل رائٹ۔۔۔؟" آذر نے فوراً" اسے کندھوں سے تھام کے سہارا دیا تھا۔

"مم۔۔ مجھے اندر جانا ہے۔" وہ اندر کی طرف بڑھنے لگی عون اور عدید بے چارے سہمے ہوئے کھڑے تھے کہ زیادہ ٹائم ویسٹ کرنے پہ انہیں اب ضرور ڈانٹ پڑے گی۔

"آؤ میرے ساتھ۔" آذر اسے ساتھ لیے اندر کی طرف بڑھ گیا تھا عون اور عدید بھی پیچھے پیچھے ہی گئے تھے جبکہ منصور حسین ڈگی کھول کے ان کے ۔۔۔۔ بیگز نکالنے لگا عون' عدید اور علیزے تینوں نے ہی ڈھیر ساری شاپنگ کی تھی اس لیے بیگز بھی کافی زیادہ تھے وہ سارے بیگز اپنے دونوں ہاتھوں میں سنبھال کر پلٹا تو مبارک خان مین ڈور سے باہر آتا دکھائی دیا۔

"یہاں کیوں کھڑے ہو منصور حسین۔۔۔؟" مبارک خان نے رک کر پوچھا۔

"یہ علیزے بی بی کے شاپنگ بیگز ہیں' کیا کروں۔۔۔؟" اس نے اپنے ہاتھوں کی طرف اشارہ کیا اس کے مضبوط ہاتھوں کی انگلیاں شاپنگ بیگز کے بوجھ سے لدی ہوئی تھیں۔

"علیزے بی بی کے شاپنگ بیگز ہیں تو اندر پہنچا کر آؤ' وہ خود تو یہاں لینے نہیں آئیں گی نا؟ تھوڑا بہت خود بھی عقل سے کام لے لینا چاہیے۔" مبارک خان نے اسے سرزنش کی تھی منصور حسین چپ ہو گیا۔

"جاؤ' ان کا سامان اندر رکھ کے آؤ۔" اس نے راستے سے ہٹتے ہوئے کہا اور منصور حسین سر ہلا کر اندر آ گیا۔ اس نے حویلی کے اندرونی حصے میں پہلی بار قدم رکھا تھا اور آنکھیں چکا چوند ہو گئی تھیں آبنوسی مین ڈور سے لے کر کوریڈور کے سنگ مرمر سے مزین چکنے فرش تک ہر چیز کمال تھی۔

طویل کوریڈور میں تقریباً" پانچ درمیانے سائز کے فانوس لٹکے ہوئے تھے اور پانچوں کا ایک ہی ڈیزائن تھا دیواروں کے ساتھ کچھ قدیمی اور کچھ جدید دور کے مناظر کی فریم شدہ سینریاں اور تصاویر سجی ہوئی تھیں وقفے وقفے سے چار پانچ آبنوسی لکڑی کے ڈیکوریشن کارنر رکھے ہوئے تھے جن پہ کچھ کرسٹل پیسز اور کچھ جانوروں کے آرٹی فیشل اجسام سجا رکھے تھے جن میں شیر اور ہرن سرفہرست تھے بڑے بڑے قیمتی گلدانوں میں مختلف قسم کے ان ڈور پلانٹس بھی موجود تھے اور منصور حسین سوچ رہا تھا کہ جن کا کوریڈور اتنا لگژری ہے ان کے بیڈرومز اور باقی گھر کا کیا حال ہو گا۔۔۔؟ وہ کوریڈور کی خوبصورتی میں مگن کب کوریڈور کے آخری سرے پہ پہنچ گیا۔ پتا ہی نہ چلا تھا چونکا تو وہ اس وقت جب اس کی سماعتوں سے وقار آفندی کی آواز ٹکرائی تھی لیکن آواز اتنی حلیم اور چاشنی لیے ہوئے تھی کہ منصور حسین پلٹ کر دیکھنے پہ مجبور ہو گیا تھا۔

"میری جان' میری گڑیا' آذر نے تمہیں بھلا کب ڈانٹا ہے؟ وہ تو صرف تمہارے لیے پریشان ہو رہا تھا' شام گہری ہو چکی تھی اور تم لوگ واپس ہی نہیں آ رہے تھے' پہلے بھی تمہارے ساتھ اتنا سنگین حادثہ پیش آ چکا ہے اب پھر

کچھ ہو جاتا تو۔۔۔؟" وقار آفندی ڈرائنگ روم کے جہازی سائز صوفے پہ بیٹھے علیزے کا سر اپنے کندھے سے لگائے تھپک رہے تھے اور وہ سسکیوں سے رو رہی تھی۔

"علیزے! دیکھو اگر تم اب بھی چپ نہ ہوئیں تو میں واقعی ناراض ہو جاؤں گا تم نے ذرا سی بات پہ مجھے مجرم بنا دیا ہے، میں گلٹی فیل کر رہا ہوں۔" آذر اور وقار آفندی اسے منانے بہلانے اور چپ کرانے کی کوششیں کر رہے تھے جس پہ آسیہ آفندی بے ساختہ مسکرا اٹھی تھیں اور نجانے کیوں ان کی نظریں آذر پہ ٹھہر سی گئی تھیں لیکن نظروں کے ٹھہرنے کا مقصد کچھ اور تھا۔ وہ کب سے علیزے کو منا رہا تھا۔ بہلا رہا تھا اس کی خوشی کے لیے بار بار سوری کر رہا تھا اور اس کے انداز میں اتنی چاہ اور اتنی محبت تھی کہ آسیہ آفندی کی نظروں سے اس کے جذبات چھپے ہوئے نہیں رہ سکے تھے علیزے اس کی دھمکی پہ چپ ہو گئی تھی اور آذر اپنی دھمکی کے اثر پہ بے اختیار مسکرا دیا تھا' آسیہ آفندی بھی انہیں مسکراتے دیکھ کر ڈرائنگ روم سے باہر نکل آئی تھیں لیکن باہر منصور حسین کو کھڑے دیکھ کر ٹھٹک کر رک گئیں۔

"کیا بات ہے؟ یہاں کیوں کھڑے ہو۔۔۔؟"

"جی وہ علیزے بی بی کا سامان رکھنے آیا ہوں۔" اس نے شاپنگ بیگز دکھائے۔

"جاؤ اس کے بیڈ روم میں رکھ آؤ۔"

"بیڈ روم میں۔۔۔؟" وہ حیران ہوا۔

"ارے نہیں! ایک منٹ ٹھہرو۔"

"جی"! وہ رک گیا۔

"رجو۔ رجو۔ کہاں گئی ہو۔" انہوں نے کچن میں کام کرتی رجو کو پکارا تھا وہ نیپکن سے ہاتھ پونچھتی بھاگتی ہوئی آئی تھی۔

"جی بیگم صاحبہ۔۔۔؟"

"اس کے ساتھ جاؤ اور علیزے کا سامان اس کے بیڈ روم میں رکھواؤ۔" انہوں نے منصور حسین کی طرف اشارہ کیا تھا رجو نے پلٹ کر منصور حسین کو دیکھا اور دیکھ کر آنکھوں کا رنگ بدل گیا وہ جو کوئی بھی تھا دل کے تار ہلا دینے والوں میں سے تھا۔ "رجو" آسیہ آفندی نے سختی سے پکارا وہ ٹھٹک کر حواسوں میں لوٹ آئی۔

"ج۔۔۔ جی بیگم صاحبہ۔"

"کھڑی کھڑی کیا دیکھ رہی ہو؟ جو کہا ہے وہ سنائی نہیں دیا تمہیں؟"

"ج۔۔۔ جی بیگم صاحبہ جا رہی ہوں میں۔" وہ فوراً آگے بڑھی۔

"جاؤ تم بھی۔" انہوں نے منصور حسین کو اشارہ کیا۔۔۔

"جی بہتر۔۔۔" وہ کہہ کے رجو کے پیچھے ہی چل پڑا تھا کشادہ سیڑھیوں کی تعداد بھی کافی زیادہ تھی رجو اس کے آگے آگے سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ اور وہ اس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ آخری پورشن پہ پہنچ کر وہ دائیں طرف مڑ گئی دائیں طرف کے آخر والا بیڈ روم علیزے کا تھا وہ بیڈ روم کے دروازے کے پاس جا کر ٹھہر گئی۔

"علیزے بی بی کے بیڈ روم میں اور کوئی ملازم نہیں جا سکتا۔ صرف میں جاتی ہوں۔ اس لیے تم یہیں ٹھہرو' میں باری باری سامان اندر رکھ دیتی ہوں۔" رجو نے اسے اندر آنے سے روکا تھا وہ وہیں دروازے کے باہر ہی ٹھہر گیا وہ اکتایا ہوا اور بے زار ہو رہا تھا۔ اس لیے جلد از جلد اس بوجھ سے آزاد ہونا چاہتا تھا جو چار پانچ بیگ لے کر اندر گئی اور قالین پہ رکھ آئی تھی۔ پھر دوبارہ لے کر گئی اور دوبارہ بھی رکھ آئی تھی بیگز سے ہاتھ آزاد ہوئے تو وہ ہاتھ جھاڑ کے واپسی کے لیے پلٹا تھا۔

"سنو۔" رجو لپک کے بیڈ روم سے باہر آئی تھی۔

"جی سنائیں۔۔؟" وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"منصور حسین۔"

"اچھا نام ہے۔"

"جی شکریہ۔"

"علیزے بی بی کے ڈرائیور ہو۔۔۔؟"

"جی! خوش قسمتی سے۔" اس نے اثبات میں جواب دیا۔

"اور میں علیزے بی بی کی خاص ملازمہ ہوں۔"

"اور میں خاص ڈرائیور۔" منصور حسین نے دلچسپی سے مسکرا کر کہا تھا۔

"خاص تو تم دور سے ہی لگ رہے ہو۔" رجو عام سی اک لڑکی تھی عام سے جذبات تھے اپنا ہم پلہ مرد دیکھا تو فوراً ہی ریجھ گئی تھی۔

"قریب سے دیکھنے پہ اور بھی خاص لگتا ہوں۔" منصور حسین کے جواب پہ وہ شرما گئی تھی حالانکہ منصور حسین نے نام سے لہجے میں کہا تھا۔

"ابھی میں فارغ نہیں ہوں' فارغ ہو کر بات کروں گی۔"

"نہ بھی کرو تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔" وہ کندھے اچکا کے لاپروائی سے بولا تھا۔

"اچھا بات سنو' تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتانا مجھ کو۔" رجو نے آفر کی۔

"روٹی پانی کے علاوہ کوئی ضرورت نہیں ہے اپنی اور وہ ٹھیک ٹھاک طریقے سے پوری ہو رہی ہے۔ اللہ اللہ خیر صلا۔" وہ اب بھی بے نیازی سے کہہ رہا تھا رجو چپ ہو گئی تھی بڑا عجیب بندہ تھا اس کی طرف دیکھے بغیر ہی چلا گیا تھا!

☼ ☼ ☼

عبداللہ ناشتا کرنے کے فوراً بعد ہی گھر سے نکل گیا تھا۔

وہ دونوں جب سے اپنے بیڈ روم سے باہر نکلے تھے وہ بار بار کن انکھیوں سے ان کے چہروں کی سمت دیکھ رہی تھی جو بے حد سنجیدگی لیے ہوئے تھے۔ ناشتا بھی خاموشی سے کیا تھا اور عبداللہ اسی خاموشی سے اپنا موبائل اور گاڑی کی چابیاں لے کر گھر سے چلا گیا تھا ان کی خاموشی' سنجیدگی اور سپاٹ چہروں کو دیکھ کر زری کی تو جان نکلی جا رہی تھی۔

"بھابھی! کیا بات ہے۔۔۔؟ کیا ہوا ہے۔" زری مین ڈور لاک کر کے سیدھی نگارش کے پاس آئی تھی نگارش ٹیبل سے برتن سمیٹ کر ٹیبل صاف کر رہی تھی۔ زری نے آتے ہی اس کے ہاتھ تھام لیے تھے نگارش بھی چپ تھی وہ زری کو بتاتی بھی تو کیا۔۔۔؟

"بھابھی بولیے نا؟ آپ چپ کیوں ہیں۔۔۔؟" زری کی آواز میں انجانے خدشوں کی وجہ سے لرزش اتر آئی تھی۔

"بات اچھی نہیں ہے' سن کر کیا کرو گی۔۔؟" زری دھک سے رہ گئی تھی۔

"بھابھی میرا دل برباد کرنا ہے تو کچھ سوچ کر کیجیے گا زری مر جائے گی اپنے شاہ کے بغیر۔" اس کے آنسو تھے کہ لب

بام آ گئے۔ سینے میں قید پنچھی پھڑپھڑا رہا تھا۔ جیسے اندر اس کا دم گھٹ رہا ہو اور رہائی کے لیے ہاتھ پیر مار رہا ہو۔

"آج صبح پاکستان سے بابا جان کا فون آیا تھا۔" نگارش نے بات کی ابتدا کی۔

"بابا جان کا فون۔۔۔؟" زری کو حیرت کا جھٹکا لگا۔

"ہاں! اور انہوں نے فون تمہارے لیے کیا تھا۔" نگارش کا حوصلہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ یکدم ہی زری پہ بم پھوڑ دے۔

"میرے لیے؟ مگر کیوں۔۔۔؟" اب پہلے سے زیادہ حیرت ہوئی تھی۔

"تمہیں واپس پاکستان بلا رہے ہیں، تمہارے لیے کسی کا رشتہ آیا ہے، تمہاری شادی کرنا چاہتے ہیں۔" نگارش نے کہہ ہی دیا اور زری یکدم چار قدم پیچھے ہٹی تھی نگارش کے ہاتھ اپنے ہاتھوں سے چھوڑ دیئے تھے۔ اور لب بام آئے موتی گر کر زمین بوس ہو گئے تھے۔ اک دھڑ دھڑ کرتی ٹرین تھی جو شور اٹھاتی ہوئی اس کے دل کو پٹڑی تلے روند کر گزر گئی تھی۔

"زری پلیز! میری پوری بات تو سن لو۔" نگارش نے آگے بڑھ کے اس کے ہاتھ تھام لیے جو پل میں ٹھنڈے اور یخ ہو چکے تھے۔

"میں تو۔۔۔ میں تو بات سن لوں گی، مگر میری بات کون سنے گا۔۔؟" آنکھوں سے دو موتی کیا گرے کہ باقیوں کو رستہ ہی مل گیا تھا بہتے چلے جا رہے تھے۔

"سب سنیں گے میری جان، سب سنیں گے، عبداللہ تمہارے ساتھ ہیں، انہوں نے بابا جان کو صاف انکار کر دیا ہے کہ وہ تمہیں ابھی پاکستان نہیں بھیجیں گے، تم ابھی پڑھ رہی ہو، تمہارے ایگزامز سر پہ ہیں، اور تم اپنی اسٹڈی ان کمپلیٹ چھوڑ کر نہیں آسکتیں۔" نگارش اسے سمجھا بجھا کر تسلیاں دے رہی تھی۔

"لیکن بھابھی! اک دن تو واپس جانا ہی ہے؟ کب تک یہاں رہوں گی اور اپنے دل کو زمانے کے سرد و گرم سے بچا کے رکھوں گی۔۔؟" زری کی آواز جیسے سرد و سپاٹ پتھرائی ہوئی لگ رہی تھی آنسوؤں کا نمکین پانی اس کے عارض بھگو رہا تھا۔

"جانا، ضرور جانا، لیکن کسی حتمی فیصلے کے بعد، اور مجھے پورا یقین ہے عبداللہ تمہیں اکیلے نہیں جانے دیں گے، وہ تمہارے ساتھ خود جائیں گے، اور تمہاری پسند اور مرضی کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوگا۔" نگارش نے اسے سمجھایا۔

"بھابھی! میرے گاؤں کے دینو موچی نے اپنی بیٹی کی پسند اور مرضی پہ سر نہیں جھکایا تو یہ تو پھر میرے بابا جان ہیں، اونچے شملے والے ملک ہیں، جاگیردار ہیں دوسروں کی بیٹیوں کی زندگی کے فیصلے پنچایت میں بیٹھے بیٹھے کر ڈالتے ہیں اپنی بیٹی تو ان کے سامنے کوئی چیز ہی نہیں ہے۔" زری متواتر رو رہی تھی۔

"زری! تم بھول رہی ہو کہ دینو موچی کی بیٹی کا کسی نے بھی ساتھ نہیں دیا تھا، نہ ماں نے، نہ باپ نے، نہ بہن بھائیوں نے، جبکہ میں اور عبداللہ تمہارے ساتھ ہیں، بابا جان بات کے پکے ہیں تو عبداللہ بھی انہی کے بیٹے ہیں، اول تو ضد نہیں کرتے، اور جب کرتے ہیں تو ضد کو پورا کیے بغیر پیچھے نہیں ہٹتے، جو کچھ شہرین کے ساتھ ہوا وہ عبداللہ کو آج بھی نہیں بھولتا اور اس کے بعد وہ تمہاری زندگی داؤ پہ نہیں لگنے دیں گے چاہے کچھ بھی ہو جائے۔" نگارش نے اسے حوصلہ افزا لفظوں میں سمجھایا تھا۔

"اور ایک بات اور۔" نگارش آخر میں مسکرا کے بولی۔

"اللہ خیر۔" زری نے دل پہ ہاتھ رکھ کے دل کو سنبھالا دیا۔

"میں نے عبداللہ سے تمہاری اور دل آور بھائی کی بات کی ہے۔" نگارش نے ایک اور انکشاف کیا۔

"کیا۔۔؟" زری یکدم اچھل پڑی تھی۔

"ہاں یار! اب یقیناً وہ اسی بات کے متعلق سوچ رہے ہوں گے۔" وہ مسلسل مسکرا رہی تھی۔

"بھابی! اگر آس کا یہ دیا بھی بجھ گیا تو زری کی سانسوں کی لو بھی بجھ جائے گی۔" زری کو اپنے چاروں اطراف میں خطرے کی گھنٹیاں بجتی محسوس ہوئی تھیں دل پہ سیاہ بادلوں نے گھیرا ڈال لیا تھا اور وہ متوحش ہرنی کی مانند ان خطروں کی لپک سے جان بچانے کی کوششوں میں لگ گئی تھی۔

"اللہ نے چاہا تو یہ آس کا دیا نہیں بجھے گا، کبھی نہیں بجھے گا، ہمیشہ جلتا ہی رہے گا، میری دعائیں اس دیئے کے ساتھ ہیں، تحفظ کا حصار لیے ہوئے۔" نگارش نے اس کے نرم گداز دودھیا ہاتھوں کو نرمی سے دباتے ہوئے ہلکے سے اس کا رخسار بھی تھپکا تھا اور زری یونہی نڈھال سی ہو کر ڈائننگ چیئر پہ گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئی تھی۔

"میں یہاں مر رہی ہوں، میری جان نکل رہی ہے اور اسے۔۔۔ اسے پتا ہی نہیں ہے، کتنا بے خبر اور کتنا پر سکون ہے وہ؟ کیا اسے میری محبت کا ذرا احساس نہیں ہے؟ میں اکیلی پاگل ہو رہی ہوں۔۔۔؟ ہائے میں مر جاؤں۔۔۔" وہ خود کلامی کے سے انداز میں کہتی اپنے دل پہ ہاتھ رکھ کے رو پڑی اور اسے رونا دل آور شاہ کی بے خبری اور سکون پہ آیا تھا۔

"زری پلیز یار۔۔۔! کیوں پگلی بن رہی ہو۔۔۔؟ پلیز سنبھالو اپنے آپ کو، ابھی تو صرف بات ہوئی ہے کون سا نکاح ہو گیا ہے؟ یا پھر رشتہ طے ہو گیا ہے۔۔۔ ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا سب کچھ تمہارے اختیار میں ہے۔" نگارش اسے سمجھا سمجھا کر تھک گئی تھی۔

"میرے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے بھابھی، کچھ بھی نہیں ہے، میرا سب کچھ بگڑنے والا ہے۔ میں۔۔۔ میں بکھرنے والی ہوں۔۔۔" وہ روہانسے لہجے میں کہتی ہوئی اٹھ کر تیز تیز قدموں سے چلتی اوپر اپنے بیڈ روم میں آ گئی تھی لیکن بیڈ پہ بیٹھ کر روتے روتے نہ جانے دل میں کیا سمائی کہ اس نے اپنا موبائل فون اٹھا کر دل آور شاہ کا نمبر ڈائل کر لیا تھا۔

اس کے دل و دماغ کا بے چینی اور اضطراب سے عجب حال تھا اس کا دل چاہ رہا تھا آج دل آور شاہ اس کے سامنے کھڑا ہو اور وہ اس کے سینے میں سما جائے، ساری دنیا اور سارے خدشوں سے چھپ جائے، اس کی مضبوط بانہوں کے حصار میں خود کو قید کر لے، یا پھر اس کے نام کی چادر اوڑھ کر ہر چیز سے بے فکر اور بے خبر ہو جائے۔ لیکن ایسا تو تب ہوتا جب وہ ملتا اور اس کے سامنے ہوتا۔۔۔! دوسری طرف رنگ جا رہی تھی۔ لیکن وہ ریسیو نہیں کر رہا تھا۔۔ اس نے نمبر ری ڈائل کر ڈالا تھا اور کال ریسیو ہونے کا انتظار کرنے لگی۔

☼ ☼ ☼

زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ زری کا نمبر دل آور شاہ کے نمبر پہ بجا تھا۔۔۔

موبائل اس کے ہاتھ میں تھا۔ وائبریشن مسلسل ہو رہی تھی، موبائل جیسے تھرک رہا تھا اور صاف پتا چلتا تھا کہ وہ پجارن تڑپ رہی ہے، البتہ وہ اتنا تڑپ کیوں رہی ہے، یہ پتا نہیں تھا۔۔۔ مگر یہ بھی سچ تھا کہ اس کی تڑپ پہ دل آور شاہ بھی تڑپ گیا تھا مگر وہ کال ریسیو کر کے نہ اس کی تڑپ سن سکتا تھا نہ اپنی سنا سکتا تھا۔ اسے پتا تھا کہ آج اگر کال ریسیو کر لی تو اس پجارن کی تڑپ کو ڈھارس مل جائے گی، اور جہاں اسے ڈھارس ملتی وہیں وہ اپنی تمام کشتیاں جلا دیتی، جو فی الحال وہ نہیں چاہتا تھا وہ جانتا تھا کہ جن راستوں پہ زری چل رہی ہے ان میں ابھی۔۔۔ پیچ و خم ہیں، بڑے نشیب و فراز ہیں، اور ان راستوں سے گزرنا اتنا آسان بھی نہیں تھا مگر پھر بھی وہ چل رہی تھی اور اس کی یہی مسافت کئی مرتبہ دل آور کے دل میں بے چینیاں بھر دیتی تھی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ اکیلی ان راستوں پہ چل چل کے تھک جائے گی، نڈھال ہو کے گر جائے گی ہو سکتا ہے بے دم بھی ہو جاتی، اور اگر ایسا ہوتا تو وہ بھلا سکون سے کب رہ سکتا تھا۔۔؟

ادھر اس کی کال بج رہی تھی اور ادھر وہ بے چین اور مضطرب سا کمرے میں ٹہل رہا تھا' بے سکونی سی بے سکونی تھی۔ یونہی ٹہلتے ٹہلتے اس نے اپنے ہاتھ بالوں میں پھنسا لیے تھے اس کا دھیان زری کے اردگرد کروٹیں لے رہا تھا۔

"نجانے ایسی کیا بات ہے کہ وہ میرے نمبر پہ کال کرنے پہ مجبور ہو گئی ہے۔۔؟ نجانے کیا انتہا ہو گئی ہے آج۔؟ وہ کیوں کر رہی ہے کال۔۔؟ کیوں اپنی اور میری چپ کا تالا توڑ رہی ہے۔۔۔؟ کیا چاہتی ہے وہ۔۔۔؟ اف کیا کروں۔۔؟" وہ بے کل سا کمرے میں ادھر سے ادھر پھر رہا تھا وہ فون کر کر کے تھک گئی تو موبائل اسکرین پہ دس مسڈ کالز کا ریکارڈ دکھائی دینے لگا تھا وہ دس بار مچلی تھی' وہ دس بار تڑپی تھی اور دل آور شاہ نے دس بار اسے اگنور کیا تھا لیکن دس بار ہی بے سکون ہوا تھا وہ تڑپ کا سلسلہ بند کر چکی تھی لیکن دل آور کے تجسس کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا وہ اسی کے متعلق سوچ رہا تھا جب اس کے موبائل پہ ایک بار پھر رنگ ہوئی' اس نے ٹھٹک کر دیکھا لیکن کال کرنے والی زرین ملک نہیں بتول شاہ تھیں۔ اس نے بوجھل سے انداز میں کال ریسیو کی تھی۔

"السلام علیکم اماں!"

"وعلیکم السلام! کیسے ہو؟"

"ٹھیک ہوں۔"

"اچھا! مگر تمہاری آواز تو کچھ اور ہی کہہ رہی ہے۔" وہ اس کی آواز کا بوجھل اور بے چین اتار چڑھاؤ بھانپ چکی تھیں۔

"جی ہاں! میں اس وقت بہت ڈسٹرب ہوں' بہت زیادہ۔" وہ اپنی انگلیوں سے اپنی کنپٹی مسلتے ہوئے بولا۔ بس یہ پریشانی تھی کہ آج زری نے صبر و ضبط کا دامن چھوڑا ہے تو کیوں چھوڑا ہے۔۔۔؟

"کیوں کسی کیس کا مسئلہ ہو گیا ہے کیا۔۔؟" بتول شاہ نے فکرمندی سے پوچھا حالانکہ وہ جانتی تھیں کہ وہ بڑے سے بڑے پیچیدہ کیس پہ بھی نہیں گھبراتا بلکہ دوسروں کو گھبرا کے رکھ دیتا ہے۔

"نہیں اماں! مجھے صرف ایک ہی کیس پریشان کرتا ہے' جب بھی اس کیس پہ سوچتا ہوں' فکر کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔"

"کس کیس کی بات کر رہے ہو؟"

"اس کیس کی جو انگلینڈ چھوڑ آیا تھا۔"

"کیا؟ زری کی بات کر رہے ہو؟ کیا ہوا ہے اسے؟" بتول شاہ چونک اٹھی تھیں۔

"یہ تو مجھے بھی نہیں پتا' بس کال آئی تھی اس کی۔" اس نے آہستگی سے بتایا۔

"کیا کہتی ہے وہ؟"

"میں نے کال ریسیو نہیں کی۔" اس نے مجرمانہ سے انداز میں جواب دیا۔

"اف! دل آور شاہ تم بھی کبھی کبھی حد کر دیتے ہو۔" وہ غصے میں ہوتیں تو اسے پورے نام سے مخاطب کرتی تھیں۔

"اماں! میں حد رکھنا چاہتا ہوں مگر وہ حد توڑ رہی تھی' لگ رہا تھا کہ پاگل ہو رہی تھی وہ۔" وہ بتول شاہ کو ساری تفصیل بتا رہا تھا۔

"تمہیں چاہے گی تو پاگل ہی ہو گی بے چاری' لیکن دل آور شاہ دل پہ پتھر رکھ لینا اچھی بات ہے مگر دل کو پتھر بنا لینا اچھی بات نہیں ہوتی۔"

"مگر اماں! آپ نہیں جانتیں۔ میں اگر دل کو پتھر نہ بناؤں تو کوئی اور بے چارا یا تو پاگل ہو جائے گا یا پتھر۔۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم کون ہے وہ بے چارا؟" وہ ٹھٹک گئیں۔

"جو بھی ہے پر جان سے عزیز ہے' اس کے لیے تو دل آور شاہ کا سر بھی حاضر ہے۔"

"نبیل۔۔؟ نبیل کی بات کر رہے ہو۔۔؟"

"نہیں اماں! اس ٹاپک پہ پھر بات کریں گے۔" دل آور نے سر جھٹک دیا تھا۔

"تم کراچی سے واپس کب آ رہے ہو۔۔۔؟"

"چند دن لگیں گے' دعا کیجیے گا کہ میں یہ کیس جیت جاؤں۔" وہ تھکے تھکے سے انداز میں کہہ رہا تھا اور بتول شاہ چپ ہو گئیں ان کا دھیان زری' نبیل اور دل آور شاہ کو سوچ رہا تھا اور خود دل آور شاہ بھی یہی کچھ سوچ رہا تھا بتول شاہ کا فون بند ہو چکا تھا۔ لیکن زری کی یاد کا سلسلہ بند نہ ہوا' وہ ساری رات سو نہیں پایا تھا۔

✡ ✡ ✡

اس نے نیو سم خریدی تھی اور اسے خود ایکٹیویٹ کیا تھا' یہ نمبر سب کے لیے نیو اور ان نون تھا۔ اس نمبر کو اس کے سوا اور کوئی نہیں جانتا تھا اور یہ تسلی ہی کافی تھی اس نے وہ سم دوسرے موبائل میں لگائی اور موبائل جیب میں ڈال کے بائیک اڑا لے گیا تھا۔ اس کا رخ سائم کے گھر کی طرف تھا حالانکہ اسے پتا تھا کہ سائم اس وقت اپنی گرل فرینڈز اور باقی دوستوں کے ساتھ اپنے فلیٹ پہ موج مستی میں مصروف ہے اور یہی موقع اس کے لیے اچھا موقع تھا اگر فاطمہ گھر پہ ہوتی تو۔۔۔!

"ہیلو۔" اس نے ان کے گیٹ پر پہنچ کر چوکیدار کو مخاطب کیا۔

"سلام صاحب۔"

"وا سلام! کیسے ہو؟"

"اللہ کا کرم ہے صاحب۔"

"سائم صاحب سے کہو جودت صاحب بلا رہے ہیں۔" اس نے ڈرامہ کیا۔

"سائم صاحب تو نہیں ہیں گھر پہ۔" جواب عین توقع کے مطابق موصول ہوا تھا۔

"اچھا! کون ہے گھر پہ؟"

"جی صرف فاطمہ بی بی ہیں۔"

"اوہ! سائم کب آئے گا۔؟"

"پتا نہیں صاحب۔"

"چلو میں اس کے موبائل پہ پتا کر لیتا ہوں۔" جودت نے سر ہلایا۔

"جی جیسے آپ کی مرضی۔"

"او کے اللہ حافظ۔" وہ کہہ کے پلٹ گیا تھا اور بائیک کو کک لگا کے اڑا لے گیا مگر صرف ان کی کوٹھی کے کونے تک ذرا اوٹ میں جا کے اس نے بائیک روک لی تھی اور موبائل نکال کر میسج ٹائپ کیا تھا۔ میسج سینڈ کرنے کے ٹھیک سات منٹ بعد ان کے گھر کا گیٹ کھلا تھا اور فاطمہ کی گاڑی تیز رفتاری سے باہر نکلی تھی۔ جودت نے بڑی پھرتی سے بائیک کے اسٹینڈ پہ لٹکا بلیک کلر کا ہیلمٹ سر پہ چڑھا لیا تھا اور فاطمہ کی گاڑی کے پیچھے ہی اپنی بائیک کی اسپیڈ بڑھا دی تھی وہ بہت عجلت میں تھی اور کافی رش ڈرائیو کر رہی تھی اس کے پیچھے وہ بھی اتنی ہی تیزی سے اسے فالو کر رہا تھا اور اپنے پلان کی کامیابی پہ دل ہی دل میں دل کھول کے مسکرا رہا تھا۔۔!!

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

✡ ✡

نبیلہ عزیز

دردِ دل

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نبیل حیات دونوں بہن بھائی ہیں' مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خودسر لڑکی ہے' وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پہ رنگ چکی ہے' جس کے پیش نظر فائزہ بیگم' نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں' لیکن مدحیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے' جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے' مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے' مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا' بے بسی اور مجبوری سے تنگ آ کر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے' لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باؤ امتیاز مل جاتا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے' جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے' اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے' وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے' وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

ولی آور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے' وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے' انہوں نے کی ہارنا نہیں سیکھا' اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دلاتی ہیں۔

۱۳

تیرھویں قسط

فاطمہ ہر دو منٹ کے وقفے سے گاڑی کی اسپیڈ مزید بڑھا رہی تھی اس کے ہاتھ پیر پھول رہے تھے وہ جلد از جلد مریم کے گھر پہنچنا چاہتی تھی اور اس سے بھی زیادہ جلدی جودت کو تھی وہ بھی جلد از جلد اپنی منزل پہ پہنچنا چاہتا تھا' اس کی منزل اس سے دور نہیں تھی اور یہی سرشاری اس کی روح کو معطر کیے دے رہی تھی وہ بائیک ڈرائیو کرتے ہوئے بھی جھوم رہا تھا۔ اگلے دس منٹ کی مسافت طے کرنے کے بعد فاطمہ کی گاڑی نے دائیں طرف ٹرن لیا تھا اور اس کے پیچھے جودت کی بائیک نے بھی!

پہلی دو گلیاں کافی کشادہ تھیں اس لیے فاطمہ کی کار با آسانی تنگ گلی کے نکڑ تک آگئی تھی اور گلی کے کونے پہ گاڑی پارک کرنے کے بعد وہ تیزی سے گاڑی سے نیچے اتر آئی تھی اور انتہائی عجلت سے گاڑی لاک کر کے بائیں سائیڈ والی گلی میں مڑ گئی۔ البتہ جودت کو بائیک سے اترنے کی ضرورت نہیں تھی وہ بائیک سمیت ہی اس گلی میں جا سکتا تھا اس لیے بائیک کی اسپیڈ کم رکھتے ہوئے وہ بھی اسی گلی میں مڑ گیا تھا بائیک کسی اور کی لے کر آیا تھا اور سر پہ ہیلمٹ چڑھا رکھا تھا اس لیے پہچانے جانے کا کوئی ڈر نہیں تھا۔

فاطمہ اس گلی کے پانچویں نمبر والے گھر کا دروازہ دھڑا دھڑ پیٹ رہی تھی اور جودت کی نظریں اس کے تعاقب میں اس دروازے تک گئی تھیں اور وہیں پہ ٹھہر گئی تھیں۔ گھر کی دیوار میں دروازے کے قریب ہی چھوٹی سی نیم پلیٹ نصب تھی' جس پہ بے رنگ اور دھندلے دھندلے سے لفظوں میں گھر کا ایڈریس اور "فاروق نیازی" کا نام لکھا ہوا تھا۔

جس کو پڑھنے کے بعد اس کی باقاعدہ تسلی ہو گئی تھی اور وہ بائیک کو کک لگا کے آگے بڑھ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے حواس باختہ ہو کر ان کے گھر کا دروازہ پیٹ ڈالا ہو۔ مریم ابھی ابھی مغرب کی نماز پڑھ کے فارغ ہوئی تھی امی اور ایمن نماز ادا کرنے کے بعد دعا مانگنے میں مصروف تھیں اس لیے ایمان ذرا فارغ تھی اسی نے آگے بڑھ کے دروازہ کھول دیا تھا۔ لیکن سامنے فاطمہ کو دیکھ کر ٹھٹک گئی تھی۔

"فاطمہ آپی' آپ۔۔۔؟" اس نے بدحواس سی فاطمہ کو حیرت اور اچنبھے سے دیکھا تھا۔

"عدیل کہاں ہے۔۔۔؟ مریم کہاں ہے۔۔۔؟ سب ٹھیک تو ہیں نا۔۔۔؟ کیا ہوا ہے گھر میں۔" فاطمہ ایمان کو پیچھے دھکیل کر سیدھی اندر آئی تھی اور بدحواسی سے کئی سوال ایک ساتھ پوچھ ڈالے تھے عدیل جو چھت پہ تھا اپنے گھر کے صحن میں کسی کی بلند آواز سن کر وہ بھی نیچے اتر آیا تھا لیکن فاطمہ کی حالت دیکھ کر ٹھٹک گیا وہ عدیل کو سیڑھیاں اترتے دیکھ کر لپک کے قریب آئی تھی۔

"تم۔۔۔ تم ٹھیک ہو نا؟" کیا ہوا تھا؟ کیا ہنگامہ ہوا ہے گھر میں' مریم کہاں ہے۔ وہ کیسی ہے؟ انکل تو ٹھیک ہیں نا۔"

وہ کسی کی بھی پروا کیے بغیر عدیل کا بازو دونوں ہاتھوں میں دبوچے خاصی بلند آواز سے سب کا پوچھ رہی تھی لیکن کیوں پوچھ رہی تھی یہ گھر کے کسی بھی فرد کو سمجھ نہیں آیا تھا عدیل نے اس کے ہاتھ اپنے بازو سے ہٹاتے ہوئے مریم کو آواز دی تھی۔

"مریم! لگتا ہے کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے ان کو آرام سے بٹھاؤ اور پانی پلاؤ۔" عدیل نے فاطمہ کے ہاتھ پیچھے ہٹا کر مریم کو اشارہ کیا تھا مریم فوراً سامنے آگئی تھی وہ ابھی ابھی جائے نماز سے اٹھی تھی اس کا دوپٹہ چہرے کے گرد ہالے کی صورت میں بندھا ہوا تھا فاطمہ نے عدیل کو دیکھنے کے بعد مریم کو دیکھا تھا ان دونوں کے چہروں پہ حیرانی ضرور تھی لیکن پریشانی دور دور تک دکھائی نہیں دے رہی تھی جس پہ فاطمہ بری طرح ٹھٹک گئی تھی۔

"فاطمہ! تو میرے ساتھ۔" مریم نے آکر اس کا بازو تھام لیا تھا لیکن فاطمہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکی تھی۔

"فاطمہ! کیا بات ہے۔۔۔؟ کیا ہوا ہے۔۔۔؟ اتنی پریشان کیوں لگ رہی ہو۔"

مریم نے نرمی سے اس کے کندھے پہ دوسرا ہاتھ رکھتے ہوئے رسانیت سے پوچھا اور سامنے کھڑا عدیل بھی اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا فاطمہ نے گہری سانس کھینچتے ہوئے کندھے سے اپنا شولڈر بیگ اتارا اور زپ کھول کر اپنا موبائل نکالا اور میسج اوپن کر کے موبائل عدیل کی سمت بڑھا دیا تھا۔ عدیل الجھن آمیز انداز میں اس کا موبائل تھام کے میسج پڑھنے لگا۔

"فاطمہ! کہاں ہو۔۔۔؟ کیا تمہیں کچھ خبر نہیں ہے؟ کل رات ہمارے گھر پہ قیامت گزر گئی' میں بہت پریشان ہوں' ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت ہے پلیز میرے پاس جلدی پہنچو تمہاری دوست مریم۔"

میسج پڑھ کے عدیل کے ماتھے پہ بل پڑ گئے تھے۔

"آپ کو یہ میسج کس نے بھیجا ہے؟" اس کا سوال بھی الجھا ہوا تھا۔

"میں تو یہی سمجھی تھی کہ مریم نے بھیجا ہے؟" فاطمہ اپنی جگہ حیران پریشان اور الجھی الجھی سی کھڑی تھی۔

"حالانکہ آپ جانتی بھی ہیں کہ ہمارے گھر میں فون اور موبائل کی سہولت نہیں ہے۔" عدیل نے اسے ایک اور غلطی کا احساس دلایا ہے۔

"مگر پریشانی کے مارے مجھے کچھ یاد نہیں رہا تھا کہ آپ لوگوں کے پاس موبائل فون ہے یا نہیں۔۔۔؟ مجھے تو یہ پڑھ کر شاک لگا تھا کہ کل رات آپ کے گھر پہ کوئی مصیبت گزر گئی ہے۔ میں نے وقت کا احساس کیا اور نہ ہی یہ جاننے کی زحمت کی کہ نمبر کس کا ہے؟" فاطمہ پریشانی سے کہتی دونوں ہاتھوں میں سر تھام کے چارپائی پہ بیٹھ گئی تھی۔

"ہمیشہ کوئی قدم اٹھانے سے پہلے جاننے کی زحمت ضرور کر لینی چاہیے' شام کا وقت ہے' اندھیرا گہرا ہو رہا ہے' اور آپ اکیلی عورت ذات ہو کر گھر سے نکل کھڑی ہوئیں' وہ بھی صرف ایک میسج پڑھ کے؟ سوچیے اگر آپ کو کوئی حادثہ پیش آجاتا تو۔" عدیل نے اسے سخت لہجے میں سمجھایا تھا اور فاطمہ اس کی بات کی گہرائی جان کر متوحش سی ہو گئی تھی وہ واقعی سچ ہی تو کہہ رہا تھا آج کل ملک اور شہر کے حالات ہی ایسے تھے کہ دن کے وقت گھر سے نکلنا محال ہو جاتا تھا یہ تو پھر شام کا وقت تھا۔

"بھائی! آرام سے بات کریں نا۔ وہ پہلے ہی اتنی پریشان ہے' نہ جانے کس خبیث نے یہ گھٹیا مذاق کیا ہے۔" مریم نے عدیل کو غصہ کرنے سے باز رکھا تھا۔

"میں بھی ان محترمہ کے لیے ہی بات کر رہا ہوں۔ اگر خود ان پہ کوئی مصیبت آجاتی تو؟" عدیل ہنوز سخت سست سنا رہا تھا اور اس بار فاطمہ نے اسے نظریں اٹھا کر دیکھا تو نظریں مسکرا رہی تھیں۔

"کاش کہ کوئی مصیبت آہی جاتی تو اچھا تھا' کم از کم آپ میرے لیے پریشان تو ہوتے رہتے۔" اس نے دل میں آئی بات زبان کی نذر کر ڈالی تھی اور عدیل اس کی بات پہ بری طرح سٹپٹا گیا تھا اس نے بے ساختہ مریم کی سمت دیکھا تھا مریم اپنی مسکراہٹ دبا کر چہرہ جھکا گئی تھی۔

"اتنی فرصت نہیں ہے میڈم کہ دوسروں کے لیے بھی پریشان ہوتے پھریں۔" وہ کہہ کے پلٹ گیا تھا۔

"دوسرے بھی تو آپ کے لیے پریشان ہوتے ہیں مسٹر عدیل عمر؟" اس نے پیچھے سے آواز دے کر کہا تھا۔

"دوسروں کو ہم نے نہیں کہا کہ ہمارے لیے پریشان ہوتے رہیں' اپنے لیے پریشان ہونے کے لیے ہم خود ہی کافی ہیں۔" وہ پلٹ کر اسے جواب دیتا ہوا باہر نکل گیا تھا اور فاطمہ نے گردن موڑ کر مریم کو شکایتی نظروں سے دیکھا تھا۔

"اپنے بھائی صاحب کی باتیں سن رہی ہو۔۔۔؟ پھر تم مجھے الزام دیتی ہو کہ میں ایسا ویسا کہہ جاتی ہوں۔" فاطمہ مریم کو گھور رہی تھی اور مریم بے ساختہ مسکرا اٹھی۔

"ارے بابا! نہیں دیتی الزام بھائی واقعی غلط کہہ رہے ہیں میں بات کروں گی ان سے' تم تو اندر آجاؤ' یہاں کیوں بیٹھ گئی ہو؟" مریم اس کی طرف داری کرتے ہوئے بولی اور فاطمہ کا ہاتھ پکڑ کے اسے اندر کمرے میں لے آئی تھی۔

"ایمان! فاطمہ کے لیے ٹھنڈا پانی لے کر آؤ۔" مریم نے کمرے سے ہی آواز دی تھی فاطمہ بے دھیانی میں عدیل کے بستر پہ ہی ٹک کر بیٹھ گئی اور مریم نے اس کے سامنے کرسی کھینچ لی تھی۔ اتنے میں ایمان چھوٹی سی ٹرے میں پانی کا گلاس لے آئی تھی۔ فاطمہ نے گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا تھا۔

"تھینک یو۔" اس نے خالی گلاس واپس ٹرے میں رکھتے ہوئے ایمان کو تھینکس کہا تھا۔

"ہاں اب بولو کیا مسئلہ ہوا ہے؟" مریم نے تحمل سے پوچھا تھا۔

"یار! میں یونیورسٹی گئی ہوئی تھی یونیورسٹی سے آف ہوا تو لائبریری چلی گئی وہاں اتنا ٹائم گزرا کہ احساس ہی نہ ہوا' ابھی تھوڑی دیر پہلے گھر پہنچی تھی' شاور لیا' اور کپڑے چینج کرکے فارغ ہی ہوئی تھی کہ تمہارا میسج۔ میرا مطلب ہے کہ یہ میسج ملا اور میسج پڑھنے کے بعد تو مجھے کچھ سوچنے سمجھنے کا بھی ہوش نہیں رہا تھا۔ میں فوراً گاڑی لے کر گھر سے نکل آئی۔" فاطمہ نے اسے تفصیل سے بتایا تھا۔

"لیکن فاطمہ یہ بھی تو سوچو تمہارے ساتھ یہ مذاق کس نے کیا ہوگا۔۔۔؟ کون ہے جو تمہاری اور میری دوستی کو جانتا ہے اور میرا نام لے کر تمہیں بلیک میل کر رہا ہے' یہ تو سراسر دھوکے کا کیس ہے یار' تم اس نمبر کی چھان بین کرواؤ۔" مریم نے اسے مشورہ دیا ہے۔

"وہ تو میں ضرور کرواؤں گی' لیکن یار بات پھر وہیں پہ آجاتی ہے کہ آخر میرے ساتھ یہ مذاق کیوں اور کس لیے کیا ہے؟ کس نے مجھے دھوکا دیا ہے؟ آخر مقصد کیا ہو سکتا ہے؟" فاطمہ خود بھی الجھ رہی تھی اور اسی الجھے الجھے دھیان میں مریم کا خیال اس لڑکے کی سمت چلا گیا جسے فاطمہ کا بھائی جودت کے نام سے بلا رہا تھا اور اسی جودت نامی لڑکے کی نظریں پورے فنکشن میں مریم پہ ہی جمی رہی تھیں وہ سب سے بے نیاز ہو کر اسے دیکھتا رہا تھا۔ کہیں یہ سب اس کا کارنامہ تو نہیں تھا۔۔۔؟ مریم نے بے اختیار سوچا تھا اور بالکل صحیح سوچا تھا لیکن وہ اپنی اس سوچ کا اظہار فاطمہ کے سامنے نہیں کر سکتی تھی۔

"یہ تو تم چھان بین کرواؤ گی تو مقصد کا پتا چلے گا۔ خیر تم کچھ دیر یہیں رہو اور کھانا کھا کر جانا؟" مریم سر جھٹک کر کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"ارے نہیں یار! میں نے لنچ کافی لیٹ کیا تھا اس لیے اب بھوک نہیں ہے' اب تو لیٹ نائٹ ہی کھانا کھاؤں گی' البتہ آپ لوگوں نے کھانا کھانا ہے تو کھائیں میں ابھی یہیں رکتی ہوں۔ سائم کو فون کرتی ہوں وہ مجھے پک کر لے گا۔

فاطمہ اب خود بھی اکیلی واپس نہیں جانا چاہتی تھی اسی لیے وہیں ٹھہر گئی تھی۔

"زیادہ نہ کھاؤ' تھوڑا سا کھالو۔" مریم نے اصرار کیا۔

"نہیں یار! مائنڈ مت کرنا' میرا موڈ نہیں ہے کھانے کا۔" فاطمہ نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا تھا مریم چپ ہو گئی۔

"تم بیٹھو میں سائم کو فون کر لوں۔" اس نے اپنے بیگ سے دوبارہ موبائل نکالا اور سائم کا نمبر ڈائل کیا تھا لیکن

اس کا نمبر بزی جا رہا تھا۔ دو تین بار ٹرائی کرنے کے بعد اس نے خفگی سے موبائل سائیڈ پہ رکھ دیا تھا لیکن موبائل رکھتے ہوئے بھی اس کی نظر عدیل کے تکیے کے نیچے سے جھانکتی کسی چمکتی ہوئی چیز پہ جا پڑی تھی اس نے بے ساختہ ہاتھ بڑھا کر وہ چیز باہر نکال لی اور بلیک کلر کے لیڈیز گلاسز دیکھ کے تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔

"لیڈیز گلاسز۔۔۔؟ عدیل عمر کے تکیے کے نیچے۔۔۔؟" وہ گلاسز کو حیران پریشان دیکھ رہی تھی اور کچھ ایسی ہی کیفیت مریم کی بھی ہوئی تھی اسے بھی یہ گلاسز دیکھ کر حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔

"یہ کس کے گلاسز ہیں۔۔۔؟" فاطمہ نے ڈائریکٹ مریم سے پوچھا تھا۔

"یہی تو میں سوچ رہی ہوں۔۔۔؟"

مریم کی آواز بھی قدرے کھوئی ہوئی تھی۔

"اوہ تو مسٹر عدیل عمر کا کسی کے ساتھ کوئی چکر چل رہا ہے؟" فاطمہ نے خود سے ہی اندازہ لگایا تھا۔

"بھائی کا کسی کے ساتھ چکر۔۔۔؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا۔۔۔؟" مریم بے یقین بھی تھی۔

"تو پھر یہ کس محترمہ کے ہیں؟" فاطمہ نے جھٹ کر گلاسز اس کے سامنے لہرائے تھے۔

"یہ تو ہم بتا سکتے ہیں کہ یہ کس کے ہیں' لیکن جس کے بھی ہیں کافی خوبصورت اور اسٹائلش ہیں۔" مریم نے تعریف کی اور فاطمہ نے اسے مزید گھور کے دیکھا تھا۔

"اسٹائلش لڑکیاں ہی اسٹائلش گلاسز پہنتی ہیں لہٰذا تم یہ نہ سوچو کہ صرف گلاسز ہی اسٹائلش ہیں بلکہ یہ بھی سوچو کہ ان کو پہننے والی لڑکی بھی ماڈرن اور اسٹائلش ہے' اور وہ کون ہے؟ یہ بھی پتا کرو۔" فاطمہ نے اپنی بات پہ زور دے کر کہا تھا۔

"میں بھلا کیسے پتا کر سکتی ہوں؟"

"تو کیا میں پتا کروں؟"

"تو کر لو۔"

"ہونہہ! میں کروں گی تو پٹخنے لگ جائیں گے تمہارے بھائی کو۔" وہ برا سا منہ بنا کر بولی تھی۔

"تمہیں بھی تو لگ رہے ہیں۔" مریم نے چھیڑا۔

"میرا مشورہ مانو تو یہ گلاسز اپنے ساتھ لے جاؤ' ان کی انوسٹی گیشن کرواؤ کہ آخر یہ کس حسینہ کے ہیں۔ کون اپنے چمکتے دمکتے نئے نکور گلاسز میرے بھائی کے تکیے کے نیچے چھوڑ گئی ہے؟ آخر کس کی رسائی ہوئی یہاں تک۔۔۔؟" مریم مسکرا کر کہتی ہوئی باہر نکل گئی تھی اور اتنے میں عدیل بھی واپس آ گیا تھا اس کے ہاتھ میں کولڈ ڈرنک کی ڈیڑھ لیٹر کی دو بوتلیں تھیں کوک اور اسپرائیٹ اس نے دونوں بوتلیں مریم کی سمت بڑھا دیں۔ مریم سمجھ گئی تھی کہ وہ فاطمہ کے لیے ہی لے کر آیا ہے۔

"نو تھینکس! اس تکلف کی کوئی ضرورت نہیں ہے' میں گھر جا رہی ہوں۔" فاطمہ ہمیشہ کی طرح عدیل کی آواز سن کر کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔

"گھر۔۔۔؟ مگر تم اکیلی گھر کیسے جاؤ گی۔۔۔؟" مریم ٹھٹک گئی۔

"چلی جاؤں گی' کچھ نہیں ہوتا۔"

اس نے تنک کے جواب دیا تھا۔

"ارے نہیں بیٹا! تم بیٹھو' عدیل تمہیں چھوڑ آتا ہے۔"

عدیل کی امی نماز پڑھ کے فارغ ہو چکی تھیں فاطمہ کا سارا مسئلہ وہ ایمان کی زبانی سن چکی تھیں اس لیے فاطمہ کو

اکیلے جانے سے روک دیا تھا جس پہ عدیل نے ایک بار پھر سٹپٹا کے دیکھا تھا۔

"نہیں آنٹی! میں چلی جاؤں گی خواہ مخواہ کسی کو پریشان کرنے کا کیا فائدہ۔" اس نے انکار کر دیا۔

"ارے بیٹا! تم ہماری پریشانی میں یہاں تک چلی آئی ہو تو کیا ہم تمہیں اسی طرح واپس بھیج دیں۔؟ جاؤ بیٹا فاطمہ کو اس کے گھر تک چھوڑ آؤ۔"

انہوں نے اشارہ کیا اور عدیل سب کے سامنے ماں کے حکم سے انکار نہ کر سکا اور خود بخود ہی قدم باہر دروازے کی سمت بڑھا دیئے تھے۔

"جاؤ! مر واب۔؟" مریم نے فاطمہ کو اس کے پیچھے دھکیلا اور فاطمہ اپنے دل کی خوشی دل میں دباتی عدیل کے پیچھے گلی میں نکل آئی تھی وہ کافی ست قدم اٹھا رہا تھا جبکہ فاطمہ کے قدم بہت فریش اور سرشاری کیفیت کی نشاندہی کر رہے تھے وہ بڑی خوشی خوشی اس کے برابر قدم اٹھا رہی تھی اور اس کے ساتھ چلتے ہوئے دل بھی بری طرح دھڑک رہا تھا۔

گاڑی کے قریب پہنچ کر عدیل رک گیا اور انتظار کرنے لگا کہ وہ گاڑی کا لاک کھولے لیکن فاطمہ نے چابی اس کی سمت بڑھا دی تھی۔

"مجھ سے ڈرائیو نہیں ہو گی' تم ڈرائیو کرو۔" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"آئیم سوری! میں نہیں کر سکتا۔ آپ خود کریں۔" اس نے چابی تھامنے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھایا تھا بلکہ گردن نفی میں ہلا کر انکار کر دیا تھا۔

"میں خود تو کر لوں' مگر ڈر ہے کہ ایکسیڈنٹ کر دوں گی' تمہارے ہوتے ہوئے میرا دھیان کسی اور طرف ذرا کم ہی جائے گا۔" اس نے کندھے اچکا کر لاپروائی ظاہر کی۔

"دیکھیے! یہ وقت یہاں کھڑے ہو کر باتیں بنانے کا نہیں ہے۔ گاڑی نکالیں اور شرافت سے گھر چلیں۔" عدیل نے اسے خفگی سے اشارہ کیا تھا۔

"تم ڈرائیو کر لو تو ٹھیک ہے ورنہ یہاں کھڑے ہو کر باتیں کرنا بھی برا نہیں ہے۔" اس نے بے نیازی سے کہا اور عدیل نے زچ ہو کر اس کے ہاتھ سے چابی جھپٹی اور لاک کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھ گیا تھا فاطمہ جلدی سے لپک کے دوسری سائیڈ پہ آئی تھی اور فرنٹ سیٹ پہ بیٹھ گئی عدیل نے گاڑی بیک کی اور واپسی کے لیے مین روڈ پہ ڈال دی فاطمہ اسے اپنی گاڑی ڈرائیو کرتے دیکھ کر خوش ہو رہی تھی وہ لوگ کافی راستہ طے کر آئے تھے جب فاطمہ کو کوئی خیال چھو کے گزرا تھا۔

"اک بات پوچھوں تم سے۔؟" وہ بے ساختہ پوچھ بیٹھی۔

"پوچھیں۔" اس نے موڑ کاٹتے ہوئے سنجیدگی سے اجازت دی۔ اور فاطمہ لحظہ بھر کے لیے ٹھہر سی گئی تھی۔

"پوچھیے فاطمہ صاحبہ۔؟" اس کی چپ پہ عدیل نے اسے خود متوجہ کیا تھا۔

"وہ گلاسز کس کے ہیں۔؟" آخر کار پوچھ ہی ڈالا۔

"گلاسز؟" وہ سمجھا نہیں تھا۔

"وہی گلاسز جو تمہارے بستر کے تکیے کے نیچے بڑی احتیاط سے رکھے ہیں اور یقیناً" ان کی وجہ سے تم تکیے پہ سر رکھ کے نہیں سوتے ہو گے کہ کہیں وہ گلاسز ٹوٹ ہی نہ جائیں۔؟" فاطمہ نے اسے گردن موڑ کر دیکھتے ہوئے کہا تھا اور عدیل ان "گلاسز" کا خیال آتے ہی مسکرا دیا تھا اس کے خیال کے پردے پہ مدیحہ کا نکھرا اور پرغرور سا سراپا لہرا گیا تھا۔

"کیوں مسکرا رہے ہو۔؟"

"بس آپ نے کسی کی یاد دلا دی اور میں مسکرا دیا۔" اس نے شانے اچکائے۔

"کون ہے وہ لڑکی۔" فاطمہ کی آواز جیسے کسی پاتال سے سنائی دی تھی۔

"بتانا ضروری نہیں ہے۔" اس نے ٹال دیا۔

اس کے جواب پہ فاطمہ کا دل مزید جل کر رہ گیا تھا ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو وہ اتنی خوش تھی اور ابھی پل بھر میں ہی اس کی خوشی غارت ہو گئی تھی۔

"یعنی آپ چھپا رہے ہیں؟" وہ دوبارہ سے "تم" سے "آپ" تک آ گئی تھی۔

"ایسی باتیں چھپانے والی ہی ہوتی ہیں۔" وہ جانے کیوں محظوظ ہو رہا تھا اور فاطمہ چپ کی چپ رہ گئی تھی اس کے پاس کہنے کو کچھ بچا بھی نہیں تھا عدیل نے اس کے گھر کے سامنے بریک لگائے تھے اور فوراً" سے پیشتر گاڑی سے اتر گیا تھا۔

"میری ذمہ داری آپ کو گھر تک چھوڑنے کی تھی میں نے آپ کو گھر تک چھوڑ دیا ہے' اب آپ جا سکتی ہیں۔" وہ گھوم کے دوسری طرف آیا تھا اور فاطمہ کی سائیڈ پہ کھڑکی کی سمت جھکتے ہوئے کہا تھا لیکن وہ جواباً" کچھ بھی نہ بولی۔

"اللہ حافظ۔" وہ کہہ کے پلٹ گیا تھا لیکن چند قدم دور جا کر دوبارہ واپس مڑ آیا تھا۔

"ویسے میڈم! آپ زیادہ شک کرنے کی ضرورت نہیں ہے' میرا کسی کے ساتھ کوئی چکر نہیں چل رہا میرا دامن بھی صاف ہے اور دل بھی' وہ گلاسز کس میڈم کے ہیں؟ یہ تو میں خود بھی نہیں جانتا' امانت ہیں کسی کی' واپس لوٹانے ہیں۔" اس نے کھڑکی میں جھک کے کہا اور دوبارہ واپس چلا گیا تھا۔

"آٹو۔" اس نے رکشے والے کو اشارہ کیا تھا اور اگلے پل وہ رکشا میں سوار ہو گیا تھا۔ فاطمہ تعجب سے اسے دیکھتی رہ گئی۔ پھر ذرا تسلی ہوئی تو مسکرا اٹھی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ اپنے پلان کی کامیابی پہ سرشار سا تھا تبھی گنگناتا ہوا کی چین گھماتا سیڑھیاں چڑھ کے صائم کے فلیٹ کے سامنے آ رکا تھا اور بڑی ترنگ میں دستک دی تھی صائم نے اسے ہول سے دیکھ لیا تھا اسی لیے دروازہ کھول دیا تھا۔

"ہیلو ایوری باڈی۔" اس نے اندر داخل ہو کر ہاتھ ہلایا تھا۔

"ہائے! کہاں تھے تم۔؟" نائلہ لپک کے اس کے قریب آئی تھی اور دونوں بازو اس کے گلے میں ڈال دیئے تھے۔

"لگتا ہے تم مجھے بہت مس کر رہی تھیں؟" وہ نائلہ کے سلکی شولڈر کٹ بالوں کو چھیڑتے ہوئے بولا تھا۔

"آف کورس یار۔! تمہارے بغیر میں ہمیشہ ہی بور ہوتی ہوں۔" وہ منہ بنا کر بولی۔

"چلو پھر تم لوگوں کی بوریت دور کرتا ہوں۔"

"ہیں! وہ کیسے۔؟" وہ سب کورس میں بولے تھے۔

"شیشہ کلب چلتے ہیں' پارٹی میری طرف سے۔"

"پارٹی؟ مگر کس خوشی میں؟" یہ سوال کومی کا تھا۔

"خوشی کا بھی پتا چل جائے گا' پہلے تم لوگ تو چلو۔" سبھی لڑکے لڑکیاں اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور جودت کی دعوت پہ یہ قافلہ سیدھا شیشہ کلب پہنچا تھا کبھی کبھی وہ سب دوست اگر خوش اور موڈ میں ہوتے تو ایک دوسرے کو شیشہ پینے کی (جو کہ ایک قسم کا نشہ ہے) دعوت دیتے تھے اور اس وقت بھی وہ لوگ جودت کی دعوت پہ اس تکیے سے

اندھیرے والے کیبن میں بیٹھے شیشہ پی کر مسرور ہو رہے تھے جووت اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ شیشہ شیئر کر رہا تھا اور کامی اور سائم وغیرہ اپنی گرل فرینڈز کے ساتھ شیئر کر رہے تھے۔

"ہوں! اب بولو کس خوشی میں دعوت دی ہے۔؟" سائم نے ذرا سا دھواں فضا میں چھوڑتے ہوئے کہا اور جووت کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے اسے متوجہ کیا تھا۔

"میں نے مریم فاروق نیازی کے گھر کا پتا کر لیا ہے۔" اس نے سائم کا سارا نشہ ہرن کر دیا تھا سائم اسے ششدر سا دیکھ رہا تھا۔

"مریم کے گھر کا پتا۔؟"

"جی ہاں! مریم فاروق نیازی کے گھر کا پتا۔" اس نے دہرا کر اور زور دے کر کہا تھا البتہ چہرے پہ فتح مندی کا سرشار سا احساس بکھرا ہوا تھا۔

"مگر کیسے۔؟" سائم کو بے چینی ہوئی تھی۔

"کیسے کو چھوڑو بس میری کامیابی پہ مبارک باد دو مجھے۔" جووت سرشاری سے بولا۔

"لیکن جووت تم۔"

"بس یار بس! کوئی نصیحت نہیں اور کوئی ہدایت نہیں بس اب صرف یہ سوچو کہ جووت آفندی مریم فاروق نیازی سے ملاقات کیسے کرے گا۔؟ ملاقات بمطلب ملنا سمجھ گئے نا تم۔؟" وہ ذو معنی لہجے میں کہہ رہا تھا اور سائم چپ سا ہو گیا جووت آفندی واقعی بہت خبیث ثابت ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

صبح گیارہ بجے کا وقت تھا جب وہ سو کر اٹھی تھی۔

اے سی کی کولنگ کی وجہ سے وہ کافی گہری اور سکون کی نیند لے کر بیدار ہوئی تھی لیکن باہر آگ اگلتے سورج نے حشر انگیز کر رکھا تھا تیز دھوپ لوگوں کے سروں پہ چڑھ کے ناچ رہی تھی اور اس دھوپ اور گرمی کو برداشت کرنے والوں کا برا حال تھا اس نے ذرا کی ذرا کھڑکی سے پردہ ہٹا کر دیکھا تھا اور آنکھیں چندھیا گئی تھیں جبھی فوراً سے پیشتر پردہ دوبارہ واپس گرا دیا تھا اور ڈھیلے ڈھالے انداز میں انگڑائی لیتی ہوئی شاور لینے کے لیے گھس گئی شاور لینے کے بعد موڈ فریش ہوا تو تیار ہو کر نیچے آ گئی تھی اتنے میں ہاتھ میں پکڑا اسیل بج اٹھا تھا اس نے اسکرین پہ نمبر دیکھا تو منہ بنا کر منہ بنا لیا تھا۔

"سوری جیزی اس وقت بات کرنے کا موڈ نہیں ہے۔" اس نے کال ڈس کنیکٹ کرتے ہوئے دل ہی دل میں جیزی سے معذرت کی تھی اور باقی کی دو تین سیڑھیاں بھی اتر آئی۔

"گڈ مارننگ۔" اس نے سامنے سے آتے نبیل کو فریش انداز میں وش کیا تھا۔

"مارننگ۔" وہ کافی سنجیدگی اور کافی آہستگی سے کہہ کر پاس سے گزر کے اوپر چلا گیا تھا جس پہ مدیحہ کو بے حد اچنبھا ہوا تھا اس نے حیرانی سے مڑ کر نبیل کی پشت کو دیکھا تھا کہ آخر وہ بغیر کچھ کہے پاس سے کیوں گزر گیا ہے۔ حالانکہ وہ ایسا نہیں تھا وہ تو پاس ٹھہر کر حال چال پوچھنے اور پیار کرنے والا آدمی تھا۔ یقیناً "کچھ ہوا تھا اسے جو وہ اس طرح چپ چاپ گزر گیا تھا۔

"کیا مسئلہ ہو گیا ہے آخر۔؟ اب تو میں نے بھی کچھ نہیں کیا جس کا انہیں غصہ ہو گا۔ وہ سوچتی ہوئی وہاں سے ڈرائنگ روم میں آ گئی۔

"مام۔! وہ نبیل بھائی کو کیا ہوا ہے؟ وہ اتنے چپ۔" کہتے کہتے اچانک اس کی نظر دائیں طرف کے صوفے کی

سمت اٹھی تھی اور منہ کے الفاظ منہ ہی رہ گئے تھے۔ بلیک لیدر کے ون سیٹر صوفے پہ اس کے والد محترم ممتاز حیات بڑے شاہانہ انداز میں براجمان تھے جن کو دیکھ کر مدحیہ کے قدم زمین نے جکڑ لیے تھے وہ کھڑے کھڑے سپاٹ پتھر کی مورت بن گئی تھی۔

"کیسی ہو بیٹا۔؟ کیا دیکھ رہی ہو۔۔۔؟" انہوں نے اسے یوں مخاطب کیا جیسے روز صبح کا معمول ہو جیسے ڈیڑھ سال بعد ملنا تو کوئی خاص معنی نہ رکھتا ہو مگر ان کے مخاطب کرنے پہ مدحیہ کے اندر غم و غصے سے ابال اٹھنے لگے تھے اس کا چہرہ نفرت سے سرخ پڑ گیا تھا۔ نظروں میں کئی ایسے مناظر گھوم گئے تھے جن کی وجہ سے اس کا فشار خون بلند ہونے لگا تھا اور شدت ضبط سے اس نے اپنے ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ لی تھیں اور ایسی کیفیت میں بہتر تھا کہ وہ وہاں سے چلی جاتی۔

"مدحیہ! سلام کرو اپنے بابا کو؟" وہ واپس پلٹ رہی تھی جب فائزہ بیگم کی آواز پہ اس کے قدم تھم گئے تھے۔

"ایم سوری مام! سلام کا مطلب ہوتا ہے کسی پر سلامتی بھیجنا، جو میں نہیں بھیج سکتی" اور ویسے بھی سلام اسے کیا جاتا ہے جسے سلام کا پتا ہو۔" نفرت اور حقارت اس کے لب و لہجے سے ہی اُمڈ رہی تھی۔ فائزہ بیگم اس کے جواب پہ سٹپٹا کر رہ گئیں جبکہ ممتاز حیات کے چہرے پہ غصے کی سرخی دوڑ گئی تھی۔

"مدحیہ! یہ کیا کہہ رہی ہو تم۔؟ تمیز سے بات کرو بابا ہیں تمہارے۔" انہوں نے بیٹی کو سرزنش کی تھی جس پہ مدحیہ کو اور بھی تپ چڑھی تھی۔

"ہونہہ سوئٹ مام! بس بھولی، بے وقوف اور نادان عورت ہیں آپ، ہر ڈیڑھ دو سال بعد تھکن اتارنے کے لیے گھر آجاتے ہیں تو آپ عزت، احترام اور تمیز کے ساتھ ان کی خدمتوں میں لگ جاتی ہیں، کبھی ان سے یہ بھی تو پوچھ لیا کریں کہ وہ دو سال یا ڈیڑھ سال کہاں اور کن کاموں میں گزار کے آتے ہیں؟ یا پھر آپ یہ ہی پوچھ لیا کریں کہ یہ عزت، احترام اور تمیز کے قابل ہیں بھی یا نہیں۔" وہ نفرت سے طنزیہ اور استہزائیہ انداز پہ اتر آئی تھی۔

"مدحیہ!" ممتاز حیات یک دم دھاڑ اٹھے تھے، لیکن یہ بھول گئے تھے کہ مقابل ان کی اپنی ہی اولاد ہے۔ جو ڈرنے والی یا جھکنے والی ہرگز نہیں تھی۔

"مسٹر ممتاز صاحب! آہستہ آواز میں بولیے، ورنہ مجھے آپ سے بھی زیادہ اونچی آواز میں بولنا آتا ہے۔" وہ انگلی اٹھا کر وارننگ دینے والے انداز میں بولی تھی۔

"مدحیہ! یہ کس لہجے میں بات کر رہی ہو اپنے بابا کے ساتھ۔" فائزہ بیگم بھی صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

"پلیز مام! مجھے بار بار یہ احساس مت دلائیں کہ یہ میرے بابا ہیں، مجھے نفرت ہوتی ہے یہ سوچ کر کہ میں ان کی اولاد ہوں، گھن آتی ہے اپنے آپ سے بھی ڈیڑھ سال ہو گیا ہے مجھے اپنے آپ سے گھن کھاتے ہوئے ڈیڑھ سال سے جل رہی ہوں، صرف یہ سوچ سوچ کر کہ میں اس انسان کی اولاد ہوں اور اس انسان کا گھٹیا اور گندہ خون میری رگوں میں دوڑ رہا ہے۔" وہ کہتے کہتے یک دم پھٹ پڑی تھی اور فائزہ بیگم ششدر سی رہ گئیں۔

"بدتمیز، بے ہودہ لڑکی، تمہیں جرات کیسے ہوئی کہ تم اپنے باپ سے اس لہجے میں بات کرو۔" وہ اسے شعلہ بار نظروں سے دیکھتے ہوئے قریب آئے تھے۔ مگر وہ بھی پیچھے ہٹنے کی بجائے ان کے سامنے ڈٹ کے کھڑی رہی۔

"میں آپ کو اپنا باپ کہتے ہوئے اپنی توہین محسوس کرتی ہوں، آپ کی عزت میری نظر میں ڈیڑھ سال پہلے کینیڈا کے ایک ہوٹل کی راہداری میں ختم ہو گئی تھی، اس روز میں نے آپ پہ فاتحہ پڑھی تھی، مر گئے تھے آپ میرے لیے، آپ کی عزت، آپ کا وقار، آپ کا احترام سب مر گیا تھا اس روز۔۔۔ اور یقیناً" آپ کو خبر ہو گی کہ مرے ہوئے جذبات، مرے ہوئے احساسات اور مرے ہوئے انسان زندہ نہیں ہوتے؟ آپ بھی مر گئے ہیں، سمجھے آپ؟" وہ یک دم اونچی آواز میں دھاڑی تھی۔

"اسٹاپ اٹ! جسٹ اسٹاپ اٹ۔" انہوں نے جواباً غرا کے کہتے ہوئے ہاتھ اٹھایا تھا، لیکن اچانک نبیل سامنے آگیا تھا۔

"پلیز پاپا! کنٹرول یور سیلف۔۔۔ کیا کر رہے ہیں آپ؟"

"آپ ان کو کرنے دیں، میں بھی دیکھتی ہوں کہ کیا کرتے ہیں، ڈیڑھ سال سے انتظار تھا اس گھڑی کا کہ کبھی میرا اور ان کا بھی سامنا ہو۔" مدحیہ یک دم دوبارہ سامنے آئی تھی۔

"مدحیہ پلیز! اپنے بیڈ روم میں جاؤ۔" نبیل نے اسے پرے پیچھے ہٹایا۔

"ہرگز نہیں! میں آج ان کو آئینہ دکھا کر ہی جاؤں گی، آخر ان کو پتا تو چلے کہ وہ کس حد تک گر چکے ہیں؟" وہ اونچی اور بلند آواز میں چلا رہی تھی۔ نبیل نے اسے بازوؤں میں گھیرتے ہوئے بمشکل پیچھے کھینچا تھا۔ وہ عجیب جنونی سی ہو رہی تھی اس کا انداز ہذیانی سا تھا۔

"مدحیہ! پاگل مت بنو یہ کیا طریقہ ہے بات کرنے کا۔" نبیل اسے ڈرائنگ روم سے باہر کھینچ لایا تھا۔

"اس انسان کے ساتھ یہی طریقہ ہو سکتا ہے بات کرنے کا، یہ درندہ صفت انسان ہمارا باپ نہیں ہو سکتا۔" وہ چیخ رہی تھی اور نبیل اسے زبردستی کھینچ کے بیڈ روم تک لایا تھا۔

"بیٹھو یہاں کیوں پاگل ہو رہی ہو؟ کیا ہوا ہے آخر۔" نبیل نے اسے بیڈ پہ بٹھاتے ہوئے خفگی سے کہا تھا۔

"ان کی اصلیت، ان کا جو روپ میں نے دیکھا ہے وہ آپ نے نہیں دیکھا، تم ہی لیے پاگل ہو رہی ہوں، آپ دیکھ لیتے تو شاید اسی نام نہاد باپ کو اٹھا کر اس گھر سے باہر پھینک دیتے، جو ہمارا باپ اور ہماری ماں کا شوہر کہلائے جانے کے بھی لائق نہیں ہے۔" مدحیہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا سے کیا کر ڈالے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ ممتاز حیات کو گولی سے اڑا دے۔ اس کے اندر پلنے والی نفرت آج خود کے سامنے آئی تھی۔ وہ حشر اٹھا دینے کے درپے تھی۔ حالانکہ کسی حد تک نبیل حیات بھی اپنے باپ کے کرتوت جانتا تھا۔ مگر جو کچھ مدحیہ دیکھ چکی تھی اگر واقعی نبیل بھی دیکھ لیتا تو جیتے جی مر جاتا یا پھر اپنے باپ کو مار دیتا۔

"یہ شخص اگر ایسا ہے تو میں بھی اسی گندے شخص کی اولاد ہوں میں بھی انہیں دکھاؤں گی کہ عیاش ہونا کیا ہوتا ہے۔" وہ جو منہ میں آرہا تھا بولے جا رہی تھی۔

"یہ لو پانی پیو۔" نبیل نے جگ سے پانی انڈیل کر گلاس اس کی سمت بڑھایا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے اس کی، میرے دل و دماغ میں جلتی آگ اس پانی سے بجھنے والی نہیں ہے۔" وہ نبیل کا ہاتھ ہٹا کر کھڑی ہو گئی تھی۔

"مدحیہ۔۔۔" فائزہ بیگم نے اندر داخل ہوتے ہوئے اسے پریشان نظروں سے دیکھا۔

"مام پلیز! مجھ سے کچھ مت کہیے گا، میرا دماغ پہلے ہی ماؤف ہو رہا ہے اور کچھ سنا تو پھٹ جائے گا۔" اس نے اپنی کنپٹیوں کو سہلاتے ہوئے کہا تھا اور اتنے میں دوبارہ اس کا سیل فون بجا تھا۔ مدحیہ نے پلٹ کر بیڈ سے اپنا سیل اٹھا کر نمبر دیکھا اور اس بار کال ریسیو کرتے ہوئے سیل کان سے لگا تھا۔

"ہائے جیزی! ہاؤ آر یو۔" اس نے بلا خوف و خطر بات کی تھی۔

"ایم فائن، تم سناؤ بار بار فون کیوں کر رہے ہو؟" مدحیہ بات کرتے ہوئے بیڈ روم کے دروازے کی سمت بڑھی تھی۔

"ارے واؤ! تم پاکستان آرہے ہو؟ امیزنگ یار، خوب انجوائے کریں گے بس جلدی سے آجاؤ میں بھی بہت مس کر رہی تھی بہت بور ہو رہی ہے یہاں۔" وہ بہا تمہ۔۔۔ کہتی ہوئی کمرے سے نکل گئی تھی فائزہ بیگم اور نبیل اک دوسرے کو دیکھ کے رہ گئے تھے۔ وہ مدحیہ جو ایک نارمل مدحیہ کے روپ میں ڈھل رہی تھی، ممتاز حیات کی

اچانک آمد پہ دوبارہ سے پچھلے خول میں اتر گئی تھی۔ نبیل کو بے پناہ اذیت کا احساس ہوا تھا وہ بے بس سا کھڑا تھا۔

☼ ☼ ☼

"عبداللہ کو فون کروں یا نہ کروں؟"

وہ صبح سے اسی ایک کشمکش کا شکار تھا اور یہ ہی سوچے جا رہا تھا' اس کا سارا دھیان زری کی طرف تھا اور اسی وجہ سے وہ رات بھر سو نہیں پایا تھا' کیونکہ یہ ایک ایسا معاملہ تھا جسے وہ اپنے دونوں دوستوں کے ساتھ بھی شیئر نہیں کر سکتا تھا' نہ عبداللہ کے ساتھ اور نہ ہی نبیل حیات کے ساتھ' کیونکہ زری ایک کی عزت تھی تو ایک کی محبت۔

دل آور شاہ اپنا رازداں بناتا بھی تو کس کو؟ اس لیے سود و زیاں کا سودا طے کرنا تھا تو خود ہی طے کرنا تھا' یہاں اس کے دوستوں کی دوستی کام نہیں آ سکتی تھی۔ البتہ اسے دوستی کا بھرم ضرور رکھنا تھا' تاکہ دونوں میں سے کسی ایک کو بھی دل آور شاہ سے شکایت نہ ہو پائے۔ اور ان ہی کوششوں میں وہ زرین ملک کا دل نیزے کی انی میں پروئے جا رہا تھا۔ دل آور شاہ کا زری کو نظرانداز کرنا زری کے لیے کسی جان لیوا مرض سے کم نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کل رات سے اس کا کیا حال ہوا ہوگا؟ اور اسی حال کو مزید جاننے کے لیے وہ عبداللہ یا نگارش بھابھی کو کال کرنا چاہ رہا تھا اور کر نہیں پا رہا تھا۔ لیکن عبداللہ شاید اس سے بھی زیادہ پریشانی میں مبتلا تھا۔ جب ہی تو اس کا خود فون آ گیا۔ دل آور نے ایک ہاتھ سے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے اس کی کال ریسیو کی تھی۔

"السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام! کیسے ہو؟" عبداللہ ذرا سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

"ہمیشہ کی طرح فٹ فائن ہوں' تم اپنی سناؤ' تم فٹ نہیں لگ رہے؟" دل آور نے گاڑی موڑتے ہوئے اپنی بات بھی اپنے مطلب کی سمت موڑی تھی۔

"ہاں یار! بہت ڈپریسڈ ہوں میں۔" عبداللہ نے اعتراف کیا تھا اور دل آور ہمہ تن گوش ہوا تھا کہ آخر ان دونوں بہن بھائی کے ساتھ کیا مسئلہ ہو گیا ہے؟ دونوں ہی اسے فون کرنے پہ مجبور ہو گئے تھے۔ بس فرق یہ تھا کہ بہن نے رات کو کیا تھا اور بھائی نے دن میں۔

"ڈپریسڈ ہونے کی وجہ؟" اس نے بڑے سکون اور تحمل کا مظاہرہ کیا تھا۔ وکیل تھا آخر' بات پوچھنے کا ڈھنگ خوب جانتا تھا۔

"پاکستان سے بابا جان کا فون آیا تھا کل۔" عبداللہ نے بات شروع کی۔

"تو؟"

"تو وہ زری کو پاکستان واپس بھیجنے کا اصرار کر رہے تھے۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ وہ زری کی شادی کرنا چاہتے ہیں' اس کے لیے کوئی پرپوزل آیا ہوا ہے۔"

"اوہ! تو یہ ڈپریشن ہے۔" دل آور نے ہونٹ سیکڑتے ہوئے کہا۔

"یہ ڈپریشن کچھ کم نہیں ہے' دل آور! بہت بڑا مسئلہ ہے' میں ابھی زری کو پاکستان نہیں بھیجنا چاہتا' جبکہ وہ ضد پہ اڑے ہوئے ہیں' میری بات سے تو وہ ویسے ہی خار کھاتے ہیں۔" عبداللہ پریشانی کا شکار تھا۔

"تو کیا بات کی ہے تم نے؟"

"بس میں نے تو یہ ہی کہا ہے کہ میں زری کو اس کے لاسٹ ایگزامز سے پہلے نہیں بھیجوں گا اور اگر بھیجوں گا بھی تو شادی زری کی پسند سے ہوگی' ورنہ نہیں ہوگی۔" عبداللہ نے اپنی بات دہرائی۔

"بات تو بڑی انقلاب کی ہے تم نے' مگر کیا یقین ہے کہ تم اس پہ قائم بھی رہو گے؟" دل آور شاہ اس کی ثابت قدمی کا یقین چاہ رہا تھا۔

"دل آور صاحب! میں تمہارا دوست ہوں اور اپنے دوست کو تم بہتر طور پہ جانتے ہو گے' مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"لیکن گستاخی معاف' ایک بات کہنا چاہوں گا تم سے۔" دل آور نے احتراماً کہا تھا۔

"کہو۔"

"اپنی بہن کو میرا مطلب ہے کہ زرین ملک کو تم اس کی پسند کی آزادی تو دے رہے ہو اگر یہ ہی آزادی تمہارے لیے مشکل بن گئی تو؟" دل آور ایک بک شاپ کے سامنے گاڑی پارک کرتے ہوئے ایک پوائنٹ کی بات پوچھ رہا تھا۔

"ہرگز نہیں! زرین ملک میری بہن ہے' میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں' وہ میری بساط سے زیادہ پاؤں نہیں پھیلائے گی' وہ خود تو مشکل میں پڑ سکتی ہے' لیکن میرے لیے مشکل کھڑی نہیں کر سکتی۔ جو کہوں گا وہ مانے گی۔" عبداللہ کے لہجے میں یقین تھا۔

"ہوں! یہ تو بہت اچھی بات ہے' لیکن کسی کے دل کا حال تو کوئی بھی نہیں جانتا' کبھی کبھی کسی کی پسند پوری کرنا بے حد مشکل ہو جاتا ہے۔"

"جو مشکل کام ہم اپنے لیے کر سکتے ہیں' وہ بہن اور بیٹیوں کے لیے بھی کر سکتے ہیں' میں ہائر اسٹڈی کے لیے انگلینڈ آیا تھا اور زری کی بھی خواہش تھی کہ وہ ہائر اسٹڈی کے لیے جائے سو دیکھ لو میں نے اس کی خواہش پوری کر دی' چاہے اس کے لیے مجھے اپنی ساری فیملی کی مخالفت مول لینی پڑی تھی' میں نے لے لی اور دیکھ لینا اس معاملے میں بھی ایسا ہی ہوگا۔" عبداللہ کی بات اور لہجے کی مضبوطی سے دل آور کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ زری کے لیے ڈٹ جائے گا' لیکن اصل مسئلہ تو یہ تھا کہ زری کسی اور کی پسند تھی اور پسند کسی اور کو کرتی تھی۔ عبداللہ کو اگر پتا چلتا تو وہ کس کا ساتھ دیتا۔ زری کا یا پھر نبیل کا؟ فیصلہ کرنا بے حد مشکل تھا۔

اس ٹاپک پہ اگر سوچا بھی جاتا تو دماغ شل ہو جاتا تھا اور دل آور اکثر اس سارے معاملے سے دامن بچا کے گزر جاتا' بات زری کی ہوتی یا نبیل کی' وہ اکثر نظرانداز کر جاتا تھا۔

"ان شاء اللہ! اللہ بہتر کرے گا' تم زیادہ ٹینشن مت لو۔" وہ اس کے ساتھ موبائل پہ بات کرتا ہوا گاڑی سے نکل آیا تھا۔

"یار! ٹینشن تو ہوگی' سارا معاملہ ہی بہت سنگین ہے' اب دیکھو کہ اگر ایگزامز کے بعد زری پاکستان جاتی ہے تو بابا جان کی یہ ہی کوشش ہوگی کہ وہ اس کی جلد سے جلد شادی کر دیں' جبکہ میں ایسا نہیں چاہتا' میں چاہتا ہوں کہ وہ پہلے پاکستان جائے' وہاں دوبارہ سے ایڈجسٹ کرے' پھر پتا چلے گا کہ وہ جاگیرداروں اور حویلی والوں سے شادی کر کے نباہ سکتی ہے یا نہیں۔"

"تو پھر یہ سب کیسے ہو سکتا ہے؟" دل آور گاڑی لاک کر کے مضبوط قدم اٹھاتا بک شاپ کی طرف آ گیا تھا۔

"یہ سب اسی طرح ہو سکتا ہے کہ میں بھی کچھ عرصہ کے لیے پاکستان آ جاؤں۔" عبداللہ نے اپنا ارادہ ظاہر کیا۔

"تم پاکستان آ جاؤ گے اور نگارش بھابھی؟"

"وہ بھی میرے ساتھ ہی آئیں گی۔"

"لیکن تمہارے گھر والے تو انہیں قبول کرنے کو تیار نہیں ہیں؟"

"جانتا ہوں' اور اسی لیے چاہتا ہوں کہ تمہاری طرح لاہور میں اپنا گھر لے لوں اور میں نے تمہیں اسی لیے فون

کیا ہے کہ تم میرے لیے کوئی اچھا سا گھر دیکھو۔"

"اوہ! تو یہ معاملہ ہے؟"

"ہاں یار! مجبوری ہے' زری اکیلی ان لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکے گی' وہ تو پل میں ہتھیار ڈال دے گی' میرا اس کے ساتھ ہونا ضروری ہے۔"

"ہوں! واقعی ٹھیک کہہ رہے ہو' اچھا ارادہ ہے تمہارا' میں بات کروں گا کسی سے' گھر کرائے پہ لینا ہے یا ذاتی؟"

"نہیں یار! اس کرائے کا جھنجٹ نہیں چل سکتا' ذاتی ہی لوں گا' اگر دوبارہ انگلینڈ آیا تو اس گھر کی ذمہ داری تم ہی سنبھالو گے۔" عبداللہ نے پہلے سے ہی اطلاع دے دینا ضروری سمجھا تھا' جس پہ دل آور کے تیور بدل گئے تھے۔

"کیوں؟ میں تم دونوں کا منیجر ہوں؟ سیکرٹری ہوں؟ یا چوکیدار؟ پہلے تم دونوں کو چیرس لے کر دوں' پھر ان کی حفاظت بھی کروں' واہ کیا بات ہے جناب؟ ساری زندگی تم دونوں کے کاموں میں گزار دوں اور اپنا کچھ نہ کروں۔" دل آور نے اسے کھری کھری سنا ڈالی تھی۔ عبداللہ اس کی بات پہ یک دم قہقہہ لگا کے ہنسا تھا۔

"اپنا کیا کرنا ہے تم نے؟" وہ غصے میں تھا اور عبداللہ اسے چھیڑ رہا تھا۔

"جنازہ جائز کرنا ہے جیسے تم نے کیا ہے۔"

"صرف جنازہ ہی جائز کرنا ہے؟ شادی نہیں کرنی تم نے؟" عبداللہ نے دوبارہ چھیڑا۔

"عبداللہ صاحب! تم اس وقت فون پہ ہو' میرے سامنے ہوتے تو میں تمہیں بتاتا کہ میں نے کیا' کیا کرنا ہے؟ اور میرے کرنے کا سن کر تمہارے کانوں سے دھواں نہ نکل جاتا تو میرا نام بھی دل آور شاہ نہیں تھا۔" وہ اک اک لفظ غصے اور خفگی سے چبا کر بولا تھا جس پہ عبداللہ کو جیسے ہنسی اور قہقہوں کا دورہ پڑ گیا تھا۔

"اسی لیے تو کہتے ہیں ابھی ہمارے کام نپٹا لو' پھر بعد میں تمہیں فرصت ہی کب ملے گی بھلا؟"

"ویسی کی تیسی تمہارے کاموں کی' بس تمہیں گھر لے کر دوں گا' بعد میں جو بھی چاہے کرتے رہنا' سمجھے تم؟"

دل آور نے اسے ہری جھنڈی دکھائی۔

"ارے یار! تم جانتے ہو تمہارے سوا ایسے کام کوئی نہیں کر سکتا' اسی لیے تم سے ہی کہنے پڑتے ہیں' مجبوری ہے ہماری۔"

"کیوں' کیا میں پراپرٹی ڈیلر ہوں؟ کسی نے گھر لینا ہے' کسی نے شوروم بنانا ہے' ایک کے بابا صاحب لینڈ لارڈ سے پاکستان آئے ہیں تو وہ پریشان ہے' ایک کے بابا جان پاکستان سے انگلینڈ جانا چاہ رہے ہیں تو وہ پریشان ہے' ایک کو مدحیہ حیات نے ستا رکھا ہے تو دوسرا زرین ملک کے لیے ستایا جا رہا ہے۔ واہ میرے دوستو! واہ کن الجھنوں میں الجھ گئے ہو؟" دل آور در حقیقت ان کا مذاق اڑا رہا تھا' جس پہ عبداللہ بھی اپنی بے ساختہ ابھرنے والی ہنسی نہیں روک پایا تھا۔

"ہاں یار! یہ تو تم سچ ہی کہہ رہے ہو' بہت الجھ گئے ہیں ہم لوگ' تو دعا کرتے ہیں کہ اللہ تمہیں بھی الجھا دے' شادی کے چکروں میں۔"

"ہونہہ! مجھے الجھنے دو گے تو میں الجھوں گا نا۔ جب تک تم دونوں میرے پیچھے پڑے ہو' میرا کچھ نہیں بننے والا۔" آج دل آور شاہ کو رہ رہ کے اپنا خیال آ رہا تھا۔

"کیا بات ہے جناب آج بار بار اپنے لیے دہائی دی جا رہی ہے' کوئی خاص وجہ؟" عبداللہ نے معنی خیزی سے پوچھا۔ جس پہ دل آور قہقہہ لگا کے ہنسا تھا۔

"وجہ کیا ہوئی یار؟ آج بے وجہ ہی شادی کا دل کر رہا ہے۔" دل آور اس سے بھی زیادہ معنی خیزی سے بولا تھا۔

"اوئے ہوئے! بڑے بے تاب لگتے ہو؟ بتول آنٹی سے بات کروں کہ ان کے بیٹے کا شادی کرنے کا دل کر رہا ہے جوانی منہ کو آ رہی ہے' صبر نہیں ہو رہا شہزادے سے؟"

"تمہاری بتول آنٹی کو خود ہی پتا ہے کہ ان کا بیٹا کیسا ہے؟ انہیں بتانے کی ضرورت نہیں ہے اور ہاں ایک بات اور' جوانی کو بھی اتنا بے صبرا ابھی نہیں ہونے دیا کہ وہ منہ کو آنے لگے' بس میں ہر چیز کو ایک حد تک رکھنے کا قائل ہوں۔" دل آور نے استہزائیہ سا جواب دیا تھا۔

"ویسے ایک بات تو بتاؤ یار' تمہیں کوئی پسند بھی ہے یا نہیں؟"

نہ جانے کیوں عبداللہ نے بے ساختہ ہی یہ سوال کر ڈالا تھا اور دل آور کے فر فر بولنے والے ہونٹوں پہ چپ کا تالا پڑ گیا تھا۔ وہ عجیب تذبذب کا شکار ہو گیا تھا۔

"کیا بات ہے دل آور؟ چپ کیوں ہو گئے ہو؟ کیا میں زیادہ پرسنل ہو گیا ہوں؟" عبداللہ نے سنجیدگی سے اسے مخاطب کیا تھا۔

"ارے نہیں یار! ایسی کوئی بات نہیں ہے' ابھی اس پسند اور ناپسند والے معاملے پہ دھیان نہیں دیا' لیکن جب دیا تو تمہیں ضرور بتاؤں گا۔" دل آور نے شائستگی سے بات ٹالی تھی۔

"کیا پوچھ سکتا ہوں کہ اگر تم نے اس معاملے پہ دھیان دیا تو تمہاری پسند' تمہارا انتخاب کیسی لڑکی ہو گی؟" عبداللہ کا ایک اور کھوجتا ہوا سوال آیا تھا اور دل آور کی آنکھوں کے سامنے اک نرم و ملائم اور دلکش سا سراپا پوری آب و تاب کے ساتھ سج گیا تھا۔ محبتوں اور مٹھاس سے گندھا ہوا' دل آور شاہ کے عشق میں پور پور ڈوبا ہوا۔

"کیا پھر کچھ غلط پوچھ لیا میں نے؟" عبداللہ نے پھر متوجہ کیا تھا اسے۔

"میری پسند' میری اماں بہتر جانتی ہیں' ہو سکے تو ان سے پوچھ لو۔" دل آور نے بات ہی ختم کر ڈالی تھی اور عبداللہ اس کے جواب پہ بہت کچھ سوچنے پہ مجبور ہو گیا تھا۔

"کیا تم اپنی اماں کی پسند سے شادی کرو گے؟"

"ہاں کہہ سکتے ہو' کیونکہ میری اور میری اماں کی پسند تقریباً ایک ہی ہو گی۔ جس سے وہ کہیں گی میں شادی کر لوں گا۔" دل آور کے جواب پہ عبداللہ نے لمبی سانس کھینچی تھی اور پھر چند اور باتوں کے بعد فون بند کر ڈالا' لیکن دل آور کے ذہن میں ہزاروں سوچیں اور ہزاروں الجھنیں چھوڑ گیا تھا' اس کا دماغ بوجھل اور منتشر ہو رہا تھا' وہ بوجھل قدم اٹھاتا بک شاپ کے اندر آ گیا تھا' کچھ کتابیں لینی تھیں۔

☼ ☼ ☼

پھر ایک لیلیٰ کھڑی ہوئی ہے نئے زمانے کی تلخیوں میں
پھر ایک وعدہ امر ہوا تو محبتوں کا پتا چلے گا
ابھی تو پھرتے ہو دوستوں میں' عزیز کوئی جدا نہیں ہے
کوئی ادھر سے ادھر ہوا تو محبتوں کا پتا چلے گا
محبتوں میں تو پتھروں کو بھی موم ہوتے سنا ہے لیکن
تمہارے دل پہ اثر ہوا تو محبتوں کا پتا چلے گا
وہ جس کی خاطر زمانے بھر کو بنا رہے ہو تم اپنا دشمن
وہی نہ اپنا اگر ہوا تو محبتوں کا پتا چلے گا

نگارش کسی کام سے باہر نکلی تھی لیکن گھر کے چھوٹے سے لان میں اسے سفید کاغذ جا بجا بکھرے ہوئے نظر

آ رہے تھے۔ اس نے آگے بڑھ کے ایک کاغذ اٹھا کر پڑھا۔ زری کی ہینڈ رائٹنگ میں چند اشعار تحریر تھے جن کو پڑھ کے نگارش نے چونک کر زری کے بیڈ روم کی کھڑکی کی سمت دیکھا تھا جہاں سے اور بھی کاغذ زمین کی طرف چلے آ رہے تھے۔ اس نے ڈائری پھاڑ ڈالی تھی شاید۔

"او مائی گاڈ! یہ کیا کیا اس نے؟" نگارش چکرا گئی تھی وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے اندر کی طرف بھاگی اس کا رخ زری کے بیڈ روم کی طرف تھا اس نے آتے ہی دروازہ دھڑام سے کھولا تھا۔

"زری۔!" نگارش نے تڑپ کے پکارا تھا اسے اور تیر کی سی تیزی سے اس کے پاس آئی تھی اس نے بے تحاشا آنسو بہاتی ہچکیوں سے روتی ہوئی زری کو دونوں بازوؤں سے تھام لیا تھا۔

"یہ کیا کر رہی ہو تم؟ پاگل ہو گئی ہو کیا؟" نگارش نے اسے جھنجوڑ ڈالا تھا۔

"ہاں پاگل ہو گئی ہوں میں' تڑپ رہی ہوں اپنے اندر کی' یہ لفظ صرف لفظ نہیں ہیں یہ اس شخص کی یاد' اس کی تڑپ' اس کی طلب ہیں' جب جب اس کے لیے تڑپی ہوں تب تب میں نے لفظ تحریر کیے ہیں' جب جب اسے یاد کیا ہے تب تب اپنے دل کا حال لکھا ہے' اور وہ شخص۔ وہ میری تڑپ' میرے دل کا حال ہی نہیں جانتا' انجان پھر رہا ہے مجھ سے' جیسے میرا۔ میرا تو کوئی وجود ہی نہیں ہے' جیسے اس کے انجان پن سے مجھے تو درد ہی نہیں ہوتا' مجھے تو تکلیف ہی نہیں ہوتی' پورا ایک سال ہو گیا ہے اسے دیکھے ہوئے' اس سے بات کیے ہوئے' آج میں نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اسے فون کر لیا تو وہ میرا دیوتا بن بیٹھا' اس کے سامنے ایڑیاں رگڑتی رہی لیکن اس نے فون کو آن کر کے کان سے لگانے کی زحمت نہیں کی۔ جانتی ہیں آپ کتنی بار فون کیا ہے میں نے۔ دس بار' پورے دس بار' اور دس بار اس نے تڑپ کا تماشا دیکھا ہے' ایک بٹن۔ محض ایک بٹن دبا کر اس تڑپ کو کان سے لگا کر قرار نہیں دیا' صرف یہ سوچ کر کہ کہیں زری اس قرار' اس تسلی کی عادی نہ ہو جائے۔ کہیں اس سے عمر بھر کا ساتھ نہ مانگ لے' بھابھی میری بات کاغذ پہ لکھ کے رکھ لیں' وہ شخص دوستیاں نبھانے والا شخص ہے' محبتیں نہیں' وہ کبھی میری محبت پہ ترس نہیں کھائے گا' کبھی گلے نہیں لگائے گا' وہ کبھی بھی زرین ملک پہ اپنی نگاہ یار کی برسات نہیں برسائے گا اور میں ترس ترس کر پیاسے صحرا کی مانند ہو جاؤں گی۔" زری رو رہی تھی اور ساتھ ساتھ دل آور شاہ کے ستم سے آگاہ بھی کر رہی تھی نگارش سے اس کو سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔

"زری پلیز! کیوں اتنی بدگمان ہو رہی ہو؟ ہو سکتا ہے اسے تمہاری کال کا پتا ہی نہ چلا ہو' ہو سکتا ہے وہ سو رہا ہو یا پھر سیل ہی اس کے پاس نہ ہو؟" نگارش نے اس کی تسلی کے لیے کئی بہانے ڈھونڈے تھے جس پہ زری بے ساختہ تلخی سے مسکرائی تھی۔

"کبھی ہو ہی نہیں سکتا کہ اس کے پاس سیل نہ ہو' سیل اس کے پاس تھا' اس کے ہاتھ میں تھا پھر بھی اس نے کال ریسیو نہیں کی' اس نے میرے لیے' میری ہی کال ریسیو نہیں کی' نظر انداز کر دی' اس کے سیل پہ وائبریشن ہوتی رہی اور وہ دیکھتا رہا' میری تڑپ کا تماشا دیکھتا رہا۔" زری اک اک بات یوں بتا رہی تھی جیسے وہ اس کے سامنے کھڑی رہی تھی یا پھر اسے الہام ہوا ہو' ایسے عالم میں اگر دل آور شاہ اس کی باتیں سن لیتا تو یقیناً "ششدر رہ جاتا" اس کی باتیں اور اس کی عادتیں تو وہ ایسے جانتی تھی جیسے اس کے اندر بستی تھی اور ہمہ وقت اس کے ساتھ رہتی تھی۔

"لیکن زری! اسے بھلا کیا پرابلم تھی کال ریسیو کرنے میں....؟"

"پرابلم تھی بھابھی' پرابلم ہی تو تھی' آپ نہیں سمجھیں گی اس بے موت شخص کی پرابلمز کو۔" اس نے دکھ سے کہتے ہوئے سر جھٹکا تھا۔

"مگر زری! تم خواہ مخواہ اپنا دل جلا رہی ہو' دل آور بھائی' تمہارے ہی ہیں اور تمہارے ہی رہیں گے۔" نگارش

حوصلہ نہیں کرنے دیتی تھی زری بے تحاشا رونے کے بعد رانگ چیئر پہ گرنے کے سے انداز میں ڈھے گئی تھی لیکن اچانک بجنے والے اس کے سیل نے اسے بری طرح چونکا دیا تھا' نگارش نے لپک کے اس کا سیل بیڈ سے اٹھایا تھا اور اس کا چہرہ یکدم کھل اٹھا تھا۔

"زری! بتول آنٹی کی کال ہے۔" نگارش نے چہکتے ہوئے پرجوش سے انداز میں کہا تھا اور زری نے بھیگی بھیگی آنکھوں سے بے یقینی سے دیکھا تھا لیکن نگارش نے اتنے میں کال آن کر کے موبائل زری کے کان سے لگا دیا تھا۔

"السلام علیکم۔" زری نے بمشکل اپنے آپ کو کمپوز کیا تھا۔

"وعلیکم السلام! کیسی ہو بیٹا۔" بتول شاہ کا پرسکون ٹھہرا ہوا لہجہ اور محبت بھری آواز سنائی دی تھی۔

"جی ٹھیک ہوں میں۔" زری اندر کتنی بھی ٹوٹ گیا...؟

"او اچھا! تو تم نے بھی میرے دل آور کی طرح جھوٹ بولنا سیکھ لیا ہے...؟" ان کی بات پہ زری کا دل زور سے دھڑکا تھا کہ انہیں میرے حال میری کنڈیشن کا کیسے پتا چلا...؟"

"ایم سوری آنٹی! میں آپ کی بات سمجھی نہیں...؟"

"وہ بھی یہی کہتا ہے حالانکہ بات پل میں سمجھ جاتا ہے۔ پھر بھی کہتا ہے کہ میں سمجھا نہیں۔" بتول شاہ ذرا مسکرا کے بولی تھیں۔

"آپ کس کی بات کر رہی ہیں...؟" زری نے انجان بنتے ہوئے کہا۔ "اسی کی جس سے تم بات کرنا" چاہ "رہی تھیں' جس کو تم نے دس بار کریدا ہے' دس بار ضرب لگائی ہے تم نے۔" بتول شاہ کی بات سن کر زری دھک سے رہ گئی' اس کے ہاتھ سے سیل فون چھوٹتے چھوٹتے بچا تھا اسے یہ جان کر حیرت ہوئی تھی کہ دل آور شاہ نے اپنی اماں کو کیسے بتا دیا...؟

"بیٹا! اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں ہے' وہ مجھ سے اپنی کوئی بات نہیں چھپاتا' میں اس کی ماں ہی نہیں ہمراز بھی ہوں' میں اس کی ہر بات جانتی ہوں' اور یہ بھی جانتی ہوں کہ تم نے کل رات زندگی میں پہلی بار اس کے نمبر پہ فون کیا تھا۔ لیکن وہ سن نہیں سکا' لیکن بیٹا اس کے فون نہ سننے پہ دل برداشتہ مت ہونا' اس کی کوئی مجبوری بھی تو ہو سکتی ہے۔ وہ تمہاری کال سے بہت ڈسٹرب تھا' پریشان تھا کہ آج زری اپنی چپ کیوں توڑ رہی ہے؟ آخر کیا وجہ ہے؟ اور یقیناً" اسی پریشانی میں وہ رات بھر سویا بھی نہیں ہو گا؟" بتول شاہ بات کر رہی تھیں اور زری کے دل پہ پھوار برس رہی تھی اس کے لیے یہ احساس ہی بڑا دلکش تھا کہ دل آور شاہ نے اسے کسی کے ساتھ ڈسکس تو کیا ہے نا؟ کسی کے سامنے اس کا نام لیا ہے' اس کا ذکر کیا ہے' کال بے شک نہیں سنی مگر کال پہ پریشان تو ہوا ہے؟ رات بھر سویا نہیں' جاگ کر مجھے سوچا تو ہے نا...؟ وہ بے ساختہ پلکیں موند کر دل ہی دل میں تشکر کا احساس لیے خدا کے حضور جھک گئی تھی دل سجدے پہ سجدہ کر رہا تھا... روح شانت ہو چکی تھی۔

لمحے کے ہزارویں حصے میں اس کے چہرے پہ بکھرنے والے سکون اور اطمینان کے رنگ' نگارش کی نظروں سے مخفی نہیں رہ سکے تھے نگارش اس کے قریب آئی اور زری نے شدت جذبات اور خوشی کے احساس سے مغلوب ہوتے ہوئے نگارش کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا تھا!

"تم پاکستان کب آ رہی ہو؟" بتول شاہ نے ذرا ٹھہر کے سوال کیا۔

"نیکسٹ منڈے سے میرے فائنل ایگزامز اسٹارٹ ہو رہے ہیں' مہینہ یا پھر ڈیڑھ مہینہ لگ جائے گا میری واپسی کو۔"

"اچھی بات ہے' جلدی سے آ جاؤ میں بھی اپنی بیٹی سے ملنا چاہتی ہوں۔"

"جی ضرور کیوں نہیں۔" زری سے کوئی بات ہی نہیں ہو رہی تھی۔
"نگارش کیسی ہے۔"
"جی نگارش بھابھی بھی ٹھیک ہیں' میرے پاس ہی ہیں۔"
"ارے واہ! بات کرواؤ میری۔" انہوں نے خوشی کا اظہار کیا تھا اور زری نے اللہ حافظ کہتے ہوئے فون نگارش کو تھما دیا تھا۔
"السلام علیکم آنٹی۔"
"وعلیکم السلام' جیتی رہو' کیسی ہو؟"
"جی! اللہ کا احسان ہے ٹھیک ٹھاک ہوں۔"
"بیٹا! پاکستان کا چکر لگاؤ' تم لوگ تو انگلینڈ کے ہی ہو کے رہ گئے ہو۔"
"ان شاء اللہ! بہت جلد ہم لوگ پاکستان آئیں گے۔
عبداللہ خود بھی کہہ رہے تھے' کافی عرصہ ہو گیا ہے' اور اب تو ولی اور بھائی کی طرح نبیل بھائی بھی چلے گئے ہیں۔ عبداللہ بہت اکیلا فیل کرتے ہیں اپنے آپ کو۔"
"اکیلا! بندہ اکیلا ہی فیل کرے گا نا۔
بس جلدی سے آجاؤ۔"
"ضرور آئیں گے آنٹی' آپ دعا کیجئے' بس کچھ پریشانیاں ہیں اللہ کرے کہ یہ پریشانیاں دور ہو جائیں۔"
"ان شاء اللہ۔ اللہ کرم کرے گا۔" بتول شاہ نے تسلی دی اور پھر کافی دیر نگارش کے ساتھ باتوں میں مصروف رہی تھیں۔ اور جیسے ہی فون بند ہوا۔ نگارش' زری پہ چڑھ دوڑی تھی۔
"اب بولو محترمہ! کیا کہا تھا میں نے؟ کب سے سمجھا رہی ہوں' تسلیاں دے رہی ہوں' لیکن تم ہو کہ پاگل پن کی حد کر ڈالی تھی' تڑپ تڑپ کر میرا کلیجہ بھی تڑپا ڈالا تھا۔ تھوڑی دیر اور بتول آنٹی کا فون نہ آتا تو میں خود رونے والی تھی۔" نگارش نے اسے چپت رسید کرتے ہوئے کہا اور زری کھلکھلاتی ہوئی' ہنستی ہوئی مسرور سی دور ہٹی تھی۔
"بس بھابھی اس نے مجھے نظر انداز بھی تو ایسے ہی کیا تھا کہ میرے دل میں اک بات کا خوف بیٹھ گیا تھا۔"
"کس بات کا خوف۔" نگارش نے ٹھٹک کے پوچھا۔
"بقول شاعر۔

جسے اپنا یار کہنا' اسے چھوڑنا بھنور میں
یہ حدیث دلبراں ہے' یہ کمال دلبری ہے

زری نے شعر کہتے ہوئے نگارش کو دیکھا۔
"بس اسی بات سے ڈر گئی تھی کہ میرا دلبر بھی مجھے بھنور میں نہ چھوڑ جائے۔"
"ہونہہ! بھاڑ میں گئی تمہاری شاعری' سر درد کر ڈالا ہے۔" نگارش اسے کھینچ کے کشن مارتی ہوئی باہر نکل گئی تھی اور زری ایک بار پھر کھلکھلائی تھی اور سرشاری ڈرائنگ چیئر پہ جھولنے لگی' ہونٹ بے وجہ ہی مسکرا رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

"امی! کہاں جا رہی ہیں آپ۔" وہ ابھی کسی کے دروازے کی سمت بڑھ رہی تھیں کہ پیچھے سے دانیال کی آواز سنائی دی۔ عائشہ آفندی کے قدم ٹھہر گئے تھے۔
"حویلی کی طرف۔"
"کیوں؟"
"ارے! کیوں کا کیا مطلب ہے۔؟"
"کیوں کا مطلب ہے کہ آپ کی اپنی طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو پھر کیوں جا رہی ہیں آپ؟" دانیال عشاء کی نماز پڑھ کے آیا تھا اور ابھی کچن سے پانی پی کر نکلا تھا جب ان کو یوں باہر جاتے دیکھ کر رک گیا تھا۔
"میری طبیعت کافی بہتر ہے' ایک ہی جگہ رہ رہ کر دماغ بھی تھک گیا ہے اور جسم بھی' بے شک سبھی باری باری میرے پاس آتے رہتے ہیں لیکن میں تو ایک ہی جگہ کی ہو کر رہ گئی ہوں۔" وہ کافی دھیمے سے کہہ رہی تھیں اور دانیال ان کی بات پہ اتفاق کرتے ہوئے سر اثبات میں ہلانے پہ مجبور ہو گیا تھا۔
"ہوں! ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ' جانا چاہیے آپ کو' انوشہ کہاں ہے؟"
"انوشہ بھی وہیں ہو گی لڑکیوں کے پاس۔"
"تو پھر میں اکیلا یہاں کیا کروں گا' چلیے میں بھی چلتا ہوں۔" وہ تعجب سے کہتا ہوا ان کے ساتھ ہو لیا اور عائشہ آفندی بے ساختہ اس کی بات پہ مسکرا اٹھی تھیں۔
اور وہ دونوں ماں بیٹا ایک ساتھ حویلی میں داخل ہوئے تھے' ڈرائنگ روم میں قدم رکھا ہی تھا کہ سبھی چونک اٹھے تھے۔
کومل اور آذر ہی ان کے بڑے بھتیجی اور بھتیجے تھے اور وہی دونوں سب سے زیادہ خوش ہو کر ان کی طرف آئے تھے اور دونوں ہی اپنی اس بے ساختگی پہ پل بھر کے لیے ٹھٹک سے گئے۔ کومل نے آذر کو دیکھ کر چہرہ جھکا لیا تھا جبکہ آذر نے آگے بڑھ کے عائشہ پھوپھو کا بازو تھام لیا تھا۔
"آئیے پھوپھو' یہاں بیٹھیے۔" آذر نے اپنی جگہ پیش کی تھی اور وہ نرمی سے مسکراتے ہوئے بیٹھ گئی تھیں۔

"کیا بات ہے بھئی' آج کیا محفل لگا رکھی ہے؟"

انہوں نے آذر سے پوچھا تھا جو اس یک پارٹی میں ذرا کم ہی نظر آتا تھا اس کا زیادہ تر وقت کاروباری سلسلوں میں گزرتا تھا' مگر یہ ہوتا تب بھی وقار آفندی' اسرار آفندی اور اظہار آفندی کے ساتھ ہی کچھ نہ کچھ ڈسکس کرنے میں مصروف نظر آتا تھا۔

"پھپھو! دراصل یہ محفل میں نے نہیں لگائی بلکہ لگوائی گئی ہے اور اس میں سب سے زیادہ ہاتھ ہماری اس شرارتی بلی کا ہے۔" آذر نے قالین پہ بیٹھی انوشہ کے سر پہ ہلکی سی چپت لگائی تھی۔

"اچھا؟ وہ کیسے۔؟" نمیں اور دانیال کو حیرت بھی ہوئی تھی اور دلچسپی بھی۔

"وہ ایسے کہ میں اپنے عشاء کی نماز پڑھ کے اپنے بیڈ روم میں سونے کے لیے جا رہا تھا جب یہ مجھے سیڑھیوں سے پکڑ لائی ہے' اور اپنی بات منوانے کی ضد کر رہی ہے' مگر اس کی بات ماننا ذرا مشکل کام ہے اس لیے میں فیصلہ نہیں کر پا رہا کہ کیا کروں اور کیا نہیں۔؟"

آذر اپنی پھوپھی زاد کزن انوشہ کو دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا جو معصوم اور مسکین سی صورت بنائے بیٹھی تھی۔

"کیسی بات؟ کیسی ضد اور کیسا فیصلہ۔؟" عائشہ آفندی کو تجسس ہوا تھا کہ ان کی بیٹی ان کے بھتیجے سے کیا منوانا چاہ رہی ہے؟ وہ بھی اتنے لوگوں کے ساتھ مل کر۔

"آذر بھائی! دس از ناٹ فیئر' آپ ہمارا پلان لیک آؤٹ کر رہے ہیں۔" انوشہ خفگی سے منہ بنا کر بولی تھی۔

"تو کیا اس پلان کو تم لوگوں نے سیکرٹ رکھنا ہے۔" آذر کو حیرانی ہوئی۔

"نہیں سیکرٹ تو نہیں رکھنا' لیکن پہلے آپ کی اجازت تو مل جائے' پہلے آپ تو مان جائیں نا۔"

"کام بہت مشکل ہے' میرا ماننا آسان نہیں ہے' یوں سمجھ لو یہ ایک رسک ہے اور میں اکیلا اتنی عوام کا رسک نہیں لے سکتا۔" آذر نے عوام کہتے ہوئے لڑکیوں کی سمت اشارہ کیا تھا جس پہ دانیال اور احمد مسکرا دیئے تھے۔

"تو آپ دانیال بھائی کو اور احمد بھائی کو اپنے ساتھ شامل کر لیں۔"

انوشہ بھرپور طریقے سے کیس لڑ رہی تھی۔ ساری لڑکیوں نے دل ہی دل میں اس کی ہمت اور حوصلے کی داد دی تھی۔

"او کے! میں اگر اجازت دے بھی دیتا ہوں تو ڈیڈ سے اجازت کون لے گا۔" آذر نے دوسرے پہاڑ کا ذکر کیا جس کو سر کرنا واقعی سب کے لیے مشکل تھا۔

"ان سے صرف دو ہی لوگ اجازت لے سکتے ہیں۔" انوشہ نے فوراً کہا۔

"ایک آپ اور ایک علیزے۔" اس نے آذر کی سمت اشارہ کیا تھا لیکن اس کی بات پہ کومل نے چونک کر دیکھا تھا اس کے چہرے پہ جو رنگ ابھرا تھا وہ آذر کی آنکھوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکا تھا اور آذر یہ رنگ دیکھ کر حیرت زدہ سا رہ گیا تھا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

نبیلہ عزیز

دردِ دل

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نبیل حیات دو ہی بہن بھائی ہیں، مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے، وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پہ رنگ چکی ہے، جس کے پیش نظر فائزہ بیگم، نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں، لیکن مدحیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے، جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے، مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے، مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، بے بسی و مجبوری سے تنگ آ کر خود کشی کرنے کا سوچتا ہے، لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باؤ امتیاز مل جاتا ہے، جو اسے کام کی آفر کرتا ہے، جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے، اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے، وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے، وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوس سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے، وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے، اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا، اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔

۱۴ چودھویں قسط

کومل کے چہرے پہ اک واضح ناگواری تھی‘ جو کسی اور کو تو نہ سہی لیکن آذر کو بڑی شدت سے محسوس ہوئی جس کی وجہ سے وہ اتنے سارے لوگوں کی موجودگی کے باوجود ڈائریکٹ کومل کے چہرے کی سمت دیکھنے پہ مجبور ہو رہا تھا اور دوسری طرف کومل بھی اپنے چہرے پہ اس کی نظروں کی تپش اور اک الجھی ہوئی کھوج محسوس کر چکی تبھی ذرا سا پہلو بدل کر چہرے کا رخ موڑ لیا۔ لیکن آذر نے اپنی نظروں کا پہلو پھر بھی نہیں بدلا۔

”آذر.....“ دانیال نے اسے ٹھوکا دیا۔

”ہوں.....؟“ وہ بڑے الجھے ہوئے انداز میں متوجہ ہوا کیونکہ وہ ہنوز کومل کی سمت ہی دیکھ رہا تھا۔

”انوشہ تم سے کچھ کہہ رہی تھی شاید.....؟“ دانیال نے اسے یاد دلایا۔

”ہوں! سن رہا ہوں اور سب دیکھ بھی رہا ہوں‘ مگر سمجھ نہیں پا رہا۔“ آذر کا لہجہ پُرسوچ اور مبہم سا تھا اس۔ دوبارہ اک اچٹتی سی نظر کومل پہ ڈالی‘ وہ اپنے قریب بیٹھی حرمت اور رانیہ کی سمت متوجہ ہو چکی تھی۔

”کیا مطلب ہے آپ کا..... کیا سمجھ نہیں پا رہے۔“ انوشہ کو آذر کی بات سمجھ نہیں آئی تھی مگر دانیال بخ سمجھ چکا تھا۔

”یہی کہ آپ لوگوں کا پروگرام کینسل ہونا چاہیے یا پھر اوکے؟“ آذر بہت ٹھہر کے بات کر رہا تھا۔

”آذر بھائی پلیز! ہمارا پروگرام اوکے ہونا چاہیے کینسل نہیں‘ اسی لیے تو آپ کے سامنے یہ عدالت لگا ر ہے‘ پلیز کچھ رحم کریں‘ فیصلہ ہمارے حق میں ہونا چاہیے۔“ انوشہ انتہائی لجاجت سے بولی۔

”تو پھر میرا خیال ہے کہ آپ لوگوں کو یہ کام علیزے سے کہنا چاہیے‘ ڈیڈ مجھے تو انکار کر سکتے ہیں لیک علیزے کو نہیں۔“ آذر نے کومل کے چہرے کے تاثرات دوبارہ جانچنے کے لیے جان بوجھ کر علیزے کا نام لیا لیکن اس بار شاید وہ اپنے تاثرات کنٹرول کر چکی تھی اس کا چہرہ نارمل تھا۔

”علیزے سے؟ لیکن وہ تو سو چکی ہو گی؟“ انوشہ نے وال کلاک دیکھا پونے بارہ بجے کا ٹائم ہو رہا تھا! علیزے تو عشاء کی نماز پڑھنے کے فوراً بعد ہی سونے کے لیے چلی جاتی تھی۔

”تو کوئی بات نہیں صبح کا انتظار کر لو‘ صبح بات کر لینا۔“ آذر نے کندھے اچکائے۔

”علیزے جاگ رہی ہے۔“ زین نے اندر داخل ہوتے ہوئے گڈ نیوز سنائی۔

”سچ.....؟“ انوشہ چہکی تھی۔

”سچ.....“ زین نے بھی اسی کے انداز میں جواب دیا تھا۔

”مگر تمہیں کیسے پتا کہ علیزے جاگ رہی ہے.....؟“ انوشہ کو ایک اور سوال سوجھا تھا۔

”علیزے کی لاڈلی رجو ابھی ابھی اس کے بیڈ روم سے نکلتی ہوئی دکھائی دی ہے‘ جس کا مطلب ہے کہ شہزاد علیزے اپنی خواب گاہ میں ابھی جاگ رہی ہیں‘ آپ نے اپنی کوئی عرضی پیش کرنی ہو تو کر سکتی ہیں۔“ زین۔ صوفے پہ بیٹھ کے آلتی پالتی مارتے ہوئے شاہانہ انداز میں جواب سے نوازا تھا۔

”ارے واہ! یہ تو کمال ہو گیا‘ آج تو علیزے بھی جاگ رہی ہے.....؟“ احمد مسکرا کر بولا۔

”میں ابھی علیزے کو بلا کے لاتی ہوں.....“ انوشہ فوراً اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی اور وہ سب انوشہ کی پھرتی ہنس پڑے تھے اب تو عائشہ آفندی کی طرح آذر اور دانیال بھی سارا تماشا بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ تھوڑ دیر بعد انوشہ‘ علیزے کا ہاتھ پکڑے اسے اپنے ساتھ لیے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔

”عائشہ پھوپھو کیسی ہیں آپ؟“ علیزے سب کو سلام کرنے کے بعد سیدھی عائشہ آفندی کے پاس آئی تھی

”اللہ کا شکر ہے بیٹا‘ میں بالکل ٹھیک ہوں‘ تم سناؤ کیسی ہو؟“ انہوں نے نرمی اور شفقت سے کہتے ہوئے اس ہاتھ پکڑ کے اسے اپنے پاس ہی بٹھا لیا۔

”میں بھی ٹھیک ہوں‘ بس سونے کی تیاری کر رہی تھی کہ انوشہ آپی نے بلا لیا۔“ علیزے ان سب لوگوں کو اک نظر دیکھتے ہوئے آہستگی سے بولی۔

”تمہاری انوشہ آپی نے تمہیں کسی کام کے لیے بلایا ہے۔“ عائشہ آفندی مسکرا کے بولیں۔

”کسی کام کے لیے.....؟“ علیزے نے سوالیہ نظروں سے انوشہ کی سمت دیکھا۔

”جی ہاں! کام کے لیے بلایا ہے کیونکہ یہ کام تمہارے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا۔“ انوشہ نے تمہید باندھی۔

”کیسا کام.....؟“ علیزے کو حیرانی ہوئی۔

”ارے ڈیئر! کوئی ایسا ویسا کام نہیں ہے‘ بس یوں سمجھ لو کہ آب و ہوا تبدیل کرنے کا کام ہے۔“ احمد نے بھی مداخلت کی۔

”کیا مطلب.....؟ میں سمجھی نہیں۔“ علیزے ان کی پہیلیاں نہیں بوجھ سکتی تھی۔

”مطلب کہ ان سب لوگوں کا گھومنے پھرنے کا پروگرام ہے۔“ آذر نے اس کی مشکل آسان کی تھی۔

”اوہ اچھا..... تو اس میں مشکل کیا ہے؟“ وہ حیرت سے پوچھ رہی تھی۔

”مشکل یہ ہے کہ ان کا پروگرام مری اور اسلام آباد گھومنے کا ہے‘ لاہور کی سڑکوں سے نکل کر اسلام آباد کی سڑکوں پہ پھرنا چاہتے ہیں۔“ آذر نے مزید اطلاع پہنچائی تھی جس پہ علیزے کو بھی اچنبھا ہوا تھا۔

”رئیلی.....؟“

”آف کورس یار! اگر تم ساتھ دے دو تو؟“ انوشہ کو خود میدان میں اترنا پڑا تھا۔

”میں ساتھ دے دوں.....؟ وہ کیسے.....؟“ اس نے ناسمجھی سے پوچھا۔

”ڈیڈ سے اجازت لے کر۔“ انوشہ نے مدعا بیان کیا۔

”اوہ! تو یہ کام ہے؟“ علیزے نے سر ہلایا۔

”ہاں یار! یہی کام ہے اور یہی سب سے مشکل کام ہے‘ جو صرف تم کر سکتی ہو۔“

”ہوں! وہ تو ٹھیک ہے لیکن.....“ علیزے چپ ہو گئی۔

”لیکن کیا.....؟“ انوشہ بے صبری سے بولی۔

”لیکن اگر بابا نہ مانے تو؟“ اس نے انکار کا خدشہ ظاہر کیا۔

”یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ تم کوئی کام کہو اور وہ انکار کریں۔“ انوشہ کو کامل یقین تھا کہ وہ مان جائیں گے۔

”تو پھر آذر بھائی سے کہیں کہ وہ بابا سے اجازت لینے میں میرا ساتھ دیں‘ وہ میرے ساتھ چلیں۔“ علیزے نے معصومیت اور سادگی سے کہا تھا لیکن ذرا فاصلے پہ بیٹھی کومل نے سانپ کی طرف پھنکار کے سر اٹھایا تھا اس کی نظروں میں کسی تلوار کی سی کاٹ تھی۔

”ارے ہاں! یہ بھی اچھا آئیڈیا ہے آپ لوگوں کو ڈیڈ سے ایک ساتھ اجازت مانگنی چاہیے وہ آپ دونوں کو انکار نہیں کریں گے‘ آذر بھائی پلیز اٹھ جائیں‘ ورنہ ڈیڈ سو جائیں گے۔“ انوشہ ہر طرف بس جلدی ہی مچا رہی تھی۔

”تو اچھا ہے نا صبح بات کریں گے۔ ڈیڈ کا موڈ بھی فریش ہو گا۔“ آذر نے اسے روکنا چاہا۔

”نہیں صبح نہیں‘ ابھی بات کریں۔“ وہ ضد پر اڑی ہوئی تھی اور اس کی ضد سے مجبور ہو کے آذر کو بالآخر اٹھنا ہی پڑا تھا انوشہ بھی آج اس کی نرمی کا بھرپور فائدہ اٹھا رہی تھی اور آذر بھی اسے اس لیے انکار نہیں کر پایا تھا کہ وہ اس کی اکلوتی پھوپھو کی اکلوتی بیٹی تھی اور اس نے آج تک ان سے کچھ بھی نہیں مانگا تھا‘ آج بھی نجانے کس موڈ میں تھی کہ یہ انوکھی فرمائش کر بیٹھی تھی..... اور آذر سے انکار کرنا مشکل ہو گیا تھا۔

”چلو علیزے تم بھی ساتھ جاؤ اور سنو‘ اجازت لے کر ہی آنا۔“ اس نے علیزے کو آذر کے ساتھ بھیجا اور.....

ساتھ ساتھ تاکید کرنا بھی ضروری سمجھا تھا' وہ دونوں ایک ساتھ ڈرائنگ روم سے نکلے تھے لیکن باقی لڑکیوں کے ساتھ بیٹھی کومل نے ڈرائنگ روم سے باہر نکلتے آذر اور علیزے کو کافی تیز اور سلگتی ہوئی نظروں سے دیکھا تھا' اس کے دل میں رقابت کی چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا سے کیا کر ڈالے.....

"کومل! کیا دیکھ رہی ہو؟" حرمت نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے متوجہ کیا تھا وہ یکدم چونک اٹھی تھی۔

"کچھ نہیں....." وہ مختصر سا جواب دیتی اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔

"کہاں جا رہی ہو؟" حرمت نے دوبارہ استفسار کیا۔

"میرا سر درد کر رہا ہے' اپنے بیڈ روم میں جا رہی ہوں۔" وہ اپنی کنپٹی سہلاتے ہوئے بڑے ضبط سے کہتی وہاں سے چلی گئی اور حرمت پیچھے دیکھتی رہ گئی' کیونکہ اتنے لوگوں کی موجودگی میں وہ اسے اصرار کر کے روک بھی نہیں سکتی تھی اور نہ ہی اسے سمجھا سکتی تھی' اس کا موڈ پہلے ہی خراب تھا' غصے میں کچھ بول دیتی تو خوامخواہ تماشا بن جاتا جبھی مجبوراً حرمت کو چپ ہو کے بیٹھنا پڑا تاکہ وہاں موجود اور لوگوں کو بھی کومل کے رویے کی خبر نہ ہو..... لیکن حرمت یہ نہیں جانتی تھی کہ دانیال بھی سب کچھ جانتا ہے اور اس وقت کومل کی تمام حرکتیں نوٹ کر رہا ہے' بالکل اسی طرح جس طرح حرمت کرتی تھی.....

☼ ☼ ☼

"پاپا پلیز.....! مان جائیں نا۔" علیزے نے التجائیہ انداز میں دہائی دی تھی۔

"دیکھو بیٹا! میں نے ان لوگوں کو اجازت دے دی ہے' کیا یہ کافی نہیں ہے.....!" وقار آفندی کافی سنجیدگی سے پوچھ رہے تھے۔

"تو پھر مجھے اجازت کیوں نہیں دے رہے آپ؟"

"بس تمہارے لیے کوئی اجازت نہیں ہے' تم گھر میں ہی ٹھیک ہو۔" وہ دوٹوک لہجے میں بولے۔

"کیوں؟ میرے لیے اجازت کیوں نہیں ہے؟ میں بھی گھر سے نکلنا چاہتی ہوں' گھومنا پھرنا چاہتی ہوں' سب لڑکیوں کی طرح انجوائے کرنا چاہتی ہوں' پلیز۔" پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ علیزے کسی چیز پہ ضد کر رہی تھی اور وقار آفندی مان نہیں رہے تھے حالانکہ علیزے کے ایک بار کہنے پہ انہوں نے سب کو جانے کی اجازت دے دی تھی سوائے علیزے کو۔

"دیکھو بیٹا! تم اتنا طویل سفر کرو گی تو تھک جاؤ گی' دوسرے وہاں کا موسم بھی تمہیں سوٹ نہیں کرے گا' اور سب سے اہم بات کہ میں تمہیں اپنی آنکھوں سے دور بھیجنے کا رسک نہیں لے سکتا' جب تک تم گھر سے باہر رہو گی مجھے بے چینی ہوتی رہے گی' مری کے پہاڑ' کھائی اور دشوار ترین راستے اف توبہ' میں تمہیں وہاں بھیجنے کا کبھی سوچ بھی نہیں سکتا..... ہرگز نہیں۔" وہ سختی سے کہتے ہوئے نفی میں گردن ہلا رہے تھے علیزے نے روہانسے انداز میں آذر کی سمت دیکھا وہ خاموشی اور دلچسپی سے دونوں باپ بیٹی کی بحث و تکرار سن رہا تھا لیکن علیزے کی گولڈن براؤن کانچ سی آنکھوں میں تیرتے شفاف پانیوں کو دیکھ کر اس کے دل کو کچھ ہوا وہ فوراً سیدھا ہو بیٹھا۔

"دیکھیے ڈیڈ! اگر علیزے نہیں جائے گی تو ہم بھی نہیں جائیں گے۔" آذر نے ایک دم سے فیصلہ سنایا تھا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم.....؟" وقار آفندی' آذر کو علیزے کے حق میں بولتے دیکھ کر خفگی سے گویا ہوئے۔

"تو اور کیا کہوں.....؟ ہم سب چلے گئے تو وہ اکیلی پیچھے کیا کرے گی۔" آذر کی بات پہ علیزے کو ڈھارس بندھ گئی تھی کہ چلو کوئی تو ہے میرا ساتھ دینے کے لیے.....

"تو یہ وہاں جا کر بھلا کیا کرے گی۔" وہ ہنوز خفگی سے پوچھ رہے تھے۔

"نئے لوگ' نئے شہر' نئی جگہیں دیکھے گی' گھومے پھرے گی' باقی سب کی طرح انجوائے کرے گی' اور بھلا کیا کرنا ہے اس نے؟" آذر نے اس کی بھرپور حمایت کی تھی۔

"لیکن آذر تم جانتے ہو کہ....."

"ڈونٹ وری ڈیڈ! کچھ نہیں ہو گا' ہم سب ہیں نا ساتھ' اس کی ذمہ داری آپ مجھے سونپ دیں' جیسے لے کر جاؤں گا' ویسے لے کر بھی آؤں گا' یہ صرف آپ کی ہی علیزے نہیں ہے' ہماری بھی ہے' جتنی فکر آپ کو ہوتی ہے' اتنی ہمیں بھی ہوتی ہے' اسی لیے آپ کو پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے' میں آپ کو گارنٹی دیتا ہوں کہ میں علیزے کو آنچ بھی نہیں آنے دوں گا۔" آذر نے وقار آفندی کو کچھ بھی کہنے کی گنجائش نہیں چھوڑی تھی وہ چپ سے ہو گئے تھے۔

اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی آسیہ آفندی اپنے ہاتھوں سے سونے کی چوڑیاں اتارتے ہوئے ان لوگوں کی سمت دیکھ کر مسکرا رہی تھیں کیونکہ وقار آفندی ابھی بھی اجازت دینے سے پہلے تذبذب کا شکار تھے جبکہ آذر انہیں اجازت طلب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"ڈیڈ! کیا خیال ہے آپ کا.....؟" اس نے انہیں سوچوں سے نکالا' آسیہ آفندی اور علیزے مسکراہٹ دبا گئی تھیں۔

"ٹھیک ہے! یہ بھی جا سکتی ہے لیکن....." انہوں نے دل پہ پتھر رکھتے ہوئے بالآخر اسے بھی اجازت دے ہی دی تھی۔

"لیکن کیا.....؟" آذر نے ان کی ادھوری بات پہ استفسار کیا۔

"کچھ نہیں' بعد میں بتاؤں گا' ابھی تم لوگ جا کر آرام کرو۔" وہ سر جھٹکتے ہوئے بولے تھے۔

"ٹھیک ہے ڈیڈ! تھینک یو سو مچ۔" آذر فوراً صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اس کے ساتھ ہی علیزے بھی کھڑی ہو گئی تھی۔

"گڈ نائٹ پاپا' گڈ نائٹ مما۔" وہ ان دونوں سے مل کر آذر کے ساتھ ہی باہر نکل آئی تھی اور جیسے ہی وہ دونوں واپس ڈرائنگ روم میں پہنچے وہاں یکدم ہی اک ہلچل سی مچ گئی تھی سب کا جوش عروج پہ تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ بڑے بڑے سرخ رنگلے پایوں والی مضبوط نواڑی چارپائی پہ اوندھے منہ لیٹا کافی گہری نیند سو رہا تھا جب باہر کوارٹر کے دروازے پہ زوردار دستک ہوئی اور نیند گہری ہونے کی وجہ سے پہلے تو اسے سمجھ ہی نہیں آیا تھا کہ وہ کہاں ہے..... اور یہ دستک کی آواز کہاں سے آ رہی ہے.....؟ لیکن چند سیکنڈ نیند سے بیدار ہوتے ذہن پہ زور ڈال کے سوچا تو ادراک ہوا کہ وہ بڑی حویلی کے سرونٹ کوارٹر میں محو خواب ہے اور جیسے ہی اس کا ذہن اور اعصاب ٹھکانے پہ آئے تو اسے فوراً ہی اپنی کوتاہی کا احساس ہو گیا تھا کہ وہ ڈیوٹی سے لیٹ ہو چکا ہے' جبھی تو وہ یکدم تڑپ کے اٹھ بیٹھا تھا ادھ کھلی کھڑکی اور دروازے کے نیچے سے روشنی اپنا رستہ بنائے اندر چلی آ رہی تھی جس کا مطلب تھا کہ باہر سورج پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا اور ٹائم بھی کافی زیادہ ہو چکا تھا جس پہ منصور حسین کو پورا یقین تھا کہ مبارک خان اس کی کلاس لینے کے لیے آیا ہے اور اس طرح دھڑا دھڑ دروازہ بجا رہا ہے لہٰذا منصور حسین نے اک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر باہر نکلنے کے لیے کوارٹر کا دروازہ کھول دیا۔ لیکن مبارک خان کی بجائے شہزادی علیزے کی خادمہ کو دیکھ کر اس کے واپس مڑتے قدم تھم گئے تھے۔

"السلام علیکم۔" رجو نے بڑی تمیز سے سلام کیا تھا۔

”وعلیکم السلام۔۔۔۔! فرمایئے کیا پیغام لائی ہیں آپ؟“ منصور حسین نے کافی ٹھہرے ہوئے اور پرسکون دریافت کیا تھا۔

”اندر آجاؤں؟“ رجو اس کے کوارٹر کے دروازے سے باہر کھڑی اندر آنے کی اجازت طلب کررہی تھی

”نہیں۔“ منصور حسین نے جواباً ”انکار کردیا تھا“ دوٹوک اور کھرا انکار۔

”کیوں منصور حسین؟ میں اندر کیوں نہیں آسکتی؟“ رجو نے خفگی سے پوچھا تھا۔

”کیونکہ میں تمہیں اندر بلا کر مشکوک نہیں ہونا چاہتا‘ اس لیے جس کام سے آئی ہو‘ وہ کام بتاؤ۔“ حسین کے انداز میں کوئی لچک اور کوئی نرمی نہیں تھی رجو کو تو وہ اس اکھڑے انداز میں بھی دل کو لگ رہا تھا۔

”تمہارے ماتھے پہ بل سجتے ہیں‘ شاید اسی لیے ماتھے پہ بل ڈال کے بات کرتے ہو؟“ وہ پھر بھی اسے سے باز نہیں آئی تھی۔

”مطلب کی بات کرو بی بی‘ کیوں آئی ہو؟“ منصور حسین ایسی باتوں میں آنے والا نہیں تھا لیکن رجو تو اس مٹی تھی۔

”مطلب کی بات ہی تو کررہی ہوں منصور حسین‘ پر تم آنکھ ہی نہیں ملا رہے؟“ رجو جیسے ناراضی سے بولی

”دیکھو بی بی! میں یہاں نوکری کرنے آیا ہوں‘ کسی سے آنکھیں ملانے نہیں‘ میں بندہ بڑا کھرا ہوں‘ یا تو کام ہوں‘ یا کام کی بات سنتا ہوں‘ فضول میں وقت ضائع نہیں کرتا‘ اس لیے بہتر یہی ہے کہ کام کی بات کرو‘ کیوں آ یہاں؟ کس نے بھیجا ہے؟“ اس نے ایک بار پھر استفسار کیا تھا لیکن رجو صدمے کی سی کیفیت میں کھڑی اس دیکھ رہی تھی کتنا روکھا‘ کتنا کٹھور اور کتنا بے مروت ثابت ہوا تھا وہ۔۔۔۔ اور ایک وہ تھی جو اتنے دنوں سے اسے دیکھ کر ہی خوش اور فدا ہورہی تھی۔

”اللہ حافظ۔۔۔۔“ منصور حسین نے فیصلہ کن انداز میں کہتے ہوئے کندھے اچکائے اور دروازہ بند کرڈالا تھا باہر جوں کی توں کھڑی رہ گئی تھی لیکن بند دروازے کو دیکھ کر اسے دوبارہ کچھ یاد آیا تو دروازے پہ ایک بار پھر دے ڈالی لیکن منصور حسین نے دروازہ کھولنے کی زحمت نہیں کی تھی۔

”تمہیں بڑے صاحب نے بلایا ہے منصور حسین‘ ان کی بات سنو جاکر۔“ رجو نے مجبوراً ”باہر سے ہی آ دے کر پیغام دیا تھا۔

”کیوں بلایا ہے۔۔۔۔؟“ اب کی بار اس نے فوراً ”دروازہ کھول دیا تھا وہ کندھے پہ تولیہ رکھے ہوئے تھا یقینا نہانے کے لیے باتھ روم کی سمت جارہا تھا۔

”ان ہی سے جاکر پوچھ لو۔۔۔۔“ رجو کہہ کر پلٹ گئی تھی۔

”ہوں! یہ بھی ٹھیک ہے۔“ اس نے پرسوچ سے انداز میں کہتے ہوئے سرہلایا۔ دس منٹ بعد وہ تیار ہو سیدھا وقار آفندی کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔

”سلام صاحب!“

”وعلیکم السلام! منصور حسین کیسے ہو۔۔۔۔؟“ وہ علیزے کا ملازم تھا اس لیے وقار آفندی اسے ایک الگ پروٹوکول دیتے تھے۔

”اللہ کا کرم ہے صاحب۔“ وہ شکر گزاری سے بولا۔

”کوئی پریشانی کوئی تنگی تو نہیں ہے نا یہاں؟“

”نہیں صاحب! سب ٹھیک چل رہا ہے۔“

”کسی چیز پہ کوئی اعتراض یا پریشانی ہو تو بتادینا۔“

”جی ضرور۔“

”گاڑی سروس کروائی تم نے؟“

”نہیں صاحب! ابھی تک تو نہیں کروائی‘ ایک دو بار مبارک خان اور عارف وغیرہ کے ساتھ مل کر خود ہی گاڑی کو چمکالیا تھا۔“ اس نے لاپروائی سے جواب دیا۔

”جو کام جس کا ہو اسے ہی اچھا لگتا ہے‘ نئی گاڑی ہے اسے پراپر طریقے سے سروس کروانا چاہیے تھا تمہیں۔“

”آپ کہتے ہیں تو آج ہی کروالیتا ہوں۔۔۔۔؟“ وہ مؤدب سے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

”ہوں! اس لیے تو تمہیں بلایا ہے کہ تم آج کا دن تمام ضروری کام نبٹالو‘ کل تو تم لوگوں نے نکلنا ہوگا۔“ وقار آفندی کافی آرام اور سکون سے بات کررہے تھے لیکن منصور حسین ان کی بات پہ بری طرح چونک گیا تھا۔

”آج کے دن کام نبٹالوں؟ کیا مطلب ہے آپ کا۔۔۔۔؟“ اس نے ناسمجھی سے استفسار کیا تھا۔

”ارے بھئی! میرا مطلب ہے کہ کل جانا ہے آپ لوگوں نے۔“

”کہاں جانا ہے؟“

”مری اور اسلام آباد۔“

”کیوں صاحب؟ خیریت۔“ اس نے ٹھنک کے پوچھا تھا۔

”منور حسین! تم بھی شاید پاگل ہی ہو‘ مری اور اسلام آباد لوگ کیوں جاتے ہیں بھلا۔۔۔۔؟“

”ہنی مون منانے۔“ منصور حسین کا برجستہ جواب آیا تھا جس پہ وقار آفندی بھی بوکھلا گئے تھے تب منصور حسین کو بھی احساس ہوگیا۔ کہ وہ بے ساختگی میں کافی غلط بات کہہ گیا ہے۔

”میرا مطلب ہے کہ لوگ تو ہنی مون منانے بھی جاتے ہیں‘ پکنک منانے بھی جاتے ہیں اور وہ انگلش کا کیا لفظ ہے۔۔۔۔؟ ہاں وہ کیا کہتے ہیں کہ ہالیڈیز بھی منانے جاتے ہیں۔“ منصور حسین نے فوراً ”بات سنبھالی تھی تبھی وقار آفندی بھی تھوڑا ریلیکس ہوگئے تھے۔

”ہاں یہ سب بھی ہالیڈیز منانے جارہے ہیں‘ میں نے تو علیزے کو منع کیا تھا لیکن وہ ضد کررہی تھی اس لیے مجبوراً ”اسے بھی بھیج رہا ہوں‘ لیکن تمہاری ذمہ داری پہ۔“ انہوں نے منصور حسین کی سمت اشارہ کیا تھا۔

”میری ذمہ داری پہ۔۔۔۔؟“

”ہاں! تمہاری ذمہ داری پہ‘ تمہیں اس کی حفاظت کرنا ہوگی‘ اس کے آس پاس کڑی نظر رکھو گے اور اس کے آس پاس ہی رہو گے‘ جو بھی نوٹس کرو گے فوراً ”بتادینا‘ ایسی ویسی کوئی پرابلم بن جائے تو تم اسلحہ بھی استعمال کرسکتے ہو‘ ریوالور تو پہلے ہی تمہارے پاس ہے یہ گولیاں بھی رکھ لو‘ اس میں کچھ اور سامان بھی ہے احتیاط سے رکھنا۔“ وقار آفندی ایک چھوٹا سا بیگ اس کی سمت بڑھا رہے تھے۔

”لیکن صاحب! گاڑی میں یہ سب کیسے جاسکتا ہے۔۔۔۔؟“

”کچھ نہیں ہوگا‘ تم بے فکر رہو‘ علیزے کی گاڑی کو کسی بھی چیک پوسٹ پہ نہیں روکا جائے گا‘ میں نے سارا انتظام کردیا ہے اور ویسے بھی تمہارے پاس لائسنس بھی تو ہے نا؟ تم کون سا کوئی غیر قانونی چیز لے کر جارہے ہو۔۔۔۔؟ یہ سب تو علیزے کی حفاظت کے لیے ہے‘ تمہارا ریوالور چوبیس گھنٹے لوڈڈ ہونا چاہیے‘ اس معاملے میں ذرا سی کوتاہی بھی معاف نہیں ہوگی۔“ وقار آفندی اس کی برین واشنگ کررہے تھے اور منصور حسین ہر بات پہ سرہلا رہا تھا۔

”ابھی تم گاڑی سروس کرواکے آؤ‘ باقی باتیں تمہیں بعد میں سمجھاتا ہوں۔“ انہوں نے منصور حسین کو جانے

کااشارہ کیا جس پہ وہ فوراً" کھڑا ہو گیا تھا۔

"جی بہتر۔"

"گڈ! اب تم جا سکتے ہو۔"

"مہربانی صاحب۔" وہ کہہ کے پلٹ گیا تھا۔

"اور سنو۔"

"جی۔۔۔؟"

"کسی کو یہ پتا نہ چلے کہ تم اسلحے سے لوڈڈ ہو' خود علیزے کو بھی پتا نہیں چلنا چاہیے۔" انہوں نے اسے تاکید کی تھی۔

"جیسے آپ کا حکم۔" اس نے سر جھکا دیا۔

"اوکے! جا سکتے ہو تم۔۔۔" انہوں نے کہہ کر اخبار اٹھا لیا تھا اور منصور حسین اس مردان خانے سے نکل آیا تھا لیکن وہ ان لوگوں کے اس اچانک پروگرام پہ سخت کوفت اور بے زاریت کا شکار ہوا تھا کیونکہ اسے اندازہ تھا کہ اتنے طویل سفر' مسلسل خاموشی اور اتنے گھنٹے لگاتار ڈرائیونگ سے کیا حال ہو گا۔۔۔ اور اسی حال کو سوچتے ہوئے اس کا موڈ آف ہو گیا تھا۔

"کہاں جا رہے ہو منصور حسین۔۔۔؟" مبارک خان اسے گاڑی کی سمت بڑھتے دیکھ کر قریب آ گیا تھا۔

"گاڑی سروس کروانے۔" اس نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے جواب دیا۔

"اوہ اچھا۔۔۔! علیزے بی بی نے مری جانا ہے نا اس لیے۔" مبارک خان کو شاید پہلے سے پتا تھا اس لیے منصور حسین کے بتانے سے پہلے ہی بول پڑا تھا۔

"جی ہاں! مری جانا ہے اس لیے۔" اس کا موڈ آف تھا اسی لیے کوفت زدہ سے انداز میں بولا تھا۔

"کیا بات ہے یار؟ تمہارا موڈ کیوں خراب ہو رہا ہے۔۔۔؟" مبارک خان نے دلچسپی سے پوچھا تھا۔

"یار تم خود سوچو' اتنا طویل سفر' اتنی تھکاوٹ اور حاصل وصول کچھ بھی نہیں' ایسے میں موڈ تو خراب ہو گا ہی۔" منصور حسین کے چہرے پہ ہلکے غصے کا اثر تھا مبارک خان گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا اسے۔

"حاصل وصول کیوں نہیں ہے؟ اس کام کے' اس نوکری کے پیسے نہیں لیتے تم۔۔۔؟ ماہانہ تنخواہ لیتے ہو' آخر کس لیے۔۔۔؟ اس کام کے لیے نا۔۔۔؟ تو پھر یہ بے زاری اور غصہ کیوں ہے۔۔۔ کون سا مفت میں کام کر رہے ہو۔۔۔ اگر یہ ڈرائیونگ اتنا ہی مشکل کام ہے تو نوکری چھوڑ دو' کہیں اور نوکری کر لو' کسی بینک یا کسی آفس میں۔" مبارک خان کی ڈیوٹی تھی کہ وہ گھر کے ضروری کاموں کے علاوہ تمام ملازموں پہ نظر رکھے اور انہیں ہدایت سے نوازتا رہے' جبھی آج منصور حسین کا موڈ دیکھ کر بھی وہ چپ نہیں رہ سکا تھا بے شک منصور حسین کے ساتھ اس کی کافی انڈر اسٹینڈنگ اور دوستی ہو چکی تھی لیکن اصول پھر بھی اصول تھے' وہ ذات کا پٹھان تھا' حق بات کہنے سے باز نہیں آ سکتا تھا۔۔۔ جبکہ منصور حسین اس کی شکل دیکھ رہا تھا جیسے یقین نہ آ رہا ہو کہ مبارک خان نے اتنے سخت لہجے میں اسے کھری کھری سنائی ہیں۔

"میں تو مذاق کر رہا تھا مبارک خان' ورنہ میں بھی جانتا ہوں کہ یہ میری ڈیوٹی ہے' علیزے بی بی جہاں بھی جائیں مجھے ان کے ساتھ جانا ہو گا۔" منصور حسین افسوس سے کہہ رہا تھا اسے مبارک خان کی بات پہ دکھ ہوا تھا کتنی جلدی ڈانٹ دیا تھا اس نے۔۔۔

"لیکن میں مذاق نہیں کر رہا۔ میں سنجیدگی سے بات کر رہا ہوں۔" مبارک خان کا انداز اب بھی نپا تلا سا تھا

"ہوں! بہت اچھا کیا ہے تم نے۔" اس نے سر ہلایا۔

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے تم جاؤ اب' کام کرو اپنا۔" مبارک خان کہہ کے اندر چلا گیا تھا اور منصور حسین بے دلی سے گاڑی میں بیٹھ گیا تھا گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے اسے خود بخود ہی رجو کا خیال آ گیا تھا۔

صبح اٹھتے ہی خود اس نے بھی تو رجو کے ساتھ ایسا ہی رویہ اپنایا تھا اس بے چاری کو بھی تو اتنا ہی افسوس اور دکھ ہوا ہو گا۔۔۔؟ اللہ نے چند منٹوں میں ہی اس کا بدلہ لے لیا تھا اور منصور حسین کو فوراً" ہی احساس ہو گیا تھا کہ جیسا سلوک ہم کسی کے ساتھ کرتے ہیں' ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔۔۔ لہٰذا اس نے آئندہ کے لیے اللہ سے معافی مانگ لی تھی۔

✡ ✡ ✡

"بھائی۔۔۔! بھائی۔۔۔! پلیز جلدی اٹھیں ابا جی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" عدیل دن بھر کا تھکا ہارا چھت پہ چارپائی ڈالے کافی گہری نیند سو رہا تھا جب اچانک ایمن نے آ کر اسے جھنجھوڑ کے جگا دیا تھا۔

"ابا جی کی طبیعت؟ کیا ہوا ہے انہیں؟" عدیل بھی اس اچانک افتاد پہ گھبرا گیا تھا۔

"ان کے سینے میں بہت شدید درد ہے' بہت تکلیف میں ہیں وہ۔" ایمن کی آواز بھرا گئی تھی اور عدیل یکدم چادر پرے پھینک کے اٹھ کھڑا ہوا تھا اپنے چپل پہن کر تیز تیز قدم اٹھاتا وہ پانچ سیکنڈ میں سیڑھیاں اتر آیا تھا۔

"امی! کیا ہوا ہے ابا جی کو۔۔۔؟" عدیل کے چہرے پہ ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"ابھی تھوڑی دیر پہلے تک تو بالکل ٹھیک ٹھاک سو رہے تھے' میری بھی آنکھ لگ گئی تھی' لیکن جیسے ہی کروٹ بدلی تو ان کی طرف نظر اٹھ گئی' تب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ تکلیف میں ہیں اور کراہ رہے ہیں' اٹھ کر پتا کیا ہے تو اپنے سینے کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ سینے میں درد ہے' اب تو ان سے کراہنا بھی مشکل ہو گیا ہے۔" امی بھی ابا جی کو تکلیف میں دیکھ کر رو رہی تھیں مریم اور ایمان ابا جی کے قریب جھکی ان کا سینہ سہلا رہی تھیں لیکن ان کے چہرے پہ تکلیف کے آثار کم نہیں ہو رہے تھے بلکہ اور بڑھ رہے تھے۔

"آپ حوصلہ رکھیں میں ابھی ٹیکسی لے کر آتا ہوں' انہیں ہسپتال لے چلتے ہیں۔" عدیل عجلت سے کہتا الٹے پاؤں باہر نکل گیا تھا۔

رات کے دو بجے کا وقت تھا گلیوں میں ہونے والی چہل پہل اور شور ہنگامہ ماند پڑ چکا تھا لوگ اب اپنے اپنے گھروں میں سکون کی نیند سو رہے تھے عدیل اپنی گلی سے تقریباً" بھاگتا ہوا مین روڈ تک آیا تھا۔۔۔ مین روڈ روشنیوں سے بھرا پڑا تھا بے فکرے لوگ موج مستی میں مگن تھے ایسے میں وہ اکیلا فکرمند سا ٹیکسی کی تلاش میں مسلسل ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

"ٹیکسی۔" اس نے اک ٹیکسی کو قریب آتے دیکھا تو فوراً" سامنے آ گیا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے بمشکل بریک لگائے تھے۔

"دیکھیے بھائی صاحب! میرے والد صاحب کی طبیعت بہت خراب ہے انہیں ہسپتال لے کر جانا ہے پلیز۔۔۔" عدیل دیکھ چکا تھا کہ ٹیکسی میں پہلے سے دو سواریاں موجود ہیں پھر بھی التجا کر ڈالی تھی۔

"معذرت چاہتا ہوں صاحب' میں نے یہ سواریاں ایئرپورٹ چھوڑنی ہیں ان کی فلائیٹ مس ہو جائے گی۔" ٹیکسی ڈرائیور نے انکار کر دیا تھا۔

"دیکھیے کسی کی زندگی اور موت کا سوال ہے پلیز کچھ خیال کریں۔" عدیل روہانسا ہو گیا تھا۔

"دیکھو صاحب! خوامخواہ گلے مت پڑو' جاؤ کسی اور ٹیکسی والے سے کہو۔" ٹیکسی ڈرائیور نے ٹیکسی اک جھٹکے سے

آگے بڑھالی عدیل اچھل کے پیچھے ہوا تھا ورنہ یقیناً "فٹ پاتھ پہ جا گرتا۔

"ٹیکسی....." اچانک اک اور ٹیکسی اس کے سامنے سے گزری تھی لیکن اس نے بھی عدیل کی آواز نہیں س[illegible] تھی۔

"آٹو....." اب کی بار اسے سڑک کی دوسری جانب ایک رکشا دکھائی دیا اور عدیل اندھا دھند اس رکشے [illegible] سمت دوڑ پڑا۔

"ہیلو بھائی صاحب! ہسپتال چلنا ہے۔" اس نے رکشے میں آڑے ترچھے سوئے ڈرائیور کو بازو ہلا کر متوجہ کیا وہ نیند سے کسمسا کر بمشکل سیدھا ہوا تھا۔

"کیا بات ہے باؤ جی.....؟" رکشا ڈرائیور نے اپنی ٹوپی سیدھی کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہسپتال جانا ہے' ایک مریض کو لے کر بہت ایمرجنسی ہے پلیز....."

اس مصیبت کے عالم میں تو یوں لگ رہا تھا جیسے شہر کا شہر ویران اور سنسان ہو گیا ہو' جہاں وقت پڑنے پہ کو[illegible] سواری ہی نہ مل رہی تھی۔

"معاف کرنا باؤ جی! میرا رکشا تو صبح سے خراب ہے' یہ کم بخت ٹھیک ہوتا تو میں اتنے آرام سے یوں نہ سو[illegible] ہوتا' تمہیں ضرور ساتھ لے چلتا۔" اس رکشا ڈرائیور نے بھی معذرت کرتے ہوئے معذوری ظاہر کی تھی ا[illegible] عدیل کے ماتھے پہ پریشانی سے پسینہ پھوٹ پڑا تھا کہ نجانے گھر میں تکلیف کے مارے ابا جی کی کیا حالت ہو رہی [illegible] گی اور اسے یہاں کوئی ٹیکسی یا رکشا وغیرہ ہی نہیں مل رہا تھا۔ اس نے بے بسی سے اپنے دونوں ہاتھ بالوں م[illegible] پھنسا لیے اور روہانسے سے انداز میں اوپر آسمان کی سمت دیکھا تھا آنکھوں کے گوشے بھیگ چکے تھے اور دل [illegible] گہرائیوں سے فریاد نکلی تھی۔

"یا اللہ.....! رحم فرما....." اس نے اس مشکل اور کڑے وقت میں اپنے رب کو پکارا۔ جو کبھی بھی کسی کو مایو[illegible] نہیں کرتا۔ اس کے الفاظ بھی اس کے منہ میں ہی تھے کہ اس کے پیچھے اچانک کسی گاڑی کے ٹائر چر چرا[illegible] تھے اور زوردار ہارن بجا۔ کیونکہ وہ اپنی بے دھیانی میں سڑک کے بیچوں بیچ چل رہا تھا۔

عدیل نے گاڑی کے ہارن پہ یکدم تڑپ کے اپنے پیچھے دیکھا تھا اور آنکھیں چندھیا گئی تھیں گاڑی کی ہ[illegible] لائٹس کی روشنی سیدھی اس کے چہرے پہ پڑ رہی تھی جس کی وجہ سے گاڑی ڈرائیو کرنے والے کو دیکھ نہیں پایا اور لپک کے گاڑی کے قریب آ گیا تھا لیکن ڈرائیونگ سیٹ پہ براجمان لڑکی کو دیکھ کر اس کی رہی سہی امید بھی [illegible] توڑ گئی تھی عدیل کو اس لڑکی سے ہونے والی پچھلی دونوں ملاقاتیں بخوبی یاد تھیں اس لیے اس سے توقع رکھنا فضو[illegible] تھا جبھی وہ کچھ کہنے سے پہلے ہی چپ ہو گیا تھا۔

"لگتا ہے کسی گاڑی کے نیچے آ کر مرنے کا بہت شوق ہے تمہیں....." وہ غصے سے چبا کر بولی تھی لیکن عدیل نے جواباً" کچھ بھی کہے بغیر قدم پیچھے ہٹا لیے تھے۔

"او مسٹر ہیرو.....! میں تم سے کچھ کہہ رہی ہوں؟" وہ گاڑی سے نکل کر اس کے سامنے آ گئی تھی۔

"مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا۔" عدیل بڑے کرب سے بولا تھا اپنے اندر کے بے بسی کے غبار کو وہ بمشکل ض[illegible] کر رہا تھا۔

"بہرے ہو گئے ہو.....؟"

"ہاں! اندھا بھی ہو گیا ہوں۔" اس کے لہجے میں اذیت تھی جو فی الحال مدحیہ حیات محسوس کرنے سے قا[illegible] تھی۔

"تو پھر اندھے اور بہرے ہو کر سڑکیں کیوں چھان رہے ہو..... کوئی گاڑی روند کے گزر جائے گی۔" وہ [illegible]

رہی تھی۔

"اس وقت ہر گاڑی مجھے روند کر ہی گزر رہی ہے میڈم....." عدیل کی آواز دکھ سے لرز رہی تھی اور شکست خوردہ سا لہجہ بھی چھپ نہیں رہا تھا پہلی بار مدحیہ نے چونک کر دیکھا تھا۔

"وجہ پوچھ سکتی ہوں؟"

"وجہ پوچھ کر کیا کریں گی؟"

"یہ تو بعد کا مسئلہ ہے نا' پہلے وجہ تو بتاؤ۔"

"میرے بابا کی طبیعت خراب ہے' وہ بہت تکلیف میں ہیں اور مجھے کوئی رکشا یا ٹیکسی نہیں مل رہی' پچھلے پندرہ بیس منٹ سے اسی سڑک پہ چکرا رہا ہوں۔" اس نے بالآخر کہہ ہی دیا تھا اور مدحیہ اس کی بات پہ ٹھٹک گئی تھی اس نے عدیل کو سر تا پا گہری نظروں سے دیکھا تھا اس کا حلیہ بتا رہا تھا جیسے ابھی ابھی سوتے سے اٹھ کر آیا ہو۔

"تم کوئی ڈرامہ تو نہیں کر رہے.....؟" وہ مشکوک سے لہجے میں بولی تھی اور عدیل کا ضبط جواب دے گیا تھا وہ پھٹ پڑا تھا۔

"میں ایک مجبور اور بے بس انسان ہوں' اس وقت اپنے باپ کی موت کے خوف سے سڑکوں پہ مارا مارا پھر رہا ہوں اور آپ جیسے امیر اور عیاش لوگ اپنی گاڑیوں میں گزرتے ہوئے یہ سمجھ رہے ہیں کہ میں کوئی آوارہ' کوئی موالی شاید ڈرامے کرتا پھر رہا ہوں' آپ لوگ کبھی ایسے حالات سے دوچار ہوئے ہوں تو آپ کو کسی دوسرے کا احساس ہونا.....؟ ہر چیز کی سہولت نے آپ لوگوں کے اندر بے حسی پیدا کر دی ہے' زیرو میٹر گاڑی میں بیٹھ کر پیدل چلنے والوں کو آپ لوگ کیڑے مکوڑے سمجھتے ہیں' جنہیں روند کر گزرنے پہ بھی کوئی پروا نہیں ہوتی آپ کو' میں نے اسی لیے کہا تھا آپ سے کہ وجہ مت پوچھیں' اگر پوچھ بھی لیں گی تو کیا کریں گی آپ.....؟ ڈرامہ باز کہہ کر گزر جائیں گی' بس اور کیا کریں گی.....؟ جائیں گزر جائیں' جہاں پورے شہر کی گاڑیاں گزر رہی ہیں وہاں آپ کی بھی گاڑی گزر گئی تو کوئی فرق نہیں پڑے گا' زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے' اگر میرے ابا جی کی زندگی باقی ہے تو کوئی بھی چیز انہیں موت کے منہ میں نہیں دھکیل سکتی۔" عدیل کا سارا غصہ اور سارا غبار مدحیہ پہ نکل گیا تھا اور وہ حیران پریشان اس کی صورت دیکھتی رہ گئی تھی مگر وہ تلخی سے سر جھٹک کر آگے بڑھ گیا تھا۔

"ٹیکسی۔" ایک بار پھر وہ کسی ٹیکسی کے پیچھے بھاگا تھا لیکن یہاں بھلا کون سننے والا تھا..... تیز رفتار ٹیکسی زناٹے سے گزر گئی تھی اور عدیل شکستہ سا واپس گھر کی سمت چل پڑا تھا ابھی کچھ دور آیا تھا کہ پیچھے ایک بار پھر ہارن بجا' عدیل بغیر رکے چلتا رہا لیکن اب کی بار مدحیہ نے ہارن پہ ہاتھ رکھ کے ہٹایا نہیں تھا عدیل نے تلخی سے پلٹ کر دیکھا۔

"کیا مسئلہ ہے میڈم.....؟" وہ زہر سے بھرا ہوا تھا۔

"بیٹھو گاڑی میں۔" اس نے کہتے ہوئے فرنٹ ڈور کھول دیا تھا اور عدیل گاڑی کے کھلے ہوئے دروازے کو دیکھ کر ڈانواں ڈول سا ہو گیا تھا کوئی اور وقت ہوتا تو شاید منہ موڑ کے آگے بڑھ جاتا لیکن اس وقت وہ غصے کے باوجود بھی ایسا نہیں کر سکتا تھا خاموشی سے کھلے ہوئے دروازے سے اندر بیٹھ گیا تھا اور دروازہ بند کر دیا تھا۔

"اپنے گھر کا راستہ بتاؤ۔" وہ سنجیدگی سے پوچھ رہی تھی اور عدیل سنجیدگی سے اسے راستہ سمجھانے لگا۔ وہ گاڑی کی اسپیڈ بڑھا چکی تھی اور چند منٹ بعد ہی وہ اس کی مطلوبہ گلی کے نکڑ پہ گاڑی کھڑی کر کے سیدھی ہوئی تھی۔

"اب.....؟" اس نے عدیل کو سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

"آپ یہیں ٹھہریں' میں انہیں لے کر آتا ہوں۔" عدیل کہہ کے عجلت سے نیچے اتر آیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اپنے گھر کے دروازے پہ آ رکا تھا۔

"امی! دروازہ کھولیں۔" اس نے دستک دی پانچ سیکنڈ میں ہی دروازہ کھل گیا تھا۔

"بھائی...! اتنی دیر لگا دی آپ نے۔" مریم کے چہرے پہ بدحواسی ناچ رہی تھی۔

"ٹیکسی نہیں مل رہی تھی، ابھی بھی کسی کی گاڑی ملی ہے، ٹیکسی نہیں ملی۔" وہ بتاتے ہوئے ابا جی کی طرف تھا وہ نیم بے ہوشی کی سی حالت میں تھے عدیل نے انہیں بازوؤں میں اٹھا لیا تھا۔

"میں ساتھ چلوں...؟" عابدہ خاتون آگے بڑھیں۔

"نہیں امی! گھر پہ کوئی بھی نہیں ہے، رات کے اس پہر یہ سب اکیلی کیسے رہیں گی، حالات تو ویسے ہی بہت خراب ہیں۔" عدیل نے منع کر دیا۔

"تو پھر میں ساتھ چلتی ہوں، آپ اکیلے کہاں کہاں بھاگ دوڑ کریں گے۔" مریم عابدہ خاتون کو رکتے دیکھ کر تیار ہو گئی تھی۔

"لیکن مریم۔" عدیل نے روکنا چاہا۔

"ٹھیک کہہ رہی ہے مریم، وہ ساتھ چلی جاتی ہے جاؤ مریم چادر لے آؤ۔" عابدہ خاتون نے اشارہ کیا تھا اور پھر عدیل کے پیچھے پیچھے مریم بھی نکل آئی۔

وہ ڈرائیونگ سیٹ سے پشت ٹکائے بیٹھی اس شخص کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی جس کے نام سے بھی واقف نہیں تھی لیکن پھر بھی اس کا انتظار کر رہی تھی، نجانے اسے کیا ہوا تھا کہ وہ بنا سوچے سمجھے اس کے ساتھ چلی آئی تھی ورنہ اتنی نرم اور حساس تو وہ کبھی بھی نہیں تھی جتنی آج ثابت ہوئی تھی اور وہ اپنے اس اقدام پہ خود بھی بہت حیران تھی لیکن جو بھی تھا وہ کسی کو یوں مصیبت میں چھوڑ کر نہیں جا سکتی تھی، اس شخص کی پریشانی سن کر وہ اپنا دل بھر کا غم و غصہ بھی بھول گئی تھی اور ساتھ یہ بھی بھول گئی تھی کہ اس شخص کے ساتھ ہونے والی پہلی دو ملاقاتیں کیسی گزری تھیں۔

جن کے بعد وہ اس شخص کا خون پی جانے کے درپے ہو جاتی تھی، اسے پورا پورا دن گالیوں سے نوازتی رہتی بلکہ اس کا بس چلتا تو وہ اسے یقیناً "قتل" بھی کر ڈالتی، لیکن آج وہ اسی شخص کو اپنی گاڑی میں اپنے ساتھ اپنے برابر بٹھا کے لائی تھی، وہ بھی محض اس کی مدد کرنے کی خاطر۔

وہ انہی سوچوں میں گم چپ بیٹھی سامنے ونڈ اسکرین کی سمت دیکھ رہی تھی جب وہ شخص گلی سے نکل کر گاڑی کی سمت آتا دکھائی دیا تھا مدحیہ اسے دیکھ کر گاڑی سے اتر آئی اور گاڑی کا بیک ڈور کھول دیا۔

"تھینک یو۔" عدیل نے اسے تھینکس کہہ کر بمشکل نیچے جھکتے ہوئے ابا جی کو پچھلی سیٹ پہ لٹایا اس کے پیچھے مریم بھی آرکی لیکن وہ گاڑی کے قریب کھڑی مدحیہ کو دیکھ کر ٹھٹک کے رک گئی۔

"مریم! تم پیچھے بیٹھ جاؤ۔" عدیل ابا جی کو لٹا کے سیدھا ہوا تو مریم کو بیٹھنے کا کہا جو حیران نظروں سے مدحیہ کو دیکھ رہی تھی البتہ مدحیہ نے اسے بڑے نارمل بلکہ سرسری سے انداز میں دیکھا اور پیچھے ہٹ گئی۔

"چلیں...؟" عدیل نے مدحیہ کی سمت دیکھا۔

"اوکے...." وہ کندھے اچکا کر دوسری سائیڈ سے گھوم کے ڈرائیونگ سیٹ پہ آ بیٹھی اور گاڑی اسٹارٹ کر دی مریم اور عدیل بھی بیٹھ چکے تھے وہ گاڑی بیک کرتے ہوئے مین روڈ تک لے آئی تھی۔

"کون سے ہاسپٹل جانا ہے۔" مدحیہ نے سنجیدگی سے پوچھا لیکن مریم چونک گئی تھی اس لڑکی کے لب و لہجے سے ہی لگ رہا تھا کہ وہ لندن پلٹ ہے مریم پچھلی سیٹ پہ بیٹھی ہوئی تھی اسی لیے مدحیہ اسے صرف ایک سائیڈ سے ہی دکھائی دے رہی تھی مریم کی نظر اس کی گداز دودھیا کلائی اور مخروطی ہاتھوں پہ ٹھہر گئی تھی۔

اس کی کلائی میں خوب صورت اور نفیس سے دو بریسلٹ سجے ہوئے تھے اور نفاست سے ترشے ہوئے ناخنوں پہ شاکنگ پنک کلر کی نیل پالش اس کے دودھیا ہاتھوں کو دو آتشہ بنا رہی تھی۔ اس کا ایسا جائزہ تو عدیل نے بھی نہیں لیا تھا جیسا مریم لے رہی تھی۔ جبکہ مدحیہ کو خبر بھی نہیں تھی کہ پیچھے بیٹھی لڑکی اتنے غور سے اسے دیکھ رہی ہے۔

"بتایئے نا کہاں جانا ہے آپ نے؟ کون سے ہسپتال کی طرف ٹرن لوں...؟" مدحیہ نے ایک بار پھر عدیل کو مخاطب کیا تھا۔

"میو ہسپتال، یہ یہاں کا سب سے بڑا سرکاری ہسپتال ہے۔" عدیل نے بتایا اور ساتھ ہی راستہ بھی بتانے لگا۔ جس پہ مدحیہ نے چونک کر دیکھا تھا گویا وہ لوگ کسی پرائیویٹ ہسپتال کا خرچہ بھی افورڈ نہیں کر سکتے تھے؟ مدحیہ اس شخص کے حالات پہ حیران ہو رہی تھی اور مریم اس لڑکی پہ....! وہ اتنی پریشانی کے باوجود اس لڑکی کے متعلق سوچ رہی تھی بلکہ گاڑی میں موجود وہ تینوں نفوس ہی کچھ نہ کچھ سوچ رہے تھے اور ان کی سوچوں کا تسلسل مدحیہ کے موبائل کی رنگ نے توڑا تھا ڈیش بورڈ پہ رکھے موبائل کی نیلی لائٹس بار بار روشن ہو رہی تھیں مدحیہ نے موبائل اٹھا کر کال ڈس کنکٹ کر دی لیکن پانچ سیکنڈ کے وقفے سے دوبارہ رنگ بجنے لگی کال کرنے والا نبیل تھا جو اسے دوپہر سے تقریباً "سو مرتبہ" کال کر چکا تھا اور مدحیہ اسے ایک ہی جواب دے کر فون بند کر دیتی اس وقت بھی اس نے موبائل آن کر کے بولنے کی زحمت نہیں کی تھی بلکہ ان کے بولنے کا انتظار کیا تھا۔

"مدحیہ پلیز! رات بہت ہو گئی ہے، گھر واپس آجاؤ، جو بھی بات کہنی ہے، گھر آ کر کہو، پلیز میری بات مان لو۔" نبیل اسے نرمی سے سمجھا رہا تھا۔

"ایم سوری بھائی! میں نے آپ کو پہلی کال میں ہی بتا دیا تھا کہ جب تک وہ اس گھر میں ہیں، میں نہیں آؤں گی، بس بات ختم، آپ انہیں نکال دیں، میں ابھی آجاتی ہوں۔" مدحیہ نے سرد سے لہجے میں لاپروائی سے کہا تھا جس پہ عدیل نے ٹھٹک کر اس کی سمت دیکھا کتنی سخت تھی وہ لڑکی، اس کی کاٹ تو اس کے تیکھے نقوش سے ہی ظاہر ہو جاتی تھی، معاف کرنے والوں میں سے تو ہرگز نہیں تھی۔ پھر بھی عدیل کے ساتھ آ گئی تھی.... عدیل کو حیرت نے چھوا تھا۔

"دیکھو مدحیہ! وہ بابا ہیں ہمارے، میں کیسے ان کو گھر سے نکال سکتا ہوں....؟"

"اوکے! میں تو گھر سے نکل چکی ہوں نا....؟ آپ کیوں بار بار کال کر کے مجھے ڈسٹرب کر رہے ہیں....؟ دوبارہ کال نہ کیجئے گا، اللہ حافظ۔" اس نے کہہ کے کال بند کی اور موبائل ڈیش بورڈ پہ پٹخ دیا تھا وہ دونوں بہن بھائی چپ چاپ اس کی گفتگو سنتے رہ گئے اور اس نے میو ہسپتال کی پارکنگ میں گاڑی اک جھٹکے سے لا کے پارک کی تھی اور گاڑی کے آٹومیٹک لاک کھول دیے تھے عدیل تیزی سے نیچے اتر گیا۔ اور پھر آناً "فاناً" وہ لوگ اپنے ابا جی کو اسٹریچر پہ ڈال کے اندر لے گئے اور مدحیہ وہیں پارکنگ میں کھڑی رہ گئی اور اپنی بھاگ دوڑ میں عدیل کو اس کا خیال ہی نہ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

اپنا پن ہی اک بیگانے پن میں ہے
پورا عالم اک دیوانے پن میں ہے
یہ جو میں تم سے انجان بنا پھرتا ہوں
ساری بات ہی اسی انجانے پن میں ہے

عبداللہ کی ڈائری میں تحریر یہ شعر پڑھتے پڑھتے زری کی آنکھیں خوشی اور بے یقینی سے چمک اٹھی تھیں وہ

عبداللہ کے چھوٹے سے اسٹڈی روم سے نکل کر ننگے پاؤں نیچے کی طرف بھاگی تھی۔

"بھابھی.....! بھابھی.....! کہاں ہیں آپ!" وہ سیڑھیاں اترتے ہوئے زور زور سے پکارتی ہوئی نیچے آرہی تھی۔

"یا اللہ خیر..... کیا آفت آگئی ہے؟" نگارش گھبرا کر دل پہ ہاتھ رکھتی ہوئی کچن سے باہر نکلی آئی اس کے ہاتھ میں چمچہ تھا وہ کچن میں کھانا بنا رہی تھی اور باقاعدہ ایپرن بھی باندھ رکھا تھا۔

"یہ شعر..... یہ شعر پڑھا آپ نے؟" اس نے عبداللہ کی ڈائری نگارش کے سامنے لہرائی اور نگارش نے اس بات پہ تلملا کر اپنا ماتھا پیٹ لیا تھا۔

"اف اللہ! تمہارے یہ شعر..... کیا کروں میں ان شعروں کا..... دن رات انہی میں چکراتی رہتی ہو' بلکہ مجھے بھی چکرا کے رکھ دیا ہے۔" نگارش نے خفگی سے کہتے ہوئے اسے گھور کے دیکھا تھا۔

"دل کو بہلاتی ہوں بھابھی۔ خوب صورت لفظوں کے اظہار سے دل کو سکون رہتا ہے۔"

"لیکن یار کیسا سکون..... کون سا وہ خود تمہیں شعر سناتا ہے' جنہیں سن کر تمہارے دل کو سکون رہتا ہے؟" نگارش کبھی کبھی اس کی اس قدر دیوانگی پہ جھنجھلا جاتی تھی۔

"بھابھی.....! یوں سمجھ لیں کہ وہ خود ہی مجھے شعر سناتا ہے' اگر یقین نہیں آتا تو یہ شعر پڑھ کے دیکھ لیں۔" اس نے پھر ڈائری سامنے کی تھی اور مجبوراً نگارش کو وہ شعر پڑھنا پڑا اور شعر کے نیچے دل آور شاہ کا نام لکھا ہوا تھا اور ساتھ میں ٹائم اور ڈیٹ بھی تحریر تھی۔

"اوہ! تو اس شعر کی بات کر رہی ہو؟" نگارش نے یہ ڈائری پہلے سے پڑھ رکھی تھی یہ ڈائری عبداللہ کی تھی لیکن اس میں شعر تینوں دوستوں نے اپنی اپنی ہینڈ رائٹنگ میں تحریر کر رکھے تھے۔

"بھابھی.....! یہی شعر تو دنیا کا خوب صورت ترین شعر ہے۔" زری اس شعر کے لفظوں اور دل آور کے نام پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑی سرشاری اور بڑی چاہ سے بولی تھی۔

"اس سے اگلا شعر بھی تو پڑھو۔" نگارش کہتے ہوئے واپس کچن کی طرف پلٹ گئی۔

"اگلا شعر.....؟ وہ کس کا ہے؟"

"پڑھو تو سہی' پتا چل جائے گا۔" نگارش نے کچن سے ہی جواب دیا تھا اور زری نے تجسس کے ہاتھوں اگلا صفحہ پلٹ دیا تھا۔

تیرے خیال سے دامن بچا کے دیکھا ہے
دل و نظر کو بہت آزما کے دیکھا ہے.....
نشاطِ جاں کی قسم تو نہیں تو کچھ بھی نہیں
بہت دنوں سے تجھے ہم نے بھلا کے دیکھا ہے

زری نے زیر لب یہ شعر پڑھا تھا الفاظ واقعی دل کو چھو گئے تھے لیکن شعر کے نیچے لکھا "نبیل حیات" کا نام اس کے دل کو چھونے والا نہیں تھا' وہ دل آور شاہ کی داسی تھی اس کی پجارن' اس کی جوگن تھی' پیر کے ناخن سے لے کر سر کے بالوں تک اس کے عشق میں ڈوبی ہوئی' تن بھی گھائل' من بھی گھائل' کسی اور طرف دیکھتی بھی تو کیسے.....؟

وہ تو سوتی بھی اسی خیال سے تھی کہ خواب میں وہ ملے گا' اس سے ملاقات کی آس پلکوں پہ نیند بٹھا جاتی تھی اس کا سونا جاگنا دل آور شاہ کے لیے تھا' اس کا پہننا اوڑھنا دل آور شاہ کے لیے تھا' اس کا جینا مرنا دل آور شاہ کے لیے تھا اور جب اس کا سب کچھ دل آور شاہ کے لیے تھا تو اسے دل آور شاہ کے پہلو میں کھڑا نبیل حیات کیسے دکھائی دے سکتا تھا.....؟ اس کا نام زری کی نظروں میں بھلا کیسے جچ سکتا تھا.....؟ کبھی ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ اس کی نظر ایک انچ بھی دل آور شاہ سے ہٹ کے ادھر سے ادھر دیکھ لے اور اس وقت بھی ایسا ہی ہوا تھا اس نے دوبارہ صفحہ پلٹ کے نظریں دل آور شاہ کے لکھے ہوئے شعر پہ جما دی تھیں۔

"شعر پڑھا تم نے.....؟" نگارش ایپرن کھولتے ہوئے دوبارہ کچن سے نکل آئی۔

"ہوں! پڑھا ہے' لیکن دل کو نہیں لگا۔" زری نے لاپروائی سے کہتے ہوئے سر ہلایا تھا' نگارش نے حیرت سے اسے دیکھا اور پھر مسکرا دی۔

"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو تم' جس دل کو "دل آور شاہ" لگ جائے اس کو کوئی اور شے لگ سکتی ہے بھلا؟"

"ڈیفی نیٹلی آف کورس بھابھی.....! ایسا ہی ہے' وہ اتنا دل کو لگ گیا ہے کہ اب تو میرا دل بھی دل آور شاہ بن گیا ہے' بے رخ اور بے نیاز..... مجھ سے آنکھ ہی نہیں ملاتا' بالکل اسی کی طرح' وہی چال چلن ہیں میرے دل کے جیسے اس کے تھے۔" زری بولتے ہوئے جیسے چہک رہی تھی۔

"اپنے دل کو اتنا نہ سر پہ چڑھاؤ' پچھتاؤ گی' دل بگڑ جائے تو قابو کرنا مشکل ہو جاتا ہے' لگام ڈالو اسے۔" نگارش اسے شرارت سے سمجھا رہی تھی۔

"بھابھی.....! بہت دیر ہو چکی ہے اب تو اس بے لگام کو وہی لگام ڈال سکتا ہے جس کے لیے یہ بے لگام ہوا ہے۔"

"وہ خود بے لگام ہے' تمہارے دل کو بھلا کیا لگام ڈالے گا؟" نگارش نے مذاق اڑایا تھا اور زری بھی بے ساختہ ہنس پڑی تھی۔

"بے لگام تو بھائی بھی بہت تھے' لیکن دیکھ لیں آج کتنے قابو میں ہیں۔" زری نے نگارش کو چھیڑا۔

"محترمہ! تمہارے بھائی کو قابو کرنے کے لیے بڑی محنت کی ہے میں نے' اپنا دل' اپنی جان' اپنی زندگی اور زندگی بھر کی تمام خدمتیں ان کے نام لکھی ہیں میں نے' تب جا کے آج وہ میرے قابو میں ہوئے ہیں۔"

"اوہ! تو اسی لیے انہوں نے یہ شعر لکھا ہوا ہے.....؟" زری نے تیسرا صفحہ پلٹ کے عبداللہ کا لکھا ہوا شعر سامنے کیا تھا۔

اب اداس کیوں پھرتے ہو' سردیوں کی شاموں میں
اس طرح تو ہوتا ہے' اس طرح کے کاموں میں
دوستی کا دعوا کیا' عاشقی سے کیا مطلب
میں تیرے فقیروں میں' میں تیرے غلاموں میں

اس نے بلند آواز سے شعر سناتے ہوئے نگارش کو معنی خیز اور شوخ نظروں سے دیکھا تھا۔

"ارے یار! ان تینوں دوستوں کے کیوں کچے چٹھے کھول رہی ہو..... عبداللہ کو یہ ڈائری بہت عزیز ہے وہ ہمیشہ اپنے ساتھ اپنے بریف کیس میں رکھتے ہیں' آج نجانے کیسے ٹیبل پہ بھول گئے ہیں' لاؤ میں واپس رکھ آؤں۔" نگارش نے زری کو ڈائری الٹنے پلٹنے سے باز رکھا۔

"ارے..... رے..... اب کہاں؟ یہ انمول خزانہ اب میرے پاس رہے گا۔" زری نے ڈائری پیچھے کر لی۔

"ارے پاگل ہو گئی ہو؟ عبداللہ واپس آتے ہی اس ڈائری کو تلاش کریں گے' ایک بار میں نے بھی یہ ڈائری ٹیبل سے اٹھا کر دراز میں رکھ دی تھی اور انہوں نے پورا گھر الٹ پلٹ دیا تھا۔"

نگارش نے اسے ڈائری چھپانے والی حرکت سے روکنا چاہا لیکن وہ بھی زری تھی دیوانگی کی حد تک دیوانی۔ دل آور شاہ کے ہاتھوں سے لکھے ہوئے الفاظ کو وہ اتنی آسانی سے کسی اور کو نہیں سونپ سکتی تھی چاہے وہ اس کا سگا

بھائی عبداللہ ہی کیوں نہ ہوتا۔۔۔ کیونکہ اس ڈائری میں لکھے ہوئے الفاظ ایسے تھے جن سے اس شخص کے اظہ[illegible] جھلک رہے تھے اور وہ تیسرے صفحے پہ لکھے اس کے اظہار کو دل کی گہرائیوں سے پڑھنا چاہتی تھی اور محسوس [illegible] چاہتی تھی۔

"ایم سوری بھابھی! آج سے میں چور بھی بن گئی۔" اس نے نگارش کی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا۔

"زری۔۔۔" اس نے گھور کے دیکھا۔

"پلیز۔۔۔" وہ جواباً "التجائیہ سا بولی تھی۔

"عبداللہ کو پتا چل جائے گا یار! انہیں پتا ہے کہ آج کل تم ہی اپنے ایگزامز کی تیاری کے لیے اسٹڈی میں جا ہو۔"

"تو کوئی بات نہیں آپ کہہ دیجیے گا کہ میں اب اسٹڈی میں نہیں جاتی۔" زری نے لاپروائی سے کندھ[illegible] اچکائے۔

"اف خدایا۔۔۔!" نگارش نے سر تھام لیا تھا۔

"تھینک یو۔" زری مسکرا کر کہتی ہوئی پلٹ گئی تھی۔

"میں شکایت کروں گی۔ عبداللہ سے کہ یہ اپنے پیپرز کی تیاری نہیں کر رہی بلکہ آج کل کے دنوں میں بھ[illegible] پوئٹری پڑھنے میں مصروف ہے۔"

"او کے کر دیجیے گا شکایت۔" وہ ریلیکس تھی کیونکہ اسے یقین تھا کہ نگارش کچھ بھی نہیں کرے گی۔

"میں واقعی کر دوں گی۔"

"آپ واقعی کر دیجیے گا۔" زری ہنستے ہوئے اپنے بیڈ روم میں چلی آئی تھی۔۔۔

☼ ☼ ☼

وہ شکستہ سے انداز میں راکنگ چیئر پہ جھولتے ہوئے مسلسل چھت کو گھور رہا تھا اس کی آنکھیں رات بھر جاگ[illegible] کی وجہ سے بوجھل اور سرخ ہو رہی تھیں، سر تھا کہ سوچوں کے عذاب سے پھٹا جا رہا تھا اور دل و دماغ پہ اک عجیب سا بوجھ مسلط ہو چکا تھا۔ الجھن اور پریشانی ایسی تھی کہ سلجھائے نہ سلجھ رہی تھی کوئی حل نہیں مل رہا تھا وہ اس آگ اور عذاب میں اکیلا ہی بھٹک رہا تھا کہ اچانک اس کا سیل بجنے لگا۔ اتفاقاً "سیل اس کے ہاتھ میں ہی دبا ہوا تھا جبھی اس نے تھکے تھکے سے انداز میں سیل اسکرین اپنے سامنے کی تھی۔ اسکرین پہ "دل کالنگ" کے لفظ جگمگ[illegible] رہے تھے دل آور شاہ کی کال تھی۔ لیکن نبیل حیات میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس سے بات کرتا کیونکہ اگر و[illegible] اس سے بات کرتا تو ساری بات بتانی پڑتی۔۔۔ نبیل کی نظر اندازی سے اس کی ایک کال مسڈ ہو چکی تھی۔۔۔ اور د[illegible] سیکنڈ کے وقفے سے ہی دوبارہ سیل بجنے لگا نبیل کو یہ بھی پتا تھا کہ اگر اب بھی کال پک نہ کی تو وہ پریشان ہو جائے گ[illegible] بلکہ ہو سکتا تھا کہ گھر کے نمبر پہ فون کھڑکا دیتا اس لیے بہتر تھا کہ وہ خود ہی کال ریسیو کر لیتا۔

"ہیلو۔۔۔!" اس نے بمشکل ہیلو کہا تھا۔

"السلام علیکم۔۔۔" اس نے جواباً "سلام کیا تھا۔

"وعلیکم السلام۔۔۔" نبیل بولنے کی فارمیلٹی نبھا رہا تھا۔

"کہاں ہو؟" دل آور شاہ کی تفتیش شروع ہو چکی تھی۔

"گھر پہ۔"

"تو پھر کال کیوں ریسیو نہیں کر رہے تھے؟"

"ہمت نہیں تھی۔"

"ہمت۔۔۔ کیا مطلب ہے تمہارا۔۔۔ تم ٹھیک تو ہو؟" دل آور کو اس کی آواز سن کے ہی پریشانی ہو چکی تھی۔

"ہمارے گھر میں کبھی کچھ ٹھیک بھی ہوا ہے؟" نبیل کا لہجہ تلخی لیے ہوئے تھا۔

"کیا بات ہے نبیل۔۔۔؟ کیا ہوا ہے۔۔۔؟ کیا کوئی مسئلہ ہو گیا ہے۔۔۔؟" دل آور کی پریشانی میں اور بھی اضافہ ہوا تھا۔

"ہونہہ! کسی کی عزت اور غیرت سے بڑا مسئلہ اور کیا ہو سکتا ہے بھلا؟ بس یوں سمجھ لو کہ میں بھی اسی سولی پہ چڑھا ہوا ہوں، بے غیرتی کے گھونٹ پی رہا ہوں، ذلت کی زندگی جی رہا ہوں، ایسی زندگی جینے سے تو بہتر ہے کہ میں خود کو گولی مار دوں۔" نبیل جس اذیت سے دوچار تھا یہ صرف وہی جانتا تھا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم۔۔۔؟ کیا مدحیہ نے کچھ کہا ہے؟" دل آور کا پہلا خیال مدحیہ کی طرف ہی گیا تھا اور نبیل کے لب سختی سے بھینچ گئے تھے کنپٹی کی رگیں پھٹنے لگی تھیں۔

"مدحیہ کہے گی تو تب جب گھر پہ ہو گی۔" انا اور غیرت کا سر کچل کے بالآخر اس نے کہہ ہی دیا تھا کیونکہ کہے بغیر کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا گھر کی کوئی بھی بات، کوئی بھی مسئلہ دل آور سے چھپا ہوا نہیں تھا وہ سب جانتا تھا۔

"مدحیہ گھر پہ نہیں۔۔۔؟ کیا مطلب؟ کہاں ہے وہ؟" نبیل کی شکست اس کے لہجے سے عیاں ہو رہی تھی وہ بہت بکھرا ہوا لگ رہا تھا۔

"نبیل۔۔۔! مجھے صاف صاف بتاؤ کیا ہوا ہے؟ مدحیہ کہاں ہے؟" دل آور کے انداز میں سختی اتر آئی تھی۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں دل آور ہے، مجھے نہیں پتا کہ وہ کہاں ہے۔۔۔؟ وہ صبح سے گھر سے نکلی ہوئی ہے اور ابھی تک گھر نہیں آئی۔"

"مگر کیوں۔۔۔؟ کیوں نہیں آئی وہ؟" دل آور کی آواز میں غصہ تھا اس کی کنپٹیوں کا لہو بھی دہک اٹھا تھا۔

"وہ چاہتی ہے کہ میں بابا کو گھر سے نکال دوں۔"

"واٹ؟ کس لیے؟" دل آور کو حیرت کے جھٹکے لگ رہے تھے۔

"اس لیے کہ اسے بابا سے نفرت ہے، وہ انہیں ناپسند کرتی ہے، وہ اس گھر میں رہیں گے تو وہ نہیں رہے گی اور اسی ضد پہ اڑی ہوئی ہے اور وہ اکیلی لڑکی گاڑی لے کر صبح سے گھر سے نکلی ہوئی ہے۔" نبیل شکست خوردہ سا رو دینے کو تھا۔

"تو تم مجھے اب بتا رہے ہو؟" اس نے گہری سانس کھینچتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

"کیا بتاتا تمہیں۔۔۔؟ یہ کہ میری بہن کی سرکشی دیکھو یا میرے باپ کی عیاشی دیکھو۔۔۔؟ اتنے اتنے مہینے باہر عیاشی کرتے ہیں اور جب تھک جاتے ہیں تو تھکن اتارنے گھر آ جاتے ہیں اور سالوں ان کا انتظار کرنے والی میری ماں، شکایت کا لفظ زبان پہ لائے بغیر ان کی خدمت میں لگ جاتی ہے، صرف اسی بات پہ خوش ہو جاتی ہے کہ وہ گھر تو آئے ہیں نا؟ اور میں انہیں پکڑ کے گھر سے ہی نکال دوں۔۔۔؟ کیا ایسا کرنا مجھے زیب دیتا ہے۔ کیا میری ماں یہ سب سہہ پائے گی؟ تو پھر تم بتاؤ یار میں کیا کروں؟ بہن کو گھر لے کر آؤں؟ یا باپ کو گھر سے نکالوں؟" نبیل دکھ سے کہتا چلا گیا اور اس کی بات سن کے دل آور بھی خاموش ہو گیا تھا بے بسی کی انتہا پہ کھڑا نبیل حیات ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا، وہ کیا کر سکتا تھا آخر۔۔۔ دل آور نے جواباً "کچھ بھی کہے بغیر فون بند کر دیا تھا اسے اس وقت مدحیہ پہ غصہ تھا اور غصہ بھی غضب کا تھا۔۔۔

☼ ☼ ☼

"حرمت۔۔۔! میں نے کہہ دیا نا میں کہیں نہیں جاؤں گی، پلیز مجھے فورس مت کرو، تم لوگوں نے جانا ہے تو جاؤ،

مگر مجھے میرے حال پہ چھوڑ دو۔" کومل کی تیز اور تلخ آواز پہ وہ اندر داخل ہوتے ہوئے دہلیز پہ ہی ٹھہر گیا لیکن کومل اور حرمت اسے دیکھ چکی تھیں۔

"بھائی آپ۔۔۔؟ آپ رک کیوں گئے ہیں؟" حرمت نے سر پہ دوپٹہ درست کیا تھا جبکہ کومل ہنوز ضدی سے انداز میں گردن اکڑائے بیٹھی رہی۔

"کیا مسئلہ ہے؟ کون کہاں نہیں جا رہا؟" آذر کی گہری کھوجتی ہوئی نظریں کومل پہ جمی ہوئی تھیں۔

"وہ بھائی دراصل کومل کو طبیعت ٹھیک نہیں ہے' اس لیے وہ کہہ رہی تھی کہ میں نہیں جاؤں گی' تم لوگ چلے جاؤ۔" حرمت نے کومل کا بھرم رکھتے ہوئے بہانہ کیا تھا۔

"تو کوئی بات نہیں جب ان کی طبیعت ٹھیک ہوگی تب چلے جائیں گے ابھی پروگرام کینسل کر دیتے ہیں۔" آذر نے لاپروائی سے کہتے ہوئے کندھے اچکائے۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔۔۔؟" کومل نے چونک کے دیکھا تھا کہ کیا وہ اس کی خاطر اس کا احساس کر رہا تھا یا پھر اسے کچھ جتا رہا تھا۔۔۔؟

"کیوں نہیں ہو سکتا۔۔۔؟ میں ابھی سب کو منع کر دیتا ہوں' ہمارے لیے آپ اہم ہیں' یہ پروگرام نہیں۔" آذر نے واپس قدم موڑے۔

"لیکن؟" کومل نے تیزی سے اسے روکا۔

"لیکن۔۔۔؟" آذر نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"لیکن سب کو اچھا نہیں لگے گا' سب کی تیاری مکمل ہو چکی ہے۔"

"آپ کو تو اچھا لگے گا نا؟ آپ کی طبیعت جو خراب ہے۔"

"نن۔۔۔ نہیں میری وجہ سے سب کا پروگرام کینسل نہیں ہونا چاہیے۔"

"تو پھر کیا ہونا چاہیے؟"

"جانا چاہیے سب کو۔" کومل نے کہتے ہوئے چہرہ جھکا لیا۔

"سب میں آپ بھی تو شامل ہوتی ہیں۔۔۔؟"

"مگر میری طبیعت۔۔۔" وہ بات ادھوری چھوڑتے ہوئے چپ ہو گئی تھی۔

"ڈاکٹر کو بلا لیتے ہیں اور ویسے بھی ابھی تو پوری رات اور پورا دن ہم لوگ گھر پہ ہی ہیں' کل صبح نکلنا ہے ہم نے' تب تک یقیناً" آپ ٹھیک ہو جائیں گی۔" آذر بڑے سکون سے اسے تسلی دے رہا تھا اور کومل جز بز سی ہو گئی۔

"کیا خیال ہے آپ کا؟ کل تک طبیعت ٹھیک ہو جائے گی نا آپ کی۔۔۔؟" آذر کہتے ہوئے اسے اب بھی گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا اور کومل نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا حرمت کھانستے ہوئے اپنی مسکراہٹ چھپا کر رخ موڑ گئی۔

"گڈ۔۔۔! آپ بھی اپنی تیاری کر لیجیے' اللہ حافظ۔" وہ کہہ کے وہاں سے چلا گیا اور پیچھے حرمت کو ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔

"کیا ہوا ہے تمہیں؟ تم کیوں دانت نکال رہی ہو؟" کومل اندر سے خجل تو ہو چکی تھی لیکن جان بوجھ کر انجان بن گئی۔

"واہ محترمہ واہ! میرے سامنے کیسے غصے سے اکڑ اکڑ کر بات کر رہی تھیں اور ان کے سامنے ایک دم بھیگی بلی بن گئیں؟ انہیں بھی انکار کرتیں نا کہ میں نہیں جاؤں گی۔" حرمت نے گھور کے کہا۔

"کیسے انکار کرتی؟ پہلی بار تو انہوں نے کچھ کہا ہے۔ اب جانا تو پڑے گا نا؟" کومل نے معصوم بن کے کہا۔

"ارے بھئی! کہاں جانے کی باتیں ہو رہی ہیں؟" جودت ان کی بات سنتے ہوئے اندر آگیا۔

"ہم نادرن ایریاز جا رہے ہیں۔" حرمت نے فوراً" چہک کے بتایا تھا۔

"نادرن ایریاز؟ کون کون جا رہا ہے؟"

"تمام ینگ پارٹی۔"

"مطلب کہ میں بھی۔۔۔؟" اس نے اپنی طرف اشارہ کیا۔

"آپ گھر پہ ہوں گے تو جائیں گے نا؟" وہ خفگی سے بولی۔

"ارے یار! آہستہ بولو کیوں مروانا چاہتی ہو؟" جودت نے حرمت کو چپت لگاتے ہوئے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

"تو اچھا ہے نا' آپ کی کلاس ہونی چاہیے' آخر رات رات بھر کہاں رہتے ہیں آپ؟ رات کو بھی آپ گھر پہ نہیں تھے اسی لیے آپ کو ہمارے اس پروگرام کی خبر نہیں ہے۔" حرمت پھر بھی چپ نہیں ہوئی تھی۔

"کومل آپا۔" جودت نے کومل کو مدد طلب نظروں سے دیکھا۔

"کومل آپا کی تو خود کلاس لگنے والی ہے' آپ بس اپنی خیر منائیں۔" حرمت نے جس انداز سے کہا تھا کومل یکدم کھلکھلا کے ہنس پڑی تھی۔

"ماشاء اللہ' ماشاء اللہ' حسن کے چمن میں آج تو بڑے شگوفے پھوٹ رہے ہیں۔۔۔؟ کیا ماجرا ہو گیا آج؟" جودت نے ذومعنی لہجے میں کہا تھا۔

"اف! تم سب بہن بھائی ایک سے بڑھ کے ایک ہو۔" کومل نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ جس پہ وہ دونوں ہی ہنس پڑے تھے اور کچھ دیر بعد وہ بھی اپنی اپنی تیاریوں میں لگ گئے تھے اب تو کومل بھی اپنی تیاری پورے جوش و خروش سے کر رہی تھی اور باقی سب لڑکیاں اس کا مذاق اڑا رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

زری یونیورسٹی سے پیپر دے کے گھر آئی تو فریش ہونے کے لیے باتھ روم چلی گئی اور نگارش اس کے لیے کھانا گرم کرنے لگی۔ دس منٹ بعد ہی زری چینج کر کے نیچے چلی آئی تھی۔

"پیپر کیسا رہا؟" نگارش کھانا ٹیبل پہ لگاتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"شکر ہے اللہ کا بہت اچھا رہا۔" زری کھانا کھانے کے لیے بیٹھ چکی تھی۔

"عبداللہ کو بتایا؟"

"جی ہاں! سب سے پہلے انہوں نے ہی پوچھا ہے۔" وہ پلیٹ میں سالن نکال رہی تھی جب باہر ڈور بیل سنائی دی۔

"میں دیکھتی ہوں۔" زری اٹھنے لگی لیکن نگارش نے روک دیا۔

"تم کھانا کھاؤ میں دیکھ لیتی ہوں' ساتھ والی فیملی سے کوئی ہوگا۔" نگارش کرسی کی بیک سے دوپٹہ اٹھا کر پھیلاتی ہوئی دروازے تک آگئی اور دروازہ کھول دیا تھا لیکن اک ہلکی سی چیخ سے ذرا سا اچھل کے پیچھے ہوئی تھی اور اس کی آواز پہ کھانا کھاتی ہوئی زری لپک کے کچن سے باہر نکلی تھی۔

"بھابھی! کیا ہوا ہے۔۔۔؟ کون ہے۔۔۔؟" وہ ہراساں سی نگارش کے پاس آئی لیکن دروازے کے پاس آکر اس کے قدم بھی جیسے زمین نے جکڑ لیے تھے اس کی ٹانگوں میں لرزش آگئی تھی۔

☆ ☆

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

نبیلہ عزیز

دردِ دل

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نبیل حیات دو ہی بہن 'بھائی ہیں' مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے 'وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پہ رنگ چکی ہے 'جس کے پیش نظر فائزہ بیگم 'نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں 'لیکن مدحیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے 'جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے 'مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے 'مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا 'بے بسی اور مجبوری سے تنگ آ کر خود کشی کرنے کا سوچتا ہے 'لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باؤ امتیاز مل جاتا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے 'جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے 'اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے 'وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے 'وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے 'وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے 'اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا 'اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔

۱۵
پندرہویں قسط

اس کی رنگت یک لخت زرد پڑ گئی تھی' یوں جیسے کسی نے اچانک لمحے کے ہزارویں حصے میں اس کے جسم کا سارا خون نچوڑ لیا ہو۔ وہ ششدر سی کھڑی پھٹی پھٹی آنکھوں سے دروازے سے باہر دیکھ رہی تھی' اس کے ہاتھ پاؤں برف کی طرح ٹھنڈے پڑ چکے تھے اور دل کی حالت ایسی تھی جیسے کسی نے سگریٹ کی طرح اپنے پیروں تلے مسل دیا ہو' جس کی اذیت اس کے پورے جسم و جاں میں سرایت کر گئی تھی اور ہونٹ محض کپکپا کے رہ گئے تھے۔

"اسد بھائی آپ؟" یہ مختصر سا تین لفظی جملہ زبان سے ادا کرنے میں بھی اسے دانتوں پسینہ آ گیا تھا اور اس کی خوب صورت پیشانی حقیقتاً" عرق آلود ہو گئی تھی' وہ اپنے قدموں پہ بمشکل کھڑی تھی اسی لیے لرزتے ہاتھوں سے سہارے کے لیے نگارش کا بازو تھام لیا تھا۔ حالانکہ وہ بھی اپنے سامنے کھڑے اس کرخت شکل آدمی کو دیکھ کر کافی گھبرائی ہوئی تھی' لیکن زری جیسی حالت تو پھر بھی نہیں تھی' البتہ جب زری نے اس آدمی کو اسد بھائی کہا تھا تو نگارش بری طرح چونک گئی تھی' تب اسے پتا چلا کہ وہ آدمی کوئی اور نہیں عبداللہ اور زری کے بڑے بھائی اسد اللہ ہیں جن کو بارہا تصویروں میں دیکھا تھا' لیکن آج جب اچانک انہیں حقیقت میں اپنے سامنے دیکھا تھا تو وہ پہچان نہیں پائی تھی' بلکہ ان کی ہائٹ اور ان کا حلیہ دیکھ کر ڈر گئی تھی' تب ہی تو وہ یک دم چیخ کے پیچھے ہٹی تھی۔

ان کے کرخت چہرے کو ان کی بڑی بڑی مونچھیں اور بھی سفاک اور بے رحم بنا رہی تھیں' وہ اپنی موٹی موٹی سرخ خونخوار آنکھوں سے ان دونوں کا کافی گہرائی سے جائزہ لے رہے تھے' زری کے لیے ان کی خونخوار آنکھوں کے تیور نئے نہیں تھے۔ البتہ نگارش ضرور انجان تھی۔ اسی لیے اندر سے سہمی ہوئی تھی۔

"کیا اس عیاش ملک اور سفید چمڑی والے لوگوں میں رہ رہ کر اپنوں کی شکل بھی بھول گئی ہے تمہیں؟ اتنے غور سے کیوں دیکھ رہی ہو؟" وہ بولے تو ان کی بارعب اور دبنگ آواز پہ وہ دونوں ہی کانپ کے رہ گئی تھیں۔

"نن ۔۔۔ نہیں بھائی ۔۔۔ ایسی تو ۔۔۔ کک کوئی ۔۔۔ بات ۔۔۔ نہیں ہے' بس ۔۔۔ وہ ۔۔۔ وہ ۔۔۔ آپ کو اچانک ۔۔۔ دیکھ ۔۔۔ دیکھ کر ۔۔۔ یقین نہیں آ رہا تھا۔" زری نے بے ربط سے انداز میں تقریباً" ہکلاتے ہوئے کہا تھا اور دوپٹے کے پلو سے فوراً" پیشانی سے پسینہ پونچھا تھا۔

"السلام علیکم بھائی! آئیے آپ اندر آجائیے۔" نگارش نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے متانت سے انہیں سلام کیا اور اندر آنے کے لیے راستہ دیا تھا' کیونکہ وہ دونوں دروازے میں ہی کھڑی تھیں' لیکن ملک اسد اللہ نے نہ تو اس کے سلام کا جواب دیا تھا اور نہ ہی اپنے رسم و رواج اور روایات کے مطابق ان دونوں کے سر پہ ہاتھ پھیرا تھا' نگارش کو اندر سے خفت تو ہوئی تھی' لیکن یہ خفت اس نے ظاہر نہیں کی تھی' کیونکہ سچویشن ہی کچھ ایسی تھی کہ کچھ کہنا سننا ہی بے کار تھا۔

"راستہ دو۔" انہوں نے ہنوز سامنے کھڑی زری کو پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا تھا' وہ فوراً" پیچھے ہٹ گئی تھی اور اس کے پیچھے ہٹتے ہی ملک اسد اللہ مضبوط قدم اٹھاتے اندر آ گئے تھے۔ نگارش نے حیرت سے دروازے سے باہر دیکھا تھا' ان کے ساتھ کوئی سامان وغیرہ نہیں تھا۔ وہ خالی ہاتھ تھے اور اکیلے تھے' حیرت کی بات تھی' وہ پاکستان سے بغیر سامان کے آئے تھے؟

"بھابھی!" زری نے خوف کے مارے نگارش کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا تھا' جیسے کبھی نہ چھوڑنے کا ارادہ ہو۔

"ڈونٹ وری! کچھ نہیں ہو گا' تم ان کے پاس چلو' میں عبداللہ کو فون کر کے بتاتی ہوں۔" نگارش نے زری کو تھپکی دے کر تسلی دلائی تھی۔

"نہیں بھابھی ۔۔۔ اب تو عبداللہ بھائی بھی کچھ نہیں کر سکتے' بلکہ اب تو کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔" زری کی آواز روہانسی ہو رہی تھی۔

"زری پلیز! اتنی جلدی حوصلہ مت ہارا کرو' یہ دنیا ہے اور دنیا میں کبھی بھی' کچھ بھی ہو سکتا ہے' یہاں ہر بات' ہر کام' ہر سوچ ممکن ہے' یہ مت سوچو کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا' اسد بھائی بھی انسان ہیں' کوئی جن بھوت نہیں ہیں جو چند منٹوں میں ہی تمہیں اپنے پنجوں میں دبوچ کر پاکستان لے جائیں گے' تمہیں پاکستان لے کر جانا ان کے لیے اتنا آسان ثابت نہیں ہو گا' بہت سے مراحل سے گزرنا ہو گا اور سب سے بڑی بات کہ تمہارا پاسپورٹ عبداللہ کے پاس ہے اور بغیر پاسپورٹ کے لے کر جائیں گے تو خود ان پہ کیس بن جائے گا' اس لیے تم بے فکر رہو' تم محفوظ ہو' ان کے سامنے جاؤ اور ریلیکس طریقے سے بات کرو' بوکھلانے کی اور گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے' یہ معاملہ تم نہیں عبداللہ ہینڈل کریں گے' اس لیے تمہیں اس مسئلے پہ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی ڈرنے کی ضرورت ہے۔" نگارش نے اسے ذرا سا ڈانٹ کے سمجھایا تھا اور زری کو اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کی بات ماننا پڑی تھی' لیکن اسد بھائی کے سامنے جانے کا حوصلہ اور ہمت پھر بھی نہیں ہو رہا تھا۔

"آئیم سوری بھابھی ۔۔۔ میں ان کے سامنے نہیں جا سکتی' مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے۔" اس نے پھر بھی انکار کر ڈالا تھا۔

"اف! اگر اتنی ہی ہمت تھی تو محبت جیسی آگ دہکانے کی کیا ضرورت تھی؟" نگارش تلملا گئی۔

"بھابھی پلیز! آہستہ بولیے۔" زری اور بھی گھبرا گئی۔

"تو پھر جاؤ اندر' ان سے کھانا ۔۔۔ اور چائے وغیرہ پوچھو۔" نگارش نے اسے اندر کی سمت دھکیلا۔

"مگر بھابھی وہ ۔۔۔"

"زری! پاگل ہو گئی ہو کیا؟ وہ اندر بیٹھے کیا سوچ رہے ہوں گے؟ اس طرح اکیلے بیٹھے بیٹھے تو انہیں اور بھی غصہ آئے گا' حالانکہ ہمیں تو ان کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔" نگارش اسے ہر طرح سے سمجھا رہی تھی' لیکن وہ ابھی بھی ڈر رہی تھی۔

"تو پھر آپ میرے ساتھ آئیے۔" زری نے نگارش کو بھی اپنے ساتھ گھسیٹا۔

"لیکن میں عبداللہ کو فون تو کر لوں؟"

"بعد میں کر لیجیے گا' پہلے اندر تو آئیے۔" زری اپنی جگہ سے ہلنے کو بھی تیار نہیں تھی' اس لیے نگارش کو اس کے ساتھ ہی آنا پڑا' لیکن اپنا اعتماد بحال کرنے کے بعد۔

وہ دونوں ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں تو ملک اسد اللہ انہیں فون پہ کسی سے محو گفتگو دکھائی دیے تھے' ان کو اک نظر دیکھنے کے بعد وہ دوبارہ اپنی بات کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔

"وہ ابھی مصروف ہیں' تم یہیں ٹھہرو' میں عبداللہ کو فون کر کے ابھی آتی ہوں۔" نگارش نے کافی مدھم آواز میں سرگوشی کی اور زری کا ہاتھ چھوڑ کر پلٹ گئی۔

"ٹھہرو لڑکی۔" نگارش کے عقب سے ان کی گرج دار آواز ابھری تھی اور نگارش کے قدم دہلیز پہ ہی رک گئے تھے۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی گھبرا گئی تھی۔

"واپس آؤ۔" انہوں نے اسے واپس آنے کا حکم جاری کیا تھا۔

"جی کہیے؟" نگارش' عبداللہ کے بڑے بھائی ہونے کے ناتے ان کا احترام کرتی ہوئی مؤدب سی آ کھڑی ہوئی تھی۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے اسے فون کرنے کی' اسے خود آنے دو' آخر ہمیں بھی تو پتا چلے کہ اس کے آنے جانے کی روٹین کیا ہے؟ کتنی فکر رکھتا ہے وہ بہن اور بیوی کا۔" وہ غصے سے طنزیہ بول رہے تھے۔

"وہ شام سات بجے آئیں گے۔" نگارش نے اس کے آنے کا ٹائم پہلے سے بتا دیا۔

"اوہ اچھا! تو شام سات بجے واپس آتا ہے' چاہے اس کے پیچھے اس کی بہن اور بیوی جو جی چاہے گل کھلاتی

رہیں؟" ملک اسد اللہ اپنے باپ کی طرح جب بولتے تھے تو اچھا برا کچھ بھی نہیں دیکھتے تھے، بلکہ بولتے ہوئے تو ان کی سوچ بھی مفلوج ہو کے رہ جاتی تھی کہ کیا بولنا ہے اور کیا نہیں بولنا؟

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" نگارش کو ان کی بات گولی کی طرح لگی تھی، وہ یک دم بلبلا اٹھی تھی۔

"مجھ سے دھیمی آواز میں بات کرو لڑکی، میں کچھ غلط تو نہیں کہہ رہا، اس انجان ملک اور انجان شہر میں دو جوان لڑکیاں گھر پہ اکیلی ہوں تو کبھی بھی کوئی بھی گھر پہ آسکتا ہے، اگر میں آسکتا ہوں تو کوئی اور بھی آسکتا ہے۔ اور یہ بات ملک عبداللہ نے شاید کبھی سوچی ہی نہیں ہے؟" ان کی بدمزاجی کا تو نگارش کو پتا تھا، لیکن وہ شکی مزاج بھی ہیں، یہ ان کی باتوں سے اور طرز فکر سے ظاہر ہو رہا تھا۔

"نمبر ایک! میں کوئی ایسی ویسی لڑکی نہیں، ملک عبداللہ کی بیوی اور آپ کی بھاوج ہوں، میں اگر آپ سے دھیمی آواز میں بات کروں گی تو آپ کو بھی مجھ سے تمیز سے بات کرنا ہوگی، نمبر دو، آپ جب سے آئے ہیں غلط ہی تو کہہ رہے ہیں، یہ ملک اور یہ شہر آپ کے لیے انجان ہوگا، ہمارے لیے تو نہیں نا؟ ہم اس ملک اور شہر کے باسی ہیں، یہاں دو جوان لڑکیوں کی بجائے اگر ایک جوان لڑکی بھی گھر پہ ہوگی تو کبھی بھی کوئی بھی گھر پہ نہیں آسکتا، کیونکہ آنے والا بخوبی جانتا ہوگا کہ اس کا کیا حشر ہوگا؟ آپ کو بھی ہم نے خود آنے دیا ہے، ورنہ میری ایک فون کال ہی آپ کو اس گھر، اس شہر سے تو کیا اس ملک سے بھی نکلوا سکتی ہے، آپ پانچ منٹ کے اندر اندر اس ڈرائنگ روم کی بجائے جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہوں گے اور نمبر تین وہ ہی بہنیں اور بیویاں مرد کے گھر سے جانے کے بعد گل کھلاتی ہیں جن کو پابند کر کے اور قید کر کے رکھا جاتا ہے، جن پہ اعتماد نہیں کیا جاتا، جن کو دنیا سے کاٹ کے دیواروں سے لگا دیا جاتا ہے، لیکن اللہ کا شکر ہے کہ عبداللہ ایسے نہیں ہیں، انہیں بیوی پہ بھی اعتماد ہے اور بہن پہ بھی، لہٰذا آپ کو اس حوالے سے فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، لیکن اس سب کے باوجود میرے لیے ایک بات بڑی اہم ہے کہ آپ عبداللہ کے بڑے بھائی ہیں، اس رشتے کے حوالے سے آپ میرے بھائی بھی ہیں اور جیٹھ بھی، آپ کا احترام سر آنکھوں پہ، جب تک عبداللہ نہیں آجاتے، آپ بیٹھیے، آرام کیجیے، اور حکم کیجیے کہ آپ نے کیا کھانا ہے؟ تب تک میں آپ کے لیے چائے لے کر آتی ہوں۔" نگارش بولنے پہ آئی تو کمال کر دیا تھا۔ زری حیرت زدہ سی آنکھیں پھیلائے نگارش کو دیکھتی رہ گئی، نگارش اتنی اسٹرانگ تو کبھی بھی نہیں لگی تھی جتنی اس وقت لگ رہی تھی، تو گویا زری کے مقابلے میں وہ کسی کے بھی سامنے ڈٹ جانے کا حوصلہ رکھتی تھی؟ ملک اسد اللہ نے جواباً کچھ کہنا چاہا تھا، لیکن وہ اتنے میں اپنی بات مکمل کر کے ڈرائنگ روم سے باہر نکل گئی تھی۔

"ہوں... تو اس تمیز دار بیوی سے شادی کی ہے ملک عبداللہ نے؟" وہ زیر لب طنزیہ سے لہجے میں بولے تھے۔

"نگارش بھابھی ایسی نہیں ہیں، بہت اچھی ہیں وہ۔" زری نے بھی اس کی طرف داری میں ذرا تاخیر نہیں کی تھی۔

"ہونہہ! جتنی اچھی ہے میں دیکھ رہا ہوں اور ہاں ہمارے خاندان میں اسی عورت کو بھاوج کہا جاتا ہے، جو خاندانی ہو، اعلا حسب نسب کی ہو، اس کے آگے پیچھے بھرا پرا خاندان ہو، ہماری ہم پلہ اور ہماری ٹکر کی ہونی چاہیے ہماری بہو۔ کسی دو ٹکے کے خاندان کی دو ٹکے کی لڑکی ہماری بہو نہیں ہو سکتی، اور نہ ہی ہم اسے بھاوج مانتے ہیں۔" وہ پھر بولے تھے اور بنا سوچے سمجھے ہی بولے تھے۔ زری نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ انہوں نے ہاتھ اٹھا کے اسے روک دیا تھا۔

"بس بس... زیادہ طرف داری کرنے کی کوشش مت کرو، ہم بنا کہے ہی سب کچھ جانتے ہیں۔" ان کا لب و لہجہ حقارت لیے ہوئے تھا۔ جس پہ زری کو کافی تکلیف ہوئی تھی۔ لیکن دوبارہ بولنے کی جرأت نہیں کر سکی تھی، اتنے میں نگارش بھی چائے لے کر وہاں آچکی تھی۔

☆ ☆ ☆

مسلسل دو گھنٹے کی بھاگ دوڑ اور ڈاکٹرز کی ٹریٹ منٹ کے بعد صبح چھ بجے کے قریب ابا جی کو ذرا سا ہوش آیا تو ان لوگوں کے دماغ ٹھکانے پہ آئے تھے آدھے گھنٹے بعد انہیں آئی سی یو سے ایمرجنسی وارڈ میں شفٹ کر دیا گیا تھا مریم تیزی سے آگے بڑھ کے ان کے سرہانے آکھڑی ہوئی تھی وہ ان کا ہاتھ تھام کے ہاتھ سہلانے لگی۔

"آپ لوگوں کی قسمت اچھی تھی کہ آپ انہیں بروقت ہسپتال لے آئے۔ ورنہ پندرہ منٹ یا آدھا گھنٹہ اور لیٹ ہو جاتے تو یہ اٹیک ان کی جان بھی لے سکتا تھا۔" ڈاکٹر رضوی ان کا بی پی چیک کرنے کے بعد عدیل کے پاس آکھڑے ہوئے تھے۔

"اللہ کا شکر ہے جس نے کسی کو فرشتہ بنا کر ہماری مدد کے لیے بھیج دیا ورنہ..." عدیل ورنہ سے آگے کچھ کہہ ہی نہ سکا اس کا دھیان اچانک مدحیہ کی طرف چلا گیا تھا جو انہیں اس مشکل وقت میں یہاں تک چھوڑنے آئی تھی لیکن پارکنگ میں اترنے کے بعد عدیل کو اس کا خیال ہی نہیں رہا تھا یہاں تک کہ اس کا شکریہ ادا کرنے کی بھی زحمت نہیں کی تھی اور اب اس کا خیال آتے ہی عدیل کو اپنی سنگین ترین کوتاہی کا احساس ہوا تھا۔

"او مائی گاڈ... ! یہ کیا غلطی ہو گئی مجھ سے؟" عدیل سر پہ ہاتھ مارتا ہوا ڈاکٹر کو وہیں چھوڑ کے باہر کی سمت بھاگا، اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ ڈاکٹر رضوی کیا سوچیں گے...؟ وہ اسپتال کے طویل ترین احاطے سے بھاگتا ہوا پارکنگ تک آیا اور ادھر ادھر متلاشی انداز میں نظریں دوڑانے لگا۔

وہ لوگ رات تقریباً "ساڑھے تین بجے یہاں آئے تھے اور اس وقت خاصا گہرا اندھیرا تھا ہر طرف الیکٹرک پول اور لیمپ پوسٹ روشن تھے لیکن اس وقت صبح کے چھ بجے کا وقت تھا دہکتا سورج فی الحال اپنی نوخیز کرنوں میں نرمیاں سمیٹے ہوئے انگڑائیاں لیتا بے دار ہو رہا تھا۔ سورج کی ہلکی ہلکی کسمساہٹ ماحول پہ اک عجیب ساسحر طاری کیے ہوئے تھی نئے دن کی شروعات ہو چکی تھی زندگی ایک بار پھر جاگ اٹھی تھی اور عدیل اس جاگے سوئے وقت میں نئے دن کی روشنیاں لے کر مدحیہ حیات کو تلاش کرتا پھر رہا تھا جیسے یقین ہو کہ وہ ابھی بھی وہیں ہوگی... لیکن ہر طرف نظر دوڑانے پہ بھی جب وہ کہیں نظر نہ آئی تو وہ مایوسی سے واپس مڑ گیا، دل میں پشیمانی ہلکورے لے رہی تھی وہ سر جھٹکتا ہوا پارکنگ باؤنڈری سے نکل رہا تھا جب اچانک دائیں طرف نگاہ اٹھی اور وہ بے یقینی سے دیکھتا رہ گیا تھا۔

وہ اپنی گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑی چپ چاپ ادھر ادھر آتے جاتے لوگوں کو دیکھ رہی تھی اور عدیل اسے دیکھ کر بے ساختہ مسکرا اٹھا تھا۔ اس کے قدم مدحیہ کی سمت اٹھنے لگے، وہ کافی دور کھڑی تھی۔ لیکن عدیل کو بے حد قریب لگ رہی تھی اتنی قریب کہ عدیل کی سانسیں معطر سی ہو گئی تھیں۔ آس پاس کا سارا ماحول ہی مہک اٹھا تھا کسی دلکش سے جذبے نے سب کچھ مہکا کے رکھ دیا تھا۔ وہ مضبوط قدموں سے چلتا ہوا... اس کے سامنے آکھڑا ہوا تھا اور نظریں اس کے چہرے پہ جمادی تھیں۔

"السلام علیکم۔" عدیل کا لہجہ بھی کچھ اور ہی ہو رہا تھا۔ مدحیہ نے چونک کر اپنے سامنے دیکھا اور اسے دیکھ کر دوبارہ نظریں ہٹا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی جیسے اس نے اس کی آمد کا کوئی نوٹس نہ لیا ہو۔

"ایم سوری۔" وہ دوبارہ بولا مگر اب کی بار تو مدحیہ نے دیکھا بھی نہیں تھا کہ وہ سوری کسے کہہ رہا ہے۔

"دیکھیے میڈم... ! میں آپ سے مخاطب ہوں، اپنی غلطی پہ معافی مانگتا ہوں، آپ جو جی چاہے سزا دیں، بندہ حاضر ہے۔" اس نے ذرا سا سر خم کرتے ہوئے کہا تھا مدحیہ نے اس کے جھکے ہوئے سر کو گھور کے دیکھا۔

"کیسی معافی... ؟ اور کیسی سزا؟" اس کی طرح اس کا لہجہ بھی تیکھا تھا اور الفاظ بھی تیکھے تھے۔

"اپنی پریشانی میں آپ کو یہیں بھول گیا۔" عدیل کی نظریں اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے اس کی گھنی مڑی ہوئی سیاہ پلکوں پہ ٹھہر گئیں اس کی شخصیت کا تیکھا پن اس کی پلکوں سے بھی عیاں ہو رہا تھا۔

"مسٹر! میں کوئی بے جان چیز نہیں ہوں جسے آپ جہاں چاہے، بھول جائیں۔" وہ طنزیہ انداز میں چبا کر بولی

"اس وقت تو آپ مجھے بے جان چیز ہی لگ رہی ہیں، جسے جہاں چھوڑ کے گیا تھا، وہیں پہ ہے، اگر جاندار ہوتی تو اپنی جان کا استعمال کرتے ہوئے یہاں سے وہاں ہو چکی ہوتی۔" عدیل کا لہجہ دلچسپ اور متبسم سا تھا مدحیہ نے یکدم سر اٹھا کے اسے دیکھا تھا وہ ڈائریکٹ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ مدحیہ کو اس کی آنکھوں میں اک لو دیتا ہوا احساس اپنی سمت ہمکتا ہوا محسوس ہوا تھا تبھی وہ نظریں چرا کر اپنی جینز کی پاکٹ سے گاڑی کی چابی نکالنے لگی۔

"کہاں جا رہی ہیں؟ اندر نہیں چلیں گی۔۔۔؟ میرے ابا جی کو ہوش آچکا ہے۔ اور یہ سب آپ کی مہربانی سے ہی ہوا ہے۔"

"مہربانی جب بھی ہوتی ہے اوپر والے کی ہوتی ہے، کوئی بندہ کبھی بھی مہربان نہیں ہوتا جب تک کہ اوپر والا نہ چاہے۔"

"ماشاء اللہ! ایسی باتیں بھی کر لیتی ہیں آپ؟" عدیل کو مدحیہ سے ایسی بات کی توقع نہیں تھی اسی لیے کہے بغیر رہ نہیں سکا تھا۔

"کیا مطلب ہے آپ کا۔۔۔؟" وہ غصے سے اس کی سمت پلٹی۔

"مطلب کہ ایک بار پھر مجھ سے گستاخی ہو گئی۔ معافی چاہتا ہوں۔" عدیل مسکراہٹ دباتے ہوئے بولا کیونکہ اس کے تیور خاصے جارحانہ تھے۔

"دیکھو مسٹر! میرے پاس معافی کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی، اس لیے بہتر ہے کہ آپ اپنی بکواس اپنے تک ہی رکھیں۔"

"او کے او کے! اپنے تک ہی رکھوں گا، لیکن آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اس مسٹر کا ایک نام بھی ہے جسے لوگ "عدیل عمر" کہتے ہیں۔ اب آپ کی مرضی کہ آپ مجھے عدیل کہتی ہیں یا عمر۔۔۔؟" عدیل نے مسکراتے ہوئے اسے اپنا نام بتایا تھا مدحیہ نے اسے استہزائیہ نظروں سے سرتاپا دیکھا تھا۔

"مجھے آپ کے نام سے کیا لینا دینا۔۔۔؟" وہ کندھے اچکا کے بولی۔

"لیکن مجھے تو آپ کے نام سے لینا دینا ہے نا، میڈم کہہ کہہ کے بوریت ہونے لگی ہے، پلیز یور گڈ نیم۔۔۔؟" عدیل نے انتہائی عاجزانہ انداز میں اس کا نام پوچھا تھا جس پہ مدحیہ نے کافی تیکھی اور تیز نظروں سے اسے گھورا تھا۔

"آپ کو میرے نام سے کیا لینا دینا۔۔۔؟"

"میڈم۔۔۔! ساری باتیں بتانے کے لیے نہیں ہوتیں، کچھ باتیں بس سمجھنے کے لیے ہوتی ہیں، آپ اپنا نام بتا دیں، میں کسی ایسی جگہ آپ کا نام لکھ دوں گا جو کورے کاغذ سے بھی زیادہ کوری ہو گی۔" نہ جانے عدیل کس موڈ میں تھا کہ بے ساختہ ہی کہہ گیا تھا اور مدحیہ کے تیور اور بھی بگڑ گئے تھے۔

"کس خوش فہمی میں ہیں آپ۔۔۔" وہ پھنکار کے بولی تھی جبکہ عدیل پھر بھی مسکرا دیا۔

"صرف اس خوش فہمی میں کہ جو انسان بے جان چیز بن کے میرے لیے اتنے گھنٹے ایک ہی جگہ پہ کھڑا رہ سکتا ہے تو اگر وہ جاندار بن جائے تو کیا ہو گا۔۔۔؟" عدیل نے برملا اظہار کیا تھا۔

"شٹ اپ۔۔۔ جسٹ شٹ اپ! میں یہاں آپ کے لیے نہیں آپ کے فادر کے لیے کھڑی ہوں صرف اس لیے کہ شاید آپ کو دوبارہ کوئی کام پڑ جائے اور آپ کو دوبارہ ٹیکسی اور آٹو کے پیچھے نہ بھاگنا پڑے، لیکن یہاں تو میرا

خیال ہے کہ کسی کی مدد کرنا بھی محال ہے لوگ اپنے مطلب کے لیے غلط مطلب نکال لیتے ہیں۔" مدحیہ نے اسے جھاڑ کے رکھ دیا تھا۔

"طریقہ غلط ہو تو غلط مطلب ہی نکلے گا نا میڈم۔۔۔؟ آپ کو اگر میرے فادر کا اتنا ہی خیال تھا تو آپ کو اندر آکر ان کی خیریت پوچھنی چاہیے تھی' آپ کو پتا تھا کہ ان کی اتنی سیریس کنڈیشن ہے پھر بھی آپ آرام سے پارکنگ میں کھڑی ہیں اندر جانے کی بجائے واپس جا رہی ہیں تو میں اس چیز کو کیا سمجھوں۔۔۔؟ یہی نا کہ آپ میرے انتظار میں کھڑی تھیں۔۔۔؟ میں آیا ہوں تو آپ جا رہی ہیں۔۔۔؟ میرے فادر کی عیادت تو آپ نے پھر بھی نہیں کی؟" عدیل نے جیسے شکوہ کیا تھا اور مدحیہ اس کی باتوں پہ ایک بار پھر دھیمی پڑ گئی تھی۔

وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا اگر وہ یہاں اس کے فادر کے لیے کھڑی تھی تو اسے ان کے لیے اندر بھی جانا چاہیے تھا اگر وہ یہاں اتنا انتظار کرنے کے بعد بھی واپس پلٹ جاتی تو خود بخود ہی غلط مطلب نکل آتے' اس میں عدیل کی تو کوئی غلطی نہیں تھی۔ غلطی اس کی اپنی تھی جسے رفع کرنے کے لیے وہ سر جھکا کر ڈھیلے ڈھالے قدموں سے اس سمت چل پڑی جہاں سے عدیل اس کی طرف آیا تھا اور اسے ہسپتال کے اندرونی حصے کی سمت بڑھتے دیکھ کر عدیل بھی مسکراتے ہوئے اس کے ہمراہ ہولیا تھا۔

پارکنگ سے ایمرجنسی وارڈ تک کا فاصلہ ان دونوں نے خاموشی سے طے کیا تھا دونوں ایک ساتھ اندر داخل ہوئے تو مریم کی نظریں ان دونوں پہ ٹھہر سی گئی تھیں وہ لڑکی جو بھی تھی لیکن عدیل کے ساتھ چلتی ہوئی جچ رہی تھی۔

"ہیلو۔" مدحیہ نے قریب آکے کافی آہستگی سے کہا تھا۔

"السلام علیکم۔" مریم اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی تھی۔

"یہ مریم ہے میری چھوٹی بہن اور مریم یہ۔" عدیل اس کا تعارف کرواتے ہوئے رک گیا تھا۔

"مدحیہ حیات۔" مدحیہ نے اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے اپنا تعارف کروایا اور عدیل اس کے نام پہ مسکرا دیا۔

"مدحیہ۔۔۔" وہ زیر لب دہرا کے بولا اور پھر ابا جی کے قریب جا کھڑا ہوا تھا وہ بھی مدحیہ کو ہی دیکھ رہے تھے نظروں کا تاثر سوالیہ سا تھا۔

"ابا جی! ان کا نام مدحیہ حیات ہے' عدیل بھائی کی دوست ہیں۔ رات ان کی گاڑی میں ہی آپ کو ہسپتال لے کر آئے تھے۔" مریم نے قریب جا کے انہیں تفصیل سے بتایا تھا فاروق نیازی کے چہرے اور آنکھوں سے شفقت کا احساس ابھرا تھا جبکہ مدحیہ اور عدیل لفظ "دوست" پہ ہی حیران اور جز بز ہو رہے تھے۔

"السلام علیکم! کیسے ہیں آپ۔۔۔؟" مدحیہ سر جھٹک کر ان سے مخاطب ہوئی۔

"سوری مدحیہ جی! یہ بول نہیں سکتے۔" مریم نے آہستگی اور کافی دکھ سے کہا تھا جس پہ مدحیہ نے بری طرح چونک کر دیکھا تھا۔

"کیوں؟؟"

"کیونکہ یہ بیمار ہیں' پیرالائز ہیں' اور ان کی یہ کنڈیشن پچھلے چار سال سے ایسی چلی آ رہی ہے۔" مریم کا لہجہ بھیگ گیا تھا۔ اور مدحیہ جیسے دم بخود سی کھڑی رہ گئی اس نے کافی ششدر سے انداز میں مریم اور عدیل کے چہروں کی سمت دیکھا تھا۔

مریم چہرہ جھکائے اپنے آنسو پینے کی کوشش کر رہی تھی جبکہ عدیل ایک دم چپ کھڑا تھا جیسے اس کے پاس کہنے کو کچھ بھی نہ ہو۔۔۔ مدحیہ تو رات سے یہی سمجھ رہی تھی کہ اس کے ابا جی کی ویسے ہی تھوڑی بہت طبیعت خراب ہوئی ہے تو ان شاء اللہ صبح تک ٹھیک ہو جائیں گے' لیکن وہ اذیت اور تکلیف کی کس اسٹیج پر ہیں۔۔۔؟ یہ تو وہ اس وقت

جان ہی نہیں پائی تھی۔ یہ تکلیف تھی یا زندگی بھر کا عذاب تھا۔۔۔؟ خود ان کے لیے بھی اور ان کے گھر والوں کے لیے بھی۔ چار سال کا عرصہ کچھ کم نہیں ہوتا۔ اور چار سال کسی کا ایسی تکلیف اور اذیت کو جھیلنا بھی کم نہیں تھا جس کو سوچ کر ہی مدحیہ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے اور دل و دماغ میں دکھ اور افسوس کی لہر دوڑ گئی تھی۔

"آپ کھڑی کیوں ہیں' بیٹھیے نا۔۔۔؟" مریم اپنے آنسو پونچھتے ہوئے اپنے آپ کو کافی حد تک سنبھال چکی تھی اور بیڈ کے قریب کھڑی مدحیہ کو بیٹھنے کا کہا تھا۔

"ایم سوری۔۔۔! مجھے ان کی تکلیف کا اس حد تک اندازہ نہیں تھا۔ میں تو سمجھ رہی تھی کہ معمولی سی طبیعت خراب ہے ان کے سینے میں تھوڑا بہت پین ہو رہا ہے تو یہ صبح تک ٹھیک ہو جائیں گے لیکن یہ سب تو۔۔۔"

مدحیہ حیرت زدہ سی بات ادھوری چھوڑتے ہوئے خاموش ہو گئی تھی۔

"اٹس اوکے! پہلی بار دیکھنے پہ کسی کو بھی صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ خیر آپ پریشان نہ ہوں' اللہ رحم کرے گا' آپ بیٹھیے' آرام سے بات کیجیے۔ آپ بھی رات سے ہمارے ساتھ ہی جاگ رہی ہیں' ابھی تو ناشتا بھی کرنا ہو گا آپ نے۔۔۔؟" مریم کافی نارمل بات کر رہی تھی یوں جیسے پہلے سے جان پہچان ہو جبکہ مدحیہ نے ناشتے کا سن کر بے ساختہ اپنے سیل فون سے ٹائم چیک کیا تھا پونے سات بجے کا وقت ہو رہا تھا گویا رات تمام ہو چکی تھی اور وقت کی رفتار گھوم پھر کے دوبارہ وہیں پہ آ گئی تھی جب کل صبح وہ اپنے گھر سے نکلی تھی کل صبح شاید نو دس بجے کا ٹائم تھا اور اب صبح کے سات بج رہے تھے۔۔۔

"خیریت۔۔۔۔ کیا ہوا ہے۔۔۔؟ کچھ کہنا چاہتی ہیں آپ۔۔۔؟"

عدیل اس کے دیکھنے کا انداز سمجھ گیا تھا۔

"ہوں! آئی تھنک مجھے اب چلنا چاہیے۔ ٹائم بہت ہو چکا ہے۔" وہ مریم اور فاروق نیازی کو دیکھتے ہوئے عدیل سے مخاطب ہوئی تھی۔

"ایز یو وش میڈم' آئیے میں آپ کو پارکنگ تک چھوڑ آؤں۔" عدیل اسے روک بھی تو نہیں سکتا تھا تبھی تو فوراً سر خم کر دیا تھا۔

"اوکے مریم جی! نائس ٹو میٹ یو۔ اللہ حافظ انکل۔" مدحیہ نارمل سے انداز میں کہتی ہوئی مریم سے ہاتھ ملا کر پلٹ گئی تھی۔

"آپ دوبارہ کب آئیں گی؟" مریم نے شاید اپنے بھائی کے دل پہ لکھا سوال پڑھ لیا تھا جسے سن کر مدحیہ کے قدم یکدم تھم گئے تھے اس نے پلٹ کر مریم کو دیکھا۔

"فی الحال کچھ کہہ نہیں سکتی' آپ کی یاد میں اثر ہوا تو ضرور آؤں گی۔" مدحیہ اسے جواب دے کر ٹھہری نہیں تھی باہر نکل آئی اس کے پیچھے عدیل بھی لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا نکل آیا تھا۔

"ایک بات پوچھ سکتا ہوں آپ سے۔" عدیل نے اس کے برابر چلتے ہوئے سنجیدگی سے کہا تھا مدحیہ نے چلتے چلتے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

"پوچھیے۔" اس نے اجازت دی۔

"رات کے دو بجے آپ تنہا سڑکوں پہ کیا کر رہی تھیں؟" عدیل کے ذہن میں رات سے دبا ہوا سوال امڈ آیا تھا جس پہ مدحیہ کے قدم ٹھٹک کر رک گئے تھے اور پیشانی پہ ناگوار بل پڑ گئے اور اس کا ازلی غصہ عود کے سامنے آیا تھا۔

"میرا اور آپ کا ایسا کوئی تعلق نہیں ہے کہ آپ مجھ سے کوئی پرسنل سوال پوچھیں' میری ذرا سی نرمی سے شاید آپ اپنی حد بھول گئے ہیں' میں رات کے دو بجے تنہا سڑکوں پہ کیا کر رہی تھی۔ یہ میرا اور میرے گھر والوں کا مسئلہ

ہے۔ آپ کو اس فکر میں ہلکان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، سمجھے آپ۔۔؟" اس نے پل میں عدیل کو کھری کھری سنا ڈالی تھیں اور عدیل اس کے اس قدر جلدی بدلتے روپ کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا اس نے مزید کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی تھی عدیل اور کچھ کہتا بھی تو کیا کہتا۔۔۔؟ سوائے معذرت کرنے کے۔۔۔!

"ایم سوری میڈم! میں واقعی پرسنل ہو گیا تھا یا پھر یہ کہنا چاہیے کہ میں آپ کی ذرا سی نرمی پہ اپنی اوقات، اپنی حد بھول گیا تھا۔ جس پہ میں بہت شرمندہ ہوں۔ ایم ریئلی سوری۔" وہ معذرت خواہانہ لہجے میں معذرت کر رہا تھا اور مدحیہ اس پہ ایک نگاہ غلط ڈالے بغیر تنتناتی ہوئی آگے بڑھ گئی تھی۔ اور عدیل وہیں راستے میں کھڑا رہ گیا مدحیہ نے پلٹ کر اسے دیکھنے کی بھی زحمت نہیں کی تھی اپنی جینز کی پاکٹ سے چابی نکال کے لاک کھولا اور گاڑی نکال لے گئی تھی حالانکہ اسے خود بھی پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔؟

☼ ☼ ☼

وہ دن بھر کی تھکن اور رات بھر کے رت جگے سے کافی بجھ سی گئی تھی لیکن اپنی ضد سے پیچھے نہیں ہٹ رہی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے ہی فائزہ بیگم کی بھی کال آئی تھی وہ اسے واپس آنے کے لیے واسطے دے رہی تھیں لیکن مدحیہ کی ایک ہی شرط تھی اور اس کی یہ شرط ماننا ان کے لیے مشکل تھا جبھی مدحیہ نے یکدم فون بند کر دیا تھا اور اپنے پیٹ کی بھوک کا بندوبست کرنے کے لیے "آواری" کا رخ کیا تھا۔

اس نے رات سے کچھ نہیں کھایا تھا اس لیے اس نے کافی ہیوی ناشتا آرڈر کیا تھا۔ اس نے ناشتا پوری رغبت سے کیا تھا تبھی ناشتے کے بعد طبیعت فریش ہو گئی تھی لیکن ریسٹورنٹ سے نکل کر وہ اپنی گاڑی تک پہنچی ہی تھی کہ ساری فریشنس ہوا ہو گئی گاڑی کا لاک کھولتے ہوئے اس کا سیل گنگنایا تھا اور جیسے ہی اس نے نمبر دیکھا اس کے ہونٹ بھینچ گئے تھے اور اعصاب میں تناؤ آ گیا۔ کیونکہ کال کرنے والا دل آور شاہ تھا۔

"ہیلو۔!" مدحیہ کی اتنی جرات نہیں تھی کہ اس کی کال ڈس کنیکٹ کرتی۔

"دل آور شاہ بات کر رہا ہوں۔" اس کے غصے کی لپک اس کی بات سے ہی ظاہر ہو گئی تھی۔

"جی! میں جانتی ہوں۔"

"صرف جانتی ہو نا، پہچانتی نہیں ہو۔"

"پہچانتی بھی ہوں۔"

"تم اگر پہچانتی تو پوری رات اور پورا دن گھر سے باہر نہ گزارتیں، جس لاہور کی سڑکیں بھی دل آور شاہ کو سلام کرتی ہیں تم انہی سڑکوں پہ دل آور شاہ کا سر نیچا کرتی پھر رہی ہو۔" وہ غصے اور غضب سے بھرا ہوا تھا۔

"میں نے ایسا کچھ نہیں کیا کہ آپ کا سر نیچا ہو۔"

"شٹ اپ مدحیہ، جسٹ شٹ اپ! اپنی زبان کو لگام دو، تم جو کچھ کر چکی ہو، میرا سر نیچا کرنے کے لیے وہی کافی ہے۔"

"بھائی آپ کو چوٹ لگی ہے تو آپ کس قدر بلبلا رہے ہیں، اسی طرح آپ میری چوٹ کا بھی تو اندازہ کیجیے۔" وہ دبے لہجے میں چبا کر بولی تھی دونوں بہن بھائی کے میٹر گھومے ہوئے تھے۔

"تمہیں جو چوٹ لگی ہے وہ ہمیں بتاتی کیوں نہیں ہو۔۔۔؟"

"افسوس! میرے پاس وہ الفاظ نہیں ہیں جو میری چوٹ اور میری اذیت کو بیان کر سکیں، جس کے بعد یقیناً آپ بھی اور میرا معصوم اور سادہ لوح بھائی نبیل بھی منہ چھپانے پہ مجبور ہو جائیں گے، لیکن میں بیان کروں بھی تو کیسے؟ اسی لیے تو کہتی ہوں کہ اس شخص کے ہوتے ہوئے میں اس گھر میں نہیں رہ سکتی، اگر میں وہاں رہی تو بہت

بڑا ہنگامہ ہو جائے گا۔"

وہ انتہائی نفرت اور حقارت سے بات کر رہی تھی۔

"دیکھو مدحیہ! میں نے اس وقت تم سے کوئی بحث کرنے کے لیے فون نہیں کیا بلکہ صرف یہ کہنے کے لیے فون کیا ہے کہ اگر تمہیں میری عزت اور میری غیرت کا ذرا سا بھی احساس یا کوئی پروا ہے تو تم جہاں کہیں بھی ہو ابھی اور اسی وقت گھر واپس چلی جاؤ۔ میں اگر خود لاہور میں ہوتا تو تمہیں اپنے گھر لے جاتا، لیکن تمہارا اکیلے گھر میں جانا بھی مناسب نہیں ہے۔ اس لیے تمہیں واپس اپنے گھر ہی جانا ہو گا۔ نبیل تمہارا انتظار کر رہا ہے۔" دل آور نے فیصلہ مدحیہ پہ چھوڑ دیا۔

"لیکن دل آور بھائی میں وہاں۔۔۔"

"میں نے تمہیں فورس کرنے کے لیے فون نہیں کیا بس یہ کہا ہے اگر تمہیں میری عزت اور میری غیرت کا ذرا سا بھی احساس ہے تو واپس گھر چلی جاؤ۔ نہیں تو آج کی رات بھی باہر سڑکوں پہ ہی گزار لینا، میں دوبارہ تمہیں کچھ نہیں کہوں گا، اوکے اللہ حافظ۔" دل آور نے دوٹوک لہجے میں کہتے ہوئے فون بند کر دیا تھا اور مدحیہ جوں کی توں کھڑی رہ گئی۔ دل آور شاہ ایک بھائی ہونے کے ناتے ہر بار اس کے آڑے آ جاتے تھے اور وہ ان کی وجہ سے ہر بار بے بس ہو جاتی تھی اس وقت بھی اسے خون کے گھونٹ پی کر ہتھیار ڈالنے پڑے تھے۔

☼ ☼ ☼

بڑی حویلی میں آج جیسے پرجوش سی ہلچل مچی ہوئی تھی ینگ جنریشن نے اک ادھم سا مچا رکھا تھا ساری تیاری افراتفری کے سے عالم میں ہو رہی تھی اور یہ افراتفری زیادہ تر لڑکیوں کو لپیٹ میں لیے ہوئے تھی۔ کوئی دوپٹہ میچ کر رہی تھی تو کوئی اپنے جوتے، کسی کو سوٹ سے میچنگ بیگ چاہیے تھا، تو کسی کو میچنگ جیولری کی ضرورت تھی۔

انوشہ اور حرمت مبارک خان کو ساتھ لیے مارکیٹ گئی ہوئی تھیں انہوں نے اپنی کچھ ضروری شاپنگ کرنا تھی، کومل اور جویریہ کو بیوٹی پارلر جانے کی ضرورت تھی اس لیے وہ دونوں جودت کے پیچھے پڑ گئیں حالانکہ جودت ہاتھ آنے والا نہیں تھا۔ لیکن اسے اپنی کومل آپا سے بڑی انسیت تھی زیادہ دیر انکار نہ کر سکا اس لیے مانتے ہی بنی۔

"لیکن میرے پاس تو بائیک ہے۔ آپ بائیک پہ کیسے جائیں گی۔؟"

"تو کسی سے گاڑی لے لونا۔"

"ایم سوری! میری ڈرائیونگ کے پیش نظر کوئی بھی مجھے اپنی گاڑی نہیں دیتا۔" جودت شرارت سے ہنسا۔

"تو پھر۔۔؟" کومل اور جویریہ پریشان ہو گئیں۔

"پھر یہ کہ گاڑی آپ مانگیں تو مل سکتی ہے۔" جودت نے آنکھوں آنکھوں میں۔ آذر کی سمت اشارہ کیا تھا جو باہر لان میں بیٹھا چائے پیتے ہوئے میگزین دیکھ رہا تھا۔

"میں مانگوں۔۔؟" کومل بدک گئی۔

"جانا بھی تو آپ نے ہے، بالوں کی کٹنگ، تھریڈنگ اور فیشل بھی تو آپ نے کروانے ہیں کون سا میں کروانے جا رہا ہوں۔" جودت نے لاپروائی سے کہتے ہوئے کندھے اچکائے تھے اور کومل یکدم تلملا گئی تھی۔

"تم بہت خبیث ہو جودت۔"

"جی! میں جانتا ہوں۔" وہ اتنی سعادت مندی سے بولا کہ جویریہ سے مسکراہٹ دبانا مشکل ہو گیا۔ "جاؤ نا گاڑی مانگو ان سے۔" کومل نے اشارہ کیا۔

"اُن سے۔۔۔؟" جودت نے آنکھیں مٹکائیں۔
"ہاں! ان سے۔" وہ زچ ہو چکی تھی۔
"توبہ کومل آپا توبہ! میرے باپ، دادا کی بھی توبہ، میں اوکھلی میں سر نہیں دے سکتا، یہ کام کرنا ہے تو آپ نے خود ہی کرنا ہے، ورنہ میں گیا تو میری کلاس شروع ہو جائے گی، اس لیے پلیز۔۔۔" اس نے کومل کو راستہ دیا۔
"مگر میں۔۔۔"
"یار! چلی جاؤ، پہلے ہی اتنا ٹائم ویسٹ ہو چکا ہے۔" جویریہ ان کی بحث سے جھنجلا اٹھی تھی۔
"جائیے نا۔" جودت نے معنی خیزی سے دیکھتے ہوئے کہا۔
"کبھی نہ کبھی تمہیں بھی کوئی کام پڑ ہی جائے گا جودت، لیکن دیکھنا تم سے بدلہ نہ لوں تو میرا نام بھی کومل آفندی نہیں۔" وہ اسے وارن کرتی ہوئی اپنا دوپٹہ شانے پہ درست کرتے ہوئے لان میں نکل آئی تھی۔
"السلام علیکم۔" اس نے آذر کے قریب جا کے سلام کیا تھا۔
"والسلام۔" آذر نے میگزین سے نظریں ہٹا کر کومل کی سمت دیکھا تھا۔
"آپ فارغ ہیں؟" کومل کو پوچھتے ہوئے کافی جھجک محسوس ہوئی تھی۔
"جی! کیوں؟ خیریت؟"
"آپ نے کہیں جانا تو نہیں ہے۔" اس نے ہمت کر کے اگلا سوال پوچھا۔
"فی الحال تو کوئی کام نہیں ہے، اس لیے ابھی کہیں نہیں جانا، آپ کو کوئی کام ہے کیا؟" آذر حیرانی سے اسے دیکھ رہا تھا۔
"جی۔۔۔ وہ دراصل آپ کی گاڑی چاہیے تھی کچھ دیر کے لیے۔"
"وہ کس لیے؟" اس نے بھنویں اچکائیں۔
"وہ ہم لڑکیوں نے بیوٹی پارلر جانا تھا۔"
"تو مبارک خان کہاں ہے اس کے ساتھ چلی جائیں۔"
"وہ حرمت اور انوشہ کو لے کر مارکیٹ گیا ہوا ہے، انہوں نے کچھ شاپنگ کرنی تھی۔"
"او اچھا۔" آذر کو چپ ہونا پڑا تھا۔
"ساتھ کون جا رہا ہے؟"
"جودت۔۔۔"
"اوکے! آپ چابی لے جائیں، لیکن جودت سے کہیے گا کہ گاڑی ہوش و حواس میں رہ کر ڈرائیو کرے۔" آذر نے کہتے ہوئے سامنے ٹیبل پہ اپنے موبائل کے ساتھ رکھی کی چین اٹھا کر کومل کی طرف بڑھا دی۔
"تھینک یو، تھینک یو سو مچ۔" کومل چابی لے کر اس کا تھینکس کہتی ہوئی ــ پلٹ گئی۔
"کومل۔۔۔" آذر نے پیچھے سے آواز دی۔
"جی،" کومل جی جان سے واپس مڑی تھی۔
"آپ کی طبیعت کیسی ہے اب۔" اس کے پوچھنے پر کومل یکدم سٹپٹا گئی۔
"ٹھیک ہوں۔"
"ماشاء اللہ بڑی جلدی ٹھیک ہو گئی ہیں۔" وہ متبسم سے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔
"تھوڑی دیر پہلے ٹیبلٹ لی تھیں۔"
"اوکے! اچھی بات ہے، جا سکتی ہیں آپ۔" آذر نے نارمل سے انداز میں مسکراتے ہوئے اسے اجازت دی

اور کومل سر ہلا کر وہاں سے چلی گئی تھی، جودت اور جویریہ پودوں کی اوٹ میں کھڑے کومل کو دیکھ کر ہنس رہے تھے۔
"یہ لو ذلیل انسان۔" اس نے چابی اس کی ہتھیلی پہ پٹخ دی۔
"ذلیل انسان نے آپ کی ملاقات کروا دی اور کیا چاہیے آپ کو؟" جودت اسے چھیڑتا ہوا گاڑی کی سمت بڑھا تھا اور پھر انہیں ساتھ لیے گاڑی نکال لے گیا تھا۔ حویلی میں اب مدحت، انیہ اور علیزے ہی رہ گئی تھیں۔
مدحت اور انیہ اپنے تمام ڈریسز ملازمہ سے پریس کروا کے بیگ میں رکھوا رہی تھیں اور ساتھ ساتھ اپنے ماسک اور مساج بھی جاری تھے، جبکہ علیزے ان سب چیزوں سے بے نیاز تھی، اسے نہ تو کسی ماسک اور مساج کی ضرورت تھی اور نہ ہی بیوٹی پارلر کی، اور اس کے ڈریسز بھی پہلے سے ہی اتنے موجود تھے کہ وہ مہینہ بھر بھی کہیں رہنے کے لیے جاتی تو روز نیا ڈریس زیب تن کر سکتی تھی، اس لیے باقی سب کے مقابلے میں وہ کافی ریلیکس اور سکون میں تھی، البتہ اسے اپنے ملازموں کا کافی خیال تھا، اس نے رجو کو پیسے دے کر شاپنگ کے لیے بھیجا ہوا تھا، لیکن کوشش کے باوجود اسے منصور حسین کہیں بھی دکھائی نہیں دیا اور اسی کو ڈھونڈنے کے خیال سے وہ باہر نکل آئی تھی۔
"السلام علیکم آذر بھائی۔" علیزے آذر کو دیکھ کے وہیں چلی آئی تھی۔
"وعلیکم السلام! آؤ بیٹھو۔" آذر کے چہرے پہ خوشگواریت چھا گئی تھی۔
"آپ یہاں اکیلے کیوں بیٹھے ہیں؟" علیزے اس کے مقابل والی کرسی پہ بیٹھ گئی۔
"میں اکیلا کب ہوں؟" آذر نے دلچسپی سے مسکرا کے کہا۔
"کیا مطلب؟ کون ہے آپ کے ساتھ؟"
"تم۔۔۔"
"میں۔۔۔؟" علیزے اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے حیران ہوئی، لیکن پھر اس کی بات سمجھ کر مسکرا اٹھی۔
"اوہ! تو آپ ابھی کی بات کر رہے ہیں؟"
"شاید۔۔۔"
"ہوں! لگتا ہے کافی خوش گوار موڈ میں ہیں؟"
"ہنڈرڈ پرسینٹ۔" آذر نے اثبات میں سر ہلایا۔
"ریزن۔۔۔؟" علیزے نے فوراً پوچھا۔
"وِد آؤٹ ریزن۔"
"آئی کانٹ بلیو اٹ۔" وہ ماننے کو تیار نہیں تھی۔
"بلیو می۔" آذر نے مسکرا کے کہا۔
"اوکے! بٹ۔"
"اینی وے سویٹ ہارٹ تم یہ سب چھوڑو، یہ بتاؤ کہ کس کام سے آئی ہو۔" آذر نے بات بدلی۔
"آپ سے ڈرائیور کا پوچھنے آئی تھی۔"
"کسی ڈرائیور کا؟"
"اپنے ڈرائیور کا۔"
"اوہ! منصور حسین کا؟"
"جی! اسی کا پوچھنے آئی ہوں، کہاں ہے وہ؟ صبح سے ڈھونڈ رہی ہوں؟"

"گاڑی سروس کروانے گیا ہوا ہے' تھوڑی دیر تک آجائے گا' کوئی کام ہے کیا؟"
"نہیں! کچھ خاص کام نہیں ہے' بس اسے مارکیٹ بھیجنا ہے۔" علیزے نے کندھے اچکائے۔
"تمہاری تیاری مکمل ہو گئی۔"
"نہیں پیکنگ ابھی کرنی ہے' رجو مارکیٹ سے آئے گی تو پیکنگ کر دے گی۔"
"لو وہ منصور حسین بھی آ گیا۔" آذر کی نظر گیٹ کی سمت اٹھی تھی اور چمکتی دمکتی لشکارے مارتی مرسیڈیز گیٹ سے اندر آرکی' منصور حسین گاڑی سے اترا ہی تھا کہ آذر نے اشارے سے قریب بلالیا تھا' وہ بھاری قدم اٹھاتا سبز گھاس بوٹوں تلے روندتا ہوا ان کے پاس آکھڑا ہوا۔
"السلام علیکم صاحب۔"
"وعلیکم السلام! کہاں تھے تم؟"
"جی گاڑی سروس کروانے گیا ہوا تھا۔"
"تو اتنی دیر کیوں لگا دی' دوپہر سے نکلے ہوئے ہو تم؟"
"گاڑی ورکشاپ چھوڑ کر اپنے گھر والوں سے ملنے چلا گیا تھا' اتنے دن ہو گئے تھے گھر گئے ہوئے' کافی اداسی ہو رہی تھی' ماں جی اور بابا جی بھی اداس تھے' ان سے مل آیا ہوں تو خوش ہو گئے ہیں وہ کہہ رہے تھے یہ نوکری چھوڑ دو' جس میں تم ہمیں بھی بھول گئے ہو۔" منصور حسین بتاتے ہوئے بھی اداس اور بوجھل بوجھل سا لگ رہا تھا۔
آذر چاہ کر بھی مزید کچھ نہ کہہ سکا' اتنے میں آذر کا سیل فون بج اٹھا تھا اور وہ کال اٹینڈ کرتا ہوا علیزے سے ایکسکیوز کر کے اٹھ کر لان کی دوسری سائیڈ پہ چلا گیا تھا۔
"کیا تمہارے پاس نئے کپڑے نہیں ہیں؟" علیزے نے پہلی بار منصور حسین کو سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا تھا' اس کے سستے سے بے رنگ کپڑے علیزے کی طبیعت کے خلاف تھے' وہ تو اپنے ملازموں کو بھی خوشبوؤں میں بسا ہوا دیکھنا چاہتی تھی' فریش اور تازہ دم' منصور حسین ویسے تو صاف ستھرا' دھلا دھلایا سا رہتا تھا' بس اس کے کپڑے پرانے اور بدرنگ سے تھے جن کو وہ ہر بار دھو کر پہنتا تھا' لیکن ان میں پھر بھی کوئی خاص چمک دمک نہیں آئی تھی۔
"نہیں بی بی جی! نئے کپڑوں کی کیا ضرورت ہے؟ تین جوڑے ہیں وہ ہی کافی ہیں' کل صاحب سے تنخواہ ملی تھی وہ آج اپنے گھر والوں کو دے آیا ہوں' ان شاء اللہ آئندہ تنخواہ ملی تو نیا جوڑا لینے کی کوشش کروں گا۔"
"یعنی نیا سوٹ لینے کے لیے مہینہ بھر انتظار کرو گے؟"
"جی! تو اور کیا کروں؟" منصور حسین کے چہرے پہ تلخ سی مسکراہٹ بکھر گئی۔
"تم ایسا کرو کہ ابھی مارکیٹ جاؤ اور اپنے لیے کپڑے لے کر آؤ' پیسے میں تمہیں دیتی ہوں۔" علیزے کی بات پہ منصور حسین نے بری طرح چونک کر اپنی علیزے بی بی کی طرف دیکھا تھا کہ یہ عنایت بھلا کس لیے؟
"کپڑے؟" منصور حسین کو یقین نہیں آیا تھا۔
"ہاں کپڑے! رجو کو بھی بھیجا ہے' وہ بھی اپنے کپڑے لینے گئی ہوئی ہے' تم بھی جا کر لے آؤ۔" علیزے نہ جانے کیا کہہ رہی تھی منصور حسین کے کچھ پلے نہیں پڑا تھا۔
"لیکن بی بی جی کپڑے کس لیے لینے ہیں؟" وہ ناسمجھی سے پوچھ رہا تھا۔
"کیا کل صبح ٹرپ پہ نہیں جانا؟"
"جی ہاں! جانا ہے۔"
"تو اسی لیے تمہیں اور رجو کو کہہ رہی ہوں تاکہ تم دونوں بھی نئے کپڑے لے لو' سب نے نئے کپڑے لیے ہیں'

رجو بھی چلی گئی ہے' صرف تم رہ گئے ہو۔" علیزے کو اب اپنے ڈرائیور کی فکر تھی کہ وہ نئے کپڑوں میں نہیں ہو گا تو برا لگے گا۔
"اوہ اچھا! تو اس لیے کہہ رہی ہیں آپ؟" منصور حسین دھیما پڑ گیا تھا۔
"ہوں! آؤ میرے ساتھ۔" علیزے کہتی ہوئی کرسی سے اٹھ کر آگے بڑھ گئی اور منصور حسین نے بے دلی سے قدم اس کے پیچھے ہی بڑھا دیے تھے۔
وہ آگے آگے چلتی ہوئی چھوٹے سے پل سے گزر کر لان کراس کر کے مین ڈور کے سامنے والے حصے کی سیڑھیاں طے کرتی ہوئی اندر کوریڈور میں داخل ہوئی تھی اور منصور حسین بھی اس کے پیچھے آ رہا تھا۔ سیڑھیوں کے قریب جا کر علیزے ٹھہر گئی۔
"تم یہیں ٹھہرو' میں ابھی آتی ہوں۔" وہ کہہ کے سیڑھیاں چڑھ گئی اور منصور حسین وہیں کا وہیں اسٹیچو بن کے کھڑا ہو گیا تھا' لیکن ابھی چند سیکنڈ گزرے ہی تھے کہ وقار آفندی اور عائشہ آفندی دونوں بہن' بھائی ڈرائنگ روم سے نکلتے ہوئے دکھائی دیے تھے۔
منصور حسین' وقار آفندی کے ساتھ چلتی سادہ اور نفیس سے لباس میں ملبوس اس خوب صورت اور گریس فل سی عورت کو دیکھ رہا تھا' جس سے بات کرتے ہوئے وقار آفندی کے چہرے پہ شفقت اور ملائمت بالکل اسی طرح پھیلی ہوئی تھی جیسے علیزے سے بات کرتے ہوئے ان کی پوری شخصیت پہ طاری ہو جاتی تھی' وہ عورت جو بھی تھی اس کی شخصیت بھی وقار آفندی سے کم نہیں تھی' ان کی تمکنت' ان کا وقار' ان کی چال ڈھال سے ہی جھلک رہا تھا۔
"یہ یقیناً "بڑے صاحب" کی بہن ہوں گی؟" منصور حسین نے دل ہی دل میں اندازہ لگایا۔
"سلام صاحب۔" اتنے میں وہ دونوں قریب آ چکے تھے' اس لیے منصور حسین کو فوراً "سلام کرنا پڑا۔
"وعلیکم السلام! تم یہاں کیوں کھڑے ہو؟"
"وہ علیزے بی بی نے بلایا تھا۔"
"کیوں؟"
"شاید کہیں بھیجنا ہے۔"
"اوہ اچھا اچھا! اس نے تمہیں کپڑے لینے کے لیے بھیجنا ہو گا؟ صبح سے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔" وقار آفندی کو جیسے یاد آ گیا تھا۔
"جی! شاید اسی لیے۔" منصور حسین نے سر ہلایا۔

"ہوں! ٹھیک ہے، لیکن گاڑی سروس کروائی تم نے؟"

"جی! کروالی ہے۔"

"سامان وغیرہ چیک کیا؟"

"نہیں صاحب! سامان رات کو چیک کروں گا اور رات کو ہی رکھ لوں گا۔"

"ہاں! یہ بھی ٹھیک ہے۔" وہ بھی اس کی بات سمجھ چکے تھے کہ ایسا کام سب کے سامنے کرنا ٹھیک نہیں، وہ رات کو ہی سب کچھ کرلیتا تو ہی ٹھیک ہوگا۔

"اور ان سے ملو، یہ علیزے کی اکلوتی پھوپھی اور ہماری اکلوتی ہمشیرہ ہیں، عائشہ آفندی، یہ بھی ٹرپ پہ ساتھ جائیں گی، ان کا بھی خیال رکھنا۔" منصور حسین نے چونک کر دیکھا تھا، اس کا اندازہ درست ثابت ہوا تھا، وہ وقار آفندی کی بہن ہی تھیں۔

"سلام بیگم صاحبہ۔" اس نے مرعوب سے انداز میں سلام کیا، حالانکہ وہ مرعوب ہوتا نہیں تھا۔

"والسلام! کون ہے یہ؟" عائشہ آفندی نے وقار آفندی کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"علیزے کا ڈرائیور ہے، منصور حسین۔" انہوں نے سرسری سا بتایا۔

"منصور حسین؟" عائشہ آفندی نے زیرلب دہراتے ہوئے اسے سرتاپا دیکھا تھا وہ واقعی کڑیل جوان مرد تھا، وہ کتنا بہادر اور کتنا مضبوط تھا، یہ اسے دیکھ کر ہی احساس ہوجاتا تھا، لیکن پھر بھی آنکھیں اور گردن جھکائے کھڑا تھا۔

"ڈرائیور! یہ لو پیسے۔" علیزے کی مداخلت پہ تینوں نے چونک کر دیکھا تھا۔

"پیسے...؟" منصور حسین کی تنخواہ کے علاوہ پیسے لینا ہمیشہ ہی عجیب لگا تھا، اس کا ضمیر ہی گوارا نہیں کرتا تھا کہ کوئی اس پہ ترس کھائے یا ہمدردی کرے۔ وہ بس محنت کرکے کھانے پہ خوش ہوتا تھا، اس کے لیے یہ ہی کافی تھا کہ صاحب نے اسے نوکری دے دی ہے۔

"ہاں! جاؤ جاکر اپنے کپڑے لے آؤ۔" علیزے نے اسے پیسے تھماتے ہوئے کہا، منصور حسین نے وقار آفندی کو دیکھا۔

"ہاں! منصور حسین رکھ لو اور جاکر کپڑے خریدو، تمہارے کپڑے خاصے پرانے ہیں۔" انہوں نے بیٹی کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"ٹھیک ہے صاحب اور بی بی جی مہربانی آپ کی۔" وہ سر ہلا کر کہتا ہوا ان تینوں کو اللہ حافظ کہہ کے کوریڈور کی طرف بڑھ گیا تھا اور علیزے مطمئن سی ان کے ساتھ باہر نکل آئی۔

☼ ☼ ☼

"گڈ مارننگ ڈیڈ۔" وقار آفندی اس وقت ڈائننگ ہال میں عون اور عدید کے ساتھ اکیلے بیٹھے باتیں کررہے تھے، جب آذر بھی وہیں چلا آیا تھا۔

"مارننگ مائی سن مارننگ! آؤ بیٹھو۔" انہوں نے اپنی بائیں سائیڈ والی کرسی کی سمت اشارہ کیا تھا، کیونکہ دائیں سائیڈ پہ عون اور عدید بیٹھے ہوئے تھے۔

"باقی سب کہاں ہیں؟" آذر کو صبح صبح ڈائننگ ہال میں پھیلے سناٹے پہ حیرت ہوئی تھی۔

"سب اپنی اپنی تیاری کو فائنل ٹچ دے رہے ہیں۔" عدید نے شرارت سے جواب دیا تھا، جس پہ وقار آفندی اور آذر بے ساختہ ہنس پڑے تھے۔

"گڈ مارننگ ڈیڈ۔" کومل کی آواز پہ ان چاروں نے بیک وقت سر اٹھا کر ڈائننگ ہال کے داخلی دروازے کی سمت

دیکھا، وائٹ اور فیروزی بارڈر والی وائٹ لانگ شرٹ اس کے پاؤں کو چھو رہی تھی، لائٹ سے میک اپ اور جیولری کے ساتھ اس کی تیاری بھی کمال کی تھی، آذر نے سرسری سا ہی سہی لیکن اسے سرتاپا دیکھا تھا اور کومل کی کھڑے کھڑے ہی اپنی تیاری پہ کی گئی محنت وصول ہوگئی تھی۔

"ویسم ٹو بیٹا! بیٹھو نا، ناشتا کرو۔" انہوں نے آذر کے برابر والی کرسی کی سمت اشارہ کیا، لیکن وہ اس کے برابر بیٹھنے کی ہمت نہیں رکھتی تھی، اس لیے عون اور عدید کے برابر بیٹھ گئی۔

"گڈ مارننگ۔" جودت نے اندر داخل ہوتے ہوئے بلند آواز سے کہا۔

"گڈ مارننگ ڈیڈ۔" احمد اور حماد بھی چلے آئے۔

"گڈ مارننگ ڈیڈ۔" حرمت، مدحت، جویریہ اور انیہ بھی ایک ساتھ اندر داخل ہوئی تھیں، رفتہ رفتہ پورا ہال فل ہوگیا۔ اسرار آفندی اور ثروت بیگم بھی آچکے تھے، البتہ ثمرہ بیگم اور اظہار آفندی گھر پہ نہیں تھے۔ وہ کراچی گئے ہوئے تھے۔

"گڈ مارننگ پاپا۔" اتنی بہت ساری آوازوں میں علیزے کی نرم سی آواز ابھری تو ساری آوازیں تھم گئی تھیں۔

"ارے پاپا کا بیٹا، پاپا کا جانو آگیا۔" وقار آفندی نے بازو وا کردیے تھے، آج علیزے گھر سے باہر جارہی تھی، اس لیے ان کا انداز، ان کا لہجہ بے حد والہانہ سا تھا۔ علیزے ان کے سینے سے لگ گئی۔

"بس کریں پاپا! علیزے آپی اکیلی تو نہیں جارہیں؟ باقی سب بھی تو جارہے ہیں۔" عون نے انہیں ٹوکا۔

"باقی سب تو کہیں نہ کہیں جاتے ہی رہتے ہیں، لیکن میرا بچہ تو پہلی بار جارہا ہے۔" وقار آفندی نے اس کی پیشانی چومتے ہوئے کہا۔

"تو پھر آپ اپنے بچے کو یا تو گھر پہ رکھ لیں یا پھر خود ساتھ چلے جائیں۔" آسیہ آفندی نے بھی خفگی سے مداخلت کی تھی، جس پہ وہ سب ہنس پڑے تھے اور اسی ہنسی مذاق میں انہوں نے ناشتا کیا اور روانگی کے لیے اپنی گاڑیوں تک پہنچ گئے۔

جانے سے پہلے وقار آفندی نے رجو اور منصور حسین کو بلا کر ایک بار پھر ہدایات جاری کی تھیں اور تب ان سب کو رخصتی کا پروانہ دیا تھا وہ سب اپنا اپنا سامان پہلے ہی گاڑیوں میں رکھوا چکے تھے، اس لیے سب سے مل کر اپنی اپنی گاڑیوں میں آبیٹھے تھے۔ البتہ وقار آفندی، علیزے کو خود گاڑی تک چھوڑنے آئے تھے۔ وہ رخصت ہوئی تو وہ اندر گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

چار گاڑیوں پہ مشتمل یہ قافلہ انجان اور ان دیکھی منزل کی سمت گامزن تھا، سب سے آگے علیزے کی گاڑی تھی جس میں منصور حسین، رجو اور علیزے تھے، اس کے پیچھے آذر کی گاڑی تھی جس میں وہ چاروں بہن بھائی تھے۔ آذر، جودت، حرمت اور مدحت۔ ان کے پیچھے احمد کی گاڑی تھی، جس میں وہ پانچوں بہن بھائی موجود تھے۔ احمد، حماد، کومل، جویریہ اور انیہ، اور سب سے آخر میں دانیال کی گاڑی تھی جس میں دانیال، زین، انوشہ اور ان کی والدہ محترمہ عائشہ آفندی تھیں۔

عائشہ آفندی اکثر بیمار رہتی تھیں، جس کی وجہ سے ڈاکٹرز اکثر ہی انہیں آب و ہوا تبدیل کرنے کا مشورہ دیتے تھے، لیکن وہ اپنے بھائیوں کے اصرار کے باوجود بھی کبھی شہر سے باہر نہیں گئی تھیں، لیکن اس بار جب سب بچوں نے ہالی ڈیز منانے کا پروگرام بنایا تو وقار آفندی نے باقاعدہ انہیں بلا کر ساتھ جانے کا مشورہ دیا تھا اور اس بار چاہتے

ہوئے بھی وہ انکار نہیں کرپائی تھیں کہ اب وہ اکیلی نہیں تھیں' سب بچے ساتھ تھے اور یہ ہی احساس ان کی طبیعت کو اور بھی تازگی بخش گیا تھا' وہ ساتھ چلنے کے لیے مان گئی تھیں اور اب انجوائے بھی کررہی تھیں اور انجوائے تو علیزے بھی کررہی تھی' جیسے ہی گاڑی لاہور کی ہنگامہ خیز سڑکوں سے نکل کر موٹروے پہ آئی تو ان سب کی طبیعت پہ خوش گوار سا اثر پڑا تھا۔

"علیزے بی بی۔" رجو نے بے ساختہ اسے مخاطب کیا تھا۔

"ہوں۔۔۔؟" علیزے گاڑی سے باہر کے مناظر دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔

"آپ پہلی بار مری جارہی ہیں؟" رجو کو چپ بیٹھنا عذاب لگ رہا تھا۔ جب ہی بولنے کے لیے راستے نکالا۔

"ہاں پہلی بار جارہی ہوں۔" علیزے نے اثبات میں جواب دیا ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھا ڈرائیو کرتا منصور حسین ان دونوں کے سوال جواب باآسانی سن رہا تھا۔

"تو آپ پہلے کبھی کیوں نہیں گئیں؟ حالانکہ امیر لوگوں کے بچے تو ہمیشہ گرمیوں میں ہالی ڈیز منانے مری ضرور جاتے ہیں؟" رجو کو سب پتا بھی تھا' پھر بھی حیرت کا اظہار کررہی تھی۔

"وہ امیر لوگوں کے بچے ہوتے ہیں' بڑی حویلی کے نہیں۔" رجو' علیزے کے جواب پہ متاثر تو ہوئی' لیکن چپ نہیں ہوسکی۔

"بے شک بڑی حویلی کے بچوں پہ پابندی ہے' لیکن علیزے بی بی آپ پہ تو کوئی بھی پابندی نہیں ہے' آپ تو ہر جگہ جاسکتی ہیں۔"

"ارے! تمہیں کس نے کہا کہ مجھ پہ کوئی پابندی نہیں ہے؟ مجھ پہ جتنی پابندیاں ہیں کبھی میرے بابا سے تو پوچھو' وہ ہی تمہیں بتائیں گے۔" علیزے کو رجو کی کم عقلی پہ حیرت ہورہی تھی۔

"لیکن علیزے بی بی! وہ پابندی تو نہ ہوئی نا؟ وہ تو احتیاط ہے' بڑے صاحب کو پتا جو ہے کہ آپ ذرا ذرا سی بات کا اثر لے لیتی ہیں' طبیعت خراب ہوجاتی ہے' آپ کی نازک مزاجی کے لیے ہی تو احتیاط کرتے ہیں وہ؟"

"مجھے نازک مزاج بھی تو انہوں نے ہی بنایا ہے نا۔" علیزے ہلکے سے مسکرائی تھی اور رجو کے ساتھ ساتھ منصور حسین نے بھی دل ہی دل میں اس کی بات کی تائید کی تھی' منصور حسین کو کچھ ہی عرصہ ہوا تھا اس حویلی میں آئے ہوئے' لیکن وہ اس کچھ ہی عرصے میں جان چکا تھا کہ اس پوری حویلی میں جو اہمیت علیزے بی بی کی ہے وہ کسی اور کی نہیں ہے' اس کا رہن سہن شہزادیوں سے کم نہیں تھا۔ وہ بڑی حویلی کی ریاست کی شہزادی تھی اور شہزادیوں کی سی زندگی گزار رہی تھی' منصور حسین کو کبھی کبھی بڑی حیرت ہوتی تھی کہ اس چھوٹی سی لڑکی میں آخر ایسا کیا تھا جو اسے باقی سب سے ممتاز اور منفرد بناتا تھا۔

شاید یہ کہ وہ وقار آفندی کی بیٹی تھی' لیکن وقار آفندی کے دو بیٹے بھی تو تھے' انہیں تو کبھی ایسا پروٹوکول نہیں ملا تھا جیسا علیزے کو ملتا تھا۔ یا پھر یہ کہ وہ سب کزنز سے چھوٹی تھی' لیکن نہیں' بات تو پھر وہیں پہ آجاتی تھی کہ چھوٹے تو عون اور عدید بھی تھے جو علیزے سے بھی چھوٹے تھے اور ایسے ناز نخرے تو کبھی ان کے بھی نہیں اٹھائے گئے' جیسے ہر روز علیزے کے اٹھائے جاتے تھے؟ یا پھر یہ کہنا چاہیے کہ اس سارے پروٹوکول کی وجہ اس کی حد درجہ خوب صورتی تھی' ایسی خوب صورتی جو منصور حسین نے اپنی اٹھتیس سالہ زندگی میں آج تک نہیں دیکھی تھی' بلکہ جو دیکھی تھی وہ ساری خوب صورتی ایک طرف اور علیزے آفندی کی خوب صورتی ایک طرف تھی' بلکہ پھر بھی دیکھا جاتا تو علیزے کے حسن کا پلڑا بھاری ہی رہتا' کیونکہ وہ بلاشک و شبہ ایک حسین ترین لڑکی تھی۔ اس کی دودھیا رنگت سے لے کر زعفرانی ہونٹوں تک دلکشی کی بہاریں سجدہ ریز ہوتی نظر آتی تھیں' اس کے معصوم رخساروں پہ کئی دلوں کی دھڑکنیں بوسہ دیتی تھیں اور کئی دل اس کی نوک پلک پہ ٹھہر جاتے تھے' شیشے سی

شفاف آنکھوں میں کوئی اپنا عکس دیکھ لیتا تو اپنی دنیا ہار دیتا اور اسی دنیا کے خوف سے وقار آفندی اسے چھپا کے' سنبھال سنبھال کے رکھتے تھے اور اسے دیکھ کر یہ اعتراف کرنا پڑتا تھا کہ واقعی وہ ایسی چیز تھی جس کی حفاظت کرنا ضروری تھا اور یہ بھی ضروری تھا کہ اسے سینت سینت کے رکھا جاتا اور الگ پروٹوکول دیا جاتا' لیکن حیرت کی بات تھی کہ اس بار وقار آفندی نے اسے چھپا چھپا کے رکھنے کی بجائے سب کے ساتھ ٹرپ پہ بھیج دیا تھا۔

"تو پھر صاحب نے آپ کو ٹرپ پہ کیوں بھیج دیا؟" منصور حسین کے ذہن میں آئے سوال کو رجو نے زبان دے دی۔

"وہ تو اب بھی نہیں بھیج رہے تھے' بس میں نے تھوڑی ضد کی اور تھوڑا آذر بھائی نے ساتھ دیا تو مجبوراً انہیں ماننا پڑا۔" علیزے کی ایک اور بڑی خوبی تھی کہ وہ حد سے زیادہ معصوم اور سادہ تھی' نیک نیت اور صاف دل لڑکی تھی' رجو کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے بھی اس کی معصومیت ہنوز تھی۔

"بڑے صاحب آپ سے پیار بھی تو بہت کرتے ہیں' ان کی تو جان ہے آپ میں۔" رجو نے مسکرا کے کہا تھا۔ جواباً علیزے بھی مسکرائی۔

"میری بھی جان ہے ان میں' ان جیسا باپ کوئی ہو ہی نہیں سکتا' وہ ہیں تو میں ہوں' میرے بابا میرا فخر ہیں۔" علیزے کے چہرے پہ محبت کے سائے اتر آئے تھے اور وہ بے ساختہ اپنا سیل فون اٹھا کر انہیں میسج لکھنے لگی اور پھر "آئی مس یو اور آئی لو یو" کے کئی میسج ایک ساتھ وقار آفندی کے نمبر پہ سینڈ کر ڈالے تھے' جن کے فوری بعد ان کی کال آگئی تھی۔

"رئیلی بابا! میں پہلی بار شہر سے باہر جارہی ہوں' بہت عجیب بھی لگ رہا ہے اور بہت اچھا بھی' لیکن اس کے باوجود میں آپ کو بہت مس کررہی ہوں' ابھی رجو کے ساتھ بھی آپ کی ہی باتیں کررہی تھی۔" علیزے شاید پہلی بار اتنے جوش سے بول رہی تھی' دوسری طرف وقار آفندی ہنس رہے تھے کہ ان کی بیٹی کو باہر جاکر بولنا آگیا ہے۔

"آئی لو یو بابا۔" علیزے نے بے ساختہ اظہار کیا تھا اور اس کے ایسے پرجوش سے انداز پہ منصور حسین نے بلا ارادہ ہی اسے بیک ویو مرر سے دیکھا تھا' وہ بے پناہ خوش تھی اور سچی خوشی کے رنگ اس کے پورے چہرے پہ بکھرے ہوئے تھے۔

"اللہ نظر بد سے بچائے۔" منصور حسین نے دل ہی دل میں کہتے ہوئے گاڑی کی اسپیڈ بڑھادی تھی' کیونکہ آذر پیچھے سے ہارن پہ ہارن دے رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"نگارش۔۔۔ نگارش۔۔۔ کہاں ہو؟ یہ دروازہ کیوں کھلا ہوا ہے؟" شام سات بجے عبداللہ گھر آیا تو گھر کا دروازہ خلاف معمول کھلا ہوا ملا تھا۔ جس پہ اسے اچھی خاصی تشویش ہوئی تھی۔

"نگارش۔۔۔" وہ نگارش کو پکارتا ہوا آرہا تھا۔

"کہاں ہو تم؟ اور یہ دروازہ۔۔۔" جیسے ہی عبداللہ نے ڈرائنگ روم میں قدم رکھا تھا اس کی زبان کو بریک لگ گئے تھے۔ کیونکہ سامنے کا منظر ہی کچھ ایسا تھا' ناقابل یقین۔

ملک اسد اللہ اپنی تختی اور جاہ جلال سمیت سامنے ہی صوفے پہ براجمان تھے اور ان کے مقابل والے صوفے پہ زری اور نگارش خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی تھیں' یوں جیسے انہوں نے باندی بنا کے بٹھا رکھا ہو۔ لیکن اس ساری سچویشن سے ہٹ کے عبداللہ مرد تھا' مضبوط اعصاب کا مالک' اس نے چند سیکنڈ میں ہی اپنے تمام تاثرات

کور کر لیے تھے' وہ کوئی بھی گھبراہٹ اور بوکھلاہٹ ظاہر کر کے انہیں خود پہ حاوی ہونے کا موقع فراہم نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے سمجھ داری کا ثبوت دیتے ہوئے اس نے حیرت کے باوجود بھی اپنی حیرت ظاہر نہیں کی تھی' بلکہ ایک دم پرسکون اور مطمئن سا نظر آنے لگا تھا' تب ہی قدم آگے بڑھا دیے تھے۔

"السلام علیکم۔" وہ اس سے بغل گیر ہونے کے لیے نہیں اٹھے تھے' بس ہاتھ ملا کر مصافحہ کرنے پہ اکتفا کیا تھا۔

"والسلام! کیسے ہو؟"

"اللہ کا احسان ہے' ٹھیک ٹھاک ہوں' آپ سنائیں آج ہمارے غریب کدے کو رونق کیسے بخش دی؟" عبداللہ بریف کیس ٹیبل پہ رکھ کے صوفے پہ بیٹھ چکا تھا۔

"بس پاکستان میں گرمی اور لوڈشیڈنگ ہو رہی تھی' اس لیے سوچا ہم بھی ذرا انگلینڈ کی فضاؤں سے لطف اٹھا لیں۔" وہ صوفے کے ہتھے پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے تھے۔

"اور یقیناً" آپ نے ابھی تک انگلینڈ کی فضاؤں سے لطف نہیں اٹھایا ہوگا؟" عبداللہ خفیف سا مسکرایا تھا۔

"اٹھائیں گے' سارے لطف اٹھائیں گے' پہلے تم لوگوں سے مل ملا تو لیں۔" ان کا انداز مبہم سا تھا۔

"اوکے! ملنا بھی ہوتا رہے گا' پہلے آپ یہ بتائیں کہ کھانا وغیرہ کھایا آپ نے؟" عبداللہ ساری باتیں چھوڑ کے مہمان نوازی پہ اتر آیا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے کھانے کی' کھانا ہم وہیں سے کھائیں گے جہاں سے پچھلے دو دن سے کھا رہے ہیں۔" انہوں نے انکار کر دیا تھا۔

"یعنی آپ کو یہاں آئے ہوئے دو دن ہو گئے ہیں؟" عبداللہ نے پوائنٹ کی بات نوٹ کی تھی۔

"بالکل۔۔۔"

"تو دو دن پہلے کیوں نہیں بتایا آپ نے؟"

"بس کوئی ضروری کام نبٹانا تھا۔"

"تو نبٹ گیا کام؟"

"ایک نبٹ گیا ہے اور ایک رہ گیا ہے۔" انہوں نے کہتے ہوئے نظریں زری پہ جما دی تھیں اور عبداللہ ان کی بات اور ان کی نظروں کا مفہوم با آسانی سمجھ گیا تھا۔

"جو رہ گیا ہے اسے رہنے ہی دیں۔"

"کیوں؟ آخر کیوں رہنے دیں؟"

"کیونکہ اسی میں آپ کی بھلائی ہے۔" عبداللہ نے کھلم کھلا انہیں دھمکی دی تھی اور ان کا بیٹھے بیٹھے خون کھول اٹھا تھا' وہ یک دم دھاڑ اٹھے تھے۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ کریں)

نبیلہ عزیز

دردِ دل

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نبیل حیات دو ہی بہن 'بھائی ہیں 'مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے 'وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پہ رنگ چکی ہے 'جس کے پیش نظر فائزہ بیگم 'نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں 'لیکن مدحیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے 'جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے 'مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے 'مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا 'بے بسی اور مجبوری سے تنگ آ کر خود کشی کرنے کا سوچتا ہے 'لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باؤ امتیاز مل جاتا ہے 'جو اسے کام کی آفر کرتا ہے 'جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے 'اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے 'وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے 'وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے 'وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے 'اس نے

کبھی ہارنا نہیں سیکھا 'اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔

۱۶

سولہویں قسط

تم ہمیں دھمکی دے رہے ہو ہمیں..... ؟ملک اسد اللہ کو؟" ان کی بلند اور گرجدار آواز درودیوار ہلا دینے کی پوری صلاحیت رکھتی تھی لیکن اس وقت تو ان کی آواز نے درودیوار کے ساتھ ساتھ زری اور نگارش کو بھی دہلا کے رکھ دیا تھا کیونکہ ان کی خونخوار آنکھوں میں حقیقتاً" خون اترا ہوا تھا وہ تو جیسے ان تینوں کو اپنی آنکھوں سے ہی نگل جانے کے درپے ہو رہے تھے اور ان کا پہلا ہدف عبداللہ ہی تھا۔

"ہمارے درمیان ایسی تو کوئی بات ہی نہیں ہوئی جس پہ میں آپ کو دھمکی دوں گا۔" عبداللہ نے کندھے اچکاتے ہوئے لاپروائی سے کہا۔

"بات نہیں ہوئی لیکن تم نے بات کا اشارہ ضرور دیا ہے۔" وہ غصے سے چبا کر بولے تھے۔

"اوہ! تو آپ اشارہ بھی سمجھتے ہیں؟" اس نے حیرانی کا اظہار کیا جس پہ ملک اسد اللہ اور بھی بھڑک اٹھے۔

"تم کہنا کیا چاہتے ہو.....؟" ان کا مزاج برہم اور تیور خاصے خطرناک ہو رہے تھے۔

"آپ خود سمجھ دار ہیں، میرا اشارہ سمجھ چکے ہیں کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں بالکل ایسے جیسے میں آپ کا اشارہ سمجھ چکا ہوں کیونکہ میں بھی آپ کا ہی بھائی ہوں، سمجھ داری ورثے میں ملی ہے۔" عبداللہ کا اطمینان اور سکون برقرار تھا۔

"لیکن تمہاری سمجھ داری کا وقت ختم ہو چکا ہے، اب ہماری باری ہے، اب وہی ہو گا جو ہماری سمجھ داری کہے گی۔" انہوں نے دائیں ہاتھ سے اپنی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا! تو پھر کیا کہتی ہے آپ کی سمجھ داری؟ کیا ہونا چاہیے؟" وہ بھنویں سکیڑتے ہوئے انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"بتائیں تمہیں کہ ہماری سمجھ داری کیا کہہ رہی ہے.....؟" وہ سختی سے پوچھ رہے تھے۔

"جی حضور! میں ہمہ تن گوش ہوں۔" عبداللہ نے فوراً" اثبات میں سر ہلایا۔

"تم دونوں اندر جاؤ۔" انہوں نے زری اور نگارش کو بیڈ روم میں جانے کا اشارہ کیا۔

"نہیں! یہ دونوں کہیں نہیں جائیں گی، یہیں رہیں گی، یہ دونوں پڑھی لکھی اور سمجھ دار لڑکیاں ہیں، چھوٹی بچیاں نہیں ہیں کہ ان سے کوئی بڑی بات چھپائی جائے، آپ نے جو بات کہنی ہے صاف صاف کہیے، ہم سب سن رہے ہیں۔" عبداللہ نے ان دونوں کو جانے سے روک دیا تھا حالانکہ زری وہاں سے اٹھ جانا چاہتی تھی اس کی جان سولی پہ لٹکی ہوئی تھی وہ ایسی سنگین سچویشن فیس نہیں کر سکتی تھی اس کی حالت غیر ہو رہی تھی لیکن نگارش وہاں سے اٹھنے کے لیے تیار نہیں تھی وہ ان دونوں بھائیوں کی جنگ لائیو دیکھنا چاہتی تھی کیونکہ معاملہ بہت نازک اور گمبھیر ہو چکا تھا۔

"تم سب سن نہیں رہے بلکہ یہ کہو کہ تم سب بے حیا ہو گئے ہو، بے غیرت ہو گئے ہو تم۔" وہ عبداللہ کی سمت دیکھتے ہوئے غضب ناک انداز میں دھاڑے تھے۔

"خبردار بھائی صاحب! بہت ہو گئی عزت اور غیرت کی تکرار..... میں آپ کو مزید اپنی انسلٹ کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا، میں اگر بے غیرت ہوں تو آپ کہاں کے غیرت مند ہیں..... ؟ کیا ملک حق نواز کے ہاتھ میں اپنی بہن کا ہاتھ تھما دینا غیرت کہلاتا ہے آپ کی نظر میں، وہ ملک حق نواز جو سات سال پہلے آپ کی ہمشیرہ شہرین بی بی کا ہاتھ آپ کی کوشش کے باوجود دھتکار چکا ہے، ٹھکرا چکا ہے آپ کی بہن کو اور آپ اب اسی ملک حق نواز کے ہاتھ میں اپنی دوسری بہن کا ہاتھ تھمانا چاہتے ہیں..... ؟ کیا یہی غیرت مندی کا ثبوت ہے..... کیا میں بھی آپ جیسا غیرت مند بن جاؤں؟ نام نہاد غیرت مند، جس نے اپنی جاگیر اور اپنی پارٹی بڑھانے کے لیے اپنی بہنوں کی زندگیاں برباد کرنے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے.....؟

اگر آپ کو اپنی بہنوں سے کوئی ذاتی پرخاش تھی تو آپ کو چاہیے تھا کہ آپ انہیں زہر دے کر مار دیتے کم از کم وہ ایسی ذلت کی زندگی جینے سے تو بچ جاتیں۔" اب کی بار عبداللہ نے جواب دیا تو انہی کے سے انداز میں، وہ سیر کو سوا سیر ثابت ہوا تھا۔

"جس کی قسمت جس کا مقدر جہاں لکھا ہو گا وہیں شادی ہو گی نا؟ اس میں ہمارا کیا قصور ہے..... ؟ ہر انسان کا نصیب تو پہلے سے لکھا جا چکا ہے۔" ملک اسد اللہ نے جیسے دامن جھاڑا تھا اور سارا الزام ان کی قسمت اور ان کے نصیب کے ذمے ڈال دیا تھا۔

"ہونہہ! اگر ہر انسان کا نصیب اس کا مقدر پہلے سے لکھا جا چکا ہے تو پھر آپ کو اتنا تردد کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ سب کچھ مقدر پہ چھوڑ دیں، جو جس کا مقدر ہو گا اسے مل جائے گا....." عبداللہ نے انہیں لاجواب کر ڈالا تھا لیکن وہ پھر بھی ہار ماننے والے نہیں تھے۔

"لیکن زرین ملک کا نصیب ملک حق نواز کے ساتھ لکھا جا چکا ہے اور اس نصیب کو جڑنے سے کوئی نہیں روک سکتا، نہ تم، نہ کوئی اور۔" انہوں نے اک قہر بھری نظر عبداللہ پہ اور دوسری زری پہ ڈالی تھی وہ ساکت و صامت سی بیٹھی تھی، ملک حق نواز کا نام اس کے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی مانند اترا تھا، شہرین کو ٹھکرانے والے کے ساتھ زرین کو جوڑا جا رہا تھا، یہ رشتہ تھا یا عمر بھر کا پھندا.....؟

"ملک حق نواز ایک بار مرے اور دوبارہ پیدا ہونے کے بعد ہر گناہ سے پاک صاف ہو کر بھی سامنے آئے تو میں تب بھی اپنی بہن کا نصیب اس کے ساتھ جڑنے نہیں دوں گا، آپ چاہے جتنے مرضی جتن کر لیں، زری کی شادی ملک حق نواز کے ساتھ ہر گز نہیں ہو گی، چاہے اس کے لیے آپ مجھے گولی مار دیں۔" عبداللہ نے دوٹوک کہتے ہوئے انہیں اپنا فیصلہ سنا دیا تھا اور ملک اسد اللہ اپنی جگہ سے اٹھ کر عبداللہ کے سامنے آ کھڑے ہوئے تھے۔

"ضد اور انا کا مسئلہ آ جائے تو گولی مارنا ہمارے لیے مشکل بھی نہیں ہے ملک عبداللہ صاحب، سامنے چاہے تم جیسا جوان گھبرو بھائی ہو، چاہے زرین ملک جیسی جوان بہن ہو، ہماری گولی بس نشانہ دیکھتی ہے، رشتہ یا تعلق نہیں دیکھتی۔" انہوں نے عبداللہ کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے دبایا تھا۔

"اور آپ کو یہ بھی پتا ہو گا کہ گولی سے ڈرنے والے جراثیم ہم میں بھی نہیں ہیں، اگر آپ حق بات کو ضد اور انا کا مسئلہ بنا رہے ہیں تو ایسے ہی سہی۔" اس نے کندھے اچکائے تھے۔

"اسے پاکستان بھیجو، سارے فیصلے خود بخود ہو جائیں گے۔"

"اسے پاکستان بھیجوں گا نہیں، اسے پاکستان لے کر جاؤں گا، خود اپنے ساتھ۔" عبداللہ نے اپنی طرف اشارہ کیا اور ملک اسد اللہ چونک اٹھے تھے وہ خود پاکستان جانے کا کہہ رہا تھا تو گویا وہ واقعی اس مسئلے میں پوری طرح ٹانگ اڑانا چاہتا تھا۔

"تم پاکستان جاؤ گے؟"

"جی! آپ کو کوئی اعتراض ہے؟"

"تم حویلی میں قدم بھی نہیں رکھ سکتے۔"

"تو آپ سے کس نے کہا کہ میں حویلی میں قدم رکھوں گا؟" عبداللہ کا انداز ان سے بھی زیادہ روکھا اور نپا تلا سا تھا۔ وہ اس کی بات پہ ایک بار پھر چونکے تھے۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"میرا مطلب کیا ہو سکتا ہے بھائی صاحب، مطلب تو سارے آپ کے ہوتے ہیں، آپ لوگوں نے ہی تو شرط رکھی ہے کہ میں اپنی بیوی کو طلاق دوں گا تو تبھی حویلی میں قدم رکھ سکوں گا، اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ میں اپنی بیوی

کوطلاق دوں اور یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ میں حویلی میں قدم رکھ سکوں، لیکن اس بات پہ تو پابندی نہیں ہے نا کہ میں پاکستان میں بھی قدم نہیں رکھ سکتا۔ اتنا بڑا پاکستان آخر کس کام آئے گا؟ پاکستان میں ولی آور شاہ اور نبیل حیات کے اپنے گھر ہو سکتے ہیں تو ملک عبداللہ کا اپنا گھر بھی ہو سکتا ہے اور اس گھر میں ملک عبداللہ کی بہن ساری زندگی بھی رہنا چاہے تو باآسانی رہ سکتی ہے، اپنی بہن کا بوجھ اٹھا سکتا ہوں میں، اللہ کے کرم سے۔ بہت دم ہے بازوؤں میں، کمزور یا لاغر نہیں ہوں۔" عبداللہ نے انہیں اپنے ارادوں سے آگاہ کیا تھا..... اور وہ تپ گئے تھے۔

"تم غلط کر رہے ہو ملک عبداللہ، اپنوں سے ٹکر لینے میں ہمیشہ نقصان ہوتا ہے۔"

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں آپ سے کہ اپنے سے ٹکر نہ ہی لیں تو اچھا ہے، ورنہ نقصان ہی ہوگا۔" وہ بھی ان کی باتوں کے گھیرے میں آنے والا نہیں تھا۔

"ہم یہاں زرین کو لینے کے لیے آئے ہیں اور اپنے ساتھ لے کر ہی جائیں گے، تم چاہے کچھ بھی کرلو۔" انہوں نے دانت پیس کے کہا اور اپنا رخ زری کی سمت موڑ لیا تھا۔

"اور تم بھی کان کھول کر سن لو، آج تمہارا پہلا پیپر تھا، اسی لیے ہم آج تمہیں یہی بتانے آئے ہیں کہ ہم تمہارے آخری پیپر کا انتظار کر رہے ہیں، ختم کرو یہ پڑھائی کا بکھیڑا اور واپس پاکستان چلو، ورنہ کیا ہوگا تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔" وہ کہہ کر پلٹے اور ڈرائنگ روم سے نکل گئے تھے عبداللہ چاہنے کے باوجود انہیں روک نہیں سکا تھا اور زری ان کی دھمکی پہ خاک کا ڈھیر ہو گئی تھی اس کا جسم سوکھے پتے کی طرح لرز رہا تھا نگارش الگ پریشان تھی اور عبداللہ ڈرائنگ روم کے بیچوں بیچ کھڑا گہری سوچ کا شکار تھا، اسے اپنے سامنے ایک کھلی جنگ نظر آرہی تھی اور ضد اور انا کی اس جنگ میں کیا نفع تھا کیا نقصان؟ یہ تو کوئی نہیں جانتا تھا۔

☼ ☼ ☼

"بھائی..... کیا دیکھ رہے ہیں آپ.....؟" جودت نے سامنے ونڈ اسکرین پہ نظریں جمائے ڈرائیو کرتے آذر سے سوال کیا تھا۔

"کیا مطلب.....؟" آذر نے ذرا کی ذرا گردن موڑ کر جودت کو دیکھا جو اس کے برابر ہی فرنٹ سیٹ پہ بیٹھا ہوا تھا

"مطلب کہ منصور حسین ڈرائیونگ میں کمال کی مہارت رکھتا ہے، اس کی ڈرائیونگ دیکھ رہے ہیں آپ.....، گاڑی روڈ پہ نہیں پانی پہ پھسلتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے، لگتا ہے۔ بہت ماہر ہے اس چیز میں؟" جودت پچھلے تین گھنٹے سے اس فرنٹ سیٹ پہ بیٹھا یہی ایک چیز نوٹ کر رہا تھا اور آخر سراہے بغیر رہ نہیں سکا تھا۔

"ہوں! میں بھی یہی دیکھ رہا تھا، واقعی بہت مہارت ہے اسے، اور اس کی مہارت نظر بھی آرہی ہے، جس رش سے گاڑی نکالنا ہمارے لیے بھی مشکل ہو جاتا ہے، وہ وہاں سے بھی آسانی سے نکل جاتا ہے، اس نے ایک بار بھی گاڑی کے ٹائروں کو بے ربط نہیں ہونے دیا، بالکل برابر جا رہے ہیں۔" آذر نے بھی اس کی تعریف کرتے ہوئے بخل سے کام نہیں لیا تھا بلکہ کھل کر سراہا تھا..... ان دونوں بھائیوں کی نظریں سامنے روڈ پہ پھسلتی علیزے کی گاڑی پہ ہی تھیں جو کبھی کبھی تیز رفتاری کی وجہ سے ان کی آنکھوں سے اوجھل بھی ہو جاتی تھی۔

"آخر ڈرائیور کس کا ہے؟ مہارت تو ہوگی..... ؟ ڈیڈ نے بھی تو چن کے ڈرائیور رکھا ہوگا اسے۔" جودت مسکرا کے کہہ رہا تھا۔

"بھائی.....!" حرمت نے آذر کو پکارا۔

"جی؟"

"آپ نے ... اسٹاپ ... [illegible] ......!"

"کیوں.....؟"

"وہ کومل کو بھوک لگی ہے، کچھ کھانا چاہتی ہے۔" حرمت نے آہستگی سے بتایا۔

"کومل کو بھوک لگی ہے..... ؟ تمہیں کیسے پتا؟ ان کی گاڑی تو پیچھے آرہی ہے.....؟" آذر نا سمجھی سے پوچھ رہا تھا۔

"اس نے میرے نمبر پہ میسج کیا ہے۔" حرمت نے کومل کے بتانے کا ذریعہ بتایا۔

"اوہ اچھا..... " آذر نے سمجھتے ہوئے سر ہلایا تھا۔

"کومل آپا غصے کی بہت تیز اور بھوک کی بہت کچی ہیں، اس لیے جلدی انتظام کریجیے بھائی جی۔" حرمت نے ہنستے ہوئے چھیڑا تھا لیکن آذر اس کی ذو معنی بات کی گہرائی تک نہیں جا سکا تھا بلکہ اس کا انداز بہت سرسری سا تھا۔

"اب تو اسلام آباد پہنچ کر ہی کچھ ہوگا، یہاں نزدیک تو کوئی ریسٹورنٹ نہیں ہے۔" آذر نے نفی میں گردن ہلائی۔

"اسلام آباد پہنچنے میں کتنا ٹائم ہے۔" حرمت نے کومل کا دوسرا میسج پڑھ کے آذر سے پوچھا تھا۔

"بس تھوڑا ٹائم ہی رہ گیا ہے۔" آذر نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا اور اسے تسلی دی تھی۔

"بھوک تو مجھے بھی لگ رہی ہے اور اسلام آباد کے سیور سے کھانا کھانے کا موڈ ہو رہا ہے۔" جودت نے انگڑائی لیتے ہوئے سستی سے کہا۔

"سیور کا کھانا نہیں بریانی مشہور ہے اور بریانی بھی ہر قسم کی۔" آذر نے اس کی بات کی تصحیح کی تھی۔

"جی ہاں! میں بھی بریانی کھانے کا ہی کہہ رہا تھا وہاں کی بریانی ہی تو مشہور ہے۔" جودت بھی جانتا تھا کیونکہ اپنے دوستوں کے ساتھ وہ پہلے بھی کئی بار اس طرف آیا تھا اور ہمیشہ وہ لوگ سیور پہ ضرور جاتے تھے۔

"چلو پھر آج سیور پہ ہی سہی۔" آذر بھی وہیں جانے پہ آمادہ تھا اور گاڑی کی اسپیڈ بڑھادی تھی اور ساتھ ہی موبائل اٹھا کر منصور حسین کو بھی سیور پہ جانے کی اطلاع دی تھی تاکہ وہ اسی سائیڈ پہ ٹرن لے، اس نے سعادتمندی سے اوکے کہتے ہوئے فون بند کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

سیور سے اپنی پسند کی بریانی کھانے کے بعد ان لوگوں نے بکرز کا رخ کیا تھا جو سیور سے زیادہ دور نہیں تھا وہاں کی کولڈ کافی آذر کو بہت پسند تھی وہ جب بھی کسی کام کے سلسلے میں اسلام آباد آتا تھا بکرز سے کافی پیے بغیر نہیں جاتا تھا وہ چاروں گاڑیاں پارکنگ میں پارک کرنے کے بعد گاڑیوں سے اتر آئے تھے البتہ لڑکیاں گاڑیوں میں ہی بیٹھی ہوئی تھیں۔ آذر نے پارکنگ میں پھرتے ویٹرز کو آرڈر لینے کے لیے گاڑیوں کی سمت اشارہ کیا ویٹرز مینو بک ہاتھ میں لیے الرٹ کھڑے تھے اشارہ ملتے ہی سر خم کر دیا اور فوراً ہی گاڑیوں کی سمت بڑھ گئے، البتہ آذر خود علیزے کی گاڑی کی سمت آگیا۔ منور حسین نے آذر کو دیکھتے ہی علیزے کی سائیڈ کا شیشہ فولڈ کر دیا تھا۔

"کافی پیو گی....." اس نے کھڑکی میں جھکتے ہوئے علیزے سے پوچھا۔

"آپ کو پتا ہے میں کافی نہیں پی سکتی، اتنی کڑواہٹ مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔" اس نے منہ بنایا تھا۔

"کولڈ کافی ہے یار....." آذر مسکراتے ہوئے اسے کافی پینے پہ آمادہ کر رہا تھا۔

"ہے تو کافی نا.....؟" وہ کافی پینے کو تیار نہیں تھی۔

"یار! بہت بزدل ہو تم، کافی پینے سے بھی ڈرتی ہو، ایک بار ٹرائی کر کے تو دیکھو۔" وہ اسے اکسا رہا تھا۔

"اوکے! لے آئیں۔" بالآخر وہ مان گئی تھی۔
"منصور حسین! تم کیا لوگے؟"
"ضرورت نہیں ہے صاحب جی ابھی تو کھانا کھایا ہے۔" اس نے انکار کر دیا تھا۔
"اوکے۔" آذر پلٹ کر اندر چلا گیا احمد 'حماد' جودت 'دانیال اور زین پانچوں اس کے پہنچنے تک اپنا آرڈر تیار کروا چکے تھے۔
"ایک کپ علیزے کے لیے بھی۔" دانیال کے ہاتھ سے اپنا کپ تھامتے ہوئے آذر نے دانیال کو ایک اور کپ تیار کروانے کا کہا۔
"علیزے اور کافی..... ؟ دو متضاد چیزیں ہیں یار؟" دانیال کو حیرانی ہوئی۔
"آئی نو یار! بٹ میں نے کہا ہے تو وہ ضرور پیے گی۔" آذر کافی کے بڑے سے کپ میں اسٹرا اور اسپون انسرٹ کرتے ہوئے مسکرا کے بولا۔
"اوہ! تو وہ تمہارے کہنے پہ کافی پی رہی ہے..... ؟" دانیال نے آذر کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے کافی ذو معنی لہجے میں پوچھا تھا۔
"کیوں نہیں پینی چاہیے؟" الٹا آذر نے اس سے پوچھ لیا تھا۔
"ارے نہیں نہیں یار! پینی چاہیے ضرور پینی چاہیے 'لیکن یار اتنا ضرور یاد رکھنا کہ ابھی آدھا سفر باقی ہے 'کوئی مسئلہ نہ کھڑا ہو جائے۔" دانیال بھی اپنے آئس شیک سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہہ رہا تھا۔
"ڈونٹ وری یار! میں نے سوچا وہ پہلی بار ہمارے ساتھ آئی ہے 'کھائے پیئے انجوائے کرے 'صرف گھومنا پھرنا ہی تو ایڈونچر نہیں ہے 'اس کے لیے تو کافی پینا بھی ایڈونچر ہی ہو گا۔" آذر 'علیزے کو اس ٹرپ کے تمام رنگ قریب سے دکھانا اور انجوائے کروانا چاہتا تھا اور اس کے لیے ضروری تھا کہ اسے اپنے ساتھ ہر کام میں شامل کیا جاتا چاہے زبردستی اور اصرار کر کے ہی سہی۔
"لیجیے میم! آپ کی کافی۔" آذر نے علیزے کی سائیڈ پہ کھڑکی میں جھکتے ہوئے کہا تھا۔
"تھینکس۔" علیزے نے مسکراتے ہوئے کپ تھام لیا تھا۔
"اوکے انجوائے کرو۔" آذر تمام آرڈرز کا بل پے کرنے کے لیے واپس پلٹ گیا تھا۔
لیکن جیسے ہی علیزے نے اسٹرا کے ذریعے کولڈ کافی اپنے حلق سے نیچے اتاری تھی اس کے چہرے کے زاویے بگڑ گئے تھے اسے یوں لگا جیسے اس نے زہر پی لیا ہو اسے بہت زور کی ابکائی آئی تھی وہ اک جھٹکے سے گاڑی کا دروازہ کھول کے نیچے اتر آئی اس نے منہ میں بھرا ہوا مشروب نیچے اگل دیا تھا اور کڑواہٹ کی وجہ سے اس کے منہ کا ذائقہ بھی خراب ہو گیا اور اسے ابکائی آنے لگی تھی اس کی زور زور سے ابکائی کی آواز پہ اندر کی سمت بڑھتا آذر یکدم کرنٹ کھا کے پیچھے کی طرف پلٹا تھا۔
"علیزے۔" وہ اسے پارکنگ کے فٹ پاتھ کے قریب جھکی ابکائی کرتی ہوئی نظر آئی تھی اور وہ اسے دیکھ کر گھبرا گیا تھا۔
"اوہ مائی گاڈ! یہ میں نے کیا کر دیا؟" وہ اپنے آپ کو سرزنش کرتے ہوئے لپک کے اس کے قریب آیا تھا اتنے میں رجو بھی گاڑی سے نکل کر علیزے کو تھام چکی تھی۔
"کیا ہوا علیزے؟ تم ٹھیک تو ہو؟" آذر نے اس کا دوسرا بازو تھام لیا تھا۔
"وہ..... وہ کافی اتنی کڑوی۔" علیزے کو اپنی زبان 'اپنا منہ بے حد کڑوا محسوس ہو رہا تھا۔
"رجو! گاڑی سے پانی کی بوتل لے کر آؤ۔" آذر نے رجو کو اشارہ کیا۔

"جی صاحب..... " رجو لپک کے گاڑی کے اندر گھس گئی اور فوراً پانی کی بوتل نکال لائی تھی۔
"یہ لو۔" آذر نے ڈھکن کھول کر بوتل اس کی سمت بڑھا دی اور علیزے نے کلی کرنے کے بعد پانی پیا تھا لیکن اس کے منہ کا ذائقہ پھر بھی بہتر نہیں ہوا تھا۔
"کیا ہوا ہے اسے؟" اتنے میں دانیال اور جودت وغیرہ بھی وہیں آ گئے تھے..... وہ علیزے کی سمت متفکر سی نظروں سے دیکھ رہے تھے آذر نے ایک ہاتھ میں منرل واٹر کی بوتل تھام رکھی تھی اور دوسرے ہاتھ سے اپنی جیب سے رومال نکال کے اس کی سمت بڑھا رہا تھا..... نیچے فرش پہ کولڈ کافی کا کپ اوندھا پڑا تھا جس کی وجہ سے فرش گندا ہو رہا تھا عجیب سی سچویشن تھی یہاں لیکن دانیال بغیر بتائے ہی جان چکا تھا کہ یہاں کیا ہوا ہے۔
"میں نے کہا تھا نا آذر صاحب! ابھی آدھا سفر باقی ہے..... ؟" دانیال نے اسے متوجہ کرتے ہوئے چوٹ کی تھی اور کافی چھیڑنے والے انداز میں اسے دیکھا تھا۔
"یہ باتیں بعد میں کرنا پہلے اس کے لیے جوس لے کر آؤ۔" آذر نے دانیال کو گھور کے دیکھا تھا اور دانیال مسکرا دیا..... وہ کندھے اچکا کر پلٹ کے اندر چلا گیا تھا۔
"کیا ہوا ہے علیزے کو..... ؟" عائشہ آفندی ان کو علیزے کی گاڑی کے قریب کھڑے دیکھ کر اپنی گاڑی سے اتر آئی تھیں۔
"کچھ نہیں ہوا پھوپھو 'ٹھیک ہے یہ۔" آذر خود ہی سب کو تسلیاں دے رہا تھا کیونکہ غلطی اس سے ہوئی تھی اس لیے ہینڈل بھی اسی نے کرنی تھی اور علیزے 'آذر کے چہرے کے گھبرائے ہوئے تاثرات دیکھ کر اس کی پریشانی سمجھ گئی تھی اس لیے اسے اس گھبراہٹ اور پریشانی سے نکالنے کے لیے اسے اپنا آپ کنٹرول کرنا پڑا تھا۔
"لیکن کچھ تو ہوا ہے نا..... ؟" عائشہ آفندی بھی پریشان ہو چکی تھیں۔
"الس اوکے پھوپھو! میں بالکل ٹھیک ہوں 'بس یہ تھوڑی سی کافی پی ہے تو اچھی نہیں لگی 'اس لیے آذر بھائی نے اب جوس منگوایا ہے۔" علیزے نے انہیں مطمئن کرنے کے لیے خود انہیں تسلی دی تھی۔
"لیجیے جناب جوس حاضر ہے۔" دانیال جوس لے کر بہت جلدی واپس آیا تھا۔
"تھینک یو..... " علیزے نے مسکراتے ہوئے کہا اور جوس کا مگ تھام لیا تھا۔
"اسی طرح مسکراتی رہا کرو یار 'تمہاری ذرا سی تکلیف ہماری جان نکال دیتی ہے۔" دانیال بھی جواباً "مسکرا کے بولا تھا۔
"میں بہت کوشش کرتی ہوں کہ آپ لوگوں کی جان نہ نکالوں 'مگر پھر بھی..... " وہ جملہ ادھورا چھوڑتے ہوئے دلچسپی اور شرارت سے ہنس پڑی تھی۔
"مگر پھر بھی نکال ہی دیتی ہو۔" دانیال اس کا ادھورا جملہ مکمل کرتے ہوئے یکدم قہقہہ لگا کے ہنسا تھا جس پہ علیزے 'عائشہ آفندی 'آذر اور جودت بھی اپنی مسکراہٹ روک نہیں پائے تھے۔
"آپ لوگ گاڑی میں بیٹھیں میں تب تک بل کلیئر کروا کے آتا ہوں۔" آذر کہہ کے وہاں سے چلا گیا اور گاڑیوں سے نکلی ہوئی عوام دوبارہ اپنی اپنی جگہ سنبھال چکی تھی لیکن اپنی گاڑی کی طرف بڑھتی ہوئی علیزے کو دیکھ کر جودت کے دل میں نہ جانے کیا سمائی کہ وہ اس سے لفٹ مانگ بیٹھا تھا۔
"کیا میں بھی مرسیڈیز کا مزا لے سکتا ہوں؟" وہ شرارت سے کہتے ہوئے علیزے سے پوچھ رہا تھا۔
"ارے کیوں نہیں جودت بھائی 'آپ ہمیں جوائن کر سکتے ہیں۔" علیزے خوش ہو کر بولی تھی اسے اپنے سارے کزنز سے محبت تھی کیونکہ سب کزنز کو اس سے جو محبت تھی اتنا چاہتے تھے اسے.....! منصور حسین نے گاڑی کی لیفٹ سائیڈ کی طرف جھکتے ہوئے فرنٹ ڈور کھول دیا تھا۔

"آہا! اس میں بیٹھنے کا تو مزا ہی کچھ اور ہے۔" جودت نے کھل کے اظہار کیا تھا۔

"گاڑی نکالو منصور حسین۔" آذر نے اندر سے آتے ہی ان لوگوں کو نکلنے کا سگنل دیا تھا اور منصور حسین نے گاڑی کے شیشے چڑھاتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کرلی تھی۔

"اب کہاں چلنا ہے صاحب.....؟" منصور حسین نے گاڑی روڈ پہ ڈالنے سے پہلے جودت سے پوچھا تھا۔

"مجھ سے نہیں، اپنی میڈم سے پوچھو، میں تو اس گاڑی میں مہمان ہوں۔" جودت نے لاپروائی سے کہتے ہوئے کندھے اچکائے تھے اور منصور حسین کی نظروں کا اور سوال کا رخ علیزے کی طرف ہو گیا تھا اس نے بیک ویو مرر سے علیزے کی سمت دیکھا تھا۔

"اب کہاں جانا ہے میڈم.....؟"

"مجھے کیا پتا کہ کہاں جانا ہے.....؟ میں کون سا یہاں آتی جاتی رہتی ہوں.....؟ آپ نے پوچھنا ہے تو آذر بھائی سے پوچھیں۔" اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے لاعلمی ظاہر کی تھی۔

"چلیے جناب! اب آذر بھائی سے پوچھیے....." جودت نے منصور حسین کو شرارت سے اشارہ کیا تھا اور منصور حسین کی مجبوری تھی اس کو پوچھنا ہی پڑا۔ وہ اپنی گاڑی سے اتر کے آذر کی گاڑی کے پاس آگیا تھا۔

"کس طرف جانا ہے صاحب.....؟" وہ ان کے اگلے پڑاؤ کا پوچھ رہا تھا۔

"یہاں سے شاہ فیصل مسجد قریب ہے پہلے وہاں چلتے ہیں پھر بعد میں لوک ورثہ، شکر پڑیاں، لیک ویو پارک اور چھتر پارک کی طرف نکلتے ہیں۔" آذر نے بالترتیب سب جگہوں کے نام گنوائے تھے کہ ان سب جگہوں پہ جانا ہے۔

"آپ نے سب پکنک اسپاٹ ایک ہی دن میں دیکھنے ہیں؟" منصور حسین کو حیرت ہوئی تھی۔

"بالکل! کیونکہ ہم نے یہ پکنک اسپاٹ صرف دیکھنے ہیں یہاں ڈیرا ڈال کے نہیں بیٹھنا، مری کے لیے بھی نکلنا ہے۔" آذر نے منصور حسین کی بات مذاق میں اڑائی تھی۔

"ٹھیک ہے صاحب! جیسے آپ کی مرضی، لیکن ایسا ممکن نہیں ہے، آپ کو ایک ایک جگہ پہ ہی اتنا ٹائم لگ جائے گا کہ آپ یہیں ٹھہرنے پہ مجبور ہو جائیں گے۔"

"ہم یہاں نہیں ٹھہر سکتے، ہم نے یہاں کوئی بکنگ نہیں کروائی، اس لیے ہمیں اپنے بنگلے پہ پہنچنا ہے، رات وہیں ٹھہرنے کا انتظام ہے، سمجھے تم.....؟" آذر نے اسے وجہ بتائی۔

"جی صاحب! یہ بھی بہتر ہے....." منصور حسین سر ہلا کے واپس آگیا تھا اور پھر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔

"تھوڑی دیر پہلے راستے میں آذر بھائی کو میں بھی یہ ہی سمجھا رہا تھا کہ شام ہو جائے گی لیکن وہ کہتے ہیں کہ بے شک شام ہو جائے ہم نے یہ رات مری میں ہی بسر کرنی ہے، جیسے وہاں ان کے لیے کوئی دلہن بیٹھی انتظار کر رہی ہو....." جودت مذاق کے موڈ میں تھا۔

"اچھا! تو یہ بات تھی.....؟ مجھے تو پتا ہی نہیں تھا؟" منصور حسین نے پہلی بار مذاق میں کسی کا ساتھ دیا تھا۔

"جودت بھائی! میں بتاؤں گی آذر بھائی کو کہ آپ ان کا مذاق اڑا رہے ہیں۔" علیزے نے دھمکی دی۔

"بتانا، ضرور بتانا لیکن مری پہنچ کر....." جودت نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا تھا اور منصور حسین اپنی مسکراہٹ روک نہیں پایا تھا۔

"جودت بھائی! وہ ہم سے بڑے ہیں۔"

"ہاہاہا! وہ صرف تم سے بڑے ہیں۔ تمہیں ہی بچوں کی طرح ٹریٹ کرتے ہیں..... تم آذر بھائی کی اور ڈیڈ کی "کاکی" ہو۔" جودت کہتے ہوئے خوب ہنس رہا تھا۔

"آپ اب میرا مذاق اڑا رہے ہیں؟" علیزے نے اسے خفگی بھری نظروں سے دیکھا۔

"میں ایسی گستاخی کا سوچ بھی نہیں سکتا، توبہ توبہ، تم تو اتنی پیاری ہو کہ تمہارے گیت گانے کو دل چاہتا ہے۔" وہ جھوم کے بولا۔

"گیت! ارے ہاں جودت بھائی آپ کا گٹار کہاں ہے؟ آپ ساتھ نہیں لائے.....؟" علیزے کو اچانک اس کے گٹار کا خیال آیا تھا۔

"لایا ہوں یار، سب کچھ لایا ہوں، لیکن مری چل کے....." جودت نے پھر شرارت سے کہا تھا اور ہنستے ہوئے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا منصور حسین بھی چوکنا اور ہوشیار ہو کے بیٹھ چکا تھا کیونکہ شاہ فیصل مسجد کی طرف جانے والے روڈ پہ پولیس گاڑیوں کی چیکنگ کے بعد آگے جانے کی پرمیشن دے رہی تھی، سیکیورٹی کافی ٹائیٹ تھی اور منصور حسین کی گاڑی میں اسلحہ تھا لیکن منصور حسین کے لیے یہ ڈھارس ہی کافی تھی کہ گاڑی میں رجو اور علیزے بی بی بھی ہیں کیونکہ لیڈیز کی موجودگی میں گاڑی کی چیکنگ الاؤ نہیں تھی۔

"علیزے بی بی آپ اور رجو کھڑکی کے ساتھ ہو کر بیٹھیں۔" منصور حسین نے ذرا سی گردن ترچھی کر کے پیچھے کی طرف دیکھا تھا۔

"کیوں.....؟" کیوں کا سوال اٹھانے والا جودت تھا۔

"اس طرح گاڑی کی چیکنگ نہیں ہوگی۔"

"تو اس میں ہمیں ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟ گاڑی کی چیکنگ ہو یا نہ ہو، ہم کون سا اسلحہ یا غیر قانونی سامان لے کر جا رہے ہیں؟" جودت نے لاپروائی سے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے صاحب لیکن خوامخواہ یہ لوگ ہمارا ٹائم برباد کریں گے" منصور حسین نے سر جھٹکا۔

اتنے میں ایک پولیس کانسٹیبل قریب آچکا تھا لیکن گاڑی میں رجو اور علیزے کو دیکھ کر گاڑی کو پاس کا سگنل دے دیا تھا اور اس کے پیچھے باقی تین گاڑیوں کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا تھا منصور حسین کو جس چیز کا ڈر تھا وہ اس سے بچ گیا تھا آخر وقار آفندی نے اسے تاکید کر کے بھیجا تھا کہ کسی کو پتا نہیں چلنا چاہیے کہ وہ اسلحے سے لوڈڈ ہے اور اس نے ایسا ہی کیا تھا.....

"لو جی جناب! پہنچ گئے ہم شاہ فیصل مسجد۔" جودت نے مسجد کی پارکنگ میں پہنچتے ہی نعرہ لگایا تھا اور رفتہ رفتہ سبھی اپنی گاڑیوں سے اتر آئے تھے۔

"واؤ....." جودت نے ایک لڑکی کو پاس سے گزرتے دیکھ کر بے ساختہ اظہار کیا تھا۔

"واؤ نہیں کہتے جودت بھائی، سبحان اللہ کہتے ہیں۔" علیزے نے معصومیت سے اسے ٹوکا۔

"کسے دیکھ کر؟" وہ شرارت سے بولا۔

"مسجد کو دیکھ کر۔" جودت اس کے جواب پہ قہقہہ لگا کے ہنسا تھا۔

"تمہیں کس نے کہا کہ میں نے مسجد کو دیکھ کے واؤ کہا ہے.....؟"

"تو پھر.....؟" علیزے ہونق سی اسے دیکھ رہی تھی۔

"میرے واؤ کا مرکز وہ ہے، بلیک جینز اور ریڈ ٹاپ والی۔" جودت نے اشارہ کیا تھا اور علیزے اس لڑکی کو دیکھ کر سٹپٹا گئی تھی اس کی پنڈلیاں اور بازو برہنہ تھے اس کا لباس بے حد چست تھا وہ اپنی کسی دوست سے تصویریں بنوا رہی تھی اور وہاں موجود لڑکوں کا اسی کی طرف دھیان تھا۔

"جودت! تم یہاں کھڑے کیا دیکھ رہے ہو؟" آذر نے قریب آتے ہی خفگی سے پوچھا۔

"جو سبھی دیکھ رہے ہیں۔" اس نے کندھے اچکائے۔

"جودت۔" آذر نے سختی سے پکارا تھا جس پہ جودت گھبرا کے متوجہ ہوا۔
"جی چلیے! میں تو مذاق کر رہا ہوں۔" وہ سر جھٹکتے ہوئے آگے بڑھ گیا اور علیزے 'انوشہ اور حرمت وغیرہ کے گروپ میں' شامل ہو گئی تھی ان سب لڑکیوں نے سر پہ ڈوپٹے اوڑھ لیے تھے' علیزے تو اندر آ کر حیران و پریشان رہ گئی جگہ جگہ لڑکے لڑکیوں کے گروپ کھڑے تھے ہنس رہے تھے' قہقہے لگا رہے تھے' کچھ تصویریں بنوا رہے تھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہاں موجود لوگ مسجد میں نہیں کسی پارک میں کھڑے ہوں' بے ادبی کا تو کسی کو خیال ہی نہیں رہا تھا لڑکیاں ننگے سر گھوم پھر رہی تھیں' لڑکے شرارتیں کر رہے تھے انہوں نے مسجد کے چکنے فرش کو ریمپ سمجھ رکھا تھا اور ان کی یہی سمجھ تو ملک میں تباہی کا باعث تھی علیزے کو سوچ کر ہی جھرجھری سی آ گئی تھی۔
" لوگوں نے اللہ کے گھر کو پکنک اسپاٹ بنا رکھا تھا' جہاں لوگوں کو زیارت کرنے کے لیے آنا چاہیے تھا وہاں لوگ تفریح اور سیر کے لیے آ رہے تھے آذر بھائی واپس چلیں.....؟" علیزے مزید وہاں کا ماحول برداشت نہیں کر سکی تھی۔
"واپس.....؟" آذر کے ساتھ ساتھ باقی سب کو بھی حیرت ہوئی تھی۔
"جی! یہاں بہت رش ہے میرا دل گھبرا رہا ہے۔" علیزے کو واقعی یہاں آ کر الجھن سی ہوئی تھی۔
"تو تم ایسا کرو کہ تم جا کر اپنی گاڑی میں بیٹھو اتنے میں ہم مسجد گھوم پھر کے دیکھ لیں....." کومل کسی کے بھی بولنے سے پہلے خود بول پڑی تھی۔
"لیکن آپ لوگ یہاں کیا....."
"ہم لوگ یہاں اتنی دور سے مسجد دیکھنے کے لیے آئے ہیں اور دیکھ کر ہی جائیں گے' تمہاری طبیعت فریش نہیں ہے اس لیے تم جا کر تھوڑی دیر آرام کرو' موڈ فریش ہو جائے گا۔" کومل نے بڑی اپنائیت سے اسے وہاں سے ہٹانا چاہا تھا اور علیزے تو تھی ہی سادہ طبیعت 'فوراً' مان گئی تھی اور رجو کے ساتھ واپس پارکنگ میں آ گئی لیکن وہاں کا منظر دیکھ کر اس کا دماغ گھوم گیا۔
"ڈرائیور....." وہ غصے سے اور زور سے پکاری تھی منصور حسین اپنی بے دھیانی میں گاڑی میں بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا جب علیزے کی آواز پہ بری طرح چونک گیا تھا۔
"عون نے تمہیں گاڑی میں اسموکنگ کرنے سے منع کیا تھا لیکن تم پھر بھی باز نہیں آئے.....؟" علیزے نے آگے بڑھ کے اس کے دائیں ہاتھ کی انگلیوں میں دبا ہوا سگریٹ جھپٹا اور دور سڑک پہ پھینک دیا تھا جبکہ منصور حسین شبنم کے پیکر میں بھڑکتے ہوئے شعلے کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا کتنی جرأت' کتنے غصے سے اس نے اس کے ہاتھ سے سگریٹ چھین کر دور اچھال دیا تھا حیرت کی بات تھی وہ ایسی لگتی تو نہیں تھی جیسی لگ رہی تھی۔
"معافی چاہتا ہوں بی بی جی! یاد نہیں رہا' میں ابھی ایئر فریشنر آن کرتا ہوں۔"
"شٹ اپ! غلطی کر کے معافی مانگنے والے لوگ مجھے قطعی اچھے نہیں لگتے۔" علیزے کا مسجد میں موجود پبلک کا غصہ منصور حسین پہ نکل گیا تھا۔
"میں نے غلطی جان بوجھ کے نہیں کی بی بی جی۔" منصور حسین کا سر جھکا ہوا تھا۔
"کی تو ہے نا.....؟" وہ غصے سے بھری ہوئی تھی اور زندگی میں شاید پہلی بار اس نے کسی پہ غصہ کیا تھا وہ بھی منصور حسین پہ۔
"اسی لیے تو معذرت بھی کر رہا ہوں....." منصور حسین ایئر فریشنر آن کر کے گاڑی سے باہر نکل آیا تھا۔
"رجو! اسے کہو کہ اپنی زبان بند رکھے' مجھے اس وقت کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔" علیزے چڑچڑی ہو رہی تھی اور منصور حسین اس کے نرم و ملائم نقوش پہ غصے کی چھاپ دیکھ کے رہ گیا تھا۔

✲ ✲ ✲

وہ جب سے واپس گھر آئی تھی مسلسل اپنے بیڈ روم میں بند تھی۔

اس نے بیڈ روم سے باہر نکلنے کی اور کسی سے بات کرنے کی ہرگز کوشش نہیں کی تھی ممتاز حیات کی موجودگی کی وجہ سے اسے سب پہ ہی غصہ تھا اور مسئلہ یہ تھا کہ یہ غصہ اس کے اندر ہی دبا ہوا تھا' غبار کی طرح باہر نہیں نکلا تھا' شاید باہر نکل آتا تو شدت ذرا کم ہو جاتی لیکن فی الحال تو غصہ نکالنے کا کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔

اپنے کمرے میں چکراتے ہوئے وہ اچھی خاصی تھک چکی تھی اور اب تو اسے بھوک کا بھی احساس ہونے لگا تھا رات کے ایک بجے کا وقت تھا کوئی ملازم یا ملازمہ اسے بیڈ روم میں کھانا لا کر نہیں دے سکتے تھے اس لیے اگر کھانا کھانا ہی تھا تو خود جا کر... وہ وال کلاک کی سمت دیکھتی ہوئی چپل پہن کر باہر نکل آئی تھی باہر پورے گھر میں سناٹا چھایا ہوا تھا گھر کی تمام فینسی لائٹس کی بجائے نائٹ بلب جل رہے تھے جن کی ملگجی سی روشنی میں وہ خاموشی سے چلتی ہوئی سیڑھیوں کی سمت بڑھ رہی تھی جب اچانک اس کے قدم تھم گئے تھے دائیں سائیڈ والے بیڈ روم کی لائٹ جل رہی تھی اور لائٹ جلنے کا مطلب تھا کہ اندر بیٹھا فرد بھی جل رہا ہے... مدحیہ چاہتے ہوئے بھی اپنے قدم سیڑھیوں کی سمت نہیں بڑھا سکی تھی بلکہ وہ اس بیڈ روم کی طرف آ گئی جہاں لائٹ بھی جل رہی تھی اور لائٹ جلانے والا بھی۔

اس نے ہاتھ کی مدد سے دروازے پہ ذرا سا دباؤ ڈالا تھا اور دروازہ اس کے ہلکے سے دباؤ سے کھلتا چلا گیا تھا وہ بے آواز قدموں سے چلتی ہوئی اندر آ گئی تھی کمرے میں سگریٹ کے دھوئیں سے حبس محسوس ہو رہا تھا مدحیہ نے ہاتھ سے نادیدہ دھوئیں کو رفع کرنے کی کوشش کی تھی اور دھیمے قدموں سے چلتی کھڑکی کے پاس آ گئی کھڑکی کے پردے ہٹا کر کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیے تھے تازہ اور خنک ہوا کا اک تیز جھونکا اندر آیا تھا اور وہ اس جھونکے کی تازگی کو محسوس کرتی ہوئی پلٹ کر نبیل کے سامنے آ کھڑی ہوئی جو مسلسل راکنگ چیئر پہ جھول رہا تھا اور آس پاس کی ہر چیز سے بے نیاز اور لاتعلق نظر آ رہا تھا...

"بھائی! ایم سوری..." مدحیہ ڈائریکٹ اس کی سمت دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی... لیکن نبیل نے کوئی نوٹس نہیں لیا تھا۔

"بھائی میں آپ سے مخاطب ہوں۔" مدحیہ نے ذرا اونچی آواز میں کہا اور نبیل کی راکنگ چیئر تھم گئی تھی... اور پھر پانچ سیکنڈ کے توقف سے اس نے انگلیوں میں دبا ہوا سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دیا تھا۔

"کیا بات ہے؟ کیوں آئی ہو؟" اس کی آواز بے حد بوجھل اور بھاری ہو رہی تھی لہجہ بیگانگی لیے ہوئے تھا۔

"آپ سے سوری کہنے آئی ہوں۔"

"کس لیے...؟" اسے حیرانی ہوئی۔

"آپ میری وجہ سے ہرٹ ہوئے ہیں۔"

"ہونہہ... یہ کوئی پہلی بار تو نہیں ہوا' عادی ہو چکا ہوں۔" نبیل تلخی اور استہزائیہ انداز سے کہتا ہوا چیئر سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"میں ایسا کرنا نہیں چاہتی لیکن ہو جاتا ہے' میری برداشت ختم ہو جاتی ہے' میں خود پہ کنٹرول نہیں کر پاتی۔" مدحیہ جھنجھلا کے کہہ رہی تھی۔

"تم نہیں جان سکتیں مدحیہ' تمہاری اک برداشت ختم ہو جانے سے ہمارا کیا کیا ختم ہو جاتا ہے' عزت' غیرت' غرور اور ہماری انا' سب کچھ ختم ہو کے رہ جاتا ہے' نبیل حیات کسی قابل نہیں رہتا' اپنے آپ سے ہی نظریں

ملا پاتا' بے غیرت بن جاتا ہے' صرف... صرف تمہاری برداشت کی وجہ سے..." نبیل کا لہجہ بہت بکھرا ہوا لگ رہا تھا۔

"میں اس معاملے میں بہت بے بس ہوں بھائی' ایم رئیلی سوری۔" مدحیہ نے کہتے ہوئے سر جھکا لیا تھا اور سر جھکانے کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں ٹھہرے ہوئے آنسو چھلک گئے تھے وہ راکنگ چیئر کے سامنے رکھی چھوٹی سی کرسٹل ٹیبل کے پاس کھڑی تھی اس کے آنسو قالین پہ نہیں ٹیبل پہ گرے تھے اور سگریٹ کا پیکٹ اٹھاتا ہوا نبیل یکدم چونک گیا تھا۔

مدحیہ رو رہی تھی...؟ ناقابل یقین بات تھی... حیرت کا مقام تھا۔

"مدحیہ! کیا بات ہے...؟ تم رو کیوں رہی ہو...؟" نبیل سگریٹ کا پیکٹ وہیں چھوڑ کے فوراً اس کے سامنے آ گیا تھا۔

"میں بہت بری ہوں بھائی' بہت بری' میں نے آپ کو پریشان کر رکھا ہے لیکن... لیکن میں کیا کروں؟ ہر بار کچھ نہ کچھ ایسا ہو جاتا ہے کہ..." مدحیہ کہتے کہتے بھی شدت سے روئی تھی اور نبیل نے اسے بے ساختہ اپنے بازو میں گھیرتے ہوئے کندھے سے لگا لیا تھا۔

"ڈونٹ وری! کچھ نہیں ہوتا' تم بیٹھو یہاں..." نبیل نے اس کا سر تھپکتے ہوئے کہا اور اسے صوفے پہ بٹھایا... لیکن وہ متواتر رو رہی تھی۔

"دیکھو مدحیہ! اس طرح جذباتی ہونے سے کچھ نہیں ہوتا' کچھ کرنے کے لیے دماغ کو ٹھنڈا اور دل کو وسیع رکھنا پڑتا ہے' صبر' ہمت اور برداشت سے کام لینا پڑتا ہے' تمہارے دل و دماغ میں جو کچھ ہے وہ تم مجھ سے شیئر بھی تو کر سکتی ہو...؟ اور کچھ نہ سہی تو تمہارے دل کا بوجھ ہی ہلکا ہو جائے گا' پلیز مدحیہ ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ' اپنے اندر کا غبار نکالو' دل کا بوجھ کم کرو' اپنے آپ کو نکالو اس فرسٹریشن سے' پلیز۔" نبیل نے اس کے دونوں ہاتھ تھام کے انہیں سہلایا تھا اور اس کا سر تھپکا تھا۔

لیکن مدحیہ کچھ بھی بتانے کی یا پھر شیئر کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی اس کے اندر کا غم و غصہ آنسوؤں کے رستے باہر نکل رہا تھا اور پھر نبیل نے کچھ سوچتے ہوئے اسے اپنے کندھے سے لگا کر رونے دیا تا کہ وہ جتنا چاہتی کھل کے رو لیتی جس کے بعد اس کے دل و دماغ کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جاتا' لیکن نبیل یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے دل و دماغ کا بوجھ صرف رو لینے سے کم ہونے والا نہیں ہے' اگر ایسا ہوتا تو وہ اب تک نہ جانے کتنی بار رو چکی ہوتی۔

"مدحیہ! یہ لو پانی پیو..." نبیل نے گلاس میں پانی انڈیل کر گلاس اس کی سمت بڑھا دیا تھا اور مدحیہ نے دو گھونٹ پانی پینے کے بعد گلاس واپس ٹیبل پہ رکھ دیا تھا۔

"اب بتاؤ کیا مسئلہ ہے...؟ ایسی کیا چیز ہے جو تمہیں بے چین اور بے کل رکھتی ہے...؟" نبیل کافی تحمل اور سکون سے پوچھ رہا تھا...

"بھائی... آپ جانتے ہیں نا کہ بابا کا کردار کیسا ہے...؟" مدحیہ کا پوچھتے ہوئے سر جھکا ہوا تھا... اور یہ ایک ایسا سوال تھا جس پہ نبیل فوری طور پہ ہاں یا نا میں جواب نہیں دے سکتا تھا کیونکہ دونوں صورتوں میں اسے مدحیہ سے نظر چرانی پڑتی۔

"بتائیے نا بھائی..." وہ بصد اصرار پوچھ رہی تھی۔

"ہوں...!" اس نے محض ہوں کہنے پہ اکتفا کیا تھا۔

"اور آپ کو یہ بھی یاد ہو گا کہ میری ایک دوست تھی لو میری تھامسن...؟" مدحیہ کے دوسرے سوال پہ نبیل

"ہوں" کہنے کے بھی قابل نہیں رہا تھا کیونکہ اسے مدحیہ کی اگلی بات خود بخود ہی سمجھ آگئی تھی۔

"لومیری' میری دوست تھی' میری کلاس فیلو تھی' میری ہم عمر تھی' ہم لوگ اپنی ہالیڈیز منانے کے لیے انگلینڈ سے کینیڈا گئے تھے' وہاں..... وہاں..... لومیری کے..." مدحیہ کہتے ہوئے ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی تھی اور نبیل کی رنگت سفید لٹھے کی مانند ہو گئی اس کی سماعتوں میں سائیں سائیں کی آواز گونج رہی تھی اپنے باپ کا نام نہاد مجسمہ دل کے بت خانے میں ایسا زور سے گرا کہ پاش پاش ہو گیا تھا اور مدحیہ کے دل و دماغ کی اذیت نبیل کے جسم و جاں میں سرائیت کر گئی تھی بے شک مدحیہ کی بات ابھی ادھوری تھی لیکن اس کے مفہوم اور معنی بہت مکمل تھے اور اس بار تو وہ مدحیہ کو بھی تسلی نہیں دے سکا تھا..... وہ روتی ہوئی وہاں سے اٹھ کر چلی گئی تھی اور نبیل مٹی کے ڈھیر کی طرح بیٹھا رہ گیا تھا دل پہ بوجھ سا آگرا تھا۔

☼ ☼ ☼

شاہ فیصل مسجد دیکھنے کے بعد ان لوگوں نے لوک ورثہ کا رخ کیا تھا جہاں اپنے کلچر کا ہر رنگ ہر تاثر دیکھنے کے لیے موجود تھا اپنی ثقافت کا منہ بولتا ثبوت' خصوصاً" وہ جگہ جہاں ایک عورت کنویں کے قریب جھکی کنویں سے پانی بھر رہی تھی' لڑکیاں اس منظر کو دیکھ کر بہت ایکسائیٹڈ ہوئی تھیں' بے شک وہاں تمام چیزیں آرٹی فیشل تھیں لیکن ان کا تاثر بہت نیچرل تھا' وہاں کی بیل گاڑی' گھوڑا تانگہ' اونٹ کے اسٹیچو اور میوزیم کے اندر ہر چیز ان لوگوں کے شوق اور اشتیاق کو ابھارنے کے لیے کافی تھیں اور جودت نے ان کو ہر چیز کے متعلق بتا بتا کر ان کے شوق کو اور بھی ہوا دے رکھی تھی ان کو ساری جگہیں گھومنے پھرنے کے بعد لوک ورثہ ہی پسند آیا تھا۔

لوک ورثہ ایک ایسی جگہ تھی جہاں علیزے نے بھی بہت انجوائے کیا تھا وہ بھی سب کے ساتھ گھومنے پھرنے اور تصویریں بنوانے میں شامل رہی تھی اور پھر شکر پڑیاں سے واپسی پہ — شام گہری ہو چکی تھی' سبھی یہ رات اسلام آباد میں ہی رکنا چاہتے تھے لیکن آذر یہاں رکنے کے لیے تیار نہیں تھا وہ مری پہنچنا چاہتا تھا اس لیے اس منصور حسین کو گاڑی مری روڈ کی طرف موڑنے کا سگنل دیا تھا اور اس نے سرہلاتے ہوئے حکم کی تعمیل کی تھی۔

"یار منصور حسین! میں تو بور ہو گیا ہوں کوئی گانا ہی سنا دو۔" جودت نے بوریت کا اظہار کرتے ہوئے کیبنٹ میں رکھی سی ڈیز الٹ پلٹ کر دیکھی تھیں۔

"مجھے گانا سننا آتا ہے صاحب' سنانا نہیں۔" منصور حسین کی نظریں سامنے ونڈ اسکرین پہ جمی ہوئی تھیں' بات وہ جودت سے کر رہا تھا لیکن ذہن علیزے کے دو بہر والے غصے کی طرف تھا جو اس نے منصور حسین پہ انڈیلا تھا' وہ ابھی تک حیران تھا کہ علیزے بی بی نے اس پہ اتنا غصہ کیا ہے۔ اسے ڈانٹا ہے.....؟ حیرت تھی۔

"یار! ایک تو تم بھی نا بہت نپے تلے سے آدمی ہو' کھرا کھرا جواب دیتے ہو' بندے کی ہاں میں ہاں نہیں ملاتے۔" جودت نے منہ بنا کے کہا تھا۔

"منافقت سے کام نہیں لیتا صاحب۔" منصور حسین نے اسپیڈ کم رکھتے ہوئے کہا اور ساتھ والی گاڑی کو راستہ دیا تھا۔

"کیا اپنی بیوی کے ساتھ بھی ایسے ہی پیش آتے ہو روکھے پھیکے سے۔" جودت کو حیرت ہو رہی تھی۔

"بیوی نہیں ہے....." اس نے نفی میں جواب دیا۔

"ارے! کیوں نہیں ہے؟"

"شادی نہیں ہوئی ابھی"

"اوہ اچھا..... ! لیکن یار اب تک شادی ہو جانی چاہیے تھی تمہاری' یہی تو عمر ہوتی ہے شادی کرنے کی' انتیس'

نہیں ہے تو ہو گے؟"

"میں بھی یہی سوچ رہا تھا لیکن....." منصور حسین کچھ کہتے کہتے چپ ہو گیا تھا۔

"لیکن کیا یار؟ کوئی محبت وحبت کا چکر ہے کیا؟" جودت منصور حسین میں پوری طرح سے دلچسپی لے رہا تھا۔

"محبت؟" منصور حسین نے محبت کے نورانی لفظ کو زیر لب دہرایا تھا اور دل کو یوں لگا جیسے کسی نے ہلکے سے دبایا ہو' اپنی نرم و نازک ہتھیلی میں اور پھر دوسرے ہی پل اس نرم و نازک ہتھیلی سے آزاد کر دیا ہو۔

منصور حسین نے اپنے دل کو ٹھہرانے کے لیے دائیں بائیں دیکھا اور گہری سانس کھینچی تھی لیکن دوبارہ ونڈ اسکرین کی سمت دیکھنے سے پہلے اس کی نظریں بیک ویو مرر پہ جا ٹھہری تھیں علیزے کی گولڈن براؤن آنکھوں کا سحر بیک ویو مرر کو اپنے حصار میں لیے ہوئے تھا یوں لگ رہا تھا جیسے وہ بھی جودت اور اس کی باتیں دلچسپی سے سن رہی ہو اور اسے بھی اس کے جواب کا انتظار ہو۔

منصور حسین نے گاڑی کی اندرونی مدھم اور ملگجی سی لائٹ بجھا دی تھی تاکہ اسے پیچھے کا کوئی بھی منظر دکھائی نہ دے' جس کی وجہ سے پھر اس پہ کوئی فرد جرم عائد ہوتی۔

"ارے یار! لائٹ کیوں بجھا رہے ہو' مجھے میری بات کا جواب دو۔" جودت نے پھر لائٹ جلانی چاہی تھی۔

"رہنے دیں صاحب! پیچھے رجو سو رہی ہے' اس کی نیند خراب ہو گی۔" اس نے جودت کو لائٹ جلانے سے منع کیا تھا۔

"او کے! نہیں جلاتا' لیکن تم جواب تو دو' تم محبت کرتے ہو نا کسی سے۔" جودت جاننے کے لیے بہت بے چین ہو رہا تھا۔

"آپ کو کیا لگتا ہے.....؟"

"مجھے لگتا ہے کہ کرتے ہو۔"

"ہونہہ! جو لگتا ہے وہ ہوتا نہیں ہے۔" منصور حسین نے سر جھٹکا۔

"نہیں منصور حسین' جو ہوتا ہے وہی لگتا ہے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے آپ کو جو لگتا ہے آپ وہی سمجھ لیں۔"

"میرے سمجھنے کی کیا ضرورت ہے بھلا.....؟ تمہیں محبت ہے اور بس ہے۔" جودت نے منصور حسین پہ محبت کی مہر لگا دی تھی اور منصور حسین نا چاہتے ہوئے بھی ہلکے سے مسکرا دیا تھا اور اسے لائٹ بجھانے کا یہ بھی ایک فائدہ ہوا کہ جودت اس کی مسکراہٹ نہیں دیکھ سکا تھا۔

"بھائی! مری اور کتنا دور ہے.....؟" علیزے کا صبر جواب دے چکا تھا وہ گاڑی میں بیٹھے بیٹھے تھک چکی تھی۔

"ڈونٹ وری! آدھے گھنٹے کا سفر رہ گیا ہے۔" جودت نے اسے تسلی دی اور میوزک پلیئر آن کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ تقریباً" پندرہ بیس منٹ شاور کے نیچے کھڑے رہنے کے بعد نہا کر فریش ہوا تو تولیے سے بال رگڑتا ہوا باتھ روم سے نکل آیا تھا اس کی پہلی نظر بیڈ کی سائیڈ ٹیبل کی سمت اٹھی تھی جہاں دودھ کا گلاس اور چائے کا کپ ڈھانپ کے رکھے گئے تھے گویا اس کے نہانے کے دوران ملازم آکر رکھ گیا تھا..... اس نے آگے بڑھ کے چائے کے کپ پہ رکھا ڈھکن ہٹایا اور چائے کی بھاپ بے تابی سے اوپر کی طرف اٹھی تھی وہ کپ اٹھا کر اپنے روم کی کھڑکی میں آن کھڑا ہوا تھا۔

اوائل نومبر کے دن تھے سردی اپنے پر رفتہ رفتہ پوری کائنات پہ پھیلا رہی تھی ماحول میں خنک ہوا مور کی طرح پنکھ پھیلا کے ناچ رہی تھی اور اس کے ناچ کا سرور ہر ذی روح کی رگ رگ میں اتر رہا تھا' بالکل ایسے جیسے دل اور

شاہ کی رگوں میں اتر رہا تھا وہ رات کے اس پہر نہا کر ـــــ شرٹ پہنے بغیر کندھوں پہ تولیہ ڈالے کھڑکی سے ٹیک لگائے کھڑا چائے سے لطف اندوز ہو رہا تھا اور اس لطف اور سرور کے موسم میں تصور جاناں کا بج جانا بھی اک لاشعوری عمل تھا، لیکن اس عمل میں بھی کوئی مداخلت کر بیٹھا تھا اس کے سیل پہ وائبریشن ہونے لگی تھی اس نے اپنی پینٹ کی جیب سے سیل نکال کے دیکھا نمبر انجانا تھا..... چند سیکنڈ وہ دیکھتا رہا پھر بالآخر کال اٹینڈ کر ہی لی تھی۔

"السلام علیکم.....!" اس کی آواز اور لہجہ کافی سنجیدہ سے تھے۔

"وعلیکم السلام! آپ کون بات کر رہے ہیں.....؟" دوسری طرف سے کافی گھبرائی ہوئی سی نسوانی آواز سنائی دی تھی۔

"دل آور شاہ اسپیکنگ۔" اس نے اس نسوانی آواز کو یقین دلایا تھا۔

"مم، میں..... مومنہ بی بی بات کر رہی ہوں سر۔" جواباً اس نے بھی اپنا تعارف کروایا تھا اور دل آور چند ثانیے کے لیے خاموش ہو گیا تھا لیکن اس خاموشی میں اس کا پہلا خیال صرف اس طرف گیا تھا کہ وہ رات کے اس پہر فون کیوں کر رہی تھی۔

"جی کہیے بی بی! آپ نے رات کے اس پہر فون کیوں کیا ہے؟ آپ ٹھیک تو ہیں نا.....؟" دل آور کو حقیقتاً تشویش ہوئی تھی۔

"سر.....! اس وقت تک تو ٹھیک ہوں لیکن آئندہ کے لیے کوئی بھروسہ نہیں ہے، اس خبیث کو پتا چل گیا ہے کہ میں اس پہ کیس کر رہی ہوں اس لیے اس نے اپنے بندوں کو میرے پیچھے لگا دیا ہے، میں تین دن سے چھپتی پھر رہی ہوں اب تو مجھے کوئی بھی اپنے گھر میں داخل بھی نہیں ہونے دیتا، وہ کسی بھی وقت مجھے قتل کروا سکتا ہے، لیکن سر میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑ کے درخواست کرتی ہوں، میں مر بھی جاؤں تو اسے اس کے انجام تک ضرور پہنچایئے گا۔" مومنہ بی بی روہانسے لہجے میں کہتے ہوئے رو پڑی تھی اس کی آواز ہانپی ہوئی تھی اور لہجہ دھیما اور دبا دبا سا لگ رہا تھا یوں لگ رہا تھا جیسے وہ چوری اور چھپ کے فون کر رہی ہو۔

"یہ کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ.....؟ کچھ نہیں ہو گا آپ کو، آپ حوصلہ رکھیں۔"

"نہیں سر.....! ایسا ممکن نہیں ہے، اس کے بندے کتوں کی طرح میری بو سونگھتے پھر رہے ہیں انہیں جہاں بھی میری خبر مل گئی مجھے گولی مار دیں گے۔" وہ روتے ہوئے بمشکل اپنی بات مکمل کر پا رہی تھی اور دل آور کے ذہن نے ہمیشہ کی طرح فوری کام کیا تھا۔

"میں کہہ رہا ہوں نا کہ کچھ نہیں ہو گا آپ کو، آپ بس اتنا بتا دیں کہ آپ اس وقت کہاں ہیں.....؟" اس نے کچھ سوچتے ہوئے استفسار کیا تھا۔

"مم..... میں؟" وہ بتاتے ہوئے ذرا ہچکچا گئی تھی۔

"مومنہ بی بی! مصیبت اور مشکل کے وقت اللہ کے بعد آدمی کو اپنے ڈاکٹر اور اپنے وکیل پہ بھروسہ رکھنا ہی پڑتا ہے، وہ سب بتانا پڑتا ہے جو ہم نے باقی سب سے چھپا رکھا ہوتا ہے، کیونکہ اس کے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں رہتا، بیماری بتائے بغیر ڈاکٹر زندگی اور موت کی جنگ نہیں لڑ سکتا، اور راز بتائے بغیر وکیل انصاف اور ہار جیت کی جنگ نہیں لڑ سکتا، اب یہ آپ پہ ڈیپینڈ کرتا ہے کہ آپ نے کیا کرنا ہے..... اپنی زندگی بچانی ہے یا پھر اس خبیث کے ہاتھوں قتل ہونا ہے.....“ دل آور کا لہجہ سنجیدگی کے ساتھ ساتھ سخت ہو گیا تھا..... اور مومنہ بی بی اس کی بات سن کر لاجواب اور شرمندہ ہو گئی تھی۔

"سر! میں..... میں اس وقت اوکاڑہ میں ہوں، یہاں میری ایک سہیلی رہتی ہے اس کی یہاں شادی ہوئی ہے لیکن اب..... اب تو دو روز سے اس کے سسرال والے بھی باتیں کرنے لگے ہیں اور مجھے ڈر ہے کہ یہ لوگ میری خبر میرے گاؤں ہی نہ پہنچا دیں۔"

"نہیں نہیں ایسا نہیں ہو گا، آپ اطمینان رکھیں، صبح ہونے سے پہلے پہلے آپ محفوظ ہاتھوں میں پہنچ جائیں گی۔" دل آور نے تسلی دلائی۔

"لیکن سر.....!"

"آپ باقی باتیں کسی اور وقت کے لیے رہنے دیں، فی الحال مجھے اس جگہ کا ایڈریس لکھوا دیں جہاں آپ رہ رہی ہیں، آپ کو تھوڑی دیر تک پک کر لیا جائے گا۔" دل آور کی تسلی اور حوصلے پہ مومنہ بی بی بے یقین سی ہو گئی تھی اسے یقین نہ آیا کہ اتنا بڑا وکیل اس کے کیس میں اس حد تک انوالو ہو رہا ہے۔ وہ بھی بغیر کسی فیس اور معاوضے کے.....؟

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سر.....؟"

"دیکھیے بی بی! میں نے آپ سے کہا کہ اس وقت کوئی اور سوال جواب مت کریں۔" دل آور نے خفگی سے اسے ٹوک دیا تھا اور مومنہ بی بی نے جلدی جلدی اسے ایڈریس لکھوا دیا تھا۔

"معافی چاہتی ہوں سر، تھوڑی دیر کے لیے دل میں بدگمانی آ گئی تھی کہ کہیں وہ آپ تک نہ پہنچ جائے۔" وہ ندامت اور شرمساری سے کہہ رہی تھی۔

"ہونہہ.....! وہ مجھ تک نہیں پہنچے گا بلکہ میں اس تک پہنچوں گا اور معافی مانگنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اپنی زندگی ہر ایک کو عزیز ہوتی ہے ہر انسان اپنی زندگی محفوظ ہی رکھنا چاہتا ہے، آپ کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو یقیناً ایسا ہی سوچتا..... اینی وے آپ فون بند کریں تھوڑی دیر تک آپ کو کال آ جائے گی کہ آپ کو کون پک کرنے آ رہا ہے.....؟"

"آپ کا شکریہ سر! بہت شکریہ۔" مومنہ بی بی نے فون بند کر دیا تھا اور دل آور نے گہری سانس کھینچتے ہوئے اپنے ہاتھ میں پکڑے سرد چائے کے کپ کو دیکھا تھا۔

بھاپ اڑاتی چائے برف ہو چکی تھی اور برف تو اس کا جسم بھی ہو چکا تھا لیکن بچت یہ تھی کہ اس کے جسم میں دوڑتا لہو بہت گرم تھا جو باہر کی سردی ذرا کم ہی محسوس ہونے دیتا تھا..... اس وقت بھی وہ سردی سے بے نیاز چائے کا کپ ٹیبل پہ رکھ کے پلٹا، کھڑکی بند کی، اپنی شرٹ پہنی، تولیہ صوفے پہ پھینکا، بال برش کیے اور پھر اس دوران سوچتے ہوئے کسی حتمی فیصلے پہ پہنچ کر اپنا سیل فون دوبارہ اٹھا لیا تھا حالانکہ نمبر ڈائل کرتے ہوئے اسے پتا تھا کہ وہ کسی کو نیند سے ڈسٹرب کر رہا ہے، لیکن اس کے بغیر کوئی حل بھی تو نہیں تھا۔

"ہیلو! انسپکٹر شہناز اسپیکنگ۔" دوسری طرف سے نیند سے بوجھل آواز سنائی دی تھی اس نے یقیناً اس کا نمبر نہیں دیکھا تھا۔

"السلام علیکم! دل آور شاہ بات کر رہا ہوں۔" دل آور نے کافی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

"ارے شاہ جی آپ اس وقت؟" انسپکٹر شہناز کی نیند جیسے ہوا ہو گئی تھی یوں لگا جیسے وہ بستر سے اٹھ کے بیٹھ گئی ہو۔

"شرمندہ ہوں آپ کو نیند سے ڈسٹرب کر دیا۔" دل آور کا لہجہ معذرت خواہانہ ہو رہا تھا۔

"ارے! نہیں نہیں شاہ جی ایسی کوئی بات نہیں ہے، آپ سو بسم اللہ کر کے ڈسٹرب کرو ہم غریبوں کے تو ماتھے پہ شکن تک نہیں آئے گی۔" انسپکٹر شہناز کی خوشی اس کے لب و لہجے سے ہی محسوس ہو رہی تھی۔

"آپ کہاں ہیں اس وقت؟" دل آور کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے گہری نیند سے جگا کر لاہور سے اوکاڑہ جانے کے لیے کیسے کہے؟

"ایسی کیا بات ہو گئی آخر..... آج میرے شاہ جی کچھ پریشان لگتے ہیں؟" انسپکٹر شہناز اس کی سنجیدگی سے اس کی پریشانی بھانپ چکی تھی۔

"وہ دراصل میں نے آپ کو کسی کام کے لیے فون کیا تھا۔" دل آور نے بات شروع کی۔

"جانتی ہوں شاہ جی! آپ نے کسی کام کے لیے ہی فون کیا ہے' ورنہ ہمارے ایسے نصیب کہاں کہ آپ کو ہماری یاد آئے۔ ہمارا فون کھڑکایا ہے تو آپ کی مجبوری۔ خیر اللہ بھلا کرے اس مجبوری کا جس نے آپ کو فون کرنے پہ مجبور تو کیا۔" انسپکٹر شہناز نے شکر ادا کیا تھا۔

"آپ جانتی ہیں انسپکٹر شہناز میرا پروفیشن مجھے کسی کو یاد کرنے کے لیے بھی ٹائم نہیں دیتا میرے دوستوں کو مجھ سے شکوے ہونے لگتے ہیں۔"

"جانے دیجیے شاہ جی' آپ بہانہ کرتے ہوئے اور صفائی دیتے ہوئے اچھے نہیں لگتے۔"

"حالانکہ میرا کام ہی یہی ہے....." وہ ہلکے سے مسکرایا تھا۔

"ارے کون کہتا ہے کہ آپ صفائی دیتے ہیں..... میں نے تو ہمیشہ آپ کو جج کے سامنے شعلے اگلتے ہوئے اور گرجتے برستے ہوئے ہی سنا ہے۔" اس نے حیرانی سے کہا تھا۔

"بس کورٹ کی حد تک....." دل آور نے نارمل سے انداز میں کہا۔

"ہرگز نہیں! آپ کورٹ سے باہر بھی ویسے ہیں' روکھے پھیکے اور سڑیل سے..... مجال ہے جو کبھی آنکھ بھر کے یہ بھی دیکھا ہو کہ پولیس ڈیپارٹمنٹ میں ایک خوب صورت اور حسین و جمیل لڑکی بھی کام کرتی ہے' جو آتے جاتے ہوئے بڑی آس سے دیکھتی ہے کہ شاید دل آور شاہ اسے لائن ہی مار دے۔" انسپکٹر شہناز جل کے بولی تھی اور دل آور کا فلک شگاف قہقہہ بہت دور تک گونجا تھا۔

"لائن تو مار ہی دوں لیکن میڈم آزاد پنچھی ہوں' حوالات سے ڈرتا ہوں' آپ لوگ اندر کرتے ہوئے دیر نہیں لگاتے۔" وہ دلچسپی سے بولا تھا۔

"شاہ جی! آپ ایک بار لائن تو مارو' آپ کو اپنے دل کے اندر کروں گی' حوالات کے اندر نہیں۔ حوالات کے اندر کرنے کے لیے اور جو ہیں۔" انسپکٹر شہناز نے اسے آفر کی تھی۔

"سوری میڈم! قید آخر قید ہی ہوتی ہے چاہے دل کی ہو یا حوالات کی' میرا تو دم گھٹتا ہے' میں تو کسی کے دل میں بھی نہیں رہ سکتا۔" دل آور نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

"اچھا..... ! کسی کے دل میں رہ نہیں سکتے' لیکن کسی کو دل میں رکھ تو سکتے ہو نا؟"

"یہ کام بھی کافی مشکل ہے....." وہ شرارت سے بولا تھا اور انسپکٹر شہناز اس کی چالاکی پہ مسکرا اٹھی تھی۔

"آپ بندہ گھما دیتے ہو' بات گھمانا کون سا مشکل کام ہے.....؟"

"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ' میں نے اس وقت آپ کو گھمانے کے لیے ہی فون کیا ہے۔"

"اوکے! فرمایئے پھر.....؟" وہ پوری طرح سے متوجہ تھی۔

"آپ کو اس وقت اوکاڑہ جانا ہو گا۔"

"اوکاڑہ.....؟ اس وقت.....؟" اسے اچنبھا ہوا تھا۔

"جی! میں نے کسی عام سی خوب صورت اور حسین و جمیل لڑکی کو فون نہیں کیا بلکہ ایک لیڈی پولیس آفیسر کو فون کیا ہے' جس کے لیے "اس وقت" اور "اُس وقت" کوئی معنی نہیں رکھتے' یہ کسی کی موت اور زندگی کا سوال ہے' آپ کا پہنچنا ضروری ہے۔" دل آور نے زور دے کر کہا تھا۔

"لیکن شاہ جی.....؟"

"آپ جا رہی ہیں یا نہیں.....؟" وہ دو ٹوک پوچھ رہا تھا۔

"ہوں! جا رہی ہوں....." اس نے اثبات میں جواب دیا۔

"ٹھیک ہے آپ نکلنے کی تیاری کریں میں تھوڑی دیر بعد دوبارہ کال کرتا ہوں۔" اس نے کہہ کے فون بند کر دیا اور مومنہ بی بی کو بتا دیا کہ انسپکٹر شہناز اسے لینے کے لیے آ رہی ہے۔

کل رات مری پہنچتے ہی انہیں تھکن کے مارے کچھ ہوش نہیں رہا تھا کہ وہ کہاں ہیں اور کہاں نہیں؟ نیند اور دن بھر کی تھکن کی وجہ سے انہیں کھانا کھانا بھی یاد نہیں رہا تھا بس انہیں بستر کی طلب تھی اور جیسے ہی انہیں بیڈ روم نظر آئے' وہ دیوانہ وار لپکے تھے البتہ آذر نے اپنی نگرانی میں سب کا سامان نکلوا کے ان کے کمروں میں بھجوایا تھا گیٹ بند کروایا تب اپنے بیڈ روم میں گیا تھا' سب سے پہلے بستر پہ ڈھیر ہونے والی علیزے ہی تھی' عائشہ آفندی اسے دیکھنے کے لیے آئیں تو وہ سو رہی تھی' اس لیے انہوں نے رجو کو بھی اس کے کمرے میں بھیج دیا تھا اور منصور حسین کو بھی کمرے میں جا کر آرام کرنے کے لیے کہا تھا ہر طرف سے مطمئن ہونے کے بعد وہ خود بھی اپنے کمرے میں آ گئی تھیں۔

وہ لوگ تقریباً" رات کے بارہ بجے سوئے تھے اور اس وقت صبح کے بارہ بجے کا وقت ہو رہا تھا لیکن ابھی تک ان میں سے کوئی ایک بھی بے دار نہیں ہوا تھا کیونکہ باہر صبح سے بارش اور برف باری ہو رہی تھی اور پہلی نظر دیکھنے پہ یہی احساس ہو رہا تھا کہ ابھی رات ہے ماحول میں پھیلا ملگجا سا اندھیرا اور غبار شام کا سا سماں پیدا کر رہے تھے۔

"منصور حسین! چائے پیو گے؟" رجو کچن کی طرف جا رہی تھی جب مین ڈور کے بیچوں بیچ کھڑے منصور حسین کو دیکھ کر ٹھہر گئی تھی۔

"ہاں بنا دو۔" منصور حسین دھیمے لہجے میں بولا۔

رجو سر ہلاتی ہوئی فوراً" پلٹ گئی پھر وہ چائے لے کر آئی تو اس کے پاس ہی بیٹھ گئی ۔ اور خود ہی ادھر ادھر کی بے تکی باتوں میں اس کا سر کھانے لگی۔

"رجو..... ! رجو..... !" علیزے رجو کو پکارتی ہوئی اپنے بیڈ روم سے برآمد ہوئی تھی۔

"جی علیزے بی بی....." رجو منصور حسین کو وہیں چھوڑ کے بھاگی بھاگی آئی تھی۔

"اتنا ٹائم ہو گیا تم نے مجھے جگایا کیوں نہیں.....؟" علیزے اپنے ارد گرد شال لپیٹتے ہوئے کافی سستی سے بولی تھی۔

"جو جاگے تھے بی بی جی ایسا موسم دیکھ کر وہ بھی سو گئے اس لیے میں آپ کو بھلا کیا جگاتی....."

"وہ سامنے کون بیٹھا ہے؟"

"منصور حسین....." رجو نے مسکرا کے بتایا۔

"منصور حسین؟" علیزے نے دوبارہ دیکھا کیونکہ منصور حسین نے اپنے ارد گرد چادر لپیٹ رکھی تھی اور دائیں ہاتھ میں پکڑے کپ سے چائے پی رہا تھا کوریڈور کی سمت اس کی پشت تھی اس لیے دور سے پہچاننا مشکل ہو رہا تھا۔ "ناشتا بناؤں آپ کے لیے.....؟"

"ہوں! بناؤ....." وہ اسے کہہ کے برف باری دیکھنے کے شوق میں خود بھی باہر نکل آئی تھی۔

"سلام بی بی....." منصور حسین اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

"والسلام..... تم یہاں کیوں بیٹھے ہو؟ اندر جاؤ۔" اس نے اسے وہاں سے جانے کا اشارہ دیا تھا۔

"جی بہتر....." وہ سر جھکا کے پلٹ گیا تھا۔ اور علیزے خود وہاں بڑے سے ستون کے پاس کھڑی ہو کر برف باری دیکھنے لگی تھی۔ اس کے چہرے پہ ایسے قدرتی منظر کو دیکھتے ہوئے خوشی اور اشتیاق کے رنگ بکھرے ہوئے تھے۔

"گڈ مارننگ بے بی۔۔۔" دانیال بھی اس کے قریب ہی آن کھڑا ہوا تھا۔
"سیم ٹو یو بھائی۔" وہ اسے دیکھ کر خوش دلی سے مسکرائی تھی۔
"رات کیسی گزری۔۔۔؟"
"کچھ پتا نہیں۔۔۔"
"کیا مطلب؟"
"مطلب کہ نیند نے کچھ خبر نہیں ہونے دی' میں تو فوراً" ہی سو گئی تھی۔"
"ایسی کوئی بات نہیں جناب ہم بھی فوراً" ہی سو گئے تھے البتہ کچھ خوابوں نے بہت ستائے رکھا تھا۔ بات کرتے کرتے دانیال کا ٹریک بدل گیا تھا' علیزے چونک کر دیکھا وہ قریب آتی حرمت کو دیکھ کر کہہ رہا تھا حالانکہ اس کا انداز کافی غیر محسوس قسم کا تھا۔ لیکن حرمت محسوس کر چکی تھی اور اس کے چہرے پہ شرم کا گلابی عکس لہرا رہا تھا۔
"کس کے خوابوں نے۔۔۔؟" علیزے نے جان بوجھ کے چھیڑا تھا۔
"بتا دیا تو خفا ہو گی۔"
"اور نہ بتایا تو میں خفا ہو جاؤں گی۔"
"ارے میری جان! تمہارا کیا ہے چھوٹی سی چڑیا ہو' جب چاہے پکڑ کر منالو۔" دانیال نے علیزے کے کندھے پہ بازو پھیلاتے ہوئے کہا تھا۔
"حرمت آپی! دانیال بھائی آپ کو چڑیا کہہ رہے ہیں' کہتے ہیں جب چاہے پکڑلو۔" علیزے نے شرارت سے کہا تھا اور دانیال گھبرا گیا تھا۔
"علیزے! میں نے ایسا کب کہا؟"
"ابھی ابھی کہا تو ہے۔"
"یار! میں نے تو تمہیں کہا ہے۔" وہ جھنجلا گیا تھا۔
"میں جانتی ہوں آپ نے مجھے کہا ہے۔" علیزے سرگوشی سے بولی تھی اور حرمت اس کی یہ بلند سرگوشی سنتے ہوئے یکدم کھلکھلا کے ہنسی تھی دانیال نے علیزے سے نظر بچا کے حرمت کی ہنسی کو اپنی نظروں میں سمیٹا تھا۔
"وہ تو تم شرارتی ہو گئی ہو؟"
"بس کل سے ہو گئی ہوں ورنہ پرسوں تک تو ٹھیک تھی۔" علیزے کا موڈ کافی خوش گوار ہو رہا تھا اور اس کے موڈ کی یہ خوش گواریت پورا دن یونہی طاری رہی تھی' رفتہ رفتہ سب نیند سے بے دار ہو چکے تھے اور ایسا شان دار موسم دیکھ کر باہر نکلنے کے لیے مچل گئے تھے عائشہ آفندی نے کافی روکا لیکن ان سب کا کہنا تھا کہ وہ یہاں گھومنے پھرنے اور انجوائے کرنے کے لیے آئے ہیں اندر بیٹھنے کے لیے نہیں۔ البتہ عائشہ آفندی نے کہیں بھی جانے سے انکار کر دیا تھا ایک تو وہ کل سے تھکی ہوئی تھیں اور دوسرے باہر بہت زیادہ ٹھنڈ تھی۔ طبیعت خرابی کی وجہ سے وہ اتنی ٹھنڈ بھی برداشت نہیں کر سکتی تھیں اس لیے اپنی ٹیبلٹ لے کر کمرے میں آ کے لیٹ گئی تھیں اور ان لوگوں کا چار گاڑیوں پہ مشتمل قافلہ ایک بار پھر روانگی کے عمل میں تھا۔ آج حرمت اور مدحت نے کومل کو اپنی گاڑی میں کھینچ لیا تھا اور اسے فرنٹ سیٹ پہ آذر کے برابر بیٹھنے کا موقع فراہم کیا تھا کیونکہ جودت آج پھر علیزے کی گاڑی میں منصور حسین کے ساتھ انجوائے کر رہا تھا۔
وہ جب اپنے بنگلے سے نکلے تھے تب دن کے تین بجے کا ٹائم تھا اور تین بجے کا ٹائم کب شام آٹھ بجے میں تبدیل

ہو گیا تھا ان لوگوں کو احساس ہی نہ ہوا۔ احساس تو اس وقت ہوا جب جودت نے ان لوگوں کو فلم دیکھنے کا آئیڈیا دیا تھا۔
"نو سے بارہ کا شو یار۔" جودت نے احمد اور زین کے کندھے پہ ہاتھ مار کے کہا۔
"لیکن لڑکیاں۔" احمد جز بز سا ہو گیا۔
"فلم اچھی ہوئی تو دیکھ لیں گے نہ ہوئی تو واپس چلیں گے۔" اس نے شانے اچکائے۔
"یہ ٹھیک ہے چلو۔" زین ان سے پہلے آگے بڑھ گیا تھا لیکن آذر فلم دیکھنے کے لیے تیار نہیں تھا مگر سب لڑکے لڑکیوں کو تیار دیکھ کر وہ زیادہ دیر انکار نہیں کر سکا تھا مگر علیزے تھکی ہوئی تھی اس نے واپس بنگلے پہ جانے کا ارادہ کر لیا تھا۔
"لیکن علیزے تم۔۔۔" آذر کو خفگی ہوئی۔
"آئی ایم سوری بھائی! میں کل سے بھی تھکی ہوئی ہوں مسلسل تین گھنٹے بیٹھنے کی ہمت نہیں ہے' میں آرام کرنا چاہتی ہوں' سونا چاہتی ہوں' بہت نیند آ رہی ہے۔" علیزے کو فلم دیکھنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اس لیے بہتر تھا کہ وہ گھر جا کر آرام کر لیتی اس کے چہرے پہ بھی تھکن کے آثار تھے آذر اسے مزید اصرار کر کے زبردستی نہیں روک سکا تھا۔
"او کے جاؤ تم آرام کرو۔" آذر نے اس کا رخسار تھپک کے کہا اور وہ مسکراتی ہوئی پلٹ آئی تھی رجو اور منصور حسین گاڑی میں اس کا انتظار کر رہے تھے۔ اس کے بیٹھتے ہی منصور حسین نے گاڑی اسٹارٹ کر دی ابھی وہ راستے میں ہی تھے جب اس کے نمبر پہ آذر کی کال آ گئی تھی۔
"ہمارے آنے تک تم سونا مت' علیزے اکیلی ہے' خیال رکھنا اس کا' پھپھو تو کھانا کھا کر سو گئی ہیں میں نے ابھی کال کی ہے انہیں مگر وہ ریسیو نہیں کر رہیں۔" آذر نے اسے تاکید کی تھی۔
"جی صاحب جیسے آپ کا حکم' آپ کہو تو ساری رات نہیں سوؤں گا۔" منصور حسین نے تابعداری سے کہا۔
"گڈ۔۔۔! بعد میں ملتے ہیں۔" آذر نے کہہ کے فون بند کر دیا اور اتنے میں منصور حسین نے بنگلے کے سامنے بریک لگائے تھے چوکیدار نے گیٹ کھول دیا تھا وہ ایک جھٹکے سے گاڑی اندر لے آیا۔
"میں آپ کے لیے دودھ لے کر آتی ہوں بی بی جی۔" رجو گاڑی سے اترتے ہی کچن کی طرف بڑھی تھی۔
"نہیں رہنے دو' میں سونے جا رہی ہوں۔" علیزے شال سنبھالتی ہوئی اپنے کمرے کی سمت آ گئی اور رجو اپنے کمرے کی سمت چلی گئی — جبکہ منصور حسین وہیں کھڑا رہ گیا تھا کیونکہ اسے جاگنے کا حکم ملا تھا اور اس نے اس حکم کی تعمیل کرنی تھی وہ اسی ستون کے پاس کھڑا سگریٹ پھونکنے لگا۔ باہر کی سردی اور اندر کی سوچ دونوں اپنے عروج پہ تھیں وہ کہیں سے کہیں پہنچا ہوا تھا۔
"منصور حسین! تم سوئے نہیں ابھی تک؟" رجو نہ جانے کہاں سے نمودار ہو گئی تھی۔
"نہیں! آذر صاحب نے جاگنے کے لیے کہا ہے۔"
"او اچھا! پہرہ دے رہے ہو؟"
"ہوں۔۔۔" "میں بھی دوں؟" رجو شرارت سے بولی۔
"نہیں! تم جاؤ جا کر سو جاؤ۔" اس نے اسے اپنے ساتھ جاگنے سے منع کر دیا تھا۔
"لیکن۔۔۔"
"میں نے کہا نا جا کر سو جاؤ۔" منصور حسین نے سختی سے منع کیا تو وہ فوراً" پلٹ کر چلی گئی — اور وہ خود بھی اپنے کمرے کی طرف آ گیا تھا موبائل کو چارجنگ پہ لگا کر وہ دوبارہ گرم چادر اوڑھے باہر آ کر ٹہلنے لگا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ کریں)

نبیلہ عزیز

دردِ دل

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نبیل حیات دونوں بہن بھائی ہیں۔ مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے۔ وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پہ رنگ چکی ہے، جس کے پیش نظر فائزہ بیگم، نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں۔ لیکن مدحیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے، جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے، مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے، مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ بے بسی اور مجبوری سے تنگ آ کر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے، لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باذ امتیاز مل جاتا ہے، جو اسے کام کی آفر کرتا ہے، جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے۔ اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے، وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے۔ وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے، وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا قوی ہے۔ اس نے کبھی ہار نہیں سیکھا۔ اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو [illegible] ہیں۔

17
سترہویں قسط

رات بہت سرد تھی۔

برف کی ہلکی ہلکی سی پھوار اب بھی جاری تھی اور اس ٹھٹھرا دینے والے موسم میں کوریڈور سے باہر منی ڈور کے سامنے والے حصے میں ٹہلتے منصور حسین کی ٹانگیں شل ہو چکی تھیں وہ کل اور آج کی مسلسل ڈرائیو سے کافی تھکا ہوا تھا اور اوپر سے سردی نے برا حال کر رکھا تھا نیند اور تھکن کی وجہ سے اس کی آنکھیں بھی کافی بوجھل ہو رہی تھیں وہ سر جھکائے چادر لپیٹے دائیں بائیں ٹہل رہا تھا اسے پتا تھا کہ اگر وہ تھوڑی دیر کے لیے بھی اپنے کمرے میں گیا تو اسے نیند آجائے گی اور آڈر صاحب خواہ مخواہ اس پہ خفا ہوں گے "اس لیے وہ اپنی ڈیوٹی ایمانداری سے نبھاتے ہوئے اپنے آپ کو سردی کے حوالے کیے ہوئے تھا۔

"منصور حسین۔" اپنے عقب سے اجنبی آواز سن کر منصور حسین چونک کر پلٹا سامنے کوئی اور نہیں اس بنگلے کا چوکیدار کھڑا تھا جس کے ساتھ منصور حسین کی صبح بھی ملاقات ہو چکی تھی۔

"ہوں۔۔۔؟" اس نے صرف "ہوں" کہنے پہ اکتفا کیا تھا۔

"یہاں تو بہت ٹھنڈ ہے؟"

"ہاں! جانتا ہوں۔"

"پھر یہاں کیوں ٹہل رہے ہو۔۔۔؟" چوکیدار نے حیرانی سے پوچھا۔

"مجبوری ہے" آرڈر ملا ہے یہاں ٹہلنے کا۔" منصور حسین کا لہجہ طنزیہ اور تلخ سا ہو گیا۔

"او اچھا۔ لیکن اتنی ٹھنڈ میں کب تک اس طرح ٹہلتے رہو گے۔۔۔؟ گھر کہو تو کوئلوں والی انگیٹھی لا دوں؟" چوکیدار کو اتنی سردی میں ٹہلتے منصور حسین سے کافی ہمدردی محسوس ہوئی۔

"ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی میری گھر والی نے کوئلے دہکائے ہیں۔ تم کہتے ہو تو لے آتا ہوں۔" چوکیدار کافی کھلے دل کا اور مہمان نواز لگتا تھا اس سے منصور حسین کی سردی دیکھی نہیں جا رہی تھی۔

"ارے نہیں یار' تمہاری مہربانی! میں ایسے ہی ٹھیک ہوں' تمہاری گھر والی نے تمہارے لیے کوئلے دہکائے ہیں' تم بھی تھکے ہوئے ہو گے آرام کر لو جا کر۔" اس نے چوکیدار کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے تھپکا اور اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس کی پیشکش سے انکار کر دیا۔

"ارے یار! ہم تو روز یہ آرام کرتے رہتے ہیں اور اگر نہ بھی لیں تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم تو اس موسم کے عادی ہو چکے ہیں' لیکن تم یہاں نئے ہو' تم عادی نہیں ہو' اس لیے ڈر ہے کہ موسم تم پہ اثر نہ کر جائے۔" چوکیدار کے متفکر سے خیال پہ منصور حسین کے چہرے پہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

"کیا مجھے دیکھنے کے بعد بھی تمہیں یہ لگ رہا ہے کہ موسم مجھ پہ اثر کر جائے گا۔۔۔؟" منصور حسین کا اشارہ اپنی صحت کی طرف تھا۔

"کیوں منصور حسین تم انسان نہیں ہو کیا؟ جس پہ موسم اثر نہیں کر سکتا؟" چوکیدار کا سوال بھی بجا تھا۔

"انسان ہوں یار! لیکن ایک مرد ہوں' اور مرد پہ موسم اثر نہیں کرتے' مرد پہ عورت اثر کرتی ہے' صرف عورت۔ اور موسم عورت پہ اثر کرتے ہیں' ان تینوں کا ازل سے تال میل ہے کہتے ہیں' مرد' عورت اور موسم تینوں کو کبھی ایک جگہ اکٹھا کر دو تو قیامت کا پاگل پن اٹھائیں گے۔" منصور حسین کا جواب بھی بجا تھا چوکیدار واقعی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

"کیا بات کہی ہے منصور حسین' دل خوش ہو گیا ہے اور اسی خوشی میں تمہارے لیے چائے کا ایک کپ بھی ہو گیا۔" چوکیدار منصور حسین کو شاباش دیتے ہوئے پلٹ کر چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد ہی وہ اس کے لیے دہکتے کوئلوں والی انگیٹھی لے آیا تھا اور پھر اسے انگیٹھی کے قریب کرسی بھی کھینچ دی۔

"تم بیٹھ کر ہاتھ سینکو میں چائے لے آؤں۔" وہ دوبارہ اپنے کوارٹر کی سمت چلا گیا اور منصور حسین کرسی پہ بیٹھ کے آگ کی تپش سے لطف اندوز ہونے لگا تھا دہکتے سرخ انگارے انگیٹھی میں جیسے بھڑک رہے تھے اور وہ ان دہکتے بھڑکتے کوئلوں پہ نظر جمائے نہ جانے ان میں کیا کھوج رہا تھا کہ اسے چوکیدار کی واپسی کا بھی احساس نہیں ہوا۔

"لو منصور حسین چائے پیو۔" چوکیدار نے چائے کا بھاپ اڑاتا کپ اس کے چہرے کے سامنے کیا تھا وہ اپنی بیوی سے کہہ کر گرم تازہ چائے بنوا کے لایا تھا منصور حسین نے چونک کر اسے دیکھا پھر مسکرا دیا۔

"مہربانی ہے یار' کافی زحمت کی ہے تم نے۔" وہ اس کے ہاتھ سے کپ تھامتے ہوئے کافی ممنون سے لہجے میں بولا۔

"ارے! زحمت کیسی۔۔۔؟ تم مہمان ہو یہاں' اور دوسری بات کہ تم ملازم ہو اور ایک ملازم کی حالت کو ایک ملازم ہی سمجھ سکتا ہے' مالک لوگ اپنا تو خیال کر لیتے ہیں' تمہارے اور میرے جیسے ملازموں کا نہیں کرتے' اس لیے ایک دوسرے کا خیال اور احساس ہمیں خود کرنا چاہیے' مالکوں سے ایسی امید فضول ہوتی ہے۔" چوکیدار مسکرا کے کہتے ہوئے دوسری کرسی کھینچ کے اس کے مقابل ہی بیٹھ گیا۔

"ارے نہیں یار! ایسی کوئی بات نہیں ہے' ہمارے مالک لوگ اتنے برے بھی نہیں ہیں' کافی خیال رکھتے ہیں' اب یہی دیکھ لو' میں نے یہاں آنا تھا اور میرے پاس گرم کپڑے بھی نہیں تھے اس لیے علیزے بی بی نے پیسے دیے اور میں جا کر اپنے لیے گرم کپڑے اور یہ گرم چادر لے آیا' اب اگر یہاں سردی میں میں اپنی ڈیوٹی نبھا رہا ہوں تو میرے پاس گرم کپڑوں کا تھوڑا بہت سہارا تو ہے نا۔۔۔؟ اگر یہ بھی نہ ہوتا تو میں واقعی ٹھٹھر رہا ہوتا' اس سے اب تم ہی اندازہ لگا لو کہ ہمارے مالک اچھے ہیں یا برے۔۔۔؟" منصور حسین نے اپنے مالکوں کی طرف داری کی اور چوکیدار مزید کچھ نہیں کہہ سکا وہ اس کے جواب پہ خاموش ہو گیا لیکن تھوڑی دیر بعد منصور حسین اسے دوبارہ سے اپنے ساتھ باتوں پہ آمادہ کر چکا تھا ان دونوں کی کچھ دیر کے لیے محفل جم گئی تھی۔

"تم سگریٹ بھی پیتے ہو۔۔۔؟" چائے کے بعد منصور حسین نے سگریٹ اور ماچس کی ڈبیا نکالی تو چوکیدار نے بے ساختہ پوچھ لیا۔

"ہاں یار! شراب مہنگی ہے وہ نہیں پی سکتا سگریٹ سستا ہے' اس لیے پی لیتا ہوں۔" اس نے سگریٹ کو دیکھتے ہوئے استہزائیہ سے انداز میں کہا اور پھر سگریٹ کو ہونٹوں میں دبا کر ماچس کا شعلہ جلا لیا۔ لیکن سرد ماحول اور سرد ہوا کے باعث ماچس کی تیلی کا یہ ننھا سا شعلہ فوراً بجھ گیا تھا وہ ایسے سرد موسم کی تاب نہیں لا پایا تھا اس لیے منصور حسین کو ایک اور تیلی جلانی پڑی لیکن اب کی بار منصور حسین نے اس شعلے کو ہاتھ کی اوٹ کا سہارا دیا اور اپنے ہاتھ کی سمت ذرا سا جھکتے ہوئے سگریٹ کا کش لیا اور سگریٹ سلگا لیا۔

"یہ بھی نہ پیا کرو۔" چوکیدار نے منع کیا تھا۔

"جس روز یہ بھی مہنگا ہو گیا اس روز نہیں پیوں گا۔" اس نے انگلیوں میں دبے سگریٹ کو دیکھ کر سر جھٹکا۔

"اچھی بات ہے۔" چوکیدار مسکرایا۔ اور منصور حسین ادھر ادھر دیکھنے لگا چوکیدار کی باتیں اور سوال و جواب اب بھی جاری تھے ان کی نشست کافی دیر قائم رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

مری میں کوئی سینما نہیں تھا جہاں وہ فلم دیکھنے کے لیے جاتے' یہاں کسی نے اپنی رہائش گاہ کو سینما کا روپ دے رکھا تھا بڑے سے وسیع و عریض ڈرائنگ روم کو ہر چیز سے خالی کر کے پورے ہال میں کرسیوں کا انتظام کر رکھا تھا

اور ایک صاف دیوار پہ پروجیکٹر کے ذریعے فلم دکھائی جاتی تھی۔ یہاں کا ماحول بھی ان سب کو خاصا دلچسپ لگا تھا۔ ان کے علاوہ اور بھی چند منچلے اور بے فکرے لوگ موجود تھے۔

"حرمت! تم لوگ کھانے کے لیے کچھ لوگی۔؟" یہاں موجود ہر آدمی کے ہاتھ میں کھانے کے لیے کوئی نہ کوئی چیز ضرور تھی جسے دیکھ کر آذر کو لڑکیوں کا خیال آگیا تھا۔

"جی! میں پاپ کارن لوں گی۔" حرمت نے فوراً اپنی پسند بتادی۔ پھر باری باری سب نے اپنی پسند آذر کو بتائی۔ آذر سرہلا کر پلٹ گیا لیکن کچھ یاد آنے پہ دوبارہ ان کی سمت پلٹا تھا۔

"ارے کومل! آپ نے تو کچھ بتایا ہی نہیں۔؟" اس نے انوشہ کے ساتھ ایک سائیڈ پہ کھڑی کومل سے حیرت سے استفسار کیا تھا۔

"آپ نے کچھ پوچھا بھی تو نہیں۔؟" کومل نے آہستگی سے کہتے ہوئے کندھے اچکائے تھے۔

"پوچھا تو میں نے انوشہ اور جویریہ سے بھی نہیں' پھر بھی انہوں نے اپنی پسند بتادی ہے۔" آذر کے جواب پہ کومل لاجواب ہوگئی تھی۔

"اپنی پسند بتادینا اچھا ہوتا ہے' سامنے والے کو بندے کی پسند اور ناپسند کا پتا تو چل جاتا ہے نا؟ اور اس طرح دوسرا بندہ آگاہ بھی ہوجاتا ہے' بڑے فائدے ہوتے ہیں پسند بتادینے کے۔" انوشہ نے فوراً مداخلت کی تھی اور کومل نے چونک کے دیکھا۔ انوشہ کی بات ذو معنی تھی۔

"بتایئے اپنی پسند میں سن رہا ہوں۔" آذر انتظار میں کھڑا تھا۔

"آئس کریم۔" کومل نے آہستگی سے کہا۔

"آئس کریم۔؟ اس موسم میں۔؟" آذر کو اچنبھا ہوا۔

"جی! اس موسم میں۔" کومل نے سرہلایا۔

"لیکن کومل اس موسم میں آئس کریم سے گلا خراب ہوجائے گا' بیمار پڑجاؤ گی۔" آذر نے اسے باز رکھنا چاہا۔

"اس موسم میں ہی تو آئس کریم کھانے کا مزا آتا ہے' آپ بھی ٹرائی کرکے دیکھیں۔" کومل بے ساختہ کہتے ہوئے مسکرائی تھی۔

"اوکے ایزیو وش۔" اس نے کندھے اچکائے اور زین کو ساتھ لے کر باہر نکل گیا تھا اس گھر سے باہر ہی چھوٹی سی کینٹین بنی ہوئی تھی وہیں پہ کھانے پینے کی ہر چیز دستیاب تھی تھوڑی دیر بعد وہ ان سب کی پسند کی تمام چیزیں لے آیا تھا لڑکے پہلے ہی کچھ نہ کچھ کھاتے پھر رہے تھے اور اتنے میں فلم بھی اسٹارٹ ہوگئی وہ سب اپنی اپنی جگہ پہ لگ کے بیٹھ گئے تھے کومل آذر کے ساتھ ہی بیٹھی ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

علیزے اپنے روم میں آتے ہی گہری نیند سوگئی تھی سردی اور تھکن کی وجہ سے جیسے ہی اسے بستر کی نرمی اور کمرے میں موجود ہیٹر کی گرمائش میسر آئی اس کی پلکیں فوراً ہی بند ہونے لگیں اور چند سیکنڈز میں ہی وہ پرسکون اور گہری نیند کی وادیوں میں اتر گئی تھی اسے یہ بھی خبر نہیں تھی کہ باہر موسم اپنی کن جولانیوں پہ ہے۔؟ وہ جس کروٹ سوئی تھی اتنی دیر اسے اسی کروٹ پہ گزر گئی تھی بہت دیر گزر جانے کے بعد اسے نیند میں ہی تھکن کا احساس ہوا تو اس نے دائیں طرف سے بائیں طرف کروٹ بدلی اور کروٹ بدلتے ہوئے ہی اس کی آنکھ کھل گئی تھی اس نے سرسری سے انداز میں دیکھا اور دوبارہ پلکیں موندلی تھیں لیکن پلکیں موندنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ اس نے کوئی غیر معمولی چیز دیکھی ہے۔ جس کی وجہ سے علیزے نے یکدم پٹ سے آنکھیں کھول دی تھیں۔

دائیں طرف کھلنے والی کھڑکی کا ایک پٹ کھلا ہوا تھا اور پردے پہ کسی آدمی کا سایہ لہرا رہا تھا۔ اور پردہ بھی ہل رہا تھا علیزے کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور اس کے دل و دماغ میں خوف کی ایک لہر سرائیت کرگئی تھی۔

"کک۔۔۔ کون۔۔۔ ہے۔؟" اس نے خوف زدہ سے لہجے میں پوچھنے کی کوشش کی لیکن اس پہ ایسی دہشت سوار ہوئی تھی کہ حلق سے اس کی آواز ہی نہ نکل سکی اور اس میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ وہ اپنے بستر سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس جاتی اور یہ دیکھ لیتی کہ باہر کون ہے؟

"بابا۔" علیزے نے گھٹی گھٹی سی آواز میں اپنے بابا کو پکارا جیسے وہ اس کے پکارنے پہ فوراً اس کے پاس پہنچ جائیں گے' علیزے کو اپنی موت اپنے بہت قریب محسوس ہورہی تھی' دل تھا کہ اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتا جارہا تھا اور خوف تھا کہ اس کی روح کھینچ رہا تھا علیزے کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے باہر سے سرگوشیوں کی آواز سنائی دے رہی تھی اور ان سرگوشیوں میں کوئی کیا کہہ رہا تھا اسے کچھ خبر نہیں تھی۔

"آذر بھائی۔" اس کی دوسری پکار آذر بھائی کے لیے تھی لیکن وہ اپنے بابا کو اور آذر بھائی کو یہاں بستر میں بیٹھے بیٹھے نہیں بلا سکتی تھی' انہیں بلانے کے لیے اسے فون کی ضرورت تھی لیکن اسے یہ بھی یقین تھا کہ آذر بھائی کے آنے تک وہ زندہ نہیں بچے گی لیکن پھر بھی لرزتے کانپتے ہاتھوں سے وہ موبائل ٹٹولنے لگی اور سائیڈ ٹیبل سے موبائل ٹٹولتے ہوئے پانی کا جگ دھڑام سے زمین پہ گرا اور چکنا چور ہوگیا تھا علیزے خود بھی چیخ کے اٹھ بیٹھی تھی اس نے وحشت زدہ ہوکر یکدم کھڑکی کی سمت دیکھا جہاں سے کسی نے ہاتھ اندر بڑھا کر کھڑکی کا پٹ زور سے بند کردیا تھا اور اس منظر پہ علیزے کی چیخ بڑی بے ساختہ تھی وہ یکدم بستر سے چھلانگ مار کے اتری اور دروازہ کھول کے باہر بھاگ نکلی تھی۔

ٹھنڈے فرش پہ ننگے پیر اور ننگے سر بھاگتی ہوئی وہ چیخ رہی تھی اس کا رخ کوریڈور کی سمت تھا اور کوریڈور سے باہر لیٹا منصور حسین بھی اس کی چیخوں کی آواز پہ بری طرح چونک گیا تھا۔

"علیزے بی بی۔؟" وہ اندر کی سچویشن سے پریشان اپنی جیب سے ریوالور نکال کے کوریڈور کی سمت لپکا لیکن علیزے کوریڈور کا تمام فاصلہ طے کرتی ہوئی آئی اور سامنے سے آتے منصور حسین سے بری طرح لپٹ گئی۔ اور منصور حسین اس کے اس طرح لپٹ جانے پہ ساکت و صامت رہ گیا وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا' علیزے بی بی اس کے سینے سے آلگی تھیں۔؟ حیرت تھی کہ قیامت تھی' کچھ اور ہی عالم تھا' علیزے کا چہرہ منصور حسین کے گرد لپٹی گرم چادر میں چھپ گیا تھا اتنا کہ منصور حسین کے سینے سے لگ گیا تھا۔

"علیزے بی بی۔!" منصور حسین نے اپنے مضبوط اعصاب اور بلند کردار کا ثبوت دیتے ہوئے اسے احتیاط سے متوجہ کیا تھا۔

"منصور۔۔۔ ڈرائیور! وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ میرے۔۔۔ کمرے۔۔۔ میں۔۔۔ کوئی۔۔۔ آدمی۔۔۔ کوئی۔۔۔ آدمی۔۔۔ گھسنے کی۔۔۔ کک۔۔۔ کوشش۔۔۔ کررہا تھا۔" علیزے بے ربط سے لہجے میں بمشکل بول پائی تھی۔ منصور حسین یکدم چونک گیا تھا۔

"کوئی آدمی۔۔۔؟ کب؟ آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔؟" منصور حسین نے اسے پیچھے ہٹا کر اس کے کمرے کی سمت بڑھنا چاہا تھا لیکن علیزے اس سے الگ ہوکر پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہیں تھی منصور حسین جھنجلا گیا اس نے علیزے کو دونوں کندھوں سے تھام کے اسے خود سے الگ کیا وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھی۔

"آپ میرے پاس کیوں چھپ رہی ہیں؟ میں آپ کا ملازم ہوں ملازم' آپ کا ڈرائیور منصور حسین' کچھ اور مت سمجھیے مجھے۔" اس نے علیزے کو ذرا سا جھنجوڑ کے اسے ہوش دلایا تھا تاکہ اس کے حواس ٹھکانے پہ

آجائیں کیونکہ منصور حسین کو پتا تھا کہ وہ ایسی حرکت بدحواسی میں کر رہی ہے اور وہ اس کے جھنجوڑنے پہ واقعی ہوش میں آگئی تھی اور ہوش میں آتے ہی اسے پہلا خیال منصور حسین کے ہاتھوں کے لمس کا آیا تھا وہ یکدم پیچھے کو ہٹی اور اس کے پیچھے ہٹتے ہی منصور حسین کو اس کی بدحواسی کا مزید احساس ہوا تھا وہ ننگے پاؤں اور ننگے سر کھڑی تھی۔ منصور حسین اپنی گرم چادر اس کی سمت بڑھاتے ہوئے اس سے نظر چرا کر اس کے کمرے کی طرف بڑھ گیا علیزے کو بھی اپنے دوپٹے کی کمی کا احساس ہوا تھا اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی چادر اپنے اردگرد اوڑھ لی اور کوریڈور میں تنہا کھڑے رہنے کی بجائے وہ بھی منصور حسین کے پیچھے اپنے کمرے میں چلی آئی وہ اس کے کمرے کی تمام لائٹس جلا چکا تھا۔

"کیا ہوا ہے یہاں؟ کہاں دیکھا ہے آپ نے کسی آدمی کو۔۔۔؟" منصور حسین اس کے پورے کمرے میں جائزہ لیتے ہوئے کھوجتی نظروں سے دیکھ رہا تھا بیڈ کے قریب فرش پہ پانی گرا ہوا تھا اور شیشے کے جگ کے ٹوٹے ہوئے کانچ کافی دور تک بکھرے ہوئے تھے قریب ہی علیزے کا موبائل بھی پانی میں گرا ہوا تھا۔

"وہاں کھڑکی کے پاس۔" علیزے نے ڈرتے ڈرتے اشارہ کیا۔ منصور حسین کانچ کے ٹکڑوں کو اپنے بوٹوں تلے روندتا ہوا کھڑکی کے قریب چلا آیا کھڑکی کے پٹ آپس میں ملے ہوئے تھے لیکن کھڑکی کا ہک واقعی کھلا ہوا تھا اس نے پردہ ہٹا کر اپنا ریوالور ریڈی کیا اور یکدم دونوں پٹ کھول دیئے لیکن باہر کوئی بھی نہیں تھا منصور حسین نے کھڑکی سے باہر سر نکال کے جھکتے ہوئے دائیں بائیں دیکھا۔ لیکن وہاں تو دور دور تک کسی کا نام و نشان تک نہیں تھا ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔

"یہاں تو کوئی نہیں ہے علیزے بی بی۔۔۔؟" اس نے پلٹ کر دم سادھے کھڑی خوف زدہ سی علیزے کو دیکھا۔

"وہ یہاں ہی کھڑا تھا اس نے" اس نے جگ گرنے کی آواز سن کر کھڑکی بند کر دی' وہ بھاگ گیا ہوگا۔" علیزے کہتے ہوئے رو پڑی تھی اس کا پورا جسم لرز رہا تھا دوسری بار ایسا ہوا تھا کہ وہ کسی بڑے حادثے سے بچ نکلی تھی لیکن ہر بار تو ایسا نہیں ہو سکتا تھا نا۔۔۔؟

"وہ کون تھا۔۔۔؟ کیسے آیا اور کیسے بھاگ گیا۔۔۔؟ گیٹ کے سامنے اور چوکیدار کے باہر تو میں پہرہ دے رہا تھا۔۔۔؟" منصور حسین کو حیرت اور پریشانی ہو رہی تھی اس کی موجودگی میں علیزے بی بی کو کچھ ہو جاتا تو وقار آفندی کے سامنے اسے ہی جوابدہ ہونا پڑتا' انہوں نے علیزے کی حفاظت اسی کے ذمے لگا کر بھیجا تھا منصور حسین کو سوچ کر ہی معاملے کی سنگینی کا احساس ہو گیا اسی لیے وہ زیادہ پریشان ہو رہا تھا۔

"آپ بیٹھیں میں ابھی آتا ہوں۔" وہ باہر نکلنے لگا۔

"نہیں ڈرائیور! تم کہیں نہیں جاؤ گے۔" علیزے اکیلے پن سے ڈر رہی تھی۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" وہ ٹھہر گیا۔

"مجھے اکیلے ڈر لگ رہا ہے۔"

"اور مجھے آپ کے ساتھ ڈر لگ رہا ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہو تم؟"

"کچھ نہیں۔" منصور حسین کہہ کے باہر نکل گیا اور وہ لان کے اس حصے کی طرف آیا جہاں علیزے کے کمرے کی کھڑکی کھلتی تھی کھڑکی سے باہر لان کی روندی ہوئی گھاس سے لگ رہا تھا کہ واقعی وہاں کوئی آیا تھا اس نے اس بنگلے کی چھوٹی چھوٹی دیواروں کو دیکھا جہاں سے کوئی بھی کود کر باآسانی اندر آسکتا تھا منصور حسین ان سب دیواروں سے جھانک کے بھی دیکھ آیا تھا لیکن اسے کوئی مشکوک آدمی نظر نہیں آیا بلکہ منصور حسین سوچ رہا تھا کہ جو بھی یہاں آیا تھا اس کی اسپیڈ بہت تیز تھی جو وہ اتنی جلدی غائب ہو گیا۔

"کوئی ملا۔۔۔؟" وہ واپس آیا تو علیزے نے چھوٹتے ہی استفسار کیا تھا۔

"اگر کسی نے ملنا ہوتا تو بھاگنے کی ضرورت کیا تھی بھلا۔۔۔؟" وہ مایوسی سے کہہ رہا تھا

"اب کیا ہوگا۔۔۔؟" علیزے پوچھتے ہوئے بھی ڈر رہی تھی وہ کافی خوف زدہ اور ڈری سہمی سی لگ رہی تھی اور اوپر سے ٹھنڈ کی وجہ سے اس کی رنگت الگ نیلی پیلی ہو رہی تھی۔

"میں آذر صاحب کو کال کر کے گھر بلاتا ہوں۔"

"نن نہیں۔۔۔ تت۔۔۔ تم ان کو کال مت کرو۔" علیزے نے بے ساختہ اسے روک دیا۔

"کیوں علیزے بی بی۔۔۔؟ اتنی بڑی بات ہو گئی ہے اور آپ۔۔۔؟" منصور حسین کو حیرت ہوئی۔

"اس سے پہلے اس سے بھی بڑی بات ہو چکی ہے اور تمہیں نہیں پتا کہ اس بات کا کتنا اثر ہوا تھا سب کتنے پریشان اور ٹینس ہوئے تھے' اتنے دن حویلی کے سب لوگ اسی پریشانی کے زیر اثر رہے تھے اور اب بھی یقیناً" ایسا ہی ہوگا۔" علیزے پریشان اور کشمکش کا شکار تھی۔ منصور حسین کو اس کی بات پہ تعجب ہوا تھا۔

"لیکن علیزے بی بی۔۔۔"

"پلیز ڈرائیور! میں بہت پریشان ہوں' کیونکہ میں اپنی وجہ سے کسی کو پریشان نہیں کرنا چاہتی' پہلے ہی سب میری وجہ سے اتنا پریشان رہتے ہیں اور اب میری وجہ سے ان کا پروگرام خراب ہو' میں یہ نہیں چاہتی۔" علیزے کا لہجہ روہانسا ہو رہا تھا اس کے حلق میں آنسوؤں کا گولا سا اٹک گیا وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھام کے صوفے پہ بیٹھ گئی۔

"تو اس میں آپ کا کیا قصور ہے علیزے بی بی۔۔۔؟"

"میرا کوئی قصور نہیں ہے تو اس میں دوسروں کا کیا قصور ہے کہ میری وجہ سے وہ سب بھی ڈسٹرب ہوں۔" علیزے کی آواز بھیگ رہی تھی۔

"اس میں ڈسٹرب ہونے کی کیا بات ہے۔۔۔؟"

"تم سمجھ نہیں رہے' اس میں ڈسٹرب ہونے کی ہی تو بات ہے' پاپا کو یا آذر بھائی کو پتا چلے گا تو وہ فوراً" واپسی کا آرڈر دے دیں گے اور یہ سب جو اتنی خوشی خوشی گھومنے پھرنے کے لیے آئے ہیں ان کا موڈ خراب اور پروگرام درہم برہم ہو کے رہ جائے گا' بلکہ آئندہ کبھی بھی اجازت نہیں ملے گی' ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سب پہ پابندی لگ جائے گی۔" علیزے بنیادی طور پہ ایک ڈری سہمی اور ڈرپوک سی لڑکی تھی اس وقت بھی اس کے دل میں خوف پوری طرح سے موجود تھا لیکن وہ اپنے اندر کے اس خوف کو دباتی ہوئی باقی سب کا خیال کر رہی تھی اسے پتا تھا کہ پاپا کا غصہ آتش سیب پہ ہوگا اور اسے ساتھ لانے والے آذر بھائی کو بھی پاپا کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے گا۔

"لیکن علیزے بی بی! اگر کوئی نقصان ہو گیا تو۔۔۔؟" منصور حسین کو اندر ہی اندر پریشانی لاحق تھی اسے بھی بار بار وقار آفندی کا ہی خیال آ رہا تھا۔

"نہیں ہوگا نقصان' تم رحو سے کہو آ کر میرے کمرے میں سو جائے' میں اب لائٹ جلا کر سوؤں گی اور سنو! تم صرف گیٹ کی طرف ہی نہیں باقی گھر کی طرف بھی دھیان رکھنا' دیواریں کافی چھوٹی ہیں۔" اس نے منصور حسین کو تاکید کی اور منصور حسین اسے دیکھ کے رہ گیا' وہ چھوٹی سی کم عمر اور کمسن سی لڑکی دوسروں کے خیال سے اپنے اندر کا خوف اندر ہی دبا کر بہادری اور سمجھ داری کا ثبوت دے رہی تھی۔ منصور حسین کو اس لمحے وہ معصوم سی لڑکی بہت اچھی اور بہت پیاری لگی وہ بے ساختہ اسے ہی دیکھے گیا۔

"ڈرائیور۔" علیزے نے اسے وہیں کھڑے دیکھ کر متوجہ کیا۔ وہ یکدم چونک گیا۔

"میں نے تم سے کچھ کہا ہے' سنا تم نے۔۔۔؟"

"جی جی۔۔۔ سب سن لیا ہے' ابھی بھیجتا ہوں۔" وہ فوراً" اس کے کمرے سے باہر نکل آیا اور رجو کو جگا کر علیزے کے کمرے میں بھیج دیا، مگر اس کے باوجود منصور حسین کی پریشانی اور سوچ کم نہیں ہوئی تھی وہ اب زیادہ چوکس ہو کر جاگ رہا تھا اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اچانک یہ سب کیا ہوا ہے۔۔۔؟

"کیا علیزے بی بی کا دشمن اتنا باخبر ہے کہ وہ ان کے پیچھے مری بھی پہنچ گیا ہے تو کیا واقعی علیزے بی بی کی جان کو خطرہ ہے۔۔۔؟ لیکن ان کے دشمن نے انہیں ابھی تک کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔۔۔ ہو سکتا ہے وہ موقع کی تلاش میں ہو۔۔۔؟" منصور حسین کے ذہن میں طرح طرح کی سوچیں اور طرح طرح کے سوال اٹھ رہے تھے' اسے اس مسئلے کا کوئی سر پیر نظر نہیں آرہا تھا' ریشم کی گتھی کی طرح ہر ڈوری الجھی ہوئی تھی اور سلجھنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ نرم بستر پہ اوندھی لیٹی گہری نیند سو رہی تھی جب اچانک اس کے سیل پہ اولڈ رنگ بجنے لگی۔

اس نے اس رنگ کی آواز سے بچنے کے لیے تکیہ اٹھا کر اپنے سر پہ رکھ لیا تاکہ اس کی نیند ڈسٹرب نہ ہو۔ دوسری طرف والا شاید کچھ زیادہ ہی ڈھیٹ یا مجبور تھا جو اسے بار بار رنگ کر رہا تھا' مدحیہ نے بالآخر غصے سے بھناتے ہوئے تکیہ پرے پھینکا اور سیل اٹھا کر کان سے لگا لیا۔

"ہیلو۔۔۔؟" اس کا غصہ اور بے زاریت اس کی ایک ہیلو میں ہی سمٹے ہوئے تھے۔

"میڈی! میں جبزی بات کر رہا ہوں۔" دوسری طرف کی آواز سن کر اسے مزید غصہ آگیا۔

"یہ بھی کوئی وقت ہے بات کرنے کا۔۔۔؟"

"میڈی۔۔۔! میں اس وقت مشکل میں ہوں۔" وہ بے چارا پریشان لگ رہا تھا۔

"مشکل میں۔۔۔؟ کیا مطلب۔۔۔؟" وہ کروٹ بدل کر سیدھے ہوتے ہوئے بولی۔

"میں نے تمہیں بتایا تھا نا میں پاکستان آرہا ہوں۔۔۔ تو یار! میں اس وقت پاکستان میں ہوں۔"

"واٹ؟ پاکستان میں۔۔۔؟" وہ کرنٹ کھا کے اک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔

"ہاں! پاکستان میں۔"

"مگر کہاں ہو؟"

"لاہور ایئرپورٹ پہ ہوں۔"

"اف مائی گاڈ۔۔۔! تم نے مجھے بتایا بھی نہیں؟" مدحیہ ایک تو نیند سے اٹھی تھی اور ایک جبزی کی اچانک آمد، وہ حقیقتاً" پریشان ہو گئی اسے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کرنا چاہیے۔۔۔؟

"میں نے سوچا تھا کہ تمہیں اچانک سرپرائز دوں گا' لیکن یہاں آکر مجھے سمجھ نہیں آرہا کہ کہاں جاؤں اور کیا کروں۔۔۔؟ تمہارے گھر کا پتا مجھے معلوم ہے' اسی لیے پریشان ہو کر تمہیں کال کی ہے۔" جبزی خود بھی شرمندہ ہو رہا تھا۔

"کیا بات ہے میڈی؟ تمہیں میرا آنا اچھا نہیں لگا۔۔۔؟" مدحیہ کو خاموش دیکھ کر جبزی نے بے ساختہ پوچھا تھا۔

"ہوں؟ نہیں ایسی بات نہیں ہے تم وہیں ٹھہرو' میں ابھی آرہی ہوں۔" مدحیہ نے کہہ کر فون بند کر دیا اور کمبل پرے ہٹا کر بستر سے اٹھ گئی' باتھ روم میں جا کر چہرے پہ پانی کے چھپاکے مارے اور تولیے سے چہرہ پونچھتی ہوئی باہر نکل آئی' بلیک ٹراؤزر پہ اس نے وائٹ ہاف سلیوز ٹاپ پہن رکھا تھا اور ٹاپ کے اوپر ہی اس نے بلیک لانگ جرسی پہن لی' بالوں کو پونی میں جکڑ کے اپنا گرے کلر کا گرم مفلر کھینچا اور اپنے سر اور گردن کے اردگرد لپیٹ

لرجو کرڈ کے، گاڑی کی چابی، موبائل اور بیگ اٹھائے اور کمرے سے نکل آئی وہ کافی عجلت سے سیڑھیاں اتری تھی جس پہ ڈرائنگ روم میں ٹہلتے ممتاز حیات نے چونک کر دیکھا انہیں اپنے گھر میں اتنی جلدی کسی کے اٹھنے کی ہرگز امید نہیں تھی لیکن مدحیہ کو دیکھ کر انہیں اچنبھا ہوا تھا۔ وہ بھی انہیں دیکھ چکی تھی لیکن انہیں نظر انداز کرتی ہوئی آگے بڑھ گئی تھی۔

"رکو! کہاں جا رہی ہو تم.....؟" ان کی آواز پہ مدحیہ کے قدم ٹھہر گئے تھے وہ ان کے سوال پہ بہت خوش ہوئی تھی۔ اس نے ایڑیوں کے بل گھوم کر انہیں دیکھا۔

"ایئرپورٹ۔" مختصر سا جواب دیا تھا۔

"ایئرپورٹ.....؟" انہوں نے جواباً دہرایا تھا۔

"جی ایئرپورٹ، اپنے بوائے فرینڈ کو لینے کے لیے جا رہی ہوں، انگلینڈ سے آیا ہے، صرف مجھ سے ملنے کی خاطر۔" اس نے اک اک لفظ پر زور دیتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ کیا بکواس کر رہی ہو تم.....؟ نبیل کہاں ہے.....؟ اسے تمہاری بے ہودہ حرکتوں کا پتا نہیں ہے شاید.....؟" وہ یکدم غصے سے دھاڑے تھے۔ مدحیہ کے لبوں پہ ایک استہزائیہ سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

"جی تو مجھے افسوس ہے کہ نبیل بھائی کو آپ کی بے ہودہ حرکتوں کا بھی پتا نہیں ہے شاید، ورنہ وہ آپ کو کب کا ذلیل کر کے اس گھر سے نکال چکے ہوتے۔" مدحیہ ممتاز حیات کے سامنے جب بھی بولتی تھی آگ اگلتی تھی اس کا دل چاہتا تھا وہ اپنے بدکردار باپ کو آگ لگا کر جلا دے، بھسم کر ڈالے ان کو، لیکن اس کی بے بسی تھی کہ اس کا بس نہیں چلتا تھا۔

"اپنی زبان کو لگام دو۔"

"آپ جیسے گھٹیا اور بے لگام انسان کی اولاد ہوں میں، مجھے کون لگام ڈال سکتا ہے بھلا.....؟" وہ ممتاز حیات کو بے عزت کرنے کا کوئی بھی موقع ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی شاید۔

"بکواس بند۔"

"ایم سوری! میں لیٹ ہو رہی ہوں، جبزی ایئرپورٹ پہ میرا انتظار کر رہا ہو گا، آپ کی یہ تکرار پھر کبھی سہی۔" مدحیہ ان کا خون جلاتی ہوئی اطمینان سے پلٹ کر کوریڈور عبور کر گئی اور پیچھے ممتاز حیات کا خون کھولتا رہ گیا۔ ممتاز حیات کو اس کے بوائے فرینڈ کا سن کر غصہ آیا تھا مدحیہ کے لیے یہی بہت بڑی بات تھی اس کا مطلب تھا کہ جو وہ سوچتی تھی، جو وہ چاہتی تھی، وہ کر سکتی تھی.....؟

"ہوں! جبزی بہت اچھا کیا کہ تم پاکستان آ گئے۔" وہ ڈرائیو کرتے ہوئے جبزی کو دل ہی دل میں شاباش دے رہی تھی۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ ایئرپورٹ پہ موجود تھی اور جبزی کو ڈھونڈ رہی تھی۔

"میڈی۔" وہ ایئرپورٹ پہ موجود تمام نئے پسنجرز میں جبزی کو ڈھونڈ رہی تھی جب اسے اپنے عقب سے جبزی کی آواز سنائی دی۔

"جبزی۔" وہ بے ساختہ پیچھے پلٹی۔

"ہائے۔" جبزی نے بہت ہی دھیمے سے لہجے میں کہا تھا یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے اندر امڈنے والی خوشی اور جذبے کو دبا رہا ہو۔

"کیسے ہو.....؟"

"کچھ پتا نہیں۔" جبزی نے ہلکے سے مسکراتے ہوئے کندھے اچکائے تھے۔

"لگتا ہے پاکستان آ کر حواس گم ہو گئے ہیں تمہارے؟" مدحیہ نے دلچسپی سے اسے دیکھا تھا۔

"پتا نہیں۔"

"اف جبزی۔" مدحیہ اسے گھورتے ہوئے چیخ اٹھی تھی اور جبزی یکدم قہقہہ لگا کے ہنس پڑا جس پہ مدحیہ بھی اپنی مسکراہٹ روک نہیں پائی۔

"اچھی لگ رہی ہو۔" اس نے مدحیہ کو دیکھتے ہوئے تعریف کی۔

"اتنے دنوں بعد دیکھ رہے ہو اس لیے، ورنہ اتنی اچھی بھی نہیں لگ رہی، میں نیند سے اٹھ کے ایسے ہی آ گئی ہوں۔" مدحیہ نے منہ بنا کے کہا تھا۔

"کیونکہ تمہیں پتا تھا کہ تم ایسے بھی اچھی ہی لگتی ہو۔" جبزی کی بات پہ مدحیہ یکدم کھلکھلا کے ہنسی تھی وہاں موجود کئی لوگ بار بار پلٹ کر انہیں دیکھ رہے تھے اور لوگوں کو دیکھنے کی وجہ سے جبزی تھا، پاکستانی مسلم لڑکی کے ساتھ انگریز لڑکا سب کے لیے دلچسپی اور تجسس کا باعث تھا۔

"ہوں! یہ بھی ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن کیا اب مجھے یہیں ایئرپورٹ پہ گزارا کرو گی.....؟ کافی تھک چکا ہوں میں۔" جبزی نے خود ہی اسے احساس دلایا تو مدحیہ بے ساختہ ہنس پڑی تھی۔

"او کے او کے! چلو میرے ساتھ۔" وہ ہنستی ہوئی اسے کہہ کر آگے بڑھ گئی اور جبزی اپنے سامان والی ٹرالی دھکیلتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے آ گیا تھا۔ مدحیہ نے گاڑی کی ڈگی کھول کر اس کا سامان رکھوایا اور خود فرنٹ ڈور کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھ گئی ساتھ ہی جبزی کے لیے اپنے برابر والی سیٹ کا ڈور کھول دیا تھا۔

"تھینک یو۔" جبزی نے بیٹھتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا اور مدحیہ پارکنگ سے گاڑی نکالنے لگی۔

"کتنے بجے کی فلائٹ تھی تمہاری.....؟" وہ ایئرپورٹ کے وسیع و عریض احاطے سے گاڑی نکالتے ہوئے جبزی کی سمت متوجہ ہوئی۔

"پانچ بجے کی۔"

"اور تم نے مجھے چھ بجے کال کی؟" اسے ٹائم بھی یاد تھا۔

"ہاں! ایک گھنٹہ تو باہر نکلنے میں ہی لگ گیا تھا۔"

"ہوں! اور سناؤ، برائن، شیفے، کرسٹینا وغیرہ کیسے ہیں.....؟" وہ ایک روڈ سے یوٹرن لیتے ہوئے بولی۔

"سب ٹھیک ہیں اور سب ہی تمہیں مس کرتے ہیں؟" جبزی بہت خوش نظر آ رہا تھا۔

"لیکن تم جیسا مس تو نہیں کرتے نا.....؟ تم نے مجھے مس کیا اور ملنے چلے آئے.....؟" مدحیہ مسکرا رہی تھی۔

"میرے مس کرنے کی شدت کو جانتی ہو.....؟" جبزی کا لہجہ دھیما مگر سوال بہت گہرا تھا مدحیہ ایسے سوال اور ایسی باتیں اکثر اگنور کر جاتی تھی۔

"شدت ہی تو ہے، جو تم یہاں تک آ گئے ہو۔" مدحیہ نے جواب تو دیا تھا مگر سرسری سے انداز میں۔

"یعنی تمہیں شدت کا احساس نہیں ہے۔" جبزی نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔ مدحیہ نے سن کر بھی ان سنی کر دیا۔ اس معاملے پہ آ کر مدحیہ نے جبزی کی کبھی بھی پذیرائی اور حوصلہ افزائی نہیں کی تھی وہ اپنی حد میں سمٹ کر رہ جاتی تھی۔

"کہاں لے کر جا رہی ہو؟" جبزی نے کچھ خیال آنے پہ پوچھا تھا۔

"اپنے گھر۔"

"نہیں میڈی! میں تمہارے گھر نہیں جانا چاہتا۔"

"تو پھر.....؟"

"میں کسی ہوٹل میں رہنا چاہتا ہوں۔"
"ہوٹل میں کیوں۔۔۔؟" مدیحہ نے اسے تعجب سے دیکھا۔
"بس میں ہوٹل میں ایزی فیل کروں گا۔"
"تو میرے گھر میں کیا پرابلم ہے۔۔۔؟"
"پرابلم کچھ بھی نہیں ہے بس میں آزاد اور ریلیکس رہنا چاہتا ہوں' پلیز تم کسی اچھے سے ہوٹل کا رخ کرو۔" جبذی اپنے کہے پہ قائم تھا۔
"کیا تم میری فیملی کی وجہ سے ایسا کہہ رہے ہو۔۔۔؟"
"نہیں میں اپنی وجہ سے ایسا کہہ رہا ہوں۔" وہ نہیں مان رہا تھا۔
"جبذی! تم میرے مہمان ہو۔۔۔ تمہیں میرے ساتھ گھر چلنا چاہیے۔" وہ بھی ماننے کو تیار نہیں تھی۔
"دیکھو میڈی! میں تمہارا ہی مہمان ہوں' چاہے تمہارے گھر جاؤں یا نہ جاؤں۔"
"یہ کیسے مہمان ہو تم۔۔۔؟"
"بس تم سمجھ کر بھی نہیں سمجھو گی۔" جبذی نے فوراً" کہا۔
"بالکل۔"
"بہت ضدی ہو تم۔"
"تمہیں اب پتا چلا ہے۔۔۔؟" وہ ہنسی تھی۔
"بہت پہلے سے جانتا ہوں۔"
"لیکن پھر بھی ٹھیک طرح سے نہیں جانتے۔" وہ مایوسی سے سر ہلا رہی تھی اور پھر جبذی کے اصرار پہ مجبوراً" اسے ہوٹل کا رخ کرنا پڑا وہ اسے شہر کے مہنگے ترین ہوٹل میں لے آئی تھی اس کے لیے کمرا ریزرو کروایا اور اسے کمرے میں چھوڑ کر "آرام کرنے کا کہہ کے واپس آگئی تھی۔

☼ ☼ ☼

عدیل کو تین چار دن ہو گئے تھے وہ کام پہ نہیں جا سکا تھا لیکن اس نے فون کر کے باؤ امتیاز کو اپنی غیر حاضری کی وجہ ضرور بتا دی تھی وہ بھی سن کر بہت پریشان ہوئے تھے انہوں نے اسپتال آنا بھی چاہا تھا لیکن عدیل نے انہیں منع کر دیا کیونکہ امی اور ابا جی کو تو اس نے بتایا ہی نہیں تھا کہ وہ کسی ورکشاپ میں کام کرتا ہے "اگر باؤ امتیاز ابا جی کی عیادت کے لیے آجاتے تو یقیناً" اس کا راز کھل جاتا اسی لیے اس نے انہیں روک دیا تھا لیکن وہ دوسروں کو روکنا بھول گیا "ابا جی آج ہی اسپتال سے ڈسچارج ہو کر گھر آئے تھے اور وہ تینوں بھی ان کی عیادت کے لیے آج ہی آگئے تھے۔ عدیل ابا جی کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا جب باہر دروازے پہ دستک ہوئی تھی۔
"میں دیکھتا ہوں۔" وہ عابدہ خاتون کو اٹھنے سے منع کرتے ہوئے خود اٹھ کر باہر نکل آیا۔
"کون ہے۔۔۔؟" اس نے پوچھتے ہوئے دروازہ بھی کھول دیا۔
"السلام علیکم۔" سب سے پہلے چھوٹے نے سلام میں پہل کی تھی اور عدیل ٹھٹک گیا تھا۔
"وعلیکم السلام۔" عدیل انہیں دیکھ کر قدرے پریشان ہو گیا تھا اس نے ان سے کافی پریشان سے انداز میں ہاتھ ملایا تھا۔
"کیسے ہو استاد۔۔۔؟ چاچا جی کیسے ہیں۔۔۔؟" سلو نے ہاتھ ملاتے ہوئے اس کا حال پوچھا تھا۔
"ہوں' ٹھیک ہوں۔" عدیل نے کافی مختصر سا جواب دیا تھا۔

"کیا بات ہے؟ کوئی پریشانی ہے استاد۔۔۔؟" چھوٹا بھی اس کا متفکر سا چہرہ بھانپ چکا تھا۔
"نہیں نہیں! ایسی کوئی بات نہیں ہے' آؤ تم لوگ اندر آجاؤ۔" عدیل اب انہیں واپس تو نہیں لوٹا سکتا تھا اس لیے خود کو کمپوز کرتے ہوئے سامنے سے ہٹ گیا تھا وہ تینوں آگے پیچھے اندر داخل ہوئے تھے ان تینوں کے ہاتھ میں امیر سارے شاپر تھے وہ کافی زیادہ فروٹ اور کھانے پینے کی چیزیں لائے تھے۔
"یار! اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔۔۔؟" عدیل نے وہی گھسا پٹا سا روایتی جملہ دہرایا۔
"یہ ہم تمہارے لیے نہیں اپنے انکل کے لیے لائے ہیں۔" چھوٹے نے مسکرا کے کہا۔
"انکل۔۔۔؟" عدیل نے تو چھوٹے کے اسٹائل پہ حیرت سے اسے دیکھا۔
"یس انکل' تمہارے فادر ہمارے انکل ہی تو ہیں۔" چھوٹے کا اب لہجہ بدل گیا سلو اور جیدی بے ساختہ مسکرا دیئے تھے۔
"عدیل! باہر کون ہے بیٹا۔۔۔؟" عابدہ خاتون نے آواز دے کر پوچھا تھا۔
"السلام علیکم آنٹی! ہم ہیں عدیل صاحب کے کولیگ۔" سلو نے آگے بڑھ کر انہیں سلام کیا اور اپنا تعارف کروایا تھا۔
"وعلیکم السلام! آؤ آؤ بیٹا بیٹھو تم لوگ۔" عابدہ خاتون فوراً" اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئیں اور عدیل ان تینوں کے انداز دیکھ کر حیران رہ گیا تھا انہوں نے عدیل کا بھرم رکھ لیا تھا ورنہ وہ تو ان کی آمد پہ بری طرح پریشان ہو گیا تھا۔
"تھینک یو آنٹی! انکل کیسے ہیں۔۔۔؟"
"اللہ کا شکر ہے بیٹا' اب تو پہلے سے بہت بہتر ہیں۔"
"ہم تو بہت دنوں سے آنا چاہ رہے تھے لیکن عدیل صاحب نے خود ہی منع کر دیا' ہمارے سینئر ہیں یہ' اس لیے ان کی بات سے انحراف بھی نہیں ہو سکتا۔۔۔ مگر آج سوچا کہ اپنی مرضی ہی کر لیں۔" چھوٹے نے مسکرا کے کہا تھا اور عدیل غش کھا کے گرنے کو تھا وہ ان تینوں کو آنکھیں پھیلا پھیلا کے دیکھ رہا تھا ورکشاپ میں وہ کیا نظر آتے تھے اور اس وقت کیا نظر آرہے تھے۔۔۔؟ عدیل کو یقین ہی نہیں آرہا تھا۔
"بیٹا! آپ لوگ بیٹھو باتیں کرو میں چائے بھجواتی ہوں۔" وہ وہاں سے باہر نکل گئیں اور وہ تینوں فاروق نیازی کی سمت متوجہ ہو گئے فاروق نیازی انہیں دیکھ کر خوش ہوئے تھے۔
"انکل۔۔۔! آپ کا بیٹا بہت ذہین اور بہت انٹیلی جنٹ ہے' ہم آفس میں انہیں اپنا استاد مانتے ہیں' کیوں استاد۔۔۔؟" چھوٹے نے شرارت سے کہتے ہوئے عدیل کی سمت دیکھا تھا۔
"لیکن حقیقت میں تو تم خود استاد ہو۔" عدیل کو اعتراف کرنا ہی پڑا کہ چھوٹا ہی سب کا استاد ہے' ہر کام میں ماہر۔۔۔ ہر بات میں آگے۔
"مان گئے نا استاد۔۔۔؟" چھوٹا یکدم قہقہہ لگا کے ہنسا تھا ان کی ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ اور نوک جھوک میں فاروق نیازی کا دل بہل گیا تھا ان کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ خوش ہوئے ہیں۔
"مان گئے جناب' مان گئے' آج تو تم تینوں کی ڈریسنگ بھی بہت کمال کی ہے۔" عدیل نے ان کی پینٹ شرٹ کی طرف اشارہ کیا تھا۔
"عدیل صاحب! آپ جانتے تو ہیں ہماری ڈریسنگ تو ہر روز ہی کمال کی ہوتی ہے اب ورکشاپ کے مکینکوں کی طرح گندے کپڑے پہن کر تو نہیں گھوم سکتے نا۔۔۔؟" وہ باتوں باتوں میں سب کچھ کہہ بھی گیا تھا اور عدیل اس کی اس چالاکی پہ اپنی مسکراہٹ روک نہیں پایا تھا۔
"چائے۔" وہ چاروں خوش گپیوں میں مصروف تھے جب نسوانی آواز پہ یکدم بریک لگ گئے عدیل نے گردن

موڑ کر دیکھا ایمن ٹرے لیے کھڑی تھی۔

"ایمن۔!" عدیل فوراً" کھڑا ہو گیا تھا اور چھوٹی سی ٹیبل کھینچ کے ان تینوں کے سامنے رکھنے لگا' لیکن اپنے دھیان اور اپنی ترنگ میں ہنستے چھوٹے کی نظریں پلاار وہی ایمن پہ جا ٹھہری تھیں۔

بھولی بھالی 'معصوم سے چہرے والی' سادہ سی لڑکی چھوٹے کو ایک پل میں چھوٹے سے بڑا بنا گئی تھی اس کی ہنسی تھم چکی تھی۔

"کیا بات ہے شہریار صاحب؟ آپ چپ کیوں ہو گئے؟" سلو نے چھوٹے کو اس کے پورے نام سے مخاطب کرتے ہوئے ٹھوکا دیا۔

"نن نہیں۔ کچھ نہیں۔" اس نے یکدم چونکتے ہوئے نفی میں گردن ہلائی تھی۔

"شہریار۔؟" عدیل نے بھی بے ساختہ چونک کر دیکھا تھا وہ چھوٹے کا اصلی نام پہلی مرتبہ سن رہا تھا۔

"دیکھیے انکل۔ عدیل صاحب ایسے ری ایکٹ کر رہے ہیں جیسے اپنے کولیگ کے نام کا بھی پتا نہ ہو۔" چھوٹے نے پھر بات سنبھالی تھی اور عدیل سنبھل گیا تھا۔

"تھینک یو۔" چھوٹے نے ایمن کے ہاتھ سے چائے کا کپ پکڑتے ہوئے شکریہ ادا کیا کیونکہ عدیل فاروق نیازی کی سمت متوجہ تھا ٹشو سے ان کا منہ صاف کر رہا تھا۔ سلو اور جیدی نے بھی شکریہ ادا کیا تھا ایمن خاموشی سے کچھ بھی کہے بغیر باہر نکل گئی لیکن چھوٹے کے دل و دماغ میں اپنا نقش چھوڑ گئی اور چھوٹے کی کیفیت باقی دونوں سے بھی چھپی ہوئی نہیں رہ سکی تھی وہ اب سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

تو یقین کر تو یقین کر' وہ رائیگاں' وہ رائیگاں
میری زندگی سے نکل گیا جو لمحہ تیرے خیال کا

اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو اس کی کنپٹیوں سے لکیر بناتے ہوئے اس کے بالوں میں جذب ہو رہے تھے' وہ بے آواز رو رہی تھی شاید اسے خود بھی احساس نہیں تھا کہ وہ رو رہی ہے' اس کی ذات۔ رنج کا عالم تھا اور اس عالم میں وہ بے طرح یاد آ رہا تھا اتنا کہ اس کے بغیر زری کو اپنی سانسیں بھی سینے کا بوجھ لگنے لگی تھیں یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا دم گھٹ رہا ہو۔ وہ بے دم سے انداز میں راکنگ چیئر پہ جھول رہی تھی جب پورے گھر کے سناٹے میں لینڈ لائن فون کی گھنٹی گونج اٹھی۔ لیکن زری میں اتنی سکت نہیں تھی کہ اٹھ کر فون اٹینڈ کرتی' وہ جیسے تھی' ویسے ہی پڑی رہی۔

"زری۔ فون اٹینڈ کرو' میں قرآن پاک پڑھ رہی ہوں۔" نگارش نے اپنے بیڈ روم سے اسے آواز دی اور مجبوراً" زری کو اپنے آپ کو سنبھالنا پڑا ورنہ یقیناً" نگارش کا غصہ اور ناراضی سہنا پڑتی' اسی لیے وہ گہری سانس کھینچتی ہوئی راکنگ چیئر سے اٹھی اور اپنے آنسو پونچھ کر فون سیٹ کے پاس آ گئی تھی۔

"السلام علیکم۔" دل آور شاہ کی طرح سلام میں پہل کرنے کی عادت تھی اس کی' لیکن اس کی آواز سن کر دوسری طرف خاموشی چھا گئی تھی نبیل کو یقین کرنا مشکل ہو گیا تھا کہ اس کا فون زری نے ریسیو کیا ہے۔

"السلام علیکم۔" زری نے اس خاموشی کو توڑنے کے لیے دوبارہ سلام کیا تھا۔

"وعلیکم السلام۔ کیسی ہیں آپ۔؟" دوسری طرف کی آواز لو دے رہی تھی۔

"کون۔؟" زری نے اس مدھم اور ٹھہری ہوئی آواز کو پہچاننے کی کوشش کی۔

"نبیل حیات۔"

"ارے آپ۔؟ کیسے ہیں؟" زری کی الجھن حل ہو گئی تھی۔

"جیسی آپ ہیں؟"

"کیا مطلب۔؟"

"مطلب اداس۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

"یہ میں نہیں کہہ رہا آپ کی آواز کہہ رہی ہے۔"

"میری آواز۔؟" زری ٹھٹکی۔

"آپ کی آواز کہہ رہی ہے کہ آپ روئی ہیں' آپ کی آواز پہ آنسوؤں کا بوجھ ہے۔" نبیل تو یوں کہہ رہا تھا جیسے اس کے سامنے بیٹھ کے اسے دیکھ رہا ہو۔

"آپ کو شاید کوئی وہم ہو رہا ہے۔؟" زری نے سر جھکا

"تو آپ میرا وہم دور کر دیں نا۔؟ کہہ دیں کہ آپ اداس نہیں ہیں اور آپ روئی بھی نہیں ہیں' آپ جھوٹ بھی کہیں گی تو میں مان جاؤں گا' میں دل آور نہیں ہوں جو سچ بات بھی نہیں مانتا۔" نبیل نے بات کرتے کرتے ایک مثال کے طور پہ دل آور کا نام لیا تھا مگر زری تھی کہ اس کا دل دھڑک دھڑک گیا بلکہ اس کے نام پہ تو زری کا رواں رواں دھڑکتا تھا۔ اگر اس کی یہ دھڑکن نبیل حیات سن لیتا تو یقیناً" دوسری بات نہ کرتا۔

"آپ نے شاید عبداللہ بھائی سے بات کرنے کے لیے فون کیا ہے۔؟" زری بات ٹال گئی۔

"ہوں۔ شاید۔" نبیل نے آہستگی سے کہا۔

"وہ گھر پہ نہیں ہیں۔"

"آپ تو ہیں نا۔"

"آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا مطلب ہے آپ کا۔؟" زری پہلے ہی پریشان تھی نبیل کی مبہم سی باتوں پہ اور بھی الجھنے لگی تھی۔

"میرا مطلب ہے کہ آپ کو پیغام تو دے سکتا ہوں نا؟ آپ گھر پہ ہی ہیں نا۔؟" نبیل نے اپنی بات سنبھالی کیونکہ اس کی آواز کے بعد چھانے والی خوشگوار حیرت کے باعث وہ بے ساختگی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

"جی! ضرور دے سکتے ہیں۔" "وہ دراصل عبداللہ نے دل آور کو کوئی گھر دیکھنے کے لیے کہا تھا' دل آور تو شہر میں نہیں ہے' اس لیے اس نے گھر دیکھنے کے لیے مجھے بھیج دیا' میں کل ہی وہ گھر دیکھ کر آیا ہوں' گھر کافی اچھا ہے' آپ عبداللہ سے کہیے گا مجھے کال کر لے' میں اسے ساری لوکیشن خود بتا دوں گا۔" نبیل نے اسے پیغام دیا تھا۔

"او کے کہہ دوں گی۔"

"ٹھیک ہے پھر میں فون بند کرتا ہوں۔" نبیل نے بات ختم کی۔

"ایک منٹ پلیز۔" وہ بے اختیار بول اٹھی تھی' اور اس کی اس بے اختیاری پہ نبیل کا دل تھم گیا تھا' دھڑکنیں بھی ہمہ تن گوش ہو گئی تھیں کہ وہ کچھ کہنے والی ہے۔

"جی! میں سن رہا ہوں۔" اس نے ذرا توقف سے کہا تھا۔

"آپ نے جو گھر دیکھا ہے کیا وہ آپ لوگوں کے گھر سے قریب ہے؟" زری پوچھنا تو یہ چاہتی تھی کہ آپ نے جو گھر دیکھا ہے کیا وہ دل آور کے گھر سے قریب ہے؟ لیکن وہ چاہنے کے باوجود بھی اتنا واضح سوال پوچھ نہیں پائی تھی۔ مجبوری اور مصلحت آڑے آ گئی اور اسی مصلحت نے نبیل حیات کو خوش فہمی کی دنیا میں دھکیل دیا تھا۔

"افسوس کہ وہ گھر میرے گھر سے قریب نہیں ہے' بلکہ دل آور کے گھر سے قریب ہے۔" نبیل کے جواب نے

مایوس اور اداس پڑتی زری کو پل میں خوش کر دیا تھا۔

"اوکے! میں فون بند کرتی ہوں۔"

"ایک منٹ پلیز۔" اب کی بار نبیل نے اسے روک لیا تھا۔

"ایک بات پوچھوں آپ سے؟" نبیل نے ذرا سا حوصلہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"جی پوچھیے۔" اس نے اجازت دی۔

"آپ اداس کیوں تھیں؟" وہ نبیل کے سوال پہ ہلکی پھر مسکرا دی تھی۔

"پہلے تھی 'مگر اب نہیں ہوں۔" زری کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ خوش ہے 'تھوڑی دیر پہلے والی اداسی ختم ہو چکی تھی۔

"اب کیوں نہیں ہیں؟"

"بس کچھ نہیں 'میں فون بند کر رہی ہوں 'اللہ حافظ۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور فون بند کر دیا 'اس کے لیے اتنی خوشی ہی کافی تھی کہ پاکستان میں ان کا گھر ولی آور کے گھر سے قریب ہوگا۔ وہ فون اسٹینڈ کے پاس کھڑی اپنی خوشی سنبھال رہی تھی 'جب فون کی گھنٹی دوبارہ بجنے لگی 'زری کو یقین تھا کہ نبیل کا ہی فون ہے 'اسی لیے اس نے دوبارہ ریسیو نہیں کیا 'لیکن اسے یہ پتا نہیں تھا کہ کبھی کبھی انسان کا یقین بھی اسے دھوکا دے جاتا ہے 'وہ فون سیٹ کے پاس کھڑی تھی۔ ولی آور شاہ کا نمبر جگمگا رہا تھا۔ لیکن اس نے اس یقین پہ ریسیو نہ کیا کہ دوسری طرف نبیل حیات ہے۔ وہ وہاں سے ہٹ کے اپنے کمرے میں آگئی 'لیکن کافی دیر بعد نگارش کی بات نے اسے چکرا کے رکھ دیا تھا۔

"ولی آور بھائی کی کال کب آئی؟" وہ زری سے پوچھ رہی تھیں۔

"ولی آور کی کال؟" زری کو اچنبھا ہوا۔

"ہاں! سی ایل آئی پہ تو انہی کا نمبر ہے 'کیا تم نے ریسیو نہیں کیا۔" نگارش کو بھی تعجب نے گھیرا تھا۔

"سی ایل آئی پہ اس کا نمبر؟ او مائی گاڈ۔" اس نے سر پہ ہاتھ مارتے ہوئے فون کی طرف دوڑ لگائی اور اس کا نمبر دیکھ کر تو دل مٹھی میں آگیا۔

"ہائے میں مر گئی 'یہ میں نے کیا کر دیا؟ اس کا فون تو اتنی دیر بجتا رہا اور میں سمجھی کہ نبیل۔" وہ کہتے کہتے چپ ہو گئی اور دونوں ہاتھوں میں سر تھام کے رہ گئی تھی۔

"اب رونے سے کیا ہوگا؟ بلکہ یہ سوچو کہ عشق میں عاشق لوگوں کا اتنا نقصان دنیا یا دوسرے لوگ نہیں کرتے ' جتنا نقصان وہ خود اپنا کرتے ہیں۔ کبھی جلد بازی میں 'کبھی لاپروائی میں اور کبھی شدت میں 'اور بعد میں تمہاری طرح سر پکڑ کر بیٹھ کے روتے ہیں 'مگر اس رونے سے حاصل کچھ نہیں ہوتا 'نہ تو ولی آور بھائی کی دوبارہ کال آسکتی ہے اور نہ ہی تم اپنی غلطی کی تلافی کر سکتی ہو 'اس لیے بہتر ہے کہ یہ رونا دھونا بند کرو۔" نگارش کو اس پہ غصہ آرہا تھا۔

"بھابھی! مجھے نہیں پتا تھا 'میں تو سمجھی تھی کہ نبیل۔"

"تو کیا نبیل انسان نہیں ہے؟ کیا تم اس کی کال نہیں سن سکتیں؟" نگارش نے اسے جھڑک دیا۔ اور زری اپنی غلطی پہ دل مسوس کے رہ گئی 'اس نے کال کیوں کی تھی؟ اسے تو یہ بھی پتا نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

اس نے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے ساری رات جاگ کر گزاری تھی 'رجو تو فوراً ہی سو گئی 'لیکن

علیزے نیند کے باوجود بھی سو نہیں پائی 'اسے یوں لگتا تھا جیسے وہ آنکھ جھپکے گی اور کوئی وحشی اسے دبوچ لے گا اور اس وحشی کے خوف نے اسے سکون کی نیند سونے ہی نہیں دیا تھا 'حالانکہ اسے پتا تھا کہ باہر منصور حسین پہلے سے زیادہ چوکس ہو کر سو رہا ہے اور اندر رجو اس کے پاس ہے 'لیکن پھر بھی وہ نیند سے آنکھ نہیں ملا پائی تھی۔

فجر کے وقت اٹھی 'وضو کیا اور نماز پڑھنے کے لیے کھڑی ہو گئی 'کچھ وقت عبادت میں گزرا تو ذہن پہ طاری خوف کم ہو گیا 'وہ تسبیح ختم کر کے اٹھی اور جائے نماز سمیٹنے لگی 'لیکن یوں ہی جائے نماز سمیٹتے ہوئے اس کی نظر اپنے بیڈ پہ رکھی منصور حسین کی بلیک کلر کی چادر پہ پڑی تھی۔

"اگر یہ چادر کسی نے میرے پاس دیکھ لی تو؟ سب ہی سوال کریں گے 'وجہ پوچھیں گے کہ کیا ہوا ہے؟ او نو۔" وہ جائے نماز الماری میں رکھ کے فوراً بیڈ کے قریب آئی تھی اور اپنے کمبل میں جھانکتی ہوئی وہ چادر کھینچ لی تھی 'وہ اس چادر کو گول مول کر کے لپیٹتی ہوئی باہر نکل آئی 'اس کا رخ منصور حسین کے کمرے کی طرف تھا۔ علیزے کو منصور حسین کے کمرے کا پتا تو نہیں تھا 'لیکن اندازہ ضرور تھا کہ وہ کسی لاسٹ والے بیڈ روم میں ہے اور اس نے لاسٹ والے بیڈ روم کے دروازے پہ ہی دستک دی 'چند سیکنڈ بعد دروازہ کھولنے والا منصور حسین ہی تھا 'اس کے سر پہ بندھا ہوا رومال بتا رہا تھا کہ وہ بھی وضو کی حالت میں ہے اور اس نے بھی ابھی ابھی نماز ادا کی ہے۔ اس لمحے علیزے کو دیکھ کر منصور حسین کی نظریں جھک گئی تھیں۔

"یہ تمہاری چادر دینے آئی ہوں۔" اس نے چادر منصور حسین کی سمت بڑھاتے ہوئے کہا۔

"شکریہ بی بی جی۔" اس نے جھکی نظر سے کہتے ہوئے چادر تھام لی تھی۔

"تم سوئے نہیں رات بھر؟" علیزے کو احساس ہو چکا تھا کہ وہ بھی جاگتا رہا ہے۔

"نہیں۔"

"کیوں۔؟"

"بس پریشانی میں نیند نہیں آئی۔" وہ آہستگی سے بول رہا تھا۔

"تمہیں کیا پریشانی تھی؟"

"مجھے بڑے صاحب کی طرف سے پریشانی تھی 'انہوں نے آپ کی ذمہ داری 'آپ کی حفاظت مجھے سونپی تھی ' اس لیے آپ کی پریشانی میری پریشانی 'اور آپ کا نقصان بھی میرا نقصان ہے۔"

"لیکن میں تم سے یہ کہنے کے لیے آئی ہوں کہ تم اس بات کا ذکر کسی سے بھی مت کرنا 'نہ پاپا سے 'نہ آور بھائی سے۔" علیزے نے اسے منع کیا تھا۔

"میں معافی چاہتا ہوں بی بی جی 'میں بڑے صاحب سے اتنی بڑی بات نہیں چھپا سکتا 'یہ میرے اصول کے خلاف ہے۔" منصور حسین نے انکار کر دیا تھا۔

"تمہاری بتائی ہوئی اتنی بڑی بات پوری حویلی میں پریشانی کا پہاڑ کھڑا کر دے گی 'پاپا میرا کالج جانا اور گھر سے باہر نکلنا بند کر دیں گے 'آور بھائی پھر سے ان دیکھے دشمن کی کھوج میں لگ جائیں گے 'اور باقی سب افراد چپ ہو کے رہ جائیں گے۔" علیزے نے اسے اس بات کے سائیڈ افیکٹ بتائے تھے۔

"لیکن علیزے بی بی! بات چھپا لینا مسئلے کا حل تو نہیں ہے نا؟ اس طرح آپ کو کوئی نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔" منصور حسین بے حد پریشان اور الجھا ہوا تھا۔

"کسی نے مجھے نقصان پہنچانا ہوتا تو اب تک پہنچا چکا ہوتا۔" علیزے نے خفگی سے کہا تھا اور منصور حسین چونک گیا تھا۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟"

"میرا مطلب ہے کہ کوئی ہمیں محض ہراساں کرنا چاہتا ہے' نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔" علیزے نے کافی گہری بات کہی تھی' منصور حسین کا تو اس طرف دھیان ہی نہیں گیا تھا' وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی۔

"لیکن بی بی جی۔ یہ صرف آپ کا اندازہ بھی تو ہو سکتا ہے' دشمن کو کبھی کمزور نہیں سمجھنا چاہیے اور نہ ہی دشمن سے بے خبر ہو کر رہنا چاہیے' جو لوگ دشمن کو کمزور سمجھتے ہیں اور اس سے بے خبر ہو کر رہتے ہیں وہ لوگ نقصان اٹھاتے ہیں' آپ لاپروائی اور غفلت سے کام مت لیں' بڑے صاحب کو بتا دیں' وہ یقیناً سارے مسئلے کو کور کر لیں گے۔" منصور حسین اسے سمجھا رہا تھا۔

"جب مناسب لگا تب بتا دوں گی' فی الحال نہیں بتا سکتی اور اس بات کا تم بھی مت بتانا۔"

"لیکن بی بی جی! صاحب کو پتا چلا تو وہ مجھے نوکری سے نکال دیں گے' اور آئندہ کے لیے وہ مجھ پہ اعتبار بھی نہیں کریں گے۔" منصور حسین بے بس اور تذبذب کا شکار تھا۔

"اور اگر بتاؤ گے تو میں تمہیں نوکری سے نکال دوں گی۔" علیزے نے اسے دھمکی سے نوازا تھا۔

"یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟"

"ٹھیک کہہ رہی ہوں' اس مسئلے کو اپنے تک رکھو گے تو بہتر رہے گا۔"

"جی۔" وہ محض جی کہہ کے رہ گیا تھا۔

"اور سنو! سب کب آئے تھے رات کو؟" وہ جاتے جاتے پھر ٹھہر گئی تھی۔

"دو بجے آئے تھے۔"

"ٹھیک ہے' سب سو رہے ہیں' تم بھی سو جاؤ۔" علیزے اسے کہہ کے واپس پلٹ گئی اور منصور حسین اندر چلا گیا' وہ رات بھر سے جاگ رہا تھا' اب نماز کے بعد اسے نیند آنے لگی تھی' اس کا ارادہ سونے کا تھا اور علیزے بھی اب سونے کا ارادہ لے کر پلٹی تھی' لیکن آج شاید نیند اس کے نصیب میں نہیں تھی۔

"علیزے۔" کومل کی چبھتی ہوئی آواز پہ علیزے کے قدم وہیں کے وہیں تھم گئے تھے۔

"ارے کومل آپی! آپ جاگ رہی ہیں۔" علیزے نے نارمل سے انداز میں کہا' لیکن کومل کا انداز نارمل نہیں تھا۔

"جاگ بھی رہی ہوں اور دیکھ بھی رہی ہوں۔" کومل کے لب و لہجے میں شک بول رہا تھا' لیکن علیزے اس کے اس شک سے بے خبر تھی۔

"کیا دیکھ رہی ہیں؟" اس نے لاپروائی سے پوچھا تھا۔

"منصور حسین کے کمرے میں کیا کر رہی تھیں تم؟" کومل کے سوال پہ علیزے ٹھٹک گئی تھی کہ کومل نے اسے دیکھ لیا ہے۔

"وہ۔ وہ۔ ڈرائیور کی چادر' یہاں کوریڈور میں گری ہوئی تھی' وہی اٹھا کر اسے دے کے آئی ہوں۔" علیزے نے فوراً وضاحت دی تھی' تاکہ اسے اصل بات کا پتا نہ چلے' لیکن کومل رقابت کی جلن میں کچھ برا سوچنے سے بھی باز نہیں آئی تھی۔

"اتنی اہم تھی وہ چادر۔" اس کا لہجہ طنزیہ ہو گیا تھا' نظروں میں ہلکی سی کاٹ تھی۔

"کومل آپی! وہ چادر ہمارے لیے اہم نہ سہی' لیکن اس کے لیے تو اہم ہے نا؟" علیزے نے پھر بھی کافی سادگی سے جواب دیا تھا۔

"اتنی اہم کہ بڑی حویلی کی لاڈلی اور نخریلی بیٹی جس نے کبھی اپنی چادر بھی زمین سے جھک کر نہیں اٹھائی ہوگی' وہ اپنے ڈرائیور کی چادر اٹھا کر اس کے بیڈ روم میں پہنچا کے آرہی ہے؟ واہ یار' حیرت ہو رہی ہے اور رشک آرہا ہے

منصور حسین کی اس چادر پہ۔" کومل کو پہلی بار کوئی ایسا موقع ہاتھ آیا تھا کہ وہ تنہائی میں علیزے کو نشتر چبھو سکتی۔

"کومل آپی! یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟" علیزے اب بھی اس کے کاٹ دار لفظوں کے مفہوم سمجھنے سے قاصر تھی۔

"میں جو کہہ رہی ہوں' تم اس سے انجان بن رہی ہو۔" کومل نے کافی چبا کے کہا تھا۔

"آپ نے جو کہنا ہے صاف صاف کہیں' مجھے آپ کی ایسی باتیں سمجھ نہیں آرہیں۔" علیزے پریشان سی الجھنے لگی تھی۔

"تم اس وقت۔"

"ارے کومل' علیزے تم لوگ یہاں کیوں کھڑی ہو؟" اپنے بیڈ روم سے نکلتی عائشہ آفندی کو دیکھ کر کومل کی ادھوری بات منہ میں ہی رہ گئی تھی۔

"پھپھو میرے کمرے میں جائے نماز نہیں تھی' میں وہ لینے کے لیے نکلی ہوں تو علیزے منصور حسین کے کمرے سے آرہی تھی۔ اسے اس کی چادر دے کر' وہ بھی اس وقت جب سارا عالم تاریکیوں میں ڈوبا ہوا ہے۔" کومل نے پھونکتے ہی عائشہ آفندی کو باتوں باتوں میں اصل بات کا اشارہ دے دیا تھا اور اس کی اس بات پہ ان کی روح کانپ اٹھی تھی۔

"کومل! تم کیا بول رہی ہو' تمہیں شاید خود بھی اندازہ نہیں ہے؟" عائشہ آفندی کا لہجہ سخت تھا۔

"پھپھو! میں نے کچھ غلط۔"

"بس! اپنے کمرے میں جاؤ تم۔" انہوں نے کومل کو مزید کچھ بولنے کی مہلت نہیں دی تھی اور کومل' علیزے پہ ایک طنزیہ سی نظر ڈالتی ہوئی اپنے کمرے میں گھس گئی۔

"عائشہ پھپھو! یہ کومل آپی' یہ کیا کہہ رہی تھیں؟" علیزے کا لہجہ روہانسا ہونے لگا تھا۔ کومل کی بات کے مفہوم کو وہ تھوڑا بہت سمجھ ہی چکی تھی' لیکن پھر بھی ذہن ایسا معصوم اور کورا تھا کہ وہ اس بات کو جھٹلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"چھوڑو اس بات کو' پتا نہیں وہ کیا کہہ رہی ہے' آؤ تم اپنے کمرے میں آجاؤ' باہر بہت ٹھنڈ ہے۔" وہ علیزے کو بازو سے تھامتے ہوئے اپنے ساتھ لیے اس کے کمرے میں آگئی تھیں' وہاں صوفے پہ رجو بھی کمبل اوڑھے سو رہی تھی۔

"رجو یہاں کیوں سو رہی ہے؟" انہیں حیرت ہوئی' علیزے کسی کو بھی اپنے کمرے میں سونے نہیں دیتی تھی۔

"میں رات کو سوتے میں ڈر گئی تھی' اس لیے رجو کو اپنے کمرے میں بلا لیا تھا۔"

"ہوں! اچھا کیا تم نے' اگر مجھے کہہ دیتیں تو میں آجاتی تمہارے پاس۔" وہ اس کا ہاتھ سہلا رہی تھیں' لیکن علیزے کومل کی بات پہ الجھی ہوئی تھی' ذہن منتشر سا ہو رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

اک موم کی گڑیا ہے' اک پریم کہانی ہے
اک شاخ ہے نازک سی
کلیوں کی جوانی ہے
وہ پھول کی تتلی ہے
شعلہ ہے کہ پانی ہے

بے شان سمندر کی
لہروں کی روانی ہے
وہ نور سحر ہے یا اک شام سہانی ہے
دیکھوں تو سپنا ہے
سوچوں تو کہانی ہے
کیا نام رکھوں اس کا؟ کیا بات کہوں اس سے؟
وہ دن کا اجالا ہے، وہ رات کی رانی ہے
اک موم کی گڑیا ہے، اک پریم کہانی ہے

"واؤ جودت بھائی! آپ نے تو کمال کر دیا ہے۔" انوشہ، حرمت اور انیہ وغیرہ نے دونوں ہاتھوں سے تالیاں بجاتے ہوئے اسے ستائشی انداز میں سراہا تھا۔ اس نے ان سب کی فرمائش پہ یہ نظم انہیں گٹار کی دھن پہ سنائی تھی اور اس کی آواز اور یہ دھن اتنی خوب صورت اور باربط تھیں کہ ان سب کو سن کر مزا آگیا تھا' بلکہ سب سراہے بغیر نہیں رہ سکے تھے سوائے علیزے کے۔ بیٹھا آذر بھی مسکرا رہا تھا۔

"یہ نظم میں نے اسپیشلی علیزے کو ڈیڈی کیٹ کی ہے' اور مجھے لگتا ہے یہ نظم کسی نے علیزے کے لیے ہی لکھی ہے۔" جودت نے اعلانیہ کہا تھا اور وہاں موجود سب ہی لوگ ہنس پڑے تھے' علیزے کافی چپ چپ بیٹھی تھی' لیکن ان سب کو اپنی طرف متوجہ پا کر چہرہ جھکا لیا تھا۔

"کیا بات ہے؟ موم کی گڑیا آج اداس اور چپ چپ سی لگتی ہے۔" دانیال نے علیزے کو شرارت سے چھیڑا تھا۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے بھائی۔"

"تو پھر خاموش کیوں بیٹھی ہو؟"

"کچھ نہیں بس پاپا کو مس کر رہی تھی۔" اس نے آہستگی سے کہا تھا۔

"اوہ تو یہ بات ہے تو تم ایسا کرو نا پاپا کو فون کر لو۔" دانیال نے مشورہ دیا۔

"کیا تھا' لیکن ان کا سیل بزی تھا۔"

"کوئی بات نہیں' تھوڑی دیر بعد کر لینا۔" انہوں نے اسے تسلی دی تھی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"لیکن اس سے پہلے کہ تم فون کرو' اتنی دیر میں ہم بیت بازی کھیلتے ہیں۔" جودت کا نیا آئیڈیا سامنے آیا تھا۔

"مجھے پوئٹری نہیں آتی۔" اس نے جیسے شرمندگی سے کہا تھا۔

"لو جی قصہ ہی ختم ہوا۔" جودت نے گٹار سائیڈ پہ رکھتے ہوئے ہاتھ جھاڑے تھے۔

وہ لوگ اس وقت الگ الگ پتھروں پہ بیٹھے ہوئے سورج کی مدھم اور کمزور سی کرنوں سے لطف اندوز ہونے کی ناکام کوششیں کر رہے تھے' وہ صبح سے گھر سے نکلے ہوئے تھے' پہلے وہ مری کے مال روڈ پہ ادھم مچاتے رہے اور پھر جب بہت زیادہ گھومنے پھرنے کے بعد تھک گئے تو اس پہاڑی کی اس سطح پہ آ نکلے جہاں ان کے تھوڑی دیر بیٹھنے اور محفل جمانے کی جگہ دستیاب ہو رہی تھی' یہاں چھوٹے بڑے ڈھیر سارے پتھر بھی تھے جن پہ انہوں نے با آسانی اپنی اپنی نشست سنبھال لی تھی اور یہاں ہی جودت کو گٹار بجانے کا خیال آیا تھا اور شاید اس کا گٹار بجانے کا موڈ بھی ہو رہا تھا تب ہی بہت اچھا بجایا تھا۔

"آذر' رجو! تم میرے ساتھ چلو ہم تھوڑی دیر واک کر لیں۔" عائشہ آفندی سب بچوں کو ہنسی مذاق پہ آمادہ دیکھ کر وہاں سے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

"پھوپھو! میں چلوں آپ کے ساتھ۔" آذر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

"ارے نہیں بیٹا! تم بیٹھو' میں کون سا دور جا رہی ہوں' ابھی آجاتی ہوں' تم لوگ انجوائے کرو۔" وہ آذر کو منع کرتی ہوئی رجو کو ساتھ لے کر آگے بڑھ گئی تھیں' وہ جب سے یہاں آئی تھیں ان لوگوں کے ساتھ ایک بار بھی باہر نہیں نکلی تھیں' موسم بہت زیادہ خراب تھا اس لیے انہوں نے سردی میں نکلنے کا رسک نہیں لیا تھا' لیکن آج بارش اور برفباری نے تھوڑا وقفہ دیا تھا۔ تب ہی وہ بھی ان لوگوں کے ساتھ باہر آگئی تھیں۔

"آپ! اپنا ہاتھ مجھے پکڑا دیں' کہیں آپ کا پیر نہ پھسل جائے۔" ایک ڈھلوانی سطح سے اترتے ہوئے رجو نے احتیاطاً ٹھہر کر ان کا ہاتھ پکڑنا چاہا تھا' لیکن اس ڈھلوانی سطح سے اترتے ہوئے بلا ارادہ ہی ان کی نظر اس پہاڑی کے نیچے والی سڑک پہ جا پڑی تھی اور ان کی نظروں میں پوری دنیا گھوم کے رہ گئی تھی۔ ان کو لگا جیسے زمین آسمان ایک ہو گئے ہوں اور ان کے اس تصادم پہ عائشہ آفندی گنگ سی ہو گئی تھیں۔ وہ ایک ہی جگہ پہ جامد ہو چکی تھیں۔

"کیا ہوا ہے بی بی جی؟ آپ رک کیوں گئی ہیں؟" رجو نے انہیں بازو ہلا کر متوجہ کیا تھا اور عائشہ آفندی حواسوں میں آتے ہی یک دم چیخ اٹھی تھیں۔

"زہرہ۔" وہ اتنی بلند آواز سے چیخ کے پکار رہی تھیں کہ آس پاس کی فضا میں بھی ان کی آواز گونج کے رہ گئی تھی۔

"زہرہ! رکو' زہرہ۔" وہ یک دم رجو سے ہاتھ چھڑا کر تیزی سے اترنے کے لیے لپکی تھیں' لیکن اتنی عجلت اور بے دھیانی کی وجہ سے ان کے قدم غیر متوازن ہو گئے تھے اور جیسے ہی ان کے قدموں نے توازن کھویا وہ لڑھکتی ہوئی زمین پہ آگری تھیں۔

"زہرہ' رکو' رجو خدا کے لیے روکو اسے' وہ جا رہی ہے' زہرہ۔" عائشہ آفندی گرنے اور اتنی شدید چوٹ کے باوجود پھر سے پکارنے کے لیے اٹھی تھیں' لیکن ان کی پکار ان کی زہرہ کے علاوہ اور سب نے ہی سنی تھی اور اسے

دور جاتے دیکھ کر عائشہ آفندی مرغ بسمل کی مانند تڑپ اٹھی تھیں۔

"زہرو!" وہ زمین سے اٹھ کر اس کے پیچھے جانے کے لیے لپک رہی تھیں، جب اچانک پیچھے سے دانیال اور آذر وغیرہ نے تھام لیا تھا۔

"امی! کیا ہوا ہے، کہاں جا رہی ہیں آپ؟" دانیال ان کے مٹی سے خراب ہوئے کپڑے دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔

"وہ۔ وہ زہرو۔ زہرو کو دیکھا ہے میں نے، دانیال، جاؤ، جاؤ اسے روکو بیٹا۔ اسے کہو عائشہ بلا رہی ہے۔" وہ تو جیسے پاگل ہو چکی تھیں اور آذر کے ساتھ ساتھ دانیال بھی حیران رہ گیا تھا۔

"زہرو آنٹی؟" ان دونوں نے حیرانی سے زیر لب دہرایا تھا۔

"ہاں زہرو! میری زہرو۔" عائشہ آفندی کہتے ہوئے سینے پہ ہاتھ رکھ کے تڑپ تڑپ کے رو پڑی تھیں۔

"آپ روئیں مت، ہم دیکھتے ہیں۔" آذر اور دانیال انہیں باقی سب کے حوالے کر کے بھاگ کھڑے ہوئے تھے، لیکن مطلوبہ جگہ پہ بار بار تلاش کرنے کے باوجود بھی وہ انہیں کہیں نظر نہیں آئی تھیں۔ آذر اور دانیال دونوں کے ذہن میں زہرو آنٹی کے نقش زندہ تھے، لیکن اتنے سالوں بعد ان نین نقوش میں کیا فرق آیا تھا، یہ تو وہ بھی نہیں جانتے تھے، لیکن اگر عائشہ آفندی نے انہیں پہچان لیا تھا تو وہ دونوں بھی پہچان سکتے تھے اور اس چیز سے پتا چلتا تھا کہ ان میں زیادہ فرق نہیں آیا تھا، تب ہی تو انہوں نے جلدی اور آسانی سے پہچان لیا تھا۔

"سوری پھوپھو! وہ تو کہیں بھی نہیں ہیں۔" آذر نے واپس آتے ہوئے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا تھا، اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔

"وہ چلی گئی، وہ میرے دیکھتے دیکھتے چلی گئی ہے۔" عائشہ آفندی بے تحاشا رو رہی تھیں اور پھر وہاں سے وہ سب انہیں بمشکل واپس بنگلے پہ لے کر آئے تھے۔

"امی! بس کریں نا، کیوں اتنا رو رہی ہیں، بیمار پڑ جائیں گی۔" دانیال نے ان کا کندھا دبایا۔

"تم، تم بھائی، بھائی صاحب کو کال ملاؤ، میں انہیں بتاتی ہوں۔" انہوں نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا اور مجبوراً دانیال کو کال کرنا ہی پڑی تھی۔

"ہیلو۔" وقار آفندی کی آواز ایئر پیس سے سنائی دی تھی۔

"بھائی صاحب! میں عائشہ بات کر رہی ہوں۔" وہ آنسوؤں سے رندھی ہوئی آواز میں بولی تھیں۔

"عائشہ! تم رو رہی ہو، کیا ہوا ہے۔" وہ پریشان ہو اٹھے تھے۔

"بھائی صاحب! میں نے، میں نے زہرو کو دیکھا ہے، ابھی دیکھا ہے، تھوڑی دیر پہلے۔" وہ بتاتے ہوئے پھر سے رونے لگی تھیں۔

"زہرو کو؟" وقار آفندی کی آواز کسی گہرے پاتال میں ڈوبی ہوئی محسوس ہوئی تھی، ریسیور میں سناٹا چھا گیا تھا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

☼ ☼

نبیلہ عزیز

دردِ دل

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نبیل حیات دو ہی بہن بھائی ہیں، مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے، وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پہ رنگ چکی ہے، جس کے پیش نظر فائزہ بیگم، نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں، لیکن مدحیہ پاکستان جانے سے انکار کردیتی ہے، جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے، مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے، مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، بے بسی اور مجبوری سے تنگ آخر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے، لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باؤ امتیاز مل جاتا ہے، جو اسے کام کی آفر کرتا ہے، جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے، اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے، وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے، وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے، وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے، اس نے ہارنا نہیں سیکھا، اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو ... دیتا ہیں۔

اٹھارہویں قسط ۱۸

اور یہ سناٹا کافی دیر یوں ہی چھایا رہا تھا۔

وقار آفندی کی آواز کہیں گم ہو چکی تھی، جبکہ اس چیز سے بے خبر عائشہ آفندی اپنی ہی کہے جارہی تھیں۔

"ہاں! میں نے زہرہ کو دیکھا ہے بھائی صاحب... وہ... وہ... میری زہرہ ہی تھی... وہ میرے سامنے ہی گاڑی میں بیٹھ کر چلی گئی، اور میں... میں اسے پکارتی رہ گئی، اس نے تو مجھے دیکھا بھی نہیں، میری آواز بھی نہیں سنی، وہ رکی بھی نہیں اور چلی گئی۔" عائشہ آفندی گہرے صدمے کے زیر اثر تھیں، اسی لیے ان کے منہ سے بے ربط الفاظ نکل رہے تھے۔

اور گہرے صدمے کے زیر اثر تو شاید وقار آفندی بھی تھے، جن کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل رہا تھا۔

"عائشہ! تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے شاید؟" انہوں نے سوال کیا تھا، لیکن بمشکل...

"نہیں! ہرگز نہیں، مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی، اتنے سال ہو گئے پہلے کبھی ایسی غلط فہمی نہیں ہوئی تو آج کیسے ہونی تھی بھلا؟ میں اپنے پورے یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ زہرہ تھی، وہ سر سے پاؤں تک زہرہ تھی، زہرہ میرے دل پہ لکھی ہے، میں اسے کیسے بھول سکتی ہوں بھلا؟" عائشہ آفندی کے ساتھ ساتھ آنسو بھی بہہ رہے تھے، وقار آفندی کو یقین بھی دلا رہی تھیں۔

"لیکن عائشہ..." انہوں نے کچھ کہنا چاہا تھا، مگر عائشہ آفندی نے ان کی بات کاٹ دی تھی۔

"نہیں بھائی صاحب! اب کوئی تسلی یا دلاسا مت دیجیے گا، وہ یہیں کہیں ہے، میرے آس پاس، بس آپ ایک بار پھر اسے تلاش کرنا ہے، وہ اسی ملک میں ہے، وہ ضرور مل جائے گی، بس ایک بار... صرف ایک بار اس سے پوچھنا ہے کہ وہ اپنی عائشہ کو اس طرح اچانک بغیر بتائے کیوں چھوڑ کر چلی گئی؟ اس نے اگر کسی کے ساتھ شادی کرلی تھی تو مجھے بتا کر جاتی، غیروں کی طرح، اجنبیوں کی طرح کیوں چلی گئی؟" عائشہ آفندی روتے ہوئے کہہ رہی تھیں اور دوسری طرف سے ریسیور رکھ دیا گیا تھا، کال بند ہونے کی آواز پہ عائشہ آفندی چونک گئیں۔ انہوں نے فوراً" دانیال کی سمت دیکھا تھا۔

"فون بند کیوں ہو گیا ہے؟"

"امی! یہاں سگنلز کا مسئلہ ہے، کال ڈراپ ہو جاتی ہے۔" دانیال انہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا، وہ کافی دیر سے پریشان حال سی رو رہی تھیں اور دانیال ان کی طرف سے متفکر ہو رہا تھا، اسے پتا تھا کہ ان کی صحت پہ برا اثر پڑے گا، لیکن وہ تھیں کہ سمجھ ہی نہیں رہی تھیں، انہیں اس وقت زہرہ کے سوا کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا، سالوں بعد وہی جوانی والی بے صبری ابھری تھی۔

ان کی زبان پہ صرف زہرہ کا نام تھا۔

ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ زہرہ کو کہیں سے ڈھونڈ کے اپنے سامنے لے آئیں اور وہ سب کچھ پوچھ ڈالیں جو وہ اتنے سالوں سے اپنے دل و دماغ میں لیے پھر رہی تھیں۔ لیکن ان کا بس چلتا تب نا؟ دانیال ان کی حالت کے پیش نظر ان کی میڈیسن لے آیا تھا۔

"پلیز یہ میڈیسن کھالیں، طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔" اس نے زبردستی انہیں میڈیسن کھلائی تھیں، ان کی میڈیسن میں نیند کی دوا بھی شامل تھی، جس کے بعد وہ یقیناً" تھوڑی ریلیکس ہو جاتیں، اسی لیے وہ انہیں ان کے بیڈ روم میں لے آیا تھا۔ اور انہیں کمبل اوڑھا کر کمرے سے باہر نکل آیا تھا۔ باہر آ کر بھی ٹہلتے ہوئے اسی بات کو سوچ رہا تھا۔

✲ ✲ ✲

وقار آفندی کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا اور ان کی سماعتوں میں سائیں سائیں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

...کے دماغ کے پرخچے اڑ گئے تھے، ان کی سوچیں، ان کے خیالات اور ان کا سکون سب کچھ برباد اور منتشر ...رہ گیا تھا، ان کا ذہن ہر چیز سے مفلوج ہوا تھا تو انہوں نے عائشہ آفندی کا فون بغیر کچھ کہے ہی بند کر دیا تھا، ...اس وقت ان کے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا، ان کی قوت گویائی بھی جیسے سلب ہو چکی تھی، وہ جہاں ...ہی بیٹھے رہ گئے۔ ان کی ذات دھواں دھواں ہو رہی تھی اور اس دھوئیں کے مرغولے آسمان کی سمت اٹھ ...ایک اذیت ناک اور تلخ سا غبار تھا جو ان کے اطراف میں بہت تیزی سے پھیلتا جارہا تھا اور وہ اس ...اور تلخ غبار میں ڈوبتے جارہے تھے اور انہیں اس کیفیت میں نہ جانے اور کتنی دیر گزر جاتی کہ اچانک ...خان آفس روم کے دروازے پہ دستک دے کر اندر چلا آیا۔

...صاحب، جی! وہ نیچے وزیٹنگ روم میں معیز ہمدانی آپ کا انتظار..." مبارک خان کہتے کہتے اچانک ان کی ...نظر اٹھی تھی اور وہ بے ساختہ چپ ہو گیا۔ قیامت گزر جانے کے آثار صاف دکھائی دے رہے تھے، وہ دیکھ ...حیران ہو گیا۔

"صاحب! آپ ٹھیک تو ہیں؟" مبارک خان ان کی ٹیبل کے قریب آگیا تھا، لیکن وہ پھر بھی متوجہ نہیں ہوئے ...اور مبارک خان کی تشویش اور بڑھ گئی تھی۔

"صاحب! کیا بات ہے؟ آپ ٹھیک نہیں لگ رہے؟" اس نے آگے بڑھ کے ان کے کندھے کو ہلایا اور وقار ...یک دم جیسے کسی سکتے سے باہر آئے، انہوں نے چونک کر مبارک خان کی سمت دیکھا، ان کی آنکھیں خالی ...لگ رہی تھیں۔

"صاحب! آپ کچھ بولتے کیوں نہیں؟ کیا ہوا ہے آپ کو؟" مبارک خان ان کی طرف سے بے حد پریشان ...تھا اور وقار آفندی کچھ بھی بولنے سے قاصر نظر آرہے تھے، اس نے کچھ سوچتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا اور پھر ...پانی انڈیل کر گلاس ان کی سمت بڑھا دیا تھا۔

"صاحب! یہ پانی پئیں۔" اس نے ان کی حالت کے پیش نظر فوراً" انہیں پانی نکال کے دیا تھا۔

"نہیں! اس کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ انکار کرتے ہوئے اپنی چیئر سے اٹھ کھڑے ہوئے اور مٹھیاں بھینچتے ...کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہلنے لگے، ان کے ہر انداز سے بے سکونی، بے چینی اور اضطراب جھلک رہا تھا۔

"صاحب! آپ کچھ بتائیے؟"

"بس کرو مبارک خان، بس کرو، چپ ہو جاؤ۔" وقار آفندی یک دم غصے سے دھاڑ اٹھے تھے اور مبارک خان ...ایسی گرج پہ گڑبڑا کے رہ گیا، وقار آفندی کا غصہ اور وہ بھی اس انتہا کا؟ مبارک خان حیرت زدہ سا ہو رہا تھا، ...آفندی کا یہ روپ اس کے لیے بالکل نیا تھا۔ حیرت تو لازما" ہونی تھی۔

"گاڑی نکالو، ہمیں حویلی جانا ہے۔" انہوں نے اپنا کوٹ اور موبائل اٹھاتے ہوئے حکم جاری کیا۔

"جی بہتر۔" وہ حیرت کے باوجود ان کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے گلاس ٹیبل پہ رکھ کے باہر نکل گیا اور اس کے ...بھی باہر نکل آئے۔ آفس میں کیا ہو رہا تھا اور وہ کیا، کیا کام ادھورے چھوڑ کر جارہے تھے، انہیں کوئی ...نہیں تھا، ان کی ذات پہ کیا بیت رہی تھی، یہ صرف وہی جانتے تھے۔ مبارک خان نے بہت عجلت میں ...ڈالی تھی اور ان کے نیچے پہنچنے تک وہ ان کے لیے گاڑی کا دروازہ بھی کھول چکا تھا اور جیسے ہی وہ اندر بیٹھے ...گارڈ نے آگے بڑھ کے دروازہ بند کر دیا اور دوسرے ہی پل مبارک خان نے گاڑی آگے بڑھا دی تھی اور ...ڈرائیو کرتے ہوئے حویلی کا رخ کیا تھا، وقار آفندی کی حالت گاڑی میں بھی کافی مضطرب محسوس ہو رہی ...مبارک خان کو تجسس تو ہو رہا تھا، لیکن وہ اب دوبارہ کچھ کہہ کر ان کا ضبط نہیں آزمانا چاہتا تھا، اسی لیے چپ ...رہا اور بہت جلد حویلی کے بڑے سے گیٹ کے سامنے آکر بریک لگائے تھے۔ عارف نے وقار آفندی کی

گاڑی دیکھتے ہوئے ایک لمحے کی بھی تاخیر کیے بغیر پھرتی سے اٹھ کر گیٹ کھول دیا۔ وقار آفندی کی اپنے وقت سے پہلے آفس سے واپسی سب کے لیے ہی حیرانی اور تشویش کا باعث تھی۔

آسیہ آفندی اپنی دونوں دیورانیوں ثروت بیگم اور ثمرہ بیگم کے ساتھ لان میں بیٹھی باتیں کرتی ہوئی چائے پی رہی تھیں، جب اچانک اندر داخل ہونے والی وقار آفندی کی گاڑی دیکھ کر چونک گئیں۔

"وقار آبھی گئے؟" وہ ہاتھ میں پکڑا چائے کا کپ ٹیبل پہ رکھتے ہوئے کھڑی ہو گئیں۔

"آپ لوگ بیٹھیں، میں کچھ دیر میں آتی ہوں۔" وہ معذرت کرتی ہوئی وہاں سے چلی گئیں، اتنے میں وقار آفندی لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے کوریڈور تک پہنچ چکے تھے اور ان کے پیچھے آسیہ آفندی بھی تیز تیز قدم اٹھاتی قریب آگئیں۔ وقار آفندی کوٹ بازو پہ ڈالے کوریڈور میں چلتے ہوئے ہی اپنے گلے سے ٹائی کی ناٹ کھولنا شروع ہو گئے تھے۔

"وقار! آپ آج جلدی آگئے ہیں، کیا بات ہے؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" آسیہ آفندی ان کے بازو سے ان کا کوٹ تھامتے ہوئے کافی فکر مندی سے پوچھ رہی تھیں۔

"ہوں ٹھیک ہوں۔" انہوں نے بمشکل مختصر سے جواب سے نوازا تھا۔

"لیکن آپ مجھے ٹھیک نہیں لگ رہے؟ سب ٹھیک تو ہیں نا؟ علیزے کیسی ہے؟" آسیہ آفندی کا پہلا خیال علیزے کی سمت گیا تھا۔

"ہاں! ٹھیک ہیں، سب ٹھیک ہیں، علیزے بھی ٹھیک ہے، ڈونٹ وری۔" وہ اپنے بیڈ روم کا دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہو گئے اور آسیہ آفندی بھی ان کے پیچھے پیچھے تھیں۔

"لیکن آپ ٹھیک نہیں ہیں، آپ...."

"آسیہ! پلیز مجھے کچھ دیر کے لیے تنہا چھوڑ دو۔" وقار آفندی نے آسیہ آفندی کی سمت پلٹتے ہوئے نہ جانے کس انداز، کس لہجے میں کہا تھا کہ آسیہ آفندی حیرت اور بے یقینی سے پتھر کی طرح ایک ہی جگہ پہ جم کے رہ گئی تھیں۔

"تنہا چھوڑ دوں...." وہ خود کلامی کے سے انداز میں بولی تھیں، اور وقار آفندی ٹھٹک گئے۔

"آسیہ! میں اس وقت بہت الجھا ہوا اور بہت پریشان ہوں، پلیز ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ، مجھے تنہائی کی ضرورت ہے۔" اس بار انہوں نے ذرا ٹھہر کے سمجھایا تھا اور آسیہ آفندی، وقار آفندی کی اجنبی سی صورت، اجنبی سا انداز دیکھتی ہوئی باہر نکل گئیں، وہ گلے پڑنے والی اور بحث و تکرار کرنے والی بیویوں میں سے نہیں تھیں، اسی لیے دل میں اٹھتے ہزاروں سوال، وسوسے اور وہم دل میں ہی دباتی ہوئی چلی گئیں اور وقار آفندی راکنگ چیئر پہ ڈھے گئے تھے، دل و دماغ میں ایک اٹھا پٹخ سی مچی ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

سوکھے پیڑ پہ بہار آجائے تو ہرے پیڑ بھی اسے حیرانی اور حسد سے دیکھتے ہیں کہ یہ مرتے مرتے جینے کیسے لگا؟ اور اس پہ بہار آئی ہے تو کیوں آئی ہے؟ آخر وجہ کیا تھی؟ وہ سوکھے سے ہرا کیسے ہو گیا؟ اس کی شادابی کا راز کیا ہے؟ سب ہی اس راز کو جاننا چاہتے ہیں، بالکل ایسے ہی جیسے مدحیہ، فائزہ بیگم اور ممتاز حیات جاننا چاہتے تھے کہ نبیل حیات جیسے سوکھے اور خشک پیڑ پہ آج بہار آئی لگ رہی تھی اور اس بہار کو سب ہی نے محسوس کیا تھا، یہاں تک کہ ملازموں نے بھی، کیونکہ نبیل نے آج انہیں بلاوجہ ہی مقررہ تنخواہ سے زیادہ پیسے دیے تھے، حالانکہ ملازموں نے تو کہا بھی نہیں تھا، وہ سب زیادہ پیسے دیکھ کر حیران ہوئے تھے۔

"صاحب! یہ پیسے؟" ان کے ملازم نے پیسے دیکھتے ہوئے کچھ کہنا چاہا، لیکن نبیل نے ہاتھ اٹھا کر ملازم کو کچھ کہنے سے روک دیا۔

"یہ میں اپنی خوشی سے دے رہا ہوں، رکھ لو۔" اس نے باقاعدہ خود بول کر اپنی خوشی کا اعلان کیا تھا۔

"صاحب! بہت مہربانی ہے آپ کی، اللہ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔" ملازم اور ملازمہ دعائیں دیتے ہوئے پلٹ گئے تھے، لیکن نبیل ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے کی دہلیز میں کھڑی مدحیہ کو دیکھ کر ٹھٹک گیا، کیونکہ وہ بالکل اسی کی سمت دیکھ رہی تھی اور اس کے دیکھنے کا انداز خاصا گہرا تھا۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟" نبیل نے اپنے تاثرات کافی حد تک کمپوز کر لیے تھے۔

"آپ کی خوشی...." وہ سنجیدگی سے کہتی ہوئی دہلیز سے ہٹ کے نبیل کے ساتھ والے صوفے پہ آبیٹھی۔

"کیا مطلب؟ میری خوشی؟" وہ جان بوجھ کر انجان بن گیا۔

"خوشی آپ کی ہے، مطلب بھی آپ جانتے ہوں گے، آپ ہمیں نہ بتانا چاہیں تو یہ الگ بات ہے۔" مدحیہ سنجیدگی سے کھوج رہی تھی۔

"ارے مدحیہ! کیسی باتیں کر رہی ہو؟ میں کیا نہیں بتانا چاہتا؟" نبیل حیران ہوا تھا۔

"وجہ.... اپنی خوشی کی۔" مدحیہ کا لہجہ مضبوط تھا اور نظریں نبیل پہ جمی ہوئی تھیں۔

"ادھوری خوشی بتانے کا مزا نہیں آتا، پوری خوشی بتاؤں گا تو تمہیں بھی خوشی ہوگی۔" نبیل بہت ٹھہرے ہوئے انداز میں کہہ رہا تھا، البتہ چہرے پہ اس کی خوشی کا عالم اب بھی وہی تھا جو زری کی کال سنتے ہوئے تھا۔

"تو آپ ادھوری خوشی میں اتنے خوش ہو رہے ہیں کہ ملازموں میں پیسے بانٹتے پھر رہے ہیں؟" مدحیہ نے آنکھیں سکیڑتے ہوئے کہا۔

"ہاں! صرف اسی لیے کہ شاید کوئی غریب خوش ہو کر دل سے دعا دے دے اور میری ادھوری خوشی پوری خوشی میں تبدیل ہو جائے۔" نبیل بڑے دل سے کہہ رہا تھا اور مدحیہ اس کے لہجے کی شدت پہ اسے دیکھتی رہ گئی۔

"آپ کسی سے محبت کرتے ہیں، آپ نے کبھی بتایا کیوں نہیں؟" مدحیہ کو حقیقتاً نبیل کے اس جذبے کا جان کر بہت حیرانی اور تعجب ہوا تھا۔

"میں کسی سے محبت کرتا ہوں، مجھ سے کبھی کسی نے پوچھا ہی نہیں، نہ میری ماں اور بہن نے، نہ میرے دونوں بھائیوں نے۔" نبیل کے منہ سے بلا ارادہ ہی شکوہ پھسلا تھا اور مدحیہ کو اس شکوے نے گردن جھکانے پہ مجبور کر دیا تھا، وہ شرمندہ ہوئی تھی۔

"ایم سوری! میں نے کبھی اس بارے میں سوچا ہی نہیں، میں سمجھتی تھی کہ آپ بھی میری طرح اس جذبے، احساس سے خالی، بس جیے جا رہے ہیں، آپ کی کسی بھی لڑکی سے شادی کر دیں گے اور آپ کا گھر بس جائے گا۔" مدحیہ جو سوچتی تھی وہی کہہ رہی تھی۔ نبیل اس کی بات پہ استہزائیہ سے انداز میں مسکرایا تھا۔

"میری جان! میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا، جن لوگوں کے دل بس جاتے ہیں، ان لوگوں کے گھر بڑی مشکل سے بستے ہیں، ہمیشہ ایک ہی چیز بستی ہے یا دل یا گھر۔" نبیل نے خاصی گہری بات کہی تھی، مدحیہ اس کی باتوں پہ حیران ہوئی تھی۔

"اور جو لوگ لو میرج کر لیتے ہیں؟ وہ تو اپنا گھر بھی بسا لیتے ہیں اور دل بھی؟" مدحیہ نے اپنے اندازے کے مطابق کہا۔

"یہ تمہاری غلط فہمی ہے تمہاری، کبھی قریب سے مشاہدہ کرنا، پھر تمہیں پتا چلے گا کہ گھر بسانے کی کوشش میں دل اجڑ جاتا ہے، اور جن لوگوں کا گھر بھی بستا ہے اور دل بھی وہ لوگ دنیا کے خوش قسمت ترین لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔" نبیل کی بات پہ مدحیہ کو اتفاق کرنا ہی پڑا تھا، کیونکہ اس نے سو فیصد درست بات کہی تھی۔

"اللہ کرے کہ آپ کا بھی ان ہی لوگوں میں شمار ہو۔" مدحیہ نے روایتی بہنوں کی طرح دعا دی تھی۔

"آمین۔۔۔" نبیل نے صدق دل سے آمین کہا۔

"تو پھر اب بتا دیں نا کہ کون ہے وہ لڑکی جس سے آپ محبت کرتے ہیں؟" مدحیہ نے اپنے مطلب کا سوال پوچھ ہی لیا تھا اور نبیل اس کی بات پہ بے ساختہ مسکرا دیا تھا۔

"صبر میری جان صبر' دل آور کو آنے دو' پھر سب پتا چل جائے گا تمہیں۔"

"کیا مطلب؟ دل آور بھائی کو بھی اس سلسلے کا پتا ہے؟"

"نہیں پتا! کیونکہ میں نے کبھی کسی کو بتایا ہی نہیں' ہاں اب وہ آئے گا تو ضرور شیئر کروں گا۔"

"اوہ تو یعنی آپ سب سے چھپائے پھر رہے ہیں؟" مدحیہ نے سرہلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں کہہ سکتی ہو۔" اس نے بھی اثبات میں جواب دیا تھا۔

"اوکے! ایز یو وش' دل آور بھائی کے آنے کا ہی انتظار کر لیتے ہیں۔"

"بالکل! میں بھی اس کی واپسی کا انتظار کر رہا ہوں۔" نبیل جیسے کوئی ارادہ باندھے بیٹھا تھا۔

"ٹھیک ہے' پھر میں چلتی ہوں' آپ سے بعد میں ملاقات ہوتی ہے۔" مدحیہ اپنی گاڑی کی چابی اٹھاتے ہوئے خود بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"مدحیہ۔۔۔"

"جی بھائی؟" نبیل کی آواز پہ اس کے قدم تھم گئے تھے۔

"میں نے سنا ہے جیزی پاکستان آیا ہوا ہے؟ کیا یہ سچ ہے؟" نبیل کا لہجہ اور انداز سنجیدہ ہو چکے تھے۔

"جی! آپ نے ٹھیک سنا ہے' وہ کل ہی پاکستان آیا ہے' ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے' میں اس وقت اسے ہی پک کرنے جا رہی ہوں۔" اس نے بغیر جھجکے اور بغیر رکے اسے صاف صاف بتا دیا تھا۔۔۔ نبیل کچھ کہنا چاہتا تھا' لیکن کہہ نہیں پا رہا تھا۔

"ڈونٹ وری! وہ ہمارے نام نہاد بابا جیسا برا اور بدنیت نہیں ہے' اس کا کریکٹر ہمارے بابا کے کریکٹر سے لاکھ درجہ بہتر اور اچھا ہے۔ بدکردار نہیں ہے وہ اچھے برے کی تمیز رکھتا ہے عزت کرنا بھی جانتا ہے۔ میرے اور اس کے درمیان ایسا کوئی ریلیشن نہیں ہے' جس کی وجہ سے آپ کو شرمندہ ہونا پڑے اور گردن جھکانی پڑے' وہ میرا محض ایک دوست ہے' اس کے علاوہ اور کچھ مت سمجھیے گا' اس وقت وہ پاکستان میں ہمارا مہمان ہے اور مہمان نوازی کرنا ہمارا حق بنتا ہے' مجھے یہ حق نبھانے سے مت روکیے گا۔" مدحیہ نے نبیل کے سامنے ہر بات واضح کر دی تھی اور نبیل اس کی ساری بات سمجھ گیا تھا' اسی لیے سر کے اشارے سے اسے جانے کی اجازت دے دی تھی' وہ جان چکا تھا کہ مدحیہ اتنی سرکشی دکھاتی ہے تو کیوں؟ وہ غلط نہیں تھی' بس طریقہ غلط تھا۔

✲ ✲ ✲

"زونیہ' زوسیہ نیچے آؤ دونوں۔" مریم نے صحن میں کھڑے ہو کر چھت پہ کھیلتی دونوں بہنوں کو آواز دی تھی۔

"جی آپی۔۔۔؟" وہ دونوں اچھلتی کودتی نیچے اتر آئیں۔

"دونوں اپنا ہوم ورک ختم کرو۔" مریم نے برآمدے میں تخت پہ رکھے ان کے اسکول بیگز کی طرف اشارہ کیا۔

"آپی! رات کو ختم کر لیں گے۔" زونی نے لجاجت سے کہا۔

"ہرگز نہیں! رات کو لائٹ نہیں ہوتی' اندھیرے میں تم لوگوں سے پڑھا نہیں جاتا' نیند آجاتی ہے' اس لیے

ابھی بیٹھو اور ختم کرو' شاباش۔۔۔" اس نے انہیں برآمدے کی سمت دھکیلا تھا' اور خود کچن کی سمت آگئی' کیونکہ رات کے کھانے کے لیے تیاری بھی تو کرنی تھی۔

"امی! اس سے تو بہتر ہے کہ میں کالج چھوڑ دوں۔" کچن سے سنائی دیتی ایمن کی آواز پہ مریم کے قدم باہر برآمدے میں ہی رک گئے تھے۔

"تو بیٹا تم بتاؤ میں اور کیا کروں؟ اگر میرے پاس کچھ پیسے ہوتے تو میں تمہارے ابا جی کی دوائی ہی لے آتی' کل سے انہوں نے دوائی نہیں لی اور میں نے عدیل اور مریم کے سامنے بھی ذکر نہیں کیا کہ ان کی دوائی ختم ہو چکی ہے' وہ دونوں بھی پریشان ہوں گے' عدیل اپنی تنخواہ پہلے ہی ایڈوانس لے چکا ہے اور کہاں سے لے گا بھلا؟" عابدہ خاتون کی پریشان اور متفکر سی آواز پہ مریم جیسے منجمد سی ہو گئی تھی۔ ابا جی نے کل سے دوائی نہیں کھائی تھی اور ان لوگوں کو پتا ہی نہیں تھا؟ مریم سوچ کر ہی پریشان ہو گئی۔

"اگر وہ دوائی نہیں لیں گے تو ٹھیک کیسے ہوں گے؟ اب کیا ہو گا؟ عدیل بھائی بھی ایڈوانس لے چکے ہیں' اف! کیا کریں اب؟" مریم کی پریشانی کا گھوڑا بے سمت دوڑ پڑا تھا' اب اسے چین نہیں تھا۔

"امی! اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ میں کالج چھوڑ دیتی ہوں' یہ فیسیں اور کتابوں کا خرچہ سب فضول ہے' ایمان بھی کالج چھوڑ دے گی' اس طرح کچھ تو بوجھ کم ہو گا۔" ایمن الٹا امی کو سمجھا رہی تھی اور مریم تھکے تھکے قدموں سے چلتی ہوئی کمرے میں آکر بستر پہ ڈھے سی گئی۔

اس مسئلے کا کوئی حل سجھائی نہیں دے رہا تھا' صرف ایک کمانے والا تھا اور پورا گھر کھانے والا تھا۔ اور اس کی جاب بھی ایسی تھی کہ بمشکل گزارا ہوتا تھا' اوپر سے ابا جی کی بیماری ان کا علاج' آخر کیا کچھ ہو سکتا تھا اکیلے بندے سے" مریم سوچ سوچ کر ہلکان ہونے لگی۔

"مریم آپی! وہ فاطمہ آپی آئی ہیں۔" ایمان نے کمرے میں جھانکتے ہوئے اطلاع دی اور مریم یک دم اٹھ بیٹھی۔

"فاطمہ آئی ہے؟" اسے حیرانی ہوئی تھی۔

"جی ہاں! فاطمہ آئی ہے' کیونکہ آپ جو نہیں آتیں۔" فاطمہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہی سلام کی بجائے شکوہ کیا تھا۔

"السلام علیکم۔۔۔" مریم اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی۔

"وعلیکم السلام! آج حجرہ نشین کیوں ہوئی بیٹھی ہو؟" فاطمہ نے چارپائی کے ساتھ رکھی کرسی پہ بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"آج دل پہ تھوڑا بوجھ آگیا ہے' باہر نکلنے کو دل نہیں چاہ رہا۔" مریم بے ساختہ کہہ گئی تھی۔

"دل پہ بوجھ آگیا ہے؟ مگر کس قسم کا؟" فاطمہ کو حیرانی ہوئی تھی کہ مریم پہلی بار اس سے کچھ ڈسکس کر رہی تھی۔

"جو تم سمجھ رہی ہو ایسا کچھ نہیں ہے فاطمہ! میں بس اپنے گھر کے حالات کی طرف سے پریشان ہوں' چند دن پہلے ابا جی کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہو گئی تھی' وہ ہاسپٹلائز رہے ہیں' کافی خرچہ اٹھانا پڑا عدیل بھائی کو' اب گھر کے اور اسکول کالجز کے ہی اخراجات اتنے زیادہ ہیں کہ کیا بتاؤں تمہیں۔" مریم اتنی پریشان تھی کہ سب کہہ دیا تھا' حالانکہ پہلے وہ اپنے گھر کے حالات بھی چھپا کے رکھتی تھی' لیکن آج اس سے صبر نہیں ہو رہا تھا۔

"اوہ تو یہ بات ہے؟" فاطمہ نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے سرہلایا۔

"یہ بات اتنی چھوٹی نہیں ہے فاطمہ۔"

"میں جانتی ہوں یہ بات اتنی چھوٹی نہیں ہے' اسی لیے تو تمہارے لیے ایک آفر لے کر آئی ہوں' باوجود اس کے

کہ تم اور تمہارا بھائی پہلے بھی ایک آفر ٹھکرا چکے ہو۔" فاطمہ کی بات پہ مریم نے یک دم جھٹکے سے سر اٹھا کر دیکھا۔

"آفر.... ؟ کیسی آفر.... ؟" مریم نے اچنبھے سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تمہارے لیے جاب کی آفر...." فاطمہ نے مختصراً" بتایا۔

"میرے لیے جاب کی آفر؟ فاطمہ یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟" مریم کو وقفے وقفے سے حیرت کے جھٹکے لگ رہے تھے۔

"میں جو کہہ رہی ہوں، تم سن رہی ہو، کیا خیال ہے کرو گی جاب؟" فاطمہ نے بھی سنجیدگی سے پوچھا۔

"میں جاب...." مریم کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"اگر گھر کے حالات بہتر کرنا چاہتی ہو تو تمہیں یہ آفر قبول کر لینی چاہیے، ایک آدمی آج کل کے مہنگائی کے دور میں گھر نہیں چلا سکتا، بیماریوں کے علاج، گھر کے اخراجات، اسکول اور کالجز کی فیسیں اور دیگر ضروریات واقعی ایک آدمی سے ہینڈل نہیں ہو سکتیں، گھر کے باقی افراد کو بھی اس کام میں ہاتھ بٹانا چاہیے، اور میرا خیال ہے کہ یہ موقع اللہ نے تمہیں دیا ہے، اب کی بار ٹھکرانا مت، ورنہ پچھتاؤ گی۔" فاطمہ اسے سمجھا رہی تھی اور وہ سمجھ رہی تھی۔ مریم کو احساس ہو چکا تھا کہ فاطمہ ٹھیک کہہ رہی ہے، حالانکہ مریم نے پہلے بھی ایک، دو بار جاب کرنے کی بات کی تھی، لیکن عدیل نے سختی سے منع کر دیا تھا، لیکن آج کل گھر کے جو حالات جا رہے تھے، ان کے پیش نظر ضروری تھا کہ وہ اس معاملے میں اپنے مقام پہ ڈٹ جاتی، ورنہ عدیل اکیلا ہی اس چکی میں پستا رہتا۔

"اب کیا سوچ رہی ہو؟" فاطمہ نے خفگی سے ٹہوکا دیا۔

"سوچ نہیں رہی، فیصلہ کر رہی ہوں۔" مریم بے حد سنجیدہ تھی۔

"کیسا فیصلہ؟"

"جاب کرنے کا۔"

"ہوں! اچھی بات ہے، کرنا چاہیے۔" فاطمہ نے اس کی ہمت بندھائی تھی اور مریم نے آخر کار فیصلہ کر ہی لیا تھا۔

"ٹھیک ہے، مجھے یہ آفر قبول ہے، تم بتاؤ جاب کیا ہے؟" مریم ایک مضبوط فیصلہ کرنے کے بعد قدرے مطمئن ہو چکی تھی۔

"ارے جاب تو بہت ہی ایزی ہے تمہارے لیے، میری آنٹی کی ایک پرائیویٹ انگلش اکیڈمی ہے، انہیں ایک اچھے مزاج کی فی میل ٹیچر کی ضرورت ہے، وہ تو آج اخبار میں اشتہار دینا چاہ رہی تھیں، لیکن میں نے انہیں روک دیا کہ ایک بار مجھے ٹرائی کر لینے دیں، مجھے سب سے پہلا خیال تمہارا ہی آیا تھا، اکیڈمی کا ماحول بہت ہی اچھا ہے اور سیلری بھی بہت اچھی ہو گی، تمہیں شکایت نہیں ہو گی، اور یہ جاب ایسی ہے کہ تمہیں کسی بھی انٹرویو کی کوفت نہیں اٹھانا پڑے گی، وہ تو تمہیں فوراً" اپائنٹ کر لیں گی، بس تمہارے ہامی بھرنے کی دیر ہے۔" فاطمہ اس کے لیے ڈھال بن گئی تھی، مریم کو اور بھلا کیا چاہیے تھا، اس نے ہامی بھر لی تھی اور فاطمہ اس کے فیصلے پہ بے حد خوش ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

اس کا پیپر ختم ہو چکا تھا، وہ فارغ ہو چکی تھی، اس لیے اپنے نیکسٹ پیپر کی تیاری کے لیے وہ کمپیوٹر لیب میں آگئی، جہاں اسٹڈی کرتے کرتے اسے ٹائم گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا اور جب ہوش آیا تو اپنے سر پہ ہاتھ مار کے رہ گئی۔

"اف خدایا! اتنا ٹائم ہو گیا ہے؟" اس نے اپنے موبائل سے ٹائم چیک کرتے ہوئے پریشانی سے کہا۔

"عبداللہ بھائی کی کال بھی نہیں آئی؟" وہ سارا پھیلاوا سمیٹتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی.... اور کمپیوٹر لیب سے نکل

نے عبداللہ کا نمبر ڈائل کیا تھا، دوسری طرف پہلی رنگ پہ ہی کال ریسیو کر لی گئی تھی۔

"ہیلو.... ؟"

"السلام علیکم بھائی! آپ آئے کیوں نہیں؟ اور نہ ہی کال کی ہے آپ نے؟

"اتنا ٹائم ہو رہا ہے۔" زری ٹائم دیکھ کر پریشان ہو رہی تھی۔ ڈونٹ وری کچھ نہیں ہوتا، مجھے پتا تھا کہ تم پیپر کی تیاری کر رہی ہو، اس لیے تمہیں ڈسٹرب نہیں کیا، اب تم تیار رہو، میں بس آ رہا ہوں۔" عبداللہ نے اس تسلی دیتے ہوئے فون بند کر دیا۔ زری اپنا دوپٹہ اور اسکارف اچھی طرح اوڑھتی ہوئی یونیورسٹی کا طویل ترین احاطہ تیز تیز قدموں سے طے کرتی ہوئی گیٹ سے نکل آئی، اسے پتا تھا کہ عبداللہ کو پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی، وہ جس بینک میں کام کرتا تھا وہ اس کی یونیورسٹی سے زیادہ دور نہیں تھا، اس لیے وہ زری کو آسانی سے پک اینڈ ڈراپ کر دیتا تھا، زری کو ابھی وہاں کھڑے پانچ منٹ ہی گزرے تھے کہ یک دم اس کا رنگ فق ہو گیا، اس کے دائیں طرف سے ملک اسد اللہ کی آواز ابھری تھی۔

"کہاں تھیں اتنی دیر سے؟ ہم کب سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں؟ اتنا لمبا ہو گیا تھا تمہارا پیپر؟" وہ عین اس کے سامنے آ کھڑے ہوئے تھے اور انہوں نے زری کو سرتاپا قہر آلود نظروں سے دیکھا تھا، وہ اپنی جگہ پہ کانپ کے رہ گئی تھی۔

"وہ.... میں اپنے نیکسٹ پیپر کی تیاری کے لیے لیب میں چلی گئی تھی، عبداللہ بھائی کو میں نے صبح ہی بتا دیا تھا۔" اس نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے بمشکل جواب دیا تھا کہ کہیں جواب نہ دینے پہ وہ مزید غضب سے نہ بھر جائیں۔

"اپنے عبداللہ بھائی کی بات ہم سے نہ ہی کرو تو بہتر ہے، خیر چھوڑو اس قصے کو، آؤ ہم تمہیں ڈراپ کر دیتے ہیں۔" انہوں نے زری کو کہتے ہوئے ذرا فاصلے پہ کھڑی اپنی گاڑی کی سمت اشارہ کیا۔

"نن.... نہیں! تھینک یو، عبداللہ بھائی مجھے لینے کے لیے آ رہے ہیں، ابھی فون پہ بات ہوئی ہے ان سے۔" زری ان کے ساتھ جانے کا کبھی مر کے بھی نہیں سوچ سکتی تھی، وہ اسے آتے جاتے اپنی موت کے فرشتے کی طرح دکھائی دیتے تھے، اور اپنی موت کے فرشتے کے ساتھ اپنی مرضی سے کیسے جا سکتی تھی بھلا؟

"ہم بھی تو تمہیں ہی لینے کے لیے آئے ہیں؟" وہ کافی سخت اور برفیلے لہجے میں کہہ رہے تھے۔

"جی! وہ تو.... ٹھیک ہے، لیکن.... وہ عبداللہ بھائی بھی بس پہنچنے ہی والے ہیں۔" اس وقت زری پہ ایک ایک لمحہ عذاب گزر رہا تھا، ان کی دہشت ہی اتنی تھی کہ ایسے ٹھنڈے اور یخ بستہ موسم میں وہ اور بھی ٹھنڈی ہو گئی تھی، اس کے ہاتھ پاؤں بالکل یخ ہو رہے تھے اور ماتھے پہ بھی ٹھنڈے پسینے آ رہے تھے۔

"کوئی بات نہیں، اسے منع کر دو، ہمارے ساتھ چلو۔" انہوں نے اسے دوبارہ چلنے کا کہا۔

"ایم سوری بھائی! میں آپ کے ساتھ نہیں جا سکتی۔" اس نے انکار کر دیا تھا اور ملک اسد اللہ ایسے صاف انکار پہ آگ کی طرح بھڑک اٹھے تھے۔

"تم ہمارے ساتھ چلنے سے انکار کر رہی ہو؟" ان کی غضب ناک دھاڑ پہ آس پاس کے لوگ بھی ٹھہر گئے تھے، زری نے شرمندگی اور خوف سے چہرہ جھکا لیا، وہ ان کے اس قدر غیض و غضب کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔

"دیکھتے ہیں کہ کیسے نہیں جاتی ہو تم۔" انہوں نے دو قدم آگے بڑھتے ہوئے زری کا بازو دبوچا اور اسے کھینچتے ہوئے اپنی گاڑی تک لے آئے تھے۔

"نہیں بھائی صاحب! اس طرح تو نہیں نا۔" عبداللہ نے ان کا بازو تھام کے انہیں روک دیا تھا، وہ اپنی گاڑی کا دروازہ کھول رہے تھے۔

"دیکھو ملک عبداللہ! ہم تمہیں بار بار سمجھا رہے ہیں کہ ہمارے راستے میں مت آؤ' مت ٹانگ اڑاؤ اس معاملے میں۔" انہوں نے جیسے عبداللہ کو دھمکی دی تھی۔

"کیا کریں گے آپ؟ زری کو اپنے ساتھ لے جائیں گے؟ ہونہہ! دیکھتا ہوں میں کہ کیسے لے کر جاتے ہیں؟" عبداللہ بھی غصے سے کہہ رہا تھا اور پھر وہاں سے پلٹ کر اپنی گاڑی کی سمت چلا گیا۔ ملک اسد اللہ زری کو دوبارہ اپنی گاڑی میں بٹھانے کی کوشش کرنے لگے' لیکن اس سے پہلے کہ وہ اس کوشش میں کامیاب ہوتے ایک پولیس کار جھٹکے سے ان کے قریب آر کی' انہوں نے ملک اسد اللہ کو سیکنڈز میں اریسٹ کرلیا تھا اور زری ملک' اسد اللہ کو پولیس والوں کے شکنجے میں دیکھ کر ششدر سی رہ گئی تھی۔

"بھائی!" اس نے پلٹ کر عبداللہ کی سمت دیکھا وہ اپنی گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا کسی کا فون سن رہا تھا۔

"بھائی پلیز! روکیں انہیں! وہ اسد بھائی کو لے کر جا رہے ہیں۔" زری ایک بہن تھی' اپنے بھائی کو مشکل میں دیکھ کر رہ بھی نہیں سکتی تھی' وہ بھاگتی ہوئی عبداللہ کے قریب آئی تھی۔

"ان کے سنگین عزائم کے آگے بند ھ باندھنے کے لیے یہ سب بہت ضروری ہے' جانے دو فی الحال' انہیں بھی تو پتا چلے کہ جیل کی سلاخیں کس چیز کا نام ہے؟ پاکستان میں تو چوہدری اور ملک لوگ جیل میں بند ہونا اپنی توہین سمجھتے ہیں' اپنی جگہ غریبوں کے بیٹوں کو پیش کر دیتے ہیں' اور وہ بے گناہ چاہے جتنے سال جیل میں سڑتا رہے' انہیں کوئی پروا نہیں ہوتی۔" عبداللہ اپنے جاگیردرانہ ماحول کو کافی اچھی طرح جانتا تھا اور مخالفت بھی کرتا تھا' لیکن اپنے بابا جان اور بھائی صاحب کے سامنے کبھی اس کی ایک بھی نہیں چلی تھی' اسی لیے تو وہ ان لوگوں سے دور ہو گیا تھا۔

"لیکن بھائی! یہاں پردیس میں وہ جیل میں قید کاٹیں گے' کیا یہ اچھا لگے گا؟" زری پھر بھی اس کا بھلا چاہ رہی تھی۔

"وہ اگر جیل میں قید نہیں کاٹیں گے تو تم پاکستان جا کر قید کاٹو گی۔" عبداللہ کا لہجہ سنجیدہ ہو چکا تھا۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟"

"میرا مطلب ہے کہ وہ بھی تو تمہیں ملک حق نواز کی قید میں دینا چاہتے ہیں' آج اگر ڈٹ جاؤ گی تو کل اس قید سے بچ جاؤ گی' انہیں جانے دو' تاکہ انہیں پتا چلے کہ تم کمزور نہیں ہو۔" عبداللہ اسے سمجھا رہا تھا' لیکن زری جو اپنے سینے میں موم کا دل رکھتی تھی' وہ اس موم کے دل کو پتھر کا دل نہیں بنا سکتی تھی' وہ اس وقت اپنے بارے میں نہیں' بلکہ اسد اللہ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

"بعد کی باتیں بعد میں دیکھی جائیں گی' آپ فی الحال انہیں آزاد کروا دیں' میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے انہیں تکلیف اٹھانا پڑے اور مجھے بابا جان اور بی بی جان کے سامنے شرمندگی ہو' اگر وہ جیل چلے گئے تو بی بی جان کو بھی تکلیف ہو گی۔" زری آہستگی سے سر جھکائے کہہ رہی تھی اور عبداللہ اس کے دھیمے سے لہجے اور جھکے ہوئے سر کو دیکھ کے رہ گیا اور پھر تاسف سے ایک گہری سانس کھینچی تھی۔

"کاش! کہ وہ بھی اپنی بہن کے لیے اسی طرح کچھ اچھا سوچ لیں' جیسا وہ ان کے لیے سوچ رہی ہے۔" عبداللہ نے اپنے موبائل پہ کسی کو کال ملاتے ہوئے کچھ کہا تھا اور پھر ملک اسد اللہ کو آزاد کرنے کا کہہ کر خود گاڑی میں بیٹھ گیا تھا۔

"بیٹھو....." اس نے زری کے لیے فرنٹ ڈور کھول دیا تھا۔

"لیکن وہ اسد بھائی۔" اس نے ذرا فاصلے پہ کھڑے اسد اللہ اور پولیس آفیسرز کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ڈونٹ وری! پانچ منٹ بعد چھوڑ دیں گے تم بیٹھو۔" عبداللہ نے اسے تسلی دلائی تھی اور تب جا کے اس نے

آگے بڑھائے تھے' ملک اسد اللہ کے ہاتھ پیچھے کی طرف بندھے ہوئے تھے' وہ بار بار پلٹ کر انہیں دیکھ رہی تھی البتہ ملک اسد اللہ نے صرف ایک بار دیکھا تھا' وہ بھی عبداللہ کی سمت دیکھا تھا' لیکن ان کا ایک بار دیکھنا بھی غضب کا تھا۔

عبداللہ اپنی گاڑی نکال لے گیا تھا اور زری اس واقعے پہ چپ ہو کے رہ گئی تھی' نہ جانے ابھی اور کیا کچھ ہونا باقی تھا؟

☼ ☼ ☼

بہت بے چین رہتی ہے طبیعت ایک مدت سے
دل و جاں کو نہیں مل پائی راحت ایک مدت سے

بہت مجبور ہوں ورنہ بہت محسوس کرتا ہوں
مری جاں تم سے ملنے کی ضرورت ایک مدت سے

تمہارے غم سے گھبرا کر میں اب لوگوں سے کہتا ہوں
کہ میں نے ترک کر دی ہے محبت ایک مدت سے

اس نے اپنا لیپ ٹاپ آن کیا تو لیپ ٹاپ کی وال پہ یہ تین اشعار اسے سیاہ رنگ کے لفظوں میں لکھے نظر آئے تھے۔ اس کی وال پیپر کا کلر کمبی نیشن بلیک اینڈ وائٹ تھا' سفید اسکرین پہ سیاہ رنگ کے چنار کے پتوں کے درمیان لکھے یہ اشعار بے پناہ اداسی کا اعلان کر رہے تھے اور وہ ان اشعار کو پڑھنے کے بعد اور بھی بے چین اور مضطرب ہو گیا تھا' اسی لیے لیپ ٹاپ کو وہیں بیڈ پہ چھوڑ کے بیڈ سے اٹھ گیا' آج نہ جانے کیوں اسے بار بار کسی کا خیال ستا رہا تھا— ورنہ ایسا بہت کم ہوتا تھا کہ دل آور شاہ کو بے چینی لاحق ہوتی۔ اور جب ہوتی تھی تو وہ اپنے مضطرب دل کو اندر ہی اندر مارنے کی اور اس کی خواہش اور احساسات دبانے کی کوششیں کرتا تھا' تب سگریٹ پہ سگریٹ سلگتا رہتا' اور وہ اپنے اندر کا غبار سگریٹ کے دھوئیں کی صورت باہر نکالتا رہتا تھا۔

"آپ کچھ بے چین سے لگتے ہیں؟" زری کی دھیمی آنچ دیتی آواز پہ دل آور نے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کے اسے دیکھا تھا' وہ اس کے سامنے والے صوفے پہ بڑی تمکنت سے بیٹھی اسے دیکھ رہی تھی اور اپنے دل کی پیاس کو قطرہ قطرہ سیراب کر رہی تھی' اس لمحے وہ خود کو دنیا کی امیر ترین عورت تصور کر رہی تھی' جس کا محبوب سراپا اس کے سامنے تھا اور سر جھکائے غلاموں کی طرح بیٹھا تھا' اس لمحے اسے دو جہاں کے والی سے اور کچھ نہیں چاہیے تھا' اس صرف ایک خواہش تھی کہ یا لمحے ٹھہر جائیں' یا پھر یوں ہی بیٹھے بیٹھے عمر تمام ہو جائے' لیکن وہ تھا کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک کام بھی نہیں چاہتا تھا' نہ لمحوں کو ٹھہرانا چاہتا تھا' نہ عمر بتانا چاہتا تھا' کیونکہ وہ ایک حقیقت پسند تھا' حقیقت کو افسانہ سمجھ کے زری کی طرح خوش نہیں ہو سکتا تھا۔

"اس لیے بے چین ہیں؟ میری وجہ سے یا اس تنہائی کی وجہ سے؟" وہ اسے بولنے پہ اکسا رہی تھی۔

"آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔" اس نے پھر چہرہ جھکا لیا۔

"تو آپ صحیح سمجھا دیں۔" زری میں نہ جانے کہاں سے اتنی ہمت آگئی تھی کہ اس سے سوال جواب کرنے بیٹھ گئی تھی۔

"عبداللہ کو اور کتنی دیر لگے گی؟" اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"جتنی دیر آپ کو اپنی بے چینی بتانے میں لگے گی۔" زری تو جیسے اسے ستا رہی تھی۔

"ٹھیک ہے' پھر میں چلتا ہوں۔" وہ صوفے سے کھڑا ہو گیا اور قدم باہر کی سمت بڑھا دیے تھے۔

"مجھے آپ سے یہ امید نہیں تھی کہ آپ بھی نظر چرانے والوں میں سے ہوں گے۔" زری کی آواز پہ دل آور کے قدم تھم گئے تھے۔

"مجھے بھی آپ سے یہ امید نہیں تھی کہ آپ نظر جمانے والوں میں سے ہوں گی۔" دل آور نے واپس پلٹتے ہوئے برجستہ جواب دیا تھا اور زری بے ساختہ ہنس پڑی تھی اور اس کی ہنسی کا سحر ایسا تھا کہ دل آور نے وہاں سے ہٹ جانا ہی مناسب سمجھا تھا لیکن ان کے گھر سے نکلنے کے بعد بھی اس کی سماعتوں میں زری کی اس ہنسی کی کھنک باقی رہی تھی' وہ عبداللہ سے ملنے آیا تھا' لیکن عبداللہ واش روم میں شاور لے رہا تھا اور نگارش اپنے میکے گئی ہوئی تھی' اسی لیے وہ زری کے پاس زیادہ دیر تنہا نہیں بیٹھا تھا' وہ آج جس موڈ میں تھی وہ دل آور شاہ کو بھی بے چین کر رہی تھی' اسی لیے تو وہ اٹھ آیا تھا' لیکن گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بھی اس کا دھیان زری کی طرف ہی تھا۔ اور اس وقت بھی اس کا دھیان اسی کی طرف تھا جب اس دھیان کے تسلسل کو فجر کی اذان نے توڑ دیا تھا۔

دل آور نے چونک کر دیکھا' اس کا لیپ ٹاپ بیڈ پر ہنوز آن ہی پڑا ہوا تھا اور ہاتھ کی انگلیوں میں سگریٹ سلگ رہا تھا' اس نے سر جھٹکتے ہوئے سگریٹ جھک کر ایش ٹرے میں مسلا اور خود باتھ روم کی سمت بڑھ گیا' اذان ہو چکی تھی۔ اس لیے اس نے وضو کر کے اب نماز بھی پڑھنی تھی' جب ہی اپنے بوجھل اور تھکے تھکے ذہن سے ہر بات جھٹک ڈالی تھی اور پھر نماز کے بعد دعا میں اپنے لیے چین اور سکون مانگا تھا' اللہ سے صبر اور اطمینان عطا کرنے کی درخواست کی تھی' وہ آج حقیقتاً "اداس اور بجھا بجھا سا تھا' شاید زری والی اداسی اس کے اندر اتر آئی تھی' وہ اسے بے وجہ ہی یاد کر رہا تھا' دل کو بے کلی لاحق تھی۔

☼ ☼ ☼

مری کا موسم آج بھی بہت اچھا ہو رہا تھا۔

سب ہی اپنے وقت پہ بے دار ہو گئے تھے' لیکن صرف علیزے تھی جو ابھی تک سو رہی تھی' اس کی آنکھ نہیں کھلی تھی' اس لیے اس کی نماز بھی قضا ہو چکی تھی' اب تو دن کے ساڑھے گیارہ کا ٹائم ہو رہا تھا' اسی لیے عائشہ آفندی نے رجو کو اسے جگانے کے لیے بھیجا۔ رجو نے باقاعدہ اس کے بیڈ روم کے دروازے کو زور' زور سے پیٹا تھا' تب جا کے علیزے کی آنکھ کھلی تھی۔

"کون ہے؟" اس کی نیند سے بوجھل آواز سنائی دی۔

"بی بی جی! میں ہوں' رجو' دروازہ کھولیں بی بی جی' بہت ٹائم ہو رہا ہے' دن کے بارہ بج رہے ہیں۔" رجو نے باہر سے ہی اپنا اعلان جاری رکھا تھا۔

"بارہ بج گئے؟" **علیزے** نے دروازہ کھولتے ہوئے حیرت سے کہا' اس کا سر بہت بھاری ہو رہا تھا اور قدم بھی تھوڑے غیر متوازن لگ رہے تھے' کل وہ بہت ڈسٹرب رہی تھی' اس لیے رات کو ٹرینکولائزر لے کر سوئی تھی' جب ہی اس وقت اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے' ذہن بوجھل ہو رہا تھا۔

"جی! بارہ بج گئے ہیں' آپ فریش ہو کر آجائیں' عائشہ بی بی آپ کا ہی انتظار کر رہی ہیں۔" رجو کہہ کر چلی گئی اور **علیزے** اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھامتی ہوئی باتھ روم میں آگئی اور دیوار گیر آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے آپ کو عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگی' اک عجیب سا احساس اسے اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا' وہ اپنے ہاتھ' پاؤں' اپنا چہرہ' اپنی گردن چھو چھو کر دیکھ رہی تھی' اتنی دیر سونے کی وجہ سے سارا جسم سویا سویا سا لگ رہا

تھا۔ "علیزے۔" اس کے بیڈ روم سے آذر کی آواز سنائی دی۔

"جی آذر بھائی آ رہی ہوں۔" اس نے جلدی جلدی برش کیا اور منہ ہاتھ دھو کر باہر نکل آئی۔ "اتنی دیر لگا دی تم نے طبیعت تو ٹھیک ہے نا" آذر کو تشویش ہو رہی تھی۔

"جی ٹھیک نہیں رات ٹرینکولائزر لے کر سوئی تھی اس لیے جلدی آنکھ نہیں کھلی بلکہ اب بھی جسم تھکا تھکا سا لگ رہا ہے۔" وہ سر جھکائے آہستگی سے کہہ رہی تھی۔

"ڈونٹ وری! ابھی فریش ہو جاؤ گی' باہر سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں' کیا آج گھومنے کا ارادہ نہیں ہے؟" آذر اسے فریش کرنے کے لیے پوچھ رہا تھا۔

"جی! ابھی آتی ہوں۔" وہ انکار کر کے ان لوگوں کا موڈ نہیں خراب کرنا چاہتی تھی اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی ہامی بھر لیتی تھی۔

"او کے! جلدی آجاؤ۔" وہ اس کا ہاتھ تھپک کے باہر نکل گیا اور علیزے گرم کپڑے پہننے لگی' وہ تھوڑی دیر میں باہر آئی تو واقعی سب ہی منتظر تھے۔

"لیجیے شہزادی **علیزے** آچکی ہیں' اب قافلے کو روانگی کی اجازت دیجیے۔" کومل کا لہجہ دھیما لیکن طنزیہ اور کاٹ دار تھا آذر نے آج پھر اسے چونک کر دیکھا تھا کیونکہ وہ زیادہ دور نہیں کھڑا تھا با آسانی سن سکتا تھا۔ اور اس کی بات سن کر آذر کو آج بھی سخت الجھن اور حیرت ہوئی تھی کومل کا رویہ علیزے کے ساتھ ایسا کیوں تھا آخر.....؟

"کیا بات ہے آج اتنا لیٹ کیوں ہو گئیں...؟" عائشہ آفندی کو بھی اس کی طرف سے تشویش ہو رہی تھی۔

"بس نیند گہری تھی اس لیے وقت کا احساس نہیں ہوا' ایم سوری کہ آپ سب کو میری وجہ سے انتظار کرنا پڑا۔" **علیزے** نے بے حد آہستگی سے کہتے ہوئے کومل کی سمت دیکھا تھا۔ جس کے چہرے کی ناگواری وہ پہلے تو نہیں لیکن اب با آسانی محسوس کر سکتی تھی کیونکہ وہ کومل کے اندر کی کاٹ اور ناگواری کی جھلک دیکھ چکی تھی۔

"ارے ایسی کوئی بات نہیں ہے ڈیر' ہم پورا دن بھی سوئی رہتیں تو ہم پورا دن انتظار کر سکتے تھے۔" دانیال نے

مسکرا کر اس کا سر تھپکتے ہوئے کہا۔

"تھینک یو بھائی! اٹس مائی پلیژر۔۔۔" علیزے کا لہجہ سنجیدہ تھا وہ کل سے کچھ چپ چپ سی تھی اسے کومل کا شک اندر ہی اندر کسی پن کی طرح چبھ رہا تھا۔

"چلو پھر جلدی سے ناشتا کرو' آج نتھیا گلی کے لیے نکلتے ہیں۔" دانیال نے اسے ناشتا یاد دلایا۔

"نہیں مجھے بھوک نہیں ہے' آپ چلیں میں راستے سے کچھ لے لوں گی۔" علیزے کو واقعی بھوک نہیں تھی اس نے انکار کر دیا تھا اور اس کے انکار پہ سب کھڑے ہو چکے تھے ان کا رخ باہر گاڑیوں کی سمت تھا عائشہ آفندی کے ساتھ علیزے بھی دھیمے اور سست قدم اٹھاتی باہر نکل آئی تھی۔

سامنے ہی روش پہ منصور حسین گاڑی کا دروازہ کھولے الرٹ کھڑا تھا علیزے کی ڈائریکٹ نظر اسی پہ پڑی تھی اور اتفاقاً" منصور حسین نے بھی اسی پل نظریں اٹھا کر اندرونی مین ڈور کے سامنے والی سیڑھیاں اترتی علیزے کی سمت دیکھا تھا نظروں کا یہ تصادم علیزے کے لیے خفت کا باعث تھا اسے جب بھی اپنا منصور حسین سے لپٹنا یاد آتا تھا وہ شرمندگی سے زمین میں گڑ جاتی تھی' یہی وجہ تھی کہ کل سے اس کا منصور حسین سے نظر ملانا محال ہو گیا تھا' ایک کومل والی بات اور دوسری اپنی بدحواسی میں کی گئی حرکت' دونوں ہی اس کے ڈوب مرنے کے لیے کافی تھیں' منصور حسین نے بھی اسے دیکھ کر نظریں جھکالی تھیں اور جب وہ اس کے پاس سے گزر کر گاڑی میں بیٹھی تو وہ دروازہ بند کر کے اپنی سائیڈ پہ آگیا دوسری گاڑیاں رفتہ رفتہ نکل چکی تھیں۔

وہ بھی گاڑی بیک کرتے ہوئے گیٹ سے باہر لے آیا تھا' آج عائشہ آفندی علیزے کے ساتھ تھیں اور رجو منصور حسین کے ساتھ فرنٹ سیٹ پہ بیٹھی ہوئی تھی۔

"کیا بات ہے علیزے بیٹا۔۔۔؟ تم اداس اور چپ چپ سی لگ رہی ہو؟" عائشہ آفندی پوچھے بغیر نہیں رہ سکیں علیزے کی خاموشی سب ہی کو محسوس ہو رہی تھی۔

"ارے پھوپھو! میں نے بتایا تو ہے کہ میں بالکل ٹھیک ہوں' بس تھکن ہو رہی ہے' کبھی اتنا سفر جو نہیں کیا' اور پھر پورا پورا دن گھومنا پھرنا' میری تو ٹانگوں اور پاؤں کی ایڑیوں میں درد ہونے لگتا ہے' میں بہت جلدی تھک جاتی ہوں۔" علیزے انہیں مطمئن کرنے کے لیے تسلی دی۔

"تو کسی روز ریسٹ کر لونا۔" انہوں نے اپنے ہاتھ سے علیزے کے چہرے پہ آئے بال پیچھے ہٹائے تھے۔

"میرا ریسٹ کرنا دوسروں کو ناگوار گزرتا ہے۔" علیزے کا لہجہ ذرا سا بھیگ گیا اس سے کومل کی ناگواری برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

"کس کو ناگوار گزرتا ہے؟" عائشہ آفندی کو اچنبھا ہوا۔

"ہوں! کسی کو بھی نہیں۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی تھی اور اپنی طرف سے بات ٹالنے کی کوشش کی تھی۔

"مگر بیٹا۔۔۔"

"پلیز آپ اس بات کو رہنے دیں' زیادہ کریدنے سے زیادہ تکلیف ہوتی ہے۔" علیزے نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا اور عائشہ آفندی چپ ہو گئی تھیں وہ بھی تو زہرہ سے ملنا چاہتی تھیں اسے کریدنا چاہتی تھیں کیا اسے بھی اس کریدنے پہ تکلیف ہو سکتی تھی؟ لیکن عائشہ آفندی کو اس طرح یہ پتا تو چل سکتا تھا نا کہ وہ انہیں بنا بتائے سب کچھ چھوڑ کر کیوں چلی گئی؟ کیوں کبھی پلٹ کر بھی نہیں دیکھا؟ کبھی یہ بھی نہیں پوچھا کہ پیچھے عائشہ پہ کیا گزری ہے؟ کیا بیتی ہے اس کی ذات پہ؟ عائشہ آفندی کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

"پھوپھو!" کیا سوچ رہی ہیں؟"

"کچھ نہیں بیٹا!" انہوں نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے آہستگی سے کہا اور علیزے کا کندھا تھپکتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

☼ ☼ ☼

"جس طرف بھی دیکھ رہا ہوں' ہر طرف سوچیں ہی سوچیں نظر آ رہی ہیں' کیا بات ہے؟ تم بھی سوچ میں گم ہو گئے؟" دانیال خفگی سے کہتا ہوا آذر کے برابر ایک پہاڑی کے اوپر بنی ریلنگ کے قریب آ کھڑا ہوا۔

"کیا کہنا چاہ رہے ہو تم؟"

"میں کہنا چاہ رہا ہوں کہ میں اس وقت ہر چہرے پہ گہری سوچ کے سائے دیکھ رہا ہوں' امی بھی سوچ میں گم ہیں' علیزے بھی چپ اور پرسوچ سی ہے' کومل کے چہرے کا بھی یہی حال ہے' اور ادھر تم بھی اسی مرض کا شکار ہوئے کھڑے ہو۔" دانیال کی خفگی ہنوز تھی۔

"دانیال! تم نہیں جانتے کہ میں کیا سوچ رہا ہوں؟" آذر بے حد الجھا ہوا تھا۔

"ہونہہ! تمہارے جیسا بے خبر نہیں ہوں میں۔" دانیال استہزائیہ انداز میں ہنسا تھا' آذر نے چونک کر اس کے چہرے کی سمت دیکھا۔

"میرے جیسا بے خبر؟ کیا مطلب۔۔۔؟"

"تم کومل کے بارے میں سوچ رہے ہو نا۔۔۔؟" دانیال کے اندازے پہ آذر کی آنکھیں حیرت اور بے یقینی سے پھیل گئیں کہ اس نے اس قدر درست اندازہ کیسے لگا لیا؟

"دانیال۔۔۔! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" آذر حیران پریشان تھا۔

"میں کہہ رہا ہوں کہ تم کومل کے بارے میں سوچ رہے ہو کہ کومل کا رویہ علیزے کے ساتھ اتنا کھردرا کیوں ہے؟" دانیال تو اسے کسی نجومی کی طرح سب کچھ پرفیکٹ بتا رہا تھا۔

"دانیال۔۔۔؟" وہ حیرت کے مارے مزید کچھ نہیں کہہ پایا تھا اور دانیال نے مسکراتے ہوئے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا اور پہاڑوں کے اس پار ڈوبتے سورج کو دیکھا اور آذر کو وضاحت دی تھی۔

"دن شروع ہوتا ہے تو سب سے پہلے سورج بےدار ہوتا ہے اور یہ سورج پورا دن پوری کائنات پہ راج کرتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ یہ سورج ڈوب جاتا ہے اور آسمان کے سینے پہ چاند جگمگانے لگتا ہے' ٹھنڈی میٹھی روشنیوں والا چاند' سب ہی اس چاند کو اس کی نرمی اور مٹھاس کی وجہ سے پسند کرتے ہیں اور لوگوں کی اس پسندیدگی کی وجہ سے سورج کو چاند سے جلن ہونے لگتی ہے اسے اپنے آپ پہ بھی غصہ آتا ہے کہ وہ غروب کیوں ہوتا ہے۔۔۔؟ کیوں چاند کو ابھرنے کا موقع دیتا ہے۔۔۔؟ لیکن یہ ڈوبنا اور ابھرنا ایک فطرت ہے اور یہ فطرت ازل سے اب تک جاری رہے گی' اسی طرح سورج کی چاند سے جلن بھی ہمیشہ قائم رہے گی۔" دانیال آذر کو ایک مثال دیتے ہوئے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن آذر پھر بھی ناسمجھی سے دیکھ رہا تھا۔

"میری اس مثال کا اشارہ علیزے اور کومل کی طرف ہے' کومل سورج ہے' بڑی حویلی کی بڑی بیٹی' اس نے ہمیشہ اپنے تمام کزنز میں راج کیا ہے' لیکن جیسے ہی علیزے پیدا ہوئی' پورے گھر کی توجہ اور پیار محبت علیزے کی سمت منتقل ہو گیا' پورا دن سورج کی دھوپ میں گزارنے والے لوگ چاند کے شیدائی ہوئے تو سورج کو بھی شکایتیں ہونے لگیں' اسے چاند سے حسد اور جلن محسوس ہوتی تھی' بڑی حویلی میں علیزے چاند تھی تو کومل بھی سورج کا

سا مقام رکھتی تھی اس لیے یہ پرخاش اس کے دل میں بچپن سے چلی آرہی ہے کسی بھی بچے نے کومل کی حیثیت کو کم نہیں کیا تھا سوائے علیزے کے.... اور بات یہیں تک ختم نہیں ہوتی آذر صاحب، یہ معاملہ بہت سنگین ہے، یہ قصہ بہت دور تک جاتا ہے۔" دانیال آج شاید آذر کی آنکھوں سے ناسمجھی کی پٹی اتارنے کے درپے تھا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب کہ کومل کے ساتھ دل کے معاملے میں بھی ایسا ہی سلوک ہوا ہے، کومل جس کو پسند کرتی ہے وہ علیزے کو پسند کرتا ہے۔" دانیال کے اس دھماکے پہ آذر دو قدم دور اچھلا تھا، وہ دانیال کو ششدر سا دیکھ رہا تھا، وہ ایسے انکشاف کر رہا تھا کہ آذر دنگ رہ گیا تھا۔

"کومل شاید بچپن کی ساری باتیں اگنور کرکے علیزے کے ساتھ نارمل کزنز کی طرح بی ہیو کرتی لیکن آذر آفندی کی محبت اسے ایسا کرنے سے روک دیتی ہے، کیونکہ کومل آذر کو دیکھ دیکھ کر جیتی ہے اور آذر، علیزے کو دیکھ کر اس پہ قربان ہوتا ہے، ایسے عالم میں تم بتاؤ کہ کومل کا رویہ علیزے کے ساتھ درست کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ کیسے علیزے کے ساتھ دوستوں کی طرح اور کزنز کی طرح رہ سکتی ہے؟ کیسے بڑی بہنوں کا سا سلوک کر سکتی ہے؟ علیزے اور کومل کے درمیان تم کھڑے ہو میرے دوست، اور فیصلہ بے پناہ مشکل ہے کہ کس کو کس طرف جانا چاہیے؟" دانیال نے آج اس قصے کا سارا کچا چٹھا کھول کے رکھ دیا تھا اور آذر نے بے ساختہ ریلنگ کو مضبوطی سے تھام لیا کہ مبادا وہ کہیں گر ہی نہ جائے۔

"اور ہاں! ایک بات اور اس سارے قصے میں علیزے بے گناہ اور انجان ہوتے ہوئے بھی اس چکی میں پس رہی ہے، اس کا کوئی قصور نہیں ہے لیکن پھر بھی قصوروار ٹھہرائی جا رہی ہے۔" دانیال اسے ہر بات سے آگاہ کر رہا تھا۔

"کومل مجھے پسند کرتی ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟" آذر نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔

"کیوں؟ یہ کیوں نہیں ہو سکتا بھلا؟ کیا اس چیز پہ کوئی پابندی ہے؟" دانیال نے اس کے بچکانہ سے سوال پہ خفگی سے کہا۔

"مگر دانیال....."

"کیا تم نے اپنے ماتھے پہ لکھوا رکھا ہے کہ تم علیزے کو پسند کرتے ہو اور کوئی تمہیں پسند نہ کرے؟" دانیال کو آذر کی لاپروائی اور نادانی پہ چڑ ہو رہی تھی۔

"میں علیزے کو پسند کرتا ہوں؟ دانیال تم غلط فہمی کا شکار ہو، میں علیزے کو....."

"ہاں! تم علیزے کو محض اپنی کزن سمجھتے ہو، ہے نا؟ ہونہہ! کزنز تو پھر اور بھی بہت ہیں۔ صرف علیزے کے لیے ہی اتنے ہلکان کیوں ہوتے ہو؟ وہ تمہارے لیے اتنی اسپیشل کیوں ہے؟ مان لو میرے یار کہ جو میں کہہ رہا ہوں وہ سب سچ ہے، تم علیزے کو پسند کرتے ہو اور کومل تمہیں پسند کرتی ہے۔ اور پسند کا یہ چکر کچھ مناسب نہیں ہے، کیا بنے گا آخر؟" دانیال خود بھی متفکر ہو رہا تھا جبکہ آذر تو مزید کچھ کہہ ہی نہ سکا۔ وہ سب واپسی کا شور مچا رہے تھے اور آذر جیسے مرے مرے قدموں سے چلتا ہوا گاڑی تک آیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ اپنے دھیان میں بیڈ روم کا دروازہ کھول کے بیڈ روم میں داخل ہوئی تھیں، لیکن اندر داخل ہوتے ہی انہیں شدید کھانسی کا دورہ پڑ گیا تھا، بیڈ روم سگریٹ کے دھوئیں سے دھواں دھواں ہو رہا تھا اور اس قدر زہریلے دھوئیں

سے ان کا دم گھٹ گیا۔

وہ کھانستے ہوئے بمشکل کھڑکی تک گئی تھیں اور کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیے تھے۔

"وقار! یہ آپ اسموکنگ کر رہے ہیں؟ اتنی زیادہ۔؟ ہر چیز دھواں دھواں ہو گئی ہے۔" آسیہ آفندی ان کے عین سامنے آ کھڑی ہوئی تھیں وہ راکنگ چیئر پہ جھول رہے تھے۔

"کھڑکی بند کر دو آسیہ۔" انہوں نے بے حد گمبھیر اور بوجھل آواز سے کہا تھا۔

"کیسے بند کر دوں کھڑکی۔..؟ پورا بیڈ روم حبس زدہ ہو رہا ہے آپ کا دم نہیں گھٹ رہا؟" آسیہ آفندی پریشانی سے جھنجلا رہی تھیں۔

"دم گھٹ رہا ہے، اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ کھڑکی بند کر دو۔" وقار آفندی کا لہجہ بہت عجیب ہو رہا تھا، آسیہ آفندی بے بس سی کھڑی تھیں آج پورا ایک ہفتہ ہو گیا تھا ان کو اس حال میں دن رات تمام کرتے ہوئے، اور ان کو پورا ایک ہفتہ ہو چکا تھا ان سے اس حال کی وجہ پوچھتے ہوئے، وہ جب زیادہ اصرار کرتی تھیں تو وقار آفندی غصے سے ڈانٹ دیتے تھے اور وہ ہزاروں الجھنیں ذہن میں لیے پلٹ جاتی تھیں۔

"ایسی کیا بات ہے آخر جو آپ مجھ سے شیئر نہیں کرتے؟" آسیہ آفندی ان کے قریب آگئی تھیں اور وقار آفندی نے ان کے سوال کو نظرانداز کرکے سگریٹ ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے کچھ کہنے کے لیے ہنکارا بھرا۔

"علیزے کے برتھ ڈے میں صرف پانچ دن رہ گئے ہیں، ان لوگوں کو کہو صبح واپس آجائیں۔" ان کو اس حال میں بھی علیزے کا برتھ ڈے یاد تھا، اتنے دنوں بعد کوئی بات کی بھی تھی تو علیزے کی۔ آسیہ آفندی چپ سی ہو گئیں۔

"علیزے کا برتھ ڈے یاد ہے آپ کو؟"

"ہونہہ! تمہیں کس نے کہا کہ میں بھول گیا ہوں؟" وہ استہزائیہ ہنسے تھے۔

"علیزے انیس سال کی ہو رہی ہے، اس کی انیس برتھ ڈیز سیلیبریٹ کی ہیں میں نے، کوئی ایک بھی بھولا ہوں تو بتاؤ مجھے؟" یہ ان کا ریکارڈ تھا کہ انہوں نے علیزے کا ایک بھی برتھ ڈے مس نہیں کیا تھا، وہ ہمیشہ ہر سال کہیں ملک سے باہر بھی ہوتے تھے تو اس کے برتھ ڈے پر گھر واپس آجاتے تھے اور کافی دھوم دھام سے سیلیبریٹ کرتے تھے تو اس بار کیسے ہو سکتا تھا کہ اس کا برتھ ڈے سیلیبریٹ نہ ہوتا اور مس ہو جاتا؟

"لیکن مجھے لگ رہا تھا کہ اس بار برتھ ڈے مس ہو جائے گا، کوئی سیلیبریشن نہیں ہو گی۔" آسیہ آفندی اپنے خیالات کا اظہار کر رہی تھیں۔

"نہیں! ایسا نہیں ہو سکتا، وقار آفندی کی زندگی میں علیزے کی کوئی بھی خوشی مس نہیں ہو سکتی ان شاءاللہ جب تک زندہ ہوں یہ سلسلہ چلتا ہی رہے گا۔" وہ پر عزم سے لہجے میں کہتے ہوئے راکنگ چیئر سے اٹھ کھڑے ہوئے اور ذرا فریش ہونے کے لیے باتھ روم کا رخ کیا۔ اور آسیہ آفندی آذر کو فون کرنے کے لیے چل دیں۔

وقار آفندی نے اتنے دنوں بعد اپنی چپ کا روزہ توڑا تھا اس لیے آسیہ آفندی کے لیے فی الحال یہ بھی کافی تھا کہ چلو انہوں نے کسی کام میں دلچسپی تو لی ہے نا؟ اسی لیے انہوں نے فوراً فون کرکے اپنی فوج کو واپسی کا آرڈر دے دیا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

نبیلہ عزیز

دردِ دل

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نبیل حیات دو ہی بہن بھائی ہیں' مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے' وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پہ رنگ چکی ہے' جس کے پیش نظر فائزہ بیگم' نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں' لیکن مدحیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے' جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے' مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے' مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا' بے بسی اور مجبوری سے تنگ آ کر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے' لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باؤ امتیاز مل جاتا ہے' جو اسے کام کی آفر کرتا ہے' جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے' اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے' وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے' وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے' وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے' اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا' اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دلاتی ہیں۔

۱۹
انیسویں قسط

"کیا....؟ ہم واپس جا رہے ہیں؟" علیزے نے آذر کے منہ سے واپسی کا سن کر کافی بے یقین اور ترسے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ وہ تو جب سے آئی تھی تب سے ہی واپس جانا چاہ رہی تھی، لیکن ان سب کی خاطر خاموش تھی کہ اس کی وجہ سے وہ سب خوامخواہ بدمزا ہوں گے، لیکن اس وقت اچانک واپسی کی خبر بن کر جیسے اس کے دل کی مراد بر آئی تھی۔

"ہوں.... ہم واپس جا رہے ہیں۔" آذر نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلایا۔

"لیکن بھائی! اتنی جلدی....؟" واپسی کی اطلاع پہ سب سے پہلے اعتراض اور خفگی انوشہ کو ہوئی تھی، وہ سب اس وقت ڈرائنگ روم میں اپنی اپنی نشست سنبھالے بیٹھے تھے اور ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے سے اندر کھڑا آذر سب کی نظروں کا مرکز تھا اور سب کی نظریں سوالیہ تھیں۔

"آنی کی کال آئی تھی، ڈیڈ نے خود واپسی کا آرڈر دیا ہے کہ صبح تم سب کو حویلی میں موجود ہونا چاہیے اب یہ جلدی ہے یا دیر۔ یہ میں نہیں جانتا۔" آذر نے سب کو باری باری وضاحتیں اور جواب دینے کی بجائے صاف صاف بتا دیا کہ یہ آرڈر اوپر سے آیا ہے، اس لیے اس میں اعتراضات کی اور خفگی کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اور پھر واقعی ایسا ہی ہوا تھا، وہاں موجود سب ہی افراد چپ ہو کے رہ گئے تھے، ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی ان لوگوں میں کافی گپ شپ اور ہنسی مذاق ہو رہا تھا، مگر واپسی کا سن کر علیزے کے سوا سب بجھ سے گئے تھے۔

"کیا بات ہے؟ یہاں اتنی خاموشی کیوں ہے؟" عائشہ آفندی عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد وہیں ڈرائنگ روم میں چلی آئیں، لیکن ان سب کو خاموش دیکھ کر انہیں حیرت ہوئی تھی۔

"ہم لوگ صبح واپس جا رہے ہیں، ڈیڈ نے واپسی کا کہا ہے۔" آذر نے ان کی سمت پلٹتے ہوئے جواب دیا۔

"اچھا....؟ خیریت تو ہے نا؟" عائشہ آفندی کو تشویش ہوئی۔

"کیا اپنے گھر جانے کے لیے خیریت ہونا ضروری ہوتا ہے؟" آذر نے بے تاثر سے انداز میں پوچھا تھا عائشہ آفندی ٹھٹک کے رک گئیں۔

"نہیں بیٹا! یہ بات نہیں ہے میں تو پیچھے والوں کی خیریت معلوم کرنا چاہ رہی تھی، آج اچانک واپسی کا حکم دے دیا ہے تو کہیں کوئی مسئلہ تو نہیں ہے نا۔" انہوں نے وضاحت دی تھی۔ "نہیں کوئی مسئلہ نہیں آپ لوگ بس واپسی کی تیاری کریں، صبح صبح یہاں سے نکلنا ہو گا، اس لیے اپنے اپنے سامان کی پیکنگ ابھی سے کر لیں، تاکہ صبح ہم لوگ لیٹ نہ ہوں۔" وہ کھڑے کھڑے ان سب کو ہدایات دے کر واپس پلٹ گیا اور وہ سب بجھے بجھے سے انداز میں اٹھ کر اپنے اپنے کمرے کی سمت چل دیے سب نے کافی پھیلاوا سمیٹنا تھا۔

✵ ✵ ✵

"ہیلو! گڈ مارننگ...." وہ دروازے کے ہینڈل پہ ذرا سا دباؤ ڈالتی ہوئی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔

"ہائے! سیم ٹو یو میڈی۔" جبزی اپنے روم میں بیٹھا ناشتا کر رہا تھا، جب مدحیہ اچانک اندر چلی آئی اور وہ اسے دیکھ کر فوراً" کھڑا ہو گیا۔

"اٹس او کے! بیٹھو ناشتا کرو تم...." مدحیہ اسے اشارہ کرتی ہوئی خود کھڑکی کی سمت بڑھ گئی اور کھڑکی کے تمام پردے اک جھٹکے سے ہٹا دیے تھے چمکتے سنہرے دن کی روشنی لپک کے اندر داخل ہوئی اور پورا کمرہ کھل اٹھا۔

"کیسی لگی یہاں کی صبح....؟" مدحیہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا تھا۔

"نائس ویری نائس، اٹریکٹیو اینڈ فریش مارننگ، ایز لائیک یو۔" جبزی نے بھی جواباً" کھلے دل سے اظہار کیا۔ مدحیہ ایک دم کھلکھلا اٹھی۔

"غلط کہہ رہے ہو تم، میں تو مارننگ سے بھی زیادہ فریش اور اٹریکٹیو ہوں۔" مدحیہ کا موڈ آج کچھ فریش تھا، اسی لیے وہ اپنی فریش نیس کا اظہار بھی کافی فریش انداز میں کر رہی تھی۔

"ہوں ایم ایگری ود یو۔" جبزی نے اس کی شوخی سے اتفاق کیا۔

"جو سچ ہے، جو حقیقت ہے، اس سے ایگری تو ہونا ہی پڑے گا نا؟" مدحیہ نے لاپروائی سے کندھے اچکائے تھے۔

"ہوں! یہ بھی ٹھیک ہے۔" جبزی ناشتا کرتے ہوئے مسکرایا، اور مدحیہ بھی ہنستی ہوئی پلٹ کر بیڈ پہ آ بیٹھی۔

"ارے! یہ کیا ہے؟" اس کی نظر بیڈ پہ بکھرے پھیلاوے کی سمت اب گئی تھی۔

"تمہارے لیے گفٹس ہیں۔" اس نے بھی لاپروائی سے جواب دیا۔

"میرے لیے گفٹس؟ کیا مطلب؟" اسے حیرت ہوئی تھی۔

"یس! برائن، شیٹے، کرسٹینا اور باقی فرینڈز نے بھیجے ہیں۔" جبزی۔ ناشتا ختم کر کے نیپکن سے ہاتھ پونچھتا ہوا بولا۔

"ارے واؤ! تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔" مدحیہ کو حقیقتاً" بہت زیادہ خوشی ہوئی تھی کہ اس کے فرینڈز نے اسے گفٹس بھجوائے ہیں، وہ بھی اتنے شوق اور اتنی محبت سے....

"تم پہلے مجھے ملی کب ہو؟" وہ صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"کل ملی تو تھی؟" مدحیہ برائن کا بھیجا ہوا گفٹ الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔

"تو کیا آتے ہی بتا دیتا؟"

"ہاں! بتا دیتے، اس میں کیا حرج تھا بھلا؟" وہ گفٹ ریپر کھول چکی تھی، اس نے مدحیہ کے لیے بہت قیمتی پرفیوم بھیجا تھا، مدحیہ اس پرفیوم کی مہک سے مسحور ہو گئی تھی۔

"حرج تھا یار، کیونکہ کل میں ذہنی طور پر تیار نہیں تھا۔" جبزی اپنی پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ پھنسائے عین اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"کیا مطلب؟ کس لیے ذہنی طور پہ تیار نہیں ہو۔" مدحیہ نے چونک کر جبزی کی سمت دیکھا وہ ڈائریکٹ اسے ہی دیکھ رہا تھا اور اس کی لو دیتی آنکھیں بول رہی تھیں وہ سب سنا رہی تھیں جو مدحیہ سننا نہیں چاہتی تھی۔ "اس گفٹ کے لیے جس کے لیے تم بھی ذہنی طور پر تیار نہیں ہو۔" جبزی نے اپنی جیب سے چھوٹی سی سرخ رنگ کے مخملی سی ڈبیا نکال کر مدحیہ کے سامنے کی تھی اور مدحیہ اس سرخ رنگ کی ڈبیا کو دیکھ کر گنگ ہو گئی، بے شک وہ ڈبیا بند تھی، لیکن اس میں موجود گفٹ مدحیہ کے ذہن اور سوچ سے چھپا ہوا نہیں تھا، کیونکہ وہ گفٹ پوشیدہ ہو کر بھی پوشیدہ نہیں تھا۔

"جبزی! یہ.... یہ.... کیا کہہ رہے ہو تم؟" مدحیہ کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا، وہ کیا بولے اور کیا نہ بولے؟

"میں جو کچھ کہہ رہا ہوں تم اچھی طرح سمجھ رہی ہو، لیکن دیکھو میڈی میری تم سے ایک ریکوئسٹ ہے کہ تم پلیز اس وقت اس گفٹ کو مت ٹھکرانا.... ابھی میرے پاس بہت ٹائم ہے، تم مجھے سوچو، مجھے پرکھو، پھر جو فیصلہ کرو تو مجھے بتا دینا، ابھی یہ گفٹ تم اپنے پاس رکھو، اگر تم نے کبھی یہ گفٹ پہن لیا تو میں سمجھوں گا تم نے مجھے قبول کر لیا، اور اگر مجھے واپس کر دیا تو میں سمجھوں گا تم نے مجھے ٹھکرا دیا ہے، میں نہ تم سے سوال کروں گا، نہ جواب، ہمیشہ کے لیے سامنے سے ہٹ جاؤں گا، بس یہ میرا تم سے وعدہ ہے اور عہد بھی۔" جبزی نے جو کچھ کہا تھا اس پہ کسی اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی تھی۔ مدحیہ نے لب بھینچتے ہوئے اک نظر جبزی کو اور اک نظر اس کے ہاتھ کی سمت دیکھا اور پھر گہری سانس کھینچتے ہوئے وہ گفٹ تھام لیا اور جبزی کے چہرے پہ امید کے کئی رنگ آ ٹھہرے

تھے اور ہونٹوں کو مسکراہٹ چھو گئی تھی۔

"تھینک یو میڈی۔" وہ آہستگی سے بولا اور مدحیہ بیڈ سے کھڑی ہو گئی' اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"چلیں؟" جبزی نے خود ہی استفسار کیا۔

"ہوں! چلو۔" وہ سرخ ڈبیا مٹھی میں دباتی ہوئی اٹھ کر باہر نکل آئی اور اپنی الجھن اور بے دھیانی میں باقی کے گفٹس بھی اٹھانا بھول گئی تھی' اس لیے وہ سارے گفٹس جبزی خود اٹھا کر اس کے پیچھے باہر نکل آیا تھا۔

☼ ☼ ☼

مریم کی بات پہ پورے کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

عابدہ خاتون نے یک دم فاروق نیازی کی سمت دیکھا اور وہ بھی بستر پہ لیٹے ان ہی کی سمت دیکھ رہے تھے' مریم اپنی بات کر چکی تھی' اس لیے اب ان کے بولنے کی منتظر تھی' عابدہ خاتون خود اس وقت حیرت اور بے یقینی کے شکنجے میں تھیں کہ مریم نے اتنا بڑا فیصلہ کیسے کر لیا؟ وہ یہ قدم کیوں اٹھانا چاہتی ہے؟ آخر بیٹھے بیٹھے کیا ہوا ہے اسے؟ کیا سوچ سمائی ہے اس کے ذہن میں؟

"ابا جی! میں نے آپ دونوں سے اجازت مانگی ہے' آپ کو خاموش ہونے کا نہیں کہا۔" مریم نے پھر سے بات چھیڑ دی۔

"لیکن بیٹا! تم یہ جاب کیوں کرنا چاہتی ہو؟" فاروق نیازی کے اشارے پہ عابدہ خاتون نے استفسار کیا۔

اور ان کے استفسار پہ مریم نے سر اٹھا کر ان کے چہرے کی سمت دیکھا۔

"امی! آپ جانتی ہیں کہ میں یہ جاب کیوں کرنا چاہتی ہوں؟ بے شک خود میری کوئی خواہشیں' کوئی بہت زیادہ ضرورتیں نہیں ہیں' لیکن ایمن' ایمان' زونیہ اور زوبیہ کی تو ضرورتیں ہیں نا؟ کیونکہ وہ ابھی پڑھ رہی ہیں' انہیں اور کچھ نہ سہی' لیکن اسکول اور کالج کے لیے تو پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے' فیسز کے علاوہ بھی ہزاروں خرچے ہوتے ہیں اور یہ خرچے عدیل بھائی کیسے پورے کر رہے ہیں' یہ آپ لوگ بھی اچھی طرح جانتے ہیں' گھر کے اخراجات' اور ابا جی کی بیماری کا علاج بھی ٹھیک طریقے سے ہو جائے تو ہمارے لیے اللہ کا بڑا احسان ہو گا' لیکن ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنا بھی ٹھیک نہیں ہے' گھر میں اور کوئی ایسا فرد نہیں ہے جو عدیل بھائی کا ہاتھ بٹا سکے' کوئی بھائی نہیں ہے جو برابر چل کے مدد کر سکے' ایسے میں اگر میں کچھ کر سکتی ہوں تو مجھے کرنا چاہیے' آپ مجھے روکیے مت' بلکہ خوشی خوشی اجازت دیجیے' میں وعدہ کرتی ہوں کہ عدیل بھائی کا بھائیوں کی طرح ساتھ دوں گی' آپ پلیز! میرے بارے میں نہیں' عدیل بھائی کے بارے میں سوچیں' وہ کتنے پریشان رہتے ہیں' کتنا بوجھ ہے ان پہ' پلیز ابا جی! آپ گھر کے حالات بخوبی جانتے ہیں' مجھے اجازت دینے سے بہت بہتری آ جائے گی۔" مریم نے ان کا بے جان سا ہاتھ تھام لیا اور انہیں متفق کرنے کی پوری کوشش کی تھی' ان کی بے تاثر آنکھیں اس وقت آنسوؤں کے بوجھ سے جھکی ہوئی تھیں۔

ان کی بیماری نے ان کے بچوں کو پریشانیوں اور تفکرات میں ڈال دیا تھا' وقت سے پہلے بڑا بنا دیا تھا' لڑکیاں جس عمر میں اپنی خواہشیں اور خواب پورے کرنے کا سوچتی ہیں' ان کی بیٹیاں گھر کے حالات اور ضرورتیں پوری کرنے کا سوچ رہی تھیں۔۔۔ ان کے آنسو بہہ کر ان کی کنپٹیوں میں جذب ہو گئے اور انہوں نے سر اثبات میں ہلاتے ہوئے مریم کو جازت دے دی' کیونکہ مریم نے جو کچھ کہا تھا وہ سب صحیح تھا' سب کچھ ان کے سامنے ہی تو تھا۔

"لیکن عدیل نہیں مانے گا۔" عابدہ خاتون کو عدیل کی طرف سے ڈر تھا۔

"ان کو میں منا لوں گی۔" مریم اپنے آنسو پونچھتی ہوئی سیدھی ہوئی اور ابا جی کا ہاتھ دباتے ہوئے ان کے ہاتھ پہ

بوسہ دیا۔

"تھینک یو ابا۔" وہ ان کا شکریہ ادا کرتی وہاں سے اٹھ گئی' اس نے امی اور ابا جی کو تو منا لیا تھا' لیکن ابھی عدیل کا مسئلہ باقی تھا اور اگلی صبح ایسا ہی ہوا تھا عدیل کو مریم کے جاب کرنے کا سن کر جیسے کرنٹ چھو گیا تھا۔

"مریم جاب کرے گی؟ لیکن کیوں؟" عدیل نے ناشتا درمیان میں ہی چھوڑ دیا۔

"بیٹا! اچھی آفر ہے' اچھی سیلری ہے' اور مریم بھی تو پورا دن گھر میں فارغ اور ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کے بیٹھی رہتی ہے' اس لیے میں نے اور تمہارے ابا جی نے سوچا ہے کہ وہ جاب کر لے' کم از کم تمہاری ہی کچھ ہیلپ ہو جائے گی۔" عابدہ خاتون نے عدیل کو بہت طریقے سے سمجھانے کی کوشش کی تھی' لیکن عدیل کا مزاج برہم ہو چکا تھا۔

"اب میں اپنی ہیلپ بہنوں سے کرواؤں گا۔"

"دیکھو بیٹا! بہن کوئی طعنہ نہیں ہے' جس پہ مرد کو غصہ آ جائے' بہن پہ اعتماد کرو' اس پہ بھروسہ رکھو تو بھائیوں سے کم ثابت نہیں ہوتی' کئی ایسی مثالیں ہیں جن میں بہنوں نے بھائیوں کے ساتھ دیے ہیں' تمہیں کیوں اعتراض ہے۔" مریم کے کہنے پہ عابدہ خاتون پورا پورا اس کا ساتھ دے رہی تھیں۔

"امی! آپ کس زمانے کی اور کن مثالوں کی بات کر رہی ہیں؟ آپ آج کل کے معاشرے کو اور آج کل کے چال چلن کو نہیں جانتیں' یہاں مرد' عورت کو نگلنے کے لیے تیار کھڑا ہے' کوئی بہت ہی قسمت والی یا عزت والی [illegible] ہو گی جو مرد کے شکنجے سے بچ نکلتی ہو گی' ورنہ عورت کو بچتے ہوئے کم ہی دیکھا ہے۔" عدیل سخت انکاری تھا۔

"کیا آپ کو اپنی بہن پہ اعتماد نہیں ہے؟" مریم کچن کی دہلیز پہ آ کھڑی ہوئی اور اس کے سوال پہ عدیل چونک گیا۔

"بتایئے نا بھائی! کیا آپ کو اپنی بہن پر اعتماد نہیں ہے؟" وہ کافی دو ٹوک اور سنجیدگی سے پوچھ رہی تھی۔

"مریم! میں یہ بات نہیں کر رہا' میرا یہ مطلب نہیں ہے۔"

"بھائی! میں آپ سے آپ کی بات کا مطلب نہیں پوچھ رہی' میں یہ پوچھ رہی ہوں کہ آپ کو مجھ پہ اعتماد ہے یا نہیں؟" وہ ضدی بچے کی طرح ایک ہی سوال پہ اڑ چکی تھی۔

"مریم! یہ کیسی بات کر رہی ہو تم؟" عدیل اپنی جگہ سے کھڑا ہوا۔

"آپ! بس میرے سوال کا جواب دیں' آپ کو مجھ پہ اعتماد ہے یا نہیں؟ اگر اعتماد ہے تو مجھے جاب کرنے دیں' اور اگر اعتماد نہیں ہے تو مجھے منع کر دیں' میں کبھی جاب کرنے کا ذکر بھی نہیں کروں گی' بلکہ کبھی گھر سے باہر قدم بھی نہیں نکالوں گی۔" مریم نے عدیل کے سامنے بہت کڑا سوال رکھ دیا تھا' وہ نہ ہاں میں جواب دے سکتا تھا اور نہ ہی نا میں' وہ تذبذب کا شکار ہو چکا تھا۔

"سوچ کیا رہے ہیں؟ جواب دیں مجھے؟" مریم نے کبھی اس طرح ضد میں آ کر بات نہیں کی تھی' لیکن آج اس کے تیور بھی بدلے ہوئے تھے۔

"دیکھو مریم! مجھے تم پہ اعتماد ہے' خود سے بھی زیادہ اعتماد ہے' لیکن یہ معاشرہ اعتماد کے قابل نہیں ہے' میں تم پہ تو اعتماد کر سکتا ہوں لیکن اس معاشرے پہ نہیں کر سکتا۔" اس نے مریم کو کندھوں سے تھام لیا۔

"آپ کو مجھ پہ اعتماد ہے نا؟ تو پھر آپ بے فکر ہو جائیں' آپ کی عزت کو میں نے سنبھال کے رکھنا ہے' اس معاشرے نے نہیں۔" مریم نے اسے پورا یقین دلایا تھا اور یہ اس کا یقین اور لہجے کی مضبوطی تھی کہ عدیل اسے مزید منع نہیں کر سکا اور مریم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے' وہ بے ساختہ اس کے کندھے سے لگ گئی اور عدیل نے اس کا سر تھپکتے ہوئے اسے بھائیوں سا بھرپور مان بخشا تھا' عابدہ خاتون کی آنکھیں بھی نم ہو چکی تھیں۔

"اب بس کرو' ناشتا ٹھنڈا ہو رہا ہے' کام پر بھی جانا ہے تم نے۔" انہوں نے دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھتے

ہوئے انہیں آواز دی اور عدیل پلٹ کر دوبارہ ناشتا کرنے کے لیے آبیٹھا' پھر جیسے ہی عدیل گھر سے رخصت ہوا' مریم بھی فاطمہ کی بتائی ہوئی اکیڈمی جانے کے لیے تیار ہونے لگی' وہ آج پہلی بار جارہی تھی' اس لیے کافی اچھی طرح تیار ہوئی تھی' حالانکہ اس کی تیاری میں بھی سادگی کی جھلک تھی' لیکن پھر بھی بہت اچھی لگ رہی تھی' وہ امی اور ابا جی سے مل کر گھر سے نکل آئی' یہ اس کا گھر سے نکلنے والا پہلا قدم تھا' لیکن اس کے ارادے بہت مضبوط تھے' حوصلہ بلند اور نیت نیک تھی' اس لیے کامل یقین تھا کہ اللہ اس کا ساتھ بھی دے گا اور اس کی عزت کی حفاظت بھی کرے گا' کیونکہ سب کی عزتوں کا محافظ اور رکھوالا تو وہی تھا۔۔۔ اوپر والا۔۔۔!

✡ ✡ ✡

علیزے مری سے عجیب سے احساسات لے کر جارہی تھی۔

آذر کے ذہن پہ بھی دانیال کا کیا گیا انکشاف حاوی تھا۔

عائشہ آفندی کے دل پہ زہرہ سے نہ ملنے کا رنج طاری تھا۔

اور کومل آذر کی توجہ نہ ملنے پہ اندر ہی اندر گیلی لکڑی کی طرح سلگ رہی تھی' اس کا بس چلتا تو علیزے کو منظر سے ہٹا دیتی۔۔۔ وہ علیزے' جو ہر طرح سے بے ضرر تھی' جو کسی کے لیے برا نہیں سوچتی تھی' جو کسی کے ساتھ کچھ برا ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔

جس کے لیے آذر سمیت سب کزنز برابر تھے' جو نہ حسد کرتی تھی' نہ دل میں میل رکھتی تھی' بس اپنی ذات کے دائرے میں رہتی تھی' وقار آفندی یا باقی حویلی والے اسے اتنا اہمیت دیتے تھے تو اس میں اس کا کیا قصور تھا بھلا؟ وہ خود تو نہیں کہتی تھی کہ سب اسے پروٹوکول دیں' لیکن پھر بھی کومل اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتی تھی' وہ علیزے کو اپنا رقیب سمجھتی تھی' اسی لیے اب وہ اپنی اس جلن اور رقابت کو اپنے لفظوں تک لے آئی تھی' اپنے لہجے اور انداز سے اظہار کرنے لگی تھی اور اس کے اسی اظہار کا بوجھ علیزے اپنے دل پہ لیے بجھی بجھی سی واپسی کے سفر کے لیے روانہ ہوئی تھی۔

بلکہ اس سفر میں کئی لوگ بجھے بجھے سے اور مایوس سے تھے' لیکن جودت ہنوز ہشاش بشاش اور خوش تھا اور اس کا نشانہ آج بھی منصور حسین تھا۔

"کیا بات ہے منصور حسین! تم بھی چپ چپ سے ہو؟" اس نے گردن موڑتے ہوئے منصور حسین کی سمت دیکھا۔

"میرا کام ہی ایسا ہے کہ مجھے چپ رہنا پڑتا ہے۔" منصور حسین نے گہری سانس کھینچی تھی۔

"کیوں یار! باتوں کے دوران ڈرائیونگ نہیں ہو سکتی؟"

"ہو سکتی ہے' لیکن یہ کام مالکوں کا ہے' وہ باتیں بھی کرتے ہیں اور ڈرائیونگ بھی' لیکن ہم ملازم لوگوں کا کام ہوتا ہے چپ رہنا اور چپ رہ کر کام کرنا۔۔۔ ہمارے بولنے پہ اعتراض ہوتا ہے۔" منصور حسین کے جواب ہمیشہ کھرے ہی ہوتے تھے۔

"یار منصور حسین! تم ہمیشہ اتنی جلی کٹی سی باتیں کیوں کرتے ہو؟ یوں لگتا ہے جیسے تم سے یا محبت چھن گئی ہے یا عزت؟" جودت کی بات پہ پوری گاڑی گھوم کے رہ گئی تھی' گاڑی کے ٹائر چرچرا اٹھے تھے۔ منصور حسین کے ہاتھ کسی فولاد کی طرح اسٹیرنگ پہ جم گئے تھے۔

"بے شک میں ملازم ہی سہی جودت صاحب! لیکن اپنی عزت اور محبت پہ بات کرنے کی اجازت میں کسی کو بھی نہیں دے سکتا' چاہے وہ آپ ہوں' چاہے کوئی اور۔۔۔" منصور حسین کا لہجہ بہت سخت اور پتھریلا ہو رہا تھا۔ جودت

نے حیرت سے منصور حسین کی سمت دیکھا۔ اس کے تیور ٹھٹکا دینے کی حد تک بگڑے ہوئے تھے۔

"آپ میری ذات پہ بات کریں' میری ذاتی باتوں اور معاملات پہ بات نہ کریں' کیونکہ میں یہ بات پسند نہیں کرتا۔" منصور حسین نے جودت کو ایک حد میں رہنے کا اشارہ دیا تھا اور یہ اشارہ بہت واضح تھا' جس پہ منصور حسین کو کوئی شرمندگی بھی نہیں تھی' اس لیے وہ سر جھٹک کر گاڑی دوبارہ سے اسٹارٹ کرچکا تھا' جودت نہ جانے کیوں کچھ بھی کہے بغیر چپ ہو گیا تھا۔ شاید اس لیے کہ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا' کیونکہ اس نے واقعی ایک غلط بات کہی تھی اور منصور حسین ایک غیرت مند آدمی تھا' جس سے یہ بات برداشت نہیں ہوئی تھی' جب ہی جودت بھی منصور حسین کی خفگی سہہ گیا۔

"ایم سوری یار۔" جودت نے آہستگی سے سوری کیا اور منصور حسین کی نظر بے ساختہ بیک ویو مرر کی سمت اٹھ گئی۔

"علیزے بی بی کہتی ہیں کہ غلطی کر کے معافی مانگنے والے لوگ مجھے قطعی اچھے نہیں لگتے۔" منصور حسین نے علیزے کی بات دہرائی۔

"کیا مطلب؟ کیا کہنا چاہتے ہو تم؟" جودت کو سمجھ نہیں آئی تھی' لیکن علیزے سمجھ چکی تھی کہ وہ اسے اس کا غصہ اور اس کی بات یاد دلا رہا ہے۔

"میرا مطلب ہے کہ میں بھی علیزے بی بی کی بات سے متفق ہوں' مجھے بھی غلطی کر کے معافی مانگنے والے لوگ اچھے نہیں لگتے' اور معافی دینے کو دل بھی نہیں چاہتا۔" منصور حسین نے اپنے غصے پہ قابو پالیا تھا' اس لیے قدرے نارمل انداز میں بات کر رہا تھا' ورنہ ایک پل میں اس کا پارہ کہاں سے کہاں جا پہنچا تھا' وہ برداشت نہیں کرتا تھا' کسی کی بات سہہ نہیں پاتا تھا' اسی لیے اکثر لوگ اس سے نالاں ہی رہتے تھے' رجو' عارف اور مبارک خان کی طرح۔۔۔!

"اچھا؟ علیزے نے یہ بات کہی ہے؟ لیکن علیزے اتنی سخت تو نہیں ہے؟ کیوں علیزے یہ کیا سن رہا ہوں میں؟" جودت نے گردن موڑ کر علیزے کو دیکھا۔

"جی! ٹھیک سن رہے ہیں آپ۔۔۔" وہ ذرا سنبھل کے بیٹھ گئی۔

"ارے واقعی؟ تم اتنی سخت تو نہیں ہو؟" جودت حیرت کا اظہار کر رہا تھا۔

"میں اتنی نرم بھی نہیں ہوں جودت بھائی! آپ میری نرمی پہ مت جائیں' بات اصول کی آجائے گی تو اصول کی کروں گی' میں یہ سوچتی ہوں جن لوگوں نے بعد میں معافی مانگنی ہوتی ہے وہ پہلے غلطی ہی کیوں کرتے ہیں؟" علیزے نے سنجیدگی سے کہا۔

"غلطی کرنے سے پہلے سوچتا کون ہے یار؟"

"لیکن سوچنا چاہیے نا' میں کہتی ہوں کہ غلطی کرنے سے پہلے سو بار سوچو' اور اچھا کام کرنے سے پہلے ایک بار بھی مت سوچو' بس میرا تو یہی پوائنٹ آف ویو ہے۔" اس نے کندھے اچکائے اور جودت حیران ہوا تھا کہ علیزے بھی ایسی باتیں کر لیتی ہے۔

"خیر! فی الحال اس بات کو چھوڑو اور اپنے ڈرائیور سے کہو کہ میرا سوری قبول کر لے۔" جودت نے سفارش کے لیے کہا۔

"نو! میں یہ نہیں کہہ سکتی' یہ اس کی اپنی مرضی پہ ڈپینڈ کرتا ہے۔" علیزے نے نفی میں سر ہلایا اور منصور حسین کو علیزے کی یہ بات اور انداز بہت اچھے لگے تھے' اس نے دل ہی دل میں علیزے کو سراہا تھا۔

"کیوں منصور حسین! پھر کیا ارادہ ہے تمہارا؟" جودت' علیزے کی طرف سے رخ موڑ کر سیدھا ہوا تھا۔

"اگر اس روز میری غلطی پہ علیزے بی بی نے مجھے معاف کردیا ہوتا تو شاید اس وقت میں بھی آپ کو معاف کردیتا۔" منصور حسین نے موڑ کاٹتے ہوئے کہا۔

"تو تم علیزے کا بدلہ مجھ سے لوگے؟" جودت کو اچنبھا ہوا۔

"نہیں صاحب! بدلہ نہیں لے رہا' بلکہ ان کے اصول پہ چل رہا ہوں' آخر ڈرائیور ہوں ان کا۔" منصور حسین نے کافی اطمینان سے جواب دیا۔

"سوچ لو منصور حسین! غلطی کررہے ہو' معافی نہ دے کر۔" جودت نے اسے دھمکایا۔

"دیکھیے صاحب! اگر آپ صاحب ہونے کے ناتے کہہ رہے ہیں تو پھر آپ کو معافی مانگنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے' آپ مالک ہیں اور میں ملازم اور اگر آپ انسانیت کے ناتے کہہ رہے ہیں تو پھر معافی میری مرضی سے ہی ملے گی۔" منصور حسین بھلا کب کسی سے دبنے والا تھا' جودت اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"میں معافی تمہاری مرضی سے چاہتا ہوں۔" وہ بھی آخر جودت تھا زچ کردینے والا۔

"ٹھیک ہے' سوچوں گا۔" منصور حسین نے سکون سے کہتے ہوئے گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی' وہ لوگ مری اور اسلام آباد کی حدود سے نکل آئے تھے' اب ان کا رخ لاہور کی سمت تھا۔

☼ ☼ ☼

پورے گھر میں خاموشی اور سناٹا چھایا ہوا تھا اور وہ دونوں اس خاموشی کے دوران گھر کی چیزیں سمیٹتی پھر رہی تھیں' نگارش نے پیکنگ کا کام ابھی سے شروع کردیا تھا' کیونکہ عبداللہ نے ٹکٹس کنفرم کروالیے تھے۔ اور آج زری بھی اپنے ایگزامز سے فارغ ہوگئی تھی' اس لیے اب ان کی واپسی کنفرم ہوچکی تھی۔

"کیا بات ہے' اتنی خاموش کیوں ہو؟" نگارش ریک میں سجی کتابیں ایک کارٹن میں بند کرکے رکھتے ہوئے زری کی سمت متوجہ ہوئی۔

"ڈر لگ رہا ہے۔" زری رائٹنگ ٹیبل سے ساری چیزیں سمیٹتے ہوئے بہت بے دل اور سست لگ رہی تھی۔

"کس چیز سے؟" نگارش ٹیبل اور کرسیوں پہ وائٹ کور چڑھا رہی تھی۔

"پاکستان سے۔" زری کی آواز دھیمی تھی۔

"کیوں۔؟"

"مجھے لگتا ہے پاکستان مجھے نگل جائے گا' میں پاکستان کی سرزمین پہ نہیں بلکہ کسی دلدل میں قدم رکھنے والی ہوں' جس میں' میں دھنس جاؤں گی' بے بس ہوجاؤں گی اور۔ اور یہی بے بسی سوچ کر میرا دل ڈوب رہا ہے' نہ جانے کیا ہونے والا ہے۔" زری کی حالت خاصی عجیب سی ہورہی تھی' اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

"کیا تمہیں عبداللہ پر بھروسہ نہیں ہے؟" نگارش نے خفگی سے پوچھا۔

"بھروسہ ہے بھابھی' ان پہ تو پورا بھروسہ ہے' لیکن جو وہاں میری تاک لگائے بیٹھے ہیں' ان پہ بھروسہ نہیں ہے۔" زری روہانسی ہوگئی۔

"وہاں ولی آور بھی تو ہے؟ کیا اس پہ بھی بھروسہ نہیں ہے؟" نگارش نے جان بوجھ کر ولی آور کا ذکر کیا تھا۔

"وہاں ملک حق نواز بھی تو ہے بھابھی؟ کیا ولی آور شاہ' ملک حق نواز سے چھین لے گا مجھے؟ کیا مجھے اس سے بچالے گا؟ کیا میرے بھروسے پہ پورا اترے گا وہ؟ ہزاروں لوگوں کے لیے لڑتا ہے' کیا ملک حق نواز سے لڑے گا میرے لیے؟ اگر وہ میرے لیے لڑنے کو تیار ہے تو میں آج ہی پاکستان جانے کے لیے تیار ہوں۔ مگر بھابھی مجھے پورا یقین ہے وہ ایسا کچھ نہیں کرے گا' وہ سب کے لیے لڑ سکتا ہے' مگر میرے لیے نہیں۔" زری کے آنسو اس

کے رخساروں پہ بہہ رہے تھے اور نگارش چپ کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔

"دل آور اتنا برا یا بزدل نہیں ہے' جتنا تم سمجھ رہی ہو' یہ کبھی ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ تمہیں یا عبداللہ کو کسی محاذ پہ اکیلا چھوڑ دے' مجھے پوری امید ہے کہ وہ ہم لوگوں کا ساتھ دے گا' ملک حق نواز اس کے سامنے کچھ بھی نہیں ہے' بس چند دن کی بات ہے' تم خود دیکھ لینا' کیونکہ دل آور تمہارا ساتھ دے یا نہ دے' لیکن عبداللہ کا ساتھ ضرور دے گا' عبداللہ کی بات ہوئی تھی دل آور سے وہ کہہ رہا تھا کہ وہ ہمیں ریسیو کرنے کے لیے خود آئے گا' عبداللہ کو کسی بھی کام کے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" نگارش نے زری کو حوصلہ اور یقین دلایا تھا اور زری کا دل جیسے ٹھہر سا گیا۔ نگارش بھابھی کی تسلی پہ ذرا سی ڈھارس ہوئی تھی اسے۔

"بھابھی! یہ آپ....."

"بس' بس! یہ ساری باتیں یہیں رہنے دو' اور کام کرو میرے ساتھ' میری ہیلپ کروانے کی بجائے الٹا مجھے ٹینشن دے دے کر مار رہی ہو۔" نگارش نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا اور زری اپنے آپ کو سنبھالتی بمشکل کام کی طرف متوجہ ہوئی تھی' ورنہ خدشے اور وسوسے اب بھی اس کے دل و دماغ میں ہلکورے لے رہے تھے' مگر وہ کنٹرول کر گئی۔

☼ ☼ ☼

"کیا میں اپنی ذاتی گاڑی لے سکتا ہوں؟" جبزی کو بیٹھے بیٹھے گاڑی کا خیال آیا تھا' آخر وہ کب تک مدحیہ کی گاڑی پہ ڈیپینڈ کر سکتا تھا؟

"پتا نہیں۔" مدحیہ نے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔

"ارے! کیوں پتا نہیں ہے؟ تمہارے بھائی صاحب شوروم بنا رہے ہیں اور تمہیں پتا ہی نہیں ہے؟" جبزی نے حیرت سے کہا۔

"میرے بھائی صاحب شوروم بنا رہے ہیں تو اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ میں گاڑیوں کی انفارمیشن ساتھ لیے پھر رہی ہوں' شوروم ان کا ہے' کام ان کا ہے' مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ میں گاڑیوں کی معلومات رکھتی پھروں؟" مدحیہ نے کافی خفگی سے جواب دیا۔

"تو پھر میں کس سے معلومات لوں؟"

"معلومات کی کیا ضرورت ہے؟ تمہیں چاہیے کہ تم گاڑی رینٹ پہ لے لو۔" مدحیہ نے اسے ایک مفید مشورے سے نوازا۔

"گاڑی رینٹ پہ.....؟"

"ہاں! ظاہر ہے تم نے زیادہ عرصہ تو یہاں نہیں رہنا' ایسے میں اگر تم نیو زیرو میٹر گاڑی لیتے ہو تو اس میں سراسر تمہارا نقصان ہے' پندرہ' بیس لاکھ کی گاڑی اگر تم جانے سے پہلے سیل بھی کرو گے تو وہ سیکنڈ ہینڈ کہلائے گی اور سیکنڈ ہینڈ گاڑی کوئی بھی پندرہ' بیس لاکھ میں تم سے نہیں خریدے گا' تمہیں پانچ' چھ لاکھ کا نقصان ضرور ہو گا' اس لیے اتنے بڑے نقصان سے بہتر ہے کہ تم کوئی اچھی سی گاڑی رینٹ پہ لے لو' ڈرائیو تم خود کر لو گے۔" مدحیہ کا انداز اب بھی لاپروا سا تھا' جبکہ جبزی نہ جانے کیوں ہنس رہا تھا۔

"کیا بات ہے' کیوں ہنس رہے ہو؟ ایسا کیا کہہ دیا ہے میں نے؟" مدحیہ نے دائیں طرف ٹرن لیتے ہوئے کہا۔

"اس لیے ہنس رہا ہوں کہ تمہیں تو گاڑیوں کی معلومات ہی نہیں ہے' پھر بھی اتنا کچھ بتا دیا؟" جبزی نے اسے چھیڑنے کے سے انداز میں کہا تھا اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی مدحیہ کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

...نک گاڈ! تمہارے چہرے پہ مسکراہٹ آئی۔" جبزی نے شکر ادا کیا۔

...کے اوکے! اب یہ تو بتاؤ کہ جانا کہاں ہے؟" مدحیہ نے گاڑی کی اسپیڈ کم رکھتے ہوئے پوچھا۔

...ڑی کا پتا کرتے ہیں' کہاں سے ملے گی؟" جبزی آج کے دن میں گاڑی کا مسئلہ حل کرنا چاہتا تھا۔

...ڈھونڈتے ہیں' جہاں سے بھی مل گئی۔" مدحیہ نے کندھے اچکائے تھے اور پھر یوں ہی اپنی موج و مستی میں ...پہ ملنے والی گاڑیاں دیکھنے چل دیے تھے۔

☼ ☼ ☼

...ی کوئی مل گیا تھا
...ی کوئی مل گیا تھا
سر راہ چلتے چلتے
سر راہ چلتے چلتے

...چھوٹا خاصی سریلی آواز میں یوں لہک لہک کر گنگنا رہا تھا جیسے فلم میں گانا بھی اسی پہ پکچرائز کیا گیا ہو۔

"واہ چھوٹے واہ! کیا کمال کا گاتے ہو یار! لیکن کیا بات ہے یار آج تمہارے گانے کا اثر نہیں ہو رہا؟" سلو نے ...کام کرتے ہوئے درمیان میں لقمہ دینا ضروری سمجھا۔ وہ درحقیقت عدیل کو چھیڑ رہے تھے' جبکہ عدیل چپ ...خاموشی سے اپنے کام میں مصروف تھا' آج ورکشاپ میں کام زیادہ تھا' اس لیے عدیل خود ساتھ مل کر کام ...کر رہا تھا۔ دو' تین گاڑیوں کا کام بیک وقت ہو رہا تھا۔ گاڑیوں کے انجن کھلے پڑے تھے اور ڈیزل سے ان کے ...کپڑے ابتر ہو رہے تھے۔

"اثر ہو رہا ہے یار بالکل ہو رہا ہے' بس ظاہر آہستہ آہستہ ہو گا۔" چھوٹے نے مطمئن سے انداز میں کہا۔

"ارے یار! اثر کیا ہونا ہے بھلا؟ تم گانے ہی اداس گا رہے ہو۔" جیدی نے منہ بنا کے کہا۔

"ہیں؟ یہ وجہ ہے؟" چھوٹے نے بھنویں اچکائیں۔

"تو اور کیا؟ کوئی دل کو چھونے والا گاؤ گے تو اثر ہو گا نا؟"

"ہاں یار! یہ تو تم ٹھیک کر رہے ہو' میں بھی نرا نگوڑا ہی ہوں۔" چھوٹے نے اپنے سر پہ ہاتھ مارتے ہوئے خود کو سرزنش کی۔

"چلو کوئی بات نہیں' اب اپنا ٹریک بدل لیتا ہوں۔" اس نے کسی نئے گانے کے لیے اپنے آپ کو تیار کیا۔

"شاباش....." جیدی اور سلو نے ہمت بندھائی۔

موسم ہے عاشقانہ ـــــ موسم ہے عاشقانہ
اے دل کہیں سے ان کو ایسے میں ڈھونڈ لانا

چھوٹے نے ایک نیا سر لگایا اور بے ساختہ عدیل کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ امڈ آئی' وہ اس کی اس مسکراہٹ کے لیے ہی تو اتنے جتن کر رہے تھے۔

"ہرے....." انہوں نے عدیل کو مسکراتے دیکھ کر نعرہ لگایا۔

"بہت کمینے لوگ ہو تم....." عدیل نے رینچ سے گاڑی کے ٹائر کا پیچ کستے ہوئے سر جھٹکا۔ البتہ چہرے کی مسکراہٹ ہنوز تھی۔

"ہم لفنگے بھی ہیں استاد۔" سلو معنی خیزی سے کہہ کر ہنسا تھا۔

"جانتا ہوں' بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔" وہ کام کرنے کے ساتھ ساتھ باتیں بھی کر رہے تھے

"استاد! اب آپ جیسا شریف بھی تو نہیں ہوا جا سکتا کہ بندہ کسی کو یاد بھی کرے اور بتائے بھی نہ؟" چھوٹے نے اسے چھیڑا۔

"ارے! میں کس کو یاد کرنے لگا بھلا؟" عدیل نے تعجب سے کہا۔

"یہ تو آپ کو ہی پتا ہوگا استاد' اگر نہیں پتا تو اپنے دل سے پوچھ لو۔" چھوٹا معنی خیزی سے بات کر رہا تھا' عدیل ہنس دیا۔

"میں نے پہلے بھی تمہیں کہا تھا کہ خوش فہمیاں پالنا اچھی بات نہیں ہے' اس سے بہتر ہے کہ بندہ اپنا کام کرلے۔" عدیل نے چھوٹے کو گاڑی کے نیچے گھسنے کا اشارہ کیا' کیونکہ اس گاڑی کا کچھ کام نیچے لیٹ کر کرنے والا تھا' گاڑی کو انہوں نے پہلے ہی جیک پہ لگا رکھا تھا۔

"سوری استاد! میرا موڈ آج بہت اچھا ہے' آج نیچے جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے' یہ کام سلو یا جیدی سے کہو۔" چھوٹے نے پہلی بار کسی کام سے انکار کیا تھا اور عدیل بھی نہ جانے کس موڈ میں تھا کہ کسی سے بھی کہنے کی بجائے خود نیچے لیٹ کر گاڑی کے نیچے گھس گیا۔

"ارے..... رے استاد! یہ کیا کر رہے ہو؟ آپ نکلو باہر' میں خود کرلیتا ہوں۔" چھوٹے نے عدیل کو کام کرتے دیکھ کر منع کیا۔ مگر عدیل اب ادھورا کام کیسے چھوڑ سکتا تھا۔

"کوئی بات نہیں' کام تو کرنا ہی ہے' چاہے جس طرح بھی کرنا پڑے۔" عدیل کی آواز گاڑی کے نیچے سے آرہی تھی۔

"ہیلو..... کیا ہمیں کوئی گاڑی رینٹ پہ مل سکتی ہے؟" سنجیدہ سی نسوانی آواز پہ وہ چاروں ہی چونک گئے تھے' چھوٹے نے یک دم گردن موڑ کے دیکھا تھا اور مدحیہ کو دیکھ کر بری طرح ٹھٹکا تھا۔

"آپ.....؟" وہ اسے پہچان چکا تھا' لیکن مدحیہ اسے نہیں پہچانی تھی۔

"میں آپ سے کچھ پوچھ رہی ہوں مسٹر؟" مدحیہ نے حیران حیران سی نظروں سے دیکھتے چھوٹے کو دوبارہ متوجہ کیا اور اب کی بار اس آواز پر عدیل بھی چونک گیا' اس نے گاڑی کے نیچے سے ہی جھانک کر دیکھنے کی کوشش کی تھی' ذرا سے فاصلے پہ اسے دودھیا پاؤں بلیک کلر کے باریک ڈوریوں والے سینڈلز میں مقید نظر آئے تھے اور ان کے ساتھ جوگرز والے پاؤں بھی نظر آرہے تھے' یعنی اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا؟ عدیل سب کچھ وہیں چھوڑ چھاڑ کے گاڑی کے نیچے سے نکل آیا۔

"السلام علیکم میڈم!" عدیل اپنے کپڑوں سے دھول مٹی جھاڑتا ہوا سامنے آکھڑا ہوا' اب کی بار مدحیہ نے چونک کر دیکھا تھا اور عدیل کو اس ماحول اور اس حلیے میں دیکھ کر اس کی آنکھیں بے یقینی سے پھیل گئی تھیں۔

"تم یہاں؟" وہ اپنے تاثرات پہ کنٹرول نہیں کرپائی تھی اور بے ساختہ بول اٹھی' اس کے سوال پہ عدیل کے لبوں کو اک خفیف سی مسکراہٹ چھو گئی تھی۔

"جی ہاں! میں یہاں' میرے جیسے بے کار لوگوں کا یہی ٹھکانا ہے۔" عدیل نے لاپروائی سے کہا' لیکن مدحیہ تو جیسے کسی شاک میں آگئی تھی' وہ ہکا بکا سی عدیل کا حلیہ دیکھ رہی تھی۔

"لیکن تم! یہ کام کیسے.....؟" مدحیہ یوں بات کر رہی تھی جیسے پہلو میں کھڑا جبزی نہیں سامنے کھڑا عدیل اس کا دوست ہو' اور اسے اس کے کام پہ افسوس ہو رہا ہو۔

"کیوں میڈم؟ اس کام میں کیا برائی ہے بھلا؟" عدیل نے استہزائیہ سے انداز میں کہتے ہوئے کندھے اچکائے تھے۔

"برائی نہیں ہے' لیکن....." مدحیہ کہتے کہتے چپ ہوگئی۔

"سلو! میڈم اور صاحب کے لیے کرسیاں لے کر آؤ۔" عدیل نے سلو کو اشارہ کیا تھا۔

"جی استاد! ابھی لایا۔" سلو نے جواباً بڑی پھرتی کا مظاہرہ کیا۔

"بیٹھیے۔" عدیل نے مدحیہ اور جبزی کو بیٹھنے کی آفر کی' حالانکہ عدیل کو خود مدحیہ کے ساتھ جبزی کو دیکھ کر نہ جانے کیوں بہت عجیب سا فیل ہوا تھا' لیکن وہ اس چیز کا اظہار نہیں کرسکتا تھا' کیونکہ اس کے پاس نہ ایسا کوئی حق تھا' نہ تعلق۔

"نو تھینکس! بیٹھنے کا وقت نہیں ہے۔" مدحیہ نے انکار کردیا۔

"تو آپ آئی کیوں ہیں؟" عدیل ڈائریکٹ اس کے چہرے کی سمت دیکھ رہا تھا۔

"پتا نہیں کیوں آئی تھی۔" مدحیہ نے نفی میں سر ہلایا۔

"کس چیز کی ٹینشن لے رہی ہیں آپ؟" عدیل نے بغور اس کے تاثرات نوٹ کیے تھے۔

"کہا نا کچھ نہیں' چلو جبزی' واپس چلو۔" مدحیہ کہتے ہوئے یک دم پلٹ گئی۔ جبزی بھی اس کے ساتھ واپس پلٹ گیا تھا۔

"میڈم! آپ کو رینٹ پہ گاڑی مل سکتی ہے' آپ ٹھہریے تو سہی۔" عدیل نے پیچھے سے آواز دی' لیکن مدحیہ بغیر کچھ سنے اور بغیر کچھ کہے وہاں سے نکل گئی' وہ سب دیکھتے رہ گئے۔

مدحیہ کوشش کے باوجود اپنی کیفیات پہ کنٹرول نہیں کرپائی تھی' اس لیے اسے وہاں ٹھہرنا مناسب نہیں لگا تھا اور وہ وہاں سے آگئی تھی' لیکن اس کا ذہن الجھا ہوا تھا' اسی الجھن نے اسے وہاں ٹھہرنے نہیں دیا' جبزی کو بھی مدحیہ کے ری ایکٹ پہ حیرت ہوئی تھی اور حیرت تو عدیل وغیرہ کو بھی ہو رہی تھی کہ وہ آئی بھی اور چلی بھی گئی۔

متراں دی چھتری توں اڈھ گئی
امبراں نے لاندی اے اڈاریاں

پھل کوئی ولایت والا لے گیا
پڈا میں رہ گیا کیاریاں

چھوٹے نے ایک اور موقع کی مناسبت سے گانا ڈھونڈ لیا تھا' اب کی بار عدیل نے اسے گھور کے دیکھا تھا اور چھوٹا اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے رخ موڑ گیا۔

"ویسے استاد! اللہ جھوٹ نہ بلوائے آج صاف لگ رہا تھا کہ میڈم کے دل میں اتر گئے ہو' اس ڈیزل اور دھول مٹی سمیت' آج تو میڈم کے منہ سے کوئی شرارہ بھی نہیں پھوٹا۔" چھوٹے نے دوبارہ عدیل کی سمت رخ موڑتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

"لیکن یار! میڈم کے پہلو میں وہ مسٹر کون تھا؟" سلو کا دھیان جبزی کی طرف تھا۔

"اپنے استاد کا رقیب اور کون؟" چھوٹے نے جھٹ سے بیان دیا۔

"بکو مت' جو منہ میں آتا ہے بول جاتے ہو۔" عدیل نے اسے جھڑک دیا۔

"بول نہیں جاتا استاد' کھٹک تو تم بھی گئے ہو۔" چھوٹا بھی اپنے نام کا ایک ہی تھا' عدیل زچ ہوگیا۔

"ہاں' ہاں! کھٹک گیا ہوں' پھر؟" اس نے چڑ کے پوچھا۔

"پھر لڈیاں پاواں۔" چھوٹے نے قہقہہ لگاتے ہوئے بھنگڑا ڈالا اور اس کے ساتھ جیدی اور سلو بھی شامل ہوگئے تھے اور عدیل بھی اتنے غصے کے باوجود اپنا قہقہہ نہیں روک پایا۔

☆ ☆ ☆

عصر اور مغرب کا درمیانی وقت تھا جب ان لوگوں کی گاڑیاں فراٹے بھرتی ہوئی بڑی حویلی میں داخل ہوئی تھیں اور ان کو دیکھتے ہی حویلی میں جیسے یکدم ہلچل سی مچ گئی' سب سے پہلے عون اور عدید بھاگتے ہوئے باہر آئے تھے اور علیزے کو گاڑی سے اترتے دیکھ کر بے ساختہ اس سے لپٹ گئے۔

"آئی مس یو علیزے آپی! آئی مس یو سو مچ۔" وہ دونوں بڑی معصومیت سے باری باری اپنی بے تابی کا اظہار کر رہے تھے۔

"آئی مس یو جانو۔" علیزے نے ان کی پیشانی پہ پیار کیا اتنے میں وقار آفندی' آسیہ آفندی' ثروت بیگم' ثمرہ بیگم اور اسرار آفندی بھی باہر نکل آئے اور سب ہی بچوں سے بہت محبت اور بہت خوشی سے ملے' لیکن جب وہ سب لوگ اندر آئے تو ان کی حیرت اور خوشی سے آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔

"ارے علیزے کے برتھ ڈے کی تیاری ہو رہی ہے نا...؟" دانیال نے گھر میں ہونے والی تیاری دیکھ کر فوراً ہی جان لیا تھا سامنے ٹیبل پہ انویٹیشن کارڈز بھی بکھرے ہوئے تھے جو لوگوں میں تقسیم کرنے تھے۔

"ہوں بالکل...! چودہ نومبر کا دن تم لوگ بھول سکتے ہو' مگر میں نہیں' چودہ نومبر کا دن میری زندگی کا خوب صورت ترین دن تھا۔" وقار آفندی علیزے کو اپنے بازو کے حصار میں لیے کھڑے تھے۔

"چودہ نومبر کا دن تو ہم بھی نہیں بھول سکتے' اللہ نے ہمیں اتنی پیاری اتنی کیوٹ سی کزن سے نوازا تھا۔" دانیال نے شرارت سے کہتے ہوئے علیزے کے سر پہ ہلکی سی چپت لگائی' دانیال' انوشہ اور زین بھی حقیقتاً" علیزے سے بہت زیادہ پیار کرتے تھے' آخر ان لوگوں کا تو علیزے سے دوہرا رشتہ تھا۔

"کزن کزن' علیزے' علیزے' ہونہہ! بھاڑ میں گئی علیزے' کان پک گئے ہیں اس کا نام سن سن کر...." کومل بمشکل خود پہ ضبط کرتی ہوئی منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی ہوئی وہاں سے پلٹ کر سیڑھیاں چڑھ گئی۔ حرمت اور آذر دونوں بہن بھائی نے بیک وقت کومل کی سمت دیکھا تھا' وہ بہت تیزی سے سیڑھیاں طے کر گئی تھی۔ آذر گہری سانس کھینچ کے رہ گیا' البتہ باقی سب بڑے زور و شور سے اپنے ٹرپ کی روداد سنانے میں مصروف تھے۔

بڑی حویلی میں پھر سے رونقیں جاگ اٹھی تھیں لیکن ان رونقوں اور ہنگاموں کے باوجود وقار آفندی کا سارا دھیان عائشہ آفندی کی طرف تھا۔ عائشہ آفندی ہنسنے اور مسکرانے کے باوجود کافی اداس اور بجھی بجھی سی لگ رہی تھیں اور یہ بات آسیہ آفندی نے بھی نوٹ کر لی تھی اسی لیے وہ عائشہ آفندی کے پاس آ بیٹھی تھیں۔

"کیا بات ہے عائشہ؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا...؟ اتنی تھکی تھکی سی کیوں لگ رہی ہو...؟" آسیہ آفندی کو پریشانی ہو رہی تھی۔

"میں تو سالوں سے تھکی ہوئی ہوں بھابھی! بس کسی کو محسوس نہیں ہوتا۔" عائشہ آفندی کا لہجہ اور آواز کافی کمزور سے تھے۔

"کیوں کیا ہوا ہے...؟"

"کچھ پتا نہیں کیا ہوا ہے...؟" عائشہ آفندی بے بس اور ناامید سی ہو رہی تھیں۔

"عائشہ! کیوں اتنی مایوس اور ناامید ہو رہی ہو...؟ ہوا کیا ہے؟ کچھ بتاؤ تو...؟" وہ ان سے بصد اصرار پوچھ رہی تھیں۔

"امی نے مری میں زہرہ آنٹی کو دیکھا تھا' اس لیے اداس ہیں۔" زین نے لاپروائی سے کہتے ہوئے آسیہ آفندی کی مشکل آسان کی تھی لیکن آسیہ آفندی بھی زہرہ کا نام سن کر ٹھٹک گئی تھیں۔

"کیا؟ زہرہ کو دیکھا تھا؟ لیکن کب؟ کہاں؟" آسیہ آفندی نے ایک ہی سانس میں کئی سوال پوچھ ڈالے تھے۔

"مری میں دیکھا تھا' آٹھ' دس دن ہو گئے ہیں' دل پہ یہی بوجھ لیے پھر رہی ہوں۔" عائشہ آفندی کے لہجے سے

تھکاوٹ چھلک رہی تھی' یوں لگ رہا تھا جیسے وہ بہت زیادہ نڈھال ہو چکی ہوں۔

"تو پھر تم اس سے ملی تھیں؟" آسیہ آفندی کا اگلا سوال اٹھا۔

"ملی ہوتی تو شاید دل پہ یہ بوجھ نہ رہتا۔"

"کیا مطلب ہے عائشہ؟ سب صاف صاف بتاؤ نا؟" وہ الجھ گئیں۔ اور پھر عائشہ آفندی نے زہرہ کو دیکھنے کی ساری روداد سنا ڈالی' جسے سن کر آسیہ آفندی چند ثانیے کے لیے خاموش ہو گئی تھیں۔

"تو اس کا مطلب ہے کہ زہرہ یہیں کہیں ہے پاکستان میں؟"

"ہاں! وہ یہیں ہے۔" اب عائشہ آفندی کے لہجے میں یقین شامل ہو چکا تھا۔

"ہوں! تم فکر نہ کرو' میں وقار سے بات کروں گی' ہم اسے دوبارہ ڈھونڈنے کی کوشش کریں گے۔" آسیہ آفندی نے انہیں تسلی دی اور پھر بیچ رات کو جب وہ سونے کے لیے بیڈ روم میں آئیں تو انہوں نے سب سے پہلا ذکر زہرہ کا ہی چھیڑا تھا۔

"کیا آپ کو پتا ہے عائشہ نے زہرہ کو دیکھا ہے؟" وہ بیڈ پہ بیٹھے ہوئے کمبل درست کر رہی تھیں' وقار آفندی بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر بیٹھے کوئی ضروری فائل چیک کر رہے تھے' جب ان کی بات پہ ٹھہر گئے۔

"ہاں! پتا ہے' سب پتا ہے' لیکن پلیز میں آج کل کے دنوں میں اپنے گھر میں کوئی ایسا ذکر نہیں سننا چاہتا جس کی وجہ سے گھر میں ٹینشن اور بدمزگی پیدا ہو' اس لیے عائشہ سے بھی کہہ دو کہ فی الحال اس بات کو یہیں رہنے دے۔" وقار آفندی نے ان کو سختی سے منع کر دیا تھا اور آسیہ آفندی چپ رہ گئی تھیں' وہ اب اور کیا کہہ سکتی تھیں بھلا؟ اسی لیے خاموشی سے سونے کے لیے لیٹ گئی تھیں۔ البتہ وقار آفندی کا ذہن پھر سے بھٹک چکا تھا' وہ فائل سائیڈ پہ رکھتے ہوئے بستر سے اٹھ گئے سگریٹ اور دھوئیں کا سلسلہ پھر سے شروع ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

علیزے کے برتھ ڈے کی ارینج منٹ حویلی میں ہی ہو رہی تھی اور اس ساری ارینج منٹ کی ذمہ داری مبارک خان پہ تھی' مبارک خان نے دن رات ایک کر رکھا تھا' ہر کام اپنی نگرانی میں کروا رہا تھا اور منصور حسین اسے ڈھونڈتا پھر رہا تھا' اس وقت بھی وہ اسے کھوجتا ہوا حویلی کی چھت پہ آ گیا تھا' کیونکہ حویلی کے چاروں اطراف ریلنگ پہ لائٹنگ کا کام ہو رہا تھا' حویلی کو دلہنوں کی طرح سجایا جا رہا تھا۔

"السلام علیکم۔" منصور حسین نے کافی آہستگی سے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام! آؤ' آؤ منصور حسین بیٹھو یہاں۔" مبارک خان نے کرسیوں کی سمت اشارہ کیا۔

"نہیں یار! میں بیٹھنے نہیں آیا' میں کسی کام سے آیا ہوں۔" منصور حسین کافی سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔

"کس کام سے؟" مبارک خان بھی پوری طرح سے متوجہ ہوا تھا' کیونکہ منصور حسین اس وقت سنجیدہ اور بے لچک نظر آ رہا تھا۔

"مجھے دو دن کی چھٹی چاہیے' میں جب سے کام پہ آیا ہوں ایک دن بھی چھٹی نہیں لی' لیکن اب مجھے ضرورت ہے' میں نے گھر جانا ہے۔" منصور حسین کافی تھکا ہوا تھا شاید' گھر جا کر آرام کرنا چاہتا تھا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو منصور حسین؟ تم جانتے بھی ہو کہ آج کل گھر میں کتنا کام ہے' کتنی مصروفیت ہے اور تم چھٹی لینا چاہ رہے ہو؟" مبارک خان نے کافی خفگی سے اسے دیکھا۔

"مبارک خان! یہ کام تو کبھی ختم نہیں ہوں گے' تو کیا کبھی گھر نہیں جاؤں گا؟" منصور حسین کو اس سے بھی زیادہ خفگی ہوئی تھی۔

"اب میں کیا کہہ سکتا ہوں بھلا؟ مجبوری کے مارے سب کچھ کرنا ہی پڑتا ہے' مجھے دیکھ لو' چھ مہینے ہو گئے ہیں' میں گھر نہیں گیا' میرے بھی ماں' باپ ہیں' بہنیں ہیں' بھائی ہے' بیوی ہے' کیا میرا دل نہیں چاہتا گھر جانے کے لیے؟" مبارک خان کا لہجہ بھی قدرے اداس ہو گیا' جس پہ منصور حسین کو نہ چاہتے ہوئے بھی خاموش ہونا پڑا۔

"دیکھو منصور حسین! یہ فنکشن ختم ہو لینے دو' پھر تم آرام سے چھٹی لے لینا اور گھر جا کر ریسٹ کر لینا۔" مبارک خان نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"ہوں! ٹھیک ہے' لیکن صرف اس فنکشن تک۔" منصور حسین کو ماننا ہی پڑا تھا' ورنہ وہ چھٹی لینے کا پکا ارادہ کر کے آیا تھا۔

"ٹھیک ہے' ایسا ہی ہو گا۔" مبارک خان نے اسے تسلی دی اور منصور حسین سر ہلا کر پلٹ گیا۔

"اور سنو منصور حسین۔" اس نے پیچھے سے اسے پکارا۔

"ہوں! کہو؟" وہ ٹھہر گیا۔

"بڑے صاحب نے کہا ہے' علیزے بی بی کی گاڑی سروس کروالاؤ' گیراج میں کھڑی ہے' کافی گندی لگ رہی ہے۔" مبارک خان نے پیغام دیا تھا۔

"ٹھیک ہے' کروالاتا ہوں۔" وہ کہہ کر چلا گیا اور ابھی وہ نیچے آیا ہی تھا کہ علیزے نے پکار لیا۔

"جی بی بی! کہیے؟" وہ سر جھکائے کھڑا تھا۔

"میں نے بوتیک جانا ہے۔" وہ بھی کافی دھیمی آواز میں بولی تھی' جب سے مری میں اس کے ساتھ وہ واقعہ پیش آیا تھا وہ منصور حسین سے آنکھ ملا کر بات ہی نہیں کرتی تھی۔

"معذرت چاہتا ہوں بی بی! فی الحال میں گاڑی سروس کروانے کے لیے جا رہا ہوں۔"

"تو پھر میں کیسے جاؤں گی؟"

"آپ انتظار کر لیں' بعد میں چلی جایئے گا' تب تک گاڑی لے کر آجاؤں گا۔" منصور حسین بھی آہستگی سے جواب دے رہا تھا۔

"کس نے جانا ہے؟" آذر اور دانیال بھی ڈرائنگ روم سے نکل آئے تھے۔

"میں نے بوتیک جانا ہے' لیکن ڈرائیور گاڑی سروس کروانے کے لیے جا رہا ہے' اس لیے سوچ رہی ہوں کہ اب کس کے ساتھ جاؤں؟" علیزے پریشانی سے کہہ رہی تھی۔

"آذر کے ساتھ چلی جاؤ' یہ بھی مارکیٹ کی طرف ہی جا رہا ہے۔" دانیال نے فوراً" مشورہ دیا۔

"نہیں! میں نے کسی کام سے کہیں اور بھی جانا ہے' میں اپنے ساتھ نہیں لے کر جا سکتا' تم اپنے ساتھ لے جاؤ۔" آذر نے بھی فوراً" ہی انکار کر دیا' وہ علیزے کے قریب ہو کر اسے خوامخواہ دوسروں کی نفرت اور حقارت کا نشانہ نہیں بنوانا چاہتا تھا' اسی لیے پچھلے کئی دنوں سے اس سے کترا رہا تھا۔

"لیکن میں۔۔۔" دانیال نے کچھ کہنا چاہا۔

"تم فارغ ہو دانیال' تم لے جاؤ' میں فی الحال بزی ہوں۔" آذر نے دانیال کو درمیان میں ہی ٹوک دیا' دانیال چپ ہو گیا' اب وہ انکار کیسے کرتا؟ سو مجبوراً" جانے کے لیے مان گیا' تب کہیں منصور حسین بھی آزاد ہوا اور گاڑی لے کر حویلی سے نکل آیا' وہ بھی آذر اور علیزے کے متعلق ہی سوچ رہا تھا' منصور حسین کی نظر بڑی گہری نظر تھی' پہلی نظر اور پہلی ملاقات میں ہی پہچان جاتا تھا کہ کون کیسا ہے؟ کس مزاج کا ہے؟ کیا کہتا ہے؟ اور کیا چاہتا ہے؟ اور یہی حال آذر سے مل کر بھی ہوا تھا' وہ آذر کی چاہت' اس کا مزاج' اس کی طبیعت سب جان گیا تھا اور یہ بھی جان چکا تھا کہ آذر پچھلے چند روز سے کچھ چپ چپ اور ڈسٹرب سا ہے اور اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ وہ علیزے

بی بی کی وجہ سے ڈسٹرب ہے' کیونکہ آذر جتنا علیزے سے کلوز نظر آتا تھا آج کل اتنا ہی دور نظر آ رہا تھا' جس کے پیچھے یقیناً" کوئی بڑی وجہ ہی تھی۔

منصور حسین نے اپنی سوچوں کو ذہن سے جھٹکتے ہوئے گاڑی سیدھی چائنا ورکشاپ کے اندر لا کھڑی کی اور خود گاڑی سے اتر آیا تھا۔

"السلام علیکم۔" اس نے سامنے کھڑے عدیل سے ہاتھ ملایا۔

"وعلیکم السلام! آیئے بیٹھیے منصور صاحب۔" عدیل نے کرسی کی سمت اشارہ کیا اور منصور حسین آگے بڑھ کے کرسی کی طرف آ گیا۔

"شکریہ۔" وہ شکریہ ادا کرتے ہوئے جیب سے سگریٹ اور لائٹر نکال کر کرسی پہ بیٹھ گیا' اسے حویلی میں ہوتے ہوئے سگریٹ پینے کا موقع ذرا کم ہی ملتا تھا' اس لیے وہ جب بھی حویلی سے نکلتا اپنا شوق' اپنی عادت پوری کر لیتا تھا۔

"کہیے؟ کیا حکم ہے ہمارے لیے؟" عدیل گاہک کو بڑے پیار اور بڑے احترام سے ہینڈل کرتا تھا۔

"گاڑی سروس کروانی ہے۔" اس نے سگریٹ نکال کر سلگاتے ہوئے کہا۔

"اتنی جلدی؟ ابھی چند روز پہلے ہی تو آپ نے سروس کروائی تھی؟" عدیل کے بولنے سے پہلے ہی چھوٹا بول پڑا۔

"دو ہفتے پہلے کی بات ہے' اور دو ہفتے میں تو انسان کو سروس کی ضرورت پیش آجاتی ہے' تم گاڑی کی بات کر رہے ہو؟" اس نے استہزائیہ انداز میں کہہ کر سگریٹ کا کش لیتے ہوئے دھواں فضا میں اڑا دیا۔

"ارے باؤ منصور! یہاں لوگ دو' دو سال گاڑی سروس نہیں کرواتے' آپ دو ہفتے کی بات کر رہے ہو؟" چھوٹا کون سا کم تھا۔

"یہ گاڑی کس کی ہے' تمہیں پتا نہیں ہے شاید؟" منصور حسین کے لہجے میں تمسخر تھا۔

"کس کی ہے جناب؟" چھوٹے نے بھی تجسس سے پوچھا تھا۔

"آفندی انڈسٹریز کے مالک وقار آفندی کی بیٹی کی گاڑی ہے۔" منصور حسین نے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے جواب دیا اور چھوٹے نے ہونٹ سکیڑ لیے تھے۔

"او اچھا! پھر تو ان کا حق بنتا ہے کہ جب چاہیں گاڑی سروس کروائیں۔"

"بالکل! میں بھی تو یہی کہہ رہا تھا۔" منصور حسین نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تو اس کا مطلب ہے کہ آپ ان کی بیٹی کے ڈرائیور ہیں؟" چھوٹے کا ذہن اب کہیں اور جا پہنچا تھا۔

"ظاہر ہے' اسی لیے تو اس وقت تمہارے سامنے ہوں۔" منصور حسین پاؤں سیدھے کر کے بیٹھ گیا۔

"پھر تو بڑے خوش قسمت ہو باؤ منصور۔" چھوٹے نے رشک کا اظہار کیا۔

"ارے بھئی میں ڈرائیور ہوں ڈرائیور' خوش قسمت کیسے ہو گیا بھلا؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"باؤ منصور! اتنے بھولے نہ بنو' لوگ یہاں وقار آفندی سے ملنے کے لیے ترستے ہیں' مہینوں پہلے ٹائم لیتے ہیں اور آپ ان کے گھر میں رہتے ہو' ان کی بیٹی کے ڈرائیور ہو' یہ خوش قسمتی کی بات نہیں تو اور کیا ہے؟" چھوٹا خفگی سے کہہ رہا تھا جس پہ منصور حسین نے لاپروائی سے سر جھٹکا۔

"میں ایسی خوش قسمتی کو دل پہ نہیں لیتا شہریار صاحب! اور نہ ہی چھوٹی موٹی خوش قسمتی پہ خوش ہوتا ہوں۔" منصور حسین کا اپنا انداز بڑا شاہانہ تھا' جسے دیکھ کر عدیل بے ساختہ مسکرا دیا اور اس کی بات سے متاثر بھی ہوا تھا "بالکل ٹھیک کہا منصور صاحب آپ نے' میں بھی کچھ ایسے ہی خیالات رکھتا ہوں کسی امیر کبیر آدمی اور خوب

صورت لڑکی کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے اور دعا سلام کو اپنی خوش قسمتی تصور کرنا انسان کی سب سے بڑی بے وقوفی اور کم عقلی کی علامت ہے اور یہ علامت ہمارے چھوٹے میں بے بہا پائی جاتی ہے۔" عدیل ذرا فارغ تھا' اس لیے کرسی کھینچ کر خود بھی منصور حسین کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ منصور حسین پہلے بھی ایک دفعہ ان کے پاس آچکا تھا۔ اس لیے ان میں تھوڑی بہت بے تکلفی بھی ہو چکی تھی۔

"اس کا کوئی قصور نہیں ہے' باؤ عدیل' یہ عمر ہی ایسی ہے' خوش فہمیوں میں ڈالنے والی۔" منصور حسین نے مذاق اڑایا اور اسی ہنسی مذاق میں وہ گاڑی سروس کرنے میں لگ گئے' البتہ عدیل کافی دیر منصور حسین سے باتوں میں مصروف رہا تھا۔

☼ ☼ ☼
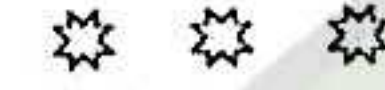
جودت کافی دیر سے ڈرائنگ روم میں بیٹھا مسز یدر کا انتظار کر رہا تھا' وہ شاید اوپر اپنے بیڈ روم میں تیار ہو رہی تھیں' عاصم' سائم اور فاطمہ گھر پہ نہیں تھے' شاید اسی لیے ان کی کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی اور جودت انتظار کرتے ہوئے بور ہونے لگا۔

"ارے جودت تم یہاں؟" سائم اچانک ڈرائنگ روم میں داخل ہوا اور جودت کو صوفے پہ بیٹھا دیکھ کر بے ساختہ حیرت اور خوشی کا اظہار کیا تھا۔

"جی ہاں! میں ہی ہوں' میری آتما نہیں ہے۔" جودت نے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔

"ہاں! تمہاری آتما تو مری اور اسلام آباد بھٹکنے کے لیے گئی ہوئی تھی' واپسی کب ہوئی۔" سائم مسکراتے ہوئے بیٹھ گیا۔

"دو دن پہلے۔"

"اچھا! تو تم نے بتایا کیوں نہیں؟"

"سوچا پہلے تھکن اتار لوں' پھر بتا دوں گا۔" جودت نے کندھے اچکائے۔

"کیسی تھکن؟" سائم کا سوال معنی خیز سا تھا۔

"ارے نہیں! ایسی ویسی تھکن نہیں تھی' ساری فیملی کے ہوتے ہوئے ایسا سوچنا بھی گناہ ہے۔" جودت نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"اچھا! اتنا احترام کرتے ہو فیملی کا۔"

"آف کورس یار! جب بہنیں اور بھائی ساتھ ہوں تو احترام کرنا ہی پڑتا ہے۔"

"چلو شکر ہے' کسی کا تو احترام کرتے ہو نا۔" سائم نے شکر ادا کیا تھا اور جودت قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

"ہیلو مائی سن! کیا ہو رہا ہے؟" مسز یدر نک سک سے تیار ساڑھی کا پلو سنبھالتی ہوئی اندر داخل ہوئیں۔

"ہائے آنٹی! کیسی ہیں آپ؟" جودت فوراً" کھڑا ہو گیا۔

"بالکل ٹھیک ہوں' تم سناؤ' آج کیسے آنا ہوا؟ مجھے پتا چلا ہے کہ تم کافی دیر سے انتظار کر رہے ہو؟" وہ جودت کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود بھی بیٹھ گئیں۔

"جی! وہ آنی نے آپ کے لیے یہ کارڈ بھیجا ہے۔" جودت نے کارڈ ان کی سمت بڑھا دیا۔

"اوہ تو علیزے کی برتھ ڈے ہے؟" مسز یدر کارڈ دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھیں۔

"جی! اور آنی نے آپ کو اسپیشلی انوائیٹ کیا ہے' اسی لیے یہ کارڈ مجھے دے کر بھیجا ہے۔"

"ہاں... ہاں! کیوں نہیں بھئی' میں ضرور آؤں گی۔" انہوں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے حامی بھری اور

جودت ان کا شکریہ ادا کرتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

"ارے اتنی جلدی کہاں جا رہے ہو؟ بیٹھو نا؟" سائم اور مسز یدر نے بیک وقت اسے روکا تھا۔

"ایم سوری! فی الحال بیٹھنے کا ٹائم نہیں ہے' میں نے ابھی کہیں اور بھی جانا ہے کارڈ دینے کے لیے۔" اس نے معذرت چاہی تھی۔

"کہاں جانا ہے؟ میں بھی چلتا ہوں۔" سائم بھی کھڑا ہو گیا۔

"مسز رزاق کی طرف..." جودت نے سائم کی آنٹی کا نام لیا۔

"ارے وہ تو اس وقت اکیڈمی میں ہوں گی؟" سائم نے اطلاع دی۔

"تو کوئی بات نہیں' میں اکیڈمی چلا جاتا ہوں' ان فیکٹ یہ کام مجھے آنی نے سونپا ہے' اس لیے اسے پورا کرنا ضروری ہے اور میں ذرا بھی کوتاہی نہیں کر سکتا۔" جودت نے اصل وجہ بتائی۔

"او کے! چلو پھر میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔" سائم جانے کے لیے تیار تھا۔

"تھینکس گو..." جودت کہتے ہوئے پلٹا اور مسز یدر کو اللہ حافظ کہہ کر سائم کے ساتھ باہر نکل آیا۔

"اور سناؤ کوئی نئی تازہ؟ تمہارے دن کیسے گزرے؟" جودت بائیک اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"سو بورنگ یار! کوئی مزا نہیں آرہا' موسم بے رنگ سا گزر رہا ہے۔" سائم نے منہ بنایا۔

"اچھا... یہ سب تم کہہ رہے ہو؟" جودت نے مذاق اڑاتے ہوئے تعجب کا اظہار کیا۔

"ہاں یار! طبیعت فریش نہیں ہے۔" سائم نے اعتراف کیا۔

"تو پھر کریں فریش؟" جودت نے چھیڑا۔

"تم تو کر لو گے' لیکن میں کیا کروں گا؟" سائم منہ بنا کے بولا تھا۔

"یار! جیسے میں اپنی طبیعت فریش کرنا چاہتا ہوں ویسے ہو نہیں رہی نا؟" جودت کے جواب پہ سائم اس کا مفہوم سمجھ گیا تھا' اسی لیے چپ بھی ہو گیا اور اتنے میں جودت نے بائیک اکیڈمی کی پارک میں لا کھڑی کی تھی۔

جودت اور سائم کو چوکیدار پہلے سے جانتا تھا' اس لیے فوراً" گیٹ کھول دیا۔ وہ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے اندر داخل ہوئے تھے اور قدم پرنسپل کے آفس روم کی طرف بڑھا دیے تھے۔

"ویسے یار! رنگا رنگ خوشبوئیں اور رنگا رنگ نظارے دیکھنے ہوں تو بندہ گرلز کالج یا اکیڈمی کا رخ کرے۔" جودت کے لہجے اور آنکھوں میں شرارت تھی' وہ کلاس روم سے نکل کر سیڑھیاں اترتی لڑکیوں کو دیکھ رہا تھا۔

"جودت! انسان بنو' آنٹی کو پتا چلا تو ناراض ہوں گی۔" سائم نے اسے ٹہوکا دیا تھا اور مجبوراً" جودت نے سر جھکا لیا۔

لیکن جب وہ مسز رزاق کو کارڈ دے کر واپس آرہے تھے کہ کلاس رومز کے سامنے سے گزرتے ہوئے جودت کے قدم اچانک ٹھٹک گئے' وہ ایک سرسری نظر میں ہی پہچان گیا تھا کہ وہ کون ہے؟

"جودت...!" سائم نے اسے اپنے ساتھ نہ پا کر فوراً" پیچھے پلٹ کر دیکھا تھا۔

"میں شاید اپنا سیل بھول آیا ہوں' تم چلو میں لے آؤں۔" جودت اپنی جیبیں ٹٹولتا ہوا بہانا بنا کر پلٹ گیا اور سائم اس کی چالاکی سے بے خبر گیٹ عبور کر گیا۔

اس کی کلاس آف ہو چکی تھی اس لیے وہ اپنی چیزیں سمیٹتی ہوئی پلٹ رہی تھی جب کسی کو کلاس روم کے دروازے کی چوکھٹ کے بیچوں بیچ کھڑے دیکھ کر ٹھٹک گئی لیکن جیسے ہی اس کے چہرے پہ نظر گئی اس کا رنگ فق ہو گیا۔

"ہائے! کیسی ہیں آپ...؟" جودت اسے اپنی گہری نظروں کی زد میں رکھتے ہوئے قدم بڑھاتا ہوا قریب آگیا۔

"آپ کون ہیں؟ میں آپ کو نہیں جانتی۔" مریم نے اپنی چادر درست کرتے ہوئے ناگواری سے کہا۔

"آپ کا گھائل ہوں، بس جاننے کے لیے یہی کافی ہے۔" جودت جتنے قدم بڑھا کے قریب آیا تھا، مریم اتنے ہی قدم اٹھا کر پیچھے ہوئی تھی۔

"شٹ اپ! تمیز سے بات کریں، آپ کون ہیں؟ کیا ہیں؟ مجھے یہ جاننے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔" مریم کافی پراعتماد لڑکی تھی، وہ جودت سے متاثر ہونے والی نہیں تھی۔

"لیکن مجھے تو بتانے کی ضرورت ہے نا مریم فاروق نیازی؟" جودت نے اس کا پورا نام لیا، جس پہ مریم نے چونک کر دیکھا اور جودت اس کے ری ایکٹ پہ بے ساختہ مسکرا دیا۔

"کہتے ہیں کہ شکر خورے کو شکر مل ہی جاتی ہے، آج اس پہ بھی یقین آگیا ہے، راستے میں آپ کی ہی طلب کر رہا تھا اور یہاں آپ مل گئیں، اللہ کا شکر ادا کرنے کے علاوہ اور کیا کر سکتا ہوں بھلا۔" جودت اس کے چہرے پہ نظریں جمائے اسے بغور دیکھ رہا تھا اور مریم نے کچھ کہنا ہی چاہا تھا کہ جودت نے اسے روک دیا۔

"فی الحال کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے، میں ذرا جلدی میں ہوں، آپ سے پھر ملوں گا، اللہ حافظ....." وہ اسے چپ رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے بے باک نظروں سے دیکھتا پلٹ کر چلا گیا اور مریم وہیں کی وہیں کھڑی دیکھتی رہ گئی۔

✲ ✲ ✲

"شہناز بی بی! آپ سے کوئی ملنے کے لیے آیا ہے۔" انسپکٹر شہناز ڈیوٹی پہ جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی، جب ملازمہ کی اطلاع پہ اس کے ہاتھ رک گئے۔

"کون ملنے کے لیے آیا ہے؟" اس کا سوال کھوجتا ہوا تھا۔

"پتا نہیں کون ہے، آپ سے ملنے پہ بضد ہے۔" ملازمہ نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

"ٹھیک ہے، بٹھاؤ اس کو، میں آ رہی ہوں۔" اس نے اجازت دیتے ہوئے اپنے آپ پہ ایک طائرانہ سی نگاہ ڈالی اور شوز پہننے کے بعد اپنی گاڑی کی چابی اور موبائل لے کر خود بھی نیچے آگئی، لیکن ڈرائنگ روم میں چار، پانچ گارڈز کے ساتھ اس آدمی کو دیکھ کر انسپکٹر شہناز بری طرح ٹھٹک گئی تھی، اس کی پیشانی پہ بل پڑ گئے تھے۔

"السلام علیکم۔" اسے دیکھ کر وہ آدمی کھڑا ہو گیا۔

"وعلیکم السلام! بیٹھیے۔" مجبوراً اسے فارملیٹی نبھانی ہی پڑی۔

"شکریہ میڈم بہت شکریہ۔" وہ آدمی بیٹھ گیا۔

"کہیے؟ کون ہیں آپ اور کس سلسلے میں آئے ہیں؟" اس کا لب و لہجہ پروفیشنل ہو چکا تھا۔

"ملک حق نواز نام ہے میرا، مومنہ بی بی کے کیس کے سلسلے میں آیا ہوں۔ دل آور شاہ اور مومنہ بی بی سے ملنا چاہتا ہوں، ملاقات کروا دیں۔" اس نے اپنا تعارف کروایا تھا۔۔۔ نپے تلے انداز میں۔

"ملک حق نواز؟" انسپکٹر شہناز دنگ رہ گئی تھی۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

✲ ✲

نبیلہ عزیز

درِ دل

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نبیل حیات دو ہی بہن بھائی ہیں' مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے' وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پہ رنگ چکی ہے' جس کے پیشِ نظر فائزہ بیگم' نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں' لیکن مدحیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے' جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے' مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے' مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا' بے بسی اور مجبوری سے تنگ آ کر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے' لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے بابا امتیاز مل جاتا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے' جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے' اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے' وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے' وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے' وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے' اس نے بھی ہارنا نہیں سیکھا' اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔

۲۰

بیسویں قسط

یہ نام اس کی سماعتوں پہ کسی بم کی طرح پھٹا تھا۔
لیکن اس نے ایک ذہین اور سمجھ دار آفیسر ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے تمام تاثرات لمحے کے ہزارویں حصے میں کنٹرول کرلیے تھے کیونکہ یہاں اس کا مشتعل ہونا خود اس کی ذات کو ہی نہیں اس گھر میں موجود اس کے ماں باپ اور مومنہ بی بی کو بھی کسی مشکل میں ڈال سکتا تھا کیونکہ اس وقت وہ اکیلی تھی اور سامنے کھڑے افراد مسلح تھے وہ ڈری نہیں تھی بس قدرے محتاط ہو گئی تھی ایسے ہزاروں کیسز سے روزانہ ان کا واسطہ پڑتا تھا جن میں الٹا خود پولیس آفیسرز کو یا پھر ان کے گھر والوں کو نقصان اٹھانا پڑتا تھا اس لیے وہ کسی عظیم نقصان کے خیال سے ہی کچھ دھیمی پڑ گئی۔

"اوہ! تو آپ ہیں ملک حق نواز صاحب؟" اس نے حیرت اور تعجب کا اظہار کیا۔

"کیا بات ہے میڈم؟ کیا میرا نام پہلی بار سنا ہے آپ نے؟" ملک حق نواز نے انسپکٹر شہناز کو گہری اور کھوجتی ہوئی نظر سے دیکھا۔

"ارے نہیں ملک صاحب..... ! نام پہلی بار نہیں سنا' دیکھا پہلی بار ہے۔" انسپکٹر شہناز کافی خوش اخلاقی سے بات کر رہی تھی۔

"ہوں! تو پھر مجھے دیکھا ہے تو مجھے سمجھ بھی گئی ہوں گی آپ.....؟" ملک حق نواز جیسے انسپکٹر شہناز کو کچھ باور کروا رہا تھا اور نادان تو وہ بھی نہیں تھی' البتہ یہ الگ بات تھی کہ وہ نادان بن رہی تھی کیونکہ صورت حال ہی کچھ ایسی تھی۔

"جی' جی بالکل! بہت اچھی طرح سمجھ چکی ہوں' آپ کی حیثیت' آپ کا مرتبہ سب سمجھ میں آچکا ہے' بس آپ یہ بتائیے کہ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟" انسپکٹر شہناز نے کافی عاجزی اور ملنساری سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"دیکھیے میڈم شہناز! آپ نے شاید غور نہیں کیا.....؟ میں اپنی عرض تو پہلے جملے میں ہی واضح کرچکا ہوں' لیکن کوئی بات نہیں' ایک بار پھر سہی۔" ملک حق نواز آج اپنے مزاج کے خلاف بڑے ٹھہراؤ سے بات کر رہا تھا۔
"جی کہیے! میں سن رہی ہوں۔" انسپکٹر شہناز نے اپنی ساری توجہ ملک حق نواز کی سمت مرکوز کر رکھی تھی۔
"دل آور شاہ اور مومنہ بی بی سے ملاقات کرنا چاہ رہا ہوں' لیکن دونوں ہی کہیں میسر نہیں آرہے' البتہ یہ سننے میں ضرور آیا ہے کہ ان دونوں کا آپ سے پرسنلی کانٹیکٹ رہتا ہے' اس لیے سوچا ہے کہ آپ سے ہی کہا جائے کہ ملاقات کی کوئی سبیل نکالیں' تاکہ کچھ وہ اپنی کہہ سن لیں اور کچھ میں اپنی کہہ سن لوں..... کہیے کیا خیال ہے آپ کا؟" ملک حق نواز بڑے طریقے سے بات کر رہا تھا لیکن انسپکٹر شہناز سب سمجھتی تھی وہ نا سمجھ بچی نہیں تھی جو اس کی چکنی چپڑی باتوں میں آجاتی' اس نے بھی کچھ بولنا تو تھا لیکن بہت سوچ سمجھ کر۔
"دیکھیے ملک صاحب! دل آور شاہ ایک بہت اچھے' بہت ذہین اور سمجھ دار وکیل ہیں' میرا ان کے ساتھ کوئی پرسنل ریلیشن شپ نہیں ہے۔ جس کی وجہ سے پرسنل کانٹیکٹ ہو گا' بس ہمارا پروفیشن ایسا ہے کہ کبھی کبھار آمنا سامنا ہو جاتا ہے' جس کی وجہ سے دعا سلام بھی ہوتی رہتی ہے' لیکن اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے' البتہ دل آور شاہ کے بارے میں اتنا ضرور پتا ہے کہ آج کل وہ اپنے کسی کیس کے سلسلے میں کراچی گئے ہوئے ہیں اور امید ہے کہ دو تین روز تک واپس لاہور آجائیں گے لیکن یہ بات پھر بھی کنفرم نہیں ہے' ہو سکتا ہے وہ لیٹ ہو جائیں یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ جلدی واپس آجائیں اس لیے یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا اور رہی بات مومنہ بی بی کی تو ان کے بارے میں بھی میری معلومات کچھ ایسی ہی ہیں' کیونکہ مومنہ بی بی' دل آور شاہ کا کیس ہے' اس لیے ان کے بارے میں زیادہ معلومات دل آور شاہ کو ہی ہوں گی' آپ ان کی واپسی کا انتظار کرلیں' آپ کا سارا مسئلہ حل ہو

جائے گا۔" انسپکٹر شہناز نے مومنہ بی بی کے متعلق مکمل لاتعلقی کا اظہار کیا تھا جس پہ ملک حق نواز کی پیشانی پہ ناگواری کے باعث بل پڑ گئے تھے۔

"انسپکٹر شہناز! آپ کی معلومات ناقص اور محدود ہو سکتی ہے لیکن ملک حق نواز کی نہیں' میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا کہ آپ مجھے دیکھ کر مجھے سمجھ گئی ہوں گی' لیکن آپ تو کچھ بھی نہیں سمجھیں..... ملک حق نواز آپ کے گھر کی اس چار دیواری میں بیٹھ کر اس چار دیواری تک ہی محدود نہیں ہے' بلکہ یہاں بیٹھ کر بھی آپ کے پورے گھر کے بارے میں بتا سکتا ہوں۔ جس کے ثبوت کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ مومنہ بی بی اس وقت اسی چار دیواری میں موجود ہے' میں چاہوں تو ایک منٹ میں اسے نکال کے باہر لے آؤں..... سمجھیں آپ.....؟" ملک حق نواز نے کافی سخت لہجے میں کہتے ہوئے انسپکٹر شہناز کے سامنے چٹکی بجائی تھی اور انسپکٹر شہناز نے خود کو ایسا کنٹرول کیا تھا کہ اپنا رنگ فق نہیں ہونے دیا ورنہ اگر یہاں اس کا رنگ فق ہو جاتا تو ساری بازی پلٹ جاتی' ملک حق نواز نے محض تیر پھینکا تھا کہ لگ گیا تو لگ گیا' نہ لگا تو نہ سہی۔

"ملک صاحب! میں نے بھی آپ سے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ میں آپ کی حیثیت' آپ کا مرتبہ سب سمجھ چکی ہوں' آپ کے اثر و رسوخ کا اندازہ بھی ہو چکا ہے پھر بھی سب کچھ دیکھتے ہوئے میں آپ سے جھوٹ کیسے بول سکتی ہوں.....؟ آپ اس وقت با اختیار ہیں' کچھ بھی کر سکتے ہیں' ایسے میں میں غلط بیانی سے کام لے کر معاملہ کیوں بگاڑوں گی بھلا.....؟ میں بے وقوف نہیں ہوں' اس وقت میرے لیے آپ کی بات اہم ہے' آپ میرے گھر آئے ہیں' اچھے طریقے سے بات کر رہے ہیں' کوئی غصہ نہیں ہے' کوئی دھمکی نہیں' پھر بھی اگر میں آپ کے ساتھ جھوٹ بولوں گی تو یہ الٹا میرے لیے نقصان دہ ہو گا آپ کے لیے نہیں..... ہاں اگر آپ کو شک ہے کہ مومنہ بی بی میرے پاس ہے' میرے گھر میں ہے تو پلیز میں آپ سے کہوں گی کہ آپ اپنا شک دور کرلیں' میرا گھر کھلا پڑا ہے' آپ تلاشی لے سکتے ہیں' حالانکہ میرے گھر کی تلاشی لینے کا آپ کو کوئی حق نہیں ہے' آپ کے لیے قانوناً "جرم" ہے یہ' لیکن پھر بھی آپ کو میری طرف سے اجازت ہے' آپ اپنی تسلی کرلیں۔" انسپکٹر شہناز کے اعتماد کے آگے ملک حق نواز کا پھینکا گیا تیر بے کار گیا تھا وہ بھی خود پہ اعتماد رکھ کے اتنی بڑی بات کہہ گئی تھی کہ ملک حق نواز خاموش رہ گیا۔

"دیکھیے انسپکٹر شہناز! میں اس وقت آپ کے گھر کی تلاشی لینے کے ارادے سے نہیں آیا' میں تو آپ کو صرف یہ بتانے کے لیے آیا ہوں کہ مجھے انجان مت سمجھیے گا؟ میں انجان نہیں ہوں' دل آور شاہ سے کہیے گا کہ مجھ سے غافل مت رہے' کہیں مومنہ بی بی کو انصاف دلاتے دلاتے اپنا نقصان نہ کرلے' کیونکہ دل آور شاہ کی وجہ سے یا پھر مومنہ بی بی کی وجہ سے میری ساکھ خراب ہوئی تو اچھا نہیں ہو گا' آج کل الیکشن کے دن ہیں' میری بدنامی سے میری پارٹی کو نقصان پہنچا تو سب کا انجام برا ہی ہو گا' اتنا برا کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔" ملک حق نواز نے انگلی اٹھا کر وارننگ دی تھی اور پھر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔
"اور ہاں! جو بھی اس معاملے میں شریک ہو گا سب لپیٹ میں آئیں گے' معافی کسی کے لیے بھی نہیں ہو گی۔" اس نے جاتے جاتے ایک اور وارننگ دی اور اپنے گارڈز کو اشارہ کرتے ہوئے خود بھی قدم باہر کی سمت بڑھا دیے۔
"معاف کرنے والا تو دل آور شاہ بھی نہیں ہے ملک صاحب....." انسپکٹر شہناز کی آواز پر ملک حق نواز کے قدم تھم گئے تھے' اس نے یکدم پلٹ کر انسپکٹر شہناز کی سمت دیکھا۔
"آپ مجھے دھمکی دے رہی ہیں.....؟" ملک حق نواز نے اپنی سمت اشارہ کرتے ہوئے بے یقینی سے پوچھا۔
"میں دھمکی نہیں دے رہی ملک صاحب! آپ کو صرف یہ بتا رہی ہوں کہ اگر آپ بے قصور ہیں تو دل آور شاہ

کبھی آپ سے ٹکر نہیں لے گا اور اگر آپ واقعی قصوروار ہیں تو ول آور شاہ کے عتاب سے بچنا اتنا آسان نہیں ہو گا آپ کے لیے' میری یہ بات آپ بے شک لکھ کر رکھ لیں' معافی کی گنجائش ان کے پاس بھی نہیں ہوتی۔" انسپکٹر شہناز نے ملک حق نواز کو ول آور شاہ کے متعلق تھوڑا بہت بتا دینا ہی مناسب سمجھا تھا کہ کہیں وہ ول آور شاہ کو ایری غیری شخصیت ہی نہ سمجھتا پھرے۔

"یہ دھمکی نہیں تو اور کیا ہے....؟" ملک حق نواز نے انسپکٹر شہناز کو کافی سخت نظروں سے دیکھا تھا۔

"اگر یہ اتنی سی بات آپ کو دھمکی لگ رہی ہے تو پھر دھمکی ہی سہی۔" اس نے کندھے اچکائے اور ملک حق نواز مٹھیاں بھینچ کے رہ گیا کیونکہ ایک پولیس آفیسر کے گھر پہ ان کا کوئی ہنگامہ برپا کرنا بھی ان کے حق میں ٹھیک نہیں تھا لہٰذا ضبط ہی بہتر تھا۔

"ہوں! ٹھیک ہے پھر' اللہ حافظ۔" انسپکٹر شہناز کے تنے ہوئے اعصاب اور بھی تن گئے تھے ملک حق نواز کی نظریں چھید دینے والی تھیں لیکن پھر بھی وہ لب بھینچتی ہوئی زہر کا گھونٹ پی کے رہ گئی' وہ آج اگر ملک حق نواز کے سامنے خاموش ہوئی تھی تو محض مومنہ بی بی کی وجہ سے' کیونکہ وہ اپنے غصے اور اشتعال کی وجہ سے مومنہ بی بی کی زندگی خطرے میں نہیں ڈال سکتی تھی' ملک حق نواز آج کل اپنی ساکھ برقرار رکھنے کے لیے اسے جان سے بھی مار سکتا تھا' اسی لیے تو وہ جگہ جگہ اس کی بو سونگھتا پھر رہا تھا اور دوسری طرف ول آور شاہ نے مومنہ بی بی کی حفاظت کی ذمہ داری اسے سونپی ہوئی تھی اس لیے اسے یہ ذمہ داری ہر حال میں نبھانی تھی چاہے کچھ بھی ہو جاتا۔

"شہناز! کیا بات ہے بیٹا....؟ کون تھے یہ لوگ؟" قیوم رضوی کی آواز پہ انسپکٹر شہناز یکدم چونک گئی۔

"کیا ہوا ہے؟ پریشان لگ رہی ہو؟" انہوں نے دوبارہ استفسار کیا وہ بیٹی کے چہرے سے ہی پریشانی بھانپ چکے تھے۔

"کچھ نہیں ابی جان! بس وہ مومنہ بی بی کی طرف سے پریشانی ہو رہی تھی' ملک حق نواز میرے گھر تک پہنچ گیا ہے۔" انسپکٹر شہناز نے ان کی سمت پلٹتے ہوئے متفکر سے انداز میں جواب دیا۔

"اچھا! تو یہ ملک حق نواز تھا....؟" انہوں نے پرسوچ سے انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا وہ ابھی ابھی گھر میں داخل ہوئے تھے اور ملک حق نواز ان کے گھر سے نکل رہا تھا جسے دیکھ کر ان کے ماتھے پہ سلوٹیں پڑ گئی تھیں۔

"جی ہاں! یہ وہی خبیث ہے۔" انسپکٹر شہناز غصہ ضبط کرتے ہوئے بولی۔

"کیا بات ہے؟ اس نے کچھ کہا ہے کیا....؟"

"جی ہاں! اسے شک ہو چکا ہے کہ مومنہ میرے پاس ہے اور میرا ول آور شاہ سے پرسنل کانٹیکٹ بھی ہے۔" انسپکٹر شہناز کبھی اپنی مٹھیاں بھینچ رہی تھی اور کبھی پیشانی مسل رہی تھی۔

"اوہ! تو یہ مسئلہ ہے....؟"

"جی یہی مسئلہ ہے اور اس مسئلے کا کوئی حل سمجھ نہیں آ رہا۔" انسپکٹر شہناز پریشانی کے مارے ڈرائنگ روم میں دائیں سے بائیں ٹہل رہی تھی اسے مومنہ بی بی کے لیے کوئی ٹھکانہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

"تو بیٹا! تم ول آور سے بات کرو نا' اسے ساری صورت حال سے آگاہ کرو' وہ یقیناً" کوئی حل سوچ لے گا۔" انہوں نے بیٹی کو مشورہ دیا۔ لیکن انسپکٹر شہناز کا دل نہیں مان رہا تھا کہ وہ ول آور شاہ کو پریشان کرے' آخر وہ کیا سوچے گا کہ انسپکٹر شہناز اتنی جلدی ذمہ داری سے گھبرا گئی ہے....؟

"نہیں ابی جان! میرا دل نہیں مان رہا' میں ول آور شاہ کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا چاہتی۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

"لیکن بیٹا! اس طرح تو مسئلہ حل نہیں ہو گا نا۔ اب تو مومنہ بی بی کے ساتھ ساتھ خود تمہاری زندگی کو بھی خطرہ

لاحق ہو چکا ہے' ملک حق نواز سامنے آ چکا ہے آخر؟" عبدالقیوم رضوی بیٹی کو ساری اونچ نیچ سمجھا رہے تھے۔

"لیکن ابی جان! آپ یہ بھی تو سوچیے کہ ملک حق نواز اگر میرے گھر تک پہنچ سکتا ہے تو وہ کہیں بھی پہنچ سکتا ہے' مومنہ بی بی نہ تو کسی دارالامان میں رہ سکتی ہے' نہ کسی ہاسٹل میں' اور نہ ہی کسی ہوٹل میں' کیونکہ ان جگہوں پہ وہ محفوظ نہیں رہ سکے گی اور رہی بات گھر میں رکھنے کی تو کوئی بھی اسے اپنے گھر میں نہیں رکھے گا' کیونکہ مومنہ بی بی کو اپنے گھر میں رکھنا اور پناہ دینا خطرے سے خالی نہیں ہے اور آج کل کسی اور کی وجہ سے کون خطرہ مول لیتا ہے بھلا؟" انسپکٹر شہناز حقیقتاً" پریشان ہو رہی تھی۔

"تو بیٹا! پھر چھوڑو اوروں کی بات' تم اسے رہنے دو' وہ یہیں رہے گی' ہم سمجھیں گے کہ ہماری ایک نہیں دو بیٹیاں ہیں۔" عبدالقیوم رضوی نے بڑی فراخدلی سے کہا تھا وہ ریٹائرڈ آرمی آفیسر تھے' بہت بہادر' وسیع ظرف اور رحمدل بھی' پہلے دن جب انسپکٹر شہناز نے ان کو مومنہ بی بی کے متعلق بتایا تھا تو انہوں نے بڑی خندہ پیشانی سے مومنہ بی بی کو خوش آمدید کہا تھا اور اپنے گھر میں پناہ دی تھی لیکن آج ملک حق نواز آڑے آ گیا تھا۔

"نہیں ابی جان! اب مومنہ بی بی کا یہاں رہنا مناسب نہیں ہے' کیونکہ میں اور میرا گھر ملک حق نواز کی نظر میں آ چکے ہیں' وہ مجھ پہ اور میرے گھر پہ چیک رکھے گا' اسی لیے مومنہ بی بی کو کہیں اور شفٹ کرنا پڑے گا' جہاں اس کی سوچ بھی نہ جا سکے۔"

انسپکٹر شہناز اس کے لیے کسی محفوظ جگہ کا سوچ رہی تھی اور اس کی سوچیں' تفکرات' اور پریشانی باہر کھڑی مومنہ بی بی کو ندامت کے کنویں میں دھکیل گئی تھیں' اس کی وجہ سے سب پریشان ہو رہے تھے' وہ سب کے لیے مصیبت بن گئی تھی' کیوں اس نے اپنی وجہ سے دوسروں کو بھی آزمائش میں ڈال رکھا تھا....؟ اس کی سوچیں اور خیالات اسے چپ کرا گئے تھے' اب اس نے چپ رہ کر ہی کچھ اور سوچنا تھا اور فیصلہ کرنا تھا' وہ دوسروں پہ بوجھ کب تک بنتی؟ آخر کب تک تنگ کرتی؟

✵ ✵ ✵

"عدیل عمر....!" سوچتے سوچتے اچانک ایک کپکپی کی سی صورت میں اس کا نام اس کے لبوں سے ادا ہوا اور وہ اس نام پہ خود ہی چونک گئی۔

"عدیل عمر....؟" اس نے اپنے آپ سے تصدیق کے لیے دوبارہ نام دہرایا اور دوبارہ بھی اسے یہی لگا کہ یہ نام اس کے دل سے ادا ہوا ہے.... اور دل سے ادا شدہ "عدیل عمر" مدحیہ حیات کو گم سم کر گیا تھا۔

وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ یہ نام اس کے دل سے ادا ہوا ہے تو کیوں ہوا ہے....؟ وہ اپنے آپ کو ٹٹول رہی تھی' اپنے دل کو کھوج رہی تھی' اور جو سمجھ آ رہا تھا وہ ناقابل یقین سا لگ رہا تھا۔

"تو کیا محبت....؟" یہ خیال ذہن میں آتے ہی وہ سر تھام کے بیڈ پہ بیٹھ گئی اور اس کی سماعتوں میں دور دور تک اس کی اپنی ہی "نہیں نہیں" کی آواز گونجتی ہوئی سنائی دے رہی تھی۔

"کیا مدحیہ حیات کو کسی سے محبت بھی ہو سکتی ہے۔" وہ خود اپنی ذات سے سوال کر رہی تھی اور جواباً" پھر اسے وہی گم سم سی خاموشی سنائی دے رہی تھی' چپ چپ اور حیران پریشان۔

"مدحیہ! تم ابھی تک جاگ رہی ہو بیٹا؟" فائزہ بیگم اس کے بیڈ روم کی لائٹ جلتی دیکھ کر اندر آ گئی تھیں اور مدحیہ کو بیڈ کی پائنتی کی طرف ایک کنارے پہ بیٹھے دیکھ کر انہیں اور بھی تشویش کا احساس ہوا تھا۔

"مدحیہ! اس طرح کیوں بیٹھی ہو؟ کیا ہوا ہے؟" انہوں نے قریب آتے ہوئے مدحیہ کے کندھے پہ ہاتھ رکھا اور مدحیہ چونک گئی اس نے یکدم سر اٹھا کر فائزہ بیگم کو جیسے خالی خالی نظروں سے دیکھا۔

”مدحیہ! تم ٹھیک تو ہو...... ؟ اس طرح کیا دیکھ رہی ہو...... ؟“ انہوں نے مدحیہ کی آنکھوں سے گھبرا کر پوچھا۔

”کک...... کچھ نہیں ہوا مجھے۔“ اس نے یکدم نفی میں سر ہلاتے ہوئے اپنے چہرے پہ ہاتھ پھیرا اس کی پیشانی پہ نامحسوس سے پسینے کے قطرے تھے جو اس نے دونوں ہاتھوں سے پونچھ ڈالے تھے۔

”رات کے اس پہر اس طرح کیوں بیٹھی ہو...... ؟ آخر کیا ہوا ہے تمہیں؟ تمہاری حالت اتنی غیر کیوں ہو رہی ہے؟“ فائزہ بیگم اس کی حالت دیکھ کر دہل چکی تھیں ان کا دل مٹھی میں آ گیا۔

”مام! میں نے کہا نا کچھ نہیں ہوا مجھے‘ بس سوچتے سوچتے نہ جانے دھیان کہاں چلا گیا تھا کہ میری کیفیت کنٹرول سے باہر ہونے لگی تھی۔“ مدحیہ نے بمشکل اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے انہیں ٹالنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن فائزہ بیگم کی تسلی نہیں ہوئی تھی وہ ابھی تک گھبرائی ہوئی تھیں۔

”آر یو شیور...... ؟“

”یس مام! ایم شیور‘ اینڈ پلیز لیو می الون۔“

اس نے اپنی کنپٹیوں کو سہلاتے ہوئے کہا اور فائزہ بیگم اسے دوبارہ اس کے مزاج میں دیکھ کر قدرے مطمئن ہو گئی تھیں اسی لیے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”اوکے! تم آرام کرو‘ گڈ نائٹ“ وہ مدحیہ کا گال تھپک کر چلی گئیں اور مدحیہ عدیل عمر سے محبت کا ادراک لیے جوں کی توں بیٹھی رہ گئی۔ اور پھر نہ جانے کتنی دیر گزر گئی کہ وہ یکدم سے ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”یہ نہیں ہو سکتا‘ یہ...... یہ میرے دل کا پاگل پن ہے‘ یہ صرف میرے دماغ کا خلل ہے‘ ورنہ وہ کون ہے؟ کیا ہے؟ میں کچھ بھی نہیں جانتی‘ محض ایک دو بار دیکھ لینے سے بھی کبھی محبت ہوئی ہے بھلا...... محبت کے لیے تو ایک عمر چاہیے ہوتی ہے‘ یہ اک بار دیکھنے کا یا پھر اک بار ملنے کا کھیل تو نہیں ہے نا‘ یہ تو پوری زندگی کی بازی ہے‘ اور بازی اتنی آسانی سے تو نہیں لگ جاتی؟ بس مجھے اس کا ورکشاپ میں کام کرنا اچھا نہیں لگا‘ اس سے زیادہ تو اور کچھ نہیں...... وہ مرے یا جیے میری بلا سے‘ مجھے ہلکان ہونے کی کیا ضرورت ہے بھلا...... ؟ عدیل عمر صرف عدیل عمر ہے اور کچھ نہیں‘ کچھ نہیں‘ کچھ نہیں۔“ اس نے بری طرح عدیل کی ذات کی نفی کرتے ہوئے سر دائیں بائیں جھٹکا تھا اور عدیل کا بھوت سر سے اتار پھینکا تھا‘ وہ جب سے عدیل کو ورکشاپ میں کام کرتے دیکھ کر آئی تھی تب سے مسلسل سوچوں میں اور اپنے آپ سے جنگ میں پھنسی ہوئی تھی لیکن اب اس نے سب کچھ ذہن سے جھٹک ڈالا تھا اور اپنے چہرے کی کیفیت مٹانے کی غرض سے واش روم میں گھس کر چہرے پہ ٹھنڈے پانی کے چھپاکے مارنے لگی تاکہ اس کے تنے ہوئے اعصاب کچھ ڈھیلے پڑ سکیں اور پھر پانچ منٹ بعد وہ واش روم سے نکل کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آ کھڑی ہوئی اور ابھی وہ تولیے سے اپنا چہرا خشک کر رہی تھی جب اس کی نظر ڈریسنگ ٹیبل پہ رکھی سرخ رنگ کی مخملی ڈبیا پہ جا پڑی۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر وہ ڈبیا اٹھالی اور پھر آہستگی سے اس ڈبیا کو کھول بھی لیا تھا...... اس ڈبیا میں جگمگاتی ڈائمنڈ رنگ مدحیہ کے لیے جیزی کی طرف سے ایک سوالیہ نشان تھا‘ ہاں یا نہ...... ؟

اور مدحیہ فی الحال اس ہاں یا نہ کا فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی اس لیے اس نے سختی سے لب بھینچتے ہوئے وہ ڈبیا دوبارہ بند کی اور ڈریسنگ ٹیبل کی دراز میں پٹخ دی تھی اور بیڈ روم کی تمام لائٹس آف کر کے بیڈ پہ ڈھیر ہو گئی۔

سناٹا ہر سو پھیل چکا تھا‘ رات گہری سے بھی گہری ہو رہی تھی‘ اندھیرا بھیگ رہا تھا اور خیال بھٹک رہے تھے‘ جا بجا‘ دل سے دماغ تک‘ یہاں سے وہاں تک‘ ورکشاپ سے اس کے بیڈ روم تک‘ اس کی ذات سے اس کی محبت تک‘ ہر طرف‘ ہر سو‘ بس خیال ہی خیال تھے‘ صرف اور صرف عدیل عمر کے...... گویا وہ دماغ سے جھٹک دینے سے

ابھی جھٹکا نہیں گیا تھا۔

٭ ٭ ٭

”کیا دیکھ رہے ہو منصور حسین...... ؟“ وہ کافی دیر سے روشنیوں میں ڈوبی حویلی کی مضبوط اور بلند عمارت کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا جب عارف نے اس کے کندھے پہ ہاتھ مارتے ہوئے اسے متوجہ کیا تھا۔

”شان و شوکت دیکھ رہا ہوں۔“ وہ واقعی دلہنوں کی طرح سجی حویلی کو حیرت اور اچنبھے سے دیکھ رہا تھا۔

حویلی کی شان و شوکت دیکھنی ہے تو کل دیکھنا‘ جب علیزے بی بی کا برتھ ڈے ہو گا اور امیر کبیر لوگ اپنی بیگمات کے ساتھ یہاں وہاں ٹہلتے ہوئے دکھائی دیں گے۔“

عارف حویلی کا کافی پرانا ملازم تھا اس لیے حویلی کی شان و شوکت سے بھی کافی اچھی طرح واقف تھا جبکہ منصور حسین نیا تھا اور اس کے لیے حویلی کی شان و شوکت بھی نئی تھی۔

”ہونہہ! حویلی کی شان و شوکت دیکھنی ہے تو پرسوں دیکھنا‘ جب تمہیں یہاں وہاں کوئی بھی ٹہلتا ہوا دکھائی نہیں دے گا۔“ منصور حسین نے کافی تمسخرانہ انداز میں کہا تھا جس پہ عارف کو کچھ سمجھ نہیں آئی تھی۔

”کیا مطلب ہے منصور حسین...... ؟“

”مطلب ہے کہ جب کوئی فنکشن ہوتا ہے تو بڑی رونق ہوتی ہے‘ بڑی روشنیاں ہوتی ہیں‘ بڑی چہل پہل ہوتی ہے‘ لیکن جب فنکشن ختم ہو جاتا ہے تو ہر طرف سناٹے چھا جاتے ہیں‘ ویرانی اور بے رونقی سی ہو جاتی ہے‘ تب کچھ بھی اچھا نہیں لگتا‘ اپنی شان و شوکت سے بھی بندہ اکتا جاتا ہے۔“ منصور حسین نے اسے وضاحت سے بتایا اور عارف کو سر اثبات میں ہلاتے ہوئے اس سے اتفاق کرنا ہی پڑا تھا۔

”ہوں! ٹھیک کہہ رہے ہو یار! ایسا ہی ہوتا ہے۔“

”ارے! تم لوگ یہاں بیٹھے باتیں بنا رہے ہو۔ اتنا نہیں سوچتے کہ آ کر میرا ہاتھ ہی بٹا دو۔“ مبارک خان گیٹ کی طرف جاتے جاتے ان دونوں کو دیکھ کر رک گیا۔

”کیا تم ہمارا ہاتھ بٹاتے ہو؟ کبھی عارف کی جگہ چوکیداری کی تم نے؟“ کبھی میری جگہ ڈرائیوری کی تم نے...... کبھی تمہیں ہماری تھکن کا احساس ہوا...... نہیں نا؟ تو پھر ہم تمہارا احساس کیسے کریں؟ تمہارا ہاتھ کیوں بٹائیں ہم‘ منصور حسین نے مبارک خان کو کھری کھری سنائی تھی اور مبارک خان جھنجلا گیا۔

”یار! تم سے تو بات کرنا ہی فضول ہے‘ نہ جانے کس مٹی سے بنے ہو تم‘ روکھے اور سڑیل‘ سامنے والے کا لحاظ بھی نہیں کرتے۔“ مبارک خان بہت بدمزا ہوا۔

”اس زمانے میں کوئی کسی کا لحاظ نہیں کر رہا مبارک خان صاحب...... یہاں سب کو اپنی اپنی پڑی ہے‘ کسی سے شکوہ کرنا سب سے بڑی غلطی ہے یہاں اور آئندہ اس غلطی سے پرہیز کرنا‘ کیونکہ یہاں سب نے اپنا اپنا کام خود کرنا ہے۔ اس لیے ہاتھ بٹانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور ویسے بھی بڑے صاحب کے خاص ملازم تم ہو ہم نہیں‘ جو کچھ تم کر سکتے ہو وہ ہم کیسے کر سکتے ہیں بھلا...... ؟“ منصور حسین تو بندے کا دماغ دھو کے رکھ دیتا تھا مبارک خان تو شکوہ کر کے پچھتایا۔

”منصور حسین...... ! منصور حسین۔“ رجو دور سے ہی آوازیں دیتی ہوئی آ رہی تھی اس نے گردن موڑ کر اپنی طرف آتی رجو کو دیکھا۔

”فرمائیے کنیز! کیا پیغام لائی ہیں؟“ منصور حسین کا انداز استہزائیہ تھا جس پہ مبارک خان نے اسے گھور کے دیکھا۔

"بڑے صاحب نے بلایا ہے تمہیں۔" رجو نے اپنی سانس ہموار کرتے ہوئے کہا۔

"اور کچھ......؟"

"ان سے جا کر پوچھ لو' وہ بتا دیں گے اور کچھ۔" رجو نے خفگی سے کہا۔

"ارے! کیا ہو گیا ہے تم سب کو......؟ سب مجھ پہ ہی اکڑ رہے ہو......؟ میرا قصور تو بتاؤ؟" منصور حسین نے حیرت سے کہا۔

"اپنے قصور بعد میں پوچھنا پہلے بڑے صاحب کی بات سن لو جا کر' وہ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔" مبارک خان کا لہجہ بھی خفگی لیے ہوئے تھا منصور حسین کندھے اچکاتا ہوا کھڑا ہو گیا اور رجو پیغام دے کر خود کوارٹرز کی سمت بڑھ گئی۔

"پلیز آذر بھائی! آپ اس طرح نہیں جا سکتے' پہلے آپ مجھے بتائیں کہ آپ مجھ سے کس لیے ناراض ہیں۔" علیزے کی آواز پہ منصور حسین کے قدم ٹھہر گئے اس کی آواز بائیں طرف والے لان کے کونے سے آ رہی تھی گویا اس کے ساتھ آذر بھی تھا۔

"میں تم سے ناراض نہیں ہوں یار' تم کیوں اتنی ٹینشن لے رہی ہو؟" یہ نرم سی آواز آذر کی تھی۔

"تو پھر آپ مجھ سے سیدھے منہ بات کیوں نہیں کرتے......؟ جہاں میں ہوتی ہوں آپ چلے جاتے ہیں؟ ابھی بھی میں آئی ہوں اور آپ اندر جا رہے ہیں......؟ یہ ناراضی نہیں تو اور کیا ہے؟" علیزے کی آواز بھیگ رہی تھی اور لہجہ روہانسا ہو رہا تھا۔

"یہ ناراضی نہیں ہے میری جان! ضروری نہیں کہ انسان اسی وقت کتراتا ہے جب ناراض ہوتا ہے' کسی سے کترانے کے لیے کچھ اور وجوہات بھی ہو سکتی ہیں' میرا تم سے کترانا تمہارے حق میں ہی بہتر ہو گا۔" منصور حسین دیکھ رہا تھا آذر' علیزے کو سمجھانے کی خاطر اس کے دونوں ہاتھ تھام کے نرمی سے تھپک رہا تھا کیونکہ چھوٹے سے دل کی علیزے' آذر کی ذرا سی بے رخی اور لاتعلقی پہ چھم چھم نیر بہا رہی تھی وہ کب سے آذر کو ڈھونڈتی پھر رہی تھی لیکن وہ اسے میسر ہی نہیں آ رہا تھا اور جیسے ہی وہ اسے لان میں ٹہلتا ہوا دکھائی دیا وہ فوراً اس کے پیچھے لان میں آ گئی تھی۔

"مجھے میرے حق میں ایسی بہتری نہیں چاہیے جو آپ کی لاتعلقی اور بے رخی کی وجہ سے آئے' آپ جیسے پہلے تھے آپ کو میرے ساتھ ویسا ہی رہنا ہے' میں کبھی کسی کی بھی ناراضی اور لاتعلقی برداشت نہیں کر سکتی' آپ تو پھر آپ ہیں۔" علیزے آنسوؤں کے درمیان جھنجلاتے ہوئے کہہ رہی تھی اور آذر اس کی بات پہ اس کی اتنی محبت پہ اور اس کی معصومیت پہ بے ساختہ مسکرا دیا۔

"او کے او کے! نہیں ہو تا میں تم سے لاتعلق' بس تم اپنے یہ آنسو ختم کرو اور پیاری سی مسکراہٹ سے مسکرا دو۔" آذر نے پیار سے کہتے ہوئے اس کا گال تھپکا اور علیزے روتے روتے مسکرا دی تھی' وہ دونوں لان میں کھڑے تیز روشنیوں میں صاف دکھائی دے رہے تھے منصور حسین نے ان سے نظریں ہٹا کر سر جھٹکا اور قدم دوبارہ اندر کی طرف بڑھا دیے تھے۔

☼ ☼ ☼

"السلام علیکم!" اس نے ڈرائنگ روم میں قدم رکھتے ہوئے کافی دھیمی آواز میں سلام کیا کیونکہ ڈرائنگ روم میں چھائی خاموشی اسے پہلے قدم پر ہی محسوس ہو گئی تھی۔

"وعلیکم السلام! آؤ بیٹھو۔" عبدالقیوم رضوی نے اسے سامنے والے صوفے پہ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"جی! کہیے....." انسپکٹر شہناز کا دل دھڑک رہا تھا کہ نہ جانے کیا ہو گیا ہے، جس کے لیے انہوں نے اسے فون کر کے وقت سے پہلے ہی گھر بلا لیا تھا۔

"یہ لیٹر ہے تمہارے لیے۔" انہوں نے ہاتھ پکڑا کاغذ بیٹی کی سمت بڑھا دیا۔

"میرے لیے لیٹر.....؟ کس نے بھیجا ہے؟" انسپکٹر شہناز کو اچنبھا ہوا۔

"خود دیکھ لو" وہ خود سے کچھ بھی نہیں بتانا چاہتے تھے اس لیے کاغذ ہی اسے تھمایا تھا اور اگلے پانچ سیکنڈ میں مختصر سی تحریر پہ نظر دوڑاتے ہوئے انسپکٹر شہناز یکدم اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔

"واٹ؟ مومنہ بی بی چلی گئی؟" انسپکٹر شہناز کو مومنہ بی بی کا لیٹر پڑھ کر شاک لگا تھا۔

"لیکن ابی جان! آپ نے اسے جانے کیوں دیا ہے؟" انسپکٹر شہناز کا پریشانی کے مارے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔

"وہ ہمیں بتا کر جاتی تو ہم اسے روکتے نا.....؟ اس نے ہمیں بتایا ہی نہیں، بس چپ چاپ بغیر کچھ بتائے اٹھ کر چلی گئی۔"

عبدالقیوم رضوی خود بھی بے حد پریشان اور متفکر نظر آ رہے تھے۔

"تو چوکیدار کہاں مر گیا تھا.....؟ وہ تو اسے روک سکتا تھا' یا پھر اسی وقت مجھے بتا سکتا تھا؟" انسپکٹر شہناز کا غصہ عود کے آیا تھا وہ یونہی کاغذ ہاتھ میں پکڑے دندناتی ہوئی باہر نکل آئی چوکیدار کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اسے پتا تھا کہ اس کی شامت ضرور آئے گی۔

"بی بی جی! مجھے نہیں پتا تھا کہ وہ چلی جائیں گی' میں گیٹ بند کر کے نہانے کے لیے چلا گیا تھا' انہوں نے خود ہی گیٹ کھولا اور خود ہی چلی گئیں۔" چوکیدار نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

"تو کیا چار گھنٹے تم نہاتے ہی رہے ہو کہ تمہیں پتا نہیں چلا.....؟"

انسپکٹر شہناز غصے سے بھڑک رہی تھی اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کیا کر ڈالے۔

"نہیں بی بی جی! مجھے تو بس دس منٹ ہی لگے تھے اور دس منٹ بعد میں واپس آیا تو گیٹ کھلا ہوا تھا۔" چوکیدار اسے صفائی دے رہا تھا۔

"دس منٹ میں وہ کہاں تک جا سکتی تھی بھلا.....؟ تم نے اس کا پیچھا بھی نہیں کیا؟" انسپکٹر شہناز مٹھیاں بھینچ رہی تھی اور چوکیدار پہ غرا رہی تھی وہ بے چارا برا پھنسا تھا۔

"ہمیں بتانے تک دس منٹ نہیں بلکہ بیس پچیس منٹ گزر چکے تھے اور بیس پچیس منٹ میں تم جانتی ہو کہ آدمی کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے' اس لیے اس کا پیچھا کرنا فضول تھا' ہم نے ہی اسے اس کے پیچھے جانے سے روکا تھا۔" عبدالقیوم رضوی چوکیدار کے لیے ڈھال بن گئے تھے جبکہ انسپکٹر شہناز اپنے والد صاحب کی لاجک پہ اپنا سر پیٹ کے رہ گئی تھی۔

"ابی جان! یہ کیا کر دیا آپ نے.....؟ وہ بیس پچیس منٹ میں بھی کہیں نہیں جا سکتی تھی' کیونکہ اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔" "ایک روپیہ بھی نہیں تھا' اس نے جہاں بھی جانا تھا' پیدل جانا تھا' اور پیدل چلنے والا اتنی دیر میں بھلا کہاں تک جا سکتا ہے.....؟" انسپکٹر شہناز جھنجلا رہی تھی اور عبدالقیوم رضوی بھی اپنی اس غلطی پہ ذرا دیر کے لیے خاموش ہو گئے تھے۔

"اب..... اب میں اسے کہاں تلاش کروں.....؟ اور..... اور دل آور شاہ کو کیا جواب دوں گی کہ ایک پولیس آفیسر ہونے کے باوجود مجھ سے ایک لڑکی تک نہیں سنبھالی گئی.....؟" انسپکٹر شہناز بمشکل اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے پاؤں پٹختی ہوئی گاڑی کی سمت بڑھی اور ایک جھٹکے سے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے گاڑی نکال لے گئی تھی

اور عبدالقیوم رضوی دیکھتے رہ گئے تھے۔

رات کو نو بجے کا ٹائم تھا' اندھیرے کا راج گہرا ہو چکا تھا اور اس اندھیرے کا غلام پورا شہر مصنوعی روشنیوں کے زیر اثر جگمگا رہا تھا' بے شک روشنیاں بہت تھیں لیکن رات بھی آخر رات تھی' اور اس رات میں کسی کو ڈھونڈنا آسان کب تھا بھلا.....؟ لیکن انسپکٹر شہناز پھر بھی یہ مشکل کام کرنے کے درپے تھی اور اس کام میں وہ چاہ کر بھی پولیس کی مدد نہیں لے سکتی تھی کیونکہ ساتھ ساتھ ملک حق نواز کا دھڑکا بھی لگا ہوا تھا اس لیے اسے یہ کام خاموش رہ کر کرنا تھا۔

☼ ☼ ☼

رات کے سوا نو بجے کا وقت تھا جب اس نے ایک روڈ سے دوسرے روڈ پہ یوٹرن لیا تھا اور ساتھ ہی اسپیڈ بڑھا دی تھی' لیکن اگلے ہی پل اسے بریک پہ پاؤں رکھنا پڑ گیا اور گاڑی کے ٹائر زور سے چرچرائے تھے کیونکہ کوئی اس کی گاڑی سے ٹکرا کر یکدم دور جا گرا تھا جس پہ نبیل حیات کا دماغ چکرا گیا تھا۔

"اوہ مائی گاڈ! یہ کیا ہو گیا ہے.....؟" نبیل حیات گھبرائے ہوئے انداز میں بہت عجلت کے ساتھ گاڑی سے نکل آیا تھا گاڑی کی ہیڈ لائٹس آن تھیں اس لیے اسے دور سے ہی پتا چل گیا تھا کہ گاڑی سے ٹکرانے والی لڑکی ہے' اس نے کافی بڑی سی چادر اوڑھی ہوئی تھی جو اس ایکسیڈنٹ سے گرنے کی وجہ سے اس کے اوپر سے سرک گئی تھی۔

"آپ..... آپ ٹھیک تو ہیں نا.....؟" نبیل نے ذرا جھجکتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر اسے سیدھا کیا لیکن وہاں اتنی ہمت اور اتنی سکت نہیں تھی کہ اس کے سوال کا جواب دیا جاتا' وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں تھی کیونکہ اس کے سر پہ شدید چوٹ آئی تھی۔

"ہیلو پلیز آنکھیں کھولیں۔" نبیل کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ ایسی سچویشن پہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔

"ارے صاحب! بے چاری کے چوٹ لگی ہے' مر جائے گی' فوراً ہسپتال لے جاؤ' ورنہ تختے پہ چڑھا دیے جاؤ گے۔" اس کے قریب سے دو آدمی گزرتے ہوئے ٹھہر گئے تھے انہوں نے نبیل کو اس حادثے کی سنگینی سے آگاہ کیا ورنہ کوئی اور لوگ ہوتے تو اتنا شور مچاتے کہ نبیل کی جان کو آ جاتے' یہ دونوں آدمی اچھے تھے اس لیے مخلصانہ مشورہ دیا تھا۔

"تھینک یو! میں ابھی انہیں ہسپتال لے جاتا ہوں۔" نبیل نے اس پہ جھکتے ہوئے اسے دونوں بازوؤں میں اٹھایا اور تیزی سے گاڑی کی سمت بڑھا گاڑی کا ڈور بند تھا اس لیے ان دو آدمیوں میں سے ایک نے آگے بڑھ کے ڈور کھولا اور اس لڑکی کو گاڑی میں ڈالنے کے لیے مدد دی تھی۔

"اور ہاں صاحب! آپ شکل سے شریف اور اس شہر سے انجان لگتے ہیں۔" اس لیے آپ کے لیے ایک اور مشورہ ہے۔" اس آدمی نے ڈور بند کرتے ہوئے کہا۔

"جی! کہیے....." نبیل فرنٹ ڈور کھولتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھ گیا تھا۔"

"اس لڑکی کی حالت دیکھ کر لگتا ہے کہ اسے زیادہ نقصان نہیں پہنچا' اس لیے ہسپتال میں ڈاکٹرز کی پوچھ پڑتال اور جھنجھٹ میں پڑنے سے بہتر ہے کہ آپ انہیں اپنے کسی پرسنل ڈاکٹر میرا مطلب ہے کہ فیملی ڈاکٹر سے ٹریٹ منٹ کروا لیں' ورنہ ہسپتال والے آپ کی جان نہیں چھوڑیں گے۔" اس آدمی نے ایک اور — مشورہ دیا جس پر نبیل واقعی اس آدمی کا مشکور ہوا اور ہاتھ گاڑی سے نکالتے ہوئے اس سے ہاتھ ملایا۔

"تھینک یو سو مچ بھائی صاحب، بہت مدد کی آپ نے میری۔"

"تھینکس او کے سر! انسانیت کے ناتے یہ سب کچھ بھی نہیں ہے؟" اس آدمی نے انکساری سے کہا اور پھر قدم پیچھے ہٹا لیے۔

"اللہ حافظ۔" نبیل نے اللہ حافظ کہتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی لیکن اب اس آدمی کے مشورے پہ اس کا ہسپتال جانے کا ارادہ بدل گیا تھا' اس کا رخ اب گھر کی طرف تھا اس نے اسپیڈ مزید بڑھاتے ہوئے ذرا کی ذرا گردن ترچھی کر کے پچھلی سیٹ پہ پڑی اس لڑکی کو دیکھا تھا وہ ہلکی ہلکی آواز میں کراہ رہی تھی شاید اس کے سر پہ چوٹ آئی تھی اس لیے یقیناً اس کے سر میں درد ہو رہا تھا لیکن بے ہوشی کے باعث وہ نہ تو کچھ دیکھ پا رہی تھی اور نہ ہی حرکت کر رہی تھی بس اس کے حلق سے عجیب و غریب آواز نکل رہی تھی جس پہ نبیل کی پریشانی اور بھی بڑھ گئی وہ کشمکش کا شکار ہونے لگا کہ اسے ہسپتال لے کر جائے یا پھر اپنے گھر؟

لیکن پھر اس آدمی کے مشورے کو ترجیح دیتے ہوئے اس نے گھر جانے کا ہی فیصلہ کیا اور اگلے پندرہ منٹ بعد وہ اپنے گھر کے پورچ میں گاڑی پارک کر چکا تھا اور گاڑی سے اتر کر تیزی سے پچھلی سیٹ کی طرف آیا اور ڈور کھول کر اس لڑکی کو گاڑی سے نکال کر اندر کی سمت قدم بڑھا دیے تھے۔ وہ راہداری سے گزر کر ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ رہا تھا جب سامنے سے سیڑھیاں اترتی مدحیہ ٹھٹک کر رک گئی تھی۔

"بھائی! یہ کیا ہوا ہے....؟ کون ہے یہ لڑکی....؟" مدحیہ پہلے رکی تھی پھر تیزی سے قریب آگئی لیکن نبیل کوئی بھی جواب دیے بغیر ڈرائنگ روم میں داخل ہوا اور اس لڑکی کو صوفے پہ ڈال دیا تھا۔

"بھائی! کون ہے یہ؟" مدحیہ اس لڑکی کی حالت دیکھ کر پریشان ہو رہی تھی۔

"یار! مجھے خود نہیں پتا کہ یہ کون ہے....؟ بس میں گھر آ رہا تھا اور یہ لڑکی اچانک راستے میں میری گاڑی سے ٹکرا گئی' ابھی تو شکر ادا کرو کہ اس کی جان بچ گئی ہے' ورنہ اس وقت کوئی اور مصیبت کھڑی ہو جاتی۔" نبیل اپنے موبائل سے ڈاکٹر کا نمبر ڈائل کرتے ہوئے مدحیہ کو بھی بتا رہا تھا۔

"تو آپ اسے ہسپتال لے کر کیوں نہیں گئے....؟"

"ہسپتال لے کر جانا خود مصیبت میں ٹانگ اڑانے کے مترادف ہے' اس لیے ڈاکٹر کو گھر بلا رہا ہوں۔" نبیل اس وقت اپنی عقل سے نہیں کسی اور کی عقل سے کام لے رہا تھا مدحیہ کو بڑی الجھن ہوئی تھی کہ وہ ایک چلتا پھرتا پولیس کیس اٹھا کر گھر لے آیا ہے کہیں کوئی اور مصیبت نہ پڑ جائے....؟

"بھائی! مصیبت کیسی بھلا....؟ اس لڑکی کی جان بچ گئی ہے' دیکھنے میں بھی ٹھیک ٹھاک ہے' پھر ہسپتال سے کترانے کی وجہ....؟" مدحیہ کو جوبات اچھی نہیں لگی تھی وہ اس کی وضاحت چاہ رہی تھی۔

"وجہ یہ ہے کہ اس وقت رات کا وقت ہے اور یہ ایک لڑکی کا معاملہ ہے وہ لڑکی بے ہوش تھی اور میں اسے بے ہوشی کی حالت میں ہسپتال چھوڑ کر نہیں آ سکتا تھا کیونکہ قانونی لحاظ سے دیکھا جائے تو جب تک یہ لڑکی ہوش میں نہ آ جاتی ہاسپٹل والے مجھے وہاں سے ہلنے کی بھی اجازت نہیں دے سکتے تھے' مجھے اس کے ساتھ وہاں ہی بندھ کے رہنا پڑتا اور دوسری بات کہ پتا نہیں جب یہ ہوش میں آتی تو اس ایکسیڈنٹ کا سارا الزام مجھ پہ رکھ دیتی اور پولیس والے میرے سر ہو جاتے' اور تیسری اور اہم بات یہ ہے کہ یہ لڑکی بہت نڈھال اور تھکی تھکی لگ رہی تھی' اپنا پورا جسم اور چہرا ڈھانپ رکھا تھا اس نے' اور یہ خالی ہاتھ تھی اس کے پاس اپنے آپ کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا' جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ پہلے سے کسی مصیبت میں مبتلا تھی' ایسے میں اسے ڈاکٹر زیا پھر پولیس والوں کے حوالے کر دینا بھی ٹھیک نہیں تھا لہٰذا سب کچھ سوچنے کے بعد میں اسے گھر لے آیا ہوں' دیکھنے سے ہی محسوس ہو رہا ہے کہ یہ لڑکی بے ضرر ہے' ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی ڈونٹ وری۔" نبیل نے مدحیہ کو کافی اچھی طرح دلیل اور وضاحت سے سمجھایا تھا اور شکر تھا کہ وہ سمجھ گئی تھی اور سمجھنے کے ساتھ ہی اسے اس لڑکی

ہمدردی محسوس ہوئی تھی۔

"نبیل بیٹا! تم اتنے لیٹ کیوں....؟" فائزہ بیگم کچھ کہتے ہوئے اندر داخل ہوئی تھیں لیکن صوفے پہ پڑی بے ہوش حالت لڑکی کو دیکھ کر ٹھہر گئیں۔ ان کے چہرے کے تاثرات بھی ایسے ہی تھے جیسے تھوڑی دیر پہلے مدحیہ کے ہوئے تھے۔

"مدحیہ! تم ماما کو ساری بات بتاؤ' میں تب تک ڈاکٹر ہاشمی کو ریسیو کرتا ہوں۔" نبیل مدحیہ کا کندھا تھپک کر باہر نکل گیا اور دس منٹ بعد ڈاکٹر ہاشمی ان کے گیٹ پہ موجود تھے' نبیل انہیں اپنے ساتھ لیے اندر آ گیا ڈاکٹر ہاشمی نے اس لڑکی کا تفصیلی چیک اپ کیا اور درد کے انجکشن اور کچھ ٹیبلٹس دینے کے بعد چلے گئے تھے' نبیل نے ان کے سامنے یہی ظاہر کیا تھا کہ وہ لڑکی ان کی کزن ہے اور اچانک سیڑھیوں سے گر گئی ہے اسی لیے ڈاکٹر ہاشمی کی تسلی ہو گئی تھی اور ویسے بھی وہ جانتے تھے کہ نبیل حیات' دل آور شاہ کا دوست ہے اور اس حوالے سے قابل اعتبار بھی ہے' نبیل ان کو رخصت کرنے کے بعد واپس آیا اور صوفے پہ ڈھے گیا۔

"اف! اتنی تھکن پورا دن اتنے کام نبٹاتے ہوئے نہیں ہوئی جتنی اس ایک گھنٹے میں ہو گئی ہے۔" نبیل نے اپنے دونوں ہاتھ بالوں میں پھنسا لیے تھے۔

"چائے لیں گے....؟" نہ جانے کیوں اور کیسے مدحیہ کو اس کی تھکن کا احساس ہوا تھا اور اس نے خود ہی اس سے چائے کا پوچھ لیا تھا۔

"ضرور لوں گا' لیکن اگر تم خود بنا کر لاؤ تو۔" نبیل نے آنکھیں کھولتے ہوئے ڈائریکٹ مدحیہ کی سمت دیکھا۔

"جی! ابھی بنا کر لاتی ہوں۔" مدحیہ اٹھ کر چلی گئی۔

"دیکھو بیٹا! اس لڑکی کا اس طرح ڈرائنگ روم میں پڑے رہنا مناسب نہیں ہے' تم اسے کسی روم میں شفٹ کر دو۔" فائزہ بیگم کو اس لڑکی کا صوفے پہ پڑے رہنا کافی غیر مناسب اور معیوب لگا تھا اسی لیے کہہ بھی دیا۔

"گیسٹ روم میں شفٹ کر دوں....؟"

"گیسٹ روم میں کیسے شفٹ کرو گے' گیسٹ روم کے دروازے کا لاک خراب ہے' چار پانچ روز ہو گئے ہیں میں نے چیک کیا تھا لاک ہی نہیں کھل رہا۔" فائزہ بیگم نے اسے پرابلم بتائی۔

"تو پھر کہاں شفٹ کرنا ہے اسے....؟" نبیل ماں سے پوچھ رہا تھا۔

"میرے بیڈ روم کے ساتھ والا بیڈ روم خالی ہے' اسے وہاں شفٹ کر دیں' میں رات کو اس کے پاس ہی رہ لوں گی۔" مدحیہ نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے کہا اور چائے کا کپ نبیل کو تھما دیا۔

"لیکن بیٹا! تم کیسے اس کے پاس رہ سکتی ہو؟ یہ پتا نہیں کون؟"

"اوہ کم آن ماما! ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کی ٹینشن نہیں لینی چاہیے' کچھ نہیں ہوتا' یہ لڑکی خود زخمی ہے' بیمار حالت میں ہے اور ہمارے ہی رحم و کرم پہ ہے' یہ ہمیں نقصان نہیں پہنچا سکتی اور ویسے بھی کسی نہ کسی نے تو اس کے پاس رہنا ہی ہے نا.... تو پھر یہی بہتر ہے کہ میں ہی رہ لوں' مجھے تو ویسے بھی رات گئے تک نیند نہیں آتی' میں آسانی سے جاگتی رہوں گی' اب یہ کام نبیل بھائی تو نہیں کر سکتے؟ وہ خود تھکے ہوئے آئے ہیں اب آرام کریں گے اور آپ بھی ماشاءاللہ اپنے ہزبینڈ کے ساتھ ہوتی ہیں اس لیے آپ کے رہنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' لہٰذا گھوم پھر کے بات مجھ پر ہی آ جاتی ہے' سو میں حاضر ہوں۔" مدحیہ کے جواب پہ وہ دونوں ماں بیٹا دیکھتے رہ گئے تھے کہ یہ کیا ماجرا ہو گیا ہے....؟ کیا وہ اپنے علاوہ بھی دوسروں میں انٹرسٹ لے سکتی ہے....؟

"اوکے! میں اس لڑکی کو وہاں ہی شفٹ کر دیتا ہوں' تم وہ بیڈ روم کھلوا دو....." نبیل نے اس کی بات سے کوئی اختلاف نہیں کیا تھا اور اسے اجازت دیتے ہوئے چائے کے سپ لینے لگا۔

"ہوں! چائے بہت اسٹرانگ ہے۔" نبیل کو چائے کا کڑک ذائقہ پہلے سپ پہ ہی محسوس ہوگیا۔

"اسٹرانگ چائے اور اسٹرانگ چاہ

بندے کے دل و دماغ کے سارے کس بل نکال کے رکھ دیتی ہے' بندہ فریش ہو کے رہ جاتا ہے۔" مدحیہ مسکرا کر کہتی ہوئی پلٹ گئی۔

"یہ تو دل آور والی سوچ ہے....؟" نبیل ہلکے سے مسکرایا۔

"بالکل! سوچ انہی کی ہے' بس بیان میں کر رہی ہوں۔" وہ بھی جواباً" مسکرا کر بولی۔

"کیوں....؟" وہ چائے کے سپ لیتے ہوئے لطف اندوز ہو رہا تھا کیونکہ وہ اسٹرانگ چائے اس کے اعصاب کو واقعی تقویت پہنچا رہی تھی۔

"کیونکہ ان کی سوچ میری سوچ سے ملتی ہے۔"

"ہوں! یہ تو میں بھی مانتا ہوں۔" وہ کپ خالی کر کے رکھتے ہوئے کھڑا ہو گیا اور مدحیہ باہر نکل گئی اس نے ملازمہ کو بلا کر کمرا کھلوایا تھا اور بستر وغیرہ ٹھیک کروا کر نیچے آگئی پھر نبیل نے اس لڑکی کو اوپر مدحیہ کے ساتھ والے بیڈ روم میں شفٹ کر دیا اور خود اپنے بیڈ روم میں چلا گیا' اب اس لڑکی کی ذمہ داری مدحیہ حیات پہ تھی۔ اب اس نے رات بھر جاگنا تھا اور اس لڑکی کی دیکھ بھال کرنی تھی۔

☼ ☼ ☼

"دانیال! کہاں جا رہے ہو تم....؟" آذر اندرونی مین ڈور کی سمت بڑھ رہا تھا لیکن انیکسی کی طرف سے نکل کر گاڑیوں کی سمت بڑھتے دانیال کو دیکھ کر قدم رک گئے۔

"مارکیٹ۔" دانیال نے گاڑی کی چابی لہراتے ہوئے اسے اشارہ دیا۔

"کیوں....؟ اس وقت کیوں جا رہے ہو؟" آذر کو اچنبھا ہوا۔

"ارے یار! اس وقت کو کیا ہوا ہے....؟ ابھی تو دس بجے ہیں۔" دانیال نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

"اوہ ہاں! لیکن تم جا کیوں رہے ہو....؟" آذر نے بھی اپنی گھڑی سے ٹائم دیکھ لیا تھا اسی لیے حیرت قدرے کم ہو گئی تھی' آج کل دراصل سرما کی لمبی راتیں شروع ہو چکی تھیں اس لیے رات کے دس گیارہ بجے بھی آدھی رات کا سا گمان ہوتا تھا۔

"آجاؤ' بتاتا ہوں پھر...." دانیال گاڑی کا ڈور کھولتے ہوئے بولا۔

"میں کیوں آجاؤں؟ میرا کیا کام بھی بھلا....؟" آذر نے دور سے ہی انکار کر دیا۔

"ارے آجاؤ یار! اپنے بیڈ روم میں بیٹھ کر بھی تو بور ہی ہونا ہے تم نے....؟" دانیال نے ذرا خفگی سے کہا جس پہ نہ چاہتے ہوئے بھی آذر کو آنا ہی پڑا' دانیال نے خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے اس کے لیے فرنٹ ڈور کھول دیا تھا اور آذر آکر اس کے برابر فرنٹ سیٹ پہ براجمان ہو گیا اور جیسے ہی گاڑی کی ہیڈ لائٹس آن ہوئیں چوکیدار نے فوراً" گیٹ کھول دیا تھا۔

"ہاں اب بتاؤ؟ کہاں جا رہے ہو؟ اور کیوں جا رہے ہو؟" گاڑی مین روڈ پہ آتے ہی آذر نے سوال داغ دیا۔

"مارکیٹ جا رہا ہوں یار! علیزے کے لیے برتھ ڈے گفٹ لینے کے لیے.... دانیال نے کافی سکون سے جواب دیا تھا جبکہ آذر اس کے جواب پہ چپ ہو گیا تھا۔

"کیا بات ہے؟ چپ کیوں ہو گئے ہو؟" دانیال نے قدرے توقف سے اسے دوبارہ متوجہ کیا تھا۔

"نہیں! کچھ نہیں...." اس نے آہستگی سے نفی میں گردن ہلائی۔

"کیا تم نے گفٹ نہیں لیا علیزے کے لیے....؟" دانیال نہ جانے کیوں اسے کھوج رہا تھا۔

"میں اس کے لیے گفٹ لوں گا تو افسانہ بنے گا۔" آذر نے تلخی سے کہتے ہوئے سر جھٹکا۔

"کوئی افسانوی بات ہو تو افسانہ بنتا ہے نا؟" دانیال نے ہلکے سے چوٹ کی تھی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" آذر نے یکدم دانیال کی سمت دیکھا۔

"میرا مطلب ہے کہ ہمارے گفٹس کا افسانہ کیوں نہیں بنتا....؟ صرف تمہارا ہی کیوں....؟" دانیال کا سوال بھی بجا تھا۔

"یہی تو میں کہتا ہوں کہ صرف میرا ہی افسانہ کیوں بنتا ہے....؟" آذر جھنجلا رہا تھا۔

"کیونکہ تمہاری ساری حرکتیں افسانوی سی لگتی ہیں' تم اتنے ہینڈسم' ڈیشنگ اور ریزروسے ینگ مین ہو ہمیشہ اپنے کام سے کام رکھتے ہو' سب کزنز سے بڑے ہو' اس لیے کافی ذمہ دار اور سمجھ دار بھی ہو' لیکن اس کے باوجود علیزے کی کیئر ایسے کرتے ہو جیسے تمہیں اور کوئی کام ہی نہ ہو' ایسے میں دیکھنے اور سننے والوں کو تھوڑا دال میں کالا تو لگے گا نا....؟ آخر دیکھنے اور سننے والے بھی دماغ' عقل اور سوچ رکھتے ہیں....؟ جس سے وہ کوئی بھی افسانہ بنا سکتے ہیں' اس لیے ان کی سوچ اور افسانے کا قصور نہیں ہے یار.... بلکہ تمہارا اپنا قصور ہے۔" دانیال آج پھر اسٹارٹ ہو چکا تھا۔

"میرا قصور ہے....؟" آذر نے حیرت اور اچنبھے سے اپنی طرف اشارہ کیا۔

"قصور ہے نا' سارا قصور ہی تمہارا ہے' وہ بات' وہ راز' وہ جذبات جو تم نہ جانے کب سے دل میں دبائے پھر رہے ہو' وہ تمہیں بہت پہلے ظاہر کر دینے چاہیے تھے تاکہ دوسروں کو بھی تمہارے جذبات کا پتا چل جاتا اور کوئی تمہارے بارے میں سوچنے کی کوشش بھی نہ کرتا۔" دانیال کا اشارہ کومل کی طرف تھا۔

"یار! ایسا کچھ نہیں ہے جیسا تم کہہ رہے ہو۔" آذر اب بھی انکاری تھا۔

"تو پھر قسم دو مجھے کہ ایسا کچھ نہیں ہے' تمہارے دل میں علیزے کا خیال تک نہیں ہے.... تمہارے ہاتھ میں اگر کومل کا ہاتھ تھمایا جائے تو تم تھام لو گے....؟ تمہیں اور تمہارے دل کو ذرا پروا نہیں ہوگی؟" دانیال نے آذر کو بری طرح گھیرے میں لے لیا تھا وہ نہ ہاں کر سکتا تھا' نہ نا کر سکتا تھا' وہ ایک آزمائش' ایک امتحان میں مبتلا ہو چکا تھا' جواب دیتا بھی تو کیا دیتا....؟

"بتاؤ نا؟ تمہیں اور تمہارے دل کو ذرا پروا نہیں ہوگی....؟ کوئی فرق نہیں پڑے گا تمہیں اور تمہارے دل کو۔"

دانیال اسے آزما رہا تھا اور آذر گہری سانس کھینچتے ہوئے سیٹ کی بیک سے سر ٹکا کر رہ گیا۔

"دانیال! مجھے اور میرے دل کو فرق پڑے یا نہ پڑے لیکن ڈیڈ کو ضرور فرق پڑتا ہے' کیونکہ ڈیڈ نے ہمیشہ علیزے کے ساتھ مجھے دیکھا ہے اور اسی چیز کا وہ کئی بار باتوں باتوں میں اظہار بھی کر چکے ہیں۔" آذر نے دانیال کو ڈیڈ کے ارادے سے آگاہ کرنے کی کوشش کی تھی۔

"میں جانتا ہوں اور بہت اچھی طرح جانتا ہوں' لیکن یار اس وقت میں ڈیڈ کو فرق پڑنے کی نہیں' تمہیں فرق پڑنے کی بات کر رہا ہوں.... تم سے یہ کہہ رہا ہوں کہ اگر علیزے کو چاہتے ہو تو اس چاہت کو دل میں مت دباؤ' بلکہ اظہار کرو' صاف اور واضح اظہار۔" دانیال۔۔ اسے کسی ایک اور حتمی فیصلے پہ اکسا رہا تھا۔

"لیکن یار! کیسے اظہار کروں....؟ علیزے ابھی بہت چھوٹی ہے.... وہ ابھی اس چیز کو نہیں سمجھتی....؟ میں کیوں اس کی معصومیت کو داغ دار کروں؟" آذر خفگی سے کہہ رہا تھا۔

"کیا کہا....؟ علیزے ابھی بہت چھوٹی ہے....؟ واہ! کیا کہنے ہیں تمہارے....؟ ارے محترم! ذرا عقل پہ زور دو تو تمہیں احساس ہو کہ علیزے آفندی آج رات بارہ بجے کے بعد پورے بیس سال کی ہو جائے گی' اور بیس سال کی لڑکی ہو یا لڑکا ایسے جذبات سے بے بہرہ نہیں رہتا' اٹھارہ سال کی لڑکی شادی کے قابل ہو جاتی ہے اور تم

بیس سال کی لڑکی کو محبت کے قابل نہیں سمجھ رہے؟ یہ تو عمر ہوتی ہے محبت کا بیج بونے کے لیے' اور تیس سال کی عمر تک یہ بیج پوری طرح سے پروان چڑھ جاتا ہے' اب تم خود سوچ لو کہ تم نے کیا کرنا ہے؟ علیزے کو انجان رکھنا ہے؟ یا پھر خود کو مل سے انجان رہنا ہے....؟" دانیال کی باتیں خاصی گہری تھیں' آذر سوچنے پہ مجبور ہو گیا۔

"تو پھر کیا کروں....؟"

"اظہار کرو بھائی! اظہار کرو۔"

"مگر کیسے....؟" آذر کو کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔

"ارے یار! کل اس کا برتھ ڈے ہے' موقع اچھا ہے' تم کوئی ایسا گفٹ لو اس کے لیے کہ وہ سب کچھ خود بخود ہی سمجھ جائے۔" دانیال نے گاڑی شاپنگ مال کے سامنے پارک کرتے ہوئے کہا۔

"ایسا گفٹ کیا ہو سکتا ہے بھلا....؟"

"اندر آجاؤ' بتاتا ہوں تمہیں۔" دانیال گاڑی سے اتر گیا اور اس کے پیچھے آذر بھی گاڑی سے اتر آیا تھا۔

☆ ☆ ☆

ہونا تو وہی ہے جو مقدر میں میرے ہے
لیکن لوہ میرے خواب' میرے خواب' میرے خواب

"آپ کی ہر بات بجا بی بی جان! لیکن آپ اگر سوچیں تو بیٹیاں بھی تو انسان ہی ہوتی ہیں نا....؟ ان کے سینے میں بھی بدقسمتی سے دل ہی دھڑکتا ہے' اس دل میں ہزاروں حسرتیں ہوتی ہیں' ہزاروں خواہشیں' ہزاروں خواب ہوتے ہیں' اور ان ہزاروں خوابوں اور خواہشوں کو ایک دم سے گلا گھونٹ کر مار دینا اتنا آسان نہیں ہوتا' ان کو مارتے مارتے انسان خود مر جاتا ہے اور مجھے لگتا ہے کہ میں بھی مر جاؤں گی' ایک دن ایسا ہو کے ہی رہے گا۔" آج پھر زری کے لیے بی بی جان کا فون آیا ہوا تھا' وہ اس سے واپسی کا پوچھ رہی تھیں اور زری کے دل کی دھڑکنیں پھر سے لرزنے لگی تھیں اس کے دل کے نہاں خانوں میں چھپا خوف پھر سے امڈ آیا تھا۔

"خدا کا خوف کرو لڑکی! کیسی باتیں کر رہی ہو....؟" بی بی جان دہل گئیں۔

"بی بی جان! اگر یہی بات میں آپ سے کہوں تو....؟ آپ لوگ خدا کا خوف کیوں نہیں کرتے.... بیٹیوں کی زندگیوں سے بھی کھیلتے ہیں اور دلوں سے بھی؟"

نہ جانے آج کیا بات تھی کہ زری سے ضبط نہیں ہو رہا تھا وہ رخساروں پہ آنسوؤں کی طرح بکھر رہی تھی' اس کے حوصلے پگھل رہے تھے.... آج کل اس کا دل بے وجہ ہی بے چین اور مضطرب رہنے لگا تھا.... اس کے اندر ابال اٹھتے تھے' وہ اندر ہی اندر ہولنے لگتی تھی اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ پاکستان جانے کی بجائے کہیں صحراؤں کی طرف نکل جائے' جہاں صرف وہ ہوتی' اس کا دل ہوتا' اس کی ذات ہوتی اور اس کا عشق ہوتا.... کوئی دوسرا بھی اس کی ذات اور اس کے عشق میں مداخلت نہ کر پاتا۔

"ہیلو.... ہیلو زری بیٹا؟" ریسیور میں سے بی بی جان کی آواز سنائی دے رہی تھی لیکن بے آواز روتی ہوئی زری انہیں کوئی جواب نہیں دے پائی تھی اور ریسیور کریڈل پہ ڈال دیا اور لاؤنج کی دہلیز میں کھڑا عبداللہ اندر آ گیا۔

"زری...." عبداللہ کی سنجیدہ' نپی تلی اور بھاری آواز زری کے بہت قریب سے ابھری تھی' زری یکدم گڑبڑا گئی۔

"عبداللہ بھائی آ.... آپ؟" وہ بوکھلا کر اپنی جگہ سے کھڑی ہو چکی تھی۔

"بیٹھو...." عبداللہ نے اسے اس کی سابقہ جگہ پہ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"جج.... جی؟" زری کی رنگت متغیر ہونے لگی تھی اس نے خود کو بمشکل کرسی پہ بیٹھنے کے قابل کیا تھا' ورنہ ٹانگوں کی جان تو پہلے مرحلے پہ ہی ٹوٹ چکی تھی۔

"کس کا فون تھا....؟" وہ جانتا تھا مگر اس کے منہ سے سننے کے لیے پوچھ رہا تھا۔

"بی بی جان کا...." زری کی آواز بے حد دھیمی ہو چکی تھی۔

"کیا کہہ رہی تھیں....؟" عبداللہ کے انداز پہ زری کی جان نکل رہی تھی کہ نہ جانے اسے کیا ہوا ہے....؟ نہ جانے اس نے کیا بات سنی ہے کہ وہ اس حد تک نپا تلا اور سرد و سپاٹ نظر آرہا ہے۔

"واپسی کا پوچھ رہی تھیں۔" زری نے سر جھکا رکھا تھا۔

"پھر تم نے کیا کہا؟"

"یہی کہ ہم واپس آرہے ہیں۔"

"بس یہی کہا تم نے....؟"

"جی...." اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تو پھر روئی کس بات پہ ہو....؟" عبداللہ اپنے مطلب کے سوال پہ آگیا۔

"نن.... نہیں کسی بات پہ نہیں روئی۔" اس نے فوراً" نفی میں گردن ہلائی۔

"دیکھو زری! دل کی بات دل میں رکھنے والے لوگ خسارے میں رہ جاتے ہیں' اور میں نہیں چاہتا کہ تم کسی خسارے میں رہو' اس لیے بہتر ہے کہ تم بولو اور بتاؤ مجھے کہ تم کیوں روئی ہو....؟" عبداللہ کو زری کی باتوں سے لگا تھا کہ اس کے دل میں کوئی ہے اور اس "کوئی" کو جاننے کے لیے وہ ساری نام نہاد عزت اور غیرت بالائے طاق رکھتے ہوئے اس سے پوچھنے کے لیے بیٹھ گیا تھا۔

"اپنے نام کے ساتھ ملک حق نواز کا نام سن کر روئی ہوں' اور اس لیے روئی ہوں کہ میری ماں کو بھی میرا احساس نہیں ہے' وہ بھی مجھے ملک حق نواز کے ساتھ رخصت کرنے پہ خوش ہیں۔" زری کی آواز پھر سے بھرا گئی تھی۔

"بس یہی بات تھی یا کوئی اور....؟" عبداللہ اس کے جھکے ہوئے سر پہ نظریں جمائے بیٹھا تھا زری نے گھبرا کر عبداللہ کی سمت دیکھا اور پھر فوراً" نظریں جھکا لی تھیں۔

"میں کیا پوچھ رہا ہوں زری....؟ بس یہی بات تھی یا کوئی اور....؟" عبداللہ نے پھر اپنی بات پہ زور دیا۔

"جی! بس یہی بات تھی۔" زری نے مرے مرے لہجے میں جواب دیا۔

"ہوں! ٹھیک ہے' یہ تو طے ہے کہ ملک حق نواز کا نام تمہارے نام کے ساتھ نہیں آئے گا' اس لیے اس بات پہ رونا فضول ہے۔ لیکن اگر کوئی اور بات ہے تو پھر یہ تمہارا مسئلہ ہے' بعد میں مجھے کوئی الزام مت دینا کہ عبداللہ بھائی نے میرا ساتھ نہیں دیا۔" عبداللہ نے زری کے کسی اور مسئلے سے واضح لاتعلقی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں عبداللہ بھائی! آپ کو الزام دینے کا میں کبھی مر کے بھی نہیں سوچ سکتی' آپ نے تو ہمیشہ میرا ہی ساتھ دیا ہے' اتنا تو کوئی ماں باپ بھی کسی کا ساتھ نہیں دیتا' جتنا آپ نے میرا دیا ہے۔" زری کا لہجہ بے حد دھیما ہو رہا تھا۔

"میں نے تم پہ کوئی احسان نہیں کیا' یہ سب تمہارا حق ہے' تم میرے لیے بہن بھی ہو اور بیٹی بھی' میں تمہیں ہمیشہ خوش دیکھنا چاہتا ہوں اور تمہاری خوشی اور بہتری کی خاطر ہی میں اپنے خاندان والوں سے ٹکر لے رہا ہوں' ورنہ اور تو کوئی اختلاف ہی نہیں ہے' میرے اور ان کے درمیان....؟ اس لیے میں سوچ رہا ہوں کہ اگر میرے اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی تمہیں کوئی مسئلہ رہے تو یہ اچھی بات نہیں ہے' تمہیں اپنے اندر کی بات صاف صاف

بتانی چاہیے اگر نہیں بتاؤ گی تو ذمہ دار تم خود ہو گی۔" عبداللہ اسے کرید رہا تھا۔

"نن.... نہیں بھائی! ایسی کوئی بات نہیں ہے...." زری نے اپنے بے اختیار اور بے قابو دل کو دباتے ہوئے بمشکل اس حقیقت سے انکار کیا تھا' وقت سے پہلے ہی وہ اپنے بھائی کی عزت' غیرت اور انا کو آزمائش میں نہیں ڈال سکتی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اگر وہ اس وقت اس سے کچھ پوچھ رہا ہے تو اپنی رگوں میں دوڑتی غیرت کو اپنے پاؤں تلے کچل کر پوچھ رہا ہے' ورنہ کون ایسا بھائی ہو سکتا تھا جو اپنی بہن سے اس کی پسند' اس کی محبت اور اس کے دل کی بات پوچھے....؟ اور اگر پوچھ رہا تھا تو یہ اس کا اچھا پن تھا' نیکی تھی' بڑائی تھی اس کی' ورنہ وہ نہ بھی پوچھتا تو وہ کیا کر سکتی تھی بھلا....؟

"ٹھیک ہے پھر! ختم کرو یہ رونا دھونا اور اپنی پیکنگ اور تیاری مکمل کرو' جو ہو گا چار دن بعد دیکھا جائے گا۔"

عبداللہ اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور زری کا سر تھپک کر باہر نکل گیا' زری جوں کی توں بیٹھی رہ گئی۔

آج سے چار دن بعد اٹھارہ نومبر کو ان کی فلائیٹ تھی' سب تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں' سارے بندوبست بھی ہو چکے تھے پھر بھی.... پھر بھی ایک وہ تھی کہ اس کا دل بس ڈوبتا ہی جا رہا تھا' اتنی تسلیاں' اتنے دلاسے' اتنے پختہ یقین کے بعد بھی وہ مایوس کی مایوس ہی تھی نہ جانے ایسا کون سا حوصلہ شکن احساس تھا جو اسے آس کی ڈور ہی نہیں تھامنے دے رہا تھا....!

☆ ☆ ☆
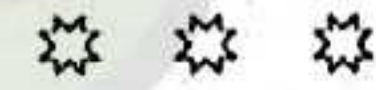
"مریم....!" "جی امی....؟" عابدہ خاتون کی آواز پہ مریم بری طرح چونک کر متوجہ ہوئی۔

"دھیان کہاں ہے تمہارا....؟" عابدہ خاتون نے بغور اس کے چہرے کی سمت دیکھتے ہوئے پوچھا جس پہ مریم یکدم سٹپٹا گئی اور اپنے اڑے اور بکھرے ہوئے اعصاب کو یکجا کرنے کی فوری اور ناکام کوشش کی تھی۔

"کک.... کیا مطلب ہے آپ کا....؟ میرا دھیان کہاں ہونا ہے بھلا....؟"

مریم ماں کی نظروں کی کھوج سے بوکھلا گئی تھی وہ انہیں اپنی پریشانی سے آگاہ نہیں کرنا چاہتی تھی' اگر جودت آفندی کے متعلق انہیں بھنک بھی پڑ جاتی تو وہ ساری مجبوریاں اور گھر کے حالات بالائے طاق رکھتے ہوئے اسے فوراً "گھر بٹھا لیتیں' وہ ہر مشکل وقت میں صبر و شکر کرتے ہوئے گزارا کر سکتی تھیں' لیکن ان کی عزت پہ کوئی حرف آئے یہ برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔

"تم مجھے دو روز سے کچھ پریشان پریشان سی لگ رہی ہو....؟ اور میں اسی انتظار میں ہوں کہ تم مجھے اپنی پریشانی بتاؤ گی' لیکن نہیں! تم پریشانی بتانے کی بجائے الٹا چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔" عابدہ خاتون نے بیٹی کا صحیح جائزہ لیا تھا اور مریم ان کے اتنے درست اندازے پہ مزید محتاط ہو گئی تھی۔

"نہیں امی! پریشانی کی تو کوئی بات نہیں ہے' بس میں یہ سوچ رہی تھی کہ فی الحال گھر میں کچھ بھی نہیں ہے اور مجھے جاب جوائن کیے ہوئے ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں....؟ ایسے میں میں مسز رزاق سے اپنی تنخواہ کے لیے کہوں بھی تو کیسے....؟ وہ کیا سوچیں گی آخر....؟ اور ادھر پورا مہینہ پڑا ہے ابھی.... اتنے دن گزارا کیسے ہو گا بھلا؟" مریم نے جیسے تیسے ہی سہی کوئی بہانا بنا ہی لیا تھا اور اس کے جواب پہ عابدہ خاتون کی کھوجتی ہوئی جائزہ لیتی ہوئی نظریں ڈھیلی پڑ گئی تھیں۔ "اللہ مالک ہے بیٹا سب اس کی ذات پہ چھوڑ دو' گزارہ کیسے ہو گا یہ اس کی ذات بہتر جانتی ہے' وہ مالک ہے ہمارا' ہم اس کے بندے ہیں' اسے ہماری فکر ہم سے بھی زیادہ ہوتی ہے' اس لیے ہمیں پریشان ہونے کی تو ضرورت ہی نہیں ہے' جو بھی ہو گا اس کی مرضی اور اس کی رضا سے ہو گا' تم بس اس کا رحم اور اس کی رضا مانگو' ان شاء اللہ ہر مسئلہ حل ہو جائے گا۔" عابدہ خاتون نے مریم کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے تھپکا اور اسے سمجھایا تھا'

بس یہ حقیقتاً" تھوڑی دیر کے لیے مریم کا دل سنبھل گیا تھا ورنہ تو اسے جودت آفندی کی طرف سے دھڑکا ہی لگا ہوا تھا۔

"بس امی! آپ ہمارے لیے دعا کرتی رہا کریں۔" اس نے ماں کے دونوں ہاتھ تھام لیے تھے۔

"ارے بیٹا! یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے....؟" عابدہ خاتون نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

"ارے! یہ صبح صبح اتنا لاڈ پیار کیوں ہو رہا ہے....؟ آج کوئی خاص دن تو نہیں؟ کوئی برتھ ڈے وغیرہ یا تہوار؟" عدیل ناشتا کرنے کی غرض سے باورچی خانے کی طرف آیا تو دہلیز میں ہی ٹھہر گیا اور کافی حیرت کا اظہار کیا تھا جس پہ مریم اور عابدہ خاتون بے ساختہ مسکرا اٹھیں۔

"اپنے بچوں کو پیار کرنے کے لیے کیا کسی خاص دن یا تہوار کی ضرورت ہوتی ہے؟" عابدہ خاتون نے عدیل کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"آج کل زندگی اتنی مصروف ہو گئی ہے کہ اپنی اولاد اپنے بچوں کو پیار کرنے کے لیے بھی لوگوں کو خاص دن کی ہی ضرورت ہوتی ہے' ورنہ عام دنوں میں تو وقت ہی نہیں ملتا۔" عدیل کا کہنا بھی بجا تھا لیکن غلط تو عابدہ خاتون بھی نہیں تھیں۔

"یہ امیر اور بڑے لوگوں کی باتیں ہیں بیٹا! ورنہ ہم غریب لوگوں کے پاس اولاد اور بچوں کے سوا اور ہوتا ہی کیا ہے؟ ہم دولت کو نہیں اولاد کو دیکھ دیکھ کر جینے والے لوگ ہیں کیونکہ ہماری جمع پونجی تو ہماری اولاد ہی ہوتی ہے۔" ان کے لہجے میں ـــــ ممتا بول رہی تھی عدیل آہستگی سے مسکرا دیا۔

"یہ تو آپ واقعی صحیح کہہ رہی ہیں' لیکن امی چند ایسے امیر اور بڑے لوگ بھی ہیں' جو آج بھی دولت کو نہیں اپنی اولاد کو دیکھ دیکھ کر جیتے ہیں' جن کی اولاد ہی ان کا سب کچھ ہے' ہمارے شہر کے بہت بڑے بزنس مین ہیں وقار آفندی' آفندی انڈسٹریز کے مالک' آج ان کی بیٹی کا برتھ ڈے ہے' آپ اس برتھ ڈے کی ارینج منٹ کا ہی سن لیں تو حیران رہ جائیں گی' ان کی بیٹی کے ڈرائیور سے ملاقات ہوئی تھی وہی ساری تفصیل بتا رہا تھا' وقار آفندی اپنی بیٹی سے اتنی محبت کرتے ہیں کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا' لوگ تو محاورتاً" کہتے ہیں نا کہ اولاد کو دیکھ دیکھ کر جینا' لیکن وہ تو حقیقتاً" اپنی بیٹی کو ہی دیکھ دیکھ کر جیتے ہیں۔" عدیل کے ذہن میں منصور حسین کی باتیں گردش کر رہی تھیں۔

"بس بیٹا! ایسی محبت وہی کر سکتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے بہت زیادہ نوازا ہے' لیکن میں تو پھر بھی یہی سوچتی ہوں کہ اللہ ہم سب کو اپنی عاجزی میں ہی رکھے۔" عابدہ خاتون کافی عاجزی سے کہہ رہی تھیں اور عدیل ناشتا کرنے کے لیے کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا لیکن عدیل کے لیے ناشتا گرم کرتی مریم کے ذہن میں ایک اور ریشم کا دھاگہ الجھ گیا تھا' وہ وقار آفندی اور جودت آفندی کی ادھیڑبن میں لگ گئی تھی' تو اس کا مطلب تھا کہ جودت آفندی اور وقار آفندی ایک ہی فیملی سے بی لانگ کرتے تھے؟ اور مریم سوچ سوچ کر پاگل ہو رہی تھی کہ آخر وہ اتنے امیر کبیر فیملی اور اپر کلاس سے تعلق رکھنے والا لڑکا اس کے پیچھے کیوں پڑ گیا ہے؟ اس کے لیے تو ایک سے بڑھ کر ایک لڑکی موجود تھی.... ماڈرن' اسٹائلش' خوب صورت اور پڑھی لکھی لڑکیاں' تو اسے بے شمار مل سکتی تھیں' پھر اس کی نظر انتخاب مریم پہ ہی کیوں ٹھہری تھی....؟ وہ اسے ہی اس طرح کیوں دیکھتا تھا....؟ اس کی نظریں اتنی بے باک ہوتی تھیں کہ مریم اندر ہی اندر سمٹ کے رہ جاتی تھی اور اب تو اسے اور بھی دھڑکا لگ گیا تھا کہ وہ جو بھی ایک بار اس کے سامنے آیا ہے' اب وہ بار بار سامنے آئے گا اور بار بار اس کے راستے کی رکاوٹ بنے گا' اور وہ جو اپنے گھر کے حالات بہتر کرنے کا عزم لے کر گھر سے نکلی تھی اس کا کیا بنے گا آخر ....؟ اور اسی "آخر" پہ آکر اس کی پریشانی اور تفکرات کے سائے شروع ہو جاتے تھے جو اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے لگتے تھے۔

☆ ☆ ☆

تیرہ نومبر اور چودہ نومبر کی درمیانی شب لے کر اب تک سب کزنز اسے باری باری وش کر رہے تھے۔

سب سے پہلے رات کے بارہ بجے اسے آذر نے وش کیا تھا اور سب سے پہلا گفٹ بھی آذر نے ہی دیا تھا' اس کے بعد وقار آفندی اور آسیہ آفندی اسے وش کرنے کے لیے اس کے بیڈ روم میں آئے تھے' ان کے جانے کے بعد باقی سب نے مل کر مدھم تالیوں کی دھن پہ اسے اتنے خوب صورت انداز میں وش کیا تھا کہ علیزے خوشی سے چہک اٹھی تھی۔

حرمت نے اس کے لیے کیک بیک کیا ہوا تھا اور رات سوا بارہ بجے اس نے وہی کیک کاٹ کر سب کا منہ میٹھا کروایا تھا' اور اسی طرح صبح وہ ناشتے کے لیے ڈائننگ روم میں آئی تو ڈائننگ روم تازہ پھولوں سے سجا ہوا نظر آیا۔

"یہ میری طرف سے لولی' پریٹی' سویٹ اینڈ بیوٹی فل ڈارلنگ علیزے کے لیے۔" جودت نے اچانک سامنے آتے ہوئے ایک سرخ رنگ کا تازہ گلاب اس کے سامنے پیش کیا یوں جیسے کوئی بوائے فرینڈ بڑے اسٹائل سے اپنی گرل فرینڈ کو پیش کر رہا ہو' علیزے کے ساتھ ساتھ باقی سب بھی اس کے انداز پہ مسکرا دیے تھے۔

"تھینک یو' ہینڈسم' چارمنگ' اینڈ ڈیشنگ برادر....." علیزے نے اسی کے سے اسٹائل میں کہتے ہوئے پھول اس کے ہاتھ سے تھام لیا جس پہ ڈائننگ روم میں موجود سبھی افراد یکدم قہقہہ لگا کر ہنسے تھے اور ان میں سب سے بلند قہقہہ وقار آفندی کا ہی تھا' وہ بیٹی کی شوخی و شرارت پہ بے پناہ خوش ہو رہے تھے اور ان سب کی انہی شوخیوں اور شرارتوں میں انہوں نے ناشتا کیا اور پھر سب اپنے اپنے کاموں اور اپنی اپنی تیاریوں میں لگ گئے تھے..... ہر طرف گہما گہمی کا سا سماں تھا ملازمین کی الگ دوڑ لگی ہوئی تھی مبارک خان سب کے سر پہ سوار اپنی نگرانی میں کام کروا رہا تھا تاکہ کوئی کمی نہ رہ جائے اور کوئی کوتاہی نہ ہو' وقار آفندی مبارک خان کے کام سے بہت خوش تھے وہ اپنا ہر کام محنت' لگن اور پورے دھیان سے مکمل کرتا تھا اور اس طرح کبھی کسی کو اس سے کوئی شکایت نہیں ہوتی تھی۔

شام کو جیسے ہی فنکشن اسٹارٹ ہوا دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ رہ گئی تھیں' کئی کنال پہ پھیلی ہوئی وسیع و عریض بڑی حویلی اس وقت روشنیوں کا ایک پورا جہان لگ رہی تھی اور روشنیوں کا یہ جہان اس وقت صرف اور صرف شہزادی علیزے کی خوشی میں آباد تھا' اور آج یہاں اس خوشی میں شہر کے بڑے بڑے امیر کبیر لوگوں نے شرکت کرنی تھی اور اس کی شروعات ہو چکی تھی' سب سے پہلے آسیہ آفندی کی دوست مسز بدر اپنی فیملی کے ساتھ آئی تھیں عاصم' سائم' فاطمہ اور مسٹر بدر کمال بھی ساتھ تھے۔

"ہائے آنٹی! کیسی ہیں آپ.....؟" فاطمہ آگے بڑھ کے آسیہ آفندی سے کافی شوق سے ملی تھی۔

"فائن بیٹا! آپ سناؤ کہاں ہوتی ہو..... بڑے عرصے بعد دیکھا ہے؟" آسیہ آفندی نے پیار سے گال سہلاتے ہوئے پوچھا۔

"بس! یونیورسٹی کی وجہ سے' بہت بزی ہوتی ہوں' لیکن آج سوچا کہ علیزے کو ہی دیکھ آؤں' آج کے دن تو علیزے کی چھب دیکھنے والی ہوتی ہے۔" فاطمہ نے کھلے دل سے تعریف کی اور اس کی اس تعریف میں کوئی مبالغہ آرائی بھی نہیں تھی کیونکہ ہمیشہ سادہ رہنے والی علیزے جب اپنی برتھ ڈے کے روز اتنے سارے لوگوں کی وجہ سے ہلکا پھلکا میک اپ کرتی تھی اور نازک سی جیولری پہنتی تھی تو یوں لگتا تھا جیسے وہ ہزاروں سنگھار کر کے سامنے آ گئی ہو۔

"بس بیٹا! یہ تو تمہاری محبت ہے' ورنہ تم خود اتنی خوب صورت اتنی پیاری ہو۔" انہوں نے اس کی ٹھوڑی کو چھوا اور فاطمہ مسکرا دی۔

"اچھا تو علیزے اب کہاں ہے.....؟" فاطمہ علیزے کو دیکھنے کے لیے بے چین ہو رہی تھی۔

"اپنے بیڈ روم میں ہے' تھوڑی دیر تک آ جائے گی۔" انہوں نے اسے تسلی دی تھی۔

"اوکے! لیکن کومل اور حرمت بھی نظر نہیں آ رہیں.....؟"

"تم اندر چلی جاؤ' تمہیں سب نظر آ جائیں گی۔" آسیہ آفندی نے مسکرا کر اندر کی سمت اشارہ کیا اور فاطمہ بھی جواباً مسکراتے ہوئے سرہلا کر اندر کی سمت بڑھ گئی۔

"ہوں! تو آج کل کیا مصروفیت ہے آپ لوگوں کی.....؟" آذر سائم اور جودت سے پوچھ رہا تھا جس پہ عاصم بے ساختہ مسکرا دیا کیونکہ اسے ان لوگوں کی مصروفیت کا تھوڑا بہت اندازہ پہلے سے ہی تھا اسی لیے پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ گھساتے ہوئے ہلکے سے کھنکارا تھا۔

"ہماری مصروفیت وہی ہے جو پہلے تھی' یونیورسٹی' یونیورسٹی اور یونیورسٹی..... بس اور تو کچھ نہیں۔" جودت نے کندھے اچکاتے ہوئے ذرا لاپروائی سے جواب دیا تھا' جس پہ سائم نے چہرا جھکا لیا۔

"بس اور تو کچھ نہیں نا.....؟" آذر نے دہرا کے پوچھا کیونکہ آج وہ دونوں بڑے عرصے بعد اکٹھے نظر آئے تھے۔

"جی ہاں! اور کچھ نہیں۔" دونوں نے نفی میں گردن ہلائی تھی۔

"کیوں عاصم صاحب! کیا یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں.....؟" آذر نے عاصم کو مخاطب کیا۔

"اتنے اچھے انداز میں کہہ رہے ہیں تو ٹھیک ہی کہہ رہے ہوں گے.....؟" عاصم نے بھی جواباً کندھے اچکائے تھے اور آذر بس دیکھ کے رہ گیا۔

"ارے آذر صاحب! جانے دیجیے' کیوں رنگ میں بھنگ ڈال رہے ہیں.....؟ آج انہیں انجوائے کرنے دیں' یہ انوسٹی گیشن کل کے لیے رہنے دیں۔" عاصم نے نرمی سے کہتے ہوئے ان کی جان بخشی کروائی تھی اور وہ بڑی سہولت سے وہاں سے کھسک گئے تھے' اور اتنی سی دیر میں ہی ان کا پورا لان لوگوں سے بھر چکا تھا حویلی کے گیٹ سے لے کر اندر ڈرائنگ روم تک ریڈ کارپٹ بچھا ہوا تھا اور اس خوب صورت ارینج منٹ کو مدھم سروں میں بجتا میوزک اور بھی دلفریب اور سحر انگیز بنا رہا تھا ہمیشہ کی طرح آج بھی لوگوں کی نظروں میں ستائش تھی اور کئی لوگوں نے باقاعدہ سراہا بھی تھا..... اور اس چیز کا سارا کریڈٹ مبارک خان کو جاتا تھا جس پہ وقار آفندی بھی خوش تھے اور مبارک خان بھی خوش تھا اتنے سارے لوگوں کی تعریف پہ اس کی ساری محنت وصول ہو گئی تھی۔

"مبارک خان! کیک آ چکا ہے یا نہیں.....؟" آسیہ آفندی اچانک کچھ یاد آنے پہ اپنے قریب کھڑی خواتین سے ایکسکیوز کرتی ہوئیں' مبارک خان کی طرف آ گئی تھیں۔

"جی بیگم صاحبہ! کیک تو ایک گھنٹہ پہلے ہی منگوا لیا تھا میں نے۔" مبارک خان نے کافی احترام اور تابعداری سے جواب دیا تھا۔

"ہوں شاباش! میں نے سوچا کہ کہیں آرڈر لیٹ نہ ہو جائے۔" وہ نرمی سے بولی تھیں۔

"بڑی حویلی سے کوئی آرڈر ہو اور وہ لیٹ ہو جائے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے بیگم صاحبہ؟ میں کیک چیک کرنے کے لیے تین بار گیا ہوں' یوں سمجھیں کہ پاس کھڑے ہو کر تیار کروایا ہے' ان شاءاللہ سب مہمانوں کو پسند آئے گا....." مبارک خان کو جیسے پورا یقین تھا۔

اور آسیہ آفندی جواباً کچھ کہنے ہی والی تھیں کہ احمد پاس آ گیا تھا۔

"آنی! وہ کچھ خواتین آپ کو یاد کر رہی ہیں۔" احمد نے ایک ٹیبل کی طرف اشارہ کیا تھا اور آسیہ آفندی نے فوراً گردن موڑ کر دیکھا ان کی کچھ جاننے والی خواتین بیٹھی ہوئی تھیں جنہیں ثروت بیگم کمپنی دے رہی تھیں۔

"اچھا! میں آ رہی ہوں' اور مبارک خان ٹھیک ہے تم جاؤ اپنا کام کرو۔" آسیہ آفندی کہتے ہوئے ان عورتوں کی سمت بڑھی تھیں انہوں نے آج گرے کلر کی خوب صورت نفیس اور انتہائی قیمتی ساڑھی زیب تن کر رکھی تھی

جس میں ان کی گریس فل شخصیت بہت متاثر کن لگ رہی تھی تھوڑی دیر پہلے وقار آفندی کے پہلو میں کھڑی بج رہی تھیں اور فوٹوگرافر نے ان کی کئی تصویریں بناڈالی تھیں۔

"زری.... زری بیٹا.... ادھر آجاؤ' چوٹ لگ جائے گی۔" یہ آواز آسیہ آفندی کی سماعتوں سے اچانک ٹکرائی تھی اور ان کے قدم بے ساختہ تھم گئے تھے انہوں نے اس آواز کی سمت تڑپ کر دیکھا ایک عورت اپنی تین چار سالہ بچی کو پکار رہی تھی جو لان میں کھیلتے ہوئے ادھر ادھر بھاگ رہی تھی' آسیہ آفندی اس پیاری سی بچی کو دیکھ کر رہ گئیں۔

"زری....؟" انہوں نے دھیمے اور کھوئے ہوئے انداز میں زیر لب دہرایا تھا اور یوں لگا جیسے ان کا دل مٹھی میں آگیا ہو' زری کے نام پہ ان کے دل سے ہوک نکلی تھی۔

"آنی! دیکھیں علیزے آگئی ہے۔" ان کے قریب ہی انوشہ بے تحاشا چہک کر بولی تھی اور آسیہ آفندی نے اس بچی سے نظریں ہٹا کر علیزے پہ مرکوز کردیں' علیزے انہی کی سمت آرہی تھی اور علیزے کے ایک ایک قدم پہ ہزاروں نگاہیں اٹھ رہی تھیں۔

بلیک کلر کے جدید تراش خراش کے انتہائی قیمتی اور خوب صورت لباس میں ملبوس علیزے آفندی اس وقت ہزاروں نگاہوں کے نیچے بسنے والے دلوں کی دھڑکنیں بے ترتیب کر گئی تھی اور آذر آفندی کے سینے میں تو کئی ہارٹ بیٹ مس ہوئی تھیں اور پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ اسے دیکھ کر آذر کے سینے میں دھڑکتے ایک جاندار نے کچھ بوکھلائی ہوئی حرکتیں سرزد کی تھیں.... بے اختیار اور اچانک.... شاید اس لیے کہ آج وہ پہلی بار سیاہ رنگ پہن کر آئی تھی.... یا شاید اس لیے کہ وہ پہلی بار اتنے دل سے تیار ہو کر آئی تھی....؟ لیکن جو بھی تھا سب کو مبہوت کرنے کے لیے کافی تھا' بلیک کلر کی لانگ شرٹ پہ بلیک دھاگے کا کافی نفیس کام کیا گیا تھا' سامنے دامن پہ اور بازوؤں کی پٹی پہ سلور کرسٹل کے نگ جڑے ہوئے تھے اور یہی نگ اس کے دوپٹے کی چاروں اطراف میں نظر آرہے تھے' چوڑی دار پاجامے کے نیچے بلیک پنسل ہیل والے سینڈل اس کے خوب صورت اور متناسب سراپے کو اور بھی نمایاں دکھا رہے تھے' اسٹائلش اور یونیک سے ہیر اسٹائل کے باوجود علیزے نے دوپٹہ کافی سلیقے سے سر پہ اوڑھ رکھا تھا۔ یہ اس کی عادت تھی وہ کبھی ننگے سر سامنے نہیں آتی تھی' البتہ اسے ننگے سر کسی نے دیکھا تھا تو وہ صرف منصور حسین تھا اسی لیے تو وہ اب کہیں نظر آجاتا تھا تو وہ نظریں چرا جاتی تھی۔

"مما! کیا دیکھ رہی ہیں؟" علیزے نے پاس آکر ماں کے ہاتھ تھام لیے تھے آسیہ آفندی یکدم چونک گئیں۔

"دیکھ رہی تھی کہ میری بیٹی ماشاء اللہ اب جوان ہوچکی ہے' شادی کے قابل ہوچکی ہے۔" انہوں نے پیار سے کہتے ہوئے علیزے کی نظر اتاری اور اسے اپنے ساتھ لگالیا تھا علیزے بری طرح جھینپ گئی۔

"مما....!" اس نے خفگی کا اظہار کیا تھا۔

"اچھا! ادھر آؤ مہمانوں سے ملو' سب تمہارا انتظار کررہے ہیں۔" آسیہ آفندی اسے ساتھ لے کر مہمانوں سے ملوانے لگیں اور رفتہ رفتہ کیک کاٹنے کا ٹائم بھی آن پہنچا تھا بڑے سے کیک پہ اس کا نام اور برتھ ڈے لکھا ہوا تھا' چھوٹی چھوٹی کیک کینڈلز کو گل کرتے ہی فضا میں ایک دم سے ہیپی برتھ ڈے اور تالیوں کی آواز گونجنے لگی یہاں تک کہ حویلی کے در و دیوار بھی گنگنا اٹھے تھے۔

علیزے نے سب سے پہلے وقار آفندی اور آسیہ آفندی کو کیک کھلایا تھا لیکن یہی کیک وقار آفندی کے حلق میں اٹک گیا تھا ان کے سیل پر ایک میسج موصول ہوا۔

"بیٹی کی سالگرہ مبارک ہو وقار آفندی' لیکن اتنا یاد رکھو آج تم اپنی بیٹی کی بیسویں اور آخری سالگرہ منا رہے ہو' آئندہ تمہیں موقع نہیں ملے گا... ان شاء اللہ!

وقار آفندی کے ہاتھ میں موبائل لرز کے رہ گیا اور ان کے چہرے کی رنگت یک لخت زرد پڑ گئی لیکن اتنے سارے لوگوں میں اور اس ہنگامے میں کوئی بھی ان کی سمت متوجہ نہیں تھا وہ مرے مرے بے جان قدموں سے چلتے ہوئے مرکزی حصے سے تھوڑا ہٹ گئے تھے' لیکن ان کی ایسی شکستہ سی حالت دیکھ کر گیٹ کے پاس کھڑا منصور حسین فوراً لپک کے ان کے قریب آیا۔

"ارے صاحب! آپ ٹھیک تو ہیں نا....؟ کیا ہوا ہے آپ کو؟" اس نے وقار آفندی کو تھام کر قریبی کرسی پہ بٹھایا تھا۔

"ایک گلاس پانی لادو۔" انہوں نے اپنی کنپٹی اور سینے کو سہلاتے ہوئے کہا۔

"جی ابھی لایا۔" وہ فوراً گیا اور پانی لے آیا تھا.... وقار آفندی ایک ہی سانس میں پورا گلاس پی گئے تھے۔

"اب ٹھیک ہیں آپ؟" منصور حسین فکرمندی سے پوچھ رہا تھا۔

"ہوں ٹھیک ہوں۔" وہ ابھی بھی اپنا سینہ سہلا رہے تھے اور اپنی کیفیت کو دبانے کی کوشش کررہے تھے کیونکہ اس وقت یہاں ہزاروں لوگ جمع تھے اور اتنے لوگوں میں ان کی ذرا سی بات بھی ایشو بن سکتی تھی اور رسوائی کے بھی بے پناہ امکان تھے اسی لیے ضبط کرجانا' اور خاموش ہوجانا ہی بہتر تھا' کیونکہ اس وقت کچھ بولنے کا یا ظاہر کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا بلکہ الٹا نقصان تھا۔

ان کی اپنی ہی جگ ہنسائی ہونی تھی کہ کسی نامعلوم اور ان دیکھے دشمن نے ان کی نیندیں اور ان کی زندگی حرام کر رکھی تھی اور وہ کچھ نہیں کرپارہے تھے بلکہ اس کے سامنے ہر طرح سے بے بس تھے....!

اور پھر فنکشن ختم ہونے تک وہ اسی طرح قدرے گم سم اور چپ چاپ سے رہے اور فنکشن ختم ہونے کے بعد بھی ان سب نے پوچھا تو طبیعت خرابی اور سر درد کا کہہ کر اپنے بیڈ روم میں چلے گئے تھے اس لیے باقی سب نے بھی خاموشی سے اپنے اپنے بیڈ رومز کا رخ کیا تھا اور ویسے بھی سب تھکے ہوئے تھے سب کو نیند آرہی تھی اس لیے کسی نے بھی اس مسئلے پہ زیادہ غور نہیں کیا تھا۔

✡ ✡ ✡

"ہیپی.... برتھ ڈے.... ٹو یو
ہیپی.... برتھ ڈے.... ٹو یو
ہیپی.... برتھ ڈے.... ٹو یو
مائی ڈیئر علیزے ڈارلنگ!"

وہ ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے بیٹھی اپنی جیولری اتار رہی تھی جب کوئی دھیمے سے گنگنا کر اسے وش کرتے ہوئے اندر داخل ہوا تھا' علیزے نے چونک کر آئینے میں نظر آتے عکس کو دیکھا اور پھر یکدم اسے کرنٹ چھو گیا وہ ایک سیکنڈ میں تڑپ کر سیدھی ہوئی تھی۔

"ڈرائیور! تم یہاں....؟ میرے بیڈ روم میں؟" علیزے پہ تو جیسے حیرت اور اچنبھے کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا رات کے اس پہر اپنے بیڈ روم میں کسی ملازم کو اتنے استحقاق سے داخل ہوتے دیکھنا بھی تو سر پہ پہاڑ ٹوٹنے کے ہی برابر تھا۔

"جی ہاں! میں یہاں.... شہزادی علیزے کی خواب گاہ میں۔" اس نے کہتے ہوئے انتہائی سکون اور سہولت سے دروازے کا لاک لگا کر بولٹ بھی چڑھا دیا۔

"ڈرائیور! یہ.... یہ کیا کررہے ہو تم....؟ تمہاری جرات کیسے ہوئی میرے بیڈ روم میں آنے کی۔" علیزے

اسے دروازہ بند کرتے دیکھ کر پاگل ہوا اٹھی تھی لیکن ساتھ ہی اس پہ خوف بھی طاری ہو چکا تھا کیونکہ وہ مضبوط قدم اٹھاتا اس کی سمت آرہا تھا۔

"یہ جرات میں ہزاروں بار کر چکا ہوں جان ڈرائیور! جرات کا قصہ نہ چھیڑو۔" وہ بڑی دلکشی سے کہتا ہوا عین اس کے سامنے آرکا' علیزے اس کے تیور دیکھ کر برف کی مانند ٹھنڈی ہونے لگی تھی اس کی خوب صورت پیشانی پہ ٹھنڈے پسینے کے قطرے نمودار ہو چکے تھے کیونکہ منصور حسین آج منصور حسین نہیں کچھ اور ہی لگ رہا تھا صاف ستھرا' خوشبوؤں میں بسا ہوا' اس کی ڈریسنگ بھی بے تحاشا قیمتی نظر آرہی تھی اور علیزے کے چاروں اطراف خوف وخطرے کی گھنٹیاں بجنے لگی تھیں وہ یکدم کسی متوحش ہرنی کی مانند بدحواس ہو کر دروازے کی سمت بھاگی تھی لیکن دوسرے ہی پل اس کی کلائی جکڑ کر اسے بیڈ کی سمت دھکیل دیا گیا تھا وہ بری طرح چکرا گئی تھی۔

"ڈرائیور.....!" وہ چیخ اٹھی تھی۔

"میں ڈرائیور نہیں ہوں تمہارا۔" اس نے اپنی جیب سے سگریٹ اور لائٹر نکالتے ہوئے سکون سے جواب دیا تھا۔

"تو پھر..... کک کون ہو تم؟" علیزے یکدم بیڈ سے اٹھ بیٹھی۔

"شوہر ہوں تمہارا۔" اس کا سکون ہنوز برقرار تھا اسے اپنی آنکھوں کے سامنے دنیا گھومتی ہوئی نظر آئی تھی۔

"شوہر؟ کیا مطلب ہے تمہارا' کون ہو تم..... تم بتاتے کیوں نہیں۔" علیزے خود میں بمشکل ہمت پیدا کرتی ہوئی اس کے سامنے آکھڑی ہوئی وہ عجیب سے انداز میں مسکراتے ہوئے سگریٹ سلگانے لگا تھا اور پھر گہرا کش لے کر دھواں علیزے کے چہرے پہ چھوڑ دیا تھا۔

"دل آور شاہ!" اس نے دھواں علیزے کے چہرے پہ چھوڑنے کے ساتھ ساتھ اپنا نام بھی اس کے چہرے پہ پھونک دیا تھا۔

"دل آور شاہ.....؟"

"ہوں! دل آور شاہ..... اور تم دل آور شاہ کی بیوی ہو۔" اس نے کہتے ہوئے علیزے کا ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب کر لیا اور پتھر کی مورتی کی طرح پتھرائی ہوئی علیزے کے کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی تھی۔

ڈرائیور' منصور حسین' دل آور شاہ' شوہر' بیوی یہ سب اس کے ذہن میں گڈمڈ سے ہو رہے تھے۔

(باقی آئندہ ماہ ملاحظہ کریں)

✲ ✲

نبیلہ عزیز

دردِ دل

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نبیل حیات دو ہی بہن' بھائی ہیں' مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے' وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پہ رنگ چکی ہے' جس کے پیش نظر فائزہ بیگم' نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں' لیکن مدحیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے' جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے' مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے' مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا' بے بسی اور مجبوری سے تنگ آ کر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے' لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باؤ امتیاز مل جاتا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے' جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے' اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے' وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے' وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے' وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے' اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا' اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔

۲۱

اکیسویں قسط

اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا۔

"بیوی۔۔۔؟" ان سب لفظوں پہ اور ان سب ناموں پہ یہ ایک نام بھاری ہوگیا تھا اور اس لفظ کا یہ بھاری پن علیزے کے نازک دل و دماغ اور نازک اعصاب سے سہارنا مشکل ہوگیا۔ اس کے حواس اس کا ساتھ چھوڑنے لگے تھے اور اس سے پہلے کہ وہ لڑکھڑا کر نیچے زمین پہ آگرتی دل آور شاہ نے احتیاط سے اسے بازو سے پکڑتے ہوئے بیڈ پہ بٹھا دیا اور خود بھی اس کے بے حد قریب بیڈ پہ ہی بیٹھ گیا۔

"ایک شوہر اپنی بیوی کو حاصل کرنے کے لیے کبھی اتنی جدوجہد اور اتنا صبر نہیں کرتا جتنا میں نے کیا ہے۔ انتظار ہی کرتا رہا کہ کب تم بیس سال کی ہوگی اور کب میری دسترس میں آؤگی۔۔۔؟ تمہیں پانے کے لیے تو میں نے رانجھا بننے میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔۔۔ اب دعا کرو کہ کوئی کیدو پیدا نہ ہو؟" دل آور نے انتہائی سکون اور نرمی سے کہتے ہوئے اس کا نازک دودھیا مخملی سا ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھ میں لیتے ہوئے ہلکے سے دبایا تھا اور علیزے اس کے مضبوط ہاتھ کے دباؤ اور حدت سے یک دم جیسے پھر سے حواسوں آگئی تھی' اسے کرنٹ چھو گیا تھا۔

"چھوڑو میرا ہاتھ۔۔۔" وہ اس کے ہاتھ کے نیچے سے اپنا ہاتھ کھینچتی ہوئی جھٹکے سے کھڑی ہوگئی لیکن دوسرے ہی پل وہ دل آور کے ہلکے سے جھٹکے سے ہی اس کے اوپر آرہی تھی۔

"اتنا احتجاج کس لیے میری جان۔۔۔؟ احتجاج کرنے سے پہلے کم از کم یہ ضرور۔ سوچ لینا چاہیے کہ ہم آخر کتنے پانی میں ہیں۔۔۔؟ ڈٹ جائیں گے یا بہہ جائیں گے؟" وہ اسے احتیاط سے سمیٹ چکا تھا وہ تڑپی تھی۔ ماہی بے آب کی مانند۔

"ڈرائیور پلیز۔ اچھوڑ دو مجھے تم کون ہو۔۔۔؟ کیا ہو۔۔۔؟ میں بالکل بھی نہیں جانتی' پلیز۔۔۔" علیزے کے حلق میں بے بسی کے مارے آنسوؤں کا گولا سا اٹک گیا۔

وہ اپنے ہی گھر میں' اپنے ہی بیڈ روم میں اتنی بے بس ہوچکی تھی کہ اپنے بہت اپنوں کو بھی مدد کے لیے نہیں پکار سکتی تھی کیونکہ بیڈ روم کی دیواریں ساؤنڈ پروف تھیں۔۔۔ اور علیزے بے بس۔۔۔

"جانِ ڈرائیور! میں کون ہوں۔۔۔؟ کیا ہوں۔۔۔؟ تم یہ سب جاننے لگوگی لیکن دو گھڑی پاس تو بیٹھو' دھڑکنوں کا دھڑکنوں سے تال میل تو ہونے دو' کچھ ڈرائیور کی سمجھو اور کچھ ڈرائیور کو سمجھاؤ' مسئلے تو تب ہی حل ہوتے ہیں جب باہمی مشورے اور مذاکرات کیے جائیں' اس طرح اٹھ اٹھ کر بھاگنے سے سوائے کھینچا تانی کے اور کچھ نہیں ہوتا۔۔۔" دل آور نے اسے دوبارہ بیڈ پہ بٹھا دیا۔

اور سگریٹ کا آخری کش لے کر سگریٹ کو قالین پہ پھینکا اور اپنے بوٹوں تلے مسل دیا۔

"سوری! تمہارے بیڈ روم میں ایش ٹرے نہیں ہے نا اس لیے قالین کو زک پہنچانی پڑی۔" اس نے ساتھ ساتھ معذرت کے آداب بھی پورے کیے تھے اور پھر ذرا سا ترچھے انداز میں بیٹھتے ہوئے پوری توجہ سے اس کی سمت متوجہ ہوا۔

"بتاؤ کیا جاننا چاہتی ہو۔۔۔؟ کیا بتاؤں تمہیں۔۔۔؟" وہ جیسے اب اپنے اصل روپ اور اصل مزاج میں آگیا تھا اس کے دیکھنے کا انداز اور بولنے کا لہجہ بدل گیا تھا علیزے چونک گئی۔ اور ایک پل کے لیے اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی سی دوڑ گئی اور خوف سے روح بھی کپکپا اٹھی۔

"خیرو بابا پہ فائرنگ کروانے سے لے کر اب تک کیا کیا ہوا ہے۔۔۔؟ سب بتاتا ہوں تمہیں' اک بات بھی نہیں چھپاؤں گا پہلے یہ لفافہ کھول کر چیک کرلو' اس میں نکاح نامہ بھی ہے' اس کی بھی تسلی کرلو اور جان لو کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں۔۔۔؟" دل آور شاہ نے نپے تلے سرد و سپاٹ سے لہجے میں کہتے ہوئے اپنی پینٹ میں اڑسا ہوا لفافہ نکال کر علیزے کی گود میں رکھ دیا۔

یوں جیسے اسے منہ دکھائی پیش کی ہو اور علیزے کی رنگت متغیر ہوگئی' خیرو بابا پہ فائرنگ کا ذکر سن کر تو اس کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہوگئے تھے اس لیے گود میں رکھا لفافہ اٹھا کر کھولنے کی تو اس میں ہمت ہی نہیں تھی' خوف لمحہ بہ لمحہ قطرہ قطرہ اس کی رگوں میں پھیلتا جارہا تھا اور اس خوف کی لرزش اس کے ہاتھوں سے نمایاں نظر آرہی تھی' اس کے ہاتھ بری طرح کپکپا رہے تھے لیکن پھر بھی اسے وہ لفافہ تو کھولنا تھا سو بڑی مشکل سے اپنی ہمتیں مجتمع کرتے ہوئے اس نے ہاتھ بڑھا کر وہ لفافہ اٹھایا اور چاک کردیا۔

☼ ☼ ☼

دھڑام کی آواز سے کچھ گرا اور گر کر ٹوٹ گیا۔

اور ٹوٹ کر بکھرنے کی یہ آواز بہت دور تک گئی تھی اتنی دور کہ سننے والے دہل گئے تھے۔

"زری۔۔۔! کچھ گرا ہے۔۔؟" نگارش نے سیڑھیوں کی ریلنگ سے جھکتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔" زری کی بے یقین اور سہمی ہوئی۔ آواز سنائی دی۔

"کیا گرا ہے۔۔۔؟" نگارش نے دوبارہ پوچھا۔

"میرا دل۔۔۔" زری کی سہمی ہوئی سی آواز کو نگارش مذاق سمجھی تھی۔

"اچھا۔۔۔! تو کیا ٹوٹ گیا؟"

"ہاں بھابھی! ٹوٹ گیا۔۔۔ ٹوٹ گیا میرا دل۔" اب کی بار زری کی آواز میں آنسوؤں کا غلبہ تھا وہ شاید رو پڑی تھی اور نگارش ٹھٹک کر سیدھی ہوئی اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی سیڑھیاں اتر آئی زری لاؤنج میں لگے ریک کے پاس کھڑی تھی اور کافی شدت سے رو رہی تھی اور اس کے رونے کی وجہ نگارش کو لاؤنج کے فرش پہ ہی بکھری نظر آگئی تھی جس پہ نگارش کا دل بھی دھک سے رہ گیا۔

بلیک کلر کا کافی مگ بڑی بے دردی سے ٹوٹ کر ٹکڑوں میں تقسیم ہوچکا تھا' یہ مگ تین چار سال پرانا تھا' زری ایک بار مدیحہ کے ساتھ مارکیٹ گئی تھی اور وہاں اسے یہ مگ بہت پسند آئے تھے تب اس نے تین مگ ایک ساتھ خریدے تھے' دل آور شاہ' نبیل حیات اور عبداللہ کے لیے۔۔۔!

اپنی پسند سے اس نے بلیک کلر کا مگ دل آور شاہ کے لیے سلیکٹ کیا تھا' جبکہ عبداللہ کا نیوی بلو کلر اور نبیل حیات کا چاکلیٹی کلر میں تھا۔ ان کے کلرز مختلف لیکن ڈیزائن اور شیپ ایک جیسے ہی تھے جو ان تینوں کو بہت پسند آئے تھے اور یہی وہ مگ تھا جس میں پہلی مرتبہ اس نے کافی بنا کر دل آور کو دی تھی اور وہ پہلی مرتبہ ہی چونک گیا تھا۔ اسے اس مگ سے لپٹی خوشبو اور چاہت کا احساس ہوگیا تھا اور پھر یہ احساس ہمیشہ بڑھتا ہی رہا۔ جب بھی وہ تینوں دوست ان کے گھر میں اکٹھے بیٹھتے تھے تو نگارش اور زری انہیں انہی میں کافی یا چائے بنا کردیتی تھیں اور جب سے دل آور اور نبیل پاکستان گئے تھے عبداللہ نے بھی اپنے مگ میں کافی پینا چھوڑ دیا تھا۔ اس لیے نگارش نے وہ تینوں مگ صاف کرکے لاؤنج کے ریک میں سجا دیے تھے اور آج زری کو خیال آیا کہ وہ یہ مگ پیک کرکے دیگر سامان میں رکھ دے' تاکہ پاکستان جاکر وہ لوگ پھر اپنی کافی کی یاد تازہ کرلیتے' لیکن دو مگ پیک کرنے کے بعد جب اس نے تیسرے کو اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو نہ جانے کیا ہوا' وہ بلاوجہ ہی اس کے ہاتھوں سے پھسل گیا۔ جس کا صدمہ اسے ہچکیوں سے رلا گیا۔

"زری پلیز۔۔۔ کنٹرول میری جان' اب اتنی سی بات پہ کیا رونا۔۔۔؟ کانچ کی چیز تو ہوتی ہی ٹوٹنے کے لیے ہے۔" نگارش نے آگے بڑھ کے اسے اپنے ساتھ لگالیا۔

"بھابھی۔۔۔! اس کانچ کی چیز میں میری محبت کا پہلا لمس' پہلا احساس بسا تھا۔۔۔ بکھر گیا وہ احساس' گر کر ٹوٹ

گیا۔" زری کا دل یوں تھا جیسے کسی نے اپنے ہاتھ کی دونوں مٹھیوں میں بڑے زور سے بھینچ رکھا ہو' جس سے اس کے دل کا دم گھٹ رہا تھا اور جان ٹوٹ رہی تھی۔

"ارے نہیں پاگل... اب اپنی محبت کو اس بے جان چیز سے تو مشروط مت کرو' محبت کسی کی نشانیوں کی محتاج نہیں ہوتی۔" نگارش نے اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے سہلایا۔

"محبت نشانیوں کی نہیں لیکن احساس کی محتاج تو ہے نا؟ اور اس کانچ کے مگ میں تو میری محبت کے کئی احساس پوشیدہ تھے؟ یہ احساس بکھرے ہیں تو میرا دل بھی تو بکھرے گا نا؟" زری کے دل پہ ممکنہ دکھ کے الہام اتر رہے تھے اور اس کی کیفیت کچھ ایسی ہو رہی تھی کہ جسے دیکھ کر نگارش کا دل بھرنے لگا۔

"پلیز زری...! سنبھالو خود کو' کچھ نہیں ہوا' صرف مگ ہی تو ٹوٹا ہے؟ ہم دل آور بھائی کے لیے نیا اور اس سے زیادہ اچھا مگ لے آئیں گے' جو تمہاری طرف سے ان کے لیے گفٹ ہی ہوگا۔" نگارش نے اسے بہلانے کی کوشش کی تھی۔

"نہیں بھابھی...! یہ صرف مگ نہیں ٹوٹا' اس مگ کے ساتھ تو بہت کچھ ٹوٹا ہے' لوگ کہتے ہیں کہ جب کانچ کی کوئی چیز ٹوٹتی ہے تو سمجھو کوئی انہونی ہونے والی ہے اور آپ... آپ جانتی ہیں کہ میرا دل کوئی بھی انہونی سہنے والا دل نہیں ہے' ادھر کچھ ہوگا' ادھر یہ مر جائے گا۔" وہ رو رہی تھی' بلک رہی تھی اور نگارش اسے بچوں کی طرح سنبھال رہی تھی۔

"زری...! صرف تین' چار روز کی بات ہے' ان شاء اللہ ہم پاکستان جائیں گے تو تمہارے سارے وہم اور وسوسے دور ہو جائیں گے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" نگارش اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے اسے تسلی دے رہی تھی۔

لیکن آج کل نہ جانے کیوں زری کے دل کی اتنی عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی کہ لاکھ سمجھانے اور بہلانے سے بھی نہیں بہل رہا تھا۔ بہت دیر بعد وہ چپ ہوئی تھی اور رو دھو کر لاؤنج میں بکھرے کانچ کے ٹکڑے اٹھانے لگی' لیکن یہ کانچ کے ٹکڑے اٹھاتے ہوئے اس کا دل لہولہان ہو رہا تھا۔ مگر وہ بمشکل ضبط کرتی ہوئی ٹکڑے سمیٹ کر اپنے بیڈ روم میں آ گئی۔ یہاں اس وقت سوا نو بجے کا وقت تھا اور پاکستان میں رات کے سوا دو بج رہے تھے۔

پاکستان میں رات کے سوا دو بجے ایسا کیا ہوا ہے' جس نے زری کے دل کو اپنی مٹھیوں میں لے کر بری طرح مسل ڈالا تھا؟ زری کے پاؤں کے تلوے زمین پہ نہیں لگ رہے تھے۔ وہ اضطراب کے مارے دائیں بائیں چکرا رہی تھی۔ اس کے دل و دماغ پہ بے کلی اور بے چینی سوار ہونے لگی تھی۔ لیکن وہ فی الحال یہ معلوم نہیں کر سکی کہ آخر ہوا کیا ہے؟ یوں بیٹھے بیٹھے اس کے دل کی حالت اتنی غیر کیوں ہو گئی ہے؟ صرف مگ ٹوٹ جانے پہ تو ایسا نہیں ہو سکتا تھا؟ زری ہر طرف سے بے بس ہو کر کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی — باہر موسم بہت سرد ہو رہا تھا اور اس کے اندر آتش دہک رہا تھا' شعلے اگلتا ہوا اور زری اس ٹھنڈے اور گرم موسم کی زد میں کھڑی سب کچھ اپنے دل پہ سہار رہی تھی' بڑی ہمت اور بہادری کے ساتھ۔

✲ ✲ ✲

پندرہ نومبر کا سورج طلوع ہو چکا تھا۔

علیزے آفندی اور دل آور شاہ نے رات جاگ کے گزاری تھی۔ ایک ہی بیڈ پہ آمنے سامنے بیٹھ کر... آنکھوں آنکھوں میں رات بیت گئی تھی اور اسی رات میں یوں لگ رہا تھا جیسے دونوں کی ذات بیت گئی تھی۔ ایک سرا علیزے آفندی کے ہاتھوں میں تھا اور ایک سرا دل آور شاہ کے ہاتھ میں۔ وہ ساری باتیں اور سارے

ثبوت اس پہ واضح کر چکا تھا جن کو جاننے اور دیکھنے کے بعد علیزے آفندی چپ ہو گئی تھی... بلکہ چپ لگ گئی تھی' چپ کا تالا لگ گیا تھا اور اس تالے کی کنجی اور اسے کھولنے کا اختیار اب صرف دل آور شاہ کے پاس تھا... تو کیا اس ایک رات میں وہ سارے اختیار دل آور شاہ کو سونپ چکی تھی؟ اس نے اپنا سب کچھ اس کے ہاتھ میں دے دیا تھا؟ وہ جو بھی چاہتا کر سکتا تھا؟ تو اس کا مطلب تھا کہ گزشتہ رات محض ایک رات نہیں تھی... بلکہ قیامت کی رات تھی۔

اور اس قیامت کی رات نے علیزے آفندی کی ذات کے سارے غرور چھین لیے تھے۔ اس کی معصومیت کو دھجی دھجی بکھیر ڈالا تھا۔ اس رات کے بعد وہ تو علیزے آفندی کے قدموں کی خاک بھی نہیں رہی تھی۔ اس کے سارے ناز' سارے غرور مٹی میں مل گئے تھے۔ وہ آج منہ کے بل گری تھی اور یہ گرنا اسے توڑ کے رکھ گیا تھا... وہ اٹھنے اور سنبھلنے کے قابل نہیں رہی تھی اور اسی گم سم حالت میں صبح ہو گئی اور صبح کے انتظار میں بیٹھا دل آور شاہ آہستگی سے اس کے بیڈ سے اٹھ کھڑا ہوا اور پھر گم سم بیٹھی علیزے کے سامنے اپنا مضبوط ہاتھ پھیلا دیا تھا۔ علیزے اس کے ہاتھ کو دیکھتے ہوئے چونکی تھی' بلکہ اپنے سامنے پھیلے ہوئے اس کے ہاتھ کا مفہوم سمجھتے ہوئے خاموشی سے اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا اور دل آور نے اپنے ہاتھ کے زور پہ اسے بیڈ سے اٹھنے میں مدد دی تھی۔

اور پھر بڑی احتیاط سے اسے اپنے ساتھ لیے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ علیزے اس کے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہونے کا مطلب بھی سمجھ گئی تھی۔ یعنی وہ اسے فریش دیکھنا چاہتا تھا اور علیزے اس کے چاہنے کے مطابق اپنے چہرے کو ٹشو سے صاف کرتے ہوئے بالوں میں برش پھیرنے لگی اور یوں ہی بالوں میں پھیرتے ہوئے اچانک اس کی نظر ٹیبل پہ رکھے ان گفٹس کی سمت اٹھی تھی جو کل اسے سب لوگوں نے اور کزنز نے دیے تھے اور جو اس نے ابھی تک کھول کر دیکھے ہی نہیں تھے اور انہی گفٹس میں گولڈن ریپر اور گولڈن ربن سے سجا ہوا آذر آفندی کا گفٹ بھی ہنوز پیکنگ میں بند پڑا تھا۔

"دیر ہو رہی ہے ہمیں۔" دل آور شاہ نے گھڑی دیکھتے ہوئے اسے متوجہ کیا اور علیزے —— کو ان گفٹس سے نظریں چرانی پڑ گئیں۔ بال سمیٹ کر وہ اس کی سمت پلٹی۔ اس کی ڈریسنگ البتہ رات والی ہی تھی۔ وہی سیاہ سوٹ... کسی کی قسمت سے بھی زیادہ سیاہ... اسی ڈریس کے نیچے اس نے سیاہ سینڈل پہنے تھے اور سینڈلز کے اسٹریپس بند کرنے کے بعد وہ سیدھی کھڑی ہو چکی تھی۔

"چلیں...؟" وہ کافی سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔ لیکن علیزے کو جواب دینے میں بڑی دقت ہوئی تھی۔

"ہوں! چلیں..." اس کی آواز تھی یا ہوا کا دھیما جھونکا' جو غیر محسوس انداز میں چھو کے گزر گیا اور دل آور شاہ نے اس کے برابر کھڑے ہوئے اپنا دایاں بازو اس کے کندھوں کے گرد حمائل کر دیا اور وہ نازک کانچ کی گڑیا اس کے بازو کے حصار میں آ گئی تھی اور تب دل آور شاہ نے اپنے نمبر سے ایک کال ملائی تھی۔ اسی حویلی کے ایک نمبر پہ...!

✲ ✲ ✲

وقار آفندی ڈائننگ ہال میں بیٹھے اپنے الجھے بکھرے اور منتشر سے ذہن کو اخبار کی سرخیوں میں گم کرنے کی کوششیں کر رہے تھے۔ جب ٹیبل پہ رکھے ان کے سیل پہ رنگ بجی تھی اور اس قدر اچانک اور غیر متوقع انداز میں بجی تھی کہ اخبار ان کے ہاتھ میں لرز گیا۔ حالانکہ یہ لرزش تو ان کے ہاتھوں میں رات سے ہی ہو رہی تھی۔ اس وقت تو رنگ ٹیون کا محض بہانا بنا تھا... انہوں نے جلدی سے سیل اٹھا کر دیکھا تھا۔ نمبر وہی رات والا تھا' جس

سے انہیں وہ میسج موصول ہوا تھا اور وہ اسی نمبر سے کال دیکھ کر اندر سے ٹھٹھر کے رہ گئے۔ لیکن کال کرنے والے کو جاننے کے لیے کال ریسیو کرنا بے حد ضروری تھا۔ اس لیے انہوں نے فوراً" کال ریسیور کرلی تھی۔

"ہیلو! کون....؟" اتنی بڑی شخصیت ہونے کے باوجود وقار آفندی کے لہجے میں خوف بول رہا تھا۔

"تمہارا داماد...." جواب مختصر مگر کاٹ ڈالنے والا تھا۔

"کون ہو تم....؟ اور کیا بکواس کررہے ہو؟" وقار آفندی سے اس وقت مشتعل ہونے کی امید نہیں تھی' لیکن پھر بھی وہ مشتعل ہو رہے تھے۔

"میں وہی ہوں جسے تم اتنے عرصے سے اندر ہی اندر پاگلوں کی طرح تلاش کررہے ہو اور تمہاری بیٹی مجھے پہلو میں لیے پھر رہی ہے۔" اس آواز میں طنز تھا' تمسخر تھا' ایسا سب کچھ تھا جس سے وقار آفندی کی ہستی تڑپ اٹھتی۔

"یقین نہیں آتا تو اپنی بیٹی کے بیڈ روم میں آکر دیکھو' میں تمہیں وہیں ملوں گا۔" اتنا کہنے کے بعد کال ڈس کنیکٹ ہو گئی اور وقار آفندی پاگل ہو اٹھے تھے۔ علیزے کا خیال آتے ہی ان کا دل مٹھی میں آگیا۔ وہ سیل اور اخبار وہیں چھوڑ کے یک دم اٹھ کر لپکے تھے۔ جس کی وجہ سے انہیں کرسی سے ٹھوکر بھی لگی تھی۔ وہ بمشکل گرنے سے بچے۔ کیونکہ بروقت دوسری کرسی کی بیک کا سہارا لے لیا تھا۔ لیکن وہ دو منٹ سنبھلنے کے لیے بھی نہیں ٹھہرے۔ انہیں لگ رہا تھا کہ جیسے بہت دیر ہو چکی ہے۔ وہ ایک سیکنڈ کے اندر اندر علیزے کے بیڈ روم تک پہنچنا چاہتے تھے۔ لیکن بڑی حویلی کے تین پورشنز کا طویل ترین زینہ طے کرتے ہوئے ان کی ساری ہمتیں جواب دے رہی تھیں۔ ان کا ہر قدم شکستگی کی سمت بڑھ رہا تھا اور اپنے بیڈ روم سے نکلتے آذر نے ان کو دیکھا اور وہ یہی سمجھا کہ ڈیڈ یقیناً" علیزے کے بیڈ روم میں اسے جگانے کے لیے جارہے ہیں۔ اس لیے ذرا لاپروائی سے کام لیتے ہوئے نیچے اتر آیا اور وقار آفندی اوپر علیزے کے بیڈ روم کے سامنے پہنچ گئے۔ بیڈ روم کے دروازے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے ان کا ہاتھ کانپ رہا تھا اور جیسے ہی وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے تھے ان کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں۔

سامنے کا منظر قیامت سے کم نہیں تھا۔ اس منظر میں حشر برپا تھے۔ کیونکہ علیزے جس کے بازو کے حصار میں کھڑی تھی وہ کوئی اور نہیں ان کے اپنے گھر کا ملازم اور علیزے کا ڈرائیور منصور حسین تھا۔

"منصور حسین....؟" وقار آفندی کے دماغ کی رگیں تن گئیں' جبکہ دل آور شاہ کی موٹی موٹی آنکھوں میں سرخ ڈورے ہلکورے لینے لگے تھے۔ غضب اس کے چہرے کے نین نقوش میں اتر آیا تھا۔ لیکن پھر یہ سوچ کر کہ جب علیزے اس کی تھی' اس کے ساتھ تھی تو پھر یہ غیض و غضب بھلا کس لیے....؟ اس نے اپنے اندر کے بپھرے ہوئے زخمی شیر کو سلا دیا تھا' تھپک دیا تھا تھوڑی دیر کے لیے۔

"منصور حسین نہیں! منصور حسین کا پوتا ہوں میں.... منصور حسین شاہ کا پوتا.... اور بابر شاہ کا بیٹا.... دل آور شاہ ہوں میں.... دل آور شاہ۔" اس نے اپنی سمت انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے چبا چبا کر اتنے ٹھوس اور اٹل انداز میں تعارف کرا دیا کہ اس کے تعارف میں کوئی شک نہیں رہ گیا تھا اور وقار آفندی کھڑے کھڑے اس بڑی حویلی کے تین پورشنز سے نیچے گرے اور حویلی کی مضبوط ترین عمارت کے ملبے تلے دب گئے تھے۔ جہاں سے نکلنا اب ان کے بس کی بات نہیں تھی۔

"دل آور شاہ....؟" یوں جیسے ان کے ہونٹوں نے اس کا نام لینے کی کوشش کی تھی' ہلکی سی جنبش کے ساتھ۔

"ہاں دل آور شاہ! تمہاری بیٹی کا ڈرائیور نہیں' تمہاری بیٹی کا شوہر' جس کی تصدیق کے لیے تم نکاح نامہ بھی دیکھ سکتے ہو اور تسلی کے لیے اپنی بیٹی سے بھی پوچھ سکتے ہو' بلکہ یہاں ہی نہیں تم اسے اکیلے لے جا کر بھی پوچھ سکتے ہو' میری طرف سے اجازت ہے۔" دل آور شاہ نے وقار آفندی کی ملبے تلے دبی ہوئی لاش کو اور بھی زمین کے اندر دبا دیا تھا۔ لیکن اک لاش نما فنا شدہ وقار آفندی نے نہ جانے کس طرح علیزے کی سمت دیکھا تھا کہ ان کی

سوالیہ نظروں کے سوال پہ علیزے نے آہستگی سے سر جھکا لیا۔

"جی پاپا! یہ سچ ہے' میں اس سے شادی کر چکی ہوں' میرا اس کے ساتھ نکاح ہو چکا ہے' اب یہ میرا شوہر ہے' پہلے آپ کو اس لیے نہیں بتایا کیونکہ مجھے آپ کے ری ایکشن کا پتا تھا۔ لیکن آج اس لیے بتا رہی ہوں کہ میں آج اپنی مرضی' اپنی رضا سے یہ حویلی چھوڑ کر اپنے شوہر کے ساتھ اس کے گھر جارہی ہوں' لہٰذا مجھے روکنے کی اور میرے سامنے رکاوٹ بننے کی کوئی بھی کوشش نہ کرے' آپ' نہ کوئی اور...."

علیزے آفندی کی آواز پہ جہاں آذر آفندی کے قدم دروازے میں ہی رک گئے تھے وہیں وقار آفندی کی شریانوں میں گردش کرتا خون بھی رک گیا تھا۔ نبضیں تھمنے لگی تھیں اور دل بند ہو رہا تھا۔ چہرے پہ مرگ کا عالم تھا اور اسی عالم مرگ میں آذر آفندی بھی دم بخود اور ششدر سا کھڑا تھا۔ وہ ابھی ابھی نیچے ڈائننگ ہال میں گیا تھا اور وہاں گرا ہوا اخبار اور ڈیڈ کا سیل دیکھ کر وہ چونک گیا اور جیسے ہی سیل چیک کیا تو رات والا میسج سامنے آیا تھا۔ تب ہی وہ پریشانی سے پلٹا اور ان کے پیچھے چلا آیا تھا۔ لیکن علیزے کے بیڈ روم کے دروازے میں پہنچ کر اس کے قدم زمین نے جکڑ لیے تھے اور اس میں کچھ بھی کہنے کی صلاحیت نہیں رہی تھی۔ آذر آفندی کی سماعتوں کے پرخچے اڑ گئے تھے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی علیزے کو اور کبھی دل آور شاہ کو دیکھ رہا تھا جو اس کی نظر میں اب بھی منصور حسین ہی تھا۔ البتہ منصور حسین کی اصلیت کیا تھی یہ تو صرف وقار آفندی ہی جانتے تھے۔

"چلیں....؟" دل آور شاہ نے علیزے سے کہتے ہوئے وقار آفندی اور آذر آفندی کی سمت دیکھا۔

"ہوں...." علیزے نے آہستگی سے سر ہلایا اور پھر دل آور شاہ کے بڑھتے ہوئے قدم کے ساتھ قدم ملانا پڑا۔

"منصور حسین...." آذر ان کو دروازے کی سمت بڑھتے دیکھ کر یک دم بپھر گیا۔

"خبردار آذر آفندی! اپنی جگہ سے ایک انچ بھی آگے بڑھے تو گولیوں سے چھلنی کردوں گا۔" دل آور شاہ نے یک دم ریوالور سامنے کرتے ہوئے اسے منجمد کر ڈالا۔ وہ ان سب کو بے بس کرنے کے پورے پورے انتظام کر کے آیا تھا۔ علیزے ــ اس کے ریوالور کی زد میں آذر آفندی کو دیکھ کر دھک سے رہ گئی۔

"پلیز آذر بھائی....! میں نے آپ سے کہا نا کہ کوئی بھی میرے راستے کی رکاوٹ نہ بنے' تو پھر کیوں آپ خوامخواہ ہنگامہ کرنا چاہتے ہیں' ہر لڑکی اپنے شوہر کے ساتھ جاتی ہے۔ میں بھی جا رہی ہوں' پلیز آپ روکنے کی کوشش مت کریں۔" علیزے نے کافی سخت لہجے میں آذر کو منع کر دیا اور آذر ساکت و صامت رہ گیا تھا۔

"علیزے۔" وہ بے یقینی سے بولا۔

"مر چکی ہے آپ کی علیزے.... میں اب آپ کی علیزے نہیں ہوں.... نہیں ہوں میں آپ کی علیزے۔" وہ بھی یک دم بکھر گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں امڈتے آنسو آذر نے واضح محسوس کیے تھے۔ لیکن پھر بھی وہ کچھ نہ کر سکا تھا۔ دل آور شاہ اسے ساتھ لے کر بیڈ روم سے نکل گیا۔

"علیزے....!" وقار آفندی کے منہ سے محض اس کا نام سنائی دیا تھا اور وہ کھڑے قد سے یک دم تیورا کے نیچے زمین پہ آگرے۔

"ڈیڈ....!" ان دونوں کے پیچھے نکلتا آذر یک دم وقار آفندی کے گرنے کی آواز سن کر ان کی سمت لپکا۔

"علیزے! ڈیڈ...." آذر دو زانو نیچے زمین پہ بیٹھتے ہوئے اپنی پوری قوت سے چیخا تھا۔

"علیزے....! ڈیڈ مر جائیں گے۔"

آذر زور' زور سے چیخ رہا تھا اور اس کے چیخنے کی آواز باقی گھر والوں کے ساتھ ساتھ سیڑھیاں اترتی علیزے بھی سن چکی تھی' تب ہی دل آور شاہ کے ہاتھ میں دبا اس کا ہاتھ کانپا تھا اور قدم ٹھٹک کے رکے تھے۔ لیکن دل آور شاہ نے اسے رکنے نہیں دیا اور وہ چاہ کر بھی رک نہیں سکی تھی۔

اوران دونوں کو سیڑھیاں اترتے دیکھ کر پورا گھر جیسے پتھر کا ہو گیا تھا۔ جودت' کومل' دانیال' احمد' آسیہ آفندی' ثروت بیگم' اسرار آفندی سب کے سب اپنی اپنی جگہ پہ پتھر کے بت ہو گئے تھے۔۔۔ اور اوپر سے آذر کے چلانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ان سب چیزوں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے دل آور شاہ سیڑھیاں اتر کر کوریڈور کی سمت بڑھ گیا اور علیزے اس کے ساتھ گھسٹتی ہوئی جا رہی تھی۔

وہ اسے ساتھ لیے کوریڈور سے باہر روش پہ نکل آیا۔

"گلاب خان! گاڑی اندر لے کر آؤ۔" اس نے محض دو سیکنڈ کی کال کی تھی اور گیٹ پہ اس کی گاڑی کا ہارن سنائی دینے لگا تھا' جیسے ہی عارف نے گیٹ کھولا اس کی چمچماتی ہوئی "سرف" بڑی حویلی کی روش پہ آکھڑی ہوئی' جس کی ڈرائیونگ سیٹ پہ گلاب خان براجمان تھا' مستعد اور چوکس۔۔۔

"منصور حسین۔۔۔! یہ کیا کر رہے ہو تم۔۔۔؟ یہ کیا بدتمیزی ہے۔۔۔؟" مبارک خان اپنے کوارٹرز سے نکل کر ادھر ہی آرہا تھا۔ لیکن دل آور شاہ کے ہاتھ میں دبوچا ہوا علیزے کا بازو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

"خبردار! زیادہ ہمدرد بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ جہاں ہو وہیں کھڑے رہو۔" دل آور شاہ نے اس کی سمت بھی ریوالور تان لیا اور مبارک خان کے ساتھ چوکیداری پہ مامور عارف بھی چونک گیا۔

"منصور حسین تم یہ سب کیوں؟" مبارک خان نے کچھ کہنا چاہا۔

"میں منصور حسین نہیں تمہاری علیزے بی بی کا شوہر ہوں۔۔۔ سمجھے تم؟" دل آور شاہ نے جس انداز میں کہا تھا اس پہ مبارک خان اور عارف ہکا بکا رہ گئے۔

"علیزے بی بی کا شوہر۔۔۔؟"

"ہاں! اسی لیے تمہاری علیزے بی بی کو اب اپنے ساتھ اپنے گھر لے کر جا رہا ہوں۔" اس نے کہتے ہوئے جن نظروں سے علیزے کی سمت دیکھا تھا وہ اپنے قدموں پہ کھڑی نہیں رہ سکی تھی۔ یک دم لڑکھڑا گئی۔ اس کا جسم بے جان ہونے لگا تھا۔ وہ دل آور شاہ کے ہاتھ سے مٹھی میں دبی ریت کی مانند پھسلنے لگی تھی اور اس سے پہلے کہ وہ زمین بوس ہو جاتی' دل آور نے اسے بانہوں میں سنبھال لیا۔

"پاپا۔۔۔" بے ہوشی کی وادی میں اترتے ہوئے علیزے کے لبوں نے اپنے باپ کو ہی پکارا تھا' لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی' وقار آفندی بہت پیچھے رہ گئے تھے' بہت پیچھے۔

"گلاب خان! دروازہ کھولو۔" دل آور شاہ نے اسے اشارہ کیا اور گلاب خان نے ایک سیکنڈ کی پھرتی سے دروازہ کھول دیا۔ لیکن جیسے ہی دل آور شاہ' علیزے کو بانہوں میں اٹھا کر گاڑی کی سمت بڑھا تھا عارف نے یک دم اس پہ بندوق تان لی۔

"میں تمہیں علیزے بی بی کو ایسے نہیں لے جانے دوں گا' تم یہاں سے ایک قدم بھی نہیں ہل سکتے۔" عارف ایک وفادار ملازم تھا۔ تب ہی تو اس کے سامنے ڈٹ گیا اور مبارک خان' عارف کی ذہانت پہ پہلے چونکا' پھر خوش ہوا تھا' دل ہی دل میں اسے شاباش دی۔

"اگر میں یہاں سے نہ گیا تو تمہاری علیزے بی بی کی یہاں سے لاش جائے گی۔" دل آور شاہ نے گلاب خان کی سمت اشارہ کیا تھا۔ جس نے ریوالور علیزے کی کنپٹی پہ رکھ دیا۔

"تم ایسا نہیں کر سکتے منصور حسین۔" مبارک خان' علیزے بی بی کے لیے تڑپا تھا۔

"اپنے مطلب کے لیے اگر میں خیرو بابا پہ گولی چلا سکتا ہوں تو تمہاری علیزے بی بی کی کھوپڑی بھی اڑا سکتا ہوں' میرے ملازم تم لوگوں سے بھی زیادہ وفادار ہیں' ابھی اشارہ کروں تو تم اپنے قدموں پہ کھڑے بھی نہیں رہ سکو گے' تم گولی چلاتے ہوئے پھر بھی ڈر جاؤ گے' لیکن میرے ملازم نہیں ڈریں گے' میں خود نڈر ہوں تو میرے ملازم بھی

نڈر ہیں۔" دل آور شاہ کا ایک ایک لفظ سرد سپاٹ اور زہر میں بجھا ہوا تھا' جسے سن کر وہ ساکت ہو گئے تھے۔

"خیرو بابا پہ گولی تم نے چلائی تھی۔۔۔؟" مبارک خان پاگل ہو جانے کی حد تک حیرت زدہ ہو رہا تھا۔

"ہاں! میں نے چلائی تھی' تم سب کو بے وقوف بنانے کے لیے۔" وہ تمسخرانہ انداز میں ہنسا تھا اور ان دونوں کے چہروں پہ ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ صبح صبح ایسے انکشافات پہ عقل مفلوج ہو گئی تھی۔ دل آور نے آگے بڑھ کے علیزے کو گاڑی میں ڈالا اور پھر خود بھی گاڑی میں سوار ہو گیا تھا۔ گلاب خان نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے ذرا سا بیک کیا۔

"میں نے کہا تھا نا عارف! پرسوں تمہیں اس حویلی میں دور' دور تک کوئی بھی ٹہلتا ہوا دکھائی نہیں دے گا' کوئی شان و شوکت نہیں رہے گی یہاں۔" دل آور نے کھڑکی کا شیشہ فولڈ کرتے ہوئے اسے یاد دلایا تھا اور پھر مسکراتے ہوئے ان کو آخری سلام کیا۔ ہاتھ ماتھے تک لے جا کر۔

"رب راکھا۔۔۔" اور پھر اس کے بعد اس کی گاڑی پھسلتی ہوئی گیٹ سے باہر نکل گئی۔

مبارک خان اور عارف بے یقین سے کھڑے تھے۔ کیونکہ منصور حسین وہاں سے جا چکا تھا۔ لیکن اپنے پیچھے ایک قیامت چھوڑ گیا تھا' ایسی قیامت جو بڑی حویلی کے در و دیوار پہ پہلے کبھی نہیں اتری تھی اور جب اتری تھی تو بنیادیں بھی ہلا کے رکھ گئی تھی۔ وقار آفندی کی حالت پہ وہ علیزے والی حیرت اور بے یقینی بھی بھول گئے تھے۔ انہیں وقار آفندی کی زندگی کی فکر لاحق ہو چکی تھی۔ حویلی کے اندر شور مچا ہوا تھا۔ کسی کو کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ فی الحال ان کی یہی کوشش تھی کہ وقار آفندی کو جلد از جلد اسپتال پہنچایا جائے۔ اسی لیے مبارک خان کو پہلا آرڈر گاڑی نکالنے کا ہی ملا تھا اور اس کے پیچھے کئی اور گاڑیاں بھی تیار تھیں۔

✵ ✵ ✵

مدحیہ نے رات جاگ کر گزاری تھی۔

بے شک وہ اس لڑکی کی خاطر ہی جاگنے کے لیے بیٹھی تھی' لیکن دھیان اس کا عدیل عمر کی طرف ہی بھٹکتا رہا تھا۔ اس کا دھیان پلٹ پلٹ کر جا ئنا ورکشاپ میں کام کرتے عدیل عمر کی طرف جاتا اور وہاں جا کر بے بس ہو جاتا' کیونکہ اسے ورکشاپ سے نکالنا بے حد مشکل کام تھا۔ بے شک اس کی اس سے بہت مختصر اور کم ملاقاتیں ہوئی تھیں' لیکن پھر بھی وہ جان چکی تھی کہ وہ کتنا خوددار ہے؟ اور اس کی یہی خودداری مدحیہ کے ہر دھیان کے آڑے آرہی تھی۔ اسے پتا تھا کہ وہ اسے کبھی کچھ بھی نہیں کرنے دے گا۔ جبکہ وہ اسے نہ جانے کیوں اس ورکشاپ میں برداشت نہیں کر پا رہی تھی۔ شاید اس کے اندر ہمکتے جذبے کا پہلا تقاضا ہی یہی تھا۔

محبوب کو حالت شہنشاہی میں دیکھنا' اپنے محبوب کو فقیرانہ حالت میں بھلا کون برداشت کر پاتا ہے؟ ہر صاحب محبت اور صاحب جذبہ اپنے محبوب کے لیے تاج محل کے خواب ہی دیکھتا ہے۔ سو وہ بھی دیکھ رہی تھی۔ حالانکہ محبت کے وجود سے انکاری تو اب بھی تھی اور سوچ کی تان اسی جملے پر آکر ٹوٹتی تھی۔

"میں اور محبت۔۔۔؟ وہ بھی عدیل عمر سے۔۔۔؟ نہیں' نہیں' ہرگز نہیں۔" اور جہاں اس کی سوچ کی تان ٹوٹتی تھی وہیں اس کی محبت کا دھاگہ مضبوط سے بھی مضبوط تر ہوتا تھا۔ بے شک وہ اعتراف نہیں کرتی تھی' لیکن اس حقیقت کا ادراک تو اس پہ بھی ہو چکا تھا کہ عدیل عمر اس کے دل کا قلعہ تسخیر کر چکا ہے۔ چار' چھ ملاقاتوں میں ہی فتح پا گیا تھا۔ لیکن بس مسئلہ یہ تھا کہ ہر انسان کی طرح فطری طور پہ اس کے لیے بھی ہار ماننا بہت مشکل تھا۔ اس لیے وہ مان ہی نہیں رہی تھی۔ حالانکہ جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ باقی تو کچھ نہیں رہا تھا۔ سوائے نام نہاد خود سری کے۔۔۔ وہ خود سر تھی اور وہ خوددار تھا۔۔۔ اور مسئلہ بھی بس یہی تھا۔ دونوں اپنی اپنی ذات میں سربلند رہنا چاہتے تھے۔ اس بات

سے بے خبر کہ محبت تو جھکی گردنوں کا ہار ہے.... انہی پہ سجنا پسند کرتی ہے۔

"آہ..." اس لڑکی کی کراہ پہ اس نے یک دم چونک کر دیکھا۔ رات کی سیاہی دن کے سنہرے اجالوں میں تبدیل ہو رہی تھی۔ صبح چھ بجے کا وقت تھا۔ وہ لڑکی ہوش میں آچکی تھی اور جیسے ہی اس نے سر کو حرکت دینے کی کوشش کی اس کے سر میں درد کی شدید ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں' درد پھیلنے لگا تھا۔

"ہیلو! گڈ مارننگ...." مدحیہ نے اسے متوجہ کرنے کے لیے اسے وش کیا اور اس کی توقع کے عین مطابق اس لڑکی نے مدحیہ کی سمت چونک کر دیکھا۔ اس کی خالی خالی آنکھوں میں حیرت اور الجھن کے تاثرات ابھرنے لگے تھے' کیونکہ اس کمرے کا ماحول اور مدحیہ کا چہرہ اس کے لیے یکسر اجنبی تھا۔ وہ انجان تھی اور بے یقین بھی۔ اس کی بے یقینی مدحیہ کی سمجھ سے بالاتر تھی۔

"کیسی ہیں آپ؟ کیسا فیل کر رہی ہیں؟" مدحیہ نے بڑی بردباری سے کام لیتے ہوئے پوچھا۔ لیکن وہ لڑکی شاید جواب دینے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھی۔ اس کی چپ' اس کی بے یقینی' اس کی حیرت اور اس کی الجھن ہنوز تھی۔

"دیکھیے مس! میں آپ سے مخاطب ہوں' آپ سے کچھ پوچھ رہی ہوں' اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟" مدحیہ نے اب کی بار کافی نپے تلے اور دو ٹوک سے لہجے میں پوچھا اور وہ لڑکی پھر بھی جواب دینے کی بجائے اٹھنے کی کوشش کرنے لگی' جس پہ مدحیہ کو خاصا غصہ آیا تھا۔

"اسٹاپ اٹ! میں نے آپ کو یہاں سے اٹھنے کے لیے نہیں کہا' آپ کی طبیعت پوچھی ہے؟"

"میری طبیعت کو کچھ نہیں ہوا' ٹھیک ہوں' زندہ ہوں' آپ کو بھی نظر آرہا ہے' بس رات گزر گئی' آپ کی بڑی مہربانی' اب مجھے جانے دیجیے۔" اس لڑکی نے بول کر مدحیہ کو حیران پریشان کر دیا تھا۔ اتنی تلخی تھی اس کے لہجے میں کہ مدحیہ دیکھتی رہ گئی۔ اتنے میں نبیل بھی دروازہ کھول کر اندر چلا آیا۔

"گڈ مارننگ...." وہ بھی وقت سے پہلے ہی اٹھ گیا تھا۔ اسے بھی رات سے اس لڑکی کی طرف سے پریشانی ہو رہی تھی۔

"ارے....! آپ کہاں جا رہی ہیں؟" نبیل اس لڑکی کو بیڈ سے اترتے دیکھ کر چونک گیا۔

"اس شہر کی سڑکوں پہ' اس شہر کی گلیوں میں...." وہ لڑکی اس حد تک تلخ ہو گی' ان دونوں بہن' بھائی کو اندازہ نہیں تھا' اسی لیے اب ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے تھے۔

"کیوں؟ آپ کا گھر نہیں ہے کیا؟" نبیل پوچھے بغیر نہیں رہ سکا۔

"میرا گھر ہوتا تو میں سڑکوں پہ یوں ماری ماری نہ پھر رہی ہوتی۔" اس لڑکی کا لہجہ بھیگ گیا تھا۔ اس کی ساری تلخی اس کے لہجے کی نمی میں چھپ گئی تھی۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟ آپ کا گھر کیوں نہیں ہے؟"

"میرا گھر اس لیے نہیں ہے' کیونکہ میرے پاس عزت نہیں ہے' عزت دار لڑکیوں والا غرور نہیں ہے' میرا ریپ ہوا ہے' میری عزت لوٹی گئی ہے' مجھے برباد کیا گیا ہے اور پھر بھی.... پھر بھی میرا مجرم ہر جگہ دندناتا پھر رہا ہے' کوئی اسے اس کے انجام تک پہنچانے والا نہیں ہے اور میں جب اس کے خلاف آواز اٹھاتی ہوں تو بے گھر کر دی جاتی ہوں۔ میرے اپنے گھر والے مجھے اپنے گھر میں رکھتے ہوئے ڈرتے ہیں اور آپ جان سکتے ہیں جس لڑکی کا بوجھ اپنے گھر والے نہیں اٹھا سکتے اس کا بوجھ دوسرے لوگ کیسے اٹھا سکتے ہیں بھلا؟ میں تو ایسی مصیبت بن گئی ہوں کہ پولیس والوں سے بھی سنبھالی نہیں جا رہی اور آپ کے گھر سے اس لیے جا رہی ہوں کہ ساری حقیقت جاننے کے بعد آپ نے بھی تو مجھے اپنے گھر سے نکالنا ہی ہے نا؟ تو پھر کیوں نہ میں خود ہی چلی جاؤں؟" اس لڑکی کی بیان کی گئی حقیقت اور اس کے سوال پہ ان دونوں کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ مدحیہ کا رنگ سفید لٹھے کی مانند

ہو چکا تھا۔ وہ چکرا گئی تھی اور خود نبیل کے ماتھے پہ بھی پسینے کے قطرے نمودار ہو چکے تھے۔

ماہ نومبر کی ایک سرد صبح میں ماتھے پہ پھوٹتے پسینے کے قطرے دماغی انتشار کا نتیجہ اور باقاعدہ ثبوت دے رہے تھے۔ وہ اس لڑکی کی سمت دیکھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ کیونکہ وہ بھی تو ایک "مرد" تھا اور دوسرے کسی مرد کی درندگی اور ہوس پہ شرمسار اور نادم تھا۔۔۔۔ اس لڑکی سے نظر ملانے کی ہمت نہیں رہی تھی اور وہ ان دونوں کو خاموش اور گم سم سا دیکھ کر بمشکل بیڈ کا سہارا لے کر کھڑی ہوئی اور نقاہت زدہ کمزور قدموں کو بڑی ہمت مجتمع کر کے زمین پہ جماتی ہوئی دروازے کی سمت بڑھی۔ وہ نبیل کی سائیڈ سے ہو کر گزری تھی اور دروازے کے ہینڈل پہ رکھتے ہوئے دروازہ کھول لیا۔

"ٹھہریے۔۔۔!" نبیل کی آواز متوازن اور لہجہ مضبوط تھا۔ مدیحہ اس کے انداز پہ چونک گئی۔ اسے ادراک ہو چکا تھا کہ نبیل کوئی فیصلہ کر چکا ہے۔

"آپ یہیں رہیں گی، کہیں نہیں جائیں گی، میں دوں گا آپ کو تحفظ۔۔۔ تب تک۔۔۔ جب تک میں زندہ ہوں۔۔۔ آپ کو اس گھر سے نہ کوئی نکالے گا نہ آپ نکل سکتی ہیں، یہ میرا وعدہ ہے، نبیل حیات کا وعدہ۔" نبیل کی زندگی کا یہ شاید پہلا وعدہ تھا جو اس نے کسی سے کیا تھا۔ وہ بھی اتنے مضبوط اور اٹل انداز میں۔۔۔ وہ لڑکی اسے دیکھتی رہ گئی۔ دروازے کے ہینڈل پہ رکھا اس کا ہاتھ لرز گیا تھا، جبکہ مدیحہ نہ جانے کیوں وہاں سے روتی ہوئی باہر نکل گئی تھی۔ حالانکہ نبیل حیات کے فیصلے پہ زندگی میں پہلی بار اسے اپنے بھائی پہ فخر ہوا تھا۔ لیکن ساتھ ساتھ اسے اپنی دوست میری کا دکھ بھی رلا گیا تھا۔ اس کے ساتھ بھی تو ریپ ہوا تھا۔ اس کی عزت بھی لوٹی گئی تھی۔ اسے بھی برباد کیا گیا تھا۔ مدیحہ روتی نہ تو اور کیا کرتی؟

☼ ☼ ☼

دل آور شاہ کی گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی اپنے گھر کے گیٹ کے سامنے آکر رکی تھی۔

اس کے ملازم زلفی نے فوراً"۔۔۔۔ گیٹ کھول دیا اور گلاب خان ایک جھٹکے سے گاڑی اندر روش پہ لے آیا تھا اور گیٹ بند کر کے زلفی بھاگتا ہوا گاڑی تک آیا اور گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔

"سلام صاحب۔۔۔" اس نے دل آور کو گاڑی سے اترتے دیکھ کر احتراماً" سلام کیا۔

"والسلام! کیسے ہو زلفی۔۔۔؟" دل آور نے کافی اپنائیت سے پوچھا تھا۔

"ٹھیک ہوں صاحب! آئیے اندر آئیے نا۔۔۔" زلف خان عرف زلفی، گلاب خان کی بیوی گل کا بھائی اور گلاب خان کا سالا تھا۔ عمر میں پندرہ سال کا، لیکن مزاج میں تیس سالہ سنجیدگی رکھتا تھا۔

دل آور شاہ کی غیر موجودگی میں گلاب خان پہ کافی ذمہ داریاں تھیں جن کی وجہ سے اسے اکثر و بیشتر گھر کے کام نبٹانے کی غرض سے گھر سے باہر بھی جانا پڑتا تھا اور گل کو گھر میں اکیلے رہنا پڑتا تھا۔ اس لیے دل آور شاہ کی پرمیشن پہ زلفی کو یہاں لایا گیا تھا۔ زلفی ایک، دو بار پہلے بھی یہاں آچکا تھا۔ اس لیے دل آور شاہ کو اس کے بارے میں پتا تھا۔ تب ہی اس کے آنے پہ کوئی اعتراض نہیں کیا تھا اور آج زلفی بھی اسے اتنے دنوں بعد دیکھنے پر بہت خوش نظر آرہا تھا۔ اسے دل آور شاہ کا مزاج، اس کی شخصیت، اس کا رہن سہن، سب بہت پسند تھا۔ وہ دل آور شاہ کو آئیڈیلائز کرتا تھا، لیکن دل ہی دل میں۔

"آرہا ہوں یار! آرہا ہوں۔" دل آور گاڑی سے اتر آیا۔ لیکن اس کے اترنے کے بعد جیسے ہی زلفی کی نظر گاڑی کے اندر گئی وہ ساکت اور مبہوت رہ گیا۔ وہ لڑکی تھی یا پھر سراپا حسن کا مجسمہ؟ یا پھر ہوش ربا قیامت؟ یا کسی ریاست کی شہزادی۔۔۔؟ یا۔۔۔ یا پھر کوہ قاف کی راہ بھٹکی ہوئی پری؟ وہ جو کچھ بھی تھی دل آور شاہ نے اسے بڑی

لاپروائی، بڑی بے دردی اور بڑی کمال بے نیازی سے اپنی گاڑی کی سیٹ پہ ڈال رکھا تھا۔

"گلاب خان! بیسمنٹ کا لاک کھول دو جا کر۔۔۔" دل آور شاہ نے بے ہوش پڑی علیزے کو گاڑی سے نکالتے ہوئے اپنا اگلا حکم جاری کیا۔

"بیسمنٹ۔۔۔؟" گلاب خان ٹھٹکا، لیکن کچھ کہنے کی جرات نہیں کر سکا۔ تب ہی سر ہلا کر آگے بڑھ گیا اور دل آور شاہ اس کے پیچھے پیچھے اندر آگیا تھا۔ لیکن زلفی کے پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگے تھے۔

"تو کیا صاحب اتنی خوب صورت لڑکی کو بیسمنٹ میں ڈالنے کے لیے لے کر آیا ہے۔" زلفی کے ذہن میں آنے والا یہ سوال گل کے ذہن میں بھی آیا تھا۔ وہ کچن سے نکل کر دل آور شاہ کو سلام کرنے کے لیے سامنے آئی تھی۔ لیکن اس کے حصار میں کسی بے ہوش لڑکی کو دیکھ کر ٹھٹک گئی تھی۔ اس لڑکی کا ملکوتی حسن ان سب کی آنکھوں کو خیرہ کر رہا تھا۔

"سلام صاحب۔۔۔!" وہ بمشکل اسے سلام کر پائی تھی۔

"والسلام۔۔۔!" وہ اسے سنجیدگی سے جواب دیتا ہوا آگے بڑھا اور اوپر جانے والی سیڑھیوں کے پیچھے بیسمنٹ کے دروازے میں داخل ہو گیا تھا۔

یہ بیسمنٹ نہیں علیزے آفندی کا قید خانہ تھا اور دل آور شاہ نے اس قید خانے میں آکر علیزے کو بڑی بے رحمی سے اپنی بانہوں سے جھٹک دیا تھا۔ کسی انتہائی ناگوار بوجھ کی مانند۔۔۔ اور یوں زور سے گرنے کی وجہ سے علیزے کا سر زمین سے ٹکرایا تھا۔ جس پہ وہ بے ہوشی کے باوجود کراہ اٹھی تھی اور اس کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔

"پاپا۔۔۔!" جیسے ہی اس کے ذہن میں سارا واقعہ تازہ ہوا اسے پہلا خیال وقار آفندی کا ہی آیا تھا۔

"ہونہہ پاپا۔۔۔" وہ نفرت اور حقارت سے دیکھتے ہوئے سر جھٹک کر پلٹ گیا اور علیزے اس کے قدموں کی چاپ پہ کرنٹ کھا کے سیدھی ہوئی تھی۔ دل آور سیڑھیوں کی سمت بڑھ رہا تھا۔

"ڈرائیور۔۔۔" وہ اسے وہاں سے جاتے ہوئے دیکھ کر چیخی۔

"ڈرائیور! رکو میری بات سنو۔۔۔ ڈرائیور پلیز۔" علیزے نے چیختے ہوئے اسے روکنے کی اور خود زمین سے اٹھنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ دونوں کام ناکام ہو گئے تھے۔ نہ وہ خود اٹھ سکی تھی، نہ وہ رکا تھا اور علیزے چیختی اور روتی بلکتی ہوئی رہ گئی۔ وہ بہت بلند آواز سے چیخ رہی تھی۔ لیکن یہاں سننے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ جیتے جی زندہ سلامت قبر میں اتار دی گئی ہو اور اسے تو یہ بھی نہیں پتا تھا کہ اس کے لیے یہ قبر کھودی کس نے ہے؟ اگر پتا چل جاتا تو وہ واقعی مر جاتی۔۔۔!

لیکن فی الحال وہ انجان تھی اور انجانے میں اور اندھیرے میں سر ٹکرا رہی تھی، باہر سب کے لیے صبح تھی، لیکن اس کے لیے ہر طرف رات ہو چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

دل آور شاہ نے قید خانے کا دروازہ بند کر کے دروازے میں تالا ڈال دیا۔

اور اس قید خانے کے دروازے میں تالا ڈالنے کے بعد واپس پلٹتے ہوئے دل آور شاہ کی چال بہت عجیب سی ہو رہی تھی۔۔۔ اس کی چال میں کیا کچھ نہیں تھا؟ فتح، شکستگی، سرشاری، اذیت، سرخروئی، ندامت، آزادی، لاپروائی یا پھر اعصاب پہ بوجھ کا احساس سب کچھ مل کر اس کی چال میں اتر آیا تھا۔ اس کے ایک ایک قدم کے کئی معنی تھے، کئی مفہوم تھے۔ وہ ڈھیلے ڈھالے انداز میں چلتا ہوا ڈرائنگ روم کے صوفے پہ آکر بیٹھ گیا اور اپنا سر صوفے کی

بیک سے ٹکا کر اپنے دونوں ہاتھ پیچھے کی طرف موڑ کے گدی کے نیچے رکھتے ہوئے اس نے آنکھیں موندلی تھیں۔ ساری رات کی جاگی آنکھوں میں تھکن اور رتجگے کی جلن ہونے لگی تھی۔ حالانکہ پوری رات جاگ کر گزارنے کا تجربہ اس کے لیے نیا نہیں تھا۔ لیکن اس طرح کا جاگنا آنکھوں میں جلن چھوڑ گیا تھا۔

اگر اس ایک رات میں اس کی آنکھیں جل رہی تھیں تو پھر علیزے آفندی کی آنکھیں تو اس ایک رات میں لہو رس رہی ہوں گی؟

”صاحب... ناشتا کریں گے؟“ اس کی بند آنکھوں کے پار زلفی کی آواز ابھری تھی اور دل آور شاہ برسوں کی مسافت سے واپس پلٹ آیا۔

”ہوں! کروں گا‘ لیکن اماں کے ساتھ‘ بس وہ لاہور پہنچنے ہی والی ہیں۔“ اس نے گہری سانس کھینچتے ہوئے جواب دیا اور پھر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”ٹھیک ہے صاحب! بتا دیتا ہوں گل باجی کو۔“ زلفی سر ہلا کر پلٹ گیا۔

”صاحب! میں نے سارا سامان کمرے میں پہنچا دیا ہے۔“ گلاب خان سیڑھیاں اتر کر ڈرائنگ روم کی طرف آگیا۔

”ہوں ٹھیک ہے! اور ہاں تمہیں یاد ہے نا میں نے تمہیں کیا تاکید کی تھی؟“

”جی صاحب! یاد ہے‘ بہت اچھے سے یاد ہے۔“

”زلفی اور گل کو بھی سمجھا دینا‘ میرے دوست‘ میرے کولیگز‘ میرے جاننے والے کبھی کوئی بھی آئے کسی کو بھی اس لڑکی کے بارے میں پتا نہیں چلنا چاہیے‘ آپ لوگوں کی کسی بھی حرکت سے یہ احساس نہ ہو کہ یہاں گل کے علاوہ کسی لڑکی کا کوئی وجود بھی ہے۔“ اس کی وارننگ واقعی وارننگ ہوتی تھی اور یہ بات اس کے سارے ملازم بخوبی جانتے تھے اور سمجھتے بھی تھے۔

”جی صاحب! جو حکم۔“ گلاب خان نے سر خم کر دیا۔

”او کے! جاؤ اپنی ڈیوٹی سنبھالو‘ اماں پہنچنے والی ہی ہوں گی۔“ وہ اسے کہتے ہوئے خود صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا اور تھوڑی دیر پہلے خود پہ غالب آجانے والے تمام احساسات اور کیفیات کو پرے جھٹک دیا تھا۔

اپنے بیڈ روم میں آکر اس نے بوٹ اتارے‘ اپنی جیبیں خالی کیں‘ گھڑی اتار کر رکھی اور نئے پریس شدہ کپڑے لے کر شاور لینے کے لیے چلا گیا تھا‘ اپنے چہرے کو داڑھی سے آزاد کرنے کے لیے اس نے شیو کی‘ آفٹر شیو لگایا اور پھر اپنی اصلی حالت میں لوٹ آیا تھا۔ منصور حسین والا رہا سہا چولا بھی اتار پھینکا تھا۔ شاور لینے اور ڈریس اپ ہونے کے بعد وہ دل آور شاہ کی شان دار شخصیت کو پوری طرح سے اجاگر کرتا ہوا نظر آیا تھا۔

وہی دل آور شاہ آن اور انا والا۔

وہ بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ رکھی اپنی گھڑی اٹھا کر اپنی مضبوط کلائی پہ باندھ رہا تھا۔ جب باہر گیٹ پہ بتول شاہ کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا اور گھڑی کا لاک بند کرتے ہوئے دل آور شاہ کا ہاتھ کانپ گیا تھا۔

بائیس سال بعد بتول شاہ نے اپنے آبائی شہر لاہور میں قدم رکھا تھا اور بائیس سال بعد رکھے جانے والے اس قدم پہ لاہور کی زمین کا بھی کلیجہ شق ہو گیا تھا۔ دل آور شاہ کے ہاتھ کی طرح جیسے زمین بھی کانپ گئی تھی۔ شاید اس لیے کہ بتول شاہ کے دل سے اور دامن سے بندھا ہوا دکھ بہت عظیم اور اذیت ناک تھا۔ جس کا بوجھ صرف بتول شاہ سینے میں دبائے ہوئے پھر رہی تھیں۔ ورنہ یہ بوجھ تو زمین بھی نہیں سہار سکتی تھی جو انہوں نے سہارا ہوا تھا۔ ان کی ہمت اور ان کے حوصلے تو دل آور شاہ سے بھی کئی گنا بڑھ کے تھے۔ وہ بلاشبہ ایک بہادر اور چٹان نما عورت تھیں۔ ان کی اتنی مضبوطی اور بہادری پہ تو دل آور شاہ بھی چند ثانیے کے لیے چپ ہو جاتا تھا۔

گاڑی کے ایک ہارن کے بعد دوسرے ہارن کی نوبت نہیں آئی تھی اور گیٹ کھل گیا تھا۔ اسی لیے دل آور ایک بار پھر اپنے ذہن سے سارے خیالات جھٹک کر بیڈ روم سے باہر آگیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا سیڑھیاں بھی اتر آیا۔ ان کے گاڑی سے اترنے تک وہ گاڑی تک پہنچ چکا تھا۔

”السلام علیکم اماں...“ اس نے بتول شاہ کا ہاتھ پکڑ کر انہیں گاڑی سے اترنے میں ہلکی سی مدد دی۔ اور بتول شاہ نے اسے سینے سے لگا لیا۔

”میرے بچے‘ میرے جوان‘ جیتے رہو۔“ وہ اسے آغوش میں بھینچے ہوئے کافی گلوگیر لہجے میں بولیں اور ان کے دکھ‘ ان کی اذیت پہ دل آور شاہ کا دل بھی بجھ گیا تھا۔ اس لمحے انہیں بابر شاہ کی یاد آ رہی تھی‘ کیونکہ اس لمحے انہیں بابر شاہ کی صورت دل آور شاہ میں نظر آ رہی تھی‘ انہیں لگ رہا تھا جیسے ان کے سامنے اس وقت بابر شاہ کھڑا تھا‘ سر اٹھائے‘ سرخرو سا انداز لیے۔

”میں... میں... خوش نہیں ہوں اماں‘ میرے سینے کی آگ پہ ابھی... بھی کوئی پانی نہیں پڑا‘ میں‘ میں وقار آفندی کو زندہ چھوڑ آیا ہوں۔ مجھ سے... مجھ سے یہ احساس برداشت نہیں ہو رہا کہ میں وقار آفندی کو زندہ چھوڑ آیا ہوں‘ وہ... وہ ابھی تک جی رہا؟ وہ سانس لے رہا ہے؟ وہ ابھی بھی زمین کے اندر نہیں‘ زمین سے باہر ہے‘ میں نے جب جب اسے دیکھا ہے‘ مر مر کے جیا ہوں‘ دل چاہتا تھا اپنے دونوں ریوالور اس کے سینے پہ خالی کر دوں‘ پرخچے اڑا دوں وقار آفندی کے‘ مسمار کر دوں بڑی حویلی کو‘ ان کا بچہ بچہ زندہ درگور کر ڈالوں... یہ... یہ علیزے آفندی میرے سینے کی آگ کو ٹھنڈا نہیں کر پائے گی‘ یہ تو کچھ بھی نہیں ہے‘ میرے اندر بھڑکتے شعلوں پہ اک بوند بھی نہیں ہے‘ یہ علیزے آفندی۔

میں پاگل ہو رہا ہوں اماں‘ میں بڑی حویلی والوں کو زندہ چھوڑ آیا ہوں۔“ دل آور شاہ کے اندر کا غبار انہیں دیکھتے ہی باہر امڈ آیا تھا اور بتول شاہ نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنے ہاتھوں سے تھپکے تھے۔

”غلط فہمی ہے تمہاری - کہ بڑی حویلی والے زندہ ہوں گے... ہونہہ... ہو ہی نہیں سکتا... مر چکے ہیں بڑی حویلی والے... زندہ درگور ہو چکے ہیں اور وقار آفندی اب اپنی موت بھی مانگے گا تو رب سے اسے اپنی موت بھی نہیں ملے گی۔“ بتول شاہ اسے سمجھاتے ہوئے انتہائی نفرت اور حقارت سے بولی تھیں‘ ان کے لہجے سے زہر ٹپک رہا تھا۔

”لیکن میں اسے اپنے ہاتھوں سے مارنا چاہتا تھا تاکہ حشر کے روز اپنے بابا کے سامنے سرخرو ہو پاتا کہ ان کا رہ جانے والا کام ان کے بیٹے نے کر دیا ہے۔“ دل آور شاہ کے لہجے میں عجیب سی اذیت اور عجیب سی شدت محسوس ہو رہی تھی۔

”بس کرو شاہ! میرے حوصلے بلند ہی رہنے دو‘ ورنہ تمہاری اماں ریت کی طرح بکھر جائے گی اور تم سمیٹ نہیں پاؤ گے۔“ بتول شاہ کے انداز میں تھکن اتر آئی تھی اور بھرنہ چاہتے ہوئے بھی دل آور شاہ کو خود پہ کنٹرول کرنا پڑا اور ان کے گرد بازو لپیٹے ہوئے انہیں اپنے بازو کا سہارا دیے اندر آگیا۔

”سلام بیگم صاحبہ...“ گل بڑے احترام سے آگے بڑھی تھی۔

”والسلام! جیتی رہو۔“ انہوں نے اس کا سر تھپکا تھا۔

”السلام علیکم بیگم صاحبہ!“ زلفی بھی صوفے کی پچھلی سائیڈ سے نکل کر سامنے آگیا۔

”والسلام! جیتے رہو‘ خوش رہو۔“ وہ کافی خوش مزاجی اور شفقت سے پیش آ رہی تھیں۔

”بیگم صاحبہ! کیا لیں گی آپ؟ میں کیا لے کر آؤں آپ کے لیے...؟ آپ آج پہلی بار اپنے گھر آئی ہیں؟ آپ کو دیکھ کر‘ آپ سے مل کر بہت خوشی ہو رہی ہے ہمیں۔“ گل واقعی ان کی آمد پہ بہت خوش ہوئی تھی اور اس کی

خوشی کا اظہار اس کے لہجے سے ہی ہو رہا تھا۔

"مجھے بھی اپنے گھر آکر اور تم لوگوں سے مل کر بہت خوشی ہو رہی ہے' اب آگئی ہوں تو یہاں رہوں گی بھی اور تمہارے ہاتھ کے بنے ہوئے کھانے بھی کھاؤں گی۔" بتول شاہ نے بہت نرمی سے جواب دیا اور گل ان کی بات پہ خوش ہو گئی۔

"بہت شکریہ بیگم صاحبہ! مجھے تو آپ کے لیے کھانے بنا کر بھی بہت خوشی ہو گی' آپ یہاں ہی رہیں' ہم آپ کی خدمت کریں گے۔" دل آور شاہ نے ان کو بتایا تھا کہ گل بہت اچھی لڑکی ہے' سو بتول شاہ کو اس کے کہے پہ یقین آگیا تھا۔ وہ واقعی اچھی لڑکی تھی' سمجھ دار اور بردبار قسم کی۔

"صاحب! ناشتا لگا دوں؟" وہ دل آور سے پوچھ رہی تھی۔

"ہوں! لگا دو۔" اس کی اجازت ملتے ہی گل نے منٹوں میں ناشتا لگا دیا ۔ اور وہ دونوں ماں' بیٹا ناشتا کرنے بیٹھ گئے تھے۔ ان دونوں کے درمیان فی الحال خاموشی تھی اور اس خاموشی میں خلل نبیل حیات نے ڈالا تھا۔ اس کی کال آگئی تھی۔ ٹیبل پہ رکھے اس کے سیل پہ وائبریشن ہو رہی تھی اور دل آور' نبیل کا نمبر بھی دیکھ چکا تھا۔

"کس کی کال ہے؟" بتول شاہ نے پوچھ ہی لیا۔

"نبیل کی....."

"ارے! تو پھر ریسیو کرو نا۔" انہیں حیرانی ہوئی۔

"ہوں! کرتا ہوں۔" اس نے نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا اور سیل اٹھا کر کال ریسیو کرلی ۔

"السلام علیکم۔" اس نے کافی سکون سے سلام کیا تھا۔

"وعلیکم السلام! کہاں ہو؟ تم نے تو کہا تھا کہ تم پندرہ کو واپس آجاؤ گے؟" نبیل کا لہجہ اور انداز بے حد سنجیدہ تھے۔

"تو میں نے کب انکار کیا ہے کہ میں پندرہ کو واپس نہیں آسکتا؟"

"تو پھر.....؟"

"تو پھر یہ کہ دراصل میں اس وقت اپنے گھر میں ہوں اور اماں کے ساتھ بیٹھا ناشتا کر رہا ہوں۔" دل آور نے اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا ۔ کیونکہ اسے نبیل کے ری ایکشن کا پہلے سے اندازہ تھا۔

"کیا.....؟ تم آچکے ہو.....؟ تم ناشتا کر رہے ہو.....؟ اور تم نے مجھے بتانے کی زحمت بھی نہیں کی.....؟" نبیل تو جیسے دنگ رہ گیا۔

"بس یار! بھوک لگی ہوئی تھی' اس لیے سوچا کہ تمہارے آنے سے پہلے پیٹ پوجا کرلوں۔" دل آور نے اسے چھیڑا۔

"تو ٹھیک ہے پھر' تم کھاؤ اور مرو' لیکن مجھ سے بات مت کرو۔" نبیل نے غصے سے کہتے ہوئے فون بند کر دیا اور دل آور بے ساختہ ہنس پڑا۔

"کیا بات ہے؟ کیا کہہ رہا تھا نبیل.....؟"

"کہنا کیا ہے؟ بس گالیاں دے رہا ہے مجھے۔" دل آور ہنستے ہوئے دوبارہ ناشتے کی طرف متوجہ ہوا۔

"کیوں.....؟"

"کیونکہ میں نے اپنی واپسی کا اسے کیوں نہیں بتایا؟"

"ہاں تو بتا دیتے نا؟" انہوں نے نبیل کی سائیڈ لی۔

"اماں! کیسے بتا دیتا؟ ابھی ایک گھنٹہ پہلے ہی تو آیا ہوں میں؟" وہ بھی درست کہہ رہا تھا۔ بتول شاہ سر ہلا کے رہ

گئیں۔ اتنے میں نبیل کی کال دوبارہ آنے لگی۔

"اب اسے آپ کا خیال آیا ہے۔" دل آور نے پیش گوئی کی۔

"السلام علیکم۔" اس نے دوبارہ سلام کیا تھا۔

"تم نے کہا کہ تم اماں کے ساتھ بیٹھ کر ناشتا کر رہے ہو' تو اس کا مطلب ہے کہ آنٹی لاہور آئی ہوئی ہیں؟" نبیل کی ایئر پیس سے سنائی دیتی آواز پہ بتول شاہ کے چہرے پہ مسکراہٹ بکھر گئی تھی اور دل آور یک دم قہقہہ لگا کر ہنسا۔

"میں نے تم سے کچھ پوچھنے کے لیے فون کیا ہے۔ تمہارے قہقہے سننے کے لیے نہیں۔" نبیل جل بھن گیا۔

"اوہ سوری سوری! ہاں اماں لاہور آئی ہوئی ہیں' ابھی ابھی آئی ہیں ہم دونوں ماں' بیٹا تقریباً"..... اس سے پہلے کہ دل آور کی بات مکمل ہوتی' نبیل نے پھر فون بند کر دیا تھا اور دل آور پھر ہنس دیا تھا۔

✲ ✲ ✲

وقار آفندی بے ہوش تھے۔ وہ آئی سی یو میں تھے۔ ان کی حالت بہت زیادہ خراب تھی۔

لیکن ان سے بھی زیادہ خراب حالت ان کی تھی جو ہوش میں تھے اور آئی سی یو کے باہر کھڑے تھے۔ بڑی حویلی کے ایک ایک فرد کے چہرے پہ ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ لیکن ان میں سے ایک چہرہ ایسا تھا جس پہ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے خود مٹھیاں بھر بھر کے مٹی ڈال دی ہو اور اس مٹی کے ساتھ وہ چہرہ بھی مٹی ہو چلا تھا۔ وہ چہرہ وقار آفندی کا نہیں تھا۔ وہ چہرہ عون اور عدید کا بھی نہیں تھا..... وہ چہرہ صرف اور صرف "آذر آفندی" کا تھا۔ جو پہلے قدم پہ ہی ٹھوکر کھا کر منہ کے بل گرا تھا اور چہرے کے سارے نقوش زخمی اور بدوضع ہو گئے تھے۔ جن کی اذیت اور درد اس کے دل میں ہی نہیں اس کے پورے جسم میں پھیل رہا تھا۔ کسی سرطان کی طرح۔

"آذر.....! تم گھر چلے جاؤ۔" اس کی حالت ایسی تھی کہ دانیال کو نہ چاہتے ہوئے بھی اسے کہنا پڑا۔ جس پہ آذر نے اسے جن نظروں سے دیکھا تھا دانیال کو چپ ہونا پڑا۔ اس کی آنکھوں کا زخمی پن اور نظروں کی کاٹ دانیال کو خاموش کروانے کے لیے کافی تھیں۔

"ہاں! دانیال ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تم گھر چلے جاؤ' تمہاری طبیعت بھی ٹھیک نہیں لگ رہی اور ویسے بھی حویلی میں اور کوئی نہیں ہے۔" اسرار آفندی نے بیٹے کی حالت کے پیش نظر اسے گھر جانے کا مشورہ دیا تھا۔ لیکن آذر کو کسی کے مشورے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تو جیسے بہرہ ہو چکا تھا۔ وہ اسپتال کی راہ داری میں دیوار کے ساتھ لگے صوفے پہ سر جھکائے بیٹھا نیچے چکنے فرش پہ کسی نادیدہ نقطے کو پچھلے تین گھنٹے سے لگاتار گھورے جا رہا تھا۔ چہرہ مسلسل جھکا ہوا تھا۔ لب بھینچے ہوئے تھے اور آنکھوں میں سرخی اتری ہوئی تھی۔ وہ سر اٹھانے کے قابل نہیں تھا۔ کسی سے بات کرنے اور نظر ملانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ بلکہ خودکشی کر لینے کو دل چاہ رہا تھا۔ اتنی تذلیل کے بعد جینا بھی کوئی جینا تھا؟

آذر کے دل میں ابال اٹھ رہے تھے جن کو بھینچنے کے لیے وہ اپنے ہونٹ اور ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ رہا تھا..... باقی سب بھی کھڑے تھے۔ باقی سب بھی چپ تھے۔ باقی سب بھی پریشان تھے۔ لیکن جس طرح آذر اندر ہی اندر مر رہا تھا۔ ایسا تو کوئی بھی نہیں ہو رہا تھا۔

اچانک آئی سی یو کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر ندیم اقبال باہر آگئے ۔ اسرار آفندی اور اظہار آفندی کے ساتھ ساتھ باقی سب بھی لپک کے ڈاکٹر کے قریب گئے۔

"ایم سوری سر! فی الحال ان کے بچنے کے چانسز بہت کم نظر آرہے ہیں' کیونکہ ان پہ فالج کا شدید ترین اٹیک ہوا ہے۔ جس میں ان کا پورا جسم مفلوج ہو چکا ہے۔ اس لیے ان کا دل بند ہونے کا خطرہ ہے۔ کیونکہ لیفٹ سائیڈ

یہ فالج کا اٹیک بہت خطرناک ثابت ہوتا ہے اور ان کی لیفٹ سائیڈ بھی حد سے زیادہ متاثر ہوئی ہے۔ ایسے کیسز میں مریض کے بچنے کے چانسز محض نائنٹین پرسینٹ ہوتے ہیں۔ اگر مسٹر وقار آفندی نیکسٹ ٹوئنٹی فور آورز میں اس اٹیک کو اپنی ول پاور یہ برداشت کرلیتے ہیں تو پھر ان کی زندگی کی کچھ امید کی جاسکتی ہے اور امید پہ تو دنیا قائم ہے۔ دعاؤں سے تقدیر بھی بدل جاتی ہے' آپ سب ان کے لیے دعا کیجیے۔" ڈاکٹر ندیم اقبال ان کا کندھا تھپک کر ان کی سماعتوں پہ ایک اور بم گرا کر آگے بڑھ گئے تھے اور وہاں موجود تمام افراد دھواں دھواں ہوگئے تھے۔ سب کے سب دم بخود اور ششدر کھڑے تھے۔ یہ دن ان کے لیے کون کون سی قیامتیں لے کر طلوع ہوا تھا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے بڑی حویلی کے عروج کا ستارہ ڈوب چکا تھا۔ وقار آفندی کی تباہی بڑی حویلی کی تباہی تھی' ایک عظیم تباہی۔

☆ ☆ ☆
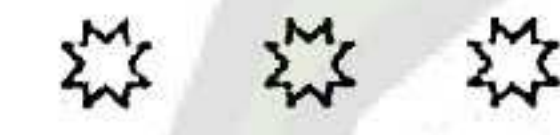
وہ لان میں بیٹھا بتول شاہ کے ساتھ باتیں کررہا تھا جب اس کے سیل پہ وائبریشن ہونے لگی۔
"لگتا ہے آج سب کو خبر ہوچکی ہے....؟" وہ سیل اٹھاتے ہوئے مسکرا کر بولا اور پھر اسکرین پہ نمبر دیکھا' جہاں نمبر کی بجائے انسپکٹر شہناز کا نام جگمگا رہا تھا۔
"السلام علیکم...." اس نے فوراً" کال ریسیو کی تھی اور بتول شاہ سے ایکسکیوز کرکے لان کی اک سائیڈ پہ آگیا۔
"وعلیکم السلام! کیسے ہیں شاہ جی...؟" انسپکٹر شہناز کا لہجہ تھوڑا سنجیدہ اور بجھا بجھا سا تھا۔
"اللہ کا بڑا کرم' بڑا احسان ہے میڈم! لیکن کیا بات ہے آج شہریاراں میں اس قدر اداسیاں کیوں....؟" دل آور اس کے لہجے کی سستی بھانپ چکا تھا۔
"شاہ جی! کہاں ہیں آپ؟ میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں...؟" انسپکٹر شہناز کی پریشانی اس کے لہجے سے عیاں تھی۔
"کیوں؟ خیریت...؟"
"میں بہت پریشان ہوں شاہ جی...."
"اللہ رحم کرے میڈم! آپ جیسے بہادر محافظ پریشان ہونے لگیں گے تو ہم جیسے شہریوں کا کیا بنے گا....؟ دشمن نگل جائیں گے ہمیں...." دل آور نے اسے پریشانی سے نکالنے کے لیے کہا۔
"آگ لگے دشمن کو شاہ جی! آپ کی دھڑکنوں پہ تو ہماری نبض حرکت کرتی ہے۔" انسپکٹر شہناز کے بے ساختہ کہنے پہ دل آور بھی بے ساختہ ہنس پڑا۔
"ہوں! اب لگا ہے کہ انسپکٹر شہناز ہی بات کررہی ہیں۔" وہ خوش دلی سے کہہ رہا تھا۔
"تو پھر کب ملیں گے آپ...؟"
"ارے میڈم! میں نے انکار کب کیا ہے؟ آپ جب چاہو بندہ ناچیز حاضر ہے...."
"اچھا! تو اس کا مطلب ہے کہ آپ واپس آچکے ہیں کراچی سے...؟"
"جی بالکل آچکا ہوں۔"
"تو کیا میں آپ سے ملنے کے لیے آسکتی ہوں....؟" انسپکٹر شہناز کو جیسے یقین نہیں آرہا تھا۔
"آسکتی ہیں بالکل آسکتی ہیں' گھر کے دروازے کھلے ہیں۔"
"ٹھیک ہے شاہ جی! میں ابھی پہنچ رہی ہوں۔" انسپکٹر شہناز نے کہتے ہوئے فون بند کردیا۔ اور اگلے دس منٹ میں وہ واقعی اس کے گھر کے گیٹ پہ پہنچ چکی تھی گلاب خان اسے پہچانتا تھا اس لیے فوراً" گیٹ کھول دیا انسپکٹر شہناز کی گاڑی اندر روش پہ آرکی ــــ دل آور اسے دیکھ کر کھڑا ہوگیا۔
"السلام علیکم۔" اس کے سلام پہ دل آور نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔ جبکہ انسپکٹر شہناز کی نظریں بتول شاہ پہ تھیں۔
"ان سے ملیے' یہ میری اماں جان ہیں' اور اماں جان یہ ہیں انسپکٹر شہناز' کرنل عبدالقیوم رضوی کی صاحبزادی...." دل آور نے بہت اچھے طریقے سے ان کا ایک دوسرے سے تعارف کروایا بتول شاہ بھی اپنی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں کیونکہ انسپکٹر شہناز بھی انہی کی سمت بڑھی تھی۔
"السلام علیکم آنٹی! کیسی ہیں آپ؟" وہ آگے بڑھ کے ان سے گلے ملی تھی انہوں نے بھی شفقت سے گلے لگا کر اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔
"وعلیکم السلام بیٹا! میں ٹھیک ہوں' جیتی رہو' خوش رہو' بیٹھو یہاں۔" انہوں نے قریبی کرسی کی سمت اشارہ کیا۔
"تھینک یو آنٹی...." وہ اس وقت یونیفارم کی بجائے پنک کلر کی خوب صورت اور نفیس سی ساڑھی میں ملبوس تھی اور اس کی پرسنالٹی بہت پر اثر لگ رہی تھی دل آور اسے ضرور سراہتا اگر بتول شاہ پاس نہ ہوتیں' کیونکہ وہ اپنی ماں کا بہت احترام اور عزت کرتا تھا اس لیے ان کے سامنے تو وہ مذاق میں بھی ایسی بات نہیں کہہ سکتا تھا۔
"شاہ جی...! میں تو سمجھتی تھی کہ آپ ہی اپنے ماں باپ کا شاہکار ہیں' لیکن آنٹی کو دیکھ کر تو لگ رہا ہے کہ آپ کی پوری فیملی ہی شاہکار ہوگی...؟" انسپکٹر شہناز نے بتول شاہ کی گریس فل پرسنالٹی اور خوب صورتی دیکھ کر دل میں آئی بات دل میں نہیں رکھی تھی لیکن اس کی بات پہ بتول شاہ کے چہرے پہ ایک سایہ سا لہرا گیا تھا جو دل آور کی نظروں سے چھپا ہوا نہیں رہ سکا تھا۔
"تھینک یو میڈم! یہ آپ کی نظر کا ذوق ہے' ورنہ آج کل شاہکاروں کی کمی نہیں ہے' خیر چھوڑیں اس بات کو آپ یہ بتائیں کہ آپ کس لیے اتنی پریشان تھیں کہ آپ کو اتنا ارجنٹ مجھ سے ملنا پڑا...؟" دل آور پوری سنجیدگی کے ساتھ اس کی سمت متوجہ ہوچکا تھا۔
"وہ مجھے دراصل مومنہ بی بی کے سلسلے میں بات کرنا تھی۔" انسپکٹر شہناز بات کرتے ہوئے ہچکچا گئی اسے دل آور شاہ کو اپنی کوتاہی کا بتاتے ہوئے شرمندگی ہورہی تھی۔
"ہاں ہاں! کہیے کیا بات ہے۔" انسپکٹر شہناز جھجکنے والی نہیں تھی اسی لیے دل آور کو اس کی جھجک پہ حیرت اور اچنبھا ہورہا تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ انسپکٹر شہناز اپنی بات بتانا شروع کرتی اچانک گیٹ کھلا اور دو گاڑیاں آگے پیچھے اندر روش پہ آرکی تھیں جن کو دیکھ کر دل آور فوراً" کھڑا ہوگیا کیونکہ آنے والے اس کے عزیز از جان تھے.... مدحیہ اور نبیل....!
"بھائی....!" مدحیہ بڑے والہانہ انداز میں قریب آئی اور دل کے کندھے سے لگ گئی۔
"آئی مس یو سو مچ بھائی۔" مدحیہ کے لہجے اور انداز سے محبت اپنائیت اور بے ساختگی جھلک رہی تھی اور ہمیشہ کی طرح اتنے دنوں بعد ملنے پہ دل آور نے اپنی لاڈلی کے ماتھے پہ بوسہ دیا اور اس کا سر تھپکا تھا۔
"آئی مس یو ٹو ڈارلنگ' آئی رئیلی مس یو۔" دل آور شاہ کے نرم اور پر شفقت انداز پہ انسپکٹر شہناز اور بتول شاہ دیکھتی رہ گئی تھیں کیا یہ روپ بھی دل آور شاہ کا تھا....؟ اتنا میٹھا' اتنا شیریں کہ دیکھنے والی نظروں کے دل کو چھو گیا تھا بتول شاہ کی آنکھوں میں نمی جبکہ انسپکٹر شہناز کی آنکھوں میں رشک اتر آیا تھا....!
"اماں سے ملو...." دل آور نے آہستگی سے کہتے ہوئے مدحیہ کو متوجہ کیا تھا۔

"او ہاں سوری! ہم انہی سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔" وہ اپنی بے دھیانی پہ مسکراتی ہوئی بتول شاہ کی سمت آ گئی۔

"السلام علیکم مما!" وہ بڑی محبت سے کہتی ہوئی ان کے گلے لگ گئی۔ اور اس کے بعد کہیں نبیل کی باری آئی تھی۔

"میں یہاں صرف آپ کے لیے آیا ہوں' ورنہ یہ بے مروت اور ظالم شخص یہاں اکیلا ہوتا تو میں ہرگز نہ آتا۔" نبیل نے اپنی آمد کا مقصد فوراً" ہی کلیئر کر دیا۔

"تم نہ بھی بتاؤ تو انہیں پتا ہے کہ تم ان کے لیے ہی آئے ہو' میں انہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔" دل آور نے مداخلت کی۔

"یہی تو تمہاری چالاکیاں ہیں۔" نبیل جل کر بولا تھا جس پہ سب کے چہروں پہ مسکراہٹ بکھر گئی۔ انسپکٹر شہناز بھی اپنی مسکراہٹ نہیں روک پائی تھی۔

"انسپکٹر شہناز! ان سے ملیے یہ میرا بہت اچھا دوست' میرا جگر' میری جان نبیل حیات ہے' اس کی دوستی کے بغیر دل آور شاہ کچھ نہیں ہے۔" دل آور نے خفا خفا سے نبیل حیات کا تعارف بہت دل سے کروایا تھا۔

"اور یہ میری اکلوتی لاڈلی بہن ہے مدحیہ حیات۔" اس نے قریب کھڑی مدحیہ کا ایک بار پھر سر تھپکا تھا اور پھر انسپکٹر شہناز کا تعارف بھی کروایا ...... وہ سب ہی آپس میں مل کر بہت خوش ہوئے تھے اور خوش تو آج بتول شاہ بھی بہت زیادہ تھیں' ان کے بیٹے نے آج بائیس سال بعد انہیں لاہور کی زمین پہ قدم رکھنے کے قابل کر دیا تھا۔

"بیٹا...! تم لوگوں کی باتوں کا ٹائم اسٹارٹ ہو رہا ہے تم باتیں کرو' میں تمہارے لیے چائے بھجوا کر نماز پڑھ لوں' ظہر کا وقت نکلا جا رہا ہے۔" بتول شاہ نبیل کا کندھا تھپک کر اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

"لیکن جلدی آئیے گا' ہم آپ کے لیے ہی آئے ہیں۔" مدحیہ نے انہیں تاکید کی تھی۔

"اچھا بیٹا! نماز پڑھ کے آتی ہوں۔" وہ مسکراتے ہوئے اس کا گال سہلا کر اندر چلی گئیں۔ اور دل آور دوبارہ سے انسپکٹر شہناز کی سمت متوجہ ہو چکا تھا کیونکہ انسپکٹر شہناز کی بے چینی اسے واضح محسوس ہو رہی تھی۔

"جی میڈم! آپ کچھ کہہ رہی تھیں...؟ شاید مومنہ بی بی کے بارے میں...." اس کے استفسار پہ انسپکٹر شہناز نے نبیل حیات اور مدحیہ کی طرف دیکھا تھا اور دل آور اس کے دیکھنے کا مفہوم بھی سمجھ گیا تھا۔

"ارے نہیں نہیں میڈم...! ڈونٹ وری... آپ بے فکر رہیں۔ جو بھی بات کہنی ہے کھل کے کہیے؟" دل آور شاہ کی تسلی پہ انسپکٹر شہناز قدرے ریلیکس ہو گئی۔

"سوری سر! کچھ معاملات ایسے ہوتے ہیں جن میں بندہ نہ چاہتے ہوئے بھی بے اعتباری پہ آ جاتا ہے پلیز مائنڈ مت کیجیے گا۔" انسپکٹر شہناز نے نبیل سے معذرت کی تھی۔

"جی میڈم...! سمجھ سکتا ہوں میں' آپ بے فکر ہو کر اپنا مسئلہ ڈسکس کر سکتی ہیں۔" نبیل نے کافی سنجیدگی اور تحمل سے جواب دیا۔

"تھینک یو۔" وہ نبیل کا شکریہ ادا کرتے ہوئے دل آور کی سمت متوجہ ہوئی۔

"شاہ جی! وہ دراصل ملک حق نواز' مومنہ بی بی کی بو سونگھتا ہوا میرے گھر تک پہنچ گیا تھا' اسے خبر ہو چکی تھی کہ مومنہ بی بی میرے پاس ہے اس لیے وہ کل صبح میرے گھر آ گیا تھا۔" انسپکٹر شہناز کی بات پہ دل آور کے ماتھے پہ بل پڑ گئے تھے۔

"تو پھر بچ کے نکل گیا..."

"تو اور کیا کر سکتی تھی شاہ جی...؟ میرے گھر میں اس وقت مومنہ بی بی موجود تھی میرے ذرا سے غصے اور ری ایکشن پہ وہ کچھ بھی کر سکتا تھا' مومنہ بی بی کو جان سے مارنا مشکل نہیں ہے اس کے لیے' اسے اگر بھنک بھی پڑ جاتی کہ وہ یہاں ہے تو اس وقت یقیناً" سچویشن کچھ اور ہوتی۔ وہ تو میں تھی جس نے اس کے سامنے اعتماد کا دامن نہیں چھوڑا اور اسے صاف کہہ دیا کہ میرے گھر کی تلاشی لے لے' جس پہ وہ تھوڑا دھیما پڑ گیا اور اس کا یقین شک میں تبدیل ہو گیا کہ شاید اس کے پاس اطلاع غلط پہنچی ہو گی' حالانکہ اس کو ملنے والی اطلاع ہنڈرڈ پرسینٹ درست تھی وہ بالکل ٹھیک جگہ پہ پہنچا تھا اور اس کا یہ پہنچنا خطرے سے خالی نہیں جا سکتا تھا اگر میں نہ ہوتی.... لیکن شاہ جی! سب کچھ کور کر لینے کے باوجود ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔" انسپکٹر شہناز پھر دھیمی پڑ گئی تھی۔

"کیسا مسئلہ....؟" دل آور کی سنجیدگی عروج پہ تھی۔

"میں ڈیوٹی پہ تھی' امی اور ابی جان گھر پہ تھے لیکن انہیں پتا ہی نہیں چلا اور مومنہ بی بی انہیں بتائے بغیر گھر چھوڑ کر چلی گئی۔ جاتے ہوئے یہ تحریر چھوڑ گئی تھی۔" اس نے رقعہ نکال کر دل آور کی سمت بڑھا دیا تھا جس کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔

"میں نے کل شام سے اب تک اسے بہت ڈھونڈا ہے' ساری رات سڑکوں پہ گزار دی لیکن وہ کہیں بھی نہیں ملی۔" انسپکٹر شہناز متفکر ہو رہی تھی اور دل آور لب بھینچے اس کی تحریر پہ نظریں جمائے ہوئے تھا۔

"فیروزی رنگ کا سوٹ اور کالے رنگ کی چادر میں ملبوس تھیں۔" نبیل کی لب کشائی پہ دل آور اور انسپکٹر شہناز نے یکدم چونک کر دیکھا

"آپ کو کیسے پتا نبیل صاحب؟"

"کیونکہ وہ مومنہ بی بی کل رات میری گاڑی سے ٹکرائی تھیں۔" نبیل کے انداز میں اطمینان تھا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ اب کہاں ہے وہ؟" انسپکٹر شہناز کو بے چینی ہو چکی تھی وہ نبیل کی سمت بے صبری سے دیکھ رہی تھی۔

"اب وہ وہاں ہیں جہاں کوئی ملک حق نواز نہیں پہنچ سکتا۔ میں نے مومنہ بی بی کو پورا پورا تحفظ دینے کا وعدہ کیا ہے' اور وہ میرے گھر میں ہی رہیں گی اور ان کی ہر ذمہ داری میں پوری کروں گا۔" نبیل کہہ رہا تھا اور دل آور اسے ناسمجھی سے دیکھ رہا تھا کہ نبیل نے یہ فیصلہ کیوں کیا ہے؟ کیونکہ یہ فیصلہ کوئی عام اور معمولی فیصلہ نہیں تھا اور دل آور کے اس طرح دیکھنے پہ نبیل اسے کیا بتاتا کہ اس نے اپنے ضمیر پہ رکھے ایک بوجھ کو کم کرنے کے لیے یہ فیصلہ کیا ہے' ایک ایسا بوجھ جو اس نے خود نہیں اس کے باپ نے اس کے ضمیر پہ ڈال دیا تھا جس کی وجہ سے مدحیہ بھی اکثر روتی اور تڑپتی ہوئی بولائی بولائی پھرتی تھی۔

نبیل کو اپنے باپ کے کرتوتوں کا اندازہ تھا لیکن وہ ان کا مداوا نہیں کر سکتا تھا لیکن اب جب ایک ایسی لڑکی سامنے آ کھڑی ہوئی تھی جسے ان کے سہارے کی ضرورت تھی' جو ان کے باپ جیسے انسان کی ڈسی ہوئی تھی تو پھر وہ اسے سہارا کیوں نہ دیتا؟ کیوں مداوا نہ کرتا؟ ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ اس لڑکی پہ بیتی ساری حقیقت جان لینے کے بعد اس سے نظریں چرا لیتا۔ اور اگر وہ ایسا کر بھی لیتا تو مدحیہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ وہی بوجھ مدحیہ کے ضمیر پہ بھی تو تھا۔ اتنا ہی وزنی اور اتنا ہی اذیت ناک' جس کو تھوڑا سا کم کرنے کے لیے نبیل نے زندگی میں پہلی بار ایسا فیصلہ کر لیا تھا جس میں کسی کی بھی پسند نہیں پوچھی تھی اور کسی سے مشورہ بھی نہیں مانگا تھا' اور اس کے اس فیصلے پہ مدحیہ کے سوا شاید اور کوئی خوش بھی نہیں تھا لیکن نبیل کو اس معاملے میں کسی کی خوشی کی پروا نہیں تھی' اسے پتا تھا کہ سب کا ردعمل وقتی ہو گا' اور وقت کے ساتھ ساتھ سب کچھ بدل جائے گا۔ اسی لیے وہ مطمئن تھا۔"

"کیا بات ہے؟ تمہیں میرا فیصلہ اچھا نہیں لگا۔" نبیل نے دل آور کو ٹٹولا۔

"برا کیوں لگے گا بھلا..." دل آور نے بھنویں سکیڑتے ہوئے کہا۔

"تو پھر خاموش کیوں ہو؟"

"میرا اور انسپکٹر شہناز کا مسئلہ تمہارے گھر پہنچ جانے پہ خاموش ہوں' اللہ انسان کو ٹھوکروں سے اٹھا کر ٹھکانے پہ بھی پہنچا دیتا ہے اور ہم تم جیسے لوگ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔" دل آور نے گہری سانس کھینچتے ہوئے پشت کرسی کی بیک سے ٹکا دی۔

"اللہ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور پوشیدہ ہوتی ہے' شاید کہ اس کام میں بھی ہو؟" نبیل سکون سے کہہ رہا تھا۔

"بالکل! ہو گی ضرور ہو گی بس ادراک بعد میں ہوتا ہے' جیسے اللہ کے اس کام میں مصلحت تھی کہ میں اس وقت شاہ جی سے ملنے ان کے گھر پہ آؤں اور وہاں آپ سے بھی ملاقات ہو اور آپ میری رات بھر کی پریشانی کو ایک پل میں دور کر دیں' اسی کو اللہ تعالیٰ کی مصلحت کہتے ہیں' سبحان اللہ۔" انسپکٹر شہناز نے صدق دل سے کہا تھا اور وہ تینوں بھی اتفاق کرتے ہوئے سبحان اللہ کہہ چکے تھے۔ اتنے میں گل چائے اور دیگر لوازمات لے کر حاضر ہو چکی تھی' نومبر کا مہینہ تھا' موسم بہت ہلکا پھلکا اور خوش گوار ہو رہا تھا دل آور نے اپنے مہمانوں کو آج خوب کمپنی دی تھی جس پہ انسپکٹر شہناز بھی بہت خوش تھی اور نبیل بھی بہت فریش نظر آ رہا تھا۔ پھر شام ڈھلے وہ لوگ وہاں سے اٹھ کر واپس گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

اس بیسمنٹ کے گہرے تاریک ماحول میں اس کی جان سوکھے پتے کی طرح لرز رہی تھی۔

اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اٹھ کر کسی دیوار سے ٹیوب لائٹ کا بٹن ٹٹول کر لائٹ ہی آن کر لیتی' وہ اسے جہاں پھینک کر گیا تھا وہ صبح سے وہیں ——— بیٹھی رو رہی تھی وہ جب بھی گھٹنوں سے سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھنے کی کوشش کرتی اسے اندھیروں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا اور وہ سہم کر پھر سے چہرہ چھپا لیتی' رو رو کر اس کا حشر ہو چکا تھا' وقار آفندی کی لاڈلی کی آنکھیں آنسوؤں سے زخمی ہو رہی تھیں' مسلسل رو رہی تھیں اور وقار آفندی کو خبر ہی نہیں تھی وہ ہسپتال میں خود سے بھی بے خبر پڑے تھے۔ انہیں پتا ہی نہیں تھا کہ ان کی علیزے پہ کیا بیت رہی ہے؟ رات بہت گہری ہو چکی تھی جب ہلکی سی آہٹ سے بیسمنٹ کا دروازہ کھلا اور کوئی اندر داخل ہوا۔

"ڈرائیور۔" علیزے اپنی ساری ہمتیں مجتمع کرتے ہوئے کھڑی ہو گئی ۔ اور آنے والے نے دروازے کے قریب ہی نصب کی بورڈ سے لائٹس جلا دی تھیں اتنے اندھیرے سے یکدم اتنی تیز روشنی ہو جانے پہ علیزے کی آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔

"یہ کھانا کھا لیں بی بی جی۔" یہ آواز اس کے ڈرائیور کی نہیں بلکہ گلاب خان کی تھی۔

"تت... تم... کک کون ہو؟" علیزے کے پورے جسم میں نقاہت ہو رہی تھی۔

"میں صاحب کا ملازم ہوں' چوکیدار ہوں بی بی جی۔" گلاب خان نے سر خم کرتے ہوئے کہا۔

"وہ... وہ... خود کہاں ہے' بلاؤ اسے۔" علیزے کے بھیگے بھیگے لہجے میں وہی مالکوں والا رعب در آیا تھا۔

"وہ نہیں آ سکتے بی بی جی۔ وہ اس وقت اپنے کمرے میں ہیں۔ اور کسی گہری سوچ میں گم ہیں۔ سگریٹ بھی بہت پی رہے ہیں۔" گلاب خان نے اسے اس کی کیفیات سے آگاہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن علیزے پتا نہیں کیوں اور کیسے اتنی سرکش ہو رہی تھی کہ اپنی ہی کہے گئی۔

"میں کچھ نہیں جانتی...! وہ جہاں بھی ہے' جس حالت میں بھی ہے' اسے کہو وہ یہاں آئے۔ وہ مجھے میرا گناہ بتائے۔ میں جاننا چاہتی ہوں کہ یہ سزا کس گناہ کے بدلے میں دی جا رہی ہے مجھے؟" وہ روتے روتے چیخ اٹھی تھی

قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

قرآنِ حکیم کی مقدس آیات اور احادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔
ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

حالانکہ وہ دن بھر رونے کی وجہ سے بے حد نڈھال ہو رہی تھی۔

"بی بی جی...! آپ میرا ایک مشورہ مانیں' آپ نے جو بھی کہنا ہے' کل صبح کہہ لیجیے گا' ابھی رہنے دیں' ابھی مت چھیڑیں۔" گلاب خان نے بہتیرا روکا تھا اسے لیکن اس کی ایک ہی رٹ تھی کہ وہ خود یہاں آئے اور مجبوراً گلاب خان پیغام لے کر اس کے سامنے پہنچ گیا تھا جسے سن کر دل آور شاہ کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گیا۔

"ٹھیک ہے تم جاؤ' کام کرو' میں جاتا ہوں اس کے پاس۔" دل آور نے ٹیبل کے قریب آ کر انگلیوں میں سلگتا ہوا سگریٹ ذرا سا جھٹکتے ہوئے ایش ٹرے میں مسل دیا ۔ اور پھر گہری سانس خارج کرتے ہوئے لب بھینچ کر کمرے سے نکل آیا۔

"شاہ...! رکو بیٹا۔" بتول شاہ نے اسے سیڑھیاں اترتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور اس کے عزائم بھی بھانپ لیے تھے کیونکہ اس کے تیور بہت خطرناک ہو رہے تھے' لیکن وہ ان کے روکنے پر بھی نہیں رکا تھا اور اگلے چند سیکنڈز میں وہ عین علیزے آفندی کے سامنے کھڑا تھا۔

علیزے ایک پل کے لیے ٹھٹک سی گئی وہ اسے دیکھ کر پہچان نہیں پائی تھی کیونکہ وہ اپنے چہرے کی داڑھی وغیرہ صاف کر چکا تھا اس کا پرکشش چہرہ اور تیکھے کاٹ دار نقوش واضح ہو چکے تھے اب وہ مکمل دل آور شاہ کے روپ میں تھا اور وہاں اب منصور حسین کا شائبہ تک نہیں تھا' وہ اس کے سامنے کھڑا ڈائریکٹ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا اور علیزے اس کی آنکھوں کے غضب سے نہ جانے کیسے بے خوف اور نڈر ہو گئی تھی۔

"کھانا بھیجا تھا' کھایا تم نے...؟" اس کا لہجہ تھا یا برف' علیزے ٹھٹھری تھی لیکن سہہ گئی۔

"نہیں کھاؤں گی۔" ہٹ دھرم سا جواب موصول ہوا۔

"کیوں نہیں کھاؤ گی...؟ کیا وجہ ہے آخر؟" اس کے لفظ بے حد نپے تلے سے تھے۔

"اس لیے کہ تم مجھے زبردستی یہاں لے کر آئے ہو' تم نے مجھے یرغمال بنایا ہے' تم نے مجھ سے ناٹک کروایا ہے' جھوٹ بلوایا ہے مجھ سے' دھوکا دیا ہے مجھے اور میرے گھر والوں کو ڈرامہ کیا ہے تم نے۔ کیوں آخر کیوں...؟ کیوں کیا تم نے ایسا؟ کیوں لے کر آئے ہو مجھے یہاں؟ آخر کیا گناہ ہے میرا؟" وہ یکدم پھٹ پڑی تھی اور دل آور لب بھینچے اس کی سمت خاموشی سے دیکھتا رہا جس پہ علیزے اور بھی جذباتی ہو گئی اور آنسو تواتر سے بہہ نکلے تھے۔

"بولو! تم بولتے کیوں نہیں ہو؟ تم نے یہ سب کیوں کیا ہے آخر؟" وہ روتے بلکتے ہوئے چیخی تھی جس پہ دل آور کا پارہ بھی ہائی ہو گیا تھا۔

"تڑاخ...!" اس کے بھاری مضبوط ہاتھ کا تھپڑ علیزے آفندی کا دماغی نظام درہم برہم کر گیا تھا وہ توازن نہیں رکھ پائی تھی۔ سیدھی فرش پہ جا گری تھی۔

"یہ سب مجھ سے نہیں اپنے اس خبیث باپ سے پوچھو' جس نے مجھے آٹھ سال کی عمر میں لاوارث کر کے اس شہر سے نکلنے پہ مجبور کر دیا تھا' آٹھ سال کی عمر سے تمہارے باپ کا دیا ہوا ناسور سینے میں لیے پھر رہا ہوں اس ناسور کو

بکنے میں بائیس سال لگے ہیں علیزے آفندی... بائیس سال اور بائیس سال میرے اندر یہ زہر پھیلا ہے۔ میرے جسم کی رنگت سفید سہی لیکن میرے دل کی رنگت نیلو نیل ہو رہی ہے' میرا سینہ اندر سے سیاہ ہے' اور یہ سیاہی تمہارے باپ نے بخشی ہے' میں دل آور شاہ دنیا کے لیے ایک آئیڈیل شخصیت سہی لیکن اندر سے میں خاک ہوں خاک۔ اور میں نے قسم کھائی ہے وقار آفندی کو بھی خاک میں ملا کر چھوڑوں گا' جیتے جاگتے اسے خاک میں ملا دوں گا یہ میرا میری ماں سے عہد ہے' اور تمہیں یہاں لانا میرے عہد کا پہلا مرحلہ ہے' تم سمجھ دار ہو' تم سوچ سکتی ہو کہ اس وقت وقار آفندی کا کیا حال ہو گا جب اسے یہ پتا چلے گا کہ اس کی بیٹی دل آور شاہ کے پاس بغیر نکاح کے رہ کے آئی ہے' جس کا کوئی نکاح نہیں ہوا تھا' سب کچھ جعلی تھا' جھوٹ تھا' صرف وقتی طور پہ سب کو دکھانے کے لیے وہ جعلی نکاح نامہ تیار کروایا تھا تاکہ کوئی بھی اس کام میں رکاوٹ نہ ڈال سکے۔

تمہارے باپ نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ اگر میں منصور حسین کے نام سے شناختی کارڈ اور لائسنس بنوا سکتا ہوں تو نکاح نامہ بھی بنوا سکتا ہوں' تمہیں بغیر نکاح کے اپنے پاس رکھ سکتا ہوں' تمہیں برت سکتا ہوں' تمہیں عرش سے اٹھا کر فرش پہ پٹخ سکتا ہوں۔ یہ سب باتیں تمہارا باپ کبھی نہیں سوچے گا کیونکہ اسے دل آور شاہ کے نام کی تکرار سے ہی فرصت نہیں ملے گی' اور اگر ملے گی تو مر جائے گا۔ اس سوچ سے ہی مر جائے گا کہ اس کی علیزے' دل آور شاہ کی دسترس میں ہے۔ اور اگر وہ اس سوچ سے بھی نہیں مرا تو میں تمہیں اس کے پاس بھیج کر مار دوں گا' وہ جب اپنی کنواری بیٹی کی واپسی کا حال دیکھے گا تو کیا کرے گا؟ یہ بھی سوچ لو تم...! تمہارے باپ کو مارنے کے بہت ہتھیار ہیں میرے پاس' اب فیصلہ یہ کرنا ہے کہ کون سا ہتھیار فائدہ مند رہے گا...؟

میں اگر چاہتا تو تمہیں کڈنیپ بھی کروا سکتا تھا بڑی آسانی سے' مگر کڈنیپ کرنے میں وہ مزا نہیں تھا جو تمہیں سب کے سامنے لے آنے میں تھا سو میں نے ایسا ہی کیا اور تم جانتی ہو میں کیا کیا کر سکتا ہوں؟ میری رسائی کہاں تک ہے؟ تم سے بہتر تو کوئی بھی نہیں جان سکتا جانِ ڈرائیور۔" اس نے ذرا سا جھکتے ہوئے علیزے کا بازو دبوچا اور اسے اپنے سامنے کھڑا کر دیا تھا اس کے پھول سے چہرے پہ انگلیوں کے نشان ثبت تھے اور جہاں جہاں انگلیوں کے نشان ثبت تھے وہاں وہاں سے رخسار ابھر آیا تھا وہ سب کچھ جاننے کے باوجود اسے پتھرائی ہوئی اور ششدر سی دیکھ رہی تھی دلاور شاہ زہر اگل رہا تھا ایک ایسا زہر جو اب علیزے کا جسم نیلا کر رہا تھا۔

"لیکن اس سارے قصے میں مجھے بڑی تکلیف ہوئی ہے' بہت اذیت محسوس کر رہا ہوں' وقار آفندی کی بیٹی کو اپنی بیوی ظاہر کر کے خود اپنی نظروں میں گر گیا ہوں' اپنے مقام سے بہت نیچے آگیا ہوں میں' مجھے یہ کب زیب دیتا تھا کہ جھوٹ میں ہی سہی مگر وقار آفندی کی بیٹی کو بیوی کا لقب دوں۔ سچ پوچھو تو بڑی توہین ہوئی ہے میری۔"

وہ انتہائی نفرت اور حقارت سے چبا چبا کر کہہ رہا تھا اور علیزے کو اپنی جان نکلتی ہوئی محسوس ہوئی ایسی نفرت ایسی بے رحمی اور ایسی سفاکی کا عالم اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اس لیے وہ چکرا رہی تھی لیکن یونہی چکراتے سر کے ساتھ اس کی نظر اٹھی اور بیسمنٹ کی سیڑھیوں پہ کھڑی بتول شاہ پہ ٹھہر گئی تب ہی اس کے دیکھنے کے انداز پہ اس کی نظروں کے تعاقب میں دل آور نے بھی گردن موڑ کر پیچھے دیکھا تھا اور — وہیں منجمد ہو گیا۔ دل پہ ایک عجیب حالت آن وارد ہوئی تھی۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

✲ ✲

نبیلہ عزیز

دردِ دل

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نبیل حیات دو ہی بہن، بھائی ہیں، مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے، وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پہ رنگ چکی ہے، جس کے پیش نظر فائزہ بیگم، نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں، لیکن مدحیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے، جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے، مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے، مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، بے بسی اور مجبوری سے تنگ آ کر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے، لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے بابا امتیاز مل جاتا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے، جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے، اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے، وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے، وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے، وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے، اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا، اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔

۲۲
بائیسویں قسط

یہ کیسا مقام تھا اس کی زندگی میں۔
اس کے ایک طرف بتول شاہ کھڑی تھیں اور ایک طرف علیزے آفندی۔
ایک کی طرف دیکھتا تو مرجاتا' ایک کی طرف دیکھتا تو ماردیتا۔

گویا اذیت اس کے دونوں طرف تھی؟ وہ کچھ کہنے اور کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ فی الحال.... البتہ ان دونوں کی کیفیات اور تاثرات اس سے بالکل مختلف تھے بتول شاہ کو دیکھتے ہوئے علیزے اجنبی' ناسمجھ اور خالی خالی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ جبکہ علیزے کو دیکھتے ہوئے بتول شاہ کی آنکھیں پتھریلی ہوگئی تھیں۔

ان کے چہرے پہ بائیس سال رقم تھے اور ان بائیس سالوں میں ایسا کچھ تھا جس کا کرب ناک احساس زہر کی طرح ان کی رگ وپے میں سرائیت کرگیا تھا۔ علیزے کی دلکش سی صورت ان کی آنکھوں میں مرچیں سی بھرگئی تھی اور ان کی پتھریلی سپاٹ آنکھیں جلنے لگی تھیں اور اس جلن سے ان کی آنکھیں ——— سرخ ہونے کے ساتھ ساتھ نمکین پانیوں سے لبریز ہوچکی تھیں۔ ہاتھوں کی مٹھیاں سختی سے بھینچے' مضبوط قدموں پہ کھڑی وہ صبرو ضبط کے کن مراحل سے گزر رہی تھیں' یہ ان کا اللہ جانتا تھا یا پھر دل آور شاہ۔

لیکن اس سے پہلے کہ ان کے صبر کا پیالہ چھلکتا اور وہ یہاں بائیس سالوں کی اذیت بکھا دیتیں' انہوں نے ایک بار پھر اپنے اندر کے غضب کو کچلا اور قدم واپس موڑ لیے تھے۔ یہاں ٹھہرنا ان کے اختیار سے باہر بھی ہو سکتا تھا' جبکہ وہ اپنے اختیار سے باہر نہیں ہونا چاہتی تھیں۔ اس لیے ان کا مڑجانا ہی بہتر تھا۔ لیکن وہ وہاں سے پلٹ کر سیڑھیاں چڑھتے ہوئے لڑکھڑا سی گئیں.... وہ گرنے کو تھیں' لیکن بروقت دیوار کا سہارا لیتے ہوئے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔

''اماں....'' دل آور شاہ نے بے ساختہ تڑپ کے پکارا اور یک دم علیزے کا بازو جھٹک کر ان کے پیچھے لپکا۔

''اماں.... پلیز رکیں۔'' لیکن وہ علیزے آفندی کی صورت دیکھنے کا عذاب دل پہ لیے بیسمنٹ کی سیڑھیاں چڑھ گئی تھیں اور دل آور کے پہنچنے تک وہ اپنے بیڈ روم میں بند ہوچکی تھیں اور وہ ان کے بیڈ روم تک آکر بھی بند دروازے کو دیکھتا رہ گیا۔ اس وقت بتول شاہ پہ کیا گزر رہی تھی وہ سب جانتا تھا۔ اسی لیے وہ دروازے پہ دستک دے کر انہیں مزید تکلیف سے دوچار نہیں کرنا چاہتا تھا اور یوں ہی عجیب تھکے تھکے قدموں سے آکر لاؤنج کے صوفے پہ ڈھیر ہوگیا۔ وہ بند دروازے کے پار بتول شاہ کے گرنے والے آنسو اپنی روح پہ گرتے ہوئے محسوس کررہا تھا اور اس کی روح پہ بتول شاہ کے آنسوؤں سے آبلے پڑتے تھے' جن کی تکلیف دل آور شاہ کا رواں رواں تڑپا رہی تھی۔

''گلاب خان.... گلاب خان۔'' وہ مٹھیاں بھینچتے ہوئے دھاڑا۔

''جی صاحب! حاضر ہوں۔'' وہ فوراً سامنے آکھڑا ہوا۔

''بند کردو بیسمنٹ کا دروازہ.... اور تالا ڈال کے چابی کہیں دور پھینک دو۔'' وہ شدت غضب سے کہہ رہا تھا اور گلاب خان کی آنکھیں تحیر سے پھیل گئی تھیں۔ لیکن وہ اس کے غصے اور غضب کے پیش نظر کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ حالانکہ وہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ چابی کہاں پھینکے؟

لیکن پھر بھی گلاب خان دل میں افسوس لیے بیسمنٹ کا دروازہ بند کرنے چلا آیا تھا اور علیزے کے قید خانے کو ایک بار پھر تالا ڈال دیا گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

''منصور حسین کے ساتھ اس کا چکر آج سے نہیں' بہت پہلے سے چل رہا تھا۔'' کومل کے زہر خند لہجے پہ آذر نے اک جھٹکے سے سر اٹھا کر دیکھا تھا اور کومل کا دل ٹھنڈک سے بھر گیا تھا۔

''کومل....!'' ثمرہ بیگم نے بیٹی کو سرزنش کرنے والے انداز میں دیکھا۔

''سوری ممی....! یہ صرف میرے منہ کی بات نہیں ہے۔ اس کا ایک منظر تو عائشہ پھوپھو بھی دیکھ چکی ہیں۔'' کومل نے سب کے چونکنے اور دیکھنے پہ بڑے سکون سے عائشہ آفندی کی سمت دیکھا جو بڑی حویلی کی بربادی پہ ماتم کناں سی بیٹھی تھیں اور وقار آفندی کو ملنے والے دکھ اور اذیت پر رو' رو کر آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔

''بتائیے نا پھوپھو....! وہ منظر جب مری میں ایک روز فجر کے وقت محترمہ علیزے بی بی کو اپنے ڈرائیور منصور حسین کے بیڈ روم سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا اور اسے دیکھ کر صاف پتا چلتا تھا کہ علیزے نے وہ رات منصور حسین کے بیڈ روم میں ہی گزاری تھی۔ کیونکہ ہمیں دیکھ کر وہ گھبرا گئی تھی۔'' کومل نے جیسے انہیں یاد دلانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن عائشہ آفندی کا ذہن پے در پے ملنے والے جھٹکوں کی وجہ سے ٹھکانے پہ نہیں تھا کہ وہ کومل کی اتنی سنگین اور گھٹیا بات کا مفہوم سمجھتیں یا پھر علیزے کے دفاع میں کچھ بولتیں۔ بلکہ انہوں نے تو شاید اس کی بات سنی ہی نہیں تھی۔ اسی لیے چپ کی چپ بیٹھی رہیں اور ان کی چپ پہ آذر کے دماغ کی شریانیں پھٹنے کے قریب ہوگئی تھیں۔ کسی بھی غیرت مند مرد کے لیے ایسی بات سن کر ڈوب مرنے کا مقام تھا۔ احمد' حماد اور زین وغیرہ کی گردنیں اور نظریں جھک گئی تھیں۔ لیکن ان سب کے درمیان ایک فرد ایسا بھی تھا جس کا دل یہ سب ماننے سے انکاری تھا۔

''علیزے! ایسی نہیں تھی۔'' یہ مضبوط لہجہ اور دعوا دانیال کا تھا۔ جس پہ کومل کے ساتھ ساتھ باقی سب نے بھی بیک وقت دانیال کی سمت دیکھا تھا۔

''کوئی کچھ بھی کہے' لیکن میں کہتا ہوں کہ علیزے ایسی نہیں تھی۔ وہ ایسی ہو ہی نہیں سکتی.... مجھے علیزے کی پاکیزگی پہ اتنا ہی یقین ہے جتنا اپنے اللہ کے ہونے پہ یقین ہے۔'' دانیال مضبوط لب ولہجے میں بولتے ہوئے ان سب کی سوچوں کو ڈانوا ڈول کرگیا تھا۔

''یعنی آپ کے کہنے کا مطلب ہے کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں۔ غلط بیانی سے کام لے رہی ہوں یا پھر علیزے پہ الزام لگا رہی ہوں۔'' کومل نے ناگواری سے کہا۔

''کبھی کبھی انسان کی زندگی میں کچھ ایسے لمحات بھی آجاتے ہیں جو الزام نہ ہوتے ہوئے بھی الزام بن جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے علیزے کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوا ہو؟ ورنہ میری نظر میں تو وہ اب بھی پاک اور صاف ہے' ہر غلطی اور گناہ سے دھلی ہوئی۔'' دانیال اب بھی علیزے کے خلاف نہیں اس کے حق میں تھا۔ اس کا یقین دیکھ کر آذر ہونٹ بھینچ کے رخ پھیر گیا۔

''میں علیزے پہ الزام لگا سکتی ہوں' لیکن آپ کی ماں تو علیزے پہ الزام نہیں لگا سکتی نا؟''

''جس روز میری ماں نے علیزے پہ الزام لگایا اس روز سمجھ لیجیے گا کہ انہوں نے انوشہ پہ الزام لگا دیا' کیونکہ ایک ماں اپنی بیٹی پہ کبھی الزام نہیں لگا سکتی۔'' کومل کی باتیں دانیال پہ اثر نہیں کرسکتی تھیں۔ وہ علیزے کے حوالے سے اس کی باتوں میں آنے والا نہیں تھا۔

''کیا اس طرح کرنے سے حقیقت چھپ جائے گی؟'' وہ طنزیہ بولی تھی۔

''تو کیا آپ اس طرح کرکے افسانہ بنالیں گی؟'' جواب دوبدو تھا۔

''آپ اسے غلط کہنے کی بجائے الٹا مجھے غلط کہہ رہے ہیں؟'' کومل کے چہرے سے ہلکا غصہ جھلک رہا تھا۔

''کیونکہ وہ غلط ہے یا نہیں ہے' لیکن آپ اسے غلط ثابت کرنے پہ تلی ہوئی ہیں۔ اس لیے میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ یہ سب ثابت کرکے کیا ظاہر کرنا چاہتی ہیں؟'' دانیال کے سوال پہ کومل سٹپٹا گئی۔ لیکن اپنے محاذ سے

ہٹی نہیں۔

"میں یہ ظاہر کرنا چاہتی ہوں کہ یہ سب کیا دھرا علیزے کا ہے۔ اس کا چکر بہت پہلے سے چل رہا تھا۔ منصور حسین کا یہاں آنا ان دونوں کی ملی بھگت تھی۔ انہوں نے ہم سب کو بے وقوف بنایا تھا۔ آپ کی نظر میں وہ جتنی پاکیزہ اور شفاف ہے' حقیقت میں وہ اتنی پاکیزہ اور شفاف نہیں ہے۔ اس کی پہلے سے ہی منصور حسین کے ساتھ کمٹ منٹ تھی۔ کیا آپ کو یاد نہیں کہ ہم لوگ جب مری میں گھومنے پھرنے کے لیے نکلتے تھے تو علیزے تھکن کا بہانا بنا کر بنگلے پہ ہی رک جاتی تھی اور اس کے ساتھ اس کے نام نہاد ڈرائیور منصور حسین کو بھی بنگلے پہ ہی رکنا پڑتا تھا۔ اب ہمارے پیچھے بنگلے پہ کیا ہوتا تھا؟ یہ ہمیں کب پتا تھا؟ لیکن سچ کہتے ہیں ایسی باتیں چھپی ہوئی نہیں رہتیں.... اک نہ اک دن سامنے آجاتی ہیں اور دیکھ لیجیے اب تو سب کے سامنے آگیا ہے سب کچھ.... اب تو کوئی شک اور شبہ بھی نہیں رہا....؟ آپ سب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے منصور حسین کا ہاتھ پکڑ کے چلی گئی ہے.... کیا یہ بھی میرا الزام ہے؟ ہونہہ! یہ کیوں نہیں کہتے کہ آج بڑی حویلی کی بربادی اور رسوائی علیزے بی بی کی بے جا لاڈ اور پیار کا نتیجہ ہے۔ اب اس اکیلی کے کیے کا بھگتان پوری حویلی کو بھگتنا پڑے گا' لوگوں کی باتوں اور انگلیوں کا نشانہ سب کو بننا پڑے گا۔ سب کی نظر جھکے گی' سب کا سر نیچا ہوگا' کیونکہ اس نے سب کی غیرت کا جنازہ نکالا ہے۔ اس لیے ماتم بھی تو سب نے کرنا ہے؟

اپنے آپ کو اور باقی گھر والوں کو محض جھوٹی تسلیاں دینے اور قیافے لگانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ جو کچھ ہونا تھا وہ ہوچکا ہے۔ منہ کالا کر گئی ہے منصور حسین کے ساتھ جو نہ جانے کب سے اس کا عاشق تھا اور اس کے عشق میں بھیس بدل کر بھی آگیا۔" ماحول لوہے کی طرح گرم تھا۔ اس لیے کومل کے الفاظ کی ضربیں سب کے ذہنوں کے کس بل نکال سکتی تھیں۔ سو اس نے یہ ضربیں لگانے میں دل کھول کے نشتر نما الفاظ کا استعمال کیا تھا اور کافی حد تک کامیاب بھی ٹھہری تھی۔

وہاں موجود سننے والے افراد کے ذہن کسی نہ کسی حد تک پراگندہ ہو ہی چکے تھے اور وہ ان سب کو اس حد تک متنفر کردینا چاہتی تھی کہ وہ سب مل کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے علیزے پہ بڑی حویلی کے دروازے بند کردیتے" اگر کبھی خدانا خواستہ وہ بھولی بھٹکی آبھی جاتی تو اسے یہاں کوئی بھی قبول نہ کرتا۔ بلکہ اسے دھکے دے کر یہاں سے نکال دیا جاتا اور اسی مقصد کو ذہن میں رکھتے ہوئے وہ سب کے سامنے بڑھ چڑھ کے بول رہی تھی اور اسے اب کسی کا کوئی ڈر بھی نہیں تھا۔ جن کا ڈر تھا وہ اسپتال کے بستر پہ بے ہوش اور لاچار پڑے تھے اور یہ لاچاری اب ڈاکٹرز نے ان کی آئندہ زندگی کا حصہ قرار دے دی تھی۔ وہ اگر ٹھیک ہو بھی جاتے تو بستر سے اٹھ نہیں سکتے تھے۔ ان کا پورا جسم مفلوج ہوچکا تھا۔ وہ بڑی حویلی کو قائم رکھنے والا ایک اہم ستون تھے اور یہ ستون گر چکا تھا۔ زمین بوس ہوچکا تھا اور بڑی حویلی کا شیرازہ بکھرنا شروع ہوگیا تھا۔ مضبوط دیواروں کی اینٹیں اکھڑ رہی تھیں اور بنیادیں زمین میں دھنسنے کے امکان صاف دکھائی دے رہے تھے اور یہی غم تو آسیہ آفندی کو کھائے جارہا تھا۔ وہ اپنے بیڈ روم میں نڈھال اور بے جان سی پڑی روئے جارہی تھیں۔ عون اور عدید اپنے باپ اور اپنی ماں کی حالت دیکھ کر بے حال ہوچکے تھے۔ ان کے معصوم ذہنوں پہ برا اثر ہوا تھا۔ لیکن یہاں بھلا کس کو پروا تھی کہ کس پہ کیا اثر ہوا ہے؟ حالات کی کروٹ بہت نقصان دہ ثابت ہوئی تھی۔ سب کچھ بدل گیا تھا۔ یہاں تک کہ اپنے بھی....

"کیا ہورہا ہے یہاں؟" اسرار آفندی نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا تھا۔ کیونکہ وہاں سب کے چہروں پہ سوچ کے جال بچھے ہوئے تھے۔

"جو بھی ہورہا ہے غلط ہورہا ہے۔" دانیال گہری سانس خارج کرتے ہوئے صوفے سے کھڑا ہوگیا۔

"کیا مطلب؟ کیا ہوا ہے؟" وہ پہلے ہی پریشان تھے۔ دانیال کی سنجیدگی پہ تشویش ہونے لگی۔

"کچھ نہیں.... آپ تیار ہیں تو آئیے چلتے ہیں' کافی ٹائم ہورہا ہے۔" وہ بات ٹال گیا تھا۔

"آذر! گھر پہ رہے گا؟" انہوں نے صوفے پہ سر جھکا کر بیٹھے آذر کی سمت دیکھا۔

"نہیں! میں بھی چلوں گا۔" بالآخر وہ بھی کھڑا ہوگیا۔ انہوں نے اسپتال جانا تھا۔ وہ لوگ گھر پہ کپڑے چینج کرنے آئے تھے اور اسپتال میں مبارک خان' اظہار آفندی اور جودت کو چھوڑ آئے تھے۔ اس لیے اب واپس اسپتال جارہے تھے۔ اس وقت رات کے ایک بجے کا وقت تھا جب وہ گھر سے نکل آئے تھے۔

✡ ✡ ✡

صبح ناشتے کی ٹیبل پہ ان دونوں ماں' بیٹے کے درمیان مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

بتول شاہ نے ساری رات بیڈ روم میں بند جلتے ہوئے گزار دی تھی تو سکون میں دل آور شاہ بھی نہیں رہا تھا۔ رات اس کی بھی کانٹوں پہ بسر ہوئی تھی۔ ساری رات ڈرائنگ روم میں ادھر ادھر ٹہلتے ہوئے اس کے پاؤں کے تلوے بھی جلنے لگے تھے اور لگاتار پھیلنے والے سگریٹوں کے دھوئیں کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی دھواں دھواں ہورہا تھا۔ اس دھوئیں کی کڑواہٹ اس کی آنکھوں میں زہر بن کے اتر رہی تھی اور چہرے پہ شدت کرب کا عالم تھا۔

رات تھی کہ عذاب تھا؟ ٹلنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی.... اس رات کو بیتنے میں ایک مدت لگ گئی تھی۔ تب جاکے سویرے کا کنارہ نظر آیا تھا اور اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش شروع کی تھی اور اس کوشش میں پہلا کام اس نے نماز پڑھنے کا کیا تھا۔ اسے پتا تھا کہ اس کے اندر بھڑکتے شعلے وضو کے پانی سے ہی سرد ہوں گے۔ ورنہ اس کے اندر کا دہکتا الاؤ اتنی آسانی سے ٹھنڈا پڑجاتا' یہ ممکن ہی نہیں تھا۔ اس کے دماغ میں حشر برپا کرتی نفرت زمین پہ پیشانی ٹکا کر اللہ کو کیے جانے والے سجدے سے ہی معدوم ہوگئی تھی اور نماز کے آخری سجدے تک وہ سر سے لے کر پاؤں تک قدرے شانت ہوچکا تھا۔ اشتعال دھیما پڑ گیا تھا اور رگوں میں بپھرے ہوئے لہو میں ہمواری آگئی تھی اور مسجد سے واپس گھر آتے ہوئے وہ رات کے مقابلے میں خاصا پرسکون لگ رہا تھا۔ پیدل چلتے ہوئے گھر میں داخل ہوا تو قدموں میں ایک توازن تھا اور ایسا ہی ایک توازن بتول شاہ کے مزاج میں بھی آچکا تھا۔ وہ رات کی اذیت رات کے ساتھ گزار آئی تھیں۔ اس لیے ان کا چہرہ بھی اس وقت ہر احساس اور ہر تاثر سے عاری تھا۔ وہ نماز پڑھ کے نیچے آئیں تو اتنے میں گل بھی آچکی تھی اور ان کے کہنے پہ فوراً" ہی ناشتا بنانے چلی گئی اور جب دل آور گھر آیا تب تک ناشتا تیار ہوچکا تھا۔ جس پہ اسے تھوڑی حیرانی بھی ہوئی' لیکن ڈائننگ روم میں بیٹھی اخبار پڑھتی بتول شاہ کو دیکھ کر اسے سمجھ آگیا تھا کہ یہ جلدی بتول شاہ کے حکم پہ ہورہی ہے۔ وہ متوازن قدموں سے چلتا وہیں آگیا۔

"السلام علیکم اماں جان....!" اس کی بھاری آواز پہ انہوں نے آہستگی سے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ کیونکہ ان کی توجہ اخبار پہ تھی۔

"وعلیکم السلام.... جیتے رہو۔" اس کے سلام کا جواب دے کر انہوں نے نظریں دوبارہ اخبار کے صفحے پہ مرکوز کردی تھیں اور نہ جانے کیوں دل آور مزید کچھ بول ہی نہیں سکا اور گل اتنے میں ناشتا لگا گئی۔ سو ناشتے کے دوران بھی ان میں خاموشی حائل رہی تھی۔

اور جب وہ ناشتا ختم کرچکا تو بتول شاہ فوراً" ہی کرسی دھکیل کر کھڑی ہوگئی تھیں۔

"ڈرائیور سے کہو گاڑی نکالے۔" بات مختصر تھی' لیکن دل آور چونک گیا تھا۔

"کیوں....؟"

"کیا پوچھنے کی ضرورت ہے؟" ان کے لہجے میں نامحسوس سی تلخی تھی۔

"لیکن اماں..."

"فی الحال مجھے جانے دو' میں پھر آؤں گی۔ اپنی زری سے ملنے... اس کی خاطر تو میں نے آنا ہی ہے؟" ان کے لہجے میں ایسا کچھ تھا کہ وہ انہیں دوبارہ رکنے پہ اصرار نہیں کر سکا تھا چپ رہ گیا۔

اس نے ڈرائیور سے گاڑی تیار کروائی اور انہیں رخصت کرنے کے لیے گیٹ تک آیا۔ گلاب خان' زلفی اور گل ان کی اتنی جلدی واپسی پہ اداس ہوئے تھے۔ لیکن وہ انہیں دوبارہ آنے کا وعدہ دے کر رخصت ہوئی تھیں اور جاتے جاتے گل کی مٹھی میں چند ہزار ہزار کے نیلے نوٹ بھی تھما دیے تھے اور خود اپنی ذات پہ کبھی نہ ختم ہونے والی اذیت اور دکھ کی چادر اوڑھ کر وہاں سے چلی گئی تھیں اور دل آور خود پہ ضبط کیے اندر چلا آیا تھا۔ ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ اس کے منشی قادر کا فون آگیا۔ وہ بے چارا کام سے بوکھلایا ہوا تھا۔ اس لیے دل آور کو خود آفس جانا پڑا۔

✡ ✡ ✡

آج اس کا موڈ بہت فریش تھا۔

شاید اس لیے کہ آج وہ اپنے بستر سے ایک ارادہ لے کر اٹھی تھی اور یہ ارادہ کچھ ایسا تھا کہ اس کے انگ انگ سے سرشاری سی پھوٹ رہی تھی۔ دل' دماغ میں اک تازگی آن بسی تھی۔ جس کے ہمراہ اس نے شاور لیا تھا۔ نئے کپڑے پہنے تھے۔ پرفیوم اسپرے کیا تھا۔ بال سنوارے تھے۔ کلائیوں میں بریسلٹ اور پاؤں میں ہائی ہیل سینڈل پہننے کے بعد اپنے آپ کو ڈریسنگ ٹیبل کے بڑے سے آئینے میں تنقیدی نگاہ سے دیکھا تھا۔ کمی بیشی کہیں بھی نہیں تھی۔ اسی لیے مطمئن ہو کر گلے میں مفلر ڈالتی ہوئی اپنا بیگ اور سیل فون لے کر بیڈ روم سے نکل آئی اور یوں ہی سیڑھیوں کی سمت بڑھتے اس کا دھیان اپنے بیڈ روم کے ساتھ والے بیڈ روم کی طرف چلا گیا اور بے ساختہ ہی وہ اس بیڈ روم کی طرف آگئی تھی۔ اس نے ہینڈل گھما کر دروازہ کھولا تو سامنے ہی بیڈ پہ گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے بیٹھی مومنہ بی بی نظر آئی۔

"ہیلو! گڈ مارننگ..." مدحیہ کافی فریش انداز سے کہتی ہوئی اندر چلی آئی اور مومنہ بی بی نے چونک کر دیکھا۔

"مدحیہ باجی...؟" وہ اسے دیکھ کر سیدھی ہو بیٹھی۔

"ارے یار! میں نے کل بھی تمہیں کہا تھا کہ میرے نام کے ساتھ "باجی" وغیرہ کا دم چھلا لگا کر میرے نام کو وزنی مت کرو' جیسے تم نے اچھی خاصی خوب صورت اور ینگ سی مومنہ کو "بی بی" بنا کے رکھ دیا ہے۔ ویسے ہی مجھے "باجی" بنانا چاہتی ہو؟" مدحیہ نے اسے مصنوعی خفگی سے ٹوکا تھا اور مومنہ بی بی اسے دیکھ کے رہ گئی۔

"دیکھو یار! ظاہر سی بات ہے۔ کیا تمہاری اور میری عمر ہے "باجی یا بی بی" والی؟" اب کے مدحیہ نے ذرا فرینڈلی سا انداز اپنایا اور مومنہ بی بی نے حیرت سے اس کی شکل دیکھی تھی۔ بات تو اس کی بھی سچ تھی؟ لیکن وہ بے چاری کیا کہہ سکتی تھی؟ ان پڑھ' سیدھے سادھے' دیہاتی ماں' باپ نے اسے بی بی بنا دیا تھا اور وہ بن گئی تھی۔ اس کے تو شناختی کارڈ پہ بھی مومنہ بی بی ہی لکھا ہوا تھا۔ نوے فیصد دیہاتی عورتوں کی طرح وہ بھی بی بی کے زمرے میں آتی تھی اور یہ بی بی اب اس کی پہچان بن چکا تھا۔

"اس میں میرا کیا قصور ہے مدحیہ باجی؟ یہ تو ماں' باپ کے سوچنے کی بات تھی۔ وہ مومنہ بی بی کی بجائے میرا پورا نام مومنہ محمد بخش بھی لکھ سکتے تھے۔ جیسے آپ کا نام مدحیہ حیات ہے۔ لیکن یہ عقل پڑھے لکھے ماں' باپ کو ہوتی ہے۔ ان پڑھ ماں' باپ کو نہیں' جو کسی قسم کا بھی کوئی فارم لکھواتے ہیں تو اس میں خاوند یا باپ کے نام سے زیادہ

بی بی کو اہم بنا دیتے ہیں۔ اس لیے بی بی ہماری مہر بن جاتی ہے۔" مومنہ بی بی کے جواب پہ مدحیہ نے کافی دلچسپی اور حیرانی سے دیکھا۔ وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی مدحیہ کے تمام ڈاکومنٹس میں اس کا نام مدحیہ حیات ولد ممتاز حیات لکھا ہوا تھا۔ بی بی کا لفظ تو کہیں بھی نہیں تھا؟

"یعنی گاؤں میں سب لڑکیوں کے ناموں کے ساتھ بی بی ہوتا ہے؟" اس نے تعجب کا اظہار کیا۔

"جی ہاں بالکل... باپ کا نام ہو نہ ہو بی بی ضرور ہوتا ہے۔ آپ کو گاؤں میں کئی بی بیاں ملیں گی' سکینہ بی بی' کوثر بی بی' رسولہ بی بی' مومنہ بی بی یا پھر صرف بی بی۔" مومنہ بی بی نے مدحیہ کو حیرت اور دلچسپی میں ڈال دیا۔

"ہوں... امیزنگ... گویا یہ بی بی والے جراثیم بہت دور' دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ میرے ختم کرنے سے ختم نہیں ہوں گے۔" اس نے پرسوچ سے انداز میں کہا۔

"جی بالکل! بہت مشکل کام ہے۔" مومنہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"خیر! اتنا بھی مشکل نہیں ہے۔ گاؤں کی تمام عورتوں کو نہ سہی' تمہیں تو صرف مومنہ کہا ہی جا سکتا ہے؟"

"ہوں! جیسے آپ کی مرضی باجی۔" مومنہ بی بی نے ہامی بھری تھی۔

"اف! پھر باجی...؟" مدحیہ جھنجلا گئی تھی۔

"دیکھو! آج سے تم مومنہ اور میں مدحیہ... نو بی بی... نو باجی... اوکے...؟" مدحیہ نے انگلی اٹھا کر جس انداز سے کہا تھا اس پہ مومنہ بی بی بے ساختہ مسکرا اٹھی۔

"جی! اوکے۔" اس نے سر ہلایا۔

"ہوں! گڈ گرل..." مدحیہ بھی جواباً" مسکرائی تھی۔

"اور اب یہ بتاؤ کہ میں ذرا باہر جا رہی ہوں۔ اگر کسی چیز کی ضرورت ہے تو بتا دو' واپسی پہ لے آؤں گی؟" مدحیہ نے کافی نرمی اور خلوص سے پوچھا تھا اور مومنہ بی بی ان دونوں بہن' بھائی کی اتنی ہمدردی' خدا ترسی' اپنائیت اور وسیع ظرف پہ کل سے کئی مرتبہ انہیں حیران نظروں سے دیکھ چکی تھی۔ اسے ان کے ماتھے پہ شکن تک نظر نہیں آئی تھی۔ وہ بلا مبالغہ کھلے دل اور کھلے ظرف کے حامل تھے۔

"کیا سوچ رہی ہو مومنہ...؟" مدحیہ نے اسے چپ ہوتے دیکھ کر ٹھوکا دیا۔

"کچھ نہیں...! میں تو بس یہ سوچ رہی ہوں کہ مجھے کس چیز کی ضرورت ہو سکتی ہے بھلا؟" مومنہ بی بی کے لہجے میں اپنی ذات کے لیے ہی تمسخر تھا جو مدحیہ کو اچھا نہیں لگا۔

"کیوں نہیں ہو سکتی بھلا؟ کیا تم لڑکی نہیں ہو؟ کیا تمہاری ضرورتیں نہیں ہیں؟ کیا پہننا اوڑھنا جرم ہے؟ یا پھر تم نے ایک ہی لباس میں عمر گزارنے کا عہد کر رکھا ہے۔" مدحیہ نے خفگی سے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"لیکن مدحیہ باجی...! آپ جانتی ہیں کہ اس وقت میری ضرورت یہ چھت ہے۔ یہ چار دیواری ہے اور اس سے بڑھ کے کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ہے مجھے' تن پہ کپڑا بھی ہے اور معدے میں غذا بھی۔ اس لیے گزارہ ہو ہی جائے گا۔ میں خوامخواہ آپ کے اخراجات بڑھاؤں یہ ضروری نہیں ہے۔" مومنہ بی بی کے لہجے میں عاجزی اور بے بسی تھی۔

"ہم نے اپنے اخراجات اور اپنے وسائل دیکھ کر ہی تمہاری ذمہ داری اٹھائی ہے۔ اگر اتنی حیثیت نہ ہوتی تو شاید ہم تمہاری ذمہ داری بھی نہ اٹھاتے؟ اللہ نے کسی کی ذمہ داری اٹھانے کی توفیق دی ہے تو پھر گریز کیسا؟ شاید تمہارے صدقے اللہ ہماری بے سکون زندگی کو سکون بخش دے۔ شاید کسی کے گناہ کو دھوتے دھوتے ہمارے گناہ دھل جائیں؟" مدحیہ کے لہجے میں بولتے بولتے کرب سا اتر آیا تھا۔

"یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟" مومنہ بی بی کو حیرت اور الجھن ہوئی تھی۔

"ہاں! ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ آخر ہم بھی تو انسان ہیں۔ گناہ سے پاک کیسے ہوسکتے ہیں؟ لیکن گناہ سے پاک ہونے کی اور گناہ کو دھونے کی کوشش تو کرسکتے ہیں نا؟" مدحیہ کا لہجہ تلخ ہوچکا تھا۔ لیکن پھر فوراً" ہی سر جھٹک دیا۔

"اینی وے! تمہیں اخراجات کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ نے بہت نوازا ہے۔ تمہارے استعمال کرلینے سے سب ختم نہیں ہوجائے گا اور ویسے بھی تمہاری ذمہ داری نبیل بھائی نے اٹھائی ہے اور تمہارے اخراجات تمہاری ضرورتیں بھی وہی پوری کریں گے۔ کون سا میں اپنی جیب سے خرچ کروں گی؟ میں نے تو بس ان کو بتانا ہے اور ان سے کیش وصول کرنا ہے۔" اس نے لاپروائی ظاہر کرتے ہوئے کندھے اچکائے تھے اور مومنہ بی بی کے چہرے پہ نہ چاہتے ہوئے بھی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ کیونکہ مدحیہ کا انداز ہی کچھ ایسا تھا۔

"پھر کیا خیال ہے تمہارا؟" اس نے دوبارہ پوچھا۔

"فی الحال کچھ سمجھ نہیں آرہا۔" مومنہ بی بی نے بے چارگی سے کہا تھا۔

"اوکے! ایزیو وش..... جب سمجھ میں آجائے تب بتادینا۔" مدحیہ کہہ کے پلٹ گئی۔

"مدحیہ باجی.....!" اس نے پیچھے سے بے ساختہ پکارا تھا اور مدحیہ نے یک دم پلٹ کر اسے جن نظروں سے دیکھا تھا۔ مومنہ بی بی نے فوراً" اپنی زبان دانتوں تلے دبالی تھی۔ وہ پھر باجی کہنے کی غلطی کر بیٹھی تھی۔ حالانکہ تھوڑی دیر پہلے بھی اس نے بات کے دوران اسے باجی کہا تھا۔ لیکن مدحیہ نے غور نہیں کیا تھا۔ مگر اب.....

"میں معافی چاہتی ہوں مدحیہ باجی! لیکن سیانے کہتے ہیں کہ امیر اور غریب اتنی جلدی گھل مل نہیں سکتے۔ تھوڑا ٹائم لگتا ہے۔ میں اتنی جلدی نہ تو آپ کے برابر آسکتی ہوں اور نہ ہی آپ کو اپنے برابر لاسکتی ہوں۔ اس لیے تھوڑا برداشت کیجیے، رفتہ رفتہ باجی کہنا چھوڑ دوں گی۔" مومنہ بی بی نے کافی معذرت خواہانہ لہجے میں کہا تھا۔ جس پہ مدحیہ نے مزید بحث میں الجھنے کی بجائے سر جھٹک دیا تھا۔

"اوکے! تم یہ بتاؤ تم نے مجھے آواز کیوں دی ہے؟" مدحیہ نے اس کے روکنے کی وجہ پوچھی تھی۔

"وہ میں نے پوچھنا تھا کہ آپ کہاں جارہی ہیں؟"

مومنہ بی بی کے اس سوال پہ نہ جانے کیوں مدحیہ پل بھر کے لیے جھجک سی گئی۔ اسے سمجھ نہ آیا کہ وہ اسے کیا جواب دے؟ کیا کہے کہ وہ کہاں جارہی ہے؟

"کیوں تمہیں کوئی کام ہے؟" وہ اس کے سوال کا جواب گول کرگئی تھی۔

"نہیں! بس یہ کہنا تھا کہ جہاں بھی جارہی ہیں ذرا جلدی واپس آجائیے گا۔"

"کیوں؟ کیا تمہیں یہاں ڈر لگ رہا ہے؟"

"نہیں مدحیہ باجی! ڈر کیسا؟ ڈر تو ان کو ہوتا ہے جن کے پاس کچھ ہو؟ میرے پاس کیا ہے بھلا؟ سب کچھ تو پہلے ہی گنوا چکی ہوں؟ بس اس لیے کہہ رہی تھی کہ تنہا بیٹھے بیٹھے دل گھبرانے لگتا ہے۔ آپ ہوتی ہیں تو دل کو ڈھارس رہتی ہے۔" اس کی بات پہ مدحیہ چند ثانیے کے لیے چپ ہوئی پھر گہری سانس کھینچتے ہوئے سر ہلادیا۔

"اوکے! جلدی آجاؤں گی، لیکن اگر زیادہ گھبراہٹ ہو تو تم بیڈ روم سے باہر بھی آسکتی ہو۔ مام کے ساتھ بیٹھ کر باتیں بھی کرسکتی ہو۔ گھر کی چار دیواری کے اندر تمہیں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ تم آزاد ہو یہاں۔" مدحیہ نے اسے ریلیکس کرنے کی پوری کوشش کی تھی اور مومنہ بی بی نے تشکر آمیز نظروں سے دیکھا تھا۔

"شکریہ..... بہت بہت شکریہ مدحیہ باجی۔"

"اوکے! گڈ بائے۔" وہ کہہ کر باہر نکل آئی تھی۔ لیکن سیڑھیاں اترتے ہوئے فائزہ بیگم سے سامنا ہوا تھا۔

"کہاں جارہی ہو؟" وہی ایک فطری سا سوال بار بار اس کے آڑے آرہا تھا۔

"بس ایک کام سے جارہی ہوں۔" مدحیہ کہہ کر ان کے سامنے ٹھہری نہیں تھی۔ بے شک جو بھی تھا۔ لیکن وہ

ایک ماں تھیں اور وہ ماں کی گہری نظروں کے سامنے عیاں نہیں ہونا چاہتی تھی۔ اسی لیے ذرا کترا کے جواب دیا تھا۔

"ہام.....! میری واپسی تک مومنہ کا خیال رکھیے گا، میں جلدی آجاؤں گی۔" سیڑھیاں اترنے کے بعد اسے خیال آیا تو اس نے مڑ کر فائزہ بیگم کو تاکید کی تھی۔

"خوش قسمت ہے مومنہ بی بی جس کے خیال تمہیں ستا رہے ہیں۔" فائزہ بیگم نے رشک کا اظہار کیا اور مدحیہ مسکراتی ہوئی کوریڈور عبور کرگئی۔ ابھی اس نے گھر کے گیٹ سے گاڑی نکال کر روڈ پہ ڈالی ہی تھی کہ اس کا سیل فون بج اٹھا تھا۔

"ہیلو....." اس نے بنا دیکھے ہی کال ریسیو کرلی تھی۔

"کیسی ہو.....؟" دوسری طرف جیزی تھا۔

"ایک دم فٹ! تم سناؤ، تم کیسے ہو؟" مدحیہ کے لہجے میں بے پناہ بشاشت تھی۔

"کیسا ہونا چاہیے مجھے؟ کیا تمہیں میری کچھ خبر ہے؟ کیا اس کو مہمان نوازی کہتی ہو کہ دوبارہ پلٹ کر خبر بھی نہ لو کسی کی؟" جیزی شکوہ کررہا تھا۔ مدحیہ تو اسے سچ مچ بھولی ہوئی تھی۔

"سوری یار! ایم ریئلی سوری..... ان فیکٹ دو دن پہلے نبیل بھائی کا کسی لڑکی کے ساتھ ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا۔ اس لیے گھر میں کچھ مصروفیت تھی اور کل دل آور بھائی اپنے گھر آئے ہوئے تھے تو ہم ان سے ملنے چلے گئے۔ تب ہی تم سے ملنے کا ٹائم نہیں ملا۔" وہ ڈرائیو کرتے ہوئے اسے جواب دے رہی تھی۔

"اور اس وقت کہاں جارہی ہو؟" جیزی کے کہنے پہ مدحیہ چکرا گئی۔

"اف! کیا ہوگیا ہے تم سب کو؟ میں کہیں جانے کے لیے کیا نکلی ہوں کہ شہر کا شہر پیچھے پڑ گیا ہے۔ ہر طرف ایک ہی سوال سنائی دے رہا ہے۔ کہاں جارہی ہو؟ کہاں جارہی ہو؟" اس نے جیسے سر پیٹ لیا۔

"تو تم بتادو کہ تم کہاں جارہی ہو؟" جیزی سکون سے کہہ رہا تھا اور مدحیہ ٹھہر سی گئی۔

"کسی سے ملنے جارہی ہوں۔" اب کی بار اس کا بشاشت آمیز لہجہ دھیما پڑ چکا تھا۔

"کس سے ملنے جارہی ہو؟" یہ سوال جیزی چاہتے ہوئے بھی نہیں پوچھ سکا تھا، کیونکہ مدحیہ کا دھیما لہجہ اسے ٹھٹکا گیا تھا اور وہ یہ سوال پوچھ کر اپنے وہم پہ یقین کی مہر نہیں لگانا چاہتا تھا۔

"ہیلو جیزی!" مدحیہ نے اس کی خاموشی پہ اسے پکارا تو وہ چونک کر متوجہ ہوا۔

"ہوں! سن رہا ہوں۔" اب اس کا لہجہ دھیما ہوچکا تھا۔

"چپ کیوں ہوگئے ہو؟"

"کچھ کہنے کے لیے بھی تو نہیں ہے؟ اینی وے۔ تم جہاں جارہی ہو، جاؤ، واپسی پہ تم سے بات ہوگی مگر بھولنا مت یہ بھی یاد رکھنا کہ میں منتظر ہوں۔" جیزی نے کہہ کر فون بند کردیا اور مدحیہ فون کو دیکھ کے رہ گئی تھی کیونکہ جیزی اپنی بات کا مفہوم واضح کرگیا تھا۔

☆ ☆ ☆

اوماڑا اے تے ماڑا سہی یار تو ہے
کج وی ہووے او ساڈا پیار تو ہے
کیوں ماہے دا کیوں ڈھولے دا گلہ کراں
میں تاں لکھ واری بسم اللہ کراں.....

اوبسم اللہ کراں۔۔۔

ورکشاپ کے گرد آلود برآمدے میں لکڑی کے بنچ پہ رکھے کالے رنگ کے ٹوٹے پھوٹے سے ٹیپ ریکارڈر میں فل والیوم سے گونجتی ملکو کی آواز عدیل کے اعصاب پہ ٹینشن کی طرح سوار ہو رہی تھی وہ پہلے ہی کافی بے زار تھا' ملکو کے ان چونچلوں پہ اور بھی کوفت اور بے زاریت ہونے لگی تھی اس نے دو تین بار چھوٹے کو ٹیپ ریکارڈر بند کرنے کے لیے بھی کہا تھا لیکن وہ یہ رسک لینے کو تیار نہیں تھا کیونکہ یہ ٹیپ ریکارڈر سالوں سے بند پڑا تھا اور دو دن پہلے چھوٹے نے اسے کاٹھ کباڑ سے دریافت کر کے اسے دس روپے کا نیا سوئچ لگا کر تقریباً "پچاسی جھٹکے دیئے تھے اور تب جا کے وہ اسٹارٹ ہونے پہ آمادہ ہوا تھا اور چھوٹا خوشی سے بھاگتا ہوا جا کر ساتھ والے چائے کے ڈھابے سے یہ کیسٹ اٹھا لایا حالانکہ اس نے جب یہ کیسٹ لا کر ٹیپ ریکارڈر میں فٹ کیا تھا تو ٹیپ ریکارڈر نے ابکائی کرنے والے انداز میں فوراً" وہ کیسٹ باہر اگل دیا تھا کیونکہ ٹیپ ریکارڈر کے کیسٹ ڈالنے والے فریم ٹوٹے ہوئے تھے اس لیے بغیر کسی فریم یا بغیر کسی سہارے کے کیسٹ کا ٹھہرنا مشکل تھا لیکن دوسری طرف ٹھہرانے والا بھی آخر "چھوٹا" تھا۔

اس نے کیسٹ ٹیپ ریکارڈر میں ڈال کے اس کے دائیں بائیں ماچس کی تیلیاں پھنسا دی تھیں اور اوپر سے ٹیپ ریکارڈر پہ ایک زوردار تھپڑ رسید کیا اور تب سے اب تک ملکو گا گا کر ہلکان ہو گیا تھا کیونکہ چھوٹے نے اسے بند کرنے کی زحمت نہیں کی تھی بس جب بجلی آف ہوتی تو اسے ذرا دم لینے کا وقفہ ملتا تھا ورنہ تو نان اسٹاپ چلتا رہتا اور اگر بھی درمیان میں ٹیپ ریکارڈر اٹکنے لگتا تھا تو چھوٹا اسے تھپڑ مار کے پھر سے اس میں پھریری سے بھر دیتا اور اس پہ ستم کہ ٹیپ ریکارڈر کا والیوم بھی کم نہیں ہوتا تھا کیونکہ اس کا والیوم والا بٹن ہی غائب تھا اور اس کا یہ اعصاب شکن مشغلہ عدیل کی برداشت سے باہر ہو رہا تھا لیکن پھر بھی وہ ضبط کیے اپنے کام میں مصروف رہا تھا تاکہ اس کے کچھ سخت سست بولنے پہ کوئی بدمزگی پیدا نہ ہو' لیکن چھوٹا تھا کہ باز ہی نہیں آ رہا تھا۔

اساں تاں چن کے یار بنایا شوقاں دا

ہورے کیہڑا امل لگدا اے ایناں لوکاں دا؟

چھوٹے نے شاید عدیل کو زچ کرنے کا پورا پورا پروگرام بنا رکھا تھا کیونکہ اب وہ خود بھی ساتھ ساتھ گانا شروع ہو چکا تھا جس پر عدیل کو اور بھی تاؤ آ رہا تھا۔

"دیکھ چھوٹے۔۔۔! یہ ہاتھ میں پکڑا ہوا رنچ تمہارے سر پہ دے ماروں گا اس لیے بہتر ہے کہ شرافت سے اپنا اور اس کا منہ بند کرو' ورنہ تم دونوں کو اٹھا کر باہر پھینک آؤں گا۔" عدیل کی برداشت جواب دے چکی تھی اس نے خونخوار نظروں کے ساتھ چھوٹے کو اور اس کے دریافت شدہ دھکا اسٹارٹ ٹیپ ریکارڈر کو بیک وقت دیکھا تھا۔

"استاد! تم تو یوں غصہ کر رہے ہو جیسے ملکو تمہیں چھیڑ رہا ہو۔" چھوٹے نے چوٹ کی تھی جس پہ عدیل تلملا گیا تھا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"ارے استاد! مطلب والی باتیں ہمیں نہیں آتیں' ہم تو بغیر مطلب والی بات کرتے ہیں۔ ویسے استاد! آپس کی بات ہے یہ جو یار ہوتے ہیں یہ ماڑے کیوں ہوتے ہیں؟" چھوٹے نے آخر میں معصومیت سے سوال داغ دیا اور عدیل نے اسے گھور کے دیکھا۔

"تم آخر کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"اللہ کی قسم استاد! میں بھی وہی چاہتا ہوں جو تم چاہتے ہو لیکن کیا کریں؟ رنگ میں بھنگ تو وہ ولایت والا (جیزی) ڈال گیا تھا جب بھی یاد آتا ہے کھوپڑی گرم ہو جاتی ہے اچھا بھلا استاد کا کام سیدھا ہو رہا تھا لیکن وہ نہ

جانے کہاں سے بیچ میں آگیا لیکن استاد کوئی بات نہیں تیری ٹانگ میں اگر دم ہوا تو وہ میڈم ضرور آئے گی کیونکہ یہ تو ایک فطری سی بات ہے کہ جس طرح دیسی کو ولایتی میں بڑی کشش ہوتی ہے اسی طرح ولایتی کو بھی دیسی میں بڑی کشش محسوس ہوتی ہے' خصوصاً" ولایتی عورت تو دیسی مرد کی طرف کھنچی چلی آتی ہے' اور تم بھی ماشاءاللہ دیسی مرد ہو' مشرقی مرد ہر لحاظ سے مکمل' کشش سے مالا مال' ممکن ہی نہیں کہ وہ ولایتی میڈم تمہارے سحر سے بچ نکلے۔"
چھوٹے کی بات پہ عدیل نے ناگواری سے سر جھٹکا۔
"میرے دل میں اس کا خیال تک نہیں ہے تمہیں خوامخواہ ایشو بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنے کام سے کام رکھا کرو۔"
"ہونہہ استاد! تمہارے دل میں اس کا خیال تک نہیں ہے تو پھر دماغ میں یہ گرمی کس لیے ہے؟ جو تم ہم پہ نکال رہے ہو۔" چھوٹے کا انداز معنی خیز سا تھا۔
"تمہارے کرتوت ہی ایسے ہوتے ہیں کہ خوامخواہ دماغ گرم ہونے لگتا ہے۔"
"میرے کرتوت یا پھر۔۔۔؟" چھوٹے نے بات ادھوری چھوڑتے ہوئے اسے دیکھا تھا اور عدیل نے سمجھتے ہوئے یکدم اسے مارنے کے لیے رینچ گھمایا تھا اچانک ورکشاپ کے احاطے میں ایک گاڑی جھٹکے سے آن رکی۔ سلور کلر کی چمچماتی ہوئی یہ گاڑی عدیل کے لیے اجنبی نہیں تھی اس کا ہاتھ یکدم نیچے پہلو میں آگرا تھا۔
"مرد پہ دیسی شراب اور عورت پہ دیسی مرد بڑا اثر کرتے ہیں استاد۔ آزمائش شرط ہے۔" چھوٹا اس کے قریب سرگوشی سے کہتا ہوا پاس سے گزر کر ورکشاپ کی پچھلی سائیڈ پہ چلا گیا جہاں جیدی اور سلو کسی گاڑی کی مرمت میں مصروف تھے۔ وہ گاڑی سے اتر کر اس کے قریب آگئی۔
"ہیلو۔!" آواز تھی یا مٹھاس جس کا احساس عدیل کو روح تک محسوس ہوا تھا۔
"السلام علیکم۔" اس نے بھی کافی ٹھہرے ہوئے لہجے میں سلام کیا تھا۔
"کیسے ہیں آپ؟" اس وقت وہ احساسات اور جذبات سے گندھی ہوئی ایک نارمل لڑکی نظر آرہی تھی جس کے وجود میں بھڑکتا غصہ اس لمحے کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا وہ سر سے پاؤں تک تسخیر پہ آمادہ تھی اور اس لمحے عدیل کو اس کی ذات کے آئینے میں اپنے آپ کے سوا اور کوئی نظر نہیں آیا تھا اسے اس کے وجود میں اپنا آپ دکھائی دے رہا تھا' وہ اس وقت اس کے سامنے کھڑی "مدحیہ حیات" نہیں بلکہ "عدیل عمر" لگ رہی تھی شاید اسی لیے کہ عدیل عمر کے سامنے آنے کے لیے اسے مدحیہ حیات کو پیچھے چھوڑ کے آنا پڑا تھا شاید اپنے اسی بستر میں جہاں سے وہ عدیل عمر سے ملنے کا ارادہ لے کر اٹھی تھی اور اب اس کے سامنے کھڑی وہ مدحیہ "مدحیہ" ہی نہیں لگ رہی تھی جس کو دیکھ کر عدیل عمر کا دل بھی اپنی جگہ سے اس کی سمت ہمکنے لگا تھا اور اس نے ہاتھ میں پکڑا رینچ ایک سائیڈ پہ ڈال دیا۔
"میں ٹھیک ہوں! آپ سنائیں کیسی ہیں؟" عدیل کا دل اس کے لہجے پہ حاوی ہو رہا تھا' آنچ دے رہا تھا۔
"میں آپ کے سامنے ہوں۔ اب آپ فیصلہ کریں کہ میں کیسی ہوں؟" وہ آج پہلی بار دل کی رضا سے آئی تھی اس لیے سب کچھ دل کی رضا پہ چھوڑ رکھا تھا صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ اس کی چھوٹ پہ دل اپنی رضا سے کیا کیا کرتا ہے؟ کیا گل کھلاتا ہے؟ کون سا چاند چڑھاتا ہے؟ کہاں تک جاتا ہے؟ کتنا بہکتا ہے اور کتنا سنبھلتا ہے؟ یہی جاننے کے لیے اس نے دل کو خاصی ڈھیل دے رکھی تھی اور وہ عدیل عمر کے حضور آن پہنچا تھا کسی سدھائے ہوئے بے زبان جانور کی طرح۔۔۔!
"آپ اپنے فیصلے دوسروں پر بھی چھوڑتی ہیں؟" عدیل کا سوال دلچسپی لیے ہوئے تھا۔
"اکثر نہیں' کبھی کبھی۔" وہ بھی خوشگواریت سے بولی۔

"کبھی کبھی کیوں؟"
"کیونکہ دل کبھی کبھی موج و مستی پہ آمادہ ہوتا ہے۔" اس نے لاپروائی سے کہا۔
"یعنی آپ اس وقت موج و مستی پہ آمادہ ہیں؟" عدیل کے معنی خیز لہجے پہ مدحیہ بری طرح چونکی تھی وہ اس کی بات کو ذو معنی پیراہن دے چکا تھا۔
"نن نہیں۔۔۔! ایسی بات نہیں ہے۔" مدحیہ جیسی شعلہ صفت لڑکی کا یوں گڑبڑا جانا عدیل کو لطف دے گیا تھا اس کے دماغ کی گرمی دور ہو گئی تھی۔
"تو پھر کیسی بات ہے؟ کس موج میں ہیں آپ؟ اور کس مستی کی بات کر رہی ہیں؟" اس کے رنگ' اس کے انداز دیکھ کے عدیل خود مستی میں آگیا تھا۔ اور مدحیہ نظریں چرا گئی۔
"کیا بیٹھنے کو نہیں کہیں گے؟" اس نے عدیل کی بات کو سنی ان سنی کرتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا۔
"ارے کیوں نہیں۔! سو بسم اللہ' سر آنکھوں پہ' آیئے' بیٹھیے۔" عدیل نے چونکتے ہوئے فوراً" پلاسٹک کی کرسی کھینچ کر اس کے سامنے رکھ دی اور دوسری کرسی اپنے لیے کھینچ لایا۔
"ارے بے فکر رہیں! کرسی گندی نہیں ہے بس حالات اور ماحول نے اسے بدوضع اور بے رنگ بنا دیا ہے۔" عدیل نے اسے تسلی دی تھی اور مدحیہ خجل ہوتی ہوئی بیٹھ گئی۔
"اب بتایئے! کیا لیں گی آپ؟" وہ عین اس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا اور مدحیہ کو یوں اس کے روبرو بیٹھنے پہ جھجک سی ہو رہی تھی۔
"نہیں! کچھ نہیں۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی تھی۔
"کیا ناشتا کر کے آئی ہیں؟"
"نہیں۔"
"ارے! تو پھر انکار کس لیے ہے؟ یہاں ناشتا کریں گرما گرم حلوہ پوری' چنے اور لسی کے ساتھ دماغ کی خشکی دور ہو جائے گی۔" عدیل نے اسے ناشتے پہ اصرار کیا تھا۔
"نہیں! اتنا ہیوی ناشتا میں نہیں کر سکتی۔" وہ اتنا بھاری بھرکم ناشتا کرنے پہ تیار نہیں تھی۔
"اتنا بھی ہیوی نہیں ہے' بس آپ کو نام سن کر ایسا لگ رہا ہے اس نرم گرم سے موسم میں یہ ناشتا بہت گرمائش دیتا ہے۔" عدیل کا اصرار ہنوز تھا۔
"ایم سوری! اتنا ہیوی ناشتا تو نہیں لیکن چائے لے سکتی ہوں۔" اس نے چائے پہ رضامندی ظاہر کی تھی اور مجبوراً" عدیل کو اپنے اصرار سے ہٹنا پڑا۔
"اوکے! ابھی منگواتا ہوں۔" اس نے کہتے ہوئے گردن موڑ کر سلو کو آواز دی تھی۔
"سلو۔! اوئے سلو۔" اس نے بلند آواز سے پکارا۔
"جی استاد؟" سلو فوراً" ہاتھ جھاڑتا ہوا حاضر ہوا تھا۔
"دو کپ چائے پکڑو ڈھابے سے۔" اس نے اشارہ کیا تھا۔
"استاد! سلام تو کر لینے دیں۔ سلام میڈم! کیسی ہیں آپ؟" سلو نے عدیل کو خفگی سے کہا تھا اور ساتھ ہی مدحیہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔
"وعلیکم السلام! ٹھیک ہوں' اللہ کا شکر ہے۔" مدیحہ نے آہستگی سے کہا اور اس کے انگلش لب و لہجے میں "اللہ کا شکر" ادا کرنا بہت اچھا لگا تھا۔
"چلیں شکر ہے' اللہ اپنا کرم ہی رکھے' آپ بیٹھیں میں ابھی چائے لے کر آتا ہوں۔" سلو خوشدلی سے کہتا ہوا

چلا گیا۔ عدیل کو پتا تھا کہ وہ تینوں لوفر اسے بہت تنگ کریں گے اسی لیے تو اس نے بڑے لوفر "چھوٹے" کو نہیں بلایا تھا جو صرف نام کا چھوٹا تھا' کام کا نہیں' کام تو اس کے بڑے بڑے تھے' خصوصاً" اس کی عقل بہت بڑی تھی' کافی دور کی سوچ رکھتا تھا۔ اور اس کا ادراک عدیل کو کافی اچھی طرح سے ہو چکا تھا۔

"اور سنائیں کیسے آنا ہوا آپ کا؟ میرے لائق کوئی خدمت۔" عدیل دوبارہ سے اس کی سمت متوجہ ہو چکا تھا اور مدحیہ کو اس وقت کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کہے؟ اور کیا بتائے کہ وہ یہاں کیوں آئی ہے؟ کیونکہ اس کے پاس کوئی وجہ ہی نہیں تھی یہاں آنے کی۔

"وہ دراصل میں نے آپ کے گھر جانا تھا' آپ کے فادر کی خیریت معلوم کرنے کے لیے لیکن مجھے آپ کے گھر کا پتا نہیں تھا اس لیے یہاں آنا پڑا ہے۔" مدحیہ کو بروقت ایک بہانا سوجھ ہی گیا تھا اور عدیل اس کا یہ گریز فوراً" ہی سمجھ گیا۔

"وہ اچھا اچھا۔! تو آپ ابا جی کی عیادت کے لیے یہاں آئی ہیں؟" اس نے اپنی ذومعنی سی مسکراہٹ کو چھپانے کے لیے دور سے آتے سلو پہ نظریں جمادیں تاکہ مدحیہ سے نظروں کا تصادم نہ ہو۔

"آپ مجھے گھر کا پتا بتادیں' میں چلی جاؤں گی۔" وہ بھی بات کرتے ہوئے کافی جھجکی اور کترائی کترائی سی لگ رہی تھی اپنے سابقہ شعلہ جوالہ انداز سے قطعی مختلف نظر آرہی تھی۔

"ارے نہیں نہیں! جب تک میں آپ کو اپنے گھر لے کر نہیں جاؤں گا آپ کیسے جائیں گی بھلا؟ آپ کے ساتھ میرا ہونا ضروری ہے۔" عدیل کے جواب پہ اس نے بے ساختہ پلکیں اٹھا کر دیکھا اور عدیل اس کی گہری سیاہ آنکھوں کے وار سے گھائل ہو کے رہ گیا تھا اس کی آنکھوں کی دھار بہت تیز تھی۔

"استاد! چائے۔" سلو آنکھوں کی آنکھوں تک رسائی کا یہ منظر دیکھ چکا تھا اسی لیے گلا کھنکار کے متوجہ کیا۔

"ہوں! لاؤ دو ادھر۔" عدیل نے نظروں کا دامن چھڑا کر سلو کے ہاتھ سے دونوں کپ تھام لیے تھے۔

"میں جاؤں استاد؟"

"ہوں! جاؤ۔" عدیل نے سلو سے نظر ملائے بغیر کہا تھا۔

"ٹھیک ہے استاد! کرلو موجاں۔" سلو آہ بھر کے کہتا ہوا واپس چلا گیا اور اس کی یہ سرگوشی نما آہ سن کر عدیل مسکراہٹ دبا گیا۔

"یہ لیجیے چائے۔" اس نے کپ مدحیہ کی سمت بڑھا دیا تھا۔

"تھینکس۔" مدحیہ نے دودھیا ہاتھ بڑھاتے ہوئے چائے کا وہ چھوٹا سا کپ تھام لیا اور عدیل اس کے ہاتھ کی خوبصورتی دیکھ کے رہ گیا۔ دودھ کی طرح سفید' ملائم اور گداز ہاتھ عدیل کی نظروں کو بھٹکا گئے تھے۔

"ہوں! اچھی چائے ہے اور اسٹرانگ بھی۔" مدحیہ نے چائے کا سپ لینے کے فوراً" بعد تعریف کی تھی۔

"اتنی زیادہ محنت اور تھکن کے بعد اسٹرانگ چیزیں ہی ہماری ترجیح ہوتی ہیں جو تھکے ہارے جسم سے ساری تھکن نچوڑ دیتی ہیں اور دل و دماغ ہلکے پھلکے ہو جاتے ہیں۔" عدیل نے بھی چائے کا سپ لیا۔

"آپ اتنی محنت کیوں کرتے ہیں؟" مدحیہ کے ذہن میں اٹکا ہوا سوال باہر آیا تھا۔

"کیونکہ میں اپنے گھر کا واحد کفیل ہوں' پانچ بہنوں کا بھائی اور ماں باپ کا ایک ہی بیٹا ہوں۔ اس لیے محنت تو مجھ پہ فرض ہے۔" وہ لاپروائی ظاہر کر رہا تھا۔

"لیکن آپ کوئی اور کام بھی تو کرسکتے ہیں؟" وہ فوراً" بولی۔

"بہت کوشش کی تھی کرنے کی' یہاں تک کہ خودکشی بھی' لیکن اللہ کو خودکشی کرنا پسند نہیں ہے اس لیے اس نے مجھے خودکشی کے کام سے ہٹا کر یہاں بھیج دیا' شاید اسے میرے لیے یہی پسند تھا۔" اس نے کندھے جھٹکے تھے۔

"لیکن یہ کام آپ کو سوٹ نہیں کرتا۔" وہ بے ساختگی سے بولی تھی۔

"ہمیں زندگی میں بہت سے کام ایسے کرنے پڑتے ہیں جو ہمیں سوٹ نہیں کرتے' جیسے آپ یہی دیکھ لیں کہ آپ کا یہاں آنا سوٹ نہیں کرتا' لیکن پھر بھی آپ کو آنا پڑا ہے کیونکہ آپ کے پاس کوئی اور چارہ نہیں تھا بالکل اسی طرح میرے پاس بھی یہاں آنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔" عدیل کے لہجے میں ہلکی تلخی کی آمیزش تھی۔

"لیکن کام کا کوئی اسٹینڈرڈ تو ہونا چاہیے؟"

"دیکھیے میڈم! ایسی بات وہی بندہ سوچ سکتا ہے جو ہر لحاظ سے آزاد ہو' بے فکر ہو' حالات اور مشکلات میں پھنسا ہوا آدمی یہ سب نہیں سوچ سکتا اس کی عقل اور شعور تو مسائل سے ہی مفلوج ہو چکے ہوتے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ مجبوری معیار نہیں دیکھتی۔ مجبوری یہ نہیں سوچتی کہ کیا معیاری ہے؟ اور کیا غیر معیاری ہے؟ مجبوری کہتی ہے کرو۔ وہ سب کرو جو تمہارے اختیار میں ہے۔ چاہے وہ معیاری ہے یا غیر معیاری' اچھا ہے یا برا حلال ہے یا حرام؟ بس تم نے کرنا ہے کیونکہ میرا نام مجبوری ہے اور محبت کی طرح مجبوری بھی اندھی ہوتی ہے کچھ بھی نہیں دیکھتی' مقام' مرتبہ' معیار بھی نہیں دیکھتی سب کروالیتی ہے بلکہ وہ کام بھی کرواتی ہے جو کام انسان سے کبھی محبت بھی نہیں کروا پاتی اس لیے اور دیگر مجبوروں کی طرح میں بھی اس مجبوری کے ہاتھوں مجبور ہوں وہ سب کرنے کے لیے جو شاید میرے معیار کا نہیں ہے۔" عدیل کے تفصیلی اور تلخ سے جواب پہ مدحیہ چپ چاپ سی اسے دیکھتی رہ گئی۔ اس کے لفظ لفظ میں سچائی اور چبھن تھی وہ اب کچھ کہتی بھی تو کیا کہتی۔؟

"خیر! چھوڑیں اس بات کو۔ آپ کو ایک بات بتاتا ہوں۔" عدیل نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔ اور چائے کا سپ لیتے ہوئے مدحیہ کو کچھ بولتی ہوئی نظروں سے دیکھا تھا۔

"کیا.....؟" مدحیہ نے بھی چائے کا سپ لیتے ہوئے بے ساختہ پوچھا۔

"آپ اس وقت بہت "اپنی" سی لگ رہی ہیں۔" عدیل اظہار کیے بنا نہیں رہ سکا اور مدحیہ نے یکدم پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا تھا وہ مسکرا رہا تھا اس کی مسکراہٹ میں کئی رنگ تھے کئی معنی تھے ——— وہ نظر جھکانے پہ مجبور ہو گئی۔ عدیل اس کی حرکت پہ قہقہہ لگاتا' اگر اسے مدحیہ کا ڈر نہ ہوتا وہ کسی بھی وقت اپنا ٹیمپر لوز کرسکتی تھی اسی لیے وہ سنبھل گیا اور اپنا قہقہہ دبا گیا اور ہمیشہ اعتماد سے بات کرنے والی انتہائی بولڈ سی مدحیہ نہ جانے کیوں اس لمحے نروس ہو گئی تھی۔

"اوکے۔! میں اب چلتی ہوں۔" وہ چائے کا خالی کپ رکھتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

"آئندہ کی امید بھی رکھ سکتے ہیں یا نہیں؟" وہ بلا ارادہ پوچھ بیٹھا۔

"کیا آئندہ بھی آنا چاہیے؟"

"یہ سوال تو آپ کو اپنے آپ سے کرنا چاہیے۔"

"لیکن! میں یہ سوال آپ سے کر رہی ہوں۔" وہ عدیل پہ نظریں جما چکی تھی۔

"کیا میرے جواب کی اہمیت ہے آپ کی نظر میں؟"

"ہے تو پوچھ رہی ہوں نا۔"

"تھینک یو۔! پھر میں تو کہوں گا آپ کا جب بھی دل چاہے آپ آئیں میرے گھر سے دل تک تمام دروازے کھلے ہوئے ملیں گے آپ کو۔" اس نے خوشدلی سے بازو پھیلا کر کہا۔

"وجہ؟ اتنی عنایت کس لیے؟" وہ اسے کھوجنا چاہتی تھی۔

"آتی جاتی رہیں گی تو وجہ بھی پتا چل جائے گی۔" وہ مسکراہٹ چھپا نہیں سکا۔

"اوکے!گڈ بائے۔" وہ کہہ کے پلٹ گئی اور اپنے گلاسز بالوں میں اٹکا لیے تھے اور گاڑی کے قریب جا کر دوبارہ پلٹ کر اسے دیکھا۔ وہ بھی اسے ہی دیکھ رہا تھا اور پھر وہ گاڑی بیک کرتے ہوئے روڈ تک لے گئی۔ عدیل اسے دور تک دیکھتا رہا جیسے ہی اس کی گاڑی آنکھوں سے اوجھل ہوئی وہ واپس پلٹا تھا لیکن یکدم گڑبڑا گیا کیونکہ وہ تینوں عین اس کے پیچھے کھڑے تھے اور عدیل کو گھور رہے تھے وہ جان بوجھ کر بال سہلاتا ہوا کترا کے ان کے پاس سے گنگناتا ہوا گزر کر آگے بڑھ گیا۔

کیوں ماہیے دا کیوں ڈھولے دا گلہ کراں

او میں تاں لکھ واری بسم اللہ کراں....

"استاد۔" اس کے گنگنانے پہ چھوٹا یکدم چیخ اٹھا اور خونخوار انداز میں اس کی سمت لپکا تھا اور جواباً" وہ اپنا بچاؤ کرتے ہوئے قہقہہ لگا کے ہنسا تھا۔

٭ ٭ ٭

"پلیز بھابھی۔! ایک منٹ' میں کچھ بھول گئی ہوں۔" زری گھر کی دہلیز سے باہر قدم رکھتے ہوئے یکدم رک گئی۔ عبداللہ سارا سامان گاڑیوں میں رکھوا رہا تھا دو گھنٹے بعد ان کی فلائٹ تھی۔

"کیا بھول گئی ہو؟" نگارش بھی ٹھٹک کے رک گئی۔

"جائے نماز۔" زری نے کہتے ہوئے قدم واپس موڑ لیے۔

"جائے نماز....؟" نگارش کو حیرت ہوئی تھی۔

"ہاں بھابھی! میری جائے نماز جس پہ میں نماز پڑھتی ہوں۔"

"لیکن زری! جائے نماز تو پاکستان سے بھی مل جائے گی؟"

"یہ جائے نماز کہیں سے بھی نہیں ملے گی بھابھی۔" زری گھر کے کوریڈور میں داخل ہو چکی تھی۔

"کیا مطلب؟" نگارش کو بھلا کیا پتا تھا۔

"مطلب آکر بتاتی ہوں۔" زری بغیر رکے اور بغیر پیچھے پلٹے کہتی ہوئی کوریڈور عبور کر گئی اور نگارش وہیں دہلیز میں کھڑی دیکھتی رہ گئی۔

"نگارش! کھڑی کیوں ہو؟ گاڑی میں بیٹھو۔" گاڑی کے قریب کھڑے عبداللہ نے آواز دی۔

"وہ زری آجائے تو....." نگارش بات ادھوری چھوڑتے ہوئے چپ ہو گئی۔

"کیوں؟ زری کہاں گئی ہے؟" عبداللہ بھی زری کی غیر موجودگی پہ چونکا۔

"اندر گئی ہے کچھ بھول گئی تھی شاید۔"

"اسی لیے میں نے تم لوگوں سے کہا بھی تھا کہ سب کچھ دوبارہ چیک کر لینا تاکہ بعد میں مسئلہ نہ ہو۔" عبداللہ خفگی سے کہتا گاڑی میں بیٹھ گیا۔ سامان والی گاڑی اس نے خود ڈرائیو کرنی تھی اور جس گاڑی میں زری اور نگارش نے جانا تھا وہ گاڑی نگارش کے بھائی نے ڈرائیو کرنا تھی۔

"آپی! آپ بیٹھیں تب تک وہ بھی آجاتی ہیں۔" شیراز (نگارش کا بھائی) نے آگے بڑھ کے نگارش کو بیٹھنے کا کہا۔ لیکن نگارش کو بے چینی ہو رہی تھی کہ کہیں زری دیر نہ لگا دے اور وقت کی کمی کی وجہ سے عبداللہ غصہ نہ کر بیٹھے۔ اسی لیے وہ وہیں کی وہیں کھڑی رہی تھی۔

"لیجیے بھابھی! میں آگئی۔" زری تیزی سے قدم اٹھاتی گھر سے باہر نکل آئی تھی اور تب جا کے نگارش کا سانس بحال ہوا تھا۔ اور دونوں نے قدم گاڑی کی سمت بڑھا دیے تھے شیراز ان کے پیچھے گھر کا دروازہ لاک کیا اور آکر

گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔

"اب بتاؤ ایسا کیا ہے اس جائے نماز میں کہ عین ٹائم پہ تمہاری جان اٹک گئی تھی؟" گاڑی مین روڈ پہ آتے ہی نگارش کا سوال بھی سامنے آگیا۔

"اس جائے نماز میں میری زندگی کا قیمتی اثاثہ ہے۔" زری نے نیلے رنگ کی دبیز روؤں والی ویلوٹ کی مخملی جائے نماز پہ بڑی عقیدت — اور محبت سے ہاتھ پھیرا۔

"کیسا اثاثہ؟" نگارش کے کچھ پلے نہیں پڑ رہا تھا۔

"آج سے تین سال پہلے اسی جائے نماز پہ اس نے (دل آور شاہ) نماز پڑھی تھی' آپ کو یاد ہو گا عبداللہ بھائی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا' کافی چوٹیں آئی تھیں اور اس دن وہ اور نبیل ہمارے گھر ہی ٹھہر گئے تھے' آپ دوسرے بیڈ روم میں تھیں' جلدی سو گئی تھیں لیکن میں جاگ رہی تھی وہ عبداللہ بھائی اور نبیل کے ساتھ باتیں کر رہا تھا' اس کی آواز مجھے سنائی دے رہی تھی تو میں کیسے سو سکتی تھی بھلا؟ اور جب ان کی باتوں کا سلسلہ ختم ہوا تو وہ اٹھ کر باہر نکل آیا' وہ نماز پڑھنا چاہتا تھا اور جائے نماز ڈھونڈ رہا تھا' اس نے پہلی بار کوئی چیز مانگی تھی اور وہ تھی جائے نماز۔ وہ وضو کر کے آیا تھا اور میں نے اسے اپنی جائے نماز دی' تب اس نے اس جائے نماز پہ عشاء کی نماز پڑھی تھی' اللہ کو سجدہ کیا تھا' وہ اللہ کے حضور جھکا تھا اور میرا دل اس کے حضور جھک گیا تھا' اس وقت ان لمحات میں مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ جائے نماز بچھا کے نہیں۔ بلکہ میرے دل کو بچھا کے میرے دل پہ قدم جما کے کھڑا اپنے رب کو سجدہ کر رہا ہے' دل میرا تھا۔ قدم اس کے تھے۔ اور سجدہ اللہ کا تھا۔ کتنی خوش قسمتی کی بات ہے نا وہ میرے دل پہ کھڑا اللہ کو سجدہ کر رہا تھا اور تب سے اب تک اس کے قدم میرے دل پہ ہیں' میرا دل نیچے ہے اور اس کے قدم اوپر۔ وہ جب جب قدم اٹھا کے چلتا ہے میرا دل تب تب نیچے ہی نیچے دبتا چلا جاتا ہے' اس جائے نماز میں اور میرے دل میں بس اتنا ہی فرق ہے کہ اس کا رنگ نیلا ہے اور میرے دل کا رنگ سرخ۔" زری انتہائی مدہم' دھیمی اور سحر انگیز آواز میں بولتی ہوئی نگارش کو ششدر سا کر چکی تھی نگارش کے دل و دماغ سے دھواں نکل گیا تھا۔ یہ عشق اور جنوں کی کون سی منزل تھی جہاں یہ زری جا پہنچی تھی؟ اور اس منزل پہ پہنچنے کے بعد حاصل کیا تھا؟ ایک اور مسافت؟ یا ایک اور منزل....؟ نگارش کا دل اس سوچ سے ہی دہل گیا تھا اسے جھرجھری سی آگئی تھی۔

"یا اللہ! اس پگلی پہ اپنا رحم فرمانا۔" اس نے دل ہی دل میں دعا کی۔

"آپ میرا اثاثہ پوچھتی ہیں' کیا یہ اثاثہ کم ہے کہ اس جائے نماز پہ اس کے سجدے کا لمس ہے' اس کی پیشانی کا غرور ہے اس میں۔ میرے ہزاروں سجدے اور اس کا ایک سجدہ ہے اس جائے نماز میں' اس سے بڑھ کر میرا اثاثہ اور کیا ہو سکتا ہے بھلا؟ اور میں اسے ہی یہاں بھول جاتی؟ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟" زری نے بڑی محبت' بڑی چاہ اور بڑے جذب سے کہتے ہوئے اس جائے نماز کو اپنے ہاتھ میں پکڑے بیگ میں رکھ دیا۔

"یہ بیگ ایئرپورٹ پہ جا کر میں نے اپنے اٹیچی میں رکھنا ہے تاکہ محفوظ رہے۔" وہ پہلے سے ارادہ باندھ رہی تھی اور نگارش کو یاد آرہا تھا کہ زری نے یہ جائے نماز کبھی کسی کو نہیں دی تھی' اس پہ صرف وہ خود نماز پڑھتی تھی اور آئندہ بھی اس نے اسی میں نماز پڑھنا تھی اسی لیے تو وہ ساتھ لے کر جا رہی تھی۔

آدھے' پون گھنٹے میں وہ لوگ ایئرپورٹ پہنچے تھے' نگارش کے پیرنٹس اور بہن بھائی پہلے سے وہاں موجود تھے بس شیراز ان کے ساتھ تھا' نگارش پہلی بار پاکستان جا رہی تھی اس لیے وہ سب ہی سی آف کرنے آئے تھے' فلائٹ میں ٹائم کم رہ گیا تھا اس لیے عبداللہ اور شیراز کو کافی بھاگ دوڑ کرنا پڑی تھی سامان کلیئر کروا کے خود بھی ان ہونا تھا اس لیے کافی جلدی مچی ہوئی تھی اور سب کچھ اوکے ہوتے ہی وہ سب مل کر ایئرپورٹ کے اندرونی حصے کی سمت بڑھ گئے تھے' زری بار بار انگلینڈ کی فضاؤں میں دیکھ رہی تھی' انگلینڈ اس کی محبت کی جائے پیدائش تھی' وہ

انگلینڈ کو کیسے بھول سکتی تھی بھلا؟ اور یونہی آنکھوں میں آنسو لیے وہ نگارش کا ہاتھ تھامے جہاز کا زینہ طے کر گئی لیکن اپنی سیٹ کے پیچھے والی سیٹ پہ نظر پڑتے ہی وہ جم سی گئی۔ ملک اسد اللہ بھی اسی فلائٹ سے واپس پاکستان جا رہے تھے' زری کو دیکھ کر ان کے چہرے پہ کرختگی آگئی تھی اور رخ پھیر لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ اپنے اسٹڈی روم میں بیٹھا ایک اہم کیس اسٹڈی کر رہا تھا جب اسٹڈی روم کے دروازے پہ کسی نے ناک کیا۔

"یس کم ان۔" اس نے اپنے سامنے پھیلی فائل کو بند کرتے ہوئے اجازت دی اور اس کی طرف سے اجازت ملتے ہی گلاب خان دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوا تھا۔

"سلام صاحب۔" گلاب خان نے کافی ٹھہرے ہوئے لہجے میں سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔ آؤ۔" دل آور اپنی توجہ اس پہ مرکوز کر چکا تھا۔

"صاحب! آپ سے کچھ کہنا تھا' اگر آپ غصہ نہ کریں تو۔" گلاب خان کا لہجہ اور انداز بے حد سنجیدہ تھا اور دل آور شاہ کا ڈر بھی تھا۔ اس نے گلاب خان کو حیرت سے دیکھا تھا۔

"تمہیں پتا ہے گلاب خان جائز بات پہ میں غصہ نہیں کرتا۔" اس نے گلاب خان کو آگاہ کیا۔

"صاحب! یہ بات بھی جائز بات ہی ہے۔"

"تو پھر بے فکر ہو کر کہو۔ کیا کہنا ہے؟" اس نے اپنا پین بند کر کے کتاب کے درمیان رکھتے ہوئے کتاب بھی بند کر دی تھی۔

"صاحب! میرا اس بات سے کوئی تعلق تو نہیں ہے اور نہ ہی مجھے کوئی حق ہے کہ میں آپ کے کام میں مداخلت کروں' لیکن صاحب اللہ کا بندہ ہوں' انسان ہوں اور انسان کے دماغ میں خیال آتے دیر نہیں لگتی' اچھے برے سب خیال آتے ہیں' خیال آتا ہے تو احساس جاگتا ہے اور میرے دل و دماغ میں بھی یہ احساس جاگ رہا ہے کہ وہ لڑکی جسے آپ نے بیسمنٹ میں بند کر رکھا ہے وہ اگر بھوک پیاس سے مر گئی تو اللہ میری پکڑ ضرور کرے گا اور میرا ضمیر بوجھ تلے دب جائے گا کیونکہ وہ لڑکی آپ کی گناہ گار اور مجرم سہی' آپ کی اس سے نفرت اور دشمنی سہی' لیکن میری تو نہیں ہے نا؟ میں تو اس کے لیے کچھ کر سکتا تھا نا؟ کیونکہ اس کے قید خانے کی چابی میری جیب میں ہے۔ میں اس کے لیے اس قید خانے کا دروازہ نہیں کھول سکتا کیونکہ مجھے آپ کا ڈر ہے اور جب مجھے آپ کا اتنا ڈر ہے تو کیا اللہ کا ڈر نہیں ہے؟ آپ مجھ سے پوچھ گچھ کر سکتے ہیں تو اللہ بھی کر سکتا ہے۔ کیونکہ میں آپ کا نوکر اور اس کا بندہ ہوں' اس لیے آپ بتائیں کہ میں کیا کروں؟ میں نہ تو آپ سے چھپ کے کچھ کر سکتا ہوں اور نہ ہی اس کی ذات سے چھپ سکتا ہوں' اسی لیے آپ کے پاس آیا ہوں' بڑی مشکل میں ہوں' برے خیال آ رہے ہیں۔" گلاب خان سر جھکائے کھڑا وہ سب کہہ چکا تھا جو وہ دو دن سے کہنا چاہ رہا تھا مگر کہہ نہیں پا رہا تھا۔ دل آور اس کی بات سن کر خاموش ہو گیا۔ بالکل خاموش! چند ثانیے وہ خاموش رہنے کے بعد گہری سانس کھینچتا ہوا اٹھا اور اپنے اسٹڈی روم کی دیوار گیر کھڑکی کے تمام پردے ہٹا دیے تھے اور کھڑکی کے دونوں پٹ کھول کر باہر دیکھنے لگا' باہر سیاہ اندھیرا تھا۔ اتنا سیاہ جتنا دل آور شاہ کے اندر تھا۔

"سگریٹ اور لائٹر دو۔" اس کی بھاری ـــــ آواز سپاٹ تھی۔

"جی صاحب!" گلاب خان نے فوراً" آگے بڑھ کے اس کی رائٹنگ ٹیبل پہ رکھا سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر اٹھایا اور اسے پیش کر دیا۔ دل آور نے سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبایا اور پھر اسے لائٹر کا شعلہ دکھا دیا۔ اور ایک

گہرا کش لیتے ہوئے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر دوبارہ گلاب خان کی سمت بڑھا دیا تھا اور گلاب خان ان کو واپس ٹیبل پہ رکھتے ہوئے دوبارہ اپنی سابقہ جگہ پہ جا کھڑا ہوا تھا۔

"تو تم اب مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" اب کی بار تو دل آور کے لہجے میں بھی دھواں تھا۔

"اجازت! صاحب صرف اجازت۔" وہ فوراً" بولا تھا۔

"کس چیز کی اجازت؟"

"صاحب! اس لڑکی کو روٹی پانی دینے کی اجازت۔"

"صرف روٹی پانی؟"

"جی صاحب! صرف روٹی پانی۔" گلاب خان نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اگر کل کو تمہیں اس کی کسی اور ضرورت کا خیال آگیا تو؟" دل آور نے سگریٹ کا گل جھاڑتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ اس کی نظریں گلاب خان کی بجائے اپنے ہاتھ کی انگلیوں میں دبے سگریٹ پہ تھیں۔

"صاحب! روٹی اور کپڑے کے سوا انسان کی اور کوئی بڑی ضرورت نہیں ہوتی ہر چیز کے بغیر گزارہ ہو جاتا ہے لیکن ان دو چیزوں کے بغیر نہیں ہو سکتا' فی الحال اس لڑکی کو ان دونوں چیزوں میں سے روٹی کی ضرورت ہے۔" گلاب خان کافی سوچ سمجھ کے بول رہا تھا۔

"ہوں! ٹھیک ہے' جاؤ تم اور دے دو اسے روٹی پانی' شاید تم اللہ کی پکڑ سے بچ جاؤ' اگر میری ایک اجازت سے تمہارا ضمیر سرخرو ہوتا ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" اس نے گلاب خان کی اٹکی ہوئی سانس بحال کر دی تھی گلاب خان کے کہے کا مان رکھ لیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے صاحب کا بہت وفادار اور تابعدار ملازم تھا کیونکہ وہ اسے بھی پروٹوکول دیتا تھا' ملازم کو ملازم سمجھ کے دھتکارتا نہیں تھا۔

"بہت بہت شکریہ صاحب! بہت زیادہ شکریہ' آپ کا یہ احسان ہے مجھ پہ۔" گلاب خان دل سے مشکور ہوا تھا۔

"میرا کوئی احسان نہیں ہے! لیکن گلاب خان تمہیں کیا پتا؟ اس لڑکی پہ جو بیت رہی ہے تم صرف وہ دیکھ سکتے ہو' لیکن جو مجھ پہ بیت چکی ہے وہ تمہیں کبھی نظر نہیں آئے گی' تمہیں کبھی خیال نہیں آئے گا اور نہ ہی کبھی احساس جاگے گا۔ تمہیں صرف یہ لگے گا کہ تمہارا صاحب ظالم ہے اور یہ لڑکی مظلوم ہے۔ شاید یہ لڑکی مظلوم ہی ہو۔ لیکن اس کی بدقسمتی یہ ہے کہ وقار آفندی کی بیٹی ہے ایک ظالم انسان کی بیٹی مظلوم کیسے ہو سکتی ہے؟ میں اس پہ ترس کھانا بھی چاہوں تو نہیں کھا سکتا گلاب خان کیونکہ اس کی رگوں میں اس کے ذلیل باپ کا خون ہے جس سے مجھے اتنی نفرت ہے کہ دل چاہتا ہے اب بھی اسپتال جا کر اسپتال کے بستر پہ اس کے مفلوج اور معذور جسم کو بھی اپنے ریوالور کی گولیوں سے چھلنی کر کے رکھ دوں۔ اک ریت کے ذرے جتنا بھی ترس نہ کھاؤں اس پہ اور ایسی عبرت ناک موت دوں کہ ہر زمانے میں مثال دی جائے۔" دل آور شاہ کا غضب اس کے لہجے میں بول رہا تھا اور گلاب خان بے یقین اور حیرت زدہ سا کھڑا اسے دیکھتا رہ گیا وہ جواباً" کچھ کہہ ہی نہیں سکا تھا اور پھر ذرا توقف سے ٹھٹکا اور وہاں سے باہر نکل آیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"پانی ـ پانی ـ پاپا ـ مما ـ پانی ـ مم ـ مجھے ـ پانی ـ ڈ ـ ڈرا ـ ئیو ـ ہے ـ پانی ـ" گلاب خان بیسمنٹ کا دروازہ کھول کے نیچے آیا تو اسے وہ لڑکی فرش پہ اوندھے منہ گری ہوئی نظر آئی اور اس کی حالت نیم بے ہوشی کی سی تھی کیونکہ اس کی آنکھیں بند اور یوں اوندھے منہ گرے ہونے کے باوجود اس کے منہ سے یہ کمزور' نڈھال اور نقاہت زدہ سے الفاظ نکل رہے تھے اس کی پیاس اور پانی کی طلب اتنی شدید تھی کہ وہ بے ہوش ہو کر بھی بے ہوش

نہیں ہو پا رہی تھی اس کی زبان پہ ایک ہی فریاد تھی۔ پانی اور صرف پانی۔!

اور اس کی یہ حالت اور اس کی پیاس کا یہ عالم دیکھ کر گلاب خان کانپ کے رہ گیا۔ اس کا دل مٹھی میں آ گیا' ذات کا پٹھان تھا' خالص پٹھان' اس لیے اس کے خمیر میں نرمی اور سختی کا تناسب برابر پایا جاتا تھا اور اس وقت اس کی ذات پہ نرمی اور خوف خدا کا سایہ تنا ہوا تھا اس کے دل کی عجیب سی حالت تھی۔

"بی بی جی۔۔۔! بی بی جی۔۔۔! آنکھیں کھولیں بی بی جی۔۔۔ میں پانی لے کر آیا ہوں آپ کے لیے۔" گلاب خان دوزانو اس کے قریب نیچے فرش پہ بیٹھ گیا اور نیم بے ہوش پڑی علیزے کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی قبر میں دبی ہوئی ہے اور کوئی اسے قبر سے باہر کھڑا آوازیں دے رہا ہے۔ جس کی بہت مدھم سی آواز اس کی سماعتوں تک بمشکل پہنچ رہی تھی اس کا چہرہ فرش پہ تھا اس کے چہرے کی ایک سائیڈ فرش سے جڑی ہوئی یوں جیسے اس کے چہرے کا ایک حصہ اور فرش کی سطح آپس میں پیوست ہو چکے ہوں اور فرش کی ساری ٹھنڈک اس کے چہرے میں منتقل ہو چکی تھی جس کی وجہ سے اس کے چہرے کی رنگت برف کی طرح سرد اور ہونٹ نیلے ہو رہے تھے اور وہی نیلے ہونٹ پیاس کی شدت سے لرز رہے تھے۔

"پانی۔۔۔ پاپا۔۔۔ پانی۔۔۔ مم۔۔۔ مجھے۔۔۔ پانی۔۔۔ د۔۔۔ دو۔۔۔" اس کے منہ سے نامحسوس سی آواز نکل رہی تھی جو بمشکل سنی جا سکتی تھی۔

"بی بی جی! میں پانی لے کر آیا ہوں نا آپ کے لیے۔ آپ اٹھیں پانی پی لیں۔" گلاب خان نے دوبارہ کہا تھا لیکن اس میں کچھ کہنے سننے کی سکت ہوتی تو وہ جواب دیتی نا اور خود سے اٹھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کا جسم نقاہت سے بے جان ہو چکا تھا اور اتنی طاقت نہیں تھی کہ اس فرش سے کروٹ بدل کر سیدھی ہو جاتی۔

"گلاب خان! لگتا ہے کہ کبھی کبھی ہی عقل سے کام لیتے ہو؟ کیا تمہیں لگتا ہے کہ یہ خود اٹھ سکتی ہیں؟" گلاب خان کے قریب ہی گل کی آواز سنائی دی تھی اور گلاب خان چونک گیا۔

"تم یہاں؟"

"ہاں! میں یہاں۔"

"لیکن! تم یہاں کیوں آئی ہو۔ صاحب غصہ کریں گے۔" اس نے گل کو خفگی سے گھورا تھا۔

"میں بس یہ دیکھنے آئی تھی کہ یہ بی بی جی زندہ ہیں یا مر گئیں؟"

"اللہ معافی دے! یہ کیا بول رہی ہو؟ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟" گلاب خان نے جھرجھری سی لی۔

"کچھ نہیں ہوا مجھے لاؤ میں انہیں اٹھاتی ہوں۔" گل سر جھٹک کر آگے بڑھی اور پھر نیچے بیٹھ کر علیزے کو مضبوطی سے سہارا دے کر سیدھا کیا تھا اور ایک ہی پوزیشن میں اتنے گھنٹے پڑے رہنے کے بعد جسم کو حرکت ملی تو وہ تکلیف سے کراہ اٹھی تھی اس کو سیدھا کر کے دیکھا تو اس کے چہرے کا زاویہ ٹیڑھا ہوا لگ رہا تھا۔ گل نے اپنے دوپٹے سے اس کی پیشانی رخسار اور ہونٹ صاف کیے تھے جن پہ فرش کی گرد جم گئی تھی۔

"پپ۔۔۔ پانی۔۔۔!" اس کی ہونٹوں کی جنبش پہ گل نے گلاب خان کو دیکھا تھا۔

"گلاب خان! ان کی حالت تو بہت خراب ہے؟" گل نے کافی تشویش سے کہا تھا۔

"جو کچھ بھی کرنا ہے یہیں کرنا ہے' ڈاکٹر کی امید مت رکھو' اتنی اجازت نہیں ہے ان کے لیے۔" گلاب خان اپنی بیوی کی بات کا مطلب سمجھ چکا تھا۔

"یہاں پہ کیا ہو سکتا ہے بھلا؟" گل مایوس ہوئی تھی۔

"کوشش کریں تو سب ہو سکتا ہے' تم فوراً جاؤ اور ان کے لیے چائے بنا کر لاؤ' چائے کی گرمائش سے یہ قدرے ہوش میں آ جائیں گی لیکن ٹھہرو۔ پہلے انہیں یہ پانی پلا دو۔" گلاب خان نے جگ سے پانی انڈیل کر گلاس گل کو تھما دیا تھا۔

"بی بی جی۔۔۔! ذرا آسرا لیں اور یہ پانی پی لیں۔" اس نے علیزے کو ذرا سا سہارا دے کر اونچا کیا اور گلاس اس کے منہ سے لگا دیا تھا' علیزے کو یہ بھی نہیں پتا تھا کہ پانی کا گلاس اس کے منہ سے لگا ہوا ہے۔ گل نے خود ہی اس کے منہ میں پانی ڈالا تھا اور چند گھونٹ اسے پانی پلانے کے بعد اس کا چہرہ اور اس کے بازو سہلانے لگی تھی اس کے جسم کو تھوڑا تھوڑا دبا کر گرمائش میں لانے کی کوشش کی تھی۔

"گلاب خان! ان کے لیے بستر کا ہونا بھی بہت ضروری ہے' یوں ٹھنڈے فرش پہ تو ٹھنڈ سے ہی مر جائیں گی۔" گل کو ہر چیز کا خیال آ رہا تھا۔ "میں بھی کچھ یہی سوچ رہا تھا۔"

"سوچو مت! کرو' جاؤ لے کر آؤ۔" گل کافی اتاؤلی ہو رہی تھی۔

"لیکن گل وہ صاحب؟"

"ارے! صاحب کچھ نہیں کہیں گے اگر کہا بھی تو تم میرا بتا دینا' مجھ پہ غصہ نہیں کریں گے وہ۔" گل نے اسے سمجھایا اور گلاب خان پریشانی سے سر ہلاتے ہوئے اٹھ کر چلا گیا۔ پھر اس نے نیچے بچھانے کے لیے فوم کا گدا اور سنگل کمبل لا کر دیا تھا اور گل نے بڑی دقت سے علیزے کو فرش سے گھسیٹ کے گدے پر لٹایا تھا اور اوپر کمبل اوڑھا دیا تھا۔

"تم یہاں بیٹھو میں ان کے لیے دودھ گرم کر کے لاتی ہوں' بعد میں چائے کے ساتھ انڈے بوائل کر کے لے آؤں گی تب تک یہ ہوش میں آ جائیں گی۔" گل کہتی ہوئی گلاب خان کو وہاں بٹھا کر چلی گئی تھی اور گلاب خان اس لڑکی کی بدقسمتی پہ سوچ رہا تھا وہ کتنے بڑے گھر کی بیٹی تھی' کتنی امیر تھی' کتنی لاڈلی تھی لیکن پھر بھی بدقسمت تھی' اپنے باپ کا بویا کاٹ رہی تھی' اتنی آسائشوں میں زندگی گزارتے ہوئے اسے کیا پتا تھا اسے آگے جا کر اپنے باپ کے کیے کا بھگتان بھی بھگتنا ہے؟ اسے کیا خبر تھی کہ جو آسائشات اور مراعات اسے اس کے باپ نے دے رکھی ہیں وہ اس کے باپ کی وجہ سے ہی چھن جائیں گی؟ وہ مخملی بیڈ سے زمین کی سخت سطح پر آ جائے گی اس کا نرم و نازک وجود زمین کی سختی سہہ نہیں پائے گا بلکہ اس کے لیے عذاب بن جائے گا۔ اور اس پہ یہ عذاب دیکھ کر گلاب خان کو بہت دکھ اور افسوس ہو رہا تھا۔

"گلاب خان!" گل کی آواز پہ وہ بری طرح چونکا تھا۔ وہ چھوٹی سی ٹرے لیے کھڑی تھی۔

"کیا سوچ رہے ہو؟ بی بی جی کو دیکھو۔ وہ ہوش میں آ رہی ہیں شاید۔" اس نے گلاب خان کو متوجہ کیا۔

"ہاں' ہاں! تم ان کو یہ دودھ پلاؤ' ٹھیک ہو جائیں گی یہ۔" اس نے فوراً کہا تھا اور گل دوبارہ علیزے کے پاس بیٹھ گئی۔ پھر اس نے چمچہ کے ساتھ آہستہ آہستہ اس کے منہ میں دودھ ڈالنا شروع کیا تھا دودھ نیم گرم تھا جس کی تراوٹ سے علیزے کے سن ہوئے حواس واپس آنے لگے تھے اور لگاتار دو گھنٹے کی دیکھ بھال کے بعد وہ مکمل ہوش میں آ چکی تھی۔ اب اسے خوراک کی ضرورت تھی کیونکہ معدہ خالی تھا۔

"آج زلفی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے میں نے اس کے لیے دال چاول بنائے تھے آپ کو اگر بھوک لگی ہے تو آپ کے لیے لے آؤں؟" گل نے اسے تکیے کے سہارے دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بٹھاتے ہوئے استفسار کیا تھا اور کھانے کے لیے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے علیزے کے حلق میں آنسوؤں کا گولا سا اٹک گیا دو تین دن پہلے اس نے دل آور شاہ کی طرف سے بھیجا ہوا کھانا ٹھکرا دیا تھا اور کھانا سے منہ موڑ کر کبھی نہ کھانا کھانے کا عزم کیا تھا لیکن آج وہ اس نوبت اس حال کو پہنچ چکی تھی کہ کھانے کے سوا اور کسی چیز کی طلب یا ضرورت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

آج وہ کھانے کے لیے ترس رہی تھی' وہ جو بھی لے آتے وہ کھانے کے لیے تیار تھی' کیونکہ پیٹ کا دوزخ اگر

بھرا نہ جائے تو بڑے بڑوں کو شکست خوردہ، نڈھال، کمزور اور بے جان کر ڈالتا ہے اور وہ تو تھی ہی نازک اندام سی موم کی گڑیا جس نے کبھی ایک منٹ بھی بھوک برداشت نہیں کی تھی۔ جس کے ایک اشارے پہ ہر جو کھانے کے تمام لوازمات اور تمام ذائقے ٹیبل پہ سجا دیتی تھی، ایک وقت کے کھانے میں کئی ڈشز تیار ہوتی تھیں اور وہ محض برائے نام کھانا کھاتی تھی لیکن آج اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ خوب پیٹ بھر کے کھانا کھائے اور اس کے بے جان جسم میں پھر سے طاقت اور توانائی آجائے کیونکہ وہ پیٹ کے دوزخ کا یہ عذاب سہار نہیں پا رہی تھی، ایک ایسا عذاب جو لوگوں سے قتل کروا لیتا تھا، چوری اور ڈاکے پہ مجبور کر ڈالتا تھا، صرف اس لیے کہ پیٹ کا یہ دوزخ خالی نہ رہے، نہ انسان کا اپنا، نہ انسان کے اپنوں کا۔ پیٹ کی آگ ایسی آگ تھی کہ انسان ہر آگ میں کودنے کے لیے تیار ہو جاتا تھا کیونکہ بھوک اللہ نے ایک ایسی چیز بنائی ہے جس کے سامنے طاقت ور اور کمزور انسان یکساں نڈھال ہو جاتے تھے۔ جس کو سہنا کسی بھی ذی روح کے بس میں نہیں تھا اس میں اتنی طاقت تھی کہ انسان کی انا، غیرت، عزت، غرور اور آن سب کچھ ڈھیر ہو سکتا تھا یہاں تک کہ انسان خود بھی....!

"لیجیے بی بی جی.... کھانا کھا لیجیے۔" گل نے کھانے کی ٹرے لا کر اس کے سامنے نیچے فرش پہ ہی رکھ دی تھی اور علیزے نے چونک کر زمین پہ رکھی ٹرے اور ٹرے میں رکھے دال چاول کی پلیٹ دیکھی تھی اور علیزے کے حلق میں آنسوؤں کا پھندا سا پڑ گیا۔ گل نے پلیٹ اٹھا کر اس کے ہاتھ میں پکڑا دی تھی اور علیزے نے اپنی کم مائیگی کے باوجود بڑے بے صبرے سے انداز میں چاول کھانا شروع کر دیے تھے لیکن اس کے ہاتھ لرز رہے تھے اس سے چمچہ نہیں پکڑا جا رہا تھا، ہاتھ میں پکڑی پلیٹ بھی لرز رہی تھی بلکہ یہاں تک اس کے حلق کا نوالہ بھی نیچے نہیں اتر رہا تھا مگر وہ پھر بھی پلیٹ تھوڑی دیر کے لیے رکھ دینے پر آمادہ نہیں تھی یوں جیسے اس سے یہ کھانا بھی چھن جائے گا اور پھر تین چار نوالے کھانے کے بعد جب اس کی ہمت جواب دے گئی تو اس نے تھک کے پلیٹ واپس نیچے فرش پر رکھ دی اور لرزتے کانپتے وجود کے ساتھ وہ بے ساختہ اپنے حال اپنی کیفیت پہ رو پڑی اور کھانا چھوڑ کر اپنے چہرے پہ ہاتھ رکھے وہ یوں بلک بلک کر روئی تھی کہ گل اور گلاب خان کے دل بھی کانپ گئے۔ گل کافی دیر اسے تسلی اور دلاسے دیتی رہی لیکن علیزے کی ہچکیاں رکنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اسے کئی خیال رلا رہے تھے جن میں یہ خیال سرفہرست تھا کہ وہ وقار آفندی کی بیٹی ہو کر کھانا کھانے کے لیے ترس رہی ہے؟ اس کے پاپا کو پتا چلے گا تو وہ مر جائیں گے۔ ان کی علیزے بھوکی تھی۔ ان کے لیے یہ احساس مر جانے کے برابر تھا....!

علیزے نہ جانے کتنی دیر تک یونہی روتی رہی اور پھر بہت بعد میں گل اور گلاب خان اسے تسلی دے کر چلے گئے تھے البتہ جاتے جاتے کھانا اور پانی وغیرہ پاس رکھ گئے تھے جس کو دیکھ کر علیزے کی آنکھیں پھر سے پانیوں سے بھر گئی تھیں۔ اتنی آسائشوں کے بعد غریبی کا یہ وقت کاٹنا بے انتہا مشکل تھا۔ اس کا رونا بلکنا بجا تھا....

☆ ☆ ☆

وہ فجر کی نماز پڑھ کے واپس گھر آیا تو بل ڈوگ نے اسے دیکھ کر بھونکنا شروع کر دیا تھا۔

اس نے ٹھٹک کر دیکھا تھا بل ڈوگ اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے بے چین ہو رہا تھا اتنے دن ہو گئے تھے اس نے بل ڈوگ پہ کوئی توجہ نہیں دی تھی اور یہی سوچ کر وہ اس کی جانب آگیا اور بل ڈوگ اسے دیکھ کر بڑے لاڈ سے دم ہلانے لگا تھا۔ اس کے ادھر ادھر ٹہلنے کی چال بھی بدل گئی تھی۔

"کیسے ہو شیرو؟" اس نے بل ڈوگ کے قریب آ کر اسے سہلایا تھا اور اس کی کھسیائی ہوئی سی غراہٹ سنائی دینے لگی گویا وہ اس موٹے سنگل سے آزاد ہونا چاہتا تھا کہ دل آور نے آگے بڑھ کر دیوار میں نصب کھونٹے سے اس کی سنگل کھول دیا تھا۔ اور بل ڈوگ خوشی کے اظہار کے طور پہ لان کے ایک سرے سے بھاگتا ہوا دوسرے سرے تک چلا گیا۔

"صاحب۔! بل ڈوگ پہ جب آپ توجہ دیتے ہیں تو اس کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہیں رہتا۔" زلفی مسکرا کر کہتا ہوا قریب آگیا اتنے دنوں سے زلفی ہی بل ڈوگ کی دیکھ بھال کر رہا تھا لیکن اتنے دنوں میں اس نے ایک بار بھی بل ڈوگ کو اتنا خوش نہیں دیکھا تھا جتنا اس وقت دیکھ رہا تھا۔

"اسے مجھ سے پیار ہی بہت ہے، اسی لیے تو اسے انگلینڈ سے اپنے ساتھ ہی لے آیا تھا۔" دل آور مسکرایا تھا۔

"حالانکہ آپ کو انگلینڈ سے اسے لانے کی بجائے ایک میم لانی چاہیے تھی۔" زلفی کی بات پہ دل آور قہقہہ لگا کے ہنسا تھا۔

"میم اس لیے لے کر نہیں آیا کہ شاید میم اتنی وفادار نہ ہوتی جتنا یہ وفادار ہے۔ وہ دوبارہ واپس جانے کی ضد کرتی، شور کرتی، ہنگامہ کرتی جبکہ اس نے ہمیشہ میرے ساتھ رہنے کی ضد کرنی ہے اس ملک کا ہر سرد و گرم اس نے میرے ساتھ ہی سہنا ہے اور میری ذرا سی توجہ پہ یوں خوشی کا اظہار کرنا ہے کہ جیسے پہلے کبھی خوش ہی نہ ہوا ہو۔" دل آور کی دلیل پہ زلفی خوب متاثر ہوا تھا۔

"صاحب۔! آپ کی تو کیا ہی بات ہے۔ اسی لیے تو کبھی کبھی بڑا دل چاہتا ہے کہ کاش میں "دل آور شاہ ہوتا؟" زلفی کی خواہش سن کر اس کا فلک شگاف قہقہہ گونجا تھا جس پہ قریب آتا گلاب خان کافی حیران ہوا تھا۔

"یعنی تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ کاش میں "زلف خان" ہوتا؟" دل آور نے ہنستے ہوئے دلچسپی سے زلفی سے کہا تھا۔

"صاحب۔! میں نے یہ تو نہیں کہا؟" وہ کھسیانا ہوا تھا۔

"تو پھر اور کیا کہا ہے یار؟ اگر تم دل آور شاہ ہوتے تو ظاہر سی بات ہے کہ پھر میں زلف خان ہوتا۔ زلف خان نہ ہوتا تو گلاب خان ہوتا۔ لیکن جو بھی ہوتا یار لیکن دل آور شاہ نہ ہوتا۔ دل آور شاہ ہونے میں بڑی اذیت ہے۔ تم نہیں جانتے۔" کہتے کہتے دل آور کا لہجہ بجھ گیا اس کی زبان پہ تلخی آگئی تھی لیکن اس سے پہلے کہ یہ تلخی بڑھتی اس کے سیل فون پہ وائبریشن ہونے لگی۔

"گلاب خان! بل ڈوگ کے لیے دودھ لے کر آؤ اس کا بریک فاسٹ دو اسے۔" دل آور نے اسے ہدایت دیتے ہوئے کال ریسیو کر لی تھی زلفی بھی وہاں سے چپ چاپ پلٹ گیا۔

"السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام! گڈ مارننگ۔" دوسری طرف کی آواز نبیل کی تھی۔

"صبح بخیر۔" دل آور کا انداز سنجیدہ تھا۔

"کیا ہو رہا ہے؟" نبیل نے کافی فریش لہجے میں پوچھا۔

"کیوں؟ کیا ہونا چاہیے؟" دل آور نے الٹا اس سے سوال کر ڈالا تھا۔

"بے چینی۔" نبیل کی آواز بھی کچھ مضطرب اور بے چین ہی لگ رہی تھی۔

"بے چینی؟ مطلب؟" دل آور سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

"یار! کیا تمہیں نہیں پتا کہ آج عبداللہ آرہا ہے؟" نبیل خفگی سے جھنجلایا تھا اور دل آور کو ہر چیز سمجھ میں آگئی تھی۔

"او اچھا! عبداللہ۔" اس نے لفظ کو کافی لمبا کھینچا تھا۔

"ہاں یار عبداللہ۔ کیا تمہیں نہیں یاد تھا؟" نبیل کو حیرت ہوئی تھی۔

"یاد تھا۔! لیکن بے چینی نہیں تھی۔" دل آور سکون سے بولا۔

"کیوں نہیں تھی؟"

"کیونکہ تمہیں جو ہے۔" دل آور کے جواب پہ نبیل ٹھٹک گیا۔

"کیا تمہارا دوست نہیں ہے؟"

"صرف دوست ہے نا۔" اس کا ہر جواب الٹا تھا۔

"تو میرا اور کیا ہے؟"

"یہ تو تمہیں پتا ہونا چاہیے جسے بے چینی ہو رہی ہے۔"

"اف! میں نے غلط کیا صبح صبح تمہیں فون کر کے۔" نبیل زچ ہو گیا۔

"تو تمہیں کس نے کہا تھا کہ تم اتنی صبح صبح فون کر کے مجھ سے میری بے چینی پوچھو؟ ویسے اگر میں نے تمہیں اپنی بے چینی بتا دی تو تمہاری ساری بے چینی ختم ہو جائے گی۔" دل آور کا لہجہ مبہم تھا نبیل کے کچھ پلے نہیں پڑا تھا۔

"اچھا خیر! یہ بتاؤ کہ ان کو ریسیو کرنے کے لیے گھر سے کب نکلنا ہے؟" نبیل نے اگلا سوال کیا۔

"نو بجے۔"

"ارے کیوں؟ نو بجے کیوں؟ آٹھ بجے نکلتے ہیں' نو بجے لیٹ ہو جائیں گے۔" نبیل کو جلدی اور بے چینی ایک ساتھ لاحق ہوئی تھیں۔

"کیوں ایئرپورٹ پر جا کر میں نے پروازوں کی گنتی کرنی ہے جو آٹھ بجے ہی پہنچ جاؤں؟ ہاں اگر تمہیں اتنی جلدی اور اتنی بے چینی ہے تو تم جا سکتے ہو' میں بعد میں آجاؤں گا۔" دل آور کے جواب پہ نبیل بے چارہ ٹھنڈا پڑ گیا تھا لیکن اندر ہی اندر اس پہ تلملا بھی رہا تھا مگر افسوس کہ کر کچھ نہیں سکتا تھا۔

"اوکے! نو بجے ہی چلیں گے۔" اس نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔

"گڈ! جلدی عقل آگئی تمہیں۔" دل آور مسکرا کے بولا تھا۔

"دل آور ے! تو بڑا ذلیل ہے' اللہ کرے کہ تیرا حال بھی کبھی میرے جیسا ہو۔"

"کیوں؟ تمہارے حال کو کیا ہوا ہے؟ کوئی خاص وجہ؟" اس کے انجان بن کے کہے جانے والے سوال پہ نبیل گڑبڑا گیا۔

"نن نہیں! کچھ نہیں ہوا بس ایسے ہی۔" نبیل ٹال گیا تھا۔

"ٹھیک ہے پھر! اللہ حافظ۔" دل آور نے بات سمیٹی تھی۔

"اوکے! گڈ بائے۔" نبیل نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا لیکن اندر راہداری کی سمت بڑھتے ہوئے دل آور نبیل ہی سوچ رہا تھا کیونکہ نبیل اس کو سوچ رہا تھا جو دل آور کو سوچ رہی تھی۔

✲ ✲ ✲

یہ عالم شوق کا دیکھا نہ جائے
وہ بت ہے یا خدا دیکھا نہ جائے
یہ آج کن نظروں سے تو نے دیکھا
کہ تیرا دیکھنا' دیکھا نہ جائے....

زری کی نگاہیں تھیں اور دل آور شاہ مجسم تھا۔ یہ حقیقت تھی یا افسانہ تھا؟ دو عالم تھے جو زری کی نگاہوں میں ایک ہو کر ٹھہر گئے تھے' پوری کائنات پر اسم محبت پھونک دیا گیا تھا۔ پوری کائنات اس اسم کے طلسم میں جکڑی تھی جو جہاں تھا وہ وہیں رہ گیا تھا جہازوں کی پروازیں جہاں تھیں وہیں ساکت ہو گئی تھیں' ایئرپورٹ پہ آنے جانے والے ہزاروں مسافر اپنی اپنی جگہ پر منجمد ہو چکے تھے' ایئرہوسٹس' پائلٹ اور دیگر عملہ جامد ہو گئے تھے تمام ذی نفس اپنی سانسیں روک چکے تھے کیونکہ زری کا عشق ان سب کو اس وقت ایسے حال میں ہی تصور کر رہا تھا۔ گویا وہ وہاں اکیلی تھی اور اس کے سامنے وہ بھی اکیلا کھڑا تھا باقی ساری دنیا پتھر کی ہو گئی تھی۔ انسانوں سے مجسموں میں تبدیل ہو گئی تھی اور مجسموں کے سامنے وہ کچھ بھی کر سکتی تھی دنیا سے بے نیاز ہو کر اسے دیکھتے ہوئے سیراب بھی ہو سکتی تھی حالانکہ وہ یہ بھول گئی تھی کہ پوری کائنات حالت حرکت میں ہے سوائے اس کے۔

وہ دوسروں کو پتھر کے مجسمے تصور کر رہی تھی حالانکہ خود اس وقت پتھر ہوئی کھڑی تھی۔ اس کا عشق دل آور شاہ کو اپنی آنکھوں سے چوم رہا تھا اس کی آنکھوں نے اس کے اک اک نقش پہ بوسہ دیا تھا اس کے پاؤں پہ' اس کے ہاتھوں پہ' اس کے ماتھے پہ' اس کے چہرے پہ' اس کے بالوں پہ' اک اک نقش کو چوم کر دل میں اتار لیا تھا اور دل کی دھڑکنیں جہاں تیز ہوئی تھیں وہیں انہیں اک قرار آگیا تھا' رگ و پے میں طمانیت اتر گئی تھی۔ وہ اس کے سامنے تھا' اس کی نظروں میں تھا' آنکھوں میں بسا ہوا تھا' دل میں دھڑک رہا تھا' ایسے عالم میں زری کو اور کیا چاہیے تھا؟

اس کی محبت' اس کا عشق' اس کی چاہ بس ایک ہی تھی.... دل آور شاہ.... اور.... دل آور شاہ....!

"السلام علیکم۔!" وہ عین اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔ زری جو پتھر بنی کھڑی تھی اس کی آواز پہ' اس کے گمبھیر لہجے پہ' اس کے انداز پہ یکدم چیخ کے پتھریلے حواسوں سے ہوش میں آئی تھی اور اسے دیکھنے کے بعد اس کے دل کی حالت نازک تھی کیونکہ دل آور شاہ اس کے سامنے اس کے قریب کھڑا اسے ہی دیکھ رہا تھا....!!!

(باقی آئندہ ماہ ملاحظہ کریں)

✲ ✲

نبیلہ عزیز

درِ دل

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نبیل حیات دو ہی بہن بھائی ہیں مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پہ رنگ چکی ہے جس کے پیش نظر فائزہ بیگم نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں لیکن مدحیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا بے بسی اور مجبوری سے تنگ آ کر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باؤ امتیاز مل جاتا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دلاور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔

۲۳

تیئسویں قسط

اس کی نظریں زری کے چہرے پہ تھیں اور زری پر نزع کا عالم تھا۔

اس کی قوت گویائی سلب کرنے کے لیے یہ احساس ہی کافی تھا کہ۔۔۔ وہ اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کا رواں رواں دل آور شاہ کی نظروں کی خوشبو سے مہک اٹھا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے کھڑے کھڑے اس کا پورا بدن خوشبودار ہو گیا ہو' وہ صندل کی طرح مہکنے لگی تھی۔

لیکن خود اس میں اتنی جرات نہیں تھی کہ ایک سیکنڈ سے بھی زیادہ اس کے چہرے کی سمت دیکھ پاتی۔ دل آور شاہ کی آنکھوں کا سامنا کرنا بہت مشکل تھا۔ اس کی دیوار جاں کی طرح اس کی پلکیں بھی لرز رہی تھیں۔۔۔ وہ موم تھی۔ سرتاپا موم' اور دل آور شاہ کی نظروں کی گرمی سے اس کے سامنے کھڑی پگھل رہی تھی۔ یوں ہی قطرہ قطرہ پگھلتے ہوئے شاید اس کی پوری ذات پگھل جاتی۔ اگر درمیان میں نبیل حیات نہ آجاتا۔

"السلام علیکم۔۔۔ کیسی ہیں آپ؟" نبیل نے قریب آتے ہی سلام کیا تھا۔ جس پہ زری کے ساتھ دل آور شاہ بھی چونک گیا تھا اور اپنے اس طرح چونکنے پہ خود دل آور کو بھی حیرت ہوئی تھی۔ کیا وہ زری کو اتنی محویت سے دیکھ رہا تھا کہ پل بھر کے لیے سب کچھ فراموش کر بیٹھا تھا؟ یہاں تک کہ عبداللہ اور نبیل کو بھی؟ اف۔۔۔ یہ کیا کر بیٹھا تھا وہ۔

اس نے اپنے آپ کو سرزنش کی تھی اور سر کو بری طرح جھٹکا تھا۔ اس کی ذات پہ دبے پاؤں اک بے اختیاری کا لمحہ آیا تھا۔ سو بیت گیا تھا۔ اب پھر وہ مشتاق تھی اور وہ بے زار۔ اسے تعلق سے لاتعلق ہوتے ہوئے محض چند سیکنڈز لگے تھے۔ زری نے اسے نظریں اور قدم پیچھے ہٹاتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ پاس آکے اسے خوشبوؤں میں بسا کے' بنا کچھ کہے واپس مڑ گیا تھا اور اس کا یوں واپس مڑنا زری کی تڑپ اور پیاس کو اور بھی بڑھا گیا تھا۔ وہ بھلا کب سیراب ہو پائی تھی؟ دل آور شاہ صدیوں بھی اس کے سامنے کھڑا رہتا تو اس کی پیاس نہیں بجھ سکتی تھی۔ وہ عشق کا صحرا تھی۔ اتنی جلدی سیراب نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کی تشنگی مٹانا آسان نہیں تھا۔۔۔ وہ اس پہ ساون کی طرح ٹوٹ کر برستا تو کوئی بات بھی تھی۔

اور ادھر نبیل حیات تھا۔ دل کے کشکول میں محبوب کی نظر عنایت کے چند سکے اور فقیر راضی۔۔۔

زری اگر کبھی یہ نہیں دیکھ پائی تھی کہ نبیل حیات اسے دیکھتا ہے تو نبیل حیات بھی کبھی یہ نہیں دیکھ پاتا تھا کہ وہ کسے دیکھتی ہے۔ دیکھ لیتا تو شاید کشکول اس کے قدموں میں ہی توڑ دیتا۔

"لگتا ہے آپ ذہنی طور پہ ابھی تک انگلینڈ میں ہی ہیں؟" نبیل نے اس کی طرف سے جواب نہ پاکر دلچسپی سے کہا تھا اور زری نے ایک بار پھر چونک کر دیکھا تھا۔

"کیا مطلب؟ میں سمجھی نہیں؟" اس کے انداز میں ناسمجھی سی تھی۔

"مطلب کہ نہ سلام کا جواب' نہ خیریت کی تسلی' یہاں ہو کر بھی یہاں نہیں لگ رہیں آپ؟" نبیل نے مسکراتے ہوئے اس کے چہرے کی سمت دیکھا۔ سادگی میں بھی بلا کا وقار تھا۔ نبیل کا دل چاہا وقت ٹھہر جائے اور وہ یوں ہی کھڑا اسے بے نیاز ہو کر اسے دیکھتا رہے۔

"تو پھر کہاں لگ رہی ہوں آپ کو؟" زری نے بھی جواباً" دلچسپی سے پوچھا تھا۔

"میرے دل میں۔۔۔" نبیل کا دل چاہا کہہ دے۔ لیکن وقت اور جگہ مناسب نہیں تھے۔

"زری۔۔۔!" مدحیہ' نگارش اور عبداللہ سے مل کر لپک کے اس کے پاس آئی اور اس سے لپٹ گئی تھی۔

"مدحیہ تم؟" زری اس کے اتنے شوخ اور فریش انداز پہ حیران رہ گئی تھی۔

"ہاں میں۔۔۔ کیوں کیا تمہیں یقین نہیں آرہا؟" مدحیہ شرارت سے مسکرائی تھی۔

"ارے! یقین کیسے آئے؟ کہاں تو تم پاکستان آنے پہ خوش ہی نہیں تھیں اور کہاں پاکستان آخر اتنی خوش ہو کہ مسکراہٹ ہی نہیں رک رہی۔" زری نے اپنی حیرت کا برملا اظہار کیا تھا جس پہ مدحیہ اور بھی ہنسی تھی۔

"ڈونٹ وری۔۔۔ تم آگئی ہو تو یقین بھی آجائے گا۔" مدحیہ نے مزید شرارت سے اس کا ہاتھ تھپکا تھا اور اس کی اس شرارت پہ نبیل بھی بے ساختہ ہنسا تھا۔

"کیا آپ لوگوں نے یہیں کھڑے رہنا ہے؟" نگارش' دل آور کے پاس سے ہٹ کے ان لوگوں کے پاس آگئی تھی اور دل آور' عبداللہ کے ساتھ اس کے سامان کی طرف بڑھ گیا۔

"ارادہ تو یہی ہے۔" نبیل نے نگارش کی بات پہ کافی دلچسپی سے جواب دیا تھا۔

"لیکن آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ آپ کے گھر کا لان نہیں ہے جہاں آپ کا مزید کھڑے رہنے کا ارادہ ہے۔ یہ پبلک پلیس ہے۔ یہاں کھڑے رہنا کافی معیوب لگتا ہے۔" نگارش کے ٹوکنے پہ نبیل نے حیرت اور خفگی سے دیکھا تھا۔

"اوہ اچھا۔۔۔ تو آپ نے بھی بھابھیوں والے طور طریقے سیکھ لیے ہیں؟" نبیل کے انداز پہ نگارش بے ساختہ ہنسی تھی۔

"ظاہر ہے بھئی! بھابھی ہوں تو بھابھیوں والے طور طریقے بھی تو سیکھوں گی نا؟ یوں بیچ راستے میں کھڑے ہونا بھی کوئی اچھی بات ہے بھلا؟ جس پہ آپ لوگوں کو شاباش دوں؟" نگارش کے لہجے میں مصنوعی خفگی تھی۔

"اف توبہ۔۔۔ آپ تو واقعی بھابھی بن گئی ہیں۔" نبیل نے توبہ توبہ کرتے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگائے تھے اور نگارش کے ساتھ ساتھ زری اور مدحیہ بھی ہنس پڑی تھیں۔

"نبیل۔۔۔!" عبداللہ کی آواز پہ نبیل نے فوراً" پلٹ کر دیکھا تھا۔

"چلیں اب۔۔۔؟" سامان کلیئر ہو کے باہر آچکا تھا۔ اس لیے اب وہ یہاں سے جانے کے لیے تیار تھا۔

"چلیں بھابھی۔۔۔ آپ کے سرتاج' آپ کے ملک صاحب بلا رہے ہیں۔" نبیل نے نگارش وغیرہ کو چلنے کا اشارہ دیا۔

"ان کے بلانے پہ تو میں کہیں بھی جا سکتی ہوں۔" نگارش بھی اس وقت کافی شرارتی اور فریش موڈ میں تھی۔

"اوہو۔۔۔ بہت خوب۔" نبیل نے بھی جواباً" چھیڑا اور یوں ہی ایک دوسرے کے ساتھ چھیڑ چھاڑ اور ہنسی مذاق کرتے ہوئے وہ لوگ ایئرپورٹ کے مرکزی حصے سے پارکنگ ایریا کی سمت بڑھے تھے۔

"کہاں جانے کا ارادہ ہے؟" دل آور نے عبداللہ کے ساتھ چلتے ہوئے کافی سنجیدگی سے پوچھا تھا۔۔۔ سامان کافی زیادہ تھا۔ تین ٹرالیاں سامان سے لدی ہوئی تھیں اور وہ تینوں سامان کی یہ ٹرالیاں دھکیلتے ہوئے تقریباً" ایک ساتھ ہی چل رہے تھے۔ اس لیے دل آور کے پوچھنے پہ نبیل کو اچنبھا ہوا تھا۔

"کیا مطلب؟ کہاں جانا ہے اس نے؟"

"اپنے گھر یا اپنی حویلی؟" دل آور نے اپنا سوال واضح کیا تھا۔

"اوہ اچھا۔۔۔ تو یہ پوچھ رہے ہو تم؟" نبیل نے سمجھنے والے انداز میں سر ہلایا۔

"کیا بات ہے؟ تم چپ کیوں ہو؟" عبداللہ کو چپ دیکھ کر دل آور کو الجھن ہوئی تھی۔

"میں فیصلہ نہیں کر پا رہا کہ میں کیا کروں؟ اپنے گھر جاؤں یا حویلی۔" عبداللہ بھی اس معاملے پہ آکر کافی الجھا ہوا تھا۔

"فیصلہ اتنا مشکل تو نہیں ہے۔" دل آور نے نارمل سے لہجے میں کہا تھا۔

"یہ تم کہہ سکتے ہو مگر میں نہیں۔۔۔ یہ فیصلہ میرے لیے مشکل نہیں ہے۔ مگر زری کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہ فیصلہ ایک رسک ثابت ہو گا۔ زری کو لے کر سیدھا اپنے گھر جاؤں تو تب بھی بابا جان کو غصہ آئے گا کہ میں

پہلے حویلی کیوں نہیں گیا؟ اور اگر یہاں سے سیدھا حویلی جاؤں تو تب بھی ان کا غصہ کہ میں نگارش کو حویلی لے کر کیوں آیا ہوں؟ اس لیے کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ میں کیا کروں؟" عبداللہ واقعہ پریشانی اور کشمکش کا شکار تھا اور نبیل کو سن کر حیرت ہوئی تھی کہ زری کا کیا معاملہ ہے۔ آخر ایسا کون سا مسئلہ ہے، جس کی اسے خبر ہی نہیں؟

"میں کچھ کہہ سکتا ہوں اس معاملے میں؟" دل آور کی سنجیدگی بتا رہی تھی کہ معاملہ سنگین تھا۔ نبیل کو بے چینی ہونے لگی تھی۔

"ہوں۔۔۔ کہو یار! میں تم سے ہی تو پوچھ رہا ہوں کہ کیا کروں؟" عبداللہ نے فوراً اثبات میں جواب دیا تھا۔

"میرا مشورہ ہے کہ تم پہلے حویلی جاؤ، وہاں سب سے اچھے طریقے سے ملو، صلح جو انداز اپناؤ۔ تمہاری بی بی جان نے اتنے سالوں سے تمہیں نہیں دیکھا۔ وہ تم سے ملیں گی، تمہیں دیکھیں گی، تمہارے ساتھ ساتھ بھابھی کو دیکھیں گی اور ہو سکتا ہے کہ اس دیکھنے اور ملنے ملانے کے چکر میں ان کا دل کچھ نرم ہو جائے اور معاملہ سلجھ جائے اور جب تمہارا اپنا معاملہ سلجھ گیا تو تم بعد میں دوسرا معاملہ بھی سلجھا سکتے ہو۔" دل آور شاہ کا مشورہ وہ کبھی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن عبداللہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کا خاندان اور اس کی فیملی کیسی ہے؟ اس فیملی میں نرمی نام کو نہیں تھی۔۔۔ بس جو تھی وہ عبداللہ اور زری میں تھی۔ اسی لیے وہ اپنے گھر والوں سے بالکل مختلف تھے۔

"تمہاری بات ٹھیک ہے دل آور! لیکن یہ بھی یاد رکھو کہ اگر میں وہاں رہ نہ سکا تو وہاں سے نکل بھی نہیں سکوں گا۔ کیونکہ میں زری کو وہاں نہیں چھوڑنا چاہتا اور وہ دوبارہ زری کو میرے ساتھ بھیجنے پہ تیار نہیں ہوں گے۔۔۔ اس بات پہ خون خرابا بھی ہو سکتا ہے۔" عبداللہ نے اسے پہلے سے آگاہ کرنا چاہا تھا۔

"اس کا انتظام بھی ہے میرے پاس، تم فکر مت کرو، بس حویلی جاؤ، تاکہ بعد میں وہ لوگ تم پہ یہ اعتراض نہ کریں کہ تم حویلی نہیں گئے۔" دل آور اسے آئندہ کے لیے ایک پوائنٹ سمجھا رہا تھا۔

"دل آور! میں وہاں زری کو ایک پل کے لیے بھی نہیں چھوڑنا چاہتا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ وہ راتوں رات زبردستی زری کا نکاح پڑھوانے سے بھی گریز نہیں کریں گے۔" عبداللہ کو صرف اور صرف زری کی فکر تھی اور اس فکر کے بارے میں جان کر نبیل جیسے گنگ سا ہو گیا تھا۔

"زری کا نکاح؟ مگر کس سے؟" نبیل کی حیرانی عروج پر تھی۔ اس کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ اسے اب واقعی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ دونوں کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ اور یہ سب کیا چکر ہے؟ بات زری کے متعلق تھی۔ اس لیے عبداللہ کے سامنے وہ کھل کے استفسار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن دل آور ایک نظر میں اس کے چہرے پہ اڑتی ہوائیاں دیکھ چکا تھا۔۔۔ وہ نبیل کی کیفیت محض ایک نظر میں ہی بھانپ گیا تھا۔

"میں نے کہا نا تم فکر نہ کرو، تم لوگ جیسے جاؤ گے، ویسے ہی واپس آؤ گے، تم گاڑی میں بیٹھو، تمہیں ساری تفصیل سمجھا دیتا ہوں۔" وہ لوگ گاڑیوں کے پاس آ کر ٹھہر گئے تھے۔ ان کو دیکھتے ہی گلاب خان گاڑی سے نکل آیا۔

"السلام علیکم صاحب۔" گلاب خان نے عبداللہ کو سلام کیا تھا۔

"وعلیکم السلام! کیسے ہو گلاب خان؟" عبداللہ دیکھتے ہی پہچان گیا تھا کہ وہ دل آور کا ملازم گلاب خان ہے۔

"ٹھیک ہوں صاحب! اللہ کا کرم ہے۔ لائیں سامان گاڑی میں رکھ دوں۔" اب سامان رکھنے کی ذمہ داری گلاب خان کی تھی۔۔۔ وہ ذمہ داری پوری کرنے لگا۔

"ملک عبداللہ ہم سے نہیں ملو گے کیا؟" دل آور اپنی گاڑی کا دروازہ کھول رہا تھا۔ جب اس آواز پہ ٹھہر گیا۔ وہ جو بھی تھا عبداللہ سے مخاطب تھا۔ لیکن اس کی زہریلی نظران سب پہ تھی۔ زری بھی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے رک گئی تھی۔ اس نے بھی جب پیچھے مڑ کر دیکھا تو پتھر کی ہو گئی تھی۔۔۔ ملک اسد اللہ کے پہلو میں زری کی موت کا فرشتہ

کھڑا تھا، جسے دیکھ کر وہ زرد پڑ گئی تھی اور اس پہ سرتاپا کپکپی طاری ہو گئی تھی۔

"ملوں گا، ضرور ملوں گا، آپ سے ملنے کے لیے ہی تو آیا ہوں۔" عبداللہ گاڑی سے پاؤں نیچے اتارتا ہوا ان کے قریب آ گیا تھا اور پھر خود ہاتھ آگے بڑھا کے اس سے ہاتھ ملایا تھا۔

"آپ لوگ گاڑی میں بیٹھیں۔" دل آور نے مدیحہ اور نگارش کو اشارہ کیا تھا۔

"دل آور بھائی۔۔۔" نگارش سہم گئی۔

"ڈونٹ وری! کچھ نہیں ہوتا، آپ لوگ گاڑی میں بیٹھیں، یہاں کھڑے ہونا ٹھیک نہیں ہے۔" دل آور کا لہجہ سخت تھا۔ اس لیے مجبوراً ان تینوں کو گاڑی میں بیٹھنا پڑا اور دل آور نے گاڑی کا دروازہ بند کر دیا۔

"مجھے ملک حق نواز کہتے ہیں۔" یہ جملہ دل آور کی سماعتوں پہ کسی چابک کی طرح پڑا تھا۔ وہ یک دم دوبارہ پلٹا تھا۔ ملک حق نواز، نبیل کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے اپنا تعارف کروا رہا تھا۔

"ملک حق نواز؟" اس نے زیر لب دہرایا اور پھر نبیل سے ہاتھ ملاتے ملک حق نواز کو ایک قہر بھری نظر سے دیکھا تھا اور مضبوط قدم اٹھاتا ان کے قریب آ گیا۔

"اور مجھے دل آور شاہ کہتے ہیں۔" اس نے بھی ملک حق نواز کے سے انداز میں ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے اپنا تعارف کروایا تھا، جس پہ ملک حق نواز نے بری طرح ٹھٹک کے دیکھا تھا۔ ملک حق نواز کے چہرے کی بدلتی کیفیت دیکھ کر عبداللہ اور نبیل کو بیک وقت حیرت ہوئی تھی۔ دل آور کے تعارف نے اس کے چہرے کے تاثرات بدل کے رکھ دیے تھے، سارا تفاخر سرد پڑ گیا تھا۔

"مجھے امید نہیں تھی ملک صاحب کہ آپ میرے تعارف کو یوں دل پہ لے لیں گے۔" دل آور، ملک حق نواز کو کافی گہری اور کاٹ دار نظروں سے دیکھتا چوٹ کرنے سے باز نہیں آیا تھا۔

"جو لوگ ہمارے دماغ میں گھڑی کی سوئیوں کی طرح ٹک ٹک کرتے رہتے ہیں وہ اگر سامنے آ جائیں تو ان کے تعارف کو دل پہ لینا ہی پڑتا ہے۔" ملک حق نواز نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا اور دل آور سے ہاتھ ملایا تھا۔

"چلیں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ میں آپ کے دماغ میں ٹک ٹک کرتا رہتا ہوں یعنی ہر دم آپ کے ساتھ ہی رہتا ہوں؟" دل آور کا انداز استہزائیہ تھا۔ جو ملک حق نواز کو کافی ناگوار گزرا۔

"اور میں آج کل اس ٹک ٹک کو بند کرنے کی کوشش میں ہوں، امید ہے جلدی بند ہو جائے گی۔" ملک حق نواز کافی چبا کے بولا تھا۔

"اور مجھے یقین ہے یہ ٹک ٹک بند نہیں ہو گی اور بڑھے گی، اتنی کہ ملک صاحب نیند کو ترسیں گے۔" دل آور کا لہجہ مضبوط اور مستحکم تھا۔

"یہ تو وقت آنے کی بات ہے شاہ صاحب؟" ملک حق نواز کچھ جتا رہا تھا۔

"وقت آ چکا ہے ملک صاحب اور کس وقت کا انتظار ہے آپ کو؟ اپنا بندوبست کر رکھیں، بلاوا کسی وقت بھی آ سکتا ہے۔" دل آور نے بھی اسے اشارہ دے دیا تھا۔

"یہ بلاوا جتنا میرے لیے نقصان دہ ثابت ہو گا، اتنا آپ کے لیے بھی ہو گا۔" ملک حق نواز نے ڈھکی چھپی دھمکی دی تھی۔

"میں قاتل، زانی اور شرابی نہیں ہوں۔ میں غریبوں کا گوشت کھانے والا بھیڑیا نہیں ہوں، بلکہ میں تم جیسے بھیڑیوں کو دنیا کے سامنے لانے والا آدمی ہوں۔ تم جیسے دس بھی آ جائیں تو میرا نقصان نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اوپر والا جانتا ہے، کون کتنا غلط ہے۔" دل آور کے چہرے پہ غصہ اتر آیا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا ملک حق نواز کے ٹکڑے کر دے۔ ایسے لوگوں کو دیکھ کر تو اس کا پارہ ویسے ہی ہائی ہو جاتا تھا اور ملک حق نواز تھا کہ الٹا اسے دھمکی

دے کر اور رعب جما کر بات کر رہا تھا اور دل آور کا خون کھول اٹھا تھا۔

"دل آور۔۔۔ پلیز کول ڈاؤن! کیا مسئلہ ہے آخر؟" عبداللہ نے دل آور کا غصہ امڈتے دیکھا تو فوراً" اس کا بازو تھام لیا تھا۔

"مسئلہ تم ان ہی سے پوچھنا کہ ان کے کرتوت اور کارنامے کیا ہیں؟" دل آور نے انتہائی غضب اور حقارت سے ملک حق نواز کو دیکھتے ہوئے عبداللہ کے ہاتھ سے اپنا بازو چھڑایا تھا۔

"حق نواز چلو تم گاڑی میں بیٹھو' بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔" ملک اسد اللہ نے ملک حق نواز کو وہاں سے ہٹانا چاہا۔

"چلو۔۔۔ ! تم بھی گاڑی میں بیٹھو۔" عبداللہ نے دل آور کو اشارہ کیا تھا۔

"جارہا ہوں' میں بھی فی الحال کوئی بدمزگی نہیں چاہتا' لیکن ملک حق نواز اتنا یاد رکھنا کہ تمہاری گردن اور انصاف کا پھندا ایک دوسرے سے دور نہیں ہیں۔" اس نے جاتے جاتے ملک حق نواز کو وارننگ دی تھی اور پھر پلٹ کر دوبارہ گاڑی تک آگیا۔

"دل آور پلیز یار۔۔۔ کچھ بتاؤ تو سہی؟ آخر آپ لوگوں کے درمیان کیا مسئلہ چل رہا ہے؟" عبداللہ کو تجسس ہو رہا تھا۔

"بعد میں بتاؤں گا' ابھی تم گاؤں جاؤ۔" اس نے بتانے سے گریز کیا تھا۔

"ارے نہیں یار! تم سمجھ نہیں رہے' میں صرف اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ اگر ملک حق نواز کے حوالے سے کوئی اور ویک پوائنٹ ہے تو کم از کم مجھے حویلی جانے سے پہلے پتا تو ہو؟ تاکہ میں اس پہ کچھ بول تو سکوں۔" عبداللہ' ملک حق نواز کے بارے میں کچھ اور معلومات چاہتا تھا۔۔۔ دل آور نے اس کی بات پہ پہلے نبیل کو' پھر دوبارہ عبداللہ کو دیکھا اور گہری سانس کھینچی تھی۔

"اس نے ایک لڑکی مومنہ بی بی کے ساتھ زیادتی کی ہے۔۔۔ آج سے تقریباً" دس' گیارہ ماہ پہلے کی بات ہے۔۔۔ مومنہ بی بی! انصاف چاہتی ہے۔۔۔ اس کا کیس میرے ہاتھ میں ہے اور مومنہ بی بی آج کل نبیل کے گھر میں رہ رہی ہے۔ اس گھٹیا انسان سے چھپ چھپ کے جی رہی ہے کہ کہیں یہ اس کے الزام سے بچنے کے لیے اس کا قتل ہی نہ کروادے۔" دل آور نے غصہ ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اسے بتایا تھا اور عبداللہ اور نبیل ششدر رہ گئے تھے۔

نبیل کے دماغ کو ایک اور جھٹکا لگا تھا کہ یہ وہی ملک حق نواز ہے' جس کے بارے میں اس روز انسپکٹر شہناز بتا رہی تھی اور جو مومنہ بی بی کا مجرم تھا۔ جس نے مومنہ بی بی کی زندگی برباد کر کے رکھ دی تھی۔۔۔ وہ کتنے دھڑلے سے دندناتا پھر رہا تھا؟ لیکن ایک بات اور تکلیف دہ تھی کہ وہ عبداللہ کا رشتہ دار تھا' بلکہ زری کا بھی۔

"دل آور۔۔۔ تم سچ کہہ رہے ہو؟" عبداللہ تو جیسے شرمندگی سے مر گیا تھا۔

"میرے سچ کی تصدیق کرنی ہے تو مومنہ بی بی کے پاس جاؤ' نبیل کے گھر پہ ملے گی۔" دل آور نے تلخی سے اشارہ کیا۔

"اف خدایا! میرے خاندان میں ذلالت اب اس حد تک بڑھ گئی ہے۔" عبداللہ کا دماغ پھٹنے کے قریب تھا۔ اس نے سر تھام لیا۔

"تم خاندان کی بات کرتے ہو' میرے تو اپنے گھر میں ہی ذلالت پائی گئی ہے۔" نبیل کا خیال اپنے باپ کی طرف چلا گیا تھا اور دل میں اک اذیت کا ابال سا اٹھا تھا۔

"خیر چھوڑو اس مسئلے کو۔۔۔ میں نبٹ لوں گا' تم جاؤ اب۔" دل آور نے اپنے اعصاب ٹھکانے پہ لاتے ہوئے

عبداللہ کا کندھا تھپکا تھا۔

"لیکن یار۔۔۔ میں ان ظالم اور بے حس لوگوں میں زری کو لے کر کیسے جاؤں؟" وہ اس ندی میں پیر ہی نہیں ڈال رہا تھا۔

"یہ لو۔۔۔ یہ اپنے پاس رکھ لو' کام آئیں گے۔" دل آور نے ایک موبائل فون اور ایک ریوالور عبداللہ کو تھمایا تھا۔

"اس موبائل میں' میرے نمبر کے علاوہ گلاب خان' نبیل' انسپکٹر شہناز اور ایس پی کامران اور پولیس اسٹیشن کا نمبر بھی سیو ہے۔ تمہیں فوری طور پہ جس کی بھی مدد کی ضرورت ہو تم کال کر سکتے ہو اور یہ بھی لوڈڈ ہے' اس کو استعمال کرنے کی نوبت آئے تو کسی کے سینے پہ مت استعمال کرنا' سیدھا سیدھا قتل کا کیس ہو گا' اس لیے استعمال کرنا پڑا تو کسی کی ٹانگ یا بازو پہ استعمال کرنا' تاکہ کسی کی جان نہ جائے' ہوش و حواس بے شک چلے جائیں۔" دل آور نے اسے ہر طرح سے سمجھانا ضروری سمجھا تھا اور عبداللہ اس کا مشکور ہو گیا تھا۔

"تھینک یو یار۔۔۔ تھینک یو سو مچ۔۔۔ اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ وہ سب میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے' کیونکہ تم میرے ساتھ ہو۔" عبداللہ بے ساختہ اس سے بغل گیر ہو گیا اور دل آور نے غصہ جھٹک کر اس کو تسلی دی اور گلاب خان کو اس کے ساتھ جانے کے لیے تیار کیا تھا۔

اور گاڑی میں بیٹھی زری کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اسے آنے والے وقت سے خوف آرہا تھا کہ نہ جانے آگے کیا ہونے والا ہے۔ دل آور' عبداللہ اور نبیل گاڑی سے باہر کھڑے نہ جانے کیا کیا پلان بنا رہے تھے کہ نگارش کو بھی پریشانی اور بے چینی ہونے لگی تھی۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ دل آور ان کو گاڑی میں بٹھا کے گیا تھا۔ اس لیے نہ تو وہ گاڑی سے نکل سکتی تھیں اور نہ ہی ان کو اپنے پاس بلا سکتی تھیں۔ لیکن شاید اللہ کو ہی ان کی حالت پہ رحم آگیا تھا کہ وہ تینوں گاڑی کے قریب آگئے اور نبیل نے آگے بڑھ کے گاڑی کا دروازہ کھولا تھا۔

"مدحیہ۔۔۔ تم اپنی گاڑی میں آجاؤ' ان لوگوں نے گاؤں جانا ہے۔" نبیل کے کہنے پہ زری نے یک دم ہراساں سے انداز میں نگارش کو دیکھا تھا۔

"گاؤں؟" اس کی سانسیں اٹکنے لگی تھیں۔

"کچھ نہیں ہو گا! یوں سمجھ لیں کہ ہم لوگ آپ کے ساتھ ہی ہیں۔" نبیل نے تسلی دی تھی اور مدحیہ' زری اور نگارش سے مل کر گاڑی سے اتر آئی تھی۔

زری نے بے اختیار گاڑی سے باہر کھڑے عبداللہ سے بات کرتے دل آور کو دیکھا تھا۔ زری کے دل کی تو پیاس بھی نہیں بجھی تھی اور وہ لوگ گاؤں جانے کے لیے تیار ہو گئے تھے؟ زری کے دیکھتے دیکھتے ہی نبیل نے گاڑی کا دروازہ بند کر دیا۔ پھر ڈرائیونگ سیٹ گلاب خان نے سنبھال لی تھی اور دل آور سے رخصت ہو کر عبداللہ بھی فرنٹ سیٹ پہ آبیٹھا تھا۔ دل آور اور نبیل وہیں کھڑے تھے اور گلاب خان گاڑی نکال لے گیا تھا۔ اس کے پیچھے مدحیہ بھی گاڑی نکال لے گئی تھی اور رفتہ رفتہ وہ دونوں بھی وہاں سے نکل آئے تھے۔

☼ ☼ ☼
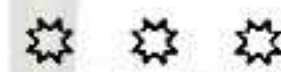
وہ نہا کر نکلا اور تولیے سے بال رگڑتا ہوا اپنے کمرے میں آگیا تھا جہاں مریم پہلے سے موجود کمرے کی صفائی کرنے میں مصروف تھی۔ عدیل کو گنگناتے دیکھ کر اس کے ہاتھ ٹھہر گئے تھے۔ وہ کل سے کافی خوش اور فریش لگ رہا تھا۔

"یہ گانا آپ نے سنا پہلی بار ہے؟ یا اچھا پہلی بار لگا ہے؟" مریم کے سوال پہ عدیل گنگناتے ہوئے رک گیا۔

"کیا مطلب۔۔۔؟" عدیل نے تولیہ کھونٹی سے لٹکا کے اپنی شرٹ پہنتے ہوئے مریم کو ناسمجھی سے دیکھا تھا۔

"مطلب کہ آپ کل سے جب سے کام سے واپس آئے ہیں مسلسل یہی گانا گنگنا رہے ہیں؟ کیا یہ گانا زیادہ اچھا لگ گیا ہے آپ کو۔" مریم کے کہنے پر عدیل یکدم اک بے ساختہ سا قہقہہ لگا کے ہنسا تھا۔ تو گویا مریم کل سے اسے نوٹس کر رہی تھی؟

"یہی سمجھ لو کہ اچھا پہلی بار لگا ہے۔ ورنہ سنا تو پہلے بھی تھا۔" عدیل نے بھی دلچسپی سے مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"اوہ اچھا اچھا۔۔۔ تو جس کی وجہ سے اچھا لگا ہے اس کا نام بتا سکتے ہیں؟" مریم جاننا چاہتی تھی۔

"میرے بتانے کی کیا ضرورت ہے؟ تم خود جانتی ہو اسے۔۔۔ بلکہ مل بھی چکی ہو۔" عدیل اپنی خوشی اپنے دل کی کیفیت مریم سے نہیں چھپا سکتا تھا۔

"یعنی مدحیہ حیات؟" مریم نے بستر کی چادر سے سلوٹیں دور کرتے ہوئے بے ساختہ خوشی کا اظہار کیا تھا۔

"ہوں۔۔۔ وہی۔" عدیل اثبات میں جواب دیتا آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بالوں میں برش پھیرنے لگا۔

"سچ؟ مجھے یقین نہیں آرہا؟" مریم چادر کا کونا چھوڑ کے پوری طرح سے عدیل کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

"کیوں؟ اس میں ناقابل یقین کیا ہے؟ کیا اپنے بھائی کی پرسنالٹی پہ کوئی شک ہے؟" عدیل نے مریم کو چھیڑا تھا۔

"ارے نہیں، نہیں! مجھے اپنے بھائی کی پرسنالٹی پہ پورا یقین ہے۔ بس اس لیے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ تو شاید لندن پلٹ ہے اور تھوڑی اکھڑ مزاج بھی ہے۔ آپ کا اور اس کا یہ جوڑ میل۔۔۔؟" مریم بات ادھوری چھوڑ کے چپ ہو گئی تھی۔

"لندن پلٹ ہے تو کیا ہوا؟ کیا اس کے پاس دو آنکھیں اور ایک دل نہیں ہے؟ کیا وہ دیکھ کر محسوس نہیں کر سکتی؟ کیا وہ لڑکی نہیں ہے؟ اور ہاں وہ اکھڑ مزاج اور ضدی ضروری ہے، لیکن اندر سے بہت حساس اور نرم ہے۔ اس کو آئینے کی طرح دیکھ چکا ہوں میں۔ اتنی شفاف تھی کہ مجھے اس میں اپنا آپ صاف نظر آرہا تھا۔ وہ ناریل کی طرح ہے، باہر کا خول بہت سخت سہی، لیکن اندر سے کچی گری (کچے ناریل) کی طرح ہے نرم اور میٹھی۔" عدیل نے مدحیہ کے حوالے سے دل کھول کے اظہار کیا تھا اور مریم اس کے اظہار پہ مسکرا اٹھی تھی۔

"یعنی آپ گئے کام سے؟" اس کے لہجے میں شرارت تھی۔

"ہاں۔۔۔ کہہ سکتی ہو۔" عدیل نے بھی جواباً شرارت سے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور اپنے بال سہلائے تھے۔

"تو کیا یہ گلاسز بھی اسی کے ہیں؟" مریم نے عدیل کے تکیے کے نیچے رکھے گلاسز نکالے، جو کافی عرصے سے عدیل کے تکیے کے نیچے ہی پائے جاتے تھے۔

"آف کورس۔۔۔ اور کس کے ہو سکتے ہیں بھلا؟" عدیل یوں لاپروائی سے کہہ رہا تھا جیسے اس کا مدحیہ کے ساتھ صدیوں سے کوئی ریلیشن چلا آرہا تھا۔

"اوہ۔۔۔ مجھے تو پہلے ہی شک تھا۔۔۔ خیر آپ یہ بتائیں کہ آپ ان سے ہماری ایک پراپر طریقے سے مہذب اور پر تکلف سی ملاقات کب کروا رہے ہیں؟" مریم نے فرمائش کی تھی۔

"جب مجھے سیلری ملے گی۔" عدیل کے چہرے سے ابھی تک مسکراہٹ جھلک رہی تھی۔

"اوہونہہ۔۔۔ سیلری ملنے میں تو ابھی دس، بارہ دن باقی ہیں؟" مریم نے بدمزا ہوتے ہوئے برا سا منہ بنایا۔

"تو کیا یوں ہی خالی گھر میں لے آؤں؟ آج کل کے دنوں میں تو گھر میں ہمارے کھانے کے لیے کچھ نہیں ہے،'

کسی مہمان کو کیا کھلائیں گے بھلا؟" عدیل نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا اور مریم ذرا دیر کے لیے چپ سی ہوگئی تھی۔ پھر ذرا توقف سے گویا ہوئی۔

"میں کوشش کروں گی کہ مجھے جلدی سیلری مل جائے' پھر انہیں انوائیٹ کروں گی۔" مریم کے لہجے میں اک عجیب سی چاہ تھی۔ وہ مدیحہ سے جس رشتے کے حوالے سے ملنا چاہتی تھی اس کو سمجھتے ہوئے عدیل کے چہرے پہ نرمی بکھر گئی اور پھر مریم کے قریب آتے ہوئے اس کا سر تھپکا تھا۔

"ان شاء اللہ۔۔۔ اللہ بہت بہتر کرے گا۔۔۔ کبھی وہ وقت بھی آئے گا' جب مہمان جس وقت بھی آئے گا' ہمیں پریشانی نہیں ہوگی کہ ہمارے پاس خاطر مدارات کے لیے چائے اور کولڈ ڈرنک کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔۔۔ جب تمہیں تمہارے لیے لایا ہوا برگر کسی اور کو نہیں دینا پڑے گا۔" عدیل اس کا سر تھپکتے ہوئے اسے تسلی دے رہا تھا۔ سمجھا رہا تھا اسے۔۔۔ اور مریم اپنے آنسو ضبط کرنے کے لیے سر جھکا گئی تھی۔

"عدیل۔۔۔ تمہارے بابا کو تیار کر دیا ہے میں نے۔" برآمدے سے امی کی آواز سنائی دی۔ انہوں نے آج ابا جی کے چیک اپ کے لیے جانا تھا۔ اس لیے عدیل نے آج ورکشاپ سے چھٹی کی تو مریم بھی اکیڈمی جانے کی بجائے گھر پہ رہ گئی تھی۔ تاکہ عدیل کے ساتھ اسپتال جا سکے' کیونکہ عدیل اکیلا ان کے ساتھ بھاگ دوڑ نہیں کر سکتا تھا۔ سرکاری اسپتالوں میں ڈاکٹرز کے پیچھے بھاگنا' چیک اپ کے لیے نمبر لگوانا اور ساتھ ساتھ مریض کو سنبھالنا اتنا آسان نہیں تھا۔ اسی لیے مریم' عدیل کی مدد کے خیال سے گھر پہ ہی رک گئی تھی اور اب ان دونوں بہن بھائی نے ساتھ ہی جانا تھا۔

"چلو۔۔۔ جلدی کرو' تم بھی تیار ہو جاؤ' تب تک میں ٹیکسی لے آتا ہوں۔" وہ نرمی سے اس کا سر تھپک کے باہر نکل گیا تھا اور مریم ہاتھ میں پکڑے گلاسز دوبارہ اس کے۔ تکیے کے نیچے رکھ کے بستر کی چادر درست کر کے باہر نکل آئی تھی۔ اور چادر اوڑھ کے تیار ہوگئی تھی۔ اتنے میں عدیل واپس بھی آگیا۔ ٹیکسی گلی کی نکڑ پہ کھڑی تھی۔ عدیل' ابا جی کو بازوؤں میں اٹھائے گاڑی تک لے گیا اور اس کے پیچھے پیچھے مریم بھی ٹیکسی میں آبیٹھی تھی۔

☆ ☆ ☆
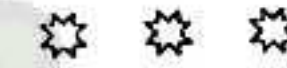
اس کی گاڑی اپنے آفس کے سامنے ایک جھٹکے سے رکی تھی اور اس کے پیچھے نبیل کی۔

دل آور گاڑی سے اترا تو اس کے پیچھے نبیل بھی اتر آیا تھا۔ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے آفس روم میں داخل ہوئے تھے۔

"بتاؤ اب کیا مسئلہ ہے؟" دل آور نے موبائل اور چابیاں ٹیبل پہ ڈالتے ہوئے نبیل کو دیکھا۔ نبیل کرسی کے ہتھوں پہ بے چینی سے ہاتھ جمائے بیٹھا تھا۔ اس کے سوال پہ "فورا" ہی بے چینی سے کھڑا بھی ہوگیا۔

"مسئلہ میں نے بتانا ہے یا تم نے بتانا ہے؟ آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ ملک حق نواز کا کیا سلسلہ ہے؟ اور وہ نکاح کی کیا بات کر رہے تھے تم لوگ؟" نبیل بے چینی سے ٹہلتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"آرام سے بیٹھو گے تو بتاؤں گا نا؟" دل آور اپنی چیئر دھکیل کر بیٹھ گیا تھا اور بے چین اور بے کل سے ٹہلتے نبیل کو سر تا پا دیکھا تھا۔ نبیل پہ کیا گزر رہی تھی دل آور بخوبی جانتا تھا۔ اسی لیے تو اس نے اپنی بے چینیوں کو سینے کے سب سے سرد خانے میں دفن کر دیا تھا۔ صرف ایک کا بے چین رہنا ہی اچھا تھا۔ کیونکہ اگر دونوں ہی بے چین رہتے تو شاید ایک دوسرے کے دوست ہی نہ رہتے۔

اور اس وقت ان دونوں کے درمیان سچویشن اور کنڈیشن کچھ اور ہوتی' اور یقینا" ایک دوسرے سے نظر بھی نہ ملا پاتے۔ شاید اسی لیے دل آور شاہ بہت پہلے ہی ان بے چین اور بے کل کر دینے والی راہوں سے قدم واپس موڑ چکا تھا۔ وہ اس منزل کو نہیں پانا چاہتا تھا۔ جس کو پانے کے لیے نبیل کے قدم بھی رواں دواں تھے۔ جس کو پانے کی چاہ نبیل کے دل میں بھی ہمکتی تھی۔ وہ ایسا کیسے کر سکتا تھا کہ خود وہ منزل پالیتا اور نبیل کو نامراد ٹھہرا دیتا۔ اس کی مسافت رائیگاں کر دیتا' اسے مایوس لوٹنے پہ مجبور کر دیتا؟ وہ ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا' کیونکہ دل آور شاہ جیسا بھی تھا لیکن خود غرض نہیں تھا۔۔۔ یہ سچ تھا کہ اسے یہ سارے رشتے اپنی ذات سے بھی زیادہ عزیز تھے۔

"ہوں۔۔۔ بتاؤ؟" نبیل اپنی بے چینی کنٹرول کرتا ہوا دوبارہ کرسی پہ بیٹھ گیا اور دل آور اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے گہری سانس خارج کرتا خود بھی سیدھا ہو بیٹھا تھا۔

"ملک حق نواز کو جانتے ہو۔۔۔ وہ کون ہے؟" دل آور نے آغاز سوال کرنے سے کیا تھا۔

"نہیں۔۔۔" نبیل کا جواب حسب توقع تھا۔

"وہ ملک شرافت علی کا چچازاد کزن ہے۔"

"ملک شرافت علی۔۔۔؟" نبیل کا دماغ اس وقت آدھا حاضر۔۔۔ آدھا غیر حاضر تھا۔

"عبداللہ کے بابا جان۔۔۔"

"واٹ۔۔۔؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟" دل آور کے انکشاف پہ نبیل دنگ رہ گیا تھا۔

"مجھے بھی اسی طرح شاک لگا تھا۔ خیر آگے سنو۔" دل آور نے بات کا سلسلہ جاری رکھا۔

"ملک حق نواز' ملک شرافت علی کا سب سے چھوٹا کزن ہے' عبداللہ سے آٹھ دس سال بڑا اور ملک اسد کا تقریبا" ہم عمر ہی ہوگا۔ ملک حق نواز ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا اس لیے اس کے چاؤ چونچلے بھی کچھ زیادہ ہی تھے اور ان چاؤ چونچلوں میں بڑے بزرگوں نے بنا سوچے سمجھے عبداللہ کی بڑی بہن شہرین کو ملک حق نواز کے ساتھ منسوب کر دیا۔ لیکن ملک حق نواز شروع سے ہی ایک خبیث انسان ثابت ہوا ہے اس نے جوانی کے منہ زور گھوڑے پہ سوار ہوتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ شہرین کے ساتھ اپنا رشتہ توڑ دیا' پتا نہیں یہ شہرین کی خوش قسمتی تھی کہ بد قسمتی۔۔۔ البتہ ملک حق نواز اپنے چچا زاد۔۔۔ کی بیٹی کے ساتھ بندھ کے نہیں رہنا چاہتا تھا حالانکہ بہت لوگوں نے اسے منانے کی کوشش بھی کی تھی یہاں تک کہ ملک شرافت علی نے خود بھی اسے راضی کرنے کی کوشش کی تھی کیونکہ ملک شرافت علی کی ملک حق نواز پہ نہیں اس کی جاگیر' اس کی جائیداد پہ نظر تھی' کیونکہ وہ اکلوتا جو تھا۔۔۔؟ مگر اکلوتا ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ضدی' بد لحاظ اور ایک نمبر کا گھٹیا آدمی تھا' وہ نہیں مانا اور اپنی من مانی کرتا رہا' شراب اور حرام کاری اس کا شوق بن چکے ہیں' وہ کسی کی عزت کو عزت نہیں سمجھتا' آس پاس کے گاؤں والے اور اس کے اپنے گاؤں والے ہر وقت اس سے خوف زدہ رہتے ہیں۔

دو بار الیکشن میں بھی حصہ لے چکا ہے اور دونوں بار جیت بھی چکا ہے۔ ملک شرافت علی کی بیٹی کو ٹھکرانے کے بعد بھی وہ ان کا منظور نظر ہے اور اب زری سے شادی کا خواہش مند ہے' کیونکہ وہ اپنی طرف سے شہرین کو ٹھکرانے کا ازالہ کرنا چاہتا ہے۔ اور عبداللہ مسلسل احتجاج کر رہا ہے کہ یہ ازالہ ہے یا ظلم۔۔۔؟ وہ اپنے گھر والوں کے اس فیصلے کے خلاف ہے۔۔۔ وہ زری کی شادی زری کی پسند سے کرنا چاہتا ہے' اس لیے یوں سمجھو کہ عبداللہ آج اپنے گاؤں' اپنی حویلی میں جنگ لڑنے گیا ہے۔ اب یہ جنگ کیا نتائج سامنے لاتی ہے یہ تو رات کو پتا چلے گا۔۔۔ یا پھر کل۔۔۔؟" دل آور نے نبیل کو ساری تفصیل سے آگاہ کرتے ہوئے کندھے اچکائے تھے اور نبیل دم بخود سا بیٹھا سب سن رہا تھا۔

"ملک حق نواز' زری سے شادی کا خواہش مند ہے۔۔۔؟" یہ سوچ ہی نبیل کی رگوں کو کاٹ دینے کے لیے کافی تھی نبیل کا دل چاہ رہا تھا ملک حق نواز دوبارہ اس کے سامنے آجائے تو وہ اسے گولی سے اڑا دے' اس کے دماغ کی رگیں پھٹنے کو تھیں۔

"وہ۔۔۔ وہ کیا کہتی ہے اس بارے میں۔۔۔؟" نبیل کو زری کا خیال آیا تھا جس پہ دل آور کے دل و دماغ کا سکون منتشر ہو گیا تھا وہ اپنی کرسی چھوڑ کے اٹھ گیا۔

"مجھے کیا پتا کہ وہ کیا کہتی ہے۔۔۔؟ میں کون سا اس کے ساتھ ہوتا ہوں۔۔۔؟ یا پھر اس کے دل کی خبریں رکھتا ہوں۔۔۔؟" دل آور کہتے ہوئے رخ موڑ گیا تھا۔

"لیکن دل آور۔۔۔! تم جانتے ہو نا کہ میں۔۔۔" نبیل کافی بے بسی سے بولا تھا لیکن بات ادھوری رہ گئی تھی کیونکہ دل آور کا منشی قادر دروازے پہ دستک دے کر اندر آ گیا تھا۔

"سر! وہ آپ کے سیالکوٹ والے کلائنٹ آئے ہیں، قتل کے کیس والے۔۔۔ آپ سے ملنا چاہ رہے ہیں۔" قادر اس کی اجازت طلب کر رہا تھا۔

"پانچ منٹ بعد انہیں اندر بھیج دو۔" دل آور نے قادر کو جانے کا اشارہ کیا اور نبیل کے قریب آ کھڑا ہوا۔

"مجھے پورا یقین ہے کہ عبداللہ کچھ نہیں ہونے دے گا۔ اس لیے تم بھی یہ یقین اپنے ساتھ رکھو۔۔۔ ان شاء اللہ سب بہتر ہی ہو گا۔" دل آور نے اپنا مضبوط ہاتھ نبیل کے کندھے پہ جماتے ہوئے اسے تسکین دی تھی۔ اور دل آور کے ایسے مضبوط لہجے اور انداز پہ نبیل کو کافی حد تک تسلی ہوئی تھی اسی لیے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس سے ہاتھ ملا کر چلا گیا تھا، کیونکہ دل آور کے کلائنٹ اس کے انتظار میں تھے۔

✲ ✲ ✲

وقار آفندی پوری طرح سے ہوش و حواس میں آ چکے تھے لیکن اس کے باوجود وہ ساکت و صامت سے لگ رہے تھے۔

ان کی آنکھوں کے سامنے سارے ہی چہرے موجود تھے آذر، دانیال، جودت، احمد، عماد، زین، عون، عدید، اسرار آفندی، اظہار آفندی سب چہرے باری باری ان سے ملنے کے لیے ان کے سامنے آتے رہے۔ لیکن جس چہرے کو ان کی پتھرائی ہوئی آنکھیں دیکھنا چاہتی تھیں وہ سامنے ہی نہیں آ رہا تھا، وہ دکھائی ہی نہیں دے رہا تھا۔ ان کے وجود کے ساتھ ساتھ آنکھیں بھی پتھر ہو گئی تھیں۔

"وقار۔۔۔!" ان کے قریب سے گلوگیر اور آنسوؤں کے بوجھ سے بھیگی اور بوجھل آواز ابھری تھی اور اس آواز کو سنتے ہی ان کے دل پہ لرزا طاری ہو گیا تھا۔

"آسیہ۔۔۔!" ان کا دل زور سے دھاڑا تھا اور پھر دھاڑیں مار مار کے رویا تھا۔ زبان سے وہ پکار نہیں سکتے تھے اور دل سے پکارنے پہ آسیہ آفندی سن نہیں سکتی تھیں۔ وقار آفندی کا دل بھر آیا تھا۔

"وقار۔۔۔! مجھے دیکھیں نا۔۔۔ میں ہوں آپ کی آسیہ۔۔۔ آپ۔۔۔ آپ۔ مجھ سے منہ موڑے یہاں ہسپتال میں کیوں پڑے ہیں؟ آپ کو نہیں پتا آپ کے بغیر میرا کیا حال ہو گیا ہے؟ آپ کی آسیہ چار دن میں ہی بوڑھی لگنے لگی ہے۔ یقین کریں وقار، آسیہ آپ کے بغیر کچھ بھی نہیں ہے میں تو سب کچھ آپ پہ وار چکی ہوں۔ آپ کو کچھ ہو گیا تو میرا کیا بنے گا؟ کیا کروں گی میں۔۔۔؟ یہاں کوئی کسی کا نہیں ہوتا۔ میرا کون ہو گا؟" آسیہ آفندی، وقار آفندی کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامے بے تحاشا رو رہی تھیں اور ان کے اس طرح رونے پہ وقار آفندی کی پتھر آنکھوں سے بھی آنسو بہہ نکلے تھے۔ ان کا پورا جسم بے جان تھا اور بے جان جسم کی پتھر آنکھوں سے آنسو بہہ کر خود بخود ہی ان کی کنپٹیوں سے لڑھک کر بالوں میں جذب ہو رہے تھے۔

"وقار۔۔۔ آپ کو میرا خیال کیوں نہیں آتا؟ آپ ٹھیک کیوں نہیں ہو رہے؟ آپ۔۔۔ آپ میرے لیے نہ سہی میرے بچوں کے لیے ٹھیک ہو جائیں۔ میرے عون اور عدید کے لیے ٹھیک ہو جائیں۔ میری۔۔۔ میری علیزے

کے لیے ٹھیک ہو جائیں۔۔۔ وقار آپ سن رہے ہیں نا؟ میں آپ سے کیا کہہ رہی ہوں۔ آپ کو ہم سب کی خاطر ٹھیک ہونا ہے۔" آسیہ آفندی تڑپ تڑپ کے کہہ رہی تھیں اور وقار آفندی کے آنسو خاموشی سے بہتے جا رہے تھے۔ وقار آفندی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا ان کے سوالوں کا، ان کے پاس صرف خاموشی تھی۔ لمبی اور گہری خاموشی، سوال کرنے والوں کو نڈھال کر دینے والی خاموشی۔۔۔ عمر بھر کی خاموشی۔

"آنی پلیز! آپ باہر آ جائیں۔" دانیال، آسیہ آفندی کو دونوں کندھوں سے تھام کے ان کے روم سے باہر لے آیا تھا جو ہچکیوں سے رو رہی تھیں۔

"ہم آپ کو اس لیے ساتھ لے کر آئے تھے کہ آپ ان کو تسلی دیں، دلاسا دیں، ان کی ہمت بڑھائیں نا کہ ان کی طبیعت پہلے سے زیادہ خراب کر دیں۔" دانیال خفا ہو رہا تھا۔

"دانیال۔۔۔! عون اور عدید کو بھی آنی کے ساتھ واپس گھر بھیج دو۔" احمد نے عون اور عدید کو دانیال کی طرف بھیجا، دانیال تھوڑی دیر آنی کو تسلی دلاسا دینے کے بعد مبارک خان کے ہمراہ واپس گھر بھیج کر دوبارہ روم میں آیا تو وقار آفندی کی حالت کافی تشویشناک پائی تھی ڈاکٹرز ایک دم سے پریشان نظر آنے لگے تھے۔ اور ان کا ٹریٹ منٹ نئے سرے سے شروع ہو گیا تھا۔

"یہ اچانک کیا ہوا ہے ان کو؟" آذر پریشانی سے آگے بڑھا تھا۔

"انہوں نے کوئی گہری ٹینشن لی ہے، دل بہت کمزور ہو چکا ہے، سہہ نہیں پا رہا۔" ڈاکٹر پریشانی سے جواب دے رہا تھا۔

"یہ میڈیسن فوراً چاہئیں۔" ڈاکٹر نے تیزی سے کاغذ قلم تھام کے نسخہ لکھا اور کاغذ آذر کی سمت بڑھا دیا تھا۔

"ہسپتال کی ڈسپنسری سے یہ میڈیسن ختم ہو چکی ہیں اس لیے آپ کو کسی اور جگہ سے تلاش کرنا پڑیں گی۔" ساتھ ساتھ ڈاکٹر نے بتا بھی دیا تھا اور آذر وہ نسخہ ہاتھ میں تھامے پرائیویٹ روم سے باہر نکل آیا تھا۔

"لائیے! یہ میڈیسن میں لے آتا ہوں۔" جودت نے آذر کو روک دیا تھا اور وہ نسخہ خود تھام لیا تھا۔

"لیکن تم۔۔۔؟" آذر نے کچھ کہنا چاہا تھا۔

"میرے پاس بائیک ہے۔ میں جلدی لے کر آ جاؤں گا۔" جودت نے اسے یقین دلایا تھا۔

"او کے۔۔۔! لے آؤ لیکن پھر وہی بات کہ جلدی پہنچنا ڈیڈ کی کنڈیشن خاصی سیریس ہے۔" آذر نے پھر بھی اسے تاکید کرنا ضروری سمجھا تھا۔

"او کے۔۔۔! جلدی پہنچوں گا۔" جودت اسے تسلی دے کر پلٹ گیا تھا۔

"چلو میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔" جودت کا دوست کامی بھی ڈیڈ کی عیادت کے لیے ہسپتال آیا ہوا تھا، جودت کو میڈیسن لانے کے لیے تیار دیکھا تو وہ بھی ساتھ ہی آ گیا تھا۔

✲ ✲ ✲

"ڈاکٹر نے یہ میڈیسن اور انجکشن لکھ کر دیے ہیں تم اباجی کے پاس ٹھہرو میں یہ سب لے آؤں۔" عدیل ڈاکٹر کے روم سے باہر نکلا تو اس کے ہاتھ میں سفید پرچی تھی وہ مریم کو بتا کر میڈیکل اسٹور پہ جانے والا تھا کہ مریم نے اسے روک دیا تھا۔

"ٹھہریں! آپ ایسا کریں کہ اباجی کو کچھ دیر کے لیے کسی وارڈ کے بیڈ پہ لٹا دیں، وہ زیادہ دیر اس وہیل چیئر پہ نہیں بیٹھ سکتے، تھک جائیں گے۔"

"لیکن مریم! کوئی خالی بیڈ ڈھونڈنے میں ٹائم لگے گا ڈاکٹر نے یہ انجکشن فوری منگوائے ہیں۔" عدیل پریشانی

سے بولا۔

"لائیں! یہ میڈیسن اور انجکشن میں لے آتی ہوں۔" اس نے عدیل کے ہاتھ سے پرچی تھام لی تھی اور پھر پلٹ کر ہسپتال کے اندرونی حصے سے باہر نکل آئی اور اپنی بے دھیانی میں وہ عدیل سے دوائیوں کے لیے پیسے لینا بھی بھول گئی تھی۔

تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی وہ ہسپتال کے باہر بنے میڈیکل اسٹورز میں سے ایک اسٹور کی طرف بڑھی تھی۔

"پلیز! یہ میڈیسن دے دیں۔"

اس نے سفید پرچی پہ لکھا نسخہ میڈیکل اسٹور کے سامنے والے کاؤنٹر پہ رکھا اور سیلز مین کو جلدی دوائیاں نکالنے کا کہا تھا' وہ اپنے دھیان میں تھی اپنے قریب کھڑے جودت کو بھی نہ دیکھ سکی البتہ جودت کے ساتھ کھڑے کامی نے اسے ضرور دیکھ لیا تھا۔

"جودت۔۔۔!" اس نے جودت کو ٹھوکا دیا۔

"ہوں۔۔؟" پریشانی میں جودت کو بھی آس پاس کا کوئی دھیان نہیں تھا۔

"ادھر دیکھو؟" کامی نے اشارہ کیا تھا۔

اور جودت نے اپنی سائیڈ پہ دیکھا اس سے تین قدم کے فاصلے پہ مریم کھڑی تھی جودت اس کو دیکھتے ہی چونک گیا تھا۔

"مریم۔۔؟" اس نے خود کلامی کے سے انداز میں اس کا نام لیا تھا۔

"بات کرو گے؟" کامی کو پتا تھا کہ یہ لڑکی جودت کی کمزوری ہے' وہ اپنی فیلنگز کا کئی بار سرعام اظہار کر چکا تھا۔

"نہیں۔۔! ٹائم نہیں ہے مجھے میڈیسن لے کر جلدی پہنچنا ہے۔" جودت کو پتا تھا کہ اگر ذرا بھی لیٹ ہو گیا تو آذر کے ہاتھوں اس کی شامت آجائے گی۔

"کتنا بل ہے ان کا۔۔؟" مریم دوائیوں کا شاپر دیکھتی ہوئی بولی۔

"دو ہزار۔۔" سیلز مین نے ذرا لاپروائی سے بتایا تھا۔

"دو ہزار۔۔؟" مریم بری طرح ٹھٹکی تھی۔

اس کے پاس تو پیسے ہی نہیں تھے اس نے ذرا پریشانی اور عجلت میں اپنا پرس کھنگالا' پرس میں صرف پندرہ سو روپے تھے جو اس نے اپنے اکیڈمی آنے جانے کے کرائے کے لیے رکھے ہوئے تھے ان میں سے بھی پانچ سو روپے کم تھے' میڈیسن دو ہزار کی تھیں۔

"سوری سر! میں پیسے بھول آئی ہوں' آپ یہ میڈیسن سیو رکھیں میں ابھی آکر لے لیتی ہوں؟" مریم عجلت سے کہتی ہوئی پلٹ کر میڈیکل اسٹور سے نکل آئی تھی۔

"آپ میڈیسن لے جائیں بل میں پے کر دیتا ہوں؟" جودت اچانک اس کے راستے میں آگیا تھا مریم جہاں اسے دیکھ کر ٹھٹکی تھی وہیں چکرا بھی گئی تھی وہ نہ جانے کہاں سے نمودار ہوا تھا؟

"دیکھیں۔۔۔ میں اس وقت خود پریشانی میں ہوں' آپ کو تنگ نہیں کرنا چاہتا بس آپ کی ہیلپ کرنا چاہتا ہوں' آپ پلیز میڈیسن لے جائیں۔"

جودت کافی مہذب طریقے سے بات کر رہا تھا لیکن مریم اس کی کسی بھی ہیلپ کے چکر میں پڑنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

"تھینک یو سو مچ! مجھے آپ کی کسی بھی ہیلپ کی ضرورت نہیں ہے' پیسے بھائی کے پاس ہیں اس لیے زیادہ پریشانی کی بات نہیں ہے' یہ میڈیسن میں خود ہی آکر لے جاؤں گی۔" مریم نے کافی سختی اور بے گانگی سے اس کی آفر

مسترد کر دی تھی اور وقت کی نزاکت دیکھتے ہوئے جودت مزید کچھ کہے بغیر اس کے راستے سے ہٹ گیا تھا' مریم تیزی سے سڑک کراس کر کے ہسپتال کے اندر چلی گئی اور جودت پلٹ کر میڈیکل اسٹور کے اندر آگیا تھا ان کی مطلوبہ میڈیسن بھی مل چکی تھیں میڈیسن کا بل کلیئر کروا کے وہ کامی کے ساتھ رخصت ہو گیا تھا لیکن مریم جب پیسے لے کر وہاں پہنچی تو سر تھام کے رہ گئی تھی' جودت اس کی میڈیسن کا بھی بل پے کر گیا تھا اور مریم کو لگا وہ اسے مقروض کر گیا ہے۔ لیکن وہ کسی بھی صورت اس کا یہ احسان نہیں رکھ سکتی تھی۔

٭ ٭ ٭

گاڑی مین روڈ سے گاؤں کی چھوٹی سڑک کی سمت مڑی تو زری کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

گاؤں میں داخل ہوتے ہی ایک شان دار سا ڈیرہ نظر آتا تھا یہ ڈیرہ ملک شرافت علی کا ہی ڈیرہ تھا' یہاں ہر وقت پنچائیت لگی رہتی تھی' آس پاس کے علاقے والوں' ملنے ملانے والوں اور دوست احباب کا ہر وقت یہاں آنا جانا لگا رہتا تھا' گاؤں کا غریب طبقہ بھی اپنے مسائل حل کروانے' زمینوں اور لڑائی جھگڑوں کے معاملات طے کروانے کے لیے یہاں ہی پایا جاتا تھا۔ اس لیے اس ڈیرے سے لوگوں کی محفل کبھی ختم نہیں ہوتی تھی۔ آئے روز دور دراز کے علاقوں سے ان کے مہمان آتے رہتے تھے اور مہمانوں کی خاطر مدارات کا انتظام بھی یہیں پہ ہوتا تھا' رات گئے تک محفلیں جمتی تھیں اور اس وقت بھی یہی حال تھا گاڑی ڈیرے کے قریب سے گزری تو عبداللہ نے ڈیرے کے اندر نظر دوڑائی تھی۔

ملک اسد اللہ اور ملک حق نواز کی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ لوگ یہاں ہی تھے اور یقیناً "ابھی ابھی ہی پہنچے تھے۔ عبداللہ گہری سانس کھینچتا ہوا لب بھینچ کر سیدھا ہو بیٹھا تھا وہ اکیلا ہوتا تو یقیناً" پہلے اس ڈیرے پہ ہی اترتا۔ لیکن فی الحال زری اور نگارش اس کے ساتھ تھیں وہ یہاں نہیں ٹھہر سکتا تھا' گاڑی اگلے پانچ منٹ میں ان کی حویلی کے سامنے موجود تھی گاڑی کی فرنٹ سیٹ پہ عبداللہ کو دیکھتے ہی حویلی کے دونوں چوکیداروں نے بڑا سا لکڑی کا پھاٹک وا کر دیا تھا۔ گلاب خان' عبداللہ کے اشارے پہ گاڑی اندر لے آیا تھا کشادہ اور طویل ترین ڈرائیو وے پہ سلو اسپیڈ سے چلتی گاڑی حویلی کے مرکزی برآمدے کے عین سامنے آرکی تھی اور عبداللہ گاڑی سے نیچے اتر آیا تھا اور ساتھ ہی اس نے گاڑی کا پچھلا دروازہ بھی کھول دیا تھا عبداللہ سب کے سامنے ہر طرح سے ڈٹ جانے کے لیے تیار تھا جبکہ زری اور نگارش اپنی اپنی جگہ پہ دونوں سہمی بیٹھی تھیں' زری کی حالت تو کچھ زیادہ ہی خراب تھی کہ اپنے ہی گھر میں قدم رکھتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔

"زری۔۔۔!" زری کو کسی سوچ میں گم پا کر عبداللہ نے متوجہ کیا تھا۔

"جج۔۔جی؟" وہ چونک کر متوجہ ہوئی اور عبداللہ کو انتظار میں کھڑے دیکھ کر فوراً" نیچے اتر آئی تھی۔

یہاں سب کو خبر تھی کہ عبداللہ اور زری دونوں بہن بھائی آج واپس پاکستان آرہے ہیں لیکن پھر بھی حویلی یوں نظر آرہی تھی جیسے صدیوں سے ویران پڑی ہو' ہر طرف گہرا سناٹا تھا۔ حالانکہ شام سے پہلے کا وقت تھا' شام بس ڈھلنے کو تھی' پنکھ پکھیرو اپنے اپنے آشیانوں کو لوٹ رہے تھے' وہ بھی اپنے آشیانے میں لوٹ کر آئے تھے مگر یہاں شاید کسی کو بھی ان کا انتظار نہیں تھا شام کے وقت حویلی میں خاصی چہل پہل ہوتی تھی لیکن آج ایسا کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا اور عبداللہ اس خاموش "ویلکم" کو بخوبی سمجھ سکتا تھا۔ لیکن پھر بھی سر جھٹک کر قدم آگے بڑھا دیا تھا۔

"عبداللہ۔۔۔!" نگارش کی آواز پہ عبداللہ نے چونک کر نگارش کو دیکھا اور قدم ٹھہر گئے تھے۔

نگارش کی آنکھوں اور چہرے پہ ایک عجیب سا خوف ہلکورے لے رہا تھا اور یہ خوف عبداللہ کی نظروں سے

پوشیدہ نہیں رہ سکتا تھا اور بے ساختہ ایسے حالات میں بھی مسکرا دیا تھا۔ زری نہ ہوتی تو شاید وہ نگارش کے اس انداز اس خوف زدہ سی ادا پہ اسے بانہوں میں بھر لیتا لیکن فی الحال اس کا ہاتھ تھپکنے پہ اکتفا کیا تھا۔

"پاگل ہو۔ !محبت کرتا ہوں تم سے اور محبت انسان کے قدم اکھڑنے نہیں دیتی۔ تم نے یہ سوچ بھی کیسے لیا کہ کہیں میں تمہیں چھوڑ نہ دوں؟"

عبداللہ کے انداز میں سرزنش تھی وہ کافی آہستگی سے اس سے مخاطب ہوا تھا اس لیے ذرا فاصلے پہ رخ پھیر کے کھڑی زری نہیں جان سکی تھی کہ ان کے درمیان کیا بات ہوئی ہے؟

"بی بی جی! بی بی جی! چھوٹے ملک صاحب آ گئے۔ باہر دیکھیں۔ چھوٹے ملک صاحب آ گئے۔"

ایک نوعمر ملازمہ برآمدے کی بائیں طرف سے نکل کر اپنے دھیان میں ادھر ہی آ رہی تھی جب عبداللہ اور زری کو دیکھتے ہی اس کے وجود میں بجلی سی بھر گئی تھی۔ اور بی بی جان کو اطلاع دینے کی غرض سے زور زور سے چلاتی ہوئی ان سے پہلے ہی راہداری میں گم ہو گئی تھی۔

"چلو۔ !تم بھی چھوٹے ملک صاحب کی ملکانی صاحبہ ہو اندر جانا ہے؟" عبداللہ نے نگارش کو ٹینشن فری کرنے کی خاطر کافی شرارت سے کہا تھا اور پھر تینوں اندر آ گئے تھے۔

"میں بسم اللہ۔ میں بسم اللہ! میں صدقے۔ میں واری۔ میرے کلیجے دی ٹھنڈک۔ میری اکھاں دا چانن۔"

بی بی جان بے تحاشا ممتا سے مغلوب اپنے خالص پیار کا خالص پنجابی میں اظہار کرتیں اپنے شاہانہ تخت سے فوراً اٹھ کھڑی ہوئی تھیں اور قریب آتے عبداللہ کو آگے بڑھ کے سینے سے لگا لیا تھا۔

"کیسی ہیں بی بی جان؟" عبداللہ کا لہجہ بھی ماں کی ممتا کے سامنے نرم ہو گیا تھا۔

"تجھے دیکھ لیا ہے تو سمجھو کہ میں ٹھیک ہی ہوں۔" وہ عبداللہ کی پیشانی پہ بوسہ دیتی ہوئی بولی تھیں۔

"بی بی جان۔ !" عبداللہ کے عقب سے زری کی آواز سنائی دی تھی اور بی بی جان نے اپنی بھیگی آنکھیں پونچھتے ہوئے بازو وا کر دیے تھے اور زری بچوں کی طرح لپک کے ان کے سینے سے لگی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی وہ آج اپنی ماں سے پانچ سال بعد مل رہی تھی اور ان پانچ سالوں میں یوں لگ رہا تھا جیسے بہت کچھ بدل گیا تھا اپنے بھی اپنے نہیں رہے تھے۔ اور اپنوں کے پرائے ہونے کا دکھ ہی اسے یوں بے پناہ رلا رہا تھا۔

"زری۔ !کسی اور کو بھی ملنے دو گی یا نہیں؟" عبداللہ نے مصنوعی خفگی سے کہا تھا اور پھر بی بی جان کو کندھوں سے تھام کے زری سے الگ کیا تھا۔

"بی بی جان۔ !یہ آپ کی بہو ہے 'نگارش۔" عبداللہ نے نگارش کی طرف اشارہ کیا تھا۔

اور بی بی جان اتنی خوبصورت اور پیاری سی لڑکی کو اپنے سامنے دیکھ کر ٹھٹک گئی تھیں۔ کافی باوقار سی لڑکی تھی عبداللہ کے پہلو میں کھڑی سج رہی تھی۔

"السلام علیکم بی بی جان۔ !" نگارش نے کافی جھجکتے اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں سلام کیا تھا۔

بی بی جان نے ایک نظر عبداللہ کو دیکھا اور پھر دوبارہ نگارش کو دیکھا تھا وہ اپنے دل کو پتھر نہیں بنا سکی تھیں انہوں نے نگارش کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے بھی سینے سے لگا لیا تھا۔

"جیتی رہو۔ خوش رہو۔ اللہ سدا سہاگن رکھے۔" انہوں نے اسے دعاؤں سے نوازا تھا اور نگارش کی پلکیں بھیگ گئی تھیں۔ عبداللہ کے حوالے سے زری کے بعد یہ دوسرا رشتہ تھا جو اس سے اس طرح محبت سے پیش آیا تھا اور اسے بہت اچھا لگا تھا دل کو سکون محسوس ہوا تھا۔

"آؤ بیٹھو تم لوگ۔ تھک گئے ہو گے؟" بی بی جان نے تخت پہ رکھی تسبیح دوبارہ تھام لی تھی اور۔۔۔ صوفے کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"ان کے بیٹھنے کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے یہاں۔" ملک شرافت علی کی کرخت آواز پہ صوفے کی سمت اٹھتے عبداللہ کے قدم یکدم ٹھہر گئے تھے اس نے فوراً پیچھے پلٹ کے دیکھا تھا۔

"بابا جان۔ !" عبداللہ بے ساختہ ان کی طرف بڑھا تھا۔

"بس۔ !اس کی ضرورت نہیں ہے جہاں ہو وہیں کھڑے رہو۔"

انہوں نے سختی سے منع کر دیا تھا اور عبداللہ دم بخود سا کھڑا رہ گیا تھا اسے اپنی سماعتوں پہ یقین نہیں آ رہا تھا کہ بابا جان نے اسے اس طرح کہا ہے؟

بے شک ان لوگوں میں ہزاروں اختلافات سہی' ہزاروں رنجشیں اور گلے شکوے ہی سہی لیکن پھر بھی وہ ان کا بیٹا تو تھا؟ اتنے عرصے بعد واپس آیا تھا۔ کم از کم ان کو اس سے ایک بار ملنا تو چاہیے تھا؟ بعد کی بعد میں دیکھی جاتی لیکن انہوں نے تو کوئی گنجائش ہی نہیں رکھی تھی۔ چہرے پہ جاہ جلال لیے دونوں ہاتھ پشت پہ باندھے وہ عبداللہ کو بڑی خونخوار نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"ملک صاحب۔ !یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ میرا بچہ اتنے سالوں بعد آیا ہے آپ اسے دم تو لینے دیں۔" بی بی جان تڑپ گئی تھیں۔

"اتنے سالوں بعد آیا ہے تو اسی طرح آتا نا جس طرح ہم نے کہا تھا؟" ملک شرافت علی کا اشارہ نگارش کی طرف تھا ان کی شرط تھی کہ عبداللہ جب بھی واپس آئے نگارش کو طلاق دے کر واپس آئے ورنہ اس حویلی میں عبداللہ کے لیے کوئی جگہ نہیں ہو گی۔

"چھوٹے ملک صاحب نے پہلے کب آپ کی کوئی بات مانی ہے، جواب مانیں گے؟" ملک اسد اللہ کی آواز بھی داخلی دروازے کی سمت سے ابھری تھی آواز میں طنز اور تمسخر تھا۔ عبداللہ نے چونک کر دیکھا تھا دونوں باپ بیٹا برابر کھڑے تھے دونوں کی طرز زندگی اور قول و فعل ایک سے ہی تھے انیس بیس کا بھی فرق نہیں تھا دونوں میں اور کسی ایک سے بھی کسی قسم کی گنجائش کی امید رکھنا فضول تھا۔ یہاں کوئی بھی عبداللہ کا طرف دار نہیں تھا کیونکہ بی بی جان بھلا کب شوہر کے سامنے ٹھہر سکتی تھیں۔ اس لیے عبداللہ نے اس میدان میں اکیلے ہی اترنا تھا۔

"چلیں۔ !آج ایک فیصلہ کرتے ہیں۔ جو میں منوانا چاہتا ہوں وہ آپ مان لیں جو آپ منوانا چاہتے ہیں وہ میں مان لیتا ہوں جو اپنی بات سے ہٹ جائے وہ مرد نہیں کہلائے گا؟" عبداللہ کا لہجہ بھی ان جیسا ہی کرخت ہو چکا تھا اور آنکھوں کا رنگ بھی سنگین تیوروں میں بدل گیا تھا۔

"کیسا فیصلہ۔ ؟" اب کی بار ملک اسد اللہ نے چونک کر دیکھا تھا۔

"بیوی کو طلاق دینے کا فیصلہ؟" عبداللہ کا لہجہ کاٹ دار اور دو ٹوک تھا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ کیا کہنا چاہ رہے ہو تم؟" بابا جان سمجھ نہیں پائے تھے۔

"مطلب کہ انہی قدموں پہ کھڑے کھڑے ملک اسد اللہ اپنی بیوی کو طلاق دے دیں تو میں بھی ابھی یہیں کھڑے کھڑے اپنی بیوی کو طلاق دے دوں گا اور وہی کروں گا جو آپ کہیں گے۔" عبداللہ نے گویا ملک اسد اللہ کے گلے میں پھندا ڈالا تھا۔ بابا جان' ملک اسد اللہ اور بی بی جان کے ساتھ ساتھ زری اور نگارش بھی دنگ رہ گئی تھیں۔

"یہ کیسی شرط ہے بھلا؟" ملک اسد اللہ کو غصہ آیا تھا۔

"مجھ سے میری بیوی کو طلاق دلانے کے لیے میری یہی شرط ہے؟" عبداللہ کا انداز استہزائیہ تھا۔

"اس کا مطلب ہے تم طلاق دینے کے لیے تیار نہیں ہو؟" وہ کافی چبا کے بولے تھے۔

"میں تو تیار ہوں۔ بس آپ کے تیار ہونے کا انتظار ہے؟ کیا خیال ہے پھر گاؤں کے نکاح خواں سے دو طلاق

ناموں کے پیپرز منگواؤں؟" عبداللہ سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"بکواس بند کرواپنی۔ اور زبان سنبھال کے بات کرو۔ تم اپنی بیوی سے میری بیوی کا مقابلہ کررہے ہو؟" ملک اسداللہ بھڑک اٹھے تھے ان کے لہجے میں واضح حقارت تھی۔

"اگر نام نہاد رشتے کو دیکھا جائے تو آپ کی بیوی میری بھابھی ہوتی ہیں اس لیے میں ان کے لیے کوئی غیر مہذب الفاظ استعمال نہیں کرنا چاہتا۔ مگر اتنا ضرور پوچھوں گا کہ کیا آپ کی بیوی کسی اعلا قسم کے میٹریل سے تیار ہوئی ہیں جن کا کسی سے کوئی مقابلہ نہیں ہے؟ جتنا اعلا حسب نسب ہے ان کا وہ میں بھی اچھی طرح جانتا ہوں۔"

عبداللہ بھی کچھ کم نہیں تھا۔

"خبردار...! میری بیوی کے بارے میں کچھ کہا تو۔" ملک اسداللہ یکدم دھاڑے تھے۔

"تو پھر آپ کون ہوتے ہیں میری بیوی کے لیے کچھ کہنے والے؟ جس روز میرے کہنے پہ آپ نے اپنی بیوی کو طلاق دی اس روز مجھ سے کوئی بات کیجیے گا کوئی حق نہیں ہے آپ کو میری بیوی کے بارے میں کچھ کہنے کا۔ اب ایک لفظ بھی کہا تو بہت برا ہوگا آپ کے لیے۔" عبداللہ نے رنگ بدل کے بات کی تھی اور ملک اسداللہ اور بابا جان کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔

"تم اس لڑکی کی خاطر ہم کو چھوڑ رہے ہو؟" بابا جان کے لہجے کی کرختگی ہنوز تھی۔

"آپ یہ کیوں نہیں کہتے کہ اس لڑکی کی وجہ سے آپ مجھے چھوڑ رہے ہیں؟" عبداللہ کے جواب دوبدو ہوتے تھے۔

"ہم نے ہمیشہ اس لڑکی کی جگہ وجاہت علی کی بیٹی کو دیکھا ہے تمہاری دلہن وہی بنے تو اچھا ہے۔"

انہوں نے اپنے مرحوم بھائی وجاہت علی کا ذکر کیا تھا۔

"جانتا ہوں...! بڑی اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ آپ کی بھتیجی ہے اسی لیے تو آپ اسے یہاں لانا چاہتے ہیں لیکن بابا جان آپ کو اس معاملے میں بھی مجھ سے مایوسی ہوگی۔ میں اتنا ظالم نہیں ہوں کہ کسی کی اچھی بھلی زندگی تباہ کرکے رکھ دوں۔ مجھے یقین ہے کہ چچا وجاہت علی کی بیٹی جہاں بھی ہوگی خوش ہوگی اور خوشحال زندگی گزار رہی ہوگی میں اس کی زندگی برباد نہیں کرسکتا۔ اگر ایسا کرنا ہی ہوتا تو آج سے پانچ سال پہلے کرلیتا۔" عبداللہ کا طنز اور تلخی بابا جان کو طیش دلا گئے تھے۔

"تو پھر تم یہ بھی بھول جاؤ کہ ہم تمہاری لائی ہوئی اس دو ٹکے کی لڑکی کو قبول کریں گے۔ ہمارے گھر میں نہ تمہارے لیے کوئی جگہ ہے اور نہ ہی اس لڑکی کے لیے۔ اس لیے بہتر ہے کہ جن قدموں پہ کھڑے ہو انہی قدموں پہ واپس لوٹ جاؤ۔ تم ہمارے لیے مرگئے۔ ہم تمہارے لیے مرگئے۔" انہوں نے تو انتہا کردی تھی۔

"جو انسان آپ کا مطلب پورا نہیں کرتا وہ آپ کے لیے مرہی جاتا ہے یہ بات بھی بڑی اچھی طرح جانتا ہوں میں۔" عبداللہ تلخ سا ہنسا تھا۔

"اسے کہو...! ہماری نظروں سے دور ہوجائے' چلا جائے یہاں سے' نکل جائے اس حویلی سے۔" بابا جان غصے سے بی بی جان کی طرف دیکھتے ہوئے بلند آواز سے دھاڑے تھے اور ان کی اتنی بلند آواز پہ حویلی کے دیگر مکین بھی ڈرائنگ روم میں آگئے تھے جن میں ملک اسداللہ کے بیوی اور بچے بھی تھے۔

"جارہا ہوں...! اور اس ظلم کدے میں میں رہنا بھی نہیں چاہتا۔ اور نہ ہی میں یہاں رہنے کا ارادے سے آیا تھا۔ یہ کمین گاہ آپ کو مبارک۔"

وہ بھلا کب ہار ماننے والا تھا بابا جان کا دماغ گھوم گیا تھا۔

"یعنی تمہارا پلان تھا کہ تم نے یہاں نہیں رہنا؟" بابا جان سے پہلے ملک اسداللہ بول پڑے تھے۔

"بے شک میرا پلان تھا۔ لیکن آپ میں دم ہے تو آپ میرا پلان بدل بھی سکتے ہیں میرے پلان کو ناکام بھی بنا سکتے ہیں بس ذرا سی ہمت اور حوصلے کا کام ہے آپ اپنی بیوی کو طلاق دے دیں میں اپنی بیوی کو دے دیتا ہوں پھر آپ کی پسند کی بیوی لاؤں گا اور یہیں ڈٹ کے رہوں گا آپ کے ساتھ آپ کے شانہ بہ شانہ۔"

عبداللہ نے کہتے ہوئے اپنی بھابھی کو ایک نظر دیکھا تھا وہ عبداللہ کی بات پہ سٹپٹا گئی تھیں۔

"اور ہاں...! میں جانتا ہوں کہ آپ کی ایک بیوی نہیں' کئی بیویاں ہیں کچھ ایسی جن سے آپ نے شادیاں کر رکھی ہیں اور کچھ ایسی جن سے شادیاں نہیں کیں لیکن میں نے ان کو طلاق دینے کا نہیں کہا میں نے تو آپ کی اعلا حسب نسب والی بیوی کو طلاق دینے کا کہا ہے تاکہ آپ کو پتا تو چلے تاکہ آپ نے کس کو طلاق دی ہے؟"

اب سٹپٹانے کی باری ملک اسداللہ کی تھی وہ عبداللہ کو کھا جانے والی خونخوار نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"ملک عبداللہ...! بہت غلط کررہے ہو تم بھائی' بھائی کا شریک ہوتا ہے اور تم شریک کو اور شریک (دشمن) بنا رہے ہو۔" ملک اسداللہ کے لہجے میں عجیب سی دھمکی تھی۔

"میں برٹش ایمبیسی میں کمپلین لکھوا کے آیا ہوں کہ پاکستان میں قیام کے دوران مجھے' میری بیوی کو اور میری بہن کو اگر ذرا سا بھی نقصان پہنچے تو ذمہ دار ملک شرافت علی' ملک اسداللہ اور ملک حق نواز ہوں گے۔ اس لیے میرا شریک بننے سے پہلے سوچ لیجیے گا کہ آپ نے اگر شریک بننا ہے تو کس حد تک بننا ہے؟ کیونکہ میں نے اپنے نقصان کی کوئی بھی معافی نہیں لکھوائی' سیدھی سزا کی درخواست کی ہے۔" عبداللہ نے اسے وارن کرہی دیا تھا کہ کہیں وہ اپنے ہی زعم اور غصے میں نہ رہیں۔ وہ سارا بندوبست کرکے آیا ہے "بہن کے ساتھ اب تمہارا کیا علیک سلیک ہے۔ وہ گھر آگئی ہے۔ بس بات ختم۔" بابا جان چونک کے بولے تھے۔

"بات ختم کہاں ہوئی ہے بابا جان؟ جب میں اس گھر میں نہیں رہ سکتا تو میری بہن بھی نہیں رہ سکتی۔ مجھے آپ سب پہ اب کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ آپ کچھ بھی کرسکتے ہیں آپ راتوں رات اس کی شادی بھی کرسکتے ہیں اور بربادی بھی۔ آپ کے لیے کوئی بھی کام مشکل نہیں ہے۔" عبداللہ بڑے سکون سے کہہ رہا تھا جبکہ ان کا سکون منتشر ہوگیا تھا اور زری کی جان بھی جیسے مٹھی میں آگئی تھی۔

"یہ میری بیٹی ہے۔" بابا جان نے دانت پیس کر جتایا تھا۔

"آپ کی بیٹی ہے تو کیا آپ کو قتل کا اختیار دے دیا جائے؟" وہ زیادہ سنگین لہجے میں بولا تھا۔

"میں اس کا قتل بھی کروں تو مجھے کسی کے اختیار کی ضرورت نہیں ہے۔"

"تو اس کا مطلب ہے کہ آپ خدا بن بیٹھے ہیں جس کو کسی کے اختیار کی ضرورت نہیں ہے' جو خود ہی اتنا بااختیار ہے کہ کچھ بھی کردیتا ہے؟" اس کے جواب پہ وہ لاجواب ہوگئے تھے مگر پیچھے تو کسی نے بھی نہیں ہٹنا تھا۔

"زری...! تم اندر جاؤ۔" ملک اسداللہ نے اشارہ کیا۔

"زری...! اندر نہیں جائے گی بلکہ میرے ساتھ میرے گھر جائے گی۔" عبداللہ نے روک دیا تھا۔

"یہ کیسے ہوسکتا ہے بھلا؟" وہ دونوں باپ بیٹا تو اور زیادہ بھڑک اٹھے تھے۔

"یہ بھی بڑے اچھے طریقے سے ہوگا کیونکہ میرے ساتھ اس وقت پولیس فورس ہے اور پولیس فورس کے ساتھ ایکدم الرٹ میڈیا۔ جو آپ کے ذرا سے ہنگامے اور میرے ایک اشارے کے منتظر ہیں۔ اور اگلے دس منٹ میں آپ کے یہ سفاک اور بے رحم چہرے پوری دنیا کے سامنے ہوں گے اور آپ لوگوں کے وہ کرتوت بھی سامنے آئیں گے جو آج تک کسی کی بھی نظروں سے نہیں گزرے۔" عبداللہ کی دھمکی پہ ان کے رنگ بدل گئے تھے۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟ تم پاگل ہوگئے ہو کیا؟" بابا جان پھر گرجے تھے۔

"ہاں۔۔۔! پاگل ہو گیا ہوں۔ جب آپ کے پاس میرے لیے کوئی گنجائش کوئی رعایت نہیں ہے تو میرے پاس بھی نہیں ہے جو انسان اپنوں کا اپنا نہیں بن سکتا وہ بے چاری غریب عوام کا اپنا کیسے ہو سکتا ہے؟" عبداللہ بھی مکمل اجنبیت پہ اتر آیا تھا۔

"ملک عبداللہ۔۔۔! تم حد سے بڑھ رہے ہو۔" ملک اسد اللہ کا بس چلتا تو عبداللہ کو گولی مار دیتا۔

"آپ نے مجبور کیا ہے مجھے۔" وہ کندھے اچکا کے بولا تھا۔

"اسد اللہ۔۔۔! گاؤں کی باہر والی سڑک پہ پولیس کی دو گاڑیاں کھڑی ہیں کیا تمہیں پتا ہے کہ پولیس کی گاڑیاں یہاں کیا کر رہی ہیں؟"

ملک حق نواز کہتا ہوا اندر داخل ہوا تھا اور ان سب پہ نظر پڑتے ہی خاموش ہو گیا تھا زری غیر محسوس طریقے سے نگارش کی اوٹ میں ہو گئی تھی کہ ملک حق نواز کی غلیظ اور گندی نظر اس پہ نہ پڑے جبکہ ادھر بابا جان اور ملک اسد اللہ حیرت زدہ سے رہ گئے تھے کہ عبداللہ انہیں محض دھمکی نہیں دے رہا تھا بلکہ سچ کہہ رہا تھا پولیس اور میڈیا ساتھ لے کر آیا تھا۔

"یہ پولیس کی گاڑیاں تو فی الحال ہماری سیکیورٹی کے لیے یہاں آئی ہیں لیکن آپ فکر نہ کریں جس روز آپ کو گرفتار کرنے آئیں گی اس روز دو نہیں بلکہ چار گاڑیاں آئیں گی۔ آخر اللہ نے ایک روز مومنہ بی بی کا بھی تو انصاف کرنا ہے۔" عبداللہ کا رخ اب ملک حق نواز کی طرف تھا بابا جان ٹھٹک گئے تھے کہ عبداللہ کو مومنہ بی بی کے معاملے کا بھی علم ہے؟

"میں جانتا ہوں کہ تم یہ سب دل آور شاہ کی شہ پہ کر رہے ہو۔ اور دیکھ لینا مومنہ بی بی کے اس چکر میں کسی روز میری گولی سے دل آور شاہ مارا جائے گا۔"

"آہ۔۔۔!" ملک حق نواز کی بے رحم دھمکی پہ نہ جانے کیسے زری کے منہ سے ایک ہچکی نما آہ نکل گئی تھی کہ نگارش نے یکدم گھبرا کے دیکھا تھا۔

"اور اس روز میری گولی سے ملک حق نواز مارا جائے گا۔ کیونکہ آپ لوگ خود کہتے ہیں قتل کے بدلے قتل اور عزت کے بدلے عزت۔ اور فی الحال تو آپ پہ کسی کی عزت کا قرض ہے۔ جو آپ سے دل آور شاہ ہی وصول کرے گا اور ایسا وصول کرے گا کہ کبھی کسی عورت کو نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھیں گے بلکہ اپنی بیوی کو بھی بہن سمجھو گے آپ۔" عبداللہ نے تمسخرانہ انداز میں کہا تھا۔

"ملک عبداللہ۔۔۔!" اس کی بات پہ ملک اسد اللہ یکدم غرا کے اس کی طرف بڑھا تھا لیکن ملک حق نواز نے اسے دبوچ کر روک لیا تھا۔

"چھوڑ دیں انہیں۔۔۔! دیکھتا ہوں میں کہ کیا کرتے ہیں یہ؟" عبداللہ نے جیب سے ریوالور نکالتے ہوئے اس کا بولٹ چڑھایا تھا۔

اور اس کو ریوالور تانے دیکھ کر بی بی جان، زری، نگارش کے ساتھ ساتھ ملک اسد اللہ کے بیوی بچے بھی چیخ اٹھے تھے۔

"ملک حق نواز۔۔۔! چھوڑو مجھے۔۔۔"

ملک اسد اللہ غرایا تھا۔

"عبداللہ۔۔۔! پلیز چلیں یہاں سے۔ پلیز عبداللہ۔۔۔! ہم لوگ اگر اور یہاں ٹھہرے تو اور زیادہ ہنگامہ ہو گا۔"

نگارش نے روتے ہوئے لپک کر عبداللہ کا بازو تھام لیا تھا۔

"جاؤ بیٹا۔۔۔! چلے جاؤ یہاں سے۔ تمہارا یہاں رکنا ٹھیک نہیں ہے۔" بی بی جان بھی رو پڑی تھیں۔

اور بی بی جان کو روتے دیکھ کر عبداللہ کے اشتعال دھیما پڑ گیا تھا اس نے ریوالور والا ہاتھ نیچے کر لیا تھا۔

"ٹھیک ہے جا رہا ہوں۔۔۔! لیکن آپ سب لوگ ایک بات کان کھول کے سن لیں کہ زری کی شادی اس درندے سے کبھی مر کے بھی نہیں ہو گی اس کے ساتھ شادی کرنے سے بہتر ہے کہ میں زری کو خود گولی مار دوں اس لیے آپ لوگ اس شادی کا خیال دل سے نکال دیں تو اچھا ہے باقی آپ کی مرضی۔"

عبداللہ نے جاتے جاتے ایک بار پھر وارن کیا تھا۔

"چلو۔۔۔!" اس نے زری اور نگارش کو چلنے کا اشارہ کیا تھا۔

وہ دونوں ایک ساتھ چلتے ہوئے باہر نکل گئی تھیں اور زری کو یوں لگا جیسے ملک حق نواز کی چبھتی ہوئی نظریں اس کے ساتھ اس کے پیچھے تک آ گئی ہوں۔

"تم زری کو دنیا کے کسی بھی کونے میں لے جاؤ لیکن شادی اس کی ملک حق نواز سے ہی ہو گی یہ ملک حق نواز کا دعوا ہے۔ یاد رکھنا۔"

ملک حق نواز کی آواز پہ داخلی دروازے کی سمت بڑھتے عبداللہ کے قدم یکدم رک گئے تھے۔

"اور جس دن ایسا ہو گا وہ دن یا تو آپ کی زندگی کا آخری دن ہو گا یا میری زندگی کا یا پھر زری کی زندگی کا۔ یہ بھی یاد رکھیے گا۔ اللہ حافظ۔" وہ کہتا ہوا سب پہ ایک طائرانہ سی نظر ڈالتا ہوا باہر نکل گیا تھا زری اور نگارش پہلے ہی گاڑی میں بیٹھی ہوئی تھیں عبداللہ کے آتے ہی گلاب خان نے گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔

ہر سو اندھیرا پھیل چکا تھا شام سے رات ہو چکی تھی۔ وہ لوگ مسلسل سفر میں تھے۔ انگلینڈ سے لاہور اور لاہور سے اپنے گاؤں اور اب پھر گاؤں سے لاہور کا سفر جاری تھا۔ نیند، تھکن اور ذہنی دباؤ سے برا حال ہو رہا تھا۔ عبداللہ نے تھکے تھکے انداز میں سر سیٹ کی بیک سے ٹکا دیا تھا۔

گلاب خان ان کے آتے ہی ایس پی کامران کو اطلاع دے چکا تھا کہ وہ لوگ باخیریت حویلی سے نکل آئے ہیں تب ایس پی کامران نے پولیس فورس کو واپسی کا آرڈر دے دیا تھا۔ یہ کام انہیں دل آور شاہ نے کہا تھا اور وہ دل آور شاہ کی بات ٹال نہیں سکتے تھے کیونکہ دل آور شاہ بھی ان کے ایسے ایسے کام نکلوا دیتا تھا جو کوئی اور نہیں کر سکتا تھا اس لیے یہ لین دین تو چلتا ہی رہتا تھا لیکن آج عبداللہ کو دل آور کی وجہ سے خاصی بیک سپورٹ حاصل ہوئی تھی وہ اس کی ذہانت اور داؤ پیچ کا معترف ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ آج کافی لیٹ گھر آیا تھا۔

گاڑی کے ہارن پہ زلفی نے گیٹ کھولا تھا اور وہ گاڑی اندر لے آیا تھا، زلفی گیٹ بند کر کے بھاگتا ہوا اس کی گاڑی کے قریب آیا تھا۔

"سلام صاحب۔۔۔!" زلفی کے انداز کی طرح اس کا سلام بھی بڑا پرجوش قسم کا ہوتا تھا۔

"واسلام۔۔۔! کیسے ہو؟ خیریت؟" دل آور گاڑی سے اتر آیا تھا۔

"جی صاحب۔۔۔! خیریت ہی ہے، وہ گلاب خان نہیں آیا آپ کے ساتھ؟" زلفی نے دل آور کو اکیلے دیکھ کر استفسار کیا تھا۔

"گلاب خان کسی کام سے گیا ہوا ہے اس نے فون پہ بتایا نہیں تھا تم لوگوں کو؟" وہ اپنا بریف کیس نکال کے اندر کی طرف بڑھا۔

"بتایا تو تھا لیکن میں سمجھا کہ آپ کے ساتھ ہی کام سے گیا ہو گا۔" زلفی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

"نہیں۔۔۔! میرے ساتھ نہیں، میرے دوست کے ساتھ کیا ہوا ہے۔"

"آپ کا دوست جو آج انگلینڈ سے آیا ہے؟" زلفی کو دل آور سے باتیں کرنے کا شوق تھا اسی لیے بات کو طول دیتا تھا۔

"ہاں وہی۔۔۔!" دل آور کہہ کے سیڑھیوں کی سمت بڑھا تھا۔

"کھانا کھائیں گے؟ گل کو بلاؤں؟" اس کے پوچھنے پہ دل آور سیڑھیاں طے کرتے ہوئے ٹھہر گیا تھا اور پلٹ کر زلفی کو دیکھا جو سیڑھیوں کے پاس کھڑا تھا۔

"گل تمہاری کیا لگتی ہے؟"

"جی۔۔۔! بہن۔"

"تم سے بڑی ہے کہ چھوٹی؟"

"جی۔۔۔! بڑی ہے۔"

"تو تمہیں اس کو کیا کہنا چاہیے؟"

"جی۔۔۔! باجی۔" زلفی نے اس کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے سر جھکا لیا تھا۔

"تو پھر۔۔۔؟"

"معافی چاہتا ہوں صاحب۔۔۔! غلطی ہو گئی ہے، میں انہیں گل باجی ہی کہتا ہوں بس ویسے ہی منہ سے پھسل گیا تھا۔" اس کے انداز پہ دل آور مسکرا دیا تھا۔

"او کے۔۔۔! لیکن دھیان سے رہا کرو یار۔ اتنے بدحواس کیوں ہو جاتے ہو؟"

"پتا نہیں صاحب۔۔۔! مجھے کیا ہو جاتا ہے؟" زلفی سر کھجا کے رہ گیا۔

"تھوڑے اور ذمہ دار ہو جاؤ میں تمہیں اپنے ساتھ رکھا کروں گا؟"

دل آور پلٹ کے دوبارہ سیڑھیاں طے کرنے لگا۔

"سچ کہہ رہے ہیں صاحب؟" وہ پیچھے سے چہکا تھا۔

"اپنے دل کے سوا میں کسی کو جھوٹی تسلیاں نہیں دیتا۔" وہ سر جھٹک کر کہتا سیڑھیاں طے کر گیا تھا اور زلفی کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہیں تھا گل سامنے ہوتی تو وہ اسے بھی ضرور بتاتا۔

☆ ☆ ☆

میرے بابل کا اونچا محل
میرے ساجن کی گلیاں تنگ
میں پھولوں کی رہنے والی
مجھے ملا ہے کانٹوں کا سنگ

وہ اپنے گھٹنوں کے ارد گرد دونوں بازو لپیٹے دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی بے آواز آنسوؤں سے رو رہی تھی اور اس کے قریب ہی فرش پہ بیٹھی گل اسے چپ کروانے اور تسلیاں دلاسے دینے میں مصروف تھی۔ گل آج ذرا فارغ تھی اس لیے شام سے ہی علیزے کے پاس آکر بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے بیٹھنے میں کتنا ٹائم گزر گیا تھا اس کی دونوں کو ہی خبر نہیں تھی۔

"دیکھو بی بی جی۔۔۔! یہ وقت اللہ نے شروع سے ہی آپ کی قسمت میں لکھ دیا تھا، یہ وقت آپ نے دیکھنا ہی تھا اس لیے اس طرح رونے دھونے سے کیا ہو گا؟ ہونا تو وہی ہے جو ازل سے لکھا جا چکا ہے۔" گل بار بار اسے سمجھا رہی تھی۔

"لیکن مجھے کم از کم پتا تو چلے کہ میرے ساتھ یہ سب کیوں ہوا ہے؟ یہ سزا کس گناہ کی سزا ہے؟ مجھے کیوں اس قبر میں اتار دیا گیا ہے؟ وہ مجھے بتا تا کیوں نہیں؟" علیزے روتے روتے اچانک چیخ اٹھی تھی اور پھر اچانک ہی اس کی چیخ حلق میں ہی پھنس گئی تھی اور وہ ایک پل کے لیے خوف سے کانپ کے رہ گئی تھی بیسمنٹ کی سیڑھیوں کے پاس ہی دل آور شاہ کھڑا تھا جس کو دیکھ کر گل کے ہاتھوں کے توتے بھی اڑ گئے تھے وہ بھی لرز اٹھی کیونکہ اس کے تیور بہت سنجیدہ تھے۔

"سلام صاحب۔۔۔!" گل بمشکل ہمت مجتمع کرتی ہوئی اٹھی اور اسے سلام کرتے ہوئے سیڑھیوں کی سمت بڑھ گئی دل آور نے محض سر ہلانے پہ اکتفا کیا تھا اور گل دل ہی دل میں علیزے کی خیریت کی دعا مانگتی ہوئی وہاں سے چلی گئی تھی۔

دل آور خاموشی سے اسے دیکھتا ہوا ذرا فاصلے پہ رکھی کرسی کھینچ کر عین اس کے سامنے لے آیا تھا اور اس کے سامنے کرسی رکھ کے اس کے روبرو بیٹھ گیا۔ وہ اس کے سامنے دیوار سے ٹیک لگائے نیچے زمین پہ بیٹھی ہوئی تھی دل آور کی کاٹ دار آنکھیں اسی کو اپنے حصار میں لیے ہوئے تھیں اور علیزے سر سے پاؤں تک جل اٹھی تھی۔

اس کے چہرے کے ناگوار تیور دیکھتے ہوئے دل آور نے اپنی نظریں پھیر لی تھیں اور جیب سے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر نکالتے ہوئے سگریٹ سلگا لیا تھا۔

"اگر میں تمہیں بتا دوں کہ تمہارے ساتھ یہ سب کیوں ہوا ہے؟ یہ سزا کس گناہ کی سزا ہے؟ اور تمہیں کیوں اس قبر میں اتار دیا گیا ہے تو مجھے یقین ہے کہ تم جس زمین پہ بیٹھی ہو اسی زمین میں سما جاؤ گی، جو اذیت میں سہہ رہا ہوں، وہی اذیت تم سہہ لو یہ کبھی ہو ہی نہیں سکتا سنو گی تو مر جاؤ گی اور میں تمہیں وقت سے پہلے نہیں مارنا چاہتا۔" دل آور نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے دھواں فضا میں چھوڑا اور نظروں کا زاویہ دوبارہ علیزے کی سمت بدل لیا تھا۔

"لیکن میرا کیا گناہ ہے آخر؟" اس کی آواز پھر سے بھرا گئی تھی۔

"ہونہہ۔۔۔!" اس کے سوال پہ دل آور تلخی سے ہنسا تھا۔

"اس دنیا میں تمہارا صرف ایک ہی گناہ ہے کہ تم وقار آفندی کی بیٹی ہو۔ بس اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔" اس کا فیصلہ دو ٹوک تھا کافی سکون اور اطمینان بھرا۔

"تمہاری میرے پاپا کے ساتھ کیا دشمنی ہے؟" وہ اس سے ڈری ہوئی تھی اتنی کہ دل آور ٹانگ پہ ٹانگ چڑھانے کے لیے سیدھا ہوا تو اس کی چیخ نکل گئی وہ اس کے ایک تھپڑ سے ہی خوف زدہ ہو چکی تھی۔

"وہ سوال نہ کرو کہ جن سے تمہارا اور میرا یوں آمنے سامنے بیٹھنا بھی محال ہو جائے۔" دل آور نے اسے ٹوکا تھا۔

"پلیز ڈرائیور۔۔۔! میں۔۔۔ میں۔۔۔ تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ پلیز مجھے یہاں سے جانے دو۔ مجھے میرے گھر جانے دو۔ میں یہاں نہیں رہ سکتی۔ مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ مجھے نیند نہیں آتی۔ میں سو نہیں پاتی۔ پلیز مجھے جانے دو۔" علیزے کہتے ہوئے بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی تھی۔ دل آور نے اس کے اس طرح رونے پر خفگی سے سر جھٹکا تھا۔

"تو چلی جاؤ۔ تمہیں روکا کس نے ہے؟ سارے دروازے کھلے ہیں تم جب چاہے جا سکتی ہو میں نے تمہارے پیروں میں زنجیریں تو نہیں ڈال رکھیں؟" دل آور نے بڑی لاپروائی کا اظہار کیا تھا۔

لیکن علیزے اس کی لاپروائی کا مفہوم بھی اچھی طرح سمجھتی تھی اسی لیے تو اپنی بے بسی پہ اور زیادہ رونا آیا تھا۔ وہ اور زیادہ روئی تھی۔

اور اس سے پہلے کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے مزید کچھ کہتے اچانک دل آور کے سیل پہ وائبریشن ہونا شروع ہو گئی تھی یہ کال گلاب خان کے نمبر سے تھی۔

"السلام علیکم۔۔۔!"

"وعلیکم السلام صاحب۔۔۔! کافی دیر سے فون کر رہا ہوں مگر کال ہی نہیں مل رہی تھی۔" گلاب خان شاید ساتھ ساتھ ڈرائیو بھی کر رہا تھا۔

"میں بیسمنٹ میں ہوں شاید اس لیے۔"

"آپ کی آواز نہیں آ رہی صاحب؟"

"مجھے تمہاری آواز صاف سنائی دے رہی ہے تم کہو کیا کہنا ہے۔"

دل آور سگریٹ بوٹوں تلے مسل کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"ہم لوگ واپس آ رہے ہیں۔"

"اچھا۔۔۔! کون کون آ رہے ہو؟ سب خیریت ہے نا؟"

"صاحب۔۔۔! کچھ سنائی نہیں دے رہا۔" گلاب خان خاصی اونچی آواز میں بولا تھا۔

"ارے یار۔۔۔! میں پوچھ رہا ہوں کہ عبداللہ اور زری وغیرہ ٹھیک ہیں؟ سب خیریت ہے نا؟ کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی؟" اس نے اب باقاعدہ نام لے کر اور دہرا کے پوچھا تھا۔ جس پر علیزے نے روتے روتے چونک کر دیکھا تھا۔

"عبداللہ اور زری؟" علیزے کے ذہن میں جھماکا ہوا تھا یہ نام اس کے لیے اجنبی نہیں تھے یہ نام تو آسیہ آنٹی کی زبان سے اس نے کئی بار سنے تھے۔

"ٹھہرو۔۔۔! میں بیسمنٹ سے باہر جاتا ہوں۔" دل آور کہتا ہوا سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا تھا اور علیزے یکدم کسی سکتے سے باہر آئی تھی۔

"ڈرائیور۔۔۔! رکو میری بات سنو۔ ڈرائیور پلیز۔" علیزے بمشکل گرتے پڑتے اٹھی اور اس کے پیچھے بھاگی تھی لیکن اتنے میں وہ باہر جا چکا تھا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ کریں)

نبیلہ عزیز

دردِ دل

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدیحہ اور نبیل حیات دونوں بہن بھائی ہیں' مدیحہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے' وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پہ رنگ چکی ہے' جس کے پیش نظر فائزہ بیگم' نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں' لیکن مدیحہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے' جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے' مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے' مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا' بے بسی اور مجبوری سے تنگ آ کر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے' لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باؤ امتیاز مل جاتا ہے' جو اسے کام کی آفر کرتا ہے' جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے' اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے' وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے' وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

داور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے' وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے' اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا' اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔

۲۴
چوبیسویں قسط

رات خاصی گہری اور تاریک ہو چکی تھی جب ان کی گاڑی دوبارہ لاہور کی حدود میں داخل ہوئی تھی۔

زندہ دلان شہر جاگ رہا تھا اور زندہ دل شہر کے زندہ دل باسی جاگنے اور رتجگا دھوم دھام سے منانے میں مصروف تھے اور اس رتجگے کی رونقیں ریڈ لائٹ ایریا سے شرفا کی گلیوں تک اپنے عروج پہ تھیں اور سڑکوں پہ جابجا بکھرے مناظر دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے۔

کوئی اور وقت ہوتا تو نگارش ان مناظر کو یقیناً دلچسپی سے دیکھتی اور انجوائے کرتی کیونکہ وہ پہلی بار پاکستان آئی تھی اور پہلی بار یہ سب دیکھ رہی تھی لیکن افسوس کہ اس وقت ان کے دل بے سکون اور دماغ منتشر سے تھے نگارش کے ساتھ ساتھ زری اور عبداللہ کا بھی یہی حال تھا' سوچیں گہری اور الجھی ہوئی تھیں اور انہی سوچوں کے دوران ساری رونقیں اور سارے مناظر پیچھے رہ گئے تھے اور ان کی گاڑی اپنے گھر کے سامنے آرکی تھی' عبداللہ نے چونک کر دیکھا تھا۔

یہ گھر دل تور نے پسند کیا تھا' اسی نے خریدا تھا اور اسی نے اس گھر کی حسب ضرورت تھوڑی بہت سیٹنگ وغیرہ کروائی تھی اور ملازم بھی رکھے تھے' عبداللہ تو اس گھر کو پہلی بار دیکھ رہا تھا اور پہلی نظر دیکھ کر ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ ہمیشہ کی طرح دل تور کا یہ انتخاب بھی شاندار تھا' گھر کی خوبصورتی رات کے اندھیرے اور مصنوعی روشنیوں میں بھی اجاگر ہو رہی تھی۔

عبداللہ نے دل ہی دل میں سراہا تھا اور اتنے میں گلاب خان کے ایک ہی ہارن پہ گیٹ فوراً کھل گیا تھا اور گاڑی سبک رفتاری سے آگے بڑھتی اندر پورچ میں آرکی تھی جہاں دل تور شاہ کی سرف پہلے سے موجود تھی جس کا مطلب تھا کہ وہ ان کا انتظار کر رہا تھا۔

"دل تور یہیں ہیں؟" عبداللہ کو حیرت ہوئی تھی۔ "جی۔! صاحب یہیں ہیں' وہ سامنے بیٹھے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" گلاب خان نے لان کے بائیں طرف اشارہ کیا تھا جہاں ایک ٹیبل اور چار کرسیاں بچھی ہوئی تھیں اور انہی میں سے ایک کرسی پہ دل تور شاہ براجمان تھا۔ "اوہ۔! ہماری وجہ سے وہ بھی بے آرام ہو رہا ہے۔" عبداللہ شرمندگی اور افسوس سے کہتا گاڑی کا دروازہ کھول کے نیچے اتر آیا تھا اور اس کے پیچھے زری اور نگارش بھی اتر آئی تھیں۔

"مبارک ہو۔! بچ کے آ گئے ہو۔" دل تور مسکراتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ "تم نہ ہوتے تو نہیں آ سکتا تھا' بڑے گھاگ شکاری تھے۔" عبداللہ نے اعتراف کیا تھا۔

"ہاہاہا۔! مجھے پہلے سے ہی پتا تھا کہ بڑے گھاگ شکاری ہیں' اسی لیے میں ہمیشہ ایسے گھاگ شکاریوں کو وہ دیتا ہوں جن کو نگلنا بھی مشکل ہو جائے اور اگلنا بھی اور آج تم بھی ان کے لیے ایسا ہی شکار ثابت ہوئے ہو۔ بڑی تکلیف ہوئی ہو گی ان کو۔ دانت کچکچا کے رہ گئے ہوں گے؟" دل تور عبداللہ کے اعتراف پہ قہقہہ لگا کر ہنسا اور زری کی جان لے گیا تھا وہ اس کے قہقہے پہ تھم سی گئی تھی اور نظریں تمنائی پھر اس کے دیدار کے لیے اس ذات کی چوکھٹ پہ جا بیٹھی تھیں اور اپنا خالی اور حاجت مند دامن پھیلا دیا تھا۔

وہ سفید شلوار سوٹ میں ملبوس اونچے پورے قد سے کھڑا عبداللہ سے مخاطب زری کے دل کو اس کی دھڑکن سمیت سما کے رکھ گیا تھا وہ دیکھتی رہ گئی تھی اس کے چہرے کی رنگت دمک رہی تھی وہ صاف ستھرا اور فریش لگ رہا تھا اس کی صحت بھی پہلے سے کافی اچھی محسوس ہو رہی تھی' وہ شلوار سوٹ بہت کم پہنتا تھا مگر جب پہنتا تھا اسے بہت سوٹ کرتا تھا' اس کی پرسنالٹی گریس فل اور شاندار لگنے لگتی تھی ایسے میں اس کے مقابل کھڑے ہو کر اسے دیکھنا زری کے لیے بہت مشکل ہو جاتا تھا اس وقت بھی کچھ یہی حال تھا وہ بڑی مشکلوں سے دل کو لگام ڈال دل کڑا کر کے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس صورت پہ تو وہ قربان تھی۔ وہ آخر کیوں نہ دیکھتی؟ وہ اس کے سامنے

کھڑا تھا؟ دیکھ دیکھ کر دل ہی نہیں بھرتا تھا تو وہ کیا کرتی؟ مجبور تھی اسے دیکھنے پہ اسے چاہنے پہ اور مجبور کرنے والا اس کا عشق تھا۔ منہ زور اور بے لگام جو دل تور شاہ کی سمت ہی سرپٹ بھاگے جا رہا تھا جسے یہ بھی پرواہ نہیں تھی کہ اگر راستے میں ٹھوکر کھا کے گرا تو چوٹ کتنی گہری آئے گی؟ سنبھل بھی پائے گا یا نہیں؟ اور زری بھی عشق کی رتھ سوار تھی وہ جس طرف بھی لے جاتا اس نے تو جانا تھا۔ مجبور جو تھی لیکن اس وقت تو وہ کچھ زیادہ ہی مجبور تھی اتنی کہ عبداللہ سے بات کرتا دل تور بھی محسوس کر چکا تھا لیکن اس نے زری کی سمت دیکھ کر اسے نوٹس نہیں کیا تھا بس اپنے دھیان میں بات کرتا رہا اور وہ اپنے دھیان میں کھوئی رہی تھی۔ "زری!" نگارش بھی اس کی محویت بھانپ چکی تھی اسی لیے اسے ٹوکا دیا تھا۔

"اُف۔! مر جائے یہ زری۔ جب بھی کم بخت دل سیراب ہونے کی کوشش کرتا ہے زری کی یہ پکار ہمیشہ خلل ڈال دیتی ہے۔" وہ دل ہی دل میں جھنجلا کے رہ گئی تھی۔

"چلو۔! ہم اندر چلتے ہیں۔" نگارش نے اندر کی سمت اشارہ کیا تھا جس پہ عبداللہ اور دل تور بھی متوجہ ہوئے تھے۔

"ٹھیک ہے یار۔! آپ لوگ آرام کریں میں بھی اب چلتا ہوں کافی ٹائم ہو رہا ہے۔" دل تور نے اپنی مضبوط کلائی پہ بندھی گھڑی سے ٹائم دیکھتے ہوئے اجازت چاہی تھی۔

"ارے۔! اتنی جلدی کیوں؟ کچھ دیر تو بیٹھو نا۔" عبداللہ کو اس کے اجازت طلب کرنے پر اچنبھا ہوا تھا۔

"نہیں یار۔! صبح کورٹ بھی جانا ہے اور ابھی ایک فائل پہ کام بھی کرنا ہے' اور ٹائم دیکھو رات کے بارہ بج رہے ہیں اس لیے اب چلنا چاہیے تم بھی تھک گئے ہو گے کھانا کھاؤ اور اب آرام کرو' باقی باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی۔" اس نے عبداللہ سے الوداعی ہاتھ ملایا تھا اور اسے تسلی دی تھی۔

"اوکے۔! جیسے تمہاری مرضی۔" عبداللہ نے سرہلایا تھا اور دل تور خدا حافظ کہتا ہوا وہاں سے جانے کے لیے پلٹ گیا تھا لیکن زری اور نگارش کے پاس سے گزرتے ہوئے اس کے قدم ٹھٹکے تھے' زری کے ملبوس سے اٹھتی "کائنات فرینڈ" کی خوشبو نے اسے اپنا آپ یاد دلایا تھا۔ مگر دل تور وہاں ٹھہرا نہیں تھا کیونکہ اس کے وہاں ٹھہرنے کا کوئی جواز نہیں بنتا تھا۔ اس لیے وہ بغیر رکے آگے بڑھ گیا تھا۔

"صاحب۔! میں بھی چلوں؟" چوکیدار کے پاس بیٹھا گلاب خان اسے دیکھ کر قریب آ گیا تھا۔ "عبداللہ!" دل تور نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے رک کر آواز دی تھی۔

"حکم جناب۔" عبداللہ بھی بے جان سے متوجہ ہوا تھا۔

"مجھے اپنے ڈرائیور کو ساتھ لے جانے کی اجازت ہے یا نہیں؟" کافی عاجزی سے پوچھا گیا تھا۔

"تو میرے پاس کون رہے گا۔" عبداللہ کو پریشانی ہوئی تھی۔

"آس پاس خواتین نہ ہوتیں تو میں تمہیں بتاتا کہ تمہارے پاس کون رہے گا۔" دل تور کا مسکراتا ہوا ذو معنی لہجہ عبداللہ کو اس کی بات کا مفہوم سمجھا گیا تھا جس پہ عبداللہ سٹپٹا گیا تھا۔

"دل تور۔! کبھی تو شرم کر لیا کرو۔" اس نے سرزنش کی تھی۔

"شرم ہی تو کی ہے۔" دل تور ہنسا تھا۔

"اوکے اوکے۔! جاؤ اب اور اپنے ڈرائیور کو بھی لے جاؤ' لیکن گاڑی چھوڑ جانا۔" عبداللہ نے جان چھڑائی تھی۔

"اوکے جناب۔! اللہ حافظ۔" دل تور مسکراتے ہوئے کہہ کر گاڑی کی فرنٹ سیٹ پہ بیٹھ گیا تھا اور گلاب خان نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔ اس کی دو گاڑیاں تھیں سرف اور پراڈو۔ جن میں سے وہ اپنے استعمال میں

زیادہ تر سرف ہی رکھتا تھا اور پراڈو کبھی کبھار استعمال میں آتی تھی اس لیے اب جب عبداللہ آیا تھا تو اس کے پاس فی الحال کوئی گاڑی نہیں تھی اس لیے دل آور نے پراڈو اس کے لیے بھیج دی تھی کہ جب تک عبداللہ گاڑی نہ لے لیتا تب تک اسی کے استعمال میں رہتی جبکہ عبداللہ کا دل چاہ رہا تھا کہ گلاب خان بھی اسی کے پاس رہے جو کہ ناممکن سی بات تھی کیونکہ گلاب خان دل آور کا بہت خاص آدمی تھا اس لیے وہ زیادہ دیر اسے کہیں نہیں چھوڑ سکتا تھا لہٰذا اپنے ساتھ لے کر ہی رخصت ہوا تھا۔

✿ ✿ ✿

اوائل دسمبر کے دن تھے۔

موسم بھی لوگوں کے مزاج کی طرح دن بہ دن سرد ہوتا جارہا تھا' راتیں لمبی اور دن چھوٹے ہو چکے تھے۔ لیکن بڑی حویلی تو جیسے کسی جمود کا شکار تھی جہاں یوں محسوس ہوتا تھا کہ پندرہ نومبر کی صبح کا وقت ہی ہمیشہ کے لیے ٹھہر گیا تھا جو نہ آگے بڑھ رہا تھا اور نہ پیچھے سرک رہا تھا بس اس جمود میں یہ فرق آیا تھا کہ وقار آفندی اسپتال سے ڈسچارج ہو کر گھر آگئے تھے اور اب آسیہ آفندی کی آزمائش کا وقت شروع ہو چکا تھا کیونکہ وقار آفندی اب اللہ کی ذات کے بعد صرف آسیہ آفندی کے رحم و کرم پہ ہی تھے اور وہی ان کی دیکھ بھال کر رہی تھیں۔ فالج کے مریض و سردی میں زیادہ تکلیف ہوتی تھی اس لیے ان کا زیادہ خیال رکھنا پڑ رہا تھا اور آسیہ آفندی تو چار دن میں ہی تھکنے لگی تھیں شاید اس لیے کہ ان کے سینے پہ بہت زیادہ غم کا بوجھ تھا۔ بیٹی کا غم اور شوہر کا غم۔ دونوں غم ہی انتہا کے تھے وہ اندر سے نڈھال ہو چکی تھیں۔ بس صبر کیے جا رہی تھیں اسی لیے بات بات پہ رو پڑتی تھیں۔ اس وقت بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا وہ وقار آفندی کے لیے چکن سوپ بنا کر لائی تھیں لیکن وہ بیڈ پہ لیٹے تھے اور آسیہ آفندی سے ان کو اٹھانا اور تکیوں کے سہارے ٹیک لگا کر بٹھانا مشکل ہو گیا تھا انہوں نے لاکھ کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی تھی اور اسی بے بسی پہ ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے وہ رو پڑی تھیں۔

"ارے بیگم صاحبہ! کیا کر رہی ہیں آپ؟ لائیے میں کرتا ہوں۔" مبارک خان دروازے پہ دستک دے کر اندر داخل ہوا تھا اور آسیہ آفندی کو نڈھال ہوتے دیکھ کر لپک کے قریب آیا تھا۔ آسیہ آفندی روتے ہوئے پیچھے ہٹ گئی تھیں اور اچھے خاصے صحت مند مبارک خان نے فوراً ہی وقار آفندی کو سہارا دے کر تکیوں سے ٹیک لگا کے بٹھا دیا تھا۔

"پلیز بیگم صاحبہ! آپ روئیں مت صبر اور حوصلے سے کام لیں۔ آپ حوصلہ رکھیں گی تو صاحب جی بھی ٹھیک رہیں گے اس طرح رونے سے تو آپ خود بھی بیمار پڑ جائیں گی اور آپ کو پتہ ہے کہ صاحب جی کو آپ کی ضرورت ہے آپ بیمار پڑ گئیں تو ان کو کون سنبھالے گا؟" مبارک خان ایک سمجھدار اور وفادار ملازم تھا اسے پتہ تھا کہ وقار آفندی پہ آج کل مشکل وقت تھا۔ اس لیے وہ ان کے اس مشکل اور کڑے وقت میں ان کا برابر کا شریک تھا ان کے ساتھ ایک ملازم کی طرح نہیں بلکہ ایک ساتھی کی طرح پیش آرہا تھا اس وقت بھی اسے کوئی کام نہیں تھا وہ صرف ان کی خاطر وہاں آیا تھا لیکن آسیہ آفندی کو دیکھ کر بہت افسوس ہوا تھا اسی لیے گھر کے ایک مخلص اور ہمدرد فیملی ممبر کی طرح انہیں سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن اس سمجھانے میں بھی ایک عزت تھی' احترام تھا' عقیدت تھی جس کی وجہ سے اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں وہ سر جھکائے بات کر رہا تھا۔

"مبارک خان! ان سے کہو جلدی ٹھیک ہو جائیں مجھ سے ان کی یہ حالت برداشت نہیں ہو رہی' یہ ٹھیک نہ ہوئے تو مجھے کچھ ہو جائے گا۔" آسیہ آفندی بمشکل بول پائی تھیں ان کا حلق آنسوؤں کے بوجھ سے جیسے بند ہو رہا تھا۔

"ٹھیک ہو جائیں گے۔ انشاء اللہ جلدی ٹھیک ہو جائیں گے۔ آپ دعا کریں بس۔" مبارک خان نے آگے بڑھ کر سائیڈ ٹیبل پہ رکھا سوپ والا باؤل اٹھایا اور ان کے بیڈ کے قریب کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا تھا اور انہیں خود سوپ پلانے لگا تھا اور ساتھ ساتھ ٹشو سے ان کا منہ بھی صاف کرتا جا رہا تھا اور آسیہ آفندی اس کی اتنی اپنائیت پہ دیکھتی رہ گئی تھیں۔ حالانکہ یہ کام اس کی ملازمت کا حصہ نہیں تھا مگر پھر بھی وہ یہ سب کر رہا تھا اسی لیے آسیہ آفندی کو اس کڑے وقت میں اگر کسی کی وضع داری اور خلوص پہ یقین آیا تھا تو وہ صرف مبارک خان تھا۔

✿ ✿ ✿

وہ آج بہت دنوں بعد جبذی سے ملنے کے لیے آئی تھی اور جبذی اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا۔

"واؤ میڈی؟" اس نے اپنے روم کا دروازہ کھولتے ہوئے اچانک خوشی کا اظہار کیا تھا۔ "کیسے ہو؟" مدیحہ نے اندر داخل ہوتے ہوئے کافی سنجیدگی سے پوچھا تھا۔

"ٹھیک ہوں یقیناً" اس نے دونوں بازو پھیلاتے ہوئے اپنے ٹھیک ہونے کا ثبوت دیا تھا۔

"کیا ہو رہا تھا؟" مدیحہ پورے روم میں اک طائرانہ سی نظر دوڑاتے ہوئے صوفے پہ بیٹھ گئی تھی۔

"چیٹ ہو رہی تھی۔" جبذی نے لیپ ٹاپ کی سمت اشارہ کیا تھا جو صوفے کے سامنے ہی ٹیبل پہ رکھا تھا اور اس کی اسکرین روشن تھی۔

"کس سے چیٹ ہو رہی تھی؟"

مدیحہ نے لیپ ٹاپ کا رخ ذرا سا اپنی سمت موڑتے ہوئے پوچھا تھا۔

"دیکھ لو کس سے ہو رہی تھی۔" جبذی اورنج جوس کا ٹن اٹھا کر کھولتے ہوئے مدیحہ کے برابر ہی صوفے پہ آبیٹھا تھا اور ایک ٹن مدیحہ کی سمت بڑھا دیا تھا — برائن' کرسٹینا اور مائیکل چاروں بیک وقت آن لائن تھے مدیحہ انہیں آن لائن دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی اور پھر بے ساختہ ہی اس کی انگلیاں کی بورڈ پہ حرکت کرنے لگی تھیں اور فوراً ہی اسے ان کے ہیلو ہائی موصول ہونا شروع ہو گئے تھے۔

"کیسی ہو میڈی؟ پاکستان کیسا لگا؟" یہ سوال کرسٹینا کی طرف سے آیا تھا۔

"میں بھی اچھی ہوں اور پاکستان بھی اچھا ہے۔" مدیحہ نے میسج کے جواب میں ایک اسمائل کا آئی کون بھی پاس کیا تھا۔

"اچھا۔ سن کر حیرت ہوئی۔" "فوراً" ریپلائی آیا تھا جس کے اینڈ میں ایک حیرت زدہ سا آئی کون ایڈ تھا۔

"حیرت کس لیے ہوئی؟" مدیحہ نے تعجب کا اظہار کیا تھا۔ "کہ پاکستان اچھا کب سے ہو گیا ہے؟" کرسٹینا نے پھر استہزائیہ سا کریکٹر سینڈ کیا تھا۔

"جب سے محبت ہوئی ہے۔" مدیحہ یہ جملہ ٹائپ کرتے ہوئے ذرا سا جھجکی تھی لیکن پھر سینڈ کر ہی دیا تھا۔

"محبت؟" کرسٹینا نے اس لفظ کو کافی لمبا کھینچ کے لکھا تھا۔

"ہاں۔ محبت۔" مدیحہ نے اقرار کیا تھا۔

"کس سے۔؟ جبذی سے؟" کرسٹینا کے اگلے سوال پہ مدیحہ ٹھہر گئی تھی۔ اس کی انگلیوں کی حرکت دھیمی پڑ گئی تھی۔ مدیحہ نے اک نظر اپنے قریب جبذی کو سرتاپا دیکھا' وہ اس وقت نائٹ ڈریس میں تھا گھٹنوں تک شارٹس' ٹخنوں تک ٹراؤزر اور وائٹ سادہ سی کھلے گریبان کی ٹی شرٹ میں ملبوس ڈھیلے ڈھالے لاپروا انداز میں بیٹھا جوس سے شغل فرما رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن کی اسکرین پہ ہر ادھیڑ عمری شبیہ لہرائی تھی' جو چند روز پہلے ورکشاپ کے گرد آلود اور کاٹھ کباڑ والے ماحول میں بھی اس کے مقابل گھسی پٹی کرسی پہ بیٹھا اس کے ساتھ

چائے پیتے ہوئے بھی کافی دیانت دار اور پرکشش لگ رہا تھا۔ ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ رہن سہن کا بھی اور اسٹیٹس کا بھی۔

اور مدحیہ نے ان میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا اور یہ فیصلہ 'یہ انتخاب اس کے لیے مشکل نہیں تھا کیونکہ اس کا دل بہت پہلے ہی آنکھیں بند کرکے مدیل عمر کا انتخاب کرچکا تھا۔ بس مشکل یہ تھا اس انتخاب کا اظہار کرنا۔ لیکن کبھی نہ کبھی تو کرنا ہی تھا، تو پھر کرسٹینا کے سامنے ہی سہی۔

مدحیہ نے گہری سانس کھینچی اور سامنے اسکرین کی سمت دیکھا تھا۔

"بتاؤ نا۔ جمزی۔؟" کرسٹینا دوبارہ پوچھ رہی تھی۔

"نہیں۔" اس نے سینڈ کر ہی دیا تھا۔

"تو پھر کس سے؟"

"ایک پاکستانی سے۔!"

"پاکستانی سے۔؟"

"ہاں۔! پاکستانی، محنت اور مزدوری کرنے والا پاکستانی، اپنا تن من مارنے والا پاکستانی، محبت اور عزت کرنے والا پاکستانی۔" مدحیہ نے فخر سے جواب لکھا تھا۔

"لیکن تم تو۔؟"

"میں غلط تھی۔" مدحیہ نے اعتراف کیا تھا۔

"تو پھر جمزی وہاں کیا کر رہا ہے؟"

"یہ میں نہیں جانتی۔ یہاں آنا اور یہاں رہنا اس کا اپنا فیصلہ تھا۔ میں نے اسے کوئی امید نہیں دلائی تھی اور ویسے بھی وہ یہاں مہمان ہے۔ میں اسے زبردستی یہاں سے واپس تو نہیں بھیج سکتی نا؟"

"لیکن وہ تو صرف تمہارے لیے تمہاری محبت میں وہاں رہ رہا ہے؟" کرسٹینا کو حیرت ہو رہی تھی۔

"وہ میرے ملک میں رہے، میرے شہر میں رہے، لیکن میری محبت میں نہ رہے کیونکہ میں خود کسی کی محبت میں رو رہی ہوں۔" مدحیہ کا جواب دوٹوک تھا۔

"اف میڈی۔! تم نے مجھے چکرا کے رکھ دیا ہے، مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں کیا کہوں؟"

"اوکے۔! پھر بات ہوگی۔" مدحیہ نے بات سمیٹی تھی۔

"اوکے۔ بائے۔!"

کرسٹینا بھی آف لائن چلی گئی تھی اور مدحیہ نے بھی لیپ ٹاپ پیچھے سرکا دیا تھا۔ اس نے لیپ ٹاپ اپنی جانب ذرا ترچھا کرکے رکھا ہوا تھا۔ اس لیے جمزی نہیں دیکھ پایا تھا کہ ان کی آپس میں کیا بات ہوئی ہے۔

"کیا ہوا؟ پھر کرسٹی نے کچھ کہہ دیا؟" جمزی نے مدحیہ کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا۔

"نہیں۔ اس نے کچھ نہیں کہا۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی تھی۔

"اوکے۔ چھوڑو اس بات کو، یہ لو جوس پیو۔" اس نے مدحیہ کو دوبارہ جوس کی طرف متوجہ کیا تھا۔

"نو تھینکس۔ موڈ نہیں ہے۔" اس نے انکار کر دیا تھا۔

"کہیں باہر چلیں؟"

"نہیں، پھر کسی وقت چلیں گے، ابھی میں گھر جا رہی ہوں۔"

مدحیہ کہہ کے اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور اس کے موڈ کے پیش نظر جمزی چاہ کر بھی اسے روک نہیں سکا تھا۔ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی وہاں سے نکل آئی تھی اور جمزی الجھا سا رہ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

مسلسل تین گھنٹے کی میٹنگ کے بعد نشست برخاست ہوئی تو رفتہ رفتہ سب ہی میٹنگ ہال سے باہر نکل گئے تھے۔

لیکن صرف تنور تھا جو وہیں کا وہیں بیٹھا رہا تھا۔ اس نے اپنا سر کرسی کی بیک سے ٹکا دیا تھا۔ یوں جیسے تھک گیا تھا۔ اور اس کو وہیں بیٹھے دیکھ کر دانیال بھی وہاں سے نہیں جاسکا تھا۔

پورا میٹنگ ہال خالی ہوچکا تھا اور صرف وہ دونوں وہاں بیٹھے تھے اور ان کے درمیان مکمل خاموشی تھی۔ دانیال نے اک نظر تنور کو دیکھا تھا اور پھر لب بھینچ لیے تھے۔ ایک دوسرے سے بات کرنے کے لیے بات کا اور الفاظ کا کوئی سرا ہی ہاتھ نہیں آرہا تھا۔ اتنے دنوں سے ان لوگوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ ایک تناؤ سا ایک گریز سا حائل تھا، لیکن یہ مسئلے کا حل تو نہیں تھا نا؟ آخر کبھی نہ کبھی کوئی نہ کوئی بات تو کرنی ہی تھی یہی سوچ کر دانیال بھی وہیں ٹھہر گیا تھا۔ لیکن تنور اسے بیٹھے دیکھ کر وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"تنور پلیز۔ رکو میری بات سنو۔" دانیال نے اسے روکا تھا۔

"ہونہہ۔ تمہارے پاس کوئی بات ہوتی تو میں ضرور سنتا دانیال صاحب۔ لیکن افسوس کہ تمہارے پاس کوئی بات نہیں ہے۔ صرف تسلیاں ہیں تسلیاں۔ جھوٹی اور خوش فہم تسلیاں۔ بے بنیاد تسلیاں۔ جن کو میں پہلے بھی سن چکا ہوں، لیکن اب مزید نہیں سننا چاہتا۔ اب جو کچھ جیسے چل رہا ہے اسے چلنے دو کیونکہ اب کچھ کہنے سننے کے لیے ہمارے پاس کچھ بھی نہیں رہا۔"

تنور کافی چبا کر بات کر رہا تھا، اس کا لہجہ کافی تلخ اور طنزیہ سا ہو رہا تھا۔

"تنور۔ ہمارے پاس کہنے سننے کے لیے بہت کچھ ہے، لیکن تم سمجھنے کی کوشش تو کرو۔ اس سارے قصے میں ایسا کچھ ضرور ہے جو ہم سے پوشیدہ ہے۔ جو ہم سے چھپا ہوا ہے، جسے ہم نہیں جانتے، جسے علیزے جانتی ہے یا پھر ڈیڈ اور منصور حسین جانتے ہیں۔ تمہیں خود پتا ہونا چاہیے کہ علیزے ایسا نہیں کرسکتی تھی اور اگر اس نے ایسا کیا ہے تو ضرور کوئی وجہ ہوگی؟ کوئی بڑی وجہ۔ کوئی انتہا درجے کی وجہ؟" دانیال کے ذہن میں جو سوچیں کلبلا رہی تھیں وہ ان سب کے سامنے لانا چاہتا تھا۔ لیکن کوئی بھی سمجھنے اور غور کرنے پہ تیار ہی نہیں ہو رہا تھا۔

"ہونہہ۔ کہا نا تمہارے پاس کوئی بات نہیں ہے، صرف تسلیاں ہیں، جھوٹی، خوش فہم اور بے بنیاد تسلیاں۔" تنور نے تمسخرانہ سے انداز میں کہتے ہوئے سر جھٹکا تھا۔

"تنور۔ تم تو علیزے کے بہت قریب تھے۔ بہت خیال رکھتے تھے اس کا، بہت چاہتے تھے اسے۔ ہم سب سے زیادہ انڈر اسٹینڈ کرتے تھے اس کو۔ اور تم ہی اس کو سمجھ نہیں پائے؟ تم ہی سب سے زیادہ بدظن ہوئے پھر رہے ہو اس سے؟ کیا تمہیں اس پہ ذرا بھی اعتماد نہیں تھا؟" دانیال کے لہجے میں تاسف تھا۔ دکھ تھا اور بے یقینی بھی۔

"مجھے اس پہ سب کچھ تھا۔ اعتماد تھا، بھروسہ تھا، اس سے محبت تھی، اس سے پیار تھا، کیا کچھ نہیں تھا اس سے۔ لیکن اس نے سب ختم کر دیا۔ خود۔ خود ختم کیا اس نے۔ میری آنکھوں کے سامنے، سب مٹا دیا اس نے۔ اس کے جو الفاظ میں نے سنے ہیں، وہ میں جانتا ہوں، تم سنتے تو اس وقت اس کی حمایت میں ایک لفظ بھی نہ کہتے۔ جاؤ دیکھو۔ ڈیڈ کو دیکھو، جو کچھ میں نے سنا تھا وہ سب ڈیڈ نے بھی سنا تھا۔ میں سہہ گیا اور بچ گیا، وہ نہیں سہہ سکے، اس لیے بچ نہیں سکے۔ وہ ظاہر سے مفلوج ہوئے ہیں، میں باطن سے مفلوج ہوا ہوں۔ ان کا جسم پیرالائز ہوا ہے اور میرے دل و دماغ پیرالائز ہوگئے ہیں۔ بس فرق اتنا ہے کہ وہ بستر سے لگ گئے ہیں اور میں چل پھر رہا ہوں۔

وہ اپنے جسم سے کام نہیں لے سکتے اور میں اپنے دل و دماغ سے کام نہیں لے سکتا۔ ناکارہ ہوگئے ہیں ہم لوگ۔ ناکارہ۔ سمجھتے ہو نا اس کا مطلب؟" آذر نے تلخی سے کہتے ہوئے دانیال کو دیکھا تھا۔

"آذر۔ علیزے اب بھی واپس آجائے تو۔"

"بس دانیال بس۔ اب اور نہیں۔ عزت کوئی لباس نہیں ہے' جسے اتار کر دھو کر پونچھ کر دوبارہ پہنا جاسکتا ہے۔ عزت 'عزت' ہی ہوتی ہے' اتر گئی سو اتر گئی' دوبارہ بحال نہیں ہوسکتی' اگر ایسا کرنے کی کوشش بھی کرو گے تو بھی دل میں آئینے کی طرح بال رہ جائے گا اور جس چیز میں بال رہ جائے' اسے جوڑنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔"
آذر نے دانیال کی بات کاٹتے ہوئے خفگی اور تلخی سے کہا تھا۔ اب تو اس کا لہجہ ہمہ وقت ہی تلخ رہتا تھا۔

"لیکن آذر۔ علیزے کے ساتھ۔"

"پلیز دانیال۔ میں کچھ نہیں سننا چاہتا۔ میرے سامنے کسی کا نام مت لو۔" آذر نے ہاتھ اٹھا کر اسے منع کیا تھا۔

"کیوں نام نہ لوں؟ کیا اتنے ہی لاتعلق اور بے حس ہوگئے ہو تم؟"

"ہاں ہاں۔ ہوگیا ہوں بے حس اور کیا سننا چاہتے ہو تم۔ جو کچھ وہ کرکے گئی ہے کیا وہ بے حس ہونے کے لیے کافی نہیں ہے۔ تم کہتے ہو اس کے ساتھ ضرور کچھ ہوا ہوگا۔ لیکن میں کہتا ہوں کیا ہوا ہوگا بھلا' کیا وہ منصور حسین اسے گن پوائنٹ پہ لے گیا ہے یا پھر وہ اسے بے ہوش کرکے کڈنیپ کرکے لے کر گیا ہے؟ وہ اپنے بیڈ روم میں تھی' ٹھیک ٹھاک حلیے میں تھی' وہ بھی اس کے ساتھ تھا' اس کے بیڈ روم میں تھا۔ وہ چاق و چوبند تھا تو وہ بھی اپنے ہوش و حواس میں تھی۔ اس کی کنپٹی پہ میں نے تو کوئی گن نہیں دیکھی تھی' جس کے دباؤ میں آکر وہ اس کے ساتھ جاتی۔ بلکہ وہ تو اعتراف کررہی تھی کہ وہ اپنی مرضی سے حویلی چھوڑ کر اپنے شوہر کے ساتھ جارہی ہے۔ اگر وہ کسی دباؤ میں ہوتی تو ہمیں کوئی اشارہ بھی دے سکتی تھی' رو سکتی تھی' چلا سکتی تھی' اس منصور حسین کی کبھی اتنی جرأت نہیں ہوسکتی تھی کہ وہ اس کے بیڈ روم میں گھس کر اسے سب کے سامنے زبردستی۔ اپنے ساتھ لے جاتا اور اس کی مرضی کے بغیر یہ سب کرلیتا۔ اگر اس نے زبردستی ہی اسے لے کر جانا ہوتا تو بہت پہلے ہی اسے اپنے ساتھ لے جاتا' آخر وہ اس کے ساتھ آتی جاتی تھی۔ وہ اس کا ڈرائیور تھا' اگر چاہتا تو بڑی آسانی سے اسے کڈنیپ کرسکتا تھا' لیکن نہیں۔ اس نے ایسا نہیں کیا۔ کیونکہ یہ معاملہ زور زبردستی کا نہیں تھا' یہ جو کچھ بھی ہوا ہے دونوں کی باہمی رضا سے ہوا ہے۔ اس لیے میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ علیزے آفندی پہ چودہ اور پندرہ نومبر کی درمیانی شب کوئی آفت آئی تھی جو اسے منصور حسین کے ساتھ اڑا کرلے گئی ہے۔" آذر نے تلخی سے کہتے ہوئے غصے سے کرسی کو ٹھوکر ماری اور اپنا بریف کیس اٹھا کر باہر نکل گیا تھا۔ اس کے اندر ابال اٹھ رہے تھے اور دماغ کی شریانیں پھٹنے کو تھیں۔ اس لیے وہ مزید آفس میں رکے بغیر وہاں سے نکل آیا تھا۔ وہ غصے میں تھا اور کافی رش ڈرائیو کرتا ہوا حویلی پہنچا تھا۔

"السلام علیکم۔!" سیڑھیاں اترتی کومل کے چہرے پہ رنگ آگئے تھے۔ لیکن آذر نے کوئی بھی جواب نہیں دیا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات کافی عجیب اور غیر معمولی ہورہے تھے جنہیں دیکھ کر وہ چونکی تھی۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" کومل اپنائیت کا پیکر بنی آگے بڑھی تھی۔

"ٹھیک ہوں۔" وہ روکھے سے انداز میں کہہ کر سیڑھیاں طے کرگیا تھا۔ اس کا رخ علیزے کے بیڈ روم کی طرف تھا۔ کومل کو دیکھ کر جھٹکا لگا تھا۔

وہ اس کے بیڈ روم کا دروازہ اک زوردار جھٹکے سے کھول کر اندر داخل ہوا تھا اور علیزے کا خوب صورت سجا سجایا لگژری بیڈ روم جیسا وہ چھوڑ کر گئی تھی' ویسا ہی جوں کا توں نظر آرہا تھا۔ یوں جیسے علیزے ابھی ابھی بیڈ روم

سے نکل کر باہر گئی ہو۔

آذر نے ادھر ادھر نظر دوڑائی تھی اور پھر اسے دائیں سائیڈ کی دیوار سے لگے صوفے اور صوفے کے سامنے والی ٹیبل پہ علیزے کی برتھ ڈے کے تمام گفٹس ہنوز پیکنگ میں بند پڑے نظر آئے تھے اور صوفے کے ساتھ والی چھوٹی کرسٹل ٹیبل پہ سب سے الگ تھلگ آذر کا دیا ہوا گفٹ رکھا تھا اور باقی سب کی طرح وہ بھی ہنوز پیکنگ میں ہی تھا۔ گویا علیزے نے آذر آفندی کے جذبات کھول کر بھی نہیں دیکھے تھے۔ یہ بھی زحمت نہیں کی تھی کہ وہ گولڈن ریپر ہٹا کر ہی دیکھ لے کہ وہ اس ریپر کی اوٹ میں کیا پیک کرلایا ہے؟ محبت لایا تھا یا محبت کا اقرار لایا تھا۔

وہ اس پہ کچھ سوچتی تو تب نا؟ اور آذر گولڈن ریپر میں لپٹے اپنے جذبات کی ناقدری پہ مٹھیاں بھینچتا ہوا سرخ چہرہ اور سرخ آنکھیں لیے اس گفٹ کی طرف بڑھا تھا۔

"آئی لو یو علیزے۔ آئی لو یو علیزے۔" سفید پتھر سے بنے تاج محل کے اندر سے میٹھی سی مدھر سی آواز میں اظہار محبت کیا جارہا تھا اور یہ اظہار آذر کو اور بھی کاٹ کے رکھ گیا تھا۔ وہ یہ گفٹ بڑے چاؤ سے بڑی مشکل سے انتخاب کرکے لایا تھا۔ محبت کی علامت اور محبت کا نشان سمجھ کے۔ ایک محبت کرنے والے کا محبت بھرا تحفہ سمجھ کے۔ لیکن یہاں محبت کو سمجھتا کون تھا بھلا؟ ہونہہ محبت۔ آذر تاسف سے دیکھتا ہوا آگے بڑھا اور کھڑکی کے پٹ کھول کر ہاتھ میں پکڑے سفید سنگ مرمر سے بنے تاج محل کو اپنی پوری قوت سے کھڑکی سے باہر پھینک دیا تھا۔ حویلی کا احاطہ بہت وسیع تھا۔ اس لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ تاج محل حویلی کے احاطے سے باہر جاکے گرتا۔

لیکن جہاں گرا تھا وہیں دانیال کی گاڑی کے ٹائر چرچرائے تھے اور وہ فوراً" گاڑی سے اتر آیا تھا اس نے کشادہ اور طویل ڈرائیو وے کے بیچوں بیچ سفید سنگ مرمر کے ٹکڑے بکھرے ہوئے دیکھے تھے۔

"آئی لو یو علیزے۔ آئی لو یو علیزے۔" ایک چھوٹے سے پرزے میں ریکارڈ یہ جملہ ابھی تک اظہار سے باز نہیں آرہا تھا۔ جس سے لگ رہا تھا کہ ٹوٹنے کے بعد بھی محبت ختم نہیں ہوتی' چاہے دل ٹوٹ جائے' چاہے تاج محل۔

دانیال نے وہ گنگناتا ہوا پرزہ اٹھایا اور علیزے کے بیڈ روم کی کھڑکی کی سمت دیکھا تھا جہاں آذر نے کھڑکی کے پٹ بڑے زور سے بند کیے تھے اور دانیال تاسف سے دیکھتا نفی میں سر ہلاتا ہوا سفید سنگی ٹکڑوں کو بوٹوں تلے روندتا چپ چاپ انیکسی کی سمت بڑھ گیا تھا' بڑی حویلی کے حالات کشیدہ ہوچکے تھے۔ رشتوں میں اچھی خاصی بدمزگی اور بدگمانی پیدا ہوچکی تھی۔

* * *

وقت کی عدالت میں
زندگی کی صورت میں
یہ جو میرے ہاتھوں میں
ایک سوالنامہ ہے
کس نے یہ بنایا ہے؟
کس لیے بنایا ہے؟
کچھ سمجھ میں آیا ہے؟
زندگی کے پرچے کے

سب سوال لازم ہیں
سب سوال مشکل ہیں۔

علیزے کے قدم سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کانپ رہے تھے۔ اس لیے اس کے گرنے کے ڈر سے گل نے اسے مضبوطی سے تھام رکھا تھا جوان جہان لڑکی چند دن کی قید اور دو دن کے بخار سے خود چلنے پھرنے سے قاصر اور دوسروں کے سہاروں کی محتاج ہوگئی تھی۔ وہ ایک قدم سیڑھی پہ رکھتی تھی تو دوسرا قدم اٹھانے کے لیے اسے چند سیکنڈ اپنی ہمت مجتمع کرنی پڑتی تھی۔

اور یہ چند سیڑھیاں طے کرنے میں اسے یوں لگا جیسے گھنٹوں گزر گئے ہوں ایک ہاتھ سے وہ دیوار کا سہارا لے رہی تھی اور ایک ہاتھ گل نے تھاما ہوا تھا اور ان دو سہاروں کی مدد سے وہ اس ٹھنڈی قبر نما بیسمنٹ کی سیڑھیاں طے کرکے دروازے تک پہنچنے میں کامیاب ہوئی تھی اور اس دروازے سے باہر قدم رکھتے ہوئے اس کا دل بھر آیا تھا۔

علیزے کو جب یہاں لایا گیا تھا تو وہ بے ہوش تھی اسی لیے بے ہوشی کی وجہ سے اسے نہیں پتا تھا کہ اسے کن راستوں سے لاکر کہاں پھینک دیا گیا تھا۔ اس کے لیے تمام راستے انجان اور ان دیکھے تھے۔

"بی بی جی۔ ادھر آجائیں۔ صاحب نے کہا تھا کہ آپ کو لان میں بٹھاؤں۔" گل اسے سیڑھیوں کے پیچھے نکال کے راہداری اور ڈرائنگ روم کے مرکزی حصے کی طرف لے آئی تھی۔

"لان میں؟" علیزے نے بے یقینی اور حسرت سے پوچھا تھا۔

"جی ہاں۔ لان میں صاحب نے خود کہا ہے۔" گل نے اسے یقین دلایا تھا اور علیزے کو یوں لگا جیسے گل نے اسے زندگی کی نوید سنائی ہو۔ اور پھر آہستہ قدموں سے چلتی وہ بمشکل گل کے سہارے راہداری عبور کرکے باہر لان تک آئی تھی۔

علیزے نے پہلی بے تاب اور پیاسی نظر آسمان کی طرف اٹھائی تھی شفاف نیلا آسمان اور آسمان کے ماتھے پہ سجا سنہری سورج علیزے کی آنکھیں لبالب پانیوں سے بھر گئی تھیں۔ وہ ہمیشہ سورج کی دھوپ سے ذرا بچ کے رہتی تھی۔ وقار آفندی ہمیشہ احتیاط کرتے تھے کہ کہیں علیزے کی رنگت دھوپ کی وجہ سے سنولا نہ جائے کہیں خراب نہ ہوجائے کوئی انفیکشن نہ ہو اور آج وہی دھوپ علیزے کو اپنے جسم کے لیے ایک راحت محسوس ہورہی تھی اور وہ پلکیں موندتے ہوئے رو پڑی تھی اس کے آنسو رخساروں پہ بہہ آئے تھے۔

"بی بی جی! تھک جائیں گی وہاں کرسی پہ بیٹھ جائیں۔" گل نے لان میں بچھی کرسیوں کی سمت اشارہ کیا تھا لیکن علیزے وہیں لان کی سیڑھیوں پہ بیٹھ گئی تھی اور اپنی بھیگی آنکھوں کو پونچھتے ہوئے دوبارہ آسمان کی طرف دیکھا تھا۔ اس کے بخار سے تپتے ہوئے جسم اور دل و دماغ کو دھوپ کی وجہ سے سکون ملنے لگا تھا۔ بیسمنٹ میں بہت زیادہ ٹھنڈ تھی اور علیزے اتنی سردی برداشت کرنے کی عادی نہیں تھی۔ اس لیے اسے ٹھنڈ کی وجہ سے بخار ہوگیا تھا۔ گل دو دن سے مسلسل اس کی دیکھ بھال کررہی تھی اور جب جل تور کو پتا چلا کہ اس کی طبیعت زیادہ خراب ہے تو وہ صبح آفس جانے سے پہلے خود اسے دیکھنے کے لیے آیا تھا۔ وہ بخار میں بے سدھ پڑی تھی۔ اس لیے وہ جاتے جاتے گل سے کہہ گیا تھا کہ باہر دھوپ نکلے تو وہ اسے تھوڑی دیر کے لیے دھوپ میں لے جائے تاکہ اس کے جسم کو سورج کی تھوڑی حرارت مل سکے اس لیے جل تور کے جانے کے تقریباً دو تین گھنٹے کے بعد جب علیزے قدرے ہوش میں آئی تھی تو گل نے اسے بیسمنٹ سے باہر لانے میں جلدی کی تھی کہ کہیں صاحب کا یہ حکم پھر کسی فیصلے میں تبدیل نہ ہوجائے۔ اور علیزے باہر آکر یوں دیکھ رہی تھی جیسے مرنے کے بعد دوبارہ اسے زندگی عنایت کردی گئی ہو جس کی ہر مرنے والے کی طرح اسے امید ہی نہیں تھی اور جب امید اور توقع سے بڑھ کے ملا تھا تو اس کی آنکھیں بار بار چھلک رہی تھیں اس کا دل چاہ رہا تھا وہ یوں ہی عمر بھر اس آزاد اور

کھلی فضا میں انہی سیڑھیوں پہ بیٹھی رہے اور اس کی عمر تمام ہو جائے۔ اس وقت علیزے کے لیے اس کھلی فضا اور قدرتی ماحول سے بڑھ کے اور کوئی بھی شے قیمتی نہیں تھی۔ علیزے کو چند ہی دن میں ان سب چیزوں کی قدروقیمت کا احساس ہو گیا تھا' جن کی اہمیت پہ اس نے کبھی غور ہی نہیں کیا تھا۔ اس سورج سے زیادہ اسے ہیٹر کی گرمائش اہم محسوس ہوتی تھی۔

لیکن آج احساس ہوا تھا کہ سورج بھی انسان کے لیے بہت بڑی نعمت ہے اور اس نے اس نعمت پہ کبھی دھیان ہی نہیں دیا تھا اور آج جب دھیان دیا تھا تو اس کے سوا کوئی اور چیز اہم نہیں لگ رہی تھی۔

گل نے بارہا اسے سیڑھیوں سے اٹھانے کی اور کمرے میں بٹھانے کی کوشش کی تھی' لیکن وہ نہیں مانی تھی۔ لان کی سیڑھیوں کا رخ مشرق کی طرف تھا۔ اس لیے مشرق کی طرف سے نکلنے والے سورج کی سنہری روپہلی دھوپ سیدھی علیزے پہ ہی پڑ رہی تھی۔ جس سے اس کے ٹھٹھرے ہوئے جسم کو کافی تقویت مل رہی تھی۔ پہلے تو وہ کافی دیر لان کو دیکھتی رہی' پھر جب تھک گئی تو اپنا سر گھٹنوں پہ ٹکا دیا تھا اور پلکیں موند لی تھیں۔ اور یوں ہی گھٹنوں پہ سر رکھے اور پلکیں موندے ہوئے اسے نہ جانے کتنی دیر گزر گئی تھی جب گیٹ پہ کسی گاڑی کا ہارن سنائی دیا تھا۔

مگر بخار کی وجہ سے علیزے کا سر اور آنکھیں اتنی بھاری اور بوجھل ہو رہی تھیں کہ وہ ذرا کی ذرا سر اٹھا کر اتنا بھی نہ دیکھ سکی کہ آنے والا کون ہے۔

پہلے گیٹ کھلا تھا۔ پھر گاڑی اندر آئی تھی' پھر گاڑی روک کر کوئی گاڑی سے نیچے اترا تھا اور پھر رفتہ رفتہ بھاری قدموں کی چاپ اس کے قریب آتی چلی گئی تھی۔

"ہیلو۔ کیسی ہو؟" اس کی آواز علیزے کے بہت قریب سے ابھری تھی اور علیزے کا دل چاہا تھا وہ اپنی سماعتیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر لے' تاکہ وہ کبھی اس کی آواز نہ سن سکے۔

"میں تم سے مخاطب ہوں جان وقار۔ کیسی ہو؟ کچھ اچھا فیل ہوا یا نہیں؟" وہ اطمینان سے کہتا اپنی پینٹ ذرا سی گھٹنوں کے اوپر کھینچتا ہوا اس کے برابر ہی لان کی سیڑھیوں پہ بیٹھ گیا تھا۔

اور اب کی بار نقاہت کے باوجود علیزے نے یک دم کرنٹ کھا کے دیکھا تھا' وہ اس کے ساتھ' اس کے بالکل برابر' اس کے بے حد قریب بیٹھا ہوا تھا اور علیزے کو یوں لگا جیسے اس کے پورے جسم پہ کسی نے تیل چھڑک کر اسے آگ لگا دی ہو' اس کا رواں رواں جل اٹھا تھا۔ وہ یک دم پیچھے ہٹی تھی' لیکن اس کا ہاتھ ولی نور کے ہاتھ کے نیچے دبا رہ گیا تھا۔

"بیٹھی رہو۔ برا ہو سکتا ہوں' لیکن بدنیت یا بدکردار نہیں ہو سکتا۔" ولی نور نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ کے نیچے دبا کر اسے پیچھے ہٹنے سے روکا تھا اور علیزے نے اسے سرخ آنکھوں سے بڑے زخمی انداز سے دیکھا تھا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ولی نور نے اس کی آنکھوں کی زخمی تحریر بڑے واضح حروف میں پڑھی تھی۔

"جس چیز کو تم میری بدبختی سمجھ رہی ہو وہ بھی میری بدبختی نہیں تھی' وہ سب بھی میں نے بڑی ایمان داری سے کہا تھا' اتنی ایمانداری سے کہ۔" اس نے کہتے ہوئے بات ادھوری چھوڑی تھی اور علیزے کی روح تک تڑپ اٹھی تھی۔ وہ ولی نور شاہ کی ادھوری بات کے آگے خاک ہو گئی تھی اور اس کے ہاتھ کے نیچے سے اپنا ہاتھ کھینچ لینے کا سارا غرور مٹی میں مل گیا تھا۔

سیڑھیوں کے فرش پہ علیزے کا نازک سا ہاتھ رکھا تھا اور اس کے ہاتھ کے اوپر ولی نور کے ہاتھ کا بوجھ تھا' لیکن علیزے نے اب ہاتھ کھینچنے کی کوشش ترک کر دی تھی۔

"اوہ نو۔ تمہیں تو ابھی بھی بخار ہے۔" اس کو علیزے کے ہاتھ کی حدت ذرا دیر بعد محسوس ہوئی تھی۔ اس

نے علیزے کا ہاتھ پکڑ کر اس کی کلائی چھو کر دیکھی تھی۔

"ٹیبلٹ لو گی؟" اس نے علیزے کے جھکے ہوئے چہرے کو دیکھنے کی کوشش کی تھی۔

"نہیں۔" علیزے نے نفی میں سر ہلایا تھا۔ اس کی جھکی ہوئی آنکھیں پانیوں سے لبریز تھیں۔

لیکن ولی نور نے اس کے انکار پہ کوئی توجہ نہیں دی تھی اور گل کو پکار لیا تھا۔

"جی صاحب۔ کیسے؟" گل دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی ہوئی سامنے آئی تھی۔

"میرے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل کی دراز سے بخار کی ٹیبلٹ اور دو کپ چائے کے ساتھ ایک گلاس پانی لے کر آؤ۔ بس پانچ منٹ کے اندر اندر۔" اس نے حکم جاری کیا تھا اور گل ایک دم الرٹ ہو گئی تھی۔

"جی صاحب۔ ابھی لے کر آئی۔" وہ فوراً پلٹ گئی تھی۔ لیکن پلٹنے سے پہلے اس کی نظریں علیزے کے ہاتھ پہ ٹکی تھیں' جو اس وقت ولی نور کے ہاتھ میں تھا اور یہ منظر گل کے لیے ایک ناقابل یقین اور ناقابل فراموش منظر تھا۔ جس پہ وہ دل ہی دل میں حیران ہوتی اندر چلی گئی تھی۔

"آج میرے ایک اہم کیس کی ڈیٹ تھی اور مجھے اس میں کچھ پرابلمز نظر آ رہی تھیں۔ لیکن اللہ کی مدد سے اس کیس کا رزلٹ میرے حق میں ہی نکلا ہے۔ اس لیے کورٹ سے نکلتے ہوئے میں بہت خوش تھا اور میرا ارادہ اپنے دوستوں کی طرف جانے کا تھا' لیکن نہ جانے پھر کیوں تمہارا خیال آ گیا کہ تم بیمار ہو' اس لیے دوستوں سے ملنے کا ارادہ ترک کر کے گھر آ گیا ہوں۔ صرف تمہارے خیال سے تمہاری خاطر۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑے یوں نرمی اور اپنائیت سے بتا رہا تھا جیسے ان دونوں کے درمیان پیار و محبت کا بہت ہی گہرا رشتہ قائم ہو۔ یا پھر یوں جیسے وہ اس کی بیوی ہو یا محبوب۔

"ایک سوال پوچھوں تم سے؟ جواب دو گے؟" علیزے نے پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا تھا' بھیگی آنکھیں سوالیہ ہو رہی تھیں۔

"اسی طرح تو جان بھی مانگو گی تو دے دوں گا۔ سوال کا جواب تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔" ولی نور نے نثار ہو جانے والے انداز میں کہا تھا۔

"کیا تم واقعی لوگوں کو انصاف دلاتے ہو؟" علیزے کے لہجے اور سوال میں بے یقینی تھی اور ولی نور علیزے کے سوال پہ ٹھہر سا گیا تھا۔

"کوشش تو یہی کرتا ہوں۔ لیکن کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوتا ہوں' یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔" اس نے کندھے اچکائے تھے۔

"تو پھر یہ بتاؤ کہ میرے بارے میں تمہارا انصاف کیا کہتا ہے؟" علیزے بڑی بہادری کا مظاہرہ کرتی اس سے سوال و جواب کر رہی تھی۔

"تمہارے بارے میں میرا انصاف جو کہتا ہے وہ میں نہیں کر سکتا۔ کیونکہ میرا ضمیر مجھے اجازت نہیں دیتا اور مجھے اللہ سے ڈر بھی لگتا ہے۔" ولی نور نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے گہری سانس خارج کی تھی اور اس کے جواب پہ علیزے کی روح فنا ہو گئی تھی۔ اس کا ہاتھ کانپ گیا تھا اور پورے جسم میں کپکپی سی دوڑ گئی تھی۔

"صاحب۔ چائے۔" اتنے میں گل چھوٹی سی ٹرے لیے حاضر ہو گئی تھی۔

"ہوں۔ لاؤ ادھر ہی رکھ دو۔" ولی نور نے سیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"جی صاحب۔" گل نے آگے بڑھ کے ٹرے سیڑھی پہ رکھ دی تھی۔

"او کے۔ تم جاؤ اب۔" اس کے کہنے پہ گل اندر چلی گئی تھی اور ولی نور نے ہاتھ بڑھا کے پانی کا گلاس اور ٹیبلٹ اٹھا کے علیزے کی سمت بڑھا دی تھیں اور علیزے میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ ٹیبلٹ لینے سے

انکار کرتی۔ اس لیے چپ چاپ دل کڑا کر کے اس کے ہاتھ سے گلاس اور ٹیبلٹ لے لیے تھے۔ بڑی مشکل سے ٹیبلٹ نگلنے کے بعد اس نے منہ پہ ہاتھ رکھ لیا تھا۔

"ڈونٹ وری۔ کچھ نہیں ہو گا تم یہ چائے پیو۔" اس نے چائے کا کپ اٹھا کر علیزے کی سمت بڑھایا تھا۔

"میں۔ میں۔ چائے نہیں پیتی۔" اس نے بمشکل کہا تھا کیونکہ اسے ٹیبلٹ کی وجہ سے ابکائی آرہی تھی۔

"تم تو کبھی فرش پہ بھی نہیں سوئی تھیں، لیکن پھر بھی سو رہی ہو۔" اس نے مثال دی تو۔ علیزے نے مجبوراً اس کے ہاتھ سے کپ تھام لیا تھا۔

"ہوں گڈ۔ کافی سمجھ دار لڑکی ہو۔ بات کو کافی جلدی انڈراسٹینڈ کر لیتی ہو۔" ولی آور نے اسے سراہا تھا اور چائے کا کپ اٹھا کر خود بھی چائے کے سپ لینے لگا۔

علیزے کو اپنا آپ، اپنا دل مار کے وہ کام کرنا پڑ رہے تھے جو اس نے پہلے کبھی نہیں کیے تھے۔ لیکن وقت تھا کہ اس سے سب کروا رہا تھا۔ یہاں تک کہ اسے ولی آور کے پہلو میں بٹھا کر چائے پلوا رہا تھا اور وہ پینے پہ مجبور تھی۔

"تزور آفندی کیسا لگتا ہے تمہیں؟" چائے پیتے ہوئے ولی آور نے ایک غیر متوقع سوال کیا تھا اور علیزے چونک گئی تھی۔

"تزور بھائی؟" علیزے نے حیرت اور نا سمجھی سے اسے دیکھا تھا۔

"ہوں۔ تمہارا تزور بھائی۔ وہی۔ اسی کی بات کر رہا ہوں۔"

"کیوں۔ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟" علیزے کو اس کے عجیب سے سوال پہ الجھن ہوئی تھی۔

"جو پوچھا ہے اس کا جواب دو۔ سوال مت کرو۔" وہ چائے کا سپ لیتے ہوئے بولا تھا۔

"کیا مطلب تھا تمہارا؟ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" علیزے ٹھٹک گئی تھی۔

"میرا مطلب ہے کہ کوئی اسپیشل فیلنگز اس کے حوالے سے۔" ولی آور نے ذرا سی گردن ترچھی کر کے اپنی سمت دیکھتی علیزے کی آنکھوں میں دیکھا تھا جس کی گولڈن براؤن آنکھوں میں تحیر پھیل گیا تھا۔

"ڈ۔ ڈرائیور۔ یہ۔ یہ۔ تم کیا۔ کک۔ کہہ رہے ہو۔ تت۔ تم نے یہ سوچ بھی کیسے لیا کہ۔؟" علیزے حیرت زدہ سی رہ گئی تھی۔

"ہونہہ، مجھے کیا ضرورت ہے ایسا فضول سوچنے کی۔ یہ سوچ تو تمہارے تزور بھائی کی ہے، جو اب اپنی سوچ پہ پچھتا رہا ہے۔" ولی آور نے لاپروائی سے کہتے ہوئے سر جھٹکا تھا۔

"تزور بھائی کی سوچ۔" علیزے کے کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی تھی۔ اسے اپنی سماعتوں پہ اور ولی آور کے کہے الفاظ پہ یقین نہیں آرہا تھا۔ لیکن اسے ساتھ ساتھ یہ بھی یقین تھا کہ اس کے قریب بیٹھا یہ آدمی مذاق نہیں کر سکتا۔

"ہوں۔ تزور بھائی کی سوچ۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"مم۔ مگر۔ یہ۔ یہ۔ کیسے ہو سکتا ہے بھلا وہ۔ وہ میرے بارے میں۔ ایسا کیسے سوچ سکتے ہیں۔" علیزے کے دل و دماغ اس حقیقت کو قبول کرنے پہ تیار نہیں ہوئے تھے۔

"یہ تو وہی بتا سکتا ہے کہ اس نے ایسا کیسے سوچ لیا اور ایسا کیسے ہو سکتا ہے بھلا۔" وہ ابھی بھی لاپروائی سے کام لے رہا تھا۔

"تت۔ تم مجھے مینٹلی ڈسٹرب کرنے کے لیے ایسا کر رہے ہو نا؟" اس نے ولی آور کو مشکوک نظروں سے دیکھا تھا۔

"میں تمہیں دنیا کی تمام حقیقتوں سے روشناس کرانے کے لیے ایسا کر رہا ہوں، میرے پاس رہو گی تو تمہیں

زندگی کی ہر اونچ نیچ کا پتا چل جائے گا۔ بڑی حویلی میں رہ کر دنیا کو پتا تھا کہ تم کیا ہو اور اب یہاں میرے گھر میں رہ کر تمہیں پتا چلے گا کہ دنیا کیا ہے۔ دنیا جنت بھی ہے اور دوزخ بھی۔ پہلے تم نے جنت کا رخ دیکھا ہے۔ اب دوزخ کا رخ دیکھو گی۔" کہتے کہتے ولی آور کا لہجہ سخت ہو گیا تھا اور علیزے دل تھام کے رہ گئی تھی۔ وہ روح تک لرز گئی تھی اور اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا اس کے سیل پہ بتول شاہ کی کال آگئی تھی اور وہ وہاں سے اٹھ گیا تھا۔ لیکن علیزے کے پاس ہمیشہ کی طرح الجھنیں اور سوال چھوڑ گیا تھا۔ اس کا سر درد سے پھٹنے لگا تھا۔ زندگی ریشم کی ڈوریوں کی طرح الجھ چکی تھی کوئی سرا ہی ہاتھ نہیں آرہا تھا۔

☼ ☼ ☼

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا جب کسی نے ان کے گھر کا دروازہ انتہائی زور سے دھڑا دھڑ پیٹ ڈالا تھا۔

عدیل کے ساتھ ساتھ باقی گھر والے بھی گہری نیند سے جاگ گئے تھے۔ وہ اپنے اوپر سے گرم لحاف ہٹا کر بڑی تیزی سے اپنے بستر سے اٹھا تھا اور زیرو پاور بلب کی روشنی میں جوتے پہن کر کمرے کا سوئچ بورڈ ٹٹولا اور لائٹ جلا کر جلدی سے دروازہ کھول کے باہر نکل گیا تھا۔ اتنے میں مریم اور عابدہ خاتون بھی اپنے اپنے کمروں سے نکل آئی تھیں۔

"عدیل۔ باہر کون ہے بیٹا؟" عابدہ خاتون پریشان ہو چکی تھیں۔

"پتا نہیں کون ہے، دیکھتا ہوں ابھی۔" عدیل کہہ کر بیرونی دروازے کی سمت بڑھ گیا تھا۔

"کون ہے؟" اس نے دروازہ کھولنے سے پہلے احتیاطاً پوچھا تھا۔

"استاد۔ میں ہوں شہریار۔ دروازہ کھولو۔" عدیل کو باہر سے چھوٹے کی آواز سنائی دی تھی اور دماغ میں کسی انہونی کا الارم بجا تھا۔

"شہریار۔" اس نے فوراً دروازہ کھول دیا تھا۔

"کیا بات ہے خیریت تو ہے؟" عدیل پریشانی سے پوچھ رہا تھا۔

"خیریت نہیں ہے استاد۔ ورکشاپ میں آگ لگ گئی ہے، سب تباہ ہو گیا ہے۔ ہم۔ ہم سب برباد ہو گئے ہیں۔" شہریار نے اس کے سر پہ بم پھوڑ دیا تھا اور عدیل کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کے پیروں تلے سے زمین کھینچ لی ہو۔

"ورکشاپ میں آگ۔" عدیل کو اپنی آواز کسی کنویں سے آتی محسوس ہوئی تھی۔ رات کے تین بجے اچانک گہری نیند سے ہڑبڑا کے اٹھنا اور پھر ایسی خبر سننا دماغ کو ہولا کے رکھ گیا تھا۔

"استاد۔ تم یہاں سے چلے جاؤ، تمہارا یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔" شہریار نے اسے آنے والے وقت کی سنگینی سے بچاؤ کا راستہ بتایا تھا اور عدیل دم بخود رہ گیا تھا۔

"شہریار! یہ کیا کہہ رہے ہو تم، تمہارا مطلب ہے کہ میں گھر سے بھاگ جاؤں۔" عدیل کا لہجہ بے یقین سا تھا۔

"وقت کی نزاکت یہی کہہ رہی ہے استاد کہ آپ گھر سے چلے جائیں۔ کچھ دن بعد میں آجانا۔" شہریار نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"مگر کیوں شہریار، میں کیوں بھاگ جاؤں، میں نے کیا کیا ہے بھلا۔" عدیل کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ وہ شہریار کی بات سمجھنے اور ماننے پہ تیار نہیں ہو رہا تھا۔

"بے شک آپ نے کچھ نہیں کیا استاد۔ لیکن ورکشاپ کی ذمہ داری تو آپ پہ ہی تھی نا، اب اگر ورکشاپ میں کوئی نقصان ہوتا ہے تو ذمہ دار بھی تو آپ کو ہی ٹھہرایا جائے گا۔"

"ورکشاپ میں تین گاڑیاں جل گئی ہیں تو کیا ان کا نقصان باؤ امتیاز پورا کرے گا' ہونہہ! ہرگز نہیں۔ وہ یہ نقصان آپ کے کھاتے میں ڈال دے گا اور آپ یہ نقصان کیسے پورا کریں گے؟ اگر نقصان پورا نہ ہوا تو آپ کو جیل جانا پڑے گا اور اگر خدانخواستہ آپ جیل چلے گئے تو وہاں سے نکلو گے کیسے اور پیچھے گھر والوں کا کیا ہوگا؟ اس لیے بہتر ہے کہ آپ یہاں سے چلے جاؤ۔" شہیار عدیل کے ہر مسئلے پہ سوچ رہا تھا اور عدیل چکرا گیا تھا۔

"کیسے چلا جاؤں' کہاں چلا جاؤں' کیا کہیں جانا اتنا آسان ہے بھلا۔ میرے گھر میں ماں ہیں' بہنیں ہیں' معذور اور لاچار باپ ہے' انہیں کس کے سہارے پہ چھوڑ جاؤں ادھر میں گھر سے باہر قدم رکھوں گا۔ ادھر وہ بے سہارا ہو جائیں گے۔ لوگ گدھ کی طرح نوچنے کے لیے آجائیں گے ان کو۔ میری عزت' میری بہنیں غیر محفوظ ہو کے رہ جائیں گی۔ کون تحفظ دے گا ان کو' کون حفاظت کرے گا ان کی ہونہہ۔ میرا گھر سے بھاگنا آسان نہیں ہے یار۔ میں چھڑا چھانٹ نہیں ہوں کہ بھاگ جاؤں۔ میرے گھر میں میری عزت ہے۔ کل کو میں بھاگ جاتا ہوں تو کیا میرے گھر پولیس نہیں آئے گی' کیا میرے گھر کی تلاشی نہیں لیں گے' میری ماں' بہنوں سے پوچھ پڑتال نہیں کریں گے' دھمکیاں نہیں دیں گے' تنگ نہیں کریں گے' کیا آئے روز میرے گھر کی کنڈی نہیں کھڑکے گی۔ اگر یہ سب ہوگا تو کیا عزت رہ جائے گی میری اور کیا فائدہ میرے بھاگنے کا۔ اس لیے اس سے بہتر ہے کہ میں سامنے جاکر حالات کا مقابلہ کروں کہ آخر ہوا کیا ہے۔"

"بس تم اگر دوست ہو تو اس برے وقت میں میرا ساتھ دو' مجھے تم لوگوں کے ساتھ کی ضرورت ہے۔" عدیل نے اپنی جگہ سے ہٹنے کی بجائے ڈٹ جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ حالات کے سامنے ڈٹ گیا تھا۔

"ایک بار پھر سوچ لو استاد۔" شہیار نے آخری کوشش کی تھی۔

"تم نے سوچنے کا وقت کب دیا ہے چھوٹے' نیند بھی توڑ دی اور خواب بھی۔"

عدیل شکوہ کناں لہجے میں کہتا ٹیکسی سے سر جھٹک کر اندر آگیا تھا۔ مریم اور عابدہ خاتون اتنی سردی کے باوجود بغیر کسی گرم کپڑے کے برآمدے میں ستون کے قریب کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھیں۔

"کیا بات ہے بیٹا! کون ہے؟ کیا ہوا ہے؟ سب ٹھیک تو ہے نا۔" عابدہ خاتون اس کے پیچھے کمرے تک آئی تھیں۔

"جی امی۔ اللہ کا شکر ہے سب ٹھیک ہے۔ بس ایک دوست پہ پولیس کیس بن گیا ہے' اس کے لیے جارہا ہوں' آپ دعا کیجیے گا کہ زیادہ مسئلہ نہ بنے۔" عدیل نے اپنی گرم چادر اٹھا کر کندھوں پہ پھیلائی تھی۔

"اللہ خیر۔ اللہ خیر۔ اللہ رحم کرے سب پہ۔ جلدی گھر آجانا۔" وہ اس کا کندھا تھپکتے ہوئے بولی تھیں۔

"ان شاء اللہ جلدی گھر آجاؤں گا' آپ ذرا مریم کو اندر بھیج دیں۔" اس نے بوٹ پہنتے ہوئے کہا تھا اور عابدہ خاتون باہر نکل گئیں اور وہ بوٹ پہننے کے بعد کھڑا ہوا ہی تھا کہ مریم اندر آگئی تھی۔

"کہاں جارہے ہیں آپ؟" مریم کا لہجہ سنجیدہ اور ناپا تلا سا تھا اور عدیل اس کے سوال پہ رک گیا تھا اور پھر اس کے سامنے آکر اسے کندھوں سے تھام لیا تھا۔

"دیکھو مریم۔ مجھے پتا ہے کہ تم بہت بہادر ہو' نیک ہو' عزت دار ہو' میرے لیے ہمیشہ بہن نہیں بلکہ بھائی ثابت ہوئی ہو' تمہارے صبر اور ہمت کی داد دیتا ہوں' تم نے کبھی اپنا یا ہمارا حوصلہ کرنے نہیں دیا اور مجھے امید ہے کہ آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا۔ تم اپنا بھی حوصلہ بلند رکھو گی اور باقی سب کو بھی ہمت اور حوصلہ دو گی' خصوصاً" امی اور ابا جی کو۔"

عدیل نے اسے سمجھانے کے لیے تمہید باندھی تھی اور مریم کا دل کانپ گیا تھا۔

"آپ۔ یہ۔ سب کیوں کہہ رہے ہیں۔ آخر کہاں جارہے ہیں آپ' ہوا کیا ہے؟" مریم کے چہرے کا

رنگ بدل گیا تھا اور تفکر کے سائے لہرانے لگے تھے۔

"مریم پلیز۔ تم نے پریشان نہیں ہونا' اگر تم پریشان ہو گئیں تو سمجھو کہ ہمارا پورا گھر پریشان ہو جائے گا۔ ان حالات میں ہمارے گھر کو اگر کوئی چیز بچا سکتی ہے تو وہ ہے تمہاری ہمت' بہادری اور سمجھ داری اور مجھے یقین ہے کہ تم سب کچھ سنبھال کے رکھو گی اور سب کا خیال بھی رکھو گی' یہ گھر اور اس گھر کی عزت اب تمہارے ہاتھ میں ہے۔ سنوار بھی سکتی ہو اور بگاڑ بھی سکتی ہو۔ یہ وقت شاید ہم دونوں بہن بھائی کے لیے آزمائش کا وقت ہے۔ دعا کرو اللہ ہمیں اس آزمائش میں سرخرو کرے۔" عدیل نے کہتے ہوئے مریم کا ہاتھ تھام کے تھپکا تھا۔

"لیکن آپ یہ کیوں نہیں بتا رہے کہ آپ کہاں جارہے ہیں' کیا ہوا ہے؟" مریم جھنجلا گئی تھی۔ اس کی جان مٹھی میں آئی ہوئی تھی اور عدیل تھا کہ بتانے سے گریز کر رہا تھا۔

"وہ دراصل ورکشاپ میں آگ لگ گئی ہے۔ کافی نقصان ہوا ہے اور یقیناً" اس نقصان کا ذمہ دار مجھے ہی ٹھہرایا جائے گا۔ اس لیے اس نقصان کی وجہ سے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ میں جارہا ہوں اگر کل وہ پہر تک واپس نہ آیا تو سمجھ لینا کہ مجھے جیل ہو گئی ہے۔ لیکن خیر جو بھی ہوگا میرا کولیگ ہے ایک' شہیار نام ہے اس کا' وہ آکر آپ لوگوں کو ساری بات بتا دے گا۔"

عدیل کو بتانا ہی پڑا تھا اور مریم کے تو پیروں تلے سے زمین سرک گئی تھی۔

"کیا۔ آپ جیل جارہے ہیں۔" مریم کو لگا جیسے کسی نے اس کے سر سے سائبان چھین کر اسے تپتے صحرا میں دھکیل دیا ہو' وہ چکرا گئی تھی۔

"کچھ کہہ نہیں سکتا' ابھی جاؤں گا تو پتا چلے گا کہ میرے لیے کیا سزا ہے۔" عدیل نے لاعلمی ظاہر کی تھی۔

"لیکن عدیل بھائی آپ۔" مریم نے کچھ کہنا چاہا تھا' لیکن عدیل نے اسے روک دیا تھا۔

"بس۔ زیادہ ٹائم نہیں ہے۔ شہیار باہر کھڑا انتظار کر رہا ہے۔ اب جو بھی ہوگا دیکھا جائے گا' تم دعا کرنا اور سب کو تسلی دینا۔" عدیل نے کہہ کر اس کا سر تھپکا اور خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گیا تھا۔ مریم تڑپ کے اس کے پیچھے لپکی تھی۔ لیکن عدیل تب تک عابدہ خاتون سے مل کر گھر کی دہلیز عبور کر گیا تھا۔

"استاد۔ ایک بار پھر سوچ لو۔ ایسے معاملے لمبے چوڑے ہو جاتے ہیں۔ جتنا بھی سلجھانے کی کوشش کرو اتنا الجھتے ہیں اور آپ کے پیچھے تو اور کوئی بھی نہیں ہے جو آپ کے لیے بھاگ دوڑ کرے گا۔" چھوٹے نے ٹیکسی سے اترنے سے پہلے اسے ایک بار پھر سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"میرے لیے اللہ تو ہے نا' سب کچھ کرنے والا۔ میری کوئی غلطی' میرا کوئی قصور نہیں ہے' اس لیے میرا انصاف وہی کرے گا' جو سب سے بڑا عادل ہے۔" عدیل نے پورے یقین اور بھروسے سے کہا تھا اور ٹیکسی سے اتر آیا تھا۔

ورکشاپ کے باہر پولیس اور فائر بریگیڈ والوں کی گاڑیاں کھڑی تھیں' چند آس پاس کی دکانوں والے لوگ بھی جمع تھے اور لوگوں کے ہجوم میں امتیاز کاشمیری (باؤ امتیاز) کھڑے تھے۔ عدیل مضبوط قدموں سے چلتا ہوا قریب آیا تھا۔

"باؤ عدیل آگیا۔" سب سے پہلے اس پہ چائے کے ڈھابے والے بھٹی صاحب کی نظر پڑی تھی اور پھر پورا ہجوم عدیل کی سمت متوجہ ہو گیا تھا۔ جبکہ باؤ امتیاز تیزی سے اس کے پاس آیا تھا۔

"یہی ہے میری بربادی کا ذمہ دار۔" باؤ امتیاز دھاڑا تھا اور چھوٹے' جیدی اور سلو کا دل مٹھی میں آگیا تھا۔ پولیس کانسٹیبل لپک کے عدیل کو گھیر چکے تھے اور پھر وہی ہوا تھا جس سے بچنے کے لیے چھوٹے نے اسے بارہا سمجھایا تھا۔ عدیل عمر کو گرفتار کر لیا گیا تھا اور سب دیکھتے رہ گئے تھے۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمایے)

نبیلہ عزیز

درد دل

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نبیل حیات دو ہی بہن بھائی ہیں' مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے' وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پہ رنگ چکی ہے' جس کے پیش نظر فائزہ بیگم' نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں' لیکن مدحیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے' جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے' مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے' مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا' بے بسی اور مجبوری سے تنگ آ کر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے' لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باؤ امتیاز مل جاتا ہے' جو اسے کام کی آفر کرتا ہے' جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے' اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے' وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے' وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دلآور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے' وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے' اس نے

...رنا نہیں سیکھا' اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بتاتی ہیں۔

پچیسویں قسط

"او کے۔۔۔! میں جلدی آجاؤں گی۔۔۔ اللہ حافظ۔۔۔" وہ چادر اوڑھ کر بیگ لیتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی تھی لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ گھر سے ایک پریشانی ساتھ لے کر نکل رہی ہے تو آگے ایک اور پریشانی اس کی منتظر ہے۔

وہ ابھی اسٹاف روم میں پہنچ کر اپنی بڑی سی چادر اتار کے اپنے سوٹ کا میچنگ دوپٹہ نکال رہی تھی جب ان کا پیون پیغام لے کر حاضر ہوا تھا۔

"میڈم۔۔۔! آپ سے کوئی ملنے آیا ہے' کافی دیر سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" پیون نے کافی مودب سے انداز میں اطلاع پہنچائی تھی۔

"کون۔۔۔؟ شہریار۔۔۔" مریم چونک گئی تھی اس کا خیال بے ساختہ شہریار کی طرف ہی گیا تھا کیونکہ اسے اس وقت شہریار کا ہی انتظار تھا۔

"سوری میڈم۔۔۔! نام نہیں بتایا انہوں نے۔۔۔" پیون نے نفی میں گردن ہلائی تھی۔

"اچھا۔۔۔! میں خود دیکھ لیتی ہوں۔" مریم اپنا بیگ اور چادر لاکر میں رکھتے ہوئے اسٹاف روم سے نکل آئی تھی' اس کا رخ وزیٹنگ روم کی طرف تھا وہ خاصے تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی وہاں تک آئی تھی لیکن وزیٹنگ روم میں پہنچ کر اس کے قدم اپنی جگہ پہ جیسے جم کے رہ گئے تھے کیونکہ سامنے ہی صوفے پہ جودت آفندی براجمان تھا جو اسے دیکھتے ہی فوراً صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"ہائے۔۔۔! کیسی ہیں آپ۔۔۔؟" جودت آج جیسے بڑی فراغت نکال کے بڑے اطمینان سے اس سے ملنے آیا تھا اسی لیے بڑے سکون سے اس سے مخاطب تھا جبکہ مریم کے چہرے کی رنگت بدل چکی تھی' جودت آفندی کا اس سے ملنے کے لیے اکیڈمی آنا اس کے لیے کوئی بھی اسکینڈل کھڑا کر سکتا تھا اور وہ فی الحال کوئی بھی اسکینڈل افورڈ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی' جودت آفندی کی آمد مریم کی ریپوٹیشن پہ ایک دھبا ثابت ہو سکتی تھی اور وہ مر کے بھی یہ دھبا نہیں لگوانا چاہتی تھی۔

"مجھے کیا خبر تھی کہ آپ یوں مجھے نظروں کے رستے دل میں اتارنے کھڑی ہو جائیں گی؟ پتا ہوتا تو میں پہلے ہی آجاتا؟"

جودت کا لہجہ اور انداز خاصے معنی خیز تھے' جس پہ مریم سر سے پاؤں تک سلگ اٹھی۔

"جسٹ شٹ اپ۔۔۔! زبان سنبھال کے بات کریں' مجھے ایسی بکواس پسند نہیں ہے۔" مریم پہلے ہی کافی پریشان تھی اس لیے جودت کی معنی خیزی پہ اس کا دماغ اور زیادہ گرم ہو گیا تھا۔

"لیکن مجھے تو بہت پسند ہے چاہے وہ بکواس آپ کریں یا میں۔۔۔" جودت نے ہنوز معنی خیزی سے مسکراتے ہوئے کندھے اچکائے۔

"آپ یہاں کیوں آئے ہیں۔۔۔؟" مریم نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے بمشکل سوال کیا تھا۔

"پیاسا کنوئیں کے پاس کیوں آتا ہے۔۔۔؟" الٹا جودت کا سوال مریم کو سٹپٹا کے رکھ گیا تھا۔

"کیا مطلب ہے آپ کا۔۔۔؟"

"ارے۔۔۔! حیرت کی بات ہے' آپ ایک ٹیچر ہو کر مطلب مجھ سے پوچھ رہی ہیں۔۔۔؟ وہ بھی اتنے آسان سوال کا۔۔۔؟"

جودت بھنویں اچکاتے ہوئے ذرا سا مسکرایا تھا اور چار قدم کا فاصلہ طے کر کے دو قدم کے فاصلے پہ اس کے بے حد قریب آکھڑا ہوا تھا۔

"بھئی ظاہری بات ہے کہ پیاسا کنوئیں کے پاس اپنی پیاس بجھانے کے لیے آتا ہے جیسے میں آپ کے پاس آیا ہوں۔"

جودت کے بے باک سے انداز پہ مریم نے بڑی مشکل سے اپنے ہاتھ کو تھپڑ مارنے سے روکا تھا ورنہ اس کا جی تھا کہ جودت آفندی کے منہ پہ ایسا زناٹے دار تھپڑ رسید کرے کہ اس کے چہرے پہ زندگی بھر کے لیے ایک نشان رہ جائے' لیکن مریم کے لیے آج کا دن اذیت اور برداشت کا دن تھا۔ وہ جودت آفندی پہ ہاتھ اٹھا کے اشتعال نہیں دلانا چاہتی تھی کیونکہ اگر وہ مشتعل ہو جاتا تو اس کی پریشانیوں میں اور بھی اضافہ ہو سکتا تھا اور تھپڑ کے عوض مزید پریشانی نہیں خرید سکتی تھی۔

"دیکھیے جودت صاحب۔۔۔! آپ کی گھٹیا گفتگو مجھ پہ اثر انداز نہیں ہو سکتی۔۔۔ آپ خوامخواہ اپنا ٹائم ویسٹ کر رہے ہیں۔۔۔ اس لیے پلیز آپ کسی ایسی لڑکی کا ایڈریس لیں جو آپ کے ٹائپ کی اور آپ کی ضرورت کے مطابق ہو جس پہ ٹائم ویسٹ کرنے سے آپ کو نفع ہو' نقصان نہیں۔۔۔" مریم نے ذرا تحمل سے کام لیتے ہوئے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"آپ کو کیا پتا مریم جی۔۔۔؟ اس وقت آپ کو دیکھنا' آپ سے بات کرنا ہی میرا اصل نفع ہے' صبح صبح اٹھنے کا اور بستر چھوڑنے کا صلہ مل گیا ہے' طبیعت پہ بڑا اچھا اثر پڑا ہے' دل بڑی تیزی سے حرکت میں ہے۔" جودت نے بڑے سرشار سے انداز میں اپنے دل پہ ہاتھ رکھا تھا۔

"جودت صاحب پلیز۔۔۔! میری آپ سے ایک ریکوئسٹ ہے کہ آپ کے دل میں میرے حوالے سے جو بھی خیال ہے پلیز آپ اس خیال کو اپنے دل سے نکال دیں' کیونکہ میرے متعلق آپ کا انتخاب بہت غلط ہے' میں ایسی نہیں ہوں جیسی آپ سمجھ رہے ہیں۔ میری ذات اور آپ کی ضرورت کا کوئی جوڑ میل نہیں ہے' میری ذات کچھ اور ہے' آپ کی ضرورت کچھ اور ہے۔۔۔ آپ کی ضرورت تو آپ کی اپنی کلاس سے ہی پوری ہو سکتی ہے' آپ اپنی کلاس سے نیچے کیوں آ رہے ہیں۔۔۔؟" مریم بہت زیادہ برداشت سے کام لے رہی تھی۔

"کیونکہ میں میک اپ سے سجے چہروں اور رنگین بالوں سے اکتا چکا ہوں' میرا دل آپ کی نیچرل بیوٹی کا ہو کر رہ گیا ہے' جب سے آپ کو دیکھا ہے' ایک دن بھی آپ کی طلب کے بغیر نہیں گزرا' سوچتا ہوں آپ کو دو قدم دور سے دیکھنے پہ میرا یہ حال ہے تو دو قدم اور قریب سے دیکھنے پہ کیا حال ہو گا۔۔۔؟" جودت نے اپنے خیالات اور جذبات کا کھلے عام اظہار کیا تھا اور مریم کے صبر و برداشت جواب دے گئے تھے۔

"آپ یہاں سے خود جائیں گے یا مجھے چپڑاسی کو بلانا پڑے گا۔۔۔؟" وہ زچ ہو چکی تھی۔

"مجھے یہاں سے نکالنے کے لیے چپڑاسی کو بلانے کی کیا ضرورت ہے بھلا۔۔۔؟ آپ خود میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے گیٹ سے باہر نکال دیں' میں چپ چاپ چلا جاؤں گا۔۔۔" جودت نے بڑی معصومیت سے اسے حل بتایا تھا اور مریم مٹھیاں بھینچ کے رہ گئی تھی۔

"ارے۔۔۔! جودت تم یہاں۔۔۔؟" اچانک وزیٹنگ روم کے داخلی دروازے سے مسز رزاق کی آواز ابھری تھی جو اس اکیڈمی کی پرنسپل اور اونر تھیں' مریم ان کی آواز پہ چونک گئی تھی۔

"السلام علیکم آنٹی۔۔۔! کیسی ہیں آپ۔۔۔؟" جودت ان کی سمت پلٹتے ہوئے پوری طرح ان کی طرف ہی متوجہ ہو چکا تھا۔

"وعلیکم السلام بیٹا۔۔۔! تم یہاں کیسے۔۔۔؟ اکیلے ہی آئے ہو۔۔۔؟ سائم کہاں ہے۔۔۔؟" وہ اپنی ساڑھی سنبھالتی ہوئی اندر ہی آگئی تھیں اور مریم ان کی آپس میں جان پہچان پہ حیران رہ گئی تھی کہ گویا وہ جودت آفندی کو اپنی مرضی سے اس اکیڈمی سے نکال بھی نہیں سکتی تھی۔

"جی۔۔۔! وہ دراصل مجھے مس مریم سے کوئی کام تھا اس لیے یہاں آیا ہوں اور سائم تو شاید یونیورسٹی چلا گیا

ہے۔۔۔" جودت نے کافی لاپروائی سے بتایا تھا جبکہ مریم اس کے جواب پہ سلگ اٹھی تھی اس نے جودت آفندی کو خاصی خونخوار نظروں سے دیکھا تھا۔

"مریم سے کام تھا۔۔۔؟" مسز رزاق کو حیرت ہوئی تھی کیونکہ وہ بھی جانتی تھیں کہ مریم اس ٹائپ کی نہیں ہے۔

"جی میڈم۔۔۔! وہ دراصل چند روز پہلے میرے ابا جی کی طبیعت بہت زیادہ خراب تھی ہم انہیں اسپتال لے گئے تھے' تب وہاں سے میڈیسن لیتے ہوئے میں بل کے پیسے اپنے بھائی کے پاس ہی بھول گئی تھی اور اس وقت اتفاق سے جودت صاحب بھی وہیں پہ تھے اور میڈیسن کا بل انہوں نے پے کر دیا تھا اس لیے ان کا ادھار تھا میری طرف' یہ وہی لینے آئے ہیں' پلیز۔۔۔! جودت صاحب ٹھہریے آپ' میں ابھی پیسے لے کر آتی ہوں۔۔۔"

مریم نے بڑی حاضر دماغی سے بات کا رخ ہی پلٹ دیا تھا جس پہ مسز رزاق حیران اور جودت ہکا بکا رہ گیا تھا۔

مسز رزاق کو تعجب ہوا تھا کہ جودت محض کچھ پیسوں کے لیے وہاں آیا ہے۔۔۔؟ حالانکہ اتنے پیسے تو یقیناً اس کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے۔۔۔؟ جبکہ دوسری طرف جودت کا بھی برا حال تھا' مریم کی بات پہ وہ مسز رزاق کے سامنے شرمندہ ہو کے رہ گیا تھا۔

"لیجیے جودت صاحب۔۔۔! یہ آپ کے پیسے۔۔۔ پورے دو ہزار روپے ہیں' چیک کر لیں۔۔۔ اینڈ تھینکس اگین آپ نے مشکل وقت میں میری ہیلپ کی' میں آپ کا یہ احسان یاد رکھوں گی۔" مریم نے کافی سلیقے اور سمجھ داری سے سارا معاملہ کلیئر کر دیا تھا اور جودت ہاتھ میں پکڑے ہزار ہزار کے دو نوٹ دیکھتا رہ گیا تھا۔

"اوکے میڈم۔۔۔! میں چلتی ہوں اب۔۔۔ اٹینڈنس بھی لگوانی ہے' کلاس کا ٹائم ہو رہا ہے۔۔۔ اللہ حافظ۔۔۔" مریم انتہائی لاپروائی اور لاتعلقی کا مظاہرہ کرتی جودت کی سمت دیکھے بغیر وہاں سے چلی گئی تھی اور مسز رزاق کے پاس کھڑا جودت کچھ بھی نہیں کہہ سکا تھا۔

"ارے بیٹا۔۔۔! تم کھڑے کیوں ہو۔۔۔؟ بیٹھو نا۔۔۔" مس رزاق نے سر جھٹکتے ہوئے آداب میزبانی نبھائے تھے۔

"نو تھینکس آنٹی۔۔۔! میں بھی اب چلتا ہوں' جس کام کے لیے آیا تھا وہ تو ہوا نہیں۔۔۔ خیر پھر سہی۔۔۔" اس نے کندھے اچکائے تھے۔

"کیا مطلب۔۔۔؟ کس کام کے لیے آئے تھے۔۔۔؟" وہ ٹھٹکی تھیں۔

"نہیں۔۔۔! کچھ نہیں۔۔۔ اوکے اللہ حافظ۔۔۔" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے خدا حافظ کہہ کر وہاں سے باہر نکل آیا تھا لیکن کلاس رومز کے سامنے سے گزرتے ہوئے وہ ایک بار پھر ٹھہر گیا تھا۔

"ادھر آؤ۔۔۔!" اس نے سامنے کرسی پہ بیٹھے پیون کو اشارہ کیا تھا۔ "جی صاحب۔۔۔؟" وہ فوراً" اس کے قریب آیا تھا۔

"یہ لو۔۔۔! یہ تمہاری ٹپ ہے۔" جودت نے ہاتھ میں پکڑے دو ہزار روپے اسے تھمائے اور پیون اس کی اتنی عنایت پہ خوش اور حیران ہوا تھا۔ "مہربانی صاحب۔۔۔! بہت بہت مہربانی۔۔۔" پیون اس کا بے حد مشکور ہو رہا تھا۔

"مہربانی بعد میں۔۔۔ پہلے میرا پیغام پہنچا کے آؤ۔۔۔"

"پیغام۔۔۔؟"

"ہاں پیغام۔۔۔! مس مریم کے لیے۔۔۔"

"جی صاحب۔۔۔! کہیے ابھی پہنچا دیتا ہوں۔" پیون جی جان سے الرٹ ہوا تھا آخر دو ہزار کا تازہ تازہ تڑکا لگا تھا اسے۔۔۔

"اوکے۔۔۔! ان سے کہو آپ سے آج کی ملاقات اچھی رہی' میں آپ سے ملنے پھر آؤں گا۔" جودت نے انتہائی اطمینان سے پیغام دیا تھا اور پیون نے وہی پیغام جوں کا توں مریم تک پہنچا دیا تھا جس پہ مریم ایک بار پھر

پریشان ہو اٹھی تھی اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔۔۔!

☼ ☼ ☼

آج موسم بے حد سرد اور ابر آلود ہو رہا تھا۔ فضا میں گہری دھند کی ایک دبیز تہہ چھائی ہوئی تھی اور اس دھند میں بادل بھی جھکے آ رہے تھے۔ سیاہ بادلوں نے دن میں بھی رات کا سماں باندھ دیا تھا اور ایسے موسم میں زلفی کا بچکانہ من بچکانہ سی خواہش کرنے لگا تھا۔

"گل باجی۔۔۔! گل باجی۔۔۔! کہاں ہیں۔۔۔؟" زلفی گل کو پکارتا ہوا اندر آ گیا تھا کیونکہ گیٹ پہ اس وقت گلاب خان موجود تھا۔

"کہو۔۔۔؟ کیا بات ہے۔۔۔؟" گل کچن میں برتن دھو رہی تھی زلفی کی آواز سن کر وہیں سے جواب دیا تھا اور زلفی سیدھا اس کے پاس پہنچ گیا تھا۔

"گل باجی۔۔۔! وہ۔۔۔ وہ باہر بہت ٹھنڈ ہو رہی ہے۔۔۔" زلفی نے جیسے اطلاع دی تھی۔

"ہوں۔۔۔! وہ تو میں جانتی ہوں۔۔۔ کوئی نئی بات کرو' کرنی ہے تو۔۔۔؟" گل نے برتن دھو کر پانی کا نل بند کر دیا تھا اور برتن خشک کرنے لگی تھی۔

"وہ باجی۔۔۔! وہ بارش بھی ہونے والی ہے۔۔۔" زلفی کچھ کہنے کے لیے تمہید باندھ رہا تھا یہ بات گل فوراً" ہی بھانپ گئی تھی۔

"ہوں۔۔۔! میں یہ بھی جانتی ہوں۔۔۔ اس کے علاوہ کچھ۔۔۔؟" وہ سارے برتن باری باری خشک کر کے ایک سائیڈ پہ رکھتی جا رہی تھی۔

"وہ باجی۔۔۔! باہر ٹھنڈ بھی ہے' بارش بھی بس ہونے ہی والی ہے' تو ایسے موسم میں۔۔۔" وہ پھر کچھ کہنے سے رک گیا تھا اور گل اپنے چھوٹے بھائی کی اس جھجک پہ بے ساختہ نرمی سے مسکرا دی تھی۔

"ہوں۔۔۔! بولو کیا کھاؤ گے۔۔۔؟ سموسے' پکوڑے یا کچھ اور چیز۔۔۔؟" وہ برتن سمیٹ کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

"سچ باجی۔۔۔! تمہیں پتا چل گیا۔۔۔؟" زلفی خوشی سے چہکا تھا۔

"بے وقوف۔۔۔! بھائی کا دل کچھ کھانے کو چاہ رہا ہے تو بہن کو پتا نہیں چلے گا تو اور کس کو چلے گا۔۔۔؟" گل نے اس کے کندھے پہ چپت لگائی تھی۔

"اچھا۔۔۔! تو پھر تم بنا رہی ہو نا باجی۔۔۔؟" زلفی نے یقین کرنا چاہا تھا۔

"ہاں ہاں۔۔۔! بناتی ہوں' لیکن اپنے کچن میں' یہ صاحب کا کچن ہے' وہ آ گئے تو کیا سوچیں گے کہ ہم ان کے جانے کے بعد اس طرح عیاشی کرتے ہیں۔۔۔؟" گل کچن سے نکل آئی تھی۔

"لیکن صاحب ایسے نہیں ہیں گل باجی۔۔۔ وہ تو کھانا کھا رہے ہوں تو گلاب خان کو بھی اپنے ساتھ بٹھا لیتے ہیں۔۔۔" زلفی گل سے متفق نہیں تھا۔

"یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو زلفی۔۔۔! لیکن ہم کما اپنا رہے ہیں تو کھانا بھی اپنا ہی چاہیے تاکہ ضمیر زندہ رہے۔۔۔" اس نے دلیل دی تھی۔

"ہاں۔۔۔! تو میں کب کہہ رہا ہوں کہ ضمیر کو مار دو' تم اپنے کچن میں ہی بنا لو' لیکن بناؤ تو سہی۔۔۔" زلفی کو شاید بھوک لگی ہوئی تھی اسی لیے زیادہ اتاولا ہو رہا تھا۔

"ٹھیک ہے بناتی ہوں' سب کچھ بناتی ہوں' لیکن پکوڑوں اور چٹنی کے ساتھ نان بازار کے ہونے چاہئیں۔۔۔"

میرے بنانے تک تم بازار سے جا کر نان لے آنا۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔! وہ تو میں لے آتا ہوں لیکن کیا وہ پری بھی نان پکوڑے کھائے گی۔۔۔؟" زلفی جاتے جاتے ٹھہر گیا تھا۔

"پریاں نان پکوڑے نہیں کھاتیں پگلے۔۔۔" گل سمجھ گئی تھی کہ وہ علیزے کی بات کر رہا ہے۔

"لیکن باجی۔۔۔! مجبور اور قید پریاں سب کچھ کھا لیتی ہیں' کوڑے بھی اور پکوڑے بھی۔۔۔" زلفی کی بات بھی بجا تھی گل کو اتفاق کرنا پڑا تھا۔

"ہاں۔۔۔! یہ بھی ٹھیک کہا تم نے۔۔۔ مجبوری' مفلسی اور قید سب کچھ کروا لیتی ہے' پرستان کی پریاں بھی خاک میں مل جاتی ہیں۔" گل کا لہجہ دکھی سا ہو گیا تھا۔

"خیر چھوڑو باجی۔۔۔! اب رونے مت بیٹھ جانا' آج موسم اچھا ہے' آج اس پری کو ہنسانے کی کوشش کرتے ہیں۔۔۔" زلفی نے سر جھٹکا تھا۔

"دکھ دل کو جکڑ کے بیٹھے ہوں تو ہونٹ ہنسنے کا سلیقہ بھول جاتے ہیں میرے بھائی۔۔۔" گل نے ایک گہری سانس کھینچی تھی افسردہ اور اداس سی۔

"گل باجی۔۔۔! رہنے دو ہم کچھ بھی نہیں کرتے۔۔۔" زلفی بھی دھیما پڑ چکا تھا۔

"ارے نہیں نہیں۔۔۔! ہم اپنے ساتھ ساتھ تمہیں اداس نہیں کر سکتے۔۔۔ تم جاؤ گلاب خان سے پیسے لے کر نان لے آؤ۔۔۔"

گل نے فوراً "اداسی کا حصار جھٹک دیا تھا اور پھر اس کے اصرار پہ زلفی نان لینے چلا گیا تھا اور خود وہ کچن میں آ گئی تھی۔۔۔

✡ ✡ ✡

دل آور شاہ کورٹ سے فارغ ہوتے ہی سیدھا شوروم آیا تھا۔

یہ شوروم دل آور اور نبیل کی پارٹنر شپ پہ چل رہا تھا اس شوروم پہ دونوں نے برابر کے شیئرز انویسٹ کیے تھے' دونوں برابر کے حق دار تھے' لیکن دل آور کی کورٹ کی مصروفیت کی وجہ سے نبیل ہی شوروم کو زیادہ ٹائم دے رہا تھا اور دل آور کبھی کبھار ہی ٹائم دے پاتا تھا۔ لیکن آج کسی کام کے سلسلے میں نبیل کو اسلام آباد جانا پڑ گیا تھا اس لیے دل آور کو شوروم آنا پڑا تھا۔ اور وہ شوروم پہنچتے ہی اپنے سامنے موجود کسٹمر کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا اور ایسی ہی حیرانی اس کسٹمر کو بھی ہوئی تھی۔

"شاہ جی۔۔۔! آپ۔۔۔؟" انسپکٹر شہناز کو اچنبھا ہوا تھا۔

"ہاں جی۔۔۔! میں ہی ہوں۔۔۔ لیکن آپ یہاں کیسے۔۔۔؟ کہیں کوئی چھاپہ وغیرہ تو نہیں مار دیا ہمارے شوروم پہ۔۔۔؟"

دل آور نے بریف کیس ٹیبل پہ رکھتے ہوئے حیرت اور پریشانی کا مصنوعی اظہار کیا تھا۔

"یہ آپ کا شوروم ہے۔۔۔؟"

"جی۔۔۔! یہ چھوٹی سی گاڑیوں کی دکان ہماری ہی ہے۔۔۔" اس نے ہمیشہ کی طرح اتنے بڑے شوروم کو دکان کا نام دیا تھا۔

"لیکن شاہ جی۔۔۔!" آپ نے کبھی بتایا تو نہیں۔۔۔؟"

"فرصت ہی کب ملی ہے انسپکٹر صاحبہ۔۔۔؟"

"ہوں۔۔۔! اوکے تو پھر میں چلتی ہوں۔" انسپکٹر شہناز نے کرسی پہ رکھا اپنا بیگ اٹھا لیا تھا۔

"کیوں انسپکٹر صاحبہ۔۔۔؟ دکان پسند نہیں آئی۔۔۔؟" دل آور کے ذو معنی لہجے پہ انسپکٹر شہناز کے قدم تھم گئے تھے وہ اس کی سمت پلٹی تھی۔

"یہاں سے شاہ جی۔۔۔! دکان بھی پسند ہے اور "دکان دار" بھی۔۔۔ لیکن افسوس کہ اس دکان دار کا بھاؤ بہت اونچا ہوتا ہے' میرا پرس اس دکان سے خریدی ہوئی گاڑی کی قیمت افورڈ نہیں کر پائے گا۔" انسپکٹر شہناز نے مایوسی اور بے چارگی سے سر ہلایا تھا۔

"ہاہاہا۔۔۔! اگر دکان دار آپ سے یہ کہہ دے کہ پوری دکان ہی آپ کی ہے تو پھر۔۔۔؟" دل آور انسپکٹر شہناز کی بات پہ بے ساختہ قہقہہ لگا کے ہنسا تھا۔

"تو پھر یہ دکان دار کی کوئی نئی چال ہو گی' مجھ جیسے سادہ اور کمزور دل کسٹمر کو پھانسنے کے لیے۔" انسپکٹر شہناز نے اپنے شکوک و شبہات کا اظہار کیا تھا۔

"چال۔۔۔؟ آپ دکان دار کے اتنے خلوص اور اتنی محبت کو بھی چال سمجھ رہی ہیں۔۔۔ افسوس کہ آپ کے ذہن سے شک کے جراثیم نہیں جاتے۔" دل آور نے تاسف سے سر ہلایا تھا۔

"افسوس اور شک بھی تو اسی بات پہ ہے ناں شاہ جی کہ یہ دکان دار خلوص سے پیش آتا ہے' محبت سے نہیں۔۔۔! محبت سے پیش آئے تو یہ نگوڑی اپنی پوری زندگی کا ہی سودا نہ کر ڈالے۔۔۔؟" انسپکٹر شہناز نے آہ بھری تھی۔

"ارے۔۔۔! اس دکان دار کا بھاؤ اتنا مہنگا بھی نہیں ہے کہ بدلے میں گاہک کو اپنی پوری زندگی کا ہی سودا کرنا پڑ جائے۔" وہ مسکرایا تھا۔

"یہ آپ کہہ رہے ہیں ناں شاہ جی۔۔۔! کیونکہ آپ میری جگہ پہ نہیں ہیں' میری جگہ سے اپنے آپ کو دیکھیں تو۔۔۔!" انسپکٹر شہناز نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

"لگتا ہے موسم کا اثر ہے۔۔۔؟" دل آور نے دلچسپی سے کہا تھا۔

"آپ کسی موسم سے کم تو نہیں ہیں۔۔۔ آپ کا ہی اثر ہے اور جس پہ آپ اثر کر جاتے ہیں پھر اس پہ کوئی اور موسم اثر نہیں کرتا۔"

"وردی والوں کے منہ سے شاعرانہ باتیں۔۔۔؟ حیرت ہوتی ہے کبھی کبھی۔" دل آور نے مذاق کیا تھا وہ جان بوجھ کر انسپکٹر شہناز کو چھیڑ رہا تھا۔

"وردی والوں کے سینے میں بھی دل ہوتا ہے شاہ جی۔۔۔" انسپکٹر شہناز نے آہستگی سے کہا تھا۔

"کون سا دل۔۔۔؟ دل آور شاہ والا دل یا پھر محض سینے میں قید رہ کر دھڑکنے والا دل۔۔۔؟" اس نے پھر دلچسپی سے سوال کیا تھا۔

"جانے دیجیے شاہ جی۔۔۔! موسم پہلے ہی ابر آلود ہو رہا ہے۔۔۔" انسپکٹر شہناز نے سر جھٹکا تھا۔

"جانے دیا انسپکٹر صاحبہ۔۔۔! اور کوئی حکم" اس نے بڑی شرافت اور تابعداری کا مظاہرہ کیا تھا۔

"امی جان کے لیے گاڑی پسند کرنی تھی۔۔۔" انسپکٹر شہناز نے شوروم کے چمچماتے فلور پہ سجی گاڑیوں کو اک نظر دیکھا تھا۔

"موسٹ ویلکم۔۔۔! آپ گاڑی پسند کریں' گاڑی آپ کے گھر پہنچ جائے گی۔" دل آور نے ہاتھ سے گاڑیوں کی سمت اشارہ کیا تھا۔

"مجھے وہ آف وائٹ گاڑی پسند آئی ہے۔"

"اوکے۔۔۔! وہی گاڑی آپ کے گھر پہنچ جائے گی۔۔۔" دل آور نے سنجیدگی سے کہا تھا۔۔۔
"لیکن اس گاڑی کی قیمت۔۔۔؟ اس کی کیا ڈیل ہے آپ کی طرف سے۔۔۔" انسپکٹر شہناز نے جاننا چاہا تھا۔
"میں عورتوں کے ساتھ ڈیل نہیں کرتا۔۔۔" دل آور نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے انکار کر دیا تھا۔
"تو پھر۔۔۔" انسپکٹر شہناز کو حیرانی ہوئی تھی۔
"پھر یہ ڈیل آپ کو اس شوروم کے سیکنڈ اونر نبیل حیات کے ساتھ کرنا پڑے گی' کیونکہ فی الحال ہمارے پاس مینیجر وغیرہ کی سہولت نہیں ہے' اس لیے زیادہ تر ڈیلنگز ہمیں خود ہی کرنا پڑ رہی ہیں۔۔۔ لیکن آپ تسلی رکھیں آپ کے بجٹ کا پورا پورا خیال رکھا جائے گا۔"
آخر میں دل آور نے اسے تسلی دی تھی۔
"یقین تو نہیں آتا کہ آپ میرے بجٹ کا خیال رکھیں گے۔۔۔ لیکن خیر مان لیتی ہوں۔" انسپکٹر شہناز نے مایوسی سے کہتے ہوئے کندھے اچکائے تھے۔
"پھر وہی شک۔۔۔" دل آور کے شکوے پہ انسپکٹر شہناز بے ساختہ کھلکھلا کے ہنسی تھی۔
"آپ کے کام ہی شک والے ہوتے ہیں شاہ جی۔۔۔! آپ کے کیس کی فیس ہی اتنی بھاری ہوتی ہے کہ لوگوں کو آپ کے پاس آتے ہوئے سو بار سوچنا پڑتا ہے' پھر میں یہ کیسے مان لوں کہ آپ میرے بجٹ کا خیال رکھیں گے۔۔۔ اور مجھے کچھ ڈسکاؤنٹ دیں گے۔"
انسپکٹر شہناز جانتی تھی کہ دل آور کی فیس کلائنٹ کے کانوں سے دھواں نکال دیتی ہے۔۔۔ وہ شہر کا مہنگا ترین وکیل تھا۔
"دیکھیے انسپکٹر صاحبہ۔۔۔ میں اگر لوگوں سے بھاری فیس لیتا ہوں تو ان کو مایوس بھی نہیں کرتا' میرے ہاتھ میں دیے گئے کیس کی جیت بھی یقینی ہوتی ہے اور شاید آپ مومنہ بی بی کے کیس کو بھول گئی ہیں جس کی میں نے کوئی فیس نہیں لی بلکہ خود اس کیس پہ پیسہ لگا رہا ہوں تاکہ کسی غریب کو انصاف مل سکے اور ایسے انصاف میں کئی غریبوں کو دلا چکا ہوں بس میری فیس ان ہی لوگوں کے لیے بھاری ہوتی ہے جن کے والٹ میں روپے کم اور کریڈٹ کارڈز زیادہ ہوتے ہیں۔۔۔" دل آور نے انسپکٹر شہناز کی غلط فہمی دور کرنا چاہی تھی۔۔۔
"ارے شاہ جی۔۔۔! میں تو مذاق میں کہہ رہی تھی ورنہ آپ کو مجھ سے بہتر کون جانتا ہے بھلا۔۔۔ مجھے پتا تھا کہ آپ اوپن ہارٹڈ ہیں اس لیے تو مومنہ بی بی کو میں نے آپ کے پاس بھیجا تھا' ورنہ کسی اور کا خیال تو نہیں آیا مجھے۔۔۔؟" انسپکٹر شہناز نے بھی اپنی بات کی وضاحت کی تھی۔
"پھر میری بھاری فیس کی شکایت کیوں کرتی ہیں۔۔۔؟" دل آور نے خفگی سے کہا تھا۔
"میں نہیں کرتی لوگ کرتے ہیں۔۔۔" وہ مسکرائی تھی۔
"یعنی۔۔۔! آپ کے لیے لوگ اہم ہیں۔"
"لوگ جائیں بھاڑ میں شاہ جی۔۔۔ میرے لیے آپ اہم ہیں' میری بلا سے اس سے بھی زیادہ بھاری فیس لیں۔ مجھے کیا تکلیف ہے بھلا۔۔۔" انسپکٹر شہناز خفگی سے جھنجلا کے بولی تھی اور دل آور پھر قہقہہ لگا کر ہنسنے پہ مجبور ہو گیا تھا۔
"ہاں ہاں۔۔۔! کیوں نہیں۔۔۔ ایسی ہی ایک فیلڈ میں آپ خود بھی تو ہیں ناں۔۔۔؟ آخر زیرو میٹر گاڑیاں ایسے ہی تو نہیں خریدی جاتیں۔۔۔" دل آور کا اشارہ رشوت کی طرف تھا جس کو سمجھتے ہی انسپکٹر شہناز نے کانوں کو ہاتھ لگائے تھے۔
"توبہ شاہ جی۔۔۔! اب یہ الزام تو نہ دیں' ہماری حق حلال کی کمائی ہے۔"

"ہوں۔۔۔! ایسے ہوتی ہے تکلیف۔۔۔ جب کوئی ہماری حق حلال کی کمائی کو کوئی الزام دیا جاتا ہے۔۔۔" دل آور نے اسے آئینہ دکھایا تھا۔
"اوکے ایم سوری۔۔۔" انسپکٹر شہناز نے معذرت کی تھی۔
"نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے آپ بیٹھیے میں چائے منگواتا ہوں۔"
"نو تھینکس۔۔۔! چائے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے فی الحال کسی کام سے جانا ہے اور بارش اسٹارٹ ہونے سے پہلے مجھے یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"
"اوکے۔۔۔! جیسے آپ کی مرضی۔۔۔ باقی گاڑی کی قانونی کارروائی اور پیپرز وغیرہ آپ کل خود آئیں گی تو نبیل کروا دے گا' البتہ گاڑی پر میں سیل ٹیگ لگا دیتا ہوں۔" دل آور نے وہ گاڑی اس کے لیے بک کروا دی تھی انسپکٹر شہناز کی موجودگی میں ہی اس گاڑی پہ سیل کا ٹیگ لگا دیا گیا تھا اور پھر وہ وہاں سے نکل آئی تھی اور ابھی وہ انسپکٹر کو رخصت کر کے فارغ ہوا ہی تھا کہ اس کا سیل فون بجنے لگا تھا۔
اس نے سیل فون اٹھا کر دیکھا تو اسکرین پہ عبداللہ کا نمبر نظر آیا تھا جس پہ اس نے فوراً" کال ریسیو کی تھی۔
"السلام علیکم۔۔۔!" وہی کال ریسیو کرنے کا مخصوص اسٹائل۔
"وعلیکم السلام۔۔۔! کہاں ہو۔۔۔؟" عبداللہ نے چھوٹتے ہی استفسار کیا تھا۔
"شوروم میں۔۔۔!" اس کا جواب مختصر تھا۔
"اور نبیل صاحب۔۔۔؟ وہ کہاں ملیں گے اس وقت۔۔۔؟" عبداللہ کا لہجہ طنزیہ ہو رہا تھا۔
"اسلام آباد میں!" اس کا دوسرا جواب بھی مختصر تھا۔
"کیوں؟ اسلام آباد میں کیوں؟" عبداللہ کو حیرانی ہوئی تھی۔
"کام کے سلسلے میں!" اس کا تیسرا جواب بھی مختصر ہی موصول ہوا تھا۔
"اف یار! ایک تو میں تم لوگوں کے کام سے تنگ آ گیا ہوں کام کام کام ہر وقت کام یار کبھی کام کے علاوہ بھی کچھ کر لیا کرو۔"
"مثلاً"۔۔۔ کیا کریں۔" دل آور نے الٹا اس سے پوچھا تھا۔
"محبت کرو یار محبت! قسم سے یار مزا آ جاتا ہے محبت کر کے۔۔۔ محبت کرنے والے کام کرنا بھول جاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں محبت ہی کام ہے۔" عبداللہ نے جھٹ سے مشورہ دیا تھا مفت اور مفید!
"ہونہہ ملک صاحب۔۔۔! آپ ٹھہرے جدی پشتی رئیس اور جاگیردار آپ کا گزارہ' صرف محبت کر کے بھی ہو جاتا ہے' لیکن ہمارا گزارہ' صرف محبت سے نہیں ہو سکتا۔۔۔ ہمیں کام کرنا پڑتا ہے۔۔۔ آپ اب یہی فرق دیکھ لیں۔۔۔ آپ محبت کر کے شادی رچا کر بیوی کے ساتھ بڑے سکون سے گھر پہ آرام فرما ہیں اور انتہائی اطمینان اور تسلی کے ساتھ اپنے بیڈ روم میں بیٹھے یہ ابر آلود موسم' یہ دھند میں لپٹا دن اور یہ بھیگا دسمبر انجوائے کر رہے ہیں جبکہ ہم دونوں چھڑے چھانٹ بے چارے صبح صبح گھروں سے نکل کر کام کے لیے بھٹک رہے ہیں۔ کورٹ کچہری اور آفسز کے دھکے کھاتے پھر رہے ہیں' وہ اسلام آباد میں ٹھٹھر رہا ہے اور میں لاہور میں۔۔۔ کیونکہ آپ نہ بھی کام کریں گے تو گزارہ' ہو جائے گا' لیکن کام کیے بغیر ہمارا گزارہ' نہیں ہو گا۔"
دل آور کی بات پہ عبداللہ اپنا بے ساختہ امڈنے والا قہقہہ نہیں روک پایا تھا۔
"ہاہاہا۔۔۔! اسی لیے تو کہا ہے کہ تم لوگ بھی ایسا موسم گھر بیٹھے انجوائے کرنے کا سامان کر لو یعنی محبت کر لو۔"
"بس بس۔۔۔! رہنے دو۔۔۔ جب ہمارا دل چاہے گا ہم کر لیں گے تم اپنے مشورے اپنے پاس رکھو" دل آور نے مصنوعی غصے سے کہا تھا۔

"اوکے! نہ کرو محبت لیکن انجوائے تو کرلو" عبداللہ شرارت سے کہہ رہا تھا۔
"وہ کیسے ۔۔۔؟"
"وہ ایسے کہ نگارش آج کچن میں ہے اور وہاں سے طرح طرح کی خوشبوئیں آرہی ہیں' میں نے سوچا اکیلے حلق سے نہیں اترے گا۔ اس لیے تم لوگوں کو بھی بلا لیتا ہوں۔۔۔" عبداللہ نے اپنے فون کرنے کی وجہ بتائی تھی۔
"نو تھینکس یار! تم اکیلے ہی انجوائے کرو' مجھے یہاں کام ہے۔" دل آور نے بڑی سہولت سے انکار کر دیا تھا۔
"ایسی کی تیسی تمہارے کام کی اس نے اتنا سب کچھ اسپیشلی تم دونوں کے لیے بنوایا ہے سب ضائع چلا جائے گا کم از کم تم تو آسکتے ہو نا؟" عبداللہ غصے سے بھنا گیا تھا۔
"دل آور بھائی! میں نے یہ سب کچھ اس لیے بنایا ہے تاکہ آپ لوگ ہمارے گھر آسکیں ورنہ گھر میں یہ سب کچھ تو ہم روز ہی بناتے رہتے ہیں۔"
عبداللہ کے قریب سے نگارش بھابھی کی آواز ابھری تھی جو دل آور کو سیل فون کے ایئرپیس سے صاف سنائی دی تھی اور دل آور کے پاس مزید انکار کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔
"اوکے! میں آرہا ہوں۔" اس نے ہامی بھری تھی۔
"بھاڑ میں جاؤ مت آؤ تم میرے بلانے پہ نہیں اپنی بھابھی کے بلانے پہ آرہے ہو۔" عبداللہ کاٹ کھانے کو دوڑا تھا۔
"ظاہر ہے! بھابھی نے ہمارے لیے اتنی محنت کی ہے' اتنا کچھ بنایا ہے تو انہی کے لیے آئیں گے نا؟" دل آور نے جواباً اسے اور چڑایا تھا اور عبداللہ نے کھٹاک سے فون بند کر دیا تھا جس پہ دل آور بے ساختہ ہنسا تھا۔

٭ ٭ ٭

"علیزے بی بی۔۔۔! علیزے بی بی۔۔۔!"
وہ فرش پہ بچھے بستر پہ بیٹھی سردی سے ٹھٹھر رہی تھی اور اپنے ہاتھ پاؤں کمبل میں چھپانے اور گرم کرنے کی کوشش کر رہی تھی جب زلفی کی آواز پہ اس نے چونک کر دیکھا تھا۔۔۔
"تت ہم کون۔" اس کی آواز بھی ٹھٹھری ہوئی تھی۔
"مم' میں گل باجی کا بھائی ہوں بی بی جی! زلف خان نام ہے میرا مگر سب زلفی کہتے ہیں۔" وہ پری اس سے مخاطب تھی زلفی خود گڑبڑا گیا تھا۔
"گل کہاں ہے؟" علیزے اپنے آپ کو کنٹرول کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔
"وہ جی۔۔۔ وہ کچن میں ہے۔۔۔ باہر بارش ہو رہی ہے اور بہت ٹھنڈ بھی ہے اس لیے ہم لوگوں نے گھر پہ سموسے اور پکوڑے بنائے ہیں' باجی نے کہا کہ آپ کو بھی دے آؤں یہ آپ کے لیے ہیں۔۔۔" زلفی نے چھوٹی سی ٹرے نیچے فرش پہ علیزے کے قریب ہی رکھی تھی حالانکہ وہ یہ بات گول کر گیا تھا کہ یہ سموسے اور پکوڑے دینے کے بہانے اسے دیکھنے کے لیے آیا ہے' کیونکہ وہ جب سے آئی تھی زلفی نے اسے دوبارہ دیکھا جو نہیں تھا اور اب اسے دیکھ کر وہاں سے ہٹنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اسے اپنے صاحب پہ حیرت ہوئی تھی' ہیرے کو مٹی میں رول رہا تھا۔
"گل سے کہنا میرے پاس آئے۔۔۔" اس نے زلفی کو پیغام دیا تھا۔
"جی! ابھی بھیجتا ہوں۔۔۔" زلفی فوراً" سرہلاتے ہوئے پلٹ گیا تھا۔
اور علیزے کی نظریں اس ٹرے پہ ٹھہر گئی تھیں ایک پلیٹ میں سموسے تھے ایک پلیٹ میں پکوڑے تھے' ساتھ ہی چھوٹے سے باؤل میں چٹنی اور کیچپ تھا اور ایک اور پلیٹ میں اخبار میں کوئی چیز لپٹی ہوئی تھی وہ چیز کیا تھی یہ تو علیزے کو نہیں پتا تھا البتہ اس اخبار کے ٹکڑے پہ علیزے کی نظریں جم سی گئی تھیں۔۔۔
"وقار آفندی۔۔۔" اس نے اخبار کی سرخی میں نظر آتے نام کو زیر لب دہرایا تھا اور جب یقین ہو گیا کہ یہی نام لکھا ہوا ہے تو اس نے پلیٹ میں سے وہ اخبار کا ٹکڑا جھپٹ کر اٹھایا تھا جس میں سے دو تین نان پلیٹ میں گرے تھے اس اخبار میں نان لپیٹے ہوئے تھے جو زلفی جلدی میں یونہی اٹھا لایا تھا۔
"شدید ترین فالج کے شکار وقار آفندی کو کل صبح ہاسپٹل سے ڈسچارج کر کے گھر بھیج دیا جائے گا۔۔۔" علیزے کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ وہ بار بار اس سرخی کو پڑھ رہی تھی اور پھر پتھرا رہی تھی۔۔۔
"جی بی بی جی۔۔۔! آپ نے بلایا تھا مجھے؟" گل کی آواز پہ علیزے نے یکدم چونک کر دیکھا تھا۔
"گل! یہ' یہ اخبار' یہ اخبار کہاں سے آیا ہے کس ڈیٹ کا ہے یہ۔۔۔؟" علیزے تڑپ کے کھڑی ہو گئی تھی اس نے اخبار کا وہ چھوٹا سا ٹکڑا گل کے سامنے لہرایا تھا۔
"مجھے کیا پتا یہ اخبار کس ڈیٹ کا ہے بی بی جی۔۔۔ اس میں تو زلفی نان لپیٹ کر لایا تھا بازار سے۔۔۔" گل نے لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔
"مجھے۔۔۔ مجھے یہ پورا اخبار لادو کہیں سے پلیز گل مجھے یہ پورا اخبار لادو۔" علیزے اس اخبار کے ٹکڑے کو دیکھتے ہوئے رو پڑی تھی۔
"ارے بی بی جی! کیا ہو گیا ہے؟ ایسا کیا ہے اس اخبار میں؟" گل اس کو یوں تڑپ تڑپ کے روتے دیکھ کر پریشان ہو گئی تھی۔
"میرے بابا' یہ فالج کا اٹیک ہوا ہے اور' اور مجھے پتا ہی نہیں۔" علیزے روتی ہوئی فرش پہ دوزانو بیٹھ گئی تھی اور وہ اخبار کا ٹکڑا مٹھیوں میں دبوچ رکھا تھا جس پہ نہ ڈیٹ تھی اور نہ ہی اس سرخی کے نیچے دیا گیا حوالہ یا تفصیل تھی۔۔۔ کیونکہ نیچے سے اخبار پھٹا ہوا تھا بلکہ چاروں اطراف سے پھٹا ہوا تھا اور علیزے اس ٹکڑے کو دیکھ دیکھ کر رو رہی تھی' تڑپ رہی تھی وہ بھی بے بس تھی اور اخبار کا وہ پھٹا ہوا ٹکڑا بھی بے بس تھا!
"فالج کا اٹیک۔۔۔؟" گل بھی سن کر پریشان ہو گئی تھی۔
"گل! مجھے یہ اخبار لادو۔۔۔ پلیز گل۔۔۔ یہ اخبار لادو۔۔۔" علیزے بلک رہی تھی۔
"بی بی جی۔۔۔! مجھے پتا تو نہیں کہ یہ اخبار کون سا ہے؟ لیکن ایک خبر مجھے پتا ہے تقریباً" سارے ہی اخباروں میں آتی ہے آپ صاحب کے پرانے اخباروں میں سے دیکھ لیں۔۔۔ شاید مل ہی جائے۔۔۔؟" گل کا آئیڈیا برا نہیں تھا علیزے نے تڑپ کے دیکھا تھا۔
"پرانے اخبار؟ کک کہاں ہیں؟" وہ یکدم کھڑی ہو گئی تھی۔
"وہ کونے میں رکھی الماری میں پڑے ہیں اس سال کے سارے اخبار مل جائیں گے آپ کو۔۔۔" گل نے بڑی ذہانت کا ثبوت دیا تھا اور علیزے لپک کے اس الماری کی طرف بھاگی تھی اور پھر اگلے چند سیکنڈز میں وہ اخبارات سے بھری الماری فرش پہ الٹ چکی تھی' اسے پندرہ اور سولہ نومبر کے اخبار کی تلاش تھی اور اس تلاش میں اسے زیادہ دور نہیں جانا پڑا تھا چودہ نومبر سے چودہ دسمبر تک سارے اخبار اس کے سامنے تھے۔۔۔ اس کے پرتھ ڈے سے لے کر وقار آفندی کے پیرالائز ہونے تک کی تمام خبریں اخبار کی سرخیوں کی زینت بنی ہوئی تھیں اور علیزے سولہ نومبر کا اخبار ہاتھ میں آتے ہی دھاڑیں مار مار کر رونا شروع ہو گئی تھی۔
"بابا۔۔۔ یہ' یہ کیا ہو گیا ہے آپ کو؟" علیزے روتے روتے فرش پہ ہی دوہری ہو گئی تھی اس کے آنسو اخبار کے ڈھیر پہ گر رہے تھے اور اخبارات کے کاغذ گیلے ہوتے جا رہے تھے۔
"بی بی جی! سنبھالیے اپنے آپ کو۔۔۔ اس طرح رونے سے تو کچھ نہیں ہو گا نا؟" گل نے فرش پہ جھکی تڑپ

تڑپ کے روتی علیزے کو سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن علیزے کا دل غم سے چور تھا۔۔۔ اتنی جلدی کیسے سنبھل جاتی۔

✡ ✡ ✡

ملیں ہم کبھی تو ایسے کہ حجاب بھول جائے
میں سوال بھول جاؤں ' وہ جواب بھول جائے
وہ کسی خیال میں ہو اور اسی خیال میں ہی
کبھی میرے رستے میں وہ گلاب بھول جائے
تیری سوچ پہ ہو حاوی میری یاد اس طرح سے
کہ تو اپنی زندگی کا یہ نصاب بھول جائے

بارش دیوانہ وار برس رہی تھی۔

اور زری اندرونی مین ڈور کے سامنے والے حصے میں بڑے سے ستون سے ٹیک لگائے کھڑی بارش کی یہ دیوانگی بڑے دل سے ' بڑے دھیان سے دیکھ رہی تھی اور اس دیوانی بارش میں بھیگتے سبز لان ' سبز پودے اور رنگین پھول بھی اس کی توجہ اپنی طرف مبذول نہیں کرپا رہے تھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی وجد میں کھڑی ہو وہ وہاں ہو کر بھی وہاں نہیں لگ رہی تھی۔

اس کے دھیان ' اس کے گیان ' اس کی روح پہ دل آور شاہ کی حکمرانی تھی اور وہ اسی حکمران کے تابع کھڑی تھی ۔ اسے بس اتنی خبر تھی کہ بارش ہو رہی ہے ' اب اس بارش میں کیا کیا ہو رہا ہے۔؟ اسے ذرا بھی خبر نہیں تھی لیکن جیسے ہی اس دھواں دھار برستی بارش میں ان کے گھر کا گیٹ کھلا تھا اس کا عشق جی اٹھا تھا۔

کیونکہ آنے والا دل آور شاہ تھا اور زری کو لگا یہ دیوانی بارش اس پہ برس گئی ہو ' اس کا من بھیگ بھیگ گیا تھا۔

گاڑی پورٹیکو میں پارک کر کے وہ گاڑی سے اتر آیا تھا اور پورٹیکو سے مین ڈور تک آتے آتے وہ دھواں دھار بارش کی تیز بوچھاڑ سے اچھا خاصا بھیگ گیا تھا اور مین ڈور کے سامنے والے حصے کی چھت کے نیچے آتے ہی اس نے اپنی شرٹ اور اپنے بالوں پہ پڑنے والا بارش کی بوندوں کا پانی جھاڑنا شروع کر دیا تھا اور اپنے اس دھیان اور عجلت میں وہ ستون کے قریب کھڑی زری کو نہیں دیکھ پایا تھا۔ اور وہ تھی کہ اس کی اک اک حرکت اک اک جنبش پہ واری جا رہی تھی۔

دل چاہا اس کے چہرے ' اس کے بال ' اس کی شرٹ پہ گرنے والے بارش کے قطروں کو اپنے دوپٹے میں جذب کر لے اور دوپٹے کو مغرور کر ڈالے اپنی قسمت پہ اور اپنی اوقات پہ۔۔۔ لیکن دل نے تو بس چاہا تھا۔۔۔ اور چاہت کس کی پوری ہوتی ہے بھلا۔۔۔؟

اندر کی طرف بڑھتے دل آور شاہ کے قدم اپنے پیچھے ابھرنے والی آواز پہ ٹھٹک کر رک گئے تھے اس نے چونک کر اس آواز کے تعاقب میں دیکھا تھا اور اسے دیکھ کر وہ تھم سا گیا تھا۔

آج وہ بھی کچھ اور سے کچھ اور لگ رہی تھی دل آور شاہ کی نظریں حیران رہ گئی تھیں ' وہ ریڈ کلر کے خوب صورت ' دیدہ زیب اور جدید تراش خراش کے سوٹ میں ملبوس بلیک کلر کی لانگ جرسی پہنے ' خوب صورتی اور نفاست سے دوپٹہ اوڑھے سرخ گلاب کے پھولوں سی زری اس کے بالکل سامنے ہی تو کھڑی تھی اور دل آور شاہ اسے دیکھنے کی تاب نہیں لا پایا تھا اور ساختہ نظریں جھکا لی تھیں ' دل آور شاہ کی تیس سالہ زندگی میں ایسی کوئی عورت اور ایسا کوئی مرد نہیں تھا کہ جس کے سامنے اس کی نظریں جھکی ہوں ' سوائے ایک زرین ملک کے۔۔۔!

اس کی زندگی میں زری وہ واحد ہستی تھی جس کو دیکھتے ہوئے ہمیشہ ہی اس کی نظریں جھک جاتی تھیں جس طرح وہ اپنی کاٹ دار آنکھوں سے باقی سب کو دیکھتا اور گڑبڑا کے رکھ دیتا تھا اس طرح وہ اسے نہیں دیکھ پاتا تھا اس کے سامنے تو وہ ہمیشہ نظریں چرا کے اور کترا کے بات کرتا تھا ' بلکہ زری کے سامنے تو اس کا سر بھی جھک جاتا تھا اور گردن بھی۔۔۔!

بالکل ایسے جیسے اس وقت ہوا تھا دل آور نے سر بھی جھکا لیا تھا اور نظریں بھی ' کیونکہ اگر اس لمحے وہ نظریں اٹھا کر اسے دیکھ لیتا تو یقین کامل تھا کہ یا تو دل آور شاہ۔۔۔ دل آور شاہ نہ رہتا۔۔۔ یا زری۔۔۔ زری نہ رہتی۔۔۔ اس مختصر سے لمحے میں سب کچھ بدل سکتا تھا۔ دل بھی اور دنیا بھی۔۔۔ بس اک ذرا دیکھنے کی دیر تھی۔۔۔ اور وہ اس دیکھنے سے کترا گیا تھا۔۔۔ دامن بچا گیا تھا۔

"السلام علیکم۔۔۔! کیسی ہیں آپ؟" دل آور کو نظریں جھکانے کے باوجود ملاقات کے آداب نبھانے پڑے تھے۔

"اگر آپ دل کے طریقے سے پوچھتے تو میں آپ کو بتاتی کہ میں کیسی ہوں؟ لیکن آپ دنیاداری کے طریقے سے پوچھ رہے ہیں تو بتانا پڑے گا کہ اچھی ہوں ' ٹھیک ہوں ' خوش ہوں۔۔۔" زری کے لہجے اور الفاظ میں شکوے تھے ' شکایتیں تھیں ' گلے تھے ' لیکن اس نے تو جیسے سنے ہی نہ تھے۔

"یہ تو بہت خوشی کی بات ہے کہ آپ اچھی ہیں ' ٹھیک ہیں ' خوش ہیں ' انسان کو اور کیا چاہیے بھلا۔۔۔؟" دل آور نے سنجیدہ سے لہجے میں کہا تھا۔

"ہونہہ۔۔۔! انسان کو اور کیا چاہیے بھلا۔۔۔ یہ بھی بتا دوں یا سمجھ جائیں گے۔۔۔؟" زری ہنوز ستون کے ساتھ پشت لگائے دونوں ہاتھ اپنی جرسی کی جیبوں میں پھنسائے انتہائی سکون سے کھڑی اپنے سامنے کھڑے دل آور شاہ جیسے مجرم کو دیکھ رہی تھی جو اس کے دل کی عدالت میں کھڑا تھا اور اقبال جرم پہ تیار نہیں تھا۔

"میرا خیال ہے کہ بہت ٹھنڈ ہے یہاں ' ہمیں اندر چلنا چاہیے؟" دل آور اس کا سوال نظر انداز کر گیا تھا کیونکہ وہ جواب نہیں دینا چاہتا تھا۔۔۔

"وکیل صاحب! ٹھنڈ لگ رہی ہے؟ یا ڈر لگ رہا ہے؟" زری تو آج اس کے لیے دل آور شاہ ثابت ہو رہی تھی۔۔۔ نڈر اور رائل!

"ڈر اچھا ہوتا ہے!" شعلے اگلنے والے دل آور کا لہجہ اس لمحے بہت دھیما تھا۔

"بے وقت لگے تو برا بھی ہوتا ہے۔۔۔!" زری اپنے انداز و بیان پہ قائم تھی۔

"ڈر کا دوسرا نام عزت ہے۔۔۔ اس لیے آپ کے دل میں اور نظر میں یہ ڈر ہونا ہی چاہیے ' دوسرے لفظوں میں میرا مطلب ہے کہ عزت ہونی چاہیے ' جب ہم اپنے دل و نظر کا یہ ڈر اتارتے ہیں تو سمجھیں کہ عزت اتارتے ہیں۔۔۔ اور عزت اتارنا اچھی بات نہیں۔۔۔" اس نے دلیل دی تھی۔

"ہونہہ! صفائی دینا تو کوئی آپ سے سیکھے۔۔۔" زری کے انداز میں خفگی تھی۔

"کیا کروں۔۔۔؟ میرا تو کام ہی یہی ہے؟" دل آور کے لہجے میں تلخی کا رس تھا۔

"جانتی ہوں! آپ کا تو کام ہی یہی ہے ' پھر بھی الجھ رہی ہوں۔۔۔" زری نے سر جھٹکا تھا۔

"الجھنے سے بہتر ہے کہ کوئی کام کر لیں۔۔۔" اس نے مشورہ دیا تھا۔

"میں کام نہیں کرتی۔۔۔" اس نے لاپروائی سے جواب دیا تھا۔

"میں جانتا ہوں! آپ کام نہیں کرتیں ' آپ محبت کرتی ہیں۔" وہ سوچ کے رہ گیا تھا۔

"یہ بھی اچھا کرتی ہیں۔" اس نے لاپرواہی کا جواب لاپروائی سے ہی دیا تھا ' گویا جتانا چاہ رہے ہیں؟ وہ اسے

نظروں سے جانچ رہی تھی۔

"ہوں! عبداللہ انتظار کر رہا ہو گا" دل آور نے وہاں سے جانے کا جواز ڈھونڈا۔

"جائیے... ! ضرور جائیے... وکیل صاحب ویسے بھی یہاں بہت ٹھنڈ ہے... آپ کو لگ جائے گی..." زری نے اسے آزاد کیا تھا۔

"تھینک یو!" دل آور نے مزید کچھ بھی کہے بغیر اور بات کو طول دیے بغیر اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے قدم دوبارہ اندر کی سمت موڑ لیے تھے یوں جیسے اسے کٹہرے سے رہائی ملی ہو۔

"سنیے وکیل صاحب!" اس نے پھر پیچھے سے آواز دی تھی اور اس کے قدم دوبارہ رک گئے تھے۔

"اگر کوئی آپ کو اپنے دل کا وکیل کرلے تو کیا خیال ہے... کیس جیت جائیں گے یا ہار جائیں گے...؟" اس پگلی کے پگلے سوال تھے لیکن دل آور اس کے اس پگلے سوال پہ اس کی سمت پلٹا نہیں تھا بلکہ اس کی سمت پشت تھی۔

"ہار جاؤں گا..." اس کا جواب دو ٹوک تھا۔

"کیوں...؟ وکیل صاحب کیوں؟ میں نے تو سنا ہے آپ کوئی کیس نہیں ہارتے..." زری تڑپ ہی تو گئی تھی

"وہ دنیاوی کیس ہوتے ہیں... میں کسی دل کا کیس نہیں لڑ سکتا... مجھے یقین ہے کہ میں ہار جاؤں گا... اس لیے کوئی بھی مجھے اپنے دل کا وکیل نہ کرے..." اس نے انتہائی سنجیدگی سے حقیقت سے آگاہ کیا تھا اور زری چپ کی چپ رہ گئی تھی اور دل آور نے قدم آگے بڑھا دیے تھے۔

"وکیل صاحب! آپ ایک بار کوشش تو کرسکتے ہیں نا؟" اس کی کانپتی ہوئی آواز پھر اس کے قدموں کی زنجیر بنی تھی۔

"میں کوشش نہیں کرتا عمل کرتا ہوں۔"

"آپ عمل کریں اور ہار جائیں... یہ بھی تو نہیں ہو سکتا نا؟"

"ہماری زندگی میں کچھ کیس ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو ہم ہر صورت میں ہار جاتے ہیں کوشش کرکے بھی اور عمل کرکے بھی... کیونکہ یہ ہار مقدر میں لکھی ہوتی ہے جو ہمیں مل کر ہی رہتی ہے' چاہے جتنی بھی تیاری کرو' چاہے جتنی بھی تدبیر کرو..." دل آور نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی اور پھر اس کی سمت پلٹ کر دیکھے بغیر اندر چلا گیا تھا۔

زری کے قدم بے ساختہ پیچھے ہٹے تھے اور وہ ستون سے لگ گئی تھی وہ بے یقین سی ہوئی تھی تو بے چین وہ بھی ہو چکا تھا... نگارش بھابھی اور عبداللہ کے پاس ہو کر بھی وہ ان کے پاس نہیں تھا وہ تو باہر ہی ستون کے پاس کھڑا رہ گیا تھا... دل و جان سمیت!

☆ ☆ ☆

مغرب کا وقت تھا جب باہر دروازے پہ دستک ہوئی تھی۔

مریم اور عابدہ خاتون تو صبح سے ہی اس دستک کے انتظار میں تھیں' لیکن جیسے ہی یہ دستک ہوئی تھی ان دونوں ماں بیٹی کے دل دھڑک اٹھے تھے' کسی انہونی کے خیال سے ہی جسم کانپ گیا تھا' کیونکہ وہ دونوں ہی پہچان چکی تھیں کہ یہ دستک عدیل کی نہیں ہے۔

"آپ ٹھہریے... ! میں دیکھتی ہوں..." مریم نے عابدہ خاتون کو چارپائی سے اٹھتے دیکھ کر روک دیا تھا اور عابدہ

خاتون تو پہلے ہی اندر سے نڈھال تھیں مریم کے روکنے پہ جہاں کی تہاں رہ گئی تھیں۔

"کون ہے؟" اس نے دروازے کے قریب آکر پوچھا تھا۔

"میں ہوں شہریار! عدیل صاحب نے بھیجا ہے..." باہر سے شہریار کی تھکی تھکی سی آواز سنائی دی تھی۔

"شہریار...؟" مریم نے فوراً" ہی دروازہ کھول دیا تھا۔

"السلام علیکم!" شہریار نے احتراماً" نظریں جھکاتے ہوئے سلام کیا تھا۔

"وعلیکم السلام! عدیل بھائی کہاں ہیں؟" مریم کے انداز میں بے چینی تھی۔

"وہ... وہ اس وقت پولیس اسٹیشن میں ہیں' باؤ امتیاز نے انہیں جیل بھجوا دیا ہے' ہم صبح سے انہی کے لیے بھاگ دوڑ کر رہے تھے' لیکن بارش کی وجہ سے کوئی بھی کام سیدھا نہیں ہو سکا اور کل پھر سنڈے ہے' کل بھی کچھ نہیں ہو سکے گا۔"

شہریار اسے سمجھانے اور تسلی دینے کے لیے تفصیل سے بتا رہا تھا اور مریم بمشکل اپنے قدموں پہ کھڑی رہ سکی تھی۔

"اب' اب کیا ہو گا؟" اس کی آواز لرز رہی تھی۔

"آپ پریشان نہ ہوں' بس دعا کریں' اللہ سب بہتر کرے گا' ہم سب باؤ امتیاز کو منانے کی کوشش کر رہے ہیں' اگر وہ مان گئے تو عدیل صاحب فوراً" باہر آجائیں گے' ان شاء اللہ! مجھے پورا یقین ہے کہ اللہ بہتر سبب نکالے گا..." شہریار اسے تسلی دے رہا تھا لیکن مریم کا دل اتنی آسانی سے کیسے بہل سکتا تھا...؟ اسے سنبھلنے کے لیے چند منٹس چند سیکنڈز' چند گھنٹوں کی ضرورت تھی کچھ وقت درکار تھا' یونہی قدموں پہ کھڑے کھڑے کیسے سنبھل جاتی؟

"مریم! مریم! کیوں کھڑی ہو؟ کون ہے؟" وہ عابدہ خاتون کی آواز پہ چونک کے متوجہ ہوئی تھی۔

"جی امی! آرہی ہوں۔" اس نے اپنے اعصاب ٹھکانے پہ لاتے ہوئے پلٹ کر انہیں جواب دیا تھا۔

"اچھا! میں اب چلتا ہوں دوبارہ کوئی خبر ہوئی تو دوبارہ آؤں گا بلکہ جب تک عدیل صاحب گھر نہیں آتے ہیں آپ کی خیر خبر لینے کے لیے آتا ہی رہوں گا' آپ کو باہر کا کوئی بھی کام ہو مجھ سے کہیے گا' میں کردوں گا' آپ عدیل صاحب کی بہن ہیں تو میری بھی بہن ہیں۔ آپ کی عزت آپ کا احترام سر آنکھوں پہ..." شہریار نے اپنی خدمات پیش کی تھیں اور مریم اس کی مشکور ہو کر رہ گئی تھی۔

"تھینک یو... تھینک یو سو مچ! ایم سوری امی اور باقی گھر والوں کو ابھی اس مسئلے کا علم نہیں ہے اس لیے فی الحال آپ کو اندر نہیں بلا رہی' جس کے لیے میں بہت شرمندہ ہوں آپ سے..." مریم نے شہریار کے باہر کھڑے ہونے پہ معذرت چاہی تھی۔

"ارے! نہیں نہیں... میں اندر نہیں آسکتا... یہ مناسب نہیں ہے عدیل صاحب گھر پہ ہوتے تو اور بات تھی' لیکن ان کی غیر موجودگی میں نہیں۔" شہریار نے سمجھ داری کا ثبوت دیتے ہوئے خود ہی انکار کر دیا تھا اور پھر اسے خدا حافظ کہہ کر وہاں سے چلا گیا تھا۔

اور مریم دروازہ بند کرکے اندر آگئی تھی' عابدہ خاتون اسی کے انتظار میں بیٹھی تھیں' اسے واپس آتے دیکھ کر ان کی آنکھوں میں سوال اتر آئے تھے اور مریم کو اب ان سوالوں کے بہت محتاط اور مناسب طریقے سے جواب دینے تھے' ان کو سنبھالنا بھی تھا اور سمجھانا بھی تھا جو کہ بہت مشکل کام تھا۔

☆ ☆ ☆

صبح گھر سے نکلتے ہوئے وہ بہت فریش تھا۔

لیکن اس وقت واپسی پہ وہ بہت ڈسٹرب اور بوجھل لگ رہا تھا۔ اس کے قدم بہت تھکے تھکے سے لگ رہے تھے، یوں جیسے کوئی طویل مسافت طے کر کے آیا ہو اور اس کی یہ تھکاوٹ گلاب خان اور گل نے بھی محسوس کی تھی۔

"سلام صاحب!" گل نے آہستگی سے سلام کیا تھا۔

"وعلیکم السلام!" وہ بریف کیس اور موبائل ٹیبل پہ ڈالتے ہوئے خود صوفے پہ ڈھیر ہو گیا تھا۔

"صاحب جی! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" گل اسے دیکھ کر متفکر سی ہوئی تھی اسی لیے بے ساختگی میں پوچھ لیا تھا۔

"ہوں ٹھیک ہوں! بس ایک کپ چائے لا دو۔" اس نے اپنی ٹائی کی ناٹ کھولتے ہوئے شرٹ کا سب سے اوپری بٹن بھی کھول دیا تھا۔

"جی! ابھی لے کر آتی ہوں۔" وہ فوراً پلٹ کر چلی گئی تھی اور دل آور نے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر نکالتے ہوئے سگریٹ سلگا لیا تھا۔

"وکیل صاحب! آپ ایک بار کوشش تو کر سکتے ہیں نا؟" زری کی لرزتی کانپتی سی آواز اس کی سماعتوں پہ نقش سی ہو گئی تھی وہ اس کے سامنے تو اس سے دامن چھڑا لیتا تھا، لیکن اس کے بعد اس سے دامن چھڑانا بہت مشکل ہو جاتا تھا۔

اس نے اپنے ذہن کو مصروف کرنے کے لیے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کر لیا تھا اور ٹی وی کا والیوم انتہائی فل چھوڑ دیا تھا۔

"چائے صاحب جی!" گل اک کپ چائے منٹوں میں بنا کر لے آئی تھی۔ لیکن ٹی وی کے فل والیوم میں اس کی آواز سنائی نہیں دی تھی۔

"صاحب جی! یہ چائے لے لیں۔" گل صوفے کے قریب آ گئی تھی اور اس پہ نظر پڑتے ہی دل آور نے ٹی وی بند کر دیا تھا۔

"صاحب جی!" گل اس کے موڈ کے پیش نظر کچھ کہتے کہتے رک گئی تھی۔

"کہو؟ کیا کہنا ہے؟" وہ سمجھ چکا تھا کہ گل کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن اس کی وجہ سے چپ ہو گئی ہے۔

"صاحب جی! وہ۔۔۔ وہ علیزے بی بی بلا رہی تھیں آپ کو۔۔۔ انہوں نے کہا تھا آپ گھر آجائیں تو آپ کو پیغام دے دوں کہ آپ ایک بار ان سے مل لیں۔۔۔" گل نے اس کا پیغام پہنچایا تھا۔

"ہونہہ۔۔۔! اس سے کہو۔۔۔ آج تو اپنے آپ سے بھی ملنے کو دل نہیں چاہ رہا۔۔۔ تم سے کل ملوں گا۔۔۔" دل آور نے انکار کر دیا تھا۔

اور گل اس کا انکار لے کر چلی گئی تھی، لیکن علیزے آج پھر پہلے کی طرح بپھری ہوئی تھی اس نے دل آور شاہ کے انکار کو ذرا بھی کانوں پہ نہیں دھرا تھا۔

بیسمنٹ کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔۔۔ اخبار اس کے ہاتھ میں تھا۔۔۔ دل غم سے بوجھل اور دماغ غصے سے مشتعل ہو رہا تھا اور وہ غم و غصے سے پاگل ہوتی یونہی اخبار ہاتھ میں لیے بیسمنٹ کے کھلے دروازے سے دندناتی ہوئی باہر نکل آئی تھی اس وقت اس کا سارا ڈر اور خوف نجانے کہاں جا سویا تھا۔

وہ اس لمحے بہت نڈر اور بے خوف لگ رہی تھی وہ دل آور شاہ کے ہاتھوں مر جانے یا مار دینے کے درپے ہو رہی تھی اس کے تیور بہت جارحانہ تھے اور قدموں کا رخ ڈرائنگ روم کی طرف تھا۔

"ڈرائیور۔۔۔" وہ اسی طرح دندناتی ہوئی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تھی اور اپنی ذات کے بھنور میں ڈوبتے ابھرتے دل آور شاہ نے یکدم چونک کر دیکھا تھا وہ اس وقت صوفے پہ براجمان اپنی ہی سوچوں میں غلطاں سگریٹ

پینے میں مصروف تھا جب علیزے اس کی سوچوں میں خلل ڈالتی ہوئی شیشے کی ٹیبل کے اس پار عین اس کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی دل آور بیٹھا ہوا تھا لیکن اس نے اپنے سامنے کھڑی علیزے آفندی کو سرسری نظر سے مگر سر تا پا دیکھا تھا۔ اس کے سفید کبوتر سے پاؤں ننگے تھے وہ بغیر جوتوں کے بھاگتی ہوئی آئی تھی اور اس کا سر بھی ننگا تھا تیز رفتاری اور بے دھیانی میں ڈوپٹہ سر سے ڈھلکا ہوا تھا۔ دل آور نے ایسی لاپروائی اس کے سراپے میں پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی، وہ بڑا خیال رکھتی تھی اپنے دوپٹے وغیرہ کا۔۔۔ لیکن آج سارے خیال اور سارے خوف نجانے کہاں ترک کر آئی تھی؟

"کیوں آئی ہو؟" دل آور کی آواز گمبھیر اور لہجہ بوجھل ہو رہا تھا لیکن لہجے اور آواز میں ٹھہراؤ حد سے زیادہ تھا۔

"تم نہیں آئے اس لیے آئی ہوں!" اس نے کافی چبا کر کہا تھا۔

"میں نے کہا نا تم سے کل ملوں گا؟" اس نے اپنی بات دہرائی تھی۔

"کل تک اگر تم مر گئے تو؟" وہ غم و غصے سے یکدم چیخ اٹھی تھی۔

"تو کل تمہارے لیے جشن آزادی کا دن ہو گا۔۔۔" دل آور نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے لاپروائی سے جواب دیا تھا۔

"لیکن مجھے پتا ہے تم کل تک مرنے والے نہیں ہو۔۔۔" علیزے کبھی بھی اتنی سفاک نہیں تھی لیکن اس وقت حد درجہ سفاک ہو رہی تھی جی چاہ رہا تھا اسے ابھی کے ابھی موت کے گھاٹ اتار دے۔

"تم دعا کرو، شاید مر ہی جاؤں، تمہاری ہی دعا قبول ہو جائے۔۔۔" جس طرح علیزے حد درجہ سفاک ہو رہی تھی اسی طرح وہ حد درجہ عجیب ہو رہا تھا۔

"میری دعا میں اثر ہوتا تو تم اب تک زندہ نہ ہوتے۔۔۔" وہ غصے سے بپھر رہی تھی۔

"او یعنی! یہ بھی آزما چکی ہو۔۔۔" اس نے افسوس سے سر ہلایا تھا۔

"ہاں ہاں۔۔۔! سب آزما چکی ہوں۔۔۔ لیکن اللہ تم جیسے انسانوں کو موت بھی نہیں دیتا۔"

"ہوں! سچ کہہ رہی ہو۔۔۔" دل آور نے اس کی بات سے اتفاق کیا تھا۔

"تم اپنی بکواس بند رکھو۔۔۔ میں تمہاری بکواس سننے نہیں آئی۔۔۔ میں صرف یہ پوچھنے آئی ہوں کہ تم نے مجھے یہ کیوں نہیں بتایا کہ میرے پاپا اتنے شدید بیمار ہیں؟ ان پہ فالج کا اٹیک ہوا ہے؟ وہ پیرالائز ہو گئے ہیں؟ بتاؤ مجھے آخر کیوں نہیں بتایا مجھے؟" وہ اس پہ چیخ رہی تھی چلا رہی تھی اور وہ ہنوز ایک ہی پوزیشن میں بیٹھا بغیر کچھ کہے، کسی ریسپانس کے اسے دیکھ بھی رہا تھا اور اسے سن بھی رہا تھا۔

حالانکہ اس کا صرف ایک تھپڑ یا صرف ایک بات ہی اس کا سارا غصہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا کر کے اسے ہمیشہ کے لیے خاموش کروا سکتے تھے۔۔۔ مگر نہیں اس نے ایسا نہیں کیا تھا، کیونکہ وہ اس وقت واقعی ڈسٹرب تھا اور اس موڈ میں نہیں تھا کہ اس کے غصے کے جواب میں غصہ ہوتا۔۔۔ یا پھر اس کی اتنی بدتمیزی اور زبان درازی پہ اس کی زبان کھینچ لیتا۔۔۔ یا اسے مارتا پیٹتا اور سزا دیتا!

بلکہ وہ تو اتنا ڈسٹرب اور بوجھل تھا کہ آج علیزے آفندی کی ساری بدتمیزیاں اور ساری باتیں سنی ان سنی کر گیا تھا یوں جیسے سر کے اوپر سے گزر گئی ہوں اور یہ علیزے کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اس وقت ڈسٹربنس اور بوجھل پن کا شکار تھا۔

ورنہ ردعمل میں اس کے ساتھ کیا ہو سکتا تھا یہ بتانے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔

"بیٹھو! بیٹھ جاؤ۔۔۔ آرام سے بیٹھ کے بات کرو۔۔۔" اس نے سگریٹ کا آخری کش لینے کے بعد سگریٹ ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے کافی تحمل کا مظاہرہ کیا تھا اور اسے سامنے والے صوفے پہ بیٹھنے کا کہا تھا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے کہ یہ سب پڑھنے کے بعد بھی میں تمہارے ساتھ بیٹھ کر آرام سے بات کر سکتی ہوں؟" علیزے نے ہاتھ میں پکڑا اخبار شدت غضب سے دل آور کے چہرے پہ دے مارا تھا' جو سیدھا اس کے چہرے پہ ہی لگا تھا۔

اور یہ دل آور شاہ کی ڈسٹربنس' بوجھل پن اور شکستگی کی انتہا تھی کہ وہ اس کی اس حرکت پر مشتعل نہیں ہوا تھا' بلکہ یہ بھی سہہ گیا تھا۔

"دیکھو! ایک کام کرو۔ یا بیٹھ جاؤ' یا چلی جاؤ۔۔۔ لیکن مجھے تنگ مت کرو۔" دل آور نے کافی ٹھہرے ہوئے لہجے میں اسے سمجھانا چاہا تھا۔۔۔

"جو میں پوچھ رہی ہوں اس کا جواب کیوں نہیں دیتے؟ تم نے اتنے ظلم کیوں کیے ہیں؟ کیوں ہمارے گھر کو برباد کر دیا ہے؟ میرے پاپا کو پیرالائز کر دیا ہے تم نے۔۔۔ مجھے میری ہی نظروں میں گرا دیا ہے۔۔۔ میں کسی اور کو تو کیا اپنے آپ کو بھی منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی۔۔۔؟ صرف تمہاری وجہ سے' تمہارے کیے کی وجہ سے' آخر کیوں؟ کیوں بلیک میل کیا مجھے؟ استعمال کیا مجھے؟ آخر کیوں؟ ڈرائیور! کیوں۔۔۔؟ تم بتاتے کیوں نہیں۔۔۔؟" علیزے تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی اور چلا چلا کر پوچھ رہی تھی۔

"کل پوچھنا۔۔۔ کل بتاؤں گا۔۔۔" اس کا وہی ایک جواب تھا علیزے زچ ہو گئی تھی اس کے کل سے۔۔۔ اور وہ اطمینان سے ایک اور سگریٹ سلگا چکا تھا جس سے ایک گہرا کش لیتے ہوئے اس نے دھواں فضا میں چھوڑ دیا تھا اور علیزے کی نظروں کے سامنے دھوئیں کے مرغولے اڑتے ہوئے پورے ڈرائنگ روم میں پھیل گئے تھے۔

"کل نہیں! آج ابھی اسی وقت بتاؤ مجھے۔" اس نے ضد کی تھی۔

"کیا چاہتی ہو؟" اس نے ایش ٹرے میں سگریٹ کا گل جھاڑتے ہوئے پوچھا تھا۔

"میں اپنے تمام سوالوں کے جواب چاہتی ہوں۔۔۔ میں اپنا اور اپنے پاپا کا گناہ جاننا چاہتی ہوں۔۔۔" وہ اپنی بات پہ زور دے رہی تھی۔۔۔ اور اس کی اسی ایک تکرار سے تنگ آ کر اس نے گل کو بلا لیا تھا۔

"جی صاحب کہیے؟" وہ فوراً" حاضر ہوئی تھی۔

"دیکھو گل! اس سے کہو تنگ مت کرے۔۔۔ کل کا انتظار کرے۔۔۔ اس کی ہر بات فرصت سے سنوں گا۔۔۔ بس آج ٹھہر جائے۔" دل آور نے جیسے درخواست کی تھی اور گل بے چاری سر ہلا کے رہ گئی تھی۔

"جی صاحب۔۔۔! کہہ دیتی ہوں۔"

"مگر میں کچھ سننا نہیں چاہتی۔۔۔" وہ چلائی تھی۔

"گل! اسے یہاں سے لے جاؤ۔۔۔" دل آور کے ضبط اور برداشت بھی بلا کے تھے' گل کو حیرت اور اچنبھا ہوا تھا کہ صاحب نے اپنی برداشت سے بھی زیادہ برداشت کیسے کیا ہے۔۔۔؟

"میں یہاں سے نہیں نہیں جاؤں گی۔۔۔" وہ ٹس سے مس نہیں ہو رہی تھی بلکہ ڈٹ گئی تھی۔

"اوکے! میں چلا جاتا ہوں۔۔۔" دل آور اپنا سگریٹ کا پیکٹ' لائٹر' موبائل اور بریف کیس اٹھا کر سیڑھیوں کی سمت بڑھ گیا تھا۔

"ڈرائیور۔۔۔! ڈرائیور۔۔۔! پلیز میری بات کا جواب دے کر جاؤ۔" وہ پیچھے چیختی چلاتی رہ گئی تھی اور وہ اس کے سامنے ہی سیڑھیاں طے کر کے چلا گیا تھا اور اس کے جانے کے بعد بے بسی کے مارے وہ دھاڑیں مار مار کے روتی ہوئی نیچے قالین پہ ہی ڈھیر ہو گئی تھی اور گل ایک بار پھر اسے سمجھانے بجھانے میں لگ گئی تھی۔

آج اس کا غم حد سے سوا تھا۔۔۔ آج اپنے پاپا کی تکلیف بھلائے نہیں بھول رہی تھی اسی لیے تو وہ صبح سے تڑپ رہی تھی اور رو رو کر پاگل ہو رہی تھی لیکن اتنا رونے کے بعد بھی کوئی حل سجھائی نہیں دے رہا تھا۔۔۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔۔۔ گہرا گھور اندھیرا۔۔۔ اندھا اور پاگل کر دینے والا اندھیرا۔۔۔ اور دل آور شاہ تھا کہ اس گہرے اندھیرے میں آگہی کی ذرا سی کرن بخشنے پہ بھی تیار نہیں تھا اور وہ پوچھ پوچھ کے ہار گئی تھی۔۔۔!

☼ ☼ ☼

"کیا دل آور شروع سے ہی ایسا ہے؟" نبیل نے سامنے ٹیبل سے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے سوال کیا تھا۔

"کیا مطلب؟ شروع سے ہی؟" بتول شاہ نے اپنا کپ اٹھاتے ہوئے ناسمجھی سے دیکھا تھا۔

"مطلب کہ سخت' ضدی' غصیل اور ذہین بھی؟" نبیل یہ سوال دلچسپی سے پوچھ رہا تھا۔

"ہوں! ضدی اور ذہین تو وہ اس وقت سے ہے جب سے پیدا ہوا ہے لیکن سخت۔۔۔" نجانے کیوں وہ بتاتے بتاتے رک گئی تھیں۔

"لیکن۔۔۔؟" نبیل نے اس لیکن سے آگے بھی جاننا چاہا تھا۔

"لیکن سخت اور غصیل وہ تب ہوا تھا جب اس کے بابا کی ڈیتھ ہوئی تھی۔۔۔" بتول شاہ چائے کے کپ پہ نظریں جمائے بمشکل جواب دے پائی تھیں۔

"اوہ ایم رئیلی سوری آنٹی! میں نے انجانے میں آپ کو اداس کر دیا۔" نبیل نے بے ساختہ معذرت کی تھی اسے واقعی افسوس ہوا تھا۔

"اٹس اوکے بیٹا! یہ کوئی نئی بات نہیں ہے اداسی اور غم کے ساتھ تو بائیس سال پرانا رشتہ ہے اب تو احساس ہی نہیں ہوتا؟" انہوں نے افسردگی سے سر جھٹکا تھا اور نبیل چپ سا ہو گیا تھا۔

"کیا بات ہے بیٹا! چپ کیوں ہو گئے ہو؟ باتیں کرو نا' اتنا اچھا لگ رہا ہے' میرے لیے تو آج تم نہیں' سمجھو کہ میرا دل آور گھر آیا ہوا ہے۔۔۔" انہوں نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے نبیل کو شرمندگی اور افسوس کے حصار سے نکالنے کی کوشش کی تھی۔

"اور میرے لیے بھی آپ اس کی ماں نہیں' میری ماں ہیں۔۔۔" نبیل نے بھی جواباً" مسکرا کے کہا تھا۔

"ارے۔۔۔! یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے بیٹا! میں تم دونوں کی ماں ہوں' بلکہ تینوں کی' عبداللہ بھی تو ہے۔۔۔؟ وہ بھی تو میرا بیٹا ہی ہے نا؟" انہوں نے کافی خوشدلی سے کہا تھا اور نبیل مسکرا دیا تھا۔

"بیٹے تو آپ کے تین ہیں اور پوتے' پوتیاں ابھی ایک بھی نہیں۔۔۔ کبھی اس طرف غور کیا آپ نے؟" نبیل نے ایک اور دلچسپ سوال ڈھونڈ اٹھا۔

"بالکل۔۔۔! غور ہی غور ہے۔۔۔ بس اب وہ فرصت سے ملے تو اس سے بات کروں گی۔"

"کیسی بات۔۔۔؟"

"یہی کہ مجھے بیس اکیس پوتے پوتیوں کی ضرورت ہے' تم تین بیٹے ہو' سات سات بچے بانٹ لو مل کر اکیس ہو جائیں گے اور ان شاء اللہ اگلے سات سالوں تک میرا گھر ایک بھرا پرا گھر ہو گا۔۔۔ ساری تنہائی' اکیلا پن اور اداسی ختم ہو جائے گی۔۔۔" ان کے جواب پہ نبیل قہقہہ لگا کے ہنسا تھا۔

"ہاہاہا! آنٹی پہلے ہمارے لیے بیویوں کا تو انتظام کر لیں' تبھی آپ ہمارے بچوں کا یہ پولٹری فارم قائم کر سکیں گی۔۔۔" نبیل ان کی بات پہ خاصا محظوظ ہوا تھا۔

"انتظام میں نے کیا کرنا ہے؟ انتظام تو تم لوگ خود کرتے ہو عبداللہ نے کر لیا ہے۔۔۔ اب تم دونوں کی باری ہے" وہ خفگی سے بولی تھیں۔

"ان شاء اللہ! یہ باری بھی جلدی آ جائے گی۔۔۔" اس نے انہیں تسلی دی تھی۔

"کس کی؟" انہوں نے بے ساختہ پوچھا۔
"میری!" نبیل نے شرارت سے کہا تھا۔
"ارے واہ! لیکن کب؟" انہیں خوشی اور حیرانی ہوئی تھی۔
"خدا نے چاہا تو بہت جلد۔۔۔ نہ چاہا تو کبھی نہیں۔۔۔ بس ابھی سوچ میں ہوں' ارادے باندھ رہا ہوں کہ پیش قدمی کیسے کروں۔۔۔؟"
"گڈ گڈ۔۔۔! بہت اچھی بات ہے۔۔۔ بہت خوشی ہوئی ہے سن کر۔۔۔ اللہ تمہیں زندگی دے' خوش رکھے اور تمہاری مراد پوری کرے۔۔۔ آمین!" انہوں نے اسے دعا دی تھی۔
"آنٹی! ایک بات پوچھوں آپ سے؟" نبیل کے لب و لہجے میں سنجیدگی اتر آئی تھی۔
"سو بار پوچھو بیٹا! اجازت کی کیا ضرورت ہے؟"
"آپ اسے کتنا جانتی ہیں؟" نبیل کا سوال بہت عجیب تھا۔
"جتنا اپنے آپ کو جانتی ہوں!" ان کا جواب بہت مضبوط تھا۔
"تو پھر آپ اس کی کیفیت اس کے جذبات سے بھی واقف ہوں گی؟"
"آف کورس بیٹا! جانتی ہوں سب جانتی ہوں" ان کے انداز میں یقین تھا۔
اس کے دل میں کیا ہے؟ کس سے محبت ہے اسے؟" نبیل کے سوال میں تجسس تھا وہ دل آور کے بارے میں جاننا چاہتا تھا مگر کبھی بھی جان نہیں پایا تھا۔
"ہم تو ایسے پوچھ رہے ہو جیسے خود تو اسے جانتے ہی نہیں؟" بتول شاہ نے ذرا سے تعجب کا اظہار کیا تھا۔
"جی آنٹی! یہی سچ ہے وہ ہم سب کو جانتا ہے' لیکن ہم اسے نہیں جانتے' اس کے اندر کیا ہے؟ ہمیں علم نہیں ہے وہ ہم سے تو ہماری ساری سن لیتا ہے۔۔۔ لیکن ہمیں اپنی ایک بھی نہیں بتاتا۔۔۔" نبیل سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔
"یہ تمہاری کمزوری ہے یا اس کی؟"
"یہ ہماری کمزوری ہے' کیونکہ ہم اس کے دوست ہو کر بھی اسے کبھی نہیں جان پائے' حالانکہ جاننا چاہیے تھا۔۔۔" نبیل کو اپنے آپ پہ شکوہ ہوا تھا۔
"ارے نہیں بیٹا! کبھی کبھی کچھ نہ جاننا ہی بہتر ہوتا ہے کچھ باتوں کی پوشیدگی میں ہی بھلائی ہوتی ہے' لیکن تم پریشان مت ہو' وہ جس سے بھی محبت کرتا ہے' اس سے کئی گنا زیادہ وہ تم سے محبت کرتا ہے' تم بہت اہم ہو اس کے لیے' وقت آنے پہ سب کچھ بتا دے گا' تم لوگوں کو نہیں بتائے گا تو اور کس کو بتائے گا بھلا؟" بتول شاہ نے اسے سمجھایا تھا اور کسی بھی طرح کی بدگمانی دل میں لانے سے باز رکھا تھا۔
"جی آنٹی! اس میں تو کوئی شک نہیں ہے کہ وہ ہمارے لیے یا ہم اس کے لیے کتنے اہم ہیں اور کتنی محبت کرتے ہیں بلکہ اس کا خلوص اور اس کی محبت تو ناقابل بیان ہے اور کبھی کبھی تو مجھے فخر اور غرور ہوتا ہے وہ میرا دوست ہے۔۔۔" نبیل نے دل کی گہرائیوں سے اظہار کیا تھا۔
"اللہ یہ دوستی سلامت رکھے اور نظر بد سے بچائے۔۔۔"
"آمین!" وہ مسکرائی تھیں۔
"اچھا! آنٹی میں چلتا ہوں اب کافی ٹائم ہو رہا ہے۔" نبیل چائے کا خالی کپ واپس ٹیبل پہ رکھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔
"آج یہیں رک جاتے تو اچھا تھا۔۔۔" وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

"جی ضرور رک جاتا۔۔۔ لیکن مجھے کسی آدمی کے ساتھ ضروری کام ہے' ملنا ہے اس سے اور اس نے ساڑھے گیارہ بجے ہوٹل میں ملنے کا ٹائم دیا ہے اس لیے میں نے اسی ہوٹل میں روم بک کروالیا ہے رات وہیں ٹھہروں گا۔"
اس نے معذرت کی تھی۔
"تو پھر صبح ناشتا یہیں سے کرنا۔۔۔" انہوں نے دعوت دی تھی۔
"تھینکس آنٹی۔۔۔! صبح صبح ہی واپسی کے لیے نکل جاؤں گا' ان شاء اللہ ناشتا لاہور جا کر ہی کروں گا۔"
اس نے دوبارہ معذرت چاہی تھی۔
"کیوں۔۔۔؟ اتنی جلدی کیوں؟"
"بس وہ دل آور آج کل کورٹ کے کاموں میں بزی ہے اور ہمارے پاس مینیجر بھی نہیں' اس لیے سارا کام خود ہی دیکھنا پڑ رہا ہے۔"
"او کے۔۔۔! ٹھیک ہے پھر۔۔۔" انہوں نے اثبات میں سر ہلایا تھا اور نبیل ان سے مل کر واپس ہوٹل میں آ گیا۔۔۔ آدھے گھنٹے بعد اس کی اس آدمی کے ساتھ میٹنگ تھی اور یہ میٹنگ اگلے ایک گھنٹے کے بعد ختم بھی ہو گئی تھی' نبیل فارغ ہو چکا تھا' اس نے ٹائم دیکھا ساڑھے بارہ بج رہے تھے' وہ دن بھر کا تھکا ہوا تھا اس لیے تھوڑی دیر ریسٹ کرنے کا سوچا تھا لیکن ابھی وہ اپنے روم میں جانے کے لیے سیڑھیاں چڑھ ہی رہا تھا کہ اس کے قدم سیڑھیوں پہ ہی جمے رہ گئے تھے اس کی نظریں ساتھ والی سیڑھیوں کی سمت تھیں اور وہ سیڑھیوں کی ریلنگ پہ ہاتھ رکھے دم بخود سا کھڑا رہ گیا تھا اسے لگ رہا تھا جیسے وہ یونہی کھڑے کھڑے سیڑھیوں سے نیچے گر جائے گا۔

☼ ☼ ☼

"یس کم ان۔۔۔!" وہ اپنے کچھ ضروری سامان کی پیکنگ کر رہا تھا جب بیڈ روم کے دروازے پہ ہلکی سی دستک ہوئی تھی۔۔۔ وہ سمجھا کہ حرمت ہو گی' کیونکہ اس نے تھوڑی دیر پہلے حرمت کو چائے لانے کا کہا تھا۔
"چائے۔۔۔" وہ اپنا تولیہ' شیونگ کٹ' اور پرفیوم وغیرہ اٹیچی کیس میں رکھ رہا تھا جب کومل کی آواز پہ یکدم کرنٹ کھا کے پلٹا تھا۔
"آپ۔۔۔ آذر کو اپنے بیڈ روم میں کومل کی آمد کچھ عجیب لگی تھی کیونکہ اس کی اپنی فی میل کزنز کے ساتھ کبھی بھی اتنی بے تکلفی نہیں رہی تھی کہ وہ اس کے بیڈ روم میں آتیں یا پھر وہ یوں بلا جھجک ان کے بیڈ رومز میں جاتا۔ وہ سوائے علیزے کے باقی سب کے ساتھ ایک حد تک رہنے کا اور فاصلہ رکھنے کا عادی تھا اور اسے کومل کی یہ حد کراس کرنے کی بے تکلفی سخت ناگوار گزری تھی۔
"آپ کیوں آئی ہیں۔۔۔؟ میں نے تو حرمت کو چائے لانے کا کہا تھا۔۔۔؟" آذر نے مروتاً بھی اپنی ناگواری چھپانے کی زحمت نہیں کی تھی۔
"میں اپنی حویلی میں اپنے چچا زاد کزن کے بیڈ روم میں آئی ہوں کسی منصور حسین ڈرائیور کے بیڈ روم میں نہیں گئی کہ آپ کو ناگوار گزرے۔۔۔"
"کومل۔۔۔!" آذر نے یکدم غصے اور غضب ناکی سے دھاڑتے ہوئے ہاتھ اٹھایا تھا لیکن ایک لمحے کے ہزارویں حصے کی سوچ تھی جس نے اس کا ہاتھ فضا میں ہی روک دیا تھا' وہ اسے ایک زناٹے دار تھپڑ رسید کرتا اگر اس پہ یہ خیال حاوی نہ ہو جاتا کہ وہ ایک عورت پہ ہاتھ اٹھا رہا ہے۔۔۔؟ اور عورت بھی وہ جس پہ اس کا کوئی حق تھا نہ اختیار۔۔۔ کیونکہ وہ ماں تھی نہ بہن۔۔۔ بیوی تھی نہ بیٹی۔۔۔ اس لیے وہ صرف کزن ہونے کے ناتے اس پہ ہاتھ نہیں اٹھا سکتا تھا۔۔۔ لیکن کومل کو اس ادھورے تھپڑ کا مس اور درد اپنے گال پہ بڑی شدت سے محسوس ہوا

تھا یوں لگ رہا تھا جیسے آذر کے ہاتھ کی پانچوں انگلیاں اس کے چہرے پہ نقش ہو گئی ہوں۔۔۔ اور گہرا نشان چھوڑ گئی ہوں!

"مجھے خوشی ہوتی اگر آپ کے ہاتھ کا تھپڑ میرے چہرے کی زینت بن جاتا اور میرے چہرے کو رنگ بخش دیتا۔" کومل نے شکایتی لہجے میں کہتے ہوئے سر اٹھا کر اس کے چہرے کی سمت دیکھا تھا۔

"ایم سوری۔۔۔! آپ یہاں سے جا سکتی ہیں۔" اس نے اپنے ہاتھ کی مٹھی بھینچتے ہوئے ہاتھ پہلو میں گرا لیا تھا۔

"اٹس اوکے۔۔۔! میں یہاں سے چلی جاتی ہوں۔ مگر اتنا تو بتا دیں کہ آپ کو اتنی تکلیف کس بات پہ ہوئی ہے۔۔۔؟ میرے سچ بولنے پہ۔۔۔ یا پھر منصور حسین کے نام پہ۔۔۔؟" اس نے خاصے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا تھا۔

"دیکھیے کومل۔۔۔! اس وقت آپ اپنی لمٹس کراس کر رہی ہیں اور مجھے یہ چیز سخت ناپسند ہے' یہ بات آپ بھی جانتی ہیں۔"

"جانتی ہوں! بہت اچھی طرح جانتی ہوں' آپ کی ان تمام لمٹس کو بھی جانتی ہوں جو آپ کی آنکھوں کے سامنے ہی روندی جا چکی ہیں۔۔۔" کومل نے کافی چبا کر کہا تھا اور آذر اس کا لحاظ کرتے ہوئے چپ ہو گیا تھا۔

"میں آپ کے بیڈ روم میں نہیں آنا چاہتی تھی' لیکن مجبوراً" آنا پڑا!۔۔۔" اس نے تمہید باندھی۔۔۔ اور آذر نے بے ساختہ چونک کر دیکھا تھا۔۔۔

"سنا ہے آپ فرار ہو رہے ہیں۔۔۔؟" کومل کے لہجے اور الفاظ کی کاٹ ہنوز تھی۔۔۔

"کومل پلیز۔۔۔! اسٹاپ اٹ۔۔۔ اور برداشت نہیں کروں گا۔۔۔" آذر نے سختی سے اسے وارننگ دی تھی لیکن وہ باز آنے والی بھلا کب تھی۔۔۔؟

"یعنی کہ میں نے سچ سنا ہے؟" اس نے آذر کی سمت دیکھتے ہوئے استہزائیہ لہجے میں کہا تھا۔

"دیکھیے کومل۔۔۔! میں اپنے کام کے سلسلے میں جا رہا ہوں' وہ بھی صرف ایک ہفتے کے لیے اور سب کو بتا کر جا رہا ہوں' اچانک یا چوری چھپے نہیں جا رہا۔۔۔؟ اس لیے پلیز۔۔۔ آپ کو بلاوجہ خود سے مفروضے قائم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔۔۔ آذر نے اب بھی ناگواری کا اظہار کیا تھا۔۔۔

"بلاوجہ۔۔۔؟" اس نے بے ساختہ اچنبھے سے کہا تھا۔۔۔

اور اس سے پہلے کہ جواباً" آذر کچھ کہتا اتنے میں دانیال دروازہ دھکیل کر اندر چلا آیا تھا۔

"آذر۔۔۔! یہ دونوں فائلز بھی ساتھ رکھ لو' تمہیں بعد میں مسئلہ۔۔۔" دانیال کچھ کہتے ہوئے اندر داخل ہوا تھا مگر کومل کو وہاں دیکھ کر بات ادھوری رہ گئی تھی۔۔۔

"ایم سوری۔۔۔! میں نے بے وقت مداخلت کی۔۔۔" دانیال معذرت کرتے ہوئے واپس پلٹا تھا۔

"رکیے دانیال بھائی!" کومل نے اسے پیچھے سے آواز دی تھی اور پھر اس کے قریب آ کر چائے کے کپ کی چھوٹی سی ٹرے اس کے ہاتھ میں تھما دی تھی۔۔۔

"یہ چائے دیجیے ان کو۔۔۔ انہیں چائے کی طلب ہو رہی تھی۔۔۔ اور ساتھ میں ان سے یہ بھی کہیے کہ کسی کا غم منانا ہے تو حویلی میں رہ کر ہی منا لیں' کسی انگلینڈ یا امریکہ جانے کی ضرورت نہیں ہے' غم ہمیشہ غم ہی رہے گا چاہے کہیں بھی چلے جائیں۔۔۔؟" وہ کافی طنز اور تمسخر سے کہتی وہاں سے چلی گئی تھی اور آذر نے غصے سے دانیال کے ہاتھ میں پکڑی چھوٹی سی ٹرے کپ سمیت دیوار کے ساتھ دے ماری تھی۔۔۔

☆ ☆ ☆

آج ملک حق نواز کے ڈیرے پہ کسی جشن کا سا سماں تھا۔

کیونکہ آج ملک اسد اللہ صوبائی اور ملک حق نواز قومی اسمبلی کی سیٹ کے لیے نامزد ہوئے تھے اور یہ خوشی ان کے لیے بہت بڑی خوشی تھی۔۔۔ اور اس خوشی میں آج ملک حق نواز کے ڈیرے کی رونقیں عروج پہ تھیں ہر طرف عیش و عیاشی اور موج و مستی کا جہان آباد تھا کھانے پینے سے لے کر رت جگا منانے تک کا انتظام کیا تھا۔۔۔ لوگوں کے آنے جانے کا اور مبارک باد کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

ملک حق نواز اپنے علاقے کے کچھ دوستوں سے مبارک باد وصول کر رہا تھا جب ڈیرے کے احاطے میں ایک پولیس جیپ آ کر رکی تھی اور وہ چونک گیا تھا۔۔۔

"ملک حق نواز کہاں ہیں۔۔۔؟" ایس ایچ او جمال احمد نے ڈیرے کے کمی کو قریب بلایا تھا۔

"جی۔۔۔! وہ سامنے کھڑے ہیں۔۔۔" اس نے دائیں طرف اشارہ کیا تھا لیکن اتنے میں ملک حق نواز خود ہی قریب آ گیا تھا۔

"ایس ایچ او صاحب۔۔۔ آج کیسے زحمت کی آپ نے؟" اس نے ایس ایچ او جمال احمد سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا تھا۔

"ملک صاحب! آپ کے وارنٹ گرفتاری ہیں میرے پاس۔۔۔" جمال احمد نے وارنٹ نکال کر دکھائے تھے۔

"وارنٹ گرفتاری۔۔۔؟ مگر کس جرم میں۔۔۔؟" ملک حق نواز کے ماتھے پہ بل پڑ گئے تھے۔

"مومنہ بی بی کے ریپ کے جرم میں۔۔۔" جمال احمد کے بتانے پہ اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا تھا اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

☆ ☆

نبیلہ عزیز

دردِ دل

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نبیل حیات دو ہی بہن بھائی ہیں' مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے' وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پہ رنگ چکی ہے' جس کے پیش نظر فائزہ بیگم' نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں' لیکن مدحیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے' جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے' مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے' مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا' بے بسی اور مجبوری سے تنگ آ کر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے' لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے بازاؔمتیاز مل جاتا ہے' جو اسے کام کی آفر کرتا ہے' جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے' اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے' وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے' وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

داور آذر شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے' وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے' اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا' اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔

۲۶

چھبیسویں قسط

دن ڈوب رہا تھا اور شام کے سائے ڈھل رہے تھے۔

دن بھر کھیتوں پہ کام کرنے والے کسان اپنے بیوی بچوں اور اپنے مویشیوں کے ساتھ اس وقت واپس اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے، لیکن واپسی کے اس سفر میں دن بھر کی تھکن بہت واضح محسوس کی جا رہی تھی، سب کے قدم ست اور تھکے تھکے سے لگ رہے تھے یہاں تک کہ صبح سے اپنے کھونٹے سے جدا رہنے والے مویشی بھی اداس لگ رہے تھے اور اپنے مالک کے چھڑی سے ہانکنے پہ بڑی سستی سے قدم اٹھا رہے تھے، جس پہ ان کے مالکوں کا غصہ ان کی پیٹھ پہ اتر رہا تھا ایک دو چھڑی ان کی پیٹھ پہ پڑتی تو ان کے قدموں میں تیزی آجاتی تھی اور اس تیزی میں وہ اپنے سے آگے چلنے والے مویشیوں کو دھکیلتے ہوئے خود آگے بڑھنے کی کوشش کرتے تھے اور اس کوشش اور دھکم پیل میں ان کے گلے میں جھولتی گھنٹیاں بج اٹھتی تھیں اور شام ڈھلے فضا میں کسانوں کی مویشیوں کو ہانکنے کی مخصوص آوازیں اور مویشیوں کے گلے کی گھنٹیوں کا مخصوص شور گھروں میں بیٹھے افراد کو بہت دور سے ہی ان کی واپسی کا پتا دے رہے تھے۔

انسانوں اور جانوروں کے اس قافلے میں وہ بھی شامل تھی اور آہستہ قدموں سے گھر کی سمت گامزن تھی۔ کیونکہ دن بھر اس نے بھی کام کیا تھا۔ وہ بھی تھکی ہوئی تھی۔ اس کے قدم بھی ست تھے... بلکہ اس کی تھکن تو سب سے زیادہ تھی کیونکہ وہ کھیتوں میں کام کرنے کی عادی نہیں تھی اور اسی لیے اس قافلے میں سب سے پیچھے تھی۔

پچھلے دو روز سے اس کے ابا کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی انہیں بہت تیز بخار تھا اس لیے آج اماں انہیں ڈاکٹر کے پاس شہر لے گئی تھی اور چھوٹے تینوں بھائی اسکول چلے گئے تھے سو مجبوراً اماں کی تاکید پہ اسے کام پہ آنا پڑا تھا، حالانکہ اسے کھیتوں میں آنا اور کام کرنا بالکل اچھا نہیں لگتا تھا وہ ہمیشہ گھر پہ ہی رہتی تھی اور گھر کے کام کرنے کی عادی تھی لیکن آج اس کی سیاہ بختی اسے کھیتوں پہ لے آئی تھی۔

ان کا قافلہ بڑی موج میں رواں تھا جب بڑی دور سے آگے پیچھے تین گاڑیاں دھول اڑاتی ہوئی مغرب کی سمت بڑھتی نظر آئی تھیں اور اس قافلے کی موج میں بھگدڑ سی مچ گئی تھی سارا قافلہ منتشر ہو گیا تھا، سب کسانوں نے بڑی پھرتی سے اپنے اپنے مویشیوں کو بیچ راستے سے ہٹا کر راستہ صاف کر دیا تھا سارے قافلے والے دائیں بائیں دو حصوں میں تقسیم ہو چکے تھے اور اتنے میں وہ گاڑیاں بھی قریب آگئی تھیں اور آگے پیچھے تینوں گاڑیاں دھول اڑاتی ہوئی زناٹے سے پاس سے گزر گئی تھیں لیکن اتنی تیز رفتاری کے باوجود ملک حق نواز کی نظر پیچھے رہ گئی تھی وہ اپنی گاڑی کے پاس سے گزرنے والی لڑکی کو دیکھ چکا تھا اور دھول مٹی کا غبار چھٹنے تک اس کے اندر کا شیطان سرور میں آچکا تھا اس نے بے ساختہ گاڑی کو بریک لگوائے تھے۔ اور گاڑی بیک کرنے کا اشارہ کیا تھا۔

"یہ لڑکی کون ہے اچھو...؟" اپنی گاڑی کی فرنٹ سیٹ پہ بیٹھے ملک حق نواز نے گاڑی کے سائیڈ ویو مرر سے دیکھتے ہوئے ڈرائیور سے پوچھا تھا۔

"وہی ہے ملک صاحب...! چاچا بخشو کی بیٹی۔ جس نے آپ کو دیکھ کر اپنے گھر کا دروازہ بند کر لیا تھا۔" اچھو نے اسے یاد دلایا تھا۔

"مومنہ بی بی ولد محمد بخش...؟" ملک حق نواز نے خاصے مبہم لہجے میں اس کا نام لیا تھا۔

"جی... جی... پورا نام یہی ہے۔" اچھو نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"گاڑی سے اتر کر جاؤ اور اسے روک کر پوچھو کہ مومنہ بی بی آج کون سا دروازہ بند کرو گی...؟ کہاں چھپو گی آج...؟ اس کھلے آسمان تلے یا زمین کے اندر...؟" ملک حق نواز کے لہجے میں بے رحمی اور ظلم کی لپک تھی۔

"کیا مطلب ہے ملک صاحب...؟ کیا کوئی ارادہ ہے آج...؟" اچھو ٹھٹکا تھا کیونکہ ملک حق نواز کی آنکھوں کے رنگ ہی بدل چکے تھے۔

"ہاں یار...! ارادہ تھا تو نہیں... مگر بن گیا ہے۔ آج بڑی تھکن ہو رہی ہے۔" ملک حق نواز نے اپنی گردن کو بل دیتے ہوئے تھکن کا اظہار کیا تھا۔

"ملک صاحب...! تھکی ہوئی تو وہ بھی لگ رہی ہے...؟" اچھو نے آنکھ دباتے ہوئے کافی کمینگی سے کہا تھا۔

"ساری تھکن اتار دوں گا ہم ایک بار اسے لے کر تو آؤ۔" ملک حق نواز نے اسے اشارہ کیا تھا۔

"جی... جی... ملک صاحب...! ابھی... بس ابھی لے کر آتا ہوں... تھکن آپ کی ہو اور میں سامان نہ کروں...؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا...؟" ملک حق نواز کا نوکر اس سے بھی زیادہ خبیث تھا اور ایسی خباثت اور حرام کاریوں پہ چٹخارے لینا تو اس کی پرانی عادت تھی وہ فوراً گاڑی سے نیچے اتر آیا تھا اور مومنہ بی بی کی سمت بڑھا تھا۔

"سنو...!" اس نے پیچھے سے آواز دی تھی اور مومنہ بی بی کے قدم زمین نے جکڑ لیے تھے۔

"مومنہ بی بی...!" اب کی بار اس نے ذرا بلند آواز سے پکارا تھا اور مومنہ بی بی کے نام کی اس پکار پہ جیسے پورا قافلہ لرز اٹھا تھا۔ کیونکہ اس پکار کا مقصد گاؤں کا بچہ بچہ جانتا تھا... وہ بھی جانتی تھی۔ اسی لیے تو اس کا کلیجہ اچھل کر حلق میں آگیا تھا۔

"واپس آؤ...! تمہیں ملک صاحب بلا رہے ہیں۔" اتنے میں اچھو اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔

"کیوں... وہ کیوں بلا رہے ہیں...؟" اس نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے بڑی ہمت کا مظاہرہ کیا تھا۔

"تمہارے حسن کو خراج پیش کرنے کے لیے...!" اچھو نے مسکراتے ہوئے اسے سر تا پا ذو معنی نظروں سے دیکھا تھا اور مومنہ بی بی کا رنگ فق ہو گیا تھا اسے یوں لگا جیسے وہ کسی جنگل میں کھڑی ہو اور اس کے چاروں اطراف بھیڑیے غرا رہے ہوں، وہ ان کے ہاتھ آجاتی تو وہ اسے ایک جھٹکے میں ہی چیر پھاڑ ڈالتے، لیکن ان سے بچنے کے لیے اس کے پاس کوئی راستہ نہیں تھا۔ نہ زمین نگل کر اسے بچا سکتی تھی... نہ آسمان اسے اپنی وسعتوں میں سمیٹ کر محفوظ کر سکتا تھا... اور نہ ہی وہ قافلے والے اس کی عزت و آبرو کی حفاظت کر سکتے تھے جو آسمان اور زمین کی طرح بے بس اور لحظہ بہ لحظہ... قدم بہ قدم اس سے دور ہوتے جا رہے تھے اور اپنے پیچھے دھول چھوڑتے جا رہے تھے، وہی دھول جو بس کچھ ہی دیر میں اس کی عزت پہ پڑنے والی تھی اور اس کا صاف ستھرا دامن گرد آلود ہونے والا تھا۔

"میں نہیں جاؤں گی...!" اس نے ایک اور ہمت کی اور انکار کر دیا تھا۔

"اچھا...! تو پھر کہاں جاؤ گی...؟" اچھو نے استہزائیہ انداز میں کہتے ہوئے بھنویں اچکائی تھیں۔ اور مومنہ بی بی نے بے ساختہ مشرق کی سمت بڑھتے قافلے کی طرف دیکھا تھا۔

"اپنے گھر...!" اس کی آواز دھیمی مگر لہجہ ذرا مضبوط تھا جس پہ اچھو قہقہہ لگا کے ہنسا تھا جیسے اس کی خوش فہمی کا مذاق اڑایا ہو۔

"مگر کل صبح... یا پھر پرسوں صبح... وہ بھی اگر ملک صاحب کا دل بھر جائے تب...!" اچھو کی خباثت پہ وہ کپکپا کے رہ گئی تھی۔ اس کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے اور پورے جسم پہ چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں۔

"دیکھو مومنہ بی بی...! خواہ مخواہ وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے... ہونا تو وہی ہے جو ملک صاحب سوچ چکے ہیں... اس لیے آرام سے چل کر خود ہی گاڑی میں بیٹھ جاؤ...!" اچھو نے بڑی بے حسی اور لاپروائی سے اسے مشورہ دیا تھا لیکن اس دنیا میں کون ایسا انسان ہے جو جیتے جی خود جا کر قبر میں بیٹھ جائے...؟ اور اپنے اوپر منوں مٹی ڈال لے...؟ اور وہ بھی ایک انسان تھی۔ جو نہ خود جا کر قبر میں بیٹھ سکتی تھی اور نہ ہی اپنے اوپر منوں مٹی ڈال سکتی تھی۔ اسے زندگی بھی پیاری تھی اور عزت بھی... جس کے لیے اسے ہاتھ پاؤں تو مارنا ہی تھے، سو اس نے پوری

کوشش کی تھی اور وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی تھی۔
"لو۔۔۔! یہ اب اور تھکائے گی۔" اچھو نے خفگی سے سر جھٹکا تھا اور گاڑی میں بیٹھے باقی آدمیوں کو اشارہ کیا تھا جو اس کے ایک اشارے پر دندناتے ہوئے گاڑی سے اترے تھے، مومنہ بی بی کے تعاقب میں ان کے قدموں کی دھمک اور بھاگنے کی رفتار بہت تیز تھی۔

"ماسی برکتے۔۔۔! چاچا شرفو۔۔۔! رکو۔۔۔ خدا کے لیے مجھے بچاؤ۔۔۔" مومنہ بی بی نے اس بے بس قافلے میں موجود اپنے ہمسائے ماسی برکتے اور چاچا شرفو کو آوازیں دی تھیں، جو صبح اماں اور ابا کو کہہ کر آئے تھے

"آپ فکر نہ کریں، ہم ساتھ ہی تو ہیں مومنہ کون سا اکیلی کھیتوں پہ جا رہی ہے۔۔۔؟ آپ کی بیٹی ہے تو ہماری بھی بیٹی ہے اور عزت سانجھی ہوتی ہے۔" لیکن وہ اب اماں ابا کو کیسے بتاتی کہ عزت سانجھی نہیں ہوتی بلکہ عزت اپنی اپنی ہوتی ہے، سانجھی عزت کہنے والے کیا یونہی سر عام چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں؟

"ماسی برکتے۔۔۔! رک جاؤ۔۔۔ خدا کے واسطے مجھے بچالو۔۔۔" وہ پیچھے سے چلا رہی تھی، چیخ رہی تھی، پکار رہی تھی۔۔۔ اور وہ سب سن رہے تھے۔

سب جان رہے تھے لیکن رک نہیں رہے تھے۔ اس پہ کیا بیت رہی ہے۔۔۔؟ یا کچھ دیر بعد کیا بیتے گی۔۔۔؟ سب جانتے تھے، سب کو پتا تھا۔

ماسی برکتے کو بھی پتا تھا وہ بھی جانتی تھی۔ مگر مجبور تھی۔ کیونکہ ماسی برکتے کے گھر میں خود دو جوان بیٹیاں تھیں اور مومنہ بی بی کی مدد کرنے کی صورت میں خود اس کی بیٹیاں ملک حق نواز کے زیر عتاب آسکتی تھیں کیونکہ ملک حق نواز پہلے بھی ایسے ایک دو معاملے میں مدد کرنے والوں کو کڑی سزا سے نواز چکا تھا جس کے بعد سب نے کسی دوسرے کی مدد کرنے سے توبہ کرلی تھی۔ اور اسی لیے مومنہ بی بی کی چیخ و پکار کی طرف سے کان بند کرتے ہوئے اپنے میلے کچیلے دوپٹے سے آنسو پونچھتی ماسی برکتے آگے بڑھتی رہی اور وہ مسلسل پیچھے تڑپتی رہی تھی، مومنہ بی بی کے قدموں کے بھاگنے کی آواز اور اس کے پیچھے ان خونخوار درندوں کے بھاگنے کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ لیکن آخر کب تک۔۔۔؟ وہ کتنا اور کب تک بھاگ سکتی تھی۔۔۔؟ قدم ہار گئے تھے۔

بلکہ اس کے قدم نہیں اس کی قسمت ہار گئی تھی۔ بھاگتے بھاگتے اس کی چپل ٹوٹ گئی تھی اور پاؤں ٹوٹی ہوئی چپل میں الجھ کر مڑ گیا تھا اور وہ لڑکھڑا کے زمین پہ آگری تھی، دھول مٹی میں ہاتھ پاؤں اور کپڑے بھی اٹ گئے تھے اور ابھی وہ اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ درندوں کا وہ گروہ اس پہ حاوی ہوگیا تھا۔ انہوں نے اسے دبوچا اور گاڑی میں لا پھینکا تھا اور اس کی چیخوں سے وہ شام، وہ منظر، وہ کھیت، وہ مویشی اور وہ قافلے والے سب لرز اٹھے تھے۔

سنا ہے۔۔۔! جنگلوں کا بھی کوئی دستور ہوتا ہے۔۔۔
سنا ہے۔۔۔! شیر کا جب پیٹ بھر جائے تو
وہ حملہ نہیں کرتا،
سنا ہے۔۔۔! جب کسی ندی کے پانی میں
بئے کے گھونسلے کا گندمی سایہ لرزتا ہے تو
ندی کی رو پہلی مچھلیاں اس کو
پڑوسی مان لیتی ہیں،
ہوا کے تیز جھونکے جب درختوں کو ہلاتے ہیں
تو مینا اپنے گھر کو بھول کر
کوے کے انڈوں کو پروں میں تھام لیتی ہے

سنا ہے۔۔۔! گھونسلے سے جب کوئی بچہ گرے تو
سارا جنگل جاگ جاتا ہے
ندی میں باڑ آجائے
یا کوئی پل ٹوٹ جائے
تو کسی لکڑی کے تختے پر
گلہری، سانپ، چیتا اور بکری
ساتھ ہوتے ہیں،
سنا ہے۔۔۔! جنگلوں کا بھی کوئی دستور ہوتا ہے۔۔۔
خداوند۔۔۔! جلیل و معتبر، دانا و بینا، منصف و اکبر
ہمارے شہر میں بھی اب
جنگلوں کا ہی کوئی دستور نافذ کر۔۔۔!

☼ ☼ ☼

"ملک صاحب۔۔۔! ملک صاحب۔۔۔! ہوش میں آیئے ملک صاحب۔۔۔! ابھی آپ اس دنیا سے رخصت نہیں ہوئے، ابھی آپ اپنے ڈیرے پر ہی موجود ہیں، ابھی آپ نے اس دنیا میں دیکھا ہی کیا ہے۔۔۔؟ ابھی تو ہم نے آپ کو بہت کچھ دکھانا ہے۔۔۔ بڑے حساب کتاب دینے ہیں آپ نے۔۔۔ ابھی تو صرف بلاوا آیا ہے آپ کے لیے۔۔۔؟ رخصت تو آپ کو بڑے اہتمام سے کیا جائے گا۔" ایس پی کامران مہدی نے ایس ایچ او جمال احمد کے عقب سے نمودار ہوتے ہوئے کسی گہرے خیال میں ڈوبے ملک حق نواز کو اس خیال کی گہرائی سے باہر کھینچا تھا اور ملک حق نواز بری طرح چونک گیا تھا۔

"ایس پی کامران مہدی آپ۔۔۔؟" ملک حق نواز مزید ٹھٹکا تھا۔

"جی ملک صاحب۔۔۔! میں ہی ہوں، ایس پی کامران مہدی۔۔۔ دراصل جس روز آپ جیسی کسی معزز شخصیت کو اپنا مہمان بنانے کی زحمت دینا ہوتی ہے اس روز ہمیں خود خدمت میں حاضر ہونا پڑتا ہے، اب یہی دیکھ لیں آپ کو اریسٹ کرنے کے لیے محض ایک ایس ایچ او کو بھیجنا بھی تو مناسب نہیں تھا نا۔۔۔؟ اسی لیے آپ کا احترام کرتے ہوئے میں خود آیا ہوں اور میرے ساتھ آپ کے احترام میں پولیس فورس کی پوری چار گاڑیاں آئی ہیں اور آپ کے ڈیرے کو چاروں اطراف سے کور کرلیا گیا ہے، حالانکہ پتا بھی ہے کہ آپ کہیں بھاگنے والے نہیں ہیں، کیونکہ معزز لوگ بھاگا نہیں کرتے، مقابلہ کرتے ہیں، لیکن کیا کریں ملک صاحب مجبوری ہے، ڈیوٹی بھی تو نبھانی ہے آخر۔۔۔؟" ایس پی کامران مہدی نے ملک حق نواز کو باتوں باتوں میں سب باور کروا دیا تھا کہ اس کی کسی چال یا کسی چالاکی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

"لیکن میرے خلاف تو ایسا کوئی کیس نہیں تھا۔۔۔؟" ملک حق نواز نے انجان بننا چاہا تھا۔

"آپ "تھا" کو چھوڑیں ملک صاحب۔۔۔ "ہے" کی بات کریں۔۔۔ آپ کے خلاف کیس ہے تو بس ہے۔ اسی لیے تو کورٹ سے وارنٹ جاری ہوئے ہیں۔" ایس پی کامران مہدی نے سر جھٹکتے ہوئے کہا تھا۔

"لیکن جب تک کسی تھانے میں کیس درج نہ ہو تب تک کورٹ سے وارنٹ کیسے آسکتے ہیں۔۔۔؟" ملک حق نواز الجھ رہا تھا۔

"تو آپ سے کس نے کہا کہ تھانے میں کیس درج نہیں ہے۔۔۔؟" ایس پی کامران مہدی نے دلچسپی سے دیکھا

تھا۔

"میں خود کہہ رہا ہوں کہ میرے خلاف کسی بھی تھانے میں ایسا کوئی کیس درج نہیں ہے' میں پوری چھان بین کر چکا ہوں۔" ملک حق نواز اپنے اصلی رنگ اور اصلی حالت میں واپس لوٹ رہا تھا۔

"ملک صاحب۔! آپ سمجھتے ہیں کہ سیاست آپ جیسے جاگیرداروں اور رئیس زادوں سے شروع ہو کر آپ پہ ہی ختم ہو جاتی ہے' سیاست کے ساتھ تو آپ ایسے کھیلتے ہیں جیسے آپ کے ڈیرے کی باندی ہو' حالانکہ آپ یہ نہیں جانتے کہ جہاں آپ کی سیاست ختم ہوتی ہے وہاں سے ہم پولیس والوں اور وکیلوں کی سیاست شروع ہوتی ہے' آپ کے ڈیرے کی باندی کو ہم اپنی جیب میں لیے پھرتے ہیں' اور آپ کو کیا پتا کہ جب وردی والے اور کالے کوٹ والے ایک ساتھ ہو جاتے ہیں تو بڑے بڑے بادشاہوں اور حکمرانوں کا تختہ الٹ دیتے ہیں آپ تو کوئی چیز ہی نہیں ہیں' اس لیے آپ اپنے ذہن میں یہ بات اچھی طرح بٹھا لیں کہ پچھلی دس جنوری سے تھانے میں یہ کیس درج ہے اور اب جنوری سے دسمبر آگیا ہے' اس لیے آپ کا بلاوا بھی آگیا ہے' لہٰذا آپ کو شرافت کا لبادہ اوڑھتے ہوئے ہمارے ساتھ تھانے چلنا ہوگا' ورنہ بصورت دیگر ہمیں خود لے جانا بھی آتا ہے۔" ایس پی کامران نے بھی اسے اپنا اصل روپ دکھا دیا تھا تاکہ وہ کسی غلط فہمی یا خوش فہمی میں نہ رہے۔

"اس کیس کی پیروی کون کر رہا ہے۔؟" ملک حق نواز کا لہجہ سرد ہو چکا تھا۔

"بیرسٹر دل آور شاہ۔" ایس پی کامران مہدی کا جواب بھی سپاٹ تھا۔

"دل آور شاہ۔؟" ملک حق نواز جانتا تو پہلے سے تھا مگر اس وقت ایس پی کامران مہدی کے منہ سے دل آور شاہ کا نام سن کر اس کا خون کھول اٹھا تھا۔

"ہوں۔! تو یہ کارنامہ اس کا ہے۔؟" ملک حق نواز نے دانت پیسے تھے۔

"جی۔! یہ کارنامہ انہی کا ہے۔ اب ہو گئی تصدیق۔؟ اب چلیے۔ خوامخواہ ٹائم ویسٹ ہو رہا ہے۔" ایس پی کامران نے اشارہ کیا تھا۔

"ایس پی کامران مہدی آپ مجھے گرفتار کریں گے۔ مجھے۔؟" ملک حق نواز نے غصے سے اپنی سمت اشارہ کیا تھا۔

"کہا تو ہے ملک صاحب۔! مجبوری ہے۔ لیکن آپ بے فکر رہیں' میں آپ کو ہتھکڑی نہیں لگاؤں گا اور نہ ہی آپ کو دھکا دے کر آگے چلنے کا کہوں گا۔ بلکہ بہت ہی باعزت طریقے سے لے کر جاؤں گا' آپ چلیے تو سہی۔" ایس پی کامران مہدی نے ایس ایچ او جمال احمد اور دیگر پولیس اہلکاروں کو اشارہ کیا تھا جو ملک حق نواز کے دائیں بائیں آکر الرٹ کھڑے ہو گئے تھے گویا انہوں نے ملک حق نواز کو چلنے کا سگنل دیا تھا اور اسے چلنا ہی پڑا تھا۔ اور جاتے جاتے ایس پی کامران مہدی کے قدم نجانے کیوں تھم گئے تھے اس نے دائیں طرف ذرا ٹھہر کے دیکھا تھا۔

"ادھر آؤ۔!" اس نے ذرا فاصلے پر کھڑے آدمی کو اشارے سے پاس بلایا تھا۔

"جی ایس پی صاحب۔؟" وہ بڑے گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا تھا۔

"نام کیا ہے تمہارا۔؟" ایس پی کامران اسے خونخوار نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"جی۔! اشرف محمود۔" اس نے سر جھکاتے ہوئے بتایا۔

"عرف اچھو ہے نا۔؟" ایس پی کامران نے غضب ناکی سے پوچھا تھا۔

"جج۔ جی۔ عرف اچھو۔!" اس نے اعتراف کیا تھا۔

"افسر علی۔! کرو اس کی چھترول اور بٹھاؤ اسے گاڑی میں۔" ایس پی کامران نے سیدھا اس کے منہ پہ گھونسا رسید کرتے ہوئے اسے پولیس کانسٹیبل کے قدموں میں پھینکا تھا اور دو تین پولیس کانسٹیبل اس کی تواضع میں لگ گئے تھے جس پہ اچھو کے کراہنے کی آوازیں بہت دور تک گئی تھیں اور پولیس کانسٹیبلوں نے اسے مارتے مارتے یونہی گاڑی میں لا پھینکا تھا اور اس کے ملک حق نواز کو بھی سوار کر لیا گیا تھا' پولیس کی گاڑیوں کے روانہ ہوتے ہی ڈیرے پہ اور پورے گاؤں میں ایک ہنگامہ مچ گیا تھا۔

✡ ✡ ✡

"اب کیا ہوگا۔؟" ایمن اور ایمان دونوں عابدہ خاتون کی سمت دیکھتے ہوئے پریشانی سے بولی تھیں لیکن عابدہ خاتون کے پاس ان کے "اب کیا ہوگا" کا کوئی جواب نہیں تھا وہ خود اس حقیقت کو جاننے کے بعد ایک سوالیہ نشان کی مانند بت بنی بیٹھی تھیں' ان کا کلیجہ تو یہ سن کر پھٹ گیا تھا کہ ان کا بیٹا ورکشاپ میں کام کرتا رہا ہے' وہ بیٹا جسے اس کے باپ نے اتنی محنتوں اور مشکلوں سے پڑھایا لکھایا تھا' اچھی تعلیم دلوائی تھی۔ تو کیا اس اچھی تعلیم کے بعد بھی اس شہر کے کسی بھی آفس میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔؟

"بتایئے نا مریم آپی۔! اب کیا ہوگا۔؟ عدیل بھائی جیل سے باہر کیسے آئیں گے۔؟ ہم کیا کریں گے۔؟ ہمارا تو ان کے سوا اور کوئی بھی نہیں ہے۔؟" ایمان کا لہجہ روہانسا سا ہو رہا تھا وہ عدیل' مریم اور ایمن سے چھوٹی تھی ہم بھی بچپنا تھا' اسی لیے اتنی بڑی بات سن کر زیادہ گھبرا گئی تھی۔

"پلیز ایمان۔! آہستہ بولو۔ ساتھ والے کمرے میں اباجی ہیں' انہوں نے سن لیا تو وہ یہ سب نہیں سہہ پائیں گے۔" مریم نے ایمان کو اونچی آواز میں بولنے سے روکا تھا۔

"لیکن آپی۔!" اب کی بار ایمن نے کچھ کہنا چاہا تھا۔

"لیکن ویکن کو چھوڑو۔ بس دعا کرو کہ اللہ ہماری مدد کرے اور کوئی بہتر حل نکالے۔" مریم کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"کیا مطلب۔؟ تم کہاں جا رہی ہو۔؟" مریم کو چادر اوڑھتے دیکھ کر ان تینوں ماں بیٹی نے چونک کر دیکھا تھا۔

"فاطمہ کے گھر جا رہی ہوں۔! کیونکہ کوئی اور کرے نہ کرے وہ اس مشکل وقت میں ہماری مدد ضرور کرے گی۔" مریم چادر اوڑھ کر بیگ اٹھا چکی تھی۔

"لیکن بیٹا۔! تم اکیلی۔؟" عابدہ خاتون مزید پریشان ہوئی تھیں۔

"امی۔! اب ہم نے جو بھی کرنا ہے' اکیلے ہی کرنا ہے' یہ دنیا دار اور محلے دار آپ کی مدد کرنے کے لیے ہرگز نہیں آئیں گے' اس لیے آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے' آپ گھر سنبھالیں اور میں باہر سنبھالتی ہوں۔ اللہ حافظ۔!" وہ کہہ کر رکی نہیں تھی اور ان تینوں پہ اک طائرانہ سی نظر ڈالتی ہوئی باہر نکل گئی تھی اور وہ تینوں ماں بیٹی دعا کرتی رہ گئی تھیں۔

✡ ✡ ✡
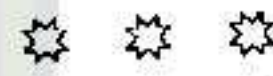
وہ گھر نہیں آیا تھا' اس کی لاش گھر آئی تھی' کیونکہ وہ اندر سے مر چکا تھا۔ وہیں اسلام آباد کے اس ہوٹل کی سیڑھیوں پہ جہاں اس نے اپنے باپ ممتاز حیات کو ایک لڑکی کے ساتھ بانہوں میں بانہیں ڈالے دیکھا تھا اور وہ اس لڑکی کے ساتھ کس طرز کی چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے۔ یہ دیکھ کر نبیل حیات جیتے جی مر گیا تھا اور مرنے کے بعد اس نے ان سیڑھیوں پر سے اپنی زندہ لاش کیسے ہٹائی تھی۔؟ یہ تو صرف وہ جانتا تھا یا پھر اس کی جان کا مالک رب جانتا تھا۔

اسی ہوٹل میں جہاں وہ رات ٹھہرا ہوا تھا اس کا باپ ایک لڑکی کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہا تھا یہی سوچ اور یہی

بات اس کے لیے سوہان روح ثابت ہو رہی تھی اسے اپنی رگوں میں دوڑتا خون اپنی ہی رگوں کو کاٹتا ہوا محسوس ہوا تھا' اس کی آنکھیں شدت ضبط سے سرخ ہو گئی تھیں وہ اپنے لبوں اور اپنے ہاتھوں کو بھینچتا ہوا بمشکل ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا' لیکن یہ بھی تو ضبط و برداشت سے باہر تھا نا کہ وہ بھی اسی ہوٹل میں قیام کرتا اور رات گزارتا۔۔۔ اسی لیے جب اس کے اختیار سے باہر ہوا تو وہ سب کچھ سمیٹ کے رات کے پونے دو بجے ہوٹل کا بل پے کر کے باہر نکل آیا تھا اور پھر باقی کی رات یونہی اسلام آباد کی سڑکوں پہ گاڑی دوڑاتے ہوئے گزر گئی تھی۔ وہ اس شہر جیسا پرسکون تھا لیکن اس وقت اسے نہ یہ شہر پرسکون لگ رہا تھا اور نہ اپنا آپ۔۔۔! اندر باہر ایک اذیت سی اذیت تھی' ایک عذاب سا عذاب تھا' سکون کا تو کہیں شائبہ تک نہیں رہا تھا۔

اور اسی بے سکونی اور اذیت کی آغوش میں آ کر اسے احساس ہوا تھا کہ مدحیہ کیوں تڑپتی تھی۔۔۔؟ کیوں رات دن کسی ان دیکھی آگ میں جلتی تھی۔۔۔؟ کیوں اسے کہیں چین نہیں آتا تھا۔۔۔؟ کیوں وہ بے کل پھرتی تھی۔۔۔؟ یہاں تک کہ وہ ضدی اور باغی ہو گئی تھی اور ہمہ وقت اس کے سر پہ سرکشی سوار رہتی تھی۔ وہ زندگی میں کبھی ممتاز حیات کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی اور آج ایسی ہی حالت اور کیفیت نبیل حیات کی ہو رہی تھی آج وہ بھی ممتاز حیات کی شکل نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ آج مدحیہ کی طرح اسے بھی اپنے باپ سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔۔۔ انتہا درجے کی نفرت۔۔۔ آج وہ بھی چاہتا تھا کہ زندگی میں کبھی دوبارہ اسے ممتاز حیات کی شکل دیکھنا بھی نصیب نہ ہو۔۔۔ کیونکہ اسے پتا تھا کہ اگر ایسا ہوا تو یقیناً وہ اپنے آپ پہ کنٹرول نہیں کر پائے گا۔ جیسے اس وقت اپنے آپ کو سنبھالنا اور کنٹرول کرنا مشکل ہو رہا تھا اور بالآخر تھک ہار کے اس نے گاڑی کا رخ لاہور کی سمت موڑ دیا تھا اور اسلام آباد سے لاہور تک کا سفر کیسے کٹا تھا۔۔۔؟ اسے کچھ خبر نہیں تھی۔ اسے بس یہ پتا تھا کہ وہ اسلام آباد میں بھی اذیت میں تھا اور لاہور آ کر بھی اس کی اس اذیت میں۔۔۔ رتی برابر بھی فرق نہیں آیا تھا وہ اپنی زندہ لاش کو گھسیٹتا ہوا گھر میں داخل ہوا تھا۔ صبح چھ بجے کا وقت تھا' ماحول میں خنکی حد سے سوا تھی' دسمبر کا مہینہ تھا' دھند روز بہ روز گہری ہوتی جا رہی تھی اور یہ دھند اور ٹھنڈ لوگوں کو بے حد ٹھٹھرا رہی تھی لیکن نبیل ایسی آگ میں جل رہا تھا کہ اسے یہ ٹھنڈ ذرا بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی وہ گاڑی سے باہر نکلا تو بھی اپنے آپ سے لاتعلق سا لگ رہا تھا۔

"سلام صاحب جی۔۔۔!" گھر کا مالی لپک کے پاس آیا تھا۔

"والسلام۔۔۔!" نبیل آہستگی سے جواب دیتے ہوئے آگے بڑھا تھا۔

"لائیے صاحب جی۔۔۔! میں کمرے تک چھوڑ آتا ہوں۔" اس نے نبیل کی تھکن کا خیال کرتے ہوئے اس کے ہاتھ سے کوٹ اور بریف کیس لینا چاہا تھا۔

"نو تھینکس۔۔۔! اس کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے انکار کر دیا تھا۔

"ٹھیک ہے صاحب۔۔۔! جیسے آپ کی مرضی۔۔۔" مالی فوراً" تابعداری سے سر ہلاتے ہوئے سامنے سے ہٹ گیا تھا اور نبیل اپنا کوٹ بازو پہ ڈالے' بریف کیس ہاتھ میں پکڑے بڑے تھکے تھکے اور شکستہ قدموں سے چلتا ہوا اندر آ گیا تھا اور ابھی سیڑھیاں طے کر کے اپنے بیڈ روم کی سمت بڑھا ہی تھا کہ اس کے قدم دوبارہ زمین نے جکڑ لیے تھے اور قدموں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا تھا وہ جہاں پہ تھے وہیں پہ ٹھہر جانا چاہتے تھے کیونکہ اسے ایسا محسوس ہوا تھا کہ جیسے اللہ نے اس کے مردہ قالب میں روح پھونک دی ہو اور اس کی زندہ لاش' زندہ وجود میں تبدیل ہو گئی ہو۔

کیونکہ اس کی بے سکون اور بے آرام سماعتوں کو قرآن پاک کی تلاوت کی آواز نصیب ہوئی تھی اور یہ روح کو شانت کر دینے والی آواز مومنہ بی بی کے کمرے سے آتی ہوئی سنائی دی تھی اور نبیل کو لگا کہ اس کی ذات پہ ایک سرور سا طاری ہو گیا ہو' وہ جو آگ میں جل رہا تھا وہ تن من سے ٹھٹھر کے رہ گیا تھا' اس کی رگ رگ میں ٹھنڈک اتر گئی تھی اور وہ مومنہ بی بی کے کمرے کے ادھ کھلے دروازے سے نظر آتے اس تسخیر کر لینے والے منظر کو اپنی

نظروں میں اتارنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

وہ سامنے قالین پہ قبلہ رخ جائے نماز بچھائے رحل میں قرآن پاک رکھے تلاوت کرنے میں مشغول تھی' بڑا سا سفید دوپٹہ اس نے اپنے چہرے اور سر کے گرد ایک ہالے کی صورت میں باندھ کر دوپٹہ پورے جسم پہ پھیلا رکھا تھا وہ اپنے آپ کو کافی اچھے طریقے سے اور سلیقے سے ڈھانپے ہوئے تھی نبیل کو محسوس ہوا جیسے قرآن پاک کے مقدس صفحات سے روشنی اور نور کی کرنیں پھوٹ رہی ہوں جو مومنہ بی بی کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھیں اور مومنہ بی بی کا چہرہ نور برسا رہا تھا جس پہ نبیل حیات کی نظر نہیں ٹھہر رہی تھی مگر پھر بھی وہ اسے دیکھے جا رہا تھا۔ اور اس دیکھنے میں اسے یہ بھی پتا نہ چلا کہ تلاوت ختم ہو گئی ہے۔

جبکہ مومنہ بی بی قرآن پاک جزدان میں لپیٹتے ہوئے چونک گئی تھی' اسے خود پہ کسی کی نظروں کا احساس ہوا تھا اور اسی احساس کے تحت اس نے گردن موڑ کر دروازے کی سمت دیکھا تھا اور نظروں کے اس تصادم پہ دونوں ہی ٹھٹک گئے تھے' نبیل ہوش و حواس میں واپس لوٹ آیا تھا۔

''نبیل صاحب آپ....؟'' وہ یونہی رحل اور قرآن پاک سینے سے لگائے' جائے نماز سے اتر کے ننگے پاؤں کمرے کی چوکھٹ میں آ رکی تھی۔

''ایم سوری....! میں ابھی اسلام آباد سے آیا ہوں' اپنے بیڈ روم میں جا رہا تھا کہ یہاں سے گزرتے ہوئے تلاوت کی آواز سن کے رک گیا۔'' نبیل نے شرمندگی سے سر جھکاتے ہوئے وضاحت دی تھی۔

''آپ شرمندہ کیوں ہو رہے ہیں نبیل صاحب....؟ میرے پاس ایسا کچھ نہیں ہے جس پہ آپ کو شرمندگی اور مجھے غصہ محسوس ہو.... جس پہ ایسا کچھ محسوس ہوتا ہے وہ تو میں ایک سال پہلے ہی گنوا چکی ہوں....'' مومنہ بی بی نے ذرا سی تلخی سے کہتے ہوئے سر جھکا تھا۔

''پلیز....! آپ ایسا تو مت کہیں.... اچھا نہیں لگتا....'' نبیل نے اسے منع کیا تھا کیونکہ وہ پہلے ہی رات بھر کا جلا ہوا تھا۔

''ہوں....! معافی چاہتی ہوں' آپ خود تھکے ہوئے آئے ہیں' میں نے خواہ مخواہ آپ کو پریشان کر دیا۔'' مومنہ بی بی نے فوراً معذرت کی تھی۔

''ایسی بات نہیں ہے....! بس جو آپ کہہ رہی ہیں' وہ غلط ہے۔'' نبیل نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا تھا۔

''چھوڑیں نبیل صاحب....! اس قصے کو رہنے دیں کہ کیا غلط ہے اور کیا نہیں....؟ آپ کو اس وقت آرام کی ضرورت ہے' آپ آرام کریں' زندگی کے یہ جھمیلے تو کبھی ختم نہیں ہوں گے....'' اس نے نبیل کو آرام کرنے کا مشورہ دیا تھا اور وہ شکریہ ادا کرتے ہوئے سامنے سے ہٹ گیا تھا۔

''سنیے....!'' اس نے پیچھے سے بے ساختہ پکارا تھا شاید اس لیے کہ وہ نبیل حیات کے قدموں کی تھکن بھانپ چکی تھی۔

''جی....؟'' وہ اپنے بیڈ روم کے دروازے میں جا کے پلٹا تھا۔

''چائے پئیں گے....؟'' نبیل کو اس لمحے وہ رمز شناس لگی تھی۔

''مل جائے تو انکار نہیں۔'' نبیل کو واقعی چائے کی طلب محسوس ہو رہی تھی' لیکن وہ اپنی ذہنی اذیت میں اس طلب اور اپنے سر درد کو بھی فراموش کیے ہوئے تھا۔

''میں ابھی لے کر آتی ہوں۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتی ہوئی اندر کمرے کی طرف پلٹی اور قرآن پاک احتیاط سے الماری میں رکھ کر نیچے کچن میں آ گئی تھی۔ وہ پچھلے چند دنوں سے خود ہی ملازمہ کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔ حالانکہ فائزہ بیگم اور مدیحہ نے اسے منع بھی کیا تھا' لیکن وہ ایک دیہاتی اور محنتی لڑکی تھی' گھر میں ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کے نہیں بیٹھ سکتی تھی اور یہی کہ کر اس نے انہیں مطمئن کر دیا تھا اور اب وہ وقتاً فوقتاً کچن کے کاموں میں بھی حصہ لے رہی تھی اور فائزہ بیگم اس کے سگھڑاپے اور طریقے سلیقے کی معترف ہو گئی تھیں۔ وہ بڑی نفاست سے کام کرتی تھی۔ اسی لیے انہیں اس کے ہاتھ کا کام پسند آیا تھا' اس کے ہاتھ میں لذت تھی' ذائقہ تھا' ہر چیز میں ماہر تھی وہ کھانے سے لے کر چائے بنانے تک.... اور اس کا اعتراف ان سب نے کیا تھا۔

وہ اپنے بیڈ روم میں آتے ہی اپنا کوٹ اور بریف کیس صوفے پہ ڈال کے خود بیڈ پہ ڈھیر ہو گیا تھا اور ابھی آنکھیں بند کی ہی تھیں کہ رات کا منظر پھر سے آنکھوں کے پردے پہ تازہ ہو گیا تھا اور اس منظر میں اسے ممتاز حیات اس لڑکی کے چہرے سے بال ہٹاتے ہوئے اور اس کے ہاتھ پہ بوسہ دیتے ہوئے نظر آئے تھے اور نبیل نے یک دم آنکھیں کھول دی تھیں اور اک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا تھا۔ وہ اپنے بالوں کو مٹھیوں میں جکڑے بیٹھا تھا جب دروازے پہ ہلکی سی دستک ہوئی تھی۔

''کم ان....!'' اس نے دستک پہ سر اٹھاتے ہوئے آہستگی سے اجازت دی تھی۔

''چائے....!'' اس نے پاس آ کر چھوٹی سی ٹرے میں رکھا کپ اس کی سمت بڑھایا تھا۔

''تھینک یو....!'' نبیل نے قدرے بوجھل انداز میں کہتے ہوئے کپ اٹھا لیا تھا۔

''کسی اور چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟'' وہ واپس پلٹتے ہوئے رکی۔

''ہوں.... ہے ضرورت۔'' نبیل نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

''جی کہیے؟'' وہ متوجہ ہوئی تھی۔

''مجھے نیند کی گولیوں کی ضرورت ہے۔ میں سونا چاہتا ہوں۔'' نبیل کی ضرورت سن کر مومنہ بی بی چونک گئی تھی۔

''نیند کی گولیاں....؟'' اسے اچنبھا ہوا تھا۔

''ہوں! نیند کی گولیاں.... تاکہ میں سکون سے سو سکوں۔'' وہ اپنی کنپٹیوں کو مسل رہا تھا۔

''لیکن نبیل صاحب! آپ تو تھکے ہوئے آئے ہیں' آپ کو تو خود بخود ہی نیند آ جائے گی' گولیاں کھانے کی کیا ضرورت ہے بھلا؟''

''میں جانتا ہوں نا! نیند نہیں آئے گی' آپ بس مجھے کچن سے گولیاں لا دیں۔'' اس نے خفگی سے کہا تھا۔

''جی بہتر....!'' وہ اس کے موڈ کے پیش نظر فوراً پلٹ گئی تھی اور پھر اسے کچن سے گولیاں لا کر دی تھیں' جن کے بعد وہ فوراً ہی سو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

مریم نے کافی دھڑکتے دل کے ساتھ ڈور بیل پہ ہاتھ رکھا تھا۔ کیونکہ وہ آج پہلی بار یوں اکیلی فاطمہ کے گھر آئی تھی۔ ورنہ پہلے جب بھی اس نے فاطمہ سے ملنے کے لیے آنا ہوتا تھا' عدیل اسے خود چھوڑ کے جاتا تھا یا پھر فاطمہ خود ان کے گھر آ جاتی تھی۔ اس لیے مریم کو کبھی بھی یوں اکیلے آنے جانے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی' لیکن آج مجبوری اور حالات نے یہ بھی کروا ہی لیا تھا اور وہ اکیلی آنے پہ مجبور ہو گئی تھی۔

''السلام علیکم میڈم!'' چوکیدار نے پہلی بیل پہ ہی گیٹ کھول دیا تھا۔

''وعلیکم السلام.... کیا فاطمہ بی بی گھر پہ ہیں؟''

''سوری میڈم جی.... فاطمہ بی بی تو بڑی بیگم صاحبہ کے ساتھ دبئی گئی ہوئی ہیں شاپنگ کے لیے۔'' چوکیدار نے معذرت کی تھی۔

”وہی۔۔۔؟“ مریم کے تو جیسے قدموں تلے سے زمین سرک گئی تھی۔ اس کی نظر میں تو یہی واحد امید اور آس تھی جس کے سہارے وہ عدیل کے لیے کچھ بھاگ دوڑ کر سکتی تھی‘ لیکن اب وہی واحد سہارا میسر نہیں تھا‘ تو وہ کہاں جا سکتی تھی؟ کیا کر سکتی تھی؟ اس کے اختیار‘ اس کے بس میں تو کچھ بھی نہیں تھا۔ حالانکہ وہ گھر سے سب کو تسلی دے کر نکلی تھی‘ لیکن اب۔۔۔

”جی ہاں۔۔۔ وہی۔۔۔“ چوکیدار نے دُہرا کے بتایا تھا۔

”کب گئی ہیں؟“ اس نے بمشکل خود کو سنبھالتے ہوئے پوچھا تھا۔

”جی۔۔۔ ایک ہفتہ پہلے۔“

”اور واپس کب آئیں گی؟“ اس نے پھر ذرا سی امید باندھی تھی۔

”جی۔۔۔ ایک ہفتہ اور لگ جائے گا۔۔۔ دو ہفتے کے لیے گئی ہیں۔“ چوکیدار کے جواب پہ مریم کا رو دینے کو دل چاہا تھا‘ کیونکہ اس کی آس ٹوٹی تھی‘ وہ مایوس ہوئی تھی‘ آگے کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا‘ ایسے میں اسے رونا نہ آتا تو اور کیا ہوتا‘ وہ وہاں سے قدم گھسیٹتی ہوئی واپس پلٹی تھی۔

✡ ✡ ✡

گلاب خان نے اسے دیکھتے ہی گیٹ کھول دیا تھا اور وہ گاڑی اک جھٹکے سے اندر لے آئی تھی۔ سامنے روش پہ کھڑا زلفی بھاگ کے پیچھے ہٹا تھا۔ ورنہ یقیناً ”گاڑی کے جھٹکے سے دور جا گرتا۔

”بھائی گھر پہ ہیں؟“ اس نے گاڑی سے اترتے ہی استفسار کیا تھا۔

”جی میڈم۔ صاحب گھر پہ ہی ہیں۔“ زلفی نے اپنی سانسیں ہموار کرتے ہوئے جواب دیا تھا۔

”اوکے۔۔۔ تھینک یو۔۔۔“ وہ سرہلا کر کہتی ہوئی کی چین گھماتی اندر کی سمت بڑھی تھی‘ لیکن پھر جاتے جاتے رک گئی تھی اور پیچھے مڑ کے دیکھا تھا۔ زلفی اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ مدحیہ کے پلٹ کر دیکھنے پہ سٹپٹا گیا تھا۔

”سوری۔۔۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ کوئی بالکل سامنے کھڑا ہوگا۔ شکر ہے تم بچ گئے۔“ وہ شرارت سے مسکراتی ہوئی کہہ کر اندر آ گئی تھی اور پیچھے زلفی ایسی حسیناؤں اور ان کی اداؤں کو سوچتا اور دیکھتا رہ گیا تھا۔

”السلام علیکم بی بی جی۔“ گل کچن سے نکل رہی تھی۔ مدحیہ کو آتے دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی۔

”وعلیکم السلام! کیسی ہو گل رانی؟“ مدحیہ نے مسکرا کے پوچھا تھا۔

”جی میں ٹھیک ہوں‘ اللہ کا بڑا کرم ہے۔“

”ہوں‘ اچھی بات ہے‘ بھائی کہاں ہیں؟ کہیں نظر نہیں آ رہے؟“ مدحیہ نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا تھا‘ کیونکہ ہر طرف خاموشی تھی۔

”جی۔۔۔ وہ اپنے بیڈ روم میں ہیں‘ آپ بیٹھیے‘ میں انہیں بلا کر لاتی ہوں۔“ گل نے کہتے ہوئے ڈرائنگ روم کی طرف اشارہ کیا تھا۔

”تھینک یو۔۔۔ تم بیٹھو‘ میں انہیں بلا کر لاتی ہوں۔“ مدحیہ دلچسپی سے کہہ کر سیڑھیوں کی سمت آ گئی تھی اور اگلے چند سیکنڈ میں وہ اس کے بیڈ روم کے دروازے پہ دستک دے رہی تھی۔

”یس کم ان۔۔۔“ اندر سے اس کی سنجیدہ سی آواز سنائی تھی۔

”گڈ مارننگ!“ وہ آہستگی سے دروازہ دھکیل کر اندر آ گئی تھی اور وہ جو بڑے مصروف سے انداز میں تیار ہو رہا تھا‘ اچانک مدحیہ کی آواز سے چونک گیا تھا۔

”ارے مدحیہ! میری جان‘ میری گڑیا‘ تم یہاں۔“ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے اس کی سمت بڑھا اور بڑے

والہانہ انداز میں اس کا سر اور اس کے گال تھپکے تھے۔ اسے حقیقتاً ”مدحیہ کی آمد پہ بہت خوشی ہوئی تھی۔

”جی ہاں! آپ کو خود تو کبھی خیال نہیں آ سکتا‘ اسی لیے میں نے سوچا کہ آج سنڈے ہے‘ آج چھاپہ مارتی ہوں‘ یقیناً ”پکڑے جائیں گے۔“ مدحیہ کی بات پہ اس کا بجھا بجھا‘ بوجھل سا ذہن ایک دم فریش ہو گیا تھا اور وہ قہقہہ لگا کے ہنسا تھا۔

”ویسے تمہیں دیکھ کر میں بھی یہی سوچتا ہوں کہ تمہیں پولیس لائن میں ہونا چاہیے تھا۔ آئے روز لوگوں کی شامت آتی رہتی۔“ وہ دلچسپی سے کہہ رہا تھا۔

”اف۔۔۔ ایسا سمجھتے ہیں مجھے؟“ مدحیہ نے مصنوعی خفگی سے دیکھا تھا۔

”ارے! اس سے بھی زیادہ سمجھتا ہوں‘ آخر بہن ہو میری‘ میں اگر لوگوں کے ساتھ رعایت نہیں برتتا‘ تو تم نے بھلا کب رعایت برتنی تھی؟“ دل آور نے اسے وضاحت دی تھی۔

”ہاں۔۔۔ یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں‘ برے لوگوں کو تو میرا بھی معاف کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ دل چاہتا ہے سولی پہ لٹکا کے ماروں۔“ مدحیہ نے دانت کچکچائے تھے۔

”گڈ! میں بھی یہی چاہتا ہوں‘ خیر چھوڑو‘ یہ بتاؤ ناشتا کرو گی؟“ وہ اپنے کف لنکس بند کرتے ہوئے بولا تھا۔

”آف کورس! اپنے بیڈ روم سے نکل کے سیدھی یہیں آئی ہوں۔“ اس نے کندھے اچکائے تھے۔

”چلو! پھر آ جاؤ نیچے‘ ناشتا کرتے ہیں۔“

”ٹھہر جائیں ابھی مجھے اپنا بیڈ روم تو دیکھنے دیں۔“ مدحیہ اب بیڈ روم کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

”میری جان! میرے بیڈ روم میں کیا رکھا ہے بھلا؟ سادہ سا تو ہے۔“

”ابھی تک اس بیڈ روم کی مالکن نہیں آئی؟ اس لیے۔۔۔ سادہ ہے‘ جب وہ آئے گی تو سج جائے گا‘ چار چاند لگ جائیں گے اسے۔“

”اس بیڈ روم کی مالکن؟“ وہ زیر لب دہرا کے رہ گیا تھا۔

”جی ہاں۔۔۔ اس بیڈ روم کی مالکن۔۔۔ میری بھابھی اور آپ کی بیوی۔“ مدحیہ چہک کر بولی تھی۔

”ہوں‘ ویسے ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ جو دل کی مالکن ہو‘ وہی بیڈ روم کی بھی مالکن ہو۔“ دل آور نے سر جھکا دیا۔

”واٹ۔۔۔ یہ کیا بات ہوئی بھلا؟“ مدحیہ کو جھٹکا لگا تھا۔ وہ اس کے ساتھ اس کے بیڈ روم سے نکلتے نکلتے رک گئی تھی۔

”یہی تو اصل بات ہے میری جان! اندر اور باہر کے مالک الگ الگ ہوتے ہیں اور یہ ریت تو شروع سے چلی آ رہی ہے‘ کوئی تن کا حکمران اور کوئی من کا حکمران‘ کسی کا تن پہ اختیار اور کسی کا من پہ اختیار‘ مقدر کے سکندر ہوتے ہیں وہ لوگ جن کے اندر اور باہر کا مالک ایک ہوتا ہے‘ صرف ایک‘ ورنہ بڑے بڑے بادشاہوں اور فقیروں کو بھی اس اندر اور باہر کی تقسیم میں بٹے ہوئے دیکھا ہے اور یہ تقسیم انسان کو کہیں کا بھی نہیں چھوڑتی‘ انسان نہ اندر کا رہتا ہے‘ نہ باہر کا‘ اور نہ ہی اپنے آپ کا۔۔۔ کیونکہ کبھی من حاوی ہو جاتا ہے اور کبھی تن‘ کبھی من فقیر‘ کبھی تن فقیر۔۔۔ کبھی من بادشاہ‘ کبھی تن بادشاہ اور اس بادشاہی اور فقیری کے چکر میں انسان نڈھال ہو جاتا ہے‘ کیونکہ انسان بھی آخر کیا کرے؟ تن بھی اس کا اپنا اور من بھی اس کا اپنا‘ لیکن ان دونوں میں سے خوش کس کو رکھے؟ اندر کو یا باہر کو؟ فیصلہ بہت مشکل ہے یار۔“ دل آور کے لہجے میں سنجیدگی اور بات میں گہرائی تھی۔ مدحیہ ٹھٹک کر اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

”کیا بات ہے؟ کیا دیکھ رہی ہو؟ ایسا کچھ غلط تو نہیں کہا میں نے؟“ دل آور نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا تھا۔

"ہوں... نن... نہیں... کچھ نہیں۔" اس نے چونکتے ہوئے نفی میں گردن ہلائی تھی۔

"تو پھر چلو! ناشتا تیار ہو چکا ہوگا۔" دل آور نے کافی بشاشت کا مظاہرہ کیا تھا۔

"چلیے..." وہ آہستگی سے کہتی اس کے ساتھ نیچے ڈائننگ روم میں آ گئی تھی اور دل آور نے خود کرسی پہ بیٹھنے سے پہلے مدحیہ کی سائیڈ پہ آ کر اسے کرسی نکال کے پیش کی اور اس کے بیٹھنے کے بعد خود جا کر اپنی کرسی پہ بیٹھا تھا۔

"اس گھر میں آج دوسری بار میں کسی کے ساتھ بیٹھ کر ناشتا کر رہا ہوں، پہلے اماں کے ساتھ اور آج تمہارے ساتھ، ورنہ ہمیشہ اکیلے ہی اپنی تنہائی کے ساتھ بیٹھ کر ناشتا کیا ہے۔" دل آور کا لہجہ عجیب سا ہو رہا تھا، مدحیہ نے ذرا ٹھہر کر اسے دیکھا تھا۔

"تو آپ مما کو یہاں کیوں نہیں لے آتے؟ وہ بھی اکیلی رہ رہی ہیں اور آپ بھی؟"

"مدحیہ... لاہور بے شک ہمارا آبائی شہر ہے، لیکن پھر بھی یہ شہر ہمیں کبھی راس نہیں آیا اور وہ یہاں آ کر مزید کچھ کھونا نہیں چاہتیں۔"

"بھائی...! ایک بات پوچھوں آپ سے؟" مدحیہ نے بمشکل خود کو یہ سوال پوچھنے کے لیے تیار کیا تھا۔

"ہوں... پوچھو۔" اس نے سنجیدگی سے اجازت دی تھی۔

"بابا کی ڈیتھ کیسے ہوئی تھی؟ مرڈر سے یا...؟" مدحیہ نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا تھا اور سوال بھی ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ لیکن مدحیہ کا یہ سوال دل آور کی پوری ہستی کو دھواں دھواں کر کے رکھ گیا تھا اور اس کے چہرے کی رنگت پہ لہو رنگ حاوی ہو گیا تھا۔ لیکن سامنے مدحیہ تھی اور اسے خود کو کنٹرول کرنا ہی تھا اور اس کے سوال کا جواب بھی دینا تھا... کیونکہ وہ سب کو ٹال سکتا تھا، لیکن اسے نہیں...

"سوسائٹ سے..." اس نے صرف اتنا سا لفظ ادا کرنے کے لیے بمشکل اپنے جبڑے کو حرکت دی تھی۔

"سوسائٹ سے..." مدحیہ ششدر سی رہ گئی تھی، کیونکہ وہ شروع سے ہی یہی سمجھتی آ رہی تھی کہ دل آور بھائی کے بابا کی ڈیتھ مرڈر سے ہوئی تھی۔ سوسائٹ کا تو اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا اور نہ ہی کبھی یہ سوال پوچھنے کی ہمت کر پائی تھی، مگر آج نہ جانے کیسے بلا ارادہ ہی یہ سوال پوچھ لیا تھا۔

"خیر چھوڑو اس بات کو... تم یہ بتاؤ کہ تم یہاں کیوں آئی ہو؟ کوئی خاص ریزن؟" دل آور نے بڑی جلدی خود کو کمپوز کیا تھا۔

"میں یہاں کیوں آئی ہوں؟" مدحیہ نے جیسے یاد کرنے کی کوشش کی تھی۔

"ہاں یاد آیا! میں یہاں کسی خاص ریزن سے آئی ہوں۔" مدحیہ بھی دل آور کی خاطر اس موضوع سے نکل آئی تھی۔

"ہاں بولو! میں سن رہا ہوں۔" وہ پوری طرح سے متوجہ ہوا تھا۔

"وہ ان فیکٹ میں جب سے پاکستان آئی ہوں، میں نے ایک بار بھی ٹھیک سے شاپنگ نہیں کی، اس لیے میں نے سوچا کہ میں ہمیشہ نبیل بھائی کی جیب سے شاپنگ کرتی ہوں، کیوں نہ آج یہ شاپنگ آپ کی جیب پہ ڈال دوں؟" مدحیہ نے شرارت سے کہا تھا۔

"ہوں... شاپنگ... ویسے کتنے میں ہوگی یہ شاپنگ؟ پانچ، دس ہزار کافی ہیں نا؟" دل آور نے سنجیدگی سے استفسار کیا تھا۔

"واٹ...؟ پانچ، دس ہزار؟ اس سے زیادہ تو آل ریڈی میرے بیگ میں موجود ہیں۔" مدحیہ چیخ اٹھی تھی۔

"بھائی صاحب! آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں صرف سیٹھ نبیل حیات کی بہن نہیں ہوں، بلکہ بیرسٹر دل آور شاہ کی بھی بہن ہوں اور اس لحاظ سے میرے بیگ میں رقم بہت کم ہے۔ میرے بیگ کو تھوڑا اور وزنی

ہونا چاہیے، مجھے بہلانے کی کوشش مت کریں۔" وہ تنگ کر بولی تھی۔

"اوکے اوکے... نہیں بہلاتا، یہ بتاؤ کہ کتنے پیسے لوگی؟ بلکہ میرے ساتھ طے کر لو، میں تمہیں ماہانہ پاکٹ منی دوں گا، جیسے نبیل دیتا ہے اور ان شاء اللہ نبیل سے زیادہ ہی دوں گا، تمہیں کبھی مانگنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی۔" دل آور نے اسے کھلی آفر دی تھی۔

"نہیں، میں نے پیسے نہیں لینے، میں نے شاپنگ کرنی ہے بس۔" مدحیہ اس کی آفر پہ جھجک گئی تھی۔

"ارے بس کیوں؟ تم پیسے بھی لو اور شاپنگ بھی کرو، تم مجھ سے مانگا کرو، مجھ سے چھینا کرو، مجھے خوشی ہوگی مدحیہ، کہ میرا بھی کوئی اپنا ہے، مجھ پہ حق جتانے والا اور میری کمائی کو خرچ کرنے والا، میں مہینے میں لاکھوں کماتا ہوں، لیکن انہیں خرچ کرنے والا کوئی بھی نہیں۔ کوئی بھی نہیں۔" کہتے کہتے وہ پھر سے افسردہ اور بوجھل سا ہو گیا تھا، لیکن مدحیہ نے اسے زیادہ دیر اداس نہیں ہونے دیا تھا۔

"ارے... کیوں نہیں بھائی... میں ہوں نا آپ کے پیسے خرچ کرنے والی، بس آپ میرے ساتھ چلیں..."

"ساتھ...؟" دل آور چونک گیا تھا۔

"ہاں ساتھ... میں آج یہ شاپنگ آپ کے ساتھ کرنا چاہتی ہوں، آپ نہیں جائیں گے تو میں بھی نہیں جاؤں گی۔" اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔

"تو... میں شاپنگ کے لیے پیسے دے سکتا ہوں، مگر ساتھ نہیں جا سکتا۔" دل آور نے نفی میں گردن ہلائی تھی۔

"تو ٹھیک ہے! آپ اپنے پیسے بھی اپنے پاس رکھیں، میں نہیں لوں گی، مجھے آپ کی ضرورت ہے، آپ کے پیسوں کی نہیں، اگر صرف پیسے ہی لے کر شاپنگ کے لیے جانا ہوتا تو مجھے یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی؟ میں اکیلی بھی جا سکتی تھی۔" وہ خفا ہوتی ناشتا ختم کرتے ہی کرسی دھکیل کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"سوری میری جان! میں فارغ نہیں ہوں، مجھے کسی ضروری کام سے جانا ہے، تمہارے ساتھ پھر کبھی چلا جاؤں گا۔" دل آور نے بچنا چاہا تھا۔

"اوکے! آپ جائیں اپنے ضروری کام سے، میں آپ کو روک تو نہیں رہی؟" اس نے کندھے اچکائے تھے۔

"مدحیہ پلیز! سمجھنے کی کوشش کرو۔"

"سمجھ چکی ہوں، سب سمجھ چکی ہوں، آپ بے فکر رہیں، دوبارہ نہیں کہوں گی آپ کو۔" اس نے یوں ہی ناراضی سے کہتے ہوئے اپنا بیگ بھی اٹھا لیا تھا۔

"لیکن تم جا کہاں رہی ہو؟" دل آور نے جلدی جلدی ناشتا ختم کیا اور نیپکن سے ہاتھ پونچھتے ہوئے کرسی دھکیل کر کھڑا ہو گیا تھا۔

"واپس اپنے گھر۔" اس کے لہجے میں ہنوز ناراضی تھی اور دل آور اس کی ناراضی نہیں سہہ سکتا تھا۔ اس نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔

"ٹھہرو... چلتا ہوں۔" وہ اسے کہہ کر اپنا موبائل اور والٹ لینے کے لیے چلا گیا تھا اور مدحیہ نیچے کھڑی اپنی فتح مندی پہ مسکرا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"کیا بات ہے ثروت؟ کیوں پریشان ہو؟" اسرار آفندی بیوی کے چہرے کی پریشانی بھانپ چکے تھے، وہ کافی دیر سے بیڈ سے ٹیک لگائے ایک ہی پوزیشن میں بیٹھی ہوئی تھیں اور ان کو یوں دیکھتے اسرار آفندی نے پوچھ ہی لیا تھا۔

"میں اپنے بیٹوں کی طرف سے پریشان ہوں، جن پہ آپ نے کبھی دھیان ہی نہیں دیا، کبھی غور ہی نہیں کیا کہ وہ

کیا کر رہے ہیں اور کیا نہیں؟" ثروت بیگم تو جیسے ان کے پوچھنے کے ہی انتظار میں تھیں' فوراً" شروع ہو گئی تھیں۔

"کیا مطلب کہ بیٹوں کی طرف سے پریشان ہوں؟ کیا ہوا ہے آخر؟" انہوں نے ٹی وی کا والیوم کم کر دیا تھا۔

"آذر کو دیکھا ہے آپ نے؟ عجیب قنوطی سا ہو گیا ہے۔ سیدھے طریقے سے بات ہی نہیں کرتا۔ جب سے حویلی میں منصور حسین اور وہ علیزے والا مسئلہ ہوا ہے' تب سے یوں دیوانہ بنا پھر رہا ہے' اس کے کہیں آنے کی خبر ہے' نہ جانے کی' پہلے تو وہ کبھی ایسا نہیں کرتا تھا۔" ثروت بیگم کے لہجے میں پریشانی ہلکورے لے رہی تھی اور اسرار آفندی گہری سانس کھینچ کے رہ گئے تھے۔

"ہاں۔ جانتا ہوں' وہ بہت اپ سیٹ لگ رہا ہے آج کل۔ لیکن ہم سب کیا کر سکتے ہیں اب؟ وہ مسئلہ ہی کچھ ایسا رونما ہوا ہے کہ سب کے سب ڈسٹرب ہو کے رہ گئے ہیں۔" اسرار آفندی کا لہجہ دھیما پڑ گیا تھا۔

"سب کے سب نہیں۔ وہ کچھ زیادہ ہوا ہے' اس نے زیادہ اثر لیا ہے' باقی سب روٹین پہ آ گئے ہیں' صرف وہی ہے جو ایک ہی جگہ پہ ٹھہرا ہوا ہے' سب کام کرتا ہے پھر بھی لگتا ہے کہ وہ اندر سے منجمد ہے' پگھل نہیں رہا۔" اسرار آفندی خود بھی فکر مند ہو رہے تھے۔ لیکن ثروت بیگم کی پریشانی دیکھتے ہوئے انہیں الٹا ان کی ہمت بندھانی پڑی تھی۔

"تم پریشان مت ہو۔ ان شاء اللہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وقت خود بہت بڑا مرہم ہے۔ گہرے سے گہرا زخم بھی مندمل کر ڈالتا ہے۔ اس حویلی کی عزت و غیرت پہ یہ زخم ابھی تازہ ہے اور تازہ زخم ہمیشہ اٹھتے بیٹھتے درد دیتا ہے' تکلیف دیتا ہے' اور آذر بھی آج کل اسی تکلیف سے گزر رہا ہے' جودت' زین اور حماد وغیرہ ابھی ناسمجھ اور لاابالی دور سے گزر رہے ہیں' وہ اس زخم کی گہرائی کو اور اس زخم کی تکلیف کو نہیں سمجھ سکتے' لیکن آذر بہت حساس اور سمجھ دار لڑکا ہے' وہ اس زخم کی گہرائی سے نکل ہی نہیں رہا۔ مگر بے فکر رہو۔ وقت خود بخود ہی اسے دنیا داری کی طرف موڑ دے گا۔ نارمل ہو جائے گا وہ بھی۔ مگر وقت لگے گا' بس تم حوصلہ رکھو۔" انہوں نے ثروت بیگم کے ہاتھ کو تھپکتے ہوئے تسلی دی تھی۔

"لیکن اسرار۔ ہمیں اب اولاد کے بارے میں کچھ سوچنا چاہیے' یوں سب کچھ وقت کے دھارے پہ چھوڑ دینا بھی تو ٹھیک نہیں ہے نا؟" ثروت بیگم خاصی متفکر اور پریشان ہو رہی تھیں۔

"کیا سوچنا چاہیے؟ کیا کہنا چاہتی ہو تم؟" وہ اب پوری طرح سے متوجہ ہو چکے تھے۔

"آذر کی شادی کے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا؟"

"آذر کی شادی؟ مگر ثروت یہ سب کیسے ممکن ہے؟ حویلی کے حالات تو تم خود ہی جانتی ہو' ایسے حالات میں کیا ہو سکتا ہے بھلا؟" اسرار آفندی کو ان کی بات کچھ اچھی نہیں لگی تھی۔

"حویلی کے حالات اب کبھی پہلے جیسے نہیں ہو سکتے اسرار۔ اب جو بھی کرنا ہے ہم نے انہی حالات میں کرنا ہے' جوان اولاد کو آزاد نہیں چھوڑنا چاہیے' ایک نتیجہ تو آپ لوگ دیکھ ہی چکے ہیں اور اس سے پہلے کہ باقی اولادیں بھی اپنی من مانی کریں' ہمیں خود ہی ان کو اپنے اپنے کھونٹے سے باندھ دینا چاہیے۔ میں نے کومل کے لیے سوچا ہے۔ آذر کی دلہن وہی بن سکتی ہے' گھر کی بیٹی ہے' دیکھی بھالی ہے' اس کے ساتھ کھڑی اچھی لگے گی' آپ کا کیا خیال ہے؟" ثروت بیگم نے اپنی بھانجی اور ان کی بھتیجی کا نام سامنے رکھا تھا' لیکن اسرار آفندی سوچ کے رہ گئے تھے۔

"تمہارے خیال اللہ نے رد کر دیے ہیں' ہم اب کیا کر سکتے ہیں بھلا؟" اسرار آفندی کے خیال میں علیزے کی شبیہ لہرائی تھی۔ ان کے ذہن میں جب بھی بہو کا خیال آتا تھا تو علیزے کا تصور ہی ذہن کے پردے پہ اجاگر ہوتا

تھا۔ لیکن اب وہ کیا کر سکتے تھے بھلا؟ سب کچھ الٹ ہو گیا تھا۔

"آپ چپ کیوں ہو گئے ہیں اسرار؟ کیا آپ کو اچھا نہیں لگا۔"

"نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔ بس کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے آذر سے ضرور پوچھ لینا' زندگی اس کی ہے' اس نے بسر کرنی ہے' آخری فیصلہ بھی اسی کا ہونا چاہیے۔" اسرار آفندی نے گہری سانس کھینچتے ہوئے ٹی وی آف کر کے لیمپ جلا دیا تھا اور ثروت بیگم شوہر کی اداسی اور دل گرفتگی دیکھ کر چپ ہو گئیں۔ وہ سونے کے لیے لیٹ چکے تھے۔

✡ ✡ ✡

"مدحیہ۔" دل آور نے شاپنگ مال کی پارکنگ سے گاڑی نکال کر روڈ پہ ڈالتے ہوئے اپنے ساتھ فرنٹ سیٹ پہ بیٹھی مدحیہ کو پکارا تھا اور وہ چونک گئی تھی۔

"جی بھائی۔؟" وہ اس کی اتنی زیادہ سنجیدگی پہ ذرا پریشانی سے متوجہ ہوئی تھی۔

"مجھے ایک بات تو بتاؤ۔" وہ ہنوز سنجیدہ تھا۔

"جی پوچھیے۔" مدحیہ کا دل بری طرح سے دھڑک اٹھا تھا۔

"تم نے آج مجھے میرے کس گناہ کی سزا دی ہے۔" دل آور کا اشارہ آج کی شاپنگ کی طرف تھا اور مدحیہ اس کی بات کا مفہوم سمجھتے ہی کھلکھلا اٹھی تھی۔

"یہ سزا ہے؟" وہ شرارت سے چھیڑنے والے انداز میں پوچھ رہی تھی' کیونکہ اس نے واقعی آج اسے خوب تنگ کیا تھا۔

"یہ سزا نہیں تو اور کیا ہے؟ صبح ساڑھے گیارہ بجے گھر سے نکلے تھے اور اس وقت شام کے پانچ بج رہے ہیں۔" دل آور نے اپنی گھڑی سامنے کی تھی۔

"اف بھائی۔ ایک گھنٹہ تو آئس کریم کھانے اور لنچ کرنے میں ہی لگ گیا تھا؟" وہ خفگی سے جھنجلا کے بولی تھی۔

"اور باقی کے ساڑھے چار گھنٹے۔" دل آور نے گھور کے دیکھا تھا۔

"ڈونٹ وری بھائی! آج آپ یہی سوچیے گا کہ آپ نے آج کا دن میرے نام کر دیا ہے۔" وہ لاپروائی ظاہر کرتے ہوئے چہکی تھی۔

"وہ تو کر ہی دیا ہے۔ اب یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے بھلا؟" دل آور نے تعجب سے کہا تھا۔

"بھائی۔" مدحیہ اس کے انداز پہ چیخ اٹھی تھی اور دل آور بے ساختہ قہقہہ لگا کے ہنسا تھا' بے شک مدحیہ نے اسے آج اپنے ساتھ بہت خوار کیا تھا۔ لیکن پھر بھی مدحیہ کی چھوٹی چھوٹی شرارتوں اور باتوں میں اس کا دن اچھا گزر گیا تھا۔ حالانکہ مدحیہ نے اس کا والٹ اچھا خاصا خالی کیا تھا' لیکن اسے پھر بھی کوئی پروا نہیں تھی۔ مدحیہ کے ساتھ اتنے عرصے بعد ٹائم گزار کے اسے بہت خوشی ہوئی تھی اور یوں ہی اس کی کسی بات پہ ہنستے ہوئے دل آور کی نظر چاندنا ورکشاپ کے سامنے سے گزرتے ہوئے چونک گئی تھی اور اس نے اسپیڈ کم کرتے ہوئے ایک سائیڈ پہ بریک لگا دیے تھے۔ پھر رفتہ رفتہ گاڑی کو بیک کرتے ہوئے ورکشاپ کے عین سامنے لے آیا تھا۔

"ارے۔ یہاں کیا ہوا ہے؟" وہ تشویش سے کہتا گاڑی سے نیچے اتر آیا اور اس کو نیچے اترتے دیکھ کر مدحیہ بھی چونک گئی تھی' کیونکہ چاندنا ورکشاپ کے بورڈ پر اس کی اب نظر پڑی تھی۔ اس نے ٹھٹک کر دیکھا۔ وہاں بہت سے لوگ جمع تھے اور پولیس بھی نظر آ رہی تھی' مدحیہ کو یہ سب دیکھ کر بہت زیادہ پریشانی ہوئی تھی اور پریشانی تو

دل آور کو بھی ہوئی تھی جو گاڑی سے اتر آیا تھا۔

"السلام علیکم کیا ہوا ہے یہاں؟" دل آور کی آواز پہ ایس ایچ او جمال احمد اور وہاں کھڑے باقی افراد نے چونک کے دیکھا تھا۔

"علیکم السلام! شاہ صاحب' آپ یہاں؟" ایس ایچ او جمال احمد نے سب کو چھوڑ چھاڑ کے اس سے ہاتھ ملایا تھا۔

"بس یہاں سے گزر رہا تھا تو لوگوں کا یہ ہجوم دیکھ کر رک گیا۔ کیا ہوا ہے آخر؟" اس نے ورکشاپ کی تباہ کن حالت دیکھتے ہوئے استفسار کیا تھا۔

"بس دو' تین روز پہلے ورکشاپ میں آگ لگ گئی تھی' تین گاڑیوں کا نقصان ہوا ہے۔ اس لیے گاڑیوں کے مالکوں نے ہنگامہ اٹھا رکھا ہے اور ادھر باؤ امتیاز کاشمیری سب کچھ ایک لڑکے پہ ڈال کے خود صاف دامن بچا رہے ہیں۔" ایس ایچ او جمال احمد نے اسے ساری سچویشن بتائی تھی اور دل آور لڑکے کے ذکر پہ ٹھٹکا تھا۔

"کس لڑکے پہ؟"

"وہی جسے باؤ امتیاز نے سارے ورکشاپ کا انچارج بنا رکھا تھا۔ عدیل عمر نیازی۔" ایس ایچ او جمال احمد نے اس کا پورا نام دہرایا تھا۔

"اوہ۔ عدیل عمر۔؟" دل آور کو سن کر افسوس ہوا تھا۔ عدیل کے ساتھ تو اس کی دو' تین مرتبہ ملاقات بھی ہو چکی تھی۔

"کہاں ہے وہ۔؟" دل آور نے مزید استفسار کیا تھا۔

"تھانے میں۔" وہ تو اسی رات گرفتار ہو گیا تھا۔ ایس ایچ او جمال احمد کو بھی جیسے اس کی گرفتاری کا افسوس تھا۔

"کون سے تھانے میں؟" اس کا لہجہ پُرسوچ تھا۔

"سٹی تھانے میں۔" ایس ایچ او جمال احمد چھوٹے (شہریار) سے عدیل کے حالات کا سارا قصہ سن چکے تھے۔ اسی لیے وہ باؤ امتیاز کے اس الزام کے خلاف تھے اور اس وقت اپنی نگرانی میں ساری انکوائری دوبارہ کروا رہے تھے۔

"ٹھیک ہے پھر ایس ایچ او صاحب۔ اس وقت چلتا ہوں میں' آپ سے تھانے میں ہی ملاقات ہوگی اب۔" مدحیہ کا خیال آتے ہی دل آور کو مزید وہاں ٹھہرنا مناسب نہیں لگا تھا اور ایس ایچ او جمال احمد سے ہاتھ ملا کر وہاں سے پلٹ آیا تھا۔ لیکن اس کو واپس پلٹتے دیکھ کر ذرا فاصلے پہ کھڑے چھوٹے کا سکتہ ٹوٹ گیا تھا' وہ حواسوں میں لوٹتے ہی دل آور کے پیچھے بھاگا تھا اور تب تک دل آور اپنی گاڑی کا دروازہ کھول چکا تھا۔

"رکیے سر۔ بات سنیے پلیز۔" وہ بھاگتا ہوا اس کے قریب آیا تھا۔ دل آور چونک کے پیچھے پلٹا تھا۔

"ارے چھوٹے تم۔؟" دل آور کو اسے دیکھ کر خوشی ہوئی تھی۔

"ہاں۔ مم۔ میں۔ لیکن اگر میں غلطی پر نہیں تو۔ تت۔ تو آپ شاید منصور حسین۔؟" چھوٹے نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ وہ اتنے بڑے آدمی کے سامنے بے ربط سا ہو گیا تھا وہ غلطی نہیں کرنا چاہتا تھا' حالانکہ وہ کافی دیر سے دل آور کو بار بار دیکھ رہا تھا اور ہر بار غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ ہو بہو منصور حسین تھا' بس چہرے پہ داڑ اور عام سے سادہ سے لباس کی کمی تھی کیونکہ اس وقت جو آدمی اس کے سامنے موجود تھا اس کا چہرہ داڑھی وغیرہ سے صاف تھا اور لباس بھی قیمتی تھا۔ البتہ چال ڈھال تو پہلے بھی شاہانہ تھی اور اب بھی شاہانہ تھی۔

"نہیں۔ تم غلطی پر نہیں ہو۔ میں ہی منصور حسین ہوں۔ لیکن میرا اصل نام دل آور شاہ ہے۔ البتہ

کورٹ کچہریوں میں لوگ بیرسٹر دل آور شاہ کے نام سے جانتے ہیں۔ اس لیے اب تم بتاؤ کہ تم نے کس نام سے جاننا ہے؟" وہ دلچسپی سے پوچھ رہا تھا اور چھوٹے کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

"بیرسٹر دل آور شاہ؟" اس نے زیر لب دہرایا تھا۔

"خیر چھوڑو۔ یہ وقت نہیں ہے زیادہ باتوں کا۔ یہ میرا کارڈ رکھ لو' کل مجھ سے ملنا' ان شاءاللہ عدیل جلدی باہر آجائے گا۔" دل آور نے اپنے والٹ سے کارڈ نکال کر اسے تھمایا تھا اور چھوٹے کے چہرے پہ خوشی اور بے یقینی کے رنگ دوڑ گئے تھے۔

"تھینک یو سر۔ تھینک یو سو مچ۔" چھوٹے نے بڑے پرجوش انداز اور ممنون لہجے میں اس کا شکریہ ادا کیا تھا۔

"ہوں۔ لگتا ہے کہ تم بھی صرف باہر کے منصور حسین ہو۔ ورنہ اندر سے تم بھی کچھ اور ہی ہو؟" دل آور کا اشارہ اس کے پڑھے لکھے ہونے پہ تھا۔

"سر۔ آپ کو تو پتا ہی ہوگا کہ کوئی بھی منصور حسین نہیں بنتا۔ دنیا بنا دیتی ہے۔" چھوٹے کا لہجہ خاصا گہرا تھا۔

"گڈ۔ تمہاری اس بات پہ انعام ہونا چاہیے تھا' لیکن میں اس وقت ذرا جلدی میں ہوں' میرے ساتھ میری سسٹر ہے' اسے گھر ڈراپ کرنا ہے' اس لیے تمہارا انعام ادھار رہا' ان شاءاللہ جلدی دوں گا' میں کسی کا ادھار نہیں رکھتا' پھر ملاقات ہوگی اللہ حافظ۔"

دل آور نے چھوٹے کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اسے امید دلائی تھی اور پھر گاڑی کے کھلے دروازے سے اندر بیٹھ گیا تھا اور یوں ہی دل آور کو دیکھتے دیکھتے چھوٹے کی نظر فرنٹ سیٹ کی سمت اٹھی تھی اور وہ مدحیہ کو دیکھ کر ایک بار پھر ششدر رہ گیا تھا۔

"وہ دل آور شاہ کی بہن ہے؟" یہ انکشاف ہی اس کا دماغ ہلا کے رکھ گیا تھا اور دوسری طرف مدحیہ کا بھی برا حال تھا۔ اس کی دن بھر کی خوشی غارت ہو چکی تھی۔ عدیل عمر جیل میں ہے؟ یہ احساس اسے بے چین و بے کل کر گیا تھا۔

"کیا بات ہے میری جان؟ تم کیوں چپ ہو گئی ہو؟" اس نے موڑ کاٹتے ہوئے پوچھا تھا۔

"کچھ نہیں' بس تھک گئی ہوں۔" اس نے چہرہ جھکا لیا تھا اور پھر دل آور نے بھی زیادہ دھیان نہیں دیا تھا اور اسپیڈ بڑھا دی تھی۔

☼ ☼ ☼

"زری۔ زری۔ تمہارے لیے گڈ نیوز ہے یار۔" نگارش اندر سے تقریباً" بھاگتی ہوئی باہر آئی تھی اور باہر لان چیئر پہ بیٹھی زری نگارش بھابھی کے اتنے جوش و خروش پہ یک دم چونک گئی تھی۔

"میرے لیے گڈ نیوز؟" زری نے ذرا حیرت کا اظہار کیا تھا۔

"ہاں۔ ایک نہیں بلکہ دو' دو گڈ نیوز ہیں۔" نگارش تو جیسے کھلی پڑ رہی تھی۔

"بتائیں نا؟ کیسی گڈ نیوز ہیں؟" زری کو تجسس ہوا تھا۔

"پہلے اپنے ان خوب صورت ہاتھوں سے یہ تازہ تازہ بھٹے چھیل کر نمک لگا کر پلیٹ میں سجا کے پیش کرو تو پھر سناتی ہوں یہ گڈ نیوز۔" نگارش اسے تنگ کرنے کے لیے اطمینان سے کہتی اس کے مقابل چیئر پہ بیٹھ گئی تھی اور زری اس کی فرمائش پہ حیرت سے دیکھنے لگی تھی۔

"ایسی بھی کیا بات ہے کہ پہلے میں آپ کی خوشامد کروں اور پھر بات سنوں؟" اس نے تعجب کا اظہار کیا تھا۔

"بس ایسی ہی کوئی بات ہے اور اس بات کے لیے تمہیں میری یہ خوشامد کرنا ہی پڑے گی۔" نگارش اپنی فرمائش سے پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہیں تھی اور زری چند سیکنڈز یوں ہی دیکھتی رہی، پھر ڈھیلے ڈھالے انداز میں سامنے ٹیبل پہ رکھی باسکٹ میں سے مالٹے اٹھا کر چھیلنے لگی تھی، پھر ان کو کاٹ کر نمک لگا کر پلیٹ میں رکھ کے نگارش کے سامنے پیش کر دیا تھا اور نگارش اپنے سامنے رکھی پلیٹ دیکھ کر مسکرا دی تھی۔

"تو میری پیاری نند اور پیاری بہن تمہارے لیے گڈ نیوز یہ ہے کہ تمہاری بتول آنٹی لاہور آ رہی ہیں، وہ بھی صرف تمہارے لیے، تم سے ملنے کے لیے، ابھی ابھی ان کا فون آیا تھا۔" نگارش کی بات پہ زری کے چہرے پہ ایک پل کے لیے خوشی کا رنگ ابھر کر معدوم پڑ گیا تھا۔

"کیا بات ہے زری؟ تمہیں خوشی نہیں ہوئی سن کر۔" نگارش کو زری کی طرف سے کوئی بھی ردعمل نہ پا کر حیرت ہوئی تھی۔

"خوشی؟ کیسی خوشی بھابھی؟ جب بتول آنٹی کا بیٹا ہی مجھ سے مل کر خوش نہیں ہوتا تو مجھے بتول آنٹی سے مل کر کیسے خوشی ہو گی؟ کس رشتے کے حوالے سے؟ آخر خوش ہونے کے لیے کوئی رشتہ یا کوئی وجہ بھی تو ہونی چاہیے نا؟ بلاوجہ خوش ہونا بے وقوفی ہی تو ہے؟" زری کافی تلخ ہو رہی تھی اور نگارش چونک گئی تھی۔ اسے دل آور اور زری کی ملاقات کا تو پتا تھا، لیکن ملاقات میں ہونے والی باتوں کا نہیں پتا تھا۔

"کیوں۔ بتول آنٹی کا بیٹا کیوں خوش نہیں ہوتا؟ اسے کیا ہوا ہے؟" نگارش الجھن بھرے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

"ہونہہ۔ یہ تو وہی بتا سکتا ہے کہ وہ زری سے مل کر خوش کیوں نہیں ہوتا؟" زری کے لہجے کی تلخی ہنوز تھی۔

"ارے نہیں یار۔ اب وہ اپنی خوشی کا اظہار سب کے سامنے صاف کھل کر تو نہیں کر سکتا نا؟" نگارش کی وہی تسلیاں تھیں۔

"سب کے سامنے نہ سہی، مگر میرے سامنے تو کرے نا؟" زری اس کی تسلیوں پہ جھنجلا گئی تھی۔

"ہو سکتا ہے کہ وہ ایک ہی بار اپنی خوشی کا اظہار کرنے کے قائل ہوں؟" پھر ایک تسلی اور پھر ایک خوش فہمی، زری نے سر جھٹک دیا۔

"خیر چھوڑیں۔ آپ دوسری گڈ نیوز سنائیں؟ وہ کیا ہے؟" زری نے اس بات کو سمیٹ دیا تھا۔

"تمہیں پہلی پہ خوشی نہیں ہوئی تو دوسری پہ کیا ہو گی؟" نگارش کا جوش بھی دھیما پڑ چکا تھا۔

"یہ تو گڈ نیوز پہ ڈیپینڈ کرتا ہے کہ وہ کس کو کتنا خوش کرتی ہے؟ اگر کوئی نیوز سن کر کوئی خوش ہو جائے تو سمجھ جائیں کہ وہ واقعی گڈ نیوز ہے۔" زری نے اسے گڈ نیوز کی پہچان بتائی تھی۔

"او کے! مان لیتی ہوں۔ البتہ دوسری گڈ نیوز یہ ہے کہ ملک حق نواز کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ وہ مومنہ بی بی کے کیس کے سلسلے میں جیل جا چکا ہے۔" یہ گڈ نیوز نگارش نے بہت نارمل سے انداز میں سنائی تھی، جبکہ زری اچھل کے رہ گئی تھی۔

"واٹ۔ یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟" اسے تو جیسے یقین ہی نہیں آیا تھا۔

"میں وہی کہہ رہی ہوں جو تم سن چکی ہو؟" نگارش نے کندھے اچکائے تھے۔

"لیکن بھابھی۔ اسے۔ اسے اریسٹ کس نے کروایا ہے؟" زری کو اشتیاق ہو رہا تھا یہ جاننے کا کہ یہ سب کس کا کارنامہ ہے؟

"اسی نے جو زری سے مل کر خوش نہیں ہوتا۔ وہی بتول آنٹی کا بیٹا۔" نگارش نے لاپروائی سے بتایا تھا۔

"ایسا کارنامہ بتول آنٹی کا بیٹا ہی کر سکتا ہے بھابھی۔ اور کوئی نہیں۔" زری کو پل بھر کے لیے اس پہ فخر ہوا تھا۔

"اوہ۔ تو اب اچھا لگ رہا ہے؟" نگارش نے اسے گھورا تھا۔

"اچھا نہیں بھابھی۔ پیارا لگ رہا۔ پیارا لگ رہا ہے۔" زری کو ملک حق نواز کے بارے میں جان کر بہت خوشی ہوئی تھی۔

"اور اگر ملک حق نواز پھر جیل سے باہر آ گیا تو۔؟" نگارش نے چھیڑا تھا۔

"تو جس نے ایک بار اسے جیل بھیجا ہے وہ دوبارہ بھی بھیج سکتا ہے۔" زری کا موڈ کچھ بہتر ہو چکا تھا۔

"تو تم لوگ اسے جیل ہی بھیجتے رہو گے؟" نگارش نے مذاق اڑایا تھا۔

"وہ ہے ہی جیل بھیجنے کے لائق۔ ساری عمر جیل کی چکی میں بند رہے تو بھی کم ہے۔" زری غصے اور نفرت سے مٹھیاں بھینچتے ہوئے بولی تھی۔

"زری۔ یقین نہیں آتا کہ تم اور عبداللہ اسی فیملی سے ہو جس فیملی سے ملک حق نواز یا پھر ملک اسد اللہ ہیں، مجھے تم لوگوں کے علاوہ باقی ساری فیملی سے بہت خوف آتا ہے، بہت بے رحم لگتے ہیں سب۔" نگارش نے ڈرتے ڈرتے ہی سہی، لیکن اپنے خیالات کا اظہار کر ہی دیا تھا۔

"ہم جیسا کوئی اور بھی تھا بھابھی! جو اس فیملی سے نہیں لگتا تھا، جو بے رحم اور سنگ دل نہیں تھا، جو عیاش اور بدکردار نہیں تھا، جو اس فیملی میں سب سے اچھا تھا اور وہی اس فیملی کو سب سے پہلے چھوڑ گیا۔" زری کا خیال اور سوچیں بہت پیچھے چلے گئے تھے اور دل سے ایک ٹھنڈی آہ ابھری تھی۔

"کون۔ کس کی بات کر رہی ہو؟" نگارش نے بے ساختہ پوچھا تھا۔

"چچا وجاہت علی کی بات کر رہی ہوں، بس اب تو ان کے دھندلے دھندلے سے نقش بھی ذہن کی سلیٹ سے مٹ گئے ہیں۔ آخر بائیس سال کا عرصہ کچھ کم نہیں ہوتا، اس وقت تو میں تھی بھی چھوٹی سی، لیکن مجھے یاد ہے وہ بہت پیار کرتے تھے ہم سے۔ مجھ سے بھی اور عبداللہ بھائی سے بھی۔" زری کا لہجہ پرانی یادوں کے ذکر سے بوجھل ہو گیا تھا۔

"ان کے اپنے کتنے بچے تھے؟" نگارش بھی سنجیدہ ہو چکی تھی۔

"تین۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی۔" زری آہستگی سے بولی تھی۔

"تو تم لوگ ان سے ملتے کیوں نہیں ہو؟ وہ کزن ہیں تمہارے، خون کا رشتہ ہے ان سے؟" نگارش نے تعجب سے کہا تھا۔

"وہ جب ہم سے بچھڑے تھے تو بابا جان نے ان پہ واپسی کے اور ان سے ملنے کے سارے دروازے بند کر دیے تھے۔ سب کچھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا تھا انہوں نے۔" وہ اداس ہو چکی تھی۔

"انہوں نے تو تم لوگوں پہ بھی واپسی کے دروازے بند کر دیے ہیں؟ اور میرا خیال ہے اب چچا وجاہت علی کے بچوں کو اور تم لوگوں کو مل کر ایک ساتھ ہو جانا چاہیے۔" نگارش نے ایک نیا مشورہ دیا تھا۔

"ہمیں کیا پتا کہ اب وہ کہاں ہیں؟ کیسے ہیں؟ کس حال میں ہیں اور وہ ہمارے بارے میں کیسا سوچتے ہیں؟" زری نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"کیوں؟ تمہاری چچی نے کیا دوسری شادی کر لی تھی؟" نگارش سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"کچھ پتا نہیں، ان کی بعد کی لائف کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے، انہوں نے شادی کی یا نہیں کی؟ کچھ علم نہیں ہے۔" زری نے نفی میں گردن ہلائی تھی۔

"لیکن یار، یہ سب جاننا کچھ مشکل تو نہیں ہے؟ آج کل انٹرنیٹ کے دور میں گھر بیٹھے ہی سب کچھ ممکن ہو سکتا ہے۔" نگارش کے کہنے پہ زری محض سر ہلا کے رہ گئی تھی اور دل بے طرح اداس ہو چکا تھا۔

✡ ✡ ✡

اس کے چہرے پہ دو آنکھیں نہیں تھیں، دو زخم تھے۔ ایسے زخم جن سے آنسوؤں کی جگہ خون رس رہا تھا اور اب تو وہ پلکیں بھی جھپکتی تھی تو درد ہوتا تھا اور اس درد کی اذیت سے بچنے کے لیے وہ پلکیں جھپکنے کی بجائے آنکھیں بند کیے لیٹی تھی اور اپنی دونوں کلائیاں اپنے چہرے پہ رکھی ہوئی تھیں کہ اس کی آنکھیں کہیں غلطی سے بھی جھپکنے کی اور حرکت کرنے کی گستاخی نہ کریں، آخر وہ دو دن سے مسلسل رو رہی تھی اور آنکھوں کا حشر ہو چکا تھا۔ گل بھی کافی دیر سے نہیں آئی تھی اور وہ خود بھی کافی دیر سے یوں ہی بے حس و حرکت پڑی ہوئی تھی۔ یوں سیدھے لیٹے لیٹے پورا جسم جیسے اکڑ سا گیا تھا۔ نیچے فرش پہ بچھے فوم کے گدے کے باوجود فرش کی ٹھنڈک محسوس ہو رہی تھی مگر پھر بھی وہ وہاں سے اٹھی نہیں تھی۔

لیکن ایک خیال تھا۔ بہت منہ زور۔۔۔ اور بہت تیز رفتار۔۔۔ ذہن میں کوندے کی طرح لپکا تھا اور وہ یک دم اٹھ کر بیٹھ گئی تھی اور پھر اس سے اس بیسمنٹ میں ٹھہرنا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی ننگے پیر باہر کو بھاگی تھی۔ اس کے لیے ایک یہ بھی آسانی تھی کہ بیسمنٹ کا دروازہ اکثر کھلا ہی رہتا تھا۔ شاید اس لیے کہ دل آور کو پورا یقین تھا کہ وہ کبھی بھی کہیں بھاگ نہیں سکتی۔ بے شک وہ اپنے گھر کا گیٹ بھی کھلا چھوڑ کے چلا جائے تو وہ نہیں بھاگے گی اور یہ بھی سچ ہی تھا۔ اس وقت بھی وہ بھاگ نہیں رہی تھی۔ بس یہاں سے نکلنے کے لیے ہاتھ پیر مارنے کی کوشش کر رہی تھی اور اس کوشش کے لیے اسے چند سیکنڈز میں ہی بہت زیادہ ہمت مجتمع کرنی پڑی تھی۔

وہ بڑے تیز قدموں سے بھاگتی ہوئی باہر آئی تھی اور دل ہی دل میں دعا کر رہی تھی کہ کسی سے بھی سامنا نہ ہو اور ایسا ہی ہوا تھا، وہ گل وغیرہ کی نظروں سے بچتی ہوئی اوپر آگئی تھی۔ اسے دل آور شاہ کے بیڈ روم میں جانا تھا، لیکن اسے نہیں پتا تھا کہ اس کا بیڈ روم کون سا ہے؟ اس نے سامنے نظر آنے والے بیڈ رومز کے دروازوں کے ہینڈل گھما کے دیکھے تھے جو کہ لاک تھے اور رفتہ رفتہ سب سے لاسٹ والے بیڈ روم کا لاک اوپن ملا تھا۔ اس نے آہستگی سے ہینڈل گھمایا اور دروازہ کھل گیا تھا۔ جس پہ علیزے کا دل کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا تھا اور ماتھے پہ پسینے کے قطرے چمکنے لگے تھے۔ وہ پہلی بار۔۔۔ زندگی میں پہلی بار ایسی کوئی چوریوں والی حرکت کر رہی تھی۔ تب ہی اس کا برا حال تھا۔ ہاتھ پیر کانپ رہے تھے۔ لیکن اب وہ واپس نہیں جا سکتی تھی۔ اب اسے دل آور شاہ کے آنے سے پہلے پہلے کچھ تلاش کرنا تھا۔ جس کے لیے اسے مزید ہمت کرنا پڑی اور وہ اندر آگئی تھی۔

۔۔۔۔ نفاست سے سجا خوب صورت اور تقریباً سادہ سا بیڈ روم اس کے سامنے تھا۔ وہ ادھر ادھر دیکھتی ہوئی تیزی سے الماری کی طرف بڑھی تھی اور الماری کے پٹ اس نے چوپٹ کھول دیے تھے اور کافی عجلت میں اس کی چیزوں کو الٹ پلٹ کرنے لگی تھی۔ پھر اس کی نظر اس کے بریف کیس کی سمت اٹھی تھی اور اس نے ایک جھٹکے سے وہ بریف کیس بھی الماری سے نکال لیا تھا اور اسے بیڈ پہ رکھ کر اس کے نمبر پریس کرنے لگی تھی، لیکن وہ کلک نہیں ہو رہے تھے۔۔۔ وہ بار بار کوشش کر رہی تھی، لیکن ہر بار ناکامی ہو رہی تھی۔

”ون زیرو ون پریس کرو۔۔۔ کھل جائے گا۔“ علیزے کا اس کی آواز پہ اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا تھا۔ دل آور شاہ کی آواز نے اس کی روح کھینچ لی تھی۔ اسے ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی سی دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

✡ ✡

نبیلہ عزیز

دردِ دل

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نبیل حیات روہی بہن بھائی ہیں' مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے' وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پہ رنگ چکی ہے' جس کے پیش نظر فائزہ بیگم' نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں' لیکن مدحیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے' جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے' مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے' مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا' بے بسی اور مجبوری سے تنگ آ کر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے' لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے بابا امتیاز مل جاتا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے' جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے' اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے' وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے' وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آویز شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے' وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے' اس نے ہارنا نہیں سیکھا' اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دلاتی ہیں۔

ستائیسویں قسط

اس کے اوسان خطا ہو چکے تھے۔

اور وہ پتھر کے بت کی طرح ساکت و صامت سی اپنی جگہ پہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ اس کی رگوں میں دوڑتا لہو بھی جیسے منجمد ہو چکا تھا اور وہ سر سے پاؤں تک برف کی مانند ٹھنڈی پڑنے لگی تھی۔ کیونکہ خود سے سرزد ہونے والی خطا اور دل آور شاہ کی طرف سے ملنے والی سزا کے بارے میں سوچ کر ہی اس کے پیروں تلے سے زمین سرکنے لگی تھی۔

"رک کیوں گئی ہو۔۔۔؟ کھولو نا۔۔۔ نمبر بالکل کریکٹ بتایا ہے میں نے۔۔۔ پریس کرو۔۔۔ فوراً" کھل جائے گا۔"

وہ اس کی حالت سے بے خبر لاپروائی سے کہتا اپنے پیچھے دروازے کا بولٹ چڑھا کر قدم بہ قدم چلتا ہوا آگے بڑھ آیا تھا اور وہ اسے دروازے کا لاک لگا کر اپنی سمت بڑھتے دیکھ کر اور زیادہ خوف زدہ ہو گئی تھی' وہ کانپتی ہوئی ٹانگوں کے ساتھ بمشکل قدم اٹھاتی اس سے دور رہنے کے لیے پیچھے ہٹنے لگی تھی' وہ ایک ایک قدم آگے بڑھ رہا تھا اور وہ ایک ایک قدم پیچھے ہٹ رہی تھی' یہاں تک کہ بیڈ روم کی کشادگی ان دونوں کے قدموں میں سمٹ گئی تھی اور علیزے پیچھے ہٹتے ہٹتے الماری سے جا لگی تھی اور وہ اس کے بے حد قریب آرکا تھا اور اس کی نظریں علیزے کے گلابی رخساروں کو چھونے لگی تھیں۔

"تم آج پہلی بار میرے بیڈ روم میں آئی ہو۔۔۔ اور میں ٹھہرا مہمان نواز بندہ۔۔۔ مہمانوں کی خوب خاطرداری کرتا ہوں۔۔۔ سر آنکھوں پہ بٹھاتا ہوں۔۔۔ اور اگر مہمان تمہارے جیسا ہو تو دل میں جگہ دیتا ہوں۔۔۔ اس لیے آج ایسا کرو۔۔۔ یہیں رہو۔۔۔ میرے پاس۔۔۔ میرے بیڈ روم میں۔۔۔ تمہاری جان کی قسم خاطرداری میں کوئی کسر نہیں چھوڑوں گا۔"

دل آور کی نظریں ہی نہیں لہجہ بھی بہکا ہوا سا لگ رہا تھا اور علیزے کی جان فنا ہو گئی تھی' اس کے پورے جسم کے اک اک روئیں سے پسینہ پھوٹتا ہوا محسوس ہوا تھا اور اس کی خوبصورت پیشانی پہ پھوٹنے والے ننھے ننھے کانچ کے موتیوں جیسے پسینے کے قطرے بھی دل آور کی نظروں سے چھپے ہوئے نہیں رہ سکے تھے' وہ اسے بڑے غور سے اور بڑے قریب سے دیکھ رہا تھا۔

"بولو۔۔۔! بنو گی مہمان۔۔۔؟" اس نے کافی گمبھیر لہجے میں پوچھا تھا' اس کی آواز خمار آلود ہو رہی تھی اور علیزے کے دل و دماغ کی حرکت جیسے بند ہونے لگی تھی۔

"مم۔۔۔ مجھے جانے دو۔۔۔ پپ۔۔۔ پلیز۔۔۔ ڈرائیور۔۔۔ مجھے جانے دو۔۔۔" علیزے بمشکل اپنی قوت گویائی کا استعمال کر پائی تھی۔ ورنہ وہ تو جیسے اپنی ساری ہمتیں اور ساری قوتیں ہی کھو بیٹھی تھی۔

"جانے دوں۔۔۔؟ کہاں جانے دوں۔۔۔؟ رات بہت کالی اور موسم بہت سرد ہے۔۔۔ ایسے جان لیوا لمحات میں تمہیں اگر جانے دوں تو خود کدھر جاؤں۔۔۔؟" اس کی آواز' اس کی آنکھیں اور اس کا لہجہ دھڑکتی خواہشوں اور بہکتے جذبات کے بوجھ سے بوجھل ہو رہے تھے اور علیزے مرجانے کو تھی۔

"مجھ سے غلطی ہو گئی ڈرائیور۔۔۔! مجھے معاف کر دو۔۔۔ پلیز۔۔۔ مجھے جانے دو۔۔۔ میں آئندہ تمہارے بیڈ روم میں نہیں آؤں گی۔" علیزے کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے اور وہ کہتے کہتے رو پڑی تھی۔

اور پھر دل آور کے دیکھتے ہی دیکھتے اس کے نرم و گداز اور گلابی گلابی سے رخسار آنسوؤں کے نمکین پانیوں سے بھیگتے چلے گئے تھے۔۔۔ دل آور نے آج پہلی بار اپنی آنکھوں کے سامنے گلابی پھولوں پہ شبنم ٹپکنے کا منظر دیکھا تھا اور اس دلفریب منظر کا فسوں اس کے چہار سو پھیل گیا تھا اور وہ اس فسوں خیزی کے ہاتھوں مخمور سا ہونے لگا تھا۔

"جانتی ہو اس وقت تم جس کنڈیشن میں ہو' یہ کنڈیشن مردوں کو کتنا اپیل کرتی ہے؟"

دل آور نے اپنے دونوں ہاتھ علیزے کے دائیں بائیں الماری پہ جماتے ہوئے علیزے کے بچاؤ کے تمام

تے مسدود کردیے تھے اور اس کے اس طرح دائیں بائیں ہاتھ جما کر کھڑے ہونے سے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ پورے کی پوری اس کی بانہوں کے حصار میں آگئی ہو' فرق بس اتنا تھا کہ اس حصار میں وہ اس کے سینے سے نہیں بلکہ الماری سے لگی کھڑی تھی' لیکن دل آور کی بات پہ اس نے یکدم کرنٹ کھا کے اسے دیکھا تھا اور اس کی گولڈن براؤن آنکھوں کے متوحش سے تاثر پہ دل آور نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"روتی بلکتی ہوئی عورت مرد کے جذبات کی آگ پہ تیل کا کام کرتی ہے اور آگ پہ تیل کا اثر تو تم جانتی ہی ہو گی؟ سب کچھ جل کے راکھ ہو جاتا ہے۔" دل آور کے لہجے اس کی باتوں اور اس کے تیوروں سے علیزے بری طرح خائف ہو چکی تھی اور اس کے منہ سے گھٹی گھٹی سی سسکیاں ابھرنے لگی تھیں۔

"مجھے معاف کر دو۔۔۔ پلیز ڈرائیور۔۔۔ مجھے معاف کر دو۔۔۔ مجھے جانے دو۔۔۔" علیزے نے بے بسی سے ایک بار پھر التجا کی تھی۔

"تم وہ واحد لڑکی ہو جس نے میرے بیڈ روم تک آنے کی جرات کی ہے اور تمہاری اس جرات کو خراج تحسین پیش کیے بغیر تمہیں جانے دوں؟ یہ بھی تو مناسب نہیں لگتا نا؟ کچھ تو ہونا چاہیے آخر۔۔۔؟" دل آور کے عزائم خطرناک لگ رہے تھے۔

"نن۔۔۔ نہیں۔۔۔! پلیز ڈرائیور نہیں۔۔۔ میں مرجاؤں گی۔۔۔" علیزے کا خون خشک ہو چکا تھا وہ تڑپ اٹھی تھی۔

"اف یار۔۔۔! مر تو میں جاؤں گا اگر میرے سامنے اس طرح کھڑی التجائیں کرتی رہو گی۔۔۔؟ اور تمہاری ان التجاؤں پہ میری' میرے ہی دل سے ٹھن جائے گی' دشمن ہو جائیں گے ہم ایک دوسرے کے۔۔۔" دل آور نے بھی بے بسی کا اظہار کیا تھا اور علیزے بھی بے بسی کے مارے رو رہی تھی اس کے آنسو زار و قطار بہے چلے جا رہے تھے۔

"لگتا ہے کہ آج تم دل آور شاہ کو ڈبو کر ہی چھوڑو گی۔۔۔؟" دل آور نے اپنا دایاں ہاتھ الماری سے ہٹا کر اپنی انگلی سے اس کی ٹھوڑی کو اٹھا کر اس کا چہرہ اونچا کیا تھا اور اس کی انگلی کا ذرا سا لمس بھی علیزے کے لیے بجلی کے کسی ننگے تار سے کم نہیں تھا اس کی سسکیاں ہچکیوں میں بدلنے لگی تھیں اور جان لبوں پہ آگئی تھی جیسے اب نکلی کہ تب نکلی۔

"تم اور تمہاری ذات کورے کاغذ کی طرح ہے' بالکل صاف' اندر باہر سے ایک جیسی پانی جیسی شفاف' بے ضرر اور بے ریا۔۔۔ کبھی کبھی بہت اچھی لگتی ہو۔۔۔ تم پہ رحم بھی آتا ہے۔۔۔ دل چاہتا ہے تمہاری کورے کاغذ جیسی ذات پہ پورے کے پورے دل آور شاہ کو چھاپ دوں' اپنا حرف حرف' لفظ لفظ لکھ ڈالوں' رنگ ڈالوں تمہاری ذات کو۔۔۔" دل آور نے انتہائی گمبھیر آواز میں کہتے ہوئے اسے خاصی گہری نظروں سے دیکھا تھا اور اس کی نظروں کے مفہوم سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس نے ضرور کچھ ٹھان رکھی ہے، جس کو دیکھ کر علیزے کو اپنے اعصاب مفلوج ہوتے ہوئے محسوس ہوئے تھے۔

"لیکن پھر سوچتا ہوں کہ تم وقار آفندی کی بیٹی ہو۔۔۔" دل آور نے وقار آفندی کے نام پہ نفرت سے سر جھٹکا تھا اور علیزے اس کی اتنی نفرت پہ اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

"البتہ آج یہ اعتراف ضرور کروں گا کہ تم بڑے بڑے زاہدوں کو بھی رند کرنے کی پوری پوری صلاحیت رکھتی ہو' آج اس وقت اس جگہ کوئی اور ہوتا تو تمہارے قدموں میں ڈھیر ہو چکا ہوتا' واللہ پسینہ آجاتا ہے تمہیں دیکھتے ہوئے۔۔۔ تمہیں دیکھنا اور دیکھ کر اپنے آپ میں رہنا صرف دل آور شاہ کا حوصلہ ہے' ورنہ ممکن ہی نہیں کہ اپنے آپ میں رہا جائے۔"

دل آور نے اس کی خوبصورتی کے سحر کو برملا تسلیم کیا تھا کیونکہ وہ لگی لپٹی بات کرنے کا عادی نہیں تھا۔

"مجھے جانے دو ڈرائیور... !پلیز... تمہیں خدا کا واسطہ... مجھے جانے دو... میں اب کبھی بھی تمہارے بیڈ روم میں نہیں آؤں گی... مجھ سے غلطی ہو گئی... پلیز مجھے معاف کر دو... میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں' پلیز...."

علیزے اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے رو پڑی تھی اور اب کی بار ایسی دھواں دھار روئی تھی کہ سب کچھ جل تھل ہو گیا تھا' لیکن اس سے پہلے کہ دل آور مزید کچھ کہتا اچانک اس کی جیب میں موبائل کی وائبریشن ہونے لگی تھی اور اس نے فوراً "موبائل جیب سے نکال لیا تھا اور عبداللہ کا نمبر دیکھتے ہی کال ریسیو کر لی تھی۔

"السلام علیکم... !" اس کا لہجہ' اس کا انداز' اس کے تیور بدل چکے تھے بالکل پہلے جیسے ہو گئے تھے جن میں نہ کوئی خمار تھا اور نہ ہی کسی قسم کا کوئی بوجھل پن تھا۔ چند منٹ پہلے کے لمحات کا تو شائبہ تک نظر نہیں آ رہا تھا۔

"وعلیکم السلام... !کیسے ہو...؟" عبداللہ نے کافی بشاشت سے پوچھا تھا۔

"اکیلا ہوں... تنہا ہوں... تڑپ رہا ہوں..." دل آور نے افسردگی سے کہا تھا اور جواباً" عبداللہ قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔

"ہاہاہا... !تم تنہا ہو سکتے ہو... مگر کبھی تڑپ نہیں سکتے۔" عبداللہ کے لہجے میں یقین تھا۔

"کیوں...؟ کیا تم مجھے مردہ تصور کرتے ہو...؟ کیا میرے سینے میں دل اور جسم میں جان نہیں ہے کہ میں تڑپ نہیں سکتا؟ کیا میری رگوں میں جذبات نہیں دوڑتے؟ یا پھر تم سمجھتے ہو کہ میں انسان نہیں بجلی سے بنا روبوٹ ہوں کوئی...؟"

دل آور نے جل کے کہا تھا اور موبائل کے ایئر پیس سے عبداللہ کے مسلسل قہقہوں کی آواز سنائی دینے لگی تھی۔

"یہ جتنی حالتیں تم نے گنوائی ہیں نا... ان میں سے صرف پہلی حالت چھوڑ کے باقی سب پرفیکٹ ہیں' میں تمہیں بالکل ایسے ہی سمجھتا ہوں کہ تمہارے سینے میں دل اور جسم میں جان نہیں ہے' اس لیے تم تڑپ نہیں سکتے... اور تمہاری رگوں میں جذبات نہیں صرف خون دوڑتا ہے... اور یہ بھی کہ تم واقعی بجلی سے بنے روبوٹ ہو اور بس اپنے کام نبٹاتے پھر رہے ہو اس کے علاوہ اور کچھ نہیں..." عبداللہ کی مسکراہٹ دل آور بنا دیکھے بھی محسوس کر سکتا تھا۔

"میں اس کے علاوہ بھی اور بہت کچھ ہوں ملک صاحب... !"

"یہ روبوٹ کتنا رومانٹک ہے...؟ یہ بات میری شادی کے بعد میری بیوی سے پوچھنا..." دل آور نے کافی معنی خیزی سے کہا تھا۔ اور عبداللہ کا ایک بار پھر قہقہہ بلند ہوا تھا۔

"ہاہاہا... !یہ بات تو ہم پوچھے بغیر بھی جانتے ہیں کہ تمہاری بیوی کے کانوں سے دن رات دھواں نکلا کرے گا آخر تمہاری باتیں جو ایسی ہوتی ہیں..." عبداللہ نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

"اس وقت صرف باتیں نہیں ہوں گی جناب... !عمل بھی ہو گا..." دل آور نے ایک اور معنی خیز پوائنٹ بتایا تھا اور عبداللہ کا حشر ہو گیا تھا اس کی پسلیوں میں درد ہونے لگا تھا اتنا زیادہ ہنسنے اور قہقہے لگانے کی وجہ سے...

اور علیزے اس کو باتوں میں مصروف دیکھ کر آہستگی سے الماری سے ہٹ کے دروازے کی سمت بڑھی تھی اور دل آور کی بے دھیانی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہاں سے نکل جانا چاہا تھا لیکن دو قدم آگے بڑھنے کے بعد ہی اس کے قدم رک گئے تھے کیونکہ اس کی کلائی دل آور کے مضبوط ہاتھ کے شکنجے میں آ چکی تھی اور علیزے کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔

"ماری جائے گی..." دل آور نے علیزے کو جن نظروں سے دیکھ کر کہا تھا ان پہ تو علیزے کو پورے جسم میں سنسناہٹ سی دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی تھی مگر دوسری طرف عبداللہ کچھ نہیں سمجھا تھا۔

"کون...؟"

"جو بھی آئے گی... !" دل آور بات تو عبداللہ کے ساتھ کر رہا تھا لیکن مفہوم علیزے کو سمجھا رہا تھا۔

علیزے کی کلائی ہنوز اس کے ہاتھ میں تھی اور وہ تھر تھر کانپ رہی تھی' کیونکہ وہ ایک غلطی پہ ایک اور غلطی کرنے چلی تھی پہلی کی ابھی معافی نہیں ملی تھی کہ اب ایک اور سزا کا اضافہ ہو گیا تھا۔

"بہت سفاک ہو یار... !" عبداللہ نے تاسف کا اظہار کیا تھا۔

"نازک لوگوں کے ساتھ سفاک لوگ ہی سوٹ کرتے ہیں ملک عبداللہ صاحب... !ورنہ نازک لوگ تو جان کو آ جائیں۔" اس نے ذرا استہزائیہ لہجے میں کہا تھا لیکن اب کی بار علیزے اس کی بات پہ نہیں بلکہ اس کے منہ سے نکلنے والے نام پہ چونکی تھی۔

"ملک عبداللہ صاحب...؟" اس نے اس نام کو بے ساختہ زیر لب دہرایا تھا' لیکن دل آور کا ذہن حد سے زیادہ کوئیک تھا۔

ادھر علیزے نے ہونٹوں کو جنبش دی تھی اور ادھر اس کے ذہن نے کام دکھایا تھا اس سے پہلے کہ علیزے اس نام کو دوبارہ ذرا بلند آواز سے دہراتی دل آور نے اس کی کلائی چھوڑ کر اپنا ہاتھ اس کے منہ پہ جما دیا تھا تاکہ عبداللہ کو اس کی آواز سنائی نہ دے' کیونکہ وہ اگر اس کی آواز سن لیتا تو اور سوال کرتا اور دل آور اپنی ریپوٹیشن خراب نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے علیزے کی آواز کا گلا گھونٹ دیا تھا جبکہ علیزے تڑپی تھی' پھڑپھڑائی تھی' روئی تھی... مگر دل آور شاہ کی مضبوط چوڑی ہتھیلی اپنے منہ سے نہیں ہٹا سکی تھی اور اس کوشش میں پیچھے ہٹتے ہوئے وہ دوبارہ الماری سے جا ٹکرائی تھی۔

"ویسے تمہارے ساتھ کوئی نرم و نازک سی لڑکی نہیں بلکہ اچھی خاصی سخت اور دھانسو قسم کی لڑکی ہونی چاہیے۔"

عبداللہ نے چڑنے والے انداز میں دانت کچکچا کے کہا تھا اور اب کی بار دل آور قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔

"نو ٹینشن یار... !جیسی بھی ملی' چلے گی... کیونکہ اپنی پسند کے سانچے میں ڈھالنا مجھے آتا ہے... نرم و نازک سی ملی تو اسے سخت بنا دوں گا اور سخت ملی تو اسے نرم و نازک کر دوں گا... یہ مسئلہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں... بس خود میں صلاحیت ہونی چاہیے۔"

اس نے علیزے کو مسکراتی ہوئی نظروں سے دیکھا تھا اور وہ ایک بار پھر بے بس کونج کی طرح پھڑپھڑائی تھی۔

"دل آور... !باز آ جا..." عبداللہ نے اسے تنبیہہ کی تھی۔

"اوکے... !آ گیا باز... اب تم یہ بتاؤ کہ تم نے فون کیوں کیا ہے...؟" دل آور اصل سوال کی طرف آ گیا تھا۔

"اف... !تمہاری بے ہودہ گفتگو میں یہ بھی بھول گیا کہ فون کیوں کیا ہے...؟" عبداللہ نے جیسے اپنے سر پہ ہاتھ مارا تھا۔

"ٹھیک ہے... !میں فون بند کر دیتا ہوں' تم یاد کر لو کہ تم نے فون کیوں کیا ہے...؟" اس نے لاپروائی سے کہا تھا۔

"اچھا... !بڑی جلدی ہے تمہیں فون بند کرنے کی...؟" عبداللہ نے مصنوعی خفگی سے کہا تھا۔

"بس میرا دم گھٹ رہا ہے' فون بند کر کے تھوڑا ریلیکس ہونا چاہتا ہوں..." دل آور اپنی آڑ میں علیزے کی فیلنگز بیان کر رہا تھا' کیونکہ اس کا ہاتھ ابھی تک اس کے منہ پہ جما ہوا تھا۔

"اوکے... ! کرو ریلیکس... اللہ حافظ..." عبداللہ نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا اور دل آور نے گہری سانس کھینچتے ہوئے موبائل دوبارہ اپنی جیب میں ڈال لیا تھا اور گردن موڑتے ہوئے علیزے کی سمت متوجہ ہوا تھا اور آہستگی سے اپنا ہاتھ پیچھے ہٹا لیا تھا۔

"ہوں... ! اب بولو کیا کہنا چاہتی ہو...؟" دل آور نے انتہائی گہری گہری سانسیں لیتی علیزے کو بولنے پہ اکسایا تھا۔

"عبداللہ کون ہے...؟" علیزے نے اپنی تکلیف کو بھلا کر بے تابی سے پوچھا تھا۔

"تمہارا کزن... ملک شرافت علی کا بیٹا... !" دل آور پلٹ کر بیڈ کی سائیڈ ٹیبل کی طرف گیا اور وہاں سے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر نکال کر سگریٹ سلگا لیا تھا۔

"میرا کزن...؟" علیزے خود کلامی کے سے انداز میں بولی تھی۔

"ہاں... ! تمہارا کزن اور میرا دوست..." وہ کہتے ہوئے اپنے بیڈ پہ بیٹھ گیا تھا اور جھک کر دائیں ہاتھ سے اپنے بوٹوں کے تسمے کھولنے لگا تھا۔

"اور... نن... زری کون ہے...؟" علیزے نے بڑی مشکلوں سے سوال پوچھا تھا اور اس کے سوال پہ دل آور نے تسمے کھولتے کھولتے یکدم سر اونچا کر کے اسے دیکھا تھا اس کے آنسو اب بھی بہہ رہے تھے۔

"محبت... !" اس نے بے ساختہ لفظ محبت ادا کر دیا تھا اور علیزے نے چونک کر اس کے چہرے کی سمت دیکھا تھا۔

"کیا کہا...؟ محبت...؟" اس نے حیرانی سے پوچھا تھا۔

"ہاں... محبت... ! کیونکہ میری نظر میں اس کی یہی شناخت ہے..." وہ بوٹوں کے تسمے کھول کر سیدھا ہو چکا تھا۔

"کیا مطلب...؟ میں سمجھی نہیں..." وہ واقعی اس کی بات کے مفہوم کو سمجھنے سے قاصر تھی۔

"تم کبھی سمجھو گی بھی نہیں کیونکہ یہ تمہاری سمجھ کی چیز نہیں ہے..." وہ بوٹ اور جرابیں اتارنے کے بعد اپنی شرٹ کی آستینوں کے بٹن کھولنے لگا تھا اور ساتھ ساتھ سگریٹ اور اس کے دھوئیں سے بھی دل بہلا تا جا رہا تھا۔

"محبت میری سمجھ کی چیز نہیں ہے...؟" علیزے الجھ گئی تھی۔

"محبت تمہاری پوری حویلی کی سمجھ کی چیز نہیں ہے..." وہ سگریٹ ہونٹوں میں دباتے ہوئے اب شرٹ کے سامنے والے بٹن کھول رہا تھا اور علیزے حیران اور الجھی الجھی سی بے دھیانی میں اسے دیکھے جا رہی تھی۔

"مگر میں نے تم سے محبت کے بارے میں تو نہیں پوچھا...؟" علیزے کی بات پہ ڈریسنگ روم کی طرف بڑھتے دل آور کے قدم ٹھہر گئے تھے اور وہ یونہی کھلے گریبان سمیت پلٹ کر چلتا ہوا دوبارہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا وہ ابھی تک الماری سے لگی کھڑی تھی۔

"مگر تم نے مجھ سے زری کے بارے میں تو پوچھا ہے نا...؟" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

"تو تم زری کے بارے میں بتاؤ نا..." علیزے نے تکرار کی تھی۔

"میری سمجھ بوجھ کی ڈکشنری میں زری کا مطلب محبت اور محبت کا مطلب زری ہے... اس سے زیادہ میں نہیں جانتا..." اس نے اب بھی بہت مبہم سا جواب دیا تھا۔

"زری اور عبداللہ کا آپس میں کیا رشتہ ہے...؟" علیزے نے بڑی ذہانت کا ثبوت دیا تھا اور سوال بدل دیا تھا۔

"گڈ... ! یہ سوال اچھا ہے... زری اور عبداللہ بہن بھائی ہیں... عبداللہ ملک شرافت علی کا چھوٹا بیٹا اور زری کا

بس یا اور کچھ...؟" اس نے علیزے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا اور علیزے چپ کی چپ رہ گئی تھی اور کیا پوچھتی...؟

"نہیں... ! کچھ نہیں..." اس نے آہستگی سے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"تو پھر اب تم باعزت طریقے سے یہاں سے جا سکتی ہو..." اس کے کہنے پہ علیزے نے یکدم نظریں اٹھا کر اسے دیکھا تھا حالانکہ دل آور نے شرٹ کے نیچے بھی وائٹ کلر کی بنیان پہنی ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود علیزے اس کی شرٹ کے بٹن کھلے دیکھ کر نظریں جھکا گئی تھی۔

"کیا بات ہے...؟ جانے کو دل نہیں چاہ رہا...؟" دل آور کے اگلے سوال پہ علیزے کے چہرے کا رنگ سرخ ہو گیا تھا اور اس نے بے ساختہ قدم دروازے کی طرف بڑھا دیے تھے لیکن دروازے کے قریب جا کر اس کے قدم رک گئے تھے اور اس نے دوبارہ پلٹ کر اسے دیکھا تھا۔

"ایک بات کہوں تم سے...؟" وہ اس سے اجازت طلب کر رہی تھی۔

"کہو... !" اس نے ذرا سا جھک کر ایش ٹرے میں سگریٹ مسلتے ہوئے اسے اجازت دی تھی۔

"کیا تمہیں اب بھی لگتا ہے کہ میں باعزت ہوں...؟ کیا میری کوئی عزت باقی رہ گئی ہے تمہاری نظر میں...؟" علیزے کی آنکھیں اور لہجہ زخمی ہو رہے تھے اور حلق میں آنسوؤں کا گولا سا اٹکنے لگا تھا۔

"ہاں... ! مجھے اب بھی لگتا ہے کہ تم باعزت ہو... البتہ یہ الگ بات ہے کہ صرف میری نظر میں ہو، دنیا کی نظر میں نہیں۔ حالانکہ میں نے تمہارے ساتھ کچھ بھی نہیں کیا، لیکن تمہارے میکے والے سمجھتے ہیں کہ سب کچھ ہو چکا ہے اور میرا مقصد بھی یہی ہے، ان کو یقین دلانا کہ سب کچھ ہو چکا ہے، مگر حقیقت کیا ہے یہ تو صرف تم جانتی ہو کہ میں نے تمہیں بری نظر سے کبھی نہیں دیکھا، میں نے تمہیں اپنے مطلب کے لیے استعمال کیا ہے، اپنی کسی طلب کے لیے نہیں... ہاں یہ افسوس کی بات ہے کہ وقار آفندی کی صرف ایک ہی بیٹی ہے، ہو سکتا ہے کہ اس کی کوئی اور بیٹی ہوتی تو میں اسے ٹارگٹ بنا لیتا اور تمہیں چھوڑ دیتا، لیکن یہ سب کچھ سہنا اور برداشت کرنا اب تمہاری مجبوری اور بے بسی ہے۔

بلکہ یہ بھی نہیں... ! کیونکہ تمہاری برداشت، مجبوری اور بے بسی کی حد تو اس وقت شروع ہو گی جب تم یہاں سے نکلو گی اور واپس اپنی حویلی جاؤ گی اور تمہارا باپ تمہیں دیکھ دیکھ کر مرے گا اور مر مر کے جیے گا، تب میں تمہارے باپ سے پوچھوں گا کہ اذیت کیا ہوتی ہے...؟ اور اس اذیت کے ناسور کو دل میں دبا کر جینا کیسا لگتا ہے...؟ زندگی، موت... اور موت زندگی لگنے لگتی ہے، یہ جیتی جاگتی دنیا انسان پہ قبر کی طرح تنگ ہو جاتی ہے اور میں یہ دنیا وقار آفندی پہ تنگ کر دینا چاہتا ہوں..." دل آور کا لہجہ سخت اور بے رحم ہو چکا تھا اور علیزے ہمیشہ کی طرح دم بخود سی رہ گئی تھی جبکہ وہ مزید وہاں رکے بغیر واش روم میں چلا گیا تھا۔

آج علیزے کے ساتھ جس طرح پیش آیا تھا اگر ایسا نہ کرتا تو یقیناً وہ آئندہ بھی نڈر ہو کر اس کے بیڈ روم میں آنے کی جرات کر سکتی تھی، لیکن دل آور نے اپنے تیور بدل کر اسے خائف کر دیا تھا اور اس کا مقصد بھی یہی تھا اسے خائف کرنا... لیکن علیزے اس کے ہر مقصد سے بے خبر تھی اسی لیے مرے مرے قدم اٹھاتی واپس اپنے قید خانے میں آ گئی تھی...!

☼ ☼ ☼

عبداللہ گہری نیند سو رہا تھا جب گھر کے لینڈ لائن نمبر پہ رنگ ہونے لگی تھی۔ اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دی

تھیں، کمرے میں ملگجا سا اندھیرا پھیلا ہوا تھا، اس نے ہاتھ بڑھا کے لیمپ جلا دیا تھا اور کال ریسیو کر لی تھی۔

"ہیلو۔۔۔!" اس کا لہجہ نیند سے بوجھل ہو چکا تھا، لیکن دوسری طرف کا لہجہ حد درجہ کرخت تھا، عبداللہ کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔

"تم لوگوں نے ہماری نیندیں برباد کرنے کے بعد یہ سوچ بھی کیسے لیا کہ تم لوگ سکون کی نیند سوئے رہو گے۔۔۔؟"

ملک اسد اللہ کی آواز اس کی سماعتوں کے لیے ایسے ہی ثابت ہوئی تھی جیسے کسی نے صور پھونک دیا ہو، عبداللہ اپنی کہنی پہ زور ڈالتے ہوئے فوراً ذرا سا اونچا ہوا تھا۔

"یہی بات ملک حق نواز، بابا جان اور آپ خود کیوں نہیں سوچتے۔۔۔؟ آپ نے بھی تو آج تک ہزاروں لوگوں کی نیندیں برباد کی ہیں۔۔۔ ہزاروں پہ ظلم کیے ہیں۔۔۔ ہزاروں کو ستایا ہے آپ نے۔۔۔ تو اب آپ کیا سمجھتے ہیں کہ آپ کو کسی کی آہ نہیں لگے گی۔۔۔؟ آپ کو کبھی مکافات عمل سے نہیں گزرنا پڑے گا۔۔۔ اور آپ کی نیندیں بھی برباد نہیں ہوں گی۔۔۔؟ ہونہہ۔۔۔! یہ بھول ہے آپ کی۔۔۔ آپ کا وقت شروع ہو چکا ہے۔۔۔ اب آپ کی باری ہے۔۔۔ اب آپ نے جاگنا ہے اور راتوں کو اٹھ اٹھ کر اپنے گناہ گننے ہیں۔۔۔ جن کی تعداد لاتعداد ہے۔۔۔" عبداللہ نے بھی ان کو دندان شکن جواب دیا تھا جس پہ ملک اسد اللہ اور بھڑک اٹھے تھے۔

"ہم اپنے گناہ گنیں گے یا نہیں۔۔۔ لیکن تم دل آور شاہ کی زندگی کے دن گننا شروع کر دو، اسے بتا دینا کہ اس نے شیر کی کچھار میں ہاتھ ڈالا ہے۔۔۔" ملک اسد اللہ نے انتہائی غضب ناکی سے انتہائی سفاک لہجے میں چبا کر کہا تھا۔

"یہ بات تو ایسے ہی ہو گئی ملک اسد اللہ صاحب۔۔۔! کہ جیسے میں اپنی زندگی کے دن گننا شروع کر دوں۔۔۔؟ آپ نہیں جانتے کہ دل آور شاہ کی موت آپ کے لیے ملک عبداللہ کی موت ثابت ہو گی، اسے مارنے سے بہتر ہے کہ آپ مجھے مار دیں۔۔۔" عبداللہ اندر سے تڑپ کے رہ گیا تھا۔

"ضرورت پڑی تو تمہیں مارنے سے بھی گریز نہیں کریں گے ہم۔۔۔ تمہارا ہونا نہ ہونا ایک برابر ہے ہمارے لیے۔۔۔ اور اگر ہم تمہارے ساتھ اس طرح پیش آ سکتے ہیں تو دل آور شاہ تو کچھ بھی نہیں ہے ہماری نظر میں۔۔۔" ملک اسد اللہ خاصے تحقیر بھرے لہجے میں بولے تھے اور عبداللہ ان کی بے خبری اور خوش فہمی پہ استہزائیہ سا ہنسا تھا۔

"دل آور شاہ کو عبداللہ مت سمجھیں ملک صاحب۔۔۔! جو آپ کے ساتھ تھوڑی بہت رعایت برت دے گا۔۔۔ دل آور شاہ۔۔۔ دل آور شاہ ہے۔۔۔ رعایت کی گنجائش نہیں نکلتی اس کے پاس۔۔۔ وہ تخت یا تختہ والے محاورے کا پابند ہے۔۔۔ اور آپ اگر یہ سمجھتے ہیں کہ اس نے شیر کی کچھار میں ہاتھ ڈالا ہے تو آپ صحیح سمجھتے ہیں کیونکہ شیر کی کچھار میں شیر ہی ہاتھ ڈال سکتا ہے، یہ آپ کو آگے جا کر خود ہی پتا چل جائے گا۔۔۔" عبداللہ بھی اتنی آسانی سے دبنے والا نہیں تھا۔

"آگے جا کر کس کو پتا چلتا ہے اور کس کو نہیں۔۔۔ یہ تو وقت آنے کی بات ہے نا۔۔۔ ابھی تو ہم نے یہ اطلاع دینے کے لیے فون کیا ہے کہ ملک حق نواز کو اریسٹ کروا کر اس نے اچھا نہیں کیا، اسے اب بھی کہہ دو کہ باز آ جائے ورنہ کسی کو انصاف دلاتے دلاتے خود اس کے ساتھ کوئی ناانصافی نہ ہو جائے۔۔۔؟" ملک اسد اللہ نے صاف کھلے لفظوں میں دھمکی دی تھی اور فون بند کر دیا تھا اور عبداللہ ہاتھ میں پکڑے ریسیور کو دیکھتا رہ گیا تھا، نجانے انہوں نے عبداللہ کے گھر کا نمبر کیسے۔۔۔؟ اور کہاں سے حاصل کیا تھا کہ فوراً فون کھڑکا دیا تھا۔۔۔؟ حالانکہ اس کے گھر کا نمبر کوئی بھی نہیں جانتا تھا، لیکن پھر عبداللہ نے یہ سوچ کر سر جھٹک دیا تھا کہ واقعی ان سے کسی قسم کی توقع کی جا سکتی ہے، وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں، کیونکہ بغیر کسی ایڈریس اور بغیر کسی اتے پتے کے وہ انگلینڈ میں اس کے گھر پہنچ گئے تھے تو پاکستان میں رہ کر اس کے گھر کا نمبر حاصل کرنا کون سا مشکل کام تھا ان کے لیے۔۔۔؟ عبداللہ نے سوچتے ہوئے ریسیور کریڈل پہ ڈال دیا تھا اور اپنا موبائل اٹھا کر اس کی اسکرین سے ٹائم دیکھا تھا، صبح کے نو بج رہے تھے۔

"ارے۔۔۔! میں اتنی دیر تک سویا رہا۔۔۔؟ اور نگارش نے بھی آج نہیں جگایا۔۔۔؟" عبداللہ حیرانی سے کہتے ہوئے فوراً کمبل ہٹا کر بیڈ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا، لیکن پھر کسی احساس کے تحت اس نے پلٹ کر بیڈ کی دوسری سائیڈ کی طرف دیکھا تھا اور چونک گیا تھا۔۔۔ نگارش بے سدھ پڑی تھی حالانکہ وہ اس وقت تک اٹھ کر ہزاروں کام نبٹا لیتی تھی، زری تو پھر بھی فجر کی نماز اور قرآن پاک پڑھنے کے بعد ذرا دیر کے لیے آرام کر لیتی تھی، لیکن نگارش نے تو آرام کرنا سیکھا ہی نہیں تھا وہ نماز اور قرآن پاک پڑھنے کے بعد ناشتے کی تیاری میں لگ جاتی تھی، لیکن آج اسے ہوش ہی نہیں تھا جبھی عبداللہ پریشانی سے اس کی طرف بڑھا تھا۔

"نگارش۔۔۔! نگارش۔۔۔! کیا ہوا۔۔۔؟ تم ٹھیک تو ہو۔۔۔؟" اس نے بیڈ کی دوسری سائیڈ پہ آ کر اس کے قریب بیٹھتے ہوئے پوچھا تھا، لیکن جیسے ہی اس نے نگارش کے رخسار کو تھپکا تھا وہ ٹھٹک گیا تھا کیونکہ وہ بہت تیز بخار میں پھنک رہی تھی۔

"اف۔۔۔! اسے اتنا تیز بخار ہے اور مجھے پتا بھی نہیں چلا۔۔۔؟" عبداللہ پریشانی سے اس کی کلائی اور ماتھے کو چھو کر دیکھ رہا تھا۔

"نگارش۔۔۔!" اس نے نگارش کے قریب جھکتے ہوئے پکارا تھا۔

"ہوں۔۔۔!" نگارش نے آنکھیں کھولنے کی اور ذرا سا بولنے کی کوشش کی تھی، مگر نقاہت کی وجہ سے نہ وہ آنکھیں کھول سکی تھی اور نہ ہی کچھ بول سکی تھی۔

"میں زری کو بلاتا ہوں، پھر ہم تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے چلتے ہیں۔۔۔" وہ اس کا رخسار تھپک کر اس کی پیشانی پہ بوسہ دیتے ہوئے اٹھ کر بیڈ روم سے باہر نکل آیا تھا اور نیچے آتے ہی اسے زری ڈرائنگ روم میں بے چین سی ٹہلتی ہوئی ملی تھی وہ بھی پریشان تھی۔ عبداللہ کو سیڑھیاں اترتے دیکھ کر فوراً اس کی طرف بڑھی تھی۔

"بھائی۔۔۔! بھابھی کہاں ہیں۔۔۔؟ ان کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔۔۔؟ وہ ابھی تک اٹھیں کیوں نہیں۔۔۔؟" زری نے خاصی تشویش سے پوچھا تھا۔

"وہ بیڈ روم میں ہے، اسے بہت تیز بخار ہے، ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا پڑے گا۔۔۔" عبداللہ کے لہجے میں بھی پریشانی تھی۔

"اوہ۔۔۔! مجھے تو پہلے ہی شک ہو گیا تھا کہ ضرور ان کی طبیعت خراب ہے، اسی لیے وہ ابھی تک نہیں اٹھیں۔۔۔" زری بھی پریشان اور فکر مند ہو گئی تھی۔

"آپ فریش ہو کر ناشتا کر لیں، پھر بھابھی کو ڈاکٹر کے پاس لے چلتے ہیں، اتنی صبح تو کوئی ڈاکٹر بھی نہیں ملے گا۔" زری کہتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف آ گئی تھی اور پھر دونوں بہن بھائی آگے پیچھے سیڑھیاں طے کرتے ہوئے اوپر بیڈ روم میں آ گئے تھے۔

"بھابھی۔۔۔! بھابھی۔۔۔! کیسی ہیں آپ۔۔۔؟" زری نے اس کے پاس آ کر بیڈ پہ بیٹھتے ہوئے اسے پکارا تھا۔

"زری۔۔۔؟" نگارش جیسے نیم بے ہوشی کی سی حالت میں تھی اس کے ہونٹ غیر محسوس سے انداز میں ہلے تھے۔

"جی بھابھی۔۔۔! میں ہوں زری۔۔۔ یہ آپ نے راتوں رات اتنی طبیعت کیسے خراب کر لی۔۔۔؟ ہم کو بتایا بھی نہیں۔۔۔؟" زری نے اس کے بخار سے تپتے ہوئے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں دبایا تھا۔

"زری... پانی..." نگارش کا حلق اور ہونٹ خشک ہو رہے تھے اسی لیے اس نے پانی مانگا تھا بخار کی وجہ سے پیاس سے برا حال تھا۔

"جی بھابھی...! میں ابھی پانی لے کر آتی ہوں..." زری فوراً" وہاں سے اٹھ گئی تھی کیونکہ ان کے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ رکھا پانی کا جگ خالی تھا اس لیے اسے نیچے کچن میں آنا پڑا تھا اور پانی لا کر بمشکل اسے سہارا دے کر پانی پلایا تھا۔ اور اتنے میں عبداللہ شاور لے کر کپڑے چینج کر کے واش روم سے باہر نکل آیا تھا۔

"بھابھی اسپتال نہیں جا سکیں گی' ان کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہے' باہر سردی ہے' آپ ایسا کریں کہ ڈاکٹر کو گھر بلا لیں..." زری کو اندازہ ہو چکا تھا کہ نگارش اٹھ کر چل نہیں سکے گی اس لیے اس کی سہولت کی خاطر ڈاکٹر کو گھر بلانے کا مشورہ دیا تھا۔

"لیکن میں کس ڈاکٹر کو بلاؤں...؟ مجھے تو کسی کا پتا ہی نہیں ہے..." عبداللہ اس معاملے میں انجان تھا کیونکہ ابھی شہر میں اجنبی جو تھا۔

"تو آپ کسی سے پوچھ لیں نا...؟"

"کس سے پوچھوں...؟ دل آور تو اس وقت کورٹ میں ہو گا اور نبیل تو خود اس شہر میں میری طرح انجان ہے۔ خیر پھر بھی میں اسے ٹرائی کرتا ہوں..." عبداللہ ہیر برش ڈریسنگ ٹیبل پہ ڈال کر بیڈ کی سائیڈ ٹیبل سے اپنا موبائل اٹھاتے ہوئے اس کا نمبر ڈائل کر چکا تھا۔

"ہیلو...!" دوسری طرف سے فوراً" ہی کال ریسیو ہو گئی تھی۔

"کہاں ہو...؟" عبداللہ نے سنجیدگی سے پوچھا تھا۔

"راستے میں ہوں... شوروم جا رہا ہوں..." نبیل گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔

"کسی ڈاکٹر کا کانٹیکٹ نمبر ہے تمہارے پاس...؟"

"کیوں...؟ خیریت...؟ کون بیمار ہے...؟" نبیل چونک گیا تھا۔

"نگارش کی طبیعت خراب ہے... اسے بخار ہے... اسے لے کر جانا مشکل ہے اس لیے سوچا ہے کہ ڈاکٹر کو یہیں بلا لیتے ہیں..." عبداللہ ذرا فاصلے پہ ہی کھڑا تھا اس کی باتیں زری کافی آسانی سے سن رہی تھی۔

"میں آ جاؤں...؟" نبیل نے عبداللہ کی پریشانی کے خیال سے کہا تھا۔

"نہیں... تھینک یو یار...! اس کی ضرورت نہیں ہے' تم آرام سے آفس جاؤ' اور مجھے ڈاکٹر کا نمبر سینڈ کر دو۔"

عبداللہ نے نبیل کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

"یار...! اتنی غیریت کیوں برت رہے ہو...؟ اگر ضرورت ہے تو میں آ جاتا ہوں اور ہم بھابھی کو اسپتال لے جاتے ہیں...؟" نبیل نے بصد اصرار پوچھا تھا۔

"ارے نہیں یار...! اب اتنی بھی پریشانی کی بات نہیں ہے' صرف بخار ہی تو ہے' تھوڑی دیر میں اتر جائے گا' تم بس ڈاکٹر کا نام اور نمبر بتا دو... بعد میں اگر ضرورت پڑی تو بلا لوں گا تمہیں..." عبداللہ نے ذرا تحمل کا مظاہرہ کیا تھا۔

"اوکے...! میں تمہیں سینڈ کرتا ہوں... ڈاکٹر ہاشمی نام ہے ان کا... دل آور کے جاننے والے ہیں... اس کا حوالہ دو گے تو فوراً" آ جائیں گے..." نبیل نے اسے تفصیل سے بتایا تھا' لیکن دل آور کے حوالے کے ذکر پر عبداللہ کو صبح صبح موصول ہونے والی ملک اسد اللہ کی کال یاد آ گئی تھی۔

"وہ کورٹ سے فارغ کب ہوتا ہے...؟" اس نے دل آور کے متعلق استفسار کیا تھا۔

"عموماً" تو بارہ ایک بجے تک کورٹ سے فری ہوتا ہے' لیکن کبھی کبھی پہلے بھی فری ہو جاتا ہے' کیوں... تم کیوں پوچھ رہے ہو...؟" نبیل کے بیک گراؤنڈ میں گاڑی کی آواز بند ہو چکی تھی' گویا وہ شوروم کی پارکنگ میں پہنچ چکا تھا۔

"مجھے اس سے ملنا ہے' ایک ضروری بات ڈسکس کرنی ہے' تم سے بھی اور اس سے بھی' اس لیے دو بجے اس کے آفس میں ملتے ہیں... اوکے...؟" دل آور اور نبیل کو اس کال کے بارے میں بتانا بہت ضروری تھا' اسی لیے مجھے ملنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن زری اور نبیل بیک وقت اس کی بات پہ چونک گئے تھے ایک فون کے اس پار اور ایک فون کے اس پار...!

"خیر تو ہے نا...؟ ایسی کون سی ضروری بات ہے...؟ جو ایک ساتھ مل کر ڈسکس کرنی ہے...؟" نبیل نے دور رہ کر زری کے ذہن میں ابھرنے والا سوال دہرایا تھا۔

"یار...! اب ساری بات فون پہ ہی تو نہیں بتائی جا سکتی...؟ میں فون بند کر رہا ہوں... دو بجے ملتے ہیں... اللہ حافظ۔"

عبداللہ نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا اور نبیل اور زری بے چین سے ہو کر رہ گئے تھے۔

بعد میں پھر عبداللہ نے ڈاکٹر ہاشمی کو بلایا' نگارش بھابھی کا چیک اپ کروایا' خود ناشتا کیا' نگارش کو سوپ وغیرہ پلایا... سب کچھ کیا' لیکن زری کو کچھ خبر نہیں تھی کہ کیا ہو رہا ہے کیونکہ وہ عبداللہ کی مبہم سی بات میں الجھی ہوئی تھی۔

نگارش بھابھی کو سنبھالتے ہوئے' ان کے ماتھے پہ پٹیاں رکھتے ہوئے اور ان کے سارے کام کرتے ہوئے بھی وہ ذہنی طور پہ غیر حاضر رہی تھی' کیونکہ آج تو وہ نگارش سے بھی شیئر نہیں کر پا رہی تھی' آخر وہ خود بیمار تھی اسے مزید پریشان کیا کرتا تھا بھلا...؟

☆ ☆ ☆

"میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔"

مدحیہ نے اپنے سامنے کھڑے شہریار سے سنجیدگی سے کہا تھا جس پہ شہریار بری طرح ٹھٹک گیا تھا۔

"آپ ان سے ملنا چاہتی ہیں... مگر کیسے...؟ وہ تو پولیس اسٹیشن میں ہیں...؟" شہریار کو حیرت ہوئی تھی۔

"تو کیا میں پولیس اسٹیشن نہیں جا سکتی...؟" مدحیہ نے اس سے زیادہ حیرت کا اظہار کیا تھا۔

"نہیں میڈم...! آپ کا پولیس اسٹیشن جانا مناسب نہیں ہے..." شہریار نے نفی میں گردن ہلائی تھی۔

"کیوں...؟ مناسب کیوں نہیں ہے...؟" مدحیہ نے اسے تیکھی سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

"دیکھیے میڈم...! یہ کورٹ کچہری اور تھانے وغیرہ جیسی جگہوں پر مرد ہی آتے جاتے اچھے لگتے ہیں' کیونکہ یہ مردوں کی جگہیں ہیں' یہاں عورتوں کا آنا جانا معیوب سمجھا جاتا ہے' خصوصاً" شریف گھرانے کی عورتوں کا' آپ کو احتیاط کرنی چاہیے۔"

شہریار نے اسے مخلصانہ مشورہ دیا تھا' لیکن مدحیہ سمجھ ہی نہیں پا رہی تھی اسے بس عدیل عمر سے ملنے سے غرض تھی۔

"تو پھر میں اس سے مل کیسے سکتی ہوں...؟" وہ جھنجلائی تھی۔

"بس آپ دعا کریں کہ وہ جلدی باہر آ جائے' میری صبح صبح بات ہوئی ہے دل آور صاحب سے..." قدرے جھنجلا کر ادھر ادھر دیکھتی مدحیہ نے چونک کر شہریار کو دیکھا تھا۔

"کیا۔۔۔؟دل آور بھائی سے بات ہوئی ہے۔۔۔؟کیا کہا انہوں نے۔۔۔؟" اسے تجسس ہوا تھا۔

"وہ کہہ رہے تھے کہ عدیل صاحب کی بیل کروانے کے لیے انہیں کچھ ضروری کاغذات اور معلومات کی ضرورت ہے جو انہیں صرف میں ہی لا کر دے سکتا ہوں' اس لیے مجھے ان کے آفس ٹائمنگ کے بعد ان سے ملنا ہوگا اور عدیل صاحب سے بھی ملاقات کروانی پڑے گی اور ان شاء اللہ ایک دو روز تک کام ہو جائے گا' کیونکہ انہوں نے اس کیس کی کچھ جانچ پڑتال بھی تو کرنی ہے نا۔۔۔؟" شہریار نے تفصیلی جواب دیا تھا۔

"اوہ۔۔۔!تو تم اب ان سے ملو گے۔۔۔؟" مدیحہ نے گہری سانس کھینچی تھی۔

"ظاہر ہے۔۔۔!ملنا تو ہے۔۔۔ان سے نہیں ملنا تو اور کس سے ملنا ہے۔۔۔؟ان کا بہت بڑا احسان ہے کہ انہوں نے یہ کیس ہاتھ میں لیا ہے' وہ بھی بغیر کسی فیس کے۔۔۔ اور بغیر کسی فیس کے۔۔۔ ورنہ عدیل صاحب کا تو کوئی مدد کرنے والا بھی نہیں تھا۔۔۔" شہریار نے افسوس سے سرہلایا تھا۔

"ہونہہ۔۔۔!کوئی نہ بھی ہو۔۔۔اوپر والا تو ہے نا۔۔۔؟ اور یہ مدد بھی دل آور بھائی نہیں۔۔۔اوپر والا ہی کر رہا ہے۔۔۔ کیونکہ کسی کو کسی کا وسیلہ بنا کر وہی بھیجتا ہے' کبھی شہریار کی صورت میں' کبھی دل آور شاہ کی صورت میں۔۔۔ایسی وے تم میرا یہ نمبر رکھ لو' بھائی سے ملاقات میں جو بھی بات ہو مجھے بتا دینا' ورنہ میں واقعی اس سے ملنے کے لیے چلی جاؤں گی۔"

مدیحہ نے اپنا نمبر لکھ کر اس کی سمت بڑھایا تھا اور اسے جیسے دھمکی بھی دی تھی جس پہ شہریار بے ساختہ مسکرا دیا تھا اور وہ پلٹ کر گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔۔۔"خدا حافظ۔" وہ اسے ہاتھ ہلا کر گاڑی اڑا لے گئی تھی۔۔۔!

✡ ✡ ✡
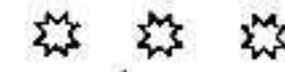
"یس مما۔۔۔!آپ نے بلایا تھا۔۔۔؟" عون دروازے پہ دستک دے کر اندر داخل ہوا تھا اور سوالیہ نظروں سے آسیہ آفندی کی جانب دیکھا تھا۔

"ادھر آؤ۔۔۔!میرے ساتھ بیٹھو۔۔۔" آسیہ آفندی نے آہستگی سے الماری کا پٹ بند کرتے ہوئے عون کو اشارہ کیا اور صوفے کی طرف بڑھ گئی تھیں اور عون ان کی تقلید کرتے ہوئے ان کے برابر ہی صوفے پہ آ بیٹھا تھا' وہ خاصا چپ اور سنجیدہ تھا اور یہ چپ اور سنجیدگی تب سے چلی آ رہی تھی جب سے علیزے حویلی چھوڑ کر گئی تھی' وہ دونوں بھائی ہر وقت کبوتر کی طرح اڑنے والے اور غڑغوں' غڑغوں کرنے والے' پھولوں کی طرح چپ ہو کر مرجھا گئے تھے' ان کی باتیں اور شرارتیں سب ختم ہو کے رہ گئی تھیں۔

اور اپنے بچوں کو چپ اور اداس دیکھ دیکھ کر آسیہ آفندی کا دل اندر ہی اندر کڑھتا رہتا تھا' شوہر کی بیماری کی وجہ سے وہ اپنے دونوں بچوں کو بھی ٹائم نہیں دے پا رہی تھیں اور وہ بھی ان کو ڈسٹرب کیے بغیر اپنی روٹین پہ اسکول آ جا رہے تھے' ٹیوشن پڑھ رہے تھے اور اپنا قرآن پاک کا سبق بھی دہرا رہے تھے مولوی صاحب کے پاس' کیونکہ پہلے وہ ایک ایک مرتبہ قرآن پاک کا سبق پورا پڑھ چکے تھے' اب دوبارہ سے شروع کیا ہوا تھا اور آسیہ آفندی اس سب پہ بہت زیادہ خوش ہوتیں اگر یہ سب روٹین پہ کرتے ہوئے ان کی پہلے والی شوخیاں اور شرارتیں بھی زندہ ہوتیں۔۔۔ اسی لیے تو ان کو بجھا بجھا سا دیکھ کر ان کا دل بھر آتا تھا۔

"عدید کہاں ہے۔۔۔؟" انہوں نے اپنے قریب سر جھکائے عون کی طرف رخ پھیرا تھا۔

"جی۔۔۔!وہ اپنے بیڈ روم میں ہے۔۔۔" اس نے یونہی سر جھکائے ہوئے جواب دیا تھا۔

"وہ کیوں نہیں آیا۔۔۔؟" انہوں نے عون کے جھکے ہوئے سر کو دیکھا اور استفسار کیا تھا۔

"آپ نے صرف مجھے بلایا تھا شاید۔۔۔" عون نے اپنے بچپنے کے برعکس جواب دیا تھا' سمجھ داری لیے

ہوئے۔۔۔!

"پہلے بھی تو میں صرف ایک کو بلاتی تھی اور تم دونوں آ جاتے تھے۔۔۔؟" وہ ماں تھیں لاجواب کرنا آتا تھا۔

"لیکن پہلے پاپا بیمار نہیں تھے نا۔۔۔؟اب ان کو ڈسٹرب کرنا اچھا نہیں لگتا۔۔۔" عون نے پھر بھی معقول جواب ڈھونڈا تھا۔

"عون۔۔۔!تمہارے پاپا پہلے بیمار نہیں تھے اور انہیں تم لوگوں کا بیڈ روم میں آنا' باتیں کرنا' شرارتیں کرنا اچھا لگتا تھا' لیکن اب وہ بیمار ہیں' اس لیے انہیں تم لوگوں کا بیڈ روم میں آنا' باتیں کرنا اور شرارتیں کرنا زیادہ اچھا لگے گا۔۔۔ کیونکہ وہ اکیلے ہو گئے ہیں' تنہا ہو گئے ہیں' بیڈ روم سے باہر کی دنیا مر گئی ہے ان کے لیے۔۔۔ ختم ہو گئی ہے۔۔۔ کیونکہ وہ دنیا کے لیے مر گئے ہیں۔۔۔ ختم ہو گئے ہیں۔۔۔ زندہ ہو کر بھی زندہ نہیں ہیں۔۔۔ یہ بیڈ روم ان کے لیے ایک لگژری قبر کی مانند ہے اور تم نہیں جان سکتے بیٹا۔۔۔ قبر جتنی بھی لگژری ہو جائے' آخر قبر ہی ہوتی ہے اور اس قبر میں پڑے ہوئے بے جان مردہ انسان پہ جب کبھی کبھار اس کے اپنے دو حرف فاتحہ کے پڑھنے کے لیے آتے ہیں تو وہ بے جان مردہ جیسے جی اٹھتا ہے' اپنی موت اور بے بسی کی ساری تکلیفیں بھول کر اس پہ خوشی اور سکون کی لہر دوڑ جاتی ہے' بالکل ایسے ہی تم دونوں آؤ گے تو تمہارے پاپا پہ خوشی اور سکون کی لہر دوڑ جائے گی' کیونکہ تم دونوں نہیں آؤ گے تو اور کون آئے گا۔۔۔؟ اور ان کے پاس بیٹھے گا۔۔۔؟ دیکھو بیٹا۔۔۔!فاتحہ اپنی اولاد ہی آ کر پڑھتی ہے' کوئی اور نہیں پڑھتا آ کر۔۔۔" آسیہ آفندی نے انتہائی سفاک اور بے رحم الفاظ میں کہتے ہوئے اپنے حلق اور اپنی آنکھوں میں امڈنے والے زہریلے اور تلخ آنسوؤں کو بڑی مشکل سے اندر ہی اندر پینے کی اور اپنے آپ کو ضبط کے دائرے میں رکھنے کی کوشش کی تھی۔

"پلیز مما۔۔۔!ایسا تو مت کہیں۔۔۔؟" عون ابھی بچہ تھا' ضبط نہیں کر سکا تھا' اس کے آنسو نرم رخساروں پر پھسل آئے تھے۔

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں بیٹا۔۔۔!یہی سچ ہے۔۔۔ اور سچ ہمیشہ کڑوا ہوتا ہے۔۔۔ اور تم لوگوں کو اس کڑوے سچ اور تلخ حقیقت کا سامنا کرنا ہی ہے۔۔۔ اس لیے میں چاہتی ہوں کہ تم دونوں آیا کرو' اپنے پاپا کے پاس بیٹھا کرو' باتیں کیا کرو' ان کے بے جان جسم میں جان پڑ جائے گی' کچھ پل کی خوشی اور راحت مل جائے گی' دل بہل جائے گا ان کا۔۔۔" آسیہ آفندی نے عون کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ کر تھپکتے ہوئے کہا تھا اور عون بے ساختہ ان سے لپٹ کر رو پڑا تھا۔

"ایم سوری مما۔۔۔!اب ایسا نہیں ہوگا۔۔۔ ہم روز آیا کریں گے۔۔۔ اور پاپا کے ساتھ باتیں کیا کریں گے۔۔۔ ایم رئیلی سوری مما۔۔۔ رئیلی سوری۔۔۔" عون آسیہ آفندی سے لپٹا ہچکیوں سے رو رہا تھا اور ان کے سر کو اس کے بالوں کو چومتے ہوئے آسیہ آفندی کے آنسو بھی اس کے بالوں میں جذب ہو گئے تھے۔

"ریلیکس بیٹا۔۔۔!رونے سے کچھ نہیں ہوگا۔۔۔ میں بھی بہت روئی ہوں۔۔۔ مگر اب کوشش کر رہی ہوں کہ نہ رویا کروں۔۔۔ تم بھی مت رو۔۔۔" انہوں نے اس کی پشت سہلاتے ہوئے اسے چپ کرایا تھا۔۔۔ اور اس کی پیشانی کو چومتے ہوئے اسے خود سے الگ کیا تھا۔

"یہ لو پانی پیو۔۔۔!" انہوں نے صوفے کی سائیڈ والی چھوٹی ٹیبل سے پانی کے جگ سے پانی انڈیل کر گلاس اس کی سمت بڑھا دیا تھا اور عون نے بمشکل پانی کے دو گھونٹ لیے تھے اور گلاس پیچھے ہٹا دیا تھا۔

"میں نے تمہیں رلانے کے لیے یہاں نہیں بلایا تھا' بلکہ کسی کام کے لیے بلایا تھا۔۔۔" انہوں نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا تھا۔

"جی مما کہیے۔۔۔!میں سن رہا ہوں۔۔۔" اس نے آہستگی سے سر جھکاتے ہوئے پوچھا تھا۔

"دیکھو بیٹا۔! تمہارے پاپا کے لیے کچھ شاپنگ کرنی ہے' ان کے ٹاولز' ٹشوز اور ضرورت کی کئی اور چیزیں بھی لینی ہیں' میڈیسن بھی ختم ہو رہی ہیں ان کی۔۔۔ اس لیے میں دانیال کے ساتھ ذرا مارکیٹ تک جا رہی ہوں۔۔۔ دیر بھی ہو سکتی ہے۔۔۔ تمہارے پاپا سو رہے ہیں۔۔۔ اس لیے تمہیں میری واپسی تک یہیں ان کے پاس رہنا ہو گا۔۔۔ کیونکہ انہیں کسی بھی وقت کسی چیز کی ضرورت پڑ سکتی ہے اور اگر وہ اٹھ کر ٹیک لگانا چاہیں تو مبارک خان کو بلا لینا۔۔۔" آسیہ آفندی نے اسے ہدایات دی تھیں اور اس نے سعادت مندی سے اثبات میں سر ہلا دیا تھا جس پہ وہ اس کا ہاتھ سہلا کر اٹھ گئی تھیں۔

"السلام علیکم آنی۔۔۔!" دانیال آہستگی سے دستک دے کر اندر داخل ہوا تھا۔

"وعلیکم السلام۔۔۔! لو دانیال بھی آگیا۔۔۔ میں اب چلتی ہوں۔۔۔ جلدی لوٹنے کی کوشش کروں گی۔۔۔ اپنے پاپا کا خیال رکھنا۔۔۔ اللہ حافظ۔۔۔"

آسیہ آفندی ڈریسنگ ٹیبل پہ رکھا اپنا بیگ اٹھا کر دانیال کے ساتھ باہر نکل گئی تھیں اور ان کے پیچھے دروازہ بند ہو گیا تھا۔

عون ان کے جانے کے بعد چند سیکنڈ یونہی صوفے پہ بیٹھا رہا اور پھر آہستہ قدموں سے اٹھ کر چلتا ہوا وقار آفندی کے بیڈ کے پاس آگیا تھا اور ان کو بغور دیکھتے ہوئے ان کے قریب ہی بیڈ پہ بیٹھ گیا تھا۔

وقار آفندی کی پلکیں بند تھیں' لیکن نجانے کیوں بند پلکیں بھی لرز رہی تھیں۔

"پاپا۔۔۔! مما کہتی ہیں کہ ہمارے آنے سے' باتیں کرنے سے اور پاس بیٹھنے سے آپ کے بے جان جسم میں جان پڑ جائے گی' کچھ پل کی خوشی اور راحت مل جائے گی' دل بہل جائے گا آپ کا۔۔۔ لیکن پاپا۔۔۔! مما شاید بھول گئی ہیں کہ ان لوگوں کے آنے سے انسان کے بے جان جسم میں جان پڑتی ہے جن کو انسان اپنی جان سے بڑھ کے چاہتا ہے' انہی کو دیکھ کر خوشی اور راحت ملتی ہے اور انہی کے پاس بیٹھ کر دل بہلتا ہے۔۔۔ اور آپ کی جان تو وہی ہیں نا جو آپ کو بے جان کر کے چلی گئی ہیں' چھوڑ گئی ہیں۔۔۔؟

ہمارا اور ان کا کیا مقابلہ۔۔۔؟ ان کی کمی ہم کیسے پوری کر سکتے ہیں بھلا۔۔۔؟ ان کی کمی تو بس وہی پوری کر سکتی ہیں۔۔۔ آپ کے بے جان جسم میں تو صرف انہی کے آنے سے جان پڑ سکتی ہے۔۔۔ اور۔۔۔ اور ہم انہیں کہیں سے لا بھی نہیں سکتے۔۔۔؟ وہ کھو گئی ہیں پاپا۔۔۔" عون کا لہجہ کہتے کہتے بھیگ گیا تھا۔

"کاش۔۔۔! وہ کہیں سے آجائیں اور۔۔۔ اور آپ کو پھر سے ٹھیک کر دیں۔۔۔ آپ بالکل پہلے جیسے ہو جائیں۔۔۔ کیونکہ آپ کو اس حال میں دیکھ کر بہت تکلیف ہوتی ہے ہمیں اسی لیے۔۔۔ اسی لیے تو ہم یہاں نہیں آتے۔۔۔ اپنے بیڈ روم میں بیٹھے رہتے ہیں۔۔۔ آپ کی اور لیزے آپی کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ کیوں ہمیں چھوڑ کر چلی گئیں۔۔۔؟ وہ ایسی تو نہیں تھیں۔۔۔؟ پاپا میرا دل کہتا ہے میری آپی ایسی نہیں ہیں۔۔۔ ان سب کو غلط فہمی ہو گئی ہے۔۔۔ لیزے آپی منصور حسین کے ساتھ نہیں گئیں' منصور حسین انہیں زبردستی لے کر گیا ہے۔۔۔ پاپا یہ۔۔۔ یہ سب بہت برے ہیں' بہت گندے ہیں' لیزے آپی کے لیے گندہ سوچتے ہیں۔۔۔ مجھے بہت برا لگتا ہے' بہت برا۔۔۔"

عون وقار آفندی کے سینے پہ سر رکھے بے تحاشا رویا تھا اور اپنے دل کا غبار بھی جی کھول کے نکالا تھا یہاں تک کہ وقار آفندی کی بند پلکوں سے آنسو بہہ نکلے تھے اور قطار در قطار بہنے والے آنسو ان کی کنپٹیوں کے بالوں میں جذب ہونے لگے تھے۔

"آپ بھی چپ ہو گئے ہیں۔۔۔ کسی سے کچھ نہیں کہتے۔۔۔ ہم سے بھی نہیں۔۔۔ پاپا پلیز۔۔۔! کچھ تو بولیے۔۔۔ میں جانتا ہوں کہ آپ جاگ رہے ہیں' آپ مما کی بھی باتیں سن رہے تھے اور آپ میری بھی باتیں سن رہے ہیں۔۔۔

لیکن آپ ہم سے بات نہیں کررہے... کیوں بابا... ؟ کیوں... ؟" عون کی بات پہ وقار آفندی کا دل کانپ گیا تھا مگر دکھ تو اس بات کا تھا کہ وہ اپنے سینے سے لگ کر روتے اپنے لخت جگر کو بازو میں سمیٹ کر اپنے ہونے کا احساس بھی نہیں دے سکتے تھے کیونکہ ان کے بازو بے جان تھے اور وہ خود بے بس...

پھر بعد میں عون جتنا بھی رویا' جتنا بھی تڑپا لیکن خود ہی سنبھلا تھا... کیونکہ سنبھالنے والا جواب کوئی نہیں تھا۔ اور اپنے بچوں کو اس قدر تنہا محسوس کرکے وقار آفندی بھی آج بہت روئے تھے...!

☼ ☼ ☼

وہ کورٹ سے اور اپنے چند دیگر کاموں سے فارغ ہو کر اپنے آفس پہنچا تو پارکنگ لاٹ میں نبیل اور عبداللہ کی گاڑیاں دیکھ کر چونک گیا تھا... اور یونہی حیران ہوتے ہوئے وہ اندر آگیا تھا۔

"السلام علیکم سر...!" اس کا منشی قادر اسے دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"وعلیکم السلام... !اندر کون ہے... ؟" اس نے اپنے آفس کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"آپ کے دوست ہیں سر...! نبیل صاحب اور عبداللہ صاحب... کافی دیر سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں..." قادر کے لہجے میں احترام تھا۔

"کچھ بھیجا اندر؟ چائے وغیرہ؟" اس نے ان کی خاطر تواضع کے بارے میں استفسار کیا تھا۔

"جی سر... چائے وغیرہ بھجوائی ہے۔" اس کے منشی نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"اوکے... بیٹھو تم' اپنا کام کرو۔" وہ اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود اندر آگیا تھا۔

"السلام علیکم..." اس نے باآواز بلند سلام کیا تھا اور وہ دونوں چونک کر متوجہ ہوئے تھے۔

"وعلیکم السلام! مل گئی فرصت؟" عبداللہ نے خفگی سے کہا تھا۔

"جی! مل گئی' کیوں؟ کیا آپ کو چاہیے؟" دل آور نے اپنا بریف کیس اور گاڑی کی چابی ٹیبل کی بائیں سائیڈ پہ رکھتے ہوئے کہا۔

"الحمد للہ... ہمارے پاس تو آل ریڈی ہے۔" عبداللہ نے ہاتھ جھاڑے تھے۔

"لیکن افسوس کہ ہمیں کبھی کبھی ملتی ہے' بلکہ ڈھونڈنی پڑتی ہے؟" اس نے اپنے بریف کیس سے اپنا موبائل اور سگریٹ نکالتے ہوئے کہا تھا۔

"اور تم ہمیں کبھی کبھی ملتے ہو' بلکہ ڈھونڈنا پڑتا ہے۔" عبداللہ نے طنز کیا تھا۔

"لگن سچی ہو تو بندہ مل بھی جاتا ہے۔" دل آور نے سگریٹ کی ڈبیا اور لائٹر ان دونوں کو پیش کیے تھے۔ لیکن عبداللہ نے ہمیشہ کی طرح سگریٹ نکال کر سلگانے کی بجائے ڈبیا ایک سائیڈ پہ رکھ دی تھی۔

"لگن سچی ہو تو ملک حق نواز بھی مل جاتا ہے۔" عبداللہ نے جان بوجھ کر اس کا ذکر کیا تھا۔

"آف کورس! مل جاتا ہے۔" دل آور نے کندھے اچکائے تھے۔

"لیکن اگر مل جائے تو آگے کا حل بھی سوچ لینا چاہیے۔" عبداللہ کی بات پہ دل آور ٹھٹکا تھا۔

"کیا مطلب ہے؟ آگے کا حل کیا سوچنا چاہیے تھا۔" اس نے عبداللہ اور نبیل کے روبرو اپنی چیئر پہ بیٹھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"آگے کا حل یہ کہ جواباً" وہ لوگ کچھ بھی کرسکتے ہیں... مجھے آج صبح کال بھی موصول ہوئی ہے ملک اسد کی... اور میں تب سے اب تک پریشان ہوں۔" عبداللہ نے اپنی پریشانی اور یہاں آمد کی وجہ بھی بیان کی تھی۔

"اوہ... !تو یہ کہو نا کہ میرے قتل کی دھمکیاں موصول ہوئی ہیں تمہیں۔" دل آور نے ہونٹ سکیڑتے خود ساری بات سمجھ لی تھی۔

"یہ صرف دھمکیاں نہیں ہیں یار! ان کا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ ان سے کسی بھی قسم کی توقع کی جاسکتی ہے۔" عبداللہ نے دہائی دی تھی۔

"تو اس کے لیے کیا کرنا چاہیے مجھے؟ ملک حق نواز کو جیل سے نکال کر اس سے معافی مانگ کر' اسے اس کے ڈیرے پہ واپس چھوڑ کر آنا چاہیے یا پھر مومنہ بی بی کے پاس جاکر سر جھکا کر اس سے معذرت کرلینی چاہیے کہ میں معافی چاہتا ہوں مومنہ بی بی' میں آپ کا کیس نہیں لڑسکتا' میں آپ کو انصاف نہیں دلا سکتا' میں حق نواز سے ٹکر نہیں لے سکتا' کیونکہ وہ خطرناک آدمی ہے' اس کے سامنے آنا میرے بس کی بات نہیں۔ اس لیے پلیز آپ کسی اور کی طرف رجوع کریں' کوئی اور در کھٹکھٹائیں' مجھے تو قتل کی دھمکی ملی ہے اور میں تو ڈر گیا ہوں' دل آور نے استہزائیہ سے انداز میں کہتے ہوئے آگے کا نقشہ کھینچا تھا۔

"میرے کہنے کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ تم ایسا کرو؟ تم اگر انا پرست اور غیرت مند ہو تو بے غیرت میں بھی نہیں ہوں کہ تمہیں یہ کہوں کہ مومنہ بی بی کے کیس سے پیچھے ہٹ جاؤ؟" عبداللہ نے ذرا سخت لہجے کا استعمال کیا تھا۔

"تو پھر کیا مطلب ہے تمہارا؟ کیا چاہتے ہو تم؟" دل آور نے سگریٹ کی ڈبیا سے سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبا لیا تھا اور پھر اسے آگ کا شعلہ دکھاتے ہوئے ایک گہرا کش لیا تھا۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم احتیاط کرو اور اپنے لیے سیکورٹی کا انتظام کرو' گارڈز رکھو اپنے ساتھ' ورنہ نقصان بھی ہوسکتا ہے۔"

عبداللہ حقیقتاً" دل آور کے حوالے سے پریشان تھا اور یہ جاننے کے باوجود کہ ڈر اس کی ہڈیوں کو چھو کر بھی نہیں گزرا' پھر بھی اسے ڈر جانے والی احتیاطی تدابیر وغیرہ بتا رہا تھا' کیونکہ وہ اپنے فکرمند دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔

"کیا نقصان ہوسکتا ہے؟ یہ سیکورٹی' یہ گارڈز' یہ پہرے کیا میری موت کو روک لیں گے؟ بچالیں گے مجھ کو؟ کیا کبھی مرنے نہیں دیں گے؟ ہونہہ... غلط فہمی ہے تمہاری' موت اور مقدر سے بچنا ناممکن بات ہے یار' کیونکہ یہ دونوں ازل سے لکھ دیے گئے ہیں اور جو لکھی جاچکی ہے وہ ٹل نہیں سکتی' اگر میری موت ملک خاندان کے ہاتھوں لکھی ہے تو ان ہی کے ہاتھوں ہوگی' کسی حادثے میں لکھی ہے تو حادثے سے ہوگی اور اگر رضائے الٰہی سے لکھی ہے تو ان شاء اللہ رضا الٰہی سے ہی ہوگی۔ حالانکہ ہر موت رضائے الٰہی سے ہی ہوتی ہے۔ لیکن ہر موت میں الٰہی کی رضا الگ الگ ہوتی ہے' اس لیے میری موت کے لیے الٰہی کی کیا رضا ہے؟ یہ تو الٰہی ہی جانتا ہے۔ میں اور تم کچھ بھی نہیں کرسکتے' اور نہ ہی کوئی سیکورٹی کام آسکتی ہے۔"

دل آور نے اسے ایک معقول اور مضبوط جواب سے نوازا تھا' جس پہ عبداللہ نے اک نظر اپنے برابر والی چیئر پہ بیٹھے نبیل حیات کو دیکھا تھا جو ان دونوں کی گفتگو کے دوران خاموش بیٹھا سب سن رہا تھا۔

"لیکن اللہ نے یہ بھی تو فرمایا ہے نا کہ انسان کو اپنی زندگی' اپنی جان کی حفاظت کرنی چاہیے۔ مشکل وقت آجائے تو جان بچانے کے لیے کچھ بھی کیا جاسکتا ہے؟" اب عبداللہ کی بجائے نبیل نے لب کشائی کی تھی۔

"اوکے... جب یہ مشکل وقت آئے گا تب میں کچھ بھی کرلوں گا' لیکن فی الحال مجھ پہ ایسا کوئی مشکل وقت نہیں آیا کہ میں اپنی ہی ذات پہ پہرے لگوا دوں اور زندہ ہوتے ہوئے بھی اپنے دائیں بائیں فرشتے کھڑے کرلوں' ایسا وہ لوگ کرتے ہیں جو موت سے ڈرتے ہیں' میں موت سے نہیں ڈرتا۔ میرے تمام دروازے کھلے ہیں۔ جب چاہے آسکتی ہے۔ موسٹ ویلکم' بٹ آئی کانٹ ڈو دس۔" اس نے ذرا سے بازو پھیلاتے ہوئے نفی میں سر ہلایا تھا اور اب کی بار نبیل نے اک نظر اپنے برابر والی چیئر پہ بیٹھے ملک عبداللہ کو دیکھا تھا۔

وہ دونوں جو صبح سے اس کے لیے پریشان اور فکر مند ہو رہے تھے۔ اس کی باتیں سن کر خاموش سے ہو گئے تھے۔ اس نے ان کے مزید کچھ کہنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی تھی۔ اس لیے عبداللہ مزید کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر کے گہری سانس کھینچتا ہوا کرسی دھکیل کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"نبیل! میرا خیال ہے کہ مجھے اب گھر چلنا چاہیے؟" عبداللہ کا لہجہ سخت اور ناپا تلا سا ہو رہا تھا۔

"اتنی جلدی؟" دل آور اس کے لہجے کو محسوس کر چکا تھا۔

"نگارش کی طبیعت خراب ہے۔ ڈاکٹر نے اس کے لیے میڈیسن لکھ کر دی ہیں۔ وہ لے کر گھر جانا ہے۔ خدا حافظ۔" عبداللہ ہنوز اسی لہجے میں کہتے ہوئے پلٹ کر دروازے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

"کیا ہوا ہے نگارش بھابھی کو؟" دل آور نے فوراً پوچھا تھا' لیکن عبداللہ رکا نہیں اور نہ ہی اس نے جواب دیا تھا۔

"عبداللہ!" وہ پیچھے سے اسے پکارتا رہ گیا تھا۔ لیکن عبداللہ سنی ان سنی کرتے ہوئے وہاں سے چلا گیا تھا۔

"دیکھ رہے ہو نبیل! اس نے میری بات تک نہیں سنی؟" دل آور مارے جھنجلاہٹ کے اپنی چیئر سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"تم نے کون سا سنی ہے؟" نبیل نے کندھے اچکائے تھے۔

"اف نبیل! تم بھی؟ پلیز یار تم دونوں میری پوزیشن سمجھنے کی کوشش کرو میں اگر ایسا کروں گا تو ملک حق نواز مجھ پر حاوی ہو جائے گا۔ وہ صاف سمجھے گا کہ میں نے اس کے ڈر سے' اور اس سے بچاؤ کے لیے یہ حفاظتی اقدامات کیے ہیں' جبکہ میں ایسا نہیں چاہتا۔ زندگی' موت' عزت اور ذلت اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ وہ جب بھی' جو بھی دے گا' مجھے منظور ہو گا' لیکن یہ سب نہیں۔"

اس نے نفی میں گردن ہلائی تھی اور نبیل بھی چپ سا ہو گیا تھا' کیونکہ وہ ان کا کہا ماننے کو تیار نہیں تھا! اور وہ پریشان تھے۔

✡ ✡ ✡

عبداللہ وہاں سے سیدھا مارکیٹ آیا تھا۔

میڈیکل اسٹور سے میڈیسن لینے کے بعد اسے یاد آیا کہ زری نے اسے کچھ فروٹ اور جوسز لانے کا بھی کہا تھا' کیونکہ نگارش کو ڈاکٹر نے فی الحال کسی بھی غذا سے منع کیا تھا۔ اس لیے اس نے تاکید کر کے بھیجا تھا کہ وہ اس کے لیے کچھ ہلکی پھلکی چیزیں لے کر آئے' کیونکہ فریج خالی پڑا ہوا تھا' جب ہی عبداللہ کو میڈیسن لینے کے بعد ایک بڑی سی فروٹ شاپ کی طرف آنا پڑا تھا۔

اس شاپ سے فروٹ بہت مہنگا ملتا تھا۔ لیکن اس فروٹ کی یہ خاصیت تھی کہ فریش' صحت مند اور صاف فروٹ ہوتا تھا۔ عبداللہ پہلے بھی ایک بار اس شاپ پہ آ چکا تھا۔

تین کلو انار' تین کلو سیب' چار درجن کیلا اور چار درجن کینو۔ شاپ کیپر نے چیزوں کی تعداد کا حساب کر کے اس گریس فل سی خاتون کو ان کا بل بتایا تھا جو عبداللہ سے ذرا آگے کھڑی فروٹ خرید رہی تھیں اور وہ اپنی باری کا منتظر تھا۔

"یہ لیجیے۔" انہوں نے اپنے پرس سے پیسے نکال کر شاپ کیپر کو تھمائے تھے اور فروٹ کے چار شاپر بمشکل ہاتھوں میں لے کر وہ واپسی کے لیے پلٹی تھیں۔ لیکن ابھی صرف دو قدم ہی آگے بڑھی تھیں کہ کینوؤں والے شاپر سے جھانکتی ایک سبز ٹہنی سے سیبوں والا شاپر پھٹ گیا تھا اور شاپر میں موجود سارے کے سارے سیب نیچے

زمین پہ بکھر گئے تھے اور وہ آگے بڑھتے بڑھتے رک گئی تھیں۔

"اوہ۔" عبداللہ کے منہ سے بے ساختہ افسوس کا لفظ ادا ہوا تھا' کیونکہ وہ بے چاری پہلے ہی اتنے وزنی بیگ اٹھائے ہوئے تھیں اور اس پہ یہ نئی مصیبت۔

"ٹھہریے! میں سمیٹ دیتا ہوں' عبداللہ نے انہیں نیچے بیٹھنے سے روک دیا تھا اور جلدی جلدی شاپ کیپر سے نیا شاپر لے کر سارے سیب چن کر شاپر میں ڈالنے لگا تھا۔ لیکن وہ یہ نہیں دیکھ پایا تھا کہ اس کی آواز سن کر آسیہ آفندی کو یوں لگا تھا جیسے وہ بائیس سال پیچھے چلی گئی ہوں اور ان کی سماعتوں میں بالکل ایسی ہی آواز گونجنے لگی ہو۔

"لیجیے! سارے اس میں ڈال دیے ہیں۔" عبداللہ جو نیچے پنجوں کے بل بیٹھا ہوا تھا سارے سیب شاپر میں ڈالنے کے بعد یک دم اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ لیکن اس خاتون کو یک ٹک اپنی سمت دیکھتے پا کر ذرا سا ٹھٹک گیا تھا۔

"لائیے۔ میں آپ کو گاڑی تک چھوڑ آتا ہوں۔" عبداللہ نے انہیں متوجہ کرنے کے لیے ان کے ہاتھ سے باقی شاپر بھی تھام لیے تھے اور نہ جانے کیا وجہ تھی کہ آسیہ آفندی نے بھی بغیر کسی تامل کے اسے شاپر تھما دیے تھے اور وہ ان کے ساتھ چل پڑا تھا اور ابھی وہ گاڑی کے قریب آئے ہی تھے کہ گاڑی کے ساتھ کھڑا کسی کا فون سنتا دانیال' آسیہ آفندی کو کسی اور کے ساتھ آتے دیکھ کر فوراً' فون بند کر کے ان کی طرف لپکا تھا۔

"دانیال بیٹا' ان سے یہ بیگ پکڑ کر گاڑی میں رکھ لو۔" آسیہ آفندی نے انتہائی آہستگی سے کہتے ہوئے ایک بار پھر عبداللہ کے چہرے کو دیکھا تھا' جس کا اک اک نقش ان کے کلیجے کو کھینچ رہا تھا' لیکن اس کھنچاؤ کی وجہ کیا تھی؟ یہ انہیں خود بھی معلوم نہیں ہو رہا تھا۔

"لیکن آنی۔ آپ ٹھیک تو ہیں نا؟ کیا ہوا ہے آپ کو؟" دانیال پریشان ہو گیا تھا۔

"ہاں' میں ٹھیک ہوں بیٹا' بس یہ بیگ زیادہ وزنی تھے۔ اس لیے انہوں نے ہیلپ کروا دی۔" آسیہ آفندی نے عبداللہ کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"اف آنی! آپ کم از کم میرے فون سننے کا ہی انتظار کر لیتیں' میں نے کہا بھی تھا کہ میں آپ کے پیچھے ہی آ رہا ہوں۔ بس آذر کی کال تھی اس لیے بات کرنا پڑ گئی۔" دانیال خفگی سے کہتا عبداللہ کے ہاتھ سے بیگ لے کر گاڑی میں رکھ چکا تھا اور دوبارہ اس کی طرف پلٹا تھا۔

"تھینک یو سر۔ آپ نے اتنی ہیلپ کی۔" اس نے عبداللہ سے ہاتھ ملاتے ہوئے شکریہ ادا کیا تھا۔

"اٹس اوکے! تھینکس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ آپ کی آنی ہیں تو میری بھی آنی ہیں۔" عبداللہ نے کافی خلوص سے آداب نبھائے تھے اور آسیہ آفندی نے بے ساختہ چونک کر دیکھا تھا' حالانکہ اس نے تو محض محاورتاً" اور اخلاقاً" کہا تھا' لیکن ان کے تو سیدھا دل پہ اثر ہوا تھا۔

"او شیور! اینڈ تھینکس اگین سر۔" دانیال نے خوشدلی سے کہتے ہوئے کندھے اچکائے تھے۔

"اوکے! یو ویلکم۔" عبداللہ نے ذرا سا مسکراتے ہوئے سر ہلایا تھا اور دو قدم پیچھے ہٹ کے کھڑا ہو گیا تھا' کیونکہ آسیہ آفندی نے گاڑی میں بیٹھنا تھا اور اس کے پیچھے ہٹتے ہی دانیال نے ان کے لیے فرنٹ ڈور کھول دیا تھا۔ وہ خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ گئی تھیں' لیکن گاڑی میں بیٹھنے کے بعد بھی انہوں نے عبداللہ کی طرف دیکھا تھا اور عبداللہ اب بھی ان کے دیکھنے پہ چونک گیا تھا اور اب کی بار شیشے کے پار نظر آتی شکل و صورت اور کچھ کھوجتی ہوئی اداس آنکھیں عبداللہ کو بھی ٹھٹکا گئی تھیں۔ وہ یک دم الجھ گیا تھا۔

اور اتنے میں دانیال اسے ہاتھ ہلاتے ہوئے گاڑی نکال لے گیا تھا' مگر عبداللہ اپنے دماغ پہ زور ڈالتے ہوئے الجھتا ہوا سا رہ گیا تھا۔

آنی؟ دانیال؟

دانیال؟ آنی؟

آنی... آنی! آسیہ پھوپھو؟

عبداللہ کے ذہن میں ان دو ناموں کی تکرار ہو رہی تھی اور یہ تکرار ایک نام پہ آ کر اٹک گئی تھی اور اسے جیسے کرنٹ چھو گیا تھا۔ دانیال اور آسیہ پھوپھو؟ یہ... یہ؟ وہ دونوں تھے؟ عبداللہ نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا تھا اور پھر بے ساختہ گاڑی کے پیچھے بھاگا تھا۔

"دانیال... دانیال... رکو پلیز... گاڑی روکو۔" لیکن اب اس کے پکارنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ گاڑی آنکھوں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ بہت دور جا چکے تھے وہ لوگ اور عبداللہ تاسف سے ہاتھ ملتا رہ گیا تھا۔

تو کیا اتنے سالوں بعد آنی بھی اسے بار بار دیکھ کر پہچاننے کی کوشش کر رہی تھیں اور اتنی دیر میں عبداللہ نے بھی انہیں نہیں پہچانا تھا۔

بہت بڑی کوتاہی ہو گئی تھی اس سے' وہ اپنے سگے خون کے رشتوں کو اپنے ہاتھوں سے گنوا بیٹھا تھا۔

☼ ☼ ☼

مان لے اب بھی میری جان ادا' درد نہ چن
کام آتی نہیں' پھر کوئی دعا' درد نہ چن
میں تیرے لمس سے محروم نہ رہ جاؤں کہیں
آخری بار مجھے خود سے لگا' درد نہ چن
کچھ نہ دے گا یہ مسائل سے الجھتے رہنا
چھوڑ سب کچھ میری بانہوں میں سما' درد نہ چن

نبیل اپنے موبائل پہ بجنے والی زری کی کال دیکھ کر اپنے دل کو سنبھالنے میں لگ گیا تھا' وہ اسے کال کر رہی تھی۔ اور اس کے لیے تو یہ احساس ہی ہر احساس پہ بھاری تھا کہ وہ اس کے نمبر پہ اسے کال کر رہی ہے اور اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اس احساس اور اس خوشی کے مارے وہ اپنے ہی موبائل کو سینے سے لگا لے اور وہ سینے سے لگا دھڑکتا رہے اور وہ اسے محسوس کرتا رہے۔ مگر یہ ممکن کب تھا بھلا...؟ وہ تو اسے اس کی اجازت کے بغیر نظر اٹھا کر دیکھنے کی بھی گستاخی نہیں کر سکتا تھا' سینے سے لگانے کی بات تو قیامت کی بات تھی... اور ایسا تصور بھی حشر کا تصور تھا۔

اور حشر کے اس تصور میں اس کے دل پہ حقیقتاً "ایک قیامت گزر گئی تھی کیونکہ کال بجتے بجتے بند ہو گئی تھی۔

"او شٹ...!" نبیل نے بے اختیار اسٹیرنگ پہ مکا دے مارا تھا حالانکہ غلطی اس کی اپنی ہی تھی کیونکہ اس کے موبائل پہ زری کی کال کافی دیر سے بج رہی تھی اور وہ ایک ہاتھ سے ڈرائیو کرتا دوسرے ہاتھ میں موبائل پکڑے اسکرین پہ نظر آتے زری کے نام کو ہی دیکھے جا رہا تھا اور اس دیکھنے دیکھنے میں ہی کال مسڈ کالز میں شامل ہو گئی تھی اور وہ کف افسوس ملتا رہ گیا تھا۔ لیکن یہ افسوس زیادہ دیر افسوس نہیں رہا تھا بلکہ ذرا دیر بعد پھر سرشاری میں بدل گیا تھا' اس کی کال دوبارہ آ گئی تھی۔

"ہیلو...؟" نبیل نے فوراً" کال ریسیو کر لی تھی اور گاڑی کی اسپیڈ کو بھی کم کر دیا تھا۔

"السلام علیکم...! میں زری بات کر رہی ہوں۔" اس کی آواز بے حد دھیمی تھی۔

"وعلیکم السلام...! جی میں آپ کا نمبر دیکھ چکا ہوں۔" نبیل کا لہجہ اس سے بھی زیادہ نرم ہو چکا تھا۔

"مجھے لگتا ہے کہ آپ ڈرائیو کر رہے ہیں...؟" زری نے گاڑی کی آواز محسوس کر لی تھی۔

"جی...! آپ کو لگ رہا ہے تو صحیح ہی لگ رہا ہو گا' میں واقعی ہی ڈرائیو کر رہا ہوں۔" وہ ذرا سا مسکرایا تھا۔

"تو میں کال بند کر دیتی ہوں' آپ آرام سے ڈرائیو کر لیں' میں بعد میں کال کر لوں گی۔" زری نے کال بند کرنا چاہی تھی۔

"ارے...! نہیں... نہیں... کال بند کرنے کی ضرورت نہیں ہے' آپ بات کریں' میں سن رہا ہوں۔" نبیل نے فوراً" اسے روکا تھا۔

"تھینک یو...! لیکن آپ جا کہاں رہے ہیں...؟" وہ بات شروع کرنے سے پہلے تمہید کا سہارا لے رہی تھی۔

"اپنے آفس...! شوروم..." اس نے نارمل سے انداز میں بتایا تھا۔

"لیکن اس وقت...؟" زری نے جان بوجھ کر حیرانی ظاہر کی تھی۔

"جی... وہ دراصل کسی کام کے سلسلے میں دل آور کے آفس جانا پڑ گیا تھا' ابھی وہیں سے واپس آ رہا ہوں۔"

"زیادہ ضروری کام تھا...؟" زری کرید رہی تھی۔

"ہاں... کہہ سکتی ہیں..." نبیل نے کندھے اچکائے تھے۔

"کیا جان سکتی ہوں کہ کیا کام تھا...؟"

"کیوں خیریت...؟ آپ کیوں پوچھ رہی ہیں...؟" نبیل نے دلچسپی سے پوچھا تھا۔

"وہ... دراصل صبح عبداللہ بھائی آپ کو کوئی بات ڈسکس کرنے کے لیے دل آور شاہ کے آفس میں بلا رہے تھے اس لیے مجھے تب سے پریشانی ہو رہی تھی کہ نجانے ایسی کون سی بات ہے جسے ڈسکس کرنے کے لیے وہ آپ کو وہاں بلا رہے ہیں...؟" زری نے اپنی پریشانی کہہ ہی ڈالی تھی اور نبیل اس کی پریشانی سن کر بے ساختہ مسکرا دیا تھا۔

"اوہ...! تو یہ بات ہے۔ اس پریشانی نے آپ کو فون کرنے پہ مجبور کیا ہے...؟" نبیل نے سمجھنے والے انداز میں سر ہلایا تھا۔

"جی... میں واقعی' بہت پریشان تھی' بلکہ اب بھی ہوں' کیا بات تھی...؟ کیا وجہ تھی آخر...؟" اس کا لہجہ اب بھی متفکر سا تھا۔

"ارے...! آپ پریشان نہ ہوں' آپ کے پریشان ہونے والی کوئی بات نہیں تھی' بس وہ دل آور کا ایک مسئلہ تھا اس پہ بات کرنا تھی۔" نبیل نے لاپروائی سے کہا تھا لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ جس مسئلے کو وہ اتنی لاپروائی سے لے رہا تھا وہی مسئلہ زری کی پریشانی اور فکر مندی کا اصل مرکز تھا... اور اس کے لیے تو وہ ہلکان ہو رہی تھی...!

"کیسا مسئلہ...؟" زری کو پھر پوچھنا پڑا تھا۔

"ملک حق نواز کا مسئلہ تھا' وہ جیل میں ہے' اس لیے ملک اسد اللہ آپ کے بڑے بھائی صاحب کی کال عبداللہ کو موصول ہوئی تھی وہ دل آور کو... دھمکیوں سے نواز رہے تھے اور عبداللہ نے یہی بات ڈسکس کرنے کے لیے مجھے بھی دل آور کے آفس بلایا تھا' لیکن وہ ماں کا شیر ایسا ہے کہ کچھ سننے کو ہی تیار نہیں ہو رہا تھا' کہتا ہے' ہونے دو جو ہوتا ہے' دیکھی جائے گی... اس لیے ہم دونوں بھی اٹھ کر واپس آ گئے ہیں... ہم نے بھی کہا... دیکھی جائے گی...۔" نبیل کہے جا رہا تھا اور زری چکرا کے رہ گئی تھی۔

ملک اسد اللہ کی کال اور دھمکی کوئی ایسی ویسی بات نہیں تھی کہ نظر انداز کر دی جاتی' یہ تو زری جانتی تھی یا عبداللہ جانتا تھا کہ وہ محض ڈرانے کے لیے دھمکیاں نہیں دیتے بلکہ کوئی باز نہ آئے تو عمل بھی کرتے ہیں' لیکن دل آور کو یہ بات کون سمجھاتا...؟

"ہیلو... زری... ہیلو...!" نبیل ایکدم خاموشی چھا جانے پہ بار بار اسے پکار رہا تھا۔

"ایم سوری...! میرا خیال ہے کہ عبداللہ بھائی آ گئے ہیں' میں کال بند کرتی ہوں اس وقت' آپ سے پھر بات

ہوگی۔"

زری نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کردیا تھا' لیکن نبیل کے لیے اتنا بھی کافی تھا کہ اس نے زری کی آواز سن لی تھی اور وہ خوش ہوگیا تھا۔

✡ ✡ ✡

اور ٹھیک تین روز بعد شہریار کی مدد سے وہ عدیل عمر کی ضمانت کے کاغذات تیار کرواکر پولیس اسٹیشن پہنچ گیا تھا۔ اور اسے دیکھتے ہی ایس ایچ او جمال احمد اپنی سیٹ سے کھڑے ہوگئے تھے وہ ذرا کم کم ہی پولیس اسٹیشن کے چکر لگاتا تھا اس لیے اسے دیکھ کر ہی ایس ایچ او جمال احمد احتراماً" کھڑے ہوجاتے تھے۔

"السلام علیکم شاہ صاحب۔۔۔! آج کیسے رونق بخش دی اس ستم خانے کو۔۔۔؟" ایس ایچ او جمال احمد نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا تھا۔

"ہمارے ایک عزیز قید کاٹ رہے ہیں آپ کے اس ستم خانے کی۔۔۔ سوچا ہمارے چند کاغذوں کے عوض آپ اگر اس کی جان بخشتے ہیں تو ایسے ہی سہی۔۔۔ ہمارا کیا جائے گا۔۔۔؟ بس چند کاغذ۔۔۔ اور ایک بے گناہ آزاد ہوجائے گا۔"

دل آور نے ایس ایچ او جمال احمد کی پیش کی ہوئی کرسی پہ بیٹھتے ہوئے کندھے اچکائے تھے۔

"چند بے گناہ تو آپ نے بھی قید کر رکھے ہیں شاہ جی۔۔۔! ابھی ان کو آزاد کرنے کے بارے میں تو نہیں سوچا آپ نے۔۔۔؟"

اپنے عقب سے ابھرنے والی انسپکٹر شہناز کی آواز پہ دل آور نے بے ساختہ چونک کر دیکھا تھا کیونکہ انسپکٹر شہناز کی بات پہ اس کا پہلا خیال ہی علیزے کی طرف گیا تھا کیونکہ اس کے پاس تو صرف وہی قید تھی۔۔۔!

"مثلاً۔۔۔؟" دل آور انسپکٹر شہناز کو دیکھ کر احتراماً" اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"مثال آپ کے سامنے کھڑی ہے شاہ جی۔۔۔!" انسپکٹر شہناز اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی اور ایس ایچ او جمال احمد مسکرا دیے تھے۔

"آپ کو شاید پتا نہیں ہے انسپکٹر صاحبہ۔۔۔! کہ میرا ایک اصول ہے میں کسی کو قید نہیں کرتا' بلکہ آزاد چھوڑ دیتا ہوں' البتہ یہ اور بات ہے کہ لوگ پھر بھی خود کو قید میں ہی سمجھتے ہیں۔۔۔" اس نے انسپکٹر شہناز کو ذرا مبہم سا جواب دیا تھا۔

"جانے دیجیے میڈم۔۔۔! کن سے بات کررہی ہیں بھلا۔۔۔؟ بیرسٹر صاحب ہیں آخر۔۔۔؟" ایس ایچ او جمال احمد نے مسکرا کر سر جھٹکا تھا۔

"یہ اگر بیرسٹر صاحب ہیں تو ہم بھی اس وقت فل یونیفارم میں ہیں ایس ایچ او صاحب۔۔۔! کیا خیال ہے آپ کا۔۔۔؟" انسپکٹر شہناز نے ایس ایچ او جمال احمد کی سمت دلچسپی سے دیکھا تھا۔

"ہمارے خیال تو ہمیشہ ہی اچھے ہوتے ہیں میڈم۔۔۔" ایس ایچ او جمال احمد ان لوگوں کی نوک جھوک پہ ہنس رہے تھے۔

"ذرا سوچیے شاہ جی۔۔۔! اگر ہم آپ کو اٹھا کر حوالات میں بند کردیں تو آپ کی ضمانت کرانے کے لیے کون آئے گا۔۔۔؟" انسپکٹر شہناز کے سوال پہ دل آور شاہ یکدم فلک شگاف قہقہہ لگا کے ہنسا تھا کیونکہ اس کا سوال ہی اتنا دلچسپ سا تھا۔

"ہاہاہا۔۔۔! میری ضمانت کرانے کے لیے پورا شہر آئے گا میڈم۔۔۔ پورا شہر۔۔۔!" وہ ابھی تک ہنس رہا تھا۔

"مطلب۔۔۔؟" انسپکٹر شہناز اس کی استہزائیہ سی ہنسی پہ سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"مطلب کہ پورا شہر میرا دشمن ہے' کوئی بھی مجھے دیکھنا نہیں چاہتا' اس لیے میری ضمانت کرانے کے لیے کوئی بھی نہیں آئے گا کیونکہ ویسے بھی کہا جاتا ہے کہ جو انسان سب کا ساتھ دیتا ہے' وہی اکیلا رہ جاتا ہے' اس لیے مجھے ایسا کوئی بھروسہ نہیں ہے کہ کوئی آئے گا۔۔۔" دل آور کا لہجہ نجانے کیوں اچانک ہی سنجیدہ ہوگیا تھا۔

"لیکن مجھے یقین ہے کہ پورا شہر ہی آئے گا۔۔۔! پورا شہر آپ کا دشمن ہے تو پورا شہر آپ کا دوست بھی ہے شاہ جی۔۔۔! ابھی اپنے آپ کو حوالات میں بند کرکے تو دیکھیں۔۔۔؟" انسپکٹر شہناز نے خاصے سچے دل سے کہا تھا کیونکہ اسے واقعی یقین تھا۔

"فی الحال تو میں کسی کو چھڑوانے کے لیے یہاں آیا ہوں' آپ یہ پیپرز چیک کرلیں۔۔۔" اس نے بات بدل دی تھی۔ اور پھر ضروری کارروائی کے بعد عدیل عمر کو آزاد کردیا گیا تھا' جو شہریار کو دیکھنے اور ملنے کے بعد دل آور شاہ کو حیرت زدہ سا دیکھ رہا تھا۔

"کیسے ہو بہادر۔۔۔؟" دل آور نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے ذرا بشاشت سے پوچھا تھا۔

"ٹھیک ہوں۔۔۔! مگر آپ۔۔۔؟" عدیل کچھ کہہ نہیں پایا تھا اور شہریار عدیل کی کیفیت سمجھتے ہوئے مسکرا دیا تھا۔

"ارے یار۔۔۔! باقی کے سوال بعد میں۔۔۔ فی الحال یہاں سے تو نکلو۔۔۔؟" دل آور نے اس کے کندھے کو تھپکتے ہوئے باہر نکلنے کا اشارہ کیا تھا اور خود ایس ایچ او جمال احمد اور انسپکٹر شہناز کی طرف پلٹا تھا۔

"اوکے ایس ایچ او صاحب۔۔۔! بہت بہت شکریہ آپ کا۔۔۔ اب اجازت دیجیے۔۔۔ اللہ حافظ۔۔۔" وہ ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا تھا اور خدا حافظ کہہ کر وہاں سے نکل آیا تھا البتہ انسپکٹر شہناز اسے چھوڑنے کے لیے گاڑی تک آئی تھی۔

"تھینک یو انسپکٹر صاحبہ۔۔۔! اتنے پروٹوکول کے لیے بہت شکریہ۔۔۔" دل آور نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے پلٹ کر اسے دیکھا تھا' عدیل اور شہریار بھی انہیں ہی دیکھ رہے تھے۔

"شرمندہ کررہے ہیں ہمیں۔۔۔؟" انسپکٹر شہناز سنجیدگی سے پوچھ رہی تھی۔

"میری اتنی مجال کہاں کہ آپ کو شرمندہ کروں۔۔۔؟" اس نے عاجزی کا مظاہرہ کیا تھا۔

"ایک اور شرمندہ کرنے والی بات۔۔۔" انسپکٹر شہناز نے خفگی سے سر جھٹکا تھا۔

"اوکے۔۔۔! نہیں کرتا شرمندہ کرنے والی بات۔۔۔ اب خوش۔۔۔؟" اس نے ہتھیار ڈال دیے تھے اور انسپکٹر شہناز مسکرا دی تھی۔

"اللہ حافظ۔۔۔!" وہ بھی مسکراتے ہوئے کہہ کر گاڑی میں سوار ہوگیا اور عدیل کے لیے فرنٹ ڈور اور شہریار کے لیے بیک ڈور کھول دیے تھے اور ان کے بیٹھتے ہی گاڑی اسٹارٹ کردی تھی لیکن گاڑی کو بیک کرتے کرتے ایک بار پھر انسپکٹر شہناز کے قریب رک گیا تھا اور گاڑی کا شیشہ فولڈ کرتے ہوئے اس سے مخاطب ہوا تھا۔

"چند بے گناہ ایسے بھی ہوتے ہیں' جو ہمیشہ ہماری قید میں رہیں تو ہی اچھا لگتا ہے اور انسان کبھی بھی انہیں آزاد چھوڑنے کے بارے میں نہیں سوچتا۔۔۔ اور یہ بے گناہ وہ لوگ ہوتے ہیں' جن سے ہم محبت کرتے ہیں یا پھر وہ لوگ جو ہم سے محبت کرتے ہیں۔۔۔ اور ایسے لوگوں کو ہم ہمیشہ قید میں ہی دیکھنا چاہتے ہیں۔۔۔" دل آور کی بات انسپکٹر شہناز کے ساتھ ساتھ عدیل اور شہریار کے بھی دل کو لگی تھی' انسپکٹر شہناز دو قدم اور قریب آگئی تھی۔

"مثلاً۔۔۔؟" اس نے دل آور کے سے انداز میں کہا تھا۔

"مثال میرے سامنے ہی تو کھڑی ہے انسپکٹر صاحبہ۔۔۔؟" وہ دلچسپی سے کہہ کر انسپکٹر شہناز کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہراتے ہوئے گاڑی نکال لے گیا تھا اور وہ اپنی جگہ پہ جھنجلا کے رہ گئی تھی جبکہ دل آور گاڑی روڈ پہ

ڈالتے ہوئے بھی مسکرا رہا تھا۔

"ہیلو۔ کیا دیکھ رہے ہو۔۔۔؟ دل آور شاہ یا منصور حسین۔۔۔؟" اس نے گم سم سے بیٹھے عدیل کو مخاطب کیا تھا۔

"منصور حسین۔۔۔" عدیل کا لہجہ عجیب سا ہو رہا تھا۔

"منصور حسین میرے ایک کیس کا حصہ تھا' کیس ختم ہوا تو وہ بھی ختم ہو گیا۔۔۔" اس نے بے نیازی سے جواب دیا تھا۔

"لیکن وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ وقار آفندی کی بیٹی کا ڈرائیور۔۔۔ وہ گاڑی۔۔۔ وہ حلیہ۔۔۔ وہ سب۔۔۔؟" عدیل بے ربط سا ہونے لگا تھا اسے رفتہ رفتہ سب یاد آ رہا تھا۔

"وہ سب بھی اسی کیس کا حصہ تھا۔۔۔ بھول جاؤ اسے۔۔۔ اور یہ یاد رکھو کہ تمہارے سامنے اب کون ہے۔۔۔؟"

دل آور نے رائٹ سائیڈ پہ ٹرن لیتے ہوئے خاصے دو ٹوک لہجے میں کہا تھا جس کا مطلب تھا کہ وہ اس منصور حسین والے قصے کو دہرانا نہیں چاہتا تھا اسی لیے عدیل چپ کا چپ رہ گیا تھا۔

"جاب کرو گے۔۔۔؟" دل آور نے چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد خود ہی سوال کیا تھا اور وہ دونوں چونک گئے تھے۔

"جاب۔۔۔؟" عدیل حیرت اور بے یقینی سے گنگ ہو گیا تھا۔

"ہاں۔۔۔! میں نے جب تمہیں ورکشاپ میں دیکھا تھا تو تب بھی تمہاری جاب کے بارے میں سوچا تھا لیکن تب میں فارغ نہیں تھا اس لیے سوچا تھا کہ فارغ ہو کر تمہیں جاب کی آفر دوں گا' لیکن بعد میں بھی اتنی مصروفیت رہی کہ پھر خیال ہی نہیں آیا۔۔۔ اینی وے تم بتاؤ میرے لیے جاب کرو گے یا کہیں اور ارادہ ہے۔۔۔؟" وہ ڈرائیونگ میں مصروف عدیل کی سمت دیکھے بغیر پوچھ رہا تھا اور عدیل کے پاس تو جیسے کچھ کہنے کے لیے الفاظ ہی نہیں تھے وہ اللہ کی اس قدر مہربانی اور نوازش پہ کچھ بول ہی نہیں پا رہا تھا۔

"دیکھو۔۔۔! یہ مت سمجھنا کہ میں نے تمہاری ضمانت کروائی ہے' تمہارے لیے کچھ بھاگ دوڑ کی ہے تو بدلے میں تمہارے ساتھ کوئی ڈیل کر رہا ہوں یا پھر اس میں میرا کوئی مفاد شامل ہے۔۔۔ نہیں۔۔۔ ہرگز نہیں۔۔۔! ایسا سوچنا بھی مت۔۔۔ میں جب کسی کی مدد کا ذمہ اٹھاتا ہوں تو اپنا نفع نقصان اور اپنا مفاد نہیں دیکھتا' ہاں یہ ضرور سوچتا ہوں کہ کسی دوسرے کا فائدہ ہو جائے۔۔۔ اس لیے تم پوری طرح سے آزاد ہو' خود فیصلہ کر سکتے ہو کہ تم نے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں۔۔۔؟ میرے پاس منیجر کی جاب ہے' کرنا چاہو تو کر سکتے ہو۔۔۔ نہ کرنا چاہو تو زبردستی نہیں۔۔۔" دل آور نے کہتے ہوئے گاڑی شوروم کی پارکنگ میں پارک کر دی تھی۔

"منیجر کی جاب۔۔۔؟" عدیل نے زیر لب دہرایا تھا اور دل آور گاڑی کا دروازہ کھول کے نیچے اتر آیا تھا اور اس کے پیچھے وہ دونوں بھی اتر آئے تھے۔

"ہاں۔۔۔! منیجر کی جاب۔۔۔ اس شوروم میں۔۔۔" اس نے کافی سکون سے شوروم کی شاندار سی عمارت کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"اس شوروم میں۔۔۔؟" شہریار نے کافی اشتیاق سے کہا تھا۔

"ہاں۔۔۔! اس شوروم میں۔۔۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"تھینک یو سر۔۔۔! تھینک یو ویری مچ۔۔۔" عدیل کا لہجہ بے حد ممنون ہو رہا تھا اس کی آنکھیں' اس کا لہجہ بھیگ گیا تھا' اسے تو جیسے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی تھی' اللہ نے اسے ایک مشکل' ایک آزمائش میں ڈالنے کے بعد اسے اس کے صبر کا صلہ بھی دے دیا تھا' اتنا اچھا صلہ کہ وہ اللہ کے حضور جتنے بھی شکرانے ادا کرتا' وہ کم تھے۔

"آپ۔۔۔ آپ۔۔۔ تو واقعی میرے لیے فرشتہ ثابت ہوئے ہیں سر۔۔۔" عدیل حد سے زیادہ شکر گزار ہو رہا تھا۔

"ارے چھوڑو یار۔۔۔! کوئی انسان کبھی فرشتہ نہیں ہو سکتا اور کوئی فرشتہ کبھی انسان نہیں ہو سکتا' کیونکہ فرشتے کے لیے انسان بننا مشکل ہے اور انسان کے لیے فرشتہ بننا' اس لیے جو جیسا ہے اسے ویسا ہی رہنے دو۔۔۔" دل آور نے سر جھٹکا تھا۔

"مجھے اب کیا کرنا ہو گا۔۔۔؟" عدیل نے اسے وہیں کھڑے دیکھ کر پوچھا تھا۔

"تمہیں اب کچھ نہیں کرنا' تم اس وقت بس اپنے گھر جاؤ اور اپنے گھر والوں سے ملو' اپنے ماں باپ سے' اپنی بہنوں سے اور اپنے دوستوں سے' اس کے بعد فریش ہونے کے لیے ریسٹ کرو اور کل صبح فل تیاری سے آ کر اپنی سیٹ جوائن کرو' کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ باقی اسٹاف پہ تمہارا اچھا امپریشن پڑے' اس لیے اس وقت اس حلیے میں تمہیں متعارف کروانا مناسب نہیں ہو گا کیونکہ اس طرح اچھا امپریشن نہیں پڑے گا۔۔۔" عدیل اتنے دنوں سے جیل میں تھا' اس کے کپڑے خاصے ملگجے اور شکن آلود ہو رہے تھے' چہرے پہ سیاہ رواں بھی عجیب سا حلیہ پیش کر رہا تھا' سو دل آور کا مشورہ سو فیصد درست اور مفید مشورہ تھا' عدیل نے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

"او کے سر۔۔۔! جیسے آپ کی مرضی۔۔۔" اس نے دل آور سے ہاتھ ملاتے ہوئے تابعداری سے کہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔۔۔! میرا مقصد اس وقت تمہیں شوروم دکھانا تھا' تم اب گھر جا سکتے ہو' تم سے کل ملاقات ہو گی۔۔۔"

دل آور اس کا ہاتھ تھپک کر پلٹ گیا تھا لیکن دو قدم آگے بڑھنے کے بعد پھر ان کی سمت پلٹا تھا۔

"اور سنو۔۔۔! یہ جو تمہارا دوست ہے نا۔۔۔ شہریار۔۔۔ یہی تمہارا اصل دوست ہے۔۔۔ سچا' کھرا اور مخلص۔۔۔ اس کا ساتھ کبھی مت چھوڑنا' ورنہ زندگی کی جیل میں اکیلے رہ جاؤ گے اور کوئی بیل بھی نہیں کروائے گا۔" دل آور نے شہریار کی سمت اشارہ کرتے ہوئے عدیل کو تاکید کی تھی اور وہاں سے چلا گیا تھا جبکہ عدیل نے اس کا مفہوم سمجھتے ہوئے شہریار کو گلے سے لگا لیا تھا کیونکہ شہریار نے واقعی اس کا دوست ہونے کا حق ادا کر دیا تھا جس کی گواہی دل آور شاہ نے بھی دے دی تھی۔۔۔!

☆ ☆ ☆

پندرہ جنوری۔۔۔!

اپنے لیپ ٹاپ پہ پندرہ جنوری کی ڈیٹ دیکھ کر نجانے کیوں آذر کے ہاتھ وہیں کے وہیں رک گئے تھے اور اس کا دل جیسے کسی اتھاہ گہرائی میں ڈوب کے ابھرا تھا۔۔۔ ایک گہرا غوطہ آیا تھا اور آذر کو یوں لگا کہ دم نکل گیا ہو۔

"دو ماہ۔۔۔؟

اف۔۔۔! علیزے کو دیکھے ہوئے دو ماہ گزر گئے۔۔۔؟" آذر کے دل و جان پہ یہ خیال قیامت کی طرح گزرا تھا اور روح پہ ایک لرزش چھوڑ گیا تھا۔۔۔ کہاں تو اس کے بغیر دو پل نہیں گزرتے تھے اور کہاں دو مہینے گزر گئے تھے کہ اس

کی آواز تک نہیں سنی تھی۔

"تو کیا اب وہ عمر بھر نہیں ملے گی۔۔۔؟ تو کیا اب عمر یونہی تمام کرنی پڑے گی۔۔۔؟ بے کار' بے معنی اور خالی۔۔۔؟"

آذر سوچتے سوچتے مضطرب سا ہو گیا تھا۔

"وہ۔۔۔ وہ دل سے لگا کر رکھنے والی صورت کبھی نظر نہیں آئے گی۔۔۔؟ کبھی پاس نہیں بیٹھے گی۔۔۔؟ کبھی بات نہیں کرے گی۔۔۔؟ تو اس کا مطلب ہے کہ دل کو کبھی قرار نہیں آئے گا۔۔۔؟" وہ یونہی اضطراب کے عالم میں لیپ ٹاپ وہیں بیڈ پہ چھوڑ کے بیڈ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور اتنی شدید سردی کے باوجود کھڑکی کے شیشے کھول دیے تھے' باہر پورا واشنگٹن بارش میں بھیگا ہوا تھا' لیکن زندگی پھر بھی سڑکوں پہ رواں دواں تھی اور سفر جاری تھا۔

یہاں نہ کوئی آذر تھا اور نہ کوئی علیزے تھی۔۔۔ نہ کسی سے بچھڑنے کا غم تھا اور نہ کسی سے ملنے کی خوشی تھی۔۔۔!

یہاں تو بس انسان تھے اور ان کی ضرورتیں تھیں۔۔۔ اس سے آگے' اس سے بڑھ کے تو کچھ تھا ہی نہیں۔۔۔

وہ کس دیس آ گیا تھا۔۔۔؟ وہ کیوں آ گیا تھا۔۔۔؟ صرف علیزے کا غم چھپانے کے لیے یا بے حسوں کے شہر میں خود کو بے حس کرنے کے لیے۔۔۔؟ لیکن یہ بھی تو نہیں ہو رہا تھا۔۔۔؟ نہ غم چھپ رہا تھا' نہ وہ بے حس ہو رہا تھا۔۔۔ بلکہ وہ تو کچھ اور زیادہ شدتوں سے یاد آنے لگی تھی

"آذر۔۔۔! زندگی اس طرح نہیں گزرے گی۔۔۔ کب تک بھاگو گے۔۔۔ اور کب تک منہ چھپاؤ گے۔۔۔؟ مرد بنو یار۔۔۔ یہاں سب کو تمہاری ضرورت ہے۔۔۔ ڈیڈ کو علیزے نے نہیں تم نے اکیلا کر دیا ہے۔۔۔ ان کو تمہارے سہارے کی ضرورت ہے۔۔۔ آنی بھی کمزور ہو گئی ہیں۔۔۔ بوڑھی لگنے لگی ہیں۔۔۔ عون اور عدید اپنے بیڈ روم کے ہو کر رہ گئے ہیں۔۔۔ پورے گھر کا شیرازہ بکھر گیا ہے یار۔۔۔ سنبھالو آخر ڈیڈ کے بعد اس گھر کے کرتا دھرتا تم ہو' ڈیڈ کو بہت مان تھا تم پہ' بہت بھروسہ تھا تمہاری ذات پہ۔۔۔ پلیز تم تو ایسا مت کرو۔۔۔ واپس آ جاؤ یار۔۔۔ واپس آ جاؤ۔۔۔" فون کے ایئر پیس سے ابھرنے والی دانیال کی آواز ابھی تک اس کے کانوں میں گونج رہی تھی اور اس کے رخسار بھیگ رہے تھے' آذر نے چونک کر اپنے رخساروں کی نمی کو ہاتھ سے محسوس کیا تھا یعنی وہ رو رہا تھا

"کس کے لیے۔۔۔؟ ڈیڈ کے لیے۔۔۔؟ آنی کے لیے۔۔۔؟ عون اور عدید کے لیے۔۔۔؟ یا پھر۔۔۔ یا پھر علیزے کے لیے۔۔۔؟"

اس نے خود سے سوال کیا تھا اور اپنے اندر سے اس سوال کا جواب موصول ہوتے ہی اس نے اپنا چہرہ پونچھ کر سر جھٹک ڈالا تھا۔

"نہیں۔۔۔! اب اور نہیں۔۔۔ اب اسے یاد نہیں کرنا۔۔۔ نہیں کرنا۔۔۔ کبھی نہیں کرنا۔۔۔" وہ پرعزم اور مضبوط لہجے میں کہتے ہوئے نفی میں سر ہلاتا ہوا کھڑکی کے شیشے بند کر کے پلٹا اور لانگ کوٹ اور شوز پہن کر اپنے ضروری ڈاکومنٹس لے کر ہوٹل کے روم سے باہر نکل آیا تھا' اس نے آج ہی پاکستان جانے کے لیے ٹکٹ کنفرم کروانا تھا کیونکہ وہ اب اور یہاں نہیں رہنا چاہتا تھا۔۔۔!

✡ ✡ ✡

"سنو گل۔۔۔" اس نے کھانے کی ٹرے لے کر بیسمنٹ کی طرف جاتی گل کو آواز دی تھی۔

"یہ کیا ہے۔۔۔؟ کہاں جا رہی ہو۔۔۔؟" وہ ڈرائنگ روم میں ٹی وی دیکھ رہا تھا جب اس کی اچانک گل پہ نظر پڑی تھی۔

"جی صاحب۔۔۔! یہ کھانا ہے۔۔۔ علیزے بی بی کے لیے لے کر جا رہی ہوں۔۔۔" گل نے آہستگی سے جواب دیا

تھا۔

"ہوں۔۔۔! علیزے بی بی کے لیے کھانا۔۔۔؟" اس نے دو سیکنڈ کے لیے سوچا پھر ریموٹ صوفے پہ اچھال کر صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"لاؤ۔۔۔! آج تمہاری علیزے بی بی کے لیے کھانا میں لے کر جاتا ہوں۔۔۔" اس نے قریب آ کر گل کے ہاتھوں سے ٹرے تھام لی تھی اور گل بے چاری سر ہلا کر پیچھے ہٹ گئی تھی' وہ بھلا کیا کہہ سکتی تھی۔۔۔؟

"تم اپنا کوئی اور کام نبٹا لو۔۔۔" وہ گل سے کہہ کر وہاں سے ہٹ گیا تھا' اس کا رخ بیسمنٹ کی طرف تھا' سیڑھیوں کے پیچھے بنے دروازے میں کوئی تالا تھا نہ زنجیر۔۔۔ بس جو کچھ بھی تھا علیزے کے قدموں سے لپٹا ہوا تھا' تالا بھی اور زنجیر بھی۔۔۔ جو اسے کہیں بھی بھاگنے نہیں دے رہے تھے اور وہ بیسمنٹ کی دیوار سے لگ کر بیٹھی دیوار ہو گئی تھی اور وہ ٹرے اٹھائے سیڑھیاں اتر آیا تھا۔۔۔

اب میری ناک میں رہتے ہیں کوہ قاف کے جن
میں پرستان کی ملکہ اٹھا لایا ہوں۔۔۔!

اس نے سیڑھیاں اتر کر فرش پہ بیٹھی علیزے کی سمت بڑھتے ہوئے بڑے دلکش موڈ سے یہ شعر پڑھا تھا اور اس کی آواز پہ اور اس کے شعر پہ علیزے نے یکدم اک جھٹکے سے سر اٹھا کر دیکھا تھا' تب تک وہ اس کے بالکل سامنے اور قریب آ چکا تھا' لیکن وہ بیٹھی ہوئی تھی سو مجبوراً "دل آور" کو بھی بیٹھنا پڑا تھا۔

آف وائٹ کھدر کے شلوار سوٹ میں ملبوس' ڈارک براؤن گرم چادر کندھوں پہ پھیلائے' نیچے فرش پہ پنجوں کے بل بیٹھا وہ ڈائریکٹ اس کی زخم زخم آنکھوں میں دیکھ رہا تھا اور آج نجانے کیا بات تھی کہ علیزے بھی اسے ڈائریکٹ دیکھ رہی تھی آنکھوں سے آنکھیں چار کر کے۔۔۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے دو آنکھیں پانیوں میں ڈوب گئی تھیں۔

"میں نے سوچا اتنے دنوں سے پرستان کی ملکہ کو نہیں دیکھا' آج اسے دیکھ آؤں۔۔۔" وہ بڑے دلفریب موڈ میں تھا اس نے ایک بار پھر دل آور کی سمت دیکھا وہ عین اس کے سامنے بیٹھا اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"پلیز یار۔۔۔! رویا نہ کرو۔۔۔ میرا دل مائل ہونے لگتا ہے۔۔۔" اس نے اپنے ہاتھوں سے علیزے کے رخساروں سے آنسو پونچھ ڈالے تھے۔

"دیکھو۔۔۔! میں تمہارے لیے کھانا لے کر آیا ہوں' یہ رونا دھونا چھوڑو اور مزے سے کھانا کھاؤ۔۔۔ چائے بھی پلاؤں گا۔۔۔"

اس نے خود ہی نوالہ بنا کر علیزے کی سمت بڑھا دیا تھا' لیکن علیزے نے نوالہ کھانے کی بجائے دل آور کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

"ڈرائیور۔۔۔! جو تم کہو گے میں کروں گی۔۔۔ ہر بات مانوں گی۔۔۔ ملکہ نہیں کنیز بن کے رہوں گی۔۔۔ تمہاری باندی بن جاؤں گی۔۔۔ بس ایک بات۔۔۔ صرف ایک بات مان لو۔۔۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے رو پڑی تھی۔

"کیا۔۔۔؟" وہ حیران ہوا تھا۔

"مجھ سے۔۔۔ مجھ سے۔۔۔ شش۔۔۔ شادی کر لو۔۔۔ پلیز ڈرائیور۔۔۔" علیزے کہتے ہوئے جیسے مر گئی تھی۔۔۔!!!

✡ ✡

(باقی آئندہ انشاءاللہ)

نبیلہ عزیز

دردِ دل

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نبیل حیات دونوں بہن بھائی ہیں' مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے' وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پہ رنگ چکی ہے' جس کے پیش نظر فائزہ بیگم' نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں' لیکن مدحیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے' جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے' مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے' مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا' بے بسی اور مجبوری سے تنگ آ کر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے' لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے بادا امتیاز مل جاتا ہے' جو اسے کام کی آفر کرتا ہے' جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے' اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے' وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے' وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے' وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے' اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا' اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔

۲۸
اٹھائیسویں قسط

اور مر تو جیسے دل آور شاہ بھی گیا تھا۔ کیونکہ علیزے آفندی نے وہ بات کہہ ڈالی تھی۔ جو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی جو وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا اور جس کو سن کر وہ خود بھی دم بخود سا اس کو دیکھ رہا تھا اور وہ اس کا دایاں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑے دکھ، اذیت اور بے بسی کی انتہا کو چھوتی ہوئی ہچکیوں سے رو رہی تھی اور اس کے پورے جسم کے ساتھ ساتھ دل آور کے ہاتھ پہ اس کے ہاتھوں کی گرفت بھی لرز رہی تھی اور اس کی ایسی حالت اور ایسی کیفیت دیکھ کر دل آور کی اپنی حالت اور کیفیت بھی عجیب سی ہو گئی تھی اور اس کے ہاتھ میں پکڑا نوالہ بھی جیسے اپنی جگہ پہ جوں کا توں ساکت سا رہ گیا تھا۔

"شادی۔۔۔؟" دل آور کے منہ سے نکلنے والا لفظ بھی جیسے بے یقین اور پریشان سا لگ رہا تھا۔

"ہاں شادی۔۔۔ پپ۔۔۔ پلیز۔۔۔ ڈرائیور۔۔۔ مجھ سے شادی کر لو۔۔۔ پھر۔۔۔ مم۔۔۔ مجھے تمہارا ہر ستم اور ہر سزا قبول ہو گی۔۔۔ پھر۔۔۔ تت۔۔۔ تم۔۔۔ مجھے جان سے بھی مار دو گے۔۔۔ تو بھی میں اف نہیں کروں گی۔۔۔ بس۔۔۔ مجھ سے۔۔۔ مجھ سے نکاح کر لو۔" علیزے کا لہجہ بکھر رہا تھا۔ آواز میں لرزش تھی اور الفاظ بے ربط سے ہو رہے تھے۔

"پلیز ڈرائیور! مجھے مارو۔۔۔ لیکن عزت کی موت مارو۔۔۔ یوں ذلت کی موت مت مارو۔۔۔ میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ خدا کے واسطے میری عزت، میری آبرو، مجھے واپس بخش دو۔۔۔ مجھ سے نکاح کر لو۔" علیزے نے ہچکیوں سے روتے ہوئے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے اور جوابا" دل آور کے ہاتھ میں پکڑا نوالہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے ٹرے میں جا گرا تھا۔

اس کے دو عالم لرز اٹھے تھے۔ وہ پنجوں کے بل زمین پہ بیٹھا ہوا تھا۔ لیکن اسے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اس کے قدموں کے نیچے زمین پھٹ کر دو حصوں میں بٹ گئی ہو اور وہ زمین کے اندر نیچے ہی نیچے دھنستا جا رہا ہو۔ کسی بھنور کی طرح چکراتی ہوئی زمین اسے اپنے بھنور کی لپیٹ میں لیتی۔ اپنی طرف ہی کھینچے جا رہی تھی اور اسے اس بھنور سے نکلنے کا کوئی حل بجھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ ایسا ششدر ہوا تھا کہ کچھ کہہ ہی نہیں پا رہا تھا اور وہ تھی کہ تڑپ تڑپ کر اس کے سامنے ہاتھ جوڑتی اپنی ذات کی قبولیت کی بھیک مانگ رہی تھی۔

"ڈرائیور۔۔۔ ! میں۔۔۔ میں تمہارا ہر ظلم سہہ لوں گی۔۔۔ ہر جبر برداشت کر لوں گی۔۔۔ بس مجھے دین و دنیا کی نظر میں سرخرو کر دو۔۔۔ مجھے بچا لو سب کی نظروں اور سوالوں سے۔۔۔ ورنہ۔۔۔ میں مر جاؤں گی ڈرائیور۔۔۔ مر جاؤں گی۔۔۔ خدا کے لیے ڈرائیور۔۔۔ مجھے چھپا لو۔۔۔ سب سے چھپا لو۔۔۔ پلیز ڈرائیور۔۔۔ مجھے چادر دے دو۔۔۔ مجھے ڈھانپ دو۔۔۔ میں ننگے سر کھڑی ہوں۔۔۔ میری عزت رکھ لو۔۔۔ نکاح کر لو مجھ سے۔" وہ روتے ہوئے اس قدر تڑپ رہی تھی کہ اگر اس لمحے وہ دل آور شاہ سے اس کی عمر بھر کی کمائی، اس کی تمام جمع پونجی اور اس کے گھر بار سمیت اس کی جان بھی مانگتی تو وہ یقینا" دے دیتا۔

لیکن اس لمحے جو کچھ وہ اس سے مانگ رہی تھی وہ دینا تو دل آور شاہ کے لیے جان دینے سے بھی زیادہ مشکل کام تھا اور پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ کسی عاجز اور بے بس سوالی کا سوال سن کر دل آور شاہ کی مٹھی میں اسے دینے کے لیے خاموشی اور چپ کے سوا اور کچھ نہیں تھا اور اس "کچھ نہیں" کا احساس ہوتے ہی دل آور شاہ کے دل و دماغ کے ساتھ ساتھ اس کے احساسات بھی ایک دم منجمد ہو کے رہ گئے تھے۔ جس کے باعث اسے احساس ہی نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کتنا رو رہی ہے؟ کتنا تڑپ رہی ہے؟ اور کتنا گڑگڑا رہی ہے؟ وہ اسی جامد کیفیت، احساسات اور دل و دماغ کے ساتھ وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور قدم واپسی کے لیے موڑے۔ اور علیزے اس کی خاموشی اور اس کے قدموں کی واپسی پہ یوں تڑپی تھی کہ جیسے دل آور شاہ نے چپ چاپ قدم واپس نہیں موڑے تھے بلکہ اس کی شہ رگ کاٹ دی ہو اور وہ اس شہ رگ کے کاٹے جانے کے درد سے بلبلا کر اک جھٹکے سے زمین سے اٹھی اور تیزی سے اک سائیڈ سے آگے بڑھ کر اس کے سامنے اس کے راستے میں حائل ہو گئی تھی۔

"نہیں ڈرائیور۔۔۔ اس طرح نہیں۔۔۔ تم ایسا نہیں کر سکتے۔۔۔ تم اس طرح نہیں جا سکتے۔۔۔ تمہیں کچھ تو کہنا ہو گا۔۔۔ تمہیں کچھ تو کرنا ہو گا۔۔۔ تم مجھ پہ ظلم کرنا چاہتے ہو نا؟ تو کرو، جتنا مرضی ظلم کرو، جتنا تمہارا دل چاہتا ہے، اتنا کرو مگر خدا کے واسطے مجھے ٹھکراؤ مت۔ کیونکہ تم نے اگر مجھے ٹھوکر ماری تو میرا کہیں بھی کوئی ٹھکانہ نہیں رہے گا۔۔۔ میں۔۔۔ میں دو جہان سے ٹھکرا دی جاؤں گی۔۔۔ پلیز ڈرائیور۔۔۔ پلیز۔۔۔!" اس نے بے تحاشا روتے ہوئے ایک بار پھر اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے اور دل آور شاہ کے قدم ایک بار پھر زمین نے جکڑ لیے تھے۔ وہ علیزے کے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے چہرے اور جڑے ہوئے ہاتھوں کو دیکھ کر سر جھکانے پہ مجبور ہو گیا تھا اور علیزے اس کے سر جھکانے کے انداز سے ہی سمجھ گئی تھی کہ یہ سر انکار میں جھکا ہے اقرار میں نہیں اور اس کے جھکے ہوئے سر نے علیزے کو اور بھی تڑپا دیا تھا جبکہ دل آور نے اس کے سامنے سے ہٹ کر وہاں سے گزر جانا چاہا تھا۔

مگر اب کی بار اس کے قدم زمین نے نہیں بلکہ کسی اور نے جکڑ لیے تھے اور دل آور شاہ اپنی جگہ پہ جم کے رہ گیا تھا اس کے عرش اور فرش کانپ گئے تھے اس کی پوری ہستی لرز اٹھی تھی وہ بری طرح دہل گیا تھا آخر بڑی حویلی کی عزت اور آن و وقار آفندی کی بیٹی اس کے قدموں میں جھک گئی تھی اس نے اپنے ہاتھ اس کے پیروں پہ رکھ دیے تھے تو گویا اس نے آج اپنی انا، اپنا غرور اور اپنی ذات دل آور شاہ کے قدموں میں ڈال دی تھی۔ تو گویا اب اس کے پاس باقی کچھ بھی نہیں رہا تھا؟ وہ خالی ہو چکی تھی۔۔۔ ہار چکی تھی۔۔۔ اور لٹا چکی تھی۔۔۔ سب کچھ اس کے پیروں میں ڈال دیا تھا۔

لوگ محبت یا نفرت کی جنگ میں دل ہارتے تھے لیکن وہ اپنا آپ ہار گئی تھی اپنی انا، اپنا غرور، اپنی ذات ہار گئی تھی، صرف اور صرف اپنی عزت کی خاطر اس نے سب کچھ ہار دیا تھا۔ وہ بے بس اور پسپا ہو چکی تھی اور اس کی اسی بے بسی اور پسپائی کا خیال آتے ہی اس کے ہاتھوں کا لمس دل آور کو پیروں پہ کسی کرنٹ کی طرح محسوس ہوا تھا اور وہ ایک دم پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اس نے اپنے پاؤں پیچھے کھینچ لیے تھے۔ مگر علیزے پھر بھی اس کے پاؤں چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

وہ اپنے اس عمل کے دوران کس پل صراط پر سے گزر رہی تھی؟ دل آور شاہ اس چیز کا بخوبی اندازہ کر سکتا تھا مگر وہ اس کے اس عمل کے دوران کس پل صراط پر سے گزر رہا ہے؟ علیزے آفندی اس چیز کا کبھی بھی اندازہ نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ وہ علیزے کی حالت سے باخبر تھا جبکہ علیزے اس کی کیفیت سے بے خبر تھی وہ بس تڑپے جا رہی تھی اور تڑپائے جا رہی تھی۔

"پلیز ڈرائیور۔۔۔ آج۔۔۔ آج جو جی چاہے کرو۔۔۔ مگر پلیز انکار مت کرو۔۔۔ آج تم مجھے عزت دو گے، تو کل اللہ تمہیں عزت دے گا کسی کی عزت اور عیب ڈھانپنے والے پہ اللہ مہربان ہوتا ہے اس لیے اللہ تم پر بھی مہربان ہو گا تم میری عزت اور میرے پاپا کا عیب ڈھانپ دو خدا کے لیے، تمہیں ڈھانپ دو اللہ تمہاری عزت اور تمہارے عیب ڈھانپے گا پلیز ڈرائیور، مجھ سے نکاح کر لو۔" دل آور کے کانوں میں جیسے سائیں سائیں کی آواز گونجنے لگی تھی اور دل پہ جیسے اک لرزا سا طاری ہو گیا تھا۔

اس کی ایسی حالت تو اس وقت بھی نہیں ہوئی تھی جب اس کی اماں اس کے بابا کی لاش چارپائی پہ گھر آتے دیکھ کر تڑپی تھیں دیوانہ وار بھاگی تھیں روئی تھیں کرلائی تھیں اور دھاڑیں مار مار کر روتے ہوئے اس کے بابا کی لاش سے لپٹ گئی تھیں اور اس قیامت خیز منظر نے دل آور شاہ کی معصومیت اور بچپن کو مار کر اسے اتنا سخت اور سفاک بنا دیا تھا کہ وہ آج اس مقام کو پہنچ گیا تھا کہ جہاں ایک عورت اس کے قدموں میں جھکی اس سے عزت و آبرو کی بھیک مانگ رہی تھی اور وہ اسے یہ عزت اور آبرو دینے سے قاصر تھا۔

کیونکہ علیزے کو دینے کے لیے اس کے پاس دکھ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ وہ اس کے معاملے میں اس سے

زیادہ بے بس اور لاچار تھا کیونکہ اس کی اماں کا درد اور بابا کی لاش اسے اپنے عزم اور ارادوں سے پیچھے نہیں ہٹنے دیتے تھے کیونکہ یہ بائیس سالہ عزم اور ارادے اس کے ساتھ پل بڑھ کر جوان ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ سوئے تھے اس کے ساتھ جاگے تھے۔ اس کی زندگی کا حصہ تھے وہ دل آور شاہ کی ہڈیوں اور خون میں رچ بس چکے تھے اس کے دماغ میں لاوے کی طرح پکتے تھے۔ اس کی زندگی کا مقصد اور اولین ترجیح ہی یہ عزم اور ارادے تھے تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ ان سے پیچھے ہٹ جاتا؟ یا پھر اپنے قدموں سے اکھڑ جاتا؟

ہاں اتنا ضرور تھا کہ وہ انسان تھا اس کے سینے میں دل تھا اور دل میں ایک کونا ضمیر کا بھی تھا... جو اس وقت اس لڑکی کی وجہ سے شرمندہ ہو رہا تھا اور اسے بھی کر رہا تھا اور دل آور شاہ اپنے آپ کو ہمیشہ کی طرح پتھر ثابت کرتا ہوا اس کی گرفت سے اپنے پاؤں کو آزاد کروا کے آگے بڑھ گیا تھا۔

"ڈرائیور...!" اور وہ وہیں فرش پہ بیٹھی ذلت' اذیت اور بے بسی کے احساس سے چیخ اٹھی تھی مگر وہ وہاں سے جا چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس کی آنکھوں پہ سیاہ پٹی بندھی ہوئی تھی اور اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا وہ ان کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہی تھی اور باپ' بیٹی کا یہ کھیل کافی دیر سے جاری تھا جس کو کھیلتے کھیلتے وہ بالآخر تھک گئے تھے اور وہیں لان چیئر پہ بیٹھ گئے تھے جبکہ وہ یوں ہی ان کو ڈھونڈتی ڈھونڈتی گیٹ سے باہر نکل آئی تھی۔ لیکن اسے خبر ہی نہیں تھی کہ وہ گھر سے باہر نکل آئی ہے اور کس راستے پہ کس طرف جا رہی ہے؟ وہ بس ہاتھوں سے ہوا میں راستے کی سمت ٹٹولتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی اور جس راستے پہ وہ آگے بڑھ رہی تھی' وہ راستہ اونچائی کی طرف جا رہا تھا' اتنی اونچائی کی طرف کہ جس کو دیکھ کر ہی خوف آ جائے' اور وہ تھی کہ دیکھ ہی نہیں رہی تھی کیونکہ اس کی آنکھوں پہ تو پٹی بندھی ہوئی تھی اسے تو کچھ پتا ہی نہیں تھا وہ تو بے خبری میں موت کے منہ میں جا رہی تھی۔

"پاپا... پاپا... بولیں نا... کہاں ہیں آپ؟ آپ چپ کیوں ہو گئے ہیں؟ کچھ بولتے کیوں نہیں؟ پلیز آپ سامنے آ جائیں نا... میں آپ کو ڈھونڈ رہی ہوں۔" وہ اپنی دھن اور بے خبری میں انہیں پکارتی ایک بہت ہی اونچی پہاڑی کی طرف آ نکلی تھی جس کے ایک طرف سمندر تھا اور ایک طرف کھائی تھی ٹھاٹھیں مارتا سمندر اور گہری کھائی اسے نگلنے کے لیے تیار کھڑے تھے اور وہ ان سب سے انجان اپنے پاپا کو ہی پکار رہی تھی۔

"پاپا...!" اب کی بار اس نے انتہائی زور سے پکارا تھا اور تھوڑی دیر سانس بحال کرنے کی غرض سے بیٹھنے والے وقار آفندی کے لیے یہ پکار دل دہلا دینے والی ثابت ہوئی تھی وہ یک دم گھبرا کے اٹھے تھے اور اسے ڈھونڈتے ہوئے باہر آ گئے تھے وہ جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے ان کے جسم سے جان ختم ہوتی جا رہی تھی کیونکہ انہیں یاد تھا کہ علیزے کی آنکھوں پہ سیاہ پٹی بندھی ہوئی تھی اور وہ کچھ بھی نہیں دیکھ سکتی تھی... اور اس کا نہ دیکھنا خطرے سے خالی نہیں تھا اسی لیے وہ زیادہ بوکھلا رہے تھے۔

"پاپا...!" علیزے کی پکار بڑھتی جا رہی تھی۔

وہ بے ساختہ اس طرف کو بھاگے تھے جس طرف سے آواز آ رہی تھی اور وہ اس طرف آ ہی گئے تھے اور وہاں آ کر انہیں یوں محسوس ہوا تھا کہ جیسے جسم میں رہی سہی جان بھی کسی نے ایک جھٹکے سے کھینچ کر نکال دی ہو اور وہ جہاں تھے وہیں کے وہیں کھڑے رہ گئے تھے۔ کیونکہ ان کے کلیجے کا ٹکڑا... ان کی زندگی... ان کا سرمایہ حیات... ان کی علیزے موت کے منہ میں کھڑی تھی اور وہ بس دور کھڑے دیکھ رہے تھے۔ بے بس اور لاچار کمزور اور عاجز... کچھ کرنے کی تو سکت ہی نہیں تھی اور نہ ہی کوئی اختیار تھا۔

"پاپا پلیز ہیلپ می... مجھ سے یہ... یہ پٹی نہیں کھل رہی... پاپا... مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا... پلیز یہ کھول دیں پاپا... پلیز ہیلپ می۔" وہ سختی سے بندھی ہوئی پٹی کو کھولنے کی کوشش میں کبھی ایک قدم آگے بڑھ رہی تھی اور کبھی پیچھے ہٹ رہی تھی... اور اس کی زندگی بس اسی ایک قدم آگے اور ایک قدم پیچھے کے درمیان ڈول رہی تھی۔ اگر ذرا جو تیسرا قدم اٹھا لیتی تو یقیناً "موت کی آغوش میں پہنچ جاتی اور وقار آفندی اسے اسی تیسرے قدم سے باز رکھنا چاہتے تھے اسے پکارنا چاہتے تھے اسے بچانا چاہتے تھے مگر اچانک نہ جانے کیا ہوا تھا کہ ان کی آواز بند ہو گئی تھی۔ وہ بولنا چاہتے تھے مگر بول نہیں پا رہے تھے اور کوشش کے باوجود بھی ان کے حلق سے ان کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ وہ اسے روکنے سے اور پکارنے سے قاصر تھے اور یہی سوچ کر وقار آفندی کی رگوں میں اک سنسناہٹ سی دوڑ گئی تھی اور پورے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے وہ ان کے سامنے تھی لیکن وہ ان کے سامنے ہوتے ہوئے بھی بہت دور بہت فاصلے پہ تھی اتنے فاصلے پہ جتنے فاصلے پہ زندگی سے موت تھی... یا تو لمحہ بھر کا فاصلہ... یا پھر عمر بھر کا فاصلہ...! اور ادھر علیزے آفندی اپنی آنکھوں پہ بندھی پٹی سے الجھ رہی تھی اور بے بس ہو رہی تھی۔

"پاپا... پاپا... پلیز کہاں گئے ہیں آپ؟" علیزے کی پریشان اور بھرائی ہوئی آواز انہیں یہاں تک سنائی دے رہی تھی۔ لیکن ان کی اپنی آواز اور قوت گویائی سلب ہو چکی تھی اور اس کشمکش اور پریشانی کے عالم میں انہوں نے دیکھا کہ ایک تیز رفتار اور منہ زور جھونکا علیزے کے قدم اکھاڑ گیا تھا اور وہ اتنی نازک تھی کہ ہوا کے سرپھرے جھونکے سے ہی لڑکھڑا گئی تھی اور اس کا یہ لڑکھڑانا اسے موت سے قریب کر گیا تھا۔ اس کا پاؤں پھسلا تھا اور وہ سیدھی ہزاروں فٹ نیچے گہری کھائی میں جا گری تھی اور اس کی دلخراش چیخیں پوری وادی میں گونج رہی تھیں۔

"پاپا...!" اس کی آخری چیخ اور آخری پکار بھی یہی تھی اور وقار آفندی تھرا اٹھے تھے۔

"علیزے...!" انہوں نے اپنی پوری قوت سے اسے پکارا تھا اور ان کی اس پکار سے بھی پوری وادی گونج اٹھی تھی۔ ان کی علیزے ان کی آنکھوں کے سامنے مر گئی تھی اور وہ اسے بچا بھی نہیں سکے تھے اور اسی خیال اور اسی درد کے ہاتھوں وہ سر تا پا پسینے میں شرابور ہو گئے تھے اور ان کا جسم مرغ بسمل کی مانند تڑپا تھا۔ جس کے باعث ان کے ساتھ بیڈ پہ سوئی آسیہ آفندی کی بھی آنکھ کھل گئی تھی انہوں نے فوراً" اٹھ کر لیمپ جلا دیے تھے۔

"وقار... کیا ہوا ہے آپ کو... آپ ٹھیک تو ہیں نا؟" آسیہ آفندی نے کافی تشویش سے پوچھا تھا کیونکہ ان کے جسم کو ہلکے ہلکے جھٹکے لگ رہے تھے اور وہ سر سے پاؤں تک پسینے میں بھیگے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

"وقار... کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ آپ کی حالت تو بہت خراب لگ رہی ہے؟"

"ع... ع... لیز... ے... ع... عل... علیزے...!" ان کی فالج زدہ زبان سے بمشکل علیزے کا نام ادا ہوا تھا اور آسیہ آفندی ساکت و صامت سی رہ گئی تھیں۔

"علیزے...؟" انہوں نے یہ نام زیر لب خود کلامی کے سے انداز میں دہرایا تھا۔ دو ماہ بعد ان کی مفلوج زبان نے پہلی بار حرکت کی بھی تھی تو علیزے کے نام پہ؟ وہ حیران نہ ہوتیں تو اور کیا ہوتا؟

یعنی ان کا لاچار' مفلوج اور بے بس جسم علیزے کے نام پہ اور علیزے کی تکلیف پہ اب بھی تڑپ اٹھتا تھا؟ تو اس کا مطلب تھا کہ ان کی یہ حالت علیزے کی "وجہ" سے نہیں بلکہ علیزے "کے لیے" ایسی ہو گئی تھی؟ انہیں بس علیزے کے دکھ کا دکھ تھا انہیں بس علیزے کی تکلیف کی تکلیف تھی وہ آج بھی اپنے درد پہ نہیں علیزے کے درد پہ تڑپتے تھے۔ جیسے اس وقت تڑپ رہے تھے اور رات کے اس پہر ان کی ایسی حالت اور ایسی تڑپ دیکھ کر آسیہ آفندی گھبرا گئی تھیں کیونکہ ان کی حالت رفتہ رفتہ مزید بگڑ رہی تھی۔

"ع... ع... علیز... ے... لیز... ے... ع... عل... لیز... زے..." وہ بمشکل ہانپتی ہوئی سانسوں کے دوران لڑکھڑاتی زبان سے اس کا نام مکمل کر پا رہے تھے اور ان کا لہجہ جیسے بھیگ رہا تھا۔

"اس وقت علیزے آپ کو کیوں یاد آگئی؟ کیا آپ نے اسے خواب میں دیکھا ہے؟ کیا ہوا ہے اس کو؟" آسیہ آفندی کا اندازہ بالکل درست تھا۔ وہ جان گئی تھیں کہ ضرور انہوں نے کوئی بھیانک خواب دیکھا ہے۔ لیکن ان کا یہ سوال کہ "کیا ہوا ہے اس کو؟" انہیں دوبارہ سے کچھ دیر پہلے کے منظر کی یاد دلا گیا تھا اور وہ منظر پھر سے ان پہ لرزا ساطاری کر گیا تھا اور ان کی روح بھی کپکپا گئی تھی۔

"وقار... وقار! آپ پلیز سنبھالیں اپنے آپ کو... میں... میں ابھی دانیال کو بلاتی ہوں۔" آسیہ آفندی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے اور وہ تیزی سے موبائل اٹھا کر دانیال کا نمبر ڈائل کرنے لگی تھیں۔ عائشہ آفندی کی فیملی انیکسی میں رہتی تھی اور اپنے بیڈ روم سے نکل کر انیکسی تک جانا اور پھر وہاں سے واپس آنا بھی کسی دوسرے گھر جانے اور آنے کے برابر لگتا تھا اور اس جانے اور آنے میں کافی ٹائم بھی لگ جاتا تھا۔ اس لیے بہتر تھا کہ وہ فون کال کا سہارا لے لیتیں اور انہوں نے ایسا ہی کیا تھا۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی۔

"ہیلو...؟" دانیال کی آواز نیند کی وجہ سے کافی بھاری محسوس ہو رہی تھی۔

"دانیال...! میں بات کر رہی ہوں تمہاری آنی... بیٹا... تمہارے ڈیڈ کی حالت بہت خراب ہے' تم جلدی پہنچو۔" آسیہ آفندی کا خود پہ اختیار نہیں رہا تھا اور وہ رو پڑی تھیں اور ان کے رونے کی آواز سن کر دانیال کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔

"پلیز آنی... آپ پریشان نہ ہوں... میں آ رہا ہوں۔" دانیال نے عجلت اور پریشانی سے کہتے ہوئے فون بند کر دیا تھا اور پھر اگلے پانچ منٹ میں وہ ان کے پاس ان کے سامنے موجود تھا۔ لیکن وقار آفندی کی اس قدر بگڑتی ہوئی حالت دیکھ کر اس نے فوراً "ان کو اسپتال لے جانے کا فیصلہ کیا تھا اور مبارک خان کو کال کر کے گاڑی نکالنے کا کہا تھا البتہ ان کے شور کی آواز سن کر باقی سب بھی بے دار ہو چکے تھے اور پوری حویلی میں ایک افراتفری سی مچ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ رات تھی کہ کوئی پہاڑ؟ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی آگے یا پیچھے سرکنے کو تیار نہیں تھی اور اس پہاڑ نما رات میں دل آور شاہ کو اپنا آپ بھی کسی پہاڑ کی مانند ہی لگ رہا تھا۔ ایک ہی جگہ پہ ساکت' جامد' ٹھہرا ہوا... لیکن مٹی کا ڈھیر... دیکھنے والوں کے لیے بہت کچھ... مگر اپنے لیے کچھ بھی نہیں۔ بے شک وہ پتھریلی چٹان کی مانند تھا لیکن اس کی بنیاد تو آخر مٹی ہی تھی نا؟ اگر ذرا سی کمزور پڑ جاتی تو پوری چٹان ڈھیر ہو جاتی اور اس چٹان کے ڈھیر ہونے کے ساتھ ساتھ بہت کچھ زمین بوس ہو سکتا تھا۔ لیکن وہ اس وقت اس مقام پہ تھا جہاں پہ نہ چٹان بن کے رہنا آسان تھا اور نہ ہی زمین بوس ہونا آسان تھا۔ بلکہ وہ تو اس وقت اس مقام پہ تھا جہاں پہ ہر قدم اور ہر فیصلہ ہی موت اور اذیت کا فیصلہ تھا اور یہ فیصلہ بہت مشکل تھا اتنا مشکل کہ دل آور شاہ جیسا با اختیار انسان بھی بے بسی کی سولی پہ لٹک گیا تھا اور کلیجے کے اندر نیزے کی انی گڑی رہ گئی تھی۔

وہ جب سے علیزے کے پاس سے اٹھ کے آیا تھا بس یوں ہی یک ٹک کھڑکی میں کھڑا گھر کی بیک سائیڈ میں بنے سوئمنگ پول کو دیکھ رہا تھا۔ جس کے شفاف پانی کے اوپر ہلکی ہلکی دھند اور غبار کی تہ چھائی ہوئی نظر آ رہی تھی اور ایسی ہی دھند اور غبار کی تہ دل آور شاہ کو اپنے دل پہ چھائی ہوئی محسوس ہو رہی تھی جس میں ایک چہرہ تھا جو کبھی چھپ رہا تھا اور کبھی ابھر رہا تھا کبھی اداس اور مایوس لگتا تھا اور کبھی خوش اور شاد نظر آتا تھا۔ یہ وہ چہرہ تھا جس کے رخساروں پر دل آور کا دل بوسے دیتا تھا اور آنکھیں سجدہ کرتی تھیں... دل کے بوسے اور آنکھوں کے سجدے صرف اس چہرے کو ہی تو نصیب تھے اور دل آور کو وہ چہرہ ہی نصیب نہیں تھا۔

"زری...!" دل آور نے ایک گہری سانس کھینچی تھی اور دل میں سسکتا ہوا لفظ ایک کپکپاہٹ کی صورت ہونٹوں سے ادا ہوا تھا۔

"آج تم مجھے عزت دو گے' تو کل اللہ تمہیں عزت دے گا کسی کی عزت اور عیب ڈھانپنے والے پہ اللہ مہربان ہوتا ہے اس لیے اللہ تم پر بھی مہربان ہو گا تم میری عزت اور میرے پاپا کا عیب ڈھانپ دو... خدا کے لیے ہمیں ڈھانپ دو۔ اللہ تمہاری عزت اور تمہارے عیب ڈھانپے گا... پلیز... ڈرائیو... مجھ سے نکاح کر لو... پلیز ڈرائیو... مجھ سے نکاح کر لو... پلیز ڈرائیو... مجھ سے نکاح کر لو۔" اس کے کانوں میں بس اس ایک جملے کی بازگشت سنائی دے رہی تھی اور وہ تھک ہار کے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے کھڑکی کے قریب ہی رکھی راکنگ چیئر پہ بیٹھ گیا تھا۔

"علیزے...!" دل آور کو خود بھی محسوس نہیں ہوا تھا کہ اس کے ہونٹوں نے بے دھیانی میں علیزے کے نام کو چھوا ہے۔ بس اس کے ذہن میں تو سوچوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور وہ تھا کہ اس سمندر میں پوری طرح سے ڈوبا ہوا تھا۔

"دیکھو شاہ...! زندگی میں ایسا کچھ مت کرنا کہ میں تمہیں کبھی معاف ہی نہ کر پاؤں... تم وقار آفندی کو بیچ چوراہے میں الٹا لٹکا کر گولی بھی مار دو گے تو مجھے ذرا بھی افسوس نہیں ہو گا لیکن اگر اس کی بیٹی کی عزت پہ ہاتھ ڈالو گے تو میں تمہیں کبھی معاف نہیں کر سکوں گی' آخر ایک مرد کا بھگتان عورت کیوں بھگتے؟ وقار آفندی کی سزا وقار آفندی کو ملنی چاہیے اس کی بیٹی کو نہیں' کیونکہ عورت محبت کی طرف سے ملنے والی چوٹ تو سہہ لیتی ہے لیکن عزت کی طرف سے ملنے والی چوٹ نہیں سہہ پاتی... ہمیشہ اس چوٹ سے بلبلاتی رہتی ہے اور یہ چوٹ اور بلبلانا تم نہیں جان سکتے۔" بتول شاہ کی تلخ سی آواز اس کی سماعتوں میں ابھر کر معدوم ہو گئی تھی۔

"اماں...!" وہ بے ساختہ بے چینی سے کہتا ہوا دوبارہ راکنگ چیئر سے کھڑا ہو گیا تھا اور اپنا موبائل اور گاڑی کی چابی اٹھا کر باہر نکل آیا تھا۔

اور رات کے اس پہر دل آور کو گاڑی نکالتے دیکھ کر گلاب خان پریشان سا تیزی سے قریب آیا تھا۔

"صاحب...! آپ اس وقت کہاں جا رہے ہیں؟ سب خیریت تو ہے نا؟" اس نے پریشانی سے استفسار کیا تھا۔

"ہوں... تم گیٹ کھولو۔" اس نے آہستگی سے سر ہلایا تھا اور گلاب خان اس کا موڈ دیکھتے ہوئے پلٹ کر گیٹ تک چلا گیا اور گیٹ کھول دیا تھا اور وہ اپنی گاڑی زنانے سے نکال لے گیا تھا۔ رات کے تین بجے کا وقت تھا اور وہ گھر سے نکل کر سڑکوں پہ آ گیا تھا۔ اس کے اندر ابال اٹھ رہے تھے وہ برداشت نہیں کر پا رہا تھا اور اسی بے کل اور مضطرب کیفیت کو ضبط کرتے کرتے اس نے اسٹیئرنگ پہ مکا دے مارا تھا۔

"میں دنیا کا بے بس ترین انسان ہوں... میں کبھی کچھ بھی نہیں کر پایا... کسی کو محبت نہیں دے سکا اور کسی کو عزت نہیں دے سکا بلکہ یہ سب تو دور کی بات ہے' میں تو اپنی ماں کو اس کی محنت کا صلہ بھی نہیں دے سکا میں بہت بد قسمت انسان ہوں' مجھ سا بد قسمت دنیا میں اور کوئی نہیں ہو سکتا' کوئی بھی نہیں۔" وہ انتہائی رش ڈرائیو کرتے ہوئے نفی میں سر ہلا رہا تھا۔ ہاتھوں کی گرفت اسٹیئرنگ پہ اتنی مضبوط تھی کہ ہاتھوں کی رگیں ابھر آئی تھیں اور دل و دماغ میں ایک محشر بپا تھا اور ایسے عالم میں تو اسے یہ بھی نہیں پتا تھا کہ اس کی گاڑی کا رخ کس طرف ہے؟

☼ ☼ ☼

"شاہ... تم یہاں...؟ اس وقت؟"

صبح کے ساڑھے سات بجے کا وقت تھا اور وہ تیار ہو کر ناشتا کرنے کے لیے سیڑھیوں سے نیچے اتر رہی تھیں کہ

اچانک گھر کے مختصر سے کوریڈور کے مرکزی دروازے سے داخل ہوتے دل آور شاہ کو دیکھ کران کے رواں قدم سیڑھیوں پہ ہی رک گئے تھے۔ لیکن اسے خاموش دیکھ کرذرا سے توقف کے بعدان کے قدموں میں پھر سے روانی آگئی تھی اور وہ تیزی سے چلتی ہوئی اس کے قریب رکی تھیں۔

"شاہ... تم بول کیوں نہیں رہے؟ کیا ہوا ہے؟ تم ٹھیک تو ہو نا؟" بتول شاہ نے اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے انتہائی پریشانی اور تشویش سے پوچھا تھا۔

"ٹھیک ہوں اماں! زندہ سلامت ہوں' آپ کے سامنے ہوں' آپ پریشان کیوں ہو رہی ہیں؟"

"شاہ... !یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟" انہوں نے اسے الجھی ہوئی سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

"اماں پلیز... آپ پریشان نہ ہوں' سب ٹھیک ہے' میں یہاں آپ سے ملنے کے لیے آیا ہوں' آپ کو پریشان کرنے کے لیے نہیں آیا۔" دل آور نے خفگی سے کہتے ہوئے اپنے چہرے پہ رکھے ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے تھے۔

"تم اس وقت اتنی دور سے مجھ سے ملنے کے لیے آئے ہو؟ مگر کیوں؟ خیریت؟" وہ بھی آخر دل آور کی ماں تھیں' اس کے جواب پہ مطمئن ہونے والی نہیں تھیں جیسے وہ خود نہیں ہوتا تھا۔

"یہاں آنے سے پہلے جو آخری خیال آیا وہ آپ کا تھا اور اس خیال کے ساتھ ساتھ میں بھی آپ کی طرف آگیا۔" وہ ان کے ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھپکتے ہوئے بولا تھا اور بتول شاہ نے چونک کر خاصی گہری نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"پہلا خیال کس کا تھا؟" ان کا سوال مختصر اور دوٹوک تھا۔ جس پہ دل آور کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی اور وہ ان کے ہاتھ چھوڑ کران کے سامنے سے ہٹ گیا تھا۔

"تمہیں زری کے خیال آتے ہیں اور زری کو تمہارے خواب آتے ہیں تم یہ خواب و خیال کے سلسلے جوڑ کیوں نہیں دیتے؟" انہوں نے اس کے پیچھے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے کافی مضبوط لہجے میں پوچھا تھا اور صوفے کی سمت بڑھتے دل آور کے قدم ٹھٹک کر رک گئے تھے۔ گویا وہ پہلے خیال تک جا پہنچی تھیں؟

"کیونکہ مجھے اور بھی بہت سے خیال آتے ہیں۔" وہ گہری سانس خارج کرتے ہوئے صوفے پہ بیٹھ گیا تھا۔

"کیسے خیال؟" وہ عین اس کے سامنے آکھڑی ہوئی تھیں۔

"بس کچھ دوستوں کے اور کچھ دشمنوں کے۔" اس نے صوفے کی بیک سے سر ٹکاتے ہوئے آنکھیں موند لی تھیں' جبکہ بتول شاہ نے اسے چونک کر دیکھا تھا۔

"دوستوں کا خیال آنا تو محبت کی علامت ہے مگر دشمنوں کا خیال آنا کس چیز کی علامت ہے؟" ان کا لہجہ قدرے تیکھا سا محسوس ہو رہا تھا۔

"انسانیت کی...!" دل آور کے اگلے جواب پہ وہ اور زیادہ چونکی تھیں۔

"تو کیا تمہاری انسانیت کو اس کا خیال آتا ہے جو انسان ہی نہیں ہے؟" بتول شاہ کا لہجہ چبھتا ہوا سا تھا۔

"پلیز اماں! میں کب کہہ رہا ہوں کہ مجھے وقار آفندی کا خیال آتا ہے؟" وہ جھنجلا گیا تھا۔

"تو پھر...؟" انہوں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

"مجھے اس کی بیٹی کا خیال آتا ہے۔" دل آور کی آواز دھیمی پڑ گئی تھی۔

"اس کی بیٹی کا؟" انہیں ایک اور جھٹکا لگا تھا۔

"ہاں... !اس کی بیٹی کا... علیزے کا؟" اس نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"مگر کیوں؟" ان کے سوال کافی مختصر سے تھے اور لہجہ بھی بدل چکا تھا۔

"گزشتہ رات میں اسے کھانا دینے گیا تھا۔" وہ بتاتے ہوئے ٹھہر سا گیا تھا۔

"پھر...؟" انہوں نے اسے بولنے پہ اکسایا تھا۔

"پھر میں نے وہ سب دیکھا جو میرے پلان میں نہیں تھا۔" دل آور کہتے ہوئے سر جھکا کر بیٹھا ہوا تھا اور بتول شاہ اس کے مزید بولنے کا انتظار کر رہی تھیں۔

"وہ... وہ... میرے قدموں میں جھک گئی تھی۔" وہ بڑے کرب سے بتا رہا تھا اور بتول شاہ کے قدموں تلے سے زمین سرک گئی تھی اور سینے کے اندر سالوں سے رکھا پتھر بھی کانپ گیا تھا وہ ہنوز سر جھکائے بیٹھے دل آور کو دیکھ کے رہ گئیں۔

"تم اپنی بتاؤ... تم جھکے یا نہیں؟" وہ اس کا جواب سننا چاہتی تھیں "میں کیسے جھک جاتا اماں؟ یہ... یہ... میرے جھکنے کا مقام نہیں ہے۔ یہاں دل آور شاہ جھکے تو بے غیرت کہلائے گا۔" وہ بے ساختہ تڑپ کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا۔

"جس انسان نے جھکنا ہو۔ وہ "در" نہیں دیکھتا دل آور شاہ... چاہے وہ در زری کا ہو' چاہے علیزے کا... جب جھک ہی جانا ہے تو پھر یہ در کیا؟ اور وہ در کیا؟" وہ عجیب تلخ سے لہجے میں بولی تھیں۔

"مگر میں اس سے نکاح نہیں کر سکتا اماں... ہرگز نہیں... مر بھی جاؤں تب بھی نہیں۔" وہ نفی میں سر ہلا رہا تھا۔

"نکاح...؟" بتول شاہ نکاح کے لفظ پہ جیسے سناٹے میں آگئی تھیں۔

بے شک یہ انہی کا ظرف تھا کہ وہ اسے جھکنے کا کہہ رہی تھیں مگر نکاح کا لفظ سن کر ایک بار تو انہیں یوں لگا تھا کہ جیسے ان کے جسم اور ان کے دل پہ کسی نے جلتے دہکتے کوئلے انڈیل دیے ہوں اور ان کے جسم کے ساتھ ساتھ ان کے دل کے بھی پرخچے اڑ گئے ہوں اور وہ کھڑے کھڑے دھجیوں میں بکھر گئی تھیں ان کی ذات پہ سیاہ تاریکی کے سائے لہرا گئے۔ ان کی حالت ایسی تھی جیسے کسی ہزاروں فٹ کی اونچائی سے پھینکے جانے والے شیشے کی ہوتی ہے۔ چکنا چور... ریزہ ریزہ... ٹکڑوں میں تقسیم۔

اور ان تقسیم شدہ ٹکڑوں کو دوبارہ جمع کر کے ایک شکل میں لانا انتہائی ناممکن سی بات تھی مگر وہ واقعی ایک مضبوط اور پتھریلی چٹان نما عورت تھیں وہ ناممکن کو بھی ممکن بنانے کی ہمت اور حوصلہ رکھتی تھیں۔ ان کی حالت شیشے کے ٹکڑوں جیسے تو ہو سکتی تھی مگر ان کی طاقت شیشے جیسی کمزور نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ بہادر خاتون تھیں اور انہوں نے بہادر ہی رہنا تھا وہ اپنی زندگی کو ایک جنگ سمجھتی تھیں اور یہ جنگ انہوں نے اپنے آخری دم تک لڑنی تھی اور اس جنگ مسلسل کا انہوں نے کبھی اپنے رب سے شکوہ بھی نہیں کیا تھا اور وہ شکوہ و شکایت کرنے والوں میں سے تھیں بھی نہیں' بلکہ وہ تو صبر و شکر کرنے والوں میں سے تھیں... ورنہ انہوں نے آج تک اللہ نے جو انہیں دیا تھا اس پہ شکر کیا تھا اور جو ہوا تھا اس پہ صبر کیا تھا اور آج بھی ان کی آزمائش کی گھڑی تھی آج پھر اللہ نے انہیں آزمایا تھا اور وہ آزمائش کا پیالہ پی گئی تھیں۔

"وقار آفندی مت بنو دل آور شاہ۔" بتول شاہ پیالہ پی چکی تھیں اور دل آور شاہ دم بخود سا رہ گیا تھا وہ اپنے سامنے کھڑی عورت کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا اور یقین کرنا چاہ رہا تھا کہ وہ واقعی ایک عورت ہیں یا پتھریلی چٹان؟ اتنا حوصلہ' اتنا ظرف اور اتنا صبر تو اس نے آج تک کسی عورت میں نہیں دیکھا تھا جتنا وہ آج اپنے سامنے کھڑی عورت میں دیکھ رہا تھا۔

"اماں...؟" دل آور کے ہونٹوں سے ادا ہونے والا یہ لفظ بھی کپکپا رہا تھا کیونکہ وہ بے یقینی کی انتہا پہ تھا۔

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں دل آور شاہ! وقار آفندی مت بنو' تمہاری رگوں میں دوڑتا بابر شاہ کا خون اور اس خون

میں بتول شاہ کی تربیت تمہیں کبھی بھی یہ اجازت نہیں دیتی کہ تم بے رحمی اور سفاکی کے راستے پہ چلو... یا پھر تم کسی وحشت یا درندگی کا مظاہرہ کرو' میں تمہیں ایک انسان دیکھنا چاہتی ہوں' حیوان نہیں۔" بتول شاہ کا لب و لہجہ اچھا خاصا بے لچک نظر آرہا تھا۔

"اماں... آپ... یہ سب کیا کہہ رہی ہیں؟" ول آور نے ان کے مقابل کھڑے ہوتے ہوئے انہیں دونوں کندھوں سے تھام لیا تھا اور ان کے احساسات سے عاری اور سپاٹ چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"تمہیں پتا ہے' میں جو کہتی ہوں وہ ایک ہی بار کہتی ہوں اور مجھے بھی پتا ہے کہ تم ایک بار میں ہی سمجھ جاتے ہو۔" بتول شاہ قدموں سے اکھڑنے والی عورت نہیں تھیں۔ وہ ہمیشہ اپنی بات اور اپنے فیصلے پہ اٹل ثابت ہوتی تھیں۔ تب ہی تو ول آور کو سن کر اس قدر دھچکا لگا تھا کیونکہ جو کچھ وہ کہہ رہی تھیں وہ سب کرنا انتہائی مشکل' بلکہ ناممکن سی بات تھی۔ اسی لیے وہ آہستگی سے نفی میں سرہلاتا ہوا پیچھے ہٹ گیا تھا۔

"نہیں اماں... ! میں یہ سب نہیں کرسکتا۔ آپ... آپ مجھے حکم دو کہ میں اپنا سر کاٹ کے آپ کے قدموں میں رکھ دوں' تو قسم ہے اس پاک ذات کی میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کروں گا۔ لیکن... یہ... یہ سب نہیں کرسکتا۔" اس نے انکار کردیا تھا۔

"کیوں نہیں کرسکتے؟ آخر اس کو اس نوبت پہ پہنچانے والے بھی تو تم ہو... کہ وہ تمہارے قدموں میں جھکنے پہ مجبور ہوگئی ہے پہلے اس نے اپنے باپ کے کیے کا بھگتان بھگتا ہے اور اب تمہارے کیے کا بھگتان بھگتے گی... کیوں؟ کس لیے آخر؟ وہ عورت ہے اس لیے... یا پھر تم مرد ہو اس لیے؟ حالانکہ میں نے تمہیں کہا بھی تھا کہ تم ایسا کوئی کام مت کرنا کہ میں زندگی میں کبھی تمہیں معاف نہ کرپاؤں... مگر تم نے میری ایک نہیں سنی... تم نے تب بھی اپنی مرضی کی... اور تم آج بھی اپنی مرضی کررہے ہو؟ کیا اس سب کے بعد بھی تم مجھ سے معافی کی توقع رکھو گے۔" وہ خاصے سخت لہجہ میں بولتے ہوئے ول آور کے چہرے کو ہی دیکھ رہی تھیں۔

"مگر اماں... میں نے ایسا کچھ نہیں کیا کہ آپ مجھے کبھی معاف ہی نہ کرپائیں... وہ جیسی تھی... ویسی ہی ہے... میں نے اس کے اور اپنے درمیان مرد اور عورت والی "ہوس و نفس" کو جگہ نہیں دی... وہ تو اتنی ہی پاک ہے جتنی پہلے تھی۔" ول آور نے ماں کے سامنے گواہی دی تھی۔

"میں جانتی ہوں کہ وہ اتنی ہی پاک ہے جتنی پہلے تھی مگر یہ بات تم کس کس کو بتاؤ گے؟ اور کون کون اس بات کو مانے گا کہ وہ جیسی تھی ویسی ہی ہے۔ یہ بات تو یا تم جانتے ہو یا پھر تمہارا خدا جانتا ہے... لیکن خدا کی خدائی نہیں جانتی... کیونکہ خدائی وہی کچھ جانتی ہے جو سامنے نظر آرہا ہوتا ہے۔ اب سامنے نظر آنے والی چیز کے پیچھے کیا ہے۔ یہ کوئی بھی جاننے کی زحمت نہیں کرتا۔" بتول شاہ نے انتہائی دکھ سے کہتے ہوئے نفی میں گردن ہلائی تھی۔

"اماں... ! آپ کی ہر بات اور ہر حکم سر آنکھوں پہ... لیکن میں اس کے لیے بس اتنا کرسکتا ہوں کہ اسے واپس بڑی حویلی چھوڑ آؤں... اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کرسکتا... میں مر تو سکتا ہوں... مگر وقار آفندی کی بیٹی کو بیوی نہیں بنا سکتا... چاہے میرے لیے اس دنیا میں رہ جانے والی وہ آخری لڑکی ہی کیوں نہ ہو۔" ول آور کا لہجہ بتول شاہ سے بھی زیادہ سخت اور پتھریلا ہورہا تھا۔

"اگر تم نے اسے واپس ہی چھوڑنا تھا تو لائے ہی کیوں تھے؟" وہ دونوں ماں' بیٹا ایک دوسرے کو دوبدو جواب دے رہے تھے۔

"میں وقار آفندی کو سزا دینے کے لیے اسے لایا تھا... اور وہ یہ سزا بھگت بھی رہا ہے... یہ دیکھیے... یہ میرا موبائل دیکھیے... اس میں وقار آفندی پہ دورہ پڑنے کی اطلاع ہے... جو اسے آج رات ہی پڑا ہے... اور وہ اس

وقت اسپتال میں ہے۔ یہ ہے اس کی سزا۔۔۔ عبرت ناک سزا۔۔۔ جب جب سوچے گا‘ مرے گا۔۔۔ اور میں اسے اسی طرح ماروں گا۔۔۔ تڑپا تڑپا کر۔۔۔ ورنہ میں چاہتا تو اسے گولی بھی مار سکتا تھا۔۔۔ اس کا ایکسیڈنٹ کروا کر اسے اپاہج بھی بنا سکتا تھا مگر اسے پھر بھی اتنی اذیت نہیں پہنچ سکتی تھی۔ جتنی اب پہنچ رہی ہے۔۔۔ صرف اس خیال سے اس سوچ سے کہ اس کی بیٹی دل آور شاہ کے پاس ہے۔۔۔ بابر شاہ کے بیٹے کے پاس۔۔۔

آپ اندازہ بھی نہیں کرسکتیں کہ میری طرف سے ملنے والی یہ سزا وقار آفندی کی آنے والی سات نسلیں بھی یاد رکھیں گی۔۔۔ اور رہی بات علیزے آفندی کی بے بسی کی تو وہ میں ایک دو دن میں ختم کردوں گا۔۔۔ واپس بھیج دوں گا اسے۔“ اس نے کہتے ہوئے بات ہی ختم کرڈالی تھی اور ان کے سامنے سے ہٹ کر باہر نکل گیا تھا اب اس کا رخ اپنے بیڈ روم کی طرف تھا اور بتول شاہ ڈرائنگ روم کے بیچوں بیچ کھڑی دیکھتی رہ گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

وہ گھر کیا آیا تھا کہ پورے گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی ماں بھی خوش تھی اور بہنیں بھی آگے پیچھے دوڑتی پھر رہی تھیں‘ ایک تو اس کی رہائی کی خوشی اور دوسری اس کی جاب کی خوشی نے انہیں اپنی ساری تکلیفیں بھلا ڈالی تھیں‘ اللہ نے واقعی انہیں صبر کا پھل دے دیا تھا اور وہ تب سے اب تک دل آور شاہ کے لیے دعائیں کررہی تھیں جس نے ان غریبوں پہ اتنا بڑا احسان کیا تھا۔

”کیا بات ہے آخر۔۔۔؟ آج بڑی دل لگا کر تیاری کی جارہی ہے؟ آپ نے آفس ہی جانا ہے یا کسی ڈیٹ کا پلان ہے؟“ مریم اس کا کمرا صاف کرنے کی غرض سے دوبارہ اس کے کمرے میں آچکی تھی مگر وہ ابھی تک آئینے کے سامنے کھڑا تیار ہورہا تھا جبھی تو وہ نظروں کا زاویہ بدل کر دیکھنے پہ مجبور ہوگئی تھی اور عدیل مسکراتا ہوا اس کی سمت پلٹا تھا۔

”اف یار۔۔۔ پہلی بار تو کہیں جانے کے لیے تیار ہورہا ہوں اور آپ لوگوں کو پہلی بار ہی کھٹکنے لگا ہے؟“ اس نے مصنوعی خفگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا جس پہ مریم حیران رہ گئی تھی۔

”اوہ۔۔۔! تو آپ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کو کھلی چھوٹ دے دیں؟ آپ پہ نظر بھی نہ رکھیں اور آپ ایک روز اچانک ہی ہماری بھرجائی گھر لے آئیں۔۔۔ وہ بھی ہمیں خبر کیے بغیر؟“ مریم نے اسے بغور جانچتی ہوئی نظروں سے دیکھ کر حیرت اور معنی خیزی کا مظاہرہ کیا تھا۔

”یہ بھی خوش فہمی ہے تمہاری۔۔۔ ورنہ اچانک تمہاری بھرجائی کو گھر لے آنا اتنا آسان بھی نہیں ہے۔ جتنا تم تصور کررہی ہو۔۔۔ یہ کام امیر لوگوں کے ہیں۔۔۔ ہم غریب لوگوں کے نہیں۔۔۔ اچانک شادیاں وہی ارینج کرسکتے ہیں۔“ عدیل نے کندھے اچکائے تھے اور چارپائی کے پائے پہ پاؤں رکھ کے ذرا سا جھکتے ہوئے جوتوں کے تسمے باندھنے لگا تھا۔

”ایسی کرم نوازیاں اللہ کبھی کبھی غریبوں پہ بھی کردیتا ہے۔۔۔ بس مایوس نہیں ہونا چاہیے۔۔۔ اس کا کرم کسی بھی وقت ہوسکتا ہے۔“ مریم کہتے ہوئے اس کے کپڑے اور جوتے وغیرہ اٹھا کر سمیٹنے لگی تھی لیکن ابھی عدیل نے کچھ کہا بھی نہیں تھا کہ باہر دروازے پہ دستک ہونے لگی تھی اور عدیل جلدی جلدی تسمے باندھ کے سیدھا ہوگیا تھا۔

”ارے آج صبح صبح کون آگیا؟“ وہ برآمدے میں لگے وال کلاک کی سمت دیکھتے ہوئے باہر دروازے کی طرف بڑھا تھا۔

”کون۔۔۔؟“ اس نے دروازہ کھولتے ہوئے یوں ہی پوچھا تھا اور ساتھ ہی دروازہ بھی کھول دیا تھا مگر دروازہ کھول دینے کے بعد وہ حیران پریشان اور بے یقین سا دیکھتا رہ گیا تھا اس کے سامنے مدحیہ حیات کھڑی تھی اور وہ حیرت زدہ

سا کھڑا تھا۔

”السلام علیکم۔۔۔!“ مدحیہ نے اس کی حیرانی کو نظر انداز کرتے ہوئے سلام کیا تھا۔

”ہوں۔۔۔ ہاں۔۔۔ وعلیکم السلام۔“ وہ بمشکل اپنی حیرت اور پریشانی کے گھیرے سے باہر آتے ہوئے متوجہ ہوا تھا۔

”کیا میں اندر آسکتی ہوں؟“ اس نے خود ہی اندر آنے کے لیے اجازت مانگی تھی اور عدیل اپنی بدحواسی اور کوتاہی پہ خود کو سرزنش کرتا ہوا سامنے سے ہٹ گیا تھا۔

”ایم سوری۔۔۔ آیئے آپ اندر آیئے۔“ اس نے اسے راستہ دیا تھا اور مدحیہ اندر آگئی تھی حالانکہ اندر قدم رکھتے ہوئے اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا اور وہ اندر سے جھجک بھی رہی تھی آخر وہ عدیل عمر کے گھر پہلی بار آئی تھی جس پہ عدیل کی بھی حالت ایسی ہی تھی جیسی اس کی ہورہی تھی۔

”ارے مدحیہ آپ۔۔۔؟“ مریم عدیل کے کمرے سے نکلتے ہوئے مدحیہ کو دیکھ کر بے ساختہ چہکی تھی اور لپک کے اس کے قریب آئی تھی۔

”السلام علیکم۔۔۔ کیسی ہیں آپ۔“ مدحیہ نے آہستگی سے کہتے ہوئے اس کی سمت ہاتھ بڑھایا تھا جبکہ مریم اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کے گلے لگ گئی تھی۔

”رشتہ قریب کا ہو تو قریب سے ملنا چاہیے۔۔۔ اس طرح دور سے نہیں۔“ مریم نے ذومعنی لہجے میں کہتے ہوئے عدیل اور مدحیہ دونوں کو کن انکھیوں سے دیکھا تھا اور عدیل بال کھجاتے ہوئے پیچھے ہٹ گیا تھا۔

”امی۔۔۔ امی۔۔۔ باہر آئیں۔۔۔ دیکھیں کون آیا ہے؟“ مریم نے عابدہ خاتون کو آواز دی تھی اور وہ فاروق نیازی کے کمرے سے باہر نکل آئی تھیں مگر مریم اور عدیل کے ساتھ کھڑی جینز اور لیڈیز کوٹ میں ملبوس انتہائی ماڈرن سی لڑکی کو دیکھ کر حیران رہ گئی تھیں۔

”السلام علیکم۔“ مدحیہ نے ہی سب کو سلام کرنے میں پہل کی تھی۔

”امی۔۔۔ یہ دل آور شاہ کی بہن ہیں۔۔۔ مدحیہ حیات‘ جب ابا جی کی طبیعت خراب ہوئی تھی تو یہی ہمیں اپنی گاڑی میں اسپتال لے کر گئی تھیں۔“ مریم نے اس کا تعارف کروایا تھا اور عابدہ خاتون کے چہرے پہ خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی‘ انہوں نے مدحیہ سے ملنے سے پہلے اک نظر عدیل کی سمت بھی دیکھا تھا وہ ان کی اک نظر سے ہی خجل سا ہوگیا تھا کیونکہ عابدہ خاتون اسے اک نظر میں ہی ”ستائش اور ماشاء اللہ“ کا احساس دلا چکی تھیں۔

”آؤ بیٹا۔۔۔ اندر آجاؤ۔۔۔ باہر کیوں کھڑی ہو؟“ وہ اسے اپنے ساتھ لیے فاروق نیازی کے کمرے میں آگئی تھیں دراصل وہ اسے فاروق نیازی سے ملوانا چاہتی تھیں۔

”میں نے کچھ غلط تو نہیں کہا تھا بھائی صاحب؟“ مریم نے ان کے اندر جانے کے بعد عدیل کو چھیڑا تھا اور عدیل بے ساختہ ہنس پڑا تھا۔

”ارے یار۔۔۔ میں نے واقعی آفس جانا ہے‘ میرا کوئی پلان نہیں ہے۔“

”آپ کا نہ ہو‘ ان کا تو ہے نا؟ اور ویسے بھی اب آپ نے آفس کیا جانا ہے بھلا؟ اب تو وہ متھے لگ چکی ہیں وہ بھی پہلے ہی روز۔“ مریم نے آج پورا پورا ارادہ باندھ رکھا تھا اسے چھیڑنے اور تنگ کرنے کا جس پہ عدیل بار بار ہنس رہا تھا اور انجوائے کررہا تھا۔

”ارے۔۔۔ ہوسکتا ہے کہ اس کا یہ متھے لگنا میری قسمت ہی سنوار دے؟“ عدیل نے اپنے فائدے کا پہلو تلاش کیا تھا جس کو سن کر مریم بھی اس کی چالاکی اور ذہانت پہ ہنس پڑی تھی۔

”صبح صبح دیدار ہوگیا ہے‘ قسمت تو آپ کی ویسے ہی سنور گئی ہے۔“ مریم نے پھر چھیڑنے والے انداز میں دیکھا

تھا۔

"آہاں۔۔۔ اتنے دنوں بعد ہوا ہے یہ دیدار بھی۔۔۔" عدیل نے جیسے آہ بھری تھی۔

"بھائی۔۔۔!" مریم نے حیرت سے چلا کے پکارا تھا۔

"چھوڑو یار۔۔۔ اندر جاؤ۔۔۔ وہ امی اور ابا جی کے پاس اکیلی ہوگی۔" عدیل نے اسے اندر بھیجا تھا۔

"اور آپ۔۔۔؟" مریم نے جاتے جاتے اسے دیکھا۔

"میں بھی آتا ہوں۔" وہ کہہ کر اپنے کمرے میں آگیا تھا۔ لیکن ابھی اسے دو منٹ ہی گزرے تھے کہ مریم، مدحیہ کو لے کر اس کے پیچھے ہی آگئی تھی۔

"آپ یہاں بیٹھیں۔۔۔ بھائی سے بات کریں۔۔۔ میں تب تک چائے بنا کر لاتی ہوں۔" مریم اسے چھوڑ کر باہر نکل گئی تھی اور وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے تھے۔

مدحیہ کمرے کی تنہائی میں نروس سی ہو گئی تھی اور اس کا یہ نروس سا انداز عدیل کی خواہشوں کو کروٹیں بدلنے پہ مجبور کر گیا تھا اس کا دل اس خواہش پہ تو کچھ زیادہ ہی مچلا تھا کہ وہ اسے کندھوں سے تھام کے اپنے بے حد قریب کرلے۔۔۔ مگر خواہش تو آخر خواہش ہی ہوتی ہے نا؟ پوری ہو جائے ضروری تو نہیں۔۔۔ سو مجبوراً" ایک گہری سانس کھینچتے ہوئے اسے اپنی اس ــــــــــ خواہش کو دبا کر خود پہ کنٹرول کرنا پڑا تھا۔

"بیٹھیے۔۔۔!" عدیل نے اسے کرسی پہ بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا مگر وہ بڑے اہتمام سے کرسی پہ بیٹھنے کی بجائے عدیل کے بستر پہ ہی بیٹھ گئی تھی اور اس کے بیٹھنے کے بعد وہ خود کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا تھا اور ہمیشہ کی طرح آج بھی وہ عین اس کے سامنے ہی بیٹھا تھا۔

"کیا آج بھی آپ میرے ابا جی کی خیریت ہی پوچھنے کے لیے آئی ہیں؟" اس نے جان بوجھ کر اسے تنگ کرنے والا سوال کیا تھا۔

"آف کورس۔۔۔ اور کس لیے آنا تھا میں نے؟" لیکن اس بار مدحیہ نے بھی اپنے مزاج کے مطابق جواب دیا تھا کیونکہ جس طرح ڈٹ کے وہ اس کے سامنے بیٹھ چکا تھا اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اسے مزید نروس کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اس لیے بہتر تھا کہ وہ اس ارادے کو ارادہ ہی رہنے دیتی۔

"ریئلی۔۔۔" عدیل نے اور زیادہ دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔

"اینی ڈاؤٹ۔۔۔؟" مدحیہ نے ڈائریکٹ اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں بھی جیسے مسکرا رہی تھیں۔

"ہاں۔۔۔ ڈاؤٹ تو ہے۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"کیا؟" مدحیہ نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

"میں تو کچھ اور ہی سمجھ رہا تھا۔" عدیل کا لہجہ بھی کچھ اور ہی ہو رہا تھا۔

"کیا مطلب۔۔۔؟ کیا سمجھ رہے تھے آپ۔۔۔" مدحیہ نا سمجھی سے پوچھ رہی تھی۔

"یہی کہ آپ خیریت پوچھنے کے لیے نہیں بلکہ خیریت دیکھنے کے لیے آئی ہیں۔" عدیل نے دیکھنے پہ زور دیا تھا اور مدحیہ اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے اپنی مسکراہٹ روکنے میں ناکام ہو گئی تھی۔ آخر وہ ٹھیک ہی تو سمجھا تھا وہ اسے دیکھنے ہی تو آئی تھی۔۔۔ کیونکہ اتنے دنوں سے دیکھا جو نہیں تھا۔

"اوہ۔۔۔ تو یعنی میں ٹھیک ہی سمجھا تھا؟" عدیل اس کی مسکراہٹ سے باغ و بہار ہو گیا تھا۔

"آپ سے کس نے کہا کہ آپ ٹھیک ہی سمجھے تھے؟" مدحیہ اب اسے تنگ کرنے کے موڈ میں تھی۔

"آپ کے چہرے کے اک اک نقش نے۔۔۔ آپ کی آنکھوں نے۔۔۔ آپ کے ہونٹوں نے۔۔۔ آپ کی

مسکراہٹ نے۔۔۔" عدیل نے وہیں بیٹھے بیٹھے ذرا سا آگے جھکتے ہوئے کہا تھا اور ساتھ ہی اس کی آنکھوں کے دریچے میں بھی جھانکا تھا جہاں آج بھی عدیل کو اپنا آپ ہی بسا ہوا نظر آیا تھا۔

"غلط فہمی بھی تو ہو سکتی ہے آپ کی؟" اس نے کندھے اچکائے تھے۔

"اگر یہ غلط فہمی ہے تو پھر میں اس غلط فہمی میں ہی خوش ہوں۔۔۔ مجھے اسی غلط فہمی میں مبتلا رہنے دیں۔" وہ دوبارہ سیدھے ہوتے ہوئے بولا تھا۔

"لیجیے۔۔۔! آپ کے لیے گرما گرم چائے اور ساتھ میں قیمہ اور پراٹھے۔۔۔" مریم بڑی سی ٹرے اٹھائے اندر آگئی تھی۔

"قیمہ اور پراٹھے؟" "کل بھائی کے آنے کی خوشی میں امی نے ان کی پسندیدہ ڈش بنائی تھی، امی کو پتا تھا کہ بھائی ناشتے میں پراٹھے کے ساتھ بھی قیمہ ہی کھائیں گے۔" مریم نے مسکراتے ہوئے بتایا تھا۔

"اوہ۔۔۔! تو یہ ان کا ناشتا ہے؟ میں تو ڈر ہی گئی تھی کہ کہیں مجھے نہ کھانا پڑ جائے۔" مدحیہ قدرے ریلیکس ہو گئی تھی اور اس کی بات پہ وہ دونوں بہن بھائی ہنس پڑے تھے۔

"ارے۔۔۔ کھانا تو آپ کو پڑے گا۔۔۔ کیونکہ یہ صرف ان کا ناشتا نہیں ہے۔۔۔ یہ آپ دونوں کا ناشتا ہے آپ کو شیئر کرنا پڑے گا ان کے ساتھ۔" مریم نے شرارت سے دونوں کو دیکھا تھا۔

"نو۔۔۔ میں پہلے بھی ایک بار ان کو بتا چکی ہوں کہ میں اتنا ہیوی ناشتا نہیں کرتی، مجھے عادت نہیں ہے۔" مدحیہ نے نفی میں سر ہلایا تھا اور مریم نے اس کے انکار پہ عدیل کی سمت دیکھا تھا کہ اب کیا کرے؟

"ڈونٹ وری۔۔۔ یہ آج ناشتا میرے ساتھ ہی کریں گی۔۔۔ کیونکہ یہ ناشتا کسی ہوٹل کا نہیں، بلکہ میری امی کے ہاتھ کا بنا ہوا ہے۔" عدیل نے مریم کو تسلی دی تھی اور وہ مطمئن ہو کر مسکراتی ہوئی باہر نکل آئی تھی مریم کو بھی اکیڈمی جانا تھا۔ اس لیے وہ تیار ہونے کے لیے چلی گئی تھی۔

"مگر میں یہ۔۔۔" مدحیہ کچھ کہہ ہی نہیں پائی تھی اور عدیل نے ناشتا شروع بھی کر دیا تھا۔

"جب کسی کے ساتھ چلنا ہو تو اس کے ہر کام میں اس کا ساتھ دینا پڑتا ہے۔ چاہے وہ ناشتا ہی کیوں نہ ہو۔" عدیل بڑے سکون سے کہتے ہوئے نوالہ منہ میں رکھ چکا تھا انداز بہت لاپروا سا تھا اور مدحیہ مزید کوئی انکار نہیں کر سکی تھی اور اس کے ساتھ ناشتا کرنے میں شریک ہو گئی تھی، جس پہ عدیل ناشتا کرنے کے دوران ہی مسکرا دیا تھا۔ کیونکہ وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ چلنا چاہتی ہے اور اس کی خاطر وہ اپنے آپ کو بدل بھی سکتی ہے اور یہ بات عدیل کے لیے ایک خوش آئند بات تھی۔

"تھینک یو۔۔۔" عدیل نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا تھا۔

"فار واٹ۔۔۔" مدحیہ چائے کا کپ ہونٹوں سے لگاتے ہوئے ٹھہر گئی تھی اور حیرانی سے سوال کیا تھا۔

"میرا ساتھ دینے کے لیے۔۔۔" عدیل کا لہجہ اور جواب دونوں ہی مبہم اور متبسم سے ہو رہے تھے۔

"میں نے یہ ناشتا اس لیے کیا ہے کہ یہ آپ کی امی نے بنایا ہے۔" مدحیہ بھی اتنی آسانی سے اسے خوش نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"اٹس اوکے۔۔۔ جس لیے بھی کیا ہے۔۔۔ مگر ساتھ تو میرا ہی دیا ہے نا؟ اس لیے تھینکس اگین۔" عدیل چائے کے سپ لیتے ہوئے لطف لے رہا تھا ارجوابا" مدحیہ خاموش ہو گئی تھی۔

"اوکے! میں اب چلتی ہوں۔۔۔ کافی ٹائم لے لیا آپ کا۔" مدحیہ تھوڑی دیر بعد اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ ہی عدیل بھی کھڑا ہو گیا تھا۔

"ٹائم کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت کچھ لے لیا ہے آپ نے۔" وہ آہستگی سے بولا تھا۔

"کیا کہا۔۔۔؟" مدیحہ ٹھٹکی تھی۔
"کچھ نہیں کہا۔ بس ریکوئسٹ کر رہا ہوں کہ اباجی کی خیریت پوچھنے کے لیے آتی رہا کریں۔۔۔ دل بہلا رہے گا۔" عدیل نے آج پھر اسے تاکید کی تھی۔
"کس کا۔۔۔" مدیحہ اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے رکی تھی۔
"آف کورس اباجی کا۔۔۔ اور کس کا بھلا؟" عدیل کہتے ہوئے شرارت سے قہقہہ لگا کے ہنسا تھا اور مدیحہ اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے بیگ لے کر باہر نکل آئی تھی اور پھر سب سے مل کر وہاں سے رخصت ہوئی تھی جبکہ عدیل گھر سے نکل کر گلی میں اسے گاڑی تک چھوڑنے کے لیے آیا تھا۔
"ویسے ایک بات پوچھنا تو میں بھول ہی گیا کہ آپ کو گھر کا پتا کیسے چلا؟" عدیل کو اس سوال کا خیال اب آیا تھا۔
"آپ کے کچھ دوست احباب بھی ہوتے ہیں شاید۔" مدیحہ مسکرائی تھی۔
"او اچھا۔۔۔ تو یہ چھوٹے کا کمال ہے۔" وہ فوراً سمجھ گیا تھا اور مدیحہ نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔
"جی۔۔۔ بہت اچھا دوست ہے یہ آپ کا۔" مدیحہ بھی آخر دل آور شاہ کی بہن تھی تعریف میں بخل سے کام نہیں لیا تھا، بلکہ کھل کے سراہا تھا۔
"جانتا ہوں۔۔۔ اور اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ جس نے مجھے ورکشاپ کی جاب کے عوض ایک مخلص دوست عطا کر دیا ہے۔۔۔ بلکہ مجھے تو سب کچھ اسی ورکشاپ سے ہی ملا ہے۔" عدیل اللہ کا شکر گزار ہو رہا تھا۔
"ہوں۔۔۔ اچھی بات ہے۔" مدیحہ بیگ سے چابی نکال کر لاک کھولنے لگی تھی اور لاک کھول کر گاڑی میں بیٹھتے ہوئے پلٹ کر عدیل کو دیکھا تھا۔
"تھینکس۔۔۔ آپ نے اتنا اچھا اور مزے دار سا ناشتا کروایا۔۔۔ بہت اچھا لگا مجھے۔" مدیحہ نے شکریہ ادا کیا تھا اور یہ سچ بھی تھا۔ کیونکہ اسے ناشتا بہت مزے دار لگا تھا۔
"یہ ناشتا میں آپ کو روز بھی کروا سکتا ہوں۔۔۔ اگر آپ چاہیں تو۔۔۔؟" عدیل اسے سرتاپا گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔
"تھینک یو۔۔۔ میں آجایا کروں گی۔" مدیحہ اس کی بات گول کر گئی تھی اور وہ سمجھ کر مسکرا دیا تھا۔
"اوکے! گڈ بائے۔" وہ کہہ کر ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھ گئی تھی اور دروازہ بند کرنے کے بعد شیشہ فولڈ کر دیا تھا اور گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بیک کرنے لگی تھی۔
"اور ہاں آپ سے ایک بات کہنا تو میں بھول ہی گئی۔" وہ گاڑی کو ذرا پیچھے سرکاتے ہوئے بولی تھی۔
"کیا بات۔۔۔؟" وہ جی جان سے متوجہ ہوا تھا۔
"یہی کہ آج آپ بہت ہینڈسم لگ رہے ہیں۔۔۔ آج مجھے لگا کہ میں غلطی پر نہیں تھی۔" وہ کہہ کر ایک سیکنڈ کی بھی تاخیر کیے بغیر گاڑی اڑا لے گئی تھی اور عدیل وہیں کشادہ سی گلی میں کھڑا مسکراتا رہ گیا تھا اس کے آج کے دن کی صبح واقعی بہت اچھی ثابت ہوئی تھی وہ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ پھنسائے کافی مسرور سے انداز میں چلتا ہوا واپس گھر آگیا تھا۔ جہاں عابدہ خاتون اور مریم اس کی منتظر تھیں۔

☆ ☆ ☆

"میں بھی تمہارے ساتھ لاہور چلوں گی۔" وہ اگلی صبح سو کر اٹھا تو وہ پہلے سے فیصلہ کیے بیٹھی تھیں اور وہ ڈرائنگ روم میں رکھا ان کا چھوٹا سا اٹیچی کیس دیکھ کر ہی سمجھ گیا تھا کہ ان کی تیاری پکی ہے مگر نہ جانے کیوں دل آور کو ان کا فیصلہ اچھا نہیں لگا تھا وہ سن کر خوش نہیں ہوا تھا۔

"آپ لاہور کیوں جانا چاہتی ہیں؟" دل آور نے نہ چاہتے ہوئے بھی استفسار کر ہی لیا تھا۔
"کیوں۔۔۔؟ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟" بتول شاہ نے خفگی سے دیکھا تھا۔
"کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ آپ فی الحال لاہور جائیں۔" اس نے برملا اظہار کیا تھا۔
"مگر کس لیے؟ کچھ بتاؤ تو سہی؟" وہ جھنجلائی تھیں۔
"اس لیے کہ ابھی میرے بہت سے ادھورے کام نبٹانے والے ہیں، ابھی بہت کچھ باقی ہے ابھی آپ مداخلت مت کریں۔" وہ انہیں روکنا چاہتا تھا۔
"تم فکر مت کرو۔ تمہارے سارے ادھورے کام نبٹانے میں تمہارا ساتھ دوں گی، مدد کروں گی تمہاری۔" انہوں نے دل آور کو بہلایا تھا۔ مگر وہ الجھ رہا تھا اس کا دل نہیں مان رہا تھا کہ وہ لاہور جائیں۔
"مجھے آپ کی مدد کی نہیں۔۔۔ بلکہ دعا کی ضرورت ہے اور وہ آپ یہاں بھی کر سکتی ہیں پلیز اماں، آپ ابھی مت جائیں، میں آپ کو بعد میں آکر لے جاؤں گا۔" وہ انہیں مسلسل روک رہا تھا۔
"دیکھو شاہ۔۔۔! زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہے کب ہے اور کب نہیں ہوگی، یہ بھلا کس کو خبر؟ میں نے چند روز پہلے زری سے ملنے کا اور لاہور آنے کا وعدہ کیا تھا مجھے وہ وعدہ تو پورا کرنے دو۔۔۔ کہیں ساتھ لے کر ہی نہ مر جاؤں۔۔۔ اور میری زندگی کی طرح میری قبر پہ بھی کوئی بوجھ پڑا رہے؟" بتول شاہ کی بات پہ دل آور بے ساختہ چپ سا ہو گیا تھا لیکن زری کا خیال آتے ہی اس نے دوبارہ ان کی سمت دیکھا تھا۔
"زری سے کیوں ملنا ہے آپ نے؟" وہ تجسس سے پوچھ رہا تھا البتہ چہرے پہ الجھن تھی۔
"کیونکہ اس کی زندگی بھی بتول شاہ کی زندگی سے مختلف نہیں ہے درد سانجھا نہ سہی۔۔۔ مگر تنہائی کا سفر سانجھا ہی ہے دونوں کا۔۔۔ یاویں دیکھو تو آبلے ہی آبلے ہیں۔" کہتے ہوئے لہجہ بھر آگیا تھا ان کا، مگر پھر وہی حقیقت کہ اپنے آپ کو سنبھال گئی تھیں اور دل آور مزید کچھ کہے بغیر لاہور جانے کے لیے تیار ہونے لگا تھا اب کچھ اور کہنے کی تو گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔

(باقی آئندہ)

☆ ☆

نبیلہ عزیز

درِ دل

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نبیل حیات دو ہی بہن بھائی ہیں' مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے' وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پہ رنگ چکی ہے' جس کے پیش نظر فائزہ بیگم' نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں' لیکن مدحیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے' جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے' مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے' مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا' بے بسی اور مجبوری سے تنگ آ کر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے' لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باؤ امتیاز مل جاتا ہے' جو اسے کام کی آفر کرتا ہے' جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے' اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے' وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے' وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

زرتاج شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے' وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے' اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا' اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔

—۲۹—

انتیسویں قسط

دانیال کو اس کی فلائٹ کا پہلے سے ہی پتا تھا۔

اسی لیے وہ کسی ڈرائیور کو ایئرپورٹ بھیجنے کے بجائے خود ہی اسے ریسیو کرنے کے لیے آگیا تھا۔ جبکہ دوسری طرف آذر کو بھی ڈرائیور کی ہی امید تھی لیکن ڈرائیور کی جگہ دانیال کو دیکھ کر اسے حیرت بھی ہوئی تھی اور وہ ٹھٹکا بھی تھا لیکن پھر بھی اس نے فوراً" ہی اپنی حیرت کا اظہار نہیں کیا تھا۔۔۔ بلکہ دبا گیا تھا۔

"السلام علیکم۔۔۔! کیسے ہو؟" آذر نے ہی آگے بڑھ کر اس سے ہاتھ ملانے اور حال احوال پوچھنے میں پہل کی تھی کیونکہ دانیال تو اپنی جگہ پہ خاموش کھڑا تھا۔

"وعلیکم السلام۔۔۔! میں ٹھیک ہوں اللہ کا شکر ہے تم اپنی سناؤ کیسے ہو؟" دانیال نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔

"میں بھی ٹھیک ہوں۔۔۔! مجھے کیا ہونا ہے بھلا؟" آذر نے لاپروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے کہا تھا اور قدم پارکنگ کی سمت بڑھا دیے تھے۔

"ہونے کو تو کچھ بھی ہوسکتا ہے۔۔۔ اس میں کون سی دیر لگتی ہے۔۔۔؟ دانیال نے استہزائیہ سے لہجے میں کہتے ہوئے آذر کے ہاتھ سے اٹیچی کیس کا ہینڈل تھام لیا تھا اور اٹیچی کیس کو گھسیٹتے ہوئے اس کے ساتھ اس کے برابر چلنے لگا تھا۔

"ہونہہ! واقعی کچھ بھی ہونے میں دیر نہیں لگتی۔۔۔" آذر نے آہستگی سے اعتراف میں سر ہلایا تھا۔

"ہاں۔۔۔! انسان آخر واپس لوٹ ہی آتا ہے تم سناؤ واپسی کا سفر کیسا رہا؟" دانیال سامنے دیکھتے ہوئے چل رہا تھا جبکہ آذر کی نظریں چونک کر دانیال کے چہرے پہ جا ٹھہری تھیں۔

"واپسی کا سفر۔۔۔؟"

"ہاں۔۔۔! واپسی کا سفر۔۔۔ اور شاید علیزے سے کومل تک کا سفر۔۔۔" دانیال عجیب سے انداز میں کہتے ہوئے آگے بڑھ کے گاڑی کے ڈور کھولنے لگا تھا جبکہ آذر اس کی بات پہ دیکھتا رہ گیا تھا۔

"اب دیکھ کیا رہے ہو؟ گاڑی میں بیٹھو واپس تو تم آہی گئے ہو دوبارہ کہاں جاؤ گے؟" دانیال نے اٹیچی کیس گاڑی کی ڈگی میں رکھنے کے بعد اسے بھی گاڑی میں بیٹھنے کے لیے متوجہ کیا تھا اور آذر کسی دھیان سے چونک کر بے ساختہ ایک گہری سانس کھینچتے ہوئے فرنٹ ڈور کھول کر گاڑی میں بیٹھ گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی دانیال نے بھی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔

"گھر چلو گے یا ہاسپٹل۔۔۔؟" اس نے بڑی احتیاط سے گاڑی پارکنگ سے نکال کر روڈ پہ ڈالتے ہوئے آذر سے سوال کیا تھا جس پہ آذر کو ایک بار پھر چونکنا پڑا تھا۔

"ہاسپٹل۔۔۔ مگر کیوں۔۔۔؟" اس نے دانیال کی سمت دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"ڈیڈ کی طبیعت بہت خراب ہے۔۔۔ کل سے ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہیں۔۔۔ میں بھی ہاسپٹل میں ان کے پاس ہی تھا۔۔۔ وہیں سے تمہیں ریسیو کرنے کے لیے آیا ہوں۔۔۔" دانیال ڈرائیونگ کے دوران بڑے سکون سے اسے جواب دے رہا تھا۔

"تم نے کل تو مجھے نہیں بتایا تھا۔۔۔؟" آذر پریشان ہوچکا تھا۔

"کل بتا دیتا تو تم کیا کرلیتے۔۔۔؟ آنا تو پھر بھی تم نے آج ہی تھا نا؟" دانیال تو جیسے ہر بات کو ہی سکون سے لے رہا تھا۔

"دانیال۔۔۔! تم ہر بات میں طنز سے کام کیوں لے رہے ہو۔۔۔؟" آذر کو جھنجلاہٹ ہونے لگی تھی۔

"ہونہہ۔۔۔! مجھے کیا ضرورت ہے ہر بات میں طنز سے کام لینے کی۔۔۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ دلوں میں اور لہجوں

میں زہر اتر آیا ہے جن کی آمیزش ہر بات اور ہر لفظ میں محسوس ہوتی ہے۔۔۔ اس میں کوئی دانستہ عمل شامل نہیں ہے۔" اس نے موڑ کاٹتے ہوئے جواز پیش کیا تھا اور آذر اس کی بات پہ لب بھینچ کے رہ گیا تھا۔

"خیر پھر بھی تمہیں طنز لگا ہے تو معذرت چاہتا ہوں۔" دانیال نے کندھے اچکاتے ہوئے معذرت بھی کرلی تھی اور آذر مزید کچھ بھی نہیں کہہ سکا تھا اور ان کا باقی کا سفر خاموشی میں ہی کٹا تھا' دانیال نے گاڑی ہاسپٹل کی پارکنگ میں پارک کی تھی اور آگے پیچھے دونوں ہی گاڑی سے اتر آئے تھے ان کا رخ اندر کی طرف تھا۔

"آنی۔۔۔!" ہاسپٹل کی راہداری میں داخل ہوتے ہی آسیہ آفندی سے ٹکراؤ ہوا تھا اور وہ بے ساختہ ان کے سامنے ٹھہر گیا تھا جس پہ آسیہ آفندی بھی اچانک اسے اپنے سامنے دیکھ کر خود پہ کنٹرول نہیں رکھ پائی تھیں۔

"آذر۔۔۔! میرا بیٹا۔" وہ اس کے کندھے سے لگ کر بے اختیار ہچکیوں سے رو پڑی تھیں انہوں نے بیچ راستے کا بھی خیال نہیں کیا تھا اور آذر ان کے کندھے کے گرد بازو حمائل کرتے ہوئے انہیں تسلی دینے لگا تھا۔۔۔

"پلیز آنی۔۔۔! سنبھالیں اپنے آپ کو ڈیڈ ان شاء اللہ جلدی ٹھیک ہوجائیں گے۔ آپ بس دعا کریں ان کے لیے۔" اس نے دوسرے ہاتھ سے ان کے سر اور کندھے کو تھپکتے ۔۔۔ اور سہلاتے ہوئے انہیں ڈھارس دینے کی کوشش کی تھی۔

"میری دعاؤں سے کب کچھ سنور رہا ہے۔۔۔؟ سب کچھ برباد ہوگیا ہے میں میں اجڑ گئی ہوں آذر۔۔۔ میرا سب کچھ بکھر گیا ہے۔۔۔ میں تنہا ہوگئی ہوں۔" وہ بے تحاشا روتے ہوئے اپنا درد اپنی تکلیف اور اپنا دکھ بیان کررہی تھیں جس کو آذر بھی گہرائی سے اور کافی اچھی طرح سے سمجھتا تھا مگر کیا کرسکتا تھا بھلا۔۔۔؟ سوائے تسلی اور دلاسوں کے۔۔۔!

"میں تنہا ہوگئی ہوں آذر۔۔۔! میں بھری دنیا میں تنہا ہوگئی ہوں۔۔۔ اکیلی رہ گئی ہوں سب کے درمیان۔" آسیہ آفندی تڑپ تڑپ کے رو رہی تھیں بین کررہی تھیں ان سے علیزے آفندی کی جدائی کا اور وقار آفندی کی بیماری کا دکھ برداشت نہیں ہورہا تھا۔

"ایسا مت کہیں آنی۔۔۔! ہم سب آپ کے ساتھ ہیں آپ کے ہر دکھ سکھ میں آپ کے شریک ہیں آپ اپنے آپ کو اکیلا کیوں سمجھ رہی ہیں؟ کیا پہلے کبھی ایسا ہوا ہے جواب ہوگا؟ بس درمیان میں حالات کچھ ایسے ہوگئے کہ پوری زندگی کا توازن ہی بگڑ گیا تھا۔۔۔ لیکن ہمیشہ تو ایسا نہیں ہوسکتا نا؟ توازن آخر بحال ہو ہی جاتا ہے۔" آذر نے انہیں بھرپور تسلی دینے کی پوری پوری کوشش کی تھی اور پھر یونہی انہیں اپنے ساتھ لیے وقار آفندی کے لیے ریزرو پرائیویٹ روم میں لے آیا تھا اور اس کے پیچھے کھڑا دانیال اس کی باتوں پہ غور کرتا رہ گیا تھا۔۔۔!

☼ ☼ ☼

اس ایک خواب میں آج تک
میں بندھا ہوں آس کے جال میں
کوئی شہریار وفاؤں کا
کبھی آئے عشق کے تخت پر
کہیں دور شہر جمال میں
میرے سرد جسم کو ڈھانپ دے
وہ سلگتی سانسوں کی شال میں
جہاں میں ہوں اس کے جواب میں

جہاں وہ ہو میرے سوال میں
نہ ہو ایک سانس کا فاصلہ
جہاں اس کے میرے وصال میں۔۔۔

آج بہت ٹھنڈ تھی اور وہ تازہ تازہ شاور لے کر باہر آئی تھی اسی لیے ٹھنڈ سے بچنے کی خاطر اس نے ٹی وی لاؤنج کا ہیٹر آن کر دیا تھا اور ذرا سی دیر میں ہی پورے لاؤنج کا ماحول گرمائش کی لپیٹ میں آگیا تھا رفتہ رفتہ اس کی کپکپی کم ہوتی گئی اسی لیے وہ ریلیکس ہو کر صوفے پہ نیم دراز سی ٹی وی دیکھنے لگی تھی اور یونہی ٹی وی دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔

اور آنکھ لگے ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ اسے راہداری میں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی تھی، چاپ بھی ایسی کہ دل پہ لگے۔۔۔ اور دل جاگ جائے اور جب انسان کا دل جاگ جاتا ہے تو اس کی دنیا سو جاتی ہے۔

اور اس وقت زری کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔۔۔ اس کا دل جاگ چکا تھا اور دنیا سو چکی تھی۔

اس کے دل کی بستی کی ہر گلی میں بس اک ہی چاپ سنائی دینے لگی تھی اور یہ چاپ اس کی پوری ذات پہ حاوی ہو چکی تھی۔ وہ اس چاپ کی چاہ میں سراپا سماعت بن گئی تھی اور جہاں وہ چاپ ٹھہری تھی وہیں اس کا دل ٹھہر گیا تھا۔

اس کی دھڑکنیں اور سانسیں بھی ٹھہر گئی تھیں۔

دل آور شاہ اس کے پاس کیا ٹھہرا تھا کہ اس کی ذات کیا، کائنات بھی ٹھہر گئی تھی۔ بس صرف احساسات اور جذبات تھے جو ہلچل میں تھے باقی سب کچھ تو ٹھہرا ہوا تھا اور اسی ٹھہرے ہوئے احساس کے اثر نے زری کو کچی نیند سے جگا دیا تھا۔

وہ بے ساختہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور اس نے یکدم گردن موڑ کر صوفے کی دائیں سائیڈ کی طرف دیکھا تھا اور پھر دیکھتی رہ گئی تھی کیونکہ وہ اسی کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کی نظریں زری کے سیاہ دراز گھنے بالوں پہ تھیں نم آلود بال اس کے تازہ تازہ غسل کی گواہی دے رہے تھے اور دل آور شاہ ان ظالم گواہوں کی گواہی کو جھٹلا نہیں پا رہا تھا بلکہ وہ تو پورے کا پورا ان کے حق میں نظر آ رہا تھا۔

اور زری اسے ان گواہوں کے حق میں دیکھ کر صوفے سے کھڑی ہو گئی تھی اس کا ٹھہرا ہوا دل پھر سے حرکت میں آگیا تھا اور دل کی اس حرکت کے آگے اس کے قدم بے اختیار و بے بس ہو گئے تھے وہ بنا سوچے سمجھے ہی اس کے قریب اور اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی اور پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ دل آور نے اسے دیکھ کر۔۔۔ نظریں جھکائی تھیں اور نہ سر جھکایا تھا بلکہ وہ تو اسے نظر جمائے بغور دیکھ رہا تھا حالانکہ اس طرح دیکھنا اس کا شیوہ نہ تھا وہ ساری دنیا کو اس طرح دیکھ سکتا تھا مگر زری کو نہیں۔

لیکن آج اس وقت وہ جس طرح زری کو دیکھ رہا تھا اس طرح تو اس نے کبھی کسی کو بھی نہیں دیکھا تھا آج نظریں بھی اور تھیں۔۔۔ انداز بھی اور تھا۔۔۔ اور سامنے کا منظر بھی اور تھا۔

جب سب کچھ اور تھا تو ظاہری بات تھی کہ وہ دونوں بھی کچھ اور ہی لگ رہے تھے۔ اس لیے تو ایک دوسرے کے اتنے قریب نظر آ رہے تھے، اتنے قریب کہ دھڑکنوں کو دھڑکنیں سنائی دینے لگی تھیں ایک کا دل، دوسرے کے دل کی دھڑکنیں با آسانی سن رہا تھا۔

زری نے اس کے دل کی پرشور دھڑکنوں کو شانت کرنے کے لیے اپنا ہاتھ اس کے دل کی سمت بڑھا دیا تھا۔

"زری۔۔۔!" ابھی اس کا ہاتھ اس کے سینے پہ اس کے دل تک پہنچا ہی نہیں تھا کہ اس پکار پہ لرز کر رہ گیا تھا اک مانوس سی آواز تھی جو اسے دل آور شاہ کے دل تک پہنچنے سے روک گئی تھی ورنہ فاصلہ تو بس اک ہاتھ بھر کا رہ گیا تھا۔

اور زری اس ہاتھ بھر کے فاصلے کے رہ جانے پہ ششدر سی رہ گئی تھی اس کا دل کسی اتھاہ گہرائی میں ڈوبتا چلا گیا تھا۔

"زری۔۔۔!" اب کی بار پکارنے کے ساتھ ساتھ اس کا دایاں گال بھی تھپکا گیا تھا اور وہ سٹپٹا کے ہوش میں آگئی تھی۔

اس کی آنکھ کھل گئی تھی اور آنکھ کھلتے ہی جیسے سب کچھ سامنے آگیا تھا اس کی کچی نیند کا خواب حقیقت کی تصویر نظر آیا البتہ یہ اور بات تھی کہ اس حقیقت میں کوئی اور چہرہ بھی موجود تھا اسی آواز کی طرح مانوس سا۔۔۔

"لگتا ہے میری جان بڑی گہری نیند سو رہی تھی۔۔۔؟" انہوں نے بڑی اپنائیت اور نرمی سے کہتے ہوئے اسے محبت پاش نظروں سے دیکھا تھا اور زری حقیقت میں مجسم انہیں اپنے سامنے دیکھ کر تڑپ کے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"بتول آنٹی۔۔۔!" وہ ہوش و حواس میں آتے ہی ان کو پہچان گئی تھی حالانکہ وہ دونوں ایک دوسرے کو پہلی بار روبرو دیکھ رہی تھیں۔

"اوہ۔۔۔! تو پہچان ہی لیا تم نے۔۔۔؟" بتول شاہ نے مسکراتے ہوئے اسے گلے لگا لیا تھا اور زری بھی بے ساختہ مسکرا دی تھی۔۔۔

"اپنوں کو پہچاننے میں وقت نہیں لگتا۔۔۔ ان کو تو ان کے قدموں کی چاپ سے ہی پہچان لیا جاتا ہے۔" زری مسکرا کر کہتی ہوئی ان سے الگ ہوئی تھی اور ان سے ذرا فاصلے پہ کھڑا دل آور شاہ گلا کھنکھارتے ہوئے انہیں اپنی موجودگی کا احساس دلانے پہ مجبور ہو گیا تھا اور زری یکدم کرنٹ کھا کے سیدھی ہوئی تھی وہ نظریں اور سر جھکائے ہوئے اس کی طرف سے تقریباً "رخ موڑے کھڑا تھا۔

جو اشارہ تھا کہ وہ بغیر دوپٹے کے ننگے سر کھڑی ہے اور وہ اسے اس طرح اس حلیے میں نہیں دیکھ سکتا۔۔۔ اور کبھی ہو بھی تو نہیں سکتا کہ وہ زری کے سامنے اپنی نظروں کو گستاخ ہونے دیتا جبھی ہمیشہ نظریں جھکی ہوئی ہی رہتی تھیں اور زری بھی ہمیشہ کی طرح اس کا گریز سمجھتے ہوئے سنبھل گئی تھی اور اس نے فوراً" سر پہ دوپٹا اوڑھ لیا تھا۔

"السلام علیکم۔۔۔!" اس نے اچھی طرح دوپٹہ اوڑھ لینے کے بعد اسے سلام کیا تھا اور دل آور نے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر اس کی سمت دیکھا تھا وہ دوپٹہ اوڑھ چکی تھی اور اسی کی سمت دیکھ رہی تھی۔

"وعلیکم السلام۔۔۔! عبداللہ کہاں ہے؟" وہ سلام کا جواب دیتے ہی بات عبداللہ تک لے گیا تھا۔

"وہ بھابھی کے ساتھ مارکیٹ تک گئے ہیں، آپ لوگ بیٹھیں، وہ بس آتے ہی ہوں گے۔" زری نے اسے اور بتول شاہ کو ایک ساتھ بیٹھنے کا کہا تھا اور خود سامنے سے ہٹ گئی تھی۔

"ارے۔۔۔! تم کہاں جا رہی ہو بیٹا؟" بتول شاہ نے صوفے کی سمت بڑھتے ہوئے استفسار کیا تھا۔

"بس عبداللہ بھائی کو فون کرنے لگی ہوں کہ وہ ذرا جلدی گھر آ جائیں۔" وہ کہتے ہوئے فون سیٹ کے پاس آگئی تھی کیونکہ اس کا اپنا موبائل اوپر اس کے بیڈ روم میں رکھا ہوا تھا۔

"ارے۔۔۔! رہنے دو بیٹا۔۔۔ آ جائیں گے وہ لوگ بھی۔۔۔ ابھی تم تو ہمارے پاس بیٹھو۔" بتول شاہ نے اسے فون کرنے سے باز رکھنا چاہا تھا لیکن دل آور شاہ کی موجودگی میں وہ انہیں ٹھیک طرح سے کمپنی بھی نہیں دے سکتی تھی اس لیے نگارش بھابھی اور عبداللہ بھائی کی موجودگی ضروری تھی اور اس نے انہیں فون بھی کر دیا تھا اور پھر ملازمہ کو چائے وغیرہ کا کہہ کر دوبارہ ان کے پاس آگئی تھی۔

"ادھر آؤ۔۔۔! ادھر میرے پاس بیٹھو۔" انہوں نے زری کو اپنے قریب بیٹھنے کا کہا تھا اور وہ نجانے کیوں دھڑکتے

دل کے ساتھ ان کے قریب بیٹھتے ہوئے اندر سے نروس ہو رہی تھی 'شاید اس لیے کہ عین سامنے والے صوفے پہ دل آور شاہ بیٹھا ہوا تھا یا پھر اس لیے کہ وہ دل آور شاہ کی ماں کے بالکل برابر میں بیٹھی ہوئی تھی 'لیکن جو بھی تھا اس کا دل اندر ہی اندر کپکپا رہا تھا اور چہرہ جھکا ہوا تھا۔

"کیا بات ہے اس طرح چپ کیوں بیٹھ گئی ہو؟ کیا ہمارا اچانک آنا اچھا نہیں لگا؟" بتول شاہ نے اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے انتہائی نرمی اور دلچسپی سے پوچھا تھا۔

"نن ۔۔۔ نہیں آنٹی ۔۔۔! ایسی تو کوئی بات نہیں ہے ۔۔۔ بس وہ میں سو کے اٹھی ہوں شاید اس لیے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔" اس نے کافی آہستگی سے جواب دیا تھا اور بتول شاہ اس کی بات پہ مسکرا دی تھیں۔

"تو پھر ایسا کرو ۔۔۔ ہم دونوں بیٹھے ہیں تم دوبارہ سو جاؤ نیند پوری ہو جائے گی تو سب سمجھ آ جائے گا۔" بتول شاہ کی بات پہ دل آور اور زری کے چہرے پہ بیک وقت مسکراہٹ ابھری تھی اور دونوں کی نظروں کا تصادم بھی ہوا تھا کیونکہ دونوں نے ایک دوسرے کو بیک وقت دیکھا تھا اور اس مسکراہٹ کا منظر ان دونوں کے ہی دل میں اتر گیا تھا۔

"کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ آپ آئیں اور میں آرام سے سو جاؤں ۔۔۔؟" زری بڑی معصومیت اور سادگی سے پوچھ رہی تھی اور بتول شاہ نے مسکراتے ہوئے اسے دوبارہ اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا۔

"مذاق کر رہی ہوں بیٹا! ورنہ مجھے پتا ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔" انہوں نے اس کی پیشانی چومتے ہوئے اس کے گال کو تھپکا تھا اور ان کی اتنی والہانہ محبت اور محبت کے اس اظہار پہ زری کے چہرے پہ سرخی بکھر گئی تھی اس کا چہرہ لال ہو گیا تھا اور وہ بے وجہ ہی اپنے ہاتھوں کو مسلنے لگی تھی اور دل آور اس کی کنفیوژن سمجھ گیا تھا اسی لیے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"آپ لوگ بیٹھیں باتیں کریں 'میں تب تک ایک کال کر لوں۔" وہ اپنا سیل فون نکالتے ہوئے زری کی مشکل حل کرتا ہوا بہانہ بنا کر وہاں سے نکل آیا تھا۔

اور پھر باہر لان میں آ کر اس نے واقعی نبیل کا نمبر ڈائل کر لیا تاکہ وہ اتنی دیر میں اس سے کام کے متعلق کچھ انفارمیشن ہی لے لیتا اور دوسری طرف نبیل بھی جیسے اس کے فون کے ہی انتظار میں تھا اس نے دوسری رنگ پہ ہی کال ریسیو کر لی تھی۔

"ہیلو ۔۔۔!" نبیل نے کافی بے تابی سے ہیلو کہا تھا کیونکہ دل آور کل سے دستیاب جو نہیں ہو رہا تھا۔

"السلام علیکم!" دل آور نے کافی سنجیدگی سے اور نپے تلے انداز میں سلام کیا تھا۔

"وعلیکم السلام! کہاں ہو تم؟ میں کل سے تمہارے نمبر پہ ٹرائی کر رہا ہوں مگر تمہارا نمبر آف جا رہا تھا پھر میں نے گھر کے نمبر پہ کال کی تو گلاب خان سے پتا چلا کہ تم شاید اسلام آباد چلے گئے ہو اسی لیے مجھے پریشانی ہو رہی تھی۔ سب خیریت تو تھی نا ۔۔۔؟" نبیل واقعی بے حد پریشان لگ رہا تھا۔

"ہاں! خیریت تھی ۔۔۔ بس اماں سے ملنے گیا تھا ۔۔۔ آج واپس آ گیا ہوں۔" دل آور ہنوز سنجیدگی سے جواب دے رہا تھا لیکن نبیل نے ابھی تک اس کی سنجیدگی کو نوٹس نہیں کیا تھا۔

"اچھا ۔۔۔! تو پھر آنٹی کا سناؤ وہ کیسی ہیں؟ تم انہیں ساتھ ہی لے آتے؟" نبیل کو حقیقتاً خوشی ہوئی تھی۔

"ہم لوگ اس وقت عبداللہ کے گھر پہ ہیں اماں عبداللہ کی فیملی سے ملنے کے لیے آئی ہیں۔"

"اوہ اچھا اچھا! تو یہ بات ہے؟ لیکن تم یہ تو بتاؤ کہ تمہیں کیا ہوا ہے؟ تم کچھ اپ سیٹ لگ رہے ہو؟" نبیل کا دھیان بالآخر اس کی طرف ہو ہی چکا تھا۔

"نہیں ۔۔۔! کچھ نہیں ہوا اتنی دور سے ڈرائیونگ کر کے آیا ہوں اس لیے تھکا ہوا ہوں۔" دل آور نے اسے

ٹال دیا تھا۔

"ماننے والی بات تو نہیں ہے کہ تم ڈرائیونگ سے تھک گئے ہو ۔۔۔ لیکن پھر بھی کوئی بات نہیں مان ہی لیتا ہوں۔" نبیل بھی بڑی سعادت مندی سے اس کے ٹالنے سے ٹل گیا تھا۔

"ٹھیک ہے! میں اس وقت کال بند کرتا ہوں 'میرا خیال ہے کہ عبداللہ آ گیا ہے۔" دل آور نے کال بند کرنی چاہی تھی اور نبیل جیسے مچل گیا تھا۔

"اوکے ۔۔۔! پھر میں بھی آ رہا ہوں 'اللہ حافظ" اس نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا اور دل آور نے پلٹ کر گیٹ کی طرف دیکھا تھا جہاں سے عبداللہ کی گاڑی اندر داخل ہو رہی تھی۔

عبداللہ اور نگارش دونوں ہی آگے پیچھے گاڑی سے اتر آئے تھے لیکن عبداللہ نے اس کی طرف کوئی بھی دھیان دیے بغیر اندر کی طرف قدم بڑھا دیے تھے جس پہ دل آور کو پہلے تو حیرانی ہوئی تھی لیکن پھر وہ اگلے ہی پل اس کی اس اجنبیت اور لاتعلقی کی وجہ سمجھ گیا تھا 'یعنی وہ ابھی تک اس سے ناراض تھا اسی لیے اتنی سنجیدگی کے باوجود وہ اس کی ناراضی کا سوچ کر بے ساختہ مسکرا دیا تھا۔

"السلام علیکم دل آور بھائی! کیسے ہیں آپ؟" نگارش عبداللہ کو اندر جاتے دیکھ کر حیران ہوئی تھی لیکن وہ دل آور کو اگنور کر کے اس کے پیچھے اندر نہیں جا سکی تھی بلکہ لان میں کھڑے دل آور کے پاس آ کھڑی ہوئی تھی۔

"وعلیکم السلام بھابھی ۔۔۔! میں ٹھیک ہوں آپ سنائیں آپ کی طبیعت اب کیسی ہے؟" دل آور نے گیٹ بند کرتے چوکیدار کی سمت دیکھتے ہوئے بڑے نارمل سے انداز میں پوچھا تھا۔

"اللہ کا شکر ہے! میں اب ٹھیک ہوں لیکن آپ یہ بتائیں کہ کیا آپ لوگوں کے درمیان کوئی مسئلہ ہوا ہے کہ آپ لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا بھی نہیں؟" نگارش دل میں اٹھنے والا سوال زبان پہ لائے بغیر نہیں رہ سکی تھی اور دل آور اس کے سوال پہ ایک بار پھر مسکرا دیا تھا۔

"نہیں! میری طرف سے تو ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے ۔۔۔ بس وہ خود ہی کسی بات پہ ناراض ہے لیکن ڈونٹ وری جلد ہی مان بھی جائے گا۔" دل آور نے لاپروائی سے سر جھٹکا تھا اور نگارش دل آور کو نارمل دیکھ کر ذرا ریلیکس ہو گئی تھی۔

"اوکے ۔۔۔! وہ ناراض ہیں نا ۔۔۔ ہم تو نہیں؟ اس لیے پلیز اب اندر چلیے ۔۔۔ میں آپ کو چائے پلواتی ہوں۔" نگارش نے مسکراتے ہوئے کہا تھا اور دل آور نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اندر کی طرف قدم بڑھا دیے تھے اور نگارش بھی اس کے پیچھے ہی اندر چلی آئی تھی۔

"زری! دل آور بھائی بھی چائے پئیں گے۔" نگارش نے عبداللہ اور بتول شاہ کو چائے سرو کرتی زری کو متوجہ کیا تھا اور زری نے ان دونوں کی طرف سے فارغ ہو کر دل آور کے لیے بھی ایک کپ اٹھا لیا تھا۔

"نہیں! میں چائے نہیں پیوں گا۔" دل آور نے صوفے پہ بیٹھتے ہوئے انکار کر دیا تھا۔

"کیوں؟ چائے کیوں نہیں پئیں گے ۔۔۔؟" جہاں اس کے انکار پہ نگارش ٹھٹکی تھی وہیں زری کے قدم بھی رک گئے تھے کیونکہ وہ اسے چائے دینے کی غرض سے ٹیبل کی دوسری سائیڈ سے ہو کر اسی کی طرف آ رہی تھی لیکن اس کے انکار پہ اس کے قدم وہیں کے وہیں تھم گئے تھے۔

"جہاں گھر آئے مہمان کو سلام تک نہیں کیا جاتا میں وہاں چائے نہیں پی سکتا یہ میرا اصول ہے۔" اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا تھا اور اس کا یہ اشارہ کس کی طرف ہے؟ یہ بات عبداللہ بھی سمجھ چکا تھا اور نگارش بھی۔

"اچھا ۔۔۔! تو الٹا "نزی" بھی تم ہی دکھا رہے ہو؟" عبداللہ کو اس کی بات سن کر مزید تاؤ آیا تھا اور وہ چائے کا

سپ لیتے لیتے رک گیا تھا جس پہ دل آور اپنی مسکراہٹ دبا گیا تھا کیونکہ اسے پتا تھا کہ اگر عبداللہ نے اس کے چہرے پہ مسکراہٹ دیکھ لی تو وہ غصے سے اور زیادہ تپ اٹھے گا لیکن زری کی نظروں سے یہ مسکراہٹ مخفی نہیں رہ سکی تھی اس کی بے تاب نظریں دل آور شاہ کے چہرے کی ہی ہو کر رہ گئی تھیں۔

"مجھے کیا ضرورت ہے تڑی دکھانے کی؟ میں یہاں اماں کو چھوڑنے کے لیے آیا ہوں کوئی تڑی دکھانے نہیں آیا۔" دل آور نے لاپروائی کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا جس پہ عبداللہ دانت کچکچا کے رہ گیا تھا۔

"دل آور ے! مجھے غصہ مت دلا ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔" عبداللہ بمشکل اپنے غصے پہ قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا اور بتول شاہ اور نگارش ان کی اس خفگی اور ناراضی کا منظر دیکھ کر ہنس پڑی تھیں۔

"کیا اچھا نہیں ہوگا؟ کیا کر لو گے آخر۔" دل آور جان بوجھ کر اسے چھیڑ کر لطف اندوز ہو رہا تھا۔

"ورنہ یہی چائے تمہارے اوپر انڈیل دوں گا آرام سے خود ہی پی لو یہی بہتر ہے۔" عبداللہ نے دھمکی دی تھی۔

"یہ چائے تو میری ہے۔" زری اپنے دھیان میں چائے کا کپ پکڑے کھڑی تھی جو اچانک اندر آنے والے نبیل حیات نے اچک لیا تھا وہ بھی اس لیے کہ وہ عبداللہ اور دل آور کی بات سن چکا تھا بلکہ ان کے مسئلے کی نوعیت بھی سمجھ چکا تھا جبکہ زری ہکابکا سی دیکھتی رہ گئی تھی۔

"شاباش! بڑی اچھی انٹری ماری ہے تم نے یہ چائے اسے ملنی بھی نہیں چاہیے تھی کیونکہ یہ انکار کر چکا ہے۔" عبداللہ نے اسے داد دی۔

"یہ انکار کر چکا ہے نا...؟ لیکن ہم میں انکار کا حوصلہ نہیں ہے، جو بھی ملے صبر و شکر کر کے گزارا کر لیتے ہیں۔" نبیل اطمینان سے کہتا بتول شاہ کی سمت بڑھ گیا تھا البتہ چائے کا کپ اس کے ہاتھ میں ہی تھا جس پہ تقریباً" سبھی ہنس بھی رہے تھے۔

"بھابھی! مجھے تو آپ نے چائے پلوانے کا کہا تھا؟" دل آور نے نگارش کو یاد دلایا۔

"ارے ہاں ہاں! کیوں نہیں میں ابھی لے کر آتی ہوں۔" نگارش فوراً" اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اب وہ کپ لے کر آیئے گا جو میری قسمت میں ہو... یہ میری قسمت میں نہیں تھا۔"

دل آور نے جاتے جاتے تاکید کی تھی جسے سن کر نگارش، زری اور بتول شاہ تینوں ہی چونکی تھیں لیکن کسی نے بھی ایک دوسرے کو کچھ محسوس نہیں ہونے دیا تھا۔

اس کے بعد تینوں اپنی اپنی جگہ پہ خاموش ہو گئی تھیں اور دل آور سر جھٹک کر عبداللہ اور نبیل کے ساتھ باتوں میں شریک ہو چکا تھا حالانکہ وہ یہ بھی جان چکا تھا کہ زری کے چہرے کی ساری خوشی بجھ سی گئی ہے لیکن پھر بھی اس نے زیادہ دھیان نہیں دیا تھا آخر جو چیز اس کی قسمت میں ہی نہیں تھی اس پہ دھیان دینے کا فائدہ ہی کیا تھا بھلا...

اور ادھر وہ تھی جو اپنے خواب کے سچے ہونے پہ پچھتا رہی تھی کیونکہ ایسی حقیقت سے تو وہ خواب ہی بہتر تھا جس میں وہ دل آور شاہ کے اور دل آور شاہ اس کے سامنے، قریب اور اکیلا کھڑا تھا جس میں وہ ہاتھ بڑھا کے ایک دوسرے کو چھو بھی سکتے تھے اور جس میں ان کے درمیان کوئی تیسرا نہیں تھا اور نہ ہی کسی کا ڈر تھا اور شاید اسی لیے اس کا پچھتاوا بڑھتا ہی جا رہا تھا کیونکہ اسے کچھ دیر پہلے کا خواب شدت سے یاد آ رہا تھا...!

☼ ☼ ☼
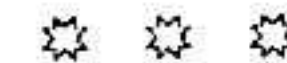
ان لوگوں نے انہیں رات کے کھانے کے بعد ہی واپس آنے دیا تھا۔

حالانکہ دل آور نے وہاں سے اٹھنے کی بارہا کوشش کی تھی لیکن عبداللہ اور نگارش ہر بار ہی آڑے آ گئے تھے،

صرف یہ کہہ کرکہ بتول آنٹی آج پہلی بار ان سے ملنے ان کے گھر آئی ہیں اور وہ وہاں سے ڈنر کیے بغیر چلی جائیں یہ بھی تو ممکن نہیں تھا نا۔۔۔؟

سو مجبوراً "ان لوگوں کے اتنے اصرار کے بعد انہیں ڈنر تک وہاں رکنا ہی پڑا تھا اور اب وہ تقریباً" دس بجے واپس آئے تھے اور دل آور کے ساتھ بتول شاہ کو دیکھ کر گلاب خان اور گل بہت خوش ہوئے تھے بلکہ زلفی بھی اس خوشی میں کسی سے پیچھے نہیں تھا۔

"جیتے رہو۔۔۔ خوش رہو۔۔۔ اللہ عمر دراز کرے۔" انہوں نے زلفی اور گلاب خان کے کندھوں پہ شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے دعا دی تھی اور گل سے باقاعدہ گلے ملی تھیں انہوں نے کبھی بھی ملازموں کے ساتھ مالکانہ انداز نہیں اپنائے تھے' وہ ہمیشہ ملازموں کے ساتھ بھی اپنائیت اور خلوص سے پیش آتی تھیں بلکہ یہ عادت تو ان دونوں ماں بیٹے کی مشترکہ تھی۔

"گل۔۔۔! اماں کا بیڈ روم صاف کیا تم نے؟" دل آور کا ارادہ اپنے بیڈ روم میں جانے کا تھا لیکن وہ جانے سے پہلے ان کے بیڈ روم کی طرف سے تسلی کرنا چاہ رہا تھا۔

"جی صاحب۔۔۔! صبح جب گلاب خان کو آپ کا میسج آیا تھا تو میں نے اسی وقت بیڈ روم صاف کر دیا تھا بیگم صاحبہ آرام سے جاکر سو سکتی ہیں۔" گل نے فوراً" اثبات میں جواب دیا تھا۔

"ٹھیک ہے اماں! آپ بھی جاکر آرام کریں اور میں بھی کچھ دیر ریسٹ کرتا ہوں پھر مجھے ایک کیس پہ کام بھی کرنا ہے' صبح ڈیٹ ہے۔" وہ اپنی مضبوط کلائی پہ بندھی گھڑی سے ٹائم دیکھتا ہوا بتول شاہ کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

"اوکے بیٹا۔۔۔! آرام کرو تم۔۔۔ میں بھی اپنے بیڈ روم میں جا رہی ہوں۔۔۔ گل تم میرے ساتھ آؤ بیگ سے میرے کپڑے نکال دو' میں نے عشاء کی نماز کے لیے وضو کرنا ہے۔" وہ دل آور کو گڈ نائٹ کہہ کر اس کے اطمینان کے لیے گل سے کہتی ہوئی اپنے بیڈ روم کی سمت بڑھ گئی تھیں اور دل آور ان کے بیڈ روم میں جانے کے بعد ایک گہری سانس کھینچتا ہوا اوپر اپنے بیڈ روم میں آگیا تھا اور بیڈ روم میں آکر اسے نجانے کیسی تھکن اور بوجھل پن محسوس ہوا تھا کہ وہ آتے ہی اپنے بیڈ پہ چاروں شانے چت ڈھیر ہو گیا تھا اور دونوں ہاتھ اپنے سر کے نیچے تکیے کی صورت رکھتے ہوئے بیڈ روم کی چھت پہ نظریں جما دی تھیں۔

وہ جب سے علیزے کے پاس سے اٹھ کے گیا تھا تب سے اپنے دل پہ ایک بوجھ لیے پھر رہا تھا اور بوجھ بھی ایسا تھا کہ جو اپنے دوستوں کے درمیان بیٹھ کر دن بھر گپ شپ کرنے کے بعد بھی دل سے ایک انچ بھی ادھر ادھر نہیں ہٹا تھا' جہاں پہ تھا' وہیں پہ دھرا ہوا تھا۔

اور جب انسان کا دل کسی بوجھ تلے دب جائے وہ انسان خود بھلا کب اٹھ سکتا ہے۔۔۔ اور اس وقت دل آور کے ساتھ بھی یہی صورت حال تھی' اس کے دل پہ بوجھ تھا تو خود بھی کچھ کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔

مگر مجبوری تھی' کام تو اس نے کرنا ہی تھا' اپنے دل کے مسئلے میں وہ کسی اور کے لیے مسئلہ کھڑا تو نہیں کر سکتا تھا نا۔۔۔؟ اس لیے مجبوراً" وہ اٹھا اس نے شاور لیا' کپڑے چینج کیے اور اپنے اسٹڈی روم میں آگیا تھا۔۔۔ حالانکہ اس کا ذہن یکسوئی سے عاری تھا مگر پھر بھی وہ سگریٹوں کے سہارے ضروری کیس کی فائل پہ کام کرتا رہا اور رات کے پونے تین بجے وہ سب کچھ مکمل کرکے اپنی چیئر سے اٹھ کھڑا ہوا اسے تھکن اور بوجھل پن سے یوں لگ رہا تھا جیسے پورا جسم اکڑ کے رہ گیا ہو اس لیے اب وہ آرام کرنا چاہتا تھا لیکن بیڈ روم میں آکر اپنی شرٹ کے بٹن کھولتے ہوئے نجانے کیوں اور کس سوچ کے تحت اس کے ہاتھ وہیں کے وہیں رک گئے تھے اور اس کا دھیان پھر سے وہاں جا پہنچا تھا جہاں سے اس کے دل پہ بوجھ رکھا گیا تھا اور وہ بے ساختہ دوبارہ اس بوجھ کو ساتھ لیے اپنے بیڈ روم سے نکل آیا اس کے قدم بیسمنٹ کی طرف اٹھ رہے تھے' اس کے قدم بوجھل تھے۔۔۔ یا اس کا دل بوجھل تھا۔۔۔؟

یہ فیصلہ بہت مشکل تھا لیکن جو بھی تھا ان کا بہاؤ بیسمنٹ کی طرف ہی تھا وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آگیا تھا۔

رات کے تین بجے دنیا موت کی سی گہری نیند سوئی ہوئی تھی ہر طرف سناٹا تھا گہرا اور گمبھیر سناٹا اور اتنا ہی گہرا اور گمبھیر اندھیرا بھی جن کو اپنے قدموں تلے روندتا ہوا وہ بیسمنٹ کے دروازے تک جا پہنچا تھا ادھ کھلے دروازے کو اپنے دائیں ہاتھ سے دھکیل کر وہ اندر آگیا تھا اور بیسمنٹ کی کشادہ سیڑھیاں بے آواز قدموں سے طے کرتا ہوا اس سائیڈ کی طرف آگیا تھا جس سائیڈ پہ علیزے آفندی فقیروں کی طرح ۔۔۔۔۔ بیٹھی تھی جس کو دیکھ کر دل آور کو ایک دھچکا سا لگا تھا کیونکہ اسے یقین تھا کہ وہ اس وقت سو رہی ہوگی' لیکن اپنے یقین کو بے یقین ہوتے دیکھ کر وہ اپنی جگہ پہ حق دق سا رہ گیا تھا۔ اس کے قدم جہاں تھے وہیں کے وہیں رکے رہ گئے تھے وہ علیزے سے چند قدموں کے فاصلے پہ کھڑا جیسے گم سم اور ساکت و صامت سا ہو چکا تھا اس کی امید اس کی توقع اور اس کی سوچ ٹھرا اٹھی تھیں۔

کیونکہ اسے تو اس بات کا رتی برابر بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس وقت اس پہر بھی جاگ رہی ہوگی۔ اسے تو اس بات کا یقین تھا کہ رات کے اس پہر دنیا کا ہر ذی نفس نیند کی آغوش میں تھا۔

چرند پرند سے لے کر اشرف المخلوقات تک پوری کائنات گہری نیند سو رہی تھی' پورا شہر سو رہا تھا' کیونکہ یہ وقت ہی سونے کا تھا' سب سو رہے تھے۔

لیکن صرف وہ دونوں تھے۔۔۔ جو ابھی تک اس وقت اس پہر بھی جاگ رہے تھے۔

آخر کیوں۔۔۔؟ کیا وجہ تھی آخر۔۔۔؟ صرف وہ دونوں ہی کیوں۔۔۔؟ ایسا کیا مشترکہ تھا ان میں جس نے ان دونوں کو جگا رکھا تھا۔۔۔؟ دل یا دل کا بوجھ۔۔۔؟

عجیب عجیب سوچیں تھیں اور عجیب عجیب خیالات تھے جو دل آور کے دل و دماغ میں اودھم مچا رہے تھے۔ اک کلبلاہٹ سی تھی جو ہر سوچ اور ہر خیال میں اتر کر دل آور کے دل و دماغ کو بھی عجیب سا بنا رہی تھی اور وہ بمشکل اپنے اعصاب کو کنٹرول کرتا ہوا سر جھٹک کر آگے بڑھ آیا تھا۔

"السلام علیکم۔۔۔!" اس نے قریب آکر کافی آہستہ آواز میں سلام کیا تھا۔

اور علیزے کو یوں لگا تھا کہ جیسے اسے کسی نے قبر میں دفن کر دیا ہو اور باہر سے پکارنے والوں کی آواز اسے بہت دور سے سنائی دے رہی ہو۔ جس کو سن کر اس نے بمشکل زانو پہ رکھا سر اٹھا کر اپنے سامنے کھڑے صیاد کو دیکھا تھا ایک ایسا صیاد جو اسے ہمیشہ کے لیے رکھنے کو بھی تیار نہیں تھا۔

حالانکہ وہ اس کی اس قید میں رہنے کے لیے بھی تیار تھی۔۔۔ وہ بھی محض ایک نام کے عوض۔۔۔ مگر وہ مانتا تب نا؟ جبھی اس نے تھک کر دوبارہ اپنا سر زانو پہ ٹکا دیا تھا کیونکہ اب تو اپنی گردن پہ اپنے ہی سر کا بوجھ نہیں اٹھایا جاتا تھا' دل چاہتا تھا کہ کوئی اسے بھی تن سے جدا کر دے۔۔۔ اور اس کی اٹکی ہوئی جان کو ایک ہی دفعہ ہر قید سے رہائی مل جائے اور وہ ہر دکھ اور ہر غم کے بوجھ سے آزاد ہو جائے۔

لیکن وہ کیا کرتی۔۔۔؟ ایسا بھی تو نہیں ہو رہا تھا۔۔۔ اسے تو جیسے موت بھی قبول کرنے کو تیار نہیں تھی اور اپنی ذات کی ایسی ناقدری پہ دو آنسو پھر دیوانہ وار لڑھکے تھے اور اس کی اپنی ہی گود میں گر کر فنا ہو گئے تھے اور وہ جو اس کے سامنے کھڑا تھا اس کی مسلسل خاموشی پہ آہستگی سے اپنی پینٹ کے پائنچے اوپر کھینچتے ہوئے پنجوں کے بل فرش پر عین اس کے سامنے بیٹھ گیا تھا۔

"علیزے۔۔۔!" دل آور نے آج شاید پہلی بار اس طرح نارمل طریقے سے اس کو اس کے نام سے پکارا تھا جس پہ دل آور کو خود بھی بہت عجیب سا محسوس ہوا تھا' لیکن یہ وقت یہ سچویشن ایسی تھی کہ اسے پکارے بغیر اور اسے مخاطب کیے بغیر کوئی چارا نہیں تھا۔

"مجھ سے بات نہیں کرو گی کیا۔۔۔؟" اس کا لہجہ دھیما اور آواز گمبھیر تھی اور ساتھ ساتھ دل کا بوجھل پن چہرے سے بھی جھلک رہا تھا اور انداز بھی کچھ ایسا ہی تھا بوجھل بوجھل۔۔۔ تھکا تھکا سا۔۔۔! علیزے کو بھی محسوس ہوا تھا شاید۔۔۔ اس نے ایک بار پھر سر اٹھا کر اپنے سامنے دیکھا تھا وہ اس کے قریب ہی دو قدم کے فاصلے پہ عین اس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا اور دیکھ بھی اسے ہی رہا تھا۔

"میرے پاس بات کرنے کے لیے کچھ باقی رہ گیا ہے کیا۔۔۔؟" علیزے کا لہجہ لہو رس رہا تھا اور لفظ زخمی ہو رہے تھے آنکھوں کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا رو رو کر انگارے بن گئی تھیں، جن کی جلن سے آنسو بہے جا رہے تھے۔

"تمہارے پاس بات کرنے کے لیے کچھ باقی نہیں رہا اور میرے پاس کچھ بھی کرنے کے لیے کچھ باقی نہیں رہا لیکن پھر بھی تم بتاؤ تم کیا چاہتی ہو؟" دل آور اسے بغور گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا اور اس کے پوچھنے پہ علیزے کے دل پہ ایک گھونسا سا پڑا تھا اس کی روح تک تڑپ گئی تھی۔

"میری بے بسی کا مذاق اڑا رہے ہو ڈرائیور۔۔۔؟" اس کے حلق میں جیسے آنسوؤں کا گولا سا اٹک گیا تھا۔

"کسی کی بے بسی کا مذاق اڑانے والا میں کون ہوتا ہوں بھلا؟ میں خود ایک بے بس انسان ہوں۔" اس نے کہتے ہوئے تلخی سے سر جھکا تھا۔

"دوسروں کو بے بس کرنے والا خود کیسے بے بس ہو سکتا ہے بھلا؟" علیزے ماننے کو تیار نہیں تھی اور دل آور کے چہرے پہ ایک انتہائی تلخ سی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

"ہونہہ! تم نہیں سمجھو گی ایسی وے آؤ میرے ساتھ تمہیں کچھ سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔" وہ اس کی نازک کانچ سی کلائی پکڑتا ہوا ایک دم اٹھ کھڑا ہوا تھا اور علیزے کو تو سنبھلنے کا بھی موقع نہیں ملا تھا وہ اس کے ساتھ کھنچتی چلی گئی تھی اور وہ اسے ساتھ لیے اس کی کلائی پکڑے سیڑھیاں چڑھ گیا تھا حالانکہ دل آور کے قدموں کی رفتار بہت دھیمی اور بہت متوازن تھی۔

لیکن پھر بھی اس کے ساتھ چلتے ہوئے علیزے کی سانس پھول گئی تھی۔ اس کے قدم بھی تھک گئے تھے اور وہ ہانپنے لگی تھی۔ جس پہ دل آور ٹھہر گیا تھا اور اس نے ملگجے سے اندھیرے میں اپنے ساتھ کھڑی علیزے کو دیکھنے کی کوشش کی تھی مگر اسے علیزے واضح نظر نہیں آ رہی تھی بلکہ اس کی ہانپتی ہوئی سانسوں کی آواز واضح سنائی دے رہی تھی۔ جس کو سننے کے بعد دل آور نے ڈرائنگ روم یا اپنے بیڈ روم کی طرف جانے کے بجائے کچن کی طرف قدم بڑھا دیے کچن کا دروازہ کھول کر کچن کی تمام لائٹس جلا دیں اور پھر پلٹ کر علیزے کو دیکھا تھا جو دروازے کے بیچوں بیچ کھڑی تھی وہ اسے سراپا دیکھ کے رہ گیا۔

کیونکہ اس وقت وہ علیزے۔۔۔ علیزے ہی نہیں لگ رہی تھی۔

کہاں وہ شہزادیوں کے سے رہن سہن والی علیزے۔۔۔ اور کہاں یہ فقیرانہ حلیے کی مالک لڑکی۔۔۔ جس کے تن پہ کپڑے بھی اس کے اپنے نہیں بلکہ دل آور شاہ کے گھر کی ملازمہ کے تھے، جن کو دیکھ کر دل آور کی نظریں جھک گئی تھیں کیونکہ اس کا یہ حال تو اس کے پاس آ کر ہی ہوا تھا نا اور اسے اس نوبت تک پہنچانے والا بھی وہی تھا۔

لہٰذا اسے دیکھ کر نظریں نہ جھکاتا تو اور کیا کرتا؟

"آؤ ادھر بیٹھو!" اس نے کچن میں لگی ٹیبل کے قریب آ کر اس کے لیے کرسی کھینچی تھی اور علیزے نے اپنے لیے کرسی کھینچنے والے اس شخص کو عجیب بے یقین سی نظروں سے دیکھا تھا جو ہمیشہ اس کے سامنے نفرت، حقارت غصے اور انتقام کا پیکر بنا آتا تھا، لیکن آج اس نے غور کیا تھا کہ وہ شخص بھی۔۔۔ وہ نہیں لگ رہا تھا شاید اسی لیے وہ خود میں ہمت پیدا کرتی آگے بڑھ آئی تھی اور دل آور کی پیش کی ہوئی کرسی پہ بیٹھ گئی تھی۔

"کھانا کھایا تم نے؟" وہ کرسٹل ٹیبل کی دوسری طرف رکھی کرسی کے پیچھے کھڑا اپنے سامنے کرسی پہ بیٹھی علیزے سے پوچھ رہا تھا۔

"نہیں!" اس نے جھکے ہوئے سر کو نفی میں ہلایا تھا۔

"او کے! میں تمہارے لیے کھانا گرم کرتا ہوں وہی کھانا جو اس روز وہیں رہ گیا تھا۔" وہ کرسی کی بیک سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے خود بھی پیچھے ہٹ گیا تھا۔

"نہیں! مجھے بھوک نہیں ہے۔" علیزے نے فوراً انکار کر دیا تھا مگر دل آور نے اس کے کسی بھی انکار پہ کوئی توجہ نہیں دی تھی اور فریج سے کھانا نکال کر اس کے لیے گرم کرنے لگا اور اس دوران ان دونوں کے درمیان مکمل خاموشی چھائی رہی تھی۔

لیکن پانچ منٹ بعد وہ سب کچھ گرم کر کے اس کے سامنے رکھ چکا تھا اور اس کے مقابل والی کرسی کھینچ کے خود بھی اس کے سامنے بیٹھ گیا تھا۔

"کھانا کھاؤ" اس نے کافی تحمل سے اسے کھانا کھانے پہ آمادہ کیا تھا۔

"مجھے نہیں کھانا مجھے بھوک نہیں ہے۔" اس نے پھر انکار کر دیا تھا لیکن اکثر وہ انکار نہیں سنتا تھا۔

"کیا مجھے خود کھلانا پڑے گا؟" اسے پتا تھا کہ اس کا یہ حربہ کار آمد ثابت ہو گا اور واقعی ایسا ہی ہوا تھا' علیزے کے ہاتھ خود بخود کھانے کی طرف بڑھ گئے تھے اور اس نے بمشکل لرزتے کانپتے ہاتھوں سے نوالہ بنا کر منہ میں رکھا تھا اور دل آور کی نظریں آج بار بار اسی کی طرف اٹھ رہی تھیں اس کے حال پہ اور اس کے حلیے پہ۔۔۔!

جن کو آج غور سے اور گہرائی سے دیکھا تھا تو "اندر" کچھ ہوا تھا۔۔۔ کچھ ایسا جو بے چین کر دینے کے لیے کافی تھا' جو دل آور شاہ کے دل میں پن کی طرح چبھنے لگا تھا اور یہ چبھن اسے بار بار علیزے کی طرف متوجہ کر رہی تھی جس کی کمزور اور نقاہت زدہ حالت دیکھ کر لگ رہا تھا کہ جیسے وہ صدیوں کی بیمار ہو اس کے گولڈن براؤن بالوں کی الجھی ہوئی لٹیں اس کی پونی سے نکل کر اس کے چہرے کو چھو رہی تھیں اور اس کے چہرے کی گلابیاں بکھیرتی ہوئی رنگت بالکل زرد پڑ چکی تھی رنگین شیشے کی طرح چمکتے ہوئے شفاف ہونٹ بے رنگ ہو چکے تھے اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے بن گئے تھے جن کی وجہ سے پورا چہرہ ہی بے رونق ہو چکا تھا' کھانا کھاتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور اس سے ٹھیک طرح سے روٹی کا نوالہ بھی نہیں نگلا جا رہا تھا مگر پھر بھی وہ کھانے پر مجبور تھی۔۔۔ اور وہ اسے مجبور کرنے پہ مجبور تھا کیونکہ وہ اسے کچھ کہنے سے پہلے ریلیکس کرنا چاہتا تھا۔

"چائے بناؤں تمہارے لیے؟" وہ اس پہ نظریں جمائے ہوئے پوچھ رہا تھا اور علیزے چونک گئی تھی۔

"بہت ٹھنڈ ہو رہی ہے اس وقت' چائے پیو گی تو ریلیکس ہو جاؤ گی' میں بناتا ہوں' اپنے لیے بھی اور تمہارے لیے بھی۔" وہ کہہ کر کرسی دھکیل کے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور علیزے اس کی پشت کو دیکھتی رہ گئی۔ وہ بڑے اطمینان سے چائے بنانے میں مصروف ہو چکا تھا علیزے نے آہستگی سے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیے وہ صرف اس کے ڈر کی وجہ سے کھا رہی تھی ورنہ کھانے کو دل کب چاہ رہا تھا بھلا۔۔۔؟

"چائے کے ساتھ کچھ لو گی۔۔۔؟" وہ اپنے کام میں مصروف اس کی سمت دیکھے بغیر پوچھ رہا تھا۔

"نہیں۔۔۔" اس کا جواب توقع کے عین مطابق تھا۔

"کھانا تو تم نے برائے نام ہی کھایا اور چائے بھی خالی ہی پیو گی تو پھر بھوک کیسے مٹے گی؟" وہ جیسے بڑے تحمل اور بڑی اپنائیت سے استفسار کر رہا تھا۔

مگر علیزے نے اسے کوئی بھی جواب نہیں دیا تھا کیونکہ اتنا تو وہ جان ہی گئی تھی کہ وہ اس کے انکار کے باوجود بھی اپنی مرضی ہی کرے گا اس لیے انکار کرنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا بہتر تھا کہ وہ چپ ہی رہتی۔

"او کے ۔۔۔! کچھ بھی نہ کھاؤ مگر چائے تو پی لو بہت اچھی بنی ہے۔ یقیناً" تمہیں بھی اچھی لگے گی ٹرائی کرو۔" دل آور نے لاپروا سے انداز میں کہتے ہوئے چائے کا کپ اس کے سامنے رکھ دیا تھا اور اپنا کپ یونہی ہاتھ میں پکڑے دوبارہ اس کے مقابل والی کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا تھا۔

اور اطمینان سے چائے کے سپ لیتے ہوئے علیزے کی سمت دیکھنے لگا تھا۔

"تم نے بتایا نہیں کہ تم کیا چاہتی ہو؟" اس نے دوبارہ وہی استفسار کیا تھا اور علیزے اس کے استفسار پہ لب بھینچ گئی تھی۔

"کیا اپنے گھر جانا چاہتی ہو؟" وہ چائے کا سپ لے کر کپ ٹیبل پہ رکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا اور وہ اس کے اس نئے سوال پہ یکدم چونک گئی تھی۔

"گھر؟" اس کے لب کپکپائے تھے اور اس نے بغور دل آور کے چہرے کو دیکھا جس پہ واقعی سنجیدگی نظر آرہی تھی۔

"ہاں گھر۔۔۔ تمہارا گھر بڑی حویلی۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا اور علیزے کا دل جیسے کسی نے اپنے پیروں تلے دبا کر کچل دیا تھا۔

"نہیں! میں نہیں جانا چاہتی میں کہیں بھی نہیں جانا چاہتی۔" وہ النفی میں سر ہلانے لگی تھی۔

"کیوں؟ کیوں نہیں جانا چاہتیں آخر ایک نہ ایک دن تو تم نے واپس جانا ہی ہے تو اب کیوں نہیں!" دل آور بغور اس کے چہرے کے تاثرات نوٹ کر رہا تھا۔

"نہیں ڈرائیور۔۔۔! میں کہیں نہیں جاؤں گی۔۔۔ کبھی نہیں جاؤں گی جب تک تم مجھ سے شادی نہیں کرو گے میں اس گھر سے نکلنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔۔۔ بے شک تم مجھے دھکے دے کر نکال دو میں کسی گاڑی کے نیچے آکر مر جاؤں گی مگر واپس بڑی حویلی نہیں جاؤں گی کیونکہ اس طرح اپنا آپ لے کر واپس جانے سے بہتر ہے کہ میں واقعی مر جاؤں۔" علیزے کا کہتے ہوئے لہجہ بھرا گیا تھا اور آنکھوں سے پھر آنسو رواں ہو گئے تھے۔

"ایسا نہیں ہو سکتا علیزے۔۔۔! یہ سب ممکن نہیں ہے میں تم سے شادی نہیں کر سکتا۔ لیکن تمہیں تمہارے گھر چھوڑ کے آسکتا ہوں اور یہ کام میں بہت جلد کر دوں گا شاید ایک یا دو روز میں یا پھر کچھ روز میں۔۔۔ لیکن فی الحال یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

اس نے آج علیزے کے سامنے بھی انکار کر ہی دیا تھا اور علیزے اس کا جواب سن کر گنگ سی رہ گئی۔ وہ اسے ایک یا دو روز میں واپس گھر چھوڑنے کی بات کر رہا تھا لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا بھلا۔۔۔؟ وہ اپنے گھر والوں کا سامنا کیسے کر سکتی تھی؟ مان، اعتبار، یقین سب کچھ تو وہ توڑ آئی تھی اب انہیں جوڑنے کے لیے کیا رہ گیا تھا اس کے پاس؟ سب کچھ تو وہ خود روند آئی تھی باقی کیا رہ گیا تھا بھلا؟

"ڈرائیور۔۔۔! ایک اور سزا مت دو مجھے۔۔۔ میں، میں نہیں سہہ پاؤں گی، مجھ میں اب اور ہمت نہیں ہے پلیز ڈرائیور! ایسا مت کرو مجھے کہیں نہیں جانا مجھے، مجھے یہیں رہنے دو بس مجھ سے نکاح کر لو۔" علیزے ہمیشہ کی طرح کہتے کہتے یکدم بلک بلک کر رو پڑی تھی اور دل آور اس کی کیفیت پہ ایک بار پھر چپ ہو گیا تھا۔ لیکن پھر اسے سمجھانے کے لیے اپنی چپ کو توڑنا پڑا تھا۔

"دیکھو علیزے۔۔۔! تمہارے اور میرے راستے الگ ہیں تم میری منزل نہیں ہو بلکہ تم میری منزل کے راستے میں بھی نہیں ہو۔۔۔ میری زندگی میں بھی کہیں نہیں ہو میں تمہیں کیسے اپنا سکتا ہوں؟"

"صرف نکاح کر لینے سے کیا ہوتا ہے۔۔۔؟ ہوتا تو تبھی ہے جب دل و دماغ کسی کے ساتھ آمادہ ہوں لیکن جب دل و دماغ ہی آمادہ نہیں ہیں تو نکاح کا تصور کرنا بھی فضول ہے اس لیے تم یہ بات ذہن سے نکال دو اور صرف یہ سوچو کہ تم نے اپنے گھر جانا ہے تمہاری زندگی وہاں ہے تمہاری خوشیاں وہاں ہیں تمہارے اپنے وہاں ہیں یہ تو تم ایک مجبوری کا سودا کر رہی ہو۔۔۔ اور مجبوری کے سودے انسان کو تھکا دیتے ہیں اور کبھی کوئی فائدہ نہیں دیتے الٹا ہمارا نقصان ہی ہوتا ہے۔

اس لیے بہتر ہے کہ ہم دونوں اس سودے سے بچ جائیں اور کوئی بیچ کا راستہ نکال لیں جو نہ تمہارے لیے مشکل ہو اور نہ میرے لیے جس پہ چلتے ہوئے ہمارے دل پہ اور پاؤں پہ آبلے نہ پڑیں۔" دل آور نے اسے سمجھانے کی پوری پوری کوشش کی تھی لیکن وہ کیا سمجھی تھی اور کیا نہیں؟ یہ وہ نہیں جانتا تھا، البتہ وہ اسے اپنی طرف سے پوری طرح سے سمجھا چکا تھا وہ بس یہی جانتا تھا۔

"لیکن ڈرائیور۔۔۔!" اس نے بے ساختہ کچھ کہنا چاہا تھا مگر دل آور نے اسے ٹوک دیا تھا۔

"بس علیزے! میں نے جو کہنا تھا کہہ دیا، جو سمجھانا تھا سمجھا دیا اب یہ تمہارے سوچنے اور سمجھنے پہ ڈپینڈ کرتا ہے کہ تم نے کیا کرنا ہے؟ کس فیصلے پہ آمادہ ہونا ہے؟ اور کیا صحیح ہے اور کیا غلط! یہ بھی تم اچھی طرح سوچ سکتی ہو دو دن ہیں تمہارے پاس۔۔۔ دراصل وقار آفندی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی وہ ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہے لیکن امید ہے کہ دو روز تک ہاسپٹل سے ڈسچارج کر دیا جائے گا اور جیسے ہی اسے ہاسپٹل سے ڈسچارج کیا جائے گا میں فوراً ہی تمہیں واپس حویلی چھوڑ آؤں گا اس لیے تم اپنے آپ کو ذہنی طور پہ تیار رکھو کہ تم نے دو روز بعد اپنے گھر جانا ہے، ہر صورت میں اور ہر حال میں!"

وہ اسے اپنے ارادے اور اپنے فیصلے سے آگاہ کرتے ہوئے کرسی دھکیل کر اٹھ کھڑا ہوا تھا اور علیزے وہیں کی وہیں بیٹھی رہ گئی تھی اب تو اس کے پاس کہنے کے لیے الفاظ بھی باقی نہیں رہے تھے۔ کتنی بار منتیں کرتی اور کتنی بار پاؤں پکڑتی؟ آخر ہونا تو وہی تھا جو قسمت میں لکھا جا چکا تھا اور وہ ناچیز قسمت کے اس لکھے کو کیسے مٹا سکتی تھی؟ جب تک کہ وہ اوپر والا نہ چاہتا!

"میں اپنے بیڈ روم میں جا رہا ہوں۔۔۔ اس لیے اب تم بھی جا کر آرام کرو۔۔۔ فجر ہونے والی ہے۔" وہ کہہ کر وہاں سے چلا گیا تھا اور علیزے کے پاس سناٹے چھوڑ گیا تھا اسے اپنے آس پاس ویرانی ہی ویرانی نظر آرہی تھی اور ان ویرانیوں میں وہ اکیلی اور تنہا بیٹھی رہ گئی تھی!

لیکن آخر کب تک؟

کب تک وہ یونہی بیٹھی رہتی؟ بالا آخر اسے وہاں سے اٹھنا ہی تھا اور وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی مگر اب یہ تھا کہ اس سے قدم بھی نہیں اٹھایا جا رہا تھا وہ مرے مرے قدم اٹھاتی پاؤں گھسیٹ کے چلتی ہوئی بمشکل اپنے آپ کو حواسوں میں رکھ کر وہاں سے نکل آئی تھی اس کے بے جان قدم بیسمنٹ کی طرف اٹھ رہے تھے جب کسی آواز پہ ٹھٹک کر اسے ٹھہرنا پڑا تھا۔

"سنو لڑکی۔۔۔!" یہ آواز دل آور شاہ کی نہیں تھی، لیکن دل آور شاہ کی آواز جیسی بارعب ضرور تھی۔ وہی دبدبہ، وہی طنطنہ، علیزے بغیر پلٹے ہی سمجھ گئی تھی کہ وہ کون ہیں۔

"میرا شاہ تمہارے باپ جیسا نہیں ہے وہ تم سے نکاح کرے گا اور ضرور کرے گا یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔" بتول شاہ متوازن قدم اٹھاتی ۔۔۔ سائیڈ سے ہو کر اس کے سامنے آگئی تھیں۔

"یہ، یہ۔۔۔ کک۔۔۔ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ یہ، یہ، کیسے ہو سکتا ہے؟" علیزے کی بے یقینی سے آنکھیں پھٹ گئی تھیں اور اس کی زبان بھی لڑکھڑا گئی تھی اسے اپنے کانوں پہ یقین نہیں آرہا تھا کہ اس نے یہ سب صحیح سنا ہے دل آور شاہ کی ماں خود نکاح کے لیے وعدہ کر رہی تھیں اور اسے یقین دلا رہی تھیں کہ وہ یہ نکاح ضرور کرے گا تو علیزے نے تو حیران ہونا ہی تھا۔

"یہ ہو سکتا ہے ضرور ہو سکتا ہے کیونکہ یہ ایک آزمائش ہے اور میرا بیٹا اس آزمائش پہ ضرور پورا اترے گا' آخر وہ کسی وقار آفندی کا نہیں بلکہ بتول شاہ کا بیٹا ہے بابر شاہ کا سپوت ہے وہ اتنا کم ظرف نہیں ہے کہ کسی عورت کے سر پہ چادر بھی نہ دے سکے تم بے فکر رہو جب تک بتول شاہ زندہ ہے تمہاری عزت پہ آنچ نہیں آنے دے گی تم لاکھ وقار آفندی کی بیٹی سہی لیکن وہ بھی آخر میرا بیٹا ہے یہ پیالہ بھی پی جائے گا صرف میری خاطر۔"

بتول شاہ نے انتہائی سخت اور پتھریلے لہجے میں کہتے ہوئے علیزے کو ایک زہر آلود نظر سے سر تا پا دیکھا تھا اور پلٹ کر قدم دوبارہ اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھا دیے تھے۔

"آنٹی....!" علیزے کے منہ سے بے ساختہ یہ پکار نکلی تھی اور بتول شاہ اپنی پوری ہستی سے ہل کے رہ گئی تھیں ان کے قدم لڑکھڑا گئے تھے لیکن صورت حال ایسی تھی کہ ٹھہرنا بھی محال تھا اور وہاں سے چلے جانا بھی مشکل تھا اور وہ ہمیشہ سے مشکل کام ہی کرتی آئی تھیں اس لیے یہ بھی کر گزری تھیں اور علیزے ان کی پشت دیکھتی رہ گئی وہ پلٹ کر اسے دیکھے بغیر اور اسے جواب دیے بغیر اپنے بیڈ روم میں چلی گئی تھیں البتہ علیزے کے پاس ایک تسلی ایک آس اور ایک یقین ضرور چھوڑ گئی تھیں....!

☼ ☼ ☼

وہ صبح کورٹ جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا جب اس کے موبائل پہ نبیل کی کال آئی تھی اور وہ اپنی ٹائی کی ناٹ لگاتے لگاتے رک گیا تھا۔

"السلام علیکم....!" اس نے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل سے موبائل اٹھا کر کان سے لگا لیا تھا۔

"وعلیکم السلام....! کیسے ہو!" نبیل کافی فریش موڈ میں لگ رہا تھا۔

"ٹھیک ہوں! تم سناؤ صبح صبح کیسے یاد کر لیا!" دل آور یونہی موبائل ساتھ لیے دوبارہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

"یار....! ہم تو ہر وقت تمہیں یاد کرتے ہیں تم صبح صبح کی بات کر رہے ہو؟" نبیل نے خفگی سے سر جھٹکا تھا۔

"جانتا ہوں! اچھی طرح جانتا ہوں لیکن پھر بھی صاف صاف بتاؤ کہ کس لیے فون کیا ہے میں آفس سے لیٹ ہو رہا ہوں' مجھے کورٹ بھی پہنچنا ہے۔" دل آور نے اک نظر گھڑی کی سمت دیکھتے ہوئے اسے اصل مقصد بتانے پہ اکسایا تھا۔

"ارے یار! تم نے تو ہر وقت ہی کہیں نہ کہیں پہنچنا ضروری ہوتا ہے' بس ہم ہی پاگل ہیں کہ جو تمہیں بار بار فون کر کے ڈسٹرب کرتے رہتے ہیں۔" نبیل خفگی سے جھنجلا گیا تھا۔

"نبیل! بکواس مت کرو تمہیں خود پتا ہے کہ مجھے اس وقت کورٹ پہنچنا ہوتا ہے۔" دل آور نے اسے جھڑک دیا تھا۔

"تو میں تمہیں کب منع کر رہا ہوں کورٹ پہنچنے سے؟ اوکے تم جاؤ کورٹ پہنچو لیٹ ہو رہے ہو تم۔" نبیل نے فون بند کر دیا تھا اور اب کی بار دل آور کو تاؤ آیا تھا اس نے اسے خود کال بیک کی تھی۔

"ہیلو....!" نبیل نے چار پانچ مرتبہ رنگ بجنے کے بعد کال ریسیو کی تھی۔

"نبیل! پلیز یار کیوں ٹینشن دے رہے ہو! بتاؤ کیا بات ہے؟" دل آور نے نجانے کیوں اپنے غصے کو نرمی میں بدل دیا تھا اور نبیل اس کے انداز پہ مسکرا دیا تھا اور اسے مزید زچ کرنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔

"ارے یار! آج بتول آنٹی کی آمد کی خوشی میں مما نے تمہاری فیملی کو اور عبداللہ کی فیملی کو ڈنر پہ انوائیٹ کیا ہے تم لوگ آج ڈنر پہ ہماری طرف انوائیٹڈ ہو بس یہی بتانے کے لیے فون کیا ہے اب تم آنٹی کو بھی بتا دینا۔" نبیل نے

بالآخر اسے بتا ہی دیا تھا۔

"نہیں یار! آج نہیں' میں ذرا مینٹلی اپ سیٹ ہوں میں تمہاری اس دعوت کو انجوائے نہیں کر پاؤں گا اس لیے تم یہ دعوت کل پہ اٹھا رکھو پلیز یار میری بات کو مائینڈ مت کرنا۔"

دل آور نے اسے ذرا سمجھانے کی کوشش کی تھی مگر نبیل بھی مجبور تھا۔

"کل؟ نہیں یار کل تو بہت مشکل ہے کیونکہ کل میں نے اور عبداللہ نے کراچی بھی جانا ہے ہم نے تو سیٹس بھی ریزرو کروالی ہیں اسی لیے سوچا تھا کہ جانے سے پہلے یہ دعوت بھی ہو ہی جائے تو اچھا ہے پھر ہماری واپسی میں بھی دو تین دن لگ جائیں گے اور ہو سکتا ہے کہ آنٹی بھی واپس اسلام آباد چلی جائیں۔ اس لیے یہ دعوت آج رات کے لیے ہی بہتر ہے تم اپنے آپ کو فریش کرنے کی کوشش کرو ویسے بھی میں نے آج تم سے کچھ شیئر کرنا ہے رات کو ڈنر کے بعد فرصت سے بیٹھیں گے دنیا داری تو ہوتی ہی رہے گی کچھ دل داری بھی کر لیں آخر! کیا خیال ہے۔"

نبیل نے آخر میں شرارت سے پوچھا تھا اور دل آور لمحے کے ہزارویں حصے میں ہی اس کی بات کا اور دل داری کا مفہوم سمجھ گیا تھا اور اس نے اپنے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے چھوڑ دیے تھے۔

"چلو ٹھیک ہے پھر.... یہ دعوت اور یہ دل داری آج ہی سہی۔" دل آور نے گہری سانس خارج کرتے ہوئے ہامی بھر لی تھی لیکن نبیل حیات اس کی بات کا مفہوم نہیں سمجھ سکا تھا اور خوشی خوشی فون بند کر دیا تھا۔

لیکن دل آور شاہ' اس کی اس دعوت اور دل داری پہ گم سم سا ہو کے رہ گیا تھا۔ ہاتھوں میں اتنی سکت نہیں رہی تھی کہ وہ دوبارہ ٹائی کی ناٹ لگاتا یا پھر موبائل آف کر کے واپس ٹیبل پہ رکھتا بلکہ وہ تو جہاں تھا وہیں کا وہیں پتھر ہو گیا تھا۔ دل کسی اتھاہ گہرائی میں ڈوبا تھا اور اس کی دھڑکنیں دیکھتے ہی دیکھتے مدھم سے مدھم تر ہوتی چلی گئی تھیں اور سماعتوں میں "دعوت اور دل داری" جیسے الفاظ گونجتے رہ گئے تھے اور اب واقعی لگ رہا تھا کہ دل اور دنیا پہ نزع کا عالم وارد ہو چکا تھا' اب بس چار سو قیامت کے آثار تھے.... اور اس قیامت سے فرار کا راستہ کہیں بھی نہیں تھا۔

اسی لیے اسے اس قیامت کے سامنے ڈٹ جانے کے لیے دل آور شاہ بننا ہی پڑا تھا جو کسی بھی قیامت یا کسی بھی طوفان کے سامنے ڈھے نہیں سکتا تھا بلکہ ساری قیامتیں خود پہ سہہ لینے کی پوری طاقت اور حوصلہ رکھتا تھا اور اسی حوصلے کا ثبوت دیتے ہوئے وہ ایک بار پھر اٹھ کھڑا ہوا تھا اور سیدھا کورٹ جا پہنچا تھا جہاں اس کے ایک کیس کی ڈیٹ تھی اور اسے یہ کیس جیتنا ہی تھا کیونکہ ہارنا اس کا شیوہ نہیں تھا۔

اس کی نیت اور ایمان سچے تھے اور یہ اس کا اللہ جانتا تھا اس لیے وہ کبھی ہار بھی نہیں سکتا تھا!

☼ ☼ ☼

"ہیلو میم! کیسی ہیں آپ....؟"

وہ اکیڈمی سے نکل کر بس اسٹاپ کی طرف جا رہی تھی جب اچانک اس آواز پہ اس کے قدم ٹھٹک کر رک گئے تھے لیکن اس نے پلٹ کر دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"اف.... ! یہاں تو پلٹ کر دیکھنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کرتے یہ جان سے پیارے لوگ۔" جودت بڑی ترنگ سے کہتا اپنی بائیک اس کی سائیڈ پہ اس کے برابر لے آیا تھا اور مریم اسے دیکھ کر تب بھینچ گئی تھی۔

"بس! تھوڑا بزی ہو گیا تھا ڈیڈ بیمار تھے ہاسپٹل کے چکر کاٹنا پڑ رہے تھے اور کچھ اپنی یونیورسٹی کے "وخت" بھی تھے اس لیے اتنے دن درشن کے لیے حاضری نہیں دے سکا لیکن اب آپ بے فکر رہیں یہ حاضری روز دیتا رہوں گا صبح' دوپہر' شام۔" وہ بڑی ادا سے کہتا شرارت سے سینے پہ ہاتھ رکھ کے اس کی سمت جھکا تھا جبکہ مریم اس کی

حرکت پہ بے ساختہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی تھی اور وہ پھر بائیک اس کے قریب لے آیا تھا۔

"آپ کیا سمجھی تھیں کہ جودت آفندی جان چھوڑ گیا؟" وہ آنکھوں پہ بلیک گلاسز چڑھائے متبسم سے لہجے میں کہتا اسے سرتاپا گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا اور مریم کو اس کی نظریں اپنے جسم پہ انگاروں کی طرح محسوس ہو رہی تھیں اور ان انگاروں کی جلن کو ضبط کرنا اس کے لیے محال ہو رہا تھا وہ بڑے ضبط سے اس سے مخاطب ہوئی تھی۔

"پلیز راستہ چھوڑیں۔۔۔!" مریم نے پھر بھی ذرا تحمل سے کام لیا تھا۔

"تم اپنے تک آنے کا راستہ دے دو میں یہ راستہ چھوڑ دوں گا۔" اس نے لاپروائی سے کندھے اچکائے تھے اور مریم کا پارہ ہائی ہو گیا تھا وہ بیچ راستے میں اس کی ایسی بے ہودہ باتیں اور حرکتیں ہرگز برداشت نہیں کر سکتی تھی اس کے آس پاس اکیڈمی کی اسٹوڈنٹس بھی گزر رہی تھیں تھوڑی دیر پہلے ہی ـــ چھٹی ہوئی تھی۔ اس لیے ابھی اسٹوڈنٹس کا رش چھٹ رہا تھا۔

"شٹ اپ جودت آفندی! میرا راستہ چھوڑو۔۔۔ تمہارا مقصد کیا ہے؟ تم آخر چاہتے کیا ہو؟" مریم دبے لہجے میں چیخی تھی اور جودت اس کی برہمی پہ لطف اندوز ہوتے ہوئے بے ساختہ مسکرا دیا تھا۔

زندہ رہنے کے لیے تیری قسم
اک ملاقات ضروری ہے صنم
اک ملاقات ضروری ہے صنم

اس نے جواباً" گانا گنگناتے ہوئے خاصے لوفرانہ انداز میں اسے آنکھ ماری تھی اور مریم سر سے لے کر پاؤں تک جل اٹھی تھی اس کا دل چاہ رہا تھا کہ جودت آفندی کے منہ پہ اک زوردار طمانچہ دے مارے مگر پھر بھی اپنے آس پاس کا خیال رکھتے ہوئے اس نے اپنے ہاتھ کو بھی اپنے کنٹرول میں ہی رکھا تھا۔

"کہو؟ کیا ارادہ ہے؟ کرو گی ایک ملاقات؟ صرف ایک، وہ بھی جیسی تم چاہو۔" جودت نے خباثت کی حد کر دی تھی اور مریم کی برداشت کی بھی حد ہو گئی تھی اب کی بار وہ اپنے ہاتھ کو کنٹرول میں نہیں کر سکی تھی مگر اس کا ہاتھ اپنے چہرے پہ پڑنے سے پہلے ہی جودت نے اپنی گرفت میں سنبھال لیا تھا جس کو چھڑانے کے لیے مریم نے اپنی طرف سے ایک بھرپور سعی کی تھی مگر جودت نے اس کا ہاتھ چھوڑنے کے بجائے اپنے ہونٹوں سے لگا لیا تھا اور مریم یکدم جیسے پتھر کا بت بن گئی تھی وہ ششدر سی اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔

"یہ بوسہ تمہاری جرات کا خراج ہے اور مجھے امید ہے کہ تم آئندہ کسی بھی جرات سے پہلے اس خراج کو ضرور یاد رکھو گی۔" وہ اسے ایک بار پھر خباثت سے آنکھ دباتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

لیکن پیچھے سے ول آور شاہ کی گاڑی نے اسے بائیک سمیت ٹھوکر مار کر کئی فٹ دور اچھالتے ہوئے اس کی ساری خباثت اور سارا نشہ ہرن کر دیا تھا جس پہ مریم بدک کر پیچھے ہٹ گئی تھی جبکہ ول آور شاہ اپنی گاڑی سے غضب ناکی کی علامت بنا نیچے اتر آیا تھا کیونکہ وہ جودت آفندی کی حرکت دیکھ چکا تھا اور اس کا میٹر گھوما ہوا تھا اس وقت۔

اور مریم کو اس افتاد پہ اپنی آنکھوں کے سامنے زمین و آسمان چکراتے ہوئے نظر آئے تھے۔۔۔!

☆ ☆ ☆

(باقی آئندہ)

نبیلہ عزیز

دردِ دل

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نبیل حیات دو ہی بہن بھائی ہیں' مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے' وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پہ رنگ چکی ہے' جس کے پیش نظر فائزہ بیگم' نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں' لیکن مدحیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے' جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے' مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے' مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا' بے بسی اور مجبوری سے تنگ آ کر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے' لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باؤ امتیاز مل جاتا ہے' جو اسے کام کی آفر کرتا ہے' جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے' اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے' وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے' وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

داراب آزر شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے' وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے' اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا' اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دلاتی ہیں۔

تیسویں قسط

کیونکہ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے اتنا بڑا ہنگامہ مچ گیا تھا۔

وہ آدمی کون تھا اور کون نہیں؟ مریم یہ نہیں جانتی تھی مگر وہ جو بھی تھا اس وقت اس کے عزائم بہت خطرناک لگ رہے تھے وہ خاصے جارحانہ تیوروں سے جودت کی طرف بڑھا تھا اور اس نے نیچے زمین پہ گرے ہوئے جودت کو اس کی شرٹ کے کالر سے دبوچ کر اک جھٹکے سے اپنے سامنے کھڑا کر دیا تھا۔

"جودت آفندی! تم نے آج ثابت کر دیا ہے کہ تم واقعی ایک ذلیل اور گندے گھرانے کی اولاد ہو۔ مگر اتنا یاد رکھنا کہ تمہاری یہ گندگی اگر کسی اور کے گھر تک پہنچی تو تمہارے اس جوانی کے نشے میں ڈوبے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کتوں کو ڈال دوں گا۔ اور تمہارے گھر والوں کو تمہارا نام و نشان بھی نہیں ملے گا۔" اس نے جودت کو اس کی شرٹ کے گریبان سے پکڑ کر ذرا سا جھنجوڑتے ہوئے انتہائی غضب ناک لہجے میں اسے وارننگ دی تھی اور جودت اپنے اعصاب ٹھکانے پہ آتے ہی اس کی دھمکی پہ نہیں بلکہ اس کی شکل و صورت دیکھ کر دم بخود سا رہ گیا تھا۔ اسے اپنی چوٹ اور افتاد بھول گئی تھی۔ وہ بس آنکھیں پھیلائے بے یقین سے انداز میں اس کے چہرے کی سمت دیکھ رہا تھا۔

"منصور حسین! تت... تم؟" جودت کی زبان لڑکھڑا گئی تھی اسے اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کی آنکھوں کے سامنے ان کی حویلی کو برباد کرنے والا علیزے کا ڈرائیور منصور حسین کھڑا ہے۔

"ہاں! میں اور تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو لیکن اگر نہیں بھی جانتے تو کوئی بات نہیں تمہارے ڈیڈ تو جانتے ہی ہیں۔ اس لیے بہت جلد تم لوگ بھی جان جاؤ گے اور یہ بھی جان جاؤ گے کہ کسی دوسرے کی عزت کو عزت نہ سمجھنے والے کا میں کیا حال کرتا ہوں؟ کسی کی بہن یا بیٹی پہ بری نظر ڈالتے ہوئے تمہیں شرم بھی آئے گی اور تمہیں برا بھی لگے گا لیکن یہ شرم تمہیں تب ہی آئے گی جب تمہیں اپنی یا کسی اور کی عزت کا خیال آئے گا۔ اور جہاں تک میرا اندازہ کہتا ہے تو وہ یہی ہے کہ تمہیں یہ خیال کبھی نہیں آئے گا اس لیے میں تمہیں یہ سمجھا دینا چاہتا ہوں کہ اگر آئندہ کبھی تم مجھے اس لڑکی کو یا پھر کسی بھی لڑکی کو چھیڑتے ہوئے یا تنگ کرتے ہوئے نظر آئے تو تمہارا وہ حشر کروں گا کہ پورا شہر تماشا دیکھے گا اور تم اپنی شناخت پہ منہ چھپاتے پھرو گے اور اس لیے بہتر ہے کہ تم اپنی حرکتوں سے باز آ جاؤ۔ ورنہ آج جس گاڑی سے میں نے تمہیں ٹھوکر ماری ہے کل میں تمہیں اس گاڑی سے روند کے بھی گزر سکتا ہوں۔ یہ ٹھوکر تو تمہارے لیے محض ایک اشارہ تھی تاکہ تم سنبھل جاؤ ورنہ میں تمہارے ساتھ کس طرح پیش آ سکتا ہوں تم کبھی سوچ بھی نہیں سکتے اور میں ہمیشہ کرتا بھی وہی ہوں جو کسی نے سوچا بھی نہیں ہوتا اور اس کی ایک مثال تو تم دیکھ ہی چکے ہو گے؟" دل آور نے غصے سے بھری کاٹ دار آنکھوں سے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اسے بہت کچھ باور کروا دیا تھا اور پھر اسی ایک جھٹکے سے اس کی شرٹ کا گریبان چھوڑتے ہوئے اسے پیچھے دھکیل دیا تھا اور خود واپسی کے لیے قدم موڑ لیے تھے۔ جبکہ جودت کا دھیان یکدم علیزے کی طرف چلا گیا تھا جو ان لوگوں کے درمیان شناسائی کا ایک حوالہ تھی۔

"علیزے! علیزے کہاں ہے منصور حسین؟ تت... تم نے اس کے ساتھ ایسا کیوں کیا ہے؟ کیوں دھوکا دیا ہے ہمیں؟ کیوں؟" جودت پیچھے سے بلند آواز میں چلایا تھا۔ دل آور نے مریم کے قریب پہنچ کر ذرا کی ذرا پلٹ کر جودت کی سمت دیکھا تھا جو چہرے پہ تکلیف اور الجھن کے آثار لیے کھڑا اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"جو دوسروں کی علیزے کے ساتھ ایسا کرتے ہیں ان کی اپنی علیزے کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔" دل آور نے کافی تلخ اور چبھتے ہوئے لہجے میں کہتے ہوئے مریم کی طرف اشارے سے اسے کچھ جتایا تھا اور پھر مزید اسے دیکھے بغیر دوبارہ مریم کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

"اگر آپ کو مسئلہ نہ ہو تو آیئے میں آپ کو ڈراپ کر دیتا ہوں۔" اس نے مریم کو دیکھتے ہوئے اپنی گاڑی کی

طرف اشارہ کیا تھا اور مریم اپنے سامنے کھڑے اس آدمی کی شاندار پرسنالٹی اور اتنی بڑی گاڑی دیکھ کر اندر سے تذبذب کا شکار ہو گئی تھی کہ وہ کیا کرے؟ انکار کر دے یا اقرار کر لے؟ آخر وہ آدمی جو بھی تھا اس کے لیے تو بالکل اجنبی ہی تھا نا وہ اتنی آسانی سے کیسے اس کی گاڑی میں بیٹھ جاتی۔

"آپ پریشان مت ہوں۔ میری بھی ایک بہن ہے اس لیے دوسروں کی بہنوں کی عزت کرنا کافی اچھی طرح جانتا ہوں البتہ میں آپ سے زیادہ اصرار نہیں کروں گا اگر آپ جانا چاہیں تو ٹیکسی سے بھی جا سکتی ہیں، میں آپ کو ٹیکسی ہائر کر دیتا ہوں۔" دل آور اس کے لیے اپنی گاڑی کا بیک ڈور کھولتے کھولتے رک گیا تھا اور مریم اس کی بات پہ سنبھل گئی تھی اس نے اپنے آپ کو فوراً "کمپوز کر لیا تھا۔

"نن... نہیں! ٹیکسی کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے دل آور کو ٹیکسی کرنے سے روک دیا تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ اس کے ساتھ جانے کو تیار تھی اس لیے دل آور نے اس کے روکنے کا مفہوم سمجھتے ہوئے پلٹ کر دوبارہ اپنی گاڑی کا بیک ڈور کھول دیا تھا اور مریم دھڑکتے دل کے ساتھ حوصلہ بلند کرتی ہوئی آگے بڑھ کے گاڑی کے اندر بیٹھ گئی تھی اور دل آور نے اس کے بیٹھنے کے بعد گاڑی کا ڈور بند کر کے خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی اور اگلے دو منٹ میں وہ جودت کے سامنے ہی گاڑی نکال لے گیا تھا اور اس کی گاڑی کی بیک سیٹ پہ بیٹھی مریم چپ کی چپ رہ گئی تھی۔

آج جو کچھ ہو چکا تھا وہ واقعی بہت غلط اور چپ ہو جانے والا تھا اسی لیے اس کے ذہن کو خاموشی کیا ملی تھی کہ سوچوں نے الگ شور مچا دیا تھا جس کی وجہ سے اس کے تمام محسوسات بیدار ہو گئے تھے اور اس کے ہاتھ پہ ثبت جودت آفندی کے ہونٹوں کا لمس انگارے کی طرح دہکنے لگا تھا۔ جلن دینے لگا تھا۔ اسے اپنے ہاتھ کی جلد پہ کسی تیزاب کی سی تکلیف کا احساس ہونے لگا تھا اور اسی احساس کے تحت وہ لاشعوری طور پہ ہی اپنے ہاتھ کو دوسرے ہاتھ سے مسلنے لگی تھی، اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اپنے ہاتھ کی جلد وہاں سے کاٹ کے پھینک دے جہاں پہ اس کے ہونٹوں کا لمس سلگ رہا تھا۔ کیونکہ اس کے ہاتھ کا وہ حصہ وہ جگہ اور وہ نقش اسے اذیت دے رہے تھے وہ اندر ہی اندر جل رہی تھی کڑھ رہی تھی اور اپنے ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ رہی تھی اور اس سارے چکر میں اس کے ذہن نے یہ بھی نکل گیا تھا کہ وہ اس وقت ایک اجنبی کی گاڑی میں سوار ہے اور کہاں جا رہی ہے؟ وہ بے خبری میں تھی اس وقت ٹکرا گلے ہی پل دل آور کے موبائل کی رنگ ٹون نے اس کو خبردار کرنے کے ساتھ ساتھ چونکا دیا تھا۔

"یس دل آور شاہ اسپیکنگ۔" اس آدمی نے کال ریسیو کرتے ہی اپنا تعارف کروایا تھا اور مریم اس کے تعارف پہ ششدر سی رہ گئی تھی اس نے اک جھٹکے سے سر اٹھا کر ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھے اس آدمی کو دیکھا تھا جو اب اپنا تعارف کروانے کے بعد کسی سے بات کر رہا تھا۔

"ایس پی کامران مہدی بات کر رہا ہوں۔" ایس پی کامران مہدی نے کسی لینڈ لائن نمبر سے کال کی تھی اسی لیے اسے بھی اپنا تعارف کروانا پڑا تھا۔

"اوہ... ایس پی صاحب کیسے ہیں آپ؟" دل آور کی ساری توجہ اب ایس پی کامران مہدی کی طرف مبذول ہو چکی تھی۔

"شکر ہے اللہ کا بیرسٹر صاحب! آپ سنائیں کیا چل رہا ہے آج کل؟" ایس پی کامران مہدی نے بھی کافی فریش لہجے میں جواب دیا تھا۔

"وہی سب کچھ جو آپ کی طرف چل رہا ہے۔ کام کام اور صرف کام۔" دل آور نے ہلکے سے کندھے اچکائے تھے۔

"چلیں بیرسٹر صاحب! اچھے کی امید رکھتے ہیں۔ اللہ کبھی ہمیں بھی تو فرصت دے گا ہم بھی کام کے علاوہ کچھ

اور انجوائے کرلیں گے۔" ایس پی کامران مہدی نے ٹھنڈی آہ بھری تھی اور دل آور اس کے انداز پہ بے ساختہ قہقہہ لگا کے ہنسا تھا۔

"سنا تھا کہ امید پہ دنیا قائم ہے' مگر آج تو اس محاورے پہ یقین بھی آگیا ہے۔ کیونکہ ایس پی صاحب بھی اسی محاورے پہ قائم ہیں۔" دل آور نے ایس پی کامران مہدی کی بات کو خوب انجوائے کیا تھا۔

"تو پھر اور کیا کریں؟ دل کو کچھ تو تسلی دینی ہی ہے بیرسٹر صاحب۔" ایس پی کامران مہدی نے بھی — مسکرا کر جواب دیا تھا۔

"خیر! یہ تسلیاں تو ہم اپنے آپ کو دیتے ہی رہیں گے آپ یہ بتائیں کہ آج یاد کیسے کرلیا؟ کوئی نئی تازہ؟" دل آور نے اس سے اصل بات کے لیے استفسار کیا تھا۔

"نئی تازہ یہی ہے کہ ملک حق نواز کی بیل کے لیے کچھ سرگرمیاں نظر آرہی ہیں۔ ملک اسد اللہ اور ملک شرافت علی اس سے ملاقات کے لیے بھی آئے تھے اور اس کی بیل کی بات بھی ہورہی تھی آخر ان کا اپنا اثر ورسوخ بھی بہت ہے۔ بیل تو وہ کرواہی لیں گے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ اس کیس میں میڈیا کو بھی انوالو کرلیں تاکہ یہ مسئلہ جن لوگوں کی نظروں سے چھپا ہوا ہے ان کے سامنے بھی آجائے اور ملک حق نواز کی بیل ناممکن ہوجائے ورنہ وہ بہت آسانی سے بچ کے نکل جائے گا۔"

ایس پی کامران مہدی نے اسے مسئلہ بتانے کے ساتھ ساتھ مسئلے کا حل بھی بتادیا تھا جس پہ دل آور کے ماتھے پہ سلوٹیں پڑگئی تھیں اور لہجہ بھی بدل گیا تھا۔

"نہیں ایس پی صاحب! ایسا ممکن نہیں ہے۔ میں اس ذلیل انسان کو سزا دینے کے لیے مومنہ بی بی کو میڈیا والوں کے ننگے سوالوں کے سامنے کھڑا نہیں کرسکتا۔ میں اس کو سزا دلاؤں گا تو اپنے طریقے سے۔ یہ طریقہ میرے معیار کا نہیں ہے۔ میں اس مظلوم لڑکی کا استعمال نہیں کرسکتا۔" دل آور نے کافی سختی سے نفی میں سر ہلایا تھا کیونکہ وہ اس مسئلے کے ایسے حل پہ تیار نہیں تھا۔ وہ مومنہ بی بی کو پوری دنیا کی نظروں کے سامنے نہیں لاسکتا تھا وہ ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا مگر ایس پی کامران مہدی اس کی اس سوچ کو اتنی جلدی سمجھ نہیں سکا تھا اسی لیے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"لیکن بیرسٹر صاحب! یہ مسئلہ یہ کیس بھی تو اسی لڑکی کا ہے نا؟ آپ اسے کون سا کسی اور کیس میں انوالو کررہے ہیں؟ وہ اس کیس میں انوالو نہیں ہوگی تو کیس مضبوط کیسے ہوگا؟ اور اگر ملک حق نواز کی بیل ہوگئی تو سب سے زیادہ مسئلہ آپ کو ہوگا۔ وہ اب آپ کو اپنا دشمن اور اپنا ٹارگٹ سمجھ رہا ہے۔ اس کا پہلا حملہ آپ پر ہی ہوگا۔" ایس پی کامران مہدی بھی اپنی جگہ پہ درست تھا۔

مگر دل آور کی بھی اپنی ہی منطق ہوتی تھی وہ ایسی باتوں کے ذرا کم ہی نوٹس لیتا تھا کیونکہ اس نے کرنا وہی ہوتا تھا جو اس کی اپنی مرضی ہوتی تھی اس لیے ادھر ادھر کے مشوروں پہ دھیان دینا اس نے سیکھا ہی نہیں تھا اور اس وقت بھی اس کا ایسا ہی ردعمل تھا' وہ کسی بھی مشورے پہ دھیان دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔

"ایس پی صاحب! اس لڑکی پہ ظلم ہوا ہے زیادتی ہوئی ہے اس کے ساتھ اسے بے چادر اور بے آبرو کیا گیا ہے اور اسی ظلم' زیادتی اور آبروریزی سے بلبلا کر اس نے انصاف کے لیے آواز اٹھائی ہے' احتجاج بلند کیا ہے یہاں تک کہ اس انصاف کی خاطر اپنے گھر اور گھر والوں کو بھی چھوڑ دیا ہے۔ گھر سے بے گھر ہوگئی ہے وہ اور آپ اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ کسی لڑکی کے لیے بے آبرو ہونا اور بے گھر ہونا کتنی بڑی اذیت ہوگی ؟ کتنا بڑا عذاب ہوگا؟ لو' اس لڑکی نے تو یہ دونوں اذیتیں دیکھی ہیں دونوں عذاب اٹھائے ہیں اور ایسے میں' میں ہی اس کے اس احتجاج کو اس کے لیے مشکل بنادوں تو آپ کا کیا خیال ہے کہ پھر کبھی کوئی بھی مظلوم عورت انصاف کے لیے آواز

اٹھا پائے گی؟ یا کبھی کسی زیادتی پہ احتجاج کرپائے گی؟ ہونہہ۔۔۔! نہیں ایس پی صاحب ایسا کبھی نہیں ہوگا پھر ہر مظلوم عورت ظلم کو انصاف سے بہتر سمجھنے لگے گی' پھر کبھی کوئی عورت احتجاج نہیں کرے گی اور نہ ہی کبھی انصاف کے لیے کوئی آواز اٹھائے گی اور میں لوگوں کو انصاف دلانے والا ایسا کبھی نہیں چاہ سکتا میری وجہ سے کوئی انسان انصاف سے محروم رہ جائے اور انصاف کی طلب سے دور ہوجائے۔ اسی لیے آپ یہ خیال ذہن سے نکال دیں کہ میں اس معاملے میں میڈیا سے کوئی ہیلپ لوں گا' بے شک ملک حق نواز بیل کروا کے لاک اپ سے باہر آجائے' مجھے کوئی پروا نہیں ہے' اس کی بیل سے بھلا کیا ہوگا؟ میں اسے دیکھ لوں گا اس کی بیل کا پوائنٹ تو پہلے روز سے ہی میرے ذہن میں تھا وہ لوگ اس کی بیل تو کسی بھی وقت کسی بھی طرح کرواسکتے تھے۔ بہرحال میں کوشش کروں گا کہ اس کی بیل کی اپیل ریجیکٹ ہوجائے۔ اس لیے آپ بھی بے فکر رہیں اور آگے آگے دیکھیے کہ کیا ہوتا ہے لیکن پھر بھی میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھے انفارم کیا ہے اور امید ہے کہ آپ آئندہ بھی اسی طرح میرا ساتھ دیں گے بغیر کسی بات کو مائنڈ کیے۔"

دل آور نے ایس پی کامران مہدی کو کافی اچھے طریقے سے اپنے پوائنٹ آف ویو سے آگاہ کیا تھا اور ایس پی کامران مہدی نے اس پوائنٹ آف ویو کو اچھی طرح سے سمجھ بھی لیا تھا۔ اسی لیے اسے مزید کچھ بھی سمجھانے کی کوشش نہیں کی تھی اور سارا معاملہ اس کے پوائنٹ آف ویو پر چھوڑ دیا تھا۔

"ٹھیک ہے بیرسٹر صاحب! جیسے آپ بہتر سمجھتے ہیں' آپ ویسا ہی کریں کیونکہ آپ اگر بغیر کسی غرض کے ایک مظلوم عورت کا ساتھ دے رہے ہیں تو اس اچھے کام میں ہم کیسے پیچھے رہ سکتے ہیں؟ ہم ان شا اللہ ہمیشہ ایسے معاملے میں آپ کا ساتھ نبھائیں گے۔ آپ جو بھی کہیں گے ہماری طرف سے آمین ہے۔" ایس پی کامران مہدی نے اسے اپنی طرف سے پوری طرح سے مطمئن کیا تھا اور دل آور کو اس کی بات پہ خوشی ہوئی تھی کہ چلو کسی اور نے تو اس جیسا سوچا۔۔۔!

"تھینک یو ایس پی صاحب تھینک یو سو مچ! مجھے آپ سے یہی امید تھی' بہرحال میں اس وقت فون بند کرتا ہوں' مجھے اس وقت کہیں جانا ہے' آپ سے پھر فرصت میں بات ہوگی۔" دل آور نے مریم کے خیال سے گاڑی کی اسپیڈ کم کرتے ہوئے ایس پی کامران مہدی سے اجازت چاہی تھی کیونکہ آخر اس نے اس لڑکی سے اس کا ٹھکانہ بھی تو پوچھنا تھا۔

"اوکے بیرسٹر صاحب اللہ حافظ۔" ایس پی کامران مہدی نے جلدی ہی فون بند کردیا تھا اور دل آور فون بند ہوتے ہی بیک سیٹ پہ بیٹھی حیرت سے گنگ مریم فاروق نیازی کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

"آپ نے کس طرف جانا ہے؟ کہاں ڈراپ کروں؟" دل آور نے بغیر اس کی طرف دیکھے ذرا نرمی سے دریافت کیا تھا اور مریم اس کے پوچھنے پہ ایک بار پھر چونک کر متوجہ ہوئی تھی۔

"جی۔۔۔ جی! کیا کہا آپ نے؟" اس نے غیر حاضر دماغ سے دوبارہ استفسار کیا تھا۔

"آپ نے کس طرف جانا ہے؟ کہاں ڈراپ کروں آپ کو؟" دل آور نے دوبارہ دہرایا تھا اور مریم نے آہستگی سے اپنے گھر کا ایڈریس بتادیا تھا کیونکہ وہ جس آدمی کو اجنبی اور نجانے کیسا سمجھ رہی تھی وہ آدمی ہی اصل اعتماد کے قابل ہے یہ تو وہ جانتی ہی نہیں تھی۔ اسی لیے اس نے بغیر کسی حیل وحجت کے اپنے گھر کا ایڈریس بتادیا تھا اور دل آور نے ٹھیک پانچ منٹ کے بعد گاڑی اس کے مطلوبہ ایڈریس پہ جا روکی تھی۔

"آگے گلی تنگ ہے؟" دل آور نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"جی! آگے گلی تنگ ہے۔" مریم کی آواز دھیمی تھی اور دل آور نے اب کی بار گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا تھا کیونکہ مریم نیچے اترنے کے لیے دروازے کی سمت ہاتھ بڑھا رہی تھی۔

"دیکھیے.....! مجھے غلط مت سمجھیے گا' دراصل آپ کو اپنے ساتھ اپنی گاڑی میں لانے کا صرف یہی مقصد تھا کہ جووت آفندی کو کم از کم اتنا اندازہ ہو جائے کہ آپ کی مجھ سے کوئی جان پہچان ضرور ہے اس لیے وہ آئندہ آپ کو تنگ کرنے اور آپ کی طرف دیکھنے سے بھی گریز کرے' کیونکہ آپ تو نہیں لیکن وہ مجھے اچھی طرح جانتا ہے اور اس طرح آپ کو میرے ساتھ دیکھ کر اور بھی جان جائے گا ورنہ میں آپ کو ٹیکسی سے بھی بھیج سکتا تھا بس اسی وجہ سے میں نے آپ کو اپنے ساتھ آنے کی آفر کی تھی۔"

دل آور نے اس کے جانے سے پہلے بات کی وضاحت کر دینا ضروری سمجھا تھا تاکہ وہ لڑکی اسے غلط نہ سمجھے اور اس کا ذہن کسی بھی ایسے ویسے خیال سے پاک ہو جائے حالانکہ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس لڑکی کا ذہن تو اس کا نام سن کر ہی ایسے ویسے خیال سے پاک ہو گیا تھا وہ اسے اس کے نام سے ہی پہچان گئی تھی۔

"نہیں سر! آپ ایسا مت سوچیے آپ نے مشکل وقت میں میری مدد کر کے مجھ پہ احسان کیا ہے جس کے لیے میں آپ کی شکر گزار ہوں اور ہمیشہ رہوں گی۔ آئی ایم ریئلی تھینکس فل ٹو یو اور رہی بات آپ کو جاننے کی تو یہ سچ ہے کہ میں بھی آپ کو اچھی طرح جانتی ہوں کیونکہ آپ پہلے ہی ہماری دعاؤں میں شامل ہیں۔ میری ماں' میری بہنیں اور میں خود آپ کے لیے خدا کے حضور دعاگو ہو چکی ہوں۔ اس لیے کہ آپ نے ہمارے واحد سہارے کا ہمارے اکلوتے بھائی کا ساتھ دیا ہے۔ ہمیں بے سروسامان ہونے سے بچایا ہے۔ عدیل عمر نیازی کی ضمانت کروائی ہے اور اسے آزادی دلائی ہے اور عدیل عمر نیازی کی بہن ہونے کے ناتے میں ایک بار پھر آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی سر۔ تھینک یو سو مچ۔ آپ واقعی ایک اچھے انسان ہیں' مجھے آپ سے مل کر اور آپ کو دیکھ کر واقعی بہت خوشی ہوئی ہے۔ اللہ آپ کو کامیابیاں و کامرانیاں عطا کرے اور آپ کی عمر دراز کرے آمین۔"

مریم نے بھی جواباً کھل کے جواب دیا تھا اور جو دل میں تھا سب کہہ دیا تھا جبکہ دوسری طرف دل آور خود بھی اس لڑکی کی بات پہ اور اس کے تعارف پہ حیران رہ گیا تھا۔ وہ عدیل عمر کی بہن تھی یہ تو اسے پتا ہی نہیں تھا۔ جسے جان کر اسے واقعی بہت حیرانی ہوئی تھی۔

"اللہ حافظ سر!" وہ دل آور کو اسی طرح حیران چھوڑ کر گاڑی سے نیچے اتر گئی تھی اور وہ چند سیکنڈ یونہی اس لڑکی کو گلی مڑتے دیکھ کر پھر گاڑی آگے بڑھا چکا تھا۔!

☼ ☼ ☼

"السلام علیکم سر!" وہ ابھی شوروم کی پارکنگ میں گاڑی پارک کر کے گاڑی سے نیچے اترا ہی تھا کہ اچانک عدیل عمر اس کے سامنے آگیا تھا۔

"ارے! وعلیکم السلام کیسے ہو؟" دل آور نے جواباً خاصی گرمجوشی کا مظاہرہ کیا تھا جس پہ عدیل کو کافی تسلی ہوئی تھی کہ اس کا موڈ خوشگوار ہے۔

"جی! اللہ کا احسان ہے' میں ٹھیک ہوں' آپ سنائیں کہاں تھے اتنے دنوں سے؟ میں اتنی بار آفس آیا مگر ہر بار آپ کی غیر موجودگی کا سن کر مجھے واپس جانا پڑا' آج بھی مجھے امید نہیں تھی کہ آپ سے ملاقات ہو گی لیکن پھر بھی اپنے آپ کو تسلی دے کر چلا آیا کہ شاید آج مایوس نہ لوٹنا پڑے اور دیکھیں آج اللہ نے مایوسی کا منہ دیکھنے سے بچا لیا ہے۔ آج آپ سے ملاقات ہو ہی گئی ہے۔" عدیل نے اس سے ملاقات ہو جانے پہ خاصی خوشی کا اظہار کیا تھا جبکہ دل آور اس کی بات پہ اور اس کے انداز پہ مسکرا دیا تھا۔

"مسٹر عدیل! میں تو آپ کو خاصا سمجھ دار سمجھ رہا تھا لیکن آپ تو پہلے قدم پہ ہی سمجھ داری سے دستبردار ہو گئے ہیں بہت افسوس ہوا یہ جان کر!" دل آور نے جیسے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے نفی میں سر ہلایا تھا اور عدیل نے

اس کے افسوس پہ الجھی ہوئی اور ناسمجھ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"کیا مطلب سر! کیا کیا ہے میں نے جس پہ آپ کو اتنا افسوس ہو رہا ہے؟"

"تم ابھی بھی تم پوچھ رہے ہو کہ تم نے کیا کیا ہے؟ ارے واہ! کمال کی بات ہے یار۔ اتنے دن ہو گئے میں نے تمہیں کہا تھا کہ تم آفس آجانا اب میں آفس میں ہوتا ہوں یا نہیں ہوتا تمہیں بھلا اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ بے شک آفس میں میں نہیں تھا لیکن میرا پارٹنر تو ہے نا اور نبیل حیات تو میرا پارٹنر ہی نہیں میرا بھائی بھی ہے اور میرا دوست بھی۔ اس کے سامنے تم میرا نام ہی لے لیتے تو وہ فوراً تمہیں جاب پہ رکھ لیتا اتنے دن مس کر دیے تم نے آخر کیا فائدہ؟ اتنے دنوں میں تو تم یہاں ایڈجسٹ ہو سکتے تھے مگر سمجھ داری سے کام لیتے تب نا۔"

دل آور نے اسے جیسے سرزنش کی تھی جس پہ عدیل کو کافی شرمندگی ہوئی تھی۔

"سر! مجھے اس طرح منہ اٹھا کے ان کے سامنے جانا اچھا نہیں لگا کیونکہ میرے پاس نہ سیل فون ہے اور نہ ہی آپ کا کوئی نمبر تھا کہ میں آپ سے بات ہی کروا دیتا تاکہ ان کو یقین آجاتا کہ مجھے آپ نے ہی بھیجا ہے اور جب میرے پاس ایسا کوئی ثبوت ہی نہیں تھا تو مجھے لگا کہ میرا جانا فضول ہے اسی لیے میں باہر سے ہی واپس لوٹ جاتا تھا۔" عدیل نے اسے اپنی سوچ اور اپنی عقل کی بات بتائی تھی جس پہ دل آور ایک بار پھر مسکرایا تھا۔

"یہ تمہاری سوچ اور تمہاری عقل کی بات ہے نا ورنہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ تم میرے پارٹنر کے پاس جاتے اور وہ اپنے سیل فون سے میرا نمبر ڈائل کر کے مجھ سے ہی پوچھ لیتا کہ میں نے کسی کو بھیجا ہے یا نہیں؟ تمہارے سیل فون اور نمبر کی تو ضرورت ہی پیش نہیں آسکتی تھی؟" دل آور کے جواب پہ عدیل کو لاجواب ہونا پڑا تھا بلکہ یہ بھی تسلیم کرنا پڑا تھا کہ وہ ایک وکیل سے بات کر رہا ہے جس سے جیتنا آسان کام نہیں تھا۔

"سوری سر! میں سمجھ گیا ہوں کہ میں غلطی پر تھا۔" عدیل نے بلا جھجک اعتراف کر لیا تھا۔

"ارے نہیں یار! سوری کی ضرورت نہیں ہے' میں نے تو تمہیں اس لیے تمہاری غلطی کا احساس دلایا ہے کہ تم نے اتنے دن مس کر کے اپنا اور ہمارا نقصان کیا ہے' اتنے دنوں میں تم سب کچھ سیکھ سکتے تھے' سمجھ سکتے تھے اور آج تم اس وقت تک میرا انتظار کرنے کی بجائے اندر آفس میں اپنی سیٹ پہ ہو سکتے تھے۔ خیر کوئی بات نہیں ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا! آؤ میرے ساتھ میں تمہیں ملواتا ہوں اپنے پارٹنر نبیل حیات سے۔" دل آور اس کا کندھا تھپک کر خود بھی اندر کی طرف قدم بڑھا چکا تھا اور عدیل اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا شوروم کے اندر آگیا تھا۔

"نبیل صاحب کہاں ہیں؟" اس نے کسی ورکر سے استفسار کیا تھا۔

"سر! نبیل صاحب اور عبداللہ صاحب آفس روم میں ہیں' شاید آپ کا ہی انتظار کر رہے ہیں۔" ان کا وہ ورکر جواب دے کر وہاں سے ہٹ گیا تھا اور دل آور عدیل کو ساتھ لیے نبیل کے روم کی طرف آگیا تھا اور باہر رک کر دروازے کو ناک کیا تھا۔

"پلیس کم ان!" اندر سے نبیل کی ہی آواز سنائی دی تھی۔

"السلام علیکم!" دل آور دروازہ دھکیلتا ہوا اندر داخل ہوا تھا۔

"وعلیکم السلام! شکر ہے کہ آپ کو بھی اس شوروم کا خیال آیا۔" نبیل نے اسے دیکھتے ہی خفگی کا اظہار کیا تھا اور دل آور نے اس کی کسی بھی خفگی کا کوئی نوٹس لیے بغیر عبداللہ سے ہاتھ ملانے کی طرف دھیان دیا تھا۔

"لگتا ہے کہ کوئی خاص میٹنگ ہو رہی ہے؟" دل آور نے عبداللہ کے چہرے کی سمت دیکھتے ہوئے اندازہ لگایا تھا۔

"جی جناب! میٹنگ تو ہو ہی رہی ہے اور ارادہ تھا کہ آپ کو بھی اس میٹنگ میں شریک کیا جائے مگر آپ جناب کو فرصت ہی کہاں کہ تھوڑی دیر ہمارے ساتھ بیٹھ کر کچھ ضروری مسئلے مسائل ہی ڈسکس کر لیں۔ اس لیے

مجبوری تھی یہ میٹنگ ہمیں خود ہی اسٹارٹ کرنا پڑی۔" عبداللہ نے اثبات میں سرہلاتے ہوئے اس سے شکوہ بھی کیا تھا اور اپنی مجبوری بھی بتائی تھی۔

"خیر چھوڑو! یہ مسئلے مسائل بھی ڈسکس ہوتے ہی رہیں گے۔ تم ان سے ملو یہ ہیں عدیل عمر نیازی ہمارے اس شوروم کے نئے منیجر اور عدیل عمر یہ ہیں ہمارے جگر کے ٹکڑے ملک عبداللہ صاحب ان کی دوستی اور ان سے یاری کی وجہ سے ہی ہماری زندگی کا نظام چل رہا ہے ورنہ زندگی ہمارے لیے بالکل بے کار ہوتی۔" دل آور نے خاصا تفصیلی تعارف کروایا تھا جس پہ عبداللہ نے اٹھ کر مسکراتے ہوئے عدیل عمر سے ہاتھ ملایا تھا۔

"اور یہ رہے اس شوروم کے اونر اور ہمارے پارٹنر نبیل حیات۔ یہ اگر نبیل حیات نہ ہوتے تو ضرور ہماری محبوبہ ہوتے کیونکہ ہمیں ان سے اتنا ہی پیار ہے جتنا کسی انسان کو اپنی محبوبہ سے ہوتا ہے۔ ہر طرح سے کوشش کی جاتی ہے کہ ان کا پورا پورا خیال رکھوں مگر پتا نہیں کہ کامیاب ہوتا بھی ہوں یا نہیں۔ بہر حال نبیل صاحب یہ ہیں آپ کے منیجر عدیل عمر نیازی ان کے بارے میں میں پہلے بھی آپ کو بتا چکا ہوں اب خود ہی آپس میں دعا سلام بڑھالیں اور مجھے ریسٹ دیں۔" دل آور نے تعارف کروانے کی بھی فارمیلٹی نبھادی تھی اور نبیل کو اٹھ کر عدیل سے ہاتھ ملانا پڑا تھا۔

"کیسے ہو یار! بیرسٹر صاحب کے منہ سے تمہاری کافی تعریف سنی ہے انہیں یقین ہے کہ تم اپنا کام اچھے طریقے سے ہینڈل کرو گے۔" نبیل نے اس کی تعریف کا برملا اظہار کیا تھا جس پہ عدیل نے ذرا نروس ہوتے ہوئے سر جھکا لیا تھا اور پھر اک نظر دل آور کی سمت دیکھا تھا۔

"سر! ان کے الفاظ صرف تعریف نہیں ہیں بلکہ میرے لیے تو اعزاز ہیں کہ انہوں نے میرے لیے ایسا کہا ہے اور مجھے اس قابل سمجھا ہے ورنہ میں کہاں اور یہ کہاں۔"

"ارے یار! ہم لوگوں کے ساتھ رہنا ہے تو یہ ڈائیلاگ "میں کہاں اور وہ کہاں" نہیں چلے گا ہم لوگ تو یاروں کے یار ہیں' یہ ذات پات' اونچ نیچ اور امیری غریبی کے چکر ہمیں نہیں آتے بس ہم بندہ دیکھتے ہیں اور بندے کا دل دیکھتے ہیں۔" عبداللہ نے بڑے فرینڈلی انداز میں عدیل کو تینوں دوستوں کے مزاج سے اور خیالات سے آگاہ کیا تھا جس پہ عدیل کو واقعی کافی ڈھارس اور تسلی ہوئی تھی۔

"تھینک یو سر! یہ تو آپ لوگوں کا بڑا پن ہے' ورنہ آج کل لوگ ایسا نہیں سوچتے یہاں سارا چکر ہی امیری غریبی کا چل رہا ہے یہ دور نفسا نفسی کا دور ہے' کسی کو کسی دوسرے کی کوئی پروا نہیں ہے اور نہ ہی کسی سے کوئی غرض ہے اور ایسے میں اگر آپ لوگ ایسی سوچ رکھتے ہیں میں آپ لوگوں کو دل سے سلام پیش کرتا ہوں۔" عدیل نے ذرا سا سر خم کرتے ہوئے جیسے سلام کیا تھا اور دل آور نے اس کے کندھے کو تھپکتے ہوئے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔

"بیٹھ جاؤ! بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔" دل آور خود بھی اس کے ساتھ والی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا تھا۔

"تھینک یو!" عدیل شکریہ ادا کرتے ہوئے بیٹھ گیا تھا۔

"کیا بات ہے؟ تم کس سوچ میں ہو؟" دل آور کے سوال کا رخ نبیل کی طرف تھا۔

"میں سوچ رہا ہوں کہ میں نے انہیں پہلے کہاں دیکھا ہے؟" نبیل اپنی سوچ سے الجھ رہا تھا۔

"آپ نے مجھے وہاں دیکھا ہے جہاں آپ سے ایک لڑکی ـــ کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔" عدیل پہلی نظر میں ہی اسے پہچان گیا تھا اسی لیے اس نے فوراً ہی نبیل کی الجھن بھی دور کردی تھی۔

"اوہ اچھا اچھا تو آپ وہی ہیں جنہوں نے مجھے اس لڑکی کو اسپتال لے جانے سے منع کیا تھا۔" نبیل کو بھی یاد آگیا تھا۔

"توجی! یہاں تو پرانی جان پہچان نکل آئی ہے۔" عبداللہ اور دل آور ہاتھ پہ ہاتھ مارتے ہوئے ہنس پڑے تھے۔

"ویسے ایکسیڈنٹ کس لڑکی کا ـــــ ہوا تھا؟" عبداللہ نے نبیل کو شرارتی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"ارے یار! مومنہ بی بی کی بات کررہے ہیں' اس روز اسی ـــــ کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔" نبیل نے فوراً" صفائی پیش کی تھی۔

"وہ! تو اس ایکسیڈنٹ کی بات ہورہی ہے۔" عبداللہ اور دل آور دونوں دھیمے پڑ گئے تھے۔

"تو اور کیا ورنہ ہماری ایسی قسمت کہاں کہ ہمارا ایکسیڈنٹ کسی ایسی جگہ پہ ہو جہاں ہم چاہتے ہوں۔" نبیل نے جیسے اداسی سے سرد آہ بھری تھی اور دل آور اس کی اس سرد آہ سے نجانے کیوں چپ سا ہو گیا تھا۔

"تم ایکسیڈنٹ کہاں چاہتے ہو؟" عبداللہ نے نبیل کو خاصی گہری' ذو معنی اور جانچتی ہوئی نظروں سے دیکھا تھا جس پہ نبیل ذرا سنبھل گیا تھا۔

"ابھی تیاری میں ہوں' بہت جلدی بتادوں گا تمہیں۔" نبیل نے ریلیکس انداز میں کندھے جھٹکے تھے۔

"ہیں! واقعی؟ یہ میں کیا سن رہا ہوں دل آور یہ کسی ایکسیڈنٹ کی تیاریوں میں ہے اور ہمیں پتا ہی نہیں۔" عبداللہ نے ایکدم حیرت اور اچنبھے کا اظہار کیا تھا مگر دل آور نے پھر بھی کوئی خاص نوٹس نہیں لیا تھا بلکہ وہ بات ہی بدل گیا تھا۔

"تم ایکسیڈنٹ کو چھوڑو یہ بتاؤ کہ کام کی تیاری کہاں تک پہنچی ہے؟ کیا پروگرام بنایا ہے تم لوگوں نے؟" وہ ڈائریکٹ کام کی بات پہ آ گیا تھا۔

"بس پروگرام وہی ہے جو تمہیں بتایا ہے ہم دونوں کل کراچی جارہے ہیں اس لیے اب وہاں جاکر ہی پتا چلے گا کہ آگے کیا کرنا ہے۔" نبیل بھی کام کی بات کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔

"کچھ اندازہ ہے کہ کتنے دن لگیں گے۔" دل آور مزید سوال پوچھ رہا تھا۔

"فی الحال تو کچھ اندازہ نہیں ہے یار! اسی لیے تو رات کو تم لوگوں کو ڈنر پہ انوائٹ کیا ہے کہ نجانے کتنا ٹائم لگ جائے ہمیں فرصت ملنے میں' اس لیے بہتر ہے کہ ہم پہلے ہی تھوڑا بہت انجوائے کرلیں۔" نبیل نے اسے دعوت کی وجہ بتائی تھی۔

"ہوں! بہتر ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ منیجر کی سیٹ کے لیے کچھ انتظام کرنے کو کہا تھا میں نے؟" دل آور نے عدیل کی سمت اشارہ کرتے ہوئے نبیل سے کچھ استفسار کیا تھا۔

"ہاں! کردیا ہے انتظام۔ یہ لو۔" نبیل نے کہتے ہوئے ٹیبل کا لاک کھولا اور ایک لفافہ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا تھا جسے ہاتھ بڑھا کے دل آور نے اٹھالیا تھا۔

"عدیل عمر! تم آج سے اس شوروم کے منیجر ہو اور اس شوروم کے منیجر کے لیے ہم نے کچھ سہولیات فراہم کرنے کا سوچا ہے کیونکہ ان کے بغیر نہ ہمارا کام چل سکتا ہے' نہ تمہارا' اس لیے یہ سہولتیں بہت ضروری ہیں باقی اس جاب کے حوالے سے جو بھی ضروری کاغذی کارروائی رہتی ہے وہ بھی تھوڑی دیر تک کمپلیٹ ہو جائے گی' پہلے تم یہ چیک کرو۔" اس نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے وہ لفافہ عدیل کے سامنے رکھ دیا تھا۔

"لیکن سر! یہ ہے کیا؟" عدیل لفافہ اٹھانے سے پہلے ذرا دیر کے لیے ٹھہر گیا تھا۔

"خود چیک کرلو۔" دل آور نے اشارہ کیا تھا۔

اور مجبوراً" عدیل کو وہ لفافہ خود ہی کھولنا پڑا تھا اور کھولنے کے بعد وہ حیران سا دیکھتا رہ گیا تھا کیونکہ اس کی نظروں کے سامنے ایک ان پیک سیل فون' ایک چابی اور کچھ ہزار ہزار کے نوٹوں پہ مشتمل رقم تھی جس کی اسے کچھ سمجھ

نہیں آرہی تھی اور اس کی نا سمجھی دور کرنے کے لیے دل آور کو ایک بار پھر بولنا پڑا تھا۔

"یہ تمہارے لیے موبائل ہے' تم آج ہی نیا نمبر لو اور سیل کو آن کرو' اس طرح کسی بھی کام کے حوالے سے تم ہمارے ساتھ رابطے میں رہوگے' نہ تمہیں مسئلہ ہوگا' نہ ہمیں اور یہ بائیک کی چابی ہے' تم جب تک اس جاب پہ رہوگے' یہ بائیک تمہارے استعمال میں رہے گی اور اگر اس جاب پہ نہیں رہوگے تب بھی یہ تمہاری ملکیت رہے گی اور یہ ہے تمہاری پہلی ایڈوانس سیلری۔ اس میں کمی بیشی کا تمہیں کوئی اعتراض ہو تو تم بلا جھجک بتاسکتے ہو' کیونکہ ہر انسان کو اپنے رائٹ کے لیے بولنے کا پورا اختیار ہوتا ہے۔ باقی تمہاری اپنی کوئی ڈیمانڈ ہو تو وہ بھی بتادو' ہم پوری کوشش کریں گے کہ وہ ڈیمانڈ پوری کرسکیں۔" دل آور نے اس کی پوری تسلی کروائی تھی اور اسے سب کچھ تفصیل سے بتایا تھا' جس کے بعد عدیل کے پاس بولنے کے لیے الفاظ بھی نہیں رہے تھے' وہ چپ کا چپ رہ گیا تھا۔

"ارے یار! اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ تم پہ کوئی احسان نہیں ہے؟ بلکہ یہ سب تو تمہاری جاب کا ایک حصہ ہے' ہاں تم اچھا کام کروگے تو پرموشن بھی ہو سکتی ہے۔"

اب کی بار نبیل نے مداخلت کی تھی اور عدیل حقیقتاً" دل آور شاہ کے سامنے اس کا دل سے مشکور ہوا تھا۔ حالانکہ عدیل نہیں جانتا تھا کہ دل آور شاہ اس وقت اس کی عزت اس کی بہن کو بھی باحفاظت گھر پہنچا کے آیا ہے جس کا مطلب تھا کہ وہ اس پہ ایک اور احسان کرکے آیا ہے' مگر دل آور ایسا نہیں تھا کہ اسے اس احسان کے متعلق بھی بتاتا۔

بس جو بات ڈھکی چھپی تھی وہی اچھی تھی' ورنہ ہو سکتا تھا کہ عدیل اپنی بہن پہ گھر سے باہر نکلنے کی پابندی ہی لگادیتا۔ لہٰذا بہتر تھا کہ عدیل کو نہ ہی بتایا جاتا اور اس نے ایسا ہی کیا تھا۔ البتہ ان لوگوں کی باتیں اور کاروباری مسئلے مسائل کافی دیر تک چلتے رہے تھے۔ کیونکہ ان لوگوں نے کام کے سلسلے میں کراچی جانا تھا' اس لیے بہتر تھا کہ سب کچھ پہلے سے ہی طے کرلیا جاتا۔

✲ ✲ ✲

"آپ کہاں جارہے ہیں؟" اسرار آفندی تیار ہو کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے سے ہٹے ہی تھے کہ ثروت بیگم سامنے آ کھڑی ہوئی تھیں۔

"آفس اور کہاں؟" انہوں نے تعجب سے جواب دیا تھا۔

"اور اسپتال بھی جائیں گے؟" ان کا اگلا سوال سامنے آیا تھا۔

"ظاہر ہے بھئی اسپتال بھی جانا ہی ہے۔" وہ لاپروائی سے بولے تھے۔

"ٹھیک ہے۔ پھر اگر اسپتال جائیں تو اپنے صاحبزادے سے کہیے گا کہ ذرا گھر کا بھی چکر لگالے' ہمارے لیے تو وہ ابھی بھی ایسے ہی ہے جیسے امریکا میں بیٹھا ہوا ہے۔ کسی اور کا تو اسے خیال ہی نہیں ہوتا سوائے بھائی صاحب کی فیملی کے۔" ثروت بیگم نے برملا اپنی خفگی کا اظہار کیا تھا اور اسرار آفندی سمجھ گئے تھے کہ وہ آذر کی بات کررہی ہیں۔

"آجائے گا' آجائے گا' بس بھائی صاحب بھی دو روز میں اسپتال سے ڈسچارج ہو جائیں گے' تم فکر نہ کرو' دانیال بھی تو ہے نا' اتنے دنوں سے بھاگ دوڑ کررہا ہے۔" اسرار آفندی نے بیوی کو ریلیکس کرنا چاہا تھا۔

"پتا ہے! سب پتا ہے' وہ اتنی بھاگ دوڑ کیوں کرتا ہے؟ یہ بھی جانتی ہوں' لیکن مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں ہے' میں تو بس اپنے بیٹے کی بات کررہی ہوں کہ وہ اتنی بھاگ دوڑ کیوں کررہا ہے آخر؟ اسے کیا مطلب ہے بھلا؟ جتنا بھائی صاحب کے ساتھ اس کا رشتہ ہے اتنا ہی باقی سب کا بھی تو ہے نا؟ اسے ان کی اتنی فکر ہے اور اپنی پروا ہی نہیں ہے۔" ثروت بیگم خاصی برہم ہورہی تھیں' اسرار آفندی ان کے تیور دیکھ کر جز بز سے ہو گئے تھے کہ اب ان

سے کیا کہیں اور کیا نہ کہیں۔

”لیکن خیر! جو بھی ہے ‘ جیسے ہی بھائی صاحب اسپتال سے ڈسچارج ہو کر گھر آتے ہیں ہمیں فوراً“ ہی آذر اور کومل کے رشتے کا اعلان کر دوں گی اور کچھ عرصے میں ہی شادی بھی کر دیں گے ‘ آخر اور کتنا انتظار کروانا ہے بچوں کو؟ یہی تو عمر ہوتی ہے ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے کی۔ آپ کو نہ سہی ‘ لیکن مجھے تو بہت فکر ہے اس کی ‘ آخر سب بہن ‘ بھائیوں سے اور کزنز سے بڑا ہے وہ۔ بس یہ کام اب ہو ہی جانا چاہیے۔“ انہوں نے اپنی طرف سے پکا ارادہ باندھ رکھا تھا۔ جو کہ اسرار آفندی کو کچھ مناسب نہیں لگا تھا ‘ جس کا انہوں نے اظہار بھی کر دیا تھا۔

”دیکھو ثروت! تم جو جی چاہے کرو ‘ مگر ابھی نہیں ‘ ابھی ان دنوں میں ایسا کچھ بھی کہنا اور کرنا ہماری خود غرضی ہوگی ‘ جو کہ مجھے پسند نہیں ہے اور نہ ہی میں ایسا چاہتا ہوں ‘ بھائی صاحب کچھ بہتر ہو گئے تو پھر سب کچھ سیٹ ہو جائے گا ‘ ہم کومل اور آذر کی شادی ان شاء اللہ بہت دھوم دھام سے کریں گے۔ بس تھوڑا اور صبر کر لو ‘ بھائی صاحب نے ہمیشہ ہمارے لیے اتنا کچھ کیا ہے ‘ ہماری زندگیاں سنوار دی ہیں ‘ ہمارے اور ہمارے بچوں کے مستقبل بنا دیے ہیں ‘ تو کیا ہم ان کے لیے اتنا سا بھی نہیں کر سکتے؟ کیا ہم سے ذرا سا انتظار بھی نہیں ہو سکتا؟“ اسرار آفندی نے ذرا سنجیدگی سے انہیں سمجھانے کی کوشش کی تھی اور آخر میں سوال کرتے ہوئے بات ان پہ چھوڑ دی تھی ‘ جس کے بعد ثروت بیگم ذرا دیر کے لیے خاموش ہو گئی تھیں۔

”ثروت آنٹی وہ...!“ کومل اچانک کچھ کہتی ہوئی دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوئی تھی ‘ لیکن ان دونوں کو بڑے سنجیدہ موڈ میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑا دیکھ کر وہیں کی وہیں رک گئی تھی۔

”ایم سوری! میں سمجھی کہ آنٹی اکیلی ہوں گی۔“ کومل بے ساختہ معذرت کرتے ہوئے پلٹ رہی تھی۔

”ٹھہرو بیٹا!“ اسرار آفندی نے اسے روک دیا تھا۔

”جی انکل؟“ کومل کے قدم رک گئے تھے۔

”تم اپنی آنٹی سے بات کر لو ‘ میں آفس جا رہا ہوں۔“ وہ بریف کیس اٹھا کر کومل کا سر تھپکتے ہوئے باہر نکل گئے تھے اور کومل ان دونوں کے چہرے کے تاثرات دیکھتی رہ گئی تھی۔

”کیا بات ہے آنٹی؟ کیا ہوا ہے آپ لوگوں کو؟ کوئی مسئلہ ہے کیا؟“ کومل ثروت بیگم کے قریب چلی آئی تھی۔

”نہیں! کوئی مسئلہ نہیں ہے ‘ سب ٹھیک ہے۔“ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے وہاں سے ہٹ کے اپنے بیڈ پہ بیٹھ گئی تھیں ‘ لیکن کومل کو پتا تھا کہ ضرور کوئی ایسی بات ہوئی ہے ‘ جو آنٹی کے موڈ پہ اچھی ثابت نہیں ہوئی ‘ ورنہ اس طرح وہ چپ نہیں ہوتی تھیں۔

”کیا آپ بتانا نہیں چاہتیں؟“ اس نے پھر کریدنے کی کوشش کی تھی۔ ”نہیں چھپانا بھی نہیں چاہتی بیٹا! مگر جب تک کوئی بات فائنل نہ ہو جائے تب تک کچھ کہنا بھی تو فضول ہے۔“ وہ کافی عجیب سے انداز میں بول رہی تھیں۔

”کیا بات فائنل نہ ہو جائے؟“ کومل کو تجسس ہو رہا تھا کہ آخر بات کیا ہوئی ہے۔ کیونکہ جب وہ اندر داخل ہوئی تھی تو ان دونوں میاں ‘ بیوی نے بے ساختہ ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا ‘ جس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اسی کے متعلق کوئی بات ہو رہی تھی اور حقیقتاً“ ایسا ہی تھا ‘ بات اسی کے متعلق ہو رہی تھی ‘ اس لیے اس کا تجسس بھی ایک فطری عمل تھا ‘ اس نے تو کریدنا ہی تھا۔

”تمہارے اور آذر کے رشتے کی بات!“ ثروت بیگم نے بھی پردہ اٹھا ہی دیا تھا۔

”کیا؟ رشتے کی بات؟“ کومل کو اپنی سماعتوں پہ جیسے یقین نہیں آیا تھا۔

”ہاں میں چاہتی ہوں کہ جلدی سے جلدی تمہاری اور آذر کی انگیجمنٹ ہو جائے اور پھر کچھ عرصے بعد ہم لوگ شادی بھی کر دیں گے۔“

”آپ... آپ سچ کہہ رہی ہیں آنٹی؟“ کومل کے چہرے پہ تو خوشیوں کے ہزاروں رنگ بکھر گئے تھے۔ اس پہ تو جیسے شادی مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔

”ہاں بیٹا! سچ کہہ رہی ہوں مجھے بھلا کیا ضرورت ہے مذاق کرنے کی ‘ مگر تمہارے انکل کہتے ہیں کہ تھوڑا صبر کر لو ‘ پہلے بھائی صاحب کو ٹھیک ہونے دو ‘ پھر جو چاہے کر لینا ‘ ابھی ایسا کچھ کرنا مناسب نہیں ہوگا ‘ بس اسی لیے چپ ہو گئی ہوں۔“

وہ آخر میں کافی دھیمے سے لہجے میں بولی تھیں ‘ لیکن فی الحال کومل کے لیے اتنی خوشی ہی کافی تھی کہ اس کے اور آذر آفندی کے رشتے کی بات تو چل نکلی ہے نا اور اب امید تھی کہ یہ بات ہو کر ہی رہے گی ‘ اسی لیے اسے ایک دم عجیب سی سرشاری کا سا احساس ہوا تھا۔

”اوکے! اس میں تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ڈیڈ کے ٹھیک ہونے کے بعد بھی ایسا ہو سکتا ہے ‘ بس چند دن سے کیا فرق پڑتا ہے ‘ آپ انتظار کر لیں۔“ کومل نے بڑے سکون اور بڑی شانتی سے انہیں مشورہ دیا تھا۔

”وہ تو کرنا ہی پڑے گا ‘ لیکن خیر کوئی بات نہیں ‘ میری بڑی بہو تو تم ہی بنو گی بھلا تمہارے علاوہ کوئی اور اچھی لگ سکتی ہے میرے شہزادے کے ساتھ؟“

انہوں نے پاس بیٹھی کومل کا چہرہ تھام کے اس کے ماتھے پہ پیار کیا تھا اور کومل کی بے ساختہ نظریں جھک گئی تھیں ‘ اس کے دل میں ایک عجیب سی ہلچل ہونے لگی تھی۔ آج تک جو کچھ وہ چاہتی تھی ‘ وہی ہونے والا تھا ‘ اس لیے اسے اور کیا چاہیے تھا بھلا ‘ خواب سچ ہونے لگے تھے۔

☆ ☆ ☆
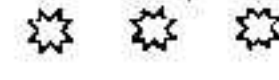
”جودت!“ آذر کافی دیر سے جودت کو اسپتال کے وزیٹنگ روم کے صوفے پہ مسلسل ایک ہی پوزیشن میں بیٹھے ہوئے دیکھ رہا تھا اور اسے اس طرح بیٹھے دیکھ کر آذر کو خاصی تشویش بھی ہوئی تھی ‘ کیونکہ وہ ایک ہی جگہ پہ ٹک کر بیٹھنے والا نہیں تھا اور اگر بیٹھ ہی گیا تھا تو ضرور اس کے پیچھے کوئی وجہ بھی تھی ‘ اسی لیے آذر اس کے قریب چلا آیا تھا اور اسے مخاطب بھی کیا تھا ‘ لیکن جودت پھر بھی متوجہ نہیں ہوا تھا۔

”جودت! میں تم سے مخاطب ہوں ‘ کیا ہوا ہے تمہیں؟ اس طرح کیوں بیٹھے ہو؟“ آذر اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے اسے متوجہ کرتے ہوئے خود بھی اس کے برابر ہی بیٹھ گیا تھا ‘ جس پہ جودت کو متوجہ ہونا ہی پڑا تھا۔

”بس ایسے ہی طبیعت کچھ فریش نہیں ہے۔“ جودت عجیب کشمکش کی سی کیفیت میں بیٹھا ہوا تھا اور ذہن طرح طرح کی سوچوں سے الجھ رہا تھا ‘ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے؟ کیونکہ اس کے ذہن پہ صرف اور صرف ”منصور حسین“ سوار تھا وہ اس وقت سے لے کر اب تک صرف اسی کے متعلق سوچے جا رہا تھا اور ساتھ ساتھ تذبذب کا بھی شکار تھا کہ باقی سب کو منصور حسین کے متعلق بتائے یا نہ بتائے؟ کیونکہ یہاں کی سچویشن بھی ایسی تھی کہ یہاں کوئی بات کرنا بھی نئے سرے سے کوئی ہنگامہ کھڑا کرنے کے مترادف تھا۔ لہٰذا وہ یہی سوچ رہا تھا کہ وہ چپ ہی رہے۔ مگر جو اندر ابال اٹھ رہے تھے وہ چپ بیٹھنے ہی نہیں دے رہے تھے منصور حسین کو دیکھ کر اس کا ذکر ضبط کرنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔

”طبیعت خراب ہے کیا؟“ آذر اسے بغور دیکھتے ہوئے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

”نہیں ‘ خراب نہیں ہے ‘ بس فریش نہیں ہے ‘ ذہن کچھ اپ سیٹ سا ہو رہا ہے ‘ سمجھ نہیں آ رہا کہ کیا کروں؟“ جودت کے لہجے سے ہی لگ رہا تھا کہ وہ خاصا پریشان اور الجھا ہوا ہے ‘ جس پہ آذر کو مزید تشویش ہوئی تھی۔

"صاف صاف بتاؤ کہ مسئلہ کیا ہے؟ کیوں اتنے اپ سیٹ ہو رہے ہو۔" اب تو آذر کو بھی پریشانی ہونے لگی تھی۔

"کوئی خاص بات نہیں ہے بھائی! آپ پریشان نہ ہوں' ایسا کوئی خاص مسئلہ نہیں ہے' جس پہ اتنا پریشان ہوا جائے۔" اس نے آذر کو ٹالنے کی کوشش کی تھی۔

"لیکن مسئلہ ہے تو سہی نا؟" آذر جھنجلا گیا تھا۔

"ٹھیک ہے کہ کوئی مسئلہ ہے مگر جب مناسب ہوا تب بتادوں گا۔"

جودت فی الحال آذر کو کچھ بھی بتانا نہیں چاہتا تھا' جبکہ اس کے نہ بتانے پہ آذر کی تشویش اور بھی بڑھ رہی تھی' کیونکہ اس نے جودت کو اس قدر الجھے ہوئے اور متفکر انداز میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"کسی کے ساتھ کوئی جھگڑا ہوا ہے کیا؟" آذر بس اسی نتیجے پہ پہنچا تھا کہ وہ کسی کے ساتھ لڑ جھگڑ کر آیا ہے۔

"نہیں۔" اب کی بار اس نے خاصا مختصر سا جواب دیا تھا۔

"جودت!" آذر نے ذرا غصے سے اس کا بازو پکڑ کر اسے اپنی سمت دیکھنے پہ مجبور کیا تھا۔

مگر جودت اس کی سمت دیکھنے کی بجائے تکلیف سے "آہ" کر کے رہ گیا تھا' کیونکہ جہاں سے آذر نے اس کا بازو پکڑا تھا' وہیں پہ اس کے چوٹ لگی ہوئی تھی اور جودت اس چوٹ پہ بینڈیج بھی کروا کے آیا تھا' مگر تکلیف تو ہنوز تھی' جس کو وہ ضبط کیے صرف اور صرف "منصور حسین" کو سوچے جا رہا تھا' لیکن اب اس تکلیف سے بھی پردہ اٹھ گیا تھا' آذر نے بے ساختہ اس کے منہ سے نکلنے والی "آہ" سے چونکتے ہوئے اس کے بازو کو ایک بار پھر چھو کر ٹٹولا تھا' جودت کو پھر تکلیف ہوئی تھی۔

"یہ سب کیا ہے جودت؟ کیا ہوا ہے تمہیں؟" آذر کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔

"زیادہ پریشانی والی بات نہیں ہے بھائی! بس میری بائیک کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا اور بائیک سے گرنے کی وجہ سے یہ چوٹیں آئی ہیں' مگر اللہ کا شکر ہے کہ زیادہ نقصان نہیں ہوا' کافی بچت ہو گئی ہے۔" جودت نے پھر بھی اسے تسلی ہی دی تھی۔

"صرف ایکسیڈنٹ ہوا ہے یا کچھ اور بھی؟" آذر اسے ہر طرح سے کرید رہا تھا۔

"نہیں اور کچھ نہیں ہوا' بس ایکسیڈنٹ ہی ہوا ہے۔" جودت اسے مطمئن نہیں کر پا رہا تھا' کیونکہ آذر یہ ماننے کو تیار ہی نہیں تھا کہ جودت اس ذرا سے ایکسیڈنٹ اور ذرا سی چوٹ سے اتنا اپ سیٹ سا بیٹھا ہے' اسے یقین تھا کہ ضرور کوئی اور وجہ ہے' جس سے وہ اتنا ڈسٹرب لگ رہا ہے۔

"آذر بیٹا! تم یہاں بیٹھے ہو' تمہیں ڈاکٹرز اندر بلا رہے ہیں۔" آسیہ آفندی' آذر کو ڈھونڈتی ہوئی ویٹنگ روم میں آگئی تھیں اور آذر ان کے بتانے پہ اک نظر جودت کو دیکھتا ہوا وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"خیر! جو بھی ہے تم اس وقت گھر جاؤ' باقی بات بعد میں ہو گی۔" اس نے جودت کا کندھا تھپک کر اسے وہاں سے جانے کا کہا تھا اور خود آسیہ آفندی کے ساتھ ڈاکٹرز کے پاس چلا آیا تھا' کیونکہ اسے پتا تھا کہ ضرور ڈیڈ کے ٹیسٹ کی رپورٹس آئی ہوں گی' جب ہی ڈاکٹر نے اسے خاص طور پہ بلایا ہے' اسی لیے اس نے آسیہ آفندی کو اپنے ساتھ ڈاکٹرز کے روم میں جانے سے منع کر دیا تھا اور اکیلا دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہو گیا تھا' آسیہ آفندی باہر کی باہر ہی کھڑی رہ گئی تھیں اور انہیں پتا تھا کہ آذر نے انہیں ساتھ آنے سے کیوں منع کیا ہے۔

☆ ☆ ☆

"چلیں؟" وہ کافی بجھے بجھے سے انداز میں تیار ہو کر نیچے آیا تھا اور ڈرائنگ روم میں دائیں بائیں ٹہلتی بتول شاہ کو چلنے کا سگنل دیا تھا۔

"ہوں... چلو۔" انہوں نے اک نظر ٹھہر کر اسے سر تا پا گہری نظر سے دیکھا تھا اور پھر اس کی ہاں میں ہاں ملائی تھی اور دل آور ان کی طرف سے جواب ملتے ہی باہر کی سمت قدم بڑھا چکا تھا۔ پھر گاڑی نکالنے تک یہ دونوں ماں' بیٹا خاموش ہی رہے تھے' لیکن آخر کب تک' کب تک۔ بتول شاہ اس کی یہ خاموشی برداشت کر سکتی تھیں؟ انہوں نے کچھ تو بولنا ہی تھا۔

"کیا بات ہے' اتنے خاموش کیوں ہو؟" انہوں نے دل آور کی سمت گردن موڑتے ہوئے استفسار کیا تھا۔

"تو اور کیا کروں؟" دل آور نے الٹا ان سے پوچھ لیا تھا۔

"جو میں نے کیا ہے وہ کرو۔" بتول شاہ بھی جواباً "نپے تلے" سے انداز میں بولی تھیں۔

"کر تو رہا ہوں' جو بھی' جو کچھ کہہ رہا ہے' چپ چاپ سب کر رہا ہوں۔"

دل آور آج نبیل کی دعوت پہ جاتے ہوئے خوش نہیں ہو رہا تھا' شاید اس لیے کہ اس کے ذہن میں صبح سے نبیل کے الفاظ گونج رہے تھے اور دل آور صبح سے اسی "دعوت اور دل داری" کے گھیراؤ میں پھنسا ہوا تھا' حالانکہ اس نے دن میں ہزاروں کام نبٹائے تھے' سب سے بات چیت بھی کی تھی' مگر پھر بھی اس کے دل و دماغ پہ وہی دعوت اور دل داری والا قصہ سوار رہا تھا اور اس وقت بھی ذہن کی اسکرین پہ یہی سب کچھ چل رہا تھا۔

"لیکن جو کچھ میں کہہ رہی ہوں' وہ تم سمجھ نہیں رہے۔" بتول شاہ نے اسے یاد دلانا چاہا تھا۔

"میں سب سمجھ رہا ہوں اماں' پہلے مجھے زہر کا ایک پیالہ تو پی لینے دیں' دوسرے کی باری تو بعد میں آئے گی نا اور پتا نہیں تب تک یہ سینے میں چھپا کا فرزندہ بھی رہے گا یا نہیں۔" دل آور نے خفگی اور افسردگی سے کہتے ہوئے سر جھکا تھا اور بتول شاہ اس کی بات کا مفہوم سمجھتی رہ گئی تھیں۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ فیصلہ تو تم پہلے سے ہی کر چکے ہو' اب زہر پینے نہ پینے کی بات کہاں سے آگئی ہے؟" وہ اس کا موڈ دیکھتے ہوئے الجھ پڑی تھیں کہ وہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟

"ایک انسان زہر پینے کا فیصلہ کر چکا ہو تو اس کا کیا مطلب ہے کہ اسے زہر پیتے ہوئے تکلیف بھی نہیں ہو گی؟" دل آور نے خاصے تلخ سے انداز میں سوال کیا تھا۔

"تکلیف تو انسان کو اسی وقت ہوتی ہے جب وہ کسی بھی قسم کا زہر پینے کا فیصلہ کرتا ہے اور جب فیصلہ کر لیتا ہے تو پھر بعد میں تکلیف کیسی؟ مجھے دیکھو' کتنے فیصلے کیے ہیں زندگی میں؟ مگر جب کر لیے تو کر لیے؟ پھر نہ درد... نہ تکلیف... اور نہ ہی کوئی پچھتاوا' زندگی میں ایسا کرو گے تو کبھی کسی بات پہ اور کسی کام میں مایوسی نہیں ہو گی اور ہمیشہ ثابت قدم رہو گے اور میں تم سے ایسی ہی امید رکھتی ہوں۔" بتول شاہ اسے اپنے جیسا ہی دیکھنا چاہتی تھیں۔

"آپ نہیں سمجھیں گی اماں' کہ دل کے معاملے اور دل کے فیصلے کتنے پیچیدہ ہوتے ہیں؟ یہاں درد بھی ہوتا ہے' تکلیف بھی ہوتی ہے اور پچھتاوا بھی ہوتا ہے۔" دل آور کا لہجہ جیسے تلخی سے رس رہا تھا' دکھ کی چاشنی اس کے اک اک لفظ سے محسوس ہو رہی تھی۔ "صرف دل کے معاملے اور دل کے فیصلے ہی پیچیدہ نہیں ہوتے ہیں' مگر انسان کو کرنا ہی پڑتے ہیں' تم کو بھی کرنا ہی پڑیں گے۔ بس سب کچھ اللہ کی ذات پہ چھوڑ دو' سب کچھ ہی بہتر ہو جائے گا۔" بتول شاہ نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے ہلکے سے اس کا کندھا دبایا تھا' جیسے اس کا حوصلہ اور اس کی ہمت بڑھانے کی کوشش کی ہو۔ "چھوڑ دیا ہے' سب کچھ چھوڑ دیا ہے' زری کو چھوڑ دیا تو سمجھ لیں کہ سب کچھ چھوڑ دیا' آج میں نبیل کی دعوت میں زری کو چھوڑنے ہی تو جا رہا ہوں اور نبیل کی یہ دعوت میں زندگی بھر بھول نہیں سکوں گا' دل پہ لکھی رہے گی۔" دل آور کا لب و لہجہ بھی دل آور کا نہیں لگ رہا تھا اور بتول شاہ اس کی کیفیت دیکھ کر چپ ہو گئی تھیں' اتنے میں اس نے نبیل کے گھر کے سامنے گاڑی کو بریک لگا دیے تھے۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

☆ ☆

نبیلہ عزیز

دردِ دل

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نبیل حیات دو ہی بہن بھائی ہیں، مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے، وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پہ رنگ چکی ہے، جس کے پیش نظر فائزہ بیگم، نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں، لیکن مدحیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے، جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے، مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے، مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، بے بسی اور مجبوری سے تنگ آ کر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے، لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باؤ امتیاز مل جاتا ہے، جو اسے کام کی آفر کرتا ہے، جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے، اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے، وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے، وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

داراب آزر شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے، وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے، اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا، اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔

قسط ۱۳

اکتیسویں قسط

چوکیدار نے اس کی گاڑی دیکھتے ہی گیٹ پورے کا پورا وا کردیا تھا۔ اور دل آور اپنے اندر کے غبار کو اندر ہی دباتے ہوئے ایک گہری سانس کھینچتا ہوا گاڑی اک جھٹکے سے اندر لے آیا تھا اور گاڑی باہر روش پہ پارک کرنے کے بعد گاڑی سے نیچے اتر آیا تھا اور اس کے پیچھے بتول شاہ بھی گاڑی سے اتر آئی تھیں ان دونوں کا رخ اندر کی طرف تھا لیکن نبیل انہیں ریسیو کرنے کے لیے خود باہر آچکا تھا۔

"السلام علیکم آنٹی۔۔۔! کیسی ہیں آپ؟" نبیل بے ساختہ ان کے سامنے ذرا جھک گیا تھا۔

"وعلیکم السلام بیٹا۔۔۔! بالکل ٹھیک ہوں اور بہت خوش بھی ہوں۔" بتول شاہ نے بہت فریش موڈ میں جواب دیا تھا۔

"اچھا۔۔۔! وہ کیوں بھلا؟" نبیل نے بھی کافی فریش موڈ میں استفسار کیا تھا کیونکہ وہ خود بھی بہت خوش تھا۔

"وہ اس لیے کہ تم بہت خوش ہو اور کیا ایک ماں کے لیے یہ خوشی کافی نہیں ہے کہ اس کا بیٹا بہت خوش ہے" بتول شاہ نے نبیل کے کندھے پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے پھر اس کے گال کو پیار سے تھپکا تھا۔

"صرف ایک بیٹا خوش ہے نا؟ دوسرے کو کیا ہوا ہے؟ چہرے سے تو یوں لگ رہا ہے جیسے کسی دعوت میں نہیں' بلکہ کسی وفات پہ آیا ہے۔" نبیل نے دل آور کے چہرے کی سمت اشارہ کرتے ہوئے ان سے پوچھا تھا اور بتول شاہ کا کلیجہ دہل گیا تھا۔

"ارے نہیں بیٹا۔۔۔! ایسا نہیں بولتے ہمیشہ اچھا بولنا چاہیے۔" انہوں نے نبیل کو سرزنش کی تھی۔

"اوکے۔۔۔! ایم سوری لیکن یہ تو بتادیں کہ اسے آخر ہوا کیا ہے؟ صبح جب فون کیا تو تب بھی اس کا موڈ کچھ ایسا ہی ہو رہا تھا بس دوپہر کو جب شوروم میں دیکھا تھا تب قدرے بہتر تھا یعنی کام کے وقت موڈ آن اور آگے پیچھے آف۔۔۔" نبیل کو دل آور کے موڈ سے الجھن ہو رہی تھی۔

"تمہیں میرے موڈ کے آن اور آف ہونے سے کیا پرابلم ہے آخر۔۔۔؟ تمہارا موڈ آن ہے نا؟ بس یہی کافی ہے۔ آج کے دن آن بھی بس تمہارا ہی ہونا چاہیے ہماری خیر ہے تم اپنی فکر کرو۔"

دل آور کو اپنی ذات پہ وہ خول چڑھانا ہی پڑا تھا جو کبھی کسی کو نظر نہیں آیا تھا اور جس کو چڑھا کر وہ اپنے دل کو بھی روندجاتا تھا اور دیکھنے والوں کو خبر بھی نہیں ہوتی تھی یہاں تک کہ عبداللہ اور نبیل کو بھی نہیں۔

"یہ تو تم مجھے ٹالنے کے لیے کہہ رہے ہونا؟ ورنہ تمہیں پتا ہے کہ ہمیں اپنی اتنی فکر نہیں ہوتی جتنی ایک دوسرے کی فکر ہوتی ہے تمہارا موڈ آن یا آف ہونے سے مجھے پرابلم نہیں ہوگی تو اور کس کو ہوگی؟ یا پھر اس بات سے بھی انکار ہے تمہیں؟" نبیل تو آج بغور اس کا معائنہ کرنے پہ تلا ہوا تھا اور دل آور اس کی خاطر اپنے دل پہ پاؤں رکھ کے مسکرا دیا تھا۔

"اوکے۔۔۔ اوکے۔۔۔! مان لیا کہ تمہیں پرابلم ہے لیکن تم بھی تو یہ مان لو کہ تمہارا موڈ آج واقعی آن ہے۔" دل آور نے بات کو شرارت اور خوشگواریت کا رخ دے دیا تھا۔

"اوکے۔۔۔ اوکے۔۔۔! میں نے بھی مان لیا کہ میرا موڈ آج واقعی آن ہے۔ پھر۔۔۔؟" نبیل نے بھی شرارت سے پوچھا تھا۔

"پھر تو میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا' پہلے تم یہ بتاؤ کہ تیسرا کہاں ہے؟ اس کی گاڑی نظر نہیں آرہی۔" دل آور کا اشارہ عبداللہ کی طرف تھا جس کو نبیل نے فوراً ہی سمجھ لیا تھا۔

"بس کسی کام سے گیا ہے' ابھی تھوڑی دیر میں آجائے گا' ڈونٹ وری۔۔۔ اپنی فیملی یہیں چھوڑ گیا ہے بس تمہاری کمی تھی۔" نبیل آج حقیقتاً "چہک رہا تھا اور یہ بات کسی سے بھی چھپی ہوئی نہیں تھی یہاں تک کہ مدیحہ' مومنہ بی بی اور فائزہ بیگم نے بھی محسوس کی تھی اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارے بھی کیے تھے جس پہ نبیل بس مسکرا کے رہ گیا تھا۔

"چلو۔۔۔ اب تمہاری بھی پوری ہوگئی ہے اب اور کیا کرنا ہے۔" دل آور اس سے آگے کا پروگرام پوچھ رہا تھا۔

"اب اور کچھ نہیں کرنا بس اندر چلنا ہے۔ ہم نے خوامخواہ اپنے ساتھ ساتھ آنٹی کو بھی کھڑا کر رکھا ہے۔" نبیل نے کہتے ہوئے اندر کی سمت اشارہ کیا تھا اور ساتھ ہی قدم بھی آگے بڑھادیے تھے۔

"اگر میرے کھڑے ہونے سے تم لوگوں کے موڈ ٹھیک ہوجائیں تو میرے لیے یہی بہت ہے۔" بتول شاہ ان دونوں کو مسکراتے ہوئے دیکھ کر قدرے ریلیکس ہوگئی تھیں اور ان کے ساتھ ہی اندر آگئی تھیں۔

مگر ڈرائنگ روم میں قدم رکھتے ہی ان تینوں کے قدم رک گئے تھے کیونکہ ان کے قدم زری کی آواز نے جکڑ لیے تھے۔

اک تازہ حکایت ہے
سن لو تو عنایت ہے
اک شخص کو دیکھا تھا
تاروں کی طرح ہم نے
اک شخص کو چاہا تھا
اپنوں کی طرح ہم نے
اک شخص کو سمجھا تھا
پھولوں کی طرح ہم نے
وہ شخص قیامت تھا
کیا اس کی کریں باتیں
دن اس کے لیے پیدا
اور اس کی ہی تھیں راتیں
کب ملنا کسی سے تھا
ہم سے ہی تھیں ملاقاتیں
رنگ اس کا شہابی تھا
زلفوں میں تھیں مہکاریں
آنکھیں تھیں کہ جادو تھا
پلکیں تھیں کہ تلواریں
دشمن بھی اگر دیکھیں
سو جان سے دل ہاریں

یونہی اپنی دھن میں نظم سناتے سناتے زری کی نظریں ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے کی سمت اٹھی تھیں اور پھر وہیں کی وہیں ٹھہر گئی تھیں دل آور کو لگا کہ وہ اب خاموش ہوجائے گی لیکن نہیں ایسا نہیں ہوا تھا وہ نجانے کس موڈ میں تھی کہ اس نے نظم پڑھنے کا سلسلہ پھر بھی جاری ہی رکھا تھا اور غیر محسوس طریقے سے نظم کے مصرعوں کا نشانہ بھی اسے ہی بنا رکھا تھا۔

کچھ تم سے وہ ملتا تھا
باتوں میں شباہت میں

ہاں تم سا ہی لگتا تھا
شوخی میں شرارت میں
لگتا بھی تم ہی سا تھا
دستور محبت میں

پھر بولتے بولتے نجانے کیوں اس کی آواز میں لرزش آگئی تھی اور آنکھوں کی زمین نم لگنے لگی تھی اور دل آور کے دل کو کچھ ہوا تھا مگر وہ چپ نہیں ہوئی تھی۔
پتا نہیں کیوں آج اس نے نظم مکمل کرنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔

وہ شخص ہمیں اک دن
اپنوں کی طرح بھولا
تاروں کی طرح ڈوبا
پھولوں کی طرح ٹوٹا
پھر ہاتھ نہ آیا وہ
ہم نے تو بہت ڈھونڈا
تم کس لیے چونکے ہو
کب ذکر تمہارا ہے
کب تم سے تقاضا ہے
کب تم سے شکایت ہے
اک تازہ حکایت ہے
سن لو تو عنایت ہے
سن لو تو عنایت ہے

زری کی یہ نظم دل آور کے لیے ایک تازہ حکایت نہیں تھی بلکہ "اک تازہ شکایت" تھی اور کسی کی تازہ شکایت سن کر بے چین ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو بے چین ظاہر نہ ہونے دینا بھی صرف دل آور شاہ کا ہی کمال تھا۔
"واؤ زری... ! تم نے تو کمال کر دیا ہے۔ بہت ہی خوب صورت نظم ہے۔ ویری ویری نائس... !" مدحیہ نے کافی بھرپور انداز میں سراہا تھا اور زری جھینپ کر چہرہ جھکا گئی تھی۔
"ماشاء اللہ... ! ماشاء اللہ... ! بہت ہی عمدہ ذوق ہے میری بیٹی کا۔ بہت اچھا لگا سن کر... ویلڈن۔"
نبیل اور دل آور کے ساتھ اندر داخل ہوتی بتول شاہ نے بھی کافی کھلے دل سے تعریف کی تھی اور زری اپنے لہجے کی لرزش اور آنکھوں کی نمی چھپاتے ہوئے ان سے ملنے کے لیے ان کے احترام میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔
"تھینک یو آنٹی۔" اس نے ان کے گلے ملتے ہوئے ان کی تعریف پہ شکریہ ادا کیا تھا۔
"نگارش سے سنا تو تھا کہ تمہیں شاعری سے لگاؤ ہے' مگر اس لگاؤ کے ساتھ ساتھ اتنی گہرائی اور اتنا اثر بھی ہے یہ مجھے اندازہ نہیں تھا' مگر آج ہو گیا ہے۔" بتول شاہ مسکراتے ہوئے بتا رہی تھیں اور ان کی بات پہ تقریباً" سبھی مسکرا دیے تھے خصوصاً" نبیل تو کچھ زیادہ ہی مسکرا رہا تھا۔
"اس کا ذوق تو شروع سے ہی عمدہ رہا ہے ہمیشہ ہر معاملے میں۔" فائزہ بیگم نے بھی بتول شاہ سے ملتے ہوئے زری کی ہی تعریف کی تھی' پھر وہ نگارش' مدحیہ اور مومنہ بی بی سے ملی تھیں اور مومنہ بی بی سے مل کر اسے پہچاننے

کی کوشش کی تھی انہیں سمجھ نہیں آرہا تھا کہ انہوں نے اس لڑکی کو پہلے کہاں دیکھا ہے؟
"یہ مومنہ بی بی ہیں۔ ہمارے اسلام آباد والے گھر میں آئی تھیں آپ کو یاد ہوگا۔" دل آور ان کی نظروں کی الجھن بھانپ گیا تھا اسی لیے ان کی مشکل آسان کر دی تھی کہ کہیں وہ اس الجھن میں نہ الجھتی رہیں اور اس کے یاد دلانے پہ انہیں بھی فوراً" ہی سب کچھ یاد آگیا تھا۔
"اوہ... اچھا اچھا... ! یہ مومنہ بی بی ہے اتنے عرصے بعد دیکھا ہے میں اسی لیے پہچان نہیں سکی شاید۔" انہوں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا تھا اور پھر فائزہ بیگم کے ساتھ ہی صوفے پہ بیٹھ گئی تھیں۔
"السلام علیکم... ! میں لیٹ تو نہیں ہو گیا؟" عبداللہ نے کافی عجلت میں اندر داخل ہوتے ہوئے سلام کیا تھا کیونکہ وہ باہر ڈرائیو وے پہ دل آور کی گاڑی دیکھ آیا تھا اس لیے اسے نہیں پتا تھا کہ دل آور ابھی ابھی آیا ہے یا پھر کافی دیر سے آیا ہوا ہے؟ تبھی اسے اپنے لیٹ ہو جانے کی فکر ہوئی تھی۔
"تم لیٹ ہوئے ہو یا نہیں یہ تو ہمیں نہیں پتا مگر اتنا اندازہ ضرور ہو گیا ہے کہ تمہارے آجانے سے بھابھی کے چہرے پہ بہار آگئی ہے... رنگ آگئے ہیں... رونق آگئی ہے... یقین نہیں آتا تو آنکھ بھر کے دیکھ لو۔" دل آور نے اپنے موڈ میں چینج لانے کے لیے توپوں کا رخ عبداللہ اور نگارش کی سمت موڑ دیا تھا' شاید اس لیے کہ وہ زری کی نظم کا اثر زائل کرنا چاہتا تھا البتہ یہ اور بات تھی کہ سبھی نے اس کی بات پہ خوب انجوائے کیا تھا اور سب کا دھیان بھی عبداللہ اور نگارش کی طرف ہی ہو گیا تھا اور نگارش جھینپ گئی تھی۔
"چلو... ! کوئی تو ہے نا جس کے چہرے پہ ہمارے آجانے سے بہار آجاتی ہے' رنگ آجاتے ہیں' رونق آجاتی ہے' تم لوگوں کی طرح چھڑا چھانٹ تو نہیں ہوں نا کہ جن کے آنے اور جانے سے کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔" عبداللہ بڑے اطمینان سے ان کو جلانے والے انداز میں کہتا بتول شاہ سے مل کر نگارش کے برابر جا بیٹھا تھا اور اس کے اس طرح بیٹھنے پہ مدحیہ' زری' بتول شاہ اور فائزہ بیگم بھی ہنس پڑی تھیں کیونکہ اس کا انداز ہی کچھ ایسا تھا کہ سب کو ہنسی آئی تھی جبکہ نگارش شرم سے سمٹ کے رہ گئی تھی۔
"پڑے گا فرق... ضرور پڑے گا۔ ہمارے آنے اور جانے سے بھی فرق پڑے گا۔ بس تم چار دن صبر تو کرو کہ آگے ہوتا کیا ہے۔" دل آور کے جواب پہ نبیل بے ساختہ مسکرایا تھا اور زری نے بے ساختہ اس کے چہرے کی سمت دیکھا تھا جس پہ لاپروائی اور شرارت کے آثار نظر آرہے تھے۔
"یعنی کہ ارادہ ہے... فرق لانے کا۔" عبداللہ نے بھی جواباً" ذو معنی لہجے میں پوچھا تھا۔
"کیا ابھی بھی چاہتے ہو کہ ارادہ نہ بنے؟" دل آور بھی لطف اندوز ہونے والے موڈ میں تھا۔
"ارے... ! نہیں نہیں... میں کیوں نہیں چاہوں گا بھلا؟ بناؤ' بناؤ' ضرور بناؤ اس میں میرا ہی فائدہ ہے آخر بھابھیاں بھی ملیں گی اور بھتیجے' بھتیجیاں بھی' واہ کیا کمال کا سین ہوگا وہ بھی ہر طرف رونق ہی رونق ہوگی۔" عبداللہ نے بڑی فراخدلی کا ثبوت دیتے ہوئے بڑے شاہانہ انداز میں انہیں اجازت دی تھی اور اس کی اس اجازت پہ سب قہقہہ لگا کر ہنس پڑے تھے۔
"ہوں... ! واقعی عبداللہ بھائی صحیح کہہ رہے ہیں۔ آپ کو یہ ارادہ ضرور بنانا چاہیے مجھے بھی بھابھیوں کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ ابھی تو صرف ایک بھابھی ہے دو اور آجائیں گی تو رونق ہو جائے گی اور پھر اتنی بوریت بھی نہیں ہوگی نہ ہمیں اور نہ آپ کو... کیوں مما... ! کیا خیال ہے آپ کا؟" مدحیہ نے کہتے کہتے بتول شاہ سے بھی مشورہ مانگ لیا تھا اور وہ بھلا اس نیک کام میں کون سا پیچھے تھیں انہوں نے بھی فوراً" ہاں میں ہاں ملائی تھی۔
"ارے ہاں بھئی... ! میرا خیال تم لوگوں سے مختلف کیسے ہو سکتا ہے بھلا... ؟ میں بھی خیر سے یہی چاہتی ہوں کہ

یہ دونوں جلد از جلد اپنی بیویاں لے آئیں آخر کچھ ہمیں بھی تو مصروفیت ملے۔" بتول شاہ بھی اس کام میں راضی تھیں اور نبیل اور دل آور دونوں ایک دوسرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کرکے رہ گئے تھے۔

"بیگم صاحب۔! کھانا تیار ہے ٹیبل پر لگا دیا ہے۔" اس سے پہلے کہ وہ دونوں کچھ کہتے مومنہ بی بی ان سب کو بلانے کے لیے آگئی تھی۔

"چلو جی۔۔۔! اب بقیہ کانفرنس کھانے کی میز پہ۔۔۔" عبداللہ کو بہت بھوک لگی ہوئی تھی اس لیے کسی کا بھی انتظار کیے بغیر فوراً" اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"کانفرنس یا کبڈی۔۔۔؟" دل آور اور نبیل بھی اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور عبداللہ کو جان بوجھ کر چھیڑا تھا۔

"کبڈی۔" عبداللہ کو کچھ سمجھ نہیں آیا تھا اور وہ دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ پہ ہاتھ مارتے ہوئے قہقہہ لگا کر ہنس پڑے تھے۔

"ارے بھئی۔۔! کھانے کی میز پہ کانفرنس نہیں ہوتی بلکہ کبڈی ہوتی ہے اور ہر طرف کبڈی کبڈی کی ہی آواز سنائی دیتی ہے۔ اس لیے تمہیں اٹھتے دیکھ کر ہی احساس ہو رہا ہے کہ تم بھی کھانے کے ساتھ کبڈی کبڈی ہی کرنے جا رہے ہو۔ عزائم خاصے خطرناک لگ رہے ہیں۔" دل آور کے نشانے پہ آج شاید صرف عبداللہ ہی تھا لیکن عبداللہ کو بھلا کیا پروا تھی وہ چاہے کچھ بھی کہتا رہتا۔

"جناب دل آور شاہ صاحب۔۔۔! بیک گراؤنڈ کے لحاظ سے دیکھو گے تو پنجاب کا باسی اور ذات کا جٹ ہوتا ہوں۔ کھانے کے ساتھ کبڈی تو کروں گا ہی۔ اب میں نبیل حیات تو ہوں نہیں کہ کھانا بھی کھاؤں تو بڑے طور طریقے اور سلیقے کے ساتھ۔۔۔" عبداللہ نے اپنے ساتھ ساتھ نبیل کو بھی گھسیٹ لیا تھا۔

"اف۔۔۔! جہاں یہ تینوں موجود ہوتے ہیں وہاں کسی چوتھے کی کیا گنجائش۔۔ یہ بھی نہیں دیکھتے کہ کوئی اور بھی پاس ہے یا نہیں؟" فائزہ بیگم خفگی سے اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتی ہوئی بتول شاہ کے ساتھ اٹھ کر ڈائننگ روم کی طرف بڑھ گئی تھیں اور وہ سب بھی اٹھ کر ہنستے ہوئے ان کے پیچھے ہی آگئے تھے۔

لیکن جب کرسی پہ بیٹھنے کی باری آئی تھی تو دل آور کے قدم ٹھٹک گئے تھے کیونکہ وہ واش بیسن پہ ہاتھ دھونے کے بعد سب سے آخر میں ٹیبل کی طرف آیا تھا اور تب تک سب اپنی اپنی کرسیوں پہ بیٹھ چکے تھے لیکن عبداللہ اور نبیل کے ساتھ والی کرسی خالی تھی اور اسی کرسی کے عین سامنے والی کرسی زری کی تھی۔

گویا وہ بیٹھتا تو وہ دونوں آمنے سامنے آجاتے کیونکہ عبداللہ کے مقابل والی کرسی پہ نگارش تھی اور نبیل کے مقابل والی کرسی پہ مدحیہ بیٹھی ہوئی تھی اس طرح دل آور کے مقابل والی کرسی پہ زری نظر آرہی تھی اور مشکل یہ تھی کہ وہ جگہ چینج بھی نہیں کرسکتا تھا اور یوں کھڑا بھی نہیں رہ سکتا تھا۔

"ارے۔! کیا بات ہے؟ اس طرح کھڑے کیا دیکھ رہے ہو؟" نبیل نے گردن موڑ کر دل آور کی سمت دیکھا تھا۔

"بس۔۔! دیکھ رہا ہوں کہ آج تم دونوں نے مجھے سائیڈ پہ کیوں کر دیا ہے؟ حالانکہ تم لوگوں کو پتا ہے کہ مجھے تم دونوں کے درمیان والی جگہ پسند ہوتی ہے۔" دل آور کا ذہن اپنے مطلب کا نقطہ نکال ہی لایا تھا لیکن زری اس کے اس نقطے پہ چونک گئی تھی۔ یعنی وہ اس کے سامنے نہیں بیٹھنا چاہتا تھا۔

"لو جی۔۔! اس میں بھلا کیا مسئلہ ہے؟ یہ لو۔۔ ہوگئی تمہاری پسند کی جگہ خالی۔" نبیل لاپروائی سے کہتے ہوئے اپنی کرسی سے اٹھ کر زری کے سامنے والی کرسی پہ بیٹھ گیا تھا اور دل آور نے مدحیہ کے سامنے والی کرسی سنبھال لی تھی۔

"تھینک یو۔۔!" اس نے آہستگی سے نبیل کا شکریہ ادا کیا تھا۔

"حالانکہ تھینکس تو مجھے تمہارا کہنا چاہیے۔" نبیل نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا تھا جسے صرف دل آور ہی سن سکا تھا اور اس کی بات کا مطلب بھی سمجھ گیا تھا کہ اس کا اشارہ زری کی طرف ہے۔

جبکہ دوسری طرف زری کا تن من دھواں دھواں ہو گیا تھا۔ اسے دل آور شاہ کا اتنا گریز اور اس طرح کا بے مہر رویہ اندر ہی اندر کاٹ رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے دل آور کا یہ انداز اسے دیمک کی طرح چاٹ جائے گا اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے کھوکھلی ہو جائے گی۔ اس کے دل کے گوشے وقفے وقفے سے بھیگنے لگے تھے رم جھم باہر نہیں لیکن اندر چھڑ گئی تھی اور وہ بڑی مشکل سے کھانے کا نوالہ حلق سے نیچے اتارنے میں کامیاب ہوتی تھی۔ ورنہ اسے تو یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اس کا حلق بھی بند ہو گیا ہو۔

اور ادھر نبیل سمجھ رہا تھا کہ وہ شرم کی وجہ سے سر جھکائے بیٹھی ہے اور اس سے ٹھیک طرح سے کھانا بھی نہیں کھایا جا رہا۔ لیکن اصل مسئلہ کیا ہے۔۔۔؟ وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی انجان تھا۔

☼ ☼ ☼

اپنے گھر کے دروازے کے باہر گلی میں بائیک رکنے کی آواز پہ مغرب کی نماز کے بعد دعا مانگتی مریم نجانے کیوں بری طرح چونک گئی تھی اور اس کا دل بھی کسی انجانے خیال سے بے قابو ہو کر دھڑک اٹھا تھا اور وہ جلدی جلدی چہرے پہ ہاتھ پھیر کر جائے نماز سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی لیکن ابھی وہ جائے نماز تہ کر ہی رہی تھی کہ اتنے میں دروازے پہ زور سے دستک ہوئی تھی اور مریم کا دل اچھل کر حلق میں آگیا تھا اور ٹانگیں کانپنے لگی تھیں۔

اس کا خیال اور وہم، وسوسے جودت آفندی کی سمت ہی گھوم رہے تھے۔ اسے ہر آہٹ پہ اس کا ہی خدشہ ستا رہا تھا اور دل کو طرح طرح کے خوف جکڑے جا رہے تھے کیونکہ دل آور شاہ کے ایکشن کے بعد وہ کوئی بھی، کسی بھی قسم کا ری ایکشن دے سکتا تھا اور مریم کو اس کی کمینگی پہ پورا یقین تھا کہ وہ بدلے کے طور پہ کچھ الٹا سیدھا ضرور کرے گا مگر اتنی جلدی۔۔۔؟ یہ اسے امید نہیں تھی۔

"کون ہے؟" دروازے پہ دوبارہ دستک ہوئی تو عابدہ خاتون کچن سے نکل آئی تھیں۔

"امی۔۔! دروازہ کھولیں۔۔۔ میں ہوں عدیل۔" باہر سے عدیل کی آواز سنائی دی تھی اور مریم کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کا مٹھی میں جکڑا ہوا دل ایکدم سے آزاد چھوڑ دیا ہو اور اسے ایک گہری اور سکھ کی سانس ملی ہو۔ اور وہ اپنے دل پہ ہاتھ رکھتے ہوئے شانت سی ہوگئی تھی۔

"عدیل۔۔۔!" اتنے میں عابدہ خاتون نے حیران ہوتے ہوئے دروازہ کھول دیا تھا کیونکہ عدیل نے کبھی بھی اس طرح زوردار دستک نہیں دی تھی۔

"جی۔۔! میں ہی ہوں۔۔۔ آپ کو یقین کیوں نہیں آرہا؟" عدیل کے دونوں ہاتھ چیزوں سے لدے پھندے تھے اور وہ ہنستا ہوا ان کی حیرانی کو انجوائے کرتا ہوا اندر آگیا تھا۔

"تم نے پہلے کبھی اس طرح دستک جو نہیں دی۔" انہوں نے اپنی حیرانی کی وجہ بتائی تھی۔

"اوہ۔۔! تو آپ اس لیے حیران ہو رہی ہیں؟ وہ دراصل میرے دونوں ہاتھوں میں شاپرز تھے بڑی مشکل سے دستک دے پایا ہوں اس لیے میری دستک روٹین سے ہٹ گئی تھی۔"

عدیل نے کہتے ہوئے آگے بڑھ کے دونوں ہاتھوں میں پکڑے ہوئے شاپرز صحن میں رکھی چارپائی پہ ڈال دیے تھے۔

"ارے واؤ۔۔! اتنی ساری چیزیں۔" ایمان کمرے سے نکلتے ہی چہک اٹھی تھی۔

"ہوں۔۔! اور یہ سب تم لوگوں کے لیے ہیں۔" عدیل نے اس کا گال تھپکا تھا۔

"تھینک یو بھائی۔۔۔! آپ کتنا خیال رکھتے ہیں سب کا۔" ایمان اس کی مشکور ہوئی تھی۔

"پاگل۔۔۔! یہ سب تم لوگوں کی دعائیں ہیں اور کچھ نہیں اور ویسے بھی تم سب کا خیال میں نہیں رکھوں گا تو اور کون رکھے گا۔" عدیل نے ایمان کے سر کو ہلاتے ہوئے مریم کی طرف دیکھا تھا جو برآمدے میں ہنوز ایک ہی پوزیشن میں کھڑی تھی۔

"ارے۔۔۔! تم اس طرح چپ کیوں کھڑی ہو؟ کیا ہو گیا ہے بھئی۔۔۔؟ ادھر آؤ میرے پاس۔۔۔"

عدیل کو مریم کے اس طرح چپ کھڑے رہنے پہ حیرت ہوئی تھی اور اسی حیرت کے مارے اسے اپنے قریب بلا لیا تھا اور مریم اپنے واہم اور خدشوں سے چونک کر اپنے دل میں چھپے خوف کو ذرا دیر کے لیے پرے جھٹکتی ہوئی جائے نماز برآمدے کی شیلف پہ رکھ کے عدیل کی سمت آ گئی تھی۔

"جی۔۔۔" وہ آ کر عدیل کے پاس کھڑی ہو گئی تھی۔

"لگتا ہے تم میری دستک پہ اور اتنی ساری چیزوں پہ حیران نہیں ہوئیں۔ اس لیے اب میرا خیال ہے کہ تمہیں بھی حیران کر ہی دوں تو بہتر ہے۔" عدیل کو سب سے زیادہ مریم کے تاثرات اور اس کی خوشی دیکھنے کی بے چینی ہو رہی تھی۔

"آپ حیران کرنا چاہتے ہیں۔۔۔؟ وہ کیسے۔۔۔؟" مریم نے اس کی بات میں دلچسپی لینے کی کوشش کی تھی۔

"وہ کیسے۔۔۔؟ ابھی بتاتا ہوں۔" وہ مریم کے کندھے کے گرد بازو لپیٹتے ہوئے اسے دروازے کے عین سامنے لے آیا تھا عابدہ خاتون اور ایمان بھی ناسمجھی سے دیکھ رہی تھیں کہ وہ آخر کر کیا رہا ہے؟ کام سے آتے ہی عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگا ہے حیرت ہے۔ پہلے تو ایسا کبھی نہیں کیا اس نے۔۔۔

وہ اس کو کھڑا کر کے خود باہر نکل گیا تھا اور دو منٹ بعد وہ بڑی احتیاط سے دروازے کے باہر بنے سیڑھی نما چوڑے سے تھڑے پر سے بائیک کو دھکیلتا ہوا اندر آ گیا تھا اور وہ سب حیران کی حیران رہ گئی تھیں۔

"ارے۔۔۔! بائیک۔۔۔؟ یہ کس کی ہے۔۔۔؟" اب کی بار مریم کو بھی شدید حیرت ہوئی تھی۔

"میری۔۔۔!" عدیل نے بائیک لا کر صحن کے بیچوں بیچ کھڑی کر دی تھی۔

"سچ بھائی۔۔۔؟" ایمان یکدم چہکتے ہوئے اچھل پڑی تھی اور مریم کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا وہ عدیل کو حیران اور سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"ہاں سچ۔۔۔! یہ میرے باس نے مجھے دی ہے اور یہ بائیک اب ہمیشہ میرے پاس ہی رہے گی، میری جاب بھی اسٹارٹ ہو گئی ہے آج۔۔۔ اور یہ بائیک بھی اسی جاب کا حصہ ہے۔"

عدیل آج حقیقتاً بہت خوش لگ رہا تھا اور اس نے ان سب کو بھی خوش کرنے کی پوری پوری کوشش کی تھی۔

"کیا واقعی آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔۔۔؟" مریم کو جیسے ابھی بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔

"ارے میری جان۔۔۔! مجھے تم لوگوں سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے بھلا۔۔۔ مجھے دل آور شاہ کے شوروم میں منیجر کی جاب مل گئی ہے اور انہوں نے جاب کے ساتھ ساتھ جو ضروری سہولیات تھیں وہ بھی مہیا کی ہیں۔۔۔ یہ دیکھو۔۔۔" عدیل نے جیب سے چمکتا ہوا موبائل نکال کر ان کے سامنے کر دیا تھا اور مریم دل آور شاہ کے نام پہ ٹھہر سی گئی تھی اس کا خیال پھر سے دن والے واقعے کی طرف چلا گیا تھا اور اسے اندر سے بے چینی ہوئی تھی کہ کہیں دل آور شاہ نے عدیل کو کچھ بتا نہ دیا ہو۔۔۔؟ لیکن پھر دوسرے ہی سیکنڈ اسے یہ سوچ کر اپنے آپ کو ڈھارس دینی پڑی تھی کہ اگر عدیل کو کچھ پتا ہوتا تو وہ اس وقت اتنا خوش نہیں ہو سکتا تھا اور اس وقت اس کے لیے یہی تسلی کافی تھی لہٰذا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اسے بھی عدیل کی خوشی اور کامیابی پہ خوش ہونا پڑا تھا اور اس نے عدیل کے ہاتھ

سے موبائل تھام لیا تھا جسے وہ بڑے اشتیاق سے دیکھنے لگی تھی اور عابدہ خاتون دل آور شاہ کو دعائیں دیتی ہوئی فاروق نیازی کو بتانے چل دی تھیں۔۔۔!

☆ ☆ ☆

"میرا خیال ہے کہ ہمیں اب چلنا چاہیے۔" ڈنر کے ایک گھنٹے بعد عبداللہ نے وال کلاک سے ٹائم دیکھتے ہوئے نبیل سے اجازت چاہی تھی۔

"اتنی جلدی۔۔۔؟" نبیل نے بھی بے ساختہ کلاک کی سمت ہی دیکھا تھا۔

"یار۔۔۔! ساڑھے گیارہ ہو رہے ہیں۔ یہاں سے نکلنے اور گھر پہنچنے تک ساڑھے بارہ' پونے ایک بجے کا ٹائم ہو جائے گا اور ویسے بھی تمہیں پتا ہے کہ گھر صرف ملازموں کے رحم و کرم پہ ہے' حالات اتنے خراب ہیں کہ کسی پر بھی بھروسہ کرنا فضول ہے' اس لیے تم لوگ ابھی بیٹھو۔ انجوائے کرو۔ بس ہم چلتے ہیں۔۔۔" عبداللہ کہتے ہوئے صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"ارے بیٹا۔۔۔! تھوڑی دیر اور بیٹھتے نا۔۔۔؟ پھر دوبارہ کب فرصت ملتی ہے بھلا۔ ابھی تو ہم نے کھل کے باتیں ہی نہیں کیں۔" بتول شاہ نے عبداللہ کو روکنے کی کوشش کی تھی۔

"واقعی آنٹی۔۔۔! یہ تو آپ صحیح کہہ رہی ہیں۔ ہم نے ابھی تک ٹھیک طرح سے فرصت سے بیٹھ کر باتیں ہی نہیں کیں لیکن خیر کوئی بات نہیں۔۔۔ ان شاءاللہ زندگی رہی تو ضرور بیٹھیں گے اور باتیں بھی کریں گے۔ ابھی رات بھی کافی ہو رہی ہے' گھر جانے میں ٹائم لگے گا میرے ساتھ یہ دونوں نہ ہوتیں تو شاید میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ بیٹھ ہی جاتا' مگر اب ان کو بھی تو لے کر جانا ہے' ویسے بھی مجھے لگ رہا ہے کہ زری کو نیند آ رہی ہے' کھانا کھانے کے بعد سست ہو گئی ہے۔"

عبداللہ نے زری کے بجھے بجھے چہرے کی سمت دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا تھا جس پہ باقی سب نے بھی بے ساختہ زری کی سمت دیکھا تھا مگر دل آور نے اپنی نظروں کو اس بے ساختگی سے بھی روک لیا تھا۔ اس نے باقی سب کی طرح زری کی طرف دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"نہیں۔۔۔! ایسی بات نہیں ہے۔ مجھے نیند نہیں آ رہی۔۔۔ بس سر درد کر رہا ہے۔ اس لیے آرام کرنا چاہتی ہوں۔" زری نے اپنی سستی کی وجہ بتائی تھی اور اس بتانے میں بھی اس کا لہجہ کافی ست سا تھا۔

"چلو پھر ٹھیک ہے۔۔۔ اتم لوگ جاؤ اور آرام کرو۔ ان شاءاللہ پھر بات ہو گی۔ تم سے تو باتیں بھی بہت سی کرنی ہیں۔" بتول شاہ نے پھر دوبارہ انہیں روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

اور وہ تینوں ان سب سے ملنے کے بعد باہر آ گئے تھے۔ نبیل اور فائزہ بیگم انہیں گاڑی تک چھوڑنے کے لیے آئے تھے اور پھر ان لوگوں کے جانے کے بعد فائزہ بیگم' بتول شاہ' مدیحہ اور مومنہ بی بی چاروں ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئی تھیں جبکہ نبیل دل آور کو ساتھ لیے باہر لان میں نکل آیا تھا۔

"آج موسم واقعی بہت اچھا ہو رہا ہے۔" نبیل نے آسمان پہ ٹمٹماتے ستاروں کو دیکھتے ہوئے بڑے موڈ بڑی ترنگ میں کہا تھا۔

"ہوں۔۔۔! شاید۔۔۔" دل آور کا لہجہ دھیما تھا۔

"شاید نہیں یار۔۔۔! سچ مچ موسم بہت خوب صورت ہو رہا ہے' اتنا خوب صورت کہ کسی حسینہ کے سامنے اپنے دل کے سارے جذبات کھول کے رکھ دینے کو جی چاہ رہا ہے۔ مگر افسوس کہ حسینہ گھر چلی گئی ہے۔" نبیل آج اپنے سارے راز کہہ دینے اور سارے اظہار کر دینے کے لیے بے قرار ہو رہا تھا۔

"کیا مطلب۔۔۔؟ گھر چلی گئی ہے؟" دل آور نے انجان بننے کے لیے تھوڑی سی کوشش کی تھی۔

"دل آور۔۔۔!" نبیل نے بڑے دل سے اسے مخاطب کیا تھا۔

"ہوں۔۔۔" وہ بمشکل بول پایا تھا۔

"تمہارے خیال میں زری کیسی لڑکی ہے۔" نبیل کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ سوال کیا کرے۔

"کیا مطلب۔۔۔؟ کیسی لڑکی ہے؟ یہ کیسا سوال ہے آخر۔۔۔؟" دل آور نے خفگی سے پوچھا تھا۔

"یار۔۔۔! میرا مطلب ہے کہ میرے لیے کیسی رہے گی؟ میرے ساتھ۔۔۔ میری لائف پارٹنر بن کر۔۔۔؟"

نبیل کے حواس عجیب بہکے بہکے سے محسوس ہو رہے تھے اور دل آور کو اپنے جیتے جاگتے دل کو کسی سرد خانے میں رکھنا پڑا تھا تاکہ وہ کسی بھی احساس اور جذبات سے عاری ہو جائے اور اسے کچھ بھی محسوس نہ ہو۔

"ہوں۔۔۔! اچھی ہے اور تمہاری لائف پارٹنر بن کر تو اور بھی اچھی رہے گی۔"

نبیل اس کا دوست تھا' اس کا یار تھا اور یار کے لیے کچھ تو کہنا ہی تھا چاہے اس کہنے کہنے میں ہی خود پہ قیامت گزر گئی۔

"دل آور۔۔۔! میں۔۔۔ میں۔۔۔ اس سے بہت محبت کرتا ہوں یار۔۔۔ بہت زیادہ۔۔۔ اب تو مجھے لگتا ہے کہ میری محبت یہ خاموش عشق وارد ہو گیا ہے۔ اسے بس ایک نظر دیکھ لوں اور مہینوں خوش رہتا ہوں لیکن نجانے کیا وجہ ہے کہ تمہیں بھی کسی کو بتانے کا اور اس کے سامنے اظہار کرنے کا حوصلہ ہی نہیں ہوا مجھے۔۔۔؟ بس اتنے سالوں سے اتنی خاموشی سے اور اتنے دل سے اسے اور صرف اسے چاہے جا رہا ہوں۔"

نبیل بہت ٹھنڈا اور پر سکون بندہ تھا۔ لیکن آج اس کا اظہار اس کا انداز اور اس کے الفاظ بتا رہے تھے کہ اس کے اندر کتنی شدت اور کتنی ہلچل ہے۔ دل آور گردن موڑ کر اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔

"لیکن دل آور۔۔۔! اب اسے چاہنے کے ساتھ ساتھ دل چاہتا ہے کہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی زندگی میں لے آؤں اور اپنی بے رنگ زندگی کو اس موسم کی طرح خوب صورت بنا دوں۔ مگر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جب تک تم میرا ساتھ نہیں دو گے تب تک میری زندگی' زندگی نہیں بنے گی۔ اس کا ہاتھ عبداللہ سے صرف تم مانگ سکتے ہو ورنہ مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ میں خود ایسا کچھ سوچوں یا پھر اپنے گھر والوں سے کچھ کہوں۔ یہ بات صرف تم کر سکتے ہو کیونکہ عبداللہ وغیرہ فیملی سے باہر شادی نہیں کرتے اور اس بات سے مجھے ڈر لگتا ہے۔"

نبیل نے بالآخر اپنا مدعا بیان کر ہی دیا تھا اور دل آور اس کا یہ مدعا تو بیان کرنے سے پہلے ہی اچھی طرح جانتا تھا' اسی لیے تو اس نے اپنے دل کو کسی سرد خانے میں ڈال دیا تھا تاکہ نبیل کے دل پہ کچھ نہ گزرے۔

"نہیں۔۔۔! ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ عبداللہ تمہارے لیے کبھی انکار نہیں کرے گا مجھے یقین ہے۔" دل آور نے نبیل کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اس کا کندھا دبایا تھا۔

"عبداللہ انکار نہ کرے مگر زری۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ تو انکار کر سکتی ہے نا۔۔۔؟ اب اس کے دل میں کیا ہے یہ تو اللہ ہی بہتر جان سکتا ہے۔" نبیل کو اب زری کے دل کی بھی فکر ہو رہی تھی۔

"ہاں۔۔۔! دلوں کے حال تو صرف اللہ ہی بہتر جان سکتا ہے لیکن پھر بھی اللہ سے بہتری کی ہی امید رکھنی چاہیے۔ ان شاءاللہ جو بھی ہو گا بہتر ہی ہو گا۔" دل آور نے اسے مایوس کرنے کی بجائے تسلی دی تھی اور دل آور کے اپنے حوصلے اور تسلیوں کی خاطر ہی تو اس نے یہ کام اسے سونپا تھا۔

"تو پھر تم عبداللہ سے مانگو گے نا زری کا ہاتھ۔۔۔؟" نبیل یہ بھی تسلی کرنا چاہتا تھا۔

"ہوں۔۔۔! مانگوں گا۔۔۔ ضرور مانگوں گا۔۔۔ تمہاری خاطر تو بھیک بھی مانگ سکتا ہوں۔۔۔ یہ تو پھر بھی زری کا ہاتھ ہے۔" دل آور نے بڑے حوصلے اور بڑے ضبط سے کہتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"تھینک یو دل آور۔۔۔! تھینک یو ویری مچ۔۔۔ مجھے پتا تھا کہ جب تمہیں پتا چلے گا تو تم میرا ساتھ ضرور دو گے۔" نبیل کہتے ہوئے دل آور کے گلے لگ گیا تھا اور خوشی کے مارے اس کی پشت تھپکی تھی۔

"تمہارا ساتھ نہیں دوں گا تو اور کس کا دوں گا۔۔۔؟ دن میں بتایا تو تھا کہ تم نبیل حیات نہ ہوتے تو ضرور میری محبوبہ ہوتے۔" دل آور نے اپنے لہجے اور انداز کو خوش گوار رکھنے کی کوشش کی تھی۔

"بہت شکریہ جناب۔۔۔ بہت بہت شکریہ۔۔۔ یہ بھی اعزاز کی بات ہے میرے لیے۔۔۔" نبیل مسکراتے ہوئے اس سے الگ ہوا تھا۔

"ارے واہ۔۔۔! یہاں تو کچھ اور ہی سین چل رہا ہے؟ خیر تو ہے نا؟"

مدحیہ نے باہر نکلتے ہوئے ان کا گلے ملنے کا منظر دیکھ لیا تھا اور اسے واقعی دلچسپ حیرت ہوئی تھی۔

"ہاں جی۔۔۔! خیر ہی ہے بس تمہاری فرمائش پہ تمہاری بھابھی لانے کا سوچ رہے ہیں۔" نبیل نے مدحیہ کے سر پر چپت لگاتے ہوئے کہا تھا۔

"صرف ایک بھابھی۔۔۔؟ میں نے تو دو کے لیے کہا تھا۔" مدحیہ خفا ہوئی تھی۔

"دو بھی ہو جائیں گی ابھی تم شروعات تو ہونے دو۔" نبیل مسکرا رہا تھا۔

"او کے۔۔۔! کریں شروعات۔ اندھے کو کیا چاہیے دو آنکھیں اور مجھے کیا چاہیے۔ دو بھابھیاں۔۔۔" مدحیہ نے کندھے اچکائے تھے اور اتنے میں فائزہ بیگم اور بتول شاہ بھی باہر آگئی تھیں اب بتول شاہ کا ارادہ بھی گھر چلنے کا تھا۔

لیکن جب سب کو اللہ حافظ کہنے کے بعد دل آور اپنی گاڑی کی سمت بڑھا تھا تو نبیل نے اسے ایک بار پھر روک لیا تھا۔

"تو پھر کب کرو گے بات۔۔۔؟" اسے بے چینی سی بے چینی ہو رہی تھی۔

"ابھی نہیں۔۔۔! ابھی تم لوگ کراچی سے واپس تو آجاؤ۔ جس روز مناسب لگا' بات کرلوں گا اور تم آنٹی سے کہنا کہ وہ نگارش بھابھی سے بات کرلیں پھر بات کرنے کے بعد باقاعدہ پرپوزل لے جائیں گے۔" دل آور نے اسے اتنی جلدی کرنے سے روکا تھا۔

"او کے۔۔۔! جیسا تمہیں مناسب لگے۔" نبیل کو ماننے ہی بنی تھی اور وہ لوگ ان سب سے مل کر واپسی کے لیے نکل آئے تھے لیکن دلوں پہ بہت سا بوجھ لے کر آئے تھے۔

☼ ☼ ☼

رات خاصی گہری اور سیاہ ہو رہی تھی جب وہ دونوں ماں بیٹا گھر پہنچے تھے۔

بتول شاہ بنا کہے ہی دل آور کے اندر کی کیفیت جانتی تھیں اسی لیے انہوں نے گاڑی میں بھی اسے مخاطب کرنے کی کوشش نہیں کی تھی اور گھر پہنچ کر بھی اپنے آپ کو اس کام سے باز رکھا تھا اس لیے گاڑی سے اترتے ہی وہ خاموشی سے اندر چلی گئی تھیں جبکہ دل آور دس پندرہ منٹ گاڑی سے اتر ہی نہیں سکا تھا۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ کی بیک سے سر ٹکائے اور پلکیں موندے نجانے کہاں سے کہاں نکل گیا تھا کہ واپسی کا راستہ ہی بھول گیا تھا۔

مگر اس کے گاڑی سے نہ نکلنے پہ اس کے پالتو بل ڈوگ کو بے چینی ہو رہی تھی اور اس نے ذرا آہستہ اور متوجہ کرنے والے انداز میں بھونکنے کی دوبارہ کوشش کی تھی اور عجیب عجیب خیالوں میں بھٹکتا دل آور اس کی اس کوشش پہ جہاں بھی تھا واپس لوٹ آیا تھا۔

اور تھکے تھکے انداز میں گاڑی کا دروازہ کھول کے نیچے اتر آیا تھا اس کے قدم اندر کی سمت اٹھ رہے تھے لیکن مین ڈور کے سامنے والی سیڑھیاں چڑھ کر اندر جاتے ہوئے اس کے قدم ٹھٹک گئے تھے۔ اسے ملگجے سے اندھیرے میں لان کی سیڑھیوں پہ کسی کا ہیولا سا نظر آیا تھا اور یہ ہیولا کس کا تھا؟ یہ اسے سمجھنے کے لیے زیادہ دیر نہیں لگی تھی اور دل آور شاہ کے قدم اس کی سمت "مڑ" گئے تھے۔ وہ انہی تھکے تھکے قدموں سے چلتا ہوا اس کے برابر آبیٹھا تھا اور علیزے نے اپنا آنسوؤں سے تر چہرہ آہستگی سے دوسری طرف موڑ لیا تھا جبکہ دل آور کا چہرہ جھکا ہوا تھا' وہ نیچے سیڑھیوں کی سمت دیکھ رہا تھا۔

"تم جانتی ہو علیزے۔۔۔ مرد کتنا بے بس ہوتا ہے؟ رو بھی نہیں سکتا۔" دل آور کا لہجہ بے حد بوجھل اور بے حد گمبھیر ہو رہا تھا اس کی آواز میں توازن نہیں تھا ہوا میں پتوں کی طرح بکھری جارہی تھی۔

"تم رو رہی ہو اور مجھے تم پہ رشک آرہا ہے۔" دل آور کی حالت ہی عجیب سی ہو رہی تھی اور حالت کے ساتھ ساتھ باتیں بھی عجیب سی لگ رہی تھیں۔ علیزے کو ایک پل کے لیے حیرت ہوئی تھی کہ وہ ایسا کیوں کہہ رہا ہے۔ آخر اسے ایسا کیا ہوا ہے کہ وہ اتنا بے بس لگ رہا ہے اور اسے رو لینے والوں پہ رشک آرہا ہے اور یہ اس کی حیرت ہی تھی کہ وہ اپنا رونا بھول کر اس کی طرف دیکھنے پہ مجبور ہو گئی تھی اس نے چہرہ دل آور کی طرف موڑ لیا تھا لیکن اندھیرا اتنا تھا کہ وہ اس کے چہرے کو واضح نہیں دیکھ پائی تھی تو پھر چہرے کے تاثرات کیسے دیکھ سکتی تھی۔ مگر اتنا ضرور نظر آگیا تھا کہ وہ اس کے برابر سر جھکائے ہوئے بیٹھا تھا۔

اور اس کا سر جھکا کر بیٹھنا علیزے کے لیے ایک اور حیرت تھی۔

"تمہیں کیا ہوا ہے ڈرائیور۔۔۔؟" آج پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ علیزے نے خود اس سے کچھ پوچھا تھا۔ وہ بھی صرف اس کے متعلق۔۔۔ یوں جیسے دونوں میں بڑے دوستانہ سے تعلقات ہوں۔

"میں ہمیشہ ہر عدالت میں ہر کیس جیت کے گھر آتا تھا علیزے۔۔۔ مگر آج۔۔۔ آج میں محبت کی عدالت میں دل کا کیس ہار کے گھر آیا ہوں۔۔۔ سب کچھ ہار آیا ہوں۔۔۔ سب کچھ چھوڑ آیا ہوں۔۔۔ علیزے۔۔۔ میں۔۔۔ میں دوستی پہ محبت وار آیا ہوں۔۔۔ آج۔۔۔ آج سب کچھ ختم کر آیا ہوں۔۔۔"

انتہائی بے بس انداز میں کہتے کہتے اس کا لہجہ گمبھیر ــــــــ ہو گیا تھا اور علیزے دم سادھے' آنکھیں پھیلائے بے یقین اور حیران پریشان نظروں سے اسے دیکھے جارہی تھی۔

اسے ہرگز یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ ساری باتیں ڈرائیور کہہ رہا ہے؟

"لیکن۔۔۔! تم تو آج اپنے دوست کی طرف دعوت پہ انوائٹ تھے تم تو وہاں گئے تھے؟"

علیزے کو پتا تھا کہ وہ اپنے دوست کے گھر دعوت پہ گیا ہوا ہے۔ اسے یہ انفارمیشن گل نے دی تھی۔

"ہونہہ۔۔۔! وہ میرے دوست کی طرف سے دعوت نہیں تھی۔ دل لگی تھی۔ دل داری تھی' جس میں اس نے اپنے دل کا بوجھ اٹھا کر میرے دل پہ ڈال دیا ہے اور کہتا ہے کہ اب اس بوجھ کو خوشی خوشی اٹھاؤ اور خوش نظر آؤ۔۔۔ لیکن۔۔۔ تم بتاؤ علیزے۔ جس دعوت میں انسان کو اپنے ہی دل کا خون پینا پڑے کیا وہ دعوت ہوتی ہے؟"

دل آور کی عجیب بہکی بہکی باتیں علیزے کو کچھ سمجھ نہیں آرہی تھیں۔ اسے بھلا کیا اندازہ ہو سکتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور کیا نہیں۔

"بتاؤ نا علیزے۔۔۔ کیا وہ دعوت ہوتی ہے؟" اس نے علیزے کی سمت گردن موڑتے ہوئے اسے بولنے پہ اکسایا تھا جواب دینے پر اصرار کیا تھا مگر وہ کیا بولتی؟ کیا جواب دیتی آخر۔۔۔؟ اس کے کچھ پلے پڑتا تب نا۔۔۔!

"خیر۔۔۔! میں بھی پاگل ہوں۔۔۔ تم سے پوچھ رہا ہوں۔۔۔ تم سے۔۔۔ جس کا کبھی دل سے اور دل کے کسی کیس سے واسطہ ہی نہیں پڑا۔ جسے پتا ہی نہیں ہے کہ عدالت کون سی ہے؟ جرم کس کا ہے؟ کیس کون سا ہے؟ مجرم کون ہوتا ہے اور مدعی کون کہلاتا ہے۔"

اس نے استہزائیہ سے انداز میں کہتے ہوئے سر جھٹکا تھا جیسے علیزے پہ مسکرا رہا ہو۔

"تم بہت اچھی لڑکی ہو علیزے۔۔۔ بہت اچھی۔ ان ساری باتوں سے کوسوں دور ہو۔۔۔ انجان ہو۔۔۔ آزاد ہو۔۔۔ پتا ہی نہیں کہ یہ سب کیا ہوتا ہے؟ رئیلی علیزے۔۔۔! بہت خوش قسمت ہو تم۔۔۔" دل آور کہتے کہتے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور دوبارہ اپنے قدم اندر کی سمت موڑ دیے تھے۔

"ڈرائیور۔۔۔!" اس نے پیچھے سے بے ساختہ اسے پکارا تھا اور دل آور کے قدم ایک پل کے لیے رک سے گئے تھے۔

"سوری یار۔۔۔! میں نے تمہیں خوامخواہ ڈسٹرب کر دیا۔۔۔ پلیز کیپ اٹ اپ۔۔۔"

وہ اس سے معذرت کر کے مزید رکے بغیر اندر چلا آیا تھا اور علیزے پیچھے دیکھتی رہ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"گڈ مارننگ آذر بھائی۔۔۔!" آذر صبح صبح تیار ہو کر سیڑھیاں اتر کے نیچے آ رہا تھا جب انوشہ اور کومل اچانک ہی سامنے آ گئی تھیں۔

"گڈ مارننگ۔۔۔!" جواباً" آذر نے بھی اسے وش کیا تھا۔

"کیسے ہیں آپ۔۔۔؟" یہ سوال کومل کی طرف سے آیا تھا اور آذر آگے بڑھتے بڑھتے ٹھہر گیا تھا۔

"ٹھیک ہوں۔۔۔! اللہ کا کرم ہے۔۔۔ آپ سنائیں۔" اسے بھی آخر فارمیلٹی تو نبھانی ہی تھی۔

"ہوں۔۔۔! میں بھی ٹھیک ہوں۔ ڈیڈ کیسے ہیں؟ گھر کب آئیں گے؟" کومل جان بوجھ کر بات کو طول دے رہی تھی آخر اتنے دنوں بعد دیکھا تھا اور موڈ بھی فریش تھا۔

"امید ہے آج شام تک ڈسچارج ہو جائیں گے۔ آپ سب بس دعا کریں ان کے لیے۔۔۔"

"لیکن آذر بھائی۔۔۔! مما تو آج اسپتال جانے کے لیے تیار ہیں۔ دانیال بھائی سے کہہ رہی تھیں کہ مجھے بھی ساتھ لے جانا۔" انوشہ کو ڈیڈ کے ڈسچارج ہونے کا سن کر عائشہ آفندی کا خیال آیا تھا۔

"ارے نہیں نہیں۔۔۔! اس کی ضرورت نہیں ہے، وہ آرام سے گھر پہ رہیں ڈیڈ آج ضرور گھر آجائیں گے۔ وہ گھر پہ ہی مل لیں گی ان سے۔۔۔" آذر نے ان کے جانے کا سن کر نفی میں سر ہلایا تھا۔

"یہ بات اب مما کو کون سمجھائے۔" انوشہ نے کندھے اچکائے تھے۔

"اوکے۔۔۔! میں بات کرتا ہوں ان سے۔۔۔ ابھی ناشتا کر لوں۔" وہ کہہ کر ڈائننگ روم کی طرف چلا آیا تھا۔

"گڈ مارننگ۔۔۔!" اس نے اسرار آفندی اور ثروت بیگم کو وش کیا تھا۔

"گڈ مارننگ۔۔۔! جیتے رہو۔۔۔ خوش رہو۔۔۔ بیٹھو یہاں۔۔۔" وہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھیں۔

"تھینک یو۔۔۔!" وہ ان کے برابر ہی کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا تھا۔

"آفس جا رہے ہو؟" انہوں نے اس کی تیاری دیکھ کر بڑی نرمی اور پیار سے پوچھا تھا۔

"نہیں۔۔۔! اسپتال جا رہا ہوں۔" اس نے جوس کا جگ اٹھاتے ہوئے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"کیوں۔۔۔؟ آج تو شاید بھائی صاحب اسپتال سے ڈسچارج ہو جائیں گے نا۔"

"جی۔۔۔! ہو جائیں گے۔۔۔ تو کیا ان کو پورے دن کے لیے اکیلا چھوڑ دیں؟ اور اسپتال کے جو بلز وغیرہ ہیں وہ کس نے کلیئر کرنے ہیں؟" وہ جوس کا گلاس اٹھاتے ہوئے الٹا ان سے پوچھ رہا تھا۔

"نہیں۔۔۔! میں تو بس اس لیے پوچھ رہی تھی کہ دانیال بھی شاید اسپتال ہی جا رہا ہے اس لیے تم آفس جاؤ گے۔" ثروت بیگم سمجھ گئی تھیں کہ آذر کو ان کا سوال برا لگا ہے اسی لیے انہوں نے جواباً" وضاحت پیش کی تھی۔

"میں آفس نہیں جاؤں گا دانیال آفس جائے گا۔ پہلے اسپتال جا کر ڈیڈ اور آنی سے ملے گا پھر آفس جائے گا البتہ میں ڈیڈ کے پاس ہی رہوں گا۔" آذر نے انہیں ذرا سمجھا کے بتایا تھا اور وہ سمجھ بھی گئی تھیں۔

"ہوں۔۔۔! اچھی بات ہے تمہارا جانا ضروری ہے تم انہیں ساتھ لے کر ہی گھر آنا۔ آفس کی فکر مت کرو میں بھی آفس ہی جا رہا ہوں۔" اسرار آفندی کہہ کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"عون اور عدید اسکول چلے گئے۔" آذر نے رجو سے استفسار کیا تھا آج کل آسیہ آفندی کی غیر موجودگی میں عون اور عدید کی ذمہ داری رجو پہ ہی تھی اور ان کے سارے کام وہی سر انجام دے رہی تھی۔

"جی۔۔۔! چلے گئے ہیں۔۔۔ مبارک خان لے گیا ہے ساتھ۔۔۔" رجو نے اثبات میں جواب دیا تھا۔

"ہوں۔۔۔! ٹھیک ہے میرے ناشتا ختم کرنے تک تم آنی کا ناشتا لے آؤ میں ساتھ لے جاؤں گا البتہ احمد اور زین گھر آ کر ناشتا کریں گے۔" آذر نے ناشتا شروع کرنے سے پہلے رجو کو ہدایت دی تھی اور وہ سر ہلاتے ہوئے واپس مڑ گئی تھی۔

"کب چلنا ہے تم نے۔۔۔؟" آذر کے عقب سے دانیال کی آواز ابھری تھی۔

"بس یہ ناشتا ختم کر لوں۔۔۔ کیوں؟ تمہیں کیا جلدی ہے؟" آذر نے ناشتے کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"مجھے جلدی نہیں ہے امی کو جلدی ہے وہ تیار کھڑی ہیں۔" دانیال نے بے چارگی سے کہا تھا۔

"لیکن دانیال عائشہ پھوپھو کیوں جا رہی ہیں؟ ڈیڈ آج گھر تو آ ہی جائیں گے۔ پھر جانے کا کیا فائدہ۔۔۔" آذر نے خفگی سے کہا۔

"فائدے اور نقصان کا مجھے نہیں پتا۔ بس وہ جانے پہ بضد ہیں اس لیے میں انہیں منع نہیں کر سکتا ہمیں کیا؟ ابھی چلی جائیں شام کو ڈیڈ اور آنی کے ساتھ ہی واپس آ جائیں گی۔"

دانیال نے کندھے اچکائے اور آذر اس کی بات پہ چپ ہو گیا تھا۔ پھر انہیں عائشہ آفندی کو ساتھ لے کر ہی اسپتال جانا پڑا تھا۔

☼ ☼ ☼

تم کس لیے چونکے ہو — کب تم سے شکایت ہے
کب ذکر تمہارا ہے — اک تازہ حکایت ہے
کب تم سے تقاضا ہے — سن لو تو عنایت ہے

وہ تکیے میں چہرہ چھپائے بیڈ پہ اوندھے منہ پڑا تھا لیکن رات سے اب تک ذہن میں بس یہی الفاظ بار بار چکرا رہے تھے اور اس کا دماغ اس حد تک بوجھل ہو رہا تھا کہ اس کا اپنے بیڈ سے اٹھنے اور باہر نکلنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا حالانکہ وہ اتنی دیر تک بستر میں پڑے رہنے کا عادی نہیں تھا، وہ تو صبح سویرے ہی بستر چھوڑ کے اٹھ جاتا تھا مگر آج پہلی بار وہ اتنا بے دل ہوا تھا کہ دنیا کو دیکھنے کو ہی دل نہیں مان رہا تھا۔ بہت دیر اسے یونہی پڑے پڑے گزر گئی تھی۔

اور جب بے چینی حد سے سوا ہوئی تو وہ یکدم کمبل ہٹا کر اٹھ بیٹھا تھا اور بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ رکھا سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر اٹھا کر سگریٹ سلگا لیا تھا، یونہی سگریٹ پھونکتے ہوئے موبائل پہ نظر پڑی تھی۔ اس کا دل چاہا وہ عبداللہ کو کال کرے مگر موبائل اسکرین پہ دو میسجز دیکھ کر اس نے کال کا ارادہ ترک کر دیا تھا کیونکہ یہ میسجز عبداللہ اور نبیل کے تھے وہ دونوں کراچی جانے کے لیے روانہ ہو چکے تھے، اور جانے سے پہلے انہوں نے باقاعدہ اسے میسجز کیے تھے اس لیے اب راستے میں انہیں کال کرنا فضول تھا۔

"دل آور۔۔۔! دروازہ کھولو بیٹا۔۔۔" وہ اپنے دھیان میں گم موبائل ہاتھ میں پکڑے دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں سگریٹ سلگائے بیٹھا تھا جب بتول شاہ کی پریشان آواز کے ساتھ دروازے پہ دستک بھی سنائی دی تھی۔

اور دل آور نے بے ساختہ چونکتے ہوئے سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دیا تھا اور اٹھ کر دروازہ کھول دیا تھا۔

"جی... !السلام علیکم۔" اس نے کافی ڈھیلے ڈھالے انداز میں سلام کیا تھا۔

"تم ابھی تک تیار نہیں ہوئے؟" بتول شاہ کافی پریشان اور عجلت میں لگ رہی تھیں۔

"کیوں... خیریت... ؟" اب کی بار دل آور بھی ٹھٹک گیا تھا وہ واقعی بہت پریشان لگ رہی تھیں۔

"ہوں... خیریت ہے بھی اور نہیں بھی... وہ دراصل ہمارے کالج کی ایک لیکچرار ہیں مسز وقاص آفریدی... آج صبح لاہور آتے ہوئے ان کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے وہ اس وقت اسپتال میں ہیں، اس لیے مجھے ابھی اسپتال پہنچنا ہے۔ ان کی بیٹی کی کال آئی تھی انہیں پتا تھا کہ میں لاہور آئی ہوئی ہوں۔" انہوں نے کافی گھبرائے ہوئے لہجے میں بتایا تھا اور دل آور کے تنے ہوئے اعصاب پھر سے ڈھیلے پڑ گئے تھے۔

"تو اس میں آپ کو اتنا گھبرانے کی کیا ضرورت ہے؟ گلاب خان کو اپنے ساتھ لیں اور اسپتال پہنچ جائیں۔"

"نہیں بیٹا، گھبرانے والی بات تو ہے نا... وہ دراصل پشاور کی رہنے والی ہیں۔ یہاں لاہور میں ان کا اور کوئی جاننے والا نہیں ہے اور اس مشکل وقت میں ان کی بیٹی نے مجھے آواز دی ہے۔ اس لیے میرا فرض بنتا ہے کہ میں "فوراً" سے پیشتر ان کے پاس پہنچوں۔"

انہوں نے اپنی پریشانی کی اصل وجہ بتائی تھی اور پھر دل آور کو بھی ان کی عجلت کی سمجھ آ گئی تھی۔

"ٹھیک ہے آپ گلاب خان کے ساتھ چلی جائیں۔ مجھے فی الحال آفس جا کر ایک کلائنٹ سے ملنا ہے اور فارغ ہوتے ہی میں بھی وہیں اسپتال ہی آ جاؤں گا۔"

دل آور نے ان کے کندھوں پہ ہاتھ رکھ کے انہیں تسلی دی تھی اور ہلکے سے مسکرا اٹھی تھیں۔ "جیتے رہو، سدا آباد رہو۔" وہ اس کی پیشانی چوم کر باہر نکل گئی تھیں اور دل آور کا دل نہ جانے کیوں لرز گیا تھا۔ وہ جب بھی کبھی انہیں اس طرح گہری نظر سے دیکھتا تھا تو اس کے دل پہ اسی طرح ایک سایہ سا لہرا جاتا تھا۔

"اماں... !" وہ بے ساختہ نہ چاہتے ہوئے بھی انہیں پکار بیٹھا تھا اور وہ سیڑھیاں اترتے اترتے ٹھہر گئی تھیں۔

"ہاں، کہو؟" وہ یوں ہی ریلنگ پہ ہاتھ رکھے ہوئے اس کی سمت مڑی تھیں۔ وہ اپنے بیڈ روم کے دروازے کی چوکھٹ میں کھڑا تھا۔

"میں آ جاؤں آپ کے ساتھ؟" اچانک ہی اس کا دل ان کے ساتھ جانے کو چاہا تھا۔

"ارے نہیں میری جان... تم ابھی آفس جا کر اپنے کلائنٹ سے ملو، پھر بعد میں آ جانا۔"

"لیکن اماں! میرا دل بہت اداس ہے۔ میں آپ کے ساتھ جانا چاہتا ہوں، باتیں کرنا چاہتا ہوں، کلائنٹ سے پھر مل لوں گا۔" دل آور نے بچوں کی طرح ان کے ساتھ جانے کی ضد کی تھی۔

"بری بات بیٹا! کام میں کوتاہی نہیں کرتے۔ کلائنٹ بھی آخر مجبور ہوتے ہیں اور تم تو وقت پہ کام کرنے کے عادی ہو۔ یہ سستی تمہیں سوٹ نہیں کرتی۔ شاباش تم آفس جاؤ، پھر وہاں سے اسپتال آ جانا۔" وہ کہہ کر اس کو نرمی سے دیکھتی ہوئی پلٹ کر سیڑھیاں اتر گئی تھیں اور دل آور ایک بار پھر لپک کر سیڑھیوں کی ریلنگ کے قریب آیا تھا۔

"آپ جا رہی ہیں؟" اس نے عجیب بے کل سے انداز میں بے تکا سا سوال کیا تھا۔

اور بتول شاہ راہداری کی سمت بڑھتے بڑھتے ایک بار پھر رک گئی تھیں اور سر اٹھا کر سامنے سیڑھیوں کی ریلنگ کے قریب کھڑے دل آور کو دیکھا تھا۔

"ہاں... جا رہی ہوں... کیوں؟ کوئی کام ہے کیا؟" انہوں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔ "ہاں، کام تو بہت سے ہیں مگر فی الحال آپ سے یہی پوچھنا تھا کہ آپ نے ناشتا کیا ہے یا نہیں؟" اس نے دھیمے مگر سنجیدہ انداز میں

پوچھا تھا اور بتول شاہ اس کی اس قدر فکرمندی پہ دیکھ کے رہ گئی تھیں۔

"نہیں، میں نے ناشتا نہیں کیا۔ صرف ایک کپ چائے کا لیا ہے، لیکن ڈونٹ وری، لنچ ایک ساتھ ہی کریں گے، اوکے؟" انہوں نے اسے مطمئن کرنے کے لیے بہلایا تھا۔

"ہوں! ٹھیک ہے، میں بھی ناشتا نہیں کرتا۔ لیکن ڈونٹ وری، لنچ ایک ساتھ ہی کریں گے، اوکے؟" اس نے بھی جواباً انہی کے سے انداز میں جواب دیا تھا۔ جس پہ بتول شاہ نے اسے خفگی سے گھورا تھا۔

"شاہ! یہ کیا ضد لگا رکھی ہے تم نے؟ مجھے جانے دو گے یا نہیں؟" وہ کافی خفگی سے بولی تھیں۔

اور دل آور کو ذرا دیر کے لیے سنبھلنا پڑا تھا۔ ورنہ وہ اس پہ غصہ بھی ہو سکتی تھیں۔

"اوکے! اب کچھ نہیں کہتا، جائیں آپ۔" اس نے ان کے جانے کے لیے رضامندی دے دی تھی۔

"نیچے آ کر ناشتا کرو اور آفس جاؤ، اللہ حافظ۔" وہ پھر اسے اللہ حافظ کہہ کر آگے بڑھ گئی تھیں اور دل آور پھر سے مضطرب ہوا تھا۔ اس کا دل پھر سے ان کے پیچھے لپکنے کو چاہا تھا اور اس نے پھر سے اس چاہ کو پورا کیا تھا۔

اور تیزی سے دھڑ دھڑ کرتا سیڑھیاں اترتا ہوا نیچے آ گیا۔ اس کے قدم بتول شاہ کے پیچھے پیچھے ہی اٹھ رہے تھے اور وہ باہر ڈرائیو وے تک آ گیا تھا۔ جبکہ بتول شاہ گاڑی کے قریب پہنچ چکی تھیں۔

"اماں..." اس نے مین ڈور کے سامنے والی سیڑھیاں اترتے ہوئے پھر پکارا تھا اور گاڑی کا دروازہ کھولتی بتول شاہ خفگی سے جھنجلا کر واپس مڑی تھیں۔

"ہوں... اب کیا ہوا ہے؟" وہ دل آور کو سر تا پا دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔

"پلیز اماں اور کچھ نہیں کہنا، بس صرف اتنی سی بات کہنی ہے کہ آپ مجھے آج ایک کام کی اجازت دے دیں صرف ایک کام کی اجازت، پلیز۔"

وہ ان کے قریب عین ان کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا اور بتول شاہ اس کی اتنی سنجیدگی پہ ٹھٹک گئیں۔

"کیسی اجازت؟ کس کام کی اجازت؟" وہ کافی الجھے ہوئے اور نا سمجھ سے انداز میں پوچھ رہی تھیں۔

"علیزے کو بڑی حویلی چھوڑنے کی اجازت، پلیز اماں، آپ صرف ایک بار اجازت دے دیں۔ بس پھر سارا معاملہ ختم ہو جائے گا۔ میں اسے آج ہی بڑی حویلی چھوڑ آؤں گا۔ پلیز، پھر آپ جو بھی کہیں گی میں کروں گا، کبھی آپ کے سامنے انکار نہیں کروں گا۔ کبھی کسی بات پہ "اف" بھی نہیں کروں گا۔ پلیز، ایک بار اسے چھوڑنے کی اجازت دے دیں۔"

دل آور نے انہیں کندھوں سے تھامتے ہوئے جیسے التجا سی کی تھی۔ وہ آج کے دن ان سے یہ بات منوا لینا چاہتا تھا۔ تاکہ وقار آفندی کے ڈسچارج ہونے کے ساتھ ہی وہ اسے بھی بڑی حویلی چھوڑ آتا۔

لیکن بتول شاہ اس کی بات سن کر چپ سی ہو گئی تھیں۔ وہ آخر کیسے یوں کھڑے کھڑے اجازت دے دیتیں کہ چلو ٹھیک ہے، جاؤ جا کر علیزے کو چھوڑ آؤ۔ آخر انہیں بھی تو کچھ وقت چاہیے تھا۔ کچھ سوچنے کے لیے، کچھ سمجھنے کے لیے، جبکہ وہ تھا کہ ہتھیلی پہ سرسوں جما رہا تھا۔

"میری واپسی کا انتظار کرو، آج شام تک یہ فیصلہ بھی ہو جائے گا۔" وہ اپنے کندھوں سے اس کے ہاتھ ہٹاتے ہوئے خاصے فیصلہ کن لہجے میں بولی تھیں اور پھر آگے بڑھ کے گاڑی کے کھلے ہوئے دروازے سے اندر بیٹھ گئی تھیں۔ گلاب خان پہلے ہی ڈرائیونگ سیٹ پہ تیار بیٹھا تھا اور بتول شاہ کے بیٹھتے ہی اس نے گاڑی اسٹارٹ کر لی تھی۔

اور دل آور کے دیکھتے ہی دیکھتے گاڑی آہستہ آہستہ پیچھے سرکتی ہوئی گیٹ سے نکلی اور آنکھوں سے اوجھل ہو گئی تھی اور وہ بت بنا وہیں کھڑا رہ گیا تھا۔

بتول شاہ دل آور کی باتوں میں الجھ کر مطلوبہ اسپتال کا نام ہی بھول گئی تھیں۔

اور اپنے اندازے کے مطابق ہی دو، تین اسپتالز کے چکر کاٹ لیے تھے۔ مگر مسزوقاص آفریدی کا انہیں کہیں بھی پتا نہیں چلا تھا اور جس نمبر سے ان کی بیٹی کی کال آئی تھی وہ نمبر بار بار ٹرائی کرنے پر بھی بزی جا رہا تھا۔ بتول شاہ گاڑی میں بیٹھی بری طرح جھنجلا رہی تھیں اور ان کے ساتھ گلاب خان بھی خوار ہو رہا تھا۔ وہ بھی تقریباً" ہر اسپتال میں اس نام کی خاتون کا پتا کرتا پھر رہا تھا مگر پتا ندارد۔

"بیگم صاحبہ! میرا خیال ہے آپ گھر چلی جائیں اور نام و پتا مجھے دے دیں، میں اور بھی اسپتالوں میں جا کر پتا کر لیتا ہوں۔ جب معلوم ہو گیا تو بعد میں آپ کو بھی لے آؤں گا۔"

گلاب خان نے بتول شاہ کی پریشانی کے خیال سے انہیں گھر جانے کا مشورہ دیا تھا۔

مگر بتول شاہ اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے مایوس ہو کر واپس نہیں جا سکتی تھیں۔ کیونکہ اس وقت ان کی کولیگ کی زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔ وہ اس طرح یہ کام اپنے گھر کے ملازم کے ذمے لگا کر خود گھر جانے کو ہرگز تیار نہیں تھیں۔

"فی الحال یہ جو سامنے اسپتال ہے۔ تم وہاں گاڑی روکو۔ میں خود پتا کرتی ہوں۔" انہوں نے سامنے نظر آتے ایک بڑے سے اسپتال کی بلند و بالا عمارت کی طرف اشارہ کیا تھا اور گلاب خان دیکھ کے رہ گیا تھا۔

"بیگم صاحبہ۔ ایکسیڈنٹ کے زخمی کو اتنے بڑے اسپتال میں کبھی بھی نہیں لایا جاتا یا تو لوگ اٹھا کر سرکاری اسپتال لے جاتے ہیں یا پھر کسی چھوٹے موٹے پرائیویٹ اسپتال لے جاتے ہیں۔ بڑے بڑے اسپتالوں میں تو قدم رکھنے کی بھی فیس ادا کرنا پڑتی ہے۔ اس لیے ادھر کا کوئی بھی رخ نہیں کرتا۔"

گلاب خان نے واقعی ایک سمجھ دار ملازم ہونے کا ثبوت پیش کیا تھا مگر وہ بھی سمجھتیں تب نا؟

"لیکن پتا کر لینے میں کیا حرج ہے بھلا؟" انہوں نے اپنی کہی تھی۔

"جی ٹھیک ہے۔ جیسے آپ کی مرضی۔" گلاب خان نے تابعداری سے کہتے ہوئے گاڑی اسپتال کی پارکنگ میں روک دی تھی اور تیزی سے نیچے اتر کر بیک ڈور کھول دیا تھا اور وہ بھی گاڑی سے اتر آئی تھیں۔ اسپتال کی وسیع و عریض پارکنگ کا احاطہ اور ڈرائیو وے کا طویل راستہ تیز تیز قدموں سے طے کرتی ہوئی وہ سیدھی اسپتال کے ریسپشن تک جا پہنچی تھیں۔

وہاں پہلے سے ہی بہت رش تھا۔ کان پڑی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ لیکن پھر بھی بتول شاہ بہت سے لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتی ہوئی ریسپشن پہ کھڑی لڑکی تک پہنچ ہی گئی تھیں۔ جو پہلے ہی اتنے سارے لوگوں کی وجہ سے گھبرائی ہوئی تھی۔

"مسز وقاص آفریدی نام کی پیشنٹ کا پتا کرنا ہے۔ کیا وہ اسی اسپتال میں ہیں؟"

بتول شاہ نے اس لڑکی کو بڑی مشکل سے اپنی طرف متوجہ کیا تھا اور اس لڑکی نے بے دھیانی سے سر ہلا دیا تھا۔

"یس میڈم۔ وہ اسی اسپتال میں ہیں۔" اس نے ایک نظر سامنے رکھے رجسٹر کو دیکھا تھا۔ "کہاں ہیں وہ؟" بتول شاہ کو جیسے ایک دم سے کچھ تسلی اور ڈھارس مل گئی تھی۔

"جی۔ روم نمبر ایک سو تین۔ سیکنڈ فلور۔" اس لڑکی نے جلدی جلدی بتا کر رجسٹر بند کر دیا تھا اور دوسرے ہنگامہ مچاتے لوگوں کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ حالانکہ پہلے اس ریسپشن پہ تین لڑکیاں آن ڈیوٹی ہوتی تھیں۔ لیکن اس وقت وہ بے چاری اکیلی پھنسی ہوئی تھی اور اتنے زیادہ لوگوں کو گائیڈ کر کر کے اس کے حواس اڑے ہوئے تھے۔ مگر بتول شاہ یہ نہیں جانتی تھیں کہ ان کی اپنی جلد بازی اور عجلت کے ساتھ ساتھ اس لڑکی کی یہ بے دھیانی اور اڑے حواس انہیں کہاں سے کہاں لے جائیں گے؟

زندگی کا ایک ایسا مقام اور ایک ایسا لمحہ، جس سے بچتے ہوئے اور جس سے بھاگتے ہوئے ایک زندگی ہوگئی تھی۔ آج وہی مقام اور وہی لمحہ ان کے سامنے آگیا تھا۔

وہ اپنی عجلت میں سیکنڈ فلور کے روم نمبر ایک سو تین کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تھیں اور سامنے بیڈ پہ نظر آتے وجود کو دیکھتے ہی پتھر کی ہوگئی تھیں۔ حالانکہ سامنے نظر آتا وجود بھی پتھر کا ہی تھا۔ بس فرق صرف اتنا تھا کہ وہ وجود بستر پہ پڑا تھا اور بتول شاہ ابھی اپنے پتھرے وجود کو لیے اپنے قدموں پہ کھڑی تھیں۔ مگر کس طرح کھڑی تھیں؟ یہ شاید وہ بھی نہیں جانتی تھیں۔

"ز۔۔۔ ز۔۔۔ ہ۔۔۔ ؟" وقار آفندی پہ جیسے نزع کا وقت آن پہنچا تھا۔ ان کی زبان اور ان کے جسم پہ اک لرزا سا طاری ہو گیا تھا اور ٹشو سے ان کا منہ صاف کرتی آسیہ آفندی نے یک دم چونک کر اپنے پیچھے دیکھا تھا اور اپنے پیچھے دیکھتے ہی ان کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

"زہرہ؟" آسیہ آفندی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے لپک کر ان کے قریب آئی تھیں۔

"زہرہ۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ میں کیا دیکھ رہی ہوں؟ یہ۔۔۔ تم ہی ہو نا؟ تم۔۔۔ تم کہاں چلی گئی تھیں؟"

آسیہ آفندی نے بتول شاہ کے پتھر وجود کو اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا تھا لیکن بتول شاہ جواباً" کچھ بھی نہیں کہہ سکی تھیں۔ وہ تو جیسے بے حس و حرکت سی کھڑی تھیں۔

"السلام علیکم!" اتنے میں دانیال اور آذر عائشہ آفندی کا چیک اپ کروا کر وہیں آ گئے تھے۔ لیکن ان کے وہاں آنے تک وقار آفندی کے روم کا منظر بدلا ہوا تھا۔ وہاں جو چہرہ نظر آ رہا تھا۔ وہ ان سب کے لیے ہی ناقابل یقین تھا۔ خصوصاً" عائشہ آفندی اور وقار آفندی کے لیے۔

"زہرہ؟" عائشہ آفندی بے ساختہ خوشی اور اشتیاق کے مارے بتول شاہ کے گلے لگ گئی تھیں اور عائشہ آفندی کا یہ گلے لگنا بتول شاہ کو بائیس سال پیچھے لے گیا تھا اور وہ یک دم کرنٹ کھا کے پیچھے ہٹی تھیں۔۔۔ مگر عائشہ آفندی نے ان کا اس طرح پیچھے ہٹنا نوٹ ہی نہیں کیا تھا۔

"زہرہ! کہاں چلی گئی تھیں تم؟ میں نے تمہیں کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا؟ کہاں کہاں نہیں گئی میں؟ میں پاگل ہو گئی تھی تمہارے لیے۔ مگر تم کہیں نہیں ملیں۔ تمہیں بھی نہیں کیا اس طرح گم ہو جاتے ہیں؟ کہ اپنوں کو خبر بھی نہ دیں؟ کیا تمہیں کبھی میرا خیال بھی نہیں آیا؟ کیا تم نے کبھی یہ بھی نہیں سوچا کہ تمہاری عائشہ پہ کیا گزری ہوگی؟"

عائشہ آفندی بتول شاہ کو دونوں کندھوں سے تھامتے ہوئے رو پڑی تھیں۔

اور بتول شاہ نے پتھرائی ہوئی نظروں سے پہلے وقار آفندی کو، پھر آسیہ آفندی کو، پھر عائشہ آفندی کو اور پھر آذر اور دانیال کو دیکھا تھا۔ ان سب کی نظریں بھی بتول شاہ پہ ہی تھیں۔

"کس پہ کیا گزری؟ میں سب جانتی ہوں، مگر مجھ پہ کیا گزری، یہ کوئی بھی نہیں جانتا۔۔۔ تم بھی نہیں۔" انہوں نے عائشہ آفندی کے ہاتھ نرمی سے پکڑ کر پیچھے ہٹا دیے تھے اور ادھر وقار آفندی کے منہ سے خاصی بلند قسم کی کراہ نکلی تھی۔ انہوں نے اٹھنا چاہا تھا مگر بے بسی آڑے آ گئی تھی۔ وہ زہرہ بتول شاہ سے کچھ کہنا چاہتے تھے۔ مگر کہہ نہیں پا رہے تھے۔

"ز۔۔۔ ز۔۔۔ ہ۔۔۔ م۔۔۔ م۔۔۔ معا۔۔۔ ف۔۔۔ ی۔"

وقار آفندی کے منہ سے نکلنے والے ٹوٹے بکھرے الفاظ تھے جو بتول شاہ کو بھی توڑ کے رکھ گئے تھے اور وہ یک دم اک جھٹکے سے واپس جانے کے لیے مڑی تھیں۔ لیکن انہیں واپس مڑتے دیکھ کر وہ سب ہی پریشان ہو گئے تھے۔

"زہرہ آنٹی! پلیز رکیے، کہاں جا رہی ہیں آپ؟" آذر یک دم ان کے راستے میں حائل ہو گیا تھا۔

"پلیز آنٹی! آپ بیٹھ کر بات کریں۔ آخر ہوا کیا تھا؟" دانیال بھی سامنے آگیا تھا۔

لیکن بتول شاہ کا یہاں رکنا انگاروں پہ لوٹنے کے برابر تھا اور وہ انگاروں پہ کیسے ٹھہر سکتی تھیں؟ اس لیے وہاں موجود سبھی نے انہیں روکنے کی پوری پوری کوشش کی تھی۔ مگر وہ وہاں رک نہیں سکی تھیں اور دیکھتے دیکھتے ہی وقار آفندی کی حالت ایک دم سے ابتر ہو گئی تھی۔ آسیہ آفندی اور آذر وغیرہ ان کی طرف لپکے تھے اور ادھر عائشہ آفندی تھیں جو زہرہ بتول شاہ کے پیچھے انہیں پکارتی ہوئی سیڑھیاں اتر آئی تھیں۔ مگر بتول شاہ کی سماعتوں میں گونجتی چیخوں کے سوا انہیں کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ کسی آندھی طوفان کی طرح اسپتال کے احاطے سے باہر نکلی تھیں۔

"زہرہ پلیز... رکو تو سہی، مجھے بتاؤ تو سہی کیا ہوا تھا۔ تم کیوں چلی گئی تھیں؟ پلیز رکو، زہرہ خدا کے لیے میری بات تو سنو۔"

عائشہ آفندی ان کے پیچھے پیچھے انہیں پکارتی ہوئی آ رہی تھیں اور بتول شاہ اندھا دھند تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی پارکنگ میں اپنی گاڑی کی طرف جانے کی بجائے باہر روڈ کی سمت آ گئی تھیں۔ ان کا چہرہ جھکا ہوا تھا۔ آنسو زار و قطار بہہ رہے تھے۔ سماعتوں میں اپنی ہی چیخوں کا شور گونج رہا تھا اور سامنے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا کہ وہ اس وقت کہاں ہیں؟ اور کس طرف جا رہی ہیں؟ لیکن پیچھے عائشہ آفندی ہانپ گئی تھیں۔ ان کو پکار پکار کر تھک گئی تھیں۔ مگر ہوا وہی تھا جو قسمت میں ازل سے لکھ دیا گیا تھا۔ حالانکہ ان کو سڑک کی طرف بھاگتے دیکھ کر گلاب خان بھی گاڑی وہیں چھوڑ کر ان کے پیچھے بھاگا تھا۔

لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی تھی اور فضا میں ان کی چیخ کی آواز اور ٹائر چرچرانے کی آواز گونجتی رہ گئی تھی۔ گاڑیوں کے اتنے اژدھام میں دو گاڑیاں آپس میں ٹکراتے ٹکراتے بچی تھیں اور تیسری گاڑی بتول شاہ کو روندتی ہوئی گزر گئی تھی۔ مگر ہر طرف یک دم سناٹا سا چھا گیا تھا۔

گلاب خان اور عائشہ آفندی پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتے رہ گئے تھے۔

✵ ✵ ✵

"اماں..."

وہ اپنے آفس میں بیٹھا بتول شاہ کا نمبر ڈائل کر رہا تھا۔ جب اچانک ہی اس کے ہاتھ سے موبائل چھوٹ کر نیچے کارپٹ پہ جا گرا تھا اور اس کے منہ سے بے ساختہ ہی اماں کا لفظ ادا ہوا تھا۔

وہ صبح سے ہی بڑا اپ سیٹ تھا۔ اس لیے موبائل کے یوں ہاتھ سے چھوٹنے پہ اور زیادہ مضطرب ہو گیا تھا اور اس نے فوراً موبائل اٹھا کر دوبارہ ان کا نمبر ڈائل کیا تھا۔ مگر ان کے نمبر پہ کوئی رنگ نہیں جا رہی تھی۔ دو، تین بار ٹرائی کرنے کے بعد اس نے گلاب خان کے نمبر پہ ٹرائی کیا تھا۔

اور تین، چار مرتبہ رنگ بجنے کے بعد گلاب خان نے کال ریسیو کر لی تھی۔ لیکن پیچھے بہت زیادہ شور سنائی دے رہا تھا اور اس شور کے درمیان کھڑا گلاب خان رو رہا تھا۔

"گلاب خان... کہاں ہو تم؟ اماں کہاں ہیں؟" دل آور کو عجیب سی بے چینی ستا رہی تھی۔

"صاحب... وہ... وہ بیگم صاحبہ کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ صاحب آپ جلدی پہنچو، ورنہ دیر ہو جائے گی۔"

گلاب خان نے روتے ہوئے بڑی مشکل سے اسے بتایا تھا اور دل آور یک دم اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کے کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی تھی اور وہ روح تک کانپ گیا تھا۔

"گلاب خان! اماں کو زیادہ چوٹیں تو نہیں آئیں؟" یہ سوال پوچھتے ہوئے اس کی آواز لرز رہی تھی کہ مبادا اسے کچھ اور ہی سننے کو نہ مل جائے۔

"بہت چوٹیں آئی ہیں صاحب... بہت چوٹیں آئی ہیں... بس اللہ سے ان کی زندگی کی خیر مانگیں۔"

گلاب خان دکھ اور اذیت سے بتاتے ہوئے بلک رہا تھا اور دل آور کو یوں لگا تھا کہ جیسے اس کے دل و دماغ کا دھواں نکل گیا ہو اور ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا چھا گیا ہو۔ پھر اس کے بعد اسے نہیں خبر تھی کہ اس کے ہاتھ سے موبائل کب گرا تھا؟ اسے ٹھوکر کہاں لگی؟ وہ گاڑی تک کیسے پہنچا تھا اور اس نے یہ سارا سفر کب اور کیسے طے کیا تھا؟ اس کا دماغ بس گھوم رہا تھا اور پوری دنیا میں جیسے تاریکی چھائی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

✵ ✵ ✵

وہ اسپتال کی راہداری میں بلبلائے ہوئے شیر کی طرح چکر کاٹ رہا تھا۔

صبح سے شام ہو گئی تھی۔ لیکن بتول شاہ کو ابھی تک ہوش نہیں آیا تھا۔ وہ آئی سی یو میں مسلسل زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہی تھیں۔ لیکن نہ زندگی جیت رہی تھی اور نہ موت ہارنے کو تیار تھی۔

اور دل آور شاہ کی حالت ایسی تھی کہ جیسے جان نزع پہ آئی ہوئی تھی۔ جیسے اب نکلی کہ تب نکلی۔ وہ صبح سے اب تک اس ایک راہداری میں چکر کاٹ کاٹ کر پاگل ہو گیا تھا۔ گلاب خان اور اس کے سوا کسی تیسرے کو ابھی تک اس ایکسیڈنٹ کی خبر نہیں تھی اور ابھی وہ نبیل اور عبداللہ کو فون کر کے بتانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک ایک ڈاکٹر اور نرس آئی سی یو کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئے تھے اور دل آور تیزی سے ان کے قریب آیا تھا۔

"مبارک ہو! آپ کی مدر ہوش میں آ چکی ہیں۔ آپ تھوڑی دیر کے لیے ان سے مل سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ اس وقت زیادہ بات کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔"

ڈاکٹر نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے اسے تسلی دی تھی اور دل آور کے ساتھ ساتھ گلاب خان نے بھی اللہ کا شکر ادا کیا تھا اور پھر وہ تیزی سے آئی سی یو کی سمت بڑھ گیا تھا۔

"اماں!" دل آور کی دبنگ قسم کی آواز اس وقت بے حد دھیمی اور بے جان سی لگ رہی تھی۔ وہ مرے مرے قدموں سے چلتا ہوا ان کے بیڈ کے قریب آ کھڑا ہوا تھا۔ ان کا پورا جسم سفید پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا۔ دو، دو ڈرپس لگی ہوئی تھیں۔ چہرے پہ خراشوں کے نشان نظر آ رہے تھے اور انتہائی اذیت سے بند پلکوں کو انہوں نے بڑی مشکل سے کھولتے ہوئے دل آور کی سمت دیکھا تھا۔

اور چہرے پہ ایک درد سے گندھی ہوئی مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہو گئی تھی۔

"تمہیں پتا تھا نا، آج میری زندگی کا آخری دن ہے۔ اس لیے مجھے جانے سے روک رہے تھے؟ اور... اور مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ میرا بیٹا کیا چاہ رہا ہے؟ کیوں بے چین ہو رہا ہے؟ ہونہہ... اور میں سمجھ ہی نہیں سکی۔" بتول شاہ بڑی مشکل سے اپنی باقی ماندہ ہمتیں مجتمع کرتے ہوئے اس سے بات کرنے کی کوشش کر رہی تھیں ورنہ درد اور تکلیف اتنی تھی کہ "اف" بھی کرنا مشکل لگ رہا تھا۔

"پلیز اماں... ایسا کچھ مت کہیں... آپ ان شاء اللہ جلدی ٹھیک ہو جائیں گی۔ آپ نے ہر حال میں ٹھیک ہونا ہے، صرف میرے لیے، میرے لیے جینا ہے آپ نے، ورنہ اکیلا ہو جاؤں گا، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اکیلا۔" دل آور نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا تھا۔ اس کی آواز کافی بھیگی ہوئی لگ رہی تھی۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں... میں... تمہیں اکیلا چھوڑ کے کیسے جا سکتی ہوں بھلا؟ اب تک جو زندہ ہوں، تو تمہارے لیے ہی تو زندہ ہوں ورنہ تم جانتے ہو کہ نہ جانے کب کی مر گئی ہوتی؟"

بتول شاہ کے آنسو نہ چاہتے ہوئے بھی کنپٹیوں تک بہہ نکلے تھے اور دل آور کا دل مٹھی میں آ گیا تھا۔

"لیکن اماں! آپ کو اب بھی جینا ہے، اب بھی زندہ رہنا ہے، میری خاطر، صرف میرے لیے، میری زندگی میں اور ہے ہی کون، صرف آپ کے سوا؟ آپ کے بغیر تو میرے لیے زندگی کا تصور بھی سوہان روح ہے۔" دل آور نے کہتے ہوئے اپنے دائیں ہاتھ سے ان کی آنکھوں سے آنسو صاف کیے تھے۔ مگر اب ان آنسوؤں کو رستہ مل گیا تھا۔ وہ تھم ہی نہیں رہے تھے۔

"نہیں بیٹا! زندگی میں کوئی بھی ہمیشہ ساتھ نہیں رہتا... نہ ماں' باپ... نہ اولاد... اور نہ ہی دوست احباب... ایک نہ ایک دن سب ساتھ چھوڑ جاتے ہیں... لیکن کوئی فرق نہیں پڑتا۔ زندگی بس چلتی ہی رہتی ہے۔" بتول شاہ کہتے کہتے ذرا دیر کے لیے سانس لینے کو رکی تھیں۔ ان کی سانس اکھڑنے لگی تھی۔ "میں جانتی ہوں رشتوں کے حوالے سے تمہارا دامن بالکل کورا ہے' بالکل خالی ہے... نہ بہن بھائی' نہ کزن' نہ کوئی اور رشتہ دار... کچھ بھی تو نہیں ہے تمہارے پاس... تم نے ساری زندگی میرے ساتھ' میری طرح تنہا گزار دی' زری کو چاہا اور وہ چاہ بھی پوری نہ ہو سکی۔ میرے لیے اس سے بڑی دکھ کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ میرے دل آور کو زری ہی نہ مل سکی۔ وہ زری جس کو میں نے ہزاروں بار دلہن بنے تیرے پہلو میں کھڑے دیکھا ہے۔ ہزاروں بار اسے اپنی بہو کے روپ میں اس کے ماتھے پہ بوسہ دے کر اپنے سینے سے لگایا ہے اور کل اسی زری کو نبیل کا سمجھ کر دل کی بات ہی نہیں کی اور تم کہتے ہو کہ میرے بغیر زندگی کا تصور بھی سوہان روح ہے۔ ہونہہ... تم زری کے بغیر رہ سکتے ہو تو پھر بتول شاہ کے بغیر بھی رہ سکتے ہو۔ کیونکہ مجھے پتا ہے کہ تمہارا بہت بڑا جگرا ہے۔ تم اپنے دل سے ٹکرا سکتے ہو تو پوری دنیا سے ٹکرا سکتے ہو اور تمہارے ان ہی حوصلوں کو دیکھ کر یہ کہنے کا حوصلہ کیا ہے کہ پلیز علیزے سے نکاح کرلو۔ اس کی زندگی داغ دار ہونے سے بچالو۔ مجھے سرخرو کردو' میری قبر پہ علیزے کی آہوں کا بوجھ مت ڈالو... ورنہ مجھے قبر کا سکون بھی نصیب نہیں ہوگا۔"

بتول شاہ نے بالآخر اسے کہہ ہی دیا تھا۔ مگر تب تک ان کا تنفس تیز ہو چکا تھا اور ان کی سانسوں کی یہ رفتار دیکھ کر نرس نے یک دم تمام ڈاکٹرز کی ٹیم کو الرٹ کردیا تھا۔

"اماں! آپ ٹھیک تو ہیں نا' کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ ادھر میری طرف دیکھیں۔"

ان کی ایسی حالت دیکھ کر دل آور کے چھکے چھوٹ گئے تھے۔ اسے اپنی نظروں کے سامنے زمین و آسمان چکراتے ہوئے نظر آئے تھے۔ ڈاکٹرز نے اس کے ہاتھ سے بتول شاہ کا ہاتھ چھڑالیا تھا اور دل آور کو لگا جیسے انہوں نے اس کے ہاتھ سے زندگی کا دامن چھڑالیا ہو۔

"سر پلیز... آپ فی الحال تھوڑی دیر کے لیے باہر چلے جائیں؟" ڈاکٹر نے کافی پریشانی اور عجلت میں اسے باہر جانے کا کہا تھا۔ مگر دل آور باہر کیسے جاتا۔ اس کا دل بتول شاہ کی طرف کھنچ رہا تھا۔

"آیئے سر! آپ باہر آجایئے۔" نرس اسے زبردستی چھوڑنے کے لیے باہر دروازے تک آئی تھی اور پھر دروازہ بند کردیا گیا تھا۔

"شاہ..." بتول شاہ نے جیسے تڑپ کے پکارا تھا۔ انہوں نے آئی سی یو سے باہر نکلتے دل آور کی پشت دیکھی تھی اور انہیں یوں لگا کہ جیسے وہ ہمیشہ کے لیے ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا ہو۔ اسی لیے وہ تکلیف کے باوجود تڑپی تھیں۔ مگر ڈاکٹرز نے ان کی کنڈیشن کور کرنے کے لیے انجکشن دینے شروع کردیے تھے۔ لیکن وہ اب زندگی کے اس سنگین اسٹیج پر تھیں۔ جہاں ان پہ بے ہوشی اور غنودگی کا انجکشن بھی اثر نہیں کررہا تھا اور وہ اپنی کراہوں کے درمیان ڈاکٹرز سے التجا کررہی تھیں۔

"پپ پلیز ڈاکٹر صاحب... صرف... صرف... ایک بار... میرے شاہ کو بلادیں... مجھے صرف ایک بار دیکھ لینے دیں۔" بتول شاہ کی بات سے ڈاکٹرز کا دل بھی جیسے دکھ سے بھر گیا تھا اور انہوں نے ساری ٹریٹ منٹ کچھ دیر کے لیے ترک کرتے ہوئے دل آور شاہ کو اندر بلالیا تھا۔

"اماں! اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟ تکلیف کم ہوئی یا نہیں۔" وہ لپک کے پاس آیا تھا۔

"تکلیف... کم... ہو سکتی ہے... اگر... تم... کرو... تو؟" بتول شاہ نے ہاتھ اٹھا کر اس کے چہرے کو چھونے کی کوشش کی تھی۔ مگر ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ اس لیے ہاتھ وہیں کا وہیں رہ گیا تھا۔

"ہاں... ہاں... میں کروں گا ضرور کروں گا۔ آپ کہیں کیا بات ہے؟" اس نے فوراً" اثبات میں سرہلایا تھا اور ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کر اپنے ہونٹوں سے لگالیا تھا۔

"میں... میں... نے... آج... دد... وقار... آفندی... کی حالت... دیکھی ہے... دد... دد... اپنی سزا... اسی... دنیا... میں... بھ... بھگت... چکا... ہے... تت... تم... اب... علیز... ے... کو... سزا... مت... دد... میرا... خدا... گواہ... ہے... میں نے... آج... وقار... آفندی... کو معاف کیا... معاف کیا میں نے۔"

بتول شاہ کے الفاظ سے عرش فرش کانپ گئے تھے اور دل آور شاہ تو جیسے کھڑے قد سے ڈھے گیا تھا۔ اس کی ماں زندگی کی تلخیوں کا آج ایک اور پیالہ پی گئی تھی اور وہ زندگی اور موت کے پل صراط پہ جھولتی بتول شاہ کو دیکھ کے رہ گیا تھا۔ دل آور کی سرخ آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے اور وہ انہی آنسوؤں کے درمیان انہیں ہی دیکھتا جارہا تھا۔

"دیکھو... مجھے... میری... قبر کی... اذیت... سے آزاد... کردو... پ... سکون... کردو... مجھے... زری... کو... تو... تم... چھوڑ ہی چکے... ہو... علیز... ے... کو اپنالو... میری خاطر... نکاح... کر... لو... اس سے... آج ہی... ابھی... میری... نظروں... کے سامنے... پھ... پھر... کوئی... دکھ... کوئی اذیت... نہیں رہے گی... تاقیامت... سکون... میں آجاؤں... گی... اور... کچھ... نہیں... تو... میرے... ہاتھوں کی لاج رکھ... لو۔"

انہوں نے انتہائی مشکل سے اٹک اٹک کر' ٹھہر ٹھہر کر اپنی بات مکمل کی تھی اور بہتے آنسوؤں کے ساتھ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے اور دل آور نے تڑپ کر ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے تھے۔ پھر ان کے ہاتھوں کو بڑے ضبط سے تھپک کر یک دم پلٹا اور آئی سی یو سے باہر نکل گیا تھا اور اسے اس طرح باہر نکلتے دیکھ کر گلاب خان بڑی تیزی سے اس کے قریب آیا تھا۔

"کیا بات ہے صاحب؟ سب ٹھیک تو ہے نا؟ بیگم صاحبہ کیسی ہیں اب؟ زیادہ پریشانی کی بات تو نہیں ہے نا؟" گلاب خان خاصا متفکر اور پریشان نظر آرہا تھا۔ کیونکہ دل آور کی حالت ہی کچھ ایسی دکھائی دے رہی تھی۔ "گلاب خان' تم گھر جاؤ... اور... علیزے کو لے کر آؤ' اسے بتاؤ جاکر کہ میں نکاح کی تیاری کیے بیٹھا ہوں۔" اس نے جواباً" جو کچھ کہا تھا وہ گلاب خان کو حیران پریشان کردینے کے لیے کافی تھا۔ مگر اس میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ اس سے کوئی سوال کرتا۔ اس لیے فوراً" سر جھکا کر حکم کی تعمیل کرتا پلٹ کر چلا گیا تھا۔

✡ ✡ ✡

وہ بیسمنٹ کے فرش پہ لگے بستر پہ لیٹی' چہرے پہ کلائی رکھے اپنے گھر کی چار دیواری میں موجود اپنے تمام رشتوں کو سوچتی ہوئی ان کے درمیان سانس لے رہی تھی' ان کو محسوس کررہی تھی' ان کے ساتھ جی رہی تھی جب اچانک کسی کے قدموں کی آہٹ پہ یک دم چونک سی گئی تھی اور اپنے ہنستے بستے گھر کی چار دیواری سے ایک پل میں دل آور شاہ کے بیسمنٹ میں آپہنچی تھی اور اس نے اپنے چہرے سے کلائی ہٹا کر فوراً" سامنے دیکھا تھا۔ اس کے سامنے گلاب خان سر اور نظریں جھکائے ہوئے کھڑا تھا اور زبان سے چپ تھا مگر علیزے کو اس وقت اس کی چپ بھی کافی انوکھی سی چپ لگ رہی تھی کیونکہ گلاب خان کا انداز ہی کچھ ایسا تھا اور اس کے انداز سے ہی علیزے کی سماعتوں میں عجیب سی خطرے کی گھنٹی بجنے لگی تھی اور وہ یک دم پریشان سی ہو کر اٹھ کے بیٹھ گئی تھی۔

"کیا ہوا ہے گلاب خان؟ سب ٹھیک تو ہے نا؟" علیزے کے اپنے چہرے پر بھی تفکر کے سائے لہرانے لگے تھے۔

"بیگم صاحبہ کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ وہ صبح سے اسپتال میں ہیں۔ مجھے صاحب نے بھیجا ہے میں آپ کو لینے

کے لیے آیا ہوں۔"

گلاب خان اس کے سامنے صاف صاف نہیں کہہ سکا تھا کہ وہ اسے نکاح کے لیے لینے آیا ہے۔

"ڈرائیور کی مما کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے؟ اوہ مائی گاڈ۔ یہ تو بہت برا ہوا ہے۔" علیزے نے اپنا دل تھام لیا تھا۔

اسے واقعی بہت صدمہ ہوا تھا۔ دل آور شاہ بے شک اسے جتنا بھی برا لگتا تھا مگر بتول شاہ اسے کبھی بھی بری نہیں لگی تھیں' بلکہ نہ جانے کیا بات تھی کہ علیزے کا ہمیشہ دل چاہتا تھا کہ وہ اس سے بات کریں اور اسے کچھ دیر اپنے پاس اپنے ساتھ بیٹھنے دیں مگر سچویشن ہی ایسی ہوتی تھی کہ اسے کبھی بھی یہ موقع نصیب نہیں ہوا تھا۔ "برے سے بھی زیادہ برا ہوا ہے بی بی جی لیکن اس وقت زیادہ بات کرنے کا وقت نہیں ہے ورنہ دیر ہوجائے گی۔ آپ جلدی سے میرے ساتھ چلیں۔"

گلاب خان نے اسے پھر چلنے کے لیے کہا تھا اور علیزے ٹھٹک گئی تھی۔

"میں چلوں؟ میں۔۔۔؟" وہ بے یقینی سے پوچھ رہی تھی۔

"جی۔۔۔ آپ۔۔۔ صاحب نے آپ کو ہی بلایا ہے۔" گلاب خان نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"لیکن! مجھے کیوں بلایا ہے؟ میرا کیا کام؟" علیزے کو اتنے مہینوں کے بعد اپنے کہیں جانے کا سن کر سچ مچ یقین نہیں آرہا تھا۔ یوں جیسے گلاب خان اس کے ساتھ مذاق کررہا ہو۔

گلاب خان نے اب کی بار اس کے سر پہ بم پھوڑا تھا اور علیزے یک دم بدک کے رہ گئی تھی۔

"نکاح؟" اس کے منہ سے ایک اور ناقابل یقین لفظ ادا ہوا تھا۔

"جی ہاں۔۔۔ نکاح۔" گلاب خان اسے بس یقین دلائے جارہا تھا اور وہ بے یقین ——— ہوتی جارہی تھی۔

"مگر وہ ڈرائیور کی مما کا ایکسیڈنٹ؟ وہ۔۔۔ وہ تو اسپتال میں۔۔۔؟" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

"جی! بیگم صاحبہ کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے اور یہ نکاح بیگم صاحبہ کی خواہش پہ ہی ہو رہا ہے اور ہوگا بھی اسپتال میں ہی اس لیے اس وقت آپ کو میرے ساتھ اسپتال ہی چلنا ہے۔"

گلاب خان نے اسے ساری سچویشن بتادی تھی اور علیزے سن کر چپ کی چپ بت بن گئی تھی۔

آخر اس کے پاس کہنے کے لیے تھا ہی کیا؟ سب کچھ اس مقام پہ آخر ختم ہوگیا تھا۔ اب تو وہ اپنی ذات سے بھی دستبردار ہونے کو تھی۔

لیکن اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اتنی آسانی سے اٹھ کر گلاب خان کے ساتھ چل پڑتی۔ بلکہ اس کا تو یہ سوچ کر ہی جسم ٹھنڈا پڑ گیا تھا کہ وہ اپنا آپ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس "ڈرائیور" کو سونپ رہی ہے جو اس کا اس کے باپ کا اور اس کے پورے خاندان کا دشمن ہے اور جس سے علیزے کو خود بے پناہ نفرت ہے جسے وہ دیکھنا بھی نہیں چاہتی جس کو وہ جان سے مار دینا چاہتی ہے۔

لیکن کیا کرتی؟ اس ڈرائیور کے سوا کوئی اس کی عزت بھی تو نہیں ڈھانپ سکتا تھا۔

اور یہی سوچ کر اس کے قدم زمین سے اٹھے اور آگے بڑھنے لگے تھے اور اس کے پیچھے پیچھے گلاب خان بھی بیسمنٹ سے باہر آگیا تھا۔ باہر کھڑی گل اسے دیکھ کر قریب آگئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں بڑی سی سیاہ رنگ کی شیشے جڑی دھاگے کی کڑھائی والی چادر تھی۔ یہ چادر گل نے اپنے میکے سے خاص طور پہ علیزے کے لیے منگوائی تھی اور آج علیزے کو نکاح کے لیے جاتے دیکھ کر وہ جلدی سے وہ چادر اٹھا لائی تھی۔

"علیزے بی بی! آپ نے کہا تھا جب آپ کو ضرورت ہوگی تو آپ یہ چادر لے لیں گی اور میرا خیال ہے کہ آج سے زیادہ آپ کو اس چادر کی ضرورت پھر کبھی نہیں ہوگی۔" گل نے وہ چادر اس کے سامنے پھیلائی تھی اور علیزے نے وہ چادر چپ چاپ اس کے ہاتھ سے لے کر اوڑھ لی تھی اور کچھ بھی کہے بغیر باہر نکل گئی تھی۔ لیکن گل اور گلاب خان ایک دوسرے کو دیکھ کے رہ گئے تھے۔

☆ ☆ ☆

گاڑی سے اترتے ہوئے اس کے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔

اور جسم و جان برف کی مانند سرد پڑ چکے تھے۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ کسی بھی وقت کہیں بھی لڑکھڑا کر گر جائے گی۔ مگر نہ جانے کیسے اور کس طرح وہ اپنے آپ کو سنبھالتی ہوئی گلاب خان کی معیت میں چلتی اندر اسپتال کی راہ داری تک آگئی تھی۔ جہاں دل آور شاہ زندگی میں پہلی بار فقیرانہ انداز میں لاچار' بے بس اور مفلس نظر آرہا تھا۔ جسے دیکھ کر لگ ہی نہیں رہا تھا کہ وہ دل آور شاہ ہے۔

"صاحب جی!" گلاب خان نے قریب آکر اسے متوجہ کیا تھا اور دل آور نے اس کی آواز پہ چونک کر اپنے دائیں طرف دیکھا تھا اور گلاب خان کے قریب ہی سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی علیزے نے بھی اسے ہی دیکھا تھا۔ دونوں کی نظروں کا تصادم ہوا تھا اور دونوں کی نظریں ہی جھک گئی تھیں کیونکہ دونوں ہی بے بس تھے۔ نظریں نہ جھکاتے تو اور کیا کرتے؟ لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ نظروں کے ساتھ ساتھ اپنے اپنے مقام پہ دونوں کی ذات بھی جھک گئی ہے۔ حالات نے انہیں ہرا دیا تھا اور وہ ہارے ہوئے لوگ زندگی کی جنگ کی شروعات کرنے جارہے تھے۔

اور اس شروعات سے پہلے اک دوسرے کو دیکھ کر دونوں کے دل میں ہی عجیب عجیب سے ابال اٹھے تھے۔ مگر یہ وقت وہ نہیں تھا کہ دل میں اٹھنے والے کسی ابال یا کسی درد پہ دھیان دیا جاتا۔ بلکہ یہ وہ وقت تھا جس میں اپنے آپ کو اور اپنی ذات کو بھول جانا ہی بہتر تھا اور ان دونوں نے ایسا ہی کیا تھا۔ بھول گئے تھے سب کچھ۔۔۔ سب ہی کچھ۔

"گلاب خان۔۔۔ اندر آجاؤ۔" دل آور آہستگی سے کہہ کر پلٹ گیا تھا اور گلاب خان اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے علیزے کو اپنے ساتھ لیے اس کے پیچھے ہی آگیا تھا۔ حالانکہ آئی سی یو میں جانے کی کسی کو بھی اجازت نہیں تھی۔ لیکن محض بتول شاہ کی خوشی کی خاطر ڈاکٹرز نے یہ چھوٹ بھی دے دی تھی۔

"آنٹی۔۔۔" علیزے بے ساختہ تڑپ کر ان کی سمت بڑھی تھی اور انہوں نے اپنی درد سے ٹوٹتی ہوئی سانسوں کے درمیان بڑی مشکل بڑی وقت سے پلکیں اٹھا کر علیزے کو دیکھا تھا۔ مگر علیزے کا چہرہ ان کی آنکھوں میں دھندلا گیا تھا "آنٹی! یہ سب کیا ہوگا؟ کیوں ہوگیا ہے؟ آپ تو صبح تک بالکل ٹھیک تھیں؟" علیزے ان کا ہاتھ تھامتے ہوئے روہانسی سی ہوگئی تھی۔

"م۔۔۔ میں۔۔۔ نے کہا تھا کہ آج۔۔۔ شام۔۔۔ تک۔۔۔ تمہارے۔۔۔ حوالے۔۔۔ سے۔۔۔ کوئی۔۔۔ فیصلہ ہوجائے گا۔۔۔ او۔۔۔ دیکھ لو۔۔۔ شام۔۔۔ بھی۔۔۔ ہوگئی۔۔۔ ہے۔۔۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔ فیصلہ بھی۔"

وہ اپنی آخری سانسوں سے بھی جنگ لڑ رہی تھیں اور علیزے کا دل ڈوب ڈوب گیا تھا۔

"پلیز آنٹی۔۔۔ ایسا مت کہیں۔۔۔ آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔" علیزے نے پہلی بار کسی کو تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔

"علیز۔۔۔ ے۔۔۔ میرے۔۔۔ دل آور۔۔۔ کا۔۔۔ اب۔۔۔ اس۔۔۔ دنیا۔۔۔ میں۔۔۔ اور کوئی۔۔۔ نہیں ہے۔۔۔ تمہارے سوا۔۔۔ اس۔۔۔ کا ہمیشہ۔۔۔ ساتھ۔۔۔ نبھانا۔۔۔ وہ بھی۔۔۔ تمہارا ہی۔۔۔ بن کے رہے گا۔۔۔ بلکہ۔۔۔ اب۔۔۔ وہ ہے ہی تمہارا۔۔۔ اس نے۔۔۔ میری۔۔۔ لاج۔۔۔ رکھی۔۔۔ ہے۔۔۔ تم۔۔۔ بھی۔۔۔ میری۔۔۔ بات کی۔۔۔ لاج رکھنا۔۔۔

زندگی... کے... کسی بھی... موڑ پہ... وہ... تمہیں نہیں... چھوڑے گا... تم... بھی... اسے... کبھی... مت چھوڑنا... چاہے... زندگی میں... کچھ... بھی... ہو جائے۔"

بتول شاہ کا ہاتھ علیزے کے ہاتھ میں تھا اور علیزے کے اپنے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ ایسی سنگین اور جان لیوا سچویشن اس نے پہلے کب دیکھی تھی بھلا؟

"آیئے مولوی صاحب! اندر آجایئے۔" بتول شاہ کے سرہانے کی سائیڈ میں کھڑا دل آور ان کی باتوں کا بوجھ دل پہ لیے مولوی صاحب کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ مولوی صاحب کے ساتھ ایس پی کامران مہدی اور ایک ڈاکٹر صاحب بھی تھے جنہیں اس وقت بطور گواہ بلایا گیا تھا اور وہ بخوشی آبھی گئے تھے۔ مگر افسوس کہ صورت حال بے حد اذیت ناک اور رنج سے بھرپور تھی۔

جو بھی دیکھ رہا تھا اس دکھ کو دل سے محسوس کر رہا تھا۔ خوشی کے یہ لمحات غم کے لبادے میں لپٹ جائیں گے یہ بھلا کب کسی نے سوچا تھا؟ نہ وقار آفندی نے... اور نہ بتول شاہ۔

جس طرح وقار آفندی کو اپنی بیٹی کی شادی دھوم دھام سے کرنے کا شوق تھا۔

اسی طرح بتول شاہ کے دل میں بھی اپنے بیٹے کی شادی کے حوالے سے بہت ارمان تھے۔

مگر اللہ کو کیا منظور تھا؟ یہ کون جانتا تھا بھلا؟ قبولیت کا وقت آیا تو علیزے نے اپنے سامنے کھڑے دل آور کو دیکھا تھا۔ "ہاں قبول ہے۔" علیزے نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ اس کا ہاتھ بتول شاہ کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ جیسے وہ اس کی ہمت بندھا رہی ہوں اور بتول شاہ کا ہاتھ دل آور کے ہاتھ میں تھا۔ جیسے وہ ہمیشہ کے لیے انہیں اپنے پاس رکھ لینا چاہتا ہو... وہ دونوں آمنے سامنے کرسیوں پہ بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک دوسرے کو با آسانی دیکھ بھی سکتے تھے۔ مگر دل آور نے پھر بھی اسے ایک بار بھی نہیں دیکھا تھا۔ حالانکہ علیزے نے اسے تین بار دیکھا تھا۔

"ہاں قبول ہے... ہاں قبول ہے۔" تیسری دفعہ کہتے ہوئے علیزے کی آنکھوں کے قیدی تیزی سے باڑھ پھلانگ آئے تھے اور اس کا ضبط بکھر گیا تھا۔ جس پہ گلاب خان نے آگے بڑھ کے بے حد شفقت سے اور بے حد مان سے اس کے سر پہ ہاتھ رکھ دیا تھا۔

اور جب یہی لمحہ دل آور پہ آیا تو اس کی بھی جیسے پوری کائنات ٹھہر گئی تھی اور دل میں اک لہر سی اٹھی تھی۔ زری... اس کے دل نے بے حد شدت سے پکارا۔ مگر جب اس نے اس پکار پہ یک دم سر اٹھا کر سامنے دیکھا تو سامنے اسے صرف اور صرف علیزے کا چہرہ نظر آیا تھا جو اسے قبول کر چکی تھی اور جس کے ماتھے پہ اب اسی کا نام قسمت بن کر تحریر ہو چکا تھا اور اس چہرے کو دیکھنے کے بعد زری کا چہرہ معدوم سا ہو گیا تھا۔

"اف..." بتول شاہ دل آور کی ہاں کی منتظر تھیں۔ ان کی کراہ اسے واپس کھینچ لائی تھی اور اس نے بتول شاہ کو دیکھتے ہوئے علیزے کو قبول کر لیا تھا اور ساتھ ہی سائن بھی کر دیے تھے۔

"مبارک ہو بیرسٹر صاحب! مبارک ہو... بہت بہت مبارک ہو۔" ایس پی کامران مہدی، ڈاکٹرز اور مولوی صاحب اسے مبارک باد دے رہے تھے۔ مگر دل آور کو بھلا کب ہوش تھا؟ اس کا دھیان تو بس بتول شاہ کے ہاتھ کی طرف تھا جو ایک دم سے بے جان سا ہو گیا تھا اور علیزے کا ہاتھ بھی ان کی گرفت سے نکل گیا تھا۔ جس پہ وہ دونوں ہی چونک گئے تھے۔ مگر بتول شاہ کے کلمہ پڑھتے ہونٹ ساکت ہو چکے تھے اور دل آور کا دل بند ہو گیا تھا۔

"اماں...!" اس نے بڑی مشکل سے اٹھ کر ان کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں تھام کر پکارا تھا۔ مگر وہ کیسے جواب دیتیں؟ آخر موت بازی لے گئی تھی اور زندگی چپ چاپ ان کے ہاتھوں میں ہار گئی تھی... مات کھا گئی تھی۔

(باقی آئندہ)

نبیلہ عزیز

درد دل

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نبیل حیات دونوں بہن بھائی ہیں' مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے' وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں کھو کر بیہ رنگ چکی ہے' جس کے پیش نظر فائزہ بیگم' نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں' لیکن مدحیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے' جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے' مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصے سے نوکری کی تلاش میں ہے' مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا' بے بسی اور مجبوری سے تنگ آ کر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے' لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے بادامتیاز مل جاتا ہے' جو اسے کام کی آفر کرتا ہے' جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے' اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے' وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے' وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دلاور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے' وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے' اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا' اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔

۳۲

بتیسویں قسط

اور زندگی کی اس مات پہ دل آور شاہ تو جیسے پتھر کا ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھ بے دم سے ہو کر پہلو میں آگرے تھے اور اس کی بے یقین 'پتھرائی ہوئی اور پھٹی پھٹی آنکھیں بتول شاہ کے ایکدم سے پرسکون ہو جانے والے چہرے پہ جمی ہوئی تھیں اور وہ دم بخود سا کھڑا بس دیکھتا رہ گیا تھا۔

"دل آور صاحب...! آپ باہر آجائیں پلیز..." اس کی حالت کے پیش نظر ایس پی کامران مہدی نے تیزی سے اٹھ کر اسے کندھوں سے تھام لیا تھا اور اسے اپنے ساتھ لیے آئی سی یو سے باہر نکل آئے۔

ادھر علیزے بھی ساکت و صامت سی بیٹھی آنکھیں پھیلائے ہوئے بے یقین سی نظروں سے بتول شاہ کے بے جان جسم کو دیکھ رہی تھی 'کیونکہ اسے واقعی یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ اس سے کیا ہوا وعدہ پورا کرنے کے بعد حقیقتاً "اس دنیا کو خیرباد کہہ چکی ہیں۔

"علیزے بی بی...! آپ بھی باہر آجائیں۔ ڈاکٹرز کو اپنا کام کرنے دیں۔" ڈاکٹر صاحب کے اشارے پہ گلاب خان نے علیزے کو متوجہ کیا تھا اور وہ یکدم چونک گئی تھی۔

"اور آنٹی...؟" علیزے جیسے باہر جانے کو تیار نہیں تھی۔

"پلیز میم...! بس چند منٹ ویٹ کریں 'پھر آپ کو ڈیڈ باڈی مل جائے گی' آپ پریشان نہ ہوں۔" ڈاکٹر نے علیزے کی پریشانی دیکھتے ہوئے خود اسے تسلی دی تھی اور وہ اس تسلی پہ بڑے ضبط سے محض سر ہلا کر وہاں سے اٹھ کر گلاب خان کے ساتھ آئی سی یو کے دروازے تک آگئی تھی 'لیکن دروازے تک آکر اس کے دل کو نجانے کیا ہوا تھا کہ وہ دوبارہ لپک کر بتول شاہ کے بیڈ کے قریب آئی تھی اور بے اختیار بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ جھک کر ان کے ماتھے پہ بوسہ دیا تھا۔ عزت... عقیدت... اور محبت بھرا بوسہ...!

"آئی مس یو آنٹی... آئی رئیلی مس یو... اینڈ... آئی رئیلی لو یو..." علیزے اپنے جذبات اور محسوسات کو دبا نہیں پائی تھی اور اس کے ایسے اظہار پہ گلاب خان کی آنکھیں بھی بے ساختہ پانی میں بھیگ گئی تھیں 'البتہ آئی سی یو کے ادھ کھلے دروازے سے نظر آتے اس منظر کو دل آور نے محض خالی خالی نظروں سے دیکھا تھا مگر کچھ محسوس نہیں کیا تھا۔ کیونکہ وہ واقعی اس وقت اتنے گہرے صدمے سے پتھر کا ہو چکا تھا۔

"علیزے بی بی...!" گلاب خان نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے اسے ایک بار پھر متوجہ کیا تھا اور علیزے تیزی سے اٹھ کر آئی سی یو سے باہر نکل آئی تھی اور اس کے پیچھے گلاب خان بھی باہر نکل آیا تھا۔

☼ ☼ ☼

عائشہ آفندی نے زہرہ بتول شاہ کا ایکسیڈنٹ اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتے دیکھا تھا۔ وہ شوگر اور بلڈ پریشر کی مریضہ اپنی نظروں کے سامنے ایسا ہولناک منظر دیکھ کر برداشت نہیں کر پائی تھیں اور کھڑے قد سے تیورا کر نیچے زمین پہ آگری تھیں۔ اور محض دو فٹ کے فاصلے سے ان کے پیچھے آنے والے دانیال کے بھی ان کو اس طرح نیچے گرتے دیکھ کر حواس اڑ گئے تھے اور وہ آگے پیچھے کچھ دیکھے بغیر بے ساختہ ان کی طرف بھاگا تھا اور ان کے قریب پہنچ کر ان کو سنبھالنے میں لگ گیا تھا 'اس لیے اسے نہیں پتا تھا کہ چند قدم کے فاصلے پہ کس کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے؟ لوگوں کا اتنا ہجوم کیوں جمع ہے؟ اور آخر عائشہ آفندی اس طرح اچانک بے ہوش ہو کر کیوں گری ہیں؟

اسے اس وقت بس ان کی فکر ہو رہی تھی 'باقی سب کچھ بھول گیا تھا۔ یہ بھی بھول گیا تھا کہ وہ زہرہ آنٹی کے پیچھے اسپتال سے نکلی تھیں تو پھر زہرہ آنٹی کہاں ہیں؟ اور انہیں اچانک کیا ہوا ہے؟

اس کا تو ذہن بس عائشہ آفندی کی طرف تھا۔ اس نے انہیں اٹھا کر صرف اسپتال پہنچنے کی کوشش کی تھی ان کی ایسی حالت دیکھ کر اس کے اپنے ہاتھ پیر پھول رہے تھے 'وہ بڑی ہمت اور بڑی عجلت میں اسپتال پہنچا تھا' جہاں آذر بھی ایسی صورت حال دیکھ کر ایکدم پریشان ہو گیا تھا اور فوراً "ڈاکٹرز کی طرف دوڑ لگادی تھی۔ ڈاکٹرز نے وقتی طور پہ عائشہ آفندی کی کنڈیشن دیکھتے ہوئے انہیں اسپتال میں ایڈمٹ کر لیا تھا جس پہ آذر 'دانیال اور آسیہ آفندی تینوں ہی بے حد پریشان ہوئے تھے کیونکہ ابھی ابھی وقار آفندی کی بھی حالت اچانک اتنی بگڑ گئی تھی کہ مجبوراً "ڈاکٹرز کو انہیں نیند کا انجکشن دینا پڑا تھا اور محض چند منٹ میں ہی وہ انتہائی گہری اور پرسکون نیند سو گئے تھے۔ ان کی پریشانی سے نکلے تھے تو عائشہ آفندی کی پریشانی نے آگھیرا۔

اسی پریشانی پریشانی کے چکر میں انہیں یہ بھی احساس نہ ہوا کہ آج ان کی علیزے واقعی ان کے لیے "پرائی" ہو گئی ہے۔ اتنی پرائی جتنا دل آور شاہ پرایا تھا۔

وقار آفندی کے لیے بھی اور آذر آفندی کے لیے بھی...!

آج سے ان کا علیزے پہ نہ کوئی حق تھا اور نہ کوئی اختیار...!

اور اس چیز کا اگر انہیں پتا چلتا تو یقیناً "جیتے جی مر جاتے...!

کیونکہ اصل نکاح تو آج ہی ہوا تھا نا؟ اور اس اصل اور نقل کی حقیقت واقعی مار دینے کے لیے کافی تھی۔

☼ ☼ ☼

فجر کی پہلی اذان ہو رہی تھی جب علیزے اور دل آور شاہ 'بتول شاہ کی ڈیڈ باڈی لے کر گھر پہنچے تھے اور ان کی ڈیڈ باڈی دیکھتے ہی گل اور زلفی ہچکیوں سے رونے لگے تھے۔

لیکن دل آور کو کچھ احساس نہیں ہو رہا تھا کہ کون رو رہا ہے اور کون ہنس رہا ہے؟ کون چپ ہے اور کون تڑپ رہا ہے...؟

خاموشی سے کسی روبوٹ کی طرح ایمبولینس سے اسٹریچر اتروا رہا تھا اور اسی ایمبولینس کی آواز پہ آس پاس کے کئی لوگ پریشانی اور تشویش سے گھروں سے باہر نکل آئے تھے اور پھر جس جس کو بھی بیرسٹر دل آور شاہ کی والدہ ہونے کے ناتے بتول شاہ کی ڈیتھ کا پتا چلا تھا 'سبھی نے بے حد افسوس کا اظہار کیا تھا اور وہ چپ چاپ سر جھکائے سب کے تعزیتی کلمات سن رہا تھا' حالانکہ سمجھ کچھ بھی نہیں آرہی تھی کہ وہ سب لوگ کیا کہہ رہے ہیں...؟ وہ تو بس سن رہا تھا۔ سمجھنے کی صلاحیت نہیں تھی اس میں...!

اسی لیے اسپتال میں بھی ساری بھاگ دوڑ گلاب خان نے اور ایس پی کامران مہدی نے ہی کی تھی 'کیونکہ دل آور تو اس پوزیشن میں تھا ہی نہیں کہ وہ خود یہ ساری بھاگ دوڑ کر پاتا۔ اس لیے اسپتال کی ساری کاغذی کارروائی ایس پی کامران مہدی نے خود مکمل کروائی تھی اور باقی کا چھوٹا موٹا کام گلاب خان نے سنبھال لیا تھا۔

"علیزے بی بی...! میرا خیال ہے کہ آپ کا یہاں سب کے سامنے ٹھہرنا مناسب نہیں ہے 'آپ فی الحال کمرے میں چلی جائیں' بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔" گلاب خان نے اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق اسے جو مشورہ دیا تھا وہ اتنا برا بھی نہیں تھا 'کیونکہ یہ تو علیزے نے بھی محسوس کیا تھا کہ کئی لوگ اسے بار بار دیکھ رہے تھے اور اسے اس چیز سے الجھن بھی ہو رہی تھی۔

"ٹھیک ہے...! میں یہاں سے چلی جاتی ہوں۔" علیزے نے فوراً اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"گل...! جاؤ علیزے بی بی کو صاحب کے کمرے میں چھوڑ آؤ۔" گلاب خان نے گل کو آواز دی تھی 'لیکن اندر کی سمت پلٹتی علیزے کے قدم رک گئے تھے۔

"صاحب کے کمرے میں...؟" علیزے کو بیسمنٹ کی بجائے بیڈ روم کا سن کر حیرت ہوئی تھی اور کچھ عجیب بھی لگا تھا 'کیونکہ بیڈ روم جو "صاحب" کا تھا۔

"جی' بی بی جی...! اب آپ اس گھر کی اور صاحب کے بیڈ روم کی مالکن ہیں اور میں اس گھر کی مالکن کو بیسمنٹ میں بھیجنے کی گستاخی تو نہیں کر سکتا نا؟ لٰہذا اب آپ کی جگہ صاحب کے بیڈ روم میں ہے' اس لیے اب آپ کو وہیں جانا ہوگا۔" گلاب خان نے اسے ذرا گہرائی میں جاکر سمجھانے کی کوشش کی تھی' مگر وہ پھر بھی تذبذب کا شکار تھی' اس کا دل آور شاہ کے بیڈ روم میں جانے کو۔ نہیں چاہ رہا تھا اور نہ ہی حوصلہ پڑ رہا تھا۔

"لیکن پہلے تو...؟" اس نے کچھ کہنا چاہا تھا۔

"دیکھیے بی بی جی...! آپ خود سیانی ہیں۔ خود سمجھ سکتی ہیں... کہ پہلے کی بات اور تھی اور اب کی بات اور ہے' پہلے وہ آپ کے لیے غیر بھی تھے اور نامحرم بھی' لیکن اب وہ آپ کے مالک بھی ہیں اور محرم بھی' اب آپ ان کی عزت ہیں اور ان کی عزت ہونے کے ناتے آپ کا وہی مقام ہے جو میں آپ کو بتا رہا ہوں اور یقیناً" آپ سمجھ بھی گئی ہوں گی۔" گلاب خان نے اسے سمجھانے کی خاطر پھر ایک دلیل دی تھی اور وقت کچھ ایسا تھا کہ مجبوراً" علیزے کو سمجھنا ہی پڑا تھا اور چپ چاپ گل کے ساتھ اندر کی طرف قدم بڑھا دیے تھے۔ پھر یہ گلاب خان ہی تھا جس نے نبیل اور عبداللہ کو فون کرکے یہ ہولناک خبر سنائی تھی اور وہ دونوں گہری اور پرسکون نیند سے تڑپ کر اٹھے تھے بلکہ ان کے تو کانوں سے دھواں نکل گیا تھا' وہ دونوں ششدر رہ گئے تھے' انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک دن میں اتنا کچھ ہو گیا ہے اور انہیں خبر بھی نہیں ہوئی...؟

☆ ☆ ☆
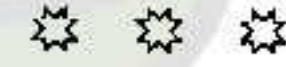
بتول شاہ کی وفات کی خبر نبیل اور عبداللہ کی فیملی پہ بھی کسی بم کی طرح گری تھی۔

فائزہ بیگم' مدحیہ' مومنہ بی بی' نگارش اور زری کے ساتھ ساتھ انسپکٹر شہناز کی آنکھیں بھی بتول شاہ کی ناگہانی موت پہ اشکبار تھیں بلکہ یہاں تک کہ نبیل اور عبداللہ بھی خود پہ اختیار نہیں رکھ سکے تھے' ان کی آنکھوں سے بھی آنسو چھلک آئے تھے اور دل آور کو مضبوط بازوؤں کے گھیرے میں لے کر دونوں ہی رو پڑے تھے۔

کیونکہ بتول شاہ کی اچانک موت کا دکھ انہیں دل آور سے بھی زیادہ محسوس ہو رہا تھا اور لحہ بہ لحہ دکھی کر رہا تھا۔

مگر دل آور تھا کہ ہنوز پتھر بنا بیٹھا تھا...!

اس کی آنکھ سے تو ایک بھی اشک نہیں ٹپکا تھا...!

وہ آخر پتھر ہو چکا تھا اور پتھر سے اشک کیسے ٹپکتا...؟

اس کے سامنے سب ہی روئے تھے مگر وہ خود کسی کے بھی سامنے نہیں رویا تھا۔! لیکن اس کے آنسو کہاں گر رہے تھے یہ بات سبھی جانتے تھے۔

سب کو معلوم تھا کہ غم کی شدت نے اسے پتھرا کے رکھ دیا ہے۔ اسی لیے تو ان سب کو زیادہ دکھ ہو رہا تھا۔ مگر وہ سب اس کے اس دکھ کو کم بھی تو نہیں کر سکتے تھے نا...؟

حالانکہ دل آور شاہ کے اس دکھ میں پورا شہر برابر کا شریک تھا' اس کے تمام کولیگز' سب جاننے والے اور تمام دوست احباب یہ خبر سنتے ہی اظہار تعزیت کے لیے پہنچ گئے تھے اور اتنے سارے لوگوں کو دیکھ کر یوں لگ رہا تھا جیسے واقعی پورا شہر وہاں جمع ہو گیا ہو۔ مگر دل آور کی نظر سے کوئی دیکھتا تو احساس ہوتا کہ وہاں کوئی بھی نہیں ہے۔ بس اتنے سارے لوگوں میں وہ اکیلا ہے۔ تنہا ہے۔ کوئی اپنا نہیں ہے۔ سب پرائے ہیں... سب غیر ہیں... سب دعا سلام کے ساتھی ہیں...!

اس دنیا میں اس کا صرف ایک خون کا رشتہ تھا اور آج وہ بھی ختم ہو گیا تھا اور اسی ایک رشتے کے ختم ہونے کے غم نے اسے بت بنا دیا تھا اور وہ حقیقتاً" کسی بت کی مانند جوں کا توں بس ایک ہی جگہ پہ بیٹھا ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

"لیکن پھوپھو...! آپ کو ہوا کیا تھا؟ آپ اس طرح اچانک بے ہوش کیسے ہو گئیں؟" ان کے ہوش میں آتے ہی آذر نے انتہائی تشویش بھرے انداز میں سوال کیا تھا اور اس کے اس سوال پہ عائشہ آفندی کی آنکھوں کے سامنے پھر سے وہ منظر تازہ ہو گیا تھا اور وہ بے ساختہ سسک اٹھی تھیں۔

"کیا بات ہے پھوپھو...؟ آپ بتا کیوں نہیں رہیں...؟ کیا ہوا تھا آخر...؟" آذر نے اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے پاس بیٹھتے ہوئے ان کے ہاتھ تھام لیے تھے۔

"مم... میری زہرہ کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا اس وقت... وہ... وہ میرے آگے آگے روتی ہوئی مجھ سے دور جا رہی تھی' لیکن... پیچھے سے آنے والی گاڑی نے اسے... بب... بری طرح کچل دیا تھا... اور وہ میری آنکھوں کے سامنے... دیکھتے ہی دیکھتے خون میں نہا گئی تھی... اور... لوگوں کے ہجوم نے اسے گھیر لیا تھا... لیکن پھر پتا نہیں کیا ہوا...؟ اور کیا نہیں...؟ مجھے تو کچھ خبر نہیں ہوئی۔" عائشہ آفندی بتاتے ہوئے رو رہی تھیں جبکہ آذر اور دانیال ششدر سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے تھے۔

"زہرہ آنٹی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا...؟ او مائی گاڈ... ہم لوگوں کو پتا بھی نہیں چلا...؟" آذر نے پریشانی سے سر تھام لیا تھا اور کچھ ایسا ہی حال دانیال کا بھی ہوا تھا۔

"ہمیں کبھی بھی وقت پر کچھ بھی پتا نہیں چلتا۔ ہم ہمیشہ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں۔" عائشہ آفندی کا لہجہ ایکدم جیسے تلخ سا ہو گیا تھا ان کے اندر شدید دکھ اور آنسوؤں کا ابال سا اٹھ رہا تھا اور وہ انتہائی اونچی اونچی آواز میں تڑپ تڑپ کر رونا چاہ رہی تھیں' مگر یہ اسپتال تھا اور یہاں وہ اپنی یہ بے بس سی خواہش پوری نہیں کر سکتی تھیں' انہیں ہمیشہ کی طرح آج بھی صبر و ضبط سے ہی کام لیتا تھا۔

"پلیز...! آپ... آپ پریشان نہ ہوں پھوپھو... میں ابھی پتا کرواتا ہوں کہ کل اس روڈ پہ جس خاتون کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے' وہ کہاں ہیں؟ اور کس اسپتال میں ہیں؟ میں کوشش کرتا ہوں کہ ساری انفارمیشن مل جائے... بس آپ تھوڑا انتظار کریں۔" آذر ان کا ہاتھ تھپکتے ہوئے فوراً" وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"کہاں جا رہے ہو...؟" دانیال نے اسے اٹھتے دیکھ کر بے ساختہ پوچھا تھا۔

"مبارک خان کی طرف جا رہا ہوں۔ اسے بھیجتا ہوں آس پاس سے کچھ پتا کرنے کے لیے... تمہیں پتا ہے نا اسی روڈ پہ تین چار اور اسپتال بھی ہیں شاید انہیں وہاں ایڈمٹ کروا دیا گیا ہو...؟" آذر اپنے قیاس کا گھوڑا دوڑاتے ہوئے واقعی زہرہ آنٹی کے ایکسیڈنٹ کے متعلق تمام معلومات لینے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔

"ہوں...! ٹھیک ہے جاؤ... لیکن خود کہیں مت جانا... تمہیں پتا ہے ناڈیڈ کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے اور ادھر امی بھی بیمار ہیں...؟" دانیال نے اسے تاکید کی تھی اور آذر جواباً" سر ہلا کر باہر نکل گیا تھا۔ اور دانیال گردن موڑتے ہوئے دوبارہ عائشہ آفندی کی سمت متوجہ ہو گیا تھا کیونکہ وہ ابھی تک رو رہی تھیں۔

"امی پلیز... کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ اور کتنا روئیں گی آپ؟ اس طرح تو آپ کی طبیعت اور زیادہ خراب ہو گی۔ پلیز... سنبھالیں اپنے آپ کو ان شاء اللہ زہرہ آنٹی کے بارے میں ابھی پتا چل جائے گا۔" دانیال نے انہیں تسلی دی تھی' مگر عائشہ آفندی کو اک عمر ہو گئی تھی ان تسلیوں پہ جیتے ہوئے... آخر اور کتنا صبر کرتیں...؟

"کب پتا چلے گا اور کس کس چیز کا پتا چلے گا؟ مجھے تو آج تک یہ پتا نہیں چلا کہ زہرہ مجھ سے دور کیوں ہو گئی تھی؟ اس نے پلٹ کر کبھی خبر کیوں نہیں لی؟ وہ اگر مجھ سے خفا ہے تو کیوں خفا ہے؟ وہ میری آواز کیوں نہیں سنتی؟ وہ مجھ سے دور کیوں بھاگتی ہے؟ ایسا کیا ہے اس کے دل میں جس کا مجھے پتا نہیں ہے؟ آخر ایسا کیا ہے دانیال...؟" وہ کہتے

کہتے یکدم ہچکیوں سے رو پڑی تھیں اور دانیال نے انہیں اپنے بازو کے گھیرے میں لے کر ان کا کندھا سہلایا تھا وہ آج خاصی نڈھال ہو رہی تھیں۔

✡ ✡ ✡

نہ خلاؤں میں مجھے ڈھونڈ تو' نہ ہی مقبروں میں تلاش کر
جو سجے ہوئے ہیں صلیب پر مجھے ان سروں میں تلاش کر
یہ الگ کہ خواہش زر نہیں' میرا گھر نہیں' میرا در نہیں
یہ تونگری' یہ سکندری' میری ٹھوکروں میں تلاش کر
وہ جو ایک کانچ کا شخص تھا اسے موسموں نے بدل دیا
اسے آئینوں میں نہ ڈھونڈ تو' اسے پتھروں میں تلاش کر

ذرا سا جھک کر بتول شاہ کے جنازے کو کندھے پہ اٹھاتے ہوئے دل آور شاہ کے دل میں اک ہوک سی اٹھی تھی اور پھر اس نے قدم باہر کی سمت بڑھا دیے تھے اس کے ساتھ بتول شاہ کے جنازے کو کندھا دینے والوں میں نہ حیات' ملک عبداللہ اور عدیل عمر نیازی سر فہرست تھے۔ بتول شاہ کی سرخ پھولوں سے سجی ڈولی کے چاروں پائے انہوں نے اپنے کندھوں پہ تھام رکھے تھے۔ اور آہستہ آہستہ باہر کی سمت بڑھ رہے تھے۔

شام گہری ہو چکی تھی اور مغرب کی نماز کے بعد تدفین کا وقت تھا۔ اس لیے مغرب کی نماز ادا کرتے ہی لوگ بتول شاہ کی نماز جنازہ کے لیے جمع ہوتے گئے تھے لہٰذا اب ذرا دیر کے لیے بھی ٹھہرنا بہت مشکل تھا حالانکہ دل آور کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ گھر سے باہر قدم بھی رکھے۔۔۔ لیکن کیا کر سکتا تھا آخر۔۔۔؟ انہیں روک بھی تو سکتا تھا نا۔۔۔؟

"اماں۔۔۔!" وہ بے ساختہ نہ چاہتے ہوئے بھی انہیں پکار بیٹھا تھا اور وہ سیڑھیاں اترتے اترتے ٹھہر گئی تھیں۔

"ہاں۔۔۔ کہو؟" وہ یونہی ریلنگ پہ ہاتھ رکھے ہوئے اس کی سمت مڑی تھیں اور وہ اپنے بیڈ روم کے دروازے چوکھٹ میں کھڑا تھا۔

"میں آجاؤں آپ کے ساتھ۔۔۔؟" اچانک ہی اس کا دل ان کے ساتھ جانے کو چاہا تھا۔

"ارے نہیں میری جان! تم ابھی آفس جا کر اپنے کلائنٹ سے ملو' پھر بعد میں آجانا۔"

"لیکن اماں۔۔۔! میرا دل بہت اداس ہے' میں آپ کے ساتھ جانا چاہتا ہوں' باتیں کرنا چاہتا ہوں' کلائنٹ سے پھر مل لوں گا۔" دل آور نے بچوں کی طرح ان کے ساتھ جانے کی ضد کی تھی۔

"بری بات بیٹا۔۔۔! کام میں کوتاہی نہیں کرتے۔ کلائنٹ بھی آخر مجبور ہوتے ہیں اور تم تو وقت پہ کام کرنے عادی ہو۔ یہ سستی تمہیں سوٹ نہیں کرتی۔ شاباش تم آفس جاؤ۔ پھر وہاں سے اسپتال آجانا۔" وہ کہہ کر اس کو نرمی سے دیکھتی ہوئی پلٹ کر سیڑھیاں اتر گئی تھیں اور دل آور ایک بار پھر لپک کر سیڑھیوں کی ریلنگ کے قریب آیا تھا۔

"آپ جا رہی ہیں؟" اس نے عجیب بے کل سے انداز میں بے تکا سا سوال کیا تھا۔ اور بتول شاہ راہداری سمت بڑھتے بڑھتے ایک بار پھر رک گئی تھیں اور سر اٹھا کر سیڑھیوں کی ریلنگ کے قریب کھڑے دل آور کو دیکھا تھا۔

"ہاں۔۔۔! جا رہی ہوں۔۔۔ کیوں؟ کوئی کام ہے کیا؟" انہوں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

"ہاں۔۔۔! کام تو بہت سے ہیں' فی الحال آپ سے یہی پوچھنا تھا کہ آپ نے ناشتا کیا ہے یا نہیں؟" اس نے

دھیمے مگر سنجیدہ انداز میں پوچھا تھا اور بتول شاہ اس کی اس قدر فکرمندی پہ اسے دیکھ کے رہ گئی تھیں۔
"نہیں۔۔۔! میں نے ناشتا نہیں کیا۔ صرف ایک کپ چائے کا لیا ہے' لیکن ڈونٹ وری' لنچ ایک ساتھ ہی کریں گے۔ اوکے؟" انہوں نے اسے مطمئن کرنے کے لیے بہلایا تھا۔
"ہوں۔۔۔! ٹھیک ہے میں بھی ناشتا نہیں کرتا' لیکن ڈونٹ وری' لنچ ایک ساتھ ہی کریں گے۔ اوکے؟" اس نے بھی جواباً "انہی کے سے انداز میں جواب دیا تھا جس پہ بتول شاہ نے اسے خفگی سے گھورا تھا۔
"شاہ۔۔۔ یہ کیا ضد لگا رکھی ہے تم نے؟ مجھے جانے دو گے یا نہیں؟" وہ کافی خفگی سے بولی تھیں اور دل آور کو ذرا دیر کے لیے سنبھلنا پڑا تھا۔ ورنہ وہ اس پہ غصہ بھی ہو سکتی تھیں۔
"اوکے۔۔۔ اب کچھ نہیں کہتا جائیں آپ۔" اس نے ان کے جانے کے لیے رضامندی دے دی تھی۔
"نیچے آ کر ناشتا کرو اور آفس جاؤ' اللہ حافظ۔" وہ پھر اسے خدا حافظ کہہ کر آگے بڑھ گئی تھیں اور دل آور پھر سے مضطرب ہوا تھا۔ اس کا دل پھر سے ان کے پیچھے لپکنے کو چاہا تھا اور اس نے پھر سے اس چاہ کو پورا کیا تھا۔
"اماں۔۔۔" دل آور کے ہونٹ بے ساختہ ذرا سے کپکپائے تھے اور دل پہ جیسے کربلا کا عالم چھا گیا تھا۔ کیونکہ گھر کے گیٹ سے باہر قدم رکھتے ہی اس کا دل دھاڑیں مار مار کے رویا تھا اور ادھر علیزے کا بھی یہی حال تھا۔ وہ بھی بہت تڑپی تھی۔ اس نے آخری بار بتول شاہ سے ملنے کی اور ان کا چہرہ دیکھنے کی بہت کوشش کی تھی۔ مگر اس کی اس کوشش کے آڑے گل آگئی تھی۔ اس نے اسے باہر نکلنے سے روک دیا تھا۔
"نہیں بی بی جی! آپ کا اس طرح سب کے سامنے باہر جانا ٹھیک نہیں ہے۔ پہلے ہی گھر پہ قیامت ٹوٹی ہوئی ہے۔ اب آپ سب کے سامنے جائیں گی تو سب طرح طرح کے سوال کریں گے اور صاحب تو پہلے ہی بہت پریشان ہیں۔ کس کس کو جواب دیں گے؟" گل نے خود بھی سمجھ داری سے کام لیتے ہوئے اسے بھی سمجھانے کی کوشش کی تھی۔
"لیکن گل وہ۔۔۔ وہ جا رہی ہیں۔ میں۔۔۔ میں ان سے پھر کبھی نہیں مل سکوں گی۔ پلیز۔۔۔ مجھے ایک بار۔۔۔ صرف ایک بار ان سے مل لینے دو۔ میں چادر اوڑھ لیتی ہوں۔ چہرہ ڈھانپ لیتی ہوں۔ مجھے کوئی نہیں دیکھے گا۔ کسی کو کچھ پتا نہیں چلے گا۔ پلیز گل۔۔۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔" علیزے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے ایک بار پھر تڑپی تھی۔
کیونکہ سب مرد حضرات جنازہ لے کر گیٹ سے باہر نکل چکے تھے۔ لیکن کچھ عورتیں' کچھ لڑکیاں تھیں جو گیٹ کے قریب کھڑی ابھی بھی رو رہی تھیں۔ علیزے کے لیے بے شک وہ سب انجان چہرے تھے۔ لیکن گل انہیں اچھی طرح جانتی تھی۔ اسی لیے وہ نارمل تھی۔
"بی بی جی۔۔۔ میں سب سمجھتی ہوں۔ بس آپ کے سمجھنے کی ضرورت ہے اور ویسے بھی اب وہ لوگ جا چکے ہیں۔ آپ اپنے آپ کو اس طرح ہلکان مت کریں۔ آپ آرام کریں میں باہر جا رہی ہوں۔ ابھی مہمانوں کو بھی دیکھنا ہے۔ آپ کے پاس بعد میں آؤں گی اللہ حافظ۔" گل اسے کندھوں سے تھام کے بیڈ پہ بٹھاتی ہوئی باہر نکل گئی تھی اور اس کمرے میں اکیلی رہ جانے والی علیزے بے ساختہ اپنی بے بسی پہ پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی تھی۔

✡ ✡ ✡

مبارک خان کافی جگہوں سے پتا کر کے آیا تھا۔ مگر زہرہ آنٹی کے بارے میں کہیں سے کچھ پتا نہیں چلا تھا۔ جس پہ آذر کو بہت مایوسی اور خفگی ہوئی تھی اور ابھی وہ خود کہیں جا کر پتا کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ ڈاکٹرز نے وقار آفندی کو ڈسچارج کرنے کے بعد گھر جانے کا مشورہ دے دیا تھا اور آسیہ آفندی فوراً "گھر جانے کے لیے تیار ہو گئی تھیں۔ آخر وہ بھی اتنے دنوں سے اسپتال میں رت جگا منانے کے ساتھ ساتھ قید کاٹ رہی تھیں۔ اس لیے

ان کو دیکھتے ہوئے مجبوراً "آذر کو بھی گھر جانے کے لیے تیار ہونا پڑا تھا۔
"مبارک خان تم گاڑی نکالو ہم ڈیڈ کو لے کر آتے ہیں۔" آذر مبارک خان سے کہہ کر وقار آفندی کے روم کی طرف بڑھا تھا۔ لیکن دو قدم آگے بڑھنے کے بعد دوبارہ مبارک خان کی سمت پلٹا تھا۔
"رکو مبارک خان۔" اس نے واپس مڑتے مبارک خان کو آواز دی تھی۔
"کیا بات ہے؟ تم کچھ پریشان لگ رہے ہو؟" آذر کی سرسری نظر نے بھی بڑا گہرا کام کیا تھا۔
"نہیں صاحب۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔" مبارک خان نے آہستگی سے نفی میں گردن ہلائی تھی۔ مگر آذر سمجھ گیا تھا کہ وہ محض اسے ٹالنے کے لیے ایسا کہہ رہا ہے۔
"ایسی بات ہے مبارک خان۔۔۔ کیونکہ میں نے پہلے کبھی بھی تمہارے چہرے پہ ایسی پریشانی نہیں دیکھی۔ ہاں تم بتانا نہ چاہو تو یہ اور بات ہے۔" آذر واقعی مبارک خان کے چہرے کی پریشانی کو ٹھیک پہچانا تھا۔
"نہیں صاحب! اب آپ سے کیا پردہ بھلا' بس گھر میں بیوی اور بچے دونوں کی طبیعت خراب ہے۔ وہ مجھے ایک دو دن کے لیے گھر بلا رہے تھے۔ لیکن میں نے انکار کر دیا ہے کہ جب تک صاحب ٹھیک نہیں ہو جاتے۔ میں بھلا کیسے جا سکتا ہوں۔ اس لیے میں ان کی طرف سے تھوڑا پریشان تھا۔ ورنہ اور تو کوئی بات نہیں ہے۔" مبارک خان کو بالآخر بتانا ہی پڑا تھا اور آذر اس کی پریشانی سن کر چپ ہو گیا تھا۔
"ہوں۔۔۔ ٹھیک ہے۔ ابھی تو گھر چلو۔۔۔ پھر دیکھتے ہیں کہ کیا ہوتا ہے۔" آذر آہستگی سے اور پرسوچ سے لہجہ میں کہتا ہوا دوبارہ پلٹ گیا تھا۔ حالانکہ آذر ابھی بھی اس کی بات پہ مطمئن نہیں ہوا تھا۔
مگر اس وقت صورت حال ہی کچھ ایسی تھی کہ وہ زیادہ پوچھ پڑتال یا پھر کرید نہیں سکتا تھا۔ اسی لیے وقتی طور پہ اس بات کو نظر انداز کر دیا تھا اور پھر کچھ دیر بعد وقار آفندی اور عائشہ آفندی کو ساتھ لے کر واپس بڑی حویلی آگئے تھے۔

"مما۔۔۔ پاپا۔۔۔ آپ آگئے۔" عون اور عدید ان کو دیکھتے ہی لپک کر ان سے لپٹ گئے تھے۔
"ہاں میری جان! ہم آگئے ہیں۔ ہم بہت مس کر رہے تھے تم دونوں کو۔"
آسیہ آفندی نے ان دونوں کو لپٹا کر باری باری ان کے ماتھے پہ پیار کیا تھا۔
"پاپا! وہ۔۔۔ وہ کیسے ہیں اب؟" عدید کا پوچھتے ہوئے لہجہ بھی گلوگیر ہو گیا تھا۔
"اپنے پاپا سے خود پوچھ لو نا وہ کیسے ہیں؟" آسیہ آفندی نے اس کے بالوں کو سہلاتے ہوئے اسے اشارہ کیا تھا اور عدید ان کے اشارے پہ سر ہلا کر فوراً "وقار آفندی کے بیڈ کی طرف بڑھ گیا تھا اور بیڈ کی دوسری سائیڈ پہ عون جا کر کھڑا ہو گیا تھا' لیکن وقار آفندی کل سے نجانے کیوں اتنے ساکت و صامت سے ہو گئے تھے کہ انہیں اب اپنے آس پاس کا بھی احساس نہیں رہا تھا کہ ان کے پاس کون ہے اور کون نہیں ہے؟
کیا کہہ رہا ہے اور کیا نہیں کہہ رہا؟
وہ کہاں ہیں اور کہاں نہیں ہیں؟
ان کے تو دل و دماغ میں بس اپنی ادھوری معافی اور پوری زندگی کا سین گھوم رہا تھا۔
اور تو کچھ سنائی دے رہا تھا اور نہ دکھائی۔
بس صرف اور صرف زہرہ بتول شاہ کا چہرہ تھا جو ساری دنیا پہ نقش ہو گیا تھا اور اس چہرے کے سوا ساری دنیا مٹ گئی تھی۔ بیوی' بچے' بہن بھائی' سب رشتے بھول گئے تھے' سب رشتے پیچھے چلے گئے تھے۔
بس اب تو یا زہرہ بتول شاہ یاد تھی۔۔۔ یا پھر۔۔۔ خدا یاد تھا۔۔۔!
جن کی نظروں میں وہ گناہ گار تھے اور جن سے انہوں نے معافی مانگی تھی اور معافی نہیں ملے گی۔ یہ بھی انہیں

یقین تھا اور اسی یقین نے تو انہیں مزید جامد کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

مجھے جو بھی ملا فقط ذات خدا سے ملا۔۔۔
اے ماں خدا سے جو بھی ملا فقط تیری دعا سے ملا۔۔۔

بتول شاہ کی قبر پہ مٹی ڈالتے ہوئے اس کا دل رو رہا تھا اور ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ آج اس کے سب خون کے رشتے دفن ہو چکے تھے۔ مٹی میں مل گئے تھے۔ خاک کے ساتھ خاک ہو گئے تھے اور وہ دیکھتا رہ گیا تھا۔ سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ سب ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ وہ تقدیر کے آگے ڈٹ نہیں سکا تھا اور تقدیر سب کچھ بہا کے اپنے ساتھ لے گئی تھی اور اسے تنہا کر گئی تھی۔

"دل آور۔" نبیل نے نیچے زمین پہ دوزانو بیٹھے دل آور کے کندھے پہ اپنا مضبوط ہاتھ جماتے ہوئے اسے متوجہ کیا تھا۔

"اٹھو! گھر چلو تمہیں پتا ہے نا تمہارے ایسے حال پہ آنٹی کو کتنی تکلیف ہو گی۔ کیا تم انہیں اور تکلیف دینا چاہتے ہو؟" نبیل نے اسے ذرا نرمی سے بہلانے کی کوشش کی تھی مگر اس کا بہلنا آسان کب تھا بھلا۔

"تم گاڑی نکالو میں اسے لے کر آتا ہوں۔" عبداللہ نے نبیل کو اشارہ کیا تھا اور نبیل سر ہلا کر پلٹ گیا تھا۔

"دل آور۔! اٹھو میرے ساتھ گھر چلو تم جانتے ہو نا گھر پہ کتنے مہمان آئے ہوئے ہیں' کتنی دور دور سے مہمان آئے ہیں ان کو کھانا بھی تو کھلانا ہے یا پھر یونہی بھوکا بھیج دو گے سب کو؟" عبداللہ نے نرمی کی بجائے ذرا سنجیدگی سے پوچھا تھا اور یہ سنجیدگی دل آور کے دماغ پہ جا کے لگی تھی۔

وہ بھلا اپنی ماں کی موت کے افسوس کے لیے آئے مہمانوں کو بھوکا کیسے بھیج سکتا تھا؟ نبیل اور عبداللہ نے کراچی سے آتے ہی پہلا انتظام یہی کیا تھا مہمانوں کے لیے کھانا آرڈر کیا تھا اور اب سب مہمانوں کو کھانا کھلانے کا وقت تھا کیونکہ سب جنازہ پڑھ چکے تھے۔ اس لیے ان لوگوں کا ذرا جلدی گھر پہنچنا ضروری تھا۔ اور یہی بات سوچتے ہوئے بالآخر دل آور کو اٹھنا ہی پڑا تھا اور چپ چاپ ان کے ساتھ چل پڑا تھا۔

"دل آور صاحب! اب ہمیں بھی اجازت دیجیے ہم بھی چلتے ہیں ٹائم بھی کافی ہو گیا ہے حالانکہ آپ کو اس دکھ کے وقت میں چھوڑ کر جانے کو دل تو نہیں چاہ رہا لیکن مجبوری ہے کسی خاص جگہ پر ریڈ کا پلان ہے اس لیے پہنچنا ضروری ہے۔" ایس پی کامران مہدی قبرستان کے باہر ہی اپنی گاڑی کے قریب کھڑا انتظار کر رہا تھا اور دل آور کو عبداللہ کے ساتھ قبرستان سے باہر نکلتے دیکھ کر فوراً اس کے قریب آیا۔

"لیکن ایس پی صاحب! آپ کھانا کھائے بغیر کیسے جا سکتے ہیں؟ صبح سے آپ ہمارے ساتھ ایسے ہی گھوم رہے ہیں۔" عبداللہ نے ایس پی کامران مہدی کو روکنا چاہا تھا' لیکن ایس پی کامران مہدی کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا وہ دل آور اور عبداللہ سے ہاتھ ملا کر وہاں سے رخصت ہو گیا تھا اور وہ لوگ وہاں سے گھر آ گئے تھے۔

گھر میں اور بھی بہت سے مہمان تھے' عبداللہ اور نبیل کے ساتھ ساتھ عدیل اور شہریار بھی مہمانوں کی خاطر تواضع میں لگ گئے تھے اور دل آور بس سب کو چپ چاپ دیکھ رہا تھا۔

"بھائی!" مدحیہ دل آور کو یوں چپ اور نڈھال سے انداز میں بیٹھے دیکھ کر اس کے قریب آ گئی تھی اور دل آور نے محض اسے سر اٹھا کر دیکھا تھا اور پھر دوبارہ سر جھکا کر بیٹھ گیا تھا جس پہ مدحیہ کے دل میں عجیب سا ابال اٹھا تھا اور وہ بے ساختہ صوفے پہ اس کے برابر بیٹھ گئی تھی۔

"آپ۔۔۔ آپ کچھ بول کیوں نہیں رہے؟ آپ کیوں اتنے چپ ہو گئے ہیں؟ کیا صرف آپ کو مما کا غم ہے؟ کیا ہمیں ان کا کوئی غم نہیں ہے؟ کیا وہ میری مما نہیں ہیں؟ آپ تو ان کے آخری وقت میں بھی ان کے ساتھ تھے ان کے پاس تھے' لیکن مجھے۔۔۔ مجھے تو ان سے بات کرنا بھی نصیب نہیں ہوا۔ آپ سے زیادہ دکھ تو مجھے ہو رہا ہے' میں کیا کروں آخر آپ کی طرح چپ اوڑھ کے بیٹھ جاؤں؟ نہ بولوں' نہ روؤں' نہ دیکھوں' نہ سنوں کیا کروں آخر؟ آپ بتائیے۔۔۔ کیا کرنا چاہیے مجھے؟"

مدحیہ نے روہانسے لہجے میں کہتے ہوئے دل آور کا کندھا ہلایا تھا اور دل آور نے آہستگی سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا تھا اور یونہی سر جھکائے بیٹھا آہستہ آہستہ اس کا ہاتھ تھپکنے لگا تھا جیسے اسے تسلی دے رہا ہو' لیکن زبان سے پھر بھی کچھ نہیں کہا تھا۔

کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ ابھی کچھ کہنے کے لیے لب کھولے گا تو اس کے سارے ضبط ٹوٹ جائیں گے اور سارے حوصلے بکھر جائیں گے اور پھر وہ سب کی لاکھ کوششوں سے بھی سمٹ نہیں سکے گا۔ اس لیے بہتری اسی میں تھی کہ وہ اپنے صبر و ضبط پہ قائم رہتا اور اپنے حوصلے بکھرنے نہ دیتا اور سب اس سوچ پہ دنگ تھے کہ وہ بکھرا کیوں نہیں؟ اور وہ ٹوٹا کیوں نہیں؟ آخر یہ غم کی انتہا تھی یا پھر غم کے بعد صبر کی انتہا تھی کہ اس نے اپنی زبان کے لفظ اور آنکھوں کے آنسو پتھر کر دیے تھے اس کی زبان سے نہ لفظ نکلے تھے اور نہ آنکھ سے آنسو۔۔۔!

بس سب کچھ بے حس اور جامد ہو چکا تھا سب کی کوشش تھی کہ اس کی چپ کو توڑا جائے۔

"بھائی۔۔۔ ابا! آپ نے اب بھی نہیں بولنا کیا اب بھی کچھ نہیں کہنا؟ کیا میری خاطر بھی نہیں؟" مدحیہ کے کہتے کہتے آنسو بہہ نکلے تھے اور دل آور نے گردن موڑ کر ایک بار پھر اپنے بائیں پہلو میں بیٹھی سسکیوں سے روتی مدحیہ کی طرف دیکھا تھا وہ صبح سے مسلسل رو رو کر نڈھال ہو چکی تھی اور چہرہ بھی کافی مرجھایا ہوا سا لگ رہا تھا جسے دیکھ کر دل آور کا دل بھی پگھل گیا تھا وہ واقعی اس وقت اس کے دکھ میں برابر کی شریک لگ رہی تھی۔ اسی لیے دل آور نے اس کے کندھوں کے گرد اپنا بازو پھیلاتے ہوئے اسے اپنے کندھے سے لگا لیا تھا اور مدحیہ ہچکیوں سے رو پڑی تھی۔

"بس کرو مدحو! چپ ہو جاؤ اور کتنا روؤ گی؟ پلیز مجھے تکلیف مت دو' میں سہنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔" دل آور نے مدحیہ کا کندھا سہلاتے ہوئے اسے چپ کروانے کی کوشش کی تھی اور لاؤنج سے نکل کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوتی زری کے قدم ٹھٹک کر رک گئے تھے اس نے صبح سے لے کر اب تک دل آور کو کچھ بولتے یا کچھ کہتے ہوئے نہیں دیکھا تھا' لیکن اب وہ کچھ کہہ رہا تھا تو صرف مدحیہ سے اور مدحیہ مسلسل روئے جا رہی تھی۔

"مدحو پلیز! چپ ہو جاؤ ورنہ۔۔۔ ورنہ میں ایسا بکھر جاؤں گا کہ کوئی سمیٹ بھی نہیں سکے گا۔۔۔ پلیز مجھے میرے اختیار میں رہنے دو۔" دل آور کا لہجہ بہت کمزور ہو رہا تھا اور زری اس کے کمزور لہجے پہ خود بکھرنے لگی تھی' اس کی آنکھیں پانیوں سے لبریز ہو گئی تھیں۔ شاید یہ حقیقت تھی یا فسانہ تھا' لیکن جو بھی تھا آج واقعی دل آور شاہ کے دکھ پہ ہر آنکھ پرنم تھی' ہر آنکھ میں آنسو تھے' ہر دل میں دکھ تھا۔ کیونکہ اس کا درد سب نے گہرائی میں جا کر محسوس کیا تھا۔

"سر۔۔۔! ہمیں بھی اب اجازت۔۔۔" عدیل اور شہریار اچانک ہی زلفی کے ساتھ اندر آ گئے تھے' لیکن اندر کا رونا بلکنا منظر دیکھ کر قدم وہیں کے وہیں رک گئے تھے اور انہیں شرمندگی ہوئی تھی کہ وہ غلط وقت پہ آ گئے ہیں۔

"اندر آ جاؤ عدیل! باہر کیوں رک گئے ہو؟" دل آور ان کی طرف متوجہ ہو چکا تھا اسی لیے انہیں اندر آنے کا کہا تھا اور مجبوراً عدیل اور شہریار کو اندر آنا ہی پڑا تھا۔

"سر۔۔۔! کافی ٹائم ہو چکا ہے' ہمیں اب اجازت دیں آپ سے ان شاء اللہ صبح ملاقات ہو گی۔" عدیل نے دل آور کے کندھے سے لگ کے روتی ہوئی مدحیہ کو اچٹتی ہوئی نظروں سے دیکھا تھا اور پھر نظریں جھکالی تھیں۔ آخر وہ

دل آور شاہ کے سامنے اس کو نظر بھر کے دیکھنے کی جرات کیسے کر سکتا تھا؟

"کھانا وغیرہ کھایا؟" دل آور نے مختصر سے انداز میں پوچھا تھا۔

"نہیں سر۔! نبیل صاحب اور عبداللہ صاحب نے تو بہت اصرار کیا ہے مگر ہمیں فی الحال بھوک نہیں ہے اس لیے کچھ بھی کھانے کو دل نہیں چاہ رہا۔" عدیل نے نفی میں سر ہلایا تھا اور خود دل آور بھی اس حالت میں نہیں تھا کہ وہ مزید اصرار کرتا اور کھانا کھانے کے لیے روک لیتا۔ اس لیے اس کی حالت کے پیش نظر ہی عدیل وغیرہ نے اس سے جلدی اجازت چاہی تھی اور وہاں سے رخصت ہو گئے تھے۔

اسی طرح رفتہ رفتہ سبھی مہمان باری باری رخصت ہوتے گئے تھے' البتہ نبیل اور عبداللہ نے آج رات اس کے پاس ہی ٹھہرنے کی کوشش کی تھی' لیکن دل آور نے انہیں منع کر دیا تھا۔

کیونکہ وہ دونوں بے حد تھکے ہوئے تھے' پہلے نبیل کے گھر دعوت' پھر صبح اٹھ کر کراچی جانا' پھر پورے دن کی بھاگ دوڑ' پھر ہوٹل میں رات گزارنے کے بعد افراتفری میں دوبارہ لاہور واپسی اور پھر یہاں آکر بھی ان دونوں نے ہی سب کچھ سنبھالا تھا اس لیے اب ضروری تھا کہ وہ دونوں اپنے گھر جاتے اور سکون سے آرام کرتے' کیونکہ بے سکونی اور نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے کسی کی بھی طبیعت خراب ہو سکتی تھی اسی لیے دل آور نے انہیں یہاں رکنے سے منع کر دیا تھا کیونکہ یہاں رہ کر وہ بھی اس کی وجہ سے سکون کی نیند نہیں سو سکتے تھے' لہٰذا یہی بہتر تھا کہ وہ گھر چلے جاتے۔

"عبداللہ چلا جاتا ہے' لیکن میں رک جاتا ہوں' ڈونٹ وری۔ ماما اور مدیحہ آسانی سے رہ لیں گی اور ویسے بھی اب تو مومنہ بی بی بھی ہے ان کے ساتھ۔" نبیل اسے تنہا چھوڑ کر جانے کے لیے تیار نہیں تھا۔

"عبداللہ پلیز یار! سمجھاؤ اسے کتنی دیر اور کتنے دن رکو گے میرے ساتھ۔۔۔؟ آج۔۔؟ کل۔۔؟ پرسوں۔۔؟ ہفتہ۔۔؟ دو ہفتے۔۔؟ مہینہ۔۔؟ دو مہینے۔۔؟ سال۔۔؟ دو سال۔۔؟ آخر کب تک رکو گے۔۔۔؟ یہ میرا گھر ہے اور یہاں میں نے تنہا ہی رہنا ہے کوئی بھلا کب تک ساتھ دے سکتا ہے؟ اور جب کوئی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ساتھ نہیں دے سکتا تو پھر صرف ایک دن کے لیے یا پھر ایک رات کے لیے بھی کیوں؟ یہ رات بھی بس چند گھنٹوں کی رہ گئی ہے ابھی تھوڑی دیر میں ختم ہو جائے گی اور بس۔۔۔!" دل آور نبیل کی ضد پہ نجانے کیوں اتنا تلخ ہو گیا تھا کہ نبیل نے دوبارہ کچھ بھی نہیں کہا تھا اور اس سے ہاتھ ملا کر عبداللہ وغیرہ کے ساتھ ہی وہاں سے چلا گیا تھا' لیکن نبیل کا اس طرح جانا بھی دل آور کے دل پہ بوجھ چھوڑ گیا تھا اور اس کا ذہن اور زیادہ اپ سیٹ ہو گیا تھا اور وہ وہیں کا وہیں گیٹ کے پاس ہی کھڑا رہ گیا تھا جسے کافی دیر بعد گلاب خان نے آکر متوجہ کیا تھا۔

"صاحب! باہر کافی ٹھنڈ ہو رہی ہے آپ یہ چادر اوڑھ لیں موسم اچھا نہیں ہے آپ بیمار پڑ جائیں گے۔" گلاب خان اس کی کالے رنگ کی گرم چادر لے کر اس کے قریب آگیا تھا اور چادر کی تہہ کھول کر اس کے کندھوں کے گرد پھیلا دی تھی اور دل آور نے اک گہری سانس کھینچتے ہوئے قدم اندر کی سمت موڑ لیے تھے اور گلاب خان نے گیٹ بند کر دیا تھا۔

"صاحب! آپ کے لیے چائے لے کر آؤں؟" وہ اندر آکر ڈرائنگ روم کے بیچوں بیچ کھڑا خالی خالی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا جب گل اس کے پاس آکھڑی ہوئی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس نے کل سے کھانے کا ایک ذرہ بھی زبان پہ نہیں رکھا وہ اتنے گھنٹوں سے مسلسل بھوکا بھی ہے اور پیاسا بھی اور اس کے سب دوست وغیرہ بھی جا چکے ہیں۔ ایسے میں اسے کھانے کے لیے بھلا کون کہے گا؟ اور کون پوچھے گا اس سے؟ اس لیے یہ ہمت گل نے خود ہی کر لی تھی۔

لیکن دل آور کو آج بھلا کسی چیز کی کب طلب تھی آج تو جیسے اس کی پوری ہستی اور پوری ذات ہی مر چکی تھی۔

وہ تو بس خالی کھوکھلا اور خواہشوں سے عاری وجود لیے ہی کھڑا تھا اور تو کچھ بھی باقی نہیں تھا۔

"آپ کہتے ہیں تو کافی بنا لیتی ہوں۔" گل نے پھر سوال بدل کر دہرایا تھا۔

"نہیں! کسی چیز کی بھی طلب نہیں ہے۔ تم جاؤ' آرام کرو جا کر تم بھی تھک گئی ہو گی۔"

دل آور نے آہستگی سے اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کر تھپکتے ہوئے اسے جانے کا کہا تھا اور خود بتول شاہ کے بیڈ روم کی طرف بڑھ گیا تھا جبکہ گل کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے' دل آور کو یوں تھکے تھکے اور خالی خالی سے انداز میں تنہا بتول شاہ کے بیڈ روم میں جاتے دیکھ کر اس کا دل مٹھی میں آگیا تھا اور وہ اپنے دوپٹے سے آنسو پونچھتی ہوئی وہاں سے ہٹ گئی تھی اور دل آور بتول شاہ کے بیڈ روم میں آگیا تھا جہاں سب کچھ ابھی بھی تازہ تھا جیسے وہ بیڈ روم سے ابھی ابھی تیار ہو کر باہر نکلی ہوں اور ان کے لیڈی پرفیوم کی دلفریب سی مہک بیڈ روم کی فضا میں ابھی بھی رچی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

"شاہ۔! کس کو ڈھونڈ رہے ہو؟" اک سرگوشی نما سرسراہٹ دل آور کی سماعتوں کو چھو کے گزر گئی تھی اور اس نے بے ساختہ پورے بیڈ روم میں ادھر ادھر دیکھا تھا اور بیڈ روم کو خالی پا کر پھر سے دل بھر آیا تھا۔

"صاحب۔۔۔! اب آپ بھی آرام کر لیں نا دیکھیں بہت ٹائم ہو گیا ہے۔ آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔" گلاب خان بھی اس کی خاطر ابھی تک جاگ رہا تھا کیونکہ جب تک وہ نہ سوجاتا' ان لوگوں کو بھی بھلا کب سکون تھا؟ اور دل آور نے بڑے حوصلے اور بڑے ضبط کے ساتھ اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے اپنے پیچھے دروازے کی چوکھٹ میں کھڑے گلاب خان کو دیکھا تھا۔

"صاحب۔۔۔! ہم سب جانتے ہیں کہ آپ کا دکھ' آپ کا غم بہت بڑا ہے اور اس دکھ کا اور اس غم کا کوئی مداوا بھی نہیں ہے' لیکن یہ دکھ اور یہ غم ایسا ہے کہ ہر کوئی اپنے سینے میں لیے پھر رہا ہے' زندگی میں ہر کسی کو یہ چوٹ لگتی ہے' ہر کسی کو یہ درد سہنا پڑتا ہے۔ ماں باپ ہمیشہ ساتھ نہیں رہتے اور ماں باپ کے مر جانے سے اولاد مر نہیں جاتی یہ زندگی ہے اور زندگی چلتی ہی رہتی ہے کسی کے چلے جانے سے زندگی رک نہیں جاتی' ہاں دل میں دکھ ضرور رہ جاتا ہے اور دکھ تو ہمیشہ انسان کی زندگی کا حصہ بنے رہتے ہیں۔ بس انسان کو حوصلہ رکھنا چاہیے اور مجھے پتا ہے کہ آپ کا حوصلہ اور آپ کا صبر بہت بلند ہے۔ آپ بہت مضبوط ہیں' اس میں کوئی شک نہیں ہے' لیکن آپ کو اپنا بھی خیال رکھنا چاہیے کیونکہ آپ اپنا خیال نہیں رکھیں گے تو اور کون رکھے گا؟" گلاب خان نے بڑے مدبرانہ اور دوستانہ سے انداز میں دل آور کو سمجھانے کی اور ہمت بندھانے کی کوشش کی تھی' جس پہ دل آور محض سر ہلا کر چپ ہو کے رہ گیا تھا۔

"صاحب۔۔۔! آپ اس وقت اپنے کمرے میں جائیے' آرام کیجیے' یہ دکھ تو اب ہمیشہ ساتھ ہی رہے گا۔" گلاب خان آگے بڑھ کے اسے کندھے سے تھام کے باہر لے آیا تھا اور بتول شاہ کے بیڈ روم کا دروازہ بند کر دیا تھا۔

"رہنے دو گلاب خان! میں خود چلا جاؤں گا۔" اس نے سیڑھیوں کے قریب آکر گلاب خان کے سہارے کی بجائے سیڑھیوں کی ریلنگ تھام لی تھی۔

"ٹھیک ہے! آپ جائیں آرام کریں۔" گلاب خان آہستگی سے پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اور دل آور بمشکل قدم اٹھاتا ہوا سیڑھیاں چڑھنے لگا تھا۔

"صاحب جی۔۔۔! وہ۔۔۔ وہ آپ سے کچھ کہنا تھا۔" گلاب خان کو اچانک کچھ یاد آیا تھا اور دل آور کے قدم رک گئے تھے اس نے پلٹ کر گلاب خان کو سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

"صاحب جی۔۔۔! مجھے نہیں پتا کہ آپ کے دل میں کیا ہے؟ اور آپ کے دماغ میں کیا ہے؟ لیکن جو میرے دل میں تھا اور جو میرے دماغ میں تھا میں نے وہی کیا ہے اگر آپ کو ناگوار گزرے تو معافی چاہتا ہوں' لیکن میں نے

علیزے بی بی کا اور آپ کا رشتہ دیکھتے ہوئے انہیں بیس منٹ میں بھیجنے کے بجائے صبح آپ کے بیڈ روم میں بھیج دیا تھا کیونکہ میرے خیال اور میری عقل کے حساب سے دیکھا جائے تو اب وہی ان کی اصل جگہ ہے۔ اور اصل مقام ہے جس میں آپ کی بھی عزت ہے اور ان کی بھی عزت ہے۔۔۔! اس لیے اس میں علیزے بی بی کا کوئی قصور نہیں ہے۔ آپ نے اگر کچھ کہنا ہے تو مجھے کہہ لیں۔۔۔ میں آپ کی ہر سزا کے لیے تیار ہوں۔" گلاب خان نے دل آور کے بیڈ روم میں جانے سے پہلے علیزے کی وہاں موجودگی کا مسئلہ کلیئر کر دینا بہتر سمجھا تھا۔

"سزا۔۔۔؟" دل آور نے زیر لب دہرایا تھا۔

"جی ہاں صاحب جی سزا۔۔۔! کیونکہ آپ مالک ہیں اور میں ملازم ہوں اور میں نے ایک ملازم ہو کر آپ کی ذاتی زندگی میں مداخلت کی ہے۔ آپ کی اجازت کے بغیر یہ قدم اٹھایا ہے حالانکہ میری اتنی اوقات نہیں ہے کہ میں ایسا کچھ کروں۔ اس لیے آپ کو پورا پورا حق ہے کہ آپ مجھے سزا دیں یا مجھ پہ غصہ کریں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا میں حاضر ہوں۔" گلاب خان اس کے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا جبکہ دل آور کے دل و دماغ پہ کچھ اور ہی چل رہا تھا۔

"ماں۔۔۔! اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟ تکلیف کم ہوئی یا نہیں؟" وہ لپک کے پاس آیا تھا۔

"تکلیف۔۔۔ کم۔۔۔ ہو سکتی ہے۔۔۔ اگر۔۔۔ اگر۔۔۔ تم۔۔۔ کرو۔۔۔ تو۔۔۔" بتول شاہ نے ہاتھ اٹھا کر اس کے چہرے کو چھونے کی کوشش کی تھی مگر ڈرپ لگی ہوئی تھی اس لیے ہاتھ وہیں کا وہیں رہ گیا تھا۔

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔! میں کروں گا۔۔۔ ضرور کروں گا۔۔۔ آپ کہیں کیا بات ہے۔۔۔؟" اس نے فوراً" اثبات میں سر ہلایا تھا اور ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا تھا۔

"میں۔۔۔ میں۔۔۔ نے۔۔۔ آج۔۔۔ و۔۔۔ وقار۔۔۔ آفندی۔۔۔ کی حالت۔۔۔ دیکھی ہے۔۔۔ و۔۔۔ وہ۔۔۔ اپنی۔۔۔ سزا۔۔۔ اسی۔۔۔ دنیا۔۔۔ میں۔۔۔ بھ۔۔۔ بھگت۔۔۔ چکا۔۔۔ ہے۔۔۔ تت۔۔۔ تم۔۔۔ اب۔۔۔ علیز۔۔۔ ے۔۔۔ کو۔۔۔ سزا۔۔۔ مت۔۔۔ دو۔۔۔ میرا۔۔۔ خدا۔۔۔ گواہ۔۔۔ ہے۔۔۔ میں نے۔۔۔ آج۔۔۔ وقار۔۔۔ آفندی۔۔۔ کو معاف کیا۔۔۔ معاف کیا میں نے۔۔۔"

بتول شاہ کے الفاظ سے عرش فرش کانپ گئے تھے اور دل آور شاہ تو جیسے کھڑے قد سے ڈھے گیا تھا۔ اور کھڑے قد سے ڈھے جانے والے دل آور شاہ کے دل و دماغ پہ اب یہی آواز بار بار بازگشت کر رہی تھی۔

"میرا۔۔۔ خدا۔۔۔ گواہ۔۔۔ ہے۔۔۔ میں نے۔۔۔ آج۔۔۔ وقار۔۔۔ آفندی۔۔۔ کو معاف کیا۔۔۔ معاف کیا میں نے۔۔۔!"

"معاف کیا میں نے۔۔۔!"

"معاف کیا میں نے۔۔۔!"

وہ گلاب خان سے کچھ بھی کہے بغیر سیڑھیاں چڑھنے لگا تھا' لیکن ذہن میں وہی الفاظ مسلسل تکرار کر رہے تھے۔

اس کے قدم من من بھر کے ہو چکے تھے اور ایک ایک سیڑھی ایک ایک صدی کی مسافت پہ محسوس ہو رہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ یونہی سیڑھیاں چڑھتے نیچے گر جائے گا کیونکہ اس کے قدموں میں ذرا بھی توازن نہیں تھا وہ کسی بھی وقت اپنا توازن کھو سکتا تھا اور اس کے قدم کسی بھی وقت لڑکھڑا سکتے تھے اسی لیے تو اس نے سیڑھیوں کی ریلنگ تھام رکھی تھی اور اسی لیے تو گلاب خان بھی پیچھے کھڑا اسے چڑھتے ہوئے دیکھتا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

کل کا پورا دن گزر گیا تھا اور کل کی پوری رات گزر گئی تھی۔

آج کا پورا دن گزر گیا تھا اور آج کی آدھی رات گزر گئی تھی اور وہ دل آور کی طرح مسلسل بھوکی اور پیاسی بیٹھی

ہنوز جاگ رہی تھی اور جل رہی تھی، چین ایک پل نہیں تھا۔

وہ بیڈ سے کھڑکی تک اور کھڑکی سے بیڈ تک نجانے کتنے ہی چکر کاٹ چکی تھی جن سے یوں لگ رہا تھا جیسے پاؤں کے تلوے بھی شل ہو گئے ہوں اور آخر کار یہ شل ہوئے تلوے بھی جواب دے گئے تھے اور وہ تھک ہار کے نڈھال سی ایک بار پھر بیڈ پر بیٹھ گئی تھی اور ابھی اسے بیڈ پہ بیٹھے دو منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ اچانک دروازے پہ آہٹ سی سنائی دی اور اگلے چند سیکنڈ میں دروازے کا ہینڈل گھما کر وہ اندر داخل ہوا تھا اور علیزے اسے دیکھ کر جہاں کی تہاں بیٹھی رہ گئی تھی۔

بے شک، جو بھی تھا۔ دن جیسے بھی گزر گیا تھا۔ لیکن اس وقت وہ اسے اپنے سامنے اور اپنے ساتھ ایک ہی بیڈ روم میں دیکھ کر "خاک" ہو گئی تھی۔ اس کے دل و دماغ برف کی مانند سرد پڑ گئے تھے اور وہ بوجھل اور مضمحل سے دل آور کو اپنی سمت قدم بڑھاتے ہوئے بڑی بے تاثر اور سپاٹ سی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

وہ لڑکھڑاتے ہوئے غیر متوازن اور ڈھیلے ڈھالے قدموں سے چلتا ہوا عین اس کے سامنے آکھڑا ہوا تھا اور علیزے نے آہستگی سے اس سے نظریں چراتے ہوئے سر جھکا لیا تھا جبکہ اس کے سامنے کھڑا مضبوط پہاڑ نما دل آور شاہ اپنے اندر کے دکھ کی وجہ سے بھر بھری ریت کی طرح بکھر گیا تھا۔

"علیزے۔۔۔!" وہ ہارے ہوئے انداز میں علیزے کے سامنے قالین پہ دو زانو بیٹھتے ہوئے اس کی گود میں منہ چھپا کر رو پڑا تھا اور علیزے جو پہلے ہی خاک ہوئی بیٹھی تھی اس کے اس طرح بکھرنے سے خود بھی بکھر گئی تھی۔

وہ ساکت و صامت سی اپنی گود میں منہ چھپائے انتہائی شدت سے روتے ہوئے دل آور شاہ کو دیکھ رہی تھی، کیونکہ اس نے دل آور شاہ کو اتنے ہارے ہوئے اور اتنے شکستہ روپ میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

مگر آج اس کا دکھ واقعی اتنا بڑا تھا کہ وہ ٹوٹ گیا تھا۔۔۔ بکھر گیا تھا۔۔۔!

اور وہ ٹوٹ کے بکھرا بھی تھا تو کس کے پاس۔۔۔؟

علیزے دل آور شاہ کے پاس۔۔۔ جو اسے سمیٹ بھی نہیں سکتی تھی۔ جو اسے سنبھال بھی نہیں سکتی تھی۔

"علیزے۔۔۔! آج دل آور شاہ مر گیا۔۔۔ مر گیا آج دل آور شاہ۔۔۔ آج میں زہرہ بتول شاہ کو نہیں، دل آور شاہ کو دفن کر کے آیا ہوں۔ آج میں دل آور شاہ کو قبر میں اتار آیا ہوں۔ مٹی ڈال آیا ہوں دل آور شاہ پہ۔۔۔ آج مٹ گیا دل آور شاہ آج سچ مچ مٹ گیا۔۔۔!"

وہ بہت بری طرح رو رہا تھا۔ اور علیزے اتنے مضبوط اور اونچے پورے مرد کو اپنی گود میں منہ چھپا کے روتے ہوئے دیکھ کر عجیب بے بس سی ہونے لگی تھی۔ اس کا دل بھی رونے لگا تھا۔ کچھ اس کے دکھ پہ۔۔۔ کچھ اپنے دکھ پہ۔۔۔

"میری تیس سالہ زندگی میں مجھے کبھی یہ احساس نہیں ہوا کہ ماں کیا ہوتی ہے اور باپ کیا ہوتا ہے۔۔۔؟ بس مجھے اتنا پتا ہے کہ زہرہ بتول شاہ کیا ہوتی ہے۔۔۔؟"

"علیزے۔۔۔! وہ صرف میری ماں ہی نہیں تھیں۔۔۔ بلکہ۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ تو میرے لیے باپ بھی تھیں۔۔۔ وہ میری زندگی۔۔۔ اور میری کل کائنات تھیں۔۔۔ میرا سب کچھ وہی تو تھیں۔۔۔ میں جو کچھ بھی تھا صرف انہی کے دم سے تھا۔۔۔ اب وہ نہیں ہیں تو میں بھی اب کچھ نہیں ہوں۔۔۔ مگر دکھ اس بات کا ہے کہ انہوں نے پوری زندگی کوئی سکھ نہیں دیکھا۔۔۔ کوئی خوشی نہیں پائی۔۔۔ پہلے زندگی کانٹوں پہ بسر کر دی۔۔۔ اور اب قبر کو گھر بنا لیا ہے۔۔۔ اور میں۔۔۔ ہمیشہ کا بدنصیب۔۔۔ ان کے لیے کچھ بھی تو نہیں کر سکا۔۔۔ کچھ بھی تو نہیں۔۔۔؟"

ہمیشہ سب کے سامنے آن بان اور شان سے رہنے والا آج علیزے کے سامنے یوں بکھر رہا تھا، یوں ٹوٹ رہا تھا جیسے وہ اس کی ذات کا آئینہ تھی، اس کی ذات کا عکس تھی، اس کی ذات کا حصہ تھی۔۔۔ جس کے سامنے ٹوٹ کر

قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

بکھرتے ہوئے اسے کوئی شرم نہیں تھی اور اسے کوئی عار نہیں تھا۔ پورا دن کسی کے بھی سامنے اس کی آنکھ سے آنسو تک نہیں ٹپکا تھا اور یہاں وہ یوں لگ رہا تھا جیسے پوری زندگی کی کسر پوری کر دے گا۔

"ڈرائیور۔۔۔!" علیزے اس کی ایسی حالت اور ایسی کیفیت برداشت نہیں کر پا رہی تھی اس نے بے حد آہستگی سے اور رندھی ہوئی آواز سے اسے پکارا تھا۔ اس کے اپنے آنسو بھی بہہ رہے تھے اور کچھ نہ سہی، لیکن بتول شاہ کا دکھ تو اسے بھی تھا وہ بھی کل رات سے ان کے لیے بہت زیادہ روئی تھی۔ اس کا دل بھی موم کی طرح پگھل رہا تھا۔

"علیزے۔۔۔! وہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئی ہیں مجھے۔ اکیلا کر گئی ہیں مجھے، میں تنہا ہو گیا ہوں آج، بالکل تنہا اتنی بڑی دنیا میں اور اتنے سارے دوستوں میں بھی تنہا ہو گیا ہوں۔ آج میرے سارے رشتے ختم ہو گئے ہیں۔۔۔ سارے رشتے۔ دل آور کی آواز حد سے زیادہ بھاری ——— ہو رہی تھی۔

علیزے کو تو یہ سمجھ بھی نہیں آ رہی تھی کہ وہ اسے کوئی حرف تسلی کہے بھی تو کیسے۔۔۔؟ وہ سدا کی معصوم۔۔۔ اور سدا کی نادان۔۔۔ اسے تو سلیقہ ہی نہیں تھا کہ ایسی رنجیدہ اور دلخراش صورت حال میں کیا کہنا چاہیے؟ اور کیسے پیش آنا چاہیے؟ بس اس پگھلتے ہوئے وقت اور احساس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے اتنا کیا تھا کہ اپنا لرزتا کپکپاتا ہوا ہاتھ اٹھا کر بڑے حوصلے اور بڑے صبر کے ساتھ دل آور کے بالوں پہ رکھ دیا تھا۔

"ڈرائیور۔۔۔! پلیز مت رو۔ بس کرو اس روز میں رو رہی تھی اور تمہیں مجھ پہ رشک آ رہا تھا، لیکن آج نجانے کیا بات ہے کہ تم رو رہے ہو اور مجھے تم پہ رشک نہیں آ رہا بلکہ رونا آ رہا ہے کیونکہ میں جانتی ہوں تم اس وقت تنہا ہو، واقعی تنہا ہو اور تنہائی انسان کے لیے زہر ثابت ہوتی ہے۔ ایک نہ ایک دن مار دیتی ہے۔ جیسے مجھے مار دیا ہے اس تنہائی نے۔" علیزے خاصے بھرائے ہوئے لہجے میں بول رہی تھی اور اس کے آنسو دل آور کے بالوں میں جذب ہو رہے تھے۔ انہی بالوں میں جن میں علیزے کے ہاتھ کی دودھیا نازک مخروطی انگلیاں دل آور کے لیے ایک تسلی بن کے سرک رہی تھیں اور دل آور اس تسلی کے باوجود بھی خود کو سنبھال نہیں پا رہا تھا اس کے ذہن میں بتول شاہ کا ہی خیال بھٹک رہا تھا۔ اس کی سوچ وہیں پہ اٹکی ہوئی تھی۔ وہ وہیں پر منجمد ہوا لگ رہا تھا۔

"علیزے۔۔۔! اگر تنہائی کا یہ زہر تمہیں یا مجھے مار سکتا ہے تو پھر سوچو کیا یہ زہر انہیں نہیں مار سکتا تھا؟ انہوں نے بھی تو پوری زندگی تنہا گزاری ہے، اک عمر تنہائی کاٹی ہے انہوں نے۔۔۔ اور آج بھی وہ تنہا ہی چلی گئیں اور۔۔۔ اور مجھے بھی تنہا کر گئی ہیں۔۔۔ علیزے۔۔۔! تمہیں۔۔۔ تمہیں نہیں پتا کہ میں کتنا تنہا ہوں؟ کتنا تنہا۔۔۔!"

دل آور نے علیزے کے ہاتھ پکڑ کر اپنے چہرے پہ رکھ لیے تھے اور اس کے رخساروں پہ آنسوؤں کی نمی اور شیو کی چبھن علیزے کو اپنی ہتھیلیوں میں محسوس ہوئی تھی اور اس نے کسمسا کر اپنے ہاتھ پیچھے ہٹانے چاہے تھے مگر دل آور کی گرفت اب اتنی بھی کمزور نہیں تھی کہ وہ ہاتھ چھڑاتی اور اس سے ہاتھ چھوٹ جاتے۔۔۔!

"مم۔۔۔ میں تمہارے لیے چائے بناؤں ڈرائیور؟" علیزے کو اس کے سامنے سے اٹھنے کا اور کوئی بہانا نہیں سوجھا تھا۔

"نہیں۔۔۔! مجھے کسی چیز کی بھی طلب نہیں ہے۔۔۔ نہ بھوک ہے' نہ پیاس ہے' کچھ بھی نہیں ہے۔"
اس نے نفی میں سرہلاتے ہوئے علیزے کے ہاتھ اپنے چہرے سے نیچے کر لیے تھے اور پھر اس کے دونوں ہاتھوں کو نرمی سے چھوتے ہوئے انہیں یوں جوڑ دیا تھا جیسے وہ دعا مانگ رہی ہو اور اس دعا کے انداز میں جوڑے ہاتھوں کو دیکھ کر وہ عجیب تلخی سے مسکرا دیا تھا۔
"کاش۔۔۔! تم نے میرے مرنے کی دعا دل سے کی ہوتی علیزے۔۔۔ تو آج شاید میں مر ہی چکا ہوتا؟" اس نے علیزے کے ہاتھ آہستگی سے جھٹک دیے تھے اور علیزے کا چہرہ اونچا کر کے اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔

"لیکن۔۔۔! بگڑا اب بھی کچھ نہیں۔ دعا تو تم اب بھی کر سکتی ہو۔ میرے پاس بھی اب کچھ نہیں رہا جینے کے لیے۔۔۔ ہاں البتہ میرے مرنے سے اب یہ فرق پڑے گا کہ تم بیوہ کہلانے لگو گی۔۔۔ "دل آور شاہ کی بیوہ" اور مجھے پتا ہے تمہیں اس لفظ سے کوئی فرق نہیں پڑے گا بلکہ خوشی محسوس ہوگی اور میں تمہیں خوش ہی تو کرنا چاہتا ہوں؟"
وہ عجیب بہکی بہکی باتیں کر رہا تھا اور علیزے اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی اس کے حواس واقعی اڑے ہوئے لگ رہے تھے اس کی باتوں میں بے ربطگی آگئی تھی۔
"ڈرائیور۔۔۔! یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ تم کیا کہہ رہے ہو؟" علیزے کو حیرت ہوئی تھی۔
"ہونہہ۔۔۔! کچھ نہیں۔۔۔" وہ سر جھٹک کر اس کے سامنے سے اٹھ گیا تھا اور علیزے اس کے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے اپنے ہاتھوں کو اور اپنے دامن کو دیکھتی رہ گئی تھی۔
وہ وہاں سے اٹھ کر راکنگ چیئر پہ جا بیٹھا تھا اور پلکیں موند کر پھر سے بتول شاہ کے لیے پگھلنے لگا تھا اور علیزے راکنگ چیئر پہ جھولتے دل آور کو چند سیکنڈ یونہی دیکھتی رہی اور پھر اٹھ کر وہاں سے باہر آگئی۔ اس گھر میں تھوڑا بہت چلنے پھرنے سے یہ تو اسے اندازہ ہو ہی چکا تھا کہ کچن کہاں ہے وہ سیدھی کچن میں جا پہنچی۔
اس کا ارادہ چائے بنانے کا تھا حالانکہ اس نے آج تک کبھی بھی چائے نہیں بنائی تھی' لیکن آج دل آور کی حالت اور صورت حال دیکھ کر بے ساختہ ہی اس نے چائے بنانے کا سوچا تھا اور وہ اس سوچ پہ عمل پیرا بھی ہوگئی تھی۔
اس نے چند روز پہلے گل کو چائے بناتے ہوئے دیکھا تھا وہ دیکھنا ہی اس کے کام آگیا تھا اور اس نے سب کچھ ڈھونڈ ڈھانڈ کے آخر کار چائے بنالی تھی اور پھر واپس کمرے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ وہ جس طرح ہوا کے جھونکے کی طرح گئی تھی۔ اسی طرح واپس بھی آگئی تھی۔
"ڈرائیور۔۔۔!" اس نے قریب آکر آہستگی سے پکارا تھا' لیکن وہ یونہی آنکھیں بند کیے پڑا رہا تھا۔
"ڈرائیور۔۔۔!" اس نے دوبارہ اسے پکارا۔
"ہوں۔۔۔؟" اس نے بمشکل "ہوں" میں جواب دیا تھا۔
"چائے۔۔۔!" علیزے کی آواز دھیمی پڑ گئی تھی جبکہ دل آور نے یکدم آنکھیں کھول دی تھیں وہ اس کے سامنے چھوٹی سی ٹرے میں چائے کا کپ لیے کھڑی تھی۔ اور اس کو اس روپ میں دیکھ کر دل آور اپنی پوری ہستی سے ششدر سا رہ گیا تھا اور اس کے ہونٹ آہستگی سے کپکپائے تھے۔
"بیوی۔۔۔؟" اس کے اعصاب یکدم جھنجھنا اٹھے تھے۔

☆ ☆(باقی آئندہ)☆

نبیلہ عزیز

دردِ دل

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نبیل حیات دو ہی بہن بھائی ہیں' مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے' وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پہ رنگ چکی ہے' جس کے پیش نظر فائزہ بیگم' نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں' لیکن مدحیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے' جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے' مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے' مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا' بے بسی اور مجبوری سے تنگ آ کر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے' لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باؤ امتیاز مل جاتا ہے' جو اسے کام کی آفر کرتا ہے' جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے' اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے' وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے' وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آزر شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے' وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے' اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا' اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔

تیتیسویں قسط

کیونکہ یہ لفظ اور یہ خیال اس کے دماغ پہ کسی چابک کی طرح پڑا تھا اور وہ جیسے بلبلا کے رہ گیا تھا۔
نجانے کیوں اسے اس لمحے بڑا عجیب سا لگا تھا اور بڑی تکلیف بھی ہوئی تھی۔
شاید اپنے آپ پہ۔۔۔ یا شاید علیزے کی ذات پہ۔۔۔
لیکن جو بھی تھا یہ ان کی زندگی کا ایک بہت ہی عجیب ترین موڑ تھا کہ وہ دونوں ہی ایک دوسرے کے سامنے بے بس و بے اختیار کھڑے تھے اور ایک دوسرے سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ جو کچھ ہونا تھا وہ تو ان کی اتنی "نفرت اور نہیں نہیں" کے باوجود بھی ہو ہی چکا تھا اس لیے اب کچھ کہنے اور کرنے کے لیے تو تھا ہی نہیں۔
بس اب تو وہ دونوں تھے۔۔۔ اور ان کی اجنبیت تھی۔
اور اب جو بھی کرنا تھا اسی اجنبیت کی دیوار کے آر پار رہ کر ہی کرنا تھا۔ ورنہ اور تو کوئی حل ہی نہیں تھا زندگی کو سہل کرنے کے لیے۔۔۔
شاید اسی لیے دونوں کو شعور آگیا تھا کہ اب زندگی کرنے کی طرز کیا ہوگی؟ اور طریقہ کیا ہوگا؟ دکھ کی بھٹی میں دونوں ہی جلے تھے اس لیے صبر بھی دونوں کو ہی آچکا تھا' دونوں ہی صابر ہو چکے تھے اور آج اس لمحے سے دونوں پہ ہی ادراک ہو چکا تھا کہ اب زندگی "یہی" ہے اور اسے ہی قبول کرنا ہے۔
چاہے دل مانے۔۔۔ چاہے نہ مانے۔۔۔!
"ڈرائیور۔۔۔! چائے۔" اس نے ایک بار پھر اسے متوجہ کیا تھا۔
"ہوں۔۔۔! رکھ دو۔" وہ ایک بار پھر چونک کر متوجہ ہوا تھا اور علیزے نے آہستگی سے آگے بڑھ کے چائے کا کپ ٹیبل پہ رکھ دیا تھا اور خود پلٹ گئی تھی۔
"تھینک یو۔۔۔!" دل آور کی نظریں ٹیبل پہ رکھے چائے کے کپ پہ تھیں اور شکریہ علیزے کا ادا کر رہا تھا۔
علیزے نے ٹھٹک کر گردن موڑ کے اسے دیکھا تھا وہ بڑی خود فراموشی کے عالم میں بیٹھا تھا اور علیزے اسے اک نظر دیکھ کر صوفے پہ جا بیٹھی تھی کیونکہ اب اس میں اتنی ہمت اور اتنی جرات نہیں تھی کہ وہ اس کے سامنے دوبارہ جا کر بیڈ پہ بیٹھ جاتی۔ بلکہ وہ تو پہلے ہی اس بیڈ سے بڑی مشکل سے اٹھی تھی اب دوبارہ جا کر بیٹھنا تو ممکن ہی نہیں تھا۔
"سو جاؤ!" اس نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے گمبھیر اور بوجھل سے لہجے میں کہا تھا۔
"نیند نہیں آرہی۔" علیزے نے اپنے ہاتھوں کو آپس میں مسلتے ہوئے انتہائی آہستگی سے جواب دیا تھا۔
"کیوں۔۔۔؟ تمہیں نیند کیوں نہیں آرہی۔۔۔؟" وہ چائے کا سپ لیتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔
"نرم بستر پہ سونے کی عادت نہیں رہی۔" علیزے کے جواب پہ وہ ٹھہر سا گیا تھا اور پھر گردن اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ جبکہ وہ بڑے لاپروا اور لاتعلق سے انداز میں گردن جھکائے بیٹھی اپنی گود میں رکھے اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔
"عادت تو تمہیں میرے ساتھ رہنے کی بھی نہیں ہے؟ پھر کیا کروگی۔۔۔؟" دل آور کا لہجہ عجیب بے تاثر سا ہو رہا تھا اور اب کی بار اس کے اس لہجے اور سوال پہ علیزے نے بھی چونک کر دیکھا تھا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا دونوں کی نظروں کا تصادم ہوا تو دونوں نے ہی نظریں جھکا لی تھیں۔
"میری عادتوں کو تم سے بہتر کوئی بھی نہیں جانتا۔ مجھے فرش پہ سونے کی عادت ہو سکتی ہے تو پھر۔۔۔" علیزے نے یونہی اپنے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے اسے جواب سے نوازا تھا' لیکن اس ادھورے جواب کا مفہوم دل آور بہت گہرائی سے اور بہت آسانی سے سمجھ چکا تھا۔
"ہوں۔۔۔! تو پھر میرے ساتھ رہنے کی عادت بھی ہو سکتی ہے یعنی اس فرش میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں

ہے؟" دل آور نے آہستگی سے سرہلاتے ہوئے خود کلامی کے سے انداز میں خود کو جیسے کچھ باور کروایا تھا اور پھر خاموشی سے دوبارہ چائے کا کپ اٹھا کر چائے پینے لگا تھا۔
علیزے کے ہاتھ سے بنی ہوئی چائے جو اس نے زندگی میں پہلی بار بنائی تھی اور وہ بھی صرف اس کے لیے بنائی تھی اور علیزے اسے چائے پیتے ہوئے دیکھ رہی تھی جبکہ وہ اپنے دھیان میں چائے پی رہا تھا۔
رات بہت حد تک بیت چکی تھی اور وہ دونوں ہنوز اپنی اپنی جگہ پہ اپنی اپنی سوچوں میں گم بیٹھے جاگ رہے تھے' وہ راکنگ چیئر پہ جھول رہا تھا اور وہ صوفے پہ بیٹھی ہوئی تھی اور یونہی بیٹھے بیٹھے دونوں کی پہلی رات گزر گئی تھی۔
دکھ' درد اور ذلیلوں کے بوجھ تلے دبی ہوئی رات۔۔۔ یعنی ان دونوں کی سہاگ رات۔۔۔!!!

☼ ☼ ☼

دکھ کی رات ڈھل چکی تھی اور ذلیلوں کا دن شروع ہو چکا تھا اور ان ہی ذلیلوں کے سہارے وہ بھی اپنے آپ کو ذرا سا سنبھال لینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ علیزے فجر کی نماز پڑھ رہی تھی جب دل آور راکنگ چیئر سے اٹھ کر اپنے بیڈروم کی کھڑکی میں جا کھڑا ہوا تھا اور کھڑکی کھول کر باہر دیکھنے لگا تھا۔
باہر کی تازہ ہوا اس کے بوجھل اعصاب کو کپکپا کے رکھ گئی تھی' بالکل اسی طرح جس طرح دعا مانگتے ہوئے علیزے کے ہاتھ کپکپا رہے تھے' اسے شاید کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ دعا میں اللہ سے اگر کچھ مانگے تو کیا مانگے؟ کیونکہ اپنے لیے تو کچھ مانگنے کے لیے تھا ہی نہیں۔۔۔ تو پھر کس کے لیے مانگے۔۔۔؟ اور اسی مانگنے اور نہ مانگنے کی کشمکش میں بیٹھی علیزے کے دعا کی خاطر پھیلے ہوئے ہاتھوں کو دیکھ کر دل آور کے دل میں دعا کی طلب بے دار ہوئی تھی۔ اک بلا ارادہ اور بے ساختہ سی طلب!
"علیزے۔۔۔! میں نے تمہیں بے سکون کیا ہے' دکھ دیا ہے تمہیں' دل دکھایا ہے تمہارا' تنہا کر دیا ہے تمہیں اور۔۔۔ اور۔۔۔ اب خود تنہا ہو گیا ہوں' خود بے سکون ہو گیا ہوں' اب اپنا دل دکھ سے بھر گیا ہے' اب مجھے دعا کی ضرورت ہے اور یہ دعا تمہارے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا صرف تم کر سکتی ہو۔ پلیز علیزے! میرے لیے دعا کرو۔ دعا کرو اللہ مجھے سکون دے اور صبر عطا کرے اتنا کہ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے شانت ہو جاؤں۔" وہ علیزے سے التجائیہ سے انداز میں کہتا وہاں سے ہٹ کے بیڈروم سے باہر نکل گیا تھا۔
علیزے اپنے خالی اور پھیلے ہوئے ہاتھوں کو دیکھتی رہ گئی تھی اس میں اتنا حوصلہ اور اتنا ظرف نہیں تھا کہ وہ اس شخص کے لیے دعا کرتی جو اس کے خاندان کو اور اس کے دل کو برباد کرنے کا باعث بنا تھا جس نے اسے کہیں کا بھی نہیں چھوڑا تھا جو اس کی ذات کو دو کوڑی کا کر کے رکھ چکا تھا۔
آخر وہ اس کے لیے دعا کرتی بھی تو کیسے۔۔۔؟
یہ ممکن ہی کب تھا بھلا۔۔۔؟
وہ اپنے کپکپاتے ہوئے ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچتی ہوئی اپنے ہونٹوں کو سیے ہوئے جائے نماز سمیٹ کر اٹھ گئی تھی اور بڑے ضبط سے اپنے آنسوؤں پہ بند باندھتی ہوئی اسی کھڑکی میں آکھڑی ہوئی تھی جہاں وہ کھڑا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ آج بھی اسی جائے نماز پہ بیٹھی تھی جس پہ اس کے دل آور شاہ نے سجدہ کیا تھا' نماز ادا کی تھی اور دعا مانگی تھی۔
البتہ اس نے تو پتا نہیں کون سی دعا مانگی تھی اور کس کے لیے مانگی تھی؟
مگر زری کی تمام دعائیں تو بس اسی کے لیے ہوتی تھیں۔

حرف اول سے لے کر حرف آخر تک صرف اس کا نام ہوتا تھا۔
اس کے دل سے نکلنے والا لفظ جیسے دل آور شاہ کی ہی امانت تھا۔
کسی اور کا تو گزر بھی ممکن نہیں تھا کہ اس کی دعاؤں میں شریک ہو جاتا۔
صرف وہی وہ تھا... کل بھی... آج بھی... آئندہ بھی... اور اس وقت بھی...! اور وہ تھی کہ اس کے لیے دعائیں مانگے جا رہی تھی کیونکہ کل وہ سب اس کا جو حال دیکھ چکے تھے اسے واقعی دعاؤں کی ہی ضرورت تھی دل سے اٹھنے والی بے لوث اور شدت آمیز دعائیں، جو اس کے لیے صرف اور صرف زری ہی کر سکتی تھی۔ زری کے سوا کوئی اور ہرگز نہیں کر سکتا تھا۔

☼ ☼ ☼
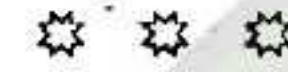
"انوشے...! انوشے...! کہاں ہو بھئی؟ ممی کہاں ہیں؟"
دانیال انیکسی میں داخل ہوتے ہی عائشہ آفندی کے بیڈ روم کی طرف جاتا تھا اس وقت بھی یہی ہوا تھا وہ سیدھا ان کے بیڈ روم میں ہی گیا تھا، لیکن انہیں وہاں نہ پا کر اس نے انوشہ کو آوازیں دینا شروع کر دی تھیں۔
"جی بھائی! کیا بات ہے؟ خیریت؟" انوشہ اپنے بیڈ روم میں بیٹھی پڑھ رہی تھی جب دانیال کی آواز پہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے باہر نکل آئی تھی۔
"بات کیا ہو گی بھلا؟ تم سب ہی غائب ہو، ممی کہاں ہیں؟ وہ بھی نظر نہیں آ رہیں؟" دانیال عائشہ آفندی کی طبیعت کی وجہ سے ہر وقت ہی تشویش زدہ سا رہتا تھا اسے ان ہی کی طرف سے پریشانی گھیرے رکھتی تھی۔
"ہم نے کہاں غائب ہونا ہے بھلا؟ زین شاید جودت اور حماد کے ساتھ نکلا ہوا ہے۔ میں یہاں اسٹڈی میں بزی ہوں اور مما کو سب نے ڈیڈ کے بیڈ روم میں بلایا ہوا ہے اور رہی بات آپ کی تو آپ اپنے آپ سے خود ہی پوچھ کر بتا سکتے ہیں کہ آپ کہاں تھے؟" انوشہ نے بھی اسے اسی کے سے انداز میں جواب دیا تھا جبکہ دانیال اس کے جواب پہ ذرا سا ٹھٹکا تھا۔
"ممی کو سب نے ڈیڈ کے بیڈ روم میں بلایا ہے؟ مگر کیوں؟" اس نے مزید تشویش سے پوچھا تھا۔
"یہ تو مجھے نہیں پتا البتہ یہ ضرور پتا ہے کہ آج کی میٹنگ بہت خاص میٹنگ ہے، سبھی حکمران وہیں جمع ہیں۔" انوشہ نے اسے مزید اطلاع دی تھی اور دانیال کے ذہن میں خطرے کا الارم بجنے لگا تھا۔
"خاص میٹنگ؟ ہوں... سمجھ گیا..." اس نے فوراً قدم واپس موڑ لیے تھے اس کا ارادہ اب وہیں جانے کا تھا۔
"کیا سمجھ گئے ہیں؟ کچھ مجھے بھی سمجھا دیں؟" انوشہ پیچھے سے مچل کے بولی تھی۔
"چل جائے گا پتا۔ صبر رکھو۔" اس نے جیسے اسے تسلی دی تھی۔
"مگر آپ جا کہاں رہے ہیں؟" اس نے پھر پوچھا تھا۔
"وہیں جہاں سبھی حکمران جمع ہیں۔" دانیال بڑے سکون سے کہتا ہوا سیڑھیاں اتر گیا تھا اس کے قدموں میں روانی آ گئی تھی وہ جلد از جلد میٹنگ میں پہنچنا چاہ رہا تھا اور اسی عجلت میں وہ کوریڈور مڑتی ہوئی حرمت سے ٹکراتے ٹکراتے بچا تھا۔
"اللہ خیر! کیا ہو گیا ہے آپ کو؟" حرمت نے خفگی سے کہتے ہوئے بمشکل اپنے آپ کو سنبھالا تھا۔
"سوری! میں نے دھیان نہیں دیا۔" دانیال خود بھی خجل ہو گیا تھا۔
"تو دھیان کہاں ہے آپ کا؟" اس نے بے ساختہ سوال داغ دیا تھا اور دانیال نے بے ساختہ اس کے چہرے کی

سمت دیکھا تھا وہ چہرے سے ہی خفت زدہ سی لگ رہی تھی۔
"دھیان بھی بس یہیں کہیں تھا۔" دانیال نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹا کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا تھا۔
"دھیان کو بس یہیں کہیں نہیں ہونا چاہیے، صرف ایک ہی جگہ پہ ہونا چاہیے۔ ورنہ یہیں کہیں دھیان رکھنے والے ٹھوکر کھا لیتے ہیں۔" حرمت نے اسے جیسے سمجھانے کی کوشش کی تھی اور پھر اک سائیڈ سے کترا کے گزر گئی تھی۔ جبکہ دانیال وہیں کھڑا اس کی بات کا مفہوم سمجھتا رہ گیا تھا۔
"کیا بات ہے دانیال بھائی؟ یہاں کیوں کھڑے ہیں آپ؟" جویریہ لاؤنج سے نکل کر اپنے بیڈ روم میں جا رہی تھی جب دانیال کو کوریڈور کے کونے پہ کھڑے دیکھ کر رک گئی تھی۔
"ہوں! کچھ نہیں بس ایسے ہی رک گیا تھا۔" وہ چونک کر سر جھٹکتا ہوا ڈیڈ کے بیڈ روم کی طرف آ گیا تھا حالانکہ اس کے دل میں کھدبد ضرور ہو رہی تھی کہ حرمت آخر ایسی بات کیوں کہہ گئی ہے؟ ورنہ وہ تو کبھی کچھ بھی نہیں کہتی تھی۔
"عائشہ! تم کیوں چپ ہو گئی ہو تم بھی تو کچھ کہو نا؟ تمہاری کیا رائے ہے؟"
ثروت بیگم کی آواز پہ دانیال دروازے پہ دستک دیتے دیتے رک گیا تھا ثروت بیگم عائشہ آفندی سے مخاطب تھیں۔
"آپ نے بات ہی چپ کروانے والی کر دی ہے، کچھ کہنے کے لیے کیا ہے اب؟ فیصلہ تو آپ لوگ پہلے ہی کر چکے ہیں۔ اب اس میں ہماری رائے کیا اہمیت رکھتی ہے بھلا۔" عائشہ آفندی کا دھیما اور بجھا بجھا سا لہجہ بتا رہا تھا۔ انہیں کچھ اچھا نہیں لگا۔ اب کیا اچھا نہیں لگا یہ تو ان لوگوں میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔
"کیوں؟ تمہاری رائے کیوں اہمیت نہیں رکھتی؟ تمہیں کچھ بھی کہنے کا پورا پورا حق ہے تم کہہ سکتی ہو۔ ہم سب سن رہے ہیں اور کوشش کریں گے کہ تمہاری رائے کا احترام کریں۔" اسرار آفندی نے وقار آفندی کی جگہ بولنے کا حق ادا کیا تھا اور باہر کھڑے دانیال کو بے چینی نے آ گھیرا تھا کہ اب اس کی ماں نجانے کیا کہنے والی ہیں کہ سب کو انتظار ہو گیا ہے؟
"نہیں بھائی صاحب! میں اپنی رائے زبردستی کسی پہ مسلط نہیں کرنا چاہتی سب کی اپنی اپنی اولاد ہے اور اپنا اپنا اختیار، ہر کوئی اپنی مرضی ہی کرنا چاہتا ہے آپ لوگوں نے اپنی اولاد کے بارے میں سوچا ہے تو کچھ بہتر ہی سوچا ہو گا۔" عائشہ آفندی کافی آہستگی سے بول رہی تھیں اور وہ بڑی مشکل سے سن پا رہا تھا۔
"ارے نہیں عائشہ! کیسی باتیں کر رہی ہو تم؟ ہماری اور تمہاری اولاد میں کوئی فرق ہے کیا؟ ہماری اولادیں ہم لوگوں میں بٹی ہوئی تو نہیں ہیں؟ یہاں سب کچھ ایک ہی تو ہے؟" اسرار آفندی نے بڑی اپنائیت اور بڑے خلوص سے اپنی بہن کو مان بخشنے کی کوشش کی تھی تاکہ وہ اپنے دل کی بات دل میں ہی نہ رکھ لیں بلکہ دل میں جو بھی ہے وہ صاف کہہ دیں۔
"نہیں بھائی صاحب! یہاں سب کچھ ایک ہی تو نہیں ہے نا؟ اولادوں میں فرق تو آپ کے اس فیصلے سے ہی آ گیا ہے کہ آپ نے اپنے بچوں کے بارے میں سوچ لیا ہے، لیکن ہمارے بچوں کے لیے کچھ بھی نہیں سوچا۔ آپ کو آذر اور احمد وغیرہ کی زندگی کا فیصلہ یاد ہے، لیکن دانیال اور زین وغیرہ کی زندگی کا کچھ پتا نہیں ہے۔ کیا ان کے لیے بھی کچھ سوچا ہے آپ نے؟ کیا ان کے لیے بھی کوئی فیصلہ کیا ہے آپ نے؟ یا پھر لاوارث سمجھ کر چھوڑ دیا ہے۔" عائشہ آفندی پہلے ہی زہرہ بتول شاہ کے غم میں جلی ہوئی بیٹھی تھیں اور اوپر سے اپنے دونوں بھائیوں کے اس نئے فیصلے نے انہیں اور بھی جلا کر راکھ کر دیا تھا اور دانیال زندگی میں پہلی بار اپنی ماں کو اتنے سخت لہجے میں بات کرتے سن کر حیران رہ گیا تھا بلکہ حیران تو وہ سبھی رہ گئے تھے کہ آخر عائشہ کو ہوا کیا ہے؟

"عائشہ! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ یہ سب کیا کہہ رہی ہو تم؟" اسرار آفندی اور اظہار آفندی دونوں ہی تڑپ گئے تھے۔ کیونکہ ان کی بہن نے آج تک ان سے اس طرح بات نہیں کی تھی۔

"میں وہی کہہ رہی ہوں، جو آپ لوگ کر رہے ہیں۔ کومل آپ کو آذر کے لیے پسند آ گئی ہے اور حرمت احمد کے لیے مناسب سمجھی جا رہی ہے تو پھر دانیال کے لیے کیا سوچا ہے آپ نے؟ اس کے لیے کسے پسند کیا گیا ہے آخر؟ بتائیے مجھے دانیال کدھر گیا بھلا؟"

عائشہ آفندی دکھ کے مارے بپھر جانے کو تھیں اور دانیال کے قدم جیسے زمین نے جکڑ لیے تھے، حرمت اور احمد کے نام پہ اس کا دماغ چکرا گیا تھا۔ اسے اچھا خاصا دھچکا سا لگا تھا۔

تو گویا حرمت کے لہجے کی تلخی کی اصل وجہ یہی تھی اور اسی لیے وہ قدرے اکھڑی اکھڑی سی لگ رہی تھی۔

"دانیال کے لیے؟" وہ سب عائشہ آفندی کی بات پہ جیسے ایک دوسرے کو دیکھ کے رہ گئے تھے۔

"ہاں! دانیال کے لیے۔" انہوں نے بڑے خفگی بھرے لہجے میں کہا تھا۔

"دانیال کے لیے بھی ان شاء اللہ اچھا ہی ہو گا۔ وہ بھی ہمارا ہی بیٹا ہے اس کی شادی بھی اسی گھر میں ہو گی تم فکر کیوں کرتی ہو بھلا؟" انہوں نے عائشہ آفندی کو تسلی دینی چاہی تھی۔

"کیوں فکر نہ کروں؟ میں ماں ہوں اس کی۔ اس کے دل کو مجھ سے بہتر کون جان سکتا ہے بھلا؟ آپ کا کوئی فیصلہ میرے بیٹے کے دل پہ گراں گزرے میں یہ کیسے برداشت کر سکتی ہوں؟" عائشہ آفندی آج چپ ہونے والی نہیں تھیں۔ جبکہ دانیال کو یہ گوارا نہیں تھا کہ اس کی ماں اپنے بھائیوں سے اس طرح لڑ جھگڑ کر اس کی پسند یا اس کا حق حاصل کرے۔ بلکہ اس سے تو بہتر تھا کہ وہ اپنی پسند اور اپنے دل میں پنپنے والی محبت سے ہی دستبردار ہو جاتا۔

"تو بتاؤ نا عائشہ؟ ایسا کیا ہے، جو اس طرح تم سے برداشت نہیں ہو رہا۔ کچھ بتاؤ گی تو پتا چلے گا نا؟" وہ لوگ اصرار کر کر کے تھک گئے تھے اور اس سے پہلے کہ عائشہ آفندی بھی تھک ہار کے زبان سے کچھ کہہ دیتیں۔ دانیال یک دم دروازہ دھکیل کر اندر آ گیا تھا اور وہ سب اس کے اس طرح اچانک اندر چلے آنے پہ حیران رہ گئے تھے۔

"السلام علیکم!" اس نے سب پہ اک طائرانہ سی نظر ڈالتے ہوئے سب کو ہی سلام کیا تھا۔ البتہ آسیہ آفندی کے چہرے پہ نظر پڑتے ہی اس کی نظر ٹھٹک گئی تھی۔ ان کا چہرہ بھیگا ہوا تھا اور اپنے اس بھیگے ہوئے چہرے کو چھپانے کی کوشش میں وہ ذرا سا سر جھکائے ہوئے بیٹھی تھیں۔

"وعلیکم السلام! تم یہاں؟" عائشہ آفندی اسے دیکھ کر ٹھٹک گئی تھیں۔ کیونکہ دانیال کے چہرے کے تاثرات کچھ اور ہی کہہ رہے تھے۔

"جی ہاں! آپ کے لیے ہی آیا ہوں۔ آپ کی میڈیسن کا ٹائم ہو رہا ہے۔ آپ کو پتا ہے نا۔ اگر میڈیسن وقت پر نہ لیں تو کتنا مسئلہ ہو جاتا ہے پھر؟ اس لیے آپ ابھی اٹھیں اور میرے ساتھ چل کر میڈیسن لیں ابھی۔" دانیال نے بڑے اچھے اور نارمل طریقے سے کہتے ہوئے آگے بڑھ کے ان کا ہاتھ تھام کر انہیں صوفے سے اٹھا لیا تھا۔

"ارے نہیں بیٹا ابھی بیٹھنے دو اسے، کچھ ضروری بات کرنی ہے اس سے۔" اظہار آفندی نے روکا تھا۔

"نہیں ماموں ان کی صحت سے زیادہ ضروری بات تو اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی اور ویسے بھی آپ سب ہیں نا۔ آپ بات کر لیں، بس انہیں فی الحال آرام کرنے دیں۔" دانیال پہلی بار کسی بڑے کے سامنے اپنی من مانی کرتا ہوا ماں کو ساتھ لیے ڈیڈ اور آپی کو اک نظر دیکھ کر وہاں سے نکل آیا تھا اور عائشہ آفندی اسے روکتی رہ گئی تھیں مگر اس نے واپس انیکسی میں آ کر ہی دم لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"صاحب! باہر کچھ مہمان آئے ہیں۔" زلفی اسے اطلاع دینے کے لیے اندر بھاگا آیا تھا۔

"کون مہمان ہیں؟" دل آور نے اپنے پاس بیٹھے عبداللہ اور نبیل وغیرہ سے توجہ ہٹاتے ہوئے پوچھا تھا۔

"ملک شرافت علی اور ملک اسد اللہ آئے ہیں۔ بیگم صاحبہ کی تعزیت کے لیے۔" اب کی بار زلفی نے پورا نام لے کر ان کی آمد کی وجہ بتائی تھی۔ جبکہ وہاں بیٹھے سبھی افراد چونک گئے تھے کیونکہ اس نے ان لوگوں کا نام لیا تھا جن کی انہیں امید ہی نہیں تھی۔

"صاحب کیا کروں؟ انہیں اندر لے آؤں یا پھر۔۔۔" زلفی نے اسے خاموش دیکھ کر استفسار کیا تھا۔

"نہیں، نہیں ایسا نہیں کرنا، تم انہیں اندر لے کر آؤ۔" دل آور نے کافی تحمل سے کام لیتے ہوئے اسے ان لوگوں کو اندر لانے کا اشارہ دیا تھا اور زلفی تابعداری سے سر ہلاتے ہوئے پلٹ کر واپس چلا گیا تھا۔

"گل۔۔۔!" عبداللہ نے گل کو آواز دی تھی۔

"جی صاحب جی؟" گل ڈرائنگ روم کے سامنے سے گزرتے گزرتے ٹھہر گئی تھی۔

"زری اور نگارش بی بی سے کہو اس طرف آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کچھ مہمان آئے ہیں اس لیے فی الحال اندر ہی رہیں۔" عبداللہ نے گل سے کہہ کر زری اور نگارش کو اندر آنے سے منع کر دیا تھا۔ تاکہ ان دونوں کا ان سے سامنا نہ ہو اور کوئی بدمزگی پیدا نہ ہو۔

"جی! ابھی کہہ دیتی ہوں۔" گل فوراً پیغام لے کر پلٹ گئی تھی اور اتنے میں وہ لوگ بھی اندر آ گئے تھے۔

"السلام علیکم!" ملک اسد اللہ نے اندر داخل ہوتے ہوئے کافی بلند اور دبنگ قسم کی آواز میں سلام کیا تھا۔

"وعلیکم السلام!" دل آور لاکھ شکستہ حال سہی، لیکن اب بھی دشمن کے سامنے ڈٹ جانے کی پوری پوری طاقت رکھتا تھا۔ اسی لیے اتنی شکستگی اور بے دلی کے باوجود انہیں دیکھ کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ آخر وہ اس کی ماں کے اظہار تعزیت کے لیے اس کے گھر آئے ہوئے تھے۔

"کیسے ہیں دل آور صاحب؟ کیا حال ہیں آپ کے؟" ملک اسد اللہ نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے اس سے حال چال دریافت کیا تھا۔ حالانکہ اس کا حال کسی سے چھپا ہوا نہیں تھا۔ وہ کس قدر ڈھے چکا تھا یہ تو صاف نظر آ رہا تھا۔

"اللہ کا شکر ہے۔" دل آور نے بڑی مشکل، بڑے حوصلے سے جواب دیا تھا۔ کیونکہ اس کا کسی سے کچھ بھی کہنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔

"بیٹھیے، تشریف رکھیے۔" نبیل نے ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے انہیں بیٹھنے کے لیے صوفے کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"ہوں، شکریہ" وہ دونوں باپ، بیٹا ان سے مل کر صوفے پہ بیٹھ گئے تھے اور ان کے بیٹھنے کے بعد وہ تینوں بھی بیٹھ گئے تھے اور پھر ملک شرافت علی نے فاتحہ خوانی کے لیے ہاتھ اٹھا لیے تھے اور ان کے ساتھ ساتھ وہاں بیٹھے سبھی افراد نے ہاتھ اٹھا کر فاتحہ پڑھی اور ان کی مغفرت کے لیے دعا کی تھی اور آمین کہتے ہوئے چہرے پہ ہاتھ پھیر لیے تھے۔

"جس گاڑی کے ساتھ ایکسیڈنٹ ہوا کیا اس کے بارے میں کوئی پوچھ پڑتال نہیں کی آپ نے؟" ملک اسد اللہ دل آور سے مخاطب تھا جو چپ چاپ سر جھکائے ہوئے بیٹھا تھا۔

"پوچھ پڑتال کیسی؟ یہ سب تقدیر میں تھی اور تقدیر میں جو کچھ ہو وہ ہو کر ہی رہتا ہے۔" دل آور کا جواب بہت ٹھہرا ہوا اور بہت سپاٹ تھا۔ ملک اسد اللہ دیکھ کر رہ گیا تھا۔

"وہ تو ٹھیک ہے کہ تقدیر کا لکھا ہو کر ہی رہتا ہے۔ لیکن اب کوئی ہمارے سامنے ہمارے کسی اپنے کو قتل کر کے چلا جائے تو کیا ہمیں تقدیر کا لکھا سمجھ کر چپ کر کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کے بیٹھ جانا چاہیے یا پھر اس کی کوئی پوچھ پڑتال

بھی کرنی چاہیے۔" ملک اسد اللہ نے عجیب طنزیہ سے لہجے میں سوال کیا تھا اور دل آور چند ثانیے کے لیے لب بھینچ کے رہ گیا تھا۔

"قتل' خودکشی اور رب کی رضا سے آئی موت میں بڑا فرق ہوتا ہے ملک صاحب۔ قتل اور خودکشی کی وجہ سے آنے والی موت پہ صبر نہیں آتا جبکہ رب کی رضا سے آنے والی موت پہ انسان کو خود بخود صبر آجاتا ہے جیسے مجھے صبر آگیا ہے۔ البتہ آپ اگر یہ سمجھ رہے ہیں کہ کوئی ٹیکسی ڈرائیور جان بوجھ کر میری ماں جی کو گاڑی سے ٹکر مار کر چلا گیا ہوگا تو ایسا بھی نہیں ہے۔ آخر اس ٹیکسی ڈرائیور کی میری ماں جی سے کیا دشمنی ہے۔ اس لیے مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں خوامخواہ پوچھ پڑتال کروں اور لوگوں کو سزائیں دوں۔ سزا دینے والی اور بخشنے والی تو اوپر والے کی ذات ہے۔ ورنہ میں کیا اور میری اوقات کیا۔" دل آور کا لہجہ بے حد بوجھل اور مضمحل سا ہو رہا تھا۔ جس پہ بے ساختہ اس کے برابر بیٹھے عبداللہ نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اس کا کندھا دبایا تھا اور دل آور اس کے ہاتھ کے اس دباؤ پہ سرہلا کے رہ گیا تھا۔

"خیر چھوڑو ان باتوں کو' جو بھی ہوا ہے' ہمیں اس پہ بے حد افسوس ہے۔ ماں' باپ کا ہمیشہ ہمیشہ کا ساتھ تو کسی کو بھی نصیب نہیں ہوتا اور جن کو ہوتا ہے' بہت خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ۔ لیکن وہ اس خوش قسمتی کی قدر نہیں کرتے۔ بہرحال اللہ ماں' باپ کا سایہ سب پہ سلامت ہی رکھے تو اچھا ہے۔ ورنہ اولاد رل جاتی ہے۔" ملک شرافت علی نے بھی کچھ بولنے کا فرض نبھایا تھا۔ ورنہ وہ مسلسل چپ ہی بیٹھے ہوئے تھے۔

"یہ تو واقعی صحیح کہہ رہے ہیں آپ۔" نبیل نے ان کی بات سے اتفاق کیا تھا اور اتنے میں ذلفی ان کے لیے چائے وغیرہ بھی لے آیا تھا۔ جس کے دس' پندرہ منٹ بعد وہ دونوں باپ' بیٹا اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"اچھا دل آور صاحب! اجازت دیجیے اب' فی الحال اتنا ہی کافی ہے' آپ سے ملاقات کا ارادہ تو ہے' لیکن ذرا فرصت سے۔ کیونکہ اس وقت تو آپ کا اپنا غم بھی تازہ ہے اور وقت بھی مناسب نہیں ہے۔ اس لیے باقی کا قصہ پھر کسی وقت پہ اٹھا رکھتے ہیں' اللہ حافظ۔" ملک اسد اللہ نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے اپنے مطلب کا اشارہ بھی دے دیا تھا اور پھر وہاں سے رخصت بھی ہوگئے تھے۔ البتہ ان کے جانے کے بعد دل آور پھر تھک ہار کے شکستہ سا صوفے پہ بیٹھ گیا

☼ ☼ ☼

آج بتول شاہ کا سوئم تھا۔ اس لیے آج وہ سب ہی ذرا جلدی گھر سے آگئے تھے البتہ طبیعت کچھ خراب ہونے کی وجہ سے مدحیہ ذرا لیٹ پہنچی تھی۔ اسی لیے اس کے پہنچنے تک مہمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوچکا تھا اور ابھی وہ باہر روڈ پہ گاڑی پارک کرکے گاڑی سے اتر ہی رہی تھی کہ اس کی گاڑی کے قریب ہی عدیل نے بھی بائیک کو لاکر بریک لگا دیے تھے اور مدحیہ اس اچانک بریک لگنے پہ چونک گئی تھی۔

"السلام علیکم! کیسی ہیں آپ؟" وہ بائیک کو لاک لگا کر بائیک سے اتر آیا تھا۔

"وعلیکم السلام! ٹھیک ہوں میں' آپ سنائیں؟" مدحیہ نے کافی دھیمے سے لہجے میں پوچھا تھا اور عدیل اس کی طبیعت کی اداسی اور سستی اس کے لہجے سے ہی محسوس کرگیا تھا۔

"اللہ کا احسان ہے' سب ٹھیک ہے' البتہ آپ ٹھیک نہیں لگ رہیں؟" عدیل نے اسے سرتاپا گہری نظروں سے جانچا تھا اور اس کی نظروں کو بڑی تقویت ملی تھی۔ کیونکہ آج مدحیہ کسی الگ ہی روپ میں نظر آرہی تھی اور عدیل کو آج اس کے سامنے اپنا دل اور اپنی نظریں بے اختیار ہوتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں۔ کیونکہ وہ مغربی طور و اطوار کی لڑکی اس وقت مشرقی حلیے میں نظر آرہی تھی۔ اس نے آج شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی اور گلے میں دوپٹا

بھی نظر آرہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اسے آج پہلی بار اس لباس میں دیکھ کر عدیل کا دل مچل مچل گیا تھا۔ لیکن دل پہ دھیان کون دے؟ وہ تو کسی بھی وقت کہیں بھی مچل سکتا ہے۔

"بس ایسے ہی طبیعت کچھ بوجھل سی ہو رہی ہے۔ رات سے سر میں بہت درد ہے۔" مدحیہ نے آہستگی سے کہتے ہوئے کنپٹی کو سہلایا تھا۔

"تو پھر آپ یہاں کیوں آئی ہیں۔ آپ گھر پہ آرام کرلیتیں۔" عدیل کو پریشانی ہوئی تھی۔

"یہ آرام کرنے کا دن نہیں ہے نا۔ اس لیے آرام نہیں کرسکتی تھی۔ بتول شاہ میری پھوپھی یا میری خالہ نہیں تھیں۔ بلکہ میری ماں تھیں اور اپنی ماں کے مرنے کے بعد آرام کیسے آتا ہے۔" مدحیہ کا لہجہ بھرا گیا تھا۔

"اوہ ایم سوری! میرا یہ مطلب نہیں تھا' میں تو محض آپ کی طبیعت کی وجہ سے ایسا کہہ رہا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ وہ آپ کے لیے کتنی اہم تھیں اور مائیں تو ہوتی ہی اہم ہیں۔ اسی لیے تو ان کے بچھڑنے پہ اتنا دکھ ہوتا ہے اور آپ کے اسی دکھ پہ تو ہم سب کو بھی دکھ ہو رہا ہے' بے حد افسوس بھی ہے مگر اب ہم سب ان کی مغفرت کی دعا کے سوا اور کر بھی کیا سکتے ہیں بھلا؟" عدیل نے بڑے اچھے طریقے سے اسے سمجھانے کی اور ڈھارس بندھانے کی کوشش کی تھی' لیکن تب تک مدحیہ کے آنسو اس کے رخساروں تک بہہ آئے تھے اور عدیل بے چارا بے چین سا ہو گیا تھا۔

"پلیز! آپ اس طرح روئیں مت' رونے سے کوئی واپس نہیں آجاتا۔ بلکہ اس رونے سے بہتر ہے کہ آپ ان کے لیے جنت الفردوس میں بلند درجات کی دعا کریں۔ جس سے انہیں بھی فائدہ ہو اور آپ کو بھی خوشی اور سکون حاصل ہو۔ یہ رونا دھونا چھوڑ دیں پلیز۔ اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔" عدیل اسے اب ذرا سنجیدگی سے سمجھا رہا تھا اور مدحیہ بالآخر ٹشو سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کچھ دیر کے لیے سنبھل سی گئی تھی۔

"تھینک یو! میں فی الحال اندر چلتی ہوں۔ آپ بھائی وغیرہ سے مل لیں۔ مرد حضرات کے لیے انہوں نے شاید سامنے گراؤنڈ میں انتظام کیا ہوا ہے۔" مدحیہ لوگوں کی آمد و رفت دیکھ کر عدیل کو گراؤنڈ کی طرف اشارہ کرتی خود آگے بڑھ گئی تھی۔

"مدحیہ' سنیے پلیز۔" عدیل نے اسے پیچھے سے پکارا تھا اور مدحیہ کے قدم روڈ کراس کرتے کرتے ٹھہر گئے تھے۔ اس نے آج اسے اس کے نام سے پکارا تھا۔ اسی لیے وہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ کے رہ گئی تھی۔

"پلیز اب روئیے گا مت ورنہ میرے دل کو پورا دن بے چینی ہوتی رہے گی۔" عدیل جیسے التجا کر رہا تھا اور مدحیہ اس کی اس التجا پہ اپنے دل کو دھڑکنے سے روک نہیں پائی تھی اور وہ اسے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر اس کے سامنے سے ہٹ گیا تھا۔ آخر وہ دونوں تقریباً" روڈ کے بیچوں بیچ ہی کھڑے تھے اس لیے وہ بھی ہٹ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

شام ہوچکی تھی اور بتول شاہ کے سوئم کا دن بھی تمام ہوچکا تھا۔ سب لوگ' سب مہمان رخصت ہوچکے تھے۔ اب صرف عبداللہ اور نبیل کی فیملیز تھیں جو یہاں اس کے پاس موجود تھیں اور وہ ان لوگوں کے درمیان اکیلا اور خاموش بیٹھا ہوا تھا۔

"دیکھو بیٹا! تم خود سمجھ دار ہو تمہیں ہمارے سمجھانے کی تو ضرورت ہی نہیں ہے لیکن پھر بھی تمہیں ایک ماں ہونے کے ناتے اتنی تسلی ضرور دوں گی کہ بے شک میں نے اپنی کوکھ سے صرف نبیل کو پیدا کیا ہے لیکن میری نظر میں تم میں اور نبیل میں کوئی فرق نہیں ہے۔ تم میرے لیے نبیل ہی ہو اس لیے کبھی بھی اپنے آپ کو تنہا مت سمجھنا۔ نبیل اور مدحیہ تمہارے بہن' بھائی ہیں تو میں ماں ہوں تمہاری۔ تم ہم سے کچھ بھی کہہ سکتے ہو۔ تمہیں

کوئی بھی روک رکاوٹ نہیں ہے۔ نہ آج' نہ کل' نہ پھر کبھی۔ ہاں تم اگر ماں سمجھ کر مجھ سے کچھ کہو گے تو مجھے خوشی ہوگی کہ تم نے مجھے پرایا نہیں سمجھا۔" دل آور کے قریب ہی بیٹھی فائزہ بیگم نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا تھا اور اس کی ہمت بندھانے کی کوشش کی تھی۔ جس پہ دل آور محض سر ہلا کے رہ گیا تھا۔

زری اسے اس حال میں دیکھ کر اندر ہی اندر مر رہی تھی۔ اس کا دل' اس کا شاہ' دکھی تھا۔ اسے تو کچھ سوجھ ہی نہیں رہا تھا۔ وہ تو خود پہ بڑا ضبط کیے اس کا یہ حال اور اس کا یہ حلیہ برداشت کر رہی تھی ورنہ اس پہ کیا بیت رہی تھی' یہ تو صرف وہ جانتی تھی یا پھر اس کا خدا جانتا تھا۔ کیونکہ دل آور کے اس حال پہ' اس حلیے پہ اور اس دکھ پہ اس کا دل کس طرح کٹ رہا تھا' یہ صرف خدا ہی جان سکتا' ورنہ کسی انسان کے بس کی تو بات ہی نہیں تھی۔

"صاحب! آپ کے لیے فون ہے کسی کا۔" وہ سب باہر لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جب ہمیشہ کی طرح زلفی پیغام لے کر حاضر ہوا تھا اور دل آور نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

"کس کا فون ہے؟"

"صاحب! شاید جسٹس احمد کریم نام بتایا ہے انہوں نے' انگلینڈ سے فون کیا ہے۔" زلفی نے نام یاد رکھنے کے لیے ذہن پہ پورا پورا زور ڈالا تھا اور کامیاب ہو ہی گیا تھا۔

"ہوں۔۔ ٹھیک ہے' میں آرہا ہوں۔" اس نے اثبات میں جواب دیا تھا اور کرسی دھکیل کر آہستگی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا' جبکہ زلفی اس سے پہلے ہی واپس پلٹ گیا تھا کیونکہ فون ہولڈ پہ رکھا ہوا تھا۔

"آپ لوگ بیٹھیں میں آپ کے لیے چائے بھجواتا ہوں تب تک میں فون کال سن لوں۔"

"ارے نہیں یار! چائے کی ضرورت نہیں ہے تم فون کال سن لو' پھر بات کرتے ہیں۔" عبداللہ نے اسے منع کیا تھا مگر وہ سنی ان سنی کرتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا۔

"میرا خیال ہے' ہمیں بھی اب واپس چلنا چاہیے۔ دل آور بھائی بھی خاصے تھکے ہوئے ہیں۔ انہیں بھی فی الحال آرام کی ضرورت ہے۔ آپ لوگوں نے جو بھی بات کرنی ہے کل کر لیجیے گا ابھی مناسب نہیں ہے۔" نگارش نے ان لوگوں کو مزید کوئی بھی بات کرنے سے روک دیا تھا اور عبداللہ' نبیل اور فائزہ بیگم کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ جیسے ان کی رائے لینا چاہی ہو۔

"ہاں! کہہ تو وہ ٹھیک ہی رہی ہے۔ فی الحال اسے آرام کی ضرورت ہے۔ ہم لوگوں کو چلنا چاہیے۔ باقی باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی۔" فائزہ بیگم نے بھی نگارش کی بات سے اتفاق کیا تھا۔

"ٹھیک ہے پھر تم لوگ بھی چلنے کی تیاری کرو۔" عبداللہ نے نگارش اور زری کو اشارہ کیا تھا اور وہ دونوں ہی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ ان کے بیگ وغیرہ اندر رکھے ہوئے تھے۔ اس لیے وہ دونوں آگے پیچھے چلتی ہوئی اندر آگئی تھیں۔ نگارش اس سے آگے تھی۔ اس لیے وہ زری سے پہلے ہی آگے بڑھ کے لاؤنج میں داخل ہوگئی تھی۔

جبکہ نگارش کے پیچھے آنے والی زری کے قدم ڈرائنگ روم کے سامنے سے گزرتے ہوئے بے ساختہ ہی وہیں کے وہیں رک گئے تھے۔ کیونکہ اندر سے فون پہ بات کرتے دل آور کی آواز باہر تک سنائی دے رہی تھی اور اس کی آواز سن کر زری وہاں سے گزر جاتی۔ یہ بھی تو ایک ناممکن سی ہی بات تھی نا؟ اور دل آور جو انتہائی مختصری بات کر رہا تھا چند سیکنڈز بعد بات کو سمیٹتے ہوئے فون بند کر کے اچانک ڈرائنگ روم سے باہر نکل آیا تھا اور ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے کے عین سامنے کھڑی زری کو دیکھ کر ٹھٹک گیا تھا۔

"خیریت؟" دل آور نے ذرا تشویش سے پوچھا تھا۔

"جی' خیریت۔" زری نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"آپ نے اندر جانا ہے کیا۔" دل آور نے قدرے الجھ کر استفسار کیا تھا۔

"نہیں۔" زری نے نفی میں جواب دیا تھا۔

"تو پھر؟" اب اس کی الجھن اور بھی بڑھ گئی تھی۔

"مجھے بتول آنٹی کے حوالے سے کچھ کہنا تھا۔ مگر اب جب کچھ کہنا چاہ رہی ہوں تو میرے پاس یوں لگ رہا ہے کہ جیسے سارے الفاظ ہی ختم ہو گئے ہیں۔ جیسے کچھ کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں رہا۔ سب ختم ہو گیا ہے۔" زری واقعی بہت کوشش کر رہی تھی کچھ کہنے کی مگر اس سے کچھ بھی کہا نہیں جا رہا تھا۔

"ہاں' یہ تو سچ ہے' سب ختم ہو گیا ہے' باقی تو کچھ بھی نہیں رہا۔" وہ جیسے خود کلامی کے سے انداز میں بولا تھا اور اس کے اس انداز پہ زری نے بے ساختہ اس کے چہرے کی سمت دیکھا تھا۔ وہ نظریں جھکائے ہوئے کھڑا تھا۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟ کیا ختم ہو گیا ہے؟ اور کیا باقی نہیں رہا کچھ بتانا پسند کریں گے آپ۔" اب کی بار زری کو الجھن ہوئی تھی اور اس نے دل آور کو سراپا بے چین اور مضطرب سی نظروں سے دیکھا تھا۔

"پلیز' راستہ چھوڑیں باہر سب انتظار کر رہے ہوں گے۔" دل آور نے اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے وہاں سے گزر جانا چاہا تھا۔

"میں بھی سراپا انتظار ہوں وکیل صاحب' آپ کو میرا انتظار نظر کیوں نہیں آتا؟" زری اس کی سرد مہری پہ بپھر گئی تھی۔ اس کا دل چاہا وہ اس کے گریبان کو دونوں ہاتھوں میں دبوچ کر جھنجھوڑ ڈالے۔ مگر وہ ایسا کر بھی تو نہیں سکتی تھی نا۔ آخر وہ اس کا اپنا دل تھا۔ چاہے جیسا بھی تھا۔

"پلیز زرین' راستہ چھوڑیں۔" دل آور نے پھر التجا کی تھی۔

"آپ کا راستہ چھوڑ دوں' تو پھر کس کا راستہ لوں وکیل صاحب؟ کوئی تو راستہ دکھائیں؟" زری اس سے زیادہ بے بس اور نڈھال لگ رہی تھی اور اس کا لہجہ بھی روہانسا سا ہو رہا تھا۔

"زرین! میں نے آج تک آپ سے کبھی کچھ بھی نہیں کہا۔ لیکن آج اگر کچھ کہوں گا تو آپ کو چاہیے کہ آپ میرے اس کہے سے ہی سمجھ جائیں اور میں صرف اتنا ہی کہوں گا کہ "دل آور شاہ مر چکا ہے۔" بس اور کچھ نہیں۔" دل آور کے بے تاثر اجنبی اور سفاک لہجے میں کہے گئے اس جملے نے زرین ملک کی روح کھینچ لی تھی اور اس کا کلیجہ جیسے منہ کو آ گیا تھا۔ وہ اپنے سامنے کھڑے دل آور کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی کہ وہ یہ سب کیا اور کیوں کہہ رہا ہے؟" اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔

"د۔ل۔ آ۔و۔ر۔ شا۔ہ۔ مر۔ چکا۔ ہے؟" زری کی زبان بے ربط ہو گئی تھی اور حرف بکھر گئے تھے اور اب وہ یہ سارے حرف جوڑنا بھی چاہتی تو نہیں جوڑ سکتی تھی' کیونکہ اس میں سکت ہی نہیں تھی۔

"مم۔ مگر۔ وکیل صاحب! دل آور شاہ مر چکا ہے' تو پھر زری کیوں زندہ ہے؟" اس نے بڑی دیر بعد کھوئے ہوئے سے لہجے میں پوچھا تھا۔

"میں کچھ نہیں جانتا زرین' میں نے جو کہنا تھا' کہہ دیا ہے' پلیز اب راستہ چھوڑیں۔" دل آور اس کی سمت دیکھے بنا راہداری کی دوسری سمت دیکھنے لگا تھا جبکہ وہ بری طرح تڑپ اٹھی تھی۔

"راستہ چھوڑ دوں' کیوں وکیل صاحب! کیوں راستہ چھوڑ دوں؟ اک عمر آپ کے راستے میں گزاری ہے وکیل صاحب اور آپ کہہ رہے ہیں کہ راستہ چھوڑ دوں؟ آخر کیوں؟ کیا وجہ ہے؟ آپ اتنے دنوں سے مجھے اپنے کیوں نہیں لگ رہے؟ مجھے اتنے دنوں سے کیوں یہ احساس ہو رہا ہے کہ آپ میرے نہیں رہے؟ مجھے کیوں لگ رہا ہے کہ دل آور شاہ نظریں پھیر چکا ہے اور زرین ملک جیتے جی لٹ چکی ہے۔ میں جب جب آپ کو دیکھ رہی ہوں تو مجھے کیوں احساس ہو رہا ہے کہ میں ایک اجنبی' غیر اور پرائے مرد کو دیکھ رہی ہوں۔ وکیل صاحب میں آپ کو دیکھوں اور مجھے شرمندگی ہو' ایسا کیوں ہے آخر' کیوں؟ بتائیے مجھے وکیل صاحب' جواب دیجیے مجھے؟" زری دھواں دھار روتے ہوئے مسلسل ایک ہی تکرار کیے جا رہی تھی اور اسے اپنے آس پاس کا بھی خیال نہیں رہا تھا کہ اگر اچانک کوئی اندر آ گیا تو کیا سوچے گا۔

"میں آپ کو اجنبی' غیر اور پرایا لگ نہیں رہا' بلکہ میں ہوں' میں اجنبی بھی ہوں' میں غیر بھی ہوں اور میں پرایا بھی ہوں' آج سے نہیں' بلکہ ازل سے ہوں اور ابد تک ایسا ہی رہوں گا۔ اس لیے آپ کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ دل آور شاہ مر چکا ہے۔" اس نے اپنے اک اک لفظ پہ زور دیتے ہوئے کہا تھا اور پھر لب بھینچتے ہوئے اس کی اک سائیڈ سے ہو کر گزر گیا تھا اور زری اس کے اس طرح گزر جانے پہ تڑپ تڑپ گئی تھی۔

"وکیل صاحب' یہ کیا کہہ دیا ہے آپ نے؟" وہ پیچھے سے چیخی تھی' لیکن دل آور راہداری عبور کر کے جا چکا تھا۔

"وکیل صاحب!" وہ پھر زور سے چیخی تھی۔ مگر تب تک نگارش اس کے قریب آ چکی تھی۔

"زری پلیز! سنبھل جاؤ' بس کرو اب۔" نگارش کا اپنا لہجہ بھی بھیگ رہا تھا۔ وہ زری کی تڑپ پہ تڑپ جاتی تھی۔

"بھابھی' وہ۔ وہ۔ کیا کہہ گیا ہے۔ سنا آپ نے۔ اس نے۔ کک کیا کہا ہے؟" وہ ہچکیوں سے روتے ہوئے نگارش کا بازو تھام کر باہر کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔

"ہاں' سن چکی ہوں' سب سن چکی ہوں' اسی لیے تو رو رہی ہوں کہ سب سن لیا ہے۔" نگارش لاؤنج سے نکل کر ادھر ہی آ رہی تھی' جب ان دونوں کو راہداری میں کھڑے دیکھ کر وہیں کی وہیں رک گئی تھی۔

"بھابھی!" زری بری طرح روتے ہوئے نگارش کے کندھے سے لگ گئی تھی۔

"نگارش' زری' چلنا نہیں ہے کیا۔" عبداللہ کی آواز پہ وہ دونوں ہی ٹھٹک گئی تھیں۔

"جی! آ رہے ہیں۔" نگارش زری کو سنبھالتی ہوئی آگے بڑھ آئی تھی اور عبداللہ ان دونوں کو بتول آنٹی کی وجہ سے اداس سمجھ کر چپ چاپ ان کے آگے آگے چل پڑا تھا۔

مگر آج اس گھر سے جاتے ہوئے نہ جانے کیوں زری کا دل رو رہا تھا اور بڑی شدت سے رو رہا تھا۔

نگارش نے اسے بمشکل لا کر گاڑی میں بٹھایا تھا اور عبداللہ نے گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔ نبیل ان سے پہلے ہی گاڑی نکال لے گیا تھا۔ اب بس عبداللہ کی باری تھی اور وہ بھی اک جھٹکے سے گیٹ عبور کر گیا تھا اور گیٹ سے نکلتے ہوئے سامنے ڈرائیو وے پہ کھڑے دل آور کو دیکھ کر گاڑی میں بیٹھی زری گھٹ گھٹ کر رو پڑی تھی۔

کوئی ناز تھا جو رہا نہیں
کوئی خیال تھا جو کہا نہیں
کوئی آرزو تھی دبی دبی
کوئی بوجھ تھا جو ہٹا نہیں
کسی موڑ پر تو وہ ملے مجھے
کوئی موڑ ایسا بنا نہیں

☆ ☆ ☆

وہ سب چلے گئے تھے اور وہ اکیلا رہ گیا تھا۔ اب وہ تھا یا اس کی تنہائی تھی اور اس کی اس تنہائی میں صرف سگریٹوں کا دھواں ہی تھا جو اسے اپنی آغوش میں لپیٹ رہا تھا اور وہ اس دھوئیں میں خود بھی دھواں دھواں ہو رہا تھا' کیونکہ انسان کا دل جل رہا ہو تو انسان خود دھواں ہی ہو جاتا ہے اور دل آور کے ساتھ بھی اس وقت ایسا ہی ہو رہا

تھا۔ وہ گیلی لکڑی کی طرح سلگ رہا تھا اور وہ سگریٹ کی طرح بجھ رہا تھا۔ اس کا سورج کی طرح دہکنا اور چراغ کی طرح روشن ہونا بہت پیچھے رہ گیا تھا اور وہ اب پیچھے جاکر سب کچھ موڑ کے واپس نہیں لا سکتا تھا۔ کیونکہ اب جو کچھ پیچھے رہ گیا تھا' وہ بس پیچھے ہی رہ گیا تھا۔

بالکل ایسے جیسے زری پیچھے رہ گئی تھی۔

اسے پکارتی رہ گئی تھی۔

اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کی طرف سے آنکھیں' کان اور دل بند کرکے وہاں سے چلا آیا تھا اور چھوڑ آیا تھا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اور عمر بھر کے لیے۔

اب اسے آگے کو سفر کرنا تھا۔ وہ سفر جو اس کی اماں اس کے پاؤں سے باندھ گئی تھیں اور جس سے ہٹنا اب اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ کیونکہ اب وہی اس کا سفر تھا اور اب وہی اس کی منزل تھی اور اپنی منزل سے کوئی کب تک دور رہ سکتا ہے آخر' کبھی بھی نہیں۔

اور یہ سچ تھا کہ دل آور اگر سفر تھا تو علیزے اس کی منزل تھی۔

اور علیزے اگر سفر تھی تو دل آور اس کی منزل تھا۔

ان کا تو سفر اور منزل کا سا ساتھ تھا۔

جو شروع سے چلا آرہا تھا اور جس نے ہمیشہ رہنا تھا۔

یہ پل دو پل کی دوری بھی کوئی دوری تھی بھلا۔

اس نے پلٹنا تو آخر منزل کی طرف تھا سو وہ پلٹ گیا تھا۔

رات کے تین بجے کا وقت تھا جب وہ آخری سگریٹ اپنے بوٹ تلے مسل کر گہری سانس کھینچتا ہوا لان سے پلٹ کر اندر آگیا تھا۔ گل' گلاب خان اور زلفی تو مہمانوں کے جاتے ہی اپنے اپنے کوارٹرز میں چلے گئے تھے۔ اب بس اسی کے لیے اندرونی مین ڈور کھلا ہوا تھا۔ اس لیے اس نے اندر آتے ہی مین ڈور بند کردیا تھا اور قدم سیڑھیوں کی طرف بڑھادیے تھے۔

بے شک اس کا رخ اپنے بیڈ روم کی طرف تھا' لیکن پھر بھی اپنے بیڈ روم کے حوالے سے اس کا ذہن بالکل صاف اور سلیٹ کی مانند تھا۔ کہیں کونے کھدرے میں بھی یہ خیال نہیں تھا کہ اس کے بیڈ روم میں کوئی اور بھی موجود ہے۔ البتہ اپنے بیڈ روم کے دروازے کا ہینڈل گھما کر اندر داخل ہوتے ہی وہ یک دم ٹھٹک سا گیا تھا اور اس کا صاف سلیٹ کی مانند ذہن پھر سے طرح طرح کی سوچوں اور طرح طرح کے خیالوں سے بھر گیا تھا۔ لیکن اب اور کتنا سوچتا' تنگ آکر سوچوں اور خیالوں کو ذہن سے جھٹکتا ہوا دروازہ لاک کرکے آگے بڑھ آیا تھا اور صوفے کے قریب آکر قدم رک گئے تھے اور نظریں علیزے پہ ٹھہر گئی تھیں۔

وہ نہ جانے کب یوں ہی صوفے پہ بیٹھے بیٹھے سو گئی تھی اور اس کا سر اور بازو دائیں طرف لڑھک چکے تھے۔ نیند گہری تھی اسی لیے اسے احساس نہیں تھا کہ وہ کتنی بے ترتیب ہوئی پڑی ہے اور دل آور کی نظریں اسے سر سے پاؤں تک دیکھ رہی ہیں۔

شاید اسے احساس ہوتا تو وہ یک دم تڑپ کر اٹھ کھڑی ہوتی۔

مگر بات پھر وہی تھی کہ نیند گہری تھی۔

اور اس کی اس گہری نیند کا دل آور کو بھی احساس ہوچکا تھا۔ اسی لیے دو قدم اور بڑھا کے سوئی ہوئی علیزے کے برابر ہی صوفے پہ بیٹھ گیا تھا اور انتہائی احتیاط کے ساتھ اس کا مرمریں سا نازک ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا تھا اور پھر آہستہ آہستہ اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں دبانے لگا تھا۔ جیسے اسے نرمی سے سہلا رہا ہو اور علیزے اس

سہلانے پہ کسمسا سی گئی تھی۔

"علیزے۔" اس کے کسمسانے پہ دل آور نے آہستگی سے اسے پکارا تھا لیکن نیند گہری تھی۔ اس لیے وہ نہ سن سکی تھی اور نہ محسوس کرسکی تھی۔ البتہ دل آور اس کے ہاتھ کے لمس کو بڑے بوجھل دل سے محسوس کررہا تھا۔

"علیزے۔ بات سنو میری۔ میں تمہارا ہوں۔ سنبھالو مجھے۔ نہیں سنبھالو گی تو پچھتاؤ گی۔ آج وقت ہے تمہارے پاس۔ آج میں تمہاری مٹھی میں ہوں۔ آج مجھے قید کرلو۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے پاس رکھ لو۔ میری ہوجاؤ۔ اور مجھے اپنا کرلو۔ علیزے۔ آج دل آور شاہ کسی کا بھی نہیں تمہارے سوا۔ آج غافل مت رہو۔ جاگ جاؤ علیزے' غفلت کی نیند اچھی نہیں ہوتی۔ آج مجھے ضرورت ہے تمہاری۔ میرے ساتھ جاگو۔ میرے ساتھ بات کرو۔ میرے سینے پہ ہاتھ رکھو۔ مجھے قرار دو علیزے۔ میں بے سکون ہوں مجھے سکون دو۔ دعا دو مجھے۔ علیزے مجھے دعا دو۔" اس نے انتہائی بوجھل اور گمبھیر آواز میں کہتے ہوئے اپنے دکھ کی شدت اور اپنے رشتے کی عقیدت تک جاتے ہوئے علیزے کا وہی مرمریں سا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اپنے ہونٹوں سے لگالیا تھا اور جہاں اس کے ہونٹوں کی مہر سے علیزے کا وجود معتبر ہوا تھا وہیں علیزے کے ہاتھ کے پاکیزہ لمس سے دل آور شاہ کے ہونٹ بھی معتبر ہوگئے تھے۔

علیزے کا ہاتھ اور دل آور کے ہونٹ ایک دوسرے کو چھو کر جیسے مہک اٹھے تھے۔

کیونکہ یہ ان کا ایک دوسرے کے لیے زندگی کا پہلا لمس تھا۔ جس سے ان کا رشتہ مزید پائیدار ہوا تھا اور ان کی ایک دوسرے پہ مہر لگ گئی تھی۔

ہاں یہ اور بات تھی کہ علیزے اس مہر سے' اس لمس سے اور اس احساس سے انجان تھی' بے خبر تھی۔ وہ اس پہ اپنے حق اور اپنے استحقاق کی پہلی مہر ثبت کرچکا ہے۔ اسے خبر ہی نہیں تھی۔

اور اس کی اسی بے خبری میں دل آور نے اس کا ہاتھ چھوڑ کر آہستگی سے اس کی کمر میں بازو حمائل کرتے ہوئے بے حد احتیاط سے اسے اٹھالیا تھا اور صوفے سے بیڈ تک کا فاصلہ طے کرتے ہوئے ذرا سا جھک کر اسے بیڈ پہ لٹا دیا تھا۔ کیونکہ وہ اتنے دنوں سے صوفے پہ ہی سو رہی تھی لیکن اگر گہرائی سے سوچا جاتا تو وہ آخر کب تک صوفے پہ سو سکتی تھی؟

جب ایک رشتہ بن چکا تھا' سب کچھ قبول کیا جاچکا تھا' تو پھر اس رشتے کی حقیقتوں کو قبول کرنے میں بھلا کیا قباحت تھی؟ وہ صوفے پہ سوتی یا بیڈ پہ بات تو ایک ہی تھی' رشتہ تو وہی تھا۔ سو وہ بیڈ پہ ہی سوتی تو بہتر تھا' کیونکہ بیڈ پہ اب اس کا اور دل آور کا برابر کا حق تھا اور وہ اسے یہ حق خود اپنے ہاتھوں سے سونپ چکا تھا۔ اسے بیڈ پہ لٹا کر کمبل پھیلا کے اس کے اوپر اوڑھا دیا تھا اور خود دوبارہ تھکے تھکے قدموں سے چلتا ہوا راکنگ چیئر تک چلا آیا تھا جہاں پچھلے کئی دنوں سے اس کی کئی راتیں تمام ہورہی تھیں اور آج کی رات بھی یوں ہی تمام ہوگئی تھی۔

☆ ☆ ☆

علیزے سو رہی تھی' جب گل کی آواز پہ اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اس نے بے ساختہ چھت کی طرف دیکھا تھا اور پھر اپنے دائیں بائیں نظر دوڑائی تھی اور خود کو صوفے کے بجائے بیڈ پہ پاکر اسے جیسے کرنٹ چھو گیا تھا۔ وہ اک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی تھی اور سامنے ہی راکنگ چیئر پہ بیٹھے دل آور پہ نظر پڑی تھی۔ وہ گل کی طرف متوجہ تھا جو اس کے لیے ٹیبل پہ ناشتا لگا رہی تھی' کیونکہ دل آور کو ناشتے کی طلب ہورہی تھی اور اس نے گل سے کہہ کر ناشتا یہیں منگوالیا تھا۔ اس لیے اس وقت اس کا دھیان ناشتے کی طرف ہی تھا۔

جبکہ علیزے اسے اپنی سمت متوجہ کرنے کے لیے بے چین ہورہی تھی' لیکن گل کی موجودگی کی وجہ سے

اسے تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہی رہنا پڑا تھا۔ جس پہ وہ مزید پہلو بدل کر رہ گئی تھی۔

"ارے علیزے بی بی' آپ اٹھ گئیں۔ کیا آپ کے لیے بھی ناشتا لے آؤں؟" گل واپس پلٹتے ہوئے اسے دیکھ کر رک گئی تھی۔

"ہوں۔۔۔ نہیں ابھی بھوک نہیں ہے۔" علیزے نے بے دھیانی میں نفی میں سر ہلایا تھا۔

"ٹھیک ہے' آپ فریش ہو جائیں' میں بعد میں ناشتا بنا دوں گی۔" گل علیزے کو صاحب کے بیڈ پہ سوئے ہوئے دیکھ کر دل ہی دل میں بہت خوش ہوئی تھی۔ اسی لیے اب اسے بڑے آرام سے فریش ہونے کا کہہ کر باہر نکل گئی تھی اور وہ دونوں بیڈ روم میں اکیلے رہ گئے تھے۔

علیزے جو اتنی دیر سے اسے اپنی سمت متوجہ کرنے کے لیے بے چین ہو رہی تھی' اب تنہائی ملتے ہی چپ سی ہو گئی تھی۔ اسے کچھ سمجھ ہی نہیں آرہا تھا کہ وہ اس سے کیسے اور کیا کہے؟ اک عجیب سی جھجک تھی جو اس کے کچھ کہنے کے آڑے آرہی تھی اور ایسا شاید پہلی بار ہوا تھا۔ ورنہ وہ تو ڈرائیور سے ہر بات بلا جھجک کہہ جاتی تھی۔ شاید پہلے وہ ڈرائیور کو اپنی پراپرٹی سمجھتی تھی اس لیے اور اب وہ خود کو ڈرائیور کی پراپرٹی سمجھ رہی تھی اس لیے اس سے کچھ کہا ہی نہیں جا رہا تھا۔ وہ کچھ پوچھنے کی کوشش کے باوجود بھی اس سے پوچھ نہیں پائی تھی۔

"گڈ مارننگ!" بالآخر دل آور نے ہی بولنے میں پہل کی تھی مگر علیزے نے پھر بھی ۔۔۔ اسے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

"ناشتا کرو گی؟" دل آور بھی آخر بتول شاہ کا ہی بیٹا تھا زندگی نبھانے والا۔

"نہیں" اور وہ بڑی حویلی کی بیٹی تھی کچھ بھی نہ سمجھنے والی' سب کچھ ملیا میٹ کر دینے والی۔

"ہوں' میں جانتا ہوں' تم اس وقت کس سوچ پہ ٹھہری ہوئی ہو۔" دل آور نے اک نظر اسے دیکھتے ہوئے کہا اور جوس کا گلاس اٹھا لیا تھا اور ذرا توقف سے گویا ہوا تھا۔

"تم رات کو سو رہی تھیں' تمہیں صوفے سے اٹھا کے بیڈ تک میں لے کر آیا تھا۔" اس نے انتہائی مضبوط اور تحمل آمیز لہجے میں اس کے ان کہے سوال کا جواب دیا تھا' تاکہ وہ الجھتی نہ رہے۔

"مگر میرے خیال میں ہمارے درمیان ایسا کوئی تعلق اور ایسا کوئی رشتہ نہیں ہے' جس کے حوالے سے تم مجھے صوفے سے بیڈ تک لے کر آئے ہو؟" علیزے ڈر اور جھجک کے باوجود بھی بالآخر کہہ ہی گئی تھی اور دل آور جوس کا گلاس ہونٹوں سے لگاتے لگاتے یک دم ٹھہر سا گیا تھا۔

"کیا کہا تم نے؟ ذرا پھر سے کہنا۔" دل آور نے جیسے اس کی بات پہ غور کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر علیزے نے وہی بات دوبارہ کہنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ یونہی چپ کی چپ بیٹھی رہی تھی۔

"ہوں! تو تمہارے خیال میں ہمارے درمیان ایسا کوئی تعلق اور ایسا کوئی رشتہ نہیں ہے جس کے حوالے سے میں تمہیں صوفے سے بیڈ تک لے کر جا سکوں؟" اس نے پر سوچ سے انداز میں کہتے ہوئے جوس کا گلاس واپس ٹیبل پہ رکھ دیا تھا۔ اور آہستگی سے کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"تو پھر اتنے دنوں سے تم کس تعلق اور کس رشتے کے حوالے سے میرے ساتھ میرے بیڈ روم میں قیام پذیر ہو؟ کیوں میرے ساتھ ایک ہی چھت تلے رہ رہی ہو؟ کیوں میرے سامنے میرے لیے ایک تسلی' ایک دلاسا بن کر بیٹھی ہوئی ہو؟ آخر کس تعلق اور کس رشتے کے حوالے سے؟" دل آور کو علیزے کی بات بری لگی تھی اور اسے اس بات پہ غصہ بھی آیا تھا۔

"کیوں کہ میری نظر میں یہ تعلق اور یہ رشتہ ہے۔ مگر تمہاری نظر میں یہ تعلق اور یہ رشتہ کچھ بھی نہیں ہے اس لیے تو میں پہلے بھی قید تھی اور میں آج بھی قید ہوں۔ بس فرق صرف اتنا آیا ہے کہ وہ بیسمنٹ تھا اور یہ بیڈ روم

ہے۔ وہاں فرش کا بستر تھا یہاں فوم کا بستر ہے۔ وہ سخت تھا یہ نرم ہے۔ کھانا وہاں بھی ملتا تھا کھانا یہاں بھی ملتا ہے۔ میں تب بھی جی رہی تھی' میں اب بھی جی رہی ہوں' تم کل بھی مجھ پہ حاوی تھے' تم آج بھی مجھ پر حاوی ہو۔ اور میں کل بھی تمہارے سامنے بے بس تھی آج بھی بے بس ہوں اور ہمیشہ اسی طرح بے بس ہی رہوں گی۔ میرا وجود' میری ذات اور میرا غرور نہ کل تھے نہ آج ہیں' نہ آئندہ ہوں گے۔" علیزے کہتے ہوئے بے ساختہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی اور دل آور جن قدموں پہ کھڑا تھا انہی قدموں پہ دم بخود سا کھڑا رہا تھا۔

تو علیزے کے اندر یہ غبار تھا کہ وہ بیسمنٹ سے نکل کر بیڈ روم میں کیوں قید ہے؟ اور دل آور کو خبر ہی نہیں تھی۔

"یہ تعلق یہ رشتہ تمہارا احسان نہیں ہے مجھ پہ۔ یہ احسان ہے تو صرف تمہاری مما کا جنہوں نے میری عزت کو عزت سمجھا اور مرنے سے پہلے میرا ننگا سر ڈھانپ دیا میری خاطر' میری عزت کی خاطر تمہاری منت کی' منایا تمہیں اس لیے زندگی میں اگر کبھی میں مر کے خاک بھی ہو گئی تو ان کا یہ احسان تب بھی یاد رکھوں گی اور انہیں ہمیشہ دل سے دعا دوں گی مگر تم۔۔۔"

علیزے بولتے ہوئے آؤٹ آف کنٹرول ہونے لگی تو بے ساختہ اٹھ کر واش روم میں بند ہو گئی تھی اور دل آور باہر کھڑا دکھتا رہ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا آفس جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا جب اس کے بیڈ روم کے دروازے پہ دستک ہوئی تھی۔ "یس کم ان۔۔۔" اس نے ہیئر برش بالوں میں پھیرتے ہوئے آہستگی سے اندر آنے کی اجازت دی تھی اس کے خیال میں انوشہ یا زین ہوں گے' لیکن ان دونوں کی بجائے آذر کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر دانیال خود بھی قدرے حیران ہوا تھا۔

"ہیلو گڈ مارننگ!" آذر نے ہلکے پھلکے سے انداز میں اسے وش کیا تھا۔

"ہوں سیم ٹو یو!" دانیال ہیئر برش ڈریسنگ ٹیبل پہ ڈال کر اس کی سمت پلٹا تھا۔

"کیسے ہو؟" آذر دانیال کو بغور دیکھ رہا تھا۔

"اچھا بھلا ہوں' نظر نہیں آرہا؟" دانیال نے کندھے اچکائے تھے۔

"نظر ہی تو نہیں آرہا؟" آذر نے کسی اور ہی لہجے میں کہا تھا۔

"کون نظر نہیں آرہا؟" اس نے نا سمجھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"دانیال وجاہت علی۔" آذر نے اس کے نام پہ زور دیا تھا۔

"مجھے بھی کہیں نظر نہیں آرہا' مگر اب ارادہ ہے کہ اسے تلاش کروں کیونکہ جب تک اسے تلاش نہیں کروں گا تب تک اپنی پہچان اور اپنی شناخت نہیں ہو گی اور اس دنیا میں شناخت بہت ضروری ہے۔" دانیال کا لہجہ استہزائیہ سا ہو رہا تھا اور آذر نے اس کا یہ استہزائیہ پن کافی گہرائی سے محسوس کیا تھا۔

"کیا ہوا؟ کسی نے کچھ کہا ہے کیا؟" آذر کھٹک چکا تھا۔

"یار! ضروری نہیں کہ کوئی دوسرا ہی آپ سے کچھ کہے۔ کبھی کبھی انسان کا اپنا آپ ہی اس سے بہت کچھ کہہ جاتا ہے۔" دانیال نے سر جھٹکا تھا۔

"انسان کا اپنا آپ بھی اس سے بے وجہ کچھ نہیں کہتا اس کے پیچھے بھی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے اس لیے تم بتاؤ کہ تمہارے ایسا کہنے کے پیچھے کیا وجہ ہے آخر؟ اور ویسے بھی تم دو روز سے کہیں بھی نظر نہیں آرہے نہ گھر

میں نہ آفس میں اور موبائل بھی آف مل رہا ہے۔ خیریت تو ہے نا؟"
آذر کو بھی دو دن سے تشویش ہو رہی تھی اسی لیے وہ آج صبح صبح ہی اس کی خبر لینے کے لیے انیکسی میں چلا آیا تھا۔
"ہاں یار! سب خیریت ہے۔ تم پریشان مت ہو اور یہ بتاؤ کہ آج ادھر کا رستہ کیسے بھول گئے؟" دانیال نے سرسری سے انداز میں کہا تھا۔
"تمہارا پتا کرنے کے لیے آیا تھا کہ تمہیں کیا ٹینشن ہے؟ کیوں کترائے کترائے سے پھر رہے ہو؟ آخر ہوا کیا ہے؟ تم کچھ بتا کیوں نہیں رہے؟" آذر نے کافی پریشانی اور تشویش سے پوچھا تھا۔
"ارے یار! مجھے چھوڑو۔ مجھے کوئی ٹینشن نہیں ہے اور نہ ہی کچھ ہوا ہے تم اپنی کہو آخر تم کومل کے ہو ہی گئے نا؟ کومل تو بہت خوش ہوگی آج کل؟" دانیال نے بڑی خوش اسلوبی سے بات کا رخ ہی بدل دیا تھا۔
"دانیال!" آذر اسے دیکھ کے رہ گیا تھا۔
"تو کیا کچھ غلط کہہ رہا ہوں میں؟" دانیال نے حیرت سے پوچھا تھا۔
"تم صحیح بھی تو نہیں کہہ رہے نا!" اب کی بار آذر نے سر جھکا تھا۔
"وہ کیسے؟" اس نے آذر کو سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔
"وہ ایسے کہ میں اپنے بڑوں کے اس فیصلے سے خوش نہیں ہوں' مجھے ان کے دونوں فیصلے ہی پسند نہیں آئے' نہ مجھے اپنے لیے کومل پسند ہے اور نہ مجھے حرمت کے لیے احمد پسند ہے' میں نے ان سے کچھ سوچنے کے لیے وقت مانگا ہے ابھی کچھ بھی فائنل نہیں ہوا۔ بات ابھی میرے اختیار میں ہے۔" آذر نے بڑے سکون سے اسے آگاہ کیا تھا اور دانیال ٹھٹک سا گیا تھا اسے آذر کی بات پہ حیرت ہوئی تھی۔
"کیوں؟ تمہیں یہ دونوں فیصلے کیوں پسند نہیں آئے؟"
"کیوں کہ حرمت کے لیے مجھے دانیال وجاہت علی پسند ہے اور اپنی بہن کا ہاتھ میں اسی کے ہاتھ میں دینا چاہوں گا' اس کے لیے چاہے کچھ بھی ہو جائے' میں یہ کر کے ہی رہوں گا۔" آذر نے اچانک اسے اپنی پسند اور اپنا فیصلہ سنا دیا تھا اور دانیال جیسے دم بخود سا اسے دیکھتا رہ گیا تھا وہ دانیال کے سامنے بیٹھ کر اتنی بڑی بات کہہ گیا تھا اس لیے دانیال کے لیے تو واقعی یہ ششدر ہونے والی ہی بات تھی۔
"مگر آذر!" اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی تھی۔
"اگر مگر کچھ نہیں۔ بس میں نے جو سوچ رکھا ہے' میں وہی کروں گا۔ البتہ تمہارے ذہن میں کوئی اعتراض ہے تو تم مجھے بتا سکتے ہو۔ جھجکنے کی اور ہچکچانے کی ضرورت نہیں ہے اور رہی بات کومل کی اور میری تو اس کے بارے میں ابھی میں سوچوں گا تو ہی کوئی فیصلہ کروں گا فی الحال ایک ہی فیصلہ کیا ہے اور وہ میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔" آذر کہہ کر صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔
"لیکن آذر! وہ سب تو بات طے کر..." دانیال نے پھر بولنے کی کوشش کی تھی' مگر آذر نے ٹوک دیا تھا۔
"جو میں طے کر چکا ہوں' تم اس کی فکر کرو' باقی سب کو چھوڑو' مجھے کوئی پروا نہیں ہے' یہ میرا مسئلہ ہے میں ہینڈل کر لوں گا۔ بس تم خوش رہو اور اپنے آپ کو اکیلا مت سمجھو' میں ہر میدان میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تم ملک وجاہت علی کے بیٹے ہو تو عائشہ آفندی کے بھی بیٹے ہو اور بہت اہم ہو ہمارے لیے۔" آذر نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا اور پھر اس کے بیڈ روم سے باہر نکل گیا تھا۔
جبکہ دانیال ہنوز حیران پریشان سا کھڑا اپنے بیڈ روم کے بند دروازے کو دیکھ رہا تھا۔ کیوں کہ آذر نے اس کے کچھ کہنے کے لیے تو کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی تھی سب کچھ تو وہ خود ہی طے کر گیا تھا تو گویا آذر بھی میرے دل کی بات

سے باخبر تھا...؟
حالانکہ میں نے کبھی کسی کو کچھ محسوس تو نہیں ہونے دیا۔ پھر بھی... پھر بھی... ممی بھی جان گئیں اور آذر بھی...؟ وہ خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑاتا ہوا پرفیوم اسپرے کر کے خود بھی بیڈ روم سے باہر نکل گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"زلفی...!" دل آور کی آواز پہ زلفی جی جان سے متوجہ ہوا تھا۔
"جی صاحب جی... !حکم...؟"
"گل کہاں ہے؟"
"جی... !وہ تو کوارٹر میں ہے شاید۔" زلفی نے ذرا سوچتے ہوئے جواب دیا تھا کہ گل کہاں ہے آخر؟
"اچھا ٹھیک ہے! پھر تم ہی چلے جاؤ۔" دل آور نے اخبار سمیٹتے ہوئے کہا۔
"کہاں صاحب جی؟" زلفی نے استفسار کیا تھا۔
"اوپر بیڈ روم میں! علیزے بی بی سے کہو صاحب نیچے بلا رہے ہیں۔" دل آور نے اسے پیغام دیا تھا۔
"بس اتنا ہی کہنا ہے؟" زلفی جاتے جاتے رک گیا تھا۔
"ہوں! اتنا ہی کہنا ہے۔" اس نے آہستگی سے جواب دیا تھا اور زلفی خوشی خوشی پلٹ کر اوپر چلا آیا تھا۔
مگر صاحب کے بیڈ روم کے دروازے پہ دستک دیتے ہوئے بے چارے کا دل دھڑک گیا تھا آخر اتنی خوب صورت لڑکی کے سامنے جانا بھی تو آسان نہیں تھا نا؟
ہاں یہ الگ بات تھی کہ اندر سے اس کی دستک کا کوئی بھی ریسپانس موصول نہیں ہوا تھا۔ جس کے بعد اس نے دوبارہ دستک دی تھی' مگر پھر بھی اندر سے چپ کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا تھا۔ تب مجبوراً زلفی نے ذرا سا دروازہ دھکیل کر اندر جھانکا تھا اور وہ دلکش سی حسینہ اسے بیڈ پہ بیٹھی ہوئی نظر آئی تھی اس لیے زلفی سارا دروازہ دھکیل کر اندر آ گیا تھا۔
"سلام! بی بی جی!" اس نے بڑے اچھے طریقے سے سلام عرض کیا تھا۔
مگر علیزے نے اسے سرخ روئی روئی آنکھوں سے دیکھنے کے سوا کچھ نہیں کہا تھا۔
"سوری بی بی جی' میں نے آپ کو ڈسٹرب کر دیا ہے۔ وہ دراصل مجھے صاحب جی نے بھیجا ہے' وہ آپ کو نیچے بلا رہے ہیں۔" زلفی اس کی آنکھیں اور اس کا چہرہ دیکھ کر ہی سمجھ گیا تھا کہ وہ غلط وقت پر آیا ہے۔ اسی لیے اس نے فوراً معذرت بھی کر لی تھی۔
"کیوں؟ کیوں بلایا ہے نیچے؟" علیزے کی آواز بھی خاصی بھیگی ہوئی تھی۔
"جی! یہ تو میں نہیں جانتا کہ کیوں بلایا ہے' مگر ان کے بلانے کے انداز سے لگتا ہے کہ کسی کام سے ہی بلایا ہے۔" زلفی نے دل آور کے سنجیدہ اور بے لچک سے انداز کو مدنظر رکھتے ہوئے کہا تھا اور علیزے اس کی بات سن کر انکار میں جواب دیتے دیتے رک گئی تھی۔
"ہوں! ٹھیک ہے' تم جاؤ میں آ رہی ہوں۔" اس نے اپنے آپ کو کنٹرول کرتے ہوئے جواب دیا تھا اور پھر بیڈ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔
"جی بہتر...!" زلفی سر خم کر کے کہتا ہوا پلٹ کر باہر نکل آیا تھا اور اس کے پیچھے ہی دو چار منٹ کے وقفے سے علیزے بھی نیچے آ گئی تھی' وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا علیزے ڈرائنگ روم میں آ کر رک گئی تھی البتہ زبان سے کچھ نہیں کہا تھا' مگر دیکھ سوالیہ نظروں سے رہی تھی۔

”چادر لے لو اور میرے ساتھ چلو۔“ وہ کہتے ہوئے صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”کیوں؟ کہاں جانا ہے؟“ علیزے کا سوال بے ساختہ سا تھا۔

”مارکیٹ جانا ہے۔“ دل آور بھی مختصر سے جواب دے رہا تھا۔

”مگر کس لیے؟“ علیزے کو مارکیٹ کا سن کر حیرانی ہوئی تھی۔

”تمہاری شاپنگ کے لیے۔“ دل آور نے آہستہ سے کہا تھا اور علیزے چونک گئی تھی اس نے یکدم سر اٹھا کر دل آور کے چہرے کی سمت دیکھا تھا' مگر وہ کہیں اور دیکھ رہا تھا نجانے ان دونوں کو کیا ہوا تھا کہ وہ صبح سے اک دوسرے سے اجنبی اور کھنچے کھنچے سے نظر آرہے تھے۔

”میری شاپنگ کے لیے؟“ اس نے آہستگی سے خود کلامی کے سے انداز میں کہا تھا۔

”ہوں! تمہاری شاپنگ کے لیے۔ تم چادر لے کر آؤ' میں باہر گاڑی میں انتظار کر رہا ہوں۔“ وہ کہہ کر ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے کی سمت بڑھا تھا۔

”مگر مجھے کسی بھی شاپنگ کی اور کسی بھی چیز کی کوئی ضرورت نہیں ہے' مجھے کچھ نہیں لینا' مجھے کہیں بھی نہیں جانا۔ میں جیسی ہوں' جہاں ہوں' بس ٹھیک ہوں' تم میری فکر مت کرو۔“ علیزے نے دبے دبے لہجے میں اسے ٹوک دیا تھا اور علیزے کی بات پہ اس کے قدم رک گئے تھے وہ جاتے جاتے دوبارہ اس کی سمت پلٹا تھا۔

”تمہاری فکر میرا فرض بن چکا ہے مسز علیزے شاہ! اور یہ فرض بنانے والی تم خود ہو' یہ رشتہ تمہاری ڈیمانڈ تھا' اب اگر ڈیمانڈ پوری ہوئی ہے تو رونا دھونا کس بات کا ہے؟ مجھے تم سے اور تمہیں مجھ سے کوئی محبت نہیں تھی اور نہ ہی ہمارے درمیان کسی قسم کے عہد و پیمان کا چکر تھا کہ جس کے پورا نہ ہونے پہ ہمیں کوئی افسوس یا رنج ہوگا' بلکہ ہمارا تعلق تو مجبوری کا تعلق ہے جسے اب تم نے بھی نبھانا ہے اور میں نے بھی نبھانا ہے۔ چاہے اس کو نبھانے میں ہمارے دل پہ کچھ بھی گزرے۔ الزام ایک دوسرے کو نہیں دینا۔ بس نبھانا ہے ہر صورت اور ہر حال میں نبھانا ہے' نہ تم شکوہ کرو نہ میں شکوہ کرتا ہوں بس جیسے چل رہا ہے ویسے چلنے دو البتہ جو ہو چکا ہے وہ ہو چکا ہے لیکن آج کے بعد میری پوری کوشش ہوگی کہ میں اس تعلق کو اور اس رشتے کو اچھے طریقے سے اور پوری ایمان داری سے نبھا سکوں کیونکہ مجھے اس تعلق اور رشتے میں میری ماں نے باندھا ہے اور اس لحاظ سے میں اس رشتے کا ہمیشہ احترام کروں گا اور ہمیشہ عزت بھی دوں گا۔ زندگی کے ہر مقام پہ اور زندگی کے ہر موڑ پہ' اس معاملے میں تم کبھی بھی مجھے پیچھے نہیں پاؤ گی۔ جو تمہارا حق ہے اور جو تمہارا مقام ہے وہ تمہیں ضرور ملے گا۔ البتہ اس معاملے میں تمہاری کیا سوچ ہے اور کیا نظریہ ہے یہ میں نہیں جانتا مگر پھر بھی باہر تمہارا انتظار کر رہا ہوں پندرہ منٹ کا ٹائم ہے آنا چاہو تو آجاؤ فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے' میری طرف سے کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔“ وہ اسے سب کچھ صاف صاف سنا کر اک جھٹکے سے پلٹا اور باہر نکل گیا تھا اور پیچھے کھڑی علیزے گم سم سی دیکھتی رہ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

اب عروج پر ہے تمہارا موسم خزاں میں تم کو خرید لیں گے
مانگو گے ہم سے رحم کی طلب' نہ تم کو مہلت مزید دیں گے
وفا کی لاج میں ہم نے صدیوں سے خون اپنا سکھا دیا ہے
فریب و مستی کے بدلے تم کو سزا بھی سن لو شدید دیں گے

ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد علیزے چادر اوڑھ کر باہر نکل آئی تھی اور اسے گاڑی کے قریب کھڑے دیکھ کر ایک پل کے لیے اس کے قدم ٹھٹک کر رک گئے تھے اسے وہ دن یاد آگیا تھا جب وہ پہلی بار بڑی حویلی کے کوریڈور سے

نکل کر باہر آئی تھی اور وہ اسی طرح اس کی گاڑی کے قریب کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔

”مگر کوئی علیزے کے دل سے پوچھتا کہ تب اور اب میں کتنا فرق تھا اور اس نے تب اور اب کے درمیان کیا کچھ جھیلا تھا؟

”دروازہ کھلا ہے آیئے بی بی جی“ گلاب خان نے مداخلت کرتے ہوئے ان دونوں کو ہی چونکا دیا تھا کیونکہ دل آور بھی اسی خیال میں پیچھے چلا گیا تھا جس خیال کے تحت علیزے کے قدم ذرا فاصلے پہ ہی رک کے رہ گئے تھے اور وہ چاہ کر بھی آگے نہیں بڑھ سکی تھی۔

مگر گلاب خان انہیں حال میں کھینچ لایا تھا اور وہ سر جھٹکتی ہوئی آگے بڑھ کے گاڑی کی فرنٹ سیٹ پہ بیٹھ گئی تھی اور گلاب خان نے دروازہ بند کر دیا تھا۔

”آیئے صاحب جی۔۔۔ بی بی جی انتظار کر رہی ہیں۔“ گلاب خان نے اسے بھی متوجہ کیا تھا اور دل آور گہری سانس کھینچ کر اپنی سوچوں کو پیچھے جھٹکتے ہوئے پلٹ کر گاڑی میں بیٹھ گیا تھا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی پھر گلاب خان نے آگے بڑھ کے گیٹ کھولا اور دل آور گاڑی نکال کر روڈ پہ لے آیا تھا۔

البتہ اس کا دھیان علیزے کی طرف ہی تھا۔ یعنی وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اس نے بھی ”نبھانا“ ہی ہے۔۔۔؟

اس نے اک نظر اپنے برابر فرنٹ سیٹ پہ بیٹھی علیزے کو دیکھا اور پھر نجانے کیوں لب بھینچتے ہوئے جیب سے موبائل نکال کر عبداللہ کا نمبر ڈائل کر لیا تھا اور دوسری طرف عبداللہ نے فوری کال ریسیو کی تھی۔

”السلام علیکم! کیسے ہو عبداللہ“ دل آور کے لہجے میں بے پناہ ٹھہراؤ اور بے پناہ صبر کی جھلک نظر آرہی تھی۔

”وعلیکم السلام! میں ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ خیریت سے ہو نا؟“ عبداللہ کو اس کی فکر تھی۔

”ہاں! خیریت سے ہوں تم لوگ آج آئے کیوں نہیں؟“ دل آور اپنے مطلب کی بات کرنا چاہ رہا تھا۔

”بس! آج سوچا کہ تم ریسٹ کر لو' ہم کل مل لیں گے۔“ وہ اسے تسلی دے رہا تھا۔

”کل نہیں! آج ملنا ہے تم اور نبیل شام کو میری طرف آرہے ہو وہ بھی اپنی فیملی کے ساتھ۔۔۔“ دل آور نے ملنے پہ زور دیا تھا۔

”کیوں؟ خیریت؟ سب ٹھیک تو ہے نا؟“ عبداللہ کو تشویش لاحق ہوئی تھی۔

”ہاں! سب ٹھیک ہے' بس تم لوگوں کو کسی سے ملوانا ہے آج۔۔۔“ دل آور تو جیسے بلا کا پرسکون نظر آرہا تھا جبکہ اس کے برابر بیٹھی علیزے بری طرح چونک گئی تھی اس نے بے ساختہ گردن موڑ کر اسے دیکھا تھا۔

”واقعی کسی سے ملوانا ہے کیا؟“ عبداللہ کو حیرت ہوئی تھی۔

”ہاں! واقعی ملوانا ہے کسی سے' تم بھابھی وغیرہ کو لے کر وقت پہ آجانا' میں نبیل کو بھی کہہ دیتا ہوں او کے؟“ دل آور نے بات سمیٹی تھی۔

”ہوں! او کے۔“ عبداللہ نے پرسوچ سے انداز میں کہا تھا اور پھر فون بند ہو گیا تھا جبکہ علیزے ابھی بھی اسے کچھ حیران اور کچھ بے یقین نظروں سے دیکھ رہی تھی' مگر وہ اس سے بے نیاز اب نبیل کا نمبر ڈائل کر رہا تھا۔

(باقی آئندہ)

☼ ☼

نبیلہ عزیز

دو دل

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نبیل حیات دو ہی بہن بھائی ہیں' مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے' وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پہ رنگ چکی ہے' جس کے پیش نظر فائزہ بیگم' نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں' لیکن مدحیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے' جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے' مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے' مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا' بے بسی اور مجبوری سے تنگ آ کر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے' لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باؤ امتیاز مل جاتا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے' جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے' اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے' وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے' وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آزر شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے' وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے' اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا' اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دلاتی ہیں۔

۳۴

چونتیسویں قسط

"مریم! کیا بات ہے؟ تم پچھلے کچھ دنوں سے مسلسل پریشان نظر آرہی ہو مگر بتا نہیں رہیں؟ کیا وجہ ہے آخر؟ کیا پریشانی ہے تمہیں؟"

وہ کافی بے دلی سے اکیڈمی جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی جب عابدہ خاتون کمرے میں اس کے پاس چلی آئی تھیں اور مریم ان کی بات پر چونک کر متوجہ ہوئی۔

"ارے نہیں امی! ایسی کوئی بات نہیں ہے میں بالکل ٹھیک ہوں مجھے کیا پریشانی ہو سکتی ہے بھلا؟" اس نے ذرا سا جھک کر بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے اپنی چادر اٹھائی اور ان کے سامنے لاپروا نظر آنے کی کوشش کی۔

"پریشانی نہیں ہے مگر کچھ تو ہے نا جس نے تمہیں اس قدر اپ سیٹ کر رکھا ہے؟ تمہارا کسی بات کی طرف دھیان ہی نہیں ہے ورنہ تم تو سب کی طرف دھیان رکھتی تھیں سب کا خیال ہوتا تھا تمہیں؟ مگر پچھلے کچھ دنوں سے تو میں ایسا کچھ بھی نہیں دیکھ رہی؟ تمہیں تو اپنے آپ کی بھی خبر نہیں ہے؟ عدیل بھی اسی بات کو نوٹس کر رہا تھا۔ مگر اس نے تم سے کہا نہیں کیونکہ وہ سمجھ رہا ہے کہ تم شاید جاب کی وجہ سے تھک گئی ہو۔ اگر ایسا ہے تو تم جاب چھوڑ دو ہمارا گزارا ہو رہا ہے اور ان شاء اللہ اپنے رب تعالیٰ سے پوری امید ہے کہ آئندہ سے بھی اچھا اور بہتر گزارا ہوگا۔ تم اپنے ذہن پہ کوئی بھی پریشانی سوار مت کرو۔"

عابدہ خاتون نے اس کی پریشانی دور کرنے کے لیے اسے تسلی دی تھی اور مریم چادر پھیلا کر اوڑھتے ہوئے رک گئی۔ "امی پلیز آپ ایسا کیوں سوچ رہی ہیں؟ میں نے کہا نا میں بالکل ٹھیک ہوں بس یہ موسم کی وجہ سے کچھ سستی سی ہو رہی ہے ورنہ اور تو کچھ نہیں ہے اور جاب کا کیا ہے؟ میں کون سا پہاڑ توڑتی ہوں جا کر؟ اکیڈمی میں جا کر پڑھاتی ہوں اور واپس آجاتی ہوں' بس اتنی سی جاب ہے میری اور آپ کہتی ہیں کہ وہ بھی چھوڑ دوں؟ ہونہہ یہ تو خود گھر آئی روزی' رزق کو ٹھکرانے والی بات ہے۔"

مریم نے انہیں پوری پوری تسلی دینے کی کوشش کی تھی اور عابدہ خاتون اسے سرتاپا دیکھتے ہوئے اس کی بات اور اس کے لہجے کا سچ ڈھونڈتی رہ گئی تھیں۔

"آپ خواہ مخواہ پریشان نہ ہوں! سب کچھ ٹھیک ہے۔ میں بھی ٹھیک ہوں بس آپ کی دعا کے ساتھ ساتھ اب اجازت بھی چاہیے میں اکیڈمی سے لیٹ ہو رہی ہوں پلیز!"

مریم ان کو کندھوں سے تھام کے ایک بھرپور تسلی دیتے ہوئے بولی اور پھر وال کلاک کی سمت دیکھا وہ واقعی کافی لیٹ ہو رہی تھی۔

"ہوں! ٹھیک ہے خیر سے جاؤ اور خیر سے آؤ' اللہ تمہیں اپنے حفظ و امان میں رکھے آمین!" انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کی پیشانی چوم کر اسے رخصت کی اجازت دی تھی اور مریم کے دل کا بوجھ اور پریشانی قدرے کم ہو گئے تھے اس لیے وہ گھر سے رخصت ہوئی تھی اور بڑے سکون سے بس اسٹاپ تک پہنچی تھی مگر بس اسٹاپ تک پہنچتے ہی اس کا سارا سکون رخصت ہو گیا تھا۔

کیونکہ سامنے ہی جودت آفندی چمچماتی ہوئی کار سے ٹیک لگائے کھڑا اسے ہی دیکھ رہا تھا اور جس سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ اسی کا انتظار کر رہا ہے اور جس کو سوچ کر ہی مریم کے چہرے کی رنگت متغیر ہو گئی جسم کانپ گیا تھا اب وہ نہ آگے بڑھ سکتی تھی اور نہ پیچھے ہٹ سکتی تھی۔

کیونکہ اسے اپنے آس پاس کا بھی خیال تھا آخر یہ بس اسٹاپ ان کے گھر اور محلے سے دور ہی کتنا تھا بھلا اور اگر وہ یہاں کوئی تماشا بناتا تو مریم کو اندازا تھا کہ اس کے باپ اور بھائی کی عزت چند سیکنڈ میں ہی مٹی میں رل سکتی تھی اور اس کا صاف ستھرا بے داغ دامن پل میں غلیظ اور داغ دار ہو سکتا تھا۔ اسی لیے اس نے اپنے آپ کو کنٹرول میں رکھنے کی اور عقل اور تحمل سے کام لینے کی پوری پوری کوشش کی تھی اور خود کو لاتعلق اور لاپروا ظاہر کرتے ہوئے

اس کے سامنے سے گزر جانا چاہا تھا مگر وہ اسے گزرتے ہوئے دیکھ کر گاڑی سے ہٹ کر سیدھا کھڑا ہو گیا تھا۔

"سنو!" اس نے پیچھے سے اسے آواز دی تھی اور مریم کے قدم جہاں کے تہاں جم گئے البتہ پیچھے پلٹ کر دیکھنے کا حوصلہ تو پھر بھی نہیں ہوا تھا۔

"میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھو مجھے بس تمہارا تھوڑا سا ٹائم چاہیے۔ مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے۔"

جودت نے شاید پہلی بار سکون اور تحمل سے بات کرنے کی کوشش کی تھی اور اب کی بار مریم نے بے ساختہ پلٹ کر اسے دیکھا کیونکہ اسے اس لوفر اور آوارہ شخص کی بات کا ذرا بھی یقین نہیں تھا۔

"دیکھو! مجھے غلط مت سمجھو میں اس وقت یہاں تمہیں تنگ کرنے کے ارادے سے نہیں آیا میں واقعی کسی کام سے آیا ہوں۔ میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھو ورنہ مجھے زیادہ نہ سہی مگر تھوڑا بہت تو تم جانتی ہی ہو گی؟ شرافت کی زبان کے علاوہ بھی مجھے ایک اور زبان آتی ہے جس کو سمجھ نہ آئے اسے وہی سمجھانی پڑتی ہے اور اس چیز کو تم سے بہتر اور کوئی بھی نہیں جانتا جبکہ میں چاہتا ہوں کہ تم شرافت کی زبان ہی سمجھ جاؤ تو بہتر ہے کیونکہ یہ ایریا تمہارا ہے اور یہاں مجھ سے کچھ الٹا سیدھا ہو گیا تو یقیناً" تمہارے اور تمہارے گھر والوں کے لیے بہت برا ہو گا۔ تم اپنے آپ کو خود بدنام کرو گی اس لیے تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ تم گاڑی میں بیٹھ جاؤ بات ختم ہوتے ہی تم جہاں کہو گی میں تمہیں ڈراپ کر دوں گا۔ تم سے وعدہ' پکا والا وعدہ' پلیز ٹرسٹ می۔"

جودت نے اتنی لمبی چوڑی بات پہلے کبھی نہیں کی تھی اور جب کی تو مریم دیکھنے اور سوچنے پہ مجبور ہو گئی۔

"لیکن میں تمہارا یقین کیسے کر لوں؟" مریم نے زبان کھولی بھی تھی تو ذرا سخت لب و لہجے میں۔

"جیسے بھی کرو کرنا تو تمہیں پڑے گا ہی کیونکہ اگر نہیں بھی کرو گی تو مجھے کیا فرق پڑے گا بھلا' نقصان الٹا تمہارا ہی ہے۔ یو نو زبردستی کرنا مجھے آتا ہے تمہیں ہاتھ سے پکڑ کر یا بانہوں میں اٹھا کر گاڑی میں بٹھانا مشکل نہیں ہے میرے لیے سو پلیز ڈارلنگ کم آن۔"

اس نے بڑے لاپرواہ اور غیر سنجیدہ سے انداز میں کہتے ہوئے گاڑی کا فرنٹ ڈور کھول دیا تھا جو مریم کے لیے گاڑی میں بیٹھنے کا ایک اشارہ تھا' ایک ایسا اشارہ جس پہ عمل کرنے کا وہ کبھی مر کے بھی نہیں سوچ سکتی تھی۔ لیکن اس اشارے سے انکار بھی اسے کھڑے کھڑے رسوا کر سکتا تھا اور وہ یہ رسوائی افورڈ نہیں کر سکتی تھی۔

سو اس نے اپنی نگہبانی رب کو سونپتے ہوئے قدم آگے بڑھا دیے اور جودت آفندی کی گاڑی کی فرنٹ سیٹ پہ بیٹھ گئی اور جودت اس کے بیٹھتے ہی گاڑی کا دروازہ بند کر کے خود ڈرائیونگ سیٹ پہ آ بیٹھا اور پھر محض چند سیکنڈز میں ہی اس کی گاڑی وہاں سے فراٹے بھرتی ہوئی ہوا ہو گئی تھی۔

اس نے گاڑی فل اسپیڈ پر چھوڑ رکھی تھی لیکن وہاں سے بہت دور آ کر اس نے گاڑی کی اسپیڈ کم کر دی اور گردن موڑ کر اپنے ساتھ بیٹھی مریم کو دیکھا وہ بالکل سامنے ونڈ اسکرین کی سمت دیکھ رہی تھی "کتنی اچھی لگ رہی ہو میرے ساتھ بیٹھی ہوئی۔" جودت نے اپنے ذہن میں آنے والا خیال صاف کہہ دیا تھا اور مریم کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی کیونکہ جودت کا لہجہ ہی کچھ ایسا ہو رہا تھا کہ مریم کو اپنے آس پاس خطرے کا الارم بجتا ہوا محسوس ہوا تھا لیکن اب وہ کر بھی کیا سکتی تھی بھلا؟ اب جو بھی تھا وہ برداشت کرنا اور چپ رہنا تھا۔

"دل چاہ رہا ہے' تمہیں دور بہت دور لے جاؤں شہر سے بھی دور جہاں تمہارے اور میرے سوا کوئی بھی نہ ہو۔ جہاں میرا شوق اور میری دیوانگی اور تمہارا حسن اور تمہاری پاکیزگی ایک ہو جائیں جہاں سارے فاصلے اور ساری دوریاں مٹ جائیں۔" جودت بڑے دلبرانہ انداز اور لہجے میں اپنے دل کا حال کہہ رہا تھا اور مریم چپ چاپ سب سن رہی تھی اور اندر ہی اندر ضبط کے گھونٹ پی رہی تھی۔

"کیا خیال ہے تمہارا؟ چلو گی میرے ساتھ جنت کی سیر کو؟" جودت نے اب کی بار اسے باقاعدہ مخاطب کیا تھا۔

"دیکھو جودت آفندی! تم نے جو وعدہ کیا ہے اس پر غور کرو اِدھر اُدھر کی باتیں مت کرو ورنہ اسی گاڑی سے کود کر مرجاؤں گی مجھے اپنی عزت سے زیادہ اپنی جان پیاری نہیں ہے۔"

مریم کا لہجہ اور الفاظ انتہائی سخت تھے اور جودت بے ساختہ اس کی دھمکی پر مسکرا دیا تھا۔

"اونہوں! کیسی باتیں کرتی ہو سویٹ ہارٹ ایسے بھلا مرنے دوں گا تمہیں' تم نے ابھی دیکھا ہی کیا ہے نہ دنیا دیکھی ہے' نہ دیوانہ دیکھا ہے اور بنا دیکھے تم مرجاؤ یہ تو مجھے اور بھی دیوانہ کرنے والی بات ہوگی' ہے نا۔"

وہ مریم کو بڑی گہری اور مستانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا اور لبوں کی مسکراہٹ اور بھی مستی بھری ہوگئی تھی۔

"مگر تم نے وعدہ..." مریم نے کچھ کہنا چاہا تھا مگر جودت نے بات کاٹ دی تھی۔

"ہاں! میں جانتا ہوں کہ میں نے تم سے وعدہ کر رکھا ہے اور اسی وعدے پہ تم نے مجھ پہ ٹرسٹ کیا ہے اسی لیے' اسی لیے تو ابھی تک دل کے مجبور کرنے کے باوجود بھی تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگایا اور اس پہ بھی غور نہیں کیا کہ تم میرے کتنے قریب بیٹھی ہو حالانکہ بہت عرصے سے شوق تھا کہ تمہاری سانسوں کی خوشبو کو اپنی سانسوں میں جذب کرکے دیکھوں مگر شکر ادا کرو کہ تم سے وعدہ کر بیٹھا ہوں۔"

جودت نے جیسے آہ بھری تھی اور مریم اس کی بات پہ قدرے ریلیکس ہوگئی تھی۔

"لیکن تمہیں اتنا بتا دوں کسی لوفر' آوارہ' دیوانے کے وعدے کا بھروسہ نہیں کرنا چاہیے کسی وقت بھی توڑ سکتے ہیں کیونکہ ان کا خود پہ اختیار جو نہیں ہوتا۔"

جودت نے اگلی بات کہہ کر اسے پھر سے پل میں ہراساں کردیا تھا اور مریم کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر قہقہہ لگا کر ہنسا اور گاڑی کو ایک دم بریک بھی لگا دیے تھے۔

"ارے ڈونٹ وری یار! آؤ اندر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔" وہ گاڑی کا ڈور کھول کر نیچے اتر آیا تھا' لیکن مریم لاہور کے سب سے بڑے اور مہنگے ترین ریسٹورنٹ کے سامنے گاڑی پارک دیکھ کر وہیں کی وہیں بیٹھی رہ گئی تھی۔

"نہیں! تم نے جو بھی بات کرنی ہے یہیں کرو' میں اندر نہیں جاؤں گی۔" وہ اپنی جگہ سے ہلنے کو بھی تیار نہیں تھی۔

"اف یار! جہاں اتنا بھروسہ کرلیا ہے وہاں تھوڑا سا اور سہی تمہاری قسم میں کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں کرنے والا اور نہ ہی میں نے کوئی روم بک کروا رکھا ہے۔ بس میں نے تم سے بات کرنی ہے اور تو کچھ نہیں۔"

وہ آخر میں خاصے معنی خیز لہجے میں بولا تھا اور مریم شرم سے کٹ کے رہ گئی تھی۔

"آجاؤ یار! ورنہ مجھے ٹیبل یہیں روڈ پہ لگوانی پڑے گی۔" جودت نے جھنجلا کر اصرار کیا تھا۔

"تو پھر ہم لوگ فیملی ہال میں بیٹھیں گے۔" مریم نے شرط رکھی تھی۔

"اوکے اوکے! لیکن فیملی کہاں ہے؟" جودت نے جان بوجھ کر اسے تنگ کرنے کے لیے آگے پیچھے دیکھا اور وہ اگنور کرتی ہوئی گاڑی سے اتر آئی اور پھر جودت اپنے وعدے کے مطابق کوئی بھی ایسی ویسی حرکت کیے بغیر اسے اپنے ساتھ لیے فیملی ہال میں آگیا تھا۔

"ہاہاہا! اتنے بڑے ہال میں بیٹھ کر بات نہیں کرنی چاہیے بلکہ میچ کھیلنا چاہیے قسم سے مزا آجائے گا۔"

جودت نے ریسٹورنٹ کے فیملی ہال میں داخل ہو کر اسے گھوم پھر کر دیکھتے ہوئے خاصے دلچسپ اور انجوائے کرنے والے انداز میں کہا تھا۔

"پلیز سر!" ویٹر نے اسے متوجہ کرتے ہوئے اسے کرسی پیش کی تھی۔

"ہوں! تھینکس" وہ سر ہلا کر اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پلٹ کر کرسی پہ بیٹھ گیا تھا کیونکہ مریم اس کے بیٹھنے سے پہلے ہی بیٹھ چکی تھی۔

"کیا لوگی؟" جودت اس سے یوں پوچھ رہا تھا جیسے ان دونوں میں یہ سلسلہ برسوں سے چلا آرہا ہو۔

"نو تھینکس! میں گھر سے ناشتا کرکے آئی ہوں۔" اس نے حسب توقع نفی میں جواب دیا اور مجبوراً جودت نے محض جوس آرڈر کیا تھا جس کے بعد ویٹر وہاں سے چلا گیا اور وہ دونوں اس ہال میں اکیلے بیٹھے رہ گئے تھے کیونکہ یہ صبح کا وقت تھا اس لیے فیملی ہال میں ذرا بھی رش نہیں تھا' البتہ مین سیپرٹ کیبن اس وقت بھی آباد تھے۔

"ہوں تو ڈیئر مریم بات دراصل یہ ہے کہ میں ایک الجھن میں ہوں' جس کو سلجھانے کے لیے میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں لیکن اگر تم سچ سچ جواب دو تو۔" اس نے مریم کو سنجیدگی سے کہتے ہوئے مخاطب کیا۔ اور مریم نے جواباً "الجھی ہوئی سوالیہ نظروں سے اس کے چہرے کی سمت دیکھا اور اس کی الجھن اور سوالیہ نظروں کو دیکھتے ہوئے جودت کو بات کا سلسلہ جاری رکھنا پڑا۔

"وہ میں دراصل منصور حسین کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں وہ کون ہے؟ کہاں رہتا ہے؟ کیا کرتا ہے؟ بس مجھے اس کے بارے میں ساری معلومات چاہئیں۔" اس نے اپنی الجھن آخر کہہ ہی ڈالی تھی مگر مریم کی الجھن ابھی بھی دور نہیں ہوئی تھی۔

"کون منصور حسین؟" مریم کا سوال جودت کو چونکا گیا تھا۔

"کیا مطلب؟ کیا تم منصور حسین کو نہیں جانتیں؟" جودت کو حیرت ہوئی تھی۔

"مجھے کیا پتا تم کس کا پوچھ رہے ہو؟ کون منصور حسین؟" مریم کو جھنجلاہٹ ہونے لگی تھی۔

"وہی منصور حسین جس نے اس روز میری بائیک کو اپنی گاڑی سے ٹکر ماری تھی اور تمہیں اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھا کے لے گیا تھا۔" جودت نے اسے یاد دلایا تھا اور مریم بری طرح چونک گئی تھی۔

"وہ... ؟ وہ تو..." اس کے منہ سے بے ساختہ دل آور شاہ کا نام نکلنے ہی والا تھا کہ اس نے فوراً "لب بھینچ لیے تھے کیونکہ اسے اندازا ہوچکا تھا کہ جودت آفندی اس کے بارے میں بالکل بھی نہیں جانتا اور اس کے ذریعے معلومات لینا چاہتا ہے لیکن مریم بروقت عقل آجانے پر سنبھل سی گئی تھی۔

"کیا وہ تو؟ کون ہے وہ؟" جودت نے اس کے لفظوں پہ غور کیا تھا اور بڑی تیزی سے استفسار کیا تھا۔

"میرا مطلب ہے کہ وہ تو مجھے خود بھی نہیں پتا تھا کہ وہ کون ہے؟ میرے لیے تو وہ اتنا ہی اجنبی تھا جتنے کہ تم۔ بات صرف اتنی تھی کہ اس نے میری عزت کو عزت سمجھا تھا اور میری ہیلپ کی تھی اسی لیے وہ میرے لیے اہم تھا' لیکن میرے نزدیک جو بھی تھا بہت اچھا انسان تھا وہ۔" مریم نے بڑے مضبوط لہجے میں کہتے ہوئے اس کی تعریف کی تھی جبکہ جودت تپ اٹھا تھا۔

"جتنا اچھا انسان ہے وہ' یہ ہم سے بہتر کوئی بھی نہیں جانتا۔ بس تم اتنا بتاؤ کہ تم اسے کتنا جانتی ہو؟" جودت نے پھر اس کا جاننے پہ زور دیا تھا اور مریم تھی کہ ماننے کو تیار ہی نہیں تھا۔

"میں کب جانتی ہوں سے...؟ مجھے کیا پتا کہ وہ کون تھا اور کون نہیں...؟ اس نے تو مجھے میرے گھر کے قریب ڈراپ کیا اور چلا گیا... نہ اس نے میرا نام پوچھا... نہ میں نے اس کا نام پوچھا بس اتنا جانتی ہوں اس کو' اب مجھے کیا پتا اس کا نام منصور حسین ہے یا کچھ اور۔" وہ خاصے خفگی بھرے انداز میں بولی تھی اور جودت چند ثانیے کے لیے چپ سا ہوگیا تھا۔

"دیکھو...! وہ ہمارا بہت بڑا دشمن ہے... ہمارا بہت بڑا نقصان کیا ہے اس نے... اس کے بارے میں جاننا بہت ضروری ہے میرے لیے... پلیز ہیلپ کرو میری..." جودت نے زچ ہو کر التجا کی تھی مگر مریم دل آور شاہ کو چھوڑ کر اس کی ہیلپ کیسے کرسکتی تھی بھلا...؟ اس کی نظر میں جو دل آور شاہ کا مقام تھا وہ جودت آفندی کا کبھی مر کے بھی نہیں ہوسکتا تھا۔

"اگر وہ اتنا ہی بڑا دشمن ہے تمہارا۔۔۔ تو تم اس کے بارے میں کیسے جانتے ہو؟" مریم نے نقطہ اٹھایا تھا۔

"کیسا دھوکا۔۔۔؟" مریم اس سے اصل مسئلہ اگلوانا چاہتی تھی۔

"یہی تو مسئلہ ہے کہ بتا نہیں سکتا۔۔۔ اس نے کام ہی ایسا کیا ہے کہ ہم اپنے آپ سے بھی نظر ملانے کے قابل نہیں رہے۔" جودت کچھ بھی پتا نہ چلنے پہ خفگی اور جھنجلاہٹ کا شکار ہونے لگا تھا۔

"علیزے کون ہے؟" اچانک مریم کے ذہن میں علیزے کا نام گونجا تھا اس نے بے ساختہ پوچھ بھی لیا تھا' لیکن جودت اس کے سوال پہ ٹھٹک گیا تھا۔

"علیزے؟ تت۔۔۔ تم علیزے کے بارے میں کیسے جانتی ہو؟"

"میں علیزے کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی اس روز تم نے ہی اس آدمی سے علیزے کے بارے میں پوچھا تھا تبھی مجھے خیال آیا کہ علیزے کون ہے۔۔۔؟ جس کا تم پوچھ رہے تھے۔۔۔؟" مریم نے اسے وضاحت دی تھی اور وہ پھر سے کچھ دھیما پڑ گیا تھا۔

"نہیں! کوئی نہیں چلو میں تمہیں ڈراپ کروں۔" وہ عجیب الجھے ہوئے اور بے چین سے انداز میں کہتا کرسی دھکیل کر اٹھ کھڑا ہوا تھا اس کے لہجے اور اس کے انداز سے جھلکتی کچھ دیر پہلے والی شوخی و شرارت کہیں غائب ہو چکی تھی' وہ واقعی اس معاملے کو لے کر بہت سیریس نظر آرہا تھا جس پہ مریم حیران ہوتی ہوئی اٹھ کر اس کے پیچھے پیچھے گاڑی تک چلی آئی تھی۔۔۔

"کہاں ڈراپ کروں؟ گھر یا اکیڈمی" وہ سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

"اکیڈمی۔۔۔!" اس نے آہستگی سے جواب دیا تھا۔

اور جودت نے اپنے وعدے کے مطابق گاڑی کا رخ اکیڈمی کی طرف موڑ دیا تھا۔۔۔!

☼ ☼ ☼

وہ خود گاڑی سے اترنے کے بعد اس کی سائیڈ پہ آیا اور فرنٹ ڈور کھول دیا تھا۔ اور علیزے بمشکل اپنی تمام ہمتیں مجتمع کرتی ہوئی گاڑی سے اتر آئی اور اس نے گاڑی کا ڈور بند کر دیا تھا۔

علیزے نے بڑی عجیب اور کھوئی کھوئی نظروں سے شاپنگ مال کی بلند و بالا عمارت کو نیچے سے اوپر تک دیکھا اور پھر چند سیکنڈ زدیکھنے کے بعد نظروں کا زاویہ اپنے آس پاس کی طرف موڑ دیا پارکنگ لاٹ میں بہت گہما گہمی تھی بہت رش تھا نئی سے نئی گاڑیاں تھیں' نئے سے نئے لوگ تھے۔ اور ان لوگوں کے ہنستے مسکراتے تازہ دم چہرے تھے۔ جو علیزے کی نظروں کو بہت بھلے لگ رہے تھے' وہ ان چہروں کو' ان لوگوں کو' ان گاڑیوں کو اور اس آزاد اور کھلے ماحول کو بڑی حسرت سے دیکھ رہی تھی' اس کا دل چاہ رہا تھا یہ گہما گہمی اور رش یونہی رفتہ رفتہ بڑھتا رہے اور وہ یونہی حسرت سے کھڑی دیکھتی رہے کیونکہ اس کے لیے یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھنا ایک خواب بن گیا تھا۔ اور آج جبکہ وہ یہ خواب واقعی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی تو اسے اپنی آنکھوں پہ ہی یقین نہیں آرہا تھا۔

"چلو!" دل آور نے چند سیکنڈ اس کے چلنے کا انتظار کیا تھا مگر جب وہ ایک ہی جگہ پہ کھڑی رہی تو اسے مجبوراً اس کو مخاطب کرنا پڑا اور وہ چونک کر متوجہ ہوئی اس کو اپنے انتظار میں کھڑے دیکھ کر آہستگی سے سر جھکاتی ہوئی اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی تھی۔

وہ اس سے ذرا آگے چل رہا تھا اس لیے شاپنگ مال میں داخل ہوتے ہی اس نے سب سے پہلے ایک بوتیک کا رخ کیا کیونکہ اسے اندازہ تھا کہ لڑکیوں کی شاپنگ کا آغاز ہی ڈریسز وغیرہ سے ہوتا ہے اس لیے اس نے سب سے پہلے اسی کام کو ترجیح دی۔

مگر علیزے کے لیے یہ کام بہت ہی مشکل تھا اسے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا لے۔۔۔؟ دل آور کی موجودگی میں اسے اپنا آپ بے بس لگ رہا تھا۔ وہ اسے تذبذب کا شکار دیکھ کر اس کی پرابلم سمجھ گیا' اس لیے اسے ریلیکس کرنے کی کوشش کی۔

"دیکھو! تمہیں کوئی بھی چیز خریدنے کے لیے کوئی بھی روک رکاوٹ نہیں ہے۔ تم اپنی پسند اور مرضی سے جو بھی چاہو خرید سکتی ہو' تمہارا کام ہے چیز پسند کرنا اور میرا کام ہے چیز کی قیمت ادا کرنا۔۔۔ آگے پیچھے کی سوچیں تم مت سوچو' بس اپنی چیزوں کی طرف دھیان دو۔" دل آور نے اسے پیسوں کی طرف سے بے فکر رہنے کے لیے تسلی دی تھی۔ "مم۔۔۔ مگر مجھے تو یہ بھی نہیں پتا کہ میرے لیے کیا اچھا ہے اور کیا نہیں؟ میں نے اکیلے تو کبھی کچھ بھی نہیں لیا۔ پہلے تو ماما یا پھر رجو ہیلپ کر دیتی تھیں۔" علیزے نے خاصی بے چارگی سے کہا اور دل آور کو اس کی یہ پرابلم بھی حل کرنی پڑی تھی۔

"ہوں! ڈونٹ وری یہ بھی کر کے دیکھ لیتے ہیں۔" وہ ذرا توقف سے کہتا ہوا آگے بڑھ آیا تھا اور پھر پندرہ سوٹ اس نے مختلف بوتیکس سے علیزے کے ساتھ مل کر خریدے اور پسند کیے تھے' جن کے ساتھ میچنگ لیدر بیگز اور میچنگ سینڈلز اور شوز بھی تھے اس لیے اب کپڑوں اور جوتوں کے بعد باقی دیگر چیزیں رہ گئی تھیں۔

"اور کیا کیا لینا ہے؟ ساتھ ساتھ بتاتی جاؤ۔" وہ ایک لیڈی کاسمیٹکس شاپ کے سامنے رک گیا اور علیزے ٹھٹک گئی اب وہ اسے کیا بتاتی کہ اس نے کیا کیا لینا ہے۔ اس لیے چپ ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی تھی۔

"میں نے کچھ کہا ہے شاید؟" دل آور نے پھر اسے متوجہ کیا تھا۔

"ہوں۔۔۔ ہاں وہ انفیکٹ اپنے لیے کپڑوں اور جوتوں کے سوا کچھ بھی لینے کا مجھے ذرا بھی سینس نہیں ہے' میرے لیے تو ساری چیزیں رجو ہی پسند کر کے لے کر جاتی تھی۔ اس لیے مجھے نہیں پتا کہ کیا کیا لینا ہے۔"

علیزے نے جواب گول مول کر دیا تھا مگر وہ جو آج گھر سے سب کچھ لے کر آنے کا ارادہ کر کے نکلا تھا وہ کوئی بھی چیز مس کر کے جانے والا نہیں تھا اس لیے علیزے کے معذوری ظاہر کرنے کے باوجود اس لیڈیز کاسمیٹکس شاپ میں داخل ہو گیا تھا اور مجبوراً علیزے کو بھی اس کے پیچھے اندر آنا پڑا اور جیسے جیسے وہ اس کے لیے میک اپ اور دیگر ضرورت کی اشیا نکلواتا جا رہا تھا علیزے کھڑے کھڑے پانی ہوتی جا رہی تھی' اس کی ہتھیلیوں میں پسینہ پھوٹ آیا تھا اور سیلز گرلز علیزے کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

"سر! کیا یہ آپ کی وائف ہیں؟" جیسے ہی دل آور نے کاسمیٹکس سے بھرے ہوئے دونوں بیگ اٹھائے تھے تو ایک سیلز گرل پوچھے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

"کیا آپ کو میری یہ شاپنگ دیکھ کر نہیں لگ رہا کہ یہ میری وائف ہیں؟" اس نے شاپنگ کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"ہوں! لگ تو یہی رہا ہے سر اس لیے تو پوچھا ہے۔" وہ سیلز گرل مسکرائی تھی۔

"تو پھر ٹھیک ہی لگ رہا ہے۔ یہ میری وائف ہیں۔" دل آور نے لاپروا اور سرسری سے انداز میں بتایا تھا۔

"پھر تو واقعی بہت خوش قسمت ہیں یہ۔ ایسا کیئرنگ ہزبینڈ کسی کسی کو ہی ملتا ہے۔"

اس سیلز گرل نے خاصے رشک آمیز لہجے میں کہا تھا اور اس کی بات پہ جہاں دل آور کے قدم رکے تھے وہیں علیزے کے دل سے اک ہوک سی اٹھی تھی اور پھر دل آور کی سمت دیکھے بغیر اس شاپ سے باہر نکل آئی تھی۔

"تھینک یو!" دل آور بے حد آہستگی سے کہتا ہوا پلٹ کر شاپر زاٹھا کر اس کے پیچھے ہی نکل آیا تھا' علیزے کا رخ باہر کی طرف تھا جس کا مطلب تھا کہ وہ اب مزید ٹھہرنا نہیں چاہتی اس لیے دل آور بھی سر جھٹک کر لب بھینچتا ہوا اس کے پیچھے ہی سیڑھیاں اتر گیا اور دونوں کے قدم گاڑی کے قریب آ رہے تھے۔ لیکن دونوں کے درمیان

بات پھر بھی نہیں ہوئی تھی اور واپسی کا سفر ہنوز خاموشی میں ہی گزر گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"زری! جاگ رہی ہو؟" نگارش اس کے بیڈروم کے دروازے پہ دستک دیتی ہوئی اندر آگئی۔ جبکہ زری کی طرف سے کوئی بھی جواب موصول نہیں ہوا تھا' وہ بستر پہ جس کروٹ لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے وجود میں ذرا بھی حرکت محسوس نہیں ہوئی تھی اس لیے نگارش دھیمے قدموں سے چلتی ہوئی اس کے قریب بیڈ پہ ہی آبیٹھی۔

"زری!" نگارش کو پتا تھا کہ وہ جاگ رہی ہے اور جان بوجھ کر جواب نہیں دے رہی۔

"زری! میں جانتی ہوں کہ تم جاگ رہی ہو لیکن پھر بھی جواب نہیں دے رہیں لیکن اس طرح چپ رہنے سے کیا ہوگا۔ ؟ ادھر میری طرف دیکھو تو سہی جواب تو دو۔" نگارش نے زری کو کندھے سے پکڑ کر اس کا رخ اپنی طرف موڑنا چاہا تھا لیکن زری کو ہاتھ لگاتے ہی وہ پریشان ہوگئی۔

اسے بہت تیز بخار تھا اور نگارش کو خبر ہی نہیں تھی۔

"زری! تمہیں اتنا تیز بخار ہے اور تم نے بتایا ہی نہیں؟" نگارش پریشانی اور تشویش نے اس کے ماتھے کو چھو کر دیکھنے لگی۔

"کوئی بخار نہیں ہے مجھے۔ ٹھیک ہوں میں۔" زری نے سپاٹ سے لہجے میں کہتے ہوئے کروٹ بدل لی۔

"مگر زری! یہ کیا پاگل پن ہے؟ اپنے آپ سے کیا دشمنی ہے بھلا؟ خود کو کیوں سزا دے رہی ہو؟" نگارش نے بغور اس کے چہرے کی سمت دیکھا اور خاصی خفگی کا اظہار کیا۔

"اپنے آپ سے ہی تو دشمنی ہے اور اب اپنے آپ کو ہی تو سزا دینی ہے۔ زری کو مار ڈالنا ہے جیتے جی مار ڈالنا ہے۔ اب زندگی جینے کا کوئی سبب بھی تو نہیں ہے نا؟" زری تکیے کے سہارے اٹھ کر ذرا سی نیم دراز ہوگئی تھی اور اپنے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئی اپنی ڈبڈباتی آنکھوں کے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کی تھی۔

"زری! یہ کیسی باتیں کر رہی ہو تم؟ زندگی جینے کا یہ کوئی طریقہ بھی تو نہیں ہے نا؟ بچھڑنے والوں کے ساتھ دنیا بچھڑ نہیں جاتی اور مرنے والوں کے ساتھ مرا نہیں جاتا۔ ملتا وہی کچھ ہے' جو انسان کے نصیب میں ہوتا ہے۔ تمہیں جو نہیں مل رہا اس پہ صبر کو لو کہ وہ تمہارے نصیب میں نہیں ہے۔ تم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پرسکون ہو جاؤ گی۔ تمہیں اپنے نصیب پہ صبر آجائے گا بس ایک بار اپنے آپ کو تسلی تو دو اپنے دل کو سمجھاؤ تو سہی"

نگارش نے ہمیشہ کی طرح آج بھی اسے سمجھانے کی ہی کوشش کی تھی مگر اب وہ سمجھنے والی اسٹیج پہ نہیں تھی۔ اب اس کا دکھ تسلی' دلاسوں صبر کی حدود سے نکل چکا تھا۔ اب اس کے دکھ کے دامن میں محض بے صبری تھی' آنسو تھے' اور آہیں تھیں۔

اب تو اسے تسلی بھی ایسے لگتی تھی جیسے گولی لگ گئی ہو۔ اور اسی لیے وہ نگارش کی تسلی پہ بلبلا اٹھی تھی۔ اسے بہت درد ہوا تھا۔

"کیسے سمجھاؤں بھابھی؟ کیسے سمجھاؤں؟ اور کب تک تسلیاں دوں اپنے آپ کو؟ کب تک بہلاؤں اپنے دل کو؟ نہیں بھابھی نہیں اب نہیں بہلایا جاتا مجھ سے۔ اور۔۔۔ اور اب صبر بھی نہیں ہوتا۔ اب کی بار کوئی تک نہیں ٹوٹا کوئی دل نہیں ٹوٹا اب کی بار میں خود ٹوٹ گئی ہوں' بکھر گئی ہوں۔ میرا صبر اور میرا ضبط سب کچھ بکھر گیا ہے بھابھی۔ میرے بس میں کچھ بھی نہیں رہا۔ میرے دونوں ہاتھ خالی ہو چکے ہیں' بالکل خالی۔" زری اپنے ہاتھوں کو پھیلا کر دیکھتی ہوئی تڑپ تڑپ کر رو پڑی تھی۔

"پلیز زری! بس کرو تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے' اس طرح رونے سے تو تمہاری طبیعت مزید خراب

ہوگی' پلیز سنبھالو اپنے آپ کو۔۔۔ اس طرح پاگل بننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" نگارش نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا۔

"بھابھی! جس شخص کی محبت کو آپ نے اپنے تن کا اوڑھنا بچھونا' اپنے من کا ہنسنا' رونا' اور اپنا دین و ایمان سمجھ لیا ہو' اپنی دنیا اس کی خاطر تیاگ دی ہو' اپنا دل اس کے قدموں کی خاک پہ بھی وار دیا ہو۔ اور وہی شخص ایک روز اگر آپ سے یہ کہہ دے کہ میں مر گیا ہوں' بھول جاؤ مجھ کو' میں تمہارا تھا ہی نہیں' میں پرایا ہوں' راستہ چھوڑ دو میرا۔ تو پھر۔ تو پھر آپ انصاف کریں بھابھی۔ تو ایسے میں آپ پہ کیا گزرے گی؟ کیسے تڑپیں گی آپ؟ اور کیسے روئیں گی آپ؟ کیا سمجھ جائیں گی؟ یا صبر آجائے گا کیسے ہوگا یہ سب؟ بتائیں مجھے؟

زری نے نگارش کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے تھے اور اسے جھنجھوڑتے ہوئے متواتر رو رہی تھی مگر نگارش کے پاس اس کے زخمی سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا وہ بے چاری خود بے بس ہو چکی تھی۔

"بھابھی! بولیے نا؟ آپ جواب کیوں نہیں دے رہیں؟ یا پھر اس کی طرح آپ کے پاس بھی میرے سوالوں کا کوئی جواب نہیں ہے؟ اس نے نگارش کے ہاتھوں کو ایک بار پھر اپنے گرم ہاتھوں سے جھنجھوڑ کر متوجہ کیا تھا۔

"دیکھو زری! تمہیں اس وقت آرام کی ضرورت ہے۔ تم فی الحال آرام کرو۔ میں تمہارے لیے چائے اور ٹیبلٹ لے کر آتی ہوں۔ اس ٹاپک پہ پھر بات ہوگی۔" نگارش نرمی سے کہتی اس کے ہاتھوں کو تھپک کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"نہیں! مجھے کچھ مت دیں۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ اور نہ ہی مجھے کچھ لینا ہے۔ میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔ ٹیبلٹ نہ لینے سے مر نہیں جاؤں گی۔ زندہ رہوں گی' دیکھ لیجیے گا مرنے والی نہیں ہوں میں۔"

زری نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے چائے اور ٹیبلٹ سے انکار کر دیا تھا۔

"زری! تم خود سوچو' اگر عبداللہ کو تمہاری اس حالت کا پتا چل گیا تو وہ کیا سوچیں گے؟ کیا خیال کریں گے وہ؟ اس لیے پلیز جو بات' جو مسئلہ پردے میں ہے اسے پردے میں ہی رہنے دو۔ ورنہ بہت شاک لگے گا ان کو۔ کیونکہ ایسا کوئی مسئلہ تو ان کے خواب و خیال میں بھی نہیں ہوگا؟"

نگارش اسے ہر طرح سے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن وہ سمجھتی بھی تو تب نا؟

"بھابھی! مرنے والا کبھی یہ نہیں سوچتا کہ میرے مرنے کے بعد کون کیا سوچے گا؟ اور کون کیا خیال کرے گا؟ وہ اس وقت بس یہ ہی سوچ رہا ہوتا ہے کہ وہ مر رہا ہے' وہ مٹ رہا ہے' وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو رہا ہے۔ اور اس ختم ہونے کا غم اسے کچھ بھی سوچنے نہیں دیتا۔ اس لیے مجھے بھی اس وقت یہی سوچ کھائے جا رہی ہے کہ میں اندر ہی اندر مر رہی ہوں مٹ رہی ہوں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو رہی ہوں اور میرے ساتھ ساتھ میرا دل بھی مر رہا ہے۔ اور اس دل میں پلنے والی محبت بھی مر رہی ہے۔ اس لیے مجھے۔ کچھ خبر نہیں کہ کون کیا سوچ رہا ہے؟ یا پھر کون کیا سوچے گا؟ بس آپ مجھے میرے حال پہ چھوڑ دیں۔ مجھے اکیلا چھوڑ دیں۔ مجھے تنہا رہنے دیں پلیز!"

اس نے بے تحاشا روتے ہوئے نگارش کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے اور نگارش چند سیکنڈ یونہی کھڑی اسے دیکھتی رہی اور پھر پلٹ کر باہر نکل گئی حالانکہ وہ زری کو بتانے آئی تھی کہ دل آور بھائی نے آج شام کو ان لوگوں کو اپنی طرف انوائٹ کیا ہے اور ساتھ میں یہ بھی کہا ہے کہ انہوں نے کسی سے ملوانا ہے۔

"اب کس سے ملوانا ہے؟ وہ لوگ یہی سوچ سوچ کر تو حیران ہو رہے تھے۔

لیکن زری کی کنڈیشن دیکھ کر نگارش خاموشی سے چپ چاپ کچھ بھی کہے بغیر واپس چلی گئی اور زری اس کے جاتے ہی تکیے میں منہ چھپائے اور زیادہ تڑپ تڑپ کے روئی تھی۔

☆ ☆ ☆

وقار آفندی کے بیڈ روم میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ وہ تینوں نفوس اپنی اپنی سوچ اور اپنے اپنے خیال میں گم بیٹھے ہوئے تھے۔ اور لاشعوری طور پر ایک دوسرے کی طرف سے کچھ کہنے کے منتظر تھے۔ مگر کسی کے پاس بھی کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ ان میں سے کوئی کہتا بھی تو کیا کہتا؟

بس وال کلاک کی سوئیوں کی ٹک ٹک تھی جو متواتر سنائی دے رہی تھی اور اسی ٹک ٹک کے دوران ہی اچانک موبائل کی رنگ بج اٹھی تھی اور آذر نے بے ساختہ چونکتے ہوئے موبائل کی طرف دیکھا اور پھر یونہی ہاتھ بڑھا کے ٹیبل پہ رکھے موبائل پہ بجتی کال ڈس کنیکٹ کر دی تھی اور ایک گہری سانس کھینچتے ہوئے دوبارہ سر جھکا لیا۔ مگر اب کچھ کہنے کے ارادے سے سر جھکایا تھا اور تمہید باندھنے کے لیے الفاظ تلاش کرنے لگا۔

لیکن کبھی کبھی برے وقت میں اچھے دوستوں کی طرح الفاظ بھی انسان کا ساتھ چھوڑ جاتے ہیں' تب انسان کو اپنی مدد آپ کے تحت ہی سب کچھ خود سنبھالنا پڑتا ہے' سو اس وقت آذر کا بھی یہی حال تھا۔ اسے بھی سب کچھ خود ہی سنبھالنا تھا۔

"ڈیڈ! ان فیکٹ میں آپ کو اپنی فیلنگز اور اپنے اموشنز بیان کر کے نہیں بتا سکتا اور نہ ہی آپ لوگوں میں سے کوئی اس چیز کو سمجھ سکتا ہے۔ اس لیے پلیز میری آپ سے یہی ریکویسٹ ہے کہ آپ مجھے مجبور مت کریں۔ میں کومل سے شادی نہیں کر سکتا۔ میرے دل و دماغ میرا ساتھ نہیں دے رہے۔ میں اس معاملے میں خود کو بہت بے بس پا رہا ہوں۔ پلیز آپ ممی پاپا سے بھی کہہ دیں وہ مجھے میرے حال پہ چھوڑ دیں۔" بالآخر اس نے جو دل و دماغ میں تھا وہ کہہ ہی دیا۔

اور اس کی بات پہ وقار آفندی نے نظروں کا زاویہ بدل کر آسیہ آفندی کی سمت دیکھا تھا جیسے ان سے کچھ کہنے کی التجا کی ہو اور وہ آسیہ آفندی تھیں جو ان کی نظروں کے زاویے بھی سمجھتی تھیں۔

"لیکن بیٹا! تمہیں تمہارے حال پہ چھوڑ دینا اس مسئلے کا کوئی حل بھی تو نہیں ہے نا؟ کومل اس گھر کی بڑی بیٹی ہے۔ اچھی ہے۔۔۔ خوب صورت ہے اور سب سے بڑی بات کہ تمہاری ہم عمر بھی ہے۔ تم اس سے شادی نہیں کرو گے تو اور کون کرے گا؟ جودت اور زین وغیرہ تو ہیں ہی اس سے چھوٹے اور دانیال کے لیے تو تم پہلے ہی حرمت کا کہہ چکے ہو اس لیے تم خود سوچو پھر کومل کی نسبت کس سے ٹھہرائی جائے۔" آسیہ آفندی نے اسے ہر اونچ نیچ سے آگاہ کرنے کی پوری پوری کوشش کی تھی۔

"ممی! یہ میرا مسئلہ نہیں ہے میرا مسئلہ اپنی ذات ہے' میں دوسروں کو دیکھوں یا اپنے آپ کو دیکھوں؟" آذر کا لہجہ بے بس سا ہو رہا تھا اور آسیہ آفندی کے ساتھ ساتھ وقار آفندی بھی اسے دیکھ کے رہ گئے تھے۔

"میں جانتی ہوں بیٹا! اپنے دل کو اور اپنی ذات کو مارنا بہت مشکل ہوتا ہے لیکن کبھی کبھی اپنوں کی خاطر انسان کو اپنے آپ کی بھی قربانی دینی پڑ جاتی ہے۔ اپنے جذبات اور احساسات وغیرہ کو دبا کر دوسروں کے جذبات اور احساسات کی قدر کرنی پڑتی ہے۔ اپنے آپ کی بجائے دوسروں کو دیکھنا پڑتا ہے اور یہ سب کچھ کرنے کے لیے انسان کے اندر حوصلہ' ظرف' صبر کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ ورنہ ہر کوئی ایسی قربانی نہیں دے سکتا اور مجھے پتا ہے کہ تمہارے اندر حوصلہ بھی ہے ظرف بھی ہے اور صبر بھی ہے تم اپنے دل کو اور اپنی ذات کو مار سکتے ہو تم یہ قربانی دے سکتے ہو ورنہ یہ گھر جو پہلے ہی اتنا بکھر چکا ہے تمہارے اس انکار سے مزید تنکا تنکا ہو جائے گا اور بڑی حویلی کی تباہی پورا شہر دیکھے گا۔"

آسیہ آفندی اس کو ہر ممکن طریقے سے سمجھانا چاہتی تھیں اور آذر کے دل پہ اک سایہ سا لہرا گیا تھا۔ (اور آذر آفندی کے دل کی تباہی کون دیکھے گا؟) آذر دکھ کی شدت سے محض سوچ کے رہ گیا تھا۔

"ممی! مجھے کچھ وقت چاہیے میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔" اس نے خاصے تھکے تھکے سے انداز میں کہا تھا۔

"کیا کچھ وقت کے بعد تمہاری فیلنگز اور تمہارے اموشنز بدل جائیں گے؟ یا پھر یا پھر تم بدل جاؤ گے؟" آسیہ

آفندی آج یہ مسئلہ حل کر کے ہی اٹھنا چاہتی تھیں اسی لیے آذر کو دیکھتے ہوئے ذرا توقف سے پھر گویا ہوئی تھیں۔
"دیکھو بیٹا! یہ بات تم بھی جانتے ہو اور میں بھی جانتی ہوں کہ کچھ وقت کے بعد بھی نہ تمہاری فیلنگز اور اموشنز بدلیں گے اور نہ ہی تم بدلو گے اور جب سب کچھ وہی رہنا ہے تو پھر کچھ وقت کی کیا ضرورت ہے؟ تم نے فیصلہ ہی کرنا ہے نا؟ کل بھی اور آج بھی تو کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ وہ فیصلہ تم آج ہی کر لو؟" انہوں نے ڈائریکٹ آذر کے چہرے کی سمت دیکھتے ہوئے کہا تھا اور آذر نے اک گہری سانس کھینچتے ہوئے سر اٹھا کر آسیہ آفندی اور وقار آفندی کی طرف دیکھا تھا۔
"آپ کیا چاہتی ہیں آنی؟ کہ میں یہ شادی کر لوں؟" اس نے جیسے فیصلہ کن لہجے میں پوچھا۔
اور اس کے سوال پہ آسیہ آفندی نے وقار آفندی کو دیکھا تھا جن کے چہرے پہ اقرار نظر آ رہا تھا۔
"ہوں! تو پھر ٹھیک ہے یہ فیصلہ میں آپ لوگوں پر چھوڑتا ہوں میرے لیے تمھی بابا سے بڑھ کر آپ اور ڈیڈ ہیں آپ جو بھی فیصلہ کریں گے مجھے قبول ہوگا اگر میری ذات کی تباہی سے بڑی حویلی تباہی سے بچ سکتی ہے تو آپ لوگ بچائیں میں قربانی کے لیے حاضر ہوں۔" آذر یکدم صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور ان دونوں کو اپنے فیصلے سے آگاہ کرتا ہوا پلٹ کر بیڈ روم سے نکل گیا تھا۔
"آذر!" آسیہ آفندی نے بے ساختہ پکارا مگر وہ اب ٹھہر نہیں سکتا تھا اور وہ وقار آفندی کی طرف دیکھ کے رہ گئی تھیں جن کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں کیونکہ آذر کو انہوں نے اپنے سگے بیٹوں سے بھی بڑھ کے چاہا تھا اور اس کی تعلیم و تربیت پہ بھی خاص توجہ دی تھی۔
اس لیے آذر کی شخصیت اور ذہانت کا سہرا وقار آفندی کے سر ہی جاتا تھا اور آذر کی بھی سب سے زیادہ انڈر اسٹینڈنگ ان ہی کے ساتھ تھی اسی لیے آذر کے انکار پہ اسرار آفندی اور ثروت بیگم نے یہ مسئلہ ان ہی کے سامنے رکھا تھا اور مجبوراً وقار آفندی اور آسیہ آفندی کو اسے بلا کر سمجھانا پڑا تھا حالانکہ اس کے جذبات سے وہ دونوں بھی بہت اچھی طرح واقف تھے لیکن وہ بھی کیا کر سکتے تھے بھلا۔
انہوں نے بھی سارے حالات مدنظر رکھتے ہوئے اسے سمجھانے کی پوری کوشش کی تھی جس کے نتیجے میں یہ ہوا تھا کہ وہ اپنی زندگی کا فیصلہ ان پہ چھوڑ گیا تھا اور انہوں نے اللہ کا نام لے کر یہ فیصلہ کومل کے حق میں سنا دیا تھا۔
جس پہ کومل کے ساتھ ساتھ بڑی حویلی کے تمام افراد ہی بہت خوش ہوئے تھے اک سوائے آذر آفندی کے۔

☼ ☼ ☼

شام کے قریب زری کا بخار قدرے کم ہو چکا تھا۔ اسی لیے نگارش اسے باہر لان میں بیٹھے دیکھ کر اس کے پاس ہی چلی آئی تھی۔
"اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟" نگارش نے قریب آ کر باقاعدہ اس کی پیشانی اور کلائی کو چھو کر دیکھا تھا اس کا جسم پہلے کے مقابلے میں اب ذرا ٹھنڈا محسوس ہو رہا تھا اس لیے وہ تھوڑی ریلیکس ہو گئی تھی۔
"کچھ کھاؤ گی؟ لے کر آؤں تمہارے لیے" نگارش کو پتا تھا کہ اس نے صبح سے کچھ بھی نہیں کھایا۔
"نہیں! ضرورت نہیں ہے۔" زری کا جواب تلخ سا محسوس ہو رہا تھا نگارش اس کے سامنے ہی کرسی کھینچ کے بیٹھ گئی۔
"تمہارے ساتھ چلو گی اس کے گھر؟"
"کس کے گھر؟" نگارش کے عجیب سے لب و لہجہ پہ زری نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔
"تمہارے وکیل صاحب کے گھر۔"

"کیوں؟ اس وقت کیوں؟" اسے حیرانی ہوئی تھی۔
"یہ تو ہمیں بھی نہیں پتا کہ اس وقت کیوں جانا ہے؟ بس اتنا پتا ہے کہ اس نے صبح فون کر کے ہمیں اور نبیل بھائی کی فیملی کو انوائٹ کیا ہے اور ساتھ میں یہ بھی کہا ہے کہ ہمیں کسی سے ملوانا ہے اب "وہ کسی" ــــ کون ہے؟ یہ ہم میں سے کسی کو بھی خبر نہیں ہے؟" بھی اپنے اپنے ذہن میں ایک ایک سوالیہ نشان لیے گھوم رہے تھے۔
"بہرحال جو بھی ہے جانا تو ہے ہی۔ اس لیے میں ذرا فریش ہونے کے لیے جا رہی تھی مگر سوچ رہی ہوں کہ تم بھی ساتھ چلو آخر تم بھی تو دیکھو کہ وہ کس سے ملوانا چاہ رہا ہے؟"
نگارش نے بات کرتے کرتے زری کو بھی چلنے کا اشارہ کیا تھا حالانکہ زری اس کی بات سن کر الجھ سی گئی تھی اور باقی سب کی طرح اسے بھی حیرانی ہوئی تھی کہ وہ آخر کس سے ملوانا چاہ رہا ہے اور ایسا کون سا رشتہ ہے اس کا جس کو وہ لوگ نہیں جانتے۔
"کیا خیال ہے تمہارا چلو گی ہمارے ساتھ؟" نگارش نے الجھی ہوئی زری کو سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔
"نہیں! میں اس کے گھر نہیں جانا چاہتی۔ آپ لوگ چلے جائیں میں یہیں ٹھیک ہوں۔" اس نے جانے سے انکار کر دیا تھا۔
"تو کیا تم اب کبھی بھی اس کے گھر نہیں جاؤ گی؟ اور اگر نہیں جاؤ گی تو باقی سب کو کیا جواب دو گی کہ تم اس کے گھر کیوں نہیں جاتیں مدیحہ جاتی ہے میں جاتی ہوں نبیل بھائی اور عبداللہ جاتے ہیں تو پھر تم کیوں نہیں جاتیں؟ کیا وجہ بتاؤ گی سب کو؟" نگارش نے ذرا خفگی سے پوچھا تھا اور زری چپ ہو گئی تھی۔
"لیکن! بلایا تو اس نے آپ لوگوں کو ہے نا تو آپ لوگ جائیں میرا جانا ضروری تو نہیں ہے۔" اس نے پھر ذرا توقف سے جواب دیا تھا۔
"اس نے تمہیں بھی بلایا ہے۔" اس کے جواب پہ نگارش جھنجلا کر بولی تھی۔
"مجھے بھی؟" اب کی بار وہ ٹھٹکی تھی۔
"ہاں! تمہیں بھی کیونکہ اس نے عبداللہ سے کہا ہے کہ بھابھی وغیرہ کو لے کر وقت پہ آ جانا اس لیے اب اس کی اس بات کا مطلب تم خود ہی سمجھ سکتی ہو کہ بھابھی تو چلو میں ہو گئی تو پھر بھابھی کے ساتھ یہ "وغیرہ" کون ہے؟ ورنہ وہ یہ بھی تو کہہ سکتا تھا کہ بھابھی کو لے کر وقت پہ آ جانا" نگارش نے دل آور کی بات کا مفہوم اخذ کیا تھا اور زری کے دل پہ چوٹ پڑی تھی۔
"تو کیا اب میں اس کی باتوں سے اس کے لفظوں کے مطلب ڈھونڈ کر اس کے گھر جاؤں گی؟" زری کا لہجہ بھرا گیا تھا۔
"ہاں! یہ تو ہے آخر وہ وکیل صاحب ہیں تمہارے۔ صاف بات کہنے کا تو پیشہ ہی نہیں ہے ان کا۔" نگارش ذرا غصہ کھائے ہوئے تھی اور زری پھر سے بھر گئی۔
"نہیں ہیں وہ میرے وکیل صاحب ــــ وہ وقت اور تھا جب مجھے اس کو اس کے نام سے بلاتے ہوئے شرم آتی تھی میں جھجکتی تھی اسے دل آور یا پھر شاہ کہتے ہوئے۔ اس لیے اسے اس کے پیشے کے حوالے سے بلاتی تھی مگر اب ــ اب وہ مر چکا ہے تو زندہ میں بھی نہیں ہوں اب وہ بھی میرے لیے کچھ اور نہیں صرف دل آور شاہ ہے جیسے سب کے لیے ہے ویسے ہی میرے لیے بھی ہے۔ وہ جو اک "خاص" بات تھی وہ ختم ہو چکی ہے اب یہاں کچھ بھی نہیں رہا۔"
زری بھرے ہوئے لہجے میں کہہ کر رو پڑی تھی اور نگارش عبداللہ کی گاڑی گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر فوراً اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی تھی۔

کیونکہ عبداللہ نے اسے گھر آنے سے پہلے کال بھی کی تھی کہ وہ اس کے آنے سے پہلے تیار ہو جائیں لیکن وہ تیار ہونے کی بجائے یہاں زری کے پاس ہی بیٹھ گئی تھی اس لیے اسے اندازا تھا کہ اب عبداللہ غصہ ضرور کرے گا کیونکہ ٹائم کافی زیادہ ہو چکا تھا۔

"کیا بات ہے؟ تم لوگ ابھی تک ایسے ہی بیٹھی ہو؟ تیار نہیں ہوئیں؟" عبداللہ کو اُلجھن ہوئی تھی۔

"وہ بس میں تیار ہونے کے لیے جا ہی رہی تھی کہ زری کو دیکھ کر رک گئی تھی' زری کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے وہ کہتی ہے کہ آپ لوگ چلے جائیں میں نہیں جا رہی۔" نگارش نے زری کے سنبھلنے تک بات سنبھالنے کی کوشش کی تھی۔

"ارے کیوں؟ کیا زیادہ طبیعت خراب ہے۔" عبداللہ خاصی فکرمندی سے اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

"ہاں! صبح بہت تیز بخار تھا اسے لیکن اب اللہ کا شکر ہے کہ پہلے سے بہتر ہے۔" نگارش نے اسے تسلی دی تھی۔

"لیکن پھر بھی ایک بار ڈاکٹر کو تو دکھا لینا چاہیے تھا۔ اٹھو زری ابھی ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں بعد میں کہیں اور چلیں گے۔" عبداللہ نے اسے فوراً" اٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔

"نن... نہیں بھائی! اس کی ضرورت نہیں ہے' میں اب کافی ٹھیک ہوں۔" زری نے نفی میں گردن ہلائی تھی۔

"کیا واقعی سچ کہہ رہی ہو؟" عبداللہ نے پورا یقین چاہا تھا۔

"جی! سچ کہہ رہی ہوں۔" وہ اثبات میں بولی تھی۔

"ہوں! تو پھر جلدی سے اٹھو اور چینج کرکے آجاؤ' ہمیں بس پانچ منٹ میں نکلنا ہے۔" وہ کہہ کے آگے بڑھ گیا تھا۔

"مگر بھائی!" زری التجائیہ سے لہجے میں بڑبڑائی تھی۔

"اگر مگر کچھ نہیں! تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے تمہیں گھر پہ اکیلا نہیں چھوڑا جا سکتا۔ تم ہمارے ساتھ ہی چلو گی' بس بات ختم۔" عبداللہ نے جاتے جاتے پلٹ کر جواب دیا اور اندر چلا گیا تھا اور زری نگارش کو دیکھ کے رہ گئی تھی جو عبداللہ کے پیچھے ہی اندر کی سمت قدم بڑھا چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

علیزے کی شاپنگ کا سارا سامان گل نے ہی شاپنگ بیگز سے نکال کر وارڈروب' ڈریسنگ ٹیبل اور باتھ روم میں سیٹ کیا تھا اور یہ کام کرتے ہوئے گل بھی اندر سے بہت خوش تھی کہ چلو شکر ہے کہ علیزے بی بی کی زندگی بھی رفتہ رفتہ اپنے اصل مقام پر سیٹ ہو رہی ہے' ورنہ وہ لوگ تو اسے دیکھ دیکھ کر اندر ہی اندر جلتے کڑھتے رہتے تھے' لیکن اب انہیں بھی تسلی ہو گئی تھی کہ ان شا اللہ اک دن علیزے بی بی بھی اپنے شایان شان زندگی بسر کرے گی اور گزشتہ تمام دکھ' تمام اذیتیں اور تمام تکلیفیں بھول جائے گی اور اللہ کی خاص رحمت ہو گی اس کی ذات پہ کیونکہ اس کے صبر و برداشت کا پیمانہ بہت وسیع تھا۔ اور اک نہ اک دن اللہ انسان کو اس کے صبر و برداشت کا صلہ ضرور دیتا ہے سو اسے بھی یہ صلہ ضرور ملے گا ان لوگوں کو پورا پورا یقین تھا۔

"گل! اپنی بی بی جی سے کہہ دو کچھ دیر میں کپڑے چینج کرکے تیار ہو جائیں میرے کچھ مہمان آرہے ہیں ان سے ملنے کے لیے۔" گل وارڈروب بند کرکے پلٹ رہی تھی جب اندر داخل ہوتے دل آور کی آواز پہ ٹھٹک کر رک گئی تھی کیونکہ علیزے سامنے ہی تو بیڈ پہ بیٹھی ہوئی تھی لیکن وہ پھر بھی گل کو مخاطب کرکے پیغام دے رہا تھا اور گل کے لیے تو یہ بھی ایک حیرت کا مقام ہی تھا۔

"گل! اپنے صاحب جی سے کہو میں جانتی ہوں۔ اس لیے آپ فکر نہ کریں' میں کچھ دیر میں کپڑے چینج کرکے تیار ہو جاؤں گی۔" علیزے نے بھی جواباً" اسی کے سے انداز میں جواب دیا تھا اور گل ان کے سوال و جواب پہ ہکا بکا سی رہ گئی تھی۔

"گل! اپنی بی بی جی سے کہہ دو کہ میں نیچے انتظار کر رہا ہوں جب بلاؤں تو وہ نیچے آجائیں" اس نے ایک اور پیغام دیا تھا۔

"گل! اپنے صاحب جی سے کہو آپ جب بھی بلائیں گے میں آجاؤں گی۔" اس نے فوراً" پیغام کا جواب دیا تھا۔

"ہوں! شکریہ" وہ کہتے ہوئے لب بھینچ کر پلٹا اور بیڈ روم سے باہر نکل گیا تھا اور علیزے گہری سانس خارج کرکے رہ گئی تھی۔

"اب کیا کرنا ہے بی بی جی؟ مہمان تو بس آتے ہی ہوں گے" گل کو بھی پتا تھا کہ نبیل اور عبداللہ اپنی فیملی کے ساتھ آرہے ہیں۔

"تم میرے لیے کپڑے نکال دو' میں شاور لے لوں۔" علیزے سنجیدگی سے کہتی بیڈ سے اٹھ گئی تھی اور گل اثبات میں سر ہلا کر وارڈروب سے اس کے لیے کپڑے نکالنے لگی۔

☼ ☼ ☼

آج کوئی ہنر' کوئی روش' کوئی طریقہ تو بتاؤ....
کہ دل ٹوٹے بھی نہ' وہ ملے بھی نہ اور چین آجائے....

ان کی گاڑی ایک جھٹکے سے آکر اس کے گھر کے ڈرائیو وے پہ رکی تھی اور زری کے دل سے پھر ایک سایہ سا گزرا تھا کیونکہ وہ آج بھی ڈرائیو وے پہ ہی ان کی گاڑی کے سامنے کھڑا تھا اور عبداللہ گاڑی کا انجن بند کرکے گاڑی سے نیچے اتر آیا اور ان کے ہاتھ ملانے تک وہ دونوں بھی گاڑی سے اتر آئی تھیں۔

"السلام علیکم دل آور بھائی! کیسے ہیں آپ؟" نگارش بھی اس کے قریب آکر ٹھہر گئی۔

"وعلیکم السلام! اللہ کا شکر ہے' میں ٹھیک ہوں' آپ سنائیں آپ سب کیسے ہیں؟" اس نے بڑے تحمل اور سکون سے جواب دیا تھا' زری اسے اک نظر دیکھ کر رخ پھیر گئی تھی کیونکہ وہ اسے آج بھی پرایا ہی نظر آیا تھا اور اس سے پہلے کہ نگارش کچھ کہتی اچانک ہی دوبارہ گیٹ کھلا تھا اور نبیل کی گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی اندر آگئی تھی۔

"لو جی! وہ لوگ بھی آگئے۔" عبداللہ نبیل کی گاڑی دیکھ کر مسکرایا۔

"بڑے وقت پہ پہنچے ہو دونوں" دل آور کا دل اندر سے بے حد افسردہ سا ہو رہا تھا کیونکہ وہ آج اپنے جان سے عزیز اور شہ رگ سے بھی قریب تر دوستوں کو ایک ناقابل یقین دھچکا دینے جا رہا تھا' جس کا اسے بے پناہ افسوس تھا اور پھر اس افسوس کے باوجود اسے اپنے آپ کو کمپوز بھی کرنا پڑ رہا تھا اس لیے' جس اذیت کا وہ شکار تھا وہ اسے اپنے چہرے سے ظاہر بھی نہیں ہونے دیتا تھا اور یہ بھی اس کے لیے ایک اذیت ہی تھی۔

"کیا خیال ہے بھائی؟ ہم لوگ واپس چلیں؟ دل آور بھائی تو راستہ دینے والے نہیں لگ رہے؟" مدیحہ نے نبیل اور عبداللہ کو مخاطب کیا تھا اور دل آور بے ساختہ چونک گیا تھا۔

"ارے نہیں نہیں یار! آؤ آپ لوگ اندر آجاؤ' میں کافی دیر سے آپ لوگوں کا ہی تو انتظار کر رہا تھا۔" دل آور

فوراً" راستے سے ہٹ گیا تھا اور پھر وہ سب اس کے ساتھ چلتے اندر آ گئے تھے۔

"ارے بیٹا! میں تو تمہارے اس طرح اچانک سب کو ایک ساتھ بلانے پہ پریشان ہی ہو گئی تھی صبح سے سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ تم نے کیوں بلایا ہے اور آخر کس سے ملوانا ہے؟ میں تو تم سے فون پہ ہی پوچھنے والی تھی لیکن نبیل نے ہی منع کر دیا تھا۔" فائزہ بیگم نے آج پہلی بار کچھ بولنے میں پہل کی تھی اور دل آور نے بمشکل مسکرانے کی ناکام سی کوشش کی تھی ورنہ اس سے نہ تو مسکرایا جا رہا تھا اور نہ ہی منہ سے کچھ کہا جا رہا تھا مگر پھر بھی کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی تھا اب ان کو گھر بلا کر خود چپ ہو کر تو نہیں بیٹھنا تھا نا۔

"ہوں! ابھی آپ بیٹھیں کھانا کھائیں کچھ ریلیکس کریں پھر آپ کو بتاتا ہوں کہ میں نے آپ کو کس سے ملوانا ہے۔" دل آور نے بات کو غیر سنجیدگی سے لیا تھا۔

"لیکن بھائی! اس طرح تجسس کے مارے تو کھانا بھی نہیں کھایا جائے گا؟" مدیحہ ذرا سا جھنجلائی تھی۔

"لیکن! اس طرح تجسس ختم ہو جانے کے بعد بھی تم سے کھانا نہیں کھایا جائے گا۔" دل آور کو ان سب کے رد عمل کا پہلے سے ہی کافی اچھی طرح سے اندازا تھا۔

"ارے! ایسا کون سا تجسس ہے، جس کی دونوں صورتیں ہی خطرناک ہیں، جاننا بھی اور نہ جاننا بھی؟" مدیحہ جان بوجھ کر دل آور کا موڈ خوشگوار کرنے کے لیے حد سے زیادہ ایکسائیٹڈ ہو رہی تھی۔

"بس ہوتا ہے کبھی کبھی! ایسا بھی ہوتا ہے۔ اینی وے! آپ لوگ فی الحال کھانا کھا لیں کھانا تیار ہے یہ باتیں تو بعد میں بھی ہوتی رہیں گی۔ زلفی! زلفی! گل سے کہو کھانا لگا دے۔" دل آور مدیحہ سے کہتے ہوئے زلفی کو پکارنے لگا۔

"جی صاحب جی! ابھی کہہ دیتا ہوں۔" وہ سر ہلا کر فوراً" چلا گیا۔

اور پھر ٹھیک دس منٹ کے بعد گل نے کھانا ٹیبل پر لگا دیا تھا اور وہ سب ڈائننگ روم میں آ گئے تھے۔

سبھی ہلکی پھلکی باتوں کے دوران ٹھیک ٹھاک طریقے سے کھانا کھا رہے تھے لیکن ایک صرف وہ تھا یا زری تھی جس سے کھانے کا نوالہ بھی حلق سے نیچے نہیں اتر رہا تھا کہ اک بے ارادہ سی نظر اٹھی تھی اس کی طرف اور پھر وہی نظر اس کی مرجھائی ہوئی صورت دیکھ کر درد سے کراہ کے جھک گئی تھی۔

اور یہی حال زری کا بھی ہوا تھا اس کی نظر بھی بے اختیار اس پہ جا پڑی تھی اور اس کو یوں چپ چپ اور بوجھل سا دیکھ کر اس کی نظر بھی پانیوں سے دھندلا گئی تھی۔

"کیا بات ہے دل آور؟ تم کھانا کیوں نہیں کھا رہے؟" نبیل نے اس کے سامنے کھانا جوں کا توں رکھے دیکھا تو اسے خاصی تشویش ہوئی تھی۔

"بس یار! ایسے ہی۔۔۔ دن میں کھانا کافی لیٹ کھایا تھا اس لیے اب بھوک نہیں ہے۔" دل آور نے اسے ٹالنے کے لیے کہا اور ہاتھ پیچھے کھینچ لیے تھے۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" عبداللہ کو بھی فکر ہوئی تھی۔

"ہوں! بالکل ٹھیک ہے بس تم لوگ کھانا کھاؤ پھر بات ہوتی ہے۔" اس نے انہیں ریلیکس کیا تھا اور کچھ دیر بعد

کھانے سے فارغ ہو کر وہ واپس ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے تھے۔

"تمہاری کیسی طبیعت ہے بیٹا؟ بخار کم ہوا؟" فائزہ بیگم نے زری کی سمت متوجہ ہوتے ہوئے اس کی کلائی کو چھو کر دیکھا تھا۔

"جی! پہلے سے بہتر ہوں میں تو گھر پہ ہی رہنا چاہ رہی تھی، لیکن بھائی اور بھابی نے ہی نہیں رکنے دیا بخار کی وجہ سے خاصی تھکن ہو رہی ہے۔" زری کی آواز اور لہجہ بھی خاصا نڈھال لگ رہا تھا دل آور اس کی بات سن کر رخ پھیر گیا تھا تاکہ نظر دوبارہ اسے دیکھنے کی غلطی نہ کرے!

"ہاں! تو اچھا کیا ہے نا انہوں نے، بخار کی حالت میں تمہیں گھر پہ کیسے چھوڑ آتے؟" فائزہ بیگم نے ان کی حمایت میں جواب دیا تھا۔ اور ذرا فاصلے پہ بیٹھے دل آور کو مزید شرمندگی ہوئی تھی۔

"ایم سوری! میری وجہ سے آپ سب کو زحمت اٹھانا پڑی ہے، لیکن مجبوری تھی آپ سب کو یہاں بلانا اور بتانا بھی ضروری تھا کیونکہ آپ لوگ میرے لیے پریشان تھے آپ کو فکر تھی کہ میں اکیلا ہوں حالانکہ ایسا نہیں ہے میں اکیلا نہیں ہوں۔ میرے ساتھ میری تنہائی اور میرا اکیلا پن شیئر کرنے کے لیے کوئی اور بھی ہے ایک ایسا رشتہ جو انسان کے ہر اچھے اور برے وقت میں اس کے ساتھ ہوتا ہے اور ساتھی کہلاتا ہے اس لیے اپنے اسی رشتے سے ملوانے کے لیے میں نے آپ سب کو یہاں بلایا ہے۔ امید ہے کہ اگر آپ لوگوں کو زیادہ اچھا نہ لگا تو زیادہ برا بھی نہیں لگے گا۔" دل آور کو زندگی میں پہلی بار کچھ کہتے ہوئے اتنی پریشانی اور پشیمانی کا سامنا ہو رہا تھا۔ ورنہ وہ بات کہتے ہوئے ڈرنے اور جھجکنے والا آدمی نہیں تھا اس کی تو ہر بات کھری اور دو ٹوک ہوتی تھی۔

"دل آور! تم کیا کہہ رہے ہو ہمیں کچھ سمجھ نہیں آ رہا؟" عبداللہ کے ساتھ ساتھ باقی سب بھی الجھے ہوئے بیٹھے تھے۔

"ہوں! مجھے پتا ہے کہ تم لوگ کچھ بھی نہیں سمجھو گے اور نہ ہی میں تم لوگوں کو سمجھا پاؤں گا، لیکن پھر بھی بتانا تو ہے ہی۔" اس نے کہتے ہوئے سب کو چائے سرو کرتی گل کی طرف دیکھا تھا۔

"جاؤ گل! علیزے بی بی کو اپنے ساتھ لے آؤ۔" اس نے علیزے کو سب کے سامنے لانے کا حکم دے ہی دیا تھا اور وہ سب حیران پریشان سے دیکھ رہے تھے کہ وہ کہہ کیا رہا ہے؟ اور ہو کیا رہا ہے۔

"جی صاحب! ابھی لے آتی ہوں؟" گل ٹرے اک سائیڈ پہ رکھ کے پلٹ کر ڈرائنگ روم سے باہر چلی گئی اور پھر محض پانچ منٹ لگے تھے گل کی واپسی کو اور ان لوگوں کی آنکھیں خیرہ ہونے کو! کیونکہ گل کے ساتھ علیزے بھی تھی جو ان سب کے سامنے سنگ مرمر کی مورت کی طرح آ کھڑی ہوئی تھی۔

"السلام علیکم!" علیزے اندر سے بہت کنفیوژ بھی تھی مگر کیا کرتی زندگی کا یہ لمحہ بھی تو اک دن فیس کرنا ہی تھا سو اپنے اندر ہمت تو لائی ہی تھی اور وہ لے ہی آئی تھی۔

"وعلیکم السلام!" انہوں نے بمشکل اس کے سلام کا جواب دیا تھا اور دل آور اپنے آپ کو کنٹرول کرتا ہوا صوفے سے اٹھا اور علیزے کے قریب اس کے پہلو میں آ کھڑا ہوا تھا۔

"علیزے! ان سے ملو یہ میرے بہت ہی گہرے دوست نبیل حیات کی مدر ہیں۔ فائزہ آنٹی اور میرے لیے بھی بالکل میری ماں کی طرح ہیں اور فائزہ آنٹی! یہ ہے علیزے میری بیوی مسز دل آور شاہ۔"

اس نے علیزے کو فائزہ بیگم سے متعارف کرواتے ہوئے باقی تمام افراد پہ جیسے انتہائی تباہ کن بم پھوڑ دیا تھا اور بیٹھے بیٹھے ان سب کے دل و دماغ کے پرخچے اڑ گئے تھے اور آس پاس سب کچھ دھواں دھواں ہو گیا تھا۔

"مسز دل آور شاہ؟" زری کے ہونٹ ذرا سا کپکپائے تھے اور پھر وہیں کے وہیں ساکت و صامت بھی ہو گئے تھے۔

"دل آور! یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟ تم ہوش میں تو ہو نا؟" عبداللہ اپنی جگہ سے بے ساختہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"میں جو کہہ رہا ہوں وہ آپ سب سن رہے ہیں یہ کوئی مذاق نہیں ہے یہ ایک سچ ہے ایک ٹھوس حقیقت ہے یہ میری بیوی ہے اور میں آپ سب کو اپنی بیوی سے ملوا رہا ہوں آج سے چار دن پہلے ہی ہمارا نکاح ہوا ہے اور یہ نکاح صرف نکاح ہی نہیں ہے اسے لوگ لو میرج بھی کہتے ہیں اس لیے مجھے یہ بتانے میں کوئی قباحت نہیں ہے کہ یہ میری اور علیزے کی لو میرج ہے اور اس لو میرج کو اپنے انجام تک پہنچانے میں اماں نے ہمارا ساتھ دیا ہے اور یہ لو میرج ان کی آنکھوں کے سامنے ان کی آخری سانسوں کے دوران اسپتال میں ہوئی ہے حالانکہ اماں میری شادی کہیں اور کرنا چاہتی تھیں انہوں نے کسی اور کو پسند کر رکھا تھا۔

مگر مجھے... مجھے... علیزے پسند تھی اس لیے اس وقت علیزے آپ سب کے سامنے علیزے دل آور شاہ کے روپ میں موجود ہے۔" دل آور نے اپنی طرف سے انہیں بہت سکون، ٹھہراؤ اور تفصیل سے جواب دیا تھا اور اس کے جواب پہ وہ سب اپنی جگہ سے کھڑے ہونے پہ مجبور ہو گئے تھے لیکن ان سب میں صرف زری تھی جس سے اپنے قدموں پہ کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا تھا مگر اس کے ہونٹ ابھی تک ایک ہی لفظ پہ اٹکے ہوئے تھے۔

"مسز دل آور شاہ۔" اس کے منہ سے یہ نام، یہ حوالہ اک سسکی کی طرح برآمد ہوا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا اور اس کے قدم لڑکھڑا سے گئے تھے۔

"زری!" ان سب نے بے ساختہ چونک کر زری کی طرف دیکھا تھا لیکن وہ عشق کا پیکر عرش سے فرش پہ گرا اور گر کر ٹوٹ گیا تھا اور وہ سب دیکھتے رہ گئے تھے۔

زری اچانک کھڑے قد سے تیورا کے گری تھی اور منہ کے بل گرنے کی وجہ سے دیکھتے ہی دیکھتے خون میں لت پت سی ہو گئی تھی جس پہ ان سب کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں کیونکہ سامنے کا منظر ناقابل یقین تھا۔

"زری!" عبداللہ تڑپ کے اس کی طرف لپکا تھا اور بڑی تیزی سے اسے اپنی بانہوں میں اٹھا کر سیدھا کیا تھا اس کی پیشانی، ناک اور منہ سے خون بہہ رہا تھا جو عبداللہ کے ہاتھوں کو بھی رنگین کر گیا تھا۔

"زری!" عبداللہ نے اسے جھنجھوڑا تھا اسے یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے اس کا دل کاٹ کے رکھ دیا ہو۔ اور دوسری طرف دل آور شاہ تھا جسے اپنی رگوں سے زندگی زری کے خون کی طرح بہتی ہوئی محسوس ہوئی تھی جبکہ نبیل حیات عشق کے اس انکشاف پہ جہاں کا تہاں پتھر ہوا کھڑا تھا...!!

(باقی آئندہ)

☆ ☆

نبیلہ عزیز

درِ دل

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نبیل حیات دونوں بہن بھائی ہیں' مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے' وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پہ رنگ چکی ہے' جس کے پیش نظر فائزہ بیگم' نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں' لیکن مدحیہ پاکستان جانے سے انکار کردیتی ہے' جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے' مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

نبیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے' مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا' بے بسی اور مجبوری سے تنگ آ کر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے' لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے بابا امتیاز مل جاتا ہے' جو اسے کام کی آفر کرتا ہے' جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے' اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے' وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے' وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آویز شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے' وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے' اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا' اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دلاتی ہیں۔

پینتیسویں قسط

اور یہ بات صرف زری کی ہی بات نہیں تھی کہ صرف وہی منہ کے بل گری تھی۔
بلکہ دیکھا جاتا تو وہاں موجود سبھی افراد ہی منہ کے بل گرے تھے۔
چوٹ بھی سبھی کو آئی تھی اور درد بھی سبھی کو ہوا تھا۔
مگر فرق صرف اتنا تھا کہ زری کا خون بہہ نکلا تھا اور ان سب کے دل و دماغ اندر ہی اندر لہولہان ہو گئے تھے۔ لیکن اس چوٹ' درد' اور خون کا سلسلہ تو دل آور شاہ کے گھر سے لے کر اسپتال پہنچنے تک ہنوز جاری ہی رہا تھا' جس کے باعث وہ سب اپنی اپنی ذات اور اپنی اپنی اذیت میں گم ایک دوسرے سے نظریں چرائے ہوئے انجان کھڑے تھے کسی کو بھی کسی دوسرے کا احساس نہیں تھا سب اپنی ہی تکلیف میں مبتلا تھے۔
دل آور کا درد اور تھا... نبیل کی چوٹ اور تھی' عبداللہ کے رنج اور تھے۔
وہ تینوں ہی خود کو ایک دوسرے سے نظریں ملانے کے قابل نہیں سمجھ رہے تھے اور اس کرب انگیز عالم میں اچانک ہی ڈاکٹر لودھی آئی سی یو روم کا دروازہ کھول کر باقی ڈاکٹرز اور نرسوں کے ساتھ باہر نکل آئے تھے۔
"مسٹر ملک!" ڈاکٹر لودھی نے سامنے کھڑے عبداللہ کو متوجہ کیا تھا اور وہ یکدم چونک گیا تھا۔
"ہوں... ہاں... ڈ... ڈاکٹر صاحب... اب... اب کیسی ہے وہ؟ اسے... اسے ہوش آگیا؟ وہ... وہ ٹھیک تو ہے نا؟ اسے کچھ ہوا تو نہیں؟"
عبداللہ کی آواز جیسے لرز رہی تھی اور اس نے اپنی پریشانی اور بے چینی کے ہاتھوں مجبور ہو کر بے ساختہ اک اضطراب کی سی کیفیت میں ڈاکٹر لودھی کا بازو پکڑ لیا تھا اور اپنے اس اضطراب اور بے چینی میں اس نے ڈاکٹر کا مایوس چہرہ بھی نوٹ نہیں کیا تھا۔
"بتائیں نا ڈاکٹر صاحب! اسے ہوش آیا' یا نہیں؟ وہ... وہ ٹھیک تو ہے نا؟ اسے کچھ ہوا تو نہیں؟" ڈاکٹر کی خاموشی پہ عبداللہ نے کافی گھبرا کے پوچھا تھا اور جواباً ڈاکٹر لودھی نے اپنا بازو پہ رکھے اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔
"پلیز ملک صاحب! آپ اللہ پہ بھروسہ اور تسلی رکھیں' وہ ان شاء اللہ جلدی ٹھیک ہو جائیں گی۔" ڈاکٹر لودھی نے اس کے ہاتھ کو تھپکا تھا۔
"وہ... وہ ٹھیک ہو جائے گی؟ مطلب وہ... وہ اب ٹھیک نہیں ہے؟" عبداللہ کو مزید جھٹکا لگا تھا اور تشویش کے مارے اس کا دل تو جیسے مٹھی میں ہی آگیا تھا کیونکہ ڈاکٹر کا دھیما اور سست سا لہجہ ہی بتا رہا تھا کہ بات غیر معمولی ہے۔
"ہوں... اوکے... آئیے میرے ساتھ... بتاتا ہوں آپ کو۔" ڈاکٹر کہہ کر اپنے روم کی طرف بڑھ گئے تھے' اور عبداللہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی آگے یا پیچھے ہٹنے کے قابل نہیں رہا تھا۔
"عبداللہ! کیا سوچ رہے ہیں آپ؟ جائیے نا... ڈاکٹر کے پاس جائیے۔" نگارش اپنے آنسو دوپٹے سے پونچھتی ہوئی اس کے قریب آگئی تھی۔
"ہوں! جا رہا ہوں۔" وہ نگارش کے متوجہ کرنے پہ ایک بار پھر ہمت باندھنے پر مجبور ہو گیا تھا اور جانے سے پہلے بے ساختہ گردن موڑ کر دل آور اور نبیل کی سمت دیکھا جس پہ وہ دونوں چپ چاپ آگے بڑھ کے اس کے ساتھ ڈاکٹر لودھی کے روم میں آگئے تھے۔
"پلیز! تشریف رکھیے۔" ڈاکٹر نے کرسی کی سمت اشارہ کیا تھا۔
"تھینک یو!" دل آور نے بے حد آہستگی سے شکریہ ادا کیا تھا۔
"مس زرین ملک آپ کی سسٹر ہیں؟" ڈاکٹر لودھی کو پہلے ہی پتا تھا لیکن انہوں نے ایک بار پھر کنفرم کرنا چاہا تھا۔
"جی!" وہ بمشکل کہہ پایا تھا۔

"اور یہ؟" ڈاکٹر لودھی نے نبیل اور دل آور کی طرف دیکھا تھا۔
"میرے دوست بھی کہہ سکتے ہیں اور میرے بھائی بھی۔" عبداللہ نے ایک گہری سانس کھینچی تھی اور سر جھکا لیا تھا۔
"مس زرین ملک کے ہزبینڈ یا فیانسی وغیرہ؟" ڈاکٹر کے اگلے سوال پہ عبداللہ نے لب بھینچ لیے تھے اور اس وقت اس کی کنڈیشن کو محسوس کرتے ہوئے بے ساختہ دل آور نے اپنا مضبوط ہاتھ اس کے کندھے پہ رکھ کے اس کا کندھا ہلکے سے دبایا تھا' حالانکہ وہ جانتا تھا کہ اس کی یہ تسلی اور یہ ڈھارس عبداللہ کے لیے کتنی کھوکھلی سی ہے۔
"مسٹر ملک!" ڈاکٹر لودھی نے اسے جواب کے لیے اکسایا تھا۔
"نہیں! ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ وہ ان میرڈ ہے۔" عبداللہ نے بڑے صبر اور ضبط سے جواب دیا تھا۔
"تو پھر! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ ان کے دل و دماغ کو ایسا کون سا صدمہ پہنچا ہے کہ وہ کوما میں چلی گئی ہیں۔" ڈاکٹر لودھی کے اگلے سوال پہ ان تینوں کو یوں لگا تھا کہ جیسے اسپتال کی بلند و بالا عمارت کی چھت ان کے سروں پہ ہی آگری ہو۔ اور انہوں نے ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر ڈاکٹر کے چہرے کی سمت دیکھا تھا۔
"کوما میں... ؟ یہ... کیا کہہ رہے ہیں آپ۔" عبداللہ نے زیر لب دہرا کے پوچھا تھا مگر ان دونوں میں تو اتنی سی بھی سکت نہیں رہی تھی کہ زبان سے کوئی لفظ ہی دہرا لیتے۔
"جی ہاں! وہ کوما میں چلی گئی ہیں' اور یہ سب کسی گہری چوٹ اور کسی گہرے صدمے کی وجہ سے ہوا ہے۔" ڈاکٹر لودھی نے اپنے پورے تجربے اور پورے وثوق سے چیک اپ اور ٹیسٹ کروانے کے بعد انہیں یہ ہولناک خبر سنائی تھی۔
"مم... مگر ایسے... یہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟ وہ... وہ کوما میں کیسے جا سکتی ہے؟ اسے تو بہت معمولی سی چوٹ آئی ہے۔ ورنہ... ورنہ تو وہ بالکل ٹھیک تھی۔" عبداللہ روہانسے لہجے میں پوچھ رہا تھا اور ڈاکٹر لودھی اس کی کم عقلی پہ افسوس سے سر جھٹک کر رہ گئے تھے۔
"آپ سے کس نے کہا کہ انہیں بہت معمولی سی چوٹ آئی ہے۔" ڈاکٹر کا لہجہ کافی استہزائیہ سا ہو چکا تھا۔
اور ذرا سے توقف کے بعد دوبارہ سے بات کا سلسلہ جوڑ لیا تھا۔
"مسٹر ملک! آپ نہیں جانتے۔ آپ کبھی اندازا بھی نہیں کر سکتے کہ انہیں کتنی گہری چوٹ آئی ہے اور کتنا گہرا صدمہ پہنچا ہے۔ وہ اس وقت صدمے کی اس اسٹیج پر ہیں کہ جہاں انسان کا جسم' اس کا دل و دماغ اور اس کی عقل بیک وقت مفلوج ہو کے رہ جاتے ہیں' اور پھر اس اسٹیج سے واپس آنا مریض کے اور ڈاکٹرز کے اختیار میں نہیں رہتا' بلکہ اللہ کی طرف سے ایک معجزہ بن جاتا ہے' اور اب آپ کو بھی اس معجزے کا انتظار کرنا ہو گا کیونکہ مس زرین ملک کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہے وہ کسی گہرے اور بہت بڑے شاک میں ہیں' ورنہ اتنی سی چوٹ یا اتنے سے صدمے سے کوئی بھی پیشنٹ کوما میں نہیں جا سکتا۔ بس آپ لوگوں کی دعا اور اللہ کی نظر کرم ہی کچھ عنایت کر سکتی ہے' جس سے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ دو دن میں ہی ہوش کی دنیا میں واپس لوٹ آئیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ انہیں دو سال بھی ہوش نہ آئے۔"
ڈاکٹر لودھی نے انہیں پوری تفصیل سے آگاہ کیا تھا اور وہ تینوں اپنی اپنی جگہ پہ دم بخود سے بیٹھے رہ گئے اور عبداللہ کو تو یوں لگ رہا تھا کہ جیسے بیٹھے بیٹھے وہ خود بھی مفلوج ہو گیا ہو' اور اس کی عقل بھی پتھرا گئی ہو کیونکہ اب ان دونوں کے سامنے وہ ڈاکٹر کو کیسے بتاتا کہ اسے کیا صدمہ پہنچا ہے؟ اور اسے کیسی چوٹ لگی ہے؟ وہ تو اتنی دیر سے خود اپنی سوچوں اور اپنے خیالات کی نفی کرتا پھر رہا تھا' لیکن ڈاکٹر لودھی نے اس کی سوچوں اور خیالات پہ تصدیق کی مہر لگا دی کہ وہ جو سوچ رہا ہے' وہ سچ ہے۔
زری منہ کے بل نہیں گری... بلکہ پاش پاش ہو گئی ہے... ٹوٹ گئی ہے... بکھر گئی ہے... لٹ گئی ہے...

صرف اور صرف دل آور شاہ کی خاطر۔

صرف اس کی چاہ میں' اس کی محبت میں اور صرف اس کے عشق میں' اور اس کی اس چاہ اور اس عشق نے عبداللہ جیسے آدمی کو بھی توڑ ڈالا تھا' وہ ڈاکٹر لودھی کے روم سے اپنے قدموں پہ اپنی لاش گھسیٹتا ہوا باہر آیا تھا۔

☼ ☼ ☼

چھ ماہ بعد

باہر موسم بے حد اچھا ہو رہا تھا' ہوا بہت تیز چل رہی تھی اور اس تیز اور ٹھنڈی ہوا میں بھی ہلکی سی نمی محسوس ہو رہی تھی اور بارش کے آثار بھی صاف دکھائی دیتے تھے اسی لیے موسم کا ایسا موڈ اور ایسے تیور دیکھ کر علیزے جلدی سے چھت پہ دھو کر پھیلائے ہوئے اپنے اور دل آور کے کپڑے اتار کر نیچے لے آئی تھی لیکن نیچے آتے آتے بھی ہوا میں رچی نمی کی بدولت اس کا اپنا چہرہ بھی نم آلود سا ہو گیا تھا اور وہ اپنے دوپٹے سے یہ نمی پونچھتی ہوئی کپڑے بازو پہ اٹھائے اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھ گئی تھی۔

حالانکہ پہلے یہ کام گل کی ذمہ داری ہوتے تھے مگر جب سے علیزے کو اس گھر میں بیوی کا درجہ ملا تھا اس نے خود بخود ہی اس گھر کی تمام ذمہ داریوں میں شریک ہونا شروع کر دیا تھا' وہ بیڈ روم اور کچن سے۔ باہر لان تک تمام کام خود کرنے لگی تھی اور یونہی کرتے کرتے ان چھ ماہ میں وہ ہر کام میں طاق ہو گئی تھی۔ برتن دھونے سے کپڑے دھونے تک اور چولہا جلانے سے لے کر دل جلانے تک وہ سب کچھ سیکھ گئی تھی آخر زندگی میں اور کچھ نہیں سیکھا تھا تو پھر یہ تو سیکھنا ہی تھا نا۔

"ارے علیزے بی بی! لائیے یہ کپڑے میں رکھ آتی ہوں۔" گل ٹیرس سے کرسیاں ہٹا کر ادھر ہی آ رہی تھی کہ علیزے کو اتنے کپڑے اٹھائے ہوئے دیکھ کر تیزی سے اس کے قریب آئی تھی۔

"نہیں! تم رہنے دو۔ میں خود رکھ لوں گی۔ بس تم ایسا کرو کہ زلفی یا گلاب خان سے کھوبل ڈوگ کو اس کے روم میں لے جائیں' باہر بارش شروع ہونے والی ہے۔" علیزے نے گل کو نیچے کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"جی ٹھیک ہے! کہہ دیتی ہوں۔" گل سر ہلاتی ہوئی آگے بڑھ کے سیڑھیاں اتر گئی تھی اور اتنے میں دل آور بھی سیڑھیاں چڑھ آیا تھا۔

"السلام علیکم!" علیزے نے اس پہ "سلامتی" بھیجی تھی اور وہ محض سر ہلا کے اس کے پاس سے گزر کر بیڈ روم کی طرف بڑھ گیا تھا۔

اور ظاہر ہے کہ علیزے نے بھی بیڈ روم میں ہی آنا تھا سو مجبوراً ڈھیلے ڈھالے قدم اٹھاتی ہوئی اس کے پیچھے ہی آئی تھی۔ دل آور اپنا بریف کیس اور کوٹ صوفے پہ ڈال کر بیڈ پہ ڈھیر ہو گیا تھا' وہ کپڑے لے کر وارڈ روب کی سمت بڑھ آئی تھی اور وارڈ روب کے درمیانی دونوں پٹ کھول کر اپنے اور اس کے کپڑے تہہ کر کے الگ الگ خانوں میں رکھنے لگی۔

"کپڑے نکال دوں؟ چینج کرنے ہیں؟" علیزے نے بیڈ پہ چاروں شانے چت لیٹے دل آور کو ایک نظر دیکھتے ہوئے وارڈ روب کا تیسرا پٹ کھولا تھا جس میں اس کے تمام پریس شدہ کپڑے ہینگ کیے ہوئے تھے۔ "ہوں نکال دو۔" اس نے بے حد آہستگی سے کہہ کر اپنے دونوں ہاتھ بالوں میں پھنسا لیے تھے۔ علیزے اس کا وائیٹ شلوار سوٹ نکال کر واش روم میں رکھ آئی اب اس کا ارادہ کچن میں جانے کا تھا' لیکن دل آور کی آواز پہ اس کے قدم ٹھٹکے تھے۔

"گل سے کہو میرے لیے ایک کپ چائے لے آئے۔ میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔" اس نے پیغام دیا تھا اور

علیزے کچھ بھی کہے بغیر بیڈ روم سے باہر نکل آئی تھی اور یہ تو چھ ماہ سے ہو رہا تھا' دل آور نے جو بھی کام کہنا ہوتا تھا وہ گل کا ہی نام لیتا تھا جبکہ وہی کام علیزے کر کے اس کے سامنے رکھ دیتی تھی۔

اس وقت بھی وہ خود ہی چائے بنا کر لے آئی تھی۔

"ڈرائیور؟" اس نے قریب آ کر آواز دی تھی۔

"ہوں" دل آور نے چونک کر دیکھا تھا۔

"چائے" علیزے نے کپ سامنے کیا تھا اور وہ بے ساختہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

"تھینک یو" اس نے اس کے ہاتھ سے کپ لیتے ہوئے شکریہ ادا کیا تھا۔

اور علیزے اسے کپ تھمانے کے بعد جاتے جاتے پھر رک گئی تھی۔

"زری سے مل کر آئے ہو؟" علیزے کے اچانک سوال پر دل آور نے بھی اچانک سر اٹھا کر دیکھا تھا اس کے چہرے کی رنگت اور اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ علیزے چونکی تھی۔

"نہیں۔ اس نے ہمیشہ کی طرح نفی میں گردن ہلائی تھی۔

"کیوں؟ تم تو کہہ کر گئے تھے کہ اس سے مل آؤ گے۔" اسے تعجب ہوا تھا۔

"یہ تو میں ہمیشہ کہہ کر جاتا ہوں۔" دل آور کے لہجے میں استہزا کا رنگ تھا۔

"تو پھر ملتے کیوں نہیں؟" وہ جھنجلائی تھی۔

"کیونکہ میں ملنا نہیں چاہتا۔ کیونکہ مجھ میں حوصلہ نہیں ہے' کیونکہ میں اس قابل نہیں رہا۔"

وہ اس سے بھی زیادہ جھنجلایا تھا۔

"مگر وہ تو تم سے ملنا چاہتی ہے نا۔" علیزے نے زری کے چاہنے پہ زور دیا تھا۔

"ہونہہ! پھر تو وہ اور بھی بہت کچھ چاہتی ہے؟" دل آور کا لہجہ لہو ٹپکا رہا تھا۔

"تو کر دو نا پوری اس کی چاہت' جو وہ چاہتی ہے۔" وہ بہت سپاٹ اور بہت عجیب سی ہو رہی تھی۔

"علیزے پلیز! جاؤ یہاں سے' مجھے اکیلا چھوڑ دو۔" دل آور نے اپنی فیلنگز سے زچ ہو کر بہت بے بسی سے علیزے کو وہاں سے چلے جانے کا کہا تھا اور علیزے چند سیکنڈ یونہی کھڑی اسے دیکھتی رہی اور پھر وہاں سے ہٹ گئی تھی۔

ابھی وہ بیڈ روم سے نکل کر نیچے ڈرائنگ روم میں آئی ہی تھی کہ لینڈ لائن فون کی رنگ بجنے لگی اور علیزے نے گل کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھا۔

"گل... گل کہاں ہو؟ فون بج رہا ہے۔" اس نے گل کو آوازیں دی تھیں مگر وہ شاید آس پاس کہیں نہیں تھی اس لیے مجبوراً علیزے کو خود ہی کال اٹینڈ کرنا پڑی حالانکہ وہ فون کالز بہت کم اٹینڈ کرتی تھی۔

"ہیلو!" اس نے بہت دھیمی آواز میں ہیلو کہا تھا۔

"السلام علیکم میڈم! میں قادر بات کر رہا ہوں صاحب کا منشی۔" دوسری طرف سے چھوٹتے ہی اپنا تعارف کروایا گیا تھا اور علیزے نے پہلے بھی ایک دو بار اس کا نام سن رکھا تھا اس لیے قدرے ریلیکس ہو گئی تھی۔

"وعلیکم السلام! کیسے فون کیا آپ نے؟" علیزے کا لہجہ تھوڑا نارمل ہو چکا تھا۔

"بس میڈم! مجھے پوچھنا تھا کہ صاحب گھر پہنچ گئے؟" وہ کافی جھجک کے بات کر رہا تھا۔

"جی پہنچ گئے ہیں۔ کیوں خیریت؟ کوئی پیغام وغیرہ ہے ان کے لیے۔" علیزے نے خود ہی اندازا لگانے کی کوشش کی تھی۔

"نہیں! کوئی پیغام وغیرہ نہیں ہے۔ بس میں صرف ان کی طبیعت کی وجہ سے پریشان ہو رہا تھا دراصل وہ جب

یہاں سے نکلے تو انہیں بہت تیز بخار تھا اور اس بخار کی حالت میں وہ ڈرائیو کر کے گئے ہیں' اس لیے مجھے پریشانی ہو رہی تھی کہ وہ خیریت سے گھر پہنچے ہیں یا نہیں؟" قادر اپنی پریشانی بتا رہا تھا اور علیزے اپنی بے دھیانی میں تھی۔

"ڈرائیور کو بخار ہے اور اس نے بتایا بھی نہیں۔" وہ ریسیور ہاتھ میں پکڑے سوچ کے رہ گئی۔

"ہیلو!" اس کی طرف سے خاموشی پا کر قادر کو تصدیق کرنے کے لیے ہیلو کہنا ہی پڑا تھا کہ وہ لائن پہ ہے یا نہیں۔

"جی ہاں! سن رہی ہوں۔ وہ خیریت سے گھر پہنچ گئے ہیں۔ آپ نے ان کے لیے اتنی زحمت کی تھینک یو سوچ۔ میں ان کو بتا دوں گی کہ آپ کی کال آئی تھی۔"

علیزے نے ایک سمجھدار اور سلجھی ہوئی بیوی ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے قادر کا شکریہ ادا کیا تھا اور پھر اللہ حافظ کہنے کے بعد فون بند کر دیا تھا۔

اس نے اگر اپنی طبیعت کا نہیں بتایا تو مجھے انوالو ہونے کی کیا ضرورت ہے بھلا۔ بخار ہوتا ہے تو ہوتا رہے' بلکہ میری طرف سے بھاڑ میں جائے۔ اتنے سے بخار سے کون سا مر جائے گا؟

وہ خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑاتی ہوئی اپنے دل میں آنے والی پریشانی کو سر جھٹک کر پیچھے دھکیلتی ہوئی کچن میں آ گئی تھی اور پھر واقعی وہ اپنے کام میں لگ کر اس کی پریشانی بھول گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

ضبط کرتا ہوں تو
ہر زخم لہو دیتا ہے
آہ کرتا ہوں تو
اندیشہ رسوائی ہے
دیکھتا ہوں تو
ہزاروں ہیں میرے دوست مگر
سوچتا ہوں تو
وہی عالم تنہائی ہے!

وہ نبیل حیات جو ہمیشہ بہت ہی فریش اور رومانٹک موڈ میں رہتا تھا۔
جس کی ڈیسنٹ پرسنالٹی اپنی جگہ ایک متاثر کن اثر رکھتی تھی۔
جس کا سکون اور تحمل قابل رشک سمجھا جاتا تھا۔
جس کی محبت میں بھی ایک ٹھہراؤ تھا' صبر تھا' قناعت تھی۔
جس نے زری کو ہمیشہ چاہا' دل کی گہرائیوں اور شدتوں سے چاہا تھا۔
لیکن اسے جب بھی' جہاں بھی دیکھا۔ ٹھہر ٹھہر اور ڈر ڈر کر دیکھا تھا۔
مگر یہ بات بھی سچ تھی کہ اسے دل میں سجایا بہت تھا۔
کبھی دل کے اس کونے میں رکھا۔ کبھی دل کے اس کونے میں رکھا۔ اور پھر ایک دن آخر اسے اپنا دل ہی بنا ڈالا تھا۔
مگر اسے کیا خبر تھی کہ وہ دل دھڑکے گا بھی تو کسی اور کے لیے۔
طلب کرے گا تو کسی اور کو۔

تڑپے گا تو کسی اور کے لیے۔
اور نبیل حیات اپنے سینے میں اک خلا لیے کر رہ جائے گا۔
اس کے پاس کچھ بھی نہیں رہے گا' بالکل خالی ہاتھ ہو جائے گا۔
اس کی محبتیں' اس کی چاہتیں' اس کے خواب اور اس کی خواہش سب کچھ دل کے طاق پر رکھے رہ گئے تھے' اور اسے اک عجیب سی چپ لگ گئی تھی۔
اس کی خاموش محبت نے اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش کر ڈالا تھا۔

سارے اظہار اور ارمان دل میں ہی دم توڑ گئے تھے اور ان مردہ خوابوں اور مردہ ارمانوں کا زہر اس کے دل و دماغ کے ساتھ ساتھ اس کے جسم و جان کو بھی زہر آلود کر رہا تھا۔

وہ دن بہ دن مر رہا تھا۔ زری سے بھی زیادہ نازک حالت اس کی تھی کیونکہ زری تو کوما میں تھی' اور سکون میں تھی مگر وہ ہوش میں تھا' لیکن حواسوں میں نہیں اور اسی وجہ سے درد تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا' چوٹ بھی گہری ہوتی جا رہی تھی اور زخم ہر دن اور ہر رات کے بعد ناسور بن رہا تھا۔

اور ان سب کیفیات کی اذیت سے نبیل کو اکثر اپنی سانس اپنے ہی سینے میں گھٹتی ہوئی محسوس ہوتی تھی' اور وہ اپنی اس حالت پہ بے بس سا ہو کر اکثر ہی پاگلوں کی طرح سڑکوں کی خاک چھاننے نکل کھڑا ہوتا اور جب بری طرح تھک جاتا تو دوبارہ واپس لوٹ آتا تھا۔

مگر یہ تو فائزہ بیگم اور مدیحہ ہی جانتی تھیں کہ وہ واپس لوٹ کر بھی واپس نہیں لوٹتا بلکہ باہر ہی کہیں راہوں میں بھٹکتا رہتا' صرف اس منزل کے غم میں جو کسی کا بھی نصیب نہیں تھی۔

جو خود بھی نامراد ٹھہری تھی اور اس کو چاہ کر نبیل حیات بھی بامراد نہیں ہوا۔
وہ اگر عشق کا پیکر تھی تو وہ بھی محبت کا مجسمہ تھا۔
وہ اگر ٹوٹ کر بکھری تھی تو وہ بھی چکنا چور ہو گیا تھا۔

وہ بھی کرچیوں کی صورت کئی حصوں میں بٹ گیا تھا اور اس سے بھی اپنا آپ سمیٹا اور سنبھالا نہیں جا رہا تھا کیونکہ وہ یہ سوچ کر ہی مرجاتا تھا کہ وہ زری کو چاہتا رہا۔ اور زری دل آور کو چاہتی رہی۔ لیکن اپنی اپنی چاہ۔ اور اپنی اپنی طلب میں کسی کو بھی خبر نہیں ہو سکی تھی کہ کون کس کو چاہتا ہے؟ اور کس کے لیے پاگل ہے؟

مگر اس چاہ اس طلب اور اس محبت کی دھن میں اب اور اک ہوا تھا وہ سب ہی ایک دوسرے سے نظریں ملانے کے قابل نہیں رہے تھے۔ کیونکہ ان تینوں کی دوستی کے بیچ اب محبت کی جگہ ندامت حائل ہو چکی تھی۔

اب وہ ایک دوسرے سے مسکرا کر اور قہقہے لگا کر نہیں ملتے تھے بلکہ اب تو وہ نظریں اور سر جھکا کر ملتے تھے۔ اور اپنی جھکی ہوئی نظروں اور جھکے ہوئے سروں کا بوجھ وہ اپنے اپنے دل پہ اٹھائے پچھلے چھ ماہ سے بمشکل سب کچھ نبھاتے پھر رہے تھے حالانکہ اندر سے وہ تینوں ہی کھوکھلے ہو چکے تھے۔

"سر...! سر...! آپ نے گھر نہیں جانا کیا؟" عدیل نے بڑی مشکل سے اتنی دیر سے اپنے دھیان میں گم بیٹھے نبیل کو متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی اور نبیل بری طرح چونک کر متوجہ ہوا تھا۔

"ہاں...! ہاں گھر تو جانا ہی ہے۔" نبیل عجیب سے لہجے میں خود کلامی کے سے انداز میں کہتا اپنی چیئر سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" عدیل کو اس کی کیفیت دیکھ کر تشویش سی ہوئی تھی۔

"ہوں! سب ٹھیک ہے یار سب ٹھیک ہے ڈونٹ وری۔" نبیل کافی مسخرانہ سے انداز میں کہتے ہوئے اپنی چیئر کی بیک پہ رکھی اپنی جیکٹ اٹھا کر واپس جانے کے لیے دروازے کی سمت قدم بڑھا چکا تھا اور عدیل وہیں کا وہیں اس

کے پیچھے کھڑا اس کی پشت دیکھتا رہ گیا۔

"سنو!" نبیل دروازے کے قریب جا کر پھر پلٹا۔

"جی کہیے؟" عدیل پوری طرح سے متوجہ ہوا تھا۔

"سب کو سیلری پہنچ گئی؟" اس نے تمام ورکرز کے بارے میں پوچھا تھا۔

"جی! پہنچ گئی ہے۔" عدیل نے اثبات میں جواب دیا تھا۔

"اور تمہاری سیلری؟"

"جی! مجھے بھی مل گئی ہے۔"

"کسی اور چیز کی ضرورت تو نہیں ہے نا؟ اگر ہے تو بتا سکتے ہو۔" نبیل ہمیشہ ہر مہینے اس سے یہ سوال پوچھتا تھا اور اسے تسلی بھی دیتا تھا لیکن عدیل کی تنخواہ ماشاءاللہ اتنی تو تھی ہی کہ عدیل کی پریشانیاں کافی حد تک کم ہو گئی تھیں اور وہ پرسکون رہنے لگا تھا۔

"تھینک یو سر! اللہ کا احسان اور مہربانی ہے آپ کی۔ کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔"

عدیل نے دل کی گہرائیوں سے اس کا شکریہ ادا کیا تھا اور نبیل جواباً" سر ہلا کر دوبارہ پلٹ گیا۔ مگر عدیل جانتا تھا کہ وہ یہ ساری پوچھ گچھ کرنے کے باوجود بھی ذہنی طور پہ سیٹ نہیں ہے کیونکہ وہ ایسی سچویشن میں تو پچھلے کئی مہینوں سے نظر آ رہا تھا اور عدیل بہت چاہ کر بھی نبیل کی ایسی کیفیت اور ایسی حالت کے متعلق نہ نبیل سے کوئی سوال کر سکا تھا اور نہ مدیحہ سے کچھ کہہ سکا تھا کیونکہ اسے یہ سب مناسب نہیں لگتا تھا اس لیے اس وقت بھی وہ اپنے سارے تجسس اور اپنے سارے سوال اپنے ہی ذہن میں لے کر رہ گیا تھا اور نبیل حیات تھکے تھکے قدموں سے چلتا دروازہ کھول کر اپنے آفس سے باہر نکل گیا تھا......!

☼ ☼ ☼

ضبط لازم ہے مگر دکھ ہے قیامت کا فراز
ظالم اب کے بھی نہ رویا تو مر جائے گا

عبداللہ کی خوبصورت بادامی آنکھیں اب ہمہ وقت سرخ ہوئی رہتی تھیں یوں لگتا تھا کہ جیسے ابھی اس کی آنکھوں سے خون چھلک آئے گا... کیونکہ۔

چھ ماہ کا رت جگا... اور چھ ماہ کا دکھ اس کی آنکھوں کو زخم زخم کر چکا تھا۔

اس نے چھ ماہ کی راتیں زری کے سرہانے بیٹھ کر اور جاگ کر گزاری تھیں' وہ زری کو دنیا و جہان سے بے خبر پڑے ہوئے دیکھتا تھا تو دل ہی دل میں روتا تھا۔

اس نے اس کے لیے کیا کیا نہ سوچ رکھا تھا کہ وہ اس کی پسند سے اس کا رشتہ طے کرے گا۔ اس کی دھوم دھام سے شادی کرے گا۔ ہر چیز میں اور ہر بات میں اس کی مرضی اس کی پسند کو فوقیت دے گا' جو وہ چاہے گی وہی کرے گا لیکن یہاں تو سب کچھ ہی مٹی میں مل گیا تھا۔

وہ اس شخص کو چاہ بیٹھی تھی جس کے سامنے عبداللہ اپنا دامن پھیلا کر بھیک بھی نہیں مانگ سکتا تھا۔ جس کے پاس دینے کے لیے بھی کچھ نہیں رہا تھا' خود اپنا بھی نہیں رہا تھا' بلکہ کسی اور کا ہو چکا تھا۔ اور جو پہلے ہی کسی اور کا ہو چکا تھا وہ زری کا کیسے ہو سکتا تھا بھلا...؟

اور بے بسی کی حالت میں اکثر وہ اپنے ہاتھوں کی مٹھیاں اور اپنے لب بھینچ کے رہ جاتا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے ہاتھوں کی اور کنپٹی کی رگیں ابھر آتی تھیں اور نگارش اس کی حالت دیکھ کر اندر ہی اندر کڑھتی رہتی تھی کیونکہ ایسی اذیت بھری صورت حال میں تو اس کی تسلیاں بھی عبداللہ کے دل کو سکون نہیں دے سکتی تھیں۔ کئی مرتبہ تو ایسا بھی ہوتا تھا کہ دو دو دن بات کیے بغیر ہی گزر جاتے تھے۔ اور کبھی کبھی تو عبداللہ دو دو دن بھی اسپتال سے گھر نہیں آتا تھا۔

کبھی کبھی نگارش کے دن اور راتیں زری کے پاس بیٹھے بیٹھے گزر جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ وہ دونوں میاں بیوی بھی ایک دوسرے کے لیے اجنبی سے ہو کے رہ گئے تھے۔ ان کا ذہن زری کے غم سے اور اس کی اذیت سے ہٹ ہی نہیں پا رہا تھا۔ ان کے دل و دماغ تو اس غم نے دیمک کی طرح چاٹ ڈالے تھے۔ ان کی سوچ' ان کے خیال' ان کی فکر زری کے گرد ہی گھومنے لگتی تھی اور ایسے عالم میں وہ باقی سب کچھ بھول کر پس پشت ڈال دیتے تھے کیونکہ ان کے سامنے زری کا بے جان وجود پڑا ہوتا تھا۔

وہ وجود جو عشق کی علامت تھا۔

وہ وجود جو محبت کی کہانی تھا۔

وہ وجود جو ہجر کا آئینہ تھا۔

جسے دیکھ کر' جسے سوچ کر' جسے چھو کر باد صبا بھی مہک مہک جاتی تھی اور آج وہی وجود کسی شجر سے ٹوٹے ہوئے خزاں رسیدہ پتے کی طرح نظر آتا تھا اور دیکھنے والوں کی آنکھیں بھر آتی تھیں۔

"نگارش۔" نگارش عین زری کے سامنے بیٹھی اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑے نم نظروں سے اسے یک ٹک دیکھ رہی تھی جب عبداللہ دروازہ کھول کے اچانک اندر آ گیا تھا۔

"آؤ میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔" رات گہری ہو رہی تھی اور موسم بھی کچھ اچھا نہیں تھا اس لیے عبداللہ نے سوچا تھا کہ نگارش کو وقت پہ ہی گھر چھوڑ آئے۔

"مگر میرا دل نہیں چاہ رہا گھر جانے کو۔ میں آج زری کے پاس رکنا چاہتی ہوں۔ کیوں زری تم بھی یہی چاہتی ہو نا کہ میں آج یہیں رک جاؤں؟" نگارش نے عبداللہ سے بات کرتے کرتے گردن موڑ کر بے ساختہ زری کو مخاطب کیا تھا اور عبداللہ کا دل جیسے مٹھی میں آ گیا۔ اس کے جسم و جان میں کرب کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔

"بتاؤ نا زری! تم بھی یہی چاہتی ہو نا... کہ میں آج یہاں ہی رک جاؤں؟" نگارش نے جان بوجھ کر زری کو مخاطب کرنے کی اور اپنی بات میں انوالو کرنے کی کوشش کی تھی۔

"نگارش پلیز! بس کرو چلو میرے ساتھ میں تمہیں گھر چھوڑ کر آتا ہوں۔" عبداللہ تکلیف سے جھنجلایا تھا۔

"کیوں بس کروں عبداللہ؟ آپ... آپ مجھے بات کیوں نہیں کرنے دیتے؟ یہ... یہ اتنی لاپروا کیوں ہو گئی ہے مجھ سے؟ کیا اسے ذرا بھی احساس نہیں ہوتا کہ میں کتنی اکیلی ہو گئی ہوں' میں کتنی تنہا ہوں اس کے بغیر۔ میری کوئی بہن' کوئی کزن' کوئی دوست نہیں ہے یہاں اس کے سوا۔ اور یہ... یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان پڑی ہے۔ اسے خبر ہی نہیں کہ میں گھر میں اکیلی پھرتی ہوں تو روتی ہوں۔ اس کی ڈائری' اس کی شاعری اس کے پرفیوم دیکھتی ہوں تو دل کٹ جاتا ہے میرا۔ دن میں کئی مرتبہ اس کے بیڈ روم کے چکر لگاتی ہوں' اور ہر مرتبہ بیڈ روم خالی دیکھ کر مایوس لوٹ آتی ہوں۔ دل چاہتا ہے یہ پھر سے کوئی نظم پڑھے اور میں اس کے سامنے بیٹھ کر وہ نظم سنوں۔ یہ پھر سے کسی بات پہ تڑپ کر روئے اور میں پھر سے اسے خود سے لگا کر بچوں کی طرح چپ کرواؤں یہ پھر سے بے یقین ہو جائے اور میں پھر سے اسے یقین دلا دلا کر تھک جاؤں کہ زری ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تم نے جو سنا وہ جھوٹ تھا۔ تم نے جو دیکھا وہ خواب تھا اور جھوٹ اور خواب پہ یقین نہیں کرتے۔ تم بھی مت کرو۔ زری پلیز! ہوش میں آ جاؤ' لوٹ آؤ۔ کسی اور کو نہ سہی ہمیں ضرورت ہے تمہاری۔"

نگارش اس کو بازوؤں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے ہچکیوں سے رو پڑی تھی اور عبداللہ بمشکل اپنی آنکھوں میں

اُڑتے نمکین پانیوں کو ضبط کرتے ہوئے مزید آگے بڑھ آیا تھا۔

"نگارش پلیز! چلو میرے ساتھ۔ وہ تمہاری کوئی بات نہیں سنے گی۔" عبداللہ نے نگارش کے کندھے پہ ہاتھ رکھا تھا اور زری کی پلکیں اس کی بات پہ لرز کر رہ گئی تھیں۔

مگر افسوس کہ اس کی پلکوں کی یہ لرزش نہ عبداللہ دیکھ سکا تھا اور نہ نگارش کو نظر آئی تھی۔ اگر دیکھ لیتے تو انہیں بھی یہ پتا چل سکتا تھا کہ اسے بھی ان کی تکلیف پہ تکلیف ہوتی ہے' اسے بھی دکھ ہوتا ہے وہ بھی اندر ہی اندر روتی ہے مگر اس کی تکلیف اس کا دکھ' اس کے آنسو کسی کو نظر نہیں آتے۔

وہ سب اپنے اندر کا غبار نکال لیتے ہیں' اور وہ چپ پڑی بس سنتی رہتی ہے۔ اگر سننے کی بجائے بول سکتی تو یقیناً" نگارش کا ہاتھ پکڑ کر اسے روک لیتی۔ مگر افسوس کہ وہ لاچار تھی بے بس تھی' بے جان تھی۔ عشق نے اسے مار ڈالا تھا اور وہ مر گئی تھی۔

عبداللہ نگارش کے انکار کے باوجود بھی اسے گھر چھوڑنے چلا گیا تھا۔ اور زری اسے روک بھی نہ سکی تھی اور اس بات پہ اس کا دل چھم چھم رویا تھا بارش کی طرح!

☆ ☆ ☆

شام ہوتے ہی بارش شروع ہو گئی تھی اور بارش بھی ایسی طوفانی اور موسلا دھار برسی تھی کہ دیکھنے اور سننے والوں کے دل ہول اٹھے تھے۔ آسمانی بجلی کی کڑک اتنی زوردار ثابت ہو رہی تھی کہ کچن میں کھڑی روٹیاں بناتی علیزے کے ہاتھ اس کی کڑک دار اور خوف ناک آواز پہ کانپ کانپ گئے تھے اور وہ بمشکل روٹی توے پہ ڈالنے میں کامیاب ہو سکی اور دل ہی دل میں دعا پڑھنے لگی۔

"کیا بات ہے علیزے بی بی؟ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟" علیزے کے ہونٹوں کی ذرا سی جنبش سے ہی گل کو اندازا ہو گیا تھا کہ وہ کچھ کہہ رہی ہے۔

"میں کہہ نہیں رہی بلکہ دعا پڑھ رہی ہوں' درود شریف کا ورد کر رہی ہوں۔ سچ ایسی بارش سے تو خوف آ رہا ہے۔" علیزے واقعی اندر سے دہل چکی تھی اور اس کا دہلنا اس کے چہرے سے ہی نظر آ رہا تھا۔

"ہوں! بی بی جی ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔ مجھے بھی بہت ڈر لگ رہا ہے۔" گل بھی بجلی کی کڑک سے سہم چکی تھی۔

"میرا خیال ہے جلدی جلدی کام ختم کر کے ہم بھی اپنے اپنے بیڈ روم میں جاتے ہیں جاؤ زلفی کو بلاؤ' اور اسے کہو کہ صاحب کو بلا لائے۔ کھانا تیار ہے۔" ان چھ ماہ میں اتنا فرق آیا تھا کہ علیزے نے گھر کے ملازموں کے سامنے اسے "صاحب" کہنا سیکھ لیا تھا البتہ اس کے سامنے وہ اب بھی اسے "ڈرائیور" کہہ کر ہی مخاطب کرتی تھی اور دل آور نے اسے کبھی منع بھی نہیں کیا تھا کیونکہ اسے اس کا ڈرائیور کہنا برا نہیں لگتا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ واقعی اپنے آپ کو اس کا ڈرائیور ہی سمجھتا تھا۔

"جی! ابھی کہہ دیتی ہوں۔" گل باہر نکل گئی تھی اور گل کی طرف سے پیغام ملتے ہی زلفی دل آور کو بلانے چل دیا تھا مگر اگلے پانچ چھ منٹ کے بعد وہ یونہی واپس لوٹ آیا تھا۔

"کیوں؟ کیا کہا صاحب نے؟" علیزے سب کاموں سے فارغ ہو کر ہاتھ دھونے کے لیے سنک کی طرف بڑھ چکی تھی۔

"کہنا کیا تھا وہ تو کچھ بولے ہی نہیں۔ بہت گہری نیند میں ہیں۔ میں دو چار آوازیں دینے کے بعد واپس آ گیا۔" زلفی نے کندھے اچکائے تھے اور علیزے سر ہلا کے رہ گئی کیونکہ وہ واقعی بھول چکی تھی کہ اسے بخار ہے۔ اور

اس کے منشی قادر نے اسے فون کر کے بتایا بھی ہے۔

"ٹھیک ہے۔ تم لوگ کھانا کھاؤ۔ میں پھر دروازہ بند کر کے چلی جاؤں گی۔" علیزے کو اندرونی دروازہ بند کرنے کی فکر تھی کیونکہ دل آور روزانہ رات کو یہ ڈور بڑی احتیاط اور بڑے دھیان سے بند کر کے سونے کا عادی تھا۔

"آپ نے کھانا نہیں کھانا کیا؟" گل نے ٹھٹک کر پوچھا تھا۔

"نہیں! ابھی بھوک نہیں ہے بعد میں کھالوں گی۔ فی الحال تم لوگ کھاؤ۔" وہ کہہ کر باہر نکل آئی تھی' اور کچھ دیر بعد وہ لوگ کھانا کھا چکے تو علیزے نے تمام دروازے اور تمام لائٹس بند کرنے کے بعد اوپر اپنے بیڈ روم کی طرف رخ کیا تھا لیکن بیڈ روم میں قدم رکھتے ہی اس کے قدم ٹھٹک کر رک گئے تھے کیونکہ بیڈ روم کی تمام لائٹس آف تھیں اور ہر طرف گھرے اندھیرے کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

اور اس اندھے ماحول میں بارش کا شور' بادلوں کی گرج اور آسمانی بجلی کی کڑک دار آوازیں حقیقتاً" اک بھیانک سا تصور پیدا کر رہی تھیں جس کی وجہ سے علیزے کے دل میں ایک خوف کی لہر دوڑ گئی۔ اور اس نے بے ساختہ کافی عجلت سے سوئچ بورڈ پہ ہاتھ مارا تھا جس سے اچانک بیڈ روم میں کھٹا کھٹ کئی روشنیاں جگمگا اٹھی تھیں اور اس نے بڑی بے تابی سے بیڈ کی طرف دیکھا۔ جہاں وہ اوندھے منہ بے سدھ پڑا نظر آیا۔

"ڈرائیور!" وہ بے ساختہ اس کی طرف بڑھی تھی۔

"ڈرائیور!" اس نے ایک بار پھر اسے پکارا تھا مگر وہ ایسا بے سدھ پڑا تھا کہ اس پہ کوئی بھی آواز اثر نہیں کر رہی تھی۔

"ڈرائیور پلیز! اٹھو! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" علیزے نے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی کیفیت بتائی تھی' مگر وہ کچھ سنتا بھی تو۔

"ڈرائیور پلیز! اٹھو۔" مجبوراً" علیزے کو اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھنا پڑا تھا لیکن اس کے جسم کی حدت سے علیزے کے خوف زدہ سے حواس ٹھکانے پہ آ گئے تھے اور وہ بدک کے رہ گئی اس کا جسم آگ کی طرح تپ رہا تھا اور اس آگ نے اسے بے سدھ کر رکھا تھا۔ اتنا تیز بخار؟ وہ اسے اس طرح بخار میں پھنکتے دیکھ کر پشیمان سی ہوئی تھی' کیونکہ اسے تو عصر کے وقت ہی قادر نے فون کر کے بتا دیا تھا کہ صاحب کو بہت تیز بخار ہے لیکن علیزے نے ہی پلٹ کر اس کی کوئی خیر خبر نہیں لی۔

"کیوں؟ میں کیوں لیتی اس کی خبر؟ اسے بخار کی بجائے کچھ بھی ہو میری بلا سے۔" اس کے اندر کی نفرت پھنکاری تھی۔ تمہارے خیال میں اگر اس طرح تمہیں کچھ ہو جاتا تو کیا وہ یہ کہہ سکتا تھا کہ اسے بخار کی بجائے کچھ بھی ہو میری بلا سے۔ انسان کے سینے کے اندر موجود دل بنیادی طور پہ سرخ خون سے بنا گوشت کا ایک لوتھڑا ہے جو انسان کے جذبات احساسات اور حالات کے سرد و گرم کے اثر سے جمتا اور پگھلتا ہے اور وہ اس جمنے اور پگھلنے میں بھی صدیوں اور سالوں کا نہیں بلکہ سیکنڈز کا وقت لیتا ہے' پل میں پگھل بھی سکتا ہے اور پل میں جم بھی سکتا ہے۔

اور کبھی کبھی یہ کام انسان کے کسی ایک خیال' کسی ایک سوچ سے بھی ہو جاتا ہے۔

ادھر کوئی خیال ذہن کو چھو کے گزر جائے اور ادھر دل جیسا لوتھڑا پگھل جائے۔ علیزے کے ساتھ بھی اس وقت یہی ہوا تھا۔

ادھر اس کی نفرت پھنکاری تھی اور ادھر ذہن کے اک خیال اور خیال میں لپٹے سوال نے اس کے دل کو پگھلا کے رکھ دیا تھا آخر وہ اک موم کی گڑیا تھی' اس کا دل پتھر کیسے ہو سکتا تھا؟

وہ پھر سے اس کی طرف متوجہ ہونے پہ مجبور ہو گئی تھی اور اسے متوجہ ہونے کے بعد احساس ہوا تھا کہ وہ اس

وقت اسے جس حلیے میں چھوڑ کر گئی تھی وہ ابھی تک اس حلیے میں تھا یہاں تک کہ وہ چینج بھی نہیں کر سکا تھا حالانکہ وہ اس کے کپڑے نکال کے رکھ گئی تھی لیکن پھر بھی وہ بیڈ سے اٹھ نہیں سکا اور اسی چیز کا علیزے کو افسوس ہو رہا تھا اور اس کے اس افسوس اور پشیمانی نے اسے دل آور کے قریب کر دیا۔

"ڈرائیور!" اس نے دوبارہ اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے اسے پکارا تھا۔ البتہ اب اس پکار میں خوف نہیں تھا بلکہ فکر تھی' تشویش تھی' پریشانی تھی۔

"اف اب کیا کروں۔ اسے تو کچھ ہوش نہیں ہے۔" علیزے کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا وہ اوندھا پڑا تھا اور اسے سیدھا کرنا بھی اس کے لیے محال تھا آخر وہ اتنی ہمت اور اتنی طاقت کہاں سے لاتی مگر اس وقت اپنی ہمت اور اپنی طاقت آزمانے کے سوا اور کوئی چارا بھی تو نہیں تھا۔

اور یہ اس کی ہمت ہی تھی کہ اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا کے دل آور کے گال کو تھپکا تھا' اسے چھوا تھا' اور اسے ہوش میں لانے کی پوری پوری کوشش کی تھی۔

"ڈرائیور! پلیز ہوش میں آؤ۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ پلیز۔ پلیز آنکھیں کھولو۔"

علیزے نے اس کے چہرے کو اس کے بازو کو اس کے کندھے کو ہلا کے دیکھا تھا مگر جواب ندارد۔ اور جب وہ کسی طور بھی ہوش میں نہ آیا تو اس نے اپنی ہمت کے ساتھ ساتھ اپنی طاقت بھی آزما ڈالی تھی۔ اور اپنے دونوں ہاتھ اس کے کندھے پہ جما کے اسے سیدھا کرنے کی کوشش کی تھی۔

اور کندھے کو پیچھے کی طرف دھکا لگنے پہ دل آور گہری غنودگی میں ذرا سا کسمسایا تھا اور اس کی اس کسمساہٹ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے علیزے نے اسے فوراً" سیدھا کر لیا تھا۔

جس سے اسے کافی تسلی ہوئی تھی حالانکہ اس تسلی کے چکر میں وہ خود اچھی خاصی ہانپ گئی تھی۔ "ڈرائیور پلیز! کچھ تو کہو۔ میری طرف دیکھو تو سہی۔ میں اکیلی ہوں کیسے سنبھالوں تم کو؟" علیزے اس کے مضبوط ہاتھوں اور کشادہ پیشانی کو چھو چھو کر بخار کی شدت محسوس کرتی مزید پریشان ہو رہی تھی' کیونکہ اس کا جسم حقیقتاً" بہت تیز بخار میں جھلس رہا تھا۔

"ڈرائیور! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ آنکھیں کھولو پلیز۔ تم کچھ کہتے کیوں نہیں؟ پلیز۔" اس نے دل آور کی ایسی نیم بے ہوش اور بے خبری حالت پہ روہانسے لہجے میں کہتے ہوئے اس کی شرٹ کا گریبان پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا تھا۔

"اف میرے اللہ! میں کیا کروں اب؟" وہ بیڈ پہ اس کے پہلو میں بیٹھی اپنا سر تھام کے رہ گئی تھی۔

"بیٹا! جب بہت تیز بخار ہوتا تو پھر برف کی ٹھنڈی پٹیاں بھگو کر رکھتے ہیں اس سے بخار کی شدت کم ہو جاتی ہے۔" علیزے کی سماعتوں میں آسیہ آفندی کی آواز گونجی تھی بہت عرصہ پہلے عون کو بخار ہوا تھا اور آسیہ آفندی اس کے سرہانے بیٹھی برف کے ٹھنڈے پانی میں پٹیاں بھگو بھگو کر رکھ رہی تھیں جب علیزے نے حیرت سے سوال کیا تھا اور اس سوال کا جواب آج اس کے کام آ گیا تھا۔

"برف کی ٹھنڈے پانی کی پٹیاں۔" اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا تھا اور وہ یکدم اٹھ کھڑی ہوئی۔ بڑی تیزی سے بیڈ روم سے نکل کر نیچے کچن میں آئی اور فریج سے برف کے کیوبز نکال کر ایک بڑے سے باؤل میں ڈال کے کپڑے کی دو تین پٹیاں بنا کر اوپر لے آئی تھی اور اپنے پیچھے بیڈ روم کا دروازہ بند کر ڈالا۔ لیکن اس کے ماتھے پہ پٹیاں رکھنے سے پہلے علیزے کی نظر دل آور کے حلیے کی سمت اٹھی تو اسے بڑی الجھن کا احساس ہوا تھا اس کی شرٹ کے بٹن گریبان تک بند تھے' پینٹ کا بیلٹ بھی ہنوز بندھا ہوا تھا اور بلیک کلر کی جرابیں بھی اس کے پیروں میں جوں کی توں موجود تھیں۔

اور اسے بخار کی حالت میں اس طرح ہر طریقے سے جکڑے ہوئے دیکھ کر علیزے سے برداشت نہیں ہوا تھا

اور اس نے مجبوراً "خود پہ ضبط کرتے ہوئے ٹھنڈے پانی کا باؤل سائیڈ ٹیبل پہ رکھ کر اپنا لرزتا کانپتا ہوا ہاتھ اس کی شرٹ کی طرف بڑھا دیا تھا اور اس نے انتہائی ہمت اور حوصلے سے کام لیتے ہوئے اس کی شرٹ کا پہلا بٹن کھولا تھا مگر اس ایک بٹن کو کھولتے کھولتے اس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی تھی۔

بے شک وہ دونوں میاں بیوی ہونے کے باوجود بھی نازک اور گداز جذبات سے ابھی کوسوں دور تھے' لیکن شرم و جھجک سے تو دور نہیں تھے نا اور اس شرم کے ہاتھوں ایسی سچویشن میں بھی علیزے پہ اک عذاب آن وارد ہوا تھا جس کو عبور کرنا اس کے لیے ایک اور جان جوکھم کا مرحلہ تھا۔ اور اس مرحلے کو طے کیے بغیر اور کوئی چارا بھی نہیں تھا۔

سو علیزے نے اس آزمائش کا بیڑہ بھی اپنے کندھوں پہ اٹھاتے ہوئے ایک ایک کر کے اس کی شرٹ کے سارے بٹن کھول دیے تھے' مگر اس کے اوپر تقریباً "جھک کر اس کی پینٹ سے بیلٹ کا ہک کھولتے ہوئے اسے دانتوں پسینہ آگیا تھا' شرم اور جھجک نے اس کے چھکے چھڑا دیے تھے اور ادھر دل تھا کہ بری طرح دھڑک اٹھا تھا کیونکہ اسے آج وہ کام کرنا پڑ رہے تھے جو وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ لیکن پھر بھی اس نے کر ہی لیے تھے' ہمت نہیں ہاری تھی اور ضبط سے کام لیا تھا۔ ورنہ دل آور کے ایسے کام وہ کرتی۔؟ کبھی ہو ہی نہیں سکتا تھا مگر کیا کرتی سینے کے اندر بیٹھا سرخ خون کا لوتھڑا اس وقت پگھلا ہوا تھا اور اسے وہ کام بھی کرنا پڑے تھے جو اس کے لیے انتہائی شرم کا باعث تھے۔

اور وہ بڑی ہمت اور بڑی مشکل سے اس کی پینٹ سے بیلٹ کھینچ کر نکالنے میں کامیاب ہو سکی تھی' اور پھر ہانپتے ہوئے اس نے اک گہری سانس خارج کی تھی۔

لیکن پھر بھی اس کی مشقت کا وقت ختم نہیں ہوا تھا کیونکہ ابھی اس کے پیروں سے جرابیں اتارنا باقی تھا' اس لیے وہ اپنی دھڑکنوں کو اور اپنی سانسوں کو ہموار کرتی ہوئی اس کے پیروں کی سائیڈ پہ آگئی تھی' اور پھر ذرا سا جھک کر اس کی پینٹ کے پائنچے اوپر کرتے ہوئے اس کی جرابیں اتارنے لگی۔

اور اس کی جرابیں اتارتے ہوئے علیزے کے ہاتھ اس کے پیروں سے بھی ٹچ ہوئے تھے جس کی وجہ سے اسے دل آور کے پیروں سے بخار کی شدت سے اک بھاپ سی نکلتی ہوئی محسوس ہوئی تھی اور بخار کی شدت اور گرم بھاپ کے احساس کو کم کرنے کے لیے علیزے نے بے ساختہ اپنے ٹھنڈے ہاتھوں کی جان افزا راحت اس کے پیروں کو سونپ دی تھی' جس سے دل آور کے جسم میں ایک لہر سی دوڑتی ہوئی اس کے دل و دماغ اور اس کی روح تک جا پہنچی تھی' وہ انتہائی گہری غنودگی سے بھی کسمسا گیا تھا۔

"علیزے۔۔۔!" اس کے ہونٹوں سے اس کا نام ادا ہوا تھا' غنودگی میں بھی وہ اس کا لمس پہچان گیا تھا۔

"ڈرائیور!" علیزے اس کے پیروں کو سہلاتے سہلاتے اس کی آواز پہ فوراً "اس کے قریب آئی تھی مگر وہ اس کے پکارنے پہ اب بھی کوئی جواب نہیں دے سکا تھا۔

اس لیے علیزے باقی سارے کام چھوڑ چھاڑ کے اس کے قریب بیڈ پہ اس کے پہلو میں ہی بیٹھ گئی تھی اور رفتہ رفتہ اس کے ماتھے پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں بھگو بھگو کر رکھنے لگی۔ اور اس کے اس عمل کو ابھی پندرہ منٹ ہی گزرے تھے کہ اچانک ہی لائٹ چلی گئی' اور اتنے گہرے اور گھپ اندھیرے میں علیزے اپنی جگہ پہ جیسے جوں کی توں جم کے رہ گئی تھی مگر اس کے باوجود اس نے اندھیرے میں ہی ادھر ادھر دیکھنے کی کوشش کی تھی کہ شاید کوئی ایسی چیز نظر آ جائے جس سے وہ کوئی تو لائٹ روشن کر سکے۔

شاید اللہ کو اس پہ ترس آگیا تھا کہ اگلے دو سیکنڈ میں دل آور کے موبائل پہ کسی ایس ایم ایس کی مدھم سی بیپ کے ساتھ سائیڈ ٹیبل پہ رکھا موبائل روشن ہو گیا تھا۔ اور علیزے کو امید کی کرن نظر آگئی تھی' اس نے فوراً" ہاتھ بڑھا کر اس کا موبائل اٹھا لیا تھا۔

اور اس موبائل کی روشنی میں اس نے کینڈل اسٹینڈ ڈھونڈنا شروع کر دیا تھا جو اسے سائیڈ ٹیبل کے سب سے نچلے دراز میں سے دستیاب ہوا اور پھر اس کی سگریٹ کے پیکٹ کے ساتھ رکھے لائٹر سے موم بتی جلا دی تھی جس کی مدھم سی لو بیڈ روم میں لرزنے لگی اور اس لرزتی ہوئی لو میں وہ دوبارہ دل آور کی طرف متوجہ ہوئی وہ ہنوز بے سدھ پڑا ہوا نظر آ رہا تھا۔

"ڈرائیور! آنکھیں کھولو نا۔ پلیز دیکھو لائٹ بھی نہیں ہے مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ اور۔۔۔ اور باہر بارش بھی بہت تیز ہے۔ اتنی خوف ناک سی آوازیں آ رہی ہیں۔"

علیزے اپنے ٹھنڈے ہاتھوں سے اس کے چہرے کو چھو رہی تھی اور موم بتی کی لو کی طرح دل آور کی پلکوں پہ ہلکی سی لرزش ہوئی تھی' جس سے علیزے کو مزید حوصلہ ہوا تھا۔

"ڈرائیور پلیز! اب بس کرو ٹھیک ہو جاؤ۔ دیکھو میں تھک گئی ہوں تمہیں بلا بلا کے ایک بار میری آواز تو سنو میری طرف دیکھو تو سہی۔"

اس نے ایک بار پھر اس کے گالوں کو تھپکا تھا اور اپنے چہرے پہ اس کے نرم ہاتھوں کی تھپک سے دل آور کی پلکوں پہ پھر اک جنبش۔۔۔ ہوئی تھی اور اس نے بڑی مشکل سے آنکھیں کھول کر دیکھنے کی کوشش کی تھی مگر اس کوشش میں بھی اس کی آنکھوں میں حیرانی اور بے یقینی تیر گئی تھی۔ موم بتی کی مدھم سی روشنی میں علیزے اس کے بے حد قریب اور عین اس کے سینے کے اوپر جھکی آنکھوں میں ہلکی سی نمی لیے بڑی تشویش اور بڑی فکر سے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"علیزے۔۔۔ تم۔" دل آور کے ہاتھوں میں بھی حرکت ہوئی تھی اور اس نے اپنے چہرے پہ رکھے علیزے کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ کر اس کے ٹھنڈے لمس کو محسوس کیا تھا۔

"ہاں! میں ہی ہوں پلیز ڈرائیور آنکھیں کھولو مجھ سے بات کرو میں' میں بہت پریشان ہوں تمہارے لیے۔ تم اس طرح کیوں پڑے ہو؟ کیوں تھک گئے ہو؟ تم۔۔۔ تم اس طرح بالکل بھی اچھے نہیں لگ رہے۔ تم اتنے سے بخار سے ہار گئے ہو یا کوئی اور وجہ بھی ہے۔" علیزے نے پھر اس کے چہرے کو تھپکا تھا اور دل آور کے چہرے پہ غنودگی کے باوجود بھی ایک استہزائیہ سے احساس کی لہر دوڑ گئی تھی۔

"میں ہار گیا علیزے! میں سب سے ہار گیا میں تم سے بھی ہار گیا۔" اس نے انتہائی بوجھل آواز میں کہتے ہوئے دوبارہ سے پلکیں موندلی تھیں اور علیزے بے چین ہو گئی تھی۔

"ڈرائیور۔" اس نے بڑے بے چین سے لہجے میں پکارا تھا اور دل آور نے پھر سے آنکھیں کھول دی تھیں اور ایک بار پھر قرب کی انتہا کو چھوتی علیزے کو دیکھا تھا۔

"فکر نہ کرو۔ تمہیں اس طرح چھوڑ کر مروں گا نہیں۔ کیونکہ مجھے پتا ہے کہ آج تم بھی مجھے مرنے نہیں دو گی۔ آج تو میری موت کے فرشتے کو بھی سوچ سمجھ کر آنا ہو گا۔" دل آور نے عجیب بہکے بہکے اور بے ربط سے لہجے میں کہتے ہوئے علیزے کے چہرے کے دائیں بائیں جھولتے بالوں کو آہستگی سے پیچھے ہٹایا تھا۔

"پلیز! ایسی باتیں مت کرو۔ مجھے پہلے ہی بہت ڈر لگ رہا ہے۔" وہ خفگی سے بولی تھی۔

"اور مجھے ڈر بھی لگ رہا ہے اور پیاس بھی لگ رہی ہے۔" دل آور کی نظریں اس کے وجود کی ہوشربا خوبصورتی کو چھو کر رہ گئی تھیں اور علیزے اس مدھم اور طلسمی سی روشنی میں بھی اس کی نظروں کی حدت سے دہک اٹھی تھی اور فوراً" ہی اک جھٹکے سے سیدھی ہو بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ تپ اٹھا تھا۔

"پانی پیو گے۔" اس نے خود کو اس سنسناتے ہوئے احساس سے نکالنے کی کوشش کی تھی۔

"پلادو۔" اس نے بہت ڈھیلے ڈھالے انداز میں کہا تھا اور علیزے بمشکل خود کو سنبھالتی ہوئی گلاس میں پانی انڈیلنے لگی اور پھر اسی مشکل سے اسے پلایا بھی تھا۔

"شکر ہے کہ بخار پہلے سے کم ہو چکا ہے۔" علیزے کو اس کے جسم کی تپش میں ذرا کمی محسوس ہوئی تھی۔

"افسوس کہ کیوں کم ہوا ہے۔" دل آور نے تھک کر اپنا سر دوبارہ تکیے پہ ڈال دیا تھا اور علیزے کی رات یونہی اس کے سرہانے بیٹھے بیٹھے گزر گئی تھی۔

البتہ دل آور کی رات ہوش اور بے ہوشی کے درمیان ڈولتے ہوئے گزری تھی اور اس لیے علیزے کو رات بھر جاگنا پڑا اور اس کی تیمارداری کرنا پڑی۔ لیکن فجر کی اذان ہوتے ہی وہ اس کے پاس سے اٹھ گئی تھی اور اسے اکیلا چھوڑ دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

رات بہت اندھی بارش برسی تھی۔ اس لیے آج کی صبح بہت ٹھنڈی اور بہت تازہ محسوس ہو رہی تھی۔

لیکن اس کے باوجود بھی نجانے کیوں علیزے کو نہ ٹھنڈک محسوس ہو رہی تھی اور نہ تازگی۔ وہ دل آور کے ساتھ صرف اس کی خاطر صرف اس کی فکر میں جاگ کر بہت عجیب سی ہو گئی تھی' اس کا ذہن کسی اور سمت میں بھٹک نکلا تھا اور اس بھٹکے ہوئے ذہن کے ساتھ وہ نماز پڑھنے کے بعد اس کے لیے ناشتا بنا کر لے آئی تھی کیونکہ اسے پتا تھا کہ دل آور نے کل شام سے کچھ نہیں کھایا۔

مگر ناشتے کی ٹرے لے کر بیڈ روم میں داخل ہوتے ہی پورے بیڈ روم میں سگریٹوں کا دھواں بھرا تھا اور باہر کے ٹھنڈے اور تازہ ماحول سے اندر آتے ہی اس کا دم گھٹ گیا تھا' اس لیے ذرا سنبھلتے ہی وہ ہاتھ میں پکڑی ٹرے لے کر ٹیبل کی طرف بڑھ گئی تھی اور ٹرے ٹیبل پہ رکھنے کے بعد دل آور کے قریب آئی' وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھا سگریٹ پھونکنے میں مشغول تھا۔

"ڈرائیور پلیز! بس کرو تم یہ سگریٹ چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟" اس نے آج دوسری بار دل آور کے ہونٹوں سے سگریٹ چھین لیا تھا اور اس کا ٹکڑا ایش ٹرے میں مسل ڈالا تھا۔

اور دل آور نے بیڈ کے قریب کھڑی علیزے کو دیکھتے ہوئے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ رکھا لائٹر اور سگریٹ کا پیکٹ دوبارہ اٹھا لیا تھا۔ جسے دیکھ کر علیزے کو مزید چبھن ہوئی تھی۔

"ہونہہ! سگریٹ اس لیے نہیں چھوڑتا۔ کیونکہ یہ میرے ساتھ ساتھ جلتا رہتا ہے' سلگتا رہتا ہے۔" اس نے کہتے ہوئے ایک اور سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبا لیا تھا اور اسے ابھی لائٹر سے شعلہ دکھا ہی رہا تھا کہ علیزے نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

"پلیز! چھوڑ دو۔" علیزے کا لہجہ اور انداز ہی کچھ ایسا تھا کہ دل آور نے بے ساختہ اس کے چہرے کی سمت دیکھا تھا۔

"چھوڑ دوں۔" وہ اس سے جیسے آخری بار اجازت چاہ رہا تھا۔

"ہاں۔! چھوڑ دو۔" اس نے آہستگی سے سرہلایا تھا۔

"لو چھوڑ دیا۔" دل آور نے بڑے سکون اور بڑے اطمینان سے کہہ کر سگریٹ ہونٹوں سے نکال کر دو ٹکڑے کر کے ایش ٹرے میں ڈال دیا تھا اور پھر لائٹر اور سگریٹ کا پیکٹ اپنی ہتھیلی پہ رکھ کے اس کے سامنے کر دیا علیزے نے اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے اس کی ہتھیلی پہ رکھا لائٹر اور سگریٹ کا پیکٹ اٹھا کر پلٹ کے ڈسٹ بن میں ڈال دیا تھا۔

"اور کچھ۔" وہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"مانیں گے۔؟" علیزے نے بھی جواباً اسے سوالیہ نظروں سے ہی دیکھا تھا۔

"ہمت ہوئی تو مانوں گا۔ وعدہ نہیں کرتا۔" اس نے کافی ڈھیلے ڈھالے انداز میں کہا تھا۔

"پھر ایک بات کہوں تم سے۔؟" وہ آہستگی سے چلتی ہوئی کھڑکی میں آکھڑی ہوئی تھی اور کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیے تھے اور دل آور نے اپنا سر بیڈ کراؤن سے ٹکاتے ہوئے اپنے اعصاب ڈھیلے چھوڑ دیے تھے کہ نجانے اب وہ کیا بات کہنے والی ہے کہ جس سے پہلے وہ اس طرح تمہید باندھ رہی ہے۔

"تم ایسا کرو۔ زری کے ہو جاؤ۔" علیزے نے بے حد آہستگی سے اور بے حد دھیمے لہجے میں اتنی بڑی بات کہہ دی تھی کہ دل آور نے یکدم کرنٹ کھا کے اس کے چہرے کو دیکھا تھا مگر وہ اس کی سمت پشت کیے کھڑی تھی اس لیے اس کی نظروں کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

"میں جانتی ہوں تمہیں میری بات عجیب لگے گی کہ پہلے میں ہی کہتی تھی کہ مجھے اپنا لو۔ اور اب میں ہی کہہ رہی ہوں کہ زری کو اپنا لو۔ مگر یہ سچ ہے۔ یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ مجھے تمہاری نہیں۔ صرف تمہارے نام کی ضرورت تھی۔ جو مجھے مل چکا ہے۔ جبکہ زری کو صرف تمہارے نام کی نہیں۔ بلکہ تمہاری بھی ضرورت ہے اور نہ ہی میرے دل میں کوئی اسپیشل فیلنگز ہیں تمہارے لیے۔ مگر پھر بھی۔ پھر بھی محض ایک رات صرف ایک رات تمہیں اس طرح بے ہوشی کی حالت میں دیکھ کر میرا یہ حال ہو گیا ہے کہ میں رات بھر سو نہیں سکی۔ میں کھانا نہیں کھا سکی' یہاں تک کہ اپنے آپ کو تم سے دور بھی نہیں رکھ سکی۔

اور تم۔ تم تو زری کو چاہتے بھی ہو' تمہیں اس سے محبت بھی ہے' اور تمہارے دل میں اسپیشل فیلنگز بھی ہیں اس کے لیے۔ تو پھر۔ تو پھر تم اسے بے ہوشی کی حالت میں کیسے دیکھتے ہو گے؟ کیسے برداشت کرتے ہو گے؟ کیسے اپنے آپ کو اس سے دور رکھتے ہو گے؟ میرا تم سے نفرت میں یہ حال ہو گیا ہے تو تمہارا اس سے محبت میں کیا حال ہوتا ہو گا؟ ہے نا ڈرائیور میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا۔" علیزے عجیب بے چین سے لہجے میں کہتی ہوئی اس کی سمت پلٹی تھی۔ مگر دل آور چپ کے سوا کچھ نہیں کہہ سکا تھا۔

"پلیز ڈرائیور! چپ مت رہو کچھ کہو۔ میں تمہارے منہ سے تمہاری زبان سے اور تمہارے الفاظ سے کچھ سننا چاہتی ہوں اور تم جانتے ہو کہ اس وقت چپ نہیں رہنا چاہیے جب کچھ کہنا ضروری ہو؟"

علیزے نے اسے کچھ کہنے پہ اکسایا تھا۔

"میں تمہارا ہوں علیزے۔" دل آور کا لہجہ اور الفاظ انتہائی دوٹوک سے تھے البتہ آواز کافی گمبھیر ہو رہی تھی۔

"مگر میں تمہاری نہیں ہوں ڈرائیور!" اس کا جواب برجستہ تھا۔

"ہونہہ کون میرا ہے اور کون نہیں؟ یہ سوچنا چھوڑ دیا ہے۔ البتہ میں کس کا ہوں۔ اب صرف یہ سوچتا ہوں۔" دل آور کے سنجیدہ لہجے میں استہزا کی آمیزش تھی۔

"تو پھر تم بہت بڑی غلطی پر ہو۔" علیزے کا لب و لہجہ بھی استہزائیہ ہوا تھا۔

"میں جب بھی ہوتا ہوں "غلطی" پر ہی ہوتا ہوں' اور میں نے آج تک زندگی میں غلطیاں ہی کی ہیں' بہت بڑی غلطیاں کی ہیں اس لیے سمجھ لو کہ ایک غلطی اور سہی۔"

اس نے بڑی لاپروائی سے کہتے ہوئے دوبارہ اپنا سر بیڈ کراؤن سے ٹکا کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔

"مگر تم کس کے ہو' اور کس کے نہیں ہو' مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" علیزے اس کی ذات کی نفی کرنے پہ تلی ہوئی تھی۔

"لیکن میں کس کا ہوں اور کس کا نہیں ہوں۔ مجھے اس سے بہت فرق پڑتا ہے۔" وہ اپنی ہی دھن میں تھا۔

"ہاں! سچ کہہ رہے ہو تم۔ فرق پڑتا ہے' تمہیں فرق پڑا ہے۔ اس لیے تو یہ حال بنائے بیٹھے ہو ورنہ یہ سگریٹ یہ دھواں یہ حلیہ کس لیے ہے آخر؟ فرق کے لیے نا' کیونکہ تم کسی کے ہو تمہیں اس سے بہت فرق پڑتا ہے۔ بالکل ایسے جیسے زری کو فرق پڑا ہے۔ بس تم دونوں کے فرق میں فرق صرف اتنا ہے کہ وہ بے ہوش بستر پہ پڑی ہے اور تم ہوش و حواس میں ہو کر بھی بستر پہ پڑے ہو۔" علیزے ضبط کرتے کرتے بھی جیسے بپھری گئی تھی اور اس کی بات پہ بے ساختہ حیران ہوتے ہوئے وہ بیڈ سے اٹھ کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

"ہوں! تو تمہارا خیال ہے کہ میں زری کا غم منا رہا ہوں؟" دل آور نے براہ راست نظریں اس کے چہرے پہ جما دی تھیں اور علیزے خود پہ ضبط کر کے اس کی نظروں کو نظر انداز کرتی ہوئی وہاں سے ہٹ گئی تھی مگر دل آور نے اپنی مضبوط گرفت سے اس کی نازک کلائی دبوچتے ہوئے اسے دوبارہ اپنے سامنے کھڑا کر دیا تھا اور اس افتاد میں علیزے یہ بھی محسوس نہ کر سکی کہ اس کے ہاتھ کی گرفت اب بھی کتنی گرم ہے۔

"جواب دو۔" اب وہ اسے جواب پہ اکسا رہا تھا۔

"میرا خیال نہیں میرا یقین ہے۔" وہ اپنے بیان پہ قائم تھی۔

"تو پھر اس بار تم خود بہت بڑی غلطی پر ہو۔ میں کسی کا بھی کوئی غم نہیں منا رہا۔" اس نے اپنے الفاظ پہ زور دے کر کہا تھا اور علیزے کے ہونٹوں پہ ایک طنزیہ سی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

"ہاں! یہ بات تو میں بھول ہی گئی تھی کہ تم غم نہیں مناتے۔ تم جشن مناتے ہو۔" اس نے ایک بھرپور طنز کیا تھا۔ اور دل آور نے اس کے طنز پہ لب بھینچتے ہوئے اس کی کلائی چھوڑ کر اپنے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام لیا تھا اور ایک بار پھر براہ راست اس کی گولڈن براؤن آنکھوں میں جھانکا تھا۔

"آج تک تمہاری ذات پہ تو کوئی جشن نہیں منایا میں نے؟ منایا ہو تو بات کرو۔"

دل آور نے بھی جواباً طنزیہ لہجے میں خاصا چبا کر پوچھا تھا۔

"یہ کیوں نہیں کہتے کہ تم نے آج تک کس کس کی ذات پہ جشن نہیں منایا؟ نہ منایا ہو تو بات کرو؟" علیزے نے اس کا جملہ بدل کے اسے ہی جواب دیا تھا اور دل آور اس کے جواب پہ جھنجلا گیا تھا۔

"علیزے پلیز! اپنی بات کرو' صرف اپنی بات۔ میں نے کسی کے ساتھ کبھی کچھ نہیں کیا۔ جو بھی کیا ہے' تمہارے ساتھ کیا ہے۔ جشن مناؤں گا تو تمہاری ذات کا مناؤں گا۔ غم مناؤں گا تو تمہارا مناؤں گا کیونکہ میں نے اپنی زندگی میں کسی کو اس نظر سے دیکھا ہے تو تمہیں دیکھا ہے۔ کسی کو اس لمس سے چھوا ہے تو تمہیں چھوا ہے۔ میں تم سے چھپا ہوا نہیں ہوں جیسا بھی ہوں تمہارے سامنے ہوں۔ میں مجرم ہوں تو بھی تمہارا ہوں۔ میں مظلوم ہوں تو بھی تمہارا ہوں۔ مجھے سزا دینی ہے تو تم دو۔ مجھے بخشنا ہے تو تم بخشو۔ دوسرے کی بات کیوں کرتی ہو؟ دوسروں کی بات مت کرو۔ میں تمہارا ہوں اور صرف تمہارے سامنے جوابدہ ہوں۔"

اس نے کافی بری طرح سے جھنجلاتے ہوئے علیزے کو ٹوک دیا تھا اور علیزے نے جواباً اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔

"تو تم صرف میرے سامنے جوابدہ ہو؟" اس نے سنجیدگی سے پوچھتے ہوئے دل آور کے ہاتھ اپنے چہرے سے ہٹا دیے تھے۔

"ہاں! صرف تمہارے سامنے۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"تو پھر جواب دو مجھے کہ زری کے ساتھ یہ کیوں کیا تم نے؟" علیزے نے آج اسے اپنی عدالت کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا تھا اور اس کے اس سوال پہ کٹہرے میں کھڑے مجرم نے اک جھٹکے سے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

نبیلہ عزیز

دو دل

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نبیل حیات دونوں بہن بھائی ہیں' مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے' وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پہ رنگ چکی ہے' جس کے پیش نظر فائزہ بیگم' نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں' لیکن مدحیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے' جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے' مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے' مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا' بے بسی اور مجبوری سے تنگ آ کر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے' لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے بابا امتیاز مل جاتا ہے' جو اسے کام کی آفر کرتا ہے' جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے' اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے' وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے' وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آویز شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے' وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے' اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا' اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دلاتی ہیں۔

چھتیسویں قسط

مگر اس کے اس دیکھنے میں بھی ایک عجیب سا تاثر تھا۔ اک عجیب سی کیفیت تھی۔
جیسے وہ کچھ کہنے کے لیے الفاظ تلاش کر رہا ہو اور اسے یہ الفاظ ذرا دیر کے بعد میسر آنے ہوں۔

"کیا کیا ہے میں نے زری کے ساتھ ۔۔۔؟" وہ علیزے کے سوال کے بعد چند سیکنڈز کے توقف سے گویا ہوا تھا۔

"کوئی وعدہ کیا ہے اس کے ساتھ؟ کوئی قسم کھائی ہے اس کے لیے؟ محبت کا اظہار کیا ہے اس کے سامنے؟ کوئی امید دلائی ہے اسے؟ یا حوصلہ افزائی کی ہے اس کی؟ ہوں! بتاؤ مجھے کیا کیا ہے میں نے اس کے ساتھ۔" دل آور اس معاملے میں بالکل کھرا تھا اس لیے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بات کر رہا تھا۔

"تو کیا واقعی تم نے زری کے ساتھ کچھ نہیں کیا ۔۔۔؟" وہ بھی اسے بغور تنقیدی' جانچتی ہوئی اور بے یقین سی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"نہیں! میں نے واقعی زری کے ساتھ کچھ نہیں کیا ۔۔۔ کبھی وعدہ کیا ہے نہ کبھی قسم کھائی ہے ۔۔۔ نہ اظہار کیے ہیں اس سے ۔۔۔ اور نہ ہی امیدیں دلائی ہیں اسے ۔۔۔ محبت کے اس سفر میں وہ یہاں تک پہنچی ہے تو اکیلی پہنچی ہے ۔۔۔ میں تو کہیں تھا ہی نہیں میں نے تو اس سے کبھی بات تک نہیں کی ۔۔۔ کبھی میسج نہیں کیا ۔۔۔ کبھی کال نہیں کی ۔۔۔ آج تک اس سے نظر نہیں ملائی۔ آج تک اسے اشارہ نہیں دیا۔ جب بھی کی ہے اس کی عزت ہی کی ہے ۔۔۔ جب بھی کیا ہے اس کا احترام ہی کیا ہے ہمیشہ فاصلے سے ہی دیکھا اسے ۔۔۔ اور ہمیشہ فاصلے پہ ہی رہا اس سے مگر پھر بھی وہ اس حال کو پہنچی ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے آخر؟" دل آور بات کرتے کرتے بے بس سا ہونے لگا۔

"تو کیا تم نے محبت بھی نہیں کی اس سے؟" علیزے آج پتا نہیں کن کن سوالوں کے جواب طلب کر رہی تھی اور دل آور اس کے سوالوں پہ بار بار ٹھٹک رہا تھا' بار بار ٹھہر رہا تھا۔
"بتاؤ نا ڈرائیور؟ تو کیا تم نے محبت بھی نہیں کی اس سے؟" اس نے پھر اپنے سوال پہ زور دیا تھا۔
"اس سوال کا جواب ضروری نہیں ہے۔" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا تھا۔
"کیوں ضروری نہیں ہے؟" وہ بضد ہوئی۔

"کیونکہ یہ میرا اور میرے دل کا معاملہ ہے' میں کس سے محبت کرتا ہوں اور کس سے نہیں کرتا' میں نے اس چیز کو لے کر کبھی کسی کو ڈسٹرب نہیں کیا' اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اس چیز کو لے کر کوئی مجھے بھی ڈسٹرب نہ کرے اس محبت میں' میں جیا ہوں' میں مرا ہوں' میں نے ہمیشہ اپنے دل کی بات اپنے دل تک ہی رکھی ہے' کبھی دماغ تک نہیں لے کر گیا۔ کبھی دل کو دماغ پہ سوار نہیں کیا اور نہ ہی کبھی دنیا پہ ظاہر ہونے دیا ہے کہ اس دل پہ اور اس دماغ پہ کیا بیت رہی ہے؟ تو پھر ۔۔۔ تو پھر ۔۔۔ وہ' وہ کیوں ٹوٹ گئی سب کے سامنے؟ کیوں بکھر گئی وہ ۔۔۔؟ اس نے اگر محبت کی تھی تو اسے یہ بھی پتا ہونا چاہیے تھا کہ محبت صرف وصال کا اور پھولوں سے سجی سیج کا نام نہیں ہے' بلکہ محبت تو ہجر اور کانٹوں سے پروئے ہوئے بستر کا نام ہے ۔۔۔ محبت تو شروع ہی موت سے ہوتی ہے ۔۔۔ اور محبت کرنے والوں کو شیشے کا نہیں بلکہ پتھر کا ہونا چاہیے ۔۔۔ تاکہ محبت کے علاوہ اور کچھ بھی اثر نہ کرے' نہ کوئی سرد گرم' نہ کوئی ہجر و وصال ۔۔۔ نہ کوئی زری اور نہ کوئی علیزے' بس پتھر کے ہو جاؤ اور بے فکر رہو۔"
دل آور نے خاصے بے لچک سے لہجے میں کہتے ہوئے سر جھٹکا اور رخ کھڑکی کی سمت موڑ لیا تھا۔
جبکہ اس کے سامنے کھڑی علیزے اس کے جواب پہ اور اس کے اطمینان پہ اسے دیکھتی رہ گئی اور اس لمحے اسے واقعی یہی محسوس ہوا تھا کہ اس کے سامنے کوئی انسان نہیں بلکہ پتھر کھڑا ہے' جس پہ واقعی اب کچھ بھی اثر نہیں کر سکتا۔

"کیا بات ہے؟ کہاں کھو گئی ہو؟ دیکھنا کہیں محبت کے اس چکر میں پڑ کر تمہیں بھی محبت نہ ہو جائے؟" دل آور نے گردن موڑ کر استہزائیہ سے انداز میں کہتے ہوئے اس کا گال تھپک کر اسے متوجہ کیا تھا اور وہ اس کے اتنے اچانک لمس پہ چونک گئی تھی اور اسے خاصی ناگوار نظروں سے دیکھا تھا۔
"میں اور تم سے محبت؟ ہونہہ کوئی عقل والی بات کرو ڈرائیور۔" اس نے انتہائی زہرخند سے لہجے میں کہہ کر سر جھٹکا تھا اور اس کی بات پہ دل آور عجیب سے انداز میں مسکرا اٹھا تھا۔
"افسوس! جب سے تم زندگی میں آئی ہو ساری عقلیں دھری کی دھری رہ گئی ہیں' زنگ کھا گئی ہیں دماغ میں۔" اس نے اپنی کنپٹی کی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
"بات کو ٹالو مت ۔۔۔ میں تم سے زری کی بات کر رہی ہوں اور تم مجھ سے میری بات کر رہے ہو۔ یہ کیا طریقہ ہے بھلا؟" وہ غصے سے جھنجلائی تھی۔
"یہی تو اصل طریقہ ہے اور تم اس طریقے کو سمجھ ہی نہیں رہیں' زری غیر ہے میرے لیے' اس کی بات کیسے کروں اور کیوں کروں؟ جبکہ تم میری ہو۔ اس لیے ساری باتیں تمہاری ہی کرتا ہوں صرف تمہاری۔"
وہ کہتے ہوئے دوبارہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا تھا جہاں ہوا کے ٹھنڈے جھونکے ہلکورے لے رہے تھے۔
"مجھ سے غلط بات مت کیا کرو ڈرائیور ۔۔۔ میں تمہیں اچھی طرح سمجھتی ہوں۔" اس نے چبا کر کہا۔
"میں نے ہمیشہ کوشش کی ہے کہ تم سے کبھی کوئی غلط بات نہ کروں' میں تمہارے سامنے ایک کھلی کتاب کی طرح ہوں' اور تم ہو کہ سمجھتی ہی نہیں ہو ۔۔۔ مگر پھر بھی دعوا کرتی ہو کہ تم مجھے اچھی طرح سمجھتی ہو حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر تم مجھے اچھی طرح سمجھتیں تو مجھ سے یہ تھوڑی دیر پہلے والے اِدھر اُدھر کے سوال نہ کرتیں۔"
دل آور نے بڑے عجیب سے اور تمسخرانہ انداز میں کہتے ہوئے سر جھٹکا تھا۔
"ہونہہ ۔۔۔! تو تم بھی تو کھلی کتاب کی طرح نہیں ہو نا؟" علیزے نے بھی چوٹ کی تھی۔
"چلو یہ بھی ٹھیک ہے کہ میں تمہارے ۔۔۔ سامنے کھلی کتاب کی طرح نہیں ہوں۔ مگر مجھے یہ بتاؤ کہ اگر میں سچ مچ کھل جاؤں تو کیا کرو گی؟ کیا اس کتاب کو پڑھنے کے بعد عمل بھی کر سکو گی یا نہیں؟" اس نے پلٹ کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔
"ہونہہ! مجھے ایسا کوئی شوق نہیں ہے۔" وہ پھر زہرخند ہوئی تھی۔
"ہوں! تو پھر یہ طے ہے نا کہ میں واقعی ایک کھلی کتاب ہوں لیکن تم مجھے پڑھنے کا شوق ہی نہیں رکھتیں؟" اس نے کندھے اچکائے تھے۔
"دیکھو! میں بحث میں نہیں الجھنا چاہتی ۔۔۔ میں بات کو سمیٹنا چاہتی ہوں۔ بلکہ سب کچھ سمیٹنا چاہتی ہوں۔"
"کیا سب کچھ؟" وہ پھر سوالیہ ہوا۔
"سب کچھ جیسے زری اور تم۔" وہ کہتے ہوئے پرسکون تھی۔
"مطلب ۔۔۔؟" دل آور نے علیزے کے چہرے کو جانچا۔
"مطلب وہی ہے کہ زری کو اپنا لو۔" وہ اپنے کہے پہ قائم تھی۔
"اور تمہیں؟" دل آور کا یہ سوال بھی برجستہ تھا۔
مگر اب کی بار علیزے برجستگی سے کام نہیں لے سکی تھی بلکہ چند ثانیے کے لیے چپ سی ہو گئی تھی اور پھر اس نے اک گہری سانس کھینچتے ہوئے اپنا فیصلہ بھی سنا دیا تھا۔
"مجھے چھوڑ دو ۔۔۔ طلاق دے دو مجھے میری فکر مت کرو میری زندگی گزر ہی جائے گی۔ لیکن تمہارے بغیر وہ مر جائے گی جو تمہاری خاطر سب کو چھوڑ بیٹھی ہے سب کچھ تیاگ دیا ہے اس نے۔" علیزے کہتے کہتے جیسے زچ سی

ہو گئی تھی۔

"تمہیں چھوڑ دوں ۔۔۔ اور زری کو اپنا لوں' واہ کیا کمال کا آئیڈیا ہے میری جان ۔۔۔ یہ آئیڈیا مجھے کیوں نہیں آیا؛ دل آور نے اک طنزیہ سا مذاق کرنے کی کوشش کی تھی۔

"ہاں! مجھے چھوڑ دو ۔۔۔ مگر زری کو اپنا لو ۔۔۔ پلیز ڈرائیور وہ تکلیف میں ہے اسے ۔۔۔"

"بس علیزے بس! وہ تکلیف میں ہے تو اس سے زیادہ تکلیف میں 'میں خود ہوں' تم سب کو یا تو اپنی اپنی تکلیفیں نظر آتی ہیں یا پھر ایک دوسرے کی تکلیفیں نظر آتی ہیں مگر میری تکلیف ۔۔۔ دل آور شاہ کی تکلیف آج تک کبھی کسی کو نظر نہیں آئی ۔۔۔ کبھی کسی کو میرا احساس نہیں ہوا' نہ کسی زری کو' نہ کسی علیزے کو' اور نہ ہی کسی دوست کو' سب کو ہمیشہ اپنا آپ ہی نظر آیا ہے۔ اپنی تکلیف ہی دکھائی دی ہے' میرا درد' میری چوٹ' میرا زخم کسی کو دکھائی نہیں دیا' چاہے وہ تم ہو' چاہے زری ہو' اور چاہے عبداللہ یا نبیل ہوں سب کو اپنی اپنی پروا ہے' سب کو اپنی اپنی فکر ہے۔ میرے بارے میں' میری تکلیف کے بارے میں کبھی کسی نے نہیں سوچا' کبھی کسی کو احساس ہی نہیں ہوا کہ میرے سینے میں بھی دل ہے ۔۔۔ موسم اور محبت اس پہ بھی اثر انداز ہو سکتے ہیں افسوس اس بات کا نہیں کہ کسی کو میری فکر نہیں ہے' کسی کو میری تکلیف کا احساس نہیں ہے' بلکہ افسوس تو اس بات کا ہے کہ سب کی تکلیف پہ میں کیوں تڑپتا ہوں؟ میں کیوں ہلکان ہوتا ہوں؟ مجھے کیوں چین نہیں آتا؟ اور اس کے باوجود سب کی نظر میں برا بھی میں ہی بنتا ہوں۔" وہ علیزے کی بات پہ یکدم غصے سے بھر گیا تھا اور علیزے اس کی اس قدر بلند دھاڑ پہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی' اسے دل آور کے بپھرے ہوئے تیور دیکھ کر خوف آ گیا اور وہ اس کے سامنے سے جاتے جاتے پھر ٹھہر گیا تھا۔

"اور ہاں ۔۔۔ اب جو تم بار بار کہہ رہی ہو نا کہ مجھے چھوڑ دو یہ اتنا آسان نہیں ہے جتنا تم نے سمجھ رکھا ہے۔ تمہارے کہنے پہ میں سب کچھ چھوڑ سکتا ہوں' مگر تمہیں نہیں چھوڑ سکتا' تم کوئی سگریٹ نہیں ہو جس کو تمہارے کہنے پہ اتنی آسانی سے چھوڑ دوں' تم جیتی جاگتی انسان ہو' بیوی ہو' عزت ہو میری' سگریٹ کا ٹکڑا نہیں ہو جسے میں فورا" اٹھا کر ڈسٹ بن میں ڈال دوں' آج ایسی بات کی ہے۔ مجھ سے' آئندہ کبھی مت کہنا' ورنہ میرا خود پہ اختیار نہیں رہے گا اور انجام تمہیں بھگتنا پڑے گا۔"

اس نے انگلی اٹھا کر اسے خاصے غضب ناک طریقے سے وارننگ دی تھی اور علیزے چپ کی چپ رہ گئی۔ جبکہ وہ پلٹ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا غصے سے بیڈ روم سے باہر نکل گیا تھا۔

✡ ✡ ✡

وہ جذبوں کی تجارت تھی یہ دل کچھ اور سمجھا تھا
اسے ہنسنے کی عادت تھی یہ دل کچھ اور سمجھا تھا
مجھے اس نے کہا تھا آؤ نئی دنیا بساتے ہیں
اسے سوجھی شرارت تھی یہ دل کچھ اور سمجھا تھا
ہمیشہ اس کی آنکھوں میں دھنک سے رنگ ہوتے تھے
یہ اس کی عام حالت تھی یہ دل کچھ اور سمجھا تھا

اک بے بسی تھی' اک اضطراب تھا جو نبیل حیات کو کہیں بھی بیٹھنے نہیں دے رہا تھا وہ کئی گھنٹے مسلسل سڑکوں پہ گاڑی بھگانے کے بعد تھک ہار کے گھر واپس آیا تو اس کا دماغ پھر سے اڑ گیا تھا۔ کیونکہ سامنے کا منظر ہی کچھ ایسا تھا کہ وہ جسم سے لے کر جان تک جل گیا تھا' اس کا رواں رواں سلگ اٹھا تھا۔

"بابا!" نبیل پوری قوت سے چیخ اٹھا تھا کیونکہ ممتاز حیات کے ہاتھ میں مومنہ بی بی کا دوپٹہ دیکھ کر اس کا دماغ ہی آؤٹ آف کنٹرول ہو گیا تھا۔

جبکہ ممتاز حیات نے فورا" سے پیشتر اس کا دوپٹہ چھوڑ دیا تھا اور مومنہ بی بی ان کی گرفت سے اپنا دوپٹہ آزاد ہوتے دیکھ کر بڑی بے تابی سے لپک کے نبیل کے پیچھے چھپ گئی تھی یوں جیسے وہ کسی آسمانی آفت سے بچنے کے لیے پہاڑ کے پیچھے چھپ گئی ہے۔

"صاحب! وہ' وہ بڑے صاحب ۔۔۔" مومنہ بی بی کی حلق سے آواز ہی نہیں نکل رہی تھی اس کے حلق میں آنسوؤں کا گولا سا پھنس گیا تھا اور نبیل کے چہرے کی رنگت غصے اور غضب کے مارے نیلی پیلی ہونے لگی تھی اور اس کی آنکھوں کا رنگ بھی پل بھر میں ۔۔۔ سرخ ہو گیا تھا وہ تیر کی طرح ممتاز حیات کی سمت بڑھا تھا۔

"یہ کیا کر رہے تھے آپ؟ آپ کو جرات کیسے ہوئی اس پہ بری نظر ڈالنے کی؟ آپ کو پتا بھی ہے کہ یہ پہلے ہی آپ جیسے کسی زہریلے سانپ کی ڈسی ہوئی ہے' پہلے بھی ایک درندہ اس کی ذات پہ اپنی درندگی آزما چکا ہے' آپ ۔۔۔ آپ پھر بھی ۔۔۔ پھر بھی جانتے بوجھتے ہوئے بھی باز نہیں آئے' آپ کو ذرا خیال نہیں آیا کہ آپ کیا حرکت کر رہے ہیں؟ آپ کو ذرا شرم نہیں آئی کہ یہ آپ کی بیٹی کے برابر کی ہے ۔۔۔؟" نبیل نے انہیں گریبان سے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا تھا۔

"تو خود اسے اپنے گھر میں کیوں رکھا ہوا ہے؟ کیا اپنا دل ٹھنڈا کرتے ہو؟ خوب صورت بھی تو بہت ہے آخر؟" ممتاز حیات نے نبیل کو طعنہ دے مارا تھا اور وہ اس طمانچے نما طعنے پہ کرنٹ کھا گیا تھا۔

"بابا ۔۔۔؟" وہ جیسے گنگ سا ہو گیا تھا۔

"ہاں ۔۔۔! ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہوں آخر اس لڑکی کو اپنے گھر میں رکھنے کا مقصد کیا ہے؟ کیوں اتنے مہربان ہو اس پہ ۔۔۔؟ اگر اتنی ہی مظلوم ہے تو اسے کسی دارالامان میں کیوں نہیں چھوڑ آتے؟ اپنے گھر میں اپنی نظروں کے سامنے کیوں بسا رکھا ہے اسے؟" ممتاز حیات نے تو کمینگی کی حد کر ڈالی تھی اور نبیل یہ سب سن کر ششدر سا ہو گیا تھا۔

"بولو ۔۔۔ بتاؤ مجھے؟ چپ کیوں ہو گئے ہو؟" ممتاز حیات کو نبیل کی چپ پہ اور بھی شہ ملی تھی۔

"اس نے اسے اپنے گھر میں اس لیے رکھا ہوا ہے کہ اس میں انسانیت ہے' لیکن تم میں انسانیت نہیں ہے تم نے تو اپنے گھر پہ بھی بری نظر ڈالنے سے گریز نہیں کیا' تم جانور ہو جانور ۔۔۔ گوشت نوچنے والے جانور تمہیں جہاں گوشت نظر آتا ہے' بھونکنے لگتے ہو' غرانے لگتے ہو' تمہاری آنکھوں کے آگے ہوس کی چربی چڑھ جاتی ہے' تم اندھے ہو جاتے ہو' تمہارا نفس تمہیں ذلیل کر کے رکھ دیتا ہے اور میں ایک ذلیل انسان کے ساتھ اب مزید کوئی رشتہ نہیں رکھنا چاہتی' لہٰذا میرا فیصلہ یہی ہے کہ مجھے آج اور ابھی طلاق دے دو ۔۔۔ اور اس گھر سے دفع ہو جاؤ ۔۔۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔"

فائزہ بیگم ان کی اور نبیل کی باتیں سن چکی تھیں اور ساری سچویشن سمجھ بھی چکی تھیں اس لیے انہوں نے کھڑے کھڑے وہ فیصلہ سنا دیا تھا جس سے وہ ساری زندگی ڈرتی ہی آئی تھیں اور آج جب یہ ڈر اتار کے پھینکا تھا تو وہ سب کچھ کہہ ڈالا تھا جو وہ کہنے کا کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھیں۔

"ماما!" نبیل کے ہونٹ کپکپائے تھے۔

"بس! اب اور نہیں نبیل اب اور برداشت نہیں کر سکتی ۔۔۔ ساری زندگی برداشت کیا ہے' اب میری برداشت کی حد ختم ہو گئی ہے' اب میں مر گئی ہوں جیتے جی مر گئی ہوں مجھے اک عمر ہو گئی ہے اس شخص کی ذلالتوں کے ساتھ جیتے ہوئے اب میرا حق بنتا ہے کہ میں مر جاؤں۔" فائزہ بیگم غصے و نفرت اور دکھ سے کہتی ہوئی رو پڑی

تھیں۔

"مگر مام!" نبیل کی زبان ہی اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی' وہ کچھ کہنے کی کوشش کے باوجود بھی کہہ نہیں پا رہا تھا۔

"اگر مگر کچھ نہیں۔۔۔ کسی کو کچھ پتا نہیں چلے گا اور اگر چل بھی گیا تو مجھے کوئی پروا نہیں ہے' میں کسی ملک حق نواز کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔" انہوں نے ممتاز حیات کو ملک حق نواز کا لقب دے دیا تھا اور نبیل ان کا گریبان چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا تھا۔

"مجھے طلاق دے دو ممتاز حیات۔۔۔ مجھے اپنے نام کے ساتھ اب تمہارا نام بھی گوارا نہیں ہے۔" فائزہ بیگم کافی سپاٹ ہو رہی تھیں۔

"دے دوں گا تمہیں طلاق۔۔۔ مل جائے گی تمہیں۔۔۔ تھوڑا انتظار کرو۔" ممتاز حیات کہہ کر اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھے تھے۔

"یہ گھر میرا ہے۔۔۔ آپ یہاں نہیں رہ سکتے۔" نبیل کی آواز پہ ان کے بیڈ روم کی طرف بڑھتے قدم رک گئے تھے۔

"کیوں نہیں رہ سکتا۔۔۔ صرف اس لڑکی کی وجہ سے؟" انہوں نے کافی چبھتی ہوئی نظروں سے مومنہ بی بی کی طرف دیکھا تھا۔

"ہاں! صرف اس لڑکی کی وجہ سے' کیونکہ اب یہ گھر اس لڑکی کا گھر ہوگا' کیونکہ اب یہ مالکن ہوگی کیونکہ اگلے چند لمحوں میں میں اس سے شادی کرنے والا ہوں تاکہ دوبارہ کوئی آپ جیسا ملک حق نواز اس پہ بری نظر نہ ڈالے۔" نبیل نے فائزہ بیگم سے بھی زیادہ سنگین دھماکا کیا تھا۔ جس پہ وہاں موجود تینوں نفوس ساکت و صامت سے ہو گئے تھے۔

"نبیل۔۔۔؟" فائزہ بیگم نے چونک کر دیکھا۔

"صاحب۔۔۔؟" مومنہ بی بی کے ہونٹ بھی لرز گئے تھے۔

"یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ کسی کو کوئی بھی اعتراض ہو مجھے پروا نہیں ہے۔ البتہ مومنہ بی بی کو اعتراض ہے تو وہ انکار کا پورا پورا حق رکھتی ہے۔ میں اس کے انکار کا احترام۔۔۔ کروں گا۔" نبیل کہہ کر وہاں سے نکل گیا تھا اور پیچھے وہ تینوں دیکھتے رہ گئے تھے۔

☆ ☆ ☆

کچھ خاص نہیں بس اتنی سی محبت ہے تم سے
ہر رات کا آخری خیال ہر صبح کی پہلی سوچ ہو تم

ٹھیک ایک ماہ بعد آزر اور کومل کی شادی تھی' ہر طرف رونق ہی رونق تھی ہر طرف ہنگامے ہی ہنگامے تھے مگر آزر کو دیکھا جاتا تو یوں لگتا تھا کہ جیسے دنیا بھر کا جمود صرف اس کی ذات پہ ہی چھا گیا ہو' کوئی بھی رونق' کوئی بھی ہنگامہ اس پہ اثر نہیں کر رہا تھا وہ جہاں بیٹھا ہوتا تھا اسے وہاں بیٹھے بیٹھے گھنٹوں گزر جاتے تھے۔ اس کے آس پاس کیا ہو رہا ہے اسے احساس تک نہیں ہوتا تھا اور اس کی یہ حالت کسی اور کو نہ سہی مگر دانیال کو بہت کھٹکتی تھی۔

وہ جب بھی اسے اس طرح بیٹھے ہوئے دیکھتا تھا اسے غصہ آجاتا مگر آج نجانے کیا بات تھی کہ اسے آزر پہ غصہ نہیں آیا تھا بلکہ ترس آیا تھا' رحم آیا تھا اور وہ نپے تلے قدموں سے چلتا ہوا اس کے برابر ہی صوفے پہ آ بیٹھا تھا۔

"کیسے ہو؟" دانیال کے لہجے کے ساتھ ساتھ سوال بھی بہت دھیما سا تھا۔ مگر آزر اپنے ہی کسی خیال میں گم اس کی آواز' اس کا سوال نہیں سن سکا تھا اور دانیال اس کی کیفیت سمجھ گیا تھا۔

"آزر۔۔۔!" اب اس نے اسے اس کے نام سے پکارا تھا۔

"ہوں۔۔۔! ہاں۔۔۔!" وہ چونک کر متوجہ ہوا تھا اور اپنے قریب صوفے پہ بیٹھے دانیال کو خالی خالی نظروں سے دیکھا تھا۔

"میرا خیال ہے تم اس وقت اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے ہو' جہاں اس وقت تمہارے علاوہ پانچ دس لوگ اور بھی ہیں' کچن کی آوازیں بھی ہیں' شور بھی ہے' ہنگامے بھی ہیں' مگر تمہیں کچھ دکھائی نہیں دے رہا' کچھ سنائی نہیں دے رہا' تمہیں تو یہ بھی نہیں پتا کہ تم بیٹھے کہاں ہو؟ ایسا کیوں ہے بھلا۔۔۔ کچھ پوچھ سکتا ہوں تم سے؟ کیا اس لائق سمجھتے ہو مجھے؟" دانیال نے اس کے گھٹنے پہ ہاتھ رکھ کے اسے متوجہ کیا تھا اور آزر اس کے سوال پہ اس کی صورت دیکھتا رہ گیا تھا۔

"اس طرح کیا دیکھ رہے ہو؟ بتاؤ نا' میں نے کچھ پوچھا ہے تم سے؟" دانیال نے پھر اسے جواب دینے پہ اکسایا تھا۔

"دیکھ رہا ہوں کہ تم سب کچھ جانتے ہوئے بھی کس قدر انجان بن رہے ہو؟" آزر نے خاصے تلخ اور چبھتے ہوئے سے انداز میں کہا تھا۔

"میں انجان نہیں بن رہا بلکہ تم سے سننا چاہ رہا ہوں۔" دانیال نے تم پہ زور دیا تھا۔

"کیا جاننا چاہ رہے ہو؟" آزر نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔

"تمہارے اندر کا حال۔" اس نے آزر کے سینے کی سمت اشارہ کیا۔

"میرے اندر کا حال تو غالباً" تم سے بہتر اور کوئی نہیں جانتا؟" آزر نے جیسے اپنے حال پہ طنز کیا تھا۔

"اسی لیے تو سب سے زیادہ پریشانی بھی مجھے ہی ہوتی ہے۔" دانیال واقعی متفکر ہو رہا تھا۔

"پریشانی؟ مگر کس چیز کی؟" اس نے جان بوجھ کر تعجب ظاہر کیا تھا۔

"تمہارے حال کی۔۔۔" دانیال نے اسے سراپا افسردہ اور تاسف زدہ نظروں سے دیکھا تھا۔

"ہونہہ! میرے حال کو کیا ہوا ہے بھلا؟ ٹھیک ہی تو ہے' بہت خوش ہوں میں' آخر میری شادی ہو رہی ہے' ایک سہرا سے دو ہونے جا رہا ہوں۔ اس سے بڑی خوشی کی بات اور کیا ہوگی میرے لیے؟" آزر کے لہجے میں طنز تھا' ایک گہرا طنز۔ دانیال چند ثانیے کے لیے خاموش ہو گیا تھا۔

"دیکھو آزر۔۔۔ اب طنز کرو یا چوٹ۔۔۔ حال بتاؤ یا حلیہ۔۔۔ فیصلہ تو ہو چکا ہے' شادی تو تم نے کرنی ہی ہے تو پھر اسی طرح۔۔۔ اس طرح اداسی کا اشتہار بننے کی کیا ضرورت ہے آخر؟ اس طرح کرو گے تب بھی شادی ہوگی اور اگر نارمل رہو گے تو تب بھی شادی ہوگی' مگر اس سے فرق یہ آئے گا کہ سیکنڈ طریقے سے سب کچھ اچھا نظر آئے گا اور سب خوش رہیں گے' جبکہ تم فرسٹ طریقے پہ ڈٹے ہوئے ہو۔"

"پلیز دانیال پلیز۔۔۔! یہ ساری باتیں صرف کہنے کے لیے ہی ہوتی ہیں' ان پہ عمل کرنا پڑ جائے تو جان عذاب میں آجاتی ہے' گلے میں پھندا پڑ جاتا ہے' انسان چکی کے دو پاٹوں میں پس کے رہ جاتا ہے' امیدیں ختم ہو جاتی ہیں دل و دماغ کی عمر حاصل پھر بھی کچھ نہیں ہوتا' الٹا اپنے ہی دل کی لاش اٹھانا پڑ جاتی ہے اور اپنے دل کی لاش اپنے کندھوں پہ اٹھانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔۔۔ یہ صرف میرا ہی المیہ نہیں ہے سب کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے' کبھی تم پہ گزرتی تو تمہیں احساس ہوتا' مگر خوش قسمت ہو۔۔۔ دل کے معاملے میں مطمئن ہو۔۔۔ اور اللہ تمہیں مطمئن ہی رکھے آمین۔" آزر نے کہتے ہوئے آخر میں اس کا کندھا تھپکا تھا اور دانیال کو ایک بار پھر چپ ہونا پڑا تھا۔

"مگر پھر بھی یار میں یہ ہی چاہوں گا کہ تم خوش رہو۔" دانیال نے ذرا توقف سے دوبارہ کچھ بولنے کا ارادہ پورا کیا تھا اور آذر اس کی بات پہ بے ساختہ نفی میں سر جھٹکتے ہوئے طنزیہ سے انداز میں مسکرایا تھا۔

"ہونہہ! خوش تو بہرحال نہیں رہ سکتا البتہ خوش نظر آنے کی کوشش ضرور کر سکتا ہوں۔"

"لیکن آذر!" دانیال نے کچھ کہنا چاہا تھا۔

"ایم سوری دانیال! میں اس وقت کچھ سننے کی پوزیشن میں نہیں ہوں، جو جیسا چل رہا ہے، چلنے دو بس گہرائی میں مت جاؤ گہرائی میں جانے سے ہمیشہ نقصان ہوتا ہے۔" آذر اسے ہاتھ اٹھا کر روکتے ہوئے وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"تم دونوں میں کیا کھسر پھسر ہو رہی ہے؟ وہ بھی اتنے سنجیدہ موڈ میں۔۔۔؟" عائشہ آنندی ان دونوں کے قریب چلی آئی تھیں۔

"کچھ نہیں پھوپھو۔۔۔! ایسی کوئی بات نہیں ہے بس آپ کے بیٹے کو ہر بار گہرائی میں جانے کی عادت پڑ گئی ہے، اسے کہیں زیادہ نہ سوچا کرے شادی کے دن قریب ہیں اس لیے اپنے ذہن پہ زیادہ بوجھ نہ ڈالے۔" آذر ہلکے پھلکے انداز میں کہتا عائشہ آنندی کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

"کیسا بوجھ؟" اس کی بات پہ عائشہ آنندی کو الجھن ہوئی تھی۔

"عجیب الٹی سیدھی باتیں سوچتا رہتا ہے، بڑا فارغ ٹائم ہے اس کے پاس۔" آذر کے انداز پہ غور کرنے کے بعد عائشہ آنندی کو اندازہ ہوا تھا کہ وہ مذاق کر رہا ہے، تب انہوں نے کچھ ریلیکس ہو کر دانیال کی طرف دیکھا تھا۔

"فارغ ٹائم تو تم سب کے پاس ہی ہے، سوچتے تو تم بھی رہتے ہو، اب یہ پتا نہیں کہ کیا سوچتے رہتے ہو؟" وہ جواباً مسکرائی تھیں اور آذر کچھ دیر بعد وہاں سے اجازت لے کر باہر نکل گیا تھا اور دانیال پھر کسی سوچ میں پڑ گیا تھا۔ وہ آج کل مسلسل آذر کے متعلق ہی سوچ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆
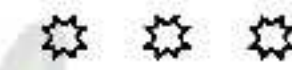
"مجھے ایک بار۔۔۔ صرف ایک بار۔۔۔ بس آخری بار۔۔۔ اور شاید پہلی بار۔۔۔ اس سے اظہار تو کرنا چاہیے نا؟ اس دل میں اس نامراد دل میں یہ خواہش، یہ حسرت تو نہ رہے کہ بنا اظہار کے ہی مر گیا؟ نہ اس کے در پہ پہنچا نہ سجدہ کیا، بس پتھر کی جبیں لیے، بت بنا رہ گیا۔ ہرگز نہیں کبھی نہیں اس جبیں کو ایک بار اس کے در پہ تو ضرور لے کر جاؤں گا۔ بلکہ آج ہی جاؤں گا اور ابھی ہی جاؤں گا آج کے بعد کل کس نے دیکھا ہے بھلا؟ کل پہ رہ جانے والے لوگ خالی ہاتھ رہ جاتے ہیں اور میں، میں تو ہوں ہی خالی ہاتھ اب اور خالی ہونے کے لیے تو کچھ بھی نہیں ہے، اس لیے اب اس کے در پہ اس کے دل کے در پہ جانا ہی بہتر ہے اور آج میں جاؤں گا ہر حال میں جاؤں گا ابھی جاؤں گا اور اسی وقت جاؤں گا۔" اس نے اندھا دھند سڑکوں پہ گاڑی دوڑاتے ہوئے اچانک گاڑی کا رخ ہسپتال کی طرف موڑ دیا تھا۔ اور گاڑی فل اسپیڈ پہ چھوڑ دی۔

مگر اس وقت کون جانتا تھا کہ یوں پاگلوں کی طرح ڈرائیو کرتے ہوئے نبیل حیات کے رخساروں پہ کتنے آنسو بے آواز بہے تھے اور دل کتنی بار صحرا میں بھٹکے مسافر کی طرح ہولایا تھا۔

پاگل تو وہ پہلے ہی ہو چکا تھا مگر اس وقت وہ دل و دماغ کی یورش سے سچ مچ جنونی سا ہو رہا تھا اس کے اندر چھپی سالوں کی تڑپ اس کے روئیں روئیں سے نمایاں ہو رہی تھی۔ وہ آج کچھ بھی چھپا نہیں پا رہا تھا، جیسے وہ اپنے اختیار میں ہی نہ رہا ہو، اس کا اپنی ذات سے ہی اختیار اٹھ چکا تھا، وہ بے بس تھا اور اس بے بس اور جنونی سی حالت میں وہ سیدھا ہسپتال جا پہنچا تھا۔

"نبیل بھائی آپ؟ خیریت تو ہے نا؟" نگارش جو زری کے بیڈ کے قریب ہی کرسی پہ بیٹھی ہوئی تھی نبیل کو یوں اچانک بغیر دستک کے اندر داخل ہوتے دیکھ کر حیرانی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"میں زری سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔" اس کا لہجہ اور انداز ایسا تھا کہ نگارش ٹھٹک کر دیکھنے پہ مجبور ہو گئی تھی۔

"زری سے بات کرنا چاہتے ہیں؟" اسے مزید حیرت ہوئی تھی۔

"جی ہاں! زری سے بات کرنا چاہتا ہوں کیا اجازت ہے؟" اب کی بار اس نے اجازت طلب کرنے کی فارملیٹی نبھائی تھی۔

"جی۔۔۔ جی! کر سکتے ہیں۔" نگارش نے اپنے تاثرات کنٹرول کرتے ہوئے ہاتھ میں پکڑی زری کی ڈائری زری کے سرہانے رکھی اور اک سائیڈ پہ ہو گئی۔

"جو بھی بات کروں گا یہ سنے گی نا؟" نبیل نے جیسے تسلی چاہی تھی۔

"ہونہہ! یہی تو افسوس ہے صرف سنتی ہے بولتی کچھ بھی نہیں۔" نگارش کے لہجے میں دکھ کی چبھن تھی۔

"میں بھی نہیں بولتا تھا، صرف سنتا تھا، مگر آج یہاں سننے کے لیے نہیں آیا، صرف بولنے کے لیے آیا ہوں، تاکہ میں بولوں اور یہ سنے۔"

نبیل نے زری کی سمت اشارہ کیا تھا مگر نگارش اس کے تیور دیکھ کر لرز گئی تھی۔ کیونکہ اس کی آنکھوں کے سامنے اک اور محبت انکشاف پہ آمادہ تھی۔ اور انکشاف جب بھی ہو جس چیز کا بھی ہو ہمیشہ دہلا ہی دیتا ہے اور اس لیے نگارش بھی دہل گئی تھی اور اس کا دل بھی۔

"نبیل بھائی! کیا یہ سہہ پائے گی؟" نگارش کو شروع سے ہی شک تھا کہ نبیل زری کو چاہتا ہے اس سے محبت کرتا ہے، اسپیشل فیلنگز رکھتا ہے۔ مگر کہتا کچھ بھی نہیں اظہار نہیں کرتا ڈرتا ہے جھجکتا ہے لیکن آج وہ سارے ڈر اور ساری جھجک بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنے اظہار کا جنون اٹھائے، اپنے لفظوں کے موتی لیے اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا اور نگارش کا شک یقین کے سانچے میں ڈھل گیا تھا۔

"میں بھی تو نہیں سہہ پا رہا اس لیے تو آج، آج سب کچھ کہہ کر آزاد ہو جانا چاہتا ہوں۔" اس نے کہتے ہوئے ایک گہری سانس خارج کی تھی۔

"تو آپ آزاد ہونے کے لیے آئے ہیں؟" نگارش نے بھی ذرا توقف سے سوال کیا تھا۔

"ہاں۔۔۔ دل پہ بوجھ اٹھا اٹھا کر تھک گیا ہوں۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"تو پھر یہ بوجھ وہ کیسے اٹھائے گی۔۔۔ آپ جانتے ہیں نا یہ ایک ایسا بوجھ ہے جو زمین بھی نہیں سہار سکتی اس کے دکھ میں، اس کے ہجر میں بنجر ہو جاتی ہے اور آپ ایک بنجر زدہ زمین کو مزید عذاب میں مبتلا کرنا چاہ رہے ہیں؟" نگارش نے دکھ سے کہا تھا۔

"نہیں! میں اسے مزید عذاب میں مبتلا نہیں کرنا چاہ رہا بلکہ یہ بتانا چاہ رہا ہوں کہ یہ اکیلی بنجر زدہ نہیں ہے اور نہ ہی یہ اکیلی ہجر زدہ ہے، ہم جیسے لوگ بھی اس عذاب کا شکار ہیں ہم بھی اک عذاب جھیل رہے ہیں اور اس عذاب کو جھیلنے کے بعد بھی جی رہے ہیں اس کی طرح دل سے اور دنیا سے غافل نہیں ہوئے۔"

نبیل کی ہر بات میں اور ہر لفظ میں دکھ تھا، درد تھا، چبھن تھی نگارش سے مزید سنا نہ گیا اور اس روم سے باہر نکل گئی تھی اور نبیل زری کے بیڈ کے پائنتی کی طرف کھڑا رہ گیا تھا۔

کمرے کا دروازہ بند تھا۔

اور کمرے میں مکمل خاموشی تھی۔

زری بے ہوش پڑی تھی اور نبیل ہوش و حواس میں کھڑا تھا۔
اور سوچ رہا تھا کہ بے ہوش پڑی زری سے کیا کہے... کہاں سے بات شروع کرے... اور کہاں پہ بات ختم کرے؟

جبکہ زری مضطرب سی ہو رہی تھی کہ نبیل کیا کہنے والا ہے آخر ایسی کون سی بات ہے۔ جس کو سنا کے اور سنانے سے ہی نگارش اتنی پریشان ہو گئی تھی اور ان دونوں کے لہجوں میں دکھ جھلکنے لگا تھا۔

"نبیل پلیز! بولیے کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟ کیوں اتنے پریشان ہیں؟ کیوں آئے ہیں یہاں؟" زری اٹھ نہیں سکتی تھی بول نہیں سکتی تھی سوال نہیں کر سکتی تھی مگر اندر ہی اندر پریشان تو ہو سکتی تھی نا... بے چین تو ہو سکتی تھی نا؟

"زری...!" نبیل کو شاید اس کی بے چینی اور اضطراب کا احساس ہو ہی گیا تھا۔ مگر زری جو پہلے ہی بے جان سی پڑی تھی اس کی اس پکار پہ دھک سے رہ گئی تھی۔

"یہ کیا؟ یہ تو محبت کی آواز ہے؟ یہ تو عشق کا لہجہ ہے؟"

یہ پکار تو قیامت کی پکار ہے... اس سے کون بچے؟ اور اس کو کون سنے؟

وہ کوئی دل آور شاہ تھی جس کا کلیجہ محبت کی آواز، عشق کے لہجے اور قیامت کی پکار پہ بھی نہ کانپتا؟ وہ تو موم کا وجود تھی، لیکن پتھر ہو کے رہ گئی تھی۔

"سنا ہے محبت کی رمز، محبت کا دکھ تم سے بہتر کوئی بھی نہیں جانتا، کسی کو محسوس ہی نہیں ہوتا اس لیے محبت کی رمز اور محبت کا دکھ تم سے کہنے آیا ہوں، تاکہ تم سنو اور مجھے علاج بتاؤ، حل نکالو میرے درد کا، میری بے بسی کا اور میری اس مفلوج محبت کا جو تمہارے ساتھ پچھلے چھ ماہ سے اس بستر پہ پڑی ہے اور کوما کا شکار ہے۔"

نبیل کی آواز بے حد گمبھیر ہو رہی تھی اور لہجہ بھیگنے لگا تھا اس نے اپنے دونوں ہاتھ بیڈ کی پائنتی والے اسٹینڈ پہ جما دیے تھے جیسے وہ بے بسی کی انتہا پہ کھڑا ہو۔

"زری پلیز! اور کچھ نہیں تو مجھے صرف اتنا ہی بتا دو کہ اگر کسی کی محبت کوما میں چلی جائے تو اسے کیا کرنا چاہیے؟"
اس کا ہر سوال ہی جان لیوا تھا اور زری اس کے ہر سوال کے ساتھ مر رہی تھی۔

"بولو زری! بتاؤ مجھے کسی کی محبت کوما میں چلی جائے تو اسے کیا کرنا چاہیے۔ اس انسان کو مر جانا چاہیے؟ پگھل جانا چاہیے؟ یا پتھر کا ہو جانا چاہیے؟"

نبیل نے زری کے چہرے کی سمت دیکھا جو بظاہر تو بہت پرسکون تھا مگر اندر کہیں طوفان اٹھ رہے تھے اور اندر کے اس طوفان کو باہر تک آنے میں ابھی کچھ وقت درکار تھا۔ مگر نبیل کو اس وقت کا انتظار نہیں تھا۔ کیونکہ وہ وقت اور انتظار کے اس جملے سے نکل آیا تھا اور اپنے آس پاس کی ہر زنجیر کو جھٹک رہا تھا جھٹلا رہا تھا۔

"ہونہہ! مجھے پتا ہے کہ تمہارا جواب کیا ہو گا؟ یہی نا کہ انسان کو پتھر کا ہو جانا چاہیے؟ بالکل ایسے جیسے تم ہو گئی ہو جیسے دل آور ہو گیا ہے، ویسے ہی بالکل ویسے ہی مجھے بھی ہو جانا چاہیے کیونکہ ہم تینوں کا آپس میں رشتہ ہی کچھ ایسا ہے کہ ہم تینوں ایک دوسرے سے محبت کریں اور پتھر کے ہو جائیں۔ تو پھر... تو پھر تم خود سوچو زری کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ تم دونوں محبت کر کے پتھر کے ہو جاؤ اور نبیل حیات محبت کر کے بھی موم کا ہی رہ جائے؟

ہونہہ! نہیں ہرگز نہیں ایسا کبھی نہیں ہو سکتا دو پتھر لوگوں میں ایک موم کا انسان نہیں رہ سکتا اگر رہنا ہے تو اسے بھی ان کے بیچ پتھر بن کے رہنا ہو گا اور میں آج یہاں یہی بتانے کے لیے آیا ہوں کہ میں بھی آج سے تم لوگوں کی طرح پتھر ہی ہوں اور پتھر ہی کہلاؤں گا۔ مگر اس پتھر ہونے سے پہلے اک اعتراف کرنا تھا اک حسرت پوری کرنی تھی۔

سو اس کے لیے تمہاری خدمت میں حاضر ہونا ضروری تھا۔ اور وہ ہو گیا ہوں۔" نبیل نے کہتے ہوئے سر جھکا لیا تھا اور ذرا توقف کے لیے ٹھہرا تھا۔

"زری! اعتراف یہ ہے کہ نبیل حیات کے دل و جان کو ہی نہیں' روئیں روئیں کو بھی محبت ہے تم سے اور حسرت یہ ہے کہ میں اپنا حال کہوں اور تم سامنے بیٹھ کے سنو۔ اور یہ حسرت اور یہ اعتراف تب سے اس دل میں لیے پھر رہا ہوں جب تم نے پہلی بار انگلینڈ کی سرزمین پہ قدم رکھا تھا' لیکن اس وقت میں یہی سمجھا تھا کہ تم نے انگلینڈ کی سرزمین پہ قدم نہیں رکھا بلکہ میرے دل پہ قدم رکھا ہے' جہاں تمہارے آنے سے بہار آگئی تھی۔ جہاں تمہارے قدم رکھنے سے ہی محبت کا پودا اگ آیا تھا مگر میں نے اس پودے کو ہمیشہ خاموشی سے پالا پوسا اور پروان چڑھایا' سوچا۔ عبداللہ نے تمہیں اسٹڈی کے لیے یہاں بلوایا ہے' اب اگر میں اظہار کرتا' اپنی محبت ظاہر کرتا' یا پھر اپنی ماں کے ذریعے پرپوزل دیتا تو یقیناً" عبداللہ تم سے بدظن ہو جاتا کہ اس کے یہاں آتے ہی یہ سب بھی شروع ہو گیا ہے؟ اسی لیے' اسی لیے تمہاری خاطر میں نے اپنے دل کو گونگا بہرہ اور اندھا بنا دیا۔ کبھی کچھ بولا نہ کبھی کچھ سنا اور نہ ہی کبھی کچھ دیکھا۔

بس اس پودے کو پالنے میں لگا رہا جو صرف تمہارے ایک قدم کی مرہونِ منت میرے دل کی سرزمین پہ اگا تھا۔ اور اس دھن میں مجھے یہ بھی پتا نہ چلا کہ تمہارے دل کی سرزمین پہ کس کی محبت کے پھول کھل چکے ہیں؟ اگر اس بات کا علم ہو جاتا تو میں اپنے دل سے اس پودے کو بہت پہلے ہی جڑ سے اکھاڑ پھینکتا۔

مگر افسوس کہ پتا اس وقت چلا ہے جب اس پودے کی جڑیں میری نس نس میں پھیل گئیں اور اس کا درد میری رگ رگ میں بہہ رہا ہے۔

میں شکار ہو چکا ہوں' میں چیخ رہا ہوں' چلا رہا ہوں' تڑپ رہا ہوں' مچل رہا ہوں' مگر سنبھل نہیں رہا' بچ نہیں رہا' مر رہا ہوں' ہر گھڑی' ہر لمحہ۔

مگر چاہتا ہوں کہ مرنے سے پہلے اور پتھر ہونے سے پہلے تمہاری محبت سے اور اس پودے کی جڑوں سے آزاد ہو جاؤں اور میں یہاں آزاد ہونے کے لیے ہی آیا ہوں اور یہ بتانے کے لیے آیا ہوں کہ آج سے نبیل حیات بھی پتھر اور اس کے جذبات بھی پتھر۔

اب کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں وہی نبیل حیات ہوں اک اچھا سا موم کا پتلا۔ اب میں چلتا پھرتا پتھر کا انسان ہوں اور پتھروں پہ کچھ اثر نہیں کرتا۔ چاہے ہجر ہو' چاہے وصال ہو' چاہے زری ہو' چاہے مومنہ بی بی۔" وہ کہتے کہتے ایک بار پھر ٹھہرا تھا۔

"مومنہ بی بی؟" زری کا دل روتے روتے چونکا۔

"مومنہ بی بی؟ کیا مومنہ بی بی؟ نبیل آپ چپ کیوں ہو گئے ہیں؟ بتائیے نا' مومنہ بی بی کا ذکر کیوں کیا؟" زری کی خاموشی کرلائی تھی۔

"ہاں! مومنہ بی بی۔" نبیل نے یوں اثبات میں سر ہلایا تھا جیسے زری کی خاموشی کی زبان بھی بآسانی سمجھ رہا ہو۔

"زری! میں نے سوچا ہے کہ جب ہم لوگ ایک دوسرے کے نہیں ہو سکتے تو پھر کیوں نہ ہم لوگ ان کے ہو جائیں جن کو ہماری ضرورت ہے' جن کی زندگی ہمارے نام سے ہی سہل ہو جائے گی۔ جن کو سہارا مل جائے گا۔ جو سنور جائیں گے۔"

"نبیل پلیز! آگے بولیں۔" زری کا دل چیخا۔

"سو اسی لیے آج میں نے مومنہ بی بی سے شادی کا فیصلہ کر لیا ہے' میں اسے اپنا نام دے رہا ہوں' اپنے گھر میں جگہ دے رہا ہوں' مقام دے رہا ہوں' بالکل ایسے ہی جیسے دل آور نے علیزے بھابھی کو دیا ہے۔"

نبیل نے اچانک اور بے ساختہ ہی وہ بات کہہ دی تھی جو بے جان پڑی زری کو بھی ہلا کے رکھ گئی تھی۔

"ہاں زری ۔۔۔ یہ سچ ہے اور یہی حقیقت ہے وہ کہے یا نہ کہے وہ مانے یا نہ مانے لیکن وہ بے وفا نہیں ہے میں کہتا ہوں میرا دل کہتا ہے' دل آور بے وفا نہیں ہے' نہیں ہے وہ بے وفا اس نے وہی کیا ہے جو آج میں کرنے کے لیے آیا ہوں پتھر ہو گیا ہے وہ ۔۔۔ مر چکا ہے وہ لاش گھسیٹ رہا ہے اپنی ۔۔۔ جیسے اب میں گھسیٹوں گا جیسے تم گھسیٹو گی جیسے عبداللہ گھسیٹ رہا ہے' ہم سب اپنی اپنی لاشیں گھسیٹ رہے ہیں زری اور یہی ہمارا مقدر تھا اور اب اس مقدر کے ساتھ ہم نے جینا بھی ہے اور زندگی بھی گزارنی ہے۔"

نبیل کا لہجہ بھیگنے لگا تھا اور زری کی ہستی تہس نہس ہو گئی تھی۔

"زری! اگر میری مانو تو واپس آجاؤ ۔۔۔ واپس ہوش کی دنیا میں لوٹ آؤ ۔۔۔ یہاں ہوش و حواس میں رہ کر بھی جیا جا سکتا ہے۔ یہاں پتھر بن کے بھی جیا جا سکتا ہے یہاں کسی اور کا ہو کر بھی جیا جا سکتا ہے ضروری نہیں ہے کہ محبت نہ ملے تو بستر سے لگ جاؤ۔

بلکہ ضروری تو یہ ہے کہ تم پھر سے اٹھو' پھر سے حوصلہ کرو' اور پھر سے محبت نبھاؤ۔ کیونکہ محبت میں ہمت ہارنا بہت آسان ہوتا ہے مگر محبت میں حوصلہ رکھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ جیسے میں نے رکھا ہے جیسے دل آور نے رکھا ہے ویسے ہی تم بھی رکھو۔

آخر تمہاری محبت کی شدت تو ہماری محبت سے بھی زیادہ ہے' تمہیں تو اور زیادہ حوصلہ رکھنا چاہیے ہم سے بھی زیادہ۔" نبیل آج جو کچھ من میں تھا وہ سب کہتا جا رہا تھا۔

"مجھے دیکھو میں بھی تو ہوں یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہارے دل پہ دل آور کی دسترس ہے پھر بھی تم سے محبت کرنا کم نہیں کر سکتا۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ میں اب کسی اور کا ہونے جا رہا ہوں' مگر پھر بھی تم سے دل کا تعلق نہیں توڑ سکتا اور یہ بھی جانتا ہوں کہ ہم کبھی مل نہیں سکتے' پھر بھی جینے کے لیے تیار ہوں' مر نہیں سکتا شاید اس لیے کہ جیوں گا تو تم سے محبت کرتا رہوں گا' مر گیا تو تم آنکھ سے اوجھل ہو جاؤ گی پھر کیسے دیکھوں گا؟ کیسے چاہوں گا؟ اور کس سے محبت کروں گا؟"

وہ بے ساختہ کہتے ہوئے بپھر گیا تھا اور زری کی سانسوں میں اک ہلچل سی ہوئی تھی۔

"خیر! میں جو بھی کروں یہ میرا مسئلہ ہے اور تم جو بھی کرو یہ تمہارا مسئلہ ہے' ہم ایک دوسرے کو سمجھانے کا اور کسی چیز سے روکنے کا کوئی حق یا کوئی اختیار نہیں رکھتے ۔۔۔ سب کی اپنی اپنی زندگی ہے اور سب کا اپنا اپنا اختیار ہے' میرے بس میں جو ہے میں وہ کرنے جا رہا ہوں' تمہارے بس میں جو ہو گا تم وہ کر لینا۔

بس میں آج سے آزاد ہوا۔ میرے دل سے بوجھ اتر گیا کہ میں تمہارے در تک نہیں پہنچا۔ لیکن دیکھو آج پہنچا بھی ہوں' اظہار بھی کر دیا' اعتراف بھی کر لیا اور یہ بھی مان لیا کہ زندگی تمہارے بغیر کچھ بھی نہیں مگر پھر بھی زندگی بسر تو کرنی ہی ہے اور وہ چاہے مومنہ بی بی کے ساتھ ہو جائے' چاہے کسی اور نسوانی وجود کے ساتھ ۔۔۔ انسان کی محبت کا پیکر ہی اس کے پہلو میں سجا ہو یہ ضروری تو نہیں ہے؟" نبیل نے کہتے ہوئے تلخی سے سر جھٹکا تھا اور اپنے دونوں ہاتھ اس کے بیڈ کی پائنتی سے ہٹا لیے تھے اور واپسی کے لیے ارادہ باندھ لیا تھا۔

مگر اس کے قدم واپسی کا سوچ کر ہی لرز رہے تھے اور دل سینے کی قید میں بے قراری سے تڑپا تھا۔

"آئی لو یو زری! آئی لو یو سو مچ۔" نبیل کے ہونٹوں پہ یہ اک جملہ مچلا اور آنکھوں میں آنسو امڈ آئے تھے مگر پھر وہ وہاں ٹھہرا نہیں تھا اور اک جھٹکے سے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا تھا۔

"نبیل ۔۔۔!" زری کا من اس کے پیچھے بلند آواز سے چیخا تھا کیونکہ وہ نبیل حیات کے درد کو بہت آسانی سے اور بہت قریب سے سمجھ سکتا تھا اور اس درد کو سمجھتے ہوئے اس کی حالت بگڑ گئی تھی اور سب کچھ کنٹرول سے باہر ہو

"سر...! مبارک ہو... بہت بہت مبارک ہو مس زرین ملک ہوش میں آگئی ہیں۔" ڈاکٹر لودھی نے آئی سی یو سے باہر نکلتے ہی سامنے کھڑے عبداللہ کو بڑی گرم جوشی سے یہ خبر سنائی تھی اور نگارش کے ساتھ ساتھ عبداللہ کی بھی بے چینی سے آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

"آپ سچ کہہ رہے ہیں؟" عبداللہ نے ہنوز بے یقینی کا ہی مظاہرہ کیا تھا۔

"جی ہاں! میں سچ کہہ رہا ہوں اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعائیں سن لی ہیں اللہ نے نواز دیا ہے آپ کو' کرم کر دیا ہے آپ پہ..." ڈاکٹر لودھی خود بھی بہت خوش تھے اور عبداللہ نے بے ساختہ آگے بڑھ کے ڈاکٹر لودھی کو گلے سے لگا لیا تھا۔

"تھینک یو ڈاکٹر... تھینک یو سو مچ۔" عبداللہ کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے اور لہجہ آنسوؤں کے بوجھ سے بھیگنے لگا تھا۔

"اللہ یہ خوشی آپ کو مبارک کرے اور مس زرین جلدی سے صحت یاب ہو جائیں۔" ڈاکٹر لودھی نے اس کا کندھا تھپکا تھا اور پھر کسی کام کے لیے اپنے اسٹاف کی طرف بڑھ گئے تھے۔

جبکہ عبداللہ اپنے رب کا شکر ادا کرتے ہوئے وہیں فرش پہ ہی سجدے میں جھک گیا تھا۔ اور نگارش بھی اللہ کا شکر بجالائی تھی۔

"نگارش...! یہ... یہ سب کیسے ہو گیا...؟ مجھے... مجھے یقین نہیں آرہا... جب ہماری ساری امیدیں ہی دم توڑ چلی تھیں تب... تب وہ ہوش میں آگئی...؟ آخر یہ سب ہوا کیسے؟ کون آیا تھا اس سے ملنے...؟ وہ... وہ نرس بتا رہی تھی کہ کوئی آیا تھا...؟" عبداللہ کو اچانک ہی نرس کی بات یاد آئی تھی۔ اور نگارش عبداللہ کے اس سوال پہ ٹھٹک گئی تھی کہ اسے کیا جواب دے کہ کون آیا تھا...؟

"کیا سوچ رہی ہو نگارش...؟ کہاں کھوئی ہو...؟ بتاؤ نا کیا بات ہوئی ہے...؟ کون آیا تھا بھلا...؟" عبداللہ نے گم سم سی نگارش کو کندھوں سے پکڑ کے متوجہ کیا تھا...

"نبیل بھائی آئے تھے..." اس نے بے حد مدھم آواز میں بتایا تھا۔

"نبیل...؟" اب کی بار عبداللہ کو حیرت کا سنگین جھٹکا لگا تھا۔

"جی..." نگارش نے بمشکل ہی کہا تھا۔

"کیا کہا اس نے زری سے...؟" عبداللہ کا اپنا لہجہ دھیما پڑ چکا تھا اور آواز کہیں دب چکی تھی۔

"یہ بات آپ زری سے پوچھ لیجیے گا..." نگارش کترا گئی تھی اور عبداللہ کے ہاتھوں کی گرفت اس کے کندھوں پہ ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ اور وہ مرے مرے قدموں سے چلتا ہوا پلٹ کر کاریڈور میں لگے صوفے پہ بیٹھ گیا تھا۔

اس کے دماغ میں سائیں سائیں ہو رہی تھی' وہ باتیں اور وہ چیزیں جو اس نے پہلے کبھی نہیں سمجھی تھیں' اب وہی باتیں اور وہی چیزیں لمحے کے ہزارویں حصے میں ہی سمجھ آجاتی تھیں۔ شاید اس لیے کہ اب احساسات' حالات کی چوٹ اور ضربیں کھا کھا کر حد سے زیادہ حساس اور نرم ہو گئے تھے... نبیل یہاں کیوں آیا تھا...؟ کس وجہ سے آیا تھا...؟ کیا کہا تھا...؟ کیوں کہا تھا...؟ وہ یہ سب نہیں جانتا تھا' مگر نبیل کے جانے کے بعد زری کی منجمد حالت کسی منہ زور طوفان کی طرح بگڑ گئی تھی اور اس کی طبیعت کا بگڑنا سب کچھ واضح کر گیا تھا۔ اب مزید سوال و جواب کرنے کی یا پھر کچھ جاننے کی تو ضرورت ہی نہیں رہی تھی' اسی لیے تو اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر جھکا لیا تھا...

☆ ☆ ☆

دل سے دور دراز
دل سے دور دراز بسے ہے
دنیا دور دراز
اشک لہو میں گھل مل جائیں
سینہ سہک سہک سہلائیں
آنسو بے آواز
دور دور تک روح میں گونجیں خاموشی کے ساز
نہ جانے کس نقطے پہ جا کے کھلے غموں کا راز
ابھی تو ہے آغاز' نی امڑی' ابھی تو ہے آغاز
دنیا دور نہ جانے امڑی' دل سے دور دراز

آج نجانے کیا وجہ تھی کہ اس کا دل اداس تھا۔ اور اس اداسی کی وجہ سے طبیعت میں خاصی سستی گھلی ہوئی تھی وہ بے وجہ ہی ڈرائنگ روم میں دائیں سے بائیں ٹہلتے ہوئے چکر کاٹ رہا تھا۔ اور علیزے کچن سمیٹ کر باہر نکلی ہی تھی کہ ڈرائنگ روم میں مضطرب سے ٹہلتے دل آور کو دیکھ کر اس کے قدم رک گئے تھے اور عین اسی وقت دل آور کی بھی اس پہ نظر پڑی تھی اور وہ ٹھہر گیا تھا۔

"وہاں کیوں کھڑی ہو...؟ ادھر آجاؤ..." اس نے علیزے کو ڈرائنگ روم میں آنے کا اشارہ کیا تھا۔ اور علیزے بھی نجانے کس موڈ میں تھی کہ اس کے ایک اشارے پہ ہی چلتی ہوئی اندر آگئی تھی...

"بیٹھو...!" اس نے صوفے کی طرف اشارہ کیا...

وہ چپ چاپ صوفے پہ بیٹھ گئی تھی اور اس کے بیٹھنے کے بعد ذرا توقف سے وہ خود بھی اس کے برابر اور اس کے بے حد قریب ہی بیٹھ گیا تھا اور اپنا سر جھکا لیا تھا جس پہ علیزے نے سر اٹھا کر اپنے دائیں طرف بیٹھے دل آور کو دیکھا تھا وہ سفید شلوار سوٹ میں ملبوس ڈارک براؤن چادر کندھوں پہ پھیلائے' سر جھکائے بیٹھا عجیب ہی کیفیت کا شکار نظر آرہا تھا۔ مایوسی اور یاسیت اس کے انداز سے ہی ظاہر ہو رہی تھی۔ اور علیزے لاشعوری طور پہ ہی یہ جاننے کی منتظر ہو گئی تھی کہ آخر اسے ہوا کیا ہے...؟ وہ کیوں اتنا اداس اور مضطرب لگ رہا ہے...؟ مگر اسے یہ بھی پتا تھا کہ وہ اسے بنا پوچھے ہی سب کچھ بتا دے گا۔

اپنی اداسی اور اپنا اضطراب سب کچھ کھول کے سامنے رکھ دے گا' سوائے زری اور بتول شاہ سے جڑے ماضی کے اور علیزے تھی کہ کبھی چاہ کر بھی اس سے اس کے ماضی کے متعلق نہیں پوچھ سکی تھی۔ ہمیشہ سوال ہونٹوں پہ آکے دم توڑ دیتے تھے' حالانکہ اس کا دل بہت چاہتا تھا کہ وہ زری کے متعلق پوچھے' اور بتول شاہ کے متعلق سوال کرے' اس کے ماضی کو جانے' مگر اس نے کبھی اتنی جرات نہیں کی تھی کہ اپنی زبان پہ چلتے سوال اس کے سامنے رکھ دیتی... دل آور نے ہمیشہ جو بھی اس سے کہا تھا' جو بھی شیئر کیا تھا خود اپنی مرضی اور اپنی رضا سے کیا تھا۔ علیزے نے کبھی کریدنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اور اس وقت بھی ان کے درمیان یہی سچویشن چل رہی تھی' علیزے چپ تھی مگر کچھ سننا چاہتی تھی اور دل آور بھی خاموش تھا مگر کچھ کہنا چاہتا تھا۔ اور اسی کہنے اور سننے کے چکر میں کئی پل یونہی سرک گئے تھے اور بالآخر دل آور کی طرف سے ہی آغاز ہوا تھا...

"علیزے...! انسان جب اداس ہوتا ہے تو اس کے احساسات اور جذبات اتنے نرم کیوں ہو جاتے ہیں...؟ کیوں انسان پگھلے ہوئے موم کی طرح ہو جاتا ہے...؟ کیوں اسے کسی اپنے کے سہارے کی ضرورت محسوس ہونے لگتی ہے...؟ کیوں دل چاہتا ہے کہ کوئی سینے کو سہلائے اور دل پہ ہاتھ رکھے؟ کیوں نرم لمس کی طلب ستانے

لگتی ہے۔؟ اور کیوں انسان پھر بھی اکیلے کا اکیلا ہی رہتا ہے۔؟"
اس نے ذرا سی گردن موڑتے ہوئے علیزے کی طرف دیکھا تھا۔

"کیونکہ اداسی میں انسان کی ذات پہ چڑھے سارے خول اتر جاتے ہیں۔" علیزے نے انتہائی سنجیدگی سے جواب دیا تھا اور دل آور اس کے جواب پہ دنگ رہ گیا تھا اس کی بات واقعی سو فیصد درست تھی۔

"کبھی تمہارے ساتھ ایسا ہوا۔؟" اس نے مزید سوال کیا۔

"میرے ساتھ تو ہمیشہ ہی ایسا ہوتا ہے میں تو چوبیس گھنٹوں میں بیس گھنٹے اداس ہی رہتی ہوں اس لیے میری ذات پہ خول بھی ذرا کم ہی رہتا ہے۔" وہ ذرا تلخی سے مسکرائی تھی اور ایک بار پھر دل آور پہ نظر ڈالی تھی۔

"البتہ تمہاری بات الگ ہے تمہاری ذات پہ بیس گھنٹے خول ہی چڑھا رہتا ہے، صرف چار گھنٹے ایسے ہوتے ہیں۔ جن میں واقعی تم صرف تم ہی نظر آتے ہو اور ان چار گھنٹوں میں تم اگر مجھے بلاؤ بھی تو میں چپ چاپ آکر تمہارے برابر صوفے پہ بیٹھ جاتی ہوں کیونکہ مجھے پتا ہوتا ہے کہ اداسی کے ان چار گھنٹوں میں تمہاری ذات پہ کوئی خول نہیں ہوگا اور تم انا کے نہیں بلکہ پسپائی کے گھیرے میں ہوگے اور پسپا ہوئے شخص کی آنکھوں میں ایسا اثر ہوتا ہے کہ مقابل گھائل ہو جاتا ہے کسی بات سے انکار نہیں کرتا فوراً مان جاتا ہے۔ جیسے اکثر میں مان جاتی ہوں۔ یعنی تمہارے دیکھنے سے ہی گھائل ہو جاتی ہوں۔" علیزے کی باتیں اب گہرائی لیے ہوئے ہوتی تھیں اور دل آور سوچتا رہ جاتا تھا کہ یہ سب علیزے کہہ رہی ہے؟ وہ علیزے جسے بات کرتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا، وہ علیزے جو ہر وقت خوف کے حصار میں رہتی تھی، وہ علیزے جسے بات کرنا ہی نہیں آتی تھی۔ جو معصومیت اور ناسمجھی کا پیکر تھی۔

"تم اداس ہوتی ہو تو کیا دل چاہتا ہے تمہارا۔؟ کیا کرنے کی خواہش ہوتی ہے؟" دل آور ابھی بھی گردن ترچھی کیے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"دل چاہتا ہے تمہیں جان سے مار دوں۔" علیزے نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس کے علاوہ۔۔۔؟" وہ بڑے سکون سے پوچھ رہا تھا۔

"اپنے پاپا سے ملنے کو دل چاہتا ہے، دل چاہتا ہے ان کے سینے سے لگ کے بہت زیادہ روؤں۔۔۔" وہ بھی جو اس کے دل میں تھا سب صاف صاف بتا رہی تھی۔

"ہونہہ۔۔۔! یہ تو اسی وقت ہو سکتا ہے نا جب تم مجھے جان سے مار دو۔؟"

"اسی لیے چاہتی ہوں نا کہ تمہیں جان سے مار دوں، تمہیں مار دوں گی تو ان سے ملوں گی نا؟"

"تو پھر مار کیوں نہیں دیتیں۔؟" دل آور نے بے چینی سے کہا تھا۔ مگر علیزے جواباً چپ رہی تھی وہ بہت کچھ کہہ دیتی مگر کہنے کو دل نہیں چاہا تھا۔

"بولو نا علیزے۔۔۔! تو پھر مار کیوں نہیں دیتیں۔؟" دل آور نے پاس بیٹھی علیزے کا ہاتھ پکڑنا چاہا تھا مگر وہ اک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"علیزے۔۔۔!" دل آور نے اسے پیچھے سے آواز دی تھی لیکن وہ پھر بھی رکی نہیں بلکہ ڈرائنگ روم سے نکل کر سیڑھیاں چڑھ گئی تھی اور اس کا رخ بیڈ روم کی طرف نہیں اوپر چھت کی طرف تھا کیونکہ اسے پتا تھا کہ وہ اس کے پیچھے بیڈ روم میں ضرور آئے گا اس لیے وہ اوپر چھت پہ آگئی تھی۔ اور دل آور چند ثانیے کے لیے یونہی جوں کا توں بیٹھا رہ گیا تھا۔

پھر اچانک نجانے من میں کیا سمائی تھی کہ ایک جھٹکے سے وہ خود بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا اور اس کے پیچھے ہی باہر نکل آیا تھا لیکن اس کا رخ اپنے بیڈ روم کی طرف تھا، جہاں آکر اس نے اپنے بریف کیس سے اپنا ریوالور نکالا اور اس میں سے گولیاں چیک کرتے ہوئے بیڈ روم سے نکل کر اوپر چھت کی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا تھا۔

"علیزے۔۔۔!" اس نے چھت پہ پہلا قدم رکھتے ہی علیزے کو پکارا تھا اور ریلنگ پہ دونوں ہاتھ جمائے گھر کی بیک سائیڈ کی طرف دیکھتی علیزے نے اس کی آواز پہ ایک گہری سانس کھینچی تھی مگر پلٹ کر اسے دیکھا نہیں تھا۔

"علیزے۔۔۔! بات سنو میری۔۔۔" دل آور نے قریب آکر اسے بازو سے پکڑ کر جھٹکے سے اپنی سمت موڑا تھا۔

"تمہارا دل چاہتا ہے نا کہ تم مجھے جان سے مار دو۔؟ یہ لو۔۔۔ یہ پکڑو۔۔۔ اور مار دو مجھے۔۔۔" اس نے علیزے کے ہاتھ پکڑ کر ریوالور اس کے ہاتھ پہ رکھ دیا تھا اور علیزے ملگجے سے اندھیرے میں بھی اپنے ہاتھ پہ رکھے ریوالور کو دیکھ کر کانپ گئی تھی۔

"علیزے۔۔۔! دیکھ کیا رہی ہو۔۔۔؟ اپنا شوق پورا کرو، اور مجھے زندگی کے عذاب سے آزاد کر دو اور۔۔۔ اور۔۔۔ خود بھی آزاد ہو جاؤ۔" دل آور نے اسے کندھوں سے تھام کے جھنجھوڑا تھا۔

"علیزے۔۔۔! سوچو مت، میرا ریوالور لوڈڈ ہے، خالی کر دو اسے، میرا سینہ حاضر ہے۔" اس نے اسے ہر طرح

سے الگ سانے کی کوشش کی تھی۔ مگر علیزے اسے تھپڑ یا کوئی مکا تک نہیں مار سکتی تھی گولی مارنا تو بہت دور کی بات تھی۔

"ہونہہ۔۔۔! ضروری نہیں ہے کہ ہم جو چاہتے ہیں وہ کر بھی لیں' چاہت جیسی بھی ہو کب پوری ہوتی ہے بھلا۔۔۔؟" اس نے استہزائیہ سے انداز میں کہہ کر سر جھٹکا تھا۔

"مگر میں چاہتا ہوں کہ تم مجھ پہ وار کرو۔" دل آور نے عجیب جنون خیزی سے کہتے ہوئے اس کے ہاتھ میں پکڑے ریوالور کی نال اپنے سینے پہ رکھ لی تھی۔

"مگر میں اپنے ہاتھ تمہارے خون سے نہیں رنگنا چاہتی' تمہارا قتل میرے سر ہو گا۔"

"میں اپنا قتل تمہیں معاف کرتا ہوں' تم مجھے جبری رضا سے مار دو۔" وہ تو جیسے ابھی کھڑے کھڑے اس کے ہاتھوں مر جانے کے لیے تیار تھا۔

"میں تمہیں اپنی دعا سے مارنا چاہتی ہوں' میں دعا کرتی ہوں کہ تم مر جاؤ۔" علیزے نے انتہائی سفاکی کا مظاہرہ کیا تھا۔

"ہونہہ۔۔۔! علیزے یہ کیوں نہیں کہتیں کہ مجھے مارنے کے لیے تم میں حوصلہ نہیں ہے' ہمت نہیں ہے تم میں۔۔۔ تمہیں بھی اس پنجرے اور صیاد سے محبت ہو گئی ہے' اب اڑنا تم بھی چاہو تو اڑ نہیں سکتیں۔۔۔؟" دل آور نے اسے دونوں کندھوں سے تھام کے اس کے سامنے اس کے اندر کی کیفیت بیان کی تھی مگر علیزے اس کی بات پہ نظریں چرا گئی تھی۔

"میری مجبوری اور میری بے بسی کو میری محبت مت سمجھو ڈرائیور۔۔۔! مجھے اس پنجرے سے محبت ہو سکتی ہے لیکن اس صیاد سے نہیں۔" اس نے زہر خند سے لہجے میں کہتے ہوئے نفی میں سر ہلایا تھا اور دل آور نے اس کے انکار پہ اسے اپنے قریب کر لیا تھا۔

"میں بھی نہیں چاہتا کہ تم مجھ سے محبت کرو۔" اس نے بے حد بوجھل سے انداز میں کہتے ہوئے علیزے کو اپنے دونوں بازوؤں کے گھیرے میں لے لیا تھا۔ اور علیزے اس کے حصار پہ لرز اٹھی تھی۔ اس کا ایسا لمس علیزے کے لیے بالکل نیا تھا۔

"مگر میں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ تم میرے قریب رہو' میرے اتنے قریب کہ تمہارے دل کی دھڑکن میرے دل کی دھڑکن لگنے لگے۔" وہ اسے رفتہ رفتہ اپنے بازوؤں میں بھینچ رہا تھا اور اس کے بازوؤں میں لپٹ کر علیزے بالکل ہی چھپ گئی تھی' دل آور کے کندھوں اور بازوؤں پہ پھیلی چادر علیزے کو بھی ڈھانپ چکی تھی۔

"میں تمہیں محسوس کرنا چاہتا ہوں' میرے آس پاس رہا کرو۔" دل آور کی آواز بھیگنے لگی تھی اور علیزے نے اسے پیچھے ہٹانے کی ایک بھرپور سعی کی تھی۔

"پلیز علیزے۔۔۔ بس کچھ دیر۔۔۔" وہ جیسے التجا کر رہا تھا۔ وہ کسی احساس میں ڈوب رہا تھا' وہ پگھل رہا تھا۔ مگر ابھی دو چار منٹ ہی گزرے تھے کہ گھر کے گیٹ پہ نبیل کی گاڑی کا ہارن بجا تھا۔ اور دل آور کے بھٹکے بھٹکے اور بے بس سے اعصاب پھر سے ٹھکانے پہ آ گئے تھے۔ وہ چونک گیا تھا۔

"نبیل۔۔۔؟ اس وقت۔۔۔؟" وہ بے ساختہ علیزے سے الگ ہوا تھا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

☆ ☆

نبیلہ عزیز

دردِ دل

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نبیل حیات دو ہی بہن بھائی ہیں' مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے' وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پہ رنگ چکی ہے' جس کے پیش نظر فائزہ بیگم' نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں' لیکن مدحیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے' جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے' مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے' مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا' بے بسی اور مجبوری سے تنگ آ کر خود کشی کرنے کا سوچتا ہے' لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے یاور امتیاز مل جاتا ہے' جو اسے کام کی آفر کرتا ہے' جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے' اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے' وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے' وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آزر شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے' وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے' اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا' اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دلاتی ہیں۔

۳۷
سینتیسویں قسط

اور علیزے بھی یکدم چونک گئی تھی۔

"نبیل بھائی؟" اسے بھی کافی حیرت ہوئی تھی۔

"ہوں... وہی ہے... تم نیچے بیڈ روم میں چلو' میں اسے دیکھتا ہوں۔" دل آور اسے کہتے ہوئے بڑے پر سوچ اور پریشان سے انداز میں سیڑھیوں کی طرف بڑھا تھا۔ مگر نہ جانے کس خیال کے تحت وہ جاتے جاتے پھر رک گیا اور پلٹ کر دوبارہ علیزے کی سمت دیکھا۔ وہ وہیں کھڑی تھی جہاں دل آور نے اسے خود سے الگ کیا تھا۔ اس لیے وہ دوبارہ پلٹا اور اس کے قریب آگیا اور علیزے کے سامنے رکتے ہوئے اس کا خوب صورت اور دلنشین چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"میرے اندر کی اداسی اور میری ذات کی تنہائی کو میرے نفس کی کمزوری مت سمجھنا۔ میں نفس کے ہاتھوں کمزور اور مجبور ہونے والا انسان نہیں ہوں۔ میں نے تمہیں کبھی حاصل کیا بھی تو تمہاری مرضی' تمہاری رضا اور تمہاری اجازت سے کروں گا۔ تمہاری اجازت کے بغیر کبھی کچھ بھی نہیں ہوگا۔ تم بے فکر رہو' اتنا بے لگام بھی نہیں ہوں۔ اپنے نفس کو لگام ڈالنا اور اسے کھینچ کے رکھنا مجھے اچھی طرح آتا ہے۔ اس لیے جو بھی کروں گا' تمہاری چاہ سے اور رضا سے کروں گا۔ فی الحال ریلیکس رہو یو ڈونٹ وری اوکے۔" وہ بڑے تحمل اور بڑے ٹھہراؤ سے اسے ایک بھرپور تسلی سے نواز کر اس کے دونوں رخساروں کو اپنے ہاتھوں سے تھپکتا ہوا پلٹ گیا۔ لیکن چند قدموں کے فاصلے پہ جا کے پھر ٹھہر گیا اور ایک بار پھر علیزے کی طرف پلٹا اور اس کے انتہائی قریب آرکا۔

"اور ہاں... اپنے ذہن میں یہ بات' یہ سوچ کبھی مت لانا کہ میں شاید کسی اور کے تصور یا کسی اور کی طلب میں تمہارے قریب آتا ہوں۔ بلکہ یہ سوچنا کہ میں تمہیں اپنی ذات کا حصہ سمجھ کر تمہارے قریب آتا ہوں۔ کیونکہ کسی بھی انسان کی ذات کے بٹے ہوئے حصے اچھے نہیں ہوتے' اس طرح انسان بکھر کے رہ جاتا ہے۔ اسی لیے میں بھی یہ حصے سمیٹنا چاہتا ہوں' یکجا ہونا چاہتا ہوں۔ اس طرح بکھرا ہوا نہیں رہنا چاہتا اور سمیٹنے کے لیے ضروری ہے کہ میں تمہارے قریب آؤں۔ میاں' بیوی کی قربت ایک دوسرے کے لیے کالے جادو کی طرح ہوتی ہے۔ جتنا عمل تسلسل سے ہوگا' اتنا ہی اثر شدید ہوگا۔ لہٰذا میاں' بیوی کا ایک دوسرے کی قربت میں رہنا ہی بہتر ہوتا ہے۔"

اس وقت ان دونوں کے درمیان یہ لمحہ بہت ہی نازک لمحہ تھا۔ اس لیے دل آور نہیں چاہتا تھا کہ اس لمحے اس نازک سی لڑکی کے نازک سے جذبات کو کوئی ٹھیس پہنچتی یا اس کی سوچ کسی غلط سمت میں جاتی۔ اسی لیے وہ اتنی پریشانی اور عجلت بھرے احساس کے باوجود جاتے جاتے بھی بار بار ٹھہر رہا تھا۔

"تو پھر تم اداس کیوں تھے؟" علیزے کا سوال بہت زیادہ معصومیت لیے ہوئے تھا۔

"اپنی تنہائی کی وجہ سے' اپنے اکیلے پن کی وجہ سے' اپنی بالکل خالی اور سپاٹ زندگی کی وجہ سے' مگر جب تم پہ نظر پڑی تو خیال آیا کہ میں تنہا نہیں ہوں۔ میں اکیلا نہیں ہوں اور میری زندگی بالکل خالی نہیں ہے' کیونکہ اس میں تم میرے ساتھ ہو' ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔

اسی لیے دل چاہا کہ تمہارے وجود میں اپنے آپ کو تلاش کروں۔

تمہیں دل کی گہرائیوں سے چھو کر اور سینے میں چھپا کر محسوس کروں۔

کہ تمہارے دل میں' میں بھی دھڑکتا ہوں یا نہیں۔

مگر ابھی دل کی دھڑکن دھڑکنا شروع ہی ہوئی تھی کہ ایک دوسرے سے الگ ہونا پڑ گیا۔" دل آور کو جیسے افسوس ہوا تھا۔ مگر علیزے اسے ہنوز یک ٹک کھڑی دیکھ رہی تھی۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟" اس نے عجلت میں بھی سوال کر ڈالا تھا اور علیزے چہرے پر استہزا لے کر رہ گئی۔

"بتاؤ نا؟"

"ہونہہ... بس یہ دیکھ رہی ہوں کہ اس وقت واقعی تمہاری ذات پہ کوئی خول نہیں ہے یا میری غلط فہمی ہے؟"

علیزے اسے اس ملگجے سے اندھیرے میں بھی بغور دیکھ رہی تھی۔

"یہ تمہاری غلط فہمی نہیں ہے بلکہ یہ وہی چار گھنٹے ہیں جن میں کسی بھی انسان کی ذات پہ کوئی خول نہیں ہوتا اور اس وقت میری ذات پہ بھی کوئی خول نہیں ہے۔" دل آور نے واقعی اسے سچ بتایا تھا اور علیزے اس کے سچ پہ چپ ہو گئی تھی۔ لیکن اس سے پہلے کہ دل آور کچھ اور کہتا اتنے میں گل سیڑھیاں چڑھ کے اوپر آگئی۔

"صاحب... وہ نبیل صاحب اور مومنہ بی بی آپ سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔" گل نے آکر اطلاع دی تھی اور نبیل کے ساتھ ساتھ مومنہ بی بی کا سن کر دل آور تشویش سے ٹھٹکا تھا۔

"مومنہ بی بی بھی ساتھ آئی ہیں؟" وہ خود کلامی کے سے انداز میں کہتا ہوا پھر علیزے کی طرف متوجہ ہوا۔

"ٹھیک ہے' تم نیچے چلو' میں بھی جا رہا ہوں۔ گل تم علیزے بی بی کے ساتھ آجاؤ۔" وہ گل کو اشارہ کرتے ہوئے سیڑھیاں اتر کے نیچے چلا گیا تھا اور علیزے اس کی پشت دیکھتی رہ گئی۔

✡ ✡ ✡

"السلام علیکم!" بہرحال جو بھی تھا وہ ڈرائنگ روم میں بڑے سکون سے داخل ہوا تھا۔

"وعلیکم السلام!" نبیل جو ڈرائنگ روم کی مغربی دیوار پہ لگی ایک بہت ہی خوب صورت' مگر انتہائی اداس سا منظر پیش کرتی پینٹنگ دیکھ رہا تھا۔ دل آور کی آواز پہ فوراً اس کی طرف پلٹا اور اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے اس کے قریب آگیا۔

"آج بڑا دل چاہ رہا تھا کہ تمہیں گلے لگا کے ملوں۔ اس لیے دیکھ لو بے وقت چلا آیا ہوں۔" نبیل نے دل آور سے بغل گیر ہونے کے لیے خود ہی بازو پھیلا دیے تھے اور دل آور اس کی بات پہ حیران ہوتا اس کے گلے لگ گیا۔

"آج ایسی کیا بات ہوئی ہے کہ تمہارا گلے ملنے کو دل چاہ رہا تھا؟ اور تمہیں بے وقت آنا پڑا؟" دل آور نے گلے ملتے ہی سوال کیا۔ اتنے میں گل اور علیزے بھی سیڑھیاں اتر کر نیچے آگئی تھیں۔

"ذرا زور سے بھینچو' تاکہ مجھے پتا تو چلے کہ میں دل آور سے گلے مل رہا ہوں۔" نبیل کی باتیں ہی عجیب سی ہو رہی تھیں۔ دل آور نے فوراً ہی محسوس کیا۔

"کیوں ویسے یقین نہیں آرہا کہ تم دل آور کے گلے مل رہے ہو؟" دل آور نے اس سے الگ ہوتے ہوئے پوچھا تھا اور نبیل آہستگی سے مسکرا دیا۔

"یقین ہے یار... سب یقین ہے' تم پہ ہی تو یقین ہے۔" نبیل نے اس کا ہاتھ تھپکا۔

"کس بات کا؟" دل آور نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"اس بات کا صرف تم ہی تو ہو جو نبیل حیات کو سچے دل سے چاہتے ہو' اپنا سمجھتے ہو' اور اس کے لیے کچھ بھی کر گزرتے ہو' لیکن آج دیکھو میں بھی کچھ کر گزرا ہوں۔" نبیل نے مومنہ بی بی کی طرف اشارہ کیا اور دل آور اس کے اشارے پہ چونک گیا۔

"کیا مطلب؟ کیا کیا ہے تم نے؟" اس کے اتنے تشویش بھرے انداز پہ نبیل ایک بار پھر طنزیہ سا مسکرایا۔

"ارے ڈونٹ وری یار... ایسا بھی کچھ نہیں کیا میں نے' صرف نکاح کیا ہے اور نکاح کرنا کوئی بری بات تو نہیں ہے نا؟" نبیل نے بڑے ریلیکس سے انداز میں کہتے ہوئے لاپروائی ظاہر کی تھی۔

"کیا؟ نکاح؟" دل آور کے دماغ پہ چوٹ پڑی تھی اور اس نے کرنٹ کھا کے نبیل کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔۔۔ نکاح۔۔۔ میں نے مومنہ سے نکاح کرلیا ہے۔ گھر بسالیا ہے تمہاری طرح' مبارک دو مجھے۔" نبیل کی بات پہ دل آور کا چہرہ تاریک پڑگیا اور اسے یوں لگا جیسے اس کا پورا جسم نیلو نیل ہوگیا ہو اور اس کی ذات کھڑے کھڑے ریت کے ڈھیر میں تبدیل ہوگئی ہو۔ وہ ڈھے جانے کو تھا جب علیزے آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی اس کے پہلو میں آ کھڑی ہوئی اور اس کا کندھا دل آور کے بازو سے ٹچ ہوا تھا۔ جس پہ اس نے چونک کر خالی خالی نظروں سے علیزے کی سمت دیکھا۔ علیزے بھی نبیل کی بات پہ بہت شاکڈ نظر آرہی تھی۔

"نبیل؟" دل آور کے ہونٹ ذرا سے ہلے تھے۔

"ارے۔ اتنے حیران کیوں ہو رہے ہو؟ ابھی تو میں نے تمہیں ایک اور گڈ نیوز دینی ہے۔" نبیل بہت ہی ہلکے پھلکے اور فریش موڈ میں نظر آنے کی کوشش کررہا تھا۔

"گڈ نیوز؟" دل آور کے بس ہونٹ ہل رہے تھے۔ البتہ سمجھ کچھ نہیں آرہا تھا۔

"ہاں گڈ نیوز۔۔۔ عبداللہ کے حوالے سے ہے۔" نبیل نے بے حد آہستگی سے کہا۔

"نبیل یہ سب کیا کہہ رہے ہو؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا؟ میرا۔۔۔ میرا۔۔۔ دماغ۔۔۔ پھٹ رہا ہے۔" دل آور کی حالت اس وقت بہت ہی عجیب سی ہو رہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اس وقت کسی دلدل پہ کھڑا ہو اور لمحہ بہ لمحہ اس دلدل میں دھنس رہا ہو اور اس کے پاس اس سے بچنے کا کوئی راستہ نہ ہو۔

"میں مشکل زبان میں تو نہیں بتا رہا۔ آسان سی اردو ہے یار میری طرف سے گڈ نیوز تھی کہ میں نے آج چند گھنٹے پہلے مومنہ سے نکاح کرلیا ہے اور عبداللہ کی طرف سے یہ گڈ نیوز ہے کہ زری کو ہاسے ہوش میں آگئی ہے۔ وہ اب ٹھیک ہے۔" نبیل نے یکے بعد دیگرے دھماکے کرڈالے تھے اور دل آور اس کے ان دھماکوں سے دھجی دھجی بکھر گیا تھا جبکہ علیزے بری طرح چونک گئی۔

"کیا زری ہوش میں آگئی؟" علیزے کے چہرے پہ بے پناہ خوشی اُمڈی تھی اور اس نے بڑے بے ساختہ اور بڑے بے تاب سے انداز میں پوچھا تھا۔ جس پہ الٹا نبیل نے علیزے کو حیرانی سے دیکھا کہ وہ اتنی خوش کیوں ہو رہی ہے؟ اور علیزے بھی اس کے یہ حیرت آمیز تاثرات بھانپ گئی تھی کہ وہ اسے اس طرح کیوں دیکھ رہا ہے اور اس کی آنکھوں میں کیا سوال ہلکورے لے رہا ہے؟ اسی لیے پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ علیزے بے اختیار ہو گئی تھی۔

"زری میری دشمن نہیں ہے اور نہ ہی میرے لیے غیر ہے۔ زری میری اپنی ہے' میری کزن ہے' میرے ماموں کی بیٹی ہے۔ بہن ہے میری اور۔۔۔ اور عبداللہ بھائی' میرے ماموں زاد بھائی ہیں۔۔۔ میں ان کی پھوپھی آسیہ آفندی کی بیٹی ہوں۔ مجھے۔۔۔ مجھے اس بدنصیب کی خوشی نہیں ہوگی تو اور کس کو ہوگی؟ اس کے درد' اس کی تکلیف کی تڑپ مجھے نہیں ہوگی تو کیا آپ دونوں کو ہوگی؟ آپ دونوں۔۔۔ جو اپنے اپنے جذبات میں جل کر اپنے اپنے دلوں کی تسکین کے لیے نہ جانے کیا کیا کرتے پھر رہے ہیں۔ ہونہہ۔۔۔ کبھی کوئی لو میرج کرلیتا ہے اور کبھی کوئی کورٹ میرج اور پھر بھی دونوں کے دونوں پاک صاف اور نیک کے نیک۔ کمال ہے ہمیں تو پتا ہی نہیں تھا کہ محبت اس طرح بھی ہوتی ہے؟ ایسی محبت تو بندہ زندگی میں کئی بار کرلے اور پھر بھی ٹینشن فری رہے۔ آپ دونوں کی طرح آئندہ اگر کسی نے محبت کرنی ہوئی تو ان کو آپ دونوں کا ایڈریس میں دوں گی اور کہوں گی کہ محبت سے نبٹنے کے لیے نئے اور انوکھے طریقے سیکھنے کے لیے آپ کے پاس کلاسز لیں اور ماہر ہو جائیں' محبت کسی اور سے اور نکاح کسی اور سے کرنے میں۔ کیوں ہے نا سچی بات؟ کرنا چاہیے نا ایسا؟" علیزے نے نبیل کی حیرت دور کرتے کرتے ان دونوں کو اک ایسے کٹہرے میں کھڑا کردیا جہاں ان دونوں کے پاس چپ کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔

"کیوں نبیل بھائی؟ کچھ غلط کہا میں نے؟ غلط کہا ہے تو میں اپنی غلطی تسلیم کروں گی۔" علیزے نے نبیل پہ سوال داغا تھا اور ساتھ ہی اک نظر اپنے برابر کھڑے دل آور کو دیکھا تھا۔

"ہونہہ۔۔۔ آپ لوگوں نے محبت نہیں کی بس محبت کرنے کی کوشش کی ہے اور آپ اس کوشش میں ناکام ہوئے ہیں اس لیے اپنی اپنی جگہ پہ چپ سادھ کے بیٹھ گئے ہیں۔ البتہ جو اس کوشش میں کامیاب ہوئی ہے وہ اس وقت اسپتال کے بستر پہ پڑی آپ کی طرح نئی زندگی کے مزے نہیں لوٹ رہی۔" علیزے کے لہجے میں طنز' تمسخر اور کاٹ کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا۔ وہ دونوں حقیقتاً" کچھ نہیں بول پائے اور اپنی جگہ پہ کھڑے رہ گئے تھے۔

"بہرحال پھر بھی آپ کی اس کوشش پہ میں آپ کو داد دیتی ہوں اور کچھ نہ سہی' آپ نے کوشش تو کی ہے ورنہ میرے اور مومنہ جیسے لوگ تو یہ بھی نہیں کرتے۔" آج علیزے وہ لہجہ اور وہ زبان بول رہی تھی جس کا اسے ڈھنگ ہی نہیں آتا تھا اور سننے والے حیران ہو رہے تھے۔

"خیر! کوئی بات نہیں۔ جس نے برباد ہونا تھا وہ تو ہوگئی۔ آپ بیٹھیے نبیل بھائی آپ کی نئی زندگی کی شروعات کی خوشی میں میں آپ کو اپنے ہاتھوں سے بنی چائے پلواتی ہوں اور آپ کا منہ میٹھا کرواتی ہوں۔" علیزے کہتی ہوئی کچن کی طرف بڑھی۔

"نہیں بھابھی! اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ کافی وقت ہو رہا ہے ہمیں اب گھر چلنا چاہیے۔" نبیل کی آواز نے اس کے بڑھتے قدم روک دیے۔

"ٹائم؟ ہوں ٹائم تو واقعی کافی ہو رہا ہے مگر اب آپ آ ہی گئے ہیں تو بیٹھیے بھی' اتنی سی دیر میں کیا ہو جائے گا بھلا؟ صرف چائے ہی تو تیار کرنی ہے۔"

علیزے نے لاپروائی سے کندھے اچکائے تھے مگر نبیل بھلا اس وقت چائے پینے کی پوزیشن میں کب تھا؟ اس کی تو بھوک پیاس علیزے نے اڑا کے رکھ دی تھی۔

"نہیں! ہم چلتے ہیں اب بس یہ بے خبر تھا میں اسے خبر دینے کے لیے آیا تھا کہ کل کو یہ اعتراض نہ کرے کہ میں نے اسے بتایا نہیں۔ اب بتا دیا ہے اس لیے امید ہے کہ اسے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ لہٰذا اب اجازت چاہتا ہوں' آپ بھی آرام کریں' اللہ حافظ۔" نبیل دل آور کی طرف اشارہ کرکے کہتا ہوا مومنہ کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے نکل گیا اور وہ دونوں وہیں کھڑے دیکھتے رہ گئے۔

"مبارک ہو! نبیل حیات آپ کا دوست ہی نکلا۔" علیزے ایک اور طنزیہ نشتر پھینکتی ہوئی وہاں سے چلی گئی اور قدرت کی اس ستم ظریفی پہ دھواں دھواں ہونے والا دل آور شاہ وہیں کا وہیں صوفے پہ ڈھے گیا تھا!

☼ ☼ ☼

عدیل ابھی سونے کی نیت سے اپنے بستر پہ لیٹا ہی تھا کہ اس کی موبائل رنگ بجنے لگی اس نے سرہانے رکھا موبائل نکال کر دیکھا اس کی اسکرین پہ مدیحہ کا نمبر جگمگا رہا تھا۔

"مدیحہ؟" اسے اس وقت مدیحہ کی کال دیکھ کر سخت حیران ہوئی تھی۔ مگر اس حیرانی کے باوجود اسے فوراً" کال بھی ریسیو کرنی پڑی۔

"ہیلو!" اس کا ہیلو بھی حیرت لیے ہوئے تھا۔

"السلام علیکم!" مدیحہ نے بڑی مشکل سے سلام کی رسم نبھائی۔

"وعلیکم السلام! مدیحہ آپ ٹھیک تو ہیں نا؟" عدیل اپنے بستر پہ اٹھ بیٹھا تھا۔

"ہاں! میں ٹھیک ہوں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔" مدیحہ کی آواز کافی رندھی ہوئی سی لگ رہی تھی' جس پہ عدیل کو مزید تشویش ہوئی۔

"اس وقت؟" اس نے وال کلاک کی سمت دیکھا جہاں رات کے ساڑھے بارہ بجے کا ٹائم ہو رہا تھا۔

"ہاں اس وقت اور ابھی" مدحیہ نے کبھی بھی اس سے۔ اس طرح کی کوئی ضد نہیں کی تھی اور آج اگر کی تھی تو بہت ہی دوٹوک... اور سرکش سے انداز میں کی تھی جس پہ عدیل جز بز سا ہو گیا۔

"لیکن مدحیہ! ٹائم۔"

"عدیل پلیز! میں اس وقت تم سے ملنا چاہتی ہوں' صرف تم سے اگر نہیں مل سکتے تو پھر زندگی بھر نہ ملنا۔" مدحیہ نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا اور عدیل پریشان ہو اٹھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ کس طرح کی جذباتی اور جنونی قسم کی لڑکی ہے اگر وہ واقعی نہ گیا تو نجانے کیا کر بیٹھے؟ کیونکہ اس کے جنون کی ایک دو جھلک تو وہ پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔

"اف خدایا! نجانے کیا ہو گیا ہے اس لڑکی کو؟ اللہ خیر کرے سب خیریت ہی ہو۔" عدیل مجبوراً کمبل ہٹا کر اٹھا اور جوتے پہن کر کھڑا ہو گیا۔

موبائل جیب میں ڈالا اور جرسی پہن کر بائیک کی چابی اٹھاتا ہوا کمرے سے باہر نکل آیا۔

"کون ہے؟" باہر کھٹکے کی آواز پہ عابدہ خاتون نے فوراً اندر سے آواز دی تھی۔

"امی! میں ہوں۔ میں ذرا کام سے باہر جا رہا ہوں کچھ دیر میں آجاؤں گا۔" عدیل کافی عجلت میں لگ رہا تھا اور اس کی آواز پہ مریم بھی اپنے کمرے سے باہر آگئی۔

"اس وقت کہاں جا رہے ہیں آپ؟" مریم پہلے کی ڈری ہوئی تھی اسے وہ وقت یاد آگیا تھا جب پہلے بھی ایک بار یونہی عدیل کچھ دیر بعد آجانے کا کہہ کر گیا تھا مگر ایک بڑی مصیبت میں پھنس گیا تھا۔

"بس ایک کام سے جا رہا ہوں جلدی آجاؤں گا۔" وہ بائیک نکالنے کی غرض سے بائیک کی طرف بڑھا۔

"ایسا کون سا کام ہے؟ جو آپ کو یوں آدھی رات کو یاد آگیا ہے؟" مریم بھی اس کے پیچھے صحن میں نکل آئی تھی۔

"مریم! میں آکر بتاؤں گا پلیز۔" اس نے عجلت میں نکل جانا چاہا تھا۔

"نہیں! آپ اس طرح بتائے بغیر کہیں نہیں جائیں گے۔ جہاں بھی جانا ہے بتا کر جانا ہے۔" مریم نے انتہائی ضدی لہجے میں کہا تھا اور عدیل کو عجلت کے باوجود رکنا پڑ گیا تھا۔

"مجھے مدحیہ کی کال آئی تھی۔ وہ کچھ پریشان ہے' اس نے بلایا ہے' اس لیے جا رہا ہوں۔" اسے آخر بتانا ہی پڑا تھا۔

"مدحیہ کی کال۔۔۔؟ وہ بھی اس وقت؟" مریم بھی چونکی تھی۔

"ہاں! مجھے بھی تو اس بات کی پریشانی ہے کہ اس نے اس وقت کال کیوں کی اور کیوں بلایا ہے؟" عدیل کہہ کر بیرونی دروازے کا لاک کھولنے لگا۔

ہوں! ٹھیک ہے آپ جائیے لیکن پلیز گھر کے نمبر پہ میسج یا دو منٹ کی کال کر کے خیریت ضرور بتا دیجیے گا۔" مریم نے دروازہ کھول کر بائیک باہر نکالتے عدیل کو تاکید کی۔ اور اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اور ہاں! امی کو بھی بتا دینا' وہ بھی پوچھ رہی تھیں۔" وہ کہہ کے دروازہ عبور کر گیا تھا اور مریم دروازہ بند کر کے اندر آگئی۔

✲ ✲ ✲

وہ گاڑی کے اسٹیرنگ پہ سر رکھے بے آواز رو رہی تھی جب اچانک اس کے موبائل پہ رنگ بجی تھی اور اس نے چونک کر موبائل اٹھا لیا تھا۔

"ہیلو!" اس نے بے حد آہستگی سے ہیلو کہا تھا۔

"کہاں ہیں آپ؟ میں آرہا ہوں۔" عدیل شاید بائیک پہ تھا اس لیے ہینڈ فری کے ماؤتھ پیس سے اس کی آواز کے ساتھ ہوا کا شور بھی سنائی دے رہا تھا۔

"میں روڈ پہ ہوں اپنی گاڑی میں تمہارے گھر سے ذرا فاصلے پہ۔" مدحیہ نے اپنے آنسوؤں پہ تھوڑا سا کنٹرول کرتے ہوئے بتایا تھا۔

"کس سائیڈ پہ؟" عدیل نے اپنی بائیک کو بریک لگا دیے تھے۔

"لیفٹ سائیڈ پہ" مدحیہ اسے جگہ کا بتاتی گئی اور عدیل نے سیدھا اس کی گاڑی کے قریب آکر بریک لگائے تھے اور بہت تیزی سے اپنی بائیک سے اتر آیا۔ اور اتنے میں مدحیہ بھی اسے دیکھ کر گاڑی سے نیچے اتر آئی تھی۔

"مدحیہ! آپ ٹھیک تو ہیں! رات کے اس پہر آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟" عدیل کے لہجے میں بے پناہ تشویش تھی اور مدحیہ جو بار بار اپنے آنسوؤں کو کنٹرول کرنے کی کوشش کر رہی تھی اس کے اتنے پریشان کن اور اپنائیت آمیز سوال پہ بے ساختہ سر جھکانے پہ مجبور ہو گئی۔

"مدحیہ!" عدیل کو لحہ بہ لحہ مزید پریشانی اور تشویش ہو رہی تھی کیونکہ مدحیہ کا ایسا انداز' ایسا رویہ' ایسا روپ وہ پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا اس نے کبھی بھی اس طرح کا کوئی تجسس کری ایٹ نہیں کیا تھا۔ اور آج اگر کیا تھا تو اسے واقعی پریشانی گھیرے میں لے رہی تھی۔

"عدیل۔۔۔! ہم۔۔۔ ہمارا۔۔۔ گھر برباد ہو گیا ہے۔۔۔ تباہ ہو گیا ہے۔ ہمارے گھر میں تو پہلے ہی کوئی سکون اور کوئی خوشی نہیں تھی مگر اب۔۔۔ اب تو اور بھی ویرانی چھا گئی ہے۔۔۔ منحوس ہو گیا ہے ہمارا گھر۔" مدحیہ اس کے پکارنے پہ اس کی طرف پلٹتی ہوئی رو پڑی تھی اور عدیل نے اسے ناسمجھی سے سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

"مدحیہ پلیز! کیا ہوا آخر؟ آپ صاف صاف کیوں نہیں بتا رہیں؟ میرا پریشانی کے مارے دماغ ماؤف ہو چکا ہے۔" عدیل ذرا جھنجلا کے بولا تھا۔

"کیا بتاؤں۔۔۔؟ اور کس طرح بتاؤں؟ کچھ سمجھ نہیں آرہا مجھے۔ میرے۔۔۔ میرے۔۔۔ پاس الفاظ نہیں ہیں کہ میں اپنے گھر کی تباہی کا قصہ بیان کر سکوں۔ اور بتا سکوں کسی کو کہ یہ ہوا ہے ہمارے ساتھ۔" مدحیہ اپنی گاڑی سے ٹیک لگائے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر بے تحاشا رو رہی تھی۔

"نبیل صاحب اور آنٹی تو ٹھیک ہیں نا؟" عدیل کا پہلا خیال ان کی طرف ہی گیا تھا۔

"ہاں ہاں سب ٹھیک ہیں مگر سب کی قسمت خراب ہے اور جن کی قسمت خراب ہو وہ لوگ کبھی خوش نہیں رہ سکتے' وہ لوگ کبھی سکون سے نہیں رہ سکتے۔ اس لیے ہم لوگ بھی کبھی خوش نہیں ہو سکتے اور نہ ہی کبھی سکون سے رہ سکتے ہیں۔ سوچا تھا دل آور بھائی کے حوالے سے کوئی خوشی ملے گی مگر انہوں نے اپنی پسند سے بنا بتائے نکاح کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حیرت میں ڈال دیا اور ہم نے ساری امیدوں کا رخ نبیل بھائی کی طرف موڑ دیا تھا اور باقی رہ جانے والی امیدیں ان سے وابستہ کر لی تھیں مگر آج۔ آج انہوں نے بھی سب کچھ جلا کر راکھ کر ڈالا ہے آج انہوں نے بھی وہی جھنڈا لہرایا ہے جو دل آور بھائی نے لہرایا تھا۔ آج انہوں نے بھی نکاح کر لیا ہے۔" مدحیہ دکھ سے کہتے کہتے سسک رہی تھی' بلک رہی تھی اور عدیل دم بخود سا رہ گیا۔

"نبیل صاحب نے نکاح کر لیا؟ اتنا اچانک؟ مگر کیوں؟" عدیل کو واقعی دھچکا لگا تھا۔

"ہاں نکاح کر لیا ہے۔ وہ بھی ملک حق نواز کی ستائی ہوئی مومنہ بی بی کے ساتھ۔ جس کو انہوں نے پچھلے کافی عرصہ سے اپنے گھر میں پناہ دے رکھی تھی اور آج انہوں نے وہی گھر مومنہ بی بی کو سونپ دیا ہے' اپنا سب کچھ اسے دے دیا ہے سب کچھ۔۔۔ اپنا آپ بھی۔ زری کے لیے کچھ بھی نہیں چھوڑا' اس کا انتظار بھی نہیں کیا اور زری آج

ہوش میں بھی آگئی ہے' اور... اور... میں اس سے ملنے بھی نہیں جاسکی آخر... کس منہ سے جاتی اس کے سامنے؟ ہم لوگوں نے اسے دیا ہی کیا ہے بھلا؟ ہمیں اس کی پروا ہی کب ہے؟ ہم سب نے تو اسے جیتے جی مار ڈالا ہے... مار ڈالا ہے اسے۔" مدحیہ روتے روتے چیخ اٹھی تھی اور عدیل بے ساختہ گھبرا گیا۔

"مدحیہ پلیز! بس کریں۔ ہم لوگ اس وقت روڈ پہ کھڑے ہیں' لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے پلیز صبر سے اور حوصلے سے کام لیں۔" عدیل نے اسے تسلی دینی چاہی تھی۔

"صبر... کیسے کروں صبر۔ کس چیز کا صبر... بات صرف اتنی سی ہوتی تو شاید صبر بھی آجاتا مگر یہاں تو کوئی ایک نہیں' پورا گھر برباد ہوا ہے۔"

مدحیہ کا صبر و برداشت آج جواب دے چکے تھے اور وہ بات بات پہ بپھر رہی تھی' بلک رہی تھی۔

"پورا گھر... ؟ کیا مطلب؟ کیا ہوا ہے؟ کیا کوئی اور بھی مسئلہ ہے؟"

"عدیل... ! مسئلہ نہیں ہوا۔ مسئلے کی حد ہوگئی ہے۔ مما اور بابا میں ڈائیورس ہوگئی ہے۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے الگ ہوگئے ہیں۔ بابا نے گھر چھوڑ دیا ہے۔" وہ یونہی گاڑی سے ٹیک لگائے روتی ہوئی نیچے بیٹھ گئی۔ اور عدیل ایک اور انکشاف پہ دم بخود سا رہ گیا۔

"ڈائیورس؟" اس کی سماعتوں پہ یہ لفظ ہتھوڑے کی طرح برسا تھا اور اس پہ مدحیہ کی سسکیاں اور ہچکیاں الگ ضربیں لگا رہی تھیں۔

"اوئے ہوئے! یہاں کیا سین چل رہا ہے؟ سو رومینٹک یار۔" قریب سے ہی تین چار لڑکوں کی آوازیں اور معنی خیز سی سیٹیاں بجانے کی آوازیں سنائی دینے لگیں اور عدیل کو جیسے کرنٹ چھو گیا اس نے یکدم پلٹ کر ان لڑکوں کی طرف دیکھا تھا۔

"کیا بات ہے یار؟ کیا مان نہیں رہی؟" وکی نے آنکھ دباتے ہوئے انتہائی خباثت سے کہا اور عدیل کے تن بدن میں خون کی لہر دوڑ گئی وہ سر سے پاؤں تک غصے اور غضب ناکی سے سلگ اٹھا تھا۔

"یو شٹ اپ! تمیز نہیں ہے تم لوگوں کو؟ کون کیا کر رہا ہے تم لوگوں کو کیا تکلیف ہے آخر؟ اپنے کام سے کام رکھو اور دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" عدیل نے مدحیہ کے خیال سے ذرا ضبط سے کام لیتے ہوئے انہیں مناسب الفاظ میں وہاں سے جانے کا کہا تھا۔

"ارے یار! غصہ کیوں کرتے ہو؟ ہم تو بس اس لیے پوچھ رہے ہیں کہ اگر نہیں مان رہی تو ہم حاضر ہیں' پوری پوری ہیلپ کریں گے تمہاری اور حصہ آدھا آدھا۔" کامی نے وکی سے بھی زیادہ خباثت کا مظاہرہ کیا تھا اور عدیل کی برداشت کی حد ختم ہوگئی تھی۔

"تم گاڑی میں بیٹھو۔" اس نے مدحیہ کو انتہائی سختی اور آہستگی سے گاڑی میں بیٹھنے کا کہا تھا۔

"عدیل... ! آپ..." مدحیہ بھی اس کے تیور دیکھ کر رونا دھونا بھول گئی تھی۔ لیکن عدیل اتنے میں ان لڑکوں کی طرف پلٹ چکا تھا۔

"عدیل پلیز اسٹاپ اٹ! میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔ پلیز کوئی اور پریشانی کری ایٹ مت کریں۔" مدحیہ پیچھے سے اونچی آواز میں چیخی اور عدیل کے قدم نہ چاہتے ہوئے بھی رک گئے تھے کیونکہ اسے اچھی طرح اندازہ ہو چکا تھا کہ مدحیہ حقیقتاً" کتنی پریشان اور اپ سیٹ ہے۔ اس کے کسی بھی جذباتی اقدام پر کوئی بھی نیا مسئلہ کھڑا ہو سکتا تھا۔ مگر اس کے رک جانے پہ ان لڑکوں نے یکدم زوردار قہقہے لگاتے ہوئے ہوٹنگ کرنا شروع کردی۔

"واؤ! بڑا اثر رکھتی ہے یار تھوڑا سا ہم پہ بھی سہی کیوں جودت؟ کیا خیال ہے تمہارا؟" وکی نے اپنے خبیث خیالات میں اپنے ایک اور خبیث دوست کو شامل کیا تھا جو ان لوگوں سے بے زار اور اکتایا ہوا سا ذرا دور ان سے

ہٹ کے کھڑا تھا۔

"وکی پلیز! چھوڑ یہ تماشا چل یہاں سے۔" جودت نشے کے باوجود خاصی اکتاہٹ کا شکار نظر آرہا تھا۔

"ہونہہ! چھوڑنے کو دل ہی تو نہیں چاہ رہا۔ چیز ہی کچھ ایسی ہے' مل بانٹ کے کھانے والی۔" اس کا اشارہ مدحیہ کی طرف تھا اور عدیل کا ضبط جواب دے گیا وہ یکدم غصے سے پاگل ہوتا تیر کی سی تیزی سے ان لڑکوں کی طرف لپکا اور اس وکی نامی لڑکے کو گریبان سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔

"اوہ! تیری تو" اس نے عدیل کو کوئی گالی دینا چاہی تھی لیکن عدیل کے زوردار گھونسے نے اس کے منہ سے پھوٹنے والی گالی کو اس کے گلے میں ہی گھسا دیا تھا۔

"ارے یار! چوری اوپر سے سینہ زوری ایک تو رات کے اس پہر اتنی خوب صورت لڑکی کو ساتھ لے کر سڑکوں پہ رومینس کرتا پھر رہا ہے اور اوپر سے کسی کے ساتھ شیئر بھی نہیں کرتا۔" کامی بھی وکی کی خاطر اپنی شرٹ کے بازو فولڈ کرتا ہوا میدان میں کود پڑا تھا۔

"کیا تم لوگ اپنی منگیتروں' اپنی بیویوں اور اپنی ماں بہنوں کو دوسروں کے ساتھ شیئر کرتے ہو؟" عدیل نے اپنی طرف بڑھتے کامی کو بھی انتہائی زوردار دھکے سے نیچے پٹخ دیا تھا۔

"بے غیرت گھروں کے بے غیرت لوگ ہو تم۔" عدیل ان کو مارتے ہوئے دھاڑ رہا تھا اور اس کی بات پہ جودت کا میٹر بھی گھوم گیا پھر وہ تینوں تھے اور ان سے نبٹنے کے لیے وہ اکیلا تھا۔

"پلیز! چھوڑ دو اسے عدیل پلیز بس کرو۔" مدحیہ لپک کے پاس آئی تھی اور اس نے عدیل کے شکنجے میں دبوچے جودت کو چھڑانے کی کوشش کی تھی۔

جودت کی گردن کے گرد عدیل کا بازو کسی پھندے کی طرح لپٹا ہوا تھا اور جودت کی آنکھیں باہر کو ابل رہی تھیں۔

"اور کسی معاملے میں نہیں' صرف اتنی سی بات پہ تمہاری غیرت جاگ اٹھی ہے؟ حالانکہ غیرت نام کی تو کوئی چیز ہی نہیں ہے تم میں۔" عدیل جو منہ میں آرہا تھا وہ انہیں بکتا جا رہا تھا۔

"دیکھو چھوڑ دو اسے ورنہ ہم اسے نہیں چھوڑیں گے۔" وکی نے خونخوار سے لہجے میں کہتے ہوئے جھپٹ کر مدحیہ کا بازو پکڑ لیا اور عدیل مدحیہ کا بازو اس خبیث لڑکے کی گرفت میں دیکھ کر بے بس ہو گیا اور مجبورا" اس نے جودت کی گردن کو پرے جھٹک دیا تھا۔

"اب چپ چاپ جہاں سے آئے ہو وہاں چلے جاؤ۔ یہ لڑکی ہمارے ساتھ جائے گی یہی تمہاری سزا ہے۔" وکی اور کامی نے مدحیہ کے دونوں بازو اپنی اپنی گرفت میں دبوچ رکھے تھے اور عدیل کو وہاں سے چلے جانے کی وارننگ دی تھی مگر اس سے پہلے کہ عدیل کوئی اور طریقہ آزماتا اتنے میں دور سے ہی پولیس جیپ کے سائرن کی آواز سنائی دینے لگی اور مدحیہ نے ان لڑکوں کو پولیس کے خیال سے یکدم چونکتے دیکھ کر زور زور سے چلانا شروع کر دیا اور ان دونوں نے فورا" اس کے بازو چھوڑ دیے تھے کیونکہ سائرن کی آواز اور بھی قریب آتی جا رہی تھی۔

"جودت! چلو نکلو یہاں سے۔" وکی نے لپک کے جودت کو سنبھالا تھا۔

"وہ تو ہم نکل ہی رہے ہیں۔ مگر مسٹر عدیل اتنا یاد رکھنا غیرت اور بے غیرتی کا بڑا لمبا چوڑا حساب نکلتا ہے تمہاری طرف تیار رہنا ہم ایک چکر پھر لگائیں گے۔" جودت نے جاتے جاتے اسے وارننگ دی تھی اور عدیل نے ان کی طرف سے رخ ہی پھیر لیا تھا اور ان کے جاتے ہی پولیس جیپ بھی ان کے پاس سے زناٹے سے گزر گئی تھی۔ جبکہ مدحیہ اس نئے ہنگامے اور اس نئی مصیبت سے چکراتے ہوئے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے روتی ہوئی عدیل سے لپٹ گئی تھی۔

"مدیحہ!" عدیل اس کی اس بے بس اور بے اختیار سی حرکت پہ دھک سے رہ گیا تھا۔

"عدیل پلیز! یہ دنیا' یہ لوگ' یہ ماحول سب بہت گندے ہیں' بہت غلیظ ہیں مجھے نفرت ہوگئی ہے سب سے۔ ہر طرف ہوس ہی ہوس ہے' ہر کوئی نفس کا ستایا ہوا پھر رہا ہے۔ تمہارے جیسا کوئی بھی نہیں ہے پلیز مجھے اپنا لو' مجھے چھپا لو اپنی بانہوں میں۔ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھپ جانا چاہتی ہوں۔" وہ اس کے سینے سے لگی روتے ہوئے کہہ رہی تھی اور عدیل اس کی خواہش پہ سر سے پاؤں تک دھڑک اٹھا تھا اور اسی دھڑکن کی شدت سے ڈر کے اس نے مدیحہ کو فوراً" بہت نرمی اور بہت ہی احتیاط کے ساتھ خود سے الگ کر دیا تھا۔

"اس وقت بہت رات ہو رہی ہے مدیحہ! اور رات کے وقت گھر سے باہر رہنا لڑکیوں کے لیے مناسب نہیں ہوتا اس لیے پلیز اب تم گھر چلو۔ میں تمہیں ڈراپ کر دیتا ہوں تمہارے گھر والے بھی پریشان ہوں گے۔" عدیل نے اس کے کندھوں کو تھپکتے ہوئے اسے سمجھانے کی کوشش کی اور مدیحہ نے اس کی بات کے جواب میں سر جھکا دیا اس لیے عدیل نے گاڑی کا دروازہ کھول کے اسے فرنٹ سیٹ پہ بٹھایا کچھ دور ایک جنرل اسٹور تھا وہاں اس نے اپنی بائیک پارک کی اور مدیحہ کی گاڑی میں ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا تھا۔

☆ ☆ ☆

نبیل سخت بے چینی کے عالم میں گھر کے لان میں ٹہل رہا تھا۔

آج کا دن بہت ہی ہنگامہ خیز اور تباہ کن ثابت ہوا تھا۔ بہت کچھ دیکھتے ہی دیکھتے پلٹ کے رہ گیا تھا اور وہ سب خالی ہاتھ رہ گئے تھے۔ ہر کسی پہ کوئی نہ کوئی قیامت ٹوٹی تھی' اور کوئی نہ کوئی انکشاف پیش آیا تھا جس کی وجہ سے سب کے دل و دماغ ہی زلزلے کی زد میں تھے اور کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ آخر یہ سب اتنا اچانک کیسے ہو گیا؟

فائزہ بیگم اپنے بیڈ روم میں بند تھیں۔

مومنہ نبیل کے بیڈ روم میں اکیلی بیٹھی اپنی قسمت پہ حیران پریشان ہو رہی تھی۔

مدیحہ نجانے کب سے گھر سے نکلی تھی اور ابھی تک نہیں آئی تھی۔

اور نبیل لان میں ٹہلتا ہوا ہر طرف سے سوچوں میں گھرا قطرہ قطرہ موم کی طرح پگھل کر ختم ہو رہا تھا۔ لیکن ابھی پوری طرح سے پگھل کر ختم نہیں ہوا تھا کہ باہر گیٹ پر مدیحہ کی گاڑی کا ہارن بجا تھا۔ نبیل نے بے ساختہ اپنی گھڑی میں ٹائم دیکھا رات کے سوا دو بجے کا ٹائم ہو رہا تھا نبیل کو ٹائم دیکھ کر سخت خفگی محسوس ہوئی اور وہ چوکیدار کے گیٹ کھولنے تک خود بھی ڈرائیو وے کے قریب آ گیا تھا۔ لیکن مدیحہ کے بجائے کسی اور کو ڈرائیونگ سیٹ پہ دیکھ کر نبیل کا رنگ متغیر ہو گیا تھا۔ اور اتنے میں گاڑی عین اس کے سامنے آ رکی اور اگلے دو سیکنڈ میں اس کے شوروم کا منیجر عدیل عمر نیازی مدیحہ کی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ سے اتر کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

"السلام علیکم! سر کیسے ہیں آپ؟" عدیل نے بے حد شائستگی سے سلام کرتے ہوئے نبیل کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بھی بڑھایا' نبیل نے بہت مرے مرے انداز میں تھام کر سلام کی رسم نبھائی تھی۔

"ہوں! ٹھیک ہوں۔" اس کا لہجہ اور اس کی آواز بھی جیسے کہیں دب چکے تھے۔

"سر! میں آپ کی فیلنگز اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں کیونکہ میرے گھر میں بھی بہنیں ہیں۔ ایک نہیں بلکہ پانچ پانچ بہنیں ہیں اس لیے بہت اچھی طرح اندازہ ہے کہ بہنوں کے معاملے میں آدمی کی فیلنگز اور سوچیں کیا ہوتی ہیں؟ کتنی فکر ہوتی ہے ان کے حوالے سے؟ انسان بہت ہی حساس ہو جاتا ہے' لیکن پھر بھی میں آپ کی تسلی کے لیے اتنا ضرور بتا دینا چاہتا ہوں کہ آپ کی بہن' آپ کی عزت ہر طرح سے محفوظ ہے۔ آپ کی عزت سر آنکھوں پہ میں جتنا آپ کا احترام کرتا ہوں اتنا ہی مس مدیحہ کا احترام بھی کرتا ہوں' اس لیے پلیز آپ اس وقت کچھ بھی غلط مت سوچیے گا۔ مس مدیحہ کچھ پریشان تھیں' ڈپریشن کا شکار تھیں' رو رہی تھیں کہ وہیں کچھ آوارہ لوفر لڑکوں سے ٹکراؤ ہو گیا اور مجبوراً" بڑی مشکل سے بچاؤ کے بعد مجھے ان کو گھر ڈراپ کرنے کے لیے آنا پڑا۔ اور مجھے خوشی ہے کہ میں نے انہیں خیریت سے باحفاظت ان کے گھر پہنچا دیا ہے اور مجھے آپ کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا پڑا۔"

عدیل نیت کا سچا کھرا تھا اس لیے اس نے بات بھی سچے اور کھرے طریقے سے کی جس پہ نبیل کے دل و دماغ پہ اتر آنے والا بوجھ خود بخود ہی کہیں دور ہٹ گیا اور وہ اندر ہی اندر ریلیکس ہو گیا تھا۔

"تھینک یو ویری مچ۔! تمہارے خیالات جان کر بہت خوشی ہوئی ہے مجھے۔ اگر ہر مرد ایسی ہی سوچ رکھنے لگے تو یہ دنیا غلاظت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پاک اور صاف ہو جائے گی پھر میرے جیسے کسی بھی بھائی کو اس طرح کی کوئی ٹینشن نہیں ستائے گی۔" نبیل نے عدیل کا کندھا تھپکتے ہوئے اسے سراہا تھا اور خوشی کا اظہار کیا تھا۔

"اوکے سر! مجھے اجازت دیجیے میں اب چلتا ہوں۔ میرے گھر والے بھی پریشان ہو رہے ہوں گے۔" عدیل نے اس سے اجازت طلب کی تھی۔

"لیکن گھر جاؤ گے کیسے؟ تمہارے پاس تو نہ گاڑی ہے نہ بائیک اور اس وقت تو کہیں سے کوئی سواری بھی نہیں ملے گی؟" نبیل کو فکر ہوتی تھی۔

"ڈونٹ وری سر! کوئی نہ کوئی سبب بن ہی جائے گا۔" عدیل نے اسے ریلیکس کرنا چاہا۔

"سبب بنائیں تو بنتا ہے نا؟ تم ٹھہرو' میں ڈرائیور سے کہتا ہوں وہ تمہیں ڈراپ کر دیتا ہے۔" نبیل کہہ کر سرونٹ کوارٹرز کی طرف پلٹ گیا اور عدیل اسے روکتا رہ گیا' مگر وہ نہیں رکا تھا۔

"تھینک یو!" عدیل اپنے دھیان میں سر جھکائے کھڑا تھا جب مدیحہ آہستگی سے گاڑی سے اتر کر اس کے برابر ہی آ کھڑی ہوئی اور عدیل نے چونک کر اس کی سمت دیکھا اس کا سر جھکا ہوا تھا۔

"تھینکس؟ مگر کس لیے؟" عدیل نے اس کے جھکے ہوئے سر کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"مجھے باحفاظت گھر پہنچانے کے لیے۔" وہ بہت ہی دھیمے لہجے میں بولی۔

"ہونہہ....! آپ کو کیا پتا کہ میں نے کس کو باحفاظت گھر پہنچایا ہے؟ آپ کو یا اپنے آپ کو؟" وہ کہتے ہوئے مبہم سا مسکرایا اور مدیحہ اس کی بات کا مفہوم سمجھ کر بات بدل گئی تھی۔

"آپ کو کوئی چوٹ تو نہیں آئی؟" اسے اندازہ تھا کہ جتنی چوٹیں ان لڑکوں کو آئی تھیں اتنی ہی عدیل کو بھی آئی تھیں۔ آخر وہ تین تھے اور وہ اکیلا۔

"آئی تو ہے مگر اب مرہم کون لگائے؟ آپ سے تو مرہم کی امید بھی نہیں کر سکتا کیونکہ آپ نے تو پہلی بار گھر آئے مہمان کو چائے کا بھی نہیں پوچھا اور اتنی سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے گھر بھیج رہی ہیں۔" عدیل نے جان بوجھ کر اسے چھیڑنے کے لیے شکوہ کیا تھا اور مدیحہ اپنی اس کوتاہی پہ یک دم سر اٹھا کر دیکھنے پہ مجبور ہو گئی تھی اور عدیل اس کے اس طرح دیکھنے پہ بے ساختہ ہنس پڑا۔

"تھینک یو! میں نے پی لی چائے۔" اس نے مدیحہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ذومعنی بات کہی اور مدیحہ نے شرم سے جھجکتے ہوئے پلکیں جھکا لی تھیں۔

"لو ڈرائیور آ گیا ہے۔" نبیل ڈرائیور کو اپنے ساتھ ہی لے کر آیا تھا اور نجانے کیوں مدیحہ اور عدیل کو ایک ساتھ برابر کھڑے دیکھ کر نبیل کے قدم ذرا سے توقف کے لیے ٹھہرے تھے اور اک خیال تھا جو اس کی عقل کو چھو کے گزر گیا تھا مگر وہ اس پہ کچھ بول نہیں سکا بس دل ہی دل میں سوچتا رہ گیا۔

"اوکے سر! اللہ حافظ۔" عدیل اس سے ہاتھ ملانے کے بعد ان دونوں کو خدا حافظ کہہ کر گاڑی میں بیٹھا اور وہاں سے رخصت ہو گیا تھا مگر نبیل کے لیے اک نئی سوچ چھوڑ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ ابھی سو کر اٹھا بھی نہیں تھا کہ اس کا موبائل بجنا شروع ہو گیا۔ اس نے فون اٹھا کر دیکھا کوئی اجنبی سا نمبر تھا اس لیے مجبوراً" اسے کال ریسیو کرنا پڑی تھی۔

"السلام علیکم!" اس نے بڑے شائستہ لہجے میں سلام کیا تھا کیونکہ یہ اس کی عادت تھی۔

"ملک اسد اللہ بات کر رہا ہوں۔" دوسری طرف سے بہت ہی نپی تلی سی آواز سنائی دی تھی اور دل آور کے ماتھے پہ بل پڑ گئے کیونکہ وہ جان گیا تھا کہ اس نے کال کیوں کی ہے۔

"جی کہیے بات! میں سن رہا ہوں۔" دل آور کا لہجہ اس سے بھی زیادہ سخت اور سپاٹ ہو چکا تھا۔

"تم جانتے ہو کہ کل ملک حق نواز کے کیس کی آخری پیشی ہے اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ تم کل عدالت نہ جاؤ۔" ملک اسد اللہ نے وہی بات کہی تھی جس کی دل آور کو امید تھی۔

"وجہ؟" اس نے یک لفظی سوال داغا۔

"وجہ یہ ہے کہ تمہارے جانے سے ملک حق نواز کو سزا ہو گی۔"

"پھر تو مجھے کل ہر حال میں جانا چاہیے نا؟ کیونکہ آخر انصاف بھی تو کوئی چیز ہے۔" دل آور نے تمسخر سے کہا تھا۔

"دیکھو دل آور شاہ! ہم چاہتے تھے کہ تم سے بات کر کے معاملہ سلجھا لیں مگر لگتا ہے کہ معاملہ اس طرح نہیں سلجھے گا ہمیں اپنے رنگ میں آ کر اپنا آپ دکھانا ہو گا۔" ملک اسد اللہ کے لہجے میں سراسر دھمکی تھی اور وہ تھا کہ دھمکیوں سے ڈرنا ہی نہیں تھا۔

"آپ نے میرا رنگ بھی نہیں دیکھا ملک اسد اللہ صاحب! میں نے مومنہ بی بی سے وعدہ کیا تھا کہ اسے انصاف ضرور ملے گا اور میں اسے یہ انصاف دلا کر ہی رہوں گا چاہے مجھے اپنی جان پہ کیوں نہ کھیلنا پڑے۔" دل آور بھی اپنی بات کا اور اپنی ضد کا کتنا پکا ہے؟ یہ ملک اسد اللہ بھی اچھی طرح جانتے تھے اسی لیے ذرا نرمی اختیار کر لی تھی۔

"دیکھو! ہم مومنہ بی بی کو اپنانے کے لیے تیار ہیں۔ ہم ملک حق نواز کا نکاح پڑھوا دیں گے اس کے ساتھ۔" ملک اسد اللہ نے نیا راستہ اختیار کیا تھا اور اک نئی چال چلی تھی۔

"آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ مومنہ بی بی کا نکاح ہو چکا ہے اور اس کا شوہر اتنی حیثیت ضرور رکھتا ہے کہ آپ لوگوں سے ٹکر لے سکے اس لیے ملک حق نواز کی بخشش کا خیال دل سے نکال دیں۔ وہ ذلیل انسان اب تمام عمر جیل میں ہی سڑے گا کیونکہ اس نے ایک مومنہ بی بی کی نہیں بلکہ کئی اور عورتوں اور لڑکیوں کی عزت بھی تباہ کی ہے اور اب وقت ہے کہ خدا کی طرف سے اس پہ عذاب نازل ہو۔" دل آور خاصا چبا چبا کے بول رہا تھا اور ملک اسد اللہ اس نئے انکشاف پہ دنگ رہ گیا تھا۔

"اللہ حافظ ملک صاحب کل عدالت میں ملاقات ہو گی۔" دل آور نے فون بند کرنا چاہا تھا۔

"ٹھہرو دل آور شاہ!" ملک اسد اللہ نے یک دم اسے روکا تھا۔

"کہیے؟" وہ رک گیا۔

"تمہارا آخری فیصلہ کیا ہے؟" ملک اسد اللہ نے اس کا حتمی فیصلہ جاننا چاہا تھا۔

"میرا آخری فیصلہ ملک حق نواز کی سزا ہے' میرا آخری فیصلہ مومنہ بی بی کا انصاف ہے اور میرا آخری فیصلہ کل عدالت جانا ہے اور اس کام سے مجھے اللہ کی پاک ذات کے علاوہ دنیا کی کوئی اور طاقت نہیں روک سکتی اور امید ہے کہ میری یہ بات آپ لوگوں کے ذہن میں کافی اچھی طرح بیٹھ چکی ہو گی۔ اس لیے اب اللہ حافظ۔" اس نے پھر

فون بند کرنے کی کوشش کی تھی۔

"رکو دل آور شاہ! دیکھو ایک بار پھر سوچ لو' ہمارے پاس فیصلے کی گھڑی بس یہی ہے' اس کے بعد نہ ہم تم سے کچھ کہیں گے اور نہ ہی تمہیں سننے کی زحمت اٹھانا پڑے گی۔" ملک اسد اللہ نے اسے وقت دینا چاہا تھا۔

"میں نے جو کچھ بھی کہا ہے سوچ سمجھ کر ہی کہا ہے۔ اس لیے اب آپ بھی سمجھ جائیے" وہ ہنوز دوٹوک بات کر رہا تھا۔

"او کے دل آور شاہ! رب راکھا۔" ملک اسد اللہ نے کہہ کر خود ہی فون بند کر دیا اور دل آور نے اپنا موبائل بند ہوتے ہی بیڈ پہ اچھال دیا اور خود اٹھ کر وارڈ روب کھول لی تھی۔

"کیا ڈھونڈ رہے ہو؟" اپنا موڈ آف ہونے کے باوجود اسے وارڈ روب میں موجود کپڑوں کو الٹ پلٹ کرتے دیکھ کر علیزے رہ نہیں سکی تھی اور بالآخر پوچھ ہی لیا تھا۔

"اپنا آف وائٹ شلوار سوٹ۔" دل آور بہت بے زار کن لہجے میں بولا تھا۔

"کیوں؟ شلوار سوٹ کیوں؟ تم نے کورٹ نہیں جانا؟" علیزے کو حیرت ہوئی تھی کیونکہ وہ صبح کے وقت شلوار سوٹ ذرا کم ہی پہنتا تھا۔

"نہیں! مجھے کہیں اور جانا ہے۔" اس نے ذرا ٹھہرتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"کہاں؟" وہ بے ساختہ پوچھ بیٹھی۔

"قبرستان!" دل آور کا جواب چونکا دینے والا تھا۔

"کیا؟ قبرستان؟ مگر کیوں؟" علیزے ٹھٹک گئی تھی اور دل آور اس کے سوال پہ دھیما پڑ گیا تھا۔

"اپنے ماں باپ سے ملنے اپنوں سے ملنے۔" اس کا لہجہ بہت ہی نرم اور بہت ہی پگھلا ہوا سا لگنے لگا تھا۔

"کیوں؟ یوں صبح صبح اٹھتے ہی کیسے خیال آ گیا ان کا؟" علیزے کا نجانے کیوں بار بار اس سے سوال کرنے کو دل چاہ رہا تھا۔

"رات کو خواب میں دیکھا تھا ان کو' اماں بہت رو رہی تھیں اور بابا بھی اداس تھے اس لیے آج میں نے سب سے پہلا کام یہی کرنا ہے کہ ان سے ملنے کے لیے جانا ہے۔ باقی کے کام بعد میں ہوتے رہیں گے۔" دل آور کا اپنا لب و لہجہ بھی کافی اداس لگ رہا تھا۔ اور علیزے کچھ کہتے کہتے رک گئی مگر وہ بھانپ چکا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے۔

"کہو؟ کیا کہنا چاہتی ہو؟" دل آور نے اسے کہنے پہ اکسایا۔

"نہیں! کچھ نہیں۔" وہ نفی میں سر ہلاتی ہوئی آگے بڑھ آئی اور وارڈ روب کے لاسٹ والے حصے سے دل آور کا آف وائٹ کھدر کا سوٹ نکال کر اس کے سامنے کر دیا تھا۔

"پلیز علیزے! جو کہنا چاہتی ہو وہ صاف صاف کہہ دو' میں کوئی اعتراض نہیں کروں گا۔" وہ بہت اداس' مایوس اور ملول سا لگ رہا تھا۔ علیزے زیادہ دیر چپ نہیں رہ سکی۔

"کیا میں بھی تمہارے ساتھ قبرستان جا سکتی ہوں؟ تمہارے بابا وغیرہ کی قبروں پہ فاتحہ خوانی کے لیے؟" علیزے نے بہت آہستگی سے پوچھا اور اس کا سوال ایسا تھا کہ دل آور اسے منع نہیں کر سکتا تھا۔

"کیوں؟ تم کیوں جانا چاہتی ہو؟"

"کیونکہ آج مجھے بھی اپنے مما اور پاپا بہت یاد آ رہے ہیں۔ آج اگر وہ نہیں مل سکتے تو تمہارے اماں اور بابا سے مل لیتی ہوں میرے لیے تو وہ بھی مما اور پاپا جیسے ہی ہیں نا؟" علیزے کی بات پہ دل آور نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

"مما اور پاپا جیسے؟" اس نے زیرلب بڑبڑا کے کہا تھا۔

"ہاں! مما اور پاپا جیسے کیونکہ وہ تمہارے مما اور پاپا ہیں' اس لیے میرے لیے بھی تو وہ مما اور پاپا ہی ہیں نا۔" اور علیزے کی بات پہ دل آور اسے دیکھتا رہ گیا تھا کہ اس نے کتنی اپنائیت بھری اور کتنی گہری بات کہی تھی۔

"کیا بات ہے؟ کیا میں نہیں جا سکتی؟" اس نے دل آور کو چپ دیکھ کر دوبارہ پوچھا۔

"نن... نہیں... ! ایسی بات نہیں ہے' میرے کپڑے چینج کرنے تک تم بھی تیار ہو جاؤ۔ تھوڑی دیر میں نکلتے ہیں۔" دل آور اسے کہہ کر وہاں سے ہٹ گیا تھا اور علیزے کے چہرے پہ ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔

اسے دل آور کے بابا اور بتول شاہ کی قبروں پہ جانے کا سوچ کر بہت اچھا فیل ہوا تھا۔ اسی لیے وہ جلدی سے چینج کر کے بڑی سی سیاہ رنگ کی چادر اوڑھ کر فوراً" تیار ہو گئی اور وہ دونوں باقاعدہ باوضو ہو کر گھر سے نکلے تھے۔

"کیا قبروں پہ چڑھانے کے لیے پھول بھی مل جائیں گے؟" علیزے نے ڈرائیو کرتے دل آور کے چہرے کی سمت دیکھا تھا۔

"ہاں مل جائیں گے۔" اسے اس کی تسلی کے لیے جواب دینا ہی پڑا تھا۔

"کیا زری کی قبر پہ چڑھانے کے لیے بھی پھول مل جائیں گے؟" اس نے اک اور تیر پھینکا۔

"علیزے!" دل آور نے لب بھینچ لیے تھے۔

"تو اس میں غلط کیا ہے بھلا؟ زری بھی تو تقریباً" مر ہی چکی ہے نا؟ کیا ہوا جو وہ بے ہوشی سے ذرا ہوش میں آ گئی ہے؟" علیزے بڑی ریلیکس نظر آ رہی تھی۔

"تم مجھے ٹارچر کرنا چاہتی ہو نا؟" دل آور نے بڑے ضبط کا مظاہرہ کیا تھا۔

"نہیں! میں زری کو اس کا حق دلانا چاہتی ہوں' تم سے اس معاملے کو لے کر علیزے اور زری میں انصاف کروانا چاہتی ہوں' دیکھنا چاہتی ہوں کہ تم کتنے انصاف پرست آدمی ہو۔" علیزے نے اسے چیلنج کیا تھا اور دل آور نے ایک گہری سانس کھینچی تھی جیسے اس نے بھی کوئی ارادہ باندھ لیا ہو۔

"ٹھیک ہے! آج تمہیں جس چیز کا یقین نہیں ہے' اس چیز کا یقین دلاتا ہوں' لیکن یہ یقین تمہیں زندگی میں پہلی بار اور آخری بار دلاؤں گا' اس کے بعد زندگی میں کبھی بھی مجھ سے کسی ایسے یقین کی امید مت رکھنا آؤ میرے ساتھ۔" دل آور نے بہت ہی پتھریلے اور سپاٹ سے انداز میں کہتے ہوئے قبرستان کے باہر والے ایریا میں اک جھٹکے سے گاڑی کو بریک لگائے تھے اور گاڑی سے اتر آیا مجبوراً" اس کے پیچھے علیزے کو بھی اترنا پڑا اور دل آور اس کے اترتے ہی پھول خریدنے میں لگ گیا۔ تازہ پھولوں کے دو الگ الگ شاپر لینے کے بعد وہ واپس اس کی طرف پلٹ آیا۔

"یہ لو یہ زری کی قبر پہ چڑھانے کے لیے اور یہ اماں اور بابا کی قبروں پہ چڑھانے کے لیے ہیں۔" اس نے دونوں شاپر علیزے کو تھما دیئے اور علیزے نے چپ چاپ تھام بھی لیے تھے۔

"آؤ۔" وہ کہتے ہوئے قبرستان کے چھوٹے سے جالی دار سبز رنگ کے گیٹ کی طرف بڑھا۔ مگر ابھی قبرستان کے اندر داخل ہوا ہی تھا کہ اس کا موبائل دوبارہ بجنے لگا۔ اس نے موبائل نکال کر دیکھا ایس پی کامران مہدی کی کال تھی۔ مگر وہ قبرستان میں کھڑے ہو کر فون نہیں سننا چاہتا تھا اس لیے اس نے ایس پی کامران مہدی کی کال ڈس کنیکٹ کر دی مگر اس کے ڈس کنیکٹ کرنے کے باوجود ایس پی کامران مہدی نے دوبارہ کال کی تھی اور دل آور نے دوبارہ ڈس کنیکٹ کر ڈالی تھی بلکہ اور تو اور موبائل کو سائلنٹ پہ لگا کر واپس جیب میں رکھ لیا تھا اور علیزے کا ہاتھ پکڑ کر اونچی نیچی جگہوں سے گزرتا ہوا تقریباً" قبرستان کے وسط میں آ گیا اور ایک ساتھ بنی تین قبروں کے پاس رک گیا۔

”یہ ہے میرے بابا کی قبر۔“ اس نے سب سے پہلے قبر کی طرف اشارہ کیا۔

”بابر شاہ ولد منصور حسین شاہ!“ علیزے نے ان کا نام پڑھا تھا اور منصور حسین شاہ کے نام پہ دل آور کے چہرے کی طرف دیکھا جو دکھ اور اذیت سے دھوئیں کی طرح ہو رہا تھا۔

”یہ ہے میری اماں کی قبر۔“ اس نے دوسری قبر کی طرف اشارہ کیا۔

”بتول شاہ ولد منصور حسین شاہ۔“ علیزے بتول شاہ کا نام پڑھ کر دنگ رہ گئی تھی۔

”بتول شاہ ولد منصور حسین شاہ۔“ اس نے دوبارہ اور پھر سہ بارہ پڑھا تھا۔

”بتول شاہ ولد منصور حسین شاہ۔“ اس کے لب بار بار ہل رہے تھے مگر حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔

”ڈرائیور!“ وہ جیسے کسی پاتال سے بولی تھی۔

”ہاں! یہ سچ ہے' یہ حقیقت ہے' بتول شاہ میری ماں سہی لیکن قبر کے اس کتبے پہ اگر میری پھوپھی بن جاتی ہیں کیونکہ وہ میرے بابا کی سگی بہن تھیں۔ لیکن میرے لیے میری ماں تھیں۔ آج بھی' کل بھی اور قیامت کے روز بھی وہ میری ماں ہی رہیں گی۔ وہ میری ماں کی حیثیت سے اور میں ان کے بیٹے کی حیثیت سے پہچانا جاؤں گا۔“ دل آور نے بڑے مضبوط لہجے میں اعتراف کیا' مگر علیزے کے قدموں تلے سے زمین سرک گئی تھی۔

”تو کیا ڈرائیور کے ماں باپ دونوں ہی نہیں تھے؟ وہ محض اپنی پھوپھی کے سہارے زندگی بسر کر رہا تھا۔“ علیزے کے دل پہ ہاتھ پڑا تھا اور پہلی بار… زندگی میں پہلی بار اسے ”اپنے ڈرائیور“ سے ہمدردی محسوس ہوئی تھی۔ اتنی ہمدردی کہ آنکھوں کے گوشے نم ہوتے محسوس ہوئے تھے۔

”اور یہ ہے میری امی کی قبر!“ اس نے بابر شاہ کی قبر کی دائیں سائیڈ والی قبر کی طرف اشارہ کیا۔

”فردوس شاہ زوجہ بابر شاہ“ علیزے نے دل آور کی ماں کا نام پڑھا اور پھر گم سم سی ہو کر رہ گئی۔ اس کے لیے یہ انکشاف کچھ کم نہیں تھا کہ بتول شاہ دل آور کی ماں نہیں بلکہ پھوپھی تھیں۔

”یہ ان تین افراد کی قبریں ہیں جو میرے اپنے تھے جو میرے سگے تھے جن سے میرا خون کا رشتہ تھا اور جن کے سوا میرا کوئی نہیں تھا ان کے بعد اس دنیا میں کسی کو اپنا سمجھا تو وہ صرف عبداللہ اور نبیل تھے اور جب عبداللہ اور نبیل سے دوستی ہوئی تو تب زری کہیں بھی نہیں تھی۔ ہماری اس دوستی کے درمیان زری کا کوئی وجود نہیں تھا' وہ بہت بعد میں آئی تھی۔ میرے لیے وہ سب سے اہم اور سب سے پہلے تھے۔ ہاں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ زری کو دیکھا وہ اچھی لگی تھی' پسند آئی تھی' اس سے محبت بھی ہوئی تھی' اسے چاہتا بھی تھا مگر ابھی اسے پانے کا خیال بھی دل سے نہیں گزرا تھا کہ مجھ پہ اور اک ہوا کہ نبیل اسے مجھ سے بھی زیادہ چاہتا ہے' مجھ سے بھی زیادہ محبت کرتا ہے' وہ اسے مجھ سے بھی زیادہ اچھی لگتی ہے اور وہ اسے مجھ سے بھی زیادہ پسند ہے اور جب کسی ایک انسان کو دوسرے انسان کی پسند کا ادراک ہوتا ہے تو پہلا انسان کشمکش کا شکار ہو جاتا ہے کہ وہ کیا کرے؟ اپنی پسند کو حاصل کر لے یا دستبردار ہو جائے' کسی کے دل کو روند ڈالے یا اپنے دل کی سیج سجائے؟ ایک بات… صرف ایک بات… تم خود سوچو علیزے اور انصاف کرو۔ اگر تم بازار جاؤ اور تمہیں وہاں کوئی چیز پسند آجائے اور تم اسے کسی بھی قیمت پر چھوڑنا نہ چاہو لیکن وہی چیز تمہاری بہن یا تمہارے کسی بھائی کو بھی پسند آجائے اور وہ بھی اسے چھوڑنا نہ چاہے تو تم کیا کرو گی؟ وہ چیز خود لے لو گی؟ یا اپنے بہن یا بھائی کے لیے چھوڑ دو گی؟“ دل آور نے انتہائی سنجیدگی سے کہتے ہوئے اس سے انصاف چاہا تھا اور علیزے اس کے سوال پہ چپ کی چپ رہ گئی تھی۔

”بولو! جواب دو علیزے! وہ چیز خود لے کر اپنے دل کی خوشی پوری کر لو گی یا اپنے بہن یا بھائی کی خوشی کے لیے چھوڑ دو گی؟“ دل آور نے اسے اکسایا تھا۔ اور خود کو دل آور کی جگہ رکھتے ہوئے علیزے کا دل کانپ گیا تھا اور ہونٹوں پہ ہلکی سی جنبش ہوئی تھی۔

”چھوڑ دوں گی!“ جواب بہت مختصر تھا مگر اعتراف بہت بڑا تھا آخر انصاف جو کرنا تھا۔

”اس چھوڑ دینے میں تمہاری بزدلی ہو گی؟ یا تمہاری فراخدلی ہو گی؟“ انصاف کے اس ترازو پہ اس کے سوال مسلسل جاری تھے۔

”فراخدلی ہو گی!“ علیزے نے اک اور اعتراف کیا۔

”کیا تمہارے دل میں اس چیز کو دوبارہ پا لینے کی کوئی تمنا رہے گی یا نہیں رہے گی؟“ اس کا تیسرا سوال بھی ہنوز سنجیدگی اور انصاف کے ترازو میں جھولتا ہوا سامنے آیا تھا۔

”نہیں رہے گی۔“ علیزے بھی اس انصاف کے معاملے میں انصاف سے ہی کام لے رہی تھی۔

”تو پھر اب اس بات کا بھی انصاف کرو کہ کیا میں زری کو اپنا سکتا تھا؟ جبکہ مجھے یہ بھی پتا چل چکا تھا کہ نبیل اس سے محبت کرتا ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہے؟“ ایک اور سوال آیا۔

”نہیں۔“ وہ بھی منصفی سے کام لے رہی تھی۔

”کیا کوئی عزت دار اور غیرت مند مرد یہ بات گوارا کر سکتا ہے کہ اس کی بیوی کو اس کا دوست دل ہی دل میں چاہتا رہے؟ اور وہ یہ بات جاننے کے باوجود بھی اپنی بیوی کے ساتھ خوش رہے؟“ دل آور نے علیزے کے سامنے امتحان اور انصاف کا ہر سوال کھول کے رکھ دیا تھا۔

”نہیں!“ علیزے کے ذہن اور عقل کے در وا ہوتے جا رہے تھے اور وہ دل آور کے احساسات کے بہت قریب پہنچ چکی تھی۔

”تو پھر میں زری کے ساتھ شادی کیسے کر سکتا تھا؟ کیسے اس کے ساتھ خوش رہ سکتا تھا کیسے گوارا کر سکتا تھا کہ اس سے شادی میں کروں اور اسے چاہے نبیل؟ جب ہم اپنے کسی بہن بھائی کی پسند کی ہوئی چیز خود استعمال کر لینے کا حوصلہ نہیں رکھتے تو پھر اپنے کسی بہن بھائی کی پسند کے جیون ساتھی کے ساتھ زندگی کیسے گزار سکتے ہیں بھلا؟ اور یہ صرف میری ہی بات نہیں ہے بلکہ میری جگہ نبیل بھی ہوتا تو ایسا ہی کرتا۔ اب یہی دیکھ لو اس نے ایسا ہی کیا ہے۔ اس نے مومنہ بی بی سے شادی کر کے زری کی طرف جانے والے تمام راستے بند کر دیے ہیں تاکہ اسے اپنے دل کے ہاتھوں مجبور نہ ہونا پڑے۔ لیکن تم میری اس بات کو غلط مت سمجھنا میں نے زری سے بھاگنے کے لیے یا اس سے دور رہنے کے لیے تم سے شادی نہیں کی۔ میں نے صرف اپنی اماں کی خوشی کی خاطر تم سے شادی کی تھی۔ ورنہ دنیا میں خدا کی پاک ذات کے علاوہ ایسی کوئی طاقت نہیں تھی جو مجھے علیزے آفندی سے شادی کے لیے مجبور کر سکتی۔ میں مجبور ہوا تو صرف اپنی اماں کی وجہ سے… ورنہ شادی کرنا ہوتی تو میں کسی اور سے بھی کر سکتا تھا تم سے شادی کرنا ضروری نہیں تھا' مگر جب قسمت میں ہی یہی لکھا تھا تو پھر ضروری بھی ہو گیا اور جب قسمت میں لکھا یہ ضروری کام ہو ہی گیا ہے تو اسے پورے دل سے اپنا بھی لیا ہے بغیر کسی کھوٹ اور بغیر کسی ملاوٹ کے… اب دل میں تمہارے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے علیزے۔ کچھ بھی نہیں…“ دل آور نے اپنے دلی جذبات کا اور دلی کیفیات کا بہت ہی کھل کے اظہار کیا تھا۔

”اور زری؟“ علیزے نے اسے آخری بار ٹٹولنا چاہا تھا۔

”علیزے! میں آج یہاں کھڑے ہو کے قسم کھاتا ہوں کہ زری کو میں بہت پیچھے چھوڑ آیا ہوں وہیں انگلینڈ کی فضاؤں میں۔ چند سال پیچھے اتنا پیچھے کہ اب مڑ کے دیکھنا بھی چاہوں تو وہ کہیں بھی نظر نہیں آتی۔ کیونکہ وہ میرے آس پاس کہیں بھی نہیں ہے' نہ دل میں' نہ دماغ میں اور نہ ہی سوچ میں' ہاں اتنا ضرور یاد ہے کہ اسے چاہا تھا اس سے محبت کی تھی مگر اسے حاصل کیے بغیر' اسے وہیں چھوڑ آیا' اسے وہیں بھول آیا تھا یہ سوچ کر کہ میں کسی اور سے محبت کروں گا اور کسی اور سے شادی کروں گا۔ وہ ”کسی اور“ تم ہو گی یہ تو مجھے بھی اندازہ نہیں تھا۔ مگر یقین کرو

تمہارے سوا اور تمہارے بعد نہ کوئی اور علیزے ہو سکتی ہے اور نہ کوئی زری۔۔۔ میں تمہارے معاملے میں بالکل کھرا ہوں اس لیے مجھے کسی چیز کا کوئی ڈر نہیں ہے۔ اور زری کے معاملے میں میری نیت اور میرا ضمیر بالکل صاف ہیں اس لیے میرے دل پہ کوئی بوجھ نہیں ہے۔ باقی اگر میں کسی معاملے میں قصوروار ہوں تو میں خدا کی عدالت میں حاضر ہوں وہ مجھے جو بھی سزا دے مجھے قبول ہو گی۔" دل آور نے آج ایسی باتیں کہہ دی تھیں کہ علیزے کے پاس جواباً" کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں رہا تھا اور وہ چپ کی چادر اوڑھ کے رہ گئی تھی۔ جبکہ دل آور اس کی طرف سے رخ موڑ کر اپنی جیب سے رومال نکال کر سر پہ باندھتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ فاتحہ خوانی کے لیے بلند کر چکا تھا اور علیزے کی نظروں نے اسے پہلی بار بڑے دھیان سے یوں سر سے لے کر پاؤں تک دیکھا اور پہلی بار اسے سامنے کھڑا اپنا "ڈرائیور" برا نہیں لگا تھا۔ جیسے ہی اس نے تینوں قبروں پہ فاتحہ پڑھنے کے بعد چہرے پہ ہاتھ پھیرا علیزے بے ساختہ چونک گئی اور فوراً" سنبھلتے ہوئے اپنے ہاتھ میں پکڑے شاپر میں سے پھول نکال کر قبروں پہ چڑھانے لگی اور دونوں شاپر خالی کرنے کے بعد اس نے بھی تینوں قبروں پہ فاتحہ پڑھی اور پھر آہستگی سے سر جھکا کر دل آور کے برابر آ گئی تھی۔

"سارے پھول ان قبروں پہ چڑھا دیے۔ زری کی قبر پہ چڑھانے والے پھول کہاں گئے؟" دل آور نے اسے خالی ہاتھ دیکھ کر پوچھا تھا۔

"نہیں! اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بکے لے کر زری سے ملنے کے لیے جاؤں گی۔ کیا مجھے لے کر جاؤ گے؟" علیزے نے ذرا ہلکے پھلکے موڈ میں بات کرنے کی کوشش کی تھی۔

"ہاں! ضرور لے کر جاؤں گا بلکہ آج ہی لے کر جاؤں گا۔" اس نے فوراً" ہامی بھری تھی اور علیزے اس کے مان جانے پہ بہت خوش ہوئی تھی۔

"تھینک یو!" اس نے بڑے ریلیکس انداز میں اس کا شکریہ ادا کیا۔

"ویلکم!" وہ بھی دھیمے سے لہجے میں کہتا واپسی کے لیے قدم بڑھا چکا تھا اور اس کے ساتھ ہی علیزے بھی چل پڑی، لیکن ابھی وہ قبرستان سے باہر نکلے بھی نہیں تھے کہ انہیں سامنے سے مبارک خان آتا ہوا دکھائی دیا تھا اور علیزے مبارک خان کو دیکھ کر چونک گئی۔

"مبارک خان۔" علیزے نے زیر لب اس کا نام دہرایا تھا۔

"السلام علیکم علیزے بی بی! السلام علیکم صاحب! کیسے ہیں آپ؟" مبارک خان نے علیزے کو سلام کرنے کے بعد دل آور کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا اور اس سے حال چال بھی پوچھا تھا۔

"وعلیکم السلام! میں ٹھیک ہوں لیکن تم یہاں کیوں؟" دل آور کو کچھ تشویش ہوئی تھی۔

"میں بہت دیر سے آپ کے نمبر پہ کال کر رہا ہوں مگر آپ کال ریسیو نہیں کر رہے تھے تب مجھے گلاب خان کے نمبر پہ کال کرنا پڑی اور اس سے پتا چلا کہ آپ علیزے بی بی کے ساتھ قبرستان آئے ہوئے ہیں اور اس وقت خالی ہاتھ ہیں۔ سو مجھے مجبوراً" آپ کے پیچھے آنا پڑا۔"

مبارک خان کیا کہہ رہا تھا۔ علیزے کے کچھ پلے نہیں پڑا تھا وہ تو بس ماؤف ہوتے دماغ کے ساتھ ان دونوں کا اتنا دوستانہ انداز دیکھ رہی تھی اور ان کی گفتگو سن رہی تھی۔

"مگر کیوں؟" دل آور کو الجھن ہوئی تھی۔

"کیونکہ آپ کی جان کو خطرہ ہے۔ ملک اسد اللہ اور ملک حق نواز کے بندے مسلسل آپ کی تاک میں ہیں۔ وہ کسی بھی وقت آپ پر حملہ کر سکتے ہیں اور یہ حملہ آپ کے لیے خطرناک اور نقصان دہ بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ان کے عزائم کچھ اچھے نہیں ہیں۔" مبارک خان اس کے لیے متفکر ہو رہا تھا اور علیزے پاگل ہو جانے کو تھی اسے

غش آرہے تھے۔

"تمہیں کیسے پتا؟" وہ یقین کرنا چاہتا تھا۔

"صاحب! آپ کا بندہ ہوں' آپ کا نمک کھاتا ہوں' آپ کے اچھے برے کی خبر نہیں رکھوں گا تو اور کیا کروں گا؟ آپ کی فکر کرنا' آپ کا دھیان رکھنا میرا فرض بنتا ہے اور میں یہ فرض ضرور نبھاؤں گا آپ بس یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں۔ ایس پی کامران مہدی بھی بہت پریشان ہیں آپ کے لیے۔" مبارک خان واقعی اس کے لیے بہت پریشان ہو رہا تھا۔

اور علیزے یہ جان کر ششدر سی رہ گئی تھی کہ اس کے ڈیڈ کا اور بڑی حویلی کا بہت ہی خاص اور بہت ہی بااعتبار ملازم مبارک خان کوئی اور نہیں بلکہ دل آور شاہ کا خاص آدمی تھا جس نے ہمیشہ دل آور شاہ کے لیے ہی کام کیا تھا یہاں تک کہ بڑی حویلی میں بھی۔۔۔!

"کیا مطلب۔۔۔؟ کیا کہنا چاہ رہے ہو تم؟" دل آور بھی چونک گیا۔

"میرا مطلب ہے کہ حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ میں ہر طرف خطرے کی بو محسوس کر رہا ہوں آپ بس علیزے بی بی کو لے کر یہاں سے جلدی نکلیں ورنہ کوئی بڑا نقصان بھی ہو سکتا ہے۔" مبارک خان کی پیشن گوئی کبھی غلط نہیں ہو سکتی تھی اسی لیے دل آور بھی علیزے کے خیال سے ایک دم الرٹ ہو گیا اور سر پہ بندھا رومال اتار کر جیب میں رکھتے ہوئے علیزے کا ہاتھ کافی مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔

"چلو علیزے! جلدی نکلو یہاں سے۔۔۔" اس نے علیزے کو اپنے ساتھ کھینچا۔

"مم۔۔۔ مگر۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ مبارک خان۔۔۔ یہ سب کیا ہے؟" علیزے مبارک خان کے متعلق جاننا چاہتی تھی۔

"یہ سب تمہیں بعد میں بتاؤں گا' ابھی چلو۔" دل آور کو اپنے بجائے علیزے کی فکر تھی اسی لیے علیزے کو بازو کے گھیرے میں لیتے ہوئے قبرستان سے باہر نکل آیا اور ان کے پیچھے اپنا اسلحہ چادر کے نیچے چھپائے مبارک خان بھی باہر آگیا تھا۔ دل آور کو تیز تیز قدموں سے اپنی گاڑی کی طرف بڑھتے دیکھ کر بڑے سے درخت کے پیچھے چھپے ایک آدمی نے یک دم فائرنگ کر ڈالی تھی اور فائرنگ کی اتنی ہولناک آواز سے دہشت زدہ سی علیزے بے ساختہ دل آور سے لپٹ گئی تھی اور اس کے لپٹنے کی وجہ سے جو گولی دل آور کے سینے میں آکر پیوست ہونی تھی وہ علیزے کے کندھے میں جا گھسی تھی اور علیزے کی چیخوں سے پوری فضا گونج اٹھی تھی اور دوسری گولی علیزے کے بازو کو چھید کے رکھ گئی تھی۔

"ڈرائیور!" علیزے اس کے بازوؤں میں لہرائی تھی۔

"علیزے۔" دل آور کی اس افتاد پہ آنکھیں پھٹ گئی تھیں وہ اسے خون میں لت پت دیکھ کر پاگل ہو اٹھا اور علیزے کو دیوانوں کی طرح اپنی بانہوں میں جھنجھوڑنے کی کوشش کی تھی۔

"علیزے۔۔۔! علیزے۔۔۔!" وہ زور زور سے پکار رہا تھا مگر علیزے ہر چیز سے غافل ہو چکی تھی اور دوسری طرف مبارک خان نے ملک حق نواز کے بندوں کو گولیوں سے چھلنی کر ڈالا تھا لیکن دل آور کو علیزے کے سوا کچھ نہیں سوجھ رہا تھا' کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا' بس وہ تھی اور اس کا بہتا ہوا خون نظر آرہا تھا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

نبیلہ عزیز

در دل

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نبیل حیات دو ہی بہن بھائی ہیں' مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے' وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پہ رنگ چکی ہے' جس کے پیش نظر فائزہ بیگم' نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں' لیکن مدحیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے' جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے' مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے' مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا' بے بسی اور مجبوری سے تنگ آ کر خود کشی کرنے کا سوچتا ہے' لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باؤ امتیاز مل جاتا ہے' جو اسے کام کی آفر کرتا ہے' جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے' اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے' وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے' وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دلاور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے' وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے' اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا' اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔

۳۸

اڑتیسویں قسط

جس کی وجہ سے اس کی آنکھیں اور اس کا چہرہ لہو رنگ ہو گئے تھے اور وہ بپھرنے لگا تھا۔

"مبارک خان۔۔۔ مبارک خان۔۔۔ گاڑی کا دروازہ کھولو۔۔۔ جلدی کرو۔"

دل آور خود بے بس تھا۔ وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ علیزے اس کے بازوؤں میں جھول رہی تھی۔ اسی لیے وہ مبارک خان پہ دھاڑا تھا۔

اور مبارک خان نے اسی دہشت زدہ اور افراتفری کے ماحول میں انتہائی تیزی اور بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے لپک جھپک آگے بڑھ کے گاڑی کا دروازہ کھول دیا تھا۔

"صاحب۔۔۔ جلدی کریں۔" مبارک خان نے پلٹ کر زور سے اسے آواز دی اور دل آور گاڑی کا دروازہ کھلا دیکھ کر علیزے کو اپنی بانہوں میں اٹھا کر تیزی سے گاڑی کی سمت لپکا اور اسے گاڑی کی بیک سیٹ پہ لٹا کر خود انتہائی عجلت سے دروازہ بند کرتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔

"مبارک خان تم یہاں اکیلے۔۔۔" گاڑی نکالتے نکالتے وہ اک پل کے لیے ٹھہرا تھا۔

"صاحب۔۔۔ آپ میری فکر نہ کریں۔۔۔ میں نبٹ لوں گا ان لوگوں سے آپ علیزے بی بی کو اسپتال لے کر جائیں۔۔۔ کہیں کوئی بڑا نقصان نہ ہو جائے' پلیز جلدی جائیں آپ۔"

مبارک خان اسے تسلی دیتے ہوئے اس کی گاڑی کا دروازہ ہاتھ سے بجاتے ہوئے پیچھے ہٹ گیا تھا اور دل آور اس کی تسلی پہ سر ہلا کر گاڑی بڑھا لے گیا تھا۔

پھر پیچھے کیا' کیا ہوا اسے کچھ خبر نہیں تھی۔

اسے خبر تھی تو صرف علیزے کی۔

علیزے۔۔۔ اس نے بچوں کی طرح پلٹ کر پیچھے دیکھتے ہوئے اسے پکارا تھا۔

مگر وہ ہوش و خرد سے بے گانہ پڑی تھی اور اس کے جسم سے خون مسلسل بہہ رہا تھا۔ اس کے جسم سے بہتے خون کو دیکھ کر دل آور کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے اپنے جسم سے خون بہہ رہا ہو اور اس کے وجود کی رگیں لمحہ بہ لمحہ خالی ہوتی جا رہی ہوں۔ اس خیال سے اس نے گاڑی کی اسپیڈ اور زیادہ بڑھا دی تھی اور اپنی اس بدحواسی اور افراتفری کے عالم میں اسے یہ بھی دھیان نہ رہا کہ وہ علیزے کو کس اسپتال لے کر جا رہا ہے۔

کیونکہ اس کے حواس ہی ٹھکانے پہ نہیں تھے۔ وہ اسپتال کے احاطے کے اندر گاڑی کو بریک لگاتے ہوئے تیزی سے نیچے اترا اور گاڑی کا بیک ڈور کھولتے ہی بے تابی سے علیزے کی نبض ٹٹولی تھی۔

نبض رواں تھی مگر بہت ہی مدھم رفتار سے۔

اور اس کی ڈوبتی نبض کے احساس نے دل آور کو اور بھی پاگل کر ڈالا۔ وہ اسے بانہوں میں اٹھا کر اندھا دھند اسپتال کے اندر کی طرف بھاگا تھا۔

اور سامنے سے آتا عبداللہ حیران رہ گیا تھا۔ مگر دل آور کے بازوؤں میں خون سے لت پت علیزے کو دیکھ کر اس کی حیرانی' پریشانی میں تبدیل ہو گئی تھی۔ وہ لپک کے دل آور کی طرف بڑھا۔

"دل آور۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ کیا ہوا ہے علیزے بھابھی کو؟" عبداللہ اس کے سامنے آگیا تھا۔

مگر دل آور کے پاس ایک سیکنڈ ٹھہرنے کا بھی وقت نہیں تھا اور نہ ہی جواب دینے کے لیے ذہن حاضر تھا۔ وہ وہاں رکے بغیر اور کچھ کہے بغیر آگے بڑھتا چلا گیا تھا اور اس کے پیچھے پیچھے عبداللہ بھی اتنے میں اسپتال کا اسٹاف بھی جمع ہو گیا تھا۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے علیزے کو اسٹریچر پہ ڈالا گیا اور فوراً" ہی اسے آپریشن تھیٹر میں لے جایا گیا تھا اور دل آور وہیں کا وہیں باہر ہی رہ گیا تھا۔

"دل آور۔۔۔ بتاؤ نا۔۔۔ کیا ہوا ہے علیزے بھابھی کو؟ ان کی یہ حالت کیسے ہوئی ہے۔"

عبداللہ کے دل کو نہ جانے کیوں اک عجیب سی تکلیف کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کا دل علیزے کا خون دیکھ کر خود بخود ہی اس کی سمت کھنچ رہا تھا۔

اور وہ بار بار دل آور سے استفسار کر رہا تھا جبکہ دل آور سر جھکائے چپ چاپ کھڑا تھا جواب ہی نہیں دے رہا تھا۔

"دل آور۔۔۔ تم بتاتے کیوں نہیں ہو؟ کیا ہوا ہے علیزے بھابھی کو؟ کس نے یہ۔۔۔"

"کیا بتاؤں تمہیں؟ کیا بتاؤں آخر۔۔۔ کیا سننا چاہتے ہو؟ یہ کہ علیزے کی حالت تمہارے بھائی ملک اسد اللہ کی کمینگی کا نتیجہ ہے۔ وہ ذمہ دار ہے۔ اس نے کروایا ہے سب کچھ۔۔۔ اس نے مجھ پہ قاتلانہ حملہ کروایا ہے مگر نشانہ وہ بن گئی۔

اس کی گولی کا شکار ہو گئی ہے وہ۔۔۔ مار ڈالا ہے اس نے علیزے کو۔۔۔ جان لے لی ہے اس کی۔" دل آور اس کے پوچھنے پہ یکدم پھٹ پڑا تھا اور عبداللہ کے قدموں تلے سے زمین سرک گئی تھی۔

وہ دم بخود سا رہ گیا تھا اور اس کے کانوں میں سائیں سائیں سی ہونے لگی تھی۔

"یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ کک کیا کہہ رہے ہو تم۔" عبداللہ کی آواز بے ربط سی ہو گئی تھی۔

"میں جو کہہ رہا ہوں' وہ غلط نہیں ہے مگر عبداللہ میری بات ایک یاد رکھنا کہ اگر علیزے کو کچھ ہوا تو میں اسی علیزے کی قسم کھا کے کہتا ہوں کہ ملک حق نواز اور ملک اسد اللہ کو بیچ چوراہے میں باندھ کر گولیوں سے چھلنی نہ کر دوں تو سمجھ لینا کہ میں بابر شاہ کا بیٹا ہی نہیں تھا۔"

دل آور کی آنکھوں میں غضب ناکی کے لال ڈورے تیر رہے تھے اور اس نے وہ قسم کھائی تھی جس کو سن کر عبداللہ بھی سر سے لے کر پاؤں تک کانپ گیا تھا۔

کیونکہ اسے دل آور کے مزاج کا بخوبی پتا تھا۔ وہ اپنے غیض و غضب اور اپنے انتقام میں کچھ بھی کر سکتا تھا۔ چاہے اس کے بعد اسے پھانسی ہی کیوں نہ چڑھنا پڑ جاتا۔

"دل آور صاحب آپ ٹھیک تو ہیں نا؟" ایس پی کامران مہدی فل یونیفارم میں ملبوس بہت ہی متفکر سے انداز میں کہتے ہوئے دل آور کے قریب آرکا تھا۔

"میں کتنا ٹھیک ہوں۔۔۔ آپ میرے حلیے سے دیکھ سکتے ہیں۔" دل آور نے اپنے خون سے رنگے کپڑوں اور اپنے چہرے کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"جی ہاں۔۔۔ مجھے اطلاع مل چکی ہے۔ آپ کی وائف کے بارے میں سن کر بہت افسوس ہوا ہے۔ اب کہاں ہیں وہ؟ زیادہ خطرے کی بات تو نہیں ہے۔"

ایس پی کامران مہدی کو خاصی تشویش ہو رہی تھی کیونکہ اسے اندازہ تھا کہ دل آور پہلے بھی ایک عظیم دکھ اٹھا چکا ہے۔ اب ایک اور دکھ سہنے کی یقیناً" اس میں بھی ہمت نہیں ہو گی۔" آپ دعا کریں کہ زیادہ خطرے کی بات نہ ہی ہو تو بہتر ہے ورنہ کسی کے بھی حق میں اچھا نہیں ہو گا۔" دل آور کے ذہن میں بار بار ملک حق نواز اور ملک اسد اللہ ہی گردش کر رہے تھے۔ وہ انہی کے متعلق سوچ رہا تھا۔

"سوری سر۔۔۔ ڈاکٹر صاحب نے آپریشن کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ یہ ایک پولیس کیس ہے آپ پہلے اپنا اسٹیٹ منٹ ریکارڈ کروائیں۔"

ایک کمپاؤڈر نے آکر دل آور کو اطلاع دی اور دل آور کے پہلے سے گھومے ہوئے دماغ سے شرارے نکلنے لگے۔ اس نے کمپاؤڈر کو یکدم گریبان سے دبوچ لیا تھا۔

"کیا کہا؟ ڈاکٹر نے آپریشن سے انکار کر دیا ہے۔" وہ دانت پیستے ہوئے غرایا تھا۔

"پلیز دل آور۔! یہ کیا کر رہے ہو تم؟ یہ کیا پاگل پن ہے آخر' بس کرو' سنبھالو اپنے آپ کو۔" عبداللہ نے جھنجلاتے ہوئے دل آور کے ہاتھ سے اس کمپاؤڈر کا گریبان چھڑا کے دل آور کو اپنی سمت کھینچ لیا تھا۔

"پلیز ایس پی صاحب۔۔۔ آپ ڈاکٹر سے بات کریں۔ ان سے کہیں کہ آپریشن جلدی شروع کریں بھابھی کی حالت بہت خراب ہے۔ اس طرح لیٹ کرنے سے کوئی بڑا نقصان نہ ہو جائے۔"

عبداللہ نے دل آور کو سنبھالتے ہوئے ایس پی کامران مہدی سے ریکویسٹ کی تھی۔

"اوکے۔۔۔ میں بات کرلیتا ہوں' آپ ان کا خیال رکھیں پلیز۔ اسی مصیبت اور نقصان کے ڈر سے ہی تو میں بار بار ان کے موبائل پہ کال کر رہا تھا' مگر انہوں نے میری کال ہی ریسیو نہیں کی۔ کیونکہ مجھے ملک حق نواز اور ملک اسد اللہ کے عزائم کی خبر ہوچکی تھی۔"

ایس پی کامران مہدی افسوس کا اظہار کرتا وہاں سے ہٹ کے آپریشن تھیٹر کی طرف آگیا اور پھر اگلے دس منٹ میں علیزے کا آپریشن اسٹارٹ ہوگیا تھا۔

"بیٹھ جاؤ اور دعا کرو کہ سب ٹھیک ہوجائے۔" عبداللہ نے اسے سہارا دے کر صوفے پہ بٹھایا۔

"عبداللہ۔۔۔ علیزے کو کچھ ہوگیا تو کچھ بھی نہیں بچے گا۔ کچھ بھی نہیں یا میں خود کو مار ڈالوں گا یا باقی سب کو موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔ بس علیزے کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ میری اور ملک حق نواز کی اس جنگ کی سزا علیزے کو نہیں ملنی چاہیے وہ بے قصور ہے۔ اسے میں نے سزا نہیں دی تو کوئی کیسے دے سکتا ہے۔ آخر کیسے؟ میری زندگی ہے وہ۔۔۔ اسی کی وجہ سے تو جی رہا ہوں میں۔۔۔ ورنہ اس دنیا میں رکھا ہی کیا ہے؟ سب بے کار ہے سب فضول ہے' صرف وہی وہ ہے اور اس کی وجہ سے میں ہوں۔" علیزے کی موت کے خیال نے دل آور کو حقیقتاً "جیسے پاگل کرڈالا تھا۔

اس کے منہ میں جو آرہا تھا' وہ بولتا جارہا تھا۔

لیکن کیا' کیا بول رہا ہے' اسے خود احساس ہی نہیں تھا۔

مگر عبداللہ کو اس کے بولنے سے اندازہ ہوچکا تھا کہ اسے علیزے سے کتنی محبت ہے اور اس کی اس محبت میں کتنی شدت ہے۔

کیونکہ اس کی شدت اور اس کی محبت تو اس کے الفاظ سے ہی ظاہر ہورہی تھی۔ بلکہ اس محبت اور شدت میں اس کا رواں رواں تڑپ رہا تھا۔

جس کو سوچ کر اور محسوس کرکے عبداللہ نے بے ساختہ اک گہری سانس کھینچی تھی اور دوبارہ سے اسے تسلی دینے میں لگ گیا کیونکہ اس وقت دل آور کو تسلی اور سہارے کی ہی ضرورت تھی۔

☼ ☼ ☼
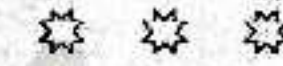
"عبداللہ! اتنی دیر سے کہاں تھے آپ؟ میں اور زری کب سے آپ کا انتظار کررہی تھیں۔ زری نے مدحیہ کو کال کرنی تھی مگر موبائل ہی آپ کے پاس تھا۔"

نگارش عبداللہ کے ہاتھ کی دستک سنتے ہی پرائیویٹ روم سے باہر نکل آئی کیونکہ اس کے خیال میں زری سوچکی تھی لیکن اسے کیا خبر نہیں تھی کہ زری تو محض پلکیں موندے لیٹی ہے۔

"بس دل آور کے ساتھ تھوڑا بزی ہوگیا تھا۔" دروازہ ادھ کھلا تھا۔ اس لیے دونوں کی آواز اندر تک سنائی دے رہی تھی۔

"دل آور بھائی! کہاں تھے وہ؟" نگارش چونکی تھی اور زری اس کے نام پہ جیسے سناٹے میں آگئی تھی۔

"اسی اسپتال میں۔" عبداللہ کا انداز بہت دھیما تھا' جس پہ نگارش اب مزید تشویش کا شکار ہوئی۔

"اسی اسپتال میں! مگر کیوں؟ خیریت تو ہے نا؟"

"خیریت نہیں ہے نگارش' دل آور پہ اسد اللہ بھائی نے قاتلانہ حملہ کروایا ہے اور اس وقت علیزے بھابھی دل آور کے ساتھ تھیں' جس گولی کا نشانہ دل آور کو بننا تھا' اس گولی کا نشانہ علیزے بھابھی بن گئیں اور اس وقت اسی اسپتال کے آپریشن تھیٹر میں موت اور زندگی کی جنگ لڑ رہی ہیں۔"

عبداللہ نے نگارش کی سماعتوں پہ بم پھوڑ دیا تھا۔ وہ یہ خبر سن کر ششدر سی رہ گئی تھی اور یہی حال اندر بیٹھی پڑی زری کا بھی ہوا تھا۔

"نگارش۔۔۔ مجھے نہیں لگتا تھا کہ دل آور علیزے بھابھی سے محبت کرتا ہے۔ مگر آج علیزے بھابھی کو

تکلیف پہ وہ کس طرح پاگل اور دیوانہ ہو رہا ہے۔ یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھ کر مجھے احساس ہو گیا ہے کہ وہ واقعی علیزے بھابھی سے بہت زیادہ محبت کرتا ہے۔"

عبداللہ نے نگارش کے سامنے اپنی سوچ کو لفظوں کا پیراہن دیا تھا۔ لیکن اندر بیڈ پہ ویران اور اجاڑ پڑی زری کے من میں دور، دور تک اور بھی سناٹے چھا گئے تھے۔

اور آنکھوں سے دو آنسو بہہ کر اس کی کنپٹیوں میں جذب ہو گئے تھے۔

"محبت" زری کے لب کپکپائے تھے۔

"زری سے کہو وہ دل آورے کو اپنی محبت سے آزاد کر دے، ہمیشہ کے لیے کیونکہ وہ اس کا نہیں ہے اور نہ ہی کبھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے اسے آزادی بخش دے۔ نکال دے اپنے دل سے۔ بھول جائے اسے، بھول جائے۔"

عبداللہ نے زری کے اس معاملے میں پہلی بار زبان کھولی تھی۔ مگر وہ بھی بے بسی اور مایوسی کی انتہا کو چھونے کے بعد۔

اور عبداللہ کے لہجے اور انداز کی اس بے بسی اور مایوسی کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کرتے ہوئے زری نے یوں ہی لیٹے لیٹے ایک گہری سانس خارج کی تھی اور پلکیں کھول دی تھیں۔

"بھائی۔ میں نے دل آور شاہ کو اپنی محبت سے آزاد کر دیا۔ میں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آزاد کر دیا ہے۔ کیونکہ وہ میرا نہیں ہے اور نہ ہی کبھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے اسے آزادی بخش دی ہے۔ نکال دیا ہے اسے اپنے دل سے۔ بھول گئی ہوں اسے، بھول گئی ہوں، سچ مچ بھول گئی ہوں۔" زری نے زیر لب کپکپاتے لہجے اور کپکپاتے ہونٹوں سے کہتے ہوئے اپنے لرزتے، کانپتے ہاتھ سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے تھے۔

اور اسے یوں لگا جیسے اس کے دل سے کوئی بہت بڑا بوجھ سرک گیا ہو۔

ہمہ وقت دل آور شاہ کی محبت سے بھرا رہنے والا دل خالی ہو گیا ہو۔

بالکل ایسے جیسے کوئی خالی برتن ہو۔

اب یہ خالی برتن ٹوٹتا یا سلامت رہتا۔ اسے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

وہ اسے آزاد کر کے، خود بھی آزاد ہو گئی تھی، ریلیکس ہو گئی تھی۔ یوں جیسے کوئی مرنے کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پرسکون ہو جاتا ہے۔

خود تم سے ملنے آئی بھی
اور آ کر بہت پچھتائی بھی
اب جھیلوں گی خاموشی سے
دوری بھی تنہائی بھی
اک کھیل تھا سچ میں ہار گئی
اس کھیل میں تھی رسوائی بھی

☼ ☼ ☼

تحقیق ہو تو روح دو عالم تڑپ اٹھے
اتنا تیرے بغیر پریشان رہا ہوں میں

آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلتے دیکھ کر وہ یکدم لپک کے تیر کی سی تیزی سے دروازے کے قریب آیا تھا۔

"ڈاکٹر صاحب۔ کیسی ہے وہ؟ وہ۔ وہ زندہ تو ہے نا۔" اس نے ڈاکٹر سے بہت ہی ڈرتے ڈرتے سوال کیا تھا۔

"آپ فی الحال اس سوال کو چھوڑیں اور ان کے لیے بلڈ کا انتظام کریں۔ ان کے لیے بہت زیادہ بلڈ کی ضرورت ہے۔" ڈاکٹر نے دل آور کے سوال کو سرے سے نظر انداز کرتے ہوئے علیزے کے لیے ایک اہم ضرورت کا اعلان کیا تھا اور دل آور اس اہم ضرورت کا سن کر ساکت و صامت سا رہ گیا تھا۔ کیونکہ وہ علیزے کا بلڈ گروپ جانتا تھا۔

"بلڈ۔" اس نے بے حد آہستگی سے دہرایا تھا۔

"جی ہاں۔ بلڈ ہی کہا ہے۔" ڈاکٹر نے بھی دہرا کے جواب دیا تھا۔

"لیکن اس کا گروپ تو او نیگیٹو ہے۔" دل آور کے دماغ سے دھواں نکلنے لگا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے وہ بیچ منجدھار میں پھنس گیا ہو اور اس کا ہاتھ علیزے کے ہاتھ سے چھوٹ رہا ہو۔

"جی ہاں۔ ان کے بلڈ گروپ کی رپورٹ آ چکی ہے۔ اسی لیے ہمارے ساتھ ساتھ اب آپ کو بھی اس کام کے لیے کوشش کرنا ہو گی۔ ورنہ ان کے بچنے کے چانسز بہت کم ہیں۔" ڈاکٹر نے کہتے ہوئے جیسے دل آور کے دل پہ ہاتھ ڈالا تھا۔

"لیکن ڈاکٹر آپ کو پتا ہے کہ او نیگیٹو تو بہت۔؟" اس نے کچھ کہنا چاہا تھا۔

"ہاں۔ مجھے پتا ہے۔ لیکن آپ ان کی فیملی سے رجوع کریں۔ آئی ہوپ کسی نہ کسی کا بلڈ گروپ ضرور میچ کرے گا۔" ڈاکٹر نے اسے ایک اور مشورہ دیا تھا۔

"فیملی۔" دل آور کے ذہن میں بڑی حویلی کا نقشہ گھوم گیا تھا لیکن وہاں جانا یا پھر ان لوگوں سے اب کسی اچھے کام کی یا کسی ہیلپ کی امید رکھنا سراسر فضول تھا۔

"اور ہاں۔ فیملی سے یاد آیا۔ آپ کی مسز کے پیرنٹس کہاں ہیں؟ انہوں نے اتنی تکلیف اور بے ہوشی کے باوجود اپنے بابا کو یاد کیا ہے۔ اگر ممکن ہے تو پلیز۔ آپ ان کے فادر کو یہاں بلا لیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے فادر یا مدر سے مل کر یا ان کی آواز سن کر ذرا جلدی کور کر لیں۔ میں نے ان کے منہ سے دو، تین بار پاپا کا لفظ سنا ہے۔"

ڈاکٹر کی اس نئی اطلاع پہ دل آور دم بخود رہ گیا اور اس کے آس پاس ایک عجیب سی سائیں سائیں کی آواز سنائی دینے لگی۔

"بیرسٹر صاحب! زیادہ سوچنے کا ٹائم نہیں ہے۔ آپ کی وائف کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔ آپ نے جو کچھ کرنا ہے ابھی کرنا ہے، پلیز ہری اپ۔"

ڈاکٹر اس کا کندھا تھپک کر پلٹ گیا۔

"سنیے ڈاکٹر صاحب۔" عبداللہ کی آواز پہ ڈاکٹر کو عجلت کے باوجود رکنا پڑا۔

"میرا دوست اس وقت صدمے کی حالت میں ہے۔ اسے یہ بھی یاد نہیں ہے کہ میرا بلڈ گروپ بھی او نیگیٹو ہی ہے۔" عبداللہ نے ذرا سا مسکرا کے کہا تھا اور دل آور نے بری طرح چونک کر دیکھا تھا۔

اور عبداللہ کی مسکراہٹ پہ اسے یاد آیا تھا کہ ان تینوں نے انگلینڈ میں اپنے بلڈ گروپ چیک کروائے تھے اور تینوں کے گروپ الگ الگ تھے۔ کسی ایک کا بھی ایک دوسرے سے میچ نہیں ہوا تھا۔

"ارے۔ یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے لیکن صرف ایک بیگ سے کام نہیں چلے گا۔ مزید بلڈ کی ضرورت پھر بھی رہے گی۔" ڈاکٹر کو سن کر خوشی ہوئی تھی۔

"آپ کو جتنی ضرورت ہے آپ لے لیں۔" عبداللہ نے دل آور کی خاطر اپنا آپ حاضر کر دیا۔

"نو سر۔ ہم ایک وقت میں صرف ایک ہی بیگ لے سکتے ہیں۔" ڈاکٹر نے انکار کر دیا۔

"ڈاکٹر پلیز۔" ایک نرس نے آپریشن تھیٹر سے نکلتے ہی ڈاکٹر کو پکارا تھا اور ڈاکٹر ان دونوں کو جلدی کا اشارہ کر کے آپریشن تھیٹر میں گھس گیا تھا۔

"دیکھو دل آورے۔ پلیز ہوش سے کام لو۔ ہوش میں آؤ۔ اس طرح بت بنے رہنے سے کچھ نہیں ہو گا۔ علیزے بھابھی کو تمہاری ضرورت ہے۔ سنبھالو اپنے آپ کو۔ جاؤ جیسے بھی سہی ان کی فیملی سے کانٹیکٹ کرو۔ اس وقت علیزے بھابھی کو ان کی بھی ضرورت ہے، پلیز سمجھو یار۔"

دل آور جوں کا توں کھڑا تھا۔ جب عبداللہ نے اپنے مخصوص مردانہ اسٹائل میں اس کا کندھا تھپکا تھا اور دل آور نے کچھ سوچتے ہوئے بڑے ہی پرعزم انداز میں گردن موڑ کر عبداللہ کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔

"علیزے کے لیے میں کچھ بھی کرسکتا ہوں عبداللہ اور اس کی خاطر آج میں وہ کام کروں گا جو میرا سر بھی کٹ جاتا تو میں نہ کرتا۔" دل آور نے کہتے ہوئے عبداللہ کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹا دیا تھا۔

"کیا مطلب؟" عبداللہ کو حیرت ہوئی۔

"مطلب بعد میں پتا چلے گا۔ ابھی میں کہیں جا رہا ہوں۔" دل آور نے ایک پرعزم سی سانس کھینچتے ہوئے کہا اور اپنے چہرے پہ ہاتھ پھیر کر چہرے کے تاثرات کنٹرول کرتے ہوئے قدم آگے بڑھا دیے۔

"لیکن۔۔۔ تم جا کہاں رہے ہو؟" عبداللہ ایک بار پھر لپک کے اس کے سامنے آگیا۔

"میں آج تم سب کا مقروض ہونے جا رہا ہوں۔ میں آج بادشاہ سے فقیر ہونے جا رہا ہوں۔ میں آج بھیک مانگنے جا رہا ہوں اب دیکھو کہ ہوتا کیا ہے۔" دل آور اس کا کندھا تھپک کے آگے بڑھ گیا تھا اور عبداللہ پیچھے کھڑا اس کی پشت دیکھتا رہ گیا۔

"سر پلیز۔۔۔ آپ میرے ساتھ آیئے۔" نرس نے قریب آکر عبداللہ کو متوجہ کیا تھا اور عبداللہ سر جھٹک کر نرس کے ہمراہ اسپتال کی لیبارٹری میں آگیا تھا۔

☼ ☼ ☼

شام ڈھل رہی تھی۔

سب اپنے اپنے کام سے واپس آچکے تھے۔ حویلی میں روزانہ کی طرح آج بھی گہما گہمی زور پکڑ چکی تھی اور کچن میں کھانے کی تیاریاں بھی عروج پہ تھیں۔ بڑی حویلی میں بہت عرصے بعد زندگی کا احساس دوبارہ سے محسوس ہوتا نظر آرہا تھا اور آذر ان سب کو ایک نظر دیکھ کر واپس پلٹ گیا تھا۔

اور ابھی وہ ڈرائنگ روم سے نکل کر باہر لان میں آیا ہی تھا کہ اس کے پرسکون ہوتے ذہن پہ اک اور پتھر آپڑا تھا اور بڑی مشکل سے ٹھہرنے والی سوچ کی لہریں ایک بار پھر منتشر ہوگئی تھیں۔

کیونکہ ان کی حویلی کے گیٹ کے اندر ڈرائیو وے پہ ایک پراڈو آکر رکی تھی اور اس پراڈو سے اترنے والی شخصیت کو دیکھ کر آذر کا اچھا بھلا پرسکون دماغ گھوم گیا تھا۔

"منصور حسین۔۔۔" آذر نے زیر لب دہرایا تھا۔

"ہیں۔۔۔ منصور حسین۔" اپنے کسی کام سے باہر نکلتی رجو بھی اپنی جگہ پہ ساکت و صامت سی ہوگئی تھی۔ بلکہ اسے جو بھی دیکھ رہا تھا یوں ہی اپنی جگہ پر منجمد ہوتا جا رہا تھا۔ جیسے انہوں نے کسی آفت کو دیکھ لیا ہو۔ جبکہ وہ کسی کی بھی سمت دیکھے بغیر آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

لیکن ہر بار یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ ان کے پاس سے گزر جاتا اور وہ لوگ یوں ہی ساکت و صامت سے کھڑے رہتے۔

آذر نے جب اسے اندرونی مین ڈور کی طرف بڑھتے دیکھا تو وہ سب کچھ ذہن سے جھٹک کر بہت تیزی سے اس کے قریب آیا تھا۔

"رک جاؤ منصور حسین۔ تمہارا ایک قدم بھی آگے بڑھا تو اچھا نہیں ہوگا۔" آذر نے یکدم اس کے سامنے آکر اسے روک دیا تھا اور دل آور کے قدم ٹھٹک کر رک گئے تھے۔

"دیکھو آذر آفندی۔۔۔ مجھے اپنی موت کا خوف ہوتا تو میں یہاں کبھی نہ آتا۔ لیکن افسوس کہ مجھے علیزے کی موت کا خوف یہاں کھینچ لایا ہے اور اگر علیزے کی موت کے خوف سے میں یہاں آگیا ہوں تو پھر میں کچھ بھی کرسکتا ہوں۔ اپنے راستے کی ہر رکاوٹ کو ہٹا سکتا ہوں۔ کیونکہ میں اس وقت سر پہ کفن باندھ کے آیا ہوں۔ اس لیے پلیز میرے راستے کی رکاوٹ مت بنو اور مجھے وقار آفندی کے پاس جانے دو۔ ہٹ جاؤ میرے راستے سے ورنہ علیزے مر جائے گی۔"

دل آور نے بہت ہی دو ٹوک سے انداز میں آذر آفندی کو اپنی بات سمجھانے کی کوشش کی۔۔۔ آذر شاید اس کی

بات سمجھتا یا نہ سمجھتا مگر اس کے خون سے رنگے کپڑے دیکھ کر اس کی نظریں پتھرا گئی تھیں۔ یعنی اس کے کپڑے علیزے کے خون سے رنگے ہوئے تھے۔

مگر اسے ہوا کیا؟

اور اگر ہوا بھی تھا تو بڑی حویلی کا اس سے کیا تعلق۔

آخری خیال نے آذر کو پھر سے پتھر بنانے کی کوشش کی تھی۔ مگر تب تک وہ آذر کو سائیڈ پہ دھکیل کر خود آگے بڑھ گیا تھا۔

"منصور حسین۔ رکو' میری بات سنو' میں تمہارے کسی نئے ڈرامے یا کسی نئی چال میں آنے والا نہیں ہوں۔ میں تمہیں گولی سے اڑا دوں گا۔" آذر پھنکارتا ہوا' دھاڑتا ہوا اس کے پیچھے آیا تھا۔ اتنے میں بڑی حویلی کے کئی افراد شور کی آواز سن چکے تھے اور منصور حسین کو ایک بار پھر اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ کر سب کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ مگر وہ سیدھا وقار آفندی کے بیڈ روم میں جا پہنچا دروازہ کھلنے کی آواز پہ وقار آفندی یکدم غنودگی سے ہڑبڑا گئے اور وارڈروب بند کرتی آسیہ آفندی بھی دہل گئی تھیں۔

"منصور حسین۔" آسیہ آفندی کی چیخ نکل گئی تھی' جبکہ وقار آفندی کی حالت غیر ہونے لگی تھی۔

"ت۔ دل۔ آ۔ و۔ ر۔ شاہ۔" انہوں نے بمشکل اس کا نام مکمل کیا تھا۔

اور دل آور کے پیچھے اپنا ریوالور لے کر آنے والا آذر وقار آفندی کے منہ سے نکلنے والے اس ٹوٹے پھوٹے سے نام پہ ٹھٹک گیا تھا۔

"ہاں۔ میں دل آور شاہ۔ بابر شاہ کا بیٹا اور منصور حسین شاہ کا پوتا زندگی میں ایک بار پھر تمہارے سامنے آ کھڑا ہوا ہوں۔ لیکن وقار آفندی اُس دل آور شاہ میں اور اِس دل آور شاہ میں بہت فرق ہے۔ تب میں تمہارا دشمن تھا اب میں تمہارا داماد ہوں۔

اس وقت میں تم سے انتقام لینے آیا تھا۔ لیکن آج میں تم سے بھیک مانگنے آیا ہوں۔

آج میں شاہ نہیں ہوں' آج میں گدا ہوا۔

آج میری بیوی کی زندگی کا سوال ہے۔ وہ اس وقت اسپتال کے آپریشن تھیٹر میں موت اور زندگی کی جنگ لڑ رہی ہے۔ اس کا بلڈ گروپ او نیگیٹو ہے اور میں اس ایمرجنسی میں کہیں سے بھی یہ گروپ ارینج نہیں کر پا رہا۔ مجھے اس کے لیے بلڈ کی ضرورت ہے۔ مجھے او نیگیٹو کی ضرورت ہے۔"

وہ کہتے ہوئے واقعی بہت بے بس اور شکست خوردہ سا لگ رہا تھا۔

"م۔ مگر۔ میری۔ علیزے کو۔ ہوا کیا ہے؟" آسیہ آفندی تڑپ کے اس کے سامنے آ گئی تھیں اور دل آور نے وقار آفندی سے نظریں ہٹا کر ان کی طرف دیکھا تھا۔

"ملک شرافت علی کے بیٹے ملک اسد اللہ اور چچا زاد کزن ملک حق نواز نے مجھ پر حملہ کروایا لیکن فائرنگ کے دوران گولی علیزے کو لگ گئی۔ جس سے وہ شدید زخمی ہوئی ہے اور اس کا خون بہت زیادہ بہہ چکا ہے۔ اس لیے ڈاکٹرز بہت زیادہ پریشان بھی ہیں۔ کیونکہ یہ بلڈ کسی بلڈ بینک سے بھی ارینج نہیں ہو رہا۔"

دل آور دھماکے پہ دھماکہ کر رہا تھا اور آسیہ آفندی نے بے ساختہ اپنے منہ پہ دونوں ہاتھ رکھ لیے تھے اور مارے حیرت کے ان کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

"ملک شرافت علی کے بیٹے ملک اسد اللہ اور چچا زاد کزن ملک حق نواز نے؟ یہ۔ یہ۔ کیا کہہ رہے ہو تم۔" وہ پاگل ہو جانے کو تھیں کہ یہاں کیا ہو رہا ہے اور ــــــــ وہ کیا' کیا انکشاف کر رہا تھا۔ ان سب کے دماغ سمجھنے سے قاصر ہو گئے تھے۔

اور وہاں موجود آذر' دانیال' کومل' جودت' عائشہ آفندی اور ثروت بیگم بھی ہکا بکا سے اس کی صورت دیکھ رہے تھے اور اس کی باتیں نا سمجھی سے سن رہے تھے۔

"مسز آفندی۔ میرا پورا نام بیرسٹر دل آور شاہ ہے۔ میرے پاس ایک کیس آیا تھا' جس میں ملک حق نواز نے ایک لڑکی کے ساتھ زیادتی کی اور اس کے نتیجے میں' میں نے اسے جیل بھجوا دیا تھا۔ لیکن اب اسے سزا ہونے والی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ میں کیس سے پیچھے ہٹ جاؤں کیونکہ کل اس کیس کی آخری سماعت ہے۔ اسی لیے میرے انکار پہ انہوں نے مشتعل ہو کر مجھ پہ حملہ کر دیا اور گولیوں کا نشانہ علیزے بن گئی اور میں علیزے کی خاطر آپ لوگوں کے پاس آنے پہ مجبور ہو گیا ہوں۔ پلیز اس وقت میں بہت مجبور ہوں۔ بہت مفلس ہوں۔ مجھے آپ لوگوں کی ہیلپ کی ضرورت ہے۔ میں آپ لوگوں کے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ پلیز خدا کے لیے علیزے کی زندگی بچا لیں۔ وہ بے قصور ہے۔ بے گناہ ہے وہ۔ آپ اسے غلط مت سمجھیں۔ غلط تو میں تھا اور میں اپنی غلطی تسلیم کروں گا۔ سب کے سامنے کروں گا۔ لیکن ابھی نہیں۔ ابھی وقت بہت کم ہے۔"

دل آور نے کہتے ہوئے سچ مچ ان سب کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے اور وہ سب بے یقین سی نظروں سے اسے دیکھتے رہ گئے تھے۔

"میرا بلڈ گروپ او نیگٹو ہے۔ میں بلڈ دینے کے لیے تیار ہوں۔" دانیال وجاہت علی ان سب کو پیچھے ہٹا کر آگے بڑھ آیا تھا اور دل آور کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کے وجود میں روح پھونک دی ہو۔

"دانیال۔" آسیہ آفندی زیر لب دہرا کے رہ گئی تھیں۔

"آنی۔ علیزے کو اس وقت ہماری ضرورت ہے اور ہمیں اس کی ضرورت ضرور پوری کرنی چاہیے۔ کیونکہ وہ اس گھر کی بیٹی ہے اور آپ کے گھر بیٹی آئے چاہے داماد' انہیں مایوس اور خالی ہاتھ نہیں لوٹانا چاہیے۔ یہ بات مجھے ڈیڈ نے سکھائی تھی اور میں آج اس بات پہ ضرور عمل کروں گا۔"

دانیال کے عزم کے سامنے سب کو ہی ہتھیار ڈالنے پڑ گئے تھے۔

"چلو۔ کہاں چلنا ہے؟" اس نے دل آور کو متوجہ کیا تھا۔

"اسپتال۔" دل آور نے کافی آہستگی سے کہا اور قدم آگے بڑھائے تھے۔

"سنو۔" عائشہ آفندی کی لرزتی ہوئی آواز پہ دل آور کے قدم ٹھٹک گئے تھے۔

"جی۔" وہ ان کے پکارنے سے ہی سمجھ چکا تھا کہ وہ کیا سوال کرنے والی ہیں؟

"تت۔ تم۔ زہرہ۔ بتول۔ شاہ کے۔" وہ سوال مکمل نہیں کر پائی تھیں۔

"جی ہاں۔ میں بابر شاہ کا بیٹا اور زہرہ بتول شاہ کا بھتیجا ہوں۔ دل آور شاہ۔ وہی دل آور شاہ جو آپ کی محبت کا ذائقہ اور آپ کی گود کا لمس آج بھی نہیں بھولا' سب یاد ہے اور اذیت بھی اسی چیز کی ہے کہ سب یاد ہے' میں بھولا کیوں نہیں ہوں۔"

وہ دکھ سے کہتا ان سب پہ اک طائرانہ سی نظر ڈال کر وقار آفندی کے بیڈ روم سے باہر نکل گیا تھا اور اس کے پیچھے پوری حویلی میں ایک بار پھر اک ہلچل سی مچ گئی تھی۔ جبکہ دانیال تو اس کے ساتھ ہی اس کی گاڑی میں آ گیا تھا لیکن باقی سب بھی رہ نہیں سکے تھے۔

باری باری سبھی اپنی اپنی گاڑیاں نکالتے چلے گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

عبداللہ بلڈ دینے کے بعد روم سے نکل ہی رہا تھا۔ کہ اتنے میں دل آور بھی وہاں آن پہنچا لیکن اس کے ساتھ دوسری شخصیت کو دیکھ کر عبداللہ ذرا سا جھجکا اور اس نے فوراً" ہی اپنے ذہن پہ زور ڈالتے ہوئے سوچا تھا کہ اس نے اس شخصیت کو پہلے کہاں دیکھا ہے؟ کیونکہ اس کی شکل و صورت بہت ہی مانوس سی لگ رہی تھی۔

"یہ میرا دوست ہے ملک عبداللہ۔" دل آور نے عبداللہ کا تعارف کروایا۔

لیکن دانیال بری طرح چونک گیا تھا۔ اسے شدید ترین حیرت کا دھچکا لگا تھا۔

"اور عبداللہ یہ علیزے کا کزن۔" دل آور نے دانیال کا تعارف کروانا چاہا تھا۔

مگر دانیال نے اسے روک دیا تھا۔

”ٹھہریے! میں اپنا تعارف خود کرواتا ہوں۔“ اس نے دل آور کو کچھ بولنے سے باز رکھا۔

”اور میں علیزے کا کزن ہوں ملک دانیال وجاہت علی۔ علیزے میری پھوپھی زاد اور ماموں زاد کزن ہے اور میں اس وقت علیزے کے لیے ہی یہاں آیا ہوں کیونکہ علیزے کا اور میرا بلڈ گروپ سیم ہی ہے۔“ دانیال نے کہتے ہوئے عبداللہ کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ جبکہ عبداللہ ہکا بکا اس کی صورت دیکھ رہا تھا۔

”گروپ تو میرا اور علیزے کا بھی سیم ہی ہے یعنی ہم لوگ اجنبی نہیں ایک ہی تسبیح کے دانے ہیں ایک ہی گھر کے فرد ہیں اور ایک ہی نسل اور خاندان کا خون ہیں۔ نہ علیزے غیر ہے نہ تم غیر ہو تو پھر یہ ہاتھ کیوں بڑھا رہے ہو گلے ملو یار۔ یہ کندھا یہ سینہ حاضر ہے تمہارے لیے۔“

عبداللہ نے کہتے ہوئے بازو پھیلا دیے تھے اور دانیال کو اس کے گلے لگنا ہی پڑا کیونکہ اس کے انداز میں بڑی چاہ بھی بڑا مان تھا۔

”یار! اس سے بڑی خوشی کی بات اور کیا ہوگی کہ آج علیزے نے ہم لوگوں کو ایک دوسرے سے ملا دیا ہے۔“ عبداللہ دانیال سے مل کر بے انتہا خوش ہوا تھا اور خوش تو دانیال بھی ہوا مگر اس کے ذہن پہ ماضی کا غبار بھی حاوی تھا جو رفتہ رفتہ ہی چھٹ سکتا تھا۔

”دانیال! میری علیزے کہاں ہے؟“ آذر کے ساتھ آسیہ آفندی بھی گرتی پڑتی وہاں آپہنچی تھیں اور دنیال بے ساختہ ان کی طرف پلٹا تھا۔

”آنی! ان سے ملیں، یہ عبداللہ ہیں۔ عبداللہ بھائی آپ کے بڑے بھائی کے صاحبزادے۔“ دانیال نے ——
—— اپنے کندھے سے کندھا ملا کے کھڑے عبداللہ کی طرف اشارہ کیا تھا۔

”عبداللہ۔“ آسیہ آفندی نے حیرت سے دل آور کی طرف دیکھا تھا کہ وہ تو کہہ رہا تھا ملک اسد اللہ نے اس پہ حملہ کروایا ہے تو پھر عبداللہ یہاں کیسے؟

”جی ہاں یہ عبداللہ ہے۔ میرا دوست اور میرا بھائی۔ ملک شرافت علی اور ملک اسد اللہ سے بالکل مختلف۔“ دل آور نے خود اس کا تعارف کروایا تھا اور آسیہ آفندی کے اعصاب قدرے ریلیکس ہو گئے۔

”السلام علیکم! کیسی ہیں آپ؟“ عبداللہ نے ذرا سا آگے بڑھ کے انہیں سلام کیا اور آسیہ آفندی نے بے ساختہ بھرائی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے گلے سے لگا لیا۔

”سر مسز علیزے شاہ کی کنڈیشن آؤٹ آف کنٹرول ہوتی جا رہی ہے ڈاکٹر صاحب نے آپ کو آئی سی یو میں بلایا ہے۔“ نرس تقریباً بھاگتی ہوئی دل آور کے قریب آئی تھی اور دل آور کے چہرے کی ہوائیاں اڑ گئی تھیں وہ بے ساختہ سب کو پیچھے ہٹا کر آئی سی یو کی طرف بھاگا تھا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ باقی سب بھی بھاگے چلے آئے تھے۔

☼ ☼ ☼

”مدیحہ میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔“

وہ سو کر اٹھی ہی تھی کہ اپنے سیل پہ جبزی کا میسج دیکھ کر حیران پریشان رہ گئی اور فوراً سے بھی پیشتر اس کا نمبر ڈائل کیا تھا۔

دوسری طرف بھی فوراً ہی کال ریسو ہو گئی تھی۔

”السلام علیکم!“ مدیحہ جو دوسری طرف سے جبزی کے اسی پرانے اسٹائل اور ہیلو ہائے کی توقع کر رہی تھی جبزی کے منہ سے بڑے تحمل سے کیا گیا سلام سن کر بے ساختہ ہی چونکی تھی۔

”وعلیکم السلام! جبزی کہاں تھے تم؟ اتنے مہینے ہو گئے ہیں، تمہاری کہیں سے کوئی خبر ہی نہیں مل رہی تم نے کوئی کانٹیکٹ ہی نہیں کیا؟ کہاں چلے گئے تھے آخر؟“ مدیحہ سلام کا جواب دینے کے فوراً بعد ہی شروع ہو گئی تھی۔

”میں مری چلا گیا تھا۔“ جبزی نے اب بھی کافی سکون سے ہی جواب سے نوازا تھا۔

”مری! کیا مطلب؟ تم ابھی تک پاکستان میں ہی تھے؟“ مدیحہ کو سن کر شاک لگا تھا۔

”ہاں! میں پاکستان میں ہی تھا، جب میں پاکستان سے کچھ حاصل کرنے کے لیے آیا تھا تو حاصل کیے بغیر کیسے جا سکتا تھا؟“ اس کی لینگویج انگلش سے اردو میں ڈھل چکی تھی۔ اور مدیحہ کو مزید حیرت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

”واٹ ڈو یو مین جبزی؟ یہ کیا کہہ رہے ہو تم۔“ مدیحہ کے کچھ پلے نہیں پڑا تھا۔ وہ اس کی بات کا مفہوم نہیں سمجھ پائی تھی۔

”میں جو کہہ رہا ہوں، تمہیں سب پتا چل جائے گا بس ایک بار تم مجھ سے ملو تو سہی۔“

جبزی ملنے پہ زور دے رہا تھا اور مدیحہ چند ثانیے کے لیے چپ سی ہو گئی۔ پھر ذرا توقف سے گویا ہوئی۔

”جبزی۔ ملنا تو میں بھی چاہتی ہوں تم سے، یہ بتا دو کہ ملو گے کہاں؟“

مدیحہ کافی سنجیدگی سے پوچھ رہی تھی۔

”وہیں۔ اسی ہوٹل میں۔“ جبزی بھی حد درجہ سنجیدہ لگ رہا تھا۔ مدیحہ کو بے چینی تو ہوئی لیکن پھر اپنا تجسس دبا گئی۔

”اوکے۔ ایک گھنٹے بعد میں تمہیں وہیں ملتی ہوں۔“ مدیحہ نے کال بند کرنا چاہی۔

”اللہ حافظ۔“ جبزی نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا اور مدیحہ اپنے موبائل کو دیکھتی رہ گئی۔

”اللہ حافظ۔“ وہ خود کلامی کے سے انداز میں بولی تھی۔ لیکن ایک حتمی نتیجہ پھر بھی اخذ نہیں کر سکی کیونکہ وہ بس چونک رہی تھی، ٹھٹک رہی تھی مگر اپنے خیالات پہ یقین کی مہر نہیں لگا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

رات گزر چکی تھی، صبح کا سورج اپنی کرنیں پوری طرح سے پھیلا چکا تھا۔

علیزے کے گھر والے اس کے ہوش میں آنے کے انتظار میں پوری رات آنکھوں میں بسر کر چکے تھے۔ لیکن وہ تھی کہ ہنوز بے ہوش پڑی تھی اور ڈاکٹرز ابھی بھی اس کی زندگی سے مایوس نظر آتے تھے اور دل آور مسلسل سر جھکائے بیٹھا تھا۔

”دل آور۔ ناشتا کر لو۔ پلیز۔ تم نے کل صبح سے کچھ نہیں کھایا۔“ عبداللہ نے قریب آ کر اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا تھا۔ لیکن وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”کر لوں گا ناشتا بھی۔ ناشتا کیے بغیر مر نہیں جاؤں گا۔ علیزے زندہ ہے تو سمجھ لو کہ دل آور شاہ بھی زندہ ہے۔“ وہ عبداللہ کو تسلی دے کر آگے بڑھا مگر عبداللہ کی آواز نے اسے روک دیا۔

”کہاں جا رہے ہو؟“ عبداللہ کھٹک گیا تھا۔

”گھر۔“ اس نے بے حد آہستگی سے جواب دیا تھا۔

”گھر۔ مگر کیوں؟“ عبداللہ کو حیرت ہوئی۔

”کیونکہ میں نے کورٹ جانا ہے۔“ اس کا لہجہ انتہائی سرد و سپاٹ سا ہو رہا تھا۔ عبداللہ کے اعصاب جھنجھنا اٹھے اس نے یکدم کرنٹ کھا کے دل آور کی طرف دیکھا تھا۔

”کورٹ۔ مگر دل آور۔ تمہاری اپنی زندگی کو بھی خطرہ ہے۔ یہ کیا کرنے جا رہے ہو تم۔“ عبداللہ کو اس کی طرف سے فکر ہوئی تھی لیکن دل آور کو اپنی کوئی فکر نہیں تھی۔

”میرا جو نقصان ہونا تھا وہ ہو چکا ہے، اب مجھے ان کی طرف سے کوئی ڈر، کوئی خوف نہیں ہے، میں نے انصاف کی یہ جنگ لڑنی ہے اور ہر حال میں لڑنی ہے۔ اس کے لیے چاہے کچھ بھی ہو جائے مجھے پروا نہیں ہے۔“ وہ کہہ کر اسپتال کے اس پرائیویٹ روم سے باہر نکل گیا اور عبداللہ کے ساتھ ساتھ آذر، دانیال، عائشہ آفندی اور آسیہ آفندی سب دیکھتے رہ گئے تھے۔ لیکن دل آور کو خود بھی پتا نہیں تھا کہ ایس پی کامران مہدی اور انسپکٹر شہناز نے

اس کے لیے کتنی ٹائٹ سیکورٹی کا انتظام کر رکھا ہے۔
اسپتال سے لے کر اس کے گھر تک اور اس کے گھر سے ہائی کورٹ تک وہ سیکورٹی کے گھیرے میں تھا۔ اسی لیے وہ بہت ہی پرامن اور پرعزم طریقے سے اپنے وقت پہ ہائی کورٹ پہنچ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس نے اپنے بیڈ روم سے نکلنے سے پہلے اپنی ڈریسنگ ٹیبل کے دراز سے جیزی کی دی ہوئی انگوٹھی والی ڈبیا نکال کر اپنے بیگ میں رکھی اور اپنا سیل فون اٹھا کر بیڈ روم سے باہر نکل آئی۔
"مدحیہ... کہاں جا رہی ہیں آپ؟" مومنہ کچن سے نکل کر فائزہ بیگم کے بیڈ روم میں جا رہی تھی' جب مدحیہ کو دیکھ کر اس نے بے اختیار ہی پوچھ لیا تھا۔
"میں اپنے ایک فرینڈ سے ملنے کے لیے جا رہی ہوں کیوں خیریت؟ کوئی کام ہے آپ کو۔" مدحیہ جاتے جاتے رک گئی تھی۔
"نن نہیں... مم مجھے بھلا کیا کام ہو سکتا ہے۔" مومنہ نے فوراً" نفی میں سر ہلایا تھا۔
"آپ کو پتا ہے آج سے کچھ عرصہ پہلے جب آپ نئی نئی اس گھر میں آئی تھیں تو ایک روز آپ نے اسی طرح مجھے روک کر مجھ سے پوچھا تھا کہ میں کہاں جا رہی ہوں اور میرے پوچھنے پہ آپ نے یہی کہا تھا کہ آپ کو کوئی کام نہیں ہے۔ آپ کو کیا کام ہو سکتا ہے بھلا اور مجھے اس بات پہ حیرت ہوتی ہے کہ آپ کو کوئی کام کیسے نہیں ہو سکتا؟ آپ بھی انسان ہیں آخر۔ آپ کی بھی ضروریات ہوں گی۔ آپ کی بھی خواہشات ہوں گی۔ لیکن آپ کہتی کیوں نہیں ہیں؟" مدحیہ کو مومنہ کی چپ اچھی نہیں لگتی تھی۔ اسی لیے وہ آج بول ہی پڑی تھی۔
"لیکن مدحیہ... مجھے ضرورت ہوگی تو میں کہوں گی نا۔" مومنہ آہستگی سے مسکرائی۔
"ضرورت سب کو ہوتی ہے اور ضرورت ہر چیز کی ہوتی ہے۔ اینی وے... کل آپ تیار رہیے گا۔ میں آپ کو اپنے ساتھ شاپنگ پہ لے کر جاؤں گی اور اپنی پسند سے شاپنگ کرواؤں گی کیونکہ آپ کو چاہے احساس ہو یا نہ ہو لیکن مجھے احساس ضرور ہے کہ آپ کی بہت سی ضروریات ہیں' جو لازمی پوری ہونی چاہئیں۔ میں بھائی سے بھی بات کروں گی' لیکن ابھی میں جلدی میں ہوں۔ ابھی مجھے کہیں پہنچنا ہے او کے بائے۔"
مدحیہ کہہ کر ہاتھ ہلاتی ہوئی پلٹ گئی تھی۔ لیکن کچھ یاد آنے پر فوراً" رک بھی گئی تھی۔
"سنیں بھابھی..." اس نے مومنہ کو بے ساختہ اس کے رشتے سے پکارا اور مومنہ سر سے پیر تک کانپ گئی وہ بھلا اپنے آپ کو اس قابل کہاں سمجھتی تھی۔
"جی..." اس نے بمشکل جی کہا تھا۔
"میں آپ کو اپنے ساتھ پارلر لے کر بھی جاؤں گی۔ میرے بھائی کو ایک فریش فیس نظر آنا چاہیے۔" مدحیہ کے اس نئے آئیڈیے پہ مومنہ قدرے جھینپ گئی۔
"نہیں... اسے پارلر لے کر جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وہ ایسے ہی ٹھیک ہے۔"
نبیل سیڑھیاں اترتا ہوا نیچے آ رہا تھا۔
"نو تھینکس... آپ اپنے خیالات اپنے تک ہی رکھیں۔ میں انہیں ضرور لے کر جاؤں گی۔" مدحیہ نے ضد کی اور نبیل نے سر جھٹک دیا۔
"او کے... یہ بات تو بعد کی ہے۔ فی الحال ہم کورٹ جا رہے ہیں۔ ول آور بھی کورٹ پہنچ چکا ہے۔" نبیل نے گھڑی دیکھی تھی۔
"کورٹ... مگر کیوں؟" مومنہ یکدم... سہم گئی تھی۔
"آج ملک حق نواز کے کیس کی لاسٹ ڈیٹ ہے۔ آج فیصلہ سنایا جائے گا۔ آج اس کی سزا کا حکم جاری ہوگا۔" نبیل کا لہجہ پریقین تھا۔

"آپ اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہیں؟ وہ بری بھی تو ہو سکتا ہے نا؟ اس کی ضمانت بھی تو ہو سکتی ہے نا؟"
مومنہ اندر سے خوف زدہ ہو چکی تھی اور نبیل اس کا خوف بھانپ گیا تھا۔
"مجھے اللہ تعالیٰ کے انصاف پہ اور ول آور کی صلاحیت اور اس کی محنت پہ پورا یقین ہے۔ اللہ تعالیٰ ضرور انصاف کرے گا اور ول آور کی محبت اور کوششوں کا صلہ ضرور دے گا۔ آپ بھی اللہ پہ بھروسا رکھیں اور میرے ساتھ کورٹ چلیں۔ میں باہر گاڑی میں آپ کا انتظار کرتا ہوں۔ آپ چادر لے کر آجائیں کہیں لیٹ نہ ہو جائیں۔" نبیل کہہ کر باہر نکل گیا تھا اور مومنہ بے بسی سے مدحیہ کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔ مدحیہ نے آگے بڑھ کے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے تسلی دی تھی۔
"ڈونٹ وری بھابھی... آپ پریشان کیوں ہو رہی ہیں۔ آپ کی حفاظت کی ذمہ داری اب بھائی پہ ہے۔ وہ ہیں نا پریشان ہونے کے لیے اور وہاں تو ول آور بھائی بھی ہوں گے۔ سیکورٹی بھی ہوگی۔ پلیز آپ بے فکر ہو جائیں اور کورٹ جانے کی تیاری کریں۔ بھائی آپ کا ویٹ کر رہے ہیں۔"
مدحیہ کی تسلی پہ مومنہ نے بمشکل اپنی ہمت مجتمع کی تھی اور فائزہ بیگم سے اجازت لے کر چادر اوڑھتی ہوئی باہر چلی گئی تھی اور ان کے پیچھے مدحیہ بھی اپنی گاڑی نکال لے گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

لف اللہ نال ربا دل میرا
مینوں "ب" دی خبر نہ کائی
"ب" پڑھدیاں مینوں سمجھ نہ آوے
لذت "الف" دی آئی
"ع" تے "غ" دا فرق نہ جاناں
ایہہ گل "الف" سمجھائی
بلھیا قول "الف" دے پورے
جیہڑے دل دی کرن صفائی

"میرا نام اب محمد جہاں زیب ہے۔
میرا مذہب اب اسلام ہے۔
میرا ملک اب پاکستان ہے۔
مجھے عشق اب اس کی پاک ذات سے ہے' جس نے مجھے پیدا کیا اور مجھے سیدھی راہ دکھائی۔ مگر میں احسان مند ہوں تمہارا جس کی وجہ سے میں آج "جیزی" نہیں۔ "محمد جہاں زیب" ہونے کا اعزاز پا چکا ہوں اور میں شکر گزار ہوں اس لڑکی کا جس نے مجھے ایک انسان سے ایک مسلمان ہونے کا فرق سمجھایا اور میرا ساتھ دیا۔ مجھے جنت اور دوزخ کی تمیز سکھائی اور مجھ جیسے برے اور بد انسان کو کلمہ پڑھا کر پاک کر دیا اور میرے اپنے ہی ضمیر کے سامنے معتبر بھی بنا دیا ہے مجھے۔"
وہ بول رہا تھا اور وہ سن رہی تھی اور جیسے جیسے سن رہی تھی اس کے چودہ طبق روشن ہوتے جا رہے تھے۔ اپنے گھر سے تو وہ جیزی سے ملنے کے لیے نکلی تھی' لیکن ملاقات محمد جہاں زیب سے ہو گئی تھی۔ جس سے ملنے کے بعد وہ مسلسل حیرتوں کی زد میں تھی۔
"کیا بات ہے مدحیہ... کیا تمہیں یہ سب جان کر خوشی نہیں ہوئی؟" اس نے گم سم سی بیٹھی مدحیہ کو خود ہی متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی۔
"جیزی... مجھے خوشی..." مدحیہ کچھ کہتے کہتے یکدم رک گئی اور وہ اس کے چپ ہو جانے پہ بے ساختہ مسکرا دیا تھا۔ کیونکہ وہ سمجھ چکا تھا کہ وہ کیوں چپ ہوئی ہے۔

"اٹس اوکے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس نے میرا نام اس لیے محمد جہاں زیب رکھا ہے کہ جیزی کہنے والوں کو کوئی پرابلم نہ ہو۔ لیکن اس کے باوجود میں یہی چاہتا ہوں کہ سب مجھے محمد جہاں زیب کہہ کر ہی مخاطب کریں۔ جیزی میں کچھ نہیں رکھا لیکن محمد میں بہت کچھ ہے۔ بہت میٹھا نام ہے یہ۔ صرف نام لینے سے ہی منہ میں لذت آجاتی ہے۔ اک مٹھاس سی ہے اس نام میں۔"

وہ بہت عقیدت اور بہت محبت سے اپنی فیلنگز بیان کررہا تھا اور مدحیہ محض سر جھکائے رہ گئی تھی۔

"خیر۔ اب بولو۔ کیا کہنے والی تھیں تم؟ میں نے تمہاری بات ٹوک دی۔"

اس نے مدحیہ کو دوبارہ سے بات کرنے پہ اکسایا تھا۔

"محمد جہاں زیب میں یہ کہنا چاہ رہی ہوں کہ مجھے خوشی ہوئی ہے اور بہت زیادہ ہوئی ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ یہ افسوس بھی ہورہا ہے کہ یہ کام اللہ نے میرے نصیب میں نہیں لکھا اور اس لڑکی پہ رشک آرہا ہے، جس کے نصیب میں اللہ نے بہت نیک کام کی سعادت لکھ دی۔

اور میری نظر میں وہ لڑکی بہت ہی خوش نصیب ہے محمد جہاں زیب اور اللہ اسے ہمیشہ خوش نصیب ہی رکھے' آمین۔" مدحیہ نے صدق دل سے دعا کی تھی اور اپنے دل سے اک بوجھ سا ہٹتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

"وہ خوش نصیب ہی نہیں بہت اچھی بھی ہے۔ اتنی اچھی کہ اللہ تعالیٰ سے پہلی دعا اسی کے لیے کی ہے اسی کو مانگا ہے اور مجھے اللہ پہ بھروسا ہے' پورا بھروسا کہ وہ میری پہلی دعا کبھی بھی رد نہیں کرے گا۔" محمد جہاں زیب کے لہجے میں ایک بھرپور یقین تھا اور مدحیہ اس کے یقین پہ چپ رہ گئی تھی۔

لیکن پھر ذرا توقف سے کچھ خیال آنے پہ اس نے آہستگی سے محمد جہاں زیب کو مخاطب کیا۔ "کیا نام پوچھ سکتی ہوں اس خوش نصیب کا؟" اس نے کسی اور ہی خیال کے تحت پوچھا تھا۔

"ہوں.... کیوں نہیں.... فاطمہ نام ہے اس کا.... فاطمہ بدر...." محمد جہاں زیب اس کا نام لیتے ہوئے بھی جیسے خوش ہورہا تھا سرشار ہورہا تھا۔

"ہوں.... بہت پیارا نام ہے.... بہت خوب صورت بھی۔" مدحیہ نے تعریف کی سراہا تھا اور وہ اس کے سراہنے پہ بے ساختہ مسکرا دیا تھا۔

"تھینک یو....!" اس نے باقاعدہ شکریہ بھی ادا کیا۔ وہ بھی یوں جیسے مدحیہ نے اس کی تعریف کی ہو یا اسے سراہا ہو۔

"تھینکس کی ضرورت نہیں ہے' ہاں البتہ اسے اس چیز کی ضرور' ضرورت ہے' یہ اس کی امانت ہے۔ تم اسے دے دو۔" مدحیہ نے اپنے بیگ سے وہ مخملی سی ڈبیا نکال کر محمد جہاں زیب کی طرف بڑھا دی تھی اور اس نے بے ساختہ مدحیہ کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔

"نہیں محمد جہاں زیب! تم یہ مت سمجھو کہ میں نے یہ رنگ واپس کرنے کا فیصلہ ابھی کیا ہے' حالانکہ تم نے جب مجھے یہ رنگ دی تھی تو تم نے کہا تھا کہ تم جب واپس لوٹاؤ گی تو میں تم سے وجہ نہیں پوچھوں گا لیکن تمہارے بغیر پوچھے بھی میں تمہیں بتا رہی ہوں کہ میں یہ رنگ اس لیے لوٹا رہی ہوں کہ مجھے اس سے کئی گنا زیادہ قیمتی ہیرا مل چکا ہے۔ بلکہ مجھے اس کو قیمتی نہیں انمول کہنا چاہیے جن کی کوئی قیمت ہی نہیں ہے' جو میرے لیے سب سے زیادہ اہم ہے' سب سے الگ ہے' میں اسے کھونا نہیں چاہتی.... اس سارے قصے کے بعد میں اس نتیجے پہ ضرور پہنچی ہوں کہ انسان کسی سے کم نہیں ہوتا کبھی کبھی کسی دکان پہ کھوٹا کہہ کر واپس لوٹا دیا جاتا ہے اور کبھی کسی دکان پر کھرا سمجھ کر پاس رکھ لیا جاتا ہے۔ بس فرق یہ ہوتا ہے کہ کھوٹے اور کھرے کی پہچان کرنے والی نظر الگ الگ ہوتی ہے۔ میں نے تمہیں کھوٹا کہہ کر واپس لوٹا دیا اور فاطمہ بدر نے تمہیں کھرا سمجھ کر اپنے پاس رکھ لیا۔

شاید اس لیے کہ اسے تم جیسے سکے کا انتظار تھا اور مجھے عدیل عمر جیسے سکے کی تلاش تھی اور زندگی کے اس موڑ پہ دونوں کا انتظار اور دونوں کی تلاش ختم ہوگئی ہے۔ وہ اپنے سکے کو پاکر خوش ہوگی اور میں اپنے سکے کو حاصل کرکے خوش ہوں اور میں شکر گزار ہوں اس رب کی جس نے کسی کو بھی مایوس نہیں کیا اور کسی کے دل پہ کوئی بوجھ نہیں رہنے دیا۔" مدحیہ کی آواز بھرا گئی تھی اور محمد جہاں زیب نے آہستگی سے سر جھکا لیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ ان دونوں میں مزید کوئی بات چیت ہوتی اتنے میں دروازے پہ دستک ہوئی تھی اور محمد جہاں زیب دستک کے انداز سے ہی پہچان گیا تھا کہ دستک دینے والا کون ہے....؟

"فاطمہ....!" اس نے بے ساختہ اس کا نام لیا تھا اور ایک لڑکی دروازہ دھکیل کر اندر آگئی تھی۔

"السلام علیکم....!" فاطمہ نے اندر آتے ہی سلام کیا اور محمد جہاں زیب کے ساتھ ساتھ مدحیہ بھی اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی تھی۔

"وعلیکم السلام....!" ان دونوں نے تقریباً" بیک وقت ہی اس کے سلام کا جواب دیا تھا۔

"مدحیہ....! کیسی ہیں آپ؟" فاطمہ نے ڈائریکٹ مدحیہ کو ہی مخاطب کیا تھا اور ایک پل کے لیے مدحیہ کو خوشگوار سی حیرانی ہوئی کہ فاطمہ اس کو غائبانہ تعارف سے ہی پہچان گئی ہے۔

لیکن پھر محمد جہاں زیب کے چہرے پہ مسکراہٹ دیکھ کر سمجھ گئی تھی کہ اس نے یقیناً" فاطمہ کو بھی بتا رکھا ہوگا کہ مدحیہ آنے والی ہے۔

"اللہ کا شکر ہے.... میں بالکل ٹھیک ہوں آپ سنائیں؟ آپ کیسی ہیں؟"

"ادھر بھی اللہ کا کرم ہے.... احسان ہے اس پاک ذات کا۔" فاطمہ مسکرائی تھی۔

"ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی شوق ہوا تھا کہ میں فاطمہ بدر نامی لڑکی کو دیکھ سکوں اور اسے مبارک باد دے کر اس کے ایک نیک کام پہ اسے پورے دل سے سراہوں اور دیکھیں' اللہ نے بیٹھے بیٹھے ہی میرا یہ شوق یہ خواہش پوری کردی ہے اور سچ پوچھیں تو آپ کو دیکھ کر اور آپ سے مل کر واقعی بہت خوشی ہوئی ہے' اللہ آپ کو بھی ہمیشہ خوش رکھے اور مزید نیکیوں کی توفیق عطا فرمائے.... آمین۔"

مدحیہ نے بہت اچھے طریقے سے اپنی فیلنگز کا اظہار کیا تھا جس پہ فاطمہ بھی بہت خوش ہوئی تھی اور تھوڑی دیر بات چیت کے بعد ان دونوں سے اجازت چاہی تھی....

"ارے....! اتنی جلدی کیوں جارہی ہیں آپ؟ ابھی بیٹھیں.... میں تو محمد جہاں زیب کو یہ گڈ نیوز دینے کے لیے آئی تھی کہ میرے مما پاپا ہماری شادی کے لیے مان گئے ہیں اور انہوں نے آج اسے ملنے کے لیے اسے ہمارے گھر بلایا ہے۔ اس لیے میں اسے شام کھانے پہ انوائیٹ کرنے کے لیے آئی ہوں...." فاطمہ نے مدحیہ کو روکنے کے ساتھ ساتھ محمد جہاں زیب کو اک نئی اطلاع دی تھی جسے سن کر محمد جہاں زیب تو خوش ہوا ہی تھا لیکن مدحیہ بھی اس اطلاع پہ بے پناہ خوش ہوئی تھی۔

"ارے واہ.... پھر تو بہت بہت مبارک ہو آپ دونوں کو...." مدحیہ نے کھل کے خوشی کا اظہار کیا تھا۔

"نو....! صرف مبارک ہی نہیں چلے گی.... تمہیں اس سارے سلسلے میں میرا ساتھ دینا ہوگا.... میری شادی میں میری مدد کرنا ہوگی ورنہ میں تو کچھ بھی نہیں کرسکوں گا...."

محمد جہاں زیب نے مدحیہ سے اس کی مدد چاہی تھی اور مدحیہ نے اس کام کے لیے فوراً" ہامی بھرلی' مجھے منظور ہے تمہاری شادی کی تمام تیاری اور تمام ذمہ داری میری لیکن ابھی اس وقت مجھے اجازت چاہیے آپ لوگ بیٹھیں.... بات کریں.... اور انجوائے کریں.... گڈ بائے" مدحیہ ان سے اجازت لے کر محمد جہاں زیب کے روم سے نکل آئی تھی۔

نجانے کیوں اسے اس وقت عدیل سے ملنے کی جلدی ہورہی تھی۔

لیکن اندر سے وہ محمد جہاں زیب اور فاطمہ کے لیے بھی بہت خوش تھی....

اسے حقیقتاً" شلوار قمیص اور دوپٹے میں ملبوس انتہائی سادہ سے انداز والی فاطمہ بہت پسند آئی تھی۔ مگر اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہی انتہائی سادہ سی نظر آنے والی فاطمہ کبھی بہت ہی ماڈرن اور فیشن ایبل لڑکی ہوا کرتی تھی۔ مگر

اللہ نے اس کے قدم سیدھی راہ کی طرف موڑ کر اسے بہت ہی سادہ، نرم دل، خوش اخلاق اور باحیا لڑکی کے سانچے میں ڈھال دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"مبارک ہو سر...! بہت بہت مبارک ہو... ہمیں شروع سے ہی امید تھی کہ یہ کیس آپ کے ہی حق میں جائے گا۔" ایڈووکیٹ اویس اختر نے عدالت سے باہر نکلتے ہی دل آور سے ہاتھ ملاتے ہوئے اسے مبارک باد پیش کی تھی۔

"تھینک یو...! تھینک یو سوچ..." دل آور تمام کاغذی کارروائی نبٹا کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھا تھا اسے ملک حق نواز کی سزائے موت کا حکم سن کر بھی کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی کیونکہ اس وقت اس کے ذہن پہ علیزے کی بے ہوشی کا غم سوار تھا اور اسے ہاسپٹل پہنچنے کی جلدی تھی اور اس عجلت میں وہ سب کو نظر انداز کرتا ہوا اپنی گاڑی کے قریب آگیا تھا۔

"مبارک ہو بیرسٹر صاحب! کہاں جا رہے ہیں۔" ایس پی کامران مہدی بھی کافی خوشگوار موڈ کے ساتھ اس کے قریب آیا تھا۔

"ہاسپٹل...!" اس نے کافی مختصراً جواب دیا تھا۔

"ہاسپٹل...؟ مگر کیوں؟ خیریت تو ہے نا۔" ان دونوں کے پیچھے آنے والا نبیل بھی وہیں ان کے پاس ہی رک گیا اور اس کے ساتھ چادر میں لپٹی ہوئی مومنہ بی بی کو بھی رکنا پڑا۔

"ارے! آپ کو نہیں پتا؟ کل صبح مسز علیزے شاہ ملک حق نواز کی طرف سے کروائے گئے حملے میں شدید زخمی ہوئی ہیں دو گولیاں لگی تھیں جنہیں آپریشن سے نکال لیا گیا ہے لیکن وہ ابھی تک ہوش میں نہیں آئیں" ایس پی کامران مہدی نے حیرت سے نبیل حیات کی طرف دیکھا تھا کہ وہ ابھی تک انجان ہے۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ اتنا سنگین مسئلہ ہو گیا ہے اور مجھے خبر ہی نہیں کسی نے بتایا ہی نہیں؟" نبیل کو حقیقتاً "بہت بڑا شاک لگا تھا اور مومنہ کے تو قدموں تلے سے زمین سرک گئی تھی۔

"اسی لیے تو نہیں بتایا تھا کہ تم پریشان ہو گے اور تمہارے ساتھ ساتھ بھابھی کو بھی پریشانی اٹھانا پڑے گی؟" دل آور نے سرسری سا جواز پیش کیا تھا۔

"یہ بات نہیں ہے دل آور...! تم نے مجھے سچ مچ خود سے الگ کر دیا ہے۔ غیر بنا دیا ہے مجھے اسی لیے... اسی لیے نہیں بتایا...؟" نبیل تو ہنوز دکھ اور شاک کی سی کیفیت میں تھا۔

"ٹھیک ہے... تم یونہی سمجھ لو... لیکن میں اس وقت مزید کوئی بھی صفائی پیش کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں... مجھے اس وقت ہر حال میں ہاسپٹل پہنچنا ہے..."

دل آور کہہ کر گاڑی کا لاک کھولنے لگا اور پھر بے ساختہ ان کی طرف پلٹا تھا۔

"لیکن پلیز...! میری آپ سب سے ریکوئسٹ ہے کہ میری علیزے کے لیے دعا ضرور کریں صرف یہ دعا کہ وہ بچ جائے، وہ زندہ رہے، میرے لیے، میری خاطر۔"

دل آور کہہ کر گاڑی میں بیٹھا اور گاڑی نکال لے گیا تھا۔

جبکہ نبیل اور مومنہ وہیں کھڑے اسے دیکھتے رہ گئے تھے ایس پی کامران مہدی تو ان کی باتوں کے دوران ہی اپنی ایک ضروری کال سننے کے لیے پیچھے ہٹ گئے تھے...

☆ ☆ ☆

وہ بہت ہی رش ڈرائیو کر کے ہاسپٹل پہنچا تھا لیکن ہاسپٹل کے سامنے پہنچ کر اس کے دماغ کو اک جھٹکا سا لگا اور اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔

"او مائی گاڈ... یہ تو وہی ہاسپٹل ہے جہاں زری ایڈمٹ تھی؟ تو کیا میں علیزے کو بھی وہیں لے آیا؟"

"اف...! تو اس لیے عبداللہ پہلے سے ہی وہیں تھا؟ او نو یہ کیا ہو گیا مجھ سے؟"

دل آور نے اپنے آپ کو بے طرح کوسا تھا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا بھلا جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا تھا اب اس طرح پریشان ہونے سے اور اپنے آپ کو کوسنے سے کیا حاصل تھا۔ اسی لیے وہ مجبوراً "اپنے پچھتاوے کو کنٹرول کرتا ہوا گاڑی سے اتر آیا تھا۔

اور اس کے پیچھے ہی نبیل کی گاڑی بھی آرکی تھی۔ وہ خود کو دل آور کی مصیبت اور پریشانی سے دور نہیں رکھ سکا تھا لیکن ہاسپٹل پہنچ کر اسے بھی اس احساس نے گھیرے میں لیا تھا جس احساس کی لپیٹ میں خود دل آور شاہ بھی آ چکا تھا۔

لیکن اس وقت اس کے لیے پوری دنیا سے زیادہ اہم صرف علیزے شاہ تھی اور وہ اس کے متعلق سوچ رہا تھا اور اسی کے لیے متفکر ہو رہا تھا۔

جبھی سارے احساسات کو جھٹک کر اندر آگیا تھا۔

"السلام علیکم...!" اس نے ہاسپٹل کے پرائیویٹ روم میں داخل ہوتے ہی سلام کیا تھا۔

"وعلیکم السلام!" آسیہ آفندی اور دانیال کے علاوہ کسی نے بھی سلام کا جواب نہیں دیا تھا۔

"کیسی ہے وہ...؟" اس نے آذر، جودت اور اسرار آفندی وغیرہ کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے آسیہ آفندی کو ہی مخاطب کیا جو مسلسل کوئی ورد پڑھ رہی تھیں۔

"اسی حال میں ہے جس حال میں چھوڑ کر گئے ہو۔" وہ کہتے ہوئے پھر سے روہانسی ہو گئیں اور ان کا لہجہ بھرا گیا تھا۔

"ڈاکٹرز نے وزٹ کیا؟" اب کی بار دانیال سے سوال کیا گیا تھا۔

"جی ہاں... کیا ہے اور مزید آدھا گھنٹہ ویٹ کرنے کا کہا ہے۔ اگر وہ آدھے گھنٹے تک ہوش میں نہ آئی تو خطرہ بڑھ بھی سکتا ہے۔" دانیال نے بہت ہی نارمل طریقے سے اسے جواب دیا تھا۔

"سر! سر! مبارک ہو آپ کو، آپ کی مسز ہوش میں آگئی ہیں۔"

دانیال کی بات ابھی ختم ہوئی ہی تھی کہ اچانک نرس بھاگتی ہوئی اندر آئی اور اس کی اس اطلاع پہ وہاں موجود تمام افراد کے جسموں میں جیسے روح پھونک دی گئی تھی۔

"سچ... علیزے ہوش میں آگئی ہے؟" آسیہ آفندی فوراً "اٹھ کھڑی ہوئیں اور پھر تقریباً" سبھی وہاں سے بھاگتے ہوئے باہر نکلے تھے۔

لیکن ڈاکٹر نے سبھی کو ملنے سے روک دیا تھا کیونکہ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ ایک گھنٹے تک وہ مکمل طور پہ ہوش میں آجائے گی اور اسے آئی سی یو سے پرائیویٹ روم میں شفٹ کر دیا جائے گا۔

تب ان سب کو دوبارہ سے انتظار کرنا پڑا جبکہ دل آور جو پہلے ہی باوضو ہو کر کورٹ میں کیس لڑنے گیا تھا۔ علیزے کے ہوش میں آنے کی اطلاع سنتے ہی وہیں ہاسپٹل کے روم میں بچھے ایک جائے نماز پہ سجدہ ریز ہو گیا اور شکرانے کے نفل ادا کیے۔

"دل آور...!" نبیل کے ساتھ عبداللہ اچانک اس روم میں داخل ہوا تھا مگر سامنے سجدے میں جھکے اور شکرانے کی حالت میں موجود دل آور شاہ کو دیکھ کر ان دونوں کے ہی قدم اپنی اپنی جگہ پہ جم سے گئے اور ان دونوں نے ہی بے ساختہ ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا۔

اور انہیں اس لمحے اپنی نظروں کے سامنے دل آور شاہ نہیں بلکہ اس کی محبت خدا کے حضور سجدہ ریز ہوئی دکھائی دی تھی اور اس کا دل انہیں جائے نماز کی طرح بچھا ہوا نظر آیا تھا۔

"ماشاءاللہ...! مبارک ہو... علیزے بھابھی ہوش میں آگئی ہیں" سلام پھیرنے کے بعد وہ دعا کے لیے ہاتھ اٹھا ہی رہا تھا کہ نبیل بے ساختہ بیچ میں ہی بول پڑا اور دل آور اس کی شرارت سمجھ گیا کہ وہ اسے چھیڑنے کے لیے بولا ہے۔

اسی لیے دل آور دعا مانگنے کے فوراً "بعد ہی اٹھ کھڑا ہوا اور اس کی طرف پلٹا تھا۔

"خیر مبارک...!" وہ کہتے ہوئے ان دونوں کے قریب آگیا تھا۔

"اتنا پیار کرتے ہو علیزے بھابھی سے؟" نبیل جان بوجھ کر ماحول کی سنجیدگی اور اداسی دور کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"اب تو مجھے خود بھی نہیں پتا کہ کتنا پیار کرتا ہوں اس سے؟ لیکن اتنا احساس ہو رہا ہے کہ جتنا تم سے کرتا ہوں اس سے بھی کئی گنا زیادہ پیار علیزے سے کرتا ہوں۔"

دل آور نے اعتراف کیا تھا اور نبیل نے قہقہہ لگا کر ہنستے ہوئے اسے گلے سے لگا لیا اور عبداللہ نے ان دونوں کے کندھے تھپکے تھے۔

"یعنی علیزے بھابھی کو میرا رقیب بنا دیا ہے تم نے؟" نبیل مصنوعی خفگی سے بولا تھا۔

"یہی سمجھ لو۔" دل آور نے کندھے اچکائے تھے۔

"ویسے یار۔۔۔! تمہارے سسرال والے بہت عجیب سے لگے ہیں مجھے۔۔۔ کسی کا بھی موڈ سیدھا نہیں ہے ایک دوسرے سے بھی خفا خفا سے لگ رہے ہیں۔۔۔ یہ کن لوگوں میں شادی کر لی ہے تم نے؟"

نبیل نے بہت ہی رازدارانہ انداز اپناتے ہوئے دل آور سے سوال کیا تھا جبکہ دوسری طرف عبداللہ نے گلا کھنکھارتے ہوئے اسے اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔

"آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اس کی سسرال کے بارے میں ذرا انڈر کنٹرول رہ کر بات کرنا کیونکہ اس کی سسرال میری پھوپھی کا گھر ہے۔ علیزے کوئی غیر نہیں میری کزن ہے۔ پھوپھی زاد بہن ہے میری اور میرے چچا ملک وجاہت علی کی فیملی بھی ساتھ ہی ہے۔"

عبداللہ نے نبیل پہ اک نیا دھماکا کیا تھا اور نبیل اپنی جگہ پہ حیران رہ گیا۔

"ہیں۔۔۔ یہ کیا چکر ہے بھلا؟" اسے اپنے کانوں پہ یقین نہیں آیا تھا۔

"بس یار۔۔۔! یہ اور کچھ نہیں۔۔۔ قسمت کا چکر ہے۔" عبداللہ نے کندھے اچکائے تھے۔

"تو کیا پہلے پتا نہیں تھا اس چکر کا۔۔۔؟" نبیل کی حیرانی ختم ہی نہیں ہو رہی تھی۔

"نہیں! بس آج ایک دوسرے سے تعارف ہوا ہے تو پتا چلا ہے یہ شاید پہلے بھی وقار آفندی کا یا بڑی حویلی کا نام لے لیتا تو میں پہچان جاتا مگر ہمارے درمیان کبھی اس ٹاپک پہ بات ہی نہیں ہوئی تو پھر پتا کیسے چل سکتا تھا؟"

"تو اب وہ لوگ کیسے مان گئے؟ اس نے تو علیزے بھابھی سے لو میرج کی تھی نا۔۔۔؟"

نبیل مارے حیرت کے سوال پہ سوال کیے جا رہا تھا۔

"علیزے کو بلڈ کی ضرورت تھی' اس لیے دل آور کو ان کی فیملی کے پاس جانا پڑا۔"

اس کے سارے سوالوں کے جواب عبداللہ دے رہا تھا اور دل آور چپ کا چپ رہ گیا تھا۔

"اوہ۔۔۔! تو یہ ماجرا ہے؟" اب نبیل کے کچھ پلے پڑا تھا اور وہ سر اثبات میں ہلانے لگا البتہ دل آور عبداللہ کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

"تھینک یو یار۔۔۔! تھینک یو ویری مچ۔۔۔ آج تم نے علیزے کو بلڈ ڈونیٹ کر کے مجھے اپنا مقروض کر لیا ہے تمہارے اس خون کا بدلہ میں زندگی بھر نہیں اتار سکتا۔۔۔"

اس نے عبداللہ کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے تھے۔

"نہیں یار۔۔۔! میرا تم پہ کوئی قرض نہیں ہے اور نہ ہی کوئی احسان ہے تم پہ بلکہ آج علیزے کو بلڈ ڈونیٹ کر کے میں نے تم پہ ثابت کر دیا ہے کہ علیزے میری بہن ہے۔ میرے لیے زرمی کی طرح ہی ہے اور اس کے ساتھ میرا پہلے بھی خون کا رشتہ تھا اور اب بھی خون کا ہی رشتہ ہے۔

اس لیے تم اب یہی سمجھنا کہ تمہاری شادی میری بہن سے ہوئی ہے۔ جس کا تم نے ہمیشہ بہت خیال رکھنا ہے اور بہت محبت کرنی ہے اس سے۔" الٹا عبداللہ نے دل آور کو سمجھانے کی کوشش کی تھی اور نبیل قسمت کے اس ہیر پھیر کو دیکھتا رہ گیا تھا۔

"تم بہت اچھے ہو عبداللہ۔۔۔ میری سوچ سے بھی زیادہ اور میری دوستی سے بھی بڑھ کے۔۔۔" دل آور نے اسے بے ساختہ اپنے گلے سے لگا لیا تھا۔

"جب تم سے دوستی ہوئی تھی تو کہا تھا نا کہ اس دوستی سے بڑھ کے کبھی کچھ بھی نہیں ہو گا۔۔۔؟ تو دیکھ لو آج

واقعی اس دوستی سے بڑھ کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔" عبداللہ نے اس کو اپنے مضبوط بازوؤں میں بھینچتے ہوئے اس کے کندھے پہ تھپکی دی اور پھر تینوں ہی مسکرا دیے تھے۔

اتنے میں نرس دوبارہ اندر آ گئی اور ان تینوں کو روم سے باہر بھیج دیا اور اس کے ساتھ ہی علیزے کو لا کر روم میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔

"علیزے۔۔۔! آسیہ آفندی کی آواز پہ علیزے نے بے ساختہ چونک کر دیکھا لیکن ان کے ساتھ ساتھ باقی سب کو دیکھ کر علیزے کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

"مما آپ؟" اس کے ہونٹ کپکپائے تھے۔

"جی میری جان۔۔۔ میں تمہاری مما۔۔۔" انہوں نے آگے بڑھ کے علیزے کا ماتھا چومتے ہوئے اسے اپنی آغوش میں چھپا لیا تھا۔

"آذر بھائی! دانیال بھائی! عائشہ پھوپھو! اسرار انکل۔۔۔ آپ۔۔۔ آپ۔۔۔ سب۔۔۔"

علیزے کی آواز کانپ رہی تھی۔ وہ سب سے مل کر خوش ہو رہی تھی' سرشار ہو رہی تھی اس کے آنسو بہہ رہے تھے۔۔۔ اسے تو جیسے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی تھی۔ لیکن ایک کمی پہ آ کر وہ بے ساختہ تھم سی گئی تھی۔

"پاپا۔۔۔؟" اس نے ماں کو سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

"بیٹا۔۔۔! ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔۔۔ وہ کہتے ہیں علیزے جلدی سے ٹھیک ہو جائے پھر تم لوگ اسے گھر لے آنا۔" آسیہ آفندی نے اس کے بال سنوارتے ہوئے کہا تھا۔

"لیکن مما! پاپا۔۔۔" علیزے کی آواز بھرا گئی تھی۔

"ارے نہیں بیٹا رونا نہیں ہے۔۔۔ بس اب جلدی سے ٹھیک ہونا ہے پھر تمہارے پاپا بھی ٹھیک ہو جائیں گے۔" وہ اسے بہلا رہی تھیں' تسلیاں دے رہی تھیں لیکن علیزے کا دل مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔ وہ وقار آفندی کے لیے متفکر ہو رہی تھی۔

"دانیال بھائی۔۔۔! آپ بتائیں نا پاپا کہاں ہیں؟ وہ کیوں نہیں آئے؟" علیزے نے قریب کھڑے دانیال کو مخاطب کیا تھا۔

"ڈیڈ کی طبیعت خراب ہے علیزے! وہ یہاں نہیں آ سکتے لیکن بہت جلد ہم تمہیں ان کے پاس لے جائیں گے۔۔۔" دانیال نے بھی اسے تسلی دی اور اس کے سر پہ ہاتھ رکھا تھا۔

"پرامس۔۔۔" اس نے وعدہ لیا۔

"اوکے پرامس۔۔۔!" دانیال کو وعدہ کرنا ہی پڑا تھا۔

"ثروت آنٹی کہاں ہیں۔۔۔؟ کومل آپی' حرمت آپی اور جودت بھائی بھی نہیں آئے۔۔۔ زین بھی نہیں ملا مجھ سے اور۔۔۔ اور میرے عون اور عدید کہاں ہیں مما۔۔۔؟" علیزے بڑے اشتیاق و۔۔۔ بے قراری سے لہجے میں پوچھ رہی تھی اور تقریباً سبھی کا ہی پوچھا تھا۔

اور علیزے کی اس لاپروائی' اس لاتعلقی اور اس اجنبیت پہ دل آور کا تھوڑی دیر پہلے خوشی کی لے پہ دھڑکنے والا دل بری طرح اداس ہوا تھا اور ایک دم سے جیسے بجھ کے رہ گیا تھا۔

کیونکہ وہ اس کمرے میں ہونے کے باوجود بھی علیزے کو کہیں نظر نہیں آیا تھا۔

شاید اس لیے کہ آج اسے سب اپنے نظر آ رہے تھے اور ان سب اپنوں میں وہ اپنے اک بہت اپنے کو بھول بیٹھی تھی' یا شاید جان بوجھ کر نظر انداز کر گئی تھی۔

لیکن جو بھی تھا۔۔۔ مگر دل آور شاہ کا دل کرچی کرچی کر گیا تھا۔

وہ علیزے کی ذرا سی لاتعلقی اور ذرا سی لاپروائی بھی برداشت نہیں کر پایا تھا' سہہ نہیں سکا تھا اسی لیے تو فوراً ہی کمرے سے باہر نکل گیا اور اب کمرے میں یا علیزے تھی۔۔۔ یا پھر علیزے کے اپنے تھے۔۔۔ اور بس۔۔۔!

(باقی آئندہ)

✲ ✲

نبیلہ عزیز

دو دل

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نبیل حیات دونوں بہن بھائی ہیں' مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے' وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پہ رنگ چکی ہے' جس کے پیش نظر فائزہ بیگم' نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں' لیکن مدحیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے' جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے' مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے' مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا' بے بسی اور مجبوری سے تنگ آ کر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے' لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے یاور امتیاز مل جاتا ہے' جو اسے کام کی آفر کرتا ہے' جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے' اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے' وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے' وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

ولی آزر شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے' وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے' اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا' اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دلاتی ہیں۔

—۳۹—
اُنتالیسویں قسط

"بھابھی۔"

"ہوں۔"

"گھر چلیں۔" اس نے بڑی معصومیت سے اور بڑی حسرت سے پوچھا تھا۔

"کیوں؟ خیریت ہے؟" نگارش اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے پھیرتے رک گئی۔

"میں گھر جانا چاہتی ہوں بھابھی۔ مجھے گھر لے چلیں پلیز... مجھے گھر لے چلیں۔ میرا دم گھٹنے لگا ہے یہاں مجھے... مجھے وحشت ہونے لگی ہے اس کمرے سے... پلیز خدا کے لیے مجھے گھر لے چلیں۔ میں اب اور یہاں نہیں رہ سکتی' میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں' مجھے یہاں سے لے چلیں۔"

زری التجائیہ سے انداز میں کہتے ہوئے روہانسی سی ہوگئی تھی اور نگارش اس کی ایسی بے بس اور لاچاری کیفیت پہ دنگ رہ گئی کہ زری اندر سے کتنی گھبرائی ہوئی اور ستائی ہوئی لگ رہی ہے۔ اتنی کہ وہ آخر رہ نہیں سکی اور اپنی بے بسی اور اذیت بیان کر ڈالی ہے۔

"بھابھی پلیز! مجھے گھر لے چلیں۔" اس نے بے چینی سے اور بے بسی سے کہتے ہوئے نگارش کا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور نگارش اپنے تعجب کے حصار سے نکل آئی تھی۔

"اوکے اوکے۔ میں عبداللہ سے بات کرتی ہوں۔ وہ ڈاکٹر سے مشورہ کرلیں گے تو پھر ہم تمہیں گھر لے چلیں گے ڈونٹ وری میری جان ڈونٹ وری۔" نگارش نے اپنے دائیں ہاتھ سے اس کے سر کو تھپکتے ہوئے اس کی پیشانی پہ بوسہ دیا تھا۔

"نہیں بھابھی ڈاکٹر اگر اجازت نہ بھی دیں تو بھی مجھے یہاں سے لے جائیں ورنہ... ورنہ میرا دم گھٹ جائے گا مرجاؤں گی میں۔" زری کا لہجہ گلوگیر ہوگیا تھا اور آنکھیں بھی پانیوں سے لبریز ہونے لگی تھیں۔

"اوکے لے چلیں گے۔" نگارش نے اسے ایک بھرپور تسلی دی تھی اور اتنے میں ڈاکٹرز اور ان کے ساتھ دو نرسیں بھی وزٹ پہ آگئیں اور ان کے پیچھے پیچھے عبداللہ بھی اندر چلا آیا تھا۔

"ہیلو مس زرین کیسی ہیں آپ؟" ڈاکٹر سلطان نے کافی نرم اور فریش انداز میں اسے مخاطب کیا تھا' لیکن وہ نظریں چرا گئی تھی۔

"ہیلو مس زرین! کیا ہوا؟ کیا ناراض ہوگئی ہیں ہم سے؟ جواب بھی نہیں دے رہیں۔" ڈاکٹر سلطان کافی خوش مزاج آدمی تھے اور زری جب سے ہوش میں آئی تھی وہ اس کے ساتھ بھی اسی طرح بہت فرینڈلی سے انداز میں پیش آتے تھے۔

"وہ آپ سے ناراض نہیں ہے' وہ اس ماحول سے اکتا چکی ہے' گھر جانا چاہتی ہے۔"

زری کے بجائے نگارش نے ان کو جواب دیا تھا اور ڈاکٹر سلطان نے کافی اچنبھے سے زری کی طرف دیکھا تھا۔

"اوہ... ! تو یہ بات ہے مس زرین گویا آپ ہم لوگوں سے اکتا چکی ہیں خیر کوئی بات نہیں اب ہم اتنے بھی برے نہیں ہیں کہ آپ کو زبردستی اس اسپتال کا مہمان بنائے رکھیں گے۔" ڈاکٹر سلطان نے مصنوعی خفگی کا اظہار کرتے ہوئے زری کا بی پی چیک کرتی نرس کی رپورٹ کی طرف دیکھا تھا' بی پی نارمل تھا۔

"کیا مطلب؟" زری نے فوراً" پوچھا۔

"مطلب یہ کہ آپ ناراض نہ ہوں آپ کے کچھ ٹیسٹ باقی ہیں وہ ہو جائیں تو پھر آپ کو جانے کی اجازت ہے' ہم آپ کو نہیں روکیں گے۔" ڈاکٹر سلطان نے جیسے زری کی ڈوبتی نبضوں کو روانی بخش دی تھی اس نے بے اختیار ان کے چہرے کی طرف دیکھا تھا لیکن بے یقین نظروں سے۔

"آپ سچ کہہ رہے ہیں ڈاکٹر؟" زری نے بہت ہی اشتیاق سے پوچھا تھا۔

"اللہ معاف کرے مس زرین میں جھوٹ کیوں بولوں گا بھلا۔" ڈاکٹر سلطان نے تعجب سے کہا اور زری ان کی طرف سے ایسے سچ اور ایسی تسلی ملنے پہ بے ساختہ مسکرا دی تھی۔

"ہوں! گڈ گرل بس اسی طرح ہنستی مسکراتی رہیں شاباش۔" ڈاکٹر سلطان نے اس کا سر تھپکتے ہوئے کہا۔ پھر اس کے چند ضروری ٹیسٹ لکھ کر دیئے اور دوسرے ڈاکٹر کے ساتھ روم سے باہر نکل گئے تھے۔

"تھینک یو بھابھی! تھینک یو ویری مچ۔" زری نے ان کے جاتے ہی نگارش کا شکریہ ادا کیا اور اب کی بار نگارش مسکرائی تھی۔

"ارے اس کام کے لیے تھینکس کی کوئی ضرورت نہیں ہے' یہ کام تو میں نے اپنے بھلے کے لیے کیا ہے۔ میں بھی اس اسپتال سے اور اپنے خالی گھر سے اکتا چکی ہوں کیوں عبداللہ آپ کا کیا خیال ہے؟" نگارش نے اپنے قریب کھڑے عبداللہ کو بھی اپنی گفتگو میں گھسیٹا تھا۔

"بالکل جناب تم دونوں سے زیادہ تو میں اکتا چکا ہوں۔ جس کو دن رات بس یہی فکر ستائے رکھتی ہے کہ گھر جانا ہے... اسپتال جانا ہے... گھر جانا ہے... اسپتال جانا ہے۔"

عبداللہ کی بات پہ وہ دونوں ہی ہنس پڑی تھیں کیونکہ وہ بے چارا سچ ہی تو کہہ رہا تھا۔ اسی لیے زری کے ٹیسٹ کروانے میں عبداللہ نے سب سے زیادہ پھرتی دکھائی تھی۔

☼ ☼ ☼

نبیل مومنہ کو گھر چھوڑ کر دوبارہ اسپتال آیا تھا لیکن داخلی دروازہ عبور کر کے وہ راہداری کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ اس کے قدم ٹھٹک کر رک گئے اسے اسپتال کے بڑے... اور کشادہ سے ویٹنگ روم میں کسی کا شک گزرا تھا اسی لیے وہ انہی قدموں پہ واپس پلٹا اور دوبارہ ویٹنگ روم میں جھانک کر دیکھا اس کے ذہن سے گزرنے والا شک یقین میں ڈھل گیا تھا اور وہ اس یقین پہ دل ہی دل میں حیران ہوتا اندر آکر اس کے بالکل برابر بیٹھ گیا تھا۔

"خیریت؟ یہاں کیوں بیٹھے ہو؟" نبیل نے گردن موڑتے ہوئے اپنے برابر سر جھکا کر چپ چاپ بیٹھے دل آور کو بڑی اپنائیت سے مخاطب کیا لیکن اس کی طرف سے جواب ندارد

"ہیلو... ! مسٹر دل آور شاہ میں آپ سے مخاطب ہوں۔" اس نے اس کا پورا نام لیتے ہوئے اپنی بات پہ زور دیا جس پہ خاموش بیٹھے دل آور کو اپنے تمام تاثرات کنٹرول کرتے ہوئے مجبوراً" اس کی طرف متوجہ ہونا ہی پڑا۔

"کہو؟ کیا کہنا چاہ رہے ہو؟" دل آور نے ایک گہری سانس کھینچتے ہوئے پوچھا۔

"یہاں کیوں بیٹھے ہو؟" نبیل نے اپنا سوال ایک بار پھر دہرایا۔

"اکیلا تھا' اس لیے یہاں آکر بیٹھ گیا۔" اس کا جواب بہت نارمل اور بہت نپا تلا سا تھا۔

"اکیلے کیوں تھے؟ علیزے بھابھی کہاں ہیں؟" نبیل کھٹک گیا۔

"اپنوں کے ساتھ!" اس کا دوسرا جواب پہلے سے بڑھ کے تھا۔

"تو پھر تم کیا ہو؟" اس وقت نبیل اسے ٹٹول رہا تھا۔

"ایک اجنبی!" دل آور کو خود بھی پتا نہیں تھا کہ وہ کیا جواب دے رہا ہے۔

"میں تو سمجھا تھا کہ تم شوہر ہو؟" نبیل نے جان بوجھ کر اسے کریدا۔

"بیویوں کے لیے شوہر سے زیادہ اجنبی اور کوئی نہیں ہوتا۔" دل آور نے بڑے مضبوط لہجے میں اپنا تجزیہ بیان کیا تھا۔

"وہ کیسے؟" نبیل نے جاننا چاہا تھا۔

"وہ ایسے کہ بیویاں اپنے ماں باپ سے اپنے بہن بھائیوں سے اور اپنی دوستوں سے دل کی ہر بات شیئر کر لیتی ہیں' اپنا دکھ رو لیتی ہیں' لیکن شوہر کے سامنے دل کی بات کو دل میں ہی رکھتی ہیں' شوہر چاہے جتنی بھی محبت کرے' بیوی خود بھی چاہے جتنی بھی محبت کرے مگر دل کی بات کو ہمیشہ دل کی بات ہی رکھتی ہے' شوہر تک نہیں جانے دیتی۔" دل آور کے لفظوں میں اس کا بہت گہرا مشاہدہ بول رہا تھا۔

"تو کیا بیوی کبھی بھی شوہر سے اپنی محبت کا اظہار نہیں کرتی؟"

"کرتی ہے۔۔۔ ضرور کرتی ہے مگر اس اظہار کے علاوہ اور کوئی بات نہیں کرتی۔"

"یار! عجیب بات ہے میرے تو کچھ پلے نہیں پڑ رہا اپنی وے چھوڑو ان باتوں کو' آؤ علیزے بھابھی سے مل لو۔" نبیل نے اس کے کندھے پہ ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"نہیں ابھی نہیں ابھی اسے اپنے گھر والوں سے مل لینے دو۔" دل آور نے انکار کر دیا۔

"ارے چھوڑو یار! مل چکے ہیں وہ لوگ بھی اور کتنا ملنا ہے بھلا؟ اٹھو اب تم ملو جا کر ویسے بھی تمہارا ملنا اور ہے اور گھر والوں کا ملنا اور۔۔۔" نبیل نے اسے وہاں سے اٹھانے کی کوشش کی۔

"نبیل! پلیز یار تنگ نہ کرو مل لوں گا بعد میں۔۔۔" دل آور جھنجلا گیا تھا۔

"کیا بھابھی کے ساتھ کوئی خفگی چل رہی ہے؟" نبیل مسکرایا۔

"ہوں! یہی سمجھ لو" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اوہ! تو یہ مسئلہ ہے اس لیے روٹھے روٹھے سرکار نظر آتے ہیں چلو کوئی بات نہیں ہم صلح صفائی کروا دیتے ہیں' تم آؤ تو سہی" نبیل نے پھر اس کا کندھا تھپکا۔

"نبیل! مجھے اکیلا چھوڑ دو جاؤ' عبداللہ کے پاس چلے جاؤ۔" دل آور نے خفگی اور جھنجلاہٹ سے کہا۔ نبیل اسے ہر طرح سے تنگ کرنے کے موڈ میں تھا۔

"نبیل ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ یار" دل آور نے اسے گھورا تھا۔

"انڈر اسٹینڈ کر رہا ہوں اسی لیے تو کہہ رہا ہوں آؤ میرے ساتھ آؤ' علیزے بھابھی سے مل کر آتے ہیں۔" نبیل نے بھی اپنی بات کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا اور دل آور نہ چاہتے ہوئے بھی ضبط کر گیا۔

"بہت ذلیل ہو تم" دل آور بڑبڑاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور نبیل مسکرا دیا۔

"تھینک یو!" وہ اس نوازش پہ اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اٹھ کر اس کے ساتھ ہی باہر نکل آیا تھا۔

"ایکسکیوزمی! کیا' ہمیں بھی تھوڑی فرصت مل سکتی ہے یا نہیں؟" نبیل نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دروازے پہ دستک دی تھی اور ان سب نے بے ساختہ چونک کر ان دونوں کی طرف دیکھا۔

"پلیز! بس تھوڑی دیر" نبیل کا اشارہ ان سب کو یہاں سے بھیجنے کی طرف تھا جس کو کوئی اور تو نہ سہی لیکن آسیہ آفندی ضرور سمجھ گئی تھیں۔

آخر ماں تھیں اور مائیں ہمیشہ ہر اونچ نیچ کو سب سے پہلے ہی سمجھ جایا کرتی ہیں وہ بھی دل آور کی خاموشی اور جھکے ہوئے سر کو دیکھ کر بہت کچھ سمجھ گئی تھیں اسی لیے انہوں نے سب کو باہر جانے کا اشارہ کیا تھا۔

"دانیال بیٹا! آؤ ہم لوگ باہر چلتے ہیں' اتنی دیر میں وہ لوگ مل لیں" آسیہ آفندی کہتی ہوئی خود بھی پلٹ گئی تھیں۔

"مما!" علیزے نے نجانے کس خدشے کے تحت انہیں بے اختیار پکارا تھا۔

"ڈونٹ وری علیزے! ہم یہیں ہیں' ابھی تھوڑی دیر میں آجاتے ہیں" دانیال نے اسے تسلی دی اور آذر وغیرہ کے ساتھ باہر نکل گیا اس لیے اب کمرے میں صرف وہ تینوں ہی رہ گئے تھے جس پہ نبیل نے گلا کھنکارتے ہوئے

کمرے میں اپنی موجودگی کا احساس دلایا تھا۔

"السلام علیکم بھابھی! اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟" نبیل بیڈ کے قریب آتے ہوئے بولا۔

"ہوں! ٹھیک ہوں اب۔ آپ کیسے ہیں؟" علیزے پہلی بار کسی کے منہ سے "بھابھی" کا لفظ سن کر قدرے جھینپ گئی تھی لیکن پھر بھی اس نے محسوس نہیں ہونے دیا تھا۔

"میں بھی اللہ کا شکر ہے کہ ٹھیک ہی ہوں' اور چاہتا ہوں کہ آپ بھی جلدی سے ٹھیک ہو جائیں اور پھر سے اپنی جنت بسا سکیں"

نبیل کی شرارت پر علیزے نے بلا ارادہ ہی دل آور کی طرف دیکھا تھا اور اتفاقاً دل آور نے بھی عین اسی لمحے علیزے کی طرف دیکھا تھا۔

"لیکن میرا خیال ہے کہ جنت بسانے سے پہلے آپ لوگوں کو تھوڑی دیر کے لیے اکیلا چھوڑ دوں تو زیادہ بہتر ہو گا۔" نبیل مزید چھیڑنے والے انداز میں کہتا پلٹ گیا مگر دروازے کے قریب جا کر ایک بار پھر ٹھہرا تھا۔

"اور ہاں بھابھی! یہ نہ سمجھیے گا کہ یہ چپ ہے تو اسے آپ کی تکلیف پہ کوئی دکھ نہیں ہے یہ بہت گہرا آدمی ہے' سمندر سے بھی زیادہ گہرا۔ اس کو سمجھنا ہے تو گہرائی میں اترنا سیکھیں ورنہ اس نے آپ کی زندگی کے لیے اللہ سے جتنی دعائیں مانگی ہیں اور شکرانے کے جتنے بھی سجدے کیے ہیں وہ آپ کو کبھی بھی نظر نہیں آئیں گے اور کبھی بھی احساس نہیں ہو گا۔ اس لیے ایک بار پھر ایک بار میری بات پہ غور ضرور کیجیے گا ۔۔۔۔" نبیل علیزے کو آگاہ کرتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا اور علیزے اس کی بات پر غور کرتی اس کے پیچھے دیکھتی رہ گئی تھی۔

لیکن چند سیکنڈ مسلسل خاموشی کے احساس نے اسے چونکا دیا تھا اور اس نے نظروں کا زاویہ بدلتے ہوئے دل آور کی سمت دیکھا' وہ نظر چرائے ہوئے کھڑا تھا۔

"کیسے ہو ڈرائیور؟" علیزے نے بڑے تحمل سے اس کا حال احوال پوچھا تھا جیسے ان کے تعلقات بڑے دوستانہ رہے ہوں۔ دل آور نے بے ساختہ سر اٹھا کر علیزے کے چہرے کی سمت دیکھا۔

"میں نے تم سے تمہارا حال پوچھا ہے۔" علیزے نے اپنے سوال پر زور دیا۔

"حال سے بے حال کر کے لوگ حال ہی پوچھا کرتے ہیں۔" دل آور ہلکے اور استہزائیہ انداز میں مسکرایا تھا۔

"حال سے بے حال تو میں ہو گئی ہوں' دیکھ نہیں رہے۔" علیزے بے حد آہستگی سے اور مدھم آواز میں بول رہی تھی حالانکہ ڈاکٹرز نے اسے زیادہ بات کرنے سے منع کیا مگر وہ آج سب اپنوں کو دیکھ کر تکلیف کے باوجود بھی چپ نہیں ہو پا رہی تھی اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ بولتی رہے' بولتی رہے اور دل کے سارے غبار نکال دے۔

"دیکھ بھی رہا ہوں اور محسوس بھی کر رہا ہوں کہ کاش یہ تکلیف مجھے آئی ہوتی' کاش یہ گولیاں مجھے لگی ہوتیں کاش اس بستر پہ میں ہوتا اور مجھے اتنی تکلیف نہ ہوتی جتنی تمہیں دیکھ کر ہو رہی ہے۔"

دل آور نے آگے بڑھ کے اس کے نازک سے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا اور اپنے جذبات اور احساسات کی گرمی کا احساس دلایا تھا۔

"لیکن میں اپنی اس تکلیف پہ بھی بہت خوش ہوں ڈرائیور کیونکہ مجھے اس تکلیف کے عوض میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی اور سب سے بڑی دولت مل گئی ہے' میرے اپنے۔۔۔ میرے گھر والے" علیزے نے بڑے دل سے اپنی خوشی کا اظہار کیا تھا۔

"تمہاری زندگی اور تمہاری خوشی کے لیے ہی تو یہ پیالہ پیا ہے ورنہ ان حالات میں میری جگہ کوئی اور ہوتا تو ایسا ہرگز نہ کرتا کیونکہ ایسا کرنے کے لیے کسی کے پاس اتنا حوصلہ ہی نہیں ہو سکتا۔" دل آور نے تلخی سے کہتے ہوئے سر جھکا تھا۔

"یہ سب کچھ کیا بھی تو تم نے تھانا؟" علیزے شکوہ کناں لہجے میں بولی۔

"یہ سب کچھ کیوں کیا میں نے تم یہ نہیں جانتی نا جب جان جاؤ گی تو پھر تم سے پوچھوں گا کہ تم کیا کہتی ہو؟ اور تمہارا انصاف کیا کہتا ہے؟"

دل آور کا لہجہ دھیما اور تلخ ہو چکا تھا۔

"یہ تو بعد کی بات ہے نا لیکن فی الحال میں تمہاری بہت زیادہ شکر گزار ہوں اور تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں کہ تم میری خاطر میرے گھر گئے اور میرے گھر والوں کو لے کر آئے ہو جس کی وجہ سے میں آج اپنی تکلیف بھی بھول گئی ہوں تھینک یو سو مچ ڈرائیور تھینک یو سو مچ"

علیزے نے اپنی طرف سے اس کے احسان کا شکریہ ادا کیا تھا مگر نجانے کیوں دل آور کو یوں لگا جیسے علیزے نے اسے اپنے آپ سے الگ کر دیا ہو' اسے کھڑے کھڑے اجنبی اور غیر بنا دیا ہو۔

"میں نے یہ سب تمہارے اس شکریے کے لیے نہیں کیا علیزے! بلکہ میں نے یہ سب تمہارے لیے کیا ہے' صرف تمہارے لیے" دل آور نے اس کی ذات کے لیے زور دیا تھا۔

"میں نے شکریہ بھی تو اسی لیے ادا کیا ہے نا کہ تم میری خاطر میرے گھر گئے ہو۔"

"اس وقت تمہاری خاطر میں کچھ بھی کر سکتا تھا علیزے! کچھ بھی۔ چاہے مجھے تمہاری خاطر کسی کا قتل ہی کیوں نہ کرنا پڑتا۔" دل آور کے اک اک لفظ میں شدت بول رہی تھی اور علیزے ٹھٹکنے اور اس کے چہرے کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

"کیوں؟ میری خاطر کیوں؟ ہمارے درمیان تو ایسا کوئی جذبہ نہیں ہے جس کے بل بوتے پہ تم کچھ بھی کر گزرو؟" علیزے نقطہ اٹھانے سے رہ نہیں سکی تھی۔

"کل تک میں بھی یہی سمجھتا تھا کہ ہمارے درمیان کچھ بھی نہیں کوئی جذبہ ہی نہیں ہے لیکن جیسے ہی تم سے جدا ہونے کا خیال گزرا سمجھ لو روح پہ ایک عذاب گزرا ہے۔ اک ایسا عذاب جس میں یہ جان لیوا ادراک ہوا کہ سارے جذبے ہمارے درمیان ہی تو ہیں باقی ساری دنیا میں تو کچھ ہے ہی نہیں ساری دنیا جذبات سے عاری ہے سوائے ہمارے۔"

دل آور کے گمبھیر لہجے میں سچ مچ اس کے بوجھل بھیگے اور مہکتے ہوئے جذبات ہمک رہے تھے۔

"دو نفرت کرنے والوں کے درمیان ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟" علیزے اس کے جذبات سے انکاری تھی۔

"کل میں تمہارے لیے تڑپا ہوں نا تو مجھ پہ میرے جذبات کا ادراک ہو گیا ہے اب جب تم میرے لیے تڑپو گی نا تو تم پہ بھی تمہارے جذبات کا ادراک ہو جائے گا بس اب دیکھنا یہ ہے کہ تم کب تڑپتی ہو میرے لیے کیوں کہ تڑپ میں انسان اپنے آپ میں نہیں رہتا کھل کے سامنے آجاتا ہے۔ میں سب کے سامنے آچکا ہوں اب تمہاری باری ہے"

دل آور نے چیلنج سے کہا اور تھوڑا سا علیزے کے اوپر جھک آیا جس پر علیزے قدرے سٹپٹا گئی۔

"ڈرائیور!" اس نے احتجاجاً اسے پکارا تھا کیونکہ ہاتھ پاؤں تو وہ ہلا ہی نہیں سکتی تھی۔

"آج تمہیں یہ بوسہ اس لیے دے رہا ہوں کہ آج میرا دل چاہ رہا ہے کہ تمہیں بوسہ دوں اور تمہیں اس سے احساس ہو کہ تم صرف میری ہو اور تم پہ صرف میرا حق ہے لیکن اس کے بعد اگلی بار یہ بوسہ تمہیں تب دوں گا کہ جب تمہارا دل چاہے گا کہ تمہارا ڈرائیور تمہیں بوسہ دے اور تمہیں احساس ہو کہ تم واقعی صرف میری ہو اور تم پہ صرف میرا حق ہے"

دل آور بہت بوجھل اور بھیگے سے لہجے میں کہتے ہوئے اس کے چہرے پہ ذرا اور جھکا تھا اور علیزے مارے بے

بسی کے ہل بھی نہیں سکی۔

"ڈ... ڈرائیور!" اس کے ہونٹ کپکپائے مگر دل آور نے اس کے ہونٹوں کو کپکپانے کے لیے بھی مہلت نہیں دی اور علیزے کے پورے ہوش و حواس سمیت اپنے ہونٹوں کی ایک بھرپور استحقاق آمیز مہر —— —— ثبت کر دی تھی اور علیزے کے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔ وہ بے جان پڑی حق دق رہ گئی تھی کہ دل آور نے یہ کیا کر دیا ہے آخر۔

آج سے پہلے تو اس نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی تھی۔

تو پھر آج کیوں؟

وہ بھی اس حالت میں۔

اور اس بے باکی سے۔

علیزے سوچ سوچ کر پاگل نہ ہوتی تو اور کیا کرتی لیکن دل آور پیچھے ہٹتے ہوئے بہت مسرور نظر آیا۔ مگر علیزے تو اب کچھ کہنے کے بھی قابل نہیں رہی تھی۔

"ایم سوری علیزے! میں زور زبردستی کا قائل نہیں ہوں مگر نجانے کیوں آج خود یہ حرکت کرنے پہ مجبور ہو گیا ہوں' شاید اس لیے کہ مجھے تمہارے دور چلے جانے کا وہم ستا رہا ہے اور میں ایسی ویسی حرکتیں کر کے تمہیں یہ جتا رہا ہوں کہ اب تم پہ صرف میرا حق ہے' تمہارے گھر والوں کا بھی نہیں' تم جہاں بھی ہو' جس حال میں بھی ہو' صرف میری ہو میری زندگی ہو' میری جان ہو۔" دل آور اس کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامے اسے اپنے دل کے تمام اظہار بخش رہا تھا اور علیزے بڑے گم سم سے انداز میں سب سن رہی تھی اور سمجھ بھی رہی تھی لیکن اس پہ عمل بھی کرے گی یا نہیں یہ پتا نہیں تھا۔

"دیکھو علیزے! یہ تمہارے اور میرے رشتے کی آزمائش کا وقت ہے اور میں چاہتا ہوں کہ ہم دونوں اس رشتے کی آزمائش پہ پورا اتریں تم میرا ساتھ دو اور میں تمہارا ساتھ دوں کیونکہ زندگی کے اس موڑ پہ ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ کی ہی تو ضرورت ہے تم نے میری عزت اور میرا بھرم رکھنا ہے اور میں نے تمہاری عزت اور تمہارا بھرم رکھنا ہے کیونکہ یہی ہمارے رشتے کا تقاضا ہے اور یہی آزمائش ہے ورنہ سب کی نظروں میں نہ تمہارا کوئی مقام رہے گا اور نہ میرا اس لیے اگر معتبر رہنا چاہتی ہو تو خود کو مجھ سے الگ مت کرنا اور کوئی بھی جذباتی سوچ سوچنے سے پہلے مجھے اور میری ذات کو ضرور سوچ لینا اور یہ بھی یاد رکھنا کہ ہم دو نہیں ہیں بلکہ ایک ہیں اور ہمیں ایک ہی رہنا چاہیے اور یہ بات میں تمہیں زندگی میں پہلی اور آخری بار سمجھا رہا ہوں۔ اس کے بعد کبھی کچھ بھی نہیں سمجھاؤں گا پھر بعد میں جو بھی سمجھنا ہو گا تمہیں خود ہی سمجھنا ہو گا بس یہ کوشش دوبارہ نہیں کروں گا کیونکہ میں واقعی زور و زبردستی کا قائل نہیں ہوں اس لیے زندگی کے اس نازک اور اہم موڑ پہ اب ہر فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔" دل آور اس کے چہرے کو چھوتے ہوئے کہہ رہا تھا اور علیزے اس کے چہرے کو دیکھتی اس کی باتوں پہ غور کرنے کی کوشش کر رہی تھی اور ابھی ٹھیک سے غور بھی نہیں کر پائی تھی کہ دروازے پہ ہلکی سی دستک ہوئی۔

"اوکے! میں ابھی چلتا ہوں تم اپنے گھر والوں سے ملو اور خوش رہو لیکن ان کے درمیان یہ بھی یاد رکھو کہ تم میری بیوی ہو۔"

دل آور اس کے بالوں کو سہلا رہا تھا اور علیزے نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"آئی مس یو... آئی رئیلی مس یو۔" دل آور کا علیزے کے پاس سے اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا اور علیزے محض پلکیں جھکا کے رہ گئی۔

"مجھے تو شاید تم سے ملنے کا موقع ہی نہ ملتا اور نہ ہی میں خود کوشش کرتا مگر نبیل نے یہ کوشش کر کے مجھ پہ بہت بڑا احسان کیا ہے اب اس ملاقات کے بدلے اس کا شکریہ ادا کرنا پڑے گا۔" دل آور کہتے ہوئے آہستگی سے مسکرایا تھا اور اتنے میں دوبارہ دستک ہوئی اور دل آور اس کے بالوں کو چھیڑتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

☼ ☼ ☼

"زری!" اسے سہارا دے کر ابھی وہیں چیئر پہ بٹھایا ہی گیا تھا کہ اتنے میں آسیہ آفندی دروازہ کھول کر اندر آ گئی تھیں اور زری نے بڑی الجھی ہوئی نظروں سے ان کے چہرے کی سمت دیکھا مگر ذہن پہ زور ڈالنے کے باوجود بھی وہ اس آشنا سی صورت کو پہچان نہیں پائی تھی۔

"آسیہ پھوپھو!" عبداللہ نے آہستگی سے نام لیا اور زری کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ وہ تو اسی لیے اس اسپتال سے ڈسچارج ہونا چاہ رہی تھی کہ اس کا کسی سے بھی سامنا نہ ہو اور وہ چپکے سے یہاں سے چلی جائے مگر آسیہ آفندی اچانک اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھیں۔

"زری! میری جان کیسی ہو؟ یہ... یہ کس تکلیف کو جھیل رہی ہو تم؟ کیا ہوا ہے تمہیں؟" آسیہ آفندی نے آگے بڑھ کر زری کی پیشانی چوم لی تھی اور اس کے قریب جھکتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا۔

"شاید کسی گناہ کی سزا جھیل رہی ہوں۔" زری استہزائیہ سا بولی۔

"ارے یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟" آسیہ آفندی تڑپ گئی تھیں۔

"جو سچ ہے وہی کہہ رہی ہوں۔ کچھ گناہوں کی سزا انسان کو موت کے بعد ملتی ہے اور کچھ گناہوں کی سزا موت سے پہلے اس لیے یہی سمجھ لیں کہ میں موت سے پہلے گناہوں کی سزا جھیل رہی ہوں وہ بھی ایک ایسے گناہ کی سزا جس میں میں خدا کے علاوہ کسی کو خدا مان بیٹھی تھی سو مجھے سزا تو ملنی ہی تھی سنگین سزا۔" زری کا لہجہ انتہائی سخت ہو رہا تھا اور عبداللہ سر جھکا کر رہ گیا۔

"انی وے آپ سنائیں علیزے کیسی ہے کچھ بہتر ہوئی؟" زری نے سر جھکا کر بات کا رخ ہی بدل دیا تھا۔

"ہاں بیٹا! اللہ کا شکر ہے کہ وہ اب پہلے سے ٹھیک ہے کافی بہتر ہے اب ہم سب کو دیکھ کر تو وہ پہلے روز ہی ٹھیک ہو گئی تھی۔" آسیہ آفندی بیٹی کی محبت پہ مسکرائی تھیں۔

"اللہ اسے ہمیشہ ٹھیک رکھے' خوش رکھے' آباد رکھے' سدا سہاگن رہے آمین" زری نے علیزے کے لیے دعا کی تھی اور نگارش کا کلیجہ منہ کو آ گیا اس نے چونک کر عبداللہ کی طرف دیکھا مگر عبداللہ لب بھینچ کر رخ موڑ گیا تھا۔

"ٹھیک ہے آنی ہم لوگ چلتے ہیں آج ہم گھر جا رہے ہیں' بہت عرصے بعد گھر میں قدم رکھنا نصیب ہو گا ان شاء اللہ آپ سے بعد میں بات ہو گی۔" ان دونوں کو گم سم دیکھ کر زری نے خود ہی بات سمیٹی تھی اور آسیہ آفندی سر ہلاتے ہوئے اک سائیڈ پہ ہو گئی تھیں۔

"ٹھیک ہے بیٹا! تم لوگ جاؤ اب تم سے ملاقات تمہارے گھر پہ ہی ہو گی ہم سب آئیں گے تم سے ملنے کے لیے۔" انہوں نے بہت نرمی اور شفقت سے اس کا سر تھپکا۔

"تھینک یو آنی!" زری نے سر جھکا لیا اور پھر عبداللہ اس کی وہیل چیئر دھکیلتا ہوا اسپتال کے روم سے باہر نکل آیا اور زری اس روم سے نکلتے ہوئے دعا کر رہی تھی کہ کاش میرا کسی سے بھی سامنا نہ ہو مگر دعائیں کبھی کبھی مستجاب نہیں بھی ہوتیں۔

ابھی وہ سیکنڈ فلور سے گراؤنڈ فلور پہ آئے ہی تھے کہ سامنے سے آتے نبیل حیات اور دل آور شاہ کے قدم وہیں

کے وہیں جم گئے اور عبداللہ اور نگارش کے چہرے پہ بھی تاریکی کا اک سایہ سا گزرا تھا۔ لیکن پھر بھی عبداللہ نے وہاں سے گزر جانا چاہا تاکہ زری کی صحت پہ کوئی برا اثر نہ پڑے یا پھر دوبارہ وہ کسی صدمے کے حصار میں نہ آجائے لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ اب ایسا نہیں ہوگا اب یہ زری 'وہ زری' نہیں رہی 'اب وہ اس زری کو' اس کے دل کو اور اس دل کی محبت کو اسپتال کے اسی بستر پر کوما میں چھوڑ کے جارہی ہے۔ جس بستر سے خود اٹھ کر آئی ہے۔ اب زندگی میں سب کے چہروں کے رنگ بدلیں گے صرف اس کے چہرے کا رنگ نہیں بدلے گا صرف ایک ہی رنگ رہے گا سکون کا رنگ 'صبر کا رنگ اور بے خبری کا رنگ۔ جیسے اس وقت رہا تھا اور اس نے عبداللہ کو آگے بڑھنے سے روک دیا تھا۔

"ٹھہریں بھائی! کہاں جارہے ہیں آپ؟ ان سے نہیں ملیں گے؟" زری نے عبداللہ کو روکا۔

"زری! ہم لیٹ ہورہے ہیں۔" نگارش نے ایک کمزور سا بہانہ پیش کیا۔

"گھر میں کون سا میرے ماں باپ میرا انتظار کررہے ہیں جس کی وجہ سے لیٹ ہونے کا ڈر ہوگا؟" زری نے نگارش کا بہانہ ٹال دیا اور نگارش جزبزسی ہوگئی تھی جبکہ زری ان دونوں کی طرف خود ہی متوجہ ہوئی تھی۔

"السلام علیکم! نبیل صاحب کیسے ہیں آپ؟ آپ کی بھابھی ٹھیک ہوئیں یا نہیں؟" زری نے بڑی برداشت اور بڑی بہادری کا ثبوت دیتے ہوئے استفسار کیا تھا۔

"وعلیکم السلام! میں ٹھیک ہوں اور اللہ کا احسان ہے کہ بھابھی بھی ٹھیک ہیں اور آپ کو بھی مبارک ہو اللہ نے آپ کو صحت بخشی ہے اور نئے سرے سے زندگی عطا کی ہے۔" نبیل نے بھی بڑی مشکل سے اپنے آپ کو اس طرح اچانک کمپوز کیا تھا کہ اسے اپنے آپ کو ہی داد دینے کو دل چاہا تھا۔

"تھینک یو نبیل صاحب! تھینک یو ویری مچ۔ آپ سب کی دعاؤں سے ہی تو ٹھیک ہوئی ہوں میں۔" زری نے آج سچ مچ اپنے آپ کو پتھر بنانے کی انتہا کر ڈالی تھی اور آج سب کے سامنے ثبوت بھی دے دیا تھا۔

"اس سے بڑی خوشی کی بات اور کیا ہوسکتی ہے بھلا؟" نبیل نے کندھے اچکائے تھے۔

"خیر! آپ سنائیں مسٹر دل آور شاہ؟ آپ کی مسز کیسی ہیں؟ وہ کب ڈسچارج ہورہی ہیں اسپتال سے؟" زری کا رخ اب دل آور کی طرف تھا اور دل آور جو ہمیشہ زری کے سامنے اپنا سر اور اپنی نظریں جھکا کر بات کرتا تھا آج علیزے کے ذکر پہ سر اٹھا کر بات کرنے پر مجبور ہوگیا تھا۔

کیونکہ آج زری کے سامنے علیزے کا ذکر یوں سر جھکا کر کرتا تو شاید علیزے کبھی بھی یوں معتبر نہ ہوپاتی جیسے اس کے سر اٹھا کر بات کرنے سے ہوگئی تھی۔

"الحمد للہ! میری مسز اب کافی بہتر ہیں اور ان شاء اللہ بہت جلد اسپتال سے ڈسچارج بھی ہوجائیں گی بس آپ سب کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔" دل آور کا لہجہ انتہائی مضبوط — تھا گویا وہ سب ہی اپنی اپنی جگہ پہ "وہ" نہیں رہے تھے جو وہ "پہلے" تھے۔

"ہاں کیوں نہیں بس اک دعا کا رشتہ ہی تو ہے جو سب کے دلوں کو زندہ رکھے ہوئے ہے اور مردہ نہیں ہونے دیتا۔" زری نے اثبات میں سرہلایا تھا۔

"تھینک یو" دل آور نے اس کا شکریہ ادا کیا تھا اور زری نے اپنے قریب کھڑی نگارش کی طرف دیکھا۔

"چلیں بھابھی! ہم لیٹ ہورہے ہیں" زری پھر بات کو وہیں پہ لے گئی تھی اور عبداللہ اس کی بات پہ چپ چاپ وہیل چیئر دھکیلتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا لیکن نبیل حیات اور دل آور شاہ وہیں کھڑے وہیل چیئر پر بیٹھی زری کو دیکھتے رہ گئے تھے۔

کیونکہ اب حقیقتاً "ان تینوں کے دل کچھ اور ہوچکے تھے اور دلوں کے دھڑکنے کی طرز بھی کچھ اور ہوچکی تھی

آج وہ اک دوسرے کے پاس سے گزر گئے تھے اور احساس تک نہیں ہوا تھا۔ آخر یہ بھی تو زندگی کا ایک حیران کن مقام تھا!

"چلو! علیزے کے چیک اپ کا ٹائم ہورہا ہے ڈاکٹرز آچکے ہوں گے۔" دل آور گھڑی دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا اور اس کے پیچھے نبیل حیات بھی۔

☼ ☼ ☼

اس کی بائیک انتہائی فل اسپیڈ پہ جارہی تھی جب اس کے سیل فون کی رنگ بجنا شروع ہوئی تھی اور مجبوراً اسے بائیک روک کر سیل فون جیب سے نکالنا پڑا تھا۔ نمبر وکی کا تھا۔

"ہیلو؟" اس نے اپنے مخصوص اسٹائل میں ہیلو کہا۔

"سائم کے فلیٹ پہ پہنچو۔" وکی نے اتنا سا پیغام دے کر فون بند کردیا اور جودت فون کو گھورتا رہ گیا تھا۔

"سائم کے فلیٹ پہ پہنچو یہ بھی کوئی طریقہ ہے بھلا؟ پوری بات بھی نہیں بتائی۔" جودت بے زاری سے کہتے ہوئے بڑبڑایا تھا کیونکہ وہ علیزے سے ملنے اسپتال جارہا تھا اس لیے اب اسے علیزے سے ملنے کا ارادہ بدلنا پڑ گیا تھا۔

اور وہ بائیک کو دوبارہ سے اسٹارٹ کرتا ہوا ہوگیا تھا اور ٹھیک دس منٹ میں سائم کے فلیٹ پہ پہنچ گیا تھا۔

"ہاں بولو! کیا بات ہے؟ اتنی ایمرجنسی میں کیوں بلایا ہے؟" جودت آتے ہی شروع ہوگیا تھا۔ "بیٹھو" وکی نے بڑے موڈ سے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

"اوکے بیٹھ گیا اب بولو۔" جودت نے صوفے پہ بیٹھتے ہوئے دوبارہ سوال داغا۔

"تمہارے سالے کا پتا لگا لیا ہے ہم نے۔" وکی نے بڑی خباثت سے آنکھ دباتے ہوئے کہا۔ "سالے کا؟ مطلب؟ میرے تو اس شہر میں بہت سے سالے ہوں گے۔ تم کس کی بات کررہے ہو؟ جواباً" اس نے خود بھی حد کر ڈالی تھی۔

"جو تمہیں آج کل مطلوب ہے اور جس کی بہن کے تم دیوانے ہوئے پھر رہے ہو مگر وہ تمہارے ہاتھ نہیں آرہی۔" وکی نے اگلا شوشا چھوڑا۔

"کون؟" جودت ٹھٹکا۔ "دیوانے کس کے ہو؟" کامی نے بھی مداخلت کی تھی۔ "مریم!" اس نے جھٹ سے پوچھا۔ "اور وہ ٹھہرا مریم فاروق نیازی کا بھائی 'عدیل عمر نیازی۔" وکی نے انتہائی حیران کن انکشاف کیا تھا اور جودت صوفے سے دو فٹ اوپر اچھل کر کھڑا ہوگیا تھا۔ "کیا؟ عدیل 'مریم کا بھائی ہے؟" جودت کو جیسے بہت بڑا جھٹکا لگا تھا۔

"جی جناب! عدیل عمر نیازی آپ کی مریم کا اکلوتا بھائی ہے اور تمہارے تو دونوں بہن بھائی کی طرف ہی بڑے حساب نکلتے ہیں؟" وکی نے جودت کی دکھتی رگ پہ ہاتھ رکھا۔

"حساب تو واقعی بڑے نکلتے ہیں یار! میں نے اس سے بڑی شرافت سے اور بڑے شریفانہ انداز میں ایک بات پوچھی تھی مگر اس نے نہیں بتائی بلکہ میرے سامنے جھوٹ بول دیا اب اسے اس جھوٹ کا حساب بھی دینا ہوگا۔" جودت کو اس وقت مریم کا وہ جھوٹ بھی یاد آگیا تھا جو وہ دل آور شاہ کی خاطر بول گئی تھی۔

"کیسی بات؟ اور کیسا جھوٹ؟ کچھ ہمیں بھی تو بتاؤ؟" کامی نے تجسس کے مارے اسے کریدا تھا۔

"یار کیا بتاؤں؟ مجھے ایک آدمی کے بارے میں پوچھنا تھا لیکن اس نے نہیں بتایا۔"

"کون آدمی؟" کامی اور وکی بات کا پیچھا کب چھوڑتے بھلا۔

"ہے ایک آدمی' دل آور شاہ نام ہے اس کا۔ اس کے متعلق پوچھا تھا مگر وہ صاف مکر گئی تھی۔" جودت کو تاؤ آرہے تھے کیونکہ وہ اب تک دل آور شاہ کو منصور حسین ہی سمجھ رہا تھا اور مریم نے پوچھنے کے باوجود بھی اس کی غلط فہمی دور نہیں کی تھی۔

"ارے! اسی دل آور شاہ کے شوروم میں ہی تو عدیل عمر نیازی بطور منیجر کام کر رہا ہے۔" وکی نے ایک اور بم پھوڑا اور جودت کو ایک اور کرنٹ چھو گیا تھا۔

"واٹ؟ یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟"

"ارے! تو اور کیا؟ ساری معلومات کس لیے حاصل کی ہیں بھلا۔"

"اوہ مائی گڈنیس! تو یہ چکر ہے یعنی وہ واقعی اسے جانتی تھی۔" جودت کا یقین اب اور بھی پکا ہو گیا تھا۔

"ہنڈرڈ پرسینٹ جانتی تھی" وکی نے جلتی پہ تیل پھینکا۔

"ہوں! وہ اسے جانتی تھی مگر وہ مجھے نہیں جانتی۔" جودت نے بڑے پر سوچ سے لہجے میں کہا تھا۔

"جب تک کسی کو اپنی پہچان نہ کرواؤ کوئی ہمیں نہیں جانتا۔ اس لیے اپنی پہچان خود کروانی پڑتی ہے۔" کامی نے بھی لگے ہاتھوں مشورے سے نوازا تھا۔

"ہاں کرواؤں گا پہچان' اب اسے پہچان ہی تو کرواؤں گا میں نے اس کے ساتھ بہت نرمی اور بہت رعایت برتنے کی کوشش کی مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا کچھ حاصل نہیں ہوا لیکن اب فائدہ بھی ہو گا اور حاصل بھی بہت کچھ ہو گا۔ اب اور کوئی چھوٹ نہیں رہی ایں کے لیے اور اس کے بھائی کو بھی پتا چلے گا کہ اس نے غیرت اور بے غیرتی کا طعنہ کس کو دیا تھا اور گالی کس کو دی تھی؟" جودت نے جیسے دل ہی دل میں کوئی خطرناک عزائم باندھ لیے تھے۔

"کیا ارادہ ہے پھر؟" وکی اور کامی نے ایک دوسرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ دیتے ہوئے جودت سے استفسار کیا تھا۔

"تم کیا کہتے ہو؟" جودت نے الٹا ان دونوں سے پوچھا۔

"وہی ایک دو رات کا سبق ہی کافی ہے۔" وکی نے خباثت سے مشورہ دیا۔

"ایک دو رات کا نہیں' پورے ایک ہفتے کے لیے سبق دوں گا۔ ایک دو رات میں میرا دل ٹھنڈا ہونے والا نہیں ہے۔" جودت دانت پیستے ہوئے بول رہا تھا۔

"تو پھر اتنے دن رکھو گے کہاں؟" کامی کو حیرت ہوئی۔

"یہیں۔ اسی فلیٹ میں۔ اس سے اچھی اور بہتر جگہ تو اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔" وہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"لیکن پروگرام کب کا ہے؟" وکی نے سب کچھ فائنلی پوچھ لینا چاہا تھا۔

"سب حالات دیکھ کر بتاتا ہوں کہ پروگرام کب کا رکھیں کیونکہ گھر میں آذر اور دانیال بھائی کی شادی کے ہنگامے بھی چل رہے ہیں اور میری کزن بھی اسپتال میں ایڈمٹ ہے اس لیے احتیاطاً" سوچ رہا ہوں کہ کہیں کوئی مسئلہ نہ کھڑا ہو جائے۔" جودت نے وجہ بتائی تھی۔

"ارے! یہ تو اور بھی اچھی بات ہے کہ تمہارے گھر میں شادی کے ہنگامے چل رہے ہیں اس طرح مصروفیت میں تمہارے گھر والوں کو تمہاری باہر کی ایکٹیویٹیز کا پتا بھی نہیں چلے گا اور تمہارا کام بھی ہو جائے گا۔" وکی نے اسے ایک اور مفید مشورے سے نوازا تھا۔

"چلو ٹھیک ہے پھر دیکھتا ہوں کہ کب ہوتا ہے" جودت ذرا جلدی میں تھا۔

"لیکن اس کے لیے سارا انتظام کون کرے گا؟" کامی نے پھر جودت کو روکا۔

"تو تم لوگ کس مرض کی دوا ہو؟" جودت اس کی طرف پلٹا۔

"مگر کچھ پلاننگ بھی تو ہو؟ کچھ ٹائمنگ کا تو پتا چلے؟ تم ہو کہ ادھر آئے ہو اور ادھر کوچ کو تیار ہو گیا ایسے کام اس طرح ہوتے ہیں؟" وکی نے جودت کو خفگی سے گھورا تھا۔

"تو کس طرح ہوتے ہیں؟ کیا دن رات سر جوڑ کر بیٹھے رہیں اور پلاننگ کرتے رہیں تو تب ہی ایسے کام ہو سکتے ہیں؟ نارمل طریقے سے بات کر لینے سے کچھ نہیں ہوتا؟" جودت ان پہ خفا ہو رہا تھا۔

"یار! ہم نے ایسا کب کہا ہے کہ ایسے کام نہیں ہو سکتے مگر یار سوچ بچار اور پلاننگ بھی کوئی چیز ہوتی ہے آخر ایسے معاملوں میں ایک دوسرے سے پوچھ کر ہی قدم اٹھانا چاہیے اس طرح معاملہ بگڑتا نہیں ہے۔" کامی نے اب ذرا تحمل سے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"او کے! آئی انڈر اسٹینڈ لیکن تم بس اتنا کرو کہ اس فلیٹ کے سب کھڑکیاں دروازے اور ان کے لاک وغیرہ اچھے سے چیک کر لو اور گاڑی کا انتظام بھی کر رکھو اس کو شکار کرنے کے بس دو ہی ٹائم ہیں ایک جب وہ اکیڈمی جاتی ہے اور دوسرا جب اکیڈمی سے واپس آ رہی ہوتی ہے اور اس کام کے لیے اور بھی جن چھوٹی موٹی چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے وہ بھی لے آو باقی سب کچھ فون پہ سمجھا دوں گا۔ تم لوگ یہ پیسے رکھ لو چیزیں خریدنے میں کام آئیں گے" جودت نے جاتے جاتے پانچ پانچ ہزار کے چند نوٹ نکال کر کامی کی طرف بڑھائے اور ان کو ہاتھ ہلاتا ہوا باہر نکل آیا تھا۔

اور پیچھے وہ دونوں خباثت سے قہقہہ لگا کر ہنسے تھے کیونکہ ان کے تو ہر طرح سے مزے ہی مزے تھے۔

☼ ☼ ☼

اگر تو وجہ نہ پوچھے تو اک بات کہوں؟
بن تیرے اب مجھ سے بھی جیا نہیں جاتا

آج ٹھیک بارہ دن بعد ڈاکٹرز نے علیزے کو ڈسچارج کرنے کا فیصلہ سنا دیا تھا۔ اور یہ فیصلہ سن کر دل آور بہت خوش ہوا تھا کہ چلو شکر ہے کہ علیزے اب گھر جائے گی مگر علیزے کے گھر جانے کی خوشی میں سرشار اور مسرور ہوتے دل آور شاہ کے قدم اسپتال کے پرائیویٹ روم میں داخل ہوتے ہی رک گئے تھے۔

"آپ اس کی تمام چیزیں پیک کر لیں میں گاڑی نکالتا ہوں" آذر آسیہ آفندی سے کہتا ہوا پلٹا مگر دل آور کو دروازے کے بیچوں بیچ کھڑے دیکھ کر ذرا دیر کے لیے رک گیا کیونکہ وہ دل آور کے چہرے کا رنگ بھانپ گیا تھا۔

"علیزے اپنے گھر جائے گی" اس نے اپنے تمام تاثرات کنٹرول کرتے ہوئے ان سب کو اپنا فیصلہ سنایا تھا اور اس کے اس باآواز بلند فیصلے پہ وہاں موجود تمام افراد نے بے اختیار چونک کر دیکھا مگر اسے جواب کسی نے بھی نہیں دیا تھا کیونکہ اس کے مقابل آذر کھڑا تھا۔

"علیزے اپنے گھر ہی جا رہی ہے۔" آذر کا جواب چبھن لیے ہوئے تھا۔

"میں اپنے گھر کی بات کر رہا ہوں جو میرا اور علیزے کا ہے" دل آور نے اپنے گھر پہ زور دیا تھا۔

"مگر میں اس گھر کی بات کر رہا ہوں جو صرف علیزے کا ہے۔" آذر بھی اپنی بات پہ اڑ چکا تھا۔

"اس کا فیصلہ علیزے خود کرے گی کہ اس کا گھر کون سا ہے؟ اور اس نے کہاں جانا ہے؟" دل آور نے فیصلہ علیزے پہ چھوڑ دیا تھا اور علیزے اس کے اس سوال پہ بری طرح سٹپٹا گئی تھی۔

"بس میں نے کہہ دیا علیزے اپنے گھر جا رہی ہے اور اس چیز کے لیے ہمیں تم سے یا علیزے سے پوچھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اب وہی ہو گا جو ہمارا فیصلہ ہو گا اور مجھے امید ہے کہ علیزے بھی اس سے انکار نہیں

کرے گی وہ بھی ہمارے ساتھ حویلی ہی جانا پسند کرے گی کیوں علیزے؟ تم کیا کہتی ہو؟ کہاں جانا ہے تم نے؟ حویلی یا بیرسٹر دل آور شاہ کے گھر؟"

آذر نے انتہائی تلخ اور طنزیہ سے انداز میں کہتے ہوئے علیزے کی سمت دیکھا تھا اور علیزے سب کے سامنے بے ساختہ نظریں جھکانے پر مجبور ہو گئی تھی کیونکہ اب سب کی نظروں کا مرکز وہی تھی۔ سب اس کے جواب کے منتظر ہو گئے تھے مگر آذر کے سوال کا جواب دینا بہت مشکل تھا خصوصاً "اس وقت۔

"علیزے! میں تم سے پوچھنا نہیں چاہتا تھا مگر بیرسٹر صاحب کی غلط فہمی دور کرنے کی خاطر پھر بھی تم سے پوچھ لیا ہے تاکہ سب کے سامنے تم خود بتاؤ کہ تم کہاں جانا چاہتی ہو؟ حویلی یا اس کے گھر؟ ہمارے ساتھ یا اس کے ساتھ؟ اپنے ڈیڈ کے پاس یا اس کے پاس؟ بولو بتاؤ اب؟" آذر اک اک لفظ چبا چبا کر ادا کر رہا تھا اور علیزے چپ چاپ سر جھکائے سب سن رہی تھی۔ اس نے جواباً "ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا مگر اس وقت اس کی چپ سے کام نہیں چل سکتا تھا۔

"علیزے! فیصلہ کرو اور بات ختم کرو ٹائم کم ہے کمرہ خالی کرنا ہے۔" آذر ذرا غصے سے بولا تھا اور مجبوراً" علیزے کو سر اٹھا کر ان سب کی طرف دیکھنا پڑا تھا۔

اور اس کی پہلی نظر آسیہ آفندی پر پڑی تھی ان کے چہرے پہ بھی یہی تحریر رقم تھی کہ وہ حویلی چلے اور اسے سب کے چہروں پہ یہی لکھا نظر آیا تھا کہ وہ ان کے ساتھ حویلی جائے۔ اور حویلی والوں کے چہروں کی تحریر پڑھ کر علیزے "اپنے گھر والے" کے چہرے کا لفظ پڑھنا بھول گئی وہ لفظ جو "محبت" تھا وہ لفظ جو "مان" تھا وہ لفظ جو "محرم" تھا اس نے نہیں پڑھا اس نے نہیں دیکھا اس نے نہیں سوچا۔ اور بس ایک نظر آخری نظر اور اجنبیت کی نظر سے سامنے کھڑے بڑے مان اور بڑی محبت سے دیکھتے اپنے "ڈرائیور" کو دیکھا اور پھر نظر چرا لی جھکا لی اور شاید چھپا بھی لی تھی۔ اور اس کے اس طرح نظریں چرانے اور نظریں جھکانے پہ ہی دل آور کے قدموں تلے زمین ایک بار سرکی ضرور تھی مگر پھر بھی وہ اپنے قدموں پہ جم کے اور ڈٹ کر کھڑا رہا کیونکہ اسے اب بھی امید تھی کہ وہ اس کی امید نہیں توڑے گی لیکن علیزے کے جواب پہ امید تو بھلا کیا ٹوٹی وہ خود ٹوٹ گیا تھا۔

"میں حویلی جانا چاہتی ہوں آپ کے ساتھ اپنے پاپا کے پاس۔"

علیزے نے جو کہنا تھا کہہ دیا مگر دل آور کو یوں لگا تھا کہ علیزے نے اس کی شہ رگ کاٹ دی ہو اور اس کا دل اپنے پاؤں تلے مسل دیا ہو اور اسے بیچ چوراہے میں کھڑا کر کے اس کے منہ پر طمانچہ دے مارا ہو۔

اس کی حالت ایسی ہو گئی تھی جیسے کسی نے اس کے جسم سے سارا خون نچوڑ لیا ہو اور وہ بالکل بے جان اور لٹھے کی مانند سفید پڑ گیا تھا لیکن پھر اس نے کہا کچھ نہیں اور خاموشی سے دروازے کے سامنے سے ایک سائیڈ پہ ہٹ گیا۔

کیونکہ اب اس کا آذر کے ساتھ کوئی اختلاف نہیں تھا کوئی بحث نہیں تھی کوئی جھگڑا نہیں تھا۔

ہاں ایک دل تھا جو یقین ’امید‘ بھروسے اور مان کی بلندیوں سے گرا اور کرچیوں میں تقسیم ہو گیا اور دل کی اس تقسیم پہ اور دھڑکنوں کی اس تباہی پہ دل آور کا دل چاہا کہ دو زانو فرش پر گرے اور زمین میں ہی اتر جائے۔ کیونکہ اس کے پاس کچھ نہیں بچا تھا۔ اب تو وہ صرف دیکھ رہا تھا کسی روبوٹ کی مانند۔

علیزے کا سامان سمیٹا گیا گاڑی نکالی گئی علیزے کو تیار کروایا گیا اور پھر سب کی سہارے سے چلتی ہوئی وہ ایک سرسری سی نظر دل آور پہ ڈالتی ہوئی اس کے سامنے ’اس کی آنکھوں کے سامنے اپنے گھر والوں کے ساتھ اسپتال کے اس پرائیویٹ روم کی دہلیز عبور کر گئی تھی اور دل آور اب دہلیز پر کھڑا کوریڈور سے مرکزی دروازے کی سمت جاتے ہجوم کو دیکھتا رہ گیا لیکن خود واپسی کے لیے قدم آگے نہیں بڑھا سکا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس کے قدم شکستہ تھے۔ کہتے ہیں کہ انسان کی اندرونی کیفیات صرف چہرے سے ہی نہیں اس کے قدموں سے بھی عیاں ہوتی ہیں جیسے انسان کے چہرے کے تاثرات ’آنکھیں‘ اور زبان بولتی ہیں بالکل اسی طرح انسان کے قدم بھی بولتے ہیں۔ اپنے جذبات اپنی کیفیات ظاہر کرتے ہیں جیسے کہ انسان خوش ہو تو سرشار قدم ’غم زدہ ہو تو بوجھل قدم‘ بیمار ہو تو نڈھال قدم ’عجلت میں ہو تو تیز قدم‘ نشے میں ہو تو بہکے قدم ’ناکام ہو تو مایوس قدم‘ بچہ ہو تو لڑکھڑاتے قدم ’جوان ہو تو مضبوط قدم‘ بوڑھا ہو تو کمزور قدم ’پرعزم ہو تو ثابت قدم اور زندگی کے کسی اہم مقام پہ آ کر ہارا ہوا ہو تو "شکستہ قدم" اور آج وہ بھی ایک ہارا ہوا انسان تھا آج اس کے قدم بھی شکستہ تھے۔

آج سے پہلے زندگی میں اس کے قدموں نے بھی ہزاروں ذائقے چکھے تھے۔ کئی بار سرشار ہوئے تھے تو کئی بار بوجھل اور کئی بار نڈھال ہوئے تھے ’اور کئی بار بہکے بھی تھے لیکن شکستہ پہلی بار ہوئے تھے کیونکہ وہ ہارا پہلی بار تھا۔ وہ اس وقت پوری طرح سے ہارا ہوا ایک شکست خوردہ انسان لگ رہا تھا اور اس وقت وہ کچھ کہنے اور کچھ کرنے کی پوزیشن میں ہرگز نہیں تھا اس وقت وہ صرف سوچ سکتا تھا کیونکہ اس وقت سوچنے کے علاوہ اس میں اور کوئی سکت نہیں تھی اس کی ہمت و حوصلہ ڈوب چکا تھا شکست کی کسی اتھاہ گہرائی میں۔

وہ اپنے بے دم شکستہ قدموں پہ اپنی غم زدہ بوجھل ذات کا بوجھ بمشکل اٹھا کر اسپتال کے پرائیویٹ روم کی چوکھٹ میں آ کھڑا ہوا تھا اور دور تک پھیلی کشادہ اور طویل راہداری میں دیکھنے کی کوشش کی تھی اور اس کوشش کے بعد وہ مضبوط انسان دھواں دھواں ہو کے رہ گیا تھا اور اس دھوئیں کی تاریکی اسے سرتاپا اپنے حصار میں گھیرنے لگی تھی وہ اس چوکھٹ میں یوں کھڑا تھا جیسے اس کی دنیا یہیں پہ ختم ہو گئی ہو اور اس چوکھٹ سے باہر اس کے لیے کچھ بھی نہ بچا ہو۔

حالانکہ اب سے تھوڑی دیر پہلے ___ وہ کافی حد تک مطمئن اور خوش تھا شاید اس لیے کہ اس کے دل میں کہیں نہ کہیں ایک چھوٹی سی ایک مدھم سی "امید" سانسیں لے رہی تھی اسے جانے والے پہ۔ بہت زیادہ نہ سہی تھوڑا بہت "مان" ضرور تھا۔ لیکن اسے تھوڑی دیر پہلے تک یہ خیال چھو کے بھی نہیں گزرا تھا کہ مان "اکثر" ٹوٹ جایا کرتے ہیں اور امیدیں ہمیشہ دم توڑنے کے لیے ہی ہوتی ہیں۔ اگر اس چیز کا خیال اسے ذرا سا پہلے ہو جاتا تو وہ یقیناً" کبھی بھی اس پہ مان نہ کرتا مگر اب۔ اب کیا ہو سکتا تھا؟ اب تو وہ بہت پیچھے رہ گیا تھا ’بہت تنہا ہو گیا تھا۔ آج اس کی امید نے ہی دم نہیں توڑا تھا بلکہ اس کا مان بھی ختم ہو گیا تھا۔ اس کی موہوم سی خوشی بھی بجھ کر راکھ ہو گئی تھی وہ اس پرائیویٹ روم کی چوکھٹ میں کھڑا ابھی تک کشادہ راہداری کو دیکھ رہا تھا جو تھوڑی دیر پہلے اتنے زیادہ لوگوں کی بدولت تنگ پڑ رہی تھی اور اب بالکل خالی اور ویران نظر آ رہی تھی بالکل اس کی ذات کی طرح!

☼ ☼ ☼

"سر کیا میں یہ روم صاف کر سکتی ہوں؟" اسپتال کی ملازمہ مریض کے ڈسچارج ہوتے ہی روم کی صفائی ستھرائی کے لیے فوراً" حاضر ہو گئی تھی شاید اب اس روم میں کسی نئے مریض کو شفٹ کرنے کی تیاری ہو رہی تھی اس لیے ان کو یہ روم از سر نو صاف کرنے کی جلدی تھی اور وہ جواباً" کچھ بھی کہے بغیر چوکھٹ پہ رکھا اپنا ہاتھ ہٹا کر خود بھی وہاں سے ہٹ گیا تھا لیکن اس کے قدم اس کا ساتھ نہیں دے پا رہے تھے وہ اپنے شکست خوردہ قدموں سے چل کر بمشکل اسپتال سے باہر پارکنگ تک آیا تھا۔ پارکنگ میں تھوڑی دیر پہلے اس کی گاڑی کے علاوہ اور بھی چند گاڑیاں کھڑی تھیں مگر اس وقت صرف اس کی پراڈو موجود تھی۔

اپنی گاڑی کا لاک کھولتے ہوئے اسے اپنے ہاتھوں میں ہلکی سی لرزش محسوس ہوئی تھی' شاید تنہا واپسی کے احساس نے اس کی تھکن' اس کی تنہائی' اس کی شکستگی میں اور بھی اضافہ کردیا تھا' تھکے تھکے انداز سے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس کی نظر پچھلی سیٹ کی سمت اٹھی تھی جس پر سرخ خون کے دھبے اب سیاہی مائل ہونے لگے تھے اس کے ذہن میں وہ منظر' وہ لمحہ' وہ وقت آج بھی پہلے دن کی طرح تازہ ہوا تھا اس کی سماعتوں میں اس کی دردناک چیخ آج بھی محفوظ تھی اور وہ اس کی تکلیف سوچ کر آج بھی تڑپ اٹھتا تھا آج بھی اس کا دل کسی انہونی کے خیال سے جیسے مٹھی میں آجاتا تھا وہ نجانے اور کتنی دیر یونہی گردن موڑے پچھلی سیٹ کو دیکھتا رہتا کہ اچانک اس کے سیل فون پہ ہونے والی وائبریشن نے اسے چونکا دیا تھا مگر چونکنے کے بعد بھی اس نے سیل فون نکال کر دیکھنے یا کال ریسیو کرنے کی زحمت نہیں کی تھی بلکہ لب بھینچ کر سر جھٹکتے ہوئے اسٹیئرنگ تھام لیا تھا اور اگلے ہی لمحے گاڑی آگے بڑھالی۔

اسپتال سے گھر کے گیٹ تک آکر بھی اس کی کیفیت میں رتی برابر فرق نہیں آیا تھا وہ اک ٹرانس کی سی کیفیت میں گھر تک پہنچا اور ایسی حالت میں کسی اور چیز کی طرف دھیان دینا ہرگز ممکن نہیں تھا۔

"سلام صاحب" چوکیدار نے اس کی گاڑی دیکھ کر فوراً" ہی گیٹ کھول دیا تھا جبکہ وہ اس کے سلام کا جواب تک نہ دے سکا تھا اور خاموشی سے گاڑی اندر بڑھالے گیا تھا حالانکہ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا کہ وہ اپنے کسی ملازم کے سلام کا جواب نہ دیتا وہ اگر کبھی غصے یا پھر غم کی حالت میں بھی ہوتا تو ہاتھ کے اشارے سے یا پھر سر کے اشارے سے ہی مگر جواب ضرور دیتا تھا لیکن نظرانداز نہیں کرتا تھا۔

شاید اسی لیے آج اس کے چوکیدار کو اس کی گہری چپ سے کسی سنگین مسئلے کا احساس ہوگیا تھا جب تک چوکیدار نے گیٹ بند کیا تب تک وہ گاڑی سے اتر کر اندر چلا گیا تھا اور آگے پیچھے کچھ بھی دیکھے بنا ڈرائنگ روم کے صوفے پر آکر ڈھے گیا تھا۔

"سلام صاحب جی" اس کی ملازمہ ڈرائنگ روم کے صوفوں پر رکھے کشن ترتیب دے رہی تھی۔ اچانک اسے آتے دیکھ کر الرٹ ہوگئی تھی مگر وہ بہت نڈھال نظر آرہا تھا ملازمہ اسے اس طرح شکستہ حال میں دیکھ کر ٹھٹک گئی تھی چوکیدار کی طرح اسے بھی اپنے مالک کی کیفیت کا فوراً" ہی اندازہ ہوگیا تھا کیونکہ اس پہ چھائی مایوسی اور شکستگی اس کے انگ انگ سے جھلک رہی تھی وہ آج حقیقتاً" دیکھنے والوں کو بھی "تنہا" لگ رہا تھا اپنی کنپٹیوں کو مسلتے ہوئے اس نے ملازمہ کو بیڈروم سے سگریٹ کا پیکٹ اور لائیٹر لانے کا کہا تھا اور پھر چند سیکنڈز میں ہی اس نے سگریٹ کو اپنے تیکھے کٹاؤ دار عنابی ہونٹوں میں دبا کر لائیٹر سے شعلہ دکھا دیا تھا اور ایک گہرا کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑ دیا تھا۔ اور پھر رفتہ رفتہ سگریٹ کا دھواں ڈرائنگ روم میں ہی نہیں اس کی ذات میں بھی بھرنے لگا تھا۔ ہر سو دھوئیں کے مرغولے پھیلتے جارہے تھے اور ہر سو اس کی تنہائی رقص کرنے لگی تھی۔ ایک کے بعد ایک سگریٹ سلگتا رہا اور دھواں بڑھتا رہا۔

گزشتہ چند دنوں سے وہ اسموکنگ سے کافی حد تک گریز کررہا تھا وہ اپنی عادت اپنی طلب پہ کنٹرول کرنا سیکھ رہا تھا مگر آج اچانک۔ سب کچھ پہلے جیسا ہوگیا تھا۔ اس کی سوچیں اور وہی عادتیں عود کے سامنے آنے کو بے تاب ہوگئی تھیں آج پھر سگریٹ اس کی شکستہ ذات کو اپنے دھوئیں کی چادر میں لپیٹ رہے تھے اور وہ پور پور دھوئیں میں ڈوب رہا تھا ڈرائنگ روم کا فرلیش ماحول دیکھتے ہی دیکھتے حبس زدہ ہوگیا اور اس کے ملازم اسے اس حال میں دیکھ کر بہت پریشان ہورہے تھے کیونکہ وہ اپنے مالک سے بہت پچی تھے اس کا اچھا برا انہیں بھی متفکر کردیتا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ نہ تو آگے بڑھ کے اسے روک سکتے تھے اور نہ ہی پوچھ سکتے تھے کیونکہ وہ اس وقت اپنی ہی ذات کے نہاں خانوں میں اترا ہوا تھا اور فی الحال اسے ڈسٹرب کرنا ہرگز مناسب نہیں تھا البتہ اس کے حال پہ وہ اندر ہی اندر

جلتے کڑھتے رہے تھے۔ وہ شام سے ڈرائنگ روم کے صوفے پہ ایک ہی پوزیشن میں بیٹھا ہوا تھا اور مسلسل سگریٹ پھونکتے ہوئے اذیت ناکی کا یہ کھیل بھی جاری تھا۔

شام سے مسلسل اس کے قریب پڑی کرسٹل ٹیبل پہ رکھا موبائل لگاتار ہونے والی وائبریشن سے تھرک رہا تھا یوں جیسے کال کرنے والا اس کے لیے تڑپ رہا ہو اور وہ موبائل اسکرین دیکھے بنا بھی جانتا تھا کہ یہ "تڑپ" اور یہ کال کس کی ہے؟ لیکن اس وقت وہ اپنے لیے تڑپنے والے سے بھی بات نہیں کرنا چاہتا تھا اس وقت وہ صرف اپنے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔ وہ اپنی تنہائی، اپنی شکستگی کی حد دیکھنا چاہتا تھا اپنے آپ کو آزمانا چاہتا تھا اور اسی لیے اس نے متواتر بجنے والی کال ریسیو نہیں کی تھی اور ایک بار پھر سر جھٹک کر سگریٹ ایش ٹرے میں مسل کر دوبارہ سگریٹ سلگا لیا تھا۔ آج نہ تو اس کے ذہن پہ سوار بوجھ کم ہو رہا تھا اور نہ ہی رات آگے سرک رہی تھی۔ ہر چیز پہ ایک جمود سا طاری تھا، سب کچھ جیسے ٹھہر سا گیا تھا، لمحات ساکت ہوئے لگ رہے تھے!

صبح کا سورج ابھی پوری طرح سے طلوع بھی نہیں ہوا تھا کہ نبیل حیات کی گاڑی سیدھی اس کے گھر کے گیٹ پر آرکی تھی اور اسے دیکھ کر گلاب خان نے فوراً گیٹ وا کر دیا تھا۔

"تمہارے صاحب کہاں ہیں؟" نبیل نے گاڑی سے اترتے ہی استفسار کیا تھا۔

"اندر ہیں مگر بہت برے حال میں ہیں" گلاب خان نبیل سے بھی زیادہ پریشان نظر آرہا تھا اور نبیل اس کی بات سن کر ایک سیکنڈ کی بھی تاخیر کیے بغیر اندر کی سمت بھاگا اور ڈرائننگ روم کے بیچوں بیچ صوفے پہ نڈھال اور بے سدھ پڑے دل آور کو دیکھ کر یکدم قدم ٹھٹک گئے تھے اور وہ بے ساختہ لپک کے اس کے قریب آیا تھا۔

"دل آورے! دل آورے آنکھیں کھولو ادھر میری طرف دیکھو۔" نبیل نے اس کے قریب جھکتے ہوئے اسے جھنجوڑا تھا۔ اور دل آور نے اپنے درد سے پھٹتے سر کو بمشکل حرکت دیتے ہوئے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی تھی۔

"دل آور کیا ہو گیا ہے تمہیں، کیا حال بنا لیا ہے تم نے؟ اٹھو آنکھیں کھولو۔" نبیل کا دل اسے دیکھ کر جیسے مٹھی میں آگیا تھا کیونکہ اس کی حالت ہی ایسی ہو رہی تھی کہ نبیل سے بھی برداشت کرنا مشکل ہو گیا تھا۔

اور دل آور نے نبیل کے بازو کا سہارا لے کر اٹھتے ہوئے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور ذرا دیر یونہی سر جھکائے بیٹھا رہا تھا۔

"دل آورے۔۔۔" نبیل نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا تھا۔

"زندہ ہوں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے تلخی سے کہہ کر وہاں سے اٹھنے کی کوشش کی تھی مگر وہ وہاں سے اٹھ نہیں سکا تھا اور اسے یوں لڑکھڑاتے دیکھ کر نبیل نے فوراً اسے تھام کر اسے سہارا دیا تھا۔

"لیکن یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا بھابی کہاں ہیں وہ گھر کیوں نہیں آئیں؟" نبیل رات سے پریشان ہو ہو کر تھک چکا تھا۔

"وہ حویلی چلی گئی ہے۔۔۔ اپنے گھر والوں کے پاس۔۔۔" دل آور نے کسی روبوٹ کی طرح جواب دیا تھا۔

"مگر کیوں۔۔۔؟ وہ اپنے گھر کیوں نہیں آئیں؟ تمہارے ساتھ تمہارے پاس۔"

"کیونکہ اسے یہ گھر پسند نہیں ہے کیونکہ اسے مجھ سے محبت نہیں ہے کیونکہ وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ یہاں۔" دل آور کہتے کہتے بے اختیار رک گیا تھا اور اس نے بے بسی سے لب بھینچ لیے تھے۔

"بس کرو نبیل بس کرو۔۔۔ مجھ سے اور کچھ مت پوچھو میرے پاس کچھ نہیں بچا میں اب کچھ بھی کہنے کے قابل نہیں اس لیے بہتر ہے کہ مجھے چپ رہنے دو پلیز مجھے چپ رہنے دو نبیل مجھے چپ رہنے دو۔" دل آور بے بسی اور شکستگی کی انتہا پہ تھا۔

"کیوں دل آورے کیوں؟ کیوں چپ رہنے دیں تمہیں؟ تم چپ کیوں رہنا چاہتے ہو؟ جو تمہارے دل میں ہے تم کہتے کیوں نہیں ہو کہو جو بھی دل میں ہے کہو میں سن رہا ہوں۔۔۔ تمہاری ہر بات سنوں گا اور سمجھوں گا بھی۔" نبیل نے اسے بولنے پہ اکسایا تھا لیکن دل آور کیسے بولتا؟ کیسے کچھ کہتا۔۔۔؟ اس کے پاس واقعی اب خاموشی اور چپ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

"کیا کہوں۔۔۔ کیا کہوں آخر؟ یہی نا کہ میں "ہار" چکا ہوں میں صرف علیزے کے چلے جانے سے ہی ہار چکا ہوں۔۔۔ تو سنو۔۔۔ ہاں میں واقعی ہار چکا ہوں۔۔۔ ہار چکا ہوں میں۔۔۔ اور مجھے ہرانے والی اور مجھے شکست دینے والی کوئی اور نہیں میری بیوی ہے میری اپنی بیوی، وہ بیوی جس کی خاطر میں نے وہ کام بھی کیے ہیں جو یقیناً" میں مر بھی جاتا تو نہ کرتا۔" دل آور کا لہجہ کہتے کہتے مزید گمبھیر ہو گیا تھا۔

"انہوں نے ایسا کیوں کیا ہے؟ تم تو کہتے تھے کہ علیزے بھابی کو تم سے محبت ہے، لو میرج کی ہے تم لوگوں نے۔۔۔ پھر یہ۔۔۔ یہ سب کیا ہے؟ کہاں ہے محبت اور کہاں ہے لو میرج۔۔۔؟" نبیل دل آور کے تسلی اور دلاسوں سے تھک چکا تھا، تنگ آگیا تھا، آج کی پوری رات اس نے بھی بالکل اس طرح جاگ کر گزاری تھی جیسے کہ دل آور نے جاگ کر گزاری تھی۔ وہ بھی اس کے لیے اتنا ہی تڑپا تھا جتنا وہ علیزے کے لیے تڑپا تھا۔

"دل آورے! بتاؤ نا کیا کہا تھا تم نے؟ اور کیا ہو رہا ہے آج؟"

"نبیل! میں نے جو کچھ بھی کہا تھا سب غلط کہا تھا۔" دل آور کا لہجہ پتھریلا ہو گیا تھا۔

"ہم جانتے ہیں کہ تم نے جو بھی کہا تھا سب غلط کہا تھا مگر ہم منتظر تھے کہ تم کبھی سچ بھی کہو گے۔" عبداللہ کی آواز پہ نبیل اور دل آور دونوں نے ہی یکدم چونک کر ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے کی طرف دیکھا تھا جہاں عبداللہ بڑے اطمینان سے کھڑا تھا۔

"عبداللہ! تم یہاں اس وقت؟" نبیل کو حیرت ہوئی تھی۔

"تم دونوں کیا سمجھتے ہو کہ تم دونوں رات بھر پریشانی اور اذیت میں تڑپ کر گزارتے ہو اور میں اپنے بیڈ روم میں سکون کی نیند سوتا ہوں۔۔۔؟ مجھے تم دونوں کی خبر نہیں ہوتی۔۔۔ یا مجھے تم دونوں کا احساس نہیں ہوتا؟" عبداللہ کے سوال پہ وہ دونوں ہی چپ رہ گئے تھے۔

"نہیں نبیل حیات۔۔۔! میں بھی سو نہیں پاتا، میں بھی رات جاگ کر ہی گزارتا ہوں۔" عبداللہ تلخی سے کہتا ڈرائنگ روم کے اندر آگیا تھا اور دل آور کے بالکل سامنے والے صوفے پہ بیٹھ گیا تھا۔

"مگر تمہیں کیسے پتا چلا کہ۔۔۔" نبیل کا اشارہ علیزے کی طرف تھا۔

"مجھے بڑی حویلی سے کال آئی تھی۔" عبداللہ نے دل آور کو نظروں میں تولتے ہوئے بتایا مگر دل آور نے کوئی رسپانس نہیں دیا تھا۔

"کس کی؟" سوال جواب وہ دونوں ہی کر رہے تھے دل آور صرف سن رہا تھا۔

"دانیال کی۔۔۔" عبداللہ کا انداز بہت پرسوچ اور عجیب سا ہو رہا تھا۔

"پھر کیا کہا اس نے۔۔۔" نبیل نے جاننا چاہا۔

"اس نے کہا ہے کہ دل آور شاہ کے سسرال والے عنقریب طلاق کا مطالبہ کرنے والے ہیں۔" عبداللہ نے نبیل کے سر پہ بم پھوڑ دیا تھا لیکن دل آور یکدم لب بھینچ کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا۔

"اوکے۔۔۔! دے دوں گا طلاق۔۔۔ ان سے کہو مطالبہ ذرا جلدی کریں میں خود یہ ملک چھوڑ کر جا رہا ہوں۔" دل آور نے بہت ہی مضبوط اور اٹل انداز میں کہتے ہوئے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔ اور وہ دونوں گنگ رہ گئے تھے۔

(باقی آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں)

✡ ✡

چالیسویں قسط

نبیلہ عزیز

دردِ دل

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نبیل حیات دو ہی بہن بھائی ہیں' مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے' وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پہ رنگ چکی ہے' جس کے پیش نظر فائزہ بیگم' نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں' لیکن مدحیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے' جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے' مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصے سے نوکری کی تلاش میں ہے' مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا' بے بسی اور مجبوری سے تنگ آ کر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے' لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے پاؤ اشتیاز مل جاتا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے' جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے' اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے' وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے' وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے' وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے' اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا' اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دلاتی ہیں۔

"یہ۔۔۔ یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟" عبداللہ بھی ششدر سا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔
"میرا خیال ہے کہ مجھے دوبارہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔" دل آور کا لہجہ حد سے زیادہ مضبوط ہو رہا تھا۔
"کیا تمہارے خیال میں شادی بیاہ یا نکاح وغیرہ بھی گڈے گڑیا کا کھیل ہے کہ جب چاہا نکاح کر لیا اور جب چاہا طلاق کا شوق پورا کر لیا؟ واہ یار۔۔۔ عجیب منطق ہے تمہاری۔۔۔؟"
عبداللہ علیزے کی طلاق کا سن کر خود پہ کنٹرول نہیں کر سکا تھا۔
"طلاق کا مطالبہ وہ کر رہے ہیں۔" دل آور نے اسے یاد دلایا۔
"تو کیا نکاح کا مطالبہ بھی انہوں نے کیا تھا؟" عبداللہ کے لہجے میں خفگی تھی۔
"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" دل آور نے پلٹ کر عبداللہ کے چہرے کی سمت دیکھا تھا۔
"میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جو کچھ کر چکے ہو اب اسے بھگتو۔۔۔ تمہارے اس طرح ہاتھ اٹھا دینے سے اور ملک چھوڑ کر چلے جانے سے کچھ نہیں ہو گا۔" عبداللہ الثا دل آور پہ غصہ ہو رہا تھا اور دل آور کے چہرے پہ اک طنزیہ سی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔
"تم کیا سمجھتے ہو کہ میں جو کچھ کر چکا ہوں میں اسے بھگت نہیں رہا۔۔۔؟ ہونہہ۔۔۔ غلط فہمی ہے تمہاری، تمہیں کیا پتا کہ میں کیا کیا بھگت رہا ہوں اور اس بھگتنے کے چکر میں مجھ پہ کیا کیا بیت رہی ہے؟"
دل آور نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر تھپکتے ہوئے بڑے زہر خند سے لہجے میں کہا تھا۔
"اگر ایسی بات ہے تو تم صاف بات کیوں نہیں بتاتے کہ اصل مسئلہ کیا ہے؟ یہ سارا چکر، یہ سارا قصہ کیا ہے آخر۔۔۔؟ کچھ ہمیں بھی تو پتا چلے؟" عبداللہ نے اب کی بار ذرا نرمی سے اپنی جھنجلاہٹ ظاہر کی تھی، اور دل آور اپنی جگہ پہ کھڑے کھڑے چپ ہو کے رہ گیا تھا، لیکن آخر کب تک۔۔۔؟
فی الحال کچھ تو کہنا ہی تھا۔ تبھی وہ ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گیا تھا۔
"مجھے سنبھلنے کا وقت دو۔۔۔ محض چند دن کا وقت میرا وعدہ ہے تم سے۔۔۔ تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔"
دل آور نے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے وعدہ کیا تھا اور وہ دونوں ہی اس کے وعدے پہ اعتبار کرتے ہوئے چپ ہو گئے تھے اور رفتہ رفتہ اس چپ کو کئی دن گزر گئے تھے، مگر پھر بھی ان دونوں نے دوبارہ اسے کریدنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

✡ ✡ ✡

"جووت۔۔۔ جووت۔۔۔! رکو۔۔۔ کہاں جا رہے ہو؟ مجھے جیولر کے پاس جانا ہے۔" جووت تیار ہو کر بہت عجلت بھرے انداز میں سیڑھیاں اتر کر کوریڈور کراس کر رہا تھا جب ثروت بیگم نے اسے پیچھے سے پکارتے ہوئے اس کا موڈ بگاڑ دیا تھا۔
"ایم سوری۔۔۔ میں اس وقت اپنی یونیورسٹی کے کسی کام سے جا رہا ہوں، مجھے اس سائیڈ پہ نہیں جانا جس سائیڈ پہ آپ جا رہی ہیں اس لیے پلیز آپ مبارک خان کو ساتھ لے جائیں، وہ آپ کو واپس بھی لے آئے گا، میں تو صرف ڈراپ ہی کروں گا نا۔۔۔؟"
اس نے انہیں ٹالنے کی کوشش کی تھی لیکن ثروت بیگم بھی آخر ماں تھیں، "فوراً" ہی اس کے گریز پہ کچھ مشکوک سی ہو گئی تھیں۔
"اب یونیورسٹی کا کیا کام ہے تمہیں۔۔۔؟ تم تو آج کل یونیورسٹی سے فری پھر رہے ہو؟" انہوں نے جان بوجھ کر اسے کریدا تھا۔

"بس ہے ایک کام، آ کر بتا دوں گا۔۔۔ ابھی میں جلدی میں ہوں۔" جووت ان کی بات سنی ان سنی کرتا ہوا پلٹ کر ہوا ہو گیا تھا اور ثروت بیگم اس کے پیچھے کھڑی دیکھتی رہ گئی تھیں۔
"کرتی ہوں تمہارا بندوبست۔۔۔ بس ایک بار آذر کی شادی سے فارغ ہو جاؤں۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی مبارک خان کی طرف چل دیں اور وہ انہیں دیکھتے ہی الرٹ ہو گیا تھا۔

✡ ✡ ✡

"ٹھہرو مریم۔۔۔ میں تمہیں ڈراپ کر دیتا ہوں۔" وہ اکیڈمی جانے کے لیے تیار ہو کر نکل رہی تھی جب عدیل نے اسے روک دیا تھا۔
"آج جلدی جا رہے ہیں آپ۔۔۔؟" مریم صحن میں ہی رک گئی تھی۔
"ہاں۔۔۔ وہ دراصل آج مجھے نبیل صاحب کے ساتھ اسلام آباد جانا ہے، شوروم کے کسی کام کے سلسلے میں۔"
عدیل بھی جلدی جلدی تیار ہو رہا تھا اور پھر فاروق نیازی سے ملنے کے بعد باہر نکل آیا تھا۔
"اوکے امی! اللہ حافظ۔۔۔ ہم ان شاء اللہ کل شام تک واپس آ جائیں گے اور اگر کام ختم نہ ہوا تو ہم لیٹ بھی ہو سکتے ہیں، لیکن پلیز آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے میں فون کرتا رہوں گا۔" عدیل ماں سے مل کر انہیں تسلی دیتے ہوئے مریم کے ساتھ ہی گھر سے نکل آیا تھا۔ اور گلی میں نکلتے ہی بائیک اسٹارٹ کر لی تھی۔
"کیا آپ بائیک پہ اسلام آباد جائیں گے؟" مریم عجیب احمقانہ سا سوال کر بیٹھی تھی اور اپنے اس سوال کے بعد خود ہی پچھتائی بھی تھی کیونکہ عدیل ایک بھرپور قسم کا قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔
اور وہ جان گئی تھی کہ یہ قہقہہ اس کی بے وقوفی پہ لگایا گیا ہے۔
"ہم نے آفس کے کام کے سلسلے میں اسلام آباد جانا ہے کسی ریس میں حصہ لینے کے لیے نہیں جانا کہ ہم لوگ بائیک لے کر نکل کھڑے ہوں۔" وہ اس کے اس احمقانہ سے سوال سے جی بھر کے لطف اندوز ہوا تھا۔
"تو پھر بائیک لے کر کیوں جا رہے ہیں؟" اس کے سوال میں اب بھی نا سمجھی اور بے وقوفی کی آمیزش موجود تھی۔
"اف پاگل لڑکی۔۔۔! میں بائیک لے کر شوروم جا رہا ہوں، وہاں بائیک چھوڑ جاؤں گا اور وہاں سے گاڑی میں نبیل صاحب کے ساتھ اسلام آباد جاؤں گا، بس اتنا سا چکر ہے اور تمہیں سمجھ میں نہیں آ رہا۔"
عدیل نے بڑے دلچسپ انداز میں کہا تھا اور مریم بھی سمجھ آ جانے پہ مسکرا اٹھی تھی۔
"نبیل صاحب کے ساتھ جا رہے ہیں تو مدیحہ صاحبہ کہاں ہیں؟ ان سے ملاقات ہوئی؟"
"ہاں۔۔۔ ہوتی رہتی ہے۔"
"تو انہیں ہماری بھابھی کب بنائیں گے؟" مریم نے شرارت سے پوچھا۔
"جب تم لوگوں کے فرض سے سبکدوش ہو گیا۔" عدیل کا جواب سنجیدگی لیے ہوئے تھا۔
"ارے نہیں بھائی۔۔۔ ابھی تو بہت دیر ہے۔" وہ خفگی سے بولی تھی۔
"کوئی بات نہیں میں انتظار کر لوں گا۔"
"لیکن آپ انہیں پرپوز تو کر دیں نا تاکہ انہیں اور ان کے گھر والوں کو پتا تو چل جائے کہ کوئی ان کو کتنا چاہتا ہے۔" مریم نے اسے ایک ہلکا پھلکا سا مشورہ دیا تھا لیکن وہ یہ مشورہ ماننے کو بھی تیار نہیں تھا۔
"کروں گا پرپوز۔۔۔! لیکن تب جب میں اس کے قابل ہو گیا جب مجھے اس کے گھر والوں سے اس کا ہاتھ مانگتے ہوئے شرم محسوس نہیں ہو گی کہ میں اپنی اوقات سے اونچی جگہ پہ ہاتھ مار رہا ہوں۔"
"لیکن مجھے نہیں لگتا کہ وہ لوگ ایسی سوچ رکھنے والے لوگ ہوں گے؟" مریم اکیڈمی کے سامنے بائیک رکتے

ہی بائیک سے اتر آئی تھی۔

"لیکن میں تو ایسی سوچ رکھتا ہوں نا ، خیر چھوڑو اس بات کو...... تم اندر جاؤ ان شاء اللہ کل گھر پہ ہی ملاقات ہوگی۔" عدیل نے اسے خدا حافظ کہتے ہوئے بائیک کا رخ موڑ لیا تھا اور مریم اس کے سفر کی سلامتی کی دعا مانگتی ہوئی اکیڈمی کے گیٹ کے اندر داخل ہوگئی تھی۔

اور ان کو گھر سے لے کر اکیڈمی تک فالو کرنے والا جودت اور اس کے دونوں ساتھی دانت پیستے ہوئے رہ گئے تھے 'کیونکہ ان کے ہاتھ سے موقع ضائع ہو گیا تھا اب انہیں دو بجے کا انتظار کرنا تھا۔

☼ ☼ ☼

ٹھیک سوا دو بجے وہ اکیڈمی سے باہر نکل آئی تھی۔

اور اس کی تاک میں بیٹھے شکاری فوراً" ہی الرٹ ہو گئے تھے۔

"اترو...... "وکی نے جودت کو اشارہ دیا 'کیونکہ مریم بس اسٹاپ کی طرف جانے والے راستے پہ قدم بڑھا چکی تھی۔ اس لیے جودت بھی فوراً" ہی گاڑی سے اتر آیا تھا اور اس نے بھی مریم کے پیچھے ہی قدم بڑھا دیے تھے اور بالآخر اس کے بے حد قریب جا پہنچا تھا۔

"ہیلو! کہاں جا رہی ہو؟" اپنے عقب میں اور اپنے بے حد قریب ہی جودت آفندی کی آواز سن کر وہ چلتے چلتے کرنٹ کھا کے پلٹی تھی۔

"تم......؟" مریم نجانے کیوں یکدم ہی خوف زدہ سی ہو گئی تھی 'حالانکہ وہ اتنی خوف زدہ پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔

"ہاں میں...... میں نے سوچا جہاں جا رہی ہو...... مجھے بھی ساتھ لے چلو۔" وہ جان بوجھ کر اسے ہراساں کرنے اور خود لطف اندوز ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔

"مم...... میں...... میں تو اپنے گھر جا رہی ہوں......" مریم کی چھٹی حس اسے پہلے سے ہی خطرے کے الارم سنانا شروع ہو گئی تھی۔

"اوہ یعنی میں تمہارے گھر نہیں جا سکتا...... لیکن خیر کوئی بات نہیں تم تو میرے ساتھ جا سکتی ہو نا ؟" وہ خاصی لاپروائی سے کہہ رہا تھا اور مریم اس کے الفاظ پہ چونک گئی تھی۔

"میں سمجھی نہیں؟" اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی تھی۔

"سمجھا دوں گا 'ایک بار میرے ساتھ تو چلو......" اب جودت کا لہجہ خباثت میں بدلنے لگا تھا۔

"کک کیا مطلب ہے تمہارا؟" وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی تھی۔

"مطلب کہ تمہیں یاد ہو گا کہ ایک بار پہلے بھی میں تمہیں اسی طرح ایک دن گاڑی میں اپنے ساتھ لے کر گیا تھا لیکن بڑی عزت 'بڑی دیانت اور بڑی شرافت کے ساتھ...... مگر تمہیں وہ شرافت 'وہ دیانت اور وہ عزت راس نہیں آئی تھی اور تمہیں نہیں پتا تھا کہ منصور حسین کون ہے۔"

وہ دانت پیس کر بولا تھا اور مریم اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں آج نشے اور خمار کی بجائے غصے کی لالی دیکھ کر مزید خوف زدہ ہو گئی تھی۔

"لیکن مجھے تو اب بھی نہیں پتا کہ منصور حسین کون ہے؟" اس نے پھر سہارے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے۔

"اوہ...... تو کیا تمہیں یہ بھی نہیں پتا کہ عدیل عمر نیازی کون ہے؟" وہ لفظ چبا کر پوچھ رہا تھا۔

"و...... وہ تو میرے بھائی ہیں۔" مریم خود پہ کنٹرول نہیں کر پا رہی تھی۔

"ہوں تو اگر تمہیں یہ پتا ہے کہ عدیل عمر نیازی تمہارا بھائی ہے تو تمہیں یہ بھی پتا ہو گا کہ منصور حسین کون ہے اور دل آور شاہ کون ہے؟" جودت کا غصہ ٹھنڈا ہونے والا نہیں لگ رہا تھا اور دل آور شاہ کے نام پہ مریم کا رنگ متغیر ہو گیا تھا اور وہ اس سے نظریں چرا گئی تھی۔

"گاڑی میں بیٹھو......" وکی اور کامی دونوں گاڑی ان کے برابر لا چکے تھے اور جودت نے تیور بدلتے ہی اسے گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔

"نہیں...... ہرگز نہیں۔" وہ بدک کے پیچھے ہٹی لیکن وہ ایک سیکنڈ کی بھی تاخیر کیے بغیر آگے بڑھا اور جیب سے رومال نکال کر اس کے منہ پہ رکھ دیا تھا اور ساتھ ہی اس کی احتجاجی کارروائی سست پڑتے ہی وہ اسے اپنے بازو کے گھیرے میں لے کر گاڑی کے پچھلے دروازے سے گاڑی کے اندر بیٹھ گیا تھا اور مریم اس کے رحم و کرم پہ اس کی گود میں آ پڑی تھی 'اس کے ہوش و حواس گم ہو چکے تھے۔

"چلو......" اس نے پچھلا دروازہ بند کرتے ہوئے وکی کو اشارہ کیا تھا اور اس نے گاڑی ہواؤں میں چھوڑ دی تھی اور پھر تینوں ہی قہقہہ لگا کر ہنسے تھے۔

"مریم فاروق نیازی......!" جودت نے خباثت سے کہتے ہوئے اس کے چہرے سے بالوں کو پیچھے ہٹایا تھا اور پھر اپنی انگلیوں سے اس کے گداز رخساروں کو چھونے لگا تھا۔

"بہت ترسایا ہے تم نے...... تمہیں چھونے کے لیے بہت تڑپا ہوں میں...... اور آج تم میرے ہی بازوؤں میں میرے ہی رحم و کرم پر ہو 'اب میں چاہوں تو کیا کیا نہیں کر سکتا۔"

وہ بڑی کمینگی سے کہتا اس کے کانوں کے قریب سرگوشیاں سی کر رہا تھا اور وہ دونوں مسکرا رہے تھے۔

"آج کیا کیا کرو گے......؟" وکی نے گردن موڑ کر جودت کو دیکھا۔

"نہیں...... آج نہیں...... آج کچھ نہیں کروں گا...... کیونکہ آج میری مام کو میرے گھر سے نکلنے پہ شک ہو گیا ہے اس لیے آج کی رات میں گھر جاؤں گا اور اب جو بھی کروں گا کل رات کو ہی کروں گا۔" جودت نے فوراً" ہی نفی میں گردن ہلائی تھی۔

"تو پھر آج کی رات ہمیں دے دو......" کامی نے آنکھ دبائی۔

"شکار میں پہلا نوالہ شیر کا ہی ہوتا ہے میرے یار...... بچا کچھا کھانے کی عادت نہیں ہے۔" اس نے کافی سختی سے کہا تھا اس لیے وہ دونوں ہی چپ ہو گئے تھے اور جودت اسے سائم کے فلیٹ میں چھوڑ کر چابی اپنے ساتھ لے گیا تھا کیونکہ اسے ان کی ہوس پہ کوئی اعتبار نہیں تھا۔ اور وہ دونوں اس کی چالاکی پہ ہاتھ ملتے رہ گئے تھے 'انہیں جودت آفندی سے اس قدر بے مروتی کی امید ہرگز بھی نہیں تھی کیونکہ وہ بڑا فراخ دل آدمی تھا لیکن مریم فاروق نیازی کے معاملے میں نہیں۔

☼ ☼ ☼

وہ ابھی کورٹ سے تھکا ہارا واپس آیا ہی تھا کہ اس کے گھر کے لینڈ لائن نمبر پہ رنگ بجنے لگی تھی اور اس نے سیڑھیوں پہ قدم رکھنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے پلٹ کر فون ریسیو کر لیا تھا۔

"السلام علیکم......!" اس کا لہجہ گمبھیر اور آواز بوجھل سی محسوس ہو رہی تھی۔

"وعلیکم السلام...... کیسے ہو؟" دوسری طرف کی آواز سن کر وہ بری طرح چونک گیا تھا اور یکدم فون سیٹ کی سی ایل آئی کی طرف دیکھا 'نمبر بڑی حویلی کا تھا۔

"تم چپ کیوں ہو گئے ہو؟ آسیہ آفندی بات کر رہی ہوں۔" آسیہ آفندی نے اس کی خاموشی فوراً" نوٹ کی

تھی۔

"جی..... پہچان گیا ہوں آپ بتائیں کوئی حکم؟" اس نے بڑے تحمل اور بڑی شرافت سے استفسار کیا تھا۔

"میں نے تمہیں بڑی حویلی بلانے کے لیے فون کیا ہے۔" آسیہ آفندی بڑا ناپ تول کر بول رہی تھیں۔

"خیریت.....؟" وہ بھی صبر و برداشت کی حد کر رہا تھا۔

"ہوں! خیریت ہی ہے..... میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔"

"ہونہہ..... آپ نے اپنے ہزبینڈ سے پوچھا وہ بھی مجھ سے ملنا چاہتے ہیں یا نہیں؟" اس کے الفاظ تو کیلے ہونے لگے تھے۔

"وہ بول نہیں سکتے....." آسیہ آفندی بھی تحمل کے دائرے میں رہ کر ہی بات کر رہی تھیں۔

"سن تو سکتے ہیں نا.....؟" وہ زہر خند ہوا۔

"سننے کے لیے ہی تو تمہیں بلا رہے ہیں۔"

"لیکن میں کچھ بھی سنانا نہیں چاہتا آپ نے جو مطالبہ وہاں کرنا ہے' وہ آپ یہاں بھی کر سکتی ہیں۔" دل آور نے جانے سے انکار ظاہر کر دیا تھا۔

"لیکن میں مطالبے سے پہلے کچھ الجھنیں سلجھانا چاہتی ہوں۔"

"مگر میں جانتا ہوں کہ آپ ان الجھنوں کو سلجھاتے سلجھاتے خود الجھ جائیں گی۔"

"یہ میرا مسئلہ ہے۔" وہ لاپروائی سے بولیں۔

"یہ آپ کا مسئلہ ہے' اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔" وہ اپنی بات پہ زور دیتے ہوئے بولا۔

"بہر حال جو بھی ہے' میں چاہتی ہوں کہ تم آج رات کا کھانا بڑی حویلی آکر ہی کھاؤ' ہم انتظار کریں گے۔" آسیہ آفندی نے اپنا فیصلہ مسلط کرنا چاہا تھا۔

"ایم سوری" اس نے انتہائی مختصر سے الفاظ میں انکار کر دیا تھا۔

"کیوں..... آخر ایسی کیا بات ہے' جو تمہارے قدموں کو بڑی حویلی آنے سے روک رہی ہے؟" وہ کچھ عجیب سے انداز میں پوچھ رہی تھیں۔

"بھرم.....!" اس نے یک لفظی جواب دیا۔

"بھرم.....؟" وہ نا سمجھی سے بولیں۔

"ہاں بھرم..... کیونکہ مجھے پتا ہے کہ میرے آنے سے بہت سارے بھرم ٹوٹیں گے اور جہاں بھرم ٹوٹتے ہیں وہاں دل تو بے آواز ہی ٹوٹ جاتے ہیں اور کانوں کان خبر بھی نہیں ہوتی۔" وہ طنزیہ سا بولا تھا۔

"میں جانتی ہوں کہ تم وکیل ہو۔" ان کا اشارہ اس کی باتوں اور اس کی دلیلوں کی طرف تھا۔

"اور آپ یہ بھی جانتی ہوں گی کہ میں ہار بھی چکا ہوں۔" وہ استہزائیہ سا ہنسا۔

"تم نے اپنی ہار خود تسلیم کر لی ہے' کسی منصف نے فیصلہ نہیں سنایا ابھی تک۔" انہوں نے بھی دلیل دی تھی۔

"کیونکہ میں حقیقت پسند آدمی ہوں' وقت کے ساتھ ساتھ ہر چیز کو قبول کر لیتا ہوں چاہے وہ میری ہار ہی کیوں نہ ہو؟" وہ کافی مضبوطی سے بول رہا تھا۔

"پھر بھی اپنی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت کو فیس کرنے سے گھبرا رہے ہو؟" وہ حیران ہوئیں۔

"انسان ہوں' گھبرا بھی سکتا ہوں' کیونکہ حقیقت بہت سفاک ہوتی ہے۔" وہ تلخ ہو رہا تھا۔

"لیکن میں چاہتی ہوں کہ تم گھبراؤ مت اور حقیقت کو فیس کرو کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ تمہارے اندر کچھ ہے؟

کچھ ایسا جو تمہیں بہت اذیت دیے ہوئے ہے۔" آسیہ آفندی کے لہجے میں نرمی جھلکی تھی۔

"مجھے اذیت میں ہی رہنے دیں' ورنہ آپ اذیت میں آجائیں گی۔" اس نے سر جھٹکا۔

"کیا اگر زہرہ تمہیں اس طرح بلاتی تو تم تب بھی نہ آتے؟" یہ ان کا آخری پوائنٹ تھا جس کو انہوں نے بالآخر استعمال کر ہی لیا تھا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟" دل آور کا دل جیسے کسی اتھاہ گہرائی میں جا گرا تھا۔

"میں نے جو کہنا تھا کہہ دیا ہے..... اللہ حافظ۔" انہوں نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا اور دل آور ہاتھ میں پکڑے ریسیور کو دیکھتا رہ گیا تھا اور وہ وہیں کھڑے کھڑے یہ سوچنے پہ مجبور ہو گیا تھا کہ آخر انہوں نے کس دعوے سے یہ بات کہہ کر فون بند کیا ہے۔

"آخر کس دعوے سے.....؟"

وہ سوچتا ہوا اور سلگتا ہوا اسا اوپر اپنے بیڈ روم میں آگیا تھا اور اپنی کنپٹیوں کو مسلتے ہوئے سگریٹ بھی سلگا لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

نبیل ڈرائیونگ سیٹ پہ براجمان ڈرائیو کر رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی فرنٹ سیٹ پہ بیٹھا عدیل گاڑی میں بجتے میوزک اور نبیل سے ہلکی پھلکی گپ شپ سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ اچانک ہی اس کا موبائل بجنے لگا تھا۔

اس نے موبائل نکال کر دیکھا' شہریار کا نمبر تھا اور اس نے سی ڈی پلیئر کا والیوم کم کرتے ہوئے کال ریسیو کر لی تھی' کیونکہ شہریار نے بہت دنوں بعد اسے کال کی تھی۔

"ہیلو استاد..... کیسے ہو؟" شہریار کے لہجے سے ہی لگ رہا تھا کہ وہ بہت خوش ہے۔

"ٹھیک ٹھاک..... اللہ کا بڑا احسان ہے یار۔" عدیل بھی جواباً" خاصے فریش لہجے میں بولا تھا۔

"مجھے کچھ بتانا تھا اسی لیے فون کیا ہے۔" شہریار کی خوشی سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی۔

"ہاں بتاؤ..... میں سن رہا ہوں۔" عدیل ہمہ تن گوش ہوا تھا۔

"مجھے جاب مل گئی ہے۔" اس نے فوراً" خوشخبری سنائی۔

"ارے سچ....." عدیل خوشی سے چہکا تھا۔

"ہاں استاد سچ....." وہ بھی اپنی خوشی کا اظہار کافی کھل کے کر رہا تھا۔

"بہت بہت مبارک ہو یار! مجھے بہت خوشی ہوئی ہے تمہاری جاب کا سن کر۔" عدیل کو واقعی بہت زیادہ خوشی ہوئی تھی اور اس کا اندازہ اس کے لہجے سے ہی ہو رہا تھا۔

"خیر مبارک استاد! میرے گھر والوں کو بھی بہت خوشی ہو رہی ہے اور اسی خوشی میں میری اماں آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔ یہ لیں اماں سے بات کریں۔"

شہریار نے باتوں باتوں میں آناً" فاناً" اپنا موبائل لے کر اپنی امی کو پکڑا دیا تھا اور عدیل سفر کے دوران نبیل کے ساتھ ماحول کی نزاکت کے خیال سے انکار کرتے کرتے رک گیا تھا کیونکہ تب تک فون ان کے ہاتھوں میں جا چکا تھا۔

"ہیلو۔" دوسری طرف سے شہریار کی امی کی آواز سنائی دی تھی۔

"السلام علیکم آنٹی..... کیسی ہیں آپ؟ بہت بہت مبارک ہو آپ کو' شہریار کی جاب کا مسئلہ حل ہو گیا۔" عدیل کو مجبوراً" بڑی خوش اخلاقی اور خوش دلی سے پیش آنا پڑا تھا۔

"وعلیکم السلام بیٹا! میں بالکل ٹھیک ہوں' تمہیں بھی بہت بہت مبارک ہو..... اللہ نے بڑے عرصے بعد اتنی

بڑی خوشی دی ہے اور اسی خوشی میں ہم لوگ چاہ رہے تھے کہ اگر ایک اور خوشی مل جاتی تو اس خوشی کا مزا دوبالا ہو جاتا۔“ انہوں نے جیسے تمہید باندھی تھی۔

”ایک اور خوشی..... میں سمجھا نہیں؟“ عدیل واقعی نہیں سمجھا تھا۔

”وہ دراصل بیٹا ہم لوگ تمہارے گھر آنا چاہ رہے تھے۔ ایمن بیٹی سے ملنے کے لیے۔“ انہوں نے ایمن کا نام واضح کردینا ہی مناسب سمجھا تھا تاکہ عدیل بھی آسانی سے سمجھ جاتا۔

”ایمن بیٹی سے؟ آنٹی آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں؟ میں سمجھ نہیں پا رہا۔“ عدیل اب بھی سمجھ اور نا سمجھی کے دائرے میں ہی ڈول رہا تھا۔

”ارے بیٹا! میں ایمن کے رشتے کے سلسلے میں آنا چاہتی ہوں، میں چاہتی ہوں کہ ایمن میرے شہریار کی دلہن بنے..... اس لیے سوچا کہ تمہاری امی اور ابو سے بھی ملاقات ہو جائے۔“ آخر ہم نے انہی کے در پہ تو سوالی بن کر جانا ہے۔“ انہوں نے آخر صاف لفظوں میں کہہ ہی دیا تھا اور عدیل ان کے منہ سے ایمن کے رشتے کی بات سن کر خوشی اور حیرت سے بے یقین سا ہو گیا تھا۔

”ہیلو بیٹا!..... تم چپ کیوں ہو گئے ہو.....؟“

”ارے نہیں نہیں آنٹی.....! ایسی کوئی بات نہیں ہے، میں دراصل اپنے آفس کے کسی کام کے سلسلے میں اسلام آباد جا رہا ہوں، راستے میں ہوں، اس لیے فی الحال کچھ نہیں کہہ سکتا، البتہ آپ ہمارے گھر آنا چاہتی ہیں تو موسٹ ویلکم آپ جب چاہیں آسکتی ہیں، باقی باتیں آپ آئیں گی تو وہ بھی ہو جائیں گی۔“ عدیل نے فوراً ہی بات سنبھالی تھی۔

”ٹھیک ہے بیٹا! تم اسلام آباد سے واپس آجاؤ تو ہم آجائیں گے، لیکن مٹھائی کے ساتھ آخر شہریار تمہارا دیکھا بھالا لڑکا ہے۔“ وہ بڑی اپنائیت سے بولی تھیں اور عدیل مسکرا کے رہ گیا تھا۔

”جی آنٹی! اگر اللہ تعالیٰ نے میری بہن کا نصیب شہریار کے نصیب سے جوڑا ہے تو میں اپنی بہن کو ایک خوش نصیب لڑکی سمجھوں گا۔ کیونکہ شہریار واقعی بہت اچھا لڑکا ہے اور میرا دیکھا بھالا بھی ہے۔ وہ باکردار ہے دیانت دار ہے، محنتی ہے، غیرت مند ہے، اس لیے ہمیں اور کیا چاہیے، لیکن پھر بھی آخری فیصلہ امی اور ابو کا ہی ہوگا، میں ان سے بات کر کے آپ کو بتا دوں گا۔“ عدیل نے انہیں بھرپور تسلی دی تھی کیونکہ وہ زیادہ نخرے دکھا کر یا موڑ بنا کر انہیں بددل نہیں کرنا چاہتا تھا اور نہ ہی اللہ کے سامنے کوئی ناشکری دکھانا چاہتا تھا۔

”ٹھیک ہے بیٹا! ہم دوبارہ فون کرلیں گے۔ تم خیریت سے جاؤ اور خیریت سے آؤ اللہ حافظ۔“ انہوں نے نرمی سے کہہ کر فون بند کر دیا تھا اور عدیل اللہ کی اتنی کرم نوازی پہ دل ہی دل میں شکر گزار ہو رہا تھا کہ چلو شکر ہے کہ کوئی تو ابتدا ہوئی۔

”لڑکا کیسا ہے.....؟“ نبیل بھی اس کی ساری گفتگو سن چکا تھا اور اس نے جان بوجھ کر ہی اس کی بات میں انٹرسٹ ظاہر کیا تھا۔

”اچھا ہے..... بلکہ بہت اچھا ہے میرے ساتھ ہی ورکشاپ میں کام کرتا تھا، جیسے ہی ورکشاپ بند ہوئی۔ ہم لوگ بے روزگار ہو کر رہ گئے، لیکن پھر بھی ہمت کسی نے بھی نہیں ہاری اور آج اسے بھی جاب مل گئی ہے۔ اچھی جاب ہے وہ مطمئن اور خوش ہے اور اس کے گھر والے اس کی اس خوشی کے بعد اس کا رشتہ طے کرنا چاہتے ہیں۔“ عدیل بتاتے بتاتے آخر میں چپ ہو گیا تھا۔

”تمہاری سسٹر کے ساتھ؟“ نبیل جان بوجھ کر ایسے سوال پوچھ رہا تھا۔

”جی!“ وہ آہستگی سے بولا۔

”تو پھر کیا خیال ہے تمہارا اس رشتے کے بارے میں؟“ اتفاقاً ہی یہ بات چھڑ گئی تھی تو وہ اس سے اس کے سارے خیالات جاننا چاہتا تھا۔

”میری طرف سے کوئی انکار نہیں ہے اور مجھے امید ہے کہ امی ابو بھی کوئی انکار نہیں کریں گے، کیونکہ ایسے اچھے رشتے بار بار نہیں ملتے۔ کیا ہوا جو وہ مالی لحاظ سے تھوڑا ویک ہے، لیکن باقی ہر لحاظ سے تو بہت اسٹرانگ ہے نا۔ نیت اور کردار کا کھرا ہے، بس میں اسی چیز پہ مطمئن ہوں اور مجھے پتا ہے کہ وہ میری بہن کو ہمیشہ بہت خوش رکھے گا اور اگر نہ بھی رکھ سکا تو اللہ مالک ہے، زندگی میں اپ ڈاؤن تو آتے ہی رہتے ہیں، ماں باپ کے گھر میں مشکل اٹھانا پڑے تو لڑکیاں برداشت کرلیتی ہیں، تو سسرال جا کر کوئی مشکل آجائے تو انہیں وہ بھی برداشت کرنی چاہیے صبر اور ہمت کے ساتھ۔“

عدیل کی باتوں نے نبیل کے ذہن کی رہی سہی کشمکش بھی دور کر دی تھی اور وہ چند سیکنڈز میں ہی ریلیکس ہو گیا تھا۔

”ہوں..... اچھی سوچ ہے تمہاری، مجھے بہت خوشی ہوئی ہے سن کر، ہر ماں باپ اور بہن بھائیوں کو ایسی ہی مثبت سوچ رکھنی چاہیے، اِن شاءاللہ، اللہ نصیب اچھے کرے گا۔“ نبیل نے اس کے خیالات اور اس کی سوچ کو سراہا تھا۔

”آمین دعا کیجیے گا۔“ عدیل آہستگی سے بولا۔

”اپنے بارے میں کیا سوچا ہے؟“ نبیل نے گردن موڑتے ہوئے اسے اک نظر دیکھا تھا۔

”کیا مطلب.....؟“ عدیل ٹھٹکا۔

”یہی شادی وغیرہ کے سلسلے میں..... کیا پلاننگ ہے تمہاری؟“ نبیل اپنے مطلب کی بات جاننا چاہتا تھا اور عدیل اس کے سوال پہ چپ ہو کے رہ گیا تھا۔

”بولو نا..... کچھ تو سوچ ہی رکھا ہوگا؟“ نبیل اسے بولنے پہ اکسا رہا تھا۔

”نہیں..... ابھی کچھ بھی نہیں سوچ رکھا ابھی مجھے اپنی بہنوں کے فرض سے فارغ ہونا ہے اور ابھی مجھے اپنا گھر اسٹیبلش کرنا ہے اس لیے اپنے بارے میں کبھی بھی نہیں سوچا اور نہ ہی کبھی کوئی پلاننگ کی ہے۔“ عدیل نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا تھا۔

”لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے بارے میں بھی سوچو کیونکہ میں بھی اپنی بہن کے فرض سے فارغ ہونا چاہتا ہوں۔“

نبیل نے اسے ہزار والٹ کا کرنٹ لگا دیا تھا اور عدیل نے اس کرنٹ کے ہاتھوں مجبور ہو کر یکدم نبیل کی طرف دیکھا تھا وہ ڈرائیو کرتے ہوئے گاڑی کی اسکرین کی طرف دیکھ رہا تھا اور بہت پر سکون نظر آ رہا تھا۔

”یہ..... یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“ عدیل ہکلا گیا تھا۔

”میں جو بھی کہہ رہا ہوں بہت زیادہ سوچنے سمجھنے اور پرکھنے کے بعد کہہ رہا ہوں۔“

”مم مگر نبیل صاحب.....!“

”میں جانتا ہوں عدیل تم مدیحہ میں انٹرسٹڈ ہو اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ بھی تمہیں پسند کرتی ہے، بلکہ یہ کہنا بھی ٹھیک ہی ہوگا کہ تم دونوں ہی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہو..... اور محبت ایک بے اختیاری جذبہ ہے یہ کہیں بھی کسی کے بھی ساتھ ہو جاتی ہے۔ اس میں انسان کی اپنی کوئی مرضی اور کوئی کوشش شامل نہیں ہوتی، اس لیے تم دونوں کی کوئی غلطی نہیں ہے، آخر تم لوگ بھی انسان ہی ہو، لیکن میں چاہتا ہوں کہ یہ محبت ایک مضبوط رشتے میں بدل جائے تو زیادہ اچھا رہے گا اور ہمیں بھی کچھ سکون مل جائے گا۔“

نبیل نے بڑے ہی اچھے اور احسن طریقے سے ساری بات واضح کرتے ہوئے عدیل کو حیران پریشان چھوڑ دیا تھا کیونکہ اسے یکے بعد دیگرے دو جھٹکے لگ چکے تھے اور ان دو جھٹکوں نے ہی اسے چکرا کر رکھ دیا تھا۔

"کیا بات ہے؟ تم خاموش کیوں ہو گئے ہو کچھ غلط کہہ دیا میں نے؟"

نبیل نے ذرا کی ذرا سامنے اسکرین سے نظریں ہٹا کر عدیل کی سمت دیکھا تھا' عدیل نظریں جھکا گیا تھا۔

"لیکن میں فی الحال خود کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ میں سوالی بن کے آپ کے در پہ آسکوں۔" وہ بہت آہستگی سے بول رہا تھا۔

"تم کس قابل ہو اور کس قابل نہیں ہو میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ باکردار ہو دیانت دار ہو' محنتی ہو اور کیا چاہیے ہمیں؟ یہی ساری کوالٹیز ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے گنوائی ہیں اور یہی ساری کوالٹیز تم میں آل ریڈی موجود ہیں پھر تم کیوں ہمارے در پہ سوالی بن کے نہیں آسکتے؟

جبکہ میں نے تو تمہیں سوالی بننے کی مہلت ہی نہیں دی' تمہارا ہاتھ بڑھنے سے پہلے ہی تمہارا ہاتھ تھام لیا ہے اور وہ فیصلہ بیٹھے بیٹھے کر دیا ہے' جس کو سوچنے میں اور کرنے میں لوگ سالوں اور مہینوں لگا دیتے ہیں' مام سے مشورہ کیا ہے نہ ڈیڈ سے..... کیونکہ مجھے پتا ہے کہ صرف وہی دونوں ہیں' جو زیادہ انوالو ہیں اس معاملے سے..... لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ تمہارے بارے میں میرا یہ فیصلہ سن کر انہیں بھی بہت خوشی ہوگی اور کسی قسم کا کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

نبیل بہت تحمل اور ..... اپنائیت سے بات کر رہا تھا اس لیے اب عدیل کے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا آخر وہ مزید کیا کہتا.....؟

"تم بے شک فی الحال بارات لے کر نہ آؤ' لیکن ایک رنگ پہنا کر مدیحہ کو اپنے نام سے منسوب کر لو تو یہ بھی رشتے کو مضبوط کرنے کے لیے کافی ہوگا اور دونوں فیملیز میں ایک نئے رشتے کی ڈور بھی بندھ جائے گی۔" اس نے اپنی خواہش ظاہر کی تھی۔

"تھینک یو میں امی اور ابو سے بات کروں گا' وہ باقاعدہ پرپوزل لے کر آئیں گے آپ کے گھر اور پھر کسی روز رسم بھی کر لیں گی۔" عدیل نے ہامی بھر لی تھی۔

"اوکے..... تو پھر اب..... صاحب نہیں بلکہ نبیل بھائی ہونا چاہیے کیونکہ مجھے بھی تمہاری شکل میں اپنا ایک بھائی نظر آ رہا ہے' چھوٹا بھائی' جو اب ہمیشہ ہر غم اور ہر خوشی میں میرے شانہ بشانہ اسی طرح قدم بڑھائے گا اور ہر طویل سفر میں میرا ساتھ دے گا۔"

نبیل نے اس کے اور اپنے درمیان کی اجنبیت اور غیریت مٹانے میں لمحہ بھی نہیں لگایا تھا اور عدیل اس کی بات پہ مسکرا دیا تھا۔

"ان شاء اللہ.....!" عدیل نے بڑے صدق دل سے کہا تھا۔

کیونکہ آخر اللہ تعالیٰ نے بیٹھے بیٹھے اس کی جھولی خوشیوں سے بھر دی تھی اور اس کی زندگی کے وہ مشکل ترین کاموں کو اس کے لیے آسان بنا دیا تھا اور اسے ذرا سی بھی پریشانی نہیں اٹھانی پڑی تھی۔

"اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے تو رحیم و کریم تو جو چاہے کر سکتا ہے' بن مانگے بھی مرادیں پوری کر دیتا ہے۔"

عدیل کا رواں رواں اللہ کے حضور شکر گزار اور مشکور ہو رہا تھا اور اس کا دل چاہ رہا تھا کہ یونہی راستے سے ہی واپس لوٹ جائے اور امی ابو اور مریم کو یہ دونوں خوشخبریاں جا کر سنائے' لیکن کیا کرتا اسے سفر میں نبیل کا بھی ساتھ دینا تھا اور اسے اب کسی بھی مقام پہ اکیلا نہیں چھوڑنا تھا۔

☆ ☆ ☆

"امی پلیز.....! چپ ہو جائیں..... اگر ابا کو بھنک بھی پڑ گئی تو ہمارے لیے مزید مسئلہ کھڑا ہو جائے گا' ان کی طبیعت بگڑ گئی تو بہت برا ہو گا۔"

ایمن اور ایمان دونوں ہی عابدہ خاتون کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھیں' کیونکہ شام حد سے زیادہ گہری ہو چکی تھی اور مریم ابھی تک گھر نہیں آئی تھی۔

انہوں نے ایک بار پی سی او سے اور ایک بار ساتھ والی کلثوم کے گھر سے مریم کے نمبر پہ کال کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کا نمبر کئی بار ٹرائی کرنے کے بعد بھی آف ہی مل رہا تھا اور ہر بار مایوس اور پریشان سی گھر واپس لوٹ آئی تھیں اور جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا اور شام گہری سے بھی گہری ہوتی جا رہی تھی تو ان کا دل واہموں اور خدشوں میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہتے چلے آ رہے تھے۔ "تو کیا کروں..... چپ ہو کر بیٹھ جاؤں؟ وہ نہیں آئی تب بھی سکون سے کھانا کھا کر اپنے بستر میں جا کر سو جاؤں.....؟" انہوں نے روتے روتے سسکیوں کے درمیان پوچھا تھا۔

"ہم ایسا کب کہہ رہی ہیں امی..... لیکن پلیز خود کو سنبھالیں اور میرے ساتھ چلیں' ہم دوبارہ فون ٹرائی کرتے ہیں۔" ایمن نے انہیں سمجھانے کی سنبھالنے کی کوشش کی تھی۔

"اور کتنا ٹرائی کریں گے.....؟ چار بجے سے فون ٹرائی کرنا شروع کیا ہے' لیکن ایک بار بھی رنگ نہیں گئی' کال نہیں ملی اور نہ ہی فون آن ہوا ہے' پتا نہیں کیا ہوا ہے میری بچی کے ساتھ؟ نجانے کس حال میں ہوگی اور کہاں ہو گی ایسا کون سا حادثہ پیش آیا ہے کہ اس کی کوئی خبر ہی نہیں مل رہی؟" عابدہ خاتون بلک بلک کر رو رہی تھیں۔

"تو پھر ایسا کریں کہ بھائی کو فون کریں اور انہیں گھر بلائیں۔" ایمان نے دوسرا مشورہ دیا۔

"کیسے بلاؤں اسے؟ اتنے گھنٹے تو اس کے سفر میں ہی کٹ جائیں گے اور یہ شام آدھی رات میں ڈھل جائے گی اور اگر شام آدھی رات میں ڈھل گئی تو ہم خالی ہاتھ رہ جائیں گے' ہمارے پاس کچھ بھی نہیں بچے گا' ہم لٹ جائیں گے برباد ہو جائیں گے' ہمارے پاس کچھ بھی نہیں بچے گا' عابدہ خاتون زارو قطار رو رہی تھیں ایمن اور ایمان کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے تھے اور اپنی ماں سے لپٹ کر وہ دونوں بھی خوب روئی تھیں۔

اور پھر بڑی ہمت اور حوصلہ مجتمع کرتے ہوئے وہ دونوں ماں بیٹی عدیل کو فون کرنے کے لیے گھر سے نکل کھڑی ہوئی تھیں' پی سی او ان کے گھر سے خاصا دور تھا اس لیے وہ دونوں اندر سے ڈر بھی رہی تھیں' لیکن افسوس کہ قسمت نے اس دفعہ بھی ساتھ نہیں دیا تھا' نبیل اور عدیل دونوں ہی میٹنگ میں تھے اور فون سائلنٹ پہ تھے اس لیے عدیل کو پتا ہی نہ چلا کہ ایمن اور امی اسے کال کرتی رہی ہیں۔

اور عدیل کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد تو عابدہ خاتون کی کمر ہی ٹوٹ گئی تھی' وہ پاؤں گھسیٹتی ہوئی گھر آئی تھیں اور چارپائی پہ گرنے کے ساتھ ہی ہچکیوں سے رونا شروع کر دیا تھا۔ کیونکہ انہیں اب تاریکی اور اندھیرے کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"آپ نے دل آور شاہ کو کال کی تھی؟ کیا کہتا ہے وہ.....؟"

آذر نے آفس سے واپس آتے ہی استفسار کیا تھا اور آسیہ آفندی نے سیڑھیوں پہ ٹھٹکنے والی کومل کی طرف دیکھا تھا جو اپنی شادی کے دنوں میں بھی ٹھیک طرح سے خوش نہیں ہو پا رہی تھی۔

اور وجہ کیا تھی' آسیہ آفندی بھی جان گئی تھیں۔

"ہاں..... کی تھی کال' آ جائے گا کچھ دیر تک۔" انہوں نے بہت نپے تلے سے لہجے میں بتایا تھا۔

"ٹھیک ہے آجائے تو بہتر ہوگا۔۔۔ آخر کچھ تو فائنل ہو' یہ معاملہ یونہی تو نہیں لٹکائے رکھنا ہم نے۔"

آزر کے لہجے میں غصہ اور خفگی تھی جس پہ آسیہ آفندی نے اک نظر ٹھہر کر اسے دیکھا تھا۔

"وہ اس گھر میں آپ لوگوں کی لڑائی جھگڑے کے لیے یا پھر دشمنی کے لیے نہیں آرہا۔ مہمان بن کر آرہا ہے' میں نے اسے کھانے پہ انوائیٹ کیا ہے' جو بھی بات ہوگی کھانا کھانے کے بعد ہوگی اور ساتھ ساتھ تم سب لوگ یہ مت بھولو کہ علیزے اب بھی اس کے نکاح میں ہے' اس کا حق اور اختیار ہم سے زیادہ ہے وہ چاہے تو اب بھی بہت کچھ کر سکتا ہے' اس لیے پلیز ہم سب کو بہت سوچ سمجھ کر بات کرنا ہوگا۔" انہوں نے آزر کے تیور دیکھ کر ہی اسے پہلے سے سمجھا دینا بہتر سمجھا تھا۔

جس پہ آزر خاموش ہو گیا تھا اور سیڑھیوں کی ریلنگ پہ ہاتھ رکھ کے کھڑی کومل کو اندر ہی اندر بہت خوشی اور تسلی ہوئی تھی کہ چلو شکر ہے کہ ابھی کوئی تو امید باقی ہے نا۔۔۔

"آنی! آپ بھی یہ جانتی ہیں کہ علیزے اس کے ساتھ خوش نہیں ہے' یہ سارا کھیل زبردستی کا کھیل ہے اور اس نے یہ کھیل کیوں کھیلا ہے یہی تو ہم جاننا چاہتے ہیں اور اسی لیے تو اسے یہاں بلا رہے ہیں' آخر ہمیں کچھ تو پتا چلے ہم کیوں اندھیرے میں جی رہے ہیں۔" آزر طیش میں آگیا تھا اور خاموش ہو جانے کے بعد بھی ایک بار پھر بول پڑا تھا۔

"صبر۔۔۔۔ اور صرف صبر۔۔۔۔ جہاں اتنا وقت گزر چکا ہے وہاں تھوڑا سا اور سہی' ورنہ کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ انسان کو لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔"

انہوں نے آزر کو کچھ جتایا تھا اور وہ ان کی بات پہ مزید کچھ بھی کہے بغیر ضبط کرتا۔۔۔ اور اندر ہی اندر سلگتا ہوا سا آگے بڑھ گیا تھا اور کومل کا دل چاہا تھا کہ آگے بڑھ کے آسیہ آفندی کو بانہوں میں بھر کر بھینچ لے' انہوں نے بہت حقیقت پسندی سے کام لیا تھا آخر۔

☼ ☼ ☼

جو ہو فیصلہ وہ سنایئے اسے حشر پہ نہ اٹھایئے
جو کریں گے آپ ستم وہاں وہ ابھی سہی وہ یہیں سہی

بالآخر اس نے بڑی حویلی کے گیٹ پہ رکتے ہوئے گاڑی کے ہارن پہ ہاتھ رکھ ہی دیا تھا اور اس کی گاڑی کے ہارن پہ جہاں چوکیدار عارف نے ایک دم الرٹ ہو کر گیٹ کھولا تھا وہیں پہ حویلی کے باقی افراد بھی اپنی اپنی جگہ پہ بڑے ہی غیر محسوس انداز میں الرٹ سے ہوگئے تھے۔

اس کی چمکتی دمکتی سرف بڑی سبک رفتاری سے آگے بڑھتی حویلی کے طویل اور انتہائی کشادہ سے ڈرائیو وے پہ آرکی تھی اور چوکیدار عارف "منصور حسین" کی پرسنالٹی اور رعب دیکھتا رہ گیا تھا۔ ایک بار اس کا دل چاہا تھا کہ وہ آگے بڑھ کے اس سے ملے' لیکن پھر اس کا موڈ دیکھتے ہوئے وہ وہیں کا وہیں رک گیا تھا اور ولی آور شاہ گاڑی سے اتر کر اندر کی طرف قدم بڑھا چکا تھا لیکن اس کا ایک ایک قدم اس کی ذات پہ عذاب ثابت ہو رہا تھا۔

اس کے جسم کی رگیں پھٹ رہی تھیں اور دماغ میں الگ ابال سے اٹھ رہے تھے۔

لیکن پھر بھی وہ قدم اٹھا رہا تھا اور محشر کے میدان کی طرف بڑھ رہا تھا' کیونکہ اس وقت بڑی حویلی اس کے لیے محشر کے میدان سے کچھ کم نہیں تھی۔

اور اس نے اس سے بچنے کی کوشش بھی بہت کی تھی مگر نہیں۔۔۔۔

اسے اس روز حساب کا سامنا کرنے پہ مجبور کیا گیا تھا اور اسے آنا ہی پڑا تھا!

اور جب وہ آہی گیا تھا تو دیکھنے والوں کو ایک دم پتھر اور سپاٹ نظر آرہا تھا۔
شاید اسی لیے آسیہ آفندی اسے کوریڈور میں داخل ہوتے دیکھ کر خود کوریڈور کے دوسرے سرے پہ ہی رک گئی تھیں اور وہ طویل کوریڈور اپنے مضبوط قدموں سے طے کرتا ان کے قریب آگیا تھا۔
"السلام علیکم۔۔۔" ان کے سامنے رکتے ہوئے اس نے اپنی نظریں جھکالی تھیں۔
"وعلیکم السلام۔۔۔ جیتے رہو۔" وہ دونوں ہی ایک دوسرے سے ملاقات کی فارملیٹی نبھا رہے تھے اور یہ بات وہ دونوں ہی جانتے تھے۔
"آپ کیسی ہیں؟ اور آپ کی صحت۔۔۔؟" اس نے بات بڑھانے کی کوشش کی تھی۔
"الحمد للہ۔۔۔ ٹھیک ہوں اور صحت بھی اچھی ہی ہے' آؤ' ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہیں۔" وہ اسے ڈرائنگ روم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی تھیں اور دل آور نے چپ چاپ ڈرائنگ روم کی طرف قدم بڑھا دیے تھے۔
"بیگم صاحبہ! عائشہ بی بی نے کہا ہے کہ دل آور صاحب کو لے کر بڑے صاحب کے کمرے میں ہی آجائیں۔" ان دونوں کے بڑھتے قدم رجو کی آواز پہ ہی رک گئے تھے اور آسیہ آفندی نے بے ساختہ دل آور کے چہرے کی سمت دیکھا تھا جبکہ وہ ان کے منہ سے کچھ سننے کا منتظر کھڑا تھا۔
"اچھا ٹھیک ہے' تم چلو ہم آتے ہیں۔" انہوں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے رجو کو وہاں سے بھیج دیا تھا اور پھر دوبارہ اس کی طرف دیکھا تھا۔
"آؤ وہیں چلتے ہیں' وقار سے بھی ملاقات ہو جائے گی تمہاری۔۔۔" انہوں نے بہت اچھے طریقے سے اسے اب وقار آفندی کے بیڈ روم کی طرف چلنے کا کہا تھا۔
اور دل آور نے پہلی بار ایک اذیت بھری سانس کھینچتے ہوئے سر خم کر دیا تھا اور ان کے ساتھ چل پڑا تھا پھر دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے وقار آفندی کے بیڈ روم میں داخل ہوئے تھے اور داخل ہوتے ہی اس کے قدم جیسے اپنی جگہ جم سے گئے تھے کیونکہ سامنے ہی وقار آفندی کے سرہانے اس کی دشمن جاں اس کی اپنی زوجہ بیٹھی ہوئی تھی اور اس نے بھی اندر آتے ہوئے اپنے "مجازی خدا" کو نظریں اٹھا کر سراپا دیکھا تھا اور نظروں کا تصادم ہوتے ہی وہ نظریں چرا گئی تھی' نہ سلام کیا تھا' نہ دعا کی تھی۔
بلکہ کچھ اس طرح سے پوز کیا تھا کہ جیسے اسے جانتی ہی نہ ہو اور وہ بھی جو اسے اک نظر دیکھ کر اندر سے یکدم موم کی طرح پگھلا تھا۔ اس کے نظریں چرا لینے سے فوراً" ہی کسی پتھریلے پہاڑ میں تبدیل ہو گیا تھا۔ جس پہ اب کچھ بھی اثر نہیں ہو سکتا تھا۔
یہاں تک کہ علیزے کی موجودگی کا احساس بھی نہیں۔
کیونکہ وہ اس سے اور اس کی موجودگی کے احساس سے انجان ہو چکا تھا۔
"السلام علیکم۔" اس نے ذرا ٹھہرے ہوئے سے لہجے اور اونچی آواز میں سلام کیا تھا۔
"وعلیکم السلام بیٹا! کیسے ہو؟" عائشہ آفندی صوفے سے اٹھ کر اس کے سامنے آگئی تھیں اور اس کے کندھے پر بڑی محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کا حال احوال پوچھا تھا۔
"جی ٹھیک ہوں۔" اس نے بڑے مختصر سے الفاظ میں جواب دیا تھا۔
"آؤ بیٹھو۔" انہوں نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔
"تھینک یو۔" وہ کسی روبوٹ کی طرح آگے بڑھ کے صوفے پہ بیٹھ گیا تھا۔
"السلام علیکم۔" اچانک دانیال اور جووت بھی اندر آگئے تھے اور دانیال نے دل آور کو دیکھ کر خود آگے بڑھ کے اس سے باقاعدہ مصافحہ کیا تھا۔

البتہ آذر وہاں پہلے سے موجود تھا' لیکن اس نے دل آور سے ہاتھ نہیں ملایا تھا اور نہ ہی دل آور نے خود ایسی کوئی کوشش کی تھی۔
"بیٹھیے۔۔۔ آپ کھڑی کیوں ہیں؟ پلیز بیٹھ جائیے۔" دل آور نے آسیہ آفندی کو وقار آفندی کے بیڈ کے قریب ہی کھڑے دیکھ کر بیٹھنے کے لیے متوجہ کیا تھا۔
"نہیں۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے' وہ بس میں دراصل چاہ رہی تھی کہ تم پہلے کھانا کھا لیتے تو زیادہ بہتر تھا۔ ہم بھی تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے۔" آسیہ آفندی بیڈ روم کے ماحول کی کشیدگی محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکی تھیں۔
"بڑی حویلی کی طرف سے دعوت کا سن کر ساری بھوک ہی اڑ گئی تھی اس لیے فی الحال کوئی بھوک نہیں ہے۔"
اس نے نفی میں گردن ہلائی۔
"تو ٹھنڈا منگوا لیتی ہوں۔"
"نو تھینکس۔ میری پیاس پانی سے بجھنے والی نہیں ہے۔"
"تو پھر آئے کیوں ہو؟" عائشہ آفندی ناراضی سے بولیں۔
"عدالت میں پیشی کے لیے۔" وہ بھی ڈرنے اور جھجکنے والا نہیں تھا۔
"اور تم جانتے ہی ہو گے کہ فیصلہ بھی آج ہی ہو گا۔" یہ آواز آذر کی تھی اور دل آور نے آذر کی طرف دیکھا تھا۔
"کیسا فیصلہ؟" اس نے جان بوجھ کر سوال اٹھایا۔
"علیزے کی طلاق کا فیصلہ۔۔۔" آذر نے طلاق کے فیصلے پہ زور دیا تھا۔
"علیزے کی طلاق کا فیصلہ۔۔۔ لیکن وہ کیوں؟" وہ جیسے سب کچھ ان کے منہ سے سننا چاہتا تھا۔
"کیونکہ علیزے تمہارے ساتھ رہنا نہیں چاہتی۔" ان دونوں کے سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔
"کیوں۔۔۔؟ علیزے میرے ساتھ کیوں نہیں رہنا چاہتی؟ کیا میں برا ہوں اس لیے؟" وہ آذر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے پوچھ رہا تھا۔
"ہاں شاید۔۔۔" آذر نے کندھے اچکائے۔
"شاید نہیں یقیناً" میں بہت برا ہوں' لیکن پھر بھی بدکردار نہیں ہوں اور اس چیز کو میرا خیال ہے کہ علیزے سے بہتر اور کوئی بھی نہیں جانتا۔" اس کی بات پہ علیزے کا جھکا ہوا سر مزید جھک گیا تھا۔ کیونکہ اس نے بات ہی ایسی کہہ دی تھی۔
"تم کتنے باکردار ہو' یہ بات علیزے ہی نہیں ہم سب بھی کافی اچھی طرح سے جانتے ہیں۔" آذر نے کمرے میں موجود تمام افراد کی سمت دیکھتے ہوئے کہا تھا۔
"میں علیزے کو یہاں سے لے گیا تھا تو اس کا مطلب ہے کہ میں بدکردار ہو گیا تھا' ہونہہ۔ اگر ایک لڑکی کو سب کے سامنے محض اپنے ساتھ لے جانا بدکرداری ہے تو ایک لڑکی کی عزت سے کھیلنے والے کو کیا نام دیں گے آپ لوگ؟"
اس نے کہتے ہوئے آذر اور باقی سب کو بھی ایک سرسری سی نظر سے دیکھا تھا۔ لیکن آذر کے پاس اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔
"بتاؤ آذر آفندی کسی لڑکی کی عزت سے کھیلنے والے کو کیا نام دو گے؟ برا یا بد سے بھی بدتر؟" اس نے آذر آفندی کو بولنے پہ اکسایا تھا۔
"یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟" آذر کے کچھ پلے نہیں پڑ رہا تھا۔
"میں جو کچھ کہہ رہا ہوں' میں یہ کہنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن آپ لوگوں نے صرف آپ لوگوں نے مجھے یہ سب

کہنے پہ مجبور کر دیا ہے' ورنہ آپ لوگوں کی نظر میں کسی دوسرے کو گرا کر خود سرخرو ہونے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا' لیکن مجھے مجبور کیا گیا ہے کہ میں حویلی آؤں اور اپنی اس گستاخ زبان سے وہ سارے راز عیاں کر دوں جن کو میں صرف اپنے آپ کے سامنے عیاں کرتے ہوئے بھی رو پڑتا ہوں۔ اور جل اٹھتا ہوں۔"

دل آور کی شکستہ سی آواز بات کرتے کرتے انتہائی مدھم پڑ گئی تھی اور اپنے بیڈ پہ ساکت پڑے وقار آفندی کی آنکھوں سے بے آواز آنسو بہہ نکلے تھے اور ان کی کنپٹیوں کے بالوں میں جذب ہونے لگے تھے۔

"لیکن میں اور کوئی راز نہیں جاننا چاہتی۔ مجھے بس اتنا بتا دو کہ تم نے میرے ساتھ یہ سب کیوں کیا تھا۔ کس گناہ کی سزا دی تھی مجھے؟ کیا قصور تھا میرا؟ کیا قصور تھا آخر؟ بتاؤ مجھے؟"

دل آور کی بات سنتے سنتے علیزے پھٹ پڑی تھی اور دل آور نے اس کے سوال پہ یکدم نظریں اٹھا کر اسے بہت ہی زخمی نظروں سے دیکھا تھا یوں جیسے وہ بہت اذیت میں ہو۔

"میں بتانا نہیں چاہتا علیزے! اس بات کو رہنے دو۔" وہ پھر بھی گریز سے کام لے رہا تھا۔

"کیوں رہنے دے؟ اس لیے کہ تمہارے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے؟ تم جھوٹے ہو۔ بدکردار ہو۔ بدنیت ہو۔" آذر نے بھی سارے ہی نشتر چبھو ڈالے تھے۔

"تمہارے دل میں کوئی بات ہے تو تم بتاتے کیوں نہیں ہو۔؟" یہ سوال عائشہ آفندی کی طرف سے آیا تھا۔

"کیونکہ مجھے پتا ہے کہ یہاں بہت سارے رشتوں کے بھرم ٹوٹ جائیں گے۔" اس نے پھر بھی ان سب کو باز رکھنا چاہا تھا۔"

"لیکن پھر بھی ہم سب سچ سننا چاہتے ہیں۔" دانیال نے بھی مداخلت کی۔

"سچ سننے کے لیے حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔" دل آور انہیں بار بار روک رہا تھا۔

"اور سچ بولنے کے لیے ہمت کی اور جرات کی ضرورت ہوتی ہے' جو فی الحال تمہارے پاس نہیں ہے۔"

"آذر آفندی! میری ہمت اور میری جرات کو مت آزماؤ' میں تمہاری اس پوری حویلی کا تختہ الٹ کے رکھ سکتا ہوں' لیکن پھر بھی میں چاہتا ہوں کہ زبان سے کچھ نہ کہوں' جو خدا کی طرف سے سزا جھیل رہا ہے اسے وہی سزا جھیلنے دوں۔ اب کسی اور سزا کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ خاص طور پر میری طرف سے۔"

"لیکن ہم چاہتے ہیں کہ تم بتاؤ۔ تم بتاتے کیوں نہیں ہو؟ آخر تم نے ایسا کیا کیوں تھا؟"

آسیہ آفندی بھی کہے بغیر نہیں رہ سکی تھیں اور دل آور نے محض اک سرسری سی نظر آسیہ آفندی پر ڈالی تھی اور پھر وقار آفندی کی طرف دیکھا تھا۔

"اپنے شوہر وقار آفندی سے پوچھیے کہ میں نے ایسا کیوں کیا تھا؟ کس لیے سزا دی تھی؟ کیا قصور تھا علیزے آفندی کا؟" اس نے وقار آفندی کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"وقار آفندی سے؟ مگر ان سے کیوں؟" ان سب کو تعجب ہوا تھا۔

"کیونکہ یہ گناہ گار ہیں' یہ بدکردار ہیں' بدنیت ہیں' یہ جھوٹے ہیں۔ یہ نفس کی لپیٹ میں آنے والے زانی ہیں۔"

وہ یکدم دھاڑا تھا اور ان سب کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں۔

"تم ہوش میں تو ہو؟ یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟" آذر کو دھچکا سا لگا تھا۔

"ہونہہ۔ میں ہی تو ہوش میں ہوں آذر آفندی۔ اس لیے تو بے سکونی کی زندگی جی رہا ہوں۔ اور میری زندگی کو بے سکون کرنے والا شخص یہ ہے۔ یہ وقار آفندی۔ بڑی حویلی کی سب سے بڑی اور معزز شخصیت۔ تم سب کے سرپرست۔ تم سب کے آئیڈیل ڈیڈ۔ اور اس ملک کے کامیاب بزنس مین۔" وہ وقار آفندی کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا اور چند سیکنڈز یونہی ان کی سمت دیکھتے رہنے کے بعد اس نے نظروں کا زاویہ دوبارہ بدل دیا تھا اور اب اس

کی نظروں کا مرکز علیزے تھی۔

"تم جاننا چاہتی ہونا کہ میں نے یہ سب کیوں کیا تھا؟ اور تمہیں کس گناہ کی سزا دی تھی؟ تو پھر سنو آج۔" اس نے ڈائریکٹ علیزے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

"زہرہ بتول شاہ اور بابر شاہ صرف دو ہی بہن بھائی تھے' بابر شاہ کی شادی ہو چکی تھی' جبکہ زہرہ بتول شاہ کالج میں پڑھ رہی تھیں۔ اور ابھی ان کے کالج کا پریڈ ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ دل آور شاہ کی پیدائش کے وقت اس کی ماں کا انتقال ہو گیا تھا اور دل آور شاہ کی ساری ذمہ داری زہرہ بتول شاہ پہ آ گئی تھی۔ وہ دل آور شاہ کے لیے ایک پھوپھی نہیں بلکہ ماں کی طرح ثابت ہوئی تھیں۔ اور اس چیز کو ان کی بچپن کی سہیلی عائشہ آفندی سے بہتر اور کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔

عائشہ آفندی نے ان دنوں ان کی ہمت اور حوصلہ بڑھانے کی کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اور ساتھ ساتھ انہیں اپنی تعلیم جاری رکھنے کا بھی مشورہ دیا تھا' لیکن زہرہ بتول شاہ نے دل آور شاہ کی خاطر اپنی مزید تعلیم کا ارادہ بھی ترک کر دیا تھا' کیونکہ وہ اسے گھر میں ملازمہ کے حوالے کر کے خود یونیورسٹی نہیں جانا چاہتی تھیں۔ اس لیے عائشہ آفندی نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ اور انہی دنوں ملک وجاہت علی کے گھر سے عائشہ آفندی کے لیے پرپوزل آیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وقار آفندی اور ملک وجاہت علی کی دوستی رشتہ داری میں بدل گئی تھی۔

دوسری طرف عائشہ آفندی' اسرار آفندی اور اظہار آفندی کو ملک وجاہت علی کی بہن آسیہ علی بہت پسند آئی تھی اور وہ اسے بھابھی بنانے کا خواب سجا بیٹھے تھے۔

جبکہ وقار آفندی اس رشتے سے انکاری تھے' وہ ابھی شادی نہیں کرنا چاہتے تھے' مگر جب انہیں یہ پتا چلا کہ ملک وجاہت علی کی بھی یہی خواہش ہے تو وہ دوبارہ پھر انکار نہیں کر سکے تھے' اور شادی کے لیے ہامی بھر لی تھی' اور یوں دونوں حویلیوں میں شادیوں کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔

اور اپنی دوست کی شادی میں بک ہونے کے لیے اور ان کی ہیلپ کرنے کے لیے زہرہ بتول شاہ کو وقتاً فوقتاً بڑی حویلی آنا پڑتا تھا اور عائشہ آفندی کی ہر خوشی اور ہر کام میں شریک ہونا پڑتا تھا اور اسی شرکت نے ان کی زندگی برباد کر ڈالی۔" وہ کہتے کہتے ذرا دیر کے لیے رکا تھا اور کمرے میں موجود تمام افراد کا دم گھٹنے لگا تھا ان کی سانسیں تک رک گئی تھیں۔

عائشہ آفندی اور زہرہ بتول شاہ دونوں آسیہ علی کے لیے شاپنگ کرنے گئی تھیں اور واپسی پہ زہرہ بتول شاہ بھی بڑی حویلی ہی آ گئی تھیں اور بڑی حویلی کے ڈرائنگ روم میں انہوں نے اپنی شاپنگ کا سامان پھیلاتے ہوئے آسیہ علی کے مایوں کے لیے لایا ہوا دوپٹہ اپنی دوست زہرہ بتول شاہ کے سر پر ڈال دیا تھا اور وہیں پہ وقار آفندی کی نظر کسی اور نظر میں بدل گئی تھی' اور اس کا احساس زہرہ بتول شاہ کو بھی ہو گیا تھا۔

وہ فوراً" واپس آ گئی تھیں لیکن وقار آفندی کی نظر واپس کیسے آ سکتی تھی؟

پھر انہوں نے بارہا زہرہ بتول شاہ کے راستے میں حائل ہونا چاہا تھا' اور وہ ہر بار دامن بچا جاتی تھیں' اور یونہی کتراتے کتراتے اور دامن بچاتے بچاتے شادی کے دن قریب آ گئے تھے' وقار آفندی اس شادی سے انکار کر دینا چاہتے تھے مگر عائشہ آفندی کا خیال آتے ہی وہ اپنی اس حرکت سے رک جاتے تھے۔ کیونکہ اب عائشہ آفندی' وقار آفندی' آسیہ علی اور ملک وجاہت علی ایک ہی ڈور سے بندھے ہوئے تھے اور اگر یہ ڈور ٹوٹ جاتی تو وہ چاروں ہی بکھر جاتے' جو کہ وقار آفندی کو منظور نہیں تھا' اسی لیے نہ چاہتے ہوئے بھی وقار آفندی کو یہ شادی کرنا پڑی تھی اور یوں عائشہ آفندی بیاہ کر بڑی حویلی سے ملک حویلی چلی گئی تھیں اور آسیہ آفندی ملک حویلی سے بڑی حویلی آ گئی تھیں۔ سب کچھ بظاہر ٹھیک چل رہا تھا لیکن وقار آفندی کا ذہن اب بھی شادی سے پہلے والی خواہش میں اٹکا ہوا

تھا اور اس خواہش میں چار سال گزر گئے تھے۔

اور ان چار سالوں میں ان کی کوئی اولاد بھی نہیں ہوئی تھی البتہ عائشہ آفندی کے ہاں دانیال کی آمد ہو چکی تھی اور وہ تین سال تین ماہ کا ہو چکا تھا۔ تب دل آور شاہ کی عمر ساڑھے چار سال ہو چکی تھی اور زہرہ بتول شاہ نے بابر شاہ سے مشورہ کر کے دل آور شاہ کو اسکول میں ایڈمٹ کروا دیا تھا اور خود فارغ رہنے لگی تھیں اور اسی فراغت سے تنگ آ کر انہوں نے دوبارہ سے تعلیم کا سلسلہ جوڑ لیا تھا۔ جس کی خبر وقار آفندی تک بھی پہنچ گئی تھی کیونکہ عائشہ آفندی میکے آئی ہوئی تھیں اور کبھی کبھار زہرہ بتول شاہ بھی چکر لگا لیتی تھیں اور اسی دوران وقار آفندی نے ایک بار پھر زہرہ بتول شاہ کی طرف ہاتھ بڑھانے کی کوشش کی تھی اور اب کی بار زہرہ بتول شاہ نے کافی بری طرح سے انہیں جواب دیا تھا اور کافی عزت افزائی سے کام لیا تھا جس کو وقار آفندی دبا گئے تھے اور اندر ہی اندر لاوے کی طرح ابلتے رہے تھے۔ اور یہ لاوا اگلے چار سالوں میں اتنی بری طرح سے پک چکا تھا کہ وہ انسانیت اور حیوانیت کا فرق بھول گئے تھے۔"

دل آور بڑے بے حس سے انداز میں سب کچھ کہتا جا رہا تھا لیکن بات جب دکھ کی جڑ تک پہنچی تھی تو اس کا کلیجہ مٹھی میں آ گیا تھا۔ اور آسیہ آفندی ——— بیڈ کا سہارا لیتے ہوئے بیڈ پہ ہی بیٹھ گئی تھیں۔ جبکہ علیزے لٹھے کی طرح سفید پڑ گئی تھی اور آذر، جویت اور دانیال وغیرہ کے چہروں پر ہوائیاں سی اڑنے لگی تھیں۔ اور کانوں میں سائیں سائیں کی آواز سنائی دینے لگی تھی۔

"وہ دن بہت ہی بدبخت دن تھا جب دانیال اور زین کا عقیقہ رکھا گیا تھا۔ اور اس شاندار عقیقہ کی رسم میں حویلی کے تمام افراد کو ہی مدعو کیا گیا تھا، لیکن صرف وقار آفندی تھے جو اس رسم میں شریک نہیں ہو سکے تھے کیونکہ وہ سنگاپور گئے ہوئے تھے اور واپس گھر آئے تو گھر خالی پڑا ہوا تھا اور خالی گھر میں چکراتے ہوئے انہیں کچھ نہ سوجھا تو انہوں نے ڈرنک کا انتظام کر لیا کیونکہ ان کے ذہن پہ زہرہ بتول شاہ کا خیال سوار تھا۔

اور اپنے خیال کو ایک گندہ اور غلیظ حل بخشتے ہوئے انہوں نے ملازمہ سے بہانا کر کے فون کروایا اور زہرہ بتول شاہ کو بڑی حویلی بلا لیا یہ کہہ کر کہ عائشہ آئی ہوئی ہے۔

زہرہ بتول شاہ نے سوال اٹھایا کہ عائشہ کے بیٹوں کا تو عقیقہ ہے، لیکن ملازمہ نے بہانا کر دیا کہ عائشہ آفندی کی طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے عقیقہ چند دن کے لیے ملتوی کر دیا گیا ہے۔" وہ پھر رکا تھا اور علیزے کے چہرے کو دیکھا تھا جہاں زردیاں اتر رہی تھیں۔

"زہرہ!" عائشہ آفندی نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے منہ پر رکھ لیے تھے کیونکہ ان کے منہ سے بے ساختہ اک سسکی سی ابھری تھی۔

"دل آور شاہ اس وقت ساڑھے آٹھ سال کا تھا جب زہرہ بتول شاہ کو عائشہ آفندی کے نام پر دھوکا دے کر حویلی بلایا گیا تھا، حالانکہ حویلی بالکل خالی پڑی تھی، لیکن اس خالی حویلی میں ایک درندہ دل آور شاہ کی پھوپھی کے لیے تاک لگائے بیٹھا تھا۔

اور دل آور شاہ کو خبر ہی نہیں ہو سکی تھی، وہ بڑی حویلی کے لان میں چکراتا رہا اور اپنی پھوپھی کی واپسی کا انتظار کرتا رہا اور اس انتظار میں اس کی بے چینی بھی شامل تھی، وہ بار بار ملازمہ سے استفسار کرتا رہا کہ اماں کب آئیں گی اور ملازمہ ہر بار اسے اپنی باتوں میں بہلا پھسلا کر کسی اور چیز کی طرف متوجہ کر دیتی تھی، لیکن آخر کار دل آور شاہ تنگ آ کر اندر آ گیا تھا مگر اندر کوئی بھی نہیں تھا۔

البتہ سیڑھیوں کے نیچے بنے بیسمنٹ سے رونے کی اور چیخنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

پھر دل آور شاہ دیوانہ وار بھاگا تھا۔ دل آور شاہ۔ یعنی میں۔ میں۔ دل آور شاہ۔ اپنی ماں کی آواز سن کر میرے جسم میں کرنٹ بھر گیا تھا اور میں سیدھا بیسمنٹ میں جا پہنچا تھا، مگر بہت دیر ہو چکی تھی۔ میری ماں سب کچھ گنوا چکی تھی اس کا دامن داغ دار ہو چکا تھا اس کی حرمت لٹ چکی تھی۔ درندہ اپنی درندگی آزما گیا تھا۔

اور میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنی ماں کی حالت دیکھتا رہ گیا تھا جو بیسمنٹ کے فرش پہ بیٹھی رو رہی تھیں اور چیخ رہی تھیں۔"

کہتے کہتے اس کی آنکھیں سرخ پڑ گئی تھیں یوں جیسے اس کی آنکھوں سے خون چھلک رہا ہو اور زندگی کے اس اذیت ناک مرحلے پر وقار آفندی نے سختی سے آنکھیں بھینچ لی تھیں اور شدت دل سے اپنی موت کی دعا کی تھی مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ اللہ نے ان کی سانسیں ہی ان کے لیے سزا بنا ڈالی تھیں۔

"میں نے ان ہاتھوں سے اپنی اماں کے بکھرے ہوئے وجود کو سنبھالا تھا اور ان سے لپٹ کر انہیں چپ کروانے کی کوشش کی تھی اور پھر بڑی مشکلوں سے انہیں اپنے ساتھ لے کر بڑی حویلی سے نکل آیا تھا لیکن بڑی حویلی سے نکلتے ہوئے میں نے دعا کی تھی کہ اللہ وقار آفندی کو بھی بیٹی دے، اور اس کی بیٹی کا بھی وہی حشر ہو جو آج میری ماں کا ہوا ہے۔

میں اس وقت بہت چھوٹا تھا لیکن میری عقل، میری سمجھ اور میری سوچ بہت بڑی تھی، مگر میں نے یہ تو سوچا ہی نہیں تھا کہ اس ایک دن میں میرا پورا گھر برباد ہو کے رہ جائے گا۔" دل آور سے اب مزید بولنا مشکل ہو چکا تھا، اس کے گلے میں پھندا سا لگنے لگا تھا۔

"میں اماں کا ہاتھ پکڑے گھر میں داخل ہوا تھا اور سامنے کھڑے بابا (بابر شاہ) کو دیکھ کر میرا ابھی پورا جسم کانپ گیا تھا، وہ اماں کی حالت دیکھ کر بڑی تیزی سے قریب آئے تھے اور اماں کو دونوں کندھوں سے تھام لیا تھا۔ پھر انہوں نے اماں کو اس قدر جھنجوڑا کہ اماں کا سکتہ ٹوٹ گیا تھا۔

اور وہ ان کے قدموں میں گر کر رو پڑی تھیں، ان کی کوئی بہن نہیں تھی، ماں نہیں تھی، بھابھی نہیں تھی جس سے وہ اپنا دکھ کہتیں۔ صرف اور صرف ایک بھائی تھا اور اس بھائی سے وہ یہ دکھ کیسے چھپا سکتی تھیں، اس لیے سب کچھ کہہ دیا تھا اور بابر شاہ جیتے جی مر گئے تھے انہوں نے بہن کو سنبھالا، اپنے قدموں سے اٹھا کر سینے سے لگایا اور انہیں ان کے بیڈ روم میں چھوڑ کر اپنے کمرے میں گئے، اپنا ریوالور نکالا اور گھر سے نکل گئے تھے لیکن گھر سے نکلنے سے پہلے وہ یہ ضرور کہہ کر گئے تھے کہ اگر وہ آج کی تاریخ میں وقار آفندی کو نہ مار سکے تو خود کو مار ڈالیں گے۔" وہ ذرا توقف کے لیے رکا تھا۔

"اور پھر ایسا ہی ہوا تھا، وہ بڑی حویلی پہنچے تو پتا چلا کہ وقار آفندی کراچی چلے گئے ہیں اس لیے وہ ناکام اور مایوس سے واپس لوٹ آئے تھے لیکن شدت غضب سے دماغ میں اس قدر ابال اٹھ رہے تھے کہ ان سے برداشت کرنا مشکل ہو گیا تھا اور انہوں نے راستے میں چلتے چلتے خود کو گولی مار دی تھی۔ اور زندگی سے رہی سہی امید بھی ختم ہو گئی تھی۔

بابر شاہ کی میت گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر جہاں اماں پاگلوں کی طرح چیخی تھیں، وہاں میرا بھی برا حال ہو گیا تھا، اور ہم ایک دن میں ہی سب کچھ لٹا کر خالی ہاتھ اور اکیلے ہو گئے تھے۔

بھری دنیا ہمارے لیے کسی جنگل سے کم نہیں تھی، ویرانی تھی، سناٹا تھا، اور درندوں کی غراہٹ تھی وہ دن کیسے گزرے یہ صرف ہم جانتے تھے۔

لوگوں نے اماں پر الزام تراشی کرنا اور بہتان لگانا شروع کر دیا تھا، اسی لیے مجبوراً انہوں نے گھر بیچ دیا، اور بابا کا سارا کاروبار بند کروا کے اسلام آباد چلی گئیں اور لاہور شہر سے ہمیشہ کے لیے تعلق توڑ دیا تھا، اور اپنے آپ کو سنبھالنے کی اور مضبوط کرنے کی کوشش کی تھی۔

لیکن اس واقعے کے ٹھیک تین مہینے بعد وہ پھر سے ایک عذاب سے گزری تھیں اور جب کچھ نہ بن پڑا تو انہوں نے زہر کا پیالہ پیتے ہوئے وقار آفندی کے آفس میں فون کیا تھا اور ان سے ان کا نام مانگا تھا۔ اپنے لیے نہیں بلکہ اس بچے کے لیے جو نا جائز تھا' ناپاک تھا' حرام تھا۔"

عائشہ آفندی کی آنکھوں سے آنسو اک تواتر سے بہہ رہے تھے اور آسیہ آفندی کے جسم پہ ایک کپکپی سی طاری ہونے لگی تھی۔

"لیکن وقار آفندی نے انتہائی سفاکی سے انکار کردیا تھا' یہ کہہ کر اگر وہ ایسا کچھ کریں گے تو ان کی بہن عائشہ کی زندگی بھی برباد ہوجائے گی' میں آسیہ پہ کوئی سوتن نہیں لاسکتا اور نہ ہی آسیہ کو کوئی دھوکا دے سکتا ہوں' اور ویسے بھی میرا ایک اسٹیٹس ہے اسٹینڈرڈ ہے' میں اپنے مقام سے نیچے نہیں آنا چاہتا۔ ہمارے درمیان جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ' اور ابارشن کروادو' اسپتال کا سارا خرچہ میں افورڈ کروں گا۔" دل آور ایک بار پھر چپ ہوگیا تھا کیونکہ اس سے بات کا سلسلہ جاری رکھنا مشکل ہورہا تھا' بولا ہی نہیں جارہا تھا۔

" اور ان کے اس جواب پہ اماں پہ کیا گزری یہ میں جانتا ہوں۔

اور ٹھیک دو دن بعد ملک وجاہت علی کو ہارٹ اٹیک ہوا اور وقار آفندی کی بہن کی زندگی بھی برباد ہوگئی' وہی زندگی جس کو وہ آباد رکھنے کا بہانا کررہے تھے پھر عائشہ آفندی پہ کیا گزری یہ وہ بھی اچھی طرح جانتے تھے' ملک وجاہت علی کے چالیسویں کے بعد ملک شرافت علی کی بری نظر عائشہ آفندی پہ جاپڑی تھی۔ انہوں نے بھاوج سے شادی کا شوشا بھی چھوڑا تھا مگر عائشہ آفندی نے انکار کردیا تھا۔

اور اسی انکار سے مشتعل ہو کر انہوں نے عائشہ آفندی کی عزت پہ ہاتھ ڈالنے کی کوشش بھی کی تھی' لیکن ان کی قسمت اچھی تھی کہ ملک شرافت علی کی بیوی نے انہیں بچالیا تھا اور وقار آفندی کو فون کرکے عائشہ آفندی کو بڑی حویلی لے جانے کا کہا تھا اور ساری سچویشن بھی بتائی تھی تب وقار آفندی بہن کو حویلی لے آئے تھے اور حویلی آکر ہی انوشہ پیدا ہوئی تھی' لیکن ملک شرافت علی نے ملک وجاہت علی کے بچوں کو جائیداد میں سے عاق کردینے کا فیصلہ سنایا تھا جس کو وقار آفندی نے فوراً" قبول کرلیا تھا اور آسیہ آفندی سے پوچھا تھا کہ وہ کہاں رہنا چاہتی ہیں؟! اپنے گھر والوں کے پاس یا وقار آفندی کے پاس؟

تب آسیہ آفندی نے گھر والوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر وقار آفندی کا ساتھ دیا تھا' اور اپنی نند اور بھاوج عائشہ کی جی بھر کے دلجوئی کی تھی' کیونکہ وہ بہت بڑے حادثے سے گزری تھی اور اسی دکھ کے عالم میں انہوں نے زہرہ کو بھی یاد کیا تھا مگر وقار آفندی ٹال گئے تھے۔ یہ کہہ کر کہ انہوں نے بہت ڈھونڈا مگر زہرہ بتول شاہ کا کچھ پتا نہیں چلا' شاید وہ بھائی کی ڈیتھ کے بعد گھر بیچ کر کسی سے شادی کرکے ملک سے باہر چلی گئی ہیں' اور عائشہ آفندی نے ان کے کہے پہ اعتبار کرلیا تھا' لیکن انہیں یہ نہیں پتا تھا کہ زہرہ بتول شاہ پہ کیا کیا بیتی ہے۔

ان سب باتوں کی معلومات مجھے بہت سالوں بعد لاہور آنے پہ ملی تھی اور میں نے اندر ہی اندر ملازموں سے بہت کچھ جانا تھا۔

"لیکن وہ بچہ۔؟" آسیہ آفندی کے ہونٹ کپکپائے تھے۔

"مردہ پیدا ہوا تھا۔" وہ بہت پتھریلے لہجے میں بولا تھا۔

وقار آفندی نے تو ابارشن کا کہہ دیا تھا لیکن وہ ایسا نہیں کرسکی تھیں' وہ بچہ پیدا کرنا چاہتی تھیں اور اس بچے کے ذریعے وقار آفندی کا گریبان پکڑنا چاہتی تھیں۔

مگر اللہ تعالیٰ کو شاید کچھ اور ہی منظور تھا اسی لیے وہ بچہ مردہ پیدا ہوا تھا۔ اور اماں زندگی کا ایک اور بھیانک اور اذیت ناک رخ دیکھ کر رہ گئی تھیں اور خود کو اللہ کی رضا پہ چھوڑ دیا تھا۔

پھر ان کی زندگی کا مرکز دل آور شاہ کی ذات تھی اور انہوں نے اپنا غم' اپنی خوشی' اپنے خواب' اپنی خواہش سب دل آور شاہ سے وابستہ کرلیے تھے۔

حالانکہ وہ پہلے بھی بہت پیار کرتی تھیں' اور بہت توجہ دیتی تھیں مگر اب اس پیار اور توجہ میں شدت آگئی تھی' ان کی رات اور ان کے دن کا محور ہی دل آور شاہ تھا۔

اور میں بھی سب کچھ بھول کر صرف انہی کی ذات کو ترجیح دیتا تھا کیونکہ وہ میرے لیے ماں بھی تھیں اور باپ بھی۔ اور انہوں نے میرے لیے بہت زیادہ جدوجہد بھی کی تھی' پہلے ایک کالج میں لیکچرار رہیں' پھر اس کالج میں اپنا پیسہ انویسٹ کرکے پرنسپل کا عہدہ سنبھال لیا' گھر سیٹ کیا' مجھے پڑھایا لکھایا' اور پھر میرے بابا کا شوق پورا کرنے کے لیے مجھے لندن بھیج دیا' وہیں پہ میری نبیل اور عبداللہ سے دوستی ہوئی' اور زندگی کے پانچ سال اماں سے دور گزارنے کے بعد میں پاکستان آیا تو میرے دل میں صرف ایک ہی عزم تھا لاہور جانا اور وقار آفندی سے انتقام لینا۔

اماں کو جب میرے ارادوں کی خبر ہوئی تو وہ بہت پریشان ہوئی تھیں انہوں نے مجھے روکا بھی تھا مگر میں قسم کھا چکا تھا کہ اگر میں بابر شاہ کا بیٹا ہوں تو ایک بار' وقار آفندی کو وہ اذیت دے کر ہی رہوں گا جس اذیت سے بابر شاہ اور زہرہ بتول شاہ گزرے تھے۔ تب انہوں نے مجھے میرے حال پہ چھوڑ دیا تھا اور یوں میں لاہور آیا' یہاں گھر لیا' نئے سرے سے لاہور شہر میں اپنا مقام بنایا اور وقار آفندی کو اذیت دینے کے تمام انتظامات بھی کرلیے۔

اور اس انتظام میں پہلا کام یہ کیا کہ مبارک خان کو اپنے ساتھ شامل کیا تھا' مبارک خان اسلام آباد میں میٹرک تک میرا کلاس فیلو رہا تھا پھر اس نے اسکول چھوڑ دیا اور اپنے گھریلو حالات کی وجہ سے کام کرنا شروع کردیا تھا' وہ کب اور کیسے لاہور پہنچا یہ میں نہیں جانتا' لیکن اسے وقار آفندی کے خاص ملازم کی حیثیت سے دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی تھی' وہ بھی مجھ سے مل کر خوش ہوا تھا' مگر اس نے میرے لیے کام کرنے سے انکار کردیا تھا' لیکن جب اسے وقار آفندی کی اصلیت کا پتا چلا تو اس نے بھی بغاوت کا اعلان کردیا۔ یوں خیرو بابا کو پیش آنے والا حادثہ' اور میرا نوکری تلاش کرنے کے لیے آنا سب ایک پلان تھا۔ ایک کامیاب پلان۔ اور میں بطور ڈرائیور بڑی حویلی میں داخل ہونے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

میں چاہتا تو علیزے آفندی کو کڈنیپ بھی کرواسکتا تھا' اس کے ساتھ بُرا بھی کرسکتا تھا۔ مگر میری ماں کا حکم تھا کہ وقار آفندی مت بننا۔ وقار آفندی بنوں گا تو وہ مجھے کبھی بخشیں گی نہیں۔ ہاں البتہ وقار آفندی کو اذیت جتنی بھی دوں وہ کم ہے۔

لیکن میں کیا کرتا؟ میں جب جب علیزے آفندی کو دیکھتا تھا میرا خون کھولتا تھا' میرے اندر غضب کے ابال اٹھتے تھے مگر میں بے بس تھا' میں پابند تھا' اس لیے صبر اور برداشت سے کام لیتا رہا' اور اسی دوران مری میں علیزے کے بیڈ روم میں' میں نے علیزے کے ساتھ کچھ فوٹو گراف بنوائے تھے' ان افیکٹ میں علیزے اور وقار آفندی دونوں کو ہی بے بس کردینا چاہتا تھا' میں چاہتا تھا کہ علیزے میرے پاس سے بھاگنے کی' احتجاج کرنے کی اور میری بات سے انکار کرنے کی کوشش نہ کرے' اس لیے ضروری تھا کہ پہلے اسے کنٹرول کیا جاتا اور میں نے ایسا ہی کیا تھا' علیزے کی برتھ ڈے کی نائٹ میں اس کے پاس آیا اور اسے کہا کہ وہ میری بیوی ہے۔ وہ حیران ہوئی تھی' احتجاج بھی کرنا چاہا تھا اور انکار بھی۔

مگر اس کی نیند اور اس کی بے ہوشی میں بنوائے گئے فوٹو گراف اسے چپ کروادینے کے لیے کافی تھے۔ اور میری یہ دھمکی بھی کافی تھی کہ میں ان فوٹو گراف کے پوسٹر بھی بنواسکتا ہوں' اور پورے شہر میں چھپوا بھی سکتا ہوں اس لیے جو میں کہوں وہ کرتی جائے۔ سو ایسا ہی ہوا تھا اور علیزے نے بالآخر ہتھیار ڈالتے ہوئے کہہ ہی دیا کہ وہ میری

بیوی ہے۔

اور ایک بیوی کی حیثیت سے میں اسے آپ سب لوگوں کے سامنے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ لیکن وہاں جاکر میں نے اسے اپنے گھر کے بیسمنٹ میں ڈال دیا تھا۔

علیزے کے بارے میں پتا چلا تو اماں بھی اسلام آباد سے آگئی تھیں اور وہ وقفے وقفے سے مجھے یہ تنبیہہ کرتی رہی تھیں کہ کسی لڑکی کی عزت سے کھیلنے کا کبھی سوچنا بھی مت 'اگر سوچو گے تو ایک بار میرے بارے میں ضرور سوچ لینا۔

عورت قابل احترام ہستی ہے 'عورت محبت کا پیکر ہے 'عورت اس دنیا کا زیور ہے 'عورت مرد کی ہوس پوری کرنے کے لیے نہیں بنی۔ عورت مرد کا غصہ سہنے کے لیے نہیں بنی۔ عورت مرد سے مرد کے انتقام کے لیے نہیں بنی 'اس لیے تمہیں کوئی اجازت نہیں ہے کہ تم وقار آفندی کا انتقام علیزے آفندی سے لو 'اور اس کی سزا اسے دو۔

وہ ایک عورت ہے اور ایک عورت کا دکھ مجھ سے بہتر اور کوئی بھی نہیں جان سکتا۔"

دل آور نے آذر 'جودت اور دانیال کی طرف دیکھا تھا جو دم بخود سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہنوز دل آور شاہ کو ہی دیکھے جا رہے تھے۔

"زہرہ بتول شاہ ظالم نہیں تھیں۔ بلکہ ایک مضبوط 'اعلا ظرف اور غیرت مند عورت تھیں۔

زندگی سے اتنے زخم اٹھانے کے باوجود بھی انہوں نے سر اٹھا کر زندگی گزاری تھی 'اور اپنی محرومیوں اور تکلیفوں کا بدلہ علیزے آفندی سے ہرگز نہیں لیا تھا اور جب علیزے نے مجھ سے کہا کہ مجھ سے نکاح کر لو 'اور مجھے اپنا نام دے دو تو خدا گواہ ہے کہ میں وقت کے اس ہیر پھیر اور اللہ تعالیٰ کی بے آواز لاٹھی پہ دنگ رہ گیا تھا۔

علیزے نے میرے پاؤں بھی پکڑے تھے لیکن میں کچھ کہہ نہیں سکا تھا۔ البتہ روح تک کانپ ضرور گیا تھا۔

کیونکہ میں زہرہ بتول شاہ کا بیٹا تھا اور زہرہ بتول شاہ نے مجھے ہمیشہ عورت کی عزت کرنا سکھایا تھا 'احترام کرنا سکھایا تھا 'کسی عورت کا سر اپنے قدموں میں جھکانا نہیں سکھایا تھا۔

اسی لیے میں نے جب یہ مسئلہ ان کے سامنے رکھا تو انہوں نے زندگی میں ایک بار پھر مجھے حیران کر ڈالا۔ یہ کہتے ہوئے کہ ٹھیک ہے تم اسے لے کر آئے ہو 'تمہاری وجہ سے وہ بدنام ہوئی ہے تو تم ہی اسے اپنا نام دے دو 'نکاح کر لو اس سے۔ تم مرد ہو 'وہ عورت ہے 'اور عورت ہمیشہ اپنی عزت کی خاطر مرد کا ہی سہارا لیتی ہے 'مرد سے ہی نام مانگتی ہے 'جو نام نہیں دیتے وہ نامرد ہوتے ہیں 'بے غیرت ہوتے ہیں 'عورت کی عزت کو عزت نہیں بنا سکتے۔

اور تب میں خاموش ہو گیا تھا 'واپس لاہور آگیا تھا 'ان سے سوچنے کے لیے وقت مانگا تھا 'اور وہ مطمئن ہو گئی تھیں 'پھر وہ لاہور آئیں 'اور یونہی ایک روز اسپتال میں وقار آفندی سے سامنا ہوتے ہی وہ خود پہ کنٹرول نہیں رکھ پائی تھیں اور ان کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔

لیکن اس ایکسیڈنٹ کے باوجود اپنی آخری سانسوں کے دوران انہوں نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے تاکہ میں علیزے سے نکاح کر لوں اور میں نے سر جھکاتے ہوئے ان کا کہا مان لیا تھا۔

کیونکہ میں ان کا کہا کبھی ٹال ہی نہیں سکتا تھا 'اور وہ علیزے آفندی سے کیا ہوا وعدہ پورا کر گئی تھیں وہ جاتے جاتے وقار آفندی کو معاف بھی کر گئی تھیں۔ اور میرے لیے ایک "اپنے" کا انتظام بھی کر گئی تھیں۔

ایک ایسا "اپنا" جو سب سے زیادہ پرایا نکلا۔ اور جس نے یہ ثابت کر دیا کہ اس کی رگوں میں واقعی "وقار آفندی" کا خون ہے۔"

دل آور شاہ کا یہ جملہ کوئی اور وقت ہوتا تو علیزے کے لیے قابل فخر ہوتا 'لیکن اس وقت یہ جملہ اس کے لیے

کسی گالی یا کسی طمانچے سے کم ثابت نہیں ہوا تھا۔

اس لیے علیزے نے یکدم اس طمانچے سے بلبلا کر اس کی طرف دیکھا تھا اور وہ تھا کہ اسے ہی دیکھ رہا تھا 'اور اس کے اس دیکھنے میں کیا کچھ نہیں تھا آخر؟ طنز 'تمسخر 'کاٹ اور تلخی۔ سب کچھ ہی تو تھا۔ اور اس سے بھی بڑھ کر یہ تھا کہ اس کی آنکھوں میں شکوہ تھا 'شکایتیں تھیں 'اور ایک بیگانہ پن بھی تھا۔

"بتاؤ علیزے! کسی کو معاف کرنا اور اعلا ظرف ہونا کتنا مشکل ہوتا ہے۔"

دل آور نے ڈائریکٹ علیزے سے سوال کیا تھا مگر علیزے کے پاس الفاظ ہوتے تو وہ جواب دیتی نا "کتنا فرق ہے تم میں اور زہرہ بتول شاہ میں۔

میں نے تمہارے ساتھ کچھ بھی نہیں کیا۔ پھر بھی تم مجھے معاف نہیں کر سکیں۔ اور وقار آفندی نے انہیں جیتے جی مار ڈالا 'پھر بھی انہوں نے اسے معاف کر دیا۔

میں نے اپنے غصے اور انتقام کے جذبات میں آکر جو کچھ بھی کیا وہ سب برا سہی 'لیکن پھر تمہاری عزت رکھ لی 'اور تمہیں اپنا نام دے دیا 'مقام دے دیا 'اپنے دوستوں میں اور اپنے جاننے والوں میں تمہاری عزت بنائی 'تمہارا احترام کیا 'تمہارا بھرم رکھا 'لیکن تم سے وفا نہیں ہو سکی 'اور نہ ہی تم وفا کو سمجھ سکیں۔

شاید تمہیں نہیں پتا کہ عورت ہونا تو بہت آسان بات ہے 'لیکن عورت ہونے کو نبھانا بہت مشکل کام ہے 'عورت تو بہت حساس ہوتی ہے 'لیکن تمہیں تو نہ زہرہ بتول شاہ کی کوئی بات یاد رہی اور نہ ہی دل آور شاہ کی۔" وہ تمسخر سے کہتا ہوا پھر رکا تھا۔

"تمہیں یاد ہو گا کہ میں نے تم سے ایک بار کہا تھا کہ محبت بڑی حویلی والوں کی سمجھ کی چیز نہیں ہے۔ تو میری جان میں نے وہ سچ کہا تھا 'یہ تمہاری سمجھ کی بھی چیز نہیں ہے 'کیونکہ تم بھی تو اس حویلی کا حصہ ہو 'اس لیے مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے 'اور نہ ہی تم سے کوئی شکوہ ہے۔

تم اس حویلی میں رہنا چاہتی ہو 'رہو۔ تم اپنے پاپا کے ساتھ رہنا چاہتی ہو 'رہو۔

میری طرف سے آزاد ہو 'میں تمہیں کل ہی طلاق بھجوا دوں گا 'کیونکہ تم جانتی ہو نا کہ میں واقعی زور زبردستی کا قائل نہیں ہوں 'جو ہے وہ ٹھیک ہے 'جو نہیں ہے وہ بھی ٹھیک ہے 'بس میری تو یہی سوچ ہے اور یہی عمل ہے 'البتہ جانے سے پہلے تم سے اتنا ضرور پوچھوں گا کہ بتاؤ۔

اس سارے قصے میں دل آور شاہ کہاں کہاں غلط ہے؟ اور کہاں کہاں برا ہے۔؟ اور آج اس قصے کے بارے میں تمہارا انصاف کیا کہتا ہے آخر ؟"

اس نے آخر میں علیزے کو اپنے سوالوں کی زد میں رکھ لیا تھا اور سوال بھی ایسے تھے جن کے جواب علیزے کو ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل سکتے تھے اور وہ اپنی جگہ پہ گنگ سی بیٹھی رہی تھی۔

"بولو علیزے آج تمہارا انصاف کیا کہتا ہے آخر۔" اس نے اپنے سوال پہ زور دیتے ہوئے علیزے کو بولنے پہ اکسایا تھا لیکن علیزے تو جیتے جی زمین میں زندہ گڑ گئی تھی 'وہ بولنے کی سکت کہاں سے لاتی؟

"ہونہہ! مجھے بھی پتا ہے اور مجھے کل بھی پتا تھا کہ حویلی والوں کے پاس کوئی انصاف نہیں ہے۔" وہ انتہائی تلخی سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"اور ہاں آذر آفندی۔! میری بدکرداری اور بدنیتی کے بارے میں کچھ کہنا ہو تو میں اب بھی حاضر ہوں۔ لیکن اپنے حق میں بات کرتے ہوئے اتنا ضرور کہوں گا کہ میں وقار آفندی جیسا "باکردار 'معزز اور عزت دار" نہیں ہوں 'ہاں اتنا بدکردار ضرور ہوں کہ آپ کی بیٹی جیسی میں یہاں سے لے کر گیا تھا 'ویسی ہی آج یہاں چھوڑ کر جا رہا ہوں 'وہ جیسی پہلے تھی آج بھی ویسی ہے 'اور آج یہاں سے جاتے ہوئے آپ سب کے سامنے میں یہ اعتراف

کرتا ہوں کہ مجھے فخر ہے اپنے مرد ہونے پہ کہ میں نے ایک مرد سے نفرت اور دشمنی کا انتقام ایک عورت سے نہیں لیا' حالانکہ میں چاہتا تو آسانی سے اپنا انتقام لے سکتا تھا' مگر مجھے وقار آفندی بننا گوارا نہیں تھا' کیونکہ میں جانتا تھا کہ میرا اللہ اور میرا ضمیر مجھے ملامت کرتے رہیں گے اور مجھے سکون سے جینے نہیں دیں گے۔" دل آور نے آخری بات کہی تھی اور سب پہ ایک طائرانہ نگاہ ڈالی تھی' ہر چہرے پر دکھ تھا' اذیت تھی' بے یقینی تھی' اور سب سے بڑی بات کہ سب کے چہروں پہ آنسو تھے۔

مگر ان کا یہ دکھ' یہ اذیت' اور یہ آنسو اس کے کس کام کے تھے بھلا۔ اسے کیا فائدہ تھا آخر۔ اب سب کچھ بے کار تھا اسی لیے وہ لاپروا تھا۔

"اینی وے۔ آپ لوگوں نے دعوت دی' بلایا' کٹہرا سجایا' بہت اچھا لگا' میں تو پہلے ہی عدالتوں کا اور کٹہروں کا عادی ہوں' ایک عدالت اور سہی۔ خیر اب چلتا ہوں۔ تھینک یو۔"

اس نے الوداعی کلمات ادا کیے تھے اور علیزے نے یکدم سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا اور ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی دل آور اسے ہی دیکھ رہا تھا لیکن جن نظروں سے دیکھ رہا تھا وہ علیزے کو کاٹ دینے کے لیے کافی تھیں۔ "اللہ حافظ۔" اس نے دروازے کا ہینڈل گھما کر دروازہ کھولتے ہوئے خدا حافظ کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا تھا مگر جس نظر سے اسے دیکھ کر گیا تھا۔

وہ نظر علیزے کو علیزے سے ہی بے گانہ کر گئی تھی۔ توڑ کر لے گئی تھی اسے اور اس کے یوں سامنے سے ہٹ جانے پہ علیزے کو ایسا لگا تھا جیسے دنیا ہی اندھیر ہو گئی ہو' اور ہر سو تاریکی سی چھا گئی ہو' جس سے گھبرا کے وہ بے ساختہ پکاری تھی۔

"ڈرائیور!" آواز اتنی مدھم تھی جیسے وہ بڑبڑائی ہو۔

"ڈرائیور!" لیکن اب کی بار اس کی آواز بہت بلند تھی اتنی کہ وہ سب بھی ہڑبڑا گئے تھے۔

"ڈرائیور! رکو۔ میری بات سنو ڈرائیور۔ پلیز رکو۔" علیزے اسے زور' زور سے پکارتی ہوئی یکدم اپنی جگہ سے اٹھی اور بیڈ روم سے باہر کی طرف بھاگی تھی۔

اور اس کا یہ بھاگنا کوئی ایسا ویسا نہیں تھا۔ وہ دیوانہ وار بھاگی تھی۔ اور اندھا دھند بھاگی تھی۔ لیکن تب تک دیر ہو چکی تھی۔

حویلی کے کھلے گیٹ سے دل آور کی گاڑی باہر نکل رہی تھی فاصلہ بڑھ چکا تھا' گاڑی کے دروازے اور شیشے بند تھے' اس تک آواز پہنچنا مشکل تھا' مگر پھر بھی وہ پکار رہی تھی' چیخ رہی تھی' اور اس کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔

"ڈرائیور پلیز! رکو یہاں۔ پلیز ڈرائیور مجھے یہاں سے لے جاؤ۔ مجھے یہاں نہیں رہنا۔ پلیز ڈرائیور۔ میرا دم گھٹ جائے گا۔ میں مر جاؤں گی۔ مجھے لے جاؤ۔ پلیز۔"

وہ اس کی گاڑی کو آنکھوں سے اوجھل ہوتے دیکھ کر بے ساختہ تھک کے رک گئی تھی اور وہیں کوریڈور کے مین ڈور کے سامنے دو زانو بیٹھتے ہوئے دھاڑیں مار مار کر رو پڑی تھی۔ لیکن آج کوئی بھی اسے چپ کروانے کے لیے نہیں آیا تھا۔

کیونکہ آج سب کے دل رو رہے تھے' اور سب کے ضمیر پہ ایک اذیت ناک سا بوجھ آپڑا تھا۔ آج کسی کو بھی کسی دوسرے کا احساس نہیں ہو رہا تھا' بلکہ سب کی سماعتوں میں دل آور شاہ کی آواز گونج رہی تھی' اور سب کا ہی ڈوب مرنے کو دل چاہ رہا تھا۔ انہیں بار بار دل آور کا خیال آ رہا تھا۔

میں تو اسی واسطے چپ ہوں کہ تماشا نہ بنے
اور تو سمجھتا ہے کہ مجھے تجھ سے گلہ کچھ بھی نہیں

☆ ☆ ☆

نہ چھیڑ قصہ الفت بڑی لمبی کہانی ہے
میں زمانے سے نہیں ہاری کسی کی بات مانی ہے

رات خاصی گہری ہو چکی تھی۔ اور وہ بہت دیر سے ٹیرس پہ کرسی ڈالے بیٹھی کرسی کی بیک سے ٹیک لگائے سیاہ آسمان کے بدن پہ چمکتے ستاروں کو دیکھ رہی تھی جو آسمان پہ چاند کی غیر موجودگی کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی نمایاں نظر آرہے تھے۔ لیکن اس کے باوجود چاند کی کمی اپنی جگہ ہنوز تھی کیونکہ ستارے چاند کی کمی کو دور نہیں کر سکتے تھے جس پہ اس کی آنکھوں میں بھی اداسی رات کی طرح ——— گہری ہوتی جارہی تھی۔ لیکن کمرے میں اس کے بیڈ پہ پڑے موبائل کی رنگ نے اسے بری طرح چونکا دیا تھا۔

رات کے اس پہر فون۔ یہ خیال آتے ہی وہ کرسی کا سہارا لے کر اٹھی تھی اور دھیمے قدم اٹھتی اندر آگئی تھی، کیونکہ اب اسے بھی اٹھنے بیٹھنے اور چلنے پھرنے میں دقت ہوتی تھی' اس نے اپنے آپ کو بہت جلدی کور کیا تھا لیکن پھر بھی ابھی وہ پوری طرح سے ٹھیک نہیں ہوئی تھی۔ کچھ وقت چاہیے تھا ابھی۔

"انوشہ۔" وہ انوشہ کا نمبر دیکھ کر حیران ہوئی تھی۔

"ہیلو۔" اس نے فوراً کال ریسیو کی تھی۔

"کیسی ہیں زری آپی؟" انوشہ کی آواز بہت ست اور سنجیدہ سی لگ رہی تھی۔

"الحمد للہ! میں ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ سب خیریت ہے نا؟" اس وقت فون کیوں کیا۔؟" زری اور عبداللہ کے تعلقات اپنے چچازاد کزنز سے بہت اچھے تھے۔

کیونکہ دانیال' زین اور انوشہ تینوں ہی انہیں بہت زیادہ چاہتے تھے اور ان سے ملنے کے لیے گھر بھی آئے تھے اسی لیے تب سے آپس میں کانٹیکٹ بھی بڑھ گیا تھا اور بے تکلفی تھی۔"

"نیند نہیں آرہی۔" انوشہ نے بہانا تراشا۔

"نیند نہ آنے کی وجہ؟ زری تھک گئی تھی بیڈ پہ ٹک گئی۔

"دل آور شاہ۔!" انوشہ کے لہجے میں اس کے نام کے ساتھ دکھ جھلکا تھا۔

"دل آور شاہ۔۔۔ کیا مطلب؟" وہ الجھی۔

"وہ آئے تھے یہاں۔" انوشہ خود ہی جیسے بتانا چاہتی تھی' دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی تھی۔

"اوہ اچھا۔۔۔! پھر؟" زری کا لب و لہجہ مدھم پڑ گیا۔

"وہ آئے اور ہمیں ہماری ہی نظروں میں گرا کر چلے گئے اور علیزے۔ وہ تو اب تک رو رہی ہے۔" انوشہ رفتہ رفتہ کھل رہی تھی اور زری یونہی رفتہ رفتہ مزید الجھتی جارہی تھی کیونکہ کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ "علیزے رو رہی ہے۔ مگر کیوں۔۔۔ کیوں رو رہی ہے وہ؟" زری نے پھر الجھ کر پوچھا تھا۔

(باقی آئندہ)

☆ ☆

۴۱

اکتالیسویں قسط

نبیلہ عزیز

دردِ دل

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نبیل حیات دونوں بہن بھائی ہیں، مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے، وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پہ رنگ چکی ہے، جس کے پیش نظر فائزہ بیگم، نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں، لیکن مدحیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے، جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے، مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصے سے نوکری کی تلاش میں ہے، مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، بے بسی اور مجبوری سے تنگ آکر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے، لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باؤ امتیاز مل جاتا ہے، جو اسے کام کی آفر کرتا ہے، جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے، اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے، وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے، وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے، وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے، اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا، اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔

"صرف علیزے ہی نہیں باقی سب بھی رو رہے ہیں۔"

انوشہ اک عجیب سے افسوس سے دوچار تھی اور زری کو مزید بے چینی اور خفگی ہونے لگی تھی۔

"پلیز انوشہ۔۔۔! کچھ بتاؤ تو سہی کہ ہوا کیا ہے؟ مجھے پریشانی ہونے لگی ہے سب کیوں رو رہے ہیں آخر۔۔۔ وہ بھی اس وقت؟" زری کو سچ مچ بہت زیادہ پریشانی اور گھبراہٹ ہو رہی تھی اس کا دل طرح طرح کے وہم اور وسوسوں کا شکار ہونے لگا تھا اور اس کی یہ پریشانی اور گھبراہٹ دیکھتے ہوئے ہی انوشہ خود بھی بے ساختہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی اور پھر انہی آنسوؤں اور ہچکیوں کے درمیان ہی انوشہ نے اسے الف تا ے ساری بات بتا ڈالی تھی اور زری سر سے پاؤں تک کانپ گئی تھی اسے اپنے جسم پہ یوں لگا جیسے چیونٹیاں سی رینگنے لگی ہوں۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو انوشہ' یہ کیا کہہ رہی ہو۔ میرا دل بند ہو جائے گا؟" زری کی آواز کانپ رہی تھی۔

"یہ سب سچ ہے زری آپی۔۔۔ یہ سب سچ ہے ایک اذیت ناک سچ۔۔۔ ہم مر گئے ہیں۔۔۔ ہم جیتے جی مر گئے ہیں۔۔۔ آج کی رات کوئی بھی سو نہیں پائے گا۔۔۔ آج کی رات سب کی تڑپتے ہوئے گزرے گی اور آج کی رات سب عذاب سے دوچار رہیں گے۔۔۔ کیونکہ آج ہم لوگوں کا غرور' ہم لوگوں کی انا اور ہم لوگوں کا نام کیچڑ میں مل گیا ہے' ہم غلیظ ہو گئے ہیں' ہم گناہ گار ہو گئے ہیں آپی۔۔۔

ہماری آنے والی سات نسلیں بھی دل آور شاہ کی گناہ گار رہیں گی۔

ہم ان کے سامنے سر اٹھانے کے بھی قابل نہیں رہے۔

انہوں نے جو کچھ بھی کیا ٹھیک کیا۔۔۔ لیکن اس کے باوجود وہ اتنے مضبوط اور بلند کردار رہے کہ انہوں نے ایک بار بھی علیزے کے ساتھ کوئی غلط حرکت نہیں کی' حالانکہ ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اپنا انتقام لینے کے لیے کچھ بھی کر گزرتا' مگر وہ ایسے نہیں نکلے۔ انہوں نے ایسا نہیں کیا انہوں نے ہماری عزت کو عزت ہی رہنے دیا۔" انوشہ رو رو کر ہلکان ہو رہی تھی اور یونہی روتے روتے اس نے فون ہی بند کر دیا تھا۔

"دل آور شاہ۔۔۔! تم اتنی اذیت لیے پھرتے تھے۔۔۔ اتنی اذیت"

زری زیر لب کہتی ہوئی ضبط نہیں کر سکی تھی اور اس کے آنسو بے آواز چال چلتے رخساروں پہ بہہ آئے تھے اور دل آور شاہ کی ذات کا دکھ اس کے دل کی رگوں کو کاٹنے لگا تھا اور اس کا دل چاہا وہ بتول شاہ کی تباہ شدہ زندگی پہ دھاڑیں مار مار کر روئے۔۔۔!

✡ ✡ ✡

دل آور شاہ خود تو چلا گیا تھا لیکن ان سب کے لیے ایک عذاب چھوڑ گیا تھا۔۔۔ کبھی نہ ختم ہونے والا عذاب۔۔۔ جن کو اب ان لوگوں نے ساری عمر جھیلنا تھا اور ساری عمر ایک دوسرے سے نظر چرا کے رہنا تھا۔ کیونکہ ان کے گھر سے ان کی اس عزت دار حویلی سے ایک عورت بے آبرو ہو کر نکلی تھی اور اس عورت کی آبروریزی کا داغ اب اس حویلی کے ہر فرد کے ضمیر پہ آپڑا تھا اور اس نام نہاد حویلی کی شان و شوکت مٹی میں مل گئی تھی۔

اب اس حویلی میں سب کا دم گھٹ رہا تھا۔

لیکن علیزے کو تو یوں لگ رہا تھا کہ اس کا اس ایک رات میں ہی دم نکل جائے گا' وہ رو رو کر اور تڑپ تڑپ کر پاگل ہو گئی تھی اور یہی حال عائشہ آفندی کا بھی تھا۔ وہ بھی اپنے بیڈ روم میں بیٹھی ہچکیوں سے رو رہی تھیں دل آور شاہ کے منہ سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ ان کے دل کو چیر رہا تھا اور وہ درد سے نڈھال ہونے لگی تھیں البتہ ایک آسیہ آفندی تھیں جو جہاں کی تہاں پتھر کی ہو کر رہ گئی تھیں اور جن کے احساسات اور جذبات کرب ناکی کی انتہا پہ پہنچ کر مفلوج ہو گئے تھے۔

ان کے دل و دماغ پہ بے حسی چھا گئی تھی یوں جیسے ان کے جسم سے جان ہی نکل چکی ہو یا پھر پوری کائنات ختم ہو چکی ہو اور اب ان کے لیے اس زندگی میں اور اس کائنات میں کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا اور وہ سوچ رہی تھیں کہ دل آور نے سچ کہا تھا اس مسئلے کو سلجھاتے سلجھاتے وہ خود الجھ جائیں گی۔ اذیت میں آجائیں گی اور۔۔۔ اور رشتوں کے بھرم ٹوٹ جائیں گے۔۔۔ اور واقعی ایسا ہی ہوا تھا اب وہ نہ رو سکتی تھیں اور نہ ہنس سکتی تھیں' ہاں البتہ گھٹ گھٹ کر مر ضرور سکتی تھیں۔

✡ ✡ ✡

جودت آفندی اپنے بیڈ روم میں صوفے پر آڑا ترچھا پڑا تھا۔

لیکن اس کے دماغ میں ابھی بھی دل آور شاہ کی آواز گونج رہی تھی۔۔۔ اور بار بار گونج رہی تھی۔

عورت قابل احترام ہستی ہے۔

عورت محبت کا پیکر ہے۔

عورت اس دنیا کا زیور ہے۔

عورت مرد کی ہوس پوری کرنے کے لیے نہیں بنی۔

عورت مرد کا غصہ سہنے کے لیے نہیں بنی۔

عورت مرد سے مرد کے انتقام کے لیے نہیں بنی۔

اس لیے تمہیں کوئی اجازت نہیں ہے کہ تم وقار آفندی کا انتقام علیزے آفندی سے لو اور اس کی سزا اسے دو" جودت ہاتھوں کی مٹھیاں اور لب بھینچے دل آور شاہ کی بچی اور کھری آواز کے حصار میں جکڑا ہوا تھا۔" انہوں نے زندگی میں ایک بار پھر مجھے حیران کر ڈالا یہ کہتے ہوئے کہ ٹھیک ہے تم ہی اسے لے کر آئے ہو' تمہاری وجہ سے وہ بدنام ہوئی ہے تو تم ہی اسے اپنا نام دو' وہ نکاح کر لو اس سے۔

تم مرد ہو وہ عورت ہے اور عورت ہمیشہ اپنی عزت کی خاطر مرد کا ہی سہارا لیتی ہے۔

مرد سے ہی نام مانگتی ہے' جو نام نہیں دیتے وہ نامرد ہوتے ہیں' بے غیرت ہوتے ہیں عورت کی عزت کو عزت نہیں بنا سکتے۔"

دل آور شاہ کے یہ الفاظ اتنے کاٹ دار تھے کہ جودت یکدم اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا اور اپنے کمرے میں ٹہلنے لگا تھا۔

"اور ہاں آزر آفندی۔۔۔! میری بدکرداری اور بدنیتی کے بارے میں کچھ کہنا ہو تو میں اب بھی حاضر ہوں' لیکن اپنے حق میں بات کرتے ہوئے اتنا ضرور کہوں گا کہ میں وقار آفندی جیسا باکردار' معزز اور عزت دار نہیں ہوں۔ ہاں اتنا بدکردار ضرور ہوں کہ آپ کی بیٹی جیسی میں یہاں سے لے کر گیا تھا ویسی ہی آج یہاں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ وہ جیسی پہلے تھی آج بھی ویسی ہی ہے اور آج یہاں سے جاتے ہوئے آپ سب کے سامنے میں یہ اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے فخر ہے اپنے مرد ہونے پہ کہ میں نے ایک مرد سے نفرت اور دشمنی کا انتقام ایک عورت سے نہیں لیا' حالانکہ میں چاہتا تو آسانی سے اپنا انتقام لے سکتا تھا۔ مگر مجھے وقار آفندی بننا گوارا نہیں تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ میرا اللہ اور میرا ضمیر مجھے ملامت کرتے رہیں گے اور مجھے سکون سے جینے نہیں دیں گے۔"

اس کے آخری جملے نے جودت کو اور زیادہ مضطرب کر ڈالا تھا اور پھر وہ اک گہری سانس کھینچتے ہوئے اپنے بیڈ روم سے باہر نکل آیا تھا اس کا رخ اپنی گاڑی کی طرف تھا۔

✡ ✡ ✡

اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور اس کے منہ پہ ٹیپ لگا ہوا تھا۔

وہ جب سے ہوش میں آئی تھی بے بسی سے پھڑپھڑاتے ہوئے بار بار اپنے ہاتھ پاؤں کھولنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اس کے ہاتھ اس کے پاؤں اور اس کا منہ اتنی سختی سے بندھے ہوئے تھے کہ وہ اپنی جگہ سے ایک انچ کے لیے بھی آگے یا پیچھے نہیں ہٹ سکی تھی اور اسی بے بسی کی سی حالت میں ہی اس کی پوری رات گزر گئی تھی۔ اور اس گزرنے والی رات کا احساس اسے سامنے ہی دیوار پہ لگے وال کلاک اور گلاس ونڈو سے ذرا سے سرکے ہوئے پردے سے ہوتا رہا تھا' جو رات کی سیاہ تاریکی کے بعد اب ملگجی سی روشنی میں بدل رہا تھا۔

اور مریم کے آنسو بے اختیار اس کے رخساروں پہ بہہ آئے تھے کیونکہ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ یہ سیاہ رات اس کی قسمت کے دن پہ حاوی ہو گئی ہے اور پورا دن تاریک پڑ گیا ہے اب کچھ بھی ہو جائے وہ یہ سیاہی کبھی مر کے بھی نہیں مٹا سکتی۔۔۔ اور اسی سیاہی کے غم نے اسے رلا دیا تھا۔ کیونکہ اسے پتا تھا کہ یہ سیاہی عدیل کو' امی کو' ابا جی کو اور اس کی معصوم بہنوں کو نگل لے گی' جیتے جی مار دے گی اور وہ لوگ کسی کو منہ دکھانے کے بھی قابل نہیں رہیں گے۔

ابھی وہ اس غم کا اس دکھ کا ماتم منا رہی تھی کہ اچانک ہی اسے دروازے کا لاک کھلنے کی آواز سنائی دی تھی' اور اس نے تڑپ کر دروازے کی سمت دیکھا تھا لاک کھلنے کے بعد چند سیکنڈز کے وقفے سے دروازہ بھی کھل گیا تھا لیکن انتہائی آہستگی کے ساتھ۔

حسب توقع جودت آفندی کی ہی صورت نظر آئی تھی جس کو دیکھتے ہی مریم کے جسم میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی تھی اور آنسو بے اختیار بہہ نکلے تھے بلکہ ان آنسوؤں میں روانی آ گئی تھی کیونکہ اسے موت کا فرشتہ اپنے قریب سے بھی قریب تر ہوتا نظر آ رہا تھا اور یقین ہو چلا تھا کہ وہ ابھی کے ابھی مر جائے گی۔

جبکہ دوسری طرف وہ تھا جودت آفندی خاموش' شرمندہ اور ندامت کا بوجھ کندھوں پہ اٹھائے سر جھکائے ہوئے۔۔۔

آہستہ قدموں سے چلتا ہوا اندر داخل ہوا اور بہت ہی بوجھل سے انداز میں آ کر بیڈ پہ بیٹھ گیا تھا۔

مریم اس کے بیڈ پہ بیٹھنے سے پھڑپھڑائی تھی' تڑپی تھی اور اس کی اس مرغ بسمل کی سی تڑپ پہ جودت نے گردن موڑ کر اس کی سمت دیکھا تھا اس کی آنسوؤں سے بھیگی متورم آنکھیں وحشتوں کے عذاب سے بھر گئی تھیں اور جودت کے دل پہ اک اور ملامت کا داغ لگا تھا اک اور طمانچہ پڑا تھا اس کے ضمیر کے منہ پر۔۔۔ اور اس نے آہستگی سے ہاتھ بڑھا کے اس کے منہ پہ لگا ٹیپ کھول دیا تھا اور پھر یونہی آہستہ آہستہ اس کے ہاتھ اور پاؤں بھی کھول دیے تھے' جن کے کھلتے ہی مریم یکدم اٹھ بیٹھی تھی اور اپنے اعصاب ٹھکانے پہ آتے ہی ذرا سا توقف لینے کے بعد ادھر ادھر دیکھتے ہوئے یکدم اک جھٹکے سے اٹھ کر وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی تھی لیکن بھاگ نہیں سکی تھی کیونکہ جودت نے اس کی کلائی پکڑتے ہوئے اس کی ساری پھرتی ختم کر ڈالی تھی اور وہ ایک ہی جگہ پہ ساکت سی ہو گئی تھی کیونکہ اسے جودت کے انداز سے اور اس کے ہاتھ کی گرفت سے کچھ اور ہی محسوس ہوا تھا۔

وہ ویسا نظر نہیں آ رہا تھا' جیسا کل تھا۔

"بیٹھ جاؤ۔۔۔ بات کرنا چاہتا ہوں تم سے۔۔۔" لہجہ دوٹوک تھا' نجانے کیوں پہلی بار میں ہی اثر کر گیا تھا اور مریم چند سیکنڈ کے وقفے سے بالآخر بیٹھ ہی گئی تھی اور جودت نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔

"اپنے گھر جانا چاہتی ہو۔۔۔؟" جودت کا سوال اسے مذاق لگا تھا' اس نے گردن موڑ کر اسے بہت ہی عجیب سی نظروں سے دیکھا' مگر وہ سر جھکائے بیٹھا تھا جس سے لگ رہا تھا کہ وہ مذاق نہیں کر رہا۔

"لیکن تمہاری زندگی کی ایک رات گھر سے باہر گزر چکی ہے۔" اس نے ذرا توقف سے کہا تھا۔

"اس ایک رات میں تمہارا بہت کچھ کھو گیا لیکن مجھے بہت کچھ حاصل ہو گیا ہے۔۔۔" جودت کے لہجے میں بے حد ٹھہراؤ تھا۔

"مجھے عبرت حاصل ہوئی ہے۔" اس کی اگلی بات بھی عجیب تھی اور مریم اس کی عجیب سی باتوں پہ ابھی بھی اسے ہی دیکھ رہی تھی مگر چپ چاپ۔

اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور ایک گہری سانس خارج کی تھی۔

"مجھے معاف کر دو مریم! میں نے تمہیں اور تمہاری پاکیزگی کو سب کی نظروں میں مشکوک اور بے یقین کر دیا ہے' میں نے تم سے تمہاری ذات کا غرور چھین لیا ہے۔۔۔ پلیز مجھے معاف کر دو' میں بہت اذیت میں ہوں' بہت پچھتا رہا ہوں۔" جودت کے اندر کا کرب اس کے لہجے میں اتر آیا تھا اور وہ چند قدم کھڑکی کی سمت بڑھانے کے بعد دوبارہ مریم کی سمت پلٹ آیا تھا اور بے ساختہ اس کے سامنے قالین پہ ہی دوزانو بیٹھ گیا تھا۔

"لیکن تم غم نہ کرو' اپنی اس غلطی کا مداوا بھی میں ہی کروں گا' تمہیں تنہا نہیں چھوڑوں گا' تمہارا ساتھ دوں گا' عزت دوں گا تمہیں' مقام دوں گا' محبت دوں گا اور وہ سب کچھ دوں گا جس کی تم خواہش کرو گی۔۔۔ بدل دوں گا اپنے آپ کو۔۔۔ صرف اور صرف تمہاری خاطر۔۔۔ تمہارا بن کے جیوں گا' جب تک جیوں گا۔" جودت نے اس کے گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ دیے تھے اور مریم بے ساختہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔

"اب کہہ رہے ہو یہ سب۔ اب کیا فائدہ ہے۔" وہ ہچکیوں سے روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"پہلے نہیں کہہ سکتا تھا' پہلے مجھ پہ میرے اندر کا شیطان حاوی تھا' لیکن اب مجھ پہ میرے اندر کا انسان حاوی ہے' اب میں وہ سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں جو تمہاری بہتری کے لیے ہو' کیونکہ گزشتہ ایک رات نے ہی ہمیں پوری زندگی کے لیے سبق سکھا دیا ہے' اپنی اوقات دکھا دی ہے' ہمیں' اور اپنے گریبان میں جھانکنے پہ مجبور کر دیا ہے۔" وہ بڑی تلخی سے کہہ رہا تھا۔

"مگر اب مجھے کیا حاصل۔۔۔؟" وہ تڑپی تھی۔

"بتا دوں گا' تم بس ایک بار مجھے معاف کر دو۔" جودت نے التجائیہ سے لہجے میں کہا تھا اور مریم نے بڑے زخمی سے انداز میں اپنے سامنے دوزانو بیٹھے معافی کے اس طلب گار کو دیکھا تھا جس کی غلطی کو گزرے چوبیس گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے لیکن اس کی چوبیس سالہ زندگی پہ داغ چھوڑ گئی تھی اور مریم نے نفرت سے اس کی طرف سے رخ موڑ لیا تھا' جبکہ جودت نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑ دیے تھے۔

"پلیز مریم۔۔۔! ایک بار' پھر ایک بار۔۔۔ مجھے معاف کر کے تو دیکھو۔" وہ ابھی بھی ملتجی تھا اور وہ ایک بار پھر کچھ بھی کہنے کی بجائے رو پڑی تھی اور جودت نے نیچے قالین پہ گرا اس کا دوپٹا اٹھا کر اس کے سر پہ ڈال دیا تھا' جس پہ وہ روتے روتے دم بخود سی ہو گئی تھی۔

✲ ✲ ✲

عدیل ابھی سو کر اٹھا ہی تھا کہ اس کا موبائل بجنا شروع ہو گیا تھا' اس نے شرٹ کے بٹن بند کرتے ہوئے بیڈ کے قریب آ کر موبائل اٹھا لیا تھا' نمبر لاہور کا تھا' رات کو بھی اس کے نمبر پہ چند مسڈ کالز تھیں لیکن اسے پتا نہیں تھا کہ کس کی ہیں۔

"ہیلو۔۔۔؟"

"عدیل! کہاں ہو۔۔۔ کہاں چلے گئے ہو۔۔۔؟ گھر آ جاؤ۔۔۔ میرے بچے گھر آ جاؤ۔" عابدہ خاتون اس کی آواز سنتے ہی بے اختیار شروع ہو گئی تھیں اور ساتھ ہی ان کے رونے کی بھی آواز سنائی دینے لگی تھی۔

"امی! کیا ہوا ہے ابا جی ٹھیک تو ہیں نا.....؟" عدیل کا پہلا خیال فاروق نیازی کی طرف ہی گیا تھا۔
"وہ.....وہ ٹھیک ہیں بیٹا، لیکن مریم....." وہ بات مکمل نہیں کر سکی تھیں۔
"مریم..... کیا ہوا ہے مریم کو۔" عدیل کے دل پہ ہاتھ پڑا تھا۔
"وہ.....وہ..... کل سے گھر نہیں آئی میں اس کا انتظار کرتے کرتے تھک گئی ہوں بیٹا، تم گھر آجاؤ۔" عابدہ خاتون نے عدیل کے سر پہ پہاڑ توڑ ڈالے تھے اور موبائل فون اس کے ہاتھ میں لرز کے رہ گیا، بلکہ وہ مضبوط قدموں پہ کھڑا لڑکھڑا گیا تھا اور بے اختیار بیڈ پہ بیٹھ گیا۔
"آپ..... یہ..... کک کیا کہہ رہی ہیں مریم کل سے گھر.....؟" وہ جملہ مکمل نہیں کر پایا تھا۔
"ہم برباد ہو گئے ہیں بیٹا..... ہم کل سے برباد ہو گئے ہیں....." عابدہ خاتون نے کہتے ہوئے فون بند کر دیا تھا۔
"عدیل اس طرح کیوں بیٹھے ہو؟ خیریت.....؟" نبیل دروازے پہ دستک دے کر خود ہی اندر چلا آیا تھا کیونکہ ان دونوں نے ابھی کچھ دیر پہلے ہی اکٹھے ناشتا کرنے کا پروگرام بنایا تھا اور ابھی وہ اسی غرض سے اسے بلانے کے لیے آیا تھا، مگر اس کے چہرے پہ اڑتی ہوائیاں دیکھ کر نبیل بھی متفکر ہو گیا تھا۔
"عدیل..... ! میں تم سے مخاطب ہوں اس طرح کیوں بیٹھے ہو؟ کیا ہوا ہے..... کس کا فون تھا۔" نبیل اس کے ہاتھ میں تھمے موبائل کو دیکھ چکا تھا اور اس کا کندھا ہلا کر اسے مخاطب کرنے کی کوشش کی تھی۔
"امی کا..... !" عدیل کی آواز اتنی مدھم ہو چکی تھی کہ جیسے کسی گہرے پاتال میں سے سنائی دے رہی ہو.....
"کیا کہہ رہی تھیں.....؟" نبیل کو مزید پریشانی ہوئی تھی۔
"میری سسٹر مریم..... کل اکیڈمی گئی تھی..... اور کل سے ابھی تک واپس نہیں آئی۔" عدیل کسی روبوٹ کی طرح بتا رہا تھا۔
"کیا.....؟" نبیل کو یکدم اتنی بڑی بات سن کر جھٹکا سا لگا تھا۔
"ہاں..... ! کل میں ہی اسے اکیڈمی ڈراپ کر کے آیا تھا۔"
"او مائی گاڈ..... ! یہ کیا ہو گیا؟" نبیل نے تو جیسے سر تھام لیا تھا۔
"ہمارے پاس عزت کے سوا اور کچھ نہیں تھا نبیل صاحب..... اور اور..... آج وہ عزت بھی۔"
"پلیز عدیل! اِنگیٹو مت سوچو اور جلدی اٹھو، ہمیں ابھی واپس چلنا ہے۔" نبیل اس کا کندھا تھپک کر بولا۔
"اب..... اب کیا ہو سکتا ہے؟"
"اب بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے، پہلے تمہارے گھر پہنچتے ہی ساری تفصیل معلوم کرتے ہیں، اگر حل نہ نکلا تو رپورٹ درج کروا دیں گے، باقی کا کام دل آور سنبھال لے گا۔" نبیل سارے کام کا پلان ترتیب دیتے ہوئے عجلت سے پلٹ گیا۔
"اور ہاں تم جلدی سے اپنا سامان پیک کر لو، میں بل کلیئر کرتا ہوں۔" وہ جاتے جاتے اسے ہدایت بھی کر گیا تھا

☆ ☆ ☆

وہ اپنے آفس میں بیٹھا اپنے کسی کیس کی فائل میں الجھا ہوا تھا۔ جب اس کا منشی دروازے پہ دستک دے کر ذرا سا اندر کی طرف نمودار ہوا تھا۔ "سر..... ! کوئی لڑکا اور لڑکی آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"
"لڑکی اور لڑکی.....؟" دل آور کو حیرت ہوئی.....
"جی ہاں..... کہتے ہیں کہ آپ کے جاننے والوں میں سے ہیں۔"

"اوکے! بھیج دو۔" اس نے اجازت دیتے ہوئے اپنی فائل سمیٹنی شروع کردی تھی۔

"السلام علیکم۔۔۔" دروازے پہ دستک کے بعد جودت کی آواز ابھری تھی اور دل آور فائل سمیٹتے سمیٹتے رک گیا تھا کیونکہ وہ جودت کو دیکھ کر بری طرح چونکا تھا۔

"کیا ہم اندر آسکتے ہیں۔۔۔؟" اس نے اجازت طلب کی اور دل آور ٹھٹک کر متوجہ ہوا تھا۔

"ہوں۔۔۔ ایم ان۔" اس نے آہستگی سے کہتے ہوئے اجازت دی تھی اور اس کی طرف سے اجازت ملتے ہی جودت مریم کو ساتھ لیے اندر آگیا تھا۔

"بیٹھو۔۔۔!" دل آور نے کرسیوں کی سمت اشارہ کیا تھا۔

"تھینک یو۔۔۔" جودت مرے مرے سے لہجے میں کہتا کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی مریم بھی بیٹھ گئی تھی' دل آور نے بے شک اسے صرف ایک بار ہی دیکھا تھا لیکن اس کا حافظہ کمزور نہیں تھا جبھی تو وہ اسے دیکھتے ہی پہچان گیا تھا کہ وہ عدیل عمر کی بہن ہے۔

"دل آور بھائی! وہ دراصل مجھے آپ کی ہیلپ کی ضرورت ہے۔" جودت نے اب اس کے سامنے تمہید باندھنے کی کوشش کی تھی۔

"سر کہہ کر مخاطب کروگے تو زیادہ بہتر ہوگا۔" اس نے بہت سخت لہجے میں اسے تنبیہہ کی تھی۔

"لیکن میں آپ کو علیزے کے حوالے سے۔"

"علیزے کا اور میرا حوالہ آج ختم ہوجائے گا' اس لیے مناسب یہی ہے کہ کسی بھی حوالے کے بغیر بات کی جائے اور یہ بتایا جائے کہ تم یہاں کیوں آئے ہو؟ اور کس ہیلپ کے لیے آئے ہو۔"

دل آور نے اس کی بات کاٹتے ہوئے بات ہی ختم کردی تھی اور جودت اس کا اتنا دو ٹوک انداز دیکھ کر چپ سا ہوگیا تھا۔

"میں انتظار کررہا ہوں تمہاری بات کا۔۔۔ مجھے کچھ اور بھی کام نبٹانے ہیں۔" اس نے اسے بولنے پہ اکسایا۔

"وہ۔۔۔ وہ دراصل مجھ سے ایک غلطی ہوگئی ہے۔" جودت نے بمشکل بات کرنے کی ہمت مجتمع کی تھی۔

"یہ کوئی نئی بات تو نہیں ہے۔۔۔؟" دل آور استہزائیہ بولا تھا۔

"نئی بات ہے۔۔۔ اور وہ یہ ہے کہ اپنی غلطی کا احساس پہلی بار ہوا ہے اور وہ بھی آپ کی وجہ سے۔۔۔!" جودت اب بات کہنا شروع ہوچکا تھا اور دل آور نے اس کی ساری بات پورے دھیان سے سنی تھی۔۔۔ اور ایک گہری سانس لے کر اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ "اس نکاح کے بعد تمہارے گھر والوں کا کیا ری ایکشن ہوگا۔۔۔ جانتے ہونا؟"

"جی جانتا ہوں۔۔۔!"

"پھر بھی یہ نکاح کرنا چاہتے ہو۔۔۔؟"

"جی ہاں۔! پھر بھی یہ نکاح کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ میں دل آور شاہ کے نقش قدم پر چلنا چاہتا ہوں' وقار آفندی کے نقش قدم پر نہیں۔" جودت کا لہجہ مضبوط تھا۔

"کیا اس لڑکی کے گھر والوں کو فیس کرلوگے؟" دل آور اس سے ہر طرح کی یقین دہانی چاہتا تھا۔

"میں ہر چیز کو فیس کرنے کا سوچ کر ہی آپ کے پاس آیا ہوں' ورنہ آسان طریقہ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ میں اسے چپ چاپ اس کے گھر چھوڑ کر واپس آجاتا' لیکن نہیں۔ میں اسے دغا نہیں دے سکتا۔ ہرگز نہیں۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی تھی اور اپنی غلطی کے بعد تلافی کے لیے ڈٹ جانے والے جودت کو دیکھ کر دل آور کو یقین آگیا تھا کہ وہ اس کے لیے اسٹینڈ لے سکتا ہے۔

اسی لیے اس نے اس کا کیس اوکے کردیا تھا اور اگلے چند ہی منٹوں بعد ان کے نکاح کی رسم ادا ہوگئی تھی' اور دل آور نے عدیل کو فون کرکے اپنے پاس اپنے آفس میں آنے کا کہا تھا وہ اب نبیل کے ساتھ سیدھا اس کے آفس میں آرہا تھا اور ایسی ہی ایک کال آذر آفندی کو بھی کی تھی۔

✡ ✡ ✡

"علیزے پلیز یار۔ بس کرو یہ رونا دھونا۔ دل آور بھائی اتنے اچھے ہیں کہ وہ کچھ بھی نہیں کریں گے۔ وہ تمہیں اس طرح نہیں چھوڑ سکتے۔" کومل نے بیڈ پہ بیٹھی گھٹنوں میں منہ چھپائے' رات سے بھوکی پیاسی اور مسلسل روتی علیزے کے پاس بیڈ پہ بیٹھتے ہوئے اس کے بالوں کو سہلا کر اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

"وہ اچھا ہے' بہت اچھا ہے۔ حد سے زیادہ اچھا ہے' اس کی اچھائی کو مجھ سے بہتر کوئی بھی نہیں جانتا' مگر اب میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اب اس کی اچھائی کی حد ختم ہوچکی ہے' اب وہ۔ وہ نہیں رہا' وہ رات کو یہاں سے جاتے ہوئے کس حال میں گیا ہے یہ میں جانتی ہوں۔ میں۔۔۔ صرف میں۔" علیزے روتے ہوئے اور کہتے ہوئے یکدم پھٹ پڑی تھی۔

"تو پھر۔ اب کیا ہوسکتا ہے علیزے؟" یہ سارا معاملہ جان لینے کے بعد کومل کا دل بھی نرم ہوچکا تھا اس کے لیے۔

"اب یہی ہوسکتا ہے کہ مجھے اس کے پاس جانا ہے' مجھے اس کے گھر میں رہنا ہے' اور صرف اس کی ہوکر رہنا ہے۔" علیزے نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔

"لیکن علیزے!" کومل نے کچھ کہنا چاہا۔

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ مجھے اس کے پاس جانے میں کوئی شرمندگی نہیں ہے' کیونکہ میں اس کی بیوی ہوں۔ منزل دل آور شاہ۔ میں خود اسے چھوڑ کر آئی تھی تو اب مجھے خود ہی اس کے پاس جانا بھی ہے۔" علیزے نے اپنی بات پہ زور دے کر کہا تھا۔

"کیا محبت کرتی ہو ان سے؟" یہ سوال ایک اہم سوال تھا اور علیزے کے آنسو پھر سے رواں ہوگئے تھے۔ مگر وہ کچھ کہہ نہیں سکی تھی۔

"بولا نا علیزے! کیا محبت کرتی ہو ان سے؟" کومل نے سوال دہرایا تھا۔

"وہ۔۔۔ وہ ہے ہی محبت کے قابل۔ لیکن افسوس کہ میری اب اتنی بھی اوقات نہیں ہے کہ اس سے محبت کرسکوں۔ کیونکہ وہ سچ کہتا ہے محبت بڑی حویلی والوں کے بس کی اور سمجھ کی چیز نہیں ہے۔ میرے بس کی بھی نہیں ہے۔" علیزے کہتے ہوئے سسک اٹھی تھی۔

"لیکن علیزے بغیر محبت کے تو یہ فاصلے نہیں مٹ سکتے۔" کومل اسے سمجھا رہی تھی۔

"میں جانتی ہوں۔ اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اب مجھے ہر کام محبت سے ہی کرنا ہے۔ محبت سے' عقیدت سے' اور عزت سے۔ اب وہ ہے تو سب کچھ ہے۔ وہ نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے۔ علیزے بھی نہیں۔" علیزے نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا تھا اور کومل کو اس کا فیصلہ سن کر خوشی ہوئی تھی۔

✡ ✡ ✡

چٹاخ۔۔۔

آذر نے ساری صورت حال دیکھنے اور سننے کے بعد ایک انتہائی زوردار تھپڑ جودت کے منہ پر رسید کردیا تھا اور جودت چپ چاپ سر جھکا کر اس کا یہ تھپڑ سہہ گیا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ اس تھپڑ سے زیادہ کا حق دار ہے۔

"تم نے بھی وہی کیا جو آج سے کئی سال پہلے بھی ہو چکا ہے۔ تم نے بھی آخر یہ ثابت کر دیا کہ تمہارے اندر بھی وہی جراثیم ہیں ذلالت والے، خباثت والے اور بے غیرتی والے۔"

آذر کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ جودت کو کھڑے کھڑے گولی مار دے یا پھر اسے مار مار کر فنا کر ڈالے۔ لیکن کیا کرتا مجبور تھا، بے بس تھا، کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ وہاں وہ اکیلا نہیں تھا۔ وہاں، دل آور شاہ بھی تھا جس کے سامنے وہ سر نہیں اٹھا سکتا تھا، وہاں عدیل عمر نیازی بھی تھا جو خود بھی سر جھکائے ہوئے بیٹھا تھا جس کے وہ لوگ گناہ گار تھے، وہاں نبیل حیات بھی تھا، وہاں مریم بھی تھی، اور آذر اتنے لوگوں کے سامنے کیا کر سکتا تھا بھلا۔

"بھائی آپ لوگ جانتے ہیں، میں رات بھر آپ لوگوں کے ساتھ ہی گھر پہ رہا ہوں، میں نے اور کوئی بھی غلط حرکت نہیں کی۔"

"غلط حرکت جو تم کر چکے ہو، کیا وہ کم ہے؟" آذر دبے لہجے میں دانت پیس کر بولا تھا۔

"لیکن میں اپنی اس غلط حرکت کا ازالہ بھی تو کر رہا ہوں نا۔" جودت پھر بھی جھجکا نہیں تھا۔

"یہ ازالہ نہیں ہے۔ ازالہ میں کروں گا۔" آذر نے جیسے فیصلہ کر لیا تھا اور کہتے ہوئے عدیل کی سمت پلٹا تھا۔

" عدیل صاحب! میں بہت شرمندہ ہوں آپ سے۔ میں جانتا ہوں کہ ایک عزت دار اور شریف گھرانے میں عزت کی کیا اہمیت ہوتی ہے۔ اور میں اس وقت آپ کی اسی عزت کی اہمیت کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کر رہا ہوں کہ ہم یہ نکاح خاموشی کی چادر میں چھپا کر نہیں رکھیں گے، بلکہ سب کے سامنے آپ کی عزت کو اپنی عزت بنا کر اپنے گھر لے کر جائیں گے، اور اسے بھی وہی مقام دیں گے جو ہمارے گھر میں باقی بہوؤں کا ہو گا۔ اگر اس میں ذرا سا بھی فرق آیا تو آپ میرا گریبان پکڑ سکتے ہیں۔

آپ کی بہن کو میں اپنی بہن سمجھ کر اپنی ذمہ داری پہ اپنے گھر لے کر جاؤں گا اور بہت دھوم دھام سے لے کر جاؤں گا، آپ بس ایک مہینے کا یا پھر چند دنوں کا وقت دے دیں، ان شاء اللہ یہ شادی اب ہماری شادیوں کے ساتھ ہی ہو جائے گی۔"

آذر نے عدیل کے قریب آتے ہوئے معذرت کرنے کے ساتھ ساتھ اسے اپنی طرف سے مریم کے تحفظ کا پورا پورا یقین دلایا تھا جبکہ عدیل سرخ — چہرہ لیے ضبط کے کڑے مراحل سے گزر رہا تھا، یہ آفس اگر دل آور شاہ کا نہ ہوتا تو وہ یقیناً "جودت آفندی کو کب کا لہولہان کر چکا ہوتا، لیکن مسئلہ یہ تھا کہ دل آور شاہ کا لحاظ آڑے آ گیا تھا کیونکہ یہ معاملہ وہ ہینڈل کر رہا تھا۔

"عدیل!" نبیل نے آگے بڑھ کے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا تھا اور کندھے پہ ہلکا سا دباؤ ڈالتے ہوئے اسے کسی نرم فیصلے پہ اکسانے کی کوشش کی تھی۔

"دیکھیں ہم سے جو غلطی ہو چکی ہے میں اس کے لیے آپ کے سامنے ہاتھ جوڑ رہا ہوں، ہمیں معاف کر دیں۔ آپ یہی سمجھیں کہ آپ نے اپنی سسٹر کا رشتہ طے کر دیا ہے اور چند دن بعد اس کی شادی ہے، ہم شادی کے وقت بھی آپ لوگوں پہ کوئی بوجھ نہیں ڈالیں گے، آپ کو کسی بھی چیز کے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" آذر نے سچ مچ عدیل کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔

عدیل ایک جھٹکے سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا تھا جبکہ باقی کا معاملہ نبیل نے خود ہینڈل کر لیا تھا۔

"ٹھیک ہے! آپ جب چاہو بارات لے کر آ جانا۔ مریم اب آپ لوگوں کی ہی امانت ہے۔"

آذر کے لیے نبیل کی طرف سے اتنی تسلی ہی کافی تھی، پھر وہ مریم کے سر پہ ہاتھ رکھ کر خود بھی باہر نکل گیا تھا اور نبیل، دل آور کے ساتھ مریم کو — لیے اپنی گاڑی میں آ گیا تھا جہاں عدیل بھی موجود تھا۔

☆ ☆ ☆

"کیا بات ہے آپ لوگ اتنے پریشان کیوں ہیں؟"

جودت کے پیچھے پیچھے آذر بھی تھکے تھکے سے قدم اٹھاتا گھر میں داخل ہوا تھا لیکن کومل، حرمت اور انوشہ وغیرہ کو پریشان دیکھ کر وہ نہ چاہتے ہوئے بھی رک گیا تھا۔

"وہ... وہ علیزے۔ صبح سے بلکہ رات سے مسلسل رو رہی ہے۔ اس نے کچھ کھایا پیا بھی نہیں۔ بھوکی ہے رات سے۔" کومل کے اشارے پہ حرمت نے ہی بات کہنا شروع کی تھی۔

"کیوں رو کیوں رہی ہے؟" آذر نے بے ساختہ ہی پوچھ لیا تھا۔

"اپنے گھر جانا چاہتی ہے۔ دل آور بھائی کے پاس۔ کیونکہ اسے ڈر ہے کہ دل آور بھائی اسے طلاق نہ دے دیں وہ رات کہہ کر گئے تھے۔" حرمت نے جلدی جلدی وجہ بھی بتا دی تھی۔

"نہیں... وہ ایسا نہیں کرے گا۔ وہ بہت سمجھ دار آدمی ہے۔" آذر کو دل آور پر یقین پختہ ہو چکا تھا۔

"وہ ایسا ہی کریں گے، میں ان کی زبانی سن چکا ہوں، وہ کہہ رہے تھے کہ میرا اور علیزے کا حوالہ — آج تک ہی ہے، آج یہ حوالہ ختم ہو جائے گا۔ یعنی آج وہ یہ رشتہ ختم کر دیں گے۔"

جودت بھی آگے بڑھتے بڑھتے ان کی یہ بات سن کر رک گیا تھا اور جودت کی یہ بات سن کر آذر کے ساتھ ساتھ وہ سب بھی ٹھٹک گئی تھیں۔

"دیکھا وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے بے چاری؟" اب کی بار کومل بھی بول پڑی تھی اور اس نے علیزے کی حمایت کی تھی۔

اور آذر چند سیکنڈز وہیں کھڑے کھڑے کچھ سوچنے کے بعد ان لوگوں کو وہیں چھوڑ کر سیڑھیاں چڑھ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"علیزے...!"

آذر دروازے پہ دستک دے کر اندر آ گیا تھا اور علیزے اس کی آواز سننے کے باوجود بھی اس کی طرف متوجہ نہیں ہوئی تھی گھٹنوں میں منہ چھپائے جوں کی توں بیٹھی رہی۔

"آؤ۔ میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آتا ہوں۔" آذر نے اس کے قریب آ کر اس کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔

علیزے کو یکدم کرنٹ چھو گیا تھا وہ مارے بے یقینی کے فوراً اک جھٹکے سے سیدھی ہو بیٹھی تھی۔

"آ... آپ... سچ کہہ رہے ہیں، آپ مجھے چھوڑ آئیں گے کیا؟"

"ہاں سچ کہہ رہا ہوں۔ تم اٹھو میں گاڑی نکالتا ہوں۔ یہ کام جتنی جلدی ہو جائے اتنا ہی بہتر ہو گا۔ ورنہ یہ نہ ہو کہ ہمیں ایک بار پھر پچھتانا پڑ جائے۔"

آذر کل رات والی کہانی اور آج کے دن والی حقیقت سے بری طرح بدظن اور بدگمان ہو چکا تھا اور اب تو اس بات پہ اور بھی زیادہ یقین کامل ہو چکا تھا کہ زندگی میں کہیں بھی، کسی بھی وقت، کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے وہ علیزے سے کہتا ہوا باہر نکل گیا تھا اور علیزے یوں بے تابی سے اٹھی تھی جیسے کسی نے اسے جنت میں داخل ہونے کی نوید سنا دی ہو۔

وہ تیزی سے اپنے آنسو پونچھتی، چپل پہن کر دوپٹا اوڑھ کر اس کے پیچھے ہی باہر آ گئی تھی۔ لیکن سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی ہی تھی کہ وقار آفندی کے بیڈ روم کے سامنے اس کے قدم ٹھٹک کر رک گئے تھے کیونکہ آسیہ آفندی بیڈ روم سے باہر نکل رہی تھیں، اس ایک رات میں ہی ان کی حالت ایسی ہو گئی تھی کہ جیسے وہ صدیوں کی مریض

ہوں۔

"اللہ حافظ مما! میرے لیے دعا کیجیے گا۔" علیزے کی آواز بھرا گئی تھی۔

"اللہ حافظ۔ جاؤ اپنے گھر میں آباد رہو' اللہ تمہیں خوشیاں نصیب کرے' لیکن اب اتنا یاد رکھنا کہ اس شخص کو زندگی میں کسی بھی موقعے پر دغا مت دینا' ورنہ کہیں کی بھی نہیں رہو گی' کیونکہ آج تو شاید وہ تمہیں قبول کرلے گا مگر بار بار ایسا نہیں کرے گا' آخر وہ بھی ایک انسان ہے۔"

آسیہ آفندی نے بڑے دوٹوک سے انداز میں اسے سمجھایا تھا اور اسے رخصت کردیا تھا۔ اور علیزے اپنے آنسو دوپٹے سے پونچھتی ہوئی خالی ہاتھ میکے سے نکل آئی تھی' اب اس کی منزل وہ تھی جہاں اس کا "ڈرائیور" تھا۔

✡ ✡ ✡

"وہ بہت اچھا ہے بھابھی! بہت اچھا ہے۔ بہت اعلا ظرف ہے۔ بلند کردار ہے۔ اتنا کہ مجھے خود پہ فخر ہونے لگا ہے کہ مجھے اس سے محبت ہے' بس۔ یہ دل اس کے دم پہ دھڑکتا ہے۔ میں۔ میں جی رہی ہوں تو صرف اس کی خاطر۔ صرف اس کے لیے۔ یہ زندگی صرف اسی کی امانت ہے۔ وہ نہیں ملا تو کیا ہوا۔ اس سے محبت کا احساس تو ہے نا۔"

آخر وہ بھی تو اپنے دل میں اتنے دکھ اتنی اذیتیں لیے جی رہا ہے نا۔

آخر بتول آنٹی نے بھی تو کانٹوں بھری یہ زندگی بسر کی ہے نا۔

تو پھر میں کیوں نہیں؟ میں کیوں نہیں جی سکتی بھلا۔ میں کیوں نہیں کرسکتی ایسا۔

میں۔ میں کروں گی۔ میں جیوں گی بھابھی۔ میں جیوں گی سب کچھ اپنے دل میں دفن کرکے جیوں گی' خوشی خوشی جیوں گی' اور دل آور شاہ کی محبت میں سر اٹھا کر جیوں گی' اس طرح کہ ہر محبت کرنے والے کو مجھ پہ اور میری محبت پہ رشک آئے گا۔ کسی کی محبت میں پاگل ہوجانا' یا مرجانا ہی کافی نہیں ہوتا بلکہ کسی کی محبت سینے سے لگا کر جی لینا بھی بڑی بات ہوا کرتی ہے۔

میں محبت کا اک نیا روپ دکھاؤں گی سب کو' میں دل آور شاہ پہ قربان۔

میرا رب راضی۔ میرا جگ راضی۔ میں دل آور شاہ پہ قیامت تک راضی۔ جو دکھ اس نے سہے' جو قربانیاں اس نے دیں۔ اس کے آگے تو یہ سب کچھ بھی نہیں ہے۔ بس اب جس حال میں وہ خوش۔ اس حال میں زری بھی خوش۔"

زری نے رو رو کر کہتے ہوئے اپنے آنسو بھی پونچھ لیے تھے اور اس کے اس فیصلے پہ نگارش کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑگئے تھے اس نے زری کے بالوں کو سہلاتے ہوئے گلے سے لگالیا تھا۔ لیکن جیسے ہی یہ ساری داستان عبداللہ تک پہنچی تھی وہ سن کر ششدر سا رہ گیا تھا کہ دل آور۔ کی زندگی کا یہ کون سا باب ہے' جو ان لوگوں کی نظروں سے بھی پوشیدہ تھا؟

✡ ✡ ✡

دل آور شاہ کے گھر کے سامنے ہی گاڑی کو بریک لگاتے ہوئے آذر نے علیزے کی طرف دیکھا تھا اور علیزے کا دل دھڑک اٹھا تھا اس نے بھی بے ساختہ ہی آذر کی سمت دیکھا تھا۔

"جاؤ علیزے! اپنے گھر جاؤ' دیر مت کرو۔ گھر بسنے میں صدیاں لگ جاتی ہیں' لیکن گھر اجڑنے میں لمحہ بھی نہیں لگتا۔ اور میں نہیں چاہتا کہ تمہارا گھر اجڑے۔ کیونکہ دل آور شاہ جیسے لوگ بڑی مشکل سے ملتے ہیں۔ اور جن کو ملتے ہیں ان کو چاہیے کہ وہ ان کی قدر کریں۔ اس لیے تم بھی اس کی قدر کرو' کیونکہ اب ہم سے بھی زیادہ

تمہارے لیے اس کو اہم ہونا چاہیے۔ اسی کی عزت میں تمہاری عزت ہے اور مجھے پتا ہے کہ تم خود بھی اس چیز کو بہت اچھی طرح سے سمجھ چکی ہو' تمہیں مزید سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ شاباش۔ تم جاؤ اور خوش رہو۔"

آذر نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اسے جانے کے لیے کہا تھا اور علیزے سر جھکا کر رہ گئی تھی۔

"تھینک یو آذر بھائی۔ تھینک یو سو مچ۔" وہ آہستگی سے کہتی دروازہ کھول کر گاڑی سے اتر گئی تھی اور گلاب خان نے اسے دیکھتے ہی بڑے خوشی بھرے انداز میں گیٹ وا کردیا تھا۔ اور آذر گاڑی آگے بڑھالے گیا تھا۔

"السلام علیکم علیزے بی بی۔!" گلاب خان کے لہجے سے ہی اس کے اندر کی خوشی جھلک رہی تھی کہ وہ علیزے بی بی کو دیکھ کر کتنا خوش ہوا ہے۔

"وعلیکم السلام! کیسے ہو گلاب خان؟" علیزے بھی بڑی اپنائیت سے پوچھ رہی تھی۔

"الحمد للہ بی بی جی! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آئیں۔ آپ اندر آئیں نا۔ باہر کیوں کھڑی ہیں؟" گلاب خان نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اپنی بے پناہ خوشی اور شفقت کا اظہار کیا تھا اور علیزے۔ آہستگی سے سر جھکا کر اندر آگئی تھی لیکن اندر قدم رکھتے ہوئے اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اس گھر میں پہلی مرتبہ قدم رکھ رہی ہو۔

اور یہ تو واقعی ایک سچ تھا۔ پہلے جب وہ آئی تھی تو دل آور اسے لے کر آیا تھا' اور وہ بے ہوشی کے عالم میں یہاں آئی تھی' لیکن آج جب وہ آئی تھی تو خود اپنی رضا سے آئی تھی اور پورے ہوش و حواس میں یہاں آئی تھی اس لیے دل دھڑکنا تو ایک فطری سا عمل تھا۔

"تمہارے صاحب کہاں ہیں؟" اس نے گیراج میں محض ایک گاڑی کھڑے دیکھ کر بے ساختہ استفسار کیا تھا۔

"صبح سے آفس گئے ہوئے ہیں' ابھی تک نہیں آئے۔" گلاب خان نے نفی میں سر ہلایا۔

"کب تک آئیں گے؟" اس کی بے چینی کا عالم ہی نرالا تھا۔

"بس آجائیں گے تھوڑی دیر تک۔ آپ کہتی ہیں تو میں فون کرکے بلالیتا ہوں۔" گلاب خان نے اپنا موبائل نکالا۔

"نن۔ نہیں۔ رہنے دو ابھی وہ خود ہی آجائے گا۔" علیزے نے فوراً اسے روک دیا تھا لیکن علیزے کو دیکھ کر بل ڈوگ نے دور سے ہی بھونکنا شروع کردیا تھا کہ اسے اس کی موجودگی کا بھی پتا چل جاتا تھا۔

"ارے علیزے بی بی! یہ آپ کو دیکھ کر خوش ہورہا ہے۔" گلاب خان نے اسے متوجہ کیا تھا اور علیزے ہلکے سے مسکراتی ہوئی لان کے آخری کونے کی طرف آگئی تھی جہاں دیوار میں پیوست کھونٹے سے کسی شیر کی سی جسامت والا بل ڈوگ بندھا ہوا تھا' پہلے علیزے کو اسے دیکھ کر بہت ڈر لگتا تھا' وحشت ہوتی تھی' جھرجھری آتی تھی' لیکن آج وہ سب بھی بہت پیچھے چلا گیا تھا آج اسے دل آور شاہ کے گھر کے کتے سے بھی ایک اپنائیت اور انسیت سی محسوس ہورہی تھی۔ کیونکہ آج اس کا تن من دل آور شاہ کے نام پہ ہی مائل ہوا جارہا تھا۔

"گلاب خان۔ گلاب خان۔ کس کے ساتھ باتیں کیے جارہے ہو؟ کون آیا ہے۔" گل کوریڈور میں ہی تھی شاید اسی لیے گیٹ کھلنے کی آواز اور گلاب خان کی باتیں کرنے کی آواز سن کر رہ نہیں سکی تھی اور باہر نکل آئی تھی لیکن باہر لان میں بل ڈوگ کے قریب کھڑی علیزے کو دیکھ کر اس کی چیخ نکل گئی تھی اور وہ لپک کر علیزے کے قریب آئی تھی۔

"علیزے بی بی!" گل کا لہجہ چہک سا گیا تھا۔

"کیسی ہو گل۔؟" علیزے خود ہی اس کے گلے لگ گئی تھی۔

"آپ کیوں چلی گئی تھیں علیزے بی بی۔ کیوں چلی گئی تھیں؟ صاحب کو اکیلا چھوڑ دیا آپ نے ذرا بھی خیال نہیں آیا، بڑی بے وفا نکلی ہیں آپ۔" گل نے ایک ہی سانس میں اتنے شکوے داغ دیے تھے اور علیزے سچ مچ شرمسار سی ہو گئی تھی کہ گل ایک نوکرانی ہو کر اپنے صاحب کے لیے اتنی حساس ہو رہی ہے اور اس نے اس کی بیوی ہو کر بھی اس کا احساس نہیں کیا تھا، بے وقعت کر کے چلی گئی تھی اسے۔ "لیکن تمہارے صاحب کی وفا میں اتنا اثر ہے کہ وہ وفا مجھے یہاں کھینچ لائی ہے۔" علیزے گل کا ہاتھ تھپک کر کہتی ہوئی اندر آ گئی تھی۔

"لیکن علیزے بی بی! صاحب آپ سے صرف وفا نہیں کرتے۔ محبت بھی کرتے ہیں۔" اب کی بار گل نے بڑے کام کی بات کی تھی۔

"اچھا۔ وہ کیسے؟" علیزے کہتی ہوئی سیڑھیاں چڑھنے لگی تھی اور گل بھی اس کے ساتھ ساتھ تھی۔

"وہ ایسے کہ جب آپ کو گولی لگی تھی تو صاحب جی کو دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ پاگل ہو گئے ہیں، ادھر ادھر بھاگتے دوڑتے رہتے تھے۔ اور جب آپ اپنے میکے چلی گئی تھیں تو یوں لگتا تھا کہ صاحب جی کی دنیا ہی اندھیر ہو گئی ہے۔ کمرے میں بند ہو کر رہ گئے تھے۔"

"تم سچ کہہ رہی ہو گل" علیزے بے ساختہ ریلنگ پہ ہاتھ رکھے ٹھہر گئی اور بڑے دل سے پوچھا تھا۔

"گلاب خان کی قسم۔ میں جھوٹ کیوں بولوں گی بی بی جی! صاحب جی کو بڑا پیار ہے آپ سے۔ جب آپ چلی گئی تھیں تو اکثر اپنے کام کے لیے آپ کو ہی آواز دیتے تھے اور پھر چپ ہو جاتے تھے اور کئی بار تو مجھے ہی علیزے کہہ گئے۔ بڑی شرم آئی مجھے۔ اور بڑا ترس بھی آیا۔"

گل بھی آج بڑے دنوں بعد اس طرح کھل کے بول رہی تھی اور علیزے تو جیسے دل تھام کے رہ گئی تھی، دل اور پہ گزرنے والی کیفیات کا سن کر اس کے اپنے دل کو کچھ ہونے لگا تھا۔

"مجھے مس کرتا تھا وہ۔" علیزے دروازہ کھول کر اپنے اور دل آور کے بیڈ روم میں داخل ہوئی تھی۔

"اس دنیا میں انہوں نے صرف آپ کو ہی تو مس کیا ہے بی بی جی۔ پر مجھے لگتا ہے کہ آج رات نہیں کیا۔" گل نے کہتے کہتے نفی میں گردن ہلائی تھی۔ علیزے چونک کر متوجہ ہوئی تھی اسے گل کا آخری جملہ کرنٹ کی طرح لگا تھا۔

"تت۔۔۔ تمہیں کیسے پتا کہ اس نے آج رات مجھے مس نہیں کیا۔"

"بتاؤ نا گل تمہیں کیسے پتا کہ اس نے آج رات مجھے مس نہیں کیا۔" علیزے کی بے چینی عروج پہ تھی۔

"آج میں نے کمرے کی صفائی کی تو سگریٹ کے ٹکڑے بہت کم ملے۔ ورنہ روزانہ تو سگریٹوں کا انبار لگا ہوتا تھا، جس سے پتا چلتا تھا کہ وہ رات بھر جاگتے رہتے ہیں۔ اور آپ کو یاد کرتے رہتے ہیں۔ مگر آج۔۔۔" گل کا وہی ایک جواب تھا۔ نفی والا۔ اور علیزے اس کے مشاہدے پہ حیران رہ گئی تھی۔

"ہونہہ۔۔۔ آج رات میں نے خود اسے بہت مس کیا تھا، شاید اسی لیے اس نے مجھے مس کرنا چھوڑ دیا۔" علیزے افسردگی سے کہتی ہوئی بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔

"کوئی بات نہیں بی بی جی۔ اب آپ آ گئی ہو نا۔ اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" گل بڑے اطمینان سے کہتی نیچے قالین پہ بیٹھ گئی۔

"لیکن مجھے سب کچھ ٹھیک کرنا نہیں آتا گل۔ اور ویسے بھی وہ مجھ سے بہت زیادہ خفا ہے۔ وہ تو مجھ سے بات بھی نہیں کرے گا۔" علیزے کو اس کے کل والے تیور یاد آ رہے تھے۔

"ارے بی بی جی! آپ کو نہیں پتا۔ کوئی بھی شوہر اپنی بیوی سے زیادہ دیر خفا نہیں رہ سکتا۔ اور خاص طور پر اس وقت جب اس کی بیوی اسے منانے کے لیے خود چل کر اس کے پاس آئی ہے۔" گل آہستگی سے مسکرائی تھی مگر

علیزے ہنوز اسے نا سمجھی سے ہی دیکھ رہی تھی۔

"مگر مجھے تو منانا بھی نہیں آتا۔" وہ جھنجلا گئی تھی۔

"اچھی طرح تیار ہونا تو آتا ہے نا۔" گل نے اس کے حلیے کو دیکھ کر کہا۔

"تیار ہونا۔۔۔ کیا مطلب؟" وہ ٹھٹکی۔

"مطلب خود ہی سمجھ میں آ جائے گا۔ بس آپ نئے کپڑے پہن کر سر سے پاؤں تک تیار ہو جائیں۔ صاحب کی ناراضی آپ کو دیکھ کر ہی ختم ہو جائے گی۔ یہ بات تو میں گارنٹی کے ساتھ کہہ سکتی ہوں۔" گل کا لہجہ معنی خیز سا ہو رہا تھا اور علیزے کے چہرے پر شرم کی سرخی دوڑ گئی تھی۔

"ہم۔۔۔ مگر۔ میں ایسا نہیں کر سکتی گل۔" وہ سن کر ہی جھجک گئی تھی۔

"ارے یہ کیا بات ہوئی علیزے بی بی! صاحب آپ کے لیے اتنا کچھ کر لیتے ہیں اور آپ ان کے لیے تیار نہیں ہو سکتیں؟ بڑے افسوس کی بات ہے یہ تو۔" گل نے مایوسی اور تاسف سے کہتے ہوئے سر ہلایا تھا اور اس کے سر ہلانے کے ساتھ ساتھ علیزے کا دل بھی ہل گیا تھا۔

"اگر میں ایسا کر لوں تو کیا وہ مان جائے گا۔" اس نے بڑے اشتیاق سے پوچھا تھا۔

"ناراض رہیں گے تو نقصان اٹھائیں گے۔ فائدہ اسی میں ہو گا کہ مان جائیں۔" گل آج اسے کچھ اور ہی مشورے دے رہی تھی اور علیزے دل آور کو منانے کے لیے اتنی بے چین تھی کہ "فوراً" ہی ہر بات کے لیے مان گئی تھی۔ اور گل اٹھ کر اس کے کپڑے نکالنے لگی تھی۔

✲ ✲ ✲

دودھیا ہاتھوں پہ ریڈ کلر کی نیل پالش اس کے مخملی ہاتھوں کو اور بھی دو آتشہ بنا گئی تھی اور ابھی وہ آخری ناخن پہ نیل پالش کا آخری کوٹ لگا ہی رہی تھی کہ باہر گیٹ پہ اس کی گاڑی کا ہارن بجا تھا اور علیزے کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ نیل پالش کی شیشی اس کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچی تھی۔

"علیزے بی بی۔ صاحب جی آ گئے۔" گل علیزے کی ہدایت کے مطابق "فوراً" بھاگتی ہوئی آئی تھی اور علیزے یکدم ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"آپ چلی جائیں۔ میں بھی نیچے جا رہی ہوں۔" گل تیزی سے کہتی ہوئی شڑاپ سے کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔ اس کا رخ نیچے کچن کی طرف تھا لیکن تب تک دل آور اندر آ چکا تھا۔

"السلام علیکم صاحب!" وہ آہستگی سے بولی۔

"وعلیکم السلام!" اس نے لاپروائی سے جواب دے کر قدم آگے بڑھا دیے۔

"چائے بناؤں آپ کے لیے؟" اس نے سیڑھیوں کی طرف بڑھتے دل آور سے جان بوجھ کر پوچھا تھا۔

"نہیں بھوک لگ رہی ہے، کھانا لگا دو، میں چینج کر کے نیچے ہی آ رہا ہوں۔" وہ عجلت سے کہتا ہوا اوپر اپنے بیڈ روم میں آ گیا تھا، مگر بیڈ روم میں قدم رکھتے ہی اس کے قدم ٹھٹک گئے تھے۔

کمرے میں نیل پالش کی ایک مخصوص سی خوشبو اسے کمرے میں قدم رکھتے ہی محسوس ہو گئی تھی، حالانکہ اپنے کمرے میں یا اپنے گھر میں اس نے یہ خوشبو پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی، لیکن پھر بھی وہ اس سے انجان نہیں تھا، کیونکہ اپنے آس پاس اکثر خواتین کے پاس وہ یہ خوشبو محسوس کر چکا تھا۔

"ہو سکتا ہے کہ گل نے کمرے کی کوئی صفائی وغیرہ کی ہو۔؟" وہ خود کو خود ہی بہلاتا سر جھٹک کر آگے بڑھ کے بریف کیس ٹیبل پہ رکھ کے خود بیڈ پر بیٹھ گیا تھا اور نیچے جھک کر اپنے بوٹوں کے تسمے کھولنے لگا تھا۔ اور بوٹوں کے

تسمے کھول کے اور پاؤں بوٹوں سے آزاد کرتے ہی وہ چند سیکنڈز کے لیے بیڈ پہ ڈھیر ہو گیا تھا مگر بازو بیڈ پر پھیلاتے ہو
وہ ایک بار پھر ٹھٹکا تھا اس کے ہاتھ سے کوئی ریشمی چیز ٹکرائی تھی اور اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دی تھیں۔

وہ ریشمی چیز علیزے کا دوپٹا تھا' بلیک کلر کا انتہائی باریک شیفون کا دوپٹا۔ جس کے چاروں اطراف ریڈ کلر کے سوتی دھاگے اور چھوٹے چھوٹے نفیس نگوں کا کام بنا ہوا تھا' یہ سوٹ اسی نے علیزے کو لے کر دیا تھا جب وہ اسے پہلی بار شاپنگ پہ اپنے ساتھ لے کر گیا تھا' لیکن علیزے نے ایک بار بھی یہ سوٹ اور یہ دوپٹا استعمال نہیں کیا تھا' تو پھر آج یہ دوپٹا یہاں کیا کر رہا تھا۔؟ وہ دوپٹا ہاتھ میں لیے یکدم سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"گل۔۔ گل۔۔ کہاں ہو؟" وہ گل کو آوازیں دیتا ہوا باہر نکل آیا۔

"جج۔۔ جی صاحب؟" وہ بوکھلائی ہوئی کچن سے باہر نکلی تھی۔

"کمرے میں کوئی آیا تھا کیا؟" وہ اوپر ریلنگ کے قریب کھڑا نیچے کھڑی گل سے پوچھ رہا تھا۔

"جج جی صاحب جی۔ مم میں گئی تھی۔ علیزے بی بی کی ساری چیزیں نکال کر سیٹ کی ہیں۔ اور ابھی کر ہی رہی تھی کہ آپ آ گئے۔" گل بہانا بنا گئی تھی۔

"تو تمہیں کیا ضرورت تھی ان چیزوں کو نکال کر سیٹ کرنے کی؟ جہاں پڑی تھیں پڑی رہتیں۔ یہ چیزیں کل بھی بے کار تھیں اور آج بھی بے کار ہیں۔ چاہے یہاں رکھو۔ چاہے وہاں رکھو۔" وہ خفگی سے کہتا ہوا وہاں سے ہٹ کے دوبارہ کمرے میں آ گیا تھا اور ہاتھ میں پکڑا وہ دوپٹا دوبارہ بیڈ پہ اچھال دیا تھا اور خود واش روم میں گھس گیا تھا۔

لیکن جیسے ہی وہ واش روم سے شاور لے کر تولیہ رگڑتا ہوا باہر نکل کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آیا' اس کے دماغ میں ایک بار پھر کھدبد ہوئی تھی۔

ڈریسنگ ٹیبل پہ سامنے ہی نیل پالش' پرفیوم' ہیئر برش اور ایک باڈی لوشن پڑا ہوا تھا' جن کو دیکھ کر صاف لگ رہا تھا کہ انہیں سیٹ کر کے نہیں رکھا گیا بلکہ استعمال کیا گیا ہے۔ اور استعمال کون کر سکتا تھا بھلا؟ گل سے تو اسے ایسی امید ہی نہیں تھی اور نہ ہی وہ ایسی کوئی حرکت کر سکتی تھی۔ تو پھر کس نے کیا تھا استعمال؟ یہ سوال اس کے ذہن میں سوال ہی رہا تھا' جواب نہیں بن سکا تھا' کیونکہ جواب لیتا بھی تو کس سے۔ وہ کپڑے وغیرہ چینج کر کے نیچے آیا اور خاموشی سے کھانا کھانے لگا تھا۔

پچھلے کافی دنوں سے اس کی روٹین چلی آ رہی تھی کہ وہ کھانا کھا کر اپنے کمرے کے پچھلی سائیڈ والے ٹیرس پہ آ کھڑا ہوتا تھا جہاں سے اس کے گھر کا سوئمنگ پول ایک بہت ہی خوبصورت سا منظر پیش کرتا تھا۔ سوئمنگ پول میں پڑنے والی روشنیوں کا اثر اتنا تیز تھا کہ ان کا عکس ولی آور کے چہرے پر بھی پڑتا تھا اور پانی میں لہراتی روشنیوں کا عکس بھی لہرا رہا ہوتا تھا۔ اور اس وقت بھی ایک ایسا ہی منظر دکھائی دے رہا تھا' وہ کھانا کھا کر ٹیرس پہ نکل آیا تھا اور دونوں ہاتھ ریلنگ پہ جمائے سوئمنگ پول کی سمت دیکھنے لگا تھا۔

ابھی اسے تقریباً" پندرہ منٹ ہی گزرے تھے کہ چند ملی جلی خوشبوؤں کا اک نرم سا جھونکا اس کی سانسوں میں آ سمایا تھا اور علیزے نے دھڑکتے دل کے ساتھ اس کی پشت پہ اپنی پیشانی ٹکا دی تھی۔

"آئی مس یو ڈرائیور۔ آئی رئیلی مس یو۔" وہ عین اس کے عقب میں کھڑی اس کی پشت سے اپنی پیشانی ٹکائے بہت دھیمے اور لرزتے ہوئے لہجے میں بہت ہی معصوم سا اظہار کر رہی تھی۔ اور ولی آور کو یوں لگا تھا کہ جیسے کسی نے اسے سر سے پاؤں تک پتھر کا کر دیا ہو وہ چند لمحے اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکا تھا۔

"ڈرائیور!" علیزے نے اپنے دونوں ہاتھ بھی اس کی پشت پہ رکھ دیئے تھے' لیکن اب کی بار وہ برداشت نہیں کر سکا تھا اور یکدم اک جھٹکے سے اس کی سمت پلٹا تھا۔

"تم۔۔ تم یہاں؟" وہ غصے اور بے یقینی سے بولا تھا البتہ علیزے پہ نظر پڑتے ہی چونکا تھا' کیونکہ وہ سرتاپا اور

سے اور ہی نظر آرہی تھی۔

"یم سوری ڈرائیور۔ ایم ریئلی سوری۔" علیزے کی آواز بھرا گئی تھی۔

"تم یہاں کیوں آئی ہو ؟" وہ بہت ہی پتھریلے سے لہجے میں بولا تھا۔

"تمہارے لیے۔" علیزے نے کوئی بھی لگی لپٹی رکھے۔ اور جھجکے بغیر کہہ دیا تھا۔

"تم گئی بھی تو میرے لیے ہی تھیں نا؟" وہ تلخی سے کہتا دوبارہ ریلنگ کی سمت مڑ گیا تھا۔

"تمہارے نزدیک میرے جانے کی اہمیت ہے۔ لیکن میرے آنے کی کوئی اہمیت نہیں ہے؟" اس نے جیسے شکوہ کیا تھا۔

"جب اہمیت تھی تب تم آئی نہیں۔ اور آج جب سب کچھ ختم ہو رہا ہے تو۔۔۔" اس نے استہزائیہ سے انداز میں کہتے ہوئے سر جھٹکا تھا۔

"یہ۔ یہ۔ کک کیا کہہ رہے ہو تم تت۔۔۔ تم ایسا کچھ نہیں کروگے۔" علیزے کی زبان اور الفاظ بے ربط سے ہوگئے تھے۔

"طلاق کے پیپرز تیار ہو چکے ہیں۔ اب تمہارا اور میرا رشتہ پین سے لکھے ہوئے ایک سائن تک رہ گیا ہے۔ اور جیسے ہی یہ سائن ہوگئے۔ ہر چیز ختم۔ ہر بات ختم۔ ہر رشتہ ختم۔ پھر تم بھی آزاد۔ اور میں بھی۔ میں وہی ڈرائیور کا ڈرائیور۔ تم وہی میم کی میم۔"

وہ دانت پیس کر کہتا ہوا دوبارہ پلٹا اور اس پہ ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر مضبوط قدم اٹھاتا کمرے میں آگیا تھا۔

"میں جانتی ہوں ڈرائیور! مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی تھی۔ مجھے تم کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے تھا۔ لیکن میں کیا کرتی۔ مجھے کچھ پتا بھی تو نہیں تھا۔ میں تو ہر حقیقت سے انجان تھی۔ مجھے تو صرف وہ پتا تھا جو میرے ساتھ ہوا تھا۔ اور پھر ہم دونوں کا آپس میں رویہ بھی تو ایسا ہی تھا کہ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے ساتھ خوش نہیں تھے۔ ایسے حالات میں میرا بڑی حویلی چلے جانا کوئی بری بات نہیں تھی۔ ہاں اب اگر میں تمہیں چھوڑ کر جاؤں تو بے شک ناراض ہو جانا۔ بے شک طلاق دے دینا۔ بے شک گھر سے نکال دینا۔ لیکن اس بار۔ صرف اس بار معاف کردو۔" علیزے نے اس کے سامنے بے اختیار اپنے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

"میرے ظرف کی حد ختم ہو چکی ہے۔ تھک چکا ہوں معاف کر کر کے۔" وہ جھنجلا گیا تھا۔

"تمہارے ظرف کی حد ہماری سوچ سے بھی زیادہ وسیع ہے ڈرائیور۔ پلیز۔" وہ التجا کر رہی تھی۔

"ایم سوری۔ میرے پاس اب کوئی گنجائش نہیں ہے۔" وہ سنگدلی سے کہہ کر رخ موڑ گیا تھا۔

"پلیز ڈرائیور! مجھے وقار آفندی کی بیٹی نہیں۔ اپنی اماں کی بہو سمجھ کر معاف کردو۔"

علیزے نے کچھ اس انداز میں اور کچھ ان الفاظ میں التجا کی تھی کہ دل آور کو کھڑے کھڑے کرنٹ چھو گیا تھا ایک تو اس نے بات ہی ایسی کہہ دی تھی اور دوسرے اس نے اس کے سامنے ہاتھ بھی جوڑ رکھے تھے۔ اس کا پتھر ہوا کلیجہ ایک بار پھر تڑخ گیا تھا۔ اس نے علیزے کو بڑی کاٹ دار نظروں سے دیکھا تھا۔

"ٹھیک ہے میں معاف کر دیتا ہوں لیکن میری کچھ شرائط ہیں کیا وہ پوری کر سکو گی تم؟"

وہ عین اس کے سامنے کھڑا اس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے پوچھ رہا تھا اور علیزے اب اس اسٹیج پہ پہنچ چکی تھی کہ اس نے ذرا سی بھی تاخیر کیے بغیر اور کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر فوراً "ہاں" بھرلی تھی۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

☼ ☼

نبیلہ عزیز

دردِ دل

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور جلیز۔ ے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نبیل حیات دو ہی بہن بھائی ہیں' مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے' وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پہ رنگ چکی ہے' جس کے پیش نظر فائزہ بیگم' نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں' لیکن مدحیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے' جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے' مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصے سے نوکری کی تلاش میں ہے' مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا' بے بسی اور مجبوری سے تنگ آ کر خود کشی کرنے کا سوچتا ہے' لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باؤ امتیاز مل جاتا ہے' جو اسے کام کی آفر کرتا ہے' جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے' اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے' وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے' وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے' وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے' اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا' اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔

"ہاں! کروں گی پوری، ضرور کروں گی، تم شرائط رکھو تو سہی؟" علیزے تو جی جان سے رضامند تھی۔
"سوچ لو... ایک بار پھر سوچ لو۔" وہ سنجیدگی سے کہتا عین اس کے سامنے آرکا تھا۔
"پچھلے چوبیس گھنٹوں سے تمہارے سوا اور کوئی سوچ آہی نہیں رہی میں اور کیا سوچوں؟"
وہ اپنے سامنے کھڑے دل آور کو اس نظر سے دیکھ رہی تھی، جس سے اسے یقین تھا کہ وہ اسے کھڑے کھڑے فتح کرلے گی۔ کیونکہ اس کی یہ نظر زندگی کی پہلی ایسی نظر تھی، جس سے وہ کسی مرد کو دیکھ رہی تھی تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ مرد اس کی اس مخمور نظر سے بچ جاتا... اور اس پہ اثر نہ ہوتا۔
"ساری دنیا سے ناتا توڑ لوگی؟ میری خاطر؟ یہاں تک کہ بڑی حویلی والوں سے بھی...؟" وہ اس کے چہرے پہ نظریں جمائے ہوئے پوچھ رہا تھا۔
"ہاں... توڑ لوں گی... سب سے توڑ لوں گی... تم سے ناتا جوڑنے کی خاطر میں سب سے ناتا توڑنے کی ہمت رکھتی ہوں... کیونکہ اگر میری مما آسیہ آفندی اپنے ہزبینڈ کی خاطر ملک حویلی والوں کو چھوڑ سکتی ہیں تو میں بھی چھوڑ سکتی ہوں... بلکہ یہ کہنا بھی ٹھیک ہی ہوگا کہ میں بھی اس وقت بڑی حویلی والوں کو چھوڑ کر ہی آگئی ہوں... وہ بھی صرف تمہاری خاطر..."
علیزے نے بڑے سکون اور بڑے اطمینان سے اسے جواب دیا تھا۔ مگر اس کے اس ایک جواب سے دل آور کی تسلی نہیں ہونے والی تھی... وہ کچھ اور بھی سننا چاہتا تھا۔
"تو کیا ساری دنیا سے کٹ کے رہ لوگی؟ اتنا حوصلہ ہے تم میں؟" وہ بھی جواباً" سنجیدگی سے ہی پوچھ رہا تھا۔ "مجھے اتنا حوصلہ بخشنے والے بھی تو تم ہی ہو نا؟ میں ساری دنیا سے کٹ کے رہ سکتی ہوں یا نہیں یہ بات تم سے بہتر کوئی بھی نہیں جانتا... ہاں یہ بات اور ہے کہ اب کی بار تو میں خود چاہتی ہوں کہ تم مجھے ساری دنیا سے کاٹ کر سب سے الگ بیسمنٹ میں قید کر رکھو... جہاں تمہارے سوا کسی کا بھی آنا جانا نہ ہو... جہاں صرف علیزے ہو... اور اس کا ڈرائیور ہو۔"
علیزے کے ایسے بہکے بہکے سے جواب پہ دل آور کے دل کو کچھ ہوا تھا اور اک منہ زور جذبات کی لہر اس کی نس نس میں دوڑ گئی تھی کیونکہ وہ بڑے ہی اعتماد سے اپنے اور اس کے بیچ کے فاصلے مٹا کر اک بالکل ہی نئی اور لودیتی قربت کا حصار سا باندھتی جارہی تھی۔
"میری بیوی بن کر رہوگی؟ یا میری اماں کی بہو؟" وہ دو قدم اٹھاتا مزید اس کے قریب آگیا تھا۔
"تمہاری اماں کی بہو بن کر رہوں۔" علیزے کے پاس تو ہر جواب پہلے سے تیار تھا۔
"وہ کیوں؟" اس کی نظریں دل آور کی سوالیہ نظروں سے لپٹ کر جھک گئیں۔
"کیونکہ تمہاری اماں کی بہو بننے میں بڑا فائدہ ہے۔" اس کے شفاف ہونٹوں پہ بکھرتی مدھم مسکراہٹ دل آور کی نظروں سے مخفی نہیں رہ سکی تھی۔
"کیسا فائدہ؟" وہ مزید آگے بڑھا۔
"تمہاری اماں کی بہو بنوں گی تو میرا تم پہ رعب رہے گا... اور اگر تمہاری بیوی بن کے رہوں گی تو تمہارا مجھ پہ رعب رہے گا... اور اس رعب کی وجہ سے میں ہمیشہ تم سے ڈرتی ہی رہوں گی۔" وہ بڑی دور کی سوچیں سوچ رہی تھی۔
"رعب تو تم مجھ پہ ہمیشہ سے جماتی ہو... ہمیشہ تم نے مجھے ڈرائیور سمجھا ہے 'دل آور' نہیں۔" وہ اور آگے بڑھا... اور علیزے اسے اپنے اتنے قریب دیکھ کر بے ساختہ جھجک کر دو قدم پیچھے ہٹی تھی۔
"تمہیں کیا پتا کہ اس ڈرائیور میں کیا چھپا ہے؟" وہ بے ساختہ مسکرا اٹھی۔

"کیا چھپا ہے؟" اس کی نظریں علیزے کے چہرے پہ گہری ہوگئیں۔
"دل آور..." اس کے ہونٹ دھیمے سے کپکپائے۔
"اور دل آور میں کیا چھپا ہے؟" اس کے چھوٹے چھوٹے سوال بڑھتے جارہے تھے۔
"علیزے کی محبت..." علیزے بھی بڑے جم کے جواب دے رہی تھی۔
"تو پھر اس محبت سے دور کیوں ہٹ رہی ہو؟ قریب آؤ نا۔" دل آور نے ہاتھ بڑھا کے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔
"قریب ہی تو آنا چاہتی ہوں۔" علیزے کی آواز لرز گئی تھی۔
"کتنا قریب؟" دل آور کی آواز کی گمبھیرتا بھی کچھ کم نہیں تھی۔ علیزے کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوگئیں اور اس کی دھڑکنوں سے جیسے پورا ماحول ہی دھڑک اٹھا تھا۔ کمرے میں فسوں خیزی بڑھنے لگی تھی۔
"اتنا قریب کہ درمیان کچھ نہ رہے..." علیزے کہتی ہوئی اس کے قریب ہوئی تھی۔
"یہ قریب ہونا بھی کوئی قریب ہونا ہے؟" دل آور فی الحال اسے شرم دلا رہا تھا کیونکہ ان دونوں کے بیچ ایک قدم کا فاصلہ اب بھی حائل تھا اور وہ یہ فاصلہ بھی نہیں چاہتا تھا۔
"تو پھر کیسا قریب ہونا 'قریب ہونا ہوتا ہے؟" وہ جھجکتے ہوئے بولی۔
"یہ تو تمہیں پتا ہونا چاہیے۔" دل آور فوراً" ہی لاپروا سا بن گیا تھا۔ جس پہ علیزے کو اس کی لاپروائی دیکھتے ہوئے خود ہی جھجک کا دامن چھوڑنا پڑا تھا اور وہ اپنے اور اس کے بیچ کا فاصلہ مٹاتے ہوئے بے حد آہستگی سے اس کے سینے سے لگ گئی تھی اور دل آور کو یوں لگا جیسے اس کی صدیوں سے بھٹکتی اور تڑپتی روح کو قرار مل گیا ہو، جیسے ایک دم سے ہر چیز شانت ہوگئی ہو۔ جیسے اس کی ذات پہ چھائے عذاب پل میں چھٹ گئے ہوں۔
اور اس عذاب سے نکلتے ہی اس کی روح ہلکی پھلکی سی ہوگئی تھی۔ اس کا تن من سرشار سا ہوگیا تھا اور اسی سرشاری اور خماری کے ہاتھوں بہکتے ہوئے اس نے اپنے سینے سے لگی علیزے کو اپنے مضبوط بازوؤں کے شکنجے میں انتہائی زور سے بھینچ لیا تھا۔ اتنے زور سے کہ علیزے کو لگا وہ اس کے سینے میں پیوست ہوجائے گی۔
"اور زور سے..." علیزے کی پسلیاں ٹوٹنے کو تھیں، مگر پھر بھی وہ چاہتی تھی کہ وہ اسے زور سے بھینچنے کی حد کر ڈالے۔
"مرجاؤ گی۔" وہ اس کے کان کے قریب سرگوشی سے بولا۔
"مرجانے دو۔" وہ اس سے بھی زیادہ سرگوشی سے بولی تھی۔
"ایک بار پھر سوچ لو۔" وہ اسے اپنی بانہوں میں بھرتے ہوئے اور بھینچتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔
"سوچ کر ہی تو آئی ہوں۔" علیزے نے کہتے ہوئے اس کے گریبان میں چہرہ چھپا لیا تھا اور اس کے چہرے کا لمس دل آور کے سینے سے ٹکرانے لگا تھا جس سے دل آور کی رگوں میں سر پٹختا جذبات کا جنون اور بھی منہ زور ہونے لگا تھا۔
"میرے جذبات کی شدتوں کو سہہ نہیں پاؤں گی۔" اس نے علیزے کو بازوؤں کے حصار سے آزاد کرتے ہوئے اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر عین اپنے چہرے کے سامنے کرلیا تھا۔
"تم اپنی شدتیں آزماؤ تو سہی۔" علیزے کا لہجہ بھی بوجھل ہورہا تھا اور اس کے الفاظ بھی...
"میری شدتوں سے پہلے میری شرائط تو تم نے سنی ہی نہیں۔" وہ اپنے ہاتھوں کے انگوٹھوں سے علیزے کے رخساروں کو سہلا رہا تھا۔
"مجھے تمہاری کسی بھی شرط سے انکار نہیں... چاہے تو سائن کروالو۔"

"سائن بھی کرواؤں گا۔ مگر آخری شرط کے بعد۔ جو سب سے زیادہ اہم ہے۔"
"آخری شرط؟ وہ کیا؟" علیزے کو حیران ہوئی۔
"بتادوں؟" وہ تصدیق چاہ رہا تھا۔
"ہاں۔" اس نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔
"میں چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے محبت کرو۔ اور اتنی شدید محبت کرو کہ باقی ہر شے کو بھول جاؤ۔ یہاں تک کہ اپنے آنے والے بچوں کو بھی۔" دل آور کی شدتیں اس کے اظہار اور اس کے الفاظ سے ہی ظاہر ہو رہی تھیں۔
"بچوں کو بھی؟ تو پھر ان سے محبت کون کرے گا؟" علیزے کو خفگی ہوئی تھی۔
"میں کس لیے ہوں آخر؟ میں کروں گا ان سے محبت۔ تم صرف مجھ سے محبت کرو گی صرف مجھ سے۔ شرط منظور ہے تو بات کرو۔" دل آور کی نظریں اس کے چہرے کے اک اک نقش کو چھو رہی تھیں اور لو سے دے رہی تھیں۔
"لاؤ کاغذ قلم۔ میں سائن کرتی ہوں۔" وہ یہ شرط ماننے کو بھی تیار تھی۔
"کاغذ قلم لانا ضروری تو نہیں۔ سائن تو تم کسی بھی جگہ کسی بھی چیز پہ کرسکتی ہو۔ بلکہ یوں کہنا ٹھیک ہوگا کہ مہر بھی لگا سکتی ہو۔" دل آور کا اشارہ اس کے گلابی شفاف ہونٹوں کی طرف تھا اور علیزے اس کا اشارہ سمجھ کر بے ساختہ بدک گئی تھی۔
"لیکن ڈرائیور۔" اس نے احتجاجاً کچھ کہنا چاہا تھا۔
"اب تم محبت کی ہامی بھر چکی ہو۔" دل آور نے کہتے ہوئے اسے کچھ بھی کہنے کی مہلت نہیں دی تھی اور اس کے سارے احتجاج اور سارے الفاظ اپنے ہونٹوں میں سمیٹ لیے تھے اور وہ بھی اتنی شدت سے کہ علیزے اس کی شرٹ اپنی مٹھیوں میں دبوچتی رہ گئی تھی۔ لیکن پھر بھی اپنا آپ چھڑا نہیں سکی تھی۔
"ڈرائیور۔" بڑی مشکل سے بڑی دیر بعد اس کے کھوئے ہوئے الفاظ واپس آئے تھے اور وہ بڑی کوششوں کے بعد کچھ کہنے کے قابل ہوئی تھی۔
"جی ڈرائیور کی جان۔ کہو۔ میں سن رہا ہوں۔" اس نے چکراتی ہوئی علیزے کو ایک بار پھر بانہوں میں لے لیا تھا اور اس کے بعد بے حد سلکی بالوں میں ہاتھ پھنساتے ہوئے انہیں سہلایا تھا۔
"میں رات بھر نہیں سوئی۔ مجھے نیند آرہی ہے۔" وہ بیڈ پہ لیٹنا چاہتی تھی۔
"میرا بھی یہ حال ہے۔" وہ گمبھیر آواز میں کہتا اس کے بالوں کو اور گردن کو نرمی سے چھو رہا تھا اور اپنا چہرہ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔
"تو پھر سونے دو نا مجھے؟" علیزے ــــــــ اس کی سانسوں کے لمس سے کسمسائی تھی۔
"آؤ سلاتا ہوں تمہیں۔" وہ اسے یوں ہی بانہوں میں لیے بیڈ پہ بیٹھ گیا تھا اور بے حد نرمی اور بے حد آہستگی سے اسے بیڈ پہ لٹا بھی دیا تھا۔
"اور تم؟" علیزے کو اب اس کا خیال آیا تھا۔
"تم بتاؤ۔ میں کیا کروں؟ جاگتا رہوں یا سو جاؤں؟" وہ اس کے دائیں بائیں بیڈ پہ دونوں ہاتھ جمائے اس کے اوپر ذرا سا جھکا ہوا تھا۔
"سو جاؤ۔" علیزے نے کہتے ہوئے اس کے گلے میں بازو حمائل کردیے تھے۔
"میں پاگل نہیں ہوں کہ آج کی رات بھی سو جاؤں۔" وہ استہزائیہ سے لہجے میں بولا تھا۔
"کیوں؟ آج کی رات کیوں نہیں سو سکتے؟" وہ ناسمجھی سے بولی۔

"کیونکہ آج کی رات میرے پاس، میرے سامنے، میری بانہوں میں میرے جاگنے کا سامان موجود ہے۔ آج کی رات سونے سے تو بہتر ہے کہ میں اپنی کنپٹی پہ ریوالور رکھ کے گولی ماروں اور مر جاؤں۔"
"پلیز۔ ایسا تو مت کہو۔" علیزے نے بے ساختہ تڑپ کر اس کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا تھا۔
"تو پھر سلانا کیوں چاہتی ہو؟" وہ مصنوعی خفگی سے بولا۔
"میں کب سلانا چاہتی ہوں؟ میں تو چاہتی ہوں کہ تم خود بھی جاگو اور مجھے بھی جگاؤ۔" بے حد دھیمی آواز میں کہتے ہوئے اس نے پلکیں جھکالی تھیں اور دل آور بے ساختہ چلا اٹھا تھا۔
"علیزے۔" وہ انتہائی زور سے اور انتہائی خطرناک تیوروں سے دھاڑا تھا اور علیزے کھلکھلاتی ہوئی چہرہ چھپا گئی تھی، کیونکہ دل آور اب پوری طرح سے اس پہ حاوی ہوچکا تھا اور وہ بے تحاشا ہنستی ہوئی اور کھلکھلاتی ہوئی اس سے بچنے کی کوشش کر رہی تھی اور اس کی کھلکھلاہٹوں سے پورا کمرہ گونج رہا تھا۔

"پلیز ڈرائیور پلیز۔ بس کرو۔ میں پاگل ہوجاؤں گی۔" علیزے اپنے چہرے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے احتجاجاً چلائی تھی۔ کیونکہ دل آور نے اسے واقعی پاگل کر ڈالا تھا۔ وہ چند جسارتوں پہ ہی بوکھلا گئی تھی۔
"اوکے۔ اوکے۔ اب کچھ نہیں کرتا۔ تم بس مجھے سلانے کی کوشش کرو۔ اور میں تمہیں جگانے کی کوشش کرتا ہوں۔" وہ معنی خیزی سے کہتا اس کے چہرے کے قریب جھک آیا تھا۔ اتنا کہ ان کی سانسیں ایک دوسرے میں رچنے لگی تھیں۔ جس پہ ان دونوں کے ہی اعصاب اک عجب سے سحر کی زد میں آگئے تھے۔
"کیا مطلب؟" علیزے کے حواس بکھرنے لگے تھے۔ اس کا لہجہ اور اس کی آواز دل آور کو پاگل کرنے کے لیے کافی تھے اور اس کے صبر اور ضبط کا دامن چھوٹنے لگا تھا۔
"آج کی شب میری بانہوں میں رہو، سارے مطلب سمجھاؤں گا۔" وہ سرگوشی سے کہتا لیمپ کی تیز روشنی گل کرچکا تھا اور علیزے نے بڑے سکون سے اور پوری آمادگی کے ساتھ ایک گہری سانس کھینچتے ہوئے خود کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس ــــ کے حوالے کردیا اور اس کی اس سپردگی پہ کب سے ٹھہری ہوئی کالی رات بھی مسکرا اٹھی تھی۔
کیونکہ ان کا یہ ملن بڑے صبر، بڑی برداشت اور بڑے ضبط کے بعد ہوا تھا۔ بڑی اذیتیں اور بڑے عذاب جھیلے تھے انہوں نے۔ اس لیے اس وصال کی رات پہ تو اب پورا پورا حق تھا ان کا اور اس حق کو پورے استحقاق سے وصول کرنے میں وہ دونوں ہی گم تھے۔ اس طرح کہ کائنات کا باقی ہر احساس ہی پس پشت ڈال دیا تھا۔ سوائے ایک دوسرے کے۔ کیونکہ اس وقت علیزے کے لیے اس کا ڈرائیور۔ اور ڈرائیور کے لیے اس کی علیزے ہی کل کائنات تھی۔

✡ ✡ ✡

دل کی پوچھتے ہو تو پھر سن لو
ہم نے بخشا تمہیں قیامت تک

وہ کپڑے چینج کرکے فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد بیڈ روم سے باہر نکل آئی تھی۔ حالانکہ سیڑھیاں اترتے ہوئے اور چڑھتے ہوئے اسے اب بھی بڑی دقت ہوتی تھی، مگر آج اس کا موڈ فریش اور خوشگوار تھا۔ اس لیے وہ دقت کے باوجود بھی ریلنگ کا سہارا لے کر سیڑھیاں اتر آئی تھی۔ اس کا رخ باہر لان کی طرف تھا۔
اور شبنم آلود گھاس پہ پاؤں رکھتے ہی اس کی روح سرشار ہو اٹھی تھی۔ اس کا من صبح کی ایسی تازگی پہ جھوم گیا

تھا اور وہ آہستہ آہستہ پھولوں کی کیاریوں کے پاس چلتی چند نوخیز پھولوں کو چن چن کر اپنی جھولی میں بھرنے لگی تھی اور اپنی بے دھیانی میں اسے پتا ہی نہ چلا کہ اس نے کتنے ہی پھول چن ڈالے تھے۔

"زری! تم یہاں۔۔۔ تم خود آئی ہو کیا؟" نگارش بھی تھوڑی دیر بعد نماز وغیرہ سے فارغ ہو کر نیچے آگئی تھی اور نیچے لان میں ٹہلتی زری کو دیکھ کر وہ سخت حیرانی اور خوشگواریت کا شکار ہوئی تھی۔

"ہاں میں۔۔۔" زری مسکراتی ہوئی اس کی طرف پلٹی۔

"لیکن تم یہاں کیسے؟" نگارش کو واقعی حیرت ہو رہی تھی کیونکہ زری ابھی بھی چلتے ہوئے لڑکھڑا جاتی تھی۔ اس کے قدم ابھی جم نہیں رہے تھے اور نہ ہی ان کی مضبوطی قائم ہو رہی تھی۔

"میں یہاں خود آئی ہوں۔۔۔ بغیر کسی سہارے کے۔۔۔" زری نے خوشی خوشی بتایا تھا۔

"لیکن کیوں زری؟ تم نے ایسا رسک کیوں لیا؟ اگر تم سیڑھیوں سے گر جاتیں تو۔۔۔؟" نگارش کو سوچ کر ہی جھرجھری سی آگئی تھی۔

"ارے ڈونٹ وری بھابھی۔۔۔ کچھ نہیں ہوتا۔۔۔ میں نے یہ رسک اپنے آپ کو آزمانے کے لیے لیا ہے۔۔۔ اپنی ہمت اور اپنا حوصلہ دیکھنے کے لیے کیا ہے یہ سب۔۔۔ اگر آج میں کسی قدم پہ گر جاتی تو آپ نہیں جانتیں کہ میں زندگی بھر اٹھ نہیں سکتی تھی۔۔۔ سنبھل نہیں سکتی تھی۔۔۔ اپنے پیروں پہ چل نہیں سکتی تھی۔۔۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔۔۔ میں کہیں بھی نہیں گری۔۔۔ اس لیے سمجھ لیں ——— کہ سنبھل گئی ہوں۔۔۔ اور چلنے پھرنے کے قابل ہو گئی ہوں۔۔۔ میرے قدم کمزور نہیں رہے۔۔۔ مضبوط ہو گئے ہیں۔۔۔ اب میں کسی بھی سہارے کے بغیر چل سکتی ہوں۔۔۔ اکیلی چل سکتی ہوں۔۔۔ خود اکیلی۔۔۔" زری نے کچھ اس انداز اور الفاظ میں اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ نگارش فوراً ہی چونک گئی تھی۔۔۔ "کیا بات ہے؟ تم ایسا کیوں کہہ رہی ہو؟ کیا ہوا ہے؟" نگارش پوچھے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

"میں اس لیے ایسا کہہ رہی ہوں کہ میں آج بہت خوش ہوں۔۔۔ بہت زیادہ خوش۔۔۔" زری کی خوشی ایسی تھی کہ اس کے لہجے سے بھی جھلک رہی تھی۔

"کیوں۔۔۔؟ ایسا کیا ہوا ہے آج کہ تم اتنی خوش نظر آرہی ہو؟" نگارش کو حیرت پہ حیرت ہو رہی تھی۔

"کیونکہ علیزے دل آور شاہ کے پاس واپس آگئی ہے۔۔۔ اپنے گھر۔۔۔ اپنے شوہر کے پاس۔۔۔ اور مجھے اس کے آجانے کی بہت خوشی ہوئی ہے۔۔۔ کیونکہ ان دونوں کا گھر ٹوٹنے سے بچ گیا ہے۔۔۔ اور دل آور شاہ کو اس کی علیزے واپس مل گئی ہے۔۔۔ اسی لیے آج فجر کی نماز کے بعد صرف ان دونوں کے لیے ہی دعا کی ہے کہ اللہ ان کا یہ ساتھ ہمیشہ سلامت رکھے۔ میری پھوپھو کی علیزے ہمیشہ سہاگن رہے' آباد رہے' اور ان کی جھولی ایسے خوب صورت پھولوں سے بھر دے۔"

زری نے کہتے ہوئے اپنی جھولی میں بھرے پھولوں کو بڑی نرم نگاہوں سے دیکھا تھا اور سارے پھول نگارش کی جھولی میں ڈال دیے تھے اور خود دھیمے قدم اٹھاتی اندر کی طرف بڑھ گئی تھی۔

"بھابھی! میں سوچ رہی تھی کہ ہم نبیل حیات اور دل آور شاہ کو کھانے پہ انوائیٹ کرتے ہیں۔ اس طرح انہیں اپنی اپنی فیملیز کے ساتھ آنے کا موقع مل جائے گا اور عبداللہ بھائی بھی اپنے دوستوں سے مل کر خوش ہو جائیں گے۔ کیا خیال ہے آپ کا؟" وہ جاتے جاتے پلٹی تھی اور جواباً نگارش محض سر ہلا کر رہ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

انا پرست ہوں

ضدی ہوں
سرپھرا ہوں
مگر مجھے تمہاری محبت بدل بھی سکتی تھی

رات بہت دیر تک جاگنے کی وجہ سے صبح اس کی آنکھ بھی بہت دیر سے ہی کھلی تھی اور آنکھ کھلتے ہی اس کی پہلی نظر دل آور کے سوئے ہوئے چہرے پہ پڑی تھی۔ جس کی وجہ سے اس کا دل بڑے زور سے اور بڑے بے ساختہ انداز میں دھڑکا تھا' کیونکہ اس کا چہرہ علیزے کے چہرے سے بے حد قریب تھا اور اسے اتنے قریب سے پہلی مرتبہ دیکھنے کی وجہ سے اس کے دل میں عجیب عجیب سے جذبات ابھرنے لگے تھے اور عجیب عجیب سے خیالات آنے لگے تھے اور تب اسے احساس ہوا تھا کہ واقعی محبت کیا کچھ نہیں بدل سکتی؟ محبت انسان کی نفرت کو بھی محبت میں بدل سکتی ہے اور اس کا ادراک اسے کل شب دل آور شاہ کا محبت بھرا روپ دیکھ کر ہی ہو گیا تھا۔

"ڈرائیور۔۔۔" علیزے نے اس کی پیشانی پہ بکھرے بالوں کو بے حد آہستگی سے پیچھے ہٹاتے ہوئے سرگوشی نما آواز میں اسے پکارا تھا۔

"ہوں۔۔۔ بولو۔۔۔ کیا دیکھ رہی ہو؟" دل آور یوں ہی آنکھیں بند کیے بولا تھا اور علیزے اس کے اتنے اطمینان سے بولنے پہ بدک گئی تھی۔

"تم جاگ رہے ہو؟" علیزے کا دل اور بھی بری طرح دھڑکا تھا۔

"سوئے ایک ساتھ تھے تو جاگنا بھی تو ایک ساتھ ہی تھا نا؟" دل آور نے آنکھیں کھولتے ہوئے اسے بازو کے حصار میں لے کر اپنے قریب کھینچ لیا تھا۔

"تمہاری زندگی کی اک نئی صبح مبارک ہو تمہیں۔" علیزے نے پلکیں جھکائے اس کے سینے پہ انگلی پھیرتے ہوئے کہا تھا اور دل آور اس کی اس شرمیلی سی ادا پہ مسکرا دیا تھا۔

"اور تمہیں بھی۔۔۔" اس نے اس کی پیشانی پہ ہونٹ رکھ دیے تھے اور علیزے نے روح تک شانت ہوتے ہوئے پلکیں موند لی تھیں۔

"بڑی حویلی چلو گی؟" دل آور نے بہت سکون سے سوال کیا تھا' مگر علیزے نے پٹ سے آنکھیں کھول دی تھیں۔

"کیا؟ بڑی حویلی؟" اسے شدید ترین حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔

"ہاں۔۔۔ بڑی حویلی۔۔۔" مگر اس کا اطمینان ہنوز تھا۔

"مگر ڈرائیور۔۔۔" اس سے بات کرنا ہی مشکل ہو گیا تھا۔

"دیکھو علیزے۔۔۔ اگر میری اماں تمہاری خاطر وقار آفندی کو معاف کرنے کا حوصلہ کر سکتی ہیں تو پھر تمہاری خاطر یہ حوصلہ میں بھی کر سکتا ہوں۔۔۔ معاف کروں گا تو پوری طرح سے کروں گا' کوئی کم ظرفی نہیں دکھاؤں گا۔۔۔ البتہ رات کو میں نے تم سے جو کچھ بھی کہا وہ بس تمہیں جان بوجھ کر ڈگمگانے کے لیے اور آزمانے کے لیے کہا تھا کہ تم میرے لیے کس حد تک جا سکتی ہو؟ یا پھر تمہارے اندر میرے لیے کتنا احساس باقی ہے؟ تم مجھ سے محبت بھی کر سکتی ہو یا صرف مجھ سے ہمدردی محسوس کرتے ہوئے یہاں تک آ گئی ہو؟ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔۔۔ تم ڈگمگائی نہیں اور نہ ہی تمہیں مجھ سے ہمدردی ہوئی ہے۔۔۔ بلکہ تم یہاں تک میری محبت اور میرے احساس میں آئی ہو۔۔۔ کیونکہ مجھے پتا ہے کہ کسی کی محبت دل میں ساری عمر دبائے رکھنے والے بھی اک دن برداشت کا دامن چھوڑ دیتے ہیں اور کھل کے سامنے آ جاتے ہیں۔۔۔ اور محبت جاگنے میں تو صرف اک لمحہ لگتا ہے۔۔۔ اور وہ لمحہ ہی پوری زندگی پہ حاوی ہو جاتا ہے۔

اس لیے یہ بات اچھی طرح سمجھ لو۔۔۔ کہ میں تمہیں کبھی بھی قید کر کے یا دنیا سے کاٹ کے نہیں رکھوں گا' بلکہ تم اپنی پوری آزادی سے' اپنی مرضی سے اور اپنی حکمرانی سے زندگی جیو گی۔۔۔ یہ گھر تمہارا ہے۔۔۔ میں تمہارا ہوں اور میرا سب کچھ تمہارا ہے۔۔۔ تم جو چاہو کر سکتی ہو' کیونکہ اب تم مالک ہو' میری بھی اور میری ہر چیز کی بھی۔" دل آور نے کوئی بھی لگی لپٹی رکھے بغیر صاف صاف کہہ دیا تھا اور علیزے بے ساختہ اٹھ بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔

"لیکن ڈرائیور۔۔۔ میں بڑی حویلی نہیں جانا چاہتی۔" اس نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"کیوں؟ کیوں نہیں جانا چاہتیں؟" وہ بھی اس کے برابر ہی اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

"کیونکہ اس طرح جانے سے نہ تمہاری عزت' عزت رہے گی اور نہ میری۔"

"تو پھر۔۔۔" دل آور سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"اگر بڑی حویلی والوں کو ہماری کوئی قدر یا ضرورت ہوئی تو انہیں ہمارے گھر خود آنا ہو گا۔۔۔ ہمیں اپنے گھر بلانا ہو گا۔۔۔ ورنہ اس طرح بن بلائے میں بھی نہیں جاؤں گی' کبھی بھی نہیں۔"

اس نے سختی سے کہتے ہوئے انکار کر دیا تھا اور دل آور اس کا اتنا عقل مندانہ فیصلہ سن کر پہلے چند سیکنڈز کے لیے چپ ہوا تھا۔ پھر حیران ہوا تھا اور پھر بے ساختہ مسکرا دیا تھا۔

"اس کا مطلب ہے کہ بہت سیانی ہو گئی ہو؟" وہ اسے قریب کرتے ہوئے بولا تھا۔

"جو عورت اپنے گھر اور اپنے شوہر سے محبت کرنا جان لیتی ہے نا۔۔۔ وہ سیانی ہو ہی جاتی ہے۔" علیزے اس وقت خالصتاً "بیویوں" والے روپ میں نظر آ رہی تھی اور دل آور کے دل میں عجیب شرارتی سی کھدبد ہونے لگی تھی۔

"نہ کرو یار نہ کرو۔۔۔ تمہاری ایسی محبت پاش باتوں سے مجھے پھر سے نشہ ہونے لگے گا۔۔۔ اور میں بھول جاؤں گا کہ اس وقت صبح ہے یا رات؟" وہ بے حد گمبھیر لہجے میں کہتے ہوئے اس کے سلکی بالوں میں چہرہ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا اور علیزے اس کے گمبھیر لہجے اور اس کی بات کے مفہوم سے ہی چونک گئی تھی اور یکدم بدک کر بیڈ سے اٹھ بھی گئی تھی۔ جس پہ دل آور قہقہہ لگا کر ہنستا رہ گیا تھا اور واش روم میں گھس گئی تھی' لیکن دو سیکنڈ بعد وہ دروازہ کھول کر ذرا سا باہر جھانکتے ہوئے مخاطب ہوئی تھی۔۔۔ مگر بڑے ہی شریر سے انداز میں۔۔۔

"سوری ڈرائیور۔۔۔ ایک بات تو میں نے کہی ہی نہیں۔۔۔ حالانکہ رات سے کہنے کی کوشش کر رہی تھی۔"

"کیا بات؟" وہ بھی کمبل ہٹا کر بیڈ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"یہی کہ۔۔۔" وہ اٹکی۔

"کیا یہی کہ؟" وہ متجسس ہوا۔

"آئی۔۔۔ رئیلی۔۔۔ لو۔۔۔ یو۔۔۔" وہ ایک ایک لفظ بڑا ٹھہر ٹھہر کر بولی تھی اور دل آور پیروں میں سلیپر پہننا بھول گیا تھا۔

"کیا۔۔۔ کیا کہا؟ ایک بار پھر کہو؟" وہ واش روم کی طرف پلٹتے ہوئے بولا۔

"آئی لو یو۔۔۔ آئی۔۔۔ رئیلی۔۔۔ لو۔۔۔ یو۔۔۔" وہ پھر بولنے سے باز نہیں آئی تھی۔

"ذرا قریب آ کر کہو۔۔۔ کیا کہہ رہی ہو؟" وہ دبے قدموں واش روم کی طرف بڑھا تھا اور علیزے اس کے جھپٹنے کا ارادہ بھانپتے ہی یکدم کھلکھلاتے ہوئے دروازہ بند کر چکی تھی اور دل آور ہاتھ ملتا رہ گیا تھا۔

"علیزے۔۔۔" وہ جھنجلایا تھا۔

"جی علیزے کی جان۔۔۔ سن رہی ہوں۔" علیزے نے اندر سے ہی بڑے محبت بھرے انداز میں پوچھا تھا۔

"باہر آؤ۔۔۔ مجھے بھی کچھ کہنا ہے۔" وہ واش روم کا دروازہ بجاتے ہوئے بولا۔

"شاور لے لوں۔۔۔ پھر آجاؤں گی۔" وہ بھی وہیں سے ہی جواب نواز رہی تھی۔

"بعد میں لے لینا۔۔۔ پہلے میری بات تو سن لو۔۔۔" وہ خفگی سے کہہ رہا تھا' لیکن اندر اب پانی کی آواز کے سوا خاموشی چھا گئی تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ شاور لینا اسٹارٹ کر چکی ہے' جب ہی دل آور غصے سے دروازے کو گھورتا پلٹ گیا تھا۔

"باہر آؤ۔۔۔ پھر پوچھتا ہوں تمہیں۔" اس کی مصنوعی دھمکی پہ علیزے کے ہونٹوں پہ بھی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

جورت کے کارنامے کا سن کر بڑی حویلی والوں کو ایک بار پھر سانپ سونگھ گیا تھا اور وہ اپنی اپنی جگہ پہ سن سے ہو کر رہ گئے تھے۔ جبکہ آذر اپنے پورے ہوش و حواس میں ان سب سے یکسر مختلف کیفیت میں گھرا اپنے خیالات اور آئندہ کے لیے لائحہ عمل سے آگاہ کر رہا تھا۔

اور اس کا پہلا اعلان یہی تھا کہ کوئی بھی تاخیر کیے بنا آج شام پوری تیاری سے شگن لے کر مریم آفندی کے گھر جایا جائے۔۔۔ کیونکہ اب وہ مریم فاروق نیازی نہیں' بلکہ مریم آفندی ہو چکی تھی۔۔۔ اب اس گھر کی عزت تھی وہ۔ اس لیے وہ یہ کام جلد از جلد نبٹانا چاہتا تھا۔

"صرف شگن لے کر جانے سے کیا ہو گا؟" اسرار آفندی نے بھی لب کشائی کی تھی۔

"صرف شگن لے کر جانے سے یہ ہو گا کہ شادی کی ڈیٹ فکس ہو جائے گی اور ہم اس ڈیٹ پہ بارات لے جائیں گے اور دوسری بات یہ کہ ان لوگوں کو آپ سے مل کر تسلی ہو جائے گی کہ ان کی بیٹی محفوظ ہاتھوں میں جا رہی ہے اور اسے ہر طرح کا تحفظ ملے گا۔" آذر اب ہر محاذ پر اکیلا ہی جنگ لڑ رہا تھا۔

"حق مہر میں دو کروڑ کا اماؤنٹ لکھوا کر بھی انہیں ابھی اور تحفظ کی ضرورت ہے کیا؟" ثمو بیگم نے خفگی سے کہا تھا۔

"ہاں۔۔۔ ہے ضرورت۔۔۔ کیونکہ ایک شریف اور عزت دار آدمی کی عزت کے سامنے یہ دو کروڑ کچھ بھی نہیں اور ویسے بھی یہ دو کروڑ انہوں نے نہیں ہمارے اپنے صاحبزادے نے لکھوائے ہیں۔۔۔ اس کی جگہ میں ہوتا تو دس کروڑ لکھواتا۔۔۔ لیکن افسوس کہ یہ نکاح میرے جانے سے پہلے ہو چکا تھا۔" آذر نے اپنی ساس کو ایک کرارا جواب دیا تھا۔ جس پہ باقی سب بھی چپ ہو گئے تھے۔

"تو شادی کی ڈیٹ کب کی فکس کرنی ہے؟" اسرار آفندی بیٹے کی رائے پوچھ رہے تھے' کیونکہ وہ جانتے تھے کہ آذر جو بھی کہہ رہا ہے ٹھیک کہہ رہا ہے اور اب انہیں وہی کرنا ہے' جو وہ کہے گا۔

"جب ہماری شادی ہو گی۔۔۔" وہ ہر بات دوٹوک طریقے سے کر رہا تھا۔

"یعنی تینوں شادیاں ایک ہی ڈیٹ کو رکھنی ہیں؟"

"نہیں۔۔۔ پہلے میری اور جورت کی شادی ہو گی۔۔۔ اور دوسرے روز دانیال کی۔۔۔ کیونکہ حرمت کو رخصت کرنے کے لیے ہمارا فارغ ہونا زیادہ ضروری ہے۔" آذر کا مشورہ اچھا تھا۔ اس لیے کوئی بھی انکار نہیں کر سکا تھا اور اس نے یہ بھی اعلان کر دیا تھا کہ مریم آفندی کے ساتھ کوئی بھی اجنبیت اور ناانصافی نہیں برتے گا۔ اس کے ساتھ بھی وہی رویہ رکھا جائے گا جو اس حویلی کی باقی بیٹیوں اور بہوؤں کے ساتھ رکھا جاتا ہے۔۔۔ اپنائیت' شفقت' محبت اور عزت والا۔

اس کے اس اعلان پہ سب نے سر تسلیم خم کر دیے تھے۔ کیونکہ اب اس حویلی کا سارا انتظام اور دارومدار اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس لیے ثروت بیگم آج شام مریم کے گھر شگن لے کر جانے کی تیاری کرنے لگی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"کیا بات ہے عبداللہ بھائی اور نبیل بھائی سے کوئی کانٹیکٹ نہیں ہے تمہارا۔" علیزے ناشتا کرتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"کیوں؟ تمہیں یہ خیال کیوں آیا؟" وہ چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے بولا۔

"کل سے ان کا کوئی ذکر۔۔۔ یا ان کا کوئی فون نہیں سنا اس لیے۔" علیزے جوس پینے لگی۔

"کیا کل سے مجھے تم سے فرصت ملی ہے جو میں ان کا ذکر کرتا۔"

دل آور اس کے مقابل والی کرسی پہ بیٹھا اسے خاصی بے باک نظروں سے دیکھتا ہوا بڑے ذو معنی انداز میں بولا تھا اور اس کی نظروں کی ایسی تپش اور لفظوں کی ایسی معنی خیزی پہ علیزے کا چہرہ شرم سے گلابی پڑ گیا تھا۔

"لیکن میں نہیں چاہتی کہ تم میری ذات میں گم ہو کر اپنے بھائیوں جیسے دوستوں کو بھول جاؤ۔" وہ پلکیں جھکاتے ہوئے بولی تھی۔

"اف یار۔۔۔ کب بھول رہا ہوں؟ ابھی تمہاری ذات میں گم ہوئے ایک دن ہی تو گزرا ہے۔ اور تم سے یہ بھی برداشت نہیں ہو رہا۔" وہ خفگی سے کہتا چائے کا کپ واپس ٹیبل پر رکھ چکا تھا۔

"ہاں تو ٹھیک کہہ رہی ہوں نا اگر تم ان کی ذات میں گم ہو کے مجھے بھول جاؤ گے یا مجھے کم ٹائم دو گے تو مجھے تکلیف ہو گی' دکھ ہو گا' اسی طرح اگر میری ذات میں گم ہو کر انہیں بھول جاؤ گے یا انہیں کم ٹائم دو گے تو انہیں تکلیف ہو گی' انہیں دکھ ہو گا۔ اس لیے میں چاہتی ہوں کہ تم اس چیز میں بیلنس رکھو۔۔۔ اور تینوں دوست پہلے کی طرح رہو۔۔۔" علیزے نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی اور دل آور مسکراتے ہوئے سمجھ بھی گیا تھا۔

"اوکے مادام۔۔۔ جو آپ کا حکم۔" اس نے سر خم کر دیا تھا۔

"مومنہ بھابھی کے کیس کا کیا بنا؟" علیزے کورٹ کے فیصلے سے انجان تھی۔

"سزا ہو گئی ہے ملک حق نواز کو۔" وہ دوبارہ چائے پینے لگا۔

"اچھا۔۔۔ کب۔۔۔؟" وہ حیران ہوئی۔

"جب تم اسپتال میں تھیں۔" وہ لاپروائی سے بتا رہا تھا۔

"کیا سزا ہوئی ہے اسے؟" وہ جاننا چاہ رہی تھی۔

"سزائے موت۔۔۔" اس کا انداز ہنوز تھا۔

"وہ کیوں؟ یہ سزا تو شاید مرڈر کیس والوں کو ہوتی ہے؟" اسے بھی تھوڑا بہت علم تھا۔

"ہاں۔۔۔ مرڈر کیس والوں کو ہی ہوتی ہے اور ملک حق نواز کی گردن پہ چھ لوگوں کے خون کے چھینٹے تھے۔ حالانکہ اس نے کئی بے گناہ اور معصوم لوگوں کی زندگی کا خاتمہ کیا ہے' لیکن چھ لوگ ایسے تھے جن کے لواحقین پولیس اسٹیشن تک بھی پہنچے' مگر ملک حق نواز کے بندوں کے ہاتھوں دبوچ لیے گئے تھے۔ اس لیے ان کی فائلز اوپن کروا کر سامنے لائی گئی اور ثبوت اور شواہد اکٹھے کیے گئے تو ملک حق نواز کے لیے عدالت کو سزائے موت کے علاوہ اور کوئی سزا نظر نہیں آئی' جبکہ ملک اسد اللہ ابھی تک اسے بچانے کی تگ و دو میں لگا ہوا ہے' جو کہ بہت ہی ناممکن سی بات ہے۔" دل آور نے اسے ذرا تفصیل سے بتایا تھا۔

"ہوں۔۔۔ تو پھر مومنہ بھابھی تو بہت خوش ہوں گی آج کل؟"

"ہاں... بہت خوش ہیں۔ کیونکہ نبیل نے ان کے ساتھ کوئی ناانصافی اور کوئی کوتاہی نہیں برتی... بہت عزت کرتا ہے ان کی... اور بہت خیال بھی رکھتا ہے... یہاں تک کہ فائزہ آنٹی نے پورا گھر ان کے ہاتھوں میں سونپ دیا ہے... اب سب کچھ کرنے دھرنے والی مومنہ بھابھی ہی ہیں... اور دوسری طرف انہیں انصاف بھی مل چکا ہے۔" دل آور بڑے سکون سے اسے آگاہ کر رہا تھا۔

"اوہ... یہ تو بہت اچھی بات ہے... پھر..." علیزے کو حقیقتاً" بہت خوشی ہوئی تھی۔

"صاحب جی! وہ باہر نبیل صاحب آئے ہیں۔" زلفی کافی عجلت میں اندر داخل ہوا تھا۔

"لیجیے جناب! آگئے آپ کے نبیل بھائی۔" دل آور نیپکن سے ہاتھ پونچھ کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"بٹھاؤ اسے میں وہیں آرہا ہوں... علیزے تم چائے بنادو اس کے لیے۔" وہ زلفی سے کہہ کر علیزے کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

"اوکے... بنادیتی ہوں... آپ جائیں۔" وہ بڑی عزت اور بڑے احترام سے بولی تھی اور دل آور ٹھٹک کر رک گیا تھا۔

"کیا کہا؟ آپ..." اس نے آپ پہ زور دیا۔

"کیا کروں؟ آپ کی عزت کا سوال ہے... دوسروں کے سامنے اتنا احترام تو پھر کرنا ہی پڑتا ہے؟" علیزے نے جیسے مجبوری ظاہر کی تھی۔

"اور اکیلے میں؟" وہ اس کا اگلا جواب سننے کا منتظر تھا۔

"اکیلے میں احترام نہیں ہوتا۔" وہ شرارت بھرے لہجے میں کہتی ہوئی آہستگی سے کرسی سے اٹھ کر ٹیبل کی دوسری سائیڈ پہ چلی گئی تھی۔

"تو پھر کیا ہوتا ہے؟" دل آور کے قدم پوری طرح سے واپس پلٹ چکے تھے۔

"پیار ہوتا ہے... محبت ہوتی ہے... اور ڈرائیور اور علیزے ہوتے ہیں۔" اس کا انداز ایسا تھا کہ دل آور کا دل مچل گیا تھا اور ابھی وہ اس کی طرف لپکنے ہی والا تھا کہ زلفی دوبارہ آگیا تھا۔

"نبیل صاحب کے ساتھ عدیل صاحب بھی ہیں... ان کے لیے بھی چائے بنادیجیے گا۔"

"اف زلفی..." دل آور اس کی مداخلت پہ دل مسوس کے رہ گیا تھا اور علیزے اپنی ہنسی دباتی ہوئی کچن میں گھس گئی تھی۔

"کیا ہوا صاحب جی؟" وہ اب صاحب جی کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

"کچھ نہیں ہوا... آؤ میرے ساتھ۔" وہ کہہ کر باہر نکل گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"السلام علیکم نبیل بھائی!" علیزے بہت سلیقے سے دوپٹا اوڑھے ان کے لیے چائے لے کر آئی تھی۔

"وعلیکم السلام! کیسی ہیں بھابھی۔" نبیل اسے دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا تھا اور عدیل کو بھی اس کی تقلید کرنا پڑی تھی۔

"الحمدللہ! بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ سنائیں مومنہ بھابھی، مدیحہ اور فائزہ آنٹی کیسی ہیں؟ آپ ان لوگوں کو بھی ساتھ ہی لے آتے؟" علیزے تو یوں بات کر رہی تھی جیسے اس کی ان سب سے صدیوں سے بے تکلفی اور گہرے مراسم چلے آرہے ہوں۔

"آپ دعوت دیں گی تو ضرور آئیں گے۔" نبیل مسکرایا۔

"لیکن میرا خیال ہے کہ اپنوں کو دعوت دینے کی ضرورت نہیں پڑتی، وہ خود ہی چلے آتے ہیں۔" اب تو وہ کافی سمجھ داری والی باتیں کرنا سیکھ گئی تھی۔

"یہ بھی ٹھیک کہا آپ نے... اوکے ہم بغیر دعوت کے ہی آجائیں گے۔"

"تھینک یو... پلیز بیٹھیے نا۔" وہ چائے کی ٹرے ٹیبل پہ رکھ چکی تھی۔

"تھینکس... پلیز آپ بھی بیٹھیے۔ میں یہاں اسی لیے آیا ہوں کہ آپ دونوں سے بات ہوسکے۔"

"جی... کہیے؟" علیزے اندر سے جھجکتی ہوئی دل آور کے ساتھ ہی صوفے پہ بیٹھ گئی تھی، کیونکہ اس سے ذرا ہٹ کے یا دوسرے صوفے پہ بیٹھتی تو یقیناً" نروس ہوجاتی۔

"جودت کے نکاح کا پتا چلا آپ کو؟" نبیل نے بات شروع کی۔

"جودت کے نکاح کا؟ کیا مطلب؟ میں سمجھی نہیں؟" اس نے ذرا الجھ کر دل آور کی سمت دیکھا۔

"میں بتاتا ہوں آپ کو۔" نبیل نے بات بتانی شروع کی اور پھر اینڈ تک جا کر ہی اسٹاپ لیا تھا۔ لیکن اتنے میں علیزے کی رنگت زرد پڑ گئی تھی۔ اس کے کانوں میں سائیں سائیں کی آواز گونجنے لگی تھی۔

"پلیز آپ پریشان نہ ہوں... معاملہ حل ہوچکا ہے... بس اب یہ مسئلہ ہے کہ وہ لوگ آج شام کو شگن لے کر آنا چاہ رہے ہیں اور شادی کی ڈیٹ فکس کرنا چاہ رہے ہیں... اس لیے عدیل پریشان ہے اور الجھا ہوا ہے کہ اسے کیا کرنا چاہیے؟ کیا اتنی جلدی یہ سب کرنا ٹھیک ہوگا؟ ہم لوگ تو آپ کی فیملی کو نہیں جانتے... لیکن آپ کی فیملی کو آپ دونوں سے بہتر کوئی بھی نہیں جانتا... اس لیے زیادہ بہتر مشورہ آپ ہی دے سکتے ہیں۔" نبیل نے ان دونوں کے چہروں کی سمت دیکھا تھا۔

"اس میں زیادہ پریشان ہونے کی اور مشورے کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وہ لوگ شگن لے کر آتے ہیں۔ آپ شگن لے کر رکھ لو اور شادی کی ڈیٹ بھی فکس کردو... کیونکہ ایسے کاموں میں دیر نہیں کرنی چاہیے... میں نے ان دونوں کا نکاح کروایا تھا تو بہت سوچ سمجھ کر کروایا تھا... مریم تمہاری نہیں ہماری بھی بہن ہے۔ اس لیے ہم تمہیں کوئی غلط مشورہ ہرگز بھی نہیں دیں گے۔ باقی رہا شادی کے اخراجات کا مسئلہ تو سمجھو کہ وہ بھی حل ہوجائے گا۔ ہم تمہیں کوئی خیرات نہیں دیں گے۔ البتہ تم ہم سے ادھار ضرور لے سکتے ہو... بعد میں آہستہ آہستہ رقم ادا کردینا۔" دل آور ہمیشہ کی طرح اصل مسئلے تک جا پہنچا تھا۔

"اس طرح تو تم ایمن کی شادی بھی نبٹا سکتے ہو... شہریار سے کہو وہ بھی آج ہی شگن لے آئے۔" نبیل کو ایمن کا بھی خیال آیا تھا۔

"مگر..." عدیل نے کچھ کہنا چاہا۔

"اگر مگر کچھ نہیں... آج یہ دونوں کام نبٹ جانے چاہئیں۔ شہریار کی امی کو کال کرو۔" نبیل بضد ہوا اور پھر عدیل کو مجبوراً" یہ کام کرنا ہی پڑا تھا۔

"ویری گڈ... اب یوں سمجھو کہ تم ان دونوں فرائض سے فارغ ہوگئے اور سرخرو بھی۔" نبیل نے اسے تھپکی دی تھی۔

"تھینک یو سر... یہ سب آپ لوگوں کی ہیلپ اور حوصلہ افزائی کی وجہ سے ہی تو ہو رہا ہے... ورنہ تو..." عدیل نے مایوسی سے سرہلایا تھا۔

"ارے نہیں یار! ہوتا وہی ہے جو انسان کی قسمت میں ہوتا ہے۔ بس میرے اور تمہارے جیسے لوگوں کو اللہ وسیلہ بنا دیتا ہے... حالانکہ ہم کرتے کچھ بھی نہیں بس وسیلہ بنتے ہیں۔ کرتا تو اللہ کی ذات کا کام ہے۔ ہم تو اس کی رضا کے بغیر ہل بھی نہیں سکتے۔" نبیل نے نفی میں سرہلاتے ہوئے کندھے اچکائے تھے۔

دل آور، نبیل اور عبداللہ جب بھی کسی کی ہیلپ کرتے تھے تو کچھ اس طرح کہ اگلے بندے کے ضمیر پہ کسی قسم کا کوئی بوجھ نہ پڑتا اور نہ ہی اسے شرمندگی ہوتی۔۔۔ عدیل کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی سلسلہ تھا ان کا۔ کیونکہ انہیں پتا تھا کہ وہ غریب ہونے کے ساتھ ساتھ خوددار بھی ہے۔

"میں نے ایک فیصلہ اور کیا ہے دل آور۔۔۔ یہ نہ سمجھنا کہ میں نے تم سے مشورہ نہیں کیا۔۔۔ بس سچویشن ایسی تھی کہ مجھے بات کرنا پڑ گئی۔ اگر بہت سوچ سمجھ کر کرتا تو تم سے پوچھے بغیر نہ کرتا۔" نبیل نے اب دوسری بات کہنے کے لیے تمہید باندھی تھی۔

"یہی نا کہ تم مدحیہ کا رشتہ عدیل کے ساتھ طے کر چکے ہو؟" دل آور نے اس کی بات کا پردہ خود ہی ہٹا دیا تھا اور نبیل، عدیل اور علیزے تینوں ہی بے ساختہ چونک کر دیکھنے پہ مجبور ہو گئے تھے۔

"تمہیں کیسے پتا چلا؟" نبیل کو شدید ترین حیرت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

"تو کیا مدحیہ کے صرف ایک تم ہی بھائی ہو؟ میں کچھ بھی نہیں ہوں؟ ہر بات کا تمہیں ہی پتا چل سکتا ہے، مجھے نہیں؟" دل آور کے لہجے میں خفگی تھی۔

"نن۔۔۔ نہیں۔۔۔ میں ایسا کب کہہ رہا ہوں۔۔۔ مگر یہ بات تو۔۔۔" نبیل کی حیرت ہنوز تھی۔

"تم مجھ سے کوئی بات چھپا سکتے ہو، مگر مدحیہ نہیں۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

"اوہ۔۔۔ تو یہ بات مدحیہ نے بتائی ہے؟" نبیل ریلیکس ہو گیا تھا۔

"ہاں۔۔۔ اور مجھے اس کا انتخاب بہت اچھا لگا ہے۔ اس کے حوالے سے اگر ہم بھی کچھ سوچتے تو ایسا ہی سوچتے۔ میری طرف سے ہاں ہے۔۔۔ بس اب شادی کے بارے میں کوئی فیصلہ مت کرنا۔۔۔ وہ میں خود کروں گا۔" دل آور نے آخر میں نبیل کو سمجھا بھی دیا تھا۔ جس پہ وہ تینوں ہی مسکرا دیے تھے۔

☼ ☼ ☼

آج منڈے تھا اور رات کو دل آور اسے تاکید کر کے سویا تھا کہ وہ اسے صبح ذرا جلدی جگا دے، کیونکہ اسے ایک کیس کے سلسلے میں کورٹ پہنچنا تھا۔ اسی لیے علیزے اسے دوبار آواز دے کر جا چکی تھی، مگر تیسری بار اس نے کوئی اور حربہ آزمانے کی کوشش کی تھی۔

"ڈرائیور۔۔۔" وہ آہستگی سے سرگوشی کرتے ہوئے بولی تھی۔

"ہوں۔۔۔" وہ گہری نیند سے بولا۔

"ڈرائیور میری جان! کورٹ جانے کا ٹائم ہو رہا ہے۔ اٹھنا نہیں ہے کیا؟" علیزے کی ایسی جان لیوا سرگوشی پہ دل آور کی ساری نیند ہوا ہو گئی تھی۔

"علیزے۔۔۔" وہ خاصی بوجھل آواز میں بولا۔

"ہوں۔۔۔" جواباً وہ بڑی نرمی سے پیش آ رہی تھی۔

"میری جان! تمہیں پتا ہے نا۔۔۔ تمہاری ایسی سرگوشیوں اور تمہاری ایسی اداؤں پہ کیا حال ہو جاتا ہے میرا؟ مجھ سے برداشت نہیں ہو پاتا۔۔۔ پاگل ہونے لگتا ہوں میں۔۔۔ اور تم صبح ہی صبح میری نیت خراب کرنے کے درپے ہو رہی ہو؟" دل آور نے جس انداز میں کہا تھا علیزے کے لیے خطرے کی گھنٹی بج گئی تھی۔ اس نے یک دم دل آور کے کندھے سے الگ ہونا چاہا تھا، مگر تب تک وہ یک دم کروٹ بدلتے ہوئے اسے اپنے حصار میں جکڑ چکا تھا۔

"اب کہاں؟ اب ہر بار تمہاری چالاکی ہی تو کام نہیں آئے گی نا؟" دل آور نے اسے اپنے سینے میں بھینچ لیا تھا

اور علیزے بری طرح پھڑپھڑائی تھی۔

"اف پلیز ڈرائیور۔۔۔ میں کچن کھلا چھوڑ آئی ہوں۔۔۔ بلی سب کچھ خراب کر دے گی۔" وہ چیخی تھی۔

"اور یہ بلی جو صبح سے شیر کو سونے نہیں دے رہی، اس کا کیا کروں میں؟" دل آور نے دیکھتے ہی دیکھتے کئی گستاخیاں کر ڈالی تھیں اور علیزے اپنا بچاؤ ہی کرتی رہ گئی تھی۔

"گل۔۔۔" علیزے زور سے چیخی تھی اور دل آور نے یک دم اسے اپنی گرفت سے آزاد کر دیا تھا۔ لیکن علیزے کی حالت دیکھ کر بے ساختہ مسکرا بھی دیا تھا۔

"آئندہ کبھی تمہیں جگانے کی کوشش نہیں کروں گی۔" وہ غصے سے تلملائی تھی۔

"میں بھی یہی چاہتا ہوں۔۔۔ کیونکہ اتنے اچھے اور رومینٹک طریقے سے جگانے کی کوشش کرو گی تو کس کافر کا جاگنے کو دل چاہے گا؟ اس سے تو بہتر ہے کہ میں الارم سیٹ کر کے سو جاؤں۔" دل آور اسے چھیڑنے والے انداز میں کہہ رہا تھا اور علیزے خفا ہو گئی تھی۔

"او کے! نہیں جگاؤں گی۔۔۔ لیکن اب اگر جاگ ہی گئے ہو تو براہ مہربانی نیچے آ کر ناشتا کر لو، مجھے مدحیہ وغیرہ کے ساتھ شاپنگ پہ بھی جانا ہے۔" وہ خفگی سے کہہ کر باہر نکل گئی تھی اور دل آور ہنستا ہوا دس منٹ میں تیار ہو کر نیچے کچن میں آ گیا تھا۔

علیزے چولہے پہ کیتلی رکھے اس کے لیے چائے بنانے میں مصروف تھی، جب دل آور نے پیچھے سے آ کر بے حد نرمی سے اسے قریب کیا۔

"گڈ مارننگ میڈم!" وہ اس کے بالوں پہ بوسہ دیتے ہوئے بولا جس پہ علیزے کو بے ساختہ ہلکی سی گدگدی سی ہوئی تھی۔۔۔ مگر اس نے کہا کچھ نہیں تھا۔

"خفا ہو۔۔۔؟" دل آور اس کے ہاتھ کو بہت ہی نرمی سے چھو رہا تھا اور علیزے اس کے ہاتھوں میں موم کی طرح پگھلنے لگی تھی۔ کیونکہ اس کی قربت کی اور اس کے ہاتھوں کے لمس کی تپش ہی کچھ ایسی تھی کہ۔۔۔

"بولو نا۔۔۔ خفا ہو مجھ سے۔" دل آور نے اسے آہستگی سے بھینچا۔

"نہیں۔۔۔ پتا نہیں کیا بات ہے۔۔۔ مجھے لگتا ہے کہ میں کبھی تم سے خفا نہیں ہو سکتی۔۔۔ ایسا کروں گی تو مر جاؤں گی۔" علیزے نے بے اختیار نفی میں سر ہلایا تھا۔

"لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے بار بار خفا ہوتی رہو اور میں تمہیں ہر ہر طرح سے منانے کی کوششیں کرتا رہوں۔" وہ کہتے کہتے ایک شرارت بھی کر گیا تھا اور علیزے بے ساختہ اس کے حصار سے نکل کر اسے گھورنے لگی تھی۔

"لیکن فی الحال مجھے منانے کی کوشش کرنے سے بہتر ہے کہ تم کورٹ جانے کی کوشش کرو، کیونکہ ٹائم زیادہ ہو گیا ہے۔" اس نے کلاک کی طرف اشارہ کیا تھا اور وال کلاک کی سمت دیکھ کر دل آور کا دماغ گھوم گیا تھا۔

"اوہ مائی گڈ۔۔۔ جلدی ناشتا دو۔" وہ سر پہ ہاتھ مارتا فوراً کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا تھا اور علیزے نے بڑی سعادت مندی سے ناشتا لگا دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

مریم اور جودت کی شادی سے ایک دن پہلے مدحیہ اور عدیل کی منگنی ارینج کی جا رہی تھی اور مدحیہ نے اس موقعے سے فنکشن کی تیاری کے لیے مومنہ، نگارش اور علیزے کو خاص طور پہ انوائیٹ کر رکھا تھا اور شاپنگ بھی ایک ساتھ کرنے کا کہا تھا۔ اسی لیے علیزے دل آور کے کورٹ جانے کے فوراً بعد ہی گلاب خان کے

ساتھ نبیل کے گھر آگئی تھی اور پھر نگارش کے آتے ہی وہ لوگ فائزہ بیگم کو ساتھ لیے گلاب خان کی نگرانی میں شاپنگ کرنے چلی گئی تھیں۔ اور دن بھر شاپنگ کے لیے خوار ہونے کے بعد علیزے واپس گھر آئی تو دل آور کو بے حد آف موڈ کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھے میگزین الٹ پلٹ کرتے دیکھا تھا۔ وہ اس کے تیور دیکھ کر دور سے ہی پریشان ہو گئی تھی۔

"السلام علیکم!" ڈرتے ڈرتے سلام کیا گیا تھا۔

"وعلیکم السلام!" اس نے بغیر اس کی سمت دیکھے جواب دیا تھا۔

"تم کب آئے؟" وہ آہستگی سے شاپنگ بیگز صوفے پہ رکھتے ہوئے خود بھی بیٹھ گئی تھی۔

"پانچ بجے۔" جواب انتہائی مختصر تھا۔

"اور اب سات بج رہے ہیں۔۔۔ دو گھنٹے ہو گئے ہیں۔۔۔ اور تم ابھی تک ایسے ہی بیٹھے ہو۔۔۔ چینج بھی نہیں کیا۔" علیزے کو اچنبھا ہوا تھا۔

"تم صبح سے بے فکر پھر رہی ہو کیا تمہیں میرا ذرا بھی خیال نہیں تھا کہ میرے گھر آنے کا ٹائم ہو رہا ہے؟" دل آور ایک روایتی شوہر کے سے روپ میں نظر آیا تھا۔

"خیال تو تھا۔۔۔ لیکن وہ مدیحہ۔۔۔" علیزے کچھ جز بز ہونے لگی تھی۔

"مدیحہ۔۔۔ مدیحہ اہم ہے یا میں؟" وہ یک دم میگزین پٹخ کر کھڑا ہو گیا تھا اور علیزے دبک گئی تھی اور اس کو یوں دبکتے دیکھ کر دل آور لمبے لمبے ڈگ بھرتا اوپر اپنے بیڈ روم میں چلا گیا تھا اور اس کے جاتے ہی علیزے کا دماغ کچھ فریش ہوا تو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بحال ہوئی اور ذہن میں اک خیال کوندے کی طرح لپکا تھا۔ اسی لیے دس پندرہ منٹ بعد وہ بھی کمرے میں آگئی تھی۔

"ایم سوری۔۔۔ تمہیں مجھ پہ بہت غصہ ہے۔۔۔ لیکن میں اس غصے کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ میں بڑی حویلی جا رہی ہوں۔۔۔ گلاب خان سے کہو مجھے چھوڑ آئے۔"

علیزے بہت نارمل طریقے سے کہتی ہوئی وارڈروب کی طرف بڑھ گئی تھی اور اس میں سے بلا وجہ ہی کچھ تلاش کرنے لگی تھی۔

"کیا۔۔۔ کیا کہا تم نے؟ تم بڑی حویلی جا رہی ہو؟" وہ ابھی ابھی شاور لے کر نکلا تھا اور اس کی بات سنتے ہی تولیہ رگڑتے اس کے ہاتھ ٹھہر گئے تھے۔

"میں نے وہی کہا ہے جو تم سن چکے ہو۔۔۔ میں بڑی حویلی جا رہی ہوں۔۔۔ اللہ حافظ۔" علیزے کہہ کر وارڈروب بند کر کے دروازے کی سمت بڑھ گئی تھی اور دل آور کے تو جیسے ہاتھوں کے توتے اڑ گئے تھے۔

"علیزے۔۔۔" وہ یک دم اس کے پیچھے لپکا اور اسے دروازے کے قریب ہی دبوچ لیا تھا۔

"پاگل ہو گئی ہو؟" اس نے علیزے کو جھنجوڑ ڈالا۔

"تو پھر تم غصہ کیوں کر رہے تھے؟ ناراض کیوں ہو رہے تھے؟" وہ منہ پھلا کر بولی۔

"میں تو مذاق کر رہا تھا۔۔۔ ستا رہا تھا تمہیں۔" وہ خفگی سے جھنجلایا۔

"تو میں کون سا سیریس کہہ رہی ہوں؟ میں بھی تو مذاق کر رہی ہوں۔۔۔ ستا رہی ہوں تمہیں۔" علیزے نے بڑی معصومیت سے کہتے ہوئے کندھے اچکائے تھے۔

"واٹ۔۔۔؟" وہ یک دم چیخا اور علیزے اس کا رد عمل دیکھ کر یک دم کھلکھلا کے ہنسی تھی اور دل آور اتنے بڑے شاک کے باوجود اس کی ہنسی میں کھو گیا تھا اور یوں ہی ایک دوسرے کو دیکھتے دیکھتے اور ہنسی ہنسی میں وہ دونوں ہی اک دوسرے میں گم ہو گئے تھے۔ دروازے سے پشت ٹکائے کھڑی علیزے کے دونوں ہاتھوں کا لمس دل آور کے سینے پہ محسوس ہو رہا تھا اور دل آور کے دونوں ہاتھ اس کے دائیں بائیں دروازے پہ جمے ہوئے تھے اور مدہوشی اتنی تھی کہ وہ دونوں ہی ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو پائے تھے۔ کیونکہ اس فسوں خیز اور قیمتی لمحات میں تو ان کی سانسیں بھی ایک ہو چکی تھیں۔ وہ اس سحر سے نکلتے بھی تو کیسے؟

لیکن افسوس کہ مداخلت کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی پہنچ ہی گیا تھا۔ دروازے پہ ہلکی سی دستک ہوئی تھی۔ مگر ان دونوں نے دروازے کے قریب کھڑے ہونے کے باوجود بھی کوئی نوٹس نہیں لیا تھا اور نہ ہی جواب دیا تھا۔ اسی لیے پھر دوبارہ دستک ہوئی تھی۔

"علیزے بی بی۔۔۔ نیچے آئیے۔۔۔ بڑی حویلی والے آئے ہیں۔" گل نے باہر سے ہی پیغام پہنچا دیا تھا اور اس کے پیغام پہ وہ دونوں ہی چونک کر حواسوں میں لوٹ آئے تھے۔

"بڑی حویلی والے۔۔۔؟" علیزے ٹھٹکی۔

"اوکے۔۔۔ پہلے فریش ہو جاؤ' پھر نیچے جاؤ۔" دل آور اطمینان سے اس کا گال تھپکتا ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا رکا تھا اور شرٹ پہن کر بٹن بند کرنے لگا تھا۔

"اور تم۔۔۔؟" وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

(آخری قسط ان شاء اللہ اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں)

✡ ✡

— 43 —

تینتالیسویں اور آخری قسط

نبیلہ عزیز

دردِ دل

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نبیل حیات دونوں بہن بھائی ہیں' مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خودسر لڑکی ہے' وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پہ رنگ چکی ہے' جس کے پیش نظر فائزہ بیگم' نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں' لیکن مدحیہ پاکستان جانے سے انکار کردیتی ہے' جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے' مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصے سے نوکری کی تلاش میں ہے' مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا' بے بسی اور مجبوری سے تنگ آکر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے' لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے بابا امتیاز مل جاتا ہے' جو اسے کام کی آفر کرتا ہے' جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے' اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے' وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے' وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے' وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے' اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا' اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔

www.paksociety.com

اور دل آور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے کھڑے اس کے سوال پہ ٹھٹک گیا تھا۔ کیونکہ وہ سمجھ رہا تھا کہ علیزے کو اپنے دھیان میں اس کا دھیان نہیں رہے گا' لیکن یہ اس کی غلط فہمی تھی' علیزے کو اب سارے دھیان ہی اس کے ہوتے تھے اسے بے دھیانی میں بھی اسی کے دھیان رہتے تھے۔

"ڈرائیور۔۔۔!" اس نے دل آور کو پھر سے متوجہ کیا۔

"اوکے۔۔۔ تم چلو۔۔۔ میں بھی آتا ہوں۔" اس نے علیزے کا یہ مان بھی رکھ لیا تھا۔

"نہیں۔۔۔! ہم دونوں ایک ساتھ جائیں گے۔" علیزے کا فیصلہ اکٹھے جانے کا تھا۔

"اوکے۔۔۔ اوکے۔۔۔! ایک ساتھ ہی چلتے ہیں۔ تم فریش ہو کر آجاؤ' تب تک ویٹ کرتا ہوں۔" اس نے اسے تسلی دی تھی اور علیزے اس تسلی پہ ریلیکس ہو کر واش روم میں گھس گئی۔

☼ ☼ ☼

عائشہ آفندی' دل آور اور علیزے کو ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے دیکھ کر ہی یک دم اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی تھیں۔

"السلام علیکم۔!" دل آور نے خاصی بلند آواز میں سلام کیا تھا اور اس کے سلام پہ باقی سب بھی اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے البتہ سب سے پہلے آگے بڑھنے والی عائشہ آفندی تھیں جنہوں نے بے ساختہ اور والہانہ انداز میں دل آور شاہ کو گلے سے لگا لیا تھا۔

"وعلیکم السلام۔! میرے بچے۔ جیتے رہو۔۔۔ سدا خوش رہو۔۔۔ اللہ میری عمر بھی تمہیں لگا دے تم میری زہرہ کے چاند ہو۔۔۔ میری زہرہ کے جگر ہو۔۔۔ اس لیے اب میری آنکھوں کا نور ہو تم۔۔۔ میرے کلیجے کی ٹھنڈک ہو۔۔۔ تمہارے حوصلے بہت بلند ہیں۔۔۔ تمہارا ظرف بہت اعلا ہے۔ اس لیے ہم سب کو معاف کر دو۔۔۔ ہم معافی کے طلب گار بن کر آئے ہیں۔" عائشہ آفندی نے اس سے الگ ہوتے ہوئے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے اور دل آور ان کے اس طرح معافی مانگنے پر گھبرا گیا تھا۔ اس نے سٹپٹا کر ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے تھے۔

"پلیز آنٹی۔۔۔! یہ کیا کر رہی ہیں آپ؟ میں ایسی معافی کے حق میں ہرگز بھی نہیں ہوں۔ آپ کی عزت آپ کا احترام سر آنکھوں پہ' لیکن ایسا کچھ میں کبھی بھی نہیں چاہوں گا۔"

اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے انہیں منع کیا تھا اور عائشہ آفندی کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے وہ بے ساختہ رو پڑی تھیں جس پہ دل آور نے ان کے ہاتھ تھپک کر تسلی دیتے ہوئے انہیں دونوں کندھوں سے تھامے قریبی صوفے پہ بٹھا دیا تھا۔

اور پھر باقی سب کی طرف متوجہ ہوا تھا جو اس کے عائشہ آفندی کی طرف سے فارغ ہونے کے منتظر تھے۔

"السلام علیکم۔!" سب سے پہلے آگے بڑھنے والا آذر تھا' دل آور نے اس کے مصافحے کے لیے بڑھے ہوئے ہاتھ اور جھکے ہوئے سر کو اک نظر دیکھا اور پھر یہاں بھی اک اعلا ظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے اس سے ہاتھ ملانے کی بجائے اپنے دونوں بازو کھول دیے تھے جس پہ علیزے کے ساتھ ساتھ باقی سب بھی حیران رہ گئے تھے اور آذر نے بے اختیار اسے اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔

"تھینکس یار۔۔۔! تھینک یو سو مچ۔" آذر نے بڑے بے ساختہ انداز میں اس کا شکریہ ادا کیا تھا۔ پھر باری باری دانیال' جودت' زین' احمد' حماد' عون' عدید' کومل' فرحت' انوشہ' جویریہ' ثروت بیگم' شمو بیگم' اسرار آفندی' اظہار آفندی اور سب سے آخر میں آسیہ آفندی اس سے ملی تھیں۔ جن سے مل کر دل آور کے دل کو کچھ ہوا تھا کیونکہ ان کی شخصیت ان کی ذات میں اک عجیب سی اداسی گھلی ہوئی نظر آ رہی تھی اور اس اداسی اور اس درد کو

دل آور سے بہتر شاید کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔

"میں نے کہا تھا نا۔ آپ یہ الجھی ہوئی گتھی نہ سلجھائیں۔" وہ بے حد آہستگی سے بولا تھا۔

"لیکن بے خبری کی زندگی جینے سے آگہی کی اذیت اچھی ہوتی ہے' انسان بے وجہ خوش رہنے سے تو بچ جاتا ہے نا۔ خوش فہمی تو نہیں رہتی' کسی پہ مان تو نہیں رہتا نا۔ جس جو کچھ ہوتا ہے سامنے آجاتا ہے۔" آسیہ آفندی کا مضمحل سا جواب سن کر دل آور چند سیکنڈز کے لیے چپ سا ہو گیا تھا۔

"لیکن آپ بھی اگر زہرہ بتول شاہ اور دل آور شاہ جیسا ظرف بڑا کر لیں تو کچھ بھی نہیں بگڑے گا۔" الٹا وہ انہیں سمجھا رہا تھا اور آسیہ آفندی محض سر ہلا کر رہ گئی تھیں۔

"علیزے بیٹا۔۔۔! ادھر آؤ۔ ہم تم دونوں کے لیے ہی آئے ہیں۔ ادھر آؤ ہمارے پاس بیٹھو۔"

اسرار آفندی نے سب سے ہٹ کے ذرا فاصلے پہ کھڑی علیزے کو اپنے قریب بلایا تھا۔ اور وہ آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی ان کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھی اور اسرار آفندی نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کا ماتھا چوم کر اسے اپنے کندھے سے لگا لیا تھا۔

اتنے میں دل آور بھی آذر اور دانیال کے برابر بیٹھ چکا تھا۔ اور سب کے بیٹھنے کے بعد ہی اسرار آفندی نے اپنی بات کہنے کے لیے تمہید باندھنی شروع کی تھی۔

"دیکھو دل آور بیٹا۔۔۔! ماضی میں جو کچھ ہو چکا ہے اس کا ہم سب کو ہی بے حد دکھ اور افسوس ہے اور اس دکھ اور افسوس کے باوجود ہم نہ تو کوئی مداوا کر سکتے ہیں اور نہ ہی کوئی تلافی ہو سکتی ہے۔ ہم لاکھ معافیاں مانگیں تم سے مگر ہمیں پتا ہے کہ پھر بھی کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ہاں البتہ انسانیت کے ناتے اور اپنے رب تعالیٰ کا خوف اپنے دل میں رکھتے ہوئے' تم اپنے ظرف کو کشادہ کر کے ہمیں دل کی گہرائیوں سے معاف کرتے ہو تو یہ تمہارا ہم پہ تاحیات بہت بڑا احسان ہو گا۔ ہم وہ معافی نہیں چاہتے جس کے بعد بھی ہم ایک دوسرے سے فاصلے پہ ہی رہیں بلکہ ہم وہ معافی چاہتے ہیں جس کے بعد ہمارے دلوں کی کدورتیں اور آپس کے فاصلے مٹ جائیں اور ہم ایک دوسرے کے قریب آسکیں۔ ایک دوسرے کی غم اور خوشی میں شریک ہو سکیں۔ ایک دوسرے کو اپنا سمجھ کر اور اپنا بن کر۔۔۔"

اسرار آفندی کی تمہید خاصی لمبی ہو گئی تھی کیونکہ وہ دل آور کو اپنے طور پہ سمجھانا چاہتے تھے۔

"ایسی معافی کے حق میں تو میں بھی نہیں ہوں آفندی صاحب۔۔۔! دوغلا پن مجھے بھی نہیں آتا' میں جب دشمن ہوتا ہوں تو دشمنی کے سوا کچھ یاد نہیں رکھتا اور جب دوست ہوتا ہوں تو دوستی کے سوا ہر چیز بھول جاتا ہوں۔ خیر آپ کیا چاہتے ہیں۔ آپ وہ بتائیں۔" اس نے کہتے ہوئے سر جھٹکا تھا۔

اور اسرار آفندی نے باقی سب پہ اک طائرانہ سی نظر ڈالی تھی اور دوبارہ سے سلسلہ کلام جوڑا۔

"ہم چاہتے ہیں کہ تم اور علیزے آذر' جودت اور دانیال کی شادی میں شرکت کرو۔ ہم تم دونوں کو انوائٹ کرنے کے لیے آئے ہیں۔"

انہوں نے صوفے کی سائیڈ پہ رکھا انویٹیشن کارڈ اٹھا کر درمیانی ٹیبل پہ دل آور کے سامنے رکھ دیا تھا اور دل آور کی نظریں اس چمکتے دمکتے ریڈ اور سلور کلر کے کارڈ پہ ٹھہر گئی تھیں۔

"اگر تم یہ کارڈ قبول کرتے ہو تو ہمیں بے انتہا خوشی ہو گی۔" اسرار آفندی نے ایک اور لقمہ دیا تھا۔

"میں علیزے کو قبول کر چکا ہوں تو سمجھیں کہ علیزے سے ریلیٹڈ ہر چیز کو قبول کر چکا ہوں۔ یہاں تک کہ یہ کارڈ بھی۔" دل آور نے ذرا سا آگے جھکتے ہوئے ٹیبل پہ رکھا وہ کارڈ اٹھا لیا تھا اور اس کی بات پہ وہاں موجود سب ہی افراد میں خوشی کی اک لہر سی دوڑ گئی تھی۔

اور علیزے نے بے ساختہ دل آور کی طرف دیکھا تھا اور دل آور اس کے دیکھنے سے ہی جان گیا تھا کہ وہ اندر سے کن فیلنگز کا شکار ہو رہی ہے اور کیا سوچ رہی ہے۔

وہ اس کی آنکھوں کی مشکور سی جنبش سمجھ گیا تھا اور ہلکے سے مسکرا دیا تھا۔

"علیزے... کیا اپنے میکے والوں کی کوئی خاطر تواضع نہیں کرو گی؟ یا پھر یونہی بیٹھی رہو گی۔"

دل آور نے ہی اسے متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی اور وہ اس کی بات پہ خجل ہوتی ہوئی اٹھ کر کچن میں آ گئی تھی جہاں گل پہلے سے ہی تیاریوں میں مصروف تھی۔

☆ ☆ ☆

کون اس گھر کی دیکھ بھال کرے
روز ایک چیز ٹوٹ جاتی ہے

"زری... آؤ نا۔ مدحیہ تمہیں بلا رہی ہے۔"

عبداللہ نے اپنے دھیان میں گم بیٹھی زری کو متوجہ کیا تھا اور زری چونک کر رہ گئی تھی۔ اور اس کی نظر بلا ارادہ ہی سامنے کی طرف اٹھی تھی جہاں مدحیہ اور عدیل اسٹیج پہ بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے دائیں بائیں علیزے، نگارش اور مومنہ بیٹھی ہوئی تھیں۔

جن کو دیکھ کر زری نے بے حد آہستگی سے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"نہیں بھائی... وہاں ابھی میری جگہ نہیں۔" اس کے ہلکے سے انکار پہ عبداللہ نے فوراً گردن موڑ کر اسٹیج کی طرف دیکھا تھا جہاں ان تینوں کی بیویاں موجود تھیں اور تینوں ہی بہت خوش نظر آ رہی تھیں اور جہاں واقعی زری کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی جس پہ واقعی عبداللہ کے دل کو کچھ ہوا تھا۔

اور وہ بے ساختہ زری کے قریب پڑی کرسی کھینچ کر اس کے مقابل ہی بیٹھ گیا تھا۔ اور بے حد نرمی اور بے حد محبت سے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے تھے۔

"میں جانتا ہوں کہ تمہیں شاعری بہت پسند ہے اور تمہارا ذوق اور تمہارا حافظہ بھی بہت عمدہ ہے لیکن اس کے باوجود میرے ذوق اور میرے حافظے کی سلیٹ پہ ایک شعر ابھر رہا ہے شاید کہ یہ شعر ایک دو لفظ کے ہیر پھیر سے کچھ غلط ہو جائے، لیکن پھر بھی کوشش کرتا ہوں تمہیں سنانے کی شعر کچھ یوں تھا کہ...

اس دنیا میں کسی کو بھی مکمل جہاں نہیں ملتا
کسی کو زمین نہیں ملتی تو کسی کو آسماں نہیں ملتا

عبداللہ کے اک عجیب سے لہجے میں کہے ہوئے شعر پہ زری کی آنکھوں کے گوشے نم ہو گئے تھے۔

"تو میری جان اس شعر کا مفہوم تو تم سمجھ ہی گئی ہو گی کیونکہ شاعری کی زبان تم مجھ سے زیادہ بہتر جانتی ہو، لیکن پھر بھی یہ واضح کرتا چلوں کہ جن لوگوں کو تم دیکھ رہی ہو تا اپنی اپنی جگہ پہ مکمل یہ بھی نہیں ہیں، انہیں بھی زندگی میں کسی کو زمین نہیں ملی تو کسی کو آسمان نہیں ملا۔"

علیزے بھابھی اور دل آور کے ماضی سے کیا کیا اذیتیں جڑی ہیں یہ تم بھی جانتی ہو اور میں بھی... بے شک وہ لوگ ایک دوسرے کو معاف کر بھی دیں، لیکن وقار آفندی کے نام کا کانٹا ان کے دلوں میں ہمیشہ چبھا ہی رہے گا جس کو نہ علیزے نکال سکتی ہے، نہ دل آور اور نہ ہی ان کے گھر والے اور ایسا ہی ایک کانٹا نبیل اور مومنہ بھابھی کی زندگی میں بھی پیوست ہے وہ بھی ایک دوسرے کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں تو کمپرومائز کی بیس پہ... ورنہ ان کی زندگیوں میں کیا کچھ ہو چکا ہے یہ بھی ہم سب سے ڈھکا چھپا تو نہیں ہے نا؟

اور رہی بات نگارش کی اور میری تو ہماری زندگی کی محرومی بھی تمہارے سامنے آئینے کی طرح موجود ہے، ہم لوگوں نے محبت بھی کر لی اور ایک دوسرے کو حاصل بھی کر لیا، لیکن پھر بھی ادھورے کے ادھورے رہے نہ اپنے ماں باپ کی شفقت ملی اور نہ ہی خود ماں باپ بن سکے۔ تمہیں شاید پتا ہو یا نہ ہو، لیکن میں نے اکثر نگارش کو اس محرومی پہ اداس افسردہ اور آنسو بہاتے ہوئے دیکھا ہے تنہائی میں وہ بہت اداس ہوتی ہے لیکن جب دنیا کا سامنا کرتی ہے تو بڑے صبر، شکر اور تحمل کے ساتھ پیش آتی ہے اور مجھے یقین ہے کہ اللہ اسے اس صبر و تحمل کا اجر ضرور دے گا۔ اس لیے میری جان میں تمہیں بھی یہی مشورہ دوں گا کہ تم بھی ان لوگوں کی طرح خوش رہنا سیکھو کیونکہ زندگی میں سب کچھ ہمارے لیے ہی نہیں ہوتا اس میں کچھ دوسروں کا بھی نصیب ہوتا ہے۔ جن کا ہمیں علم نہیں ہوتا اور ہم اپنی لاعلمی میں کسی دوسرے کے نصیب کو اپنا حق اور اپنا نصیب سمجھ کر خوش ہوتے رہتے ہیں، مگر جب ہماری یہ خوش فہمی ختم ہوتی ہے تو ہم اداس ہوتے ہیں، مایوس ہوتے ہیں اور اپنے میں حسرتیں اور رشک پیدا کر لیتے ہیں حالانکہ ایسا کرنا نہیں چاہیے کیونکہ ہر انسان کو اپنے اپنے نصیب کا ملتا ہے چاہے دولت ہو، شہرت ہو، عزت ہو۔ یا پھر جیون ساتھی ہو...

جن کو جو ملا، سمجھو اسے اللہ نے دیا، کیونکہ ہمارے نصیب لکھنے والا تو وہی ہے نا۔ ضروری نہیں ہے کہ جو ہم چاہتے ہیں وہی ہو بلکہ ضروری وہ ہوتا ہے جو اللہ چاہتا ہے اور اللہ جن کو دولت دیتا ہے کبھی کبھی ان کی قسمت میں یہ بھی لکھ دیتا ہے کہ یہ دولت انہیں برتنا بھی نصیب نہیں ہو گی جن کو شہرت دیتا ہے ساتھ ہی اس شہرت کا زوال بھی لکھ دیتا ہے، جن کو عزت دیتا ہے ان کی رسوائی بھی لکھتا ہے، جن کو اولاد دیتا ہے، ان کی آزمائش بھی لکھتا ہے اور جن کو جیون ساتھی اچھا ملتا ہے ان کی قسمت میں بے سکونی اور بے چینی بھی ساتھ ہی لکھی ہوئی ہوتی ہے اس لیے اپنی قسمت اور اپنے نصیب پر غرور کوئی بھی نہیں کر سکتا... کوئی بھی نہیں... اچھا برا وقت ہر انسان کی زندگی میں ہی آتا ہے اور ہر انسان کو جھیلنا پڑتا ہے، بس اس جھیلنے کے لیے برداشت کا مادہ ہونا لازمی ہے ورنہ سب کچھ رائیگاں چلا جاتا ہے۔

اب یہی دیکھ لو جب ہم شادی کرتے ہیں تب ہمیں پتا ہی نہیں ہوتا کہ ہمارے ہاں اولاد ہو گی بھی یا نہیں...؟ اگر ہمیں ان چیزوں کا پہلے سے ہی پتا چل جائے تو شاید ہم یہ کام ہی نہ کریں، لیکن ہم پھر بھی یہ کام کرتے ہیں کیونکہ ہم اللہ کی رضا سے انجان ہیں اور جب سب کچھ ہونا ہی اللہ کی رضا سے ہے تو ہمیں افسردگی، مایوسی، اداسی اور حسرت کا ماسک چہرے پہ سجانے کی ضرورت ہی کیا ہے بھلا۔

"اب یہ نگارش کو ہی دیکھ لو اس نے مجھ سے محبت کی، بے انتہا اور سچی محبت... اس نے مجھے چاہا اور میں اسے مل بھی گیا، لیکن پھر بھی وہ محروم ہے... روتی ہے... مجھ سے چھپ چھپ کر روتی ہے... آخر کیوں؟ کیونکہ اسے بھی مکمل جہاں نہیں ملا۔ مجھے بھی نہیں ملا، نبیل کو بھی نہیں ملا، مومنہ بی بی کو بھی نہیں ملا، علیزے کو بھی نہیں ملا، اور علیزے کے ڈرائیور کو بھی نہیں ملا کیونکہ یہ زندگی ہے۔"

عبداللہ نے اس کے دونوں ہاتھ نرمی سے تھپکے تھے اور زری کی آنکھوں سے دو اشک بہہ آئے تھے جن کو عبداللہ نے اپنی انگلیوں سے بہت نرمی سے پونچھ ڈالا تھا۔

"عشق کرنا اور نامراد رہنا، اصل عاشق اور اصل عشق کی اصل نشانی ہوتی ہے۔ تمہارے عشق پہ آزمائش اتری، مگر تم ڈگمگائی نہیں... مجھے خوشی ہے اس چیز کی... کیونکہ تمہاری نیت میں کوئی کھوٹ نہیں تھا، تمہاری محبت تمہارا عشق پاک صاف تھا، اسی لیے آج میں ایک بھائی ہونے کے باوجود تم سے اتنے حساس اور گہرے موضوع پر بھی بات کرتے ہوئے شرم محسوس نہیں کر رہا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میری بہن کا ظاہر اور باطن ایک جیسا ہے پانی کی طرح صاف شفاف... ورنہ کوئی اور مسئلہ ہوتا تو شاید میں ایسی باتیں تم سے کبھی نہ کرتا، مگر

نہیں۔۔۔ مجھے تم پہ بھروسہ ہے اور فخر بھی ہے۔؟"

عبداللہ کہہ کر اس کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور نبیل کی نظریں آنسو پونچھتی زری پہ ٹھہری گئی تھیں اور دل میں اک ایسی ہوک سی اٹھی تھی کہ سیدھی روح تک گئی تھی اور روح تڑپ اٹھی تھی مگر نہیں۔۔۔ اب یہ سب فضول تھا۔۔۔ اب بہت کچھ پیچھے رہ گیا تھا اب مومنہ کے ساتھ ناانصافی نہیں کی جاسکتی تھی۔۔۔

کیونکہ اس نے جب زری کی طرف سے اپنے دل کو پھیرا تھا تو خود سے بڑے عہد کیے تھے۔۔۔ اور اب یہ عہد ہی سب سے زیادہ اہم تھے۔۔۔ دل بے شک تڑپتا یا گھائل ہوتا رہتا۔۔۔! "زری۔۔۔! آیئے نا"۔۔۔ مدیحہ بلارہی ہے۔۔۔ "بہت ہی خوبصورت ڈریس میں ملبوس مومنہ بی بی اسٹیج سے اتر کر زری کے قریب آگئی تھی اور زری کو سہارا دینے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھادیا تھا جس پہ نبیل نظریں چرا کر رخ موڑ گیا تھا۔۔۔ وہ ایسا منظر نہیں دیکھ سکتا تھا۔۔۔

اور زری مومنہ بی بی کا ہاتھ تھام کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

نبیل سے اسٹیج تک کا فاصلہ محض چند قدموں کا تھا، لیکن زری کے لیے یہ چند قدم بھی میلوں کا سفر تھے۔۔۔ اس نے طے کیے تھے مگر بڑی مشکلوں کے ساتھ۔۔۔ اور ابھی وہ اسٹیج پہ چڑھنے کے لیے قدم اٹھا ہی رہی تھی کہ دوسرا ہاتھ علیزے نے آگے بڑھادیا تھا اور زری نے چونک کر اپنے سے دو زینے اونچی کھڑی علیزے کی سمت دیکھا تھا جس کے چہرے پہ زری کے لیے محبت ہی محبت تھی اور زری اس کے چہرے کا یہ تاثر دیکھ کر بس دیکھتی ہی رہ گئی تھی۔

جبکہ علیزے اس کا ہاتھ پکڑنے کے لیے دو قدم نیچے آگئی تھی۔

"میں نے ایک دفعہ ڈرائیور سے پوچھا تھا کہ زری کون ہے۔۔۔؟ تو اس نے جواب دیا۔۔۔" علیزے خود کلامی کے سے انداز میں بول رہی تھی کہ زری تڑپ کر پوچھ بیٹھی۔

کیا جواب دیا اس نے۔۔۔؟ سوال بڑا بے قرار تھا۔

"محبت؟!" علیزے بھی ویسا ہی بولی تھی۔۔۔ انتہائی مختصر اور یک لفظی۔

"محبت۔؟" زری نے زیرِ لب دہرایا تھا۔

"میں نے بھی جواباً "یہی کہا تھا۔۔۔ محبت۔۔۔؟" علیزے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اسٹیج کی سیڑھی چڑھنے میں مدد دے رہی تھی اور ساتھ ساتھ اس سے بات بھی کر رہی تھی۔

"پھر۔۔۔؟ پھر کچھ کہا۔۔۔؟" زری بمشکل سیڑھی چڑھی تھی۔

"پھر کیا۔۔۔ وہ مجھے کہنے لگا۔ تم نہیں سمجھوگی۔ کیونکہ محبت بڑی حویلی والوں کی سمجھ کی چیز نہیں ہے۔۔۔ لیکن اس کے باوجود میں "سمجھ گئی۔۔۔" علیزے مسکرائی اور اسے دوسری سیڑھی چڑھنے میں مدد دی تھی۔

"کیا سمجھ گئیں۔۔۔؟" زری کے سوال بہت بے ساختہ سے تھے۔

"یہی کہ زری محبت کیوں ہے۔۔۔؟" علیزے کا لہجہ بدلا تھا لیکن زری محسوس نہیں کرسکی تھی۔

"علیزے۔۔۔!" دل آور کسی سے ملنے کے بعد اپنے دھیان میں اس کے قریب آیا تھا لیکن زری کو اس کے ساتھ دیکھ کر اس کے قدم اپنی جگہ پہ ہی جم گئے تھے۔

"زری کو چھوڑ کر آتی ہوں۔؟" علیزے نے گردن موڑ کر اسے جواب دیا اور زری کو لے کر آگے بڑھ گئی تھی جہاں بیٹھے مدیحہ اور عدیل اپنی ہی چھیڑ چھاڑ اور شرارتوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

"مدیحہ!" علیزے نے اسے متوجہ کیا۔

"ارے زری۔۔۔!" مدیحہ اپنا بھاری بھر کم دوپٹا سنبھالتی ہوئی بمشکل کھڑی ہوئی تھی اور بڑے والہانہ انداز میں

زری کے گلے ملی تھی۔

"مبارک ہو۔۔۔! آخر پاکستان نے تمہیں باندھ ہی لیا۔۔۔" زری نے کچھ دیر کے لیے اپنے ذہن سے ہر حزن کا احساس جھٹکتے ہوئے مدحیہ کو بڑی خوشدلی سے مبارکباد دی تھی۔

"خیر مبارک۔۔۔! مجھے پاکستان نے نہیں پاکستان کی محبت نے باندھ لیا ہے بہت اپنائیت ہے یہاں اب کہیں اور جانے کو دل ہی نہیں چاہتا۔" مدحیہ عدیل کو دیکھتے ہوئے بڑی دلچسپی سے مسکرائی تھی اور جواباً عدیل بھی مسکراتا ہوا اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا۔

"اور اب ہم کہیں اور جانے بھی نہیں دیں گے۔۔۔" اس نے بڑے استحقاق سے کہا تھا جس پہ مدحیہ زری کے سامنے ذرا سا جھینپ گئی تھی کیونکہ وہ اسے بڑی گہری اور ذو معنی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور مدحیہ اس کے یوں بار بار نظر بھر کر دیکھنے پہ بلاوجہ ہی نروس ہوئی جا رہی تھی۔۔۔

"خیر اس بات کو فی الحال جانے دیں' یہ بتائیں آپ کیسی ہیں۔۔۔ طبیعت بہتر ہوئی آپ کی؟" عدیل زری کو سلام کرتا ہوا اس کا حال احوال پوچھنے لگا۔

"الحمد للہ۔۔۔! بالکل ٹھیک ہوں۔۔۔ اور اگر نہیں بھی ہوں تو ہو جاؤں گی' کیونکہ جلد یا دیر کرنا تو اللہ کی ذات نے ہے۔۔۔؟" زری نے اللہ کا شکر ادا کیا تھا۔

"جی۔۔۔! یہ تو بالکل صحیح کہہ رہی ہیں آپ۔۔۔ آئیے بیٹھیے۔۔۔" اس نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

اور مدحیہ زری کا ہاتھ پکڑے صوفے پہ آ گئی تھی۔۔۔

"بھائی۔۔۔! ٹائم کافی زیادہ ہو چکا ہے۔۔۔ امی کہہ رہی ہیں کہ رسم کر دینی چاہیے۔" ایمن بھی اسٹیج پہ آ گئی تھی۔

"عدیل۔۔۔! کیا خیال ہے تمہارا۔۔۔ رسم ہو جائے۔؟" نبیل نے قریب آ کر پوچھا۔

"جیسے آپ کی مرضی۔۔۔؟" عدیل بھلا کیا کہہ سکتا تھا۔۔۔؟

"ہمیں رنگ زری پہنائے گی۔۔۔" مدحیہ نے یکدم ہی اعلان کیا تھا اور زری گڑبڑا گئی تھی۔

"ہم۔۔۔ مگر۔۔۔ مدحیہ۔۔۔؟" زری کو مدحیہ کے ایسے ارادے کا اندازہ بھی نہیں تھا ورنہ وہ یقیناً اسٹیج پر ہی نہ آتی۔

"زری۔۔۔! میں یہ بندھن تمہارے ہاتھوں سے باندھنا چاہتی ہوں' یہ میری خواہش ہے۔۔۔ اور تمہیں میری زندگی کی پہلی خوشی اور پہلی خواہش سے انکار نہیں کرنا چاہیے ورنہ میرے لیے بدشگونی ہوگی۔۔۔" مدحیہ نے اس کے ہاتھوں پہ اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا اور زری اس کی بات سن کر کانپ گئی تھی۔

"لیکن مدحیہ۔۔۔! میں تو خود۔۔۔" زری نے کچھ کہنا چاہا۔

"بس تم اپنے محبت بھرے ہاتھوں سے میری زندگی کی ڈوری باندھو۔۔۔ یہ لو۔"

اس نے عدیل کی طرف سے لائی گئی انگوٹھی مریم کے ہاتھ سے لے کر ڈبیا سمیت زری کے سامنے کر دی تھی اور واقعی زری سے اس موقعے پہ انکار نہیں ہو سکا تھا اور زری نے روتے ہوئے دل سے دعا مانگ کر لرزتی انگلیوں سے انگوٹھی تھامی اور نگارش' عبداللہ' مومنہ' نبیل' علیزے' دل آور' جودت اور اس کی فیملی' شہریار اور اس کی فیملی' سلو اور جیدی اور محمد جہانزیب اور فاطمہ کی موجودگی میں سب کے سامنے مدحیہ اور پھر عدیل کو انگوٹھی پہنا دی تھی۔

جس پہ جی بھر کے تالیاں بجی تھیں اور وہیل چیئر پر بیٹھے عمر فاروق نیازی بھی اپنے اکلوتے بیٹے کی پہلی پہلی خوشی پہ مسکرائے تھے۔

"آئی لو یو بھابھی۔۔۔!" مریم' ایمن اور ایمان سے چھوٹی زونیہ اور زوسیہ نے مدحیہ کو پھول دیتے ہوئے اس کے دونوں رخسار چوم لیے تھے اور مدحیہ بے ساختہ کھلکھلا اٹھی تھی اور دونوں کو بازوؤں کے گھیرے میں لے لیا تھا

اور یہ ایک دلکش سین کیمرے کی آنکھ میں محفوظ ہو کر رہ گیا تھا بلکہ آج کے دن میں تو ایسے کئی سین تھے جو کیمرے کی آنکھ نے قید کیے تھے۔۔۔ اور انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یادگار بنا دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس سے اگلے ہی روز آذر' دانیال اور جودت کی مایوں اور مہندی کی رسم تھی۔

اور علیزے صبح ہی صبح سب لڑکیوں کے بلانے پہ بڑی حویلی چلی گئی تھی حالانکہ دل آور نے بہت شور مچایا' احتجاج کیا اور غصہ بھی دکھایا تھا مگر وہ الٹا اسے ہری جھنڈی دکھا گئی تھی اور دل آور تلملا کے رہ گیا تھا۔

کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ علیزے پورا دن گھر پہ رہے اور رات کو ایک ساتھ شادی میں جائیں مگر وہ ہاتھ ہی نہیں آئی تھی اس لیے اس کا موڈ اب آف ہی تھا۔

اور اسی آف موڈ کے ساتھ وہ شام کو بڑی حویلی پہنچا تو تقریباً سارے ہی نوٹ کیے بغیر نہیں رہ سکے تھے۔ کہ وہ پہلے جیسے موڈ میں نہیں ہے۔

"کیا بات ہے علیزے۔۔۔! دل آور بھائی کا موڈ بہت آف لگ رہا ہے۔۔" علیزے اپنے بیڈ روم میں بیٹھی تیار ہو رہی تھی جب انوشہ دروازہ کھول کر اندر آ گئی تھی۔

"ڈرائیور آیا ہے۔۔۔؟ کہاں ہے وہ۔۔۔؟ تمہیں کیسے پتا چلا کہ اس کا موڈ آف ہے۔۔۔؟" علیزے کو اس کا نام سنتے ہی بے چینی سی لگ گئی تھی۔

"نیچے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں' بس مجھے تو ان کے موڈ سے یہی لگا ہے کہ ان کا موڈ آف ہے' اب کیوں آف ہے یہ تو تمہیں پتا ہونا چاہیے۔" انوشہ نے کہتے ہوئے کندھے اچکائے تھے۔

"اس کے پاس کوئی ہے یا نہیں۔۔۔؟" علیزے کو اس کے اکیلے پن کی فکر ہوئی تھی۔

"امی اور آپی بیٹھی ہوئی ہیں۔۔۔ اسرار انکل تو مہمانوں کو ریسیو کر رہے ہیں' اور باقی سب تو اپنی اپنی تیاریوں میں مصروف ہیں۔۔۔" انوشہ اس کا میک اپ الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔

"اف۔۔۔! تو تم اسے اوپر بلا لو نا اگر اتنی فکر ہو رہی ہے تو۔۔۔؟"

انوشہ کو بیٹھے بیٹھے ہی شرارت سوجھ گئی تھی۔۔۔

"ارے نہیں انوشہ آپی۔۔۔! وہ یہاں آ گیا تو میں میک اپ کے بغیر ہی رہ جاؤں گی۔" علیزے جھنجلائی۔۔۔

"کیا مطلب۔۔۔؟" انوشہ جان بوجھ کر انجان بنی تھی۔

"خیر چھوڑیں آپ نہیں سمجھیں گی۔" علیزے سر جھٹک کر پھر سے آئینے کی طرف اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گئی تھی اور انوشہ بڑی خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"السلام علیکم دل آور بھائی۔۔۔!" انوشہ دوپٹا سر پہ اوڑھے بڑے سعادت مند بچی بنی دل آور کے سامنے آ کر جھکی اور مجبوراً دل آور کو اٹھ کر اس کے سر پہ ہاتھ پھیرنا پڑا تھا۔

"وعلیکم السلام۔۔۔! کیسی ہو۔۔۔؟" وہ بہت نارمل سے انداز میں پوچھ رہا تھا۔

"الحمد للہ۔۔۔! بالکل ٹھیک ہوں۔۔۔ وہ دراصل آپ کے لیے علیزے کا پیغام ہے' وہ آپ کو اپنے روم میں بلا رہی ہے۔" انوشہ نے بڑی سنجیدگی سے پیغام رساں کا روپ دھارا تھا۔

"روم۔۔۔؟"

دل آور سب کے سامنے ایسا پیغام سن کر ٹھٹکا تھا۔

"جی۔۔۔! وہ آپ ہی کا انتظار کر رہی تھی۔۔۔ جائیے اس کی بات سن لیجیے 'پھر تو اور زیادہ رش بڑھ جائے گا اور فنکشن بھی اسٹارٹ ہو جائے گا۔۔۔"

انوشہ کی سنجیدگی انتہائی تھی اور دل آور جز بز ہوتا آسیہ آفندی اور عائشہ آفندی وغیرہ کو دیکھ کر رہ گیا تھا۔

"ارے۔۔۔! کوئی بات نہیں بیٹا۔۔۔ جاؤ تم۔۔۔ ہم بھی ذرا مہمانوں کو دیکھ لیں۔" عائشہ آفندی لاپروائی سے کہتی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔۔۔ اور دل آور نے دوبارہ انوشہ کی طرف دیکھا تھا جو بمشکل اپنی مسکراہٹ دبانے کی کوشش میں تھی۔

"جائیے نا۔۔۔! دیر کیوں کر رہے ہیں۔۔۔؟" اس نے اسے ڈرائنگ روم سے باہر کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"ہوں۔۔۔! جا رہا ہوں۔" وہ آہستگی سے کہہ کر ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے سے باہر نکل آیا تھا اور طویل ترین کشادہ سیڑھیاں طے کرتا علیزے کے روم کے سامنے آر کا تھا' اور آہستگی سے دروازے پہ دستک دی تھی۔

"یس۔۔۔ کم ان۔۔۔" اندر سے علیزے کی نرم سی آواز سنائی دی تھی۔

اور دل آور اس کی طرف سے اجازت ملتے ہی دروازہ دھکیل کر اندر آگیا تھا جبکہ آئینے کے سامنے کھڑی اپنی دلنشیں پلکوں پہ مسکارا لگاتی علیزے آئینے میں اس کا عکس ابھرتا دیکھ کر چونک گئی تھی۔

"تم۔۔۔ ڈرائیور۔۔۔ تم یہاں۔۔۔"

علیزے تو بالکل یوں گھبرا گئی تھی جیسے دل آور کو پہلی بار اپنے بیڈ روم میں دیکھ کر گھبرائی تھی۔۔۔

"آپ نے خود ہی تو بلایا ہے بی بی جی۔۔۔!" اسے بھی ڈرائیور کے کریکٹر میں جانے میں ذرا دیر نہیں لگی تھی۔

"میں نے بلایا تھا۔۔۔؟ مگر کب۔۔۔؟" علیزے کو اچنبھا ہوا۔

"ابھی۔۔۔ چند منٹ پہلے۔۔۔ میں جھوٹ نہیں بول رہا بی بی جی۔۔۔" وہ دروازے کے قریب بالکل ایسے ہی کھڑا تھا جیسے منصور حسن کے انداز میں کھڑا ہوتا تھا۔

"تمہیں کس نے کہا کہ میں نے تمہیں بلایا ہے۔۔۔؟" علیزے خفگی سے بولی۔

"آپ کی کزن انوشہ بی بی نے۔۔۔" ڈرائیور کی معصومیت کی بھی انتہا ہو چکی تھی۔

"اوہ۔۔۔ انوشہ۔۔۔؟" علیزے چپ چاپ جانے والی انوشہ کی شرارت سمجھ گئی تھی۔

"اب آپ بتائیے۔۔۔ میرے لیے کیا حکم ہے آخر۔۔۔؟ چلا جاؤں یا کھڑا رہوں۔۔۔؟"

دل آور مسکراتی نظروں سے اسے دیکھ بھی رہا تھا' وہ زنک اور سلور کلر کی کامدار فراک اور چوڑی دار پاجامے میں نامکمل سی تیاری میں کھڑی سیدھی دل پہ لگ رہی تھی اور دل کی دھڑکنیں بے ربط سی ہونے لگی تھیں۔

"ہوں۔۔۔! کھڑے رہو۔۔۔ جب تک میں نہ کہوں' یہاں سے ہلنے کی بھی کوشش مت کرنا۔۔۔"

علیزے دو سیکنڈ سوچنے کے بعد اسے حکم دیتی ہوئی دوبارہ سے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کی طرف پلٹی تھی۔

"آنکھیں بند کر لوں یا دیکھتا رہوں۔۔۔؟" اس نے اگلا سوال کیا۔

"دیکھتے رہو۔۔۔" وہ اطمینان سے اپنے سابقہ کام میں مصروف ہو گئی۔

مگر دل آور رہ نہیں سکا تھا اور اس نے آہستہ آہستہ اپنے قدم علیزے کی طرف بڑھا دیے تھے۔

"یہ تو سراسر ناانصافی ہوئی نا بی بی جی۔۔۔ آپ کے حکم کی تعمیل میں کھڑا رہوں' یہ تو سیدھا سیدھا ظلم ہوا ایک ڈرائیور پہ۔۔۔ آپ کو کم از کم اپنے ڈرائیور کی حالت پہ ہی رحم آجانا چاہیے۔۔۔ لیکن افسوس کہ یہاں کوئی بھی کسی پہ ترس نہیں کھاتا۔۔۔ اس لیے کسی کے حکم کی تعمیل کرنے سے اور اپنی سعادت مندی ظاہر کرنے سے بہتر ہے کہ بندہ حکم عدولی سے کام لے اور بدتمیز اور بداخلاقی ظاہر کرتا ہوا سب کچھ حاصل کر لے۔۔۔ ہے نا۔۔۔"

دل آور آہستہ روی سے قدم بہ قدم چلتا علیزے کے قریب پہنچ گیا تھا اور وہ اسے اپنے عقب میں دیکھ کر بے ساختہ چیخ اٹھی تھی۔ دل آور نے فوراً" اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

"اف علیزے بی بی۔۔۔ پاگل مت بنو۔۔۔ گھر مہمانوں سے بھرا پڑا ہے اور آپ یوں چیخیں مار رہی ہیں۔۔۔ لوگ سمجھیں گے کہ ڈرائیور نے اپنی علیزے بی بی پر تشدد شروع کر دیا ہے۔"

دل آور نے اسے سمجھانا چاہا تھا مگر اپنے منہ پہ رکھے ہاتھ کی وجہ سے علیزے کی آنکھیں ابلنے کو ہو گئی تھیں جس کا اندازہ دل آور کو اس کا عکس آئینے میں دیکھ کر ہوا تھا وہ دونوں آئینے کے سامنے ہی کھڑے تھے۔

"ارے کیا ہو گیا۔۔۔؟ اس طرح کیا دیکھ رہی ہو۔۔۔؟" دل آور نے گھبرا کے ہاتھ ہٹا لیا تھا۔

"مم۔۔۔ میری لپ اسٹک۔۔۔ میرا میک اپ۔۔۔ اف۔۔۔ ڈرائیور۔۔۔" وہ اس کے ہاتھ رکھنے اور اپنا میک اپ اور لپ اسٹک وغیرہ خراب ہونے کے غم میں روہانسی سی ہو گئی تھی۔

اور سچ مچ رو دینے کو تھی اور دل آور اسے بچوں کی طرح منہ بسورتے دیکھ کر بے ساختہ مسکرا دیا تھا۔

لیکن علیزے بری طرح بدک گئی تھی۔۔۔

"سوری یار۔۔۔ بیوٹیشن کو بلواتا ہوں۔"

"میں ٹھیک کر لوں گی تم جاؤ یہاں سے۔۔۔ اور نیچے جا کر میرا انتظار کرو۔۔۔" وہ غصے سے بولی تھی۔

"تم تو ایسے حکم دے رہی ہو جیسے سچ مچ تمہارے سامنے تمہارا شوہر نہیں ڈرائیور کھڑا ہو۔۔۔" دل آور نے اسے گھورا تھا۔

"پلیز ڈرائیور۔۔۔! میں لیٹ ہو جاؤں گی۔۔۔" وہ پھر سے روہانسی ہوئی۔

"او کے جاتا ہوں۔۔۔ مگر ایک شرط پہ۔۔۔" اس کے لہجے میں شرارت تھی۔

"شرط۔۔۔؟ کیا۔۔۔؟" وہ ٹھٹک گئی۔

"آج اپنے ہاتھوں پہ مہندی لگاؤ گی نا۔۔۔؟" دل آور کو نجانے کہاں سے اس نے ہاتھوں پہ مہندی دیکھنے کا شوق آ گیا تھا کہ علیزے ذرا دیر کے لیے ٹھہر گئی تھی۔

"کیوں۔۔۔؟"

"بس ایسے ہی مجھے شوق ہو رہا ہے۔۔۔" اس کا لہجہ اور انداز ایسا تھا کہ علیزے انکار نہ کر سکی۔

"ہوں۔۔۔ لگاؤں گی۔۔۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"اور میرے ساتھ گھر بھی چلو گی۔۔۔"

"لیکن ڈرائیور۔۔۔!" وہ اسے سمجھانا چاہتی تھی۔

"پلیز علیزے۔۔۔! اکیلے رہنے کی عادت بھول گیا ہوں' صبح سے تم گھر پہ نہیں ہو تو صبح سے اپنا ہی گھر کاٹ کھانے کو دوڑ رہا ہے' یہ چند گھنٹے میں نے کس طرح گزارے ہیں' یہ میں ہی جانتا ہوں۔۔۔" دل آور کی بات ہی کچھ ایسی تھی کہ سیدھی علیزے کے دل پہ لگی تھی اور اس کا دل تڑپ گیا تھا۔۔۔

"اٹس او کے ڈرائیور۔۔۔ ڈونٹ وری۔۔۔ میں چلوں گی گھر۔۔۔ یہ فنکشن تو ختم ہو جائے۔"

وہ بھلا اس کی اداسی یا افسردگی کب برداشت کر سکتی تھی۔۔۔ فوراً" ہامی بھر لی تھی۔

"مریم کے گھر بھی جانا ہے' عدیل ہمارا انتظار کر رہا ہو گا' نبیل کی فیملی بھی یہاں سے واپسی پہ عدیل کے گھر ہی جائے گی۔۔۔" اس نے علیزے کو آگاہ کیا۔

"ہوں۔۔۔ ٹھیک ہے۔۔۔ میں بھی تب تک تیار ہو جاتی ہوں۔۔۔" وہ سر ہلاتی پھر سے مصروف ہو گئی۔ "اور کوئی حکم" دل آور پھر شرارت سے بولا تھا جس پر علیزے نے اسے گھورتے دیکھا وہ ہنستا ہوا باہر نکل آیا تھا۔

پتھر پانی ہو جاتے ہیں
لوگ کہانی ہو جاتے ہیں
ایسا وقت بھی آجاتا ہے
کہ دشمن جانی ہو جاتے ہیں

☼ ☼ ☼

ان سب کی شادیاں بخیر و خوبی انجام پا گئی تھیں۔

اور شادیوں کے ہنگامے سرد پڑتے ہی سب کی زندگی روٹین پہ آگئی تھی ہر کوئی اپنی اپنی پریکٹیکل لائف میں مصروف ہو چکا تھا۔

البتہ نئی نئی شادیوں والے ہنوز نئے نئے چونچلوں میں مصروف تھے۔

"کیا خیال ہے ایک چکر مری کا ہو جائے۔۔۔؟" صبح ناشتے کی ٹیبل پہ یہ شوشا جودت نے چھوڑا تھا۔

"وائو۔۔۔ مری۔۔۔ کیا خوب آئیڈیا ہے جودت بھائی۔" لڑکیوں نے بہت زیادہ خوشی سے کام لیتے ہوئے اس کے آئیڈیے کو سراہا تھا۔ جبکہ آذر اور دانیال اس کے آئیڈیے پہ ذرا بھی ایکسائیٹڈ نہیں ہوئے تھے۔ چپ چاپ خاموشی سے بیٹھے ناشتا کرتے رہے تھے۔

"کیا بات ہے آپ لوگوں کا مری جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے کیا۔۔۔" جودت نے ان کی خاموشی اور ان کی بے نیازی فوراً نوٹ کی تھی۔

"نہیں۔۔۔ ہمارا کوئی ارادہ نہیں ہے۔۔۔ تمہارا ارادہ ہے تو تم جاؤ۔۔۔" آذر نے لاپروائی سے کہا۔

"لیکن میں اکیلے جانے کی بات نہیں کر رہا۔۔۔ میں نے تو یہ آئیڈیا سب کے لیے دیا ہے۔۔۔"

"تو تم اکیلے ہو بھلا؟ مریم ہے نا تمہارے ساتھ۔۔۔ شادی تمہاری ہوئی ہے سب کو کیوں انوالو کر رہے ہو۔۔۔" آذر نے حیرت ظاہر کی تھی۔

"تو آپ کیوں نہیں جا رہے۔۔۔؟" جودت کا جوش بجھ گیا تھا۔

"کیونکہ ہم سوئٹزرلینڈ جا رہے ہیں اس لیے۔۔۔" آذر کے جواب پہ جودت کے پہلو میں بیٹھی مریم جودت کو بے وقوف بنائے جانے پہ اپنی مسکراہٹ دبا گئی تھی کیونکہ اسے کومل اور حرمت نے شام کو ہی بتا دیا تھا کہ وہ لوگ پرسوں کی فلائٹ پہ ہنی مون کے لیے آؤٹ آف کنٹری جا رہے ہیں۔ "سوئٹزرلینڈ۔۔۔ مگر آپ نے پہلے تو نہیں بتایا۔۔۔" جودت ابھی تک حیرت کے دھچکے سے باہر نہیں آیا تھا۔

"ہم نے سوچا جب جائیں گے تو پتا چل جائے گا۔۔۔" آذر نے کندھے اچکائے۔

"اور دانیال بھائی۔۔۔؟" اس نے اب دوسرے کپل کا پوچھا حرمت الگ چہرہ جھکائے ہوئے بیٹھی تھی۔

"وہ لوگ جرمنی جا رہے ہیں۔۔۔ ہم نے بھی جرمنی ہی جانا تھا مگر کومل کو سوئٹزرلینڈ جانے کا شوق تھا تو میں نے سوچا ہم سوئٹزرلینڈ ہی چلے جاتے ہیں۔۔۔" آذر کی انفارمیشن کے بعد جودت کی حالت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

"اور ہم۔۔۔؟" اس کا اشارہ اپنے اور مریم کی طرف تھا۔

"کیا مطلب۔۔۔؟ تم لوگ تو مری جا رہے ہو نا۔۔۔ تم نے خود ہی تو کہا ہے۔۔۔" آذر نے حیرانی سے کہا تھا اور جودت ضبط کا گھونٹ پی کر رہ گیا تھا۔

"مگر میں نے تو یہ آئیڈیا آپ سب کے ساتھ مل کر جانے اور انجوائے کرنے کے لیے سوچا تھا۔ اب اگر آپ نہیں جا رہے تو میں کیسے۔۔۔؟" جودت بات ادھوری چھوڑ کر چپ ہو گیا تھا۔

"ہوں۔۔۔ تو گویا اب تم مری نہیں جا رہے؟ تمہارا ارادہ بدل گیا ہے؟" آذر چائے کپ میں انڈیلتے ہوئے بولا۔

"ویسے تمہارے لیے میرا خیال ہے کہ سری لنکا یا بنگلہ دیش بیسٹ رہے گا۔ وہاں جاؤ ہنی مون کے لیے، بے نا گائز۔۔۔" آذر نے کہتے ہوئے ان سب کی طرف دیکھا تھا اور ان سب کے ساتھ ساتھ مریم کی بھی ہنسی چھوٹ گئی تھی۔ وہ لاکھ کوششوں کے باوجود بھی اپنی ہنسی نہیں روک پائی تھی۔ "آپ مذاق اڑا رہے ہیں میرا؟" جودت خفا ہوا۔

"مریم بیٹا! اس سے تو ہمیں کسی بھی قسم کی عقل مندی کی امید نہیں ہے۔ اس لیے اب تم ہی اسے جا کر سمجھاؤ کہ ہم اس کا مذاق اڑا رہے ہیں یا اس کا بھلا سوچ رہے ہیں۔"

آذر ناشتا ختم کرنے کے بعد اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور اس کی تقلید میں کومل بھی اٹھ گئی تھی۔ کیونکہ آذر آج شادی کے بعد پہلی بار آفس جا رہا تھا۔ اس لیے وہ اسے چھوڑنے گاڑی تک آئی تھی۔

"میری مانو تو اب آفس بھی میرے ساتھ ہی چلو۔" آذر گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے مسکرایا تھا۔

"میرا بس چلے تو یہ بھی کر لوں۔" کومل کے چہرے پہ اک شرمیلی سی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

"فی الحال تو تم سوئٹزرلینڈ چلنے کی تیاری ہی کر لو تو بڑی بات ہے۔ باقی باتیں وہیں جا کر ہوں گی۔" آذر کا لہجہ اور نظریں معنی خیز سے ہو گئے تھے۔ اسی لیے کومل جھینپ کر اسے ہاتھ ہلاتی ہوئی پیچھے ہٹ گئی تھی اور آذر اس کے بلش چہرے سے لطف اندوز ہوتا گاڑی نکال لے گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

جیسے ہی مریم اپنے بیڈ روم میں داخل ہوئی تھی۔

وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے آن وارد ہوا تھا اور مریم کو پتا تھا کہ اسے کیا بے چینی لاحق ہے۔

"مریم۔۔۔ بتاؤ۔۔۔ آذر بھائی کیا کہہ رہے تھے۔ کیا بھلا سوچ رہے ہیں میرا۔" اسے تجسس ہو رہا تھا۔

"یہی کہ ہم لوگ مری چلے جائیں۔" وہ بھی لاپروائی سے بولی۔

"لیکن میں اب مری نہیں جاؤں گا۔ وہ اپنی بیویوں کو لے کر جرمنی اور سوئٹزرلینڈ جا رہے ہیں تو میں اپنی بیوی کو لے کر مری کیوں جاؤں؟ ہم بھی یورپ ہی جائیں گے۔" وہ بچوں کی طرح ضد اور مقابلے پہ اتر آیا تھا۔

"کیا یورپ جانا ضروری ہے۔" وہ بڑے سکون اور بڑے تحمل سے پوچھ رہی تھی۔

"ہاں ضروری ہے۔۔۔ اب ضروری ہی ہے۔۔۔ اب ہر حال میں جاؤں گا۔۔۔ اور وہاں جاؤں گا، جہاں تمہیں پسند ہو۔" وہ تو جیسے تپ ہی گیا تھا۔

"ہاں تو ہم وہیں جا رہے ہیں نا جہاں مجھے پسند ہے۔" مریم نے بڑی لاپروائی سے جواب دیا۔

"کیا مطلب۔۔۔ ہم کہاں جا رہے ہیں؟" وہ چونکا۔

"پیرس۔۔۔ خوشبوؤں کے شہر۔" مریم بہت دھیما سا بولی تھی۔

"واٹ۔۔۔ پیرس۔۔۔؟" وہ حیرت سے اچھل پڑا۔

"ہاں پیرس۔۔۔ آذر بھائی نے ہماری ٹکٹس پیرس کے لیے کنفرم کروائی ہیں۔ انہوں نے خود مجھ سے پوچھا تھا کہ تم لوگ کہاں جانا چاہتے ہو۔ تو پھر میں نے ان کے بہت اصرار کے بعد پیرس کا کہا تھا۔" مریم نے اسے اصل بات سے آگاہ کیا۔

"تو تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟ سب کے ساتھ مل کر مجھے بے وقوف بنا رہی تھیں؟" جودت نے مصنوعی خفگی سے اسے گھورا تھا۔

"بے وقوف نہیں بنا رہی تھی' بلکہ یہ دیکھ رہی تھی کہ آپ کو مجھ سے کتنی محبت ہے؟ اور آپ میرے لیے کیا کرسکتے ہیں؟ کیا احساسات رکھتے ہیں آپ؟" مریم کے دل سے بے رخی کے بادل چھٹ چکے تھے۔ اسے جودت جیسے سرپھرے کی محبتوں اور شدتوں پہ یقین آچکا تھا۔ اسی لیے وہ اس کی خفگیوں پہ بھی مسکرا رہی تھی۔

"پھر کیا پتا چلا تمہیں؟" وہ عین اس کے سامنے آرکا تھا۔

"یہی کہ آپ بے شک تھوڑے سے ضدی ہیں' ہٹ دھرم ہیں' سرپھرے ہیں' کم عقل ہیں' غیر ذمہ دار ہیں' لیکن پھر بھی۔۔۔ پھر بھی۔۔۔ میرے معاملے میں بہت سمجھ دار ہیں آپ اور یہ بھی کہ محبت کرنا بھی جانتے ہیں۔" مریم اس کی شرٹ کے بٹنوں کو چھیڑتے ہوئے بولی تھی۔

"سچ میں محبت کرنا جانتا ہوں؟" وہ یک دم اس کی آخری بات پہ ایکسائیٹڈ ہوا تھا۔

"ہاں۔۔۔ مگ۔۔۔ وہ۔۔۔ ن نہیں۔۔۔ میرا مطلب تھا کہ۔۔۔"

مریم روانی میں ہاں تو کہہ گئی تھی۔ لیکن اس کی اتنی ایکسائٹمنٹ پہ نظر پڑتے ہی ذہن میں خطرے کی گھنٹی بج اٹھی تھی' کیونکہ اس کے تیور ہی کچھ ایسے تھے۔ مگر مریم کے سنبھلنے تک دیر ہو چکی تھی اور جودت نے اس کے بچاؤ اور فرار کے تمام ارادے اور راستے مسدود کردیے تھے۔

☼ ☼ ☼

وہ کب سے عدیل کے نمبر پہ کال کر رہی تھی' لیکن وہ کال ہی ریسیو نہیں کر رہا تھا اور مدحیہ کو بیٹھے بیٹھے پریشانی لاحق ہو گئی تھی۔ اسی لیے وہ گاڑی کی چابی لے کر اپنے بیڈروم سے باہر نکل آئی تھی۔

"کہاں جا رہی ہو مدحیہ۔۔۔؟" ہمیشہ کی طرح آج بھی اسے مومنہ کی آواز نے ہی روکا تھا۔

"بھابھی۔۔۔ پتا نہیں کیا مسئلہ ہے؟ میں عدیل کو کال کر رہی ہوں' وہ ریسیو نہیں کر رہا۔۔۔ ورنہ ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا۔" مدحیہ کی پریشانی دیدنی تھی۔

"ان کی تو طبیعت خراب ہے۔ نبیل بتا رہے تھے کہ آج آفس بھی نہیں آئے۔" مومنہ نے اسے اک اور پریشان کن خبر سنادی تھی۔

"اچھا۔۔۔ مگر مجھے تو آنٹی اور ایمن نے بھی نہیں بتایا۔ ابھی دن میں ہی بات ہوئی ہے ان سے۔۔۔ انہوں نے شاید مریم سے ملنے کے لیے بڑی حویلی جانا تھا۔ وہ آج شام اپنے ہزبینڈ کے ساتھ ہنی مون کے لیے پیرس جا رہی ہے۔" مدحیہ کی فکرمندی میں اور سے اور اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

"تو تم خود جا کر پتا کرلو نا؟" مومنہ نے اک نیک مشورہ عنایت کیا تھا۔

"ہوں۔۔۔ وہ تو میں جا ہی رہی ہوں' مگر عجیب بات ہے کہ نہ اس نے خود بتایا اور نہ ہی اس کے گھر والوں نے بتایا کہ اس کی طبیعت خراب ہے۔" وہ تذبذب کا شکار متفکر سے لہجے میں کہتی وہاں سے نکل آئی تھی اور اس کے پیچھے مومنہ صوفے پہ کشن درست کر کے رکھتے ہوئے مسکرا دی تھی۔

"ہیلو۔۔۔ خیریت تو ہے نا؟" آفس سے واپسی پہ کپڑے وغیرہ چینج کر کے نبیل واپس ڈرائنگ روم میں آیا ہی تھا کہ مومنہ کو اکیلے مسکراتے دیکھ کر دلچسپ تعجب ہوا تھا۔

"کیا مطلب؟" مومنہ اپنی مسکراہٹ دبا نہیں سکی تھی بلکہ اور گہری ہو گئی تھی "یہ اکیلے اکیلے مسکرانا کوئی اچھی علامت تو نہیں ہے غالباً"۔" نبیل دلچسپی سے کہتا صوفے پہ براجمان ہو گیا تھا۔

"میں اکیلے اکیلے کب مسکرا رہی ہوں؟ میں تو آپ کے سامنے مسکرا رہی ہوں۔" مومنہ کے انداز میں بھی بیویوں والی اک مخصوص سی ادا تھی۔ جس پہ نبیل کو بڑا اچھوتا سا احساس چھو کے گزرا تھا اور دل کی دھڑکنوں کے ساز بدلے تھے۔

"سامنے مسکرا رہی ہو نا۔ مگر میں تو ابھی آیا ہوں۔" نبیل نے اپنے قریب صوفے کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"نبیل۔۔۔" مومنہ اس کی بات پہ جھینپ گئی تھی۔

"اف یار۔۔۔ اتنا عرصہ ہو گیا ہے ہماری شادی کو۔۔۔ تم ابھی تک گھبرا جاتی ہو' حالانکہ تم جانتی ہو۔ اب تو ہمیں فرینڈز کی طرح بے تکلف ہو کر رہنا چاہیے۔" نبیل جواباً خفگی سے بولا تھا۔

"مم۔۔۔ مگ۔۔۔ نبیل۔۔۔" وہ بے چاری ہکلا گئی تھی۔

"اسی لیے تو تمہیں کہہ رہا ہوں کہ میں تمہارا دوست بھی ہوں۔ اتنا نہیں گھبرایا کرو۔"

"مم۔۔۔ مگ۔۔۔ نبیل۔۔۔ وہ۔۔۔ آنٹی۔۔۔ کیا سوچیں۔۔۔ گی۔۔۔ کہ ہم۔۔۔" مومنہ نے اسے ٹالنا چاہا۔

"مومنہ۔۔۔ کیا کہا ہے میں نے۔۔۔ ادھر آؤ۔۔۔ میرے پاس بیٹھو۔" اب کی بار وہ ذرا جھڑک کر بولا تھا اور مومنہ مرے مرے قدم اٹھاتی اس کے برابر صوفے پہ آبیٹھی تھی۔

"سیدھی ہو کر بیٹھو۔" اس نے حکم جاری کیا اور مومنہ آہستگی سے سیدھی ہو بیٹھی تھی اور مومنہ مرتی کیا نہ کرتی کے مصداق رخ اس کی طرف موڑ کر بیٹھ گئی تھی۔

"مومنہ۔۔۔" اس نے تنبیہہ کرنے والے لہجے میں پکارا تھا۔

"ج۔۔۔ جی۔۔۔" مومنہ کے حلق سے آواز نکلنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔

"نبیل بیٹا۔۔۔ اگر تم فارغ تھے تو عدیل کے گھر سے ہی ہو آتے۔۔۔ اتنے دن ہو گئے کوئی خیر خبر نہیں لی ان لوگوں کی؟" فائزہ بیگم اچانک ہی اپنے دھیان میں باتیں کرتی ڈرائنگ روم میں آگئی تھیں اور مومنہ ان کی آواز سنتے ہی یک دم اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی تھی۔

اور کوئی بھی بات سنے بغیر سیدھی اپنے روم کی طرف دوڑ لگائی تھی۔ یوں جیسے اسے رہائی مل گئی ہو اور نبیل سیڑھیاں پھلانگتی مومنہ کی عجلت اور سرپٹ بھاگنے کا انداز دیکھ کر بے ساختہ مسکرا دیا تھا۔

"کیا ہو گیا ہے نبیل؟ میں تم سے کچھ کہہ رہی ہوں اور تم مسکرائے جا رہے ہو؟" فائزہ بیگم نے ذرا سی خفگی سے کہا۔

"ماما۔۔۔ ابھی سچ پوچھیں تو مجھے کوئی بھی بات سمجھ نہیں آرہی۔ ابھی میرا دھیان آپ کی بہو کی طرف ہے۔ اسے مجھ سے کوئی کام ہے' میں ابھی آیا۔"

نبیل فائزہ بیگم کے کندھوں پہ ہاتھ رکھے بڑے لاڈ اور پیار سے کہتا خود بھی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا تھا اور فائزہ بیگم پہلی بار اس کے موڈ کی ایسی شرارت اور شوخی پر مسکرا کے رہ گئی تھیں اور دل کی گہرائیوں سے اپنے بیٹے اور بہو کی دائمی خوشیوں کے لیے دعا کی تھی۔

☼ ☼ ☼

مدحیہ نے گھر کے دروازے پہ دستک دی ہی تھی کہ دروازہ کھلتا چلا گیا تھا اور وہ حیران پریشان سی کھلے دروازے سے اندر آگئی تھی۔ پورا گھر خالی پڑا بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ صحن۔۔۔ برآمدہ۔۔۔ کمرہ۔۔۔ سب خالی تھا۔

"ایمن۔۔۔ ایمان۔۔۔ کہاں ہو تم لوگ۔۔۔؟" وہ اونچی آواز میں پکارتی ہوئی۔ آگے بڑھی تب ہی پورا گھر اس طرح خالی پڑا دیکھ کر اس کے دل کو کچھ ہوا تھا۔

"زونیہ۔۔۔ زونیہ۔۔۔" وہ باری باری سب کو آوازیں دے رہی تھی۔

مگر جواب موصول نہیں ہو رہا تھا۔ بڑے کمرے اور چھوٹے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ البتہ فاروق نیازی کے

کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس لیے وہ جھجکتی ہوئی کمرے کی طرف بڑھی تھی۔

"آنٹی۔۔۔ انکل۔۔۔ ہیلو۔۔۔" اس نے پکارتے ہوئے کمرے میں جھانکا تھا۔

کمرے میں عابدہ خاتون تو نہیں تھیں۔ البتہ فاروق نیازی اپنے مخصوص پلنگ پہ سو رہے تھے۔ اس لیے مدحیہ نے دوبارہ آواز دینا اور پکارنا مناسب نہ سمجھا اور کمرے کی چوکھٹ سے ہی واپس لوٹ آئی تھی۔

"جن کو پکارنا تھا۔ بس اسی کو نہیں پکارا۔۔۔ باقی سب کو پکار کے دیکھ لیا۔"

وہ صحن میں آئی ہی تھی کہ اسے عدیل کی آواز سنائی دی تھی اور اس نے چونک کر چھت کی طرف دیکھا تھا۔ سیمنٹ سے بنے جنگلے پہ دونوں ہاتھ جمائے کھڑا نیچے صحن کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔

"باقی سب کہاں ہیں؟" مدحیہ اس کی بات نظر انداز کر گئی تھی۔

"سب چلے گئے۔۔۔ مجھے اکیلا چھوڑ کر۔۔۔ مجھے کہا۔۔۔ لو گھر سنبھالو اپنا۔" عدیل کی غیر سنجیدگی اس کی باتوں سے عیاں ظاہر ہو رہی تھی۔

"مگر گئے کہاں؟ پلیز مجھے پریشانی ہو رہی ہے۔" مدحیہ کو اس کے موڈ سے ہی نظر آگیا تھا کہ وہ اسے صاف جواب نہیں دے گا' بلکہ ستائے گا۔

"جو چلے گئے ہیں ان کا مت پوچھو' جو ہیں ان کا سوچو۔" وہ ہنوز اسی موڈ میں تھا۔

"پلیز۔۔۔" جھنجلا گئی۔

"تم میرے لیے آئی ہو یا ان کے لیے آئی ہو؟"

"عدیل پلیز۔۔۔" وہ اس کا نام تو لے بیٹھی تھی' مگر پھر یک دم ہونٹ بھینچ لیے تھے اور اس کی یہ حرکت چھت پہ کھڑے عدیل نے بھی با آسانی نوٹ کی تھی۔

"کیا ہوا' چپ کیوں ہو گئی ہو؟" وہ دلچسپی سے بولا۔

"میں جا رہی ہوں۔" وہ جھنجلا کر واپسی کے لیے پلٹی۔

"جاؤ۔۔۔ شوق سے جاؤ۔۔۔ میں بھی جا رہا ہوں ڈاکٹر کے پاس۔" وہ کہہ کر جنگلے سے پیچھے ہٹ گیا تھا۔

اور مدحیہ کے واپس پلٹتے قدم رک گئے تھے۔ اس نے گردن موڑ کر جنگلے کی طرف دیکھا۔ وہ سامنے سے ہٹ چکا تھا اور مجبوراً" اسے سیڑھیوں کی طرف بڑھنا ہی پڑا تھا۔

وہ کشادہ چھت کے بیچوں بیچ بچھی چارپائی پہ سر جھکائے بیٹھا اپنی ناراضی کا کھلا اظہار کرتا نظر آرہا تھا۔ مدحیہ آہستہ قدموں سے چلتی عین اس کے سامنے بچھی دوسری چارپائی پہ آبیٹھی تھی اور سر جھکائے بیٹھے عدیل کی نظریں مدحیہ کے دودھیا پاؤں پہ ٹھہر گئی تھیں۔ بلیک سینڈلز میں مقید اس کے پاؤں ایسی چھب دکھلا رہے تھے کہ عدیل کو نظریں چرالینا ہی مناسب لگا تھا۔

"کیا ہوا تمہاری طبیعت کو۔۔۔؟" مدحیہ نے طبیعت پوچھنے میں پہل کی تھی۔

"جو تمہاری طبیعت کو نہیں ہو رہا۔" عدیل نے نظریں اٹھا کر براہ راست اس کے چہرے پہ نظریں جما دی تھیں۔

"کیا مطلب۔۔۔" وہ نا سمجھی سے بولی۔

"یہی بے چینی' بے قراری اور بے بسی۔"

"میں تمہاری طبیعت کا پوچھ رہی ہوں۔" وہ اس کی بات پر الجھی تھی۔

"میں بھی اپنی طبیعت کا ہی بتا رہا ہوں۔۔۔ ضروری نہیں کہ طبیعت صرف بخار' کھانسی' زکام سے ہی خراب ہو' طبیعت کبھی کبھی اس طرح بھی خراب ہو جاتی ہے' کیونکہ طبیعت کا سارا دارومدار دل پہ ہوتا ہے۔ انسان کا دل

خوش تو سمجھو طبیعت بھی خوش۔۔۔" عدیل نے اسے دلیل دی تھی۔

"یعنی تمہیں بخار' کھانسی' زکام کچھ بھی نہیں ہے؟" مدحیہ نے مصنوعی خفگی سے دیکھا۔

"نہیں۔۔۔ میں نے اپنی بیماری بتائی تو ہے۔"

"اوہ یعنی تم نے مومنہ بھابھی کے ساتھ مل کر بے وقوف بنایا ہے؟" وہ اب کی بار ان کا سارا گیم سمجھ گئی تھی۔

"بے وقوف نہیں بنایا۔۔۔ ایک اچھا کام کیا ہے۔۔۔" اس کے موڈ میں ہنوز شرارت کا عنصر تھا۔ مدحیہ اپنی خفگی دبا گئی تھی۔

"لیکن کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ اچھا ہونے کی بجائے کام اور بھی بگڑ جاتا ہے۔" مدحیہ بڑی دلچسپی سے مسکرائی تھی۔

"آثار تو مجھے بھی کچھ ایسے ہی نظر آرہے ہیں۔ طبیب چاہتا ہی نہیں کہ مریض اچھا ہو۔" عدیل نے اپنی گدی کے بال کھجاتے ہوئے بڑی آہستگی سے کہا تھا۔ آخر وہ عین اس کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔

"طبیب کے ساتھ دھوکے دہی سے کام نہیں لینا چاہیے نا۔ مرض صاف صاف بتانا چاہیے۔۔۔ اس سے شفا جلدی مل جاتی ہے۔" وہ بھی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ "طبیب اپنا ہوتے ہوئے بھی پرایا ہو جائے تو پھر ایسے دھوکے دینا مجبوری بن جاتا ہے۔"

"پرایا۔۔۔ مطلب؟" اس نے نا سمجھی سے دہرا کے پوچھا۔

"مطلب کہ انگیجمنٹ سے پہلے لگتا تھا کہ ہم ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں' بے تکلف ہیں اور تو اور دو چار ملاقاتیں بھی ہو جاتی تھیں۔ لیکن اب تو دعا سلام سے بھی گئے۔ ملنا چاہو بہانے سے بیمار ہونے کی اطلاع پہنچانی پڑتی ہے' ورنہ پہلے یہ حالات تو نہیں تھے نا؟ اس سے تو بہتر تھا کہ ہم انگیجمنٹ ہی نہ کرواتے۔"

عدیل تو مدحیہ سے دوری کی کوفت سے جیسے بھرا بیٹھا تھا یک دم شکایتوں کا انبار ساتھ لیے پھٹ پڑا تھا اور مدحیہ اس کی صورت دیکھ کر یک دم کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

"پہلے کی بات اور تھی۔۔۔ اب کی بات اور ہے۔۔۔ پہلے ہم آزاد تھے۔۔۔ اب ہم بندھ چکے ہیں۔ اب ہم میں ایک تعلق ہے' ایک رشتہ ہے۔ اب سب کا دھیان ہماری طرف ہو گا۔ اب سب ہمیں نوٹس کریں گے۔ اس لیے بہتر ہے کہ ہم فاصلے پہ ہی رہیں۔" اب اکثر ایسا ہوتا تھا کہ مدحیہ ہی اسے سمجھاتی ہوئی نظر آتی تھی۔

"یہ کیوں نہیں کہتیں کہ اس سے تو بہتر ہے کہ ہم شادی کر لیں۔" وہ خفگی اور غصے سے تپ اٹھا تھا۔

"تم نے ہی کہا تھا کہ ایمن کی شادی کے بعد اپنے بارے میں سوچوں گا۔۔۔ تقریباً" ایک یا دو سال بعد۔۔۔" مدحیہ نے اسے اس کا بیان یاد دلایا۔

"اف توبہ کرو۔۔۔ چھ ماہ بھی گزر جائیں تو بڑی بات ہے۔ اکیلے بیٹھ کر آہیں بھرنے سے تو بہتر ہے کہ بندہ کسی کو سامنے بٹھا کر آہیں بھرلے۔"

"اوہ یعنی کہ تم آہیں بھرنے کے لیے شادی کرنا چاہتے ہو؟" مدحیہ نے پوائنٹ اٹھایا۔

"ظاہر ہے طبیب کو تو فی الحال یہی دھوکا دینا ہے نا۔" وہ کہتے کہتے معنی خیزی سے مسکرایا۔

"شہریار کی فیملی تین ماہ بعد شادی کے لیے زور دے رہی ہے۔۔۔ لیکن میں نے ان سے چھ ماہ کا وقت مانگا ہے۔ چھ ماہ میں ایمن کی شادی اور آپ جناب کی رخصتی بھی ہو جائے گی۔ آخر میرے امی' ابو بھی بہو جیسی نعمت سے فیض یاب ہونا چاہتے ہیں۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟" مدحیہ گھبرائی تھی۔

"جو تم سن رہی ہو۔" وہ البتہ بڑا پرسکون تھا۔

"ہم... مگر... عد... ل..." وہ اس کا نام لیتے لیتے رک گئی تھی۔ اب وہ اکثر اس کا نام لینے سے گریز کرتی تھی۔
"اب تو تم میرا نام لینے سے بھی گئیں۔ بس یہی کوفت ہوتی ہے مجھے... اسی لیے تو شادی کر لینا چاہتا ہوں۔" وہ دلچسپی سے کہتا ہوا مسکرایا تھا اور مدحیہ یک دم اس کے سامنے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔
"میں چلتی ہوں۔" جب سے اس کی انگیجمنٹ ہوئی تھی۔ اسے واقعی عدیل سے بہت زیادہ شرم آنے لگی تھی۔ اب وہ اس سے بہت کم ہی ملتی تھی۔ اسی لیے تو عدیل کو آج مومنہ کی ہیلپ لینا پڑی تھی۔
"رکو تو..." وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔
"پھر آؤں گی..." وہ جنگلے کی طرف بڑھی۔ "کب..." عدیل بھی اس کے ساتھ ساتھ تھا۔
"جب رخصتی کرواؤ گے..." مدحیہ نے آہستگی سے کہتے ہوئے آس پاس کی چھتوں کی طرف دیکھا۔ شام کا وقت تھا کافی سے بھی زیادہ لوگ اپنے گھروں کی چھتوں پہ نظر آرہے تھے۔ "میں تو چاہتا ہوں کہ آج ہی کروالوں..." وہ بہت عجلت پسند ہو رہا تھا۔
"تو کروالو..." اس نے اب کی بار کندھے اچکائے تھے... اور وہ بھی کافی لاپروائی سے۔
"سچ..." عدیل کو اس کی رضامندی پہ کافی ایکسائٹمنٹ ہوئی تھی۔
"مچ..." وہ بھی جواباً شرارت سے کہتی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔
"مدحیہ... رکو بات سنو۔" وہ پیچھے سے پکارا تھا۔
"اب ایک بار ہی سنوں گی، جب تم دھوکے سے نہیں بلاؤ گے۔" وہ سیڑھیاں اترتے ہوئے بولی۔
"یار... کچھ دیر تو رکو نا... وہ سب مریم سے ملنے کے لیے گئی ہوئی ہیں۔" عدیل نے دہائی دی۔
"جب وہ سب آجائیں تو پھر آؤں گی... ابھی تم ان کو لینے جانے کی تیاری کرو۔" وہ سیڑھیاں اتر کر دوبارہ صحن میں آگئی تھی۔
"میں ان کو لینے نہیں جاؤں گا۔ جودت خود انہیں ڈراپ کردے گا۔" عدیل کا منہ بن چکا تھا، مگر مدحیہ نوٹس لینے والی نہیں تھی۔
"اچھی بات ہے... اوکے اللہ حافظ۔" وہ دروازے کی طرف بڑھی۔
"آئی ریئلی مس یو یار۔" اس نے اپنی دلی کیفیت کا اظہار کیا۔ مدحیہ ٹھٹکی پلٹی اور مسکرا اٹھی تھی۔
"آئی مس یو ٹو..." اس کے لہجے میں بھی محبت کا اک بھرپور احساس رچا ہوا تھا۔
"کیا... ؟ پھر سے کہو۔" وہ جنگلے سے ہاتھ ہٹا کر سیڑھیاں اترنے کے لیے لپکا تھا۔ مگر تب تک مدحیہ یک دم کھلکھلاتی ہوئی دروازہ کھول کر دہلیز عبور کر گئی تھی۔
اور عدیل کے گھر کا آنگن مدحیہ کی ہنسی اور کھلکھلاہٹ سے گونج اٹھا تھا۔ جس کو محسوس کرکے خود عدیل بھی مسکرا دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

نہ گلہ ہے کوئی حالات سے، نہ شکایتیں کسی کی ذات سے
خود ہی سارے ورق ہو رہے ہیں جدا، میری زندگی کی کتاب سے

زری چپ چاپ بیٹھی تھی۔ جب ان دونوں کی نظر بیک وقت اس کی طرف اٹھی تھی۔
"زری... ناشتا کرو نا بیٹا... اس طرح کیوں بیٹھی ہو؟"
وہ تینوں صبح کے وقت ناشتے کی ٹیبل پہ بیٹھے ناشتا کر رہے تھے۔ لیکن زری کو یوں ہی گم سم سا بیٹھے دیکھ کر

عبداللہ سے رہا نہیں گیا تھا۔
"میرا دل نہیں چاہ رہا۔" زری کی آواز کافی رندھی ہوئی تھی۔
"کیوں... دل کیوں نہیں چاہ رہا؟ اور یہ تم رو رہی ہو کیا؟" عبداللہ اور نگارش دونوں ہی چونک گئے تھے۔
"بھائی... پتا نہیں کیا بات ہے، میرا دل بہت ہی گھبرا رہا ہے۔ بی بی جان سے ملنے کو دل چاہ رہا ہے۔ دل چاہ رہا ہے ان کے گلے لگ کے زور، زور سے دل کھول کر رووں... اتنا رووں کہ کبھی چپ نہ ہو سکوں۔" زری کہتے ہوئے خود پہ اختیار نہ رکھ سکی اور بے ساختہ تڑپ تڑپ کر رو پڑی تھی۔ جس پہ نگارش اور عبداللہ دونوں ہی پریشان ہو اٹھے تھے۔
"اللہ خیر کرے زری... ایسا کیوں کہہ رہی ہو؟ کیا ہوا ہے آخر؟" نگارش نے اپنا ناشتا چھوڑ کر فوراً زری کو اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔
"ہم... میں نے آج خواب میں بی بی جان کو روتے ہوئے دیکھا ہے... اور... اور تب سے مم میرا دل بھی رو رہا ہے۔ مجھ سے آج ٹھیک سے نماز بھی نہیں پڑھی گئی۔ میرے حلق سے نوالہ بھی نہیں اتر رہا۔ میرا دل بند ہو رہا ہے بھابھی... میرا بی بی جان سے ملنے کو دل چاہ رہا ہے... مجھے بی بی جان کے پاس لے چلیں۔ وہ... وہ... میرے خواب میں آئی تھیں... وہ اکیلی رو رہی تھیں۔"
زری تو رو، رو کر پاگل ہو گئی تھی اور نگارش اور عبداللہ اس نئی سچویشن پہ اندر سے حد درجہ پریشان اور وہم اور وسوسوں کا شکار ہو کر رہ گئے تھے۔
"پلیز زری... سنبھالو اپنے آپ کو... اللہ بہتر کرے گا... تم دعا کرو... ہم ابھی بی بی جان کو فون کرتے ہیں۔" نگارش نے اسے بہلایا مگر زری کو صبر کیسے آتا بھلا؟ وہ سچ ہی تو تڑپ رہی تھی۔ اس کا دل اور اس کی رگوں میں بہتا

خون اسے سکون نہیں لینے دے رہا تھا۔

"صاحب جی۔۔۔ باہر آپ سے کوئی ملنے کے لیے آیا ہے۔" ملازمہ بوکھلائی ہوئی سی اندر داخل ہوئی تھی۔

"مجھ سے۔۔۔ اتنی صبح صبح۔۔۔" عبداللہ کے دل میں خدشے نے سر ابھارا تھا۔

"السلام علیکم۔" انسپکٹر شہناز اور ایس پی کامران مہدی ایک ساتھ اندر داخل ہوئے تھے اور ان کے پیچھے دل آور اور نبیل حیات کی صورتیں دکھائی دی تھیں۔

"وعلیکم السلام۔۔۔ خیریت۔۔۔ آپ سب یہاں۔" عبداللہ سے بولنا مشکل ہو گیا تھا۔ کیونکہ اسے سب کے سب ہی بہت پریشان نظر آئے تھے۔

"ایم سوری ملک عبداللہ۔۔۔ ہمیں یہ خبر انتہائی افسوس کے ساتھ سنانی پڑ رہی ہے کہ آپ کے بڑے بھائی ملک اسد اللہ۔۔۔ ملک حق نواز کو جیل سے فرار کرواتے ہوئے پولیس فائرنگ سے ہلاک ہو گئے ہیں۔ ان دونوں کی ڈیڈ باڈیز پولیس اسٹیشن میں ہیں۔ آپ جا کر تصدیق کر سکتے ہیں۔"

ایس پی کامران مہدی نے بہت ہی تحمل سے یہ خبر سنانے کی کوشش کی تھی۔ مگر پھر بھی عبداللہ کے قدموں تلے سے زمین سرک گئی تھی۔ وہ کھڑے قدے سے لڑکھڑا گیا تھا۔ مگر ان دونوں نے اسے تھام لیا تھا۔ "بھائی۔۔۔" عبداللہ کے ہونٹ کپکپائے تھے۔ اس نے دل آور اور نبیل کو خالی خالی نظروں سے دیکھا تھا۔

"بس یہی اللہ کو منظور تھا شاید۔۔۔ صبر سے کام لیں۔" ایس پی کامران مہدی نے بھی آگے بڑھ کے عبداللہ کے کندھے پہ ہاتھ رکھا تھا۔

"بی بی جان۔۔۔" زری خاصی بلند آواز سے کرلائی تھی۔ اس کا خواب سچ ثابت ہوا تھا۔

"دیکھیے زرین۔۔۔ یہ سب اللہ کے کام ہیں۔ یہ رونا دھونا سب فضول ہے۔ ہماری زندگیوں میں جو بھی ہوتا ہے اللہ کی رضا سے ہی ہوتا ہے۔ پلیز سنبھالیے اپنے آپ کو۔۔۔ ابھی آپ لوگوں نے یہ ڈیڈ باڈیز لے کر اپنے گھر بھی جانا ہے۔" انسپکٹر شہناز نے زری کو بہت اپنائیت سے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے تسلی دی تھی۔ بلکہ وہ دونوں میاں بیوی ہی ان لوگوں کی ڈھارس بندھانے میں لگے ہوئے تھے۔ کیونکہ دل آور شاہ کے حوالے سے وہ نبیل حیات اور عبداللہ کی فیملی کی بھی بہت عزت و احترام کرتے تھے۔

اور اب تو وہ دونوں (انسپکٹر شہناز اور ایس پی کامران مہدی) شادی کر چکے تھے اور ان کا شمار بھی اب دل آور شاہ کے قریبی احباب میں ہوتا تھا۔۔۔! اسی لیے وہ ان لوگوں کے غم میں برابر کے شریک نظر آ رہے تھے۔

"عبداللہ۔۔۔! چلو پولیس اسٹیشن بھی جانا ہے اور۔۔۔" دل آور نے اس کا بازو سہلایا۔

"نہیں۔۔۔ دل آور۔۔۔ نہیں۔۔۔ میں، میں ایسے نہیں جا سکتا۔۔۔ میں بی بی جان کے سامنے اپنے بھائی کی ڈیڈ باڈی لے کر نہیں جا سکتا۔۔۔ اتنا حوصلہ نہیں ہے مجھ میں۔" عبداللہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

"تم اکیلے نہیں ہو عبداللہ۔۔۔ ہم ہیں نا تمہارے ساتھ۔" نبیل نے اس کا کندھا تھپکا تھا اور عبداللہ ان دونوں کے کندھے سے لگ کر بے اختیار رو پڑا تھا اور اتنی شدت سے رویا تھا کہ نبیل اور دل آور کی آنکھیں بھی نم ہوئے بغیر نہیں رہ سکی تھیں۔

اور پھر یونہی روتے بلکتے ہوئے وہ اسے پولیس اسٹیشن لے کر پہنچے تھے، جبکہ زری نے گھر پہ ہی رو رو کر برا حال کر رکھا تھا اتنے میں فائزہ بیگم، مومنہ بی بی، مدحیہ اور علیزے بھی وہاں پہنچ گئی تھیں انہیں دل آور کا خاص آدمی "مبارک خان" چھوڑ کر گیا تھا۔

اور جب وہ سب عبداللہ کے ساتھ ڈیڈ باڈیز لے کر ان کی حویلی اور ان کے گاؤں پہنچے تھے تو ہر طرف اک کہرام مچ گیا تھا، پولیس، میڈیا اور جان پہچان کے سب لوگ ایک دم سے جیسے سمندری ریلے کی طرح امڈ کر آئے تھے اور کانوں پڑی آواز تک سنائی نہیں دے رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

زندگی ہے یا کوئی طوفان!
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

آج ان کا سوئم تھا۔

بڑی حویلی سے دانیال اور عائشہ آفندی آئے تھے تو ان کی دیکھا دیکھی بڑی حویلی کے باقی سب افراد کو بھی آنا ہی پڑا تھا، لیکن جیسے ہی آسیہ آفندی آئی تھیں زری کے ضبط کا دامن پھر سے چھوٹ گیا تھا اور وہ ان کے گلے لگ کے دھاڑیں مار مار کے روئی تھی۔

کیونکہ آسیہ آفندی بھی اس گھر کی اکلوتی بیٹی تھیں لیکن رشتوں کی ڈوریوں میں الجھ کر اتنے سال اپنوں سے بچھڑ کر گزار دیے تھے، زندگی کا کوئی سکھ انہوں نے بھی نہیں دیکھا اور زندگی کا کوئی سکھ زری کے نصیب میں بھی نہیں تھا، وہ نصیب اور قسمتوں کے حوالے سے واقعی ایک دوسرے سے کم نہیں تھیں۔

"زری۔۔۔! پلیز بس کریں۔۔۔" علیزے نے رو رو کر نڈھال ہوئی زری کو کندھے سے تھام کر تسلی دینے کی اور سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"زری۔۔۔! پلیز کیوں رو رہی ہیں آپ۔۔۔؟ کیوں۔۔۔؟ بس کریں، بہت ہو گیا اور کتنا روئیں گی آخر۔۔۔؟"

علیزے اسے سمجھانے کے لیے اسے جھنجھوڑ رہی تھی۔

"کیا رو بس بھی نہ۔۔۔؟" زری بڑے اذیت بھرے لہجے میں بولی تھی اور علیزے کے دل پہ ہاتھ پڑا تھا۔۔۔ وہ چند ثانیے کے لیے چپ سی ہو گئی تھی۔

پھر جتنی دیر بھی وہ لوگ وہاں رہے تھے علیزے نے دوبارہ کچھ نہیں کہا تھا، وہ شام ڈھلے تک وہاں بیٹھے تھے اور بالآخر نبیل اور دل آور کو ہی وہاں سے اٹھنے کا اور واپسی کا خیال آیا تھا۔

"علیزے۔۔۔! گھر چلیں۔۔۔؟" مردان خانے سے نکل کر دل آور زنان خانے کی طرف آیا تھا اور پردے کی اوٹ سے نظر آتی علیزے کو آواز دی تھی۔

"جی۔۔۔! آ رہی ہوں بس؟" علیزے اسے جواب دیتی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور اسے اٹھتے دیکھ کر زری بھی جیسے اپنے حواسوں میں لوٹ آئی تھی اور اس نے یکدم علیزے کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

"علیزے۔۔۔ ایم سوری۔۔۔ میرے منہ سے کوئی غلط یا سخت الفاظ نکل گئے ہوں تو مجھے معاف کر دینا۔۔۔ میں تم سے ایسا بولنے کا کبھی سوچ بھی نہیں سکتی۔۔۔ تم میرے لیے بہت اہم ہو، بہت عزیز ہو مجھے۔۔۔ اللہ تمہیں سدا سہاگن رکھے۔۔۔ ہمیشہ خوش رکھے، آباد رکھے۔" زری نے اسے کھلے دل سے دعا دی تھی اور ناکردہ غلطی کی معافی چاہی تھی۔ جس پہ خود علیزے کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔

اور علیزے بے اختیار اس سے لپٹ گئی تھی پھر وہ دونوں ہی اک دوسرے کو بھینچ کر بہت زیادہ اور بے تحاشا روئی تھیں۔

"علیزے۔۔۔! دیر ہو رہی ہے۔" دل آور نے پھر سے آواز دی تھی اور علیزے روتی بلکتی ہوئی زری سے الگ ہوئی تھی لیکن اس سے الگ ہوتے ہوئے بھی علیزے نے اس سے اک ایسی بات کہہ دی تھی کہ زری اپنی

جگہ پہ جمی رہ گئی تھی۔ اس کے اعصاب گم سم سے ہو گئے تھے۔

"علیزے۔۔۔!" زری کے ہونٹ بری طرح کپکپائے تھے مگر علیزے نظریں پھیر کر پلٹ گئی تھی۔

"علیزے۔۔۔!" زری نے اسے پھر پکارنے کی اور روکنے کی کوشش کی تھی۔

مگر علیزے زنان خانے کا جالی دار پردہ ہٹا کر باہر نکل آئی تھی اس نے زری کی آواز پہ کان نہیں دھرے تھے بلکہ آگے بڑھ کر دل آور کے ساتھ ہولی تھی۔

"علیزے۔۔۔!" زری رہ نہ سکی اور ان کے پیچھے لپکتی ہوئی ننگے پیر باہر تک بھاگی آئی تھی۔ وہ دونوں گاڑی کی طرف بڑھ رہے تھے اور زری وہیں حویلی کے برآمدے کے بڑے بڑے ستونوں کے پاس ہی ٹھہر گئی تھی۔ اب کی بار اسے پکارنے کی اسے ہمت ہی نہ ہوئی تھی۔ البتہ ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے دل آور کی ایک بے ارادہ سی نظر اٹھی تھی اور ستون کے ساتھ کھڑی زری کی نظروں سے جا ٹکرائی تھی اس لمحے دل آور کو لگا حویلی کے ان بڑے بڑے ستونوں کے ساتھ زری نہیں بلکہ "عشق" کھڑا ہو۔۔۔! سر سے پاؤں تک عشق۔۔۔ ننگے سر اور ننگے پیر۔۔۔ ہجر اور غم کے بیچ ڈولتا ہوا۔۔۔!

وہ عشق کی آنکھوں سے آنکھیں چار نہیں کر سکتا تھا اسی لیے نظریں چرا گیا تھا، اور نظریں چرانے میں بس ایک لمحہ لگا تھا۔۔۔ ہمیشہ کی طرح۔۔۔ بس اک لمحہ۔۔۔!

اور پھر یکدم سر جھٹکتے ہوئے وہ گاڑی میں بیٹھا اور زری کے سامنے ہی گاڑی نکال لے گیا تھا۔ پھر اس کے پیچھے ہی نبیل اور مدیحہ وغیرہ کی گاڑی رخصت ہوئی تھی اور پھر زری کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ سب اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئے تھے۔

شاید ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔۔۔!

☆ ☆ ☆

سات سال بعد۔۔۔!

تیرے عشق میں
ہائے تیرے عشق میں
راکھ سے روکھی کوئل سے کالی
رات کٹے نہ ہجراں والی
تیرے عشق میں
ہائے تیرے عشق میں

ہر سو ملگجا سا اندھیرا تھا، کیونکہ چاند کی پندرہویں رات تھی، اب چاند گھاٹے کے ترازو میں تل رہا تھا اور چاند کے ساتھ ساتھ وہ بھی دن بہ دن گھٹتی جا رہی تھی اور اسی گھاٹے کی کیفیت میں گاؤں کے کھیتوں میں دور کہیں کسی دل جلے کے دل کی جلن ان سروں میں مقید فضا میں گونجتی ہوئی سنائی دے رہی تھی۔

اور زری کا کسی تازہ زخم کی طرح رستا ہوا عشق پھر سے بلبلا اٹھا تھا اور وہ پھر سے درد اور اذیت سے نڈھال ہو گئی تھی۔۔۔

اور ان سات سالوں میں تو ایسا کئی بار ہو چکا تھا
جیسے ہی عشق کے زخم پہ صبر کا کھرنڈ آنے لگتا تھا، پھر کوئی یاد چوٹ کی طرح لگتی تھی اور کھرنڈ پھر سے چھیل کر رہ

جاتا تھا۔۔۔ اور وہ پھر سے درد اور اذیت سے بلک اٹھتی تھی اور اس کی آنکھوں کے گوشے تنہائی کے لمحات میں پھر سے نم ہونے لگتے تھے۔۔۔ حالانکہ بظاہر تو سب کچھ ٹھیک ہی چل رہا تھا۔

دل آور شاہ اور علیزے شاہ کے دو بچے بھی ہو چکے تھے، وہ اپنی زندگی میں بہت پرسکون اور مگن تھے، ان کی زندگی ایک خوشحال زندگی کی مثال تھی اور یہی حال عبداللہ اور نبیل حیات کا بھی تھا وہ دونوں بھی صاحب اولاد ہو چکے تھے اور اللہ کی اس کرم نوازی پہ ہمیشہ شکر گزار بھی رہتے تھے۔

کیونکہ اللہ نے انہیں اپنی رحمتوں اور اپنے نعمتوں سے نوازا تھا، کسی بھی شے سے محروم نہیں رکھا تھا اسی لیے وہ بھی انصاف، ایمان داری اور رحم دلی کا چلن چلتے تھے۔

عبداللہ نے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں آتے ہی دانیال اور زین کا جائیداد میں سے ان کا حصہ ان کے نام کر دیا تھا اور خود اسد اللہ کے بیوی اور بچوں کے سر پہ شفقت بھرا ہاتھ رکھا تھا، حالانکہ وہ شہر میں نبیل اور دل آور کے ساتھ مل کر کاروبار بھی کرتا تھا مگر پھر بھی گاؤں آنا جانا اور سب کا خیال رکھنا نہیں بھولتا تھا، خصوصاً "زری کا۔۔۔!"

البتہ یہ الگ بات تھی کہ زری نے بھی خود کو بی بی جان، بابا جان، حویلی، گاؤں اور اسد اللہ کے بیوی بچوں میں گم کر لیا تھا، اب ان سب کے مسائل ہوتے تھے یا زری ہوتی تھی۔۔۔

ان سات سالوں میں ایک بار بھی نہ وہ شہر گئی تھی اور نہ ہی شہر سے کوئی آیا تھا، ہاں سات سال پہلے کا اک منظر آج بھی اس کے دل و دماغ پہ تازہ تھا اور حویلی کے برآمدے کے ستون سے ٹیک لگائے کھڑا اس کا عشق بھی ہنوز تازہ تھا۔۔۔ ایسا تازہ جیسے گلاب کا پھول۔۔۔ سرخ۔۔۔ مہکتا ہوا۔۔۔ لو دیتا ہوا۔۔۔!

اور ایسی ہی اک لو دیتی ہوئی علیزے شاہ کی سرگوشی بھی اس کے کانوں میں تازہ تھی اور اسی تازہ سرگوشی کا زہر پل پل اس کی رگوں میں اترتا رہتا تھا!

اور وہ پل پل مرتی رہتی تھی۔۔۔!

کیونکہ علیزے کی سرگوشی ہی کچھ ایسی تھی
زری۔۔۔! عشق ننگا ہوتا ہے اور محبت پردہ
محبت کو عشق پہ ڈال دو تو عشق چھپ جاتا ہے
بالکل ایسے جیسے علیزے کے وجود سے زری چھپ جاتی ہے
اس لیے تم بھی سمجھ جاؤ کہ تم عشق ہو اور میں محبت
میں ظاہر ہوں اور تم چھپ گئی ہو
میں تمہارا پردہ ہوں
کیونکہ یہ سچ ہے کہ دل آور شاہ زری سے ہی عشق کرتا ہے
بس اس نے محبت کا پردہ ڈال دیا ہے
ورنہ عشق تو اسے آج بھی ہے
ورنہ عشق تو اسے آج بھی ہے
ورنہ عشق تو اسے۔۔۔!

یہ الفاظ اور یہ سرگوشی اس کے "در دل" پہ دستک دیتے رہتے تھے اور وہ پاگل ہوتی رہتی تھی۔۔۔!!

☆ ☆